بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلامی تعلیمات کی روشنی میں

ابو عمار زاہد الراشدی

قرآنِ کریم اور حدیث و سیرتِ نبوی ﷺ کے تذکرہ
پر مشتمل مضامین و بیانات کا مجموعہ

www.alsharia.org

فہرست عنوانات

۲۰۱۸ء 259

۲۰۱۲ء.......... 839

۲۰۱۰ء...1149

##

۲۰۰۵ء... 1762

۲۰۰۴ء 1807

۱۹۹۹ء..2234

۲۰۲۳ء

سانحہ جڑانوالہ اور انصاف کے تقاضے

(جامعہ فتحیہ، اچھرہ، لاہور - ۱۹ اگست ۲۰۲۳ء)

(جامعہ فتحیہ اچھرہ لاہور میں بعد نماز عصر ہفتہ وار درس کا ایک حصہ)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جڑانوالہ میں گزشتہ دنوں رونما ہونے والا سانحہ ان دنوں عوامی اور دینی حلقوں میں زیر بحث ہے، اس کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جڑانوالہ ضلع فیصل آباد میں چند روز قبل یہ سانحہ ہوا ہے کہ قرآن مقدس کے اوراق پھاڑ کر ان پر توہین آمیز جملے لکھ کر باہر پھینکے گئے جنہیں دیکھ کر لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا جو معاملات کو بروقت کنٹرول نہ کیے جانے کے باعث بڑھتے بڑھتے مسیحی آبادی کے بہت سے مکانات حتیٰ کہ عبادت گاہوں کے جلا دیے جانے تک جا پہنچا اور سوشل میڈیا کے ذریعے اس کا دھواں آناً فاناً ملک بھر میں پھیل گیا۔

دوستوں نے بتایا ہے کہ علاقہ کے بزرگ عالم دین مولانا مفتی محمد یونس رضوی نے، جن کا تعلق بریلوی مکتب فکر سے ہے، دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اس کا بروقت نوٹس لیا اور موقع پر پہنچ کر حالات قابو کرنے کی سنجیدہ کوشش کی، ملزمان کی نشاندہی ہوئی، انہیں حراست میں لیا گیا اور پولیس سے رابطہ کر کے صورتحال کو سنبھالنے کی طرف توجہ دلائی گئی مگر انتظامیہ کے ذمہ دار افسران کی مبینہ بے پروائی کے باعث تین چار گھنٹے گومگو کے ماحول میں گزر گئے اور اتنی دیر میں اشتعال اپنا کام کر گیا جو دنیا بھر میں ملک و قوم کی بدنامی کا باعث بنا اور اس پر دنیا میں ہر سطح پر ردعمل کا مسلسل اظہار ہو رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مسیحی خاندان کے جن دو لڑکوں کو توہین قرآن کریم کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے ان کے والدین اور خاندان والوں کا کہنا ہے کہ اگر ان لڑکوں کا یہ جرم ثابت ہو جائے تو وہ ان کا دفاع کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور انہیں جو سزا بھی دی جائے وہ اس کا ساتھ دیں گے مگر اس سے قبل پوری طرح تحقیق کر لی جائے، کیونکہ ان کے خیال میں یہ لڑکے مجرم نہیں ہیں اور انہیں کسی سازش کے تحت اس میں پھنسایا گا ہے جس کا واضح قرینہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے ان اوراق کے ساتھ ان لڑکوں کے فوٹو اور ان کے فون نمبر بھی پائے گئے ہیں جبکہ کوئی مجرم موقع واردات پر اپنی تصویر اور فون نمبر نہیں چھوڑا کرتا۔

بہرحال اتنی بات تو طے ہے کہ قرآن کریم کی توہین ہوئی ہے، جس نے بھی کی ہے اسے اس سنگین جرم کی قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔ اگر منصفانہ تحقیقات کے نتیجے میں یہ جرم ان لڑکوں کا ہے تو وہ کسی نرمی کے مستحق نہیں ہیں اور انہیں قانون کے مطابق سزا دینا ضروری ہے، لیکن اگر انہیں اس میں پھنسایا گیا ہے تو سازش کرنے والے بھی کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں بلکہ پوری طرح سزا کے مستحق ہیں۔ البتہ یہ کام انتظامیہ اور عدلیہ کا ہے اور انہیں جلد از جلد اپنی ذمہ داری پوری کرنی چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایسی کسی کاروائی پر فوری اشتعال میں آنا اور سوچے سمجھے بغیر بہت کچھ کر گزرنا ہمارے معاشرتی مزاج کا حصہ بن گیا ہے اور ایسے متعدّد واقعات ہمارے ہاں ہو چکے ہیں کہ فوری اشتعال کے تحت جذباتی ردعمل کا اظہار کیا گیا اور اس کے جانی و مالی نقصانات ملک و قوم کے ساتھ ساتھ دین کی بدنامی کا باعث بن گئے۔ جبکہ بعد میں یہ ثابت ہوا کہ محض سنی سنائی باتوں پر ایسا کیا گیا جبکہ حقائق اس کے برعکس ظاہر ہوئے۔ گوجرانوالہ میں کچھ عرصہ قبل ایک حافظ قرآن کو ایسے ہی الزام میں سڑک پر گھسیٹ کر انتہائی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا اور الزام بعد میں غلط ثابت ہوا۔

یہ طرز عمل قرآن کریم کے اس ارشاد کے بھی منافی ہے کہ ”فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین“ (الحجرات ۶) کوئی بھی ایسی خبر آنے پر تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں تم کسی قوم پر حملہ کر دو اور بعد میں خبر غلط ثابت ہونے پر خود تمہیں ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لیے ایسے کسی اشتعال میں مکانات اور عبادت گاہوں کو نذر آتش کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لینا بھی کوئی کم سنگین جرم نہیں ہے، اور یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اشتعال کا پیدا ہونا تو فطری بات ہے مگر اشتعال پیدا کرنا اور اس کے

دائرے کو پھیلانا فطری نہیں بلکہ مصنوعی عمل ہے جو منصوبہ بندی کے بغیر نہیں ہوتا اور یہ بھی سنگین جرم ہے جس کا سخت نوٹس لیا جانا ضروری ہے۔

چنانچہ ہمارا مطالبہ ہے کہ سانحہ جڑانوالہ کی اعلیٰ سطحی عدالتی تحقیقات کرائی جائے اور توہین قرآن کریم کے سنگین جرم کے ساتھ ساتھ عبادت گاہوں اور مکانات کو نذر آتش کرنے کے جرم پر بھی مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

بنی اسرائیل کی جدوجہدِ آزادی کی چند جھلکیاں

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۶ اگست ۲۰۲۳ء)

(بعد نماز عصر ہفتہ وار درس)

۶ اگست ۲۰۲۳ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں بعد نماز عصر ہفتہ وار درس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ اگست کا مہینہ شروع ہو گیا ہے اور حسب معمول ہر طرف سبز ہلالی پرچم لہرانے کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔ چودہ اگست کو ہم قومی یوم آزادی مناتے ہیں، اس روز برصغیر نے برطانوی استعمار کی حکومت سے آزادی حاصل کی تھی اور اسی روز پاکستان کے نام سے ایک نئی سلطنت اس خطہ میں وجود میں آئی تھی۔ ہم ان دو باتوں کی خوشی میں چودہ اگست کو ملک بھر میں تقریبات کرتے ہیں، قومی پرچم لہرایا جاتا ہے، ریلیاں ہوتی ہیں اور شہدائے آزادی کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اس سال بھی ایسا ہی ہوگا اور وطن و قوم کے لیے اور دین و ملت کے لیے ہم نئے عزم کا اظہار کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس موقع پر ایک قدیمی تحریک آزادی کے کچھ مناظر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی تفصیلات قرآن کریم نے بیان فرمائی ہیں، ان میں سے دو چار کا تذکرہ کروں گا۔

یہ بنی اسرائیل کی جدوجہد آزادی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی قیادت میں کی گئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کے یہودی قبائل کو دیکھا کہ وہ دس محرم کو روزہ رکھتے ہیں۔ وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ اس روز فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق ہوا تھا اور بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں فرعون کی غلامی سے نجات ملی تھی۔ یہ ہمارا یوم آزادی ہے اور ہم اس کے شکرانہ میں روزہ رکھتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

موقع پر فرمایا کہ ”نحن احق بموسی منکم“ ہمارا حضرت موسی علیہ السلام کے ساتھ تعلق تم سے زیادہ ہے، اس لیے ہم بھی روزہ رکھیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد دس محرم کے روزے کا سلسلہ ہمارے ہاں بھی شروع ہو گیا۔

بنی اسرائیل کی آزادی کے بہت سے مراحل قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں، ان میں سے دو چار کا ذکر کر رہا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ حضرت موسی علیہ السلام کی ولادت غلام قوم میں ہوئی تھی اور اس وقت طاقت ور اور غالب قوم یعنی آل فرعون کا طریق کار یہ تھا کہ غلام قوم بنی اسرائیل کے کسی گھر میں اگر لڑکا پیدا ہوتا تو اسے قتل کرا دیتے تھے تاکہ بڑا ہو کر ہمارے لیے مسئلہ نہ بنے۔ اور لڑکی کو زندہ رہنے دیتے تھے کہ یہ خدمت کے کام آئے گی۔ حضرت موسیؑ کی ولادت ہوئی تو والدہ محترم پریشان ہو گئیں کہ حکمران گروہ کو پتہ چل گیا تو بچے کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ اللہ تعالی نے اس موقع پر انہیں تسلی دی جو قرآن کریم میں ہے کہ ”واوحینا الی ام موسی ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی“ (القصص ۷) ہم نے حضرت موسیؑ کی والدہ کے دل میں بات ڈالی کہ بچے کو دودھ پلاؤ، اگر اس کے بارے میں خوف ہو تو صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں ڈال دو۔ اللہ تعالی نے فرمایا کہ ہم اس کی خود حفاظت کریں گے، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ صندوق دریائے نیل کی لہروں کے ساتھ فرعون کے محلات کے پاس سے گزرا تو کارندوں نے پکڑ لیا۔ کھول کر دیکھا تو ایک خوبصورت بچہ تھا۔ معصوم بچہ ایسے بھی خوبصورت لگتا ہے، اور وہ تو پیغمبر تھے۔ بلکہ اللہ تعالی نے فرمایا کہ ”والقیت علیک محبۃ منی“ (طہ ۳۹) میں نے حضرت موسی علیہ السلام پر محبت کی چادر ڈال دی تھی، جو بھی دیکھتا تھا محبت کرنے لگتا تھا۔ یہ اللہ تعالی کی طرف سے ان کی حفاظت کا بندوبست تھا۔

فرعون کی اہلیہ حضرت آسیہؓ نے دیکھا تو ان کے دل میں محبت کا جذبہ موجزن ہو گیا اور انہوں نے فرعون کے کارندوں کو قتل کرنے سے روک دیا بلکہ اپنا بیٹا بنا لیا۔ اور پھر حضرت موسیؑ کی پرورش فرعون کے خرچہ پر اس کے گھر میں ہوئی۔ جبکہ حضرت موسیؑ کو اپنی والدہ محترم سے بھی اللہ رب العزت نے ملا دیا اور دودھ وہی پلاتی رہیں۔

جوان ہونے تک حضرت موسیؑ کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بار ان کے قوم کے ایک فرد کا جھگڑا فرعون کے خاندان کے ایک شخص سے ہوا تو

موسیٰ علیہ السلام نے قوم فرعون کے شخص کو مکہ مارا جس سے وہ مر گیا۔ حضرت موسیٰؑ پکڑے جانے کے خوف سے مصر چھوڑ کر مدین چلے گئے اور حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر میں دس سال رہے۔ ان کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی، پھر وطن واپس آرہے تھے کہ کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے نبوت سے نوازا اور فرعون کو دین کی دعوت دینے پر مامور فرمایا۔

حضرت موسیٰؑ کی درخواست پر ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت ملی اور دونوں بھائی فرعون کے دربار میں اللہ تعالیٰ کے دو پیغام لے کر گئے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی سرکشی سے باز آجاؤ اور خدائی کا دعویٰ ترک کر کے ایک اللہ کی عبادت کرو۔ اور دوسرا پیغام یہ تھا کہ "ان ارسل معنا بنی اسرائیل" (الشعراء ۱۷) ہماری قوم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ اپنے پرانے وطن فلسطین میں واپس جانے دو۔ ہم واپس آزادی کے ماحول میں جانا چاہتے ہیں، تم راستہ نہ روکو۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت کی نشانی اور معجزہ کے طور پر عصا اور ید بیضا عطا فرمائے تھے جن کا اظہار فرعون کے دربار میں ہوا۔ جسے فرعون نے جادو قرار دے کر اس کے مقابلہ کے لیے اپنے جادوگر اکٹھے کرنے کا فیصلہ کیا۔ ملک بھر سے جادوگر جمع کیے گئے، کھلے میدان میں مقابلہ ہوا، جادوگروں کا جادو ناکام ہوا اور وہ سمجھ گئے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام جادوگر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ وہ ان پر ایمان لے آئے جس پر فرعون نے انہیں قتل کرنے اور سولی پر لٹکانے کی دھمکی دی۔ انہوں نے اس کی پروانہ کی اور ایمان پر استقامت کا اظہار کیا۔

اس مقابلہ میں ناکامی کے بعد فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا، جبکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ آزادی کے ساتھ اپنا کام کر رہے تھے۔ اس پر "وقال الملا من قوم فرعون اتذر موسیٰ وقومہ لیفسدوا فی الارض" (الاعراف ۱۲۷) فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ تم نے موسیٰ اور اس کی جماعت کو زمین میں فساد پھیلانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہے؟ فرعون نے یہ بات درباریوں کے سامنے پیش کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے مشورہ مانگا تو خود فرعون کے ایک رشتہ دار نے اس کی مخالفت کر دی اور دربار میں حضرت موسیٰؑ کے حق میں خطاب کیا۔ جس کا ذکر قرآن کریم نے "وقال رجل مومن من ال فرعون" (مومن ۲۸) کے عنوان سے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

یہ مراحل گزرنے کے بعد اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام کو حکم دیا کہ ”اسر بعبدی انکم متبعون“ (الشعراء ۵۲) بنی اسرائیل کو لے کر رات کے وقت مصر سے نکل جاؤ کہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل رات کو نکلے، فرعون نے پیچھا کیا، سمندر کے قریب پہنچ کر بنی اسرائیل پریشان ہو گئے کہ ہم تو درمیان میں پھنس گئے ہیں، اللہ تعالی نے سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو راستہ دیا اور فرعون کو لشکر سمیت غرق کر دیا اور اس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات ملی۔

تفسیر کشاف (اردو)

(۲۱ جولائی ۲۰۲۳ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

علامہ جار اللہ زمخشریؒ اور ان کی تفسیر ”کشاف“ اہل علم کے ہاں ہمیشہ مطالعہ اور استفادہ کا موضوع رہے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے احکام و آیات کی عقلی تشریح بھی صاحب کشاف کی اس تفسیر قرآن کریم کا امتیاز ہے جنہیں بعض معاملات میں اختلاف رائے اور تحفظات کے باوجود ہر دور میں اہل علم کے لیے استفادہ اور فہم قرآن کریم کے حوالے سے راہنمائی کا باعث سمجھا گیا ہے اور اس کی یہ افادیت آج بھی مسلم ہے۔

ہمارے فاضل دوست صاحبزادہ امانت رسول محترم نے اسے اردو کے قالب میں پیش کر کے حسن ذوق کا اظہار کیا ہے جو اہل علم اور فہم قرآن کریم کا اشتیاق رکھنے والوں کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔ اللہ تعالی ان کی یہ کاوش قبول فرمائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے نفع بخش بنائیں، آمین یارب العالمین۔

ہماری دعائیں!

(جامع مسجد تقوٰی، پیپلز کالونی، گوجرانوالہ - ۲ اپریل ۲۰۲۳ء)

بعد الحمد والصلوۃ! رمضان المبارک کا ایک عشرہ گزر گیا ہے، دو عشرے باقی ہیں۔ یہ اللہ تعالی کی رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ ہے۔ ویسے تو سارے مہینے ہی رحمتوں اور برکتوں والے ہیں، اللہ تعالی کی رحمت کو کہیں رکاوٹ نہیں ہے، لیکن اس مہینے میں عام مہینوں

سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ یہ توبہ استغفار، اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور اس کے سامنے جھولی پھیلانے کا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں ”قل مایعبؤابکم ربی لولا دعاؤکم“ (الفرقان ۷۷) اے نبی! فرما دیجئے کہ اگر تمہارا ہاتھ اٹھانا نہ ہو تو اللہ کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ تمہاری ایک ہی ادا مجھے پسند ہے کہ میرے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہو۔ اگر تمہاری دعا اور پکار نہ ہو تو رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ رمضان المبارک دعا کا مہینہ ہے، اس لیے دعا کے حوالے سے دو تین باتیں عرض کرنا چاہوں گا:

(ا) پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں عام طور پر یہ شکایت ہوتی ہے اور یہ جملہ عموماً ہماری زبان پر ہوتا ہے کہ ہم بہت دعائیں مانگتے ہیں لیکن ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اس حوالے سے ایک بات تو یہ عرض کروں گا کہ کیا واقعی دعائیں قبول نہیں ہوتیں؟ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ کسی مسلمان کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی۔ کوئی مومن جب خلوص دل کے ساتھ دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے رد نہیں کرتے اور دعا کرنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے۔ جناب نبی کریمؐ کا فرمان ہے ”ان اللہ حی کریم یستحی اذا رفع الرجل الیہ یدیہ ان یردھما صفرا خائبتین“۔ اللہ تعالیٰ زندہ و موجود اور کریم ہے، اسے اس بات سے شرم آتی ہے کہ جب کوئی آدمی اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دے تو وہ اس کے ہاتھوں کو خالی اور ناکام و نامراد واپس کر دے۔ اس لیے جب کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی دعا قبول نہ ہو، البتہ قبولیت دعا کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی قبولیت کی چار شکلیں بیان فرمائی ہیں:

- پہلی صورت یہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے۔ اور ہمارے نزدیک دعا کی قبولیت اسے ہی سمجھا جاتا ہے کہ جو مانگا ہے وہ مل جائے۔ اگر وہی مل جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ دعا قبول ہو گئی، اور اگر نہ ملے تو ہم سمجھتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ لیکن جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ جو تم نے اپنے لیے مانگا ہے وہ تمہارے لیے بہتر ہے یا نہیں۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ وہ چیز نہیں دیتے بلکہ اس سے بہتر چیز یا اس کا متبادل دے دیتے ہیں۔ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں کہ

بچہ کوئی چیز مانگتا ہے اور ماں کو اندازہ ہے کہ بچہ یہ چیز خراب کر دے گا، یا یہ چیز بچے کو نقصان پہنچائے گی، تو ماں بچے کو وہ چیز نہیں دیتی، البتہ ماں بہلانے کے لیے کوئی اور چیز بچے کو دے دیتی ہے۔ ہمارے بارے میں اللہ تعالی بہتر جانتے ہیں کہ جو ہم نے مانگا ہے وہ ہمارے حق میں بہتر ہے یا نہیں، اگر وہ بہتر نہ ہو تو اللہ تعالی وہ چیز نہیں دیتے بلکہ اس کے متبادل کوئی اور شے دے دیتے ہیں۔

- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی قبولیت کی تیسری شکل یہ ذکر فرمائی کہ نہ تو اللہ تعالی وہ دیتے ہیں جو مانگا گیا ہے، اور نہ اس کے متبادل کچھ اور دیتے ہیں، بلکہ دعا کی وجہ سے آنے والی کوئی مصیبت ٹل جاتی ہے۔ یہ تو اللہ تعالی ہی جانتے ہیں، ہمارے علم میں تو نہیں ہے کہ کل ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دعا کی وجہ سے آنے والی کوئی مصیبت ٹال دی جاتی ہے، یہ دعا کی قبولیت کی تیسری شکل ہے۔
- دعا کی قبولیت کی چوتھی شکل حضور نبی کریمؐ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اللہ تعالی اس دعا کو آخرت کے ذخیرہ میں جمع کر دیتے ہیں۔

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کبھی یہ سمجھ کر دعا مانگنا چھوڑ مت دینا کہ دعا قبول نہیں ہو رہی۔ دعا کسی نہ کسی شکل میں ضرور قبول ہوتی ہے۔ یہاں میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں کہ جناب نبی کریمؐ نے دعا کی قبولیت کی چوتھی صورت یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اللہ تعالی اس دعا کو آخرت کے اکاؤنٹ میں ریزرو کر لیتے ہیں، تو ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ یہاں نقد مل جانا بہتر ہے یا آخرت میں ملنا بہتر ہے؟ بہر حال حضورؐ نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ کبھی مایوس ہو کر دعا کرنا چھوڑ مت دینا کہ دعا قبول نہیں ہوتی، ہر مومن کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دعا کی قبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ ویسے تو اللہ تعالی سے مانگنا ہی مقبولیت کا سبب ہے، لیکن بعض چیزیں رفتار تیز کر دیتی ہیں۔ حدیث میں مختلف چیزوں کا ذکر ہے کہ فلاں کام کرنے سے دعا قبول ہوتی ہے، فلاں وقت میں دعا قبول ہوتی ہے، اس انداز سے مانگی جائے تو دعا قبول ہوتی ہے، وغیرہ۔ دعا کی قبولیت کے اسباب میں سب سے بڑا سبب جس کی وجہ سے دعا قبول ہوتی ہے وہ حلال رزق ہے، اس پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ میں بہت بڑا نام ہے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ آپؓ فاتح ایران، بہت بڑے جرنیل اور کوفہ کے بانی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ شہرت ہوگئی تھی کہ ان کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ آپ ہاتھ اٹھاتے ہیں تو وہ خالی واپس نہیں آتا۔ اور جناب نبی کریمؐ کے ارشاد گرامی کا مفہوم بھی ہے کہ اللہ کے بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ دیکھنے میں کچھ بھی نہیں لگتے، ظاہری حالت یہ ہوتی ہے کہ کوئی دروازے پر کھڑا نہ ہونے دے، کوئی اس کی بات کا جواب نہ دے، لیکن اللہ تعالی کے ہاں ان کا مقام یہ ہوتا ہے ''لو اقسم علی اللہ لابرہ'' اگر وہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات کہہ دیں تو اللہ تعالی ان کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ اللہ کے ایسے بندے ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں شہرت ہوگئی اور لوگوں کو تجربہ ہوگیا کہ ان کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی، چنانچہ لوگ کوشش کرتے کہ آپ کے منہ سے کوئی بات کہلوالیں تاکہ ہمارا کام سنور جائے۔ ایک مرتبہ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ آپ کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی، اس کی وجہ کیا ہے؟

آدمی کو کوئی مقام ملے تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوتی ہے، کوئی محنت ہوتی ہے، یا اس کی کوئی ادا اللہ تعالی کو پسند آئی ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے جناب نبی کریمؐ نے پوچھا بلال! اللہ تعالی نے مجھے جنت کی سیر کرائی تو میں نے جنت میں قدموں کی چاپ سنی۔ میں نے سوال کیا کہ یہ کس کے قدموں کی آہٹ ہے؟ تو فرشتے نے بتایا کہ یہ بلالؓ ہے جو مدینے میں چل رہا ہے لیکن اس کے قدموں کی چاپ یہاں سنائی دے رہی ہے۔ اے بلال! تم کون سا ایسا عمل کرتے ہو کہ تمہیں یہ مرتبہ حاصل ہے؟ حضرت بلالؓ سوچنے لگ گئے۔ سوچ کر کہنے لگے کہ جو کام باقی مسلمان کرتے ہیں میں بھی وہی کچھ کرتا ہوں، کوئی زائد عمل تو نہیں ہے، البتہ ایک کام میں پابندی سے کرتا ہوں کہ جب بھی وضو کرتا ہوں تو دو رکعت ضرور پڑھتا ہوں۔ تحیۃ الوضو کے دو نفل ضروری نہیں ہیں لیکن ان کا اجر بہت بڑا ہے۔ بتایا کہ میری یہ عادت ہے، میں نے کبھی اس کا ناغہ نہیں کیا۔ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا کہ یہی عمل ہے کہ جس کی وجہ سے تمہیں یہ مقام ملا۔

بہر حال حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے کسی نے دعا کی قبولیت کا سبب پوچھا تو حضرت سعدؓ نے جواب دیا کہ اور تو میں کچھ نہیں کہتا، البتہ اتنی بات ہے کہ جب سے میں نے کلمہ پڑھا ہے اس وقت سے آج تک میرے حلق سے ایک لقمہ بھی ایسا نہیں اترا جس کے

بارے میں مجھے تسلی نہ ہو کہ یہ کہاں سے آیا ہے اور کیسے آیا ہے۔ یہ درمیان میں تقریبا پچیس سال بنتے ہیں، جس کی آپؐ ضمانت دے رہے ہیں کہ اس عرصہ میں حرام کا ایک لقمہ بھی اس حلق سے نہیں اترا۔ یہ بات کہہ دینا آسان ہے، ہم تو دو دن کا حساب نہیں کر سکتے کہ جو کھایا ہے وہ کہاں سے آیا تھا، کیا پوزیشن تھی؟ تاہم حلال کھانا دعا کی قبولیت کا سب سے بڑا سبب ہے اور حلال لقمہ دعا کی قبولیت کو قریب کرتا ہے۔ یہی بات حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمائی کہ میں حلال کھاتا ہوں، حلال کھانے کی برکت ہے کہ اللہ تعالی میری کوئی دعا رد نہیں کرتے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! میرے لیے اللہ تعالی سے مستجاب الدعوات بننے کی دعا فرمادیں، تو آنحضرتؐ نے فرمایا: اے سعد! اپنا کھانا پاکیزہ اور حلال رکھو، تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے! جو آدمی اپنے پیٹ میں حرام کا لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اس کے اعمال قبول نہیں ہوتے۔ جس بندے کی نشوونما حرام اور سود کے مال سے ہوئی ہو، تو جہنم کی آگ اس کے زیادہ لائق ہے۔ جب کہ حرام کھانے کی وجہ سے دعا کی قبولیت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث مبارکہ میں، جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال حرام کی قباحت و شناعت کو اس انداز میں ذکر فرمایا: بے شک اللہ تعالی پاک ہیں اور پاکیزہ مال ہی قبول فرماتے ہیں۔ اور اللہ تعالی اپنے مومن بندوں کو بھی اسی چیز کا حکم دیتے ہیں جس کا حکم اپنے پیغمبروں کو دیا۔ پھر آپؐ نے قرآن مجید کی یہ آیات تلاوت فرمائیں: ”یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا“ (المومنون ۵۱) اے رسولو! پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ ”یا ایھا الذین امنوا کلوا من الطیبات ما رزقناکم“ (البقرہ ۱۷۲) اے اہل ایمان! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے آدمی کا تذکرہ فرمایا جو لمبا سفر کرتا ہے، پریشان حال اور غبار آلود ہے، آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر دعائیں مانگتا ہے، اے میرے رب! اے میرے رب! اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام کا ہے، اس کا پینا حرام ہے، اس کا پہننا حرام کا ہے، اور اس کی پرورش ہی حرام سے ہوئی ہے۔ تو اس کی دعا کیوں کر قبول ہو سکتی ہے۔

(۳)اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کا قبول نہ ہونا قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ فرمایا، ایک وقت ایسا آئے گا جب اللہ تعالی میری امت سے ناراض ہو جائیں گے۔ اللہ تعالی کی ناراضگی پہلی امتوں پر یہ ہوتی تھی کہ کسی کو غرق کر دیا، کسی کو الٹا دیا، کسی پر پتھر برسا دیے۔ نبی کریمؐ نے اللہ تعالی سے دعا فرمائی جس میں چار درخواستیں کیں: پہلی یہ کہ اے اللہ! میری امت کو پہلی امتوں کی طرح اکٹھے برباد نہ کیجیے گا۔ اللہ تعالی نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، نہیں کروں گا۔ دوسری یہ کہ اے اللہ! میری امت اکٹھی غرق نہ ہو۔ اللہ تعالی نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ پھر آپؐ نے دعا کی کہ میری عام امت قحط سالی سے ہلاک نہ ہو۔ اللہ تعالی نے یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے یہ تین باتیں قبول فرما لیں۔ چوتھی دعا میں نے یہ کی کہ یا اللہ! میری امت آپس میں نہ لڑے، ان میں آپس میں پھوٹ نہ پڑے۔ اللہ تعالی نے یہ دعا قبول نہیں فرمائی اور فرمایا کہ یہ آپس میں تو لڑیں گے، ایسے لڑیں لگے کہ دنیا تماشہ دیکھے گی۔ ہر چیز پر، ہر بات پر اور ہر طرح سے لڑیں گے، یہی تو اللہ کا عذاب ہو گا۔ اللہ تعالی نے حضور نبی کریمؐ کی چار میں سے تین دعائیں قبول فرما لیں اور چوتھی کے بارے میں فرمایا کہ یہ تو ہو گا۔

پھر آنحضرتؐ نے وضاحت فرمائی کہ میری امت پر جب اللہ تعالی کی ناراضگی ہو گی تو اس کے عذاب کی تین صورتیں ہوں گی: پہلی صورت یہ ہو گی ''مکان الباس بینھم'' امت منتشر ہو گی، آپس میں لڑے گی۔ یہ اللہ تعالی کے عذاب کی شکل ہو گی۔ دوسری یہ بات ارشاد فرمائی ''سلط اللہ علیھم اشرارھم'' اللہ تعالی چن چن کر امت کے شریر لوگوں کو امت پر مسلط کر دیں گے۔ اس کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ قیادت اور سیادت شرفاء کے ہاتھ میں نہیں ہو گی۔ یہ اللہ تعالی کے عذاب کی دوسری شکل ہے۔ اس امت پر اللہ تعالی کے عذاب کی تیسری شکل جناب نبی کریمؐ نے یہ ذکر فرمائی جو سب سے زیادہ خوفناک ہے ''یدعوا خیارھم فلا یستجاب لھم'' نیک لوگ دعائیں کریں گے، ان کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔

یہ باتیں ذکر کر کے میں عرض کروں گا کہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ آج ہماری اجتماعی حالت کیا ہے؟ ہمیں یہ احساس کرنا چاہیے کہ اللہ تعالی ہم سے ناراض ہیں، اللہ تعالی ہم سے راضی نہیں ہیں، اگر اللہ تعالی ہم سے راضی ہوتے تو ہمارا یہ حشر نہ ہو رہا ہوتا جو ہو رہا ہے۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہم مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ اللہ تعالی کی

ناراضگی کا پتہ دے رہا ہے۔ اس لیے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس ماہ مبارک میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اس کی نافرمانی سے، گناہوں سے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی سے توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھولی پھیلائیں، دعائیں مانگیں اور اس کے سامنے گڑگڑائیں، اور حلال کمانے اور حلال کھانے کی کوشش کریں تاکہ ہماری دعائیں قبول ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

قرآن کریم کی دنیوی و اخروی برکات

(مدرسہ ابی بن کعبؓ، حمزہ غوث، سیالکوٹ - ۱۵ مارچ ۲۰۲۳ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ یہ مدرسہ حضرت ابی بن کعبؓ کے نام پر ہے، ان کا کچھ تعارف کروانا چاہوں گا۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ امت کے سب سے بڑے قاری ہیں، ان کو امت کا سب سے بڑا قاری جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ حضورؐ نے چند بڑے قاریوں کا ذکر فرمایا تو حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سالم مولیٰ حذیفہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کا بطور خاص ذکر کیا، اور فرمایا ''اقرأھم ابی'' کہ میرے ساتھیوں میں سب سے بڑا قاری ابی ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک دن نبی کریمؐ نے حضرت ابی بن کعبؓ کو بلایا اور فرمایا ابی! حضرت جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آئے تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ آپ ابی کو بلا کر انہیں قرآن سنائیں۔ حضورؐ سب کو قرآن مجید سناتے تھے، لیکن بطور خاص حضرت ابی ابن کعبؓ کے بارے میں فرمایا کہ انہیں قرآن سنائیں۔ حضرت ابی ابن کعبؓ تعجب سے پوچھتے ہیں ''أسمانی اللہ تعالیٰ'' کہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر کہا؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لے کر کہا ہے کہ ابی کو قرآن سناؤ اور سورت بھی بتائی ہے کہ کون سی سورت سناؤں۔ سورۃ البینہ سنانے کا حکم فرمایا ہے۔ وہ کیسا منظر ہو گا، حضرت ابی ابن کعب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے کہنے پر انہیں سورۃ البینہ سنا رہے ہیں۔ یہ امت کے سب سے بڑے قاری کے اعزازات میں سے ایک اعزاز ہے۔

میں حافظ قرآن بچوں سے ایک بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حفظ قرآن مجید اللہ تعالی کی طرف سے بہت بڑی سعادت ہے۔ جب حفظ کر لیتے ہیں تو بچہ سمجھتا ہے کہ میں نے قرآن مجید یاد کر لیا ہے، لیکن میں اس میں تھوڑا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ آپ نے قرآن مجید حفظ کیا ہے، لیکن اگر میں کہوں کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی حفظ میں شریک ہیں، اس میں آپ اکیلے نہیں ہیں، تو غلط نہیں ہو گا۔ سب سے پہلے تو آپ کے حفظ کرنے میں ماں باپ کا حصہ ہے، والدین نے آپ کو حفظ کروایا ہے تو آپ نے حفظ کیا ہے، اگر وہ آپ کو حفظ نہ کرواتے تو آپ حفظ نہ کر سکتے۔ دوسرے نمبر پر آپ کے حفظ میں آپ کے ساتھ آپ کے استاد شریک ہیں جنھوں نے آپ کو پڑھایا ہے، اگر آپ کو کوئی استاد نہ ملتا تب بھی آپ کے لیے حفظ ممکن نہیں تھا۔ تیسرے نمبر پر مدرسہ کے منتظمین ہیں جنھوں نے حفظ کا انتظام کیا، جگہ بنائی، نظم بنایا۔ اگر یہ سسٹم اور نیٹ ورک نہ ہوتا تب بھی آپ کے لیے حفظ کرنا مشکل تھا۔ چوتھے نمبر پر آپ کے حفظ میں معاونین کا حصہ ہے جنھوں نے مدرسہ کے ساتھ تعاون کیا تو آپ کے لیے حفظ ممکن ہوا۔ اس لیے میں بچوں کے ذہن میں یہ بات ڈالنا چاہتا ہوں کہ حفظ میں آپ کا نمبر پانچواں ہے۔

یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی نعمت ملے تو اسے یاد رکھنا چاہیے۔ جس کی وجہ سے اچھی نوکری یا اچھا بزنس مل جائے تو وہ یاد رہتا ہے، کسی کی وجہ سے کوٹھی، منصب یا کوئی بھی نعمت ملے تو وہ یاد رہتا ہے اور یاد رہنا بھی چاہیے۔ تو جن کی وجہ سے قرآن عظیم کی نعمت ملی ہے وہ بھی یاد رہنے چاہئیں۔ آپ کو ہمیشہ یاد رہنا چاہیے کہ ہمارے حافظ بننے کے اعزاز میں یہ سب ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ جب یہ یاد ہوں گے تو آپ ان کے لیے دعا بھی کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ احادیث مبارکہ میں حافظ قرآن کو ملنے والے بہت سے اعزازات بیان ہوئے ہیں، ان میں سے ایک اعزاز کا ذکر کرتا ہوں۔ حضور نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب جنت والے جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالی باقی لوگوں کو تو الاٹمنٹ عطا کریں گے کہ تمہارا وہ مکان ہے، کوٹھی ہے۔ جبکہ حافظ قرآن کو کہیں گے کہ تم قرآن مجید پڑھتے جاؤ اور جنت کی منزلیں طے کرتے جاؤ، جہاں ''من الجنۃ والناس'' پر پہنچو گے وہاں تمہارا ٹھکانا ہو گا۔ یعنی یہ حافظ کی اپنی ہمت پر ہو گا کہ وہ کہاں تک جاتا ہے۔ اللہ تعالی ہمارے نصیب میں فرمائیں۔

تیسری بات یہ کہ آپ نے قرآن مجید حفظ کیا ہے، لیکن یہ یاد کیا ہوا ساتھ لے کر جائیں گے تو آخرت میں پڑھ سکیں گے، اگر یہیں بھول گئے تو وہاں کیسے پڑھیں گے۔ آپ کو قرآن مجید یاد کرنے میں دو تین سال لگے ہوں گے، لیکن یاد رکھنے کے لیے پانچ سال یا دس، پندرہ سال بھی ناکافی ہیں بلکہ اس وقت تک یاد رکھنا ہے جب ہم بارڈر کراس کر کے اگلے جہان منتقل ہو رہے ہوں گے۔ اور یاد کرنے کے لیے تو آپ نے محنت کی، سبق سنایا، سبقی سنائی، پارہ سنایا، منزل سنائی، دہرائی کی، لیکن یاد رکھنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟ اس کے لیے بھی کچھ کرنا پڑے گا، اس کی ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔

یہ سیالکوٹ کا علاقہ پہلوانوں کا کہلاتا ہے۔ پہلوان بننے کے لیے اکھاڑا، ورزش، تیل لگانا اور کشتی کرنا لازمی امور ہیں۔ ڈیڑھ دو سال کی ورزش سے آدمی پہلوان بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے دو تین کشتیاں جیت لیں تو اسے اعزاز اور ٹائٹل مل گیا رستم سیالکوٹ، رستم گوجرانوالہ وغیرہ۔ لیکن اب اسے پہلوان رہنے کے لیے بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ پہلوان رہنے کے لیے اکھاڑے کو وقت دینا پڑے گا۔ اگر پہلوان اکھاڑے کو وقت نہیں دے گا تو وہ سب کچھ بن سکتا ہے لیکن پہلوان نہیں رہ سکتا۔ پہلوان رہنے کے لیے اکھاڑے کو وقت دینا پڑے گا یا گھر کے ایک کونے میں اکھاڑا بنانا پڑے گا۔

اسی طرح حافظ بننے کے لیے تو دو تین سال کی محنت کافی تھی، لیکن حافظ رہنے کے لیے قرآن مجید کے ساتھ اتنا تعلق ضروری ہے کہ روزانہ آدھ پون گھنٹہ قرآن مجید سننے سنانے کا اہتمام کریں۔ اگر قرآن مجید پڑھنے سننے کا معمول نہیں رہے گا، دوسرے لفظوں میں اگر پڑھنے سننے کی ورزش نہیں رہے گی تو حافظ نہیں رہیں گے۔

اس کے بعد ایک بات آپ سب حضرات سے کہنا چاہوں گا کہ قرآن مجید اللہ تعالی کا کلام ہے جو بہت کچھ دیتا ہے، ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ قرآن مجید دنیا اور آخرت میں کیا کچھ دیتا ہے۔ آخرت میں تو حافظ قرآن کے والدین کو تاج پہنایا جائے گا، اور بھی بہت سے اعزازات ہیں جو آخرت میں ملیں گے، لیکن قرآن مجید سے اس دنیا میں بھی بہت کچھ ملتا ہے۔ قرآن مجید پڑھنے سننے سے نقد کیا فائدہ ہوتا ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ آج کل ہماری ایک عام شکایت ہوتی ہے جہاں کہیں بوڑھے بیٹھتے ہیں تو آپس میں یہ بات کہتے ہیں کہ اب پہلے زمانے والی بات نہیں رہی، پہلے والا پیار، برکت، محبت اور آپس کا اعتماد نہیں رہا۔ دنیا پروفیشنل ہو گئی ہے، آج تیس چالیس سال پہلے والا

ماحول نہیں ہے، پہلے والی برکتیں نہیں رہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ پہلے برکتیں تھیں جو اب نہیں ہیں۔ پہلے والی محبت اور بھروسہ، اعتماد نہیں رہا۔ تو سوچنا چاہیے کہ یہ برکتیں، رحمتیں آتی کہاں سے ہیں؟ برکتوں اور رحمتوں کا اپنا نیٹ ورک ہے۔ بجلی چاہیے تو واپڈا سے بات کریں گے، گیس چاہیے تو سوئی گیس والوں سے بات کریں گے، تو کیا برکتیں ویسے ہی پھر رہی ہیں کہ ہم پکڑ لیں گے؟ ان کا کوئی نیٹ ورک اور پروسیجر نہیں ہے؟ جب کہیں برکتیں حاصل ہوتی ہیں تو ہم یہ جملہ بولتے ہیں کہ رحمتوں کا فرشتہ آیا تھا، گویا رحمتوں اور برکتوں کا محکمہ فرشتے ہیں، فرشتے یہ چیزیں لے کر آتے ہیں، محبت، اعتماد تقسیم کرتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہم نے اپنے گھروں کا ماحول فرشتوں کے آنے جانے کا رہنے دیا ہے کہ وہاں فرشتے آئیں؟ ہم نے اپنے شب و روز، اپنے اعمال، اپنا روٹین ورک اور گھر کا ماحول فرشتوں کے آنے جانے کا رکھا ہوا ہے تو فرشتے آئیں گے ورنہ نہیں آئیں گے۔ سادہ سی مثال ہے کہ اگر گھر صاف ستھرا ہے، صحن میں پھولوں کی کیاری لگی ہوئی ہے، تو وہاں بلبل، کوئل اور جگنو آئیں گے۔ اور اگر گھر صاف نہیں ہے، کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا ہے تو وہاں کاکروچ، مکھیاں اور مچھر آئیں گے۔ ان دونوں کو کسی نے بھیجا نہیں ہے بلکہ ان کو ہم نے خود اپنے گھر بلایا ہے۔ گھر میں بلبل اور جگنو کا ماحول ہوگا تو وہ آئیں گے اور اگر گھر میں مینڈک کا ماحول ہوگا تو وہ آئے گا۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول فرشتوں کے آنے جانے کا ہے یا کسی اور مخلوق کے آنے جانے کا ہے؟ اگر ہم نے فرشتوں کے آنے کا ماحول نہیں بنایا تو دوسری مخلوقات آئیں گی، پھر ہم گلہ کرتے ہیں کہ پہلے والا ماحول نہیں رہا۔

فرشتے کس بات پر گھروں میں آتے ہیں؟ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشادات ذکر کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس گھر میں قرآن مجید کی تلاوت کا ماحول اور معمول نہیں ہے تو وہ اجڑا ہوا گھر ہے۔ پرانے زمانے میں گھروں میں قرآن مجید کی تلاوت کا معمول ہوتا تھا جو اب ختم ہو چکا ہے۔ اگر کوئی گھر میں قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے تو وہاں فرشتے آئیں گے ورنہ اجڑا ہوا گھر ہے "کالبیت الخرب" چاہے کتنی شاندار کوٹھی کیوں نہ ہو۔

حضور نبی کریمؐ کا دوسرا ارشاد گرامی ہے "اجعلوا من صلاتکم فی بیوتکم ولا تجعلوھا قبورا" کہ اپنی نمازوں کا کچھ حصہ گھر کے لیے بھی رکھو یعنی گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر گھر میں نماز کا ماحول ہو تو برکت ہوتی ہے، زندگی اور حیات ہوتی ہے، لیکن اگر گھر میں نماز کا ماحول نہ ہو تو وہ قبرستان ہوتا ہے۔ نماز، قرآن

مجید کی تلاوت، ذکر الٰہی، درود شریف، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے اور نبی کریمؐ کے صحابہ کرامؓ کے تذکرے پر فرشتے آتے ہیں۔ اگر ہم فرشتوں کے آنے جانے کا نیٹ ورک بنائیں گے، کنکشن قائم کریں گے تو وہ آئیں گے۔ یہ ہماری نقد ضرورت ہے کہ گھر میں برکت چاہیے، رحمتیں، دلوں کا سکون، آپس کی محبت اور اعتماد، پیار چاہیے تو یہ چیزیں قرآن مجید کی تلاوت سے ملیں گی۔ اس لیے ہمیں فرشتوں کے ساتھ دوستی قائم کرنا ہوگی، ہمیں اپنا ماحول اور معمولات ایسے بنانے ہوں گے کہ رحمت کے فرشتوں کے ساتھ ہمارا رابطہ دوبارہ بحال ہو جائے۔

قرآن مجید سے دوسرا نقد فائدہ کیا ملتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل کے حوالے سے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں کہا "ولوا انھم اقاموا التورۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم" کہ اگر وہ تورات اور انجیل کو نافذ کر لیتے، اپنے زندگی کا نظام تورات اور انجیل کے مطابق بنا لیتے تو آسمان بھی رزق برساتا اور زمین بھی رزق اگلتی۔ یہ برکتوں اور رزق کا کوڈ ہے۔ اپنے اپنے زمانے میں تورات اور انجیل تھیں، اب قرآن مجید ہے۔ اگر تورات اور انجیل اپنے زمانے میں برکتوں، رحمتوں، رزق اور معاشی بہتری کا کوڈ تھا تو آج قرآن مجید اس کا کوڈ ہے۔ اگر یہ نافذ ہوگا تو رزق، رحمتیں اور برکتیں ملیں گی۔ اس پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

بخاری شریف کی روایت ہے، حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ مسجد نبویؐ میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، صحابہ کرامؓ کی مجلس لگی ہوئی تھی، میں بھی بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آیا، سلام عرض کر کے بیٹھ گیا اور کہا یا رسول اللہ! میں جس علاقے سے آیا ہوں اس علاقے میں چوریاں، ڈکیتیاں بہت ہوتی ہیں، قتل بہت ہوتے ہیں، جان، مال اور عزت محفوظ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر گزری کہ ایک اور شخص آیا اور سلام عرض کر کے کہنے لگا یا رسول اللہ! میں جس علاقے سے آیا ہوں وہاں خشک سالی بہت ہے، کافی عرصہ سے بارش نہیں ہوئی، غلہ نہیں ہے، کنویں گہرے ہو گئے ہیں، پانی خشک ہو گیا ہے، لوگوں پر بھوک طاری ہے، کھانے کو کچھ نہیں ملتا، فاقہ ہے، بہت برا حال ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آنے والوں سے تو کچھ نہیں کہا، البتہ حضرت عدیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا، عدی! تم نے حیرہ دیکھا ہے؟ حیرہ اس دور میں ایک شہر تھا جو اب کوفہ کا

کوئی محلہ ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا یارسول اللہ! حیرہ دیکھا تو نہیں البتہ سنا ہے کہ بڑا مشہور شہر اور بڑا بارونق علاقہ ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا، عدی! اگر اللہ تعالی نے تمہیں لمبی عمر دی تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک خاتون چلے گی، اونٹ کے کجاوے میں بیٹھی ہوئی، سونے چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی، تنہا مکہ آئے گی۔ اور مکہ سے چلے گی، تنہا حیرہ جائے گی، آتے جاتے پورے راستے میں اسے اللہ تعالی کی ذات کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات سن کر تعجب ہوا کہ یہ کیسے ہوگا؟ اس دور میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ہم بھی راستہ میں ہیں، جب وہ عورت ہمارے علاقے سے گزرے گی تو ہمارے علاقے کے ڈاکو لٹیرے کہاں ہوں گے کہ وہ اطمینان سے سفر کر لے گی؟ لیکن سوال میرے ذہن میں گھومتا رہا، میں نے پوچھا نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بات ارشاد فرمادی کہ عدی! اگر تم نے کچھ اور عمر پائی تو تم ایک اور منظر دیکھو گے کہ کسری کے خزانے فتح ہوں گے، مدینہ میں آئیں گے اور یہاں تقسیم ہوں گے۔ کسری اس زمانے کی ایک سپر پاور کا حکمران تھا۔ عدیؓ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی بڑی تعجب کی تھی، میں نے پہلا سوال تو نہیں کیا، یہ سوال کر دیا کہ یارسول اللہ! وہ ہرمز کا بیٹا کسری، فارس کا بادشاہ، آپ اس کی بات کر رہے ہیں؟ حضورؐ نے بڑے اطمینان سے سر ہلایا، کہ ہاں وہی کسری بن ہرمز۔ عدی کہتے ہیں کہ میرا دماغ گھوم رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا، لیکن ایمان تھا کہ حضورؐ فرما رہے ہیں تو ایسا ہو کر رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بات ارشاد فرمادی کہ عدی! اگر اللہ تعالی نے تمہیں اور تھوڑی لمبی عمر دی تو تم ایک منظر اور دیکھو گے کہ تم لوگ ہاتھوں میں سونا چاندی اٹھا کر بازاروں اور منڈیوں میں جاکر آواز دو گے کہ یہ میری زکوۃ ہے، میرے محلے، میری برادری میں کوئی زکوۃ لینے والا نہیں رہا، کوئی زکوۃ کا مستحق میری آواز سن رہا ہو تو خدا کے لیے مجھ سے زکوۃ وصول کر لے اور مجھے فارغ کر دے۔

محدثین فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ باتیں ارشاد فرمائیں تو ان دونوں آنے والوں کو جواب دیا تھا اور ان کے مسائل کا حل بتایا تھا کہ جو سسٹم میں دے رہا ہوں اس کو نافذ کر کے دیکھو۔ اس درجے کا امن ہوگا کہ کوفہ سے عورت تنہا چلے گی اور مکہ تک اسے کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔ اور اس درجے کی خوشحالی ہوگی کہ تم ہاتھوں میں سونا چاندی اٹھا کر ڈھونڈتے پھرو گے، تمہیں کوئی زکوۃ لینے والا نہیں ملے گا۔

یہ واقعہ تو حضورؐ کے زمانے کا ہے۔ حضرت عدیؓ جب یہ روایت بیان کر رہے ہیں تو وہ حضرت عمرؓ کا زمانہ ہے۔ دس پندرہ سال کے بعد بیان کر رہے ہوں گے۔ کہتے ہیں، حضورؐ نے جو تین باتیں ارشاد فرمائی تھیں ان میں سے دو باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں، اور تیسری کے انتظار میں ہوں جیسے رات کو صبح کے سورج کا انتظار ہوتا ہے۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ جناب نبی کریمؐ نے کوئی تمثیل نہیں بیان کی تھی بلکہ پیشگوئی فرمائی تھی۔ میں نے ایک خاتون کو حیرہ سے مکہ جاتے ہوئے اور مکہ سے واپس آتے ہوئے دیکھا ہے، وہ سونے چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی تھی، کجاوہ سامان سے بھرا ہوا تھا، وہ بڑے امن اور اطمینان سے گئی اور امن کے ساتھ واپس گئی۔ پورے راستے میں کہیں بھی اس کو خدشہ نہیں ہوا کہ کوئی مجھے قتل کر دے گا، یا کوئی زیور لے لے گا، یا کوئی میری عزت لوٹ لے گا، میں یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کسریٰ کے خزانے بھی فتح ہوتے دیکھے ہیں، مدینہ میں آتے اور تقسیم ہوتے دیکھے ہیں، بلکہ فتح کرنے والوں اور اٹھا کر لانے والوں میں، میں خود بھی شامل تھا۔

تیسری بات بھی ذکر کر دوں۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانے کا واقعہ کتاب الاموال میں امام ابو عبیدؒ نے لکھا ہے۔ سو سال بعد کی بات ہے ۱۰۱ھ میں آپؒ امیر المومنین تھے، دمشق میں بیٹھتے تھے۔ عراق کے گورنر عبد الحمید نے آپ کو خط لکھا کہ امیر المؤمنین! میرے صوبے سے اس سال جو زکوۃ، عشر، خیرات وغیرہ وصول ہوئے، سال بھر کا بجٹ اور خرچے پورے کر کے کچھ رقم بچ گئی ہے، فاضل بجٹ ہے، اس کا کیا کرنا ہے؟ امیر المؤمنینؒ نے جواب لکھا کہ صوبے میں اعلان کرو کہ اگر کوئی مقروض اپنا قرضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو اس رقم سے اس کا قرض ادا کر دو۔ انہوں نے جواب لکھا کہ امیر المومنین! میں یہ کام کر چکا ہوں۔ امیر المومنین نے دوسرا خط لکھا کہ آپ کے صوبے میں جو لڑکیاں لڑکے جوان ہیں اور ان کے والدین ان کی شادی کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے تو اس رقم سے ان کی شادیاں کروا دو۔ انہوں نے جواب لکھا کہ میں یہ بھی کر چکا ہوں۔ امیر المومنین نے تیسرا خط لکھا کہ جن خاوندوں نے ابھی تک اپنی بیویوں کو مہر نہیں دیے اور مہر ادا کرنے میں کوئی دقت ہے تو ان خاوندوں کے مہر ادا کر دو۔

میں درمیان میں ایک جملہ کہتا ہوں کہ ہم تو کبھی مہر ادا کرنے کے پوزیشن میں ہوئے ہی نہیں ہیں۔ ہمارا معاشرتی ماحول یہ ہے کہ بیوی کو مہر نہیں دینا، بیٹی کو وراثت نہیں دینی اور

بہن کو حصہ نہیں دینا۔ اس پر ایک روایت ذکر کردوں۔ ترمذی کی روایت ہے جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا جس نے کسی وارث کو اس کا حصہ ادا نہیں کیا تو قیامت کے دن اس کے حساب میں کٹوتی کر کے پہلے حصہ دلوایا جائے گا، بعد میں حساب کتاب ہو گا۔ میں اس کا ترجمہ اپنی زبان میں یوں کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ حصہ میں نے طے کیا ہے تو تم کون ہوتے ہو نہ دینے والے، خود دے دو ورنہ میں دلوا دوں گا۔

امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے گورنر کو چوتھا خط لکھا کہ جو زمینیں خالی پڑی ہیں ان کی پلاٹنگ کرواؤ اور انہیں آباد کرنے کے لیے کسانوں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔ یہ قرآن مجید کو نافذ کرنے کی برکت ہے۔

یہ قصہ میں نے ایک جلسے میں سنایا تو ایک نوجوان نے ایک دلچسپ سوال کیا کہ یہ صوبے کا بجٹ تھا یا اٹلانٹک سی تھا؟ صوبے کا بجٹ کتنا تھا کہ جس کے سال بھر کے خرچے بھی پورے ہو رہے ہیں، مقروضوں کے قرض بھی ادا ہو رہے ہیں، بیویوں کے مہر بھی ادا ہو رہے ہیں، لڑکیوں کی شادی بھی ہو رہی ہے اور کسانوں کو قرضے بھی مل رہے ہیں۔ میں نے کہا بیٹا! انہی امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیز کا ایک اور واقعہ سن لو تو تمھیں بات سمجھ آ جائے گی۔

کتاب الاموال میں واقعہ مذکور ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جو اپنے وقت کی آباد دنیا میں سے کم و بیش ایک تہائی کے حکمران تھے، کسی ایک صوبے کے گورنر نہیں تھے۔ ایک دن شام کو گھر گئے تو بیوی سے پوچھا فاطمہ! تمہارے پاس کوئی ایک دو درہم ہوں گے، ضرورت ہے۔ بیوی نے پوچھا کیا ضرورت پڑ گئی ہے تو فرمایا کہ راستے میں آتے ہوئے ایک ریڑھی پر انگور دیکھے ہیں۔ انگور بڑے اچھے ہیں کھانے کو جی چاہتا ہے لیکن جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ فاطمہؒ نے جواب دیا کہ آپ کی جیب میں پیسے نہیں ہیں تو میری جیب میں کہاں سے آئیں گے۔ پھر ایک بیویوں والا جملہ بھی کہہ دیا کہ "آپ امیر المومنین ہیں، ایک درہم کے انگور منگوا کر نہیں کھا سکتے"۔ آج کے دور اس کا ترجمہ یوں بنے گا کہ آپ کے پاس اتنا بھی صوابدیدی فنڈ نہیں ہے کہ ایک درہم کے انگور منگوا کر کھا لیں؟ اس کا جواب سنیے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا فاطمہ! جس درہم کی تم بات کر رہی ہو، وہ درہم نہیں ہے، آگ کا انگارہ ہے۔

میں نے اس نوجوان سے کہا کہ بیٹا! ملک کا حکمران فرد یا حکمران طبقہ یا آج کی زبان میں اشرافیہ اگر سرکاری خزانے کے روپے کو آگ کا انگارہ سمجھیں گے تو پھر سارے کام ہوں گے، بجٹ بھی پورا ہوگا، مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہوں گے، لڑکیوں کی شادیاں بھی ہوں گی، عورتوں کے مہر بھی ادا ہوں گے اور کسانوں کو قرضے بھی ملیں گے۔

یہ میں نے قرآن مجید کی کچھ نقد برکات بیان کی ہیں کہ آخرت میں تو اس سے بہت کچھ ملے گا، دنیا میں بھی قرآن مجید کی برکت سے بہت کچھ ملتا ہے۔ اے کاش کہ ہم سمجھ جائیں، جو اس کو سمجھ گئے تھے انہوں نے اس سے بہت کچھ لے لیا تھا، ہم سمجھ نہیں پا رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا رخ اور ہمارا ٹریک ٹھیک کر دیں اور ہمیں بھی ان برکات سے مالامال فرما دیں۔ آمین۔

چند منفرد نوعیت کے دینی اجتماعات میں حاضری

(روزنامہ اسلام، لاہور - جامعة الحسنین، فیصل آباد - مسجد حمزہ، ایف ٹین ٹو، اسلام آباد - جامعہ صدیقیہ، گلشن راوی، لاہور - قرآنی سنٹر انٹرنیشنل، فیصل آباد - ۱۹ فروری ۲۰۲۳ء)

رجب اور شعبان میں عام طور پر دینی مدارس کے سالانہ امتحانات اور تقریبات کا اہتمام ہوتا ہے اور مختلف محافل میں شرکت کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سال بھی بحمد اللہ تعالیٰ بیسیوں اجتماعات میں حاضری کا موقع ملا ہے اور اس دوران روایتی ماحول اور دائرہ سے ہٹ کر کچھ منفرد نوعیت کے پروگراموں میں بھی شمولیت ہوئی ہے جن کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) فیصل آباد میں مولانا طارق جمیل کے ادارہ جامعة الحسنین کا تعلیمی و تربیتی ماحول روایتی دائرہ سے کچھ مختلف ہے جو ایک تجربہ کے طور پر مجھے بھی اچھا لگا ہے اور اس کی کامیابی کے لیے دعاگو رہتا ہوں۔ گزشتہ دنوں جامعة الحسنین کے تقاضے پر دو تین نشستوں میں دورۂ حدیث شریف کے طلبہ سے چند فکری موضوعات پر گفتگو ہوئی تو طلبہ اور اساتذہ کا ذوق اور طلب دیکھ کر خوشی ہوئی جس کے باعث میں نے ان کی یہ فرمائش قبول کر لی ہے کہ ہر ماہ کم از کم ایک بار ضرور حاضری دوں جس میں کسی علمی و فکری عنوان پر گفتگو ہو جائے گی۔ چنانچہ اگلی نشست کے لیے ۲۸ فروری مغرب کا وقت طے ہو گیا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۲) اسلام آباد کے ایک مدرسہ کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں، مسجد حمزہ ایف ٹین ٹو کے خطیب مولانا محمد ادریس شام کے اوقات میں درس نظامی کی تعلیم کا سلسلہ کافی عرصہ سے جاری رکھے ہوئے ہیں، سرکاری ملازمین اور کاروباری لوگ جو دن میں وقت نہیں نکال سکتے، مغرب کے بعد دو تین گھنٹے اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے درس نظامی کا نصاب مکمل کرتے ہیں اور وفاق المدارس العربیۃ پاکستان کے نصاب کے مطابق باقاعدہ امتحان دے کر سند حاصل کرتے ہیں۔ میں اس مدرسہ کی متعدّد تقریبات میں شرکت کر چکا ہوں، آغاز میں مجھے تردد تھا کہ سارا دن دفاتر اور مارکیٹوں میں مصروف رہنے والے حضرات شام کے دو تین گھنٹوں میں کیسے اس نصاب کو مکمل کر سکیں گے؟ مگر کام کے تسلسل اور پیشرفت کو دیکھ کر اب ذہن میں یہ آرہا ہے کہ دوسرے شہروں کے احباب کو بھی توجہ دلائی جائے کہ وہ اس تجربہ سے استفادہ کریں۔

۱۱ فروری کو اس مدرسہ کی سالانہ تقریب میں بخاری شریف کا آخری سبق پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی تو مولانا محمد ادریس نے بتایا کہ یہ آٹھویں کلاس ہے جو وفاق المدارس کے نصاب کے مطابق تعلیم مکمل کر کے دورہ حدیث سے فراغت حاصل کر رہی ہے۔ ایک دلچسپ اور حوصلہ افزا بات انہوں نے یہ بھی بتائی کہ ایک نوجوان اپنی شادی کے بعد بھی مدرسہ میں مغرب کی تین گھنٹے کی کلاس میں پابندی کے ساتھ حاضری دیتے رہے ہیں اور آج وہ آخری حدیث کا سبق پڑھ رہے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں، سرکاری ملازمین اور کاروباری حضرات میں دینی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ اور طلب کس حد تک موجود ہے، فالحمد للہ تعالیٰ ذلک۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی کی مصروفیات اور مجبوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب انداز میں تعلیمی پروگرام منظم کیے جائیں تو قرآن و سنت اور دینی علوم کی تعلیم کا دائرہ قوم کے تمام طبقات تک پھیلایا جا سکتا ہے۔

(۳) اسی طرح فیصل آباد کے ایک ادارہ میں حاضری ہوئی جس کا تعلیمی انداز منفرد اور قابل تقلید ہے۔ چنیوٹ کے معروف عالم دین مولانا قاری محمد یامین گوہر ہمارے پرانے ساتھی ہیں، سرگرم عالم دن ہیں اور قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں۔ بالخصوص تجارت و ملازمت پیشہ حضرات اور دیگر طبقات کے حضرات کو صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن کریم کی تعلیم دینے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کی

طرح کسی علاقہ کو منتخب کر کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں اور انہیں اس بات کے لیے آمادہ کرتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی صحیح تلاوت کے لیے اپنا تلفظ صحیح کریں اور اس کا باقاعدہ کورس کر کے اپنی قراءت و تلفظ کی اصلاح کریں۔ جس کے لیے انہوں نے طویل تجربات کے نتیجے میں ایک کورس ترتیب دے رکھا ہے اور مختلف دورانیوں کی کلاسوں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے فیصل آباد میں بھی کام کر رہے ہیں اور چند تجرباتی کلاسوں کے بعد اب انہوں نے سرگودھا روڈ پر شفیق کالونی میں ایک باقاعدہ مرکز قائم کیا ہے جس میں فیصل آباد کے چند سرکردہ کاروباری حضرات ان کے معاون و شریک کار ہیں۔ ۱۴فروری کو اس مرکز کی افتتاحی تقریب تھی جس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔

(۴) اسی دوران ۱۵فروری کو گلشن راوی لاہور میں جامعہ صدیقیہ کے سالانہ اجلاس میں حاضری ہوئی اور دو باتیں انتہائی خوشی کا باعث بنیں۔ ایک یہ کہ وقت کی پابندی کا بطور خاص اہتمام کیا گیا، مغرب کی نماز کے بعد ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ جلسہ کا آغاز ہوا اور آٹھ بجے حضرت مولانا عبد القیوم نیازی کی دعا پر اختتام پذیر ہو گیا۔ خدا کرے کہ وقت کی پابندی اور اس کی قدر و قیمت کو پہچاننے کا یہ ذوق ہمارے ہاں عام ہو جائے، آمین۔

دوسری یہ بات میرے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہوئی کہ بزرگ قاری محترم قاری محمد عارف صاحب نے فطری اور سنجیدہ لہجے میں قرآن کریم کی تلاوت کی تو میرا ذہن نصف صدی قبل کے اس ماحول میں جا پہنچا جب لاہور کی بڑی دینی مجالس میں حضرت مولانا قاری اظہار الحق تھانویؒ اور حضرت مولانا قاری محمد حسن شاہؒ کی تلاوت سن کر ہم حسن قراءت کا حظ اٹھایا کرتے تھے۔ میں نے قاری صاحب محترم سے عرض کیا کہ آپ کی تلاوت سن کر میرے دل میں ان بزرگوں کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ پھر جامعہ صدیقیہ کے دو چھوٹے طلبہ نے اسی سادگی اور بے تکلفی کے لہجہ میں نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھی تو ایمان تازہ ہو گیا۔

میں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ہم نے عمومی ماحول میں تلاوت کلام پاک اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کو تکلفات کے تہہ در تہہ غلافوں میں لپیٹ کر جس طرح ”فاسٹ فوڈ“ کی شکل دے رکھی ہے اس ماحول میں تلاوت اور نعت کو فطری اور بے تکلفانہ لہجے میں سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے جس پر اس مدرسہ کے منتظمین، اساتذہ اور طلبہ مبارک کے مستحق ہیں۔

معراج النبیؐ کی حکمت

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۱۹ فروری ۲۰۲۳ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں ایک بڑا معجزہ معراج اور اسراء کا ہے کہ اللہ رب العزت نے جناب نبی کریمؐ کو رات کے کچھ حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی، آسمان اور عرش کی سیر کرائی، اور جنت اور دوزخ دکھائی۔ یہ نبی کریمؐ کا معجزہ ہے۔

معجزہ اسے کہتے ہیں جو اسباب کے تحت ممکن نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے وہ کام کر دیں۔ وہ مافوق الاسباب واقعہ کسی پیغمبر کے لیے ہو تو معجزہ کہلاتا ہے، اور پیغمبر کے علاوہ کسی نیک آدمی کے اظہار کے لیے ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔ جو کام اسباب کے تحت ہو وہ معجزہ یا کرامت نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینکڑوں معجزات میں سے ایک بڑا معجزہ معراج کا ہے جس کی تفصیلات آپؐ نے بہت سی احادیث میں ارشاد فرمائی ہیں، جو صحابہ کرامؓ نے روایت کی ہیں۔ ان میں سے دو تین باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات یہ کہ ہمارا ایمان ہے کہ معراج کا معجزہ ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جسم مبارک کے ساتھ معراج کرائی گئی۔ یعنی یہ خیالی معجزہ نہیں ہے بلکہ جسمانی معجزہ ہے۔ مسجد اقصیٰ، ساتوں آسمان، جنت اور عرش کی سیر آپؐ کے جسم مبارک کے ساتھ ہوئی۔ اور یہ خواب بھی نہیں ہے بلکہ آپؐ بیداری کی حالت میں گئے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ عام محاورہ بھی ہے کہ ’’فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ‘‘ دانا آدمی کا کام حکمت کے بغیر نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ تو دانائے مطلق ہیں تو اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے؟ معراج شریف کی حکمتوں میں مفسرین کرامؒ نے بہت سی باتیں نقل فرمائی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو پیدا کرنے سے پہلے انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کی ارواح مقدسہ کے ساتھ ایک میثاق کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں ہے:

واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما آتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جآءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ، قال أاقررتم واخذتم علیٰ ذلکم اصری، قالوا اقررنا قال فاشہدوا وانا معکم من الشاہدین۔ (آل عمران ۸۱)

اللہ رب العزت نے انبیائے کرام علیہم السلام سے میثاق، معاہدہ اور وعدہ لیا کہ تم میں سے ہر ایک کو وحی، کتاب اور حکمت دوں گا۔ تم سب کے بعد ایک رسول آئے گا جو تمہاری تعلیمات کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔ جب وہ پیغمبر آئے گا تو ''لتومنن بہ ولتنصرنہ'' تم سب اس پر ایمان بھی لاؤ گے اور اس کی مدد بھی کرو گے۔ تمام انبیاء کرامؑ نے اس کا اقرار کیا۔ جس پر اللہ تعالی نے فرمایا ''فاشہدوا وانا معکم من الشاہدین'' تم بھی گواہ ہو جاؤ اور میں بھی گواہ ہوں۔ یہ اس وعدے کی تفصیل ہے جو اللہ رب العزت کا اور انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کا ہوا۔ یہ میثاق ہو گیا اور اس کے بعد انبیائے کرام اپنے اپنے وقت پر آکر چلے گئے۔ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو سب سے آخر میں آئے تو وہ وعدے کہاں پورے ہوئے؟ وعدہ انہوں نے کیا تھا جو پہلے آکر چلے گئے، اور جن کے بارے میں کیا تھا وہ سب سے بعد میں آئے۔ تو یہ دونوں وعدے کہاں پورے ہوئے؟ ایک یہ کہ تم سب انبیاء اس پیغمبر پر ایمان لاؤ گے تو انبیائے کرام حضور نبی کریمؐ پر کب ایمان لائے؟ اور دوسرا وعدہ تھا کہ تم سب اس کی مدد کرو گے۔

اس سلسلے میں مفسرین کرام نے لکھا ہے بالخصوص حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ نے مشکلات القرآن میں اس کی وضاحت کی ہے کہ ''لتومنن بہ'' کے وعدے کی تکمیل کے لیے اللہ رب العزت نے معراج کی رات تمام سابقہ انبیائے کرام کو مسجد اقصی میں اکٹھا کیا جہاں سارے پیغمبروں نے حضور نبی کریمؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب انبیاء کرامؑ نے آنحضرتؐ کی اقتدا میں نماز کی نیت باندھی تو ان کا آپؐ پر ایمان ہو گیا۔ یہ اس وعدے کی تکمیل تھی، یوں ایمان والا وعدہ معراج کی رات پورا ہو گیا۔ دوسرا مدد والا معاہدہ کہاں پورا ہوا؟ بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ رب العزت نے انبیاء کرام علیہم الصلوات و التسلیمات کے اس وعدے کی تکمیل کے لیے حضرت عیسی علیہ السلام کو آسمانوں پر زندہ رکھا ہوا ہے۔ آپؑ قیامت کے قریب زمین پر آئیں گے اور امت کو دوبارہ غلبہ دلوائیں گے، یوں جناب نبی کریمؐ کی مدد کے وعدے کی تکمیل کریں گے۔ حضرت عیسیؑ کی حیات اور زندہ رہنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیؑ کی وفات ہوگی اور مدینہ منورہ میں جناب نبی کریمؐ کے روضہ اطہر میں ان کی تدفین ہوگی۔ الغرض معراج کی حکمتوں میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ رب العزت نے انبیاء کرامؑ کے اس وعدے کی تکمیل کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کروایا۔

دوسری بات یہ کہ معراج میں اللہ رب العزت نے نبی کریمؐ کو اتنا کچھ دیا کہ جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مگر معراج میں ہمیں کیا دیا؟ ''الصلوۃ معراج المومنین'' ہمیں ہماری معراج دے دی۔ نبی کریمؐ کی معراج وہ تھی، جبکہ ہماری معراج نماز ہے۔ اللہ تعالی نے پانچ نمازوں کا تحفہ عطا کیا کہ تم دن میں پانچ وقت نماز پڑھو، تمہاری معراج ہو جائے گی۔ حضورؐ نے معراج میں عرش اور سدرۃ المنتہی پر جا کر براہ راست اللہ رب العزت سے کلام کیا تھا تو امت کے لیے آپؐ نے فرمادیا ''المصلی یناجی ربہ'' نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش پر جا کر اللہ تعالی سے باتیں کیں اور ہم فرش پر اللہ تعالی کے سامنے سجدہ میں اس سے باتیں کرتے ہیں۔ نمازی نماز میں اللہ رب العزت سے سرگوشیاں اور راز و نیاز کرتا ہے۔ اگر ہم اسے نہ سمجھ سکیں تو ہمارا اپنا قصور ہے، ورنہ نماز تو براہ راست اللہ رب العزت سے ہم کلام ہونے اور اللہ تعالی سے باتیں کرنے کا نام ہے۔ معراج النبیؐ کا ہمارے لیے سب سے بڑا تحفہ نماز ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اللہ تعالی نے یہ حکمت اختیار کی کہ پہلے پچاس نمازیں فرض کیں، پھر آہستہ آہستہ کر کے پانچ کر دیں۔ جب نمازیں کم ہوتے ہوتے پانچ پر آگئیں تو حضرت موسی علیہ السلام نے کہا کہ حضرت! ایک چکر اور لگالیں، آپ کی امت پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھے گی۔ نبی کریمؐ نے فرمایا، اب مجھے شرم آتی ہے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا، ٹھیک ہے پڑھو گے پانچ لیکن ثواب پچاس کا ہی ملے گا۔ ''مایبدل القول لدی وما انا بظلام للعبید''۔

معراج کی رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات و التسلیمات کے ساتھ ملاقاتیں ہوئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضورؐ کی تین ملاقاتیں ہوئیں جو روایات میں مذکور ہیں۔ ایک ملاقات زمین پر مسجد اقصی میں ہوئی، دوسری ملاقات چھٹے آسمان پر ہوئی، اور تیسری ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جنت میں ہوئی۔ اس ملاقات کا ذکر ترمذی شریف کی روایت میں ہے۔ جب نبی کریمؐ رخصت ہونے لگے تو حضرت ابراہیمؑ نے دو پیغام دیے۔ پہلا یہ کہ اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہنا۔ اور دوسرا یہ کہ اپنی امت کو میری طرف سے یہ پیغام دے دینا ''ان الجنۃ ارضھا طیب وماءھا عذب'' جنت کی زمین بہت اچھی ہے اور پانی بہت میٹھا ہے۔

ہم کسی جگہ بستی بسانے لگتے ہیں یا کالونی بنانے لگتے ہیں تو چیک کرتے ہیں کہ یہاں کی زمین کیسی ہے اور پانی کیسا ہے؟ آج کل ہمارے سائنسدان کہتے ہیں کہ ہم چاند پر یہ دیکھنے

گئے تھے کہ چاند رہنے کے قابل ہے یا نہیں۔ چاند کی مٹی کیسی ہے؟ کیا وہاں آکسیجن ہے؟ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اب مریخ وغیرہ پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔ ہماری سائنٹیفک اپروچ یہ ہے کہ ممکن ہے یہ زمین زیادہ دیر نہیں رہے، اس لیے کوئی متبادل تلاش کر لیں۔ متبادل دیگر سیاروں تک رسائی حاصل کر رہے ہیں کہ وہاں کی آب و ہوا اور زمین کیسی ہے؟ رہنے کے قابل ہے یا نہیں؟ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چودہ سو سال پہلے ہی بتا دیا تھا کہ متبادل جگہ جنت ہے، جہاں کی زمین بھی بہت اچھی ہے اور پانی بھی بہت میٹھا ہے۔ پھر فرمایا "ولکنھا قیعان "لیکن جنت چٹیل میدان ہے۔ جنت میں خالی پلاٹ ملے گا جسے خود آباد کرنا ہے۔ سبزہ، درخت اور آباد کاری خود کرنی ہے۔ اور پھر آباد کاری کا فارمولا بھی حضرت ابراہیمؑ نے بتا دیا "غرسھا لا الہ الا اللہ و سبحان اللہ و الحمد للہ و اللہ اکبر" جنت کی شجر کاری کیسے ہوگی اور اس پلاٹ میں سبزہ کیسے اگے گا؟ فرمایا کہ تم زمین پر جتنا اللہ کا ذکر کرو گے وہاں جنت میں سبزہ ہوگا اور درخت لگیں گے۔ جنت کے پلاٹ میں درخت اور سبزہ اگانے کا کوڈ "لا الہ الا اللہ و سبحان اللہ و الحمد للہ و اللہ اکبر" ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ تم سبحان اللہ کہو تو جنت میں ایک درخت لگتا ہے۔ الغرض جنت کی آبادی یہاں سے کر کے جانی ہے وہاں آباد اور شجر کاری کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

ایک روایت میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان قبر میں جاتا ہے تو اس کو جنت اور دوزخ دونوں کے ٹھکانے دکھائے جاتے ہیں۔ نیک شخص کو دوزخ کا ٹھکانہ دکھا کر کہا جاتا ہے کہ اگر تم صحیح کام نہ کرتے تو یہ تمہارا ٹھکانہ ہوتا، تم نے اچھے کام کیے ہیں اس لیے وہ پلاٹ کینسل ہے اور یہ جنت کا پلاٹ بحال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لیے دو پلاٹ ایک جنت کا اور ایک جہنم کا ریزرو رکھے ہوئے ہیں، کونسا پلاٹ کینسل کروانا ہے اور کونسا بحال رکھنا ہے یہ انسان کے ایمان اور اعمال کی کیفیت پر منحصر ہے۔

جنت کے پلاٹ کا سائز کیا ہوگا؟ جنت کا پلاٹ جنت کے حساب سے ہی ہوگا۔ اس پر مسلم شریف کی ایک روایت عرض کرتا ہوں۔ تفصیلی روایت ہے جس میں ہے کہ سب سے آخری جنتی آدمی جو مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آخر میں جنت میں جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے فرمائیں گے کہ جنت میں اپنی جگہ تلاش کر لو تمہاری جگہ رکھی ہوئی ہے۔ وہ گھوم پھر کر

تلاش کرے گا لیکن اسے کوئی جگہ خالی نظر نہیں آئے گی۔ عرض کرے گا کہ مجھے تو کوئی خالی جگہ نہیں ملی، ساری جگہیں پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ تلاش کرو تمہارے لیے جگہ رکھی ہوئی ہے۔ وہ پھر تلاش کر کے عرض کرے گا یا اللہ! مجھے تو کوئی جگہ خالی نہیں مل رہی۔ اللہ تعالیٰ اسے تیسری دفعہ پھر بھیجیں گے کہ جاؤ اپنی جگہ تلاش کرو۔ وہ جائے گا تلاش کرے گا لیکن اسے کوئی جگہ خالی نہیں ملے گی۔ عرض کرے گا کہ یا اللہ! مجھے تو کوئی خالی جگہ نہیں مل رہی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا بتاؤ جنت میں کتنا پلاٹ چاہیے؟ جس زمین پر رہ کر آئے ہو اس زمین جتنا پلاٹ دے دوں؟ وہ آدمی کہے گا ”استھزء بی وانت رب العالمین“ آپ رب العالمین ہو کر میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟ مجھے پلاٹ نہیں مل رہا اور آپ مجھے پوری زمین دے رہے ہیں۔ روایت میں ہے ”یضحک اللہ“ اللہ تعالیٰ اس کی بات سن کر ہنسیں گے اور فرمائیں گے ”لک الارض وعشر امثالھا“ ایک زمین نہیں بلکہ گیارہ زمینیں میں نے تجھے عطا کر دیں۔ جنت میں جو پلاٹ ہو گا جس کو یہاں سے آباد کر کے جانا ہے اس پلاٹ کا سائز کم از کم جو آخری جنتی کو ملے گا وہ گیارہ زمینوں کے برابر ہو گا۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ ہم معراج کے تحفہ نمازوں کی پابندی کر کے معراج کا ذوق حاصل کریں، اور دوسری بات کہ اپنے جنت کے پلاٹ کو قائم رکھیں۔ جنت میں پلاٹ تو ہمارے لیے ہے لیکن اسے کینسل کروانا ہے یا باقی رکھنا ہے، یہ ہمارا کام ہے۔ وہ پلاٹ ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ بحال ہو گا اور اس پلاٹ کی شجرکاری، سبزہ اور آبادکاری اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہو گی، ہم اس کا بھی اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

حدیثِ نبویؐ کے پانچ راہنما اصول

(جامعہ انوار العلوم گوجرانوالہ - ۱۳ جنوری ۲۰۲۳ء)

۱۳ جنوری ۲۰۲۳ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں مدرسہ انوار العلوم کے اختتام بخاری شریف کے اجتماع سے خطاب کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مدرسہ انوار العلوم جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ کے دورہ حدیث کے طلبہ نے شیخ الحدیث حضرت مولانا داؤد احمد کی سربراہی میں اساتذہ کرام سے

اپنے نصاب کی تعلیم حاصل کی ہے اور آج وہ بخاری شریف کا آخری سبق اور حدیث شریف پڑھنے کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔ اس سعادت پر میں طلبہ، ان کے والدین و اہل خاندان، اساتذہ اور مدرسہ کے منتظمین و معاونین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اللہ تعالی انہیں اپنے علم کی حفاظت کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، اور تمام متعلقین کو اس کی برکات عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔ اس موقع پر دعا سے قبل دو تین گزارشات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حدیث شریف پڑھنے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق و نسبت نصیب ہوتی ہے اور اس کی برکات وفیوض سے ہم بہرہ ور ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہمیں اس علم سے عملی ماحول میں جو کچھ ملتا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے:

1. حدیث کے ذریعے ہمیں قرآن کریم تک رسائی ملتی ہے۔ مثلاً پہلی وحی سورۃ القلم کی پانچ آیات ہیں جو ہمیں غار حرا کے واقعہ سے ملیں، اور غار حرا کا واقعہ "حدیث" کہلاتا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی آیات اور سورتیں حدیث کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں اور ہر آیت، سورۃ اور جملہ کا معاملہ یہی ہے۔

2. قرآن کریم کے مفہوم اور اللہ تعالی کی منشا تک ہماری رسائی کا ذریعہ بھی حدیث نبویؐ ہے۔ اس کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کا ارشاد "من یعمل سوء یجز بہ" سنتے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ پریشان ہوگئے کہ جب ہر چھوٹے بڑے عمل سوء پر سزا ملنی ہے تو پھر کون نجات حاصل کر سکے گا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی کہ "یجز بہ" کا مطلب یہ نہیں کہ ہر عمل کی سزا قیامت کو ہی ملے گی بلکہ مومن کے اعمال صالحہ کو اللہ تعالی گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنا دیتے ہیں اور مومن کو پیش آنے والی ہر مصیبت، گناہ، پریشانی اور نقصان اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اس وضاحت پر حضرت ابوبکرؓ کی پریشانی دور ہوئی اور یہ وضاحت ہم تک حدیث کے ذریعے پہنچی ہے۔

3. نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و احکام تک ہماری رسائی بھی حدیث کے ذریعے ہوتی ہے، مثلاً سورج گرہن کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ جب سورج کو گرہن کی حالت میں دیکھو تو اللہ تعالی کی طرف رجوع کرو اور

نماز پڑھو، یہ حکم ہم تک حدیث کے ذریعے پہنچا ہے، اسی طرح باقی ارشادات نبویؐ کا ذریعہ حدیث ہے۔

4. اس کے ساتھ سنت رسولؐ بھی حدیث کے ذریعے سے معلوم ہوتی ہے، مثلاً نماز حضور نبی کریمؐ کے طریقے پر پڑھنی ہے جو کہ سنت کہلاتا ہے، اور نماز کے حوالے سے آپؐ کا طریق کار اور سنت ہم تک حدیث کے ذریعے ہی پہنچا ہے۔

گویا قرآن کریم کے الفاظ و آیات، معنی و مفہوم، نبی کریمؐ کے ارشادات اور آپ کی سنت مبارکہ کو معلوم کرنے کا ذریعہ ہمارے پاس صرف حدیث نبویؐ ہے، اس کے بغیر ہم ان چاروں امور میں سے کسی ایک کا علم بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

5. دین کی ان چار بنیادوں کے علاوہ ایک اور اہم بات کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا جو فہم دین کے لیے ضروری ہے اور وہ بھی حدیث کی وساطت سے میسر آتا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم کے کسی ارشاد یا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فرمان کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ یہ بات کس موقع پر کہی گئی ہے اور کس پس منظر میں کہی گئی ہے۔ کیونکہ موقع اور پس منظر کے بدلنے سے بات اور واقعہ کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اسے آج کی دنیا میں بیک گراؤنڈ یا کانٹیکسٹ کہا جاتا ہے جبکہ مفسرین کرامؒ اسے ''شان نزول'' کہتے ہیں۔ اس کی بھی ایک مثال عرض کروں گا کہ شراب کی حرمت کی آیات میں ''لیس علی الذین امنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا'' کا یہ جملہ بعض صحابہ کرامؓ کے لیے غلط فہمی کا باعث بن گیا اور انہوں نے سمجھا کہ اس میں تھوڑی بہت شراب پی لینے کی گنجائش موجود ہے۔ معروف بدری صحابی حضرت قدامہ بن مظعونؓ بطور خاص اس مغالطہ کا شکار ہوئے اور امیر المومنین حضرت عمرؓ کے دربار میں ان کی باقاعدہ طلبی ہوئی جس پر انہوں نے اس آیت قرآنی کا مذکورہ مطلب بیان کیا تو حضرت عمرؓ نے انہیں یہ فرما کر سختی سے ڈانٹا کہ اگر تم بدری صحابیؓ نہ ہوتے تو میں تمہیں اس کی سخت سزا دیتا۔ پھر وضاحت فرمائی کہ یہ آیت شراب کے حرام ہونے کے بعد بعض صحابہ کرامؓ کے اس سوال کے جواب

میں نازل ہوئی تھی کہ شراب حرام ہے اور اسے قرآن کریم نے ''رجس'' گندگی کہا ہے تو ہمارے جو ساتھی حرمت کے اس اعلان سے قبل شراب پیتے تھے اور وہ اس دوران فوت ہو گئے بلکہ بعض شہید بھی ہوئے تو ان کا کیا بنے گا؟ ان کے اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو اہل ایمان اس سے قبل شراب پیتے رہے ان پر کوئی حرج نہیں ہے۔ یعنی حرج نہ ہونے کی بات آئندہ کے لیے نہیں بلکہ ماضی کے حوالے سے ہے۔ اس سے صحابہ کرامؓ کا اشکال دور ہوا اور بات واضح ہوئی۔

چنانچہ (۱) قرآن کریم کے الفاظ (۲) اللہ تعالیٰ کی منشا و مراد (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اقوال (۴) اور آپؐ کی سنت مبارکہ کے ساتھ (۵) ان کے واقعاتی پس منظر تک رسائی بھی حدیث کے ذریعے ملتی ہے۔ اور اس طرح حدیث نبویؐ دین کی ہر بات تک رسائی کا واحد ذریعہ قرار پاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن و حدیث پر عمل اور اس کی خدمت کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

سودی نظام۔ علماء کرام کی ذمہ داری کیا ہے؟

(جامعہ اسلامیہ محمدیہ، فیصل آباد - ۴ جنوری ۲۰۲۳ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ! آج کل ہمارا عام طور پر موضوع سود ہی ہوتا ہے کیونکہ سودی نظام کے خلاف مہم جاری ہے اور مختلف طبقات تاجر برادری، علماء کرام اور دینی حلقے اس حوالے سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آج میں اس پہلو پر گزارش کرنا چاہوں گا کہ وطن عزیز کو سودی نظام سے نجات دلانے کی جدوجہد میں علماء کرام کو کیا کرنا چاہیے؟ علماء کرام خواہ کسی بھی مکتبہ فکر کے ہوں، مسجد، جمعہ، وعظ و خطابت اور تدریس سے جو تعلق رکھتے ہیں، انہیں دو تین کام تو کرنے ہی چاہئیں:

1. سود کی حرمت کا بیان کہ سود حرام ہے اور اس کی نحوست واضح کرنا۔ جمعہ کا خطبہ، عوامی درس، کتاب کے سبق اور سکول کے لیکچر، جہاں موقع ملے سود کی نحوست اور اس کے نقصانات کو علماء کرام اپنے اپنے دائرے میں موقع بموقع واضح کرتے رہیں۔ یہ ہماری سب سے پہلی ذمہ داری ہے۔

2. دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ متعلقہ طبقات سے رابطہ قائم کریں۔ تاجروں، بینکاروں، بزنس کمیونٹی اور وکیلوں کو اس مہم کے لیے تیار کریں، انہیں بریف کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بڑھائیں۔ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام، وکلاء و تاجر حضرات اور دیگر طبقات جس طرح ختم نبوت کے مسئلہ میں آپس میں تعاون کرتے ہیں یہ بھی اسی نوعیت کا اجتماعی مسئلہ ہے، اس کے لیے بھی اسی طرح کا ماحول بنانا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم آپس میں متحد ہو کر کام کریں۔

3. جبکہ ہماری تیسری ذمہ داری یہ ہے جس پر آج میں کچھ تفصیل سے بات کروں گا کہ سودی نظام کے حوالے سے جو شکوک و شبہات سوشل میڈیا، اخبارات ورسائل اور عام مجالس میں اٹھائے جارہے ہیں، علماء کرام انہیں نظر انداز نہ کریں بلکہ موضوع بحث بنائیں، سوالات کو پہلے سمجھیں، ان کے جوابات تلاش کریں اور پھر لوگوں تک پہنچائیں۔ کیونکہ یکطرفہ سوالات اور شکوک و شبہات پھیلتے جائیں اور ان کا جواب نہ ہو تو لوگ اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں محنت کرنا پڑے گی اور پہلے خود معاملہ سمجھنا پڑے گا کیونکہ اگر میں خود شکوک و شبہات کو نہیں سمجھوں گا تو دوسروں کو کیا سمجھاؤں گا۔ شکوک و شبہات کا نوٹس لینا، ان کا جواب دینا، لوگوں کو مطمئن کرنا، ان کی تسلی کرانا، یہ ہماری دینی ذمہ داری ہے جو شروع سے چلی آرہی ہے۔

سود ہر آسمانی شریعت میں حرام رہا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت جنہیں ہم اہل کتاب کہتے ہیں، یہ تو ریکارڈ پر ہیں، ان کے علاوہ بھی جتنے آسمانی مذاہب ہیں سب میں سود حرام ہے۔ قرآن تو سود کو حرام کہتا ہی ہے، بائبل، تورات، انجیل اور ہندوؤں کی وید بھی کہتی ہے کہ سود کا لین دین جائز نہیں ہے۔ پاکستان کی چھپی ہوئی بائبل میں وہ آیات موجود ہیں جن میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ پرانی کتابیں اگرچہ تحریف شدہ ہیں لیکن ان میں بہت سے احکام موجود ہیں جن کے مطابق تمام آسمانی شریعتوں میں سود حرام رہا ہے۔

سود کے حوالے سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا تھا ان کا ذکر قرآن کریم نے بھی کیا ہے اور احادیث مبارکہ میں بھی آیا ہے۔ اور جناب نبی کریمؐ نے سود کے حرام ہونے کا صرف اعلان نہیں فرمایا بلکہ عملاً سود کو

ختم فرمایا، جب حضورؐ دنیا سے روپوش ہوئے تو عرب دنیا میں سود باقی نہیں رہا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں سود کا عام رواج تھا اور لوگوں کا کاروبار اسی حوالے سے ہوتا تھا تو جب آپؐ نے اس کی حرمت کا اعلان فرمایا تو اشکالات بھی ہوئے:

- سب سے پہلا اشکال جس کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے یہ ہوا کہ ''انما البیع مثل الربو''۔ لوگوں نے کہا کہ سود بھی تو تجارت کی قسم ہے، وہ بھی لین دین ہے اور یہ بھی لین دین ہے، وہ بھی نفع کے ساتھ ہے اور یہ بھی نفع کے ساتھ ہے، تو ان میں فرق کیا ہے؟ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں اس اشکال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''احل اللہ البیع و حرم الربو'' اللہ تعالی نے تجارت کو حلال کہا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ تجارت کے نتائج اور ہیں، سود کے نتائج اور ہیں۔ اس پر آج بہت بحث ہو چکی ہے، آپ ریسرچ کریں، دنیا کی جدید معیشت کے ماہرین یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ تجارت سے رقم پھیلتی ہے اور سود سے سمٹتی ہے، یہ آج کی تحقیق کا بنیادی نکتہ ہے اور دنیا کے بڑے مسائل میں سے ہے کہ سود نے معیشت کو جس ٹریک پر ڈال دیا ہے اسے واپس کیسے لائیں؟

ظاہری منظر یہ ہے کہ سود پر رقم دیں گے تو رقم میں اضافہ ہوگا، اور زکوۃ دیں گے تو رقم میں کمی ہوگی۔ گنتی کا ماحول تو یہی ہے کہ سود پر ایک سو روپیہ دیں تو واپس ایک سو دس یا ایک سو پندرہ آئیں گے، جبکہ زکوۃ دیں تو سو میں سے ساڑھے ستانوے رہ جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالی نے قرآن مجید میں اس کی نفی کی ہے ''ما اتیتم من ربا لیربو فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما اتیتم من زکوۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون''۔ جو تم سود پر رقم دیتے ہو کہ مال میں اضافہ ہو تو اس میں اللہ کے ہاں اضافہ نہیں ہوتا، اور جو تم زکوۃ دے کر سمجھتے ہو کہ مال کم ہو گیا ہے ''فاولئک ھم المضعفون'' تو زکوۃ سے رقم کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے۔ قرآن مجید نے دراصل اس کے اجتماعی نتائج کو ذکر کیا ہے اور اس ظاہری منظر کو رد کیا ہے کہ زکوۃ سے رقم کم ہوتی اور سود سے بڑھتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی اس بات کو لوگوں پر واضح کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

البتہ یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اصل چیز گنتی ہوتی ہے یا قدر (value) ہوتی ہے؟ میں اس کی ایک مثال دوں گا کہ جی ٹی روڈ گکھڑ پر ۱۹۶۰ء میں ہم نے گھر بنایا تھا اور ایک سو روپیہ فی مرلہ زمین خریدی تھی۔ میں نے خود دس مرلے کی رجسٹری کرائی تھی کہ تحصیلدار کے سامنے گیارہ سو ستر روپے رجسٹری کے خرچ سمیت پیش کیے تھے۔ اب وہاں گکھڑ میں جی ٹی روڈ پر ایک مرلہ زمین کی قیمت ایک کروڑ روپیہ بتائی جاتی ہے۔ گنتی تو بڑھی ہے لیکن ویلیو اس اعتبار سے وہی ہے کہ زمین تو ایک مرلہ ہی ہے، ایسا نہیں کہ ایک مرلے کی زمین پھیل کر دس مرلے ہو جائے۔ ایک بات اور سمجھ لیں کہ گنتی آپ کے پاس ہے لیکن قدر آپ کے کنٹرول میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر میری جیب میں جو پانچ ہزار روپے کا نوٹ ہے وہ میرا ہے لیکن اس کی ویلیو میرے کنٹرول میں نہیں ہے۔ اس کی قدر، اس کی قوت خرید بڑھ کر پانچ سے سات ہزار بھی ہو سکتی ہے اور کم ہو کر تین ہزار بھی۔ اس کی ویلیو مالیاتی اداروں کے اقدامات سے اور معاشی اتار چڑھاؤ سے طے ہوتی ہے۔ تو آج کی معیشت کے ان مسائل پر بحث کس نے کرنی ہے؟ فرشتوں نے تو نہیں کرنی، یہ بھی ہم علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ ہم ان معاملات کو پہلے خود سمجھیں اور پھر لوگوں کو سمجھائیں۔

• طائف کے بنو ثقیف کے سرداروں کا وفد فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا تو چونکہ طائف فتح نہیں ہو سکا تھا اور طائف والے خود اسلام قبول کرنے گئے تھے تو یہ گھمنڈ ذہن میں تھا کہ ہم خود جا رہے ہیں اس لیے اسلام اپنی شرطوں پر قبول کریں گے، لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ شرطیں مسترد فرما دی تھیں۔ سود کے جواز میں یہ دلیل کہ دوسری قوموں کے ساتھ ہماری تجارت سود کی بنیاد پر چلتی ہے اس لیے ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے، یہ دلیل انہوں نے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی تھی لیکن آپؐ نے اسے رد فرما دیا تھا۔ علماء کرام سیرت کی کسی متوسط کتاب میں ان شرائط کو ضرور پڑھیں۔ ساری کتاب تو ہم نے پڑھنی نہیں ہوتی کیونکہ ہمارا ذوق یہ بن گیا ہے کہ کتابیں سجانے کے لیے رکھتے ہیں، پڑھتے نہیں ہیں۔

اس پر ایک لطیفہ میں نے پڑھا تھا، سنا دیتا ہوں کہ ہمارا کتاب کا ذوق کیا ہے؟ ایک بہت مالدار خاتون نے کوٹھی بنوائی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ امیر لوگوں کی کوٹھی میں لائبریری بھی ہونی چاہیے، تو اس نے مختلف الماریاں بنوائیں، انہیں طرح طرح کے رنگ کروائے اور پھر کتابیں لینے کے لیے بڑے کتب خانے میں چلی گئی۔ گھر سے الماریاں فیتے سے ماپ کر گئی تھی کہ اتنے انچ نیلے رنگ کی، اتنے انچ کالے رنگ کی اور اتنے انچ سبز رنگ کی کتابیں چاہیئیں، اور وہ لا کر اس نے ان الماریوں میں سجا دیں۔ آج ہمارا کتاب کا ذوق یہی ہے کہ ہم نے مطالعہ چھوڑ دیا ہے اور کتاب بھی ہمارے ہاں سامان نمائش کر رہ بن گیا ہے۔ میں علماء کرام سے یہ عرض کر رہا ہوں کہ ان مسائل کو بیان کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

• آج ایک یہ بھی عمومی اشکال ہوتا ہے کہ سود مسلمانوں کے لیے حرام ہے کیونکہ قرآن کے احکام مسلمانوں کے لیے ہیں، تو غیر مسلم جو سود کا کاروبار کرتے ہیں اس سے آپ کو کیا مسئلہ ہے، ان کے ہاں تو سود حرام نہیں ہے۔ اس بارے میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کیا ہے؟ آپ معاہدہ نجران پڑھیں۔ نجران کے عیسائی معاہدے کے تحت اسلامی ریاست میں شامل ہوئے تھے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت تسلیم کی تھی تو ان کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا، جس میں لکھا گیا تھا کہ تم غیر مسلم بھی ہماری ریاست میں سود کا کاروبار نہیں کرو گے۔ ایک جملہ یہ تھا کہ اگر تم میں سے کسی ذمہ دار شخص نے سود کا کاروبار کیا تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔

میری علماء کرام سے گزارش ہے کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ایک تو ہم سود کا حرام اور منحوس ہونا لوگوں پر واضح کرتے رہیں، دوسرا اس کی محنت کے لیے مختلف طبقات کو تیار کریں اور انہیں قریب کرتے رہیں، اور تیسری بات کہ مختلف حوالوں سے جو شکوک و شبہات سامنے آ رہے ہیں، انہیں پہلے خود سمجھیں اور ان کے جوابات تیار کریں، پھر بیان کریں اور لوگوں کو سمجھائیں، اس سے یہ جدوجہد آگے بڑھے گی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین!

۲۰۲۲ء

مسئلہ ختمِ نبوت میں عالمی اداروں کی دلچسپی

(مسجد امن، باغبانپورہ، لاہور - عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت - ۱۴ دسمبر ۲۰۲۲ء)

(جامع مسجد امن باغبانپورہ لاہور میں ۱۳، ۱۴ دسمبر ۲۰۲۲ء کو عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیراہتمام منعقدہ دوروزہ ختم نبوت کورس کی آخری نشست سے خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور محترم بھائی مولانا قاری جمیل الرحمن اختر کا شکرگزار ہوں کہ عالمی مجلس آج کی ضرورت کے مطابق ختم نبوت کے عنوان پر ملک کے مختلف حصوں میں اجتماعات اور کورسز منعقد کر رہی ہے، اور اس حوالے سے بھی کہ آج کی اس مجلس میں مجھے کچھ گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ یہ سعی و جدوجہد قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی، اور حق کی جو بات علم اور سمجھ میں آئے اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

اس وقت دین کے حوالے سے جدوجہد کے جتنے بھی دفاعی محاذ ہیں، ان میں سب سے بڑا محاذ ختم نبوت کا ہے۔ یہ سب سے بڑا محاذ کیوں ہے؟ یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ باقی محاذوں اور مسائل پر ہمارا سامنا آپس کے داخلی گروپوں سے ہوتا ہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو وہ امت مسلمہ کے داخلی گروپوں کا ہوگا، یا اپنے آپ کو امت مسلمہ میں شمار کرنے والوں کا ہوگا۔ لیکن ختم نبوت کے مسئلے پر ہمارا محاذ اور مورچہ داخلی نہیں بلکہ خارجی ہے، اور علاقائی نہیں بلکہ عالمی ہے۔ اس مسئلے پر ہم سے مطالبات، دباؤ، اور ہمارا احصار عالمی ادارے اقوام متحدہ، یورپی یونین، آئی ایم ایف، جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن، اور امریکہ کی وزارت خارجہ کا جنوبی ایشیا ڈیسک وغیرہ کر رہے ہیں۔ اس محاذ پر ہمیں عالمی اداروں کا سامنا ہے، اس لیے

یہ سب سے بڑا مورچہ ہے کہ ہماری لڑائی مقامی نہیں ہے بلکہ عالمی ہے، علاقائی نہیں ہے بلکہ انٹرنیشنل ہے، اور سارا دباؤ عالمی طاقتوں اور بین الاقوامی اداروں کا ہے کہ یہ کرو اور یوں نہ کرو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالمی قوتوں، امریکہ، یورپی یونین، جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن، اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے اداروں کو اس سے کیا دلچسپی ہے کہ وہ سب اس مسئلے پر یکجا ہیں کہ پاکستان میں قادیانیوں کو کافر قرار دینے کا قانون واپس لیا جائے۔ ان کی اس سے غرض کیا ہے؟ باقی مسئلوں پر بات ہو جاتی ہے لیکن اس مسئلے پر یورپی یونین، جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن، انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں اور بین الاقوامی ادارے، ان سب کا ہم سے ایک ہی مطالبہ بلکہ دباؤ اور مداخلت ہے کہ تم قادیانیوں کو کافر کیوں کہتے ہو، یہ قانون واپس لو۔ ان کو یہ دلچسپی کیوں ہے، یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مغرب کا اصل مقابلہ قرآن کریم کے قوانین اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام سے ہے، جس کو ہم قرآن و سنت، شریعت اور اسلامی نظام کہتے ہیں۔ یہ نظام چودہ سو سال سے چلا آ رہا ہے، قرآن کریم محفوظ چلا آ رہا ہے اور شریعت اور فقہ کا تسلسل چلا آ رہا ہے۔ مسلمان اس سے دستبردار ہونے کو کبھی تیار نہیں ہوئے، حکومتیں جو مرضی کر لیں لیکن عام مسلمان قرآن کریم کے احکام اور سنت و شریعت کے احکام سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں اور نہ آئندہ کبھی ہوں گے، انشاء اللہ تعالی۔ چودہ سو سال کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، بہت سے گروہ پینترے بدل کر آئے، بڑی قوت کے ساتھ آئے، لیکن قرآن کریم، سنت رسولؐ اور شریعت کے احکام کے ساتھ مسلمانوں کی کمٹمنٹ کو توڑنے میں کوئی کامیاب نہیں ہوا۔ فطری بات ہے کہ قرآن کریم کے احکام، سنت رسولؐ اور شریعت کو کوئی منسوخ نہیں کر سکتا۔ اس کو منسوخ کرنے والی اتھارٹی ایک ہی ہو سکتی ہے کہ نبی کے فیصلے کو نبی ہی منسوخ کر سکتا ہے، نبی سے کم درجے کی کوئی اتھارٹی نبی کے احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ اس لیے سوچ سمجھ کر بیرونی دنیا نے یہ پلاننگ کی کہ نبی کے نام سے کوئی گروپ کھڑا کیا جائے تاکہ قرآن اور سنت کی منسوخی کا راستہ ہموار ہو۔ یہ پس منظر ذہن میں رکھیں کہ نبی کے فیصلے کو نبی ہی منسوخ کر سکتا ہے، نبی کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہی بات علامہ محمد اقبالؒ نے کہی تھی کہ قادیانی اس لیے کافر ہیں کہ انہوں نے نئی اتھارٹی کھڑی کر دی ہے، اور نئے نبی اور وحی کے عنوان سے مذہب تبدیل کر لیا ہے۔

برصغیر میں پہلے بھی اس کی کوشش ہوئی تھی، مغل بادشاہ اکبر نے اجتہاد کے نام پر بہت سے احکام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے قرآن کریم کے کچھ احکام اور شریعت کے احکام بدل دیے اور نام ”دین الٰہی“ رکھا، ٹائٹل مسلمان کا ہی رکھا، بعض چیزیں جائز اور بعض حرام قرار دے دیں۔ لیکن اس کا دعوی چونکہ اجتہاد کے نام سے تھا اس لیے اس کی بات نہیں چلی کہ شریعت کے احکام کو نبی کے ٹائٹل کے علاوہ منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اب چونکہ نبی کوئی آنا نہیں ہے تو مغرب کا اصل ایجنڈا یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن کریم اور شریعت کے احکام میں تبدیلی پر آمادہ کیا جائے اور نبی کے نام سے کوئی اتھارٹی ان سے منوالی جائے جو کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے اور میں نے فلاں حکم منسوخ کر دیا ہے۔

یہ مغرب کی دلچسپی کی وجہ ہے کہ اسلام میں ردوبدل کی کوئی ایسی اتھارٹی جس کو مسلمان تسلیم کریں، کھڑی کی جائے، اس کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کو کھڑا کیا گیا تھا اور آج بھی ان کا سب سے بڑا پشت پناہ مغرب ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ختم نبوت ہمارا سب سے بڑا مورچہ ہے، جس میں ہمیں عالمی قوتوں سے واسطہ ہے اور ان کا اصل ایجنڈا شریعت کو تبدیل کرنا ہے۔ شریعت کو تبدیل کرنے کے لیے انہوں نے نبوت کے نام پر اتھارٹی کھڑی کی جس کو پوری دنیائے اسلام کے مسلمان نہیں مان رہے۔ یہ ہمارا اور مغرب کا اصل جھگڑا ہے۔ مغرب اسی لیے قادیانیوں کی پشت پناہی کر رہا ہے، پیسے خرچ کر رہا ہے، ہم پر دباؤ اور پریشر ڈال رہا اور مجبور کر رہا ہے کہ کوئی ایسی اتھارٹی تسلیم کرو جو قرآن و شریعت کے احکام میں ردوبدل کر سکے، لیکن ایسے نہ ہوا ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ کبھی ہو گا۔

ختم نبوت کی جدوجہد پر جتنی جماعتیں اور گروہ کام کر رہے ہیں، سب اللہ تعالی کے دین کی خدمت اور اپنا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ لیکن اس جدوجہد کے دائرے مختلف ہیں۔ اس محاذ پر محنت کرنے والوں کیلئے محنت کے چار بڑے دائرے ہیں، میں وہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا درجہ خبردار کرنے کا ہے کہ جاگتے رہنا۔ ختم نبوت کی جدوجہد کا پہلا دائرہ یہ ہے کہ عام آدمی کو بیدار رکھا جائے، لوگوں کو متوجہ کرتے رہنا کہ یہ ہمارا عقیدہ ہے اس پر پکا رہنا ہے اور اس کے خلاف کوئی بات قبول نہیں کرنی۔ سب سے بڑا مورچہ عوامی سطح پر لوگوں کو بیدار اور آگاہ رکھنے کا ہے اور مختلف جماعتیں یہ کام کر رہی ہیں۔ اسی غرض سے اجتماعات

ہو رہے ہیں، جلسے، دروس، کورسز اور تربیتی کیمپ سب کی یہی غرض ہے کہ عام مسلمان اپنے عقیدے کے حوالے سے چوکنا اور باخبر رہے۔

ختم نبوت کے حوالے سے کام کرنے والوں کے لیے کام کا دوسرا دائرہ یہ ہے کہ ہماری جو پڑھی لکھی کلاس ہے جس کو مقامی اور بین الاقوامی میڈیا، پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا، لابیوں اور این جی اوز سے واسطہ پڑتا ہے اور جن کے ذہنوں میں مسلسل شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے رہے ہیں، کیے جا رہے ہیں اور پیدا کیے جاتے رہیں گے۔ یہ کالجز، یونیورسٹیز اور سوشل میڈیا اور اس سطح کا ماحول ہے جہاں بین الاقوامی ابلاغ کے ذرائع میڈیا، این جی اوز اور عالمی ادارے مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طریقے سے نوجوان نسل روایتی دین اور عقیدے میں لچک پیدا کرے اور ہماری نئی باتیں قبول کرے۔ یہ دوسرا بڑا مورچہ ہے۔ یہ آمنے سامنے بات کرنے کا، سلیقے سے بات کہنے کا، بات پہنچانے کا اور شکوک و شبہات کے جواب دینے کا مورچہ ہے۔ اس مورچے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ شبہات تو پیدا ہو رہے ہیں، جس کی جیب میں موبائل ہے اس کے ذہن میں شکوک و شبہات کا جنگل ہے۔ جو بین الاقوامی رابطہ رکھتا ہے اس کے گرد شکوک و شبہات کا پورا حصار ہے۔ اس لیے ان تک رسائی حاصل کرنا، ان تک بات پہنچانا، ان کی بات سننا، ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ کرنا، ان کے اعتراضات کا جواب دینا اور مقابلہ کرنا یہ ہماری جدوجہد کا دوسرا دائرہ ہے۔

تیسرا دائرہ یہ ہے کہ قادیانی ملک کے مختلف محکموں میں گھسے ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی بہانے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ ہدایات اور طریقہ کار باہر سے آتا ہے اور یہ یہاں بیٹھے کام کرتے ہیں۔ وہ بیوروکریسی میں بیٹھ کر چالیں چلتے ہیں، اسٹیبلشمنٹ کی مختلف گھاتوں میں بیٹھے ہوئے کبھی کوئی کام کر لیا، کبھی اسمبلی والوں کو ورغلا لیا، کبھی فوج کے جرنیل اور کبھی کسی حکمران کو ورغلا لیا۔ اسٹیبلشمنٹ اور حکمران طبقے کے اندر بیٹھ کر یہ جو سازشوں کا دائرہ ہے، جس کے ذریعے کوئی نہ کوئی شرارت ہو جاتی ہے، کئی شرارتیں ہمارے سامنے ہوئی ہیں اور کئی چالیں چلی گئی ہیں۔ دینی جماعتیں اور قومی و ملی سوچ رکھنے والے چوکنا رہتے ہیں، آواز اٹھاتے ہیں اور بات ختم ہو جاتی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ وردی والی ہو یا بغیر وردی، ان کے اندر بیٹھ کر جو لوگ سازشیں کر رہے ہیں ان سازشوں کو سمجھنا، ان کا جواب دینا اور ان سازشوں کو ناکام بنانا ہمارا تیسرا مستقل مورچہ ہے۔

میں ختم نبوت کی جدوجہد کے دائرے بیان کر رہا ہوں، اس کا چوتھا محاذ بین الاقوامی ہے جہاں پلاننگ اور منصوبہ بندی ہوتی ہے، جہاں سے ہدایات اور ڈکٹیشن آتی ہے۔ یہ ہمارا سب سے بڑا محاذ ہے۔ لیکن میں اب تک کے تجربات کی بنیاد پر یہ بات عرض کرنا چاہوں گا کہ ہماری اس محاذ پر اس حد تک توجہ نہیں ہے جس حد تک ہونی چاہیے۔ میں ماضی کے دو تجربے آپ کے سامنے عرض کرنا چاہوں گا۔

ایک تجربہ جنوبی افریقہ کا ہے۔ جنوبی افریقہ کی سپریم کورٹ میں ختم نبوت کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔ اس پر ہمارے حکمرانوں اور ہماری جماعتوں نے توجہ کی، وہاں خود جا کر کیس لڑا۔ جنوبی افریقہ کی سپریم کورٹ میں قادیانیوں کے حوالے سے کہ ان کو مسلمانوں میں شمار کیا جائے یا نہیں، یہ کیس حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ اور ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ نے جا کر لڑا تھا اور ہماری علمی قیادت نے وہاں سپریم کورٹ میں یہ مقدمہ جیتا بھی تھا۔ جہاں اوریجنل لوگ، محاذ کے اصل لوگ پہنچے ہیں، انہوں نے مقدمہ جیتا ہے۔ لیکن جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن میں ہمارے اوریجنل بندے نہیں گئے تھے اس لیے ہم ہار گئے تھے۔

میں آپ سے طریقہ واردات عرض کرتا ہوں کہ ۱۹۸۴ء میں امتناع قادیانیت آرڈیننس آیا تھا کہ قادیانی اسلام کا نام استعمال نہیں کر سکتے، مسلمان کا ٹائٹل اختیار نہیں کر سکتے، تو مرزا طاہر احمد نے ۱۹۸۵ء میں لندن جا کر مورچہ بنایا اور جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن میں جا کر کیس دائر کیا کہ ہمیں شہری حقوق، انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے اور ہمارے سیاسی حقوق پامال کر دیے گئے ہیں۔ ہیومن رائٹس کمیشن کا طریقہ کار اور پراسیس یہ ہے کہ جس ملک کے قانون کے خلاف درخواست آتی ہے، اس ملک کا سفیر ملک کا دفاع کرتا ہے۔ پاکستانی قانون کے خلاف درخواست دی گئی تو پاکستان کا دفاع سفیر نے کرنا تھا، جبکہ اس وقت سفیر منصور احمد قادیانی تھا۔ مدعی بھی قادیانی اور مدعا علیہ بھی قادیانی۔

ہمارے علم میں یہ بات آگئی تھی۔ اس وقت راجا ظفر الحق صاحب وفاقی وزیر تھے، ہمارے دوست سید ریاض الحسن گیلانی ایڈووکیٹ اس وقت ڈپٹی اٹارنی جنرل تھے، جو ختم نبوت کے بڑے وکیلوں میں سے ہیں۔ وہ، میں اور مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اسلام آباد گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ دعوی مرزا طاہر کی طرف سے ہے اور جواب منصور احمد نے دینا ہے۔ ہم ابھی سوچ رہے تھے کہ وفد بھیجنا چاہیے کہ ادھر سے ہمارے خلاف فیصلہ ہو گیا۔ جنیوا

ہیومن رائٹس کمیشن کا فیصلہ ہمارے خلاف ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کے حقوق پامال کیے گئے ہیں اور دنیا میں ہر جگہ وہی فیصلہ ہمارے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ادارہ بات کرتا ہے تو قادیانی چپکے سے جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن کا فیصلہ اس کے سامنے رکھتے ہیں کہ عالمی ادارے کا فیصلہ ہے اور وہ فیصلہ ہمارے خلاف استعمال ہوتا ہے۔

یہ میں نے دو تجربے عرض کیے ہیں۔ بین الاقوامی فورموں کا تجربہ یہ ہے کہ جہاں ہم نے خود جا کر کیس لڑا ہے وہاں ہم جیتے ہیں، اور جہاں ہم نے سفارتی ذرائع پر اعتماد کیا ہے وہاں ہارے ہیں، اور آئندہ بھی ایسے ہی ہوگا۔ جب فیصلہ بین الاقوامی سطح پر یورپی یونین، جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن اور اقوام متحدہ کی کسی کمیٹی نے کرنا ہے تو ہمیں کیس خود لڑنا ہوگا۔ مثلاً ہائی کورٹ میں میرے خلاف کیس ہے اگرچہ غلط ہے لیکن مجھے کیس لڑنا تو ہوگا خواہ کیسا بھی ہے۔

میں نے ختم نبوت کی جدوجہد کے چار دائرے ذکر کیے ہے۔ اس وقت ہم ان چار محاذوں پر سامنا کر رہے ہیں، کہیں اچھے طریقے سے اور کہیں نرم طریقے سے، اس جدوجہد میں ہماری ضروریات کیا ہیں؟ اس پر میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی جدوجہد اس جذبے سے کرنی چاہیے کہ اگر ہم ڈھیلے پڑ گئے تو سب کچھ ڈھیلا پڑ جائے گا۔ اس وقت بھی ہم سے مطالبہ اور دباؤ ہے کہ قادیانیوں کے بارے میں قوانین ختم کرو۔ اس کے مقابلے میں عوامی دباؤ کی ضرورت ہے۔ پبلک پریشر میں سب سے بڑی بات تمام مکاتب فکر کی وحدت ہے۔ یہ ہماری ضرورت ہے کہ تمام مکاتب فکر وقتاً فوقتاً اپنی وحدت کا اظہار کرتے رہیں کہ ختم نبوت کے مسئلے پر ہم ایک ہیں اور ہمارا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جس دن ہم نے اس وحدت میں دراڑ برداشت کر لی تو یہ کیس ہارنے والی بات ہوگی۔ یہ بات نوٹ کر لیں کہ امت کہلانے والے سارے اکٹھے ہیں، ہمیں وقتاً فوقتاً یہ شو کرنا پڑے گا، اکٹھے تو ہیں لیکن اس کا اظہار بھی کرتے رہنا ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ ہم اس کیس کو آج کی زبان میں لڑیں۔ ہائی کورٹ میں جمعہ کی تقریر نہیں چلتی، وکیل کے دلائل چلتے ہیں۔ سیشن کورٹ میں فجر کے بعد والا درس نہیں چلتا، وہاں وکیل کی بحث چلتی ہے۔ اس لیے ہمیں بین الاقوامی اداروں میں جانا ہوگا، جنوبی افریقہ کی سپریم کورٹ کی طرح جانا ہوگا، اور اس لیول پر اسی زبان میں جنگ لڑنا ہوگی۔ اپنی وحدت کا اظہار اور مسلسل آواز بلند کرتے رہنا، اور جہاں کیس لڑا جا رہا ہے وہاں جا کر اس ماحول کے

مطابق اس لیول پر کیس لڑنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دیں اور ہمیں یہ ذوق عطا فرمائیں کہ ہم ہر مورچے اور ہر میدان میں اپنے اور اپنی نئی نسل کے ایمان و عقیدہ کا تحفظ کر سکیں۔ آمین یارب العالمین۔

قرآن کریم آج بھی راہنمائی کا سرچشمہ ہے

(جامعہ دارالقرآن، قلعہ دیدار سنگھ، گوجرانوالہ - ۱۲ دسمبر ۲۰۲۲ء)

بعد الحمد و الصلوۃ! میرے اور آپ سب کے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ جن بچوں نے قرآن پاک حفظ مکمل کیا ہے، انہوں نے آخری سبق سنایا ہے اور ان کی دستار بندی ہوئی ہے، اور ان بچوں، ان کے والدین اور استاد محترم کی خوشی میں ہم شریک ہو رہے ہیں۔ اصل خوشی تو ان کی ہے۔ اللہ پاک ان کو یہ خوشیاں مبارک کریں اور ان کا قرآن کریم حفظ کرنا ہم سب کے لیے دنیا و آخرت کی برکات، سعادتوں اور خوشیوں کا ذریعہ بنے۔ قرآن کریم کے حوالے سے مختصر گفتگو کروں گا۔

پہلی بات یہ کہ ابھی پڑھتے ہوئے کچھ بچے ٹھٹھک گئے تھے۔ جب پڑھتے ہوئے کوئی بچہ ٹھٹھک جاتا ہے تو مجھے اپنے بھولنے کا واقعہ یاد آجاتا ہے۔ میں آخری سبق سناتے ہوئے بھول گیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں میرا حفظ مکمل ہوا۔ میں نے آخری سبق حافظ الحدیث حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ کو گکھڑ میں ایک جلسہ میں سنایا تھا، جبکہ اسٹیج پر حضرت مولانا قاری فضل کریم صاحبؒ، استاذ القراء حضرت مولانا سید حسن شاہ صاحبؒ اور والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحبؒ موجود تھے۔ میرے استاد محترم استاذ الحفاظ و القراء حضرت قاری محمد انور صاحبؒ جو مدینہ منورہ جنۃ البقیع میں مدفون ہیں میرے حفظ کے استاد تھے۔ آخری سبق سورۃ المرسلات کا دوسرا رکوع تھا۔ میں سبق سنانے آیا تو سامنے پورا مجمع تھا، مسجد بھری ہوئی تھی اور پیچھے یہ بزرگ موجود تھے۔ اس وقت میری عمر بارہ سال تھی تو میں سناتے ہوئے لڑکھڑا رہا تھا، ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اتنے بڑے بزرگوں کے سامنے اور اتنے بڑے اجتماع میں پڑھنا آسان بات نہیں تھی۔ میں آیت ”واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون“ بھول گیا۔ خیر استاد محترم نے لقمہ دیا اور میں نے پڑھ لیا، بات گزر گئی۔

اس کے ڈیڑھ دو سال بعد حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کسی پروگرام میں گوجرانوالہ تشریف لائے۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر میں تشریف فرما تھے۔ شہر کے علماء

حضرت کے پاس جمع تھے۔ میں بھی زیارت کے لیے چلا گیا۔ مجھے تصور بھی نہیں تھا کہ حضرت مجھے پہچان لیں گے۔ ایک جلسے میں ایک بچے کا سبق سنا ہے تو ہر ایک بچے کو پہچاننا تو مشکل ہوتا ہے۔ میں جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ حضرت نے نظر ڈالی اور فرمایا اب چھپتے بھی ہو ”واذا قیل لھم ارکعوا“ ادھر آؤ۔ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ حضرت کو یاد ہے کہ اس بچے نے مجھے آخری سبق سنایا تھا، یہ بھی یاد ہے کہ یہ بھول گیا تھا اور یہ بھی یاد ہے کہ آیت کونسی بھولا تھا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ پھر سبق سناؤ تو میں نے اس موقع پر دوبارہ آخری سبق سنایا۔ جب بھی کوئی بچہ ٹھٹھکتا ہے تو مجھے یہ واقعہ یاد آجاتا ہے۔ اللہ تعالی ان حضرات کے درجات بلند فرمائیں۔

محترم قاری وسیم اللہ امین ہمارے ساتھی اور رفیق تدریس بھی ہیں۔ جامعہ نصرۃ العلوم کے مدرس ہیں۔ اللہ تعالی نے ان کو دنیا بھر میں قرآن کریم سنانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اللہ تعالی عزت و مواقع اور توفیق میں مزید برکات نصیب فرمائیں۔ انہوں نے ابتدا میں ایک آیت پڑھی ”ان ھذا القرآن یہدی“ یہ قرآن ہدایت دیتا ہے ”للتی ھی اقوم“ قرآن جس راستے کی رہنمائی کرتا ہے وہ دنیا میں سب سے مضبوط، سب سے اچھا اور دنیا کے تمام راستوں میں سب سے سیدھا راستہ ہے۔ قرآن مجید کے ان دو جملوں پر آج کے دور کی چند شہادتیں ذکر کرنا چاہوں گا۔

ہمارے ایک نو مسلم دوست ہیں یحیی برٹ جو کہ آکسفورڈ میں ہوتے ہیں، نسلاً انگریز ہیں۔ ان کے والد جان برٹ بی بی سی کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ یحیی برٹ مسلمان ہو گئے، پہلے کوئی اور نام تھا پھر یحیی نام رکھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی وقت لگایا، دینی تعلیم حاصل کی اور آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی کی۔ انہوں نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے کہ سانحہ گیارہ ستمبر کے بعد یورپ میں یورپین نسلوں کے لوگ کیوں مسلمان ہو رہے ہیں؟ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۱ء تک کے دس سال کو فوکس کیا اور ریسرچ کی کہ یورپ میں باہر سے آنے والے نہیں بلکہ یورپین نسلوں کے لوگ کیوں مسلمان ہو رہے ہیں؟ نائن الیون کے دس سال بعد یورپ کے کتنے لوگ مسلمان ہوئے اور ان کے قبول اسلام کی وجہ کیا ہے؟ یحیی برٹ کا مقالہ نیٹ پر موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ دس سال میں یورپ میں یورپین نسلوں کے جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان میں سے تیرہ ہزار تک میں نے معلومات حاصل کی ہیں۔ ان مسلمان ہونے والوں میں کوئی ڈچ، کوئی انگریز، کوئی

سکاچ، کوئی جرمن ہے۔ ان کے قبول اسلام کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے تجزیہ کیا کہ ان میں سے ۸۰ فیصد لوگ وہ ہیں جن کی کسی طریقے سے قرآن مجید تک رسائی ہوئی، انہوں نے قرآن پاک کو اسٹڈی کیا اور مسلمان ہوگئے ہیں۔ یعنی قرآن پاک ان کے مسلمان ہونے کا سبب بنا۔ ''ان ھذا القرآن یھدی''۔ قرآن کریم آج بھی رہنمائی کرتا ہے، آج بھی سیدھا راستہ دکھاتا اور ہدایت دیتا ہے۔ دنیا میں آج جو لوگ مسلمان ہورہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قرآن پاک تک براہ راست رسائی ہوگئی، انہوں نے قرآن پاک اسٹڈی کیا اور قرآن پاک نے انہیں مسلمان کردیا۔

اس پر ایک اور شہادت دوں گا۔ امریکن نومسلم خاتون ڈاکٹر ایم کے ہرمینسن جو اس وقت شکاگو یونیورسٹی میں شاہ ولی اللہ کی چیئرپرسن ہیں، وہ مسلمان ہوئیں، دین پڑھا، اردو، عربی اور فارسی پڑھی۔ ۱۹۸۹ء کے دوران گوجرانوالہ بھی تشریف لائی تھیں۔ میں نے ان سے طویل انٹرویو کیا۔ وہ اصل کینیڈین ہیں، امریکہ میں رہتی ہیں، سین ڈیاگو یونیورسٹی سے پڑھا ہے۔ میں نے انٹرویو میں ان سے سوال کیا کہ آپ کیوں مسلمان ہوئی ہیں؟ مسلمان ہونے کی وجہ بتائیں تو انہوں نے جو جواب دیا اس سے اندازہ کریں کہ قرآن پاک کیسے مسلمان کرتا ہے۔ آج کے دور کے ہزاروں واقعات میں سے ایک واقعہ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ ہرمینسن بتاتی ہیں کہ میں نے سین ڈیاگو یونیورسٹی میں ماسٹر کی ڈگری کی، اس کے بعد دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف کورسز کیے۔ جب اسپین کی یونیورسٹی میں کورس کر رہی تھی، اسپین اور مراکش آمنے سامنے ہیں، درمیان میں اٹھارہ بیس میل سمندر کی پٹی ہے، ایک دن میں نے صبح ریڈیو آن کیا تو عجیب سی اور بڑی مانوس سی آواز آرہی تھی جو دل کو جا کر لگی، دل میں اس کے لیے کشش پیدا ہوئی۔ میں نے وہ آواز سنی تو مجھے ایسے لگا کہ میرے دل میں اس آواز کی تلاش تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ اس آواز سے مجھے بہت سکون حاصل ہوا، کئی دن تک سنتی رہی، آواز بہت اچھی تھی، دل میں سکون پیدا کرتی تھی۔ لیکن یہ کس چیز کی آواز ہے؟ میں نے لوگوں سے پوچھا تو لوگوں نے بتایا یہ مراکو ریڈیو ہے اور یہ آواز مسلمانوں کی ہولی بک قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ اب میں نے اسے باقاعدگی سے سننا شروع کردیا۔ مہینہ دو مہینے تک سنتی رہی۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ اسے اسٹڈی کرنا چاہیے۔ آواز اتنی اچھی ہے تو مضمون کتنا دلکش ہوگا۔ میں نے قرآن پاک کا انگلش ترجمہ تلاش کیا۔ مجھے پکھتال کا ترجمہ مل گیا۔ مہینہ دو مہینے میں نے

قرآن پاک اسٹڈی کیا ہوگا، اس کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ یہ ترجمہ تو سیکنڈلی سورس ہے۔ قرآن پاک کو اوریجنل سورس سے اسٹڈی کرنا چاہیے۔ اس غرض سے میں نے عربی کا کورس کیا، اور قرآن کریم کو براہ راست عربی زبان میں اسٹڈی کیا تو قرآن نے مجھے مسلمان کر دیا۔

یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ کیا ہمیں بھی کبھی خیال آیا ہے کہ قرآن مجید کو اصل ماخذ سے اسٹڈی کرنا چاہیے؟ ہم تو درس سن کے خوش ہیں کہ بس کافی ہے۔ قرآن پاک آج بھی ہدایت دیتا ہے۔ بہت سے واقعات کی ایک قطار میرے ذہن میں ہے۔ ایک دو واقعات بطور مثال ذکر کیے ہیں۔ دوسرا جملہ ''للتی ھی اقوم'' کہ قرآن مجید جس راستے کی رہنمائی کرتا ہے وہ سب سے سیدھا راستہ ہے۔ آج بھی قرآن کا راستہ ہی سب سے سیدھا راستہ ہے۔ اس پر دو تین واقعات ذکر کروں گا۔

اس وقت دنیا میں معیشت، معاشیات اور معاشی بحران کے حوالے سے افراتفری ایک اہم موضوع ہے۔ آج کی معاشی صورتحال یہی ہے کہ دنیا کے کمزور ممالک پھنسے ہوئے ہیں اور طاقتور ملکوں نے پھنسایا ہوا ہے۔ ہم بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ اس پر پاپائے روم جو عیسائی دنیا کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا ہیں، گزشتہ پوپ، پوپ بینی ڈکٹ نے اپنے دور میں معاشی ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی جس کے ذمے یہ کام لگایا کہ دنیا کا معاشی نظام جیسے چل رہا ہے کہ طاقتوروں نے پھنسایا ہوا ہے اور کمزور پھنسے ہوئے ہیں، عجیب افراتفری ہے، اس میں ہمیں ویٹی کن سٹی کو کیا رائے قائم کرنی چاہیے؟ اٹلی کے معاشی ماہرین نے ریسرچ کی اور رپورٹ دی جو کہ ریکارڈ پر ہے، ویٹی کن سٹی کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ اس کا ایک جملہ نقل کرتا ہوں۔ معاشی ماہرین نے کہا کہ اس وقت جو دنیا کا معاشی بحران ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں توازن نہیں ہے، غیر متوازن سسٹم اس کی بنیاد ہے۔ اس لیے دنیا کی معیشت کو بیلنس اور توازن کے ٹریک پر لانے کے لیے ہمیں معیشت کے وہ اصول اختیار کرنا ہوں گے جو قرآن مجید بیان کرتا ہے۔

دوسری شہادت شاہ چارلس کی ہے۔ جس زمانے میں وہ شہزادہ چارلس تھے، بہت تقریریں کیا کرتے تھے۔ دنیا کے بڑے دانشوروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی ایک تقریر مجھے یاد ہے، نیویارک میں ماحولیات کے مسئلے پر کانفرنس ہوئی تھی۔ کیمیائی اثرات اور موسمی تغیرات آج کا کرنٹ ایشو ہے۔ ہوا، پانی اور مٹی کا آلودہ ہونا بہت بڑا مسئلہ ہے جس پر امریکہ

اور فرانس کی کشمکش بھی ہے۔ میں ان دنوں امریکہ میں تھا۔ وہاں کے اخبارات میں اس کی تقریر کے کچھ حصے شائع ہوئے۔ شہزادہ چارلس نے اس کانفرنس میں کہا کہ اگر پولوشن اور ماحولیات کے مسئلے سے نجات حاصل کرنی ہے اور موسمی تغیرات کو سمیٹنا ہے تو ہمیں معاشرت اور سماج کے وہ اصول اختیار کرنا ہوں گے جو قرآن پاک ہمیں دیتا ہے۔

ایک اور شہادت ذکر کرتا ہوں کہ ”ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم“ قرآن پاک سیدھے راستے کی رہنمائی آج بھی کرتا ہے۔ غیر مسلم رہنمائی لینا چاہے تو قرآن اس کی بھی رہنمائی کرتا ہے۔ ہم عموماً ثواب لینا چاہتے ہیں تو ثواب مل جاتا ہے، اور اگر ہم بھی اس سے رہنمائی لینا چاہیں گے تو وہ بھی ملے گی، لیکن فیصلہ ہم نے کرنا ہے کہ رہنمائی لینی ہے یا نہیں۔ ہم نہ لینا چاہیں تو ہماری مرضی۔

ربع صدی پہلے کی بات ہے امریکہ میں نیویارک پولیس کے ڈپٹی چیف مائیکل مسلمان ہوئے۔ وہاں پر مسلمانوں کی بڑی آبادی بروکلین کے علاقے میں ہے جہاں مکی مسجد کے نام سے ایک معروف مسجد ہے۔ میں نے مکی مسجد میں بہت دفعہ حاضری دی ہے۔ وہاں کے مسلمانوں نے مائیکل موصوف کے استقبالیہ میں رمضان میں افطار پارٹی کی۔ مائیکل سے کسی نے پوچھا کہ جناب! آپ کیوں مسلمان ہوئے ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ میں نے قرآن پاک اسٹڈی کیا اور میں نے دیکھا کہ زندگی کے عملی مسائل، سوسائٹی کے پریکٹیکل ایشوز کو جتنا نیچرلی قرآن ٹچ کرتا ہے اور کوئی نہیں کرتا۔ یعنی زندگی کے عملی مسائل کو جس طرح فطری طور پر قرآن پاک بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن پاک کھانے پینے، رہن سہن کے آداب سکھاتا ہے، پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ معاملات کیسے کرنے ہیں، اللہ کے حقوق کیا ہیں، بندوں کے حقوق کیا ہیں، حلال حرام کیا ہے، تجارت اور کاروبار کیسے کرنا ہے، ملازمت کیسے کرنی ہے، فیصلے کیسے کرنے ہیں؟ ان کی قرآن رہنمائی کرتا ہے۔ مائیکل صاحب کا کہنا ہے کہ زندگی کے عملی مسائل کو جتنا فطری انداز میں قرآن کریم بیان کرتا ہے اور کوئی نہیں کرتا، اس بات نے مجھے متاثر کیا تو میں مسلمان ہو گیا۔

بہر حال آج بھی قرآن پاک ان کی رہنمائی کر رہا ہے جو اس سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں۔ ”للتی ھی اقوم“ قرآن جس راستے کی رہنمائی کرتا ہے وہ آج بھی دنیا کا سب سے بہترین اور سب سے سیدھا راستہ ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ میں بچوں، ان کے والدین، اساتذہ اور تمام متعلقین کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کا پڑھنا ان سب کے لیے دنیا اور آخرت کی برکات، کامیابیوں خوشیوں اور سعادتوں کا ذریعہ بنائیں۔ آمین!

قومی خلفشار کے اسباب کا جائزہ لینے کی ضرورت

(چناب نگر، چنیوٹ - ۲۷ اکتوبر ۲۰۲۲ء)

۲۷ اکتوبر ۲۰۲۲ء کو بعد نماز عشاء مسلم کالونی چناب نگر میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی سالانہ ختم نبوت کانفرنس کے دوران امیر مرکزیہ حضرت مولانا حافظ ناصر الدین خاکوانی دامت برکاتہم کی زیر صدارت منعقدہ چھٹی نشست میں معروضات پیش کرنے کا موقع ملا، ان کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ ملک اس وقت سنگین خلفشار سے دوچار ہے، باہمی خلفشار، بے اعتمادی اور افراتفری نے ہر شہری کو پریشان کر رکھا ہے، اس حوالے سے چند گزارشات کرنا چاہ رہا ہوں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ احد کے موقع پر پریشان کن صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کا ذکر قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جنگ کے ابتدائی مراحل میں مسلمانوں کی فتح اور پیش قدمی کے حالات پیدا ہو گئے تھے مگر اچانک پانسہ پلٹ گیا اور وقتی پسپائی کے ساتھ بہت نقصان کا سامنا کرنا پڑا، مسلمان لشکر کچھ دیر کے لیے تتر بتر ہو گیا، افراتفری میں ستر صحابہ کرام شہید اور خود نبی کریمؐ زخمی ہو گئے۔ حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید ہونے کی خبر بھی پھیل گئی، قرآن کریم نے اس کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ”قلتم انی ھذا، قل ھو من عند انفسکم“ تم پوچھتے ہو کہ یہ کہاں سے ہوا، اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجیے کہ یہ سب تمہاری اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔

اس کی تفصیلات میں جانے کی بجائے صرف یہ عرض کروں گا کہ کسی معاملہ میں نقصان یا ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو اس کے اسباب پہلے خود اپنے ہاں تلاش کرنے چاہئیں کہ یہ ہماری کس کوتاہی کا نتیجہ ہے اور پھر اس کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ قرآن کریم کا حکم ہے اور اصلاح احوال کا صحیح راستہ ہے۔

اس وقت ہم قومی سطح پر جن مسائل سے دوچار ہیں ان میں دستور کی بالادستی، قومی

خود مختاری، معیشت پر بیرونی نگرانی، اور قانون سازی میں بیرونی دخل اندازی وہ اہم معاملات ہیں جن کی وجہ سے ہمیں اس سنگین صورتحال کا سامنا ہے اور ان کے اسباب و عوامل کا تجزیہ ہمیں اپنے قومی کردار اور اب تک کی کارکردگی کی روشنی میں کرنا ہوگا، اس کے بغیر ہم اس دلدل سے نہیں نکل سکیں گے، ان میں سے دو تین مراحل کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ہمیں اس وقت قومی معاملات میں مسلسل امریکی مداخلت کی شکایت ہے جس سے آزادی کے لیے نعرے لگ رہے ہیں اور اس کے راستے تلاش کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ہماری خارجہ پالیسی کو امریکی کیمپ میں لے جانے کی بات کی جائے تو اس کی ذمہ داری ملک کے پہلے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنی پالیسیوں کے ذریعے پوری قوم کو امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ چنانچہ جب تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے دوران دینی حلقوں نے وزارت خارجہ سے ظفر اللہ خان کی برطرفی کا مطالبہ کیا تو ذمہ دار حلقوں کی طرف سے واضح طور پر کہا گیا کہ اس سے امریکہ ناراض ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو امریکی مفادات کے دائرے میں جکڑنے کا آغاز کہاں سے ہوا تھا۔ ہمارے دانشوروں اور جامعات کو اس موضوع پر کام کرنا چاہیے کہ پاکستان کو امریکی کیمپ میں کیسے لے جایا گیا تھا اور اس کے اسباب کیا تھے اور کردار کون کون سے تھے۔

اس حوالے سے دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ امریکیوں کو یہ پیغام ہمارے سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم نے سب سے پہلے دیا تھا کہ ہمیں دوستوں کی ضرورت ہے آقاؤں کی نہیں۔ امریکی کانگریس میں صدر محمد ایوب خان کا خطاب اور "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کے عنوان سے ان کی کتاب ریکارڈ پر موجود ہے۔ مگر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم امریکیوں کے سامنے یہ دوٹوک بات کہہ دینے کے بعد بھی اسی ٹریک پر مسلسل کیوں چلے آرہے ہیں اور امریکہ کے ساتھ دوستی کو "آقائی" کے حصار سے نکالنے میں کوئی کردار کیوں ادا نہیں کر پائے؟ قرآن کریم کے ارشاد "قل ھو من عند انفسکم" کے تحت اس کا جائزہ خود ہمیں لینا ہوگا اور یہ ہماری ذمہ داری ہے۔

تیسری بات یہ کہ ہماری قومی معیشت کے بیرونی نگرانی بلکہ کنٹرول میں چلے جانے کے اسباب کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے ایک مرحلہ کی طرف اشارہ کروں گا کہ

جب پاکستان کی تقسیم کی راہ ہموار کی جا رہی تھی، مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کا عمل جاری تھا، اور اس کے بڑے اسباب میں مبینہ طور پر معاشی عدم توازن کا تذکرہ زیادہ تر ہوتا تھا، اس وقت قومی اقتصادی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین مرزا مظفر احمد (ایم ایم احمد) تھے جو مرزا غلام احمد قادیانی کے پوتے ہیں۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے چند ارکان نے مولوی فرید احمد مرحوم کی قیادت میں باقاعدہ پریس کانفرنس کر کے کہا تھا کہ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان معاشی عدم توازن اور غلط فہمیاں پھیلانے والے مرزا مظفر احمد ہیں انہیں اس منصب سے برطرف کیا جائے، مگر ایم ایم احمد کی برطرفی کی بجائے ملک کی تقسیم کو گوارا کر لیا گیا۔ یہ بھی ریسرچ کا ایک اہم موضوع ہے جس کا جائزہ لے کر ہم اپنی موجودہ زبوں حالی کے اسباب کا تعین کر سکتے ہیں۔

ایک بات یہ بھی شامل کر لیں کہ ہم قومی قانون سازی میں بیرونی اداروں کی ڈکٹیشن پر چل رہے ہیں۔ اوقاف ایکٹ، گھریلو تشدد کی روک تھام کا قانون، اسٹیٹ بینک پر بیرونی نگرانی کا قانون، اور ٹرانسجینڈر ایکٹ کے ذریعے خاندانی نظام اور معاشرتی نظم کو سبوتاژ کرنے کا قانون اس صورتحال میں اس کا نمایاں مظہر ہیں۔

اپنی پریشانیوں، ناکامیوں اور نقصانات کے اسباب کا خود جائزہ لینا اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنا فطری بات بھی ہے اور قرآن کریم کا ہمارے لیے حکم بھی ہے۔ جس کی طرف عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے اس فورم کے ذریعے قوم کے تمام طبقات، اداروں اور حلقوں کو توجہ دلاتے ہوئے آخر میں اپنے اس خدشے اور قلبی اضطراب کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ قومی خلفشار کے پیچھے مجھے وہ ملکی اور بیرونی عناصر بھی متحرک دکھائی دے رہے ہیں جو پاکستان کے دستور کے خلاف ایک عرصہ سے سرگرم عمل ہیں اور جن کا ایجنڈا دستور پاکستان کو غیر مؤثر بنا کر ملک کو سیکولر ریاست کی حیثیت دینا ہے۔ ملک کے تمام اداروں، طبقات، سیاسی جماعتوں اور دینی حلقوں کو اس پر کڑی نظر رکھنی چاہیے اور خاص طور پر تمام ریاستی اداروں کو دستور کی بالادستی اور عملداری میں اپنا کردار صحیح طور پر سرانجام دینا چاہیے ورنہ خدانخواستہ ہم غفلت اور بے پروائی کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کی تلافی نہیں کر پائیں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ نومبر ۲۰۲۲ء)

مسلم امت کا معاشرتی مزاج

(جمعیت اہلسنت والجماعت، گوجرانوالہ - ۲۵ اکتوبر ۲۰۲۲ء)

جمعیت اہلسنت والجماعت ہمارے شہر کے علماء کرام کی ایک جماعت ہے جس کے تحت ہم وقتاً فوقتاً دینی کاموں کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور اجتماعی طور پر کام کرتے ہیں۔ تعلیمی، اصلاحی، مسلکی، دعوتی اور اس کے ساتھ رفاہی کام بھی مل جل کر کرتے رہتے ہیں۔ کافی عرصے سے یہ جماعت کام کر رہی ہے، حالیہ سیلاب کا مرحلہ آیا تو ہم نے مشاورت کی کہ اس محاذ پر بھی کردار ادا کرنا چاہیے اور متحرک ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سب ساتھیوں کو جزائے خیر دے، مولانا حافظ گلزار احمد آزاد، مفتی نعمان احمد، مولانا سفیان چیمہ، مولانا جواد قاسمی، مولانا قاسم قاسمی، اور شہر کے دیگر علماء کی ایک ٹیم ہے جنہوں نے اس حوالے سے محنت کی، شہر کے لوگوں نے تعاون کیا اور اس ٹیم نے اب تک بہت سے متاثرہ علاقوں میں حسب استطاعت امدادی خدمات سرانجام دی ہیں۔

اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ اب تک جو ہم نے کیا ہے یہ تو فرسٹ ایڈ کے درجے میں ہے، اس کی حیثیت ابتدائی طبی امداد کی ہے۔ سیلاب کے متاثرین لاکھوں کی تعداد میں بے گھر اور بے سہارا ہو گئے ہیں۔ یہ مہینہ دو مہینے کی بات تھی تو گزارہ ہو گیا ہے لیکن اب مہینوں کی بات نہیں ہے بلکہ جو بے گھر ہو گئے ہیں اور ان کی ہر چیز پانی میں بہہ گئی ہے وہ غریب کیا کریں گے، ان کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ اپنا کام جاری رکھنا چاہیے اور ان افراد کو سہارا دینا چاہیے، یہ دینی خدمت ہے اور میں اس حوالے سے دو تین گزارشات کرنا چاہوں گا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کے حوالے سے اس کے دو تین پہلو ذکر کروں گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا معاشرتی تعارف یہی ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بطور پیغمبر پہلا تعارف یہ ہے کہ غار حرا میں آپؐ پر وحی آئی تھی، یہاں سے آغاز ہوا تھا، وہ وحی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات تھیں جو ہمارا پہلا سبق ہے جس کا تعلق تعلیم اور مدرسہ سے ہے۔ اس کے بعد حضور اکرمؐ کا دوسرا تعارف کیا ہے؟ چونکہ غار حرا کا سارا معاملہ اچانک اور خلاف معمول ہوا تھا اس لیے نبی کریمؐ پر گھبراہٹ طاری تھی جو کہ فطری بات ہے۔ ایسے موقع پر گھبراہٹ ہو جاتی ہے۔ حضورؐ اس عالم میں گھر گئے اور اہلیہ محترمہ کو قصہ سنایا کہ آج میرے ساتھ یہ ہوا ہے اور فرمایا کہ "خشیت علی نفسی" مجھے اپنے بارے

میں ڈر لگنے لگا ہے۔ اچانک کوئی واقعہ پیش آجائے تو ایسے خدشات لاحق ہو جاتے ہیں کہ پتا نہیں کیا ہو گا۔ فرمایا، تھوڑی دیر آرام کرتا ہوں۔ تو اماں جی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے جناب نبی کریمؐ کو یہ کہہ کر تسلی دی ”کلا واللہ لا یخزیک اللہ ابدا“ میرے سردار! آپ مت گھبرائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا معجزہ یہ گنا کرتا ہوں کہ بیوی خاوند کی صفات بیان کر رہی ہے اور تسلی دے رہی ہے کہ آپ مطمئن رہیں، اللہ کی قسم وہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ذکر کی ”انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق“ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، رشتے جوڑ کر رکھتے ہیں، بوجھ میں دبے لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں، ضرورتمندوں کو کما کر کھلاتے ہیں، مسافروں اور مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور ناگہانی آفات و حادثات میں لوگوں کے مددگار بنتے ہیں۔ اس لیے اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا تعارف ہے۔ آپؐ کا پہلا تعارف وحی ہے اور اس کے کچھ دیر بعد اسی دن کا دوسرا تعارف یہ ہے کہ جو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ کے اوصاف بیان کیے۔ وہ پانچ آیات ہیں اور یہ پانچ صفات ہیں۔ یہ اسلام کا پہلا تعارف ہے اور نبی کریمؐ کی یہ صفات دین کا خلاصہ ہے۔

اسی طرح بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق یہ جملے جو حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے حضور اکرمؐ کو تسلی دیتے ہوئے آپؐ کے خدشہ کو دور کرنے کے لیے عرض کیے تھے، بعینہ یہی جملے ایک کافر سردار نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہے۔ جب مکہ مکرمہ میں مظالم کی انتہا ہو گئی اور بہت سے لوگ حبشہ ہجرت کر کے چلے گئے، حضرت صدیق اکبرؓ بھی متاثرین میں سے تھے، کافر بہت تنگ کرتے تھے، طعنے دیتے تھے، انہوں نے گھر کے صحن میں مسجد بنانا چاہی تو کافروں نے نہیں بنانے دی، بہت کچھ ہوا۔ بالآخر آدمی کہاں تک برداشت کرے، چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جناب نبی اکرمؐ سے اجازت چاہی کہ حضرت اگر اجازت ہو میں بھی کہیں جا کر سر چھپا لوں؟ حضورؐ نے اجازت دے دی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ انہوں نے سامان وغیرہ تیار کیا اور ہجرت کے قصد سے گھر سے نکل گئے۔ ایک دن کا سفر کر لیا تھا کہ راستے میں ایک کافر سردار ابن الدغنہ ملا، اس نے حضرت صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس نے پوچھا کیوں؟ تو بتایا کہ مکہ کے لوگ عبادت نہیں کرنے دیتے، اللہ کا نام نہیں لینے

دیتے، میں بے بس ہو گیا ہوں اور شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو تو آپ نے فرمایا کہ جہاں کہیں جگہ مل گئی چلا جاؤں گا۔ اس پر ابن الدغنہ نے کہا نہیں، تیرے جیسے آدمی شہر چھوڑ کر نہیں جاتے اور تیرے جیسے آدمیوں کو شہر چھوڑنے پر مجبور بھی نہیں کیا جاتا۔ ”انک لتصل الرحم وتحمل الکل الکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق“ وہی جملے جو حضرت خدیجہؓ نے حضور نبی کریمؐ سے کہے تھے، وہی جملے ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہے اور کہا میں آپ کو نہیں جانے دوں گا، آپ میری ضمانت پر واپس چلیں، مکہ والوں سے میں بات کروں گا۔ وہ حضرت صدیق اکبرؓ کو لے کر مکہ واپس آ گیا اور ان سے کہا کہ آپ گھر جائیں میں مکہ کے سرداروں سے بات کرتا ہوں۔

چنانچہ ابن الدغنہ نے چوہدریوں اور وڈیروں سے مل کر کہا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ ابوبکرؓ جیسے آدمی کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر رہے ہو تو تمہارے پاس رہ کیا جائے گا؟ ابوبکرؓ جیسے لوگ شہر چھوڑ جائیں تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟ وہ تو خدمت گزار آدمی ہے، لوگوں کی خدمت کرتا ہے، مجبوروں کے کام آتا ہے، ان کے لیے محنت کرتا ہے، ابوبکر آج کے بعد میری گارنٹی پر ہو گا۔ اس پر قریش کے سرداروں نے کہا کہ ہم تمہاری بات تسلیم کرتے ہیں اور تمہاری گارنٹی رد نہیں کرتے لیکن ایک شرط پر، یہ شرط ابوبکر سے منوالو کہ اس نے جو کچھ کرنا ہے گھر کے اندر کرے، گھر سے باہر نہ کرے۔ ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے بات کی۔ چونکہ آپ اس کی گارنٹی پر واپس آ چکے تھے اس لیے کہا ٹھیک ہے۔ چند دن گزرے، حضرت صدیق اکبرؓ گھر کی چار دیواری کے اندر کیسے بند رہ سکتے تھے؟ سوچا کہ اگر میں نے لوگوں کو دعوت نہیں دینی اور دین کا کام کھلے طور پر نہیں کرتا تو پھر میں کیا کروں گا؟ چنانچہ ابن الدغنہ کے گھر گئے اور اسے کہا کہ میں تمہاری پناہ واپس کرتا ہوں، میں چار دیواری کے اندر بند نہیں رہ سکتا، امن وسلامتی کے ساتھ کام کروں گا لیکن کھلے طور پر کروں گا۔ اور پھر حرم میں جا کر اعلان کیا کہ میں نے ابن الدغنہ کی گارنٹی واپس کر دی ہے، اب ابن الدغنہ میری کسی بات کا ذمہ دار نہیں ہے۔

یہ واقعہ اس حوالے سے ذکر کیا ہے کہ جو تعارف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہؓ نے کرایا تھا وہی تعارف حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ابن الدغنہ نے کرایا۔ میں اس کی تعبیر یوں کرتا ہوں کہ جو مزاج نبوت کا تھا وہی مزاج خلافت کا تھا۔ نبوت کی اساس بھی یہی ہے اور خلافت کی اساس بھی یہی ہے۔ ہماری تو بنیاد یہی ہے جسے ہم بھول گئے ہیں۔ ”انک

لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق'' یہ ہم میں سے ہر ایک کا سبق ہے جو ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرحلہ یہ بھی پیش آیا جب سینکڑوں کی تعداد میں بلکہ بعد میں ہزاروں لوگ ایسے تھے جو ہجرت کر کے یثرب چلے آئے تھے۔ حضور اکرمؐ وہاں ٹھکانہ کر کے بیٹھ گئے، مختلف اطراف سے ٹولیاں آ رہی تھیں، لوگ گھربار چھوڑ کر آ رہے تھے، بے گھر اور بے وسیلہ ہو کر آ رہے تھے، بلکہ حضورؐ نے مسلمانوں سے خود کہا تھا کہ مدینہ میں آ جاؤ۔ انصار مدینہ نے جس شوق اور جذبے سے ان کی مدد کی اور ان کو سنبھالا دیا وہ کمال ہے۔ قرآن کریم نے انصار مدینہ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے ''یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ''۔ انصار نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا کہ آئیے جناب! یہ آپ کے گھر ہیں ان کو سنبھالیے۔ مہاجرین صحابہ کو سنبھالنے کے لیے نبی کریمؐ نے کیا ہی خوبصورت نظام دیا۔

مدینہ اس وقت کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ جو آج مسجد نبوی کی چار دیواری ہے، حضورؐ کے زمانے کا سارا مدینہ اس کے اندر ہے۔ سینکڑوں لوگ ہجرت کر کے آ گئے تو نبی اکرمؐ نے یہ خوبصورت طریقہ اختیار کیا کہ ایک مہاجر فرد یا خاندان کو ایک انصاری خاندان کے حوالے کر دیا اور مواخات فرما دی کہ یہ تمہارا بھائی ہے اسے سنبھالو۔ ایک گھر کے لیے ایک دو آدمیوں کو سنبھالنا آسان ہوتا ہے۔ اجتماعی نظم کا موقع نہیں تھا کہ الگ محلہ بناتے، الگ کالونی بساتے، الگ کیمپ لگواتے۔ حضورؐ نے یہ کام نہیں کیا بلکہ ایک مہاجر کو ایک انصاری کے حوالے کر دیا کہ یہ تمہارا بھائی ہے، اس کو سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے گھر کے صحن میں بیٹھ کر یہ تقسیم فرمائی کہ یہ تمہارا بھائی ہے اور یہ تمہارا بھائی ہے۔ جب آپؐ نے مواخات فرما دی تو انصار بھائیوں نے کمال کر دیا۔ ایک واقعہ عرض کر دیتا ہوں، ایک طرف سے ایثار اور دوسری طرف سے بے نیازی کی حد دیکھیں۔

بخاری شریف کی روایت ہے، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ مجھے حضورؐ نے ایک انصاری صحابی حضرت سعدؓ کا بھائی بنایا کہ ان کو لے جاؤ یہ تمہارے ذمے ہیں۔ اب ان کا ایثار کا جذبہ دیکھیے اور حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کی بے نیازی دیکھیے۔ یہ دونوں جذبے مل کر کام کرتے ہیں کہ ایک طرف سے ایثار ہو اور دوسری طرف سے بے نیازی ہو،

یہ ہماری معاشرتی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ حضرت سعدؓ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو گھر لے گئے اور ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو میرا بھائی کہا ہے اور میرے حوالے کیا ہے۔ اس لیے یہ میرا گھر آج کے بعد آدھا آپ کا ہے اور آدھا میرا ہے۔ یہاں تک فرمایا کہ یہ میری دو بیویاں ہیں جس کو آپ کہتے ہیں میں طلاق دیتا ہوں آپ اس سے نکاح کر لیں۔ ادھر سے ایثار کی یہ انتہا ہے اور ادھر سے بے نیازی دیکھیں کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا کہ بھائی، مجھے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا گھر، اثاثے، غلہ اور بیویاں سب چیزیں آپ کو مبارک ہوں۔ مجھے صرف رات کو سونے کے لیے جگہ چاہیے، اور کہا کہ میں بیوپاری آدمی ہوں، دن کو کام کرنے کے لیے بازار میں جگہ چاہیے۔ اس کو آج کل تہہ بازاری کہتے ہیں کہ کہیں جگہ مل جائے تو میں کھڑا ہو کر سودا وغیرہ بیچ کر اپنا گزارا کر لوں گا۔ ان انصاری صحابی نے کہا ٹھیک ہے، یہ آپ کا گھر ہے، رات کو یہاں آرام کریں۔ اور صبح بنو قینقاع کے بازار میں گئے اور کسی جاننے والے سے بات کی۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں سب سے مالدار یہودیوں کا قبیلہ بنو قینقاع تھا جو کہ سنار تھے، صرافہ کا کام کرتے تھے۔ وہاں صرافہ بازار میں ایک جگہ کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کاروباری آدمی تھے، انہوں نے وہاں چیزیں لانا اور بیچنا شروع کر دیں، میں تفصیلات میں نہیں جاتا، صرف یہ بتاتا ہوں کہ اس بے نیازی کی برکت کیا ہوئی؟

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کافی عرصہ حیات رہے، جب ان کا انتقال ہوا تو چار بیویاں تھیں۔ بیویوں کو اولاد کی صورت میں وراثت میں آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ آٹھواں حصہ چار پر تقسیم ہو گا تو ایک بیوی کا بتیسواں حصہ بنے گا۔ پندرہ بیس سال پہلے بخاری شریف کی یہ روایت پڑھ رہا تھا تو میں نے طلباء سے کہا کہ صرافہ بازار جاؤ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی جائیداد کا حساب لگاؤ کہ مارکیٹ میں یہ رقم کتنی مالیت کی بنتی ہے۔ ایک بیوی کے حصے کا اندازہ اس دور میں اسی ہزار کے لگ بھگ بتایا گیا تھا۔ اللہ تعالی بے نیازی پر جو برکتیں دیتے ہیں کسی چیز پر نہیں دیتے۔

بہرحال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات قائم کی تو سارے مہاجرین سنبھالے گئے۔ مسلم سوسائٹی کا یہ مزاج ہے، اس پر ایک اور واقعہ عرض کر دیتا ہوں۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر عید الاضحی کی نماز پڑھائی اور خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے لوگوں پر یہ پابندی لگا دی کہ کسی نے تین دن سے زیادہ گوشت ذخیرہ نہیں کرنا۔ گوشت کھاؤ یا کھلاؤ، تین دن کے بعد کسی کے گھر میں گوشت نہ ہو۔ ذخیرہ کرنے کے لیے آج کے دور میں تو فریزر ہیں، اس زمانے میں وہ نمک وغیرہ لگا کر خشک کر لیتے تھے اور سال بھر استعمال کرتے تھے۔ نبی کریمؐ نے اعلان فرمادیا کہ تین دن کے اندر اندر کھاؤ یا کھلاؤ، چوتھے دن کسی کے گھر میں گوشت کی بوٹی نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ لوگوں نے اس ارشاد پر عمل کیا۔ جب اگلا سال آیا تو حضورؐ عید کی نماز پڑھا کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا یا رسول اللہ، آپ نے پچھلے سال گوشت ذخیرہ کرنے کی پابندی لگائی تھی وہ پابندی اب بھی ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں وہ پابندی صرف پچھلے سال کے لیے تھی، ''کلوا واطعموا وادخروا'' اب کھاؤ، کھلاؤ اور ذخیرہ کرو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

پچھلے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کی پابندی لگائی تھی اس کی وجہ آپؐ نے خود بیان فرمائی کہ اس وقت یہاں کچھ قبائل ہجرت کر کے آئے تھے جو بے سہارا تھے تو میں نے سوچا کہ کم از کم یہ تو ہو کہ گوشت ذخیرہ کرنے کی بجائے ان کو کھلا دیں، ان کی خاطر پابندی لگائی تھی تاکہ ان کی ضروریات پوری ہوں۔ اب وہ صورتحال نہیں ہے اس لیے پابندی باقی نہیں ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے کہ ایسی اسلامی شریعت کے نفاذ کی سعادت ہمیں مل جائے تو اسلامی ریاست پابندیاں بھی لگا سکتی ہے کہ یہ کرنا ہے اور وہ نہیں کرنا۔ میں نے یہ دو تین حوالے اس لیے دیے ہیں کہ اس حوالے سے سنت نبوی کیا ہے اور مسلم سوسائٹی کا مزاج کیا ہے۔ سنت نبویؐ یہ ہے کہ اپنے بھائیوں کی صرف مدد کرنا کافی نہیں ہے بلکہ انہیں سنبھالنا اور ایڈجسٹ کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمیں بھی بے سہارا، ضرورتمند اور بے وسیلہ لوگوں کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو لوگ بے وسیلہ ہوں یا کسی حادثے میں بے سہارا ہو جائیں تو ان کی مدد کرنا اور انہیں سنبھالنا اسلامی معاشرے کا مزاج اور سنت نبویؐ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم صحیح طریقے سے اپنی یہ ذمہ داری پوری کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

معاشرہ کے ضرورت مندوں کی خبرگیری

(جامع مسجد، گارڈن ٹاؤن، گوجرانوالہ - ۲۱ اکتوبر ۲۰۲۲ء)

۲۱ اکتوبر کو بعد نماز مغرب جامع مسجد گارڈن ٹاؤن گوجرانوالہ میں درس قرآن کریم کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج کا یہ پروگرام جمعیۃ اہل السنۃ والجماعۃ گوجرانوالہ کی طرف سے درس قرآن کریم کے عنوان سے ہے جبکہ اس کے اشتہار میں سیلاب زدگان کی امداد اور بحالی کے لیے جمعیت اہل سنت کی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہے اس لیے اس حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کروں گا کہ جب معاشرہ میں کچھ لوگ کسی اجتماعی آزمائش کا شکار ہو کر بے سہارا ہو جائیں اور ان کو زندگی کا نظام قائم رکھنے کے لیے امداد و تعاون کی ضرورت پڑ جائے تو ملک کے دیگر شہریوں کو کیا کرنا چاہیے اور ان کی کیا ذمہ داری بنتی ہے؟

اس سلسلہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک بار عید الاضحی کے خطبہ میں نبی کریمؐ نے قربانی کرنے والوں پر یہ پابندی لگا دی کہ تین دن کے بعد کسی کے گھر میں گوشت موجود نہیں رہنا چاہیے، مقصد یہ تھا کہ اپنے لیے ذخیرہ کرنے کی بجائے لوگوں کو کھلا دیں۔ صحابہ کرامؓ نے اس ہدایت پر عمل کیا اور تین دن میں گوشت ختم کر دیا۔ اگلے سال عید الاضحی کے موقع پر خطبہ کے دوران کسی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا پچھلے سال والی پابندی قائم ہے یا ختم ہو گئی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ پابندی صرف گزشتہ سال کے لیے تھی اب وہ باقی نہیں ہے اس لیے گوشت کھانے اور کھلانے کے ساتھ ذخیرہ بھی کر سکتے ہو۔ پھر آپؐ نے گزشتہ سال والی پابندی کی وجہ بیان فرمائی کہ مدینہ منورہ میں کچھ خاندان مہاجرین کے آکر آباد ہوئے تھے جو ضرورت مند تھے اس لیے ان کی وجہ سے میں نے پابندی لگا دی تھی کہ ذخیرہ کرنے کی بجائے گوشت ان کو کھلاؤ تاکہ وہ محروم نہ رہیں۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ بھی روایت کا حصہ ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے گزشتہ سال پابندی کا یہ حکم خود سنا تھا جبکہ اگلے سال پابندی ختم ہونے کے اعلان کے وقت وہ موجود نہیں تھے بلکہ سفر پر تھے جس کی وجہ سے وہ پابندی ختم ہونے کا اعلان نہیں سن سکے تھے۔ چند روز کے بعد سفر سے واپس آئے تو گھر والوں نے گوشت پکا رکھا تھا، پوچھنے پر بتایا کہ قربانی کا گوشت بچا رکھا تھا وہ پکایا ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے کہا کہ اس

پر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پابندی لگا دی تھی جو میں نے خود سنی تھی، اس لیے میں یہ کھانا نہیں کھاؤں گا۔ گھر والوں نے پابندی ختم ہو جانے کا بتایا تو فرمایا کہ میں اس کی تصدیق کروں گا۔ چنانچہ جب تسلی ہو گئی تب کھانا کھایا۔

یہاں ایک بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ شرعی احکام و مسائل میں فقہی اختلافات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک صحابیؓ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات سنی اور اس عمل کو اختیار کر لیا، بعد میں حضورؐ نے وہ حکم تبدیل فرما دیا تو وہ صحابیؓ اس کے بارے میں نہ جان سکے اس لیے وہ اسی سابقہ عمل پر قائم رہے، جبکہ جن حضرات نے دوسرا حکم سنا وہ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس طرح ایک مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کا عمل مختلف ہو گیا اور فقہی اختلاف کی وجہ بن گیا۔

دوسری بات یہ کہ معاشرہ میں اگر کچھ ضرورت مند افراد اپنی ضروریات خود پوری نہیں کر سکتے تو باقی لوگوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ انہیں ضروریات کی فراہمی کا اہتمام کریں، بلکہ حکومت کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ضرورت مند لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے باقی لوگوں کو ہدایت کرے، اور وہ اس کے لیے شہریوں پر ضرورت کے مطابق پابندی لگانے کا حق بھی رکھتی ہے۔ البتہ اس کے لیے حکومتی اقدامات کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے بلکہ لوگوں کو از خود اس کا اہتمام کرنا چاہیے جیسا کہ حالیہ طوفانی بارشوں اور سیلاب سے بے گھر اور بے سہارا ہو جانے والوں کے لیے ملک بھر کے دینی و رفاہی اداروں نے رضا کارانہ خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کی طرف بھی توجہ رہنی چاہیے کہ اب تک سیلاب زدگان کی امداد اور بحالی کے لیے جو کام ہوا ہے وہ بہت خوش آئند ہے مگر اس کی حیثیت وقتی امداد اور فرسٹ ایڈ کی ہے جبکہ بحالی کا اصل کام ابھی باقی ہے اور وہ چند دن کی بات نہیں ہے بلکہ اس میں کافی عرصہ لگ جائے گا جس کے لیے سرکاری اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کو اس کے لیے مسلسل اور مربوط محنت کرنا ہو گی۔

اس قسم کی اجتماعی آزمائشوں میں ایک دوسرے کا سہارا بننے کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد گرامی بھی ذکر کرنا چاہوں گا کہ یمن سے آکر مدینہ منورہ میں آباد ہونے والے اشعری قوم کے خاندانوں کی نبی اکرمؐ نے مختلف حوالوں سے تعریف کی ہے۔ ایک تو یہ کہ اشعری حضرات کو فقہاء اور قراء کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کہ یہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، جبکہ ان میں سے حضرت ابو موسی اشعریؓ قرآن کریم کے بڑے قاریوں میں

سے تھے جن کی خود حضورؐ نے بھی تعریف فرمائی ہے۔ ایک بار حضرت ابو موسی اشعریؓ سے قرآن کریم کی تلاوت سن کر آپؐ نے فرمایا کہ ابو موسی! تجھے تو اللہ تعالی نے لحن داؤدی عطا فرمادیا ہے۔ اس خاندان کی ایک اور بات کی بھی نبی کریمؐ نے تعریف فرمائی کہ یہ جب کسی اجتماعی آزمائش کا شکار ہوتے ہیں کہ اور ضروریات زندگی کی کمی کا مسئلہ ہو جاتا ہے تو سب اشعری اپنے اثاثے اکٹھے کر کے آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں جس سے ضروریات بھی کسی حد تک پوری ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے پر برتری کا ماحول بھی نہیں بنتا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اشعریوں کی یہ عادت اچھی لگتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کے کچھ لوگ ضرورت منداور بے سہارا ہو جائیں تو نارمل زندگی گزارنے اور سہولیات سے بہرہ ور لوگوں کو چاہیے کہ وہ انہیں اپنے ساتھ شریک کریں اور مل جل کر ایک دوسرے کی ضروریات پوری کریں۔

قرآن کریم نے ضرورت مندوں کی مدد کرنے کو ان کا حق بتایا ہے، ایک جگہ فرمایا کہ ”وفی اموالھم حق للسائل والمحروم“ مالداروں کے مال میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے۔ سائل اس ضرورت مند کو کہتے ہیں جو اپنی ضرورت کا اظہار کر کے سوال کرتا ہے، جبکہ محروم اس شخص کو کہا گیا ہے جو ضرورت مند تو ہے مگر اپنی ضرورت کا اظہار کر کے کسی سے سوال نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا ”وات ذا القربی حقہ والمسکین وابن السبیل“ یتیموں اور قریبی رشتہ داروں اور مسافروں کو ان کا حق دو۔ گویا یہ ان کا حق ہے اور جب اس عمل کے اجر و ثواب کا اللہ تعالی نے اپنی طرف سے وعدہ کیا ہے تو یہ ان پر کوئی احسان بھی نہیں ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو متاثرہ، بے سہارا، ضرورت منداور مستحق افراد کی امداد اور بحالی کے لیے اپنے اپنے دائرہ میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

اسوۂ نبویؐ اور رفاہی ریاست

(مرکزی جامع مسجد محمدیہ، قلعہ دیدار سنگھ، گوجرانوالہ - ۳۰ ستمبر ۲۰۲۲ء)

جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ کی دعوت پر تیس ستمبر کو قلعہ دیدار سنگھ کی مرکزی جامع مسجد محمدیہ میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کا موقع ملا جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد و الصلوٰۃ! میرے لیے سعادت کی بات ہے کہ اس دینی اور علمی مرکز میں ایک دفعہ پھر حاضری کا موقع ملا۔ وقتاً فوقتاً یہاں حاضر ہوتا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حاضری قبول فرمائیں اور مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں۔ میں اس حاضری کی دعوت پر مولانا قاضی عطاء المحسن کا شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ میں نے ان کے ساتھ مشورے سے ہی اس موضوع کا انتخاب کیا ہے کہ جناب نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ کے ہزاروں پہلوؤں میں سے ایک پہلو آج دنیا میں بہت ڈسکس ہو رہا ہے کہ رفاہی ریاست کیا ہوتی ہے اور جناب نبی کریمؐ نے اس کا کیا ماڈل پیش کیا ہے؟ جسے ویلفیئر اسٹیٹ اور فلاحی حکومت و ریاست کہا جاتا ہے وہ کیا ہے اور جناب نبی کریم نے اس کے بارے میں کیا ہدایات دی ہیں؟ اس پر چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

پہلے یہ دیکھیں کہ ریاست اور رفاہی ریاست میں کیا فرق ہوتا ہے؟ کسی بھی ملک کی حکومت اور ریاست کے تین چار بنیادی کام سمجھے جاتے ہیں: (۱) سرحدوں کی حفاظت (۲) ملک میں امن قائم کرنا (۳) ظلم زیادتی ہو تو انصاف فراہم کرنا (۴) لوگوں کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکنا (۵) اور لوگوں کو زندگی کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ فراہم کرنا۔ یہ ریاست کا بنیادی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کسی ریاست کی بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کرے تاکہ کوئی باہر سے حملہ نہ کرے، ملک کے اندر امن ہو بدامنی نہ ہو، ظلم و زیادتی اور فساد نہ ہو، لوگ ایک دوسرے پر ظلم زیادتی کریں تو مظلوم کو انصاف فراہم کیا جائے اور ظالم کو اس کے جرم کی سزا ملے جو کہ عدلیہ کا کام ہوتا ہے، ملک کی حدود میں رہنے والوں کو زندگی کی سہولیات آسانی سے فراہم ہوتی رہیں اور ان سہولیات کو حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ یہ ریاست کا عام تصور ہے۔

ویلفیئر اسٹیٹ اور رفاہی ریاست کا دائرہ اس سے آگے ہے۔ ایک رفاہی ریاست اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دیتی ہے۔ ایک ہے سہولیات فراہم کرنا کہ لوگوں کو کوئی چیز حاصل کرنے میں دقت نہ ہو اور ایک یہ ہے کہ حکومت خود ذمہ داری اٹھائے کہ یہ سہولیات ہم فراہم کریں گے۔ گورنمنٹ اور ریاست لوگوں کی بنیادی ضروریات کی گارنٹی دے اور ذمہ داری اٹھائے کہ ہم فراہم کریں گے، یہ رفاہی ریاست ہوتی ہے جسے ویلفیئر اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ دنیا میں آج بہت سی ویلفیئر اسٹیٹس موجود ہیں۔

جب پاکستان قائم ہوا تو قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے بھی اس کے لیے ”اسلامی فلاحی ریاست“ کی اصطلاح استعمال کی تھی، اللہ کرے کہ پاکستان ایسی ریاست بن جائے۔

اس حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ کیا ہے؟ اس کو دو تین دائروں میں عرض کروں گا:

پہلی بات یہ کہ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریمؐ کا ایک عرصہ یہ معمول رہا کہ کسی مسلمان کا جنازہ پڑھانے کے لیے تشریف لاتے تو پہلے پوچھتے کہ اس میت پر کسی کا قرضہ تو نہیں ہے؟ اگر جواب ملتا کہ نہیں! تو آپ جنازہ پڑھا دیتے۔ اگر جواب ملتا کہ یہ مقروض فوت ہوا ہے تو آپ کا دوسرا سوال یہ ہوتا تھا کہ کیا اس کے ترکے میں قرضے کی ادائیگی کا بندوبست موجود ہے؟ یعنی اتنا کچھ چھوڑ گیا ہے کہ قرضہ ادا ہو جائے گا؟ اگر جواب اثبات میں ملتا تو آپ جنازہ پڑھا دیتے۔ لیکن اگر جواب یہ ملتا کہ یہ مقروض فوت ہوا ہے اور اس کے ترکے میں قرضے کی ادائیگی کا بندوبست موجود نہیں ہے تو آپ اس کا جنازہ نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ فرماتے ”صلوا علی صاحبکم“ کہ تم اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھو۔ خود حضورؐ تشریف لے جاتے اور جنازہ نہ پڑھتے۔

ایک موقع پر ایک مسلمان فوت ہوا، حضورؐ جنازہ کے لیے تشریف لائے، معمول کے مطابق سوال کیا کہ اس پر قرضہ تو نہیں ہے؟ جواب ملا کہ قرضہ ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کتنا قرضہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اتنا۔ آپ نے پوچھا کہ کیا اس کے ترکے میں قرض کی ادائیگی کا بندوبست ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں! تو آپ نے فرمایا ”صلوا علی صاحبکم“ تم جنازہ پڑھو، میں جا رہا ہوں۔ حضرت ابو قتادہؓ معروف صحابی ہیں، فوت ہونے والا ان کا دوست تھا۔ وہ کھڑے ہوئے کہ یا رسول اللہ! مہربانی فرمائیں جنازہ پڑھا دیں، اس کا قرضہ میرے ذمے رہا۔ کیونکہ کسی مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر محرومی کیا ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اور جنازہ نہیں پڑھ رہے۔ کیا اس سے زیادہ محرومی کا تصور بھی ہو سکتا ہے؟ چنانچہ نبی کریمؐ نے ان کا جنازہ پڑھا دیا اور جنازے کے بعد یہ اعلان فرمایا کہ ”من ترک مالا فلورثتہ“ تم میں سے جو آدمی مال اور ترکہ چھوڑ کر فوت ہو تو وہ ترکہ اس کے وارثوں کو ملے گا، ہم اس کو نہیں چھیڑیں گے، لیکن ”من ترک کلا او ضیاعا“ جو آدمی قرضہ چھوڑ کر مرا اور ضائع ہونے والے بچے چھوڑ کر مرا جن کا کوئی سہارا نہیں ہے ”فالی

وعلی'' تو وہ میرے پاس آئیں گے اور میرے ذمے ہوں گے۔ اس بے سہارا خاندان کو سنبھالنا ہمارے ذمہ ہوگا۔

تاریخ میں یہ بات تو آپ کو ہر جگہ ملے گی کہ کسی اچھے آدمی کے پاس جائیں کہ میری ضرورت پوری کر دو تو وہ کر دیتا ہے۔ ''الی'' کی بات تو ہمیشہ سے ہوتی آرہی ہے، لیکن 'علی'' کہ وہ میرے ذمہ ہوں گے یہ بات تاریخ میں غالباً سب سے پہلے جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمائی ہے۔ یہ گارنٹی کہ جو بے سہارا اور مقروض ہے اور کوئی بندوبست نہیں ہے اس کی ضروریات میرے ذمہ ہیں۔ میرے ذمے سے مراد ریاست کے ذمہ ہونا۔ جناب نبی کریمؐ نے یہ اعلان مبارک فرمایا اور پھر اس کا ماحول بھی بنایا۔ اس ماحول کے حوالے سے دو تین واقعات عرض کرنا چاہوں گا کہ آنحضرتؐ نے کیسا ماحول بنایا۔ بیت المال کا تصور یہ قائم ہوا کہ جس کسی کو کسی حوالے سے کسی چیز کی ضرورت پڑی اور وہ چیز نہیں مل رہی تو وہ سیدھا حضورؐ کے پاس آتا تھا اور آپ کے ہاں سے اسے وہ چیز مل جاتی تھی۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک صاحب سفر کر رہے تھے، راستے میں ان کا سواری کا اونٹ مر گیا، سفر لمبا تھا۔ ان صاحب کو پتا تھا کہ اب سواری کہاں سے ملے گی۔ وہ سیدھا مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں سفر پر جا رہا ہوں، سفر لمبا ہے اور سواری مر گئی ہے، لہٰذا مجھے سواری عنایت فرمائیں۔ حضورؐ اس وقت خوش طبعی کے موڈ میں تھے۔ حضورؐ خود بھی خوش طبعی فرمایا کرتے تھے اور لوگ بھی حضورؐ کے ساتھ خوش طبعی کیا کرتے تھے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ آنحضرتؐ خوش مزاج بزرگ تھے۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ آدمی سواری مانگ رہا ہے اور حضورؐ فرما رہے ہیں کہ تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ پریشان ہو کر بیٹھ گیا کہ اونٹنی کے بچے کو میں کیا کروں گا۔ میں نے تو سفر کرنا ہے۔ اونٹنی کا بچہ مجھے اٹھائے گا یا میں اسے اٹھاؤں گا۔ وہ پریشان بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر عرض کیا تو حضورؐ نے فرمایا ٹھہرو تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ بیچارہ پھر پریشانی کے عالم میں بیٹھ گیا۔ وہ جس کیفیت میں بیٹھا ہوگا آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ وہ بیٹھ کر سوچ رہا تھا کہ اونٹنی کے بچے کو میں کیا کروں گا۔ تھوڑی دیر گزری کہ حضورؐ نے بیت المال سے یا کہیں سے اونٹ منگوایا اور اس کی مہار اس آدمی کو پکڑائی اور فرمایا یہ بھی کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہے۔

جو بات میں نے عرض کی وہ یہ ہے کہ ایک آدمی کی سواری ختم ہو گئی ہے اور سفر پر جانا ہے تو اسے یہ پتا ہے سواری کہاں سے ملے گی اور پھر اسے آپؐ کے ہاں سے سواری مل گئی۔ یہ حضورؐ نے اس کا عملی کا ماحول بنایا۔
ایک اور واقعہ عرض کر دیتا وہ بھی اسی طرح کا دلچسپ واقعہ ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے۔ حضرت ابو موسی اشعریؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کے کچھ لوگوں نے سفر پر جانا تھا اور سواریاں نہیں تھیں، مشورہ ہوا کہ جناب نبی کریمؐ سے عرض کیا جائے کہ تین چار اونٹ چاہئیں۔ تین چار اونٹ کوئی کم قیمت کا مال نہیں تھا۔ اس دور کا اونٹ آج کے زمانے کی پجارو سمجھیں۔ مشورہ ہوا اور حضرت ابو موسی اشعریؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
مجلس کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مجلس کا ماحول دیکھا جائے، سوال کا ماحول ہو تو سوال کیا جائے ورنہ انتظار کیا جائے، جا کر سیدھی اپنی بات نہیں کر دینی چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر کسی وجہ سے غصے میں تھے۔ حضرت ابو موسی نے جا کر سیدھا ہی سوال کر دیا کہ یا رسول اللہ! ہم نے سفر پر جانا ہے اور تین چار اونٹ چاہئیں۔ حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ میرے پاس اونٹ نہیں ہیں۔ انہوں نے دوبارہ سوال کیا تو حضورؐ نے پھر فرمایا کہ نہیں ہیں۔ تیسری مرتبہ سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا "واللہ لا احملکم شیئا"۔ خدا کی قسم! تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا۔ حضرت ابو موسیؓ کہتے ہیں کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ غلطی مجھ سے ہوئی ہے کہ میں نے مجلس کا ماحول نہیں دیکھا، حضورؐ کا موڈ نہیں دیکھا اور سیدھا ہی سوال کر دیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا لہذا وہ واپس چلے گئے کیونکہ حضورؐ نے انکار فرما دیا تھا اور صرف انکار نہیں فرمایا، بلکہ سواری نہ دینے کی قسم اٹھا لی تھی۔ حضرت ابو موسی نے گھر جا کر رپورٹ دی کہ یوں معاملہ ہوا، غلطی میری تھی لیکن یہ ہو گیا ہے کہ حضورؐ نے انکار فرما دیا ہے اور سواری نہ دینے کی قسم اٹھا لی ہے۔ آپ اپنے خاندان والوں کو ابھی یہ بات بتا ہی رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ان کو آواز دی عبداللہ! حضرت ابو موسیؓ کا نام عبداللہ بن قیسؓ تھا کہ رسول اللہ تمہیں بلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں واپس گیا تو اونٹوں کی دو جوڑیاں کھڑی تھیں، حضورؐ نے فرمایا یہ لے جاؤ۔
حضرت ابو موسیؓ کہتے ہیں کہ دوسری غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ میں نے حضورؐ سے قسم کے بارے میں بات ہی نہیں کی، اونٹوں کی لگام پکڑی اور لے کر چلا گیا۔ راستے میں مجھے خیال

آیا کہ یہ میں نے کیا کیا۔ حضورؐ نے تو فرمایا تھا کہ تمہیں سواری نہیں دوں گا اور آپ نے قسم اٹھالی تھی۔ اس قسم کے بارے میں حضورؐ سے کیوں نہیں پوچھا اور ایسے ہی سواریاں لے کر چل پڑا۔ حضورؐ سے پوچھ تو لینا تھا لہذا میں واپس حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے تو فرمایا تھا کہ تمہیں سواری نہیں دوں گا اور آپ نے قسم اٹھالی تھی۔ آپ نے فرمایا ہاں قسم اٹھائی تھی۔ انہوں نے عرض کیا کہ پھر آپ نے کیوں دے دیے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس اونٹ نہیں تھے۔ یہ میں نے قیس بن سعدؓ کے باڑے سے تمہارے لیے منگوائے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے قسم اٹھالی تھی کہ تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا، لیکن میرا معمول یہ ہے کہ کوئی قسم اٹھالوں اور پھر دیکھوں کہ قسم کسی خیر کے کام میں رکاوٹ بن رہی ہے تو میں قسم توڑ دیتا ہوں، خیر کے کام کو نہیں چھوڑتا اور قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں۔ جناب نبی کریمؐ نے امت کو حکم بھی یہی فرمایا ہے اور خود آپ کا معمول بھی یہی تھا۔ بہرحال حضرت ابوموسیٰؓ کے خاندان کو سواری کے لیے حضورؐ کے ہاں سے اونٹ مل گئے۔

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ جس کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی اس کی ضرورت بیت المال پوری کرے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اس کا یہ ماحول تھا۔

تیسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ معروف صحابی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عید الاضحی سے دو تین دن پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بیت المال سے بکریوں کا ایک ریوڑ دیا۔ چالیس پچاس بکریاں ہوں گی اور فرمایا کہ ابھی دو تین دن بعد قربانی والی عید آ رہی ہے، یہ بکریاں لوگوں میں تقسیم کر دو تاکہ لوگ ان کی قربانی کر لیں۔ حضرت عقبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے وہ بکریاں لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک بکری کا بچہ بچ گیا۔ میں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے بکریاں تقسیم کر دی ہیں اور میرے حصے میں یہ بکری کا بچہ بچا ہے جس کی عمر پوری نہیں ہے تو کیا میں اس کی قربانی کر لوں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں تم کر لو۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قربانی تو لوگوں پر واجب تھی مگر بکریاں بیت المال دے رہا ہے۔ حضورؐ نے ”فالی وعلی“ کا یہ ماحول بنایا کہ جس کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی اس کی ضرورت بیت المال پوری کرے گا۔ حضورؐ نے ریاست کے شہریوں کی ذمہ داری اٹھائی اور

ذمہ داری پوری کرنے کا ماحول بھی بنایا۔ یہی ماحول آگے چل کر بیت المال کا نظام بنا ہے اور وہی بیت المال کا ماحول آگے چل کر رفاہی ریاست کی صورت میں سامنے آیا۔

اس ویلفیئر اسٹیٹ کے دو تین واقعات بھی عرض کر دیتا ہوں:

ابو عبید قاسم بن سلامؒ معروف محدث، فقیہ اور معاشیات کے ماہرین میں سے گزرے ہیں اور امام ابو یوسفؒ کے معاصرین میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ واقعات اپنی تصنیف "کتاب الاموال" میں نقل فرمائے ہیں۔ ان کی یہ معروف کتاب معیشت کے باب میں کلاسیکل کتابوں میں سے ہے۔ معیشت کے باب سے دلچسپی رکھنے والے طلباء سے عرض کیا کرتا ہوں کہ عام طور پر سوال ہوتا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ میں اس پر دو کتابوں کا حوالہ دیا کرتا ہوں، دونوں تیسری صدی کے بزرگوں کی تصنیفات ہیں۔ ایک امام ابو یوسفؒ کی "کتاب الخراج" جو انہوں نے خلیفہ ہارون الرشیدؒ کے کہنے پر ملک کے معاشی قانون کے طور پر لکھی تھی اور ملک میں نافذ رہی۔ ہارون الرشید نے امام ابو یوسفؒ سے کہا تھا کہ معیشت کے ضوابط اور قوانین مقرر کر دیں کہ مالیات کہاں سے وصول کرنے ہیں، کیسے خرچ کرنے ہیں اور معاشیات کا پورا سسٹم کیا ہونا چاہیے؟ اس پر انہوں نے کتاب الخراج لکھی جو عباسی دور میں نافذ العمل رہی۔ اور دوسری کتاب امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ کی "کتاب الاموال" ہے۔ میں معیشت کے ماہرین سے کہتا ہوں کہ یہ دو کتابیں پڑھ لو جو کہ اصل عربی میں ہیں۔ ان کا اردو اور انگلش ترجمہ بھی موجود ہے۔ معیشت کا کسی بھی سطح کا ماہر یہ دو کتابیں پڑھ لے اس کے بعد اگر معیشت کے باب میں اس کا کوئی سوال رہ گیا تو مجھ سے پوچھ لے، میں اسے بتاؤں گا کہ اس کا حل کہاں ہے۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم نے پڑھنے کا کام چھوڑ دیا ہے۔ ہم جناب نبی کریمؐ کی سیرت بھی پڑھتے ہیں تو مستشرقین سے، ولیم میور سے اور واٹ اور منٹگمری سے پڑھتے ہیں، اصل سورسز سے نہیں پڑھتے۔ ہم اپنا دین بھی مستشرقین سے پڑھتے ہیں کہ فقہ حنفی کیا ہے اور فقہ مالکی کیا ہے؟

امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں یمن کے گورنر حضرت معاذ بن جبلؓ تھے۔ حضرت معاذؓ حضورؐ کے زمانے میں یمن کے گورنر رہے ہیں اور حضرت عمرؓ کے دور میں بھی یمن کے گورنر تھے۔ امام ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے ایک سال اپنے صوبے سے زکوۃ، جزیہ، خراج اور عشر وغیرہ وصول کیا۔ جس طرح حکومت کے محکمے ریونیو لیتے ہیں، زمینداروں سے تحصیلدار وغیرہ

ٹیکس وصول کرتے ہیں اور شہریوں سے انکم ٹیکس آفیسر جو تاجروں اور صنعتکاروں سے ٹیکس وصول کرتا ہے۔ حضرت معاذؓ کو اپنے صوبے سے سال بھر کا جو ریونیو وصول ہوا۔ انہوں نے اس کا تیسرا حصہ مرکز کے کسی مطالبے کے بغیر مرکز کو بھیج دیا، حالانکہ صوبہ مرکز سے لیتا ہے، لیکن یہاں صوبہ ایک تہائی مرکز کے مطالبے کے بغیر مرکز کو بھیج رہا ہے۔ اس پر مرکز کو خوش ہونا چاہیے یا ناراض ہونا چاہیے؟ حضرت عمرؓ ناراض ہوئے اور حضرت معاذؓ کو خط لکھا۔ یہ خط بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ معاذ تم تو عالم آدمی ہو، تمہیں پتہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالیات کا یہ اصول بیان فرمایا ہے "توخذ من اغنیا ئھم و ترد الی فقرا ئھم" کہ زکوۃ اور صدقات جس علاقے کے مالداروں سے وصول کیے جائیں اسی علاقے کے مستحقین پر تقسیم کیے جائیں۔ تم نے یہ رقم مجھے کیوں بھیجی ہے، یہ تو یمن کے لوگوں کا حق ہے؟ اس پر حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ اپنے صوبے کے پورے اخراجات کے بعد یہ فاضل بجٹ تھا جو بچ گیا اور میں نے آپ کو بھیج دیا۔ اس رقم کا میرے پاس کوئی مصرف نہیں اس لیے آپ کو بھیجی ہے۔ اگلے سال حضرت معاذؓ نے اپنے صوبے کا نصف ریونیو مرکز کو بھیج دیا اور ساتھ لکھا کہ یہ رقم بچ گئی ہے۔ اس سے اگلے سال دو تہائی مرکز کو بھیج دیا اور اس سے اگلے سال پورے کا پورا بجٹ مرکز کو بھیج دیا کہ اللہ کے قانون کی برکت سے اور آپ جیسے عادل حکمران کے عدل کی برکت سے آج میرے صوبے میں ایک بھی مستحق نہیں ہے جس پر خرچ کر سکوں۔ لہذا سارا بجٹ آپ کو بھیج رہا ہوں۔

میں یہ بتا رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "فالی وعلی" کا جو ماحول بنایا تھا وہ بڑھتے بڑھتے کس مقام پر پہنچا ہے۔ دوسرا واقعہ بھی حضرت عمرؓ کے زمانے کا ہے جو کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے "الفاروق" میں نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے کئی واقعات لکھے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے دور خلافت میں رات کو چکر لگا کر دیکھا کرتے تھے کہ لوگوں کا کیا حال ہے۔ ان کو بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ایسے ہی جاتے تھے۔ ایک رات چکر لگا رہے تھے، ایک گھر کے سامنے سے گزرے تو اندر سے بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ آپ وہاں سے گزر گئے کہ بچہ ہے اٹھا ہو گا اور رو رہا ہو گا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ گزرے تب بھی بچہ رو رہا تھا۔ اب آپ کو پریشانی محسوس ہوئی کہ بچہ مسلسل ہو رہا ہے کوئی وجہ ہے۔ بہر حال گزر گئے۔ جب تیسری جگہ اس گھر کے پاس سے گزرے تو بچہ تب بھی رو رہا تھا۔ اب حضرت عمر وہاں کھڑے ہو گئے کہ یقیناً کوئی مسئلہ ہے۔ اس گھر کا دروازہ

کھٹکھٹایا، ایک شخص باہر آیا، آپ نے اس سے پوچھا کہ بچہ کیوں رو رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بچہ بھوکا ہے اور ماں اسے دودھ نہیں پلا رہی اس لیے بچہ رو رہا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ ماں بچے کو دودھ کیوں نہیں پلا رہی؟ اس نے جواب دیا کہ ماں اس لیے دودھ نہیں پلا رہی کہ وہ دودھ چھڑوانا چاہتی ہے تاکہ بچے کا وظیفہ لگ جائے۔

حضرت عمرؓ نے بیت المال سے بچوں کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا لیکن اس شرط پر کہ جب ماں کا دودھ چھوڑ کر بچے کو الگ خوراک کی ضرورت ہوگی تو چونکہ گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہوگیا ہے اور خرچہ بڑھ گیا ہے تو بچے کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔ ہر بچے کو جوان ہونے تک وظیفہ ملا کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ماں اس لیے دودھ نہیں پلا رہی کہ بچہ دودھ چھوڑے گا تو اس کو وظیفہ ملے گا۔ ماں بچے سے دودھ چھڑوا کر دوسری چیزیں کھانے کی عادت ڈالنا چاہتی ہے تاکہ اس کا وظیفہ لگ جائے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ ماں سے کہو دودھ پلائے، میں ہی عمر ہوں، بچے کا وظیفہ لگ جائے گا۔ جبکہ حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھ والے ساتھی، جو غالباً حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ تھے، سے کہا اور یہ بات حضرت عمر ہی کہہ سکتے ہیں کہ عمرؓ نے کتنے معصوم بچوں کو رلایا ہوگا۔ اے عمر! تیری اس شرط کی وجہ سے کتنے بچے روئے ہوں گے۔ اس کے بعد آپ نے مشورہ کیا اور قانون بدل دیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ جاری ہو جائے گا۔

حضرت عمرؓ اس بنیاد پر بچوں کو وظیفہ دیتے کہ خاندان میں ایک فرد کا اضافہ ہوا ہے اور بجٹ میں اضافہ ہوا ہے تو اس بجٹ کا بوجھ بیت المال برداشت کرے گا۔ آج بھی دنیا کی بہت سی ریاستوں میں چائلڈ الاؤنس دیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں جس زمانے میں میں جایا کرتا تھا تو ۹ پونڈ فی ہفتہ ہر بچے کو وظیفہ ملا کرتا تھا۔ اب بھی وہاں ملتا ہے، ناروے میں بھی ملتا ہے اور کئی دیگر مغربی ممالک میں بھی چائلڈ الاؤنس ملتا ہے۔ برطانیہ کے چائلڈ الاؤنس پر ایک واقعہ ذکر دیتا ہوں۔ وزیر آباد کے سابق ایم این اے جسٹس افتخار چیمہ نے ایک مجلس میں یہ واقعہ بیان کیا۔ کہتے ہیں ہم کیمبرج یونیورسٹی میں لاء کر رہے تھے تو وہاں ایک عمر رسیدہ انگریز تھا، لوگ اس سے ملنے آیا کرتے تھے۔ سیانے لوگوں سے ملتے رہنا چاہیے، کوئی کام کی بات مل جاتی ہے۔ افتخار چیمہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کی شہرت سن رکھی تھی تو ہم تین چار پاکستانی ساتھی اس کے پاس گئے۔ اس نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ ہم نے بتایا پاکستان سے۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا تو وہ ہماری بات سے بہت خوش ہوا۔ باتوں باتوں میں بچوں کو وظیفہ

دینے کا ذکر چھڑ گیا۔ برطانیہ میں ویلفیئر اسٹیٹ کا پورا سسٹم ہے۔ اس انگریز نے ہم سے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ برطانیہ میں ویلفیئر اسٹیٹ کا جو سسٹم ہے اور بچوں، بے روزگاروں اور معذوروں کو وظیفہ ملتا ہے۔ جب یہ قانون نافذ ہوا تھا تو یہ کس نے بنایا تھا؟ ہم نے کہا ہمیں تو معلوم نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ پارلیمنٹ کی جس کمیٹی نے یہ قانون بنایا تھا میں اس کا چیئرمین تھا۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے یہ سارا سسٹم کہاں سے لیا تھا؟ میں نے یہ سب جنرل عمرؓ سے لیا تھا۔ مغرب والے حضرت عمرؓ کا نام لیتے ہیں تو ان کو جنرل عمر کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ سارا سسٹم حضرت عمرؓ سے لیا تھا۔ یہ ہے رفاہی ریاست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ویلفیئر اسٹیٹ کا جو ماحول دیا تھا وہ چلتے چلتے یہاں تک پہنچا تھا۔

ایک بات کا اور اضافہ کر دوں کہ ناروے میں اس وقت بھی جو سوشل بینیفٹ کا سسٹم ہے اسے کہتے ہی ''عمرلاء'' ہیں اور بچوں کو ملنے والے وظیفے کو عمر الاؤنس کہتے ہیں اور وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے یہ سب حضرت عمرؓ سے لیا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری باتیں دوسرے اپنا کر عمل کر رہے ہیں اور ہم آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم اس پر خوش ہیں کہ ہمارے بڑوں نے یہ کیا۔ بڑوں نے تو کیا تھا مگر ہمیں یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ ہم نے کیا کرنا ہے؟

کتاب الاموال ہی کی روایت ہے کہ عمر ثانی امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانے میں عراق کے گورنر عبد الحمیدؒ تھے۔ امیر المومنین کے نام ان کا خط آیا کہ ہمارے صوبے کا اس سال کا جو ریونیو وصول ہوا ہے، ضروریات پوری ہونے اور سال کا بجٹ پورا ہونے کے بعد فاضل بجٹ میں رقم بچ گئی ہے، اس کا کیا کرنا ہے؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب لکھا کہ صوبے میں اعلان کراؤ کہ کوئی ایسا مقروض جو اپنا قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اس کی تحقیق کر کے اس کا قرض ادا کر دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت! یہ کام میں کر چکا ہوں، رقم اس سے زائد ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ان کو دوبارہ خط لکھا کہ جن لوگوں کی بچیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں اور وہ شادی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ اس انتظار میں ہیں کہ اخراجات ہوں گے تو ان کی شادیاں کریں گے تو ان کی شادیاں اس رقم سے کروا دو۔ گورنر صاحب کی طرف سے جواب آیا کہ حضرت!

میں یہ بھی کر چکا ہوں۔ حضرت عمر نے تیسرا خط لکھا کہ جن خاوندوں نے اپنی بیویوں کے مہر ادا نہیں کیے اور مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں ان کے مہر ادا کر دو۔

درمیان میں ضمناً یہ بات عرض کر دوں کہ ہمارا یہ بھی المیہ ہے کہ نکاح کے وقت تو بہت زیادہ مہر مقرر کر دیتے ہیں، لیکن بعد میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مہر کا شرعی اصول یہ ہے کہ مہر ایسا ہونا چاہیے جو لڑکے پر بوجھ نہ ہو اور لڑکی کے لیے عار نہ ہو۔

اس پر چند سال پہلے کا ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں کہ گوجرانوالہ میں ایک شادی میں گیا تو جس کی شادی تھی وہ نوجوان دیہاڑی دار مزدور تھا اور مہر بہت زیادہ مقرر کر رہے تھے۔ میں نے اس کے باپ سے کہا کہ یہ کیا ظلم کر رہے ہو، یہ اتنا مہر کہاں سے ادا کرے گا؟ اس نے یہ جملہ بولا کہ مولوی صاحب! اللہ سے خیر مانگیں ہم نے کونسا مہر دینا ہے۔ یہ اکثر ذہنوں میں مغالطہ ہوتا ہے کہ مہر دینے کی نوبت تب آتی ہے جب کوئی جھگڑا ہو، طلاق کی نوبت آئے۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی! مہر نکاح کا ہوتا ہے، طلاق کا نہیں ہوتا۔ جب نکاح ہو گیا تو مہر تو دینا ہی ہے۔ بلکہ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی فوت ہو گیا اور اس نے مہر ادا نہیں کیا تو اس کے ترکے میں سے سب سے پہلے قرضے کے حساب میں بیوی کو مہر ادا کیا جائے گا، اور وراثت کا حصہ علیحدہ ملے گا کیونکہ مہر بھی عورت کا حق ہے۔

بہرحال حضرت عمر بن عبد العزیز نے گورنر صاحب کو خط لکھا کہ جن خاوندوں نے اپنی بیویوں کو مہر ادا نہیں کیے اور وہ مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو آپ اس رقم سے ان کے مہر ادا کر دیں۔ انہوں نے جواب لکھا کہ حضرت! یہ بھی کر چکا ہوں۔ اس پر حضرت عمر بن عبد العزیز نے چوتھا خط لکھا کہ جو زمینیں قابل کاشت ہیں اور ویران پڑی ہوئی ہیں ان کی حدبندی کراؤ اور لوگوں کو زراعت کے لیے قرضہ کے طور پر دے دو۔ یہ ہے ویلفیئر اسٹیٹ کا تصور۔

یہ بات میں نے کراچی میں ایک اجتماع میں بیان کی تو ایک نوجوان کھڑا ہو گیا کہ یہ صوبے کا بجٹ تھا یا اٹلانٹک سی (سمندر) تھا کہ صوبے کے خرچ بھی پورے ہو رہے ہیں، تنخواہیں بھی پوری ہو رہی ہیں، مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہو رہے ہیں، بے نکاحوں کی شادیاں بھی ہو رہی ہیں اور مہر بھی ادا ہو رہے ہیں؟ اس کا سوال یہ تھا کہ یہ صوبے کا بجٹ تھا یا کوئی سمندر تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا تمہارا سوال ٹھیک ہے، لیکن ایک واقعہ اور سن لو تو اس سوال کا جواب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔

ایک دن حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلافت کے فرائض سرانجام دینے کے بعد شام کو گھر تشریف لائے تو راستے میں ریڑھی پر انگور دیکھے، جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی۔ آپؒ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ بنت عبد الملک رحمھا اللہ، بڑی اچھی خاتون تھیں، بادشاہ کی بیٹی تھی، بادشاہ کی بیوی تھی، بادشاہ کی بہن تھی۔ عبد الملک کی بیٹی، کمانڈر انچیف مسلمہؒ کی بہن، اور ان کا بھائی ولیدؒ بھی بعد میں بادشاہ بنا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے گھر آکر اہلیہ سے کہا کہ فاطمہ! تمہارے پاس ایک آدھ درہم ہو گا؟ ضرورت پڑ گئی ہے۔ امیر المؤمنین، دمشق کا حکمران کہ آدھی دنیا اس کے تابع ہے اور بیوی سے پوچھ رہے ہیں کہ ایک آدھ درہم ہو گا؟ بیوی نے پوچھا کیوں؟ انہوں نے بتایا کہ راستے میں ریڑھی پر انگور دیکھے ہیں، کھانے کو جی چاہتا ہے لیکن جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ ایک آدھ درہم گھر میں ہو تو انگور لے لیں۔ اہلیہ نے کہا آپ کی جیب میں نہیں ہے تو میرے پاس کہاں سے آئے گا؟ پھر اہلیہ نے بیویوں والی بات بھی کی کہ حضرت! امیر المومنین ہیں اور ایک صاع انگور خریدنے کے لیے آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں؟ اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ انگور خرید سکیں۔ اس پر امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تاریخی جواب دیا۔ فرمایا، فاطمہ! جس درہم کی تم بات کر رہی ہو، وہ درہم نہیں، آگ کا انگارہ ہے۔ آج کی اصطلاح میں اس کو ”صوابدیدی فنڈ“ کا نام دیا جاتا ہے، ہر حاکم کا صوابدیدی فنڈ ہوتا ہے، جہاں چاہے خرچ کرے۔

میں نے اس سوال کرنے والے نوجوان سے کہا بیٹا! جس ملک کا حکمران بیت المال کے درہم کو آگ کا انگارا سمجھے گا وہاں پیسے ہی پیسے ہوں گے۔ مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہوں گے، کنواروں کی شادیاں بھی ہوں گی، مہر بھی ادا ہوں گے اور کسانوں کو قرضے بھی ملیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے روپے کو آگ کا انگارا سمجھے۔

میں نے یہ بات بیان کی ہے کہ رفاہی ریاست کیا ہوتی ہے؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا ماحول دیا ہے؟ یہی ماحول حضرات خلفائے راشدین کے زمانے میں ویلفیئر اسٹیٹ کا معیار بنا، جسے آج تک دنیا فالو کر رہی ہے، اور ہم نے اسے چھوڑ رکھا ہے۔ پاکستان بنتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہوگی، لیکن کیا ہمارے پاس وسائل کم ہیں، کیا پاکستان وسائل کے اعتبار سے غریب ملک ہے؟ نہیں! پاکستان اپنے وسائل کے اعتبار سے دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں سے ہے۔ ہمیں اللہ کی نعمتوں کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر چیز عطا کی ہوئی ہے۔ صرف دو باتوں کی

ضرورت ہے۔ حکمران سرکاری مال کو آگ کا انگارا سمجھیں، اور حکومت کو یہ فکر ہو کہ مقروضوں کے قرضے ادا کرنے ہیں، کنواروں کی شادیاں کرنی ہیں، خاوندوں کے مہر ادا کرنے ہیں، کسانوں کو قرضے دینے ہیں۔ حکمرانوں کا یہ مزاج ہو جائے تو پاکستان کسی سے کم بھی نہیں ہے، صرف اس رخ پر واپس جانے کی ضرورت ہے۔

میں نے جناب نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ذکر کیا کہ آپ نے اعلان فرمایا تھا ''من ترک مالا فلورثتہ'' کہ جو آدمی مال چھوڑ کر فوت ہوا، اس کے مال کو ہم ہاتھ نہیں لگائیں گے، مال وارثوں کا ہے۔ ''ومن ترک کلا او ضیاعا فالی وعلی'' جو آدمی بوجھ اور قرضہ چھوڑ کر مرا یا بے سہارا خاندان چھوڑ کر مرا وہ ہمارے ذمے ہوں گے۔ اللہ کرے کہ ہم نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ کے ہزاروں پہلوؤں میں سے اس ضرورت کی طرف متوجہ ہوں جو آج کی سب سے بڑی قومی ضرورت ہے۔ اور اپنی مشکلات اور مسائل کا حل امریکہ، برطانیہ اور چین سے مانگنے کے بجائے حضور نبی کریمؐ سے پوچھیں، حضرات خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے پوچھیں۔ ان کے ہاں سے ہی اس کا حل ملے گا کیونکہ سب کچھ تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں صحیح رخ پر اور جناب نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ کے راستے پر آنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

میں ایک بار پھر قاضی عطاء المحسن صاحب کا شکر گزار ہوں۔ اس خاندان کا پرانا نیاز مند ہوں، شیخ التفسیر حضرت مولانا قاضی نور محمدؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ، اور شیخ الحدیث قاضی عصمت اللہؒ میرے بزرگوں میں سے تھے، ہمیشہ ان کی شفقتیں حاصل رہی ہیں، اور میری نیاز مندی رہی ہے۔ جب مولانا قاضی عصمت اللہؒ نے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا تو ان کے کارکنوں میں بطور ورکر ایک کارکن میں بھی تھا، جبکہ حضرت قاضی صاحبؒ کو سپورٹ کرنے والوں میں والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ بھی تھے۔ الحمد للہ ہمارا خاندانی تعلق چلا آ رہا ہے اور ساٹھ سال سے میں اس کا کردار ہوں۔ ہم چونکہ شہر میں ہیں تو زیادہ واسطہ حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ سے پڑتا تھا، میں ان کے پاس جایا کرتا تھا، نصیحتیں سنتے تھے، دعائیں لیتے تھے اور ڈانٹ بھی کھاتے تھے۔ ہمارے خاندانی تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ جب حضرت قاضی صاحبؒ بیمار تھے تو والد صاحبؒ مجھے کہنے لگے قاضی صاحب کی بیمار پرسی کے لیے جانا ہے تم بھی ساتھ چلو۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اتفاق میں میرا بیٹا عمار خان ناصر قرآن مجید حفظ کر چکا تھا، مدرسے میں

پڑھتا تھا، میں نے اسے کہا کہ تم بھی ساتھ چلو۔ ہم تینوں قاضی شمس الدین صاحبؒ کے پاس گئے، آپ اس وقت صاحب فراش تھے، بات چیت کر لیتے تھے، ہلنا جلنا مشکل تھا۔ میں نے سامنے جا کر کہا حضرت! تین پشتیں حاضر ہیں۔ اس پر حضرت قاضی صاحب رونے لگ گئے۔ بہرحال ہمارے تعلق کی یہ نوعیت چلی آ رہی ہے۔ دعا کریں یہ تعلق اسی طرح قائم رہے۔ آج قاضی عطاء المحسن صاحب نے مجھے یاد کیا، میں اپنے لیے سعادت سمجھتے ہوئے حاضر ہوا ہوں، اللہ تعالی حاضری قبول فرمائیں اور ہمیں اسی طرح مل کر دین اور ملک وملت کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

سیلاب زدگان کی امداد اور بحالی

(مدرسه طیبه، کوروٹانه، گوجرانواله - ۱۲ ستمبر ۲۰۲۲ء)

الشریعہ اکادمی کوروٹانہ گوجرانوالہ کی ہفتہ وار نقشبندی محفل کی گفتگو قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ مدینہ منورہ میں ایک علاقہ اشعریوں کا محلہ کہلاتا تھا۔ حضرت ابوموسی اشعریؓ اور ان کے ساتھ چند خاندان غزوہ خیبر کے موقع پر یمن سے ہجرت کر کے آئے تھے اور آکر مدینہ منورہ میں آباد ہو گئے تھے، وہاں انہوں نے الگ جگہ لے کر اپنا محلہ بسایا تھا جو اشعریوں کا محلہ کہلاتا تھا۔ یمن سے آنے والے اس مہاجر قبیلے کی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین حوالوں سے تعریف کی ہے، ایک دفعہ ان کو ڈانٹا تھا اور دو حوالوں سے ان کی تعریف کی ہے۔

عام طور پر اشعریوں کو فقہاء اور قراء کہا جاتا تھا، دین کی سمجھ رکھنے والے اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے، ان کا عام تعارف یہ تھا۔ یعنی یہ مدینہ منورہ میں پڑھی لکھی فیملی کہلاتے تھے۔ ان میں سے حضرت ابوموسی اشعریؓ امت کے تین چار بڑے قاریوں میں سے ہیں، جن کی قراءت کی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تعریف فرمائی ہے۔

ایک دفعہ نبی کریمؐ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ ان کے علاقے میں کسی کام کے سلسلے میں گئے، واپس آتے ہوئے ان کے محلے سے گزرے۔ جب حضرت ابوموسی اشعری کے مکان کے سامنے سے گزرے تو حضرت ابوموسی اشعریؓ اپنے گھر میں بیٹھ کر مزے سے تلاوت کر رہے تھے، گلی میں آواز آ رہی تھی، حضورؐ اور حضرت عائشہؓ کھڑے ہو گئے،

تھوڑی دیر دونوں میاں بیوی ان کی تلاوت سنتے رہے اور اس کے بعد چلے گئے۔ صبح حضورؐ کی حضرت ابو موسی اشعریؓ سے ملاقات ہوئی تو آپؐ نے فرمایا، ابو موسی! رات کو میں اور عائشہ تمہارے محلے سے گزرے تھے، تم اپنے گھر میں قرآن کریم پڑھ رہے تھے، باہر آواز آ رہی تھی، ہم دونوں وہاں کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر تمہاری تلاوت سنتے رہے۔ ''لقد اوتیت مزمارا من مزامیر آل داوٗد'' لگتا ہے تمہارے گلے میں داوٗد علیہ السلام کے خاندان کی سر ہے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام بہت اچھی سر والے پیغمبر تھے، ان کی آواز بہت پیاری تھی۔ اس پر حضرت ابو موسیؓ نے کہا یا رسول اللہ! مجھے پتا نہیں چلا کہ آپ سن رہے ہیں ورنہ میں اور زیادہ لے میں پڑھتا۔

ایک موقع پر اس خاندان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈانٹا۔ ایک روایت امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ ''الوحدان'' میں نقل کی ہے کہ نبی کریمؐ نے ایک بار جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اہل علم ہیں، پڑھے لکھے لوگ ہیں، ان کے گرد کی ساری آبادی جاہل ہے اور وہ ان کو پڑھاتے نہیں ہیں۔ اور ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو پڑھے لکھے نہیں ہیں، ان کے درمیان پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں، اور وہ ان سے پڑھتے نہیں ہیں۔ حضورؐ نے ان دونوں کو ڈانٹا۔ اہل علم سے نہ پڑھنے والوں کو بھی، اور نہ پڑھانے والوں کو بھی۔ اور فرمایا کہ یہ دونوں طبقے باز آجائیں ورنہ ان کو سزا دوں گا۔ آپؐ اشعریوں کا نام تو نہیں لیا لیکن مدینہ کے لوگ سمجھ گئے کہ ان کی بات ہو رہی ہے کیونکہ یہ پڑھے لکھے لوگ تھے اور ان کے اردگرد سارے زمیندار، کاشتکار لوگ تھے۔

جب بات ان تک پہنچی تو ان کا وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ نے جمعہ کے خطبہ میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی، لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے بارے میں فرمایا تھا۔ آپؐ نے فرمایا، ہاں! لوگ ٹھیک کہتے ہیں، تمہارے بارے میں ہی یہ کہا تھا۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم سے پڑھتے وہ لوگ نہیں ہے اور سزا ہمیں ہوگی؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں ان پڑھوں کی ذمہ داری ہے پڑھے لکھوں کو تلاش کر کے ان سے پڑھیں، اور پڑھے لکھے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اردگرد ان پڑھ لوگوں کو تلاش کر کے ان کو پڑھائیں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلے کی ایک خاص صفت کی تعریف بھی کی ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا، اشعری بہت اچھے لوگ ہیں اور

ان کی یہ صفت مجھے بہت پسند ہے کہ جب کوئی اجتماعی مصیبت یا آفت آجاتی ہے تو یہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور اکٹھے ہو کر اپنی ساری پونجی اکٹھی کر لیتے ہیں اور اسے برابر تقسیم کر لیتے ہیں، تاکہ کسی کو محسوس نہ ہو کہ فلاں تو کھاتا پیتا ہے اور میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس صفت کی نبی کریمؐ تعریف کی کہ اشعریوں کی یہ صفت بہت اچھی ہے۔

یہ میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ آج ہمیں اسی بات کی ضرورت ہے۔ سیلاب زدہ علاقوں میں جو کچھ تباہی مچی ہے اللہ پاک معاف فرمائے۔ اس وقت جو بھی امداد ہو رہی ہے، الحمد للہ لوگ اپنے ذوق کے مطابق ان کی امداد کر رہے ہیں، ہر جگہ سے امداد آ رہی ہے، لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ فرسٹ ایڈ ہے۔ فرسٹ ایڈ بھی ضروری ہوتی ہے، مریض یا زخمی کو فوری طور پر سنبھالنا پہلا کام ہوتا ہے، لیکن اصل علاج تو اس کے بعد شروع ہوتا ہے اور وہ پتہ نہیں کتنی دیر تک چلے گا۔

سیلاب سے بے گھر ہونے والے، سیلاب سے اجڑنے والے، جن کے کھیت اجڑ گئے، جن کی بستیاں اجڑ گئیں، جن کے بچے بہہ گئے، جن کے جانور بہہ گئے، جو تباہ حال ہو گئے ہیں ہمیں ان کو سنبھالنے کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ ہم ان کے لیے وہ تو نہیں کر سکتے جو اشعریؓ کرتے تھے کہ ساری جمع پونجی اکٹھی کر کے اس کو برابر تقسیم کر لیتے تھے، یہ تو ہمارے بس کی بات نہیں ہے، لیکن متاثرین کو یہ احساس نہ ہونے دینا کہ ہم بالکل بے سہارا ہو گئے اور ہمارا کوئی ساتھی نہیں ہے، یہ ہماری قومی ذمہ داری ہے۔ چند سال حالات ایسے رہیں گے، ان کے مکان بنیں گے، ان کے کھیت آباد ہوں گے۔

یہ بھی اللہ کا نظام ہے کہ بڑی عید سے پہلے جانور پانی نہ ہونے کی وجہ سے مر رہے تھے اور اب جانور پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ بہرحال یہ لمبی منصوبہ بندی ہے اس کے لیے ہمیں سوچنا چاہیے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق جتنا بھی ہو سکے مستقل بنیادوں پر کوشش کرنی چاہیے، تاکہ ہم ان کے لیے کوئی ایسا نظم بنالیں کہ ان کو بحالی تک مدد ملتی رہے۔ سرکاری سطح پر جو ہوتا ہے وہ تو ہوتا ہی ہے، لیکن نجی سطح پر بھی ہمیں اس کی کوشش کرنی چاہیے، فرسٹ ایڈ کے بعد ان کی مستقل بحالی کے لیے بھی ہمیں سوچنا ہوگا اور اس کی فکر کرنی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

دعوتِ دین کے تقاضے اور داعی کی صفات

(میسج ٹی وی - ۷ ستمبر ۲۰۲۲ء)

میسج ٹی وی پر نشر کی جانے والی ایک گفتگو کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ میسج ٹی وی کا شکرگزار ہوں کہ ایک اہم موضوع پر، جو وقت کی ضرورت ہے، گفتگو کرنے کا موقع فراہم کیا۔ داعی کی صفات کیا ہونی چاہئیں اور دعوت کے تقاضے کیا ہیں؟ اس پر بات کرنے سے پہلے بطور تمہید عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک طرف دعوت ہے اور ایک طرف دفاع ہے۔ دعوت کا اپنا دائرہ ہے، دفاع کا اپنا دائرہ ہے۔ دعوت کے تقاضے اور طریقہ کار مختلف ہوتا ہے اور دفاع کے تقاضے اور طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو خلط ملط نہیں ہونا چاہیے۔ جیسے کسی بھی ملک کا ایک سفارتی دائرہ ہوتا ہے جو دوسرے ملکوں سے تعلقات بنانے کا اور اپنا پیغام پہنچانے کا دائرہ ہوتا ہے، اسی طرح ایک دفاع کا دائرہ ہوتا ہے ملک کے لیے لڑنے کا اور ملک کی حفاظت کرنے کا۔ سفارت بھی ملک کی ضرورت ہے اور دفاع بھی ملک کی ضرورت ہے۔ سفیر کی زبان و لہجہ اور ہوتے ہیں جرنیل کی زبان و لہجہ اور ہوتے ہیں۔ سفیر کی سرگرمیاں جرنیل کی سرگرمیوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن دونوں ملک کی ضرورت ہیں۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر سفیر جرنیل کا لہجہ اختیار کرے گا تو سفارت کی میز پر ہار جائے گا، اور اگر جرنیل سفیر کا لہجہ اختیار کرے گا تو میدان کی جنگ ہار جائے گا۔ ہر ایک کے اپنے تقاضے ہیں۔

اسی طرح ایک ہے دین کی دعوت، دین کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا، اس کو آپ سفارتکاری سمجھ لیجئے، اور دوسری چیز ہے دین کا دفاع کہ جہاں جہاں سے دین کو خطرہ ہے وہاں دین کے دفاع کی صورت اختیار کرنا۔ یہ دونوں دین کی ضروریات ہیں، داعی بھی دین کی ضرورت ہے اور دفاع کرنے والا بھی دین کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ایک دوسرے کے تقاضوں کو سمجھا جائے، خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ داعی سے یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جرنیل کا لہجہ اختیار کرے، اور جرنیل سے یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ داعی کا دائرہ اختیار کرے۔ دونوں کے اپنے اپنے کام ہیں۔ البتہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہونا چاہیے، اصل میں ہم یہاں گڑبڑ کر جاتے ہیں کہ دعوت اور دفاع کے تقاضوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے پر اعتراضات شروع کر دیتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ دعوت کے تقاضے کیا ہیں اور داعی کی صفات کیا ہونی چاہییں؟ اس پر قرآن کریم کی مختلف آیات اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث ہیں۔ میں قرآن کریم میں سے دو مقامات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ قرآن کریم نے ایک آیت مبارکہ میں دعوت کے تقاضے بیان کیے ہیں اور ایک مقام پر داعی کی صفات بیان کی ہیں، ان دونوں کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

اللہ رب العزت نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا: ”ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ان ربک ھواعلم بمن ضل عن سبیلہ وھواعلم بالمھتدین“۔ اس آیت کریمہ میں دعوت کے چار تقاضے قرآن کریم نے بیان کیے ہیں۔

1. پہلے دعوت دینے کا حکم دیا ہے ”ادع الی سبیل ربک“۔ پھر دعوت کے تقاضوں میں پہلی چیز ذکر کی ”بالحکمۃ“ کہ حکمت کے ساتھ دعوت دو۔ حکمت سے مراد ہے کہ موقع محل کے مطابق دیکھنا کہ کس طرح کی گفتگو کی ضرورت ہے، حکمت کسی متعیّن چیز کا نام نہیں ہے بلکہ موقع محل اور ماحول کو دیکھ کر فیصلہ کرنا کہ اس ماحول میں مجھے کس انداز میں بات کرنی چاہیے۔ داعی کے لیے دعوت کے ماحول کو سمجھنا، ماحول کے تقاضوں کا ادراک کرنا، اور اسے سامنے رکھ کر اپنی گفتگو کا لہجہ اختیار کرنا ”حکمت“ ہے۔ موقع محل کے مطابق طریقہ کار اختیار کرنا حکمت ہے۔ تو پہلی بات یہ کہ دعوت ماحول کو دیکھ کر دی جائے کہ یہاں کس لہجے میں بات کرنی چاہیے، اس کو اختیار کیا جائے۔ اگر آپ تاجروں میں بات کر رہے ہیں تو اور لہجے میں بات کریں گے، وکیلوں سے بات کر رہے ہیں تو اور لہجے میں بات کریں گے، طلبہ سے بات کر رہے ہیں تو اور لہجے میں بات کریں گے، اساتذہ میں بات کر رہے ہیں تو اور لہجے میں بات کریں گے، اور اگر سیاستدانوں میں بات کر رہے ہیں تو اور لہجے میں بات کریں گے۔

اس کی ایک مثال دیتا ہوں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کے سرداروں نے، جن میں ابوجہل بھی تھا، پوچھا کہ آپؐ جو کہہ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ یعنی آپؐ سے دین کے بارے میں دریافت کیا۔ تو چونکہ یہ چودھری قسم کے لوگ تھے، ابوجہل سردار تھا، ان کی نفسیات دیکھ کر حضورؐ نے اسے جواب دیا کہ جو کلمہ میں تمہیں بتا رہا ہوں اگر تم اسے قبول کر لو گے تو عرب کی بادشاہت

تمہاری ہوگی اور عجمی بھی تمہارے تابع ہوں گے۔ اب بظاہر دین کی دعوت سے عرب کی بادشاہت کا کیا تعلق ہے اور عجم کے تابع ہونے کا کیا تعلق ہے؟ لیکن آپؐ نے مخاطب کی نفسیات دیکھیں کہ وہ چوہدری ہے، سردار ہے، بڑا آدمی ہے، اس کو یہی زبان سمجھ آئے گی۔ ایک چوہدری اور سیاستدان کو حضورؐ دین کی دعوت دے رہے ہیں تو اس کی نفسیات اور اس کی سائیکالوجی کے مطابق بات فرما رہے ہیں۔ اسی کا نام حکمت ہے کہ جس کو دعوت دے رہے ہیں اس کی نفسیات کو سمجھیں، اس کے ماحول کو سمجھیں اور موقع محل دیکھیں کہ میں نے کیسے بات کرنی ہے؟ تو دعوت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ دین کی دعوت حکمت کے ساتھ دی جائے۔ آج کی زبان میں اسے فریکوینسی سیٹ کرنا کہا جاتا ہے، پیغام اور میسج ڈیلیور کرنے کے لیے فریکوینسی سیٹ ہونی چاہیے، داعی جہاں بھی جائے اسے وہاں کے تقاضوں اور ماحول کا لحاظ رکھنا ہوگا اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق بات کرنا ہوگی۔ ماحول سے لڑ کر کیسے اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے؟ داعی اس ماحول کو سمجھے گا اور اس کے تقاضوں کے مطابق بات کرے گا، حکمت اسی کا نام ہے کہ داعی ماحول کو دیکھے اور غور کرے کہ میری بات کس لہجے میں اور کیسے مخاطب کو سمجھ میں آئے گی، یہ داعی کی اپنی حکمت ہے کہ وہ موقع محل دیکھے اور جس بات کی ضرورت ہو، اس کے مطابق بات کرے، اس کو عقل و دانش استعمال کرتے ہوئے موقع محل کا صحیح ادراک کر کے بات کرنی چاہیے۔

2. دوسری بات یہ ارشاد فرمائی ''الموعظة الحسنة'' کہ دعوت دیتے وقت لہجہ وعظ و نصیحت کا ہو، لڑائی جھگڑے کا نہ ہو، آپ نے دعوت دینی ہے تو نصیحت اور خیر خواہی کے لہجے میں دیں۔ ہمارے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اس کی تلقین کیا کرتے تھے اور بات یوں سمجھاتے تھے کہ جس سے آپ بات کر رہے ہیں اگر اسے اندازہ ہو کہ یہ میری خیر خواہی میں بات کر رہا ہے تو وہ تمہاری سخت بات بھی سنے گا کہ یہ میرا ہمدرد ہے اور خیر خواہی کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کو یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ میرا مقابلہ کر رہا ہے اور میری کسی بات کا رد کر رہا ہے تو وہ اچھی بات بھی نہیں سنے گا۔ ''الموعظ الحسنة'' کا معنی یہ ہے کہ جسے آپ دعوت دے رہے ہیں اس کو یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ میرا ہمدرد

ہے اور میری خیر خواہی کر رہا ہے۔ یہ دعوت کا دوسرا تقاضا ہے۔ حکمت کے ساتھ دعوت دی جائے اور خیر خواہی کے لہجے کے ساتھ دعوت دی جائے۔

3. تیسری بات قرآن کریم نے یہ ذکر کی ’’جادلھم بالتی ھی احسن‘‘۔ گفتگو میں کبھی بحث بھی ہو جاتی ہے، دعوت میں کبھی سوال ہو گا اور اشکال ہو گا۔ کسی سوال کا جواب دینے، اشکال کا حل پیش کرنے، الجھن یا کنفیوژن دور کرنے کے لیے احسن طریقہ اختیار کیا جائے اور مکالمہ و مجادلہ بہترین طریقے سے کیا جائے، یہ تیسرا دائرہ بیان کیا کہ اگر مجادلہ کی ضرورت پیش آئے تو احسن طریقے سے اور خوبصورت لہجے میں مخاطب کے اشکال کا جواب دو اور اسے سمجھاؤ۔

4. چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی ’’ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین‘‘۔ اس میں اشارہ کیا کہ ہدایت دینا تمہارا کام نہیں بلکہ اللہ کا کام ہے۔ ’’انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء‘‘۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں ہدایت دینا میرا کام ہے تمہارا کام البلاغ ہے۔ قرآن کریم نے داعی کے ذمے دو باتیں لگائی ہیں: البلاغ اور المبین۔ البلاغ کا معنی ہے بات کا پہنچا دینا اور المبین کا معنی ہے سمجھا دینا۔ داعی کے ذمے یہ دو ہی کام ہیں کہ بات صحیح طریقے سے پوری پوری پہنچا دے، بات ادھوری اور نامکمل نہ ہو۔ اور المبین یعنی بات سمجھا دینا کہ مخاطب کے ذہن میں بات اتر جائے، ہدایت دینا داعی کے ذمے نہیں ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ’’افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین‘‘ کیا آپ لوگوں کو مومن بنانے کے لیے جبر کریں گے؟ نہیں! جبر کا لہجہ نہیں ہونا چاہیے، افہام تفہیم کا لہجہ ہونا چاہیے۔

دعوت کے یہ چار تقاضے قرآن کریم نے اس آیت کریمہ میں بیان کیے ہیں، ایک یہ کہ حکمت سے دعوت دیں، دوسرا خیر خواہی کے لہجے میں بات کریں، تیسرا اگر مجادلہ اور مکالمہ کی ضرورت ہو تو اچھے لہجے میں گفتگو کریں، اور چوتھا یہ کہ جبر نہ کریں۔

داعی کی صفات کیا ہونی چاہئیں؟ سورۃ الغاشیۃ کے آخر میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ’’افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ والی السماء کیف رفعت۔ والی الجبال کیف نصبت۔ والی الارض کیف سطحت۔ فذکر انما انت مذکر‘‘۔ یہاں ایک علمی سوال ہے کہ اللہ رب العزت فرما رہے ہیں کہ کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا ہے؟ اور آسمان کی

طرف نہیں دیکھتے کہ کتنا بلند ہے؟ اور پہاڑ کیسے گاڑ دیے گئے ہیں؟ اور زمین کیسے بچھا دی گئی ہے؟ تو تم نصیحت کرو، تم تو نصیحت کرنے والے ہی ہو۔ "فذکر" کی ف تعقیب اور نتیجے کے لیے ہے، گویا فرمایا گیا کہ ان چیزوں کو دیکھیں پھر لوگوں کو دعوت دیں اور نصیحت کریں، آپ تو بس داعی ہیں۔

یہاں حافظ ابن کثیرؒ نے بڑی خوبصورت بات کی ہے کہ ان چار باتوں کے بعد "فذکر" کا کیا تعلق ہے کہ یہ چار چیزیں دیکھو اور نصیحت کرو۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے ان چار چیزوں کا حوالہ دے کر داعی کی صفات بیان کی ہیں کہ داعی میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ یہ چار چیزیں ذکر کر کے داعی کو بتایا کہ تمہارے اندر یہ خوبیاں ہونی چاہئیں۔

1. پہلی چیز یہ فرمائی "افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت" کہ اونٹ کو دیکھو، وہ بڑا صابر جانور ہے، تین چار دن تک بھوکا رہ لیتا ہے، مسلسل چل سکتا ہے، اور کئی کئی دن پیاس برداشت کر سکتا ہے۔ اونٹ سب سے زیادہ صابر اور مشقت والا جانور ہے، داعی کو اونٹ کی طرح صابر اور حوصلے والا ہونا چاہیے۔

2. اس کے بعد فرمایا "والی السماء کیف رفعت" آسمان کی طرف دیکھو، داعی کا عزم آسمان کی طرح بلند ہونا چاہیے، داعی کا عزم کسی دائرے اور کسی سطح پر محدود نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اسلام پوری نسل انسانی کے لیے ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب پوری نسل انسانی کو ہے کہ آپؐ نے فرمایا "یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا"۔ داعی کے عزم میں آسمان جیسی بلندی ہونی چاہیے کہ پوری نسل داعی کا ہدف ہو۔ کسی طبقے، کسی گروہ، کسی فرقے اور کسی ایک نسل کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کو سامنے رکھ کر دعوت دے۔ اسے حافظ ابن کثیرؒ تعبیر کرتے ہیں کہ داعی اپنا عزم آسمان کی طرح بلند رکھے۔

3. تیسری بات یہ ذکر فرمائی "والی الجبال کیف نصبت" داعی میں پہاڑ کی طرح مضبوطی ہونی چاہیے، اپنی جگہ سے ہلنا نہیں چاہیے، آندھیاں آتی ہیں، طوفان آتے ہیں، سیلاب آتے ہیں لیکن پہاڑ اپنی جگہ پر رہتا ہے۔ اسی طرح داعی کو اپنے مشن، اپنے پروگرام اور اپنے ایجنڈے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے، اسے پہاڑ کی طرح جما رہنا چاہیے۔

4. چوتھی چیز یہ ذکر فرمائی ”والی الارض کیف سطحت“ کہ داعی میں زمین کی طرح عاجزی اور خضوع ہونا چاہیے، دیکھیں ہم زمین کے ساتھ کیا کچھ نہیں کرتے، اس کے باوجود زمین ہمیں کیا کچھ نہیں دیتی؟ ذرا اس بات پر غور کریں کہ ہم زمین کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں لیکن زمین سے زیادہ کوئی عاجز نہیں ہے کہ جو ہمیں پانی بھی دیتی ہے، خوراک بھی دیتی ہے، اپنے اوپر بھی جگہ دیتی ہے، اپنے اندر بھی جگہ دیتی ہے، معدنیات بھی دیتی ہے، اس نے ہمارے لیے خزانے چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ زمین سے زیادہ خدمت گزار اور زمین سے زیادہ عاجز کوئی مخلوق ہے؟ تو جیسے زمین بچھی ہوئی ہے اسی طرح داعی کو بھی خدمت گزار ہونا چاہیے۔

اللہ رب العزت نے ان آیات میں داعی کی صفات بیان کی ہیں کہ داعی کو اونٹ کی طرف صابر ہونا چاہیے، آسمان کی طرح بلند عزم والا ہونا چاہیے، پہاڑ کی طرح مستقل مزاج ہونا چاہیے، اور زمین کی طرح عاجز اور خدمت گزار ہونا چاہیے۔ آخری بات یہ کہ اگر داعی سے کہیں کوئی خطا ہو جائے تو اسے توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے، محاذ آرائی اور مورچہ بندی کی نہیں کہ وہ دعوت کے تقاضوں کے بالکل منافی ہے۔

آخر میں سوشل میڈیا سے متعلق ایک بات کرنا چاہوں گا کہ اگر کوئی اچھا ذریعہ ہاتھ میں آجائے تو اسے ضرورت کے مطابق صحیح طریقے سے استعمال کرنا چاہیے، میرے ہاتھ میں کوئی چیز آگئی ہے تو یہ نہیں کہ میں جہاں چاہوں، جیسے چاہوں اس کو استعمال کروں، بلکہ حد بندی، توازن، اعتدال رکھنا چاہیے اور اس کے اثرات بھی دیکھنے چاہئیں کہ میں جو بات کہنے لگا ہوں اس کا اثر کیا ہوگا؟ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا، اللہ تعالیٰ نے خواب میں بتا دیا کہ یہ ہوا ہے۔ حضورؐ بتائے ہوئے مقام پر تشریف لے گئے اور سارا کچھ واضح ہو گیا، بال بھی پکڑے گئے، کنگھی بھی پکڑی گئی، ملزم بھی متعیّن ہو گیا۔ حضرت عائشہؓ نے سوال کیا یا رسول اللہ! وہ بال اور کنگھی کدھر ہیں جو آپ نے برآمد کی ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ دفن کر آیا ہوں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ”افلا نشرت“ آپ نے اس کو نشر کیوں نہیں کیا؟ لوگوں کو دکھایا کیوں نہیں؟ حضورؐ نے فرمایا عائشہؓ! اللہ تعالیٰ نے مجھے بچا لیا ہے تو میں لوگوں میں شر کیوں پھیلاؤں؟ میرے ساتھ

معاملہ ہوا تھا، اللہ تعالی نے مجھے مطلع کر کے مجھے اس سے بچا لیا تو میں اسے عام کر کے لوگوں میں شر نہیں پھیلاؤں گا۔

سوشل میڈیا کا یہ مطلب نہیں کہ جو بات ہم چاہیں جب چاہیں جیسے چاہیں پھیلا دیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس خبر کا ردعمل کیا ہو گا، اس کے اثرات کیا ہوں گے؟۔ خبر میں دو اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں: ایک یہ تحقیق کی جائے کہ خبر ٹھیک ہے یا نہیں ”فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ“۔ دوسرا یہ کہ خبر ٹھیک ہونے کے باوجود یہ دیکھنا کہ اس کا ری ایکشن منفی تو نہیں ہو گا، اس سے معاشرے میں شر تو نہیں پیدا ہو گا۔ خبر ٹھیک ہے لیکن ردعمل منفی ہو گا تو حضورؐ نے فرمایا میں اسے نشر نہیں کروں گا۔ چنانچہ یہ دونوں باتیں سامنے رکھ کر ہمیں میڈیا پر بات کرنی چاہیے، خواہ مخواہ غلط استعمال کر کے ہمیں اپنے گناہوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔

دفاعِ پاکستان اور تحفظِ ختمِ نبوت

(جامعہ فتحیہ، اچھرہ، لاہور۔ ۳ ستمبر ۲۰۲۲ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ ۶ ستمبر یوم دفاع پاکستان اور ۷ ستمبر یوم تحفظ ختم نبوت ہے، ان دونوں کے ساتھ ہماری تاریخ وابستہ ہے اور دینی و ملی روایات وابستہ ہیں، اس موقع پر تقریبات ہوتی ہیں، وطن کے شہداء اور ختم نبوت کے شہداء کو یاد کیا جاتا ہے، جن کی قربانیوں کی بدولت ہمارا ملک بھی محفوظ ہے اور عقیدہ بھی بحمد اللہ محفوظ ہے۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اس کا ہدف لاہور پر قبضہ کرنا تھا۔ پاک فوج کے جوانوں نے بڑی قربانیوں کے ساتھ ملک کا دفاع کیا تھا بی آر بی نہر ہماری دفاعی لائن تھی۔ بڑی ہمت اور جرأت کے ساتھ فوجی جوانوں نے ملک کا دفاع کیا تھا اور پوری قوم ان کی پشت پر کھڑی تھی۔ اس وقت میری عمر ۱۷ سال تھی، میں روزنامہ وفاق کے نامہ نگار کے طور پر اس جنگ کا رپورٹر تھا۔ میں نے اس جنگ میں شہری دفاع کے رضا کار کے طور حصہ لیا اور اسے بطور صحافی رپورٹ بھی کیا۔ وہ مناظر مجھے یاد ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر ہم شہدائے وطن کو یاد کر کے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، یہ ہمارے عزم کا اظہار ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے فوجی جوانوں نے وطن کے لیے قربانیاں دی تھیں اور سرحد پر

لڑائی کر کے اپنے وطن کا دفاع کیا تھا تو قوم ان کی پشت پر تھی، آئندہ بھی جب ضرورت پڑی اسی طرح پوری قوم متحد ہو کر فوج کی پشت پر کھڑے ہو کر ملک کا دفاع کرے گی۔

جبکہ ۷ ستمبر یوم تحفظ ختم نبوت ہے، اس دن تقریبا ۹۰ سال کی محنت کے بعد ہماری پارلیمنٹ، دستور اور اسٹیبلشمنٹ نے دینی حلقوں کا یہ موقف تسلیم کیا تھا کہ قادیانی نبوت کے دعوے کے ساتھ اور اپنے دیگر دعاوی کے ساتھ دائرہ اسلام سے خارج ہیں، اسلام کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، قادیانیوں کو مسلمانوں کے ساتھ شمار نہ کیا جائے بلکہ جس طرح باقی غیر مسلم رہتے ہیں عیسائی، سکھ اور ہندو وغیرہ، ان کو بھی غیر مسلم اقلیتوں کے دائرے میں شمار کیا جائے۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پارلیمنٹ نے یہ جو فیصلہ کیا اس کے پیچھے بھی شہداء کی قربانیوں کی طویل تاریخ ہے۔

یہ ہماری ملی اور دینی جدوجہد کے دو بڑے دائرے ہیں، اس موقع پر ہم ملک کے دفاع کے لیے اور عقیدے کے تحفظ کے لیے اپنے عزم کی تجدید کرتے ہیں۔ میں ان دونوں حوالوں سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے چند واقعات عرض کرنا چاہوں گا کہ دفاع وطن اور دفاع عقیدہ کی اہمیت کیا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو انصار مدینہ کے خاندانوں میں ایک خاندان بنو سلمہ تھا۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ اسی خاندان میں سے تھے۔ بنو سلمہ مسجد نبوی سے کچھ فاصلے پر رہتے تھے۔ جب مسجد بن گئی تو نماز کیلئے مسجد میں انہیں دور سے آنا پڑتا تھا چنانچہ بنو سلمہ نے فیصلہ کیا کہ چونکہ ہر نماز کے لیے مسجد میں جانا ہوتا ہے اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ اپنے مکانات بیچ کر مسجد نبوی کے قریب جگہ خرید کر وہاں مکانات بنا لیتے ہیں اور اپنی آبادی مسجد کے قریب منتقل کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہر دیندار مسلمان کا جی چاہتا ہے کہ مسجد کے قریب گھر ہو تاکہ نمازوں کے لیے آسانی ہو اور برکات حاصل ہوں۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو سلمہ کے اس فیصلے کا پتہ چلا تو آپؐ نے انہیں منع فرما دیا کہ جتنی دور سے مسجد میں آتے ہو ثواب بھی اتنا ہی زیادہ ملتا ہے، جہاں سے چل کر آتے ہو، جتنے قدموں کے نشان زیادہ ہوں گے اتنی نیکیاں زیادہ ملیں گی۔ جب آدمی گھر سے وضو کر کے مسجد میں جاتا ہے تو اس کو ہر قدم پر ایک نیکی ملتی ہے، ایک گناہ معاف ہوتا ہے، ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔ تو یہ آتے جاتے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں، کیا یہ اچھی بات نہیں

ہے ؟ آپؐ نے فرمایا ”دیارکم تکتب آثارکم“ کہ ادھر ہی اپنے گھروں میں رہو تمہارے قدموں کے نشان لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے دور سے آتے جاتے ہوئے جو ثواب ملتا ہے تم کہیں اس ثواب سے محروم نہ ہو جاؤ۔

محدثین نے یہ حدیث بیان کر کے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جو منع فرمایا تھا اس کی ایک حکمت یہ بھی تھی ”کراہیۃ ان یعروا المدینۃ“ کہ مدینہ کا وہ راستہ کہیں خالی نہ ہو جائے۔ بنو سلمہ کا قبیلہ مدینہ منورہ کے راستے پر تھا، یہ مدینہ کا قدرتی دفاع تھا، اگر یہ قبیلہ وہ علاقہ خالی کر کے مسجد نبوی کے قریب آ جاتا تو پورا علاقہ خالی ہو جاتا، یہ دفاعی حکمت عملی کے خلاف تھا۔ اس لیے حضورؐ نے ان کو منع فرما دیا کہ مدینہ کا وہ راستہ خالی نہ ہو جائے اور دشمن کے لیے حملہ کرنا آسان نہ ہو جائے۔ اس سے اندازہ کریں کہ وطن کے دفاع میں حضورؐ کی نظر کتنی ہمہ گیر تھی اور آپؐ کو کتنے معاملات کا لحاظ تھا، اس دفاع وطن کی حکمت کے تحت آنحضرتؐ نے بنو سلمہ کو مکانات بیچنے سے منع فرما دیا۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امام بھی تھے، کمانڈر اور غازی بھی تھے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک دفعہ مدینہ منورہ پر بنو غسان کے حملے کا خوف طاری تھا کہ نہ معلوم وہ کب حملہ کر دیں۔ اس زمانہ میں ابلاغ کے یہ ذرائع تو نہیں تھے جو آج ہیں۔ چنانچہ ایک رات کسی طرف سے شور کی آواز آئی تو لوگوں کو خطرہ ہوا کہ شاید حملہ ہو گیا ہے۔ شور کی آواز سن کر لوگ باہر نکلے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم نے حالات معلوم کرنے کے لیے آپس میں علاقے تقسیم کیے کہ کچھ ساتھی ادھر جائیں اور کچھ دوسرے راستے پر، تاکہ دیکھیں کہ کیا ہوا ہے اور غسانی کدھر سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ابھی ہم تیاری کر رہے تھے اور گروپ بندی ہو رہی تھی کہ سامنے سے جناب نبی کریمؐ گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار چکر لگا کر واپس تشریف لا رہے تھے، آپؐ نے فرمایا کہ کوئی خطرہ نہیں ہے، میں ہر طرف دیکھ کر آیا ہوں۔ یہ دفاع وطن ہے۔ اس لیے وطن کے دفاع کا لحاظ کرنا وطن کا تقاضہ تو ہے ہی، دین کا تقاضہ بھی ہے اور جناب نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ ہے۔

عقیدے کی حفاظت اور دفاع بھی ضروری ہے۔ اس پر حضورؐ کے دو واقعات عرض کرتا ہوں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک موقع پر آپؐ تشریف فرما تھے کہ دو آدمی آئے اور کہا کہ ہم مسیلمہ کی طرف سے نمائندے ہیں۔ مسیلمہ یمامہ کے علاقے کا تھا، بنو حنیفہ کا سردار اور نبوت کا مدعی تھا، بڑا سردار تھا۔ اس کا مسلمانوں سے جو پہلا

مقابلہ ہوا تو اس میں مسیلمہ کا لشکر ۸۰ ہزار بتایا جاتا ہے۔ مسیلمہ کا دعوی تھا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور میں بھی اللہ کا رسول ہوں۔ وہ حضور کے مقابلے پر نبوت کا دعویدار نہیں تھا بلکہ شراکت کا دعویدار تھا۔ اس کے دو نمائندے اس کا خط لے کر حضورؐ کی خدمت میں آئے۔ بخاری شریف میں خط کا متن موجود ہے۔ خط کا عنوان یہ تھا ''من مسیلمۃ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ ''یعنی مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کے نام۔ گویا وہ حضورؐ کو رسول مان کر اپنی رسالت کا مدعی تھا۔ اس نے خط میں لکھا ''اشرکت معک فی الامر'' کہ مجھے بھی نبوت میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہے لیکن قریشی نبوت پر کسی دوسرے کا حق تسلیم نہیں کرتے۔

مسیلمہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشکش کی کہ مجھے اپنے بعد اپنا جانشین نامزد کر دیں یا علاقے تقسیم کر دیں کہ ''لنا وبر ولک مدر'' کچی اینٹیں ہماری اور پکی اینٹیں آپ کی، یعنی آپ شہری نبی اور میں دیہاتی نبی ہوں گا۔ حضورؐ نے اس کے نمائندوں سے پوچھا ''اتشھدان انی رسول اللہ'' مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا ''نشہد انک رسول اللہ'' ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہیں۔ پھر آپؐ نے پوچھا ''اتشھدان ان مسیلمۃ رسول اللہ'' مسیلمہ کو بھی رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا اسے بھی رسول مانتے ہیں اس پر حضور نے فرمایا ''لولا ان الرسل لا تقتل لضربت اعناقکما'' تم مجھے بھی رسول مانتے ہو اور مسیلمہ کو بھی رسول مانتے ہو اس کی سزا موت ہے، لیکن چونکہ تم سفیر ہوں اور سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا اس لیے میں تمہیں چھوڑتا ہوں، ورنہ میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔ سفارتی آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے آپؐ نے ان کو چھوڑ دیا، البتہ ان کی بات کا سختی سے جواب دیا کہ ختم نبوت کا معاملہ اتنا کمزور نہیں ہے۔

دوسرا واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ہی مروی ہے۔ امام بیہقیؒ نے السنن الکبری میں یہ روایت ذکر کی ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ کے قاضی تھے۔ ایک دن کوفہ کے بازار میں جا رہے تھے کہ ایک آدمی پر نظر پڑی، اسے بلا کر پوچھا کہ تمہیں کہیں دیکھا ہے اور کہا کہ مجھے شک ہے کہ وہ جو دو آدمی مسیلمہ کا خط لے کر حضورؐ کے پاس آئے تھے ان میں سے ایک تم بھی تھے۔ اس نے کہا آپ نے ٹھیک پہچانا ہے میں وہی ہوں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے پوچھا کہ اب بھی تمہارا عقیدہ وہی ہے؟ اس نے کہا وہی ہے۔ حضرت محمدؐ کو اللہ کا رسول مانتے ہو؟ اس نے کہا مانتا ہوں۔ مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ اس

نے کہا مانتا ہوں۔ آپؐ نے اس سے پوچھا کہ اب سفیر تو نہیں ہو؟ اس نے کہا نہیں! حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اسے گرفتار کر کے اس کی رپورٹ امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کی خدمت میں بھیجی کہ مسیلمہ کے ساتھیوں میں سے ایک آدمی چھپا ہوا تھا وہ ملا ہے، اس کو گرفتار کیا ہے، اس کا کیا کرنا ہے؟ حضرت عثمان بن عفانؓ نے جواب دیا کہ جو مرتد کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہی کرنا ہے۔ مرتد کے احکام میں سے یہ ہے کہ اسے مہلت دو، موقع دو۔ اگر سمجھانے بجھانے کے تمام تقاضے پورے کرنے کے بعد بھی اسلام کو نہ مانے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دو۔ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے بھی ایسے ہی کیا، اسے مہلت دی، سمجھایا بجھایا، اور اس کے نہ ماننے پر قتل کروا دیا۔ یہ عقیدے کے دفاع پر حضرت عثمانؓ کے دور کا واقعہ ہے کہ عقیدے کا دفاع بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا وطن کا دفاع، بلکہ وطن کے دفاع سے کئی گنا زیادہ عقیدے اور دین کا دفاع ضروری ہے۔

اسی حوالے سے دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک موقع پر مسیلمہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ میں ایک بڑا جرگہ لے کر آیا۔ حضورؐ سے ملاقات کے لیے پیغام بھیجا، آپؐ تشریف لائے۔ یہ بھی سیرت کا ایک بڑا اہم پہلو ہے۔ مسیلمہ کا کمال یہ تھا کہ وہ بہت بڑا خطیب تھا، اسی لیے تو ۸۰ ہزار کا لشکر لڑنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس سے مذاکرات کے لیے حضورؐ اپنے خطیب ثابت بن قیسؓ کو ساتھ لے کر گئے۔ یہ حضورؐ کی ڈپلومیسی اور حکمت ہے کہ خطیب کے مقابلے میں خطیب کو ساتھ لے کر گئے۔ حضرت ثابت بن قیسؓ خطیب الاسلام اور خطیب الانصار تھے۔ صحابہؓ میں سب سے بڑے خطیب تھے، انہیں خطیب رسول اللہ کہا جاتا تھا۔ حضورؐ نے مسیلمہ سے ملاقات کی اور کھڑے کھڑے اس سے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا آپ سے ملاقات کرنے اور بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ بھی نبی ہیں، میں بھی نبی ہوں، میرے ساتھ معاملات طے کریں، یعنی میں "بارگیننگ" کے لیے آیا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم مجھ سے جانشینی اور نبوت کا حصہ مانگ رہے ہو۔ آپؐ نے زمین سے ایک خشک لکڑی اٹھائی اور فرمایا کہ اگر تم مجھ سے یہ خشک لکڑی بھی مانگو گے تو نہیں دوں گا۔ اور اس سے فرمایا کہ تم اپنے دائرے میں رہو "لا تعدو قدرک" اپنی اوقات میں رہو اگر تم حد سے بڑھے تو اللہ تمہاری ٹانگیں کاٹ دے گا۔ جاؤ میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ باقی باتیں میرے خطیب سے کرو، میں جا رہا ہوں۔ میں نے تمہیں دو ٹوک جواب دے دیا ہے۔

چنانچہ آپؐ نے مسیلمہ کے پاس ثابت بن قیسؓ کو چھوڑا کہ باقی باتیں تم سے یہ کریں گے اور یہ کہہ کر آپؐ واپس تشریف لے گئے۔

وہ دفاع وطن تھا اور یہ دفاع عقیدہ تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا لحاظ رکھا ہے اور دونوں کے بارے میں آپؐ کی سنت مبارکہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضورؐ کی سنت مبارکہ اور صحابہ کرامؓ کی سنت پر چلتے ہوئے وطن کے دفاع میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائیں اور عقیدے کے دفاع میں بھی حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ وطن کا دفاع ضروری ہے اور عقیدہ کا دفاع اس سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں استقامت نصیب فرمائیں اور کامیابیاں عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

فلاحی ریاست اور اسوۂ نبویؐ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۶ جولائی ۲۰۲۲ء)

سیرۃ النبی ﷺ کے موضوع پر ایک نشست سے خطاب کا کچھ حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ویلفیئر اسٹیٹ کا صرف تصور نہیں دیا اور اس کی تعلیمات نہیں بیان کیں بلکہ جب آپؐ تئیس سال کی محنت کے بعد اس دنیا سے تشریف لے گئے تو ایک فلاحی ریاست قائم ہو چکی تھی جسے آج کی دنیا بھی فلاحی ریاست مانتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کسی مسلمان کی وفات ہوتی اور آپؐ سے تقاضا ہوتا کہ اس کا جنازہ پڑھائیں تو آپؐ اس میت کے متعلق کچھ سوالات پوچھتے تھے۔ ایک سوال یہ ہوتا تھا کہ اس کے ذمہ کوئی قرضہ تو نہیں؟ اگر جواب نہ میں ہوتا تو جنازہ پڑھا دیتے۔ اگر مقروض ہوتا تو صحابہؓ سے پوچھتے کہ قرض کی ادائیگی کا کوئی بندوبست ہے؟ اگر ہوتا تو آپ جنازہ پڑھا دیتے، اگر ایسی کوئی صورت نہ ہوتی تو خود جنازہ نہیں پڑھتے تھے، صحابہؓ سے فرماتے کہ وہ نماز جنازہ پڑھ لیں۔ ایک صحابی کی وفات پر یہی واقعہ ہوا تو پتہ چلا کہ میت مقروض ہے اور قرضہ اتارنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ صحابہؓ سے فرمایا کہ اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ ایک صحابی ابو قتادہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمارا مسلمان بھائی ہے، اسے آپ اس سعادت سے محروم نہ کیجئے، آپ جنازہ

پڑھائیں، قرضہ میں ادا کردوں گا۔ حضورؐ نے جنازہ پڑھایا اور اس کے بعد ایک اعلان فرمایا جو اسلامی فلاحی ریاست کی بنیاد ہے:

"ما من مومن الا وانا اولی الناس بہ فی الدنیا والآخرۃ، اقرءوا ان شئتم (النبی اولی بالمومنین من انفسھم)، فایما مومن ترک مالا فلیرثہ عصبتہ من کانوا، فان ترک دینا او ضیاعا فلیاتنی فانا مولاہ"

اس موقع پر فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان قرضہ یا بے سہارا خاندان چھوڑ کر فوت ہوا ہے "فالی وعلی" وہ میرے پاس آئے گا، وہ میری ذمہ داری ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر میری رائے ہے کہ "الی" کی بات تو اس سے قبل بہت لوگوں نے کی ہے کہ کوئی ضرور تمند ہو تو میرے پاس آئے لیکن "علی" کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے، یہ بات تاریخ میں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی ہے۔ نبی اکرمؐ نے یہ پالیسی دی کہ ریاست کے نادار، معذور، غریب اور ضرور تمند لوگ ریاست کی ذمہ داری میں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا ماحول یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی شخص آتا اور کسی ضرورت کا تقاضا کرتا تو آپؐ ارشاد فرماتے، بھئی! اس کو بیت المال میں سے دے دو، یا کسی سے سفارش کر کے اس کی ضرورت پوری کر دیتے۔ حضورؐ نے ایسا ماحول بنا لیا تھا کہ جو بھی ضرورت مند آتا اس کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ اس حوالے سے دو واقعات کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔

نبی کریمؐ کے پاس ایک صحابیؓ تشریف لائے اور عرض کی، یا رسول اللہ! میرا اونٹ راستہ میں مر گیا ہے، گھر سے دور ہوں، مجھے سواری عنایت فرمائیں تاکہ میں گھر جا سکوں۔ آپؐ نے فرمایا، بیٹھو، تمہیں اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں۔ وہ حیران ہوا کہ مجھے سواری چاہیے، اونٹنی کا بچہ میرے کس کام کا؟ دوبارہ عرض کی، یا رسول اللہ! مجھے سواری چاہیے، میں نے گھر جانا ہے۔ فرمایا، بھئی کہا تو ہے کہ تمہیں اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں۔ وہ پھر پریشان ہوئے اور عرض کی۔ آپ نے پھر فرمایا، بھئی اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں اور پھر ایک اونٹ منگوا کر ان کے حوالے کیا اور فرمایا کہ یہ بھی کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش مزاج بزرگ تھے اور کبھی کبھی اس قسم کی دل لگی فرما لیا کرتے تھے۔

حضرت ابو موسی اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم کچھ لوگوں نے سفر پر جانا تھا اور ہمیں اونٹوں کی ضرورت تھی۔ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ رسول اللہ کی بارگاہ میں جائیں گے تو مایوس نہیں لوٹیں گے۔ یہ حضورؐ کے پاس

پہنچے اور عرض کی یارسول اللہ! سواری کے لیے اونٹ چاہئیں۔ آپؐ نے انکار فرمادیا بلکہ قسم اٹھالی کہ نہیں دوں گا۔ ابوموسی اشعریؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے جاتے ہی مجلس کے ماحول کا لحاظ کیے بغیر اپنی ضرورت پیش کردی۔ رسول اللہ کسی وجہ سے غصے میں تھے اس لیے انکار فرمادیا۔ یہ واپس آگئے اور خاندان والوں کو بتایا کہ حضورؐ نے انکار فرمادیا ہے۔ اسی اثنا میں ایک آدمی آیا اور ابوموسی اشعریؓ سے کہا کہ آپ کو رسول اللہ یاد فرمارہے ہیں۔ یہ پہنچے تو دیکھا کہ رسول اللہ کے سامنے اونٹوں کی دو جوڑیاں کھڑی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ لے جاؤ۔ کہتے ہیں میں نے اونٹ پکڑے اور چل پڑا۔ راستے میں خیال آیا کہ آپؐ نے تو نہ دینے کی قسم اٹھالی تھی، اب اس حالت میں اگر میں نے اونٹ لے لیے تو اس میں کیا برکت ہوگی۔ میں واپس گیا اور آپؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ کے پاس تو اونٹ نہیں تھے اور آپ نے مجھے اونٹ نہ دینے کی قسم اٹھالی تھی۔ فرمایا کہ اس وقت میرے پاس اونٹ نہیں تھے، یہ قیس بن اسعدؓ کے باڑے سے ادھارے منگوائے ہیں۔ انہوں نے پھر سوال کیا کہ آپ نے تو قسم اٹھالی تھی۔ فرمایا کہ مجھے قسم یاد ہے لیکن میرا معمول ہے کہ اگر کوئی قسم اٹھالوں اور مجھے خیال ہو کہ جس کام کے نہ کرنے کی قسم اٹھائی ہے وہ خیر کا کام ہے تو میں قسم کو خیر کے کام میں رکاوٹ کا ذریعہ نہیں بننے دیتا اور کفارہ ادا کردیتا ہوں۔

یہ ماحول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی بن گیا تھا کہ ضرورت مند آپؐ کے پاس آتے تھے اور ان کی ضرورت پوری ہوتی تھی۔ اسی ماحول کو بعد میں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے منظم کرکے ''رفاہی ریاست'' کی شکل دی جو آج بھی ویلفیئر اسٹیٹ کا ماڈل سمجھا جاتا ہے۔

علومِ دینیہ کی ترویج میں خواتین کا کردار

(مدرسہ توحید و سنت، بن حافظ جی میانوالی - ۲۲ مئی ۲۰۲۲ء)

(ترجمہ قرآن کریم کی کلاس کے آغاز کے موقع پر اساتذہ اور طالبات سے خطاب کا خلاصہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ یہ مدرسہ ہمارے محترم دوست اور بزرگ ساتھی حضرت مولانا حافظ مہر محمد صاحبؒ کی یادگار اور ان کا صدقہ جاریہ ہے۔ ہم جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کئی برس اکٹھے پڑھتے رہے ہیں، وہ مجھ سے سینئر تھے اور دو تین سال پہلے فارغ ہوئے تھے،

البتہ ترجمہ قرآن کریم کی کلاس میں شریک رہے ہیں۔ فاضل اور محقق عالم تھے اور ہمارے ساتھ پاکستان شریعت کونسل کی تنظیم و تشکیل میں بھی شریک رہے ہیں۔ ان کے فرزند مولانا حافظ عمر فاروق اور دیگر اہل خاندان اور رفقاء کو اس گلشن علمی کی خدمت کرتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، اللہ تعالی سب کو جزائے خیر اور سعادت دارین سے نوازیں، آمین یارب العالمین

آج طالبات میں ترجمہ قرآن کریم کا آغاز ہے اور مجھے کہا گیا ہے کہ اس حوالہ سے بچیوں کے سامنے کچھ باتیں عرض کروں، جو میرے لیے سعادت کی بات ہے، اور میں قرآن کریم، حدیث و سنت اور فقہ و شریعت کے علوم میں عورتوں کے حصہ اور کردار کے بارے میں دو تین واقعات بیان کرنا چاہوں گا جن سے اندازہ ہو گا کہ قرون اولی میں دینی علوم کے ساتھ عورتوں کے شغف اور دلچسپی کا کیا ماحول تھا۔

امام شافعیؒ کی والد محترمہ کے بارے میں ایک واقعہ غالبا امام سبکیؒ کی کتاب "طبقات الشافعیۃ الکبری" کے حوالے سے کہیں پڑھا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ کے قاضی کے سامنے کسی مقدمہ کی گواہی کے سلسلہ میں پیش ہوئیں، اس مقدمہ میں ایک مرد اور دو عورتیں گواہ تھیں جن میں ایک حضرت امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ تھیں۔ قاضی صاحب نے ایک خاتون سے گواہی سن کر ان سے کہا کہ وہ ذرا فاصلہ میں جا بیٹھیں تاکہ وہ دوسری خاتون سے الگ گواہی سن سکیں۔ غالبا ان کا مقصد یہ تھا کہ دونوں سے ایک دوسرے سے الگ گواہی لیں گے تو اگر کوئی فرق ہوا تو پتہ چل جائے گا۔ امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ نے اس سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ہم دونوں اکٹھی گواہی دیں گی اور ایک دوسری کو گواہی کے دوران کوئی بات بتانے کی ہوئی تو بتائیں گی۔ اور کہا ان کا ایک دوسری سے الگ گواہی دینا قرآن کریم کی منشا کے خلاف ہے۔ قاضی صاحب نے دلیل پوچھی تو فرمایا کہ قرآن کریم جہاں ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی کا فرمایا ہے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ "ان تضل احدا ھما فتذکر احدا ھما الاخری" اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد کرا دے۔ اس لیے ہم دونوں اکٹھے گواہی دیں گی اور ایک دوسری کو بتائیں گی۔ قاضی صاحبؒ نے ان کے اس استدلال کو تسلیم کیا اور ان سے الگ الگ گواہی لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے پہلے زمانوں میں عورتوں کا "قرآن فہمی" کا معیار کیا تھا۔

حدیث و سنت کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ حکومتی سطح پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع و مرتب کرنے کا حکم سب سے پہلے امیر المومنین

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے دیا تھا۔ وہ زمانہ صحابہ کرامؓ کا آخری دور تھا اور تابعین کرامؒ کا دور عروج تھا۔ ہر علاقہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات و احادیث کے حلقے موجود تھے اور اہل علم ہر طرف علمی خدمات میں مصروف تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ضرورت محسوس کی کہ اس سارے کام کو محفوظ کیا جائے، جس کے لیے انہوں نے اپنے تمام گورنروں کو حکم جاری کیا کہ ان کے علاقہ میں جو اہل علم صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ میں سے موجود ہیں ان کی روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس میں مدینہ منورہ کے گورنر کو خصوصی حکم یہ تھا کہ اپنے وقت کی عظیم خاتون محدثہ و فقیہہ حضرت عمرہ بنت عبد الرحمنؒ کے علوم و روایات کو محفوظ کرنے کا بطور خاص اہتمام کیا جائے۔ وہ حضرت اسعد بن زرارہؓ کی پوتی اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کی شاگردہ اور خادمہ تھیں، بلکہ انہیں علمی حلقوں میں حضرت عروہ بن الزبیرؒ اور حضرت قاسم بن محمدؒ کے ساتھ ام المومنین حضرت عائشہؓ کا جانشین بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ میں حدیث کی روایت کے حوالہ سے عورتوں کے ذوق و محنت کی سطح کیا تھی اور ان کا علمی مقام و مرتبہ کیا تھا۔

فقہ میں عورتوں کی صلاحیت و ذہانت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، جو میں نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب قاسمیؒ کے کسی خطبہ میں پڑھا ہے، کہ امت کی معروف فقیہہ جو فاطمہ فقیہہؒ کے نام سے معروف ہیں، ان کے والد بھی وقت کے بہت بڑے فقیہ اور مفتی تھے، اور بیٹی کو علوم دینیہ بالخصوص حدیث و فقہ کی اس درجہ میں تعلیم دی کہ وہ فتویٰ نویسی میں اپنے باپ کے ساتھ شریک ہوگئیں، اور ایک دور ایسا بھی آیا کہ استفتاء پر فتویٰ فاطمہ لکھتی تھیں اور دونوں کے دستخطوں سے فتویٰ جاری ہوتا تھا۔

مگر عورت زیادہ پڑھ لکھ جائے تو رشتہ میں مشکلات بہرحال پیدا ہو جاتی ہیں، اس معیار کا رشتہ تلاش کرنا بھی مشکل ہوتا ہے، اور اگر میاں بیوی کے علمی معیار میں زیادہ فرق ہو تو نباہ میں بھی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فاطمہ فقیہہؒ کے رشتہ میں بھی یہ صورتحال پیش آئی، کوئی مالدار اور دنیوی حیثیت کا رشتہ آتا تو فاطمہؒ کے لیے علمی معیار پر پورا نہ ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہوتا تھا، اور کوئی صاحب علم رشتہ کا طلبگار ہوتا تو مالی حالت کی کمزوری کی وجہ سے والد صاحبؒ اس کو قبول نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک شہزادہ کا رشتہ آیا جس پر والد صاحب تو راضی تھے مگر خاتون نے رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ بالآخر باپ بیٹی میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ رشتہ کے طالب علماء کرام سے کہا جائے کہ وہ موجودہ دور کے

تقاضوں کے سامنے رکھتے ہوئے فقہ حنفی کی کوئی کتاب لکھیں، جس کی کتاب زیادہ پسند آئے گی اس سے رشتہ کر لیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے اس شرط پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں سے امام کاسانیؒ کی ”بدائع الصنائع“ بھی ہے، جو فقہ حنفی کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ فاطمہ فقہیہؒ کو یہ کتاب سب سے اچھی لگی اور انہوں نے امام کاسانیؒ سے شادی کر لی۔

یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد اپنی بچیوں کو یہ حوصلہ دلانا ہے کہ قرآن کریم، حدیث و سنت، اور فقہ و شریعت کے مضامین ان کے لیے نئے اور انجانے نہیں بلکہ مسلم خواتین کی قدیم روایات کا حصہ ہیں اور ہر دور میں ان علوم کی تعلیم و تدریس اور فروغ میں عورتوں کا کردار نمایاں رہا ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ مدرسہ توحید و سنت بن حافظ جی میانوالی کی طالبات، اساتذہ، منتظمین اور معاونین کو قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی کلاس کے آغاز پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت ان سب کو سعادت و برکات سے نوازیں اور دینی علم کی ترویج و اشاعت کے لیے مسلسل محنت کرتے رہنے کی توفیق عطاء فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

(مطبوعہ ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جون ۲۰۲۲ء)

سودی نظام اور ہمارا افسوسناک رویہ

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۲۲ اپریل ۲۰۲۲ء)

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۴۳ھ کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ کچھ عرصہ سے جمعۃ المبارک کے خطبات میں قرآن کریم کے حوالہ سے مختلف پہلوؤں پر بات چل رہی ہے، گزشتہ جمعہ اس پہلو پر گفتگو ہوئی تھی کہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور بہت سی باتوں اور کاموں سے منع کیا ہے جنہیں اوامر اور نواہی کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں کچھ حلقوں کی طرف سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی حیثیت آرڈر اور حکم کی نہیں بلکہ راہنمائی اور مشورہ کی ہے، اس کا ذکر حضرت شاہ

ولی اللہ دہلویؒ نے ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں کیا ہے اور آج بھی یہ بات اسی انداز میں سامنے لائی جا رہی ہے۔ اس پر یہ عرض کیا تھا کہ قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام آپشنز نہیں بلکہ آرڈرز ہیں اور ان پر عمل کے بارے میں قیامت کے دن ہر شخص جواب دہ ہو گا اور اس پر سزا و جزا کا مدار ہو گا۔

آج کی گفتگو اس حوالے سے ہوگی کہ قرآن کریم نے بہت سے کاموں سے منع کیا ہے مگر ان میں سے بعض امور پر سخت لہجہ اختیار کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے کاموں سے بہرحال بچنا ضروری ہے، ان میں سے ایک کام سود کا لین دین بھی ہے اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ”ان کنتم مومنین“ اگر تم مسلمان ہو تو سود کا لین دین ترک کر دو۔ اور منع کے باوجود سودی کاروبار کو جاری رکھنے کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ سے سے تعبیر کیا ہے، جس سے اس کبیرہ گناہ کی سنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سود کا لین دین پہلی امتوں میں بھی حرام تھا بلکہ قرآن کریم نے بنی اسرائیل پر خدا کی لعنت کے اسباب میں ذکر کیا ہے کہ ”واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ“ انہیں سود سے منع کیا گیا تھا مگر اس کے باوجود وہ سود کا لین دین کرتے تھے جس پر ”لعناھم“ ہم نے ان پر لعنت مسلط کر دی۔ یہود کے لیے سود حرام ہونے کا تذکرہ آج کی بائبل میں بھی موجود ہے۔ جناب نبی اکرمؐ جب مبعوث ہوئے تو عرب معاشرہ میں سود کا لین دین عام تھا جو ذاتی قرضوں میں بھی تھا اور تجارت میں بھی تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کی ساری قسموں کو ممنوع قرار دے دیا اور عملاً بھی ختم کیا، اس موقع پر یہ سوال اٹھایا گیا جس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح ہے کہ ”انما البیع مثل الربوا“ تجارت بھی تو سود کی طرح ہے کہ اشیا کا تبادلہ تجارت ہے جس پر منافع جائز ہے، تو رقوم کا تبادلہ بھی اسی طرح ہے اس پر منافع میں کیا حرج ہے؟

اللہ نے قرآن کریم میں اس کا واضح جواب دیا کہ ”واحل اللہ البیع وحرم الربوا“ یہ دونوں مختلف معاملات ہیں، اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے مکمل خاتمہ کا اعلان فرمایا بلکہ حجۃ الوداع کے موقع پر اس کے عملی آغاز کے لیے اپنے چچا محترم حضرت عباسؓ کو، جو سود کا کاروبار کیا کرتے تھے، اپنے ساتھ کھڑا کر کے سب صحابہ کرامؓ کے سامنے اعلان کیا کہ انہوں نے لوگوں کو جو سود پر قرضے دے رکھے ہیں ان میں اصل رقم واپس ہوگی اور سود کی رقم کی ادائیگی نہیں کی

جائے گی۔ گویا نبی اکرمؐ نے سود کی حرمت کے اعلان سے قبل دیے گئے قرضوں پر بھی سود ختم کرنے کا اعلان فرمایا۔ سیرت طیبہ کی کتابوں میں طائف کے قبیلہ بنو ثقیف کے قبول اسلام تفصیل پڑھی جا سکتی ہے، بلکہ میرا مشورہ یہ ہے کہ اصحاب ذوق اس کا ضرور مطالعہ کریں، جس میں بتایا گیا ہے کہ بنو ثقیف کا وفد اپنی قوم کی طرف سے نبی اکرمؐ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کیلئے مدینہ منورہ آیا تو انہوں نے قبول اسلام کے لیے کچھ شرائط پیش کیں۔ جن میں ایک یہ تھی کہ چونکہ دوسری قوموں اور قبائل کے ساتھ ان کی تجارت سود کے ذریعے ہوتی ہے اس لیے وہ سود نہیں چھوڑ سکیں گے۔ اسی طرح انہوں نے کہا کہ وہ نماز کے اوقات کی پابندی نہیں کر سکیں گے، ان کا بت ''لات'' نہیں توڑا جائے گا۔ ان کے علاقہ میں انگور کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے جس سے شراب بنتی ہے اور اس پر ان کی معیشت کا مدار ہے اس لیے شراب ترک کرنا بھی ان کے لیے مشکل ہو گا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود والی شرط سمیت تمام شرائط مسترد فرمادیں اور بنو ثقیف کو اپنی شرائط سے دستبردار ہو کر غیر مشروط طور پر مکمل اسلام قبول کرنا پڑا۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ بنو ثقیف کی شرائط کو مسترد کر کے جناب رسول اللہ نے انہیں غیر مشروط طور پر تمام احکام اسلام قبول کرنے کے لیے کہا تو انہوں نے صرف ایک رات میں باہمی مشورہ کر کے ان شرائط سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ہماری صورتحال یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے خطاب میں واضح طور پر کہا تھا کہ ہم اپنی معیشت کی بنیاد مغرب کے اصولوں پر نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات و احکام پر رکھیں گے۔ جبکہ دستور پاکستان میں سود کو اسلام کے منافی قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ کم از کم مدت میں ملک سے سودی نظام کا خاتمہ کرے۔ اس کے بعد وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ آف پاکستان نے بھی دوٹوک فیصلہ دیا کہ ملک میں رائج تمام سودی قوانین قرآن و سنت سے متصادم ہیں، اس لیے انہیں یکسر ختم کر دیا جائے، مگر ہم قومی سطح پر ابھی تک تذبذب کا شکار ہیں اور ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں جو یقیناً اللہ تعالیٰ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا سبب ہے۔ حتیٰ کہ اس سودی نظام کی نحوست ہے کہ ہم اسٹیٹ بینک آف پاکستان پر آئی ایم ایف کا کنٹرول تسلیم کر کے اپنی قومی خود مختاری کو بھی داؤ پر لگا چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں توبہ و استغفار کی توفیق دیتے ہوئے قرآن و سنت کی عملداری کی طرف واپس جانے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

رمضان المبارک کی برکات اور ہماری مِلّی صورتحال

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ اپریل ۲۰۲۲ء)

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس مقدس مہینہ کی برکتوں اور رحمتوں سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں:

- یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے، اس میں قرآن کریم کی تلاوت اور سماع کی عجیب بہار ہوتی ہے اور پوری دنیا میں چوبیس گھنٹے اس کی آواز گونجتی رہتی ہے۔
- یہ روزوں کا مبارک مہینہ ہے جس میں مسلمان صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کھانا پینا ترک کر کے برکتوں کے حصول اور نفس کے تزکیہ کا سامان کرتے ہیں۔
- اور یہ سخاوت اور صدقہ و خیرات کا مہینہ ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارا سال سخی ہوتے تھے اور آپ کے دروازے سے کوئی ضرور تمند خالی نہیں جاتا تھا، مگر رمضان المبارک میں آپ کی سخاوت کا ماحول ایسا ہو جاتا تھا جیسے شدید گرم موسم میں ٹھنڈی ہوا کی لہر چھا گئی ہو۔
- اس ماہ مبارک اور اس کی فضیلت و برکت کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت و محبت آج بھی قابل رشک ہے اور کرۂ ارضی پر بسنے والے انسانوں میں کسی اور مذہب کے پیروکار اس معاملہ میں مسلمانوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔
- اس مبارک مہینے میں مسلمان روحانی طور پر ”ری چارج“ ہو کر اگلے سال کے معمولات کے لیے تازہ دم ہو جاتے ہیں اور زندگی کا یہ نظام اسی تسلسل کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔
- ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ”الصوم لی وانا اجزی بہ“ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا اجر اپنی مرضی سے دوں گا۔ اس کا مطلب

یہ بھی ہے کہ روزہ واحد عبادت ہے جس کا زبان سے اظہار نہ کیا جائے تو اللہ تعالی کے سوا کسی اور کو اس کا علم نہیں ہوتا، اس لیے اس میں ریاکاری کا احتمال سب سے کم ہے، اس وجہ سے اس کا اجر و ثواب نہ صرف یہ کہ زیادہ ہے بلکہ اس ماہ مبارک میں دوسری عبادات اور اعمال خیر کا اجر بھی کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

- یہ تقوی اور تزکیہ نفس کا مہینہ ہے جس میں مسلمان کو اپنے گناہوں کے دھونے اور نفس کی صفائی و طہارت کا موقع ملتا ہے اور اصحاب ذوق اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔
- اور یہ صبر و استقامت کے ساتھ شکر گزاری کا مہینہ بھی ہے کہ اللہ تعالی کی بے پناہ نعمتوں پر مسلمانوں کو اپنے رب کی کسی نہ کسی طرح شکر گزاری کا ماحول مل جاتا ہے۔

یہ سب رمضان المبارک کی برکات ہیں اور اس کا فیض ہے مگر اس کا دوسرا پہلو بھی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے یوں فرمایا ہے ”لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابي لشدید“ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا لیکن اگر ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بہت سخت ہو گا۔ جس کی سنگین ترین صورت قرآن کریم میں ہی ان الفاظ میں مذکور ہے کہ ”لا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم“ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالی کی بھلا دیا تو اللہ تعالی نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔

آج ہم مسلمان پوری دنیا میں جس صورتحال سے دوچار ہیں، اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ خدانخواستہ ہم اس کیفیت سے دوچار ہو گئے ہیں، اپنے نفع نقصان سے بے خبر ہو جانا اور سود و زیاں سے غافل ہو جانا خدائی عذاب کی سب سے سنگین صورت ہے۔ اور آج ملت اسلامیہ اسی ماحول میں غیروں کی دریوزہ گر ہو کر باہم دست و گریبان ہے۔ اس لیے آج ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ذاتی گناہوں سے توبہ و استغفار کے ساتھ ساتھ ملی اور اجتماعی طور پر بھی توبہ و استغفار کا اہتمام کریں، اور رمضان المبارک کو دین کی طرف امت کی اجتماعی واپسی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کریں، اللہ تعالی ہمیں اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

کھیلوں کے مقابلے اور سنت نبویؐ

(مدرسہ طیبہ، کوروٹانہ، گوجرانوالہ - ۲۶ مارچ ۲۰۲۲ء)

(الشریعہ اکادمی، کوروٹانہ، گوجرانوالہ میں ہفتہ وار نقشبندی محفل سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج الشریعہ اکادمی میں کرکٹ میچ ہوا ہے جس میں اکیڈمی ہی کی دو ٹیموں نے حصہ لیا اور اس میں کنگنی والا کی ٹیم نے کوروٹانہ ٹیم پر برتری حاصل کی۔ اس پر کامیاب ٹیم کو مبارک باد دیتے ہوئے کھیلوں کے مقابلوں کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ عام طور پر کھیلوں سے تین قسم کے فوائد مقصود ہوتے ہیں:

- ایک تو یہ ہے کہ معمول کی مصروفیات سے الگ کوئی مصروفیت اختیار کی جائے تاکہ ذہنوں کو دباؤ سے نجات حاصل ہو اور وہ تازہ دم ہو کر اپنے معمولات میں پھر سے مصروف ہو جائیں، یہ انسانی زندگی کا حصہ اور ضرورت ہے۔
- دوسرا یہ کہ اس سے ورزش ہو جاتی ہے، بعض کھیلوں میں جسمانی ورزش ہوتی ہے اور بعض میں ذہنی ورزش ہو جاتی ہے، اور یہ بھی زندگی کی ضروریات میں سے ہے۔
- تیسرا مقصد جنگی ماحول میں مقابلہ کی تیاری کا ہوتا ہے کہ انسان اپنے دفاع اور دشمن پر برتری حاصل کرنے کے لیے خود کو تیار کرتا ہے۔

یہ کھیلیں اور ان کے مقابلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی ہوتے تھے اور خود نبی اکرمؐ اس کا اہتمام کرتے تھے۔ چونکہ مدینہ منورہ کا دس سالہ دور جنگی ماحول کا تھا کہ اس دور میں خود نبی اکرمؐ دو درجن سے زائد جنگوں میں شریک ہوئے، اس لیے اس ماحول میں جنگی مشقوں والے مقابلے زیادہ ہوتے تھے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مسجد نبویؐ کے صحن میں کچھ نوجوان نیزہ بازی کا مقابلہ کر رہے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ مقابلہ دیکھو گی؟ میں نے ہاں کی تو آپؐ کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے اور میں ان کے پیچھے چھپ کر کافی دیر تک یہ مقابلہ دیکھتی رہی اور جب تھک گئی تو بس کہہ کر پیچھے ہٹ گئی۔

ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی راستہ سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ نوجوانوں کی دو ٹیمیں آپس میں تیر اندازی کا مقابلہ کر رہی ہیں، آپؐ کھڑے ہو گئے اور شاباش دیتے

ہوئے فرمایا کہ خوب کھیلو، اور یہ بھی کہا کہ میں فلاں ٹیم کے ساتھ ہوں، جس پر دوسری ٹیم نے تیر پھینکنا بند کر دیے۔ نبی اکرمؐ نے پوچھا کہ رک کیوں گئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم آپ کی طرف تیر کیسے پھینک سکتے ہیں؟ آپؐ یہ فرماتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے کہ تم لوگ کھیلو میں دونوں کے ساتھ ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے مشہور پہلوان حضرت رکانہؓ کے ساتھ کشتی لڑی اور انہیں تین دفعہ پچھاڑا جس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے۔

ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ لگائی، پہلی بار حضرت عائشہؓ سبقت لے گئیں، دوسری بار آپؐ دوڑ میں آگے نکل گئے اور فرمایا ''تلک بتلک'' یہ اس کا بدلہ ہو گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار گھوڑ دوڑ کا مقابلہ کرایا، دو گروپ تھے، تربیت یافتہ گھوڑوں کا مقابلہ لمبی مسافت کا تھا اور غیر تربیت یافتہ گھوڑوں کا مقابلہ تھوڑے فاصلے کا تھا اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی اس دوڑ میں گھوڑے کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔

یہ تو جسمانی مقابلے تھے اور جنگی تیاری کے حوالہ سے تھے، اس کے علاوہ ذہنی مقابلہ میں بنو تمیم کے شاعر اور خطیب کے ساتھ مقابلہ تاریخ کا حصہ ہے کہ بنو تمیم کا وفد حضرت اقرع بن حابسؓ کی سربراہی میں مدینہ منورہ آیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعری اور خطابت میں مقابلہ کی دعوت دی جو قبول کر لی گئی۔ مقابلہ کا میدان سجا، محفل بپا ہوئی، جس میں بنو تمیم کے خطیب حضرت زبرقان بن بدرؓ نے خطابت کے جوہر دکھائے جس میں اپنے قبیلہ کی خوبیاں بیان کیں اور اپنے مفاخر کا ذکر کیا۔ جناب نبی اکرمؐ کے حکم پر خطیب الانصار حضرت ثابت بن قیسؓ نے اپنے خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید، رسول اکرمؐ کی صفات حسنہ اور اسلام کی خوبیوں کا خطیبانہ انداز میں تذکرہ کیا۔ اس طرح بنو تمیم کے شاعر حضرت اقرع بن حابسؓ نے یہی باتیں شاعرانہ لہجے میں کہیں تو آپؐ کے ارشاد پر حضرت حسان بن ثابتؓ نے شاعری میں آنحضرتؐ کی نعت اور اسلام کے محاسن کا تذکرہ کیا۔ اس مقابلہ میں بنو تمیم کے وفد کے سربراہ حضرت اقرع بن حابسؓ نے مسلمان خطیب اور شاعر کی برتری کا اعتراف کیا اور اس پر وہ سب لوگ مسلمان ہو گئے۔

یہ واقعات دورِ نبوی کے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہنی و جسمانی ورزش، جنگی تیاری، اور ایسی تفریح، جس سے ذہنوں کو فرحت و سکون حاصل ہو اور وہ تازہ دم ہو کر اپنے معمولاتِ زندگی ادا کر سکیں، اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا اہتمام فرمایا ہے۔

اس کے ساتھ، میں اپنی ٹیموں سے کہنا چاہوں گا کہ ہم گوجرانوالہ میں رہتے ہیں جو پہلوانوں کا شہر کہلاتا ہے اور یہاں کا خصوصی کھیل کبڈی ہے جو جسمانی ورزش کے لیے ہوتا ہے اور اس علاقہ کی ثقافت ہے، اس لیے میری خواہش ہے کہ الشریعہ اکادمی میں کھیل کا اگلا مقابلہ کبڈی کا ہو اور آپ لوگ اس کی ابھی سے تیاری شروع کر دیں۔

دینی مدارس کے نظام کا تاریخی پسِ منظر اور معاشرتی کردار

(جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ فروری ۲۰۲۲ء)

(جامع مسجد نور جامعہ نصرۃ العلوم میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ بزرگانِ محترم، برادرانِ اسلام! قرآن مقدس کی ایک آیت کریمہ ”یعلمون ظاھرا من الحیاۃ الدنیا وھم عن الاخرۃ ھم غافلون“ (الروم ۷) تلاوت کی ہے، مختصر وقت میں اس آیت مبارکہ کی روشنی میں کچھ ضروری باتیں عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کی بارگاہ میں دعا فرمائیں کہ خداوند ذوالجلال مجھے صحیح صحیح عرض کرنے کی، آپ حضرات کو صحیح صحیح سننے کی، مجھے، آپ کو، سب مسلمان بلکہ انسان بھائیوں کو صحیح بات سمجھنے، قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہجری اعتبار سے یہ رجب المرجب کا مہینہ ہے، اس مہینے کے فضائل اور خصوصیات اپنے مقام پر، لیکن ہمارے ہاں دو باتوں کا اس میں زیادہ تذکرہ ہوتا ہے۔ ایک جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزۂ معراج کے حوالے سے اور دوسرا یہ کہ دینی مدارس کے تعلیمی سال کا یہ آخری مہینہ ہوتا ہے۔ اس میں مدارس کی تقریبات ہوتی ہیں، قرآن کریم اور بخاری شریف کے آخری سبق اور مختلف عنوانات سے اجتماعات اور امتحانات ہوتے ہیں۔ الغرض، یہ ہمارے دینی تعلیمی سال کا آخری مہینہ ہوتا ہے، اس کے بعد شعبان اور رمضان

میں چھٹیاں ہوتی ہیں، اس حوالے سے یہ دو باتیں اس مہینے میں عام طور پر مجالس میں زیادہ ذکر ہوتی ہیں، ان میں سے دینی مدارس کی بابت دو تین باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

دینی مدارس کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صرف دین کی تعلیم دیتے ہیں، دنیا کی ضروریات کی تعلیم نہیں دیتے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تعلیم دو حصوں میں تقسیم ہے، اس تقسیم کے نقصانات ہیں اور اس تقسیم کا اثر بھی پڑ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں عرض کرنا چاہوں گا کہ تقسیم موجود تو ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ تقسیم کب ہوئی تھی اور کس نے کی تھی؟ تقسیم تو نظر آ رہی ہے، مدارس ہر جگہ ہیں اور اسکولز و کالجز بھی ہر جگہ ہیں، جو کچھ کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ مدارس میں نہیں، اور جو کچھ مدارس میں پڑھایا جاتا ہے وہ کالجوں میں نہیں۔ ان کے مضامین الگ ہیں، ان کے مضامین الگ ہیں، ان کا دائرۂ تعلیم اور ہے، ان کا دائرہ تعلیم اور ہے، حالانکہ ایک ہی محلے اور ایک ہی شہر میں ہیں، یہاں نصرۃ العلوم میں اور اسلامیہ کالج میں کتنا فاصلہ ہو گا؟ گورنمنٹ کالج اور مظاہر العلوم میں کتنا فاصلہ ہو گا؟ غرضیکہ ایک ہی شہر اور ایک ہی محلے میں وہ بھی ہے اور یہ بھی ہے، وہاں تعلیم اور ہوتی ہے اور یہاں اور ہوتی ہے، یہ کیا معاملہ ہے؟

پہلی بات تو یہ دیکھنی ہے کہ یہ تقسیم کب ہوئی تھی اور کیوں ہوئی تھی۔ ان مدارس میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس کو ''درس نظامی'' کہتے ہیں، درس نظامی کو تقریباً تین سو سال ہو گئے ہیں اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں جب پورا جنوبی ایشیا متحد تھا، بنگلہ دیش، پاکستان، انڈیا، برما یہ سب ایک تھے، اس زمانے میں ہمارے ایک بزرگ تھے، علمی خاندان کے فرد تھے، ملا نظام الدین سہالویؒ، لکھنؤ کے قریب سہالی ایک جگہ کا نام ہے وہاں کے تھے، خاندان کی کئی پشتیں علماء کی ہیں، وہ اپنے گاؤں سے اٹھ کر لکھنؤ شہر میں آ گئے۔ اورنگزیب عالمگیرؒ نے ملا نظام الدین سہالویؒ کو ایک بلڈنگ الاٹ کی کہ یہاں رہیں اور مدرسہ بھی بنائیں، اس کو ''فرنگی محل'' کہتے ہیں۔ اس زمانے میں وہاں بیرونی تجارتی کوٹھیاں ہوتی تھیں، مغربی، یورپی لوگ ہالینڈ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ کے وہاں تجارت کرتے اور اپنی کوٹھیاں بناتے تھے، وہ ان کے تجارتی مراکز ہوتے تھے، کوئی کوٹھی کسی وجہ سے خالی پڑی تھی، اورنگزیب عالمگیرؒ نے وہ کوٹھی ملا نظام الدینؒ کو دے دی کہ اسے آپ سنبھالیں۔ ملا نظام الدین سہالویؒ نے وہاں مدرسہ شروع کیا، وہ فرنگی محل کا مدرسہ کہلاتا ہے جو تین سو سال سے اب تک چل رہا ہے۔ انہوں نے ایک نصاب ترتیب دیا، اللہ تعالی نے اسے ایسی

قبولیت عطافرمائی کہ نصاب ملانظام الدین سہالویؒ نے جاری کیا لکھنؤ میں، لیکن جو چیز وقت، سوسائٹی اور سماج کی ضرورت ہوتی ہے اسے جو بھی پوری کرتا ہے اس کو اللہ تعالی قبولیت عامہ عطا فرما دیتے ہیں۔ وہ چونکہ وقت کی ضرورت تھی تو پورے ساؤتھ ایشیا میں وہی پڑھایا جانے لگا اور کچھ عرصے میں پورے ملک میں وہی نصاب رائج ہو گیا۔

نصاب میں کیا تھا؟ مختصرا یہ ہے کہ جو اسلامیہ کالج میں پڑھایا جاتا ہے اور جو نصرۃ العلوم میں پڑھایا جاتا ہے، دونوں مضامین نصاب کا حصہ تھے۔ آج کل جو سبجیکٹس یونیورسٹی میں اور جو مضامین مدرسے میں پڑھائے جاتے ہیں اس میں سب یکجا تھے۔ ایک ہی کلاس روم میں، ایک ہی تپائی پر، ایک ہی نصاب تھا، قرآن کریم بھی پڑھاتے تھے، ریاضی بھی پڑھاتے تھے، حدیث بھی پڑھاتے تھے، طب اور میڈیکل بھی پڑھاتے تھے، فقہ بھی پڑھاتے تھے، فلکیات اور سائنس بھی پڑھاتے تھے اور ہنرمندی بھی سکھاتے تھے، یہ سب ایک ہی جگہ ہوتا تھا۔ ملک کا عدالتی نظام فقہ حنفی تھا، قانون کے طور پر فقہ پڑھائی جاتی تھی۔ سرکاری، عدالتی اور دفتری زبان فارسی تھی اس لیے وہ بھی پڑھائی جاتی تھی۔ خلاصہ کلام یہ کہ جو آج کالج میں پڑھایا جاتا ہے اور جو مدرسے میں پڑھایا جاتا ہے دونوں اکٹھے تھے۔ فلکیات جس کو آج سائنس کہتے ہیں، طب جس کو آج میڈیکل کہتے ہیں، زبان، جغرافیہ، تاریخ سب اکٹھے پڑھائے جاتے تھے، ایک ہی نظم کے ساتھ، ایک ہی کلاس روم میں یہ سارے مضامین ڈیڑھ سو سال تک اکٹھے پڑھائے جاتے رہے ہیں۔

۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر وہاں قبضہ کر لیا تھا، پھر بڑھتے بڑھتے ۱۸۲۲ء تک پورے انڈیا پر اس کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں بھی فارسی زبان سرکاری رہی، فقہ حنفی ملک کا قانون رہا اور درس نظامی کا نصاب وہی رہا، حتی کہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی ضرورت کیلئے جو مدرسے بنائے تھے ان میں بھی یہی نصاب تھا۔ اورنگزیب کے زمانے سے ۱۸۵۷ء تک تقریبا ڈیڑھ صدی بنتی ہے، یہی نصاب پڑھایا جاتا رہا۔ ۱۸۵۷ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ یہاں کے حریت پسندوں کی جنگ ہوئی اور حریت پسندوں کو شکست ہوئی، ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ پر برطانیہ نے خود سارے ملک کا اقتدار سنبھال لیا تو سارے ملک کا نظام تبدیل کر دیا اور زبان تبدیل کر دی۔ سرکاری دفتری عدالتی زبان پہلے فارسی تھی اب انگریزی کر دی، ملک کا انتظامی وعدالتی قانون فقہ حنفی اور فتاوی عالمگیری تھا، اس کی جگہ انگریزی قانون لے آئے۔

جب نظام، قانون اور زبان تبدیل کر دی تو نصاب بھی تبدیل کر دیا۔ اور سابقہ نصاب میں سے پانچ مضامین نکال دیے: عربی اور فارسی زبان نکال کر اس کی جگہ انگریزی لے آئے، فقہ حنفی کی جگہ انگریزی قانون آگیا، اور چونکہ ان سب کا مدار قرآن و سنت پر تھا، جس کی ان کو ضرورت نہیں تھی تو اس سے متعلقہ پانچ مضامین، قرآن کریم، حدیث، فقہ، عربی اور فارسی سب نصاب سے نکال دیے جو بطور نصاب کے اس کے بعد نصاب کا حصہ نہیں رہے۔

زبان اور قانون پر تو ملک کے انتظامی اور عدالتی نظام کا مدار تھا، جبکہ ان پانچ مضامین پر ملک میں دین کی تعلیم کا، مسجد کا، مدرسے کا اور دین کے سارے نیٹ ورک کا مدار تھا، ان کو بالکل ختم کر دیا۔ کسی نے قرآن پڑھنا تھا تو عالم بننا تھا، حدیث پڑھنی تھی تو عالم بننا تھا، فقہ پڑھنی تھی تو عالم بننا تھا، عربی پڑھنی تو دین کی باتوں سے واقف ہونا تھا، ان چار پانچ مضامین پر ہی مسجد، مدرسے، مکتب، قرآن کریم کی تعلیم اور لوگوں کی دینی راہنمائی کا مدار تھا۔ جن مضامین پر ملک کے نظام، دفتر، عدالت اور انتظامیہ کا مدار تھا وہ رکھ لیے اور یہ پانچ مضامین نکال دیے۔

ہمارے بزرگوں نے جب دیکھا کہ مسئلہ بڑا گھمبیر ہے، اگر یہ مضامین پڑھائے نہ گئے تو مسجد بھی ویران ہو گی اور مدرسہ بھی باقی نہیں رہے گا، چنانچہ خطیب صاحب بھی گئے، امام صاحب بھی گئے، قاری صاحب بھی گئے، حافظ صاحب بھی گئے اور مفتی صاحب بھی گئے۔ اگر ان پانچ مضامین کی تعلیم باقی نہ رہتی تو یہ چار پانچ آدمی آپ کو کہیں نہ ملتے۔ اگر قرآن، حدیث، فقہ اور عربی نہ پڑھائی جاتی تو آپ کو ملک میں مولوی، قاری، حافظ نام کی کوئی شے نہ ملتی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو مسجدیں اور مدرسے کہاں جاتے؟ چنانچہ مستقبل کی اس دینی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کچھ اللہ کے بندے بیٹھے کہ ٹھیک ہے، ہم لڑائی نہیں کرتے، یہ لوگ نہیں پڑھاتے تو نہ پڑھائیں لیکن ہم پڑھائیں گے۔ اس لیے دینی مدرسے کی بنیاد اس سوچ پر ہے کہ یہ پانچ مضامین جو ہماری دینی، معاشرتی اور سماجی ضرورت ہیں: قرآن، حدیث، فقہ، عربی اور فارسی، اگر یہ نہیں پڑھاتے تو ہم لوگوں سے چندہ مانگ کر پرائیویٹ بنیاد پر رضاکارانہ طور پر اور امداد باہمی کی بنیاد پر خود پڑھائیں گے، یہ ہے دینی مدرسے کی بنیاد۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ سوسائٹی کا مزاج ہے اور اللہ کا نظام ہے کہ جو چیز معاشرے کی ضرورت ہو اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ جہاں سے وہ ضرورت پوری ہوتی ہے وہ پھیل جاتی ہے، جیسے درس نظامی کی بات میں نے کی۔ چنانچہ جب چار پانچ مدرسے بنے، دیوبند کا مدرسہ بنا، سہارنپور کا مدرسہ بنا اور دیگر مدارس بنے تو لوگوں نے سمجھا کہ یہ چیز ہماری ضرورت کی ہے۔ اور جو چیز سوسائٹی کی ضرورت پوری کرے گی وہ عام ہو گی، اسے کون روک سکتا ہے۔ جہاں جہاں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ہمیں مسجد اور مدرسے کو آباد رکھنا ہے، جس کے لیے مولوی، قاری، حافظ اور مفتی ہمیں چاہئیں تو انہوں نے اسے قبول کیا۔ اس سلسلہ میں عرض کروں گا کہ ہم شروع ہوئے تھے چار پانچ مدرسوں سے، مراد آباد کا تھا، ہاٹ ہزاری کا مدرسہ تھا، دیوبند کا تھا، سہارنپور کا تھا، مگر اس وقت پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش، برما جس کو ساؤتھ ایشیا کہتے ہیں، اس خطہ میں آج کے اعداد و شمار کے مطابق ایک لاکھ مدارس سے زائد موجود ہیں جن سے کروڑوں افراد تیار ہو چکے ہیں۔ یہ ان بزرگوں کے خلوص، محنت اور ایثار کا نتیجہ تھا۔

اس لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ تقسیم یقیناً ہوئی ہے لیکن ہم نے نہیں کی۔ ہم تو اکٹھا ہی پڑھاتے تھے، ڈیڑھ سو سال تک سب کچھ ایک ساتھ پڑھاتے رہے ہیں۔ فلکیات، سائنس، طب، ریاضی، تاریخ اور سوشیالوجی بھی پڑھاتے رہے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیم بھی دیتے رہے ہیں۔ تو پھر یہ تقسیم کس نے کی ہے؟ جنہوں نے پانچ سبجیکٹس نصاب سے نکالے تھے یہ انہوں نے کی ہے اور تب سے یہ تقسیم چلی آ رہی ہے۔

الحمد للہ یہ مدارس جو آج پورے جنوبی ایشیا میں تعلیمی سال کا آخری مہینہ گزار رہے ہیں، تقریبات اور اجتماعات ہو رہے ہیں، مختلف قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں، ان مدارس نے ایثار، قربانی اور قناعت کے ساتھ یہ خدمت سرانجام دی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اللہ رب العزت نے اس قناعت کے ساتھ انہیں نوازا ہے۔ آپ کبھی تقابل کر کے دیکھیں کسی مدرسے کے مدرس، مسجد کے امام اور دارالافتاء کے مفتی کی تنخواہ کا اپنے کسی سرکاری افسر اور ملازم کے ساتھ، ان کو کیا ملتا ہے اور ان کو کیا ملتا ہے، میں تقابل کرتا نہیں ہوں، صرف سمجھانے کیلئے بات کر رہا ہوں۔ یہ سب قناعت، قربانی، ایثار، خلوص اور محنت کا نتیجہ ہے۔ پرانے لوگوں کو یاد ہو گا، یہ مدرسہ نصرۃ العلوم ۱۹۵۲ء میں شروع ہوا تھا،

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ ہمارے چچا محترم تھے، استاذ اور مربی بھی تھے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے، ان کے ساتھ کچھ رفقاء تھے۔

میں بات سمجھانے کیلئے عرض کیا کرتا ہوں کہ حضرت والد صاحب مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ گکھڑ تشریف لائے تھے ۱۹۴۳ء میں، گکھڑ کی مسجد میں بیٹھ گئے، سن ۱۹۵۲ء تک دس سال۔ وہ اسی طرز کا مدرسہ تھا۔ مدرسہ کیا ہوتا تھا کہ ایک عالم دین کسی مسجد میں بیٹھتا تھا، اس کی علمی فضیلت یا امتیاز دیکھ کر طلبہ اکٹھے ہو جاتے تھے، کوئی نحو کا ماہر ہے تو نحو والے اکٹھے ہو گئے، کوئی فقہ کا ماہر ہے تو فقہ والے اکٹھے ہو گئے، کوئی حدیث کا ماہر ہے تو حدیث والے اکٹھے ہو گئے۔ کوئی نظم نہیں ہوتا تھا، طلبہ اکٹھے ہو جاتے تھے، پندرہ، بیس، تیس، چالیس حسب موقع، محلے والے روٹی دے دیتے تھے، مسجد میں طلبہ سوتے تھے اور استاذ پڑھاتے تھے، یہ مدرسہ ہوتا تھا۔ طلبہ استاذ کا ذوق دیکھ کر اکٹھے ہو جاتے تھے کہ یہ فلاں فن میں ماہر ہیں، اس زمانے میں والد صاحب کا ذوق زیادہ نحو کا تھا۔ نہ کوئی داخلہ ہوتا تھا، نہ کوئی خارجہ ہوتا تھا، نہ کوئی امتحان ہوتا تھا، نہ کوئی باقاعدہ نظم ہوتا تھا، علم اور فنون سیکھنے کیلئے آجاتے تھے۔ محلے والے روٹی دے دیتے تھے، طلبہ مسجد میں سو جاتے تھے، استاذ پڑھاتے تھے، نہ کوئی الگ سے تنخواہ ہوتی تھی، نہ سہولتیں ہوتی تھیں، کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ دور، دس سال حضرت والد محترمؒ نے گکھڑ کی مسجد میں اس ترتیب سے پڑھایا ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۲ء تک۔ سن ۱۹۵۲ء میں نصرۃ العلوم بنا، حضرت صوفی صاحبؒ نے بنایا، پھر دونوں بھائیوں کا مشورہ ہوا، والد صاحبؒ یہاں آنا شروع ہو گئے۔ الحمد للہ، اللہ رب العزت نے دینی مدارس کو یہ برکت عطا فرمائی خلوص اور ایثار کی وجہ سے۔ علماء کرام جو آپ کے سامنے ہیں، یہ کریانے کی دوکان ہی کر لیتے تو کچھ کما لیتے۔ ریڑھی لگا لیتے، ریڑھی لگانے سے ان کو دنیا کے اسباب کے لحاظ سے اس سے زیادہ مل جاتا تھا۔

لیکن میں جو بات کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ کہ یہ تقسیم ہم نے نہیں کی، حاشا و کلا۔ تقسیم ہم پر مسلط کی گئی ہے، تقسیم ہم پر ٹھونسی گئی ہے۔ اچھا چلیں تقسیم ہو گئی، ہم نے قبول کر لی کہ ٹھیک ہے یار، ہم اپنا کام کرتے ہیں تم اپنا کام کرو۔ اس سے بھی انکار نہیں، اس نظام تعلیم کی بنیاد تھی کہ مسلمان ملازمتوں میں جائیں، ڈیموکریسی میں جائیں، ٹھیک ہے ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اس تعلیم کی بنیاد کیا تھی؟ مسجد آباد رہے، مدرسہ آباد رہے،

حافظ، قاری، خطیب، مفتی اور مولوی مہیا ہوتے رہیں۔ یعنی وہ اپنا کام کرتے رہیں اور ہم اپنا کام کرتے رہیں۔

اگلی بات! پاکستان بن گیا۔ پاکستان کس مقصد سے بنا تھا؟ ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ''۔ پاکستان بننے کے بعد دونوں نصابوں کو اکٹھا ہونا چاہئے تھا یا نہیں؟ تقسیم کس نے کی تھی؟ انگریز نے۔ انگریز کے جانے کے بعد یہ تقسیم باقی رہنی چاہئے تھی یا ختم ہو جانی چاہئے تھی؟ کیا خیال ہے؟ یہ تقسیم کس نے ختم کرنی تھی؟ پاکستان بننے کے بعد یہ کالج اور مدرسے کی تقسیم ختم ہو جانی چاہئے تھی، لیکن کرنی کس نے تھی؟ کس کی ذمہ داری تھی؟ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ پاکستان کی تحریک کے بڑے راہنماؤں میں سے تھے، تحریک پاکستان کے قائدین میں سے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں پاکستان بننے کے بعد پانچ سال انتظار کرتا رہا اور کوشش بھی کرتا رہا کہ جو انگریزوں نے تقسیم کی تھی وہ ختم کرو۔ یہ تقسیم کیسے ختم ہونی تھی؟ وہ پانچ مضامین جو انگریزوں نے نصاب سے نکال دیے تھے، وہ واپس آنے تھے تو ختم ہونی تھی نا۔ پانچ سبجیکٹس جو انگریزوں نے نصاب سے نکالے تھے، قرآن، حدیث، فقہ، عربی اور فارسی۔ چلو فارسی پر ہم سمجھوتا کر لیتے، زبان نئی قبول کر لیتے، پہلے بھی ہم نے فارسی نئی زبان کے طور پر ہی قبول کی تھی، لیکن باقی چار مضامین نصاب میں واپس آنے تھے تو تقسیم ختم ہونی تھی۔ یہ چار سبجیکٹس نصاب میں واپس آئے بغیر تقسیم کیسے ختم ہو جانی تھی؟ چنانچہ وہ تقسیم چلتی رہی، ہمارا ریاستی نظام تعلیم، بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ آج تک ان چار سبجیکٹس کو، جن کو انگریز نے نکالا تھا، اپنے نصاب کا حصہ بنانے کیلئے تیار نہیں ہیں، اور نہ ہی یہ ریاستی نظام تعلیم میں پڑھائے جاتے ہیں۔

بلکہ ایک بات اور شامل کرنا چاہوں گا کہ ایک فارمولہ آیا تھا جس کا ہم نے تجربہ کیا تھا مگر وہ ناکام ہو گیا۔ ایوب خان مرحوم کے زمانے میں حکمرانوں نے ایک فارمولہ دیا کہ دونوں نصابوں کو اکٹھا کرتے ہیں جس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے اکٹھے تھے۔ جس کا ہم نے انکار نہیں کیا بلکہ ہم شریک ہوئے، چار پانچ جگہ تجربہ کیا گیا۔ سب کو دعوت دیتا ہوں کہ بہاولپور جائیں جا کر اسلامی یونیورسٹی کو دیکھیں، ایک تجربہ وہاں کیا گیا۔ بہاولپور کی اسلامی یونیورسٹی پہلے مدرسہ تھا جامعہ عباسیہ کے نام سے۔ ۱۹۶۲ء سے پہلے اس کا نام جامعہ عباسیہ تھا، یہ ریاست بہاولپور کا بڑا دینی مدرسہ تھا، اسے نصرۃ العلوم کی طرح ہی سمجھ لیں۔ وہاں یہ تجربہ کیا گیا کہ جامعہ عباسیہ کو جامعہ اسلامیہ کا نام دے کر اسلامی یونیورسٹی کا ٹائٹل اور گریڈ دے

دیا گیا۔ ایوب خان مرحوم نے ایسا کیا، یہ کہا گیا کہ یہاں دونوں نصاب اکٹھے پڑھائے جائیں گے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے اکٹھے کر دیے جائیں۔ یہ طے ہوا کہ تمام مکاتب فکر کے قابل ترین علماء یہاں بیٹھ کر تعلیم دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پڑھایا۔ حضرت علامہ شمس الحق افغانیؒ کو آپ جانتے ہوں گے، ایک موقع پر یہاں نصرۃ العلوم میں بھی تشریف لائے تھے ختم بخاری پر۔ ریاست قلات کے وزیر تعلیم تھے، وزارت چھوڑی اور ادھر آکر بیٹھ گئے تاکہ دونوں نصاب اکٹھے ہوں۔ بریلوی مکتب فکر کے بہت بڑے عالم حضرت مولانا سعید احمد کاظمیؒ نے ملتان میں اپنا مدرسہ چھوڑا اور بہاولپور آکر بیٹھ گئے۔ اہل حدیث مکتب فکر کے بہت بڑے عالم تھے حضرت مولانا عبد الغفار حسنؒ، انہوں نے بھی اپنا مدرسہ چھوڑا اور بہاولپور میں آکر بیٹھ گئے۔ کراچی سے حضرت مولانا عبد الرشید نعمانیؒ نے اپنا مدرسہ چھوڑا اور یہاں آکر بیٹھ گئے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے، اکٹھا کر لیتے ہیں۔

یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ہم نے انکار نہیں کیا، ہم ساتھ شریک ہوئے۔ ۱۹۶۲ء سے چند سال تک جامعہ اسلامیہ اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کی کیفیت یہ تھی کہ سارا نصاب اکٹھا پڑھایا جاتا تھا، پروفیسر صاحبان بھی تھے، مولانا صاحبان بھی تھے اور دونوں نصاب تھے۔ کافیہ بھی پڑھایا جاتا تھا اور انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن اس کے بعد ایک ایک کر کے دینی نصاب کی ہر شے نکال دی گئی۔ آپ جا کر دیکھ لیں، ایک سبجیکٹ بھی درس نظامی کا اس میں نہیں رہا۔ یہ تجربہ صرف جامعہ عباسیہ میں نہیں بلکہ اور بھی کئی جگہ ہوا۔ یہ میں نے صرف ایک مثال دی ہے اور یہ مثال اس لیے بھی دی ہے کہ ابھی دو ہفتے پہلے میں اسلامی یونیورسٹی بہاولپور میں ہو کر آیا ہوں۔ سیمینار تھا، آج اس کی رپورٹ چھپی ہے روزنامہ اسلام اور روزنامہ اوصاف میں، آپ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ وہاں کے وائس چانسلر صاحب محترم ہمارے دوست ہیں، ملک کی معروف شخصیت حضرت مولانا مفتی منیب الرحمن صاحب وہاں مہمان خصوصی تھے اور میں لیکچرار تھا۔ میں نے اس سیمینار میں عرض کیا، وائس چانسلر جناب! یہ اسلامی یونیورسٹی نہیں جامعہ عباسیہ ہے، سابقہ دینی مدرسہ ہے، اس کو آپ نے یونیورسٹی کا ٹائٹل دیا، ملک بھر سے علماء لا کر بٹھائے، انہیں بٹھا کر تعلیم اکٹھی کی، چند سال میں ایک ایک کر کے درس نظامی کے سارے مضامین نکال دیے گئے۔ ہم آپ سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ آپ جب دونوں نصابوں کو اکٹھا کرنے کا مرکز بن گئے تھے تو پھر یہ دونوں نصابوں کی دوبارہ تقسیم کس نے کی؟ ہم تو ساتھ بیٹھے تھے، ہم نے تو اپنے

مدرسے چھوڑے اور وہاں پر آئے، میں نے کہا کہ اب بھی ۱۹۶۲ء کی پوزیشن پر چلے جائیں، واللہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک والی اسلامی یونیورسٹی کی پوزیشن پر آجاؤ، ہم پہلے بھی تمہارے ساتھ تھے اور اب بھی ساتھ ہوں گے۔

لیکن ایسا نہیں ہوگا کہ نصاب اکٹھا کرو مگر اس طرح کہ آپ لوگ ہمارے مضامین کو تو شامل کرنے کیلئے تیار نہیں ہو۔ جبکہ ہم نے میٹرک تک پابندی قبول کرلی ہے، مدارس میں میٹرک تک پابندی ہے کہ نہیں؟ ہم خود پڑھاتے ہیں، دنیا بھر میں بیسک ایجوکیشن کیا ہوتی ہے؟ میٹرک اور انٹر میڈیٹ۔ اس کے بعد تو سارے الگ الگ ہوتے ہیں، ڈاکٹر الگ ہو جاتا ہے، انجینئر الگ ہو جاتا ہے، وکیل الگ ہو جاتا ہے، سائنسدان الگ ہو جاتا ہے۔ کیا وہاں سب کو اکٹھا پڑھاتے ہو؟ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے بعد آج کے کالجوں میں بھی سارے اکٹھے پڑھائے جاتے ہیں یا الگ الگ؟ کوئی سائنسدان بنتا ہے، کوئی ڈاکٹر بنتا ہے، کوئی وکیل بنتا ہے، الغرض! ملک بھر کے دینی مدارس میٹرک تک پابندی قبول کر چکے، لیکن آپ قرآن کریم ترجمہ کے ساتھ پڑھانے کی پابندی قبول نہیں کر رہے۔ باقی سبجیکٹس تو اپنی جگہ ہیں، نہ تم عربی پڑھانے کو تیار ہو، نہ قرآن کو بطور مضمون پڑھانے کو تیار ہو، نہ حدیث پڑھانے کو تیار ہو، نہ فقہ پڑھانے کو تیار ہو، یہ کونسا نصاب اکٹھا ہو رہا ہے؟

کیا آپ دوستوں کو میرا مقدمہ سمجھ میں آرہا ہے؟ میں اپنا کیس پیش کر رہا ہوں قوم کے سامنے۔ الحمدللہ پچاس سال سے اسی تعلیم سے وابستہ ہوں اور اس کا کیس پیش کر رہا ہوں کہ بھئی آپ لوگ تو نہ قرآن کو، نہ حدیث کو، نہ فقہ کو، نہ عربی کو، ان میں سے کسی ایک مضمون کو بھی بطور سبجیکٹ لینے کیلئے تیار نہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی طرح ایک مضمون بھی تم شامل کرنے کو تیار نہیں ہو۔ جبکہ ہم میٹرک تک پابندی قبول کر چکے، اب کیا کہتے ہو؟ اسلام آباد میں ایک میٹنگ تھی، میں نے اس میں کہا کہ جس دن آپ یہ سبجیکٹ شامل کرلیں گے پھر ڈومور کا مطالبہ ہم سے کرنا۔ مگر ون وے ٹریفک نہیں چلے گی، نہ چلی ہے نہ چلے گی، تم نے ایک تجربہ کر کے ہمیں پھسلانا اور ڈی ٹریک کرنا چاہا تھا۔ ہم نہیں ہوئے۔ سن ۱۹۶۲ء کا تجربہ ہمیں ڈی ٹریک کرنے کیلئے تھا، میں یہ بات بالکل دوٹوک عرض کرتا ہو۔ ۱۹۶۲ء میں بیسیوں مدرسے لیے گئے تھے کہ اکٹھا نصاب پڑھائیں گے اور سرکاری انتظام میں پڑھائیں گے، یہ ہمیں ڈی ٹریک کرنے کیلئے تھا، ہم ڈی ٹریک نہیں ہوئے، آج بھی نہیں ہو رہے اور کبھی نہیں ہوں گے۔ بھئی اکٹھا کرنا ہے تو ۱۸۵۷ء سے پہلے کی پوزیشن پر

آجاؤ جب سب کچھ اکٹھا تھا۔ ”لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین“ کوئی مسلمان ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا۔ ہم اپنے مقام پر کھڑے ہیں اور اس وقت تک اسی طرح کھڑے رہیں گے جب تک ہمارا ریاستی نظام تعلیم قرآن، حدیث، فقہ اور عربی کو بطور سبجیکٹ کے واپس لے کر ۱۸۵۷ء سے پہلے کی پوزیشن پر جانے کیلئے تیار نہیں ہوتا اور سسٹم اس کی گارنٹی نہیں دیتا۔

ہم تم سے لیتے کیا ہیں؟ بلکہ تم ہمیں دیتے ہو لیکن ہم نہیں لیتے، نہ ہی لیں گے۔ ہمیں اپنے ان بھائیوں کے صدقات وعطیات کافی ہیں، اسی پر گزارہ کریں گے، اور الحمد للہ بہت اچھا گزارہ کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے ٹریک سے نہیں ہٹیں گے، ہمیں ڈی ٹریک کرنے کی کوششیں بہت ہوئی ہیں، آئندہ بھی ہوں گی، اس وقت بھی ہو رہی ہیں، میں یہ بات نصرۃ العلوم میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں، یہاں کا میں بھی ایک خادم ہوں، اپنے بزرگوں کی مسند پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں، حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ کی مسند پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ ہم ڈی ٹریک نہیں ہوں گے ان شاء اللہ۔ ہم یہی کریں گے، البتہ تمہیں ڈی ٹریک ہونا پڑے گا، تمہیں اپنا رویہ بدلنا پڑے گا۔

بہرحال میں نے دو باتیں عرض کی ہیں، ایک یہ کہ یہ تقسیم جو موجود ہے وہ ہم نے نہیں کی۔ اور دوسری یہ کہ اب رکاوٹ بھی ہم نہیں ہیں، دونوں مضامین اور نظاموں کو اکٹھا کرنے میں ہم رکاوٹ نہیں ہیں۔ ایک بات اور کروں گا۔ آج کا فارمولہ کیا ہے کہ نصاب اکٹھا کر لو مگر اس طرح کہ دینی مضامین سارے نکال دو اور عصری سارے لے لو تو اکٹھا ہو جائے گا۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں، کہتے ہیں کہ امریکہ میں ایک ریسٹورنٹ پر بورڈ لگا ہوا تھا کہ اس ریسٹورنٹ میں اونٹ اور خرگوش کا گوشت مکس پکایا جاتا ہے۔ لوگ آتے تھے کہ اونٹ بھی کھائیں گے اور خرگوش بھی کھائیں گے۔ ایک دن ہمارے جیسا کوئی آدمی چلا گیا، کاؤنٹر پر پوچھا کہ جناب اونٹ اور خرگوش اکٹھا پکاتے ہیں؟ جواب ملا کہ ہاں۔ پوچھا کہ فارمولا کیا ہے؟ برابر برابر۔ کیسے؟ ایک اونٹ اور ایک خرگوش۔ میں اسٹیبلشمنٹ سے کہنا چاہ رہا ہوں، باوردی اور بے وردی سب سے کہ یہ فارمولہ نہیں چلے گا۔ ہم اپنا کام کرتے رہیں گے، ان شاء اللہ العزیز۔ تمام مشکلات، تمام ترکردارکشی اور تمام ترطعنوں کے باوجود کرتے رہیں گے اور یہ مدرسہ اسی طرح رہے گا، ان شاء اللہ تعالی۔

بخاری شریف اور عصرِ حاضر

(جامعہ انوار العلوم گوجرانوالہ - ۲۸ جنوری ۲۰۲۲ء)

اٹھائیس جنوری کو نماز جمعہ کے بعد جامعہ انوار العلوم مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں بخاری شریف کے آخری سبق کی تقریب سے خطاب کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ بخاری شریف کا آخری سبق پڑھنے والے جامعہ انوار العلوم اور مدرسہ مظاہر العلوم گوجرانوالہ کے تمام طلبہ، ان کے اساتذہ اور اہل خاندان کو مبارکباد دیتے ہوئے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے جامعہ انوار العلوم گوجرانوالہ کو قائم ہوئے ایک صدی مکمل ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج گوجرانوالہ کے مجلہ ''مہک'' میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں اس مدرسہ کی بنیاد ۱۹۲۲ء میں رکھی گئی تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد حضرت مولانا عبد العزیز محدث سہالویؒ نے، جو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے خطیب تھے، یہ مدرسہ قائم کیا۔ استاذ المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اس کا افتتاح کیا۔ حضرت مولانا عبد العزیزؒ کے بعد حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ اور ان کے بعد حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خانؒ اس کے مہتمم رہے۔ جبکہ ان کے بعد سے اس کے مہتمم مولانا داؤد احمد میواتی ہیں جو اپنی ٹیم مولانا عبد القدوس، مولانا مفتی جمیل احمد، مولانا قاضی کفایت اللہ، مولانا قاضی مراد اللہ، مولانا حافظ فضل الہادی اور دیگر رفقاء کے ساتھ آپ کے سامنے اسٹیج پر موجود ہیں۔

اس مناسبت سے ہم نے آپس میں مشورہ کیا ہے کہ شکرانہ کے طور پر ہم ۲۱ مئی کو جامعہ انوار العلوم کی صد سالہ تقریب کا اہتمام کریں گے جس میں سرکردہ اصحاب فکر و دانش مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ اور جامعہ انوار العلوم کی خدمات اور تاریخی کردار پر روشنی ڈالیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس کے بعد بخاری شریف کا آخری سبق پڑھنے والے طلبہ کرام کو، جواب علماء کہلائیں گے، چند باتوں کی طرف بطور سبق اور یاددہانی توجہ دلانا چاہوں گا۔

آپ حضرات نے بخاری شریف کے آخری باب اور روایت کی قراءت کی ہے جو ہم نے سنی ہے اور اس سے آپ کا سبق مکمل ہو گیا ہے۔ مگر آپ کے پڑھے ہوئے اسباق میں سے دو تین باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔

• ایک یہ کہ بخاری شریف کا نام ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیں کہ اس کتاب کا اصل نام بخاری شریف نہیں ہے، یہ عرفی نام ہے۔ اصل نام ''الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ'' ہے۔ اس نام کے ہر لفظ کا ایک مستقل پس منظر ہے۔ مگر ابھی صرف پہلے لفظ ''الجامع'' پر غور کر لیں جس کا مطلب علمی طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ''الجامع'' حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں عقائد، عبادات، احکام، اخلاقیات، مغازی، سیر اور تفسیر کے ضروری ابواب سب موجود ہوں۔ اس کا اصل معنی یہی ہے مگر عصری ماحول اور تقاضوں کے مطابق میں اس کا ایک اور مفہوم آپ حضرات کے ذہنوں میں ڈالنا چاہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسانی سوسائٹی کو درپیش کم و بیش تمام مسائل کا اس میں احاطہ کیا گیا ہے اور یہ کتاب سماج کی تمام ضروریات کی جامع ہے۔

بات سمجھانے کے لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ بخاری شریف کی دونوں جلدوں کی فہرست دیکھ لیں اور انسانی سوسائٹی کو آج کے دور میں درپیش مسائل کی ایک فہرست بنا کر اس سے تقابل کر لیں تو شاید ہی انسانی سوسائٹی کا کوئی ایسا مسئلہ ہو جو رہ گیا ہو اور امام بخاریؒ نے اس کے بارے میں قرآن و حدیث سے کوئی نہ کوئی راہنمائی پیش نہ کی ہو۔ بخاری شریف کی جامعیت کا یہ پہلو آج کے دور میں پیش نظر رکھنا اور اس کے مطابق اسے انسانی سماج کے راہنما کے طور پر پیش کرنا ضروری ہے اور اسے آپ کو مستقل طور پر سامنے رکھنا چاہیے۔

• دوسری گزارش یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے الجامع الصحیح کا آغاز ''کتاب الایمان'' سے کیا ہے اور ''کتاب التوحید'' پر اسے مکمل کیا ہے۔ دونوں کا تعلق ایمان و عقیدہ سے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کتاب الایمان میں عقائد کا مثبت طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ کن کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، جبکہ کتاب التوحید میں غلط عقائد اور عقائد کی غلط تعبیرات کا رد کیا گیا ہے۔ یہ پہلو بھی آج

کے دور میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس لیے کہ آج کا عالمی فلسفہ مسلمانوں سے پورے اصرار کے ساتھ یہ تقاضہ کر رہا ہے کہ ایمان و عقیدہ میں صرف مثبت بات کا ذکر کیا جائے اور منفی طور پر کوئی بات نہ کہی جائے۔ یعنی مسلمان صرف اپنے مذہب کی خوبیاں اور اس کا حق ہونا بیان کریں لیکن دوسرے مذہب کی کمزوریوں اور ان کے غلط ہونے کا تذکرہ نہ کریں۔ کیونکہ یہ ان کے خیال میں منفی بات ہے جس کا مذہب کے حوالہ سے ذکر نہیں ہونا چاہیے۔

یہ اسی طرز کا مطالبہ ہے جیسا قریش مکہ کے سرداروں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا کہ آپ اللہ تعالی کی عبادت کریں اور اس کی صفات اور کمالات بیان کریں مگر ہمارے خداؤں کی نفی نہ کریں اور ان کے بارے میں کوئی منفی تبصرہ نہ کریں۔ آج بھی ہم سے وہی مطالبہ ہے جس کے جواب میں یہ گزارش ہے کہ ہمارا تو بنیادی کلمہ ہی نفی (لا الہ) سے شروع ہوتا ہے اور ایمان و عقیدہ نفی اور اثبات دونوں سے تشکیل پاتا ہے۔ ہم کلمہ طیبہ میں باقی سب کی نفی کر کے ایک اللہ کی بات کرتے ہیں۔ اس لیے ہم سے یہ تقاضہ ہمارے بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے کہ کسی کی نفی نہ کریں اور صرف مثبت بات کریں۔ امام بخاریؒ نے بخاری شریف کا آغاز اور اختتام دونوں عقائد کے حوالہ سے کیا ہے اور مثبت عقائد کے ساتھ ساتھ منفی عقیدوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ صحیح عقائد کے اقرار کے ساتھ غلط عقائد اور عقائد کی غلط تعبیرات کی نفی بھی ضروری ہے اور اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

• تیسری بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ امام بخاریؒ کا طرز استدلال اور دائرہ استدلال بھی آج کے دور میں بہت زیادہ توجہ طلب ہے۔ وہ کسی بھی شعبہ اور دائرہ میں کوئی مسئلہ بیان کرتے ہیں تو اس کی دلیل کے طور پر قرآن کریم، حدیث و سنت، اور آثار صحابہ و تابعین کے تینوں دائروں سے دلیل لاتے ہیں۔ یہی اہل سنت کا دائرہ استدلال ہے۔ جبکہ آج کے دور میں یہ کہا جا رہا ہے کہ دلیل صرف قرآن کریم سے لائی جائے باقی امور شرعی دلیل کا مدار نہیں ہیں، جو قطعی طور پر غلط بات اور اہل سنت کے مسلمات کے منافی ہے۔

آپ حضرات نے بخاری شریف اول سے آخر تک پڑھی ہے اور پوری بخاری شریف میں یہ دیکھا ہے کہ کسی تفریق کے بغیر امام بخاریؒ شریعت کے ہر مسئلہ میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث و سنت اور آثار صحابہؓ و تابعینؒ کو بھی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ہمیں اس گمراہی کا مسلسل سامنا ہے جو بڑھتا جارہا ہے کہ شریعت کا مدار صرف قرآن کریم پر ہے، چنانچہ کسی بے علم شخص کے سامنے کوئی شرعی مسئلہ بیان کیا جائے تو وہ فوراً سوال کر دے گا کہ کیا یہ قرآن کریم میں ہے؟ اس صورتحال میں امام بخاریؒ کے طرز استدلال اور دائرہ استدلال دونوں کو اہتمام کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

• اس کے ساتھ آخری باب کا تذکرہ کروں گا جس کی قراءت کی گئی ہے کہ امام بخاریؒ نے اس میں اس غلط عقیدہ کا رد کیا ہے کہ قیامت کے دن اعمال اور اقوال کا وزن نہیں ہوگا۔ اس انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ قول اور عمل کا وزن کرنا قدیم زمانے میں مشاہدات اور محسوسات کے دائرے کی چیز نہیں تھی، اس لیے اسے خلاف عقل قرار دے دیا گیا۔ مگر محسوسات و مشاہدات کا دائرہ کبھی ایک جیسا نہیں رہا، قول اور عمل پرانے دور میں تولنے اور وزن کرنے کی چیزیں نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں بات اور عمل دونوں ریکارڈ میں محفوظ ہوتے ہیں اور ان کی مقدار اور وزن بھی معلوم ہو جاتا ہے، اس لیے اس بنیاد پر انکار کا کوئی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے ان سب باتوں سے قطع نظر آخری باب میں یہ کہا ہے کہ قول اور عمل دونوں کا قیامت کے دن وزن ہوگا۔ اور ایک دلیل حسب معمول قرآن کریم سے لائے ہیں کہ "ونضع الموازین" اور دوسری دلیل حدیث سے پیش کی ہے کہ "ثقیلتان فی المیزان" دو کلمے ہیں جو ترازو پر وزنی ثابت ہوں گے۔ جبکہ ایک لفظ کی وضاحت تابعی بزرگ حضرت مجاہدؒ کی زبان سے کی ہے۔ اس لیے اہل سنت کے اس دائرہ استدلال کا بھی امام بخاریؒ نے پورا اہتمام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

سورۃ الرحمٰن اور جدید سائنس

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۰ جنوری ۲۰۲۲ء)

سات جنوری کو گوجرانوالہ میں مولانا محمد سلیمان شاکر کی تصنیف ''تفسیر سورۃ الرحمن اور جدید سائنس'' کی تقریب رونمائی سے خطاب کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ میں مولانا محمد سلیمان شاکر کی تصنیف شائع ہونے سے قبل دیکھ چکا ہوں اور اس کے بارے میں میرا مختصر تبصرہ کتاب میں موجود ہے۔ آج اس کتاب کی رونمائی کی تقریب میں شرکت کا موقع فراہم کرنے پر مولانا موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

سائنس ایک عرصہ تک معقولات اور فلسفہ کا حصہ رہی ہے اور اس کے مباحث عقلیات کے دائرے میں ہوتے رہے ہیں۔ مگر جب سائنس معقولات کے ماحول سے آگے بڑھ کر مشاہدات اور تجربات کے دور میں داخل ہوئی تو اس وقت مغرب کی مذہبی قیادت مسیحیت کے پاس تھی اور پوپ اور چرچ کے ہاتھ میں مذہبیت کی باگ ڈور تھی۔ انہوں نے تجرباتی سائنس کو خدائی کاموں میں مداخلت قرار دے کر اس کی مخالفت کی اور سائنس کی بحث اور تجربات کرنے والوں کو مذہبی ماحول میں مقدمات اور سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے آکسفورڈ میں وہ مقامات دیکھے ہیں جہاں سائنس پر گفتگو اور تجربات کرنے والوں کو مذہبی عدالتوں میں سرسری سماعت کے بعد تعزیری سزائیں دی جاتی تھیں۔

اس سے یہ غلط فہمی دنیا میں عام ہوگئی کہ مذہب سائنس کا مخالف ہے اور سائنس میں پیشرفت مذہب کی نفی کے مترادف ہے۔ حالانکہ یہ صرف اس وقت کی مسیحی مذہبی قیادت کا موقف اور طرز عمل تھا جس کا اصل مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام کی صورتحال یہ ہے کہ مسلمانوں نے اندلس میں بیٹھ کر سائنس کو فلسفہ کے دائرے سے نکال کر تجربات اور مشاہدات کی دنیا سے روشناس کرایا اور موجودہ سائنس کی فکری اور تجرباتی بنیادیں فراہم کیں۔ مگر جب بنیادیں فراہم کرنے کے بعد ان بنیادوں پر عمارت کھڑی کرنے کا وقت آیا تو مسلمان اندلس سے پسپا ہوگئے اور ان کی قائم کردہ بنیادوں پر مغرب نے مشاہداتی اور تجرباتی سائنس کی عمارت کھڑی کردی جو کہ اب تک ترقی کی

راہیں طے کر رہی ہے۔ جبکہ ہم مسلمان وہاں سے ایسے پسپا ہوئے کہ سائنس کے حوالہ سے اپنا مقدمہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کا حوصلہ بھی نہ کر سکے۔

اصل صورتحال یہ ہے کہ قرآن کریم نے بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں آیات میں سائنس سے متعلقہ معاملات کا ذکر کیا ہے اور کائنات کے شواہد و احوال پر بحث کی ہے۔ آج کی مختصر گفتگو میں ان میں سے صرف دو کا ذکر کر سکوں گا۔

قرآن کریم نے ایک جگہ ذکر فرمایا ہے کہ ”سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم“ ہم لوگوں کو اپنی قدرت کی نشانیاں کائنات کے اطراف میں اور خود ان کے جسموں میں دکھائیں گے۔ یہ سائنس کی مشاہداتی پیشرفت کے بارے میں قرآن کریم کی پیشگوئی تھی جو اپنے وقت پر پوری ہوئی۔ فلکیاتی سائنس اور طبی سائنس کی صورت میں دنیا ان دونوں وعدوں کی تکمیل کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے اس کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ ”حتی یتبین لھم انہ الحق“ تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ حق ہے۔ گویا سائنس خدا کی ذات اور قدرت پر انسانوں کے ایمان کا مشاہداتی ذریعہ ہوگی اور جو لوگ دیکھے بغیر خدا کی ذات اور قدرتوں پر بالغیب ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات اور قدرتوں کا یہ مشاہدہ ایمان کی اس منزل تک پہنچائے گا۔

ایک اور مقام پر قرآن کریم نے ”اولوا الالباب“ (اصحاب دانش) کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ہے کہ ”ویتفکرون فی خلق السماوات والارض“ وہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ ان کے سامنے اس صورت میں آتا ہے کہ ”ربنا ما خلقت ھذا باطلا“ اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا۔ گویا زمین و آسمان کی تخلیق اور مسلسل تخلیقی ماحول پر غور و فکر کائنات کی مقصدیت کی طرف انسان کی راہنمائی کرتا ہے کہ یہ کارخانہ قدرت بے مقصد نہیں ہے بلکہ اس کو بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے کسی مقصد کے لیے یہ سب کچھ تخلیق کیا ہے۔

اس طرح قرآن کریم نے سائنس پر بحث و تمحیص اور اس کے تجربات و مشاہدات کا منطقی نتیجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور کائنات کے مقصد تخلیق کو سمجھنا قرار دیا ہے۔ اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سائنس جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے یہ دونوں باتیں واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ جس کا ایک پہلو یہ ہے کہ قرآن کریم نے کائنات اور انسان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حوالہ سے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے سائنسی تحقیقات

ان باتوں کی ایک ایک کر کے تائید کرتی جا رہی ہیں جس کی تازہ ترین مثال ایک مغربی سائنس دان کی یہ تحقیق ہے کہ انسان اس زمین کی مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ باہر کسی اور سیارے سے آیا ہے۔ اس کے ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ دلائل اپنے فہم کے مطابق اس نے ذکر کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کے علاوہ اس زمین کی کسی جاندار مخلوق کو زندگی کے اسباب فراہم کرنے کے لیے وہ کچھ نہیں کرنا پڑتا جو انسان کو کرنا پڑتا ہے۔ باقی تمام جاندار مخلوقات کی ضروریات ان کا ماحول خود بخود فراہم کر دیتا ہے جبکہ انسان کو سب کچھ از خود کرنا پڑتا ہے وغیر ذلک۔

اس تناظر میں مولانا محمد سلیمان شاکر کی یہ تصنیف ایک اچھی علمی پیشرفت ہے اور میرے خیال میں اس کا سب سے زیادہ خوشگوار پہلو یہ ہے کہ یہ ایک ''مولوی'' کی کاوش ہے۔ اللہ تعالی انہیں جزائے خیر سے نوازیں اور اس کاوش کو دنیا و آخرت کی قبولیت عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

۲۰۲۱ء

حلال و حرام کے دائرے اور حکمِ خداوندی

(جامعہ رحمانیہ، ماڈل ٹاؤن، ہمک، اسلام آباد - ۱۷ دسمبر ۲۰۲۱ء)

(۱۷ دسمبر ۲۰۲۱ء کو جامعہ رحمانیہ ماڈل ٹاؤن اسلام آباد میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں عقیدہ اور عبادت کے بعد جس موضوع پر سب سے زیادہ توجہ دلائی ہے وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے مسائل ہیں۔ حلال و حرام کھانے پینے اور لباس کے معاملات میں بھی ہے، باہمی تعلقات و حقوق کے حوالہ سے بھی ہے، اور کلام و گفتگو کے دائرہ میں بھی ہے۔ آج اس کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہوں گا۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ جائز و ناجائز کے یہ دائرے صرف اس زمین میں نہیں بلکہ زمین میں آنے سے پہلے جنت میں بھی تھے اور بعث بعد الموت کے بعد جنت اور دوزخ میں چلے جانے کے بعد بھی رہیں گے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارنے سے پہلے جنت میں یہ کہہ کر ٹھکانہ دیا تھا کہ دونوں میاں بیوی جنت میں رہو اور بلا روک ٹوک جو چاہو کھاؤ مگر اس درخت کے قریب نہیں جانا۔ یعنی جائز اور ناجائز کا فرق اس وقت بھی موجود تھا۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جب قیامت کے روز سب لوگ اپنے فیصلوں کے بعد جنت یا دوزخ میں چلے جائیں گے تو جنتیوں اور دوزخیوں میں مکالمہ ہوگا جس کے ایک مرحلہ میں دوزخ کے لوگ جنت والوں سے تقاضہ کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو پانی اور رزق عطا کیا ہے اس میں سے کچھ

ہمیں بھی بھیجو، تو جواب میں اہل جنت کہیں گے کہ ''ان اللہ حرمھما علی الکافرین'' اللہ تعالی نے یہ نعمتیں کافروں پر حرام کردی ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز قرار دینے کی اتھارٹی کے بارے میں اللہ تعالی نے دوٹوک بات کی ہے کہ یہ اتھارٹی صرف اللہ تعالی کے پاس ہے کہ وہ جسے حرام قرار دے اسے کوئی حلال نہیں کر سکتا، اور جسے حلال کہہ دے اسے کوئی حرام نہیں کہہ سکتا۔ حتی کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے بارے میں قسم اٹھائی کہ میں شہد استعمال نہیں کروں گا، تو اللہ تعالی نے فرمایا کہ ''لم تحرم ما احل اللہ لک'' جس چیز کو اللہ تعالی حلال فرما رہے ہیں آپ نے اسے کیوں حرام کر دیا ہے؟ حالانکہ اللہ تعالی اگر حلال و حرام کے حوالہ سے کسی کو کوئی اختیار دیتا تو مخلوقات میں جناب نبی اکرمؐ سے زیادہ کوئی اس کا مستحق نہیں تھا، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر ایک حلال چیز کو استعمال نہ کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالی نے فرمایا اور کہا کہ حلال و حرام کا فیصلہ صرف اللہ تعالی کے اختیار میں ہے۔ بلکہ حلال و حرام کی اتھارٹی میں کسی اور کو شریک کرنے کو جناب نبی اکرمؐ نے شرک کی ایک قسم فرمایا ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ نے نبی اکرمؐ سے سوال کیا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ ذکر ہے کہ عیسائیوں نے ''اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ'' اپنے احبار و رہبان کو اللہ تعالی کے سوا رب بنا لیا تھا حالانکہ ہم اسلام قبول کرنے سے قبل عیسائی تھے اور ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیا تمہارے ہاں احبار و رہبان کو حلال کو حرام کرنے اور حرام کو حلال قرار دینے کا اختیار سمجھا جاتا تھا؟ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ تو ہم سمجھتے تھے۔ فرمایا کہ ''اربابا من دون اللہ'' کا یہی مطلب ہے۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حلال و حرام کے اپنے اپنے دائرے بنا رکھے ہیں جو درست نہیں ہیں۔ آج کل بھی ہمارے فری اکانومی اور مارکیٹ اکانومی کے عنوان سے یہی ماحول ہے کہ جس چیز کو لوگ صحیح سمجھ لیں وہ جائز ہے اور جس چیز کو قبول نہ کریں وہ ناجائز ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اور اللہ تعالی کے مقرر کردہ حلال و حرام کے دائرے کو کراس کرنے کی کسی فرد، گروہ یا قوم کو اجازت نہیں ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کسی چیز کا حرام ہونا اس کے نقصان اور ضرر کی وجہ سے ہوتا ہے، اور حلال ہونا اس کے نفع اور فائدہ کے باعث ہوتا ہے۔ مگر

قرآن کریم نے اس کے علاوہ حلال و حرام کے اور اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً رمضان المبارک میں افطاری یا سحری کے اوقات میں ایک چیز کا استعمال چند لمحے پہلے جائز اور پھر ناجائز ہوتا ہے تو نہ چیز میں فرق پڑتا ہے نہ استعمال کرنے والے میں کوئی تبدیلی آتی ہے، صرف حکم بدلتا ہے کہ افطاری کے وقت سے پہلے استعمال کی اجازت نہیں تھی اس کے بعد اجازت مل گئی۔ اسی طرح سحری میں چند لمحے پہلے تک ایک چیز کھا پی سکتے تھے، وقت ختم ہوتے ہی وہ ممنوع ہوگئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جائز یا ناجائز ہونے میں اصل علت حکم خداوندی ہے، چیز کا نفع نقصان ثانوی چیز ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک جگہ ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل پر کچھ چیزیں حرام قرار دیں جو حلال و طیب تھیں مگر بنی اسرائیل کو ان کے استعمال سے روک دیا اور فرمایا کہ ''ذلک جزینٰھم ببغیھم'' یہ ہم نے ان کو سرکشی کی سزا دی تھی۔ جبکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کہ بہت سی اشیا کو ان کے ضرر اور نقصان کی وجہ سے حرام کیا گیا ہے۔ مثلاً شراب اور جوئے کے بارے میں فرمایا کہ ''رجس'' یہ گندگی ہے۔ شراب کے بارے میں کہا کہ یہ نشہ دیتی ہے، عبادات سے غافل کر دیتی ہے اور باہمی جھگڑوں کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح اور چیزوں کے بارے میں بھی ان کا نقصان بیان کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ حلال و حرام بھی اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے ہیں جن میں کسی کو ردوبدل کا اختیار نہیں ہے۔ اور اس کے لیے حرام کی جانے والی چیز کا نجس یا نقصان دہ ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ حلال و حرام کے اور اسباب بھی ہیں اور اس کی اصل علت اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ وہ مالک الملک ہے، جسے حلال کردے وہ قیامت تک حلال رہے گا اور جسے اس نے حرام کہہ دیا ہے وہ ہمیشہ حرام رہے گا۔ آج کل اس بات کو پیش نظر رکھنا بہت زیادہ ضروری ہے، اس لیے کہ یہ مغالطہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ جائز و ناجائز ہونے میں صرف نفع اور نقصان ہی بنیاد ہے جس کا فیصلہ خود سوسائٹی نے کرنا ہے۔ اور اسی بنیاد پر ہمارے دور میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے دائرے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

نبی آخر الزمانؐ اور اہلِ کتاب

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۲۳ نومبر ۲۰۲۱ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''الذین اتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم''۔ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ یعنی انہیں رسول اللہؐ کو پہچاننے میں کوئی دیر نہیں لگی مگر انکار کر دیا جس کی وجہ قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ ''حسدا من عندا نفسھم'' انہوں نے حسد کی وجہ سے ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ نہ صرف نبی آخر الزمانؐ کا انتظار کر رہے تھے بلکہ ''کانوا یستفتحون علی الذین کفروا من قبل'' اپنے مخالفوں کے خلاف نبی اکرمؐ کی برکت سے فتح کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ حسد اس بات کا تھا کہ انہیں یہ امید تھی کہ آخری پیغمبر ان کی قوم میں آئیں گے مگر وہ بنی اسرائیل کی بجائے بنو اسماعیل میں مبعوث ہوئے جو یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے انکار کی بڑی وجہ بن گیا۔ تاریخ و حدیث کے مختلف شواہد اس کی تائید کرتے ہیں کہ اہل کتاب اور اہل علم نے سابقہ کتابوں میں بیان کی گئی علامتوں کو دیکھ کر نبی اکرمؐ کو پہچان لیا تھا، ان میں سے دو چار کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

- سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بارہ سال کی عمر میں تھے کہ چچا محترم جناب ابوطالب انہیں شام کے تجارتی سفر میں ساتھ لے گئے، راستہ میں ایک مقام پر بحیرا نامی عیسائی راہب نے پہچان لیا اور جناب ابوطالب کو مشورہ دیا کہ وہ انہیں شام نہ لے جائیں، وہاں کے یہودی بھی میری طرح پہچان لیں گے اور ان سے برداشت نہیں ہوگا اس لیے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، چنانچہ چچا محترم انہیں وہیں سے واپس مکہ مکرمہ لے آئے۔

- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب غار حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو یہ واقعہ خلاف توقع اور خلاف معمول ہونے کی وجہ سے گھبراہٹ کا طاری ہونا فطری بات تھی جس پر ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے انہیں نہ صرف خود تسلی دی بلکہ اپنے خاندان کے ایک بزرگ ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عیسائی عالم تھے اور انجیل کا عربی میں ترجمہ کر کے لوگوں کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ انہوں نے نبی اکرمؐ سے غار حرا کا واقعہ سن کر کہا کہ یہ

وہی وحی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وادی طور میں نازل ہوئی تھی، اس کے ساتھ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جب آپ کو مکہ والے یہاں سے نکلنے پر مجبور کریں گے تو میں اگر اس وقت تک زندہ رہا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ یہ بھی ایک بڑے عیسائی عالم کی شہادت تھی کہ انہوں نے نبی اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کے طور پر پہچان لیا۔

• اس کے بعد جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ والوں کو ایمان لانے کی دعوت دینے پر پورا ماحول آپ کے خلاف ہو گیا۔ اور جب ایمان لانے والوں پر اہل مکہ کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو نبی اکرمؐ کی ہدایت پر کچھ صحابہ کرامؓ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے جہاں کا بادشاہ عیسائی تھا جس کا نام اصحمہؓ تھا اور نجاشی کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ قریش مکہ کی طرف سے مختلف شکایتیں کر کے اس سے تقاضہ کیا گیا کہ وہ ان مہاجرین کو قریش کے وفد کے ہمراہ مکہ مکرمہ واپس بھیج دیں۔ نجاشی بادشاہ نے مسلمانوں کو بلا کر ان کا موقف سنا تو اس دوران یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ ان مسلمانوں کا حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں موقف عیسائیوں کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کے ترجمان اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں تھوڑی دیر کے لیے پریشانی آئی کہ بات تو درست ہے اس لیے صاف بات کرنے کی صورت میں بادشاہ کا موڈ بدل بھی سکتا ہے لیکن پھر خیال آیا کہ سچ ہی بولوں گا اور کوئی گول مول بات نہیں کروں گا، نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ فرماتے ہیں کہ یہ سوچ کر میں نے حضرت مریم و عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں قرآن کریم کی متعلقہ آیات نجاشی کے دربار میں تلاوت کر کے سنا دیں جس پر خود نجاشی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے کہا کہ حقیقت تو وہی ہے جو انہوں نے بیان کی ہے، اس کے بعد نجاشی نے مسلمانوں کو نہ صرف پورا تحفظ دیا بلکہ خود بھی ایمان قبول کر لیا۔

• پھر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو وہاں ان پر ایمان لانے والوں میں حضرت سلمان فارسیؓ بھی تھے جو عیسائی

عالم تھے۔ ان کا تعلق فارس کے مجوسی خاندان سے تھا مگر عیسائیت قبول کر کے بہت سے اہل علم کے ساتھ طویل عرصہ گزار چکے تھے اور ان کی ہدایات پر اللہ کے آخری پیغمبر کی آمد کے انتظار اور تلاش میں تھے۔ انہیں کچھ لوگوں نے زبردستی پکڑ کر راستہ میں بیچ دیا اور کئی خاندانوں کی غلامی کرتے ہوئے یثرب کے ایک یہودی خاندان کے غلام کے طور پر قبا جا پہنچے جہاں نبی اکرمؐ ہجرت کے بعد کچھ عرصہ مقیم رہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ میں کئی روز تک عیسائی علماء کی بتائی ہوئی علامتوں کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں پرکھتا رہا اور بالآخر پہچان کر ایمان لے آیا اور حضور علیہ السلام کے خدام میں شامل ہو گیا۔

• اسی طرح بڑے یہودی عالم حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے بھی علامتوں سے پہچان کر اسلام قبول کیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

• اس سلسلہ میں تاریخ کی ایک اور اہم گواہی روم کے بادشاہ قیصر کی بھی ہے جو امام بخاریؒ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کے بعد دنیا کے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت کے لیے خطوط لکھے تو ایک گرامی نامہ قیصر روم ہرقل کے پاس بھی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں روانہ کیا۔ قیصر روم نے اس موقع پر صورتحال معلوم کرنے کے لیے مکہ مکرمہ کے کچھ لوگوں کو اپنے دربار میں بلانے کا اہتمام کیا جن میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی تھے جو اس وقت نبی اکرمؐ کے مقابلہ میں قریش مکہ کی قیادت کر رہے تھے۔ روم کے بادشاہ نے حضرت ابو سفیانؓ سے حضورؐ کے بارے میں مختلف سوالات کیے اور ان کے جوابات سن کر کہا کہ جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے وہ صحیح ہے تو حضرت محمدؐ واقعتا اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور میں خود ان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ مجھے اگر ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تو میں ان کے پاؤں اپنے ہاتھوں سے دھلانے کی سعادت حاصل کرنا چاہوں گا۔ مگر ایمان نہیں لایا جس کی وجہ خود بیان کی کہ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ آخری نبی تم عربوں میں آجائے گا۔

یہ بات قرآن کریم کے ارشاد گرامی کی تائید کرتی ہے کہ اہل کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان تو لیا مگر حسد کی وجہ سے ایمان لانے سے انکاری ہوئے۔ یہ اس حوالہ سے تاریخ کی پرانی شہادتیں ہیں جبکہ آج بھی صورت حال یہی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ مغرب کے بہت سے عیسائی اور یہودی دانشور نبی اکرمؐ کی تعریف میں کمی نہیں کرتے، خوبیاں بیان کرتے ہیں، کمالات کا تذکرہ کرتے ہیں اور تعلیمات کا حوالہ بھی دیتے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ عربوں کے نبی تھے اور عربوں کے لیے تھے۔ ان میں سے کچھ دانشور اسلام کو صحیح مذہب کہہ دیتے ہیں اور قرآن کریم کو الہامی کتاب کہنے میں بھی بخل نہیں کرتے مگر اس اضافے کے ساتھ کہ یہ عربوں کے لیے تھے، عرب تہذیب تھی اور عرب ثقافت تھی۔ آج کے مغربی دانشوروں کا ایک طبقہ اسلام کو، قرآن کریم کو اور جناب نبی کریمؐ کو عربوں کے دائرے میں محدود بیان کر کے تمام تر خوبیوں کے اعتراف کے باوجود ایمان لانے اور تسلیم کرنے سے گریز کرتا ہے اور قرآن کریم کے اس ارشاد کی عملی تائید کر رہا ہے کہ جن کو ہم نے کتاب دی تھی وہ نبی آخر الزمانؐ کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، انہیں پہچاننے میں غلطی نہیں لگتی مگر حسد کی وجہ سے اور نسلی برتری کے درپردہ احساس اور غرور کے باعث ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

تہذیبی یلغار اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ

(مسجد صدیق اکبرؓ، پیپلز کالونی، گوجرانوالہ - ۲۲ اکتوبر ۲۰۲۱ء)

مسجد صدیق اکبرؓ، پیپلز کالونی، گوجرانوالہ میں جلسۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ ابھی ہمارے شہر کے معروف قاری جناب قاری حماد انور نفیسی نے قرآن کریم کی بہت خوبصورت لہجہ میں تلاوت کی ہے اور ان سے پہلے مولانا ندیم احمد نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی تلاوت کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر کی تھی جبکہ ایک تلاوت قرآن کریم کا میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے شاہ حبشہ نجاشی کے دربار میں کی تھی اور وہ امت مسلمہ کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ سے متعلق ہے۔

مکہ مکرمہ میں جناب نبی اکرمؐ نے جب کفر و شرک کے ماحول میں توحید کی دعوت پیش کی تو سارا ماحول مخالف ہو گیا اور ایمان لانے والوں کے لیے طعن و تشنیع اور تشدد و اذیت کا بازار گرم ہوتا گیا جس میں مسلسل اضافہ کے باعث اہل ایمان سخت آزمائش اور امتحان کا شکار ہوئے اور کچھ حضرات نے نبی اکرمؐ سے ہجرت کی اجازت مانگی تاکہ کسی اور علاقے میں جاکر آزادی کے ساتھ اپنے دین پر عمل کر سکیں۔ انہیں حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت ملی جہاں مسیحی بادشاہ اصحمہؓ حکمران تھے اور نجاشی کہلاتے تھے۔ ان مہاجرین میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ بھی شامل تھے۔ مکہ مکرمہ والوں کو ان مسلمانوں کا حبشہ کی طرف ہجرت کر کے امن کے ساتھ زندگی گزارنا راس نہ آیا اور انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی سربراہی میں ایک وفد شاہ حبشہ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کے لیے روانہ کیا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ اس وقت قریش کے کیمپ میں تھے اور بہت ذہین ڈپلومیٹ سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے شاہ حبشہ کے دربار میں اپنا مقدمہ اس طرح پیش کیا کہ یہ لوگ ہمارے ماتحت اور غلام لوگ ہیں جو بھاگ کر حبشہ آگئے ہیں اور ہم انہیں واپس لے جانے کے لیے قریش کے وفد کے طور پر آئے ہیں۔ شاہ حبشہ نے مسلمانوں کا موقف معلوم کرنے کے لیے ان کے نمائندوں کو طلب کیا تو حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پیش ہوئے اور بتایا کہ ہم لوگ غلام اور بھاگے ہوئے لوگ نہیں ہیں بلکہ انہی کے قبیلہ کے انہی کی طرح کے آزاد لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے جن پر ایمان لانے کے باعث یہ لوگ ہمارے مخالف ہو گئے ہیں اور مسلسل اذیتوں کا انہوں نے ہمیں شکار بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے ہم نے آپ کے ملک میں آکر پناہ لی ہے تاکہ ان کے ظلم و تشدد سے محفوظ رہ سکیں۔

شاہ حبشہ نے مسلمانوں کا یہ موقف سن کر قریش کے وفد کی درخواست قبول کرنے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ پناہ لینے کے لیے ہمارے پاس آئے ہیں ہم انہیں واپس نہیں کریں گے اور یہ جب تک چاہیں گے ہماری پناہ اور امان میں رہیں گے۔ قریش کے وفد نے یہ دیکھ کر پینترا بدلا اور کہا کہ ان لوگوں کے عقائد اور خیالات حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں آپ لوگوں کے خیالات سے مختلف ہیں اور یہ انہیں آپ کی طرح نہیں مانتے۔ حضرت جعفرؓ فرماتے ہیں کہ یہ بات سن کر مجھے کچھ پریشانی ہوئی کہ حضرت مریم و عیسیٰ علیہما

السلام کے بارے میں ہمارا عقیدہ واقعتا عیسائیوں سے مختلف ہے اس لیے سوچ میں پڑ گیا کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہیے؟ اگر ہمارے عقیدہ کے اظہار سے شاہ حبشہ ناراض ہو گیا تو قریش کے وفد کا مقصد پورا ہو سکتا ہے، اور اگر گول مول بات کریں تو یہ ہمارے دین کے خلاف ہو گا اس لیے کہ صدق اور سچ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے۔

حضرت جعفرؓ فرماتے ہیں کہ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہر حال میں صحیح اور اصل بات ہی کہنی ہے نتیجہ جو بھی ہو۔ چنانچہ اللہ تعالی پر توکل کرتے ہوئے میں نے قریش کے اس اعتراض کے جواب میں شاہ حبشہ کے دربار میں قرآن کریم کی وہ آیات تلاوت کیں جو حضرت مریم و عیسی علیہما السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور جن میں ان دونوں بزرگوں کے حوالے سے مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان کی وضاحت کی گئی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ شاہ حبشہ نے قرآن کریم کی وہ آیات حضرت جعفرؓ کی زبان سے توجہ کے ساتھ سنیں اور متاثر ہوئے حتی کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے تلاوت سننے کے بعد کہا کہ جو کچھ سنا ہے وہی حقیقت ہے اس لیے میں ان پناہ گزینوں کو قریش کے مطالبہ پر واپس نہیں کروں گا۔ جس پر وفد ناکام واپس چلا گیا اور بعد میں شاہ حبشہ اصحمہ نجاشیؓ خود بھی مسلمان ہو گئے۔

یہ واقعہ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم آج بھی مغربی دنیا کے ساتھ مکالمہ کے اسی طرح کے ماحول سے دوچار ہیں، مغربی دنیا حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہما السلام کے بارے میں تو نہیں مگر دنیا پر مسلط کردہ اپنے فلسفہ و نظام اور تہذیب و ثقافت کے حوالہ سے ہم سے بار بار وضاحتیں طلب کر رہی ہے جس کے جواب میں مسلم دنیا کے حکمران گول مول باتیں کر رہے ہیں جبکہ بہت سے مسلم دانشوروں نے بھی مغرب کو مطمئن کرنے کے لیے اسلام کی بنیادی تعلیمات کے بارے میں بے جا تاویلات کا بازار گرم کر رکھا ہے، چنانچہ ہمارے خیال میں اس وقت مغربی دنیا کے فکر اور تہذیبی تقاضہ اور دباؤ کے مقابلہ میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے کردار اور عزم کو دہرانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور وقت آ گیا ہے کہ ہم قرآن کریم کی تعلیمات کسی قسم کی مرعوبیت اور تاویلات کے بغیر اصل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کریں اور بارگاہ ایزدی سے اس کے مثبت نتائج کا

یقین اپنے اندر پیدا کریں۔ خدا کرے کہ ہمارے حکمران اور دانشور وقت کی اس ناگزیر ضرورت کا پوری طرح احساس وادراک کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

سیرۃ النبیؐ اور علاج و پرہیز

(ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال گوجرانوالہ - ۱۰ اکتوبر ۲۰۲۱ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ میں محترم بھائی ڈاکٹر فضل الرحمن (ایم ایس) کا، ان کے رفقاء کا، اور یہاں کی انتظامیہ کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے حوالے سے محفل کا انعقاد کیا اور مجھے بھی موقع بخشا کہ میں آپ حضرات کے ساتھ اس مبارک محفل میں بیٹھوں اور اس کی برکات حاصل کروں۔ اللہ تعالی اس محفل کو قبول فرمائے اور ہمارے لیے دنیا و آخرت میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبتوں اور برکتوں کو تازہ کرنے کا ذریعہ بنائے، آمین۔

ابھی ہمارے نعت خواں بھائی بڑی خوبصورت نعت پڑھ رہے تھے، اس کا ایک جملہ میرا دل بار بار دوہرا رہا ہے ''میرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے''۔ یہ بات ہم یہاں بیٹھ کر تو کر ہی رہے ہیں لیکن اگر آپ تھوڑا سا نسل انسانی کی موجودہ مجموعی صورتحال کو دیکھیں تو زبان حال سے ہر انسان کے دل سے یہی آواز سنائی دے گی کہ ''میرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے''۔ آج انسانیت اسی موڑ پر کھڑی ہے جس پر جناب نبی کریمؐ نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر ''أیھا الناس'' کہتے ہوئے پہلی آواز لگائی تھی۔ جہاں انسانیت اس وقت کھڑی تھی آج بھی وہیں کھڑی نظر آتی ہے، آج پھر اسی آواز اور ویسی ہی بائیس تیئس سالہ محنت کی ضرورت ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر آواز لگائی تھی ''أیھا الناس'' اور بائیس تیئس سال کے بعد منی میں کھڑے ہو کر، جو صفا سے تقریبا دس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے، اپنی محنت کا نچوڑ کامیابی کے اس اعلان کے ساتھ کہ میں کامیاب جا رہا ہوں، ایک جملے میں بیان فرمایا تھا ''کل أمر الجاھلیۃ موضوع تحت قدمی'' جاہلیت کی ساری قدریں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ وہ جاہلیت کی ساری قدریں جو تیئس سال کی محنت سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹا ڈالی تھیں اور پاؤں تلے روند ڈالی تھیں، آج پھر نئے میک اپ اور نئی زیب و زینت کے ساتھ معاشرے پر مسلط ہیں۔ اس لیے انسانیت

آج پھر اسی موڑ پر کھڑی نظر آ رہی ہے اور پکار رہی ہے کہ ”میرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے“۔ خدا کرے کہ انسانیت کی اس آواز کو ہم سن سکیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ محنت، وہ پیغام، وہ بائیس تیئیس سالہ تگ و دو اور وہ قربانیاں نسل انسانی تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ انسانیت تو تلاش میں ہے، انسانیت تو پیاسی ہے، آج انسانی سماج اسی ماحول میں کھڑا ہے کہ کوئی چمکانے والا آئے اور وہ اپنے دل کو پیش کریں، اللہ کرے کہ اس حوالے سے ہم اپنا فرض ادا کر سکیں۔

اس وقت چونکہ میں ہسپتال میں مرض، مریض، علاج اور معالج کے ماحول میں بیٹھا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور سیرت مبارکہ کی روشنی میں عرض کروں کہ معالج کیسا ہوتا ہے، بیماری کیا ہوتی ہے اور علاج کیسے کیا جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ہلکے پھلکے انداز میں بات کروں کوئی فلسفہ اور لمبا چوڑا لیکچر نہ ہو۔ چنانچہ مریض، مرض اور معالج کیا ہوتے ہیں؟ اس پر دو تین واقعات عرض کرنا چاہوں گا اور اسی پر اکتفا کروں گا۔

- بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو کچھ حضرات کو مدینہ منورہ کی آب و ہوا موافق نہ آئی، بعض علاقوں کی آب و ہوا مرطوب ہوتی ہے، بعض کی خشک ہوتی ہے، ہر قسم کی آب و ہوا ہر کسی کو راس نہیں آتی۔ مدینہ منورہ اس وقت یثرب کہلاتا تھا، یثرب کی آب و ہوا مہاجرین کی ایک تعداد کو راس نہ آئی، لوگ بیمار ہو گئے اور ان میں دو بڑے نام ہیں، ایک حضرت صدیق اکبرؓ جنہیں بخار ہو گیا، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کپکپی کا بخار تھا، آپ ڈاکٹر صاحبان سمجھتے ہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ اور دوسرے حضرت بلالؓ تھے، وہ بھی مدینہ منورہ کی آب و ہوا راس نہ آنے کی وجہ سے بیمار ہو گئے۔ بیماری میں وطن زیادہ یاد آتا ہے اور وہ ابھی تازہ تازہ وہاں سے آئے تھے تو دونوں حضرات کو مکہ یاد آ رہا تھا اور وہ مکے کی پہاڑیاں اور پرانا وطن یاد کر رہے ہیں، وطن کی محبت فطری بات ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ اٹھتے بیٹھتے کہہ رہے ہیں کہ لوگ اپنے گھروں میں صبح کر رہے ہیں جبکہ میں مسافر ہوں اور حالت سفر میں ہوں، ایک انجانے علاقے میں ہوں، پتہ نہیں موت آئے گی تو کیا ہو گا، موت تو جوتے کے تسمے سے بھی

زیادہ قریب ہوتی ہے، نہ جانے کس حالت میں آئے گی، اس حوالے سے آپ اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت بلالؓ بازاروں میں گھوم رہے ہیں، وادیوں میں جا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ وہ دن کب آئے گا کہ میں مکے کی زمین دیکھوں گا ’’ھل اردن یوما میاہ مجنۃ‘‘ کبھی مجنہ کے چشموں پر جانے کا اتفاق ہو گا؟ کبھی مکہ مکرمہ کا اذخر گھاس دیکھوں گا؟ کبھی شامہ اور طفیل کے پہاڑ دیکھ سکوں گا؟ دونوں کا یہ حال تھا کہ بیماری کے حصار میں وطن کو یاد کر رہے تھے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ! مسئلہ پریشانی کا ہے، یہ ہمارے دونوں بزرگ اپنے وطن کو یاد کر کے شعر و شاعری کر رہے ہیں اور پریشان حال ہیں۔ تو اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔ مریض کا پہلا حق دعا ہے۔ فرمایا کہ یا اللہ! مدینے کی آب و ہوا کو ہمارے موافق کر دے، یا اللہ مدینے کی وبا کو جحفہ بھیج دے۔ یہ عرب کی سرحد تھی۔ یا اللہ مدینہ میں برکت عطا فرما، برکت جیسی مکے میں ہے۔ نہیں بلکہ ’’اَو اَکثر‘‘ مکے کی برکت سے دگنی عطا فرما، مکے کی محبت سے دوہری محبت ہمیں عطا فرما۔ غرضیکہ اس صورتحال کو دیکھ کر حضورؐ نے محسوس کیا اور دعا فرمائی۔

میں عرض کیا کرتا ہوں یہ حضورؐ کی دعا کی برکت ہے۔ مکہ کیلئے دعا ہمارے بڑے بابا جی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی جس کی برکات آج تک ہم دیکھ رہے ہیں، جبکہ مدینے کے لیے دعا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اور دوگنے کی دعا کی تھی، یعنی یا اللہ جو مکے کو برکت دی ہے مدینے کو دگنی دے، جو مکے سے ہماری محبت ہے مدینے سے دگنی عطا فرما۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہر مسلمان کو مکہ مکرمہ سے محبت ہے، اور یہ محبت ایمان کا حصہ ہے لیکن مدینے کا نام آتے ہی مسلمان کے دل کی دنیا بدل جاتی ہے جو حضورؐ کی دعا کا نتیجہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مریض کیلئے پہلا علاج دعا ہے اور دعا صرف مریض کیلئے نہیں بلکہ علاقے کے لیے بھی ہے۔

• جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں ایک بڑے صحابی ہیں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ میں بیمار ہو گئے، ہجرت کر کے گئے تھے، السابقون الاولون میں ان کا

شمار ہوتا ہے، آٹھ سال کے بعد مکہ مکرمہ میں گئے اور بیمار ہو گئے، بیماری زیادہ ہو گئی، بسا اوقات بیمار سمجھتا ہے میں جا رہا ہوں، اور کہتا ہے کہ میں تو گیا، ایسی کیفیت ہو جاتی ہے۔ نبی کریمؐ ان کے خیمے میں بیمار پرسی کیلئے گئے، انہوں نے آپؐ سے دو سوال کیے، پہلا سوال یہ کہ یا رسول اللہ! میں یہاں سے ہجرت کر کے گیا تھا، اب اپنے وطن واپس آیا ہوں اور یہاں آ کر بیمار ہو گیا ہوں، اگر یہاں فوت ہوا تو یہیں دفن ہوں گا تو میری ہجرت کیا بنے گا؟ کہیں وہ رائیگاں تو نہیں ہو جائے گی؟ دوسرا سوال یہ کیا کہ میں صاحب حیثیت آدمی ہوں، وارث ایک بیٹی کے علاوہ کوئی نہیں ہے، بیٹی کو بھی ضرورت نہیں ہے، وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے، کیا میں اپنا مال سارا صدقہ نہ کر دوں؟

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو حوصلہ دیا کہ تم اس بیماری میں مرنے نہیں والے، حوصلہ کرو، یہ صرف تسلی نہیں تھی بلکہ پیشگوئی تھی اور کمال کی پیش گوئی تھی، فرمایا کہ اللہ نے تجھ سے دنیا کی قوموں کو ابھی بڑا نفع پہنچانا ہے اور بڑی قوموں کا بیڑہ غرق کروانا ہے، حوصلہ رکھو، ابھی تجھ سے اللہ نے بڑے کام لینے ہیں، ”ینفع بک اللہ اقواما ویضر بک آخرین“ بہت سی قوموں کو تیرے ذریعے اللہ نفع دے گا اور بہت سی قوموں کو تیرے ذریعے نقصان پہنچائے گا۔ ابھی بڑے کام کرنے ہیں، حوصلہ رکھو، خیر یہ معجزہ بھی تھا جو وقوع پذیر ہوا۔ ایران کے فاتح سعد بن ابی وقاصؓ ہیں، کوفہ کے بانی اور معمار سعد بن ابن ابی وقاصؓ ہیں، کوفہ شہر آباد کیا تھا، حکم حضرت عمرؓ کا تھا، نگرانی انہوں نے کی ہے، بڑے معمار یہی تھے جن کی نگرانی میں کوفہ تعمیر ہوا۔ تو حضورؐ نے تسلی دی اور حوصلہ دیا کہ گھبراؤ نہیں ابھی تمہاری لمبی عمر ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھ سے بڑے کام لیں گے۔ تو مریض کا دوسرا حق حوصلہ اور تسلی دینا اور صبر دلانا ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین بھی یہی ہے، فرمایا مریض کی عیادت کرو، اور عیادت کیسے کرو؟ اس کو حوصلہ دو، اس کی پریشانی کا باعث نہ بنو، اس کو تسلی دو۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رضی اللہ عنہ کو حوصلہ دیا، چنانچہ وہ خاصا عرصہ زندہ رہے رہے، بڑے کام کیے، اللہ تعالیٰ نے ان سے دین کی بڑی خدمت لی۔

• ایک بات اور عرض کرتا ہوں، ایک دفعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیمار ہو گئے، بخار سے کچھ کمزوری آگئی۔ پھر ٹھیک ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجلس میں بیٹھے کھجوریں کھا رہے تھے، بخاری شریف کی روایت ہے، حضورؐ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ لیا کہ ابھی بیماری سے اٹھے ہو، خدا کے بندے کھجوریں چھوڑ دو، ان کے ہاتھ سے کھجوریں لے کر نیچے رکھ دیں کہ یہ تمہارے لیے فائدے مند نہیں ہیں۔ یہ مریض کا تیسرا حق ہے، یعنی پرہیز۔ جناب نبی کریمؐ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ کھجوریں لے لیں کہ ابھی تو بیماری سے اٹھا ہے پھر دوبارہ بیمار ہو رہا ہے؟ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ تیسرا حق مریض کا اس کو پرہیز کی تلقین کرنا، دیکھنا اور نگرانی کرنا ہے کہ کوئی چیز اس کو نقصان نہ دے۔

• اسے لطیفہ سمجھ لیں یا واقعہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ خود بیمار ہو گئے۔ آپؐ کے آخری ایام تو بڑی کمزوری کے گزرے ہیں، باری باری ازواج مطہراتؓ کے حجروں میں جانے میں دقت ہوتی تھی، بیمار کو دقت ہوتی ہی ہے۔ حضورؐ کا جی چاہا کہ مجھے ایک ہی حجرے میں رکھا جائے، حضرت عائشہ کا حجرہ تھا، ازواج مطہراتؓ نے محسوس کر لیا، بیوی سے زیادہ کون مزاج سمجھتا ہے، آپس میں مشورہ کیا اور سب نے کہا، یا رسول اللہؐ! آپ کو جہاں تسلی ہو وہیں رہیں، ایک جگہ ہی رہیں، کیونکہ باری باری حجرے بدلنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب آئے تھے تو چل نہیں پا رہے تھے، حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پاؤں سے گھسٹ کر آ رہے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں پاؤں سے زمین پر لکیریں پڑ رہی تھیں، کمزوری کی یہ کیفیت تھی، بیماری میں ایسا ہو جاتا ہے۔ اس دوران کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ساری ازواج مطہراتؓ بیٹھی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نیم بیہوشی کی کیفیت طاری ہے، سب کچھ دیکھ رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں لیکن کچھ بول نہیں پا رہے ہے۔ ازواج مطہراتؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ حضورؐ کو دوائی دینی ہے، دوائی لائی گئی تو حضورؐ نے ناں میں سر ہلایا، اشارے سے کہا کہ نہیں۔ سب آپس میں کہنے لگے کہ مریض تو منع کرتا ہی ہے، مریض کب خوشی سے دوائی پیتا ہے، سب بیبیوں نے جکڑا اور دوائی پلا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد افاقہ ہوا تو کہا کہ میں نے

تمہیں منع نہیں کیا تھا؟ کہنے لگیں یارسول اللہؐ! مریض تو منع کرتا ہی ہے، مریض کب خوشی سے دوائی پیتا ہے، فرمایا جب میں نے تمہیں منع کیا تھا تو پھر تم نے کیوں مجھے زبردستی پلائی ہے؟ اگلی بات یہ فرمائی کہ جو بیبیاں اس عمل میں شریک تھیں سب باری باری ایک دوسرے کو دوائی پلاؤ جیسے مجھے پلائی ہے، چاچا جی حضرت عباسؓ پاس کھڑے تھے، فرمایا، یہ اس کام میں شریک نہیں تھے ان کو نہ پلانا، باقی آپس میں ایک دوسرے کو زبردستی پلاؤ جیسے مجھے پلائی ہے۔ اب ایک دوسرے کو پلا رہی ہیں، ام سلمہؓ فرماتی ہیں یارسول اللہؐ! میرا تو روزہ ہے، فرمایا کوئی روزہ نہیں، بعد میں رکھ لینا، اسے بھی پلاؤ۔

میں اس کو یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ دل لگی اور خوش طبعی کا ماحول بھی رہنا چاہئے، مریض کے ساتھ اس کے ماحول کے مطابق معاملہ ہونا چاہئے، جناب نبی کریمؐ نے بیماری کے ایام کیسے گزارے ہیں اور بیماروں کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے، کس طرح محبت کے ساتھ، حضورؐ نے ان کے حقوق بیان کیے ہیں۔

جناب نبی کریمؐ نے بیمار کی بیمار پرسی کو، اس کے لیے دعا کو، اس کے علاج کو، اور اس کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کو حقوق میں شمار کیا ہے، اس سے اسے تسلی ہوتی ہے، اطمینان بڑھتا ہے، مریض کو حوصلہ رہتا ہے۔ آخر میں وہ بات پھر عرض کروں گا جو نعت خوان بھائی نے کہی تھی، آج پوری نسل انسانی دل سے یہ پکار رہی ہے کہ ”میرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے“ لیکن واسطہ بننا ہماری ذمہ داری ہے، اگر ہم واسطہ نہیں بنیں گے، اپنا کردار ادا نہیں کریں گے تو یہ جرم ہمارے ذمے ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس جرم کے ماحول اور نفسیات سے نکالے اور آج کے عالمی ماحول میں جناب نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے اپنا کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

فرقانِ حمید اور فاروقِ اعظمؓ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۰ اگست ۲۰۲۱ء)

قرآن کریم نے اپنا دوسرا نام ”الفرقان“ بتایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ”الفاروق“ کے لقب سے معروف ہیں، دونوں کا معنی حق و باطل میں فرق کرنے والا بنتا ہے۔ جبکہ اس لفظی مناسبت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے حوالہ سے حضرت عمر رضی

اللہ عنہ کا زندگی بھر کا طرز عمل بھی اس مشابہت و مماثلت کی گواہی دیتا ہے جس کی چند جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب گھر سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ قتل کرنے کے ارادے سے تلوار لے کر چلے تھے مگر راستہ میں بہن کے گھر قرآن کریم سننے کا موقع مل گیا اور اس سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے دور میں مختلف جنگوں میں حافظ قرآن کریم صحابہ کرامؓ کی کثرت کے ساتھ شہادت کی خبریں آنے لگیں تو حضرت عمرؓ کی تجویز بلکہ تحریک پر قرآن کریم کو کتابی شکل میں مرتب کر کے محفوظ کر لیا گیا۔

حضرت عمرؓ کی خلافت تک لوگ رمضان المبارک میں عشاء کے بعد مختلف ٹولیوں کی صورت میں اور اکیلے اکیلے نوافل میں قرآن کریم پڑھا کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے سب کو ایک امام کے پیچھے اکٹھے کر کے تراویح پڑھنے کا حکم دیا اور اس طرح مساجد میں باجماعت تراویح اور مکمل قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا بابرکت عمل شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

حضرت عمرؓ کی مختلف آرا کی تائید میں قرآن کریم کی متعدّد آیات نازل ہوئیں جنہیں ''موافقات عمرؓ'' کہا جاتا ہے اور جن کی تعداد امام سیوطیؒ نے ''تاریخ الخلفاء'' میں بائیس تک شمار کی ہے۔

حضرت عمرؓ نے مساجد میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے باقاعدہ مکاتب قائم کرنے کا حکم دیا اور مختلف علاقوں میں ان کا آغاز ہوا۔

حضرت عمرؓ نے صوبائی گورنروں کو قرآن کریم کے حفاظ شمار کرنے کا حکم دیا اور بیت المال سے ان کے وظیفے مقرر فرمائے جو ''طبقات ابن سعدؒ'' کی ایک روایت کے مطابق اڑھائی ہزار درہم سالانہ تک تھے۔

قرآن کریم کی تعلیم کے بارے میں امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے اپنے گورنروں کو باقاعدہ احکامات جاری کیے اور تفصیلی خطوط لکھے جن میں سے بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسی اشعریؓ کے نام ان کا مکتوب گرامی ''کنز العمال'' جلد اول میں اس طرح مذکور ہے۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ کے بندے عمر بن الخطابؓ کی طرف سے عبداللہ بن قیسؓ (ابو موسی اشعری) اور حفاظ قرآن کے نام۔ السلام علیکم۔

واضح ہو کہ یہ قرآن کریم تمہارے لیے باعث اجر و ثواب ہونے والا ہے لہذا اس

کی تعلیم پر عمل کرو اور اسے اپنے مقاصد کا آلۂ کار نہ بناؤ۔ جو قرآن کریم کو اپنا قائد و متبوع بنائے گا قرآن کریم اسے جنت کی سیر کرائے گا۔ قرآن کریم کو خدا کے حضور تمہارا سفارشی ہونا چاہیئے نہ کہ تمہارے خلاف شکایت کرنے والا، کیونکہ قرآن جس کا سفارشی ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جس کے خلاف شکایت کرے گا وہ دوزخ میں جلے گا۔ جب خدا کا بندہ رات میں اٹھتا ہے اور مسواک کر کے وضو کرتا ہے، پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھتا ہے تو فرشتہ اس کا منہ چومتا ہے اور کہتا ہے کہ پڑھو پڑھو، تم پاک و صاف ہوگئے، قرآن کریم پڑھ کر تمہیں لطف آئے گا۔ قرآن کریم ہدایت کا سرچشمہ، علم کا پھول اور رحمن کا تازہ کلام ہے۔ اگر رات میں اٹھنے والا بغیر مسواک کے وضو کرتا ہے تو فرشتہ اس کی نگرانی تو کرتا ہے لیکن منہ نہیں چومتا۔ نماز میں قرآن پڑھنا ایسا ہے جیسے کسی کو چھپا ہوا خزانہ مل جائے اور مخفی دولت حاصل ہو جائے۔ قرآن کریم پڑھا کرو، نماز نور ہے، زکوۃ برہان ہے، صبر روشنی ہے، روزہ ڈھال ہے اور قرآن تمہارے بارے میں ایک دلیل ہے۔ قرآن کریم کا احترام کرو اور اس سے بے اعتنائی نہ برتو کیونکہ خدا اس کی عزت کرتا ہے جو قرآن کریم کی عزت کرتا ہے اور اس کو بے آبرو کر دیتا ہے جو قرآن کریم کی بے حرمتی کرتا ہے۔ جو شخص قرآن کریم پڑھے، اس کو یاد کرے اور پھر اس کے مطابق عمل کرے، اللہ تعالی اس کی دعا قبول کرتا ہے، دعا کرنے والا چاہے تو خدا دنیا میں اس کی دعا کو پورا کر دیتا ہے ورنہ اس کی مانگی ہوئی چیز آخرت کے لیے جمع ہو جاتی ہے۔ یاد رکھو خدا کا انعام بہترین اور ہمیشہ رہنے والا ہے اور یہ ان لوگوں کو نصیب ہوگا جو صاحب ایمان ہیں اور اپنے مالک پر بھروسہ کرتے ہیں۔"

فرقان حمید اور فاروق اعظمؓ کا یہ تعلق جہاں امیر المومنین حضرت عمرؓ کی فضیلت و عظمت کی شہادت ہے وہاں قیامت تک کے مسلمان حکمرانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہے کہ کسی مسلم ریاست کے حکمرانوں کا قرآن کریم کی تعلیمات کے فروغ کے حوالہ سے کیا کردار بنتا ہے۔ اللہ تعالی سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حدیث و سنت کی قانونی حیثیت

(جامعہ اسلامیہ محمدیہ، فیصل آباد - ۱۷ جون ۲۰۲۱ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج کل سوشل میڈیا پر سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ محمد بن سلیمان کا ایک انٹرویو گردش کر رہا ہے جس میں انہوں نے قرآن مجید اور سنت و حدیث کی قانونی حیثیت پر گفتگو کی ہے۔ طویل انٹرویو ہے، انہوں نے کیا کہا ہے اور کیا کہنا چاہتے ہیں وہ ایک طرف، مگر اس سے جو کچھ سمجھا گیا ہے اور جو سمجھا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں قانون کی بنیاد قرآن کریم ہے، حدیث و سنت کی کچھ چیزیں ہیں، لیکن عموما حدیث و سنت قانون کی بنیاد نہیں ہے۔ ان کی باتوں سے جو سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سعودی عرب کا اپنا ایک نظام ہے، آل الشیخ وہاں مذہبی، تعلیمی اور قانونی امور کے ذمہ دار ہیں، یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ واضح کریں کہ سعودی عرب کا موقف کیا ہے؟ یہ ریاست کا موقف ہے یا شہزادہ کا اپنا موقف ہے؟ آل الشیخ یعنی شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کا خاندان سعودی عرب کے نظام حکومت میں برابر کا شریک ہے اور معاہدہ کے تحت وہ مذہب، قانون اور تعلیم تینوں کے نگران ہیں، یہ اصل میں ان کا کام ہے۔ لیکن جو بات سمجھی جا رہی ہے اس کی اصولی پوزیشن کیا ہے، اس پر میں دو تین حوالوں سے بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ شہزادہ محمد بن سلمان مسلمانوں کی بڑی شخصیت ہیں، دنیا بھر میں اس سلسلہ میں مغالطے اور غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں، اس لیے اس کی اصولی حیثیت پر بات کروں گا، سعودی عرب کے علماء کی ذمہ داری ہے، اس کی اصولی حیثیت کیا ہے؟

کیا ایک اسلامی ریاست میں اور اسلامی حکومت میں قرآن کریم کے ساتھ سنت رسول قانون اور حکم کی بنیاد ہے یا نہیں ہے؟ اس پر چند باتیں مختصرا عرض کرنا چاہوں گا۔

1. جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں بہت سے لوگوں کو مختلف علاقوں کا حاکم مقرر کیا تھا اپنے نمائندے کے طور پر، ان کو ہدایات بھی دی تھیں، وہ حکومت بھی کرتے تھے اور علاقہ میں قانون بھی نافذ کرتے تھے۔ ان میں سے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنایا تھا، بخاری شریف کی روایت ہے ان کو یمن کا حاکم بنایا، اور ڈیوٹی پر بھیجنے سے پہلے ان کا انٹرویو لیا، پوچھا کہ اگر وہاں کوئی مسئلہ پیش آیا تو فیصلہ کیسے کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا "بکتاب اللہ" میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، قرآن کریم

میں جو چیز ملی اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ نبی کریمؐ نے پوچھا ''ان لم تجد'' اگر کتاب اللہ سے کوئی حکم نہ ملا تو کیا کرو گے؟ عرض کیا ''فبسنتک'' تو پھر یا رسول اللہ! آپ کی سنت پر چلوں گا، سنت و حدیث میں دیکھوں گا کوئی بات مل گئی تو اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا ''فان لم تجد'' اگر میری کوئی حدیث و سنت بھی سامنے نہ ہوئی تو پھر کیا کرو گے؟ تو معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا ''اجتھد براءیي ولم الو'' میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، پوری کوشش کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس پر نبی کریمؐ نے معاذ بن جبلؓ کو اس کامیاب انٹرویو پر یہ کہہ کر مبارکباد اور شاباش دی ''الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یحب و یرضی'' اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ خود راضی ہے۔ تو جناب نبی کریمؐ کی وہ ہدایات جو آپ نے اپنے زمانے میں مختلف علاقوں کے حاکم مقرر کرتے ہوئے دی تھیں ان میں سنت بھی قانون کے ماخذ کے طور پر حضورؐ نے خود فرمایا۔ اول قرآن مجید، اس کے بعد حدیث و سنت، اس کے بعد اجتہاد۔

2. جناب نبی کریمؐ کے بعد صحابہ کرامؓ میں جب خلافت آئی تو باقی بحثوں میں پڑے بغیر صحابہ کرامؓ میں سے سات یا آٹھ بزرگ ہیں جنہوں نے بطور حکمران باقاعدہ حکومت کی، خلفاء صحابہؓ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت حسن، حضرت معاویہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور حضرت مروان بن حکمؒ کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ ان کو تابعین میں شمار کریں یا صحابہ میں، اگر وہ صحابہ میں شمار ہوتے ہیں جیسے بعض محدثین کرتے ہیں تو آٹھویں بزرگ یہ ہیں۔ چلیں آپ سات ہی گن لیں۔ ان حکمران صحابہ کرام کا طرز عمل کیا تھا؟ ان کی حکومت کے دور میں اور حکومت کے نظام میں سنت قانون کا ماخذ تھی یا نہیں؟ میں دیگر بحثوں میں نہیں پڑتا لیکن تاریخی تسلسل عرض کر رہا ہوں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا معمول یہ تھا کہ کوئی مسئلہ پیش آتا تھا تو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرتے تھے، اگر قرآن سے نہیں ملتا تھا تو پھر حضورؐ کی سنت تلاش کرتے تھے، اس میں سے بھی نہ ملتا تو پھر صحابہؓ سے مشورہ کرتے تھے۔ یہ تین درجے تھے۔ حضرت عمرؓ تو کئی کئی مواقع پر

باقاعدہ پوچھا کرتے تھے کہ کسی کو حضورؐ کی کوئی حدیث معلوم ہے؟ یہ مسئلہ پیش آگیا ہے تو نبی کریمؐ کا کوئی ارشاد یا کوئی فیصلہ کسی کے علم میں ہے؟ ان کی ترتیب بھی یہی تھی، قرآن کریم، اس کے بعد حدیث و سنت حکم کے لیے بھی اور قانون کے لیے بھی، اس کے بعد صحابہ کرامؓ کا مشورہ۔ یہ میں نے دو مثالیں دی ہیں ورنہ تمام حاکم صحابہ کی ترتیب یہ تھی کہ ان کی قانون اور حکم دونوں میں پہلی بنیاد قرآن کریم ہوتی تھی، دوسری بنیاد حدیث و سنت ہوتی تھی، اور تیسری بنیاد صحابہ سے مشورہ تھی، اس کو اجتہاد کہہ لیں یا اجماع کہہ لیں۔

اس کی ایک مثال دوں گا تاکہ بات صحیح سمجھ آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کو جب مرتدین اور محاربین کا معرکہ پیش آیا، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے ایک بات سے اختلاف کیا۔ منکرین ختم نبوت کے تین گروہ تھے، ان سے لڑنے میں تو کوئی اختلاف نہیں تھا، باقی مرتد قبائل سے لڑنے میں کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن منکرین زکوۃ کے خلاف لڑنے سے حضرت عمرؓ نے اختلاف کیا اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ ان سے نرمی کریں۔ بخاری شریف کی مفصل روایت ہے۔

حضرت ابوبکر منکرین زکوۃ کے خلاف لڑنا چاہتے تھے اور لڑے بھی، جبکہ حضرت عمرؓ منکرین زکوۃ کے خلاف لڑائی کے حق میں نہیں تھے، البتہ بالآخر قائل ہو گئے تھے۔ جس بات کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دونوں حضرات کی دلیل کیا تھی؟ ایک حدیث ہے، دونوں کی دلیل وہی حدیث تھی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے فیصلے سے اختلاف کیا یہ کہہ کر کہ جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا ہے ”من قال لا الہ الا اللہ عصم منی مالہ ودمہ“ جس نے کلمہ پڑھ لیا ہے اس نے اپنی جان بھی مجھ سے محفوظ کر لی ہے، مال بھی محفوظ کر لیا ہے۔ حضرت عمر کی دلیل یہ تھی کہ یہ منکرین زکوۃ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اس لیے ان کی جان و مال سے تعرض نہیں کر سکتا، اس لیے آپ ان سے لڑائی نہ لڑیں، کلمہ پڑھنے کی وجہ سے ان کی جان اور مال محفوظ ہو گئے ہیں، اب ہم ان سے تعرض نہیں کر سکتے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا کہ حدیث کا اگلا حصہ بھی پڑھ لیں، حدیث یہ ہے ”من قال لا الہ الا اللہ

عصم منی مالہ ودمہ فحسابہ علی اللہ الا بحق الاسلام" یا "الا بحقہ"۔ مطلب یہ کہ اگر اسلام کے حق میں یا اللہ کے حق میں کوئی مسئلہ ہوگا تو یہ مال اور خون کی عصمت نہیں رہے گی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا "الزکوۃ حق الاسلام" زکوۃ اسلام کا حق ہے اور یہ اسلام کے حق سے انکار کر رہے ہیں، اس لیے یہ استثناء میں شامل ہیں، پہلے میں شامل نہیں ہیں۔

ایک ہی حدیث کا پہلا جملہ حضرت عمرؓ کی دلیل تھی اور اسی حدیث کا دوسرا جملہ حضرت ابوبکرؓ کی دلیل تھی۔ جوبات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ دونوں کا مستدل حدیث تھی، وہ بھی حدیث سے استدلال کر رہے ہیں لڑائی لڑنے پر، اور یہ بھی حدیث سے استدلال کر رہے ہیں لڑائی نہ لڑنے پر۔ بالآخر حضرت عمرؓ فرمانے لگے "شرح اللہ صدری کما شرح صدر ابی بکر" اللہ تعالی نے میرا سینہ بھی کھول دیا میرا بھی شرح صدر ہو گیا جیسے حضرت صدیق اکبرؓ کا شرح صدر ہو گیا تھا اس لیے میں نے اپنا اختلاف واپس لے لیا۔ لیکن جوبات میں بتانا چاہ رہا ہوں وہ یہ کہ حضور کے دونوں جانشینوں حضرات شیخینؓ نے ایک مسئلہ پر اختلاف کیا ہے تو دونوں کی دلیل حدیث تھی۔

یہ میں نے ایک مثال کے طور پر عرض کیا ہے ورنہ بیسیوں مثالیں موجود ہیں، صحابہ کرامؓ کے دور میں جتنے بزرگوں نے بھی حکومتیں کی ہیں آپ ان کے فیصلے پڑھ لیں، ان کی ترتیب یہی تھی قرآن کریم، حدیث و سنت، اس کے بعد اجتماعی مشاورت جس میں اجتہاد اور اجماع صحابہؓ سب میں شامل ہیں۔

3. امت میں جتنے بھی علمی اور فقہی مکاتب فکر ہیں، فقہی مکاتب فکر جو احکام کی تشکیل کرتے ہیں، قانون بناتے ہیں، اہل سنت کے دائرے میں پانچ ہیں: حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور ظاہری۔ ظاہری آج کل سلفی کہلاتے ہیں۔ یہ پانچ مکاتب فکر ہیں جو احکام، قوانین اور ضوابط کی تشکیل کرتے ہیں، تشریح کرتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں۔ ان پانچوں کی متفقہ بات یہ ہے کہ سب سے پہلی دلیل قرآن کریم ہے، اس کے بعد حدیث سنت ہے، اس کے بعد اجماع امت اور قیاس ہیں جو کہ اجتہاد کے دائرے میں ہیں۔ مشاورت، اجماع اور قیاس ایک ہی دائرے کی چیزیں ہیں، یہ تیسرا مستدل ہے۔ یہ اہل

سنت کے دائرے میں امت کے تمام فقہی مکاتب فکر کا متفقہ موقف ہے اور اہل سنت کے ہاں چودہ سو سال سے اجماع چلا رہا ہے کہ ہمارے عقائد کی بنیاد بھی اور احکام کی بنیاد بھی یہ چار چیزیں ہیں، اس کے چار درجے ہیں۔ (۱) قرآن کریم، (۲) حدیث و سنت، (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔ اجماع اور قیاس صحابہؓ کے دور میں مشاورت کے دائرے میں تھا۔

4. حدیث اور سنت کو قانون کا ماخذ نہ ماننا یا اس کو حجت قطعیہ تسلیم نہ کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمیں ہر دور میں اس سے سابقہ رہا ہے، لیکن پہلے یہ سمجھ لیں کہ یہ انکار کیوں کیا جاتا ہے اور حدیث کو دلیل کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا؟ اس لیے کہ اگر حدیث کو حجت تسلیم کرلیں تو ہم قرآن کریم کی تعبیر اور تشریح میں پابند ہو جاتے ہیں کہ اس کے کسی لفظ اور آیت کی وہی تشریح ہو گی جو حضورؐ نے فرمائی ہے۔ ہم تو الحمد للہ حدیث کو مستقل حجت تسلیم کرتے ہیں، لیکن اگر حدیث کو درمیان سے نکال دیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعبیر، تشریح اور اطلاق ہماری صوابدید پر ہو گا کہ قرآن کریم کی فلاں آیت کی تشریح کیا ہے؟ ہر دور کی عقل اس کی تشریح کرے گی، ہر دور کی صوابدید اس کی تشریح کرے گی، ہم قرآن کریم کی تعبیر اور تشریح میں پابندی سے آزاد ہو جاتے ہیں اور ہمیں اختیار مل جاتا ہے کہ ہم جیسے چاہیں تشریح کرلیں، جیسے چاہیں تعبیر کرلیں، جبکہ حدیث ہمیں پابند کرتی ہے کہ قرآن کریم کی وہ تعبیر اور تشریح ہمارے ہاں قابل قبول ہو گی جو حضورؐ نے کی ہے اور صحابہؓ نے جس پر عمل کیا ہے۔

اس پر امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطابؓ کا ایک ارشاد نقل کرنا چاہوں گا، ایک موقع پر آپؓ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ دلائل کی باتیں کرتے ہیں ان کے سامنے قرآن نہ پیش کیا کرو کیونکہ ”کلام اللہ ذو وجوہ“ قرآن کریم کے ایک جملے کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، لوگ اپنی مرضی کا معنی کریں گے۔ اس لیے جب بھی دلیل پکڑو تو حدیث سے پکڑو، کیونکہ سنت واضح ہے، دو ٹوک ہے۔ سنت اور حدیث بتاتی ہے کہ فلاں آیت کا معنی یہ ہے جبکہ قرآن کریم ذو وجوہ ہے اس کے الفاظ کا ایک معنی بھی کیا جا سکتا ہے اور دوسرا بھی، ایک لفظ کے کئی معنی کیے جا سکتے ہیں۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں، اگر سنت کو درمیان سے نکال دیں تو قرآن مجید میں ارشاد ہے "والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما" کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ "فاقطعوا ایدیھما" کا معنی کیا ہے؟ اگر حضورؐ سے پوچھیں گے تو معنی ہے عملی طور پر ہاتھ کاٹنا، جیسا کہ آپ نے فاطمہ مخزومیہ کا ہاتھ کاٹا تھا، لیکن اگر درمیان سے حدیث کو نکال دیں تو ہمارے ایک متجدد صاحب فرماتے ہیں کہ اصل میں یہ محاورہ ہے۔ "ہاتھ کاٹ دو" سے مراد ہے کہ ان کو آزاد نہ چھوڑو، کام کرنے کے قابل نہ چھوڑو، ہاتھ کاٹنے سے حقیقت میں ہاتھ کاٹنا مراد نہیں ہے، عمل کے حق سے محروم کر دینا مراد ہے، جیل میں ڈال دینا مراد ہے۔ چنانچہ حدیث کو درمیان سے نکال دیں تو پھر اس کی گنجائش نکل آتی ہے۔

ان صاحب نے اس محاورے کی مثال دی کہ جب کسی بات میں ہم کوئی فیصلہ کر چکے ہوں اور کوئی آکر دوسری بات کہے تو ہم کہتے ہیں کہ میں تو فیصلہ کر چکا ہوں، میں تو ہاتھ کاٹ کے دے چکا ہوں۔ ہمارے ہاں یہ محاورہ چلتا ہے کہ میں نے ہاتھ کاٹ کر دے دیا ہے یعنی اب معاملہ میرے اختیار میں نہیں رہا، اس سے حقیقت میں ہاتھ کاٹنا مراد نہیں ہوتا، ہاتھ کاٹ کر دینے سے مراد یہ ہے کہ میں بے اختیار ہو گیا ہوں اور ایک صاحب نے یہ معنی کیا بھی ہے۔ تو میں نے یہ بات عرض کی ہے کہ حدیث و سنت کے مستقل حجت قطعیہ ہونے سے انکار کی بنیادی وجہ یہ ہے۔ اور چونکہ قرآن کریم سے تو انکار ممکن نہیں ہے اس لیے قرآن کریم کی تعبیر اور تشریح کو اپنے اختیار میں لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حدیث اور سنت کو درمیان سے نکالا جائے۔

5. ہمیں پہلے بھی اس طرح کے امور سے سابقہ پیش آتا رہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، گھبرانے کی بات نہیں ہے، معتزلہ کے دور میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو جو کوڑے لگے تھے تو کیوں لگے تھے؟ عباسیہ سلطنت کے زمانے میں معتزلہ اقتدار کا حصہ بن گئے تھے، اعتزال ریاست نے سنبھال لیا تھا، مامون الرشید کے بارے میں آتا ہے اور اس کے بعد معتصم باللہ وغیرہ معتزلی ہو گئے تھے تو انہوں نے علماء پر سختی کی تھی اور سب سے زیادہ سختی امام احمد بن حنبلؒ پر ہوئی تھی۔ صرف امام احمد بن حنبلؒ نہیں، بلکہ بیسیوں علماء کو سزائیں دی گئی

تھیں، ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ کیوں؟ اسی تعبیرات کے مسئلہ پر کہ قرآن کریم کی تعبیر وہ ہوگی جو ہم کریں گے، جبکہ علماء کہتے تھے کہ نہیں، قرآن کریم کی تعبیر وہی ہوگی جو حضور علیہ السلام نے کی ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ معتزلہ اور عباسیوں کے زمانہ میں ہم سزاؤں اور کوڑوں کا ایک پورا دور بھگت چکے ہیں۔ اسی طرح دیکھیں کہ خارجیوں کا موقف کیا تھا خارجیوں نے بھی اس دور میں کمی نہیں کی۔ ضحاک خارجی ان کا کمانڈر تھا، ایک دور میں ضحاک نے بصرہ پر قبضہ کر کے چھ ہزار مسلمان شہید کیے تھے، یہ کہہ کر کہ میرے عقیدے کے مطابق یہ مرتد ہو گئے ہیں لہذا ان کا قتل واجب ہے۔ تاریخ میں یہ ریکارڈ پر ہے۔ بصرہ پر قبضہ کرنے کے بعد اسی ضحاک خارجی نے کوفہ پر قبضہ کر لیا تھا اور اس نے کوفہ کی جامع مسجد میں ڈیرے لگا لیے تھے اور اعلان کر دیا تھا کہ سارے کوفہ والے آکر میرے ہاتھ پر توبہ کریں ورنہ سب کو مار دوں گا۔ کوفہ میں اللہ تعالی نے حوصلہ اور جراءت عطا کی امام اعظم ابو حنیفہؒ کو کہ وہ اس کے سامنے کھڑے ہو گئے، اس سے مکالمہ کیا، اس سے بحث کی اور اسے اپنا موقف تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ طویل مکالمہ ہے، اس میں سے صرف ایک ٹکڑا ذکر کرتا ہوں۔

امام اعظمؒ نے اس سے پوچھا کہ لوگوں کو کیوں قتل کر رہے ہو؟ اس نے کہا یہ مرتد ہو گئے ہیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ یہ کیسے مرتد ہوئے؟ مرتد تو اسے کہتے ہیں جو دین بدل دے، یہ تو جس دین پر پیدا ہوئے تھے اسی پر قائم ہیں تو یہ مرتد کیسے ہوئے ہیں، انہوں نے کونسا دین چھوڑا ہے؟ وہ موٹے دماغ کا آدمی تھا یہ بات ذہن میں پھنس گئی، کہنے لگا دوبارہ کہو۔ امام اعظمؒ نے فرمایا کہ میں نے کہا ہے کہ مرتد تو وہ ہوتا ہے جو ایک دین چھوڑ کر دوسرے دین میں چلا جائے، یہ لوگ جس دین پر پیدا ہوئے تھے اسی پر ہیں، کوئی تبدیلی نہیں آئی تو تم ان کو مرتد کیسے کہہ رہے ہو؟ روایت میں آتا ہے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے "امام اعظمؒ کی سیاسی زندگی" میں پورا واقعہ لکھا ہے کہ اس پر ضحاک نے اقرار کیا "اخطاءنا" کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے، لیکن غلطی کا احساس چھ ہزار بصریوں کو مارنے کے بعد

ہوا۔ معتزلہ نے بھی کمی نہیں کی اور خارجیوں نے بھی کمی نہیں کی۔ خارجیوں اور معتزلہ کی طرف سے یہ رویہ ہم بھگت چکے ہیں۔

ہمارے ہاں اکبر بادشاہ نے کیا کیا تھا، اکبر بادشاہ نے دین الٰہی کا جو اعلان کیا تھا اس کی بنیاد بھی یہی تھی کہ قرآن کی تعبیر میں کروں گا، پچھلی تعبیرات منسوخ ہو گئی ہیں، اب میں مجتہد اعظم ہوں، میں تعبیر کروں گا اور میں مختار ہوں جیسے مرضی تعبیر کروں، اور یوں دین الٰہی کی بنیاد رکھی۔ احکام میں کتنی تبدیلیاں کی تھیں میں اس تفصیل میں نہیں جاتا لیکن یہ جملہ ضرور کہوں گا کہ اکبر بادشاہ نے احکام اور قوانین میں جو تبدیلیاں کی تھیں وہ آج ہمارے بہت سے حکمران بھی کرنا چاہ رہے ہیں۔ اکبر بادشاہ نے شرعی احکام میں وہی تبدیلیاں کی تھیں جن تبدیلیوں کے لیے آج بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ احکام و قوانین کی بنیاد حدیث و سنت نہیں ہے۔ یہ رویہ ہم بھگت چکے ہیں، اس لیے میں نے عرض کیا کہ ہم معتزلہ کو بھی بھگت چکے ہیں، خوارج کو بھی بھگت چکے ہیں، اکبر بادشاہ کو بھی بھگت چکے ہیں، اور بھی کوئی آیا تو اس کو بھی بھگت لیں گے ان شاء اللہ العزیز۔ اسلام اپنی اصل اجماعی تعبیر پر قائم ہے، اس تعبیر پر جو حضورؐ نے کی ہے اور جو صحابہؓ نے کی ہے، اور ان شاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا، اللہ تعالیٰ ہمیں استقامت اور حوصلہ نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

مسلم حکمرانوں کی ایک اہم ذمہ داری

(مدرسہ طیبہ، کوروٹانہ، گوجرانوالہ - ۴ جون ۲۰۲۱ء)

(الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام مدرسہ طیبہ کورٹانہ گوجرانوالہ میں ہفتہ وار نقشبندی محفل سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ ہمارے بڑے بزرگوں میں سے تھے، والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے استاذ گرامی تھے اور تحریک آزادی و تحریک ختم نبوت کے سرگرم راہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان سے ایک تقریر کے دوران یہ واقعہ سنا تھا جو انہی کے حوالہ سے بیان کر رہا ہوں کہ بنو امیہ کے دور خلافت میں کوفہ کے گورنر حجاج بن یوسفؒ ایک روز کوفہ کے کسی محلہ سے گزر رہے تھے کہ ایک گھر سے

قرآن کریم کی تلاوت کی آواز سنائی دی، چلتے چلتے ایک آیت کریمہ اس طرح سنی کہ پڑھنے والا اعراب کی تبدیلی کے ساتھ اس قدر غلط پڑھ رہا تھا کہ اس کا معنی کفریہ ہو گیا تھا۔ حجاج بن یوسف وہیں رک گئے، دروازہ کھٹکھٹایا تو معلوم ہوا کہ ایک عجمی بزرگ قرآن کریم پڑھ رہے ہیں۔

قرآن کریم کو زیر زبر پیش اور دیگر علامات کے بغیر عرب لوگ تو صحیح پڑھ لیتے ہیں مگر غیر عربوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے، جبکہ تلفظ اور اعراب کی غلطی کی وجہ سے بسا اوقات قرآن کریم کے الفاظ کا معنی الٹ ہو جاتا ہے اور ایسا پڑھنے والے کی بے خبری میں ہوتا ہے۔ گورنر کوفہ اس بات پر پریشان ہوئے کہ غیر عرب لوگ تو زیادہ تر اسی طرح غلط تلاوت کرتے ہوں گے، اس بزرگ کو لفظ کا اصل تلفظ سمجھایا اور اہل علم کے ساتھ مشورہ کر کے متعلقہ علماء کرام کی ایک کمیٹی بنادی کہ غیر عرب لوگوں کے لیے قرآن کریم میں الفاظ پر زیر زبر پیش وغیرہ اور آیات کے ساتھ علامتیں لگائیں تاکہ عجمی حضرات کلام اللہ کی صحیح تلاوت کر سکیں۔ یہ کام اس سے قبل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حکم سے شروع ہو گیا تھا مگر پورے قرآن کریم پر اہتمام کے ساتھ سرکاری طور پر اعراب اور علامات لگوانے کا کام حجاج بن یوسفؒ کے دور میں ہوا جو آج تک چلا آرہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے تفصیلی تذکرہ میں مذکور ہے کہ دونوں بزرگ ایک بستی سے گزرے اور حسب معمول بستی والوں سے کھانا مانگا کہ ہم مسافر ہیں کھانا کھلادو مگر بستی والوں نے انکار کر دیا۔ قرآن کریم نے اسے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ”فابوا ان یضیفوھما“ بستی والوں نے ان دونوں بزرگوں کو کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ عام طور پر معروف ہے کہ یہ بستی انطاکیہ ہے، اس واقعہ کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو انطاکیہ کا نام لبوں پر آجاتا ہے جس سے وہاں کے لوگ طبعی طور پر عار محسوس کرتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ جب یہ بات مشہور ہوئی کہ کوفہ کے گورنر کی ہدایت پر قرآن کریم پر اعراب اور علامات لگوائی جارہی ہیں تو انطاکیہ والوں کا ایک وفد حجاج بن یوسفؒ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ اگر اس موقع پر ایک دو نقطوں میں ردوبدل کر دیا جائے تو انطاکیہ والے ہمیشہ کے لیے اس عار سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ ”فابوا ان یضیفوھما“ کی جگہ ”فاتوا ان یضیفوھما“ کر دیا جائے۔ ”فابوا“ کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے انکار کر دیا جبکہ ”فاتوا“ کا معنی یہ بنتا ہے کہ وہ سارے لوگ ان دو بزرگوں کو کھانا

کھلانے کے لیے جمع ہوگئے، اس طرح انطاکیہ کا تذکرہ عار کی بجائے تعریف کے ساتھ ہونے لگے گا۔

مولانا ہزارویؒ کے بیان کردہ اس واقعہ کے مطابق گورنر کوفہ حجاج بن یوسفؒ نے اس پر سخت غصہ کا اظہار کیا اور کہا کہ انہیں اس بات کی جراءت کیسے ہوئی کہ قرآن کریم کے کسی لفظ میں نقطوں کو آگے پیچھے کر دیا جائے اور میں کیا حیثیت رکھتا ہوں کہ ایسا کروں؟ بتایا جاتا ہے کہ حجاج بن یوسفؒ اس قدر غضبناک ہوئے کہ انہیں اپنے دربار سے نکل جانے کا حکم دیا کہ اگر تم ایک شہر کے نمائندہ اور سفیر نہ ہوتے تو تم میں سے ایک شخص بھی یہاں سے زندہ واپس نہ جاتا، اس لیے فوراً یہاں سے نکل جاؤ اور میں تم میں سے کسی شخص کی آئندہ شکل نہ دیکھوں۔

حجاج بن یوسفؒ کا شمار قرون اولی کے جابر حکمرانوں میں ہوتا ہے اور اس کے جبر و تشدد کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے مگر ان تمام جابرانہ کاروائیوں کے ساتھ ساتھ اس کے کھاتے میں بڑی بڑی نیکیاں بھی تاریخ میں مذکور ہیں جن میں قرآن کریم کے حوالہ سے مذکورہ واقعہ کے علاوہ ایک مسلم خاتون کی فریاد پر اپنے بھتیجے محمد بن قاسمؒ کو سندھ کے راجہ داہر سے لڑنے کے لیے فوج دے کر بھیجنے کا تاریخی واقعہ ہے جو ہماری ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور اس کی وجہ سے اس پورے خطے کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان حکمران جیسے بھی ہوں اور ان کے کردار میں جس قدر کمزوریاں اور خرابیاں دکھائی دیتی ہوں مگر ملی حمیت و غیرت کا اظہار اور دین کے تحفظ کا جذبہ ہر دور میں اور ہر طرح کے حکمرانوں کی روایت کا حصہ رہا ہے۔ مذکورہ واقعہ میں ایک مسلم حاکم کی دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ دو باتیں بطور خاص نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلم معاشرہ میں دین کے فروغ اور تحفظ کا کام حکمرانوں کے فرائض میں شامل ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اگر دین کے کسی تقاضے کے خلاف کوئی منفی بات سامنے آئے تو اسے روکنا اور اس پر غصہ و نفرت کا اظہار کرنا بھی ایک مسلم حاکم کے لیے ضروری ہے۔

اس تناظر میں ہم اپنے اردگرد عالم اسلام میں مسلم حکمرانوں کی حالت دیکھتے ہیں تو حجاج بن یوسفؒ جیسے جابر سمجھے جانے والے حکمرانوں کی یاد بھی دل کو ستانے لگتی ہے کہ اے کاش! ہمیں ایسے حکمران ہی نصیب ہو جائیں جو کم از کم ملی حمیت اور دین کے تحفظ کے جذبہ سے تو بہرہ ور ہوں، آمین یا رب العالمین۔

نسبتوں کا سفر

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ٦ مئی ٢٠٢١ء)

چند روز قبل رمضان المبارک کے دوران ہی حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ سے خواب میں ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے مجھے ذاتی استعمال کی دو چیزیں مرحمت فرمائیں۔ تعبیر رویا کی ایک دو کتابوں کے متعلقہ حصوں پر نظر ڈالنے کے بعد تعبیر یہ سمجھ میں آئی کہ کسی سفر اور مہم جوئی کی طرف اشارہ ہے۔ رمضان المبارک کے دوران سفر سے حتی الوسع گریز کرتا ہوں اور عام طور پر اس کے تقاضوں پر معذرت ہی کر دیتا ہوں مگر خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف کے رمضان المبارک کے ماحول کے بارے میں ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ ایک آدھ دن اس ماحول میں گزرنے کا موقع مل جائے تو برکت و سعادت کی بات ہوگی۔ حضرت مولانا خواجہ خلیل احمد دامت برکاتہم سے مجمل سا وعدہ بھی چلا آ رہا تھا۔

منڈھیالہ وڑائچ گوجرانوالہ کے مولانا قاری سمیع الحق خانقاہ سراجیہ کے خاص خدام میں سے ہیں، ان کے مشورہ سے اس بار پروگرام کی ترتیب بن گئی اور انہوں نے اپنی گاڑی پر آنے جانے کا نظم بنا لیا۔ پاکستان شریعت کونسل کے صوبائی سیکرٹری اطلاعات حافظ امجد محمود معاویہ اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے راہنما مولانا عمر حیات شریک سفر تھے۔ سفر کے آغاز پر ذہن میں پروگرام صرف یہی تھا کہ خانقاہ سراجیہ میں ایک دو روز گزار کر واپسی کریں گے مگر اصل فیصلے تو کبھی انسان کے بس میں نہیں رہے، چنانچہ یہ سفر باقاعدہ ایک تحریکی مہم جوئی کی صورت اختیار کر گیا اور چند روز قبل والے خواب کی نقد تعبیر نے ذہن و قلب دونوں کو سرشار کر دیا۔ ہم اٹھارہ رمضان المبارک کو نماز فجر کے بعد الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ سے روانہ ہوئے اور اکیسویں شب کو رات ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ پہنچ گئے جبکہ عام معمول سے ہٹ کر ایک بات یہ بھی ہوئی کہ ہمیں اس سفر کے لیے رخصت عزیزم ڈاکٹر حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے کیا اور واپسی پر بھی خیر مقدم کے لیے وہی دروازے پر کھڑا تھا۔

ہمارا پہلا پڑاؤ قائد آباد میں تھا جہاں مرکز دار الحبیب میں نماز ظہر کے بعد ایک نشست کا اہتمام تھا، رمضان المبارک اور قرآن کریم کے حوالہ سے گفتگو کے بعد جامعہ قاسم العلوم میں مقامی علماء کرام کے ساتھ نئے اوقاف قوانین اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے بارے

میں مشاورت کی، وہاں سے واں بچھراں رئیس الموحدین حضرت مولانا حسین علی قدس اللہ سرہ العزیز کی مسجد میں حاضر ہوئے جو والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے استاد گرامی اور شیخ و مرشد تھے۔ قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد حضرت کے پڑپوتے محترم میاں محمد عرفان سے ملاقات اور مختصر گفتگو ہوئی اور عصر تک ہم خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف پہنچ گئے۔ حضرت مولانا خواجہ خلیل احمد کی معیت میں دو روز تک سلسلہ نقشبندیہ کے اوراد و معمولات میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ رات کو تراویح میں قرآن کریم کے آخری چھ پارے "ورتل القرآن ترتیلا" کے ماحول میں سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ خانقاہ شریف میں رمضان المبارک کے دوران تراویح میں ہر عشرہ میں قرآن کریم مکمل کیا جاتا ہے، روزانہ کم و بیش تین ساڑھے تین گھنٹے اسی بابرکت ماحول میں گزرتے ہیں اور برکتوں و سعادتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

بزرگان کرام رحمہم اللہ تعالی کی قبور پر فاتحہ خوانی کی سعادت کے ساتھ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی زیارت کا شرف بھی مل گیا جو خانقاہ سراجیہ میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ محفوظ رکھا ہوا ہے اور رمضان المبارک میں سعادت مندوں کو زیارت کروائی جاتی ہے۔ محترم حضرت مولانا خواجہ عزیز احمد مدظلہ کے ساتھ متعدّد ملاقاتوں اور مختلف امور پر تبادلہ خیالات نے سفر کی چاشنی میں اضافہ کیا۔ خواجہ صاحب محترم شدید علالت کے بعد صحتیاب ہوئے ہیں، اللہ تعالی انہیں صحت کاملہ و عاجلہ سے نوازیں اور دینی و روحانی ماحول میں اپنے بزرگوں کی روایات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق دیں، آمین۔

پیر کے روز ہم نماز فجر کے بعد کے معمولات میں شریک ہو کر جوہر آباد کی طرف روانہ ہوئے جہاں مولانا حافظ فیصل احمد اپنے رفقاء سمیت ہمارے منتظر تھے۔ حافظ فیصل احمد اور ان کے بھائی مفتی حسین احمد جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فضلاء میں سے ہیں، ان کے علاوہ مولانا جنید احمد اور جامعہ کے بعض دیگر فضلاء سے بھی ملاقات ہوئی۔ جامع مسجد نمرہ میں ظہر کے بعد مختلف طبقات کے حضرات سے متعلقہ مسائل پر اجتماعی گفتگو کا موقع ملا اور رمضان المبارک و قرآن کریم کے بعض پہلوؤں کے علاوہ کرونا کی تباہ کاریوں پر اجتماعی توبہ و استغفار کی ضرورت پر زور دیا جبکہ تحفظ ناموس رسالتؐ اور تحفظ مساجد و مدارس کے حوالہ سے قدرے تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر میں نے جوہر آباد والوں کو یہ یاد دلانا

ضروری سمجھا کہ قیام پاکستان کے بعد کراچی ہمارا وفاقی دارالحکومت تھا جسے دفاعی اور بعض دیگر ضروریات کے حوالہ سے مناسب نہ سمجھتے ہوئے خوشاب کے علاقہ کو وفاقی دارالحکومت کے لیے چنا گیا اور اس کے لیے یہاں عمارات و مراکز کی تعمیر کا آغاز بھی ہو گیا۔ قائد آباد اور جوہر آباد اسی منصوبہ بندی کے تحت نئے شہر کے طور پر آباد کیے گئے۔ قائد آباد کا نام قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کے حوالہ سے اور جوہر آباد رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جوہرؒ کی یاد میں تجویز کیا گیا۔ مولانا جوہرؒ کی قومی خدمات اور جذبۂ حریت کا مختصر تذکرہ کیا اور بتایا کہ تحریک آزادی میں ان کی مخلصانہ قیادت اور قربانیوں کا اللہ رب العزت کی طرف سے انہیں یہ انعام ملا کہ وہ بیت المقدس کے الخلیل قبرستان میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قدموں میں مدفون عالم برزخ کی بہاروں کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ نئے وفاقی دارالحکومت کے طور پر اس علاقے میں عمارتوں اور مراکز کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا کہ دفاعی نقطۂ نظر سے راولپنڈی کے نواح کو دارالحکومت کے لیے زیادہ موزوں سمجھا گیا اور جنرل محمد ایوب خان مرحوم کے دور صدارت میں اسلام آباد کے نام سے موجودہ وفاقی دارالحکومت وجود میں آگیا، اللہ تعالی اسے مسلسل ترقیات و برکات کے ساتھ حقیقی طور پر اسلام آباد کی حیثیت دے، آمین یارب العالمین۔

جوہر آباد سے ہم نے میانہ گوندل جانا تھا جہاں جمعیت علماء اسلام منڈی بہاء الدین کے ضلعی امیر مولانا قاری عبد الواحد نے دعوت افطار پر علاقہ کے علماء کرام سے اجتماعی ملاقات کا اہتمام کر رکھا تھا، مگر راستہ میں پہلے سے کسی پروگرام کے بغیر ذہن کا رخ ڈھڈیاں شریف کی خانقاہ قادریہ کی طرف مڑ گیا جہاں ہمارے اکابر میں سے عظیم بزرگ حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ اور ان کے ساتھ حضرت مولانا عبد الوحید رائے پوریؒ اور حضرت پیر جی مولانا عبد الجلیل رائے پوریؒ آرام فرما ہیں، ہم اس روحانی مرکز میں جا پہنچے، بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے بعد صاحبزادہ مظفر رائے پوری سے ملاقات کی اور مداح رسولؐ رانا عبد الرؤف خان کی بیمار پرسی کر کے اگلی منزل کی طرف چل پڑے۔ میانہ گوندل میں مولانا قاری عبد الواحد کی دعوت پر سرکردہ علماء کرام جمع تھے، افطاری ان کے ساتھ کی اور ان سے دینی جدوجہد کے تقاضوں پر مختصر گفتگو کا موقع بھی مل گیا۔

اس طرح یہ سہ روزہ حضرت مولانا حسین علیؒ، حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ، حضرت مولانا محمد علی جوہرؒ، اور حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کی روحانی و فکری نسبتوں کے

ماحول میں بسر ہوا جس کے پیچھے والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صدرؒ کے ساتھ چند روز قبل کی خواب میں ملاقات بھی جھلک رہی تھی، اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہمیں ان کی نسبتوں پر استقامت اور برکات وثمرات کے تسلسل سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

اختلاف رائے اور اسوۂ صدیق اکبرؓ

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۹ فروری ۲۰۲۱ء)

۹ فروری ۲۰۲۱ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں نماز عصر کے بعد دیے گئے ہفتہ وار درس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰة۔ سیدنا صدیق اکبرؓ کے بارے میں گزشتہ تین دروس میں مختلف باتیں عرض کی تھیں، آج اس پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ اختلاف رائے کے حوالہ سے ان کا طرز عمل کیا تھا۔

رائے کا اختلاف فطری بات ہے، جہاں علم ہو گا اور عقل ہو گی وہاں اختلاف بھی ہو گا۔ اختلاف کا ہونا کوئی غلط بات نہیں بلکہ اختلاف کا نہ ہونا فطرت کے منافی ہے۔ ہماری امت کے دو سب سے بڑے بزرگوں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کے درمیان بھی اختلاف ہوتا رہا ہے جو ہمارے لیے اسوہ اور نمونہ ہے کہ اختلاف کی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ ہمارے ان دو بڑے بزرگوں کے درمیان متعدّد امور میں اختلافات کا ذکر روایات میں ملتا ہے جن میں سے صرف تین واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو خلافت صدیق اکبرؓ کے مختصر دور میں پیش آئے۔

پہلا اختلاف جس کا ذکر بخاری شریف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو خلافت کا منصب سنبھالتے ہی جن گروہوں اور قبائل کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا ان میں مرتدین اور منکرین ختم نبوت کے علاوہ ایک گروہ منکرین زکوٰة کا بھی تھا جس کے سربراہ کا نام مالک بن نویرہ بتایا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس گروہ کے خلاف جہاد میں اشکال تھا کہ یہ کلمہ پڑھتے ہیں اور دین کی باقی سب باتیں مانتے ہیں صرف زکوٰة دینے سے انکار کرتے ہیں اس لیے ان کے خلاف سختی نہیں کرنی چاہیے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کی بات قبول کرنے سے انکار کر دیا جس پر دونوں بزرگوں میں مباحثہ ہوا، حضرت

ابوبکرؓ نے بڑا ہونے کے ناتے سے حضرت عمرؓ کو سخت لہجے میں جواب بھی دیا اور اپنے موقف پر قائم رہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ بعد میں اللہ تعالی نے مجھے بھی اسی طرح شرح صدر عطا فرمایا جیسے حضرت ابوبکرؓ کو شرح صدر ہو گیا تھا۔

دوسرا اختلاف قرآن کریم کو کتابی شکل میں جمع کرنے کے حوالہ سے ہوا کہ مختلف جنگوں میں حافظ قرآن صحابہ کرامؓ کی کثرت کے ساتھ شہادتوں کی خبریں آنے پر حضرت عمرؓ کو قرآن کریم کی حفاظت کے بارے میں خدشہ اور خطرہ محسوس ہوا تو انہوں نے خلیفۂ رسولؐ کو تجویز دی کہ قرآن کریم کو کتابی شکل میں مرتب کرا کے محفوظ کرا لینا چاہیے، جس سے حضرت ابوبکرؓ نے ابتدا میں یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر یہ ضروری ہوتا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اہتمام فرماتے، جب انہوں نے نہیں کیا تو میں بھی اسے ضروری نہیں سمجھتا۔ مگر بعد میں حضرت ابوبکرؓ اس کے لیے تیار ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ تعالی نے اس مسئلہ پر عمرؓ کی طرح میرا سینہ بھی کھول دیا ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دے کر قرآن کریم کو کتابی صورت میں لکھوا کر محفوظ کر دیا گیا۔

جبکہ تیسرا اختلاف بیت المال سے عام لوگوں کو وظائف تقسیم کرنے کے معاملہ میں ہوا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اتھارٹی تھے اور آپؐ کا ارشاد ہی قانون ہوتا تھا اس لیے اس دور میں کوئی اشکال کی بات نہیں تھی، مگر آپؐ کے بعد بیت المال سے لوگوں کو وظائف دینے کے بارے میں اصول اور قانون طے کرنے کی ضرورت تھی جس پر حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ معاشرہ میں جو درجات فضیلت و مرتبہ کے حوالہ سے ہیں ان کے حوالہ سے وظائف کی تقسیم میں درجہ بندی کی جائے اور مختلف گریڈ طے کر کے اس کے مطابق وظائف دیے جائیں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے یہ رائے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ معیشت کا معاملہ ہے اور حقوق کی بات ہے اس میں برابری کا اصول ہی چلے گا۔ ان کا ارشاد یہ ہے کہ ”وھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ“۔ یہ معاش کا مسئلہ ہے اس میں برابری کا اصول ترجیح سے بہتر ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی قسم کی درجہ بندی کیے بغیر اپنے اڑھائی سالہ دور خلافت میں سب کو برابر وظیفے دیے۔ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر تو خاموشی اختیار فرمائی مگر جب خود خلیفہ بنے تو وظائف کی تقسیم کا نیا نظام بنایا اور اس میں سب سے زیادہ وظیفہ ازواج مطہراتؓ کو، پھر مہاجرین کو، اس کے بعد انصار کو اور پھر دیگر

طبقات کو درجہ بدرجہ وظائف تقسیم فرمائے۔ البتہ دس سال تک اس نظام پر عمل کے بعد اس کے معاشرتی نتائج سامنے آنا شروع ہوئے تو حضرت عمرؓ کو الجھن ہوئی اس لیے کہ ایسے گریڈ سسٹم میں معاشرہ کی طبقاتی تقسیم ہو جاتی ہے اور سماج مختلف درجوں میں بٹ جاتا ہے۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے ہمارے ہاں خاص طور پر اسلام آباد میں گریڈ سسٹم نے معاشرے کو مختلف دائروں اور طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اکثر باہمی معاملات اس معاشرتی درجہ بندی کے دائروں میں طے پاتے ہیں۔ حضرت امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" میں لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے درجہ بندی کے اس قسم کے معاشرتی نتائج دیکھے تو فرمایا کہ اب مجھے محسوس ہوا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے اس معاملہ میں زیادہ صائب تھی، اس لیے اگلے سال سے میں اس نظام کو ان کی رائے کے مطابق از سر نو ترتیب دوں گا، لیکن اگلے سال سے قبل وہ شہید ہو گئے اور معاملہ جوں کا توں رہا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اختلاف رائے تو فطری امر ہے البتہ اس حوالہ سے اگر اپنے بزرگوں کے اسوہ کی پیروی کی جائے تو بہت سی الجھنوں اور نقصانات سے بچا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۲ فروری ۲۰۲۱ء)

حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت اور اہم کارنامے

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۲ فروری ۲۰۲۱ء)

۲ فروری ۲۰۲۱ء کو بعد نماز عصر مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ اور بعد نماز عشاء مکی مسجد قلعہ دیدار سنگھ میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں کی گئی گفتگو کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سیدنا صدیق اکبرؓ کی حیات مبارکہ، مقام و فضیلت اور خلافت و حکومت کے حوالہ سے گفتگو کے بیسیوں پہلو ہیں اور ہر ایک میں ہمارے لیے سبق اور راہنمائی موجود ہے، مگر آج حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے عنوان سے تین چار سوالات کا مختصر جائزہ لینا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ دوسرا یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ کس نے بنایا تھا؟ تیسرا یہ کہ ان کی خلافت کی نظریاتی بنیاد کیا تھی؟ اور چوتھا یہ کہ بحیثیت خلیفہ انہوں نے کون سے اہم کارنامے سرانجام دیے؟

1. خلافت ایک طرز حکومت کا نام ہے جو آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل دنیا میں دو طرح کی حکومتیں رہی ہیں۔ وہ حکومتیں جو طاقتور لوگوں نے خود قائم کیں اور طاقت کے زور پر انہیں چلاتے رہے، اس کا سب سے بڑا عنوان بادشاہت ہے۔ اور دوسری یہ کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کے قوانین و احکام کو معاشرے میں نافذ کرنے کے لیے حکومتیں قائم کیں جن میں حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یوشع بن نون علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل کی حکومتوں کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں اقتدار انبیاء کرامؑ کے پاس ہوتا تھا، ایک پیغمبر دنیا سے چلے جاتے تو دوسرے آجاتے، لیکن میرے بعد چونکہ نبی کوئی نہیں آئے گا اس لیے اب خلفاء ہوں گے جو سیاسی نظام کو چلائیں گے۔ اس کے ساتھ نبی اکرمؐ نے امت کو ان خلفاء عظامؓ کی پیروی کی ہدایت فرمائی۔ گویا خلافت دنیا میں آسمانی تعلیمات کے نفاذ و ترویج کے نظام کا نام ہے جو پہلے انبیاء کرامؑ قائم کرتے تھے، جبکہ آنحضرتؐ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے باعث اس نظام کو چلانے کے لیے خلافت کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی سمجھنے کی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہوتے تھے اس لیے ان کی حکومت اللہ تعالیٰ کی خلافت سمجھی جاتی تھی، مگر جناب نبی اکرمؐ کے بعد خلافت کے منصب پر فائز ہونے والے حضرات چونکہ اللہ تعالیٰ کے براہ راست نمائندہ نہیں ہیں اس لیے یہ خلافت جناب رسول اللہؐ کی نیابت کہلاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۃ الرسول کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا حتیٰ کہ امام ابو یعلیٰؒ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو کسی نے "یا خلیفۃ اللہ" کہا تو انہوں نے یہ فرما کر ٹوک دیا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ اس طرح خلیفہ کو اللہ تعالیٰ کا نمائندہ قرار دینے کی بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ بنا کر اس بات کا پابند کیا

گیا ہے کہ وہ حکومت و انتظام میں سنت رسولؐ کا پابند ہے، اور امام معصوم یا پاپائے روم کی طرح احتساب اور تنقید و اعتراض سے بالاتر نہیں ہے۔

2. دوسرا سوال کہ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ کس نے بنایا تھا؟ اس پر عرض کروں گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں آپؐ کے واضح طرز عمل اور اشارات کے باعث لوگ سمجھتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی آپؐ کے جانشین ہوں گے مگر نامزد نہیں فرمایا تھا۔ جس کی حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس طرح جانشین نامزد کرنا قیامت تک کے لیے قانون بن جاتا اور امت کی رائے اور صوابدید کی نفی ہو جاتی۔ اس لیے نبی اکرمؐ نے اشارات کے باوجود خلافت کے معاملہ کو کھلا چھوڑ دیا اور آپؐ کی وفات کے بعد مختلف مجالس کی عمومی بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو اجتماعی طور پر خلیفہ چنا گیا۔ چنانچہ یہ کہا جائے گا کہ حضرت ابوبکرؓ کو امت نے اجتماعی رائے سے خلیفۃ الرسول منتخب کیا تھا اور فقہاء کرام نے اسی وجہ سے خلیفہ کے انتخاب میں امت کی اجتماعی صوابدید کو سب سے بہتر طریقہ قرار دیا ہے۔

3. تیسری بات یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد پہلے خطبہ میں چند باتیں واضح طور پر فرمادی تھیں جن میں سے ایک کا تذکرہ کروں گا کہ میں قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے مطابق حکومت کا نظام چلاؤں گا اور ان کا پابند رہوں گا۔ پھر فرمایا کہ اگر اس سے ہٹ کر چلوں تو لوگوں پر میری اطاعت واجب نہیں ہے اور انہیں احتساب کا حق حاصل ہوگا۔ گویا خلافت کا نظام قرآن وسنت کی پابندی اور عوام کے حق احتساب کے دو اصولوں پر استوار ہے۔ اس لیے خلیفہ کسی بادشاہ کی طرح مطلق العنان ہونے کی بجائے قرآن وسنت کا پابند اور عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔

4. چوتھی بات یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اڑھائی سالہ مختصر دور میں جو نمایاں کارنامے سرانجام دیے ہیں ان کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ

- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد منکرین ختم نبوت، منکرین زکوۃ، اور مرتدین کے مختلف گروہوں نے بغاوت کر کے ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا کر دیا تھا اور عالم اسباب میں نبی

اکرمؐ کی قائم کردہ ریاست و حکومت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ان سب کا مقابلہ کر کے حضرت ابوبکرؓ نے اسلامی ریاست و حکومت کو استحکام بخشا اور پوری استقامت کے ساتھ امت کے داخلی اتحاد کو قائم رکھا جوان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

• قرآن کریم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں سینکڑوں، حفاظ کو یاد تھا اور ہر لحاظ سے مکمل و مرتب طور پر محفوظ تھا، البتہ کتابی شکل میں نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ کی تحریک پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے قرآن کریم تحریری صورت میں لکھوا کر اسے مسجد نبویؐ میں رکھوا دیا جس سے قرآن کریم کتابی شکل میں محفوظ ہو گیا اور اس میں کسی تحریف اور ردوبدل کا دروازہ بھی بند ہو گیا کہ مسجد نبویؐ میں موجود سرکاری اور اسٹینڈرڈ نسخہ کی موجودگی میں کسی کو جرأت نہیں تھی کہ وہ قرآن کریم میں اپنی طرف سے کوئی ردوبدل کر کے اسے عام کر سکے۔

• نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کا نظام قائم کر کے ریاست کے عام شہریوں بالخصوص معذوروں اور مستحقین کی کفالت کا جو نظام دیا تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور ایسی بنیادیں فراہم کر دیں جس سے رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کا وہ نظام حضرت عمرؓ کے دور میں منظم ہو کر دنیا کے لیے ایک مثالی اور آئیڈیل رفاہی نظام کی شکل اختیار کر گیا۔

کچھ عرصہ سے ممتاز دینی و علمی شخصیات کے مسلسل دنیا سے اٹھتے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے اس نے اہل دین و دانش کے غم و صدمہ میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس تناظر میں حال ہی میں ہم سے جدا ہونے والے دو بزرگوں حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن شاہ بخاریؒ اور محترم ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوریؒ کی وفات سب اہل دین کے لیے گہرے صدمہ کا باعث بنی ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ دونوں ہمارے محترم بزرگوں میں سے تھے اور ان کی خدمات کا اپنا اپنا وسیع اور متنوع دائرہ تھا جو ہماری علمی، دینی اور تحریکی تاریخ کا اہم حصہ

ہے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائیں اور تمام متعلقین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

غیر مسلموں سے معاہدہ اور اسوۂ صدیق اکبرؓ

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۲۴ جنوری ۲۰۲۱ء)

۲۴ جنوری ۲۰۲۱ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں خلیفۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اسوہ کے حوالہ سے دروس کے تسلسل میں ہفتہ وار درس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ سیدنا صدیق اکبرؓ کی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کا واقعہ پوری اہمیت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور قرآن کریم نے بھی ”اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ“ کے حوالہ سے اس کا تذکرہ کیا ہے جو بلاشبہ ہمارے لیے ایمان کی تازگی کے ساتھ ساتھ زندگی کے بیسیوں معاملات میں راہنمائی کے پہلو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ جبکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہجرت کا ایک اور سفر بھی ہمارے لیے اسی طرح سبق آموز ہے مگر عام طور مجالس میں اس کا تذکرہ نہیں ہوتا اور میں آج اسی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو بخاری شریف میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تفصیل کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔

جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم پر مکہ والوں کے مظالم اور اذیتیں حد سے بڑھ گئیں اور بہت سے خاندان نبی کریمؐ کی اجازت سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تو ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے بھی حالات سے مجبور ہو کر ہجرت کا ارادہ کر لیا اور آنحضرتؐ سے اجازت بھی حاصل کر لی۔ سامان سفر تیار کر کے ہجرت کے لیے روانہ ہو گئے اور دو تین روز کا سفر بھی کر لیا کہ راستہ میں معروف عرب قبیلہ بنو قارہ کے سردار ابن الدغنہ نے انہیں پہچان لیا اور پوچھا کہ کدھر جا رہے ہو؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ مکہ مکرمہ کے لوگوں نے ان کے لیے وہاں رہنا مشکل بنا دیا ہے اس لیے وہ دیگر بہت سے ساتھیوں کی طرح وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ابن الدغنہ نے کہا کہ نہیں آپ ایسا نہیں کریں گے ”مثلک لایخرج ولا یخرج“ آپ جیسا شخص نہ شہر چھوڑ کر جاتا ہے اور نہ ہی اسے نکالا جاتا ہے۔ اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، محتاجوں کو کما کر دیتے ہیں، بوجھ

والوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مسافروں اور مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور ناگہانی آفات و حادثات میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ وہی جملے ہیں جو غار حرا کے واقعہ کے بعد نبی اکرمؐ کو پیش آنے والی سخت گھبراہٹ میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے آپؐ کو تسلی دینے کے لیے کہے تھے، اور اس حوالہ سے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ نبوت اور خلافت کا مزاج ایک ہی تھا۔ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ آپ میرے ساتھ مکہ مکرمہ واپس چلیں، میں قریش والوں سے خود بات کرتا ہوں اور آپ میری امان اور ضمان میں رہیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ اس کی تسلی اور ضمانت پر واپس آ گئے جبکہ ابن الدغنہ نے قریش کے سرداروں کے پاس جا کر بات کی اور کہا کہ ابوبکرؓ جیسے سماجی خدمت گزار کو شہر چھوڑ دینے پر مجبور کرنا درست نہیں ہے اس لیے میں انہیں راستہ سے واپس لے آیا ہوں اور اب وہ میری امان میں یہیں رہیں گے۔ قریش کے سرداروں کے لیے ابن الدغنہ کی اس ضمانت کو مسترد کرنا مشکل تھا اس لیے انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے مگر ہماری بھی ایک شرط ابوبکرؓ سے منوائیں کہ مذہبی سرگرمیاں کھلے بندوں جاری نہیں رکھیں گے اور گھر کی چار دیواری کے اندر ہی جو کچھ کرنا ہے کریں گے، اس لیے کہ ان کا عام جگہوں پر نماز اور قرآن کریم پڑھنا ہماری عورتوں اور بچوں کے ذہنوں پر اثرانداز ہوتا ہے جو ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ابن الدغنہ نے یہ بات حضرت ابوبکرؓ کے پاس آکر کہہ دی اور انہیں پابند کیا کہ وہ نماز، قرآن کریم اور جو کچھ بھی کرنا ہے گھر کے اندر کریں گے اور کھلے بندوں ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات قبول کر لی اور اپنی مذہبی سرگرمیوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر محدود کر لیا۔ مگر زیادہ دن ایسا نہ کر سکے کہ نماز پڑھنا اور قرآن کریم کی تلاوت گھر کی چار دیواری کے اندر ان کو گوارا نہ تھی اس لیے کچھ دنوں کے بعد انہوں نے گھر کے دروازے سے باہر کھلے میدان میں ایک تھڑا بنا لیا جو مصلی تھا اور امام بخاریؒ نے اسے اسلام میں تعمیر ہونے والی پہلی مسجد کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اس مسجد میں نماز پڑھتے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے۔ اردگرد آبادی کی عورتیں اور بچے ایسے موقع پر جمع ہو جاتے اور انہیں عبادت کرتا دیکھتے۔ حضرت ابوبکرؓ رقیق القلب بزرگ تھے، قرآن کریم پڑھتے ہوئے انہیں آنکھوں پر قابو نہ رہتا اور دیکھنے والے ان کی اس کیفیت سے متاثر ہوتے۔

یہ صورتحال قریش کے سرداروں کے لیے قابل برداشت نہیں تھی، انہوں نے پیغام بھیج کر ابن الدغنہ کو مکہ مکرمہ بلایا اور کہا کہ حضرت ابوبکرؓ نے تمہارے ساتھ کیے گئے عہد کی پاسداری نہیں کی جبکہ ہمیں ان کا کھلے بندوں نماز و قرآن پڑھنا گوارا نہیں ہے، اس لیے یا تو ابوبکرؓ کو اس طے شدہ بات پر پابند کرو اور اگر وہ اس پابندی کو قبول نہیں کرتے تو تم اپنی ضمانت ختم کرنے کا اعلان کر دو کیونکہ ہم تمہاری ضمانت و امان کی خلاف ورزی کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس پر ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ سے بات کی اور چاہا کہ وہ اس کی امان کو اس پہلی شرط کے مطابق برقرار رکھیں جس سے انہوں نے انکار کر دیا اور ابن الدغنہ سے کہا کہ وہ اس کی امان اور ضمانت واپس کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی امان کو پسند کرتے ہیں اس لیے وہ خود کو گھر کی چار دیواری میں محدود کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس پر وہ معاہدہ ختم ہو گیا۔

میری طالب علمانہ رائے میں اس تاریخی واقعہ میں ہمارے لیے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اگر ہمیں غیر مسلم قوموں کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ کرنا پڑ گیا ہے جس سے ہم اپنے شرعی فرائض و احکام کی بجا آوری میں رکاوٹ محسوس کرتے ہیں تو شریعت اسلامیہ کے احکام و قوانین ہی کو مقدم رکھنا چاہیے اور اس قسم کے معاہدات پر نظر ثانی کا ماحول پیدا کرنا چاہیے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ابن الدغنہ کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی پاسداری کرنے کی بجائے اس کی خلاف ورزی کا ماحول پیدا کر کے معاہدہ پر نظر ثانی کی راہ ہموار کی تھی اور اس کے نتیجے میں نماز کی ادائیگی اور قرآن کریم کی کھلے بندوں تلاوت پر پابندی لگانے والے یہ معاہدہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا تھا۔ ہمارے خیال میں اسلامی احکام و قوانین سے متصادم بین الاقوامی معاہدات کی جکڑبندیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ اسوہ مبارکہ صحیح سمت ہماری راہنمائی کرتا ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۰ جنوری ۲۰۲۱ء)

سیدنا صدیق اکبرؓ اور خلافت راشدہ

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۱۹ جنوری ۲۰۲۱ء)

جمادی الاخریٰ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تھی اسی مناسبت سے اس ماہ کے دوران ان کے فضائل و خدمات اور ارشادات و تعلیمات کا عام طور پر ذکر کیا جاتا

ہے۔ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ہر منگل کو نماز عصر کے بعد راقم الحروف کا مختصر درس ہوتا ہے، دوستوں کے مشورہ سے ترتیب یہ بنی ہے کہ اس ماہ ”سیدنا صدیق اکبرؓ اور خلافت راشدہ“ کے عنوان پر چار دروس میں بات ہوگی، ان شاء اللہ تعالی، پہلے درس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سب سے افضل صحابی ہیں اس لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی ان کے حوالہ سے یہ ماحول بن گیا تھا کہ کم و بیش سبھی حضرات کا یہ اندازہ تھا کہ آنحضرتؐ کی جانشینی کے منصب پر وہی فائز ہوں گے، اس پر بہت سی شہادتیں احادیث و تاریخ میں موجود ہیں جن میں سے تین چار کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

احد کی جنگ میں جب مسلمانوں کے لشکر میں افراتفری مچی جس کا ذکر قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور ایک مرحلہ میں یہ مشہور ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں، صحابہ کرامؓ میں بے چینی اور اضطراب کا عالم تھا، اس دوران قریش کے لشکر کے کمانڈر حضرت ابوسفیانؓ نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا تمہارے درمیان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہیں؟ نبی کریمؐ نے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو جواب دینے سے روک دیا۔ اس پر جناب ابوسفیان، جو بعد میں مسلمان ہوئے، پھر سوال کیا کہ کیا تم میں ابوبکر موجود ہیں؟ آپؐ نے اس کا جواب دینے سے بھی روک دیا، انہوں نے پھر سوال کیا کہ کیا تم میں عمر بن الخطاب موجود ہیں؟ اس کا جواب دینے سے بھی منع فرما دیا گیا۔ اس پر یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تینوں شہید ہو گئے ہیں، جناب ابو سفیان نے نعرہ لگایا کہ ”اعل ھبل“ ھبل زندہ باد۔ اس واقعہ کی مزید تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات کفار کے لشکر کے سربراہ کے ذہن میں بھی تھی کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوں گے تو ان کی جگہ ابوبکرؓ ہوں گے، اور اگر وہ بھی نہ ہوئے تو اس منصب پر حضرت عمرؓ ہوں گے، یہ ترتیب ان کے ذہن میں واضح تھی۔

دوسری شہادت ام المومنین حضرت عائشہؓ کی ایک طویل روایت کا حصہ ہے کہ جب بیماری کے ایام میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ میں مسجد میں جانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں اس لیے ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ ذاتی طور پر اس کو

مناسب نہیں سمجھتی تھیں اس لیے انہوں نے آپؐ سے عرض کیا کہ وہ رقیق القلب آدمی ہیں آپ کے مصلے پر کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھا سکیں گے۔ اس لیے ان کی بجائے حضرت عمرؓ سے فرما دیں، مگر نبی اکرمؐ نے یہ بات نہیں مانی اور دوبارہ حکم دیا کہ ابوبکرؓ سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انہوں نے حضرت حفصہؓ سے بھی یہ بات حضورؐ کو کہلوائی جس پر آپؐ ناراض ہو گئے اور ڈانٹتے ہوئے پھر حکم دیا کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوفات میں مسجد میں حضرت ابوبکرؓ مسلسل نمازیں پڑھاتے رہے۔

اور اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک ارشاد بھی احادیث میں مذکور ہے کہ جس کو رسول اللہ نے ہمارے دین کا امام بنایا ہم نے اسے اپنی دنیا کا امام بھی بنا لیا۔ جناب نبی اکرمؐ کا اس قدر اصرار کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ نماز کی جماعت کے لیے کھڑا کرنا واضح کرتا ہے کہ اس منصب کے لیے آپؐ کے ذہن میں بھی صدیق اکبرؓ ہی تھے۔

ایک اور روایت بخاری شریف کی عرض کروں گا کہ ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اپنے بھائی اور والد دونوں کو بلاؤ تاکہ میں انہیں لکھ کر دے دوں، ایسا نہ ہو کہ میرے بعد مختلف لوگ اس تمنا کا اظہار کرنے لگ جائیں۔ پھر فرمایا کہ رہنے دو "یابی اللہ والمومنون الا ابابکر" اللہ تعالیٰ اور مومنین دونوں ابوبکرؓ کے علاوہ کسی کو قبول نہیں کریں گے۔ اس ارشاد گرامی میں حضرت ابوبکرؓ کی اہلیت و استحقاق کا اظہار بھی تھا اور مسلمانوں کی اجتماعی صوابدید پر اعتماد کا اظہار بھی تھا کہ وہ اجتماعی طور پر کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ یہاں متکلّمین فرماتے ہیں کہ حکمت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو نامزد نہ کرتے اور فیصلہ مسلمانوں پر چھوڑ دیتے ورنہ نامزد کرنا ہی قیامت تک کے لیے قانون بن جاتا جس سے مسلمانوں کی عمومی رائے اور اہل حل و عقد کی مشاورت کی نفی ہو جاتی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد مختلف مجالس میں بحث و مباحثہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کا جانشین اور خلیفہ بنانے کا اجتماعی فیصلہ ہوا۔ اور اسی بنیاد پر فقہاء کرامؒ لکھتے ہیں کہ کسی کو خلیفہ بنانے کا سب سے بہتر اور اولین طریقہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی عمومی رائے اور ارباب حل و عقد کی مشاورت کے ساتھ خلیفہ کا انتخاب کیا جائے۔

ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک خاتون جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں آئیں اور کوئی سوال کیا۔ آپؐ نے اسے پھر آنے کا کہا۔ اس نے پوچھا کہ اگر آپ نہ ہوئے تو پھر میں کیا کروں؟ فرمایا کہ ابوبکرؓ کے پاس جانا۔ اس نے سوال کیا کہ اگر وہ بھی نہ ہوئے تو پھر؟ آپؐ نے فرمایا کہ پھر عمرؓ کے پاس جانا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں بھی ترتیب وہی تھی جس کا اظہار حضرت ابوسفیانؓ نے جنگ احد کے موقع پر کیا تھا اور اسی ترتیب سے خلافت راشدہ کا نظام آگے بڑھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ جناب نبی اکرمؐ کے جانشین، مسلمانوں کے خلیفہ اول اور خلافت راشدہ کا نقطۂ آغاز ہیں جن کا انتخاب مسلمانوں نے عمومی رائے سے کیا اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تمام طبقات نے اس پر اتفاق کیا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۱ جنوری ۲۰۲۱ء)

فہم قرآن کریم اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۶ جنوری ۲۰۲۱ء)

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی کی تصنیف ”مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا فہم قرآن“ کے پیش لفظ کے طور پر لکھا گیا۔)

”قرآن فہمی“ دین کے فہم اور تفہیم دونوں کا بنیادی تقاضہ ہے اس لیے یہ ہر دور کے اہل علم و دانش کی فکری و علمی جدوجہد کا مرکزی نکتہ رہا ہے جس کا تسلسل قیامت تک اسی طرح رہے گا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل ہونے والی وحی مسلسل کا آخری، حتمی اور مکمل مجموعہ ہے جس کے نزول کے بعد رہتی دنیا تک نسل انسانی کی ہدایت اور رشد و فلاح اسی سے وابستہ ہے۔ قرآن کریم کا اساسی موضوع نسل انسانی کی ہدایت ہے اس کا دائرہ پوری نسل انسانی اور دورانیہ قیامت تک وسیع ہے، اس لیے اس کے فہم کا منطقی تقاضہ یہ ہے کہ:

- قرآن کریم جس زبان میں نازل ہوا ہے اس کے مقام و مرتبہ، فصاحت و بلاغت اور ادبی و لسانی خصوصیات و امتیازات سے نہ صرف یہ کہ واقفیت ہو بلکہ اس کے ماضی و حال کے تنوعات، گہرائیوں اور وسعتوں تک بھی کما حقہ رسائی حاصل ہو۔

•قرآن کریم اللہ تعالی کا کلام ہے اور اس کے متکلّم تک براہ راست رسائی کا خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ذریعہ میسر نہیں ہے اس لیے اللہ تعالی کی منشا و مراد سے آگاہی کے لیے جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات و فرمودات اور افعال و معمولات ہی واحد اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

•قرآن کریم کے نزول اور اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل و تشریحات کے عینی گواہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کی تعبیرات و تشریحات اور فعل و عمل کی تفصیلات انہی سے معلوم کی جا سکتی ہیں اور وہی اس کا معیار ہیں۔

•قرآن کریم اور سنت رسولؐ کی عملداری نے جو معاشرہ عملی طور پر تشکیل دیا اس کا اعلی ترین دور صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ اور اتباع تابعینؒ کا زمانہ ہے۔ جسے خود جناب رسول اکرمؐ کے ایک ارشاد گرامی میں ”خیر القرون“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے قرآن فہمی میں اس دور کا شعور و ادراک بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

•قرآن و سنت کا دورانیہ قیامت تک ہے اور زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ حالات کا تغیر اور مسلسل تہذیبی ارتقا کے نتیجے میں متنوع مسائل و معاملات کا پیش آتے رہنا انسانی سماج کا فطری تقاضہ ہے، اس لیے قرآن و سنت کی عملی تطبیق و نفاذ کے دائرے بھی حرکت پذیر رہتے ہیں۔ ان تنوعات و تغیرات کو پیش نظر رکھنا فہم قرآن کریم کا ناگزیر تقاضہ ہے جس سے شناسائی کے لیے تاریخ اور فقہی ارتقا کو بھی مد نظر رکھنا ہو گا۔

ہمارے ہاں قرآن کریم کی سینکڑوں تفاسیر مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں جو ہمارا بہت قیمتی علمی ورثہ اور بیش بہا خزانہ ہے، اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ مگر ایک بات نظر انداز کرنا مشکل ہو گئی ہے کہ بیشتر تفسیروں میں اس دور کی معاشرتی ترجیحات اور مفسرین کے ذاتی ذوق و اسلوب کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ ان دونوں باتوں کو غیر اہم قرار نہیں دیا جا سکتا مگر ان سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فہم و تشریح کے تمام ضروری تقاضوں کے امتزاج کے ساتھ ساتھ ان میں توازن بھی ہو، حالات کے تغیر و ارتقا کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا

جائے، اور مختلف ادوار کی تعبیرات وتشریحات اور تطبیقات کا باہمی فرق اور اس کے اسباب وعوامل بھی پیش نظر ہوں۔

اس تناظر میں عصر حاضر میں قرآن کریم کے فہم اور تفہیم کے حوالہ سے جن بزرگوں کی علمی کاوشیں اصحاب فکر کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کراتی ہیں ان میں ہمارے شیخ محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات گرامی نمایاں مقام و حیثیت رکھتی ہے۔ عربی زبان کے ساتھ ان کا تعلق ومہارت اور زبان وادب کی گہرائیوں اور وسعتوں تک ان کی رسائی بلاشبہ قابل رشک رہی ہے، میں نے لندن کے ایک اجتماع میں ایک معروف عرب دانشور اور استاذ کو حضرت شیخ علیہ الرحمہ کی گفتگو پورے انہماک کے ساتھ سنتے دیکھا اور ان سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم توشیخ کی عربی سننے اور اس سے حظ اٹھانے کے لیے آتے ہیں۔

حدیث و سنت، فقہ و شریعت اور اسلامی تاریخ کی شخصیات و ادوار پر حضرت ندویؒ کی نظر ان کے مقالات وخطبات میں جابجا جھلکتی دکھائی دیتی ہے، جبکہ زمانہ کے تغیرات اور تنوعات سے ان کی کماحقہ آگاہی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف وہ امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کی جدوجہد سے دنیا کو روشناس کرا رہے ہیں، دوسری طرف وہ مغرب کی تہذیب و فلسفہ کے نقاد و جراح دکھائی دیتے ہیں، تیسری جانب عربوں اور ترکوں کو ان کی سیاسی و تہذیبی کشمکش کے اسباب وعوامل اور نتائج وعواقب سے آگاہ کرنے میں مسلسل مصروف رہے ہیں، اور اس کے ساتھ پوری اسلامی تاریخ میں دعوت و عزیمت کے مختلف مراحل ان کی نوک قلم پر ہیں۔ تاریخ وسماج کے طالب علم کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفہ سے کسی حد تک روشناسی کے بعد ان کی فکری کاوشوں کو آگے بڑھانے اور زمانۂ حال میں ان کی تطبیق ونفوذ کی راہیں تلاش و ہموار کرنے میں جن شخصیات کا کردار متوجہ کرتا دکھائی دیتا ہے ان میں عملی جدوجہد کے حوالہ سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور فکری دنیا میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی جدوجہد سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے افکار و تعلیمات کے دائرے بہت وسیع اور متنوع ہیں جن میں فکری و علمی نکات کا ایک وسیع سمندر ہے جس میں غوطہ زن ہو کر نوادرات کو اہل علم کے سامنے لانا آج کی علمی، دینی اور فکری ضرورت ہے۔ بالخصوص ایسے

ماحول میں کہ مغرب کا فکر و فلسفہ طبعی عمر گزار کر واپسی کے راستے تلاش کر رہا ہے اور مغربی دانش علم و فکر کی دنیا میں کسی نئے راہرو کی تلاش میں ہے۔ قرآن کریم اور سنت نبوی علی صاحبہا التحیۃ والسلام کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اسلوب اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زبان میں دنیا کے سامنے لانا بلاشبہ اسلام اور ملت اسلامیہ کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

اس پس منظر میں حضرت ندویؒ کے فہم قرآن کریم کے حوالہ سے محترم ڈاکٹر محمد طارق ایوبی کا یہ تجزیاتی مقالہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، میں دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت ان کی اس کاوش کو قبولیت و ثمرات سے نوازیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے نافع بنائیں، آمین یا رب العالمین۔

”عشرۂ شیخ الہندؒ“

(مولانا ارشد مدنی سوشل میڈیا ڈیسک - ۱۰ جنوری ۲۰۲۱ء)

(سال رواں کے آغاز میں ”مولانا ارشد مدنی سوشل میڈیا ڈیسک“ کی طرف سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز کی یاد میں ”عشرۂ شیخ الہندؒ“ کا اہتمام کیا گیا جس کے تحت مسلسل دس روز تک اکابر اہل علم و دانش کے خطابات کا سلسلہ چلتا رہا اور سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا بھر میں ہزاروں افراد نے اس سے استفادہ کیا۔ اختتامی نشست دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم کی زیر صدارت انعقاد پذیر ہوئی جس میں مہمان خصوصی ندوۃ العلماء لکھنو کے رئیس حضرت مولانا سید رابع ندوی دامت برکاتہم تھے، جبکہ بذریعہ فیس بک اختتامی خطاب پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل اور جامعۃ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے صدر مدرس مولانا زاہد الراشدی کا ہوا جسے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوۃ۔ میرے لیے یہ انتہائی سعادت کی بات ہے کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز کی یاد میں ان کے افکار و تعلیمات کے فروغ کے لیے منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں حاضری، بزرگوں کی زیارت اور کچھ عرض کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بات میرے لیے دوہری سعادت کی ہے کہ اپنے دو

مخدوم و محترم بزرگوں حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا سید رابع ندوی دامت برکاتہم کے زیر سایہ اس مجلس میں گفتگو کا اور ان کی برکات اور دعاؤں کے ساتھ کچھ عرض کرنے کا شرف مل رہا ہے۔ اللہ تبارک و تعالی کانفرنس کے منتظمین کو جزائے خیر سے نوازیں اور ہمیں حضرت شیخ الہندؒ کے افکار و تعلیمات اور ان کے مشن و جدوجہد کے صحیح ادراک کے ساتھ اپنے مستقبل کا پروگرام طے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے حوالے سے جب ہمارے حلقے میں بات ہوتی ہے تو میں دو باتیں عام طور پر عرض کیا کرتا ہوں۔ پہلی یہ کہ دیوبند کی تحریک کیا ہے؟ دیوبند کا فکر کیا ہے؟ دیوبند کا فلسفہ کیا ہے؟ دیوبند کا ہدف کیا ہے؟ اسے اگر کسی شخصی قالب میں دیکھنا چاہیں تو وہ حضرت شیخ الہندؒ کی ذات گرامی جس میں دیوبند کے فکر، فلسفہ، تعلیم، مشن اور جدوجہد کا ایک فرد کامل اور شخصیت کی شکل میں نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ میں دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ دیوبندیت کو اگر پہچاننا ہو کہ دیوبندی کیا ہے تو حضرت شیخ الہندؒ کا مطالعہ کریں کہ ان کی شخصیت میں دیوبندیت اپنے تمام شعبوں اور تمام تر لوازمات کے ساتھ جھلکتی ہے۔

دوسری بات یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ شیخ الہندؒ برصغیر کی ملی تاریخ کا سنگم ہیں۔ شیخ الہندؒ سے پہلے بلکہ خود حضرت شیخ الہندؒ تک ہمارے اکابر نے برصغیر کی آزادی کے لیے مسلح جنگیں لڑی ہیں جو تاریخ آزادی کا ایک مستقل باب ہے، حتی کہ وہ تحریک جسے ہم تحریک شیخ الہندؒ اور تحریک ریشمی رومال کہتے ہیں جبکہ جرمن وزارت خارجہ کی رپورٹوں کے مطابق اس کا نام "برلن پلان" تھا، حضرت شیخ الہندؒ نے جس انداز سے وہ تحریک منظم کی اور جو فلسفہ دیا وہ برصغیر کی آزادی کا ایک مکمل آئیڈیا تھا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کو سنگم اسی حوالے سے کہتا ہوں کہ وہ عسکری تحریکات کی آخری شخصیت اور عسکری تحریکات سے برصغیر کے مسلمانوں کو عدم تشدد کی طرف موڑنے والی پہلی شخصیت تھے۔ انہوں نے عسکری جنگوں کے اس دور کا اختتام کر کے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو پرامن تحریک، عدم تشدد اور نئے دور کے تقاضوں سے متعارف کرایا، اور ایسی شخصیت بن گئے جو برصغیر کی تحریک آزادی کے ایک دور کا اختتام اور ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے مشن کے حوالے سے ایک تو ان کا تعلیمی دائرہ ہے، جو صرف تعلیم کے لیے نہیں تھا بلکہ ایک مقصد کے لیے تھا، میں اس کی طرف حضرت شیخ الہندؒ کے ہی الفاظ میں توجہ دلانا چاہوں گا اپنے آپ کو بھی اور آپ سب حضرات کو بھی کہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد گرامی کا ذکر کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو ناکامیاں ہوئی تھیں، حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ میرے استاد گرامی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان ناکامیوں اور نقصانات کی تلافی کے لیے دیوبند کا مدرسہ بنایا تھا۔ ان نقصانات کی تلافی کا دائرہ کیا ہے؟ ذرا اس پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

ہمارا یہ دائرہ علمی بھی ہے، فکری بھی ہے، ثقافتی بھی ہے، تہذیبی بھی ہے، سیاسی بھی ہے، اور معاشرتی بھی ہے۔ میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کی نہیں بلکہ ۱۷۵۷ء سے پہلے کی بات کروں گا کہ ہماری پوزیشن کیا تھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں قدم رکھا اور سراج الدولہؒ کو شہید کر کے برصغیر میں اپنی مداخلت کا آغاز کیا تھا، اس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ایک دور ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پھر براہ راست برطانوی استعمار آیا، تاج برطانیہ آگیا۔ اس کے بعد کا نوے سال کا دوسرا دور ہے۔ ان دونوں ادوار کو دیکھ لیں۔

۱۷۵۷ء سے پہلے ہماری پوزیشن کیا تھی؟ سیاسی اعتبار سے تو میں اس موقع پر بات نہیں کر سکوں گا لیکن تعلیمی اعتبار سے عرض کروں گا جس کی طرف شیخ الہندؒ نے دوبارہ ہمارا رخ موڑنے کی کوشش کی۔ ہمارے ہاں تعلیمی اداروں میں درس نظامی ایک معروف نصاب رائج تھا جو صرف دینی علوم پر مشتمل نہیں تھا اس میں عصری علوم بھی شامل تھے۔ درس نظامی جو ملا نظام الدین سہالویؒ سے منسوب ہے اورنگزیب عالمگیرؒ کے دور سے اس کا آغاز ہوا تھا اور اورنگزیب نے ہی لکھنو میں فرنگی محل کی یہ کوٹھی ملا نظام الدین سہالویؒ کو عطا کی تھی۔ وہاں سے درس نظامی کا آغاز ہوا تو اس وقت کی ضروریات کیا تھیں؟ حضرت شیخ الہندؒ کے تعلیمی ذوق کا پس منظر دیکھنے کے لیے اس بات پر غور کریں کہ درس نظامی کا آغاز جب ہوا تو اس وقت کا عمومی ماحول کیا تھا؟ عمومی ماحول یہ تھا کہ فارسی دفتری اور عدالتی زبان تھی، فقہ حنفی اور فتاویٰ عالمگیری ملک کا قانون تھا، اور یونانی فلسفہ پر مبنی معقولات ملک کی علمی و فکری زبان تھی۔ قرآن کریم، حدیث و سنت اور شریعت و فقہ کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی ہماری تعلیم کا حصہ تھی، اور فقہ حنفی کو تو قانون کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ اب بھی ہم فقہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، میں بھی الحمد للہ پڑھاتا ہوں، مگر ایک درسی اور علمی ضرورت کے

دائرے میں، لیکن تب یہ قانون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی اور یہ ہمارا تعلیمی سلسلہ چلا آرہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس نظام میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی دوسرے معاملات سنبھالے، مگر سیاسی نظام کو تبدیل کیا ۱۸۵۷ء کے بعد تاج برطانیہ نے۔ جب وہ یہاں قابض ہوئے اور نیا سسٹم بنایا تو ہم زیرو پوائنٹ پر چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر اور جنوبی ایشیا کے مسلمان زیرو پوائنٹ پر چلے گئے۔ ہم نے ازسرنو اپنی زندگی کا آغاز کیا، اس آغاز میں دین و ملت کے ایک بڑے بنیادی تقاضے کی نمائندگی دارالعلوم دیوبند نے کی اور دارالعلوم کا پہلا طالب علم حضرت شیخ الہند محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز تھے۔

میرے طالب علمانہ خیال کے مطابق حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی تعلیمی جدوجہد کا نقطۂ عروج اسی پہلے والے دور کی طرف واپسی کو قرار دیا کہ ہم ۱۸۵۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جائیں اور ہمارا تعلیمی نظام عصری و دینی دونوں تقاضوں پر مشتمل ہو۔ دینی و علمی تقاضوں پر بھی اور عصری تقاضوں پر بھی کہ اس وقت دونوں درس نظامی کا حصہ تھے۔ ہمارے ہاں پاکستان کے ماحول میں جب درس نظامی کے نصاب کو آگے بڑھانے کے بارے میں بات چلتی ہے تو ہمارے ذمے یہ بات لگا دی جاتی ہے کہ ہم نے دنیا اور دین کو تقسیم کر دیا اور ہم نے مولوی اور مسٹر کی تقسیم پیدا کر دی۔ میں کہا کرتا ہوں کہ نہیں بھئی! ہم نے یہ تقسیم نہیں کی۔ جب تک تعلیمی نظام درس نظامی کے ٹائٹل کے ساتھ مولوی کے ہاتھ میں تھا عصری اور دینی علوم اکٹھے پڑھائے جاتے تھے۔ یہ تقسیم ۱۸۵۷ء کے بعد ہم پر مسلط کی گئی ہے جب برطانوی استعمار نے نیا تعلیمی نظام بنایا تو اس میں سے کچھ علوم نکال دیے، قرآن کریم اور حدیث و سنت نکال دیے تھے، فقہ و شریعت نکال دی تھی، فارسی نکال دی تھی، عربی نکال دی تھی، اور ان کی جگہ اپنے علوم شامل کیے تھے۔ انہوں نے جو مضامین اور علوم نصاب سے نکالے وہ ہم نے سنبھال لیے۔ ہمارے بزرگوں نے اس اثاثے کو سینے سے لگایا اور بے سروسامانی اور بے سہارگی کی حالت میں اس نظام کو چلایا۔ میں بتایا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ عرصہ پہلے تک بلکہ میرے بچپن تک ایسا ہی تھا کہ مسجد کی چٹائیاں اور محلے کی روٹیاں، یہ ہمارا مدرسہ ہوتا تھا۔ اب تو بہت سی سہولتیں آگئی ہیں، تکلفات آگئے ہیں۔ ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ سہولتوں میں اضافہ فرمائے، لیکن تب کس بے مائیگی کی اور ظاہری سروسامان سے محرومی کی کیفیت میں اور کس ایثار و قربانی، صبر و حوصلہ اور استقامت کے ساتھ ہمارے بزرگوں نے وہ نظام قائم رکھا۔ وہ علوم جو برطانوی استعمار نے ریاستی تعلیمی

نظام سے نکال دیے تھے، ہمارے بزرگوں نے ان علوم کو سنبھالا۔ قرآن کریم اور حدیث رسول کو، شریعت اور فقہ کو، عربی کو، اور فارسی کو بھی ایک حد تک۔ اور صرف تعلیمی دائرے میں نہیں بلکہ عملی دائرے میں بھی۔ میں اس سے اگلی بات کرنا چاہوں گا کہ ایک ہے تعلیمی دائرہ کہ درس و تدریس ہوتی رہی، نہیں بلکہ عملی ماحول کو بھی باقی رکھا، آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے کے مدارس کے ماحول اور آج کے ماحول کا تقابل کرلیں، آپ کو لباس میں، وضع قطع میں، گفتگو میں، ادب و آداب میں، باہمی احترام و تعلق اور استفادے میں کوئی جوہری فرق نظر نہیں آئے گا۔ ہاں معیار کا فرق پڑتا ہے کہ کہاں حضرت ملا نظام الدین سہالویؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور کہاں ہمارے جیسے ناکارہ لوگ، لیکن ماحول کے بنیادی دائرے آج بھی وہی ہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک ہے تعلیم کا باقی رہنا، وہ تو ہے ہی، لیکن ہمارے لیے الحمد للہ جو فخر کی بات ہے کہ ان علوم کو بیرونی قابضین نے ختم کرنا چاہا تھا، ہمارے بزرگوں نے سینے سے لگایا اور گراس روٹ لیول پر چلے گئے، زمین پر بچھ کر انہوں نے ان علوم کو سنبھالا، اور اس اگلی بات کہ اس ماحول اور تہذیب کو بھی سنبھالا۔ جسے ثقافت اور کلچر کہتے ہیں، آج اگر دنیا میں اس پرانی ثقافت کا کوئی منظر دکھائی دیتا ہے تو جنوبی ایشیا میں ہی ہے۔ آج بڑی بڑی جگہوں پر وہ کلچر ختم ہو گیا اور جدید کلچر میں مدغم ہو گیا ہے لیکن ہمارے ہاں دینی مدرسہ کے ماحول نے، شیخ الہندؒ کے شاگردوں نے اور ان کے شاگردوں نے، ان کے خوشہ چینیوں نے اس ماحول کو باقی رکھا ہوا ہے، الحمد للہ تعالی۔

حضرت شیخ الہندؒ جب مالٹا کی اسارت سے واپس آئے تو انہوں نے دو باتیں کہیں، میں ان کی طرف آپ کی اور اپنی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ تحریک شیخ الہندؒ کے بعد ملک میں آزادی کے لیے جو پرامن تحریکیں چلی ہیں، عدم تشدد پر مبنی تحریکیں جس کا آج تک تسلسل چلا آرہا ہے، ان شاء اللہ اسی کا رہے گا کہ یہ پرامن جدوجہد، عدم تشدد اور سیاسی جدوجہد کا دور ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جو فکر فراہم کی اور اس فکر پر جو قیادت سامنے آئی میں اس کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ وہ قیادت مشترک تھی۔ تحریک خلافت کو دیکھ لیں کہ اس میں کون کون لوگ تھے؟ دیوبند اور علی گڑھ دونوں کی تربیت یافتہ مشترکہ قیادت تھی۔ شیخ الہندؒ کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ ملی تحریکات کی قیادت مشترک ہونی چاہیے۔ اگر آپ اسے ایک لطیفہ کے انداز میں نہ لیں تو یہ قیادت اتنی مشترک تھی کہ وزیر آباد میں، جو حضرت مولانا ظفر علی خانؒ کا شہر ہے، ان کی یاد میں ایک تقریب تھی میں نے اس میں عرض کیا کہ یار دیکھو یہ

حضرت شیخ الہندؒ کا کمال تھا کہ ظفر علی خانؒ جو علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے مگر مولانا کہلاتے ہیں، محمد علی جوہرؒ جو یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے لیکن مولانا کہلاتے ہیں، اور مولانا شوکت علی کا بھی اسی انداز میں تعارف ہوتا ہے، تو شیخ الہندؒ کی فکر کی ایک پروڈکشن یہ بھی ہے کہ قیادت کو مشترک کر دیا، تحریک آزادی میں بھی، اور اگر ہم تحریک پاکستان کی بات کریں تو اس میں بھی قیادت مشترک نظر آئے گی۔ چنانچہ تعلیم کے اشتراک کی طرح قیادت کا اشتراک بھی حضرت شیخ الہندؒ کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اور وہ باہمی نفرت جو پیدا کی گئی تھی اور کسی درجہ میں اب بھی ہے، اس باہمی منافرت کے باوجود علمی میدان میں دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور سیاسی قیادت کے میدان میں بھی دونوں کا اشتراک ہمارے سامنے ہے، آزادی سے پہلے بھی اور بعد بھی، میں اسے حضرت شیخ الہندؒ کی فکر، دعاؤں اور تربیت کا ایک ثمرہ سمجھتا ہوں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے حوالے سے میں ایک بات اور عرض کرنا چاہوں گا، یہ تعلیمی دائرے کی بات بھی ہے اور فکری دائرے کی بات بھی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردوں نے جب ان کے دائرے کو آگے بڑھایا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالیؒ، مولانا محمد میاں انصاریؒ نے اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے جب اس دائرے کو آگے بڑھایا تو میں ان کی علمی و فکری جدوجہد کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ مولانا محمد میاں انصاریؒ کے دو رسالے جو انہوں نے سیاسی فکر و فلسفہ کی تجدید کے لیے لکھے، ایک ”انواع الدول“ اور دوسرا ”دستور اساسی ملت“ کے نام سے۔ اسے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے شاگردوں کا کارنامہ سمجھیں کہ وہ دو رسالے مختصر سے ہیں، ایک انواع الدول کے نام سے کہ دنیا کی حکومتوں کا عصری سیاسی نظم کیسا ہے، اور دوسرا دستور اساسی ملت جس میں انہوں نے ”حکومت الٰہیہ“ کا ٹائٹل استعمال کیا ہے، میں تفصیلات میں جائے بغیر میں حضرت شیخ الہندؒ کی فکر کا ایک نتیجہ بتا رہا ہوں کہ سیاسی فکر میں تجدید ہوئی کہ ہمارا ماضی کا سیاسی سسٹم مختلف تھا اور ہم کئی ادوار سے گزرے ہیں۔ خلافت راشدہ کا اپنا دائرہ تھا اور ہمارا سب سے مثالی اور آئیڈیل دور وہی ہے۔ اس کے بعد خاندانی خلافتیں آئی ہیں، بنو امیہ کی، بنو عباس کی، اور عثمانیوں کی۔ ہم خلافت کے طور پر ان سب کا احترام کرتے ہیں حتیٰ کہ خلافت عثمانیہ پر طرح طرح کے اعتراضات کے باوجود ہم نے اس کا دفاع کیا اور اس کے تحفظ کے لیے جنگ لڑی۔ لیکن آج کا دور خاندانی حکومتوں کا نہیں ہے، ہمارا تسلسل بنو امیہ کی خلافت سے لے کر خلافت

عثمانیہ کے آخر تک خاندانی خلافتوں کا رہا ہے، اب خاندانی حکومتوں کا دور نہیں رہا۔ اور ہمارے حلقے میں اس فکری تجدید کی بات اگر کسی نے کی ہے تو حضرت شیخ الہندؒ کے حلقے نے سب سے پہلے کی ہے۔ ”انواع الدول“ کے نام سے، ”دستور اساسی ملت“ کے نام سے، جبکہ ”حکومت الہیہ“ کے عنوان سے اس کے اصول پیش کیے، اور میں اسے شیخ الہندؒ کی فکر کی ایک نئی جہت تصور کرتا ہوں اور اسی حوالے سے اس کا تعارف کراتا ہوں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے حوالے سے آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الہندؒ کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے، ذرا ان کی جدوجہد پر ایک نظر ڈالیے کہ وہ ہندوستان کی آزادی اور ہماری قومی آزادی کی تحریک تھی لیکن اس کا ایک ٹائٹل ”جنود ربانیہ“ کا تھا۔ اور اس ٹائٹل کے ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے رابطہ کس کس سے کیا؟ ہم خلافت عثمانیہ کی بات کرتے ہیں، اس زمانے میں مکہ مکرمہ کا جو ماحول تھا اور شریف مکہ کی حکومت کا معاملہ، میں اس تفصیلات میں نہیں جاتا، لیکن جو یادداشتیں برلن سے چھپی ہیں، دو سال پہلے جب میں دیوبند میں منعقدہ شیخ الہندؒ سیمینار میں آیا تھا تو میں نے بعض دوستوں سے عرض کیا تھا کہ ہم نے برطانوی سی آئی ڈی کی دستاویزات تو ”تحریک شیخ الہندؒ“ کے نام سے مرتب کر دی ہیں اور شائع ہو چکی ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ اور حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ رپورٹیں ہمارے سامنے آگئیں، لیکن اس میں جرمنی کا بھی ایک بڑا کردار تھا، میری نظر سے کچھ باتیں گزریں جس کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے کہ انہیں بھی ریکارڈ پر لانا چاہیے۔ جرمنی کی سی آئی ڈی کی رپورٹوں میں اس تحریک کا نام ”برلن پلان“ بتایا گیا ہے اور ان رپورٹوں کے مطابق اس میں جرمن کے علاوہ جاپان بھی شریک تھا۔ میں اس حوالے سے یہ بات کہنا چاہ رہا ہوں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے وقت کی ضروریات و ترجیحات کا بھی خیال رکھا اور وقت کی قوتوں کا ماحول بھی دیکھا کہ کونسی قوت سے ہم کیا فائدہ لے سکتے ہیں؟ یہ قوموں اور ان کی تحریکات کی ضرورت ہوتی ہے، ہم ہر کسی کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور ہر کسی کو دھتکار نہیں سکتے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں ”ان پڑھ“ آدمی ہوں کہ نہ جرمنی زبان جانتا ہوں اور نہ انگریزی، اس لیے میں دوستوں کو توجہ دلاتا رہتا ہوں کہ وہ دستاویزات بھی سامنے آنی چاہئیں۔ یہ جرمن وزارت خارجہ کے ایک افسر اولف شمل ہیں جنہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد یہ یادداشتیں شائع کی ہیں۔

میں حضرت شیخ الہندؒ کے حوالے سے یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ انہوں نے عالمی سوچ دی ہے۔ ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کے درمیان ملی سوچ دی ہے اور مفاہمت پیدا کی ہے، مختلف ملکوں کے درمیان روابط پیدا کر کے عالمی فکر کو اجاگر کیا ہے۔ اسلام تو خود عالمی مذہب ہے جو ''یا ایھا الناس'' سے اپنا خطاب شروع کرتا ہے اور پوری انسانیت کا مذہب ہے۔ اسلام نے پوری نسل انسانی کی رہنمائی کی ذمہ داری اٹھائی ہے اور اس کا وقت پھر آنے والا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ بات درمیان میں متعلقہ ہے یا نہیں لیکن میں عالمی سطح پر آثار دیکھ رہا ہوں، میں تاریخ کا طالب علم ہوں، سماج کا طالب علم ہوں، اور سیاسیات کا طالب علم ہوں، اس بنا پر یہ عرض کر رہا ہوں کہ آنے والا دور اسلام کا ہے، دنیا کی فکر و دانش کروٹیں بدل رہی ہے۔ میں اس پر دو حوالے دوں گا جو آپ کے علم میں ہوں گے لیکن اپنی گفتگو کی تائید میں عرض کر رہا ہوں۔ ایک تو سابق پاپائے روم پوپ بینی ڈکٹ نے ایک کمیٹی بنائی تھی کہ معاشیات کے عالمی نظام میں بڑھتے ہوئے عدم توازن کا حل تلاش کیا جائے۔ میں نے دہلی کے ایک اخبار سے اس کمیٹی کی رپورٹ کا ایک حصہ نقل کیا تھا، کمیٹی نے کہا تھا کہ اس کا حل ایک ہی ہے کہ ہم معاشیات کے ان اصولوں پر واپس چلے جائیں جو قرآن کریم نے بیان کیے ہیں۔ دوسرا حوالہ کہ آکسفورڈ کے ایک نومسلم ہیں ڈاکٹر یحییٰ برٹ جو ایک انگریز فیملی کے چشم و چراغ ہیں، انہوں نے مسلمان ہو کر اس بات پر تحقیق کی کہ یورپین نسل کے جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں ان کے مسلمان ہونے کا سبب کیا ہے۔ یہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس میں انہوں نے کہا کہ اسی فیصد لوگ قرآن کریم کے مطالعہ سے مسلمان ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم آج بھی اسلام کی تفہیم اور دعوت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور انسانی مسائل کے حل کا سب سے بڑا منبع ہے۔ انسانی سماجیات کے مسائل کا قرآن کریم نے جس فطری انداز میں حل پیش کیا ہے آج ایسا کوئی فارمولا کسی کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں شیخ الہندؒ کے اس ارشاد کی طرف واپس جانا ہو گا جو انہوں نے مالٹا کی اسارت سے واپس آکر کہا تھا کہ قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھو اور قرآن کریم کے حلقے عام کرو۔

حضرت شیخ الہندؒ نے بنیادی پیغام یہ دیا تھا کہ آپس کے اختلافات کم کر کے ملی ماحول پیدا کرو اور قرآن کریم کے ساتھ فہم کا تعلق قائم کرو۔ حضرت شیخ الہندؒ کی اس آواز کے بعد قرآن کریم کے حلقے قائم ہونا شروع ہوئے، میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا، نظارۃ المعارف

القرآنیہ جو دہلی میں قائم ہوا، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا حلقہ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا ادارہ، اور مختلف قرآنی حلقے بنے، میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی اس آواز پر لبیک کہہ کر درس قرآن کریم کے متعدّد حلقے قائم کیے، اسی طرح میرے چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ کا قرآن کریم کا مستقل حلقہ تھا۔ میں یہ عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ قرآن کریم کی طرف رجوع اور قرآن کریم کے ساتھ فہم و شعور کا تعلق اور یہ بات کہ قرآن کریم کو سماجی راہنما کے طور پر پڑھا جائے۔ قرآن کریم اور سنت رسول ہمارا مرکز و مرجع ہیں، داخلی طور پر قرآن کریم کے ساتھ فہم و شعور کا تعلق اور دنیا کے سامنے قرآن کریم کو سماجی راہنما کے طور پر پیش کرنا آج ہماری ذمہ داری ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز کا ہم نام لیواؤں پر قرض ہے۔ میں برصغیر میں دو ہی شخصیتوں کا نام لیا کرتا ہوں فکری و علمی اور سماجی راہنمائی کے طور پر، ایک حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے بعد میرے ذہن میں دوسرا نام حضرت شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کا آتا ہے۔ ان کا ہم پر قرض ہے کہ جس زبان میں انہوں نے دنیا کو قرآن و حدیث سمجھائے ہیں ہم وہ زبان سیکھیں، وہ ذوق سیکھیں، وہ اسلوب پیدا کریں، اور حضرت شیخ الہندؒ کے فکرو فلسفہ کے مطابق قرآن کریم کو، سنت رسول کو، فقہ و شریعت کو دنیا کے سامنے پیش کریں، یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ جس طرح ہمارے ماضی کے راہنما تھے اسی طرح ہمارے مستقبل کے راہنما بھی ہیں، اللہ تعالی ہمیں ان کے علوم و افکار کے صحیح ادراک کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین اور ملت کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

۲۰۲۰ء

ہماری گھریلو درسگاہ

(مرکزی جامع مسجد امام اہل سنتؒ، گکھڑ- ۲۱ دسمبر ۲۰۲۰ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج کی اس محفل میں حاضری میرے لیے مختلف حوالوں سے خوشی اور سعادت کی بات ہے، ایک تو اس لیے کہ چند بچیوں نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ہے جن میں میری بھتیجیاں بھی شامل ہیں جو ہمارے چھوٹے بھائی مولانا منہاج الحق خان راشد کی بیٹیاں ہیں، دوسرا اس حوالہ سے کہ یہ درسگاہ والد گرامی امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ اور ہماری دو ماؤں کی گھریلو درسگاہ ہے، اور تیسرا اس لیے کہ میری اپنی ابتدائی درسگاہ بھی یہی ہے اور میں نے یہیں سے تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ اس لیے حفظ قرآن کریم مکمل کرنے والی بچیوں اور ان کے والدین کو مبارک باد دیتے ہوئے اس درسگاہ کی مختصر تاریخ عرض کروں گا اور اس کے بعد موقع کی مناسبت سے ایک دو اور گزارشات بھی کروں گا۔

والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ۱۹۴۳ء میں گکھڑ آئے تھے اور جامع مسجد بوہڑ والی میں خطابت و امامت کے فرائض انہوں نے سنبھالے تھے جبکہ ۱۹۴۵ء میں ان کی پہلی شادی ہوئی۔ ہماری والدہ محترمہ گوجرانوالہ کے راجپوت جنجوعہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت مولانا میاں محمد اکبرؒ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس دوران گکھڑ میں دینی تعلیم کی دو درسگاہیں قائم ہوئیں، ایک درسگاہ مسجد میں تھی جس میں والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ تعلیم دیتے تھے، مختلف علاقوں سے طلبہ جمع ہوتے تھے اور اہل محلہ ان کو کھانا مہیا کر دیتے تھے جبکہ ان کی رہائش مسجد

میں ہوتی تھی۔ یہ درسگاہ ۱۹۵۲ء میں گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم کا آغاز ہونے تک اسی طرح چلتی رہی۔ اس دور میں دینی درسگاہوں کا عمومی ماحول یہی ہوتا تھا کہ کسی صاحب علم کے پاس مختلف علاقوں سے طلبہ جمع ہو جاتے تھے، مسجدوں میں رہائش ہوتی تھی اور اہل محلہ دو وقت کا کھانا دے دیا کرتے تھے۔ حضرت والد محترمؒ نے اس دوران اسی نظم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں کے سینکڑوں طلبہ کو تعلیم دی ہے، جبکہ ۱۹۵۶ء میں وہ مدرسہ نصرۃ العلوم کے ساتھ منسلک ہو گئے تو اس مسجد میں پھر قرآن کریم حفظ و ناظرہ، قاری کلاس اور درس نظامی کی تعلیم مختلف مراحل میں ہوتی چلی آرہی ہے، جو اب معارف اسلامیہ اکادمی کے عنوان سے جاری ہے اور ہمارے چھوٹے بھائی مولانا قاری حماد الزہراوی کی سربراہی میں ایک پورا نظام مصروف عمل ہے۔

جبکہ دوسری درسگاہ ہمارے گھر میں تھی، ابتدا میں ہماری رہائش بٹ دری فیکٹری کی بالائی منزل میں تھی، میری پیدائش وہیں کی ہے، والدہ محترمہ کے پاس بچے اور بچیاں پچھلے پہر آتے تھے اور وہ انہیں قرآن کریم کی تعلیم دیتی تھیں، وہاں سے ہماری رہائش مسجد ٹھکیداراں والی گلی میں منتقل ہوئی اور حضرت والد محترمؒ کی دوسری شادی کے بعد ہمارے چھوٹے امی جان بھی آگئیں۔ وہاں بھی صورت یہی تھی کہ شام کو بچے اور بچیاں جمع ہوتے تھے اور ہماری دونوں مائیں انہیں تعلیم دیتی تھیں۔ پھر ہماری رہائش بٹ دری فیکٹری کے عقب میں ماسٹر خوشی محمد صاحب مرحوم کے مکان میں آگئی اور تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں ہم اس مکان میں آگئے جو ہمارا ذاتی مکان ہے اور گھریلو درسگاہ بھی اسی طرح چلتی رہی، ان سب مراحل میں مختلف مواقع پر والد گرامیؒ اور ہماری دونوں مائیں رحمہما اللہ تعالی اس درسگاہ میں تعلیم دیتی تھیں، قرآن کریم حفظ و ناظرہ، ترجمہ قرآن کریم، بہشتی زیور کے علاوہ درس نظامی کے اسباق بھی حضرت والد گرامیؒ بچیوں کو مسلسل پڑھاتے رہے۔

اس درسگاہ سے مختلف اوقات میں سینکڑوں بچیوں اور بچوں نے استفادہ کیا جن میں سابق صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ، سابق آئی جی پنجاب پولیس احمد نسیم چودھری، ریٹائرڈ بریگیڈیئر جناب محمد علی چغتائی اور وزارت خارجہ کے ایک سابقہ افسر جناب محمد شعبان اپل شامل ہیں، اس دور میں بنات کے لیے درس نظامی کے باقاعدہ مدارس بہت کم تھے مگر گکھڑ کی بہت سی بچیوں نے والد گرامیؒ سے درس نظامی کی کم و بیش مکمل تعلیم حاصل

کی جن میں ہماری تینوں بہنیں شامل ہیں اور اب یہ سلسلہ ”جامعہ امام اہل سنت للبنات“ کے نام سے جاری ہے۔

مجھے اس بات پر بہت خوشی ہے کہ حضرت والد گرامیؒ کے جاری کردہ دونوں تعلیمی سلسلے بدستور مصروف عمل ہیں، مسجد والے نظام ہمارے چھوٹے بھائی مولانا قاری حماد الزہراوی صاحب اور گھریلو درسگاہ کو سب سے چھوٹے بھائی مولانا قاری منہاج الحق خان راشد چلا رہے ہیں اور ان کے ساتھ گکھڑ کے اصحاب ذوق اور اصحاب خیر کا ایک حلقہ مصروف کار ہے۔ میں مسلسل دعا گو رہتا ہوں کہ اللہ تعالی والد محترمؒ اور ہماری دونوں ماؤں کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہمارے بھائیوں اور ساتھیوں کو ان کے اس صدقہ جاریہ کا تسلسل جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

اس کے بعد آج کی اس تقریب کے حوالہ سے ایک دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا، چند بچیوں نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ہے اور ان میں انعامات تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ بچیوں اور ان کے خاندانوں کو مبارک باد دیتے ہوئے ایک بات بچیوں سے اور دوسری بات ان کے والدین سے عرض کروں گا۔

بچیوں کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے قرآن کریم جیسی عظیم نعمت اور دولت کو اپنے سینوں میں محفوظ کیا ہے تو ان کے اس مبارک عمل میں اور بھی بہت سے لوگ شریک ہیں جنہیں اپنی دعاؤں میں شریک رکھنا ان کی ذمہ داری ہے:

1. پہلے نمبر پر ان کے ماں باپ ہیں جنہوں نے شوق اور توجہ کے ساتھ انہیں اس طرف لگایا اور ان کی وجہ سے وہ اللہ تعالی کی کتاب کو یاد کر سکی ہیں۔
2. دوسرے نمبر پر اساتذہ ہیں جنہوں نے پڑھایا، ان کی محنت اور توجہ کے باعث بچیوں نے قرآن کریم کو یاد کیا ہے اور ان کی محنت مسلسل ان کے ساتھ شامل رہی ہے۔
3. تیسرے نمبر پر جس مدرسہ میں انہوں نے تعلیم حاصل کی ہے اس کے منتظمین ان کے اس عمل میں حصہ دار ہیں کیونکہ ان کے انتظام اور نگرانی کی وجہ سے اساتذہ کا پڑھانا اور طالبات کا پڑھنا اسباب کی دنیا میں قابل عمل ہوا۔
4. چوتھے نمبر پر وہ لوگ جن کے تعاون سے یہ مدرسہ چل رہا ہے، ان کا تعاون بھی اس تعلیم کا اہم سبب بنا ہے اور وہ اس عمل خیر میں شامل ہیں۔

5. حافظ قرآن بچیوں سے یہ گزارش کروں گا کہ اس سارے کام میں ان کا نمبر پانچواں ہے، اس بات کو ذہن نشین کرنا اور یاد رکھنا ضروری ہے، ان سب کو دعاؤں میں یاد رکھیں اور ان کا شکریہ ادا کرتی رہیں کہ ان سب لوگوں کی وجہ سے آپ سب نے قرآن کریم جیسی عظیم نعمت حاصل کی ہے۔

جبکہ والدین سے یہ عرض کروں گا کہ آپ نے جس شوق اور توجہ کے ساتھ اپنی بچیوں کو قرآن کریم حفظ کرایا ہے اس سے زیادہ توجہ ان کو قرآن کریم یاد رکھوانے کے لیے ضروری ہے کیونکہ صرف ایک بار حفظ کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو زندگی بھر یاد رکھنا یاد کرنے سے زیادہ ضروری ہے، ورنہ یہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی اور جن مقاصد اور فوائد کے لیے یہ محنت کی ہے وہ حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ میرا عرض کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انہیں باقی سب کاموں سے روک کر صرف اسی کام کے لیے وقف کر دیں بلکہ یہ عرض کر رہا ہوں کہ زندگی کے سارے کام جو ان کے لیے آپ نے سوچ رکھے ہیں ضرور کریں مگر ان کی زندگی کی ترتیب ایسی سیٹ کر دیں کہ یہ قرآن کریم کو یاد رکھ سکیں اور قرآن کریم سننے اور سنانے کا وقت انہیں میسر آتا رہے کیونکہ اس کے بغیر قرآن کریم کو یاد نہیں رکھا جا سکتا اور یہ کام والدین ہی کی ذمہ داری بنتی ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ حفظ قرآن کریم کی نعمت سے بہرہ ور ہونے والی بچیوں، ان کے والدین اور اساتذہ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں قرآن کریم یاد رکھنے کی توفیق دیں، قرآن کریم کا علم اور فہم نصیب کریں، عمل کی توفیق دیں، قرآن کریم کی خدمت کے مواقع عطا فرمائیں اور ہم سب کو دنیا اور آخرت میں قرآن کریم کی برکات سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۲۱ء)

باہمی مشاورت کی اہمیت اور شرعی حیثیت

(مرکزی جامع مسجد، کامونکی - ۲ دسمبر ۲۰۲۰ء)

۳۰ نومبر تا ۲ دسمبر ۲۰۲۰ء کو تبلیغی جماعت کے ساتھ سالانہ سہ روزہ کی ترتیب بن گئی اور مرکزی جامع مسجد کامونکی میں تشکیل ہوئی۔ اس دوران مختلف بیانات، متعدّد شخصیات

سے ملاقاتوں، اور دینی اداروں میں حاضری کے علاوہ تبلیغی جماعت کی ایک شورائی نشست میں مشورہ کی اہمیت کے حوالہ سے مختصر گفتگو کا بھی موقع ملا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ مشورہ اور شورائی نظام و ماحول اسلام کے امتیازات میں سے ہیں اور اللہ تعالی نے مسلمانوں کی خصوصیات میں اس بات کا قرآن کریم میں ذکر فرمایا ہے کہ "وامرھم شوری بینھم" ان کے معاملات باہمی مشاورت کے ساتھ طے ہوتے ہیں۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا سلسلہ جاری تھا اور آپؐ کو بظاہر مشورہ کی ضرورت نہیں تھی مگر آپؐ کے لیے بھی حکم خداوندی یہ تھا کہ "وشاورھم فی الامر" آپ مسلمانوں سے اپنے معاملات میں مشاورت کرتے رہیں۔ اس لیے جناب رسول اللہ کا زندگی بھر معمول رہا کہ درپیش معاملات میں زیادہ تر صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کے ساتھ مشاورت کا اہتمام فرماتے تھے اور جن امور میں وحی کا نزول نہیں ہوتا تھا ان کے فیصلے باہمی مشاورت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ اس طرح کی مشاورت کے بیسیوں واقعات احادیث میں مذکور ہیں جن میں سے دو کا تذکرہ کر رہا ہوں تا کہ مشورہ کی ضرورت اور اس کی اہمیت و حیثیت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے آجائے۔

غزوۂ بدر اسلام کا فیصلہ کن معرکہ تھا جس کے بعد دو مسئلے سامنے آئے۔ ایک یہ کہ جنگ میں جو غنیمت حاصل ہوئی ہے اس کا کیا کرنا ہے؟ گزشتہ شریعتوں میں جہاد سے حاصل ہونے والے مال غنیمت کو استعمال میں لانا درست نہیں تھا اور اسے کھلے میدان میں جمع کر کے آگ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ جبکہ جناب نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ "احلت لی الغنائم" مجھے جو امتیازی امور عطا کیے گئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ غنیمت میرے لیے یعنی امت مسلمہ کے لیے حلال کر دی گئی ہے اور اسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بدر کے موقع پر حاصل ہونے والے مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں سوال پیدا ہوا تو قرآن کریم کی آیات وحی کے طور پر نازل ہوگئیں کہ پانچواں حصہ بیت المال کے لیے الگ کر کے باقی مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے۔

دوسرا مسئلہ جنگی قیدیوں کے بارے میں تھا کہ بدر میں ستر افراد قید ہوئے تھے، اس کا فیصلہ آنحضرتؐ نے مشاورت کے ذریعے کیا، غزوۂ بدر میں شریک حضرات سے آپؐ نے مشورہ کیا کہ ان قیدیوں کے بارے میں کیا فیصلہ کرنا چاہیے؟ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دینا

چاہیے۔ بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے پر ہوا کہ سب قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا۔ اس فیصلہ پر اللہ تعالی نے قرآن کریم میں تنبیہ فرمائی جیسا کہ سورہ الانفال کی آیات ۶۷، ۶۸، ۶۹ میں ہے کہ ان قیدیوں کو قتل کر دینا چاہیے تھا۔ ان آیات کو حضرت عمرؓ کے موافقات میں شمار کیا جاتا ہے یعنی جن آیات مبارکہ میں حضرت عمرؓ کی کسی رائے کی تائید کی گئی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات بطور خاص قابل توجہ ہے کہ تنبیہ کے باوجود فیصلہ وہی نافذ ہوا جو مشورہ میں طے ہوا تھا، اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس موقع پر اللہ تعالی نے فرمایا کہ "فکلوا مما غنمتم حلالا طیبا" یہ مال جو حاصل ہوا ہے حلال و طیب ہے اسے کھاؤ۔ اس سے مشورہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو بات مشورہ میں طے ہو جائے اگرچہ بظاہر ناپسندیدہ ہو مگر عمل اسی پر ہونا چاہیے۔

دوسرا واقعہ غزوۂ احد کا ہے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ مکہ مکرمہ سے قریش کا لشکر مدینہ منورہ پر حملہ کے لیے روانہ ہو گیا ہے تو صحابہ کرامؓ کو مشورہ کے لیے مسجد میں جمع کیا اور اس پر مشورہ چاہا کہ ہمیں مدینہ منورہ کے اندر محصور ہو کر دفاعی جنگ لڑنی چاہیے یا میدان میں نکل کر کھلا مقابلہ کرنا چاہیے۔ خود حضورؐ نے مدینہ منورہ میں رہ کر دفاعی جنگ لڑنے کی رائے دی مگر چونکہ مشاورت تھی اس لیے جو لوگ میدان میں جا کر کھلے مقابلہ کے حق میں تھے مجلس نے ان کی رائے کو مان لیا اور فیصلہ ہوا کہ مدینہ منورہ سے نکل کر کھلے میدان میں قریش کے لشکر کا مقابلہ کریں گے۔ مگر اس کے بعد جب میدان جنگ میں نکلنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، بعض حضرات کو خیال ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کھلے میدان میں نکلنے کی نہیں تھی تو ہم نے اس کے خلاف رائے دے کر غلطی کی ہے اس لیے ہمیں اپنی رائے واپس لینی چاہیے۔ چنانچہ وہ حضرات آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنی رائے پر ندامت کا اظہار کیا اور گزارش کی کہ ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں، آپ مدینہ سے باہر جا کر لڑنے کا فیصلہ واپس لے لیں۔ جس پر جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کے پیغمبر ہتھیار باندھنے کے بعد جنگ کیے بغیر اتارا نہیں کرتے، جس کا مطلب یہ تھا کہ جو فیصلہ مشورہ میں ہو چکا ہے اس پر عمل ہو گا اور اسی کے مطابق اپنے لشکر کو لے کر آپؐ مدینہ سے باہر احد کے دامن میں جا کر مورچہ زن ہو گئے۔ یہ واقعہ بھی یہ سبق دیتا ہے کہ مشورہ میں جو طے ہو جائے اسی پر عمل کرنا چاہیے اور اگر فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کی رائے بدل جائے تو وہ فیصلہ پر اثر انداز نہیں ہو گی۔

البتہ یہاں ایک بات طالبعلمانہ طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاورت کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے عملی طور پر یہ صورت اختیار فرمائی کہ آبادی سے نکل کر احد کے دامن میں رک گئے جس سے مدینہ منورہ سے نکل کر کھلے میدان میں جانے کی بات پوری ہو گئی، جبکہ آبادی سے زیادہ دور بھی نہیں گئے تاکہ آبادی کی پشت پناہی اور تعاون حاصل ہوتا رہے، یہ جناب نبی کریمؐ کی حکمت عملی تھی۔

مشورہ کی اہمیت اور مشاورتی فیصلہ پر عملدرآمد کے حوالہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بھی بہت سے ارشادات و واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ باہمی مشاورت مسلمانوں کی ایک نمایاں خصوصیت اور اسلام کے نظام اجتماعی کا اہم شعبہ ہے جس کی برکات و ثمرات اور منطقی نتائج واضح ہیں۔ حضرات خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں کی بنیاد بھی اکثر و بیشتر مشاورت پر ہوتی تھی اور آج بھی ہمارے لیے محفوظ اور بابرکت راستہ یہی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۹ دسمبر ۲۰۲۰ء)

فرانس کے تجارتی بائیکاٹ کی شرعی حیثیت

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۰ نومبر ۲۰۲۰ء)

فرانسیسی مصنوعات کے بائیکاٹ کے حوالہ سے بعض دوستوں نے سوال کیا ہے کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں بھی ایسا ہوتا تھا؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ایسا اس زمانے میں بھی ہوتا تھا اور معاشی بائیکاٹ اور ناکہ بندی جنگ و جہاد کا حصہ ہی تصور کی جاتی تھیں۔ اس حوالہ سے چند واقعات کا مختصراً تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

- قریش کے تمام خاندانوں نے بنو ہاشم سے مطالبہ کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و حفاظت سے دستکش ہو جائیں اور انہیں قریش کے حوالہ کر دیں تاکہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق نعوذ باللہ انہیں شہید کر سکیں۔ بنو ہاشم کے انکار پر ان خاندانوں نے ایک معاہدہ کے تحت اجتماعی فیصلہ کیا کہ وہ بنو ہاشم اور ان کے حلیفوں کے ساتھ اس وقت تک سوشل بائیکاٹ کریں گے جب تک وہ نبی کریمؐ کو ان کے حوالے نہ کر دیں۔ اس معاہدہ میں (۱) رشتوں کا

لین دین (۲) باہمی تجارت (۳) اور ایک دوسرے کے پاس آنے جانے کی ممانعت شامل تھی۔ اس کی وجہ سے نبی اکرمؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تھے۔ یہ بائیکاٹ تین سال جاری رہا تھا جس کی بہت سی تفصیلات حدیث و تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہیں مگر یہ مہم ناکام رہی تھی۔

•اسی دوران حضرت ابوذر غفاریؓ نے نبی اکرمؐ کی خدمت میں خفیہ طور پر حاضر ہو کر اسلام قبول کیا مگر اس کا اعلان حرم مکہ میں قریش کے اجتماع میں کیا تو انہیں لوگوں نے گھیر کر مارنا شروع کر دیا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ اس زدوکوب کے باعث وہ موت کے قریب پہنچ گئے تھے کہ بنوہاشم کے حضرت عباسؓ نے جو اس وقت اسلام نہیں لائے تھے انہیں لوگوں کے نرغے سے نکالا اور ان سے کہا کہ بنو غفار کے ایک شخص کو تم قتل کر رہے ہو یہ قبیلہ تمہارے تجارتی راستے میں ہے وہ شام کی طرف تمہاری تجارتی آمد و رفت روک دیں گے، اس پر لوگ پیچھے ہٹ گئے اور حضرت ابوذر غفاریؓ ان کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

•ہجرت کے بعد انصار کے بنو اوس قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو ابوجہل نے انہیں یہ کہہ کر عمرہ سے روکنا چاہا کہ تم لوگوں نے نعوذ باللہ ہمارے بھگوڑوں (مہاجرین) کو پناہ دے رکھی ہے اس لیے میں تمہیں عمرہ نہیں کرنے دوں گا۔ حضرت سعد بن معاذؓ کے ساتھ اس موقع پر ابوجہل کا یہ تکرار بخاری شریف کی ایک روایت میں مذکور ہے جس کے مطابق جب حضرت سعد بن معاذؓ نے ابوجہل سے جب کہا کہ میرے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ کی تو ہم تمہارے تجارتی راستے میں بیٹھے ہیں میرا قبیلہ شام کی طرف تمہاری تجارتی آمد و رفت روک دے گا، اس پر ابوجہل پیچھے ہٹ گیا۔

•غزوۂ بدر اسلام کا سب سے فیصلہ کن معرکہ ہے اور اللہ تعالی نے اسے ''یوم الفرقان'' فرمایا ہے۔ اس کا آغاز ہی معاشی ناکہ بندی کے پروگرام سے ہوا تھا کہ قریش کا تجارتی قافلہ حضرت ابوسفیانؓ کی سربراہی میں شام جا رہا تھا،

نبی اکرمؐ نے اسے راستے میں روکنے کا فیصلہ کر لیا جس کی خبر ملنے پر قریش نے ابوجہل کی قیادت میں قافلہ کی حفاظت کے لیے لشکر روانہ کیا۔ آنحضرتؐ کا ہدف تجارتی قافلہ تھا اور ابوجہل کے لشکر کا ہدف قافلہ کی حفاظت تھا مگر اللہ تعالیٰ نے دونوں کا آمنا سامنا بدر کے میدان میں کرا دیا جو کفر و باطل کا پہلا جنگی معرکہ ثابت ہوا۔

• غزوۂ احزاب میں قریش نے مختلف عرب قبائل کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا اور لوگوں کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ اشیاء ضرورت کی رسد بھی روک دی جیسا کہ جنگی محاصروں میں ہوتا ہے، مگر ایک ماہ تک محاصرے کے بعد قریش ناکام ہو کر واپس چلے گئے۔

• یمامہ کے علاقہ میں بنو حنیفہ قبیلہ کے سردار ثمامہ بن اثالؓ عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں مسلمان مجاہدین کے ایک دستے نے انہیں گرفتار کر کے مدینہ منورہ پہنچا دیا جہاں تین دن قید رہ کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ چلے گئے جہاں ان کے قبول اسلام کی خبر عام ہونے پر قریش نے ان سے تعرض کرنا چاہا تو انہوں نے اعلان فرما دیا کہ اگر مجھے کچھ ہوا تو تمہارے پاس یمامہ سے جو غلہ آتا ہے وہ روک دیا جائے گا اور گندم کا ایک دانہ بھی تم تک نہیں پہنچ پائے گا۔ یہ اعلان کر کے وہ اپنے علاقہ میں واپس گئے اور گندم کی آمد و رفت روک دی اور ناکہ بندی کر دی جس پر قریش نے نبی کریمؐ کی خدمت میں وفد بھیج کر یہ ناکہ بندی کھلوانے کی گزارش کی اور آپؐ نے حضرت ثمامہ بن اثالؓ کو باقاعدہ خط لکھ کر یہ ناکہ بندی ختم کرائی۔

• حدیبیہ کے معاہدہ میں قریش نے یہ غیر منصفانہ اور یکطرفہ شرط شامل کرا لی تھی کہ ان کا کوئی شخص مدینہ منورہ جائے گا تو آنحضرتؐ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے، مگر کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ مکرمہ آئے گا تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس کے بعد ایک صحابہ حضرت ابوبصیرؓ مدینہ منورہ آئے تو قریش نے انہیں واپس لانے کے لیے دو آدمی بھیجے، نبی اکرمؐ نے معاہدہ کے مطابق حضرت ابوبصیرؓ کو ان کے ساتھ واپس بھجوا دیا۔ حضرت ابوبصیرؓ راستہ

میں ان میں سے ایک کو قتل کر کے پھر مدینہ منورہ پہنچ گئے تو حضورؐ نے دوبارہ انہیں قریش کے مطالبہ پر واپس کر دیا۔ حضرت ابوبصیرؓ نے راستہ میں قریش کے وفد سے فرار ہو کر ایک جگہ ٹھکانہ کر لیا اور مکہ مکرمہ جانے سے انکار کر دیا۔ اب مکہ مکرمہ میں جس مسلمان کو معلوم ہوتا کہ ایک آزاد ٹھکانہ راستے میں بن گیا ہے تو وہ وہاں پہنچ جاتا اس طرح کچھ ہی عرصہ میں اچھا خاصا گروہ وہاں جمع ہو گیا۔ وہ ٹھکانہ قریش کے تجارتی راستے میں تھا، انہوں نے قافلوں کو روکنا شروع کر دیا جس سے قریش کی تجارت متاثر ہونے لگی۔ چنانچہ قریش نے جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں باقاعدہ وفد بھیج کر معاہدہ کی وہ شرط واپس لینے کا اعلان کیا جس پر آپؐ نے حضرت ابوبصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ منورہ بلا لیا۔

اس لیے معاشی بائیکاٹ اور ناکہ بندی بھی جہاد کا حصہ اور اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے، چنانچہ فرانسیسی مصنوعات کا بائیکاٹ بھی اسی زمرے میں شمار ہوگا اور ہمیں یہ مہم سنجیدگی کے ساتھ منظم کرنی چاہیے۔

نسبت کی اہمیت و برکات اور اس کے تقاضے

(جامع مسجد سیدنا صدیق اکبرؓ، جناح کالونی، لاہور - ۱۱ اکتوبر ۲۰۲۰ء)

(جامع مسجد سیدنا صدیق اکبرؓ فیروز پور روڈ لاہور کے زیر اہتمام ۱۱ اکتوبر ۲۰۲۰ء کو منعقد ہونے والے روحانی اجتماع اور عالمی انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ اجتماع منعقدہ ۲۴ تا دسمبر ۲۰۲۰ء سے مولانا راشدی کے بیانات کے مجموعہ کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ نسبت کے حوالے سے دو چار باتیں عرض کرنا چاہوں گا کہ نسبت کیا چیز ہے؟ اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں مختلف جگہوں پر نسبت کا اور نسبت کی برکات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے دو حوالے پیش کروں گا۔

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کا ذکر کیا: ”الذین یحملون العرش و من حولہ یسبحون بحمد ربھم ویومنون بہ ویستغفرون للذین امنوا، ربنا وسعت کل شیء رحمۃ وعلما فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک وقھم عذاب الجحیم“۔ جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں وہ اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے

رہتے ہیں، اس پر ایمان لاتے ہیں اور ایمانداروں کے لیے بخشش مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب تیری رحمت اور تیرا علم سب پر حاوی ہے پھر جن لوگوں نے توبہ کی ہے اور تیرے راستے پر چلتے ہیں انہیں بخش دے اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔ یہ فرشتے کام تو اپنا کرتے ہیں مگر دعا مسلمانوں کے لیے کرتے ہیں۔ ڈیوٹی ان کی عرش کو سنبھالنا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اللہ کی حمد کرتے رہتے ہیں اور استغفار کرتے رہتے ہیں۔ استغفار کس کے لیے کرتے ہیں؟ مسلمانوں کے لیے۔ ہم گناہگاروں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ وہ دعا بھی اللہ تعالی نے ذکر کی ہے کہ اللہ آپ کی رحمت اور علم ہر چیز پر وسیع ہے اللہ ان کو معاف کر دے۔

اور ”ربنا وادخلھم جنات عدن التی وعدتھم ومن صلح من اٰبآئھم وازواجھم وذریاتھم انک انت العزیز الحکیم“ جس جنت کا آپ نے ان سے وعدہ کیا ہے اس میں داخل کر دے اور ان کی برکت سے ان کے ماں باپ بیوی بچوں کو بھی جنت میں داخل کر دے۔ یہاں نسبت کی برکت کا ذکر ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ”الحقنا بھم ذریتھم وما التناھم من عملھم من شیء“ اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی ہم ان کے ساتھ ان کی اولاد کو بھی (جنت) میں ملا دیں گے اور ان کے عمل میں سے کچھ بھی کم نہ کریں گے۔ ہر شخص اپنے عمل کے ساتھ وابستہ ہے، اس میں فرمایا کہ ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ مقام تک پہنچا دیں گے۔ اگر بڑے بزرگ کسی اونچے مقام میں ہیں اور ان کے ماننے والے نیچے والے گریڈ میں ہیں تو اللہ تعالی دونوں کو اکٹھا فرما دیں گے، اوپر والوں کے گریڈ میں کمی بھی نہیں ہوگی۔

مگر اس کے ساتھ نسبت کے کچھ تقاضے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ بزرگوں کے ساتھ نسبت ہمارے ہاں بہت اعزاز، برکت اور اعتماد کی بات سمجھی جاتی ہے اور اس کا بڑے اہتمام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ فی الواقع یہ اعتماد اور اعزاز کی بات ہے اور اس کی بے حد برکات ہوتی ہیں، لیکن یہ نسبت دو دھاری تلوار ہے جو دونوں طرف چلتی ہے۔ اس کے فائدے اور برکات بہت زیادہ ہیں لیکن اگر اس کے تقاضے پورے نہ ہو سکیں تو دوسری طرف بات چلی جاتی ہے۔ دنیا میں محبت، رازداری، اعتماد اور بے تکلفی کے حوالہ سے سب سے بڑی نسبت میاں بیوی کی ہوتی ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالی نے اس کے دونوں پہلوؤں کا ذکر فرمایا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا تذکرہ کیا جو

مسلمانوں کی مائیں ہیں اور امت کی بزرگ ترین خواتین ہیں، اسی طرح اصلاح، تزکیہ اور طہارت کے لیے ضروری اعمال کا ذکر فرمایا ہے، اور یہ دونوں سورۃ الاحزاب میں بیان ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی مختلف آیات کریمہ کا خلاصہ اپنی ترتیب اور اسلوب کے ساتھ عرض کرنا چاہ رہا ہوں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق چلوگی تو تمہیں دوہرا اجر ملے گا، لیکن اگر کسی غلط حرکت کا ارتکاب کروگی تو عذاب بھی ڈبل ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی نسبت بڑی نعمت ہے، اگر اس کے تقاضے پورے ہوں تو دوہرے اجر کا باعث بن جاتی ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یہی نسبت دوہرے عذاب کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اسی طرح فرمایا "لستن کاحد من النساء ان اتقیتن" تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو مگر اس وقت جب تم تقویٰ اختیار کرو۔ یعنی نسبت کی برکات اور فوائد کے لیے تقویٰ شرط ہے، اگر ایمان اور تقویٰ نہ ہو تو یہ نسبت حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹے، حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے کام بھی نہیں آتی۔ گویا نسبت کا اعزاز اور برکات دونوں ایمان اور تقویٰ کے ساتھ مشروط ہیں۔ یہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ماحول کی بات بیان کی گئی ہے تو وہاں سے ہٹ کر خالی نسبت کیسے کام کر سکتی ہے؟

اس حوالہ سے ایک اور حساس بات اور بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گھریلو زندگی کے لیے بہتر سہولتوں کا تقاضہ کیا تھا، جو ناجائز نہیں تھا اور بظاہر ان کا حق بھی تھا، لیکن اس سے انکار کر دیا گیا اور کہا گیا کہ رسول اللہ کے گھر میں جس حالت میں ہو اسی طرح رہنا ہوگا اور اگر اس سے زیادہ کا تقاضہ ہے تو وہ سہولتیں اس گھر میں نہیں ملیں گی، اس کے لیے آپؐ سے علیحدگی اختیار کرنا ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نسبت سے متعلقہ معاملات میں صرف جواز عدم جواز کی بات نہیں ہوتی بلکہ اس ماحول کے تقاضوں کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا ماحول جس فقر وفاقہ کا عادی تھا اس کے مطابق رہنا ہی وہاں کا تقاضہ تھا، اس کی آسان تعبیر کے لیے مثال دے رہا ہوں کہ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ حضورؐ کے

گھر میں رہنا ہے تو وہاں کی ”ایس او پیز“ کی پابندی کرنا ہوگی ورنہ اس گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔

اسی طرح روحانی نسبتوں کی بات ہے کہ ہر سلسلہ کا اپنا ماحول اور دائرہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کے ساتھ منسلک ہونے والوں کے لیے وہاں کے ”ایس او پیز“ یعنی قواعد و ضوابط کے دائرے میں رضا ضروری ہے۔ دوسرے کسی سلسلہ کے قواعد و ضوابط ناجائز اور غیر شرعی نہیں ہوتے، لیکن جس سلسلہ سے تعلق ہے وہاں کے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتے، اس لیے جس بزرگ کی نسبت سے تعارف اور برکات حاصل کرنا مقصود ہے ان کے ماحول کو بھی قبول کرنا ہوگا ورنہ نسبت کا فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

یہ گزارشات تو نسبت کے حوالہ سے ہیں کہ

1. نسبت سے فائدہ اور برکات حاصل کرنے کے لیے ایمان اور تقویٰ شرط ہے۔

2. نسبت سے جہاں ثواب ڈبل ہوتا ہے وہاں اس کی ناقدری سے عذاب بھی ڈبل ہو جاتا ہے۔

3. جس بزرگ سے نسبت ہے اس کے ماحول اور قواعد و ضوابط کی پاسداری بھی ضروری ہوتی ہے۔

اس کے بعد تزکیہ و طہارت کے ضروری اعمال کی طرف توجہ فرما لیں جو انہیں آیات میں مذکور ہیں اور نبی کریمؐ کی ازواج مطہرات سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کے خاندان کو ”یطھرکم تطھیرا“ پاکیزگی کا ماحول دینا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ جن اعمال کا ذکر کیا گیا ہے ان پر ایک نظر ڈال لیں:

- ”فلا تخضعن بالقول“ اپنی آواز میں ایسی لچک نہ پیدا کریں جس سے بیمار دل والے شخص کے دل میں طمع پیدا ہو۔
- ”وقلن قولا معروفا“ آواز اور لہجے کو کنٹرول رکھتے ہوئے بھی گفتگو سلیقہ اور معروف طریقہ سے کریں۔
- ”وقرن فی بیوتکن“ اپنے گھروں میں رہیں اور بلا ضرورت نہ گھومیں پھریں۔

- ”لا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی“ جاہلیت اولی کے ماحول کی طرح اپنی زینت کی نمائش اور اظہار نہ کریں۔
- ”اقمن الصلوۃ“ نماز کی پابندی کریں۔
- ”اتین الزکوۃ“ زکوۃ ادا کرتی رہیں۔
- ”اطعن اللہ ورسولہ“ اللہ تعالی اور اس کے رسولؐ کے احکام کی اطاعت کریں۔
- ”واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ“ تمہارے گھروں میں اللہ تعالی کی جو آیات تلاوت کی جاتی ہیں ان کو یاد کرو اور یاد رکھو، اور اسی طرح حکمت بھی یاد کرو اور یاد رکھو۔ قرآن کریم میں عام طور پر جہاں حکمت کا لفظ قرآن کریم کے ساتھ بیان ہوا ہے مفسرین نے اس سے مراد سنت لی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و حدیث اور قرآن و سنت کو یاد بھی رکھیں اور ان کا تذکرہ بھی کرتی رہیں۔

یہ اعمال وہ ہیں جن کا ذکر ”ویطھرکم تطھیرا“ کے ساتھ کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ طہارت حاصل کرنے اور تزکیہ و اصلاح سے ہمکنار ہونے کے لیے ان اعمال کا اہتمام ضروری ہے۔ احسان و سلوک کے ماحول میں نسبت اور تزکیہ و طہارت دو بڑے تقاضے ہیں جن کے لیے محنت کی جاتی ہے اور ان سے فوائد و برکات کے حصول کا اہتمام کیا جاتا ہے جو ضروری ہے، لیکن اس کے لیے جو طریق کار اور اعمال و قواعد قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں ان کا ایک ہلکا سا خاکہ میں نے آپ کے سامنے مختصرا بیان کیا ہے۔ تفصیلات کا موقع نہیں ہے اس لیے ان گزراشات پر اکتفا کرتے ہوئے سب دوستوں سے اس دعا کا خواستگار ہوں کہ ان میں سے جو بات صحیح ہے اللہ تعالی ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت عمرؓ اور انسانی سوسائٹی کو درپیش چیلنجز

(جامع مسجد تقوٰی، پیپلز کالونی، گوجرانوالہ - ۲۰ اگست ۲۰۲۰ء)

یکم محرم الحرام ۱۴۴۲ھ کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جمعۃ المبارک کے اجتماع، بعد نماز مغرب جامع مسجد تقوی پیپلز کالونی گوجرانوالہ میں درس قرآن کریم، اور بعد نماز عشاء

چوک گھنٹہ گھر میں سالانہ فاروق اعظمؓ کانفرنس سے خطاب کا موقع ملا۔ ان پروگراموں میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی حیات و خدمات کے مختلف پہلو زیر بحث آئے جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ صرف ملت اسلامیہ نہیں بلکہ انسانی تاریخ کی عظیم شخصیات میں شمار ہوتے ہیں اور ان سے ہر دور میں امت مسلمہ اور انسانی سوسائٹی نے استفادہ کیا ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے بیسیوں فضائل و مناقب میں سے ایک یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ اگر نبوت کا سلسلہ منقطع نہ ہو جاتا اور میرے بعد کسی کے نبی کے منصب پر فائز ہونے کی گنجائش ہوتی تو عمرؓ نبی ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں نبی بننے کی صلاحیت موجود تھی مگر نبوت کا سلسلہ منقطع اور دروازہ بند ہو جانے کی وجہ سے وہ نبی نہیں بن سکے۔ چنانچہ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید میں نازل ہوئیں، جنہیں مفسرین کرامؒ کی اصطلاح میں ’’موافقات عمر‘‘ کہا جاتا ہے اور ان کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ بیان کی گئی ہے۔ بعض مواقع پر پیش آمدہ مسائل حضرت عمرؓ نے رائے کا اظہار کیا جس کی تائید میں وحی نازل ہوئی اور قرآن کریم نے ان کی رائے کو صائب قرار دیا۔ مثلاً غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں قتل کر دینا چاہیے، یہ رائے قبول نہیں کی گئی اور ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی آیات کے ذریعے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید فرما دی، اسی طرح اور بھی بہت سے واقعات احادیث میں موجود و مذکور ہیں۔

سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت عمرؓ کے ذوق کے حوالہ سے ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ نبی کریمؐ کے بعض احکام وقتی ضرورت کے لیے ہوتے تھے جو ضرورت مکمل ہو جانے کے بعد باقی نہیں رہتے تھے۔ جیسا کہ ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ کرائی گئی اور انہیں ایک دوسرے کا وارث قرار دیا گیا، جو مدینہ منورہ میں مہاجرین کو آباد کرنے کی وقتی ضرورت کے تحت تھا، بعد میں ضرورت مکمل ہونے پر وراثت کے باقاعدہ احکام نافذ ہوئے اور مواخات کا یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اسی طرح ایک موقع پر عید الاضحی کے خطبہ میں جناب نبی اکرمؐ نے اعلان فرمایا کہ قربانی کا گوشت گھر میں

تین دن سے زیادہ رکھنا منع ہے، جبکہ اگلے سال عید الاضحی کے موقع پر اعلان کیا کہ گزشتہ سال یہ پابندی وقتی ضرورت کے تحت لگائی گئی تھی کہ کچھ ضرورت مند قبائل مدینہ منورہ میں ہجرت کر کے آئے تھے، پابندی کا مقصد یہ تھا کہ گوشت ذخیرہ کرنے کی بجائے ان کو دے دیا جائے، اب وہ صورتحال نہیں ہے اس لیے پابندی ختم ہو گئی ہے۔

اس پس منظر میں ایک اور حکم پر غور کر لیا جائے کہ عمرۃ القضاء کے موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کافی عرصہ کے بعد حاضری کا موقع ملنے کی وجہ سے انتہائی عاجزی کے ساتھ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے، جسے ارد گرد دیکھنے والے دشمنوں نے کمزوری پر محمول کیا اور کہا کہ ''وھنتھم حمی یثرب'' حضورؐ کے ساتھیوں کو یثرب کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور وہ کمزور پڑ گئے ہیں۔ آنحضرتؐ کو یہ بات پسند نہیں آئی، چنانچہ انہوں نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ طواف کے پہلے تین چکر رمل کے ساتھ لگائے جائیں، یعنی عاجزی کی بجائے اکڑ کر چلا جائے تاکہ دشمن اسے کمزوری نہ سمجھے۔ یہ رمل اب تک چلا آرہا ہے اور طواف کے پہلے تین چکر آج بھی رمل کے ساتھ لگائے جاتے ہیں، حالانکہ یہ ایک وقتی ضرورت تھی جو اس کے بعد نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ میں بھی باقی نہیں رہی تھی، بالخصوص فتح مکہ کے بعد تو ماحول بالکل بدل گیا تھا اور ارد گرد کوئی طعنہ دینے والا موجود نہیں تھا، مگر رمل بدستور چلتا رہا اور اب بھی چل رہا ہے۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں ایک روایت میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی خلافت کے دور میں اس بات پر غور کیا کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، اسے ختم کر دینا چاہیے، مگر یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ جب حضورؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں بظاہر ضرورت ختم ہو جانے کے باوجود اسے ختم نہیں کیا تو اس میں یقیناً اور بھی کوئی مصلحت ہو گی، اس لیے اسے جاری رہنا چاہیے۔

یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ آج کل یہ سوچ عام ہوتی جا رہی ہے کہ نبی کریمؐ کی جس سنت مبارکہ کے بارے میں بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ شاید وقتی ضرورت کے تحت تھی اور آج اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس لیے اس سنت کو جاری رکھنے پر نظر ثانی کرنی چاہیے، یہ درست طرز فکر نہیں ہے اور حضرت عمرؓ کے اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جو کام آنحضرتؐ نے شروع کیا اور ان کی حیات طیبہ میں جاری رہا، آج اگر اب کوئی

ضرورت دکھائی نہ دیتی ہو تو بھی اس پر نظر ثانی کی بات نہیں کرنی چاہیے اور اسے بدستور جاری رہنا چاہیے۔

سیدنا حضرت عمرؓ کے بارے میں اس پہلو پر بھی کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ جہاں تک ان کے فضائل و مناقب اور عظمت و بزرگی کی بات ہے اس کا تذکرہ کرتے رہنا ہمارے ایمان کا حصہ اور تقاضہ ہے اور برکت و رحمت کا باعث ہے مگر آج کی دنیا کو بھی حضرت عمرؓ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انسانی سوسائٹی کے مشکل ترین مسائل کے حل کے لیے حضرت عمرؓ کا اسوہ اور نظام راہنمائی کا کام دیتا ہے اور ہمیں اس طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ بالخصوص گڈ گورننس اور ویلفیئر اسٹیٹ کے حوالہ سے تو حضرت عمرؓ کی شخصیت آج بھی حوالہ اور آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے، جس کا اپنے اور پرائے سب تذکرہ کرتے ہیں۔ ابھی مجھ سے پہلے مقرر نے گاندھی جی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے نظام حکومت کے حوالہ سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور حکومت کو مثالی قرار دیا تھا۔

جبکہ ہمارے ہاں تو اس کا مسلسل تذکرہ ہوتا رہتا ہے، آج ہی اخبارات میں خیبر پختونخوا کے وزیر اعلی کا بیان شائع ہوا ہے کہ گڈ گورننس کے حصول اور کرپشن کے خاتمہ کے لیے حضرت عمرؓ ہمارے بہترین راہنما ہیں۔ کچھ عرصہ قبل سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب افتخار محمد چوہدری نے اپنے دور میں ایک کیس کی سماعت کے دوران یہ ریمارکس دیے تھے کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کرپشن اور سب سے بڑی ضرورت گڈ گورننس ہے جس کے لیے ہمیں حضرت عمرؓ سے راہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک کالم میں عرض کیا تھا کہ چوہدری صاحب محترم کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے مگر میرا سوال ہے کہ حضرت عمرؓ کی گڈ گورننس ملک کے کون سے ریاستی تعلیمی ادارے میں پڑھائی جاتی ہے؟

حضرت عمرؓ کی گڈ گورننس کے حوالہ سے ایک تاریخی واقعہ ذکر کرنا چاہوں گا جو امام ابوعبیدؒ نے اسلامی معاشیات کی کلاسیکل کتاب "کتاب الاموال" میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں یمن کے گورنر حضرت معاذ بن جبلؓ نے ایک سال صوبے سے وصول ہونے والی آمدنی کا تیسرا حصہ کسی مطالبہ کے بغیر مرکز کو بھجوا دیا، جس پر حضرت عمرؓ نے انہیں باقاعدہ خط کے ذریعے تنبیہ فرمائی کہ یمن سے وصول ہونے والی زکوۃ و صدقات پر یمن کے لوگوں کا حق زیادہ ہے، آپ نے مرکز کو کیوں بھجوا دیا ہے؟ انہوں نے جواب میں

لکھا کہ یمن کی سرکاری اور عوامی ضروریات پورے ہونے کے بعد اس سال یہ رقم بچ گئی ہے، اس لیے آپ کو بھیج دی ہے۔ اگلے سال انہوں نے نصف، تیسرے سال دو تہائی، اور چوتھے سال پوری رقم مرکز کو بھیج دی اور خط لکھا کہ اللہ تعالی کے قانون اور حضرت عمرؓ جیسے عادل حکمران کی برکت سے آج ہمارے صوبے میں کوئی شخص بھی بیت المال سے مدد حاصل کرنے کا مستحق نہیں رہا، اس لیے ساری رقم مرکز کو بھیج رہا ہوں۔

گویا اللہ تعالی کے قانون واحکام کی برکات تو ہوتی ہی ہیں، عادل حکمرانوں کی برکت بھی ہوتی ہے، اس لیے آج حضرت عمرؓ کی حیات مبارکہ کے اس پہلو کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ انہوں نے کس سادگی، قناعت، جفاکشی، بے تکلفی اور صبرو حوصلہ کے ساتھ حکومت کی، لوگوں کو انصاف فراہم کیا، اللہ تعالی اور ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وقوانین کو انسانی معاشرے میں عملی طور پر نافذ کرکے سوسائٹی کو اس کی برکات سے فیضیاب کیا۔ اس لیے عرض کیا کرتا ہوں کہ فضائل و مناقب کا ذکر بھی ضروری ہے اور ہمارے ایمان کا حصہ ہے اس سے ثواب واجر ملتا ہے، برکات حاصل ہوتی ہیں، اور اپنے بزرگوں کے ساتھ نسبت بھی تازہ اور پختہ ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آج کی دنیا کے مسائل کیا ہیں اور آج کی انسانی سوسائٹی کو کون سی مشکلات، پرابلمز اور چیلنجز درپیش ہیں؟ ہمارا ایمان ہے کہ ان سب کا علاج اور حل قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کے نظام میں موجود ہے مگر ہماری اس طرف توجہ نہیں ہے، اور ہم اس حوالہ سے دنیا کی راہنمائی کے لیے علمی اور عملی طور پر کوئی کردار اختیار نہیں کر رہے۔

چنانچہ سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے میں علماء کرام، دینی کارکنوں بالخصوص دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خلفاء راشدینؓ اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کے دور حکومت کے سیاسی، انتظامی، معاشی، عدالتی اور معاشرتی نظام واحکامات کو سمجھنا اور آج کی دنیا کے سامنے پیش کرنا ہماری ذمہ داری ہے اور ہمیں اس سلسلہ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو پوری طرح سمجھتے ہوئے ان کی ادائیگی کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے، اللہ تعالی سب کو توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۶ ستمبر ۲۰۲۰ء)

آزادی کا تحفظ اور اہل دین کی ذمہ داریاں

(مدرسہ تعلیم القرآن، لنگرکسی، بھوربن، مری - ۱۳ اگست ۲۰۲۰ء)

(۱۳ اگست ۲۰۲۰ء کو بھوربن مری میں عالمی انجمن خدام الدین کے سالانہ اجتماع کی بعد نماز مغرب نشست سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ حضرت مولانا میاں محمد اجمل قادری اور عالمی انجمن خدام الدین کا شکر گزار ہوں کہ وقتاً فوقتاً ان کی توجہ فرمائی سے سلسلہ عالیہ قادریہ راشدیہ کی مختلف نشستوں میں حاضری اور احباب سے ملاقات کا موقع مل جاتا ہے اور اپنے بزرگوں کے ساتھ نسبت تازہ ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ان نسبتوں کو قائم رکھیں اور دونوں جہانوں میں ہم سب کے لیے برکتوں کا باعث بنائیں، آمین یارب العالمین۔

کل ہمارا یوم آزادی ہے، ۱۴ اگست کو ہمیں برطانوی استعمار کی غلامی سے آزادی ملی تھی اور اسی روز پاکستان کے نام سے جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی خود مختار نظریاتی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس لیے یہ دوہری خوشی کا دن ہے اور اس روز پاکستانی عوام ملک بھر میں بلکہ دنیا میں جہاں بھی وہ ہیں، آزادی اور نئے وطن کی خوشی میں تقریبات کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس مناسبت سے آج آپ حضرات کے سامنے ماضی قدیم کی دو تحریکات آزادی کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جن کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے، اور جن کی قیادت حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے فرمائی تھی، یہ دونوں تحریکیں بنی اسرائیل کے دور کی ہیں۔

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں جو اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس فلسطین سے مصر آ گئے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی حکومت و بادشاہت کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں غلام کی حیثیت سے آئے تھے، انہیں باقاعدہ منڈی سے خریدا گیا تھا مگر وہ غلامی اور قید و بند کے مراحل سے گزر کر مصر کی حکمرانی کے منصب پر فائز ہوئے اور ان کے خاندان کی حکومت کئی نسلوں تک چلتی رہی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام ہے کہ وہ کسی ایک طاقت کو ہمیشہ اقتدار پر نہیں رہنے دیتا اور توازن تبدیل کرتا رہتا ہے، جسے قرآن کریم نے ''ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض'' سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارے ہاں دو سو سال تک برطانیہ نے حکومت کی، پھر امریکہ بہادر سامنے آیا اور اب قوت و طاقت کا پلڑا مشرق کی طرف جھکتا نظر آ رہا ہے۔ پھر اس کے بعد شاید ہماری

باری آجائے مگر ابھی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ بہر حال بنی اسرائیل کی کئی نسلوں تک مصر پر بادشاہت کے بعد حالات نے پلٹا کھایا، آل فرعون کی حکومت قائم ہوئی اور بنی اسرائیل غلام ہو گئے۔ ان کی یہ غلامی اور مظلومیت کئی نسلوں تک جاری رہی۔

یہ بھی فطری بات ہے کہ نئے حکمرانوں نے جن سے حکومت چھینی ہو ان کے جبر و تشدد کا نشانہ سب سے زیادہ وہی بنتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ساتھ ایک عرصہ تک یہی کچھ ہوتا رہا، پھر اللہ تعالی نے ان کی ہدایت اور آزادی کے لیے حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، ان دونوں بھائیوں کو جب نبوت و رسالت دے کر اللہ تعالی نے بنی اسرائیل اور آل فرعون کی طرف بھیجا تو توحید و بندگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ان کی دعوت و پیغام کا حصہ تھا کہ ”ان ارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذ بھم“۔ اس میں فرعون سے کہا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو آزادی کے ساتھ ان کے وطن جانے دے اور غلامی کے عذاب سے نجات دے۔ گویا اپنی قوم کی آزادی کی جدوجہد بھی دو نبیوں کے اہداف میں شامل تھی اور اس کے لیے انہیں فرعون کے ساتھ طویل کشمکش سے گزرنا پڑا۔ فرعون نے حضرت موسیؑ کے ساتھ اپنی گفتگو میں طعنہ دیا کہ تم نے میرے گھر میں پرورش پائی ہے اور ہمارا ایک آدمی بھی قتل کر دیا تھا، اس کے ساتھ انہیں ”ولا یکاد یبین“ کہہ کر لکنت کا طعنہ بھی دیا۔ جس کا جواب حضرت موسی علیہ السلام نے دیا کہ تم کون سا احسان جتلا رہے ہو؟ یہی کہ ”ان عبدت بنی اسرائیل“ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔

بہر حال طویل جدوجہد اور کشمکش کے بعد اللہ تعالی نے فرعون کو لشکر سمیت بحیرہ قلزم میں غرق کیا اور بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا کے آزادی کی نعمت سے ہمکنار کر دیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ اپنا وطن فلسطین آزاد کرانے کے لیے وہاں پر قابض قوم کے خلاف جہاد کرو۔ بنی اسرائیل نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا جس پر اللہ تعالی نے فلسطین میں داخلہ بنی اسرائیل کے لیے چالیس سال تک حرام قرار دے دیا۔ اس دوران حضرت موسیؑ اور حضرت ہارونؑ انتقال فرما گئے اور ان کی جگہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی قیادت سنبھالی، ان کی قیادت میں جہاد کر کے بنی اسرائیل نے فلسطین آزاد کرایا اور وہاں ان کی حکومت قائم ہوئی جو کئی نسلوں تک قائم رہی۔ یہاں یہ بات بھی قابل

توجہ ہے کہ صرف آزادی قوم کی اصل منزل نہیں ہوتی بلکہ اس کے نتیجے میں آزاد ریاست کا قیام اور آسمانی تعلیمات کی حکمرانی بھی آزادی کے مقاصد میں شامل ہوتا ہے۔

پھر ایک موقع پر ایک اور ظالم بادشاہ جالوت نے ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور بنی اسرائیل کی حیثیت غلاموں جیسی ہو گئی، انہوں نے اس وقت کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام سے جہاد کے لیے امیر مقرر کرنے کی درخواست کی، قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق انہوں نے حضرت طالوت کو امیر مقرر کر دیا جن کی قیادت میں جالوت کے خلاف جہاد کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے، یہ جہاد نہر اردن کے اسی مغربی کنارے میں ہوا جہاں آج کل فلسطین اور اسرائیل کے درمیان قبضہ کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے۔ اس جنگ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت قتل ہوا، بنی اسرائیل کو فتح ملی اور حضرت طالوت کی حکومت قائم ہو گئی۔ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو داماد بنا لیا اور طالوت کے بعد حضرت داؤدؑ کی بادشاہت کا سلسلہ شروع ہوا جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ”خلافت“ کے عنوان کے ساتھ ذکر کیا ہے اور وہ حضرت سلیمانؑ کے دور میں عروج و کمال تک پہنچی۔ آج کے یہودی اس عظیم سلطنت ”اسرائیل“ کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے عربوں اور فلسطینیوں سے لڑ رہے ہیں۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ دونوں جنگیں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی قیادت میں جہاد کے عنوان سے لڑی گئیں۔ دونوں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور ریاستیں وجود میں آئیں جو تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ ان کا ذکر قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور بائبل بھی ان کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسانوں کی ہدایت کے لیے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا تو ان کے اہداف و مقاصد میں قوموں کو غلامی سے نجات دلانا، آزاد و خود مختار ریاست قائم کرنا اور آسمانی تعلیمات کی حکمرانی قائم کرنا شامل تھا۔

اسی طرح ہمارے بزرگوں نے بھی دینی جذبہ کے ساتھ جنوبی ایشیا کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت کے دو سو سالہ تسلط سے نجات دلانے کے لیے آزادی کی جنگیں لڑیں۔ نواب سراج الدولہؒ اور ٹیپو سلطان شہیدؒ سے لے کر شہدائے بالاکوٹ تک، بنگال میں حاجی شریعت اللہؒ کی فرائضی تحریک، پنجاب میں رائے احمد خان کھرلؒ کی جدوجہد، سرحد میں فقیر ایپیؒ اور حاجی صاحب ترنگ زئیؒ کی تحریکات، ۱۸۵۷ء کا معرکہ آزادی اور حضرت شیخ الہندؒ

کی تحریک ریشمی رومال اسی تناظر اور تسلسل کی تحریکات ہیں۔ جن کے بعد تحریک خلافت اور دیگر پرامن سیاسی تحریکات کا دور شروع ہوا اور عدم تشدد پر مبنی سیاسی تحریکات کے تسلسل نے انگریزوں کو یہاں سے جانے پر مجبور کر دیا، جس کے نتیجے میں ہندوستان انگریزوں کے براہ راست تسلط سے آزاد ہوا اور وطن عزیز پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا یوم آزادی ہم ایک بار پھر کل چودہ اگست کو منا رہے ہیں۔

اس موقع پر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری غلامی کا آغاز تجارت کے عنوان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثرونفوذ کے فروغ کے ذریعے ہوا تھا جو بڑھتے بڑھتے پورے جنوبی ایشیا پر برطانوی استعمار کا تسلط قائم ہونے تک جا پہنچا۔ آج پھر تجارت کے نام پر ملٹی نیشنل کمپنیاں مغرب و مشرق دونوں طرف سے ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہیں بلکہ ہماری روزمرہ زندگی ان کی پراڈکٹس اور سروسز کے سہارے چل رہی ہے، اور بیرونی تسلط کا ایک نیا دور مسلط ہوتا نظر آرہا ہے جس کا تقاضہ ہے کہ جس طرح آزادی کے حصول کے لیے دو سو سال محنت کی گئی تھی اور حضرات علماء کرام نے اس کی قیادت و راہنمائی کی تھی، اسی طرح آزادی کے تحفظ اور قومی خودمختاری کی بحالی کی ہمہ گیر منظم جدوجہد کا مرحلہ پھر ہمارے سامنے ہے جو قومی تقاضہ ہونے کے ساتھ ملی و دینی فریضہ بھی ہے۔ اور اس میں بھی علماء کرام، صوفیاء عظام اور دینی راہنماؤں کو کلیدی کردار ادا کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا شعور و ادراک نصیب فرمائیں اور پاکستان کی سالمیت و وحدت، خودمختاری و نظریاتی تشخص، اور تہذیبی امتیاز کو قائم رکھنے کے لیے اپنا اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

مغرب کی نقالی کا ایک افسوسناک پہلو

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۱ جولائی ۲۰۲۰ء)

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”لتتبعن سنن من کان قبلکم حذو النعل بالنعل“ تم پہلی امتوں کی قدم بہ قدم پیروی کرو گے۔ اس حدیث مبارکہ کی تشریح میں محدثین کرامؒ نے مختلف پہلوؤں پر بات کی ہے، ان میں سے ایک پہلو پر آج کچھ معروضات پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ اس تمہیدی گزارش کے ساتھ کہ انسان بنیادی طور پر اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کے حوالہ سے شروع سے کم و بیش یکساں چلا آرہا ہے اور قیامت

تک اس نے ایسا ہی رہنا ہے۔ اس کے اندر فطرت نے خیر و شر کی جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، ان کا بنیادی ڈھانچہ ہر دور میں ایک ہی طرز کا رہا ہے، البتہ ان کے اظہار و استعمال میں ماحول اور زمانے کے اعتبار سے ضرور کمی بیشی ہوتی چلی آرہی ہے، جو آئندہ بھی جاری رہے گی۔ اس لیے یہ بات فطری ہے کہ بعد والے انسان پہلے والے انسانوں کی طرح مختلف حالتوں میں ان جیسا طرز عمل ہی اختیار کریں، جس پر انسانی تاریخ شاہد ہے۔

قرآن کریم نے حق و باطل کی کشمکش اور خیر و شر کی آمیزش کے حوالہ سے سابقہ اقوام بالخصوص بنی اسرائیل کے جو احوال و کیفیات تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں، آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی ان کا اظہار اسی طرح ہو رہا ہے۔ جیسا کہ دوسری قوموں کی نقالی ہمارا اجتماعی مزاج بن گیا ہے اور یہ دیکھے بغیر کہ جس کام میں کسی دوسری قوم کی نقالی کر رہے ہیں، ان کو یہ کام کس وجہ سے کرنا پڑا اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ ہم نے صرف نقل کرنی ہے تاکہ ہم کسی کام میں، وہ اچھا ہے یا برا، اس قوم سے پیچھے نہ سمجھے جائیں۔

مثال کے طور پر بات دیکھ لیں کہ سولہویں صدی عیسوی میں جرمنی کے ایک مسیحی مذہبی راہنما مارٹن لوتھر نے، جو فلسفہ کا استاذ بھی تھا، پاپائے روم کی مذہبی اتھارٹی کو چیلنج کر دیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ بائبل کو ہر شخص خود براہ راست سمجھ سکتا ہے، اسے درمیان میں پادری اور پوپ کے واسطے کی ضرورت نہیں ہے، جبکہ راہنمائی کے لیے صرف بائبل کافی ہے اور کسی کی مذہبی راہنمائی درکار نہیں ہے۔ اس کے اس نظریہ نے یورپ میں قبولیت حاصل کی اور ایک نئے مسیحی فرقے پروٹسٹنٹ کی بنیاد پڑ گئی جو آج مسیحی دنیا کے دو بڑے فرقوں میں شمار ہوتا ہے اور یورپ میں اس کی اکثریت بتائی جاتی ہے۔

اس کی عالم اسباب میں بڑی وجہ یہ تھی کہ پوپ کو بائبل کی تشریح میں فائنل اتھارٹی کا جو درجہ حاصل تھا وہ کسی دلیل و استدلال کی بنیاد پر نہیں بلکہ صوابدیدی طور پر تھا۔ جبکہ پاپائیت اس دور میں بادشاہت اور جاگیرداری کے ظالمانہ و جابرانہ نظام میں شریک کار ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس کے ارتقا و تحقیق کی مخالفت میں بھی پیش پیش تھی۔ اس لیے سائنس و ٹیکنالوجی کے ارتقا اور بادشاہت و جاگیردارانہ نظام سے نجات کے لیے پاپائیت کی بالادستی سے گلوخلاصی بھی یورپ کی معاشرتی ضرورت بن گئی تھی۔ جس کی وجہ سے مارٹن لوتھر کی آواز کو پذیرائی ملی اور اس کے نتیجے میں یورپ نے بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کی تکون سے آزادی حاصل کر لی جس پر وہ آج تک قائم ہے۔

اسے دیکھ کر ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں کو شوق چڑھا کہ قرآن کریم کو ہدایت کا واحد سرچشمہ مانا جائے اور اس کی تعبیر وتشریح کو ہر شخص کا براہ راست حق قرار دے کر درمیان سے علماء کرام، محدثین اور فقہاءؒ کے واسطے کی نفی کر دی جائے۔ جس کا نقش اول اکبر بادشاہ کا خود ساختہ ''دین الٰہی'' بنا اور اس کے بعد سے یہ آواز مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف لہجوں کے ساتھ آج تک بلند ہوتی چلی آرہی ہے اور آج بھی پوری بلند آہنگی کے ساتھ سوسائٹی کے نقار خانے میں گونج رہی ہے۔ حدیث و سنت کے حجت ہونے سے انکار اور فقہ وشریعت کو بنیاد بنانے سے گریز کی فکری تحریکات کا تاریخی پس منظر کم وبیش اسی طرح کا ہے۔ حالانکہ اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب دونوں حوالوں سے دونوں طرف کی صورتحال قطعی طور پر مختلف بلکہ متضاد ہے، جس کی طرف دیکھنے کی کسی کو بھی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی، مثلاً:

- بائبل کی تعبیر وتشریح میں پوپ کی اجارہ داری کی نفی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پاپائیت کے لیے بائبل کی تعبیر وتشریح کا جو اختیار سمجھا جاتا تھا وہ استدلالی نہیں بلکہ صوابدیدی تھا اور اس کی کسی بات سے اختلاف کی گنجائش نہیں تھی۔ جبکہ مسلمانوں کے ہاں قرآن و سنت کی تعبیر وتشریح میں علماء وفقہاء کا حق استدلالی ہوتا ہے، کسی بھی موقف کے لیے قرآن و سنت سے دلیل ضروری سمجھی جاتی ہے، اور مختلف آرا میں سے کسی ایک کو ترجیح بھی دلیل کی بنیاد پر ہی دی جاتی ہے۔
- پاپائیت نے تاریک دور میں بادشاہت اور جاگیرداری کے جابرانہ نظام میں شراکت داری کرلی تھی اور اس کا کام بادشاہ اور جاگیردار کے مظالم کو جواز کی سند فراہم کرنے کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ جبکہ مسلمان علماء کرام اور فقہاء عظام ہر دور میں عوام اور مظلوم قوم کے ساتھ رہے ہیں اور چند شخصی مستثنیات سے ہٹ کر مذہبی قیادت کے اجتماعی کردار میں حکمران طبقات کی مداخلت سے آزاد دینی راہنمائی کا تسلسل قائم چلا آرہا ہے، جس کی جھلک آج بھی ہمارے معاشرے میں صاف نظر آتی ہے۔
- پاپائیت نے سائنس وٹیکنالوجی کی مخالفت کی تھی، جبکہ مسلم علماء کرام اور دانشوروں نے ہر دور میں اس کی حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ سرکردہ اہل علم نے

اس میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور آج بھی ان کا کردار یہی ہے جس کا اعتراف سنجیدہ مغربی دانشور بھی کر رہے ہیں۔

• تورات اور انجیل سمیت سابقہ آسمانی کتابیں محفوظ و مستند حالت میں موجود نہیں تھیں، حتیٰ کہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے بقول سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مستند سیرت بھی انہیں میسر نہیں تھی۔ جبکہ مسلمانوں کے پاس نہ صرف قرآن کریم بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت، خلفاء راشدینؓ کے فیصلے اور فقہاء عظامؒ کی تعبیرات وتشریحات کا عظیم علمی وفقہی ذخیرہ پورے اعتماد و استناد کے ساتھ آج بھی موجود و محفوظ ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف کتابوں میں نہیں ہے بلکہ عملی طور پر اس کا معاشرتی ماحول اور تہذیبی تسلسل بھی ساتھ قائم چلا آرہا ہے۔

نتائج و عواقب کے حوالہ سے بھی ایک نظر ڈال لی جائے:

• مذہب کے علمی ترجمانوں کو درمیان سے ہٹا دینے کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ خود مذہب ہی معاشرے سے نکل گیا۔ آج یورپ کے مذہبی مراکز اور چرچ رونقوں سے محروم ہیں اور معاشرتی زندگی میں آسمانی تعلیمات پر عمل بلکہ احترام بھی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔

• مغرب میں آسمانی تعلیمات سے انحراف کے نتیجے میں ”خاندانی نظام“ خلفشار کا شکار نظر آتا ہے، رشتوں کا تقدس بلکہ وجود تک ختم ہو کر رہ گیا ہے، حتیٰ کہ ماں باپ کی ایک بڑی تعداد اولاد کی بجائے اولڈ پیپلز ہومز میں رہنے پر مجبور ہے۔

• مغرب روحانی سکون کی تلاش میں ہے اور وجدانیات کی طرف واپسی کے راستے تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ نفسیات اور سائیکالوجی کا سہارا لیے ہوئے ہے جو مغربی معاشرہ کو روحانی سکون فراہم کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں، جبکہ ایک بڑی تعداد نشہ کو سکون کا واحد ذریعہ سمجھ کر اس میں گم ہے۔

• مغرب نہ صرف خود معاشی عدم توازن کا شکار ہے بلکہ اس نے پوری دنیا کو معاشی ناہمواری کی طرف دھکیل رکھا ہے، جس پر سابق پاپائے روم پوپ بینی ڈکٹ کی قائم کردہ کمیٹی کو یہ کہنا پڑا ہے کہ دنیا میں معاشی توازن کی بحالی کے لیے

ان معاشی اصولوں کو اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے جو قرآن کریم نے بیان کیے ہیں۔ جبکہ شہزادہ چارلس معاشرتی اصولوں کے حوالہ سے یہی بات کہہ چکے ہیں۔

اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب دونوں حوالوں سے صورتحال ہمارے سامنے ہے، جس میں المیہ کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ ہم سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی مغرب کی نقالی میں سرپٹ دوڑے جا رہے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ہماری بریکیں ہی فیل ہو گئی ہیں۔ یہ صورتحال سب سے زیادہ مسلم علماء کرام، دانشوروں اور علمی مراکز کی توجہ کی طالب ہے کیونکہ ان امور کی نشاندہی، تجزیہ اور اس سے نکلنے کے راستے تلاش کرنے کا کام اور کسی نے نہیں کرنا، وہ کریں گے تو ہو گا اور نہیں کریں گے تو اس کے نتیجے میں انسانی سوسائٹی جس ہولناک تباہی کا شکار ہونے جا رہی ہے اس کی ذمہ داری سے عند اللہ و عند الناس کہیں بھی وہ بری الذمہ نہیں ہو سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس اور ان کے لیے مخلصانہ محنت کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

یونیورسٹیوں میں ترجمہ قرآن کی لازمی تعلیم

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۷ جون ۲۰۲۰ء)

پنجاب کے گورنر محترم چودھری محمد سرور کی طرف سے یونیورسٹیوں میں ترجمہ قرآن کریم کو لازمی قرار دینے کی خبر یقیناً سب کے لیے خوشی کا باعث بنی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ پنجاب کی یونیورسٹیوں میں کسی طالب علم کو ترجمہ قرآن کریم پڑھے بغیر ڈگری نہیں ملے گی۔ پنجاب حکومت اور اسمبلی کی طرف سے اس قسم کے اعلانات اس سے قبل بھی مختلف مواقع پر سامنے آتے رہے ہیں۔ بلکہ ہماری یادداشت کے مطابق صوبائی اسمبلی نے ایک مرحلہ میں بل بھی منظور کیا تھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ کالجوں میں لازمی پڑھایا جائے گا مگر وہ بل شاید قانون سازی کی منزل حاصل نہیں کر سکا تھا۔ البتہ چودھری محمد سرور چونکہ اپنے منصب کے لحاظ سے ریاستی یونیورسٹیوں کے چانسلر بھی ہیں اس لیے ان کا یہ اعلان پہلے اعلانات سے مختلف نظر آتا ہے اور اس سے یہ توقع پیدا ہو گئی ہے کہ اب عملاً ایسا ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

چودھری محمد سرور کے ساتھ کسی دور میں ہماری بھی شناسائی رہی ہے، گلاسگو کی مرکزی جامع مسجد کے حجرہ میں حافظ محمد شفیقؒ کے ''حقہ کی محفل''میں متعدّد بار چودھری صاحب کے ساتھ شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ اور ابھی رمضان المبارک سے قبل کرونا بحران میں مساجد کھلی رکھنے کے معاملہ میں گورنر ہاؤس میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت ہوئی تو چودھری صاحب کا خطاب سامنے بیٹھ کر سنا، لیکن جب آمنے سامنے سے گزرے تو فضا میں ''تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' کی گنگناہٹ سنائی دینے لگی۔ بہرحال اس سے قطع نظر گورنر پنجاب کا یہ اعلان لائق تحسین و تبریک ہے بلکہ مجھے تو چودھری محمد سرور کے گورنر بننے کے بعد سے انتظار تھا کہ وہ اس قسم کا خیر کا کوئی کام ضرور کریں گے جس کا شاید انہیں موقع اب ملا ہے۔

گزشتہ دنوں ایک محفل میں بات چل رہی تھی کہ پنجاب میں سرکاری سطح پر فلاں کام ہونے والا ہے اور وہ کام بظاہر خیر کا نہیں لگ رہا تھا، میں نے دوستوں کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ بزدار صاحب سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں، مگر جب تک صوبائی سیٹ اپ میں چودھری محمد سرور اور چودھری پرویز الٰہی موجود ہیں مجھے اطمینان ہے کہ ان کے علم میں ہوتے ہوئے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔

قرآن کریم کی تعلیم ہر مسلمان کی بنیادی ضرورت ہے، اس کی تلاوت، اس کا فہم اور اس کے احکام پر عمل ہر مسلمان مرد اور عورت کی ذمہ دری ہے، جبکہ قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنا اور پڑھ کر سمجھنا ہمارے ان فرائض میں شامل ہے جن کی طرف قرآن کریم نے خود توجہ دلائی ہے۔ ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''حتیٰ تعلموا ما تقولون'' قرآن کریم پڑھتے ہوئے تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اس آیت اور جملہ کا مفہوم کیا ہے۔ ویسے بھی کامن سینس کی بات ہے کہ جب ہم قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام و پیام مانتے ہیں اور خود کو اس کا مخاطب سمجھتے ہیں تو اللہ رب العزت کے پیغام کو سمجھنا اور اس کے مفہوم سے واقف ہونا لازمی طور پر اس کا حق اور ہماری ذمہ داری بنتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم نے اس کے دائرے الگ الگ بیان کیے ہیں۔ ''یتلوا علیہم آیاتہ'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم پڑھ کر سناتے ہیں، اسی لیے قرآن کریم کی تلاوت و قراءت مستقل عبادت ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ ''یعلمہم الکتاب'' بھی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی تعلیم دیتے ہیں، یعنی اس کا مطلب و مفہوم بھی سمجھاتے ہیں۔ بلکہ اس

سے آگے ”تبیین للناس“ بھی ہے کہ اس مطلب و مفہوم کی ضرورت کے مطابق وضاحت بھی فرماتے ہیں۔

اس حوالہ سے ہم پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری دہری ہے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور اسلامی شناخت کو محفوظ رکھنے کے لیے عمل میں لایا گیا تھا جس کے لیے بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ اس میں قرآن کریم کے احکام وہدایات کی عملداری کا نظام ہوگا۔ اس کے علاوہ ہمارے دستور میں بھی یہ صراحت ہے کہ قرآن و سنت کی ہدایات کو تمام معاملات میں بالادستی حاصل ہوگی۔ اس کا منطقی تقاضہ یہ ہے کہ ملک کا نظام چلانے والے افراد اور مختلف محکموں میں فرائض سرانجام دینے والے افسران اور اہلکار قرآن کریم اور سنت رسولؐ کی ہدایات و تعلیمات سے آگاہ ہوں۔ جبکہ عملی صورتحال یہ ہے کہ دستور کے مطابق تو قومی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن کریم کی ہدایات کی پابندی ضروری ہے مگر قومی زندگی کے مختلف شعبوں کا نظم چلانے کے لیے جو افراد کار ریاستی تعلیمی اداروں میں تیار کیے جاتے ہیں ان کے لیے قرآن و سنت کی تعلیم لازمی نہیں ہے۔ اس معاملہ میں اصل ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ملک کے ریاستی تعلیمی نظام میں (۱) قرآن کریم (۲) حدیث و سنت (۳) فقہ و شریعت اور (۴) عربی زبان کو لازمی مضامین کا درجہ دیا جائے تاکہ کسی بھی عہدہ پر بیٹھے افسر و ملازم کو معلوم ہو کہ اس نے اپنی ڈیوٹی کس دائرے میں سرانجام دینی ہے۔ قرآن کریم کا ترجمہ تو اس کا صرف ایک ناگزیر حصہ ہے جو بطور مسلمان ہر ایک کو پڑھنا چاہیے۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم گورنر پنجاب کے اس مستحسن اقدام کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اس سلسلہ کے پہلے اعلانات سے ہٹ کر اس اعلان پر عملدرآمد بھی ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کرونا بحران۔ خدائی تنبیہ کی ایک صورت

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جون ۲۰۲۰ء)

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں انسانی سوسائٹی پر اپنے عذاب کی مختلف صورتیں، سطحیں اور دائرے بیان فرمائے ہیں، ان میں سب سے بڑا عذاب آخرت کا عذاب اور قبر کا عذاب ہے جس سے تعوذ اور پناہ کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل

دعائیں مانگنے کی تلقین فرمائی ہے۔ مگر دنیا میں بھی عذاب کے مختلف پہلو اور صورتیں قرآن کریم میں مذکور ہیں جن کا مقصد تنبیہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اس تنبیہ اور وارننگ کے بعد لوگ توبہ کرلیں اور اپنے گناہوں اور نافرمانی سے باز آجائیں جیساکہ سورۃ السجدۃ کی آیت ۲۱ میں ارشاد ربانی ہے کہ ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب سے دوچار کرتے ہیں تاکہ وہ رجوع کرلیں۔

اس کا مطلب ہے کہ عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہے جو حتمی سزا کے طور پر نہیں بلکہ خبردار کرنے اور توبہ کا موقع دینے کے لیے ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اس کے بعض مراحل کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے ایک کا تذکرہ سورۃ الاعراف کی آیات ۱۳۰ تا ۱۳۶ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس بنی اسرائیل کی آزادی اور آل فرعون کی ہدایت کے لیے تشریف لائے تو فرعون اور اس کے خاندان نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا، اور حضرت موسیٰؑ کی ہدایت اور پیغام کو قبول کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ ان کے مقابلہ اور بنی اسرائیل کو اذیتوں میں مبتلا کرنے کی نئی حرکتیں شروع کردیں۔ جن کا شکوہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے ان الفاظ میں کیا کہ ”اوذینا من قبل ان تاتینا و من بعد ما جئتنا“ حضرت ہمیں آپ کی تشریف آوری سے قبل بہت اذیتیں دی گئی ہیں اور اب آپ کی آمد کے بعد ان اذیتوں میں اضافہ کردیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے قوم کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب فرعون اور آل فرعون کو تباہ کرکے تمہیں زمین کی خلافت سے سرفراز فرمادیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جو تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آل فرعون کو خشک سالی اور قحط سالی کے ساتھ مال و دولت کی پیداوار میں کمی کے ذریعے پکڑا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ”لعلھم یذکرون“ وہ نصیحت حاصل کرلیں اور اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ مگر انہوں نے الٹی روش اختیار کی اور حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں لوگوں کا ذہن یہ بنانا شروع کردیا کہ لوگوں کو کہیں سے بہتری حاصل ہوتی تو کہتے کہ یہ ہماری وجہ سے ہے اور ہمارا حق ہے، لیکن کوئی تکلیف پہنچتی تو کہتے کہ یہ موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس پر ہم نے ان پر طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک اور خون عذاب کی صورت میں مسلط کردیں، یعنی ان چیزوں کی حد سے زیادہ کثرت ان کے لیے

عذاب بن گئی۔ لیکن وہ اپنے تکبر پر قائم رہے اور جرائم کا بدستور ارتکاب کرتے رہے۔ البتہ جب عذاب برداشت سے بڑھا تو وہ حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ”ادع لنا ربک“ آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ عذاب ہم سے ٹل گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی آزادی دے کر آپ کے ساتھ فلسطین بھیج دیں گے۔ فرمان خداوندی ہے کہ ان کے اس وعدہ پر ہم نے عذاب ہٹایا تو وہ منکر ہو گئے اور وعدہ توڑ دیا، جس کے بعد ہم نے انہیں سمندر میں غرق کر دیا اور حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے آزادی دلا دی۔

اس قسم کی صورتحال جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آئی کہ جب مکہ والوں کے مظالم اور سرکشی حد سے بڑھ گئی تو نبی اکرمؐ نے دعا فرمائی کہ یا اللہ ان پر یوسف علیہ السلام کے دور کی طرح قحط سالی کا عذاب نازل فرما۔ چنانچہ خشک سالی کا دور شروع ہوا اور ہر طرف بھوک اور قحط نے ڈیرے ڈال لیے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی سورۃ الدخان میں دھوئیں کی شکل میں جس عذاب کا ذکر ہے وہ یہی عذاب ہے جو مکہ والوں پر نازل ہوا تھا، اور دخان کی صورت یہ تھی کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے آنکھوں کو ہر طرف دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں وہ دھواں نہیں ہوتا تھا بلکہ بھوک کی شدت اور غلبہ کا اثر ہوتا تھا۔ انہوں نے بھی نبی اکرمؐ سے کہا کہ وہ اس عذاب کے ٹلنے کی درخواست کریں اور خود بھی کہا کہ اے اللہ ”اکشف عنا العذاب انا مؤمنون“ ہم سے عذاب ہٹا دے ہم ایمان لے آئیں گے، مگر عذاب ہٹائے جانے کے بعد بھی وہ اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے اور بالآخر مکمل ناکامی سے دوچار ہوئے۔

ان آیات و واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں انسانی سوسائٹی پر عمومی عذاب، وباؤں اور اجتماعی آزمائشوں کی صورت میں جو حالات آتے ہیں ان کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ لوگوں کو ان کی نافرمانی اور سرکشی پر تنبیہ کرنا مقصد ہوتا ہے جو عام طور پر پورا نہیں ہوتا۔ البتہ اتمام حجت کے بعد وہ عذاب آجاتا ہے جو حتمی سزا کے طور پر ہوتا ہے اور قومیں تباہی سے دوچار ہو جاتی ہیں۔ ہم اس وقت پوری دنیا میں کرونا وائرس کے پھیلاؤ کے جس ابتلا کا شکار ہیں اس کے طبی اور سائنسی اسباب کچھ بھی ہو سکتے ہیں، اور علاج واحتیاط کی ضرورت سے بھی انکار نہیں بلکہ سنت نبویؐ اور شرعی تقاضہ ہے، مگر اس کا یہ پہلو بھی ہم

سب کو سامنے رکھنا چاہیے جس کا قرآن کریم نے تذکرہ فرمایا ہے اور ظاہری اسباب و احتیاط کے ساتھ توبہ و استغفار کی طرف بھی پوری توجہ دینی چاہیے۔

مسلمانوں سے قرآن کریم کے چند تقاضے

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۴ مئی ۲۰۲۰ء)

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے جس میں قرآن کریم کی سب سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے، سنا جاتا ہے اور عالم اسلام میں ہر طرف قرآن کریم کی بہار کا سماں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ یہ آخری کتاب قیامت تک نسل انسانی کی ہدایت اور راہنمائی کا محور و مرکز ہے اور ہر دور میں اس کا یہ فیضان جاری رہتا ہے۔ اس موقع پر قرآن کریم کے چند تقاضوں کی طرف خصوصی توجہ و تذکیر کی ضرورت ہے جو کلام اللہ نے خود ہم سے کیے ہیں، مثلاً:

1. ارشاد باری تعالیٰ ہے ”فاقرءوا ما تیسر من القرآن“ قرآن کریم جتنا پڑھ سکو اس کی تلاوت کیا کرو۔ قرآن کریم کا امتیاز یہ ہے کہ اس کے الفاظ کی قراءت بھی ضروری ہے اور مستقل عبادت ہے۔ اس کے ہر حرف کے پڑھنے اور سننے پر کم از کم دس نیکیاں ملتی ہیں اور یہ قراءت اور سماع مسلمان کے معمولات زندگی میں شامل رہنا ضروری ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے کہ جس مسلمان کے یومیہ معمولات میں تلاوت قرآن کریم شامل نہیں ہے اس کا سینہ اجڑے ہوئے گھر کی طرح ہے۔

2. قرآن کریم کا دوسرا تقاضہ ہے کہ ”ورتل القرآن ترتیلا“ قرآن کریم کو صحیح تلفظ اور لہجے کے ساتھ پڑھا جائے۔ ہر زبان کا اپنا لہجہ اور تلفظ ہوتا ہے، اگر کسی لفظ کو صحیح طرح نہ بولا یا پڑھا جائے تو اس کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ بیان کے دوران کوئی نوجوان میری گفتگو قلمبند کر رہا تھا، میں نے سوال کیا کہ بیٹا کیا کر رہے ہو؟ کہنے لگا کہ آپ کی گفتگو کے نوٹس لے رہا ہوں، لیکن تلفظ ایسے کیا کہ Notice۔ میں نے کہا بیٹا ”نوٹس لینا“ تھانے والوں کا کام ہے تمہارا نہیں، تم نوٹس Notes لے لو تو ٹھیک رہے گا۔ اب بولنے میں تلفظ کے بدلنے سے لفظ کا معنیٰ بدل گیا، ایسا ہر زبان میں ہوتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ

قرآن کریم میں ایسا ہو جائے تو بسا اوقات صرف معنی نہیں بدلتا بلکہ ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم کو صحیح تلفظ کے ساتھ صحیح لہجے میں پڑھنا ضروری ہے ورنہ ثواب کی بجائے گناہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ باقاعدہ سیکھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح انگریزی الفاظ اسپیلنگز سیکھے بغیر سمجھ نہیں آتے، قرآن کریم کا تلفظ بھی سیکھے بغیر صحیح نہیں ہوتا، جبکہ قرآن کریم کا تقاضہ ہے کہ مجھے صحیح تلفظ کے ساتھ اور صحیح لہجے میں پڑھو۔

3. قرآن کریم کا تیسرا تقاضہ یہ ہے کہ ”بل ھو ایات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم“ قرآن کریم کی آیات مبارکہ اہل علم کے سینوں میں ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ نے اس آیت کریمہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ قرآن کریم کی اصل جگہ سینہ ہے، کتابت امر زائد ہے۔ یعنی قرآن کریم کا اصل حق یہ ہے کہ اسے یاد کیا جائے اور سینہ میں محفوظ کیا جائے۔ قرآن کریم پورا یاد ہو تو بڑی سعادت کی بات ہے، دنیا میں ہر دور میں لاکھوں حفاظ کرام موجود چلے آ رہے ہیں، اب شاید کروڑوں میں ہوں کہ اب سے دس سال قبل ایک امریکی ادارے کے سروے کے مطابق دنیا میں قرآن کریم کے حافظوں کی تعداد تیس ملین کے لگ بھگ تھی۔ لیکن اگر کوئی مسلمان سارا قرآن کریم یاد نہ کر سکے تو اتنا کم از کم اسے ضرور زبانی یاد ہونا چاہیے کہ پانچ وقت کی نماز کے فرائض و سنن سنت کے مطابق پڑھ سکے اور وقتاً فوقتاً قرآن کریم کے کسی نہ کسی حصے کی زبانی تلاوت کر سکے۔

4. قرآن کریم کا چوتھا تقاضہ یہ ہے کہ ”حتی تعلموا ما تقولون“ کہ جو پڑھ رہے ہو وہ تمہیں سمجھ بھی آ رہا ہو، یعنی قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھو۔ سادہ سی بات ہے کہ جب قرآن کریم ہماری ہدایت کے لیے ہے، راہنمائی کے لیے ہے اور تعلیم کے لیے ہے تو اسے پڑھتے ہوئے سمجھنا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے اور ہمارے لیے ہے، تو پیغام کسی کا بھی ہو اس کا پہلا حق اسے سمجھنا ہوتا ہے کہ پیغام بھیجنے والے نے ہم سے کیا کہا ہے اور کیا تقاضہ کیا ہے۔ قبول کرنا اور عمل کرنا اس کے بعد کی بات ہے مگر سمجھنا سب سے پہلے ضروری ہوتا ہے۔ مگر ہماری عمومی حالت کیا ہے؟ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ہم سے مخاطب

ہیں اور ہم جانتے ہوئے بھی کہ ہمارا خالق و مالک ہم سے بات کر رہا ہے، اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، حتیٰ کہ اسے سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ جبکہ نماز میں ہم اللہ تعالیٰ سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں اور ہم خود سمجھ نہیں رہے ہوتے کہ ہم اپنے خالق و مالک سے کیا کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب تم قرآن کریم پڑھتے ہو تو تمہیں سمجھ کر پڑھنا چاہیے، اس لیے عربی زبان اور قرآن کریم کے ترجمہ کے ساتھ ہر مسلمان کا اتنا تعلق بہرحال ضروری ہے کہ وہ جب قرآن کریم پڑھ رہا ہو تو سمجھ بھی رہا ہو کہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔

5. قرآن کریم کا ایک بنیادی تقاضہ ہم سے یہ بھی ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب اس لیے اتاری ہے "انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس" تاکہ آپ اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کریں اور حکم کریں۔ یعنی یہ حکم اور فیصلوں کی کتاب ہے، قانون اور ضابطوں کی کتاب ہے جس کے مطابق مسلمانوں کو اپنی زندگی کے تمام معاملات طے کرنے چاہئیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات میں ہدایات اور احکام نازل فرمائے ہیں جن پر عمل ہماری مرضی پر موقوف نہیں بلکہ مسلمان کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے۔ مثلاً حلال و حرام کے مسائل ہیں، باہمی حقوق و معاملات کے امور ہیں، فرائض و عبادات ہیں، تجارت کے احکام و قوانین ہیں، سیاست و حکومت کے قوانین ہیں، عدالت و قانون کے بارے میں ہدایات ہیں، معاشرت اور سماجیات سے متعلق راہنمائی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات کے ضابطے ہیں، اور خاندانی زندگی میں نکاح، طلاق، وراثت اور باہمی حقوق کی تفصیلات ہیں۔ ان احکامات کی اپنے اپنے دائرے میں پابندی اور ان پر عملدرآمد ہماری دینی ذمہ داری ہے جس کے بارے میں قیامت کے دن جوابدہی کرنا ہوگی۔

یہ چند تقاضے وہ ہیں جو قرآن کریم نے ہم سے خود کیے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

خود انسان نے کیا ترقی کی ہے؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۷ اپریل ۲۰۲۰ء)

میڈیا آج کے دور کی ایک بڑی طاقت ہے جو قوموں اور افراد کی ذہن سازی اور فکر و کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس کی کارفرمائی دنیا میں ہر طرف اور ہر سطح پر دکھائی دیتی ہے۔ ذرائع ابلاغ ہر دور میں اہم رہے ہیں اور اسلام نے بھی ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا بھرپور استعمال کیا ہے۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم کا آغاز ہی قلم کے ذکر سے کیا ہے جبکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے خطابت، شعر و شاعری اور ابلاغ کے دیگر ذرائع اسلام کی دعوت و تبلیغ اور دفاع و تحفظ کے لیے مسلسل استعمال ہوتے آرہے ہیں۔ جناب نبی کریمؐ نے قیامت کی نشانیوں میں ''فشو القلم'' یعنی قلم کا عام ہو جانا بیان فرمایا ہے۔ اور زبان و قلم کی رینج وسیع تر ہونے کا معراج شریف کی روایت میں ''یبلغ بہ الافاق'' کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ لوگ اپنی بات کو دنیا کے کناروں تک پہنچانے کی صلاحیت حاصل کرلیں گے۔ جس کا ہم آج کے دور میں نہ صرف مشاہدہ کر رہے ہیں بلکہ اسے استعمال بھی کر رہے ہیں۔

ابلاغ کے ذرائع اور میڈیا کی عملی صورتوں نے تو وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا کے مراحل سے گزرتے ہوئے جدید ترین صورتیں اختیار کرلی ہیں اور یہ سلسلہ آئندہ بھی چلتا رہے گا۔ مگر ابلاغ کی نفسیات اور میڈیا کی صلاحیت کو استعمال کرنے کی تکنیک کم و بیش آج بھی وہی ہے جو ماضی میں تھی کیونکہ انسان اسباب و ذرائع میں تو ترقی کرتا ہے مگر اس کی ذاتی نفسیات خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے وہی ہیں جو پہلے دن تھیں اور وہی قیامت تک جاری رہیں گی۔

اس پس منظر میں فرعون کے دور کا ایک واقعہ اپنی ترتیب کے ساتھ عرض کرنا چاہ رہا ہوں جو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جب فرعون کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور بنی اسرائیل کی آزادی کا پیغام پہنچایا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی کے طور پر عصا اور ید بیضا کے معجزات اس کے سامنے پیش کیے تو فرعون نے اسے جادو قرار دیتے ہوئے جادو ہی کے ذریعے اس کے مقابلہ کا اعلان کر دیا۔ اس نے ملک بھر سے جادوگر جمع کیے، حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ''یوم الزینۃ'' عید کا دن مقابلہ کے لیے طے کیا اور چاشت کا وقت مقرر کر کے اعلان عام کر دیا تاکہ زیادہ

سے زیادہ لوگ جمع ہو کر یہ مقابلہ دیکھیں۔ قرآن کریم نے اس کی دلچسپ تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

جادوگر جب حضرت موسی علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے پہنچے تو فرعون سے پہلا سوال یہ کیا کہ اگر ہم غالب آ گئے تو کیا اس کا کوئی انعام بھی ہمیں ملے گا؟ اس نے جواب دیا کہ انعام کے ساتھ مقربین میں بھی شمار کیا جائے گا یعنی پروٹوکول اور میڈل وغیرہ بھی ملیں گے۔ آمنے سامنے ہوئے تو جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ پہل آپ کریں گے یا ہم کریں؟ انہوں نے جواب دیا کہ پہل تم ہی کرو۔ اس پر جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں پھینکیں جو سانپوں کی طرح حرکت کرتے دکھائی دینے لگیں۔ یہاں قرآن کریم نے تین چار باتیں بطور خاص فرمائی ہیں۔

(۱) ''واسترھبوھم'' کہ انہوں نے خوف کا منظر پیدا کر دیا۔ یہ خوف اتنا شدید تھا کہ خود حضرت موسی علیہ السلام وہاں سے منہ موڑ کر چل دیے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اللہ تعالی نے فرمایا ''اقبل ولا تخف'' آگے بڑھو اور گھبراؤ نہیں آپ کو کچھ نہیں ہو گا تو حضرت موسی علیہ السلام واپس مڑے۔ (۲) دوسرا جملہ یہ فرمایا کہ ''سحروا اعین الناس'' انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا تھا۔ (۳) جبکہ تیسرا جملہ یہ ہے کہ ''یخیل الیہ من سحرھم'' جادو کی وجہ سے لوگوں کو دکھائی یہ دے رہا تھا کہ جادوگروں کی پھینکی ہوئی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن گئی ہیں اور حرکت کر رہی ہیں، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا یعنی یہ سارا ماحول مصنوعی تھا کہ خوف و ہراس کی ایسی کیفیت پیدا کر دی گئی کہ اللہ تعالی کے جلیل القدر اور جلالی پیغمبر بھی اس کا شکار ہو گئے جس پر اللہ رب العزت نے یہ تسلی دی کہ ''انک من الامنین'' آپ محفوظ رہیں گے۔

چنانچہ صورتحال کو زمینی حقائق کے برعکس ایسے انداز سے پیش کرنا کہ ہر طرف خوف کی کیفیت مصنوعی طور پر بپا کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیا جائے، آج کی نئی تکنیک نہیں بلکہ بہت پرانا طریق واردات ہے جسے فرعون اور اس کے جادوگروں نے انتہائی مہارت کے ساتھ استعمال کیا تھا لیکن بالآخر جب حضرت موسی علیہ السلام نے معجزہ پیش کرتے ہوئے اپنا عصا زمین پر رکھا تو وہ چونکہ حقیقی طور پر سانپ بن گیا تھا اس لیے اس نے جادوگروں کی سب رسیاں لاٹھیاں نگل لیں۔ اس پر اصحاب فن ہونے کی وجہ سے جادوگروں کو یہ بات

سمجھ میں آگئی کہ یہ جادو نہیں حقیقت ہے، اس لیے وہ بے ساختہ ایمان لے آئے اور سجدہ میں گر گئے۔

قرآن کریم نے ایک اور منظر بھی بیان فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے تو فرعون سے تقاضہ یہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کرو، وہ انہیں ساتھ لے کر مصر چھوڑ دیں گے اور فلسطین چلے جائیں گے۔ لیکن فرعون نے اس مطالبہ کو کس چابکدستی کے ساتھ الٹا کر قوم کے سامنے اس طرح بیان کیا کہ موسیٰ اور ہارون مصریوں کو ان کے ملک سے نکال کر ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور ''ویذھبا بطریقتکم المثلی'' تمہاری آئیڈیل اور مثالی تہذیب و قانون کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے ''فاستخف قومہ فاطاعوہ'' اس طریقہ سے فرعون نے قوم کو بے وقوف بنالیا اور وہ اس کے فرمانبردار ہو گئے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے خود بیان فرمائے ہیں، انہیں سامنے رکھ کر آج کے دور کی سیاست، لابنگ، میڈیا اور ذہن سازی کے مروجہ طریقوں پر نظر ڈال لیجئے، اسباب و وسائل کی ترقی اور ارتقا تو یقیناً آپ کو نظر آئے گا مگر انسان آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں ہزاروں سال پہلے تھا اور یہ سوال ایک زندہ حقیقت کے طور پر ہم سب کی طرف متوجہ ہے کہ ''خود انسان نے کیا ترقی کی ہے؟''

بخاری شریف اور عصر حاضر کی سماجی ضروریات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۹ فروری ۲۰۲۰ء)

دینی مدارس کے اجتماعات کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں ختم بخاری شریف، دستار بندی اور تقسیم انعامات کے عنوانات سے تقریبات کا تسلسل جاری ہے۔ گزشتہ عشرہ کے دوران دارالعلوم محمدیہ (اٹھارہ ہزاری)، جامعہ حسینیہ (دینہ)، مدرسہ تعلیم القرآن (کوٹ بلال)، جامعہ اجمل المدارس (فیروز ٹواں)، جامعہ مظاہر العلوم (کوٹ ادو)، جامعہ نظامیہ حیدریہ (بہاولپور)، جامعہ حنفیہ بورے والا اور دیگر مقامات پر ایسے متعدّد پروگراموں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور طلبہ و طالبات کے ساتھ ساتھ عوامی اجتماعات میں بھی کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس بار دو تین امور گفتگو کا بطور خاص موضوع ہیں جن کا مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

1. پہلی بات یہ کہ آج کے عالمی حالات اور فکری مباحث کے تناظر میں حدیث نبویؐ کی حجیت و مقام اور اہمیت وضرورت کے علاوہ اس کا وہ تعارفی پہلو بھی بطور خاص اجاگر کرنے کی ضرورت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں بیان کیا ہے کہ احادیث نبویہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام دین کی کسی بھی بات تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہیں حتی کہ قرآن کریم تک رسائی بھی حدیث کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً نزول کے حوالہ سے قرآن کریم کی پہلی پانچ آیات سورۃ العلق کی ہیں جو ہمیں غار حرا کے واقعہ سے ملی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حرا کی غار میں ایک واقعہ پیش آیا جو آپؐ سے سن کر صحابہ کرامؓ نے روایت کر دیا، اسے حدیث کہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہمیں پہلی وحی تک رسائی حاصل ہوئی۔ یہی معاملہ قرآن کریم کی باقی سورتوں اور آیات کا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم سے پہلے حدیث نبویؐ کو ماننا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر قرآن کریم کی کسی سورت، آیت اور جملہ پر ایمان لانا ممکن ہی نہیں ہے۔

2. دوسری بات جو ان مجالس میں عرض کر رہا ہوں کہ بخاری شریف احادیث نبویہؐ کا بیش بہا اور مستند ترین مجموعہ ہے جو حضرت امام بخاریؒ نے بڑی محنت اور ذوق کے ساتھ جمع کیا ہے، اور اسے امت میں سب سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ مگر اس میں امام بخاریؒ نے انسانی سوسائٹی کو درپیش مسائل و مشکلات کا قرآن و سنت کی روشنی میں حل جس ترتیب اور اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے اسے زیادہ اہتمام کے ساتھ سامنے لانا ضروری ہے، کیونکہ آج کے انسانی سماج کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ جبکہ محض اصطلاحات کے فرق کے باعث ہم اس پہلو کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو پا رہے۔

مثلاً ہمارے ہاں موضوعات کی جو ترتیب و تقسیم معروف ہے اس میں ''کتاب الاحکام'' کا یہ مطلب بنتا ہے کہ عقائد، فرائض، احکام، معاملات، آداب اور اخلاقیات کے دائروں میں سے ایک دائرہ کی احادیث اس میں مذکور ہوں گی، جبکہ واقعتاً ایسا نہیں ہے بلکہ حضرت امام بخاریؒ نے ''کتاب الاحکام'' میں اسلام کے نظم مملکت اور نظام حکومت کے اصول وضوابط بیان کیے ہیں کہ حکومت و

ریاست کیا ہوتی ہے؟ حکمران کیسا ہونا چاہیے؟ حکم و قانون کی بنیاد کیا ہے؟ حاکم ورعیت کے درمیان رابطہ اور کمٹمنٹ کی نوعیت کیا ہے؟ قضا و عدالت کا طریق کار کیا ہونا چاہیے؟ وغیرذلک۔ اسی طرح زہد و رقائق کے حوالہ سے امام بخاریؒ نے جو روایات پیش کی ہیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ارشاد کے مطابق سلوک و احسان اور روحانیات و وجدانیات کے دائرہ کی روایات ہیں، بلکہ امام ولی اللہؒ تو بخاری شریف کو علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم تاریخ اور علم تصوف کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ ہم امام بخاریؒ کے اسلوب و ذوق اور اصطلاحات سے کماحقہ متعارف نہ ہونے کے باعث ان ابواب سے عمومی ماحول میں ہی گزر جاتے ہیں۔

3. تیسری بات جس کا تذکرہ اس گفتگو میں ہو رہا ہے، یہ ہے کہ امام بخاریؒ کوئی مسئلہ بیان کرتے ہیں یا موقف اختیار کرتے ہیں تو اس کی تائید میں قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبویہؐ پیش کرتے ہیں اور پھر ان کی وضاحت کے لیے آثار صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کو لاتے ہیں۔ گویا کسی بھی دینی مسئلہ میں استدلال کے لیے یہی معتمد دائرے ہیں اور یہ اہل سنت کا دائرہ استدلال ہے جسے واضح کرنا دور حاضر کی اہم ترین فکری و علمی ضرورت ہے، کیونکہ ہمارے عمومی ماحول میں دلیل و استدلال کے دائروں اور معیارات کو خلط ملط کیا جا رہا ہے جس سے بڑی خرابیاں جنم لے رہی ہیں۔ مثلاً امام بخاریؒ نے بخاری شریف کے آغاز میں کتاب الایمان کے عنوان سے عقائد و ایمانیات بیان کیے ہیں اور اختتام پر "کتاب التوحید" کے عنوان سے عقائد کی تعبیرات کو موضوع بحث بناتے ہوئے بعض غلط تعبیرات کا رد کیا ہے۔ اور دونوں جگہ استدلال کی بنیاد قرآن کریم، حدیث نبویؐ اور آثار صحابہؓ و تابعینؒ پر رکھی ہے۔ گویا ان کے نزدیک کسی عقیدہ کا ثبوت بھی ان دلائل سے ہوگا اور عقیدہ کی تعبیر و تشریح کے لیے بھی یہی تین دائرے دلیل ہوں گے۔ اگر اس بات کو ہم علمی انداز میں پیش کر کے اسے نئی نسل کو صحیح طور پر سمجھا سکیں تو لوگوں کے بہت سے فکری مغالطوں کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ہے۔

4. دینی مدارس کے ان اجتماعات میں مدارس کے حوالہ سے موجودہ صورتحال اور نصاب تعلیم کی یکسانیت کی سرکاری مہم بھی گفتگو کا موضوع بن رہی ہے اور کم و بیش ہر جگہ اس کے بارے میں سوالات ہو رہے ہیں، جس کے جواب میں عرض کر رہا ہوں کہ پہلے اس ساری بحث کے تاریخی پس منظر کو سامنے لانا ضروری ہے۔ مثلاً درس نظامی کا یہ نصاب حضرت ملا نظام الدین سہالویؒ نے اورنگزیب عالمگیرؒ کے دور میں مرتب اور رائج کیا تھا جو اس وقت سے ۱۸۵۷ء تک ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ اس طرح پڑھایا جاتا رہا ہے کہ قرآن کریم، حدیث و سنت، فقہ و شریعت اور عربی و فارسی زبانوں کے ساتھ ساتھ اس دور کی معقولات و فلسفہ، سائنس، طب، ریاضی، معاشرتی علوم اور ٹیکنالوجی بھی نصاب کا حصہ تھے اور یہ سب مضمون اکٹھے پڑھائے جاتے تھے۔ مگر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں اس خطہ پر قبضہ جمانے کے بعد جب قرآن، حدیث، فقہ، عربی اور فارسی کے مضامین کو نصاب سے خارج کر دیا تو ان کی تعلیم کو باقی رکھنے کے لیے پرائیویٹ سیکٹر میں دینی مدارس وجود میں آئے اور اسکول اور مدرسہ کی یہ تقسیم سامنے آئی جو برطانوی حکومت کے اقدامات کا نتیجہ تھی۔ جبکہ قیام پاکستان کے بعد بھی ریاستی پالیسی کا یہی تسلسل اب تک چل رہا ہے۔ اس لیے اگر دونوں کو دوبارہ جمع کرنا ہے تو قرآن و حدیث اور فقہ و عربی کے وہ مضامین ریاستی نظام تعلیم میں واپس شامل کرنا ہوں گے جیسے ۱۸۵۷ء سے قبل تھے، اس کے بغیر اس کی اور کوئی صورت قابل قبول اور قابل عمل نہیں ہو سکتی۔ اور اس معروضی حقیقت کو نظر انداز کر کے نصاب تعلیم کی یکسانیت کا کوئی بھی فارمولا حقیقت پسندانہ نہیں ہو گا۔

۲۰۱۹ء

معاصر اسلامی معاشروں کو درپیش فکری تحدیات

(گفٹ یونیورسٹی، گوجرانوالہ - ۳۱ دسمبر ۲۰۱۹ء)

گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ نے سال گزشتہ کا اختتام ''معاصر اسلامی معاشروں کو درپیش فکری تحدیات'' کے موضوع پر دو روزہ قومی کانفرنس سے کیا جو ۳۰ و ۳۱ دسمبر ۲۰۱۶ء کو منعقد ہوئی اور اس کی مختلف نشستوں سے ڈاکٹر محمد ضیاء الحق، پروفیسر ڈاکٹر معراج الاسلام ضیاء، ڈاکٹر مستفیض احمد علوی، ڈاکٹر غلام عباس، ڈاکٹر عاصم ندیم، ڈاکٹر ریاض محمود، ڈاکٹر شہباز احمد منج، ڈاکٹر محمد سعد صدیقی، ڈاکٹر محمد حماد لکھوی، ڈاکٹر عبد القدوس حبیب، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، ڈاکٹر حافظ محمود اختر، ڈاکٹر محمد اکرم ورک، غازی عبد الرحمن قاسمی، جناب محمد مجتبیٰ، ڈاکٹر سلطان شاہ، حافظ محمد عمار خان ناصر اور دیگر ارباب فکر و دانش نے خطاب کیا۔ جبکہ گفٹ یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر قیصر شہریار درانی کی نگرانی میں کانفرنس اختتام کو پہنچی۔ راقم الحروف کو آخری نشست میں کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا جس کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلاۃ۔ گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ کو اس کانفرنس کے انعقاد پر مبارک باد پیش کرتا ہوں جو یونیورسٹی کی علمی و فکری سرگرمیوں میں ایک اچھی پیش رفت ہے۔ مجھے چند سالوں سے یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ملک کی جامعات میں علمی و فکری سرگرمیوں کے حوالہ سے اضافہ ہو رہا ہے اور خاص طور پر ان جامعات کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ دینی و ملی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے کانفرنسوں اور سیمینارز کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اور ایک طرح سے صحت مندانہ مقابلہ کا رجحان دیکھنے میں آ رہا ہے جو یقیناً خوش آئند ہے کہ قرآن کریم نے بھی خیر کے اعمال میں ''وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون''

کہہ کر اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اسلامی علوم کے ان شعبوں میں علمی و فکری سرگرمیوں میں اضافہ کے ساتھ دوسری بات جو خوشی اور اطمینان کا باعث بن رہی ہے، یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے فضلاء اور دینی مدارس کے فضلاء میں میل جول بڑھ رہا ہے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان سرگرمیوں میں شریک ہونے والے اور ان کا اہتمام کرنے والے اساتذہ و طلبہ میں دونوں طرف کے فضلاء شریک ہیں۔ پی ایچ ڈی اسکالرز میں دینی مدارس کے فضلاء کی تعداد روز افزوں ہے اور دینی مدارس کے اساتذہ و فضلاء کی دلچسپی اس میں مسلسل بڑھ رہی ہے جو ہمارے پرانے خواب کی تعبیر ہے کہ قدیم و جدید علوم کے ماہرین یکجا بیٹھیں اور مل جل کر دینی، قومی، علمی اور ملی مسائل میں قوم کی راہنمائی کریں۔

حضرات محترم! ہماری اس قومی کانفرنس کا بنیادی موضوع وہ فکری تحدیات اور چیلنجز ہیں جو اس وقت امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور جن میں صحیح سمت راہ نمائی کے لیے پوری امت ارباب فکر و دانش اور اصحاب علم و فضل کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ہمارے بہت سے فاضل دوستوں نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ میں گفتگو کے آغاز سے پہلے سوچ رہا تھا کہ فکری چیلنجز کے کون سے دائرے میں بات کروں گا؟ اس لیے کہ فکری چیلنجز کا ایک دائرہ یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کے عالمی ماحول میں امت مسلمہ کو متعدّد اہم فکری چیلنجز درپیش ہیں، جبکہ ملت اسلامیہ کو داخلی سطح پر بھی بہت سی فکری تحدیات کا سامنا ہے اور ہم اپنے قومی ماحول یعنی پاکستانی قوم کے اندرونی دائروں میں مختلف فکری چیلنجز سے نبرد آزما ہیں۔ مجھ سے پہلے ڈاکٹر محمد اکرم ورک صاحب نے اپنی گفتگو میں ’’گلوبل سوسائٹ‘‘ کی بات کر کے میری یہ مشکل آسان کر دی ہے اس لیے میں بھی اسی حوالہ سے چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

فقہ السیرۃ سے رہنمائی کی ضرورت

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے متعدّد فاضل مقررین نے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ ہمیں ان فکری تحدیات کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت سے راہنمائی حاصل کرنا ہوگی، اس لیے کہ راہنمائی کے لیے ہمارا اصل علمی و فکری سرچشمہ وہی ہے اور اسی سے فیض حاصل کر کے ہم نہ صرف اپنے بلکہ نسل انسانی کے مسائل و مشکلات کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

جناب نبی اکرمؐ کی سیرت و سنت کے بارے میں ایک پہلو کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ (۱) حدیث (۲) سنت (۳) سیرت کے تینوں شعبوں کا سرچشمہ جناب رسول اللہؐ کی ذات گرامی ہے۔ لیکن ان تینوں میں باہمی طور پر فرق موجود ہے جس کی وجہ سے محدثین کرام اور ائمہ عظام نے ان تینوں کے حوالہ سے علمی ذخیرہ الگ الگ عنوانات کے ساتھ جمع و مرتب کیا ہے۔ احادیث نبویہؐ کا دائرہ الگ ہے، سنت و شریعت کا دائرہ مستقل ہے، اور سیرت و سوانح کا دائرہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ ہماری علمی و فکری راہنمائی کا سرچشمہ یہ تینوں دائرے ہیں مگر میں اپنے اس طالب علمانہ تاثر اور احساس کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ مسائل و احکام کے استنباط اور استدلال میں حدیث اور سنت سے جس قدر استفادہ کیا گیا ہے اور کیا جارہا ہے، سیرت کی طرف ہماری اس قدر توجہ نہیں ہے۔ ممکن ہے میرا یہ احساس درست نہ ہو لیکن ایک طالب علم کے طور پر میں یہی محسوس کر رہا ہوں اور اس رائے کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ حدیث اور سنت کی طرح سیرت کو بھی ہمارے استنباط و استدلال کی مستقل بنیاد ہونا چاہیے۔ خصوصاً آج کی انسانی سوسائٹی کو درپیش مشکلات و مسائل کے حل کے لیے اس طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

میرا تاثر یہ ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے جس طرح اپنے قول اور عمل کے ساتھ امت کی راہنمائی فرمائی ہے اسی طرح خاموش حکمت عملی اور طرز و رویہ کے ساتھ بھی بہت سے مسائل حل کیے ہیں جو ہمارے لیے قیامت تک مشعل راہ ہیں۔ اس طرز عمل اور مسلسل رویہ کی تلاش سیرت کے علمی ذخیرہ میں زیادہ آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر میں دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

- ایک مثال یہ کہ جناب رسول اللہؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کے ماحول میں یہ تبدیلی سب نے دیکھی کہ آنحضرتؐ کی تشریف آوری کے بعد باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی جس کے سربراہ رسول اکرمؐ خود تھے اور اس کے بعد دس سال تک آپؐ نے ایک حاکم کے طور پر مدینہ منورہ میں زندگی گزاری۔ یہ مدینہ منورہ کے ماحول میں بہت بڑی تبدیلی تھی جس نے پورے جزیرۃ العرب کے مستقبل کا رخ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا۔ لیکن اس دوران ”میرے عزیز ہم وطنو!“ قسم کا کوئی خطاب حدیث و تاریخ کے ذخیرے میں

کہیں دکھائی نہیں دیتا، البتہ آنحضرتؐ کی وہ خاموش ڈپلومیسی ضرور دکھائی دے گی جس کے نتیجے میں نہ صرف حکومت کا وجود قائم ہوا بلکہ ''میثاق مدینہ'' کے عنوان سے دستوری خاکہ بھی تشکیل پا گیا۔

- دوسری قابل توجہ مثال یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جناب رسول اکرمؐ پر ایمان کا اظہار کرنے والوں میں منافقین کا وہ گروہ بھی شامل تھا جسے قرآن کریم نے ''وماھم بمؤمنین'' اور ''انھم لکاذبون'' کا خطاب دیا ہے۔ آپؐ کو اس گروہ کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم قرآن کریم میں ان الفاظ میں ہوا کہ ''جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم''۔ مگر نبی اکرمؐ نے پورے دس سال تک اس گروہ کے خلاف معروف معنوں میں کوئی جہاد نہیں کیا، نہ عسکری کاروائی کی اور نہ ہی کوئی اجتماعی ایکشن لیا۔ البتہ حکمت عملی ایسی اختیار کی کہ وہ بتدریج سوسائٹی میں تحلیل ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ خلافت راشدہ کے دور میں اس قسم کے کسی گروہ کا مدینہ منورہ میں سراغ نہیں ملتا۔

جناب رسول اللہؐ کی یہ حکمت عملی اگر ظاہری نصوص میں تلاش کی جائے تو شاید استدلال واستنباط کے معروف دائروں میں نہ ملے، لیکن آپؐ کے مسلسل طرز عمل کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا ایک ایک مرحلہ ترتیب کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ یہ دو باتیں میں نے بطور مثال پیش کی ہیں ورنہ اس پہلو سے سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے امور ایسے ملیں گے جن کی بنیاد آنحضرتؐ کے کسی صریح ارشاد یا متعیّن عمل پر نہیں بلکہ مسلسل طرز عمل اور رویہ پر دکھائی دے گی۔ اس لیے میں یہ گزارش کر رہا ہوں کہ حدیث و سنت کی طرح سیرت کو بھی استنباط و استدلال کا مستقل ماخذ بنانے کی ضرورت ہے جو اصلاً تو حدیث و سنت کے دائرہ میں ہی شامل ہے لیکن وہ امتیاز و فرق جس کی وجہ سے سیرت کو حدیث و سنت سے الگ کر کے علمی ذخیرہ میں مستقل طور پر پیش کیا گیا ہے، وہ استنباط و استدلال میں بھی نمایاں ہونا چاہیے۔ اور فقہ القرآن، فقہ الحدیث اور فقہ السنۃ کی طرح ''فقہ السیرۃ'' کو بھی علمی حلقوں میں موضوع بحث بنایا جانا چاہیے۔

مغربی اور اسلامی طرز حیات کی بالادستی کی کشمکش

دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ اس وقت انسانی سوسائٹی میں فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کی جو کشمکش جاری ہے وہ رفتہ رفتہ فیصلہ کن مراحل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور اگرچہ

دیگر تہذیبیں اور فلسفے بھی اس کشمکش میں شریک نظر آتے ہیں لیکن فائنل راؤنڈ اسلام اور مغربی تہذیب و فلسفہ کے درمیان ہی ہوگا۔ مغرب کا فلسفہ و تہذیب اس وقت غالب و قابض فلسفہ ہے جبکہ اسلامی فکر و فلسفہ نہ صرف مزاحمت کر رہا ہے بلکہ انسانی سوسائٹی کی قیادت حاصل کرنے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان دونوں فلسفوں اور تہذیبوں کے درمیان اس بات پر کشمکش جاری ہے کہ مستقبل میں گلوبل انسانی سوسائٹی کی قیادت کون کرے گا؟ مغرب تو موجودہ کیفیت کو "اینڈ آف ہسٹری" قرار دے کر اپنے دائمی قبضے کا اعلان کر رہا ہے لیکن اسلامی تہذیب و ثقافت نے دست برداری اور سپر اندازی قبول نہیں کی اور ابھی ان دونوں کے درمیان جنگ جاری ہے جس کا حتمی نتیجہ آخری راؤنڈ کے بعد ہی سامنے آئے گا۔ مغرب کے پاس قبضہ اور قوت ہے جس کے باعث وہ خود کو فاتح سمجھ رہا ہے جبکہ مسلمانوں کے پاس دلیل اور حسین ماضی ہے جس کے سہارے وہ یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔

ہمارا موضوع چونکہ فکری تحدیات ہیں اس لیے دلیل کی دنیا میں ایک بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ مغرب کی دانش کو اس بات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ وجدانیات، وحی اور آسمانی تعلیمات سے مکمل دستبرداری کے انسانی سوسائٹی پر منفی نتائج سامنے آئے ہیں اس لیے اس پر نظر ثانی کی بہرحال ضرورت ہے۔ یہ بات سابق برطانوی وزیراعظم جان میجر "بیک ٹو بیسکس" کے ٹائٹل کے ساتھ کہتے رہے ہیں، شہزادہ چارلس "وجدانیات کی طرف واپسی" کی ضرورت کا احساس دلاتے رہتے ہیں، جبکہ امریکی یونیورسٹیوں میں وحی اور عقل کے درمیان توازن کی تلاش تحقیقی سرگرمیوں کا اہم عنوان بن چکی ہے۔ میں سیاست اور طاقت کے میدان کی بات نہیں کر رہا کہ وہاں تو مغرب کی مکمل اجارہ داری ہے مگر دلیل کی دنیا میں مغربی دانش کی ایک سطح اپنے فکر و فلسفہ کی بنیادوں کا از سر نو جائزہ لے رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ریورس گیئر لگ چکا ہے اور الٹی گنتی شروع ہوگئی ہے جو ہمارے لیے ایک بہت بڑے علمی و فکری مشاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم مغرب کو اس واپسی کے لیے "باعزت راستہ" دینے کے لیے تیار ہیں؟ ہمارا مزاج اور نفسیات کم و بیش اس طرح کی بن چکی ہیں کہ ناک کی لکیریں نکلوائے بغیر کسی کو واپسی کا راستہ دینا ہمارے لیے مشکل عمل ہوتا ہے۔ جبکہ میرے خیال میں اب اس کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے کہ ہم دلیل و دانش کی دنیا میں مغرب کو واپسی کا باعزت راستہ دینے کی فکر کریں، اس کی راہ نمائی کرتے ہوئے اس کے سامنے اسلام کی آفاقی تعلیمات کو

آج کی زبان اور مغرب کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کریں، اور عقل اور وحی کے مابین توازن کے مکالمہ میں شریک ہو کر وحی کی ضرورت و برتری کو ثابت کریں۔ میری طالب علمانہ رائے میں اس وقت ہمارے جامعات اور دینی مدارس کو سب سے زیادہ اس بات کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ جس طرح مغرب نے ”استشراق“ کے نام سے اسلام اور مسلمانوں کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسے ہمارے خلاف پوری مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے، اسی طرح ہم بھی مغرب کے فلسفہ و تہذیب اور معاشرت کا مطالعہ کریں اور تحقیق و تجزیہ کے ذریعہ اس کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اسلامی احکام و قوانین کی برتری کو واضح کریں۔ یہ کام بہت محنت طلب ہے اور جگر کاوی کا عمل ہے کہ اس کے لیے دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے استعمال میں قلب و جگر کا خون بھی جلانا ہو گا۔ یہ سطحی اور جذباتی کام نہیں ہے لیکن اس کے بغیر اب بات آگے نہیں بڑھے گی، یہ کام بہرحال کرنا ہو گا اور جامعات کو دینی مدارس و مراکز کے ساتھ مل کر کرنا ہو گا۔

معاہدات کی حکمرانی کا دور

موجودہ عالمی ماحول میں فکری تحدیات کا تیسرا دائرہ میری طالب علمانہ رائے میں یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں حکومتوں کی نہیں بلکہ بین الاقوامی معاہدات کی حکومت ہے۔ معاہدات نے پوری دنیا کو جکڑ رکھا ہے۔ میرے نزدیک صرف وہ پانچ ملک اس وقت آزاد ملک کہلانے کے مستحق ہیں جن کے پاس سلامتی کونسل میں ”ویٹو پاور“ ہے، ان کے علاوہ دنیا کا کوئی ملک اس طرح کا آزاد اور خود مختار ملک نہیں ہے کہ وہ اپنی پالیسی اپنی اور اپنے عوام کی مرضی سے خود طے کر سکے۔ سب کے سب بین الاقوامی معاہدات کے اسیر اور پابند ہیں جن سے انحراف کی صورت میں وہی کچھ ہوتا ہے جو افغانستان اور عراق میں ہو چکا ہے۔ ان معاہدات کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے سیاسی طور پر حکومتوں کو جکڑ رکھا ہے اور ان کی خود مختاری کو قبضے میں لیا ہوا ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا پہلو علمی، فکری اور تہذیبی ہے کہ یہ معاہدات مغربی تہذیب و فلسفہ کے علاوہ باقی سب کی نفی کر رہے ہیں اور ان کی زد میں سب سے زیادہ اسلام کے احکام و قوانین ہیں۔ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کو بین الاقوامی معاہدات کی چھلنیوں سے گزار کر ان کی نفی کی جا رہی ہے، استہزاء کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور مسلمانوں پر ان سے دستبردار ہونے کے لیے ہر طرح کا دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کا علمی و فکری تقاضہ یہ ہے کہ ان کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے، اسلامی عقیدہ و ثقافت کے ساتھ ان معاہدات کے ٹکراؤ اور تضادات کی نشاندہی کی جائے اور اسلام کا موقف واضح کیا جائے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سب معاہدات کو یکسر مسترد کر دیا جائے اور نہ ہی یہ کہ انہیں من و عن قبول کر لیا جائے۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہوں گی، اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ بین الاقوامی معاہدات اور اسلامی تعلیمات کا تقابلی جائزہ لے کر بتایا جائے کہ کون سی باتیں قابل قبول ہیں اور کون سی قابل قبول نہیں ہیں۔ کن باتوں پر کسی درجہ میں مفاہمت ہو سکتی ہے اور کون سے امور ہیں جنہیں کسی طور پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالہ سے مغرب کو ایک متوازن موقف سے دوٹوک طور پر آگاہ کرنا ضروری ہے۔ اور اس سلسلہ میں امت مسلمہ کی راہنمائی ضروری ہے جو ہماری یونیورسٹیوں اور دینی مراکز کے کرنے کا کام ہے اور سنجیدہ علمی شخصیات کی نگرانی میں کرنے کا کام ہے۔

آخر میں گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ کی اس علمی و فکری کاوش پر ایک بار پھر یونیورسٹی انتظامیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہم سب کو اسلام اور امت مسلمہ کی صحیح خدمت کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳ و ۴ جنوری ۲۰۱۷ء)

فرقہ وارانہ کشمکش اور اصول انسانیت

(انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد - ۲۸ اگست ۲۰۱۹ء)

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد (IPS) نے ریڈ کراس کی انٹرنیشنل کمیٹی (ICRC) کے اشتراک سے ۲۷ و ۲۸ اگست ۲۰۱۹ء کو ''اسلام اور اصول انسانیت'' کے عنوان پر دو روزہ قومی کانفرنس کا اہتمام کیا جس کی مختلف نشستوں میں سرکردہ اصحاب فکر و دانش نے انسانیت اور انسانی حقوق کے حوالہ سے اسلامی تعلیمات و احکام کے متعدّد پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ مجھے ۲۸ اگست کو کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں معروضات پیش کرنے کے لیے کہا گیا جس کی صدارت اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز نے کی جبکہ معاون صدر دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر سہیل حسن تھے اور ان کے علاوہ اظہار خیال کرنے والوں میں مولانا محمد یاسین ظفر، ڈاکٹر

شمس الحق حنیف، ڈاکٹر محمد اقبال خلیل، جناب خالد رحمان، ڈاکٹر عطاء الرحمان اور ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی شامل ہیں۔ میری گزارشات کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد و الصلوۃ۔ میری گفتگو کا عنوان "فرقہ وارانہ کشیدگی اور اصول انسانیت" ہے اور مجھے انسانی معاشرہ کی مختلف حوالوں سے تفریق کے متنوع دائروں میں انسانی اصول و اخلاق کی پاسداری کے تقاضوں پر کچھ گزارشات پیش کرنی ہیں۔ انسانی سماج میں تفریق کئی حوالوں سے ہمیشہ سے موجود چلی آرہی ہے۔ یہ نسل کے عنوان سے بھی ہے، رنگ اور زبان کے حوالہ سے بھی ہے، مذہب بھی اس کا ایک دائرہ ہے اور وطن، قومیت، علاقہ اور دیگر بہت سے امور اس کے اسباب میں شامل ہیں۔ مگر میں ان میں سے مذہب کے حوالہ سے پائی جانے والی تفریق کی بات کروں گا۔

مذہبی تفریق کا ایک دائرہ اسلام اور کفر کا ہے اور دوسرا دائرہ امت مسلمہ کے داخلی ماحول میں باہمی اختلافات کا ہے، ان میں سے ہر ایک کے بہت سے پہلو ہیں جن کا مختصر وقت میں تذکرہ تو کجا ان کی فہرست پیش کرنا بھی مشکل ہے، اس لیے ہر دائرہ کے دو بڑے پہلوؤں کا ذکر کروں گا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ اسلام اور کفر کا دائرہ سب سے نمایاں ہے ہے کہ انسانی معاشرہ میں مسلمانوں کے ساتھ مسیحی، یہودی، ہندو، بدھ مت، سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور سب کے آپس میں معاملات چلتے رہتے ہیں۔ کافر قوموں کے ساتھ انسانی تعلقات اور اخلاقیات کے حوالہ سے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے چند واقعات کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

- بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ تشریف فرما تھے، آپ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ جنازہ گزر جانے کے بعد ساتھیوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تو یہودی کا جنازہ تھا، تو آنحضرتؐ نے فرمایا "الیست نفسا؟" کیا وہ انسان نہیں ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان یا کافر ہونا اپنے مقام پر مگر بطور انسان احترام کا حق کافر کو بھی اسی طرح حاصل ہے جس طرح کسی مسلمان کا حق ہے۔
- جناب رسول اکرمؐ پر جب طائف کے اوباش لڑکوں نے پتھراؤ کیا اور آپ زخمی حالت میں اپنے خادم حضرت زید بن حارثہؓ کے ہمراہ مکہ مکرمہ کی طرف

اس کیفیت میں واپس آرہے تھے کہ زخمی تھے اور لڑکے بدستور پیچھا کر رہے تھے، راستہ میں ایک سردار مطعم بن عدی نے یہ منظر دیکھ کر اپنے ڈیرے کا گیٹ کھول دیا اور حضورؐ کو ان لڑکوں کے تعاقب سے محفوظ کیا۔ آپؐ نے وہاں کچھ دیر آرام کیا، زخم وغیرہ دھوئے، کچھ کھایا پیا اور مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے۔ جناب نبی اکرمؐ کو مطعم بن عدی کا یہ احسان یاد تھا، چنانچہ جنگ بدر کے بعد قیدیوں کی رہائی کے فیصلہ کے موقع پر آپؐ نے فرمایا، اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان قیدیوں کے بارے میں مجھ سے بات کرتے تو میں ان کی سفارش پر ان قیدیوں کو ویسے ہی چھوڑ دیتا۔ مطعم بن عدی کافر سردار تھے اور اسی حالت میں انتقال ہوا تھا مگر آنحضرتؐ نے ان کے احسان کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ ایک اہم موقع پر اس کا اظہار بھی فرمایا۔

- جاہلیت کے دور میں کچھ قبائل نے مظلوموں کی حمایت اور ظلم و جبر کے خاتمہ، نیز ناداروں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کے لیے ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں ”حلف الفضول“ کے نام سے معروف ہے۔ جناب نبی اکرمؐ اس کا تذکرہ فرماتے تھے، اس کی تعریف کرتے تھے اور ایک موقع پر فرمایا کہ اگر آج بھی اس قسم کا کوئی معاہدہ ہو تو میں اس میں شریک ہوں گا۔

اس حوالہ سے میں ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہوں گا کہ بین الاقوامی معاہدات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی ہوتے تھے اور آج بھی دنیا میں بین الاقوامی معاہدات کا دور دورہ ہے، بلکہ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ آج کی دنیا میں اکثر ملکوں پر حکومتوں کی نہیں بلکہ بین الاقوامی معاہدات کی حکومت ہے، ان معاہدات کی تعداد تیس کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے جنہوں نے پوری دنیا کو اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے اور دنیا کا ہر ملک ان کا پابند سمجھا جا رہا ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جس ملک و قوم کے پاس طاقت زیادہ ہے یا جس کے پاس دولت زیادہ ہے وہ ان معاہدات کی جکڑ بندی سے اپنے لیے راستہ نکال لیتا ہے، مگر جو ہماری طرح طاقت و دولت میں کمزور ہے اسے بہر صورت ان معاہدات کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اس پس منظر میں اصحاب فکر و دانش سے میری ہمیشہ یہ گزارش رہتی ہے کہ جناب نبی

اکرمؐ کے دور کے بین الاقوامی معاہدات اور آج کے دور کے بین الاقوامی معاہدات پر تحقیق و مطالعہ کا کام ہونا چاہیے اور آنحضرتؐ کی سیرت و اسوہ کی روشنی میں ہمیں آج کے بین الاقوامی معاہدات کے ماحول میں اپنا طرز عمل طے کرنا چاہیے۔

- جناب رسول اکرمؐ نے جنگ کے ماحول میں جو ہدایات دی ہیں وہ انسانی احترام اور اخلاقیات کی اعلیٰ ترین مثال ہیں اور میری گزارش ہے کہ جنگی اخلاقیات کا جو معیار اسلام اور جناب نبی کریمؐ نے پیش کیا تھا اسے دوبارہ دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو، صرف اسی پر ہتھیار اٹھاؤ جو جنگ میں شریک ہے، اور املاک کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ مگر آج کے جدید ہتھیاروں نے یہ سارے دائرے توڑ دیے ہیں اور حالت جنگ میں انسانی اخلاقیات کے اصولوں کو قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔ اصحاب دانش سے میری گزارش ہے کہ اگرچہ ہم بھی مجبوراً آج کے ہتھیاروں کو استعمال کر رہے ہیں جو جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد کردہ جنگی اصولوں اور اخلاقیات کے منافی ہیں، مگر ہمیں اسلام کے ان اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا تذکرہ تو نہیں چھوڑ دینا چاہیے اور دنیا کو بتاتے رہنا چاہیے کہ اسلام کے جنگی اصول کیا ہیں اور جناب رسول اکرمؐ نے کن جنگی اخلاقیات کی تعلیم دی ہے۔

مذہبی تفریق کا دوسرا دائرہ وہ ہے جو امت کے داخلی ماحول میں پایا جاتا ہے اور اس کے بھی بہت سے پہلو ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو کافر کہہ دیتے ہیں اور گمراہ قرار دے دیتے ہیں جس کی بنیاد پر فرقہ واریت کا وسیع ماحول بن جاتا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے اس لیے صرف ایک پہلو پر عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں جن لوگوں کو ان کے کلمہ پڑھنے کے باوجود قرآن کریم نے ”وما ہم بمومنین“ کہا اور ان کے بارے میں فرمایا کہ ”واللہ یشہد انہم لکاذبون“ اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہیں اور جن کو مدینہ منورہ میں ایک متوازی مرکز ”مسجد ضرار“ تعمیر کرنے کی کوشش پر قرآن کریم نے ”کفرا وتفریقا بین المومنین وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ“ کا مصداق قرار دیا، ان کے بارے میں آنحضرتؐ کا معاشرتی طرز عمل یہ تھا کہ

ان کا مرکز تو قائم نہیں ہونے دیا گیا بلکہ اسے گرا کر نذر آتش کر دیا گیا، لیکن ان کے ساتھ معاشرتی تفریق کا ماحول قائم نہیں ہونے دیا۔

میرا ایک طالب علمانہ سا سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ ”جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم“ کافروں اور منافقوں سے جہاد کریں اور ان کے ساتھ سختی کریں، آنحضرتؐ نے دس سالہ مدنی دور میں مختلف کافر قوموں کے ساتھ تو بعض روایات کے مطابق ستائیس جنگیں لڑی ہیں مگر منافقوں کے ساتھ ایک لڑائی بھی نہیں کی، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے اس آیت کریمہ پر عمل نہیں کیا؟ نعوذ باللہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ معاملہ یوں ہے کہ کافروں کے ساتھ تو آپ نے تلوار کا جہاد کیا مگر منافقین کے خلاف حکمت عملی کا جہاد کیا کہ نہ انہیں اپنے ملی معاملات میں دخل انداز ہونے دیا اور نہ ہی اپنے خلاف مدینہ منورہ میں کوئی محاذ قائم کرنے دیا۔ ایسے منافقین کا تناسب جنگ احد کے موقع پر ہزار میں تین سو تھا، مگر صرف آٹھ سال میں جناب نبی اکرمؐ کی وفات پر ان کی تعداد چند افراد تک محدود ہو کر رہ گئی تھی جن کے ناموں کا صرف حضرت حذیفہؓ کو علم تھا اور ان پر بھی پابندی تھی کہ وہ ان میں سے کسی کا نام ظاہر نہیں کریں گے، یہ جناب نبی اکرمؐ کی معاشرتی حکمت عملی اور تدبر کا شاہکار تھا۔

میں نے کلمہ پڑھنے والوں کے درمیان داخلی تفریق کا صرف ایک دائرہ بیان کیا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دائرے ہیں جن کے بارے میں فقہاء کرام نے مستقل احکام و قوانین بیان فرمائے ہیں ان میں سے کسی ایک سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام اور کفر کے دائرے مختلف حوالوں سے موجود ہیں مگر میری طالب علمانہ رائے ہے کہ معاشرتی تعلقات اور سماجی معاملات کی بنیاد انسانی اخلاقیات اور تقاضوں پر ہوتی ہے، ان دونوں امور کو اپنے اپنے دائرے میں رکھ کر ہی ہم معاملات کو صحیح رخ پر رکھ سکتے ہیں۔

یہاں مجھ سے میری گفتگو کے حوالہ سے سوال کیا گیا ہے کہ کیا قادیانیوں کو بھی ان انسانی اصولوں اور اخلاقیات کے حوالہ سے گنجائش دی جا سکتی ہے؟ میری گزارش ہے کہ ہمارا قادیانیوں کے ساتھ تنازعہ ان کے معاشرتی اور شہری حقوق کے دائرہ میں نہیں ہے بلکہ ان کی طرف سے سماج اور معاشرہ کے متفقہ موقف کو مسترد کرنے کے باعث ہے، اس لیے ان کے ساتھ وہی معاملہ رکھا جا سکتا ہے جو پوری قوم اور سماج کے اتفاقی طرز عمل کی نفی

کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر آج قادیانی جماعت سماج کی اجتماعیت کو قبول کر لے اور معاشرہ کے متفقہ موقف کو تسلیم کر لے تو جیسے باقی غیر مسلم سوسائٹیاں پاکستان میں باعزت شہری کے طور پر رہ رہی ہیں، قادیانیوں کا بھی یہ جائز حق ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پوری قوم اور سماج کے متوازی کھڑے رہنے کی بجائے قومی فیصلوں اور دستور کی بالادستی کو قبول کریں، اس کے سوا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۱ اگست ۲۰۱۹ء)

”موتمر وثیقہ مکہ المکرمہ“ کے لیے ہماری گزارشات

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۴ جون ۲۰۱۹ء)

رابطہ عالم اسلامی کے ”موتمر وثیقہ مکہ المکرمہ“ کی تیسری نشست سے خطاب کرتے ہوئے کویت یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر حمود فہد القشعان نے ایک دلچسپ کہاوت سے گفتگو کا آغاز کیا اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں اعتدال، وسطیت اور توازن کی اہمیت و ضرورت پر خوبصورت گفتگو کی۔ ان کی زبان سے یہ کہاوت سن کر مجھے اپنے آبائی شہر گکھڑ کے ایک پرانے بزرگ صوفی نذیر احمد کشمیری مرحوم یاد آ گئے جن سے میں نے یہ کہانی نصف صدی قبل پنجابی زبان میں متعدّد بار سن رکھی ہے۔ صوفی صاحب مرحوم شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے مرید اور والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، گھریلو تعلقات کے باعث ہم انہیں تایا جی کہا کرتے تھے اور وہ بھی ہمارے ساتھ بھتیجوں جیسی شفقت کا اظہار کیا کرتے تھے۔

کہاوت یہ ہے کہ ایک پیر صاحب کا حلقہ ارادت تو بہت وسیع تھا مگر وہ علم و مطالعہ اور وعظ و گفتگو سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتے تھے، وہ مریدوں کے کسی گاؤں میں جاتے تو کئی کئی ہفتے قیام کرتے۔ ایک دفعہ کسی گاؤں کے مریدوں نے مشورہ کیا کہ پیر صاحب سے گزارش کی جائے کہ جب وہ موجود ہوتے ہیں تو مسجد میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کر دیا کریں، اس سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ پیر صاحب سے عرض کیا تو ان کے لیے مشکل پیدا ہو گئی کہ وہ اپنی اس کمزوری کو کس طرح چھپائیں۔ مریدوں کے اصرار پر انہوں نے

وعدہ کر لیا اور جمعہ کی نماز سے قبل منبر پر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی نمازیوں سے سوال کیا کہ جو بات میں آپ لوگوں سے کہنے لگا ہوں کیا وہ آپ کو معلوم ہے؟ جواب ملا کہ نہیں! پیر صاحب نے کہا کہ جو لوگ اتنے بے علم ہیں ان سے بات کرنے کا فائدہ ہی نہیں ہے اس لیے نماز کی تیاری کرو۔ اگلے جمعہ کو لوگوں نے پھر تقاضہ کر کے منبر پر بٹھا لیا تو وہی سوال پیر صاحب نے پھر دہرایا۔ جواب ملا کہ ہاں ہمیں معلوم ہے آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں۔ پیر صاحب نے کہا کہ جب معلوم ہے تو بتانے کی ضرورت کیا ہے؟ نماز کی تیاری کرو۔ تیسرے جمعہ کو نمازیوں نے باہمی مشورہ کر لیا کہ اب کے پیر صاحب کو پھر آمادہ کرنا ہے۔ وہ تیار ہوئے اور منبر پر بیٹھ کر وہی سوال دہرایا۔ نمازیوں میں سے کچھ نے کہا کہ معلوم ہے، اور کچھ نے کہا کہ معلوم نہیں۔ پیر صاحب نے کہا کہ جنہیں معلوم ہے وہ انہیں بتا دیں جو نہیں جانتے۔ اب نماز کی تیاری کرو۔ اس طرح پیر صاحب نے اپنی کمزوری کا بھرم قائم رکھا۔

یہ کہاوت جو خالص پنجابی ماحول میں نصف صدی قبل سن رکھی تھی، مکہ مکرمہ کے عرب ماحول میں کویت یونیورسٹی کے ایک سینئر استاذ کی زبان سے عربی میں سن کر جہاں ماضی کی ایک یاد تازہ ہوئی وہاں اس سماجی حقیقت کا پھر سے مشاہدہ ہو گیا کہ انسان کی ساخت چونکہ بنیادی طور پر ایک ہی سانچے میں ہوئی ہے، اس لیے خوبیاں، کمزوریاں، صلاحیتیں، نفسیات، عادات اور معمولات کم و بیش سب کے یکساں ہی ہوتے ہیں، البتہ ان کے اظہار میں مواقع اور احوال و ظروف کے اختلاف کے باعث تنوع اور فرق آجاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات ایمان میں اضافہ کا باعث بنی کہ اسلام کا خطاب چونکہ انسانی سوسائٹی کے طبقات اور الگ الگ دائروں کی بجائے نسل انسانی سے ہے اور وہ "بنی آدم" سے مخاطب ہے اس لیے اس کی تعلیمات اور احکام و قوانین قوموں، طبقوں اور گروہوں کی بجائے انسان کی بنیادی فطرت سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اور یہ وہ حقیقت واقعہ ہے جس کا اظہار نظاموں، تہذیبوں اور فلسفوں کی طویل کشمکش کے بعد اب ایک ایک کر کے مختلف حوالوں سے سامنے آرہا ہے، فالحمد للہ علی ذلک۔

"موتمر وثیقہ مکہ مکرمہ" کے حوالہ سے بہت سی باتیں عرض کرنے کی ہیں مگر کالم کا دامن اور مصروفیات کا ہجوم دونوں اس کے متحمل نہیں ہیں، البتہ موتمر کے لیے کچھ گزارشات میں نے بھی مرتب کر رکھی تھیں جن کے اظہار کا وہاں موقع نہیں تھا کہ پاکستان اور علمائے پاکستان کی نمائندگی وفاقی وزیر مذہبی امور ڈاکٹر پیر نور الحق قادری اور مولانا قاری

محمد حنیف جالندھری نے اپنے خطاب میں بہتر طور پر کر دی تھی، اس لیے وہ معروضات میں نے تحریری طور پر رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹریٹ میں جمع کرادیں، جبکہ ان کا اردو متن کچھ ردوبدل کے ساتھ یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

"رابطہ عالم اسلامی ملت اسلامیہ کا ایک باوقار ادارہ ہے جو ملت اسلامیہ کی وحدت واجتماعیت کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ علمی وفکری راہنمائی کا مرکز بھی ہے، اور اس حوالہ سے پوری امت کی امیدوں کا محور ہے۔ اللہ تعالی اس فورم کو یہ ذمہ داری بطریق احسن ہمیشہ سرانجام دیتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

اس کانفرنس کا عنوان ہے "قیم الوسطیۃ والاعتدال فی نصوص الکتاب والسنۃ"۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ امت مسلمہ بلکہ نسل انسانی کو اعتدال وتوازن کی ان اقدار و روایات کی طرف توجہ دلائی جائے جن سے رشد و ہدایت کے دو عظیم سرچشموں قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعارف کرایا ہے، اور جو رہتی دنیا تک نسل انسانی کے لیے راہنما ہونے کے ساتھ ساتھ اخروی زندگی میں بھی نجات وفلاح کا ذریعہ ہیں۔

اللہ رب العزت نے اپنے پاک کلام میں بیت اللہ کی عظمت و حرمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

- یہ "اول بیت وضع للناس" ہے یعنی روئے زمین پر انسانی آبادی کا نقطۂ آغاز ہے۔ جبکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد گرامی کے مطابق نسل انسانی کے اختتام کا نقطہ بھی یہی ہوگا کہ اس پر ایک ظالم حکمران کے حملہ کے ساتھ ہی قیامت کا بگل بجادیا جائے گا۔
- "فیہ ایات بینات" کہ یہ اللہ تعالی کی آیات کا مقام مبارک ہے جو اللہ تعالی کی عظمت وحاکمیت کی کھلی نشانیاں ہیں۔
- اس میں "مقام ابراہیم" ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی فطرت سلیمہ، استقامت وعزیمت اور جہد واستقلال کی علامت ہے۔
- "من دخلہ کان امنا" کا مظہر ہے کہ امن وسلامتی کا ماحول دنیا کے سامنے پیش کرکے پوری نسل انسانی کو امن اور باہمی سلامتی کے ساتھ رہنے کی تلقین کررہا ہے۔

- اور یہ ”مبارکا وھدی“ ہے کہ ہدایت ورشد کے ساتھ ساتھ برکات کا بھی سرچشمہ ہے۔

ہمارے خیال میں آج کی انسانی سوسائٹی کو انہی نکات کی طرف متوجہ کرنے اور اس فطری مرکزیت پر مجتمع کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

اسلام اللہ تعالی کی مخلوق کو اس کے سامنے جھک جانے کی دعوت دیتا ہے اور خالق و مالک کی ان ہدایات کے مطابق تمام انسانوں کو زندگی گزارنے کا پیغام دیتا ہے۔ جو اللہ تعالی کے پیغمبروں نے وحی الہی اور اپنے اپنے اسوۂ حسنہ کی صورت میں پیش کیا۔ ان آسمانی تعلیمات کا آخری، مکمل، محفوظ اور جامع ذخیرہ قرآن کریم اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و اسوہ کی صورت میں موجود ہے۔ اور یہ اسلام کے اعجاز و تفوق کا زندہ ثبوت ہے کہ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دنیا کے پاس آسمانی تعلیمات اور انبیاء کرام علیہم السلام کے اسوہ و سنت کا کوئی اور محفوظ و مستند ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نوع انسانی کو اگر آسمانی تعلیمات اور انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے اور اپنے مالک و خالق کو راضی کرنا ہے تو اس کے پاس قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اور ہم مسلمانوں کے لیے یہ اعزاز و افتخار کی بات ہے کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں اور بداعمالیوں کے باوجود ہم نہ صرف اس سرچشمہ ہدایت کی طرف دعوت دینے والے ہیں بلکہ اس کی حفاظت، تعلیم و تدریس اور فروغ و اشاعت کی خدمات میں بھی بحمد اللہ تعالی کسی نہ کسی درجہ میں مصروف رہتے ہیں۔

اسلام نے نسل انسانی کو جس وسطیت، اعتدال اور توازن سے متعارف کرایا ہے وہ اعتقادی بھی ہے کہ ایک طرف ”کالذین نسوا اللہ“ اور دوسری طرف ”رہبانیت“ کے دو انتہاؤں کو رد کرتے ہوئے اس دین فطرت نے نسل انسانی کو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کا سبق دیا ہے۔ اور ”ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ“ کے پیغام کے ساتھ دین و دنیا میں توازن و اعتدال کا راستہ دکھایا ہے۔

- یہ اعتدال و توازن عمل اور عبادت میں بھی ہے کہ سینکڑوں مصنوعی خداؤں کی عبادت اور وحدہ لاشریک کی بندگی سے انکار کی دو انتہاؤں کے درمیان اللہ تعالی کی بندگی اور عقیدۂ توحید کا درس دیا ہے۔
- یہ اعتدال و وسطیت معاشرتی بھی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم نے انسانی معاشرہ کی جاہلانہ رسوم و خرافات کا خاتمہ کر کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ”کل امر الجاھلیۃ موضوع تحت قدمی“ کا تاریخی اعلان فرمایا اور جاہلانہ اقدار و روایات کے ذریعے پھیلنے والی باہمی نفرتوں اور عداوتوں کا خاتمہ کر کے ”والف بین قلوبہم“ کی نوید سنادی۔

• یہ اعتدال و وسطیت خاندانی نظام میں بھی ہے کہ زنا کی اباحیت، محارم سے نکاح کی شناعت اور عورت کو مجبور محض بنا لینے کی انتہا پسندانہ جاہلی روایات کو ختم کر کے نکاح، رشتوں اور خاندان کا ایک منظم اور باوقار نظام دیا جو آج بھی دنیا بھر کے لیے قابل رشک ہے۔

• یہ اعتدال و وسطیت معیشت و اقتصاد میں بھی ہے کہ سوسائٹی میں دولت کی گردش کو ”کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم“ اور ”توخذ من اغنیاءھم وترد الی فقراءھم“ کے دو سنہری اصولوں کے دائرے میں محصور کیا۔ اور ”بیت المال“ کے ذریعے معاشرتی کفالت کا وہ نظام دیا جو رہتی دنیا تک ویلفیئر سوسائٹ اور رفاہی نظام کے لیے مثالی اور معیار رہے گا۔

• یہ اعتدال سیاست و حکومت میں بھی ہے کہ انسان پر انسان کی حکمرانی کی نفی کرتے ہوئے حکومت و ریاست کو اللہ تعالی کی حاکمیت اعلی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کا پابند بنا کر قانون کی حکمرانی کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

• اور یہ اعتدال و وسطیت جنگ و امن کے ماحول میں بھی ہے کہ انسانوں کو باہمی شخصی، نسلی طبقاتی اور علاقائی مفادات کے لیے ایک دوسرے سے جنگ کرنے سے منع کر کے جنگ و جہاد کو صرف اللہ تعالی کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے مخصوص کر دیا۔

غرضیکہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی دیکھیں اسلامی تعلیمات انسانی عقل و خواہش کی کوکھ سے جنم لینے والی انتہاؤں کے درمیان اعتدال و توازن کا سبق دیتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔

آج نسل انسانی بلکہ امت مسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ ”ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس“ کا دور دورہ ہے۔ اور ”ولقد جاءھم من ربھم الھدی“ کو انسانی پالیسیوں، معاملات، رویوں اور طرز معاشرت میں اس کا وہ صحیح مقام و حیثیت حاصل نہیں ہے

جو نظام و معاملات کو صحیح رخ پر لانے کا واحد راستہ ہے۔

آج امت مسلمہ ہمہ نوع خلفشار و تشتت کا شکار ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اپنے معاملات و امور کو قرآن و سنت اور خیر القرون کی اقدار و روایات کی راہنمائی کے دائرے میں رکھنے کی بجائے خود اپنی عقل و خواہش کے مطابق حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جس میں انسانی سوسائٹی کی دیگر معاصر اقوام اور قوتیں اپنے وسائل اور قوت و طاقت کے باعث ہم پر غالب ہو جاتی ہیں اور ہم ”مذبذبین بین ذلک“ کی تصویر بنے رہتے ہیں۔

جہاد کے مقدس شرعی فریضہ کے حوالہ سے بھی ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے کہ ایک عرصہ تک جہاد اور خلافت کی اصطلاحات کو ہمارے ماحول میں اجنبی بنانے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ اس کے لیے بہت سے داعی حتیٰ کہ مرزا غلام احمد قادیانی جیسے مدعیان نبوت کھڑے کیے گئے، مگر جب اس کے ردعمل میں مختلف علاقوں میں استعماری غلبوں کے خاتمہ کے لیے جہاد کی تحریکات شروع ہوئیں تو امت مسلمہ میں وحدت و مرکزیت کا کوئی نظام و ماحول موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ مقدس عمل تشتت و افتراق کا عنوان بن کر رہ گیا۔ ہر گروہ نے ”جہاد“ کے اپنے اہداف اور اصول و قواعد الگ وضع کر لیے اور اس کے تلخ نتائج کو ہمارے دشمنوں نے اسلام کی شناخت مسخ کرنے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے سب سے بڑا ہتھیار بنا لیا۔ حالانکہ جہاد اسلام کا ایک مقدس فریضہ ہے جس کے حدود و قواعد قرآن و سنت میں واضح طور پر موجود ہیں۔ اور فقہاء اسلام نے اس کی دائرہ بندی اور درجہ بندی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن جب ان تمام اصول و قواعد اور احکامات و ہدایات کو نظر انداز کر کے قرن اول کے خوارج کی طرح ہر گروہ اپنی اپنی تعبیر و تشریح کو ہی حتمی قرار دے گا تو اس کا نتیجہ وہی ہو گا جس سے ہم آج دوچار ہیں، اور جس کے نتیجہ میں جہاد کے مقدس عنوان کو ہمارے لیے عزت و سربلندی کی بجائے کردار کشی کا عنوان بنا دیا گیا ہے۔

آج ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس خلفشار اور تشتت کے ماحول سے امت کو نکالنے کے لیے اپنی اپنی خود ساختہ تعبیرات و تشریحات پر اصرار کو ترک کر کے اجتماعی مشاورت و تفاہم کے ماحول میں قرآن و سنت اور خیر القرون کے تعامل کی طرف واپس لوٹ جائیں، اس کے سوا کوئی اور راستہ عالم اسباب میں دکھائی نہیں دیتا۔

رابطہ عالم اسلامی اس سلسلہ میں صحیح سمت راہنمائی کا موجودہ حالات میں سب سے مؤثر فورم اور ادارہ ہے، میں دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت رابطہ کو اس ذمہ داری سے بخیر وخوبی عہدہ برآ ہونے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔“

”سودی نظام“ پر اسلام آباد میں ایک اہم سیمینار

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۴ مئی ۲۰۱۹ء)

رمضان المبارک کے دوران معمولات تبدیل ہو جاتے ہیں اور اس کا آغاز شعبان المعظم کے آخری ہفتہ سے ہی ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کچھ ضروری کام بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس سال شعبان کے آخری ایام میں اسلام آباد کا ایک اہم سفر ہوا جس کے مشاہدات میں قارئین کو شریک کرنا ضروری تھا مگر تاخیر ہوگئی۔ شریعہ اکادمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے مفتیان کرام کے چھ روزہ تربیتی کورس کا اہتمام کر رکھا تھا اور ۴ مئی کو اس کا آخری روز تھا۔ محترم ڈاکٹر مشتاق احمد اور جناب علی اصغر کا ارشاد تھا کہ میں اس میں ضرور حاضری دوں، چنانچہ تعمیل حکم میں حافظ محمد عثمان حیدر کے ہمراہ اسلام آباد پہنچا اور مذکورہ کورس کے شرکاء سے ان کے موضوع پر گفتگو کے علاوہ انسداد سود کی مہم کے حوالہ سے شریعہ اکادمی کے زیر اہتمام ایک مستقل نشست میں حاضری ہوگئی جبکہ وفاقی شرعی عدالت کے محترم جسٹس فدا محمد خان کے ساتھ مختصر ملاقات کا موقع بھی مل گیا جو مفتیان کرام کے کورس میں لیکچر کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔

مفتیان کرام سے میں نے مختصرا چند باتیں عرض کیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ تفسیر قرطبیؒ میں مذکور ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے کسی شخص نے پوچھا کہ کیا قاتل کے لیے توبہ کی گنجائش ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ چلا گیا۔ اس پر مجلس کے حضرات نے عرض کیا کہ حضرت! توبہ کی گنجائش تو ہر گنہگار کے لیے ہوتی ہے اور آپ نے بھی اس سے قبل فرمایا تھا کہ قاتل کے لیے توبہ کی گنجائش ہے، جبکہ اس سائل کو آپ نے اس کے خلاف بات کہہ دی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ میں نے اس کے چہرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کسی کو قتل کرنے کے ارادے سے جا رہا ہے اور میرے فتوے کو اپنی تسلی کے لیے استعمال کرے گا۔ مجلس میں شریک ایک صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اس سائل کو تلاش کر کے اس بات کی تحقیق کی تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا اندازہ

درست ثابت ہوا اور ان کی حکمت عملی بھی کامیاب نظر آئی کہ سوال پوچھنے والے شخص نے قتل کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس سے فقہاء کرام یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کسی استفتاء پر مفتی صاحب کو صرف یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کیا پوچھ رہا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کیوں پوچھ رہا ہے اور ان کے فتوے کا وہ کہاں اور کیسے استعمال کرے گا؟

انسداد سود کے حوالہ سے نشست میں قومی اسمبلی میں جماعت اسلامی کے ایم این اے مولانا عبد الاکبر چترالی کا حال ہی میں پیش کردہ بل موضوع گفتگو تھا جو بحث کے لیے منظور ہو کر قائمہ کمیٹی کے سپرد کیا جا چکا ہے اور اس کا سردست خوش آئند پہلو یہ ہے کہ وفاقی وزیر قانون نے اس کی مخالفت نہیں کی جس کی وجہ سے اسے بحث کے لیے منظور کر کے کمیٹی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ اس بل کے ساتھ ساتھ سودی نظام کے خلاف اب تک کی پارلیمانی، عوامی اور عدالتی جدوجہد کے حوالہ سے پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر زاہد صدیق مغل اور جناب علی اصغر کے علاوہ راقم الحروف نے بھی گزارشات پیش کیں اور خاص طور پر مختلف مکاتب فکر کے مشترکہ فورم ”تحریک انسداد سود پاکستان“ کی اب تک کی سرگرمیوں سے شرکاء کو مختصراً آگاہ کیا۔ اس فورم کی مرکزی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی ذمہ داری میرے سپرد ہے اور اس میں مختلف مکاتب فکر بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور شیعہ کے سرکردہ حضرات شامل ہیں۔

مقررین کی گفتگو میں سود کی تعریف، اطلاق اور اس کی مختلف صورتوں کے بارے میں پیدا کیے جانے والے شکوک و اعتراضات بھی زیر بحث آئے اور ان رکاوٹوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا جو پارلیمنٹ، عدالت اور عوامی محاذ پر سودی نظام کے خاتمہ کی راہ میں حائل دکھائی دیتی ہیں۔ اس پر راقم الحروف نے شرکاء محفل کو ایک لطیفہ سنایا جس سے سب دوست محظوظ ہوئے۔ وہ یہ کہ جن دنوں ”تحریک انسداد سود پاکستان“ کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور اخبارات میں میرے مختلف مضامین اور بیانات سامنے آئے تو ایک صاحب نے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور اس بات پر زور دیا کہ ہم ”انسداد سود“ کے نام پر جو کچھ کر رہے ہیں وہ قرآن کریم کے خلاف ہے اور وہ مجھ سے مل کر اس غلطی سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ ملاقات کے لیے تشریف لائے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ ہم لوگ تو قرآن کریم کے حکم پر عملدرآمد کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں، اگر خدانخواستہ یہ سب کچھ قرآن کریم ہی کے خلاف ہے تو اپنی غلطی واضح ہونے پر ہم نظر ثانی کے لیے تیار ہیں۔

انہوں نے فرمایا کہ آپ لوگوں نے جس چیز کو سود قرار دے کر اس کے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے، قرآن کریم اسے سود نہیں کہتا، قرآن کریم نے تو ”وغرابیب سود“ کہہ کر کالے پہاڑوں کو سود کہا ہے اور آپ لوگ خوامخواہ اسے معاشی نظام کی طرف لے گئے ہیں۔ اس ”نکتہ رسی“ پر باقاعدہ سر پیٹنے کو جی چاہا اور میں نے ”قالو سلاما“ کہہ کر پیچھا چھڑانے میں عافیت محسوس کی۔

شریعہ اکادمی کی سودی نظام کے حوالہ سے اس نشست سے مجھے خاصا حوصلہ ملا بلکہ یہ معلوم کر کے حوصلہ کئی گنا بڑھ گیا کہ آئندہ دنوں میں شریعہ اکادمی سودی نظام سے متعلقہ علمی، فکری اور فقہی مسائل پر ایک بڑے اور وسیع دائرہ میں سیمینار کا اہتمام کرنے والی ہے جو اس جدوجہد میں بہت فائدہ دے گا۔ اس موقع پر اس بات پر زور دیا گیا کہ وطن عزیز کو سودی نظام کی نحوست سے نجات دلانے کے لیے مختلف محاذوں پر کام کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

• پارلیمانی محاذ پر جہاں مولانا عبد الاکبر چترالی کا پیش کردہ بل زیر بحث ہے، ارکان پارلیمنٹ سے ملاقاتوں ورابطوں اور ان کی بریفنگ کا اہتمام ضروری ہے اور یہ مستقل طور پر کرنے کا کام ہے۔

• وفاقی شرعی عدالت میں سودی قوانین کے خاتمہ کا کیس ایک عرصہ سے چل رہا ہے، اس میں دلچسپی لینا، بحث و مباحثہ میں شریک ہونا اور کیس کی تاریخ پر وہاں حاضر ہو کر اپنی موجودگی اور دلچسپی کا اظہار کرنا اہل دین بالخصوص اسلام آباد اور راولپنڈی کے علماء کرام اور دینی راہنماؤں کی ذمہ داری ہے۔

• عصری و دینی درسگاہوں میں سودی نظام اور اس سے متعلقہ مباحث کو درس و تدریس کا موضوع بنانا اور اساتذہ و طلبہ کو اس کی عملی و فکری ضروریات سے آگاہ کرنا اس کا اہم تقاضا ہے۔

• عوامی محاذ پر علماء کرام اور خطباء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خطبات جمعہ اور درس و وعظ میں اس عنوان پر گفتگو کریں اور رائے عامہ کو اس سلسلہ میں بیدار و منظم کرنے کی خدمت سرانجام دیں۔

• جبکہ میڈیا کے تمام شعبوں کا یہ دینی و قومی فریضہ بنتا ہے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک اہم ریاستی ستون ہونے کی حیثیت سے اپنے موجودہ

رویہ پر نظر ثانی کریں اور شکوک و شبہات کو فروغ دینے کی بجائے دستور پاکستان کی ہدایت کے مطابق اسلامی تعلیمات کے فروغ اور فحاشی اور سودی نظام کے خاتمہ کے لیے اپنی ترجیحات کا از سر نو تعین کر کے قومی میڈیا کا قبلہ درست کریں۔

• ملک میں وفاقی دارالحکومت، خیبر پختونخواہ اور صوبہ پنجاب کی حدود میں پرائیویٹ سطح پر سود کے لین دین کی ممانعت کا قانون موجود ہے جس کے تحت یہ قابل سزا جرم ہے، مگر اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے اور نہ ہی اس پر عمل کرانے میں کوئی دلچسپی موجود ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو اس سے آگاہ کیا جائے، اس کے تحت سود خوروں کے خلاف مقدمات کے اندراج کا اہتمام کیا جائے اور اس پر عملدرآمد کا عمومی ماحول بنایا جائے۔

تقویٰ کا مفہوم اور اس کے تقاضے

(گوجرانوالہ میڈیکل کالج، گوجرانوالہ - ۱۳ مئی ۲۰۱۹ء)

(۹ رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ کو گوجرانوالہ میڈیکل کالج میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے ایک نشست سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھے گوجرانوالہ میڈیکل کالج آکر خوشی ہوتی ہے، ایک تو اس حوالہ سے کہ یہ میرے شہر کا میڈیکل کالج ہے جہاں اساتذہ کے ساتھ ساتھ بچوں اور بچیوں سے اجتماعی ملاقات ہو جاتی ہے اور کالج کی ترقی اور پیشرفت دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے جو یقیناً پرنسپل محترم ڈاکٹر پروفیسر سمیع ممتاز اور ان کے رفقاء کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ اور دوسرا اس حوالہ سے کہ یہاں کا ماحول اور سرگرمیاں بھی مسرت کا باعث بنتی ہیں جو فنی، اخلاقی اور دینی تینوں دائروں میں نمایاں دکھائی دیتی ہیں، اور میں اس پر پرنسپل صاحب اور ان کے رفقاء کار بالخصوص ڈاکٹر فضل الرحمن کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

رمضان المبارک کا مقدس مہینہ ہے اور کالج کی اسلامک سوسائٹی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر نشست کا اہتمام کر رکھا ہے۔ مختلف بچوں اور بچیوں نے حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبولؐ اور تقریر کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ میں اس سے قبل بھی یہاں آچکا ہوں اور گزشتہ حاضری پر میں نے عرض کیا تھا کہ آج

کے اس ماحول میں کالج کے بچوں اور بچیوں سے جب اچھے انداز میں قرآن کریم کی تلاوت سنتا ہوں، حمد و نعت کا ذوق ان میں دیکھتا ہوں اور ان کے منہ سے اللہ تعالی اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ سنتا ہوں تو میرا وہ خوف دور ہو جاتا ہے جس سے زمانہ نئی نسل کے بارے میں مسلسل ڈراتا رہتا ہے مگر اس لباس، حلیہ اور ماحول میں قرآن و سنت کا تذکرہ ہوتے دیکھ کر مستقبل کی قیادت کے بارے میں مختلف حلقوں کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کافور ہونے لگتے ہیں، اور آج بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔

محترم اساتذہ کرام اور طلبہ و طالبات! رمضان المبارک کا برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ ہے۔ قرآن کریم، روزہ اور صدقہ و خیرات کا مہینہ ہے۔ اور عبادات اور اعمال خیر میں سبقت کا مہینہ ہے۔ قرآن کریم نے اس مہینہ کی سب سے بڑی عبادت روزے کے بارے میں ایک اہم بات ارشاد فرمائی ہے، اسی سلسلہ میں آج کی مختصر گفتگو میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ ”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ“۔ روزے کے اور بھی بہت سے فائدے اور برکات ہیں مگر ان میں سے ایک بڑا مقصد تقوی پیدا کرنا ہے۔ قرآن کریم نے بیسیوں مقامات پر تقوی کا ذکر کیا ہے اور اسے مسلمانوں کا شعار اور اہل ایمان کی علامت قرار دیا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ تقوی کیا ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ تقوی کا لفظی معنی ”بچاؤ“ ہے۔ جیسے ہم دنیا کے بہت سے کام کرتے ہیں اور بہت سے کاموں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، بہت سی چیزیں استعمال میں لاتے ہیں اور بہت سی چیزوں کے استعمال سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں، اسی طرح دین کے حوالے سے آخرت کی کامیابی اور روح کی ترقی کے لیے بھی جہاں کچھ کام کرنا ضروری ہیں وہاں بہت سارے کاموں اور چیزوں سے بچنا بھی ضروری ہے۔

جناب نبی اکرمؐ نے ایک حدیث مبارک میں یہ بات ایک مثال کے ذریعے سمجھائی ہے۔ آنحضرتؐ نے صحابہ کرامؓ کی ایک مجلس میں سوال کیا کہ تقوی کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ”اللہ ورسولہ اعلم“ اللہ تعالی اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم کسی لمبے راستے پر جا رہے ہو اور جانے کا وہی ایک راستہ ہو، راستہ تنگ ہو

اور دونوں طرف کانٹوں والی جھاڑیاں ہوں تو اس راستے سے کیسے گزرو گے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ بدن کو سکیڑتے ہوئے اور کپڑوں کو سمیٹے ہوئے اس احتیاط کے ساتھ وہاں سے گزریں گے کہ کوئی کانٹا جسم کو نہ چبھے اور کوئی کانٹا کپڑوں سے نہ الجھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ دنیا ایک گزر گاہ ہے جہاں سے تم نے بہرحال گزرنا ہے، انسانی خواہشات جھاڑیاں ہیں جن کا کوئی حساب و شمار نہیں ہے، جبکہ ان میں کانٹے وہ انسانی گناہ اور اعمال سیئہ ہیں جو انسانوں کو ان میں الجھا دیتے ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اس احتیاط کے ساتھ گزارو کہ گناہ کا کوئی کانٹا تمہیں الجھا نہ دے اور تم ان سے بچتے بچاتے ہوئے زندگی بسر کرو۔

تقویٰ کی یہ خوبصورت مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے اور قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ روزے تم میں تقویٰ پیدا کرتے ہیں۔ روزے کی حالت میں دن کے وقت کچھ چیزوں کے استعمال پر پابندی لگ جاتی ہے، آج کل ہمارا روزہ کم و بیش پندرہ گھنٹے کا ہے۔ روزہ ہمیں یہ تربیت دیتا ہے کہ جس طرح تم بعض حلال کاموں سے اپنے آپ کو پندرہ گھنٹے کے لیے روک لیتے ہو، اسی طرح ناجائز کاموں سے اپنے آپ کو چوبیس گھنٹے روکنے کا پابند بناؤ، اور رمضان کے ایک مہینے میں جس طرح بعض کاموں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہو، اسی طرح سارا سال بچنے کی کوشش کرو۔ ہمارے ہاں ایک عمومی ماحول پیدا ہو گیا ہے جس میں سوشل میڈیا کا بھی بہت کردار ہے کہ کسی کام سے شرعی طور پر منع کیا جائے تو طرح طرح کے سوالات کھڑے کر دیے جاتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے، بلکہ ممنوعہ چیز کے فائدے گننا شروع کر دیتے ہیں۔ روزہ اس کا جواب دیتا ہے کہ خرابی چیز میں نہیں بلکہ حکم تبدیل ہوا ہے۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ دودھ کا جو گلاس سحری سے پہلے جائز تھا، وہ سحری کا وقت ختم ہونے پر ناجائز ہو گیا ہے۔ وہ کھانا جو افطاری کا وقت ہونے سے پہلے منع تھا، وقت ہوتے ہی جائز ہو گیا ہے۔ جبکہ کھائی جانے والی چیز بھی وہی ہے اور کھانے والا بھی وہی ہے، ان میں سے کوئی بھی نہیں بدلا، تو آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس میں کھانے والے شخص یا کھائی جانے والی چیز کا دخل نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کی وجہ سے کوئی بات جائز یا ناجائز ہوتی ہے۔ اس لیے کسی شرعی معاملہ کا ذکر کیا جائے تو ایک مسلمان کو ایسی بحث میں نہیں پڑنا چاہیے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر بلا تامل قبول کر لینا چاہیے۔

میں میڈیکل کالج کے اساتذہ اور طلبہ سے بات کر رہا ہوں اس لیے ایک اور مثال بھی آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر جب کسی مریض کو اس کی بیماری کے علاج میں دوائی دیتے ہوئے اس کی خوراک بتاتا ہے تو اس کے ساتھ کچھ چیزوں کے استعمال سے منع بھی کرتا ہے جسے پرہیز کہتے ہیں۔ آپ اپنے معالج سے بحث نہیں کرتے کہ چیزیں تو خراب نہیں ہیں پھر آپ ان سے مجھے منع کیوں کر رہے ہیں؟ جس طرح جسمانی صحت کے لیے پرہیز ضروری ہوتا ہے اسی طرح روحانی صحت کے لیے بھی پرہیز ضروری ہوتا ہے اور اسی کو تقوی کہتے ہیں۔

میں اس موقع پر طلبہ اور طالبات کے ذہنوں کو دو سوالوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان پر غور کریں۔ ایک یہ کہ آپ جب اپنی جسمانی صحت کے لیے معالج سے رجوع کرتے ہیں تو استعمال اور پرہیز کی فہرست خود نہیں بناتے بلکہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور اس بحث میں بھی نہیں پڑتے کہ وہ ان چیزوں سے کیوں منع کر رہا ہے؟ اور دوسری بات یہ کہ آپ کا معالج جب آپ کو یہ ہدایات دیتا ہے اور کچھ ایکسرسائز وغیرہ بتاتا ہے تو اس میں اس کی ذاتی پسند یا ناپسند کا دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے اس کا علم، فن، تجربہ اور علاج کا ایک پورا نظام ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ علاج کے سلسلہ میں آپ کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور آپ ڈاکٹر کی وہ بات بھی قبول کرتے ہیں جو آپ کی سمجھ میں آ رہی ہو اور وہ بات بھی جو آپ کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

اسی طرح روحانی صحت اور دینی معاملات میں بھی کوئی عالم دین مسئلہ بتائے، کسی کام کے کرنے کا کہے اور کسی کام سے منع کرے تو اس میں آپ کو کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی پسند یا ناپسند سے کچھ نہیں کہہ رہا بلکہ اس کے پیچھے اس کا علم ہے، تجربہ ہے اور ایک پورا نظام ہے جس کی بنیاد پر وہ آپ کی راہنمائی کر رہا ہے۔ اور تقوی اسی کا نام ہے کہ دین کا علم رکھنے والوں سے راہنمائی حاصل کر کے اللہ تعالی اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق زندگی گزاری جائے، اور روزہ ہمیں اسی کا سبق دیتا ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

”حجۃ اللہ البالغۃ“ پر چند تعارفی دروس

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۹ اپریل ۲۰۱۹ء)

معہد الخلیل الاسلامی بہادر آباد کراچی کے رئیس مولانا محمد الیاس مدنی کا ارشاد تھا کہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ”حجۃ اللہ البالغۃ“ پر ان کے ہاں کچھ تعارفی دروس کا اہتمام ہو جائے، ملک کے مختلف علاقوں کے دیگر متعدّد احباب کی طرف سے بھی ایک عرصہ سے یہ فرمائش جاری ہے۔ خود میرا حال یہ ہے کہ، کسی تکلف کے بغیر، خود کو اس کا پوری طرح اہل نہیں سمجھتا اور بہت سے امور میں تشنگی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن اس کی دن بدن بڑھتی ہوئی ضرورت و اہمیت کے باوجود اس سلسلہ میں ایسے عمومی دائرے میں اس کی تکمیل کا کوئی ماحول دکھائی نہیں دیتا جس سے مختلف الخیال اور متنوع ذوق رکھنے والے حضرات فائدہ اٹھا سکیں، اور چونکہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا ہی بہتر سمجھا جاتا ہے، اس لیے مولانا الیاس سے عرض کیا کہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سالانہ امتحان والا ہفتہ عام طور پر میرے پاس فراغت کا ہوتا ہے اس لیے اگر اس موقع پر کوئی صورت بن سکے تو حاضر ہوں، انہوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے ۷ سے ۱۰ اپریل تک معہد الخلیل الاسلامی میں اس ترتیب کے ساتھ دروس کا پروگرام بنا لیا کہ روزانہ ظہر سے عصر کے درمیان دو درس ہو جائیں اور آٹھ دروس میں کتاب کے مقدمہ کے علاوہ ارتفاقات اور استنباط الشرائع کے ابواب کا خلاصہ عرض کر دیا جائے۔ اس پروگرام کے لیے ۶ اپریل کو اپنے منجھلے پوتے محمد ہلال خان ناصر کے ہمراہ کراچی پہنچ گیا ہوں اور ۱۰ یا ۱۱ اپریل کو واپسی کا ارادہ ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۶ اپریل کو ملیر کے علاقہ میں حضرت مولانا قاری رفیق الخلیل شہیدؒ کے مدرسہ ”ادارۃ الفرقان“ میں حفاظ قرآن کریم کی دستار بندی کی سالانہ تقریب میں حاضری ہوئی اور حفاظ کے آخری سبق میں شرکت کے علاوہ قرآن کریم کے اعجاز پر چند گزارشات پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ادارہ کا تعلیمی ماحول و معیار اور اہل علاقہ کا ذوق دیکھ کر حضرت قاری صاحب شہیدؒ کی محنت و اسلوب اور ان کے خاندان کی طرف سے اس کے تسلسل کو جاری رکھنے کے عزم کا اندازہ ہوا اور ان سب کے لیے دل سے دعا نکلی۔

اگلے روز ۷ اپریل کو صبح گیارہ بجے نیو ناظم آباد میں مولانا قاری غلام رسول کے ادارہ جامعہ عثمان بن عفانؓ میں اسی نوعیت کی تقریب تھی جس میں حاضری دی اور حفاظ کے

آخری سبق میں شرکت کے ساتھ قرآن کریم کے اعجاز کے اس پہلو پر کچھ معروضات پیش کیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو جامع القرآن کیوں کہا جاتا ہے اور ان کے حکم پر مرتب کیا جانے والا ''مصحف عثمانی'' قرآن کریم کے حوالہ سے امت مسلمہ میں وحدت واجتماعیت کا ماحول برقرار رکھنے کا کیسے باعث بنا؟ اس کے بعد معہد الخلیل الاسلامی پہنچ گیا اور ظہر کے بعد مذکورہ دروس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولانا محمد الیاس مدنی نے اس کے لیے جس ذوق واسلوب کے ساتھ اہتمام کر رکھا ہے اس سے حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے فکر وفلسفہ کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے جو میرے جیسے ولی اللّٰہی طلبہ کے لیے یقیناً خوشی اور حوصلہ افزائی کا باعث ہے اور اس سے یہ تسلی ہوتی ہے کہ جو تھوڑا بہت کام ہم کر رہے ہیں اس کی سمت درست ہے اور اس میں پیشرفت کے مواقع اور امکانات بھی موجود ہیں۔ مولانا موصوف کا ارادہ ہے کہ وہ ان دروس کو تحریری صورت میں مرتب کرائیں گے اور طباعت و اشاعت کا اہتمام بھی کریں گے۔ میں نے ان سے یہ معلوم ہونے پر سوچا کہ چلو اس طرح ہمارا نام بھی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے باقاعدہ خوشہ چینوں میں ہو جائے گا جو یقیناً بہتر توشۂ آخرت اور باعث نجات ہوگا، اللّٰھم ربنا آمین۔

دروس کی دیگر تفصیلات تو اپنی ترتیب کے ساتھ سامنے آتی رہیں گی مگر ایک بات ابھی عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نصاب تعلیم ہمارے ہاں مروجہ تعلیم ''درس نظامی'' سے مختلف تھا۔ درس نظامی میں اس وقت زیادہ زور معقولات اور فقہ کے قانونی تناظر و ماحول پر تھا جبکہ ولی اللّٰہی نصاب میں منقولات اور قرآن و حدیث کی عمومی تدریس کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دینی تعلیم کے نئے نظام و نصاب میں دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں جو نصائب رائج کیا گیا وہ کہلاتا تو ''درس نظامی'' ہی ہے مگر یہ دراصل درس نظامی اور ولی اللّٰہی نصاب کا امتزاج ہے اور دونوں کو ملا کر اس دور کی ضروریات کے پیش نظر ایک نیا اور مشترکہ نصاب مرتب کیا گیا تھا جو اب تک چلا آرہا ہے۔ اس پر عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''معقولات'' کو نصاب سے خارج کر دیا تھا اور اپنے تعلیمی نظام کی بنیاد صرف منقولات پر رکھی تھی۔ تاریخ کے طالب علم کے طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے اور میری گزارش یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''معقولات'' کو خارج کر دینے کی بجائے دینی تعلیم و

تربیت کے ماحول کا رخ ''معقولات قدیمہ'' کی بجائے ''معقولات جدیدہ'' کی طرف موڑ دیا تھا۔ ہمارے ہاں معقولات کا روایتی دائرہ یونانی فلسفہ و منطق کے تناظر میں ہے جس کا دور یورپ میں فکری انقلاب اور سائنسی ارتقا کے ساتھ ختم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ سماجیات اور عمرانیات کے فلسفہ نے لے لی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس تبدیلی کو بروقت محسوس کیا اور سماجی ضروریات و نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کا نیا اسلوب اختیار کیا جو دینی تعلیم کو معقولات جدیدہ کے دائرہ میں لانے کا انقلابی قدم تھا اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اسی فکر و فلسفہ کا شاہکار ہے۔

دروس سے ہٹ کر نجی ملاقاتوں میں بعض دوستوں کے سوال پر میں نے عرض کیا کہ میرے تعلیمی ذوق میں عام طور پر تین امور روایتی ماحول سے مختلف دکھائی دیتے ہیں جن کی طرف دوستوں کو مسلسل توجہ دلاتا رہتا ہوں۔

1. حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفہ کا آج کی انسانی سماجیات کے تناظر میں تعارف۔

2. مروجہ عالمی اور ملکی قوانین کے ساتھ احکام القرآن کا تقابلی مطالعہ۔

3. اور موجودہ بین الاقوامی معاہدات سے آگاہی اور ان کے دائرہ میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کا جائزہ۔

میری تمام تر تعلیمی، تدریسی اور فکری سعی و کاوش کی جولانگاہ یہی تین دائرے ہیں اور اسی پر آخری دم تک قائم رہنے کا عزم و ارادہ رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبولیت و استقامت سے نوازیں، آمین۔ بعض دوستوں کے استفسار پر انہیں بتایا کہ مروجہ بین الاقوامی قوانین کے ساتھ احکام القرآن کا تقابلی مطالعہ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں سالانہ دورۂ تفسیر قرآن کریم میں میری معروضات کا بنیادی موضوع ہوتا ہے جو اس سال ۱۴ اپریل سے شروع ہو کر ۳ مئی تک جاری رہے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیلات الشریعہ اکادمی کے ناظم مفتی محمد عثمان جتوئی (03015797737) سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

۲۰۱۸ء

ریاستِ مدینہ کیسے وجود میں آئی؟

(جامعہ انوار القرآن، آدم ٹاؤن، نارتھ کراچی - ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۸ء)

جامعہ انوار القرآن کراچی میں اکتوبر ۲۰۱۸ء کے دوران ’’ریاست مدینہ‘‘ کے موضوع پر منعقد ہونے والے کورس کی ایک نشست میں گفتگو کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سوسائٹی میں جو تبدیلیاں کی تھیں ان میں سب سے پہلی اصلاح یہ ہے کہ عربوں کو ریاست کا تصور دیا۔ نبی کریمؐ کے یثرب پہنچتے ہی پہلے سال کے اندر ریاست بن گئی، حضورؐ کو اس کا سربراہ تسلیم کیا گیا اور ’’میثاق مدینہ‘‘ کے نام سے ایک دستور طے ہو گیا۔ میثاق مدینہ میں جناب نبی کریمؐ، مہاجرین، انصار کے دونوں قبیلے بنو اوس اور بنو خزرج، یہود کے تینوں قبیلے بنو قینقاع، بنو قریظہ اور بنو نضیر کے علاوہ اردگرد کے دیگر قبائل بھی شامل تھے۔

مدینہ منورہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے یثرب کہلاتا تھا۔ قرآن کریم میں یثرب کا نام مذکور ہے ’’یا اھل یثرب لا مقام لکم فارجعوا‘‘ لیکن جناب نبی کریمؐ نے اس کا نام تبدیل کر دیا۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، کہتے ہیں کہ آج جو مسجد نبویؐ ہے پرانا یثرب سب اس کی حدود کے اندر تھا۔ مدینہ منورہ کا سرکاری نام ’’مدینتہ الرسول‘‘ ہے یعنی رسول اللہؐ کا شہر۔ جب ریاست قائم ہوئی تو اس وقت یہ یثرب، قبا اور اردگرد کی چند بستیوں پر مشتمل تھی جسے بخاری شریف کی روایت میں ’’بحیرہ‘‘ کہا گیا ہے یعنی ساحلی پٹی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور وصال کے درمیان دس سال کا عرصہ ہے

کہ گیارہ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا۔ اس دس سال کے عرصہ میں یمن، بحرین، نجران اور نجد سمیت پورا جزیرۃ العرب ریاست مدینہ میں شامل ہو چکا تھا۔

اس سلسلہ میں تاریخ کا ایک اہم سوال ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بچتے بچاتے اور چھپتے چھپاتے یثرب جا رہے تھے، جاتے ہی حکومت کیسے بن گئی؟ آپؐ تو مہاجر تھے، آج کی زبان میں پناہ گزین۔ یثرب میں بڑے بڑے قبائل تھے، اوس اور خزرج جیسے طاقتور قبائل کے علاوہ یہود کے قبائل بھی تھے اور دیگر بہت سے قبائل تھے۔ آپؐ کے یثرب جاتے ہی مہاجروں کی حکومت کیسے بن گئی اور تسلیم کیسے ہو گئی؟ یہ امر واقعہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یثرب جاتے ہی پہلے سال کے اندر ریاست بن گئی، حضورؐ کو اس کا سربراہ تسلیم کیا گیا اور ''میثاق مدینہ'' کے نام سے ایک دستور طے ہو گیا۔ میثاق مدینہ میں دو مسلمان قبائل تھے اوس اور خزرج، ان کے علاوہ یہودی تینوں قبیلے بنو قینقاع، بنو قریظہ اور بنو نضیر اس کا حصہ تھے جبکہ اردگرد کے دیگر قبائل بھی اس میں شامل تھے۔ اس معاہدے کی رو سے سب کے آپس میں معاملات طے ہوئے تھے کہ آپ یہ کام کریں گے ہم یہ کریں گے، آپ کے یہ حقوق ہوں گے ہمارے یہ ہوں گے، آپ کی یہ ذمہ داری ہو گی ہماری یہ ہو گی، جیسے کہ دستور میں ہوتا ہے۔ اس کا تھوڑا سا پس منظر معلوم کر لیتے ہیں۔

عربوں کا مجموعی ماحول یہ تھا کہ باضابطہ حکومتیں نہیں ہوتی تھیں۔ جزیرۃ العرب میں قبائل کا نظام تھا اور کسی مرکزی حکومت کا وجود نہیں تھا۔ مکہ میں قریش تھے، طائف میں بنو ثقیف تھے، یثرب میں بنو اوس اور بنو خزرج کے ساتھ یہودی قبائل تھے، ایک علاقے میں بنو غسان تھے، ایک علاقے میں بنو حمیر تھے۔ اوس اور خزرج تو حضور علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، لیکن جو ایمان نہیں لائے تھے انہوں نے بھی آپؐ کو حکمران تسلیم کر لیا تھا۔ اردگرد کے یہودی قبائل سمیت میثاق مدینہ میں جتنے قبائل شامل تھے سب نے آنحضرتؐ کو سربراہ ریاست تسلیم کیا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ سو دو سو آدمی ہجرت کر کے آئیں اور پورے علاقے میں حکومت قائم کر لیں۔ اس کے دو پس منظر بیان کیے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ یثرب میں ایک مشترکہ حکومت کا تصور جناب نبی اکرمؐ کی تشریف آوری سے قبل قائم ہو گیا تھا اور اس میں پیشرفت ہو رہی تھی۔ بخاری شریف کی ایک تفصیلی روایت

ہے جو اس حوالے سے تاریخی پس منظر بیان کرتی ہے۔ یہ ہجرت کے بعد اور غزوۂ بدر سے پہلے کی بات ہے کہ بنو خزرج کے سردار سعد بن عبادہؓ ایک دفعہ بیمار ہو گئے۔ دو بڑے قبیلے تھے خزرج اور اوس۔ خزرج کے سردار سعد بن عبادہؓ جبکہ اوس کے سردار سعد بن معاذؓ تھے۔ سعد بن عبادہؓ بیمار ہوئے، کچھ فاصلے پر رہتے تھے، نبی کریمؐ بیمار پرسی کے لیے جا رہے تھے، راستے میں کوئی مجلس تھی جس میں عبد اللہ بن ابی بھی موجود تھا۔ بنو خزرج سے اس کا تعلق تھا اور اس نے ظاہرا ابھی کلمہ نہیں پڑھا تھا۔ مجلس میں یہودی بھی تھے، مسلمان بھی تھے، مشترک مجلس تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جہاں کہیں بات کہنے کا موقع ملتا تھا اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ حضورؐ مجلس کے پاس کھڑے ہوئے، سلام کہا اور اپنی دعوت اور نصیحت کی بات شروع کی۔ عبد اللہ بن ابی بیٹھا ہوا تھا، اس نے ناک پر رومال رکھا اور کراہت سے کہا کہ غبار کیوں اٹھا رہے ہو، ذرا ادھر ہو کر بات کرو۔ آنحضرتؐ خچر پر آئے تھے۔ پھر اس نے کہا کہ یہاں ایسی بات کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ ہمیں کیوں تنگ کرتے ہو؟ اپنے گھر میں بیٹھو، جو وہاں آئے اس کو سناؤ۔ اس طرح کے لہجے میں اس نے بات کی۔ مجلس میں بعض صحابہ کرامؓ بیٹھے تھے، ان میں عبد اللہ بن رواحہؓ بھی تھے ان کو غصہ آگیا، وہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ تم کون ہو روکنے والے؟ ہمارے رسولؐ ہیں آئیں گے اور بات کریں گے، ہم سنیں گے۔ یا رسول اللہؐ آپ ارشاد فرمائیے، میں دیکھتا ہوں کیسے روکتا ہے یہ۔ بات ایسی بڑھی کہ دونوں طرف سے لوگ گتھم گتھا ہونے لگے۔ حضورؐ نے مشکل سے دونوں طرف کے لوگوں کو روکا کہ بات سنو نہ سنو آپس میں لڑو تو نہیں۔

اس کے بعد آنحضرتؐ جب سعد بن عبادہؓ کے ہاں پہنچے تو حال احوال پوچھنے کے بعد آپ نے انہیں اس واقعہ کے بارے میں بتایا کہ ابوحباب نے یہ کام کیا ہے۔ عبد اللہ بن ابی کی کنیت ابوحباب تھی۔ سعد بن عبادہؓ نے جواب میں جو بات کہی اس نے ایک تاریخی حقیقت کھول دی۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ ایسا ہی ہے، لیکن آپ کو تو معلوم ہے اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ آپ کی ہجرت اور تشریف آوری سے پہلے ”اتفق اھل ھذہ البحیرہ“ اس ساحلی پٹی کے رہنے والوں نے ایک حکومت اور ریاست قائم کرنے پر اتفاق کر لیا تھا اور حکمران کے طور پر عبد اللہ بن ابی کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ لوگ تیاری کر رہے تھے کہ ”یعصبونہ اور یتوجونہ“ کہ اس کی تاجپوشی یا دستار بندی کر دیں، آپؐ کے آنے سے

اس کا سارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ گویا آج کل کی اصطلاح میں انتخاب ہو گیا تھا صرف حلف اٹھانا رہ گیا تھا۔ سعد بن عبادہؓ نے کہا کہ آپ کے آنے سے اس کی حکمرانی چلی گئی ہے بس اسی کا غصہ نکال رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد پھر عبد اللہ بن ابی ساری زندگی غصہ ہی نکالتا رہا، کلمہ پڑھنے سے پہلے بھی اور کلمہ پڑھنے کے بعد بھی۔ اصل غصہ یہ تھا۔ چنانچہ ایک پس منظر یہ ہے کہ اس علاقے میں ریاست اور حکومت کے قیام کا تصور بلکہ ایک حد تک پیشرفت پہلے سے موجود تھی۔

دوسرا پس منظر یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے دو تین سال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف قبائل سے مذاکرات چلتے رہے۔ حضورؐ مکہ چھوڑنا چاہتے تھے لیکن ایسے ٹھکانے کی تلاش میں تھے جہاں جا کر ریاست قائم کر سکیں۔ ادھر یثرب کی صورتحال یہ تھی کہ بنو اوس اور بنو خزرج کی آپس میں لڑائیاں چلتی رہتی تھیں۔ یہاں کے بڑے قبیلے یہی دونوں تھے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ حرب بعاث ان کے ہاں چلی، تین چار نسلیں آپس میں لڑتی رہیں اور بے شمار لوگ دونوں طرف سے قتل ہوئے۔ دونوں قبیلوں کے سنجیدہ لوگ اس لڑائی سے تنگ آ گئے تھے۔ جبکہ یہودی درمیان میں ان کی لڑائی کو ہوا دیتے رہتے تھے، کبھی اس کو اسلحہ بیچتے اور کبھی اس کو۔ اب جن دو قبیلوں کے درمیان کئی پشتوں سے لڑائیاں چل رہی ہوں اور قتل و قتال کا وسیع سلسلہ ہو ان کا آپس میں ایک دوسرے پر متفق ہونا تو ناممکن ہی تھا جبکہ یہودیوں سے یہ دونوں تنگ تھے۔ یہ لوگ تلاش میں تھے کہ کوئی ایسی شخصیت ہمیں ملے جس پر ہم اکٹھے ہو جائیں۔ چنانچہ دونوں طرف کے بوڑھے بوڑھے آپس میں بیٹھے اور مشورہ کیا کہ کوئی راستہ نکالتے ہیں، کوئی تیسری قوت مل جائے جو یہودیوں کی طرح سازشی نہ ہو اور ہمیں آپس میں اکٹھا کر دے۔ اس دوران ان کو معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں کوئی صاحب ہیں جو توحید اور نبوت کے اعلان کے ساتھ اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کے پانچ افراد مکہ گئے ہجرت سے تین سال پہلے۔ حج کے موقع پر منیٰ کی پہاڑیوں میں حضورؐ سے انہوں نے خفیہ ملاقات کی اور آپؐ کی باتیں سنیں۔ پھر آپس میں مشورہ کیا کہ یہ صاحب تو ہمارے کام کے ہیں، بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں اور یہ اس علاقے میں تنگ بھی ہیں، ہمیں ایسی ہی شخصیت کی ضرورت ہے جبکہ ان کو ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ ان میں اسعد بن زرارہؓ تھے، عبادہ بن صامتؓ تھے، جو بڑے صحابہ کرامؓ میں سے ہیں۔ انہوں نے کلمہ پڑھا، مسلمان ہوئے اور حضورؐ کو دعوت

دی کہ یا رسول اللہ! آپ ہمارے پاس یثرب آجائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کے انتظار میں ہوں کہ میری ہجرت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے گا، اگلے سال بات کریں گے۔

اگلے سال یثرب سے بارہ آدمی حضورؐ کی خدمت میں مکہ مکرمہ آئے۔ اس سال ''بیعت عقبہ اولیٰ'' ہوئی۔ لیکن پھر بھی حضورؐ نے یثرب جانے کے لیے ہاں نہیں کی۔ یہ سب لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے بھی حضورؐ کو دعوت دی کہ یا رسول اللہ! آپ ہمارے پاس یثرب آجائیں ہم آپ کے معاون ہوں گے۔ آپؐ نے فرمایا، اگلے سال بات کریں گے۔ اگلے سال پھر یثرب سے ستر آدمی آئے۔ ان ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

حضرت عباسؓ حضورؐ کے چچا تھا۔ چچا اور بھتیجا ہم عمر ہوں تو دوست بھی ہوتے ہیں۔ دو سال کا فرق تھا دونوں میں۔ حضرت عباسؓ سے کوئی پوچھتا تھا کہ آپ بڑے ہیں یا حضرت محمدؐ؟ تو کہا کرتے تھے کہ بڑے وہ ہیں لیکن پیدا میں پہلے ہوا تھا۔ حضرت عباسؓ نے کلمہ تو فتح مکہ کے موقع پر پڑھا تھا جبکہ یہ اس سے دس سال پہلے کی بات ہے۔ ان خفیہ مذاکرات میں ایک موقع پر وہ حضورؐ کے ساتھ تھے، اپنے بھتیجے کے ساتھ تھے، پیغمبر کے ساتھ نہیں۔ بیعت کے موقع پر اوس کے سردار سعد بن معاذؓ نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ ہمارے پاس تشریف لے آئیں۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ سوچ کر بات کرو کیا کہہ رہے ہو؟ میرے بھتیجے کو اپنے ہاں لے جانے کا مطلب سمجھتے ہو؟ پورے جزیرۃ العرب سے لڑنا پڑے گا۔ اگر پاؤں میں زور ہے تو بات کرو ورنہ آرام سے بیٹھو۔ اس کی حفاظت کے لیے ہم کافی ہیں، کلمہ پڑھیں نہ پڑھیں لیکن حفاظت کر رہے ہیں۔ جبکہ بنو ہاشم نے آپؐ کی حفاظت کی، جناب ابی طالب نے بھی کی اور جناب عباسؓ نے بھی کی۔ اس پر سعد بن معاذؓ نے کہا کہ ہمیں پوری طرح پتہ ہے کہ کیا ہو گا؟ سوچ سمجھ کر اور ہر قسم کے نتیجے کے لیے تیار ہو کر ہم آپؐ کو دعوت دے رہے ہیں۔ اسعد بن زرارہؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم ایمان لائے ہیں، آپؐ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، ہمیں پتہ ہے کہ حضرت محمدؐ کو وہاں جگہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ عرب کے ہر گھر سے لڑنا ہو گا، ہم اس کے لیے تیار ہیں۔

چنانچہ اس ریاست کے قیام کے لیے تین سال مسلسل مذاکرات ہوئے اور جناب نبی اکرمؐ نے دوسرے سال بارہ نقیب مقرر کر دیے یہ فرما کر کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

بارہ نقیب تھے ”اثناعشرہ نقیبا“ میں بھی تم میں بارہ نمائندے مقرر کرتا ہوں، جاکر علاقے میں کام کرو، ماحول بناؤ، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا میں آجاؤں گا۔

تاریخ کا دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ”میثاق مدینہ“ جو کہ ریاست کے قیام اور حکومت سازی کا معاہدہ تھا، کیا اس میں صرف مسلمان تھے یا غیر مسلم بھی شامل تھے؟ تین قبیلے تو یہودیوں کے تھے اور اردگرد کے دیگر غیر مسلم قبائل بھی تھے۔ اس معاہدے میں شامل فریق مسلمان بھی تھے، یہودی بھی تھے اور مشرکین بھی۔ اس کے ساتھ ایک سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ کیا حضورؐ نے یثرب پر قبضہ کر کے ریاست قائم کی تھی؟ حضورؐ نے قبضہ کر کے ریاست قائم نہیں کی تھی بلکہ وہاں کے لوگوں پر تین سال محنت کر کے، وہاں کی آبادی کو اعتماد میں لے کر یہ ریاست قائم کی تھی۔ اس ریاست کے قیام کی محنت میں ایک لڑائی بھی نہیں ہوئی۔ باہمی ملاقاتیں اور مذاکرات ہوئے ہیں، نہ حملہ کیا اور نہ قبضہ کیا، تین سال کے مسلسل فیلڈورک کے بعد تمام لوگوں کو اعتماد میں لے کر مذاکرات کے ذریعے یہ ریاست قائم ہوئی۔

چنانچہ ریاست مدینہ کے پیچھے ایک محرک تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی جدوجہد تھی اور دوسرا یثرب کے قبائل اوس اور خزرج کی آپس کی لڑائی کا ماحول تھا۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ مجھے ہجرت کے لیے انتظار تو تھا کہ حکم آئے گا، علامتیں بھی بتادی گئی تھیں کہ کونسے علاقے میں جانا ہے لیکن متعیّن نہیں تھا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آپؐ فرماتے ہیں کہ مجھے خواب میں اپنی ہجرت کا علاقہ دکھایا گیا تھا۔ علاقے کی علامتیں یہ تھیں کہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، کھجوروں کے باغات کی کثرت، اور وقفے وقفے سے پانی کے چشمے۔ فرماتے ہیں کہ میرے خیال یہ تھا کہ یہ ہجر کا علاقہ ہوگا کہ وہ بھی اسی طرح کا ہے لیکن جب ہجرت کا حکم ہوا تو یہ یثرب کا علاقہ تھا۔

اس سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک اور روایت کا حوالہ بھی دینا چاہوں گا جس میں ام المومنین حضرت عائشہؓ نے انصار مدینہ سے فرمایا کہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے دو قبیلوں اوس اور خزرج کی باہمی جنگیں تمہارے درمیان شر کا باعث تھیں؟ نہیں بلکہ یہ تو خیر کا باعث ہوئیں کہ اس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس تشریف لائے اور مدینہ منورہ کو عرب دنیا میں مرکزیت حاصل ہوئی۔

مولانا مجاہد الحسینی کی تصنیف ”قرآنی معاشیات“

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ ستمبر ۲۰۱۸ء)

معیشت انسانی سماج کی اہم ترین ضرورت اور علم و فکر کے بنیادی موضوعات میں سے ہے جس کے بارے میں انسانی معاشرت کی راہ نمائی اور ہدایت کے لیے بارگاہ ایزدی سے نازل ہونے والی آسمانی تعلیمات میں مسلسل راہ نمائی کی گئی ہے اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ارشادات و فرمودات کا یہ اہم حصہ رہا ہے۔ قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کے ارشادات میں اس بات کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو توحید اور بندگی کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کی ہدایت فرمائی کہ ماپ تول میں کمی نہ کرو اور اشیائے صرف کے معیار کو خراب نہ کرو، کیونکہ یہ بات سوسائٹی میں فساد کا ذریعہ بنتی ہے اور اس پر اس قوم کا یہ طنز بھی قرآن کریم نے ذکر کیا ہے کہ اے شعیب! کیا تمھاری نمازیں یہ سکھاتی ہیں کہ ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی کے ساتھ تصرف نہ کریں؟ یعنی یہ تصور اس قوم میں بھی موجود تھا کہ چونکہ مال ہمارا ہے، اس لیے ہم اس میں تصرف کے لیے کسی کی اجازت کے محتاج نہیں ہیں۔ چنانچہ ”فری اکانومی“ کا آج کا مروجہ فلسفہ بھی اپنے پس منظر میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی یہ بنیاد رکھتا ہے، جبکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے ہر دور میں اپنی اپنی قوموں کو یہ بتایا ہے کہ مال و دولت اور اسباب معیشت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہیں جن میں تصرف اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہی درست ہوگا اور اس کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حساب بھی دینا ہوگا۔

قرآن کریم چونکہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری، مکمل اور جامع کتاب ہے، اس لیے اس میں معیشت کے تمام ضروری پہلوؤں کے حوالے سے ہدایات موجود ہیں۔ حکمت و فلسفہ بھی ہے، اصول و ضوابط بھی ہیں اور احکام و قوانین بھی ہیں جن کی بنیاد پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی معاشرہ کو تمام ایسی جاہلی روایات و اقدار سے پاک کیا جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اور انسانی معاشرہ میں خرابی اور فساد کا باعث تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کم و بیش ربع صدی کی محنت اور جدوجہد کے ساتھ عرب معاشرہ میں جو سماجی انقلاب بپا کیا اور جس کے مثبت ثمرات سے نسل انسانی صدیوں تک فیض یاب ہوتی رہی ہے، اس کا بڑا حصہ معاشی اصلاحات پر مشتمل ہے اور آج بھی منصف مزاج انسانی دانش ان کی ضرورت و افادیت کا اعتراف کرنے پر خود کو مجبور پاتی

ہے۔ چند سال قبل مسیحی دنیا کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا پاپائے روم پوپ بینی ڈکٹ کی قائم کردہ ایک کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ دنیا کے معاشی نظام کو توازن اور انصاف کے ٹریک پر لانے کے لیے قرآن کریم کے بیان کردہ معاشی اصولوں کو اپنانا ضروری ہو گیا ہے، جبکہ برطانیہ، فرانس اور روس جیسے ممالک میں اسلام کے معاشی اصولوں کی انسانی سماج میں واپسی کی ضرورت پر سنجیدہ علمی حلقوں میں بحث و تمحیص کا آغاز ہو چکا ہے اور غیر سودی بینکاری کا رجحان بھی عالمی سطح پر بڑھ رہا ہے۔

اس پس منظر میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ معاشی اصول و قوانین کو آج کے حالات و ضروریات کے تناظر میں از سر نو سامنے لایا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب کے دائرہ کار میں آج کا دور بھی شامل ہے اور اس کے احکام و قوانین کا اطلاق آج بھی اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ چودہ سو برس قبل ہوا تھا اور جیسا کہ قیامت تک ہوتا رہے گا۔

ہمارے مخدوم و محترم بزرگ حضرت مولانا مجاہد الحسینی دامت برکاتہم نے اسی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم کی معاشی تعلیمات کو آسان اور عام فہم انداز میں زیر نظر کتاب کی صورت مرتب کیا ہے جو علماء کرام، مدرسین، خطباء اور دینی کارکنوں کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی یکساں افادیت کی حامل ہے۔ حضرت مولانا محترم کے بارے میں اس تذکرہ کے بعد اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے ارشد تلامذہ میں سے ہے اور ان کا شمار شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری، امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اس دور کے دیگر اکابر علماء کرام کے رفقاء میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبولیت سے نوازیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

مدینہ منورہ طرز کی فلاحی ریاست

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۲ اگست ۲۰۱۸ء)

وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب عمران خان کی پہلی نشری تقریر کو ملک بھر میں پوری توجہ کے ساتھ سنا گیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری

ہے جو ظاہر ہے کہ کافی دیر تک چلتا رہے گا۔ مجھ سے بعض دوستوں نے تقریر کے بارے میں پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ تقریر کے طور پر تو بہت اچھی تقریر ہے اور جناب وزیراعظم نے اس تقریر میں جن خواہشات کا اظہار کیا ہے اگر ان کے دس فیصد پر بھی وہ عمل کر پائے تو میں اسے ان کی کامیابی سمجھوں گا۔ کیونکہ تقریریں اور بیانات تو چلتے ہی رہتے ہیں، قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے اپنے متعدّد بیانات میں کہا تھا کہ ہمارے پاس قرآن کریم کی صورت میں مکمل دستور حیات موجود ہے، وہ اگر کچھ عرصہ زندہ رہتے تو شاید اس کی کچھ جھلک ہم دیکھ بھی لیتے مگر یہ ہماری قسمت میں نہیں تھا۔ چنانچہ پاکستان کو قائم ہوئے سات عشرے گزر چکے ہیں ابھی تک ہم پارلیمنٹ، کابینہ، سیکرٹریٹ یا عدلیہ میں سے کسی جگہ بھی یہ منظر نہیں دیکھ پائے کہ کوئی اہم قومی مسئلہ پیش آنے پر قرآن کریم کھول کر یا اس کا کوئی حصہ تلاوت کر کے اس کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔ اب عمران خان صاحب نے وزارت عظمٰی کا حلف اٹھانے کے بعد بلکہ اس سے پہلے بھی متعدّد بار مدینہ منورہ اور اسلام کے حوالہ سے ''فلاحی ریاست'' کی بات کی ہے اور اس کے لیے اپنے عزم کا اظہار کیا ہے تو ہم فقیروں سے زیادہ کس کو خوشی ہو سکتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی غالب کا یہ شعر بھی بے ساختہ سامنے آجاتا ہے کہ:

ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تاہم بدگمانی کے تمام خدشات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے ہم اسے ایک مسلمان کا سچا وعدہ اور مخلصانہ عزم سمجھتے ہوئے وزیراعظم عمران خان کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں، اس امید کے ساتھ کہ وہ بھی بدگمانی کے سب خدشات کو ذہن سے نکالتے ہوئے ملک کے ایک شہری اور اسلام کے نفاذ کا جذبہ رکھنے والے کارکن کی ان باتوں پر سنجیدہ توجہ دیں گے۔

اصولی بات یہ ہے کہ فلاحی ریاست، ریاست مدینہ، اور اسلامی فلاحی ریاست کا صحیح اور مکمل مفہوم جناب عمران خان اور ان کے رفقاء کے ذہنوں میں موجود ہونا چاہیے کیونکہ کسی بھی چیز کو جانے بغیر اسے نہ پوری طرح اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے تقاضے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ جبکہ اسلامی فلاحی ریاست کا صحیح مفہوم وہی ہوگا جو ''اوریجنل سورسز'' سے اسٹڈی کیا جائے گا۔ ہماری ایک اجتماعی کمزوری یہ بھی ہے کہ اکثر جدید تعلیم یافتہ

حضرات اسلام، قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کے لٹریچر میں تلاش کرتے ہیں اور ان کے بارے میں عصری نظام کے تربیت یافتہ اکثر لوگوں کی تحقیق و ریسرچ کے ذرائع زیادہ تر مغربی دانشور ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسلام کی جو تصویر وہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اسی کو اسلام سمجھتے ہوئے ہم نہ صرف اسے پلے باندھ لیتے ہیں بلکہ اصل مآخذ اور سورسز سے اسلام کی تعلیمات کو پیش کرنے والے ارباب علم و دانش کے بارے میں مثبت احساسات و جذبات سے بھی کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اگر خان صاحب محترم ناراض نہ ہوں تو میں مثال کے طور پر عرض کرنا چاہوں گا کہ (۱) قرآن کریم (۲) جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اسوہ (۳) اور اسلامی تعلیمات و قوانین کو مغربی دانشوروں کے لٹریچر سے سمجھنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص جناب عمران خان کی شخصیت و افکار کو میاں محمد نواز شریف کے بیانات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرات اسلام کو سمجھنے کی بجائے اس کے بارے میں کنفیوژن کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر پوری قوم کو کنفیوژ کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

فلاحی ریاست اور ریاست مدینہ کے حوالہ سے میں خان صاحب سے بطور مشورہ گزارش کروں گا کہ اسے اچھی طرح سمجھے بغیر اور اس کے دائرہ کار اور حدود کار کا پوری طرح ادراک کیے بغیر وہ کوئی قدم اٹھائیں گے تو اس سے کنفیوژن میں اضافہ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس لیے پہلے خود اسٹڈی کریں، اپنی ٹیم اور رفقاء کو اس کی اسٹڈی کروائیں اور ملکی ذرائع ابلاغ کے ساتھ ساتھ ریاستی تعلیمی اداروں کو بھی اس بات کے لیے تیار کریں کہ وہ فلاحی ریاست کے اصل تصور اور ریاست مدینہ کے صحیح تعارف کا ملک میں عمومی ماحول پیدا کریں کیونکہ قیام پاکستان کا اصل مقصد یہی تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، ہمارے قومی دانشوروں میں چند اہم شخصیات نے اس پر بہت کام کر رکھا ہے جس کا بغور مطالعہ کر لینے کی ضرورت ہے، فلاحی ریاست کا مجموعی نقشہ ذہنوں میں واضح ہو جائے گا۔

1. قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس کام کے لیے اپنے وقت کے معروف نومسلم مغربی دانشور علامہ محمد اسدؒ کی خدمات حاصل کی تھیں اور انہیں حکومتی سطح پر ذمہ داریاں سونپی تھیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جتنا کام کیا ہے وہ مطلوبہ اسٹڈی کے لیے اچھی بنیاد بن سکتا ہے اور یہ کام ریکارڈ پر موجود ہے۔

2. حیدرآباد دکن کے معروف دانشور ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے اس موضوع پر خاصی محنت کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم حیدرآباد کے بھارت کے قبضہ میں چلے جانے کے بعد پاکستان اور پھر فرانس چلے گئے تھے، وہاں انہوں نے پیرس میں بیٹھ کر علمی و تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ ہزاروں فرانسیسی باشندوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا، ان کا علمی و تحقیقی کام ریاست مدینہ کو سمجھنے کے لیے بہت مفید ہے۔

3. بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے سابق سربراہ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ نے بھی اس پر وقیع کام کیا ہے، ان کی علمی تحقیقات اور کاوشوں کو اس مقصد کے لیے بہتر ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

4. کراچی یونیورسٹی کے سابق استاذ پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد نے ریاست مدینہ کو موضوع بنا کر اچھی خاصی محنت کی ہے اور ان کی معرکۃ الآرا تصنیف ''عہد نبویؐ میں ریاست کا نشو و ارتقا'' میرے خیال میں اس حوالہ سے سب سے زیادہ جامع اور مؤثر کتاب ہے۔ پانچ سو کے لگ بھگ صفحات کی یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور اسے فضلی بک (سپر مارکیٹ، اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی، فون 2629724 اور 2212991) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں وزیر اعظم عمران خان صاحب کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ وہ اس کتاب کا اولین فرصت میں خود مطالعہ کریں، اپنی کابینہ کے ارکان کو پڑھائیں اور اسے ارکان پارلیمنٹ میں تقسیم کرانے کا اہتمام کریں تاکہ مدینہ طرز کی فلاحی ریاست کے مبارک عزم کی تکمیل کے لیے وہ اپنی محنت کو صحیح رخ پر آگے بڑھا سکیں۔

عوامی نمائندگی اور سیرتِ طیبہؐ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۵ جولائی ۲۰۱۸ء)

انتخابات کے موقع پر عام طور پر یہ سوال زیر بحث آجاتا ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے اس پر اظہار خیال کا سلسلہ بھی چلتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں عوام کی رائے اور ان کے نمائندوں کے چناؤ کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

تعلیمات میں اس سلسلہ میں کوئی راہنمائی ملتی ہے؟ آج اس حوالہ سے کچھ گزارش کرنے کا ارادہ ہے۔

یہ بات تو معروف و مسلم ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جن معاملات میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی ان میں لوگوں سے مشورہ کر کے فیصلے کرتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں سیرت النبیؐ کے واقعات میں موجود ہیں جن میں سے دو کا ذکر کروں گا۔ ایک یہ کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آنحضرتؐ نے فیصلہ اپنے ساتھیوں کے مشورہ کے ساتھ کیا اور دوسرا یہ کہ غزوہ احد میں مدینہ منورہ کے اندر رہ کر دفاعی جنگ لڑنے کی بجائے باہر جا کر کھلے میدان میں لڑنے کا فیصلہ بھی عوامی مشاورت سے کیا گیا اور اس موقع پر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مجلس کی عمومی رائے خود حضورؐ کی ذاتی رائے سے ہم آہنگ نہیں تھی مگر آپؐ نے اپنی رائے ترک کر کے ساتھیوں کی رائے پر فیصلہ کیا۔

غیر منصوص مسائل میں عمومی مشاورت کا یہ حکم قرآن کریم میں موجود ہے۔ ایک جگہ مسلم سوسائٹی کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ ”وامرھم شوریٰ بینھم“ ان کے معاملات باہمی مشاورت کے ساتھ طے ہوتے ہیں۔ اور دوسرے مقام پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ ”وشاورھم فی الامر“ آپ اپنے ساتھیوں کو مشورہ میں شریک کیا کریں۔ جبکہ اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نبی کریمؐ کے دور میں ایسی کسی مشاورت میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ ایسے موقع پر کچھ مخصوص لوگوں کو مشورہ کے لیے الگ کیا گیا ہو بلکہ جو لوگ بھی اس موقع پر موجود تھے وہ اس میں شریک ہوئے ہیں۔ مگر دو مواقع ایسے ہیں کہ جن لوگوں سے مشاورت مقصود ہے یا انہیں اعتماد میں لینا ضروری سمجھا گیا ان کی کثرت کی وجہ سے سب کو شریک کرنا مشکل دکھائی دیا تو اس عمومی مشاورت میں نمائندوں کو ذریعہ بنایا گیا۔

ایک موقع تو ہجرت کا ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے انصار مدینہ کے دونوں قبیلوں بنو اوس اور بنو خزرج سے ہجرت اور اس کے بعد کے معاملات کے تعین کے لیے کم و بیش دو سال تک ان سے مذاکرات کیے جو بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے عنوان سے تاریخ میں مذکور ہیں۔ جبکہ ان قبائل سے عمومی بات چیت کے لیے آنحضرتؐ نے بارہ نقیب مقرر کیے جنہوں نے اپنے قبائل اور حضورؐ کے درمیان نمائندوں کی حیثیت سے کام کیا اور ہجرت سے قبل یثرب کے عمومی ماحول کو آپؐ کی تشریف آوری کے لیے ہموار کیا۔

بلکہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس اور خزرج کے سرداروں سے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کے لیے بارہ نقیب مقرر کیے تھے جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اسی طرح میں بھی تم پر بارہ نقیب مقرر کر رہا ہوں۔ چنانچہ ان بارہ نقیبوں نے مسلسل دو سال تک علاقہ میں وہ محنت کی جس کے نتیجے میں جناب نبی اکرمؐ کے آتے ہی ”ریاست مدینہ“ قائم ہوئی اور آپؐ کو اس کا حاکم اعلی تسلیم کر لیا گیا۔

دوسرا واقعہ غزوہ حنین کے بعد کا ہے کہ حنین کی جنگ میں بنو ہوازن کو شکست ہوئی اور ان کے بہت سے افراد اور اموال مسلمان فاتحین کے قبضہ میں آئے جنہیں بطور غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے آنحضرتؐ نے کافی دن انتظار کیا کہ شاید بنو ہوازن آکر اسلام قبول کر لیں تو ان کے اموال اور قیدی انہیں واپس کر دیے جائیں۔ مگر بہت دنوں تک انتظار کے بعد بھی جب وہ نہیں آئے تو نبی کریمؐ نے اموال اور قیدی دونوں مجاہدین میں تقسیم کر دیے۔ لیکن جب یہ ہو چکا تو بنو ہوازن کا وفد حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرمائش کی کہ ہمارے اموال اور قیدی ہمیں واپس کر دیے جائیں جس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں بہت دنوں تک تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں اور اب وہ سب کچھ تقسیم کر چکا ہوں جس کے بعد واپسی کا اختیار میرے پاس نہیں رہا۔ البتہ اگر تم اموال یا قیدیوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو تو میں اس کے لیے لشکر کے لوگوں سے بات کر سکتا ہوں۔ بنو ہوازن کے وفد نے کہا کہ اگر یہ صورتحال ہے تو ہم اموال چھوڑ دیتے ہیں مگر ہمارے افراد جو قیدی ہیں وہ واپس کر دیے جائیں۔ اس پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لشکر کو جمع کیا جس کی تعداد اس وقت بارہ ہزار کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ آپؐ نے ان کے سامنے مسئلہ رکھا کہ میں نے قیدی واپس کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اس لیے قیدی تو واپس کر دو مگر تمہاری مرضی ہے ویسے ہی چھوڑ دو یا اس کے عوض قیدی لے کر چھوڑو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی کسی جنگ میں جو قیدی بھی آئے ان میں سے پہلے تمہیں ان قیدیوں کے عوض قیدی واپس کروں گا۔ اس پر مجمع میں سے اجتماعی آواز آئی کہ یا رسول اللہ! ہم سب بخوشی یہ قیدی واپس کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اس اجتماعی آواز سے ہمیں یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ تم میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں اس لیے اپنے اپنے خیموں میں واپس جاؤ ”حتی یرفع الینا عرفاء کم امرکم“ یہاں تک کہ تمہارے نمائندے ہمیں تمہاری رائے سے آگاہ کر دیں۔ چنانچہ اس

اجتماعی آواز پر فیصلہ کرنے کی بجائے جناب نبی اکرمؐ نے لشکر کی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعے حاصل کی اور پھر قیدیوں کی واپسی کا فیصلہ فرمایا۔

اس حوالہ سے ایک جگہ گفتگو ہوئی تو ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہجرت کے موقع پر ''نقباء'' کا تقرر تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا مگر ان ''عرفاء'' کا تقرر کون کرے گا؟ میں نے عرض کیا کہ روایت میں تو اس کا ذکر نہیں ہے مگر سادہ سی بات ہے کہ جب کسی نے میری رائے کی نمائندگی کرنی ہے تو اس کا تقرر بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔ اس لیے اجتماعی معاملات میں عوام سے براہ راست رائے لینے یا نمائندوں کے ذریعے انہیں مشاورت میں شریک کرنے کی دونوں صورتیں سیرت طیبہ سے ہمیں ملتی ہیں اور اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں۔

قرآن کریم اور سماجی تبدیلیاں

(جامع مسجد صدیقیہ، سیٹلائیٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ - ۸ جون ۲۰۱۸ء)

(سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں مولانا حافظ گلزار احمد آزاد کی زیر نگرانی رمضان المبارک کے دوران جاری محفل درس قرآن کریم میں ۲۴ رمضان المبارک کی نشست سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اس سال ہماری گفتگو کا موضوع ''قرآن کریم اور انسانی سماج'' ہے جس کے ایک حصہ پر ۲۳ رمضان المبارک کی نشست میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں کہ اس وقت کے انسانی سماج کے لیڈروں نے بجاطور پر یہ بات سمجھ لی تھی کہ قرآن کریم سماج کے پورے نظام کو تبدیل کرنے کی بات کر رہا ہے اس لیے انہوں نے ہر ممکن مزاحمت کی اور اس مزاحمت کی مختلف صورتوں اور مراحل کا ہم نے تذکرہ کیا تھا۔

آج کی گفتگو اس کے دوسرے پہلو پر ہے کہ مزاحمت کے تمام مراحل کا سامنا کرتے ہوئے قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ۲۳ برس کے عرصہ میں انسانی سماج کو جن تبدیلیوں سے متعارف کرایا وہ تبدیلیاں کیا تھیں؟ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر سب سے پہلے ''ایھا الناس'' کہتے ہوئے لوگوں کو اپنے دین کی دعوت دی تھی اور ''اقراء باسم ربک الذی خلق'' کی آواز لگائی تھی تو اس وقت کے انسانی معاشرہ کا نقشہ کچھ اور تھا، مگر اس کے صرف ربع صدی بعد

حجۃ الوداع کے موقع پر ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ مسلمانوں کو گواہ بنا کر اپنا ایجنڈا مکمل کر لینے کا اعلان کیا تھا تو سماج اور معاشرہ اس سے بالکل مختلف شکل اختیار کر چکا تھا۔ اور پھر اس سماجی انقلاب نے ایک صدی کے دوران ہی دنیا کے تین براعظموں تک اپنا دائرہ وسیع کر لیا تھا۔ وہ سماجی تغیرات اور معاشرتی تبدیلیاں کیا تھیں، ان پر گفتگو بہت زیادہ وقت اور تفصیل کا تقاضا کرتی ہے جس کی یہ مختصر نشست متحمل نہیں ہے اس لیے معاشرتی زندگی میں اس حوالہ سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مختصراً صرف اس طور پر ہی تذکرہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے چند اہم دائروں میں رونما ہونے والی بڑی تبدیلیوں میں سے چند کا ذکر کر دیا جائے۔ چنانچہ صرف تعارفی انداز میں ایک فہرست کی صورت میں ان تغیرات کا ذکر کروں گا جن سے قرآن کریم کے نزول اور جناب نبی کریمؐ کی بعثت کے بعد انسانی معاشرہ روشناس ہوا۔

• ان میں سے پہلا دائرہ عقیدہ کا ہے کہ جناب رسول اللہ کی بعثت مبارکہ کے وقت ہر طرف شرک اور بت پرستی کا دور دورہ تھا، ہر قبیلے نے اپنے معبود الگ تراش رکھے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے گھر خانہ کعبہ کے ماحول میں بھی سینکڑوں بتوں کی پوجا کی جاتی تھی جبکہ بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر لوگ غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے اور انہیں اپنا مشکل کشا اور حاجت روا کہہ کر پکارتے تھے۔ جناب نبی اکرمؐ نے بت پرستی اور شرک کے اس ہمہ گیر ماحول کو مسلسل محنت اور جدوجہد کے ذریعے ختم کیا کہ آپؐ کے وصال کے وقت پورے جزیرۃ العرب میں نہ کوئی بت خانہ قائم رہا تھا، نہ کوئی بت موجود تھا اور نہ ہی بت پرستی اور شرک کا ماحول کسی طرف دکھائی دے رہا تھا۔

• دوسرا بڑا دائرہ معاشرتی اور خاندانی زندگی کا تھا جس کے تغیرات اور تبدیلیوں کی نوعیت کچھ اس طرح تھی کہ: زندہ درگور کی جانے والی بچی کو زندگی کا حق مل گیا، عورت کا زندگی کا حق تسلیم کیا گیا اور عورت کو زندگی کے حق سے محروم کر دینے کی معاشرتی روایت کا خاتمہ ہو گیا۔ عورت کو وراثت کا حق مل گیا اور اس کی مالی خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔ عورت کو رائے کا حق اور اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ باقاعدہ زندگی بھر کے لیے نکاح کے سوا مرد و عورت کے جنسی تعلق کی وہ تمام صورتیں ممنوع قرار دے دی گئی تھیں جو اس معاشرہ میں جنسی تعلق کی جائز صورتیں سمجھی جاتی تھیں۔ زنا کو نسب

کا سبب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا اور زنا کی سنگین سزا مقرر کی گئی۔ تین سے زیادہ طلاقوں کا حق ختم کر دیا گیا اور مسلسل (مرحلہ وار) طلاقیں دیتے ہوئے عورت کو معلق رکھنے کی مکروہ معاشرتی روایات کا خاتمہ کر دیا گیا۔ چار سے زائد شادیوں کی ممانعت کر دی گئی اور جن لوگوں نے اس سے زیادہ شادیاں کر رکھی تھیں ان کی چار سے زائد بیویوں کو ان سے الگ کر دیا گیا۔ لوگ بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم اٹھا کر اسے لمبے عرصے تک لٹکائے رکھتے تھے، قرآن کریم نے حکم دیا کہ ایسی قسم اٹھانے والے خاوند اگر چار ماہ کے اندر رجوع نہیں کریں گے تو نکاح ختم ہو جائے گا۔ لوگ بیوی کو ماں بہن کہہ کر حرام کر لیتے تھے، قرآن کریم نے کہا کہ زبان کے ساتھ کہہ دینے سے کوئی عورت ماں یا بہن نہیں بنتی، البتہ اس قبیح حرکت کا کفارہ دینا ہوگا۔ منہ بولے بیٹے اور دیگر زبانی رشتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اس طرح خاندانی نظام میں جو تبدیلیاں قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ نے کیں ان کی فہرست بہت طویل ہے جن میں سے چند ایک کا میں نے تذکرہ کیا ہے جن کی وجہ سے خاندانی نظام کا پورا ڈھانچہ تبدیل ہو چکا تھا۔

• تجارت و معیشت کے دائرہ میں سود، سٹہ اور جوئے کو ممنوع قرار دیا گیا۔ بیچی جانے والی چیز اور اس کی قیمت کے واضح تعین کے بغیر تمام مبہم سودے ناجائز قرار پائے، معیشت و تجارت کے تمام شعبوں میں حلال و حرام کے واضح اصول اور احکام طے کر دیے گئے اور تجارت کا ایک صاف ستھرا نظام متعارف ہوا۔ رشوت، چوری، ڈکیتی، فریب کاری اور غصب و جبر کے ذریعے حاصل کی جانے والی دولت کو حرام قرار دیا گیا۔ بیت المال کی صورت میں فلاحی ریاست "ویلفیئر اسٹیٹ" کو متعارف کرایا گیا اور ریاست و حکومت کو شہریوں کی ضروریات کا کفیل اور ذمہ دار قرار دیا گیا جس سے خاندانی نظام کی طرح تجارتی اور معاشی نظام مکمل طور پر تبدیل ہو گیا۔

• سیاسی حوالہ سے اتنی بڑی تبدیلی ہوئی کہ اس نے نہ صرف جزیرۃ العرب بلکہ پوری دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اس خطہ کے لوگ قبائلی سسٹم کے طور پر زندگی بسر کر رہے تھے اور ریاست و حکومت کے تصور سے ناآشنا تھے۔ جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ریاست مدینہ'' قائم کر کے حکومت و ریاست کا سسٹم متعارف کرایا جو ابتدا میں مدینہ منورہ اور ارد گرد کے محدود علاقہ میں تھا لیکن اس نے صرف دس سال کے عرصہ میں پورے جزیرۃ العرب کو حصار میں لے لیا۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے وصال تک یمن، بحرین اور نجران بھی اس ریاست و حکومت کا حصہ بن چکے تھے۔ جبکہ اسی ریاست و حکومت نے حضرت ابوبکرؓ کے دور میں ''خلافت'' کا عنوان اختیار کیا اور وہ صرف ایک صدی کے دوران دنیا کے تین براعظموں تک پھیل گئی، اس طرح ریاست و حکومت کے تصور سے ناواقف لوگ ''عالمی حکومت'' کے نظام اور انٹرنیشنل سسٹم سے متعارف ہوئے۔ جناب رسول اکرمؐ نے نہ صرف ریاست و حکومت کا تصور دیا اور اسے عملاً قائم کر کے دکھایا بلکہ اس کی نظریاتی بنیادیں بھی متعیّن کر دیں۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے دس سالہ دور حکومت میں قرآن کریم اور وحی الٰہی کو تمام تر فیصلوں کی بنیاد بنایا اور آپؐ کے جانشین حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کی بنیاد قرآن و سنت کو قرار دیتے ہوئے اپنے پہلے خطبہ میں واضح اعلان کر دیا کہ وہ حکومت کا نظام قرآن و سنت کے دائرہ میں چلانے کے پابند ہیں اور قرآن و سنت سے خدانخواستہ انحراف کی صورت میں ملک کے شہریوں پر ان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ گویا حکومت اور شہریوں کے درمیان تعلق اور وفاداری کی اساس ہی قرآن و سنت قرار پائی اور اس طرح ایک نظریاتی حکومت و ریاست دنیا کے سامنے آئی۔

یہ صرف چند معاشرتی دائروں کی کچھ سماجی تبدیلیوں اور معاشرتی تغیرات کا میں نے ذکر کیا ہے۔ جبکہ اس سماجی انقلاب نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں اور سطحوں کو مکمل انقلاب سے دوچار کر دیا تھا اور تاریخ کے پاس اسے اسلام کا اعجاز اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ قرآن کریم نے صرف ربع صدی کے عرصہ میں انسانی سماج کے ایک بڑے حصے کو ہمہ گیر انقلاب سے عملاً روشناس کرایا جو تھوڑے ہی عرصہ میں عالمی نظام کی صورت اختیار کر گیا اور پھر اس نے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک نسل انسانی کے ایک بڑے حصے پر حکمرانی کی۔ یہ ہمارے جامعات اور دینی مراکز و مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نبویؐ انقلاب کو تحقیق و ریسرچ کا موضوع بنائیں

اور اس کے سینکڑوں تاریخی اور سماجی پہلوؤں کو پوری دنیا کے سامنے اجاگر کریں اور خاص طور پر مسلمانوں کی نئی نسل کو اس سے متعارف کرائیں۔

گفتگو کے آخر میں اس بات پر غور و فکر کی دعوت دینا چاہوں گا کہ آج ہم دنیا بھر کے مسلمانوں کو جائزہ لینا چاہیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ جناب نبی کریمؐ نے جب صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر اپنے مشن کا آغاز کیا تھا اور جب آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنی جدوجہد کے کامیاب ہو جانے کا اعلان فرمایا تھا۔ ہم ان دونوں میں سے کس مقام پر کھڑے ہیں؟ یہ سوال میرے لیے، آپ کے لیے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ہے۔ اور اگر یہ بات ہماری سمجھ میں آجائے کہ ہم اس وقت حجۃ الوداع کے ماحول میں تو بہر حال نہیں ہیں بلکہ صفا پہاڑی کے اعلان والے ماحول سے زیادہ قریب ہیں تو پھر قرآن کریم کا پیغام آج ہمارے لیے یہی ہے کہ ہم اس سماجی انقلاب کے لیے پھر سے محنت کریں جو ہمیں اس معاشرتی ماحول سے دوبارہ روشناس کرا دے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم ہاتھ میں لے کر ربع صدی کی محنت سے قائم کیا تھا۔ یہی قرآن کریم کا پیغام ہے اور یہی جناب رسول اکرمؐ کی سنت و اسوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ بات سمجھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

قرآن کریم کا ایجنڈا اور سماج کی مزاحمت

(مسجد ختم نبوت، ابوبکر ٹاؤن، سیالکوٹ روڈ، گوجرانوالہ - ۱۸ مئی ۲۰۱۸ء)

جمعیت علماء اسلام (س) ضلع گوجرانوالہ کے امیر مولانا حافظ گلزار احمد آزاد سیشن کورٹ گوجرانوالہ کے سامنے ابوبکر ٹاؤن کی مسجد ختم نبوت کے خطیب ہیں اور ہر سال رمضان المبارک کے دوران قریب ہی ایک دوست کے مکان میں روزانہ صبح نماز فجر کے نصف گھنٹہ بعد قرآن کریم کے درس کا اہتمام کرتے ہیں جس میں مختلف علماء کرام متنوع موضوعات پر قرآن کریم کا درس دیتے ہیں اور علاقہ بھر سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوتی ہے۔ اس سال تین رمضان المبارک کو مجھے درس کے لیے کہا گیا تو میں نے "قرآن کریم کا ایجنڈا اور انسانی سماج" کے موضوع پر کچھ گزارشات پیش کیں جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ قرآن کریم کے نزول کا بڑا مقصد انسانی سماج کی تبدیلی تھا اور اس نے تئیس سال کے مختصر سے عرصہ میں جزیرۃ العرب کے سماج کو یکسر تبدیل کر کے دنیا کو آسمانی

تعلیمات و ہدایات پر مبنی ایک مثالی معاشرہ کا عملی نمونہ دکھا دیا جبکہ اس معاشرتی انقلاب نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنے دائرے میں سمولیا۔ اس حوالہ سے دو پہلوؤں پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ انسانی سماج کی تبدیلی کے اس ایجنڈے پر اس وقت کے سماج کا ردعمل کیا تھا اور دوسرا یہ کہ قرآن کریم نے انسانی معاشرہ کو کن تبدیلیوں سے روشناس کرایا؟ پہلے حصہ پر آج بات ہوگی جبکہ دوسرے حصے پر اس مجلس میں اپنے دوسرے درس کے موقع پر چوبیس رمضان المبارک کو گفتگو کروں گا، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن کریم کا پیغام مکہ مکرمہ میں پیش کیا تو اس وقت کے سماج کے تمام لیڈر یہ بات سمجھ گئے تھے کہ یہ صرف چند لفظوں اور جملوں کا ورد اور تکرار نہیں ہے بلکہ مکمل معاشرتی تبدیلی اور انقلاب کا ایجنڈا ہے۔ اس لیے انہوں نے پہلے دن سے ہی مزاحمت شروع کر دی اور پھر وہ مسلسل تئیس برس تک مختلف حوالوں سے اور مختلف دائروں میں مسلسل مزاحمت کرتے رہے۔ اس مزاحمت کا آغاز پہلی مجلس سے ہی ہو گیا تھا جس میں جناب رسول اکرمؐ نے صفا پہاڑی پر مکہ والوں کو جمع کر کے ”ایہا الناس“ کے خطاب کے ساتھ توحید کی دعوت دی تھی اور اس مزاحمت میں پہل خود آنحضرتؐ کے چچا ابولہب نے کی تھی اور آپؐ سے کہا تھا ”تیرے لیے (نعوذ باللہ) بربادی ہو، کیا تم نے ہمیں اس کام کے لیے اکٹھا کیا ہے؟“ ابولہب کی اسی بات کا جواب قرآن کریم کی سورۃ اللھب میں دیا گیا ہے۔

اس طرح مزاحمت کا پہلا دائرہ طعن و تشنیع، الزامات، تحقیر اور طنز و استہزا کا تھا جس میں کسی طرف سے کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی۔ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر کو کاہن، شاعر، مجنون، ساحر اور کذاب کے الفاظ سے پکارا گیا اور پورے علاقے میں کردار کشی کا بازار گرم کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا کہ (نعوذ باللہ) مکہ اور طائف کی دو بڑی بستیوں میں کوئی سردار ایسا نہیں تھا جس پر وحی آتی، کیا آپ ہی اس کام کے لیے رہ گئے تھے؟

مزاحمت کا دوسرا دائرہ مداخلت کا تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس طرح ہے کہ انہوں نے آپس میں مشورہ کر لیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جہاں بھی قرآن کریم لوگوں کو سنائیں وہاں شور و غل کرو اور کسی کو ان کی بات سننے نہ دو۔ یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ جناب نبی کریمؐ کے چچا حضرات مسلسل ٹوہ اور تعاقب میں رہتے اور جہاں بھی آپؐ کسی اجتماع میں لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے اور قرآن کریم سناتے ان میں سے کوئی چچا کھڑا ہو

جاتا اور لوگوں سے کہتا کہ یہ ہمارا بھتیجا ہے، آج کل (نعوذ باللہ) یہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے اس لیے یہ اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے، ہم اس کا علاج کروا رہے ہیں کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا، اس لیے آپ لوگ اس کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔

مزاحمت کا تیسرا دائرہ مقابلہ کا تھا اور اس کا تذکرہ بھی قرآن کریم میں ہے کہ ایک قریشی سردار حارث بن نضر نے کچھ آلات موسیقی اور چند گانے ناچنے والیوں کا بندوبست کیا اور مکہ مکرمہ میں راگ و رنگ کی محفلیں جمانا شروع کر دیں تاکہ لوگ ان محفلوں میں آئیں اور آنحضرتؐ کی باتیں نہ سن سکیں۔ قرآن کریم نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ”لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ“ اور ”ویتخذ ہا ہزوا“ کے جملے ارشاد فرمائے ہیں کہ کھیل تماشے کی باتیں اور کام کیے جاتے تھے تاکہ لوگوں کو حق قبول کرنے سے روکا جائے اور خدا کے دین کو ہنسی اور استہزا کا نشانہ بنایا جائے۔ میں یہاں ایک بات درمیان میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل جب ٹی وی پروگراموں اور سوشل میڈیا میں دین کے نام پر اور دینی احکام و مسائل کے بارے میں پیش کیا جانے والا ماحول دیکھتا ہوں تو بے ساختہ مکہ مکرمہ میں حارث بن نضیر کی بپا کردہ محفلیں چشم تصور کے سامنے آجاتی ہیں کہ وہ بھی تو سب کچھ اسی طرح کیا کرتا تھا، اللہ تعالی ہم سب کو اس شر سے پناہ میں رکھیں، آمین۔

قرآن کریم کی راہ میں مزاحمت کا چوتھا دائرہ ان پیش کشوں کا ہے جو ابوجہل اور دوسرے بعض سرداروں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھیں کہ یہ غریب اور کمزور لوگ جو آپ کی مجلس میں ہر وقت بیٹھے رہتے ہیں ہم ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتے اس میں ہماری توہین ہوتی ہے، اس لیے اگر انہیں آپ اپنی مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کے پاس بیٹھنے اور آپ کی بات سننے کے لیے تیار ہیں۔ ان باتوں کا مقصد مسلمانوں میں تفریق اور جناب نبی کریمؐ کے ساتھیوں میں احساس کمتری پیدا کرنا تھا جس سے خود اللہ تعالی نے حضورؐ کو قرآن کریم میں منع فرمایا کہ ان بڑوں کے لیے آپ اپنے کمزوروں اور غریب ساتھیوں کو مجلس سے نہیں اٹھائیں گے۔

قریشیوں کی طرف سے قرآن کریم اور جناب رسول اکرمؐ کے خلاف مزاحمت کا پانچواں دائرہ وہ ظلم و تشدد تھا جو آنحضرتؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے ساتھ تیرہ سالہ مکی دور میں مسلسل روا رکھا گیا۔ خود جناب رسول اللہؐ اس تشدد اور اذیتوں کا شکار ہوئے اور بہت سے صحابہ کرامؓ پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے گئے۔ اس میں اسلام قبول کرنے سے روکنے کے

ساتھ ساتھ یہ بات بھی تھی کہ مسلمان اپنی عبادات اور دعوت و تبلیغ کو حرم کی حدود میں سرانجام نہیں دیں گے اور کسی عوامی جگہ پر مذہبی سرگرمیاں نہیں کر سکیں گے۔ مسلمانوں کو حرم میں نماز پڑھنے پر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ کو ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعے پابند کیا گیا کہ وہ نماز اور تلاوت قرآن کریم اپنے گھر کے اندر کریں گے اور ان کی آواز گھر سے باہر نہیں آئے گی۔

اس مزاحمت کا چھٹا دائرہ وہ سوشل بائیکاٹ تھا جو مکہ مکرمہ کے تمام قبائل نے باہمی اجتماعی فیصلے کے تحت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیروکاروں کے ساتھ بلکہ آپؐ کی حمایت کرنے والے غیر مسلموں کے ساتھ بھی کیا۔ ان سب کو ایک وادی (شعب ابی طالب) میں محدود کر دیا گیا اور سوشل بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی ناکہ بندی بھی کر دی گئی اور چاروں طرف سے نگرانی کی گئی کہ خوراک اور ضرورت کی کوئی چیز باہر سے ان تک نہ پہنچنے پائے۔ اس بائیکاٹ اور ناکہ بندی کا معاہدہ باقاعدہ دستخطوں کے ساتھ بیت اللہ کے دروازے پر لٹکا دیا گیا اور یہ ناکہ بندی مسلسل تین سال تک جاری رہی مگر یہ طویل آپریشن بھی ناکام رہا۔

مزاحمت کے ان سب ہتھکنڈوں کی ناکامی کے بعد ساتویں دائرہ میں قریش نے پینترا بدلا اور صلح و مفاہمت کے نام پر مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانے کی چال چلنا شروع کر دی جسے قرآن کریم نے ”ودوالو تدھن فیدھنون“ سے تعبیر فرمایا ہے کہ وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کچھ لچک وہ دکھائیں اور کچھ لچک جناب رسول اللہؐ پیدا کریں تاکہ درمیان درمیان میں کوئی سمجھوتا ہو جائے۔ یہ بڑا دلچسپ دور تھا جس کا تذکرہ میں قدرے تفصیل کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آج بھی پوری دنیا میں ہمیں اسی صورتحال کا سامنا ہے اور مسلمانوں کو ایسے ہی جال میں پھنسانے کی کوششیں ہر سطح پر جاری ہیں۔ جناب رسول اکرمؐ کو مخالفین کی طرف سے مصالحت کی یہ پیشکش تین صورتوں میں کی گئی۔

(ا) ایک کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح ہے کہ یہ لوگ قرآن کریم سن کر کہتے ہیں کہ ”ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ“ اس قرآن کی بجائے کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اس میں ردوبدل کر دو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب قرآن کریم میں آنحضرتؐ سے یہ دلوایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے اس بات کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ میں قرآن کریم میں اپنی طرف سے کوئی ردوبدل کر سکوں۔

(۲) دوسرا مرحلہ قریشی سرداروں کے اس وفد کی ملاقات کا ہے جو جناب رسول اکرمؐ کے ساتھ خواجہ ابوطالب کی موجودگی میں ہوئی اور جس میں آنحضرتؐ کو دو نکاتی مصالحتی فارمولا پیش کیا گیا۔ ایک یہ کہ آپ حرم پاک میں بے شک نماز پڑھیں اور قرآن کریم لوگوں کو سنائیں ہم آپ کو نہیں روکیں گے بلکہ ہم بھی آپ کے ساتھ شریک ہو جایا کریں گے، مگر آپ بھی کبھی کبھی ہمارے بتوں کی تعظیم کے لیے آیا کریں۔ اور دوسرا یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی صفات اور عظمت جتنی چاہیں بیان کریں مگر ہمارے بتوں کی نفی نہ کیا کریں، یعنی پازیٹو بات کریں نیگیٹو بات نہ کریں۔ چنانچہ ان کا کہنا تھا کہ ان دو باتوں پر ہمارا باہمی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سورۃ الکافرون کی شکل میں جناب رسول اللہؐ سے دلوایا اور دوٹوک طور پر اس پیشکش کو مسترد کر دیا گیا۔

(۳) جبکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کا تیسرا مرحلہ آنحضرتؐ کے ساتھ طائف کے بنو ثقیف کے سرداروں کی ملاقات کا بیان فرمایا ہے جو انہوں نے اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ منورہ جا کر کی اور قبول اسلام کے لیے کچھ شرائط پیش کیں جن کا تذکرہ سیرت نبویؐ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ شرائط کچھ اس طرح تھیں کہ (۱) ہم اپنا بت ”لات“ نہیں توڑیں گے (۲) نماز کی اس طرح پابندی نہیں کریں گے جیسے بتائی جاتی ہے، نماز میں ہم رکوع سجدہ نہیں کریں گے اور اوقات اپنی سہولت کے مطابق طے کریں گے (۳) شراب ترک نہیں کریں گے (۴) سود کا کاروبار نہیں چھوڑیں گے (۵) زنا نہیں چھوڑیں گے وغیرہ وغیرہ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے اگلے روز ہی باہمی مشورہ کے ساتھ سب شرطیں واپس لے لیں اور غیر مشروط طور پر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ اس حوالہ سے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ طائف کے بنو ثقیف نے یہ شرطیں اسلام قبول کرنے کے لیے پیش کی تھیں جبکہ کم و بیش اسی طرح کی شرطیں ہم پاکستانیوں کی طرف سے ملک میں اسلام کے نفاذ کے لیے مسلسل پیش کی جا رہی ہیں البتہ فرق یہ ہے کہ طائف والوں کو ایک دن میں ہی بات سمجھ میں آ گئی تھی اور انہوں نے اگلے روز وہ شرطیں واپس لے لی تھیں مگر ہم مسلسل ستر برس سے ایسی شرطوں پر اصرار کیے جا رہے ہیں۔

مصالحت و مفاہمت کے عنوان سے اسلام کو کمزور کرنے اور مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانے کی ان کوششوں میں ناکامی کے بعد قریش نے وہ آخری جرگہ کیا جس میں

"لیثبتوک اویقتلوک اویخرجوک" کی تجاویز پر غور و خوض کے بعد قریشی سرداروں نے اجتماعی فیصلہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے لیے باقاعدہ "ڈیتھ اسکواڈ" مقرر کیا گیا جس نے رات کی تاریکی میں آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے گھیرے سے نکال کر آنحضرتؐ کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لیے روانہ کر دیا۔

قرآن کریم کے ایجنڈے اور اس وقت کے سماج کی مزاحمت کے ان دائروں کا تذکرہ کرنے کے بعد میں اپنی گفتگو کے ابتدائی حصہ کی طرف آتا ہوں کہ قرآن کریم کا بنیادی موضوع اور مقصد سماج کی تبدیلی تھا جسے قریش اور بنوثقیف کے سرداروں نے سمجھ لیا تھا اور اس کے خلاف مزاحمت شروع کر دی تھی جو دو عشروں سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ مگر اس شدید مزاحمت کے باوجود قرآن کریم اور جناب رسول اللہ نے ربع صدی سے بھی کم عرصہ میں عرب معاشرہ کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور قرآن کریم اپنے ایجنڈے میں سرخرو ہوا۔ میری گفتگو کا اگلا موضوع ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ہوگا کہ وہ تبدیلیاں کیا تھیں جو عرب سماج میں قرآن کریم نے پیدا کیں اور پھر ان تبدیلیوں نے ایک صدی کے دوران دنیا کے ایک بڑے حصے کا احاطہ کر لیا۔ چونکہ آج بھی ہمیں اسی قسم کی صورتحال کا سامنا ہے اس لیے ان تبدیلیوں سے واقف ہونا ہمارے لیے ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمجھ کے ساتھ دین کی خدمت کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ انصاف، لاہور۔ ۲۲ مئی ۲۰۱۸ء)

چند معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ — دورِ حاضر کے مدعیانِ نبوت

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۸ مئی ۲۰۱۸ء)

میری گفتگو کا ایک دائرہ یہ ہوتا ہے کہ جس دور میں ہم رہ رہے ہیں اس میں نئی نبوت اور وحی کے دعوے کے ساتھ کون کون سے گروہ دنیا میں موجود ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں۔ ان سے بھی ہمیں ضرور متعارف ہونا چاہیے، یہ تقریباً چار یا پانچ ہیں، ان کا ذکر کرتا ہوں۔

(ا) ذکری مذہب

ایک تو ذکری مذہب ہے کہ بلوچستان میں مکران اور تربت کی پٹی ان سے بھری پڑی ہے، یہ تقریباً چار سو سال سے چلے آرہے ہیں، ان کی مختصر تاریخ ذکر کر دیتا ہوں۔

محمد مہدی

کم و بیش چار سو سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب تھے محمد مہدی۔ میرا قیاس ہے، کوئی حوالہ نہیں ہے، کہ جس زمانے میں ایران میں صفویوں نے قبضہ کیا اور زبردستی لوگوں کو شیعہ بنایا، اس دور میں کچھ لوگ وہاں سے بھاگے تھے، باطنی فرقہ کے لوگ بھی بھاگے تھے، ان میں یہ صاحب تھے محمد مہدی۔ ان میں باطنیت (اپنے مذہب کو چھپانا) تھی۔ یہ ۹۷۷ھ کی بات ہے، سرباز کے علاقے میں آئے۔ وہاں تربت کے علاقے میں ہمارے بزرگ قاضی عبد الصمد سربازیؒ گزرے ہیں۔ مہدی صاحب نے آکر دعویٰ کیا کہ میں مہدی ہوں، وہاں کا ایک سردار تھا مراد، جس کے نام پر کوہ مراد ہے، وہ سب سے پہلے ایمان لایا۔ جہالت کا دور تھا، لوگ ساتھ ملتے گئے، ایک اچھا خاصا گروہ بن گیا۔ مہدی نے بعد میں نبوت اور وحی کا دعویٰ کر دیا اور کہا کہ میں افضل الانبیاء ہوں۔

"معراج نامہ"

ان سے ایک کتاب منسوب ہے ''معراج نامہ'' جو مجھے مولانا علی محمد قصر قندیؒ نے بتائی تھی۔ تعارف اور پہچان کے لیے اس میں سے ان کی خرافات میں سے ایک نقل کرتا ہوں۔ ''نقل کفر کفر نباشد''۔ اس ''معراج نامہ'' میں لکھا ہے کہ حضور نبی کریمؐ کو نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ معراج کرانے کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ آپؐ نے کہا میں تمام انبیاء کا سردار ہوں، اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے عرش پر بلا لیا یہ دکھانے کے لیے کہ انبیاء کا سردار کون ہے، جب حضرت محمدؐ عرش پر تشریف لے گئے تو وہاں اللہ تعالیٰ بیٹھے ہوئے تھے اور ساتھ ملا محمد مہدی اٹکی بیٹھے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ سے کہا کہ میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ انبیاء کا سردار یہ ہے جو میرے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔

شرعی احکام کی تنسیخ

انہوں نے شریعت کے کچھ احکام منسوخ قرار دے رکھے ہیں، مثلاً نماز منسوخ کر دی اور اس کی جگہ کچھ مخصوص اذکار صبح و شام کے بتا دیے۔ یہی ان کا ٹائٹل بن گیا، اس علاقے کے مسلمانوں کو نمازی جبکہ ان لوگوں کو ذکری کہا جاتا ہے۔ روزے منسوخ کر دیے اور رمضان کی بجائے ذی الحجہ کے عشرے کے دس روزے طے کر دیے۔ اور حج بھی منسوخ کر دیا، کوہ مراد پر ستائیس رمضان کو اکٹھے ہوتے ہیں، کوہ مراد کا طواف کرتے ہیں، اور وہاں ایک میدان کو عرفات کا نام دیا ہوا ہے، وہاں وقوف کرتے ہیں، مصنوعی حج کرتے ہیں۔

ایک زمانے میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ نے بلوچستان کا دورہ کر کے مصنوعی حج کے خلاف فضا بنائی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ اسے بند کیا جائے۔ لیکن وہ کرتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان کی آبادی ساحل کے ساتھ بہت ہے، کراچی میں بھی ہے۔ حضرت مولانا علی محمد قصر قندیؒ سابقہ ذکری تھے، بعد میں مسلمان ہوئے۔ جمعیت علماء اسلام میں ہمارے ساتھ کام کیا کرتے تھے، انہوں نے ذکری مذہب کے تعارف پر کتاب لکھی ہے۔ ہمارے ایک دوست حضرت مولانا احتشام الحق آسیا آبادیؒ تھے جو شہید کر دیے گئے، دارالعلوم کراچی کے فضلاء میں سے ہیں، ان کا اسی علاقے میں دارالعلوم رشیدیہ ہے، ان کے بھی ذکری مذہب کے تعارف پر دو رسالے ہیں۔ ذکریوں سے لوگوں کو بچانے اور عام لوگوں کا ایمان محفوظ رکھنے کے لیے جن لوگوں نے سالہا سال محنت کی ہے ان میں سب سے نمایاں نام کراچی میں حضرت مولانا علی محمد قصر قندیؒ کا اور بلوچستان میں حضرت مولانا احتشام الحق آسیا آبادی شہیدؒ کا ہے۔ مولانا آسیا آبادی ایک سیمینار میں ہمارے ہاں کامونکی تشریف لائے تھے، انہیں دو سال پہلے بیٹے سمیت شہید کر دیا گیا۔

ذکری کلمہ

موجودہ دور کے مدعیان نبوت میں ذکری گروہ نئی نبوت، نئی وحی اور نئی کتاب کے نام سے ہمارے ملک میں موجود ہے۔ چار سو سال سے چلے آرہے ہیں، کسی زمانے میں اس پوری پٹی پر ان کی حکومت بھی رہی ہے۔ بلیدی خاندان ایک زمانے میں ذکری خاندان رہا ہے، سو سال سے زیادہ ان کی حکومت رہی ہے۔ مجھے بعض دوستوں نے بتایا کہ کراچی کے بعض قبرستانوں میں اس فرقے کے لوگوں کی قبروں کے کتبوں پر نعوذ باللہ یہ کلمہ لکھا ہوا

ہے "لا الہ الا اللہ، نور پاک محمد مہدی رسول اللہ"۔ ذکری لوگ کام سارا مسلمانوں کے انداز سے ہی کرتے ہیں کہ عام لوگوں کو پہچان نہیں ہوتی، سوائے قریبی لوگوں کے جواُن کو جانتے ہیں۔

(۲) بہائی مذہب

دوسرا گروہ بہائی ہے جن کو بابی بھی کہا جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے ربع صدی پہلے کی بات ہے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۵۰ء کے دور میں یہ گروہ شروع ہوا۔ اس کا پس منظر عرض کر دیتا ہوں۔

مرزا محمد علی

اہل تشیع کے اثنا عشری فرقے کا عقیدہ ہے کہ بارہویں امام غائب ایک غار سر من رای میں ہیں۔ حکومت کا اصل حق انہی کا ہے، وہی امام العصر ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں مرزا محمد علی نامی ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ امام غائب سے میرا رابطہ ہو گیا ہے، ملاقات ہوئی ہے، امام غائب نے مجھے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے۔ "الباب" یعنی میں امام غائب اور امت کے درمیان دروازہ ہوں اور اب امام غائب کی ہدایات میرے ذریعے امت کو ملیں گی۔ یہ دعویٰ تاریخی روایات کے مطابق انہوں نے مکہ مکرمہ میں طواف کے دوران حرم میں کیا۔ ان کو بھی پیروکار مل گئے، لوگ شامل ہوتے گئے۔ چونکہ یہ بات اثنا عشری عقیدے کے خلاف تھی تو اس وقت کی ایرانی سلطنت میں ان کے خلاف مقدمہ چلا اور تبریز چھاؤنی میں مرزا محمد علی باب کو ارتداد اور امام کی توہین کے جرم میں سزائے موت دے دی گئی۔

مرزا بہاء اللہ شیرازی اور "الواحِ مقدسہ"

مرزا محمد علی کے شاگردوں میں ایک صاحب تھے مرزا بہاء اللہ شیرازی۔ انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ مرزا محمد علی تو میری بشارت دینے آئے تھے، اصل میں ہوں اور میں امام غائب نہیں بلکہ نبی ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔ مرزا شیرازی نے قرآن کریم کی منسوخی کا اعلان کیا۔ ان کی کتاب "الواح مقدسہ" کے نام سے ہے، اس میں قرآن کریم کے طرز پر سورتیں بنائی گئی ہیں، اس میں سورۃ الملک کی طرز پر سورۃ الملوک ہے۔ نمازیں منسوخ کر دیں اور قبلہ تبدیل کر دیا۔

جس زمانے میں صفویوں اور عثمانیوں کی کشمکش تھی، صفوی عالم اسلام میں شیعیت کے فروغ کے لیے کام کررہے تھے، ایران پر تقریباً کنٹرول حاصل کرلیا تھا اور پھر عراق اور مصر میں اپنے پاؤں بڑھا رہے تھے، تو عثمانی خلفاء نے مزاحمت کی اور سلطان سلیم اول کے دور میں صفویوں اور عثمانیوں کی بڑی جنگ ہوئی، جس جنگ کے نتیجے میں مصر بچ گیا، ورنہ ایران کی طرح مصر بھی صفویوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سلطان سلیم اول مقابلے پر آئے تھے۔ عثمانیوں نے صفویوں کا مقابلہ کیا اور اس کا مذہبی پس منظر بالکل واضح تھا۔ میں نے الشیخ مصطفیٰ صبری جو کہ خلافت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام اور شیخ زاہد الکوثری کے استاد تھے، ان کی یادداشتوں میں پڑھا کہ صفویوں اور عثمانیوں کی جنگ کے بعد جو معاہدہ ہوا تھا، اس معاہدے کی ایک شق یہ بھی تھی کہ صفویوں نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ حضرات صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی توہین نہیں کریں گے۔ چنانچہ یہ مسائل اس وقت بھی تھے۔

بہرحال اس کشمکش سے بہاء اللہ شیرازی نے فائدہ اٹھانا چاہا، چونکہ ایران میں سبھی اثنا عشری علماء تھے اور انہوں نے بہاء اللہ شیرازی کو برداشت نہیں کیا تو اس مخاصمت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ صاحب قسطنطنیہ چلے گئے تاکہ صفویوں کے خلاف عثمانیوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے سیاسی پناہ دی لیکن کچھ عرصے کے بعد عثمانیوں کو اندازہ ہوگیا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ یہ صاحب ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہیں تو انہوں نے قسطنطنیہ سے نکال دیا۔

بہائیوں کا قبلہ

پھر بہاء اللہ شیرازی نے فلسطین میں عکہ نامی جگہ پر اپنا ٹھکانہ بنا لیا اور آزاد گروپ کے طور پر کام کرتے رہے۔ اب بہائیوں کا قبلہ عکہ ہی ہے، بہاء اللہ شیرازی عکہ میں فوت ہوئے، وہیں ان کی قبر ہے، ان کے بیٹے مرزا عبدالبہاء نے بھی عکہ ہی کو مرکز رکھا اور انہوں نے دنیا میں پھیلنا شروع کردیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت کے فلسطین کے صدر محمود عباس بہائیوں میں سے ہیں، اور یہ بھی فلسطین کے تنازعے میں عکہ کے حوالے سے فریق ہیں۔

بہائی مذہب کے امتیازات میں یہ ہے کہ نماز منسوخ کردی، الواح مقدسہ کے نام سے نئی تعلیمات دیں، اور یہ تصور دیا کہ ہم تمام مذاہب کے جامع ہیں۔ ان کے مطابق پہلے تمام انبیاء نہریں تھیں اور بہاء اللہ شیرازی سمندر ہے جس میں ساری نہریں اکٹھی ہوگئی ہیں۔

کہتے ہیں ہم مجمع البحار ہیں، بہاء اللہ شیرازی خاتم الانبیاء ہے، اس کی تعلیمات نسل انسانی کی رہنما ہیں۔ عورت اور مرد کی ہر لحاظ سے مساوات کا تصور مذہبی طور پر انہوں نے پیش کیا کہ عورت اور مرد کے احکام اور معاشرت میں کسی حوالے سے کوئی فرق نہیں ہے۔ جبکہ ہمارا مغرب کے ساتھ جھگڑا ہے کہ مرد اور عورت کی نفسیات، خلقت، اور فطری فرائض میں فرق ہے، اس لیے احکام بھی دونوں کے یکساں نہیں ہیں۔

اتحاد بین المذاہب

اتحاد بین المذاہب بہائیوں کا ٹائٹل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم تمام مذاہب کو حق سمجھتے ہیں اور تمام مذاہب کے اتحاد کے قائل ہیں۔ عملی طور پر اس کا ایک مظہر میں نے خود دیکھا ہے۔ ۱۹۸۸، ۱۹۸۹ء کی بات ہے، حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور میں شکاگو (امریکہ) میں جناب ریاض حسین وڑائچ کے مہمان تھے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ شکاگو میں بہائیوں کے عالمی مراکز میں سے ایک مرکز ہے۔ ان کے تین چار عالمی مراکز ہیں، دہلی، شکاگو اور لندن وغیرہ میں۔ میرا ذوق یہ ہے کہ ایسی جگہوں میں جاتا ہوں اور معلومات حاصل کرتا ہوں کہ ان کا دائرہ کار کیا ہے اور کام کا طریقہ کار کیا ہے، اور ان سے تبادلہ خیالات کرتا ہوں تاکہ پوری پوزیشن معلوم ہو۔ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ سے میں نے بات کی کہ ہم بہائیوں کے مرکز چلتے ہیں، دیکھتے ہیں کیا نوعیت ہے؟ ہم تینوں وہاں گئے، جاکر جب ریسپشن پر کارڈ لیا تو انہوں نے ہمیں پہچان لیا۔ پہلے سے ہمیں جانتے تھے، پورے اعزاز کے ساتھ انہوں نے ہمیں وہاں کا وزٹ کروایا۔

اس میں سے ایک بات میں ذکر کرنا چاہ رہا ہوں۔ انہوں نے ہمیں ایک بہت بڑا ہال دکھایا، اس ایک ہال میں ایک چھت کے نیچے چھ مذاہب کے عبادت خانے بنے ہوئے تھے، بالکل ان کے اپنے اپنے ماحول کے مطابق۔ ایک کونے میں مسجد کی طرز کا عبادت خانہ بنا ہوا تھا جس میں مسجد کا ماحول منبر، دریاں، تپائیاں پڑی تھیں۔ دوسرے کونے میں گرجا تھا، ان کے ماحول کے مطابق۔ ایک کونے میں ہندوؤں کا مندر۔ ایک کونے میں یہودیوں کا معبد۔ بالکل وسط میں سکھوں کا گردوارہ اور بدھوں کا عبادت خانہ۔ ایک چھت کے نیچے چھ عبادت خانے بنے ہوئے ہم نے دیکھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں سب لوگ آتے ہیں، ہم سب کو حق سمجھتے ہیں، ہماری طرف سے اجازت ہے ہر کوئی اپنے عبادت

خانے میں اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرے۔ ہمارے سامنے بھی لوگ آرہے تھے، ایک سکھ گردوارے میں گرنتھ پڑھ رہا تھا۔

اس کے انچارج انڈین تھے اور اردو بولتے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے آپ کو یہ منظر کیسا لگا کہ ہم نے چھ مذاہب ایک چھت کے نیچے اکٹھے کیے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا آپ نے یہ تو کر لیا کہ مندر، مسجد، گرجا اور گردوارہ کو اکٹھا کر لیا، لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ ایک خدا اور تین خدا کے عقیدے ایک چھت کے نیچے کیسے اکٹھے ہو گئے؟ کہنے لگے یہ فلسفے کی باتیں ہیں۔ میں نے کہا نہیں یہ عقیدے کی باتیں ہیں۔

بہرحال اتحاد بین المذاہب کے عملی مناظر ان کے ہاں ملتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اکبر بادشاہ نے ''دین الٰہی'' کے نام سے جو ملغوبہ بنایا تھا، اس نے بھی یہی کیا تھا۔ یہ نئی بات نہیں ہے، اس دور میں بہائی اس کے مذہبی طور پر دعویدار ہیں۔ آج کا بین الاقوامی موضوع بھی یہ ہے کہ سارے مذہب حق ہیں، سب کا اتحاد ہونا چاہیے، سب کی صحیح باتیں اکٹھی کر کے مشترکہ کام کیا جانا چاہیے، اس پر کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ مکالمہ بین المذاہب کا دائرہ اور ہے، اتحاد بین المذاہب کا دائرہ اور ہے۔

انیس کا عدد

بہائیوں کا ایک اور امتیاز ہے جو ان کے دائرے میں ہی محدود ہے، وہ یہ کہ ان کے ہاں انیس کا عدد بہت متبرک ہے۔ حالانکہ قرآن میں تو انیس کا عدد جہنم کے حوالے سے ذکر ہوا ہے۔ انہوں نے اپنا الگ کیلنڈر تشکیل دیا ہوا ہے جس میں انیس مہینے، اور ہر مہینے کے انیس دن ہیں۔ اس کا پس منظر کیا ہے، یا نتائج کیا ہیں، یہ ان کو ہی معلوم ہو گا۔ آج سے پچیس سال پہلے اس حوالے سے ہمارے ہاں بھی ایک تحریک چلی تھی کہ انیس کا عدد خاص عدد ہے ریاضی کے حوالے سے، اس کی کچھ خصوصیات ہیں۔

ہمارے ایک مناظر احمد دیدات تھے جو افریقہ کے تھے، عیسائیوں کے خلاف اچھے مناظر تھے، وہ انیس کے عدد کے فارمولے سے بہت متاثر ہوئے بلکہ میں بھی ابتدائی متاثرین میں سے ہوں۔ میں نے بھی اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی ایک نشست میں اس موضوع پر بات کی تھی کہ قرآن کریم کے اعجاز کی ایک نئی صورت سامنے آئی ہے۔ اس وقت ہمارا تاثر یہ تھا وجوہ اعجاز میں سے ایک نئی وجہ ریاضی کے قاعدے سے سامنے آئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ و آیات حروف ابجد کے حساب سے ''انیس کے فارمولے'' پر فٹ

بیٹھتی ہیں۔ اس پر کتابیں اور پی ایچ ڈی کے مقالات بھی آئے، میں نے بھی کچھ لکھا۔ بظاہر یہی تھا اور عام علماء بھی خوش تھے قرآن پاک کے اعجاز کی ایک نئی صورت سامنے آئی ہے۔

احمد دیدات صاحب تو فوت ہو گئے، امریکہ کے ایک صاحب تھے خلیفہ رشاد مصری، انہوں نے اس کو کمپین ہی بنالیا کہ انیس کا عدد، انیس کا عدد۔ یہ بات تب کھٹکی

1. جب خلیفہ رشاد نے یہ جملہ کہا کہ قرآن کریم تو انیس کے اس فارمولے پر پورا اترتا ہے، حدیث کوئی نہیں پوری اترتی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ پہلا اسٹیج تھا خلیفہ رشاد کا۔

2. کچھ سال بعد انہوں نے اگلا قدم اٹھایا اور کہا کہ قرآن کی بھی بعض سورتیں انیس کے فامولے پر پوری نہیں اترتیں، مثلاً آیت "لقد جائکم رسول من انفسکم" (التوبہ ۱۲۸) اور معوذتین۔ لگتا ہے یہ الحاق ہیں، قرآن کریم کی نہیں ہیں۔ یہاں اس فارمولے کو بریک لگ گئی، دنیا بھر میں لوگوں نے کہا کہ ہم اس فارمولے کو قبول نہیں کرتے۔ یہ دوسرا اسٹیج تھا خلیفہ رشاد کا۔

3. خلیفہ رشاد کا تیسرا اسٹیج یہ تھا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ بعد میں اپنے ہی ایک مرید کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

اصل میں اس انیس کے عدد کے فارمولے کے موجد بہائی تھے۔ یہ ان کے امتیازات میں سے ہے اور اسے ان کے ہاں تقدس حاصل ہے۔

بہائیوں اور قادیانیوں میں مماثلت

ایک حوالہ بہائیوں کے بارے سے اور دینا چاہوں گا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ مسئلہ درپیش تھا کہ قادیانی یہاں کلیدی آسامیوں پر اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک نے اس کو بریک لگائی، اور یہ تحریک ان کے خلاف بہت بڑی رکاوٹ بن گئی۔ اس کے بعد سے اب تک قادیانی اسی کوشش میں ہیں لیکن الحمد للہ کامیاب نہیں ہوئے۔ بھٹو مرحوم نے بھی یہ بات کہی کہ احمدی پاکستان میں وہ پوزیشن حاصل کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ کوئی فیصلہ ان کی منشا کے خلاف نہ ہو، میں اس کو کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔

ایران میں بادشاہت کے دور میں بہائیوں نے یہ پوزیشن حاصل کر لی تھی کہ وہاں کے بڑے جرنیل، بیوروکریٹ حتیٰ کہ ان کے ایک وزیر اعظم امیر عباس ہویدا بہائی تھے۔ خمینی

انقلاب میں آیت اللہ خلخالی نے بہائیوں کو ٹارگٹ کیا، ان کو نکالا اور قتل بھی کیا۔ یہ اس وقت وہاں سے بھاگے اور مختلف علاقوں میں پناہ لی۔ اس وقت بہت سے بہائی ایران، عرب، فلسطین، امریکہ، برطانیہ اور پاکستان میں ہیں۔ پاکستان میں ان کے مراکز پشاور، سیالکوٹ، لاہور، کوئٹہ سمیت بارہ شہروں میں کام کر رہے ہیں۔ ان کا اردو ماہنامہ نفحات میرے پاس آتا رہا ہے، پشاور سے چھپتا تھا۔ ان کے مظفر آباد کے ایک بڑے دانشور صابر آفاقی کی اور میری خط و کتابت بھی چلتی رہی ہے۔

یہ میں نے بہائیوں کا تعارف، پس منظر اور دائرہ کار، اور بنیادی امتیاز بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ کہاں کہاں ہیں۔

(۳) نیشن آف اسلام

اس کے بعد ختم نبوت کا انکار کرنے والے ایک اور گروہ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو اس وقت متعارف بھی ہے اور موجود بھی ہے۔ یہ ''نیشن آف اسلام'' کے نام سے امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کا بہت بڑا گروہ ہے۔ اس وقت لوئس فرخان ان کے لیڈر ہیں اور دنیا میں ان کو امریکی مسلمانوں کا نمائندہ لیڈر سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ لوگوں کو پتہ نہیں ہے، لوگ انہیں مسلمان سمجھتے ہیں اور بڑی بڑی کانفرنسوں میں ان کے لیڈر کو دعوت دی جاتی ہے۔ طرابلس کی سالانہ میلاد کانفرنس میں آتے رہے ہیں، پاکستان میں ایک صاحب نے ان کو دعوت دی تھی، ہم نے کوشش کر کے رکوائی۔ امریکی مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر بنگلہ دیش اور عراق کا دورہ کر چکے ہیں۔ لیکن یہ جس نیشن آف اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا تعارف عرض کر دیتا ہوں۔

امریکہ میں گوروں اور کالوں کی کشمکش

نیشن آف اسلام کی بنیاد بھی دعویٰ نبوت پر ہے لیکن اس سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ امریکہ میں کالوں اور گوروں کا امتیاز اور کشمکش صدیوں پرانی ہے۔ امریکیوں نے اپنی اصل آبادی تو نہ معلوم کہاں کنارے لگا دی ہے، جسے ریڈ انڈین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ گورے یورپ کے ملکوں جرمنی، اسپین اور برطانیہ وغیرہ سے جا کر بسنے والے جبکہ کالے افریقہ سے جا کر بسنے والے لوگ ہیں۔ کالوں کو غلام بنا کر لاتے تھے اور ان سے کام لیتے تھے۔ اس کشمکش کے اثرات اب بھی کسی حد تک ہیں۔ اس کشمکش میں کالوں اور گوروں میں فرق عملاً اور قانوناً بہت دیر تک رہا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں امریکی صدر جے ایف کینیڈی کے دور

تک کالوں اور گوروں کے کالج اور ریسٹورنٹ وغیرہ الگ الگ تھے، دونوں کی کالونیاں الگ الگ تھیں، حتیٰ کہ بسوں میں سیٹیں بھی الگ الگ ہوتی تھیں کہ کوئی کالا گورے کی سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتا تھا اور گورا کسی کالے کی سیٹ پر تو بیٹھتا ہی نہیں تھا۔

کالوں اور گوروں کے درمیان کشمکش کے آخری راؤنڈ کا آغاز ایک تاریخی واقعہ سے ہوا۔ ایک دفعہ برمنگھم (الاباما، امریکہ) میں یہ ہوا کہ ایک بس میں کالج کی کالی لڑکی سوار ہوئی، کالوں کی سیٹیں خالی نہیں تھیں تو وہ گوروں کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی والوں نے اسے کہا، یہاں سے اٹھو یہ گوروں کی سیٹ ہے۔ اس نے کہا یہ سیٹ خالی پڑی تھی تو میں بیٹھ گئی، کوئی بیٹھنے والا آیا تو میں اٹھ جاؤں گی۔ لوگوں نے اسے اٹھنے پر مجبور کرنا چاہا، اس نے انکار کر دیا۔ اس پر ڈرائیور نے بس روک لی اور پولیس کو اطلاع دی گئی۔ پولیس نے آکر اس لڑکی کو گرفتار کر لیا کہ گوروں کی سیٹ پر کیوں بیٹھی ہو؟ اس پر وہاں کے پادری مارٹن لوتھر کنگ نے کچھ لوگ اکٹھے کیے۔ (مارٹن لوتھر دو ہیں، ایک جرمنی کے تھے جنہوں نے پاپائے روم سے بغاوت کر کے پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد رکھی تھی، اور دوسرے یہ تھے)۔ شام کے وقت ایک پارک میں احتجاجی مظاہرہ کیا کہ یہ زیادتی ہے، لڑکی کو بلاوجہ گرفتار کیا گیا ہے۔ میں نے وہ پارک اور مارٹن لوتھر کا میوزیم دیکھا ہے۔ تو گوروں کی پولیس نے ان کو گھیر کر ان پر فائرنگ کی، ان پر بھوکے کتے چھوڑے اور ان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

یہاں سے احتجاجی تحریک شروع ہوئی اور مارٹن لوتھر کنگ نے پورے ملک میں کالوں کو منظم کیا۔ ایک سال اس نے تحریک چلا کر ۱۹۶۵ء میں ملین مارچ کیا۔ ملین مارچ کی جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے اصل میں یہ اس کی اصطلاح ہے، سب سے پہلا ملین مارچ اس نے کیا تھا۔ پورے امریکہ سے کالوں کو اکٹھا کر کے واشنگٹن میں دس لاکھ انسانوں کا پر امن جلوس نکالا۔ صدر کینیڈی کا زمانہ تھا، وہ وائٹ ہاؤس سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ مارٹن لوتھر کنگ کی وہ تقریر دنیا کی شاہکار تقریروں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں اس نے کہا میرا خواب ہے کہ میں یہ دیکھوں کالا اور گورا ایک میز پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں، میرا خواب ہے کہ میں دیکھوں کہ کالج میں گورا اور کالا اکٹھے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ایک تاریخی تقریر ہے اس کے بعد، صدر کینیڈی نے اسے بلایا اور ان کے مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں کالوں اور گوروں کے امتیاز کا قانون ۱۹۶۵ء میں ختم ہوا۔ اس سے پہلے کالوں کو ووٹ کا حق نہیں تھا، سپریم کورٹ تک لڑائی لڑ کر یہ حق حاصل کیا گیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے

امریکہ کی وزیر خارجہ تھی کونڈولیزا رائس جو وہاں کے بڑے دانشوروں میں شمار ہوتی ہے، وہ برمنگھم الاباما کی ہے، میں نے اس کا گھر دیکھا ہے، اس کے باپ کو سپریم کورٹ نے ووٹ کا حق دلوایا تھا، جس نے اس کے لیے طویل عدالتی جنگ لڑی تھی۔

ماسٹر فارد محمد

میں نے کالوں اور گوروں کا پس منظر اس لیے بتایا ہے تاکہ "نیشن آف اسلام" آپ کو سمجھ آسکے۔ ۱۹۳۰ء میں ایک صاحب ماسٹر فارد محمد افریقہ سے ڈیٹرائٹ شہر میں گئے، وہاں جا کر کالوں سے کہا کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، مکہ سے آیا ہوں اور کالوں کی نجات کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے، کالوں کو منظم کرنے آیا ہوں اور میں تمہارا نجات دہندہ ہوں۔ نام اس نے اسلام کا استعمال کیا اور نوبل قرآن کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ بنیادی تصور یہ دیا کہ کالے جو افریقہ سے لائے گئے تھے اصلاً مسلمان تھے، ان کو جبراً عیسائی بنایا گیا تھا، ان کو دوبارہ اسلام کی طرف واپس جانا چاہیے۔ چار سال ان کی تحریک چلتی رہی، ٹیمپل کے نام سے مذہبی مرکز بنایا۔

آلیجا محمد

پھر ان کو ایک صاحب الیجا پال مل گئے جو آلیجا محمد کہلاتے ہیں، یہ دراصل الیاس کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ جیسے یعقوب کو جیکب اور آدم کو ایڈم بولتے ہیں۔ الیجا پال عیسائی تھا جو فارد محمد کے ہاتھوں مسلمان ہوا، بہت متحرک آدمی تھا۔ ۱۹۳۴ء میں فارد محمد غائب ہو گئے اور یہ صاحب کھڑے ہو گئے کہ فارد محمد میری بشارت دینے کے لیے آئے تھے، اصل میں کالوں کا نجات دہندہ میں ہوں۔ میں کالوں کو نجات دلاؤں گا اور اسلام کی طرف لے جاؤں گا۔ پھر الیجا پال سے آلیجا محمد نام رکھ لیا۔

اس مذہب کی بنیاد گوروں سے نفرت پر تھی۔ نفرت کا اندازہ اس سے کریں کہ ایک دور میں ہر سفید چیز ان کے ہاں حرام ٹھہری، جیسے سفید کپڑا اور انڈہ وغیرہ۔ اور یہ بات ان کے عقیدے میں شامل ہے، میں نے ان کی کسی کتاب میں پڑھا کہ سارے انسان کالے تھے، شیطان کی نسل گوروں سے چلی ہے اور آدم کی نسل کالوں سے چلی ہے۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ آدم کان اسود، نوح کان اسود، یوسف کان اسود، محمد کان اسود۔ اصل میں صدیوں کی نفرت پیچھے چلی آرہی تھی۔ ایک دن میں نے وہاں تقریر میں کہا سیاسی طور پر تو میرا بھی یہ کہنے کو جی

چاہتا ہے کہ گورے شیطان کی اولاد ہیں لیکن عقیدے کے طور پر نہیں کہ بہر حال وہ انسان ہیں۔

مالکم شہبازؒ

جب آلیجا محمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ان کو ایک صاحب مالکم لٹل ملے، یہ چوروں کا سرغنہ تھا، جیل میں ان کی ملاقات ہوئی، اس نے آلیجا محمد کے ہاتھ پر "اسلام" قبول کیا، آہستہ آہستہ وہ اس کا دست راست بن گیا اور اس کا منسٹر کہلاتا تھا۔ اس نے مالکم لٹل سے مالکم شہباز نام اختیار کیا کہ افریقہ سے ہمارا جو قبیلہ آیا تھا اس کا نام شہباز تھا۔ لیکن بعد میں اس نے آلیجا محمد کا پول کھولا۔ اس کی یادداشتیں میں نے پڑھی ہیں اور اس کی کچھ اقساط چھاپی بھی تھیں۔ مالکم شہباز کہتا ہے دنیا میں گھومتے پھرتے میں حج پر چلا گیا۔ وہاں میں نے بیت اللہ کا طواف کرتے گوروں کو بھی دیکھا کالوں کو بھی دیکھا۔ شامی، لبنانی، ترکی گورے ہیں۔ تو میں شک میں پڑ گیا کہ کعبہ تو آدم نے بنایا تھا، شیطان کی نسل گورے یہاں کیا کر رہے ہیں؟ میں علماء سے ملا تو پتہ چلا کہ امریکہ میں تو سارا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔ اصل اسلام تو یہ ہے۔

مالکم شہباز نے حجاز کے علماء کے ہاتھ پر توبہ کی اور وہ شافعی المذہب سنی مسلمان بن گئے۔ انہوں نے امریکہ واپس جا کر بتایا کہ یہ صاحب جھوٹ بولتے ہیں، صحیح اسلام وہ ہے جو مکہ اور مدینہ میں ہے۔ انہوں نے اپنا گروپ الگ کر لیا جو مالکم شہباز گروپ کہلاتا ہے۔ نیویارک میں ان کا مرکز ہے مالکم شہباز شہید ماسک۔ اچھا مرکز ہے، میں نے وہاں بھی حاضری دی ہے۔ انہوں نے لوگوں کو آلیجا محمد سے باغی کیا لیکن صرف ایک سال کام کر سکے۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے بغاوت کا اعلان کیا تھا، ایک سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں ان کو شہید کر دیا گیا۔ لیکن ان کا گروپ چلتا رہا۔

عقائد و تعلیمات

آلیجا محمد نے ۱۹۳۴ء میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ ۱۹۷۵ء تک وہ نئی نبوت اور وحی کے دعوے پر رہے، اور اس دعوے پر کہ قرآن پرانا ہو گیا ہے اب میری تعلیمات میں نجات ہے۔ ان کا رسالہ نکلتا ہے "دی فائنل کال"۔ اس کے کچھ صفحات میرے پاس فوٹو کاپی ہیں، اس کے مطابق ان کے بارہ تیرہ عقائد جو اس میں مسلسل چھپتے ہیں، اس میں ایک عقیدہ یہ ہے کہ ماسٹر فارد محمد (پہلا نجات دہندہ) جو ۱۹۳۰ء میں نمودار ہوئے تھے اور ۱۹۳۴ء میں غائب ہوئے تھے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ تھے، کالوں کو راستہ دکھانے آئے تھے،

چار سال ان میں رہے اور پھر ماسٹر آلیجا محمد کو اپنا نبی بنا کر عرش پر واپس چلے گئے۔ اس کا اگلا جملہ یہ ہے کہ یہ وہی موسیٰ ہے جس کا یہود کو انتظار ہے، وہی مسیح ہے جس کا عیسائیوں کو انتظار ہے، اور وہی مہدی و مسیح ہے جس کا مسلمانوں کو انتظار ہے۔

قیامت کے بارے میں ان کا عقیدہ نہ ہندوؤں جیسا ہے اور نہ مسلمانوں جیسا۔ ہندوؤں کا عقیدہ دوبارہ جنم بدلنے کا اور تناسخ کا ہے۔ جبکہ نیشن آف اسلام کے ہاں قیامت اس شکل میں آئے گی کہ دنیا میں گوروں کا تسلط ختم ہو جائے گا۔ اس وقت گورے جنت میں ہیں، کالے جہنم میں ہیں، لیکن دنیا کے حالات پلٹا کھائیں گے اور دنیا پر کالوں کا غلبہ ہوگا، گورے مغلوب اور کالوں کے غلام ہوں گے۔ یہ قیامت ہوگی۔ اس قسم کے عقائد کے ساتھ اس وقت بھی امریکی کالوں میں یہ تعداد کے حوالے سے سب سے بڑا گروپ ہے۔ ایک لطیفہ یہ ہوا کہ میں نے وہاں ایک مجلس میں سوال کیا کہ کالے آدمؑ کی نسل ہیں اور انسان ہیں، گورے شیطان کی نسل ہیں، لیکن ہم ایشین نہ کالے ہیں نہ گورے، ہم گندمی لوگ ہیں تو ہم کس کی نسل ہیں؟

عالمی مکہ باز محمد علی کلےؒ

سب سے پہلے آلیجا محمد سے مالکم شہباز نے بغاوت کی، پھر بہت سے بڑوں نے بغاوت کی۔ عالمی مکہ باز محمد علی کلے جو چند سال پہلے فوت ہوئے، یہ پہلے آلیجا محمد کے ہاتھ مسلمان ہوئے تھے، جب شہباز نے بغاوت کی تو یہ بھی بغاوت میں ساتھ آئے اور صحیح العقیدہ مسلمان ہوئے۔ ان کے ایک بڑے رہنما امام سراج وہاج ہیں، نیویارک کے ہیں۔ میں ان کے مرکز گیا تھا، بہت بڑا مرکز ہے، ان سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ انہوں نے بھی پہلے آلیجا محمد کے ہاتھ کلمہ پڑھا تھا، جب مالکم شہباز نے بغاوت کی اور صحیح عقیدے پر آئے تو یہ بھی ان کے ساتھ باغیوں میں سے تھے۔ یہ جتنے بھی باغی ہیں تقریباً سب اہلسنت شافعی المذہب ہیں۔ امام سراج وہاج اچھا کام کر رہے ہیں، دنیا میں کانفرنسوں میں جاتے ہیں، نمائندگی کرتے ہیں۔

ویلس دین محمد

ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ آلیجا محمد ۱۹۷۵ء میں فوت ہوئے، ۱۹۳۴ء سے ۱۹۷۵ء تک ان کی نبوت کا دور ہے۔ ان کے بیٹے ویلس دین محمد باپ کے مرنے کے بعد اس کے عقائد سے منحرف ہو کر مالکم شہباز کی طرف چلے گئے۔ ان سے بھی میری ملاقات ہوئی ہے، شکاگو کی

ایک بڑی کانفرنس میں ہم اکٹھے تھے۔ یہ بھی شافعی المذہب ہیں، اس وقت کالوں میں صحیح العقیدہ قیادت کرنے والے لوگ امام سراج وہاج، مالکم شہباز کا گروپ اور ویلس دین محمد محنت کر رہے ہیں۔

لوئیس فرخان

لیکن بڑا گروپ آج بھی لوئس فرخان کا ہے جو ماسٹر فارد محمد کو خدا کا پرتو اور آلیجا محمد کو نبی مانتے ہیں۔ دھوکے کی فضا ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ میں جب شکاگو گیا، ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۹ء کی بات ہے، مجھے ساتھیوں نے بتایا کہ لوئس فرخان نے ایک کانفرنس کی ہے کہ تمام مسلمان مکاتب فکر اکٹھے ہوں، سب کو اکٹھا کیا، خود بھی اس میں تھا، اس میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے نمائندہ اور مہمان خصوصی شیخ علی عبدالرحمٰن الحذیفی امامِ حرمین تھے۔ یہ کانفرنس ہمارے جانے سے ایک ماہ پہلے ہو چکی تھی۔ ساتھی پریشان تھے کہ یہ کیا ہوا؟ میں نے کہا ایسے بات نہیں بنے گی۔ آپ ان کا پورا تعارف لکھیں اور فائل بنائیں۔ میں نے واپسی عمرہ پر آنا تھا، میں نے کہا واپسی پر رابطہ عالم اسلامی والوں سے بات کروں گا۔ انہوں نے پوری فائل بنائی اور شیخ حذیفی اور فرخان کی ایک مجلس کی تصویریں بھی دیں۔ اس وقت کے رابطہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف تھے، میں مکہ مکرمہ میں مولانا عبدالحفیظ مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ فائل ان کو دکھائی، ہم دونوں مل کر رابطہ کے سیکرٹری جنرل سے ملے اور بتایا امریکہ میں یہ صورتحال ہے۔ اس کے بعد رابطے والوں نے ان سے رابطہ منقطع کر لیا۔ اتنا حصہ اس میں ہمارا بھی ہے۔

لوئس فرخان دنیا کے مختلف حصوں میں اپنے آپ کو مسلم امیریکن لیڈر قرار دے کر جاتے ہیں، کرنل قذافی صاحب کے ہاں لیبیا جاتے رہے ہیں، وہاں سالانہ میلاد کانفرنس ہوتی ہے اس میں ایک بار مہمان خصوصی تھے۔ میں نے وہی فائل جو رابطہ کے سیکرٹری جنرل کو دی تھی، اسی کی کاپی پاکستان آکر لیبیا کے سفارت خانے کو بھجوائی کہ یہ دیکھو یہ صورتحال ہے، مجھے اس کی وصولی کا خط بھی ملا تھا۔

لوئس فرخان بنگلہ دیش کے دورے پر آئے تھے تو وزیراعظم خالدہ ضیاء صاحبہ نے ایئرپورٹ پر ان کا استقبال کیا تھا اور وہاں کے ایک مولانا صاحب نے مجھے لندن میں بتایا کہ میں بھی ان کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھا کیونکہ مجھے تو پتہ نہیں تھا، میں نے سمجھا کہ مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہمارے یہاں محترم شیخ رشید صاحب جب وفاقی وزیر تھے

انہوں نے ان کو دعوت دی کہ آپ پاکستان آئیں ہم آپ کا استقبال کریں گے۔ اللہ کی قدرت کہ مجھے اور مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کو پتہ چل گیا تو ہم راجہ ظفر الحق صاحب سے ملے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ چونکے۔ یہ بھی اس وقت وزیر تھے، انہوں نے کہا، مجھے تو علم نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔ اس طرح یہاں کا دورہ ہم نے رکوایا ورنہ اسلام آباد بھی استقبال کے لیے تیار تھا۔

"نیشن آف اسلام" کی صورتحال میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہے۔

حضرات علماء کرام! میں نے آپ کے سامنے چند گروپوں کا ذکر کیا ہے جو اسلام کا نام استعمال کرتے ہوئے نئی نبوت اور وحی کے نام پر موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں، ان کا مختصر تعارف کروایا ہے۔ بڑا گروپ قادیانیت باقی ہے، اس کا تعارف کہ قادیانیت کیا تھی، کیا ہے، اب کیا جھگڑا چل رہا ہے، بین الاقوامی تنازعہ کیا ہے، اور مستقبل کے امکانات کیا ہیں؟ اس پر اگلی نشست میں قدرے تفصیل کے ساتھ بات ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۴) قادیانیت

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! آپ سے مدعیان نبوت کے حوالے سے گفتگو چل رہی ہے کہ ہمارے زمانے میں نئی نبوت اور نئی وحی کے عنوان سے جو گروہ قائم ہوئے اور اس وقت موجود اور مختلف علاقوں میں متحرک ہیں، ان میں سے ذکریوں، بہائیوں، خلیفہ رشاد اور نیشن آف اسلام ذکر کیا تھا۔ نئی نبوت کا دعویدار بڑا گروہ قادیانیت ہے، اس کا آج ذکر کرتے ہیں۔

چونکہ قادیانیت کا مسئلہ ہمارے علاقے برصغیر کا مسئلہ ہے، ہماری براہ راست ان کے ساتھ تقریباً سوا سو سال سے کشمکش چل رہی ہے، اس لیے زیادہ تر بات ان کے ہی بارے میں کی جاتی ہے اور زیادہ مسائل بھی ان کے حوالے سے ہی درپیش ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ختم نبوت کے حوالے سے جتنا کام ہوتا ہے نوے فیصد قادیانیوں کے حوالے سے ہوتا ہے۔ میں ساتھیوں سے کہا کرتا ہوں کہ دوسروں کا بھی کم از کم تعارف تو کروانا چاہیے۔ اس لیے میں نے آپ کو تین چار گروہوں سے متعارف کرایا ہے کہ وہ بھی اسی حوالے سے کام کر رہے ہیں اور ان سے بھی ہمیں مسائل درپیش ہیں۔ لیکن ہمارا آمنا سامنا اور محاذ آرائی قادیانیت سے ہے اور اعتقادی حوالے سے، سماجی حوالے سے، اور سیاسی حوالے سے ان کے ساتھ ہماری کشمکش چل رہی ہے۔ میں اس کو تین دائروں میں تقسیم کرتا ہوں:

1. ایک اعتقادی دائرہ ہے جس میں عام طور پر ہمارے مناظرے ہوتے ہیں۔

2. دوسرا سماجی دائرہ ہے کہ وہ ہمارے درمیان رہتے ہوئے کیسے رہیں گے۔

3. تیسرا سیاسی دائرہ ہے کہ ان کے سیاسی عزائم کیا ہیں، ان کے بارے میں سیاسی دنیا کا موقف کیا ہے، اور ہمارے ان کے ساتھ کیا تنازعات ہیں، وغیرہ۔ ان تینوں دائروں کو الگ الگ سمجھنا ضروری ہے۔

قادیانیت پر مسلم مناظرین

اعتقادی دائرہ میں تین چار بڑے مسئلے ہیں۔ قادیانیت کے ساتھ جب ہمارا مناظروں کے عروج کا دور تھا، اس میں استاد محترم فاتح قادیان حضرت مولانا محمد حیاتؒ جو مسلمان مناظرین میں سب سے بڑے مناظر تھے۔ باقی سبھی تقریباً ان کے شاگرد ہیں۔ مثلاً مولانا لال حسین اخترؒ، مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ وغیرہ۔ جبکہ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ، علامہ ڈاکٹر خالد محمود، مولانا عبدالرحیم اشعرؒ وغیرہ ہمارے بڑے بڑے مناظرین تھے۔ قادیانیوں میں قاضی نذیر احمد، جلال الدین شمس، ابوالعطاء جالندھری وغیرہ بڑے مناظر تھے۔ ان حضرات کے آپس میں بہت مناظرے ہوئے، ان میں زیادہ تر کون سے مسائل زیر بحث رہتے تھے وہ ذکر کرتا ہوں۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا مہدی و مسیح ہونے کا دعویٰ

مرزا قادیانی نے ابتدا یہاں سے کی کہ کہا میں مہدی موعود ہوں۔ امام مہدی کے بارے میں صورتحال یہ بھی ہے کہ جب وہ تشریف لائیں گے سو لائیں گے لیکن مہدی کے نام پر سینکڑوں فتنے دنیا میں پیدا ہو چکے ہیں، یہ امر واقع ہے۔ مہدی سوڈانی، ملا محمد اٹکی ذکری، مرزا غلام احمد قادیانی، بہاء اللہ شیرازی، مرزا محمد علی باب سب نے مہدیت کے دعوے کیے۔

مہدیت کے حوالے سے اسلام کا حوالہ دینے والوں میں تین بڑے دائرے ہیں:

1. ایک جمہور اہل سنت والجماعت کا دائرہ ہے کہ امام مہدی حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے، روایات میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں۔

2. دوسرا دائرہ اہل تشیع کا ہے، ان کے ہاں امام مہدی بارہویں امام تھے جو پیدا ہو چکے، اب غائب ہیں، وہ ظاہر ہوں گے۔

3. اور تیسرا دائرہ ان مہدیوں کا ہے جنہوں نے خود مہدی ہونے کے دعوے کیے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، پھر اس نے ایک اور قدم بڑھایا کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری کے بھی منتظر ہیں۔ اس پر قرآن کریم میں اشارات مثلاً "وانہ لعلم للساعۃ فلاتمترن بھا واتبعون" (الزخرف ٦١) اور جناب نبی کریمؐ کی واضح پیشین گوئیاں متواتر احادیث میں موجود ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ جدت کی کہ مہدی اور مسیح دونوں کو اکٹھا کر دیا کہ مہدی اور مسیح ایک شخصیت ہیں۔ اس پر مناظرے اور مکالمے چلتے ہیں۔

اہل اسلام کے ہاں مہدی الگ شخصیت ہے، مسیح الگ شخصیت ہے۔ چنانچہ وہ روایت آپ کے سامنے ہوگی کہ امام مہدی دمشق کی جامع مسجد میں فجر کی نماز کی تیاری کر رہے ہوں گے کہ اوپر مینار سے آواز آئے گی کہ میں مسیح ابن مریم ہوں سیڑھی لاؤ، چنانچہ سیڑھی لائی جائے گی اور وہ اتریں گے۔ لیکن مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ مسیح اور مہدی ایک ہی ہے اور وہ میں ہوں۔ اب مسیح ابن مریم بننے کے لیے مرزا کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ اہل اسلام کے عقیدے کے مطابق مسیح تو زندہ ہیں، ان پر موت نہیں آئی "وماقتلوہ وماصلبوہ ولکن شبہ لھم" (النساء ١٥٧) وہ زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے، قرب قیامت اتریں گے۔ اتنے واضح ارشاداتِ نبویؐ ہیں کہ ابہام کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن مرزا نے ابہام پیدا کر دیا۔ مرزا صاحب کا پہلے یہی عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں، اس کی صراحت مرزا صاحب کی پہلی کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن خود مسیح بننے کے لیے یہ عقیدہ گھڑنا پڑا کہ مسیح ابن مریم فوت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ مرزائی حضرات مناظرے میں سب سے زیادہ زور اس پر دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو گئے ہیں۔ جب کوئی شک میں پڑ جائے یا مان لے تو پھر کہتے ہیں، اب جو آئے گا وہ کون ہوگا؟ وہ مرزا قادیانی ہے۔

اس پر ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ ختم نبوت کے محاذ پر ہمارے بڑے بزرگوں میں مولانا محمد علی جالندھریؒ تھے۔ ایک دفعہ تقریر میں فرمایا مرزائی لوگ صدق وکذب مرزا پر بات نہیں کرتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی بات کرتے ہیں۔ مرزا کا مسیح سے کیا تعلق؟ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں یا فوت ہو گئے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا تمہیں اس سے کیا فائدہ؟ اگر بالفرض حضرت عیسیٰؑ فوت ہو بھی گئے ہوں تو اس سے یہ

نتیجہ کدھر سے نکل آیا کہ مرزا نبی ہے۔ ان کا ایک مستقل مسئلہ ہے کہ حیات ہیں یا نہیں۔ اس پر مولانا ایک کہاوت سنایا کرتے تھے کہ ایک گاؤں میں میراثی کا لڑکا ماں سے پوچھتا ہے کہ ماں! اگر گاؤں کا نمبردار مر گیا تو پھر نمبردار کون ہو گا؟ ماں نے کہا کہ پھر اس کا بیٹا نمبردار ہو گا۔ اس نے پوچھا، وہ بھی مر گیا پھر کون ہو گا؟ ماں نے بتایا پھر اس کا بھائی ہو گا۔ پوچھا، وہ بھی مر گیا تو کون ہو گا؟ ماں نے کہا اس کا بھتیجا ہو گا۔ پوچھا، وہ بھی مر گیا تو کون نمبردار ہو گا؟ ماں نے کہا، بیٹا میں سمجھ گئی ہوں، سارا گاؤں مر جائے تم نمبردار پھر بھی نہیں بنو گے۔ یہ سنا کر مولانا کہتے تھے کہ مرزا قادیانی کی نبوت کا حضرت عیسیٰ کے مرنے سے کیا تعلق ہے؟ اس سے تمہاری نبوت کہاں سے نکل آئی۔ بہرحال قادیانی حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے قائل ہیں اور سری نگر میں ان کی قبر مانتے ہیں۔ اور یہ موضوع رفع عیسیٰؑ اور حیاتِ عیسیٰؑ کا ہمارے اور ان کے درمیان مابہ النزاع اور مناظرے کا بڑا موضوع ہے۔

ختم نبوت کا عقیدہ

اعتقادی دائرے میں دوسرا مسئلہ یہ زیر بحث ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہو گئی ہے یا جاری ہے۔ اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوت اور وحی منقطع ہو چکی ہے، اس پر سینکڑوں احادیث میں واضح ارشادات ہیں کہ میرے بعد نبوت ختم ہو چکی۔ لیکن قرآن کریم کی کچھ آیات سے اشتباہ پیدا کر کے قادیانیوں کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہونا ٹھیک بات نہیں، نبوت تو چلتی رہتی ہے، چلتی رہے گی، نبوت اللہ کی رحمت ہے اور اللہ کی رحمت بند نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ہو گا کہ جو نبی آئے گا وہ حضورؐ کے تابع ہو گا۔ اہل اسلام نے یہ بات تسلیم نہیں کی، نہ مستقل نبی، نہ تابع نبی، کوئی نبی بھی نہیں آسکتا۔

حضورؐ کے زمانے میں دو مستقل نبی کھڑے ہوئے تھے اور ایک تابع نبی کھڑا ہوا تھا۔ اسود عنسی اور طلیحہ اسدی مستقل نبوت کے دعویدار تھے جبکہ مسیلمہ تابع نبی ہونے کا دعویدار تھا۔ مسیلمہ نے مقابلے کا دعویٰ نبی کریمؐ کی زندگی میں کبھی نہیں کیا، حضورؐ پر ایمان لاتا تھا، آپؐ کی رسالت کا پہلے اقرار لیتا تھا، پھر اپنی رسالت کا اقرار کراتا کہ میں بھی ان کی پیروی میں نبی ہوں۔ حضورؐ نے اس کے دعوے کو، کہ آپؐ کی پیروی میں نبی ہوں، مسترد کر دیا اور طلیحہ اسود کا مستقل نبی ہونے کا دعویٰ بھی رد کر دیا۔ لیکن قادیانی اشتباہ اور دجل کے امام ہیں ایسا دجل اور شبہ ڈالتے ہیں کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بھی پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔

متفرق مسائل

اس کے علاوہ یہ بھی گفتگو کا میدان ہے کہ کشف اور الہام، جس کو اہل اسلام بھی مانتے ہیں، بہت سے صوفیاء نے کشف و الہام کی باتیں کی ہیں، اس کو قادیانی وحی کی قسم بتلاتے ہیں کہ ان کو الہام ہو سکتا ہے تو مرزا پر وحی بھی آسکتی ہے۔

ہمارے مناظرین کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ نبی بننے کے لیے جو معیار درکار ہے مرزا اس معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں اترتا۔ صدق و کذب مرزا پر بات کرتے ہیں۔ نبوت کا پہلا معیار ہی یہ ہے کہ حضورؐ نے مکہ والوں سے پوچھا ''ھل وجدتمونی صادقا او کاذبا؟'' اپنے آپ کو پیش کیا۔ جبکہ مرزا دجل اور فریب کا امام تھا، تو مرزا اپنی تحریرات کے حوالے سے نبوت کا اہل ہے یا نہیں، اسی کو دیکھ لیں۔ کردار اور گفتگو کے حوالے سے دیکھ لیں۔

اس کے علاوہ ایک موضوع یہ ہوتا ہے کہ مرزا کی کتابوں میں کئی انبیاء کرامؑ کی گستاخی کی گئی ہے اور نبی کی گستاخی خود کفر ہے اور وجوہِ کفر میں سے ہے۔

یہ دائرہ اعتقادی دائرہ ہے۔ اس پر کتابیں، مناظرے اور مکالمے ہر سطح پر ہوتے رہتے ہیں۔ اس پر ایک مکالمے کا ذکر کرتا ہوں۔

پارلیمنٹ کے ذریعے قادیانیوں کی تکفیر

جب ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی میں یہ بل پیش ہوا کہ قادیانیوں کو دستور میں غیر مسلموں میں شمار کیا جائے تو بھٹو مرحوم نے کہا کہ یکطرفہ فیصلہ نہ کرو بلکہ قادیانیوں کو بھی بلا لو، ساری بات آمنے سامنے کر لو تاکہ کوئی کل یہ نہ کہہ سکے کہ تم نے فیصلہ یکطرفہ کیا تھا۔ بھٹو نے یہ اچھی بات کہی۔ بھٹو مرحوم کی کئی باتوں سے مجھے اختلاف ہے لیکن بھٹو کی جن باتوں کو میں سمجھداری کی باتیں سمجھتا ہوں ان میں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ بھٹو نے کہا کہ حکومتی فیصلہ نہ کراؤ، پارلیمنٹ سے فیصلہ لے لو تاکہ کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ مجھ سے فیصلہ کرانا ہے تو میں کر دیتا ہوں لیکن بہتر ہے پارلیمنٹ سے فیصلہ کراؤ تاکہ آج کے معیار کے مطابق قومی فیصلہ شمار کیا جائے۔

قادیانیوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک قادیانی، دوسرا لاہوری۔ قادیانیوں کے سربراہ مرزا ناصر احمد اور لاہوریوں کے سربراہ تھے مولوی صدر الدین۔ دونوں کو بلایا گیا۔ گیارہ دن تک مرزا ناصر احمد نے قومی اسمبلی کے ارکان سے بحث کی۔ تین دن مولوی صدر الدین نے بحث کی۔ صفائی کا پورا موقع دینے کے بعد فیصلہ کیا گیا۔ اس میں مسلمانوں کی طرف سے

بحث مباحثہ کرنے والوں میں پیش پیش یہ حضرات تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور سرکاری طور پر جناب یحییٰ بختیار جو اٹارنی جنرل تھے سب سے زیادہ بحث انہوں نے کی تھی۔

لیکن یہ بات حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ہمیں ایک موقع پر جمعیت کی شوریٰ کی میٹنگ میں بتائی کہ اس مباحثے کے دوران، جو چودہ دن چلتا رہا ہے، ایک دن بھٹو صاحب نے مجھے کہا کہ مفتی صاحب! بات الجھتی جا رہی ہے، آپ بھی قرآن کی آیتیں پڑھتے ہیں، وہ بھی آیتیں پڑھتے ہیں، بیسیوں آیات سے استدلال کرتے ہیں، وہ خاتم کا معنیٰ کچھ اور کرتے ہیں، آپ کچھ اور کرتے ہیں، حدیثیں وہ بھی پڑھتے ہیں، آپ بھی پڑھتے ہیں، وہ بھی لغت کی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں، آپ بھی دیتے ہیں۔ ہم لوگ (جو دینی علم نہیں رکھتے ان بحثوں کو نہیں جانتے) کنفیوژ ہو رہے ہیں۔

آپ سے عرض کروں کہ قادیانیوں کی سب سے بڑی تکنیک یہی ہوتی ہے کہ سامنے والے کو کنفیوژن میں ڈال دو کہ وہ الجھا ہی رہے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔ ہر مسئلہ میں شک پیدا کرنا اور الجھانا ان کا کام ہوتا ہے۔ عام آدمی حتیٰ کہ عام عالم دین جو قادیانیت کے لٹریچر سے واقف نہیں ہے، ان کے طریقہ واردات سے واقف نہیں ہے، اگر وہ بحث مباحثہ کرے گا تو وہ بھی کنفیوژن کا شکار ہو جائے گا۔ جس کی قادیانیت کی تاریخ، لٹریچر اور طریقہ واردات پر گہری نظر ہوگی، وہی بحث مباحثہ کر سکتا ہے، دوسرا تو خود کنفیوژ ہو جائے گا۔

تو بھٹو مرحوم نے کہا کہ قرآن سے کوئی واضح آیت بتائیں جس میں ہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ مولانا مفتی محمودؒ کہتے تھے کہ ایک دفعہ تو میں بھی چکرا گیا کہ یہ کیا ہوا۔ اگر اسمبلی کا لیڈر کنفیوژ ہو گیا ہے تو پھر ساری اسمبلی کنفیوژ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذہن میں بات ڈالی۔ میں نے کہا قرآن کریم کی پہلی سورت کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے اور فرما دیا ہے کہ "والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاخرۃ ھم یوقنون" (البقرہ ۴)۔ متقین اور مومنین وہ ہیں جو اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی ہے اور جو آپ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر بعد میں بھی وحی آنی ہوتی تو "ومن بعدک" بھی فرمایا جاتا۔ بھٹو صاحب کو بات سمجھ آ گئی کہ قرآن کہتا ہے وحی حضورؐ سے پہلے ہی ہے، بعد میں نہیں ہے۔ بہرحال یہ اعتقادی دائرہ ہے اس قسم کے مسائل پر مناظرہ مباحثہ مکالمہ چلتا رہا لیکن اب قادیانیوں نے ایک عرصہ سے مناظرے کا میدان چھوڑ رکھا ہے۔

مباہلے کا میدان

ایک میدان مباہلے کا ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی نے خود چھیڑا تھا۔ مباہلے کے چیلنج کرتا رہا، کبھی عیسائی پادریوں کو، کبھی مسلمان علماء کو۔ اس کا ایک بڑا مشہور مباہلے کا چیلنج ہے، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری جو اہل حدیث اور اکابر علماء میں سے تھے، شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں سے اور جمعیت علماء ہند کے بانیوں میں سے ہیں۔ جمعیت علماء ہند کا تاسیسی اجلاس امرتسر میں ان کے گھر میں ہوا تھا۔ ان کا بڑا میدان مناظرہ کا تھا، بہت زبردست مناظر تھے، آریہ سماج ہندوؤں کے خلاف بھی، عیسائیوں کے خلاف بھی، قادیانیوں کے خلاف بھی، اور حنفیوں کے خلاف بھی بڑے مناظر تھے۔ محدث گوجرانوالہ حضرت مولانا عبد العزیزؒ اور مولانا امرتسری کا فاتحہ خلف الامام پر مشہور مناظرہ ہے۔ تحریری مناظرہ چھپا ہوا ہے جس میں دونوں نے حکم مولانا سید سلیمان ندویؒ کو مانا تھا اور سید سلیمان ندویؒ نے فیصلہ دیا تھا کہ اس میں مولانا عبد العزیز صاحبؒ کا موقف ٹھیک ہے۔ مرزا سے بھی مولانا امرتسری کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ امرتسر سے ان کا پرچہ نکلتا تھا۔ مرزا نے ان کو مباہلے کا چیلنج دے دیا اور کہا اگر مولوی ثناء اللہ سچا ہے تو میں اس کی زندگی میں اتنے عرصے کے اندر ذلت کی موت مر جاؤں، اور اگر میں سچا ہوں تو مولوی ثناء اللہ میری زندگی میں اتنے عرصے کے اندر ذلت کی موت مر جائے۔ اس پر اشتہار چھاپے، کتابیں چھاپیں، دنیا میں ڈھنڈورا پیٹا کہ مولوی ثناء اللہ کی خیر نہیں ہے۔ اس چیلنج کے ایک سال کے اندر مرزا غلام احمد قادیانی صاحب لاہور میں بیت الخلا میں فوت ہو گئے، جبکہ مولانا امرتسری اس کے بعد چالیس سال تک حیات رہے۔

پھر مباہلے کا ایک اور میدان سامنے آیا۔ حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ پاکستان بننے کے بعد چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ چنیوٹ کے قریب ربوہ میں قادیانیوں نے اپنا مرکز بنا لیا۔ مولانا چنیوٹیؒ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا بدر عالمؒ کے شاگرد تھے۔ بڑے مناظر اور متکلّم قسم کے بزرگ تھے۔ ہمارا تو زندگی بھر ساتھ رہا ہے، کم و بیش چالیس سال ہم نے اکٹھے کام کیا ہے۔ انہوں نے مباہلے کا ایک نیا رخ اختیار کیا۔ ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود قادیانیوں کے سربراہ تھے جو مرزا غلام احمد کے بیٹے تھے، ربوہ آ گئے تھے۔ مولانا چنیوٹیؒ نے مرزا بشیر الدین محمود کو چیلنج دے دیا کہ مناظرے چھوڑو، دریائے چناب کے اس طرف آپ رہتے ہیں، اس طرف میں رہتا

ہوں، درمیان میں ایک خشک پٹی ہے، وہاں دونوں جمع ہوتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم میں سے جو جھوٹا ہے اسے برے انجام کا شکار کر۔

قادیانیوں کی طرف سے کہا گیا کہ تم ایک عام مولوی ہو، کس کے نمائندے ہو؟ اس وقت کی چار بڑی جماعتوں جمعیت علماء اسلام، مجلس تحفظ ختم نبوت، تنظیم اہل سنت، اور جمعیت اشاعۃ التوحید والسنۃ کے بڑے بزرگوں، جمعیت علماء اسلام کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، تحفظ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد علی جالندھریؒ، تنظیم اہلسنت کے امیر حضرت مولانا نور الحسن شاہ بخاریؒ، اور جمعیت اشاعۃ التوحید والسنۃ کے قائد حضرت مولانا غلام اللہ خان سے لکھوایا کہ یہ ہمارا نمائندہ ہے، اس کی فتح و شکست ہماری فتح و شکست ہوگی۔ اس وقت دیوبندیوں کے دائرے میں بڑی جماعتیں یہی تھیں۔ مولانا چنیوٹیؒ نے اس کے بعد اعلان کیا کہ میں سب کا نمائندہ ہوں، سب سے نمائندگی لے لی ہے، تاریخ مقرر کی، دریائے چناب کے درمیان خشک پٹی پر گئے، سارا دن انتظار کرتے رہے لیکن مرزا بشیر الدین محمود صاحب نہیں آئے۔ اس کے بعد مولانا چنیوٹیؒ کا ہر سال معمول رہا کہ ۲۶ فروری کو باقاعدہ اعلان دہراتے، اشتہار چھاپتے اور وہاں جاتے۔ اب ان کے بعد مولانا محمد الیاس چنیوٹیؒ جاتے ہیں اور فتح مباہلہ کانفرنس بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی مباہلہ کا دائرہ ہے جو چلا آرہا ہے۔

ایک دائرہ مباہلہ کا اور تھا۔ مرزا طاہر احمد نے، جو سربراہ بنے مرزا ناصر احمد کے بعد، دنیا بھر کے بڑے بڑے مسلم علماء کو دعوت دی مباہلہ کی، کہ اللہ جھوٹے کا جھوٹ ظاہر کر دے۔ کتابچہ چھاپ کر دنیا کے مشہور علماء کو بھیجا، مجھے بھی بھیجا گیا۔ میں اس وقت جمعیت علماء اسلام پاکستان کا سیکرٹری اطلاعات اور مشترکہ مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا رابطہ سیکرٹری تھا، مجھے لندن سے رجسٹری ڈاک کے ذریعے وہ کتابچہ ملا۔ میں بھی اس کے مباہلہ کے مخاطبین میں تھا۔ اس کے جواب میں نے تفصیلی خط لکھا جو روزنامہ جنگ لندن اور ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں چھپا، اب اس کی دوبارہ اشاعت ہوئی ہے۔ اس وقت مباہلہ قبول کرنے کا اعلان جن شخصیات نے کیا ان میں مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ، پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری دامت برکاتہم تھے۔ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ نے مباہلہ قبول کرتے ہوئے اعلان کیا کہ لندن آرہا ہوں، وہاں مباہلہ کریں گے۔ میں نے خط لکھا کہ مجھے چیلنج قبول ہے، ہمارے ان تین

حضرات نے مباہلہ قبول کیا ہے، ان میں سے جس کی دعوت آپ قبول کریں گے مجھے آپ ان کے ساتھ موجود پائیں گے۔ اس پر قادیانی تاویلیں کرنے لگے کہ مباہلے کا یہ مطلب نہیں تھا، ہم نے بھی لکھ دیا آپ نے بھی لکھ دیا، بس کافی ہے، میدان میں آنا ضروری نہیں ہے۔

لندن میں ہائیڈ پارک، جو لندن کے وسط میں بہت بڑی پارک ہے، اس کا ایک کونہ ہے جو ہائیڈ پارک کارنر کہلاتا ہے، یہ کونہ قانون سے بالاتر سمجھا جاتا ہے گفتگو کے حوالے سے۔ وہاں جو کوئی جو کچھ کہنا چاہے کہے، کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔ کوئی خدا کے خلاف بات کرے یا رسول کے خلاف کرے، جو چاہے کہے۔ شام کو بڑا عجیب منظر ہوتا ہے کہ مختلف ٹولیوں میں لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر ٹولی میں ایک ایک آدمی اپنی بھڑاس نکال رہا ہوتا ہے۔ پریشر ککر کی طرح غصہ نکال کر ٹھنڈے ہو کر گھر چلے جاتے ہیں۔ مولانا چنیوٹیؒ نے کہا میں فلاں تاریخ کو ہائیڈ پارک کارنر آرہا ہوں تم بھی آجاؤ، مرزا طاہر بھی لندن میں تھے لیکن وہ نہیں آئے۔ مولانا چنیوٹیؒ اپنے ساتھیوں سمیت ایک نہیں دو دفعہ وہاں گئے۔ بہرحال مباہلے کا ایک دائرہ یہ ہے۔

حسن عودہ کا قبولِ اسلام

اس کے نتیجے کے طور پر ایک بات عرض کروں گا کہ مرزا طاہر احمد کے سیکرٹری تھے فلسطینی نوجوان حسن عودہ، اس کے نانا قادیانی ہوئے تھے۔ اس کا خاندان قادیان آگیا تھا۔ حسن عودہ کی پرورش قادیان میں ہوئی، یہ قادیانیوں کے عربی جریدے کے ایڈیٹر تھے۔ میں نے ان سے انٹرویو کیا ہے۔ یہ اس زمانے میں مسلمان ہو گئے، دوست ہیں، میں نے ان کو کہا ”حَسَنَ عَودُۃ“۔ انہوں نے لندن میں مولانا چنیوٹیؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ویمبلے کانفرنس میں تقریر کی اور کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں مرزا ناصر احمد کی دعوت مباہلہ کا پہلا ثمرہ ہوں ”انا اول ثمرۃ المباھلۃ“ کہ اسے چھوڑ کر اسلام قبول کر رہا ہوں۔

قادیانیوں کے ساتھ سماجی معاملہ

سماجی دائرہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے بہت پیروکار ملے۔ جماعت احمدیہ کا پھیلاؤ ہوا۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وہ ہمارے درمیان رہتے ہیں، حکومت ہماری نہیں ہے، مسلم حکومت ہوتی تو معاملات نمٹ چکے ہوتے۔ یہ مسئلہ کیوں پیدا ہوا، یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ جب پیدا

ہوا حکومت غیر مسلموں (انگریزوں) کی تھی، فیصلہ کرنے والی اتھارٹی غیر مسلم تھی۔ ہم غیر مسلموں کے تحت تھے، اب قادیانیوں کے ساتھ معاشرتی برتاؤ کیا ہوگا؟ یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ہمارے غلبے کے دور کے مسائل کی نوعیت اور ہے اور مغلوبیت کے دور کے مسائل کی نوعیت اور ہوتی ہے۔ بہت سے مسائل میں ہمیں اس وجہ سے نیا رخ اختیار کرنا پڑا۔ جبکہ ہماری فقہ کی ترتیب و تدوین غلبے کے دور کی ہے جہاں ہمارا اپنا معاشرہ ہو، ہماری حکومت اور ہمارا انظام ہو۔ مگر پچھلے دو تین سو سال میں ہمیں یہ بھی پیش آیا کہ ہم مغلوب ہو گئے، بحیثیت قوم غلام ہو گئے، حالات متغیّر ہو گئے۔ اب یہ نئی بات تھی کہ غیر مسلموں کے غلبے میں ان کے ماتحت وقت گزاریں گے تو کیسے؟ اس کے نئے تقاضے پیدا ہو گئے، اس سے بیسیوں مسائل پیدا ہوئے۔

مثلاً ایک مسئلہ یہ کہ احناف کے ہاں جمعہ کے انعقاد کی شرائط میں ”سلطان او نائبہ“ شرط ہے۔ اب سلطان تو ختم ہو گیا، غیر مسلم سلطان بن گئے، اب کیا کریں؟ بعض حضرات نے جمعہ ساقط کر دیا کہ اب جمعہ فرض ہی نہیں ہے، جمعہ کی جگہ ظہر پڑھنے کا حکم دیا۔ لیکن پورے برصغیر میں جمعہ مستقل معطل کر دینا امت کے اجتماعی مفاد کے خلاف تھا۔ اس وجہ سے ہم نے مسلم سلطان کے آنے تک اس شرط میں تبدیلی کی اور مسجد کے نمازیوں کی اجتماعی رائے کو سلطان او نائبہ کا قائمقام قرار دیا۔ جس کے امام اور خطیب ہونے پر نمازی متفق ہوں وہی سلطان کا نائب ہے۔ اس سے یہ شرط پوری ہو جاتی ہے اور جمعے کو تعطل کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اسی حوالے سے ہمارے بعض مفتیان کرام کا فتویٰ چلا آ رہا ہے اور عمل بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ہم ایک بڑی شرط کے بغیر مجبوری کے تحت جمعہ پڑھ رہے ہیں اس لیے جمعہ بھی پڑھا جائے اور ظہر احتیاطی بھی پڑھی جائے۔ ظہر احتیاطی کا بھی پس منظر ہے۔ مولانا احمد رضا خانؒ کا فتویٰ یہی ہے۔ غلبے کے دور میں نوعیت اور تھی اور مغلوبیت کے دور میں نوعیت اور تھی۔

علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز

بالکل یہی صورتحال ہمیں قادیانیت کے حوالے سے پیش آئی، غلبے کے دور میں مدعیان نبوت اور ان کے پیروکاروں سے نمٹنا حکومت کا کام تھا لیکن مغلوبیت کے دور میں کس نے کیا کرنا تھا اور اب معاملہ کیا ہوگا؟ اس پر علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز یہ تھی اور انہوں نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ قادیانی ہمارے ساتھ معاشرے میں رہیں لیکن انہیں

ہمارے ساتھ شمار نہ کیا جائے، ان کو غیر مسلم گروہ کے طور پر ڈیل کیا جائے۔ یہ بات سب سے پہلے علامہ محمد اقبالؒ نے کہی تھی کہ ان کے عقائد ہمارے عقائد سے مختلف ہیں جن کی وجہ سے یہ مسلمان نہیں ہیں، اگرچہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس لیے ان کو غیر مسلم اقلیت کے طور پر ڈیل کیا جائے۔ جب اقبالؒ نے یہ کہا کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں تو اس پر اقبال کا پنڈت جواہر لال نہرو سے مکالمہ بھی ہوا۔ نہرو نے کہا، قادیانی کلمہ پڑھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، کعبے کو مانتے ہیں، قرآن بھی پڑھتے ہیں، پھر مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ انگلش مکالمہ تھا، اب اردو میں چھپ گیا ہے۔ قادیانیت کو آج کے سماجی تناظر میں سمجھنے کے لیے سب سے بہتر مکالمہ ان دونوں کا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات سے میں کہا کرتا ہوں کہ اگر ہماری باتیں آپ کو سمجھ نہیں آ رہیں تو اقبالؒ کو پڑھ لو۔ اقبالؒ آپ کو سمجھا دے گا کہ قادیانی مسلمان کیوں نہیں ہیں۔ لیکن جب پاکستان بنا تو اس کی نوعیت پھر بدل گئی، اب سابقہ پوزیشن (مسلم حکومتوں والی) پر واپس جانا ہے یا اس پوزیشن (انگریز کے دور والی) پر رہنا ہے؟

۱۹۵۳ء میں تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام نے ایک اجماعی اور اجتہادی فیصلہ کیا۔ میں اسے پاکستان کے علماء کا بڑا اجماعی اور اجتہادی فیصلہ کہا کرتا ہوں۔ انہوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ چنانچہ طویل تحریک کے بعد ۱۹۷۴ء میں دستور میں یہ فیصلہ ہوا اور اس وقت سے قادیانی غیر مسلم اقلیت کے طور پر چلے آ رہے ہیں۔

آج میں نے قادیانیت کے حوالے سے دو دائرے ذکر کیے ہیں:

1. پہلا اعتقادی دائرہ جس میں مناظرے کا میدان اور مباہلہ کا میدان ہے۔

2. اور دوسرا سماجی دائرہ جس میں اقبالؒ کی تجویز، اقبال اور نہرو کا مکالمہ، اور پاکستان کے علماء کا اجماعی فیصلہ ہے۔

3. اس کے بعد تیسرا دائرہ سیاسی دائرہ ہے جو آج کل زیر بحث ہے اور تفصیل کا متقاضی ہے۔

چند معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ — دورِ اول کے مدعیانِ نبوت

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۷ مئی ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ- حضرات علماء کرام! آج منحرف مذاہب کے حوالے سے بات کریں گے۔ منحرف مذاہب سے مراد وہ مذاہب ہیں جو نام اسلام کا لیتے ہیں لیکن نئی نبوت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ میں نے ان کو منحرف مذاہب کا عنوان صرف فرق بتانے کے لیے دے رکھا ہے ورنہ تو یہ غیر مسلموں میں ہی ہیں۔ یہ اس وقت کون کون سے ہیں؟

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد اب تک بہت سے لوگوں نے مختلف ادوار میں مختلف علاقوں میں نبوت اور نئی وحی کا دعویٰ کیا۔ آنحضرتؐ نے اپنی امت میں تیس مدعیان نبوت کی پیشینگوئی بھی فرمائی تھی۔ ”سیکون فی امتی“ میری امت کہلانے والے۔ ”ثلاثون کذابون دجالون“ اور ایک روایت میں ”سبعون کذابون دجالون“ بھی ہے کہ نبوت کے ستر دعویدار پیدا ہوں گے۔ ”یزعم انہ نبی“ دعویٰ یہ کریں گے کہ ہم اللہ کے نبی ہیں، جبکہ میں ہی آخری نبی ہوں۔

پہلے میں ان کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو دور نبویؐ اور دور صحابہؓ میں مدعیان نبوت تھے۔ یہ کون کون تھے اور ان کا دعویٰ کیا تھا اور حضورؐ اور صحابہؓ کا ان کے ساتھ طرز عمل کیا تھا۔ وہاں سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے کہ اگر کسی مسلم سوسائٹی میں کوئی نبوت اور وحی کا دعویٰ کرے تو مسلم سوسائٹی کا اس کے بارے میں کیا طرز عمل ہونا چاہیے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں تین شخصوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، مسیلمہ، طلیحہ اور اسود عنسی۔ چوتھی ایک خاتون ہے سجاح، جس نے آپؐ کی وفات کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا۔

(۱) مسیلمہ

مسیلمہ یمن حجاز کے علاقے کا تھا، بنو حنیفہ قبیلے کا سردار تھا، اسے اپنی فصاحت وبلاغت پر بڑا ناز تھا، اس کی قوم بھی اس کے ساتھ تھی۔ جناب نبی کریمؐ کی نبوت، وحی اور دین کا دائرہ پھیلتے دیکھ کر اسے شوق آیا کہ میں بھی ایک علاقے کا بڑا آدمی ہوں، اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور ”الفاروق“ کے نام سے وحی کا مجموعہ بھی بنایا، اس کی بہت سی آیات نشانی اور علامت

کے طور پر مختلف مفسرین نے نقل کی ہیں۔ لیکن ایک بات جو عام طور پر ہم نظرانداز کر جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسیلمہ نے آپؐ کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ آپؐ کے مقابلے پر نہیں کیا بلکہ حضورؐ کی تابعداری کے دعوے کے ساتھ کیا۔ وہ پہلے آنحضرتؐ کی رسالت کا اقرار کرواتا تھا اور پھر اپنی نبوت ورسالت کی بات کرتا تھا۔ وہ آپؐ کی نبوت کی نفی کر کے نبوت کا مدعی نہیں تھا۔ احادیث میں اس کے بہت سے قرائن موجود ہیں۔

پہلے شہیدِ ختمِ نبوت حبیب بن زید انصاریؓ جنھوں نے مسیلمہ کذاب کے ہاتھوں شہادت پائی، ان کو جب مسیلمہ کے سامنے پیش کیا گیا تو مسیلمہ نے ان سے جو سوال کیے ان میں پہلا سوال تھا "اتشھد ان محمداً رسول اللّٰہ ؟"۔ فرمایا "اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ"۔ پھر سوال کیا "اتشھد انی رسول اللّٰہ ؟" فرمایا، نہیں۔ اس پر اس نے آپؓ کو شہید کیا۔

بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے وہ خط مذکور ہے جو مسیلمہ نے آپؐ کو لکھا تھا، اس خط کا عنوان تھا "من مسیلمۃ رسول اللّٰہ الی محمد رسول اللّٰہ" مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کے نام۔ آگے خط کا مضمون یہ تھا "اشرکت معک فی الامر ولکن قریشا قوما یعتدون" مجھے نبوت کے معاملے میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہے لیکن قریش بڑے ظالم لوگ ہیں کسی کا حق تسلیم نہیں کرتے۔ یعنی اس کا دعویٰ شریک نبی کا تھا، حضورؐ کی نبوت کے ساتھ شراکت کا تھا۔

اس کے سفیر جو اس کا خط لے کر آپؐ کی خدمت میں آئے تھے، ان سے جناب نبی کریمؐ نے پوچھا "اتشھد انی رسول اللّٰہ ؟" تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو انہوں نے کہا "نشھد انک رسول اللّٰہ" ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر آپؐ نے ان سے پوچھا "اتشھد ان مسیلمۃ رسول اللّٰہ ؟" کیا تم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا "نعم نشھد ان مسیلمۃ رسول اللّٰہ" ہم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ حضورؐ نے ان کے جواب میں ایک جملہ ارشاد فرمایا، وہی ہمارے دینی ردعمل اور دینی فیصلے کی بنیاد ہے۔ فرمایا "لولا ان الرسل لا تقتل لضربتا عنا قکما" اگر یہ قاعدہ قانون نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا کہ مجھے رسول ماننے کے بعد کسی اور کو اللہ کا رسول ماننا یہ تو ارتداد ہے اور ارتداد کی سزا قتل ہے۔ لیکن چونکہ بین الاقوامی ضابطہ ہے کہ قاصد کو قتل نہیں کیا جاتا اس لیے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔

اس پر السنن الکبریٰ میں امام بیہقیؒ نے حضرت عثمانؓ کے زمانے کا واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ میں منصب قضا پر فائز تھے، ایک دن آپؓ کوفہ کے بازار میں جا رہے تھے کہ ایک شخص پر نظر پڑی۔ شک پڑنے پر اسے بلوایا اور فرمایا تجھے کہیں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسیلمہ کا خط لے کر جو دو آدمی حضورؐ کی خدمت میں آئے تھے، ان میں ایک تم تھے۔ اس کا نام ابن نواحہ تھا۔ اس نے کہا، ہاں ان دو میں سے ایک میں تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے پوچھا کیا اب بھی مسیلمہ کو اللہ کا رسول مانتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی مانتا ہوں۔ آپؓ نے پوچھا اب تم کسی قوم کے سفیر تو نہیں ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ اس پر اسے گرفتار کر لیا اور ضابطے کے مطابق تین دن کی مہلت دی، تین دن تک اس نے توبہ نہ کی تو عبداللہ بن مسعودؓ نے اسے قتل کرا دیا اور اس کی لاش کوفہ کے بازار میں لٹکا دی کہ حضورؐ کے بعد کسی کو نبی ماننے والے کی سزا یہ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیلمہ کی نبوت کو ماننے والے حضورؐ کی نبوت کو بھی مانتے تھے۔ اور بھی شواہد ہیں جو میں ابھی نظر انداز کر رہا ہوں۔ چنانچہ مسیلمہ نے خط میں تقاضا بھی یہی کیا کہ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ شریک نہیں مانتے تو پھر آپ مجھے اپنا جانشین نامزد کر دیں، یا پھر تقسیم کر لیجیے "لنا وبر ولک مدر" شہری حلقے آپ کے اور دیہاتی حلقے میرے۔ یعنی شہروں کے نبی آپ ہوں گے اور دیہاتوں کی نبوت میرے سپرد کر دیں۔

مسیلمہ ایک دفعہ خود جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں بہت بڑا جرگہ لے کر آیا، رسول اللہ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ آپؐ اس سے ملاقات کے لیے جب تشریف لے گئے تو اپنے ساتھ ثابت بن قیس بن شماسؓ کو لے کر گئے جو خطیب الانصار، خطیب رسول اللہ کے القاب سے ملقب تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ مسیلمہ کا بڑا زعم خطابت کا تھا، اور مذاکرات بھی انہی کے حوالے کیے۔ مسیلمہ کی پیشکش کے جواب میں دو جملے فرمائے کہ "ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ" (الاعراف ۱۲۸)۔ خلافت دینا، شہر دیہات تقسیم کرنا میرا کام نہیں یہ اللہ کا کام ہے، وہ جس کو چاہے خلافت دے گا، جسے چاہے گا شہر دے گا جسے چاہے گا دیہات دے گا، یہ اللہ کا کام ہے، اس میں مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور تم ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکو گے، اگر تم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اللہ تمہاری جڑ کاٹ دے گا۔ اس کے بعد فرمایا، میں اپنا نمائندہ ثابت بن قیس چھوڑ کر جا رہا ہوں اب تم جانو اور یہ جانے، باقی مذاکرات اس سے کر لو۔

میں نے اس سے یہ بات واضح کی ہے کہ مسیلمہ کا دعویٰ آپ کی نبوت کو مانتے ہوئے آپ کے ساتھ کارِ نبوت میں شراکت کا تھا۔ جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں مسیلمہ مقابلے پر نہیں آیا، دور صدیقی میں چونکہ اس کا مطالبہ خلافت کا بھی تھا، وہ مقابلے پر آیا اور پھر جو ہوا تفصیلات آپ کے علم میں ہیں۔

(۲) طلیحہ اسدی

طلیحہ بن خویلد اسدی، بنو اسد قبیلے کا تھا۔ بنو اسد خیبر کے علاقے کا قبیلہ تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، دعویٰ کر کے لشکر اکٹھا کیا اور بغاوت کر دی۔ جناب نبی کریمؐ نے معروف کمانڈر ضرار بن ازور کو حکم دیا کہ طلیحہ سے جا کر نمٹو۔ یہ گئے اس سے مقابلہ ہوا، طلیحہ شکست کھا کر بھاگ گیا اور بھاگا رہا۔ جب وصال نبویؐ کے بعد مسیلمہ اور مرتدین کے ساتھ جنگیں ہوئیں تو پھر اپنے علاقے میں آیا اور لشکر اکٹھا کر کے مقابلے پر آ گیا۔ پہلی جنگ میں معروف صحابی عکاشہ بن محصن فزاری اسدیؓ، جو بڑے کڑیل خوبصورت نوجوان تھے اور طلیحہ کے کزن تھے، ان کا اور طلیحہ کا آمنا سامنا ہوا تو طلیحہ کے ہاتھوں حضرت عکاشہؓ شہید ہو گئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ مسیلمہ کذاب کے لشکر کو شکست دے کر واپس تشریف لا رہے تھے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو حکم دیا کہ راستے میں طلیحہ کا قضیہ بھی نمٹاتے آؤ۔ پھر طلیحہ کا مقابلہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ ہوا، اس میں پھر شکست کھائی، بھاگ گیا اور روپوش ہو گیا۔

ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں تفصیل سے یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں طلیحہ نمودار ہوا لیکن نبوت کے دعوے پر نہیں بلکہ نبوت سے توبہ کر لی۔ اب یہ اس تلاش میں تھا کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی ذمہ دار آدمی سفارشی بن کر میرے ساتھ چلے تو میں جا کر توبہ کر لوں، وہ میری بات سنے بغیر ہی کوئی فیصلہ نہ فرما دیں۔ یہ آج کل بھی ہوتا ہے کہ کوئی بڑا مجرم ہو تو سرنڈر ہونے سے پہلے کسی کو درمیان میں ضامن بناتا ہے، تھانے میں پیش ہونے کے لیے بھی، تاکہ پتہ ہو کہ یہ پیش ہوا ہے، ویسے ہی کہیں ”پار“ نہ ہو جائے۔ بہر حال کسی نے اسے بتایا کہ حضرت خالد بن ولیدؓ اس علاقے میں آئے ہوئے ہیں ان سے مل لو۔ اس نے کہا نہیں! اس کے پاس نہیں جانا وہ تو مجھے مار دے گا، کوئی اور آدمی بتاؤ۔ لوگوں نے بتایا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ ہیں۔ اس نے کہا، ہاں وہ ٹھیک ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص میں اللہ تعالیٰ نے تینوں صلاحیتیں رکھی تھیں کہ (۱) جنگ کے آدمی بھی تھے، (۲) میز کے آدمی بھی تھے، (۳) اور ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ حالانکہ اعلیٰ سطح پر یہ تینوں صلاحیتیں بہت کم اکٹھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ طلیحہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس آیا اور کہا میں توبہ کرنا چاہتا ہوں اور امیر المؤمنین کے سامنے پیش ہونا چاہتا ہوں، آپ مجھے گارنٹی کے ساتھ حضرت عمرؓ سے ملوادیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ پھر مدینہ میں حضرت عمرؓ کے سامنے اسے پیش کیا، اس نے اپنا تعارف کرایا کہ میں طلیحہ ہوں۔ فرمایا، میں نے پہچان لیا ہے۔ کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا ایمان قبول کرنے آیا ہوں، توبہ کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، توبہ تو تم کرلو گے لیکن میں عکاشہؓ کا کیا کروں گا، مجھے وہ نہیں بھولتا جو تمہارے ہاتھوں جنگ میں مارا گیا۔

طلیحہ بڑا ذہین آدمی تھا، اس نے جواب دیا، حضرت!

1. کیا آپ اس بات پر خوش نہیں ہیں کہ اللہ رب العزت نے اس کو میرے ہاتھوں جنت میں پہنچا دیا اور مجھے اس کے ہاتھوں جہنم میں نہ جانے دیا۔

2. دوسری بات اس نے یہ کی کہ حضرت! کیا کل قیامت کے دن آپ کو یہ منظر اچھا نہیں لگے گا کہ میں اور عکاشہ قاتل و مقتول دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جنت میں جا رہے ہوں گے۔

اس کی یہ باتیں سن کر حضرت عمرؓ مسکرائے اور فرمایا، ٹھیک ہے کلمہ پڑھو۔ اس نے کلمہ پڑھا، توبہ کی، ایمان قبول کیا، ایک صالح مسلمان کی حیثیت سے باقی زندگی گزاری، اور ایران کی کسی جنگ میں شہید ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ کا تذکرہ کرنے والے محدثین حافظ ابن حجر، ابن عبد البر، ابن الاثیر وغیرہ نے طلیحہؓ کا ذکر صحابہؓ میں اور شہداء میں کیا ہے۔

(۳) اسود عنسی

تیسرے مدعی نبوت اسود عنسی کا تعلق یمن سے تھا۔ یمن کا علاقہ لڑائی سے فتح نہیں ہوا تھا، اکثر قبائل خود حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ آپؐ نے یمن کے ایک حصے کا گورنر حضرت معاذ بن جبلؓ اور ایک حصے کا گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو مقرر فرما دیا۔ محصولات کی وصولی کے لیے حضرت علیؓ کو بھیجا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ بھی بعض علاقوں میں گئے، یہ سب حضرات مختلف ڈیوٹیوں پر یمن میں تھے، پورا یمن آپؐ کی حیات مبارکہ میں اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا تھا۔ لیکن صنعاء کے ایک سردار عیہلہ یا عبہلہ، جس کا

رنگ کالا ہونے کی وجہ سے اسود کہلاتا تھا، نے بغاوت کر دی، اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا، وہ شعبدے بھی دکھایا کرتا تھا، اس کو بھی اپنی خطابت پر ناز تھا۔ اس نے آپؐ کے صنعاء پر مقرر کردہ گورنر شہر بن بازانؓ کو شہید کر دیا، شاہی محل پر قبضہ کر لیا اور اعلان کر دیا کہ یمن کا دارالحکومت میرے قبضہ میں ہے۔

بعض روایات کے مطابق حضورؐ کے چند عمّال یمن سے نکل کر نجران میں آ گئے تھے۔ رسول اللہ کی بیماری کا آغاز ہو چکا تھا، آپؐ کے آخری ایام تھے، آپؐ کو خبر ملی کہ اسود نے صنعاء کے علاقے میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے، تو آپؐ نے مجلس میں ذکر کیا کہ کون ہے جو اس کو سنبھالے گا؟ تو یمن کے علاقے سے تعلق رکھنے والے اسود کے قبیلے کے صحابی حضرت فیروز دیلمیؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کی اجازت سے یمن جا کر ایک جتھہ بنایا، ان سے آمنے سامنے جنگ نہیں کی بلکہ چھاپہ مار کارروائی کی۔ پہلے اہل خانہ سے ساز باز کی، سابقہ گورنر کی بیوی جس کا نام آزاد بتاتے ہیں، اسود عنسی نے چھین کر اس کو اپنی باندی بنا لیا تھا جو کہ فیروز دیلمیؓ کی چچا زاد تھی، اس سے رابطہ کیا، پلاننگ کر کے رات کو اسے شراب پلائی، جب اس کو نشہ آیا تو قتل کر دیا اور صبح ہوتے ہی محل کی چھت پر چڑھ کر جھنڈا لہرا دیا کہ میں فیروز ہوں میں نے اسود قتل کر دیا ہے اور ہم نے قلعے پر قبضہ کر لیا ہے، سارے واپس آ جاؤ۔ اس طرح دوبارہ یمن پر مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گیا۔ اس کے بعد جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں خبر بھجوائی لیکن خبر لانے والا قاصد آپؐ کے وصال کے دو دن بعد پہنچا۔ البتہ جناب نبی کریمؐ کو وحی کے ذریعے اسی وقت اطلاع مل گئی تھی۔ حضورؐ نے وصال سے دو دن پہلے بستر علالت پر فرمایا، فاز فیروز، فاز فیروز۔ فیروز اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا، فیروز نے اپنا ٹارگٹ پا لیا۔ جب حضورؐ نے یہ فرمایا تو بہت سے لوگ نہ سمجھ سکے کہ اس فیروز سے کون مراد ہے اور وہ کیسے کامیاب ہوا۔ ان کو تب پتہ چلا جب حضرت فیروز دیلمیؓ آپؐ کی وفات کے چند دن بعد مدینہ پہنچے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خبر پہنچائی، اس سے لوگوں کو علم ہوا کہ حضورؐ نے جو فرمایا تھا اس کا مطلب کیا تھا۔

(۴) سجاح

چوتھی مدعی نبوت سجاح کا تعلق بنو تغلب سے تھا، وہ بھی بڑی فصیح خطیبہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ چالیس ہزار کا لشکر اس نے اکٹھا کر لیا تھا۔ اس زمانے میں قبائلی سسٹم تھا، قبائل ساتھ دیا کرتے تھے۔ جب یہ یمامہ کے قریب پہنچی تو لوگوں نے اسے کہا تم اور مسیلمہ الگ الگ

لڑنے کی بجائے اکٹھے کیوں نہیں ہو جاتے؟ آپس میں صلح کر لو اور اکٹھے حملہ کرو تو تم مدینہ والوں کو شکست دے سکتے ہو۔ اس سلسلہ میں دونوں گروپوں کے درمیان صلح کے لیے مذاکرات کا اہتمام کیا گیا۔ سجاح مذاکرات کے لیے مسیلمہ کے خیمے میں گئی اور اس میں سے تین دن کے بعد باہر نکلی اور کہا کہ ہماری صلح ہو گئی ہے، ہم نے آپس میں نکاح کر لیا ہے۔ قوم والوں نے پوچھا، مہر کیا مقرر کیا ہے؟ کہنے لگی یہ تو میں بھول گئی تھی، دوبارہ جا کر پوچھتی ہوں۔ اس نے کہا، مہر یہ ہے کہ تمہاری نمازیں معاف ہیں۔ مسیلمہ اور سجاح کا مجموعی لشکر اسی ہزار بتایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا پہلا لشکر حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کی قیادت میں گیا، اس نے شکست کھائی اور حضرت صدیق اکبرؓ سے ڈانٹ بھی کھائی۔ دوسرا لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں گیا تو ان کو فتح ہوئی۔ اسی یمامہ کی جنگ میں سب سے زیادہ صحابہؓ شہید ہوئے۔ مسیلمہ کذاب جب قتل ہوا اور اس کے لشکر کو شکست ہوئی تو سجاح روپوش ہو گئی اور بھاگ گئی۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے تک روپوش رہی، پینتیس چالیس سال کے بعد ظاہر ہوئی، اس کی وجہ بھی یہ بنی کہ اس کے علاقے میں قحط پڑ گیا، خشک سالی ہو گئی، لوگ علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ سجاح دمشق میں امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی، توبہ کی، ایمان قبول کیا، پھر حضرت معاویہؓ کے حکم سے اس کو کوفہ میں بسایا گیا، وہیں اس نے زندگی گزاری۔ کہا جاتا ہے کہ بڑی عابدہ، زاہدہ اور صالحہ خاتون بن گئی تھی۔ وہیں فوت ہوئی اور اس وقت کے گورنر حضرت سمرہ بن جندبؓ نے اس کا جنازہ پڑھایا۔

یہ دور نبویؐ اور دور صحابہؓ کے چار مدعیان نبوت کا میں نے تذکرہ کیا۔ دو حوالوں سے میں ان کا ذکر کیا کرتا ہوں۔ ایک اس حوالے سے کہ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کا جھوٹے مدعیان نبوت کے متعلق طرز عمل کیا تھا کہ انہوں نے کسی کے دعویٰ نبوت کو قبول نہیں کیا، بلکہ برداشت نہیں کیا۔ اور دوسرے اس حوالے سے قادیانیوں سے کہتا ہوں کہ جو ہونا تھا ہو چکا، جو تم نے کرنا تھا کیا، جو تمہارے ساتھ ہونا تھا وہ ہوا، میں ان کو غور و فکر کی دعوت دیا کرتا ہوں کہ اسود عنسی اور مسیلمہ کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے تمہارے پاس دوسرا راستہ طلیحہ اور سجاح کا بھی موجود ہے۔ ہمیشہ کے لیے مصیبت میں رہنے اور مسلمانوں کو بھی مصیبت میں ڈالنے سے بہتر ہے یہ راستہ اختیار کر لو اور واپس آجاؤ۔ ہم قبول کریں گے، سینے سے لگائیں گے۔

اس کے بعد تیرہ سو سال میں کون کون مدعیان نبوت تھے، ان کے حالات بھی پڑھنے چاہئیں۔ ان کی تفصیل پڑھنے کے لیے مولانا ابوالقاسم محمد رفیق دلاوریؒ جو کہ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے، وزیرآباد کے قریب دلاور چیمہ گاؤں کے باشندے تھے، پھر لاہور میں رہے، بڑے مصنف تھے، ان کی کتاب ”الصلوٰۃ عماد الدین“ معروف کتاب ہے، انہوں نے جھوٹے مدعیان نبوت پر ایک کتاب لکھی ”ائمہ تلبیس“ کے نام سے، اس میں مسیلمہ کذاب سے لے کر مرزا غلام احمد قادیانی تک سینکڑوں مدعیان نبوت کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خلاصہ ”ایمان کے ڈاکو“ کے نام سے سو دو سو صفحے کا بھی ہے، لیکن علماء کو پوری کتاب ہی پڑھنی چاہیے، یہ دونوں کتابیں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت نے شائع کی ہیں۔

چند معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ — عیسائیت

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۳ مئی ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! آج آپ سے بات کرنا چاہوں گا عیسائیت، مسیحیت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروکاری کا دعویٰ رکھنے، اور انجیل کی بات کرنے والوں کے بارے میں۔

ابتدائی دور

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ساڑھے پانچ، چھ صدیاں پہلے مبعوث ہوئے اور خاتم انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انجیل عطا فرمائی، ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور بغیر موت کے زندہ اٹھا لیا۔ یہ ان کے اعزازات و امتیازات میں سے ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فلسطین میں اپنی دعوت پیش کی، جنہوں نے مان لیا مسیحی کہلائے، جنہوں نے انکار کیا وہ یہودی رہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری سے یہودیت و عیسائیت کی تقسیم ہوئی۔ یروشلم، بیت المقدس، فلسطین کے علاقے پر یہودیوں کا کنٹرول تھا، یہ یہود کا مرکز تھا۔ آہستہ آہستہ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار بڑھتے گئے، روم کے لوگ اور ان کا بادشاہ عیسائی ہو گئے تھے، روم عیسائیوں کا مرکز بن گیا اور تقریباً پون صدی یہ سلسلہ رہا۔ جبکہ یروشلم بدستور یہودیوں کا قبلہ اور مرکز تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے ”رفع“ کے

پون صدی بعد روم کے عیسائی بادشاہ طیطس نے حملہ کرکے یروشلم کو تاراج کیا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نبوت پانچ چھ صدیاں چلتی رہی۔

دورِ نبویؐ میں مسلم عیسائی معاملات

نبی اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک عیسائیت حق مذہب تھا، اس دور میں جنہوں نے بھی عیسائیت قبول کی ہے وہ اہل حق تھے۔ حضورؐ کی تشریف آوری سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے عیسائیت کا دور ختم ہوگیا اور اسلام کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کیسے رہے؟ جناب نبی کریمؐ کے دور میں یہ تعلقات کیسے تھے، حضورؐ کے بعد کن مراحل سے گزرے، اس وقت کن مراحل میں ہیں، اور ہمارے تنازعات کیا ہیں، اس پر مفصل بات کریں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

(۱) عیسائی عالم ورقہ بن نوفل کی تصدیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ کا واسطہ اہلیہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ذریعے ایک عیسائی عالم سے پڑا۔ بخاری کی روایت کے مطابق آپؐ نے غار حرا کا واقعہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا اور فرمایا ”خشیت علی نفسی“ مجھے اپنے بارے میں ڈر لگنے لگا ہے۔ حضورؐ کو تشویش تھی، آپؐ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو ام المومنینؓ نے تسلی دی کہ ”لن یخزیک اللہ ابداً“۔ اللہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ ”لانک تصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق“۔ یہ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی سماجی خدمات کا ذکر کیا۔ وہ عیسائی عالم حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ ورقہ بن نوفل جو عیسائیت کے عالم تھے، عبرانی زبان جانتے تھے اور انجیل کا عربی میں ترجمہ کرکے لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کو تسلی دی اور آپؐ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں کہ وہ پرانے بزرگ اور عالم ہیں، اس کیفیت کا ذکر ان سے کرتے ہیں، ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہوا ہے، کیا خدشات ہیں۔ وہاں جاکر حضورؐ نے ان کو غار میں پیش آنے والا اپنا واقعہ سنایا، ورقہ بن نوفل چونکہ پرانی آسمانی کتابوں کے عالم تھے، وہ سمجھ گئے کہ یہ نبوت اور وحی ہے۔ کہا، یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوا تھا۔ اور پھر خدشے کا اظہار کیا کہ ایک وقت آئے کہ لوگ آپ کو پریشان کریں گے اور قوم کے لوگ آپ کو مکہ سے نکال دیں گے۔ اور اس حسرت کا اظہار کیا کہ اے کاش! میں اس وقت موجود ہوں، طاقتور

ہوں، تو میں آپ کا ساتھ دوں گا، آپ کی مدد کروں گا۔ اس پر حضورؐ کو تعجب ہوا کہ یہ قوم تو مجھ سے بڑی محبت کرتی ہے، مجھے صادق و امین کہتی ہے، مجھ پر اعتماد کرتے ہیں، میرے پاس فیصلے لاتے ہیں۔ ”او مخرجی ھم؟“ کیا وہ مجھے مکہ سے نکال دیں گے؟ ورقہ بن نوفل نے کہا آپ جیسی بات جس نے بھی کی ہے اس کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ چونکہ اس وقت تک حضورؐ نے اسلام کی دعوت کا آغاز نہیں کیا تھا تو ورقہ بن نوفل کے ان جذبات کے اظہار پر محققین ان کو اہل حق میں سے شمار کرتے ہیں۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جناب نبی کریمؐ اور وحی کو سب سے پہلے ایک عیسائی عالم سے واسطہ پیش آیا جس نے آپؐ کی تائید کی۔ جیسے قرآن کریم نے کہا ”الذین اتینا ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم“ (البقرہ ۱۴۶)۔ اہل کتاب حضورؐ کو پہچانتے ہیں۔ یہ اہل کتاب کا حضورؐ کو پہچاننے کا سب سے پہلا اظہار تھا۔ ورقہ بن نوفل اس سے کچھ عرصہ بعد ہی فوت ہو گئے لیکن ان کی تصدیق، ان کے جذبات، ان کا ایمان تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

اس کے بعد جناب نبی کریمؐ نے قریش کو اسلام کی دعوت دی جس پر مخاصمت، مخالفت، طعن و تشنیع، اذیت، تکلیفیں اور رکاوٹیں شروع ہوئیں۔ تیرہ سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا کہ اپنے ہی خاندان، برادری کے لوگ دشمن بن گئے تھے اور جان کے دشمن بن گئے تھے۔ رسول اللہؐ کی پشت پناہی کرنے والے آپ کے چچا ابوطالب اور عباسؓ تھے، باوجودیکہ ایمان نہیں لائے تھے مگر دونوں بھائیوں نے بڑی مضبوطی سے حضورؐ کی پشت پناہی کی۔ حضرت عباسؓ نے ایمان تو بہت بعد میں قبول کیا لیکن حضرت ابوذر غفاریؓ کے ایمان قبول کرنے کا واقعہ بخاری میں مذکور ہے کہ جب انہوں نے ایمان قبول کیا تو مکہ والے ان پر ٹوٹ پڑے، ان کو بچانے والے حضرت عباسؓ تھے جنہوں نے ایک دفعہ نہیں، تین دفعہ بچایا۔ جبکہ بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت بھی اگرچہ وہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن انصار مدینہ کے ساتھ مذاکرات میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ اور تاریخی واقعہ ہے کہ جب انصار کے سرداروں نے حضورؐ سے کہا کہ آپ مدینہ تشریف لائیں، ہم آپ کی حفاظت کریں گے، آپ کا ساتھ دیں گے، تو وہاں حضرت عباسؓ بھی ان خفیہ ترین مذاکرات میں حضورؐ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں کہا تھا بات سنو! یہ میرا بھتیجا ہے، ہم اس کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ سن لو میرے بھتیجے کو مکے سے لے جانے کا مطلب پورے عرب سے لڑائی مول لینا ہے، اگر پورے عرب سے لڑائی لڑ سکتے ہو تو لے

جانے کی بات کرو، ورنہ ہم اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ایمان قبول کرنے سے پہلے وہ بطور چچا کے مذاکرات میں شریک تھے۔

حضورؐ کو ذاتی طور پر تمام تکلیفوں کے باوجود اپنے ان دو چچاؤں کی پشت پناہی حاصل تھی، لیکن جو حضورؐ کے باقی ساتھی تھے ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ بالخصوص حضرت بلالؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت خبابؓ وغیرہ کا کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

(۲) عیسائی بادشاہ اصحمہ نجاشیؓ کی پناہ گاہ

جب مظالم حد سے بڑھ گئے تو یہ فکر ہوئی کہ کہیں ہجرت کر کے چلے جانا چاہیے۔ چنانچہ مشورہ میں حبشہ طے ہوا کہ وہاں پناہ ملے گی۔ حبشہ کے بادشاہ اصحمہ عیسائی تھے، ان سے مسلمانوں کو توقع تھی کہ شاید حمایت کریں گے۔ چنانچہ ایک بڑی تعداد نے حضورؐ کی اجازت سے حبشہ کی ہجرت کی۔ وہاں اصحمہ نجاشیؓ جو بعد میں مسلمان ہو گئے، انہوں نے ان کو پناہ بھی دی، حفاظت بھی کی، بلکہ قریش کا وفد مسلمانوں کو واپس لینے کے لیے شاہ حبشہ کے پاس گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ تاریخی طور پر یہ ہمارا دوسرا واسطہ تھا اس وقت کے عیسائیوں کے ساتھ۔

تیسرا واسطہ عیسائیت کے ساتھ صلح حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔ جناب نبی کریمؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور اردگرد کے ماحول میں کوئی عیسائی آبادی نہیں تھی، یہودیوں کی آبادیاں اور قبائل تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے ساتھ معاملات پیش آتے رہے۔ لیکن عیسائیوں کی کوئی بڑی آبادی قریب نہیں تھی، ان کے ساتھ کوئی معاملہ براہ راست پیش نہیں آیا۔

(۳) عیسائی بادشاہوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط

البتہ صلح حدیبیہ کے بعد جب آپؐ نے ماحول کو سازگار دیکھ کر اردگرد کے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے اور وفود بھیجے، کسریٰ، قیصر اور مقوقس وغیرہ کو خطوط لکھے۔

- فارس کے بادشاہ کسریٰ نے رسول اللہ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، فرعونیت کا اظہار کیا اور بحرین کے گورنر کو حکم دیا کہ اس شخص کو گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کرو۔
- لیکن قیصر نے پورے پروٹوکول اور احترام کے ساتھ آپؐ کا نامہ گرامی پڑھا، اس کی مکمل تفصیل بخاری میں حدیث ابی سفیان میں ہے۔ ایمان اور

دعوت کے حوالے سے میں اسے بنیادی احادیث میں شمار کیا کرتا ہوں۔ اس کے چند جملے عرض کرتا ہوں۔ قیصر نے قریش کے افراد کو بلایا کہ مدعی نبوت کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ ابوسفیان اپنے ساتھیوں سمیت اس کے دربار میں گئے۔ قیصر نے حضورؐ کے خاندان، آپؐ کی دعوت، آپؐ کے معاشرتی طرز عمل اور آپؐ کے ساتھیوں کے بارے میں تفصیل سے انٹرویو کیا۔ آخر میں اس نے دو تین باتیں کہیں وہ توجہ طلب ہیں۔ اس نے کہا کہ جو باتیں آپ نے بتائی ہیں اگر یہ سچ ہیں "انہ لنبی" تو بے شک وہ نبی ہے۔ اور اس نے کہا میں بھی اس نبی کی آمد کا منتظر تھا، میں نے خواب بھی دیکھے تھے اور اہل علم نے ان کی تعبیر یہی بتائی تھی کہ نبی آخر الزمان آنے والے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ یہ وہی ہے۔ اب دیکھیے نبی بھی کہہ رہا ہے، تصدیق بھی کر رہا ہے، اپنے انتظار کی بات بھی کر رہا ہے، لیکن کانٹا یہاں سے بدلا کہ وہ کہنے لگا مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ تم بدوؤں میں آجائے گا۔

• مقوقسِ مصر کے پاس نامہ مبارک پہنچا تو اس نے بھی پروٹوکول دیا تھا، اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا، اور ہدیے میں دو باندیاں بھیجی تھیں۔ ان میں سے ہی حضرت ماریہ قبطیہؓ سے آپؐ کے بیٹے حضرت ابراہیمؑ ہوئے تھے۔ اور دوسری باندی سیرین، امام التابعین محمد بن سیرین کی والدہ تھیں۔ ماریہ اور سیرین دونوں بہنیں مقوقسِ مصر کا ہدیہ تھیں۔ آج بھی مصر میں قبطی عیسائی موجود ہیں جو کہ باقی دنیا سے مختلف ہیں، اب بھی ان کے پادری پرانی وضع قطع کے ساتھ رہتے ہیں۔

قرآن کریم نے اہل کتاب کی اسی کیفیت کو یوں بیان فرمایا "حسدًا من عندا نفسھم من بعدما تبین لھم الحق" (البقرہ ۱۰۹) کہ اہل کتاب نے رسول اللہ اور قرآن کا انکار اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کو پہچاننے میں مغالطہ لگا ہے، پہچانتے تو ایسے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، لیکن حسد کی وجہ سے انکار کیا۔ حسد اس بات کا کہ یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو توقع تھی کہ نبی آخر الزمان ہم میں سے آئیں گے، ان کے ذریعے ہمارا دنیا پر غلبہ ہو گا۔ چنانچہ یہود کی نفسیات بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا "وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا" (البقرہ ۸۹) یہودی آنحضرتؐ کا نام لے کر اپنے دشمنوں پر رعب جتایا کرتے اور فتح کی

دعا کیا کرتے تھے، ایسے ہی جیسے آج کل ہم مسلمان سارے معاملات امام مہدی کے حوالے کر کے کہہ دیتے ہیں وہ آنے والے ہیں، دیکھ لیں گے، تم سب سے نمٹ لیں گے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، وہی جو کریں گے آکر کریں گے، ہم نے کچھ نہیں کرنا۔

خلافت کا قیام: وعدہ یا حکم؟

درمیان میں ایک غیر متعلقہ بحث عرض کرتا ہوں جو آج کل ہمارے بعض اہل فکر و دانش کے ہاں چل رہی ہے کہ حکومت اور خلافت حکم ہے یا وعدہ ہے؟ ان کا کہنا ہے کہ خلافت کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، حکم تو نہیں دیا کہ خلافت قائم کرنی ہے۔ اور دلیل یہ آیت ہے ”وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم“ (النور ۵۵)۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بطور انعام کے وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر تم دین پر چلتے رہے تو میں تمہیں زمین کی خلافت و حکومت دوں گا۔ حکم تو نہیں دیا۔ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہوا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کرنا میں تمہیں جنت دے دوں گا۔ جب اللہ کا جنت کا وعدہ ہے تو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اسی قسم کی بات ہے کہ خلافت کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہوا ہے۔

جس طرح آج ہمارا مزاج بن گیا ہے کہ ساری باتیں امام مہدیؓ اور حضرت عیسیٰؑ کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں، اسی طرح یہود کا مزاج تھا کہ نبی آخر الزمان آنے والے ہیں، ان کے آنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بتا یہ رہا ہوں کہ یہود بھی اور عیسائی بھی حضورؐ کو پہچانتے تھے، حق ان پر واضح ہو چکا تھا، انہوں نے انکار جو کیا تو حسد کی وجہ سے۔ اور حسد اس بات کا تھا کہ نبیؐ ان کی توقعات کے برعکس بنی اسماعیل میں مبعوث ہو گئے تھے جبکہ ان کو توقع تھی کہ بنی اسرائیل میں سے ہوں گے۔ اسی کو قیصر نے یہ کہہ کر بیان کیا کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ تم بدوؤں میں آجائے گا۔ یہ ہمارا تیسرا واسطہ تھا عیسائیوں کے ساتھ۔

(۴) بنو طے کا عیسائی قبیلہ

آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ میں مسلمانوں کی عیسائیوں کے کسی طبقہ کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے تو وہ ہوئی ہے بنو طے سے۔ یہ عرب قبیلہ تھا، حاتم طائی کے زمانے میں عیسائی ہو گیا تھا، ان سے جو جنگ ہوئی اس میں بنو طے کو شکست ہوئی۔ عدی بن حاتم جنگ کے بعد روپوش

ہو گئے تھے اور ان کی بہن سفانہ قیدی بن گئی تھیں۔ سفانہ جب آنحضرتؐ کے سامنے آئیں تو آپؐ نے ان کو چادر پیش کی، سر ننگا تھا، چادر مرحمت فرمائی۔ کسی نے کہا حضور! یہ کافر کی بیٹی ہے۔ فرمایا، بیٹی تو بیٹی ہوتی ہے چاہے کافر کی ہو۔ سفانہ نے آپؐ کا رویہ دیکھ کر عدی کو پیغام بھیجا کہ کہاں بھاگے پھرتے ہو یہاں تو رحمت ہی رحمت ہے، نرمی ہی نرمی ہے، معافی ہی معافی ہے۔ تو سفانہ کے کہنے پر عدیؓ واپس آئے اور اسلام قبول کر لیا، بلکہ یہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا تھا۔

(۵) نجران کے عیسائیوں سے واسطہ

اس کے بعد عیسائیت کے ساتھ معاملات کا وہ مذاکرہ و مکالمہ ہے جو مدینہ میں ہوا، جس کا قرآن کریم نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں نجران میں عیسائی اکثریت کی آبادی تھی، یہ تقریباً مسیحی ریاست تھی۔ نجران سعودیہ اور یمن کی سرحد پر ہے۔ اس وقت یہ سعودیہ کا صوبہ ہے، جبکہ یمن کا نجران پر دعویٰ ہے۔ حوثیوں اور سعودیوں کی جنگ میں نجران کا مسئلہ بھی ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے نجران کے عیسائیوں کو بھی اسلام کی دعوت کا پیغام بھیجا۔

دلچسپ واقعہ ہے، امام ترمذی نے ذکر کیا ہے کہ نجران کے عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے آپؐ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو بھیجا۔ وہ کہتے ہیں میں نے جا کر ان کو قرآن سنایا، وہ اہل علم تھے، عیسائی علماء نے اعتراض کر دیا کہ ہمیں کیا قرآن سناتے ہو، قرآن کو تو تاریخ کا پتہ نہیں ہے، تمہارا قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت مریمؑ گود میں عیسٰیؑ کو اٹھا کر قوم میں آئیں تو قوم نے کہا مریم! بچہ کہاں سے لے آئی ہو؟ ''یا اخت ھارون'' تیرا باپ بھی برا آدمی نہیں تھا، تیری ماں بھی بدکار نہیں ہے، یہ تو کنواری لڑکی بچہ کہاں سے لے آئی؟ انہوں نے کہا اسی سے پوچھو کہاں سے آیا ہے۔ اور پھر اس بچے نے بتایا بلکہ پورا خطبہ ارشاد فرمایا۔ نجران کے عیسائی علماء نے اعتراض کیا کہ قرآن میں مریم کو ''یا اخت ھارون'' کہا گیا ہے جبکہ ہارونؑ تو موسٰیؑ کے بھائی تھے اور مریم ماں ہیں عیسٰیؑ کی، درمیان میں صدیاں حائل ہیں، تو یہ بہن بھائی کس طرح بن گئے؟ مغیرہ بن شعبہؓ ان کے اس اعتراض کا جواب نہیں دے سکے۔

جواب ذہن میں نہ آنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کا جواب ہے ہی نہیں، بعض اوقات جواب ہوتا ہے لیکن بروقت ذہن میں نہیں آتا۔ واپس مدینہ منورہ آ کر رسول اللہؐ

سے عرض کیا کہ وہاں کے عیسائی علماء نے تو یہ اعتراض کر دیا، میں ان کو کوئی جواب نہیں دے سکا۔ حضورؐ نے فرمایا: خدا کے بندے! سادہ سی بات تھی تمہارے ذہن میں نہیں آئی۔ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ بنی اسرائیل میں یہ رواج تھا کہ اپنے بچوں کے نام پیغمبروں کے نام پر رکھا کرتے تھے، یہ ہارون کوئی اور تھے، یہ حضرت موسیٰؑ کے بھائی نہیں ہیں۔ اور انبیاء کے ناموں پر نام رکھنے کا رواج تو آج ہمارے ہاں بھی ہے۔ ممکن ہے اس مجلس میں بھی کوئی ہارون نام کا شخص بیٹھا ہو، کوئی موسیٰ، کوئی عیسیٰ بیٹھا ہو۔

پھر نجران کے عیسائی علماء کا وفد مدینہ منورہ آیا، جناب نبی کریمؐ کے ساتھ مجادلہ، مناظرہ، مکالمہ ہوا جو کئی دن تک جاری رہا، اس کی تفصیلات زیادہ تو نہیں ملتیں لیکن شلیث اور توحید اس کا بنیادی موضوع تھا۔ مگر گفتگو کسی نتیجے پر نہیں پہنچی، اس پر جناب نبی کریمؐ نے مباہلہ کی دعوت دے دی۔ "تعالوا ندع ابنائنا وابنائکم ونسائنا ونسائکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین" (آل عمران ۶۱)۔ روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے مباہلہ کی دعوت قبول نہیں کی، کیونکہ ان کو علم تھا کہ آپؐ سچے نبی ہیں، ان کے مقابلے میں آکر خوامخواہ مرنا ہے، اس لیے مباہلہ کے لیے نہیں آئے۔ پھر اس کے بعد معاہدہ ہوا جو "معاہدہ نجران" کے نام سے مشہور اور کتب سیرت میں موجود ہے۔

قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے "قل یا اھل الکتاب تعالوا الٰی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللّٰہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللّٰہ" (آل عمران ۶۴)۔ اس حوالے سے میں ایک اور بات کہا کرتا ہوں کہ یہ جو نجران کے عیسائی علماء سے حضورؐ کا مناظرہ یا مکالمہ ہوا، پھر مباہلہ کی بات آئی جس کی نوبت نہیں آئی، اور پھر معاہدہ ہوا، یہ تین مرحلے تھے۔ اس سے معلوم ہوا مذاہب کے درمیان مکالمہ کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

بین المذاہب مکالمہ کی بنیاد

قرآن کریم نے اہل کتاب کے ساتھ مکالمے کی ہمیں بنیاد فراہم کی ہے "قل یا اھل الکتاب تعالوا الٰی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللّٰہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللّٰہ" (آل عمران ۶۴)۔ اہل کتاب سے جب بات کریں گے اس بنیاد پر کہ دو باتیں تو ہم میں قدرِ مشترک ہیں، ان پر بات نہیں ہوگی، "سواء بیننا وبینکم" ان پر تو تم کو آنا ہی پڑے گا۔

1. پہلی بات ”ان لا نعبد الا اللّٰہ و لا نشرک بہ شیئا“۔ اللہ کی عبادت اور شرک کی نفی تورات اور قرآن کا مشترک موضوع ہے۔ علماء کرام کبھی کبھی بائبل بھی دیکھ لیا کریں، توحید جس لہجے میں قرآن بیان کرتا ہے آج کی تحریف شدہ بائبل بھی تمام تر تحریفات کے باوجود اسی لہجے میں توحید بیان کرتی ہے۔ تورات بھی، انجیل بھی، زبور بھی اسی لہجے میں توحید کی بات کرتی ہیں۔ اور یہ تو طے شدہ بات ہے کہ انبیاء کرامؑ کی بنیادی دعوت یہی تھی ”یا قوم اعبدوا اللّٰہ مالکم من الٰہ غیرہ“ (الاعراف ٦۵)۔ حضرت نوحؑ سے یہ دعوت شروع ہوئی اور جناب نبی کریمؐ تک یہ دعوت قدر مشترک کے طور پر چلتی رہی۔ اور قدر مشترک پر مباحثے نہیں ہوا کرتے۔ توحید تمام آسمانی مذاہب میں قدر مشترک ہے۔ غیر آسمانی اور خود ساختہ مذاہب سے ہم توحید کے موضوع پر بات کریں گے، مناظرہ کریں گے، لیکن آسمانی کتاب والوں سے توحید پر بات نہیں ہوگی۔

2. جبکہ دوسری قدر مشترک یہ فرمائی ”ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللّٰہ“ کہ آپس میں ایک دوسرے کو خدا نہیں بنائیں گے۔ اس کا آسان ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ انسان پر انسان کی حاکمیت اور خدائی تسلیم نہیں ہوگی۔ حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور یہ بات میں اپنے طرف سے نہیں کہہ رہا ”اربابًا من دون اللّٰہ“ سے کیا مراد ہے؟ بخاری شریف کی روایت ہے حضرت عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہوا، قرآن کریم پڑھا۔ قرآن کریم میں مجھے ایک مقام پر الجھن ہوئی کہ ”اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابًا من دون اللّٰہ والمسیح ابن مریم“ (التوبہ ۳۱) ان عیسائیوں نے اپنے احبار اور رہبان (علماء و مشائخ) اور عیسیٰؑ کو اپنا رب بنا لیا تھا۔ حضرت عدیؓ سابقہ عیسائی تھے، ان کو اشکال یہ ہوا کہ ہم تو احبار اور رہبان کو خدائی کا درجہ نہیں دیتے تھے، قرآن نے یہ ہمارے ذمے کیوں لگا دیا؟ کہتے ہیں میں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ قرآن نے ہمارے بارے میں یہ کہا ہے جبکہ یارسول اللہ! ہم تو اپنے احبار و رہبان کو خدا کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا، کیا تمہارے ہاں احبار و رہبان کو حلال و حرام میں ردوبدل کی اتھارٹی حاصل تھی؟ حلال کو حرام کرنے اور حرام کو حلال کرنے کی اتھارٹی حاصل تھی؟ اور یہ تو آج بھی پوپ کو حاصل

ہے۔ انہوں نے کہا، جی حاصل تھی۔ فرمایا بس یہی مطلب ہے ”اربابًا من دون اللّٰہ“ بنا لینے کا۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے اختیارات خدائی اختیارات ہیں۔ بات سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ حلال و حرام میں اور جائز و ناجائز کے اختیارات میں کسی کو شریک کرتے تو کس کو کرتے؟ جناب نبی کریمؐ سے زیادہ کسی کا استحقاق ہو سکتا تھا؟ نہیں۔ جبکہ حضورؐ نے اپنی ذات کے لیے شہد کے حرام ہونے کی بات کی تھی تو قرآن نے کس لہجے میں بات کی۔ فرمایا ”یا ایھا النبی! لم تحرم ما احل اللّٰہ لک تبتغی مرضات ازواجک واللّٰہ غفور رحیم ○ قد فرض اللّٰہ لکم تحلۃ ایمانکم“ (التحریم ۱، ۲)۔

میں بات یہ کر رہا تھا کہ نجران کے عیسائیوں نے بالآخر معاہدہ کر لیا کہ بطور ذمی کے رہیں گے اور نجران اسلامی ریاست میں شامل ہو گیا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے ہمیں قیامت تک کے لیے اصول بتا دیا کہ اہل کتاب سے بات تورات اور قرآن کے مشترکات پر نہیں ہو گی، وہ تو ماننا ہی پڑیں گے، مکالمہ بین المذاہب میں بات اس سے اگلے درجے میں ہو گی۔

بین المذاہب مکالمہ کے فریقین اور ایجنڈا

آج بھی مکالمہ بین المذاہب ہر سطح پر چل رہا ہے۔ گفتگو، مذاکرے، سیمینار، کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے اہل کتاب کے ساتھ مکالمے کا ایجنڈا قیامت تک کے لیے طے کر دیا ہے، لیکن اس سے پہلے آپ کو ایک واقعہ سنانا چاہوں گا۔

عیسائی دنیا کے ایک بڑے پادری ہیں بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر روون ولیمز، جو کہ برطانیہ کے سب سے بڑے پادری ہیں، پروٹسٹنٹ فرقے کے عالمی سربراہ ہیں، جس طرح کیتھولک کے سربراہ پاپائے روم ہیں جو کہ فرانسس ہیں۔ کنٹربری ان کا سب سے بڑا چرچ ہے، اس کے سب سے بڑے بشپ ڈاکٹر روون ولیمز ہیں۔ بات سمجھانے کے لیے عرض کرتا ہوں، ایسے سمجھیں کہ ان کی عیسائی دنیا میں ویسی ہی حیثیت ہے جیسے ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی ہے۔

شوکت عزیز صاحب اور پرویز مشرف صاحب کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر روون ولیمز پاکستان تشریف لائے کہ میں علماء سے مکالمہ کرنا چاہتا ہوں۔ صاحبِ علم و دانش آدمی ہیں، شوکت عزیز صاحب اس زمانے میں پرائم منسٹر تھے، ان کے ساتھ ان کی گفتگو ہوئی۔ بہت سے حضرات کو بلایا گیا، مجھ سے پوچھا گیا کیا آپ اس گفتگو میں شریک ہوں گے، اگر آپ شریک

ہوں تو ہم آپ کو بلائیں۔ میں نے پوچھا کون کون ہیں؟ بتایا گیا کہ ادھر سے ڈاکٹر روون ولیمز ہیں اور ادھر سے شوکت عزیز صاحب ہیں۔ میں نے کہا کوئی عقل کی بات کرو، وہ عیسائی مذہبی فرقے کے سربراہ ہیں، اپنے مذہب کی عالمی سطح پر نمائندگی کرتے ہیں، شوکت عزیز صاحب کس کی نمائندگی کرتے ہیں؟ دیوبندیوں کی؟ بریلویوں کی؟ اہلحدیثوں کی؟ شیعوں کی؟ میں نے کہا اگر دو شرطیں منظور ہوں تو میں گفتگو اور مکالمے کے لیے حاضر ہوں گا۔

1. پہلی شرط یہ کہ مکالمہ اصل فریقوں میں ہونا چاہیے۔ شوکت عزیز کی کیا پوزیشن ہے، جبکہ دوسری طرف عیسائی دنیا کے مسلّمہ عالم ہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا، اچھا پھر کیا کریں؟ میں نے کہا شیخ ازہر کو بلالیں، یا امام کعبہ کو بلالیں، یا انڈیا سے ندوہ یا دیوبند کے سربراہ کو بلالو۔ کسی ایسی شخصیت کو بلاؤ جو کسی فرقے کی نمائندگی کرتی ہو۔ وہ کہنے لگے، پاکستان سے کس کو بلائیں۔ میں نے کہا حاجی عبد الوہاب صاحب کو بلالو کہ وہ ایک عالمی تحریک کی نمائندگی کرتے ہیں۔

2. دوسری شرط میں نے یہ کہی کی ایجنڈا بیلنس کریں۔ گفتگو کا ایجنڈا تھا کہ ”مذہب اس وقت دہشت گردی کا سبب بن رہا ہے اس کو کیسے کنٹرول کیا جائے؟ مذہب کے نام پر دہشت گردی کو کیسے روکا جائے؟“ میں نے کہا ہمارے ہاں مناظرے کا معروف اسلوب ہے کہ دو فریق آپس میں مناظرہ کرتے ہیں، ایک فریق چیلنج کرتا ہے دوسرا قبول کرتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ دونوں طرف سے ایک ایک موضوع ہوتا ہے۔ ایک موضوع ایک فریق پیش کرتا ہے اور دوسرا موضوع دوسرا فریق پیش کرتا ہے کہ میں آپ کے موضوع پر بات کروں گا، لیکن آپ کو میرے موضوع پر بات کرنی ہوگی۔ اور دونوں پر گفتگو ہوتی ہے۔ یہ مناظرے کی روایات میں سے ہے۔ دنیا میں کہیں مذہب دہشت گردی کا ذریعہ بن رہا ہے یا نہیں، اگر بن رہا ہے تو اسے کنٹرول کیسے کیا جائے۔ میں نے کہا کہ کسی بھی دائرے میں کسی سطح پر گفتگو کرنا چاہیں، ہم پوری تسلی اور اطمینان کے ساتھ بات کریں گے، لیکن ایک موضوع ہمارا بھی ساتھ شامل کرلیں کہ مذہب سے انحراف کرکے انسانی سوسائٹی نے فائدہ اٹھایا ہے یا نقصان اٹھایا ہے؟ انقلاب فرانس کے بعد سوسائٹی نے جو مذہب کو معاشرتی زندگی سے نکال دیا تھا، اس کا مجموعی طور پر نسل انسانی کو فائدہ ہوا ہے یا نقصان

ہوا ہے؟ اس پر بھی ہم بات کریں گے۔ اس طرح پہلے ایجنڈا بیلنس کریں، پھر مکالمہ ہو گا۔

میں نے کہا مجھے زیادہ مکالموں میں جانے کا شوق نہیں ہے لیکن اگر کرنا ہے تو میری یہ دو شرطیں ہیں کہ (۱) مکالمہ اصل فریقوں میں ہونا چاہیے اور (۲) ایجنڈا بیلنس ہونا چاہیے۔

گوجرانوالہ کے ایک بڑے عیسائی پادری تھے فادر روفن جولیس۔ بیپٹسٹ فرقے کے پاکستان کے بڑے بشپ تھے، ایم این اے رہے ہیں اور وفاقی منسٹر رہے ہیں، ان کی اہلیہ محترمہ ایم پی اے رہی ہیں اور شہباز شریف کی پچھلی کابینہ میں صوبائی منسٹر رہی ہیں، فادر روفن جولس مرکزی وفاقی وزیر رہے ہیں۔ ایک دفعہ ان کا مجھے اور دوسرے علماء کو پیغام آیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب گستاخانہ خاکوں اور توہین رسالتؐ کا مسئلہ زور پر تھا۔ پیغام تھا کہ میں آپ سے ہیومن رائٹس کے بارے میں مکالمہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے لیکن ہم آپ سے بات ہیومن رائٹس پر نہیں کریں گے کہ آپ ہیومن رائٹس کے نمائندے نہیں ہیں۔ آپ بائبل کے نمائندے ہیں۔ ہیومن رائٹس پر اگر بات کرنی ہے تو عاصمہ جہانگیر سے یا ایس اے رحمان سے کریں گے، جو اُن کے نمائندے ہیں۔ آپ ہیومن رائٹس کے نمائندے کب سے بن گئے ہیں؟ آپ تو بائبل کے نمائندے ہیں، ہم آپ سے کسی مذہبی گفتگو کے لیے تیار ہیں، بائبل اور قرآن درمیان میں رکھیں گے اور آج کے مسائل پر گفتگو کریں گے۔ آپ کا ٹائٹل ”فادر“ کا ہے ہیومن رائٹس پر بات آپ سے کیوں کریں؟

آج میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عیسائیت کے ساتھ پیش آنے والے معاملات کا ذکر کیا ہے اور عیسائی مسلم تعلقات پر بات کی ہے اور آپؐ حیاتِ مبارکہ میں مسلم عیسائی تعلقات کی جو نوعیت تھی اس کا ہلکا سا خاکہ پیش کیا ہے:

1. ہمارے عیسائیوں سے تعلقات کا آغاز وحی کے فوراً بعد ورقہ بن نوفل سے ہوا۔

2. اس کے بعد حبشہ کے شاہ نجاشی اصحمہؓ کے ساتھ ہمارا دوسرا معاملہ ہوا، انہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور اسلام قبول کر لیا تھا۔

3. قیصر روم کو خط لکھا گیا اس نے ریمارکس دیے۔ مقوقس مصر عیسائی بادشاہ تھا، اسے خط لکھا گیا، اس نے جو پروٹوکول دیا وہ میں نے عرض کیا تھا کہ اس نے اپنی دو باندیاں حضورؐ کی خدمت میں پیش کیں۔

4. بنو طے کی لڑائی اور حضرت عدیؓ بن حاتم کے ساتھ ساتھ ان کے قبیلہ کا قبولِ اسلام۔

5. پھر نجران کا وفد آیا تھا، اس کے ساتھ مناظرہ اور مباہلہ کی بات اور پھر معاہدہ ہوا۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں مسلم عیسائی کشمکش

اس کے بعد عیسائیوں کے ساتھ باقاعدہ کشمکش کب شروع ہوئی؟ جناب نبی کریمؐ نے حدیبیہ کے بعد مختلف علاقوں کے بادشاہوں کی طرف اور مختلف قبائل کے سرداروں کی طرف خطوط لکھے۔ شام کے علاقے میں مختلف قبائل اور سرداریاں تھیں لیکن کنٹرول قیصر روم کا تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ قبائل قیصر روم کی نوآبادیاں تھیں یا ان کے صوبے تھے۔ ان میں سے ایک سردار نے جناب نبی کریمؐ کے قاصد کو شہید کر دیا جو خط لے کر گیا تھا، غالباً ان کا نام شرحبیلؓ تھا۔

موتہ کا معرکہ

رسول اللہ نے اس کا بدلہ لینے کے لیے زید بن حارثہؓ کی قیادت میں تین ہزار کی فوج بھیجی۔ اس فوج نے موتہ میں جا کر جنگ لڑی، ان کے بارے میں حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ زیدؓ شہید ہوئے تو جعفرؓ امیر ہوں گے، جعفرؓ شہید ہو گئے تو عبد اللہ بن رواحہؓ امیر ہوں گے۔ ان کی وہاں عیسائیوں سے جنگ ہوئی۔ یہ عیسائیوں کے ساتھ ہماری پہلی باقاعدہ جنگ ہے، اس میں ہمیں غلبہ نہیں ملا تھا۔ یہ تینوں امراء یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تو اس افراتفری سے نکالنے کے لیے حضرت خالد بن ولیدؓ خود آگے بڑھے اور لشکر کی کمان سنبھالی۔ اور ان کی سب سے بڑی کامیابی جس پر انہیں "سیف من سیوف اللہ" کا خطاب ملا، وہ ان کا یہ کارنامہ تھا کہ تین ہزار کے لشکر کو بڑی مہارت کے ساتھ اس جم غفیر سے نکال کر بحفاظت مدینہ لے آئے تھے اور اپنے لشکر کو بچا لیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ مدینہ والوں نے ان کا استقبال جوتوں سے کیا تھا کہ "انتم الفرارون" تم فرار ہو کر آئے ہو،

میدان چھوڑ کر آئے ہو، بھاگ کر آئے ہو۔ تو نبی کریمؐ نے فرمایا کہ نہیں! تم کہو ہم فرارون نہیں کرارون ہیں، ہم دوبارہ حملے کی تیاری کرنے کے لیے آئے ہیں، ہم دوبارہ جائیں گے۔

چنانچہ اسی جنگ کے تسلسل میں جناب رسول اللہ نے اپنے وصال سے پہلے موتہ کی طرف لشکر روانہ کیا اور اس کا امیر عرب قبائل کی روایات کے مطابق حضرت زید بن حارثہؓ کے بیٹے اسامہ کو بنایا کیونکہ غزوہ موتہ میں وہ امیر جنگ تھے اور شہید ہوئے تھے۔ تو ان کے بیٹے اسامہ کو امیر بنایا جو نوعمر تھے، انیس بیس سال عمر ہوگی۔ اس پر اعتراض بھی ہوا تھا کہ ایک لڑکے کو امیر بنا دیا ہے، تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے اس کے باپ پر بھی اعتراض کیا تھا "وانہ لخلیق بالامارۃ" حالانکہ وہ امارت کا اہل تھا۔ اب اس پر اعتراض کر رہے ہو، یہ بھی امارت کا اہل ہے۔ اس لشکر کو حضورؐ نے تیار کر کے روانہ کر دیا تھا۔ ابھی ایک آدھ دن ہی گزرا تھا کہ حضورؐ کا وصال ہو گیا، یہ لشکر قریب ہی تھا وہیں رک گیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ بنے، ان سے پوچھا گیا اس لشکر کا کیا کرنا ہے؟ چونکہ عمومی افراتفری مچ گئی تھی، بہت سے قبائل باغی ہو گئے تھے اور مرتدین منکرین ختم نبوت اور منکرین زکوٰۃ کا بڑا ہجوم ہو گیا تھا، تو بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس لشکر کو روک لیا جائے کہ انہوں نے شام جانا ہے، عرب کی حدود سے باہر جانا ہے، ملک کے حالات جب ٹھیک ہوں گے تو پھر ان کو بھیج دیجیے گا۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ جس لشکر کو جناب نبی کریمؐ نے خود روانہ کیا، میں اس کو واپس نہیں بلا سکتا، یہ لشکر جائے گا، چنانچہ وہ لشکر گیا۔

تبوک کا معرکہ

موتہ کے بعد دوسرا معرکہ تبوک کا تھا۔ تبوک میں لڑائی نہیں ہوئی لیکن پھر بھی بہت بڑا معرکہ ہے، جو جیش عسرۃ کہلاتا ہے، جس کے تذکرے سے سورہ توبہ بھری پڑی ہے، جس طرح سورہ انفال میں غزوہ بدر کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ اس پر میں عرض کیا کرتا ہوں کہ بدر ہماری پہلی جنگ تھی اور تبوک حضورؐ کی زندگی کا آخری بڑا معرکہ تھا۔ قرآن کریم نے ایک سورہ میں پہلے غزوہ کی اور دوسری سورہ میں آخری غزوہ کی تفصیلات بیان کیں۔ اول و آخر دونوں کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکام بیان فرمائے۔

تبوک کا پس منظر یہ ہے کہ چونکہ قیصر روم کے علاقے میں جنگ ہوئی تھی، موتہ شام کے اندر ہے اور شام روم کا علاقہ تھا۔ تو قیصر روم نے اس تناظر میں فیصلہ کیا کہ میں موتہ کی جنگ کے جواب میں شام کی فوجوں کو اکٹھا کر کے مدینہ پر چڑھائی کروں گا۔ اطلاع یہ ملی کہ

وہ خود شام آیا ہوا ہے، فوجیں اکٹھی کر رہا ہے اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ جناب نبی کریمؐ کو جب یہ اطلاع ملی تو حضورؐ نے بڑی حکمت و فراست کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ میں خود جاؤں گا اور یہ لڑائی مدینہ میں نہیں ہوگی بلکہ شام کی سرحد پر ہوگی۔ ایک کمانڈر کے لیے سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ میدان جنگ کون سا ہونا چاہیے۔ سمجھدار کمانڈر میدان جنگ اپنی مرضی کا منتخب کرتے ہیں جو کہ آدھی کامیابی ہوتی ہے۔ بدر میں بھی ایسے ہی ہوا تھا فرمایا "ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد" (الانفال ۴۲) تم آپس میں جگہ طے کرتے تو تمہارا آپس میں اتفاق نہیں ہونا تھا کہ کہاں لڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ان کو اُدھر سے لایا، اِدھر سے تمہیں لایا اور بدر میں اکٹھا کر دیا۔ تبوک سعودی عرب کا شام کی طرف آخری شہر ہے، گویا شام اور سعودیہ کی جزیرۃ العرب کی سرحد ہے۔

تبوک کے لیے بڑی عجلت سے لشکر تیار کیا گیا۔ حالات یہ تھے فصلیں پکی ہوئی تھیں اور شدید گرمی کا موسم تھا۔ زمیندار جانتے ہیں کہ فصل پکی ہوئی ہو اور زمیندار کو کہیں جانے کو کہا جائے تو یہ اس کے لیے بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ طویل سفر تھا، ایک مہینہ جانے میں لگا تھا، ایک مہینہ واپسی پر لگا۔ حکم آگیا "انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ" (التوبہ ۴۱) ہلکے ہو یا بوجھل ہو، نکلو۔ صحابہ کرامؓ کے ایثار و قربانی کا کمال یہ ہے کہ وہ نکل پڑے۔ منافقین پیچھے رہ گئے "یعتذرون الیکم اذا رجعتم الیھم" (التوبہ ۹۴) تین مسلمان بھی غلطی کا شکار ہوئے "وعلی الثلٰثۃ الذین خلفوا" (التوبہ ۱۱۸)۔ تبوک پہلی باقاعدہ محاذ آرائی تھی جو روم اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی۔ بنو طے کے بعد موتہ اور تبوک سے ہماری عیسائیت کے ساتھ کشمکش کا آغاز ہوا۔ رسول اللہؐ نے اسی موقع کے لیے فرمایا تھا "نصرت بالرعب مسیرۃ شھر" ایک مہینے کی مسافت تھی، رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی۔ یہ تبوک ہی کی بات ہے۔ آپؐ مدینہ سے چلے، قیصر روم کو جب پتہ چلا کہ محمد خود لشکر کی کمان کرتے ہوئے شام کی طرف بڑھ رہے ہیں، قیصر تھا تو وہی جس نے ابوسفیان کے سامنے "انہ لنبی" کہہ کر اقرار کیا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ آپؐ اللہ کے پیغمبر ہیں، تو اس کو حوصلہ نہیں ہوا، وہ شام میں ہی رہا۔ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ کا لشکر اس نے اکٹھا کیا تھا لیکن آپؐ کا سن کر ایک طرف دبک گیا۔ جناب نبی کریمؐ سرحد پر تبوک میں آکر بیٹھ گئے تھے، آگے نہیں بڑھے تھے۔ ایک مہینہ وہاں قیصر روم کے انتظار میں بیٹھے رہے کہ ہمارے علاقے میں

آئے گا تو ہم حملہ کریں گے، ادھر جا کر حملہ نہیں کریں گے، کیونکہ تبوک جزیرۃ العرب کا آخری شہر تھا اور آگے شام تھا۔

یہاں ایک ضمنی بات عرض کرتا ہوں۔ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اسلامی ریاست کی سرحدیں ہوتی ہیں؟ میں عرض کرتا ہوں کہ ہوتی ہیں۔ اسی لیے حضورؐ تبوک جا کر رک گئے کہ یہاں جزیرۃ العرب کی سرحد تھی۔ جب ایک مہینہ انتظار کے باوجود قیصر مقابلے پر نہ آیا تو آپؐ واپس چلے آئے۔ اس طرح غزوہ تبوک میں تین مہینے لگے تھے، ایک مہینہ جاتے ہوئے، ایک مہینہ وہاں انتظار میں، اور ایک مہینہ واپسی پر۔ تبوک میں لڑائی ہوئی نہیں تھی لیکن لڑائی کا ماحول بن گیا تھا۔

نبی اکرمؐ کا وصال اور حضرت ابوبکرؓ کی استقامت

فارس اور روم دنیا کی دو بڑی طاقتیں تھیں۔ رومہ بڑی عیسائی سلطنت تھی، قسطنطنیہ (استنبول) اس کا دارالحکومت تھا۔ اس طرح دنیا کی سب سے بڑی عیسائی سلطنت کے ساتھ مسلمانوں کا جنگ کا ماحول تبوک کے موقع پر بن گیا تھا، خود جناب نبی کریمؐ کی حیات مبارکہ میں اور حضورؐ کی قیادت میں۔ اس سے واپسی کے کچھ عرصہ ہی بعد آنحضرتؐ کا انتقال ہو گیا۔ جناب صدیق اکبرؓ نے خلافت سنبھالی تو حضرت ابوبکرؓ کی زیادہ توجہ داخلی انتشار پر قابو پانے کی رہی اور بحمد اللہ بڑی محنت، ثابت قدمی اور استقلال سے انہوں نے داخلی انتشار پر قابو پایا۔ حضرت ابوبکرؓ کو گھر سے ہی بغاوتوں کا سامنا تھا، مسیلمہ کذاب کی بغاوت، طلیحہ کی بغاوت، اسود عنسی کی بغاوت، مالک بن نویرہ کی بغاوت، مرتدین اور منکرین زکوٰۃ وغیرہ سے نمٹنا تھا۔ اور کل اڑھائی سال ان کو ملے خلافت کے، اس طرح ان کا زمانہ داخلی خلفشار پر قابو پاتے ہوئے گزر گیا، یہ بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی استقامت اور جرأت عالم اسباب میں مدینہ کی ریاست کو بچا گئی تھی۔ اگر وہ تھوڑے سے ڈھیلے پڑ جاتے تو عالم اسباب میں ریاست مدینہ کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حالات اتنے خوفناک ہو گئے تھے کہ حضرت صدیق اکبرؓ سے حضرت عمرؓ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ حضرت! ایک دو محاذ ابھی روک دیں، منکرین زکوٰۃ کے ساتھ لڑنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اگر مدینہ منورہ پر حملہ ہو جائے تو کوئی بچانے والا نہیں ہے، ہمارے پاس نفری ہونی چاہیے، ساری فوجیں باہر چلی گئی ہیں، دارالحکومت کی حفاظت کے لیے کوئی نفری موجود نہیں ہے۔ کسی نے حضرت صدیق

اکبرؓ کے جذبات کو ابھارنے کے لیے کہا حضرت! ازواج مطہرات یہاں بیٹھی ہیں اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو کیا ہو گا؟ یہ بات حضرت ابوبکرؓ ہی کر سکتے ہیں، ہمیں تو نقل کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ امام سیوطیؒ نے ان کا یہ جملہ نقل کیا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے دو جملے تاریخی جملے ہیں:

1. ایک منکرین زکوٰۃ کے حوالے سے "اینقص الدین وانا حی؟" دین میں کمی ہوگی اور میں بھی زندہ ہوں گا، یہ نہیں ہو سکتا۔

2. اور دوسرا جملہ انہوں نے یہ فرمایا تھا "لو جرت الکلاب بارجل ازواج النبیؐ"۔ اگر بھیڑیے ازواج نبیؐ کو پکڑ کر گھسیٹتے پھریں اور بچانے والا کوئی نہ ہو، یہ صورتحال مجھے قبول ہے، لیکن کوئی محاذ بند کر دوں، یہ بات میرے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ جواب دیا تھا اور حضرت عمرؓ کو ڈانٹا تھا "اجبار فی الجاھلیہ وخوار فی الاسلام" آپ جاہلیت میں تو اتنا بہادر تھے کہ حضورؐ کو شہید کرنے چلے تھے، اب اتنے کمزور پڑ گئے ہو؟

حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو قیصر روم کے ساتھ کیفیت صلح کی رہی۔ روایات میں آتا ہے کہ قیصر روم کی ریاست بھی موجود تھی، مدینہ کی ریاست بھی موجود تھی، آپس کے تعلقات بھی تھے۔ حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف سے متعلق ایک روایت میں ذکر ہے کہ قیصر روم کی اہلیہ نے حضرت عمرؓ کی اہلیہ کو خوشبو تحفے میں بھیجی۔ مطلب یہ کہ آپس میں تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا تھا، سفیروں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ شام کے علاقے میں لڑائی بھی جاری تھی، شام میں بڑے بڑے معرکے ہوتے رہے اور آہستہ آہستہ شام کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ شام کے فاتحین تین ہیں:

(۱) ابوعبیدہ عامر بن الجراحؓ (۲) خالد بن ولیدؓ (۳) اور یزید بن ابی سفیانؓ۔

یہ یزیدؓ حضرت معاویہؓ کے بڑے بھائی ہیں، بڑے صحابہ میں سے ہیں، بڑے کمانڈر تھے، شام کے فاتحین میں ہیں۔ اسی میں بیت المقدس کا معرکہ ہوا۔ بہت بڑا معرکہ تھا۔ جب حضرت ابوعبیدہؓ بیت المقدس پہنچے، وہاں کا محاصرہ کیا، بیت المقدس پر عیسائی اہل علم کا کنٹرول تھا، انہوں نے کتابوں میں جو نشانیاں پڑھ رکھی تھیں انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا ہم صلح کرتے ہیں اور بیت المقدس تمہارے حوالے کرتے ہیں، لیکن ہماری شرط یہ

ہے کہ کہ تمہارا امیر خود آئے گا، ہم چارج تمہیں نہیں دیں گے، تمہارے امیر کو دیں گے۔ اس پر حضرت عمرؓ خود سفر کر کے تشریف لے گئے اور بیت المقدس کا کنٹرول حاصل کیا۔

ادھر دمشق میں بھی اسلامی فوجیں داخل ہوئیں اور دمشق فتح ہو گیا۔ اللہ کی قدرت کہ حضرت ابوعبیدہؓ اسی دوران انتقال فرما گئے، ورنہ وہ ابھی امیر تھے۔ اور باقی دو کمانڈروں میں سے حضرت عمرؓ نے شام اور دمشق کا گورنر یزیدؓ بن ابی سفیان کو مقرر کیا۔ وہ شام کے پہلے مسلمان گورنر ہیں، یہ کچھ عرصہ گورنر رہے، پھر بیمار ہوئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی جگہ پھر ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کو شام کا امیر بنایا گیا جو نصف صدی کے لگ بھگ شام کے امیر رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں، پھر پانچ سال کا متنازعہ زمانہ بھی، اس کے بعد بیس سال کا عرصہ امارت کا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کا شکوہ اور خراجِ عقیدت

اس پر ایک دلچسپ واقعہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ذکر کیا ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ دمشق کی فتح کے بعد ریٹائرمنٹ لے کر حمص چلے گئے تھے، اس کے بعد معرکوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کی قبر حمص میں ہے، یہ شام کا علاقہ ہے۔ تاریخ ابن عساکر میں ہے کہ ایک دن حضرت خالدؓ نے اپنے دوستوں میں بیٹھے ہوئے معاصرانہ شکوہ کے طور پر کہا کہ لڑ لڑ کر ہم مر گئے، ہم نے لڑائیاں لڑیں، شام فتح کیا، اور جب دمشق پر کنٹرول ہو گیا اور شام نے اپنا شہد اور گندم مدینہ بھجوانا شروع کر دیا ہے تو اب کسی اور کو (یزیدؓ کو) یہاں کا امیر بنا دیا ہے اور مجھے کہتے ہیں غزوہ ہند کی تیاری کرو۔ حضرت عمرؓ نے کہیں اشارہ دیا ہو گا کہ اب آپ کو ہندوستان بھیجنا ہے۔ مجلس میں ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، کسی نے کہا حضرت! آپ انکار کر دیں۔ ایک اور آدمی بولا انکار کریں گے تو فتنہ پیدا ہو گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ حکم دیں اور یہ انکار کر دیں۔ یہ سن کر حضرت خالدؓ سیدھے ہو کر بیٹھے اور فرمایا "اما فی عھد عمر، فلا"۔ گھبراؤ نہیں عمرؓ کے ہوتے ہوئے کوئی فتنہ نہیں کھڑا ہو گا۔ یہ بڑا زبردست خراج عقیدت ہے حضرت عمرؓ کو۔

شام، مصر اور عراق کی فتوحات

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شام کا علاقہ مکمل طور پر رومیوں سے، اور عراق کا سارا علاقہ ایرانیوں سے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ ایران کی ریاستوں میں سے بحرین تو حضورؐ کے زمانہ ہی میں قابو آ گیا تھا۔ علاء بن حضرمی کو حضورؐ نے گورنر مقرر کر دیا تھا۔ جس طرح بحرین

بڑا گڑھ تھا فارس (ایران) کا، شام بڑا گڑھ تھا روم کا۔ بہر حال یہ معرکہ شام کا ہمارا عیسائیوں سے تھا۔

اس کے بعد مصر میں معرکہ آرائی ہوئی۔ مصر بھی عیسائی ریاست تھا۔ مقوقس مصر کو آپؐ نے اسلام کی دعوت کا خط لکھا، اس نے بڑے احترام اور پروٹوکول سے جواب دیا لیکن اسلام قبول نہیں کیا۔ مصر کا علاقہ فتح کیا ہے حضرت عمرو بن العاصؓ نے، آپؓ فاتح مصر ہیں اور مصر کے گورنر بھی رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ تین بڑے خطے قابو آئے مصر، شام اور عراق۔ عراق ایرانیوں سے اور شام و مصر عیسائیوں سے۔

دورِ خلافت کے بعد

دور خلافت راشدہ کے بعد بھی یہ لڑائیاں چلتی رہیں۔ چھوٹے چھوٹے معرکے تو ہوتے رہے، بیسیوں جنگیں ان معرکوں میں ہوئی ہیں۔ تیسرا بڑا معرکہ ہمارا عیسائیوں کے ساتھ اندلس کا ہے۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی دی۔ طارق بن زیاد لشکر لے کر جا رہے تھے۔ جب افریقہ سے یورپ میں داخل ہوئے، اندلس میں۔ مراکش افریقی شہر ہے اور اس کے درمیان میں سمندر کی سولہ سترہ میل کی پٹی ہے، دوسری طرف اندلس ہے۔ مراکش اور اندلس آمنے سامنے ہیں۔ طارق بن زیاد وہ سمندر کی پٹی عبور کر کے گئے تھے اور دوسری طرف جا کر ساری کشتیاں جلا دیں۔ یہ اندلس کا معرکہ عیسائیوں کے ساتھ ہوا جو بڑے معرکوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ کشمکش چلتی آ رہی تھی، اس دوران عیسائیوں نے اپنی شکست پر پھر کروٹ لی اور مسلمانوں کے ساتھ محاذ آرائی کا بازار گرم کیا۔

ایک دور ہے آنحضرتؐ کا۔ دوسرا دور عیسائیوں کے ساتھ کشمکش کا ہے جس میں شام، مصر اور وقفہ کے بعد اندلس کی جنگ ہے۔ اس کے بعد جو نیا محاذ صلیبی جنگوں کا بنا، اس کا سبب بیت المقدس تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ بیت المقدس ہمارا تو ہے ہی، یہودی اور عیسائی بھی دعویدار ہیں بیت المقدس کے۔ مسلمانوں کے ہاتھ آنے پر عیسائیوں کو بہت تکلیف تھی اور ہونی چاہیے تھی، فطری بات ہے جیسے بیت المقدس یہود کے ہاتھ جانے پر ہمیں تکلیف ہے۔ کوئی بھی مسلمان اس صورتحال پر خوش نہیں ہے، بڑے اضطراب کی کیفیت ہے۔

عیسائیوں نے بیت المقدس کو ٹارگٹ بنا کر پلاننگ کی تھی کہ ہم نے اپنا شہر یروشلم واپس لینا ہے۔ یہ پلاننگ پاپائے روم پوپ اربن ثانی نے کی تھی، اس زمانے میں عیسائی دنیا پر

پادریوں کی حکومت ہوتی تھی۔ انقلاب فرانس کے بعد حکومتوں پر پادریوں کا کنٹرول ختم ہوا، اس سے پہلے پاپائے روم کو حکومتوں کے سب سے بڑے سرپرست کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ یہ صلیبی جنگیں دو سو سال جاری رہیں۔ مذہب اور صلیب کے نام پر اور یروشلم کی واپسی کے نام پر رہی ہیں۔ اس دوران نوے سال بیت المقدس عیسائیوں کے پاس رہا، پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے ان سے واپس لیا۔ یہ صلیبی جنگیں کیا تھیں، اس میں عیسائیوں کے کون کون سے لوگ شریک تھے اور ہمارا کیا کردار تھا، اس پر ان شاء اللہ العزیز اگلی نشست میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

اندلس میں مسلم حکومت

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! ہمارا یہ موضوع چل رہا ہے کہ اس وقت جو مختلف مذاہب انسانی سوسائٹی میں موجود ہیں، ان کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل میں ہمارے معاملات اور تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ عیسائیت پر بات چل رہی ہے۔ آج اندلس کے حوالے سے بات ہوگی۔ اگلی نشستوں سے ان شاء اللہ دیگر مذاہب پر گفتگو ہوگی۔

اندلس یورپ کا ایک حصہ ہے، آج کل اس کو اسپین کہتے ہیں۔ اندلس اس دور کے ہسپانیہ کا ایک حصہ تھا۔ مراکش جو اقصی مغرب کہلاتا ہے، اس سے آگے یورپ شروع ہوتا ہے جس میں اندلس ہے۔

افریقہ کی فتوحات حضرت عثمانؓ کے زمانے میں شروع ہوگئی تھیں۔ مراکش افریقہ کا حصہ ہے۔ افریقہ سے یورپ کی طرف بنو امیہ کے دور میں طارق بن زیاد، مسلم بن نصیر وغیرہ جرنیلوں نے پیشرفت کی۔ یہ وہاں حملہ آور ہو کر علاقوں پر قبضہ کرتے تھے۔ یہ کام تقریباً ۹۲ھ سے شروع ہوگیا تھا، یعنی جناب نبی کریمؐ کی رحلت کے ۸۰ سال بعد یورپ میں ہمارا داخلہ براستہ اندلس شروع ہوگیا تھا۔

بنو اُمیہ اور بنو عباس کی کشمکش

بنو امیہ کی خلافت کے خلاف بنو عباس کی مہم ایک عرصے سے چل رہی تھی۔ یہ پرانی کشمکش تھی، بنو ہاشم بھی بنو امیہ کے خلاف لگے رہے، امام زید اور امام نفس زکیہ نے بھی خروج کیا، لیکن اس میں بنو عباس کا دائرہ اپنا تھا اور بنو علی کا دائرہ اپنا تھا۔ بنو علی کو باوجود خروج کے حکومت پر کنٹرول حاصل نہیں ہوا۔ بنو عباس بالآخر بنو امیہ کو گرانے میں اور ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ابو عبداللہ سفاح پہلے عباسی خلیفہ ہیں، ان کو

سفاح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بہت زیادہ خون ریزی کی تھی۔ اور جب ایک اقتدار گرا کر دوسرا اقتدار جگہ لیتا ہے تو یہ فطری بات ہے، ایسے ہوتا ہے۔ اور یہ بھی واضح بات ہے کہ سب سے زیادہ قتل عام حریف کا ہوتا ہے۔ ملکہ سبا بلقیس نے جو کہا تھا "ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذلک یفعلون" (النمل ۳۴) بادشاہوں کا سب سے پہلا ٹارگٹ یہ ہوتا ہے کہ پہلے اشرافیہ حکمران طبقات کو نیچے لانا۔

ضمناً کہہ دوں کہ یہاں بھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اقتدار سنبھالا اور پھر ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی اقتدار آ گیا تو چونکہ اقتدار مسلمانوں سے لیا تھا، اس لیے سب سے زیادہ نشانہ مسلمانوں کو ہی بنایا گیا۔ یہی بات بنوامیہ کے ساتھ ہوئی کہ بنوعباس نے بنوامیہ کے افراد کو چن چن کر قتل کیا، البتہ ان میں سے ایک شہزادہ سمجھدار نکلا، اس نے مزاحمت نہیں کی۔ اندلس کا علاقہ بنوامیہ کے ہی زمانہ میں فتح ہوا تھا، تو اس نے مزاحمت کرنے کی بجائے ایک طرف ہو کر یہ علاقہ سنبھال لینے کو ترجیح دی۔ وہ شہزادہ تھا عبد الرحمن بن معاویہ بن ہشام بن عبد الملک بن مروان۔ یہ چپکے سے وہاں سے نکلا، ظاہر بات ہے ہر آدمی کے کچھ حمایتی بھی ہوتے ہیں۔ تو یہ بچتا بچاتا اندلس جا پہنچا۔ اس کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ چونکہ اندلس کا سارا انتظام انہی کے دور میں ہوا تھا تو وہ اس کی قدر کریں گے۔ اس نے اندلس کے ساحل پر اترتے ہی اپنی خلافت کا اعلان کر دیا کہ میں خاندان خلافت کا فرد ہوں اور خلیفہ کا پوتا ہوں، یہاں میں اپنی امارت کا اعلان کر رہا ہوں۔ وہاں مقامی حکمرانوں سے مزاحمت ہوئی لیکن عبد الرحمن نے بڑھتے بڑھتے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کو عبد الرحمن الاول اور عبد الرحمٰن الداخل بھی کہتے ہیں۔ یہ اندلس میں بنوامیہ کی سلطنت کا بانی ہے۔ ۱۳۸ھ میں یہ اندلس میں داخل ہوا، جس اموی کو علم ہوا کہ عبد الرحمٰن الداخل نے اندلس میں حکومت قائم کر لی ہے، وہ وہاں جمع ہوتے چلے گئے اور ایک مستحکم حکومت قائم ہو گئی۔ ایک عرصہ تک انہوں نے حکومت کی، ۳۹۹ھ تک بنوامیہ کی وہاں حکومت رہی۔ دس خلیفہ گزرے ہیں، یہ بھی خلافت بنوامیہ کہلاتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ خلافت بنوامیہ دمشق سے منتقل ہو کر اندلس چلی گئی اور بنوعباس نے خلافت قائم کر کے بغداد کو اپنا مرکز بنا لیا۔

اس کے بعد بنوامیہ خلفشار کا شکار ہوئے۔ مختلف خاندان قبضہ کرتے رہے، حکومتیں کرتے رہے۔ مثلاً بنو حنوط، پھر بنو عباد، پھر مرابطین، پھر موحدین، پھر بنو ہود۔ طوائف الملوکی ہو گئی۔ اموی دور میں اندلس کی حکومت مستحکم تھی، اس نے بڑی ترقی کی اور اس دور

کے اندلس کو آج بھی دنیا یاد کرتی ہے۔ اندلس تہذیب کا مرکز تھا۔ اِدھر مسلم تہذیب کا مرکز بغداد تھا اور اُدھر مسلم تہذیب کا مرکز غرناطہ اور قرطبہ تھا۔ اور تاریخ مانتی ہے کہ یورپ کو تہذیب و تمدن، حقوق اور تعلیم سے روشناس کرانے والا غرناطہ اور قرطبہ تھا۔ انہوں نے تقریباً تین سو سال وہاں حکومت کی۔ پھر غرناطہ الگ ہو گیا، قرطبہ الگ ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنتی گئیں لیکن مجموعی طور پر یہ اقتدار مسلمانوں کے ہی پاس رہا۔ عیسائیوں کے ساتھ بھی جنگیں ہوتی رہیں اور آپس میں بھی جنگیں ہوتی رہیں۔ چلتے چلتے ۸۹۷ھ میں مسلمانوں کو وہاں سے مکمل شکست ہوئی۔ غرناطہ میں ابو عبداللہ جو ہمارا آخری حاکم تھا، اس کا عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ ہوا، بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کے ساتھ، اور ابو عبداللہ وہاں سے نکل گیا۔

اس طرح ۹۲ھ سے شروع ہو کر ۸۹۷ھ تک تقریباً آٹھ سو سال مسلمانوں کی وہاں حکومت رہی، جس میں سے تین چار سو سال تو ہماری مستحکم حکومت تھی، پھر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور رخصت ہی ہو گئے۔ اس دوران یورپ پر اثرات کیا ہوئے اور ہم پر اثرات کیا ہوئے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اندلس پر بنوامیہ کی خلافت قائم ہونے کے بعد باقی علاقہ بنوعباس کے لیے آزاد ہو گیا تھا تو یہاں بنوامیہ نے بنوعباس سے مزاحمت نہیں کی۔ ساری معاصرت وہاں منتقل ہو گئی تھی۔ پھر بنوعباس سے ہلاکو خان نمٹا ہے۔ تاتاری آئے لیکن بنوامیہ سمندر پار دوسرے علاقے میں بڑی دلجمعی کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

یورپ کی حالت زار

اس دوران کے تاریخی حقائق یہ ہیں۔ یورپ کی مجموعی صورتحال یہ تھی کہ نہ وہاں تعلیم تھی، نہ ہنر تھا، نہ ہی حقوق تھے، مکمل جاہلیت کا منظر تھا۔ عرب جاہلیت سے بھی بدتر۔ یورپ میں حکمران (۱) بادشاہ تھا (۲) جاگیردار تھا (۳) پاپائے روم تھا۔ جاگیرداروں کے مزارعین جانوروں سے بدتر زندگی گزارتے تھے۔ بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا، جو کہہ دیا وہی قانون ہے، اور پاپائے روم ان کے پشت پناہ ہوتے تھے۔ مذہبی قیادت ان کا ساتھ دیتی تھی۔ وہاں جا کر علم کی بات سب سے پہلے مسلمانوں نے کی ہے۔

یورپ کے مؤرخ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں لیکن مسلمان کی بجائے عربوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں تعلیم، تہذیب، تمدن اور ثقافت سے روشناس عربوں نے

کرایا۔ ہمیں ایک دوسرے کے حقوق کی پہچان عربوں نے کروائی۔ سائنس وٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت کی بنیاد عربوں نے رکھی۔ یہ بات وہ مانتے ہیں کہ یہاں کی تعلیم گاہیں پورے یورپ کی تعلیم کا مرکز تھیں۔ تقریباً تین چار صدیاں یہ ماحول رہا ہے کہ جس طرح آج ہمارے ہاں لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ، فرانس اور امریکہ وغیرہ جاتے ہیں، اس زمانے میں پورے یورپ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے غرناطہ، اندلس کا رخ کیا جاتا تھا۔ یہ مہذب اور تعلیم یافتہ ملک شمار ہوتا تھا۔ یورپ میں علم ودانش اور حقوق کا شعور داخل کرنے کا سبب اندلس بنا ہے۔

عباسی دور کی دستور سازی

میں ایک اور حوالے سے بات کرتا ہوں کہ یہ دور تھا جب ہماری چاروں فقہیں مرتب ہو کر مروج ہو چکی تھیں۔ اللہ کی قدرتِ تقسیم یہ ہوئی کہ حنفی فقہ کو عباسیوں نے اپنا لیا تھا۔ عباسیوں نے سب سے پہلے دستور مرتب کیا۔ ہمارے ہاں ایک بحث چلتی ہے کہ آیا دستور سازی جائز ہے؟ نہ معلوم کہاں سے ہم یہ تصورات لے لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں عباسیوں کے دور میں باقاعدہ دستور سازی اور قانون سازی ہوئی ہے۔ ہارون الرشید نے اپنے چیف جسٹس امام ابو یوسفؒ سے فرمائش کر کے کہا کہ میرے لیے نظم مملکت، مالیات وغیرہ کے قواعد وضوابط مرتب کر دیں تاکہ میں ان کو نافذ کر دوں۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" لکھی جو بنیادی طور پر مالیات کے نظام پر ہے۔ اردو، عربی، انگلش بلکہ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ موجود ہے۔ کتاب الخراج پڑھنے سے پہلے میں بھی یہی سمجھا کرتا تھا کہ اس میں کافروں سے خراج لینے کے متعلق مسائل ہوں گے لیکن اس میں پورا نظام معیشت ہے، بیت المال کا پورا سسٹم ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ عامل کا تقرر کیسے کرنا ہے، خلیفہ کیسے منتخب ہوگا، دستور، ایڈمنسٹریشن، مالیات اور عدالتی نظام پورے کا پورا اس میں موجود ہے۔

اس کو اگر سامنے رکھا جائے تو آج کی زبان میں وہ دستور ہی کہلائے گا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اس زمانے میں کوئی پارلیمنٹ بنائی جاتی کہ دستور مرتب کر دو، تو وہ یہی دستور مرتب کرتی جو اکیلے امام ابو یوسفؒ نے کر دیا۔ میں علماء کرام سے عرض کیا کرتا ہوں کہ سسٹم کے حوالے ہماری کلاسیکل کتابیں امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج، ابو عبید قاسم بن سلام کی کتاب الاموال اور ماوردی اور قاضی ابویعلیٰ کی الاحکام السلطانیہ (دونوں کی الاحکام السلطانیہ الگ الگ ہے)۔ ان میں قانون و دستور بھی ہے اور مالیات و عدلیہ بھی ہے۔ جبکہ

لائبریریوں میں موجود ہوتے ہوئے بھی یہ چاروں کتابیں ہمارے مطالعے سے باہر ہیں۔ کہیں کوئی مضمون لکھنا پڑجائے اور کوئی صفحہ کھول کر دیکھ لے تو الگ بات ورنہ ہم ان کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ اور دنیا بھر میں یہ پروپیگنڈہ سنتے رہتے ہیں کہ اسلام کے پاس کوئی سسٹم نہیں ہے، لیکن پڑھیں گے تو پتہ چلے گا۔

مسلم دنیا میں فقہی تقسیم

خلافت عباسیہ نے فقہ حنفی کو اپنا لیا، پوری خلافت عباسیہ میں فقہ حنفی ملک کا قانون رہی ہے۔ اس کے بعد ترکوں کی خلافت عثمانیہ آئی اس نے بھی فقہ حنفی کو ہی ریاستی قانون کا درجہ دیا۔ ہندوستان میں مغل حکومت تھی، ان کی فقہ بھی فقہ حنفی تھی۔ تین بڑے ایمپائر: عباسی ایمپائر، عثمانی ایمپائر اور مغل ایمپائر، ان میں فقہ حنفی قانون رہی ہے ۱۸۵۷ء تک۔ فقہ حنفی کے بہت سے امتیازات کی وجہ یہ ہے کہ عملاً قانون رہی ہے۔ جو قانون صرف کتابوں میں ہو اور سوسائٹی میں عملاً نہ ہو وہ قانون اور ہوتا ہے۔ اور جس قانون کو پریکٹیکل تجربات، مشاہدات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے وہ قانون اور ہوتا ہے۔ جس قانون نے سوسائٹی میں عمل کرنا ہے اس کو رکاوٹیں بھی پیش آئیں گی، اس کو حل بھی نکالنا پڑے گا۔ فقہ حنفی پر سب سے بڑا الزام حیلہ کا ہے، حالانکہ قانون کو راستہ نکالنا پڑتا ہے، قانون میں ڈیڈلاک کبھی نہیں ہوا کہ چار دن قانون نہ سہی۔ یہ بات نہیں ہوتی، قانون کوئی نہ کوئی ہوگا۔

مشرق سارا فقہ حنفی پر عمل پیرا ہے۔ مغربی افریقہ میں فقہ مالکی نے حکمرانی کی ہے، اب بھی مراکش، لیبیا، تیونس میں فقہ مالکی ہے۔ جبکہ بمبئی سے آگے ملائیشیا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا کے آخر تک سارے شافعی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق پچیس تیس کروڑ شافعی ہیں اس خطے میں۔ بمبئی سے شوافع شروع ہوتے ہیں، بمبئی میں بھی شوافع بہت ہیں بڑی مضبوط کمیونٹی ہے شوافع کی۔ دہلی میں حنفی ہیں اور لکھنؤ میں شیعہ۔ یہ تکون صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔

فقہ کی درس نظامی میں ابتدائی کتاب ”مالا بد منہ“ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی لکھی ہوئی ہے۔ میں ایک دن لندن کی ایک مسجد میں تھا، مغربی ماحول میں ہوتا یہ ہے کہ جہاں لوگ کہیں جا کر بستے ہیں، ان کے پاس جو اپنی کتابیں ہوتی ہیں اگلی نسل کے لیے وہ کتابیں بیکار ہوتی ہیں، زبان کے لحاظ سے بھی اور ذوق کے اعتبار سے بھی، ان کے کسی کام کی نہیں ہوتیں۔ وہ اول تو پھینک دیتے ہیں یا بہت زیادہ احترام کریں گے تو قریب کی مسجد

میں چھوڑ آئیں گے۔ میں نے بہت سی کتابیں مسجدوں سے اٹھائی ہیں۔ مجھے لندن کی مسجد میں ”مالابد منہ شافعی“ ملی۔ میں چونکا کہ مالابد منہ تو حنفیوں کی ہے، یہ شافعیوں کی کدھر سے آگئی۔ وہ بالکل اسی ضخامت کی، اسی زمانے کی، اسی لہجے میں، اسی انداز و ترتیب سے فارسی زبان میں تھی، اس میں شافعی فقہ بیان کی گئی تھی۔ میں نے ہدیہ مسجد میں شامل کر کے وہ کتاب لے لی۔ میرے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔

ہم حنفی، مالکیہ اور شوافع کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ مغرب میں مالکیہ اور مشرق میں شوافع ہیں، درمیان میں ایک چھوٹی سی پٹی حنابلہ کی ہے، سعودیہ اور عرب امارات۔ مصر میں بھی زیادہ شوافع ہیں۔ اندلس نے بڑے بڑے علماء پیدا کیے ہیں مثلاً امام قرطبی اور ابن خلدون وغیرہ۔

علم کا تعارف مغرب کو مسلمانوں نے کرایا ہے۔ سائنس اور صنعت و حرفت کی بنیاد بھی مسلمانوں نے فراہم کی ہے، اور حقوق کا تعارف بھی مسلمانوں نے کروایا۔ مغرب اس کا اعتراف کرتا ہے۔ جب کسی قوم کا دور ہوتا ہے تو ابتدائی ایک سو سال اس کے ارتقا کا زمانہ ہوتا ہے، اور آخری سو، سوا سو سال تنزل کا زمانہ ہوتا ہے۔ عروج کا زمانہ درمیان کا ہوتا ہے۔ جیسے بنوامیہ کے اس آٹھ سو سال کے دور میں عروج کا دور تین سو سال کا تھا۔

علم و فلسفہ کی پشت پناہی کے لیے طاقت کی ضرورت

علم، تہذیب، تمدن، فلسفہ کے لیے طاقت کی پشت پناہی ضروری ہوتی ہے، ورنہ ختم ہو جاتا ہے۔ صرف علم، صرف تہذیب، صرف فلسفہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے اگر دنیا پر ہزار سال حکومت کی ہے تو ہماری بنیاد علم اور اخلاقیات پر تھی، لیکن پشت پناہ طاقت و حکومت تھی۔ آج اگر دنیا پر مغرب کا فلسفہ حکمرانی کر رہا ہے، ہماری خواہشات کے علی الرغم کر رہا ہے، ہمارا ایک لمحہ کے لیے بھی جی نہیں چاہتا کہ ہم مغربی فلسفے کو قبول کریں لیکن ہمیں قبول کرنا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ اس کی پشت پناہی طاقت کر رہی ہے۔ مغرب کا فلسفہ تمام تر کمزوریوں کے باوجود، تمام تر اعتراضات کے باوجود، دنیا کی مختلف قوموں کے تمام تر تحفظات کے باوجود دنیا کا حکمران ہے، جس کے سامنے چین بھی بے بس ہے۔ چین معیشت کے میدان میں ٹکر لے رہا ہے، فلسفے اور تہذیب و تمدن کے محاذ پر وہ وہیں کھڑا ہے جہاں مغرب کھڑا ہے۔ یہ سب کچھ طاقت کے بل بوتے پر ہو رہا ہے۔ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

نبوت کے ساتھ بھی طاقت ضروری ہے، حضرت داؤد علیہ السلام طاقت کے ذریعے ہی خلیفہ بنے۔ خلیفہ بننے کے لیے جالوت کو قتل کرنا پڑا تھا "وقتل داوود جالوت واتاہ اللہ الملک والحکمۃ وعلمہ مما یشاء" (البقرہ ۲۵۱)۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں پہلے انہوں نے جالوت کو قتل کیا پھر میں نے ان کو حکومت، نبوت اور خلافت دی تھی۔ دنیا کا مذہب، دین، عقیدہ آسمان سے آتا ہے، دنیا میں طاقت ملتی ہے تو نظام چلتا ہے۔ اور ہم آج مار کھا رہے ہیں طاقت نہ ہونے کی وجہ سے کہ طاقت کا توازن ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جس قوم کے پاس طاقت کا توازن نہیں ہے وہ خود اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، دوسروں پر حکومت کیا کرے گی! قرآن کریم کے ایک نکتے کی طرف اشارہ کروں گا، قرآن کریم نے طاقت کا معیار بتایا ہے "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم واخرین من دونھم" (الانفال ٦٠)۔ قوت کا ترجمہ حضورؐ نے کیا تھا "الا ان القوۃ ھی الرمی" قوت رمی کا نام ہے۔ رمی کا معنی پھینکنا، رمی سے مراد ہتھیار پہنچانے اور پھینکنے کی صلاحیت۔

آج کی دنیا میں سب سے بڑی دوڑ اس بات میں ہے کہ میرے میزائل کی چھ ہزار میل تک رسائی ہے، دوسرا کہتا ہے میرے میزائل کی رسائی آٹھ ہزار میل تک ہے۔ میزائل کی رینج کس کی کتنی ہے، آج کی قوت یہ ہے۔ آج کی جدید ترین سائنس بھی قوت کا معیار میزائل کی رینج کو قرار دیے ہوئے ہے۔ اور رباط الخیل سے مراد لاجسٹک سورسز (نقل وحرکت کے ذرائع) ہیں۔ اس زمانے میں گھوڑے، خچر اور اونٹ ہوتے تھے، اس لیے رباط الخیل کہا۔ آج طیارے ہیں، بحری جہاز ہیں۔ اب میزائل کی رینج اور لاجسٹک سورسز کے ساتھ ایک اور طاقت کا اضافہ ہو گیا ہے، وہ ہے معلومات تک رسائی اور معلومات کا پھیلاؤ۔ یعنی انٹرنیٹ، کہ آپ معلومات کے حصول اور پھیلاؤ پر کتنی جلدی اور کتنی مکمل رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

دشمن کے خلاف کتنی طاقت مہیا کرو، اس کا معیار یہ بتایا "ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم" اتنی طاقت کہ تم دہشت پھیلا سکو، جس کے ساتھ تم دشمن کو رعب میں رکھ سکو۔ ارہاب دہشت کو کہتے ہیں، دہشت گردوں کو ارہابین کہتے ہیں۔ اس آیت کا سادا سا ترجمہ یہ کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جتنے تمہارے پاس وسائل ہیں سارے خرچ کرو، قوت پیدا کرو، لاجسٹک سورسز پیدا کرو۔ اتنے کہ طاقت کا توازن تمہارے ہاتھ میں ہو۔ جب طاقت کا

توازن ہمارے ہاتھ میں تھا ہم نے حکمرانی کی ہے۔ ہم نے طاقت کا توازن کھو دیا اب جس کے پاس ہے وہ حکمرانی کر رہا ہے۔

سائنس و ٹیکنالوجی اور مسلم سلطنتوں کا طرزِ عمل

• ہماری حکومتوں میں سے دو حکومتوں نے اس طرف کوئی توجہ دی ہے۔ ایک نے بالکل ابتدائی درجے میں یعنی عباسیوں نے۔ سائنسی ایجادات، سائنسی مطالعہ کا آغاز عباسیوں کے دور میں ہوا۔ انہوں نے رسد گاہ بنائی۔ رسد گاہ کیا تھی؟ ہمارے ہاں ستاروں وغیرہ کے علوم عقلیات کے دائرے میں تھے، اس کو مشاہدات کے دائرے میں لانے کے لیے سب سے پہلا کام عباسیوں نے کیا ہے۔ ادھر اندلس میں بنو امیہ تھے۔ دونوں معاصر تھے ان دونوں نے اس طرف توجہ دی۔

• پھر ہماری دو حکومتوں نے اس طرف توجہ نہیں دی جس کی ہم مار کھا رہے ہیں۔ نہ خلافت عثمانیہ نے اس کو اپنا ایجنڈا بنایا، نہ مغلوں نے بنایا۔ یورپ نے انگڑائی لی اندلس کی وجہ سے، لیکن اس کے متبادل جو ہماری حکومت یورپ کے ایک حصے ترکی میں بنی یہ بے خبر رہی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پر کوئی توجہ نہ دی، ادھر مغلوں نے بھی یہی کیا۔

میرا تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر ایک موقف ہے اور بے بنیاد نہیں ہے کہ یورپ کو حقوق، عمرانیات اور سماجیات سے اندلس نے متعارف کرایا، سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھی اندلس نے متعارف کروایا۔ یہ تو ہمارا کریڈٹ ہے، کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب بنیادیں فراہم کر کے عمارت شروع کرنے کا وقت آیا تو ہم اندلس سے بے دخل ہو گئے کہ ہماری سیاسی قوت نہیں رہی تھی، عسکری قوت شکست کھا گئی تھی۔ اور جس فلسفے اور نظام کے پیچھے سیاسی اور عسکری قوت نہ ہو اس کا حال وہی ہوتا ہے جو ہمارا اندلس میں ہوا۔ بنیادیں ہم نے قائم کیں، عمارت یورپ نے کھڑی کر دی۔ اصول ہم نے فراہم کیے، ڈھانچہ انہوں نے بنا لیا۔ آج جو بھی چیز دیکھیں گے اس کے پیچھے اندلس، غرناطہ اور قرطبہ نظر آئے گا۔ لیکن جب ہم اپنی سیاسی و عسکری قوت برقرار نہیں رکھ سکے تو وہی ہونا تھا جو ہوا۔

بغداد میں ہلاکو خان نے ہماری تباہی کا سامان کیا اور اندلس میں فرڈینینڈ اور ملکہ ازبیلا نے کیا۔ جب ابو عبداللہ غرناطہ کی پہاڑیوں سے رخصت ہوئے، جلاوطن کر دیے گئے تو پھر ازابیلا ملکہ تھی اور بادشاہ فرڈینینڈ تھا۔ ان میاں بیوی نے ہم پر فتح پائی تھی، انہوں نے باقاعدہ نوٹس دے دیا، اعلان کر دیا کہ یا عیسائی ہو جاؤ یا ملک چھوڑ دو ورنہ قتل کر دیں گے۔ یہ مہذب ملکوں کی بنیاد ہے، لاکھوں لوگ قتل کیے، لاکھوں بھاگے، لاکھوں عیسائی ہوئے۔ امریکہ میں جانے والے کالوں کی اور اسپینش کی ایک بڑی تعداد مسلمان تھی جو وہاں جا کر عیسائی ہوئے۔ ہم پر یہ اثرات ہوئے کہ ہم نے علم کی ترقی اور سائنس و ٹیکنالوجی کی طرف اور قرآن کریم کے اس ارشاد "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم" کی طرف جو قدم بڑھانا شروع کیا تھا، ادھر ہلاکو خان نے اور ادھر فرڈینینڈ اور ازابیلا نے ہمیں تہس نہس کر دیا اور ہمارے قدم وہیں رک گئے۔ اور ایسے رکے کہ ابھی تک رکے ہوئے ہیں۔ ابھی تک اجارہ داری انہی کی ہے، ابھی تک وہی ہم پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

امریکہ کی دریافت

امریکہ کی دریافت اس دوران ہوئی جب اندلس میں ہمیں شکست ہو گئی تھی۔ یہ ۱۴۹۰ء کے دور تھا، شاہ فرڈینینڈ اور ملکہ ازابیلا اسپین کے بادشاہ اور ملکہ نے اندلس میں ہمیں شکست دے کر اندلس کو خالی کرا لیا تھا۔ امریکہ کو دریافت کرنے والا کولمبس شاہ فرڈینینڈ اور ملکہ ازابیلا کا نمائندہ تھا، اس کے خرچے اور اجازت سے ہند کو دریافت کرنے نکلا تھا لیکن اس کا رخ ادھر ہو گیا اور وہ امریکہ جا پہنچا۔ اس کا تو اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ بھی دنیا میں کوئی براعظم ہے۔

پرانے زمانے میں سمندری سفر اسی طرح ہوا کے رخ پر ہوتا تھا، ہوا کا رخ بدل گیا تو سفر کا رخ بھی بدل گیا۔ جیسے بخاری کی روایت میں ہے، ابو موسٰی اشعریؓ کہتے ہیں کہ ہم سمندری راستے سے مدینہ کی طرف چلے تھے، ہوا کا رخ بدلا تو ہم حبشہ جا پہنچے، کافی عرصہ وہاں رہنا پڑا۔ اسی طرح کولمبس امریکہ جا پہنچا۔

تاریخ یہ کہتی ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب وہاں پہنچے تھے۔ یہ ایک تاریخی تنازعہ ہے کہ امریکہ عربوں نے دریافت کیا یا کولمبس نے دریافت کیا۔ لیکن یہ بات تاریخی طور پر

ثابت ہے کہ جب کولمبس وہاں پہنچا تو اسپینش عرب وہاں موجود تھے۔ امریکہ میں دوسری بڑی نیشنلٹی اسپینش کی ہے، دوسری سرکاری زبان اسپینش ہے۔

اندلس میں شکست کے بعد مسلمانوں کے لیے راستہ

یہ کہا جاتا ہے اور شواہد بھی موجود ہیں کہ اندلس پر قبضہ کرنے کے بعد جب شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا نے وہاں جبراً لوگوں کو عیسائی بنایا تھا اور یہ آرڈر دیا تھا کہ ایک ماہ کے اندر

- اسپین چھوڑ دو،
- عیسائی ہو جاؤ،
- یا پھر قتل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اندلس کی غالب اکثریت کو انہوں نے عیسائی بنا لیا تھا، بڑی تعداد کو قتل کر دیا تھا، بہت سے لوگ بھاگ گئے تھے۔ بھاگنے کا راستہ سمندر ہی تھا۔ اس کی ایک جھلک روہنگیا ارکان کی کشمکش میں دکھائی دیتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسپین والے کیسے بھاگے تھے، لیکن روہنگیا مسلمانوں کا معاملہ دیکھ کر بات سمجھ میں آ گئی۔ برما والے انہیں دھکیل رہے تھے، بنگلہ دیش والے انہیں قبول نہیں کر رہے تھے، بہت سے لوگ سمندر میں ڈوب گئے، کچھ کو کہیں پناہ مل گئی۔ ایسے ہی اسپین کے مسلمان ایمان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ نکلے، بہت سے لوگ سمندر میں ڈوب گئے اور بہت سے امریکہ پہنچ گئے۔ اکثر وہ ہیں جن کو اس زمانے میں اسپین سے نکال دیا گیا تھا۔ آج کے اسپینش انہی کی اولاد ہیں لیکن اکثر مسلمان نہیں ہیں، غالب اکثریت عیسائی ہو گئی ہے۔

امریکہ کی ہسپانوی نسل کے مسلمان

اسپینش نسل کی دو چھوٹی چھوٹی شہادتیں میرے سامنے بھی ہیں:

- ۱۹۸۷ء کی بات ہے جب میں پہلی بار امریکہ گیا، نیویارک میں گوجرانوالہ کے ہمارے ایک دوست تھے ڈاکٹر زاہد، ان کا وہاں کلینک تھا، ایک دن کہنے لگے لوگ تو یہاں سفر کر کے چیک اپ کرانے کے لیے آتے ہیں، آپ آئے ہوئے ہیں تو میرے کلینک پر چیک اپ کرا لیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کر لیں۔ انہوں نے مجھے دوسرے دن دس بجے کا وقت دے دیا کہ آپ آ جائیں اور عملے سے کہہ دیا کہ مولوی صاحب آئیں گے، ان کا چیک اپ کرنا ہے۔ چیک اپ کے لیے میرا خون لینے والی لڑکی اسپینش تھی، اس نے ٹیسٹ کے

لیے میری رگ سے خون نکالنا تھا۔ جب اس نے سوئی چبھوئی تو میں نے کوئی قرآنی دعا پڑھی۔ اب مجھے یاد نہیں کون سی دعا پڑھی تھی۔ اس نے خون شیشی میں لیا، میں اٹھ کر چلا گیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ نے خون نکالنے والی لڑکی کو کیا کہا تھا۔ میں نے کہا میں نے تو اسے کچھ نہیں کہا۔ کہنے لگے آپ نے کچھ کہا تھا۔ میں نے کہا نہ میں اس کی زبان سمجھتا ہوں، نہ وہ میری زبان سمجھتی ہے، میں نے اسے کیا کہنا تھا۔ انہوں نے کہا، وہ کہہ رہی ہے کہ مولوی صاحب سے پوچھیں جب میں نے سوئی چبھوئی تھی تو مولوی صاحب نے کیا کہا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں نے تو دعا پڑھی تھی۔ اس نے کہا، جو الفاظ مولوی صاحب نے بولے تھے ویسے میری دادی مجھے گود میں لے کر بولا کرتی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی دادی مسلمان تھی۔

- دوسرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ شکاگو (امریکہ) میں فیصل آباد کے ایک اہل حدیث بزرگ تھے حافظ محمد صدیق انور، ہمارے دوست تھے، ایک اردو اخبار ''پاکستانی'' کے نام سے شکاگو سے نکالتے تھے۔ ۱۹۹۰ء کی بات ہے میں شکاگو میں ان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا کہ ان کے پڑوس سے ایک لڑکا آیا۔ انہوں نے کہا اس کا نام علی ہے۔ وہ عیسائی لڑکا تھا، اب ظاہر بات ہے مجھے تردد ہوا کہ عیسائیوں میں علی کہاں سے آگیا۔ میں نے کہا اسے بلائیں۔ اس کو بلایا، اس کا نام پوچھا اس نے بتایا علی۔ میں نے پوچھا علی کس کے نام پر نام رکھا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ اس کے پردادا کا نام علی تھا۔

عیسائیوں کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ بھی چلتا رہا۔ مسلمان اسپین سے نکل کر امریکہ وغیرہ جا کر آباد ہوئے۔

تلخ داستانیں

حضرات علماء کرام! بڑی تلخ داستانیں ہیں، دل بہت کڑھتا ہے لیکن واقف تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ آج میں نے اندلس کے حوالے سے بات کی ہے۔ ایک بات میں شہزادہ چارلس کی نقل کرنا چاہوں گا۔ شہزادہ چارلس برطانیہ کے ولی عہد ہیں، ستر پچھتر سال کے ہو گئے ہیں۔ اب حکمرانی کیا کریں گے، لیکچر دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ اندلس ہمارا استاد ہے، ہم نے جو سیکھا ہے اندلس سے سیکھا ہے، ہمیں جو علم اور روشنی ملی ہے

اندلس سے ملی ہے۔ لیکن ہم مسلمان دوسروں کو روشنی دے کر خود اندھیروں میں بھٹک گئے، یہ ہمارا ایک المیہ ہے۔ عیسائی مسلم تعلقات کا یہ بھی حصہ ہے۔ اندلس میں یہ کشمکش چلتی رہی، بالآخر وہ غالب آ گئے اور ایسے غالب آئے کہ ہر چیز تبدیل کر دی۔ غرناطہ اور قرطبہ میں ابھی تک علی اسٹریٹ، عمر روڈ موجود ہیں۔ میرا وہاں جانے کو جی نہیں چاہتا کہ میں اندلس میں عمر روڈ پر کیسے چلوں گا، میرا حوصلہ نہیں ہے۔ میں وہاں عائشہ اسٹریٹ میں کیسے چلوں گا کہ وہاں کوئی عائشہ نظر نہ آئے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

صلیبی جنگیں

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! مسیحیت کے بارے میں بات چل رہی ہے۔ یہ فرق ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہم انہیں عیسائی کہتے ہیں تو وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں مسیحی کہا کریں۔ ہمیں ان کو مسیحی کہنے میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ وہ مسیحی بھی ہیں۔ دور نبویؐ میں مسلم مسیحی تنازعات جس کی ابتدا موتہ اور تبوک سے ہوئی، پھر دور خلافت راشدہ میں اور دور بنو عباس میں، جبکہ یہ مسلم مسیحی تنازعات ابھی تک چل رہے ہیں۔ بعض حضرات اسے فائنل راؤنڈ کہہ رہے ہیں، میں اسے سیمی فائنل راؤنڈ کہتا ہوں کہ یہ آخری راؤنڈ سے پچھلا راؤنڈ ہے، اس کے بعد پھر اگلا مرحلہ ہو گا۔

ایک اصطلاح ہمارے ہاں چلتی ہے صلیبی جنگوں (Crusades) کی، یہ کیا تھیں؟ آج اس حوالے سے بات کرنا چاہوں گا کہ صلیبی جنگوں کا پس منظر، مقاصد اور نتائج کیا تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا "انتقال"

صلیب "کراس" کو کہتے ہیں جو اُن کے ہاں مقدس مذہبی علامت ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھ گئے تھے، ان پر موت آ گئی تھی، تین دن قبر میں رہے، اس کے بعد قبر پھٹی اور وہ قبر سے نکل کر آسمانوں پر چلے گئے۔ ہمارے اور عیسائی دونوں کے عقیدے میں یہ بات ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمانوں پر موجود ہیں، قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے، اس عقیدے میں دونوں متفق ہیں۔ لیکن ہمارے اور ان کے عقیدے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ:

- ان کا کہنا ہے حضرت عیسیٰؑ سولی پر چڑھ گئے تھے، ان پر موت آ گئی تھی، تین دن قبر میں رہے تھے، تین دن بعد قبر پھٹی، وہ قبر سے نکلے اور دوبارہ زندگی کے ساتھ آسمانوں پر چلے گئے۔

• جبکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ "وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم" (النساء ۱۵۷) ان پر نہ موت آئی، نہ قتل ہوئے، نہ سولی چڑھے "بل رفعہ اللہ الیہ" (النساء ۱۵۷) بلکہ پہلی زندگی کے ساتھ ہی آپؑ زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے۔ یہودیوں کو شبہ میں ڈال دیا گیا۔

صلیب سولی کا نشان ہے، اس زمانے میں سولی پر لٹکایا جاتا تھا۔ یہ عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی صلیب (سولی) کی علامت ہے، اور یہ ان کا سب سے مقدس نشان ہے، اس کی حرمت پر وہ سارے کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

عیسائی فرقوں کی عملداری

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس مسلمانوں کی تحویل میں آ گیا تھا اور عیسائیت دو حصوں میں تقسیم تھی: مغربی یورپ (اٹلی، فرانس وغیرہ) اور مشرقی یورپ (ترکی، یونان وغیرہ)۔

1. مغربی یورپ میں پاپائے روم کی حکمرانی تھی۔ کیتھولک پیشوا، سیاسی بھی، مذہبی بھی۔ مغربی یورپ کا مرکز روم اور پاپائے روم تھا۔

2. مشرقی یورپ میں قسطنطنیہ (استنبول) کا علاقہ مشرقی رومہ کہلاتا تھا۔ اس کی قیادت قسطنطنیہ کے چرچ کے پاس تھی اور قسطنطین ان کا عیسائی بادشاہ تھا جس نے شہر کو ترقی دی تھی اور اسے اپنا مرکز بنایا۔ یہ اسلام کے دور سے پہلے کی بات ہے، اس بادشاہ کے نام سے قسطنطنیہ ہے۔ یہ ایک عرصہ سے دارالحکومت چلا آرہا ہے۔ مشرقی یورپ کا یہ مرکز تھا۔

ان کی آپس میں چپقلش چلتی رہتی تھی۔

صلیبی جنگوں کا پس منظر

بغداد خلافت عباسیہ میں دارالحکومت تھا، ایک دور میں اس کو دنیا کے سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل تھی، تمدن، تعلیم، ثقافت اور سیاست ہر لحاظ سے۔ لیکن عباسی خلفاء معاملہ سنبھال نہ سکے اور بغداد کا علاقہ تاتاریوں کے ہاتھوں تاراج و برباد ہو گیا۔

اس کے بعد بغداد پر ترک سلجوقی حکمرانوں کی حکومت رہی۔ اس زمانے میں جب عباسی خلافت ختم ہو گئی تو خلافت کا ٹائٹل مصر کے بنو فاطمہ نے اختیار کر لیا تھا۔ یہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے اہل تشیع تھے۔ مصر پر ان کی حکومت کافی عرصہ تقریباً دو سو سال

تک رہی ہے، یہ دولت بنی فاطمہ کہلاتی تھی۔ ایک دور میں بنو فاطمہ کی حکومت حجاز، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ پر بھی رہی ہے۔ خلافت عباسیہ کے بعد مصر میں بنو فاطمہ اور بغداد میں سلجوقی حکمران تھے۔ سلجوقیوں کی لڑائی ادھر بنو فاطمہ سے رہتی تھی اور ادھر مغربی یورپ کے عیسائیوں کے ساتھ بھی رہتی تھی۔

- مؤرخین صلیبی جنگوں ایک کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ جب سلجوقیوں نے دولت بنی فاطمہ سے ان کی حکومت چھینی، صلاح الدین ایوبیؒ انہی کی طرف سے تھا، اور صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں دولت بنی فاطمہ ختم ہوئی تو ان کے باقی ماندہ لوگوں نے پاپائے روم سے مدد کی درخواست کی۔ اِدھر سے سلجوقیوں نے ترکی کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا اور مشرقی یورپ کے عیسائی بھی ان سے تنگ تھے، انہوں نے بھی پاپائے روم سے مدد کی درخواست کی۔ قسطنطنیہ اور پاپائے روم آپس میں حریف اور مقابل تھے لیکن سلجوقی حکمرانوں کے سامنے خود کو بے بس پاکر مشرقی یورپ نے مغربی یورپ کی پاپائیت سے ہاتھ ملا لیا کہ ہماری مدد کرو۔ ادھر سے بنی فاطمہ مدد کی درخواست کر رہے تھے، اُدھر سے مشرقی یورپ والے عیسائی مدد کی درخواست کر رہے تھے۔ اس سے پاپائے روم کو مداخلت کا موقع مل گیا، مغربی یورپ کا حکمران تو وہ تھا ہی۔ صلیبی جنگوں کا ایک سبب تو یہ ہے۔
- دوسرا سبب مؤرخین یہ بتاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیت المقدس جب مسلمانوں کی تحویل میں آیا تو مسلمانوں نے عیسائیوں کو یہ آزادی دی تھی کہ یہاں آئیں، عبادت کریں اور اپنے مقدس مقامات کی زیارت کریں، لیکن رہ نہیں سکتے۔ بیت اللحم عیسائیوں کا قبلہ ہے جو بیت المقدس سے چند کلو میٹر بتاتے ہیں۔ عیسائیوں کے لیے بہت مقدس مقام ہے اور اس لحاظ سے کہ حضرت عیسٰیؑ کی جائے ولادت ہے ”مکاناً شرقیا“ کہہ کر قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ ہمارے لیے بھی قابل احترام مقام ہے۔ بیت اللحم ہمارا قبلہ تو نہیں ہے لیکن قابل احترام تو ہے کہ اس کی نسبت حضرت عیسٰیؑ کی طرف ہے۔ اسی طرح صہیونیت (صہیون ازم) یہودیوں کا ٹائٹل ہے۔ صہیون بیت المقدس کی ایک پہاڑی کا نام ہے جو حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ تھی، آج بھی اس

کے آثار ملتے ہیں۔ یہودیوں نے اپنی تحریک کی نسبت صہیون کی طرف کی۔
اگر وہ حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ تھی تو ہمارے لیے بھی قابل احترام ہے، ہم
اس لیے اس کی توہین نہیں کر سکتے کہ یہودیوں نے اس کو اپنا ٹائٹل بنا لیا ہے۔
حضرت داؤدؑ کو ہم بھی اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں، ان کا احترام کرتے ہیں۔

بیت اللحم عیسائیوں کا قبلہ ہے اور بیت المقدس بھی ان کا پرانا قبلہ ہے کہ یہ یہودیت سے نکلے ہیں۔ اس حوالے سے عیسائی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایسے ہی سمجھ لیں کہ اسرائیل کو ہم نے تسلیم نہیں کیا، جبکہ بہت سے مسلم ممالک نے تسلیم کیا ہوا ہے۔ بیت المقدس اسرائیل کے کنٹرول میں ہے لیکن جن ممالک نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا ہے ان کے لوگ بیت المقدس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ترکی کے صدر طیب اردگان کا بیان ہمیں تو عجیب سا لگا لیکن ان کی بات ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ بیت المقدس جانا چاہیے تاکہ مسلمانوں کی نسبت اس سے نمایاں ہو۔ ہمیں اس لیے سمجھ نہیں آیا کہ ہم اسرائیل جا نہیں سکتے۔ بہرحال اسی طرح عیسائی وہاں آتے جاتے تھے۔ سلجوقیوں نے بنو فاطمہ کے بعد اس پر کنٹرول کیا تو انہوں نے کچھ پابندیاں لگا دیں کہ آنے جانے کی اجازت تو تھی مگر راستوں کی پابندی تھی کہ فلاں راستے سے آؤ جاؤ گے۔ سکیورٹی کے طور پر یا جیسے بھی، بہرحال کچھ پابندیاں لگا دیں۔ وہ پابندیاں عنوان بن گئیں کہ ہمیں بیت المقدس جانے سے روکا جا رہا ہے اور پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ یہ دو تین معاملے اکٹھے ہو گئے۔

پوپ اربن ثانی کا فتویٰ جہاد

یہ پانچویں صدی ہجری کے آخری عشرہ کا دور تھا اور میلادی سن کے لحاظ سے گیارہویں صدی عیسوی کا آخر تھا۔ ۱۰۹۴ء، ۱۰۹۵ء کی بات ہے۔ اس وقت پاپائے روم تھے پوپ اربن ثانی، فرانسیسی تھے، ان سے قسطنطنیہ والوں نے، بنو فاطمہ والوں نے اور پادریوں نے بھی درخواست کی کہ ہمارے راستے بند کیے جا رہے ہیں۔ تو اربن ثانی نے اس ٹائٹل سے کہ ہمارے بیت المقدس آنے جانے پر رکاوٹیں نہیں ہونی چاہئیں، انہوں نے صلیب کے نام پر تحریک شروع کی۔ بعد میں دعویٰ یہ ہو گیا کہ فلسطین ہماری زمین ہے، ہم نے وہاں واپس جانا ہے اور فلسطین پر قبضہ کرنا ہے۔

اس کا اعلان اربن ثانی نے فرانس میں کلیئر ماؤنٹ کے مقام پر ۱۰۹۵ء میں کیا تھا۔ بہت بڑا عالمی اجتماع کیا اور اس میں صلیب اٹھا کر اعلان کیا کہ اس صلیب کے تقدس اور اس کی بالادستی کے لیے ہم ان کافروں (یعنی مسلمانوں) کے خلاف جہاد کریں گے، اور کہا کہ یہ مقدس صلیبی جنگ ہے۔ اور مشرقی و مغربی تمام یورپ کے بادشاہوں سے کہا کہ میں جہاد کا فتویٰ دیتا ہوں اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ مشترک ہو کر جہاد کے لیے چلو اور اس علاقے پر کنٹرول حاصل کرو۔ اس کے اعلان کا اردو انسائیکلوپیڈیا سے ایک جملہ نقل کرتا ہوں۔ اس نے کہا:

> "بیت المقدس کو بہانہ بناؤ اور سرزمین مقدس مسلمانوں سے چھین کر خود اس کے مالک بن جاؤ، یہ سرزمین تمہاری ہے، ان کافروں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس مقدس سرزمین کے بارے میں تورات کا کہنا ہے کہ اس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہیں"۔

اس پر جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے حکمران اکٹھے ہوئے، ان کی مشترکہ فوج تیار ہوئی۔ انہوں نے ۱۰۹۶ء میں پوپ کے اعلان کے اگلے سال پہلا حملہ کیا جو بہت بڑی یلغار تھی۔ پہلے حملہ میں ہی انہوں نے اس علاقے میں اپنی چار ریاستیں بنالیں: انطاکیہ، طرابلس، الریحاء اور بیت المقدس پر قبضہ کرلیا۔ ادھر یہ حال تھا کہ عباسیہ خلافت ختم ہو چکی تھی، ہماری قوتیں متفرق تھیں اور کوئی مضبوط قوت سامنے نہیں تھی۔ شام میں کوئی اور، مصر میں کوئی اور، عراق میں کوئی اور۔ ہماری مختلف حکومتیں تھیں زنگی، سلجوقی وغیرہ۔ یہاں سے پھر شام والے جاگے ہیں، نور الدین زنگی، عماد الدین زنگی، پھر صلاح الدین ایوبی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ یہ شام کے علاقائی حکمران تھے، ان کو خیال آیا تو انہوں نے مقابلے کی تیاری کی۔

صلیبی جنگیں دو سو سال چلتی رہی ہیں۔ پہلی صلیبی جنگ ۱۰۹۶ء میں ہوئی، دوسرا حملہ جرمنی کے بادشاہ کورنر ثالث اور فرانس کے لوئی ہفتم نے ۱۱۴۷ء میں کیا۔ تیسری جنگ میں جرمنی اور فرانس کے بادشاہ نے حملہ کیا، ان میں بادشاہ بھی اور شہزادے بھی شریک رہے۔ جنگیں چلتی رہیں، کبھی جرمنی آجاتا کبھی فرانس آجاتا۔ لیکن صلیبی جنگوں کی زیادہ تر قیادت فرانس نے کی، اعلان بھی فرانسیسی پوپ نے کیا تھا۔ دو سو سال انہوں نے جنگی میدان میں مسلمانوں کو مکمل شکست دینے کی کوشش کی اور شکست دیتے بھی رہے۔ بیت المقدس نوے سال ہمارے ہاتھوں سے باہر رہا۔ نوے سال کے بعد صلاح الدین ایوبی نے ان سے بیت المقدس کو آزاد کرایا۔ پھر ایک موقع پر بیت المقدس چند سالوں کے لیے ہمارے

ہاتھ سے نکل گیا تھا، پھر واپس لیا۔ آخری صلیبی جنگ ۱۲۹۲ء میں ہوئی جس میں صلیبی فیصلہ کن شکست کھا کر ناکام ہو گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔ واپس تو آئے ہوئے ہیں لیکن دوسرے راستے سے آئے ہیں۔

میں نے صلیبی جنگوں کا مختصر تعارف یہ کرایا ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی ان جنگوں میں گزری ہیں۔ یہ مذہبی جنگ تھی، صلیب کے نام پر تھی، فلسطین پر قبضے کے لیے تھی، بیت المقدس پر کنٹرول کرنے کے لیے تھی۔ ان دو صدیوں میں نوے سال وہ غالب رہے ہیں، پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے، اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند فرمائے، بیت المقدس آزاد کرایا۔ صلیبی جنگیں ۱۲۹۲ء تک چلتی رہیں۔

صلیبی جنگوں کے بعد

صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد انہوں نے رخ بدلا اور دو راستے اختیار کیے:

1. ایک محاذ علمی و فکری تھا جسے استشراق کہتے ہیں، اس کی بھی ایک لمبی تاریخ ہے۔ اس سے مراد مشرق کا مطالعہ ہے، یعنی مسلمانوں کے علوم میں مہارت پیدا کر کے ان کے اندر شکوک کی فضا پیدا کرنا۔
2. اور دوسرا محاذ نوآبادیاتی نظام تھا۔ یورپ میں ایک دور میں یہ شوق پیدا ہو گیا تھا کہ سمندر پار کے ملکوں کو دریافت کرو اور تجارتی تعلقات بنا کر وہاں تجارتی مراکز بناؤ۔

عیسائی ممالک کا نوآبادیاتی دور

نوآبادیاتی دور یہ تھا کہ دوسرے براعظموں کی تلاش کے دوران تجارت کے نئے نئے مراکز تلاش کرنے کے لیے یورپی ملکوں کے نمائندے اور قافلے بحری بیڑے لیے گھومتے پھرتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے واسکوڈے گاما آیا، امریکہ میں پہلے کولمبس پہنچا۔ یہ بھی ایک مقابلہ تھا اسپین، برطانیہ اور فرانس وغیرہ کے درمیان کہ کون زیادہ تجارتی مراکز دریافت کرتا ہے۔ جہاں جاتے تھے، ان کا بنیادی عنوان تجارت ہوتا تھا۔ ہندوستان کے ساتھ ان کی لمبا عرصہ تجارت رہی ہے، یہاں سے سامان لے جاتے تھے، وہاں سے سامان یہاں لاتے۔ اس کے لیے باقاعدہ کمپنیاں بنیں۔ ہماری طرف پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے رخ کیا۔ ہالینڈ ہمیں کراس کر کے انڈونیشیا چلا گیا۔ یہ تجارت کے نام پر آئے اور

تجارتی اڈے قائم کیے۔ ہندوستان میں دو ایسٹ انڈیا کمپنیاں آئی ہیں، ایک فرانس کی اور ایک برطانیہ کی۔ یہاں مغلوں کا دور تھا، ان سے تجارت کی اجازت لی اور تجارت شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اکبر بادشاہ کے دربار میں پیش ہوئے اور تجارت کی اجازت مانگی، اس نے اجازت دے دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی فرانس کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی، دونوں کا یہاں آنا جانا شروع ہو گیا، ان کا آپس میں مقابلہ تھا اور ہم سے مراعات حاصل کرنے کا سلسلہ تھا۔

تجارت سے حکمرانی تک کا سفر

یہ لوگ آہستہ آہستہ حکمران کیسے بنے؟ یہ تاجر لوگ تھے، تجارت کے لیے آئے تھے، ٹائٹل بھی تجارت کا تھا۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں اپنے تجارتی مرکز قائم کیے، کلکتہ، بمبئی، لکھنؤ، دلی وغیرہ میں۔ سامان رکھنے کے لیے تجارتی مراکز تو چاہییے تھے۔ جب مرکز مستحکم ہو گئے تو انہوں نے اجازت مانگی کہ ہمیں اپنے تجارتی مراکز کی حفاظت کے لیے مقامی فورس بھرتی کرنے کی اجازت دی جائے۔ مغلوں نے اجازت دے دی۔ اگر بیس پچیس مراکز ہوں اور ہر مرکز کی حفاظت کے نام پر دو دو سو آدمی ہوں تو یہ کافی تعداد بن جاتی ہے۔ اس طریقے سے یہ چھوٹی چھوٹی فوجیں بناتے گئے۔

ادھر مغلوں میں انتشار پھیل گیا۔ حیدر آباد دکن الگ ہو گیا۔ ادھر سکھوں نے بغاوت کر دی۔ ادھر مرہٹوں نے بغاوت کر دی۔ مغل آپس میں لڑ پڑے۔ شاہ جہاں کے بعد اقتدار پر قبضے کے لیے اورنگزیب، دارا شکوہ اور شجاع کے درمیان خوفناک جنگیں ہوئیں۔ انگریز اس سے دوہرا فائدہ اٹھاتے تھے۔ پنجاب پر سکھوں نے مغلوں کی کمزوری کی وجہ سے قبضہ کر لیا۔ صرف پنجاب ہی نہیں، موجودہ صوبہ خیبر پختونخوا بھی ان کے اقتدار میں چلا گیا۔ ملتان سے لے کر پشاور تک رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ ادھر مرہٹے بڑھ رہے تھے جن کے مقابلے کے لیے احمد شاہ ابدالیؒ آیا تھا۔ مغلوں کی خانہ جنگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور مغلوں کی طاقت گھٹتی گئی۔

۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنگال پر قبضہ

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے بنگال پر قبضہ کیا۔ ۱۷۵۷ء میں چھوٹی چھوٹی فوجیں ملا کر انہوں نے اپنی ایک طاقت بنا لی تھی۔ بنگال میں نواب سراج الدولہؒ حکمران تھے۔ انگریزوں نے اس بنا پر قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دی تھی کہ ہم طاقتور ہیں، فوج

ہمارے پاس ہے، جو معاہدات تجارتی طور پر کر رکھے تھے، ان معاہدات کی خلاف ورزی شروع کر دی، سراج الدولہ نے ٹوکنا شروع کیا۔

اس سے پہلے کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ مغل حکمران نظر رکھتے تھے اور جہاں خلاف ورزی زیادہ ہوتی وہاں کنٹرول بھی کر لیتے تھے۔ ہمارا ایک بڑا علمی حلقہ ہے فرنگی محلی علماء کا۔ ملا نظام الدین فرنگی محلی کا اپنے علاقے کے لوگوں سے جھگڑا ہو گیا اور اپنا علاقہ چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ آئے جہاں ایک تجارتی مرکز تھا جو فرنگی محل کہلاتا تھا، فرنگیوں کا محل۔ تجارتی مرکز تھا، اورنگزیب عالمگیر نے اپنے دور میں کسی خلاف ورزی کی وجہ سے یہ محل ان سے ضبط کر لیا تھا اور ان کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ یا کہا جاتا ہے کہ اس کا مالک مر گیا تھا اور کوئی اس کا وارث نہیں تھا، تو ان کے قبضہ کرنے کی وجہ سے یا مالک کے مر جانے کی وجہ سے وہ مغلوں کے قبضے میں آ گیا۔ ملا نظام الدین سہالوی جب اپنے علاقے سے لٹ پٹ کر آئے، ان کی شیعوں سے لڑائی ہوئی تھی جنہوں نے علاقے سے نکال دیا تھا۔ اور نگزیب عالمگیر نے وہ لکھنؤ کا فرنگی محل ان کو دے دیا کہ مدرسہ بناؤ۔ وہ فرنگی محل کا مدرسہ ابھی تک چل رہا ہے۔ یہ فقہ اور معقولات کا مرکز تھا۔

جس طرح اورنگزیب نے انگریزوں کا محل ضبط کر لیا تھا اسی طرح سراج الدولہ نے ان پر کچھ پابندیاں لگائیں تو بنگال کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سراج الدولہ کے احکامات کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کے نتیجے میں جنگ ہوئی، سراج الدولہ کی فوج کو شکست ہوئی، سراج الدولہ شہید ہوئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے پورے بنگال پر قبضہ کر لیا۔ اور نواب سراج الدولہ کو شکست خود ان کے وزیر اعظم میر جعفر کی غداری کی وجہ سے ہوئی۔ یہ ان کا پہلا اقتدار تھا جو انہوں نے ۱۷۵۷ء میں حاصل کیا۔ بنگال کی شکست کے بعد انگریز کو بیس مل گئی اور وہ آگے بڑھنے لگے، مختلف شہروں میں ان کی کمپنیاں تو پہلے ہی تھیں، تجارتی اڈے اور حفاظت کے لیے فوجیں بھی تھیں۔

انگریز کے ابتدائی دور میں بنگال ایک ہی تھا۔ اس میں کلکتہ بھی تھا، ڈھاکہ بھی تھا۔ اب کلکتہ مغربی بنگال کا دارالحکومت ہے اور ڈھاکہ مشرقی بنگال کا دارالحکومت ہے۔ جب پاکستان بنا تو مشرقی بنگال ہمارے حصہ میں آیا، مغربی بنگال میں ہندو اکثریت تھی۔

میں نے ان کا طریق کار آپ کو بتایا ہے کہ اس طریقہ سے یہ طاقت پکڑتے پکڑتے بغاوت پر آئے اور سب سے پہلی ریاست انہوں نے بنگال میں قائم کی۔ اس سے ان کے پاؤں وہاں جمے اور پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے تقریباً ستر سال میں دہلی پہنچ گئے تھے۔

چنانچہ اس طریقے سے یہ آگے بڑھتے گئے اور نوآبادیاتی بناتے گئے۔ ان کا نوآبادیاتی نظام یہ تھا کہ مسلمان ممالک میں تجارت کے نام سے جاکر وہاں اثرورسوخ بڑھاؤ اور آہستہ آہستہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر قبضہ کرلو۔ اس کی میں نے ابتدا بیان کی ہے کہ ہمارے ہاں اس کی ابتدا بنگال سے ہوئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو سمجھنے کے لیے آج کی ملٹی نیشنل کمپنیاں دیکھ لیں جو مختلف اقوام کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہیں، کسی ملک میں سرمایہ کاری کرتی ہیں، تجارت پر اجارہ داری حاصل کرتی ہیں، پھر سیاست دانوں کو قابو کرتی ہیں، اور حکومتی نظام کو کنٹرول کرتی ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کا جدید ایڈیشن ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے نام پر آئی اور اثر ورسوخ حاصل کیا اور پھر یہاں کے حکمرانوں کی کمزوریوں کو دیکھ کر بغاوت کردی۔

۱۷۹۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا میسور پر قبضہ

ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی دوسری بڑی لڑائی سلطان ٹیپو شہیدؒ سے ہوئی۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کی جنگ ہوئی۔ میسور ایک آزاد ریاست تھی، انگریزوں کو قبول نہیں کرتی تھی، اس جنگ میں سلطان ٹیپو شہید ہوگئے اور میسور پر بھی انہوں نے قبضہ کرلیا۔

سلطان ٹیپو کے والد سلطان حیدر علی نے سلطنت خداداد میسور قائم کی تھی۔ یہ جنوبی ہند میں ہے، وہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی، تب بھی اور اب بھی۔ حیدر علی کے بعد ٹیپو سلطان آیا، یہ بڑا مجاہد آدمی تھا۔ حیدر علی بھی ایک غیور مسلمان تھا۔ سلطان ٹیپو نے اس عزم کا اظہار کیا کہ میں انگریزوں کا راستہ روکوں گا۔ اس زمانے میں ماحول کیا تھا اور سلطان ٹیپو کے عزائم کیا تھے؟ اس پر میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

سائنس و ٹیکنالوجی: خلافت عثمانیہ اور سلطنت مغلیہ کی کوتاہ اندیشی

ماحول یہ تھا کہ اُدھر ترکی میں خلافت عثمانیہ قائم تھی، اِدھر ہند میں مغل حکومت قائم تھی، لیکن ہمارے پاس کہیں بھی اسلحہ سازی کے کارخانے نہیں تھے۔ میں یہ بات عرض کیا کرتا ہوں کہ ہماری دو بڑی سلطنتیں جو اپنے وقت میں عظیم سلطنتیں تھیں لیکن دونوں نے، خلافت

عثمانیہ نے بھی اور مغل حکومت نے بھی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں اور خدا جانے کب تک بھگتتے رہیں گے۔

جبکہ اندلس کی مسلمان حکومت نے سائنس، ٹیکنالوجی اور جغرافیہ پر صرف توجہ ہی نہیں دی بلکہ اس کی بنیاد ہی اندلس کی مسلم حکومتوں نے قائم کی۔ ہمارے ہاں عباسی دور میں ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا، مامون کے دور میں کہ فلسفہ، سائنس اور حکمت کا دور شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ بنوامیہ نے اندلس میں بیٹھ کر نہ صرف خود بلکہ یورپ کو بھی راستہ دکھایا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سائنس ٹیکنالوجی کی بنیاد اندلس کی مسلمان حکومتوں نے رکھی لیکن بدقسمتی کہ جب ہم بنیاد رکھنے کے بعد تعمیر کی پوزیشن میں آئے تو شکست کھا گئے تھے، اندلس ہمارے ہاتھ سے چھن گیا تھا۔ ہماری بنیادوں پر یورپ نے سائنسی ترقی کی بنیاد رکھی اور آج تک سائنس ٹیکنالوجی میں اسی کی اجارہ داری ہے۔ آج سائنس، جغرافیہ میڈیکل سائنس کے پیچھے دیکھیں تو آپ کو کوئی نہ کوئی مسلمان سائنسدان محنت کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ یہ اندلس کی مسلمان حکومتوں کی توجہ تھی جس کے نتیجے میں صرف یورپ کو نہیں دنیا بھر کو سائنس اور ٹیکنالوجی ملی ہے۔

لیکن خلافت عثمانیہ اور مغل حکومت کا سائنس اور ٹیکنالوجی میں کوئی کردار نہیں ہے، جبکہ اپنے دور کی یہ بڑی عالمی حکومتیں تھیں۔ تقریباً پانچ صدیاں دنیا میں ان کی طاقت کا لوہا مانا جاتا رہا ہے، لیکن انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ نہیں دی جس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس کی ایک ہلکی سی مثال دیتا ہوں۔ تیل کو دریافت ہوئے سو، سوا سو سال گزرے ہیں، اس زمانے میں سب سے پہلے عراق میں تیل کے چشموں کا سراغ لگا تھا۔ یہ سلطان عبدالحمید ثانی کا زمانہ تھا۔ اب سے ۱۱۰ سال پہلے اس کا دور بیسویں صدی کا پہلا عشرہ تھا۔ سلطان موصوف نے خود اپنی یادداشتوں میں بیان کیا ہے کہ ہم کہاں کھڑے تھے اور ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ اس زمانے میں ہماری جرمنی کے ساتھ صلح تھی، عالمی محاذ پر جرمنی اور خلافت عثمانیہ اکٹھے تھے۔ پہلی جنگ عظیم ان دونوں نے مل کر مغربی یورپ سے لڑی، جس میں دونوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد جرمنی نے خود کو سنبھال لیا جبکہ ہمارا بیڑا غرق ہو گیا۔

عراق میں جرمنی کی تیل نکالنے والی کمپنیاں

سلطان عبد الحمید ثانی اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں مجھے اپنے اداروں کی طرف سے رپورٹ ملی کہ عراق کی زمین کے نیچے تیل ہے لیکن ہمارے پاس تو تیل نکالنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ تیل نکالنا، پھر اسے ریفائن کر کے قابل استعمال بنانا، اور پھر مارکیٹنگ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ تیل نکلنا عراق سے ہے اور ضرورت ماسکو کو ہے، تو وہاں تک تیل پہنچانا کس کی ذمہ داری ہے؟ یہ تین مستقل کام تھے تیل نکالنا، اسے ریفائن کرنا اور مارکیٹنگ۔ جبکہ ہم میں ان تینوں کاموں کی کوئی صلاحیت نہیں تھی، اور اب بھی یہ صلاحیت ہمارے پاس نہیں ہے۔ اب بھی ہم نے پاکستان میں تیل نکالنا ہوتا ہے تو چائنہ کو بلاتے ہیں، وہ نہ معلوم زمین کا تیل نکالتا ہے یا ہمارا تیل نکالتا ہے۔ جرمنی کی حکومت خلافت عثمانیہ کی دوست حکومت تھی، جیسے اب امریکہ ہمارا دوست سمجھا جاتا ہے۔ جرمنی والوں نے خلافت عثمانیہ سے کہا کہ وہاں پینے کا اچھا پانی ہے، ہمیں کنویں کھودنے کی اجازت دیں تاکہ لوگوں کو پینے کا اچھا پانی ملے۔ سلطان عبد الحمید نے اجازت دے دی، مختلف جرمن کمپنیاں آئیں اور وہاں کنویں کھودنے شروع کر دیے۔ کچھ عرصہ بعد سلطان کو اطلاع ملی کہ وہ وہاں سے پانی بھر بھر کے باہر لے جاتے ہیں۔ ان کو پانی باہر لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ تحقیق پر پتا چلا وہ پانی نہیں تیل ہے جو وہ وہاں سے بھر بھر کے خفیہ طور پر لے جاتے ہیں۔ اس پر سلطان نے کمپنیوں کے وہ ٹھیکے منسوخ کروا دیے بلکہ کنویں ہی بند کروا دیے، کنویں اس لیے بند کروا دیے کہ ہمیں نکالنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔

اس زمانے میں امریکہ نیا نیا ظاہر ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں امریکہ فریق نہیں تھا، دوسری جنگ عظیم میں آیا اور اس کا پہلا دھماکہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرا۔ امریکہ نے عالمی جنگ میں شرکت دو ایٹم بموں کے ذریعے کی ہے، اس سے پہلے امریکہ ایک نیا ترقی یافتہ ملک تھا۔ سلطان کہتے ہیں پھر ہم نے تیل نکالنے کے لیے امریکی کمپنیوں کو بلایا۔ اتنے میں سلطان عبد الحمید نظر بند ہو گئے اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد یورپ کی کمپنیاں آئیں تب سے وہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پہلے کمپنیاں آئیں، پھر ان کی حفاظت کے لیے عسکری دستے بنے، جیسے یہاں بنے تھے، پھر فوجیں آئیں، پھر بینک آئے۔ اب وہاں فوجیں بیٹھی ہوئی ہیں اور وہ بیٹھے ہمارا تیل نکال رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم سائنس و ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے تھے، اس لیے سائنس اور

ٹیکنالوجی کے معاملہ میں ہم ان کے ہاتھوں بے بس ہو گئے۔ او تومان ایمپائر (سلطنت عثمانیہ) کا حال بھی یہی تھا اور مغل ایمپائر کا حال بھی یہی تھا۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ افراد کی غلطیاں معاف کر دیا کرتے ہیں لیکن قوموں کی غلطیاں کبھی معاف نہیں کرتے، قوموں کو اپنی غلطیاں بھگتنا پڑتی ہیں، جو ہم بھگت رہے ہیں۔ اقبالؒ نے یہی بات اس طرح کہی ہے:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ٹیپو سلطان کی خلافت عثمانیہ سے درخواست

سلطان ٹیپو کو اس کا احساس تھا۔ اس وقت خلافت عثمانیہ میں سلطان سلیم اول کا دور تھا، یہ بڑے باجبروت حکمران تھے۔ سلطان ٹیپو نے سلطان سلیم اول کے پاس وفد بھیجا کہ میں آپ کا ایک خادم ہوں، میسور کے علاقے میں میری ریاست ہے، اگر مجھے اپنی سرپرستی میں قبول فرما لیں تو میں آپ کا نمائندہ بن کر حکومت کروں۔ اس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ درخواست کرتے تھے اور کچھ ٹیکس وغیرہ دیتے تھے تو بادشاہ خلعت عطا فرماتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کی عقیدت تو تھی کہ ہمارا مذہبی و روحانی اور سیاسی مرکز ہے:

- اس پر ایک درخواست سلطان سلیم سے کی کہ ایک کام آپ کریں کہ میں اپنی سلطنت میں اسلحہ سازی کے کارخانے بنانا چاہتا ہوں تاکہ ہم مقابلہ کر سکیں۔ خرچ سارا میرا ہو گا، آپ سائنسدان فراہم کریں اور سرپرستی فرمائیں۔
- دوسری درخواست سلطان ٹیپو نے سلطان سلیم سے یہ کی کہ عدن جو کہ یمن کا بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ ہے، یہ خلافت عثمانیہ کے پاس تھی، عدن کا جغرافیائی محل وقوع ایسا زبردست ہے کہ جو عدن پہ بیٹھا ہو وہ ناکے پر بیٹھا ہے، گویا اس نے پورے علاقے میں ناکہ لگا رکھا ہے، اس کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں گزر سکتا۔ اب تو ہوائی جہاز ہیں، اس زمانے میں بندرگاہ ہی ہوتی تھی۔ سلطان ٹیپو نے یہ درخواست کی کہ آپ عدن کی بندرگاہ مجھے لیز پر، ٹھیکے پر دے دیں، میں انگریزوں کا راستہ روک لوں گا۔ انگریز ہمارے ملک پر قبضہ کرتے جا رہے ہیں، بنگال پر کر لیا ہے، اب ہماری طرف بڑھ رہے ہیں، میں ان کا راستہ روکوں گا۔

خلیفہ عثمانی سلطان سلیم اول نے خلعت تو عطا فرمادی کہ آپ ہمارے نمائندے ہیں، ہم آپ کے سرپرست ہیں، لیکن یہ بات ماننے سے انکار کردیا کہ نہ سائنسدان مہیا کیے نہ عدن کی بندرگاہ دی۔ یہ سلطان ٹیپو کی سوچ بتارہا ہوں کہ اس ماحول میں اس آدمی کا عزم اور سوچ کیا تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ کرسکا، پھر جنگ ہوئی جس میں سلطان ٹیپو کو شکست ہوئی، اس کے وزیراعظم میر قاسم کی غداری کی وجہ سے۔ میسور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ یہ دوسری بڑی پیشرفت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل ہوئی۔

یہاں ایک طرف کشمکش ایسٹ انڈیا کمپنی فرانس اور ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی ہمارے ساتھ تھی، اور ایک کشمکش دونوں کی آپس میں بھی تھی۔ دونوں علاقے قبضہ کرنے آئے تھے، جہاں موقع ملتا ہمارے ساتھ بھی مل جاتے تھے۔ چنانچہ سلطان ٹیپو کے ساتھ جو جنگ ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی ہوئی اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی فرانس سلطان ٹیپو کے ساتھ تھی۔ اور سلطان ٹیپو کی فوجوں کا کمانڈر فرانسیسی تھا۔ جبکہ حیدرآباد دکن جو ہماری بڑی ریاست تھی ان کو ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کا تعاون حاصل تھا، یہ سلطان ٹیپو کے خلاف تھی۔ میسور جب فتح ہوگیا تو اس کے بعد یہ آگے بڑھے اور بڑھتے گئے۔

۱۸۲۲ء میں شاہ عالم ثانی کی شکست

پھر ان کا تیسرا بڑا معرکہ بکسر کا ہوا، لکھنؤ کے علاقہ روہیل کھنڈ کے علاقہ میں حافظ رحمت خان روہیلہ قبائل وغیرہ کے کچھ خاندان سامنے کھڑے ہوگئے، کچھ ریاستیں کھڑی ہوگئیں۔ اس زمانے میں دہلی پر حکمران تھے شاہ عالم ثانی۔ پالم، دہلی کا بین الاقوامی ایئرپورٹ ہے، دہلی شہر سے دس پندرہ میل ہوگا۔ پالم اس وقت ایک الگ بستی تھی۔ شاہ عالم ثانی کو انہوں نے محدود کردیا کہ آپ کا دائرہ اختیار دہلی سے پالم تک ہے۔ باقی سارا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنبھال لیا تھا، ایک محاورہ مشہور تھا: ”سلطنت شاہ عالم، از دہلی تا پالم“۔

تیسری جنگ ۱۸۲۲ء کے لگ بھگ شاہ عالم ثانی کے ساتھ ہوئی، یہاں بھی انگریزوں کو فتح ہوئی اور شاہ عالم ثانی نے ان کے ساتھ صلح کی۔ صلح میں ان کا آپس میں معاہدہ تھا کہ نام بادشاہ کا ہی رہے گا، حکومت بادشاہ کے نام سے چلے گی، لیکن عملاً حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوگی۔ انتظامی، عدالتی اور مالیاتی اختیارات و کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہوگا، جبکہ مہر بادشاہ کی ہوگی۔ ان کا یہ معاہدہ ریکارڈ پر موجود ہے۔ اعلان تین جملوں کا تھا:

”زمین خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا“۔

کمپنی سے مراد ایسٹ انڈیا کمپنی کہ نظام وہ چلائے گی۔ ان کا نمائندہ دہلی آکر بیٹھ گیا، اس نے سارا نظام سنبھال لیا۔ آخری مہر بادشاہ کی لگتی تھی، بادشاہ کا شوق پورا کرنے کے لیے دہلی سے پالم تک کا علاقہ دے دیا گیا کہ یہاں آپ جو مرضی کریں، باقی پورے انڈیا میں کنٹرول ہمارا ہوگا۔

اس اعلان پر حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے، جو اس وقت علماء کے سرخیل تھے، ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا مشہور فتویٰ دیا جو ”فتاویٰ عزیزی“ میں موجود ہے۔ اس فتویٰ کی بنیاد دو چیزوں پر تھی:

1. نصاریٰ کا تغلب ہو گیا ہے یعنی کنٹرول ان کے ہاتھ میں چلا گیا ہے،

2. اور شرعی قوانین کی جگہ نئے انگریزی قوانین آگئے ہیں۔

اس لیے اب یہ ملک دارالاسلام نہیں رہا، دارالحرب ہو گیا ہے اور آزادی کے لیے جہاد فرض ہو گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی بحث ہے کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ سب سے پہلے کس نے دیا تھا۔ ہمارے ہاں اب تک معروف ہے کہ سب سے پہلے یہ فتویٰ شاہ عبد العزیزؒ نے دیا تھا لیکن تاریخی بحث یہ بھی ہے کہ ایک فتویٰ اسی عنوان کا اور اس سے زیادہ تفصیلی حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کا موجود ہے۔ یہ شاہ عبد العزیزؒ کے معاصر اور شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد ہیں۔ میں نے قاضی صاحبؒ کا وہ قلمی فتویٰ کاندھلہ میں دیکھا ہے جب ہم دو سال پہلے دیوبند شیخ الہند سیمینار میں گئے تھے، میں اور مولانا اللہ وسایا، مولانا نور الحسن راشد کے ہاں گئے تھے۔ مولانا نور الحسن راشد نے اس پر ریسرچ کی ہے، انہوں نے بتایا کہ قاضی صاحبؒ کا فتویٰ مقدم ہے۔ اب تو انہوں نے اس کو نیٹ پر بھی جاری کر دیا ہے۔ بہر حال جس کا فتویٰ بھی مقدم ہو، ہمارے لیے دونوں قابل احترام ہیں۔

مسلم ریاست کی غیر موجودگی میں جہاد کا فتویٰ

ابھی ایک نئی بحث چلی ہے۔ ”پیغامِ پاکستان“ ایک قومی بیانیہ ہے، میں اس کے لیے ایوان صدر میں ہونے والی تقریب میں شریک تھا۔ میں اس کی ایک شق پر بحث کرنا چاہوں گا کہ جہاد کا اعلان صرف ریاست کا حق ہے، کسی فرد یا گروہ کا حق نہیں ہے۔ میں نے اپنے کالم میں ایک سوال اٹھایا کہ اگر آپ پہلے مجھے اس کی تشکیل میں شریک کرتے تو میں ایک تجویز دیتا، کیونکہ جو فتویٰ اجتماعی ہوتا ہے اس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا چاہیے۔

شخصی فتویٰ کسی ایک جز کے بارے میں دیا جا سکتا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایک مسلّمہ مسلم ریاست کے ہوتے ہوئے جہاد کا اعلان ریاست ہی کا حق ہے، فرد یا گروہ کو نہیں ہے۔ لیکن اگر خود ریاست ختم ہو جائے تو پھر کون اعلان کرے گا؟ اگر غیر ملکی تسلط، غیر مسلم اقتدار ریاست ہی کو ہیک کر لے، ریاست کا انتظامی ڈھانچہ ختم ہو جائے، دوسروں کے قبضے میں چلا جائے، تب اس اعلان کی اتھارٹی کس کے پاس ہوگی؟ کیا اس صورت حال کو ہم قبول کر لیں گے، یا کوئی کھڑا ہوگا اور مزاحمت کا اعلان کرے گا؟

اس کی مثال میں نے یہ دی کہ جب ۱۸۲۲ء میں شاہ عالم ثانی کے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کا اقتدار اپنے کنٹرول میں لے لیا اور اعلان کر دیا کہ اب نظم و نسق اور عدالت و مالیات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں ہوں گے، اور شاہ عالم ثانی کی صرف مہر چلے گی۔ تو شاہ عبد العزیزؒ نے فتویٰ دیا تھا۔ اب خدانخواستہ ایسی کوئی پوزیشن دوبارہ پیدا ہو جائے اور یہ غیر متوقع نہیں ہے، ہمارے اردگرد ہمارے سروں پر سینکڑوں ملٹی نیشنل کمپنیاں ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی شکل میں ایسے منڈلا رہی ہیں جیسے گدھ منڈلا رہے ہوتے ہیں کہ کوئی جانور مرنے کے قریب ہو اور اسے جا کر دبوچ لیں۔

اس کی میں ایک اور فقہی مثال دیتا ہوں۔ احناف کے ہاں جمعہ کے انعقاد کی شرائط میں ہے کہ سلطان او نائبہ، امیر المؤمنین یا اس کا نمائندہ جمعہ پڑھائے گا۔ ہمارے ہاں جب تک مغل حکومت تھی اس کے حکمران یا نمائندے جمعہ کی امامت کرتے رہے، لیکن جب ہمارا سلطان ختم ہو گیا تو پھر جمعہ کا پڑھنا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ شرائط تو نہیں پائی جاتیں۔ فقہاء احناف کے ہاں کافی عرصہ یہ بحث رہی کہ اب جمعہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ تو ہم جمعہ کو تعطل سے بچانے کے لیے "سلطان او نائبہ" کا متبادل لائے کہ مسجد کے نمازی جس پر متفق ہو جائیں، جس کو امام بنا لیں۔ یہ اصل نہیں ہے، متبادل ہے۔ اس پر بھی ابھی بحث جاری ہے، ہمارے بہت سے فقہاء جو اس متبادل پر مطمئن نہیں تھے، ان کے ہاں اس طرح جمعہ پڑھنے کے ساتھ احتیاطی ظہر بھی پڑھنے کا کہا جاتا ہے۔ اور اس میں مولانا احمد رضا خان تو بہت سخت تھے کہ جمعہ کے ساتھ ظہر بھی پڑھو۔ ظہر احتیاطی کے پیچھے یہی فلسفہ ہے کہ شرط موجود نہیں ہے، جمعہ کیسے ہوگا۔

درمیان میں ایک لطیفہ کی بات کہ میں نے ایک دفعہ علماء کرام کی ایک محفل میں تفنن طبع کے طور پر کہا کہ آپ اسلامی نظام اور اسلامی ریاست اور خلافت کے قیام کے حق میں

ہیں۔ انہوں نے کہا، بالکل حق میں ہیں۔ میں نے کہا اگر آج صحیح معنوں میں اسلامی ریاست قائم ہو جائے، خلافت قائم ہو جائے تو آپ کے جمعے خلیفہ کی اجازت پر موقوف ہوں گے یا ویسے ہی جائز ہو جائیں گے ؟ خلیفہ کا نائب ہی جمعہ پڑھائے گا۔ سب سے پہلے تو آپ کو منبر چھوڑنا پڑے گا۔ اور پھر زکوٰۃ بیت المال وصول کرے گا یا مدرسے وصول کریں گے ؟ منبر بھی گیا، مدرسہ بھی گیا۔ میں نے کہا اب اسلامی نظام کے قیام کا نعرہ لگاؤ۔ یہ میں نے تفنن طبع کے طور پر کہا تھا لیکن یہ امر واقع ہے۔ میں نے یہ مثال اس لیے دی ہے کہ جس طرح جمعے کو تعطل سے بچانے کے لیے ہم نے اس شرط کا متبادل اختیار کیا، میرا سوال مفتیان کرام سے یہ ہے کہ اگر ریاست کا انتظامی ڈھانچہ ہی ختم ہو جائے اور دشمن کا قبضہ ہو جائے تو جہاد کا اعلان کون کرے گا؟ اس صورتحال کو قبول کر لینا اسلام کا تقاضا ہو گا یا کوئی مجاز اتھارٹی ہو گی جو مزاحمت کا اعلان کرے گی؟ مجھے ”پیغامِ پاکستان“ سے پورا اتفاق ہے لیکن یہ ایک پہلو تشنہ رہ گیا ہے، اس پر بھی جواب آنا چاہیے۔ ظاہر بات ہے اگر جمعے میں علماء متبادل ہیں تو یہاں بھی علماء ہی متبادل ہوں گے۔

جب شاہ عبد العزیزؒ نے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا تو یہ فتویٰ ہی پوری جنگ آزادی کی بنیاد بنا ہے۔ اس فتوے کے بعد جو پہلا معرکہ انگریزوں اور سکھوں کے ساتھ اس فتوے کی بنیاد پر ہوا وہ شہداء بالاکوٹ کا ہوا۔

چند معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ — یہودیت

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۲ مئی ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد و الصلوٰۃ۔ تعارف ادیان و مذاہب کے حوالے سے ہم نے گزشتہ نشست میں بات شروع کی تھی۔ موجودہ تناظر میں عالمی طور پر ہمارا سب سے بڑا ٹکراؤ یہود سے ہے، تو آج ان کے حوالے سے بات ہو گی۔ یہودیت اس وقت تعداد کے لحاظ سے کوئی بڑا مذہب نہیں ہے تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہیں۔ لیکن اثر و رسوخ کے اعتبار سے، عالمی نظام میں مداخلت کے اعتبار سے، میڈیا اور معیشت پر کنٹرول کے حوالے سے یہودی اس وقت طاقتور ترین قوم ہیں۔ یہودیت کو سمجھنا اور پہچاننا ہمارے لیے بہت سے حوالوں سے ضروری ہے۔

ایک نسلی مذہب

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نسلی مذہب ہے، حضرت یعقوبؑ کی اولاد سے ہیں، بنی اسرائیل کہلاتے ہیں، اور نسلی تفاخر کی بنیاد پر اپنے نسلی دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ ”نحن ابناء اللّٰہ واحباؤہ“ (المائدہ ۱۸) جو قرآن کریم نے ان کے بارے میں کہا تھا وہ آج بھی ان کے عقائد اور ان کی نفسیات میں موجود ہے کہ ہم برتر قوم اور برتر نسل ہیں اور ہمیں دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔

عظیم تر اسرائیل کا ہدف

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ یہود کا ایک دور وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جہانوں پر ان کی برتری کا اعلان فرمایا۔ ”وانی فضلتکم علی العالمین“ (البقرہ ۴۷) کہ اپنے دور میں تمام جہانوں پر اور تمام دنیا پر ان کو برتری حاصل تھی۔ بالاتری بھی حاصل تھی اور فضیلت بھی حاصل تھی۔ اس دور میں حضرت سلیمانؑ کی حکومت ”اسرائیل“ کہلاتی تھی، جس کے بارے میں خود حضرت سلیمانؑ نے فرمایا تھا ”قال رب اغفرلی وھب لی ملکاً لا ینبغی لاحد من بعدی“ (ص ۳۵)۔ اس کا دائرہ ان کے دور میں جو تھا وہ آج کے یہودیوں کے نزدیک گریٹر اسرائیل (عظیم تر اسرائیل) کہلاتا ہے۔ آج کے یہود کا ٹارگٹ اور نظریہ یہ ہے کہ ہم نے حضرت سلیمانؑ کے دور کا اسرائیل واپس لینا ہے، بحال کرنا ہے۔ گریٹر اسرائیل کا نقشہ نیٹ پر موجود ہے۔ ایک سانپ کی شکل میں سرحد کے ساتھ اس علاقے کو گھیرا ہوا ہے جس کو وہ گریٹر اسرائیل میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں مصر، سوڈان، عراق، اردن اور فلسطین اور سعودیہ آدھا شامل ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سے وہ سرحد گزرتی ہے۔ مدینہ پر ان کا دعویٰ ہے، جبکہ مکہ ان کے دعوے سے خارج ہے۔

یہود کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیں مدینہ سے نکالا تھا۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، تینوں قبیلوں کو۔ اور خیبر میں ہماری حکومت تھی، مسلمانوں نے جنگ کے ذریعے ہمیں وہاں سے نکالا۔ یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کا خیبر پر قبضہ ہوا اور اس وقت یہودیوں نے مزارع کے طور پر خیبر میں رہنے کی اجازت مانگی، حضورؐ نے اجازت دے دی، پھر حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں انہیں خیبر سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہود کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیں مدینہ اور خیبر سے نکالا تھا اس لیے خیبر بھی ہمارا حصہ ہے اور مدینہ بھی

ہمارا حصہ ہے۔ چنانچہ گریٹر اسرائیل کے نقشے میں مدینہ منورہ اور خیبر شامل ہیں۔ اور یہ ان کا اصل ٹارگٹ ہے کہ ہم نے قدیمی اسرائیل بحال کرنا ہے۔

عروج وزوال

قرآن کریم نے ان کے عروج کا دور بھی بیان فرمایا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا دور، حضرت یوسفؑ کی بادشاہت، پھر حضرت موسیٰؑ کے ذریعے ان کی بادشاہت کی بحالی، بنی اسرائیل کا فرعون کے ظلم سے نجات حاصل کرنا، اور یوشع بن نونؑ کی قیادت میں بیت المقدس فتح کر کے اس کو دوبارہ اپنی ریاست بنانا، پھر حضرت طالوتؑ اور جالوت کی جنگ کا بھی قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ اس جنگ میں ان کی فتح کے بعد حضرت داؤدؑ کی بادشاہت قائم ہوئی تھی، انہیں حضرت طالوتؑ نے اپنا جانشین بنایا تھا اور داماد بھی بنایا تھا۔ دوبارہ ریاست قائم ہوئی اور حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ ٹائٹل بھی دیا "یاداوود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق" (ص ۲۶)۔ پھر حضرت داؤدؑ کی جانشینی حضرت سلیمانؑ کے حصہ میں آئی، اور وہ پھر عظیم تر سلطنت بنی جن کے سامنے یمن کی ملکہ سبا نے بھی سرنڈر کیا۔ یہ تو بنی اسرائیل کے عروج کا دور تھا، غلبے کا دور تھا، فضیلت کا دور تھا، قرآن کریم کہتا ہے "وانی فضلتکم علی العالمین" (البقرہ ۴۷)۔

اس کے بعد یہود کے زوال کا دور شروع ہوا۔ ان کے زوال کے دور کا پہلا مرحلہ ہے جب حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پہلے کے دور میں بخت نصر نے، جو بابل (عراق) کا حکمران تھا، اس نے یروشلم پر (بیت المقدس اور یروشلم ایک ہی شہر کے دو نام ہیں) پر حملہ کیا اور یہودیوں کا قتل عام کیا۔ ان کا عبادت خانہ ہیکل سلیمانی تباہ و برباد کر دیا، جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا۔ جتنے لوگ قتل کر سکا قتل کیے، باقیوں کو لے گیا اور عراق میں قیدی بنا لیا۔ اور یہی بستی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں "او کالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا" (البقرہ ۲۵۹) میں آیا ہے۔ پھر حضرت عزیرؑ کی برکت سے ان کے ذریعے اس کی بحالی کا اہتمام کیا۔ ایران کے بادشاہ نے عراق کے خلاف ان کی مدد کی۔ اس وقت یہ دوبارہ بحال ہوئے اور یروشلم ان کے قبضے میں آیا۔ بیت المقدس دوبارہ تعمیر کیا، اپنے عبادت گاہ ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا۔ ان کی ریاست پھر ترقی پر آ گئی۔ اس کے بعد حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ ان میں ہی نبی گزرے۔ "اتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ" (الانعام ۸۹) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تین کتابیں بھی عطا فرمائیں۔ "وجعلکم ملوکا" (المائدہ ۲۰) ان کو بادشاہت دی اور

حکومت بھی دی۔ یہ ان کا حق کا دور تھا، عروج کا دور تھا، اور دنیا پر ان کی دنیوی و دینی ہر اعتبار سے برتری کا دور تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک ان دور چلتا رہا۔ حضرت عیسیٰؑ نے جب اپنی نبوت اور وحی کا اعلان کیا تو یہود دو حصوں میں بٹ گئے، ایک حصہ ایمان لایا اور دوسرے حصے نے انکار کر دیا۔ اکثریت انکار کرنے والوں کی تھی، ایمان لانے والے تھوڑے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ ان کے جبر کا شکار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمانوں پر اٹھالیا۔ یہ انہیں قتل نہیں کر سکے "وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم" (النساء ۱۵۷)۔ لیکن باقی مسیحی ان کے جبر کا شکار رہے، حتیٰ کہ روم عیسائیوں کے قبضے میں آگیا اور بادشاہ طیطس رومی نے یروشلم پر حملہ کیا اور اسے یہودیوں سے چھین لیا، اس طرح یہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ طیطس رومی نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے ہیکل سلیمانی کو جڑ سے اکھاڑ دیا، موجود یہودی قتل کر دیے، باقیوں کو جلاوطن کر دیا اور یہودیوں کا داخلہ وہاں بند کر دیا۔ طیطس رومی کے زمانے سے حضرت عمرؓ کی خلافت تک یہ کیفیت رہی کہ قبضہ عیسائیوں کا تھا، وہی سارا نظام چلا رہے تھے، یہودیوں کا وہاں آنے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا اور وہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔

۶۳۸ء میں بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ

پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کا بیت المقدس پر قبضہ ہوا۔ بیت المقدس کی اپنی تاریخ ہے، میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ مسلمانوں نے بیت المقدس عیسائیوں سے لیا تھا، پھر عیسائیوں نے ہم سے چھین لیا، نوے سال عیسائیوں کے پاس رہا، پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کو آزاد کروایا۔ جب طیطس رومی نے یہودیوں کو بیت المقدس سے نکالا، یہودیوں کا اس وقت سے لے کر آج سے تقریباً ایک صدی پہلے تک بیت المقدس سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔ اور قرآن کریم نے جو بیان فرمایا ہے "ضربت علیھم الذلۃ" (آل عمران ۱۱۲) ان کی تقریباً اٹھارہ سو سال تک یہ کیفیت رہی ہے، اور کہیں ان کی کوئی ریاست نہیں تھی۔ ہمارے ساتھ ان کا معاملہ وہی ہے جو میں نے پہلے عرض کیا کہ ہم نے ان کے تین قبیلوں کو مدینہ سے نکالا، یہ سب خیبر میں اکٹھے ہو گئے تھے، پھر ان کو حضرت عمرؓ کے زمانے میں خیبر سے نکالا گیا، جلاوطن کیا گیا۔ مگر اس وقت سے لے کر آج سے ایک صدی پہلے تک یہودیوں سے ہمارا کوئی

تنازعہ، کوئی جھگڑا، کوئی لڑائی، کوئی جنگ نہیں ہے۔ ان کا یہ سارا زمانہ عیسائیوں کے ساتھ دشمنی میں گزرا ہے، بلکہ طیطس رومی سے لے کر اب سے ایک صدی پہلے تک، ہٹلر تک، عیسائیوں اور یہودیوں میں شدید ترین دشمنی تھی۔ یہودی کمزور قوم تھی، عیسائی انہیں مارتے تھے، قتل کرتے تھے، جلاوطن کرتے، مال چھین لیتے تھے۔

مسلم ریاستیں: یہودیوں کی پناہ گاہیں

یہودیوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ مسلمان ریاستیں ہوتی تھیں۔ خود یہودی مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں اچھی دو پناہ گاہیں میسر تھیں:

1. اندلس میں مسلمانوں کی حکمرانی تھی، وہ ہماری پناہ گاہ تھی، وہاں ہمیں خرچہ اور تحفظ بھی مل جاتا تھا۔

2. اور اس کے بعد خلافت عثمانیہ کے بارے میں غیر جانبدار اور معتدل یہودی مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اپنے پورے دور میں یہود کی پناہ گاہ تھی۔ عیسائی ان کو اٹلی، برطانیہ، فرانس میں مارتے اور یہ قسطنطنیہ، ترکی میں آ جاتے۔

ان کا آخری راؤنڈ ہٹلر والا ہے جسے ہولوکاسٹ کہتے ہیں، اس میں کچھ مبالغہ بھی ہے لیکن ہٹلر نے ان کی کٹائی کی ہے ابھی پون صدی پہلے۔

اللہ کی قدرت کہ ذلت اور مسکنت بھی دو ہزار سال یہودیوں کے حصے میں آئی، لیکن دولت بھی ان کے حصے میں آئی ہے۔ دنیا کے سب سے زیادہ مالدار ترین یہی رہے ہیں۔ البتہ مال و دولت کے باوجود ان کی حالت مسکنت کی رہی ہے۔ ایک صدی پہلے عیسائیوں سے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف صلح کی تو تب ان کی حالت بدلنا شروع ہوئی۔ ہوا یوں کہ آج سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے یہودیوں نے اکٹھے ہو کر آپس میں فیصلہ کیا کہ کوئی صورت نکالو کہ فلسطین کی زمین، جو ہماری پرانی زمین تھی، جہاں سے ہمیں طیطس رومی نے نکالا تھا، وہاں واپس جا کر ہم آباد ہوں اور آبادی بڑھاتے بڑھاتے وہ مقام حاصل کریں کہ ہم بیت المقدس کا کنٹرول دوبارہ حاصل کر سکیں۔

بیت المقدس: حضرت عمرؓ کی اصلاحات

حضرت عمرؓ نے تو بیت المقدس کا قبضہ عیسائیوں سے لیا تھا، پھر عیسائیوں نے ہم سے لیا، پھر ہم نے دوبارہ عیسائیوں سے لیا، اور حضرت عمرؓ کے دور سے اب سے ایک صدی پہلے تک مسلمانوں کا کنٹرول رہا ہے۔

- حضرت عمرؓ نے ایک تبدیلی کی تھی کہ رومیوں کے زمانے میں ہیکل سلیمانی جو انبیاء کی عبادت گاہ تھی، اس پر نفرت سے کوڑے کا ڈھیر لگا دیا گیا تھا اور وہاں گندگی پھینکی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی صفائی کروائی، خود اپنی چادر بچھا کر صفائی شروع کی اور سارا کوڑا اٹھایا کہ یہ انبیاء کرامؑ کی عبادت گاہ رہی ہے اور مقدس جگہ ہے۔
- دوسرا تاریخی کام حضرت عمرؓ نے یہ کیا کہ صفائی کر چکنے کے بعد ساتھیوں نے کہا کہ یہاں نماز پڑھیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، نہیں! میں یہاں نماز نہیں پڑھوں گا، اس لیے کہ اگر میں نے ایک نماز یہاں پڑھ لی تو تم نے اس بہانے اس پر قبضہ کر لینا ہے، یہ ہماری عبادت گاہ نہیں ہے، یہودیوں کی عبادت گاہ ہے، یہودیوں کی عبادت کا حق ہے، ہم الگ مسجد بنائیں گے، چنانچہ انہوں نے الگ مسجد بنائی۔
- اس کے ساتھ حضرت عمرؓ نے ان کا یہ حق بحال کر دیا کہ آکر عبادت کر سکتے ہیں۔ یہودیوں کو اجازت دے دی، یہودیوں کی وہاں "دیوار گریہ" معروف ہے، نیم گری ہوئی، نیم ثابت، قدیمی آثار میں سے ہے۔ اس کے ساتھ چمٹ کر روتے ہیں، اپنے پرانے دور کو یاد کرتے اور دعائیں کرتے ہیں۔ جیسے ہم بیت اللہ میں ملتزم کے ساتھ چمٹ کر عبادت کرتے اور روتے ہیں۔

ان کو حضرت عمرؓ نے آکر عبادت کی اجازت دے دی لیکن یروشلم کے نظام کا کنٹرول مسلمانوں کے پاس رہا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے سے خلافت عثمانیہ کے دور تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

یہود اور خلافت عثمانیہ

ہمارے ہاں خلافت کی ترتیب یہ ہے:

1. خلافت راشدہ

2. خلافت بنوامیہ

3. خلافت بنوعباس۔ پھر جب ہلاکو خان نے بغداد کو برباد کر دیا تھا اور آخری عباسی خلیفہ کو قتل کر دیا تھا، پھر ہم بکھرے تھے۔ اور مصر میں کچھ دن ہمارا فاطمی حکومت کے ذریعے تھوڑا سا اقتدار رہا۔

4. اس کے بعد عثمانی کھڑے ہو گئے، انہوں نے اسلامی ریاست قائم کی، وہی ریاست بعد میں خلافت عثمانیہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ ان کا پہلا حکمران عثمان تھا، یہ سلطنت اس کے نام سے منسوب ہے نہ کہ حضرت عثمانؓ کے نام پر۔ سلطنت عثمانیہ نے خلافت کا ٹائٹل استعمال کیا اور اس کے بعد صدیوں حکومت کرتے رہے اور اہل اسلام کے متفق علیہ خلافت رہی ہے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس پر بھی اس کا کنٹرول تھا، خطبے میں ان کا نام پڑھا جاتا تھا، ان سے وفاداری کا اعلان ہوتا تھا۔ یہ الگ تاریخ ہے اور اہل اسلام کا خلافت عثمانیہ پر اعتماد و احترام اپنی جگہ پر ہے۔

فلسطین: خلافت عثمانیہ کا صوبہ

اس دوران فلسطین خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ آج کے نقشے میں فلسطین اور اسرائیل دو الگ الگ ریاستیں دکھائی دیتی ہیں، یہ دونوں ملا کر اصل فلسطین تھا جو خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ ہم نے وہاں جا کر آباد ہونا ہے اور اپنی آبادی بڑھا کر وہ ماحول پیدا کرنا ہے کہ ہم بیت المقدس کے معاملات میں دخیل ہو سکیں اور آہستہ آہستہ اس پر قبضہ کر لیں۔ اس وقت ترکی کی خلافت عثمانیہ سے ان کی کوئی لڑائی نہیں تھی۔ یہود کا وفد ترکی خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانیؒ کے پاس آیا جو اپنے وقت کے بہت باوقار حکمران اور عالمی شخصیات میں سے تھے۔ قسطنطنیہ میں خلیفہ کا ہیڈ کوارٹر "بابِ عالی" کہلاتا تھا۔ بابِ عالی کو تقریباً تین صدیاں دنیا میں وہی پوزیشن حاصل رہی ہے جو اس وقت امریکی صدر کے وائٹ ہاؤس کو حاصل ہے کہ دنیا کے ہر معاملے میں دخل دینا اور کوئی معاملہ ان کی مرضی کے بغیر طے نہ ہونا اس کی پوزیشن رہی ہے۔ سلطان عبد الحمید ثانیؒ بڑے باحمیت حکمران تھے، انہوں نے اپنی یادداشتیں خود لکھی ہیں۔ ان کو بعد میں خلافت سے معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا، اسی دوران ان کا انتقال ہوا۔ نظر بندی کے دوران انہوں نے یادداشتیں لکھیں جو

ترکی میں تھیں، مجھے ایک عرصہ سے انتظار تھا پھر ان کا عربی ترجمہ ہوا تو میں نے منگوا کر پڑھیں۔ میرے پاس موجود ہے "مذکرات السلطان عبد الحمید الثانیؒ" کے عنوان سے۔ انہوں نے اس میں لکھا کہ میرے پاس یہودیوں کا عالمی وفد آیا۔

صہیونیت کیا ہے؟

یہ اصطلاح سمجھنا بھی ضروری ہے کہ صہیونیت کیا ہے۔ صہیون بیت المقدس کے ساتھ ایک پہاڑی ہے، حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ اس پہاڑی پر تھی۔ صہیون کو یہودیوں کے ہاں وہ تقدس حاصل ہے جو ہمارے ہاں صفا اور مروہ کو ہے۔ اور اگر وہ حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ تھی تو اس کا تقدس ہمارے دلوں میں بھی ہے اور ہونا چاہیے۔ وہ خیمۂ داؤد کی نسبت حضرت داؤدؑ کی طرف کرتے ہیں۔ امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا معاہدہ کروایا تھا۔ چند عرب ممالک نے اس معاہدے کو تسلیم کیا تھا۔ کیمپ ڈیوڈ (خیمۂ داؤد) کی جگہ بطور خاص منتخب کی تھی اور وہاں جا کر صلح نامے لکھے تھے۔ یہودیوں نے صہیون پہاڑی کے تقدس کے نام سے ایک تحریک شروع کی کہ ہم اس کے تقدس کو بحال کریں گے۔

فلسطین میں آباد کاری کے لیے خلافت عثمانیہ سے درخواست

خلافت عثمانیہ کا قانون فلسطین کے حوالے سے یہ تھا کہ فلسطین میں یہودی بیت المقدس میں اپنی عبادت گاہ میں آکر عبادت کر سکتے ہیں، کچھ دن اجازت نامے کے ساتھ رہ سکتے ہیں، لیکن یہاں زمین نہیں خرید سکتے، مکان نہیں بنا سکتے، یہاں کاروبار نہیں کر سکتے، مستقل رہائش اختیار نہیں کر سکتے۔ سلطان عبدالحمید ثانیؒ سے یہودیوں کا وفد ملا، ہرتزل اس کا لیڈر تھا، اس نے سلطان سے درخواست کی کہ ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم تھوڑی بہت تعداد میں فلسطین میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ آپ اس قانون میں لچک پیدا کر کے ہمیں وہاں رہنے کی اجازت دیں۔ سلطان عبد الحمید کہتے ہیں میں نے انکار کر دیا کیونکہ ان کا سارا منصوبہ میرے ذہن میں تھا کہ یہ وہاں کرنا کیا چاہ رہے ہیں، ان کا پروگرام کیا ہے، کہتے ہیں میں نے انکار کر دیا۔

اگلے سال وہی وفد دوبارہ آیا اور اس بار پینترا بدلا۔ یہ بات آپ کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ دنیا میں سائنسدانوں کی اکثریت یہودیوں کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم انٹرنیشنل

سائنس یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں، سارے سائنسدانوں کو وہاں اکٹھا کریں گے، سائنس کی ترقی کے لیے ہم بڑا منصوبہ رکھتے ہیں، آپ ہماری سرپرستی فرمائیں اور ہمیں فلسطین میں جگہ دے دیں اور سہولیات فراہم کریں کہ ہم سائنس یونیورسٹی بنا سکیں۔ آپ کو بھی فائدہ ہوگا، ہمیں بھی فائدہ ہوگا۔ اور ہم آپ کی سپورٹ کے لیے تمام یہودی سائنسدانوں کو وہاں اکٹھا کر دیں گے۔ سلطان عبدالحمید نے کہا ٹھیک ہے، سائنس کی ترقی کی خاطر انٹرنیشنل سائنس یونیورسٹی کے لیے میں آپ کو جگہ بھی دوں گا، خرچہ بھی دوں گا، سپورٹ بھی کروں گا، پشت پناہی بھی کروں گا، لیکن اس شرط پر کہ وہ فلسطین میں نہیں ہوگی، فلسطین کے علاوہ دنیا کے جس خطے میں آپ بنانا چاہیں میں مکمل تعاون کروں گا۔ اس پر وہ نہیں آئے کہ نہیں! ہمیں جگہ فلسطین میں ہی چاہیے۔

تیسرے سال پھر آئے اور اب ایک اور پیشکش کی۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے آغاز کا دور تھا، ہر چیز پر عروج کے بعد زوال کا دور ہوتا ہے۔ یہ خاصے مقروض ہو گئے تھے۔ یہود کی پیشکش یہ تھی کہ آپ کی سلطنت کے سارے خرچے ہم اٹھاتے ہیں، آپ کے قرضے ادا کریں گے، آپ فلسطین میں ہمیں مطلوبہ جگہ دے دیں۔ اب سلطان نے انہیں غصے سے نکال دیا اور کہا کہ آج کے بعد میں آپ سے ملاقات نہیں کروں گا اور مجھ سے آپ توقع نہ رکھیں کہ میں فلسطین میں آپ کو جگہ دوں گا۔ یہ تین سال مذاکرات ہوئے۔

یہ دور تھا ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء کے درمیان کا۔ اس کے بعد سلطان عبدالحمید کے خلاف ترکی میں تحریک چلی اور پھر انہیں خلافت سے معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی ہی میں خلیفہ نے یادداشتیں لکھیں اور نظر بندی ہی میں ان کی وفات ہوئی۔ پھر وہاں انقلاب آگیا، یہ تاریخ کا ایک الگ موضوع ہے۔

۱۹۱۷ء یہود اور برطانیہ کے درمیان ”بالفور معاہدہ“

سلطان عبدالحمید نے جب آخری جواب دے دیا تو یہود برطانیہ کے پاس گئے، انہوں نے مسلمانوں سے مایوس ہو کر فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانے کے لیے برطانیہ سے رابطہ قائم کیا۔ برطانوی حکومت سے درخواست کی کہ ہم آپ سے صلح کے لیے تیار ہیں۔ یہ جنگ عظیم اول کا دور تھا۔ ان سے کہا کہ ہم آپ کے جنگی اخراجات برداشت کریں گے، آپ فلسطین پر ہمارا حق تسلیم کریں اور یہ اعلان کریں کہ فلسطین یہودیوں کا قومی وطن ہے، اور ہم سے یہ وعدہ کریں کہ اگر اس جنگ عظیم کے بعد فلسطین کا کنٹرول آپ کو حاصل ہوا تو ہمیں وہاں آباد

کرنے اور اسے اپنا وطن اور ریاست بنانے کے لیے سہولتیں فراہم کریں گے۔ اس کے لیے ۱۹۱۷ء میں باقاعدہ معاہدہ ہوا جو "بالفور ڈیکلیریشن" کہلاتا ہے۔ برطانوی وزیر خارجہ آرتھر جیمز بالفور تھے، ان کے ساتھ معاہدہ ہوا۔ اس میں بالفور نے لکھا کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرتے ہیں اور ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ سلطنت عظمیٰ برطانیہ کو جب بھی موقع ملا ہم یہودیوں کو فلسطین میں بسانے اور ریاست قائم کرنے کے لیے سہولتیں فراہم کریں گے۔ نیٹ پر یہ بالفور ڈیکلیریشن موجود ہے، پچھلے سال اس کا ایک سو سالہ جشن منایا گیا ہے۔

۱۹۱۷ء میں فلسطین پر برطانوی اتحاد کا قبضہ

جنگ عظیم اول میں ایک طرف جرمنی تھا، دوسری طرف برطانیہ، اٹلی، فرانس وغیرہ سب کا متحدہ محاذ تھا۔ خلافت عثمانیہ اس جنگ میں جرمنی کے ساتھ تھی، جرمنی کو شکست ہوئی تو خلافت عثمانیہ کو بھی ہوگئی۔ متحدہ یورپی فوجوں نے جرمنی پر بھی قبضہ کر لیا اور خلافت عثمانیہ پر بھی کر لیا۔ ترکی کے مختلف علاقوں پر کسی حصے میں فرانس گھس گیا، کسی میں اٹلی اور کسی میں برطانیہ گھس گیا۔ جنگ عظیم اول کے بعد جو بندر بانٹ ہوتی ہے کہ مفتوحہ علاقے کو قبضہ کرنے کی جنگ کے بعد فاتحین مفتوحہ علاقے آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس تقسیم میں چونکہ برطانیہ نے پہلے سے یہودیوں سے وعدہ کر رکھا تھا تو برطانیہ نے کوشش کر کے فلسطین اپنے حصہ میں لے لیا۔ اس طرح ترکی کے پیچھے ہٹنے کے بعد فلسطین برطانیہ کی نوآبادی بن گیا۔ برطانوی گورنر وہاں بٹھا دیا گیا۔ یہ ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء کی بات ہے۔ اس کے بعد برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ دنیا بھر سے جو یہودی یہاں آنا چاہیں، آجائیں، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ وہ قانون کہ یہودی فلسطین کی زمین نہیں خرید سکتے منسوخ کر دیا اور اجازت دے دی کہ یہودی یہاں زمین خرید سکتے ہیں، یہاں کاروبار کر سکتے ہیں، مکان بنا سکتے ہیں، رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔

۱۹۲۴ء میں ترکی سیکولر ملک بن گیا تھا، عربوں کی ریاستیں الگ الگ بن گئی تھیں، سعودیہ الگ، اردن الگ، عراق الگ۔ اب فلسطین بے یار و مددگار تھا، برطانیہ کے رحم و کرم پر تھا۔ برطانیہ نے یہودیوں کو بالفور معاہدے کے تحت فلسطین قومی وطن کے طور پر حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس کے لیے انتظامات ہوئے اور یہودی آنا شروع ہوگئے۔ جب برطانیہ نے قبضہ کیا تو بتایا یہ جاتا ہے، بلکہ میں کل ہی ایک پرانی دستاویز پڑھ رہا تھا، اس کے

مطابق اس وقت فلسطین میں یہودیوں کی کل آبادی دو ہزار تھی۔ برطانوی سرپرستی میں مختلف علاقوں سے یہودی وہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے، زمینیں خرید کو مکان بناتے رہے، اور ایک علاقہ کو ٹارگٹ کرلیا تھا کہ ہم نے یہ علاقہ اپنی اکثریت کا علاقہ بنانا ہے۔ کراچی سے، بمبئی سے، روس سے، جرمنی سے یہودی اکٹھے ہوئے۔

فلسطینی زمین کی فروخت کے متعلق جید علماء کرام کا فتویٰ

اس دوران جب یہودی دنیا کے مختلف حصوں سے وہاں جاکر فلسطینیوں سے زمینیں خرید رہے تھے اور فلسطینی زمینیں بیچ رہے تھے، اس وقت فلسطین کے مفتی اعظم حضرت سید مفتی امین الحسینیؒ جوان تھے، صدر ایوب خان کے زمانے میں پاکستان بھی تشریف لائے ہیں، انہوں نے فتویٰ دیا تھا کہ فلسطین کی زمین یہودیوں پر بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ یہ یہاں آباد ہوکر اپنی آبادی بناکر اور اپنی ریاست قائم کرکے بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس فتوے کی تائید میں ہمارے بزرگوں نے بھی فتوے دیے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کا فتویٰ "کفایت المفتی" میں موجود ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے مستقل کتابچہ لکھا اس پر جو اُن کی تصنیف "بوادر النوادر" کا حصہ ہے۔ انہوں نے بھی یہی بات کی کہ مفتی اعظم فلسطین ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن قوموں کے اپنے اپنے مزاج ہوتے ہیں، فلسطینیوں نے فتوے کی پرواہ نہیں کی، البتہ فتوے کا اثر یہ ہوا کہ زمین کی قیمت تین چار گنا ہوگئی، یہودی خریدتے چلے گئے، فلسطینی بیچتے چلے گئے۔

۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کے ذریعے اسرائیلی ریاست کا قیام

فلسطین ۱۹۴۵ء تک برطانیہ کی نوآبادی رہا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب اقوام متحدہ بنی تو برطانیہ نے دیکھا کہ فلسطین کے ایک حصے میں یہودیوں کی اتنی آبادی ہوگئی ہے کہ اگر ہم ریفرنڈم کرواکے ان کو وہ حصہ بطور ریاست دلوادیں تو یہ ممکن ہے۔ برطانیہ نے اقوام متحدہ کو درخواست دے دی کہ میں فلسطین سے جانا چاہتا ہوں لیکن یہ چاہتا ہوں کہ ان کا مسئلہ حل کردیا جائے، جس حصہ میں یہودی اکثریت ہے وہاں یہودی ریاست اسرائیل قائم کردی جائے۔ چنانچہ اقوام متحدہ نے ۱۹۴۵ء میں فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کردیا:

(۱) ایک حصہ اسرائیل (۲) دوسرا حصہ فلسطین (۳) تیسرا حصہ بیت المقدس۔

بیت المقدس کے دعویدار مذاہب

1. بیت المقدس پر عیسائی بھی دعویدار ہیں بیت اللحم کے حوالے سے ہے۔ بیت اللحم سے مراد "مکاناً شرقیا" (مریم ۱۶) جہاں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی۔ یہ بیت المقدس سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، یہ عیسائیوں کا قبلہ ہے۔

2. مسلمانوں کا بھی دعویٰ ہے مسجد اقصیٰ کے حوالے سے۔ یہ جو سنہرا گنبد دکھایا جاتا ہے یہ مسجد صخرہ کہلاتی ہے، مسجد اقصیٰ الگ ہے۔

3. اور یہودیوں کا دعویٰ ہیکل سلیمانی کے حوالے سے ہے۔

تین قوموں کا فلسطین پر دعویٰ ہے اور یہ تینوں جگہیں الگ الگ ہیں۔

4. بلکہ آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ ایک چوتھی قوم کا دعویٰ بھی فلسطین پر ہے، بہائیوں کا۔ جو مرزا بہاء اللہ شیرازی اور محمد علی الباب کے پیرو ہیں، اور قادیانیوں کے ساتھ ساتھ یہ ایران میں مستقل مذہب چل رہا ہے اور وہ دنیا بھر میں موجود ہیں۔ بہائیوں کا قبلہ "عکہ" ہے جو کہ فلسطین میں ہے۔ جب ایرانیوں نے انہیں نکالا تو بہاء اللہ شیرازی وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ ان کی قبر بھی وہیں ہے، ان کے بیٹے عبد البہاء بھی وہیں ان کے جانشین بنے۔ بہائی کمزور نہیں ہیں، تعداد میں تھوڑے ہیں لیکن با اثر ہیں۔ اس وقت جو فلسطین کے باضابطہ صدر ہیں محمود عباس، یہ بہائی ہیں۔

چنانچہ چار قوموں کے قبلے ہیں فلسطین میں۔

اقوام متحدہ کی تقسیم میں فلسطین یہودیوں کو دے دیا گیا، اور چونکہ فلسطین پر عیسائیوں کا اپنا دعویٰ بھی تھا، تو بیت المقدس (یروشلم) کو اس سے الگ رکھا۔ بیت المقدس نہ یہودیوں (اسرائیل) کو دیا، نہ مسلمانوں (فلسطینیوں) کو دیا۔ اسے عارضی طور پر اردن کے کنٹرول میں دے دیا، یہ کہہ کر کہ اس کا فیصلہ بعد میں بین الاقوامی سطح پر کریں گے۔ اور بعد میں فیصلہ کرنے کے حوالے سے عیسائی قیادت کا ذہن یہ ہے کہ وہاں تینوں مذاہب کی مشترکہ کمیٹی قائم کر کے اس کا کنٹرول اس کو دے دیا جائے۔ جو اسرائیل کا باضابطہ نقشہ ہے، اس میں بیت المقدس اسرائیل کا حصہ نہیں ہے، اردن کا حصہ ہے۔

۱۹۶۷ء میں اسرائیل کا بیت المقدس پر قبضہ

جب اسرائیل بنا تو اسرائیل کو یورپی ممالک، امریکہ اور روس نے تسلیم کیا، اسے سپورٹ کیا، ریاست بنوائی، اسباب مہیا کیے، اس کو مستحکم کیا۔ بعد میں ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کی تین ملکوں مصر، شام اور اردن کے ساتھ بیک وقت جنگ ہوئی۔ یہ میرے طالبعلمی کے زمانہ کی بات ہے، میں بھی جلوس وغیرہ نکالنے میں شامل تھا جمعیت طلبہ اسلام کے نام سے۔ اس جنگ میں اسرائیل نے تینوں ملکوں کو شکست دے کر

1. مصر کے صحرائے سینا پر قبضہ کر لیا،
2. شام کی گولان پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا،
3. اور اردن کے یروشلم (بیت المقدس) پر قبضہ کر لیا۔

تب سے بیت المقدس اسرائیل کے قبضے میں ہے جو کہ اردن کے ساتھ ہی ہے، عمان سے تین چار گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ اسرائیل نے قبضہ کر کے اس کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس کے بعد مصر نے تو اپنا علاقہ جنگ کر کے چھڑوا لیا لیکن شام کے مقبوضات اور یروشلم ابھی تک اسرائیل کے قبضے میں ہیں۔

اس وقت موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ نے جو سرحدیں طے کی تھیں اس کے مطابق اسرائیل الگ تھا، فلسطین الگ، اور یروشلم الگ تھا۔ اسرائیل کے ۱۹۶۷ء کے قبضے کو عالمی برادری تسلیم نہیں کر رہی۔ بیت المقدس متنازعہ سمجھا جا رہا ہے، اقوام متحدہ بھی اسے متنازعہ ہی کہتی ہے، اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ اس دوران اسرائیل نے اسے دارالحکومت قرار دینے کا اعلان کر دیا کہ بیت المقدس ہمارا دارالحکومت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ملکوں کے سفارت خانے دارالحکومت میں ہوتے ہیں، عالم اسلام نے احتجاج کیا اور کہا کہ جو ملک بھی اپنا سفارت خانہ وہاں لے جائے گا ہم اس کے بارے میں پالیسی طے کریں گے کہ اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے، اس لیے بہت سے ملک ہچکچاتے رہے ہیں۔

امریکہ: اسرائیل کا سب سے بڑا سہارا

امریکہ اسرائیل کے ساتھ ہے لیکن اس بارے میں ہچکچاتا رہا، لیکن اب امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ صاحب نے اعلان کر دیا ہے کہ ہم اپنا سفارت خانہ یروشلم میں منتقل کریں

گے۔ سفارت خانہ یروشلم میں منتقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیت المقدس کو اسرائیل کا باضابطہ دارالحکومت تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بین الاقوامی معاہدات میں متنازعہ ہے اور عالم اسلام کے ہاں بھی متنازعہ ہے بلکہ ہمارے نزدیک تو پورا فلسطین متنازعہ ہے۔ تو اب ٹرمپ کے اعلان سے یہ ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ رب العزت نے یہود کے بارے میں قرآن مجید میں بیسیوں باتیں فرمائی ہیں، ان میں سے ایک کا حوالہ میں نے دیا تھا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا "ضربت علیھم الذلۃ این ماثقفوا الا بحبل من اللّٰہ وحبل من الناس" (آل عمران ۱۱۲)۔ اللہ کی رسی، جس کی تفصیل مفسرین یوں فرماتے ہیں کہ دین اسلام قبول کرلیں۔ لوگوں کی رسی سے مراد یہ کہ لوگوں کی کوئی بڑی طاقت ان کا سہارا بن جائے۔ "بحبل من الناس" کا منظر آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ یہودیوں کا سب سے بڑا سہارا بنا ہوا ہے، اور اس حد تک سہارا بنا ہوا ہے کہ پوری دنیا کی اجتماعی رائے کو رد کر کے امریکہ کا صدر ٹرمپ یہودیوں کی حمایت میں اور بیت المقدس پر یہودیوں کا استحقاق جتانے کے لیے بڑی مضبوطی کے ساتھ کھڑا ہے۔ اور گزشتہ روز اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان کے سفیر نے جو تقریر کی ہے وہ آپ نے پڑھ لی ہوگی۔ ایک تو اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں یہ فرمایا تھا کہ یہودیوں کو عزت نصیب نہیں ہوگی سوائے دو طریقوں کے، "بحبل من اللّٰہ" یا "بحبل من الناس"۔ آج پوری دنیا کی اجتماعی رائے اس بات کو تسلیم نہیں کر رہی کہ بیت المقدس اسرائیل کا حصہ ہے لیکن "بحبل من الناس" کی سب سے بڑی علامت صدر ڈونلڈ ٹرمپ ہیں جو اسرائیلیوں کے ساتھ کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم ہر قیمت پر یہ کریں گے۔

ایک اور بات اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں فرمائی ہے "لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوًا کبیرًا" (الاسراء ۴) کہ ہم نے بنی اسرائیل کو یہ کہہ دیا تھا، تورات میں لکھ دیا تھا کہ تم دو دفعہ بڑے فساد کرو گے اور دو دفعہ دنیا پر اپنی چوہدراہٹ جتانے کی کوشش کرو گے، اور ہم دونوں دفعہ تمہیں سزا دیں گے۔ یہ دونوں واقعات گزر چکے ہیں۔ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی بخت نصر کے ذریعے "بعثنا علیکم عبادًا لنا اولی باس شدید فجاسوا خلال الدیار" (الاسراء ۵)۔ دوسری دفعہ ان کو سزا دی طیطس رومی کے ذریعے جس نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ایک بات اور بھی

فرمائی ہے ”وان عدتم عدنا“ (الاسراء ۸) اگر تم دوبارہ اپنی انہی حرکات پر لوٹو گے تو ہم بھی تمہیں وہی سزادیں گے۔ تاریخ کے ایک طالبعلم کے طور پر میں سمجھتا ہوں، میرا اندازہ ہے، میں یقینی بات نہیں کر رہا کہ اب ”ان عدتم عدنا“ کا ماحول پیدا ہو رہا ہے، یہودی دنیا میں دوبارہ اکٹھے ہو رہے ہیں بلکہ اکٹھے ہو چکے ہیں، اور یہود ایک طرف ہیں باقی دنیا دوسری طرف ہے، اور پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کے یہود کی حرکتوں کے حوالے سے جذبات آپ کے سامنے ہیں۔

یہودی آج سے ایک صدی پہلے

میں اس پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے جب علامات قیامت پر یہ حدیث پڑھی کہ یہودیوں کے ساتھ تمہاری جنگیں ہوں گی، والد محترم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے استاذ محترم سے سوال کیا تھا کہ یہودی تو دنیا میں کہیں بھی اکٹھے نہیں ہیں، ان کی کہیں ایک ریاست بھی نہیں ہے، اور ہم جیسے تیسے بھی ہیں بہرحال ہماری ریاستیں ہیں، قومیں ہیں، ملک ہیں، علاقے ہیں۔ یہودیوں کی ہم سے لڑائیاں کیسے ہوں گی؟ تو استاد محترم نے کہا تھا کہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی لیکن ایسے ہی ہو گا کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے تو ہمارا ایمان ہے کہ ایسے ہو گا۔ والد گرامی فرماتے تھے کہ جو بات ہمیں سمجھ نہیں آتی تھی وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ہوتی دیکھی کہ دنیا بھر سے یہودی ایک جگہ اکٹھے ہو رہے ہیں اور بڑی تعداد اکٹھی ہو چکی ہے اور ساری دنیا سے جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔

اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ”ان عدتم عدنا“ کی تیاری کے مراحل ہیں کہ یہودی دوبارہ جمع ہو رہے ہیں، ساری دنیا کے خلاف محاذ آرائی کیے ہوئے ہیں، اور حالات اس طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس میں ہمارے لیے بھی بہت آزمائش کی باتیں ہیں، دجال کا ظہور وغیرہ ابھی بہت سی علامات باقی ہیں۔

آج سے سو سال پہلے یہود کی یہ کیفیت نہیں تھی جو آج ہے۔ خیبر سے جلاوطنی سے لے کر آج سے سو سال پہلے تک یہود کا مسلمانوں کے ساتھ کہیں کوئی تنازعہ، لڑائی نہیں تھی۔ عیسائیوں کے ساتھ ان کے تنازعات تھے اور ہم انہیں پناہ دیا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ”لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا الیھود والذین اشرکوا“ (المائدہ ۸۲) کہ پوری نسل انسانیت میں مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یہودی ہیں۔ اب منظر یہ ہے

کہ یہودی اور عیسائی اکٹھے ہو گئے ہیں، دماغ یہود کا ہے، یہود کے پاس پیسے ہیں، باقی وسائل واسباب عیسائیوں کے ہیں۔ یہود نے آج سے دو صدیاں قبل پہلے پروٹوکول کے نام سے جو منصوبہ بندی کی تھی وہ بتدریج آگے بڑھ رہی ہے، اس کے دو مظاہر میں عرض کرنا چاہوں گا۔

طاقت کا عالمی توازن

اس وقت امریکہ سب سے بڑی طاقت ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ظاہری اعتبار سے، مادی اعتبار سے، عسکری اعتبار سے اور سیاسی اعتبار سے امریکہ دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے اور اس کے دعوے کو کوئی بھی چیلنج نہیں کر رہا۔ افغانستان کے جہاد تک دنیا میں دو بڑی قوتیں شمار کی جاتی تھیں: امریکہ اور روس۔ ان کے درمیان سرد جنگ (کولڈ وار) انیسویں صدی تک رہی ہے۔ افغانستان کی جنگ کے خاتمے پر امریکہ نے نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے یہ اعلان کیا کہ اب وہ واحد عالمی سپر پاور ہے، یک قطبی طاقت ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ بات فطرت کے خلاف ہے۔ دنیا میں کبھی یک قطبی طاقت نہیں رہی، اللہ تبارک وتعالیٰ کا سوسائٹی میں یہ نظام چلا آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیلنس رکھتے ہیں، فرمایا "ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیراً" (الحج ۴۰)۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے روکتا رہتا ہوں، ایک طاقت بڑھتی ہے تو مقابلے میں دوسری طاقت آجاتی ہے۔ افغانستان کی جنگ کے خاتمے تک صورتحال یہ رہی ہے کہ دو طاقتیں آمنے سامنے تھیں۔ یورپ کے سامنے ہٹلر تھا، بعد میں امریکہ اور مغربی طاقتوں کے سامنے روس آکھڑا ہوا تھا اور امریکہ اور روس کے مابین سرد جنگ چلتی رہی ہے۔

جب افغانستان کی جنگ عروج پر تھی اور امریکہ اس کی سپورٹ میں آگیا تھا تو یہ نظر آرہا تھا کہ افغانستان اور پاکستان کے مجاہدین کی قربانیاں اور اس کی پشت پر امریکہ کی طاقت سے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ روس شکست کھائے گا، اور پھر اس نے شکست کھائی بھی۔ اس وقت ہمارے بعض اہل علم دانشور حضرات نے یہ کہا، خود مجھ سے ہمارے بعض اساتذہ نے بات کی کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امریکہ کے مقابلے میں روس کی طاقت درمیان سے ہٹ جائے گی اور امریکہ یک قطبی طاقت ہوگا۔ اور پھر وہی ہوگا جو امریکہ چاہے گا، اس کا کوئی سامنا کرنے والا نہیں ہوگا۔

یہ بات درست تھی کہ جب دو طاقتیں آمنے سامنے تھیں تو دنیا کے ہر ملک کو سہارا تھا کہ امریکہ کا کیمپ زیادتی کرتا تو روس کا کیمپ پناہ دینے کے لیے موجود تھا۔ اور اگر روس کا کیمپ زیادتی کرتا تو امریکہ کا کیمپ پناہ دینے کے لیے موجود تھا۔ خود مشرق وسطیٰ میں یہ دونوں کیمپ موجود تھے جو توازن کا کردار ادا کر رہے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ افغانستان کی جنگ ٹھیک نہیں تھی، وہ تو ٹھیک تھی، لیکن ہر جنگ کے کچھ مثبت نتائج ہوتے ہیں کچھ منفی بھی ہوتے ہیں۔ افغانستان کی جنگ کے خاتمے پر عالمی طاقت کا توازن بگڑ گیا اور امریکہ واحد طاقت رہ گئی، ابھی تک امریکہ کو چیلنج کرنے والا سامنے کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہ ماحول زیادہ دیر رہے گا نہیں کیونکہ فطرت کے خلاف ہے، البتہ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ امریکہ یک قطبی طاقت ہے اور کوئی طاقت اس کے سامنے کھڑا ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

دورِ حاضر میں یہود کا کردار

موجودہ صورتحال میں یہود کا کردار کیا ہے؟ میں یہ عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ یہود کے کردار کو سمجھنے کے لیے امریکہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ امریکہ کی اصل آبادی کو تو ریڈ انڈین کہہ کر انہوں نے کناروں پر لگا دیا ہے۔ اسپین میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس وقت اسپین کی ملکہ ازابیلہ کے کہنے پر کولمبس وغیرہ دنیا میں سیاحت کرتے ہوئے سمندر میں سفر کر کے دوسرے کنارے تلاش کر رہے تھے، اسی میں امریکہ دریافت ہوا جو بہت بڑا براعظم ہے۔ اس میں امریکہ، کینیڈا، میکسیکو، برازیل، جنوبی امریکہ اور شمالی امریکہ سب شامل ہیں۔ اب جو امریکہ کی موجودہ آبادی ہے یہ یورپ، جرمن، اسپین، فرانس اور برطانیہ وغیرہ سے گئے ہوئے لوگ ہیں جنہوں نے امریکہ کو آباد کیا تھا۔ یہ پہلے وہاں کی لوکل آبادی سے کام لیتے رہے، پھر افریقہ سے ملازم اور غلام بھرتی کر کے لے جاتے رہے۔ امریکہ کو آباد کیا، اسے ترقی دی، اسے آرگنائز کیا، اسے سماجی بھلائی، تمدن و تہذیب سب کچھ فراہم کیا۔ اس وقت بھی آپ کو امریکہ میں مختلف نسلوں کے لوگ ملیں گے اور بہت سے ملکوں کے شہروں کے نام بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے مثلاً برمنگھم وغیرہ۔ امریکہ میں اسپینش سب سے زیادہ ہیں اور انگلش کے ساتھ اسپینش زبان امریکہ کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ یہ اسپین کے لوگ تھے جو اسپین سے بھاگے تھے وہ وہاں جا کر آباد ہوئے۔ اسپینش جو وہاں آباد ہیں ان کی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی اولاد ہے۔

امریکہ اور یورپ میں اثر و رسوخ

جب امریکہ میں مختلف ممالک سے لوگ جا کر آباد ہونے لگے، یہود نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور امریکہ میں آباد ہونا شروع ہو گئے، اور صرف آباد ہونا شروع نہیں ہوئے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی کشمکش آج سے سو سال پہلے تک قائم تھی، عیسائی سیاست دان اور عیسائی علماء بھی یہود کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی، ایسی اقلیت جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ امریکہ میں یہودیت کے ارتقا کی تاریخ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ انہوں نے وہاں نئے براعظم میں آباد ہو کر نئے سرے سے منصوبہ بندی کی، نئی صف بندی کی۔ تعلیم، سائنس، معیشت اور تجارت کے راستوں سے یہود نے وہاں اپنا اثر و رسوخ قائم کیا اور ایک منظم پلان کے ساتھ آہستہ آہستہ وہاں کے کلیدی مناصب پر، کلیدی شعبوں میں اپنا کنٹرول قائم کیا۔ اس وقت بقول اقبالؒ

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

یورپ میں بھی انہوں نے ایسے ہی کیا، محاذ آرائی بالکل چھوڑ دی اور خفیہ تعلیمی شعبے میں آگے آ گئے۔ معیشت میں ان کی ہمیشہ سے بالادستی رہی ہے اور ان کا دماغ بھی بہت کام کرتا ہے۔ ان کے سازشی دماغ کو سمجھنا ہو تو اس کے لیے قرآن کریم نے ان کے جو گزشتہ واقعات بیان کیے ہیں وہی کافی ہیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے یورپ اور امریکہ دونوں براعظموں میں اپنا اثر و رسوخ بنانا شروع کیا۔ یورپ میں تو یہ ایک حد تک ہیں، یورپ پوری طرح ان کے ساتھ نہیں ہے اور اس کا کنٹرول ان کے پاس ایک حد سے زیادہ نہیں۔ لیکن امریکہ میں یہ مکمل کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ امریکہ کے تھنک ٹینکس میں، امریکہ کی سیاسی قیادت، معاشی قیادت، امریکہ کے بینکنگ کے نظام میں نوے فیصد کنٹرول یہود کا ہے۔ پالیسی سازی کے مراکز تک رسائی حاصل کرنا اور کنٹرول حاصل کرنا، یہ یہودیوں کی تکنیک رہی ہے۔

یہودیوں اور قادیانیوں میں مماثلت

اور یہاں میں یہ بات یاد دلانا چاہوں گا کہ یہ بات علامہ اقبال مرحوم نے قادیانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی پس منظر میں کی تھی۔ قادیانیوں کا جو طریقہ انگریزوں کے دور میں تھا کہ اعلیٰ مناصب تک پہنچ کر اعلیٰ محکموں میں رسوخ حاصل کر کے کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے

لیں۔ انگریزوں کے دور سے ان کی یہ تکنیک چلی آرہی تھی۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک نے قادیانیوں کو بریک لگائی۔ اقبالؒ نے اسی پس منظر میں کہا تھا کہ قادیانیت یہودیت کا چربہ ہے۔ اس وقت امریکہ میں یہود کی آبادی بمشکل ایک یا ڈیڑھ فیصد ہو گی لیکن امریکہ کی پالیسیوں پر کنٹرول یہود کا ہے، جس کی ایک بات تو میں نے اقبالؒ کے حوالے سے ذکر کی ہے۔

دوسرے میں یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ جب ۱۹۷۴ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تو بھٹو مرحوم اپنے اس فیصلے کے دفاع میں جو باتیں کہا کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے جیل میں اپنے نگران کرنل رفیع سے کہا کہ احمدی پاکستان میں وہی پوزیشن حاصل کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے۔ آگے وضاحت کی کہ ملک کی کوئی پالیسی ان کی مرضی کے بغیر طے نہ ہونے پائے۔ بھٹو مرحوم نے کہا تھا کم از کم میں تو یہ نہیں ہونے دوں گا کہ پاکستان کی پالیسیوں کا کنٹرول ایک اقلیتی گروہ کے ہاتھ میں چلا جائے۔ فرق یہ ہوا کہ

- یہودیوں کے راستے میں کوئی مزاحمت نہیں تھی، عیسائی علماء نے مزاحمت کی کوئی قوت کھڑی نہیں کی، اور یہودی مزاحمت کے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے اور تقریباً ایک صدی میں انہوں نے امریکہ کے معاملات کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔
- جبکہ قادیانیوں کو مزاحمت کا سامنا تھا، اگر قادیانیوں کو ۱۹۵۳ء کی تحریک کی مزاحمت کا سامنا نہ ہوتا۔ آج بھی اگر انہیں مزاحمت کا سامنا نہ ہو تو قادیانی اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ تھوڑے سے عرصے میں پاکستان میں وہ پوزیشن حاصل کر سکتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے، اسی لیے وہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

یہود کا ہدف

خیر یہودیوں نے امریکہ پر کنٹرول حاصل کر لیا، امریکہ کی پالیسیاں یہود کے اشارے پر چلتی ہیں، یعنی اس وقت یہود کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ امریکہ کو چلا رہے ہیں اور امریکہ باقی دنیا کو چلا رہا ہے۔

• یہود کی اس تگ و دو کے پیچھے ایک تو ان کا وہ پرانا خواب ہے کہ فلسطین ان کا وطن ہے انہوں نے واپس لینا ہے، یروشلم کو دوبارہ قبضے میں لینا ہے، ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کرنا ہے اور اسرائیل کو بحال کرنا ہے، حضرت سلیمانؑ کے زمانے کی اسرائیلی ریاست کو دوبارہ قائم کرنا ہے۔

• دوسرے یہ کہ یہودیت نسلی مذہب ہے صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے، ان کی نسلی برتری کے احساس کا ذکر قرآن کریم نے بھی متعدّد مقامات پر کیا ہے۔

جناب رسولؐ اللہ اور یہود و نصاریٰ کا حسد

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں یہود اور عیسائیوں کو جو رکاوٹ تھی وہ نہ پہچاننا نہیں تھی، بلکہ وہ آپؐ کو پہچانتے تھے ”الذین اتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم“ (البقرہ ۱۴۶) پھر ان کے انکار کی وجہ کیا بنی؟ قرآن مجید میں ہے ”حسداً من عند انفسھم من بعد ماتبین لھم الحق“ (البقرہ ۱۰۹)۔ ان کے انکار کی بڑی وجہ حسد تھی۔ حسد اس بات پر کہ یہ نبیؐ بنی اسرائیل میں کیوں نہیں آئے، بنی اسماعیل میں کیوں آئے ہیں۔ جس کو پنجابی زبان میں ہم ”شریکا“ کہتے ہیں کہ چچازاد بھائیوں میں کیوں آئے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ”قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ“ (البقرہ ۹۱)۔ بنی اسرائیل سے ہٹ کر ہر وحی کا انکار کرتے ہیں، یہ ان کی نسلی برتری اور فوقیت کا احساس تھا جس کی بنیاد حسد ہے۔

عیسائیوں میں بھی یہی بات تھی، اس وقت میں حوالے کے لیے بخاری شریف کی ایک روایت کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ قیصر روم کے سامنے جب جناب نبی کریمؐ کا گرامی نامہ پیش ہوا اور قیصر روم نے جناب ابوسفیان سے، جو اس علاقے میں آئے ہوئے تھے، بلا کر جناب نبی کریمؐ کے بارے میں طویل انٹرویو کیا تھا، وہ بڑا دلچسپ مکالمہ ہے۔ حضورؐ کی ذات و قوم، آپ کے اخلاق اور آپ کی دعوت کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ ابوسفیان جواب دیتے گئے، آخر میں اس نے کہا تھا کہ میں بھی نبی آخر الزمان کے انتظار میں ہوں، لگتا ہے کہ یہ وہی ہیں۔ اور جناب ابوسفیانؓ سے کہا تھا جو تم کہہ رہے ہو اگر یہ درست باتیں ہیں تو ”انہ لنبی“ بے شک وہ نبی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ان کے پاؤں اپنے ہاتھوں سے دھوتا، لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ تم بدوؤں میں آجائے گا۔

چنانچہ یہ بات اس کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی۔ یہود کے راستے میں بھی یہی نسلی حسد رکاوٹ بنا۔

دنیا پر غلبے کا ایجنڈا

چنانچہ اس وقت یہود کا ایجنڈا صرف اسرائیل قائم کرنے کا نہیں ہے، وہ تو ہے ہی، ساتھ ہی اسرائیل قائم کر کے دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا ایجنڈا بھی ہے۔ اس بنیاد پر کہ "نحن ابناء اللّٰہ واحباۂ" (المائدہ ۸۱)۔ ان کا عقیدہ ہے کہ بنی اسرائیل برتر نسل ہیں اور ان کو نسلی بنیاد پر دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ دنیا اسرائیل کو ایک نسلی مذہب کہتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب جنوبی افریقہ میں گوروں کی حکومت نسلی بنیاد پر تھی۔ گوروں نے قبضہ کیا ہوا تھا اور وہ کالوں کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ اور اقوام متحدہ کے کاغذات میں، بین الاقوامی برادری کے کاغذات میں بھی، جنوبی افریقہ اور اسرائیل کو نسل پرست ریاستیں کہا جاتا تھا۔ اب تو جنوبی افریقہ بدل گیا ہے، وہاں حکومت تبدیل ہوگئی، اب وہ دور ختم ہوا اور اب سیاہ فام اکثریت کی حکومت ہے۔ لیکن اسرائیل ابھی تک اسی نسلی برتری میں ہے۔

تو میں نے دو باتیں عرض کی ہیں کہ

1. یہودی حضرت سلیمانؑ کی ریاست اسرائیل کے قیام کے لیے کوشاں ہیں،
2. اور دوسرے یہ کہ یہود نسلی برتری کے خبط کا شکار ہیں اور پوری دنیا پر عالمی قیادت اور کنٹرول کے دعویدار ہیں۔

ان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ چونکہ خود ان کے اپنے پاس طاقت نہیں ہے، انہوں نے پہلے ہمیں استعمال کرنے کی کوشش کی تھی، سلطان عبد الحمید ثانی کے ساتھ ان کے مذاکرات اور پیشکشیں ہوئیں۔ سلطان ساری بات کو سمجھتے تھے اس لیے ان کے قابو نہیں آئے۔ جبکہ برطانوی حکومت کے ذریعے، جو اس وقت سب سے بڑی مسیحی قوت تھی، عیسائی ان کے قابو آ گئے۔ انہوں نے ساری پلاننگ کر کے عیسائی وسائل کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔ مختصر طور پر خلاصہ بات کا یہ ہے کہ یہودی دماغ اور عیسائی وسائل مسلمانوں کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں اور اس وقت عالم اسلام اور اسلام ان کا ٹارگٹ ہے۔ جہادِ افغانستان کے مکمل ہونے پر، روس کے شکست کھانے پر امریکہ اور روس کے درمیان محاذ آرائی کا ماحول ختم ہو گیا تھا۔ اب روس طاقت ہے لیکن سامنے کی

طاقت نہیں ہے، یہ امریکہ کو کسی معاملے میں چیلنج نہیں کر رہا۔ نیٹو کے سیکرٹری نے افغانستان کی جنگ کے خاتمے پر کہا تھا، ایک حریف ہمارے راستے سے ہٹا ہے، اسلام ابھی باقی ہے۔ یہودی اسلام کو مغرب سے لڑا کر اور مغرب کو اسلام کے خلاف استعمال کر کے اپنا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

اسرائیل کے بارے میں عالمِ اسلام کا موقف

اس وقت ہمارا ماحول یہ ہے قرآن کریم کی وہ آیت ہمارے سامنے ہے "لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا الیھود والذین اشرکوا" (المائدہ ۸۲)۔ لیکن عالم اسلام اسرائیل کے حوالے سے دو کیمپوں میں تقسیم ہے:

1. ایک کیمپ جس میں پاکستان، سعودی عرب، ایران اور کچھ اور ممالک بھی ہیں، یہ سرے سے اسرائیل کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ہمارے پاسپورٹ میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ پاسپورٹ اسرائیل کے لیے کارآمد نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسرائیل کو ایک ریاست تسلیم نہیں کرتے، اس کو ناجائز ریاست سمجھتے ہیں، اور ہمارا موقف یہ ہے کہ فلسطین پورے کا پورا فلسطینیوں کا ہے۔ صدام حسین مرحوم کو جب پھانسی دی گئی اس میں عراق کے مقامی مسائل بھی تھے لیکن مشرق وسطیٰ کے حوالے سے وہ اسرائیل کا سخت ترین مخالف تھا، یہودیوں کا دشمن اور فلسطینیوں کا سخت حامی تھا۔ وہ کلپ موجود ہے جب صدام کو پھانسی دی جا رہی تھی تو اس کی زبان پر آخری جملہ یہ تھا کہ اس نے اعلان کیا تھا فلسطین فلسطینیوں کا ہے، پھر "اشھد ان لا الہ الا اللہ" آدھا کلمہ ہی پڑھا تھا کہ رسی کھینچ دی گئی تھی اور وہ شہید ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک موقف یہ ہے کہ فلسطین پورے کا پورا فلسطینیوں کا ہے، یہود نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے، ناجائز قبضہ کیا ہے، اسرائیل کی ریاست ناجائز ہے، ہمارا موقف بھی یہی ہے۔

2. لیکن ہمیں یہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ بہت سے مسلم ممالک اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں۔ اپنی صفوں کا یہ فرق ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے۔ ترکی، مصر، اردن، قطر، شام نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہے اور ان سے امریکہ نے تسلیم کرایا تھا۔ صدر جمی کارٹر نے کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کروائے تھے اور اسرائیل

تسلیم کرایا تھا، ان ممالک کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی ہیں۔ لیکن جو ممالک اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں، وہ بیت المقدس کو اسرائیل کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اسرائیل اس حد تک ایک جائز ریاست ہے جو اقوام متحدہ نے تقسیم کی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا: (۱) ایک حصہ یہودی اکثر آبادی پر مشتمل اسرائیل (۲) دوسرا فلسطین (۳) اور تیسرا متنازعہ علاقے کے طور پر اردن کی تحویل میں۔ پھر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے جو اردن کے حصے پر، شام کی گولان کی پہاڑیوں پر، اور بیت المقدس پر قبضہ کیا ہے، یہ ان ممالک کے ہاں بھی ناجائز قبضہ ہے، وہ اس علاقے کو اسرائیل کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔

یہ میں موقف کا فرق واضح کر رہا ہوں، کیونکہ بعض دوست پوچھتے ہیں او آئی سی (اسلامی تعاون تنظیم) کوئی واضح قدم کیوں نہیں اٹھا رہی؟ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے جو ہمیں سمجھنی چاہیے، جب یہ اکٹھے بیٹھتے ہیں تو موقف کے فرق بلکہ تضاد کی وجہ سے کوئی اجتماعی حکمت عملی نہیں طے ہو پاتی۔

حضرات محترم! میں نے یہودیت کا کچھ تاریخی پس منظر، مسلم یہودی تعلقات کا ایک تناظر، اسرائیل کے قیام کا پس منظر، موجودہ معروضی صورتحال، اور مستقبل کے امکانات کے حوالے سے چند باتیں آپ کے سامنے عرض کی ہیں۔ اگلی نشست میں عیسائیوں کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

چند معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱ مئی ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ حضرات علماء کرام! آج سے ہم اپنے دوسرے سمسٹر کا آغاز کر رہے ہیں۔ پہلے سمسٹر میں ہمارا موضوع تھا کہ موجودہ تہذیبی کشمکش اور انسانی حقوق کے حوالے سے ہمارے ساتھ دنیا کے جو فکری، ثقافتی اور تہذیبی تنازعات ہیں، ان کے کچھ حصوں کو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا تھا۔ انسانی حقوق کے چارٹر کے حوالے سے اقوام متحدہ اور بین الاقوامی اداروں و تنظیموں کے قوانین کے حوالے سے چند مسائل میں نے آپ کے سامنے بیان کیے تھے، جو ہمارے درمیان تنازعہ اور کشمکش کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

تفصیلی بات تو میں نہیں کر سکا مگر تعارفی طور پر کچھ مسائل کے حوالے سے میں نے صرف یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس وقت ہماری مغرب کے ساتھ جو فکری جنگ، سولائزیشن وار، تہذیبی کشمکش اور ثقافتی جنگ ہے، اس کا بنیادی تعارف کیا ہے؟ ہمارے درمیان ما بہ النزاع امور کیا ہیں اور دونوں کا مختلف مسائل میں موقف کیا ہے؟

اب اس سمسٹر میں آپ سے بات ہوگی کہ اس وقت انسانی سوسائٹی میں ہمیں کن مذاہب، کن مسالک اور کن افکار سے واسطہ ہے۔ سوسائٹی تو گلوبل ہوتی جا رہی ہے اور مشرق، مغرب، شمال، جنوب میں کوئی فرق نہیں رہا، نہ معلومات کے حوالے سے اور نہ رابطوں کے حوالے سے۔ اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانے کی نشاندہی کی تھی "یتقارب الزمان" یہ آپؐ کی پیشین گوئیوں میں ہے جو آپؐ نے قیامت کی نشانیوں میں بیان فرمائی تھی کہ زمانے ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے، جس کا آسان ترجمہ ہم کیا کرتے ہیں کہ فاصلے سمٹ جائیں گے۔ آج کے دور میں زمینی فاصلے بھی اور زمانی فاصلے بھی سمٹ گئے ہیں اور مزید سمٹتے جا رہے ہیں۔ پہلے اونٹوں کا سفر ہوتا تھا، اب جہازوں کا ہوتا ہے۔ پہلے پیغام، خط و کتابت کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا، اب واٹس اپ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے ارد گرد ماحول اور دنیا سے واقف ہونا چاہیے۔

قرآن کریم نے بھی یہی کیا تھا جب جناب نبی کریمؐ تشریف لائے اور مکہ مکرمہ میں آپؐ کی ایک جماعت بنی تو قرآن کریم کا اسلوب یہی رہا ہے کہ جزیرۃ العرب کے دائرے میں جن مذاہب سے عملی واسطہ تھا ان مذاہب کا بڑی تفصیل سے تعارف کروایا ہے۔ زیادہ تر مشرکین عرب تھے جو خود کو اسماعیلی یا قریشی کہتے تھے، ان کے اسلوب و عقائد، ان کی سماجی و تہذیبی روایات، ان کا خاندانی نظام، ان کا پورا سسٹم قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ مدینہ منورہ جا کر یہودیوں سے واسطہ پیش آیا تو یہودیوں کا بھی قرآن کریم نے پورا تعارف کروایا ہے۔ ان کا پس منظر، ان کی تاریخ، ان کے عقائد اور ان کی گمراہیاں کھول کر بیان فرمائیں۔ تیسرے مسلمانوں کا واسطہ جزیرۃ العرب کے وسط میں تو نہیں ایک کونے میں نجران کے عیسائیوں سے تھا۔ نجران میں عیسائی بہت بڑی تعداد میں تھے اور بنو تغلب بھی عیسائی تھے۔ تو قرآن کریم نے عیسائیوں کا تعارف بھی کروایا ہے۔ تینوں حوالوں سے کہ ان کے عقائد کیا ہیں، ان کا تاریخی پس منظر کیا ہے، ان کی روایات و معمولات کیا ہیں، تہذیبی ماحول کیا ہے، اور چوتھے نمبر پر ان کی گمراہیاں بھی تفصیل سے بیان فرمائی ہیں۔

قرآن کریم کا اسلوب یہ بتا رہا ہے کہ ارد گرد کے ماحول سے واقف ہونا چاہیے ` خود عمل کرنے کے حوالے سے بھی اور تحریکات کے حوالے سے بھی۔ جزیرۃ العرب میں اس وقت سب سے کم واسطہ صابئین سے تھا لیکن قرآن کریم نے ان کا ذکر بھی کیا ہے، اگرچہ ان کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ اس تناظر میں ہر دور میں ضروری ہے کہ ہم اپنے ماحول سے واقف ہوں کہ جن مذاہب سے ہمیں سامنا ہے، ہمارا ان کا فرق کیا ہے؟ تنازعات کہاں ہیں؟ اتفاقات و اختلافات کہاں کہاں ہیں؟ تو میں اس کو بات سمجھنے سمجھانے کے لیے تین چار دائروں میں تقسیم کیا کرتا ہوں۔

ہمارے ہاں عام طور پر ایک مغالطہ ہے کہ ہم جب تقابل مذاہب کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ہاں چند مناظرانہ مسائل ہی تقابل مذاہب سمجھے جاتے ہیں۔ عیسائیوں سے بات ہوگی تو مناظرے کے دو چار مسائل موضوع بن جائیں گے اور اسی پر سارا وقت صرف ہو جائے گا۔ وہ ایک حصہ ہے لیکن کل یہی کچھ نہیں ہے۔ یا مثلاً ہم قادیانیوں کی بات کریں گے تو چند مناظرانہ مسائل پر مباحثہ سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم ان کے پس منظر سے واقف ہوں، تاریخ سے واقف ہوں، اور ان کا تعارف حاصل ہو۔ اس لیے میری ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے تعارف ادیان اور تقابل ادیان، مناظرے کے طور پر نہیں بلکہ بریفنگ کے طور پر کہ ہمارا اور ان کا فرق کیا ہے۔ پہلے تعارف کہ یہ کون لوگ ہیں ان کی ابتدا کب ہوئی، یہ کہاں کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ دوسرے ہمارا ان سے فرق کیا ہے۔ اور تیسرے نمبر پر یہ بات عرض کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ اس وقت عالمی سوسائٹی میں ہمارے معاملات کی نوعیت کیا ہے، کہاں جھگڑا ہے، کہاں صلح ہے، کہاں ہم اکٹھے ہیں، کہاں الگ الگ ہیں، ہمارے عملی مسائل اس وقت کیا ہیں۔ یہ تین باتیں (۱) ان کا تعارف، (۲) ان کا مسلمانوں سے بنیادی معاملات کا فرق، (۳) اور تنازعات کی موجودہ صورتحال۔ مناظرہ چوتھے نمبر پر ہوتا ہے۔ میرا ذوق مناظرے کا نہیں ہے لیکن میں مناظرے مجادلے کی نفی نہیں کرتا۔ مناظرہ مجادلہ کیا جاتا ہے، کیا جانا چاہیے۔

اس کے بعد مذاہب کی درجہ بندی بھی ضروری ہے۔ ہم جب تقابل مذاہب کی بات کرتے ہیں تو ہمارے نزدیک ''یہودی مسلم'' جھگڑا اور ''حنفی غیر مقلد'' جھگڑا ایک ہی لیول کا سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا لہجہ دونوں جگہ ایک ہی سا ہوتا ہے، گفتگو کا انداز بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔

درجہ بندی کے بغیر کسی مذہب سے بات کرنا بنیادی طور پر صحیح بات نہیں ہے۔ درجہ بندی کیا ہے؟ ایک درجہ بندی تو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں درجہ بندی اس اسلوب سے بیان کی کہ ایک ہے مذاہب وادیان عیسائی یہودی وغیرہ، شاہ صاحبؒ اہل اسلام میں درجہ بندی کرتے ہوئے اہل قبلہ کا دائرہ بناتے ہیں۔ اہل قبلہ میں قرآن کریم، جناب نبی کریمؐ، اور قبلہ کی بات کرنے والے سب کو شامل کرتے ہیں۔ ان میں اہل سنت تو ہیں ہی، خوارج، معتزلہ، روافض اور کرامیہ جیسے اعتقادی فرقوں کو اہل قبلہ میں شمار کرتے ہیں۔ تیسرے نمبر پر اہل سنت کے داخلی مذاہب، فقہاء کا دائرہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی۔ لیکن شاہ صاحبؒ کے زمانے میں بعض باتیں نہیں تھیں جواب ہو گئی ہیں۔ اس لیے میری ترتیب میں یہ ہوتا ہے کہ:

1. سب سے پہلے تو ادیان و مذاہب، جو مستقل ہیں، مثلاً اس وقت سات ارب کی آبادی میں ہم مسلمانوں کو مجموعی طور پر جن مذاہب سے واسطہ ہے ان میں ہندو، سکھ، بدھ مت، مجوسی، یہودی اور عیسائی مستقل مذاہب ہیں۔

2. اس کے بعد ہمیں واسطہ ہے منحرفین سے، یہ مستقل دائرہ بن گیا ہے۔ منحرف مذاہب کا جیسے قادیانی، بہائی، نیشن آف اسلام، ذکری، رشادی وغیرہ جو نام اور ٹائٹل اسلام کا استعمال کرتے ہیں مگر نبوت و وحی کے نام پر نیا مذہب بنا لیا ہے، لیکن ہیں منحرف۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں یہ دائرہ نہیں تھا۔

3. تیسرے نمبر پر جنہیں شاہ صاحبؒ اہل قبلہ کہتے ہیں جو نئی نبوت کی بات نہیں کرتے اور اسلام کی بنیادی باتوں کو تسلیم کرتے ہیں، ان میں حق و باطل کا دائرہ ہے۔ پہلے دونوں دائروں کو کفر اسلام کا اور اس کو حق اور باطل کا دائرہ کہیں گے۔ ان میں خوارج، معتزلہ، روافض اہل باطل ہیں، جبکہ اہل سنت اہل حق ہیں۔

4. چوتھا دائرہ اہل سنت کے داخلی اختلافات کا۔ اس دائرے میں تین ذیلی دائرے ہیں: ایک اعتقادی، دوسرا فقہی، تیسرا روحانی۔ ان تینوں کو الگ الگ سمجھنا ضروری ہے:

1. اعتقادی تو یہ ہے کہ تمام اہل سنت کے عقائد تو ایک ہی ہیں، تعبیرات میں فرق ہے۔ اور اس میں تین مستقل مکاتب ہیں۔

اشاعرہ، ماتریدیہ، اور ظواہر۔ آج کے دور میں ظواہر کی جگہ سلفی یا اہل حدیث ہیں۔ ان میں کچھ متشددین ہیں اور کچھ معتدل، جو ہر جگہ ہوتے ہیں۔

2. دوسرا دائرہ فقہی احکام و مسائل کا ہے۔ احناف، شوافع، حنابلہ، مالکیہ، ظواہر۔ پانچ مکاتب فکر ہیں۔ پھر ایک خطا و صواب کا دائرہ ہے اور ایک اولی و غیر اولی کا دائرہ ہے۔

• فقہاء کے آپس کے مسائل کی نوعیت خطا و صواب کی ہے۔ ہماری الجھن یہ ہے کہ ہم کسی وقت اولی و غیر اولی کے مسئلہ پر یا خطا و صواب کے مسئلہ پر بات کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہتھیار ہمارے پاس کفر و اسلام کے ہوتے ہیں۔ فقہاء (احناف، شوافع، حنابلہ، مالکیہ، ظواہر) کا آپس کا دائرہ خطا و صواب کا دائرہ ہے، حق و باطل کا دائرہ نہیں ہے۔ ہم مجتہد کے بارے میں اصولی بات یہ کرتے ہیں ''المجتھد یخطئ و یصیب''۔ مثال کے طور پر ہم امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں ان کے فتوے کو دلیل پوچھے بغیر مانتے ہیں، لیکن یہ کہہ کر مانتے ہیں ''صواب یحتمل الخطاء'' اور اس کو حق و باطل کا عنوان نہیں دیں گے۔ حضرت امام شافعیؒ کے کسی فتوی کو ہم قبول نہیں کرتے تو یہ کہہ کر کہ ''خطاء یحتمل الصواب'' اور اس کو باطل نہیں کہیں گے۔

• اس سے اگلا دائرہ اولی و غیر اولی کا ہے۔ ہمارے بیسیوں فقہی اختلافات اولی و غیر اولی پر جا کر منتج ہو جاتے ہیں۔ فقہی احکام میں بالخصوص ہم بعض اوقات بہت تشدد کر جاتے ہیں، ہمیں اپنے رویے پر غور کرنا ہو گا۔ میں حنفی ہوں اور الحمد للہ شعوری حنفی ہوں، متصلب حنفی ہوں، احناف کے دائرے کو سمجھتا بھی

ہوں، پابندی بھی کرتا ہوں، عمل بھی کرتا ہوں، تلقین بھی کرتا ہوں۔ لیکن یہ عرض بھی کیا کرتا ہوں کہ حنفیت کے مجادلے میں صحیح ترجمان اور آئیڈیل امام طحاویؒ ہیں۔ حنفی اور غیر فقہی اختلاف کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے میرے ذوق کے مطابق امام طحاویؒ سے بڑا کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔ فقہی مجادلے میں امام طحاویؒ کی "شرح معانی الآثار" کی چند خصوصیات کا میں ذکر کیا کرتا ہوں، آپ نے اس کتاب کا کچھ حصہ پڑھا ہو گا، اس کے چند صفحات پر دوبارہ غور کریں۔ طحاوی کی تمہید کی تین چار سطروں میں انہوں نے ذکر کیا کہ فقہی مجادلے کی بنیاد انہوں نے کس پر رکھی ہے۔ امام طحاویؒ کہتے ہیں، احادیث مختلف ہیں۔ ایک ایک مسئلہ پر تین تین چار چار مختلف احادیث ملتی ہیں جس سے ملحدین غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، اور کمزور ایمان کے مسلمان شک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ دو وجہیں بیان کی ہیں۔ امام طحاویؒ کہتے ہیں میں نے الحاد کو دور کرنے کے لیے اور مسلمانوں کے تذبذب کو رفع کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے۔ گویا فقہی مجادلہ کا بنیادی مقصد امام طحاویؒ کے ہاں اختلاف کو پھیلانا نہیں بلکہ سمیٹنا ہے، شکوک کو بڑھانا نہیں ہے بلکہ کم کرنا ہے۔ امام طحاویؒ نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ ایک مسئلہ پر مثلاً تین موقف ہیں تو تینوں کے دلائل الگ الگ بیان کریں گے۔ پہلے مخالفین کے دلائل بیان کریں گے، پوری دیانت داری سے بیان کریں گے، پھر اپنے نقطہ نظر سے اس میں کمزوری واضح کریں گے۔ پھر دوسرا موقف بیان کریں گے، ان کے دلائل بیان کریں گے، پھر اپنا

موقف بیان کریں گے، پھر دلائل کا تقابل کریں گے۔ دلائل کے تقابل کی علمی بحث کے بعد اس کی درجہ بندی کریں گے کہ یہ ہمارے نزدیک جواز اور عدم جواز کا مسئلہ ہے، یا مکروہ اور غیر مکروہ کا مسئلہ ہے، یا اولی اور غیر اولی کا مسئلہ ہے۔ اور جہاں اپنے دلائل میں کمزوری محسوس کریں گے وہاں اعتراف کریں گے کہ یہاں ہمارے دلائل کمزور ہیں۔

3. اور تیسرا دائرہ صوفیاء کا ہے نقشبندی، قادری، سہروردی، چشتی۔ اہل سنت کے داخلی دائروں میں اعتقادی تعبیرات کا مسئلہ ہو، یا فقہی احکام کا مسئلہ ہو، یا روحانی سلسلے کا آپس کا کوئی مسئلہ ہو، اس پر حق و باطل کی بات نہیں کریں گے بلکہ خطا و صواب کی بات کریں گے اور اس سے اگلا دائرہ اولی غیر اولی کا ہے۔

مذاہب و ادیان کے تعارف کے موضوع میں پہلے ہم ادیان و مذاہب کی بات کریں گے، پھر منحرفین کے دائرے کی، اور پھر حق و باطل کے دائرے کی (اہل سنت، خوارج، روافض کی) بات کریں گے۔ اور آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس وقت جو ہماری جنوبی ایشیا میں مسلکی تقسیم ہے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی فکری و فقہی تقسیم ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے نہ کوئی دیوبندی تھا، نہ کوئی بریلوی تھا، نہ کوئی اہل حدیث تھا۔ جبکہ اعتزال جدید کا بھی ایک مستقل طبقہ ہے جن کو ہم متجددین کہتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہماری اس مذہبی تقسیم کا سبب کیا بنا؟ اور ہمارا موجودہ فرق کیا ہے اور تنازعات کیا ہیں؟ یہ بھی جاننا ضروری ہے، اس پر بھی بات کرنا چاہوں گا۔ ہم کرامیہ اور معتزلہ کا پس منظر تو معلوم کر لیتے ہیں لیکن دیوبندی اور بریلوی جھگڑے کا پس منظر کیا ہے، ہم اسے معلوم نہیں کرتے۔ آج میں نے آپ کو درجہ بندی بتائی ہے کہ کس ترتیب سے ہم بات کریں گے، لیکن سارے کا وعدہ نہیں کرتا، ترتیب سے چلیں گے، جتنی بات کر سکے کریں گے، ان شاء اللہ تعالی۔

قرآن کریم کی تعلیم اور ریاستی تعلیمی نظام

(معارف اسلامیہ اکادمی، گکھڑ۔ ۲۷ اپریل ۲۰۱۸ء)

۲۷ اپریل کو گکھڑ میں والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی مسجد میں جمعہ پڑھانے اور ان کے قائم کردہ مدرسہ معارف اسلامیہ اکادمی کے شعبہ تجوید وقراءت اور شعبہ حفظ و ناظرہ کی تعلیم مکمل کرنے والے قراء اور حفاظ کی دستار بندی کرانے کی سعادت حاصل ہوئی، اس موقع پر کی جانے والی گزارشات کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں نے جو آیت کریمہ آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اس میں اللہ رب العزت نے نسل انسانی اور امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام پر اپنے اس عظیم احسان کا ذکر کیا ہے جو رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کی صورت میں ہوا اور جس سے نسل انسانی رہتی دنیا تک فیض یاب ہوتی رہے گی۔ اس آیت میں جناب رسول اللہؐ کے فرائض منصبی کا بھی ذکر ہے جن میں سے دو پر آج کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ''یتلوا علیہم آیاتہ'' کہ نبی کریمؐ انسانوں کو قرآن کریم کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور دوسرا ''و یعلمہم الکتاب'' کہ وہ انہیں کتاب اللہ کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت اور تعلیم دونوں دینی فرائض میں سے ہیں۔ تلاوت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ و آیات پڑھے اور سنے جائیں جبکہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقدس کلام کا مطلب و مفہوم سمجھا جائے۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں کام انتہائی خوبی اور کمال کے ساتھ کیے اور پوری امت کو یہ دونوں کام جاری رکھنے کی تلقین فرمائی۔ چودہ سو برس سے قراء و حفاظ اور علماء و فقہاء ہر دور میں یہ فریضہ سرانجام دیتے آرہے ہیں اور قیامت تک ان شاء اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

میں آج اس پہلو پر آپ دوستوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں کام آج کے ماحول میں کہاں ہو رہے ہیں اور کون لوگ کر رہے ہیں؟ عالم اسباب میں اس وقت ہمارے سامنے جو منظر ہے اس میں یہ دونوں عظیم کام دینی مدارس میں ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور دینی مدارس کے مختلف شعبوں کے اساتذہ و طلبہ اس کار خیر میں ہر سطح پر وسیع پیمانے میں مصروف ہیں۔ اس پس منظر میں جب بعض حلقوں کی طرف سے دینی مدارس کو ''قومی دھارے'' میں لانے کی بات ہوتی ہے تو مجھے بے حد تعجب ہوتا ہے کہ یہ بات کہنے والوں کا آخر مقصد کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت اور تعلیم دونوں ہماری دینی، ملی اور

قومی ضروریات میں سے ہیں جن کے تسلسل اور فروغ کے لیے دینی مدارس کام کر رہے ہیں۔ جبکہ جن اداروں کو قومی ادارے کہا جاتا ہے ان میں سے کوئی شعبہ اور ادارہ بھی ان دو میں سے کسی قومی ضرورت کو پورا کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ تو پھر ایک اہم ترین قومی ضرورت کو پورا کرنے والے اداروں اور طبقات کو قومی دھارے سے باہر کیسے سمجھ لیا گیا ہے اور ان کے کردار و عمل کو قومی دھارے سے باہر کی چیز قرار دینے والے لوگ قرآن و سنت کی تعلیم کے بارے میں دنیا کو کیا پیغام دینے کی کوشش کر رہے ہیں؟

اس حوالہ سے ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے ہاں تعلیم دو الگ الگ دھاروں میں تقسیم نظر آتی ہے۔ ایک طرف سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کا دائرہ ہے اور دوسری طرف مسجد، مدرسہ اور جامعہ کا دائرہ ہے، ان دونوں میں دی جانے والی تعلیم کے دائرے مختلف ہیں۔ یہ تقسیم عملاً تو موجود ہے اور پورے معاشرے کا احاطہ کیے ہوئے ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تقسیم کس نے کی ہے اور اس تقسیم کو ختم کرنے میں رکاوٹ کون ہے؟ میں چاہوں گا کہ ان دونوں سوالوں کا مختصر اجائزہ لے لیا جائے۔

1. جہاں تک اس تقسیم کے آغاز کا تعلق ہے عام طور پر اسے مولوی اور دینی طبقہ کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے اور مسلسل کہا رہا ہے کہ دینی اور عصری تعلیم کی یہ تقسیم علماء نے پیدا کی ہے اور اس کا ذمہ دار دینی مدرسہ ہے۔ مگر میں اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں، اس لیے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل جب پورے برصغیر میں تعلیم کا نظام علماء کے ہاتھ میں تھا، وہ پڑھاتے بھی تھے، تعلیم کا انتظام بھی کرتے تھے اور درس نظامی کا یہی نصاب ان کے مدارس میں پڑھایا جاتا تھا جس میں قرآن و حدیث، فقہ و شریعت اور عربی زبان کے ساتھ ساتھ طب، ریاضی، فلکیات (سائنس)، دفتری زبان فارسی اور دیگر ضروری علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور یہ سب علوم جنہیں آج عصری اور دینی علوم میں تقسیم کر دیا گیا ہے ایک ہی درسگاہ میں ایک ہی تپائی پر ایک ہی طبقہ کے اساتذہ پڑھاتے تھے۔ اس وقت جب نظام علماء کے ہاتھ میں تھا، تعلیم کی یہ تقسیم کہیں بھی موجود نہیں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب تعلیمی نظام کو علماء سے لے لیا گیا اور ہزاروں علماء کرام کی شہادتوں اور ہزاروں دینی مدارس کو ختم کر دینے کے بعد جب انگریزی حکومت نے اپنی طرف سے نیا تعلیمی نظام رائج کیا تو

اس میں سے قرآن، حدیث، فقہ، عربی، فارسی اور دیگر دینی علوم کو نکال کر عصری و دینی تعلیم کی یہ تقسیم ملک پر مسلط کر دی۔ علماء کرام نے تو صرف یہ کیا کہ جن علوم کو انگریز حکومت نے نصاب سے نکال دیا تھا اور قوم کو ان علوم کی بہر حال ضرورت تھی ان کی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے بے سروسامانی کے عالم میں پرائیویٹ دینی مدارس کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ڈیڑھ سو سال کی صبر آزما محنت و کاوش کے بعد وہ آج قرآن و حدیث، فقہ و شریعت اور عربی زبان کی تعلیم کو معاشرے میں باقی رکھنے کی مہم میں بحمد اللہ تعالی سرخرو ہیں۔ چنانچہ آج ان قوتوں کا غیظ و غضب کسی طرح تھمنے میں نہیں آ رہا جنھوں نے اپنی طرف سے ریاستی نظام تعلیم سے ان علوم کو خارج کر کے یہ تسلی کر لی تھی کہ یہ علوم اب سوسائٹی میں باقی نہیں رہیں گے، مگر یہ علوم نہ صرف موجود ہیں بلکہ مغرب کے مادر پدر آزاد فلسفہ و تہذیب کے راستے میں ناقابل شکست رکاوٹ بھی بنے ہوئے ہیں۔

علماء کرام نے ان علوم کی تدریس کے تسلسل کو معاشرے میں باقی رکھنے کے لیے کس قدر مشقت و صبر اور حوصلہ و عزم کے ساتھ محنت کی میں اس پر باہر سے کوئی شہادت لانے کی بجائے آپ کے اس شہر گکھڑ کو ہی گواہ کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اسی مسجد میں جہاں آج میں آپ سے مخاطب ہوں میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد امام و خطیب کی حیثیت سے آئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۲ء تک اس مسجد کو مدرسہ کی شکل دے کر مسلسل دس سال علوم اسلامیہ کی تعلیم دی، اس طور پر کہ ان کے پاس ملک کے مختلف حصوں سے طلبہ آ کر اس مسجد میں رہتے تھے جنہیں محلہ کے لوگ دو وقت روٹی دے دیا کرتے تھے اور وہ مسجد میں ہی سو جایا کرتے تھے۔ حضرت والد محترمؒ سارا دن پڑھاتے رہتے تھے اور مذکورہ دینی علوم کے حوالہ سے روزانہ بیس بیس اسباق (پریڈ) تک پڑھا دیتے تھے جس کے لیے کوئی الگ اضافی تنخواہ نہیں ہوتی تھی۔ اس دوران سینکڑوں علماء کرام نے ان سے قرآن و حدیث، فقہ و شریعت اور دیگر دینی علوم کی کتابیں پڑھی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں جب

ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ نے گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم قائم کیا تو حضرت والد محترمؒ بھی وہاں پڑھانے کے لیے جانے لگے اور آخر عمر تک وہیں پڑھاتے رہے۔

اس طرح کی سینکڑوں دینی درسگاہیں آپ کو ملک کے طول و عرض میں ملیں گی جنہوں نے انتہائی بے سروسامانی کے ماحول میں دینی تعلیم کے تسلسل کو جاری رکھا۔ یہ درسگاہیں اس لیے تھیں کہ قرآن و سنت کے جن علوم کو ریاستی نظام تعلیم سے خارج کر دیا گیا تھا ان کا وجود مسلم معاشرے میں باقی رہے۔ اس لیے میں یہ بات بالکل دوٹوک عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دینی اور عصری تعلیم کی یہ تقسیم جو آج نظر آ رہی ہے، ہم نے نہیں کی بلکہ یہ ہم پر مسلط کی گئی تھی اور آج بھی صورتحال میں کوئی فرق دکھائی نہیں دے رہا۔ ہمارے ساتھ تو اس کہاوت والا معاملہ ہوا ہے کہ کسی زمیندار کے ڈیرے پر رات کو ایک بندر آکر مٹکے میں رکھا ہوا دودھ پی جاتا اور جاتے ہوئے تھوڑی سی ملائی قریب ہی بندھے ہوئے کٹے کے منہ پر مل جاتا۔ صبح کو زمیندار مٹکے کو دودھ سے خالی دیکھ کر اس کٹے کی پٹائی شروع کر دیتا کہ سارا دودھ یہ پی گیا ہے۔ ایک رات اس نے یہ معاملہ خود دیکھنے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ دودھ تو بندر پی جاتا ہے اور ملائی اس غریب کٹے کے منہ پر مل دیتا ہے، تب اس مظلوم کٹے کی جان بخشی ہوئی۔ ہمارے ساتھ بھی یہی معالہ جاری ہے کہ دینی و عصری علوم کی تقسیم انگریزوں نے کی تھی اور اس کے جانشینوں نے اس تقسیم کا تسلسل جاری رکھا ہوا ہے مگر سارا الزام مولوی پر اور دینی مدرسہ پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔

2. اب میں سوال کے دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں کہ آج اس تقسیم کو ختم کرنے میں کون رکاوٹ ہے؟ آج کی صورتحال صرف ایک حوالہ سے عرض کرنا چاہوں گا کہ دینی مدارس نے تو اپنے نصاب و نظام میں لچک پیدا کر کے مڈل اور میٹرک کو اس کا لازمی حصہ بنا لیا ہے اور دینی مدارس کے وفاقوں نے میٹرک کی تعلیم کو لازمی قرار دے دیا ہے، حتیٰ کہ بہت سے دینی مدارس اس سے آگے ایف اے، بی اے اور ایم اے کے درجوں کو بھی اپنے نظام میں ایڈجسٹ کیے ہوئے ہیں۔ مگر دوسری طرف ریاستی نظام تعلیم ابھی تک قرآن

کریم ناظرہ کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے سے بھی انکاری ہے۔ ۱۹۹۲ء میں وفاقی محتسب اعلی نے محکمہ تعلیم کو مڈل تک ناظرہ قرآن کریم کو لازمی کر دینے کا حکم دیا تھا جسے آج تک قبول نہیں کیا گیا۔ جبکہ ۲۰۱۲ء میں پنجاب اسمبلی نے متفقہ قرارداد کی صورت میں میٹرک تک ناظرہ اور بی اے تک ترجمہ کے ساتھ قرآن کریم کی تعلیم دینے کا فیصلہ کیا تھا جس پر عملدرآمد کی کوئی شکل ابھی تک سامنے نہیں آئی۔

عجیب ستم ظریفی ہے کہ ریاستی نظام تعلیم تو ناظرہ قرآن کریم کی تدریس و تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو دینی تعلیم کا بالکل ابتدائی درجہ ہے لیکن دینی مدارس کو مڈل اور میٹرک سے آگے کے درجوں کے لیے بھی مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ تعلیم کو دینی اور عصری دائروں میں تقسیم کرنے کا کام ہم نے نہیں کیا اور نہ ہی ہم اس تقسیم کو ختم کرنے میں رکاوٹ ہیں۔ جنہوں نے یہ تقسیم کی تھی وہی آج اسے ختم کرنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ایک ذمہ دار شخصیت نے کچھ عرصہ قبل مجھ سے پوچھا کہ دینی مدارس عصری تعلیم میں مزید آگے کیوں نہیں بڑھ رہے؟ میں نے عرض کا کہ "ون وے ٹریفک" نہ چلائیں کیونکہ آپ تو قوم کے بچوں کو ریاستی سکولوں اور کالجوں میں قرآن کریم ناظرہ اور ترجمہ کے ساتھ پڑھانے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن ہم سے دینی مدارس میں ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس دان تیار کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، اگر آپ نئی نسل کو مسلمان اور پاکستانی رکھنے میں سنجیدہ ہیں اور دستور پاکستان کا حلف آپ نے رسماً نہیں اٹھایا بلکہ اسے عملاً تسلیم بھی کرتے ہیں تو یہ کام آپ کو خود کرنا چاہیے، آخر ہمیں بار بار اس طرف حکمرانوں کو توجہ دلانے اور مطالبات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ یکم و ۲ مئی ۲۰۱۸ء)

آسمانی تعلیمات کے حوالے سے ایک مستقل آزمائش

(مسجد امن، باغبانپورہ، لاہور - ۱۵ اپریل ۲۰۱۸ء)

جامع مسجد امن باغبانپورہ لاہور کے خطیب مولانا قاری جمیل الرحمان اختر اپنے والد گرامی حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ اور ان کے شیخ و مربی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے صبح نماز فجر کے بعد روزانہ درس قرآن کریم دیتے ہیں۔ درس قرآن کریم کا ایک دور مکمل ہونے پر انہوں نے ۱۵ اپریل ہفتہ کو بعد نماز مغرب خصوصی تقریب کا اہتمام کیا جس میں حضرت مولانا قاضی ارشد الحسینی آف اٹک نے قرآن کریم کی آخری سورتوں کا درس دیا۔ راقم الحروف نے بھی اس موقع پر کچھ گزارشات پیش کیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سورۃ المائدہ آیت ۴۴ تا آیت ۵۰ میں اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں کے نزول کا مقصد اور تسلسل بیان فرمایا ہے کہ ہم نے تورات نازل کی جس کے مطابق حضرات انبیاء کرام علیہم السلام لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے، پھر انجیل نازل کی اور اس کے ماننے والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ اس کتاب کے مطابق کیا کریں، اس دوران زبور نازل ہوئی اور حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی اللہ رب العزت نے یہی حکم دیا کہ وہ لوگوں کے معاملات اور تنازعات کا کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کریں، اور ان سب کے بعد قرآن کریم نازل ہوا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ان کی اصل تعلیمات کا محافظ ہے۔

یہ سب کچھ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ”وان احکم بینہم بما انزل اللہ“ آپ لوگوں کے مسائل و معاملات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی اس وحی کے مطابق نمٹائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور بات یہ فرمائی کہ ”ولا تتبع اھواءھم“ لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ یہ بات پہلے انبیاء کرامؑ سے بھی کہی گئی تھی جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ البتہ لوگوں یعنی سوسائٹی کی خواہشات پر نہ چلنے کی تلقین کرتے ہوئے قرآن کریم میں ایک جگہ یہ کہا گیا ہے کہ ”عما جاءک من الحق“ آپ کے پاس جو وحی آئی ہے اس کے مقابلہ میں لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ہر خواہش کو مسترد کرنا

ضروری نہیں ہے بلکہ سوسائٹی کی جو خواہشات وحی الٰہی یا دوسرے لفظوں میں منصوص احکام سے متصادم ہوں وہ قابل قبول نہیں ہیں۔

یہاں ایک اور بات اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی ہے جس کے بارے میں آج قدرے تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ”واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک“ لوگوں سے اس معاملہ میں بچ کر رہیں کہ وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ بعض احکام کے بارے میں آزمائش میں ڈال دیں۔ یہ ایک خطرہ کی نشاندہی ہے کہ لوگ وحی الٰہی کے بعض احکام کے بارے میں آنحضرتؐ کو آزمائش میں ڈالنے کی کوشش کریں گے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچ کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جبکہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۳ تا ۷۵ میں بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبرؐ کو وحی الٰہی کے بارے میں آزمائش میں ڈالنے کی عملاً بھی کوشش کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل کے ساتھ انہیں محفوظ رکھا اور اس فتنے اور سازش کو ناکام بنا دیا۔ یہ آزمائش کیا تھی اور کن لوگوں نے کس قسم کی منصوبہ بندی کی تھی؟ اس کے بارے میں ان آیات کریمہ کے ضمن میں مفسرین کرامؒ نے مختلف واقعات و احوال کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض واقعات مکہ مکرمہ کے ہیں اور بعض مدینہ منورہ کے ہیں، مثلاً:

- قریش کے بعض سرداروں نے جناب نبی کریمؐ سے کہا کہ آپ حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں مگر ہمارے خداؤں کو ہاتھ نہیں لگاتے، یا تو آپ ہمارے بتوں کا بھی استلام کریں یعنی انہیں بوسہ دیں ورنہ ہم آپ کو حجر اسود کا استلام نہیں کرنے دیں گے۔
- ایک موقع پر ان سرداروں نے جناب رسول اللہؐ سے کہا کہ اگر آپ بھی ہمارے بتوں کے پاس حاضری دیا کریں تو ہم آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک ہونے کے لیے تیار ہیں۔
- ابوجہل اور امیہ بن خلف نے ایک موقع پر نبی کریمؐ سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ کو ہماری طرف مبعوث کیا گیا ہے تو پھر ان ضعفاء اور کمزور طبقات کے لوگوں کو اپنے پاس کیوں بٹھائے رکھتے ہیں، انہیں مجلس سے اٹھا دیں تاکہ ہم بڑے لوگ آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی بات سن سکیں۔

گویا یہ قریش کے سرداروں کی طرف سے آنحضرتؐ کو مصالحت کی پیشکش تھی جو مختلف مواقع پر ہوئی۔ میں اس حوالہ سے عرض کیا کرتا ہوں کہ جناب رسول اکرمؐ کو اعلان نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں چار مراحل سے گزرنا پڑا:

1. جب آپ نے قرآن کریم لوگوں کو سنانا شروع کیا اور توحید کی دعوت دی توسب سے پہلے طعن و تشنیع، استہزا، تحقیر اور الزام تراشی کا بازار گرم کیا گیا۔

2. جب اس سے بات نہ بنی تو اذیتوں اور تکالیف کا سلسلہ شروع کیا گیا جو کم و بیش ایک عشرہ تک جاری رہا اور نبی کریمؐ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف کرب و اذیت اور تشدد و جبر کا ہر حربہ آزمایا گیا۔

3. اس سے بھی اسلام کا راستہ نہ رکا تو مکہ مکرمہ اور اردگرد کے قبائل نے متحد ہو کر آنحضرتؐ اور ان کے ساتھیوں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جو تین سال تک چلتا رہا۔

4. اور جب اس میں بھی ناکامی ہوئی تو چوتھے مرحلہ میں سودے بازی اور بارگیننگ کا راستہ اختیار کیا گیا کہ آپؐ ہمارے خداؤں کی نفی نہ کریں اور ان کے پاس بھی کبھی کبھار آجایا کریں تو ہم بھی دین اسلام کے بارے میں لچک پیدا کرنے کے لیے تیار ہیں، اس پیشکش اور مصالحتی فارمولا کو قرآن کریم میں سورۃ الکافرون کے ذریعے مسترد کر دیا گیا۔

جبکہ مدینہ منورہ کے حوالہ سے مفسرین کرامؒ طائف کے بنو ثقیف کے وفد کی اس ملاقات کا ذکر کرتے ہیں جس میں انہوں نے قبول اسلام کے لیے چند شرائط پیش کی تھیں مثلاً:

- ہمیں اپنا بت ”لات“ توڑنے کے لیے نہیں کہا جائے گا۔
- مکہ مکرمہ کی طرح طائف کو بھی حرم قرار دیا جائے گا۔
- ہمیں اپنے بت خانوں کے نذرانے وصول کرنے کے لیے ایک سال کا وقت دیا جائے گا۔
- ہم نماز میں رکوع اور سجدہ نہیں کریں گے اور سر نہیں جھکائیں گے۔
- شراب کا چھوڑنا ہمارے لیے مشکل ہوگا۔
- سود کا کاروبار ترک نہیں کریں گے۔

• زنا بھی ترک نہیں کریں گے، وغیر ذالک۔

یہ شرائط مذکورہ تفسیری روایات کے ساتھ ساتھ سیرت کی کتابوں میں جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ بنو ثقیف کے وفد کی ملاقات کے تذکرہ میں بھی بیان کی گئی ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیات کریمہ میں کہا گیا ہے کہ اگر جناب رسول اللہؐ کفار کی ان شرائط کو قبول کر لیتے تو یہ آپ کے ساتھ دشمنی ترک کر کے آپ کو دوست بنا لیتے۔ اور یہ بھی ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ "لقد کدت ترکن الیھم" نبی کریمؐ تو شاید کسی مصلحت کے پیش نظر نرمی اختیار کر لیتے مگر اللہ تعالی نے آپ کو ثابت قدم رکھا اور کفار کے اس جال میں پھنسنے سے بچا لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جال میں الجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ ساری روایات سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیات کا شان نزول نہ بھی ہوں تو مصداق ضرور ہیں اور ان سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے وحی الہی کے بعض احکام کے بارے میں آزمائش میں ڈالنے کے جس خطرے کی بات سورہ المائدہ میں کی گئی ہے اور جس کے لیے کفار کی سازش اور بھرپور کوشش کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں موجود ہے اس سے مراد اسلامی عقائد و احکام کے بارے میں کفر و اسلام کے درمیان کوئی مشترکہ راستہ نکالنے کی کوشش ہے جس کے لیے مکہ مکرمہ کے قریش اور طائف کے بنو ثقیف نے پوری محنت کی مگر اللہ تعالی نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا اور اسلام کو اصلی حالت میں باقی رکھنے کا وعدہ پورا فرمایا۔

اس پس منظر میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آسمانی تعلیمات، اسلامی عقائد اور منصوص احکام و قوانین کے حوالہ سے ہمیں آج بھی اسی قسم کے چیلنج کا سامنا ہے۔ عالمی سطح پر یہ چیلنج درپیش ہے کہ اسلام کی بات کو صرف مثبت حوالہ سے پیش کیا جائے اور اس کے عنوان سے دوسروں کی نفی نہ کی جائے۔ یعنی جس کو آپ صحیح سمجھتے ہیں اسے صحیح کہیں لیکن جسے غلط اور باطل سمجھتے ہیں اس کے متعلق خاموشی اختیار کریں، جھانسہ یہ ہے کہ پازیٹو بات کریں نیگیٹو بات نہ کریں، چنانچہ اتحاد بین المذاہب کی عالمی مہم کا ٹارگٹ یہی ہے جس کا سب سے بڑا ہدف اسلام اور مسلمان ہیں۔ جبکہ اندرونی ماحول میں ہمیں اس چیلنج کا سامنا ہے کہ نماز وغیرہ فرائض کی پابندی اور اس سلسلہ میں سختی سے گریز کیا جائے اور شراب، زنا اور سود وغیرہ صریح محرمات کے بارے میں لچک پیدا کی جائے۔ میری طالب علمانہ رائے میں قرآن کریم نے اسی قسم کی صورتحال کو "ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ" سے تعبیر کیا

ہے اور اسے وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے لیے خطرہ اور چیلنج قرار دیتے ہوئے اس سے بچ کر رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ بلکہ ایسے معاملات میں لچک پیدا کرنے پر ’’اذا لأذقناک ضعف الحیاۃ وضعف الممات‘‘ کی وعید اور دھمکی بھی ارشاد فرمائی ہے۔

اس لیے قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر بیان کرنے والوں اور قرآن فہمی کے حلقوں کا اہتمام کرنے والوں سے میری اکثر یہ گزارش رہتی ہے کہ لوگوں کو قرآن و سنت کے فہم سے بہرہ ور کرتے ہوئے اس فتنے اور آزمائش کو ہر وقت سامنے رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و اسوہ کی طرف نسل انسانی کی صحیح راہنمائی کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ اپریل ۲۰۱۸ء)

آسمانی تعلیمات کے حوالہ سے درپیش چیلنجز اور اسوۂ نبویؐ

(جامعۃ العلوم الشرعیۃ، ویسٹرج، راولپنڈی - ۷ اپریل ۲۰۱۸ء)

(ختم بخاری شریف کی تقریب سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جامعۃ العلوم الشرعیۃ کے ساتھ میرا بہت پرانا تعلق ہے، اس کے بانی حضرت مولانا حافظ محمد اسحاقؒ میرے دوستوں اور جماعتی ساتھیوں میں سے تھے۔ جبکہ ہمارے گوجرانوالہ کے مخدوم و محترم استاذ الاساتذہ حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ یہاں پڑھاتے رہے ہیں جو جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے پہلے شیخ الحدیث تھے۔ میری ان سے مسلسل نیاز مندی رہی ہے اور زندگی بھر ان کی شفقتوں سے فیض یاب ہوتا رہا ہوں، وہ مولانا حافظ محمد اسحاقؒ کے خسر بزرگوار تھے اور اب حضرت قاضی صاحبؒ کے نواسے اس دینی ادارہ کی خدمت و انتظام میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور اس خاندان کی دینی خدمات میں ترقیات و برکات اور قبولیت و رضا عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

آج جن فضلاء نے دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی ہے اور اپنے استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الرؤف دامت برکاتہم سے بخاری شریف کا آخری سبق پڑھ کر درس

نظامی کا نصاب مکمل کیا ہے انہیں ان کے والدین، اساتذہ اور دیگر تمام متعلقین سمیت مبارک باد دیتا ہوں، اللہ تعالی انہیں اپنے اس علم کی حفاظت کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی مسلسل خدمت کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔ آپ حضرات چونکہ مدارس کے جزیروں سے نکل کر معاشرے کے سمندر میں داخل ہو رہے ہیں اس لیے میں آپ کو انسانوں کے اس وسیع تر سمندر میں جو مسائل، مشکلات اور چیلنجز در پیش ہوں گے ان میں سے ایک دو سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ انہیں سامنے رکھتے ہوئے اپنے طرز عمل اور پروگرام کا تعین کر سکیں۔ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دینی مدارس سے تعلیم حاصل کرنے والے فضلاء کو آج بھی کم و بیش اسی قسم کی صورتحال کا سامنا ہے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حیات مبارکہ میں در پیش تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی دعوت دی، قرآن کریم پیش کیا اور معاشرتی برائیوں سے نجات حاصل کرنے کی بات کی تو مخاطبین و مخالفین کا پہلا رد عمل طنز و تشنیع، تحقیر و استہزاء اور طعن و اعتراض کا تھا کہ یہ جادوگر ہیں، کاہن ہیں، شاعر ہیں اور نعوذ باللہ کذاب ہیں۔ لیکن جب ان تمام تر اعتراضات و طعن و تشنیع سے دعوت دین کا راستہ نہ رکا تو پھر اذیتوں اور تکالیف کا دور شروع ہوا اور جناب رسول اکرمؐ اور ان کے ساتھیوں کو کم و بیش ایک عشرہ تک مسلسل کرب و اذیت اور تشدد و جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں بھی ناکامی ہوئی تو پھر سودے بازی اور بارگیننگ کا حربہ اختیار کیا گیا جس کا تذکرہ قرآن کریم نے ”ودوا لو تدھن فیدھنون“ کے عنوان سے کیا ہے۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کے بڑے بڑے سرداروں نے جناب ابوطالب کی موجودگی میں جناب نبی کریمؐ سے مذاکرات کر کے ”کچھ لو اور کچھ دو“ کی پیش کش کی جس کا فارمولا دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ آنحضرتؐ اللہ تعالی کی جتنی چاہیں تعریف کریں اور صفات بیان کریں مگر ہمارے خداؤں کی نفی نہ کریں اور ان کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔ یعنی مثبت بات کریں لیکن منفی نہ کریں، پازیٹو بات کریں مگر نیگیٹو نہ کریں۔ اور دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہم آپ کے ساتھ اللہ تعالی کی عبادت میں شریک ہونے کے لیے تیار ہیں مگر آپ بھی ہمارے خداؤں کے پاس آیا کریں۔

اس پیشکش اور مصالحتی فارمولے کا جواب اللہ تعالی نے قرآن کریم میں سورۃ الکافرون کی صورت میں دوٹوک انداز میں دلوادیا کہ ایسا ممکن نہیں ہے اور عقیدۂ توحید پر کسی قسم کی مصالحت اور سودے بازی نہیں ہو سکتی۔

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کے معاشرتی احکام کے حوالہ سے بھی متعدّد بار یہ بات کہی گئی کہ ان میں لچک پیدا کی جائے جس کا ذکر قرآن کریم میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے مثلاً سورہ یونس کی آیت ۱۵ میں بتایا گیا ہے کہ جب ان لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو آخرت پر یقین نہ رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور کتاب لے آو یا اس میں ردوبدل کردو۔ اس کا جواب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی آیت میں دلوادیا گیا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے سرے سے قرآن کریم میں اپنی طرف سے ردوبدل کرنے کا کوئی اختیار ہی نہیں ہے اور میں صرف وحی الٰہی کا پابند ہوں۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۷۳، ۷۴ اور ۷۵ میں نبی کریمؐ سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ آپ کو قرآن کریم کے احکام کے بارے میں آزمائش میں ڈالنے کا پورا پروگرام رکھتے تھے اور اگر ہم آپؐ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو یہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتے، اور اگر ان کا پروگرام آپؐ قبول کر لیتے تو یہ آپؐ کو دوست بنا لیتے۔

تفسیر قرطبیؒ، خازن اور روح المعانی میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا ایک ارشاد ان آیات کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیات طائف کے بنو ثقیف کی اس پیش کش کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جن میں انہوں نے جناب رسول اکرمؐ سے کہا تھا کہ اگر وہ ان کی بعض شرائط قبول کر لیں تو وہ سب قبول اسلام کے لیے تیار ہیں۔ یہ شرائط ان آیات کریمہ کے حوالہ سے مختلف تفاسیر میں اور آنحضرتؐ کے ساتھ بنو ثقیف کے وفد کی ملاقات کے تذکرہ میں سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں جن میں یہ باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں:

1. ان کا بت ''لات'' نہیں گرایا جائے گا۔
2. انہیں ایک سال تک اپنے بت خانے کے نذرانے وصول کرنے کا وقت دیا جائے گا۔
3. مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی طرح طائف کو بھی حرم قرار دیا جائے گا۔
4. وہ نماز کی پابندی پر مجبور نہیں کیے جائیں گے۔
5. شراب کا چھوڑنا ان کے لیے مشکل کام ہو گا۔

6. سود کے بغیر دوسری قوموں کے ساتھ ان کا کاروبار ختم ہو جائے گا اس لیے وہ سود کا لین دین ترک نہیں کریں گے۔

7. زنا کا یکلخت ترک کرنا بھی ان کے لیے مشکل ہوگا، وغیر ذلک۔

بعض روایات میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت عملی کے تحت یہ سوچ کر کہ یہ اگر ایک دفعہ اسلام قبول کر لیں تو آہستہ آہستہ ساری پابندیاں قبول کر لیں گے، کچھ نرم جواب دینا چاہا جس پر اللہ تعالی نے سورۃ الاسراء میں "ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیہم شیئا قلیلا" کے ساتھ تنبیہ فرمائی۔ چنانچہ یہ ساری شرائط مسترد کر دی گئیں اور بنو ثقیف اپنی شرائط سے دست بردار ہو کر غیر مشروط طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

میں دینی مدارس کے فضلاء سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہی دو بڑے چیلنج آج کی گلوبل ہیومن سوسائٹی میں آپ کو بھی درپیش ہوں گے۔ عالمی سطح پر یہ کہ دوسرے مذاہب کی نفی نہ کریں اور صرف مثبت بات کرتے ہوئے "اتحاد بین المذاہب" کا ماحول پیدا کریں۔ جبکہ قومی معاشرہ میں یوں کہ دینی فرائض و واجبات کی پابندی کے لیے سختی نہ کریں اور شراب، سود، زنا، جوا، رقص و سرور، بت پرستی اور دیگر محرمات سے اجتناب کے بارے میں لچک پیدا کریں۔ اس لیے اس حوالہ سے قرآن کریم کی دو ٹوک تعلیمات اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اسوہ کو ہمیشہ سامنے رکھیں اور پورے حوصلہ و اعتماد کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیمات کے فروغ اور نفاذ کی محنت کریں۔ اللہ تعالی ہم سب کو صحیح بات سمجھنے اور اس پر عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

شام کی موجودہ صورتحال کا تاریخی پس منظر

(جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام، جہلم - ۲۵ مارچ ۲۰۱۸ء)

۲۵ مارچ اتوار کو جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم کے سالانہ جلسہ کی آخری نشست میں حاضری ہوئی، تحریک خدام اہل سنت پاکستان کے امیر حضرت مولانا قاضی ظہور الحسین اظہر میر مجلس تھے جبکہ جمعیت علمائے برطانیہ کے قائد مولانا قاری تصور الحق مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر جو گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ یہ ہمارے بزرگوں کی جگہ ہے جہاں حاضر ہو کر بہت سی نسبتیں اور یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ یہاں ایک دور میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ، حضرت مولانا حکیم سید علی شاہؒ، حضرت مولانا نذیر اللہ خانؒ اور مولنا قاری خبیب احمد عمرؒ جیسے حضرات کی زیارت و ملاقات ہوتی تھی۔ آج وہ یہاں موجود نہیں ہیں مگر ان کی نسبتیں اور برکات بدستور قائم ہیں۔ اس سال ہمارے ایک اور بزرگ دوست مولانا حکیم مختار احمد الحسینیؒ بھی نظر نہیں آرہے جو چند ماہ قبل انتقال فرما گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں کی مغفرت فرمائیں اور ہمیں ان کی یاد اور مشن کو زندہ رکھنے کی توفیق سے نوازیں۔ ہم دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہونے والے علمائے کرام اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے والے حفاظ اور قراء کی دستار بندی کے لیے جمع ہیں اور ان کی خوشی میں شریک ہیں۔ ہمارے لیے خاندانی طور پر ایک اور خوشی کی بات بھی ہے کہ حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ کے پڑپوتے، میرے مرحوم بہنوئی مولانا قاری خبیب احمد عمر کے پوتے اور عزیز بھانجے قاری محمد ابوبکر صدیق کے فرزند حافظ محمد اسید نے حفظ قرآن کریم مکمل کیا ہے اور آج اس کی بھی دستار بندی ہے، اللہ تعالیٰ ان سب علماء و قراء اور حفاظ کے پڑھنے کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

آج مجھے شام کے حالات پر گفتگو کے لیے کہا گیا ہے جو تفصیلی گفتگو کے متقاضی ہیں اور وقت ناکافی ہے اس لیے مختصراً چند باتیں عرض کر رہا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آج جس خطہ کو شام کہا جا رہا ہے یہ پورا شام نہیں ہے بلکہ اس ملک شام کا صرف ایک حصہ ہے جس کا تذکرہ ماضی کی تاریخ میں ملتا ہے۔ وہ شام اب پانچ مستقل ملکوں میں تقسیم ہو چکا ہے (۱) موجودہ شام (۲) فلسطین (۳) اردن (۴) لبنان اور اسرائیل اسی شام کے خطے ہیں جس کا قرآن و حدیث اور تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق شام کی سرزمین بابرکت اور مقدس مقامات میں سے ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج میں ''الارض التی بارکنا فیہا'' کا جو ذکر ہے وہ اسی شام میں شامل ہے۔ قرآن کریم کی دیگر بہت سی آیات میں بھی اسے ارض مقدسہ اور بابرکت زمین قرار دیا گیا ہے، اسلامی تعلیمات کے مطابق زمین کے محترم اور مقدس مقامات میں حرمین شریفین یعنی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ

کے علاوہ ارض فلسطین بھی ارض مقدسہ ہے جبکہ کوہ طور بھی قرآن کریم نے ''بالواد المقدس طوی'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

تیسری گزارش یہ ہے کہ یہ علاقہ بہت سے مذاہب کی باہمی کشمکش کی جولان گاہ ہے۔ یہودی یہ دعوی رکھتے ہیں کہ یہ ان کا مذہبی مرکز اور قبلہ ہے اور ان کے بقول ''ہیکل سلیمانی'' اسی خطہ میں تھا۔ عیسائیوں کا قبلہ بیت اللحم بھی یہیں ہے جہاں حضرت عیسی علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی اور جس کا تذکرہ قرآن کریم نے ''اذ انتبذت من اہلھا مکانا شرقیا'' کی صورت میں کیا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے لیے یہ قبلۂ اول، مسجد اقصی اور جناب نبی کریمؐ کے سفر معراج کی ایک منزل کے طور پر قابل احترام ہے اور عقیدت و محبت کا مرکز ہے۔ ان تین بڑی قوموں کے علاوہ بابیوں اور بہائیوں کا قبلہ بھی فلسطین میں ''عکہ'' نامی شہر ہے جہاں مرزا بہاء اللہ شیرازی کی قبر ہے اور بتایا جاتا ہے کہ فلسطین کے موجودہ صدر جناب محمود عباس اسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح فلسطین اور خاص طور پر بیت المقدس مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی مستقل کشمکش اور تنازعہ کی جولانگاہ ہے اور اس کے پیچھے دو ہزار سال کی تاریخ کا پس منظر موجود ہے جس میں ان تینوں کے درمیان بڑی بڑی جنگیں اور خوفناک تصادم شامل ہیں۔

چوتھی گزارش ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں بیت المقدس، فلسطین اور شام اسلامی دائرے میں شامل ہوئے اور ہم نے جہاد کے ذریعے عیسائیوں سے یہ علاقے حاصل کیے تھے۔ اس کے بعد کم و بیش تیرہ سو سال تک بیت المقدس کے قبضہ کی جنگ انہی دو قوموں کے درمیان رہی اور صلیبی جنگوں کے کئی دور ہوئے جبکہ یہودیوں کا اس میں براہ راست کوئی کردار نہیں تھا۔ یہودیوں کو جب حضرت عمرؓ نے خیبر سے جلاوطن کیا اس کے بعد بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک یہودیوں اور مسلمانوں کی کوئی باہمی جنگ تاریخ کے صفحات میں مذکور نہیں ہے۔ بلکہ اس دوران یہودیوں اور عیسائیوں کا تصادم چلتا رہا جس میں عیسائی یہودیوں کو قتل کرتے تھے اور جلاوطن کرتے تھے جبکہ مسلمانوں کی اندلس اور ترکی کی حکومتیں یہودیوں کو پناہ دیا کرتی تھیں۔ دوسری طرف مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگوں کا ایک طویل دور ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے موقع پر یہودیوں نے عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانی سے فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت مانگی، انہوں نے انکار کیا تو یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف

عیسائیوں سے صلح کرلی اور برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ان کے ساتھ معاہدہ کر کے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور جنگ عظیم اول کے بعد فلسطین پر قبضہ کر کے برطانیہ نے دنیا بھر کے یہودیوں کو وہاں آکر بسنے کا موقع فراہم کیا اور اسرائیل کی ناجائز ریاست قائم کرائی۔ اس دوران دیگر عرب ممالک کے ساتھ ساتھ شام بھی اس محاذ آرائی کی جولانگاہ تھا جس کا مقصد خلافت عثمانیہ کو ختم کر کے عالم اسلام اور عرب دنیا کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا تھا جس میں انہیں کامیابی ہوئی اور خلافت کا وجود ختم ہوگیا اور صرف شام کا علاقہ پانچ مستقل ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

یہ ایک صدی قبل کی بات ہے لیکن اب امریکہ اور اسرائیل دونوں مل کر اس خطے کو ایک نئی تقسیم سے دوچار کرنا چاہتے ہیں جس کا مقصد خلافت کے دوبارہ قیام کے امکانات کو روکنا ہے۔ سو سال پہلے کی جنگ خلافت کو ختم کرنے کے لیے تھی اور موجودہ جنگ کا اصل ہدف خلافت کی بحالی کو روکنا ہے جس کی ایک جھلک سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے اس اعلان میں دکھائی دیتی ہے کہ ہم دنیا کے کسی خطے میں نہ خلافت قائم ہونے دیں گے اور نہ ہی شریعت نافذ ہونے دیں گے۔

خلافت کا قیام اور شریعت کا نفاذ تو نوشتہ دیوار ہے جو حضرت عیسیٰؑ اور حضرت امام مہدیؒ کے ظہور پر مکمل ہوگی، یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور اسی کو روکنے کے لیے یہ ساری قوتیں زور لگا رہی ہیں۔ لیکن توجہ طلب معاملہ یہ ہے کہ ہمارے بہت سے گروہوں کی جذباتیت اور غلط طریق کار بھی ان کا معاون بنا ہوا ہے اور خلافت و شریعت کے عنوان سے ہونے والا بہت سا کام انہی استعماری قوتوں کی تقویت کا باعث بن گیا ہے۔ اس صورتحال کو سمجھنے اور صحیح راستہ اور طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس کی طرف امت کے سنجیدہ علمائے کرام کو توجہ دینی چاہیے۔

(روزنامہ انصاف، لاہور۔ ۲۸ مارچ ۲۰۱۸ء)

”خبرِ واحد“ اور اس کی حفاظت کا اہتمام

(روزنامہ انصاف، لاہور - ۱۵ فروری ۲۰۱۸ء)

گزشتہ روز ایک نوجوان نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”خبر واحد“ کی حفاظت کا اہتمام کیا تھا؟ میں نے پوچھا کہ بیٹا آپ کی تعلیم کیا ہے؟ بتایا کہ تھرڈ

ایئر کا سٹوڈنٹ ہوں۔ پھر پوچھا کہ دینی تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟ جواب دیا کہ ایک مکتب میں ناظرہ قرآن کریم اور نماز وغیرہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ علم حدیث کی کوئی کتاب اردو میں مطالعہ کی ہے؟ جواب دیا کہ نہیں۔ میں نے سوال کیا کہ بیٹا خبر واحد کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا ہے کہ یہ کیا ہوتی ہے؟ کہنے لگا کہ ٹی وی چینل کے ایک پروگرام میں یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر واحد کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہیں کیا تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ ایک نوجوان نہیں ہے، اس جیسے ہزاروں نوجوانوں نے یہ بات سنی ہوگی اور الجھن کا شکار ہوئے ہوں گے۔ اس بے چارے نے تو سوال کرنے کی ہمت کر لی ہے ورنہ اس قسم کے کئی نوجوان اسی طرح کی الجھنوں کا شکار ہو کر اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں اور بالآخر ایمان ویقین سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ آج کے دور کی مخصوص تکنیک ہے کہ وہ جدید تعلیم یافتہ حضرات جو دین کی بنیادی تعلیمات سے بے خبر ہوتے ہیں بلکہ انہیں ریاستی نظام تعلیم میں پورے اہتمام کے ساتھ قرآن و سنت کے بارے میں بنیادی معلومات تک سے بے خبر رکھا جاتا ہے، ان کے سامنے علمی نوعیت کے سوالات رکھ کر انہیں کنفیوژ کیا جائے اور پھر انہیں آہستہ آہستہ دین و مذہب کے ٹریک سے اتار دیا جائے۔ یہ تکنیک اور طریق واردات آج کے دور کا ایک بڑا فتنہ ہے جو پوری پلاننگ کے ساتھ نئی نسل کو گھیرے میں لے رہا ہے۔ میرے نزدیک ایسے نوجوان قابل رحم ہوتے ہیں اور کوشش کرتا ہوں کہ محبت پیار کے ساتھ ان کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق اصل بات سمجھا دی جائے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ ”خبر واحد“ کیا ہوتی ہے؟ میں نے نوجوان کو بتایا کہ بیٹا خبر واحد کا مطلب یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا عمل روایت کرنے والا صرف ایک ہی صحابی ہو۔ تو کیا ایسی روایت قبول کی جائے گی اور وہ شرعاً حجت ہوگی یا نہیں؟ اس پر علمی اور فنی سطح پر محدثین کرام اور فقہاء عظام نے تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے مختلف مدارج اور شرائط کا ذکر کیا ہے۔ مگر تمہارے لیے اتنی بات سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ اگر آنحضرتؐ کا کوئی حکم، ارشاد یا عمل صرف ایک صحابی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا ہے تو کیا ہمارے لیے اس کو مان لینا ضروری ہے یا کسی ”دانشور“ کی بات سن کر اسے نظر انداز کر دیا جائے گا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا جناب نبی کریمؐ نے ایسی باتوں کی حفاظت کا کوئی اہتمام کیا تھا؟ اس سوال کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ جب آنحضرتؐ نے خود اس کا اہتمام نہیں فرمایا تھا تو پھر ہمیں اس کے تردد میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سوال کے دو پہلو ہیں جنہیں الگ الگ دیکھنا ہوگا:

1. جہاں تک ”حفاظت کے اہتمام“ کا تعلق ہے وہ تو جناب رسول اللہؐ نے قرآن کریم کے بارے میں بھی نہیں کیا تھا۔ آپؐ مسلسل تیئیں سال تک نازل ہونے والے قرآن کریم کی آیات اور سورتیں صحابہ کرامؓ کو سناتے رہے جو ہزاروں لوگوں نے یاد کر لیں، جبکہ رسول اللہؐ نے ان کی ترتیب اور دیگر ضروری امور بھی انہیں سمجھا دیے جس سے سینکڑوں صحابہ کرامؓ قرآن کریم کے حافظ بن گئے۔ مگر قرآن کریم کو کتابی شکل میں جمع کرنے اور تحریری صورت میں محفوظ کرنے کا کام آنحضرتؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے دور میں مکمل کیا گیا۔ اب اگر کوئی صاحب یہ سوال اٹھا دیں کہ کیا نبی کریمؐ نے قرآن کریم کو ایک جگہ جمع کرنے، لکھوانے اور محفوظ کرنے کا اہتمام کیا تھا؟ تو اس کا واقعاتی جواب تو یہی ہوگا کہ جس کو ”جمع و حفاظت کا اہتمام“ کہا جاتا ہے وہ آپؐ کے وصال کے بعد ہوا تھا۔ مگر یہ جواب قرآن کریم کی جمع و حفاظت کے پراسیس سے بے خبر لوگوں کے لیے کس قدر الجھن اور کنفیوژن کا باعث بن سکتا ہے، اس کا اندازہ سوال اٹھانے والے صاحب کو شاید پوری طرح نہیں ہوگا۔

”خبر واحد“ حدیث نبویؐ کی ایک قسم ہے جبکہ احادیث نبویہؐ کی جمع و ترتیب اور حفظ و روایت کا بیشتر کام صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ کے دور میں ہوا تھا جسے امت نے مجموعی طور پر قبول کیا اور محدثین کرام کے اس کام کو ہر دور میں پوری امت کا اعتماد حاصل رہا ہے۔ اس لیے الگ سے یہ سوال اٹھانا کہ کیا نبی اکرمؐ نے خبر واحد کی حفاظت کا اہتمام کیا تھا، حدیث و سنت کی حفاظت و روایت کے مجموعی نظام کے بارے میں بے اعتمادی کی فضا پیدا کرنے کے مترادف ہوگا۔

2. سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا کسی ایک صحابی کی روایت قابل قبول ہے اور شرعاً دلیل بنتی ہے؟

اس پر تفصیل میں جانے کی بجائے بخاری شریف کے ایک مستقل باب کا حوالہ دے دینا کافی ہے جو ''اخبار الآحاد'' کے عنوان سے ہے۔ امام بخاریؒ نے اس میں ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ ایسی احادیث بیان کی ہیں جن سے انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں کسی ایک صحابی کی روایت بھی قبول کی جاتی تھی اور اسے شرعی دلیل سمجھ کر اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ان میں سے دو تین کا تذکرہ کر دیتا ہوں:

- جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا اور بیت المقدس کی بجائے مکہ مکرمہ کی طرف نماز میں رخ کرنے کا حکم صادر ہوا تو ایک مسجد میں لوگ سابقہ حکم کے مطابق بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک شخص نے باہر سے دیکھ کر آواز دی کہ قبلہ کا رخ تبدیل کر دیا گیا ہے اور اب ہمارا قبلہ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ شریف ہے۔ یہ بات سن کر سب نمازیوں نے نماز کے دوران ہی اپنا رخ مکہ مکرمہ کی طرف موڑ دیا اور اس ایک آدمی کی خبر پر یقین کر کے اس کے مطابق عمل کیا۔
- حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے سوتیلے باپ حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کے گھر میں شراب کی محفل میں لوگوں کو شراب پلا رہا تھا کہ باہر کسی اعلان کی آواز سنائی دی۔ مجھے کہا گیا کہ باہر جا کر سنو کہ کیا آواز ہے؟ میں نے واپس آکر بتایا کہ ایک صاحب بتا رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے حرام ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس پر سب لوگوں نے شراب کے پیالے نیچے رکھ دیے اور مجھے ابو طلحہؓ نے کہا کہ یہ ساری شراب باہر گلی میں پھینک دو چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے

کہ شراب کے حرام ہونے کے بارے میں صرف ایک صاحب کی یہ بات کافی سمجھی گئی اور اس کا اعلان شرعی دلیل قرار پایا۔

- جناب نبی اکرمؐ کے سامنے ایک موقع پر دسترخوان پر کھانے کی کچھ اشیاء رکھی گئیں، آپؐ نے ایک چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اندر سے کسی خاتون نے آواز دی کہ یا رسول اللہ! یہ صحرائی جانور گوہ کا گوشت ہے۔ حضورؐ نے یہ سنتے ہی ہاتھ پیچھے کر لیا۔ پوچھا گیا کہ کیا یہ جانور حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ حرام نہیں ہے مگر میں اسے کھانا پسند نہیں کرتا۔ گویا نبی کریمؐ نے ایک عورت کی خبر پر یقین کر کے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایک شخص کی خبر بھی دلیل بن جاتی ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

امام بخاریؒ نے اس قسم کی اور بھی مثالیں دی ہیں اور بتایا ہے کہ بہت سے شرعی معاملات میں ”خبر واحد“ حجت ہے اور اس پر آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کے دور میں عمل ہوتا رہا ہے۔ بلکہ امام بخاریؒ کا اپنا ذوق تو پوری بخاری شریف میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ اعتقادات، فرائض، عبادات، حلال و حرام، معاملات اور معاشرت کے دیگر تمام شعبوں میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ احادیث اور آثار صحابہؓ کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں جن میں سے بیشتر روایات خبر واحد ہی کے درجہ کی ہوتی ہیں۔

سیرۃ النبیؐ اور مزدوروں کے حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱۳ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ ہماری آج کی نشست کا عنوان ہے ”سیرۃ النبیؐ اور مزدوروں کے حقوق“ اس حوالے سے دو تین اصولی باتیں عرض کروں گا۔

1. پہلی بات یہ کہ مزدور کسے کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ ہم آپس میں اشیا اور صلاحیتوں کا تبادلہ کرتے ہیں تو ہمارا نظام چلتا ہے۔ ہر آدمی اپنی ساری ضروریات خود پوری نہیں کر سکتا، کوئی ضرورت کوئی بندہ پوری کرتا ہے، دوسری ضرورت کوئی اور پوری کرتا ہے۔ ایک آدمی کہے کہ میں گھر بھی خود بنا لوں گا،

غلہ بھی خود اگا لوں گا، دروازے بھی خود بنالوں گا، زمین سے پانی بھی خود نکال لوں گا، جانور بھی خود چرالوں گا، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک آدھ کام خود کرے گا اور باقی کاموں میں دوسروں کی خدمت لے گا۔ انسان کی فطرت ہے کہ کسی کام میں، جو یہ جانتا ہے، دوسروں کا تعاون کرے گا اور دوسروں سے اپنے کاموں میں تعاون حاصل کرے گا۔ مثلاً ایک آدمی بکریاں چراتا ہے تو بکریاں چرانے کے کام میں تعاون کرے گا اور باقی کاموں میں تعاون لے گا۔ کسی سے غلہ لے گا، کسی سے کپڑے لے گا وغیرہ۔ تبادلہ اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر ہمارا سارا نظام چلتا ہے۔ اگر سارے لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں کہ ہم اپنا اپنا کام کریں تو کتنے دن تک گزارا کر لیں گے، چوبیس گھنٹے بھی اس کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا کہ ہمارا سارا نظام اس پر ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تبادلے اور تعاون کی دو صورتیں ہیں:

- ایک ہے چیزوں کا تبادلہ، مثلاً دودھ دے دیا، غلہ لے لیا۔ پرانے زمانے میں دکانداری زیادہ تر گندم اور مونجی پر چلتی تھی کہ دکان پر مونجی دے آئے اور دال لے آئے، باجرہ دے آئے اور مولیاں لے آئے، گندم دے آئے اور گڑ لے آئے۔ اب بھی دور دراز دیہات میں یہ چلتا ہے۔ کوئی چیز دے کر دوسری چیز لینے کو تجارت کہتے ہیں، اسی طرح پیسے دے کر چیز لینا بھی تجارت ہے کیونکہ پیسے بھی کسی چیز کے نمائندے ہیں۔
- دوسری صورت یہ کہ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے اور میرے پاس اس کے عوض دینے کے لیے کوئی چیز یا پیسے نہیں ہیں تو میں کوئی خدمت و محنت کروں گا اور اس کے عوض میں وہ چیز لوں گا۔ یہ ہے مزدوری، جیسے گندم کی کٹائی کرتے ہیں اور معاوضہ میں گندم لیتے ہیں۔ اجرت پر کام کرنا مزدوری ہے اور ساری دنیا کا دارومدار اس پر ہے۔

2. دوسری بات یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سارے پیغمبر اپنے اپنے دور میں مزدور رہے ہیں۔ یہ حقیر پیشہ نہیں

ہے، انبیاء کا پیشہ ہے۔ فرمایا، ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں، کوئی پیغمبر ایسا نہیں جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے دس سال حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائیں اور پھر وہاں سے رشتہ بھی مل گیا تھا۔ انہوں نے جو آٹھ یا دس سال خدمت کی اور بکریاں چرائیں، یہ مزدوری تھی۔ اس کا مطلب یہ کہ ہر پیغمبر نے مزدوری کی۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ بکریاں چرانا بہت مشکل کام ہے اور بندوں کو چلانا اس سے بھی مشکل کام ہے۔ بھیڑیں چرانا آسان ہے کہ ایک بھیڑ کو جدھر لے جائیں باقی ساری اس کے پیچھے ہی آئیں گی، جبکہ بکریاں چر رہی ہوں تو ہر بکری علیحدہ رخ پر ہو گی۔ بیس بکریاں سنبھالنا مشکل ہوتا ہے اور سو بھیڑیں سنبھالنا آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو پہلے بکریوں کی ٹریننگ کراتے ہیں تاکہ بندوں کو صحیح سنبھال سکیں کیونکہ بندوں کے مزاج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جب آپؐ نے یہ فرمایا کہ ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا "وانت یارسول اللہ؟" یارسول اللہ! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں میں کئی سال مکہ میں فلاں قبیلے کے بکریاں چند پیسوں کے عوض چراتا رہا ہوں۔ گویا فرمایا یہ کوئی حقارت والا کام نہیں ہے، عزت والا کام ہے۔

حضورؐ نے پیغمبروں کا سردار ہو کر مزدوری کی اور حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ ہو کر مزدوری کرتے رہے ہیں۔ وہ زرہیں بناتے تھے اور زرہوں کی کمائی پر گھر کا خرچہ چلتا تھا، شاہی خزانے سے لینا ان کا حق تھا لیکن وہ اس سے نہیں لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے بطور خاص ان کو ایک ہنر سکھایا تھا "علمنہ صنعۃ لبوس لکم لتحصنکم من باسکم" ہم نے داؤدؑ کو زرہیں بنانا سکھایا تھا۔ زرہیں بنا کر بیچتے تھے اور گھر کا خرچہ چلاتے تھے۔ یعنی بنی اسرائیل کے بڑے خلیفہ حضرت داؤدؑ مزدوری کرتے رہے، جبکہ مسلمانوں کے بڑے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ بنے تو دوسرے دن کپڑوں کی گٹھری سر پر اٹھائی اور بیچنے بازار چل دیے۔ آپؓ پھیری لگایا کرتے تھے، کپڑا بنتے بھی تھے اور بیچتے بھی تھے۔ راستے میں حضرت عمرؓ ملے۔ پوچھا، حضرت! کدھر جا رہے ہیں؟ فرمایا کام پر جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا، آپ کام پر جائیں گے تو پیچھے مقدمے کون سنے گا؟

کسی ملک کا سفیر آجائے تو وہ کس سے ملے گا؟ حضرت ابو بکرؓ نے کہا، اگر میں کام نہ کروں گا تو شام کو بچوں کو کیا کھلاؤں گا؟ حضرت عمرؓ نے کہا، میں اس کا حل نکالتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے بڑے بڑے صحابہؓ کو اکٹھا کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ اگر خلیفۃ المسلمین محنت و مزدوری کا کام کریں گے تو حکومت کے کام کون کرے گا اور اگر آپؓ حکومتی کاموں کے لیے یہاں بیٹھ جاتے ہیں تو وہ شام کو کھانا کہاں سے کھائیں گے؟ اس کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ یہ جب ہمارا کام کریں گے، امت کا کام کریں گے، تو ہم امت کے خزانے بیت المال میں سے انہیں تنخواہ دے دیا کریں گے۔ اس کو ملازمت کہتے ہیں، اس سے حکمران کی تنخواہ طے ہو گئی۔

انبیاء بھی مزدوری کرتے رہے ہیں، خلفاء بھی مزدوری کرتے رہے ہیں اور ہندوستان کے مغل بادشاہوں میں بڑے بادشاہ اورنگزیب گزرے ہیں، پچاس سال انہوں نے حکومت کی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، برما، افغانستان، اور چین کا مغربی حصہ ان کے زیر نگیں تھا اور موبائل فون کے بغیر اس سارے علاقے پر اورنگزیب نے حکومت کی ہے کہ جہاں اطلاع ملے وہاں خود جانا پڑتا تھا۔ اگرچہ شاہی خزانہ تھا، مغلوں کے پاس بہت بڑی دولت تھی، لیکن اورنگزیب خود دو کام کرتے تھے، ایک قرآن پاک لکھتے تھے اور اس کا معاوضہ لیتے تھے۔ میں نے اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کریم کا نسخہ لندن کے میوزیم میں دیکھا ہے، بڑا خوبصورت لکھتے تھے۔ (۲) اور دوسرا کام یہ کرتے کہ ٹوپیاں بناتے تھے اور بیچتے تھے۔ میں نے یہ بتایا کہ مزدوری کوئی حقارت کا کام نہیں ہے، یہ نبیوں، بادشاہوں اور خلفاء کا کام ہے۔

3. تیسری بات یہ کہ مزدور کا حق کیا ہے؟ مزدور کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ طے کیا ہے اس کو بروقت دیا جائے۔ بلاوجہ ٹال مٹول کرنا اس پر ظلم ہے، جبکہ پیسے لے کر کام پورا نہ کرنا یہ اس کی طرف سے ظلم ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے ”اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ“ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو، اس کو پھیرے نہ لگواؤ۔

4. چوتھی بات یہ کہ آپؐ نے ہدایت دی کہ مزدور سے کام لو لیکن اس پر سختی، ظلم اور زیادتی نہ کرو۔ اس زمانے میں مزدور زیادہ تر غلام ہوتے تھے۔ جبکہ مزدور بھی ماتحت سمجھے جاتے ہیں "تحت ایدیکم"۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں، ایک دفعہ میری ایک لونڈی بکریاں چرا رہی تھی کہ کچھ دیر وہ بے پرواہ ہوگئی، اس کی بے پرواہی سے بھیڑیا آیا اور ایک بکری لے گیا۔ میں دیکھ رہا تھا، میں لونڈی کے پاس گیا اور غصے میں اسے زور سے تھپڑ مارا اور کہا بے پرواہ بیٹھی ہوئی ہو، بھیڑیا بکری لے گیا ہے۔ جب زور سے تھپڑ مارا تو پیچھے سے آواز آئی، ابو مسعود! اس کو تھپڑ مارنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم سے طاقتور بھی کوئی ہے جو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ کہنے والے رسول اللہؐ تھے۔ نیچے والے پر ظلم کرتے ہوئے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ میرے اوپر بھی کوئی ہے۔ ذرا غور کریں کہ انہوں نے تھپڑ کس کو مارا تھا؟ نوکرانی کو اور بے قصور بھی نہیں مارا بلکہ غلطی کرنے پر مارا تھا، پھر بھی حضورؐ ناراض ہوئے کہ کیوں مارا ہے۔ حضورؐ نے جب ڈانٹا تو ابو مسعودؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی اس غلطی کے کفارے میں اس لونڈی کو آزاد کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، اگر تم اس کو آزاد نہ کرتے تو "للفحتک النار" آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ اس تھپڑ کا صلہ یہی تھا کہ تم اسے آزاد کر دو۔ ایک تھپڑ جو کہ جرم کرنے پر مارا، اس پر یہ وعید فرمائی، ہمارے ہاں ماتحتوں کے ساتھ نہ معلوم کیا کیا ہوتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ جیسے کپڑے خود پہنتے تھے ویسے ہی نوکروں کو پہناتے تھے۔ ایک دن ایک آدمی نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے کہا آپ نے جو اتنا قیمتی لباس پہنا ہوا ہے ویسا ہی اپنے غلام اور نوکر کو پہنا رکھا ہے، اس کو کوئی ہلکی پھلکی چادر کافی تھی۔ فرمایا، نہیں بھئی! میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ تمہارے ماتحت ہیں "اطعموھم مما تطعمون والبسوھم مما تلبسون" جو خود کھاتے ہو ان کو بھی وہی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو بھی وہی پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام نہ ڈالو، جتنا کر سکتے ہیں ان سے اتنا کام لو، اور اگر زیادہ کام اس کے ذمہ لگا دیا ہے

اور تمہیں اندازہ ہے کہ یہ اکیلے نہیں کر سکے گا تو ’’اعینوھم‘‘ اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔

یہ میں نے چند اصول بتائے ہیں جن کا خلاصہ یہ کہ مزدوری انبیاء کا کام ہے، کوئی حقیر پیشہ نہیں ہے، عزت والا پیشہ ہے۔ مزدور کے ساتھ جو کچھ طے ہو اس کو ٹال مٹول کیے بغیر دیا جائے، ان پر ظلم نہ کیا جائے، ان کو کھانے، پینے، پہننے میں شریک کیا جائے، اور اگر کام ان کی صلاحیت سے زیادہ ہو تو ان کے ساتھ مل کر کام کیا جائے، کام میں ان کی معاونت کی جائے۔

سیرۃ النبیؐ اور دعوتِ اسلام

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱۲ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ سرور کائنات، فخر موجودات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت ملنے پر اللہ تعالی کی طرف سے توحید اور دین کا پیغام پہنچانے کا حکم موصول ہونے کے بعد جب اپنی دعوت اور محنت کا آغاز کیا تو کہاں سے کیا اور کیسے کیا؟ حضورؐ کو حکم ملا ’’فاصدع بما تؤمر‘‘ (سورہ الحجر ۹۴) جو کچھ آپ سے کہا گیا ہے اب اس کا اعلان کیجیے۔ تو آپؐ نے سب سے پہلے صفا پہاڑی سے عمومی دعوت کا آغاز کیا۔ آج تو صفا پہاڑی نہیں رہی بس اس کی علامت باقی ہے، اس زمانے میں پہاڑی ہوتی تھی اور اس دور کا رواج تھا کہ سفید چادر لہرا کر لوگوں کو بلاتے تھے، جو علامت ہوتی تھی کہ کوئی اہم واقعہ پیش آگیا ہے۔ آپؐ نے اس پر چڑھ کر چادر لہرائی تو تھوڑی دیر میں مکہ کے کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ آپؐ نے ان سے سب سے پہلے اپنی ذات کے بارے میں بات کی، اس کے بعد دعوت کا باقاعدہ آغاز اس جملہ سے کیا ’’یا ایھا الناس‘‘۔ یہ نقطۂ آغاز ہے۔ جبکہ سامنے مکی، قریشی اور عرب لوگ تھے، شاید ہی کوئی عجمی ہو، لیکن جناب نبی کریمؐ نے ان حوالوں سے کسی کو خطاب نہیں کیا، بلکہ یوں فرمایا ’’اے نسل انسانی‘‘۔ مطلب یہ کہ میں جو بات کہنے لگا ہوں یہ نہ صرف مکہ والوں کے لیے ہے، نہ صرف قریش والوں کے لیے ہے، اور نہ صرف عرب والوں کے لیے ہے، بلکہ ساری نسل انسانی کے لیے ہے۔

آج دنیا میں گلوبلائزیشن، انٹرنیشنلزم اور عالمیت کی بات ہوتی ہے اور بڑے لوگوں کے دعوے ہیں کہ ہم نے قوموں، ملکوں، نسلوں کے دائرے توڑ دیے، اب ہم ان کے اعتبار

سے نہیں بلکہ انسانیت اور گلوبلائزیشن کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ میں ان سے کہا کرتا ہوں کہ آپ جس گلوبلائزیشن کی بات کرتے ہیں، نسل انسانی میں سب سے پہلے جس شخصیت نے گلوبلائزیشن کی بات کی ہے اس کا نام ”محمد رسول اللہ“ ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ قوموں، ملکوں، زبانوں اور نسلوں سے ماورا پوری نسل انسانی کو جس نے سب سے پہلے خطاب کیا وہ آپؐ کی ذات گرامی ہے۔ آپؐ سے پہلے انبیاءؑ بھی، مصلحین بھی اور بادشاہ بھی قوموں سے ہی مخاطب ہوتے تھے لیکن یاقوم، یابنی اسرائیل اور یاایھا الملاان کا عنوان ہوتا تھا۔ سب سے پہلے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”یاایھا الناس“ سے خطاب کر کے یہ واضح کر دیا کہ میری دعوت نہ صرف مکہ والوں کے لیے ہے، نہ صرف قریش والوں کے لیے ہے، نہ صرف ہاشمیوں کے لیے ہے، اور نہ صرف عرب والوں کے لیے ہے، بلکہ ساری نسل انسانی کے لیے ہے۔

جب ہم اپنے ذہن کو اس بات پر تیار کرلیں کہ ہمارے دین کی دعوت پوری نسل انسانی کے لیے ہے تو پھر مجھے اور آپ کو سوچنا پڑے گا کہ اس وقت حضورؐ نے پوری نسل انسانی کو مخاطب کیا تھا، آج نسل انسانی کہاں کہاں بستی ہے اور اسے ”یا ایھا الناس“ کہہ کر خطاب کرنے والا آج کون ہے؟ ہماری دعوت آج کیا ہے؟ ہم تو اپنی جماعت، قوم، طبقے، مسلک، علاقے اور فرقے سے مخاطب ہیں، ہماری کوشش اپنے مسلک کا دفاع کرنے کی ہوتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنے مذہب سے مخاطب ہوتے ہیں، اہل ایمان سے مخاطب ہوتے ہیں، ہم جتنا بھی دائرہ وسیع کرلیں ہمارا خطاب مسلمانوں سے ہی ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج ”ایھا الناس“ کہنے والا کون ہے؟ یہ بھی کسی نے کہنا ہے یا نہیں؟ یہ کسی کی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ میں خود کو اور آپ کو توجہ دلانے کے لیے بات کر رہا ہوں کہ مسلمان بھائیو! کہنے والے ہم سب ہیں، اپنی قوم، اپنے علاقے، اپنی نسل اور اپنی زبان والوں کو خطاب کر کے بات کرنے والے ہم سب ہیں، لیکن نسل انسانی کو خطاب کرنے والا دنیا میں آج کون ہے؟ ہمیں سب سے پہلے یہ بات ذہنوں میں بٹھانی ہوگی کہ اسلام صرف مسلمانوں کا نہیں، پوری نسل انسانی کا ہے۔ قرآن کریم پر صرف ہمارا حق نہیں بلکہ یہ ”ھدی للناس“ ہے، اس کی دعوت پوری نسل انسانی کے لیے ہے، سب کا اس پر حق ہے۔

جناب نبی کریمؐ نے جب ”ایھا الناس“ سے خطاب کیا تو آپ کے اردگرد مکہ اور طائف والے یعنی قریش اور بنو ثقیف دو ہی طبقے تھے، تیسرے طبقہ یہود سے تیرہ سال بعد مدینہ

میں واسطہ پیش آیا۔ ان دو ہی قبیلوں کا اعتراض تھا کہ ”وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم“ (سورہ الزخرف ۳۱) آپ کہتے ہیں مجھے نبوت ملی ہے، اللہ نے اگر نبوت دینی تھی تو ان دونوں بستیوں مکہ اور طائف کے کسی بڑے سردار کو کیوں نہیں دی، آپ کو ہی کیوں دی ہے؟ یہ قرآن کریم آپ پر ہی اترنا تھا؟ بہرحال تیرہ سالہ مکی دور میں ان ہی دو طبقوں سے واسطہ رہا۔

رسول اللہؐ کی اس تیرہ سالہ دعوت کے مراحل کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضورؐ کی دعوت کا سب سے پہلا ذریعہ قرآن کریم تھا۔ چونکہ مخاطبین عرب تھے، عربی زبان جانتے تھے تو قرآن بھی عربی زبان میں اترا جو آپؐ کی دعوت کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ آپؐ منڈیوں اور تجارتی میلوں میں جاکر، خوشی غمی کے مواقع پر جاکر قرآن سناتے۔ قرآن کریم جو اللہ کا کلام ہے وہ جب حضورؐ سنائیں تو اثر کیوں نہ کرے؟ اس کے اثرات کو روکنا کیونکر ممکن ہو سکتا تھا۔ حضورؐ لوگوں کو قرآن کریم سناتے، اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کرتے اور اسلام کی دعوت دیتے۔ اس دعوت کے ردعمل میں آپ کے چچاؤں میں سے کوئی آپؐ کے پیچھے چل پڑتا۔ جب حضورؐ دعوت دیتے، اول تو یہ دعوت لوگوں کے لیے اجنبی ہوتی کیونکہ وہ صدیوں سے کفر و بت پرستی میں رہ رہے تھے، حضرت اسماعیلؑ کے بعد سے ان میں کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ان میں سے کوئی چچا لوگوں کو کہتا یہ میرا بھتیجا ہے اس کو جن چمٹ گیا ہے ”وقالوا مجنون وازدجر“ (سورہ القمر ۹) یہ مجنون ہو گیا ہے، اس کا دماغ کام نہیں کر رہا (نعوذ باللہ)، اس کی باتوں پر نہ جانا، یہ ساحر و کاہن اور شاعر ہے، اس کو پتہ نہیں کس کی بددعا لگ گئی ہے، لہٰذا اس کی بات سنجیدگی سے نہ سنیں۔

لیکن جب اس مرحلے میں کفار کو کامیابی نہ ہوئی اور حضورؐ کی دعوت قرآن کریم کے ذریعے پھیلتی رہی تو دوسرے مرحلے میں انہوں نے دعوت کو روکنے کے لیے قرآن کی محفلوں میں شور مچانے کی روش اختیار کی، کیونکہ جب کوئی حضورؐ کی زبان سے قرآن سنے گا تو متاثر ہوگا۔ اس لیے ان کا یہ ایجنڈا تھا کہ کوئی قرآن سنے ہی نہیں۔ ”وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ“ اس قرآن کو نہ سنو بلکہ جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہو وہاں شور مچاؤ تاکہ دوسرے بھی قرآن نہ سن سکیں ”لعلکم تغلبون“ (سورہ فصلت ۲۶) تاکہ تم ان کی بات روکنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ یہ پروپیگنڈا یہاں تک ہوا کہ لوگ کانوں میں انگلیاں دے کر

مکہ مکرمہ آتے تھے کہ کہیں محمدؐ کی آواز اچانک کانوں میں نہ پڑ جائے اور انہیں کامیابی نہ ہو جائے۔ اس مرحلہ میں بھی کفار کو کامیابی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد یہ مرحلہ آیا "ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ" (سورہ لقمان ٦) کہ کچھ لوگوں نے مثلاً نضر بن حارث وغیرہ نے مقابلے میں "لھو الحدیث" گانے بجانے، ناچ گانے اور قصے کہانیوں کی مجلسیں سجانا شروع کر دیں، جس کو میں یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی دعوت کو روکنے کے لیے اور اس کے اثرات کم کرنے کے لیے انہوں نے مکہ میں "کیبل" بچھا دیا تاکہ حضورؐ کی طرف کوئی نہ جائے، سارے اسی مصروفیت میں لگے رہیں۔

جب اس مرحلہ میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو سودے بازی پر آ گئے، جب دیکھا کہ ہم روکنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تو مصالحت کا راستہ اختیار کیا۔ اسی مرحلے کے بارے میں قرآن کریم میں ہے "ودوا لو تدھن فیدھنون" (سورہ القلم ٩) جناب ابو طالب کے پاس حضور اکرمؐ سے صلح کرنے کے لیے ستر سرداروں کا وفد آیا کہ جناب آپ ہماری ان سے صلح کرا دیں۔ ان کی پیشکش یہ تھی کہ ٹھیک ہے وہ بھی حرم پاک میں عبادت کریں، ہم بھی کرتے ہیں۔ ہم ان کو نہیں روکتے، وہ ہمیں نہ روکیں۔ حرم مکہ میں آپؐ عبادت کریں ہم بھی ان کے ساتھ مل کر کر لیا کریں گے اور کبھی آپ ہمارے پاس آ جایا کریں، مل جل کر گزارہ کرتے ہیں۔ آپؐ جو چاہیں کریں ہم ان کو نہیں روکتے لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ آپؐ ہمارے خداؤں کی نفی نہ کریں۔ توحید کی بات ضرور کریں لیکن ہمارے بتوں کی نفی نہ کریں یعنی آج کی اصطلاح میں "پازیٹو بات کریں، نیگیٹو نہ کریں"۔

آج بھی بین الاقوامی مکالموں میں یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ مسلمان پازیٹو بات کریں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، جب نیگیٹو بات کرتے ہیں تو ہمیں اشکال ہوتا ہے۔ مسلمان یہ کہیں کہ اسلام بہت اچھا مذہب ہے ہمیں کوئی اشکال نہیں، لیکن یہ نہ کہیں کہ عیسائیت صحیح مذہب نہیں ہے، اس سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ مسلمان اسلام کی دعوت دیں لیکن یہودیت، ہندومت اور دیگر مذاہب کی نفی نہ کریں۔ ایک دفعہ مذاکرے میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ مولانا! کیا اس میں کچھ لچک ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا ہم کیا لچک کریں گے ہمارے کلمہ کا پہلا لفظ ہی نیگیٹو ہے یعنی "لا الہ"۔ پازیٹو کا ذکر تو بعد میں آتا ہے یعنی "الا اللہ" ہمارا سبق شروع ہی لاء نفی جنس سے ہوتا ہے جو ہر چیز کی نفی کر دیتا ہے، ہم کیسے لچک کر سکتے ہیں؟

سیرت و حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں آپ کو ملے گا کہ مشرکین مکہ کا یہی مطالبہ تھا کہ آپ اللہ کی بات کریں اور اس کی عبادت کریں لیکن ہمارے بتوں کی نفی نہ کریں۔ یعنی ''لاالہ'' کی بات نہ کریں ''الا اللہ'' کی بات کرتے رہیں۔ حضورؐ نے بلکہ قرآن مجید نے یہ پیشکش مسترد کر دی اور اسی کے جواب میں سورۃ الکافرون نازل ہوئی جس میں فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا، بارگیننگ نہیں چلے گی، تم نہیں مانتے تو نہ مانو۔

قرآن کریم نے ایک اور بھی دلچسپ بات ذکر کی ہے، جب آپؐ لوگوں کو قرآن کریم سناتے تو ایک موقع پر کفار نے یہ پیشکش کی کہ ٹھیک ہے ہم قرآن کو مانتے ہیں لیکن آپ یہ کریں کہ قرآن میں کچھ ترمیم اور ردوبدل کر دیں۔ قرآن مجید میں ہے ''واذا تتلی علیھم آیاتنا بینات قال الذین لا یرجون لقآءنا ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ'' جب ان کو قرآن سنایا جاتا ہے تو جن کا آخرت پر یقین نہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو پورا قرآن بدل دیں ''ائت بقرآن غیر ھذا'' اس کی جگہ کوئی اور قرآن لائیں کہ اس قرآن کے احکام بڑے سخت ہیں، اس لیے یہ قابل قبول نہیں، ورنہ کچھ ترامیم تو ضرور کریں ''او بدلہ''۔ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ یہ مسئلہ قیامت تک چلنا ہے، اس لیے اس کا جواب بھی حضورؐ کی زبانی قرآن کریم میں دلوا دیا۔ ہمیں زحمت نہیں دی کہ ہم سوچیں کیا جواب دینا ہے۔ جواب یہ دیا ''قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقآء نفسی'' آپ کہہ دیجیے کہ مجھے سرے سے اس میں ردوبدل کا کوئی اختیار ہی نہیں، اللہ چاہے تو بدل دے کہ وحی جاری تھی، مگر میں اس میں ایک حرف کا ردوبدل بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا اتنا جواب ہی کافی تھا لیکن اس جواب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تاکید کے لیے اگلا جملہ بھی ساتھ کہلوا دیا ''ان اتبع الا ما یوحی الی'' اس میں حصر ہے کہ میں تو صرف اور صرف وحی کا پابند ہوں، اور اس کے بعد ایک جملہ اور بڑھا دیا ''انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم'' (سورہ یونس ۱۵) کہ مجھے ڈر لگتا ہے اگر خدانخواستہ مجھ سے یہ کام ہو گیا تو قیامت کے دن کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا؟

یہ ترمیم اور ردوبدل کا مطالبہ آج بھی چلتا رہتا ہے۔ بعض دانشور حضرات کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے، کچھ عرصہ پہلے ایک گفتگو میں ایک صاحب فرمانے لگے کہ مولوی صاحب! کچھ تو کرنا ہی پڑے گا، عالمی برادری کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کے لیے کوئی بات تو ماننا ہی پڑے گی، اس کے بغیر تو ہم عالمی برادری کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتے۔ جب انہوں نے بات مکمل کر لی تو میں نے کہا جناب! ٹھیک ہے پہلے ہم ایجنڈا بنا لیتے ہیں کہ آج کی دنیا

کے مطالبات پورے کرنے کے لیے ہمیں کہاں کہاں اور کیا کیا ترامیم کرنی ہیں؟ اس کی تیاری میں آپ کے ساتھ شریک ہوں گا بلکہ آپ سے اچھا مسودہ بنالوں گا کہ کہاں کہاں ترمیم کرنی پڑے گی۔ مثلاً مغرب کا مطالبہ ہے عورت کو طلاق کا برابر کا حق دو اور مرد و عورت میں کوئی فرق نہ کرو۔ اب عورت کو طلاق کا حق دینے کے لیے ترمیم کہاں کرنا ہو گی؟ ہدایہ کی عبارت میں؟ کسی امام کے قول میں؟ نہیں! بلکہ نعوذ باللہ یہ ترمیم قرآن کریم میں کرنا ہوگی۔ اس لیے ترمیم کہاں کہاں ہونی چاہیے، پہلے اس کی فہرست بناتے ہیں، لیکن ترمیم کرنی کس نے ہے؟ ہم کس کو درخواست دیں گے کہ جناب ترمیم کردیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو درخواست دینی ہے، پاکستان کی قومی اسمبلی کو دینی ہے، یا کسی جرگے کو دینی ہے؟ درخواست دینی کہاں ہے؟ ردوبدل کی اتھارٹی تم بتادو فہرست میں بنادیتا ہوں۔

بہرحال حضورؐ کی دعوت میں اس فرمائش کا مرحلہ بھی آیا کہ قرآن میں ترمیم کریں۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا یہ میرے اختیار میں ہی نہیں ہے، میں یہ کر ہی نہیں سکتا، اگر کروں گا تو مجھے ”عذاب یوم عظیم“ کا خطرہ ہے۔ جبکہ اگلی آیت میں فرمایا ”قل لو شاء اللہ ماتلوتہ علیکم ولا ادراکم بہ“ (سورہ یونس ۱۶) فرمادیں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو میں تمہیں پڑھ کر نہ سناؤں، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ پڑھ کر اس میں کوئی ترمیم کردوں۔

میں تیرہ سالہ مکی دور میں دعوت کے مراحل کا خاکہ آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد وہ آخری مرحلہ آیا جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے، جب آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ پر مظالم کی انتہا ہوگئی اور تین سال شعب ابی طالب میں محصور رہنا پڑا، حضورؐ نے طائف کا سفر بھی اس غرض سے کیا کہ یہاں کا ماحول سازگار نہیں ہے، شاید طائف والے بات مان لیں لیکن وہاں سے لہولہان واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد یہ مرحلہ آیا ”واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک اویقتلوک اویخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ“ (سورہ الانفال ۳۰)۔

آزمائش کے ان مراحل کے بعد اللہ تعالیٰ نے جب دعوت کا راستہ کھولا تو کیسے کھولا؟ انصار مدینہ کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج، ان کی آپس میں ایک صدی تک لڑائی جاری رہی جس میں سینکڑوں لوگ قتل ہوئے۔ لڑائی سے تنگ آکر چند بوڑھے مل بیٹھے اور کہا کوئی صورت نکالو، کب تک ایک دوسرے کو مارتے مرتے رہو گے؟ لوگوں نے کہا ہم ایک دوسرے پر توجمع نہیں ہوسکتے، قاتل و مقتول ایک دوسرے پر کیسے اکٹھے ہوسکتے ہیں؟ باہر کا کوئی آدمی مل جائے جو ہماری صلح کرادے۔ ان کے نمائندے حج کے موسم میں مکہ آئے

اور دیکھ رہے ہیں تھے ہمیں ہمارے کام کا کوئی آدمی مل جائے اور ہم اس سے درخواست کریں کہ ہمارے پاس آؤ اور ہماری صلح کرادو۔ ادھر جناب نبی کریمؐ کفار کے مظالم سے تنگ آکر حاجیوں کے خیموں میں چکر لگا رہے تھے، دعوت دے رہے تھے اور تلاش کر رہے تھے کہ مجھے کہیں ٹھکانہ مل سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے منیٰ میں دونوں کا اکٹھ فرما دیا۔ جہاں بیعت عقبہ اولیٰ ہوئی، بارہ آدمیوں نے بیعت کی، اگلے سال بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی جس میں ستر آدمیوں نے بیعت کی۔ آپس میں خفیہ مذاکرات ہوئے، مدینہ والوں نے عرض کیا کہ حضور! آپ ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ حضورؐ نے فرمایا، میں بھی جگہ کی تلاش میں ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو گا تو آجاؤں گا۔ حضرت عائشہؓ اس واقعہ کو تفصیل سے بیان فرماتی ہیں۔

لطف کی بات یہ کہ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، آپؐ کے ساتھ تھے۔ جب اوس و خزرج کے نمائندوں نے حضورؐ کو یثرب آنے کی دعوت دی اور کہا کہ ہم آپ کی حفاظت کریں گے، آپ کو ٹھکانہ مل جائے گا اور ہمیں رہنما مل جائے گا، دونوں کا کام چل جائے گا، تو حضرت عباسؓ کھڑے ہوئے اور کہا بات سنو! یہ ہمارا بھتیجا ہے اور ہم بنو ہاشم اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اگر تم میرے بھتیجے کو لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ لیکن یاد رکھو میرے بھتیجے کو ساتھ لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں پوری عرب دنیا سے لڑائی مول لینا ہوگی۔ اگر پورے عرب سے لڑائی مول لینے کا حوصلہ ہے تو آپؐ کو ساتھ لے جاؤ، ورنہ رہنے دو ہم ان کی حفاظت کر لیں گے۔ اس پر ان میں سے کچھ حضرات کھڑے ہوئے اور کہا ہم اپنی جانوں پر کھیل کر حضورؐ کی حفاظت کریں گے۔ بہر حال یہ معاہدہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دعوت کا نیا میدان دے دیا یعنی مدینہ منورہ۔ لیکن وہاں جانے کے بعد بھی چھ سال لڑائیوں میں گزرے، قریش نے چھ سال تک پیچھا نہیں چھوڑا۔ بدر، احد، خندق، حدیبیہ کے مراحل پیش آئے، اور حدیبیہ تک لڑائیاں چلتی رہیں۔ حدیبیہ کی صلح کے بعد دعوت کا میدان کھلا، اگرچہ حدیبیہ میں معاہدہ بظاہر کمزور شرطوں پر ہوا تھا، بہت سے مسلمانوں کو وہ شرائط ہضم نہیں ہو رہی تھیں مگر صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ کو موقع ملا اور آپؐ نے "یا ایھا الناس" کے دائرے میں دعوت شروع کی۔ اس سے پہلے تو مکہ والوں سے ہی الجھاؤ رہا۔ پھر آپؐ نے رومیوں، ایرانیوں، مصریوں، حبشیوں

وغیرہ کو دعوت دی اور یہ دائرہ ایسا پھیلا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعوت دنیا کی دو بڑی طاقتوں تک اور ان کے زیر اثر علاقوں تک پہنچا دی۔ ان میں سے ایک مرحلے کا ذکر کرتا ہوں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ دین کی دعوت، دین کا پیغام، اللہ تعالیٰ کی توحید، قرآن کریم کا تعارف اور جناب نبی کریمؐ کی دعوت پوری نسل انسانی کا حق ہے، اس لیے جناب نبی کریمؐ کو جب کھلا ماحول ملا اور حالات سازگار ہوئے تو آپؐ نے دنیا بھر کو دعوت دی اور دعوت کا میدان ایسا وسیع ہوا کہ روم میں ابو سفیانؓ کی زبانی اسلام کی دعوت پہنچی جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بخاری شریف میں یہ تفصیلی روایت موجود ہے، اس کا کچھ حصہ عرض کرتا ہوں۔

صلح حدیبیہ کے بعد جناب نبی کریمؐ نے مختلف بادشاہوں کے نام اسلام کی دعوت بھیجی۔ روم اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی، روم کے بادشاہ ہرقل قیصر روم کو بھی دعوت بھیجی۔ ہرقل اس وقت شام میں آیا ہوا تھا جو روم کا صوبہ تھا۔ ہرقل بیت المقدس میں موجود تھا جہاں اسے اسلام کی دعوت کا خط موصول ہوا۔ بڑے لوگوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ تحقیق کرتے ہیں کہ دعوت دینے والا کون ہے، اس کا تعارف پہلے حاصل کرتے ہیں، پھر اس کی دعوت کو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جب حضورؐ کی طرف سے اس کو اسلام کی دعوت ملی تو اس نے کہا ان صاحب (حضورؐ) کے علاقے سے اگر کچھ لوگ آئے ہوئے ہوں تو مجھ سے ملاؤ تاکہ میں ان کے بارے میں تحقیق کروں کہ وہ کون ہیں اور ان کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ حضرت ابو سفیانؓ، جو بعد میں اسلام لائے، اس وقت حضورؐ کے حریف تھے اور عرب دنیا میں حضورؐ کے سب سے بڑے مدمقابل آپ ہی تھے۔ خندق کی لڑائی میں حضورؐ کے خلاف متحدہ محاذ کی قیادت ابو سفیانؓ نے کی تھی۔ ابو سفیانؓ شام میں موجود تھے، آپؓ حضورؐ کے چچا بھی لگتے تھے اور خسر بزرگوار بھی تھے۔ ابو سفیانؓ خود یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہرقل کے کارندے ہمارے پاس آئے اور پوچھا آپ مکہ سے آئے ہیں؟ ہم نے بتایا، ہاں۔ انہوں نے کہا بادشاہ سلامت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابو سفیانؓ کہتے ہیں ہم ہرقل کے دربار میں گئے، ہرقل اور اس کی پارلیمنٹ بیٹھی ہوئی تھی، ہم پیش ہوئے۔ ہرقل نے ہم سے آپؐ کا مکمل تعارف حاصل کیا کہ یہ مدعی نبوت کون ہیں؟ ان کا نسب کیسا ہے؟ ان کا کردار کیسا ہے؟ بہت سے سوالات کیے، میں جواب دیتا رہا۔

سارا تعارف کر کے، تسلی کر کے آخر میں ہرقل نے ایک سوال کیا۔ ذرا منظر دیکھیے کہ اللہ تعالی نے آپؐ کی دعوت کے اسباب کیسے پیدا کیے کہ عالمی سطح پر دنیا کا سب سے بڑا حریف ہرقل سوال کر رہا ہے اور جزیرۃ العرب کے دائرے میں حضورؐ کا سب سے بڑا حریف جواب دے رہا ہے اور حضورؐ کا تعارف کرا رہا ہے۔ جب ہرقل نے سوال کیا "ماذا یامرکم؟" وہ تمہیں کیا کہتا ہے؟ اس کی دعوت کیا ہے؟ دنیا کے سب سے بڑے حکمران کے سامنے اس کے دربار میں حضورؐ کا جزیرۃ العرب کا سب سے بڑا حریف کھڑے ہو کر حضورؐ کی دعوت پہنچاتا ہے اور جواب دیتا ہے "یامرنا ان نعبد اللہ وحدہ ونترک ما کان یعبد اباءنا ویامرنا بالصلوۃ والصدق والصلۃ والعفاف" اس کی دعوت یہ ہے کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں، اللہ کے سوا جن کی پوجا ہمارے آباء واجداد کرتے آرہے ہیں سب کو چھوڑ دیں۔ ذرا دیکھیں توحید کہ دعوت کس کے سامنے کون بیان کر رہا ہے۔ پھر کہا کہ وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ نماز پڑھا کرو، سچ بولا کرو، اللہ کے رستے میں خرچ کیا کرو اور پاکدامن رہو۔ یہ اس کی بنیادی دعوت ہے۔

میں صرف اس نکتے پر توجہ دلا رہا ہوں کہ دین کی دعوت ہماری محتاج نہیں، اللہ جس کے ذریعے چاہے دعوت پہنچا دے۔ یہاں دیکھیں کہ کافر کو کافر دعوت پہنچا رہا ہے اور دعوت بھی بغیر کسی گڑبڑ کے صحیح پہنچا رہا ہے۔ ابوسفیانؓ واقعہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہرقل نے مجھے میرے ساتھیوں سے آگے بٹھا لیا تھا اور میرے ساتھیوں کو میرے پیچھے بٹھا دیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا میں اس سے سوال کروں گا اگر یہ جواب میں گڑبڑ کرے تو مجھے اشارہ کر دینا۔ ابوسفیانؓ کہتے ہیں خدا کی قسم! اس اشارے کے ڈر سے میں ہر بات کا جواب سچ سچ بتاتا رہا، ورنہ بخدا میں کیا کیا جھوٹ بولتا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میں قوم کا سردار ہوں اگر جھوٹ بولا تو میرا سارا بھرم تباہ ہو جائے گا۔ اس طرح اللہ تعالی نے پہلے ہی بندوبست کروا لیا کہ حضورؐ کے دعوت پہنچے تو صحیح شکل میں پہنچے۔ پھر جناب نبی کریمؐ کی یہ دعوت دنیا کے کونے کونے میں پھیلی۔

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ دعوت کا نقطۂ آغاز ہی نسل انسانی ہے۔ ہم سبھی اپنے آپ کو اس دعوت کا وارث سمجھتے ہیں، اور نہ سمجھیں تب بھی ہم ہی اس دعوت کے وارث ہیں کیونکہ یہ امت کے ذمے ہے۔ اس وقت نسل انسانی میں سات ارب سے زیادہ انسان ہیں، ان سات ارب انسانوں تک "یا ایھا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا" کی صدا لگانا کس کی ذمہ

داری ہے ؟ ہم تو ابھی اپنے بھائیوں کو، جو ڈیڑھ پونے دو ارب ہیں، ان کو بھی کلمہ پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو رہے کہ ان کا کلمہ صحیح کرالیں، نماز صحیح کرالیں، ان کو قرآن پڑھالیں تاکہ ہم دوسروں کو کہنے کے قابل ہو جائیں۔ لیکن یہ عبوری مرحلہ ہے، اصل ذمہ داری ہماری یہ ہے کہ ’’یاایھا الناس‘‘ سے خطاب کریں اور یہ ہماری ہی ذمہ داری ہے، ہم نے ہی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ احساس ہمارے دلوں میں پیدا کرے کہ ہم امت کی اجتماعی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور دعوت کے اس عمل میں جہاں جتنا حصہ ہم ڈال سکتے ہوں، ڈالیں۔ کم ازکم یہ تو ہو کہ کچھ نہ کچھ کرنے والوں میں ہی ہمارا نام آجائے، میں اسے اضعف الایمان سمجھتا ہوں۔ کرنا تو بہت کچھ چاہیے لیکن خدا کرے کچھ نہ کچھ کرنے والوں میں ہی ہمارا شمار ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ دعوت و تبلیغ کے عمل کو مزید ترقیات اور وسعتوں سے مالامال فرمائیں۔ دعوت کا یہ عمل اصلاح کا عمل ہے، امت کو دین پر واپس لانے کا عمل ہے، نماز، روزہ، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کی طرف واپس آنے کا عمل ہے اور وہ اسلامی ماحول پیدا کرنے کا عمل ہے جو دنیا میں دین کی دعوت کی بنیاد بن سکے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

سیرۃ النبیؐ اور مہمانوں کے حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱۱ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ ابھی ایک عزیز نظم پڑھ رہا تھا ’’کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر، کیا چیز ہے دنیا بھول گیا‘‘۔ یہ امر واقعہ ہے کہ وہاں سب کچھ بھول جاتا ہے، ویسے یہ فضیلت بیان کی جاتی ہے کہ کعبے پر جب پہلی نظر پڑے اس وقت جو دعا کی جائے قبول ہوتی ہے، لیکن واقفین حال کہتے ہیں کہ اگر اس وقت ہوش و حواس قائم رہیں تب، ورنہ عام طور پر یاد نہیں رہتا۔ میں اس پر اپنا ذاتی واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۴ء میں عمرہ کے لیے گیا تو حضرت والد گرامی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں عمرہ کے لیے جا رہا ہوں، دعا فرمادیں۔ انہوں نے دعا فرمائی اور دعا کرتے ہوئے مجھے نصیحت کی کہ طواف کرتے ہوئے پہلے تین چکروں میں رمل کرنا ہوتا ہے، تو رمل بھول جائے گا۔ میں نے کہا انشاء اللہ نہیں بھولوں گا۔ فرمایا، تو بھول جائے گا، وہاں

کوئی نہیں ہوش رہتا۔ میں نے کہا انشاء اللہ نہیں بھولتا۔ فرمایا، بھول جاؤ گے۔ اس پر حضرت ملاعلی قاریؒ کا واقعہ سنایا کہ مناسک حج پر احناف میں سب سے مفصل کتاب ملاعلی قاریؒ کی ہے۔ فرمایا ملاعلی قاریؒ نے مناسک الحج لکھی، لوگوں میں عام ہوئی، پھر کسی موقع پر خود حج کے لیے گئے۔ طواف کر رہے تھے کہ کوئی آدمی قریب آیا اور پوچھنے لگا آپ مولوی لگتے ہیں کیا آپ نے ملاعلی قاریؒ کی کتاب نہیں پڑھی؟ فرمایا اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟ اس نے کہا اس میں لکھا ہوا ہے کہ طواف میں تین چکروں میں رمل کرنا، ہے آپ رمل تو نہیں کر رہے۔ یہ ملاعلی قاریؒ خود تھے جنہوں نے لکھا تھا۔ اسی طرح والد صاحب کے سامنے تو میں نے کہہ دیا کہ انشاء اللہ نہیں بھولوں گا، لیکن والد صاحب کی بات مجھے چوتھے چکر میں یاد آئی کہ میں نے تو رمل بھی کرنا تھا، کیونکہ تینوں چکر میں نے رمل کے بغیر کر لیے تھے۔

آج کا ہمارا موضوع ہے کہ مہمان نوازی کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہدایات فرمائی ہیں اور حضورؐ کی سنت مبارکہ کیا تھی؟ آپؐ کا نبوت کے بعد جو پہلا تعارف ہے وہ مہمان نوازی کے حوالے سے ہے۔ جناب نبی اکرمؐ پر جب غار حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ نے یہ واقعہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ذکر کیا اور فرمایا ’’خشیت علی نفسی‘‘ مجھے اپنے بارے میں ڈر لگنے لگا ہے۔ آپؐ کو تشویش تھی، حضورؐ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کو تسلی دی کہ ’’لن یخزیک اللہ ابدا‘‘ اللہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اور پھر انہوں نے آپؐ کی کچھ صفات بیان کیں کہ ان صفات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کو پریشان نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کو پریشان نہیں کیا کرتا۔ ان صفات میں یہ فرمایا ’’تصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق‘‘ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی سماجی خدمات کا ذکر کیا کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، مصیبت زدہ لوگوں کے کام آتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں، مہمانوں کی مہمانی کرتے ہیں۔

’’الضیف‘‘ اس زمانے میں دو قسم کے لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ ایک وہ جو کہیں سے ملنے کے لیے آئیں اور دوسرے بے ٹھکانہ مسافر پر بھی الضیف کا لفظ بولا جاتا تھا۔ پہلے زمانے میں ہوتا تھا کہ مسجد میں مسافر آجاتے اور کہتے میں مسافر ہوں تو لوگ ان کی مہمانی کر دیا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک کہ مہمان ساتھ نہ ہوتا۔ اگر کوئی مہمان نہ آتا تو باہر گلی سے کسی مسافر کو گھر

لے آتے کہ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ حالانکہ حضرت علیؓ امیر آدمی نہیں تھے، تنگ دستی کے ساتھ گزارا کیا کرتے تھے۔ مہمان کی خدمت و اکرام کے متعلق آنحضرتؐ نے یوں بیان فرمایا ''من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ'' جس کا اللہ اور آخرت پر ایمان ہے اسے چاہیے کہ وہ مہمان کا اکرام کرے۔

مہمان کا اکرام کیا ہے؟ مہمان کے اکرام میں آنحضرتؐ نے مختلف احادیث میں چار درجے بیان فرمائے ہیں۔ پہلی بات فرمائی، ابوداؤد شریف کی روایت ہے ''لیلۃ الضیف حق واجب علی کل مسلم'' مہمان کی پہلی رات ہر مسلمان پر حق اور واجب ہے۔ کھانے کا ذکر نہیں فرمایا، رات کا ذکر فرمایا، اس سے مراد یہ ہے کہ مہمان کے رہنے، آرام اور کھانے کا انتظام کرنا۔ اس سے اگلا درجہ آپؐ نے فرمایا ''جائزۃ الضیف یوم ولیلۃ'' مہمان کا اکرام یعنی اس کے لیے خصوصی طور پر کچھ پکانا، اہتمام کرنا ایک دن اور ایک رات ہے۔ مہمان کا اکرام یہ ہے کہ عام معمول سے ہٹ کر اسے کوئی چیز تیار کی جائے، اس کے لیے منگوائی جائے۔ اور تین دن مہمانی مہمان کا حق ہے، ایک دن خصوصی اور باقی دو دن عمومی جو گھر میں پکا ہو۔ اور چوتھے دن جو اس پر خرچ ہو وہ صدقہ ہے۔ اس سے آپؐ نے مہمان کو بھی اشارہ کیا کہ تمہارا بھی زیادہ دن رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ کہیں جاتے، نافعؒ یا سالمؒ ساتھ ہوتے تھے کہ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ نافع شاگرد اور سالم بیٹے تھے، چوتھے دن ان سے کہتے بیٹا! اب ہم اپنا خرچہ خود کریں گے، چوتھا دن صدقہ ہوتا ہے اور میں صدقہ نہیں کھایا کرتا۔

یہ تو اشارتاً فرمایا، دوسری حدیث میں صراحتاً فرمایا، مہمان کو چاہیے کہ وہ میزبان کو تنگ نہ کردے کہ وہ دن گننے لگے کہ یہ کب جائیں گے؟ زیادہ سے زیادہ تین دن مہمانی کے ہیں اس کے بعد میزبان کی مرضی ہے، یہ نہیں فرمایا کہ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دو۔

میزبان کو تنگ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً کہیں مہمان ہوا تو خواہ مخواہ کیڑے نہ نکالے کہ یہ جگہ کیسی ہے، کھانے میں نمک زیادہ تھا، سالن میں مرچیں زیادہ تھیں، چائے کیسی بنائی ہے، وغیرہ۔ انہوں نے اپنی حیثیت کے مطابق جیسا انتظام کیا ہو، شکر کے ساتھ قبول کرے۔ ظاہر ہے مزاج مختلف ہوتے ہیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ میں جہاں جاؤں وہاں ساری باتیں میری مرضی کے مطابق ہوں؟ کئی باتیں میرے معیار سے زیادہ ہوں گی، کئی کم

ہوں گی، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ میں جہاں جاؤں وہاں سارے کام میری مرضی کے مطابق ہوں۔ اس لیے خواہ مخواہ نکتہ چینی کرنا اور عیب نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ میزبان کی حیثیت سے زیادہ دیر اس کے ہاں رہنے کو پسند نہیں کیا گیا۔ اس کو بے بس نہ کر دے کہ وہ کہے کل آپ کا قیام ہے یا کوچ؟ مہمان کہے قیام، تو میزبان کہے پھر ہمارا تو کوچ ہے۔ تیسرے عام طور پر علماء کرام، خطباء عظام اور اس سے بڑھ کر لیڈروں اور پیران محترم کے ہاں یہ ہوتا ہے کہ دعوت دو آدمیوں کی ہوتی ہے اور یہ بتائے بغیر دس بارہ آدمیوں کو ساتھ لیے میزبان کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ اگر آدمی زیادہ ہوں تو مجھے بتانا چاہیے کہ میرے ساتھ اتنے آدمی اور ہیں تاکہ میزبان اس کا انتظام کر لے۔ کوئی اگر دعوت دے کہ میرے ہاں چائے پی لیجئے گا اور یہ بیس آدمیوں کو لے کر پہنچ جائے تو اب میزبان نہ پلانے کا اور نہ چھوڑنے کا۔

حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ سے یہ قصہ سنا کہ وہ کہیں سفر پر جا رہے تھے تو ایک آدمی نے دعوت دی کہ حضرت! گزرتے گزرتے چائے میرے ہاں پی لیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے سفر میں کچھ دیر رک جائیں گے چائے پی لیں گے۔ یہ جب پہنچے تو چار پانچ گاڑیاں تھیں اور اس بیچارے نے چار پانچ آدمیوں کی چائے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اب وہ فوری طور پر تیس آدمیوں کی چائے کا کیسے انتظام کرتا۔ اس نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کیا کہ حضرت جب پہنچے تو اس نے گاڑی میں ہی حضرت کو دو سو روپیہ پیش کیا کہ حضرت! میرے ہاں اتنے آدمی بٹھانے کی جگہ نہیں ہے آپ راستے میں کہیں ہوٹل سے چائے پی لیجیے گا۔

ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا کہ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھے فون کیا کہ ہم کچھ دوست آ رہے ہیں، شام کا کھانا آپ کے ہاں کھائیں گے۔ میں نے پوچھا کتنے آدمی ہیں؟ انہوں نے کہا ایک گاڑی کے آدمی ہیں۔ گاڑی میں عموماً زیادہ سے زیادہ پانچ آدمی ہوتے ہیں، میں نے پانچ چھ آدمیوں کا کھانا تیار کروا لیا۔ شام کو جب گاڑی پہنچی تو وہ ویگن تھی جس میں اٹھارہ آدمی تھے۔ میں نے اسے کہا، اللہ کے بندے! بتا دینا تھا گاڑی کون سی ہے؟ وہ کہنے لگا، آپ نے پوچھ لینا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت بازار سے کچھ نہ ملتا ہو تو کتنی پریشانی ہوتی۔ میزبان کو تنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔

غزوۂ خندق کے موقع پر سارے صحابہؓ خندق کھود رہے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے میں مصروف تھے، کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا، کئی دن سے بھوکے تھے۔ ایک آدمی نے آکر عرض کیا یارسول اللہ! سخت بھوک لگی ہے کیا کروں؟ فرمایا برداشت کرو، صبر کرو۔ اس نے پیٹ سے کپڑا اٹھایا اور دکھایا کہ اس نے بھوک کے احساس کو روکنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے۔ جب اس نے یہ کیا تو حضورؐ نے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹایا، آپؐ نے دو پتھر پیٹ پر باندھے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت جابرؓ کہتے ہیں مجھ سے برداشت نہ ہوا میرا گھر وہاں قریب ہی تھا۔ میں نے کہا یارسول اللہ! اجازت ہو تو میں گھر چکر لگا آؤں۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ۔ میں گھر گیا اور جاکر بیوی سے پوچھا گھر میں کوئی کھانے کی چیز ہے، حضورؐ سخت بھوک میں ہیں؟ اس نے کہا ایک بکری کا بچہ اور ایک صاع جو ہوں گے اور تو کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے خود بکری کا بچہ ذبح کیا اور ان کی بیوی نے آٹا پیسا۔ بیوی سے کہا تم ہانڈی پکاؤ، میں حضورؐ کو بلا کر لاتا ہوں۔ ان کی بیوی نے کہا زیادہ سے زیادہ آٹھ دس آدمیوں کا کھانا ہو سکتا ہے، زیادہ آدمیوں کو دعوت نہ دیجیے گا۔ حضرت جابرؓ گئے اور حضورؐ کے کان میں کہا میں گھر گیا تھا تھوڑا بہت بندوبست کر کے آیا ہوں، آٹھ دس آدمیوں کا کھانا ہے آپ تشریف لے چلیں ساتھ آٹھ نو آدمیوں کو لے چلیں جاکر کھانا کھا لیں۔ لیکن حضورؐ سات آٹھ سو ساتھیوں کو بھوکا چھوڑ کر خود کھانا کھانے کیسے جا سکتے تھے؟ وہ کوئی عام لیڈر نہیں تھے کہ کہتے ابھی کھلاؤ اور باقی فریزر میں رکھ دو کل کام آئے گا۔

حضورؐ نے اعلان فرما دیا کہ جابرؓ نے دعوت کی ہے سب چلو، جتنے لوگ موجود تھے سب چل پڑے۔ حضرت جابرؓ پریشان ہوئے کہ کھانا آٹھ دس آدمیوں کا ہے وہ آٹھ سو آدمیوں کو کیسے پورا ہوگا۔ جب گھر کے قریب پہنچے تو ان کی بیوی نے دیکھ لیا کہ اتنے زیادہ آدمی جابرؓ ساتھ لا رہے ہیں تو اس نے سمجھا کہ جابرؓ نے بتایا نہیں ہوگا اس لیے حضورؐ سارے ساتھیوں سمیت آرہے ہیں۔ چنانچہ حضرت جابرؓ کو بلا کر کہا ''بک وبک'' تیرے ساتھ یہ ہو، تیرے ساتھ وہ ہو، یہ کیا کر دیا، ان سب کو کون کھلائے گا؟ انہوں نے کہا اللہ کی بندی! مجھے مت کوسو، میں نے حضورؐ سے کہہ دیا تھا۔ بیوی نے پوچھا واقعی کہہ دیا تھا؟ انہوں نے کہا ہاں میں نے تو کہہ دیا تھا۔ بیوی کہنے لگی، پھر اللہ جانے اور اللہ کا رسول جانے، پھر کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمادیا ہنڈیا سے ڈھکن نہیں اٹھانا اور آٹے سے کپڑا نہیں اٹھانا۔ حضورؐ نے آٹے پر ہاتھ پھیرا، لعاب ملا، ہنڈیا میں تھوک مبارک ڈالا، اور فرمایا پکاتے رہو،

لوگ کھاتے رہیں۔ چنانچہ عصر تک کھانا پکتا رہا، لوگ کھاتے رہے۔ آٹھ سو آدمیوں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ بعد میں دیکھا کہ ہنڈیا بھی ویسی کی ویسی ہے اور آٹا بھی ویسے کا ویسا ہے۔ یہ حضورؐ کا معجزہ تھا ہمارے لیے ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

ایک اور موقع کی بات ہے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند ساتھیوں سمیت کھانے کی دعوت کی، ایک اور آدمی بھی ساتھ ہو لیا تو گھر کے دروازے پر پہنچ کر حضورؐ نے میزبان سے کہا، دیکھو! یہ آدمی گنتی میں شامل نہیں ہے، از خود آگیا ہے اب تمہاری مرضی ہے اس کو بٹھاؤ، تمہاری مرضی ہے نہ بٹھاؤ، ہماری وجہ سے تم پابند نہیں ہو۔ حالانکہ وہ حضورؐ کے ساتھ گیا تھا، میزبان نے کیا کہنا تھا، لیکن حضورؐ نے اصول بیان فرما دیا، مسئلہ بیان فرمادیا کہ جتنوں کی دعوت ہو، اتنے ہی جاؤ۔ اس نے کہا، یارسول اللہ! آپ کے ساتھ آیا ہے یہ بھی کھانے میں شریک ہو جائے۔ آج کل ہمارے ہاں اس کی پرواہ نہیں کی جاتی، ہمیں توسب گھر والوں کو کسی شادی پر جانے کے لیے ایک کارڈ کافی ہوتا ہے۔

ایک لطیفہ پچھلے دنوں پڑھا تھا کہ ایک آدمی کو کسی نے دعوت دی تو وہ سارے گھر والوں کو لے کر پہنچ گیا۔ میزبان نے کہا، حیا نہیں آئی۔ مہمان نے کہا، اس کے پیپر تھے اس لیے نہیں آئی، گھر پر رہ کر تیاری کر رہی ہے، باقی ہم سب آگئے ہیں۔

میں نے آج یہ بیان کیا کہ حضورؐ نے مہمانی کے آداب بیان فرمائے ہیں، مہمان نوازی کا حکم دیا ہے، اور میزبان و مہمان دونوں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا بھی حکم دیا ہے، اور خود بھی جناب نبی کریمؐ مہمانوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔

ایک واقعہ اور سنا دیتا ہوں جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ حضورؐ کا عام معمول تھا کہ کوئی مسافر مہمان آجاتا تو ازواج مطہراتؓ کے حجروں میں پیغام بھیجتے کہ کوئی چیز کھانے کو ہے؟ اگر ستو، کھجوریں، دودھ وغیرہ ہوتا تو وہ بھیج دیتے۔ ایک دفعہ کوئی مہمان آیا آپؐ نے پیغام بھیجا لیکن نو حجروں میں سے کسی گھر سے بھی مہمان کا کھانا نہیں نکلا۔ حضورؐ نے لوگوں سے کہا، میرا مہمان ہے کوئی اسے کھانا کھلا دے گا؟ ابوطلحہ انصاریؓ اٹھے اور کہا میں گھر چکر لگا کر آتا ہوں، ذرا دیکھ آؤں گھر میں کیا کچھ ہے۔ گھر تشریف لے گئے، اہلیہ محترمہ ام سلیم سے کہا حضورؐ کا ایک مہمان ہے، گھر میں کوئی چیز کھانے کو ہے؟ اس نے کہا صرف ایک آدمی کا کھانا ہے، یا تم کھالو، یا میں کھالوں، یا بچوں کو کھلا دیں، یا مہمان کو کھلا دیں۔ اتنا کھانا ہے کہ ایک آدمی کا گزارا ہو جائے گا۔ ابوطلحہؓ نے کہا، حضورؐ کا مہمان ہے اس لیے بچوں کو تو بہلا پھسلا کر

سلا دو۔ کھانا دستر خوان پر رکھ دینا۔ عرب مہمان نوازی کے اصولوں کے مطابق میزبان نے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہوتا ہے، مہمان اکیلے کھانا نہیں کھاتا۔ تو اس میں مسئلہ یہ تھا کہ اگر ابوطلحہ کھانا کھاتے تو مہمان کیا کھاتا۔ اس کا حل یہ نکالا کہ کہا، میں مہمان کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ جاؤں گا، ایک آدھ لقمہ لوں گا تم چراغ ٹھیک کرنے کے بہانے چراغ بجھا دینا۔ میں اندھیرے میں منہ ہلاتا رہوں گا، مہمان تسلی سے کھانا کھالے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور مہمان کو اس طریقے سے کھانا کھلایا۔ اللہ رب العزت کو ان کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ قرآن مجید میں انصار مدینہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ''یؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ'' (سورہ الحشر ۹) دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوک سے ہوں۔

حضورؐ ایک اور بات کا اہتمام بھی کرتے تھے کہ مہمان آتا تو آپؐ اس سے اس کی سواری کا پوچھا کرتے کہ اونٹ کہاں باندھا ہے؟ اس کو کچھ کھلایا پلایا ہے؟ حضرت عمرؓ کا بھی سختی سے یہ معمول تھا کہ قافلہ آتا تو بندوں کو جگہ دینے سے پہلے پوچھتے اونٹ کہاں کھڑے کیے ہیں؟ خچریں کدھر ہیں؟ ان کے پانی، گھاس کا انتظام کیا ہے؟ ایک مرتبہ ایک صاحب حضورؐ کے پاس آئے۔ حضورؐ نے پوچھا، کہاں سے آئے ہو؟ بتایا، فلاں جگہ سے۔ دریافت فرمایا، اونٹ کہاں ہے؟ اس نے کہا، اللہ کے توکل پر باہر چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا، پہلے اونٹ کو باندھو، پھر توکل کرو۔ آج کل اونٹ، خچر تو نہیں ہوتے، موٹر سائیکل یا گاڑی ہوتی ہے۔ اگر رات موٹر سائیکل باہر کھڑی رہ جائے تو ممکن ہے صبح نہ ملے، اس لیے مہمان کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ اس کی سواری کو محفوظ جگہ مہیا کی جائے۔

بہرحال مہمان کی عزت، احترام، حسب موقع اس کا اکرام کرنا اور اس کی ضروریات کا خیال رکھنا اور اس کی سواری کا خیال رکھنا، ان سب باتوں کی رعایت کرنے کا حکم سیرت نبویؐ میں دیا گیا ہے۔

سیرۃ النبیؐ اور غلاموں کے حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۹ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب نبی کریمؐ سے پہلے بھی غلاموں کا سلسلہ جاری تھا، غلام جانوروں کی طرح خریدے اور بیچے جاتے تھے اور ان سے کام لیا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں تو یہ سلسلہ اسلام کے آغاز سے کچھ عرصہ بعد ہی کنٹرول ہو گیا تھا لیکن باقی دنیا میں یہ سلسلہ جاری رہا،

مثلاً امریکہ میں اب سے ایک صدی پہلے ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء تک غلاموں کی منڈیاں لگتی تھیں اور انہیں خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ اب بھی لوگ خریدے بیچے جاتے ہیں لیکن اب اس کو غلامی نہیں، بردہ فروشی کہتے ہیں۔ جناب نبی کریمؐ کی بعثت کے وقت غلام کس طرح بنائے جاتے تھے؟ عام طور اس کے تین طریقے ہوتے تھے:

1. ایک یہ کہ کسی بھی کمزور، بے سہارا، لاوارث آدمی کو کوئی بھی طاقتور آدمی پکڑ کر غلام بنا کر بیچ دیتا تھا اور وہ پھر جانوروں کی طرح بکتے بکاتے رہتے تھے۔ ہمارے دو بزرگ صحابی اسی طریقے سے غلام بنے تھے۔ حضرت زید بن حارثہؓ جو صرف صحابی نہیں بلکہ حضورؐ نے تو انہیں بیٹا بنا لیا تھا، لیکن اللہ نے قبول نہیں کیا، وہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن میں آیا ہے۔ اصلا آزاد خاندان کے فرد تھے، راہ جاتے کہیں لوگوں نے پکڑا اور بیچ دیا، اس طرح غلام بن گئے۔ پھر بکتے بکاتے مکہ مکرمہ آ گئے، مکہ میں آنحضرتؐ کے حصے میں آئے اور حضورؐ نے آزاد کر دیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ بھی اسی طرح غلام بنے۔ وہ بھی ایک آزاد خاندان کے فرد تھے، مذہب تبدیل کیا، گھر سے پناہ کی تلاش میں نکلے، راستے میں لوگوں نے پکڑا اور غلام بنا کر بیچ دیا۔ فرماتے ہیں کہ میں دس سے بھی زیادہ مالکوں کے ہاتھ بکتا بکتا مدینہ پہنچا، دس سے زیادہ مالکوں کی غلامی میں نے گزاری ہے۔ خیر ان دونوں صحابہ کے لیے تو غلامی خیر کا باعث بن گئی۔ حضرت زیدؓ غلام بنے تو اللہ تعالیٰ نے مکہ پہنچا دیا اور حضرت سلمانؓ کو بکتے بکاتے یثرب پہنچا دیا، وہ اس تلاش میں تھے کہ جناب نبی آخر الزمان آنے والے ہیں، میری ان سے ملاقات ہو جائے۔ ادھر سے اسی وقت نبی اکرمؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے، جب آپؐ قبا میں تھے اس وقت حضرت سلمانؓ ایک یہودی آقا کے غلام بن کر آئے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی توفیق دی اور وہ حضورؐ کی غلامی میں چلے گئے۔ اکثر لوگوں کو غلامی راس نہیں آتی لیکن ان کے لیے تو غلامی اللہ کی رحمت ثابت ہوئی، نعمت ثابت ہوئی۔ غلام نہ بنتے تو نہ معلوم یہاں تک پہنچتے یا نہ پہنچتے۔ بہرحال غلامی کا ایک سبب یہ تھا کہ کوئی طاقتور آدمی کسی بے سہارا کو پکڑ کر بیچ دیتا اور وہ بک کر غلام ہو جاتا تھا۔

2. دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کوئی آدمی تاوان یا قرضے میں پھنس گیا ہے، یا یا کوئی مالی ذمہ داری اس پر آگئی ہے اور وہ ادا نہیں کر پا رہا اور قرض خواہ مجبور کر رہے ہیں تو یا تو وہ خود پیشکش کر دیتا تھا کہ مجھے بیچ کر اپنی قیمت پوری کر لو، یا عدالت، جرگہ، پنچائت فیصلہ کرتی تھی کہ یہ قرضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور تم اپنے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہو تو ٹھیک ہے اس کو بیچ کر اپنا قرضہ پورا کر لو۔ یہ رواج حضورؐ کے زمانے بھی موجود تھا۔ اس پر ایک بڑا دلچسپ واقعہ ابوداؤد شریف میں مذکور ہے۔

حضرت بلالؓ مکہ مکرمہ میں امیہ بن خلف کے غلام تھے، حضرت صدیق اکبرؓ نے آزادی دلوائی تھی۔ ہجرت کر کے آئے تو مدینہ منورہ میں آزاد کردہ غلام تھے، حضورؐ کے ساتھی اور خادم تھے۔ آپؐ کے گھریلو معاملات کے ذمہ دار حضرت بلالؓ تھے۔ گھر کا خرچہ، غلہ، پانی، مہمانوں کا سنبھالنا، اس سب کی ذمہ داری حضرت بلالؓ پر تھی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ حضرت بلالؓ حضورؐ کے وزیر امور خانہ داری و مہمانداری تھے۔ یہ معروف بات ہے کہ حضورؐ کے یہ معاملات حضرت بلالؓ کے ذمے تھے، حضرت بلالؓ کے پاس گھر کے لیے خرچہ موجود ہوتا تو کرتے رہتے ورنہ قرضہ لے لیتے تھے، خرچہ تو نہیں رکتا کرنا ہی پڑتا ہے، قرضہ لے کر خرچہ پورا کرتے۔ بعد میں حضورؐ کے پاس کوئی رقم آتی خمس وغیرہ کی تو اس سے قرضہ ادا ہو جاتا تھا۔ حضرت بلالؓ اور جناب نبی کریمؐ کا آپس میں یہ معاملہ چلتا رہتا۔ مدینہ منورہ کا ایک یہودی تھا، حضرت بلالؓ اکثر اس سے قرضہ لیتے تھے۔ اتفاق سے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ قرضہ بڑھتے بڑھتے خاصا بڑھ گیا۔ اس یہودی نے کہا قرضہ واپس کرو۔ ان کے پاس گنجائش نہیں تھی۔ قرض خواہ نے ایک دن دھمکی دے دی کہ تین دن کے اندر اندر میرا قرضہ واپس کر دو ورنہ تمہارے گلے میں رسی ڈال دوں گا۔ اس زمانے میں گلے میں رسی ڈالنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تمہیں غلام بنا کر بیچ دوں گا اور اپنا قرض پورا کروں گا۔ حضرت بلالؓ بہت پریشان ہوئے کہ یہ رواج عرب میں عام تھا۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اس نے تو دھمکی دے دی ہے، لہٰذا آپ کچھ کریں۔ آپؐ نے فرمایا اس وقت تو میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ ایسے ہی تین دن گزر

گئے، تیسرے دن اس نے پھر کہہ دیا کہ اگر آج رات تک میرے پیسے نہ ملے تو میں تمہارے گلے میں رسی ڈال دوں گا۔ اب پھر حضرت بلالؓ حضورؐ کی خدمت میں آئے کہ آج میرے گلے میں رسی پڑ جائے گی، میں ایک دفعہ غلامی بھگت چکا ہوں دوسری دفعہ غلام بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یارسول اللہ! کوئی راستہ نکالیے۔ آپؐ کے پاس کوئی گنجائش نہیں تھی، کیا کرتے۔ حضرت بلالؓ نے کہا اچھا اگر انتظام آپ کے پاس بھی نہیں ہے اور میرے پاس بھی نہیں ہے اور اس نے کل صبح ہی مجھے غلام بنالینا ہے اور بازار میں لے جا کر بیچ دینا ہے تو مجھے پھر ایک بات کی اجازت دیجیے کہ میں چپکے سے رات کہیں کھسک جاؤں، جب کہیں سے گنجائش ہو جائے گی تو آجاؤں گا، حضورؐ نے اجازت عطا فرما دی۔ حضرت بلالؓ کہتے ہیں رات میں نے سونے سے پہلے سواری تیار کی، سفر کا سامان تیار کیا اور عشاء کے بعد تیاری کر کے لیٹ گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ آدھی رات کے بعد اٹھوں گا اور سفر شروع کر دوں گا، صبح ہوتے ہی میں دور کہیں پہنچ جاؤں گا۔ کہتے ہیں کہ میں سارا بندوبست کر کے ابھی لیٹا ہی تھا کہ کسی نے آواز دی بلال! رسول اللہؐ بلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں میں اٹھا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ مسجد کے باہر تشریف فرما تھے اور حضورؐ کے سامنے چار اونٹ سازوسامان سمیت کھڑے تھے۔ سازوسامان میں غلہ، کپڑے اور دیگر ضروریات کی چیزیں ہوتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا بلال دیکھو اس سے قرضہ پورا ہو جائے گا؟ میں نے اندازہ کیا اور کہا یارسول اللہ! قرضہ بھی ادا ہو جائے گا اور کچھ بچ بھی جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا یہ فلاں قبیلے کے سردار نے مجھے ہدیہ بھیجے ہیں، ان سے قرضہ ادا کر دو اور اگر ان میں سے کچھ بچ گیا تو وہ میرے گھر نہیں لانا صدقہ کر دینا۔ حضرت بلالؓ کہتے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ نے میری جان بچا لی ورنہ یا تو میں کہیں دور دراز نکل جاتا اور یا غلام بنا لیا جاتا۔ بہرحال غلام بنانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ تاوان اور قرضے میں سے غلام بنا کر بیچ دیا جاتا تھا۔

3. غلام بنانے کا تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاتا۔ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوتے تھے جنگی قیدیوں کے بارے میں تین چار آپشن ہوتے تھے: (۱) انہیں قتل کر دیتے تھے (۲) ویسے چھوڑ دیتے تھے (

۳) فدیہ لے کر چھوڑ دیتے تھے (۴) یا قیدیوں کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ قرآن کریم نے بھی مختلف آپشن ذکر کیے ہیں ”فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا“ (سورہ محمد ۴)۔

جنگ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑا گیا، ان کے بارے میں حضرت عمرؓ کا مشورہ قتل کرنے کا تھا، اس طرح کہ آپؐ اپنے چچا کو خود ماریں، ابوبکر اپنے بیٹے کو ماریں، میں اپنے ماموں کو ماروں۔ جس جس کا جو رشتہ دار ہے وہ خود اسے قتل کرے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی رائے نرمی کرنے کی تھی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، تو آپؐ نے فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ ایسے کیوں کیا؟ عمرؓ کی رائے ٹھیک تھی۔ اب فیصلہ ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے لیکن ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ فرمایا ”ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرۃ“ (سورہ الانفال ۶۷)۔ اس لہجے میں بات اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں، فرمایا دنیا کے چار پیسوں کے لیے تم نے قیدی چھوڑ دیے۔ عمرؓ کی بات کیوں نہیں مانی؟ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی کہ ان کو قتل کرنا چاہیے تھا، فدیہ لے کر آزاد نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ایک آپشن یہ بھی تھا کہ قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ آج کل زیادہ تر جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہی ہوتا ہے۔ اس پر ایک واقعہ نقل کرتا ہوں، ابوداؤد میں روایت ہے کہ کسی جنگ میں ایک خوبصورت لونڈی قیدی بن کر آ گئی جو حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کے حصے میں آئی۔ جناب نبی کریمؐ نے ان سے کہا یہ لونڈی مجھے دے دو میں اس کے بدلے اور دے دوں گا۔ وہ حیران ہوئے کہ لونڈی میرے حصے میں آئی ہے اور حضورؐ فرما رہے ہیں کہ مجھے دے دو۔ بہرحال انہوں نے دے دی۔ آپؐ نے وہ لونڈی سنبھال کر رکھی، جس قبیلے کی وہ لڑکی تھی اس قبیلے کے پاس حضورؐ کے کچھ ساتھی قید تھے۔ حضورؐ نے اس لونڈی کے ساتھ اپنے قیدیوں کا تبادلہ کروایا کہ ہمارے قیدی واپس کر دو اور اپنی لڑکی واپس لے لو۔ عرب میں یہ سب رواج موجود تھے کہ قیدیوں کو یا قتل کر دیتے تھے یا ویسے چھوڑ دیتے تھے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیتے تھے یا تبادلہ کر لیتے تھے۔

ایک آپشن قتل کرنے کا بھی تھا جیسا کہ حضرت عمرؓ کی رائے تھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا قتل کرنے چاہییں تھے۔ اگر قیدیوں کو ویسے نہ چھوڑنا ہوتا، نہ فدیہ لے کر چھوڑنا ہوتا، نہ تبادلہ کرنا ہوتا، نہ قتل کرنا ہوتا تو جیل خانے تو ہوتے نہیں تھے، تو اب اتنے زیادہ قیدیوں کا کیا کریں، ان کو کہاں رکھیں؟ اس لیے یہ آپشن موجود تھا کہ ان کو تقسیم کر دیا جاتا تھا، یہ غلام اور باندیاں کہلاتے تھے اور بکتے تھے، خریدے جاتے تھے۔

مذکورہ بالا تین طریقے غلام بنانے کے تھے۔ حضورؐ نے یہ کیا کہ پہلے دو طریقے حرام قرار دے دیے۔ آزاد انسان کو بیچنے اور غلام بنانے کا طریقہ ممنوع قرار دیا اور فرمایا "بیع الحر حرام، ثمن الحر حرام" کسی آزاد کو پکڑ کر بیچ دینے کو حضورؐ نے حرام قرار دے دیا۔ دوسرا طریقہ کہ تاوان میں کسی کو غلام بنا لیا جائے اس کو بھی حضورؐ نے حرام قرار دے دیا۔ ویسے جو سزا چاہیں دیں لیکن تاوان میں غلام بنا کر بیچ دینا درست نہیں۔ یہ دونوں طریقے حرام قرار دیے۔ آپؐ کے اس اعلان کے بعد اس حوالے سے ہمارے ہاں نہ کوئی آدمی غلام بنا ہے اور نہ بکا ہے۔ جبکہ تیسرا طریقہ باقی رکھا، بطور حکم کے نہیں بلکہ مختلف آپشنز میں سے ایک آپشن کے طور پر۔ اس لیے کہ اس کی ضرورت تھی کیونکہ جنگی قیدیوں کو اکٹھا رکھنے کی صورت نہیں تھی اور انہیں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

جبکہ آپؐ نے غلاموں کے حقوق بیان فرمائے کہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں "اخوانکم" تمہارے بھائی ہیں، آدم کی اولاد ہیں "خولکم" تمہارے خادم ہیں "جعلھم اللہ تحت ایدیکم" اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارا ماتحت بنا دیا ہے "اطعموھم مما تطعمون والبسوھم مما تلبسون" جو خود کھاتے ہو ان کو بھی وہی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو بھی وہی پہناؤ۔ ان کو اپنے برابر رکھو، ان کے ساتھ زیادتی نہ کرو "ولا تکلفوھم بما لا یطیقون" ان سے کام لو لیکن اگر کام ان کی ہمت سے زیادہ ہو تو پھر ان کے ساتھ کام میں معاونت کرو۔ ان سے اتنا ہی کام لو جتنا وہ کر سکیں۔

چنانچہ اسلام نے غلام بنانے کا آخری آپشن باقی رکھا ہے لیکن ان شرائط کے ساتھ۔ خود تو حضورؐ کا مزاج ہی اور تھا۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس سال حضورؐ کی خدمت میں گزارے ہیں، میں نے حضورؐ کو کسی پر ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا، نہ بچے پر، نہ عورت پر، نہ غلام پر۔ حضورؐ کے سامنے ایک دفعہ ایک صحابی حضرت ابو مسعود انصاریؓ

نے باندی کو تھپڑ مارا تو حضور کا طرزِ عمل کیا تھا؟ ابو مسعودؓ کہتے ہیں میری لونڈی بکریاں چرا رہی تھی کہ کچھ دیر وہ بے پرواہ ہو گئی۔ اس کی بے پرواہی سے بھیڑیا آیا اور ایک بکری لے گیا۔ ابو مسعود دیکھ رہے تھے، وہ لونڈی کے پاس گئے اور غصے میں اسے زور سے تھپڑ مارا اور کہا بے پرواہ بیٹھی ہوئی ہو، بھیڑیا بکری لے گیا ہے۔ جب زور سے تھپڑ مارا تو پیچھے سے آواز آئی۔ ابو مسعود اس کو تھپڑ مارنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم سے طاقتور بھی کوئی ہے جو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ کہنے والے رسول اللہؐ تھے۔ ذرا غور کریں کہ انہوں نے تھپڑ کس کو مارا تھا؟ نوکرانی کو، اور بے قصور بھی نہیں مارا تھا بلکہ غلطی کرنے پر مارا تھا۔ پھر بھی حضورؐ ناراض ہوئے کہ اس کو کیوں مارا ہے۔ حضورؐ نے جب ڈانٹا تو ابو مسعودؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں، میں نے اپنی اس غلطی کے کفارے میں اللہ کے لیے اس لونڈی کو آزاد کیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا، اگر تم اس کو آزاد نہ کرتے تو دوزخ میں جاتے ''للفحتک النار'' آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی، اس تھپڑ کا صلہ یہی تھا کہ تم اسے آزاد کر دو۔ ایک تھپڑ جو کہ جرم کرنے پر مارا اس پر یہ وعید فرمائی۔ ہمارے ہاں تو نہ معلوم ماتحتوں کے ساتھ کیا کیا ہوتا ہے۔ ابھی چند سال پہلے گوجرانوالہ کچہری میں ایک کمی کو مار مار کر اس کا برا حال کر دیا گیا، اس بات پر کہ اس نے ایک چوہدری کو گزرتے ہوئے سلام کر دیا تھا کہ اس کی کیا جرأت کہ اس نے مجھے سلام کہا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا معمول یہ تھا کہ جیسے کپڑے خود پہنتے تھے ویسے ہی نوکروں کو پہناتے تھے۔ ایک دن آپؓ کے ایک دوست نے آپؓ سے کہا آپ نے جو اتنا قیمتی لباس پہنا ہوا ہے اسی کپڑے سے اپنے غلام کو پہنا رکھا ہے، اس کو کوئی ہلکی پھلکی چادر کافی تھی۔ فرمایا، نہیں بھئی! میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ تمہارے ماتحت ہیں ''اطعموھم مما تطعمون والبسوھم مما تلبسون'' جو خود کھاتے ہو ان کو بھی وہی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو بھی وہی پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام نہ ڈالو۔ جتنا کر سکتے ہیں ان سے اتنا کام لو، اور اگر زیادہ کام اس کے ذمہ لگا دیا ہے اور تمہیں اندازہ ہے کہ یہ اکیلے نہیں کر سکے گا تو ''اعینوھم'' اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔

غلامی کا مسئلہ آج کی دنیا کا ایک بڑا مسئلہ ہے، جبکہ معروضی صورتحال یہ ہے کہ گزشتہ دو سو سال سے کسی جہاد میں ہم نے غلام یا لونڈی نہیں بنائے۔ جہاد فلسطین، جہاد کشمیر، جہاد افغانستان کسی میں بھی غلام اور لونڈی نہیں بنایا گیا۔ اقوام متحدہ کا ہم پر اعتراض یہ ہے کہ

جب آپ نے غلامی کا سلسلہ ترک کر رکھا ہے تو قرآن کریم سے غلامی کے متعلق آیات نکالتے کیوں نہیں؟ حدیث میں غلامی کے ابواب کیوں پڑھاتے ہو؟ آپ کی فقہ کی کتابوں میں مکاتبت، تدبیر، استیلاد کے ابواب کیوں پڑھائے جاتے ہیں؟ مجھ سے ایک مذاکرے میں یہ سوال ہوا کہ تم نے غلام بنانا کیوں چھوڑا ہوا ہے، اور اگر غلام بناتے نہیں تو یہ مسائل پڑھانا کیوں جاری رکھے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا ہم نے غلام بنانا چھوڑ اس لیے دیا کہ یہ آنحضرت کا حکم نہیں تھا بلکہ مختلف آپشنز میں سے ایک آپشن تھا۔ بعض صورتوں میں اجازت دی تھی کہ اگر یہ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ موجودہ حالات میں یہ موافق نہیں ہے اس لیے ہم تبادلہ والا آپشن اپنا لیتے ہیں۔ اور پڑھاتے اس لیے ہیں کہ یہ منسوخ نہیں ہوا، قرآن میں اس کے احکام موجود ہیں اور احادیث میں موجود ہیں تو اسے کون منسوخ کر سکتا ہے؟ تاکہ کل اگر پھر خدانخواستہ وہ حالات بن جائیں اس لیے پڑھانا بھی ضروری ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہم نے غلامی کے احکام نہ منسوخ کیے ہیں اور نہ ہم منسوخ کر سکتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے حکم، اور ایک ہوتا ہے حکم کا محل۔ وہ حکم جس ماحول کے لیے تھا اگر وہ ماحول دوبارہ آگیا تو وہ حکم بھی قائم ہے، ماحول بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔

اس پر ایک مثال دوں گا، قرآن کریم نے صلوۃ الخوف کی جو تفصیل بیان کی ہے "واذا کنت فیهم فاقمت لهم الصلوة" (سورہ النساء ۱۰۲)۔ یہ قرآن کریم کا حکم اور جناب نبی کریم کا عمل ہے لیکن آج کے دور میں میدان جنگ میں صلوۃ الخوف اس کیفیت میں نہیں پڑھیں گے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ آج اگر فوج کو مورچوں سے نکال کر اجتماعی صلوۃ الخوف کے لیے اکٹھا کریں گے تو یہ اجتماعی خودکشی ہوگی۔ اب جنگ کا ماحول بدل گیا ہے۔ اس زمانے میں صف بندی کی جنگ ہوتی تھی، اس میں نماز کی یہی ترتیب تھی۔ لیکن آج کل جنگ صف بندی میں نہیں مورچوں میں ہوتی ہے بلکہ اب تو مورچوں کی بھی نہیں رہی اب تو سنٹر میں بیٹھ کر جنگ ہوتی ہے اور کمپیوٹر کے ذریعے لڑائی کنٹرول کی جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کا حکم منسوخ ہو گیا ہے، حکم موجود ہے، حکم کا محل نہیں رہا۔ کل اگر دوبارہ صف بندی کی جنگ کا ماحول آگیا تو صلوۃ الخوف کی وہی ترتیب ہوگی جو قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ اسی طرح غلامی کا مسئلہ بھی ہے کہ ماحول بدلنے سے اس کی کیفیت بدل گئی ہے، کل اگر یہ معاہدات ختم ہو جاتے ہیں اور باقی سارے آپشنز ختم ہو جاتے

ہیں تو وہی حکم اپنا محل واپس آنے پر ویسے کا ویسا رہے گا اور غلام اور باندیاں بنائے جائیں گے ،اس لیے ہم نے یہ پڑھنا پڑھانا ترک نہیں کیا۔

سیرۃ النبیؐ اور معاشی حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۸ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ معاشی حقوق کیا ہوتے ہیں اور معیشت کیا ہوتی ہے؟ انسان جب زندگی گزارتا ہے تو اسے اخراجات کے لیے اسباب کی ضرورت پڑتی ہے، پیسوں کی اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی ضروریات شروع ہو جاتی ہیں اور اس کو جتنی بھی زندگی ملے آخر وقت تک یہ ضروریات باقی رہتی ہیں۔ یہ ضروریات اسباب سے ہی پوری ہوتی ہیں، جیب میں پیسے ہوں گے، خرچہ ہو گا تو ضروریات پوری ہوں گی۔ اللہ تبارک و تعالی نے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مختلف دائرے بتائے ہیں۔

1. پہلا دائرہ گھر کا ہے۔ بچہ پیدا ہوا تو اس کی ضروریات پوری کرنا، کپڑے، دودھ، خوراک اور علاج وغیرہ اس کے والدین کے ذمہ ہے، ان کی حیثیت کے مطابق جب تک بچہ خود کمانے کے قبل نہ ہو جائے۔ قرآن کریم نے خرچے کا اصول بیان کیا ’’علی الموسر قدرہ وعلی المقتر قدرہ‘‘ (سورہ البقرہ ۲۳۶) مالدار آدمی پر اس کی حیثیت کے مطابق اور غریب آدمی پر اس کی حیثیت کے مطابق۔ والدین اپنی حیثیت کے مطابق خرچ نہیں کریں گے تو یہ زیادتی ہوگی، اور اگر اولاد ان کی حیثیت کو نہیں دیکھے گی اور زیادہ کا مطالبہ کرے گی تو یہ بھی زیادتی ہوگی۔ سمجھدار اولاد کو پتہ چل جاتا ہے کہ ہمارے والدین کیا چیز مہیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ کہ اولاد کے جوان ہونے تک اس کی تمام ضروریات کھانا پینا، لباس و رہائش اور تعلیم و تربیت وغیرہ والدین کے ذمے ہیں۔

پھر ایک وقت آتا ہے جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں، کمانے کے قابل نہیں رہتے تو ان کا خرچہ اور ان کی خدمت اولاد کے ذمے ہو جاتی ہے، کیونکہ بچپن میں اولاد نے ان سے خدمت لی ہے اور خرچہ بھی ان کا اس پر ہوا ہے۔

بچہ خود دودھ پینے کے قابل نہیں ہوتا، فیڈر نہیں بھر سکتا، پیشاب کر دے تو کپڑے خود نہیں دھو سکتا، نہا نہیں سکتا۔ ایک وقت تک وہ اپنی ضروریات اور کام خود نہیں کر سکتا، سب کچھ والدین کرتے ہیں۔ اسی طرح ایسا ہی وقت ماں باپ پر آتا ہے جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو کھانا کھانے، کپڑے دھونے اور قضائے حاجت وغیرہ میں اولاد کے محتاج ہوتے ہیں، کمائی بھی وہ نہیں کر سکتے، تو یہ اولاد ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی ضروریات پوری کرے۔ اور جو قرآن مجید میں والدین کے لیے دعا سکھلائی گئی اس میں بھی یہی کہلوایا "رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا" (سورہ الاسراء ۲۴) کہ اے اللہ! جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا ان پر اسی طرح رحم فرما۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مجھے کس نے پالا تھا اور والدین کی خدمت کرنی چاہیے، یہ اولاد کا والدین پر احسان نہیں بلکہ اولاد پر والدین کا حق ہے۔

اسی طرح میاں بیوی کے کاموں کی فطری طور پر تقسیم کر دی گئی ہے۔ گھر کے کام کاج کرنا، صفائی ستھرائی، کھانا بنانا، بچے پالنا وغیرہ بیوی کے کام ہیں، جبکہ خرچہ مہیا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔ یہ تقسیم ہے کہ یہ کام بیوی نے کرنے ہیں اور یہ خاوند نے۔ آج ایک نیا فلسفہ شروع ہو گیا ہے کہ عورت گھر کے کام کاج بھی کرے اور ملازمت کر کے پیسے بھی کمائے۔ یہ نئی تہذیب ہے کہ عورت بچے بھی پالے اور خرچہ بھی پورا کرے۔ یہ عورت پر احسان ہے یا اس کے ساتھ زیادتی ہے؟ یہ لطیفے کی بات ہے کہ کہا جاتا ہے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے چاہئیں، مرد ملازمت کرتا ہے تو عورت کو بھی ملازمت کرنی چاہیے، مولویوں نے عورتوں کو گھروں میں پابند کیا ہوا ہے۔ حالانکہ مساوات تو تب ہو کہ عورتوں کو اپنے کاموں میں شریک کرتے ہو تو ان کے کاموں میں بھی شریک ہو۔ ایک بچہ وہ جنے تو ایک تم جنو، ایک کو وہ پالے تو ایک کو تم پالو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طے کردہ فطری تقسیم ہے۔ کیا اللہ کی یہ تقسیم فطری نہیں ہے کہ بیوی کے سارے خرچے خاوند کے ذمے ہیں؟ مگر خاوند کی حیثیت کے مطابق۔

حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ ایک مثال سے سمجھایا کرتے تھے کہ نکاح ہوتے وقت خاوند سے پوچھا جاتا ہے "قبول ہے؟" وہ کہتا ہے قبول ہے۔ اس "قبول

ہے ”میں اس کے سارے معاملات شامل ہیں۔ بیوی کی ہر قسم کی ضروریات، کپڑا، کھانا، رہائش، علاج اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت سبھی چیزیں شامل ہیں۔ اگر کوئی کہے میں نے ”قبول ہے “تو کہا تھا لیکن یہ چیزیں ذمہ نہیں لی تھیں، تو اسے بتایا جائے گا اس میں یہ سب کچھ شامل تھا اور تم نے یہ سب کچھ قبول کیا تھا۔ یہ مثال دے کر حضرت جالندھریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اسی طرح جب ایک آدمی نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا تو اس میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج، معاملات، اخلاقیات سبھی چیزیں داخل ہیں۔ ہر ایک کا الگ الگ کہنا ضروری نہیں کہ میں یہ بھی کروں گا، یہ بھی کروں گا۔

بہر حال یہ گھر کا دائرہ ہے جس میں اللہ تعالی نے خرچ کی یہ تقسیم کی کہ بچپن میں اولاد کے خرچ ماں باپ کے ذمے، اور جب والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کے خرچ اولاد کے ذمے۔ بوڑھا ہو کر آدمی بچوں کی طرح ہی ضد کرنے لگتا ہے، اولاد کو حکم ہے جیسے انہوں نے تمہاری ضد پوری کی تھی تم بھی ان کی ضد پوری کرو۔ اور میاں بیوی میں کاموں کی بھی تقسیم کر دی کہ گھر کے کام عورت کے ذمے اور اخراجات مرد کے ذمے ہیں۔

2. دوسرا دائرہ سوسائٹی اور معاشرے کا ہے، اس کے بھی اللہ تعالی نے حقوق بیان کیے ہیں کہ اپنے محلے میں، برادری میں نظر رکھو، کوئی غریب، مسکین، ضرورتمند ہے تو اس کی ضرورت پوری کرو۔ زکوۃ اور صدقات معاشرے کے ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہیں۔ سو میں سے اڑھائی تو دینے ہی دینے ہیں، اس کے علاوہ بھی دو۔ یہ صدقات کن کو دینے ہیں؟ فرمایا ”ات ذاالقربی حقہ والمسکین وابن السبیل“ (سورہ الاسراء ۲۶) رشتہ داروں کا حق پہلے ہے، مسکین اور مسافر کو دینا بھی ان کا حق ہے۔ یہ تم ان پر احسان نہیں کر رہے، ان کا حق ان کو دے رہے ہو۔ یہ بات سمجھائی کہ تم محلے اور برادری میں کسی مستحق، معذور، غریب، بے سہارا پر خرچ کرتے ہو تو یہ تمہارا احسان نہیں ہے بلکہ یہ ان کا حق ہے جو تم ان کو دے رہے ہو۔ فرمایا ”وفی اموالھم حق للسائل والمحروم“ (سورہ الذاریات ۱۹) جو مال تمہیں دیے گئے ہیں وہ صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ تمہارے مالوں میں سائل اور محروم

کا بھی حق ہے۔ سائل سے مراد وہ ضرور تمند جو ضرورت کو ظاہر کرتا ہے، لیکن بعض ایسے ضرورت مند ہوتے ہیں جو غیرت کی وجہ سے اپنی ضرورت ظاہر نہیں کرتے، ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں سمجھتے، ان کو قرآن کریم نے "المحروم" کہا ہے، ان کو سفید پوش کہا جاتا ہے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مانگتا ہے اور ضرورت ظاہر کرتا ہے اس کو تو دیا جائے، لیکن جو مانگتا ہی نہیں اور اپنی ضرورت کا اظہار ہی نہیں کرتا اس کو کیسے پہچانیں گے تاکہ اس کو اس کا حق دیا جا سکے۔ مفسرین فرماتے ہیں اس سے ایک اور فریضہ بھی عائد ہو جاتا ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنا کہ کون کس کیفیت میں ہے یہ بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ پیچھا کرے اور مانگنے پر مجبور ہو تم خود ایسے آدمیوں کو تلاش کرو اور انہیں ان کا حق دو۔ یہ میں نے دوسرا دائرہ بیان کیا سوسائٹی کا کہ معاشرے میں جن کو اللہ تعالیٰ نے پیسے دیے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضرور تمندوں کا خیال رکھیں، ان کی ضروریات پوری کریں۔

3. تیسرے درجے میں اگر کسی کا کوئی بھی سنبھالنے والا نہ ہو تو اس کی ذمہ داری ریاست اور حکومت پر ہے۔ اس پر میں ایک واقعہ بیان کروں گا۔ بخاری شریف کی روایت ہے، جناب نبی کریمؐ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ کوئی مسلمان فوت ہوتا تو آپؐ جنازہ پڑھانے کے لیے تشریف لے جاتے اور پوچھتے کہ میت پر کسی کا قرضہ تو نہیں ہے؟ اگر کہا جاتا کہ نہیں ہے تو آپؐ جنازہ پڑھا دیتے۔ اور اگر کہا جاتا مقروض مرا ہے، تو پوچھتے کیا اتنی رقم یا جائیداد چھوڑ گیا ہے کہ اس کا قرضہ ادا ہو جائے؟ اگر کہا جاتا کہ جی! اتنی رقم چھوڑ کر مرا ہے تب بھی آپؐ جنازہ پڑھا دیتے۔ لیکن اگر جواب یہ ملتا کہ میت کی میراث سے اس کا قرضہ ادا نہیں ہو سکتا تو فرماتے "صلوا علی صاحبکم" تم جنازہ پڑھ لو، خود حضورؐ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہی ہوا حضورؐ جنازہ کے لیے تشریف لائے، پوچھا اس پر قرضہ ہے؟ جواب ملا، جی ہے۔ پوچھا، کیا اتنی رقم چھوڑ گیا ہے کہ اس کا قرضہ ادا ہو جائے؟ جواب ملا، نہیں۔ آپؐ نے حسب معمول فرمایا "صلوا علی صاحبکم"، تم

جنازہ پڑھ لو میں جارہا ہوں۔ ایک صحابی ابوقتادہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ ہمارے اس بھائی کو جنازے سے محروم نہ کیجیے، اس کا جنازہ پڑھا دیں، اس کا قرضہ میرے ذمے رہا، میں ادا کردوں گا۔ کیونکہ کسی مسلمان کے لیے اس سے زیادہ محرومی کیا ہوسکتی ہے کہ حضورؐ موجود ہوں اور اس کا جنازہ نہ پڑھائیں۔ اس سے زیادہ محرومی کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ قرضہ کا انتظام ہونے کے بعد آپؐ نے وہ جنازہ پڑھا دیا۔ اس موقع پر حضورؐ نے ایک اعلان فرمایا، میں اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا "من ترک مالا فلورثتہ و من ترک کلا او ضیاعا فالی وعلی"۔ جو آدمی پیسے، جائیداد، مال چھوڑ کر مرے گا یہ مال اس کے وارثوں کو ملے گا ہم اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ اور جو کوئی بوجھ چھوڑ کر مرا ہے، قرضہ چھوڑ کر مرا ہے، یا ضیاعا لاوارث بچے اور خاندان چھوڑ کر مرا ہے تو وہ میرے پاس آئیں گے اور میرے ذمے ہوں گے۔ یہاں سے فقہاء نے یہ اصول اخذ کیا کہ معاشرے کا ہر بے سہارا، ضرورتمند حکومت کے ذمے ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے باقاعدہ اس کا نظام قائم کیا۔

میں کہا کرتا ہوں کہ تاریخ میں پہلی بار یہ اعلان آنحضرتؐ نے کیا کہ جو بوجھ اور قرضہ یا لاوارث اولاد چھوڑ مرے گا وہ میرے پاس آئیں گے اور میرے ذمے ہوں گے۔ رسول اللہؐ نے بیت المال اسی لیے قائم کیا تھا، لوگ آتے تھے اونٹ کی ضرورت ہوتی تو بیت المال سے دے دیتے، کسی کو کھجوریں ضرورت ہوتیں تو اسے بیت المال سے دے دیتے، مدینہ منورہ کا جو بھی ضرورتمند ہوتا حضورؐ کے پاس آتا، حضورؐ بیت المال سے کپڑے، خرچہ وغیرہ دے دیتے تھے۔

اسی پر ایک لطیفے کا قصہ بھی ہے کہ حضورؐ ہلکی پھلکی دل لگی بھی کیا کرتے تھے، خشک مزاج بزرگ نہیں تھے۔ ایک دفعہ ایک مسافر حاضر خدمت ہوا، عرض کیا یارسول اللہ! میں فلاں علاقے سے آیا ہوں، اب واپس جانا ہے لیکن میرا اونٹ مر گیا ہے، مجھے گھر پہنچنے کے لیے اونٹ چاہیے۔ اسے پتہ تھا کہ یہاں سے اونٹ مل جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا، بیٹھو تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ پریشان ہوگیا کہ میں اونٹنی کے بچے کو کیا کروں گا؟ میں اسے اٹھاؤں گا یا وہ مجھے

اٹھائے گا۔ اس نے حضورؐ سے عرض کیا یارسول اللہ میں اونٹ کے بچے کو کیا کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد حضورؐ نے بیت المال سے اونٹ منگوایا، اس کی مہار اس مسافر کو پکڑائی اور کہا، یہ بھی کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہے۔

جس طرح حضورؐ لوگوں سے دل لگی کرتے تھے اسی طرح بے تکلف ساتھی بھی آپؐ کے ساتھ دل لگی کیا کرتے تھے۔ ایک دلچسپ واقعہ عرض کرتا ہوں۔ حضرت نعیمانؓ بدری صحابی تھے، بڑے کھلی طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ لطیفے کرتے رہتے تھے، ان کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک دن بازار سے گزر کر مسجد میں حضورؐ کے پاس جارہے تھے کہ انگوروں کی ریڑھی دیکھی، کھانے کو دل چاہا تو مالک سے کہا، ایک صاع انگور دینا، میں حضورؐ کو چیک کراتا ہوں، اگر پسند آ گئے تو ہم کھالیں گے، اتنی دیر بعد مسجد میں آکر پیسے لے جانا۔ انہوں نے انگور لیے اور مسجد پہنچے۔ وہاں حضورؐ اور صحابہؓ موجود تھے، ان سے جاکر کہا انگور کھائیں گے؟ انہوں نے کہا کھالیں گے۔ چنانچہ سب نے انگور کھائے، تھوڑی دیر کے بعد پیسے لینے والا آدمی آ گیا۔ حضرت نعیمان نے حضورؐ سے کہا یارسول اللہ! اس کو پیسے دیں۔ آپؐ نے فرمایا، کس چیز کے پیسے؟ حضرت نعیمانؓ نے کہا ابھی انگور نہیں کھائے؟ انگور کھائے ہیں تو اب پیسے دیں۔ چنانچہ حضورؐ نے پیسے دیے، پھر حضرت نعیمانؓ نے کہا میرا جی چاہ رہا تھا کہ آپ انگور کھائیں، میرے پاس پیسے نہیں تھے تو میں نے یہ طریقہ اختیار کیا تاکہ آپ انگور کھالیں کہ ویسے تو آپ نے انگور کھانے نہیں تھے۔

میں نے یہ بات عرض کی ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں یہ ماحول تھا کہ جس کو جو چیز ضرورت ہوتی تھی بیت المال سے اس کو مل جاتی تھی۔ معاشرے کے ضرورتمندوں کی ضرورتیں آپؐ بیت المال سے پوری کیا کرتے تھے۔

یہ میں نے تین دائرے بیان کیے۔ گھر کی ضروریات اور خرچہ کی تفصیل بھی حضورؐ نے بیان فرمائی۔ بچے ماں باپ کے ذمے اور والدین اولاد کے ذمے۔ بیوی شوہر کے ذمے اور گھر کے سارے کام بیوی کے ذمے۔ دوسرے دائرے میں معاشرے کے امیروں کے ذمے لگا دیا کہ غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات پوری کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اور تیسرا دائرہ کہ جس کا کوئی خیال نہ رکھنے والا ہو وہ حکومت اور ریاست کے کھاتے میں ہیں۔ جیسا

کہ حکومتیں خلافت راشدہ کے دور میں ذمہ دار ہوا کرتی تھیں اور اپنی یہ ذمہ داری پوری کیا کرتی تھیں، اس پر بہت سے واقعات ہیں لیکن اب اتنا وقت نہیں ہے کہ بیان کیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ ایسا نظام نصیب فرمادے، آمین۔

سیرۃ النبیؐ اور قیدیوں کے حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۷ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج ہماری نشست کا موضوع ہے ”سیرۃ النبیؐ اور قیدیوں کے حقوق“ کہ حضورؐ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا کرتے تھے۔ قیدی اس زمانے میں مختلف قسموں کے ہوتے تھے۔ ایک تو جنگی قیدی ہوتے تھے۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں قرآن کریم نے مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں اور حضورؐ نے بھی ان کے بارے میں وہ صورتیں اختیار کی تھیں۔ مثلاً قرآن کریم میں جنگی قیدیوں کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے ”فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا“ (سورہ محمد ۴)۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں چار پانچ آپشن ہوتے تھے (۱) قتل کر دیتے تھے (۲) ویسے چھوڑ دیتے تھے (۳) فدیہ لے کر چھوڑ دیتے تھے (۴) قیدیوں کا تبادلہ کر لیتے تھے (۵) یا غلام بنا لیتے تھے۔ حالات کے تحت جو مناسب ہوتا آپؐ ان سے معاملہ فرماتے۔

سب سے پہلے یہ مسئلہ بدر کے موقع پر پیش آیا تھا، اس وقت حضورؐ نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ کا معمول یہ تھا کہ جس معاملے میں وحی نہیں آتی تھی آپ صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا مشورہ قتل کرنے کا تھا کہ اس دور میں جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کا رواج بھی تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں قتل نہیں کرنا چاہیے بلکہ فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیے، ایک تو ہمیں ان کے فدیہ سے کچھ فائدہ ہو جائے گا اور دوسرے ان پر احسان ہو جائے گا، ہو سکتا ہے بعد میں مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر مسلمان ہو گئے تھے۔ آپؐ نے حضرت صدیق کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ ایسے کیوں کیا؟ عمرؓ کی رائے ٹھیک تھی، اب فیصلہ ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے لیکن ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ فرمایا ”ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرۃ“ (سورہ الانفال ۶۷)۔ اس لہجے میں بات اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں، فرمایا کہ دنیا کے چند پیسوں کے لیے

قیدی چھوڑ دیے، عمرؓ کی بات کیوں نہیں مانی؟ اللہ تعالی نے تنبیہ کی کہ ان کو قتل کرنا چاہیے تھا۔

حنین کے موقع پر جنگی قیدیوں کو ویسے ہی چھوڑ دیا گیا۔ حنین کی جنگ میں بنو ہوازن کو شکست ہوئی تھی، بہت سے قیدی اور مال غنیمت میں ملا۔ آپؐ نے قیدی اور مال غنیمت فورا تقسیم نہیں کیے بلکہ انتظار کرتے رہے کہ اگر بنو ہوازن والے ایمان لے آتے ہیں تو ان کو قیدی اور مال واپس کر دیں گے۔ سترہ دن انتظار کرتے رہے، وہ نہیں آئے تو حضورؐ نے قیدی اور مال و دولت، سونا چاندی وغیرہ تقسیم کر دیا۔ تقسیم کر دینے کے اگلے دن بنو ہوازن کا وفد آیا اور کہا یارسول اللہ! ہم توبہ کرنے اور ایمان قبول کرنے آئے ہیں۔ مہربانی کر کے ہمارے قیدی اور ہمارا مال ہمیں واپس کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا، میں نے سترہ دن تمہارا انتظار کیا تم نہیں آئے تو اب میں نے تقسیم کر دیے ہیں تقسیم سے پہلے اختیار میرا تھا، تقسیم کے بعد جن کی ملکیت ہو چکی ہے اختیار ان کا ہے۔ اب ان سے پوچھنا پڑے گا کہ واپس کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن تم آئے ہو تو تمہیں خالی واپس بھی نہیں بھیجتا، میں ان سے بات کرتا ہوں۔ تم ایک چیز اختیار کر لو، یا قیدی واپس لے لو یا مال واپس لے لو، دونوں چیزیں واپس نہیں ملیں گی۔ انہوں نے کہا اگر دونوں چیزیں واپس نہیں کرتے تو پھر ایسے کریں کہ ہمیں قیدی واپس کر دیں، مال واپس نہ کریں۔ آپؐ نے فرمایا جن کی وہ ملکیت ہو چکی ہے، میں ان سے پوچھوں گا۔ چنانچہ آپؐ نے لشکر اکٹھا کر لیا، بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ فرمایا، یہ تمہارے بھائی توبہ کر کے ایمان قبول کرنے آئے ہیں، میں ان کا انتظار کرتا رہا ہوں، یہ وقت پر نہیں آئے، اب میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ ایک چیز واپس کروں گا، ان کا کہنا ہے کہ قیدی واپس کر دیں، لیکن قیدی اب تمہاری ملکیت ہو چکے ہیں، تم قیدی خوشی سے واپس کر دو تو تمہاری مرضی اور اگر نہیں جی چاہتا تو واپس تو کر دو، میرے ذمے قرضہ رہا، اگلی جنگوں میں پہلے تمہارے قیدی ادا کروں گا پھر تقسیم کروں گا۔ لشکر سے آواز آئی یارسول اللہ! ہم راضی ہیں، خوشی سے واپس کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، اس طرح تمہاری رضا، عدم رضا کا صحیح پتہ نہیں چل سکتا کہ سارے راضی ہیں یا نہیں ہیں۔ اپنے خیموں میں جاؤ، تمہارے نمائندے رات کو تم سے بات کریں گے اور مجھے صبح بتائیں گے کہ کون راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے، تب فیصلہ کروں گا۔ ساری رات مشورے چلتے رہے۔ صبح کو سب نمائندوں (عرفاء)

نے عرض کیا یارسول اللہ! سب راضی ہیں، تب حضورؐ نے فیصلہ کیا اور ان قیدیوں کو غلاموں اور لونڈیوں کو بلا کسی معاوضہ کے واپس کر دیا۔

بنو مصطلق کے قیدیوں کو بھی ویسے ہی آزاد کر دیا گیا تھا۔ غزوہ مریسیع میں جنگی قیدی آئے تو ان کی آزادی کا سبب یہ بن گیا کہ حضورؐ نے اپنے حصے میں آنی والی باندی حضرت جویریہ بنت الحارثؓ جو کہ سردار کی بیٹی تھیں، کو آزاد کر کے ان سے نکاح فرما لیا تو صحابہ کرامؓ نے کہا، اب تو یہ خاندان حضورؐ کا سسرالی خاندان بن گیا ہے، اس لیے ہم سب کو آزاد کرتے ہیں، حضورؐ کے سسرال کو گرفتار رکھنا مناسب نہیں ہے، سب نے قیدی ویسے ہی چھوڑ دیے۔

آپؐ نے جنگی قیدیوں کا تبادلہ بھی کیا ہے، اس پر ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ کسی جنگ میں ایک بڑی خوبصورت لونڈی قیدی بن کر آ گئی، عرب کی خوبصورت ترین لڑکیوں میں سے تھی جو حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کے حصے میں آئی۔ جناب نبی کریمؐ نے ان سے کہا کہ یہ لونڈی مجھے دے دیں، میں اس کے بدلے اور دے دوں گا۔ وہ حیران کہ لونڈی میرے حصے میں آئی ہے حضورؐ فرما رہے ہیں کہ مجھے دے دو، حضورؐ یہ کیوں مانگ رہے ہیں؟ بہرحال انہوں نے دے دی۔ آپؐ نے وہ لونڈی سنبھال کر رکھی، جس قبیلے کی وہ لڑکی تھی اس قبیلے کے پاس حضورؐ کے کافی سارے آدمی قید تھے، حضورؐ نے اس لونڈی کے ساتھ اپنے قیدیوں کا تبادلہ کروایا کہ ہمارے قیدی واپس کر دو اور اپنی لڑکی واپس لے لو، اب صحابہؓ کو سمجھ آئی کہ حضورؐ نے یہ لڑکی کیوں مانگی تھی۔

جنگی قیدیوں کے بارے میں حضورؐ کا یہ معمول رہا ہے۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں میں حضورؐ کے داماد ابوالعاص بن ربیع تھے جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے، حضرت خدیجہؓ ان کی خالہ بھی تھیں اور ساس بھی، حضرت زینبؓ کے خاوند تھے، قید ہو کر آ گئے تھے۔ بخاری شریف میں ان کا قصہ ہے کہ جب حضرت زینبؓ کو پتہ چلا کہ میرا خاوند گرفتار ہو گیا ہے اور فدیہ کا فیصلہ ہو گیا ہے، اور اس غریب کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، تو انہوں نے اپنا ہار خفیہ طریقے سے بھجوایا کہ ابوالعاص کو یہ دے دو کہ فدیہ دے کر آزاد ہو جائے۔ اس وقت تک مسلمان اور غیر مسلموں کے نکاح قائم تھے، اس وقت حضرت زینبؓ مدینہ میں ابا جانؐ کے گھر پر تھیں۔ ابوالعاصؓ نے جب وہ ہار حضورؐ کو دیا تو آپؐ پہچان گئے کہ زینبؓ نے اپنا ہار اپنے خاوند کو چھڑانے کے لیے بھیجا ہے۔ ہار دراصل حضرت خدیجہؓ کا تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی کو شادی کے موقع پر تحفہ میں دیا تھا۔ حضورؐ نے جب حضرت خدیجہؓ کا ہار دیکھا

تو صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ یہ بیٹی کے پاس ماں کی نشانی ہے، اگر اجازت ہو تو واپس کر دوں؟ حضورؐ ویسے سوال نہیں کیا کرتے تھے لیکن یہاں یہ بات کی، صحابہ کرامؓ نے کہا جیسے آپ کی رضا۔ چنانچہ وہ ہار حضرت زینبؓ کو واپس کر دیا گیا۔

ابوالعاص بن ربیع ایک اور موقع پر بھی قیدی بن کر آئے۔ حضورؐ کا معمول یہ تھا کہ قیدیوں کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتے تھے، کوئی قید خانہ تو تھا نہیں۔ اس سے ایک مقصد تو یہ ہوتا تھا کہ ایک دو دن یہ ہمارا ماحول دیکھ لے، ہم اسے دیکھ لیں، پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔ چنانچہ ابوالعاص کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا گیا۔ حضرت زینبؓ وہیں تھیں، ان کو علم ہوا کہ میرا خاوند پھر قیدی بن کر آگیا ہے، ستون سے بندھا ہوا ہے اور صبح نماز کے بعد اس کے بارے میں فیصلہ ہونا ہے۔ حضورؐ نے اعلان یہ فرما رکھا تھا کہ کسی کافر کو عام آدمی بھی اگر پناہ دے دے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ حضرت زینبؓ چپکے سے فجر کی نماز کے وقت آئیں، نماز ہو رہی تھی، انتظار میں دروازے پر کھڑی ہو گئیں، حضورؐ نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف متوجہ ہوئے تو زینبؓ نے کہا، اس قیدی کو میں نے پناہ دی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، ''قد اجرنا من اجرت'' جسے تو نے پناہ دے دی ہے اسے ہم نے بھی پناہ دی۔ اس طرح ابوالعاص کو دوبارہ چھوڑ دیا گیا۔ دلیر اور بہادر آدمی تھے۔ دلیر آدمی دلیر ہی ہوتا ہے چاہے کفر میں ہو یا اسلام میں۔ جب ان کو چھوڑ دیا گیا تو یہ چپکے سے مکہ چلے گئے، مکہ جا کر حرم میں کھڑے ہو کر مشرکین مکہ کے سامنے اعلان کیا کہ میں ابوالعاص ہوں، میں قیدی تھا، اب آزاد ہو کر واپس آگیا ہوں، میں نے مسلمانوں کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ وہیں کر لیا تھا لیکن میں یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا کہ قیدی بن کر اسلام قبول کیا ہے، میں تمہارے سامنے کھڑے ہو کر اعلان کر رہا ہوں ''اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ'' اور ساتھ یہ بھی کہا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اب میں مدینے واپس جا رہا ہوں، جس میں ہمت ہے مجھے روک لے۔ بہادر آدمی کی یہ بات ہوتی ہے۔

آج میں نے سیرۃ النبیؐ اور قیدیوں کے حقوق، اور آپؐ کے قیدیوں کے ساتھ مختلف رویوں کے حوالے سے بات کی ہے۔

سیرۃ النبیؐ اور غیر مسلموں کے حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۶ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج کی گفتگو کا عنوان ہے سیرۃ النبیؐ اور غیر مسلموں کے حقوق۔ نبوت سے پہلے تو مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں تھا، البتہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ نبوی زندگی، یعنی تیرہ سالہ مکی اور دس سالہ مدنی زندگی میں آپؐ کا تین قسم کے کافروں کا سامنا ہوا اور تینوں کے ساتھ آپؐ کا معاملہ الگ الگ تھا:

1. ایک وہ کافر تھے جو اسلام کے راستے کی رکاوٹ بھی تھے، مخالفت بھی کرتے تھے، آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو تیرہ سال بہت تنگ کیا اور دس سال بدر، احد اور خندق کی جنگوں میں آپؐ کا مقابلہ کیا۔ ان کافروں میں قریش، بنو ثقیف، اور بنو ہوازن شامل رہے ہیں۔ ان کو فقہاء کی اصطلاح میں ''محارب کافر'' کہا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ آپؐ کا طرز عمل مکی زندگی میں برداشت کرنے کا تھا اور مدنی زندگی میں مقابلہ کرنے کا تھا۔ مکی دور میں قرآن کریم کا یہ حکم تھا ''کفوا ایدیکم'' (سورہ النساء ۷۷) ہاتھ نہیں اٹھانا، برداشت کرنا ہے۔ حضرت خباب بن ارتؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا مالک بہت زیادتیاں کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا صبر کرو۔ انہوں نے کہا برداشت سے باہر ہے۔ فرمایا صبر کرو۔ انہوں نے اپنی کمر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ میرا حال دیکھیں، میرا مالک اسلام قبول کرنے کی سزا میں مجھے کوئلے جلا کر اوپر لٹا دیتا ہے اور اوپر بیٹھ جاتا ہے میرے جسم سے خون بہہ کر کوئلے بجھاتا ہے، میرے جسم میں پیپ پڑی ہوئی ہے۔

چنانچہ تیرہ سالہ مکی دور میں محارب کافروں سے آپؐ کا طرز عمل صبر، حوصلہ اور برداشت کا رہا۔ مدنی دور میں آٹھ سال مقابلہ ہوا چونکہ یہ حکم مل گیا تھا کہ ''اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر'' (سورہ الحج ۷۸) تو بدر، احد اور خندق میں مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے کے نتیجے میں مکہ فتح ہو گیا۔ اس سے پہلے ساری عرب دنیا انتظار کر رہی تھی کہ اس مقابلے میں کون غالب آتا ہے، جو بھی غالب آئے گا ہم اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ فتح مکہ میں جب اس مقابلے کا فیصلہ ہو گیا اور بنو ہوازن نے بھی اس کے ساتھ ہی شکست کھائی، بنو

ثقیف نے معاہدہ کر لیا۔ چنانچہ ان محارب کافروں کے ساتھ حضورؐ نے صبر کا دور بھی گزارا ہے اور مقابلے کا دور بھی گزارا ہے۔

2. کافروں کی دوسری قسم جو مقابلے پر نہیں تھے ان کے ساتھ آپؐ نے حالات کے مطابق گزارا کیا۔ مثال کے طور پر مدینہ میں آنے کے بعد جب تک یہودی مقابلے پر نہیں آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جنگ نہیں چھیڑی، ان سے معاہدہ تھا کہ ہمارے راستے میں رکاوٹ نہ بنو، اگر رکاوٹ بنو گے تو جنگ ہو گی، ویسے تم اپنی جگہ رہو، ہم اپنی جگہ رہتے ہیں۔ بلکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب آپؐ نے مدینہ میں اسلام کی پہلی ریاست قائم کی تو وہ ریاست یہود کے ساتھ مل کر قائم کی۔ حضورؐ نے جنگ کر کے، مقابلہ کر کے مدینہ کی ریاست نہیں بنائی بلکہ تین سال مذاکرات چلتے رہے ہیں، بیعت عقبہ اولی، بیعت عقبہ ثانیہ اور میثاق مدینہ۔ تین سال کے مذاکرات کے بعد آپؐ نے یہود، دیگر قبائل اور انصار کے ساتھ مل کر اسلامی ریاست قائم کی۔ یہ ریاست کافروں پر غلبہ پا کر نہیں بلکہ ان کے اشتراک سے قائم ہو گئی تھی۔

یہودیوں نے بعد میں اپنی سازشوں کی مار کھائی ہے جس کی وجہ سے جلاوطن ہوئے اور پھر خیبر کی لڑائی ہوئی۔ ورنہ احزاب تک یہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہی تھے۔ خیبر میں یہودیوں کو شکست ہو گئی، آپؐ نے ان کو جلاوطن کرنے کا ارادہ فرما لیا۔ یہودی آئے اور عرض کیا کہ آپ نے فتح حاصل کر لی ہے، ہمارے علاقے اور زمینوں کے آپ مالک ہو گئے ہیں، اب ہم نے علاقہ چھوڑنا ہے، لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ہمیں مزارع کے طور پر قبول فرما لیں۔ اصولاً یہودیوں کو وہ زمین چھوڑ کر جانا تھا کہ مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا، زمینیں مسلمان مجاہدین میں تقسیم بھی ہو گئی تھیں۔ آپؐ نے ان یہود کی پیشکش قبول فرما لی کہ ٹھیک ہے مزارع کے طور پر رہو گے لیکن جب تک ہم چاہیں گے، ہمیشہ کے لیے نہیں۔ مدت کا اختیار ہمارے پاس ہو گا، چنانچہ یہی اختیار حضرت عمرؓ نے استعمال کیا تھا جب انہوں نے اپنے دور میں یہود کو خیبر سے نکالنا چاہا تو یہود نے کہا کہ حضرت محمدؐ نے ہم سے معاہدہ کیا ہوا ہے، ہم مزارع ہیں، اس معاہدہ کو آپ کیسے توڑ سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا، معاہدہ ہوا ہے

لیکن معاہدے کا ایک جملہ مجھے یاد ہے جو تم نظر انداز کر رہے ہو۔ حضورؐ نے فرمایا تھا جب تک ہم چاہیں گے۔ یہ معاہدہ کب تک رہنا ہے یہ اختیار ہمارا ہو گا۔ یہ جملہ یاد ہے؟ انہوں نے تسلیم کیا کہ ہاں حضورؐ نے یہ جملہ بھی کہا تھا، پھر ان کو جلاوطن کر دیا۔ میں یہ بتا رہا ہوں کہ حضورؐ نے ان کی یہ پیشکش قبول فرمائی اور ان کو مزارع کے طور پر قبول کیا۔

یہودیوں کے ساتھ آپؐ نے معاملات کا آغاز لڑائی سے نہیں مذاکرات سے کیا۔ یہاں سے فقہاء نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ غیر محارب کافروں کے ساتھ معاہدہ کر سکتے ہیں، ان کے ساتھ رہ بھی سکتے ہیں جب تک وہ مقابلے پر نہ آئیں۔ عیسائیوں کے ساتھ بھی آپؐ نے یہی معاملہ کیا۔ نجران کے عیسائی آپؐ کے ساتھ گفتگو کے لیے آئے، آپؐ سے مکالمہ و مناظرہ ہوا، مجادلہ ہوا، مباہلہ کی نوبت بھی آئی، لیکن بالآخر معاہدہ ہوا۔ عیسائی بھی اسلامی ریاست کا حصہ بنے اور آپؐ نے ان کو اسلامی ریاست کے شہری کے طور پر قبول کیا۔ معاہدہ میں شرطیں طے پائیں کہ یہ تم کرو گے اور یہ ہم کریں گے۔ یہ آپؐ کا معاملہ تھا دوسری قسم کے یعنی غیر محارب کفار کے ساتھ۔ ماحول کے مطابق آپؐ نے ان کے ساتھ صلح بھی رکھی، معاہدات بھی کیے، شراکت بھی کی۔

3. کافروں کی تیسری قسم منافقین مدینہ کی تھی جن کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے ''ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وماھم بمؤمنین'' (سورہ البقرہ ۸) بعض لوگ ایمان کا دعوی تو کرتے ہیں لیکن وہ مومن نہیں ہیں۔ ''وماھم بمؤمنین'' کا فتوی آج کے کسی دارالافتاء کا نہیں تھا بلکہ مفتی اعظم اللہ تعالی کا فتوی تھا۔ کافروں کی اس قسم کے ساتھ مدنی دور کے دس سال واسطہ رہا، ان کے ساتھ آپؐ کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ شرارت تو یہ ہر موقع پر کرتے رہے، کیا کیا شرارتیں انہوں نے نہیں کیں۔ احد کے موقع پر بغاوت کی، (مسجد ضرار بنائی، حضورؐ کو قتل کرنے کے لیے گھات لگائی)، اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ پر تہمت سے بڑی کوئی شرارت ہو سکتی ہے؟ لیکن جناب نبی کریمؐ نے برداشت کیا، عبد اللہ بن ابی سامنے بیٹھا تھا۔ حضرت سعد بن معاذ نے کہا یا رسول اللہؐ اجازت ہو تو اس کو قتل کر دوں؟ فرمایا، نہیں۔

چنانچہ آپؐ نے منافقین سے محاذ آرائی نہیں کی، لڑائی نہیں کی۔ محارب کفار کے ساتھ دس سالہ مدنی دور میں حضورؐ کی ستائیس جنگیں ہوئی ہیں جو سال کی اوسطا تین جنگیں بنتی ہیں، ہر چار مہینے بعد لڑائی، لیکن منافقین کے ساتھ ایک جنگ بھی نہیں لڑی۔ یہ گھر میں بیٹھے ہوئے کافر جن کو ’’وماھم بمؤمنین‘‘ فرمایا گیا اور جن کے متعلق حکم ہوا ’’یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم‘‘ (سورہ التوبہ ۷۳) اے نبیؐ! کافروں سے بھی جہاد کرو اور منافقوں سے بھی جہاد کرو، اور ان پر سختی کرو۔ میں یہاں ایک سوال کیا کرتا ہوں کہ کافروں سے تو حضورؐ نے ستائیس جنگیں لڑی ہیں، منافقوں سے کون سی جنگ لڑی ہے؟ کسی ایک منافق کو قتل بھی ہونے دیا ہے؟ حضرت عمرؓ بار بار اجازت مانگتے کہ مجھے اجازت دیں میں اس منافق کی گردن اتار دوں، حضرت خالد بن ولیدؓ نے تلوار نکال کر اجازت مانگی کہ اس منافق کی گردن میں اتارتا ہوں، لیکن آپؐ نے اجازت نہیں دی۔ اس قسم کے کافروں کے ساتھ حضورؐ کا الگ طرز عمل تھا۔ احد کی جنگ میں ایک ہزار میں سے سات سو میدان میں رہے، تین سو منافق غداری کر کے واپس آ گئے تھے۔ گویا احد کی جنگ کے موقع پر منافقین اور مومنین کا تناسب تیس اور ستر فیصد تھا۔ بعد میں مسلمانوں کی اس پر آپس میں بحث ہوئی کہ ان منافقوں کے ساتھ لڑنا چاہیے یا نہیں۔ بعض کا کہنا تھا کہ نہیں لڑنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’’فمالکم فی المنافقین فئتین واللہ ارکسھم بما کسبوا‘‘ (سورہ النساء ۸۸) تمہیں ان سے لڑنے کی کیا ضرورت ہے، تم چھوڑو میں خود سنبھال لوں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کلمہ گو کافروں کے ساتھ معاملہ الگ ہوتا ہے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ جناب نبی کریمؐ نے ان منافقین سے بھی جنگ لڑی ہے لیکن تلوار کی نہیں بلکہ حکمت عملی کی جنگ لڑی ہے۔ حکمت عملی کے ساتھ ان کو بے اثر کر دیا۔ حضورؐ نے ان سے جنگ نہ لڑنے کی وجہ بھی خود بیان فرمائی ہے۔ بخاری کی روایت ہے، حضرت عمرؓ نے کسی موقع پر منافق کی گردن اڑانے کی اجازت چاہی تو حضورؐ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمد نے تو اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا ہے، یہ بات اسلام کی دعوت

میں رکاوٹ بنے گی۔ لوگ تو انہیں مسلمان سمجھتے ہیں کہ یہ کلمہ پڑھتے ہیں اور ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔
حضورؐ نے دس سال میں کسی ایک منافق کو قتل نہیں ہونے دیا لیکن انہیں مورچہ بھی نہیں بنانے دیا، اپنے خلاف محاذ نہیں بنانے دیا۔ منافقین نے مسجد ضرار کی شکل میں خفیہ مورچہ بنانا چاہا جو آپؐ نے نہیں بنانے دیا۔ ”والذین اتخذوا مسجدا ضرارا وکفرا وتفریقا بین المؤمنین وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ من قبل“ (سورہ التوبہ ۱۰۷)۔ آپؐ نے محاذ اور مورچہ بھی منافقین کو نہیں بنانے دیا، محاذ آرائی اور لڑائی بھی نہیں کی، قتل بھی نہیں کرنے دیا۔ تین سو آدمیوں کی میدان جنگ سے غداری برداشت کی، حضرت عائشہؓ پر تہمت جیسی بات بھی برداشت کی، اجتماعی کوئی ایکشن نہیں لیا، مسجد ضرار نہیں بنانے دی بلکہ گرادی لیکن بنانے والوں کے خلاف ایکشن نہیں لیا، البتہ اپنے ساتھ اعتماد میں بھی نہیں لیا اور ان کو کوئی حیثیت اختیار نہیں کرنے دی۔ یہ بڑی خوفناک سزا ہوتی ہے کہ مقابلے پر بھی نہیں آنے دینا اور ساتھ بھی نہیں ملانا۔ جس کو شاعر نے کہا۔

ہم تو دشمن کو بھی کچھ ایسی سزا دیتے ہیں
ہاتھ اٹھاتے نہیں، نظروں سے گرادیتے ہیں

منافقین کے ساتھ حضورؐ کی دس سالہ حکمت علمی کا خلاصہ یہی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ احد میں ہزار میں سے تین سو تھے یعنی تیس فیصد۔ لیکن جب حضورؐ دنیا سے رخصت ہوئے تو صرف تیرہ چودہ منافق تھے۔ تبوک سے واپسی پر انہوں نے حضورؐ کا راستہ روکا تھا جو چہرے لپیٹے ہوئے تھے، حضورؐ کو شہید کرنا چاہتے تھے، ناکام ہوگئے۔ اس وقت حضورؐ کے ساتھ صرف حضرت حذیفہؓ تھے ان کو حضورؐ نے ان سب کے نام بتائے، اس شرط پر کہ ان کے نام کسی اور کو نہیں بتانے۔ تو اس وقت بظاہر یہ چودہ منافق رہ گئے تھے جن کا علم صرف حضرت حذیفہؓ کو تھا اور کسی کو ان کا پتہ بھی نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ نے حذیفہؓ پر بہت زور لگایا کہ مجھے ان کے نام بتائیں۔ کوئی علامت، نشانی، کوئی اشارہ ہی دے دیں۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا، رسول اللہ سے وعدہ کیا ہوا ہے، آپ کو کیسے بتا سکتا

ہوں۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کا معمول بن گیا تھا کہ کسی عام آدمی کا جنازہ ہوتا تو جنازہ گاہ میں جاتے، وہاں دیکھتے کہ حضرت حذیفہؓ جنازے میں ہیں یا نہیں، اگر وہ موجود ہوتے تو تسلی سے جنازہ پڑھاتے، ورنہ واپس آجاتے اور جنازہ نہ پڑھاتے، بلکہ کہتے خود ہی پڑھ لو اس لیے کہ مبادا یہ ان چودہ منافقین میں سے نہ ہو۔

یہ تھی آپؐ کی حکمت عملی جس کی بنا پر منافقین کو سوسائٹی میں غیر مؤثر کر کے دھیرے دھیرے سے ایسے غائب کیا کہ نظر بھی نہیں آئے کہ کدھر گئے، اس کو کہتے ہیں ڈپلومیسی اور حکمت عملی کی جنگ۔

جناب نبی کریمؐ کو ان تین قسم کے کافروں سے واسطہ رہا۔ محارب کافروں سے حضورؐ نے مقابلہ کیا اور آخر تک شکست دی۔ غیر محارب کافروں سے آپؐ نے معاہدے بھی کیے، صلح بھی کی، اکٹھے بھی رہے۔ جبکہ کلمہ گو کافروں کو نہ محاذ آرائی کرنے دی اور نہ ان کو اپنی صفوں میں جگہ دی، ان کو حکمت عملی کے ساتھ ناکام بنایا۔ چنانچہ خلفاء راشدین کے پورے زمانے میں کسی ایک آدمی کا سراغ بھی نہیں ملتا جسے منافقین میں شمار کیا جائے۔ اس دور میں منافقین کا کوئی واقعہ منقول نہیں ہے۔ آپؐ نے منافقین کو کیسے صاف کیا، اس طرح کہ وہ سارے مسلمان ہو گئے، حضورؐ کے طرز عمل کے باعث اسلام لے آئے۔ حضورؐ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وہ سب معاشرے میں تحلیل ہو گئے اور ان کا وجود ختم ہو گیا۔ آج میں نے یہ بیان کیا کہ حضورؐ کو تئیس سالہ دور نبوی میں تین قسم کے کافروں کا سامنا کرنا پڑا اور تینوں قسموں کے ساتھ حضورؐ کا معاملہ الگ الگ تھا۔

سیرۃ النبیؐ اور معاشرتی حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۵ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ انسان دنیا کی جاندار چیزوں میں سے وہ مخلوق ہے جو اکٹھے مل جل کر زندگی گزارتے ہیں۔ تمدن، محلے، بستیاں، مکانات، شہر، ریاستیں، حکومتیں کسی اور مخلوق میں نہیں ہیں۔ یہ سسٹم نہ شیروں میں ہے، نہ ہاتھیوں میں ہے۔ تمدن یعنی مل جل کر رہنا، ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنا، یہ صرف انسانوں میں ہے، اگرچہ دوسرے جاندار بھی یہ کرتے ہیں لیکن محدود دائرے میں۔ تمدن کو معاشرت بھی کہتے ہیں اور یہ انسان کا

خاصہ ہے۔ ایک عام لفظ بولا جاتا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے، انسان میں مدنیت، شہریت، اجتماعیت، معاشرت ہوتی ہے، اور اکٹھے رہنا انسان کی مجبوری بھی ہے، انسان کی ضرورت بھی ہے اور انسان کی عادت بھی ہے۔ اکٹھے رہنے کے لیے ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھنا اور ایک دوسرے کی ذمہ داریاں پوری کرنا ضروری ہے۔ جہاں چند آدمی اکٹھے رہتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے کا لحاظ رکھنا پڑے گا، ایک دوسرے کی بات سننی پڑے گی، ایک دوسرے کا کام کرنا پڑے گا، ایک دوسرے سے کام لینا پڑے گا۔ اس کو معاشرت، تمدن اور سماج کہتے ہیں۔

اسلام تمدن اور سماج کا مذہب ہے۔ نبی کریمؐ نے آپس کے جو حقوق بیان کیے ان کی ترتیب یہ ہے کہ:

1. آپؐ نے سب سے پہلے گھر والوں کے حقوق بیان کیے ہیں، اولاد کے لیے ماں باپ کے حقوق، والدین کے لیے اولاد کے حقوق، بھائیوں کے لیے بہنوں کے حقوق، بہنوں کے لیے بھائیوں کے حقوق، خاوندوں کے لیے بیویوں کے حقوق، بیویوں کے لیے خاوندوں کے حقوق اور پھر دوسرے قریبی رشتہ داروں کے حقوق۔ قرآن کریم نے حقوق اس ترتیب سے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''ات ذاالقربی حقہ'' (سورہ الاسراء ۲۶) سب سے پہلا حق ماں باپ، اولاد، بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کا ہے۔

2. اس کے بعد دوسرے قریبی رشتہ داروں کا حق بیان کیا ہے اور اسے ''حقہ'' کہہ کر بیان کیا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کو بھی ان کے حقوق درجہ بدرجہ ادا کرو، اس کو صلہ رحمی کہتے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صلہ رحمی دوہری عبادت ہے۔ ویسے خرچ کرنا صدقہ ہے اور رشتہ داروں پر خرچ کرنا دوہرا صدقہ ہے کہ اس میں صدقہ کے ساتھ صلہ رحمی بھی ہے۔

3. اس کے بعد جناب نبی کریمؐ نے تیسرا دائرہ پڑوسیوں کا، ارد گرد رہنے والوں کا بیان فرمایا۔ ''والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب'' (سورہ النساء ۳۶)۔ یہ تین قسم کے پڑوسی بیان کیے ہیں، ایک وہ پڑوسی جو رشتہ دار بھی ہیں، دوسرے وہ پڑوسی جو رشتہ دار نہیں ہیں، اور تیسرے پہلو کا ساتھی

جسے کولیگ کہتے ہیں، جیسے کلاس فیلو، سفر کا ساتھی ، کسی کام میں شریک، ملازمت میں ساتھ کام کرنے والا۔ یہ تیسرا دائرہ پڑوسیوں کا ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریمؐ نے پڑوسیوں کے حقوق بیان کیے کہ پڑوسیوں کا لحاظ رکھا کرو، حتیٰ کہ اگر گھر میں کوئی اچھی چیز پکائی ہے تو پڑوسیوں کو بھی دو، کہتی ہیں میں نے پوچھا پڑوس کی حد کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، چاروں اطراف سے دس دس گھر۔ عرض کیا چالیس گھروں میں بھجوانے کے لیے کھانا تو میرے پاس نہیں ہوتا۔ فرمایا، اس گھر میں بھیجو جس کا دروازہ تمہارے دروازے سے زیادہ قریب ہو۔ پڑوسیوں کے حقوق میں یہ بات ہے کہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو، خوشی، غمی میں شریک ہو، ایک دوسرے کی ضرورت میں کام آئے۔

4. اس کے بعد چوتھا دائرہ ہے سوسائٹی کا کہ عمومی معاشرے میں جو محتاج اور ضرورت مند ہیں ان کا خیال رکھا جائے۔ کوئی معذور ہے، کوئی مصیبت زدہ ہے، کوئی پریشان حال ہے تو ان کے حقوق ادا کیے جائیں۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا "وفی اموالھم حق للسائل والمحروم" (سورہ الذاریات ۱۹) جو مال میں نے تمہیں دیا ہے وہ سارا صرف تمہارا نہیں ہے اس میں دوسروں کا بھی حصہ اور حق ہے سائل کا بھی اور محروم کا بھی۔ سائل سے مراد وہ ضرورت مند ہے جو اپنی ضرورت کا خود اظہار کرے، سائل سے مراد وہ سوالی نہیں ہیں جو گلیوں میں مانگتے پھرتے ہیں۔ جبکہ محروم سے مراد وہ ہے جو ضرورت مند تو ہے لیکن مانگتا نہیں ہے۔ معاشرے میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، ہمارے اردگرد ہوتے ہیں جو ضرورت مند ہوتے ہیں لیکن شرم و حیا کی وجہ سے، اپنے عزت و وقار کی وجہ سے ہاتھ نہیں پھیلاتے، ایسے لوگوں کو سفید پوش کہا جاتا ہے کہ بظاہر دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہے، کپڑے اچھے پہنے ہوئے ہیں، مگر اندر کا حال یا وہ جانتا ہے یا خدا جانتا ہے۔ اس کا بھی حق ہے کہ اس پر خرچ کیا جائے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مانگتا ہی نہیں ہے، اپنی ضرورت کا اظہار ہی نہیں کرتا، اس کو کیسے پہچانیں گے کہ اس کو اس کا حق دیا جا سکے۔ قرآن کریم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ "تعرفھم بسیمھم لایسئلون

الناس الحافا“(سورہ البقرہ ۲۷۳)۔ سمجھدار آدمی علامتوں سے، اس کے حالات و معمولات سے پہچان لیتا ہے، اور ان کی یہ بھی نشانی ہے کہ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ یعنی سوسائٹی کے وہ افراد جو اپنی ضروریات کا اظہار کرتے ہیں، ان کا بھی تم پر حق ہے اور جو افراد باوجود محتاج ہونے کے اپنی ضروریات کا اظہار نہیں کرتے ان کا بھی تم پر حق ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے ایک اور فریضہ بھی عائد ہو جاتا ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنا کہ کون کس کیفیت میں ہے۔ یہ بھی مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

آج کل ہمارا حال یہ ہے جدید سوسائٹی (پوش کالونیوں) میں تو پڑوسی کا پتہ نہیں ہوتا کہ کون ہے، جب تک اس گھر میں خوشی غمی کا موقع نہ آئے، کئی کئی سال تک کوئی خبر نہیں ہوتی کہ ساتھ کون رہتا ہے، بلکہ شادیاں بھی آج کل شادی ہالوں میں ہوتی ہیں حالانکہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ”لیس المؤمن الذی یبیت شبعان وجارہ جائع فی جنبہ وھو یعلمہ“ جس کا پڑوسی اس کے پڑوس میں رات بھوکا سویا ہے، اس کو معلوم ہے اور یہ خود پیٹ بھر کے سویا ہے، فرمایا اس کو مومن کہلانے کا حق نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا کہ پہلا درجہ اپنے اہل خانہ کا ہے۔ دوسرا درجہ برادری، رشتہ دار، قبیلہ کا ہے۔ تیسرا درجہ پڑوسیوں کا ہے اور چوتھا درجہ سوسائٹی کا ہے۔ قرآن کریم نے تفصیل اور ترتیب کے ساتھ حقوق بیان کیے ہیں۔ یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، مسافروں اور غلاموں کے حقوق درجہ بدرجہ بیان کیے اور یہ فرمایا کہ یہ تمہارا احسان نہیں ہے بلکہ ان کا حق ہے ”وات ذاالقربی حقہ والمسکین وابن السبیل“ (سورہ الاسراء ۲۶)۔

آنحضرتؐ نے جانوروں کے حقوق بھی بیان فرمائے ہیں۔ اس زمانے میں اونٹ، گھوڑے اور خچر کی سواری ہوتی تھی، اگر کوئی سوار حضورؐ کے پاس آتا تو حضورؐ پوچھتے تھے سواری کدھر ہے اسے کہاں باندھا ہے؟ ایک مرتبہ آپؐ مسجد میں تھے ایک آدمی آیا، اس نے اونٹ باہر چھوڑا اور خود مسجد میں آگیا، سلام عرض کیا آپؐ نے اس سے پوچھا کیسے آئے ہو؟ عرض کیا اونٹ پر۔ فرمایا اونٹ کدھر ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ کے توکل پر باہر چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا، نہیں! جا کر پہلے اونٹ کے پاؤں باندھو پھر توکل کرو۔ میزبان کی ذمہ داری ہے کہ پہلے مہمان کے جانور کے چارے کا اور اس کے آرام کا اہتمام کرے۔ حضورؐ

اس کا خیال کیا کرتے تھے۔ آج کل مثلاً اگر مہمان موٹر سائیکل یا گاڑی پر آیا ہے تو اس سے پوچھنا چاہیے کہ موٹر سائیکل، گاڑی کہاں کھڑی کی ہے، محفوظ جگہ پر کھڑی کی ہے؟ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن یہ بھی حقوق میں شامل ہیں۔

لوگ آج انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں جناب نبی کریمؐ نے تو راستے کا حق بھی بیان فرمایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ راستے میں مت بیٹھا کرو جہاں لوگ آجا رہے ہوں، وہاں بیٹھ کر مجلس مت لگاؤ، اس سے آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ "مالنا بد" مجبوری ہوتی ہے کوئی ساتھی ملنے کے لیے آگیا اور گھر میں بیٹھنے کی جگہ نہ ہو تو باہر گلی میں ہی بیٹھنا پڑتا ہے۔ اگر کسی مسئلے میں کوئی مجبوری ہوتی تھی تو صحابہؓ عرض کر دیا کرتے تھے کہ یا رسول اللہ یہ مجبوری ہے اور حضورؐ مجبوری کا حل بتاتے تھے یا کسی کا بتایا ہوا حل قبول فرماتے تھے۔ مثلاً حضورؐ نے خیبر کے موقع پر پالتو گدھے کی حرمت کا اعلان فرمایا اور حکم فرمایا "اھریقوھا واکسروھا" ہنڈیا الٹا دو اور توڑ دو جس میں گدھے کا گوشت پک رہا ہے۔ اس پر ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا دھونے سے کام چل نہیں جائے گا؟ گوشت پھینک دیتے ہیں لیکن ہنڈیا کی پھر بھی ضرورت پڑے گی تو آپؐ نے اجازت فرما دی کہ ہنڈیا دھو لو۔ اسی طرح جب صحابہؓ نے کہا راستے میں بیٹھنا ہی پڑتا ہے تو آپؐ نے فرمایا "اعطوا الطریق حقہ" اگر راستے میں مجلس لگانا ہی پڑتی ہے تو پھر راستے کا حق ادا کرو۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! کیا راستے کا بھی کوئی حق ہوتا ہے؟ ماحق الطریق گلی اور سڑک کا کیا حق ہوتا ہے؟ آپؐ نے راستے کے یہ حقوق بیان کیے "غضوا البصر" تاک جھانک نہ کرو "کفوا الاذی عن الطریق" راستے میں کوئی تکلیف دہ چیز (روڑا، کیلے کا چھلکا وغیرہ) نظر آئے تو اسے ہٹا دو۔ گویا آنے جانے والوں کا حق ہے کہ ان کو تکلیف سے بچاؤ۔ اور فرمایا "ردوا السلام" سلام کہنے والے کو جواب دو۔ سلام کہنا اور سلام کا جواب دینا راستے کا مستقل حق ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، ان کے شاگرد ہیں امام التابعین حضرت نافعؒ۔ یہ کہتے ہیں کہ ایک دن ابن عمرؓ نے مجھے کہا، نافع! مجھے بازار لے جاؤ چکر لگانا ہے، کام ہے۔ میں ساتھ چل پڑا، بازار میں چلتے گئے چلتے گئے ایک جگہ جا کر فرمایا چلو واپس چلتے ہیں۔ نافعؒ نے عرض کیا، حضرت! آپ بازار میں کس کام آئے تھے؟ بازار میں آدمی خرید و فروخت کرتا ہے، آپ نے تو کوئی خرید و فروخت نہیں کی۔ فرمایا میں جس کام آیا تھا وہ

کام کرلیا۔ عرض کیا، حضرت میں بھی ساتھ ہی تھا، آپ نے کیا کام کیا ہے؟ فرمایا، بازار جاتے ہوئے کچھ لوگوں کو میں نے سلام کہا، انہوں نے جواب دیا، کچھ نے مجھے سلام کہا، میں نے جواب دیا، میں اسی کام کے لیے بازار آیا تھا کہ کافی عرصہ ہوا تھا میں گھر سے بازار نہیں آیا تھا اور راستے کا سلام جواب نہیں ہوا تھا جو کہ حضورؐ کی سنت ہے۔

اسی طرح آنحضرتؐ نے راستے کا ایک یہ حق بیان کیا ''الامر بالمعروف والنھی عن المنکر'' نیکی کا حکم کرنا، نیکی کے کام میں کسی کو کوتاہی کرتے ہوئے دیکھ کر اسے تنبیہ کرنا اور برائی سے منع کرنا، یہ بھی راستے کے حقوق میں سے ہے۔

جناب نبی کریمؐ نے معاشرتی حقوق بیان فرمائے، اس کے میں نے کچھ دائرے بیان کیے ہیں، گھر، رشتہ دار، پڑوسی، عمومی سوسائٹی، راستہ اور سڑک وغیرہ۔ آپؐ نے حقوق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک دوسرے کی عزت واحترام کرو، کوئی ایسی بات یا ایسا کام نہ کرو بلکہ کوئی ایسا اشارہ بھی نہ کرو جس سے دوسرے کی توہین ہوتی ہو۔ ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کا قد چھوٹا تھا، ایک دن ان کا ذکر ہوا تو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے اشارہ کیا کہ وہ چھوٹے قد والی، زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس پر حضورؐ سخت ناراض ہوئے کہ عائشہ کیا کر رہی ہو، ایسا کر کے اس کی توہین کر رہی ہو۔ اسی طرح طنز اور استہزا سے منع فرمایا، البتہ ہلکا پھلکا مزاح کرنے کی اجازت دی۔ مزاح اور طنز میں فرق ہے، مزاح وہ ہے جس میں دوسرا محسوس کرے کہ میرے ساتھ دل لگی کی ہے، اور طنز یہ ہے کہ دوسرے کی عزت خراب ہوتی ہو اور وہ اس سے اپنی توہین محسوس کرے۔

دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھنا بھی حقوق میں شامل ہے۔ مثلا مہمان آیا ہے، کھانے کا وقت ہو تو اسے کھانا کھلانا، چائے پلانا، حقہ نسوار دینا۔ ہمارے بنگلہ دیش کے ایک دوست مولانا شمس الدین قاسمیؒ تھے۔ ایک دفعہ وہ مشرقی پاکستان سے میرے پاس بطور مہمان آئے، میں اپنی حیثیت کے مطابق ان کی مہمانی کرتا رہا۔ ایک دو روز کے بعد کہنے لگے آپ نے ہماری مہمانی نہیں کی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اپنی طرف سے تو پوری مہمانی کی ہے۔ میں نے پوچھا حضرت! کیا کمی رہ گئی ہے؟ کہنے لگے ارے بھائی! پان تو آپ نے کھلایا نہیں۔ چنانچہ مہمان کی ان ضروریات کا خیال کرنا بھی حقوق میں شامل ہے۔

جناب نبی کریمؐ نے حکم فرمایا کہ ایک دوسرے کو ترجیح دیا کرو۔ وہ مشہور واقعہ آپ نے کئی بار سنا ہوگا، یہاں بھی دیکھ لیں کہ حضورؐ نے ہمیں کیا معاشرت سکھلائی ہے، احد کی جنگ

کے موقع پر پانی پلایا جا رہا تھا، ایک زخمی نے آواز دی پانی! اس کے پاس پانی لے کر پہنچے کہ ادھر سے دوسرے کی آواز آئی پانی! انہوں نے کہا، پہلے ان کو پلاؤ۔ وہ اس کے پاس پہنچے، ایک تیسرے کی آواز آئی پانی! انہوں نے کہا پہلے ان کو پلاؤ۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ شہید ہو گئے۔ اسی طرح تینوں نے جان دے دی۔ یہ ہے ایک دوسرے کا احساس، ایک دوسرے کی خوشی، غمی کو محسوس کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا۔ یہ معاشرتی بنیاد ہے جو قرآن کریم نے بیسیوں آیات میں بیان کی ہے اور جناب نبی کریمؐ نے سینکڑوں احادیث میں ارشاد فرمائی ہے۔

اصولی اور خلاصے کی بات یہ ہے کہ معاشرت کے آداب اور حقوق، ایک دوسرے کا لحاظ، ایک دوسرے کی عزت و احترام سب سے زیادہ قرآن کریم نے اور جناب نبی کریمؐ نے سکھایا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ جامع تعلیم جناب نبی کریمؐ نے دی ہے۔ ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کی اس حد تک تلقین فرمائی کہ اگر تم گھر میں بچوں کے لیے کوئی پھل لائے ہو تو پھل کھا کر چھلکے دروازے سے باہر مت پھینکو کہ پڑوسی کے بچے دیکھیں گے اور گھر جا کر ضد کریں گے کہ ہم نے بھی کھانے ہیں۔ اگر ان کی حیثیت نہیں ہوئی تو وہ پریشان ہوں گے جس کا سبب تم بنے ہو، اب یا تو وہ بچوں کو ڈانٹ دیں گے یا خود کوئی غلط حرکت کریں گے۔ آپؐ نے یہ تلقین فرمائی کہ ایک دوسرے کے لیے اذیت اور تکلیف کا ذریعہ نہ بنو کہ یہ حق تلفی ہے۔

سیرۃ النبیؐ اور مسافروں کے حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۴ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ مسافروں کے حوالے سے آج میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو جناب نبی کریمؐ کے زمانے کے چند مسافروں کے قصے سناؤں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ بنو غفار قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، بہت بڑے صحابی ہوئے ہیں۔ ان کا قصہ بخاری شریف میں مذکور ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں، قصہ سفر کا بھی ہے اور قبول اسلام کا بھی ہے۔ جاہلیت کے زمانے میں انہیں دیگر بہت سے حضرات کی طرح بت پرستی سے نفرت تھی، موحد تھے، اللہ کی عبادت پسند تھی اور اپنے طور پر عبادت کرتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں، مجھے پتہ چلا کہ مکہ مکرمہ میں کوئی صاحب ہیں جو توحید کی تلقین کرتے ہیں، شرک سے روکتے ہیں اور اللہ کی عبادت کا حکم

دیتے ہیں۔ مجھے شوق پیدا ہوا کہ ان کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ میں نے چھوٹے بھائی کو بھیجا کہ مکہ جا کر پتہ کرو یہ صاحب کون ہیں، ان کا تعارف کیا ہے اور ان کی دعوت کیا ہے؟ میرا بھائی مکہ گیا، واپس آکر اس نے بتایا کہ وہ ایک اچھا شریف آدمی ہے، لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں، توحید کی بات کرتا ہے، شرک سے روکتا ہے، اللہ کی عبادت کا حکم کرتا ہے۔ ابوذرؓ کہتے ہیں مجھے تسلی نہیں ہوئی، میں نے خود جانے کا ارادہ کیا، سفر کا سامان باندھا، کھجوریں پانی ساتھ لیا اور چل دیا۔

مکہ مکرمہ پہنچا تو وہاں کی فضا یہ تھی کہ جناب نبی کریمؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر قریش نے ماحول بہت تنگ کر رکھا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب شعب ابی طالب میں مکہ والوں نے حضورؐ، آپ کے خاندان اور آپ کے ساتھیوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ قریش کے قبائل نے معاہدہ کر کے تین سال سوشل بائیکاٹ کیے رکھا۔ مکہ مکرمہ میں خوف و ہراس کی کیفیت تھی، آپؐ کا نام لینا بھی پریشانی کا سبب بنتا تھا، میں نے کسی سے آپؐ کے گھر کا پتہ پوچھا کہ کہاں ملیں گے تو کوئی تسلی بخش نہیں ملا، جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ آسانی سے کوئی آپؐ کا پتہ نہیں بتائے گا اور اگر میں نے زیادہ اصرار کیا تو شاید مجھے تنگ بھی کیا جائے۔ کہتے ہیں، میں مسجد حرام میں جا کر بیٹھ گیا۔ سارا دن وہاں بیٹھا رہا، زمزم پیتا رہا۔ کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، شام کو ایک صاحب آئے، پوچھا، مسافر ہو؟ میں نے کہا جی۔ پوچھا، روٹی کھائی ہے؟ کہا، نہیں۔ کہا، چلو میرے ساتھ چل کر روٹی کھالو۔ میں سارے دن کا بھوکا بیٹھا ہوا تھا اللہ کا شکر ادا کیا کہ کھانے کا انتظام ہو گیا۔ پرانے زمانے میں ایسے ہوتا تھا، خاص طور پر دیہاتوں میں کہ کوئی مسافر مسجد میں نظر آجائے تو اسے گھر لے جا کر کھانا کھلا دیتے ہیں، سونے کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں میں گیا، کھانا کھایا اور واپس آکر اسی جگہ زمزم کے پاس بیٹھ گیا۔

دوسرا دن بھی اسی کیفیت میں گزر گیا کہ خوف و ہراس کی کیفیت تھی، کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شام کا وقت ہوا، کل والا آدمی پھر آیا، اس نے پوچھا، مسافر ابھی یہیں ہے، جانا نہیں ہے۔ میں نے کہا، نہیں! آج ادھر ہی ہوں۔ اس نے کہا، چلو کھانا کھالو۔ میں نے جا کر کھانا کھایا، واپس مسجد میں رات گزاری۔ تیسرا دن بھی اسی کیفیت میں گزر گیا کسی سے پوچھا بھی تو اس نے جواب نہیں دیا، گھور کر جواب دیا، اور مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ مسافر ہوں، کوئی مجھے پکڑ کر لے جائے تو نہ معلوم میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

تیسرے دن شام کو وہ آدمی پھر آیا اور کہا، مسافر ابھی یہیں ہے، جانے کا وقت نہیں آیا؟ میں نے کہا نہیں ابھی میرا کام نہیں ہوا۔ اس نے کہا، چلو چل کر کھانا کھالو۔ میں نے اس کے گھر جاکر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اس نے پوچھا تم تین دن سے ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے ہو، خیر تو ہے، کس کام آئے تھے؟ میں نے کہا وہ کام بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اگر بات اپنے تک رکھو اور کسی کو نہ بتاؤ تو تم سے بات کہہ دیتا ہوں۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے بتاؤ۔ میں نے کہا، مجھے پتہ چلا ہے یہاں کوئی صاحب ہیں جو اللہ کی بات کرتے ہیں، شرک اور بت پرستی کی مخالفت کرتے ہیں، اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں، میرا ذوق بھی یہی ہے، میں ان سے ملنے آیا ہوں لیکن یہاں کی فضا دیکھ کر کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ آپ اگر بتادیں تو آپ کی مہربانی، اگر نہیں بتانا تو کم از کم میرا پردہ رکھنا، کسی اور کو نہ بتانا۔

یہ شخص کون تھے جو روزانہ شام کو مہمان کو ساتھ لے جاکر کھانا کھلاتے تھے؟ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ حضرت علیؓ اگرچہ فقیر آدمی تھے، مالدار نہیں تھے، محنت مشقت کرتے تھے لیکن ان کے بارے میں آتا ہے کہ زندگی میں کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا۔ سیدہ فاطمہؓ کہتی ہیں حضرت علیؓ کا معمول تھا، انتظار کرتے تھے کہ کوئی مسافر، کوئی مہمان ہو تو مل بیٹھ کر کھانا کھائیں، اور اگر کوئی نہیں آتا تھا تو یہ خود مدینہ کے راستے میں جاکر کھڑے ہو جاتے، کسی مسافر کو بلا لاتے کہ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں، جب میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا تم نے صحیح آدمی سے بات کی ہے، میں بھی ان کا ساتھی ہوں، ان کا بھائی ہوں، تمہارا کام بن گیا، اب تمہیں کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی جاکر آرام کرو، صبح میں چاشت کے وقت آؤں گا تو تم چپکے سے میرے پیچھے چل پڑنا، میں تم سے بات نہیں کروں گا، میں اس وقت انہی کے پاس جاتا ہوں، تمہیں وہاں لے جاؤں گا، لیکن میرے پیچھے چلتے ہوئے تم نے ظاہر نہیں ہونے دینا کہ تم میرے پیچھے آرہے ہو، ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ مجھے جہاں بھی خطرہ محسوس ہوا تو میں جوتے کا تسمہ صحیح کرنے کے بہانے بیٹھ جاؤں گا، تم آگے چلتے جانا تاکہ کسی کو اندازہ نہ ہو کہ تم میرے پیچھے چل رہے ہو۔ اس سے اندازہ کریں، اس وقت خوف کی کیا کیفیت تھی۔ صبح حضرت علیؓ آئے، میں ان کے ساتھ پیچھے پیچھے چل پڑا، راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

جناب نبی کریمؐ ان دنوں زید بن ارقمؓ کے مکان پر خفیہ مجلس کیا کرتے تھے، خاص خاص ساتھیوں کو پتہ ہوتا تھا جو چپکے سے وہاں آجاتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں، حضورؐ وہاں موجود تھے، میں وہاں پہنچا اور جناب نبی کریمؐ سے ملاقات کی، تعارف کرایا کہ بنو غفار قبیلے کا ہوں، میرا نام ابوذر ہے، آپ کے بارے میں سنا تھا، پہلے بھائی کو بھیجا تھا، اس نے کوئی تسلی بخش بات نہیں بتائی، اب میں خود آیا ہوں، تین دن سے حرم میں بیٹھا رہا ہوں۔ یہ آدمی روزانہ مجھے ملتا تھا، آج میں نے اس سے بات کی تو یہ مجھے آپ کے پاس لے کر آگیا۔ اب آپ بتائیں آپ کیا باتیں کرتے ہیں؟ آپؐ نے دین کی بنیادی باتوں کی دعوت پیش کی، اللہ کی دعوت، توحید کی دعوت، قیامت اور رسالت کی بات کی۔ میں نے کہا، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، مجھے کلمہ پڑھائیے۔ میں نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔ پھر پوچھا اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ آیا اپنی مرضی سے تھا لیکن اب تو کلمہ پڑھ لیا ہے، کلمہ پڑھنے کے بعد کیا مسلمان کی اپنی مرضی باقی رہ جاتی ہے؟ آج ہماری مرضی تو شروع ہی کلمہ کے بعد ہوتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ابھی تو تم اپنے قبیلے میں واپس جاؤ، کسی کو بتانا نہیں ورنہ لوگ تنگ کریں گے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ہمیں کچھ عرصے تک یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے گی تو ہم یہاں سے ہجرت کر کے کسی جگہ اپنا مستقل ٹھکانہ بنائیں گے۔ جب تمہیں یہ پتہ چلے کہ ہم نے مکہ چھوڑ دیا ہے اور کسی جگہ ٹھکانہ بنا لیا ہے تو تم وہاں آجانا، اس وقت تک تم نے کسی کو بتانا نہیں ہے، گھر جا کر چپکے سے اللہ اللہ کرتے رہو۔

ابوذرؓ کہتے ہیں میں حضورؐ کی باتیں سن کر رات حرم میں آگیا کہ صبح واپس جاؤں گا۔ صبح ہوئی تو چاشت کے وقت مکہ کے بڑے بڑے لوگ اور چوہدری حرم میں اپنے معمولات کے لیے اکٹھے ہوتے تھے، میرے ضمیر نے مجھے کہا کلمہ پڑھ کر یوں چپکے چپکے چلے جانا ٹھیک نہیں ہے، ان کو پتہ چلنا چاہیے کہ میں نے کلمہ پڑھا ہے۔ مجھے حضورؐ کی بات بھی یاد تھی لیکن میرا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ تم نے کلمہ پڑھا ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا، اس کا اظہار کرو۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ انہیں بتا کر جاؤں گا۔ قریش کا مجمع لگا ہوا تھا، میں بیچ میں جا کر کھڑا ہوگیا اور ان سے کہا، مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟ بنو غفار کا ابوذر ہوں ”اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ۔ میرا کلمہ پڑھنا تھا کہ گویا وہاں دھماکہ ہوگیا، وہ حیران تھے کہ بنو غفار کا آدمی یہاں آکر کلمہ پڑھ رہا ہے اور ہمارے درمیان آکر اظہار بھی کر رہا ہے۔ اب وہ مجھ پر حملہ آور ہوئے، کوئی مکے مار رہا ہے، کوئی جوتے مار رہا ہے، کوئی کپڑے کا

کوڑا بنا کر مار رہا ہے، کوئی ڈنڈے مار رہا ہے۔ مجھے لٹا دیا اور مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ قریب تھا کہ میں مر جاتا، حضرت عباسؓ جو حضورؐ کے چچا محترم تھے، انہوں نے کلمہ فتح مکہ کے موقع پر پڑھا ہے لیکن چچا بھتیجا کی دوستی پہلے سے تھی، انہوں نے دیکھ لیا کہ یہ تو اسے مار دیں گے، انہوں نے شور مچایا ارے خدا کے بندو! کیا کر رہے ہو؟ آکر لوگوں کو مجھ سے ہٹایا، مجھے نکالا اور ان سے کہا یہ بنو غفار کا آدمی ہے اور قبیلہ بنو غفار شام کے تجارتی قافلوں کے راستے میں ہے، یہ مر گیا تو تمہارا تجارت کا راستہ بند ہو جائے گا، تمہیں اس کا قبیلہ وہاں سے نہیں گزرنے دے گا، پھر غلہ کہاں سے لاؤ گے، راستہ بند کروانا ہے؟ پھر مجھے کہا، آپ کو کس نے کہا تھا ان کے سامنے کلمہ پڑھو، اب یہاں سے کھسک جاؤ۔ وہ تو کہہ کر چلے گئے۔ میں جا کر زمزم کے پاس بیٹھا، سانس برابر ہوا تو میں نے سوچا ابھی نہیں جاؤں گا، ایک راؤنڈ اور ہونا چاہیے۔ رات ادھر ہی گزاری۔ صبح اسی وقت پھر میں نے ان کے سامنے آکر کہا، میں ابوذر ہوں، بنو غفار سے آیا ہوں، اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ۔ وہ پھر مجھ پر حملہ آور ہو گئے اور پٹائی شروع کر دی اور میری وہی کل والی حالت ہو گئی۔ عباسؓ دور سے دوڑتے ہوئے آئے اور لوگوں کو مجھ سے ہٹایا، انہیں لعن طعن کیا کہ یہ مسافر ہے اسے کیوں مارتے ہو؟ بڑی مشکل سے مجھے ان سے بچایا، اور مجھے کہا، اللہ کے بندے کل تمہیں اتنی مشکل سے چھڑایا تھا اور کہا تھا کہ کھسک جاؤ، تم نے آج پھر وہی کام کیا، جاؤ چلے جاؤ۔ میں پھر زمزم کے کنویں پر جا کر بیٹھ گیا، سانس برابر ہوا، پانی پیا، آرام کیا، تازہ دم ہوا تو میں نے سوچا رات پھر ادھر ہی رہوں گا اور ایک راؤنڈ اور ہونا چاہیے۔ رات سو گیا، صبح اسی وقت پھر مشرکین کے مجمع میں جا کر میں نے کلمہ پڑھ دیا، وہ پھر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ عباسؓ اس بار بھی تاک میں تھے، تیسری بار بھی انہوں نے مجھے چھڑایا اور کہا یہاں سے جاتے کیوں نہیں ہو، ان کے ہاتھوں مرنا ہے؟ اس طرح تین دن میں نے خود اپنی پلاننگ کے ساتھ مار کھائی اور پھر وہاں سے گیا۔

اس مسافر کا قصہ بڑا ایمان افروز قصہ ہے، میں نے اس قصہ کا خلاصہ بیان کیا ہے، تفصیلی قصہ بخاری شریف میں موجود ہے۔ اسے کہتے ہیں ایمان، اللہ رب العزت اس ایمان کی چھوٹی سی جھلک ہمیں بھی نصیب فرما دے۔

ایک اور مسافر کا قصہ سنانا چاہوں گا، وہ مسافر مدینے کے ہیں، حضرت ابو سعید خدریؓ انصاری صحابہ میں سے ہیں۔ کہتے ہیں ہم کچھ ساتھی سفر پر جا رہے تھے۔ پرانے زمانے ایسا

میں ہوتا تھا، راستے میں رات پڑ جاتی تو مسافر قریب کسی بستی میں جا کر آواز دیتے تھے کہ ہم مسافر ہیں روٹی کھلا دینا۔ اس وقت ہوٹل اور تندور وغیرہ تو ہوتے نہیں تھے، لوگ روٹی کھلا دیا کرتے تھے اور بستر بھی لا دیا کرتے تھے۔ جب سے بستر غائب ہونا شروع ہوئے تو لوگوں نے یہ بند کر دیا، ورنہ یہ ہوتا تھا۔ ابو سعیدؓ کہتے ہیں، ہم نے گاؤں کے باہر خیمہ لگایا اور گاؤں میں آواز دی کہ ہم چند مسافر ہیں، ہمیں کھانا کھلا دینا۔ انہوں نے کہا، کہاں سے آئے ہو؟ ہم نے بتایا مدینہ سے۔ انہوں نے کہا اچھا! محمد کے ساتھی ہو، صابی ہو، جاؤ تمہارے لیے کوئی روٹی نہیں ہے، بیٹھے رہو۔ بستی والوں نے کھانا دینے سے انکار کر دیا۔ ہم آکر بیٹھ گئے، اپنی تو پکا نہیں سکتے تھے، رات کو لیٹ گئے، بھوک میں نیند بھی کہاں آتی ہے۔ آدھی رات کا وقت ہوا تو گاؤں سے ایک دو آدمی آئے، کہنے لگے کہ ہمارے سردار کو سانپ یا بچھو وغیرہ نے ڈس لیا ہے وہ بیچارہ تڑپ رہا ہے، ہمارا کوئی علاج کامیاب نہیں ہو رہا، آپ میں سے کسی کے پاس کوئی دم ٹونہ وغیرہ ہو تو مہربانی کرو ہمارے ساتھ چلو، ہمارا سردار مر رہا ہے۔ ابو سعید کہتے ہیں میں نے کہا کہ میرے پاس ٹونہ اور دم ہے، میں دم کروں گا وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن ہم مسافر ہیں تم سے کھانا مانگا تم نے ہمیں کھانا نہیں کھلایا، اس لیے ایک سو (ایک روایت کے مطابق تیس) بکریاں لوں گا تب دم کروں گا ویسے دم نہیں کروں گا۔ انہوں نے کہا ہم بکریاں دے دیں گے۔ ابو سعیدؓ نے کہا نہیں! پہلے بکریاں دو پھر دم کروں گا۔ وہ مجبور تھے کیا کرتے، انہوں نے بکریاں لا کر دیں اور کہا اب ساتھ چلو دم کرو۔ حضرت ابو سعیدؓ نے جا کر اسے دم کیا تو وہ آدمی ٹھیک ہو گیا، ایسے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اب ان صحابہ نے خیمے میں آکر صلاح مشورہ کیا کہ بکریاں تو ہم نے غصے میں لے لی ہیں لیکن نہ معلوم یہ لینا درست تھا یا نہیں۔ کسی نے کہا، واپس کر دو۔ دوسرے نے کہا، ان کو تو واپس نہیں کریں گے۔ مدینہ چلتے ہیں، جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں سارا قصہ عرض کرتے ہیں، بکریاں پیش کرتے ہیں اور ان کا حکم معلوم کرتے ہیں، اس وقت تک استعمال نہیں کریں گے جب تک آپؐ اجازت نہ دے دیں۔ چنانچہ مدینہ پہنچے اور جا کر آپؐ کی خدمت میں سارا قصہ سنایا اور بکریاں پیش کیں کہ ان کا کیا حکم ہے، ہمارے لیے جائز ہیں یا نہیں؟ اگر جائز ہیں تو ہم آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر جائز نہیں ہیں تو بیت المال میں جمع کرا دیتے ہیں۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا، ٹھیک ہے یہ بکریاں تمہاری ہیں ان میں میرا حصہ بھی نکالو۔ یہ تسلی دینے کے لیے فرمایا کہ تمہارے لیے یہ جائز ہیں، پریشانی والی بات نہیں ہے۔

آپؐ نے پوچھا، دم کس نے کیا تھا؟ ابو سعیدؓ نے کہا، میں نے۔ آپؐ نے پوچھا، کیا پڑھا تھا؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تھا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا، تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سورہ فاتحہ دم ہے۔ ایک وہ منظر تھا ابو ذرؓ کے ایمان کا، اور ایمان کا ایک پہلو یہ ہے کہ ابو سعیدؓ نے کہا یا رسول اللہ! ایک دفعہ آپ کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ سورہ فاتحہ کا نام سورہ شفاء بھی ہے، بس ایمان تھا اور آپ کے فرمان پر یقین تھا، میں نے دم کر دیا اور اللہ نے ٹھیک کر دیا۔ یہ میں نے دو مسافروں کے قصے سنائے ہیں۔

جناب نبی کریمؐ نے بہت سفر کیے ہیں۔ دس سال میں ستائیس غزوے کیے، ایک سال میں اوسطاً پونے تین سفر بنتے ہیں، گویا آپؐ اکثر سفر میں ہی رہتے تھے۔ حضورؐ نے خود بھی بہت سفر کیے ہیں اور مسافروں کو بھی بہت سنبھالا ہے۔ حضورؐ کے پاس مدینہ منورہ میں ہر وقت مسافروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اصحاب صفہ مسافر ہی تھے۔ ایک چھتہ سا ڈال رکھا تھا جو حضورؐ کا مہمان خانہ تھا۔ اس میں چالیس سے اسی تک کی تعداد رہا کرتی تھی۔ یہ حضرات حضورؐ سے ملاقات اور آپؐ کی صحبت میں رہنے کے لیے آتے تھے، کئی کئی دن آپؐ کی خدمت میں رہتے تھے اور انصار مدینہ ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ کوئی دودھ لے آتا، کوئی کھجوریں لے آتا، کوئی انگور لا کر لٹکا دیتا، اور کبھی بھوکا بھی رہنا پڑتا تھا، ان میں سے ایک مسافر کا قصہ سناتا ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ اپنا قصہ سناتے ہیں کہ میں اصحاب صفہ میں سے تھا، کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا، پانی اور چند کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ کبھی کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک دن ایسے ہی سخت بھوک لگی ہوئی تھی لیکن حضورؐ کا مہمان تھا کسی سے مانگنا بھی نہیں تھا، بھوک سے لڑکھڑا رہا تھا۔ اتنے میں حضرت عمرؓ جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے ان کے پاس جا کر سلام کہا اور ان سے باتیں شروع کر دیں اور پوچھا کہ حضرت! قرآن کریم کی فلاں آیت کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے آیت کا مطلب رستے میں چلتے چلتے بتایا۔ ان کے دروازے تک پہنچے، حضرت عمرؓ نے گھر پہنچ کر دروازہ بند کر لیا، وہ اندر چلے گئے اور میں باہر رہ گیا۔ کہتے ہیں مجھے آیت کا مطلب معلوم تھا، آیت پوچھنا مقصد نہیں تھا، مقصد یہ تھا کہ میری آواز سن کر سمجھ جائیں گے کہ بھوکا ہے تو کھانا کھلا دیں گے۔ میرا داؤ کامیاب نہیں ہوا، وہاں سے لڑکھڑاتا ہوا واپس ہوا۔ جناب نبی کریمؐ نے دیکھ لیا، فرمایا، ابو ہریرہ! بھوک لگی ہوئی ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! بھوک سے برا حال ہے۔ آپؐ نے چہرہ سے اندازہ کر لیا تھا کہ

بھوک لگی ہوئی ہے۔ آپؐ گھر تشریف لے گئے، اپنے حجروں میں پوچھا کہیں کوئی کھانے کی چیز ہو تو ایک سافر بھوکا ہے۔ چوتھے یا پانچویں حجرے سے دودھ کا پیالہ لے کر آئے تو میری جان میں جان آئی۔ میں خوش ہوا کہ گزارہ ہو جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا، ابوہریرہ! جاؤ صفہ والوں کو بلا لاؤ۔ میں پریشان ہوا کہ یہ بھی گیا۔ ایک پیالہ دودھ کا ہے اور صفہ میں چالیس پچاس آدمی ہیں، مجھے اس میں سے کیا ملے گا۔ لیکن حضورؐ کا حکم تھا، میں گیا اور ان سے کہا، آپ کو حضورؐ بلاتے ہیں، سب آ گئے حضورؐ نے فرمایا، گھیرا ڈال کے بیٹھ جاؤ، سب بیٹھ گئے۔ آپؐ نے مجھے پیالہ دیا کہ ان کو پلاؤ۔ میں نے پلانا شروع کیا۔ ایک نے پیا، دوسرے نے پیا، پیالہ ویسے کا ویسا ہی رہا، حتیٰ کہ سب نے باری باری دودھ پی لیا لیکن پیالہ ویسے کا ویسا ہی دودھ سے لبریز رہا۔ پھر مجھے حضورؐ نے فرمایا، تم پیو۔ میں نے پیا۔ آپؐ نے فرمایا، اور پیو۔ میں نے اور پیا۔ پھر فرمایا، اور پیو۔ میں نے اور پیا، اتنا پیا، اتنا پیا کہ اب بھی (یعنی چالیس پچاس سال بعد جب واقعہ بیان کیا) حلق میں دودھ اچھلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ پھر حضورؐ نے باقی ماندہ خود پیا۔

آج میں نے دور نبویؐ کے دو تین مسافروں کے قصے سنائے ہیں۔ مسافر کے حقوق کے بارے میں آپؐ کا اسوۂ یہ ہے کہ اسے صحیح مشورہ دینا صحیح راستہ بتانا، جس کا ٹھکانہ کوئی نہ ہو اسے ٹھکانہ دینا، اور جو بھوکا پیاسا ہو اسے کھلانا پلانا اس کی خدمت کرنا یہ بڑے اجر و ثواب کی بات ہے، یہ بھی مہمان کی خدمت کی طرح ہی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں مسافروں کو سنبھالنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

سیرۃ النبیؐ اور سیاست و حکومت

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۲ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔

1. اس عنوان سے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا سیاست کا نبی سے اور نبی کا سیاست سے کوئی تعلق ہوتا ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہاں ہوتا ہے بلکہ دینی سیاست کی بنیاد ہی نبوت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ذکر کیا اور فرمایا، ہم نے ان کو نبوت بھی دی تھی، بادشاہت بھی دی تھی اور حکمت بھی دی تھی، چنانچہ انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام حضرت موسیٰؑ کے

بعد یوشع بن نونؑ سے لے کر حضرت زکریاؑ تک اکثر انبیاء حاکم اور قاضی بھی تھے۔ حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالی نے خلافت ارضی دی تھی، فرمایا "یا داود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض" (سورہ ص ۲۶)۔ یہ خلافت کون سی تھی؟ "فاحکم بین الناس بالحق" (سورہ ص ۲۶) یہ حکومت والی خلافت تھی جو اللہ تعالی نے حضرت داؤدؑ کو دی۔ جبکہ حضرت سلیمانؑ کو ایسی بادشاہت دی جس کی دعا کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "قال رب اغفرلی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی" (سورہ ص ۳۵) اے اللہ! ایسی بادشاہت دے جو میرے بعد کسی کو نہ ملے۔ اور واقعتا اللہ تعالی نے ان کو ایسی بادشاہت دی جو پھر کسی کو نہیں ملی۔ ہوا پر، جانوروں پر، پرندوں پر اور جنوں پر بھی ان کی حکومت تھی، اس ریاست کا نام اسرائیل تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی" کہ بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت انبیاء کرامؑ کرتے تھے، ایک نبی تشریف لے جاتے تو دوسرے نبی آجاتے، وہ جاتے تیسرے نبی آجاتے۔ پھر فرمایا "انہ لا نبی بعدی" میرے بعد نبی کوئی نہیں آئے گا۔ تو پھر سیاسی قیادت کون کرے گا؟ فرمایا "سیکون بعدی خلفاء" میرے بعد خلفاء سیاسی قیادت کرتے رہیں گے اور یہ تسلسل قائم رہے گا۔ یہ میں نے پہلی بات کی کہ دینی سیاست نبوت ہی کی بنیاد پر چلتی ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام امام، قاضی، معلم، حکمران اور سیاستدان سبھی کچھ ہوتے تھے۔ اکثر انبیاء سیاست کرتے آئے ہیں، خود جناب نبی کریمؐ نے حکومت و ریاست بنائی، جنگیں لڑیں، صلح کی، مقدمات کے فیصلے بھی کیے، جو کچھ سیاست میں ہوتا ہے سب کچھ حضورؐ نے کیا۔

2. دوسری گزارش یہ ہے کہ سیاست کا سب سے بڑا مقصد ریاست و حکومت قائم کرنا ہوتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضورؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اردگرد کے قبائل کو ملا کر ایک ریاست قائم کی جس کو ریاست مدینہ کہتے ہیں۔ اس ریاست میں حضورؐ کی حکومت تھی، رسول اللہ کی اس ریاست و حکومت کو سبھی تسلیم کرتے تھے، یہودی بھی، قبائل عرب بھی، اور مسلمانوں کے دونوں بڑے گروہ مہاجرین و

انصار بھی۔ آپؐ نے یثرب تشریف آوری سے پہلے ہی معاہدہ کر لیا تھا کہ حکومت میری ہوگی اور حکم میرا چلے گا۔ اس کو میثاق مدینہ کہتے ہیں جسے اوس اور خزرج دونوں نے قبول کر لیا تھا۔ ریاست مدینہ جب قائم ہوئی تو بحیرہ سمندر کی ساحلی پٹی پر قائم ہوئی تھی، اور جب حضورؐ کا وصال ہوا اس وقت یعنی اس دس سال کے عرصے میں یہ حکومت یمن، بحرین، نجران، نجد، حجاز یعنی پورے جزیرۃ العرب پر پھیل چکی تھی۔ یہ پورا علاقہ اس ریاست کا حصہ تھا۔ اور جب حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالی تو اس پورے خطے کی حکومت سنبھالی۔ یہ میں نے دوسری بات بیان کی کہ حضورؐ نے بھی مدینہ منورہ میں ریاست قائم کی اور وہ ریاست حضرات صحابہ کرامؓ کے حوالے کی۔

3. تیسری بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک سوال آج کل عام طور پر کیا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست کیسے قائم ہوتی ہے؟ نبی کریمؐ نے یثرب پر ریاست مدینہ کے نام سے حکومت قائم کی۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ نے قبضہ کر کے ریاست قائم کی تھی یا مذاکرات کر کے قائم کی تھی؟ مدینہ پر قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ مذاکرات تین سال چلتے رہے ہیں، بیعت عقبہ اولی، بیعت عقبہ ثانیہ، اور ان سے پہلے ایک سال۔ یہ تین سال گفتگو چلتی رہی، معاہدات طے ہوتے رہے، شرطیں طے ہوتی رہیں، بیعت لی جاتی رہی۔ تین سال تو اوس اور خزرج سے مذاکرات چلتے رہے جبکہ مدینہ آکر حضورؐ نے یہودیوں سے جنگ نہیں لڑی بلکہ صلح صفائی سے ریاست قائم کی۔ جنگ تو خیبر میں جا کر ہوئی۔ اسلامی ریاست کی بنیاد علاقے کے قبائل کو اعتماد میں لے کر رکھی گئی، اس ریاست مدینہ میں مسلمان بھی تھے، غیر مسلم بھی تھے، سب کو اعتماد میں لے کر ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ اس لیے اسلامی ریاست کی پہلی بنیاد قبضہ پر نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد باہمی اعتماد، مذاکرات اور صلح صفائی پر رکھی گئی ہے۔ میثاق مدینہ اعتماد سے قائم ہوا تھا، مسلط نہیں کیا گیا۔ اور اس کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالی تو کیا قبضہ کیا تھا؟ نہیں! لوگوں کے مشورے سے حکومت قائم کی تھی، حضرت عمرؓ کی حکومت بھی شوری سے قائم ہوئی تھی، آپؓ نے قبضہ سے حکومت نہیں لی تھی۔

اس پس منظر میں دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جو سیاسی حقوق دیے وہ کیا تھے؟ بنیادی دو حقوق کا ذکر کرتا ہوں:

1. پہلی بات یہ کہ آپؐ نے سرکاری فیصلوں اور مشاورت میں لوگوں کو شریک کیا۔ جس معاملے میں وحی نہیں آتی تھی اس میں مشورہ کرتے تھے اور صرف مشورہ کرتے ہی نہیں تھے مشورہ مانتے بھی تھے۔ بدر میں جب قیدیوں کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا تو مشورہ سے فیصلہ کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے تھی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیں، حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ ان کو قتل کیا جائے۔ آپؐ نے صحابہؓ کی رائے سنی اور پھر حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر فیصلہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ٹوک دیا کہ جناب یہ آپ نے کیا کیا؟ اب کر لیا ہے تو ٹھیک ہے لیکن کیوں کیا ہے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا، عمرؓ کی رائے ٹھیک تھی۔ فرمایا "ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض" (سورہ الانفال ۶۷)۔

غزوہ احد کے موقع پر آپؐ کو علم ہوا کہ قریش کا لشکر آ رہا ہے اور بہت بڑا لشکر ہے۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ مدینہ کے اندر رہ کر لڑنا چاہیے باہر نکل کر لڑنا چاہیے؟ لڑائی کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ شہر کے سارے راستے بند کر دیں تاکہ جب دشمن حملہ کرے تو سب مقابلہ کریں اس کو دفاعی جنگ کہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ کھلی جنگ کا ہوتا ہے کہ میدان میں جا کر مقابلہ کیا جائے۔ حضورؐ نے مشورہ لیا کیونکہ وحی نہیں آئی تھی، اللہ رب العزت بعض معاملات میں وحی نہیں بھیجتے تھے کہ مشورہ کرو، یعنی کبھی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو وحی نہیں بھیجی جاتی۔ مشورہ کیا تو دونوں رائیں سامنے آئیں، ایک یہ کہ میدان میں نکلتے ہیں، وہاں لڑیں گے کہ پہلے بدر میں ہمارا کچھ نہیں بگڑا اب کیا ہونا ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ بہت سوں نے کہا یا رسول اللہ! حالات ٹھیک نہیں ہیں اس لیے مدینہ کے اندر رہ کر لڑتے ہیں، یہاں یہ فائدہ ہو گا عورتیں اور بچے بھی لڑائی میں شریک ہوں گے، اوپر سے دشمن پر پتھر بھی پھینکیں گے۔ حضورؐ کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر لڑا جائے باہر نہ جائیں۔ اس رائے کا اظہار فرما دیا لیکن فیصلہ دوسری رائے پر کیا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑا جائے۔ حضورؐ صرف مشورہ کرتے نہیں تھے مشورہ مانتے بھی تھے۔ آپؐ نے حکم فرما دیا چلو

باہر جاکر لڑنا ہے تیاری کرو۔ آپؐ اندر گئے، تیار ہو کر باہر نکلے تو جن لوگوں نے اصرار کیا تھا کہ نہیں ہم باہر جاکر لڑیں گے ان کو خیال ہوا کہ ہم نے غلطی کی ہے، آپؐ کی رائے باہر جاکر لڑنے کی نہیں تھی، ہم نے رسول اللہ کو اپنی رائے پر مجبور کیا ہے، ہم نے ٹھیک نہیں کیا، ہمیں حضورؐ کی رائے کے مقابلے میں رائے قائم نہیں کرنی چاہیے تھی، ندامت و شرمساری ہوئی۔ حضورؐ سے عرض کیا یارسول اللہ! ہم سے غلطی ہو گئی ہے، ہم نے آپ کو اپنی رائے پر مجبور کیا ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اب مشورے کے بعد فیصلہ ہو چکا ہے، اب فیصلہ ہی مشورہ ہے۔ اب وہی ہو گا جو فیصلہ ہو چکا۔ میں نے یہ عرض کیا کہ رسول اللہؐ مشورہ کرتے ہی نہیں تھے مشورہ مانتے بھی تھے۔

ایک واقعہ اور عرض کرتا ہوں کہ مشورے کا طریقہ کار کیا تھا؟ اس بارے میں سنت نبویؐ کیا ہے۔ یہ بھی بخاری شریف کی روایت ہے حنین کی جنگ میں بنو ہوازن کو شکست ہوئی، بہت سے قیدی اور بہت سا مال غنیمت میں ملا۔ آپؐ نے قیدی اور مال غنیمت فوراً تقسیم نہیں کیے بلکہ انتظار کرتے رہے کہ اگر وہ لوگ ایمان لے آتے ہیں تو ان کو قیدی اور مال واپس کر دیں گے۔ سترہ دن انتظار کرتے رہے، وہ نہیں آئے تو حضورؐ نے قیدی بھی اور مال و دولت، سونا چاندی بھی تقسیم کر دیا۔ تقسیم کر دینے کے اگلے دن بنو ہوازن کا وفد آیا، یارسول اللہ ہم توبہ کرنے اور ایمان قبول کرنے آئے ہیں۔ مہربانی کر کے ہمارے قیدی اور ہمارا مال ہمیں واپس کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا، میں نے سترہ دن تمہارا انتظار کیا، تم نہیں آئے تو اب میں نے تقسیم کر دیے ہیں۔ تقسیم سے پہلے اختیار میرا تھا، تقسیم کے بعد جن کی ملکیت ہو چکی ہے، اختیار ان کا ہے۔ اب ان سے پوچھنا پڑے گا کہ واپس کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ لیکن تم چل کر آئے ہو تو تمہیں خالی واپس نہیں بھیجتا، میں ان سے بات کرتا ہوں۔ مگر تم ایک چیز اختیار کر لو یا قیدی واپس لے لو یا مال واپس لے لو۔ دونوں چیزیں واپس نہیں ملیں گی۔ انہوں نے کہا اگر دونوں چیزیں واپس نہیں کرتے تو پھر ایسے کریں کہ ہمیں قیدی واپس کر دیں، مال واپس نہ کریں۔ آپؐ نے فرمایا جن کی وہ ملکیت ہو چکی ہے میں ان سے پوچھوں گا۔ چنانچہ آپؐ نے لشکر اکٹھا کر لیا، بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ آپؐ

نے فرمایا یہ تمہارے بھائی آئے ہیں، توبہ کر کے ایمان قبول کرنے آئے ہیں۔ میں ان کا انتظار کرتا رہا ہوں، یہ وقت پر نہیں آئے، اب میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ ایک چیز واپس کروں گا۔ ان کا کہنا ہے کہ قیدی واپس کر دیں۔ لیکن قیدی اب تمہاری ملکیت ہو چکے ہیں، تم قیدی خوشی سے واپس کر دو تو تمہاری مرضی اور اگر نہیں جی چاہتا تو بھی واپس کر دو، میرے ذمے قرضہ رہا۔ اگلی جنگوں میں پہلے تمہارے قیدی ادا کروں گا، پھر تقسیم کروں گا۔ لشکر سے آواز آئی، یا رسول اللہ ہم راضی ہیں خوشی سے واپس کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، اس طرح تمہاری رضا، عدم رضا کا صحیح پتہ نہیں چل سکتا کہ سارے راضی ہیں یا نہیں ہیں۔ اس لیے سب اپنے خیموں میں جاؤ، تمہارے نمائندے (عرفاء) رات خیموں میں تم سے بات کریں گے اور مجھے صبح بتائیں گے کہ کون راضی ہے کون راضی نہیں ہے، تب فیصلہ کروں گا۔ ساری رات مشورے چلتے رہے۔ صبح کو سارے نمائندوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! سب راضی ہیں، تب حضورؐ نے فیصلہ کیا اور ان قیدیوں کو واپس کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام صحابہ کرامؓ سے رائے لیتے تھے، مشورہ لیتے تھے، جہاں سب سے اکٹھی رائے لینا ممکن نہیں ہوتا تھا وہاں نمائندوں کے ذریعے رائے لیتے تھے۔ آپؐ نے حکومتی معاملات میں عام لوگوں کو مشورے کا اور رائے دینے کا حق دیا، اور جائز مشورہ ہو تو اس کو ماننا بھی ہے، جبکہ مشورہ میں سب راضی ہیں یا نہیں اس کی تسلی بھی کرتے تھے۔

2. دوسرا بڑا سیاسی حق جو حضورؐ نے دیا جس پر آج تک بحث ہو رہی ہے، نبی کریمؐ سے پہلے حکمرانی کا نظام وحی کے ذریعے چلتا تھا، پیغمبر ہی حکمران ہوتا تھا اور پیغمبر وحی سے بنتا ہے۔ حضورؐ کے بعد وحی بند ہو گئی، اب پورے جزیرۃ العرب کی حکومت ہے، اس پر جو خلافت قائم ہوئی اس کا حاکم کون ہو گا؟ اس پر حضورؐ نے اشارے تو بہت کیے کہ میرے بعد ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوں گے، مصلے پر بھی کھڑا کیا، اشاروں میں کسر نہیں چھوڑی، لیکن مقرر نہیں کیا اور فرمایا کہ امت فیصلہ کرے گی۔ بخاری شریف کی روایت ہے ایک دفعہ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا، اپنے ابا جان کو اور بھائی عبد الرحمن کو بلا لاؤ کہ میں لکھ

دوں تاکہ بعد میں خواہ مخواہ کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ پھر فرمایا، چھوڑو رہنے دو۔ اور ایک جملہ فرمایا ''یابیٰ اللہ والمؤمنون الا ابا بکر'' اللہ بھی کسی اور کو نہیں بننے دے گا اور مسلمان بھی ابوبکر کے سوا کسی کو نہیں بنائیں گے۔ یہ حکم نہیں تھا، خبر تھی کہ مسلمان خود ہی فیصلہ کریں گے اور ان کا فیصلہ درست ہو گا، اور یہ مسلمانوں کی عمومی رائے پر اعتماد کا اظہار بھی تھا۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلافت کا فیصلہ کس نے کیا؟ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت نہ قبضہ کر کے سنبھالی اور نہ خاندان کی بنیاد پر کہ میرے خاندان کا حق ہے، بلکہ مشورے سے آپ خلیفہ بنائے گئے۔ آپؓ کی حکومت کا جواز مشورہ تھا اور سقیفہ بنی ساعدہ میں صرف مشورہ نہیں ہوا بلکہ سامنے دوسرا امیدوار بھی موجود تھا اور وہ تھے سید الانصار حضرت سعد بن عبادہؓ جو خزرج کے سردار تھے۔ انصار مدینہ تقریباً فیصلہ کر چکے تھے کہ حضرت سعدؓ کو خلیفہ بنانا ہے، صرف بیعت باقی تھی۔ یہ تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وقت پر پہنچ گئے اور معاملہ سنبھال لیا ورنہ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ وہاں مذاکرات ہوئے، بحث مباحثہ ہوا۔ حتیٰ کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے کہا، خلیفہ تو قریش میں سے ہو گا تو حباب بن منذر نے کہا ''منا امیر و منکم امیر'' ایک امیر تمہارا ہو گا اور ایک امیر ہمارا ہو گا۔ تم اپنا منتخب کرو، ہم اپنا منتخب کرتے ہیں، دونوں مل کر حکومت کریں گے۔ جب اس کو تسلیم نہیں کیا گیا تو اگلی پیشکش بھی ہوئی، سعد بن عبادہؓ نے کہا ''انتم الامراء و نحن الوزراء'' امیر آپ ہو جائیں اور وزیر ہم ہوں گے۔ اس ماحول میں بات ہوئی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالی تو امت کے اعتماد کے ساتھ۔ یہ دوسرا سیاسی حق دیا کہ حکومت اب وحی سے نہیں بنے گی، اب امت کے اجتماعی اعتماد پر حکومت بنا کرے گی۔

آج میں نے یہ بیان کیا کہ حضورؐ نے اپنی ریاست میں لوگوں کو سیاسی حقوق کی کیا بنیادیں فراہم کیں۔ آپؐ نے ان کو رائے کا حق بھی دیا، مشورے کا حق بھی بحال کیا اور حکومت کے قیام کا حق بھی دیا۔

سیرۃ النبیؐ اور انسانی حقوق

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱ فروری ۲۰۱۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ گزشتہ سال کی فکری نشستوں میں وہ نمایاں شخصیات جن کے ساتھ میں نے وقت گزارا ان کا تذکرہ ہوا، اس سال ان فکری نشستوں کا موضوع یہ ہے کہ انسانی معاشرت، سوسائٹی اور سماج کے حوالے سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟ حضورؐ کی سیرت طیبہ کیا ہے؟ حضورؐ کا معمول کیا رہا ہے؟ اس کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوگی۔ آج کا موضوع ہے ''سیرۃ النبیؐ اور انسانی حقوق'' کہ انسانوں کے باہمی حقوق کے بارے میں آپؐ کا طرز عمل کیا تھا؟ آج کی دنیا میں انسانی حقوق سب سے بڑا موضوع ہے اور یہ آج کی دنیا میں بات کہنے کا ایک بڑا ہتھیار بھی ہے، بالخصوص اس حوالے سے کہ آپ جب بھی دنیا کے کسی کونے میں اسلامی شریعت کی بات کرتے ہیں تو اسے انسانی حقوق کے خلاف کہہ دیا جاتا ہے، وہ الگ موضوع ہے لیکن سر دست میں اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ انسانی حقوق ہیں کیا؟ اور جناب نبی کریمؐ کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟

انسانی حقوق کے بارے میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ ہماری اصطلاح ''حقوق اللہ اور حقوق العباد'' کے عنوان سے ہے۔ قرآن کریم نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بات کی ہے کہ اللہ کا حق کیا ہے؟ اور بندوں کا حق کیا ہے؟ جبکہ مغرب کی اصطلاح ''انسانی حقوق'' کی ہے، مغرب خدا کے حقوق کی بات نہیں کرتا، ان کے ہاں خدا کا تصور ہو یا نہ ہو ایک ہی بات ہے، خدا کا کوئی حق ہے یا نہیں ہے ایک ہی بات ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا حق اللہ کا ہے، اس کے بعد بندوں کے حقوق ہیں۔ قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالی نے یہ ترتیب بیان کی ہے کہ حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق العباد بھی ہیں۔ ابھی سورۃ الماعون کی تلاوت ہوئی ہے، اس میں چار حق بیان ہوئے ہیں۔ ایک اللہ کا اور تین بندوں کے۔ یتیم کو دھتکارنا، یہ کام کافر کرتا ہے مسلمان کا یہ کام نہیں، جو دین (قیامت) کو جھٹلاتا ہے وہ ہی یتیموں کو دھکے دیتا ہے، ایماندار اور دیندار آدمی یتیم کو دھکے نہیں دیتا۔ یہ بندوں کے حق کا ذکر ہوا۔ مسکین اور محتاج کو کھانا کھلانا، یہ بھی بندوں کا حق ہے۔ اس کے بعد نماز کا ذکر ہے کہ نماز اللہ کا حق ہے۔ نماز نہ پڑھنا اللہ کی حق تلفی ہے۔ نماز میں سستی کرنا اللہ کی حق تلفی ہے۔ اس کے بعد فرمایا ''ویمنعون الماعون'' (سورہ الماعون ۷) آپس میں استعمال کی چیزیں ایک دوسرے کو دینی چاہئیں، یہ بھی انسانی حقوق میں سے ہے۔ میں نے

خلاصہ بیان کیا کہ اس چھوٹی سی سورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے حقوق کا ذکر فرمایا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا۔

اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق قرآن کریم میں اور بھی بہت سے مقامات پر ذکر فرمائے گئے ہیں۔ ایک اور آیت پڑھ دیتا ہوں جس میں اللہ رب العزت نے ترتیب سے ذکر فرمایا ہے کہ حقوق اللہ کیا ہیں اور حقوق العباد کیا ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وماملکت ایمانکم“ (سورہ النساء ۳۶)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حقوق کے دس دائرے بیان کیے ہیں جن میں پہلا حق اپنا بیان کیا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور نو حق بندوں کے بیان کیے ہیں۔ ان کو دائروں میں تقسیم کر کے پہلے والدین کا حق بیان کیا کہ ان کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آؤ، پھر قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریبی پڑوسیوں، وہ پڑوسی جو رشتہ دار نہیں ہے ”صاحب بالجنب“ سبق کا ساتھی، سفر کا ساتھی، کمرے کا ساتھی وغیرہ، اور مسافروں اور غلاموں کے حقوق درجہ بدرجہ بیان فرمائے ہیں۔ حقوق میں پہلا حق اللہ کا بیان ہوا، پھر نو حق بندوں کے ذکر ہوئے۔ آج لوگ بندوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں لیکن پہلا حق اللہ کا ہے۔ بڑی تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بیان فرمایا۔ یہاں قریبی رشتہ داروں سے حسن سلوک کی بات ہوئی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ”وات ذالقربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل“ (سورہ الاسراء ۲۶) قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرو، یہ تمہارا احسان نہیں ان کا حق ہے، مسکین اور مسافر پر خرچ کرو، یہ تمہارا احسان نہیں ہے ان کا حق ہے۔

ایک بات میں نے یہ کہی ہے کہ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بات کرتے ہیں، اور اتنی تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دوسرا قانون اس تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کرتا مگر ہم قرآن اس لیے پڑھتے ہی نہیں کہ یہ ہم سے کہتا کیا ہے، ہم تو ثواب اور برکت کے لیے پڑھتے ہیں اور وہ ہمیں مل جاتی ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ حقوق کے حوالے سے کیا ہے؟ اس پر بیسیوں احادیث ہیں، دو ذکر کروں گا۔ حقوق کے حوالے سے بخاری شریف میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حقوق کے بارے میں حضورؐ کی سنت اور ذوق کیا ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کا واقعہ ہے۔ آپ پہلے

مجوسی تھے، پھر عیسائی ہوئے، ایک طویل عرصہ عیسائی رہے، پھر یہودیوں کے ایک خاندان کے غلام بنے اور کافی عرصہ غلامی کا گزارا، کہتے ہیں کہ باری باری دس مالکوں کے پاس رہا ہوں۔ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے غلام کے طور پر آئے تھے لیکن یہ غلامی تو آپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی، آپ کی قسمت کہ ادھر سے یہ مدینہ پہنچے اور ادھر سے حضورؐ قبا میں تشریف لے آئے، اور پھر انہوں نے اپنی آزادی خریدی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دو آدمیوں کے لیے غلامی اللہ کی بہت بڑی نعمت کا سبب بنی، جیسے حضرت یوسفؑ کے لیے غلامی بادشاہت کا ذریعہ بنی تھی، اسی طرح حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کے لیے۔ زید بن حارثہؓ غلام بن کر مکہ آئے تھے اور پھر اس مقام پر پہنچے کہ حضورؐ نے ابو زید کہلانا شروع کر دیا تھا۔ اور حضرت سلمان فارسی بھی یہودیوں کے غلام بن کر مدینہ منورہ آئے تھے۔ اسی وجہ سے مدینہ میں رہتے ہوئے بدر اور احد میں شریک نہیں ہو سکے، البتہ آزاد ہونے کے بعد غزوۂ خندق میں شریک ہوئے تھے اور خندق انہی کے مشورے سے کھودی گئی تھی۔ حضرت سلمان فارسیؓ جب مدینہ منورہ آئے تو مہاجر تھے، جناب نبی کریمؐ نے حضرت ابوالدرداءؓ سے ان کی مواخات کرا دی، جیسے حضورؐ کا مواخات کرانے کا معمول تھا۔ باہر سے آنے والے سینکڑوں ہزاروں لوگ ہوں اور ایک آدمی کو ایک خاندان سنبھال لے، یہ تو آسان ہے، اور سب کے لیے اکٹھا انتظام کرنا بہت مشکل ہے۔ حضورؐ نے بڑی حکمت عملی سے ایک مہاجر اور ایک انصاری کو بھائی بھائی بنا دیا۔

حضرت سلمان فارسیؓ کو حضرت ابوالدرداءؓ کے حوالے کر دیا۔ حضرت ابوالدرداءؓ نوجوان آدمی تھے اور حضرت سلمان فارسیؓ عمر رسیدہ تھے، آپؓ کی عمر کے بارے میں اڑھائی سو سال کی بھی روایت ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے جو محتاط روایت ذکر کی ہے وہ ایک ا ۸۰ سال کی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب آپ مسلمان ہوئے تو ڈیڑھ سو سال کے تھے اور جہاندیدہ آدمی تھے، کئی مذہب بھگتے ہوئے تھے۔ حضرت ابوالدرداءؓ آپ کو اپنے گھر لے کر گئے، وہاں جا کر حضرت سلمان فارسیؓ نے دیکھا کہ گھر میں گھر والی کوئی بات نہیں ہے۔ ام الدرداءؓ کو دیکھا کہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، گھر کی کوئی صفائی نہیں ہے۔ حالانکہ عورت گھر میں ہو تو گھر کی حالت سے پتہ چلتا ہے کہ اس گھر میں کوئی عورت رہتی

ہے۔ وہ مکان کو صاف رکھے گی، پردے لٹکائے گی، زیب وزینت کا اہتمام کرے گی، یہ عورت کی فطرت ہے، لیکن وہاں تو گھر والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ نے جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ام الدرداءؓ سے بات کی اور کہا کہ یہ اپنا کیا حال بنا رکھا ہے، نہ ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، اور گھر کیا حال کر رکھا ہے، کوئی چیز سلیقے سے نہیں رکھی ہوئی۔ ام الدرداءؓ نے جواب دیا کہ بھائی جان! بات یہ ہے کہ عورت سنورتی بھی ہے، گھر کو سنوارتی بھی ہے لیکن کسی کے لیے سنورتی اور سنوارتی ہے۔ آپ کے بھائی کو کسی بات سے دلچسپی ہی نہیں ہے، میں بھی گزارا کر رہی ہوں، وہ بھی گزارا کر رہے ہیں۔ یہ پہلی بات حضرت سلمان فارسیؓ نے اس گھر میں نوٹ کی۔ دوپہر کا وقت ہوا تو حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے لیے دسترخوان بچھایا اور کھانا لگایا اور کہا لیجیے کھانا کھائیے۔ انہوں نے کہا تم بھی آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ ابوالدرداءؓ نے کہا میرا تو روزہ ہے، میں ہمیشہ روزہ رکھتا ہوں۔ انہوں نے دوبارہ کہا آؤ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔ ابوالدرداءؓ نے پھر انکار دیا کہ میرا روزہ ہے۔ اس پر حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا اچھا ٹھیک ہے، دسترخوان اٹھا لو میں بھی نہیں کھاتا، تم کھاؤ گے تو میں کھاؤں گا۔ اب حضرت ابوالدرداءؓ مجبور ہو گئے کیونکہ مہمان کے سامنے سے دسترخوان کیسے اٹھاتے! لہذا حضرت ابوالدرداءؓ کو روزہ توڑنا پڑا اور حضرت سلمان فارسیؓ کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے، اور شرعی مسئلہ بھی یہی ہے۔

یہاں میں ایک اصول عرض کروں گا کہ حقوق اللہ بھی ضروری ہیں اور حقوق العباد بھی ضروری ہیں، لیکن دونوں کی ترتیب یہ ہے کہ فرائض و واجبات میں حقوق اللہ مقدم ہیں، جبکہ مباحات اور مستحبات میں حقوق العباد مقدم ہیں۔ فقہاء یہ مسئلہ لکھتے ہیں کہ فرض روزہ کسی کے لیے بھی توڑنا جائز نہیں، جبکہ نفلی روزہ مہمان کے اکرام میں توڑنا پڑے تو توڑ دیں اور پھر اس کی قضاء کریں کہ مہمان کا حق زیادہ ہے۔ چنانچہ حضرت ابوالدرداءؓ روزہ توڑ کر مہمان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے، حضرت سلمان فارسیؓ نے یہ دوسرا کام کیا کہ ان کا روزہ تڑوایا۔ رات کو سونے کا وقت ہوا تو حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کو بستر بچھا کر دیا کہ آپ آرام فرمائیں۔ انہوں نے پوچھا تمہارا کیا پروگرام ہے؟ کہا، میں تو ساری رات نفل پڑھتا ہوں، رات کو سوتا نہیں ہوں، عبادت کرتا ہوں۔ فرمایا، بستر لاؤ اور میرے ساتھ آرام کرو۔ انہوں نے کہا حضرت! یہ میرا معمول نہیں ہے۔ فرمایا، معمول

ہے یا نہیں بستر ادھر لاؤ اور آرام کرو۔ مجبوراً ان کو بستر پر لیٹنا پڑا۔ درمیان میں ایک بات کہتا ہوں کہ حضرت سلمان فارسیؓ حضرت ابوالدرداءؓ کے بڑے بھائی بنائے گئے تھے اور بڑا بھائی تو بڑا بھائی ہی ہوتا ہے، بڑے بھائی کا دبکا مشہور ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ خود کہتے ہیں، میں یہ سوچ کر لیٹ گیا کہ تھوڑی دیر بعد جب حضرت سلمان فارسیؓ سو جائیں گے تو میں اٹھ کر مصلے پر چلا جاؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھنے کی کوشش کی تو حضرت سلمان فارسیؓ جاگ رہے تھے، کہنے لگے کدھر جا رہے ہو؟ آرام سے سو جاؤ۔ صبح سحری کے وقت حضرت سلمان فارسیؓ اٹھے، مجھے بھی اٹھایا کہ یہ وقت ہے عبادت کا، اٹھو تم بھی نفل پڑھو، میں بھی پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد پروگرام یہ بنا کہ فجر کی نماز مسجد نبوی میں جا کر آنحضرتؐ کے پیچھے پڑھیں گے۔ مسجد جانے لگے تو حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت ابوالدرداءؓ کو ایک نصیحت کی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ اسلام کے فلسفہ حقوق کی بنیاد حضرت سلمان فارسیؓ کی اس نصیحت پر ہے۔ انہوں نے حضرت ابوالدرداء کو مخاطب کر کے فرمایا ”ان لربک علیک حقا ولنفسک علیک حقا ولزوجک علیک حقا ولزورک علیک حقا فاعط کل ذی حق حقہ“ تیرے رب کے تجھ پر حقوق ہیں، تیری جان کے تجھ پر حقوق ہیں، تیری بیوی کے تجھ پر حقوق ہیں، تیرے مہمان کے تجھ پر حقوق ہیں، دین یہ ہے کہ ”فاعط کل ذی حق حقہ“ ہر حق والے کو اس کا حق وقت پر ادا کرو۔ اللہ کے حق کے وقت میں اللہ کا حق، جان کے حق کے وقت میں جان کا حق، کھانا پینا سونا وغیرہ یہ جان کے حق ہیں، بیوی کے حق کے وقت میں بیوی کا حق، اور مہمان کے حق کے وقت میں مہمان کا حق۔ ہر حق والے کو اس کا حق اس کے وقت پر ادا کرو، یہ ہے دین۔ یہ نصیحت کی اور اور پھر دونوں بھائی جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فجر کی نماز مسجد نبوی میں آنحضرتؐ کے پیچھے ادا کی۔

نماز فجر کے بعد حضورؐ کا معمول یہ ہوتا تھا کہ مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھتے تھے، اشراق کے وقت تک بیٹھے رہتے تھے۔ یہ متفرق کاموں کی مجلس ہوتی تھی، اسے میں آج کی اصطلاح کے حوالے سے کھلی کچہری کہا کرتا ہوں۔ کوئی متعیّن کام نہیں ہوتا تھا، کوئی نئی وحی آئی ہوتی تو اس وقت سنا دیتے، کسی نے خواب دیکھا ہوتا تو اس کی تعبیر پوچھ لیتا، کوئی مہمان آیا ہے تو اس کا حال احوال پوچھ لیا جاتا، کوئی خاص ہدایات دینی ہوتیں تو وہ دے دیتے، اور سمرۃ بن جندبؓ کہتے ہیں کہ کوئی اور کام نہیں ہوتا تھا تو ہم گپ شپ کرتے رہتے

تھے۔ اشراق تک یہ مجلس ہوتی تھی، اس کے بعد آپؐ گھر تشریف لے جاتے تھے، بلکہ بسا اوقات حضورؐ خود پوچھتے تھے کسی نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا۔

ایسے ہی اس دن حضورؐ مقتدیوں کی طرف متوجہ ہوئے تو حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کو دیکھا تو ان کو بلا لیا۔ حضرت ابوالدرداءؓ سے پوچھا، بھائی کیسا لگا؟ آپس میں مزاج ملا؟ حضرت ابوادرداءؓ پچھلے ایک دن سے بھرے بیٹھے تھے، موقع ملتے ہی ساری کارگزاری سنا دی کہ یارسول اللہ! انہوں نے جاتے ہی میری بیوی سے انٹرویو کیا، پھر میرا روزہ تڑوا دیا، رات کو مجھے نفل نہیں پڑھنے دیے، مجھ سے زبردستی نیند کروائی، صبح کو یہ نصیحت کی اور ہم یہاں آ گئے ہیں۔ اس پر جناب نبی کریمؐ نے ایک جملہ کہا ”صدق سلمان“۔ صدق فعل پر بھی لگتا ہے اور قول پر بھی لگتا ہے۔ مطلب یہ کہ سلمان نے جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے اور جو کہا ہے ٹھیک کہا ہے۔ اس سے پہلے یہ جملے حضرت سلمانؓ کی نصیحت تھی ”ان لربک علیک حقا ولنفسک علیک حقا ولزوجک علیک حقا ولزورک علیک حقا فاعط کل ذی حق حقہ“۔ لیکن حضورؐ کے ”صدق سلمان“ کہنے سے یہ جملے مرفوع حدیث ہو گئے ہیں۔

یہ جناب نبی کریمؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ کے حق کے لیے بندوں کے حق نہ مارو، اور بندوں کے حق کے لیے اللہ کا حق نہ مارو، ہر ایک کا حق ادا کرو۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بنیاد قرآن کریم کی ”واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا“ والی آیت ہے اور سلمان فارسیؓ کے یہ جملے ہیں، اور اس میں بھی ترتیب وہی ہے کہ پہلے حقوق اللہ کا ذکر ہے پھر حقوق العباد کا۔

ایک اور روایت ذکر کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ حق کا شعور کیا ہوتا ہے اور حق کا یہ احساس و شعور کس نے پیش کیا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، مجلس لگی ہوئی تھی، آپ کی دائیں جانب حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے ہوئے تھے جو حضورؐ کے چچازاد بھائی ہیں اور شاگرد ہیں، ایک رشتے میں بھانجے بھی لگتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ ان کی حقیقی خالہ ہیں۔ جبکہ حضورؐ کی بائیں جانب حضرت صدیق اکبرؓ بیٹھے ہوئے تھے جو کہ اکبر الصحابۃ، افضل الصحابۃ ہیں۔ مجلس میں حضورؐ کو پیالے میں کوئی مشروب پیش کیا گیا۔ حضورؐ نے نوش فرمایا، آخر میں کچھ گھونٹ بچ گئے یا بچا لیے، اب یہ کسی کو دینے تھے۔ حضورؐ کے بیان کردہ قانون کے مطابق یہ دائیں والے کا حق بنتا ہے ”الایمن فالایمن“ اور

دائیں طرف ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا، یعنی عبد اللہ بن عباسؓ جو کہ حضورؐ کی وفات کے وقت پندرہ سال کے تھے۔ حق ان کا بنتا تھا مگر جی چاہ رہا تھا بائیں طرف دینے کو، تو جناب نبی کریمؐ نے عبد اللہؓ سے اجازت مانگی کہ عبد اللہ! اجازت ہو تو بائیں طرف دے دوں۔ وہ بھی عبد اللہؓ تھے، کہا، یا رسول اللہ! یہ آپ کا تبرک ہے، اس میں کسی کو میں اپنے اوپر ترجیح نہیں دیتا، یہ میرا حق ہے مجھے دیجیے۔ عبد اللہؓ نے حضورؐ کو اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ دیکھیں کہ حق کا شعور کسے کہتے ہیں، روایت کے الفاظ یہ ہیں 'فتلہ فی یدہ'' حضورؐ نے زور سے تھمایا اس کے ہاتھ میں کہ لے پکڑ۔ حضورؐ کا جی بائیں جانب دینے کو چاہ رہا تھا، اجازت مانگی تو اجازت نہیں ملی، غصہ بھی آیا، پیالہ دیا بھی غصے سے، لیکن دیا اسی کو ہے جس کا حق تھا۔ یہ آپؐ کا اسوہ ہے کہ جس کا حق ہے اسی کو ملنا چاہیے۔ وہ اجازت دے تو دوسرا لے سکتا ہے، وہ اجازت نہ دے تو کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔

ایک اور روایت ذکر کر دیتا ہوں، بخاری شریف کی روایت ہے جو ''حدیث بریرہ'' کہلاتی ہے۔ بریرہؓ ایک خاندان کی لونڈی تھیں۔ خاندان والوں نے مغیثؓ نامی نوجوان سے ان کی شادی کر دی۔ مالک اپنی لونڈی کی کہیں شادی کر دے اس کا حق ہے۔ بریرہؓ نے خاندان والوں سے بات کی کہ اگر تم میرا سودا کر لو، میری قیمت طے کرو تو میں تمہیں قیمت محنت مزدوری کر کے دے دیتی ہوں، جسے فقہی اصطلاح میں مکاتبت کہتے ہیں۔ انہوں نے بات منظور کر لی اور نو اوقیہ طے ہوئے نو قسطوں میں۔ بریرہؓ نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں جا کر عرض کیا، اماں جان! یہ میرا سودا ہوا ہے، میرے ساتھ کچھ تعاون کیجیے تاکہ مجھے آزادی مل جائے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا بیٹا اگر میں ساری قسطیں اپنی طرف سے دے کر تمہیں خرید لوں اور تمہیں آزاد کر دوں، یہ سودا تمہارے خاندان والوں کو منظور ہے؟ ان سے بات کر لو میں یکبارگی سارے پیسے دے دیتی ہوں اور تمہیں آزاد میں کروں گی۔ حضرت عائشہؓ نے خرید کر آزاد کر دیا، اب وہ حضرت عائشہؓ کی خادمہ بن گئیں۔ آزاد ہونے کے ساتھ ہی ان کو ایک اور حق حاصل ہو گیا جسے خیارِ عتق کہتے ہیں۔ نکاح کے وقت آزاد بالغ عورت کو تو انکار کا اختیار ہوتا ہے لیکن لونڈی کو یہ اختیار نہیں ہوتا۔ مالک نے لونڈی کا اپنی مرضی سے کہیں نکاح کر دیا ہو، لونڈی جب آزاد ہوتی ہے تو اس کا وہ حق بحال ہو جاتا ہے، اب اس کی مرضی ہے کہ خاوند کے ساتھ رہے یا نہ رہے۔ بریرہؓ جب آزاد ہوئیں تو وہ سمجھدار تھیں اور مسئلہ مسائل جانتی تھیں، انہوں نے مغیثؓ کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا کہ اب ہمارا

نکاح ختم۔ مغیثؓ صاحب بہت پریشان ہوئے کہ یہ کیا ہوا اور کہا کہ ایسا نہ کرو، لیکن بریرہؓ نے کہا یہ میرا حق ہے اور میں نے اپنا حق استعمال کر لیا ہے۔ مغیثؓ بہت زیادہ پریشان ہوئے، کچھ دن تو سفارشیں بھیجتے رہے، لیکن بریرہؓ نے کسی کی سفارش نہ مانی۔

ایک دن آنحضرتؐ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ مدینہ منورہ کے کسی محلے سے گزر رہے تھے تو مغیثؓ کو دیکھا کہ گلیوں میں دیوانہ وار پھر رہا ہے، آنسو بہہ رہے ہیں اور روتے ہوئے آوازیں دے رہا ہے، کوئی اللہ کا بندہ ہے جو بریرہ کو منا دے، میرا گھر اجڑ گیا ہے۔ حضورؐ نے ساتھی سے کہا کہ اس بیچارے کا حال دیکھو یہ اس کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے، اور وہ اس کا نام بھی نہیں سننا چاہتی۔ اللہ کی قدرت ہے اللہ کے کاموں میں کون دخل دے۔ یہ منظر دیکھ کر جناب نبی کریمؐ کو مغیثؓ پر ترس آیا اور آپؐ نے مغیثؓ کی سفارش کرنے کا فیصلہ کیا اور ایسے وقت میں سفارش کرنی بھی چاہیے۔ میں کہا کرتا ہوں ایسے وقت میں کسی کی سفارش کرنا سنت ہے، کسی کی ایسی حالت ہو جائے تو اسے دھکے نہیں مارنے چاہئیں بلکہ سفارش کرنی چاہیے۔ آپؐ نے سفارش کا فیصلہ کیا اور گھر تشریف لائے۔ بریرہؓ کو بلایا اور فرمایا مغیثؓ کا کیا قصہ ہے؟ انہوں نے کہا، یارسول اللہ میں نے اپنا حق استعمال کیا ہے اور مغیثؓ کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپؐ نے سفارش کرنا چاہی تو بریرہؓ نے کہا، یارسول اللہ! کیا یہ میرا حق نہیں تھا؟ فرمایا، حق تو تھا۔ کہا، اب میری مرضی میں اس کے ساتھ رہوں یا نہ رہوں۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ جناب نبی کریمؐ نے بریرہؓ سے کہا، بریرہ! کوئی نظر ثانی کی گنجائش ہے تو نظر ثانی کر لو، اس بیچارے کا بہت برا حال ہے۔ یہاں آپ حضرات ذرا غور کریں کہ سفارش کون کر رہا ہے اور کس سے سفارش کر رہا ہے۔ آنحضرتؐ خود سفارش کر رہے ہیں گھر کی خادمہ سے۔ فرمایا، بریرہ! یہ فیصلہ واپس لے سکتی ہو؟ وہ بھی حضرت عائشہ کی شاگرد تھی، کہا یارسول اللہ! یہ آپ حکم فرما رہے ہیں یا مشورہ دے رہے ہیں؟ یہ فرق وہ جانتی تھی کہ حکم کا درجہ کیا ہوتا ہے اور مشورے کا درجہ کیا ہوتا ہے۔ اگر آپؐ حکم دے دیں تو کس مسلمان کی مجال ہے کہ اس کا انکار کر سکے، اور مشورہ ہو تو اس میں اختیار ہوتا ہے کہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ حضورؐ نے فرمایا، حکم نہیں ہے مشورہ ہے۔ یہ سنا تو فوراً بولی ''لاحاجۃ لی'' مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس موقع پر کانپ جاتا ہوں کہ کون انکار کر رہا ہے اور کس کے سامنے کر رہا ہے۔ مگر اسی پر قصہ ختم ہو گیا۔ یہ ہے حق کا احساس۔ آج دنیا میں عورتوں اور بچوں کے حقوق کا شور مچا ہوا ہے،

بچوں کے حق کی بات اور عورتوں کے حق کی بات، یہ بات آپ حضرات کی سمجھ میں آئی ہے کہ سب سے پہلے یہ حقوق کس نے پیش کیے ہیں؟

آج میں نے قرآن کریم کی دو آیتیں اور آپؐ کی سیرت مبارکہ کے بیسیوں واقعات میں سے دو واقعے ذکر کیے ہیں کہ حقوق کے بارے میں قرآن کریم کا تصور اور مزاج کیا ہے اور حضورؐ کا مزاج اور سنت مبارکہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

کیا ریاست و حکومت کا قیام شرعی فریضہ نہیں ہے؟

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۶ جنوری ۲۰۱۸ء)

قرآن کریم کا اسلوب کسی مسئلہ کے بارے میں سارے معاملات یکجا ذکر کرنے کا نہیں ہے بلکہ کسی ایک موضوع یا مسئلہ کے حوالہ سے مختلف مقامات پر متنوع لہجوں میں متفرق ارشادات ملتے ہیں۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کریم مسلسل تئیس سال تک تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا ہے اور موقع محل کے مطابق اس کے ارشادات میں اجمال و تفصیل اور اسالیب کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اسی لیے تفسیر قرآن کریم میں ہمیں پہلا اصول یہ پڑھایا جاتا ہے "یفسر بعضہ بعضا" کہ قران کریم کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر و تشریح کرتا ہے۔ چنانچہ کسی مسئلہ میں قرآن کریم کا حتمی حکم معلوم کرنے کے لیے اس کے تمام متعلقہ مقامات و آیات کو دیکھنا ضروری ہے کیونکہ محض ایک دو آیتوں کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کر لینے سے مغالطے اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

خوارج کا یہ ذوق رہا ہے کہ وہ کسی عنوان پر قرآن کریم کی ایک دو آیات کو دیکھ کر ان کے بارے میں دیگر آیات کریمہ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی طرف توجہ کیے بغیر ایک موقف قائم کر لیتے تھے اور پھر اسی پر ڈٹ جاتے تھے جو عام طور پر گمراہی کا ماحول پیدا کر دیتا تھا۔ حدیث و تاریخ کے ذخیرے میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں سے ہم سر دست ایک کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ مسلم شریف میں کتاب الایمان کی روایت کے مطابق ایک تابعی بزرگ حضرت یزید الفقیرؒ اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ بعض دیگر ساتھیوں کے ہمراہ خارجیوں کی اس رائے سے متاثر ہو گئے تھے کہ جہنم میں جانے والا کوئی شخص وہاں سے باہر نہیں آسکے گا اس لیے یہ شفاعت وغیرہ کی باتیں بے

مقصد ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حج کے موقع پر وہ اپنے ایسے ہی چند ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ آئے تو حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی مجلس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوگئی، وہ ان لوگوں کا تذکرہ کر رہے تھے جو شفاعت کی وجہ سے جہنم سے نکل کر جنت میں جائیں گے۔ ہمارے ذہنوں میں مذکورہ خیال اتنا راسخ تھا کہ ہم نے حضرت جابرؓ سے سوال کر دیا کہ قرآن کریم جب یہ کہتا ہے کہ (۱) ''وہ لوگ جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے لیکن نکل نہیں سکیں گے'' (۲) ''اور جب کبھی وہ جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے انہیں واپس دھکیل دیا جائے گا'' تو آپ بزرگ یہ شفاعت کی کیا باتیں کرتے ہیں؟ حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے قرآن کریم پڑھا ہے اس میں ایک جگہ ''مقام محمود'' کا ذکر ہے، وہ کیا ہے؟ ہم خاموش رہے تو فرمایا یہ مقام محمود شفاعت کا مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے اور آپؐ کی شفاعت سے بے شمار لوگ جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، یہ بات خود آنحضرتؐ نے بیان فرمائی ہے۔ یزید الفقیرؒ کہتے ہیں کہ یہ سن کر ہم میں سے ایک کے سوا سب ساتھیوں نے یہ کہہ کر اپنے موقف سے رجوع کر لیا کہ یہ صحابیٔ رسول ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے آخر یہ غلط بیانی تو نہیں کر رہے۔

اس قسم کے مغالطے ہر دور میں سامنے آتے رہے ہیں جن میں ایک تازہ مغالطہ یہ ہے کہ ریاست و حکومت دین کے تقاضوں میں سے نہیں ہے بلکہ ایمان و اعمال صالحہ پر پختہ کار لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بطور انعام یہ وعدہ کیا ہے۔ اس مغالطہ کی بنیاد سورۃ النور کی آیت ۵۵ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ والوں سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دی جائے گی، چونکہ یہ بات وعدہ کے طور پر کی گئی ہے اس لیے حکومت و ریاست قائم کرنا قرآن کریم کا حکم نہیں ہے بلکہ صرف انعامی وعدہ ہے۔

اس کے باقی تمام پہلوؤں سے قطع نظر صرف اسی ایک پہلو کو سامنے رکھا جائے تو بھی یہ بات ایک مغالطہ کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتی کیونکہ قرآن کریم نے حکومت و ریاست، انتظام و قانون اور خلافت ارضی کی بات صرف اس ایک آیت میں نہیں فرمائی بلکہ دیگر بہت سی آیات مبارکہ میں ان امور کا تذکرہ موجود ہے جنہیں اس معاملہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر ان سب آیات کریمہ کو سامنے رکھ کر بات کی جائے تو خلافت و حکومت کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا حکم نہیں دیا گیا، محض ایک بے جا تکلف ہی قرار پاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خلافت کے موضوع پر اپنی معروف کتاب ”ازالۃ الخفاء“ میں لکھا ہے کہ خلافت کا قیام امت مسلمہ کے اجتماعی فرائض میں سے ہے بلکہ اس کی فرضیت اس قدر اہم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے خلافت کے قیام اور خلیفہ کے انتخاب کا فریضہ آنحضرتؐ کی تدفین سے بھی پہلے سرانجام دیا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ خلافت کے شرعی فریضہ ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کے بیسیوں اجتماعی اور معاشرتی احکام پر عملدرآمد صرف حکومت و ریاست کے ذریعے ہو سکتا ہے، اگر حکومت و ریاست موجود نہ ہو تو قرآن کریم کے ان احکام پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ جبکہ اصول یہ ہے کہ کسی شرعی فریضہ کی ادائیگی جس بات پر موقوف ہو وہ خود فریضہ کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

مثال کے طور پر حکومت و ریاست کو شریعت کے مقاصد سے خارج کر کے صرف وعدہ اور انعام کی حیثیت دینے والے بعض دانشور حضرات کا خود اپنا موقف یہ ہے کہ جہاد کا اعلان صرف حکومت و ریاست ہی کر سکتی ہے اور حدود شرعیہ کے قوانین کا نظام بھی صرف حکومت کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ تو کیا اس سے جہاد کے بارے میں قرآن کریم کے احکام پر عملدرآمد اور جرائم کی شرعی سزاؤں کے عملی نفاذ کے لیے حکومت و ریاست کا قیام ضروری نہیں ہو جاتا؟ بصورت دیگر اگر ہمارے یہ دوست اپنی ان دو باتوں پر بیک وقت قائم ہیں کہ

1. جہاد اور حدود شرعیہ صرف حکومت و ریاست کے ذریعے ہی عمل میں آسکتے ہیں۔

2. حکومت و ریاست شریعت کے مقاصد میں سے نہیں ہیں اور اللہ تعالی نے اس کا حکم نہیں دیا بلکہ بطور انعام وعدہ کیا ہے۔

تو کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہے کہ خود جہاد، حدود شرعیہ اور دیگر اجتماعی و معاشرتی احکام پر عملدرآمد ہی شریعت کے مقاصد سے خارج ہو جاتا ہے؟ لہٰذا اس قسم کے مغالطوں اور بے جا نکتہ آفرینیوں کے ذریعے اسلامی ریاست اور حکومت و خلافت کی اہمیت و ضرورت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اگر قرآن کریم کے احکام و قوانین پر عملدرآمد اور معاشرے میں ان کا نفاذ ہمارے فرائض میں سے ہے تو اس کے لیے اسلامی ریاست و حکومت کا قیام بھی اسی درجہ کا شرعیہ فریضہ ہے۔

فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری/قصور کی معصوم بچی کا المیہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۳ جنوری ۲۰۱۸ء)

بعض مضامین میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد جب فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا تو اس نے یہودیوں کے ساتھ اپنے وعدہ ''اعلان بالفور'' کے مطابق دنیا بھر کے یہودیوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ فلسطین میں آکر زمینیں خرید سکتے ہیں اور آباد ہو سکتے ہیں۔ یہ اجازت خلافت عثمانیہ نے یہودیوں کے عالمی وفد کی باقاعدہ درخواست کے باوجود نہیں دی تھی جس کی پاداش میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے لیے یہودیوں نے یورپ کی مسیحی طاقتوں سے اتحاد کر لیا تھا۔ اس موقع پر بعض عرب علماء نے فلسطینیوں کو یہودیوں پر اپنی زمینیں بیچنے سے روکنے کے لیے فتویٰ صادر کیا تھا کہ یہودیوں پر فلسطین کی زمین فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس فتویٰ کی تائید ہمارے برصغیر کے اکابر علماء کرام بالخصوص حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی فرمائی تھی۔

اس حوالہ سے بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے اور فلسطینیوں کے خلاف غلط طور پر پھیلائی گئی ہے جس پر کچھ حضرات نے مجھ سے اس کا حوالہ طلب کیا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کے لیے گزارش کر رہا ہوں کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ''بوادر النوادر'' کے نام سے ایک مستقل کتاب ہے جس میں ان کے بہت سے نادر اور مختلف النوع علمی مضامین اور فتاویٰ کو یکجا شائع کیا گیا ہے، اس میں چوہتروان (۷۴) نادرہ اسی مسئلہ کے بارے میں ہے جو ایک استفتاء کے جواب میں ہے اور عربی زبان میں ہے۔ استفتاء میں کہا گیا ہے کہ بعض مسلمان فلسطین کی زمینیں یہودیوں پر فروخت کر رہے ہیں اور بہت سے مسلمان حضرات اس خرید و فروخت میں ذریعہ بن رہے ہیں، ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ کیونکہ یہودی ایک منصوبہ کے تحت فلسطین میں آباد ہو کر اور بیت المقدس پر قبضہ کر کے اپنا معبد ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد بے وطن ہو جائے گی بلکہ ہیکل سلیمانی کی دوبارہ یہودی منصوبے کے مطابق تعمیر سے مسجد اقصیٰ بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس استفتاء کے جواب میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے فقہی دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا تھا کہ یہودیوں

پر اپنی زمینیں فروخت کرنے والے فلسطینیوں کا یہ عمل شرعا درست نہیں ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اس فتوی پر ''للثلث الاول فی رمضان المبارک ۵۳ھ ''کی تاریخ درج ہے اور ''کتبہ اشرف علی التھانوی الحنفی الفاروقی عفی عنہ من الہند ''تحریر ہے۔

جہاں تک فلسطینیوں کے مظلوم ہونے کا تعلق ہے اس میں کوئی کلام نہیں ہے اور یہودیوں کے جبر و تسلط اور ان کے ناپاک عزائم کی مخالفت و مزاحمت ہمارے دینی فرائض میں سے ہے، اس میں ہم مکمل طور پر فلسطینی قوم اور عرب عوام کے ساتھ ہیں اور ان کی ہر ممکن حمایت و معاونت کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کسی مظلوم کی حمایت و نصرت کے لیے اسے معصوم ثابت کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ اسے ایسے مصائب کا سبب بننے والی غلطیوں سے آگاہ کرنا بھی نصرت و حمایت ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ خود قرآن کریم کا اسلوب یہی ہے کہ اس نے ''فبما کسبت ایدیکم'' فرما کر عمومی قانون بیان کیا ہے کہ قوموں کے مصائب و آلام کے اسباب ان کی اپنی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ غزوۂ احد میں مسلمانوں کی وقتی ہزیمت اور نقصانات کے اسباب کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ کر کے قرآن کریم نے ان غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو وقتی طور پر مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ جانے کا سبب بنی تھیں۔ حتی کہ جب یہ پوچھا گیا کہ ''انی ھذا؟'' یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ تو قرآن کریم نے دوٹوک جواب دیا کہ ''ھو من عند انفسکم'' یہ تمہاری اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح غزوۂ حنین میں جب وقتی طور پر مسلمان لشکر کے پاؤں اکھڑے تو ''اذ اعجبتکم کثرتکم'' کہہ کر قرآن کریم نے اس کا سبب بتا دیا کہ تم اپنی کثرت کے باعث بے پروا ہو گئے تھے۔

پھر اگر مصائب و مشکلات اور ناکامیوں کے اسباب واضح کرنے کی بجائے ان پر پردہ ڈالنے کی روش اختیار کر لی جائے تو اصلاح احوال کے امکانات بھی کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ہماری گزارش ہے کہ مظلوم کی حمایت ضرور کی جائے اور پوری قوت کے ساتھ کی جائے لیکن اسے معصوم اور بے قصور ثابت کرنے کی بجائے ان غلطیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کرنا بھی اس کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا تقاضا ہوتا ہے جو اس کے مصائب و آلام کا سبب اور باعث بنتی ہیں۔

قصور کی معصوم بچی زینب شہید جس درندگی اور وحشت کا نشانہ بنی ہے اس پر ہم بھی پوری قوم کے اجتماعی کرب و اضطراب میں شریک ہیں مگر جب کچھ لکھنے کے لیے قلم پکڑا تو دماغ ماؤف سا ہو گیا ہے کہ کیا لکھوں، کیسے لکھوں اور کس کو لکھوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ یہ درندگی کا پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ اب تو ایسی شرمناک اور وحشتناک وارداتوں کی لائن ہی لگتی جا رہی ہے۔ خدا جانے ہماری اجتماعی بد اعمالیاں، بے حسی بلکہ سنگدلی اور کیا کیا گل کھلائے گی! جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کسی یہودی نے ایک معصوم بچی کے گلے میں ہار دیکھ کر اس کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا تو آنحضرتؐ نے اس کیس کی خود تفتیش فرمائی تھی اور مجرم کو گرفتار کر کے اس کا سر بھی اسی طرح دو پتھروں کے درمیان کچل کر رکھ دیا تھا۔ مگر یہ روایات اب ہمارے لیے خدانخواستہ اجنبی ہوتی جا رہی ہیں، ہم نام نہاد تہذیب و تمدن اور سولائزیشن کے اس دور میں رہتے ہیں جسے ’’اینڈ آف ہسٹری‘‘ کہا جاتا ہے اور جس میں سزا میں سختی کو تو انسانی عزت نفس کے منافی سمجھا جاتا ہے مگر شرف و عزت اور تحفظ و وقار کے سارے حقوق قاتلوں، ڈاکوؤں، درندوں، بدکاروں اور لٹیروں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں۔

ابھی لاہور کے دانشور دوست پروفیسر رفرف صاحب نے ایک پوسٹ بھجوائی ہے اسی کو اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنا رہا ہوں:

> ’’نواب کالاباغ بڑے سخت گیر اڈمنسٹریٹر تھے۔ ان کے دور میں لاہور میں ایک پانچ سالہ بچہ اغوا ہو گیا۔ نواب صاحب نے ایس ایس پی کو بلوا کر چوبیس گھنٹے کے اندر بچہ برآمد کرنے کا حکم دیا۔ چوبیس گھنٹے گزر گئے مگر بچہ برآمد نہ ہوا تو نواب صاحب نے اگلے دن اے ایس پی، ایس پی اور ایس ایس پی کے بچے منگوائے اور کالاباغ بھجوا دیے اور اعلان کیا کہ جب تک پولیس اغوا شدہ بچہ برآمد نہیں کرے گی اس وقت تک ان افسروں کے بچے انہیں واپس نہیں ملیں گے۔ یہ نسخہ کامیاب ہو گیا اور پولیس نے اسی دن بچہ برآمد کر لیا۔ نواب صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ جب تک عوام کے مسئلہ کی تکلیف بیوروکریسی تک نہیں پہنچتی افسر اس وقت تک وہ مسئلہ حل نہیں کرتے۔‘‘

۲۰۱۷ء

اقوام متحدہ کا منشور اور اسلامی نقطۂ نظر

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۲۰ دسمبر ۲۰۱۷ء)

اقوام متحدہ کی طرف سے ایک بار پھر یہ تقاضہ سامنے آیا ہے کہ پاکستان میں ناموس رسالت کے تحفظ کا قانون تبدیل کیا جائے۔ توہین رسالتؐ پر سزا کا قانون، تحفظ ختم نبوت کی قانونی دفعات، نافذ شدہ چند شرعی قوانین اور دستور کی اسلامی دفعات ایک عرصہ سے بین الاقوامی دباؤ کی زد میں ہیں۔ اقوام متحدہ، امریکہ، یورپی یونین اور ایمنسٹی انٹرنیشنل سمیت بہت سے عالمی ادارے ہمارے ان قوانین کو انسانی حقوق کے منافی قرار دے کر ان کی تبدیلی کا مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سال بھی ۱۰ دسمبر کو دنیا بھر میں "انسانی حقوق کا دن" منایا گیا جو ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی طرف سے انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹر کی منظوری کے حوالہ سے منایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یونیورسٹی آف گجرات کے شعبہ قانون نے ۱۲ دسمبر کو ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس میں محترمہ جسٹس (ر) ناصرہ جاوید اقبال صاحبہ بطور مہمان خصوصی شریک ہوئیں اور راقم الحروف نے بھی اس سے خطاب کیا۔ میں نے اپنی گفتگو کے دوران بطور خاص یہ عرض کیا کہ بڑے دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانی حقوق کے مروجہ عالمی قوانین اور اسلامی تعلیمات و قوانین کے حوالہ سے وسیع تر مباحثہ و مکالمہ کا ماحول پیدا کریں۔ عالمی طاقتوں اور اداروں کو اسلامی قوانین و احکام کے بارے میں تحفظات ہیں جبکہ ہمیں بھی مروجہ انسانی حقوق اور ان کی تعبیر و تشریح کے مغربی معیار پر اسی قسم کے تحفظات ہیں۔ ان تحفظات کا

علمی و فکری ماحول میں دلیل و منطق کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے ورنہ کنفیوژن اور تصادم دونوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

اب سے کم و بیش چھ سال قبل عمرہ کے لیے حاضری کے موقع پر مکہ مکرمہ میں انسانی حقوق کے چارٹر پر ایک سرسری تبصرہ قلمبند کرنے کا موقع ملا تھا جو پرانے کاغذات میں سے گزشتہ روز اچانک دستیاب ہوا، اسے ابتدائی اور پہلی خوانگی کے طور پر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، ارباب علم و دانش سے گزارش ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں اور نئی نسل کی صحیح راہنمائی کے لیے مؤثر کردار ادا کریں۔

(۱) انسانی حقوق کا مغربی پس منظر

مغرب میں انسانی حقوق کے حوالہ سے جو تاریخ بیان کی جاتی ہے اس کا آغاز ''میگنا کارٹا'' سے کیا جاتا ہے۔ ۱۲۱۶ء میں برطانیہ کے کنگ جان اور جاگیرداروں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا معاہدہ اس عنوان سے ہوا تھا جس کا اصل مقصد تو بادشاہ اور جاگیرداروں کے مابین اختیارات اور حدود کار کی تقسیم تھا لیکن اس میں عام لوگوں کا بھی کسی حد تک تذکرہ موجود تھا، اس لیے اسے انسانی حقوق کا آغاز تصور قرار دیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں ایک عرصہ تک حکمرانی کا حق اور اس کے تمام تر اختیارات تین طبقوں کے درمیان دائر رہے ہیں (۱) بادشاہ (۲) جاگیردار اور (۳) مذہبی قیادت۔ ان میں مختلف مراحل میں آپس میں کشمکش بھی رہی ہے لیکن عام شہری اس تکون کے درمیان جو دراصل جبر اور ظالمانہ حاکمیت کی تکون تھی صدیوں تک پستے رہے ہیں، مغرب خود اس دور کو جبر و ظلم اور تاریکی و جاہلیت کا دور کہتا ہے اور اس تکون سے نجات حاصل کرنے کے لیے مغربی دنیا کے عوام کو طویل جدوجہد اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ بہرحال ان حکمران طبقات کی باہمی کشمکش کے پس منظر میں کنگ جان اور جاگیرداروں کے درمیان حقوق و اختیارات کی باہمی تقسیم کے معاہدہ کو ''میگنا کارٹا'' کہا جاتا ہے اور مغربی دنیا اسے انسانی حقوق کی ابتدائی دستاویز قرار دیتی ہے جو ۱۲۱۵ء میں ۱۵ جون کو طے پایا تھا۔

اس کے بعد ۱۶۸۴ء میں عوامی بغاوت کے نتیجے میں انقلابی فوج نے پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کا قانون پیش کیا اور ۱۶۸۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ''بل آف رائٹس'' (حقوق کے قانون) کی منظوری دی جو اس سمت پیش رفت کا اہم مرحلہ تھا۔ ادھر امریکہ میں تھامس جیفرسن نے ۱۲ جولائی ۱۷۷۶ء کو برطانوی استعمار کے تسلط سے امریکہ کی مکمل

آزادی کا اعلان کیا اور ۱۷۸۹ء میں امریکی کانگریس نے دستور میں ترامیم کے ذریعہ عوامی حقوق کو دستور کا حصہ بنایا۔

فرانس میں زبردست عوامی جدوجہد اور بغاوت کے ذریعہ ۱۷۸۹ء کو جاگیرداری، بادشاہت اور ریاستی معاملات میں چرچ کی مداخلت کو مسترد کر کے قومی اسمبلی سے شہری حقوق کا قانون ''ڈیکلریشن آف رائٹس آف مین'' منظور کرایا اور پورے سیاسی اور معاشرتی نظام کی کایا پلٹ دی۔ اسے ''انقلاب فرانس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مغرب میں ظلم وجبر اور حقوق کے درمیان اسے حد فاصل قرار دیا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے ذریعہ نہ صرف بادشاہت اور جاگیرداری کا مکمل خاتمہ ہو گیا بلکہ اقتدار میں مذہبی قیادت کی شرکت کی بھی نفی کر دی گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چرچ، پوپ اور مذہبی قیادت نے عوام پر بادشاہ اور جاگیرداروں کی طرف سے ہونے والے دوہرے مظالم اور شدید جبر و تشدد میں عوام کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا تھا اور مذہب عملاً بادشاہت اور جاگیرداری کا پشت پناہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس لیے بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ ساتھ پوپ کی سیاسی قیادت کا بوریا بستر بھی لپیٹ دیا گیا اور نئے نظام میں ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا کہ مذہب اور چرچ کا تعلق انسان کے عقیدہ، عبادت اور اخلاقیات کے ساتھ رہے گا جبکہ سیاسی و معاشرتی معاملات میں رائے دینے، راہ نمائی کرنے اور مداخلت کرنے کا مذہب، پادری اور چرچ کو کوئی حق نہیں ہوگا۔ اسی کو آگے چل کر ''سیکولرازم'' سے تعبیر کیا گیا اور معیاری نظام قرار دے کر پوری دنیا سے اسے اختیار کرنے اور اس کی پابندی کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرہ میں یورپی ممالک یعنی برطانیہ اور جرمنی وغیرہ کے درمیان جنگ ہوئی جس میں پوری دنیا بالواسطہ یا بلاواسطہ لپیٹ میں آ گئی، اس لیے اسے ''جنگ عظیم اول'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں عالم اسلام کی نمائندہ حکومت ''خلافت عثمانیہ'' نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا چنانچہ جرمنی کے ساتھ ساتھ وہ بھی شکست سے دوچار ہو گئی تھی اور نتیجے میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ جنگ عظیم اول میں لاکھوں انسانوں کے قتل ہو جانے کے بعد اقوام و ممالک کی ایک بین الاقوامی تنظیم ''لیگ آف نیشنز'' قائم کی گئی تھی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اقوام و ممالک کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو جنگ کی صورت اختیار نہ کرنے دی جائے اور اس بین الاقوامی فورم کے ذریعہ ان تنازعات

کا حل نکال کر قوموں اور ملکوں کی باہمی جنگ کو روکا جائے، لیکن ”لیگ آف نیشنز“ اپنے اس مقصد میں ناکام ہوگئی اور بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کے درمیان پھر عالمی جنگ بپا ہوئی جس میں جرمنی اور جاپان ایک طرف جبکہ برطانیہ، فرانس اور روس وغیرہ دوسری طرف تھے۔ اس جنگ نے پہلی جنگ سے زیادہ تباہی مچائی اور اس کے آخری مراحل میں امریکہ نے اتحادیوں کی حمایت میں جنگ میں شریک ہوکر جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جس پر جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں ایک اور بین الاقوامی تنظیم اقوام متحدہ (United Nations) کے نام سے وجود میں آئی جو اب تک نہ صرف قائم ہے بلکہ بین الاقوامی معاملات کا کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اقوام متحدہ کے تنظیمی اور پالیسی سازی کے اختیارات اور معاملات پر اجارہ داری کی وجہ سے اقوام متحدہ پر مغربی ممالک کی بالادستی قائم ہے اور اسے عام طور پر انہی کے حق میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی تنظیمی صورت حال یہ ہے کہ اس کی ایک ”جنرل اسمبلی“ ہے جس میں تمام ممبر ممالک برابر کے رکن ہیں اور سال میں ایک بار تمام ممالک کے حکمران یا ان کے نمائندے جمع ہوکر عالمی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس کے نتیجے میں قراردادیں پاس ہوتی ہیں۔ لیکن ان قراردادوں کی حیثیت صرف سفارش کی ہوتی ہے ان کا نفاذ ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ جنرل اسمبلی کی سینکڑوں سفارشی قراردادیں اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی فائلوں میں دبی پڑی ہیں۔

اقوام متحدہ میں پالیسی سازی، فیصلوں اور ان کے نفاذ کی اصل قوت ”سلامتی کونسل“ ہے جس کے گیارہ ارکان میں سے پانچ ارکان (۱) امریکہ (۲) برطانیہ (۳) فرانس (۴) روس اور (۵) چین مستقل ممبر کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ چھ ارکان دنیا کے مختلف ممالک میں سے باری باری دو دو سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ یہ گیارہ رکنی سلامتی کونسل اقوام متحدہ کی اصل قوت اور اتھارٹی ہے لیکن ان میں سے پانچ مستقل ارکان کو حق استرداد (Veto Power) حاصل ہے کہ امریکہ، روس، چین، برطانیہ اور فرانس میں سے کوئی ایک ملک بھی سلامتی کونسل کے کسی فیصلے کو مسترد کر دے تو وہ کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس طرح پوری دنیا کے نظام پر اقوام متحدہ کے نام سے اصل حکمرانی اور کنٹرول ان پانچ ممالک

کا ہے اور یہ پانچ ممالک جس بات پر متفق ہو جائیں پوری دنیا کو وہ فیصلہ بہر حال تسلیم کرنا ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کا اصل مقصد قوموں اور ملکوں کے درمیان ہونے والے تنازعات کا حل تلاش کرنا اور جنگ کو روکنا تھا لیکن ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا عالمگیر منشور منظور کر کے اور اس کی پابندی کو تمام ممالک و اقوام کے لیے لازمی قرار دے کر دنیا کے سیاسی اور معاشرتی نظام میں راہ نمائی اور مداخلت کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کر لیا۔ اور اس کے بعد سے ممالک و اقوام کے درمیان جنگ کو روکنے کے ساتھ دنیا بھر کے ممالک کے سیاسی اور معاشرتی نظاموں کو کنٹرول کرنا بھی اقوام متحدہ کی ذمہ داری سمجھا جا رہا ہے اور اقوام متحدہ اس سلسلہ میں مسلسل کردار ادا کر رہی ہے۔

اقوام متحدہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے اور اس کے تحت متفقہ طور پر یا اکثریت کے ساتھ طے ہونے والے فیصلے ''بین الاقوامی معاہدات'' کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن تاریخ اور سماج کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اپنے جن فیصلوں کو دنیا پر نافذ کرنا چاہتی ہے وہ عملاً نافذ ہوتے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنے والے ملکوں کو سزا دی جاتی ہے حتیٰ کہ خلاف ورزی کرنے والے ملکوں پر فوج کشی بھی کی جاتی ہے اور انہیں اقوام متحدہ کا فیصلہ تسلیم کرنے پر بزور مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لیے انسانی حقوق کا منشور اور اقوام متحدہ کے دیگر فیصلے صرف ''معاہدات'' نہیں بلکہ عملاً ''بین الاقوامی قانون'' بن چکے ہیں اور خود اقوام متحدہ صرف بین الاقوامی تنظیم نہیں بلکہ عملاً ایک عالمی حکومت کا درجہ رکھتی ہے جس کے ذریعہ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک عملاً پوری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کے اس عملی کردار کو سامنے رکھنا بالخصوص عالم اسلام کے ان حلقوں کے لیے انتہائی ضروری ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ، اسلامی معاشرہ کے قیام اور خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لیے دنیا کے کسی بھی حصہ میں محنت کر رہے ہیں تاکہ انہیں یہ معلوم ہو کہ اس سلسلہ میں ان کا مقابلہ اصل میں کس قوت سے ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ایسی جدوجہد کرنے والے حلقے اور طبقے اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ ہم اپنے ملک میں اپنے مقتدر حلقوں سے نفاذ اسلام کا مطالبہ کر رہے ہیں یا ان سے نفاذ اسلام کے لیے لڑ رہے ہیں جبکہ حقیقی صورت حال یہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے کسی بھی حصے میں نفاذ اسلام یا شریعت کے قوانین

کی ترویج کی جدوجہد ہو اس کا سامنا اصل میں ایک بین الاقوامی نظام سے ہے اور ایک مضبوط عالمی نیٹ ورک سے ہے جو ساری دنیا میں ”انسانی حقوق کے منشور“ کے عنوان سے مغرب کا طے کردہ سیاسی اور معاشرتی نظام نافذ کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہے۔

عالم اسلام کے کم و بیش سبھی ممالک اقوام متحدہ کا حصہ ہیں اور اس کے معاملات میں شریک ہیں لیکن عالم اسلام کے نظریاتی اور باشعور حلقوں کو دو حوالوں سے واضح طور پر تحفظات کا سامنا ہے۔ ایک یہ کہ اقوام متحدہ کی فیصلہ سازی اور فیصلوں کے نفاذ کی اتھارٹی میں عالم اسلام کی کوئی نمائندگی نہیں ہے اور مسلمانوں کا کوئی ملک بھی ان پانچ ممالک میں شامل نہیں ہے جنہیں فیصلے مسترد کر دینے اور معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا اختیار اور حق حاصل ہے۔ اس طرح اقوام متحدہ کے فیصلہ سازی اور فیصلوں کی تنفیذ کے معاملات سے عالم اسلام کلیتہ بے دخل ہے اور اس کا کردار دنیا کے ان پانچ بڑوں کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے اور کرتے چلے جانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہمارا دوسرا تحفظ انسانی حقوق کے منشور کے حوالہ سے ہے جو صرف مغربی ممالک کی باہمی کشمکش اور انقلاب فرانس کے پس منظر کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے، بلکہ اس کی بہت سی دفعات اسلامی شریعت کے احکام و قوانین سے متصادم ہیں۔ اور عملی صورت حال یہ ہے جس کی ہم آئندہ سطور میں وضاحت کریں گے کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کو من وعن قبول کر لینے کی صورت میں مسلم ممالک اور حکومتوں کو قرآن و سنت کے بیسیوں احکام اور شریعت اسلامیہ کے سینکڑوں ضابطوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے جبکہ عالم اسلام کی صورت حال یہ ہے کہ مسلم ممالک کے حکمران طبقات خدانخواستہ اس کے لیے کسی درجہ میں تیار بھی ہوں مگر مسلم عوام کی اکثریت دنیا کے کسی بھی خطے میں اس کے لیے تیار نہیں ہے اور گزشتہ نصف صدی کے دوران درجنوں مسلم ممالک کی رائے عامہ جمہوری و سیاسی ذرائع سے اس امر کا اظہار کر چکی ہے کہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین اور ریاست و حکومت کے معاملات میں مذہب کے کردار سے دست بردار ہونے کے لیے وہ کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہیں۔

اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ عالم اسلام کو اقوام متحدہ کے فیصلہ سازی اور فیصلوں کے نفاذ کے نظام میں شریک کیا جائے اور انسانی حقوق کے منشور پر نظر ثانی کی جائے۔ اگر اس وقت عالم اسلام کی دیگر

حکومتیں ان کا ساتھ دیتیں تو اس سلسلہ میں مؤثر پیش رفت ہو سکتی تھی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور موجودہ صورت حال میں اب بھی اس کا بظاہر کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔

دسمبر ۱۹۴۸ء میں جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا یہ منشور منظور کیا تھا اس وقت دنیا میں مسلم ممالک کا کوئی عالمی فورم موجود نہیں تھا، خلافت عثمانیہ کا اس سے قبل خاتمہ ہو چکا تھا اور اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی عالمی فورم سامنے نہیں آیا تھا بلکہ اب تک یہی صورت حال ہے، دنیا کے بیشتر مسلم ممالک آزاد نہیں تھے اور کسی نہ کسی استعماری قوت کی نوآبادی شمار ہوتے تھے اس طرح جنرل اسمبلی میں عالم اسلام کی مکمل نمائندگی موجود نہیں تھی، اس لیے یہ کہنا کہ اقوام متحدہ کی تشکیل اس کے نظام کے تعین اور اس کے معاہدات کی تدوین میں عالم اسلام برابر کا شریک ہے، درست نہیں ہے اور انصاف کی بات نہیں ہے، اس لیے آج بھی مسلم حکومتوں بالخصوص او آئی سی کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے فرائض کو محسوس کریں اور اقوام متحدہ کے تنظیمی ڈھانچے اور اس کے تحت ہونے والے بین الاقوامی معاہدات پر نظر ثانی کا مطالبہ کرتے ہوئے اسلام اور عالم اسلام کی صحیح نمائندگی کا فرض پورا کریں۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ جب اقوام متحدہ خود مذہبی آزادی، لوگوں کے اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق اور علاقائی ثقافتوں کے تحفظ کی علمبردار ہے تو اسے کسی مذہب کی حدود کار متعیّن کرنے اور اہل مذہب کو اس مذہب کے کچھ حصوں پر عمل سے روکنے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی علاقائی ثقافتوں کو انسانی حقوق کے منشور کے نام پر بلڈوز کر کے ایک ہی تہذیبی فلسفہ کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کا اس کے پاس کوئی جواز ہے۔

ان گزارشات کے بعد ہم انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کا شق وار سرسری جائزہ لینا چاہیں گے، صرف اس پہلو سے کہ اسلامی شریعت کے ایک طالب علم اور نفاذ شریعت کی جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر اس سلسلہ میں ہمارے تحفظات کیا ہیں اور اس منشور کو مکمل طور پر قبول کر لینے کی صورت میں ہم اسلامی نقطۂ نظر سے کیا خدشات بلکہ نقصانات محسوس کرتے ہیں۔

(۲) اقوام متحدہ کا عالمی منشور

Published by the Office of Public Information, United Nations Universal Declaration of Human

Rights (URDU)

Reprinted in U.N. OPI/15-15377-June 1965-5M

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ”انسانی حقوق کا عالمی منشور“ منظور کر کے اس کا اعلان عام کیا۔ اگلے صفحات پر اس منشور کا مکمل متن درج ہے۔ اس تاریخی کارنامے کے بعد اسمبلی نے اپنے تمام ممبر ممالک پر زور دیا کہ وہ بھی اپنے اپنے ہاں اس کا اعلان عام کریں اور اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لیں۔ مثلاً یہ کہ اسے نمایاں مقام پر آویزاں کیا جائے اور خاص طور پر اسکولوں اور تعلیمی اداروں میں اسے پڑھ کر سنایا جائے اور اس کی تفصیلات واضح کی جائیں۔ اور اس ضمن میں کسی ملک یا علاقے کی سیاسی حیثیت کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔

آخری مستند متن ۔ محکمۂ اطلاعات عامہ اقوام متحدہ، نیویارک

چونکہ ہر انسان کی ذاتی عزت اور حرمت اور انسانوں کے مساوی اور ناقابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا اس دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد ہے۔

چونکہ انسانی حقوق سے لاپروائی اور ان کی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جس سے انسانیت کے ضمیر کو سخت صدمے پہنچے ہیں۔ عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سے محفوظ رہیں۔

چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عمل داری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آکر جبر اور استبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوں۔

چونکہ یہ ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے۔

چونکہ اقوام متحدہ کی ممبر قوموں نے اپنے منشور میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی حرمت اور قدر اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضا میں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

چونکہ ممبر ملکوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصولا اور عملا انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں گے اور کرائیں گے۔

چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لیے بہت ہی اہم ہے کہ ان حقوق اور آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں۔

لہذا جنرل اسمبلی اعلان کرتی ہے کہ انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہو گا تاکہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کرے، اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کاروائیوں کے ذریعے ممبر ملکوں میں اور ان قوموں میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں، منوانے کے لیے بتدریج کوشش کر سکے۔

دفعہ نمبر ۱

تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ نمبر ۲

1. ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

2. اس کے علاوہ جس علاقے سے جو شخص تعلق رکھتا ہے اس کی سیاسی کیفیت کا دائرۂ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بنا پر اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، چاہے وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا سیاسی اقتدار کے لحاظ سے کسی دوسری بندش کا پابند ہو۔

دفعہ نمبر ۳

ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

دفعہ نمبر ۴

کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، ممنوع قرار دی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۵

کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز، یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۶

ہر شخص کا حق ہے کہ ہر مقام پر قانون اس کی شخصیت کو تسلیم کرے۔

دفعہ نمبر ۷

قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کے خلاف جو تفریق کی جائے یا جس تفریق کے لیے ترغیب دی جائے اس سے سب برابر کے بچاؤ کے حق دار ہیں۔

دفعہ نمبر ۸

ہر شخص کو ان افعال کے خلاف جو اس دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کو تلف کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے مؤثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا پورا حق ہے۔

دفعہ نمبر ۹

کسی شخص کو محض حاکم کی مرضی پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۱۰

ہر ایک شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کا تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے بارے میں مقدمہ کی سماعت آزاد اور غیر جانبدار عدالت کے کھلے اجلاس میں منصفانہ طریقے پر ہو۔

دفعہ نمبر ۱۱

1. ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری کا الزام عائد کیا جائے، بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے۔ تاوقتیکہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع نہ دیا جا چکا ہو۔
2. کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بنا پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۱۲

کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کا حق ہے کہ قانون اسے حملے یا مداخلت سے محفوظ رکھے۔

دفعہ نمبر ۱۳

1. ہر شخص کا حق ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو۔
2. ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو۔ اور اسی طرح اسے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ نمبر ۱۴

1. ہر شخص کو ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ ڈھونڈنے، اور پناہ مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔
2. یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں لایا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف ہیں۔

دفعہ نمبر ۱۵

1. ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔
2. کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور اس کو قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۱۶

1. بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملہ میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔
2. نکاح فریقین کی پوری اور آزاد رضامندی سے ہوگا۔
3. خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے، اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے تحفظ کا حق دار ہے۔

دفعہ نمبر ۱۷

1. ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔
2. کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر ۱۸

ہر انسان کو آزادئ فکر، آزادئ ضمیر، آزادئ مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے، پبلک یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسوم پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ نمبر ۱۹

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے علم اور خیالات کی تلاش کرے، انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔

دفعہ نمبر ۲۰

1. ہر شخص کو پر امن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔
2. کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

دفعہ نمبر ۲۱

1. ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

2. ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

3. عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے۔ اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریقۂ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ نمبر ۲۲

معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی کہ وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو حاصل کرے جو اس کی عزت اور شخصیت کے نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۳

1. ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

2. ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی معاوضے کا حق ہے۔

3. ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو۔ اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جاسکے۔

4. ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ نمبر ۲۴

ہر شخص کا آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے علاوہ مقررہ وقفوں کے ساتھ تعطیلات بھی شامل ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۵

1. ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات شامل ہیں۔ اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا، ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

2. زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی سے پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بغیر معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ نمبر ۲۶

1. ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم مفت ہوگی کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلی تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

2. تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

3. والدین کو اس بات کے انتخاب کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۲۷

1. ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

2. ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفاد کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، عملی یا ادبی تصنیف سے جس کا وہ مصنف ہو، حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۸

ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں شامل ہونے کا حق دار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں پیش کر دیے گئے ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۹

1. ہر شخص پر معاشرے کے حقوق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

2. اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے، یا جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔

3. یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ نمبر ۳۰

اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی تخریب ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

(۳) انسانی حقوق کے مغربی تناظر اور اسلامی تناظر کا فرق

اقوام متحدہ کے منشور کے دفعہ وار تجزیہ سے پہلے تمہید کے طور پر چند تحفظات کا اظہار ضروری ہے۔

• اس میں مغربی دنیا کے تہذیبی، سیاسی اور مذہبی پس منظر کو بنیاد بنایا گیا ہے اور انقلاب فرانس سے پہلے کی صورت حال اور جنگ عظیم اول اور دوم کا باعث بننے والے اسباب کو سامنے رکھا گیا ہے۔ یہ مغربی دنیا کا پس منظر ضرور ہے لیکن عالم اسلام کا پس منظر قطعی طور پر یہ نہیں ہے، عالم اسلام میں قانون کی حکمرانی، انسانی حقوق کی پاسداری اور معاشرتی انصاف کی فراہمی کی ایک شاندار تاریخ موجود ہے جسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور مغرب اپنے علاقائی پس منظر کے ردعمل میں جس معاشرتی اور تہذیبی نتیجہ تک پہنچا ہے اسے پوری دنیا میں اور خاص طور پر اس پس منظر سے قطعی مختلف ماضی رکھنے والے عالم اسلام پر مسلط کرنے کے درپے ہے جو انصاف کا تقاضہ نہیں ہے۔

• مذہب اور مذہبی قیادت نے یورپی ممالک میں یقیناً بادشاہت اور جاگیرداری کی پشت پناہی کی ہے لیکن عالم اسلام میں مذہبی قیادت علمی وفکری طور پر ہمیشہ آزاد رہی ہے اور حکمرانوں کے مظالم کے مقابلہ میں عوام کے ساتھ رہی ہے، اس لیے جو سزا مغرب نے اپنے مذہب کے لیے تجویز کی ہے اسے عالم اسلام اور دین اسلام پر چسپاں کرنا سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔

• مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق سے مراد اگر یہ ہے کہ ہر معاملہ میں ان کے ساتھ برابری کا معاملہ کیا جائے، جیسا کہ عام طور پر اس کی یہی تشریح کی جا رہی ہے، تو یہ نہ صرف یہ کہ ناممکن ہے بلکہ عقل، انصاف اور فطرت کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے کہ مرد اور عورت کی تخلیق اور جسمانی ڈھانچے میں فرق ہے، ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیات میں فرق ہے، ان کے فطری فرائض میں فرق ہے اور ان کی قوت کار میں فرق ہے۔ اس فرق کو نہ ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور اس فرق کی موجودگی میں ہر معاملہ میں برابری ممکن نہیں ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کے لیے بہت خوبصورت اور فطری اصول بیان فرمایا ہے کہ ”ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال

علیھن درجۃ واللہ عزیز حکیم“ (سورۃ البقرہ ۲۲۸) ”عورتوں کے حقوق ان کی ذمہ داریوں کے حساب سے ہیں، اور مردوں کی ان پر فضیلت ہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے“۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم ان کی جسمانی تخلیق، ذہنی نفسیات، فطری فرائض اور قوت کار کے حساب سے ہوگی تو وہی تقسیم فطری ہوگی اور وہی دراصل مساویانہ ہوگی، اس سے ہٹ کر کوئی بھی معاملہ فطرت اور انصاف سے انحراف متصور ہوگا۔

• خاندان سوسائٹی کا ایک بنیادی یونٹ ہے جس کا وجود اور بقا سوسائٹی کی ضروریات سے ہے۔ خاندان میاں بیوی اور اولاد پر مشتمل ہوتا ہے اور ان چند افراد میں کسی ایک کا انتظامی سربراہ قرار پانا خاندان کی فطری ضرورت ہے جسے قرآن کریم نے وللرجال علیھن درجۃ سے تعبیر کیا ہے۔ خاندان ایک ادارہ ہے اور کسی بھی ادارے کا نظام صحیح چلانے کے لیے نظم ونسق ایک ہاتھ میں ہوگا تو معاملات صحیح چلیں گے اور اگر برابر کے اختیارات کے دو مینیجر کسی ادارے میں بٹھا دیے جائیں گے تو وہ کوئی بھی ادارہ ہو، تباہی کا شکار ہو جائے گا۔ اللہ تعالی نے کائنات کا نظام صحیح طور پر چلنے کی بڑی وجہ بھی یہی بتائی ہے کہ نظام ایک ہاتھ میں ہے ”لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا فسبحان اللہ رب العرش عما یصفون“ (سورۃ الانبیاء ۲۲) ”اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں خراب ہو جاتے، سو اللہ عرش کا مالک ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں“۔ اگر خدائی اختیارات کی حامل کوئی اور شخصیت اور ذات بھی موجود ہوتی تو کائنات درہم برہم ہو جاتی، اسی طرح خاندان کا نظام صحیح طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ منتظم ایک ہو۔ عورت کو اسلام نے مرد کی مشیر و معاون بنایا ہے بلکہ جناب نبی اکرمؐ نے ”والمرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا“ کہا ہے کہ گھر کے اندر کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے بارے میں مسئولہ اور ذمہ دار ہے لیکن ”الرجال قوامون علی النساء“ (سورۃ النساء ۳۴) اور ”وللرجال علیھن درجۃ“ (سورۃ البقرۃ ۲۲۸) فرما کر گھر کا نظم طے کیا ہے کہ سنیارٹی اور انتظامی کنٹرول مرد کے ہاتھ میں ہے اور یہی فطرت اور نظم کا تقاضہ ہے۔ مغربی دنیا آج اپنے خاندانی نظام کے بکھر جانے سے پریشان ہے اور بہت سے

مغربی دانشور اس پر الجھن اور پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ مغرب نے خاندانی نظام کی فطری درجہ بندی کا لحاظ نہیں رکھا اور مرد اور عورت کو یکساں اختیارات کا حامل قرار دے کر اپنے خاندانی نظام کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔

• تمہید میں انسانی حقوق کے اس منشور کو تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا ''مشترک معیار'' قرار دیا گیا ہے جو محل نظر ہے، اس لیے کہ جب یہ منشور ترتیب دیا جا رہا تھا تو انسانی آبادی کے ایک بڑے حصے میں معاشرتی کردار رکھنے والے مذاہب اور ثقافتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا، مغرب اگر اپنی سوسائٹی میں اپنے مذہب کے ظالمانہ کردار سے ناراض ہے تو اس مذہب سے انکار اس کا حق ہے لیکن باقی مذاہب کے بارے میں اس قسم کا فیصلہ کرنا اس کا حق نہیں ہے، اس سلسلہ میں عالم اسلام کی پوزیشن ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، لیکن انسانی حقوق کے منشور کی تشکیل کے وقت چین بھی اس سے باہر تھا اور تائیوان کے ایک جزیرے کو چین قرار دے کر محض خانہ پری کی گئی تھی، اسی وجہ سے عوامی جمہوریہ چین کو بھی جو دنیا کی انسانی آبادی کے کم و بیش ایک چوتھائی حصے پر مشتمل ہے، انسانی حقوق کے بارے میں مغربی دنیا کی تعبیرات و تشریحات پر مسلسل تحفظات رہتے ہیں۔ دنیا کی علاقائی تہذیبوں، ثقافتوں اور معاشرتی کردار رکھنے والے مذاہب کو نظر انداز کر کے تشکیل دیے جانے والے منشور کو تمام اقوام کے واسطے ''مشترکہ معیار'' قرار دیا جانا ان کی ثقافتوں اور مذاہب کی نفی کے مترادف ہے اور عالم اسلام کے لیے نہ یہ نفی قابل قبول ہے اور نہ ہی وہ اپنے دین و مذہب کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہے، اس لیے ان زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر اس منشور پر نظر ثانی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

(۴) اقوام متحدہ کے منشور کا دفعہ وار تجزیہ

دفعہ نمبر ۱ تا ۳۔ اقوام متحدہ کی دو رخی پالیسی

دفعہ نمبر ۱ تا ۳ سے ہمیں اصولی طور پر اتفاق ہے اور اسلامی تعلیمات بھی ان حوالوں سے اسی نوعیت کی چلی آ رہی ہیں، البتہ موجودہ حالات میں ان اصولوں کی تطبیق اور مغربی

ممالک حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے عملی کردار کے بارے میں ہمیں تحفظات ہیں، مثلاً دفعہ میں انسانوں کے درمیان ''نسلی فرق'' کی نفی کی گئی ہے جبکہ نسلی امتیاز اور برتری کی بنیاد پر قائم کی جانے والی یہودی ریاست اسرائیل کی مکمل سرپرستی کی جارہی ہے۔

دفعہ نمبر ۴۔ غلامی کا مسئلہ

دفعہ نمبر ۴ ''غلامی کے خاتمے'' کے بارے میں ہے، ہمیں اس سے بھی اختلاف نہیں اور عالم اسلام نے اسے عملاً قبول کر رکھا ہے۔ چنانچہ گزشتہ ایک صدی کے دوران دنیا بھر میں جہاں بھی شرعی بنیادوں پر ''جہاد'' کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں کسی کو غلام یا لونڈی نہیں بنایا گیا اور نہ ہی موجودہ وقت میں دنیا کے کسی بھی حصے میں جہاد کے عنوان سے جنگ لڑنے والے گروہ کسی کو غلام یا لونڈی بنا رہے ہیں، لیکن اسلام اور غلامی کے بارے میں چونکہ بین الاقوامی سطح پر کنفیوژن پایا جاتا ہے اس لیے اس حوالہ سے کچھ باتیں پیش کرنا ضروری ہیں:

جاہلیت کے دور میں کسی کو غلام یا لونڈی بنانے کے عام طور پر تین طریقے ہوتے تھے:

1. طاقت ور لوگ کمزور لوگوں کو زبردستی پکڑ کر بیچ دیتے تھے اور وہ غلام تصور کیے جاتے تھے، جناب نبی اکرمؐ کے صحابہ کرامؓ حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ اسی طریقہ سے غلام بنے تھے۔
2. قرضے یا تاوان کے بوجھ تلے دبا ہوا شخص قرضہ ادا نہ کر سکنے کی پوزیشن میں خود کو قرض خواہ یا تاوان وصول کرنے والے کے حوالے کر دیتا تھا اور وہ اسے فروخت کر دیتا تھا۔
3. جنگوں میں قید ہو جانے والے افراد کو اجتماعی قید خانے میں ڈالنے کی بجائے غلام اور لونڈیاں بنا کر تقسیم کر دیا جاتا تھا اور وہ ان لوگوں کی ملکیت ہوتے تھے۔

جناب نبی اکرمؐ نے پہلی دونوں صورتوں کو ''بیع الحر حرام'' اور ''ثمن الحر حرام'' فرما کر ممنوع قرار دے دیا تھا، اور اس ارشاد گرامی کے بعد مسلم معاشرہ میں اس نوعیت کی غلامی کا وجود باقی نہیں رہا تھا، البتہ جنگوں میں قید ہونے والوں کی غلامی کو اسلام نے باقی رکھا لیکن قطعی حکم کے طور پر نہیں بلکہ ''فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا'' (سورۃ محمد ۴) ''پھر یا تو اس کے بعد احسان کرو یا تاوان لے لو یہاں تک کہ لڑائی والے اپنے ہتھیار ڈال دیں''۔ یہ فرما کر قرآن کریم نے جنگی قیدیوں کے بارے میں دو متبادل صورتیں بھی بیان

فرمائی ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ’’غلام بنانا‘‘حکم نہیں بلکہ مختلف صورتوں میں بطور آپشن ایک صورت ہے جس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ قرآن کریم نے غلاموں کو آزاد کر دینے کی ترغیب دی ہے اور ان کے حقوق بھی متعیّن فرمائے ہیں اور انہیں بلا وجہ سزا دینے اور ان کی طاقت سے زیادہ کام لینے سے منع فرمایا ہے، حتی کہ حضرت ابو مسعود انصاریؓ کو جناب نبی اکرمؐ نے صرف اس وجہ سے لونڈی کو آزاد کر دینے کا حکم دیا تھا کہ انہوں نے لونڈی کو تھپڑ مار دیا تھا۔

بہرحال غلامی کی یہ صورت حکم کے طور پر نہیں بلکہ آپشن کے طور پر باقی رکھی ہے جس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوتے تھے اور اس وقت کا عالمی عرف یہی تھا، اسی وجہ سے آج کے عالمی عرف کو قبول کرتے ہوئے عالم اسلام نے شرعی جنگوں میں کسی کو غلام یا لونڈی بنانے سے گریز کا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔

بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جو بات قرآن و سنت کے کسی قطعی اور صریح حکم سے متصادم ہو اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی معاملہ میں کوئی متبادل صورت موجود ہے یا اجتہاد کے شرعی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئی صورت اختیار کی جا سکتی ہے تو بین الاقوامی معاہدہ کی صورت میں اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ غلامی کے بارے میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کی اس دفعہ کو اور جنیوا کنونشن کی صورت میں بین الاقوامی معاہدہ کو عالم اسلام نے اسی اصول کے تحت قبول کر رکھا ہے اور اس پر ملت اسلامیہ عمل بھی کر رہی ہے۔

اس شق کے حوالہ سے ہم پر مغرب کا یہ اعتراض ہے کہ جب غلامی کے خاتمہ کو عالم اسلام نے عملاً قبول کر لیا ہے تو پھر غلامی کے بارے میں قرآن کریم کی آیات، جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات اور فقہ اسلامی کے ابواب کو دینی تعلیم کے نصاب میں پڑھایا کیوں جا رہا ہے اور انہیں نصاب سے خارج کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین ابدی ہیں، انہیں منسوخ کرنے کی کوئی اتھارٹی موجود نہیں ہے اور ہم نے غلامی کے بارے میں موجودہ بین الاقوامی معاہدات کو قرآن و سنت کے احکام و قوانین میں نسخ کی بنیاد پر نہیں بلکہ موجودہ حالات میں ان کی تطبیق کے حوالہ سے قبول کیا ہے اور یہ اسی وقت تک ہے جب تک موجودہ حالات اور عالمی عرف باقی ہے، یہ نسخ نہیں بلکہ تطبیق کی ایک عملی صورت ہے، آئندہ کسی دور میں اگر پہلے والے حالات اور

عالمی عرف لوٹ آئے تو قرآن و سنت کے ان احکام و قوانین پر اسی طرح عمل ہو گا جیسا پہلے دور میں ہوتا رہا ہے۔

غلامی کے بارے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ آزاد انسانوں پکڑ کر بیچ دینا جسے "بردہ فروشی" کہا جاتا ہے، امریکہ میں صدر ابراہام لنکن کے دور تک موجود رہا ہے۔ اس سے قبل افریقہ سے لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں جہازوں میں بھر کر لایا جاتا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیا جاتا تھا۔ امریکہ کی سیاہ فام آبادی انہی غلاموں کی اولاد ہے، صدر ابراہام لنکن نے غلامی کے خاتمے کا قانون نافذ کیا، لیکن ان سیاہ فاموں کو اس کے بعد بھی گوروں کے برابر شہری حقوق حاصل نہیں تھے اور نہ ہی وہ ووٹ اور رائے کا حق رکھتے تھے، ووٹ کا حق انہیں ۱۹۶۴ء میں صدر جان ایف کینیڈی کے دور میں سیاہ فام لیڈر مارٹن لوتھر کنگ کی عوامی تحریک کے نتیجے میں دستوری طور پر دیا گیا، اس وقت تک وہ ووٹ کے حق سے محروم تھے۔

دفعہ نمبر ۵۔ اسلامی حدود و تعزیرات پر اعتراض کی بنیاد

دفعہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جائے گا یا سزا نہیں دی جائے گی جو ظالمانہ ہو، جس میں جسمانی تشدد ہو اور جو گھٹیا سلوک ہو۔

اقوام متحدہ کے ادارے اور بین الاقوامی لابیاں اس کی تشریح یہ کرتی ہیں کہ جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور توہین و تذلیل والا سلوک کسی شخص کے ساتھ نہیں کیا جائے گا۔ سلوک کی حد تک یہ بات ہمارے لیے بھی قابل قبول ہے بلکہ یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کی ہدایت کی ہے لیکن اس دفعہ میں "یا سزا نہیں دی جائے گی" کہہ کر سزاؤں کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی بھی جرم میں دی جانے والی سزا کو جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور توہین و تذلیل سے خالی ہونا چاہیے اور جس سزا میں ان میں سے کوئی بات پائی جاتی ہے، وہ انسانی حقوق کے منافی تصور ہو گی۔

معاشرتی جرائم کی اسلامی سزاؤں کو اسی وجہ سے انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جاتا ہے کہ ان میں قتل کرنے، سنگسار کرنے، ہاتھ پاؤں کاٹنے، قصاص میں جسمانی اعضاء قطع کرنے، کوڑے مارنے اور کھلے بندوں لوگوں کے سامنے سزا دینے کی صورتیں موجود ہیں،

قرآن وسنت کی بیان کردہ ان سزاؤں کو نہ صرف انسانی حقوق کے منافی کہا جاتا ہے بلکہ نعوذ باللہ وحشیانہ، ظالمانہ اور غیر انسانی سزاؤں سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے موقف کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ سزائیں قرآن کریم نے از سر نو طے نہیں کیں بلکہ یہ ساری سزائیں تورات کی بیان کردہ سزائیں ہیں جو آج بھی دنیا میں پڑھی جانے والی بائبل میں اسی طرح موجود ہیں۔ قرآن کریم نے بعض اصلاحات کے ساتھ توریت کی ان سزاؤں کے تسلسل کو باقی رکھا ہے۔ جبکہ دوسری بات یہ ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسانی معاشرہ میں جرائم کا خاتمہ سخت سزاؤں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آج سعودی عرب میں جرائم کی شرح کم بیان کی جاتی ہے حتی کہ حرمین شریفین میں مختلف رنگوں، نسلوں اور ثقافتوں کے لوگ ہر وقت جمع رہنے کے باوجود جرائم کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی وجہ حرمین شریفین کے تقدس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے عدالتی نظام کی وہ سخت سزائیں بھی ہیں جو اسلام کی شرعی سزائیں ہیں۔ اسی طرح دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے دور میں جرائم کا مکمل خاتمہ ہو گیا تھا، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ امارت اسلامی افغانستان میں طالبان نے اسلام کی شرعی سزاؤں کو عملاً نافذ کر رکھا تھا، جن کی برکت سے جرائم کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

دفعہ نمبر ٦ تا ١٥

دفعہ نمبر ٦ تا ١٥ کی باتوں سے ہمیں بھی اصولی طور پر اتفاق ہے اور بظاہر ان کے حوالہ سے ہمیں کوئی اشکال نہیں ہے۔

دفعہ نمبر ١٦۔ خاندانی نظام اور اسلامی تعلیمات

البتہ دفعہ ١٦ بطور خاص قابل توجہ ہے جس میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ بیان کیا گیا ہے۔ اس دفعہ پر غور کیا جائے تو درج ذیل باتیں زیادہ غور کی مستحق ہیں:

1. نکاح کا حق بالغ مردوں اور عورتوں کو ہے گویا نابالغ لڑکے اور لڑکی کے نکاح کو تسلیم نہیں کیا گیا، اسی لیے کم وبیش ہر ملک میں نکاح کے لیے لڑکے اور لڑکی کی عمر مقرر ہے اور اس سے کم عمر میں نکاح کو قانوناً تسلیم نہیں کیا جاتا۔ مثلاً پاکستان میں نکاح کے لیے لڑکے کی عمر ١٨ سال اور لڑکی کی عمر ١٦ سال ہے۔ اس سے کم عمر میں اگر نکاح ہوا ہے تو وہ قابل سزا جرم تصور ہوتا ہے اور شکایت

کرنے پر اس کے خلاف مقدمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں حدیث وفقہ کی کتابوں میں نکاح صغیر اور نکاح صغیرہ اور اس کے ساتھ ولایت کے جو احکام ہیں وہ سب موقوف ہو جاتے ہیں اور اگر اس کے ساتھ اس بات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو معاملہ اور زیادہ تعجب انگیز ہو جاتا ہے کہ مرد اور عورت باہمی رضامندی سے زنا کا ارتکاب کریں تو وہ آج کے عالمی عرف میں جرم نہیں سمجھا جاتا، گویا مقررہ حد سے کم عمر کا لڑکا یا لڑکی زنا کریں تو جرم نہیں ہے اور اگر باقاعدہ نکاح کرلیں تو یہ جرم تصور ہوگا۔

2. مرد اور عورت کے باہمی نکاح میں رنگ، نسل، قومیت اور مذہب کو رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے، اس میں مذہب کے حوالہ سے ہمارا اختلاف موجود ہے۔ اس لیے کہ اسلام کسی مسلمان لڑکی کا نکاح غیر مسلم کے ساتھ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور مسلمان مرد کا نکاح بھی کسی غیر مسلم خاتون کے ساتھ شرعاً جائز نہیں، سوائے اس کے کہ لڑکی اہل کتاب میں سے ہو اور خدا، رسول اور قیامت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بنیادی باتوں پر یقین رکھتی ہو۔ نکاح وغیرہ کے مسائل یعنی خاندانی زندگی کے احکام میں آج کے عالمی فلسفہ کے ساتھ مسلمانوں کا ایک بڑا تنازعہ یہی ہے کہ انسانی حقوق کے منشور کی اس دفعہ کی رو سے یہ تقاضہ کیا جا رہا ہے کہ مسلمان اور غیر مسلموں کے باہمی نکاح کی اجازت دی جائے، مگر مسلمان علماء دنیا میں کسی بھی جگہ قرآن و سنت کے صریح احکام کی وجہ سے یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ خاص طور پر مغربی ممالک میں جب کوئی مسلمان لڑکی غیر مسلم مرد سے یا مسلمان مرد کسی غیر مسلم عورت سے نکاح کرتا ہے اور اس پر اعتراض کیا جاتا ہے تو وہاں کی عدالتیں اس اعتراض کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اس نکاح کو جائز قرار دے دیتی ہیں۔

3. نکاح کے دوران یعنی ازدواجی زندگی میں میاں بیوی کو بالکل برابر قرار دے کر خاندان کی سربراہی کے معاملہ میں مرد کے حق کی نفی کی گئی ہے جس کے بارے میں ہم تمہید کے ضمن میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی ہے کہ اسلام نے مرد کو گھر کا حاکم قرار دیا ہے بلکہ یہ

گھر کے نظم کے حوالہ سے بھی غیر معقول بات ہے، اس لیے کہ کسی ایک کی انتظامی برتری کو تسلیم کیے بغیر گھر کا نظام چلنا اور اس کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے۔

4. نکاح کو فسخ کرنے کے بارے میں مرد اور عورت کے حق کو برابر قرار دیا گیا ہے، یہ بھی اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے کہ اسلام مرد کو براہ راست طلاق کا جو حق دیتا ہے وہ عورت کو حاصل نہیں ہے اور انسانی حقوق میں مرد اور عورت کی مساوات کے نام پر یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ مرد کی طرح عورت کو طلاق کا برابر کا قانونی حق دے کر عورت اور مرد کے درمیان مساوات قائم کی جائے۔

اسلام نے عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا لیکن مطالبۂ طلاق کا حق دیا ہے جسے خلع کہا جاتا ہے۔ اور اس مطالبۂ حق کو پورا کرنا صرف خاوند پر موقوف نہیں ہے بلکہ اگر عورت کا مطالبہ جائز ہے اور مطالبہ کے وجوہ درست ہیں تو خاوند کے علاوہ تحکیم اور قضا کی صورت میں عورت کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے متبادل راستے موجود ہیں، کیونکہ حکم اور قاضی عورت کا مطالبہ درست ہونے کی صورت میں خاوند کی مرضی کے بغیر بھی نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں۔ اس لیے اسلامی قانون کے بارے میں یہ تاثر درست نہیں ہے کہ اس میں عورت کو مکمل طور پر مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے البتہ یہ بات درست ہے کہ اسلام نے مرد کو براہ راست طلاق کا حق دیا ہے لیکن عورت کو یہ حق بالواسطہ دیا ہے جو مرد اور عورت کی نفسیات میں واضح فرق کے باعث معقول اور منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ خاندان کی بقا اور تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں عجیب بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے مذکورہ فلسفہ کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں پاکستان میں جو عائلی قوانین نافذ کیے گئے، ان میں نکاح کے فارم میں ''تفویض طلاق'' کا ایک مستقل خانہ درج کر کے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ایک درمیانی صورت تھی کہ خاوند کا بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دینا شرعاً بھی درست ہے اور اس سے مغرب کو بھی کسی حد تک مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خانہ عملاً غیر مؤثر ثابت ہوا ہے اس لیے کہ اکثر و بیشتر نکاحوں میں اس خانہ کی طرف توجہ ہی نہیں دی جاتی اور نہ ہی فارم میں کسی نکاح کے اندراج کے موقع پر اس سوال

کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے، اس لیے مغرب کا یہ دباؤ اور مطالبہ پھر زور پکڑ گیا ہے کہ عورت کو قانون میں صراحت کے ساتھ مرد کے برابر طلاق کا حق دیا جائے۔ اس کا حل ہمارے ہاں اب یہ سامنے لایا گیا ہے کہ بعض عدالتی فیصلوں میں خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا گیا ہے اور خلع کے قانونی طریق کار کے لیے سپریم کورٹ کے ایک سابق جج کی سربراہی میں قائم کیے جانے والے ''خواتین حقوق کمیشن'' نے اس سلسلہ میں نئے قانون کے نفاذ کے لیے جو سفارشات پیش کی ہیں ان میں خلع کو عورت کے مساوی حق طلاق کا درجہ دیا گیا ہے۔

بہرحال خاندانی قوانین کے حوالہ سے مغربی فلسفہ اور اسلامی تعلیمات کے درمیان یہ ایک بنیادی تنازعہ ہے جو انسانی حقوق منشور کی اس دفعہ کی بنیاد پر کھڑا ہوا ہے اور مسلسل جاری ہے۔ اس کے ساتھ ہی عورت اور مرد میں مکمل مساوات کے حوالہ سے ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ مرد اور عورت کے بارے میں قوانین، احکام اور معاشرتی روایات کے فرق کو ''جنس کی بنیاد پر امتیاز'' قرار دیا جاتا ہے اور جنس کی بنیاد پر امتیازی قوانین کے مکمل خاتمہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ حکم، قانون اور ضابطہ کے باب میں مرد اور عورت کے سلسلہ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے اور جہاں بھی کوئی فرق موجود ہے اسے امتیازی قانون یا امتیازی رویہ قرار دے کر اس کے خاتمہ پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں بات کو سمجھنے کے لیے ان چند پہلوؤں پر نظر ڈال لی جائے تو ''امتیازی قوانین'' کے خاتمہ کا یہ موقف مزید واضح ہو جاتا ہے:

- اسلام میں عورت کو حکمرانی کے حق سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔
- عورت مذہبی معاملات میں خطابت و امامت کی ذمہ داری سے مستثنیٰ ہے۔
- وراثت کے حصوں میں مردوں اور عورتوں کو بیشتر صورتوں میں برابر کا حق نہیں دیا گیا۔

اور اس قسم کے اور بہت سے امور ہیں جہاں قرآن و سنت نے مرد اور عورت کے لیے الگ الگ احکام و قوانین بیان کیے ہیں۔ یہ سب صورتیں مغرب کی نظر میں مرد اور عورت میں مساوات کے مبینہ اصول کے منافی ہیں اور امتیازی قانون یا رویہ کہلاتی ہیں۔

ہم نے ان سطور میں صرف اس فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد اور عورت میں مکمل مساوات کے قیام اور امتیازی قوانین کے خاتمہ کے لیے قرآن و سنت کے کون

کون سے احکام میں خدانخواستہ ردوبدل کرنا ضروری ہو جاتا ہے، ہم اس حوالہ سے دلائل کی بحث میں نہیں پڑے، اگر کوئی صاحب علم و دانش دلائل اور منطق کے ساتھ اس بحث کی طرف توجہ دے سکیں تو یہ ان کی بڑی دینی خدمت ہوگی۔ البتہ تفصیلات میں جائے بغیر صرف ایک اصولی بات کی طرف متوجہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی جگہ ایک فورم میں راقم الحروف سے سوال کیا گیا کہ کیا مرد اور عورت کے بارے احکام و قوانین میں فرق ہونا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ کیا مرد اور عورت میں کوئی فرق موجود ہے؟ سوال کرنے والے نے جواب دیا کہ یہ فرق تو ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر مرد اور عورت کی تخلیق میں، جسمانی ساخت میں، ذہنی رجحانات میں، نفسیات میں، قوت کار میں، فطری فرائض میں اور طرز عمل میں فرق موجود ہے جسے کسی طرح بھی ختم نہیں کیا جا سکتا تو ان کے بارے میں احکام و قوانین کا فرق بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر سوسائٹی کے نظام کو اور خاص طور پر خاندانی سسٹم کو صحیح طور پر نہیں چلایا جا سکتا۔

دفعہ نمبر ۱۷

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی دفعہ نمبر ۱۷ کے بارے میں ہمیں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دفعہ نمبر ۱۸ و ۱۹۔ آزادئ مذہب اور آزادئ رائے

البتہ ہم دفعہ نمبر ۱۸ اور دفعہ نمبر ۱۹ پر ضرور بات کرنا چاہیں گے اس لیے کہ ان دو دفعات پر عالم اسلام اور مغرب کے درمیان دو بڑے تنازعات کی بنیاد ہے۔ ایک جھگڑا آزادئ مذہب کے عنوان سے ہے اور دوسرے تنازعہ کا عنوان آزادئ رائے ہے۔ آزادئ مذہب اور آزادئ رائے کی حدود کیا ہیں اور ان کے بارے میں آج کی دنیا کے ساتھ ہم مسلمانوں کا تنازعہ کیا ہے؟ اس کی عملی صورتیں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور توہین رسالت پر موت کی سزا کے قانون کے حوالہ سے ہے جو ایک عرصہ سے جاری ہے۔ چنانچہ موجودہ عالمی کشمکش اور مباحثہ کو اس کے اصل تناظر میں سمجھنا بہت ضروری ہے۔

مغرب چونکہ ریاستی، حکومتی اور معاشرتی معاملات میں مذہب کے کردار سے دست بردار ہو چکا ہے اور اس کے نزدیک مذہب صرف فرد کی ذاتی رائے اور ترجیح کا معاملہ ہے اس لیے اس کا خیال ہے کہ ریاست اور حکومت کو مذہبی معاملات میں فریق نہیں بننا چاہیے، یہ فرد کا ذاتی حق ہے کہ وہ کوئی عقیدہ رکھے یا نہ رکھے، کسی کی عبادت کرے یا نہ

کرے، ایک مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لے، اپنے مذہب کا کھلم کھلا پرچار کرے، دوسروں کو اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دے اور اپنی مذہبی رسوم آزادی کے ساتھ ادا کرے، اس کے اس حق میں مداخلت کا حکومت یا ریاست کو حق حاصل نہیں ہے، اسی طرح ریاست و حکومت کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ مذہب کے حوالہ سے اپنے شہریوں کے درمیان کوئی فرق روا رکھے اور مختلف مذاہب کے لوگوں کے لیے الگ الگ قانون اور احکام نافذ کرے، اگر حکومت کسی فرد یا گروہ کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتی ہے تو اسے مذہبی آزادی میں مداخلت قرار دیا جاتا ہے اور اگر مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں الگ الگ احکام و قوانین کا نفاذ کرتی ہے تو اسے مذہبی امتیاز کا قانون کہا جاتا ہے اور اسے ختم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ دفعہ نمبر ۱۸ میں مذہبی آزادی کی جو حدود بیان کی گئی ہیں ان کی بنیاد پر ہمارے ہاں پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی دستوری دفعہ اور انہیں اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ سے روکنے والے امتناع قادیانیت قانون کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اسے ختم کرنے کا عالمی سطح پر مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح بعض دوسری اقلیتیں بالخصوص مسیحی آبادی بھی بعض ملکی قوانین کو مذہبی آزادی کے منافی اور مذہبی امتیاز پر مبنی قوانین قرار دے کر ان کے خاتمہ کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔

جبکہ اس سلسلہ میں اصل صورت حال یہ ہے کہ پاکستان اپنے وجود اور دستور دونوں حوالوں سے ایک نظریاتی اسلامی ریاست ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حدود میں اس نظریہ و مذہب کا نہ صرف تحفظ کرے بلکہ اس کے احکام و قوانین کا نفاذ عمل میں لائے اور ملک میں ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کرے۔ اس لیے اسلامی عقیدہ و ثقافت کی حفاظت اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری حکومت پاکستان کا ریاستی فریضہ قرار پاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے کسی بھی ملک کی حکومت کا یہ اولین فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دستور کا تحفظ کرے، اس کا نفاذ کرے اور اس کے منافی کوئی کام اپنے ملک میں نہ ہونے دے، کسی بھی ملک کے دستور کی بنیادوں اور اصولوں سے اتفاق یا اختلاف ایک الگ امر ہے لیکن ملک کے اندر اس کے تحفظ و نفاذ کا معاملہ اس سے مختلف امر ہے۔ مثلاً فرانس کے دستور کی بہت سی باتوں سے خود اس ملک کے بہت سے شہریوں کو نظری طور پر اختلاف ہوگا لیکن ملک کے شہری کی حیثیت سے اس اختلاف کے باوجود اس دستور کو ماننا اور اس پر عمل

کرنا اس کی ذمہ داری ہے اور اس سے اس پر عمل کرانا حکومت کا فرض ہے۔ اگر وہ اختلاف کی بنیاد پر ملک کے دستور کی کسی بات پر عمل کرنے سے انکار کرے گا تو یہ اختلاف نہیں رہے گا بلکہ بغاوت کی شکل اختیار کر لے گا جس کی اجازت دنیا کا کوئی ملک یا حکومت دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

پاکستان جب دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوؤں سے الگ معاشرت و ثقافت کے حوالہ سے تشکیل پایا تھا اور جب اس کا دستور اسلامی بنیادوں پر طے کیا گیا تھا، ان دونوں مواقع پر اس خطہ میں موجود غیر مسلم اقلیتیں اس عمل میں شریک تھیں اور انہوں نے اسلام کی بنیاد پر پاکستان کی تشکیل اور نظریاتی بنیادوں پر دستور کی تدوین کے عمل کو تسلیم کیا تھا جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حدود میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سوشل کنٹریکٹ اور سماجی معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور جب اقوام متحدہ نے پاکستان کی اس امتیازی حیثیت کے باوجود اس کی رکنیت کو قبول کر رکھا ہے اور پاکستان اپنے اسلامی تشخص اور نظریاتی دستور کی موجودگی میں اقوام متحدہ کا سرگرم رکن ہے تو گویا عالمی سطح پر بھی پاکستان کے اس امتیازی تشخص کو قبول کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان اور دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے دونوں مواقع پر پاکستان کے اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کا فیصلہ ملک کے عوام پر جبر کے ذریعہ مسلط نہیں کیا گیا بلکہ آزادانہ عوامی رائے اور مکمل جمہوری عمل کی صورت میں عوام کے منتخب نمائندوں نے یہ فیصلے کیے ہیں تو ان زمینی حقائق کی موجودگی میں دنیا میں کسی بھی سطح پر کسی کا یہ حق نہیں رہ جاتا کہ وہ پاکستان کے اس اسلامی نظریاتی تشخص سے انکار کرے اور ملک کے اندر اس اسلامی نظریاتی تشخص کے لیے کیے جانے والے ریاستی اور حکومتی اقدامات میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

اس اصولی گزارش کے بعد ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ پاکستان میں اپنے دستوری مذہب اسلام کی حفاظت و ترویج اسی طرح ریاست و حکومت کی ذمہ داری ہے جس طرح امریکہ میں امریکی دستور کی حفاظت و تنفیذ وہاں کی حکومت و ریاست کی ذمہ داری ہے، جس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ملک میں رہنے والے تمام غیر مسلموں کو یہ حق تو ہے کہ وہ اپنا نظری اختلاف قائم رکھتے ہوئے ملک میں رہیں اور دستور میں اتفاق رائے اور سماجی معاہدہ کی رو سے طے پانے والے اپنے حقوق سے مکمل استفادہ کریں، لیکن اس اختلاف کی بنیاد پر

پاکستان کے اسلامی تشخص اور دستور کی اسلامی بنیادوں کو چیلنج کرنے کا حق انہیں کسی طرح بھی حاصل نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں قادیانیوں کا موقف اور طرز عمل سب سے زیادہ تعجب انگیز بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ وہ عالم اسلام کے اجماعی فیصلے کو ماننے سے انکاری ہیں، پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے دستوری فیصلے سے منحرف ہیں، ملک کی سپریم کورٹ کے متفقہ فیصلے کو تسلیم نہیں کر رہے اور پاکستان کے شہریوں کے جمہوری فیصلے سے انحراف کر رہے ہیں، اور اس سب کچھ کے ساتھ ان کا اصرار ہے کہ پوری امت مسلمہ اور ساری کی ساری پاکستانی قوم ان کے سامنے سرنڈر ہو اور تمام جمہوری، عدالتی اور دینی فیصلوں سے دست بردار ہو کر ان کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں مسلمان کے طور پر اپنے وجود کا حصہ تسلیم کرے، آج قادیانی گروہ دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے کہ پاکستان میں ان کے انسانی حقوق اور مذہبی آزادی پامال کی جا رہی ہے اور وہ مظلوم ہیں جبکہ بین الاقوامی ادارے اور مغربی ممالک حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمارا موقف بالکل واضح ہے کہ مسئلہ قادیانیوں کے مذہبی یا شہری حقوق کا نہیں بلکہ ان کے معاشرتی سٹیٹس اور حقوق کے ٹائٹل کا ہے، وہ اگر اپنے بارے میں دستوری، عدالتی اور شرعی فیصلوں کو قبول کر کے مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں تو ملک کی دیگر غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ ان کے تمام حقوق محفوظ ہیں اور ان کے کسی مسلمہ حق سے انکار نہیں ہے، لیکن اگر وہ جمہوری اور دینی فیصلوں کو مسترد کرتے ہوئے دستور و قانون کو چیلنج کرتے ہیں اور مسلم اکثریت کا زبردستی حصہ بننا چاہتے ہیں تو اس کا سرے سے کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

دفعہ ۱۹ میں آزادیٔ رائے کی بات کی گئی ہے اور اس کی بنیاد پر کہا جا رہا ہے کہ مذہب اور مذہبی شخصیات سے اختلاف اور ان پر تنقید بھی آزادیٔ رائے کا حصہ ہے اور اس کو جرم قرار دے کر اس پر موت کی سزا مقرر کرنا آزادیٔ رائے اور آزادیٔ ضمیر کے انسانی حق کے منافی ہے۔ یہ بات مغالطہ کے سوا کچھ نہیں، اس لیے کہ اختلاف رائے اور چیز ہے اور توہین اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ مسلمانوں نے علمی اختلاف کا جواب ہمیشہ علمی انداز سے دیا ہے، صدیوں سے مستشرقین اسلام پر، قرآن کریم پر اور جناب نبی اکرمؐ کی شخصیت اور کردار پر اعتراضات کر رہے ہیں اور مسلمان دانش ور ان کے جوابات دے رہے ہیں، لیکن

جناب نبی اکرمؐ یا کسی بھی سچے رسول اور نبی کی توہین کو انہوں نے کبھی برداشت نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کبھی یہ بات برداشت ہو سکتی ہے۔ میں اس کی دو واقعاتی مثالیں دینا چاہوں گا۔ مغرب کے ایک دانش ور سر ولیم میور نے جناب نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر کتاب لکھی اور اس میں بعض اعتراضات کیے، ان میں اعتراضات کا مسلمانوں کی طرف سے کتاب کی صورت میں جواب دیا گیا، لیکن سلمان رشدی نے ''شیطانی آیات'' کے نام سے خرافات کا مجموعہ مرتب کیا جس کی بنیاد علمی یا تاریخی اشکالات پر نہیں بلکہ توہین و استخفاف اور طنز و استہزاء پر تھی، اس لیے اسے برداشت نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اب سے ڈیڑھ سو سال قبل لاہور میں ایک ہندو دانش ور پنڈٹ دیانند سرسوتی نے ''ستیارتھ پرکاش'' کے نام سے کتاب لکھی اور اس کے ایک باب میں قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں سو سے زیادہ اعتراضات کیے، مسلمان علماء نے اس کتاب کا جواب لکھا اور پنڈٹ سرسوتی سے براہ راست مباحثہ کر کے اسے لاجواب کیا۔ لیکن لاہور میں ہی ایک اور ہندو مصنف راج پال نے ''رنگیلا رسول'' کے نام سے کتاب لکھی جس کا نام ہی توہین آمیز تھا، اسے برداشت نہیں کیا گیا اور غازی علم الدین شہیدؒ نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اختلاف اور توہین میں فرق ہے اور توہین رسالتؐ کو جرم قرار دینے پر اعتراض در حقیقت توہین کو حقوق میں شامل کرنے کی بات ہے جو قطعی طور پر غیر معقول اور ناقابل قبول ہے۔ میں عام طور پر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا کے ہر ملک میں ''ہتک عزت'' پر قانونی چارہ جوئی کا حق شہریوں کو حاصل ہے اور ''ازالۂ حیثیت عرفی'' سے شہریوں کو قانونی تحفظ دیا جاتا ہے، اگر کسی ملک کے ایک عام شہری کی ہتک عزت اور ازالۂ حیثیت عرفی جرم ہے تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ہتک عزت اور آزالۂ حیثیت عرفی اس سے کئی گنا زیادہ سنگین جرم ہے، اس لیے کہ اس کے ساتھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کروڑوں عقیدت مندوں کے دلی جذبات کی توہین بھی شامل ہو جاتی ہے۔

''آزادئ رائے'' کے حوالہ سے ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ کم و بیش ہر ملک میں اس کی نظریاتی اساس، اس کے دستور اور قومی شخصیات کی توہین کا کسی کو حق نہیں دیا جاتا، حتیٰ کہ قومی شعائر مثلاً پرچم وغیرہ کی حرمت کے قانونی تحفظ کا اہتمام کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ فوج کی وردی، پولیس کی وردی اور ان کے سٹارز وغیرہ کو بھی قومی شعبوں کی علامات قرار دے کر ان کی توہین کو جرم سمجھا جاتا ہے، اسی طرح اسلام بھی چونکہ ایک

اسلامی ریاست کی دستوری اساس ہے، اس لیے اسلام کے شعائر اور دینی علامات کی توہین بھی جرم ہے، اور انسانی حقوق کے نام سے ان شعائر اور علامات کی بے حرمتی کا جواز فراہم کرنا انصاف اور عقل کے خلاف بات ہے۔

ہمارا مغرب سے مطالبہ ہے کہ اختلاف اور توہین کے فرق کو تسلیم کیا جائے اور جس طرح کسی بھی ملک کی قومی شخصیات اور قومی علامات کی حرمت و عزت کو قانونی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اسی طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، مسلمہ مذاہب اور ان کی علامات و شعائر کے قانونی تحفظ کا حق تسلیم کیا جائے۔

دفعہ نمبر ۲۰۔ معاشرہ کی سیاسی گروہ بندی

دفعہ نمبر ۲۰ کے بارے میں بھی کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ معاشرے کی سیاسی گروہ بندی جناب نبی اکرمؐ کے دور میں بھی موجود تھی جو پہلے قبائل کی صورت میں تھی جیسا کہ قریش میں سیاسی معاملات کی انجام دہی مختلف شعبوں میں مختلف خاندانوں کے سپرد تھی جبکہ جناب نبی کریمؐ کے وصال کے وقت مہاجرین، انصار اور خاندان نبوت کے الگ الگ سیاسی موقف کی شکل میں اس کا اظہار ہوا، انصار مدینہ نے اپنے طور پر خلیفہ کا انتخاب کرنا چاہا، مہاجرین نے ان سے اختلاف کیا اور حضرت علیؓ نے خاندان نبوت کی طرف سے مہاجرین اور انصار کے فیصلہ پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا جس کی تفصیلات میں جائے بغیر اصولی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اجتماعی و سیاسی مسائل پر الگ الگ گروہوں کی صورت میں موقف اختیار کرنے اور اس کے لیے جدوجہد کرنے کی عملی شکل اس دور کے اسلامی معاشرہ میں موجود تھی، اسی کی ترقی یافتہ صورت کو اگر جماعت سازی کی بنیاد سمجھ لیا جائے تو ہمیں اس میں کوئی اشکال نظر نہیں آتا۔ البتہ اس انجمن سازی کا بنیادی اصول ”وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ (سورۃ المائدہ ۲) کے قرآنی ارشاد کو قرار دے کر جماعت سازی کی حدود و شرائط کا تعین ضروری ہوگا۔

دفعہ نمبر ۲۱۔ اسلام میں حق حکمرانی کی بنیاد

دفعہ نمبر ۲۱ سیاسی نظام کے بارے میں ہے جس کے تحت اقوام متحدہ کے رکن ممالک نے عالمی سطح پر اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے کہ ان کا سیاسی نظام اور حکومتی نظم شہریوں کی اجتماعی رائے کے تابع ہوگا اور عوام کی رائے سے ہٹ کر قائم ہونے والی کوئی حکومت اس منشور کی رو سے جائز حکومت متصور نہیں ہوگی۔ اسے جمہوریت کہا جاتا ہے اور عوام کی

حاکمیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس حوالہ سے اسلامی تعلیمات، قرآن و سنت کے ارشادات اور خلفاء راشدینؓ کے طرز عمل کی روشنی میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری ہے:

• اسلام میں عوام کی حاکمیت کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی پابندی ایک اسلامی حکومت کی بنیاد ہے اور حکمران فرد یا گروہ عوام کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی بجائے قرآن و سنت کے احکام کو نافذ کرنے کا پابند ہے، اس لیے اسلام کے سیاسی نظام میں نظام حکومت کو حکومت کی بجائے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ حکمران از خود حکومت نہیں کرتا بلکہ قرآن و سنت کے احکام کے نفاذ میں جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے۔ چنانچہ فقہاء امت نے خلافت کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ خلیفہ وہ ہے جو جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے امت مسلمہ کے اجتماعی معاملات سرانجام دے۔

• اسلام میں عوام یا ان کے نمائندوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ قرآن و سنت کے صریح اور قطعی احکام میں کوئی رد و بدل کریں، ان کی پابندی ہر حال میں حکمران، عوام اور ان کے نمائندوں پر ضروری ہے، مگر وہ احکام و مسائل جو قرآن و سنت میں موجود نہیں ہیں، یا واضح نہیں ہیں، یا ان کی تعبیر و تشریح میں امت کے اہل علم کی آراء مختلف چلی آرہی ہیں، ان میں اجتہاد کے شرعی اصولوں کے دائرے میں حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان میں یہ فرق ضروری ہے کہ جن امور و مسائل کا تعلق عوامی اور انتظامی معاملات سے ہے ان کا فیصلہ کرنا حکومت یا عوام کے نمائندوں کا حق ہے اور جن مسائل کا تعلق شرعی امور اور دینی تعبیر و تشریح سے ہے ان میں مسلمہ اہل علم فیصلے کی اتھارٹی ہوں گے اور انہی کے فیصلے معتبر ہوں گے۔

• اسلام میں حکومت کی تشکیل اور خلیفہ کا انتخاب عوام کی رائے پر ہوگا جیسا کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد ان کے جانشین کا انتخاب عوامی بحث و مباحثہ کے بعد عوامی رائے اور انتخاب کے ذریعہ ہوا، اپنا جانشین جناب نبی اکرمؐ نے خود نامزد نہیں فرمایا البتہ اشارات ضرور کیے تھے لیکن فیصلہ مسلمانوں کی

رائے پر چھوڑ دیا تھا۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر اپنا جانشین نامزد کرنے اور اس کے لیے تحریر لکھوانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ فرما کر یہ ارادہ ترک کر دیا کہ ''یابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر'' اللہ تعالی ابو بکر کے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بننے دیں گے اور مسلمان بھی کسی اور کو قبول نہیں کریں گے، یہ ارشاد گرامی جہاں حضرت ابو بکرؓ کے خلیفۂ رسولؐ ہونے کی اہلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں مسلمانوں کی اجتماعی رائے کی اصابت پر اعتماد کا اظہار بھی ہے۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا کہ نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد اس مسئلہ پر اختلاف تو ہوا لیکن بالآخر امت حضرت ابو بکرؓ پر متفق ہو گئی۔

فقہاء اسلام نے خلافت کے انعقاد یعنی ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کی جو صورتیں بیان فرمائی ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، کم و بیش سبھی فقہاء نے اس کی پانچ صورتیں بیان فرمائی ہیں:

1. عامۃ المسلمین یا ان کے اہل حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کا چناؤ کیا گیا تھا، اسے آج کے دور میں براہ راست انتخاب یا بالواسطہ انتخاب کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

2. خلیفۃ المسلمین اپنا جانشین خود نامزد کر دے جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کر دیا تھا۔

3. خلیفۂ وقت کسی ایک فرد کو جانشین بنانے کی بجائے خلافت کے اہل لوگوں کا ایک پینل نامزد کر دے اور ان میں سے کسی کو منتخب کیا جائے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے چھ بزرگوں کا پینل نامزد کر دیا تھا اور ان میں سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ فرماتے ہیں جو اس پینل میں شامل تھے اور جنہیں اس پینل نے خلیفہ کے چناؤ کا اختیار دے دیا تھا، ان کا ارشاد ہے کہ وہ مسلسل تین دن تک اس سلسلہ میں لوگوں سے مشاورت کرتے رہے، انہوں نے مدینہ منورہ کا کوئی طبقہ اور حلقہ نہیں چھوڑا جس سے مشاورت نہ کی ہو، حتی کہ انہوں نے مسلسل تین دن اور تین رات تک آنکھ میں نیند کا سرمہ تک نہیں لگایا اور جب یہ

اطمینان حاصل کر لیا کہ لوگوں کی عمومی رائے حضرت عثمانؓ کے حق میں ہے تو انہیں خلیفہ نامزد کرنے کا اعلان کر دیا۔

4. خلیفہ کے انتقال کے وقت جو ارباب شوریٰ یا اہل حل و عقد موجود ہوں وہ نئے خلیفہ کا انتخاب کر لیں جیسا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ میں موجود اصحاب شوریٰ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ منتخب کر لیا تھا۔

5. خلافت کی اہلیت رکھنے والے کوئی صاحب طاقت کے بل پر اقتدار پر قبضہ کر لیں اور امت انہیں قبول کر لے جیسا کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد امت نے قبول کر لیا تھا اور وہ اس کے بعد کم و بیش بیس برس تک امت کے متفقہ امیر المؤمنین رہے۔

خلافت کے انعقاد یعنی کسی اسلامی حکومت کی تشکیل اور اس کے جواز کی یہ پانچ صورتیں فقہاء اسلام نے بیان فرمائی ہیں، ان میں سے دوسری، تیسری اور چوتھی صورت تو آج کے دور میں قابل عمل نہیں ہیں، اس لیے کہ اس وقت دنیا میں کوئی شرعی خلیفہ موجود نہیں ہے جو کسی کو اپنا جانشین نامزد کر سکے یا اس کے لیے کوئی پینل مقرر کر سکے اور نہ ہی خلافت کی کوئی باضابطہ شوریٰ موجود ہے جس کے ارکان خلیفہ کا انتخاب کر سکیں، اس لیے آج کے عالمی حالات میں خلافت کے انعقاد یا ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کے دو ہی راستے ممکن اور قابل عمل ہیں۔ ایک یہ کہ کسی ملک کے عوام براہ راست یا اپنے معتمد نمائندوں (ارباب حل و عقد) کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب کریں اور دوسرا یہ کہ خلافت کی اہلیت رکھنے والا کوئی شخص طاقت کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کر لے اور ملک کے عوام اسے بطور حکمران قبول کر لیں یعنی عملاً اس کی رٹ قائم ہو جائے۔

خلافت یا اسلامی حکومت کے حوالہ سے اہل سنت اور اہل تشیع کے اختلاف کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ اہل سنت کے ہاں یہ نظام ''خلافت'' کہلاتا ہے جبکہ اہل تشیع اسے ''امامت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور خلافت و امامت میں چند اصولی اور بنیادی فرق پائے جاتے ہیں:

- امام نامزد ہوتا ہے اور خلیفہ امت کی صوابدید پر منتخب ہوتا ہے جیسا کہ اہل تشیع کے نزدیک جناب نبی اکرمؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا جانشین نامزد

کر دیا تھا، جبکہ اہل سنت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے تمام طبقات نے باہمی مشاورت اور اتفاق رائے سے حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب کیا تھا۔

• امام اللہ تعالی کی طرف سے ہوتا ہے اسی لیے وہ معصوم ہوتا ہے، مگر خلیفہ احکام اسلامی کے نفاذ اور حق حکمرانی استعمال کرنے میں اللہ تعالی کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے۔ قاضی ابو یعلیؒ نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضرت ابو بکرؓ کو ''یا خلیفۃ اللہ'' کہہ کر خطاب کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ ''لست بخلیفۃ اللہ انا خلیفۃ رسول اللہ'' میں اللہ تعالی کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ امام اللہ تعالی کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے خود دلیل کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے، مگر خلیفہ جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے اپنے فیصلے اور حکم میں قرآن و سنت کی دلیل کا پابند ہے جیسا کہ صدیق اکبرؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ میں اگر قرآن و سنت کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر ضروری ہے اور اگر اس کے خلاف چلنے لگوں تو تم پر میری اطاعت ضروری نہیں ہے۔

• امام نسبی اور خاندانی ہے جیسا کہ اہل تشیع کے بارہ امام ایک ہی نسب اور خاندان سے ہیں مگر خلافت نسبی اور خاندانی نہیں ہے، اس لیے کہ چاروں خلفاء راشدین حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے بعد صحابہ کرامؓ کے دور میں بننے والے مسلمانوں کے متفقہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ میں سے کوئی بزرگ بھی ایک دوسرے کا نسبی اور خاندانی وارث نہیں تھا، اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی خلافت اکثر خاندانی دائروں میں ہی چلتی آرہی ہے لیکن حضرات صحابہ کرامؓ کے دور کا نظام خلافت جو آئیڈیل اور اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے، خاندانی اور نسبی خلافت کے دائرہ سے ہٹ کر تھا۔

• امام کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا مگر خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پہلے خطبہ میں فرما دیا تھا کہ اگر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو لیکن اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو، یہ خلیفہ کا عوام

کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اور عوام کا حق احتساب ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں عملی طور پر موجود رہا ہے۔

- امام معصوم عن الخطاء ہے اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا مگر خلیفہ کی شرعی حیثیت مجتہد کی ہے جس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ "المجتہد یخطئ و یصیب" اس لیے حضرات خلفاء راشدینؓ کے بہت سے فیصلوں سے ان کے سامنے اختلاف کیا جاتا تھا اور وہ درست ہونے کی صورت میں اختلاف کو قبول بھی کرتے تھے۔

دور حاضر میں ایران کا دستور "امامت" کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے کہ امام غائب کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے "ولایت فقیہ" کو ان کے نمائندہ کی حیثیت دی گئی ہے اور ولایت فقیہ کے طور پر آیت اللہ خمینی اور ان کے بعد آیت اللہ خامنائی اس منصب پر فائز ہوئے ہیں، ان کے ساتھ ایک "شوریٰ نگہبان" ہے اور ولایت فقیہ اور شوریٰ نگہبان کو دستوری طور پر یہ حیثیت حاصل ہے کہ ان کے فیصلے حکومت، پارلیمنٹ، عدالت اور دیگر تمام شعبوں پر بالادستی رکھتے ہیں، وہ ان میں سے کسی کا فیصلہ بھی منسوخ کر سکتے ہیں، مگر ان کے فیصلے کو کسی جگہ چیلنج نہیں کیا جا سکتا، حکومت اور پارلیمنٹ وقفہ وقفہ سے منتخب ہوتی ہیں مگر "ولایت فقیہ" کا منصب تاحیات ہے۔

جبکہ سعودی عرب اور پاکستان کے دستور "خلافت" کے تصور کے قریب ہیں، سعودی عرب میں حاکمیت اعلیٰ قرآن و سنت کی ہے، حق حکمرانی آل سعود کو حاصل ہے مگر وہ قرآن و سنت کے مطابق حکومت کرنے کے پابند ہیں، پاکستان کے دستور میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے، حق حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے اور حکومت اور پارلیمنٹ دونوں دستوری طور پر قرآن و سنت کے پابند ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۲ تا ۲۴

دفعہ نمبر ۲۲ تا دفعہ نمبر ۲۴ کے ضمن میں کوئی خاص بات کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دفعہ نمبر ۲۵۔ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم

البتہ دفعہ نمبر ۲۵ میں "معیار زندگی" اور "معاشی تحفظ" کے حوالہ سے بات کی گئی ہے، اس لیے اس حوالہ سے کچھ معروضات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

• ’’معیار زندگی‘‘ کے بارے میں یہ بات سامنے رہنا ضروری ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کے بعد جب سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو اصحاب شوریٰ نے دو اصولی فیصلے کیے، ایک یہ کہ چونکہ خلیفہ کے اوقات امور حکومت میں صرف ہوں گے اور وہ اپنا کوئی کاروبار وغیرہ نہیں کر سکیں گے اس لیے ان کے اور ان کے گھر کے اخراجات بیت المال کے ذمہ ہوں گے۔ اور دوسرا فیصلہ یہ کہ ان کے اخراجات کا تعین اس بنیاد پر ہوگا کہ وہ مدینہ منورہ کے ایک عام شہری کے معیار کے مطابق اپنے گھر کے اخراجات چلا سکیں، عام شہری سے مراد متوسط درجے کا شہری ہے اور فیصلے کے الفاظ میں یہ جملہ بہت زیادہ توجہ کا مستحق ہے کہ ’’لاوکس فیھا ولا شطط‘‘ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں حکمرانوں اور عام شہریوں کا معیار زندگی یکساں ہونا چاہیے اور اسی بنیاد پر ’’بیت المال‘‘ سے حضرت صدیق اکبرؓ کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

• امیر المومنین حضرت عمرؓ نے سرکاری عمال پر پابندی لگا دی تھی کہ:

(۱) وہ اپنے گھر کے سامنے ڈیوڑھی نہیں بنا سکیں گے۔

(۲) ترکی گھوڑے پر سواری نہیں کریں گے۔

(۳) باریک لباس نہیں پہنیں گے اور

(۴) چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائیں گے۔

یہ اس دور میں معاشرتی امتیاز کی علامات تھیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمران طبقات کو عام شہریوں کے ساتھ معاشی برابری کے ساتھ معاشرتی برابری کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔

• بیت المال سے عام لوگوں کے وظیفے مقرر کرنے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے تھی کہ وہ برابری کی بنیاد پر ہونے چاہئیں، دینی درجات یا فضیلت کو وجۂ ترجیح نہیں بنا چاہیے۔ جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ فضیلت اور درجات کے لحاظ سے وظائف کی درجہ بندی ہونی چاہیے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے دور میں وظائف کی تقسیم بالکل برابری کی بنیاد پر کی ہے مگر حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں یہ طریقہ تبدیل کر کے درجہ بندی کر دی اور امہات المومنین،

مہاجرین، انصار اور دیگر حوالوں سے مختلف گریڈ طے کر کے ان کی بنیاد پر وظائف تقسیم کیے۔ مگر امام ابو یوسفؒ نے ”کتاب الخراج“ میں لکھا ہے کہ آخری سال حضرت عمرؓ نے اس درجہ بندی کے معاشرتی نقصانات دیکھتے ہوئے یہ فرمایا کہ مجھے یہ بات سمجھ آئی ہے کہ اس کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے درست تھی۔ اس لیے اگلے سال سے اس کے مطابق عمل کروں گا۔ مگر اگلے سال سے پہلے حضرت عمرؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آ گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں معاشرتی طبقات اور درجہ بندی کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور معاشرتی یکسانیت قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

”بیت المال“ جناب نبی اکرمؐ کے دور میں ہی موجود تھا اور اس کے ذریعہ معاشرہ کے معذور اور ضرورت مند افراد کی مدد کی جاتی تھی، جناب نبی اکرمؐ بیت المال کی رقوم سے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے تھے اور تاوان میں پھنس جانے والے حضرات کی مدد بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک روایت میں مقتول کی دیت بھی بیت المال سے ادا کرنے کا ذکر ملتا ہے، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ ”من ترک مالا فلورثتہ و من ترک کلا و عیالا فالی وعلی“ جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ اس کے وارثوں کو ملے گا اور جو بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کرے گا اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ میری طالب علمانہ رائے میں ”بیت المال“ کے ذریعہ سوسائٹی کے معذور، نادار، بے روزگار، ضرورت مند اور بوجھ تلے دبے لوگوں کی مدد کرنے اور ان کی کفالت کرنے کی بنیاد رسول اللہؐ کے اسی ارشاد گرامی ”فالی وعلی“ پر ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے بیت المال کے نظام کو اس قدر منظم کیا کہ خلافت راشدہ کا دور آج بھی ویلفیئر سٹیٹ اور رفاہی ریاست کے لیے آئیڈیل تصور کیا جاتا ہے اور بہت سے مغربی ممالک اس کے بعض حصوں کی پیروی کر رہے ہیں، حتیٰ کہ ناروے میں اس سلسلہ کے بعض قوانین اور وظیفے حضرت عمرؓ کے نام کے ساتھ رائج کیے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست صحیح معنوں میں ایک فلاحی ریاست ہے جو مملکت کے تمام باشندوں کی ضروریات زندگی فراہم کرنے اور ان کی کفالت کی ذمہ داری

قبول کرتی ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کا یہ تاریخی جملہ ایک راہ نما اصول کا درجہ رکھتا ہے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے پر کوئی کتا بھی بھوک سے مرجائے تو عمرؓ سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

ایک اسلامی رفاہی ریاست میں ''بیت المال'' کا کردار کیا ہے، اس کے حوالہ سے امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور کا ایک واقعہ امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ نے ''کتاب الاموال'' میں بیان فرمایا ہے جو ایک اسلامی ریاست کے رفاہی پہلو کی وضاحت کرتا ہے۔ ان کے دور میں عراق کے گورنر عبد الحمیدؒ نے امیر المومنین کو خط لکھا کہ اس سال صوبہ میں بیت المال کو جو آمدنی ہوئی ہے اس سے سال بھر کے اخراجات پورے کرنے کے بعد کچھ رقم بچ گئی ہے اس کے بارے میں فرمائیں کہ کیا کیا جائے؟ امیر المومنین نے جواب دیا کہ صوبہ میں اعلان کر کے جو حضرات مقروض ہیں اور اپنے قرضے ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان کے قرضے بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنر کا جواب آیا کہ یہ کام کر چکا ہوں اس کے باوجود زائد رقم موجود ہے۔ امیر المومنین کا دوسرا خط آیا کہ سروے کر کے معلوم کرو کہ جو لڑکے اور لڑکیاں شادی کے قابل ہیں اور اخراجات میسر نہ ہونے کی وجہ سے شادیاں نہیں کر سکتے ان کی شادیاں بیت المال کی طرف سے کرا دو۔ گورنر صاحب نے لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں، رقم پھر بھی بچ گئی ہے، امیر المومنین نے لکھا کہ وہ شادی شدہ حضرات جو بیوی کا مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان کے مہر بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنر عبد الحمیدؒ نے لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں، امیر المومنینؒ نے پھر لکھا کہ بے آباد زمینوں کا سروے کرا کے انہیں آباد کرنے کے لیے زمین داروں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔

یہ بات بظاہر عجیب سی لگتی ہے لیکن تاریخی حقیقت ہے اور ایک اسلامی ریاست میں ''بیت المال'' کے کردار کی وضاحت کرتی ہے، ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اسلام کے یہ سنہری اصول اور خلافت راشدہ اور خلافت اسلامیہ کی یہ زریں روایات رفاہی ریاست کے حوالہ سے غیر مسلم حکومتوں کی توجہ تو حاصل کر رہی ہیں لیکن مسلم ممالک بالخصوص اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے حکمرانوں کی اس طرف توجہ نہیں ہے۔

دفعہ نمبر ۲۵ کی دوسری شق میں زچہ اور بچہ کی امداد کے حوالہ سے بات کی گئی ہے اور یہ وضاحت کی گئی ہے کہ بچہ شادی کے نتیجے میں پیدا ہو یا بغیر شادی کے، دونوں صورتوں میں یکساں سلوک کا مستحق ہوگا۔ ہمیں بچے کے بارے میں تو کوئی کلام نہیں ہے کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک درست طرز عمل نہیں ہے، لیکن زچہ کے بارے میں دونوں صورتوں میں برابر کے سلوک کی بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بغیر شادی کے بچوں کی صورت میں بھی زچہ کو قانونی طور پر برابر کے سلوک کا حقدار قرار دیا جا رہا ہے۔ جبکہ اسلام ان دونوں صورتوں میں فرق کرتا ہے اور شادی کے بغیر بچے کو جنم دینے والی زچہ اور اس کے ساتھ ناجائز سلوک قائم کرنے والا مرد دونوں اسلام کی نظر میں مجرم ہیں اور ان کے لیے سزا مقرر ہے۔

جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں ایک عورت آئی کہ اس نے زنا کیا ہے اور زنا سے پیدا ہونے والا بچہ اس کی گود میں ہے، اس لیے اسے سزا دی جائے، نبی اکرمؐ نے اس سے فرمایا کہ بچے کا تو کوئی قصور نہیں ہے، جاؤ بچے کو دودھ پلاؤ، جب اس کو تمہارے دودھ کی ضرورت نہیں رہے گی تو پھر آنا۔ روایت میں ہے کہ وہ ایک عرصہ کے بعد بچے کو لے کر آئی جس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا اور وہ اسے کھا رہا تھا، اس نے کہا کہ اب یہ بچہ روٹی کھا لیتا ہے اور اسے میرے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، اس لیے اب مجھ پر سزا نافذ کی جائے، چنانچہ نبی اکرمؐ نے اس عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کو تحفظ فراہم کیا ہے اور اس کے تحفظ کی حد تک اس کی ماں کو بھی سہولت دی ہے لیکن اس ماں کے جرم کو معاف نہیں کیا اور اسے سزا دی ہے، اس لیے زچہ بچہ دونوں کے لیے یکساں معاشرتی تحفظ کی بات اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے۔

دفعہ نمبر ۲۶ تا ۲۹

دفعہ ۲۶ تا ۲۹ کے بارے میں بھی ہم کوئی بات کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

دفعہ نمبر ۳۰

البتہ دفعہ نمبر ۳۰ قابل توجہ ہے کہ اس میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک و اقوام کو اس بات کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ہر حال میں اس منشور کی پابندی کریں گے اور اس منشور میں

بیان کردہ آزادیوں اور حقوق کی کوئی ایسی تعبیر بھی نہیں کر سکیں گے جو اس منشور کے مرتب کرنے والوں کے مقصد اور منشا کے خلاف ہو۔

ہم نے انسانی حقوق کے اس منشور کی مختلف دفعات پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف اس پہلو کو سامنے رکھا ہے کہ ان اہم باتوں کی نشاندہی ہو جائے جو ہماری طالب علمانہ رائے میں اسلامی تعلیمات کی رو سے محل نظر ہیں اور جنہیں من و عن قبول کرنا قرآن و سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ باقی رہیں یہ تفصیلات کہ ان پر دلائل اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں مدلل بحث کی جائے، یہ کام ہمارے علمی مراکز اور دینی اداروں کا ہے۔ اللہ کرے کہ ہمارے علمی و دینی مراکز اس کی طرف مناسب توجہ دے سکیں۔ آمین یارب العالمین۔

(ابوعمار زاہد الراشدی۔ نزیل مکہ المکرمہ۔ ۹ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ)

ختم نبوت کی جدوجہد کا ایک اور سنگِ میل

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۹ نومبر ۲۰۱۷ء)

حکومت اور تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کے درمیان معاہدہ اور اس کے نتیجے میں دھرنے کے اختتام پر پوری قوم نے اطمینان کا سانس لیا ہے کہ ختم نبوت جیسے نازک اور حساس مسئلہ پر ملک سنگین بحران اور خلفشار سے نکل گیا ہے اور تحریک ختم نبوت کے ایک بڑے تقاضے کی بھی بحمد اللہ تکمیل ہو گئی ہے، فالحمد للہ علی ذلک۔ اس میں جس نے بھی کسی مرحلہ میں کوئی کردار ادا کیا ہے وہ تحسین و تبریک کا مستحق ہے۔ بالخصوص معاہدہ کے دونوں فریق حکومت اور تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کے ارباب حل و عقد اور ان کے درمیان معاہدہ و مفاہمت کی راہ ہموار کرنے والے حلقے تبریک و تحسین کے ساتھ شکریہ کے بھی حقدار ہیں۔ اللہ تعالٰی سب کو جزائے خیر سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔ اس کے ساتھ ساتھ دھرنے اور اس کے پس منظر و نتائج کے حوالے سے کچھ سوالات اٹھائے جا رہے ہیں اور حسب عادت کچھ حلقے انہیں پھیلانے اور ان میں ضمنی سوالات کا اضافہ کرتے چلے جانے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں متعدّد حضرات نے مجھ سے بھی فون پر دریافت کی ہیں اس لیے بعض سوالات کا سرسری جائزہ اس کالم میں لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ اس تحریک میں دیوبندیوں کا کیا کردار ہے حالانکہ وہ ختم نبوت کی تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں لیکن اس دفعہ وہ فرنٹ پر دکھائی نہیں دیے۔ میں نے عرض کیا کہ اسے اگر مسلکی معاصرت سے ہٹ کر زمینی حقائق کے حوالے سے دیکھا جائے تو صورتحال یہ ہے کہ تحفظ ختم نبوت کے مطالبات کی جدوجہد نے جو صورت اختیار کرلی تھی اس کے تین دائرے بنتے ہیں:

1. ایک محاذ پارلیمنٹ کا ہے کہ اصل مسئلہ وہیں کھڑا ہوا تھا اور اس کا حل بھی وہیں نکلنا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ پارلیمنٹ میں الیکشن قوانین کا متنازعہ ترمیمی بل پیش ہونے پر ہاؤس میں سب سے پہلے اس کے بارے میں آواز جمعیت علماء اسلام کے سینیٹر حافظ حمد اللہ نے اٹھائی۔ اور مختلف مراحل سے گزر کر جب پارلیمانی جدوجہد آخری مرحلہ تک پہنچی تو وہ ترمیمی بل جس کے ذریعے ساری کوتاہیوں کی تلافی کی گئی اور سابقہ صورتحال بحال ہوئی اس بل کا مسودہ ایوان میں جمعیت علماء اسلام کے پارلیمانی گروپ نے پیش کیا اور اسے ایوان سے منظور کرانے میں مولانا فضل الرحمان اور راجہ محمد ظفرالحق کی محنت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

2. دوسرا دائرہ عدالتی تھا جہاں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت نے پیش رفت کی اور مجلس کے مرکزی راہنما مولانا اللہ وسایا نے اسلام آباد ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چنانچہ ان کی رٹ درخواست پر اسلام آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب جسٹس شوکت عزیز صدیقی نے متنازعہ ترمیمی بل کے متعلقہ حصوں کو معطل کرتے ہوئے حکومت کو عدالت میں طلب کرلیا اور ابھی کیس کی سماعت جاری ہے۔

3. جبکہ اس سلسلہ میں تیسرا محاذ عوامی دباؤ کا تھا جس میں ہمارے بریلوی دوستوں نے تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کے عنوان سے پیش قدمی کرکے ان دھرنوں کا اہتمام کیا اور حکومت کو بالآخر ان کے مطالبات تسلیم کرنا پڑے۔

اس مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں قادیانیوں اور ان کے بہی خواہ حلقوں کی یہ سازش نہ صرف ناکام ہوئی بلکہ آئندہ کے لیے بھی بحمد اللہ انہیں بریک لگ گئی ہے۔ گویا اس بار تحریک ختم نبوت کے مطالبات کو آگے بڑھانے اور انہیں حکومت سے منوانے میں پارلیمنٹ میں

جمعیت علماء اسلام، عدالتی محاذ پر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور عوامی دباؤ کے محاذ پر تحریک لبیک یارسول اللہؐ نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے جس پر ان تینوں جماعتوں کے قائدین کے ساتھ ساتھ سینٹ میں قائد ایوان راجہ محمد ظفر الحق بھی مبارکباد کے مستحق ہیں اور میرے خیال میں اس تنوع کو مسلکی معاصرت کی بجائے تقسیم کار کے حوالہ سے دیکھا جائے تو ایک خوبصورت تکون ہمارے سامنے آتی ہے۔

جہاں تک تحریک لبیک یارسول اللہؐ کے دھرنے اور مطالبات کا تعلق ہے اس کی سب دینی جماعتوں نے حمایت کی ہے اور خود ہم نے بھی ان کالموں میں متعدّد بار اس حمایت کا اظہار کیا ہے۔ مگر دھرنوں میں شرکت کے حوالہ سے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ دھرنوں کا اہتمام کرنے والوں نے اپنے مخصوص حلقے سے ہٹ کر نہ کسی کو شرکت کی دعوت دی ہے اور نہ ہی وہاں دوسرے حلقوں کی شرکت کے لیے حوصلہ افزائی کا کوئی ماحول موجود تھا۔ چنانچہ اس دھرنے کے دوران گوجرانوالہ میں معروف اہل حدیث راہنما مولانا مشتاق احمد چیمہ کی دعوت پر تمام مکاتب فکر کے سرکردہ زعماء کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور اہل تشیع کے ذمہ دار راہنماؤں نے شرکت کی۔ بریلوی مکتب فکر کے ممتاز راہنما صاحبزادہ نصیر احمد اویسی کی صدارت میں ہونے والے اس اجلاس میں یہ تجویز زیر بحث آئی کہ ہم سب کو دھرنے کے شرکاء کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر ان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرنا چاہیے۔ میں بھی اجلاس میں شریک تھا، اجلاس کے کم و بیش سبھی شرکاء اس تجویز سے متفق تھے مگر یہ طے پایا کہ پہلے وہاں کے ماحول کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ کیا ہماری وہاں حاضری دھرنے کے لیے مفید ہوگی، کہیں اس ماحول میں کسی نئی الجھن کا باعث تو نہیں بن جائے گی؟ اس پر دھرنے میں شریک ہونے والے بعض دوستوں سے دریافت کیا گیا تو ان کا جواب اثبات میں نہیں تھا، اس لیے ہم سب دوست خواہش کے باوجود وہاں جانے کا فیصلہ نہ کر سکے۔

اس پس منظر میں تحریک لبیک یارسول اللہؐ کے قائدین کو اس کامیاب پیش رفت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہم امید رکھتے ہیں کہ ان کی یہ کاوش اور قربانی آئندہ بھی تحریک ختم نبوت کے لیے جاری رہے گی اور وہ اس کے عمومی تقاضوں کا احساس کرتے ہوئے اس دینی محنت کو زیادہ وسیع اور مؤثر دائرے میں آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ ختم نبوت: حالیہ قانونی بحران اور مکمل انصاف کا مطالبہ

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۲۲ نومبر ۲۰۱۷ء)

اسلام آباد میں تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کا دھرنا گزشتہ دو ہفتوں سے مسلسل جاری ہے اور حکومت دھرنے والوں کے مطالبات کو منظور کیے بغیر دھرنا ختم کرانے کے تمام حربوں میں ابھی تک ناکام ہے جبکہ اسلام آباد ہائی کورٹ نے حکومت کو دھرنا ہر حالت میں ختم کرانے کے لیے جمعرات تک کی مہلت دی ہے۔

دھرنے کے مختلف مراحل کے مشاہدہ بلکہ ایک لحاظ سے ذاتی شرکت کے حوالہ سے کچھ گزارشات گزشتہ ایک کالم میں کر چکا ہوں، خیال تھا کہ حکومت اور تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کے قائدین کے درمیان مذاکرات میں دونوں کے لیے قابل قبول کوئی باوقار راستہ نکل آئے گا مگر اس کے امکانات دن بدن معدوم ہوتے دکھائی دے رہے ہیں جبکہ دھرنے سے عوام کو درپیش مشکلات میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں تک پارلیمنٹ میں انتخابی ترامیم کے ایکٹ کی منظوری کے دوران تحفظ ختم نبوت سے متعلقہ متعدّد قانونی دفعات کے متاثر ہونے کا تعلق ہے وہ پارلیمنٹ کے حالیہ فیصلہ کی رو سے دوبارہ اپنی سابقہ اور اصل پوزیشن پر بحال ہو چکی ہیں جس پر دینی حلقوں میں اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس ردوبدل کے ذمہ دار حضرات کو سامنے لانے اور انہیں ان کے مناصب سے الگ کرنے کا مطالبہ ابھی جاری ہے اور دھرنے کے قائدین اس کے بغیر دھرنا ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پارلیمنٹ میں تحفظ ختم نبوت سے متعلقہ قانونی دفعات کے ساتھ جو واردات ہوئی تھی اس کے بارے میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ غیر ارادی نہیں بلکہ طے شدہ منصوبہ کا حصہ تھی۔ اس سازش کو بے نقاب کرنے میں شیخ رشید احمد اور کیپٹن (ر) صفدر نے اہم کردار ادا کیا جبکہ اس کے سدباب، تلافی اور صورتحال کو سابقہ پوزیشن پر واپس لے جانے میں مولانا فضل الرحمان اور راجہ محمد ظفر الحق کی مسلسل کاوشیں اور تحریک لبیک یا رسول اللہ کا عوامی دباؤ لائق تبریک ہیں۔ متنازعہ ترمیمی ایکٹ کی منظوری سے قبل ایوان کو اس خدشہ سے جمعیت علماء اسلام کے سینیٹر حافظ حمد اللہ نے ابتداءً آگاہ کیا تھا مگر ان کی بات پر توجہ

نہیں دی گئی تھی جبکہ ہماری معلومات کے مطابق جس حالیہ ترمیم کے ذریعے اس کا سدباب کیا گیا ہے اور سابقہ پوزیشن بحال ہوئی ہے اس کا مسودہ جمعیت علماء اسلام کے پارلیمانی گروپ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے اور اسے پارلیمنٹ میں متفقہ طور پر منظور کرانے میں راجہ محمد ظفر الحق اور مولانا فضل الرحمان نے کلیدی کردار ادا کیا ہے جس پر مذکورہ راہنماؤں سمیت پارلیمنٹ کے تمام ارکان پوری قوم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

دھرنے کے مطالبات کی اصولی حمایت مختلف دینی حلقوں کی طرف سے کی گئی ہے۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی راہنما مولانا اللہ وسایا کا بیان اخبارات میں آچکا ہے کہ وہ تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کے مطالبات کی حمایت کرتے ہیں، اسی طرح پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمان درخواستی ایک اخباری بیان میں کہہ چکے ہیں کہ وہ دھرنے کے مطالبات کی حمایت کرتے ہیں اور حکومت کے لیے ان کا مشورہ یہ ہے کہ مسئلہ کو مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے اور تشدد سے بہر صورت گریز کیا جائے۔ بہت سے دیگر دینی راہنماؤں نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے جس سے اس سلسلہ میں قومی جذبات واحساس کی ترجمانی ہوتی ہے۔

دوسری طرف حکومتی حلقوں کی طرف سے وزیر قانون زاہد حامد کو ان کے منصب سے الگ کرنے کے مطالبہ پر یہ کہا جا رہا ہے کہ ٹھوس ثبوت کے بغیر ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے خیال میں یہ حکومت موقف موجودہ پوزیشن میں تسلی بخش نہیں ہے اس لیے کہ راجہ محمد ظفر الحق کی سربراہی میں اس معاملہ کی انکوائری کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ کو مسلسل صیغۂ راز میں رکھا جا رہا ہے اور اسے منظر عام پر لانے سے گریز کیا جا رہا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے جسے گول مول رکھنے میں عافیت سمجھی جا رہی ہے۔ لیکن اب اس معاملہ کو بہرحال واضح ہونا چاہیے اور حکومت کو دوٹوک فیصلہ کرنا چاہیے، اگر ڈان لیکس کے معاملہ میں پرویز رشید سے استعفیٰ طلب کیا جا سکتا ہے تو عقیدۂ ختم نبوت کے تقدس و حرمت کے سوال پر زاہد حامد کی وزارت کو ہر صورت بچانے کی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔

تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کے قائدین سے بھی اس موقع پر یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے مطالبات اور استقامت پر ملک بھر میں عمومی طور پر دینی کارکنوں کے جذبات ان کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں لیکن مشترکہ دینی مطالبات پر اس نوعیت کے انتہائی

اقدامات تمام مکاتب فکر کو اعتماد میں لیے بغیر کر گزرنا بہر حال حکمت و دانش سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جبکہ حالیہ دھرنے کے بارے میں گزشتہ کالم میں عرض کر چکا ہوں کہ تحریک لبیک یارسول اللہؐ کے دونوں دھڑوں کے راہنما مولانا محمد اشرف آصف جلالی اور مولانا خادم حسین رضوی ہی کم از کم مل کر یہ کام کر لیتے تو زیادہ مؤثر ہوتا۔ بریلوی مکتب فکر کے قائدین مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ اور مولانا عبد الستار خان نیازیؒ بہت قد آور شخصیات تھیں جن کا قومی سیاست اور دینی و ملی تحریکات میں نمایاں کردار رہا ہے اور ان کا احترام و اعتراف بھی دینی و قومی حلقوں میں پایا جاتا ہے۔ میں مولانا خادم حسین رضوی اور مولانا محمد اشرف آصف جلالی دونوں کے دردِ دل اور صلاحیتوں کا معترف ہوں اس لیے یہ گزارش کر رہا ہوں کہ ازراہ کرم مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ اور مولانا عبد الستار خان نیازیؒ کا طرز عمل اختیار کیجئے جو صرف بریلوی مکتب فکر کے مسلمہ قائد نہیں تھے بلکہ قومی راہنماؤں میں بھی انہیں نمایاں مقام حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ان کے تمام خوشہ چینوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

عقیدۂ ختم نبوت کی بعض قانونی شقوں میں ردوبدل کا مسئلہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۵ نومبر ۲۰۱۷ء)

مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مولانا مفتی منیب الرحمان نے ایک حالیہ بیان میں تحریک ختم نبوت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے جو کم و بیش سبھی قابل اتفاق ہے مگر ان میں سے تین امور کا بطور خاص تذکرہ کرنا چاہوں گا:

1. عقیدۂ ختم نبوت سے متعلقہ بعض قانونی شقوں میں حالیہ ردوبدل کی ذمہ داری پوری پارلیمنٹ پر عائد ہوتی ہے اور اس کی اصلاح کے لیے پارلیمنٹ کے اندر منظم جدوجہد کی ضرورت ہے۔

2. پارلیمنٹ نے ایک نئی ترمیم کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کرنے کی جو سعی کی ہے اس سے مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا جبکہ اصلاحی عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری ہے۔

3. اس سلسلہ میں اسلام آباد میں "تحریک لبیک یا رسول اللہؐ" کے دھرنے کے قائدین کے ساتھ حکومت کو مذاکرات کرکے مسئلہ کو حل کرنا چاہیے۔

مجھے ان تینوں باتوں سے مکمل اتفاق ہے اور اس کے ساتھ ایک بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ جن حضرات نے اس مسئلہ کو حل کرنا ہے وہ حل کرنے کی بجائے ٹال مٹول کے موڈ میں دکھائی دیتے ہیں اور اس بارے میں ان کی خواہش یہ لگتی ہے کہ کسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ محاذ خود بخود خاموش ہوجائے۔ اس تناظر میں تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کے دھرنے مجھے اس حوالہ سے غنیمت محسوس ہو رہے ہیں کہ جذبات و احساسات کی چنگاری کسی حد تک سلگ تو رہی ہے۔ گزشتہ روز ایک دوست نے اس صورتحال پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا تو میں نے عرض کیا کہ تحریک ختم نبوت کی "ریگولر فورسز" کسی جدوجہد کے لیے خود کو ابھی "فارم" میں محسوس نہیں کر رہیں اس لیے "ریزرو" کے کچھ دستے محاذ پر آگئے ہیں تاکہ میدان خالی نہ رہے۔ مولانا خادم حسین رضوی اور مولانا محمد اشرف جلالی بریلوی مکتب فکر کے نامور خطباء میں سے ہیں جو ملک بھر میں اپنا اپنا حلقۂ اثر رکھتے ہیں اور مسلکی عصبیت کے اظہار میں انہیں خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ ان دونوں نے "تحریک لبیک یا رسول اللہؐ" کے عنوان سے تحریک ختم نبوت کے مطالبات کے لیے ریلیوں اور دھرنوں کا الگ الگ اہتمام کیا جن کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ دونوں یہ کام اکٹھے کر لیتے تو زیادہ مؤثر ہوتا۔ ان دھرنوں کے بارے میں خبریں دوستوں سے معلوم کرتا رہا اور اخبارات میں پڑھتا رہا جبکہ مولانا رضوی کے دھرنے میں اتفاقیہ طور پر ایک دوبار شرکت بھی ہوگئی۔

جس روز اس ریلی کا آغاز تھا مجھے پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمان درخواستی سے ملاقات کے لیے اسلام آباد جانا تھا، گوجرانوالہ سے دس بجے کے لگ بھگ ویگن پر روانہ ہوا، راستہ میں گجرات، لالہ موسیٰ، کھاریاں، جہلم، دینہ اور گوجر خان میں روڈ پر بہت سے حضرات کو پرچم اور بینر سنبھالے نعرے لگاتے دیکھا بلکہ گوجر خان میں سڑک پر جمع ہونے والے حضرات سے خطاب کرنے والے ایک مقرر کی تقریر کے کچھ حصے سننے

کا موقع ملا جو ناموس رسالتؐ اور ختم نبوت کے بارے میں جذبات کے پرجوش اظہار پر مشتمل تھے۔

۱۱ نومبر کو مجھے ہزارہ جانا تھا، اچھڑیاں ضلع مانسہرہ کی جامع مسجد فاروق اعظمؓ کے خطیب مولانا عبد الحق عامر میری ہمشیرہ محترمہ کے داماد ہیں، انہوں نے ۱۲ نومبر کو اپنی بیٹی کے نکاح کی تقریب طے کر رکھی تھی۔ گیارہ نومبر کی شام کو ایک بس کے ذریعے راولپنڈی کے فیض آباد بس اسٹینڈ تک پہنچا تو وہ تحریک لبیک یا رسول اللہؐ کے دھرنے کے گھیراؤ میں تھا جس کی وجہ سے ہمیں ایکسپریس وے پر ہی بس سے اتار دیا گیا اور خاصا پیدل چل کر میں فیض آباد پہنچ پایا جہاں سارے اڈے بند تھے اور کسی طرف کوئی سواری نہیں جا رہی تھی۔ البتہ دھرنے سے خطاب کرنے والے مقرر کی آواز صاف آ رہی تھی اور نعروں کی گونج بھی وقفہ وقفہ سے بلند ہو رہی تھی، کچھ دیر وہ تقریر سنی اور نعروں میں بھی شمولیت ہوگئی۔ خطیب صاحب کون تھے یہ معلوم نہ ہو سکا، اچھی باتیں کر رہے تھے، ان میں سے دو باتیں مجھے خاص طور پر زیادہ اچھی لگیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اب اندازہ ہوا ہے کہ ہم نے اپنی نئی نسل کو عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے بارے میں تعلیم و تربیت نہ دے کر کتنی بڑی غفلت کی ہے، اب ہم اس کی تلافی کریں گے۔ دوسری بات یہ کہ بارہ ربیع الاول عید میلاد النبیؐ کا دن ہے جو قریب آ رہا ہے اس روز ملک بھر سے عاشقان رسولؐ سڑکوں پر ہوں گے اور اگر اس وقت تک حکومت نے عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے قانونی تقاضوں اور اس سلسلہ میں دینی حلقوں کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو اسے ایک نئی ملک گیر احتجاجی تحریک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد میں وہاں سے کسی نہ کسی طرح نکل کر پیرودھائی سے مانسہرہ کے لیے روانہ ہوگیا۔

تحریک ختم نبوتؐ کے حوالہ سے اپنے اس احساس کا بھی اس موقع پر ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں اسے قومی جدوجہد کی حیثیت حاصل رہی ہے اور یہ اس سطح کا قومی معاملہ رہا ہے:

- متحدہ ہندوستان کے دور میں علامہ محمد اقبالؒ نے اس کے مطالبات کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ خط و کتابت کر کے انہیں اعتماد میں لینا ضروری سمجھا تھا۔

• ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کی قیادت میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، سید ابوالاعلی مودودیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا ابوالحسنات قادریؒ، مولانا عبد الستار خان نیازیؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، سید مظفر علی شمسیؒ، حافظ کفایت حسینؒ، مولانا مظہر علی اظہرؒ اور تمام مکاتب فکر کے اس سطح کے اکابر ایک صف میں تھے۔

• ۱۹۷۴ء میں اس مسئلہ کو پارلیمنٹ کے ذریعے حل کرنے میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، چودھری ظہور الٰہی مرحوم، پروفیسر غفور احمد مرحوم، علامہ محمود احمد رضویؒ، عبد الحفیظ پیرزادہ مرحوم، یحیی بختیار مرحوم، علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ، حاجی مولا بخش سومرو مرحوم، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، مولانا محمد ذاکرؒ اور مولانا عبدالمصطفی ازہریؒ باہم شریک کار تھے جبکہ وکلاء حضرات، تاجر برادری، دینی و سیاسی جماعتیں اور طلبہ تنظیمیں کسی تفریق و امتیاز کے بغیر سڑکوں پر تھیں۔ لیکن اس کے بعد ہم اسے بتدریج محدود کرتے چلے گئے، پہلے اسے قومی تحریک کی بجائے مذہبی جماعتوں کی جدوجہد میں بدل دیا گیا، پھر ہم اسے مسلکی دائروں میں سمیٹتے چلے گئے اور اب مسلکی دائروں میں بھی گروہی مفادات اور ترجیحات اس قومی تحریک کی چھاپ بنتی جا رہی ہیں۔

مسئلہ ملک میں نفاذ شریعت کا ہو، تحفظ ناموس رسالتؐ کا ہو یا عقیدۂ ختم نبوت کے دستوری و قانونی تقاضوں کی تکمیل کا ہو، جب تک ہم ان امور کو مسلکی دائروں اور محدود مذہبی ماحول سے بالاتر ہو کر قومی مسائل کے طور پر ڈیل نہیں کریں گے اور ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت اور ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیؐ کا ماحول پیدا کرنے کی سنجیدہ محنت نہیں کریں گے ہم میں سے ہر ایک کی جدوجہد اپنے اپنے کولہو کے گرد ہی چکر کاٹتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

''ریاست مدینہ'' کا سماجی و تاریخی پس منظر

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۸ جولائی ۲۰۱۷ء)

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آتے ہی انصار مدینہ کے دونوں قبائل اوس اور خزرج کے ساتھ یہودی قبائل اور اردگرد کے دیگر قبیلوں کو ملا کر ایک ریاستی نظم قائم کیا جو اس سے پہلے موجود نہ تھا۔ اسے ''ریاست مدینہ'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے لیے تمام متعلقہ قبائل کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہوا جو ''میثاق مدینہ'' کہلاتا ہے اور باقاعدہ ایک دستور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ریاست میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''حاکم اعلیٰ'' کا مقام حاصل تھا جو سب کے نزدیک مسلم تھا۔ آنحضرتؐ کی سربراہی میں یہ ریاست دس سال کے عرصہ میں پورے جزیرۃ العرب کو حصار میں لے چکی تھی۔ چنانچہ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے بطور ''خلیفۃ رسول اللہ'' حکمرانی کا منصب سنبھالا تو ان کی حکومت کے دائرہ میں یمن، بحرین اور نجران سمیت پورا جزیرۃ العرب شامل تھا۔ اور اس دائرہ میں جس جس نے حضرت صدیق اکبرؓ کی حکمرانی قبول کرنے سے انحراف کیا، خلیفۂ اول نے ان سب سے جنگ لڑ کر اپنی حکومت کی رٹ بحال کی اور پھر اس ریاست و حکومت کا دائرہ عرب و عجم کے وسیع علاقوں تک بتدریج پھیلتا چلا گیا۔

یہاں ایک تاریخی سوال سامنے آتا ہے کہ جناب رسول اکرمؐ تو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ کے قریشیوں کے بے پناہ مظالم سے تنگ آ کر پناہ لینے کے لیے یثرب کی طرف آئے تھے، یہ آتے ہی ریاست و حکومت کی صورت کیسے بن گئی؟ اس سوال کا جائزہ لینے کے لیے ہجرت نبویؐ کے مقاصد اور اس کے ساتھ اس دور کے سماجی تناظر پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس وقت کے آثار و روایات کا ترتیب کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ تاریخی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہجرت کا مقصد صرف کفار مکہ کے مظالم سے نجات اور پناہ کی جگہ حاصل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس سے آگے تمام دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے رکاوٹوں کو دور کرنا اور دعوت اسلام کا ایک بیس کیمپ قائم کرنا بھی ہجرت کے مقاصد میں شامل تھا جو ظاہر ہے کہ کسی علاقے پر ایک آزاد ریاست و حکومت کے قیام کی صورت میں ہی ممکن تھا اور عملاً ایسا ہی ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ سے پناہ کے حصول کے لیے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے صحابہ کرامؓ کو وہاں مستقل قیام کی اجازت نہیں ملی تھی حالانکہ شاہ حبشہ نجاشیؓ نے ان صحابہ کرامؓ کو علی الاعلان امن و پناہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ اور نہ صرف یہ کہ قریش کے وفد کے احتجاج کو مسترد کر دیا تھا بلکہ انہیں اس عمل پر اپنے خلاف اہل حبشہ کی مسلح بغاوت کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ بادشاہ حبشہ اصحمہ نجاشیؓ نے قبول اسلام کا اعلان بھی فرما دیا تھا لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ ہجرت عارضی تھی اور مدینہ منورہ کی ریاست قائم ہونے کے بعد یہ مہاجرین سب کے سب مدینہ منورہ کی طرف دوبارہ ہجرت کر گئے تھے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں اپنے ساتھیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دیتے وقت اس کا اظہار فرما دیا تھا کہ یہ ہجرت مستقل نہیں ہے بلکہ حتی یجعل اللہ لکم منہ خرجا اس وقت تک ہے جب اللہ تعالیٰ تمہارے لیے موجودہ صورت حال سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا فرما دیں گے۔ جناب رسول اللہؐ جس ہجرت کے لیے خود حکم خداوندی کے مسلسل انتظار میں تھے وہ محض پناہ کے حصول کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کے مقاصد میں ایک آزاد ریاست و حکومت کا قیام بھی تھا جس کا تذکرہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ دونوں کے ماحول میں ملتا ہے۔

قریش کو مسلسل یہ ڈر تھا کہ حضور علیہ السلام کی دعوت کو اگر عمومی طور پر قبول کر لیا گیا تو مکہ مکرمہ کی سیادت و حکومت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس کا ذکر وقفہ وقفہ سے مختلف زبانوں پر آتا رہا ہے حتیٰ کہ جب آنحضرتؐ کے خلاف قریش کے سرداروں کا آخری جلسہ دارالندوۃ میں ہوا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی موجود ہے اور جس میں جناب رسول اللہؐ کو (۱) قید کرنے (۲) جلاوطن کرنے یا (۳) قتل کر دینے کی تجاویز زیر بحث آئیں تو جلاوطن کر دینے کی تجویز پر ایک بڑے سردار کی طرف سے اس مجلس میں کہا گیا کہ اس طرح تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت سے لوگوں کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور مکہ مکرمہ پر حملہ کر کے تمہاری حکومت چھین لیں گے۔ چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا کہ اس مشاورت اور فتح مکہ کے درمیان صرف آٹھ سال کا وقفہ ہے۔

جناب ابوطالب کی وفات سے قبل قریش کے سرداروں کے ایک بڑے وفد کی ان کے ساتھ ملاقات کا تذکرہ ابن ہشامؒ نے ''سیرۃ النبیؐ'' میں کیا ہے جس میں جناب ابوطالب سے کہا گیا تھا کہ اپنے بھتیجے (حضرت محمدؐ) کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ کرا دیں تاکہ معاملات زیادہ

الجھنے سے بچ جائیں۔ اس موقع پر آنحضرتؐ نے ان سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر تم اسلام کا کلمہ پڑھ لو تو نہ صرف پورے عرب پر تمہاری حکمرانی قائم ہوگی بلکہ عجم بھی تمہارے تابع ہوگا۔ یہ کسی سیاستدان کی ڈپلومیٹک اسٹیٹمنٹ نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر کا وعدہ تھا جو پورا ہو کر رہا۔

ابن ہشامؒ نے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے ہجرت کے لیے بہت سے قبائل کے سامنے یہ پیشکش رکھی تھی کہ تم میرا ساتھ دو اور میری حفاظت کرو تو میں مکہ مکرمہ چھوڑ کر تمہارے پاس آنے کو تیار ہوں۔ ”میری حفاظت کرو“ کی اس فرمائش کا مقصد محض ذاتی حفاظت نہیں تھا بلکہ اس کے پورے الفاظ یہ ہیں کہ وتمنعونی حتی ابین من اللہ ما بعثنی بہ کہ میرا دفاع اور حفاظت اس مقصد کے لیے کرو تاکہ میں اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو دنیا تک پہنچا سکوں جو اس نے مجھے دے کر بھیجا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کر لیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نسل انسانی کے لیے دیے گئے پیغام کی وسعت کیا ہے اور اس کے پہنچانے کی حدود کہاں تک ہیں۔ اسی موقع پر قبیلہ بنو عامر کو جناب نبی اکرمؐ نے یہ پیشکش کی تو اس کے ایک سردار نے آپؐ کی باتیں سن کر کہا تھا کہ اگر یہ قریشی جوان میرے ساتھ ہو جائے تو میں پورے عرب پر قبضہ کر سکتا ہوں۔ ابن ہشامؒ لکھتے ہیں کہ بنو عامر جناب رسول اللہؐ کی یہ پیشکش اس شرط پر قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے کہ اگر ہم آپ کا ساتھ دیں اور آپ کے غلبہ کے لیے سب سے لڑیں تو آپ کے بعد حکومت ہمیں مل جائے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ حکومت دینا اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے، وہ جس کو چاہے گا دے گا۔ تو بنو عامر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اب ایسا تو نہیں ہو سکتا ہم آپ کے لیے سب لوگوں سے لڑیں اور جب آپ کا غلبہ ہو جائے تو آپ کے بعد حکومت کسی اور کے ہاتھ میں دے دی جائے، ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کرنے والے، جن کی طرف ہجرت کی جا رہی ہے، اور جن کے مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہجرت کا مرحلہ درپیش ہے، ان تینوں فریقوں کے ذہنوں میں ہجرت کے ساتھ ساتھ ریاست و حکومت کا تصور پوری طرح موجود تھا۔ اس ریاست و حکومت کو ہجرت کا مقصد قرار دیا جائے یا نتیجہ کہا جائے، اس لفظی بحث میں الجھنے کی بجائے ہم ہجرت کی تیاریوں کی واقعاتی ترتیب اور اس کے سماجی تناظر کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

یہ تو ہجرت کی تیاریوں کا مکی تناظر ہے، اب دوسری طرف یثرب کے ماحول پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے کہ وہاں اوس اور خزرج کے دو بڑے قبائل طویل باہمی خانہ جنگی سے تنگ آکر اس دلدل سے نکلنے کے لیے کسی نجات دہندہ کی تلاش میں تھے۔ جبکہ یہودیوں کے تینوں قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریضہ تورات اور انجیل کی پیش گوئیوں کے روشنی میں پیغمبر آخر الزمان کی آمد کے منتظر تھے جو پوری دنیا کے لیے نجات دہندہ ہیں۔ چنانچہ انصار مدینہ کی باقاعدہ بیعت عقبہ اولی سے ایک سال پہلے جب بنو خزرج کے کچھ لوگوں کی جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ حج کے موقع پر ملاقات ہوئی اور آپؐ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسلام قبول کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی قوم کو بھی اسلام کی دعوت دیں گے۔ اس وقت ہمارے درمیان شدید ترین خانہ جنگی کی کیفیت ہے، ہو سکتا ہے اللہ تعالی آپ کی برکت سے ہمیں باہمی اتحاد نصیب فرمادیں۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق بنو خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ نے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ باہمی خانہ جنگی کے اس ماحول سے تنگ آکر یثرب اور اس کے اردگرد بحیرہ (سمندری پٹی) کے قبائل نے ایک مشترکہ حکومت کے قیام پر اتفاق کر لیا تھا اور بادشاہ کے طور پر عبد اللہ بن ابی کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ سب معاملات طے ہو گئے تھے اور صرف بطور بادشاہ عبد اللہ بن ابی کی تاج پوشی کا مرحلہ باقی تھا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے اور یہ سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی تشریف آوری سے قبل اس علاقہ میں ریاست و حکومت کے قیام کے لیے رائے عامہ کی ہمواری اور ہوم ورک کا عمل مکمل ہو چکا تھا جسے آپؐ نے نہ صرف سنبھال لیا بلکہ فوری طور پر آگے بڑھا کر ایک باقاعدہ ریاست و حکومت کی تشکیل مکمل فرمادی۔ البتہ اس میں دو فرق واضح طور پر رونما ہوئے۔ ایک یہ کہ حکمرانی کے لیے عبد اللہ بن ابی کی تاج پوشی کی بجائے جناب رسول اللہؐ کو متفقہ طور پر حاکم اعلی تسلیم کر لیا گیا۔ دوسرا یہ کہ اس ریاست و حکومت کی اساس محض سماجی تقاضے اور علاقائی ضرورت پر نہیں بلکہ نظریہ و عقیدہ پر قائم کی گئی جسے انصار مدینہ کے دونوں قبائل بنو خزرج اور بنو اوس کے باقاعدہ نمائندوں کے ساتھ بیعت عقبہ اولی اور بیعت عقبہ ثانیہ کی صورت میں تاریخ نے اپنے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔

بیعت عقبہ اولیٰ میں اوس اور خزرج کے بارہ نمائندے شریک تھے جن سے اس بات پر بیعت لی گئی کہ وہ

- اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے،
- چوری نہیں کریں گے،
- زنا نہیں کریں گے،
- اولاد کو قتل نہیں کریں گے،
- کسی پر جھوٹا الزام نہیں لگائیں گے، اور
- جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں گے۔

یہ اوس اور خزرج کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کے مستقبل کے معاملات کی اعتقادی اور نظریاتی اساس کے ساتھ ساتھ اطاعت اور وفاداری کا عہد بھی تھا۔ جبکہ اگلے سال بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انہی دو قبائل کے ستر سے زیادہ نمائندے شریک تھے جن سے یہ عہد بھی لیا گیا کہ جناب رسول اکرمؐ ہجرت کر کے ان کے ہاں تشریف لے جائیں گے تو وہ اپنے بچوں اور عورتوں کی طرح آنحضرتؐ کا دفاع اور ان کی حفاظت کریں گے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ انصار مدینہ نے ان دونوں مواقع پر کی جانے والی بیعت کا حق ادا کیا۔

یہ ہے اس دور کا سماجی تناظر اور تاریخی پس منظر جو اسباب کی دنیا میں ”ریاست مدینہ“ کے قیام اور ”میثاق مدینہ“ کی تدوین و نفاذ کا باعث بنا۔

فہم قرآن کا صحیح راستہ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جولائی ۲۰۱۷ء)

رمضان المبارک نصف سے زیادہ گزر گیا ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اپنے اپنے ذوق کے مطابق اعمال خیر میں مصروف ہیں۔ روزے کے بعد اس ماہ مبارک کی سب سے بڑی مصروفیت قرآن کریم کے حوالہ سے ہوتی ہے۔ کلام پاک اس مہینہ میں نازل ہوا تھا اور اسی میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے، تلاوت اور سماعت کے ساتھ ساتھ فہم قرآن کریم کے ذوق میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے مختلف حلقے لگتے ہیں، اخبارات و جرائد میں مضامین کی اشاعت ہوتی ہے جبکہ سوشل میڈیا نے اس کے دائرہ کو بہت زیادہ تنوع کے ساتھ وسیع کر دیا ہے۔ اس دوران بہت سے سوالات بھی سامنے آتے ہیں بلکہ لائے جاتے

ہیں لیکن ان کا بر موقع اور صحیح جواب سامنے نہ آنے پر بسا اوقات نوجوان ذہنوں میں کنفیوژن پیدا ہو جاتا ہے جس کا صحیح حل الگ تھلگ اور لاتعلق رہ کر لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا نہیں بلکہ اس میں شامل ہو کر قرآن و سنت کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں ان کی راہنمائی کرنا ہوتا ہے، اور خوشی کی بات ہے کہ اہل علم کے حلقوں میں اس طرف توجہ بڑھ رہی ہے، اللھم زد فزد۔ اس سال ہمیں بھی اس حوالہ سے کچھ سوالات سے سابقہ پیش آیا اور اپنے فہم و توفیق کے مطابق اس سلسلہ میں کچھ گزارشات پیش کی گئیں، ان میں سے ایک دو سوالات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً:

قرآن کریم کی تعلیم و تفہیم کا ذریعہ

ایک سوال یہ کیا گیا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس کے سب بندوں کے لیے ہے اس لیے اس کے ہر بندے کو خود اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور درمیان میں کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر عرض کیا گیا کہ یہ دیکھ لینا چاہیے کہ خود قرآن کریم اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے؟

قرآن کریم میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ”و یعلمھم الکتاب“ کہ وہ اپنے ساتھیوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرتؐ کے صحابہؓ کی اکثریت عرب تھی اور عرب بھی اس دور کے جس کی فصاحت و بلاغت کو معیاری سمجھا جاتا ہے، لیکن ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ خود قرآن کریم پڑھ کر اسے سمجھیں اور جیسا سمجھ میں آئے اس پر عمل کریں۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ انہیں قرآن کی تعلیم دیتے ہیں۔ پھر اس تعلیم کے ساتھ ایک اور بات کا اضافہ بھی ہے ”لتبین للناس ما نزل الیھم“ کہ جو قرآن کریم لوگوں پر نازل کیا گیا ہے اس کا بیان اور وضاحت بھی جناب رسول اللہؐ خود ہی فرمائیں گے۔ تعلیم اور ضروری امور کی وضاحت و بیان کو لوگوں کی صوابدید پر نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ یہ دونوں کام آپ نے کرنے ہیں۔ اور تفسیر و حدیث کا ذخیرہ گواہ ہے کہ آنحضرتؐ نے صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم دی اور جہاں ضرورت پڑی یا کوئی الجھن پیدا ہوئی، قرآن کریم کی آیات اور الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی منشا بھی آپؐ نے بیان فرمائی جس کے بیسیوں شواہد احادیث میں موجود ہیں۔

اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے تو یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کریں اور اس کے ضروری مقامات کی وضاحت بھی اللہ

تعالی کے رسولؐ سے پوچھیں، مگر چودہ سو سال کے بعد پاکستان کے عجمی مسلمانوں کو مشورہ دیا جارہا ہے کہ وہ عربی سیکھ لیں اور قرآن کریم کو خود براہ راست پڑھ کر جیسا سمجھ لیں اس پر عمل کریں۔

ایمان و ہدایت کا ذریعہ

اسی طرز کی ایک اور بات بھی کہی جارہی ہے کہ ایمان و ہدایت اللہ تعالی کا اور اس کے بندوں کا آپس کا معاملہ ہے، اس میں کسی اور کو دخیل نہیں ہونا چاہیے۔ اور ہدایت اللہ تعالی کے احکام کی پیروی کرنا ہے، اس میں لوگوں کو درمیان میں نہیں لانا چاہیے۔ ہم نے عرض کیا کہ

- قرآن کریم خود اس تصور کی نفی کرتا ہے اور اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ ایمان و ہدایت براہ راست نہیں بلکہ نیک بندوں کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں یہ دعا سکھلائی گئی ہے کہ ”اھدنا الصراط المستقیم“ یا اللہ ہمیں صراط مستقیم عطا فرما اور اسی سورۃ میں صراط مستقیم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالی نے انعامات فرمائے ہیں۔
- قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ان لوگوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو منعم علیہم ہیں یعنی جن پر اللہ تعالی نے انعامات فرمائے ہیں اور ان کے چار طبقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۱) انبیاء کرام علیہم السلام (۲) صدیقین (۳) شہداء (۴) صالحین۔ گویا یہ چار طبقات اللہ تعالی کی طرف سے انعام یافتہ ہیں اور قرآن کریم کے بقول ہدایت اور صراط مستقیم کا معیار بھی یہی چار طبقے ہیں، ان کے ذریعہ جو راہ ملے گی وہی صراط مستقیم ہے۔
- ایک جگہ یہ فرمایا گیا ہے ”فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا وان تولوا فانما ھم فی شقاق“۔ اس آیت کریمہ میں حضرات صحابہ کرامؓ سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اگر باقی لوگ تمہارے جیسا ایمان لائیں گے تو ہدایت یافتہ ہوں گے ورنہ گمراہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔
- ایک جگہ یہ کہا گیا ہے ”واتبع سبیل من اناب الی“ کہ ان لوگوں کے راستے پر چلو جو اللہ تعالی کی بارگاہ میں جھک گئے ہیں۔

• ایک مقام پر اس بات کا تذکرہ یوں ہے ’’ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم‘‘ کہ جو لوگ مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راہ پر چل رہے ہیں وہ جہنم کی طرف جا رہے ہیں۔

ان آیات کریمہ میں اور ان جیسی دیگر بہت سی آیات میں ہدایت کا معیار اور ذریعہ اللہ تعالی کے نیک اور مقبول بندوں کو بتایا گیا ہے جن میں حضرات انبیاء کرامؑ اور صحابہ کرامؓ تو پہلے نمبر پر ہیں، ان کے ساتھ صدیقین، شہداء اور صالحین بھی اسی زمرہ میں ہیں کہ ہدایت اور ایمان کے لیے ان کی پیروی ضروری ہے اور ان کو راہنما بنائے بغیر نہ ہدایت ملتی ہے اور نہ ہی اللہ تعالی تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ ملتا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب یہی ہے کہ قرآن کریم ہدایت کا سب سے بڑا معیار اور سر چشمہ ہے لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالی کی منشا و مراد کو سمجھنے کیلئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و تعلیمات تک رسائی ضروری ہے۔ جبکہ آپؐ کی سنت و سیرت کو سمجھنے کے لیے صحابہ کرامؓ کی پیروی لازمی امر ہے اور اس کے بعد درجہ بدرجہ فقہاء امتؒ، محدثین عظامؒ اور صالحین کے ساتھ ساتھ امت کا اجماعی تعامل بھی ہدایت و ایمان کا راستہ ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

سوشل میڈیا میں زیر بحث چند سوالات کا مختصر جائزہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۷ جون ۲۰۱۷ء)

رمضان المبارک کے دوران مختلف سوالات سوشل میڈیا میں زیر بحث رہے جن میں سے بعض کے بارے میں راقم الحروف سے بھی کچھ دوستوں نے پوچھا، ان کے حوالہ سے جو گزارشات پیش کی گئیں ان کا ضروری خلاصہ نظر ثانی کے بعد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

• ایک مضمون میں روزہ اور حج کو انفرادی عمل کہا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ بخاری شریف میں حضرت سلمۃ بن الاکوعؓ اور حضرت ربیع بنت معاذؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور میں، جب رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے صرف عاشوراء کا روزہ فرض تھا اور رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد اس کی حیثیت نفلی روزے کی رہ گئی تھی، اپنا

نمائندہ بھیج کر مدینہ منورہ کے گرد بستیوں میں اعلان کروایا تھا کہ جس نے روزہ رکھا ہے وہ روزہ مکمل کرلے اور جس نے نہیں رکھا وہ باقی دن کھائے پیے بغیر روزہ کی کیفیت میں گزارے۔ حضرت ربیعؓ فرماتی ہیں کہ ہم عادت ڈالنے کے لیے بچوں کو بھی روزہ رکھوایا کرتی تھیں اور اگر انہیں روزہ زیادہ تنگ کرتا تو کھلونے دے کر انہیں بہلایا کرتی تھیں تاکہ وہ روزہ مکمل کرلیں۔ اس کا مطلب ہے کہ روزہ انفرادی عمل نہیں بلکہ اس حکم پر عملدرآمد کا اہتمام اور نگرانی حکومت کی ذمہ داری ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ بھوک کی مشقت پیش آنے پر بچوں کو روزہ تڑوایا نہیں جاتا تھا بلکہ بہلا پھسلا کر پورا کروایا جاتا تھا۔ جن بچوں پر روزہ فرض نہیں تھا ان کا روزہ مشقت کی وجہ سے نہیں تڑوایا جاتا تھا تو جن پر فرض ہے انہیں محض مشقت کے باعث روزے سے رخصت کیسے دی جاسکتی ہے؟

حج کے لیے جناب نبی اکرمؐ نے ۹ھ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا اور انہوں نے امیر کے طور پر حج کے سارے معاملات کی نگرانی کی تھی۔ پھر خلفاء راشدین کے دور میں خلیفہ وقت امیر حج کے طور پر حج کے سارے معاملات کی خود نگرانی کرتے تھے اور حج کے احکام و قوانین پر عمل کا اہتمام کرتے تھے۔ اس لیے فرض عبادات کو انفرادی قرار دے کر ان کی ادائیگی کے معاملات کو فرد کی صوابدید پر چھوڑ دینے کا تصور درست نہیں ہے۔ اسلام میں فرض عبادات پر عملدرآمد کی نگرانی اور اہتمام حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

• یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ فطرت کیا ہے؟ اگر فطرت کا تعین خود انسانوں نے کرنا ہے تو ذہن و فکر کے تفاوت کے باعث یہ قیامت تک نہ ہوسکے گا اور ہر دور اور طبقہ کے لوگ فطرت کے اپنے خود ساختہ مفہوم پر ہی لڑتے رہیں گے۔ فطرت کا مفہوم بھی فطرت کو پیدا کرنے والے خدا اور اس کے رسول کے ارشادات کی روشنی میں ہی طے کیا جائے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے صریح ارشادات ہیں اور دوسری طرف انسانی فکر نارسا کے نامکمل نتائج ہیں اور کچھ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے

ارشادات کو انسانی فکر نارسا کے دائرے میں لانے اور اس کے تابع بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ قرآن کریم نے اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے ”ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدی“۔ انسانی فکر انفرادی ہو، طبقاتی ہو یا اجتماعی کبھی بھی اپنی طے کردہ باتوں کو قطعی قرار نہیں دے سکتی، جبکہ قرآن و سنت کی نصوص صریحہ قطعی ہیں اور اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے ذہنی خلفشار اور فکری انارکی جنم لیتی ہے۔

- یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ فقہاء کرام کی آرا سے اختلاف ہوتا آرہا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔ یہ درست ہے مگر اختلاف دلیل اور استدلال سے ہوتا ہے۔ نفی، طنز، تحقیر اور استہزا کے لہجے میں کیا جانے والا اختلاف خواہ کوئی بھی کرے، علم کی بجائے جہالت کی علامت ہوتا ہے۔ چند افراد کی طرف سے امت کے جمہور فقہاء کرام سے اختلاف کے نام پر ان کی تحقیر اور طنز و استہزا کا جو کھیل جاری ہے وہ انتہائی افسوسناک ہے اور اسے محض اختلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فقہاء کرام کے پورے طبقے کی نفی کر کے دین کی تعبیر و تشریح کا جو نیا ڈھانچہ تشکیل دینے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے وہ کسی طرح بھی قابل فہم اور قابل قبول نہیں ہے۔ ایک طرف امت کے فقہاء کرام کی عظیم جماعت ہے جو آج بھی امت مسلمہ میں غالب جمہور کی حیثیت رکھتی ہے، دوسری طرف گنتی کے چند افراد ہیں جو طنز و استہزا، تحقیر اور تعلی کے لہجے میں اپنی بات ہر صورت منوانے کی ضد کر رہے ہیں، اسے صرف اختلاف کہہ کے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اختلاف کے دائرہ کے ساتھ ساتھ اس کے درجہ کا بھی لحاظ ہوتا ہے۔ عدالت میں کیس پر بحث کرنے والا ایک وکیل وہ ہے جو ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کا جج رہا ہے اور اب ریٹائر ہو کر پریکٹس کر رہا ہے، اور دوسرا وکیل ڈگری لے کر سیدھا عدالت میں آگیا ہے۔ کوئی بھی عدالت ان دونوں وکیلوں کے دلائل اور استدلال کو ایک درجہ میں نہیں رکھے گی، اور اگر سب کو ایک درجہ میں رکھا جائے تو اسپیشلائزیشن اور تجربے کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ ابوحنیفہؒ، مالکؒ شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ،

غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، اور شاہ ولی اللہؒ کی سطح کے لوگوں سے اختلاف کے لیے علم وتفقہ اور دیانت وتقوی کا معیار بھی اسی مناسبت سے چاہیے، ورنہ اس مباحثہ کا نتیجہ اس سے مختلف نہیں ہوگا جو سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس اور صرف ڈگری بردار وکیل کے درمیان بحث کا ہوتا ہے۔ اس لیے اس نتیجے پر جھنجھلا کر طنز وتحقیر کا لہجہ تیز کر دینے کی بجائے بحث کرنے والوں کو اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

• ایک محترم کا یہ ارشاد نظر سے گزرا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو خطاب کیا ہے اس لیے بندوں کو یہ خطاب خود سمجھنا چاہیے اور قرآن کریم کا براہ راست مطالعہ کرنا چاہیے۔ تعجب ہوا کہ قرآن کریم تو جناب رسول اکرمؐ کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ ”ویعلمہم الکتاب“ وہ اپنے امتیوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے ہیں اور ”لتبین للناس ما نزل الیہم“ آپؐ لوگوں کے لیے قرآن کریم کے ضروری مقامات کی وضاحت خود کرتے ہیں۔ اب صحابہ کرامؓ تو فصاحت وبلاغت کے آئیڈیل دور کے عرب ہونے کے باوجود قرآن کریم کی تعلیم جناب رسول اللہؐ سے حاصل کرتے تھے اور ان کے لیے قرآن کریم کے ضروری مقامات کی وضاحت بھی آنحضرتؐ کی ذمہ داری تھی، مگر دور صحابہ کرامؓ سے تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد پاکستان کے عجمی مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ قرآن کریم کا براہ راست مطالعہ کریں، جو ان کی سمجھ میں آ جائے اسے اللہ تعالی کی منشا سمجھیں اور جی چاہے تو اس پر عمل بھی کر لیں۔ خدا جانے یہ ”دانش“ کا کون سا ”برانڈ“ ہے؟

• حکمت ودانش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا منبع انسان کی عقل وفہم ہے اس لیے انسان جو کچھ سوچتا ہے وہی دانش ہے، جبکہ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ ”ولقد اتینا لقمان الحکمۃ“۔ حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت ہم نے عطا کی تھی۔ اور اس کی کچھ باتوں کا قرآن کریم نے تذکرہ بھی کیا ہے کہ حکمت کا مطلب یہ ہے کہ (۱) شرک نہیں کرنا (۲) ماں باپ کی فرمانبرداری کرنا (۳) موت کا یقین اور اس کا خوف ہر وقت دل میں رکھنا (۴) نماز قائم کرنا (۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا (۶) مصائب پر صبر کرنا (۷)

لوگوں کے ساتھ ترش روئی سے پیش نہیں آنا (۸) زمین پر اکڑ کر نہیں چلنا وغیر ذالک۔

اسی طرح قرآن کریم نے جناب نبی کریمؐ کے بارے میں فرمایا کہ وہ قرآن کریم کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو حکمت کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمت و دانش کا صحیح معیار وہی ارشادات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نازل فرمائے ہیں اور جن کی تعلیم جناب نبی کریمؐ نے دی ہے۔ جبکہ قرآن و سنت کو نظر انداز کر کے سامنے لائی جانے والی باتوں کی قرآن کریم یوں تعبیر کرتا ہے کہ ”ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق“ آپ کے پاس جو حق آچکا ہے اس کے مقابلہ میں لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے۔

- یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے اور بندے کو اپنے رب کے ساتھ براہ راست تعلق قائم کرنا چاہیے۔ جبکہ قرآن کریم اس کے برعکس بندوں کو ہی ہدایت اور حق کا معیار اور ذریعہ قرار دے رہا ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں دعا سکھائی کہ ”اھدنا الصراط المستقیم“۔ اور صراط مستقیم کی وضاحت اسی سورت میں کر دی کہ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام نازل ہوا ہے۔ پھر قرآن کریم میں ہی انعام یافتہ لوگوں کے چار درجات بیان کیے ہیں (۱) انبیاء کرام علیہم السلام (۲) صدیقین (۳) شہداء اور (۴) صالحین۔ گویا ہدایت کا معیار اور ذریعہ یہ طبقات ہیں جو بندوں پر ہی مشتمل ہیں۔ ایک جگہ فرمایا ”فبھداھم اقتدہ“ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے آپ ان لوگوں کی اقتدا اور پیروی کریں۔ ایک جگہ فرمایا کہ ”ویتبع غیر سبیل المؤمنین“ جس نے مسلمانوں کا راستہ یعنی امت کا اجماعی تعامل چھوڑ دیا وہ جہنم کے راستے پر ہیں۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”واتبع سبیل من اناب الی“ جو شخص میری طرف جھک گیا ہے تم اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔ ان سب ارشادات میں ہدایت کا معیار اور ذریعہ ”بندوں“ کو ہی قرار دیا گیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ تک رسائی اس کے نیک اور مقبول بندوں کی راہنمائی اور پیروی کے بغیر ممکن کیسے ہے؟

• جناب نبی کریمؐ نے دین کے معاملات میں لوگوں کو آسانی اور ’’یسر‘‘ مہیا کرنے کی تلقین فرمائی ہے اور خود بھی آنحضرتؐ کا معمول تھا کہ دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑتا تو آسان پہلو کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر یہ بات غور طلب ہے کہ یسر اور آسانی کا مطلب اور اس کی حد کیا ہے؟ یسر کا مطلب کسی حکم سے چھٹی دے دینا نہیں بلکہ اس حکم کو عمل کرنے والے کی وسعت و طاقت کے دائرے میں لانا ہے۔ مثلاً نماز کے بارے میں ہے کہ اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو، بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھ لو، اگر لیٹ کر بھی حرکت نہیں کر سکتے تو اشارے سے پڑھ لو۔ یعنی جس کیفیت میں بھی پڑھ سکتے ہو اس طرح پڑھو مگر پڑھو ضرور۔ ہاں اس کے بعد اگر ایسی کیفیت ہو کہ کسی صورت میں بھی نہیں پڑھ سکتے تو قضا کر سکتے ہو۔ مگر یسر کا یہ مطلب نہیں کہ گھٹنے میں درد ہو رہا ہے اور سجدہ میں جانے اور اٹھنے میں مشقت پیش آرہی ہے تو نماز کی ہی چھٹی کرا دی جائے۔ یسر احکام شرعیہ اور انسانی استطاعت میں توازن پیدا کرنے کا نام ہے، احکام سے پیچھا چھڑانے کے لیے بہانے تلاش کرنے کا نام نہیں۔ اس کی سادہ سی مثال ہے کہ ہر پٹرول پمپ کے کنارے پر کوئی صاحب ہوائی سلنڈر لیے بیٹھے ہوتے ہیں جن سے گاڑیوں والے گاڑی کے پہیوں کی ہوا چیک کرواتے ہیں اور اس میں توازن قائم کرواتے ہیں۔ وہ شخص جس پہیے میں ہوا ضرورت سے زیادہ ہو اسے کم کر دیتا ہے اور جس پہیے میں ہوا ضرورت سے کم ہو اس میں مزید ہوا بھر دیتا ہے تاکہ پہیوں کا توازن درست رہے اور گاڑی صحیح چلتی رہے۔ کوئی پہیہ ہوا کے زیادہ ہونے کی وجہ سے زیادہ ٹائیٹ ہو گیا ہے اور گاڑی کو صحیح چلنے میں دشواری پیش آرہی ہے تو وہ شخص یہ کہہ کر ساری ہوا نکال نہیں دے گا کہ سارا فتور اس ہوا کا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال اور بھی دیکھ لیں کہ اگر کسی شخص کی شلوار کا ازار بند زیادہ سخت باندھا گیا ہے اور اسے چلنے میں دشواری ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ گرہ کو تھوڑا ڈھیلا کر دیا جائے، یہ نہیں کہ سرے سے ازار بند کو ہی کاٹ کر سربازار لوگوں کو تماشہ دکھایا جائے۔

• امام نسائی نے ”السنن الکبریٰ“ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خصوصیات کے باب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جب خارجیوں نے حضرت علیؓ سے بغاوت کر کے علیحدگی اختیار کر لی تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ سے اجازت لے کر ان سے مذاکرات کے لیے تشریف لے گئے۔ خوارج کے دعوے اور موقف کی بنیاد قرآن کریم کی چند آیات کے ظاہری مفہوم پر تھی، اس لیے حضرت ابن عباسؓ نے ان سے گفتگو کے آغاز میں ایک اصولی بات کی کہ میں تمہارے پاس جناب رسول اللہؐ کے صحابہ کرام، مہاجرین و انصار اور آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی اور داماد کی طرف سے آیا ہوں۔ ”علیہم نزل القرآن وھم اعرف بتاویلہ منکم ولیس فیکم منھم احد“ قرآن ان پر نازل ہوا تھا اور وہ قرآن کریم کے مفہوم اور تفسیر و تاویل کو تم سے زیادہ جانتے ہیں جبکہ تمہارے درمیان ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے خوارج کے ساتھ متنازعہ مسائل پر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی نئی فکر پیش کرنے والوں کے ساتھ مسائل پر گفتگو سے قبل اصول پر بات ہونی چاہیے اور اصولی بنیادوں کو واضح ہو جانا چاہیے کیونکہ اگر قرآن و سنت کے احکام و مسائل کی تعبیر و تشریح کا معیار اور اصول ہی الگ الگ ہوں تو محض مسائل و احکام پر بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے الجھن میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

• دنیا کے ہر عدالتی اور قانونی نظام میں دستور و قانون کی تشریح کا معیار اور اس پر فیصلہ کرنے کی اتھارٹی طے شدہ ہے جس سے ہٹ کر کسی کی بات نہیں سنی جاتی۔ مثلاً پاکستان میں اگر کوئی شخص کسی قانون کی تشریح کے حوالہ سے سیشن کورٹ میں درخواست دائر کرے تو وہ یہ کہہ کر واپس کر دی جاتی ہے کہ یہ عدالت اس مقدمہ کو سننے کی مجاز نہیں ہے، یہ کام ہائیکورٹ کا ہے اس لیے کہ قانون کی تشریح کرنا ہائیکورٹ کا اختیار ہے۔ اسی طرح دستور کی کسی شق کی تعبیر و تشریح کے بارے میں ہائیکورٹ میں درخواست پیش کی جائے تو وہ بھی ان ریمارکس کے ساتھ واپس ہو جاتی ہے کہ دستور کی تعبیر و تشریح کرنا سپریم کورٹ کا کام ہے، ہائیکورٹ اس کا مجاز نہیں ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا سٹیٹس

ہائیکورٹ کا ہے، اس میں سودی نظام کے بارے میں رٹ پر یہ بحث کئی ماہ جاری رہی کہ چونکہ سودی نظام کے خاتمہ کا دستور میں تذکرہ ہے اس لیے یہ دستوری مسئلہ ہے اور اس پر فیصلہ کرنا بھی سپریم کورٹ کا کام ہے، وفاقی شرعی عدالت اس کی مجاز نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کیس دوبارہ سماعت کے لیے سپریم کورٹ نے ہی وفاقی شرعی عدالت کو بھیجا ہوا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ کسی مجاز عدالت میں قانون یا دستور کی تعبیر و تشریح پر بحث کرنا اور اس پر دلائل پیش کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں ہے اس کے لیے ڈگری، بار کا لائسنس اور کئی سالوں کا تجربہ ضروری سمجھا جاتا ہے، اس کے بغیر کسی کو بحث میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مگر اسلامی فقہ اور قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کو یار لوگوں نے ”ہائیڈ پارک کارنر“ سمجھ رکھا ہے کہ جس شخص کا جس وقت جو جی چاہے بول دے اور پھر وہ یہ شکوہ بھی کرے کہ لوگ میری بات کیوں نہیں سن رہے، میں بھی تو قرآن کریم کی ہی تشریح کر رہا ہوں۔

چیمپئنز ٹرافی — ۱۸۰ نفلوں کی مار

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۰ جون ۲۰۱۷ء)

مجھے کھیلوں سے اس حد تک کبھی دلچسپی نہیں رہی جو معمولات اور ضروری کاموں پر اثر انداز ہو مگر بہرحال کچھ نہ کچھ تعلق ضرور چلا آرہا ہے۔ لڑکپن کے دور میں گکھڑ میں میرے ہم عمر دوستوں نے کرکٹ کی دو ٹیمیں بنا رکھی تھیں یونین کلب اور آزاد کلب کے نام سے۔ ان میں سے ایک کے کپتان محمد یونس بھٹی اب مرحوم ہو چکے ہیں جبکہ دوسری ٹیم کے کپتان محمد عبد اللہ خالد بقید حیات ہیں۔ دونوں میرے ذاتی دوستوں میں سے تھے، اللہ تعالیٰ بھٹی صاحب مرحوم کی مغفرت فرمائیں اور خالد صاحب کی صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں۔ میں بھی ان میں سے ایک ٹیم کا حصہ تھا اور کرکٹ کھیلا کرتا تھا مگر یہ سلسلہ کچھ عرصہ ہی چل سکا پھر ذہن کیرم بورڈ کی طرف مڑ گیا اور کافی عرصہ اس کا شغل رہا، اس کے بعد چند سال لڈو بھی کھیلی۔ البتہ قومی سطح پر کھیلوں سے اس حد تک دلچسپی ضرور باقی رہی کہ پاکستان کا قومی سطح پر کسی ملک سے مقابلہ ہو تو معلومات رکھنے کی کوشش کرتا ہوں،

پاکستانی ٹیم کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں اور کامیابی مل جائے تو خوشی کا اظہار بھی کرتا ہوں۔

یہ فطری بات ہے کہ دو قوموں یا گروہوں کے درمیان مقابلہ ہو تو کسی ایک طرف ہمدردی ضرور ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے روم و فارس کی باہمی جنگوں کا ذکر کیا ہے، یہ مسلمانوں کا مکی دور تھا۔ روم اور فارس دنیا کی دو بڑی قوتیں تھیں جن کی آپس میں محاذ آرائی رہتی تھی اور شام، عراق اور بحرین کے علاقے میدان جنگ تھے۔ مشرکین مکہ کی ہمدردیاں فارس کے مجوسیوں کے ساتھ تھیں جبکہ مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے اہل کتاب کے ساتھ تھیں۔ یہ قوموں کی نفسیات کا حصہ ہے کہ لڑائی کہیں اور ہو رہی ہوتی ہے جس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن ہمدردیوں کے باعث باہمی محاذ آرائی کا نفسیاتی ماحول دوسرے علاقوں میں بھی بن جاتا ہے۔ فارس کے مجوسی پیش رفت کرتے تو مکہ کے مشرکین مسلمانوں کو طعنے دیتے اور جب روم کے اہل کتاب کو کہیں کامیابی مل جاتی تو مسلمان اپنی خوشی کا اسی طرح مشرکین کے سامنے اظہار کرتے۔ حالانکہ رومی اور فارسی دونوں کافر تھے اور بعد میں مسلمانوں کی دونوں سے جنگیں ہوئیں لیکن اس وقت کے حالات میں وہ بہرحال رومیوں کے ساتھ سمجھے جاتے تھے بلکہ ہمدردی اور دلچسپی کی حد تک ان کے ساتھ تھے بھی۔

ایک موقع پر فارسیوں نے رومی علاقوں پر ایسی چڑھائی کی کہ رومی دارالحکومت قسطنطنیہ کے قریب جا پہنچے۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو طعنے دیے جس سے مسلمان پریشان ہوئے۔ انہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپؐ نے یہ کہہ کر تسلی دی کہ کوئی بات نہیں چند سالوں کے بعد رومیوں کو دوبارہ غلبہ حاصل ہوگا۔ اس پر قرآن کریم کی سورۃ الروم نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا کہ تسلی رکھو رومی چند سالوں کے بعد فارسیوں پر غالب آئیں گے اور تم مسلمانوں کو بھی خوشی کا دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ یہ باہمی نفسیاتی کشمکش اس عروج کو پہنچی کہ تفسیر ابن کثیرؒ میں مذکور روایات کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قریش کے بعض سرداروں کے ساتھ باقاعدہ شرط باندھ لی۔ اس وقت تک جوئے اور شرط وغیرہ کے ناجائز ہونے کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے اس لیے عام معمول کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ شرط لگائی اور پھر جیتی بھی۔

یہ صورتحال تو غیر مسلم قوموں کے باہمی مقابلہ میں کسی ایک طرف دلچسپی کی ہے لیکن اگر مقابلہ میں خود اپنی قوم اور ملک کھڑا ہو تو یہ دلچسپی کہیں زیادہ ہو جاتی ہے اور کھیل کا مقابلہ بھی باقاعدہ محاذ جنگ بن جاتا ہے جیسا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کھیلوں کے مقابلہ میں دونوں طرف یہ کیفیت دیکھنے میں آتی ہے۔ چنانچہ مجھے تو ان مقابلوں سے اسی حد تک دلچسپی ہوتی ہے جس کا ذکر کر چکا ہوں مگر میری اہلیہ اور پوتوں کی دلچسپی ایسے موقعوں پر قابل دید ہوتی ہے۔ بڑا پوتا طلال خان جو کہ عمار خان کا بیٹا ہے، ماشاءاللہ حافظ قرآن ہے اور اس رمضان میں ہم گھر والوں کو گھر میں ہی تراویح میں قرآن کریم سنا رہا ہے۔ جب یہ چھوٹا تھا اور اس کے پردادا جان حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ حیات تھے تو ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ بستر علالت پر تھے، اس کی ولادت پر اسے گھٹی بھی پردادا محترم نے دی تھی، انہوں نے اس سے نام پوچھا تو اس نے بتایا "طلال آفریدی"۔ انہوں نے تعجب سے اس کی والدہ کی طرف دیکھا تو اس نے وضاحت کی کہ کرکٹ کا شوقین ہے اور شاہد آفریدی کو پسند کرتا ہے اس لیے اپنے نام کے ساتھ اس نے آفریدی لگا رکھا ہے۔ پردادا نے فرمایا کہ بیٹا ہم آفریدی نہیں ہے اس لیے اپنے نام سے یہ نسبت ہٹا لو چنانچہ اس کے بعد اس نے یہ لفظ ترک کر دیا۔

میرے تین پوتے ہیں، طلال خان، ہلال خان اور ابدال خان جن کی عمریں ترتیب سے ۱۵ سال، ۱۲ سال اور ۹ سال ہیں۔ دوسرے دونوں بھی قرآن کریم حفظ کر رہے ہیں جبکہ کرکٹ کے ساتھ تینوں کی دلچسپی یکساں ہے جس میں انہیں اپنی دادی کی سرپرستی حاصل ہے۔ حالیہ چیمپئنز ٹرافی کے مقابلوں میں اس حوالہ سے ہمارے گھر میں ایک دلچسپ صورتحال پیدا ہوگئی جس نے مجھے یہ کالم لکھنے پر آمادہ کیا۔ پاکستان نے برطانیہ سے سیمی فائنل جیتا تو باقی سب لوگ خوش تھے مگر طلال خان کی دادی افسردہ ہوئی، وجہ پوچھی تو کہنے لگی کہ انگلینڈ سے ہار جاتا تو خیر تھی اب فائنل میں پہنچ کر بھارت سے ہارے گا تو زیادہ کوفت ہوگی۔ ہمارے گھر میں ٹی وی تو ہے نہیں اس لیے فائنل مقابلہ کے دن دادی اور پوتے انٹرنیٹ پر میچ میں مصروف رہے اور ان کا چچا عامر خان جو اپنے کام میں مصروف تھا وقفہ وقفہ سے صورتحال پوچھتا رہا۔ عصر کے بعد مجھے افطاری کے پروگرام کے لیے شہر سے باہر جانا تھا وہاں مجھے پاکستان کے جیتنے کی خبر مل گئی۔ میرا چھوٹا بیٹا ناصر الدین خان عامر رات سونے سے قبل مجھے دوائی کی خوراک دیتا ہے اور کچھ ٹانگیں وانگیں بھی دباتا ہے، اس نے

بتایا کہ آج بھارت ایک سواسی نفلوں سے ہار گیا ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا ایک سو اسی نفلوں سے؟ کہنے لگا کہ امی جان نے نذر مان لی تھی کہ بھارت جتنے رنز سے ہارے گا اتنے نفل پڑھوں گی، اب انہیں کیا پتہ تھا کہ بھارتی ٹیم اس میچ میں اتنی نکمی ثابت ہوگی۔ رات کو سب سے چھوٹا پوتا ابدال خان معصوم سی ہمدردی کے ساتھ دادی سے کہہ رہا تھا کہ ''دادو جان! آپ نفل بیٹھ کر پڑھ لینا''۔ اس نے کہا کہ بیٹا میں تو پہلے ہی بیماری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھتی ہوں۔

بھارتی سپریم کورٹ میں تین طلاقوں کا مسئلہ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جون ۲۰۱۷ء)

بھارتی سپریم کورٹ میں اس وقت ''تین طلاقوں'' کا مسئلہ زیر بحث ہے اور اس کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ تین طلاقوں کو جرم قرار دے دیا جائے اور انہیں قانونی طور پر تسلیم نہ کیا جائے۔ تمام مسلم مکاتب فکر کی مشترکہ نمائندہ تنظیم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' اس سلسلہ میں مسلمانوں کے موقف کا دفاع کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سپریم کورٹ میں دونوں طرف کے موقف کا خلاصہ دو خبروں کی صورت میں ملاحظہ فرمائیں جو چیف جسٹس جے ایس کیہر کی سربراہی میں کیس کی سماعت کرنے والے پانچ رکنی بینچ کے سامنے پیش کیے گئے۔

''سینئر وکیل رام جیٹھ ملانی نے عدالت میں موقف اختیار کیا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا آئینی طور پر بھی مساویانہ حقوق پر حملہ ہے، بیک وقت تین طلاقیں دینے کا حق صرف شوہر کو حاصل ہے جو آئین کے آرٹیکل ۱۴ کی خلاف ورزی ہے۔ جیٹھ ملانی نے کہا کہ اس طرح طلاق دینے کا طریق کار بے رحمانہ اور قرآن کریم کے اصولوں کے بھی خلاف ہے جس کی کسی بھی صورت وکالت نہیں کی جا سکتی۔ تین طلاقوں سے متاثرہ خاتون کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ دنیا کا کوئی بھی قانون شوہر کی خواہش پر بیوی کو سابق بیوی بنانے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ لاقانونیت کی سب سے بڑی قسم ہے۔'' (روزنامہ اوصاف لاہور ۱۳، مئی ۲۰۱۷ء)

دوسری طرف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے وکیل کپل سبل نے، جو کانگریس کے سینئر لیڈر بھی ہیں، عدالت میں اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ

”مسلمان گزشتہ چودہ سو برس سے اس قانون پر عمل کر رہے ہیں اور یہ ان کے عقیدے سے وابستہ معاملہ ہے، اسے غیر قانونی کیسے کہا جا سکتا ہے؟ انہوں نے تین طلاق کو نہ صرف مسلمانوں کے عقیدے اور ایمان سے وابستہ معاملہ بتایا بلکہ اس کا موازنہ بھگوان رام کے ایودھیا میں پیدا ہونے کے سلسلہ میں ہندوؤں کے عقیدہ سے بھی کیا اور کہا کہ اگر بھگوان رام کے ایودھیا میں پیدا ہونے کے سلسلہ میں ہندوؤں کے عقیدے پر سوال نہیں اٹھایا جا سکتا تو تین طلاق پر ایسا کیوں ہے؟“
(روزنامہ انصاف لاہور ۱۷، مئی ۲۰۱۷ء)

اسی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بھارتی اٹارنی جنرل مکل روھسکی نے عدالت کو بتایا ہے کہ

”اگر سپریم کورٹ تین طلاق کو غیر قانونی قرار دیتا ہے تو حکومت شادی اور طلاق کے ضابطے کیلئے قانون بنانے کو تیار ہے۔“

جبکہ اس صورت حال پر سپریم کورٹ کے پانچ رکنی بینچ کے یہ ریمارکس بھی روزنامہ اوصاف (۱۳ مئی) میں شائع ہونے والی خبر کا حصہ ہیں کہ

”باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے کچھ مسالک میں بیک وقت تین طلاقیں دینا جائز ہے لیکن پھر بھی بیک وقت تین طلاقیں دے کر مسلمانوں میں نکاح کو ختم کرنے کی یہ سب سے بدترین قسم ہے۔“

نکاح و طلاق کے اسلامی احکام و قوانین اس وقت دنیا بھر میں زیر بحث ہیں اور اس وجہ سے کہ ان کی بنیاد آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی پر ہے، انہیں آج کے مروجہ اس بین الاقوامی فلسفہ و نظام کے منافی سمجھا جاتا ہے جس میں آسمانی تعلیمات سے دست برداری اختیار کر کے سوسائٹی کی اجتماعی عقل و خواہش کو ہی تمام احکام و قوانین کی بنیاد بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے حوالہ سے مختلف تضادات سامنے آتے ہیں اور باعث نزاع بنتے رہتے ہیں۔ اس کشمکش کا سب سے بڑا میدان بھارت ہے جہاں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان نکاح کے جائز نہ ہونے کے ساتھ ساتھ مرد کو یکطرفہ طلاق کے حق کا مسئلہ بھی بڑے تنازعات میں شامل ہے۔ اس سلسلہ میں بھارت کے تمام مسلم مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام ”آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ“ کے فورم پر جمع ہیں اور مسلمانوں کے خاندانی نظام و قوانین کے تحفظ کیلئے مصروف جدوجہد ہیں۔

قرآن و سنت کے واضح ارشادات کی روشنی میں مسلمان مرد کا غیر مسلم عورت سے اور غیر مسلم عورت کا مسلمان مرد سے نکاح درست نہیں ہے، اس لیے مسلمان غیر مسلموں میں رشتہ نہ دیتے ہیں نہ لیتے ہیں۔ اور صرف ہندوستان کے غیر مسلموں کو نہیں بلکہ دنیا بھر کے غیر مسلموں خصوصاً سیکولر حلقوں کو اعتراض ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسی طرح قرآن کریم نے طلاق کا حق خاوند کو دیا ہے جبکہ بیوی کو براہ راست طلاق کا حق دینے کی بجائے خلع کے عنوان سے مطالبۂ طلاق کا حق دیا ہے اور اس کے لیے ایک پورا نظام پیش کیا ہے تاکہ عورت کے ساتھ ظلم اور اس کی حق تلفی نہ ہو سکے، مگر آج کے مروجہ عالمی نظام و فلسفہ کا مطالبہ ہے کہ بیوی کو بھی خاوند کی طرح طلاق کا مساویانہ حق دیا جائے تاکہ مرد و عورت کی مساوات قائم ہو سکے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں عائلی قوانین کے تحت بنائے جانے والے نکاح فارم میں ”تفویض طلاق“ کا خانہ اسی خلا کو پر کرنے کیلئے شامل کیا گیا تھا اور اب بعض قانونی حلقوں کی طرف سے خلع کو عورت کی طرف سے مطالبہ طلاق کی بجائے طلاق کے براہ راست حق سے جو تعبیر کیا جا رہا ہے وہ بھی اسی پس منظر میں ہے۔

تین طلاقوں کے حوالہ سے ایک بحث تو ہمارے ہاں فقہی حلقوں میں ہے کہ ایک مجلس میں یا ایک جملہ میں تین طلاقیں بیک وقت دینے سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے یا تینوں واقع ہو جاتی ہیں مگر انڈیا کی سپریم کورٹ میں اس کی صورت مختلف ہے اور وہاں زیر بحث مسئلہ کی نوعیت یہ نظر آتی ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں اکٹھی دینے سے نکاح یکسر ختم ہو جاتا ہے اور رجوع یا نکاح ثانی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس طرح نظر ثانی کا موقع دیے بغیر نکاح کا رستہ کلی طور پر یکلخت ختم ہو جانے کو وہاں کے بعض حلقوں میں ناانصافی قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کا ہمارے ہاں کی تین طلاقوں کی بحث سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کہ اس سے ہٹ کر اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو وقفہ وقفہ کے ساتھ تین الگ الگ طلاقیں دیتا ہے تو تیسری طلاق کے بعد وہاں بھی یہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کے واضح ارشاد کے مطابق رجوع یا نکاح ثانی کا حق تمام مسلم فقہی مکاتب فکر کے نزدیک متفقہ طور پر تیسری طلاق کے بعد یکلخت اور کلی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے مسئلہ بیک وقت تین طلاقوں کا ہو یا وقفہ وقفہ سے تیسری طلاق کا دونوں صورتوں کا آخری نتیجہ ایک ہی ہے کہ ایسی طلاق جس کے بعد نظر ثانی کی گنجائش نہ رہے۔ اس حوالہ سے زیر بحث ہے کہ مرد کو طلاق کا یکطرفہ حق حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ نظر ثانی کی گنجائش کو ختم کر دینے کا

جو حق حاصل ہے وہ سیکولر حلقوں کے خیال میں (نعوذ باللہ) دہری زیادتی ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ زیر بحث کیس میں اس کا جائزہ لے رہی ہے اور اس سے تقاضہ یہ ہے کہ اسے نہ صرف جرم تصور دیا جائے بلکہ اسے قانوناً غیر مؤثر بھی قرار دے دیا جائے۔

جہاں تک "تین طلاقوں" کے ناپسندیدہ ہونے کا تعلق ہے اسلام سرے سے طلاق کو ہی ناپسندیدہ ترین عمل (ابغض المباحات) قرار دیتا ہے اور بیک وقت تین طلاقوں کو "طلاق بدعت" سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن طلاق ایک ایسی معاشرتی ضرورت بلکہ مجبوری ہے کہ مسیحیت اور ہندوازم میں مذہبی طور پر سرے سے طلاق کا تصور ہی نہیں تھا مگر انہیں اس معاشرتی مجبوری کو بالآخر ضرورت تسلیم کرنا پڑا ہے بلکہ مغربی دنیا نے تو ضرورت سے زیادہ ہی اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔

اس پس منظر میں کیا بیک وقت تین طلاقیں دینے کے عمل کو "جرم" قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہمارے ہاں پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کے دور میں "تحفظ حقوق نسواں بل" جب اسمبلی میں پیش کیا گیا، اس وقت حکمران جماعت پاکستان مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین کے ساتھ مذاکرات کے دوران سرکردہ علماء کرام کی کمیٹی نے یہ تجویز کیا تھا۔ روزنامہ پاکستان لاہور (۱۴ اکتوبر ۲۰۰۶ء) میں شائع شدہ راقم الحروف ہی کی ایک رپورٹ میں اس کا ذکر اس طرح موجود ہے کہ

> "پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور ان کے رفقاء کو ممتاز علماء کرام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا مفتی منیب الرحمن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی غلام الرحمن، مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، راقم الحروف ابو عمار زاہد الراشدی، مولانا اخلاق احمد اور حافظ محمد عمار یاسر نے مشورہ دیا ہے کہ اگر حکومت واقعی پاکستان میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کے حوالہ سے عملی پیش رفت کرنا چاہتی ہے تو اسے مندرجہ ذیل قانونی اقدامات کرنے چاہئیں۔
>
> 1. خواتین کو عملاً وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے اس کے سد باب کیلئے مستقل قانون بنایا جائے۔
>
> 2. بعض علاقوں میں خواتین کو ان کی مرضی کے خلاف نکاح پر مجبور کیا جاتا ہے اس کی روک تھام کے لیے قانون سازی کی جائے اور اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔
>
> 3. بیک وقت تین طلاقیں دینے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور

ایسی دستاویز لکھنے والے نوٹری پبلک اور وثیقہ نویس کو بھی شریک جرم قرار دیا جائے۔

4. قرآن کریم کے ساتھ نکاح کی مذموم رسم کا سدباب کیا جائے۔

5. جبری وٹہ سٹہ یعنی نکاح شغار کو قانونا جرم قرار دیا جائے۔

6. عورتوں کی خرید و فروخت اور انہیں میراث بنانے کے غیر شرعی رواج اور رسوم کا قانونی سدباب کیا جائے۔''

ہم نے ان تجاویز میں یہ تسلیم کیا تھا کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا معاشرتی طور پر بہت برا عمل ہے اور شرعی طور پر ''طلاق بدعت'' شمار ہوتا ہے اس لیے اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ دیا جانا چاہئے۔ لیکن تین طلاقیں بیک وقت دینے کی صورت میں طلاق شرعا واقع ہو جاتی ہے یا نہیں یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ اور اس پر جمہور فقہاء اہل سنت کا یہ موقف صدیوں سے چلا آرہا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینے سے خاوند گناہ گار ہو گا اور دنیا میں بھی اسے اس برے عمل پر سزا دی جا سکتی ہے لیکن اس کے ایسا کرنے سے طلاق بہر حال واقع ہو جائے گی اور جیسی اس نے کہی ہے ویسی ہی واقع ہو گی، اسے قانونا غیر مؤثر کر دینا محل نظر ہے جس کی مسلمہ شرعی اصولوں کی روشنی میں اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص کسی کو بندوق سے ایک، دو یا تین گولیاں مار دے تو وہ سخت گناہ گار ہے اور اس نے قبیح ترین جرم کا ارتکاب کیا ہے جس پر اسے دنیا اور آخرت دونوں جگہ سزا ہو گی۔ لیکن اس عمل کے سخت ترین گناہ اور جرم ہونے کی وجہ سے اس کی گولیاں غیر مؤثر نہیں ہو جائیں گی کیونکہ وہ اپنا کام بہر حال کریں گی اور جتنی گولیاں وہ مارے گا اتنی ہی لگیں گی۔

یہ مسئلہ انڈیا کے سپریم کورٹ میں زیر بحث ہے اور وہاں کے مسلمان اس پر جو اجماعی موقف اختیار کیے ہوئے ہیں ہم ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کیلئے دعا گو بھی ہیں۔ چونکہ اس قسم کی بحثیں ہمارے ہاں بھی ہوتی رہتی ہیں بلکہ اب تو یہ مباحث عالمی مکالمہ کا حصہ بن چکے ہیں، اس لیے اس سلسلہ میں چند گزارشات قارئین کی خدمت میں پیش کر دی ہیں۔ اللہ تعالی دنیا بھر کے مسلمانوں کو قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے ساتھ وابستہ رہنے اور ان کی حفاظت کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دینی اصطلاحات کا اجماعی مفہوم اور لفظوں کی مینا کاری

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۷ مئی ۲۰۱۷ء)

لفظوں کی مینا کاری کے ذریعے قرآنی اصطلاحات کے اجماعی مفہوم کو مشکوک کرنے کی مہم کے بارے میں گزشتہ ایک کالم میں کچھ معروضات پیش کر چکا ہوں۔ ان دنوں خود مجھے اس قسم کی صورتحال کا سامنا ہے، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ صاحب نے ایک میسج میں بتایا کہ وزیر آباد کے کوئی بزرگ ''ربوا'' کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں، میں نے انہیں آپ کا فون نمبر دے دیا ہے وہ آپ سے اس سلسلہ میں ملیں گے۔ ایک روز کے بعد ان صاحب کا فون آگیا، وہ ملاقات کے لیے تشریف لائے، متشرع، نمازی اور ذاکر و شاغل دکھائی دینے والے بزرگ ہیں، ان کی گفتگو سے خلوص اور والہانہ پن جھلکتا ہے البتہ سماعت کمزور ہونے کے باعث آلۂ سماعت کا سہارا لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ساتھ تفصیلی گفتگو میں مشکل پیش آتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ قرآن کریم نے ربوا کا جو لفظ فرمایا ہے اس کا ترجمہ علماء کرام سود کرتے ہیں جو کہ غلط ہے۔ ربوا اور سود کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے اور قرآن کریم نے سود کو حرام قرار نہیں دیا۔ میں نے عرض کیا کہ اب تک تو علماء کرام ربوا کا ترجمہ سود ہی کرتے آرہے ہیں، جیسے صلاۃ کا ترجمہ نماز اور صوم کا ترجمہ روزہ کیا جاتا ہے۔ اگر وہ درست ہے تو یہ بھی درست ہے۔ فرمانے لگے کہ نماز اور روزے کا لفظ قرآن کریم میں نہیں ہے اور یہ دونوں الفاظ عربی نہیں ہیں اس لیے یہ معنی درست ہے لیکن ''سود'' کا لفظ عربی کا لفظ ہے اور قرآن کریم میں موجود ہے جو کسی اور معنی میں ہے اس لیے ربوا کا ترجمہ سود کرنا درست نہیں ہے۔ میں نے حوالہ پوچھا تو بتایا کہ سورۃ الفاطر کی آیت ۲۷ میں ہے ''وغرابیب سود'' جس میں کالے پہاڑ کو سود کہا گیا ہے، اس لیے ربوا کا معنی سود نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر بات ہے کہ اس دلیل کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

البتہ اس پر مجھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ مکالمہ یاد آگیا جو بادشاہ وقت نمرود سے ہوا تھا اور جس کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بادشاہ کے سامنے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے یعنی جس کے قبضے

میں موت و حیات ہے تو اس نے جھٹ سے کہا کہ "انا احی وامیت" کہ زندگی اور موت دینے کا کام تو میں بھی کرتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دیکھ کر کہ یہ صاحب دلیل کی دنیا کے آدمی نہیں ہیں، انہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور گفتگو کا رخ بدل دیا۔ میں نے بھی اسی میں عافیت سمجھی اور کہا کہ چلیں سود کے لفظ کو چھوڑیں، آپ یہ بتائیں کہ قرآن کریم نے ربوا کو حرام قرار دیا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ربوا کو معاشرے سے ختم کر دیا تھا۔ وہ چیز جو آنحضرتؐ نے اس قرآنی حکم کی روشنی میں ختم کر دی تھی وہ کیا تھی؟ کہنے لگے کہ وہ یہ سود نہیں تھا جسے آپ لوگ حرام کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات تو طے ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے ربوا کے نام سے کچھ چیزیں سوسائٹی سے ختم فرما دی تھیں ان کی عملی شکل کیا تھی؟ کہا کہ یہ آپ بتائیں مجھے تو معلوم نہیں ہے۔

میں نے گزارش کی کہ جب آپ کو ربوا کی عملی شکل اور اس کا وہ معنی جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل دونوں کے ساتھ متعیّن کر دیا تھا، معلوم نہیں ہے تو آپ اتنی لمبی چوڑی بحث کیوں کر رہے ہیں؟ انہوں نے اپنی بات پھر دہرائی کہ آپ لوگ ربوا کا ترجمہ سود کر رہے ہیں وہ غلط ہے اور سود کو کسی طرح بھی قرآن کریم نے حرام قرار نہیں دیا۔ اس پر میں نے کہا کہ آپ پہلے یہ معلوم کر لیں کہ جس ربوا کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا اور آنحضرتؐ نے اس کی تمام عملی صورتوں کو ختم کر دیا وہ کیا تھا؟ اس لیے کہ جب تک آپ کو وہ پوری طرح معلوم نہ ہو اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ جناب رسول اللہؐ نے مختلف مقامات پر ربوا کی عملی صورتیں بیان فرمائی ہیں اور انہیں ختم کیا ہے، بیسیوں احادیث میں ان کا تذکرہ موجود ہے اور پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ کہنے لگے کہ میرا احادیث کا زیادہ مطالعہ نہیں ہے اس لیے اب معلوم کرنے کی کوشش کروں گا اور مطالعہ کر کے پھر آپ کے پاس اس بحث کو آگے بڑھانے کے لیے دوبارہ آؤں گا۔ میں کہا آپ جب بھی تشریف لائیں میں حاضر ہوں۔

یہ ہماری اب تک کی گفتگو کی مختصر روداد ہے لیکن میں اس سلسلہ میں دو الجھنوں کا شکار ہو گیا ہوں۔ ایک یہ کہ جن دانشوروں نے (۱) خاتم (۲) توفی (۳) سنت اور (۴) ربوا جیسے قرآنی الفاظ و اصطلاحات کو لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا کر ان کے اجماعی مفہوم کو دھندلا کر دینے کی مہم شروع کر رکھی ہے ان کے استدلال اور ان وزیر آبادی بزرگ کے اسلوب میں کوئی فرق مجھے دکھائی نہیں دے رہا، اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی دانشور دوست مجھے یہ فرق،

اگر موجود ہے، تو سمجھا دیں۔ دوسری الجھن میری یہ کمزوری ہے جو مجھ پر حسب معمول غالب آرہی ہے کہ مذکورہ وزیرآبادی بزرگ کی اس کج بحثی کو یکبارگی گمراہی قرار دے کر انہیں دوسری طرف دھکیل دینے اور ان سے پیچھا چھڑا لینے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا بلکہ اسے "مغالطہ" سمجھ کر اسے دور کرنے کی کوشش کو ترجیح دے رہا ہوں۔ اور اسی لیے انہیں بحث کے لیے دوبارہ آنے سے میں نہیں روکا۔ البتہ اس بات کا خدشہ محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی "باحمیت بزرگ" میری اس کوشش کو گمراہی کی سرپرستی کا عنوان دے کر کہیں میرا نام بھی اسی فہرست میں نہ درج فرمادیں۔

مولانا ولی رازی کی تصنیف "ہادئ عالم" پر ایک نظر

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۶ مئی ۲۰۱۷ء)

قرآن کریم کی بعض سورتوں کا آغاز حروف مقطعات (مفرد حروف) سے کیا گیا ہے جس کی علمی توجیہات میں مفسرین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے نکتہ رسی کا پورا گلدستہ سجا رکھا ہے۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کلام اللہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہونے کی طرف اس پہلو سے توجہ دلائی ہے کہ قرآن کریم انہی مفرد حروف سے ترتیب پایا ہے جو عربی زبان کے حروف ابجد شمار ہوتے ہیں۔ یہ حروف انتیس ہیں اور قرآن کریم میں ان کے علاوہ کوئی حرف موجود نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کو کلام اللہ نہ ماننے والوں سے کہا گیا ہے کہ یہ حروف تمہاری دسترس میں بھی ہیں اگر ہمت ہے تو ان حروف سے تم بھی قرآن کریم جیسا کلام یا کم از کم ایک سورت بنالاؤ گویا بعض سورتوں کے آغاز میں یہ حروف مقطعات تحدی اور چیلنج کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہونے کے ساتھ ساتھ "عربی مبین" کی فصاحت کا کمال بھی ہے جو دنیا کی فصیح ترین زبان شمار ہوتی ہے اور اس کی فصاحت و بلاغت کی بنیاد ان حروف پر قائم ہے۔

یہ انتیس حروف جب فصاحت و بلاغت کے بیسیوں پہلوؤں میں اپنی بہار دکھاتے ہیں تو انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے لیکن اگر ان حروف میں بھی کمی ہو جائے اور بعض حروف کو استعمال میں لائے بغیر ابلاغ و بیان کے تنوع و کمال کو قائم رکھا جائے تو اعجاز و کمال کی نئی جہتیں انسانی دل و دماغ کو حیرت و تعجب سے دوچار کر دیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عباسی دور کے ایک معروف خطیب سحبان بن وائل اپنی زبان کی لکنت کی وجہ سے بعض حروف روانی

کے ساتھ نہیں بول سکتے تھے لیکن جب وہ خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے تو گھنٹوں بولتے چلے جاتے مگر ان کے خطاب میں وہ حروف نہیں ہوتے تھے اور ایسے حروف کو استعمال میں لائے بغیر وہ اپنا مافی الضمیر پوری مہارت اور اعتماد کے ساتھ بیان کر دیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کی خطابت و فصاحت ضرب المثل بن گئی تھی اور بڑے بڑے فصیح اللسان خطباء کو اپنے وقت کا سحبان کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہمارے بزرگوں میں سے حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ اپنی فصاحت کے باعث "سحبان الہند" کہلاتے تھے۔

مختلف زبانوں میں زبان و ادب کے متنوع پہلوؤں کے اظہار کے لیے ہر دور میں نئے نئے فنون سامنے آتے رہے ہیں جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ اس حوالہ سے عربی کا دامن سب سے زیادہ وسیع دکھائی دیتا ہے مگر اردو کو بھی تنگ دامنی کا شکوہ نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت دنیا کی مستعمل زبانوں میں بولنے والوں کی تعداد کے حوالہ سے اردو (ہندی سمیت) دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے جبکہ دنیا کے کم و بیش ہر خطہ میں بولے جانے کے باعث اپنے دائرہ کی وسعت کے حوالہ سے اسے دنیا کی سب سے بڑی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہے اور اس کا دامن بھی لسانی علوم و فنون کی وسعت و تنوع میں کمی کی شکایت نہیں رکھتا۔ اردو کے حروف ابجد عربی سے زیادہ ہیں اور اس کے نصف درجن کے لگ بھگ حروف ایسے ہیں جو عربی میں استعمال نہیں ہوتے۔ اگرچہ اردو میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں جنہیں اب رفتہ رفتہ کم کر کے غیر محسوس طریقہ سے انگلش حروف کا تناسب بڑھایا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ لاہور کی آس اکیڈمی میں انگلش پڑھانے والے ایک استاذ محترم سے جب میں نے سوال کیا کہ وہ کون سا مضمون پڑھاتے ہیں تو انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ میں "جدید اردو" پڑھاتا ہوں۔ چنانچہ اردو میں انگلش الفاظ کا استعمال اسی طرح بڑھتا رہا تو بالآخر وہ انگلش ہی ہو کر رہ جائے گی۔

زبان کے استعمال و اظہار کا یہ بھی ایک نادر اسلوب ہے کہ اس کے حروف میں امتیاز قائم کر کے بعض حروف کے ساتھ کلام کیا جائے جیسا کہ منقوط اور غیر منقوط حروف کا فرق عربی زبان میں مختلف ادوار میں بعض حوالوں سے سامنے آتا رہا ہے اور اس سلسلہ میں ابوالقاسم حریری اور ابوالفضل کا بطور مثال نام لیا جاتا ہے۔ مگر اردو میں ایسی کوئی وقیع کاوش کم از کم ہمارے مطالعہ کے دائرہ میں نہیں ہے۔

اس پس منظر میں ہمارے محترم بزرگ حضرت مولانا ولی رازی زید مجدھم کی یہ کاوش بلاشبہ ایک تجدیدی کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے جو انہوں نے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات و سیرت کے حساس اور نازک موضوع پر ”ہادی عالم“ کے نام سے تصنیف فرمائی ہے اور اس پر وہ بجا طور پر ”صدارتی ایوارڈ“ سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ اس صدارتی ایوارڈ پر ہماری رائے بھی وہی ہے جو ایک فاضل دوست کے حوالہ سے ہم نے پڑھی ہے کہ اس سے مصنف کے اعزاز میں کوئی اضافہ ہوا ہے یا نہیں البتہ ”صدارتی ایوارڈ“ کی عزت و وقار میں ضرور اضافہ ہوا ہے۔ اصلاً جناب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت مبارکہ کی وجہ سے اور پھر مصنف کے علم و فضل کے حوالہ سے بھی کہ وہ خود ممتاز صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے فرزند گرامی اور مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی جیسے ارباب فضل و کمال کے برادر بزرگ ہیں۔

کتاب کے فنی پہلوؤں کے بارے میں تو اہل فن ہی اپنی رائے کا اظہار کریں گے البتہ مصنف کے جذبہ و حوصلہ اور خصوصاً جناب نبی اکرمؐ کی ذات اقدس اور تعلیمات کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کو ضرور سلام پیش کرنا چاہوں گا۔ جبکہ اپنی اس گزارش کو مخدوم العلماء عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحئی عارفی نور اللہ مرقدہ کے ان متبرک الفاظ کے ساتھ مکمل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں کہ

> ”ماہرین علم و ادب و نکتہ سنجان فکر و نظر جب اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو ان کو جس طرح ادب اردو کی وسعت و جامعیت پر تعجب ہوگا، اسی طرح ادب اردو پر مصنف کے عبور کامل اور اسلوب نگارش کی جدت پر بھی حیرت ہوگی۔“

جنوبی پنجاب کا سفر

(روزنامہ انصاف، لاہور - ۲۶ اپریل ۲۰۱۷ء)

گزشتہ دو تین روز جنوبی پنجاب میں کافی مصروف گزرے۔ ۲۲ اپریل کو ملتان میں الکتاب فاؤنڈیشن کی تیرہویں سالانہ سیرت کانفرنس تھی جبکہ ۲۳ اپریل کو وہاڑی کی مسجد باغ والی میں بنات کی مشکوٰۃ شریف کے آخری سبق اور حفاظ کی دستار بندی کا پروگرام تھا۔ چونکہ ان دنوں جامعہ میں تعطیلات ہونے کی وجہ سے اسباق نہیں ہیں اس لیے اس کے

ساتھ ہی دو تین پروگرام اور بھی بنا لیے۔ ٹیکسلا کے جناب صلاح الدین فاروقی ہمارے پرانے ساتھی ہیں جن کے ساتھ کم و بیش نصف صدی سے نظریاتی اور تحریکی رفاقت چلی آرہی ہے۔ شروع ہی سے تحریکی پروگراموں کے اجتماعات کا ریکارڈ (آڈیو و تحریری کی صورت میں) محفوظ رکھنے کا ذوق رکھتے ہیں اور بہت سا قیمتی ذخیرہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک اور ساتھی مولانا صالح محمد حضروی بھی اب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں، جو ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہفت روزہ خدام الدین کی ادارت میں مولانا سعید الرحمان علویؒ کے ساتھ شریک کار رہے ہیں۔ ہم تینوں کا اس سلسلہ میں مشورہ ہوا ہے کہ تحریکی اور جماعتی حوالہ سے گزشتہ نصف صدی کے آڈیو اور تحریری ذخیرہ کو جمع کر کے مرتب کرنا کا کام شروع کیا جائے۔ یہ پروگرام اگر ہماری توقعات کے مطابق آگے بڑھا تو امید ہے کہ اگلے دو تین سالوں میں ہم اس تاریخی ریکارڈ کا بیشتر حصہ جمع و مرتب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

گزشتہ دنوں پشاور کے صد سالہ اجتماع کے موقع پر ہم نے ایک رات حضرو میں جناب راشد علی زئی کے گھر گزاری تھی جو مولانا صالح محمد حضروی کے بھائی ہیں اور اس حوالہ سے کتابی اور جرائد کا خاصا ذخیرہ اپنی لائبریری میں سنبھالے ہوے ہیں۔ اسی موقع پر طے ہوا کہ میرے ملتان کے سفر میں صلاح الدین فاروقی صاحب ہمراہ ہوں گے اور ہم عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی دفتر کی اس بڑی لائبریری سے استفادہ کی کوئی صورت نکالیں گے جو حضرت مولانا عبد الرحیم اشعرؒ اور ان کے بعد مولانا اللہ وسایا اور مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی کی مساعی سے نادر کتابوں اور دینی جرائد و رسائل کی محفوظ فائلوں کا بہت وقیع خزانہ بن چکی ہے۔

۲۱ اپریل کو جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد تھا، جمعیت علماء اسلام آزاد جموں و کشمیر کے امیر مولانا سعید یوسف خان نے جمعہ کا خطبہ دیا جس کے بعد ہم حضرت صوفی عطاء اللہ نقشبندی کے ساتھ مل کر دستار بندی اور تقسیم اسناد کے مرحلہ سے گزرے۔ جناب صلاح الدین فاروقی اپنے فرزند حافظ محمد معاویہ کے ساتھ گوجرانوالہ آ چکے تھے۔ چنانچہ ہم جلسہ سے فارغ ہوتے ہی فاروقی صاحب کی گاڑی میں ملتان روانہ ہو گئے۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت گوجرانوالہ کے راہنما قاری محمد یوسف عثمانی بھی ساہیوال تک شریک سفر تھے۔ نصف شب کے لگ بھگ خانیوال پہنچے جہاں جمعیت علماء اسلام (س)

پنجاب کے سیکرٹری جنرل مفتی خالد محمود ازہر اپنی مسجد میں ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے فجر کی نماز کے بعد درس قرآن اور ناشتہ کے موقع پر شہر کے سرکردہ علماء کرام کے اجتماع کا اہتمام کر رکھا تھا جو بہت بھرپور تھا اور اس حوالہ سے مفتی صاحب کا ذوق اور محنت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ وہاں سے ہم ہفت روزہ ترجمان اسلام کے سابق مدیر جناب اکرام القادری کے مدرسہ احسن المدارس پہنچے اور ان سے اپنے پروگرام کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کیا۔ اس موقع پر ایک پرانے دوست جناب شمس القمر قاسمی سے بھی طویل عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی اور ماضی کی بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں۔

خانیوال سے ملتان حاضری ہوئی تو ہم نے اپنے کام کا آغاز مہربان کالونی میں دار بنی ہاشم سے کیا جو احرار کا مرکز ہے۔ مولانا سید عطاء المؤمن شاہ بخاری اور مولانا سید عطاء المہیمن شاہ بخاری کی بیمار پرسی کی اور ان سے دعا کی درخواست کے ساتھ پیر جی سید کفیل شاہ بخاری سے اپنے پروگرام پر تبادلہ خیال کیا اور انہیں اس سلسلہ میں بھرپور تعاون کے لیے تیار پایا۔ صلاح الدین فاروقی صاحب نے ان کے ساتھ چند بزرگوں کی یادگار تقاریر کی کیسٹوں کا تبادلہ بھی کیا۔ وہاں سے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر پہنچے تو مولانا اللہ وسایا ہمارے انتظار میں تھے، دو دن ہم ان کے مہمان رہے اور لائبریری کی بہت سی فائلوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔ اس دوران مولانا عزیز الرحمان جالندھری، مولانا اللہ وسایا اور مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی کی توجہات اور مہمان نوازی سے محظوظ ہوتے رہے۔ اس موقع پر صلاح الدین فاروقی صاحب تو ان تقاریر کی تلاش میں رہے جو انہوں نے مختلف ادوار میں مرتب کی تھیں اور ہفت روزہ لولاک، ترجمان اسلام اور خدام الدین میں شائع ہو چکی ہیں، جبکہ مجھے ان جرائد میں اپنے شائع شدہ مضامین کی تلاش تھی۔ ہم نے بہت سا ذخیرہ جمع کیا مگر اندازہ ہوا کہ یہ سب کچھ دو چار دن کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے کئی بار مستقل طور پر ایام واوقات کو فارغ کرنا ہوگا۔ چنانچہ میرے ذہن نے تو ابھی سے اس کا تانا بانا بننا شروع کر دیا ہے اور سوچ رہا ہوں کہ اگلے تعلیمی سال کو جلسوں اور عوامی پروگراموں سے فارغ کر کے تعلیمی اور تحریری کاموں کے لیے وقف کر دوں کیونکہ اس کے سوا اب اس کام کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ویسے بھی مسلسل سفر اور اجتماعات میں حاضری صحت و عمر کی موجودہ کیفیت میں میرے لیے مشکل ہوتی جا رہی ہے۔

اس دوران الکتاب فاؤنڈیشن کے سالانہ ’’سیرت سیمینار‘‘ میں حاضری ہوئی۔ یہ فورم حضرت مولانا محمد نواز نقشبندی کے رفیق کار مولانا عبد الجبار طاہر اور ان کے رفقاء نے منظم کر رکھا ہے جو گزشتہ ڈیڑھ عشرہ سے تعلیمی اور فکری خدمات سرانجام دینے میں مصروف ہے۔ تیرھواں سالانہ سیرت سیمینار ایک ہوٹل کے ہال میں تھا جو اچانک بارش اور آندھی کے باوجود بہت کامیاب رہا۔ اجتماع سے مولانا مفتی ارشاد احمد اعجاز کراچی، مولانا مفتی محمد زاہد فیصل آباد اور مولانا ڈاکٹر سعید الرحمان ملتان کے علاوہ راقم الحروف اور دیگر حضرات نے خطاب کیا۔ پروگرام میں علماء اور اہل دانش کی دلچسپی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس نوعیت کے تعلیمی اور فکری پروگرام اب وقت کی اہم ضرورت بنتے جا رہے ہیں۔

اتوار کے روز عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی نائب امیر حضرت مولانا حافظ ناصر الدین خاکوانی کی خانقاہ نقشبندیہ کا افتتاحی پروگرام تھا جو کہ بوسن روڈ پر نئی تعمیر شدہ مسجد صدیق اکبرؓ میں نماز ظہر کے بعد منعقد ہوا۔ اس میں مولانا عزیز الرحمان جالندھری اور مولانا اللہ وسایا کے ہمراہ حاضری ہوئی اور نقشبندی سلسلہ کے بعض معمولات میں شرکت کی سعادت بھی حاصل کی۔ جامعہ خالد بن ولیدؓ وہاڑی کے مہتمم مولانا ظفر احمد قاسم اس اجتماع میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ صلاح الدین فاروقی صاحب تو دفتر ختم نبوت میں اپنا کچھ کام مکمل کرنے کے لیے رک گئے جبکہ میں مولانا ظفر قاسم کے ہمراہ اگلے سفر پر روانہ ہوا۔ جامعہ خالد بن ولیدؓ میں مغرب کی نماز پڑھی، چند احباب کے ساتھ مختصر نشست ہوئی جس کے بعد جامع مسجد باغ والی پہنچے جہاں پاکستان علماء کونسل کے چیئرمین مولانا صاحبزادہ محمد زاہد قاسمی بھی جلسہ میں شرکت کے لیے پہنچے ہوئے تھے، ان کے ساتھ مختلف امور پر تبادلہ خیال ہوا۔ جلسہ میں بنات کو مشکوٰۃ شریف کا آخری سبق پڑھایا، حفاظ کرام کی دستار بندی میں شریک ہوا اور اس کے بعد گوجرانوالہ کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے احباب کئی دنوں سے میری ’’آنیاں جانیاں‘‘ دیکھ رہے ہیں اور دورۂ تفسیر قرآن کریم کی تفصیلات طے کرنے کے لیے مسلسل انتظار میں ہیں۔ یہ سالانہ دورۂ تفسیر قرآن کریم ۲۹ اپریل ہفتہ سے شروع ہو رہا ہے جو اٹھائیس شعبان تک مکمل ہو جائے گا۔ اس میں والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے چند دیگر تلامذہ کے ساتھ قرآن کریم کے چند پاروں کی تدریس میرے ذمہ بھی ہوگی جبکہ مروجہ بین الاقوامی نظام و قوانین کے ساتھ قرآن کریم کے احکام و قوانین کا تقابلی مطالعہ میرے محاضرات کا

اہم حصہ ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پروگرام کی معلومات کے لیے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے ناظم مفتی محمد عثمان جتوئی سے فون ۰۳۰۱۵۷۹۷۷۳۷ پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

”بیانیہ بیانیہ“ کا کھیل

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۱۶ اپریل ۲۰۱۷ء)

ہمارے بہت سے دانشور کچھ عرصہ سے باقی سارے کام چھوڑ کر ”بیانیہ بیانیہ“ کھیلنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ میڈیا کے مختلف شعبوں میں بیانیہ، جوابی بیانیہ، قومی بیانیہ، ریاستی بیانیہ، دینی بیانیہ، متبادل بیانیہ جیسے متنوع عنوانات کے ساتھ بحث و مباحثہ کی گرم بازاری ہے اور ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ ہم اس ”فری اسٹائل کبڈی میچ“ کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ اس ”بیانیہ“ کی غرض کیا ہے، اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے اور اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ اب تک جتنی بات ہم سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں دہشت گردی کا بازار گرم ہے، قتل و قتال اور خروج و بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں جس کے لیے زیادہ تر مذہب کا نام استعمال ہو رہا ہے اور مذہبی تعلیمات کو اس دہشت گردی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ جبکہ اس کا حل یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مذہب کے ساتھ تعلق پر نظر ثانی کی جائے اور اس کی حدود از سر نو طے کی جائیں تاکہ مذہب اور اس کی تعلیمات کو دہشت گردی کے لیے استعمال کرنے کے مواقع اور امکانات کو ختم کیا جا سکے۔

اس بیماری کا یہ علاج کہاں تک درست اور کارآمد ہو سکتا ہے اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے، پہلے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بیماری امت مسلمہ اس سے پہلے بھی وسیع پیمانے پر بھگت چکی ہے اور اس کا علاج بھی ہوا تھا جو کامیاب رہا تھا اور امت مسلمہ نے اس ناسور سے نجات حاصل کر لی تھی۔ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف بغاوت و خروج کرنے والے خوارج نے ”دہشت گردی“ کا جو سلسلہ کم و بیش ایک صدی تک جاری رکھا تھا، ہزاروں مسلمانوں کو جن میں صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی ایک بڑی تعداد شامل ہے تہہ تیغ کر دیا تھا، بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور مسلم حکومت و ریاست کو ایک عرصہ تک پریشان کیے رکھا تھا۔ اس دہشت گردی کے عناصر اربعہ وہی تھے جو آج کی دہشت گردی کے ہیں۔ مثلاً (۱) اپنے مخالفین کی عمومی تکفیر (۲) ہر طرف قتل و قتال کی

گرم بازاری (۳) مسلمہ مسلم حکومتوں کے خلاف خروج و بغاوت اور (۴) اس سب کچھ کے لیے قرآن مقدس کی بعض آیات سے سطحی استدلالات۔

یہ خوارج قرآن کریم اس خوبصورتی سے پڑھتے تھے کہ ان کا نام ہی ''قاریوں کا گروہ'' پڑ گیا تھا۔ نماز و روزہ اور شب زندہ داری ان کی علامت بن گئی تھی جبکہ قرآن کریم کی بعض آیات سے استدلال کر کے وہ مسلمانوں کی گردنیں اڑا دیا کرتے تھے۔ گویا وہ عسکری دہشت گردی کے ساتھ ساتھ فکری و علمی دہشت گردی کے بھی علمبردار تھے۔ اس وقت کے اکابر امت نے اس فتنہ کا مقابلہ دو محاذوں پر کیا تھا۔ ایک محاذ بحث و مکالمہ کا تھا، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، امام اعظم امام ابو حنیفہؒ اور دیگر اساطین امت نے ان سے براہ راست مذاکرات کیے تھے، مناظرہ و مباحثہ کے مراحل سے گزرے تھے اور دلیل و منطق کے ساتھ بہت سے لوگوں کو اس غلط موقف اور طرز عمل پر نظر ثانی اور رجوع کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ جبکہ دوسرا محاذ عسکری تھا، میدان جنگ میں انہیں شکست دی گئی تھی، ان کی قوت کا زور توڑا گیا تھا اور ان کے مقبوضہ علاقوں کو ان سے خالی کرایا گیا تھا۔ امام نسائیؒ نے اس سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے ایک مباحثہ و مکالمہ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کی تعداد چھ ہزار کے لگ بھگ تھی مگر جب حضرت علیؓ کی اجازت سے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ باغیوں کے لشکر کے پاس گئے اور ان کے اشکالات و اعتراضات توجہ کے ساتھ سن کر ان کے تسلی بخش جوابات دیے تو ان میں سے دو ہزار افراد واپس آ گئے اور اپنے موقف سے رجوع کر لیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے ان خوارج کے ساتھ مباحثے تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں جنہیں سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اور ان عسکری معرکوں کو بھی منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے جن کے ذریعے ان دہشت گردوں کو میدان جنگ میں شکست دے کر امت کو قتل و قتال کے وسیع ماحول سے نکالا گیا تھا۔

ان دہشت گردوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے قرآن کریم کی آیات پیش کی تھیں اور دینی تعلیمات کا حوالہ دیا تھا مگر اس کے جواب میں امت کے اہل علم نے قرآن کریم کے ساتھ تعلق پر نظر ثانی اور اس کی کسی نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ علماء امت نے کوئی ''نیا بیانیہ'' پیش کرنے کی بجائے قرآن کریم کی سنت رسولؐ کی بنیاد پر تفہیم اور صحابہ کرامؓ کے اجماعی تعامل کو بنیاد بنا کر خوارج کے ''نئے بیانیہ'' کو شکست دی تھی۔

لیکن آج جب امت کو وہی بیماری دوبارہ لاحق ہوئی ہے تو اکابر صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کے اس طرز عمل کو اپنانے کی بجائے دین کے ساتھ تعلق کو ہی موضوع بحث بنا لیا گیا ہے۔ اور یہ مباحث کھڑے کیے جا رہے ہیں کہ معاشرہ میں اسلام کا کردار کیا ہے؟ ریاست اور مذہب کا کوئی باہمی تعلق ہوتا ہے یا نہیں؟ اور صحابہ کرامؓ کے دور سے اب تک قرآن و سنت کی سامنے آنے والی اجماعی تعبیرات و تشریحات اب بھی قابل عمل ہیں یا ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے کسی مارٹن لوتھر کی ضرورت پیش آ گئی ہے؟

مگر ان باتوں سے قطع نظر اس معاملہ کو اس حوالہ سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ دہشت گرد اپنے مذموم مقاصد کے لیے مذہب کا نام استعمال کر رہے ہیں اور بعض مذہبی تعلیمات کو اپنے انداز میں غلط طور پر پیش کر رہے ہیں، مذہب کے ساتھ معاشرہ اور ریاست کے تعلق پر نظر ثانی اور سوسائٹی میں مذہب کے کردار کی حدود از سر نو طے کرنے کا مشورہ دیا جانے لگا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شخص کے بدن میں ناسور پیدا ہونے پر اس کی جراحی کی ضرورت پیش آ جائے تو کوئی دانشور یہ مشورہ دے کہ چونکہ اس ناسور کی وجہ وہ خوراک بنی ہے جو حلق کے راستے اس کے وجود کا حصہ بنی تھی اس لیے اس کی گردن ہی کاٹ دی جائے تاکہ بیماری کے اس سبب کا سرے سے خاتمہ ہو جائے۔ اس پر ایک کہاوت یاد آ گئی ہے کہ کسی گاؤں میں ایک بکری پانی پیتے ہوئے مٹکے میں اپنا سر پھنسا بیٹھی، لوگ اکٹھے ہوئے مگر انہیں مٹکے سے بکری کی پھنسی ہوئی گردن کو نکالنے کی کوئی صورت سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اتنے میں ایک دانشور آیا اور اس نے لوگوں کو پریشان دیکھ کر مشورہ دیا کہ اس کا آسان حل یہ ہے کہ بکری کو ذبح کر دیا جائے۔ چنانچہ بکری ذبح کر دی گئی لیکن سر پھر بھی اس کے اندر ہی رہا۔ پھر اس سمجھدار آدمی نے کہا کہ اب مٹکے کو توڑ دو۔ جب مٹکے کو توڑ کر بکری کا سر آزاد کرایا گیا تو اس نے لوگوں سے کہا تم کتنے خوش قسمت ہو کہ میرے جیسا سیانا تمہارے پاس موجود ہے ورنہ تم اس بکری کی گردن کو مٹکے سے کبھی نہیں نکال سکتے تھے۔

اہانتِ رسولؐ پر ایک صحابیؓ کا طرزِ عمل

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۰ مارچ ۲۰۱۷ء)

چند بلاگرز کی طرف سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور اس پر مختلف حلقوں کے شدید ردعمل کے تناظر میں جناب نبی کریمؐ کے دور کے کچھ بلاگرز یاد آ گئے ہیں جن میں سے ایک معروف عام بلاگر کا تذکرہ قارئین کے سامنے مناسب معلوم ہوتا ہے۔

صحابیٔ رسولؐ حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں کہ جہاد کے ایک سفر میں وہ آنحضرتؐ کے ساتھ تھے اور عبداللہ بن ابی بھی چند ساتھیوں کے ساتھ شریک تھا۔ ایک مقام پر مہاجرینؓ اور انصارؓ کے چند لوگوں میں کسی بات پر تنازعہ ہو گیا جس پر عبداللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ مہاجرین جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مدینہ منورہ میں آکر آباد ہوئے ہیں ان کا معاملہ زیادہ ہی بڑھتا جا رہا ہے، اس لیے انصار مدینہ ان مہاجرین پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کا سلسلہ روک دینا چاہیے تاکہ یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی عبداللہ بن ابی نے یہ بھی کہا کہ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ عزت والے لوگ (نعوذ باللہ) ذلیل لوگوں کو مدینہ منورہ سے نکال دیں۔ ان لوگوں کی یہ باتیں حضرت زید بن ارقمؓ نے قریب بیٹھے ہوئے سن لیں اور ان کی خبر حضورؐ تک پہنچا دیں۔ آنحضرتؐ نے عبداللہ بن ابی کو بلا کر پوچھا تو اس نے ان باتوں سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اتنی پکی قسمیں کھائیں کہ آپؐ نے زید بن ارقمؓ کو ڈانٹ دیا۔

حضرت زید بن ارقمؓ اس پر اس قدر غمزدہ اور پریشان ہوئے کہ اپنے خیمے میں آکر چھپ گئے۔ مگر اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی ایک مستقل سورت نازل کر کے زید بن ارقمؓ کی صفائی دی اور جناب رسول اللہؐ سے فرمایا کہ یہ منافق لوگ جو آپؐ کے پاس آکر اس بات کی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ وہ آپ کو خدا کا رسول مانتے ہیں، سراسر جھوٹ بولتے ہیں اور اللہ تعالی خود ان کے جھوٹا ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ یہ بات جب مدینہ منورہ پہنچی تو غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور حضرت عمرؓ سمیت کچھ لوگوں نے حضور سے اجازت مانگی کہ اگر حکم ہو تو وہ اس گستاخی پر عبداللہ بن ابی کی گردن اڑا دیں۔ مگر جناب نبی کریمؐ نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ اس کا تاثر برا ہوگا اور لوگ یہ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اب اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دل چسپ اور ایمان افروز کردار عبداللہ بن ابی کے اپنے بیٹے کا تھا۔ ان کا نام بھی عبداللہ تھا اور ان کا شمار مخلص صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے جب یہ سنا کہ ان کے والد نے نبی اکرمؐ اور ان کے مہاجر ساتھیوں کے بارے میں یہ باتیں کہی ہیں اور مسلمانوں میں اس کے بارے میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے تو وہ خود حضورؐ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے باپ نے آپؐ کی شان میں گستاخی کی ہے، اگر آپ اس وجہ سے میرے والد کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی سعادت مجھے عطا فرمائیے، میں اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کروں گا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی اور نے قتل کیا تو شاید میری خاندانی غیرت اس کے خلاف جاگ اٹھے اور معاملہ کوئی اور صورت اختیار کر لے۔ پھر حضرت عبداللہؓ نے صرف اتنی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ معلوم کر کے کہ ان کا باپ کس راستے سے واپس آرہا ہے اس راستے میں ننگی تلوار لے کر کھڑے ہو گئے۔ جب باپ آیا تو حضرت عبداللہؓ نے اس سے کہا کہ تم نے جناب رسول اللہؐ کے بارے میں (نعوذ باللہ) ذلیل کا لفظ بولا ہے اور خود کو عزیز کہا ہے، اس لیے اب اپنی زبان سے کہو کہ میں ذلیل ہوں اور جناب رسول اکرمؐ عزت والے ہیں، ورنہ اس تلوار سے تمہاری گردن مار دوں گا۔ عبداللہ بن ابی کو بیٹے کی اس دھمکی پر اپنی زبان سے یہ کہنا پڑا کہ میں ذلیل ہوں اور آنحضرتؐ عزت والے ہیں۔ اس کے باوجود بیٹے نے کہا کہ میں تمہیں یہاں سے آگے اس وقت تک نہیں جانے دوں گا جب تک جناب نبی کریمؐ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ تفسیر ابن کثیرؒ کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے اجازت مرحمت فرمائی تو بیٹے نے اپنے باپ کا راستہ چھوڑا اور وہ مدینہ منورہ میں داخل ہو سکا۔

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ اس طرز عمل کی وجہ یہ نہیں تھی کہ باپ سے میری کوئی ناراضگی تھی بلکہ میرا خاندان اچھی طرح جانتا ہے کہ ہمارے قبیلہ (بنو خزرج) میں اپنے باپ کا مجھ سے زیادہ خدمت گزار کوئی نہیں تھا، لیکن جناب رسول اکرمؐ کی شان اقدس میں گستاخی میرے لیے کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں تھی اور اس کے لیے میں اپنے باپ کی جان لینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

یہ واقعہ کا جس ذکر قرآن کریم میں ہے، بخاری شریف کی بعض روایات میں بھی ہے اور تفسیر ابن کثیرؒ میں اس کی کچھ تفصیلات مذکور ہیں، اس واقعہ میں ہمارے لیے راہنمائی کے مختلف پہلو موجود ہیں۔

1. ایک یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مسلمان کی محبت و عقیدت کا فطری تقاضہ ہے کہ وہ اپنے آقا و مولا حضور نبی کریمؐ کی کسی طرح کی توہین کسی صورت برداشت نہ کرے، اور اس پر اپنے جذبات ورد عمل کا کھلم کھلا اظہار کرے۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ اس سنگین جرم کی سزا بلاشبہ قتل ہے لیکن جذبات کی شدت کے باوجود از خود کاروائی نہ کرے بلکہ اس معاملہ میں قانون کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

3. اور تیسری بات یہ ہے کہ ایسے منافقوں کی حرکتوں کو بے نقاب کیا جائے، انہیں چھپانے کی کوشش کامیاب نہ ہونے دی جائے اور ان کی قسموں پر اعتماد کرنے کی بجائے انہیں بے نقاب کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اس پس منظر میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب شوکت صدیقی نے بلاگرز کیس میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ نہ صرف ایک مسلمان کی دینی غیرت و حمیت کا اظہار ہے بلکہ قانون کا محافظ اور اس کے نفاذ کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے یہ ان کا فریضہ بھی بنتا ہے۔ قانون موجود ہے، وقوعہ سامنے ہے، جرم بلاشبہ سنگین ترین ہے اور معاملہ جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت و محبت کا ہے، اس لیے قوم ان سے توقع رکھتی ہے کہ وہ دستور و قانون کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس کیس کو جلد از جلد منطقی انجام تک پہنچائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائیں اور قبولیت و کامیابی سے ہمکنار کریں، آمین یارب العالمین۔

صلح حدیبیہ کے چند اہم پہلو

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۹ مارچ ۲۰۱۷ء)

دینی مدارس میں شش ماہی امتحانات کے بعد عام طور پر دورۂ حدیث کے اسباق کے دوران "وبہ قال حدثنا" کا ورد جاری رہتا ہے لیکن جب تاریخی، سیاسی یا سماجی حوالہ سے کوئی اہم روایت سامنے آجائے تو کچھ کہے بغیر آگے گزر جانا میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔ گزشتہ روز بخاری شریف کی کتاب الشروط میں صلح حدیبیہ کے بارے میں عبارت پڑھنے

والے طالب علم نے ایک طویل روایت پڑھی تو میں نے وہاں بریک لگا دی اور دو دن کا سبق اسی روایت کی وضاحت میں گزر گیا۔ حدیبیہ کے مذاکرات اور معاہدہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی فراست، سفارت کاری اور ڈپلومیسی کا شاہکار ہے جس کا صحیح معنوں میں حظ اس کا ذوق رکھنے والے حضرات ہی اٹھا سکتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے تین چار پہلوؤں کا قارئین کے سامنے بھی تذکرہ ہو جائے۔

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ رفقاء کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا اور یہ بات سامنے آگئی کہ قریش مکہ جناب رسول اللہؐ اور ان کے ساتھیوں کو عمرہ ادا کرنے کی اجازت نہیں دیں گے تو آنحضرتؐ نے وہاں رک کر اس صورتحال کا جائزہ لیا اور اپنی آئندہ حکمت عملی طے فرمائی۔ قبیلہ بنو خزاعہ کے ساتھ نبی کریمؐ کے اچھے تعلقات تھے وہ مسلمانوں کے بارے میں دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، ان کے سردار بدیل بن ورقاء خزاعی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حضورؐ سے ملاقات کے لیے آئے تو آپؐ نے ان کے ذریعے قریش مکہ کو ایک پیغام بھجوایا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مسلسل جنگوں نے قریش کو کمزور کر دیا ہے اور اب وہ لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، البتہ میں ان کے لیے یہ پیشکش کر رہا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ ایک معینہ مدت کے لیے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیں اور دیگر عرب قبائل اور عوام کے ساتھ میرے روابط میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اگر میں قریش کے علاوہ باقی قبائل اور لوگوں کو ساتھ ملانے اور غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو قریش کے لیے دونوں راستے کھلے ہوں گے کہ یا باقی لوگوں کے ساتھ وہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں یا اگر چاہیں تو اپنی موجودہ پوزیشن پر قائم رہیں۔ لیکن اگر وہ اس پیشکش کو قبول نہیں کرتے تو میری ان کے ساتھ آخری دم تک جنگ جاری رہے گی اور اللہ تعالیٰ دین حق کے غلبہ کے بارے میں اپنا فیصلہ نافذ کر کے رہیں گے۔

صلح حدیبیہ کے بعد نبی اکرمؐ کو پورے جزیرۃ العرب میں اپنی دعوت کا دائرہ وسیع کرنے کا جو موقع ملا اور جس میں عرب قبائل عمومی طور پر اسلام کی طرف مائل ہونا شروع ہو گئے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے فوائد میں ایک اہم فائدہ تھا جو مسلمانوں کو حاصل ہوا۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ دراصل جناب رسول اللہؐ کے مقاصد میں سے تھا کیونکہ قریش کو جنگ نہ کرنے کے معاہدہ کی پیشکش آنحضرتؐ نے خود کی تھی اور آپؐ چاہتے تھے کہ قریش کے ساتھ حالت جنگ کچھ دیر کے لیے ختم ہو جائے تا کہ باقی دنیا تک

اسلام کا پیغام پہنچانے کی جدوجہد کو کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھایا جا سکے۔ یہیں سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس صلح میں بظاہر کمزور شرائط کو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے اضطراب اور بے چینی کے باوجود اس لیے قبول کیا گیا تھا کہ آپؐ کے سامنے اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے پر امن ماحول اور فضا قائم کرنا ضروری تھا جس کے لیے یہ صورتحال برداشت کی گئی۔

قریش کے ساتھ اس بات چیت کے لیے نبی کریمؐ کے پاس گفت و شنید کے لیے پانچ الگ الگ نمائندے بدیل بن ورقاء، عروۃ بن مسعود ثقفی، رجل من کنانہ، مکرز بن حفص اور سہیل بن عمروؓ باری باری آئے تھے۔ بخاری شریف کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ آنحضرتؐ کا طرز عمل مختلف تھا۔ مثلاً ایک نمائندے کا تذکرہ "رجل من کنانہ" کے طور پر کیا گیا ہے جن کا نام مذکور نہیں ہے مگر بتایا گیا ہے کہ یہ صاحب قریش کی طرف سے باقاعدہ نمائندہ بن کر اور ان سے اجازت لے کر مذاکرات کے لیے آئے تھے۔ آنحضرتؐ نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور ساتھیوں سے کہا کہ یہ فلاں شخص ہے اور ان کے ہاں ہدی کے جانوروں کا بڑا احترام پایا جاتا ہے اس لیے اس کے آنے سے پہلے ہدی کے جانوروں کو صف میں کھڑا کر دو۔ ان صاحب نے آکر جب ہدی کا جانوروں کی قطاریں دیکھیں اور صحابہ کرامؓ کو تلبیہ پڑھتے ہوئے سنا تو وہیں رک گئے اور کہا کہ یہ حضرات تو عمرہ کے لیے آئے ہیں اور قربانی کے جانور بھی ساتھ لائے ہیں اس لیے میں انہیں بیت اللہ تک پہنچنے سے روکنے کے حق میں نہیں ہوں، یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے اور اپنے لوگوں کو جا کر بتایا کہ میں ان لوگوں کو عمرہ کی ادائیگی سے روکنے کی کاروائی میں شریک نہیں ہوں۔ اس کے بعد مذاکرات کے لیے مکرز بن حفص نامی صاحب آئے تو آپؐ نے بتایا کہ یہ فاجر آدمی ہے، مطلب یہ کہ اس کے ساتھ گفتگو بڑی احتیاط سے کرنا ہوگی۔ لیکن وہ ابھی گفتگو کا آغاز نہیں کر پائے تھے کہ ادھر سے قریش کے آخری نمائندے سہیل بن عمروؓ آگئے جن کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ اب معاملہ آسان ہو جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان کے ذریعے معاہدہ طے پا گیا۔ جناب رسول اللہؐ کے طرز عمل سے ایک بات تو یہ سمجھ آتی ہے کہ ہر شخص اور ہر قوم سے ایک ہی انداز و لہجے میں بات کرنا مناسب نہیں ہوتا بلکہ مختلف قوموں اور طبقات کے مزاج، نفسیات اور اخلاق و عادات کا لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دشمن افراد کو ہمیشہ مغلوب کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ ان

کے رجحانات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنے حق میں رائے دینے پر آمادہ کرنا زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

اس معاہدہ میں یہ طے پایا تھا کہ قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ منورہ جائے گا تو اسے واپس قریش کے حوالہ کرنا ہوگا لیکن کوئی مسلمان اگر مکہ مکرمہ واپس آگیا تو قریش اسے واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ اس شرط پر صحابہ کرامؓ کی صفوں میں بے چینی اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کا اضطراب سب کو دکھائی دے رہا تھا مگر آنحضرتؐ نے نہ معاہدہ میں صرف یہ شرط قبول کی بلکہ اس کی پوری پاسداری کی۔ چنانچہ بعد میں جب حضرت ابوبصیرؓ مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آئے تو قریش نے ان کی واپسی کے لیے دو نمائندے مدینہ منورہ بھیجے۔ آنحضرتؐ نے حضرت ابوبصیرؓ کو معاہدہ کے مطابق ان کے ساتھ واپس مکہ مکرمہ بھجوا دیا مگر حضرت ابوبصیرؓ ان میں سے ایک کو راستہ میں قتل کر کے مدینہ منورہ واپس جا پہنچے اور حضورؐ سے عرض کیا کہ آپؐ نے تو اپنی ذمہ داری پوری کر دی تھی مگر میں واپس آگیا ہوں۔ اس پر آنحضرتؐ نے ان کے بارے میں یہ جملہ فرمایا کہ ”ویل امه مسعر حرب“ کہ اس کی ماں کی ہلاکت ہو یہ لڑائی کی آگ بھڑکائے گا، یعنی قریش کے ساتھ جنگ کا وہ ماحول جو ہم نے بڑی مشکل سے ختم کرایا ہے وہ اسے واپس لے آئے گا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کیا اس کو کوئی سنبھالنے والا ہے؟ یہ سن کر حضرت ابوبصیرؓ چپکے سے واپس چلے گئے اور مکہ مکرمہ لوٹنے کی بجائے سمندر کے کنارے ڈیرہ لگا لیا جو اس طرح کے نئے مسلمانوں کے لیے ایک حفاظتی کیمپ بن گیا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب دشمن کے ساتھ کوئی معاہدہ طے پا جائے تو وہ معاہدہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اپنے کسی ساتھی کو اس میں رخنہ اندازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی ایسی کسی کاروائی کی ذمہ داری قبول کی جا سکتی ہے۔

جب اس معاہدہ کی رو سے جناب رسول اللہؐ نے مکہ مکرمہ سے مسلمان ہوکر آنے والوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے واپس مکہ مکرمہ جانے کی بجائے حضرت ابوبصیرؓ کے کیمپ میں جمع ہونا شروع کر دیا اور ان کا اچھا خاصا گروپ بن گیا۔ وہ سیف البحر کے مقام پر آرام سے نہیں بیٹھے بلکہ قریش کے تجارتی قافلوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس سے قریش تنگ آگئے اور انہوں نے آنحضرتؐ کو باقاعدہ پیغام بھجوا کر اس شرط سے دستبرداری اختیار کر لی۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت

ابوبصیرؓ کے کیمپ کے لوگوں کو مدینہ منورہ بلا لیا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ نبی کریمؐ نے معاہدہ کی مکمل پاسداری کی، اس کی خلاف ورزی کرنے والوں میں سے کسی کی ذمہ داری قبول نہیں کی اور نہ ہی انہیں مدینہ منورہ میں رہنے دیا۔ لیکن قریش کی طرف سے مذکورہ شرط سے دستبرداری کے بعد آپؐ نے نہ صرف ابوبصیرؓ کے کیمپ کے لوگوں کو کیمپ ختم کر کے مدینہ منورہ آجانے کی ہدایت کی بلکہ ان میں سے کسی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی اور انہیں آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں رہنے کی اجازت دے دی جسے آج کی اصطلاح میں ''عام معافی کا اعلان'' کہا جاتا ہے۔

صلح حدیبیہ کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے یہ چند پہلو اس لیے عرض کیے ہیں کہ ہمارے آج کے حالات اور مسائل میں ان سے راہنمائی حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت ہے اور موجودہ قومی صورتحال میں تمام فریقوں کو اس کا ضرور جائزہ لینا چاہیے۔

حضرت قاری محمد انورؒ

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱۴ فروری ۲۰۱۷ء)

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ۱۴ فروری ۲۰۱۷ء کو منعقد ہونے والی پندرہ روزہ فکری نشست میں مولانا زاہد الراشدی نے استاذ القراء حضرت قاری محمد انور صاحبؒ کے بارے میں گفتگو کی جو مولانا زاہد الراشدی کے حفظ کے استاذ تھے اور ابھی پچھلے دنوں ان کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا ہے۔ اس نشست میں ان کے حوالے سے کچھ یادداشتیں بیان کی گئیں اور آخر میں ان کے ایصال ثواب کے لیے قرآن کریم کی تلاوت اور دعا کی گئی۔ ادارہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ استاذ الحفاظ والقراء حضرت قاری محمد انور صاحبؒ کا چند روز پہلے مدینہ منورہ میں انتقال ہو گیا ہے، آپؒ میرے حفظ کے استاذ تھے اور صرف میرے ہی نہیں بلکہ ہمارے پورے خاندان کے استاذ تھے، ہم سب بھائی بہنیں ان کے شاگرد ہیں۔ الحمد للہ نو بھائیوں نے اور تین بہنوں نے حفظ کیا ہے اور ایک بڑی بہن کے سوا باقی سب کے استاذ وہی تھے۔ جبکہ وہ گکھڑ اور اس کے ارد گرد سینکڑوں حفاظ کے استاذ تھے۔ گکھڑ سے وہ افریقہ کے ایک ملک میں تشریف لے گئے، وہاں بھی بیسیوں حفاظ کے استاذ ہیں۔ پھر مدینہ

منورہ میں تقریباً پینتیس سال انہوں نے قرآن کریم پڑھایا، وہاں بھی سینکڑوں حفاظ نے ان سے قرآن کریم حفظ کیا ہے۔ آج کی تقریب میں حضرت قاری صاحبؒ کے حوالے سے کچھ باتیں عرض کروں گا۔

حضرت قاری محمد انور صاحبؒ کے تعارف کے لیے دو تین باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ گکھڑ میں حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ۱۹۴۳ء میں آئے تھے۔ ۱۹۴۱ء/ ۱۹۴۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کیا تھا اور ۱۹۴۳ء میں گکھڑ بوہڑ والی مسجد میں بطور امام و خطیب تشریف لائے تھے اور ۲۰۰۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سارا عرصہ انہوں نے گکھڑ میں گزارا۔ جب تک صحت نے اجازت دی، وفات سے سات آٹھ سال پہلے تک تو پانچوں نمازیں خود پڑھاتے تھے، صبح درس بھی دیتے تھے، جمعہ بھی پڑھاتے تھے۔ وہاں درس نظامی کا مدرسہ تھا جس میں حضرت والد صاحبؒ جب سے آئے تھے، پڑھا رہے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں سے علماء آتے تھے وہاں رہتے تھے پڑھتے تھے لیکن حفظ کا کوئی باضابطہ مدرسہ نہیں تھا۔ حفظ کا باضابطہ مدرسہ تقریباً ۱۹۵۷ء میں بنا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ راہوالی سے گکھڑ جاتے ہوئے راستہ میں ایک گتہ فیکٹری ہوتی تھی، اب وہ ختم ہو چکی ہے لیکن بلڈنگ وغیرہ موجود ہے، اس کے ساتھ سیٹھی کالونی ہے۔ یہ گتہ فیکٹری کسی زمانے میں پاکستان کی دوسری بڑی گتہ فیکٹری ہوتی تھی۔ ایک مردان میں تھی، دوسری یہ تھی۔ اس کے مالک سیٹھی محمد یوسف صاحبؒ نومسلم باپ کے بیٹے تھے، سیالکوٹ روڈ پر ایک قصبہ ہے ترگڑی، وہاں کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا احمد علی لاہورؒ کے والد بستی جلال کے تھے۔ ہمارے ایک اور بزرگ گزرے ہیں باوا جی عبد الحقؒ، وہ تلونڈی کھجور والی کے تھے۔ تلونڈی کھجور والی، جلال اور ترگڑی، یہ تینوں قریب قریب علاقے ہیں، دو دو تین تین میل کا فاصلہ ہے۔ یہ تینوں حضرات ایک ہی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ حضرت لاہوریؒ کے والد سکھ سے مسلمان ہوئے تھے، باوا جی عبد الحقؒ ہندو پنڈت سے مسلمان ہوئے تھے اور سیٹھی صاحب کے والد بھی ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ سیٹھی محمد یوسف صاحبؒ کے والد صاحب کو قرآن کریم سے بڑا لگاؤ تھا، اپنے بیٹے کو بھی انہوں نے قرآن کریم کی طرف توجہ دلائی۔ سیٹھی محمد یوسف صاحب گتہ فیکٹری کے مالک تھے اور اپنے زمانے میں ضلع گوجرانوالہ

کے چند امیر ترین لوگوں میں سے تھے۔ قرآن کریم کی خدمت کا ذوق تھا اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مدرسے بنائے جائیں۔ اس زمانے میں حفظ اور تجوید کے مدارس اکادکا کہیں ہوتے تھے، ملتان، کراچی، چنیوٹ کے علاقوں میں جہاں حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ اور حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ کے کچھ شاگرد تھے۔ ہمارے اس علاقے میں حفظ کا کوئی باقاعدہ مدرسہ نہیں تھا۔ سیٹھی محمد یوسف صاحب مرحوم کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ ایک قاری صاحبؒ ہوتے تھے، مولانا قاری عبدالحفیظ صاحبؒ، اکوڑہ خٹک کے قریب شیدو شریف ایک جگہ ہے، یہ وہاں کے تھے۔ سیٹھی صاحب قاری صاحب کو مختلف علاقوں میں لے کر جاتے، مجمع کے سامنے قاری صاحبؒ کو قرآن سنانے کا کہتے۔ قاری صاحب تلاوت کرتے، وہ قرآن کریم اچھا پڑھتے تھے۔ پھر سیٹھی صاحب لوگوں سے کہتے کہ ایسے ہی تم بھی پڑھا کرو۔ لوگ کہتے، ہم ایسے کس طرح پڑھیں؟ سیٹھی صاحب کہتے کہ اس کا بندوبست کرو، میں بھی حصہ ڈالتا ہوں۔ یہاں کوئی مدرسہ بناؤ اور قاری صاحب رکھو، میں بھی حصہ ڈالتا ہوں۔ یہ ان کا طریقہ تھا۔

اب بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ غالباً ۱۹۵۶ء/۱۹۵۷ء کی بات ہے، میں اس وقت آٹھ نو سال کا تھا، سیٹھی صاحبؒ جمعہ کے دن ہماری مسجد میں تشریف لائے، حضرت والد صاحبؒ سے کہا کہ خطبہ سے پہلے مجھے پانچ سات منٹ دیں گے؟ انہوں نے کہا، ٹھیک ہے۔ سیٹھی صاحب نے قاری صاحب سے کہا، تلاوت کریں، انہوں نے مختصر تلاوت فرمائی۔ پھر سیٹھی صاحب نے کھڑے ہو کر دو تین منٹ بات فرمائی کہ قرآن کریم اچھے طریقے سے پڑھانا چاہیے، صحیح پڑھنا چاہیے اور یاد کرنا چاہیے۔ جیسے قاری صاحب نے پڑھا ہے آپ لوگ بھی شوق پیدا کریں۔ اور کہا کہ جیسا قاری صاحب نے صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن پڑھا ہے، مولوی صاحب (مراد والد گرامیؒ) کے علاوہ یہاں کے مقامی لوگوں میں سے اگر کوئی اسی طرح ایک رکوع پڑھ کر سنا دے تو پچاس روپے انعام دوں گا۔ اس زمانے کے پچاس روپے آج کے پانچ ہزار تھے۔ ایک بزرگ مہاجر تھے حافظ احمد حسن صاحبؒ (خوشنویس زاہد اقبال صاحب کے والد)۔ انہوں نے کہا میں سناتا ہوں۔ کہا، سنائیں۔ جب سنا چکے تو سیٹھی صاحب نے کہا، آپ مقامی نہیں ہیں۔ کہا، جی میں مقامی تو نہیں ہوں، مہاجر ہوں۔ سیٹھی صاحب نے کہا، میں نے مقامی حضرات سے کہا تھا۔

چنانچہ اس طرح سیٹھی صاحب نے ایک شوق پیدا کیا۔ پھر کہا کہ ایسا کرو کہ کسی قاری صاحب کا بندوبست کرو، انہیں جو تنخواہ دو گے، آدھی تنخواہ میں دیا کروں گا۔ اسی پر فیصلہ ہو گیا کہ قاری صاحب رکھیں گے۔ اور پھر قرآن کریم حفظ و ناظرہ کی کلاس شروع ہو گئی۔ اس فیصلے کے تحت ہمارے پہلے استاذ محترم قاری اعزاز الحق صاحبؒ تھے جو امروہہ کے مہاجر تھے، انہیں مقرر کیا گیا۔ میں پہلی کلاس کا طالب علم تھا، مجھے اسکول سے اٹھا کر مدرسہ میں ڈال دیا گیا۔ تب میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ چوتھی جماعت پڑھی تھی لیکن امتحان نہیں دیا تھا۔ گیارہ بارہ لڑکوں کی کلاس تھی، ہمیں قرآن کریم حفظ شروع کروا دیا گیا۔ ناظرہ میں نے پہلے والدہ مرحومہ سے اور والد صاحبؒ سے پڑھا ہوا تھا۔

سیٹھی صاحب مرحوم سارے ملک میں ایسا ہی کرتے تھے۔ ان کی فیکٹری کماتی تھی اور وہ خرچ کرتے تھے۔ اسی طرح ترغیب دلا کر مدرسہ بنواتے تھے، کہیں تجوید کا، کہیں حفظ کا۔ کہیں آدھی تنخواہ دیتے، کہیں تیسرا حصہ اور کہیں تو پوری تنخواہ خود دیتے تھے کہ قاری صاحب رکھو تنخواہ میں دوں گا۔ ان کی گتہ فیکٹری کا ایک مستقل شعبہ تھا، شعبہ تعلیم القرآن، اس انچارج محمد حسین صاحب مرحوم تھے۔ ایک مرتبہ شاید ۱۹۶۵ء کی بات ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ ملک کے کتنے مدرسے ہیں جن کی سیٹھی صاحب اس طرح مدد کرتے ہیں؟ انہوں نے سینکڑوں میں تعداد بتائی جن کی سیٹھی صاحبؒ اس طرح معاونت اور نگرانی کرتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ مدرسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے گئے اور سیٹھی صاحب کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ میں ان کو سہارا دوں، یہ خود کفیل ہو جائیں۔ جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے تو سیٹھی صاحب پیچھے ہٹ جاتے کہ میرا کام یہی تھا۔ سیٹھی صاحب مرحوم نے افریقہ میں اور سعودی عرب میں بھی بہت سے مدرسے بنوائے۔ ہمارے استاذ محترم قاری محمد انور صاحبؒ کو یہ گکھڑ سے افریقہ لے گئے تھے، قاری صاحبؒ چند سال وہاں پڑھاتے رہے۔

اللہ تعالیٰ سیٹھی صاحب کے درجات بلند فرمائیں۔ یہ بات شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ سعودی عرب میں حفظ کا کوئی باقاعدہ مدرسہ نہیں تھا اور تراویح میں قرآن مجید سننے سنانے کا سوائے حرمین کے کہیں رواج نہیں تھا۔ سعودی عرب میں حفظ کا پہلا مدرسہ حرم مکہ میں سیٹھی صاحب نے قائم کیا تھا جس کے پہلے طالب علم شیخ عبد اللہ بن السبیلؒ تھے جو بعد میں امام الحرمین بنے۔ حرمین شریفین کے حفظ کے پہلے استاذ ابھی زندہ ہیں، قاری خلیل

احمد صاحب۔ اب معذور ہیں، آزاد کشمیر سے تعلق ہے۔ قاری خلیل احمد صاحب کا ایک بیٹا حرمین کے ائمہ میں شامل ہے جن کا نام غالبا محمد ہے۔

سیٹھی صاحبؒ نے سعودی عرب میں حفظ قرآن کے مدرسے بنوانے شروع کیے، جب تعداد خاصی بڑھ گئی تو سعودیہ والوں کو خیال آیا کہ باہر کے آدمی خرچہ کر کے مدرسے بنوا رہے ہیں۔ پیسے تو ہمارے پاس بہت ہیں ہم خود یہ کام کیوں نہ کریں۔ اس طرح ان کو خیال آیا اور انہوں نے یہ نظام خود سنبھال لیا۔ لیکن آغاز سیٹھی صاحب مرحوم نے کیا اور کئی سال تک کئی مدارس کا خرچہ یہاں سے بھجواتے رہے۔ ائمہ حرمین میں الشیخ حذیفی اور الشیخ السدیس بھی پاکستانی قاری صاحبان کے شاگرد ہیں اور قاری انور صاحبؒ کے تو وہاں سینکڑوں شاگرد ہیں۔ وہاں کے ائمہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے پاکستانی قاریوں سے پڑھا ہے۔ اس وقت بھی وہاں حضرت قاری بشیر احمد صاحب ملتانی ہیں، مسجد نبویؐ میں عشاء کے بعد بیٹھتے ہیں اور بڑے بڑے لوگ ان کے پاس آکر اپنا تلفظ صحیح کرتے ہیں۔

یہ ہمارے گکھڑ کے مدرسے کا پس منظر تھا۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ مزاج نہیں ملتے، ہم نے قرآن کریم پڑھنا شروع تو کر دیا لیکن کوئی قاری صاحب یہاں ٹکتے نہیں تھے یا محلے والے ٹکنے دیتے نہیں تھے۔ دونوں باتیں ہوتی ہیں، یا تو قاری صاحب کا اپنا موڈ ٹکنے کا نہیں ہوتا، یا وہ ٹکنا چاہتے ہیں لیکن محلے والے ٹکنے نہیں دیتے۔ یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ایک قاری صاحب آئے وہ چلے گئے، دوسرے آئے وہ چلے گئے۔ اسی طرح کئی قاری صاحبان ہمارے تبدیل ہوئے اور مسئلہ یہ تھا کہ جو قاری صاحب آتے وہ نئے سرے سے شروع کرواتے کہ تم نے صحیح نہیں پڑھا ہوا، تمہارا تلفظ صحیح نہیں، تمہارا لہجہ درست نہیں ہے۔ ہم اسی الجھن میں تھے کہ کریں کیا؟ ہر پانچ چھ مہینے کے بعد نئے قاری صاحب آجاتے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالی نے ہمیں حضرت قاری محمد انور صاحبؒ عطا فرمائے۔ لاہور میں حفظ اور تجوید کا مدرسہ تجوید القرآن سب سے قدیمی مدرسہ ہے۔ حضرت قاری فضل کریم صاحبؒ، قاری محمد حسن شاہ صاحبؒ، اور قاری محمد ظریف صاحبؒ کا مدرسہ تھا۔ ان سے حضرت والد صاحبؒ نے کہا کہ کوئی اچھا سا قاری دو، ہم نے مدرسہ چلانا ہے۔ حضرت قاری محمد انور صاحبؒ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم انہوں نے دارالعلوم ربانیہ میں حاصل کی تھی۔ تجوید القرآن لاہور میں حفظ مکمل کیا، تجوید قاری محمد حسن شاہ صاحبؒ سے

پڑھی اور اس تعلق سے ہمارے پاس گکھڑ تشریف لائے۔ وہ پھر ایسے ٹک کر بیٹھے کہ الحمد للہ ہر طرف حافظ ہی حافظ ہو گئے۔

حضرت قاری محمد انورؒ بڑے اچھے استاذ تھے۔ میں نے ان سے حفظ کرنا شروع کیا، آپؒ بڑی شفقت فرماتے تھے اور ڈنڈا بھی خوب چلاتے تھے۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ ویسے آج کا ماحول بدل گیا ہے ورنہ ڈنڈا ہی انسان کو سیدھا رکھتا ہے۔ لیکن زیادہ بھی نہ مارا جائے، ہلکی پھلکی مار میں کوئی حرج نہیں۔ ہم نے تو خیر والد صاحبؒ سے بھی بہت ڈنڈے کھائے ہیں اور قاری صاحبؒ سے بھی بہت ڈنڈے کھائے ہیں۔ میں اس پر طلبہ کو اپنا قصہ سنایا کرتا ہوں کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے سبق یاد نہیں تھا، قاری صاحبؒ نے میرے دائیں ہاتھ پر پانچ چھڑیاں ٹکا کر ماریں۔ میں آخر صاحبزادہ تھا، منہ بسورا اور اٹھ کر گھر چلا گیا۔ والدہ مرحومہ، اللہ تعالی غریق رحمت کریں، وہ بھی گھر میں بچیوں کو ناظرہ اور حفظ پڑھاتی تھیں، اگرچہ خود حافظہ نہیں تھیں۔ میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ اماں جی آپ سے کتنی بچیوں نے حفظ کیا ہے؟ کہنے لگیں تیئس بچیوں نے۔ گھر میں روزانہ ان کا مدرسہ ہوتا تھا، انہوں نے بھی ڈنڈا رکھا ہوا تھا۔ میں قاری صاحبؒ سے مار کھا کر گھر آ گیا، والدہ مرحومہ نے دیکھا کہ سبق کے وقت یہ گھر پھر رہا ہے۔ مجھے بلا کر پوچھا، میں نے منہ بسور کر جواب دیا، قاری صاحب نے مارا ہے۔ میرے ذہن میں تھا کہ ماں مجھے سینے سے لگائے گی، دلاسہ دے گی اور قاری صاحب کو دو چار سنائے گی کہ قاری کون ہوتا ہے میرے بچے کو مارنے والا۔ مجھ سے پوچھا، بیٹے! کیوں مارا تھا؟ میں نے کہا سبق یاد نہیں تھا۔ کس چیز سے مارا تھا؟ میں نے کہا ڈنڈے سے۔ کتنے؟ پانچ۔ کہاں مارا؟ دائیں ہاتھ پر۔ والدہ مرحومہ نے اپنا ڈنڈا پکڑا اور میرے بائیں ہاتھ پر چھ ڈنڈے مارے اور کہا، چلو پہنچو مدرسے۔

اس وقت مجھے بہت غصہ آیا اور آنا بھی تھا لیکن آج اماں جان کو دعائیں دیتا ہوں کہ اگر اس وقت میری ماں مجھے سینے سے لگا کر سہارا دے دیتی اور گھر میں بٹھا لیتی تو ہم آج یہ کچھ نہ ہوتے جو ہیں۔ پتہ نہیں کدھر کدھر پھرتے، کیا ہوتا اور کہاں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ سارا کمال ان چھ ڈنڈوں کا ہے۔ ایمانداری کی بات ہے، بزرگوں کی دعائیں اور ماں کے ہاتھ سے کھائے ہوئے ڈنڈے یہی دو چیزیں کام آ گئیں ورنہ میرا کانٹا بدل چکا ہوتا۔ اور ریل گاڑی کا کانٹا ہی بدلنا ہوتا ہے کہ وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ قاری صاحبؒ مارتے بھی تھے لیکن اگر کبھی سمجھتے کہ زیادہ مار لیا ہے تو بلا کر چائے بھی پلاتے تھے۔ ایک دن مجھے ڈنڈے

زیادہ لگ گئے تو میں پریشان بیٹھا تھا کہ قاری صاحب نے مارا بہت ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے منگوائی، مجھے بلایا اوئے مولوی! ادھر آ چائے پی لے۔ مجھے مولوی کہتے تھے۔ میں حیران ہوا کہ ابھی مار رہے تھے اور اب چائے پلا رہے ہیں۔ مجھ سے فرمایا، بیٹا ہم مارتے ہیں تو کسی وجہ سے مارتے ہیں۔ یہ ان کا انداز تھا۔ میں قاری صاحب سے حفظ کرتا رہا۔ میرا حفظ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو مکمل ہوا۔ قاری صاحبؒ مجھ پر بہت مہربان تھے اور بڑی شفقت فرماتے تھے۔ قاری صاحبؒ نے دو تین سال تک اپنے ساتھ مجھے قرآن کریم کا دور کروایا۔ آپؒ گکھڑ کی مسجد میں قرآن مجید سنایا کرتے تھے، میں ان کا سامع ہوتا تھا۔ پھر اپنی نگرانی میں پہلا مصلی سنانے کے لیے مجھے بھیجا۔ میں نے پہلا مصلی بدو کے گوسائیاں گوجرانوالہ کینٹ میں سنایا تھا۔

گکھڑ ہی کی دو باتیں اور ذکر کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ استاذ تو استاذ ہوتا ہے اور جس طالب علم پر استاد کی نظر ہو، اسے کیمیا بنا دیتا ہے۔ مجھے تقریر کرنا بھی حضرت قاری صاحبؒ نے سکھایا ہے، ورنہ قاری صاحبؒ کا تقریر سے کیا تعلق؟ قاری صاحبؒ نے ہمیں حفظ کے دوران تجوید کا رسالہ زینۃ القرآن سبقاً سبقاً پڑھایا اور مجھے کھڑا کر کے کہتے، اوئے مولوی! کیا سبق پڑھا ہے؟ بیان کرو۔ مجھ سے تقریر کرواتے تھے۔ گکھڑ میں کبھی کبھی مولانا قاری سید حسن شاہ صاحبؒ تشریف لایا کرتے تھے۔ وہ قاری بھی بہت اچھے تھے اور خطیب بھی بہت اچھے تھے۔ قاری محمد انور صاحبؒ کبھی جلسہ کرواتے تو شاہ صاحبؒ کو بلاتے تھے۔ مجھے کچھ جملے رٹا کر، کچھ چیزیں یاد کرا کر کھڑا کر دیتے کہ تقریر کرو۔ کبھی لکھ کر دیتے جسے میں یاد کرتا اور پھر مجمع کے سامنے تقریر کے انداز میں بیان کرتا۔

ایک واقعہ میں عموماً سنایا کرتا ہوں کہ روڈ پر جلسہ تھا، شاہ صاحبؒ کی تقریر تھی، ان سے پہلے قاری صاحبؒ نے مجھے تقریر کرنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ میں مائیک پر کھڑا ہوا اور بازو چڑھا کر قادیانیوں کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دی اور مرزا قادیانی کو پنجابی میں دو چار گالیاں دیں کہ مرزا بے ایمان، مرزا یہ، مرزا وہ۔ دو چار جو سنائیں تو والد صاحبؒ نے گردن سے مجھے پکڑا اور پیچھے بٹھا دیا۔ خود مائیک پر آ کر ارشاد فرمایا، بچہ ہے، جذبات میں غلط باتیں کر گیا ہے، میں معافی مانگتا ہوں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ہم آج کل مائیک پر کھڑے ہو کر کیا کچھ نہیں کہتے؟ میں اپنی بات کیا کرتا ہوں کہ میری تربیت اس ماحول میں ہوئی ہے، اس لیے میری زبان سے سخت لفظ کی کسی شدید ترین مخالف کے لیے بھی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔

الحمدللہ !میں آج اپنے کسی شدید ترین مخالف کا نام بھی لیتا ہوں تو احترام کے ساتھ لیتا ہوں۔ خیر، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو بولنے اور تقریر کرنے کی صلاحیت اور ذوق ہے، اس کی ابتدا بھی حضرت قاری صاحبؒ نے کی تھی۔

ایک اور واقعہ حضرت قاری صاحبؒ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۷۷ء میں تحریک نظام مصطفی چلی جو بہت بڑی تحریک تھی۔ جلسوں اور جلوسوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک سرکاری فورس ہوتی تھی ایف ایس ایف (فیڈرل سیکورٹی فورس) کہلاتی تھی۔ گکھڑ میں حکومت کے خلاف تحریک کا ایک جلوس تھا، حضرت والد صاحبؒ نے قیادت کرنی تھی۔ گورنمنٹ نے پابندی لگا دی کہ جلوس نہیں نکالیں گے لیکن جمعہ کے بعد والد صاحبؒ کی قیادت میں لوگ جلوس کے لیے جمع ہو گئے کہ جلوس نکالیں گے۔ جلوس جب آگے بڑھا تو فورس کے کمانڈر نے ایک لکیر کھینچ دی اور چاروں طرف سپاہی کھڑے کر دیے اور کہا کہ جو اس لکیر کو عبور کرے گا اسے گولی ماردیں گے۔ اس زمانے میں ایسے ہوتا تھا۔ اب بغیر وارننگ کے مارتے ہیں، اس وقت وارننگ دے کر مارتے تھے۔ اس کا یہ اعلان سن کر سناٹا چھا گیا کہ یہ کیا ہوا، چاروں طرف سپاہی گنیں نشانہ پر لیے ہوئے کھڑے تھے کہ کون لکیر عبور کرتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے۔ ادھر فورس کھڑی ہے، ادھر یہ ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ، حضرت قاری محمد انور صاحبؒ اور ایک گکھڑ کے حاجی سید ڈار مرحوم تھے، یہ تین آدمی جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ آگے بڑھے اور کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے لکیر عبور کر گئے۔ اس موقع پر والد صاحبؒ نے ایک جملہ کہا کہ مسنون عمر پوری کر چکا ہوں، اگر اب شہادت مل جائے تو بڑی سعادت کی بات ہے۔ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے لکیر عبور کر گئے، سب سناٹے میں آ گئے لیکن کسی کو کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ بھی قاری صاحبؒ کے بڑے کارناموں میں سے ایک ہے کہ انہوں نے اس طرح اپنی جان کی پروا کیے بغیر ساتھ نبھایا۔

حضرت قاری صاحبؒ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو میں ان کی خدمت میں وہاں جایا کرتا تھا۔ بہت واقعات ہیں، دو تین عرض کرتا ہوں۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۴ء میں جب میں مدینہ منورہ گیا تو آپؒ وہاں پڑھاتے تھے۔ میں نے اطلاع بھیجی کہ فلاں وقت آرہا ہوں۔ میرا زندگی میں مدینہ منورہ جانے کا پہلا موقع تھا، راستے کا پتہ نہیں تھا اس لیے جو وقت بتایا تھا اس سے دو تین گھنٹے لیٹ پہنچا۔ قاری صاحبؒ میرے بتائے ہوئے وقت پر

آئے اور اڈے پر ڈیڑھ دو گھنٹے تلاش کرتے رہے، میں نہ ملا تو پریشان واپس چلے گئے۔ میں مدینہ منورہ دیر سے پہنچا، وہاں عصر سے مغرب تک کلاس ہوتی ہے۔ وہ لوگ عصر اول وقت میں پڑھتے ہیں جیسے ہمارے ہاں اہل حدیث حضرات پڑھتے ہیں۔ عصر اور مغرب کے درمیان خاصا وقت ہوتا ہے، میں نے عصر کی نماز پڑھی اور تلاش کرتے کرتے قاری صاحبؒ کی کلاس تک پہنچ گیا۔ مجھے جونہی دور سے دیکھا تو بے ساختہ فرمایا اوئے مولوی! کان پکڑ لے۔ میں نے بیگ نیچے رکھا اور مرغا بن گیا۔ آپؒ اٹھ کر آئے اور کہا ارے میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ میں نے عرض کیا یہ نہیں کہا تھا تو اور کیا کہا تھا؟ فرمایا اللہ کے بندے! میں دو گھنٹے پریشان رہا تمہیں ڈھونڈتا رہا تم نہیں ملے تو میں واپس آ گیا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے راستے کا علم نہیں تھا اس لیے دیر ہو گئی۔ سچی بات ہے حضرت قاری صاحبؒ کو وہاں پڑھاتے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھی کہ میرے استاذ محترم ہیں اور مدینہ منورہ میں بیٹھے پڑھا رہے ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد مسجد نبویؐ کے برآمدے میں بیٹھ کر طلبہ کی منزلیں سنا کرتے تھے اور میں قریب کسی ستون کی اوٹ میں کھڑا دیکھتا اور خوش ہوتا رہتا کہ کیا خوش نصیبی ہے کہ مسجد نبویؐ کے برآمدے میں بیٹھے شاگردوں کی منزلیں سن رہے ہیں۔ بڑی خوشی ہوتی تھی اور بڑا رشک آتا تھا۔ میں اپنا اعزاز سمجھتا کہ میرے استاذ محترم ہیں اور یہاں بیٹھے پڑھا رہے ہیں۔

میرا ایک یا دو سال میں وہاں چکر لگ ہی جاتا ہے۔ میں ان کے پاس جاتا کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرتا، کوئی ساتھی ملتا تو میں اسے تعارف کرواتا کہ یہ میرے استاذ محترم ہیں۔ ایک دن کہنے لگے اس طرح نہ کہا کرو۔ میں نے کہا کیوں؟ فرمایا مجھے شرم آتی ہے۔ میں نے بے تکلفی میں کہا مجھے شرم نہیں آتی تو آپ کو کیوں آتی ہے۔ میں تو ایسے ہی کہوں گا، کیا آپ مجھے ڈنڈے نہیں مارتے رہے؟ ان کی ڈاڑھی دیر سے سفید ہوئی، ایک دور وہ بھی گزرا کہ میری ڈاڑھی آدھی سفید تھی اور ان کی کالی تھی۔ میں یہ کہتا کہ یہ میرے استاذ ہیں تو لوگ حیران ہوتے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میرا جب بھی مدینہ منورہ جانا ہوتا تو ان کا اصرار ہوتا تھا کہ میرے پاس ٹھہرو۔ ہمارا ان کے ساتھ محبت و عقیدت کا گہرا تعلق تھا، اور ان کا بھی صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہمارے پورے خاندان کے ساتھ شفقت کا تعلق تھا۔ ہمارے خاندان کا کوئی آدمی عمرے یا حج پر جاتا تو قاری صاحبؒ کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ بہت خوش ہوتے کہ مولوی صاحبؒ (حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ) کے بچے آئے

ہیں، بیٹے آئے ہیں، بھانجے آئے ہیں اور بڑی خدمت اور بڑا اعزاز فرماتے تھے۔ ایک دفعہ میں گیا لیکن انہیں بتایا نہیں اور قاری ریاض انصاری صاحب کے بیٹے حافظ محمد یحیی ابوبکر فاضل نصرۃ العلوم کے پاس ٹھہر گیا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان مسجد نبویؐ میں حضرت قاری صاحبؒ کی چھتری متعیّن ہوتی تھی۔ پہلی صف کی دوسری چھتری کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ قاری صاحبؒ سے جا کر ملا۔ انہوں نے پوچھا کب آئے ہو؟ میں نے بتایا کل آیا تھا۔ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا ابوبکر کے پاس۔ فرمایا سامان اٹھا کر گھر آجاؤ۔ ابوبکر سے کہا چلو جاؤ، مولوی کا سامان اٹھا کر ابھی یہاں لے آؤ۔ اس شفقت اور عنایت کا برتاؤ فرماتے تھے۔

ہمارے ہاں الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ میں ایک دفعہ تشریف لائے، آخر عمر میں بیمار ہوگئے تھے۔ میں نے پروگرام بنایا کہ ان کے اس علاقے میں بہت سے شاگرد ہیں تو قاری صاحبؒ کے جو شاگرد میرے علم میں تھے ان کو یہاں اکٹھا کیا۔ ایک نشست کا اہتمام کیا اور قاری صاحبؒ کو دعوت دی۔ قاری صاحبؒ تشریف لائے اور بہت زیادہ خوش ہوئے کہ یہ تو تم نے بڑا کام کر دیا، میں کس کس کے پاس جاتا اور کس کس سے ملتا، تم نے اکثر شاگردوں سے اکٹھے ملاقات کروا دی۔

پچھلے سال سعودی حکومت کی دعوت پر میرا حج پر جانا ہوا، وہ پروٹوکول کا حج تھا۔ مدینہ منورہ میں ہم تین چار دن ٹھہرے تھے۔ شام کو میں حسب معمول ملنے کے لیے گیا تو قاری صاحبؒ مسجد میں نہیں آرہے تھے، معذور تھے۔ ان کے گھر گیا اور ملاقات کی، تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس اپنے ساتھیوں کے پاس آگیا۔ دوسرے دن ان کے فرزند برادرم محمد اشفاق کا فون آگیا کہ ابوجی آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں، کہتے ہیں کہ مولوی کو ملنے ہوٹل جانا ہے۔ میں نے کہا وہ کیوں آئیں، میں خود حاضر خدمت ہوں گا۔ شام کو پھر میں آپؒ کے گھر گیا اور ملاقات کی۔ قاری صاحبؒ بڑی محبت بڑی عزت کرتے تھے بڑی شفقت سے نوازتے تھے۔

حضرت قاری محمد انور صاحبؒ کافی عرصہ سے سعودی عرب میں رہ رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک الجھن پیدا ہوگئی کہ سعودیہ نے کچھ ایسے قوانین نافذ کیے کہ لگتا تھا کہ شاید انہیں واپس آنا پڑے گا کہ وہاں کی شہریت نہیں تھی۔ سعودیہ والے شہریت نہیں دیتے۔ میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے کہ سعودیہ والے اب شاید نکال دیں گے، میں تو یہاں دفن

ہونے کی نیت سے آیا ہوں۔ دعا کرو میرے لیے۔ میں نے کہا اللہ پاک مہربانی فرمائیں گے، نیتوں کو اور نیتوں کے خلوص کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ اس سال میں وہاں نہیں جا سکا۔ استاذ محترمؒ حج کے موقع پر ساتھیوں سے پوچھتے رہے کہ مولوی نہیں آیا، کیوں نہیں آیا؟ مجھے بھی حسرت رہی کہ پچھلے سال ہی ملاقات ہوئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی موقع مل جائے اور ملاقات کا کوئی وسیلہ بن جائے۔ سچی بات ہے کہ میں تو ان کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ میرا دعاؤں کا خزانہ مسجد نبویؐ میں بیٹھا ہوا ہے۔ جب کبھی روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دیتے تو میری طرف سے سلام کہتے اور بے شمار دعائیں دیتے تھے۔

پچھلے دنوں ہمارے لیے دو تین صدمے اکٹھے ہی آ گئے۔ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ کا انتقال ہوا، ابھی ان کا جنازہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مدینہ منورہ سے فون آ گیا کہ حضرت قاری صاحبؒ فوت ہو گئے ہی۔ ابھی اسی صدمے میں تھے کہ تیسری خبر آ گئی کہ حضرت مولانا عبد الحفیظ مکیؒ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ یہ دو دن میں تین ایسی خبریں سن کر میری عجیب کیفیت تھی کہ یا اللہ کیا کریں۔ بہت صدمہ تھا اپنے بزرگوں کی جدائی کا۔ سچی بات ہے کہ باپ ہی کی طرح تھے، باپ ہی کی جگہ تھے۔ بہر حال اللہ پاک ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے اور ہمیں ان کے صدقہ جاریہ کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمات

(جامعہ ملیہ، شاہدرہ، لاہور - ۹ جنوری ۲۰۱۷ء)

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود دامت برکاتہم سے گزشتہ روز کافی عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی، محمود کالونی شاہدرہ لاہور میں ان کے قائم کردہ دینی مرکز جامعہ ملیہ کا سالانہ اجتماع تھا۔ مولانا قاری جمیل الرحمان اختر، مفتی محمد سفیان قصوری، حافظ محمد زبیر جمیل اور حافظ شفقت اللہ کے ہمراہ میں بھی اس میں شریک ہوا۔ حضرت علامہ صاحب کے ساتھ مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی اور یہ دیکھ کر اطمینان اور خوشی کی کیفیت محسوس ہوئی کہ علالت، ضعف اور کبر سنی کے باوجود علامہ صاحب علمی اور عملی دونوں حوالوں سے بحمد اللہ تعالیٰ مستعد و

متحرک ہیں۔ یہ حضرت علامہ صاحب کا حسن ذوق ہے کہ وہ جامعہ ملیہ کے سالانہ اجتماع کو کسی نہ کسی بزرگ کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس سے آج کے علماء کرام کو اپنے بزرگوں میں سے کسی شخصیت کی خدمات اور جدوجہد سے تعارف کا موقع مل جاتا ہے۔ اس سال یہ سالانہ اجتماع حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حوالہ سے تھا جس میں متعدّد بزرگوں نے حضرت تھانویؒ کی زندگی اور جدوجہد کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کر کے ان کے ساتھ اپنی نسبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ حضرت علامہ صاحب مدظلہ کے حکم پر میں نے بھی کچھ گزارشات پیش کیں جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ کسی بھی شخصیت کی خدمات اور جدوجہد کا صحیح طور پر تعارف حاصل کرنے کے لیے ان حالات اور ماحول کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے جس ماحول میں اس بزرگ شخصیت نے جدوجہد کی ہے اور جن حالات میں انہیں کام کرنا پڑا ہے۔ حضرت تھانویؒ کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی اور برطانوی استعمار کے مکمل تسلط کے تناظر میں دیکھا جائے تو صورتحال کا نقشہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس خطہ کے مسلمان اپنا سب کچھ کھو کر نئے سرے سے معاشرتی زندگی کا آغاز کر رہے تھے۔ صدیوں اس خطہ پر حکومت کرنے کے بعد مسلمانوں کا سیاسی نظام ختم ہو چکا تھا، عدالتی اور انتظامی سسٹم ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، عسکری قوت اور شان و شوکت سے وہ محروم ہو چکے تھے، اور ان کا علمی و تہذیبی ڈھانچہ بھی شکست و ریخت سے دوچار تھا۔ حضرت تھانویؒ کا میدان کار چونکہ علمی، فکری اور تہذیبی تھا اس لیے ان کی جدوجہد اور خدمات کو اسی دائرے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل اس خطہ کے مسلمانوں کے دینی اور معاشرتی ڈھانچے کی بنیاد چار چیزوں پر تھی (۱) قرآن کریم (۲) حدیث و سنت (۳) فقہ حنفی اور (۴) سلوک و احسان۔ مسلمانوں کے معاملات انہی حوالوں سے طے پاتے تھے اور یہی اصول اس وقت کی اسلامی معاشرت کی بنیادوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے بعد جب سب کچھ پامال ہو گیا تو مسلم معاشرت کی یہ چاروں بنیادیں بھی خطرات سے دوچار ہوئیں اور نئے معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل میں ان بنیادوں کو کمزور کرنے کی مہم شروع ہو گئی۔ قرآن کریم کا براہ راست انکار تو ممکن نہیں تھا مگر اس حوالہ سے یہ تبدیلی ضرور سامنے آئی کہ قرآن کریم کی جو تعبیر و تشریح صحابہ کرامؓ کے دور سے اب تک اجماعی تعامل و توارث کی صورت میں چلی

آرہی تھی اسے ماضی کا حصہ قرار دے کر قرآن کریم کی نئی تعبیر وتشریح کا نعرہ لگا دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ اب قرآن کریم اور اس کے احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح ماضی کے مسلمہ اصولوں کی بجائے عقل، سائنس اور کامن سینس کے حوالہ سے ہوگی۔ اس کے ساتھ حدیث و سنت کی ضرورت سے ہی انکار کر دیا گیا، فقہ کو ماضی کے جمود کی علامت قرار دے کر راستے سے ہٹانے کی کوششیں شروع ہوگئیں، اور سلوک و احسان کو قرآن و سنت سے الگ بلکہ اس کے متوازی فلسفہ کے طور پر متعارف کرانے کی باتیں ہونے لگیں۔ جبکہ عمومی معاشرت میں مغربی طور طریقوں کی پیروی کو وقت کی ضرورت قرار دیا جانے لگا، حتیٰ کہ ماضی کی علمی و تہذیبی بنیادوں کی نفی یا کم از کم انہیں سابقہ عرف و تعامل کی پٹڑی سے اتار دینے کی اس تگ و دو کے بعد نبوت کا منصب بھی مجوزہ تبدیلیوں کی زد میں آگیا اور نئی نبوت کی ضرورت کا کھڑاگ رچانا ضروری سمجھا گیا۔

اس ماحول میں سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کے معاشرتی ماحول کو ماضی کی ان اقدار بلکہ بنیادوں سے کاٹ دینے کی اس مہم کا مقابلہ کیا جائے اور ماضی کے علمی، دینی، معاشرتی، فکری اور روحانی تسلسل کو ہر حالت میں باقی رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے علماء حق کا ایک پورا گروہ اور قافلہ میدان میں اترا جس نے صبر آزما جدوجہد کے ساتھ حال اور مستقبل کو ماضی سے کاٹ دینے کی اس مہم کو ناکام بنا دیا۔ ان میں حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی محنت اور تگ و دو ہمیں اس لحاظ سے ممتاز اور نمایاں نظر آتی ہے کہ انہوں نے:

- احکام القرآن کو مستقل طور پر موضوع بحث بنایا اور اپنی نگرانی میں قرآنی احکام کو علمی و فقہی بنیاد پر از سر نو مرتب کرا کے امام ابوبکر جصاصؒ اور امام ابن العربیؒ کی یاد پھر سے تازہ کر دی۔
- حدیث و سنت کی ضرورت و اہمیت کو دلائل کے ساتھ واضح کیا اور اپنے مایۂ ناز شاگرد حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ سے ''اعلاء السنن'' کے عنوان سے ضروریات زمانہ کے مطابق احادیث نبویہ ﷺ کا وقیع ذخیرہ از سر نو مرتب کرا کے علماء کی راہنمائی کی۔

• اپنی معرکۃ الآراء تفسیر ”بیان القرآن“ میں سلوک و احسان کے مسائل کو قرآنی آیات سے مستنبط کر کے یہ واضح کیا کہ سلوک و احسان کوئی باہر سے آنے والی چیز نہیں بلکہ اس کی علمی جڑیں قرآن کریم میں ہی پیوست ہیں۔

• عمومی معاشرت کی اصلاح اور مسلمانوں کے خاندانی ماحول کو دینی احکام پر باقی رکھتے ہوئے اسے انگریز اور ہندو تہذیب کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ”بہشتی زیور“ جیسی کتاب لکھی جو مسلمانوں کے گھریلو ماحول میں دین کے ساتھ وابستگی کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوئی اور خاص طور پر خواتین کو دینی احکام سے آگاہ کرنے کے لیے ایک معاشرتی تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔

• مختلف عقائد کی غلط تعبیر و تشریح اور مروجہ رسوم و بدعات کو مستقل طور پر موضوع بحث بنا کر سنت نبویؐ کی پیروی کا ذوق بیدار کیا۔

• سلوک و احسان کے ماحول کو خانقاہی حوالہ سے نہ صرف قائم رکھا بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اصلاح کر کے خارجی اثرات سے اسے پاک کیا اور ہزاروں علماء کرام اور مسلمانوں کو اس کی عملی تربیت فراہم کی۔

حضرت تھانویؒ کی جدوجہد کے یہ چند زاویے ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے معاشرتی ماحول کا تسلسل اس سے قبل کے ماضی کے ساتھ قائم رکھنے میں اکابر علماء حق بالخصوص حضرت تھانویؒ کی تگ و تاز کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی مسلسل محنت کی جائے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۱ جنوری ۲۰۱۷ء)

۲۰۱۶ء

ذرائع ابلاغ اور سنت نبویؐ

(مسجد تقویٰ، پنجاب کالونی، لاہور - ۱۱ دسمبر ۲۰۱۶ء)

ربیع الاول کے دوران مختلف مقامات پر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ گیارہ ربیع الاول کو ۱۱ بجے پی سی لاہور میں وفاقی وزارت مذہبی امور کے زیر اہتمام سالانہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس کی پہلی نشست میں شرکت کی۔ بعد نماز ظہر جامعہ فتحیہ اچھرہ میں ''نبی اکرمؐ کی خاندانی زندگی'' کے عنوان پر گفتگو ہوئی۔ بعد نماز مغرب مسجد تقوی پنجاب کالونی غازی روڈ لاہور میں ''ذرائع ابلاغ کا استعمال سنت نبویؐ کی روشنی میں'' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ جبکہ بارہ ربیع الاول کو اڈیالہ روڈ راولپنڈی کے ایک شادی ہال میں تحریک اشاعت اسلام کے زیر اہتمام پروفیسر حافظ عبد الواحد سجاد کی صدارت میں منعقدہ سیرت کانفرنس میں ''معاشرتی انصاف اور اسوہ نبویؐ'' کے حوالہ سے معروضات پیش کیں۔ ذرائع ابلاغ کے عنوان پر کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دین حق کے اولین داعی تھے اور آپؐ کی سب سے بڑی ذمہ داری نسل انسانی کو اللہ تعالی کی بندگی اور توحید کی طرف دعوت دینا اور قیامت کے حساب کتاب اور عذاب سے ڈرانا تھا۔ دعوت کے لیے ابلاغ ضروری ہوتا ہے بلکہ ابلاغ پہلے ہوتا ہے پھر اس کے بعد دعوت کا مرحلہ آتا ہے۔ کیونکہ جس چیز کی دعوت دینا مقصود ہو پہلے اس کا تعارف ضروری ہوتا ہے ورنہ دعوت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے قرآن کریم کے ذریعہ لوگوں کو اللہ تعالی کی ذات، صفات،

قدرت اور اختیارات وافعال کی طرف توجہ دلائی اور اللہ رب العزت کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائی۔ قرآن کریم دعوت دین کا سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ چلا آرہا ہے۔ جناب نبی اکرمؐ کو جہاں موقع ملتا، کوئی محفل میسر آتی اور کسی بھی حوالہ سے لوگوں کا کوئی اجتماع ہوتا آپؐ ان کو قرآن کریم سناتے اور دین کی دعوت دیتے۔ حتیٰ کہ تجارتی میلوں میں جو تجارت کے ساتھ ساتھ عرب ثقافت کے اظہار کے اجتماعات بھی ہوتے تھے، لوگ شعر و شاعری کرتے، خطابت کے جوہر دکھاتے، ناچ گانا ہوتا، جاہلی عصبیت کی بنیاد پر خاندانی مفاخر کا ذکر کیا جاتا، ایک دوسرے پر برتری جتاتے، نیزہ بازی و تلوار زنی کے مقابلے ہوتے اور طرح طرح کے تماشے ہوتے۔ حضورؐ ایسے مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے، وہاں تشریف لے جا کر قرآن کریم سناتے، وعظ و نصیحت کرتے اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے۔ آپؐ ان لوگوں کی سرگرمیوں کا حصہ نہیں بنتے تھے مگر اپنی دعوت ان تک ضرور پہنچاتے تھے۔

اس حوالہ سے ایک بات پر توجہ دینے کی بطور خاص ضرورت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی دعوت و تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم کی قراءت و تلاوت ہوتا تھا اور چونکہ اولین مخاطب عرب لوگ تھے اس لیے ترجمہ و تشریح کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ قرآن کریم کا پیغام فطری جبکہ اسلوب فصاحت و بلاغت کے کمال کا تھا، اس لیے مخالفین کو اس کا اثر کم کرنے کے لیے طعن و تشنیع اور کردار کشی کے سوا کوئی بات نہیں سوجھتی تھی۔ کبھی مجنون کہتے، کبھی شاعر، کبھی ساحر اور کبھی کاہن کے طعنے کا سہارا لیتے۔ ایک مرحلہ میں قریشی سردار نضر بن حارث کو قرآن کریم کے مقابلہ میں محفلیں بپا کرنے کی سوجھی تو اس نے ناچ گانے، موسیقی اور قصے کہانیوں کو ذریعہ بنایا جس کا ذکر قرآن کریم نے ”لھو الحدیث“ کے عنوان سے کیا ہے اور ”لیضل عن سبیل اللہ“ کے ارشاد کے ساتھ گمراہی پھیلانے کا اہم سبب قرار دیا ہے۔

قرآن کریم کا خطاب انسان کے دل و دماغ سے ہوتا ہے، وہ سوچ، فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے، اسے اس کے نفع و نقصان سے آگاہ کرتا ہے اور اس کی اگلی زندگی کے حالات کی خبر دیتا ہے۔ جبکہ ناچ گانا، موسیقی، قصے کہانیاں اور نفسانی خواہشات ابھارنے والی چیزیں انسان کو ضروری معاملات سے بے گانہ کر کے خواہشات اور سفلی جذبات کے دائرے میں لے آتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ غور و فکر کی دعوت سے انسان ہدایت کی طرف جانے لگتا ہے جبکہ نفسانی خواہشات کی طرف توجہ دینے اور ان کا اسیر ہو جانے سے انسان کے قدم

گمراہی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، اس لیے اللہ تعالی نے قرآن کریم کو ہدایت کا ذریعہ اور ناچ گانے اور موسیقی وغیرہ کو گمراہی کا سبب قرار دیا ہے۔ ہر دور میں ہدایت اور گمراہی کے ان اسباب میں محاذ آرائی رہی ہے اور آج بھی اس کی صورتحال یہی ہے۔

جناب رسول اکرمؐ کے دور میں ابلاغ کے مؤثر ترین ذرائع فصاحت و بلاغت، شعرو شاعری اور خطابت تھے۔ آنحضرتؐ خود شاعر نہیں تھے جس کا ذکر قرآن کریم نے اس طور پر کیا ہے کہ اللہ تعالی نے آپؐ کو شعرو شاعری نہیں سکھائی اس لیے کہ یہ ان کے شایان شان نہیں تھی۔ البتہ صحابہ کرامؓ میں بہت سے باکمال شعراء اور خطیب تھے جن سے حضورؐ نے دعوت دین اور دفاع اسلام کا کام لیا۔ حضرت ثابت بن قیسؓ نے خطابت کے محاذ پر اسلام کی نمایاں خدمت کی جبکہ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور دیگر شعراء کرام نے شعرو شاعری میں کمال فن کا مظاہرہ کر کے اسلام کی دعوت، اللہ تعالی کی حمد و ثناء، جناب رسول اللہ کی نعت و مدح، اور مسلمانوں کے دفاع کے شاندار کارنامے سرانجام دیے۔

فصاحت و بلاغت اور گفتگو کا اعلی اسلوب دین کی دعوت کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ حتی کہ جب اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام کو کوہ طور پر بلا کر نبوت کا منصب عطا فرمایا تو انہوں نے اپنی زبان کی لکنت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت میں شریک کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ ”ھو افصح منی لسانا“ وہ زبان و بیان کی فصاحت میں مجھ سے فائق ہے اس لیے اسے بھی میرا ساتھی بنایا جائے۔

فصاحت و بلاغت سے مراد وقت کا اعلی ترین اسلوب گفتگو ہوتا ہے جو وقت اور جگہ کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے اور کبھی ایک معیار پر قائم نہیں رہتا۔ انسانی ذہنوں کی بھی ایک سطح نہیں ہوتی اور نفسیات بھی مختلف دائروں اور سطحوں میں منقسم رہتی ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن کریم اور جناب رسول اللہؐ کی ذاتی گرامی، دونوں میں یہ کمال رکھا ہے کہ وہ چونکہ سب انسانوں کے لیے ہیں اور قیامت تک کے لیے ہیں اس لیے گفتگو اور خطاب کے تمام ضروری اسلوب ان کو ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان کے کلام سے ہر درجہ اور سطح کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں اور یہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کا اعجاز ہے۔

جناب رسول اکرمؐ نے اپنے دور کے اعلی ترین اسلوب خطابت اور شعرو شاعری کو دین کی دعوت و دفاع کا ذریعہ بنایا اور قرآن کریم کے معجزانہ انداز بیان سے تمام مخالفتوں اور

رکاوٹوں کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ جناب رسول اللہؐ کی اس سنت مبارکہ سے استفادہ کرتے ہوئے آج کے دور کے گفتگو، محاورہ، مکالمہ اور ابلاغ کے بہترین اسلوب کو اختیار کیا جائے اور ہر طبقہ و دائرہ کے انسانوں کی ذہنی سطح و نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان تک قرآن کریم کی دعوت کو پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ دسمبر ۲۰۱۶ء)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا پیغام

(جامعہ مدنیہ، کریم پارک، لاہور - ۱۹ نومبر ۲۰۱۶ء)

جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور میں "مجلس یادگار شیخ الاسلامؒ پاکستان" کے زیر اہتمام حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے حوالہ سے منعقد ہونے والے سیمینار کا گزشتہ کالم میں تذکرہ کیا تھا۔ میں نے اس موقع پر جو گزارشات پیش کیں انہیں تھوڑے سے اضافہ کے ساتھ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے بارے میں گفتگو کے مختلف پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک مستقل گفتگو کا متقاضی ہے۔ مثلاً ان کا قبول اسلام کیسے ہوا؟ ضلع سیالکوٹ کے گاؤں چیانوالی کے سکھ گھرانے کے ایک نوجوان نے اسلام قبول کیا تو اس کے اسباب کیا تھے اور وہ کن حالات و مراحل سے گزر کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور غیر مسلموں کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ بوٹا سنگھ نامی نوجوان جب مسلمان ہوا تو سیالکوٹ سے جام پور اور وہاں سے بھرچونڈی شریف سندھ تک کے سفر کی داستان بھی توجہ کی مستحق ہے۔ بھرچونڈی شریف سلسلہ عالیہ قادریہ راشدیہ کی ایک اہم خانقاہ ہے، عارف باللہ حضرت حافظ محمد صدیقؒ اس وقت اس سلسلہ کے سب سے بڑے پیشوا تھے، ان کی خدمت میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی حاضری اور حضرت حافظ صاحبؒ سے استفادہ اور کسب فیض ایک مستقل موضوع بحث ہے۔ سیالکوٹ کے ایک نومسلم نوجوان کو وہاں ایسی محبت و شفقت ملی کہ وہ اپنے علاقائی نسبت ہی بھول گیا اور ہمیشہ کے لیے سندھی کا تعارف اختیار کر لیا۔

ابھی ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر امجد علی شاکر اپنے خطاب میں بتا رہے تھے کہ مولانا سندھیؒ پہلے صوفی بنے اور پھر عالم دین بنے۔ وہ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ یہ مسلم نوجوان پہلے بھرچونڈی شریف کی خانقاہ پہنچا اور پھر وہاں سے دیوبند کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے بعد دیوبند میں مولانا سندھی کے تعلیم حاصل کرنے اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے ساتھ تعلق، استفادہ اور رفاقت کا دور ہے کہ انہوں نے اپنے وقت کے سب سے بڑے محدث، فقیہ، صوفی اور تحریک آزادی کے عظیم قائد کے معتمد ترین شاگرد اور ساتھی کا مقام کیسے حاصل کر لیا؟

پھر آزادئ وطن کی جدوجہد میں ان کے کردار اور محنت و قربانی کا دور آتا ہے کہ اس عظیم مشن کے لیے صرف اپنے ملک میں محنت نہیں کی بلکہ دنیا بھر میں دربدر کی خاک چھانی اور ایک قومی جدوجہد کو بین الاقوامی تحریک میں تبدیل کر دیا۔ مختلف ملکوں کا یہ سفر ہوائی جہاز اور لگژری کاروں کا نہیں بلکہ پیدل یا زیادہ سے زیادہ عام سطح کی پبلک ٹرانسپورٹ کا تھا۔ اس سفر کی ایک جھلک اس واقعہ میں دیکھی جا سکتی ہے جو میں نے اپنے شیخ محترم حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے سنا ہے کہ مولانا سندھیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر کابل کا سفر کرنا تھا، وہ سی آئی ڈی کے تعاقب سے بچنے کے لیے ادھر ادھر گھومتے ہوئے دین پور شریف پہنچے تو وہاں بھی اردگرد مخصوص لوگوں کو نگرانی کرتے ہوئے پایا۔ چند دن وہاں رہے مگر ان کی نگاہوں سے بچ کر نکلنے کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ ایک دن تیز جلاب کی کوئی دوائی کھالی جس سے سخت اسہال شروع ہو گئے، نگرانوں نے یہ دیکھ کر کہ اب تو یہ دو تین دن تک کسی طرف جانے کے قابل نہیں رہے، نگرانی میں تھوڑی غفلت دکھائی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مولانا سندھیؒ اسی حالت میں وہاں سے نکلے اور چھپتے چھپاتے قندھار کی طرف روانہ ہو گئے اور اپنی منزل تک پہنچ جانے تک کسی کو محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آرہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟

یہ بات بھی تحقیق و مطالعہ کا اہم موضوع ہے کہ اپنی وطنی تحریک کو بین الاقوامی رخ دینے کے لیے اس مرد قلندر نے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ اس وقت سلطنت برطانیہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت شمار ہوتی تھی اور اس کے حریفوں میں جرمنی، خلافت عثمانیہ اور جاپان نمایاں تھے۔ ان تینوں بڑی قوتوں کو ایک منصوبے پر متفق کر کے آزادئ وطن کی قومی تحریک میں تعاون پر آمادہ کر لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے لیے سبھاش چندر بوس، مہندر

پرتاب، برکت اللہ بھوپالیؒ، عبید اللہ سندھیؒ اور محمد میاں انصاریؒ جیسے اصحاب عزیمت کا حوصلہ کام آیا۔ اس حوصلہ اور اس کے مظاہر سے آج کی دنیا بالخصوص نئی نسل کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا سندھیؒ کی زندگی کا ایک پہلو ایک مفکر اور اجتہادی صلاحیتوں سے بہرہ ور بلند پایہ عالم دین کا بھی ہے، انہوں نے قرآن و سنت کی صرف تعبیر و تشریح نہیں کی بلکہ اپنے دور کی سماجی ضروریات اور معاشی تقاضوں کے ساتھ ان کی تطبیق و توفیق کی راہیں بھی نکالی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان کی ساری تعبیرات کو قبول کیا جائے لیکن ان کا یہ ذوق و جذبہ آج بھی ہم سب کے لیے لائق تقلید ہے کہ قرآن و سنت کے علوم صرف کتب اور درسگاہ کے لیے نہیں ہیں بلکہ ان کا اصل مقام سماج اور معاشرہ ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے سماج اور سوسائٹی سے آگاہی بھی ضروری ہے اور ایک مفکر و مجتہد کا اصل کام یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات اور سماج کی ضروریات کے درمیان تطبیق و مفاہمت کی راہیں تلاش کرے اور انسانی سوسائٹی کے مسائل و مشکلات کا قرآن و سنت کی روشنی میں حل پیش کرے۔

میں نے مولانا سندھیؒ کی جدوجہد، خدمات اور حیات کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور ہمارے فاضل محققین کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ لیکن آج میں ایک اور پہلو کے حوالہ سے بات کرنا چاہوں گا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں قرآن کریم کے اعجاز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آنے والے دور میں جو نظاموں اور معاشرتی قوانین کے تقابل کا دور ہوگا، اس پہلو کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن و سنت کا پیش کردہ نظام اور اس کے معاشرتی احکام و قوانین دنیا کے تمام نظاموں سے بہتر ہیں اور انسانی سوسائٹی کے مسائل و مشکلات کو زیادہ بہتر طور پر حل کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں مولانا سندھیؒ کی علمی و فکری جدوجہد کو دیکھا جائے تو انہوں نے اپنے دور کے عالمی نظاموں کے درمیان مقابلہ کو وسیع تناظر اور گہری نظر سے دیکھا ہے، انہوں نے ہماری طرح اخباری خبروں اور سنی سنائی باتوں پر اپنے فکر و فلسفہ کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ خود ان عالمی نظاموں کے مراکز میں جا کر ان کی اکھاڑ پچھاڑ کا ذاتی طور پر مشاہدہ کیا۔ انہوں نے مغرب کے سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے مقابلہ میں کمیونزم کے ابھرتے ہوئے

طوفان کو ماسکو میں بیٹھ کر دیکھا۔ خلافت عثمانیہ کے بکھرنے کے عمل کا استنبول میں رہ کر مشاہدہ کیا، اور عرب قومیت کے نام پر عالم اسلام کا شیرازہ بکھیرے جانے کے مراحل کو مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر سمجھا۔ انہوں نے مغرب کے سرمایہ دارانہ وجاگیر دارانہ نظام کے مقابلہ میں ابھرتے ہوئے سوشلزم کی ان حالات کے تناظر میں تحسین ضرور کی لیکن یہ بات بھی دوٹوک انداز میں واضح کی کہ انسانی سوسائٹی کے مسائل کا اصل حل صرف قرآن کریم میں ہے اور اس کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفہ کو راہنما بنانے کی ضرورت ہے۔

مولانا سندھیؒ کو اس بات کا زندگی بھر قلق رہا کہ ہم مسلمانوں کے پاس اسلام کے عادلانہ سماجی نظام کا کوئی عملی نمونہ عصر حاضر میں موجود نہیں ہے اس لیے سرمایہ دارانہ وجاگیر دارانہ نظاموں سے نجات حاصل کرنے کے لیے دنیا کو کمیونزم اور سوشلزم کی طرف رجوع کرنا پڑ رہا ہے۔ اور وہ اس نمونہ کے قیام کے لیے ساری زندگی محنت کرتے رہے۔ البتہ ان کا دور نظاموں کے تقابل کا دور تھا اور انہوں نے اپنے دور کے نظاموں کے باہمی مقابلہ کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفہ کی طرف لوگوں کی راہنمائی کی۔ مولانا سندھیؒ کی بعض تعبیرات وتشریحات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی اس بات سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اپنے دور کے مسائل اور تقاضوں کو براہ راست معروضی حالات کے تحت سمجھنا ضروری ہے اور انسانی سوسائٹی کی راہنمائی کے لیے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفہ سے راہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس پس منظر میں ایک طالب علمانہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلی صدی نظاموں کے ٹکراؤ کی صدی تھی مگر آج کا دور تہذیبوں کے تصادم کا دور ہے۔ مغرب کی تہذیب و ثقافت پوری دنیا بالخصوص عالم اسلام کو اپنے دائرے میں سمیٹ لینے کے چکر میں ہے۔ اس لیے آج کے علماء کرام اور دانشوروں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تہذیبوں کے اس تصادم اور ثقافتوں کے اس ٹکراؤ کو سمجھنے کی کوشش کریں، آج کے عصر کا ادراک حاصل کریں، اور اس سولائزیشن وار میں قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں امت مسلمہ بلکہ نوع انسانی کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں جس کے لیے ولی اللّٰہی فکر و فلسفہ کی روشنی آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ میرے نزدیک آج کی نسل کے لیے مولانا عبید اللہ سندھیؒ

کا پیغام یہی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمت راہنمائی کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ نومبر ۲۰۱۶ء)

(ستمبر ۱۹۹۴ء کے دوران لندن اور برمنگھم میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی یاد میں منعقدہ تقریبات سے خطاب کا خلاصہ)

مولانا عبید اللہ سندھی کا تعلق پنجاب کے ایک غیر مسلم گھرانے سے تھا لیکن چونکہ ان کی تعلیمی اور تدریسی زندگی کا ایک بڑا حصہ سندھ میں گزرا، اور ان کی تعلیم و تربیت سندھ کے ایک عارف باللہ حضرت حافظ محمد صدیق آف بھرچونڈی شریف کے ہاتھوں میں ہوئی، اس لیے وہ سندھی کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے آج سے نصف صدی قبل ہمیں یہ سبق دیا تھا کہ

- علماء کرام جدید علوم اور تقاضوں سے آگاہی حاصل کریں،
- کالج کے طلبہ کو عربی گرامر کے ساتھ قرآن کریم کے ترجمہ کی تعلیم دی جائے،
- اور اسلام کو پوری انسانیت کے مذہب کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

آج جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے ان باتوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے لیکن ہم ان کی طرف متوجہ نہیں ہو رہے۔

نئی نسل کو تحریک آزادی کے مجاہدین کی خدمات اور قربانیوں سے آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ اسے آزادی کی حقیقی قدر و قیمت اور اس کے تقاضوں کا احساس ہو اور وہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ آزادئ ہند اور قیام پاکستان کے لیے علماء کی جدوجہد کو نظر انداز کر دیا جائے تو تاریخ کے دامن میں کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ تحریک آزادی کے عظیم جرنیل ہی نہیں بلکہ قرآن کریم کے مفسر اور بہت بڑے محدث تھے جن کے ہزاروں شاگرد مختلف مسلم ممالک میں قرآن و حدیث کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ نومبر ۱۹۹۴ء)

نبی اکرمؐ کا کفار کے ساتھ معاشرتی رویہ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - مجلس احرار اسلام پاکستان، مرکزی دفتر لاہور-۱

نومبر ۲۰۱۶ء)

(اکتوبر ۲۰۱۶ء کے دوران مجلس احرار اسلام پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں ایک تربیتی نشست سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی کے اس پہلو پر آج کی محفل میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپؐ نے کافروں کے ساتھ معاشرتی زندگی میں کیا معاملہ کیا ہے اور ان کے ساتھ زندگی کیسے گزاری ہے؟ اس حوالے سے جناب سرور کائناتؐ کی حیات مبارکہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ اس چالیس سالہ دور کا ہے جو نبوت سے پہلے مکہ مکرمہ میں گزرا۔ نبی اکرمؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اس لیے کفر و شرک، بت پرستی اور جاہلانہ رسوم سے آپؐ کی نفرت طبعی تھی۔ حضورؐ ان امور میں معاشرے کے ساتھ شریک نہیں تھے اور ایسی تمام باتوں سے الگ تھلگ رہتے تھے، لیکن عمومی معاشرت میں باقی لوگوں کے ساتھ آپؐ بھی اسی معاشرے کا حصہ تھے، سوسائٹی کے معاملات میں شریک ہوتے تھے، رشتہ داریاں قائم تھیں اور لین دین کے معاملات بھی جاری رہتے تھے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی کا دوسرا حصہ نبوت ملنے کے بعد کا ہے۔ جب نبوت ملی اور آنحضرتؐ نے توحید کی دعوت کا آغاز کیا تو صورتحال مختلف ہو گئی۔ اس سے قبل اخلاق حسنہ اور خدمت خلق کے باعث آپؐ کو سوسائٹی کی پسندیدہ ترین شخصیت کی حیثیت حاصل تھی، صادق و امین کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور مختلف امور میں آپ سے راہنمائی لی جاتی تھی۔ لیکن توحید کے اعلان اور عام محفلوں میں قرآن کریم کی تلاوت کو ناپسند کیا گیا اور مخالفت کا دور شروع ہو گیا جو تیرہ سال جاری رہا۔ یہ تیرہ سالہ دور مخالفت کا دور تھا، آزمائش و ابتلا کا دور تھا اور اذیت و تکلیف کا دور تھا۔ اس دور میں جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، اپنی جماعت کی توسیع کی محنت کرتے رہے، ساتھ دینے والے حضرات کی تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور صبر و حوصلہ کے ساتھ اپنے مشن کو مسلسل آگے بڑھاتے رہے، وہاں مکہ مکرمہ کی عمومی

معاشرت کا حصہ رہے اور معاشرتی معاملات میں برابر شریک ہوتے رہے۔ حتی کہ ایک موقع پر قریش کے مختلف خاندانوں نے اجتماعی فیصلہ کر کے آنحضرتؐ اور ان کے ساتھیوں کا معاشرتی بائیکاٹ کر دیا جو تین سال جاری رہا۔ اس دوران شعب ابی طالب میں انہیں محصور کر دیا گیا اور بائیکاٹ کی نگرانی کے لیے ناکہ بندی کا اہتمام بھی کیا گیا لیکن یہ بائیکاٹ یکطرفہ تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور میں بھی دعوت و تبلیغ کے تقاضوں کی تکمیل کی اور بائیکاٹ کی پروانہ کرتے ہوئے تعلقات اور دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دور میں کافروں کا غلبہ تھا اور مسلمان اقلیت میں تھے بلکہ وہ اکثریت کے مظالم اور اذیتوں کا نشانہ تھے، لیکن آنحضرتؐ نے مزاحمت کا راستہ اختیار نہ کیا، نہ اجتماعی مزاحمت کی اور نہ ہی انفرادی طور پر کسی ساتھی کو اس کی اجازت دی، بلکہ حوصلہ اور صبر کے ساتھ مظالم برداشت کرتے ہوئے دعوت تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ قائم رکھا۔ البتہ اس دوران مکہ مکرمہ کی آبادی سے ہٹ کر مختلف اطراف سے دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ کافر قبائل میں اپنی حمایت و حفاظت کے مواقع بھی تلاش کرتے رہے۔

طائف کا سفر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے کیا تھا کہ بنو ثقیف کے سرداروں کو قریش کے مظالم کے خلاف اپنی حمایت کے لیے آمادہ کر سکیں۔ حبشہ کی طرف صحابہ کرامؓ کی ہجرت کا بھی ایک اہم مقصد مسلمانوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ مہیا کرنا تھا جو حاصل ہو گئی۔ جبکہ حج کے لیے یثرب (مدینہ) سے آنے والے قافلوں کے خیموں میں حضورؐ کا بار بار جانا اور انہیں دعوت دینا بھی اسی لیے تھا کہ وہ مسلمان ہو کر مکہ مکرمہ کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھی بنیں اور انہیں محفوظ ٹھکانہ مہیا کریں جیسا کہ عملاً ہو بھی گیا۔ یثرب سے آنے والے لوگوں کے ساتھ بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد نبی اکرمؐ کی ہجرت کی راہ ہموار ہوئی اور اس ہجرت پر مکہ مکرمہ کے تیرہ سالہ مظلومانہ دور کا اختتام ہوا۔

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا جو دس سال جاری رہا اور یہ سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور تھا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آنحضرت کی ہجرت سے پہلے یثرب اور اردگرد کے قبائل ایک علاقائی حکومت کے قیام پر متفق ہو چکے تھے اور بادشاہ کے طور پر عبداللہ بن ابی کے نام کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا، صرف تاج پوشی کی رسم باقی تھی کہ حضورؐ کی تشریف آوری سے ساری صورتحال بدل

گئی۔ وہ حکومت جو عبداللہ بن ابی کی سربراہی میں قائم ہونا تھی وہ آپؐ کی قیادت میں تشکیل پا گئی۔ میری طالب علمانہ رائے میں اس ریاست و حکومت کے خدوخال طے کرنے کے لیے قبائل کے درمیان جو مذاکرات ہو چکے تھے وہی ''میثاق مدینہ'' کا ہوم ورک اور اساس بنے جس میں حضورؐ نے بنیادی تبدیلی یہ کی کہ اسے ایک نظریاتی ریاست کی شکل دے دی جو آگے چل کر خلافت راشدہ اور عالمی اسلامی خلافت کی صورت میں دنیا میں پھیلتی چلی گئی۔

ابتدا میں اس حکومت و ریاست میں مسلمان بھی شامل تھے، یہودی قبائل بھی اس کا حصہ تھے، اور اردگرد کے دیگر قبائل بھی اس میں شریک تھے۔ جبکہ اس نظم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاکم اعلیٰ جبکہ ''میثاق مدینہ'' کو دستور کی حیثیت حاصل تھی۔ بعد میں یہودی قبائل میثاق کی خلاف ورزی کے باعث یکے بعد دیگرے مدینہ منورہ سے جلاوطن ہوتے گئے اور بنوقریظہ کی جلاوطنی کے بعد مدینہ منورہ مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہودیوں کو مدینہ منورہ سے نکالنے میں مسلمانوں نے پہل نہیں کی تھی بلکہ خود یہودیوں نے اپنی فطرت کے مطابق مسلسل بدعہدی کے ذریعے یہ ماحول پیدا کر لیا تھا اور ان کی جلاوطنی کے فیصلے اس وقت کے عام عرف کے مطابق جرگوں اور ثالثوں کے ذریعے ہوئے اور یہودیوں نے ان فیصلوں کو تسلیم کیا۔

مدینہ منورہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اور طبقہ سے بھی سابقہ درپیش رہا جس کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ''وماھم بمومنین'' وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ منافقین تھے جن کی قیادت عبداللہ بن ابی کر رہا تھا۔ میری طالب علمانہ رائے میں عبداللہ بن ابی کو حکومت کا چانس ختم ہو جانے پر جو غصہ تھا وہ باقی ساری زندگی اس کا بدلہ ہی لیتا رہا۔ اس نے مدینہ منورہ میں بڑے بڑے فتنے کھڑے کیے اور مسلمانوں کو پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ احد کی جنگ میں وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان سے نکل گیا، اس وقت جنگ کے لیے احد تک جانے والے لشکر کی تعداد ایک ہزار تھی جن میں سے تین سو افراد عبداللہ بن ابی کی قیادت میں میدان چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔ اس سے ان کا تناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کم و بیش تیس فیصد تھے۔

غزوہ احد کے بعد مسلمانوں میں ان منافقین کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے؟ بعض کی رائے تھی کہ ان کے خلاف کاروائی کی جائے جبکہ دوسرے حضرات کا خیال تھا کہ انہیں اسی طرح ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کا ذکر قرآن کریم نے ''فما لکم فی المنافقین فئتین۔۔'' کی آیت کریمہ میں کیا ہے۔ ان منافقین نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا پر جھوٹی تہمت کا بازار گرم کیا، انہوں نے مدینہ منورہ سے مہاجرین کو نکال دینے کی سازش بھی کی جس کا تذکرہ قرآن کریم کی سورۃ المنافقون میں ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود حضورؐ نے ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی بلکہ وہ معاشرتی زندگی حتی کہ مذہبی معاملات میں بھی مسلمانوں کے ساتھ مسلسل شریک رہے۔ ان کے خلاف نہ کوئی احتجاجی کاروائی ہوئی اور نہ ہی انفرادی طور پر ان میں سے کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی کسی کو اجازت ملی۔ عبداللہ بن ابی کو قتل کرنے کی اجازت حضرت عمرؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کے علاوہ حضرت سعد بن معاذؓ نے بھی مانگی تھی مگر آپؐ نے کسی کو اجازت نہیں دی اور یہ فرمایا کہ اس سے دنیا کے دوسرے لوگوں کو یہ تاثر ملے گا کہ حضرت محمدؐ تو اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال حکمت عملی تھی کہ ان منافقین کی الگ گروہی شناخت قائم نہ ہونے دی جائے اور انہیں مدینہ منورہ کے اندر کوئی داخلی محاذ بنانے کا موقع نہ دیا جائے۔ حتی کہ جن چودہ منافقین نے نبی اکرمؐ کو راستے میں گھیر کر قتل کرنے کی ناکام کاروائی کی تھی، آپؐ نے ان کے نام تک حضرت حذیفہؓ کے علاوہ کسی کو نہیں بتائے اور انہیں بھی سختی کے ساتھ تاکید کی کہ ان میں سے کسی کا نام ظاہر نہ ہونے پائے۔ اور یہ بھی اسی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ انہیں مسجد کے نام پر الگ مرکز بنانے کی اجازت نہ دی گئی بلکہ ان کی بنائی ہوئی مسجد کو ''مسجد ضرار'' قرار دے کر منہدم کرا دیا گیا۔ ان منافقین کے بارے میں جنہیں قرآن کریم نے ''وماھم بمومنین'' کہہ کر کافر قرار دینے کا اعلان کر دیا تھا، آنحضرتؐ کی حکمت عملی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں معاشرتی طور پر الگ کر کے اپنا تشخص قائم کرنے کا موقع نہ دیا جائے، اور داخلی طور پر اپنے لیے کوئی محاذ کھڑا نہ ہونے دیا جائے، اس کامیاب حکمت عملی کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ وہ لوگ جو غزوۂ احد کے وقت کم و بیش تیس فیصد دکھائی دے رہے تھے، حضرت حذیفہؓ والے واقعہ تک ان کی تعداد درجن بھر رہ گئی تھی اور اس کے بعد تاریخ میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ وہ کدھر گئے۔ ظاہر بات ہے کہ

سارے مرکھپ تو نہیں گئے تھے بلکہ آہستہ آہستہ توبہ تائب ہو کر مسلمانوں کے عمومی معاشرے میں تحلیل ہو کر رہ گئے تھے جو جناب رسول اللہ کی کمال حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔

اس دس سالہ مدنی دور میں کفار کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی حکمت عملی کا جائزہ لیا جائے تو اس میں جہاں کافر قوموں کے ساتھ دو درجن سے زیادہ جنگیں موجود ہیں وہاں معاہدات بھی تاریخ کا حصہ ہیں، مل جل کر رہنے کی روایت بھی میثاق مدینہ کی صورت میں واضح دکھائی دیتی ہے، اور داخلی دشمنوں کو صف آرائی کا موقع نہ دیتے ہوئے آہستہ آہستہ انہیں بے اثر کر دینے کی کامیاب حکمت عملی کے ثمرات بھی نظر آتے ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ کا طرز استدلال

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۶ء)

حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کو ہم سے رخصت ہوئے ۱۴ اکتوبر کو چھتیس برس گزر جائیں گے لیکن ابھی کل کی بات لگتی ہے، ان کا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے، وہ مختلف تقریبات میں آتے جاتے دکھائی دے رہے ہیں، ان کی گفتگو کانوں میں رس گھول رہی ہے، ان کے استدلال اور نکتہ رسی کی ندرت دل و دماغ کو سراپا توجہ کی کیفیت میں رکھے ہوئے ہے اور ان کی فراست و تدبر کے کئی مراحل ذہن کی اسکرین پر قطار میں لگے ہوئے ہیں۔ مولانا مفتی محمودؒ کے بارے میں بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے اور بہت لکھنے کا ارادہ ہوتا ہے لیکن آج کل سماعت و مطالعہ کا ہاضمہ اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ بعض ارادے

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

کی دہلیز پر آکر دم توڑ دیتے ہیں۔ آج ان کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے کئی گھنٹے سوچتا رہا اور متعدّد پہلو باری باری سامنے آنے پر انہیں تولتا رہا بالآخر ذہن کی سوئی حضرت مفتی صاحبؒ کے استدلال کے اسلوب اور ندرت پر آکر رک گئی اور اسی کے حوالہ سے چند معروضات قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو استدلال کی جو قوت و صلاحیت عطا فرمائی تھی اس کا اعتراف سب حلقوں میں کیا جاتا تھا۔ ہمارے ایک مرحوم و مخدوم بزرگ کہا کرتے

تھے کہ مفتی صاحبؒ سامنے نظر آنے والے لکڑی کے ستون کو دلائل کے ساتھ سونے کا ستون ثابت کرنا چاہیں تو دیکھنے والا شخص ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ سیاسی، علمی، اور فکری سب قسم کے معاملات میں مفتی صاحبؒ کی اس خداداد صلاحیت کا ہم نے یکساں اظہار ہوتے دیکھا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر خود ان کی زبان سے براہ راست سنی ہوئی بعض باتیں ذکر کرنا چاہ رہا ہوں۔

۱۹۷۳ء کے دستور کی ترتیب و تدوین میں حضرت مفتی صاحبؒ بھی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بلکہ جمعیت علمائے اسلام کے پارلیمانی لیڈر کے طور پر شریک تھے۔ اس دوران یہ بات زیر بحث آئی کہ کیا عورتوں کو اسمبلی میں نمائندگی دی جا سکتی ہے؟ ہمارے بعض سرکردہ ارباب علم وفضل کو اس میں اشکال تھا۔ مفتی صاحبؒ نے اس سلسلہ میں ایک بڑے بزرگ کے ساتھ اپنی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ حضرت اشکال کس بات میں ہے، کیا عورتوں کو رائے دینے اور مشورہ میں شریک ہونے کا حق حاصل نہیں ہے یا پردہ اور مجلس کے اختلاط کے حوالہ سے اشکال درپیش ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ عورتوں کو رائے دینے کا حق تو ہے اور انہیں مشاورت میں شریک بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مشترکہ مجلس میں ان کا بے حجاب شریک ہونا درست دکھائی نہیں دیتا۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے عرض کیا کہ قرآن کریم نے آیت مقدسہ والقواعد من النسآء میں عمر رسیدہ عورتوں کے لیے جو گنجائش دی ہے اگر اس کے تحت اسمبلی کی رکنیت کے لیے عورتوں کی عمر کی حد مقرر کر دی جائے، ان کی نشستیں مردوں سے الگ کر دی جائیں، اور لباس کی بھی کوئی مناسب حد بندی کر دی جائے تو پھر آپ کو کیا اشکال ہے؟ اس پر وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔

مفتی صاحبؒ نے ایک موقع پر بتایا کہ قومی اسمبلی میں قادیانیت کے حوالہ سے بحث طول پکڑ گئی اور قادیانی امت کے سربراہ مرزا ناصر احمد کی طرف سے قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پیش کیے جانے کے باعث اسمبلی کے وہ ارکان تشویش کا شکار ہونے لگے جو قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ''خاتم النبیین'' کے مختلف معنوں اور توجیہات نے اس تشویش میں اضافہ کر دیا، حتیٰ کہ خود وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے کہا کہ دونوں طرف سے آیتیں اور حدیثیں پیش کی جا رہی ہیں اور حوالے دیے جا رہے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہے۔ اس

لیے ہمیں تو قرآن کریم سے کوئی سیدھی سی بات بتائیں کہ حضرت محمدؐ کے بعد نبی نہیں آئے گا تب بات ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ بھٹو مرحوم کی یہ بات سن کر ایک بار تو مجھے بھی پریشانی سی ہوئی پھر اللہ تعالیٰ نے ذہن میں بات ڈال دی اور میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! یہ بات تو قرآن کریم نے آغاز میں ہی واضح کر دی ہے کہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ مومن وہی ہے جو اس وحی پر ایمان لاتا ہے جو آپؐ پر نازل ہوئی ہے اور اس وحی پر بھی ایمان رکھتا ہے جو آپؐ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر آنحضرتؐ کے بعد وحی نازل ہونا ہوتی تو اس کا بھی یہاں ذکر ہوتا، چونکہ اس کا ذکر نہیں ہے اس لیے حضورؐ کے بعد کسی وحی کا نزول نہیں ہوگا۔ یہ بات سن کر بھٹو مرحوم نے کہا کہ بس بات سمجھ میں آگئی ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

اسمبلی کا ہی ایک اور واقعہ حضرت مفتی صاحبؒ نے سنایا کہ اسمبلی میں زیر بحث کسی مسئلہ پر مفتی صاحبؒ اور کچھ دیگر ارکان نے واک آؤٹ کیا تو اس پر مولانا کوثر نیازی مرحوم نے اعتراض کیا کہ آپ حضرات یہاں قوم کی نمائندگی کے لیے آتے ہیں اور یہاں آنے اور بیٹھنے کی آپ کو تنخواہ اور الاؤنس وغیرہ ملتے ہیں، اس لیے کام چھوڑ کر چلے جانا شرعاً درست نہیں ہے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم کا حکم ہے کہ جس مجلس میں غلط باتیں ہو رہی ہوں فلا تقعدوا معھم ان کے ساتھ مت بیٹھو۔ نیازی صاحب مرحوم نے کہا کہ پھر آپ مجلس میں واپس کیوں آگئے ہیں؟ مفتی صاحبؒ نے آیت کا دوسرا جملہ پڑھا حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ یہاں تک کہ وہ کسی اور گفتگو میں مصروف ہو جائیں۔ یعنی اگر مجلس کا ایجنڈا بدل جائے تو آپ اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ موقع شناسی اور اس کے مطابق گفتگو کرنے میں مہارت رکھتے تھے اور مخاطب کی بات کا اصل مقصد سمجھ کر اس کا جواب دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک بار مفتی صاحبؒ نے بتایا کہ کسی مالدار شخص نے ان سے دریافت کیا کہ کیا حرام مال پر بھی زکوۃ دینا ہوتی ہے؟ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں اس کا مقصد سمجھ گیا کہ میں کہہ دوں گا کہ نہیں تو بات بن جائے گی کہ ہماری کمائی تو اکثر حرام کی ہوتی ہے اس لیے زکوۃ نہیں دینا پڑے گی۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہاں بھئی! حرام مال میں بھی زکوۃ فرض ہوتی ہے البتہ حلال مال کی زکوۃ اور حرام مال کی زکوۃ میں کچھ باتوں کا فرق ہے۔

• حلال مال میں زکوۃ فرض ہونے کے لیے نصاب کا ہونا ضروری ہے لیکن حرام مال کا کوئی نصاب نہیں ہے۔

• حلال مال میں حولان حول (سال کا گزرنا) شرط ہے لیکن حرام مال میں فوری ادائیگی ضروری ہے۔

• حلال مال میں اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوۃ دینا ہوتی ہے جبکہ حرام مال سارے کا سارا دے دینا ضروری ہے۔

• حلال مال کی زکوۃ دینے پر اجر و ثواب ملے گا مگر حرام مال ثواب کی نیت کے بغیر صحیح جگہ پر خرچ کرنا ہو گا۔

مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ زکوۃ کا اصل مقصد تو مال کو پاک کرنا ہوتا ہے جو حلال میں اڑھائی فیصد دینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر حرام مال پورے کا پورا دے دینے سے باقی کا حلال مال پاک ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اپنا ایک ذاتی واقعہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا اسلام آباد کے گورنمنٹ ہاسٹل میں عام طور پر ۴ نمبر کمرہ میں قیام ہوتا تھا اور میں وقتاً فوقتاً جماعتی معاملات میں وہاں جایا کرتا تھا۔ ایک روز مغرب کی نماز پڑھ کر ہم بیٹھے تو جماعتی و ملکی معاملات پر گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ خاصی دیر کے بعد مفتی صاحبؒ کے خادم بھائی عبد الحلیم نے آکر پوچھا کہ کھانا تیار ہے لے آؤں؟ مفتی صاحبؒ نے مجھ سے پوچھا کہ مولوی زاہد کیا خیال ہے؟ کھانا پہلے کھالیں یا پہلے نماز پڑھ لیں۔ میں نے عرض کیا کہ پہلے نماز پڑھ لیتے ہیں پھر اطمینان سے کھانا کھائیں گے۔ مفتی صاحبؒ نے اس پر یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ کیا مطلب! اطمینان کا تعلق کھانے کے ساتھ ہے یا نماز کے ساتھ؟ پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر اطمینان کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔

ایک موقع پر حضرت مفتی صاحبؒ نے کہا کہ مسلمانوں پر حکمران انہیں میں سے چنے جانے چاہئیں اور فرمایا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! اللہ تعالی کی اطاعت کرو، اللہ تعالی کے رسولؐ کی اطاعت کرو واُولی الاَمر منکم اور ان حکمرانوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا استدلال ''منکم'' سے تھا کہ مسلمان حکمرانوں کا انتخاب خود ان میں سے ہی ہونا چاہیے۔

بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں لیکن کالم میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے اس لیے چند باتوں پر اکتفا کرتے ہوئے دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہمیں ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دور نبویؐ میں اسلامی ریاست کا نقشہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲ ستمبر ۲۰۱۶ء)

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے قبل یثرب کے علاقہ میں ریاست کا ماحول بن چکا تھا اور اس خطہ میں قبائلی معاشرہ کو ایک باقاعدہ ریاست و حکومت کی شکل دینے کی تیاریاں مکمل تھیں۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق انصار مدینہ کے قبیلہ بنو خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ نے آنحضرتؐ کو بتایا کہ آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے اس بحیرہ (سمندر کے کنارے ساحلی پٹی) کے لوگوں نے باقاعدہ حکومت کے قیام کا فیصلہ کر کے عبداللہ بن اُبی کو اس کا سربراہ منتخب کر لیا تھا اور صرف تاج پوشی کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا کہ آپ یعنی جناب نبی اکرمؐ تشریف لے آئے جس سے عبداللہ بن اُبی کی بادشاہی کا خواب بکھر گیا۔ البتہ وہ ریاست تشکیل پا گئی اور اس کے لیے جناب رسول اللہؐ نے اس خطہ کے قبائل کے درمیان ''میثاق مدینہ'' کے عنوان سے معاہدہ کرا دیا جس میں حضورؐ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ ''ریاست مدینہ'' کا نقطۂ آغاز تھا اور آنحضرتؐ کی تشریف آوری سے اس ریاست کو نظریاتی اساس فراہم ہوئی جس کی وجہ سے اسے علاقائی محدودیت سے نکال کر دنیا کی وسعت کے ایسے امکانات میسر آ گئے کہ یہ ریاست جناب رسول اللہؐ کے وصال تک صرف دس سال کے عرصہ میں پورے جزیرۃ العرب کا احاطہ کر چکی تھی اور اس کے بعد ربع صدی کے اندر ایشیا، یورپ اور افریقہ کے بہت سے علاقوں کو اس نے اپنے دائرہ میں شامل کر لیا تھا۔

ریاست کی تعریف عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ کسی متعیّنہ علاقہ کے رہنے والے لوگ ایک باقاعدہ حکومتی نظم کے تحت زندگی بسر کر رہے ہوں تو وہ علاقہ ریاست کہلاتا ہے۔ چنانچہ ریاست مدینہ کو یہ حیثیت انحضرتؐ کے دور میں حاصل ہو گئی تھی کہ ایک مستحکم نظام حکومت قائم تھا جس میں (۱) مشاورت (۲) داخلی نظم ونسق (۳) دفاع (۴) معیشت (۵)

عدلیہ اور (۶) خارجہ تعلقات و معاہدات کے اہم شعبے منظم طریقہ سے کام کر رہے تھے۔ جبکہ اس ریاست کی حدود بھی متعیّن اور واضح تھیں جیسا کہ غزوۂ تبوک سے ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ سلطنت روم کی افواج مدینہ منورہ پر چڑھائی کے لیے شام میں تیاریاں کر رہی ہیں، شام اس وقت رومی سلطنت کا صوبہ تھا اور بتایا جاتا ہے کہ خود قیصر روم اس حملہ کی تیاریوں کے لیے شام میں موجود تھا، جناب نبی اکرمؐ نے ان اطلاعات پر یہ فیصلہ کیا کہ رومی فوجوں کو مدینہ منورہ پر حملے کا موقع دینے کی بجائے خود پیش قدمی کر کے شام کے علاقہ کو میدان جنگ بنایا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے بھاری لشکر تیار کر کے شام کی طرف سفر شروع کر دیا لیکن تبوک جاکر رک گئے جو کہ شام کی سرحد پر واقع ہے اور آج بھی سعودی عرب کا سرحدی شہر ہے۔ آپؐ وہاں سے آگے نہیں بڑھے اور ایک ماہ تک وہیں قیام کر کے رومی فوجوں کے حملہ کا انتظار کرتے رہے۔ قیصر روم کو جب پتہ چلا کہ نبی اکرمؐ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے تبوک تک آگئے ہیں تو اسے حملہ کی ہمت نہیں ہوئی اور آپؐ تبوک کے علاقہ میں ایک ماہ قیام کرنے کے بعد لشکر سمیت مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔

تبوک مدینہ منورہ سے اس وقت ایک ماہ کی مسافت پر تھا اور اسی واقعہ کے حوالہ سے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ ”نصرت بالرعب میسرۃ شہر“ ایک ماہ کی مسافت سے دشمن پر رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے۔ غزوۂ تبوک سے دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ ایک مقصد یہ بھی حاصل ہوا کہ اسلامی ریاست اور رومی سلطنت کے درمیان بین الاقوامی سرحد کا تعین ہو گیا اور یہ تعین خود جناب نبی اکرمؐ کے عمل سے ہوا۔ اسی طرح جناب رسول اللہؐ نے وصال سے قبل جو چند ہدایات دی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ”اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب“ کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے وصال کے وقت جزیرۃ العرب اسلامی ریاست کے دائرہ میں شامل ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے دو انتہائی کنارے یمن اور بحرین بھی اس ریاست کا حصہ بن گئے تھے جہاں رسول اکرمؐ کے احکامات جاری ہوتے تھے۔

اسلامی ریاست اور دوسرے ممالک کے درمیان سرحدات کا تعین نہ صرف یہ کہ واضح تھا بلکہ حضورؐ نے ان سرحدات کے احترام کا بھی حکم دیا تھا۔ جیسا کہ ترمذی شریف کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں ان کا رومی حکومت کے

ساتھ کچھ عرصہ تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تھا، اس معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے چند روز قبل حضرت معاویہؓ نے دمشق سے اسلامی فوجوں کو روم کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا اور خود کمان کرتے ہوئے روم کی سمت روانہ ہوگئے۔ سفر کے کچھ مراحل طے کر چکے تھے کہ ایک بزرگ صحابیِ رسول حضرت عمرو بن عبسہؓ تیز رفتاری کے ساتھ ان کا تعاقب کر کے لشکر تک پہنچے اور حضرت معاویہؓ کو یاد دلایا کہ ان کا ایک متعیّن مدت تک رومیوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ موجود ہے تو وہ لشکر ساتھ لے کر روم کی طرف پیش قدمی کیوں کر رہے ہیں؟ حضرت معاویہؓ نے ان سے کہا کہ مجھے بھی وہ معاہدہ یاد ہے اور مدت بھی معلوم ہے جس کی خلاف ورزی کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ البتہ میں نے یہ حکمت عملی اختیار کی ہے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے قبل روم کی سرحد پر لشکر پہنچا دوں تاکہ مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر سکوں۔ اس پر حضرت عمرو بن عبسہؓ نے بتایا کہ میں نے جناب رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ تمہارا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو تو معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے قبل اپنی فوجوں کو مرکز سے حرکت نہ دو۔ حضرت معاویہؓ نے اس پر حضرت عمرو بن عبسہؓ سے صرف یہ سوال کیا کہ کیا یہ بات حضورؐ سے آپ نے خود سنی ہے؟ انہوں نے اس کا جواب ہاں میں دیا تو حضرت معاویہؓ نے کسی حیل و حجت کے بغیر لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا اور خود اس کی قیادت کرتے ہوئے دمشق لوٹ گئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اسلامی ریاست کا نقشہ بالکل واضح تھا، اس کی سرحدات متعیّن تھیں اور بین الاقوامی سرحدات کے بارے میں واضح قوانین و ضوابط بھی موجود تھے، اس لیے یہ کہنا کہ اسلام کے دور اول میں ریاست، حکومت، یا سرحدات کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا، تاریخ سے بے خبری یا تاریخی حقائق کو شکوک و شبہات کے دھندلکوں میں غائب کر دینے کی ناکام کوشش ہی کہلا سکتا ہے۔

قرآنِ کریم اور سماج باہم لازم و ملزوم ہیں

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۸ اگست ۲۰۱۶ء)

سماج اور سوسائٹی کے حوالہ سے ایک اور پہلو پر کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ انسان کی اجتماعی عقل غلطی نہیں کرتی اور سوسائٹی کی

مشترکہ سوچ کے غلط ہونے کا امکان بہت کم ہوتا ہے، اس لیے سماجی ارتقاء جو شکل اختیار کرلے وہی حرف آخر قرار پاتا ہے، نہ ہی اس کی نفی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس کو ”ریورس گیئر“ لگ سکتا ہے۔ چنانچہ انسانی سوسائٹی کی موجودہ معاشرتی صورتحال کو اسی لیے معیار سمجھا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ اگر سماج کی اجتماعی غلطیوں میں سے کسی کی قرآن و سنت کی روشنی میں نشاندہی کی جاتی ہے تو یہ کہہ کر چپ کرانے کی کوشش شروع ہوجاتی ہے کہ یہ تو سماجی ترقی اور معاشرتی ارتقاء کے ثمرات ہیں جبکہ قرآن کریم اور سنت نبویؐ میں چودہ سو سال قبل کے سماج اور معاشرے کی بات کی گئی ہے، اس لیے آج کے مسائل کو آج کے سماج کے حوالہ سے ہی دیکھنا چاہیے۔ یوں ان معاملات میں قرآن و سنت کی بات کرنا گویا ”آوٹ آف ڈیٹ“ قسم کی کوئی بات سمجھ لی جاتی ہے (نعوذباللہ)۔ یہاں دو باتیں خصوصاً قابل توجہ ہیں۔

ایک یہ کہ کیا قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چودہ سو سال قبل کے معاملات میں ہی نسل انسانی کی راہ نمائی کی ہے یا روئے زمین پر نسل انسانی کی بقا تک کے تمام ادوار کے مسائل کے بارے میں بھی راہنمائی کا سامان فراہم کیا ہے؟ اس لیے کہ جب ہم عقیدے کی بات کرتے ہیں تو یہ بات کم و بیش ہم میں سے ہر شخص کی زبان پر ہوتی ہے کہ حضرت محمدؐ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور قرآن کریم میں آئندہ کے ہر زمانہ کے لیے ہدایت اور راہ نمائی کا سامان موجود ہے۔ لہٰذا اگر ہمارا عقیدہ یہ ہے تو پھر آج کا سماج بلکہ اب سے صدیوں بعد کا سماج بھی پابند ہے کہ وہ قرآن و سنت سے راہ نمائی حاصل کرے اور اپنے معاشرتی ارتقاء اور سماجی ترقی کا قرآن و سنت کی روشنی میں جائزہ لیتا رہے۔ تاکہ وہ معاملات جو رفتہ رفتہ خودبخود سماج کا حصہ بن جاتے ہیں ان میں سے آسمانی تعلیمات کے منافی امور کی چھانٹی کرکے سماج کو ان سے پاک کرنے کی جدوجہد کی جا سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہؐ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے والے ہزاروں انبیاء کرامؑ کی تعلیمات پر ایک نظر ڈال لی جائے کہ سماجی ارتقاء اور معاشرتی ترقی کے بارے میں ان کا طرز عمل کیا تھا اور انہوں نے سوسائٹی کے اجتماعی فیصلوں اور طرز عمل کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا تھا؟ اسے ہم قرآن کریم کے حوالہ سے دیکھیں تو کچھ اس طرح کا نقشہ سامنے آتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے بعد انسانی سوسائٹی نے جو ترقی کی تھی اور اس دوران جو سماجی ارتقاء عمل میں آیا تھا، حضرت نوح علیہ السلام نے اسے من وعن قبول نہیں کیا تھا۔ بلکہ اگر اس سماجی ارتقاء کو من وعن

باقی رکھنا مقصود ہوتا تو سرے سے حضرت نوحؑ کی بعثت کی بظاہر کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حضرت نوحؑ کی تشریف آوری کا مقصد اس وقت تک کے ترقی یافتہ سماج اور سوسائٹی کے ارتقاء کی غلط باتوں کی نشاندہی کر کے انسانی معاشرہ کو ان سے نجات دلانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا اور اس ثابت قدمی کے ساتھ کیا کہ کم و بیش ایک ہزار سال تک اس سماج کی غلط روایات کے خلاف آواز بلند کرتے رہے، حالانکہ وہ اس وقت تک کا ترقی یافتہ سماج تھا اور کئی نسلوں کے معاشرتی ارتقاء پر اس کی بنیاد تھی۔

حضرت نوحؑ کے بعد مختلف زمانوں میں جتنے پیغمبر آئے انہوں نے سماج کے غلط عقائد و روایات کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ ان کے خلاف پوری قوت کے ساتھ آواز اٹھائی۔ ان کی یہ صدا صرف غلط عقائد و عبادات اور مشرکانہ طریقوں کے خلاف نہیں تھی بلکہ غلط معاشرتی روایات و اقدار بھی ان کی جدوجہد کا ہدف تھے۔ مثال کے طور پر حضرت شعیب علیہ السلام نے جب تجارتی بددیانتی اور ماپ تول میں کمی کے معاشرتی رجحان کی مذمت کی تو قوم نے بطور طنز ان سے کہا کہ اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ان نفعل فی اموالنا ما نشاء کہ تم ہمیں اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے ساتھ تصرف کرنے سے منع کرتے ہو؟

اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے شرک و کفر کے ساتھ ساتھ ”ہم جنس پرستی“ کی بھی مذمت کی اور قوم کو اس ملعون و مذموم حرکت سے منع کرتے رہے۔ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو فرعون نے باقاعدہ یہ طعنہ دیا کہ تم ہماری مثالی تہذیب کو مٹانے آئے ہو اور اپنی قوم سے کہا کہ موسیٰ اور ہارون تمہارے سامنے اس لیے آئے ہیں کہ تمہارے وطن پر قبضہ کر لیں۔ ویذھبا بطریقتکم المثلی اور تمہارے آئیڈیل نظام اور تہذیب کو مٹا ڈالیں۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا مقصد صرف توحید کا پرچار اور شرک کا خاتمہ تھا اور انہیں سماج اور سوسائٹی کے دیگر معاملات سے کوئی غرض نہیں تھی، انسانی تاریخ اور قرآن کریم سے افسوسناک حد تک بے خبری کی علامت ہے۔

اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور جدوجہد پر بھی نظر ڈال لیجیے کہ آنحضرتؐ نے اس وقت کے پورے جاہلی نظام اور تہذیب پر تنقید کی اور ہر شعبہ میں آسمانی تعلیمات کے منافی تہذیبی اقدار و روایات کی نفی کرتے ہوئے انسانی سوسائٹی کو ان سے نجات دلائی۔ ان میں شرک و بت پرستی کے ساتھ

ساتھ (۱) شراب نوشی (۲) جوا (۳) سود (۴) فحاشی و عریانی (۵) زنا (۶) رقص و سرود (۷) ہم جنس پرستی (۸) رنگ و نسل کی بنیاد پر باہمی تفاخر (۹) قبائلی عصبیت اور (۱۰) لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے جیسی بہت سی دیگر سماجی لعنتیں شامل تھیں۔ حالانکہ یہ سب قدریں اس وقت تک کے معاشرتی ارتقاء کا نتیجہ تھیں اور ''اپ ٹوڈیٹ سماج'' کا حصہ تھیں۔ حتی کہ نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں کل امر الجاھلیۃ موضوع تحت قدمی کا تاریخی اعلان فرمایا کہ آج جاہلی سماج کی تمام قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔

اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ مذہب صرف عقیدہ و عبادت اور اخلاقیات کی بات نہیں کرتا بلکہ سماجی روایات و اقدار بھی اس کی محنت کا ہدف ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس حقیقت کو بھی ذہنوں میں ہر وقت تازہ رکھنے کی ضرورت ہے کہ اصل معیار سماجی ارتقاء نہیں بلکہ آسمانی تعلیمات ہیں، جبکہ وحی الٰہی کے منافی ہر سماجی قدر اور معاشرتی روایت ''ردی کی ٹوکری'' کی نذر کر دینے کے لائق ہوتی ہے اور اس کی اصل جگہ موضوع تحت قدمی ہی ہے۔

کیا قرآن کریم اور سماج کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے؟

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۶ اگست ۲۰۱۶ء)

ایک فاضل دوست نے شکوہ کیا ہے کہ جب ہم سماجی مطالعہ اور معاشرتی ارتقاء کی بات کرتے ہیں تو کچھ لوگ قرآن کریم کی آیات پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ محترم دانشور کے ایک حالیہ کالم میں یہ بات پڑھ کر بے حد تعجب ہوا اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا قرآن کریم اور سماجی مطالعہ ایک دوسرے سے ایسے لاتعلق ہیں کہ سماج کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے قرآن کریم کو (نعوذ باللہ) لپیٹ کر ایک طرف رکھ دینا چاہیے؟ اور کیا ہماری دانش خدانخواستہ اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ سوسائٹی اور سماج کے معاملات کو دیکھتے ہوئے قرآن کریم کا حوالہ بھی اسے اجنبیت کی فضا میں لے جاتا ہے؟ جبکہ قرآن کریم تو نازل ہی سماج کے لیے ہوا ہے اور سماج کے ہر مرحلہ اور معاملہ میں نسل انسانی کی واضح راہ نمائی کرتا ہے۔ آئیے ذرا دیکھتے ہیں کہ انسان کے سماجی معاملات میں قرآن کریم ہماری کس طرح راہنمائی کرتا ہے۔

انسانی سوسائٹی کا آغاز دو افراد یعنی حضرت آدم و حواء علیہما السلام سے جنت میں ہوا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے کہا ''اسکن انت وزوجک الجنۃ'' کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں سکونت اختیار کرو۔ اور ساتھ ہی پابندی لگا دی کہ جنت کے سارے پھل کھا سکتے ہو مگر ایک پھل کھانے کی ممانعت ہے، اس کے قریب بھی مت جانا۔ اس طرح انسانی سوسائٹی کا آغاز جنت میں سکونت اور جائز و ناجائز کی پابندیوں کے ساتھ ہوا۔ اور جب اس پابندی کی خلاف ورزی پر اس جوڑے کو زمین پر اتر جانے کا حکم ہوا تو اسے بتایا گیا کہ

1. تمہارے لیے زمین میں ایک مقررہ وقت تک کے لیے مستقر (رہنے کی جگہ) اور متاع (زندگی کے اسباب) میسر ہوں گے، اور
2. میری طرف سے ہدایات آتی رہیں گی کہ زمین پر رہ کر آپ لوگوں اور آپ کی اولاد نے کیا کرنا ہے۔

گویا زمین پر انسانی سوسائٹی اور آبادی کا آغاز ایک جوڑے سے ہوا جس کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر رکھی گئی اور آسمانی تعلیمات کی پابندی کو انسانی سوسائٹی کی کامیابی کا معیار قرار دیا گیا۔ اس مقام پر مجھے بعض حضرات کے اس سوال پر حیرت ہوتی ہے کہ کیا سوسائٹی اور مذہب کا آپس میں کوئی تعلق ہوتا ہے؟ اس لیے کہ اگر مذہب سے مراد آسمانی تعلیمات ہیں تو قرآن کریم نے انسانی سوسائٹی کی بنیاد ''امایاتینکم منی ھدی'' فرما کر انہی آسمانی تعلیمات کو قرار دیا ہے۔ خدا جانے ان دوستوں کو سوسائٹی اور مذہب کے اس واضح باہمی تعلق کے علاوہ اور کون سے تعلق کی تلاش ہے؟

فرد، خاندان، سوسائٹی، اور ریاست انسانی سماج کے چار مراحل ہیں۔ قرآن کریم میں انسانی زندگی کے ان چاروں مراحل کے لیے ہدایات اور تعلیمات تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم انسانی سوسائٹی کا آغاز فرد سے نہیں بلکہ خاندان سے کرتا ہے۔ ''بث منھما رجالا کثیرا ونسآءا'' کہہ کر قرآن کریم نے فرد کی بجائے فیملی کو انسانی سماج کا بنیادی یونٹ قرار دیا ہے جس سے مغرب کے ''فردیت'' (Individualism) کے فلسفہ کا کھوکھلا پن آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور جب انسانی سماج فیملی اور سوسائٹی کے مرحلہ سے آگے بڑھ کر ریاست کے دور میں داخل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے توراۃ کی صورت میں ایک باضابطہ حکومتی نظام نازل کر کے اس کی پابندی کا حکم دیا اور فرمایا ''ومن لم

یحکم بمآانزل اللہ فاولئک ھم الکافرون‘‘ کہ جو آسمانی تعلیمات کے مطابق حکومت نہیں کریں گے وہ کافر شمار ہوں گے۔ اسی سسٹم کے تحت حضرت داؤد علیہ السلام نے خلافت سنبھالی تو انہیں حکم ہوا کہ حکومت و خلافت کے فیصلے آسمانی تعلیمات کے مطابق کرنے ہیں اور اس سلسلہ میں انسانی خواہشات کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر اس سسٹم نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نسلی اور قومی ریاست سے عالمی نظام کی طرف پیش رفت کی تو انہیں بھی یہی حکم ہوا کہ ’’وان احکم بینھم بمآانزل اللہ‘‘ کہ لوگوں کے درمیان آسمانی تعلیمات کے مطابق حکم کریں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے زندگی بھر سیاسی، عدالتی، فوجی، معاشی، معاشرتی، خاندانی، اور دیگر تمام معاملات میں وحی الٰہی کو ہی اپنے فیصلوں اور احکام کی بنیاد بنایا۔ اور جب جناب رسول اللہؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کے جانشین اور خلیفہ بنے تو انہوں نے قرآن و سنت کو ریاست و حکومت کے تمام معاملات کی اساس قرار دینے کا ہمیشہ کے لیے اعلان کر دیا۔ اس لیے اسلام کے نزدیک قیامت تک خاندان، سوسائٹی، اور ریاست کی یہی اساس رہے گی۔

مغرب نے اگر اپنے مذہب میں وقت کے ساتھ آگے بڑھنے کی استعداد نہ دیکھ کر سوسائٹی اور سماج کو آسمانی تعلیمات سے لاتعلق کر لیا ہے تو یہ اس کا مسئلہ ہے۔ ہمیں ایسی کوئی مجبوری درپیش نہیں ہے کیونکہ قرآن و سنت دونوں اصلی حالت میں موجود و محفوظ ہیں اور ان کی تعلیمات میں ’’اجتہاد و تجدید‘‘ کے عنوان سے وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے اور ہر دور کے مسائل و مشکلات کو بخوبی حل کرنے کی گنجائش بھی پوری طرح موجود ہے جس سے ہر زمانے میں بھرپور استفادہ کیا گیا ہے، آج بھی کیا جا رہا ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

مغرب کا المیہ یہ ہے کہ اس کے پاس آسمانی تعلیمات محفوظ و مستند حالت میں موجود نہیں ہیں۔ اور جو کسی حد تک موجود بتائی جاتی ہیں ان کی تعبیر و تشریح کی بنیاد دلیل اور استدلال پر نہیں بلکہ ’’پاپائی صوابدید‘‘ (کیتھولک) یا پھر سوسائٹی کی اجتماعی خواہش (پروٹسٹنٹ) پر ہے۔ یعنی ایک طرف مکمل جمود ہے اور دوسری طرف بے لگام خواہشات ہیں۔ اسلام ان دونوں انتہاؤں سے پاک اور بری ہے اور انسانی سماج کے ہر مرحلہ اور دور کے معاملات کو قرآن و سنت کی تعلیمات کے دائرے میں سنبھالنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے مہربان دانشوروں سے گزارش ہے کہ ہمیں قرآن اور سماج

کے آپس میں لاتعلق ہونے کی تھیوری نہ پڑھائی جائے۔ قرآن کریم اور سماج آپس میں لازم وملزوم ہیں اور آسمانی تعلیمات کے ساتھ انسانی سوسائٹی کی وفاداری کے اسی تعلق پر نسل انسانی کی فلاح ونجات کا مدار ہے۔ البتہ ہماری جدید دانش کی موجودہ نفسیاتی کیفیت دیکھ کر پنجابی کا یہ محاورہ یاد آنے لگتا ہے کہ ”پڑوسی کا منہ سرخ ہو تو اپنا منہ تھپڑ مار کر سرخ نہیں کر لینا چاہیے“۔

دینی مدارس اور ہمارے معاشرے کی دینی ضروریات

(جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۲۲ جولائی ۲۰۱۶ء)

شوال المکرم کے وسطی عشرہ کے دوران پورے جنوبی ایشیا میں پھیلے ہوئے ہزاروں بلکہ لاکھوں دینی مدارس کے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سال مختلف دینی مدارس میں تعلیمی سال کے افتتاح خصوصاً بخاری شریف کے سبق کے آغاز کی تقریبات میں شرکت اور گفتگو کا موقع ملا جس کا سلسلہ ابھی جاری ہے، جبکہ ۱۸ شوال کو جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں بھی مختصر گفتگو اور دعا کے ساتھ اسباق کا آغاز ہو چکا ہے۔ ان مواقع پر کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج کل جنوبی ایشیا اور سارک ممالک میں ہر طرف دینی مدارس کے تعلیمی سال کے آغاز کی تقریبات ہو رہی ہیں۔ اس لیے ان دینی مدارس کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو پورے جنوبی ایشیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کے اثرات اور دائرہ کار میں دن بدن توسیع دیکھنے میں آ رہی ہے۔ پرائیویٹ سطح پر امداد باہمی کی بنیاد پر کسی سرکاری تعاون کے بغیر دینی مدارس کا یہ نظام جنوبی ایشیا کے طول وعرض میں پھیلا ہوا ہے اور عالمی سطح پر اس کا کردار اور دائرہ تعلیم مستقل طور پر بہت سے حوالوں سے موضوع بحث ہے۔ لیکن اس وقت اس کے صرف ایک پہلو پر چند معروضات پیش کروں گا کہ اس نظام کی ضرورت کیا ہے اور اس قسم کے دینی مدارس جنوبی ایشیا کے علاوہ باقی دنیا میں اپنا اس طرح کا نظام کیوں نہیں رکھتے؟

ہمارے ایک عزیز شاگرد حافظ احسان اللہ ظفر وال ضلع نارووال سے تعلق رکھتے ہیں، وہ گزشتہ دنوں تبلیغی جماعت کے ساتھ بیرون ملک ایک سال لگا کر واپس آئے تو میں نے ان سے سفر کی روداد معلوم کرنا چاہی۔ ان کا زیادہ وقت سوڈان میں گزرا تھا اس لیے گفتگو کے

دوران ان سے سوڈان کے دینی مدارس کے حالات کے بارے میں پوچھا توانہوں نے بتایا کہ وہاں ہماری طرح کے دینی مدارس کا کوئی سسٹم موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ ان کے خیال میں یہ ہے کہ سوڈان کے ریاستی تعلیمی نظام میں دینی تعلیم باقاعدہ طور پر شامل ہے اور سرکاری سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے طلبہ اور طالبات کو انٹرمیڈیٹ تک قرآن کریم، حدیث و سنت اور فقہ و شریعت کا ایک متوازن نصاب اس طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ دینی تعلیم کے لیے الگ نظام کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

میرے خیال میں دیگر عرب ممالک میں بھی اسی قسم کی صورتحال ہے کہ عربی زبان مستقل طور پر الگ سے پڑھانے کی وہاں ضرورت نہیں ہوتی اس لیے کہ صرف و نحو اور ادب و معانی سے متعلقہ مضامین ان کے معمول کے نصاب کا حصہ ہوتے ہیں۔ اور دینی تعلیم کے حوالہ سے ان کی ضرورت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ قرآن کریم، حدیث و سنت اور فقہ و شریعت کا متوازن سا نصاب طلبہ اور طالبات کو پڑھا دیا جائے جو کہ اکثر عرب ممالک میں پڑھایا جا رہا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں صورتحال دو حوالوں سے مختلف ہے۔ ایک اس حوالہ سے کہ قرآن و حدیث اور دیگر علوم تک رسائی کے لیے عربی زبان کی اس درجہ کی تعلیم ہماری بنیادی ضرورت ہے جس سے یہ رسائی مہارت کی حد تک حاصل ہو جائے، چنانچہ ہمارے درس نظامی کے نصاب کا ایک بڑا حصہ ان فنون پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کی تعلیم بھی ہمارے لیے ایک حد تک ضرورت کا درجہ رکھتی ہے کہ صدیوں تک یہ ہماری دفتری، عدالتی اور تعلیمی زبان رہی ہے اور ہمارے علوم کا ایک بڑا حصہ اس زبان میں محفوظ ہے۔ اور دوسرا اس حوالہ سے کہ ہمارا ریاستی نظام دینی تعلیم کو اپنی ذمہ داری میں شامل کرنے کے لیے ابھی تک تیار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ دینی تعلیم کا بالکل ابتدائی درجہ جس میں صرف ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے اسے بھی سرکاری تعلیمی نصاب کا کبھی حصہ نہیں بنایا گیا۔ کچھ عرصہ قبل وفاقی محتسب اعلیٰ نے وزارت تعلیم کو حکم دیا تھا کہ ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم کو سرکاری سکولوں میں یقینی بنایا جائے تو اس پر یہ کہہ کر باقاعدہ معذرت کر دی گئی کہ ہمارے پاس سکولوں کی تعداد کے مطابق قرآن کریم پڑھانے والے اساتذہ کی فراہمی اور ان کی تنخواہوں کے لیے فنڈز کا بندوبست موجود نہیں ہے اس لیے اس حکم پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جو تعلیمی نظام ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے

تیار نہ ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ معاشرہ میں دینی تعلیم کی ضروریات کو پورا کرے گا، محض خوش فہمی بلکہ خود فریبی ہی کہلا سکتا ہے۔

دوسری طرف دینی تعلیم کے حوالہ سے معاشرتی ضروریات پر ایک نظر ڈال لی جائے:

1. مساجد میں نماز پڑھانے کے لیے امام، جمعہ کا خطبہ دینے کے لیے خطیب، اور بچوں کو قرآن کریم پڑھانے کے لیے حفاظ و قاریوں کی ضرورت ہے جو ظاہر ہے کہ ضروری دینی تعلیم سے آراستہ ہونے چاہئیں۔
2. دینی مدارس میں دینی علوم کے مختلف شعبوں میں تعلیم دینے کے لیے مستند اور تجربہ کار اساتذہ ہماری اہم ضرورت ہیں۔
3. عام مسلمانوں کو حلال و حرام، جائز و ناجائز، اور فرائض و واجبات کے ضروری مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے مستند مفتی صاحبان کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے، وغیر ذلک۔

یہ چند ضروریات بالکل عام سطح کی ہیں جن کا ماحول عملاً موجود ہے اور جن کا تقاضہ ملک بھر میں عام طور پر مسلسل جاری رہتا ہے۔ اگر ملک کے دستوری تقاضوں کے مطابق اسلامی نظام کے نفاذ اور قرآن و سنت کے مطابق انتظامی و عدالتی نظام کو بھی قومی اور معاشرتی ضرورت سمجھ لیا جائے تو ان ضروریات کا دائرہ بہت پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف ان معاشرتی دینی ضروریات کو دیکھ لیں اور دوسری طرف ریاستی تعلیمی نظام پر نظر ڈال لیں کہ وہ ان میں سے کوئی ایک ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ اس صورتحال میں دینی مدارس کے موجودہ نظام کی صحیح قدر و قیمت سامنے آتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دینی مدارس ہماری کس درجہ کی معاشرتی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں اور کتنے بڑے خلاء کو پر کیے ہوئے ہیں۔

بلاشبہ یہ دینی مدارس ہمارے لیے نعمت خداوندی ہیں اور مسلم معاشرہ میں عام مسلمان کا قرآن و سنت کے ساتھ تعلق باقی رکھنے کے ساتھ ساتھ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا شعور بیدار کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نظر بد سے بچائیں اور ہر قسم کی سازشوں سے محفوظ رکھتے ہوئے اپنا معاشرتی کردار جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۷ جولائی ۲۰۱۶ء)

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جولائی ۲۰۱۶ء)

(جناب محمد ظفر اقبال کی تصنیف کے دوسرے ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔)

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

ضرورت کے مطابق علم اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو مرحمت فرمایا ہے لیکن علم میں وسعت، ارتقاء اور اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے کی صلاحیت انسان کو ودیعت ہوئی ہے جو نسل انسانی کا اختصاص ہے۔ اور بعض مفسرین کرام کے مطابق یہی خصوصیت "وعلم آدم الاسماء کلھا" (سورہ البقرہ ۳۱) کے حوالہ سے فرشتوں پر انسان کی برتری کا ذریعہ بنی تھی۔ اپنے محدود وقت اور ضرورت کے مطابق علم چیونٹی کو بھی حاصل ہے کہ اسے زندگی گزارنے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے استفادہ کرنے اور نمٹنے کے لیے ضروری علم اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اس کی روشنی میں ایسی منظم اور مربوط زندگی گزارتی ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی طرح باقی تمام جانوروں کو بھی پیدا ہوتے ہی ان کی زندگی کے بارے میں بنیادی معلومات میسر ہوتی ہیں، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ ان میں اتنا ہی اضافہ ہو پاتا ہے جو ان کی زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے جبکہ اس سے ہٹ کر انہیں کسی اور بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اسے "فطرت نوعیہ" سے تعبیر کرتے ہیں کہ جانوروں کی ہر نوع کو زندگی گزارنے کے لیے ضروری معلومات قدرتی طور پر ودیعت ہوتی ہیں اور یہ سب کچھ وہبی ہوتا ہے کسبی نہیں۔ مشاہدہ وتجربہ سے اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ تو ہو جاتا ہے لیکن خود اس علم یا معلومات کی بنیاد کسی کسب اور محنت پر نہیں ہوتی۔ یہی حال حضرت انسان کا بھی ہے کہ اپنے نوعی اختصاص کے مطابق پیدائش کے ساتھ ہی اسے بنیادی باتوں کا شعور ہوتا ہے جس کا اندازہ دو چھوٹی سی مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچے کے جسم کو خوراک ملنے کا ذریعہ ناف کی نالی ہوتی ہے جو اس کے پیدا ہو جانے کے بعد کاٹ دی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بھوک لگنے کی صورت میں بچہ ناف کو حرکت دینے کی بجائے منہ کو حرکت دینے لگتا ہے اور ماں کے سینے سے چمٹ کر ہونٹ ہلانے لگ جاتا ہے کہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھے خوراک اس راستے سے

ملے گی اور ماں کے سینے سے ملے گی۔ یہ اسے کسی نے دنیا میں آنے کے بعد بتایا نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس حوالہ سے اس سے قبل کسی تجربہ و مشاہدہ سے گزرا ہے لیکن اس کے اندر کی کوئی چیز اسے یہ کچھ کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی طرح کی دوسری مثال یہ ہے کہ معصوم اور گود کے بچے کو جب آنکھ میں خارش ہوتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا علاج کھجلانا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ آنکھوں تک لے جاتا ہے اور کھجلاتا بھی انگلیوں سے نہیں بلکہ ہاتھ کی پشت سے ہے کیونکہ اس کے شعور میں یہ بات شامل ہے کہ انگلیوں اور ناخنوں کے ساتھ کھجلانے سے آنکھ کو نقصان پہنچے گا، اس لیے وہ مٹھی بند کرتا ہے اور اس کی پشت سے آنکھ کھجلاتا ہے۔

اسے آپ فطرت نوعیہ سے تعبیر کریں، نوعی شعور کہہ لیں یا وجدان کا نام دیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے حصول میں اس کے کسی کسب اور محنت کا دخل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی خارجی تعلیم و تربیت اس کے اس وجدان و شعور کا باعث بنی ہے بلکہ یہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہبی طور پر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ نسل انسانی کی رسمی تعلیم کا آغاز بھی قرآن کریم نے ”وعلم آدم الاسماء کلھا۔۔۔ الخ“ کی صورت میں وہبی ہی بیان فرمایا ہے۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ انسانی علم و شعور کی بنیاد کسب پر نہیں بلکہ وہب و عطیہ پر ہے۔ البتہ اس میں ترقی و وسعت اور اسے زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنانے میں انسان کا کسب، محنت اور صلاحیت ذریعہ بنتی ہے۔ اور چونکہ انسان کی زندگی صرف دنیا تک محدود نہیں ہے اور اس کی تگ و دو کا دائرہ بھی صرف زمین کا کرہ نہیں ہے اس لیے اس کی علمی استعداد، توانائیاں، مواقع، اور سعی و محنت دنیا اور زمین کی حدود کی پابند نہیں ہے۔ بلکہ اسے اس تگ و دو کے لیے ایک وسیع دائرہ دیا گیا ہے جس کی طرف قرآن کریم کی دو آیات کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے: (۱) ”سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق“ (سورہ فصلت ۴۱۔ آیت ۵۳) عن قریب ہم اپنی نشانیاں انہیں دنیا میں دکھائیں گے اور خود ان کے نفس میں، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہی حق ہے۔ (۲) ”یعلمون ظاھرا من الحیاۃ الدنیا وھم عن الاخرۃ ھم غافلون“ (سورہ الروم ۳۰۔ آیت ۷) دنیا کی زندگی کی ظاہر باتیں جانتے ہیں اور وہ آخرت سے غافل ہی ہیں۔ چنانچہ انسان کے ذمہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کی چند روزہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے آسائش تلاش کرے، اسباب فراہم کرے، اور ان کے بہتر سے بہتر استعمال کے طریقے دریافت کرتا رہے۔ بلکہ یہ بھی اس کی نوعی ذمہ

داری میں شامل ہے کہ وہ کائنات کو وجود میں لانے والے خالق و مالک کی مرضی معلوم کرے اوراس کی مرضی و منشاء کی تکمیل کے لیے متحرک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت کی زندگی کے لیے، جو اصلی اور دائمی حیات ہے، فکرمند ہو اور اسے بہتر بنانے کو زندگی کا مقصد قرار دے۔

انسان کا المیہ یہ ہے کہ اس نے اسی دنیا کی زندگی کو اپنا واحد مقصد بنا لیا ہے اور اس کی تمام تر تگ و دو اسی کے گرد گھومنے لگی ہے۔ اسی طرح اس کی فکرمندی ”دنیا میں آگیا ہوں تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے“ کے دائرے میں محصور ہے۔ جبکہ ”کیوں آیا ہوں؟ کس نے بھیجا ہے؟ آگے کہاں جانا ہے؟“ کے بنیادی سوالات اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے ہیں جسے قرآن کریم نے ”یعلمون ظاھرا من الحیاۃ الدنیا“ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کا اندازہ اس مثال سے کر لیجیے کہ میڈیکل سائنس بلاشبہ ایک وسیع، وقیع اور مفید علم ہے جس کا موضوع انسانی جسم ہے۔ یہ علم و فن انسانی جسم کے بارے میں ہزاروں سال سے تحقیق و تجزیہ کی محنت کر رہا ہے اور اس حوالہ سے انسانی معاشرے کی بڑی خدمت کر رہا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد صرف ان سوالات پر ہے کہ انسانی باڈی کے اجزائے ترکیب کیا ہیں؟ اس کا نیٹ ورک اور میکنزم کیا ہے؟ یہ کیسے صحیح کام کرتا ہے؟ اور خرابی پیدا ہو جائے تو اسے کیسے صحیح کرنا ہے؟

لیکن انسانی جسم کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ اور اسے تخلیق کس نے کیا ہے؟ کے دو اہم ترین سوال سرے سے میڈیکل سائنس کے موضوع سے خارج ہیں۔ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ میں اس وقت جس قلم کے ساتھ لکھ رہا ہوں اس کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ اس کا مقصد وجود کیا ہے اور یہ کس فرم نے بنایا ہے۔ لیکن خود اپنے بارے میں یہ جاننا مجھے ضروری نہیں محسوس ہوتا ہے کہ میرا خالق کون ہے اور اس نے مجھے کس مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے؟

اسی طرح کائنات کی وسعتوں پر غور اور محنت کرنے والی سائنس نے بھی خود کو صرف اس سوال میں مقیّد کر رکھا ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور ہم اس سے فائدہ کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ لیکن اسے یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں ہے کہ یہ سب کچھ کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے؟ جبکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدّد مقامات پر فرمایا ہے ”وما خلقنا السمآء والارض وما بینھما لاعبین“ (سورہ الانبیاء ۲۱۔ آیت ۱۶) کہ ہم نے زمین و آسمان

اور ان کے اردگرد کائنات کو کھیل تماشے کے لیے نہیں بنایا اور ”ماخلقنا ھما الا بالحق ولکن اکثرھم لایعلمون“ (سورہ الدخان ۴۴۔ آیت ۳۹) کہ ہم نے یہ سب کچھ بامقصد پیدا کیا ہے مگر اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔ لیکن ہماری سائنس اس سب کچھ سے بے نیاز ہو کر اپنی تمام تر محنت اس نکتہ پر مرکوز رکھے ہوئے ہے کہ ہمارے اردگرد کائنات کی وسعتوں میں جو کچھ موجود ہے اسے دریافت کیسے کرنا ہے؟ استعمال میں کیسے لانا ہے؟ اس سے فائدہ کیسے اٹھانا ہے؟ اور اسے اپنے دشمن کے خلاف استعمال کیسے کرنا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں سائنس کے ان دونوں دائروں کا ذکر کیا ہے اور ان کی مقصدیت اس طرح واضح فرمائی ہے کہ ”سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق اولم یکف بربک انہ علی کل شیء شھید ٥ الآ انھم فی مریۃ من لقاء ربھم الآ انہ بکل شیء محیط“ (سورہ فصلت ۴۱۔ آیات ۵۳ و ۵۴) عن قریب ہم اپنی نشانیاں انہیں کائنات میں دکھائیں گے اور خود ان کے نفس میں، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہی حق ہے۔ کیا ان کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے؟ (۵۳) خبردار! انہیں اپنے رب کے پاس حاضر ہونے میں شک ہے، خبردار! بے شک وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے (۵۴)۔ قرآن کریم نے انفس و آفاق کی نشانیوں کے مشاہدہ و تجربات کی مقصدیت کو کتنے واضح انداز میں بیان فرمایا ہے۔ مگر ہماری سائنس کے یہ دونوں دائرے اس مقصدیت سے آنکھیں بند کر کے سائنس کے صرف دنیاوی نفع و نقصان کے گرد کولہو کے بیل کی طرح مسلسل گھوم رہے ہیں بلکہ انسان اور کائنات کی مقصدیت اور آخرت کی حقیقی اور دائمی زندگی کے بارے میں انکار و تمسخر کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

انسان کو علم کے جو ذرائع میسر ہیں انہیں عام طور پر محسوسات، مشاہدات اور معقولات کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے اور بلاشبہ یہ علم کے مؤثر ذرائع ہیں۔ لیکن کیا انسان کے پاس ان کے علاوہ علم کے حصول کا اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے؟ یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے اس لیے کہ ہمارے بہت سے علمی و فکری مسائل و مشکلات کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو بات محسوسات و معقولات کے دائرہ میں نہیں ہے اس سے عام طور پر انکار کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا محسوسات، مشاہدات اور معقولات کے دائرے سے باہر کائنات میں کوئی چیز موجود نہیں ہے؟ اس کا جواب شاید ہی کوئی باشعور شخص اثبات میں دے سکے، اس لیے کہ خود سائنس جوں جوں ترقی کر رہی ہے مسلسل ایسی چیزیں دریافت ہوتی جا رہی ہیں بلکہ

استعمال میں آرہی ہیں جو اس سے قبل نہ محسوسات میں شمار ہوتی تھیں اور نہ ہی معقولات کا دامن انہیں اپنے اندر سمیٹنے کی پوزیشن میں تھا۔ مثال کے طور پر ایک نوجوان نے مجھ سے سوال کیا کہ اگر ہمارے اردگرد فرشتے اور جن موجود و متحرک ہیں تو نظر کیوں نہیں آتے اور محسوس کیوں نہیں ہوتے؟ میں نے کہا کہ ہمارے اردگرد فضا کی جو لہریں ہماری آواز اور تصویر کو لمحہ بھر میں دنیا کے ہر کونے تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ہم انہیں پوری طرح استعمال بھی کر رہے ہیں، یہ ہمیں فضا میں دکھائی کیوں نہیں دیتیں اور محسوس کیوں نہیں ہوتیں۔ اگر یہ لہریں مشاہدات و محسوسات کے دائرہ میں آئے بغیر پوری کائنات میں موجود و متحرک ہیں تو فرشتوں کے وجود اور نظام کار سے اس بنیاد پر انکار کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے کہ وہ نظر نہیں آتے یا محسوس نہیں ہوتے۔ بلکہ محسوس نہ ہونے کی بات بجائے خود محل نظر ہے، اس لیے کہ فرشتوں کی برکات اور ان کی موجودگی کے ثمرات اہل دل کو تو ہر وقت محسوس ہوتے ہیں، عام لوگوں کو بھی بسا اوقات محسوس ہو جاتے ہیں جس کے شواہد ہمارے اردگرد بکھرے پڑے ہیں۔

یہ بات اب سائنسی طور پر بھی تسلیم کرنا پڑ رہی ہے کہ کائنات میں محسوسات اور مشاہدات کی دنیا محدود ہے اور مغیبات کا دائرہ ان سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے جو وقتاً فوقتاً دریافت ہوتے رہتے ہیں اور قیامت تک اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔ بلکہ میری طالب علمانہ رائے میں ''یؤمنون بالغیب'' کی یہ تعبیر شاید سب سے زیادہ قرین قیاس ہے کہ اہل ایمان صرف محسوسات و مشاہدات پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ مغیبات اور عالم غیب کو بھی مانتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں۔

آج کی انسانی فکر کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اس نے معقولات کو علم کا آخری درجہ اور حتمی ذریعہ قرار دے رکھا ہے اور صرف دنیا کو اپنا مقصد حیات قرار دینے کے باعث محسوسات، مشاہدات اور معقولات کی سرحدوں سے باہر جھانکنے کا اسے حوصلہ نہیں ہو رہا۔ جبکہ اس وقت تعجب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے جب محسوسات سے بھی پہلے کے درجہ یعنی وجدانیات کی کوئی توجیہ کرنا آج کی فکر و دانش کی نظر میں ایک معمہ سا بن کر رہ گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تو اسے ''فطرت نوعیہ'' کا نام دے کر واضح کر دیا ہے کہ یہ نوع انسانی کے لیے علم کی وہ اساس ہے جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے تاکہ وہ اس کی بنیاد پر اپنے علم و معلومات کا دائرہ وسیع تر کرتا چلا جائے، اس سے استفادہ کرے اور اسے بامقصد

بنانے کی سعی کرے۔ وجدان کا حس، مشاہدہ اور عقل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ان تینوں سے پہلے کا مرحلہ ہے جو ماں کی گود کے معصوم بچے کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آج کی دانش کا ایک دائرہ اسے وحی کے متبادل کے طور پر پیش کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

عقل انسان کے لیے اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے جس کے استعمال کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی ہمہ نوع افادیت وضرورت کو تسلیم کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا گیا۔ لیکن اس کی ماہیت کیا ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عقل انسان کی اس خداداد صلاحیت واستعداد کا نام ہے جو محسوسات ومشاہدات اور میسر معلومات کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتی ہے اور اسے انسان کے مستقبل کی صورت گری کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔ لیکن اس کے تجزیہ واستنباط کی بنیاد وہی معلومات ہوتی ہیں جو یہ عمل سرانجام دیتے وقت اسے میسر ہوتی ہیں۔ ان محسوسات ومشاہدات اور معلومات کا دائرہ بدل جائے تو عقل کا قائم کردہ نتیجہ بھی بدل جاتا ہے۔ وہ اس کمپیوٹر کی طرح ہے جو اپنی طرف سے کچھ نہیں دیتا بلکہ جو پروگرام اس کے اندر فیڈ ہوتا ہے اس کے مطابق نتیجہ دے دیتا ہے۔ اس پروگرام کا دائرہ بدل جائے یا اس میں وسعت پیدا ہو جائے تو کمپیوٹر کا دیا ہوا نتیجہ بھی اس کے ساتھ ہی بدل جاتا ہے۔ یہی حال عقل کا بھی ہے کہ اسے جو مشاہدات وتجربات اور معلومات میسر ہوں گے ان کے مطابق وہ نتیجہ دے گی اور اگر معلومات میں اضافہ ہوگا تو نتیجہ بھی متغیّر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ جبکہ انسانی مشاہدات، تجربات اور معلومات کو کسی جگہ قرار نہیں ہے، وہ ہر دم وسعت پذیر رہتے ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے کسی بھی مسئلہ میں عقل سے یہ توقع رکھنا کہ وہ حتمی نتیجہ دے گی اور دوٹوک بات کرے گی، محض خام خیالی ہے بلکہ ناممکنات میں سے ہے۔ عقل کی آخری انتہا ظن غالب ہے، اس سے آگے اس کے پر جلتے ہیں اور وہ کسی پرواز کے قابل نہیں رہتی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ”ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدی“ (سورہ النجم ۵۳۔ آیت ۲۳) وہ محض وہم اور اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کے ہاں سے ہدایت آچکی ہے۔

چنانچہ علم میں یقین کا درجہ حاصل کرنے کے لیے وجدانیات، محسوسات، مشاہدات اور معقولات کے بعد پھر ہمیں کسی ایسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے جو ان سب سے بالا ہو اور

یقین کی منزل سے ہمکنار کرتی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ وہ وحی الٰہی ہی ہو سکتی ہے جو علم کے ان ذرائع سے بالاتر ہے، ان کی نگران ہے، اور ان سب پر فائنل اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ آخر یہ ممکن بھی کیسے ہے کہ اتنی وسیع و عریض کائنات کے خالق نے یہ سب کچھ بنا کر اور انسان کو اس میں تصرف اور استفادے کے مواقع فراہم کر کے اسے کسی علم کے بغیر کھلا چھوڑ دیا ہو کہ جا اپنی مرضی کر، ہمارا اس کام سے اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ ایک فرم چھوٹی سی مشین بنا کر اسے استعمال کے لیے مارکیٹ کے سپرد کرتی ہے تو اس کے ساتھ بنیادی معلومات کا کتابچہ فراہم کرتی ہے تاکہ اسے صحیح طریقہ سے استعمال کیا جا سکے۔ خدا جانے کائنات کے خالق و مالک کے بارے میں یہ تصور کہاں سے آگیا ہے کہ اس نے سارا نظام وضع کر کے اسے کسی ہدایت اور نگرانی کے بغیر آزاد چھوڑ رکھا ہے۔

حضرت انسان کے پاس علم کے بنیادی ذرائع چار ہیں: (۱) وجدانیات (۲) محسوسات و مشاہدات (۳) معقولات (۴) وحی الٰہی۔ ان چاروں مراحل سے گزرے بغیر انسان کا علم مکمل نہیں ہو سکتا اور ان میں حتمی اور یقینی ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اس لیے کہ اس سے قبل کے کسبی ذرائع انسان کو ظن غالب تک پہنچا کر وہیں رک جاتے ہیں اور یقین کے حصول کے لیے اسے کسی ایسے ذریعہ کی ضرورت پڑتی ہے جس کا اپنا علم یقینی اور حتمی ہو۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہی ان سب چیزوں کا خالق و منتظم و مدبر ہے۔

آج انسانی سوسائٹی میں فکر و فلسفہ اور علم و معلومات کے حوالہ سے جو بحث جاری ہے اور انسانی ذہنوں میں اس کے پیدا کردہ کنفیوژن اور پیچیدگیوں میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ ہماری طالب علمانہ رائے میں یہ ہے کہ

- دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ قرار دے لیا گیا ہے اور آخرت کی حقیقی زندگی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئی ہے۔
- معقولات کو علم و یقین کی آخری اتھارٹی سمجھ لیا گیا ہے اور وحی الٰہی کو علم کا ذریعہ نہیں تسلیم کیا جا رہا۔
- سائنس نے انسانی جسم کے اسرار و رموز اور کائنات کے وسائل کی دریافت و استعمال کو صرف دنیا کی وقتی ضروریات تک محدود رکھا ہوا ہے۔

• انسانی وجود اور کائنات کی مقصدیت تلاش کرنے اور ان کے خالق کی منشا معلوم کرنے کی بجائے "ایڈہاک ازم" کی بنیاد پر وقتی نفع و نقصان کو ہی آخری منزل قرار دے لیا گیا ہے۔

اس تناظر میں مغرب نے جس علمی و تہذیبی سفر کا آغاز اب سے تین صدیاں قبل کیا تھا وہ اپنی منطقی انتہا کو پہنچ کر اب واپسی کے راستے تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ اور مغرب کی دانش گاہوں میں وجدانیات کی اہمیت و ضرورت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ روح کے اطمینان، زندگی کی مقصدیت، سائنس کے حقیقی اہداف، خاندانی نظام کی بحالی، اور انسانی سوسائٹی کے بہتر مستقبل کے لیے آسمانی تعلیمات سے استفادہ کے موضوعات اب بحث و مباحثہ کی ترجیحات کا حصہ بن رہے ہیں۔ لیکن مسلم دنیا کی صورت حال اس سے مختلف ہے، جس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دینے پر مغرب خود کو مجبور پا رہا ہے، ہماری "جدید دانش" اسی پتھر کو چومنے اور اٹھانے کے لیے بے چین دکھائی دے رہی ہے اور عالم اسلام میں ایسے فکری علمی مباحثوں کی ہاہاکار مچی ہوئی ہے جو "آؤٹ آف ڈیٹ" ہوتے جا رہے ہیں۔

عقل اور وحی کے مباحث کا مغرب کی دنیا میں اس وقت حال یہ ہے کہ چند ماہ قبل امریکہ کی ییل یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے بعض علماء کرام کے ساتھ گفتگو کے مرحلہ میں راقم الحروف کے پاس گوجرانوالہ تشریف لائے تو انہوں نے بتایا کہ ہم مغرب میں عقل اور آسمانی تعلیمات کے باہمی تعلق کے بارے میں مسلم متکلّمین کے افکار پر کام کر رہے ہیں اور وہ خود ان میں سے امام ابو منصور ماتریدیؒ کو اس لیے موضوع بحث بنائے ہوئے ہیں کہ ان کے ہاں عقل اور وحی کے درمیان توازن انہیں زیادہ بہتر دکھائی دیتا ہے۔

عقل کو علم کا یقینی درجہ دینے اور انسانی مسائل و مشکلات کے حل کی آخری اتھارٹی سمجھ لینے کے مغالطہ نے ہی انسانی سوسائٹی کو اس کنفیوژن سے دوچار کر رکھا ہے کہ فرد کی عقل تو ناقص ہو سکتی ہے لیکن سوسائٹی کی اجتماعی عقل (کامن سینس) ناقص اور کمزور نہیں ہوتی، اس لیے وہ تمام امور میں حکم اور اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر یہ بات مسلسل نظر انداز کی جا رہی ہے کہ اس "عقل عام" کا ماخذ اور سرچشمہ کیا ہے؟ اس نے بھی تو میسر معلومات و مشاہدات اور ظاہری محسوسات سے ہی نتائج اخذ کرنے ہیں، جبکہ کسی چیز کے بارے میں

یقینی، مکمل اور آخری معلومات کا احاطہ کر لینا فرد کی طرح سوسائٹی کی اجتماعی عقل کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔

پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ عقل عام کو امریکی معاشرے سے حاصل ہونے والے محسوسات و مشاہدات و تجربات وہی ہوں جو اسے افریقی معاشرے میں میسر ہیں۔ اور یورپ کا معاشرہ بھی وہی تجربات و محسوسات مہیا کرتا ہو جو مڈل ایسٹ کی معاشرت میں جنم لیتے ہیں۔ اس حوالہ سے دیکھا جائے تو جنوبی امریکہ کی کامن سینس شمالی امریکہ سے اور مشرق وسطی کی کامن سینس وسطی ایشیا سے مختلف ہوگی، جبکہ مشرق بعید کی کامن سینس ان سب سے مختلف تجربات سے دوچار ہوگی۔ چنانچہ گلوبل انسانی معاشرے کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی سوسائٹی کو پھر کسی اور معیار کی ضرورت پیش آئے گی جو ان سب کے معاملات طے کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

مغرب چونکہ بین الاقوامیت اور گلوبل سوسائٹی کے ماحول میں نووارد ہے اس لیے اسے یہ الجھنیں پریشان کر رہی ہیں۔ جبکہ اسلام نے چودہ سو سال قبل ”یاایھا الناس“ کے خطاب سے اس عالمیت اور گلوبلائزیشن کو اپنا دائرہ کار بنا لیا تھا بلکہ وہ دنیا کے مختلف علاقوں اور براعظموں پر محیط ادوار حکومت میں ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک ان تجربات و مشاہدات سے گزر چکا ہے۔ اس لیے اسے اس معاملہ میں کسی کنفیوژن کا سامنا نہیں ہے اور وہ بالکل کلیئر ہے کہ انسانی سوسائٹی خود اپنے تمام معاملات نمٹانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اسے بہرحال خارجی راہ نمائی اور نگرانی کی ضرورت ہے جو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات ہی ہو سکتی ہیں۔ مغرب کی دانش دھیرے دھیرے اس رخ پر آرہی ہے مگر اسے پریشانی یہ ہے کہ وحی الٰہی کا مستند و محفوظ ذخیرہ اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا معتمد ریکارڈ اسلام کے سوا کسی اور کے پاس موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس رخ پر واپس آنے کے لیے مغرب کو ”اسلام“ سے استفادہ کرنے کے سوا دوسرا کوئی آپشن میسر نہیں ہے۔

چنانچہ تاریخ اور سماج کے میرے جیسے طالب علم آج پھر اس دلچسپ منظر کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اہل کتاب اپنی کتابوں میں موجود پیش گوئیوں کی وجہ سے نبی آخر الزمانؐ کے منتظر تھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان بھی لیا تھا لیکن قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ ”حسدا من عندا نفسھم من بعد ماتبین لھم الحق“ (سورہ البقرہ ۲۔ آیت

۱۰۹) انہوں نے حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنے حسد کی وجہ سے اسے قبول نہ کیا۔ یہ حسد اس بات پر تھا کہ آخری نبوت اور وحی کا یہ اعزاز بنی اسرائیل کی بجائے بنو اسماعیل کو کیوں حاصل ہو گیا ہے۔ اس کی جھلک قیصر روم ہرقل اور قریش کے سردار حضرت ابوسفیانؓ کے درمیان ہونے والے اس تاریخی مکالمہ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو بخاری شریف میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اور جس میں قیصر روم نے نبی اکرمؐ کی نبوت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ آخری پیغمبرؐ کا مجھے بھی انتظار ہے اور یہ وہی لگتے ہیں لیکن ”مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ پیغمبر تم عرب بدوؤں میں پیدا ہو جائے گا۔“

علم و دانش کا آج کا عالمی منظر بھی اس سے مختلف نہیں ہے اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود عالمی دانش کا ”قبضہ گروپ“ اسے قبول کرنے سے صرف اس لیے گریزاں ہے بلکہ اس میں مسلسل رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے کہ آسمانی تعلیمات کا مستند اور محفوظ ذخیرہ اسلام کے سوا کسی اور کے پاس موجود نہیں ہے۔ مگر اس سے زیادہ تعجب کا مرحلہ یہ ہے کہ عالمی دانش تو عقل کی کوتاہی کا عملی تجربہ کرتے ہوئے آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کے راستے تلاش کر رہی ہے لیکن عالم اسلام کی جدید کہلانے والی دانش ابھی تک اس مغربی فکر و دانش کی جگالی کرنے میں مصروف ہے جس سے پیچھا چھڑانا خود مغرب کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ عالم اسلام کی جدید نما دانش جن مباحث میں الجھی ہوئی ہے وہ ”آؤٹ آف ڈیٹ“ ہو چکے ہیں، ان کی میعاد ختم ہو گئی ہے اور آج کی سب سے بڑی علمی و فکری ضرورت یہ سامنے آ رہی ہے کہ مغربی فکر و فلسفہ کی ناکامی کے اسباب واضح کرتے ہوئے قرآن و سنت کے معارف اور احکام شریعت کی حکمت و ضرورت کو آج کے اسلوب میں اور دور حاضر کی نفسیاتی ضروریات کے مطابق پیش کیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی کو قرآن کریم کے اعجاز کا ایک بڑا پہلو اور جدید دور کی اہم ضرورت قرار دیا تھا، اور شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے بھی اسلام کی تجدید اور فقہ و شریعت کی تشکیل نو کا ہدف یہی بیان کیا ہے۔ مگر ہماری جدید دانش مروجہ فکر و فلسفہ کا رخ اسلام کی طرف موڑنے کی کوشش کرنے کی بجائے اسلام کو اس تھکے ماندہ فکر و فلسفہ کے بوسیدہ سانچے میں فٹ کرنے میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنے میں مصروف ہے۔ اس تناظر میں وہ ارباب فکر و دانش ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں جو مسلم دانش کو اس دلدل سے نجات دلانے اور قرآن و سنت کی حقیقی شاہراہ کی طرف واپس لانے کی تگ و دو کر رہے ہے

ہیں۔ اور یقیناً مستقبل میں انہی اصحاب فکر و دانش کی یہ مبارک مساعی فکری و علمی معاملات کو صحیح رخ پر گامزن کرنے کی جدوجہد کا نقش اول قرار پائیں گی۔

ہمارے فاضل دوست جناب محمد ظفر اقبال دانش وروں کے اسی قافلہ کے فرد ہیں جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری دانش و اسلوب اور مستقبل کی فکری و علمی ضروریات کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ”اسلام اور جدیدیت کی کشمکش“ میں اس حوالہ سے بعض مسلم مفکرین کے افکار کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے عصر حاضر کے فکری و تہذیبی الجھاؤ کی بعض گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے کتاب کی سرسری ورق گردانی کی ہے، اگرچہ میرے خیال میں یہ مباحث اب پرانے ہو چکے ہیں، لیکن محمد ظفر اقبال صاحب کی یہ علمی و تحقیقی کاوش نئی نسل کو ان معاملات میں صحیح سمت دکھانے کے لیے مفید ثابت ہوگی اور تحقیق و جستجو کا ذوق رکھنے والوں کی راہ نمائی کا ذریعہ بنے گی۔

دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت موصوف کی اس سعی و محنت کو اپنی بارگاہ میں قبولیت سے نوازیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

قرآن کریم کی تعلیم لازم کرنے کا مستحسن حکومتی فیصلہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۰ جون ۲۰۱۶ء)

پیشہ وارانہ تعلیم و تربیت کے وفاقی وزیر مملکت جناب بلیغ الرحمن نے گزشتہ روز اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت نے قرآن کریم کی تعلیم لازمی کر دی ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق اس بریفنگ میں وفاقی وزیر نے بتایا کہ پہلی سے پانچویں جماعت تک تمام بچوں کو قرآن کریم ناظرہ پڑھایا جائے گا، جبکہ چھٹی سے بارہویں تک طلبہ کو قرآن کریم کی ترجمہ کے ساتھ تعلیم دی جائے گی جس میں ساتویں سے دسویں تک قرآن کریم میں بیان کیے گئے واقعات پڑھائے جائیں گے۔ اور دسویں سے بارہویں تک مسلمانوں کو دیے گئے احکامات پر مشتمل سورتیں ترجمے کے ساتھ پڑھائی جائیں گی۔

رمضان المبارک کے دوران جناب بلیغ الرحمن کی طرف سے دی جانے والی یہ خبر پوری قوم کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے جس پر ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے حکومت کو اس فیصلہ پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

قرآن کریم ہماری زندگی، ایمان اور نجات کی بنیاد ہے جس کی تعلیم ایمان کا تقاضہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور و قانون کی ناگزیر ضرورت بھی ہے اور ہمارے بہت سے قومی اور معاشرتی مسائل کا حل اس سے وابستہ ہے۔ یہ کام قیام پاکستان کے بعد ہی ہوجانا چاہیے تھا اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے نفاذ کے بعد تو اس میں تاخیر کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ لیکن مختلف اندرونی و بیرونی عوامل کے باعث یہ مبارک کام مسلسل ٹال مٹول کا شکار ہوتا رہا اور اب اس طرف حکومت نے سنجیدہ توجہ کا عندیہ دیا ہے تو ہم سب کو اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تکمیل میں ہر سطح پر مخلصانہ تعاون کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔

ابھی حال ہی میں ظفروال ضلع نارووال کے ہمارے ایک عزیز شاگرد مولانا حافظ احسان اللہ تبلیغی جماعت کے ساتھ بیرون ملک ایک سال لگا کر واپس آئے ہیں، میں نے ان سے سفر کے احوال دریافت کیے تو انہوں نے بتایا کہ ان کا زیادہ وقت سوڈان میں گزرا ہے۔ وہاں کے حالات پوچھتے ہوئے میں نے سوال کیا کہ وہاں دینی مدارس کا ماحول کیسا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہاں ہماری طرز کے دینی مدارس سرے سے موجود ہی نہیں ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ سوڈان کے قومی تعلیمی نظام میں دینی تعلیم سرکاری نصاب کا حصہ ہے اور میٹرک یا انٹرمیڈیٹ تک ریاستی تعلیمی اداروں میں طلبہ کو اتنی ضروری دینی تعلیم سے آراستہ کر دیا جاتا ہے کہ پھر ان کے لیے الگ دینی مدارس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ہمارے ہاں دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی کردار اور امتیازی ماحول کی شکایت تو ہر حلقہ میں کی جاتی ہے مگر اس بات کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے یا کوئی توجہ دینا نہیں چاہتا کہ دینی تعلیم قوم کی ایک لازمی ضرورت ہے، اسے اگر ریاستی نظام تعلیم پورا نہیں کرے گا تو قوم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور اختیار کرے گی۔ اور ہمارے ماحول میں دینی مدارس کی موجودگی اور ان کے ساتھ قوم کے ہر طبقہ کے بھرپور تعاون کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دینی مدارس پاکستانی قوم کی ایک بہت بڑی ضرورت کی تکمیل کا سامان فراہم کیے ہوئے ہیں اور اس کے لیے ہر وقت سرگرم رہتے ہیں۔ جبکہ ریاستی اداروں اور مقتدر حلقوں کی طرف سے اس ضرورت کی تکمیل کا کوئی بندوبست آج تک سامنے نہیں آیا۔

اس کے ساتھ ہماری ایک بدقسمتی اور بھی ہے کہ عالمی لابیوں اور قومی سیکولر حلقوں نے ایک خود ساختہ اور مصنوعی تاثر قائم کر رکھا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو دینی تعلیم مجبوری کی وجہ سے دلاتے ہیں کہ دینی تعلیم کی طرف وہی لوگ آتے ہیں جو سرکاری اور پرائیویٹ عصری تعلیمی اداروں میں تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کے خیال میں دینی تعلیم ضرورت نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ حالانکہ یہ تاثر سراسر گمراہ کن اور خلاف واقعہ ہے۔ ملک بھر میں دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کے بارے میں سروے کیا جائے اور پرائیویٹ عصری تعلیمی اداروں میں قرآن کریم کی تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو دیکھ لیا جائے تو اس مصنوعی تاثر کی قلعی کھل جائے گی اور واضح ہو جائے گا کہ کھاتے پیتے گھرانوں اور پوش خاندانوں میں بھی دینی تعلیم کے رجحان میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اور بحمد اللہ تعالی پوری قوم میں یہ احساس دن بدن اجاگر ہو رہا ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالی کا کلام ہے جس کا پڑھنا اور سننا ہمارے لیے ثواب و برکت اور شفاء و مغفرت کے حصول کا باعث ہے، جبکہ اس سے راہنمائی لینا ہماری قومی ضرورت ہے۔

حتی کہ جس فرقہ واریت کی ہر طرف دہائی دی جا رہی ہے اس کا سادہ سا حل بھی یہی ہے کہ قرآن کریم کو ترجمہ و مفہوم کے ساتھ قوم کی دست رس میں لایا جائے۔ پرانی بات ہے کہ ایک طویل سفر کے دوران میرے ایک ہم سفر نے مجھ سے بحث چھیڑ دی کہ مولوی صاحبان نے قوم کو خواہ مخواہ فرقہ وارانہ مسائل میں الجھا رکھا ہے، ہر مولوی قرآن کریم کی آیات پڑھتا ہے اور حدیثیں سناتا ہے جس سے ہم مشکل میں پڑ جاتے ہیں کہ کس مولوی کی بات مانیں اور کس کی نہ مانیں۔ ان کا لہجہ تو بہت تلخ تھا مگر میں نے آہستگی سے کہا کہ میرے بھائی یہ سوچیں اس میں قصور کس کا ہے؟ اگر آپ قرآن کریم کا ترجمہ جانتے ہوں اور عربی زبان سے اتنا واقف ہوں کہ حدیث رسولؐ کا مفہوم سمجھ سکیں تو کیا کوئی مولوی صاحب قرآن کریم کی آیات یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنا کر آپ سے اپنے مطلب کی بات منوا سکے گا؟ ان صاحب نے کہا کہ نہیں پھر تو میں کوئی غلط بات نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا کہ پھر زیادہ قصور تو آپ کا ہے کہ کچھ لوگ آپ کی بے خبری اور جہالت کا غلط فائدہ اٹھا لیتے ہیں جبکہ آپ اپنی کمزوری کی طرف توجہ دینے کی بجائے سارا قصور مولویوں کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔

ہمارے معاشرہ میں فرقہ وارانہ عصبیت و منافرت اور ’’امپورٹڈ دانش‘‘ دونوں کو اپنے پاؤں جمانے کا موقع اس لیے مل رہا ہے کہ عام مسلمان کا قرآن و سنت کے ساتھ فہم و شعور کا تعلق نہیں ہے اس لیے دونوں طبقے من مانی تشریحات کا حوصلہ کر لیتے ہیں۔ اگر معاشرہ میں قرآن و سنت کے فہم و شعور کا اجتماعی ماحول پیدا کر دیا جائے اور اس میں ریاستی ادارے اور میڈیا اپنے منفی کردار کو مثبت کردار میں بدل دیں تو ان دونوں بیماریوں سے سوسائٹی کو نجات مل سکتی ہے۔

چنانچہ ہم وفاقی حکومت کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے امید رکھتے ہیں کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ عمل کا اہتمام بھی کیا جائے گا جس کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ سکولوں میں قرآن کریم کی مذکورہ تعلیم و تدریس کے لیے مستند اور اہل مدرسین کا انتخاب کیا جائے اور زبانی جمع خرچ سے گریز کرتے ہوئے قوم کے بچوں کو پورے خلوص کے ساتھ قرآن کریم کی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

نماز تراویح پر شکوک و شبہات کیوں؟

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۳ جون ۲۰۱۶ء)

ایک اخباری خبر کے مطابق یمن میں حوثیوں نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں نماز تراویح کی ادائیگی پر پابندی لگا دی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے والے بہت سے ائمہ مساجد کو اس بنا پر گرفتار کر لیا ہے کہ انہوں نے اپنی مساجد میں نماز تراویح با جماعت پڑھنے کا اہتمام کر لیا تھا۔

مساجد میں رمضان المبارک کے دوران عشاء کی نماز کے بعد با جماعت نماز تراویح کا آغاز امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا جو آج تک دنیا بھر میں تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اس سے قبل تراویح فرداً فرداً پڑھی جاتی تھیں، حضرات صحابہ کرامؓ اپنے اپنے ذوق کے مطابق اکیلے اکیلے یا مختلف ٹولیوں کی صورت میں یہ نماز پڑھتے تھے۔ یہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے اجتہادی فیصلوں میں سے ہے کہ انہوں نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے طے کیا کہ مسجد نبویؐ میں نماز تراویح با جماعت پڑھی جائے گی اور سب لوگ اکٹھے ایک ہی امام کے پیچھے پڑھیں گے۔ حضرت ابی بن کعبؓ اس دور میں سب سے بڑے قاری تھے جنہیں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَقرأ کا خطاب دیا تھا کہ یہ میرے

ساتھیوں میں سب سے اچھا قاری ہے۔ حضرت عمرؓ نے انھی کو حکم دیا کہ وہ بیس تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائیں اور رمضان المبارک کے دوران کم از کم ایک بار قرآن کریم ضرور سنادیں۔ یہ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ کا حکم تھا جس پر سب صحابہ کرامؓ نے اتفاق کر لیا اور ان کے اجماع واتفاق سے اسے سنت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

چنانچہ تب سے یہ کار خیر جاری ہے اور دنیا کے ہر حصے میں مسلمان اس سنت کی ادائیگی کا ہر سال اہتمام کرتے ہیں جس سے لاکھوں حفاظ قرآن کو کلام پاک سنانے اور کروڑوں مسلمانوں کو حالت نماز میں قرآن کریم سننے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ حرمین شریفین اور مسجد اقصی سمیت دنیا بھر میں تراویح مجموعی طور پر بیس رکعت کی تعداد میں ہی پڑھی جاتی ہیں، البتہ بعض حلقوں میں بیس کی بجائے آٹھ رکعتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مگر تراویح باجماعت پڑھنے، پورے رمضان میں روزانہ ادا کرنے، اور اس میں قرآن کریم سنانے کا اہتمام ان کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی تعداد کے اختلاف کے سوا نماز تراویح کی دیگر کیفیات میں وہ بھی جمہور امت کے ساتھ متفق ہیں اور یوں تراویح کی ادائیگی اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام حلقوں میں متفقہ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔

آٹھ اور بیس رکعت تراویح کے اختلاف پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ چند سال قبل سپرنگ فیلڈ، ورجینیا (امریکہ) کے دینی مرکز دارالہدی میں نماز تراویح کے آغاز پر میں بیان کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے اچانک سوال کر دیا کہ ”کیا آٹھ رکعت پڑھنے والوں کی تراویح ہو جاتی ہیں؟“ اس قسم کے سوالات عمومی مجمع میں عام طور پر مسلکی چھیڑ چھاڑ کے لیے کیے جاتے ہیں۔ میں نے ان صاحب کو ایک سادہ سا جواب دیا کہ ”ہاں آٹھ رکعت تراویح ہو جاتی ہیں لیکن بارہ رکعت رہ جاتی ہیں“۔ اس پر وہ صاحب تو خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے البتہ ہمارے فاضل دوست مولانا عبد الحمید اصغر، جو اس وقت اس مرکز کے امام تھے، بہت محظوظ ہوئے۔ انہوں نے اس جواب کا بعد میں متعدّد بار ذکر کیا اور کہا کہ عجیب جواب دیا ہے کہ آٹھ ہو جاتی ہیں لیکن بارہ رہ جاتی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں سوال کرنے والے کے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لیے جو معاملہ تھا وہ میں نے بتا دیا۔

یمن کے حوثیوں کو تراویح پر کیا اعتراض ہے یہ تو وہی بتائیں گے، مگر ہمارے ہاں بھی بعض دانش وروں نے یہ سوال کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت محمدؐ کے زمانے میں

اس طرح تراویح نہیں ہوتی تھیں اس لیے یہ بعد میں مولویوں کی ایجاد لگتی ہے۔ یہ عجیب سی روایت بن گئی ہے کہ دین کی جس بات سے انکار کرنا مقصود ہوا سے مولویوں کی ایجاد کہہ کر پہلے تو اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ سرے سے اس کا انکار ہی کر دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے، سنت نبویؐ پر ہے، یا تعامل صحابہؓ پر ہے۔ بس مولوی کا لفظ اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس کے کھاتے میں ڈال کر دین کی کسی بھی بات سے انکار کر دیا جائے۔

گزشتہ روز ایک نوجوان نے مجھ سے یہی سوال کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تراویح اس طرح ادا نہیں کی گئیں تو بعد میں مولویوں نے یہ کیوں شروع کر دی تھیں؟ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا پہلے یہ معلوم کر لو کہ یہ تراویح شروع کس مولوی نے کی تھیں؟ کہنے لگا کہ یہ مجھے معلوم نہیں ہے، میں نے کہا کہ معلوم تو کر لینا چاہیے۔ اس نے کہا کہ آپ ہی بتا دیں۔ میں نے بتایا کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا، حضرت ابی بن کعبؓ نے سب سے پہلے تراویح پڑھائی تھیں، اور ان کے پیچھے پڑھنے والے کم و بیش سبھی صحابہ کرامؓ تھے۔ اس لیے اگر ان مولویوں پر اعتماد ہے تو تم بھی پڑھ لیا کرو لیکن اگر خدانخواستہ ان پر اعتماد نہیں ہے تو پھر صرف تراویح کا معاملہ نہیں، پورے دین سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی کہ سارا دین انہی کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اور شاید بعض دانشور حضرات اپنے طرز فکر سے اسی قسم کا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

کیا قرآن کریم صرف پڑھ لینا کافی ہے؟

(جامعہ محمودیہ، بڑانوالی، گوجرانوالہ - ۳۰ مئی ۲۰۱۶ء)

۳۰ مئی کو سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ میں بڑانوالی کے مقام پر جامعہ محمودیہ کے سالانہ جلسہ دستار بندی میں قرآن کریم کے حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ چھ بچوں نے آج قرآن کریم کا آخری سبق سنایا ہے اور وہ حفاظ کرام کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ آج ان کی دستار بندی بھی کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں قرآن کریم یاد رکھنے کی توفیق دیں اور علم و خدمت کے مواقع نصیب فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔ ان بچوں نے قرآن کریم حفظ کیا ہے اور صحیح تلفظ کے ساتھ تجوید کے مطابق قرآن

کریم پڑھا ہے۔ ہم سب بحمد اللہ تعالیٰ قرآن کریم کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں، اور اب رمضان المبارک قریب آرہا ہے اس میں قرآن کریم کا پڑھنا سننا ہر طرف عام ہوگا کہ یہ قرآن کریم کا سیزن ہے اور قرآنی برکات کی بہار ہے جس میں ہر مسلمان کچھ نہ کچھ پڑھنے سننے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔

اس حوالہ سے میں ایک سوال یہ کرنا چاہوں گا کہ کیا قرآن کریم صرف پڑھ لینا کافی ہے کہ جیسے کیسے پڑھ سکے پڑھ لیا، یا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے؟ کسی بھی زبان میں اس کے الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ نہ پڑھے جائیں تو اس کا معنی بدل جاتا ہے، بلکہ بعض دفعہ معنی بگڑ بھی جاتا ہے۔ ہم اردو کا کوئی لفظ اگر غلط بول دیں تو ٹوک دیا جاتا ہے کہ یہ لفظ اس طرح نہیں ہے اسے یوں پڑھنا چاہیے۔ اسی طرح انگریزی کا کوئی لفظ صحیح طور پر نہ بولا جائے تو اس پر ٹوک دیا جاتا ہے اور صحیح تلفظ بتایا جاتا ہے۔ عربی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ کوئی لفظ صحیح طریقہ سے نہ پڑھا جائے تو معنی بدل جاتا ہے، اور اگر یہ معنی قرآن کریم میں بدلے تو اس کی سنگینی زیادہ ہو جاتی ہے۔ کسی لفظ کا کوئی حرف صحیح ادا نہ کیا جائے یا کسی لفظ میں کوئی حرف تیزی یا بے پروائی کی وجہ سے پورا نہ پڑھا جائے، دونوں صورتوں میں معنی مختلف ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک لفظ کا ذکر کروں گا۔ سورۃ الفاتحہ قرآن کریم کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورۃ ہے، اس میں ایک لفظ ہے ’’انعمت علیھم‘‘ کہ اے اللہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ لیکن عام طور پر تیزی سے یہ لفظ ’’انمت‘‘ پڑھا جاتا ہے اور جلدی میں عین کا حرف پڑھنے سننے میں نہیں آتا۔ اس صورت میں ظاہری معنی یہ بن جاتا ہے کہ ’’جن لوگوں پر تو نے نیند طاری کر دی‘‘۔ یوں آیت کا مفہوم بالکل بدل کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ ہمارے ذہنوں میں موجود رہنا چاہیے کہ قرآن کریم کا صرف پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ صحیح تلفظ کے ساتھ اور آرام کے ساتھ پڑھنا بھی ضروری ہے تاکہ معنی میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ اور یہ ہر مسلمان کے لیے خواہ وہ مرد ہو، عورت ہو، بوڑھا ہو، جوان ہو، یکساں طور پر ضروری ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان بچوں نے تو قرآن کریم مکمل یاد کیا ہے جو بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ دنیا میں بحمد اللہ تعالیٰ اس وقت قرآن کریم کے کروڑوں حفاظ موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اس پاک کلام کا اعجاز ہے لیکن ہر مسلمان کو کچھ نہ کچھ قرآن کریم یاد ہونا ضروری

ہے۔ ہمیں اس کا تھوڑا سا اندازہ کر لینا چاہیے کہ ہر مسلمان مرد، عورت، بوڑھے، بچے کو کم سے کم کتنا قرآن کریم یاد کرنا ضروری ہے۔ صرف ایک بات پر غور کر لیں کہ پانچ وقت کی نماز ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ان پانچ نمازوں کی رکعتوں کو شمار کر لیں اور یہ دیکھ لیں کہ ان میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کتنی رکعتوں میں قرآن کریم پڑھنا لازمی ہے اور اس سلسلہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کیا ہے۔

نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ آپؐ تمام نمازوں میں سورتیں بدل بدل کر پڑھتے تھے۔ بڑی سورتیں بھی پڑھتے تھے، درمیانی بھی پڑھتے تھے اور چھوٹی سورتیں بھی تلاوت کرتے تھے۔ کسی وقت تنہا بیٹھ کر ہر مسلمان کو ضرور حساب کر لینا چاہیے کہ وہ اگر حضورؐ کی سنت کے مطابق نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اسے چھوٹی بڑی کتنی سورتیں زبانی یاد ہونی چاہئیں۔ کیونکہ زبانی یاد ہوں گی تبھی نماز میں پڑھ سکے گا۔ ہم نے عام طور پر یہ معمول بنا رکھا ہے کہ دو چار چھوٹی سورتیں یاد کر لیتے ہیں اور ہر نماز میں انہی کو بار بار پڑھتے رہتے ہیں۔ ایسا کرنے سے نماز تو بہر حال ہو جاتی ہے لیکن یہ یاد رکھیں کہ سنت کے مطابق نہیں ہوتی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق ہر مسلمان کو کم سے کم آخری پارہ تو ضرور زبانی یاد ہونا چاہیے تب وہ سنت کے مطابق پانچ نمازیں روزانہ ادا کر سکے گا۔

اس لیے جس طرح ہمارے بچے قرآن کریم یاد کرتے ہیں ہمیں خود بھی کچھ نہ کچھ ضرور یاد کرنا چاہیے اور صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی کسی استاذ سے مشق کرنی چاہیے۔ یہ قرآن کریم کا حق ہے اور ہم سب کی دینی ذمہ داریوں میں سے ہے، اللہ تعالیٰ سب کو اس کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲ جون ۲۰۱۶ء)

خیر و برکت کے اصول

(جامعہ بدر العلوم، خیر پور، سندھ - ۵ مئی ۲۰۱۶ء)

ماہ رواں کے آغاز میں خیر پور میرس سندھ کے دورہ کے موقع پر جامعہ بدر العلوم خیر پور میں تاجر راہنماؤں کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، اس نشست میں کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ قرآن کریم میں شرک اور جاہلانہ رسوم کی مذمت و مخالفت کے ساتھ ساتھ حلال و حرام کے ان ضابطوں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے جو دور جاہلیت میں مختلف قبائل اور علاقوں کے لوگوں نے از خود طے کر لیے تھے اور جن پر وہ صدیوں سے عمل پیرا تھے۔ مطلق اباحیت اور فری اکانومی کا یہ تصور قدیم سے موجود چلا آرہا ہے کہ ہم اپنے اموال میں تصرف کے حوالہ سے خود مختار ہیں اور کسی کو اس میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔

• اس فلسفہ کا اظہار حضرت شعیب علیہ السلام کے حوالہ سے بھی ملتا ہے کہ جب انہوں نے قوم کو تلقین فرمائی کہ ماپ تول میں کمی نہ کرو اور مال کے معیار کو خراب نہ کرو اس لیے کہ یہ بات سوسائٹی میں فساد اور بگاڑ کا باعث بنتی ہے، اس پر قوم نے انہیں جواب میں کہا تھا کہ کیا تمہاری نمازیں اس بات کی تلقین پر تمہیں آمادہ کرتی ہیں کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور ”ان نفعل فی اموالنا ما نشاء“ (ہود ۸۷) یا اپنے مالوں میں اپنی مرضی سے تصرف نہ کر سکیں۔

• کم و بیش اسی طرح کی بات قارون نے بھی اپنی قوم سے کہی تھی جب اس سے کہا گیا کہ اللہ تعالی نے تمہیں جو مال دیا ہے اس میں سے اللہ تعالی کا حق ادا کرو۔ تو اس نے جواب میں کہا ”انما اوتیتہ علی علم عندی“ (القصص ۷۸) کہ مجھے تو یہ مال اپنے علم اور ہنر کے باعث ملا ہے۔

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں جابجا اس جاہلانہ فلسفہ کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ تصور اور اس کی بنیاد پر بنائے جانے والے معاشی قوانین خودساختہ ہیں جن کا فطرت اور حکم خداوندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن کریم میں حلال و حرام کے اصول اور ضابطے طے کرنے کو خالصتاً اللہ تعالی کا حق اور اختیار قرار دیا گیا ہے، اور اس سے ہٹ کر بنائے جانے والے ضابطوں کو جاہلیت سے تعبیر کیا گیا ہے بلکہ اسے شرک کی ایک صورت بتایا گیا ہے۔

• بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ کو قرآن کریم کی ایک آیت سمجھنے میں الجھن پیش آئی جو انہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی۔ سورہ التوبہ آیت ۳۱ میں عیسائیوں کے بارے میں کہا گیا ہے ”اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ“ (التوبہ ۳۱) کہ انہوں نے

اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے۔ حضرت عدی اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھے بلکہ عیسائی قبیلہ کے سردار تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم نے تو اپنے احبار و رہبان کو "اربابا من دون اللہ" کا درجہ نہیں دیا تھا، یہ قرآن کریم نے کیا کہہ دیا ہے؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہارے ہاں علماء و مشائخ کو حلال و حرام میں ردوبدل کا اختیار تمہارے عقیدہ کے مطابق حاصل تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں یہ تو ہمارے ہاں سمجھا جاتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کریم نے اسی کو "اربابا من دون اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالی کے سوا کسی اور کے لیے حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے کا اختیار ماننا بھی شرک کی ایک صورت ہے۔

- حتی کہ جب آنحضرتؐ نے اپنی ذات کے لیے شہد کا استعمال ممنوع قرار دیا تو قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ "لم تحرم ما احل اللہ لک" (التحریم ۱) جو چیز اللہ تعالی نے حلال کی ہے اسے آپ نے اپنے لیے کیسے حرام کہہ دیا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالی کے حکم پر آپؐ نے قسم توڑی، شہد استعمال کیا اور قسم کا کفارہ ادا کیا۔

گزارش کا مقصد یہ ہے کہ حلال و حرام کے اصول اور ضابطے بھی قرآن کریم نے واضح طور پر بیان فرمائے ہیں اور کہا ہے کہ کسی کو اللہ تعالی کی طرف سے حلال یا حرام کیے جانے کے معاملہ میں دخل اندازی کا حق حاصل نہیں ہے۔ اور قرآن کو ماننے والے قیامت تک اس بات کے پابند ہیں کہ وہ حلال و حرام کے ان قوانین کی بہر حال پابندی کریں جو اللہ تعالی نے ارشاد فرمائے ہیں اور جن کی جناب نبی اکرمؐ نے وضاحت کی ہے۔

جبکہ حرام کی جانے والی اشیا میں قرآن کریم نے سب سے زیادہ سنگینی سود کی بیان کی ہے اور اس لہجے میں بات کی ہے کہ اگر تمہارا خدا اور آخرت پر ایمان ہے تو سود کھانا ترک کر دو۔ اور یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر تم سود کے لین دین سے باز نہیں آتے تو یہ خدا اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے۔ میں چونکہ اس محفل میں تاجر بھائیوں سے بات کر رہا ہوں اس لیے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تجارت بہت اچھا پیشہ ہے اور اس کے دنیاوی اور اخروی ثمرات و برکات بے شمار ہیں، لیکن یہ تب ہو گا جب حلال و

حرام کے شرعی ضابطوں کی پابندی کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ اور رسول خداؐ کی ہدایات کے مطابق کاروبار کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کو نعمت قرار دیا ہے مگر اس کے ساتھ قرآن کریم نے اس کے لیے پانچ ضابطے بیان کیے ہیں جو قارون کے ساتھ بنی اسرائیل کے مکالمہ کی صورت میں اس طرح مذکور ہیں کہ:

1. مال و دولت کو تکبر اور برتری کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔
2. اسے آخرت کی تیاری کا ذریعہ بنایا جائے۔
3. اسے دنیا کی بہتری کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔
4. جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی لوگوں پر احسان کرو۔
5. مال و دولت کو سوسائٹی میں فساد اور بگاڑ کا ذریعہ بنانے سے گریز کیا جائے۔

اگر ہم کاروبار اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والے مال و دولت میں ان پانچ قرآنی اصولوں کو راہنما بنالیں تو یہ ہمارے لیے دنیا اور آخرت دونوں جگہ برکت و ثواب اور کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ مئی ۲۰۱۶ء)

مذاہب کا تسلسل اور ختمِ نبوت: ایک قادیانی اعتراض کا جواب

(میسج ٹی وی - ۱۵ اپریل ۲۰۱۶ء)

میسج ٹی وی کے ایک آن لائن پروگرام میں کی گئی گفتگو کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ چند سال پہلے کیپ ٹاؤن جنوبی افریقہ میں ایک ختم نبوت کانفرنس کے دوران میں نے قادیانیت کے حوالے سے ایک پہلو پر گفتگو کی گئی تھی جو الحمد للہ پسند کی گئی اور دنیا بھر میں اسے وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا اور سنا گیا۔ اس پر قادیانی حضرات کی

طرف سے ایک اعتراض سامنے آیا ہے اور وہ بھی دنیا بھر میں پھیلایا گیا ہے۔ میں آج اس حوالے سے تھوڑی سی گفتگو کرنا چاہوں گا۔

میں نے یہ گزارش کی تھی کہ قدرت کا قانون یہ ہے اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کا تسلسل یہ بتاتا ہے کہ نئے نبی کے آنے سے مذہب بدل جاتا ہے۔ چونکہ نبی وہ واحد شخصیت ہوتی ہے جس کی بات کسی دلیل کے بغیر ماننا ضروری ہوتی ہے، نبی جو کہتا ہے وہ دلیل ہوتی ہے، نبی مطلقاً مطاع ہوتا ہے، تو نبی کے بدلنے سے اطاعت کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے۔

بنیادی طور پر یہ بات علامہ محمد اقبالؒ نے کہی تھی، تو میں نے ان کی اس بات کو بنیاد بنایا تھا کہ قادیانی چونکہ نئی نبوت کی بات کرتے ہیں تو ان کا مذہب ہمارے مذہب سے الگ ہے، وہ اپنے مذہب کا نیا نام رکھیں۔ جس طرح یہودیت سے عیسائیت الگ ہوئی، نئے نبی، نئی وحی اور نئی کتاب کی بنیاد پر۔ اور جس طرح عیسائیت سے ہم مسلمان الگ ہیں، نئے نبی، نئی وحی اور نئی کتاب کی بنیاد پر۔ ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو مانتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو بھی مانتے ہیں، لیکن چونکہ ہم ان کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن کریم پر بھی ایمان رکھتے ہیں اس لیے ہمارا مذہب ان سے الگ ہے، جیسے کہ عیسائیوں کا یہودیوں سے الگ ہے۔ یہ میں نے بنیادی بات کی تھی، غلط یا صحیح اپنے مقام پر لیکن مذہب بہرحال تبدیل ہو جاتا ہے کہ اطاعت کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے۔

اس پر قادیانی حضرات کی طرف سے یہ اعتراض و استدلال کچھ عرصہ پہلے سامنے آیا ہے اور دنیا بھر میں اس کو دوہرایا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کر کے سیدھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چلے گئے ہیں، یہ درمیان میں جو انبیاء کرامؑ آئے تھے ان کے آنے سے تو مذہب نہیں بدلا تھا، ان کا ذکر مولوی صاحب نے کیوں نہیں کیا؟ بادی النظر میں یہ اعتراض سمجھ میں آتا ہے۔ اصل میں یہ اعتراض اس لیے پیدا ہوا کہ میری گفتگو میں کچھ اجمال رہ گیا تھا، میں نے پوری وضاحت نہیں کی تھی، میں معترضین کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے یہ سوال پیدا کر کے مجھے اپنی گفتگو کا اجمال دور کرنے کا موقع دیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک درمیان میں سینکڑوں نہیں، بعض روایات کے مطابق ہزاروں پیغمبر آئے ہیں، ان کے آنے سے مذہب نہیں بدلا، مذہب بدلا حضرت عیسیٰؑ کے آنے پر آخری مرحلے میں۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

1. ایک تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰؑ تک نبیوں کا آنا جاری تھا اور ختم نبوت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کو بھی خاتم الانبیاء کہا جاتا ہے لیکن بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر۔ چونکہ اس سے پہلے بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ جاری تھا اور ختم نبوت کا عقیدہ نہیں تھا اس لیے انبیاء کرامؑ کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

2. دوسری وجہ یہ بنی کہ حضرت موسیٰؑ سے شروع ہو کر حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ تک جس نبی نے بھی اس دائرے میں نبوت کی بات کی اسے تسلیم کیا گیا، لیکن جب حضرت عیسیٰؑ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو بنی اسرائیل کے یہود نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی بنیاد پر دونوں کے مذہب الگ ہو گئے۔ حضرت عیسیٰؑ کا انکار کرنے والے پہلے مذہب کے ماننے والے رہے، اور انہیں تسلیم کرنے والے نئے مذہب کے پیروکار بن گئے۔

ہمارے ہاں ایک تو یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر یہ اعلان فرما دیا تھا کہ میں آخری نبی ہوں ''لا رسالۃ بعدی ولا نبوۃ'' میرے بعد نہ کسی کو رسالت ملے گی اور نہ نبوت ملے گی۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ بنی اسرائیل کی طرز والی نبوت جسے قادیانی حضرات ''امتی نبی'' کہہ کر اپنا دعویٰ منوانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ صورت حضورؐ کے زمانے میں پیدا ہوئی تو آپؐ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

مسیلمہ کذاب کے بارے میں روایات اٹھا کر دیکھ لیں، وہ حضورؐ کے مقابلے پر مستقل نبوت کا نہیں بلکہ امتی نبی ہونے کا دعویدار تھا۔ وہ جناب نبی کریمؐ کا کلمہ خود بھی پڑھتا تھا اور لوگوں سے بھی پڑھواتا تھا، یہ اقرار کروا کے پھر اپنی بات کرتا تھا وہ رسول ہیں اور میں بھی رسول ہوں۔ یہی امتی نبی کا تصور ہے۔ وہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' اور پھر ''لا الہ الا اللہ مسیلمۃ رسول اللہ'' پڑھواتا تھا۔ نبی اکرمؐ کو رسول ماننے کے بعد امتی اور تابع نبی کے طور پر اپنی بات کرتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ ان کی اذان بھی یہی تھی۔ ختم نبوت

کے پہلے شہید حبیب بن زیدؓ جو مسیلمہ کے ہاتھوں قتل ہوئے، اسی وجہ پر قتل ہوئے۔ اس نے پہلے حبیب بن زیدؓ سے پوچھا ”اتشھد ان محمدا رسول اللہ؟“ انہوں نے کہا کہ ”اشھد ان محمدا رسول اللہ“۔ پھر پوچھا کہ ”اتشھد انی رسول اللہ؟“ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جو دو نمائندے مسیلمہ کذاب کا خط لے کر جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، رسول اللہ نے ان سے بھی اسی ترتیب سے پوچھا ”اتشھد ان انی رسول اللہ؟“ کیا تم مجھے خدا کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا جی ”نشھد“ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر پوچھا ”اتشھد ان مسیلمۃ رسول اللہ؟“ کیا تم یہ بھی گواہی دیتے ہو کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ انہوں نے کہا ہم اس کی بھی گواہی دیتے ہیں۔

مسیلمہ کذاب کا دعوی جناب نبی کریمؐ کے امتی نبی ہونے کا دعوی تھا۔ اس پر اس کا جو خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہے، بخاری شریف میں موجود ہے، اس کا عنوان بھی یہی ہے ”من مسیلمۃ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ“ کہ مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کے نام۔ اور آگے جو پیشکش کی ہے یہ زیادہ توجہ طلب بات ہے۔ اس نے جناب نبی کریمؐ کو صلح کی پیشکش کی کہ مجھے کسی درجہ میں تسلیم کر لیا جائے تو میرے پاس فارمولا ہے۔ آپ اپنے بعد مجھے خلیفہ نامزد کر دیں، اور اگر یہ بات آپ کو منظور نہیں ہے تو پھر تقسیم کر لیں ”لنا وبر ولک مدر“ شہروں کے نبی آپ اور دیہات کا نبی میں۔ یہ کھلے شواہد ہیں کہ مسیلمہ کذاب امتی نبی ہونے کا دعویدار تھا۔ امتی نبی ہونے کا تصور بنی اسرائیل میں تھا، لیکن ہمارے ہاں امتی نبی ہونے کے تصور کی حضورؐ نے مسیلمہ کذاب کو رد کرتے ہوئے صراحتا نفی فرما دی کہ نہ کوئی امتی نبی اور نہ غیر امتی۔

مسیلمہ کذاب خود مدینہ منورہ آیا، جناب نبی کریمؐ کے ساتھ دوبدو گفتگو کی۔ بخاری شریف کی روایت میں وہ مکالمہ موجود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشکش کے جواب میں دو باتیں فرمائیں۔ ایک بات تو اصولی تھی، قرآن کریم کی آیت پڑھی ”ان الارض للہ یورثھا من یشآء من عبادہ“ کہ زمین اللہ کی ہے، خلیفہ کسے بنانا ہے، شہر کسے دینے ہیں، دیہات کسے دینے ہیں، وہ اللہ کا کام ہے میرا کام نہیں ہے۔ اور دوسرا جواب عملی تھا، مسیلمہ سے اس ملاقات میں حضورؐ نے زمین سے ایک لکڑی اٹھائی، فرمایا تم مجھ سے خلافت اور زمین کی تقسیم کی بات کرتے ہو، مجھ سے اگر یہ لکڑی مانگو گے، میں دینے کا روادار نہیں ہوں۔

میں نے گزارش کی ہے کہ ختم نبوت کا تصور بنی اسرائیل میں نہیں تھا لیکن ہمارے ہاں ہے، امتی نبی ہونے کا تصور بنی اسرائیل میں تھا لیکن ہماری امت میں نہیں ہے۔ یہ دو باتیں بالکل واضح طور پر ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہئیں۔ دونوں باتوں کی نفی کرنے والے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہیں، اپنے قول کے ساتھ بھی اور اپنے عمل کے ساتھ بھی۔ بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰؑ سے پہلے جب انکار نہیں کیا گیا کیونکہ ختم نبوت کا عقیدہ نہیں تھا تو مذہب ایک ہی رہا۔ لیکن جب حضرت عیسیٰؑ کا انکار کر دیا گیا تو انکار کرنے والوں کا مذہب اور ہو گیا اور اقرار کرنے والوں کا مذہب اور ہو گیا۔ یہ تقسیم کی بنیاد تھی۔

ہمارے ہاں تو شروع سے یہ معاملہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور حضورؐ کے بعد چودہ سو سال تک جس شخص نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے، خواہ کسی حیثیت سے کیا ہے، امت نے اسے قبول نہیں کیا۔ بنی اسرائیل قبول کرتے رہے کہ ختم نبوت کا عقیدہ نہیں تھا۔ ہمارے ہاں امت نے مسیلمہ کذاب سے لے کر مرزا غلام احمد تک کسی کو قبول نہیں کیا کہ ہمارے ہاں ختم نبوت کا عقیدہ ہے۔ جب مرزا غلام احمد کا انکار کر دیا گیا، پوری امت نے انکار کر دیا، امت کے اندر کوئی حلقہ ایسا نہیں ہے جو قادیانیوں کے دعوے کو تسلیم کرتا ہو اور امتی نبی کے تصور کو تسلیم کرتا ہو، تو صحیح یا غلط کی بحث سے قطع نظر ان کا مذہب ہم سے الگ ہو گیا۔ انکار کرنے والوں کا مذہب اسلام رہا، اور ماننے والوں کا مذہب نیا ہے۔

قادیانیوں سے ہمارا یہی سوال ہے کہ جب مذہب نیا ہے تو اس کا عنوان، اس کی اصطلاحات، اس کے شعائر، یہ مسلمانوں والے کیوں ہیں؟ اصل جھگڑا قادیانیوں سے یہ ہے کہ مذہب ہم سے الگ ہے تو علامات و شعائر ہمارے کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ کلمہ طیبہ، کعبہ، بیت اللہ، امیر المومنین، ام المومنین، مسجد، مینار، یہ ہماری مسلمہ علامتیں ہیں۔ ہمارا جھگڑا یہ ہے ہماری شناخت استعمال نہ کریں۔ میں اس کی یہ مثال ایک بار پھر دہراؤں گا کہ پہلی کمپنی سے الگ ہو کر نئی کمپنی بنتی ہے، غلط صحیح سے قطع نظر، لیکن نئی کمپنی نیا نام، نیا ٹریڈ مارک، نیا مونوگرام اور نئی علامات اختیار کرے گی۔ اگر پہلی کمپنی سے جدا ہو کر نئی بننے والی کمپنی نام، مونو اور ٹریڈ مارک پہلی کمپنی کا استعمال کرے گی تو یہ عمل فراڈ اور دھوکہ کہلاتا ہے۔ اسی دھوکے کو واضح کرنے کے لیے ہم دنیا کے سامنے یہ موقف واضح کرتے رہتے ہیں۔

یہ اعتراض قادیانیوں کی طرف سے آیا تھا تو میں نے ضروری سمجھا کہ اس کا جواب دے دیا جائے، چنانچہ آج میں نے اپنی گفتگو سے قادیانیوں کے اس مغالطے کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالی قادیانیوں کو ہدایت دے، میں ان کے لیے ہدایت کا دعاگو رہتا ہوں، اللہ تعالی انہیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں قادیانی حضرات کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتا رہتا ہوں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چار آدمیوں نے نبوت کا دعوی کیا تھا۔ مسیلمہ، اسود عنسی، طلیحہ، اور سجاح نے۔

1. اسود عنسی حضورؐ کے زمانے میں مقابلے پر آیا اور قتل ہو گیا۔

2. مسیلمہ حضورؐ کے زمانے میں مقابلے پر نہیں آیا، بعد میں آیا اور قتل ہو

ا۔

3. طلیحہ نے نبوت کا دعوی کیا تھا، مسلمانوں سے دو جنگیں لڑی تھیں اور حضرت عکاشہؓ جیسے صحابی کو شہید کیا تھا۔ جبکہ بعد میں طلیحہ نے توبہ کر کے اسلام قبول کیا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں قادسیہ کی جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ محدثین کرام ان کا شمار صحابہ میں کرتے ہیں، حضرت طلیحہ بن خویلد اسدیؓ۔

4. سجاح نے بھی توبہ کر لی تھی۔ وہ نبوت کی دعویدار تھی، فوجیں لے کر مقابلے پر آئی تھی لیکن شکست کے بعد روپوش ہو گئی تھی۔ پھر حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں آئی، توبہ کی، اسلام قبول کیا، حضرت معاویہؓ کے حکم پر کوفہ میں آباد ہوئی، وہیں ایک عابدہ زاہدہ خاتون کے طور پر رہی۔ جب فوت ہوئی تو حضرت سمرہ بن جندبؓ کوفہ کے گورنر تھے انہوں نے جنازہ پڑھایا اور تدفین کی، اس طرح سجاحؒ ہماری صالحہ خواتین میں شمار ہوتی ہے۔

میں قادیانیوں سے یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ کیا مسیلمہ اور اسود کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے؟ طلیحہ اور سجاح کا نقش قدم بھی سامنے ہے۔ میں پھر دعوت دوں گا کہ تھوڑا سا زاویہ نگاہ بدلیں، طلیحہؓ اور سجاحؒ پر بھی غور کر لیں، واپسی کا راستہ کھلا ہے، واپس آئیں، آپ ہمارے بھائی ہوں گے، ہم سینے سے لگائیں گے۔ مغالطے سے نکلیں، امت پر زبردستی مسلط ہونے کی بجائے امت کا حصہ بنیں، ہم آپ کو قبول کریں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

قرآن کریم اور پاکستان کا تعلق

(جامعہ رحمانیہ، ماڈل ٹاؤن، ہمک، اسلام آباد - ۲۳ مارچ ۲۰۱۶ء)

۲۳ مارچ کا دن اسلام آباد اور راولپنڈی میں گزرا۔ مغرب کے بعد راولپنڈی کینٹ میں مصریال روڈ کے ایک شادی ہال میں جمعیت اہل سنت کے زیر اہتمام ''یوم پاکستان'' کے حوالہ سے ایک کانفرنس کا اہتمام مولانا قاضی شفیق الرحمن اور ان کے رفقاء نے کر رکھا تھا۔ اور حضرت مولانا قاضی عبد الرشید، مولانا مفتی مجیب الرحمن اور دیگر علماء کرام کے علاوہ راقم الحروف نے بھی اس میں گزارشات پیش کیں۔ جبکہ اس سے قبل بعد از نماز ظہر جامعہ رحمانیہ ماڈل ٹاؤن ہمک اسلام آباد میں چار بچوں کا حفظ قرآن کریم مکمل ہونے پر تقریب تھی اور جامعہ رحمانیہ کے مہتمم حافظ سید علی محی الدین نے اسے یوم پاکستان اور حفظ قرآن کریم کی تکمیل کے مشترکہ پروگرام کی شکل دے دی تھی۔ راقم الحروف نے اس میں جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ! آج یوم پاکستان ہے۔ ۱۹۴۰ء میں آج کے دن لاہور میں وہ تاریخی قرارداد منظور کی گئی تھی جو تحریک پاکستان کا نقطۂ آغاز بنی اور ہر سال آج کے دن اس کی یاد کو تازہ کیا جاتا ہے۔ مگر اس ساتھ جامعہ رحمانیہ کے چار حفاظ کا حفظ قرآن کریم مکمل ہونے کی تقریب بھی ہے اس لیے میں قرآن اور پاکستان کے حوالہ سے ہی کچھ باتیں کہنا چاہوں گا۔

قرآن کریم اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک تعلق تو یہ ہے کہ پاکستان کے نام سے ایک الگ ملک کے قیام کا مطالبہ اس لیے کیا گیا تھا کہ برصغیر میں رہنے والے کروڑوں مسلمان اپنی الگ مذہبی و تہذیبی شناخت رکھتے ہیں۔ اور اپنے اس امتیاز کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے لیے ہندو اکثریت کی تہذیب کے ساتھ مشترکہ طور پر چلنا مشکل ہے۔ اس لیے وہ اپنا الگ ملک چاہتے ہیں تاکہ اپنی تہذیبی شناخت کو باقی رکھ سکیں اور معاشرتی و ریاستی امور میں قرآن و سنت کے احکام کی عملداری قائم کر سکیں۔ چنانچہ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور تحریک پاکستان کے دیگر قائدین نے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد اپنی بیسیوں تقاریر و بیانات میں اس کا اظہار کیا۔ بلکہ ایک موقع پر قائداعظم سے پوچھا گیا کہ پاکستان کا دستور کیا ہوگا تو انہوں نے واضح طور پر کہا کہ پاکستان کا دستور ہمارے پاس پہلے سے قرآن کریم کی شکل میں موجود ہے اور وہی ہمارے دستور و قانون کی بنیاد ہوگا۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ

قرآن کریم جس طرح چودہ سو سال قبل سیاسی و معاشرتی حوالہ سے قابل عمل تھا اسی طرح وہ آج بھی قابل عمل ہے اور ہماری راہنمائی کرتا ہے۔

قرآن کریم کے ساتھ پاکستان کا دوسرا تعلق یہ ہے کہ دستور پاکستان میں حاکمیت اعلیٰ عوام یا کسی گروہ وخاندان کی نہیں تسلیم کی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو دستور کی اساس قرار دیا گیا ہے جو قرآن کریم کے ارشاد ''ان الحکم الا اللہ'' کا ترجمہ ہے اور دستور پاکستان کی بنیاد ہے۔ دستور پاکستان کے حوالہ سے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ جمہوریت کے اس معروف تصور کو قبول نہیں کرتا کہ حاکمیت اعلیٰ عوام کی ہے اور پارلیمنٹ مکمل طور پر خود مختار ہے۔ بلکہ ہمارے دستور کی تین بنیادیں بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ دوسری یہ کہ حکمرانی کا حق کسی گروہ یا خاندان کا نہیں بلکہ عوام کے منتخب نمائندے ہی حکومت کریں گے۔ اور تیسری یہ کہ پارلیمنٹ اور حکومت مکمل خود مختار نہیں بلکہ قرآن وسنت کی پابند ہیں۔ یہ پاکستان اور قرآن کریم کے تعلق کا دوسرا پہلو ہے۔

مگر قرآن کریم اور پاکستان کے تعلق کے ایک تیسرے پہلو کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ دنیا بھر میں قرآن و سنت کے حفظ اور فہم دونوں حوالوں سے پاکستان کو جو امتیاز اس وقت حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حفظ قرآن کریم کا سب سے مضبوط نیٹ ورک پاکستان میں ہے اور حفاظ کی تعداد بھی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے پاکستان میں زیادہ ہے۔ جبکہ دنیا کے دوسرے بہت سے ممالک میں قرآن کریم کے حفظ کی تدریس کی خدمات میں بھی پاکستان کے قراء و حفاظ سب سے نمایاں ہیں۔ میں نے دنیا کے مختلف علاقوں میں پاکستانی قراء کو حفظ قرآن کریم کی تدریس کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، جنوبی افریقہ، ہانگ کانگ، اور کینیا جیسے ممالک میں حفظ قرآن کریم کے ایسے مدارس موجود ہیں جن میں پاکستانی قراء کرام خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ میں نے سب سے کم عمر کا حافظ قرآن کریم امریکہ کے شہر اٹلانٹا میں دیکھا ہے جس نے چھ سال کی عمر میں حفظ قرآن کریم مکمل کر لیا تھا۔ وہ بنوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست حافظ عبد الغفار صاحب کا بیٹا ہے جو امریکہ میں پیدا ہوا اور وہیں اپنے والد سے قرآن کریم حفظ کیا۔

میں نے ہانگ کانگ میں حفظ قرآن کریم کے متعدّد مدارس کا مشاہدہ کیا ہے جو ہمارے دوست پاکستانی عالم دین مولانا قاری محمد طیب کی نگرانی میں سینکڑوں بچوں کو تعلیم دے

رہے ہیں۔ اور یہ بات یقیناً آپ حضرات کے لیے تعجب انگیز خوشی کا باعث ہوگی کہ حرم مکہ یعنی مسجد حرام میں حفظ قرآن کریم کا پہلا مدرسہ ہمارے ایک پاکستانی مخیر بزرگ الحاج محمد یوسف سیٹھیؒ کی توجہ اور محنت سے قائم ہوا تھا جن کا تعلق ایک نومسلم خاندان سے تھا اور گکھڑ کے قریب راہ والی میں ان کی گتہ فیکٹری مشہور تھی۔ حرم مکہ کے اس پہلے مدرسہ کے استاد پاکستانی قاری الشیخ خلیل احمد حفظہ اللہ تعالیٰ تھے اور ان کے شاگردوں میں امام الحرمین الشیخ عبداللہ بن السبیلؒ بھی شامل ہیں۔ خود میرے حفظ قرآن کریم کے استاذ محترم حضرت قاری محمد انور مدظلہ نے پینتیس برس تک مدینہ منورہ میں حفظ قرآن کریم کی تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اب یہ دونوں بزرگ علیل اور صاحب فراش ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ وعاجلہ سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

آج یوم پاکستان اور چار بچوں کا حفظ قرآن کریم مکمل ہونے کے موقع پر میں قرآن کریم اور پاکستان کے اس تعلق کی بات کرتے ہوئے خوشی اور فخر محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن ہم اس نعمت عظمیٰ کی کیا قدر کر رہے ہیں؟ یہ بات بہرحال توجہ طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن و سنت کے ساتھ مستحکم تعلق نصیب کریں اور پاکستان کو قرآن و سنت کی تعلیمات و احکام کا گہوارہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۱ مارچ ۲۰۱۶ء)

اب قرآن کریم میں ردوبدل کا مطالبہ!

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۷ مارچ ۲۰۱۶ء)

بنگلہ دیش کی سیکولر مصنفہ تسلیمہ نسرین ایک بار پھر بولی ہیں اور اب کے ان کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نمازوں کی تعداد پانچ سے کم کر کے ایک کر دیں۔ ایک عرصہ قبل انہوں نے قرآن کریم پر (نعوذ باللہ) نظر ثانی اور مروجہ عالمی نظام و قوانین کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ضروری ترامیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی جس پر ان کے خلاف بنگلہ دیش میں ”توہین مذہب“ کا مقدمہ درج ہوا اور دینی حلقوں نے عوامی سطح پر احتجاج کا اہتمام کیا۔ اس پر وہ گرفتار ہوئیں مگر یورپین یونین کی مداخلت پر انہیں رہائی دلا کر یورپ کے ایک ملک میں سیاسی پناہ دے دی گئی۔

قرآن کریم میں (نعوذ باللہ) ترامیم کا یہ مطالبہ بہت پرانا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضہ کیا گیا کہ ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ اس کے علاوہ کوئی قرآن لائیں یا اس میں رد و بدل کر دیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دلوایا کہ ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی مجھے اس بات کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے کہ قرآن کریم میں اپنی طرف سے کوئی رد و بدل کر سکوں۔

نمازوں کی پابندی کے حوالہ سے بھی اس قسم کے تقاضے ابتدا سے چلے آرہے ہیں۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کے ساتھ بار بار یہ اعلان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اور ان کے اوقات و ترتیب و کیفیات بھی قرآن و سنت میں طے شدہ ہیں۔ لیکن جب فتح مکہ کے بعد طائف کے بنو ثقیف کا وفد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تو اس نے اسلام قبول کرنے کے لیے چند شرائط پیش کیں جن میں ایک شرط یہ تھی کہ ہم نمازوں کی پابندی نہیں کر سکیں گے۔ جبکہ دوسری شرائط میں کہا گیا تھا کہ شراب، سود اور زنا کا چھوڑ دینا بھی ہمارے بس میں نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرائط مسترد کر دیں جس پر بنو ثقیف کے سرداروں نے ان سے دستبردار ہو کر غیر مشروط طور پر مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا۔

اس سلسلہ میں یہ دلچسپ واقعہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے مسیلمہ کذاب اور نبوت ہی کا دعویٰ کرنے والی خاتون سجاح نے مسلمانوں کے لشکر کے مقابلہ میں اتحاد کا فیصلہ کیا، اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے دوران باہمی نکاح کر کے اپنی فوجوں کو متحد کر لیا۔ جب سجاح سے اس کے قبیلہ کے لوگوں نے مہر کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ یہ بات کرنا میں بھول گئی تھی۔ اس لیے مسیلمہ سے دوبارہ رجوع کیا گیا تو اس نے مہر کے طور پر سجاح کو پانچ نمازیں معاف کرنے کا تحفہ دیا اور کہا کہ یہی تمہارا مہر ہے۔

اکبر بادشاہ نے متحدہ ہندوستان میں بعض درباری علماء کے ورغلانے پر دین کی تشکیل نو (ری کنسٹرکشن) کا اعلان کیا تو اس کے خودساختہ "دین الٰہی" کے ڈھانچے میں نمازوں کے نظام میں رد و بدل بھی شامل تھا۔ جبکہ کم و بیش اسی دوران بلوچستان کے ساحلی علاقہ مکران

میں ملا نور محمد اٹکی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور دیگر بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ نمازوں کی معافی اور ان کی جگہ چند مخصوص اذکار کی ترویج کا اعلان کر دیا۔ اس کے پیروکار صدیوں سے اس خطہ میں چلے آرہے ہیں جو ''ذکری'' کہلاتے ہیں اور ان کے اس ٹائٹل کی وجہ یہی ہے کہ وہ نمازوں کے منسوخ ہو جانے کے قائل ہیں اور ان کے بدلے میں صبح وشام چند مخصوص اذکار کرتے ہیں۔

اہل تشیع نے نمازوں کی تعداد تو کم نہیں کی البتہ ان کے اوقات محدود کر رکھے ہیں۔ وہ پانچ اوقات میں الگ الگ نماز ادا کرنے کی بجائے ظہر و عصر ایک وقت میں ''ظہرین'' کے نام سے اور مغرب و عشاء ایک وقت میں ''مغربین'' کے عنوان سے ادا کرتے ہیں۔ یوں ان کے نمازوں کے اوقات پانچ کی بجائے تین ہو گئے ہیں۔ چند سال قبل مصر اور ترکی کے علمی حلقوں میں یہ بحث چلی کہ فقہاء نے ضرورتاً دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنے کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں، جن میں ایک جمع صوری بھی ہے کہ ظہر کو آخری وقت میں اور عصر کو ابتدائی وقت میں ادا کیا جائے تاکہ دونوں نمازوں کو ایک وقت میں پڑھا جا سکے۔ اسی طرح مغرب کو آخری وقت میں اور عشاء کو ابتدائی وقت میں ادا کر کے ان دونوں کو بھی ایک وقت میں جمع کر دیا جائے۔ حنفی فقہاء کے ہاں صرف اسی صورت کی گنجائش ہے۔ اس پر سوال کھڑا ہوا کہ جب ''جمع صوری'' کو فقہاء احناف بھی ضرورتاً جائز کہتے ہیں تو کیا دفتری اور کاروباری مصروفیات کو ضروریات کے درجہ میں شمار کر کے ظہرین اور مغربین کی طرز پر ان کے مستقل اوقات مقرر کیے جا سکتے ہیں؟ یہ سوال ہمارے پاس بھی آیا جس پر ہم نے عرض کیا کہ ضرورت کو ضرورت کے درجہ میں ہی رکھا جانا چاہیے، اسے مستقل نظام اور معمول کے دائرے میں لے آنا ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا کے قرآنی حکم سے مطابقت نہیں رکھتا۔

خیر اس ساری بحث سے ہٹ کر تسلیمہ نسرین کا یہ مطالبہ تو قرآن کریم میں ردوبدل اور ترامیم کے حوالہ سے ہے جس پر قرآن کریم میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح اعلان موجود ہے کہ مجھے قرآن کریم کے احکام میں ردوبدل کا سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ اس لیے جب احکام خداوندی میں ردوبدل کا حضورؐ کو اختیار نہیں تھا تو پھر دنیا میں اور کون سی اتھارٹی موجود ہے جو قرآن وسنت کے صریح احکام میں کسی قسم کا ردوبدل کر سکے؟ البتہ تسلیمہ نسرین طرز کے دانشور نہ صرف نماز بلکہ قرآن کریم کے دیگر بہت سے

احکام کے بارے میں بھی ردوبدل کی وقتاً فوقتاً بات کرتے رہتے ہیں جسے دماغی خلل ہی کہا جا سکتا ہے۔

سزائے موت کا قانون اور پاپائے روم

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ مارچ ۲۰۱۶ء)

روزنامہ جنگ کراچی ۲۲ فروری ۲۰۱۶ء میں شائع ہونے والی ایک خبر ملاحظہ فرمائیے:

”کیتھولک مسیحیوں کے روحانی پیشوا پوپ فرانسس نے کہا ہے کہ موت کی سزا ختم کر دینی چاہیے، تمام حکومتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مشترکہ رائے سے موت کی سزا کو ختم کر دیں، کیونکہ اس طرح حکومتیں کسی انسان کی ہلاکت کی مرتکب نہیں ہوں گی۔ ویٹی کن سٹی میں سینٹ پیٹرز اسکوائر میں پوپ نے ہزاروں عقیدت مندوں سے خطاب کرتے ہوئے پوری دنیا بھر کے مسیحیوں کو تلقین کی ہے کہ وہ موت کی سزا کے خاتمہ کے لیے اپنی کوشش شروع کر دیں۔“

سنگین معاشرتی جرائم پر موت کی سزا آسمانی تعلیمات کا ہمیشہ سے حصہ چلی آرہی ہے اور یہ انسانی سوسائٹی کی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر معاشرے میں قتل و غارت کی روک تھام اور امن و امان کا قیام ممکن نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس معاشرتی ضرورت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ ”ولکم فی القصاص حیاۃ یااولی الالباب لعلکم تتقون“ اور اے اہل دانش! تمہارے لیے قصاص کے قانون میں زندگی ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ جبکہ قرآن کریم کا اس کے ساتھ یہ ارشاد بھی ہے کہ یہ سزا توریت کے بیان کردہ حکم کا تسلسل ہے۔ ”وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص“ اور ہم نے توریت میں بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بھی بدلہ اور قصاص ہے۔

اسی طرح بائبل میں دوسرے بہت سے جرائم مثلاً ارتداد، ماں باپ کی توہین اور زنا وغیرہ کی سزا قصاص، قتل اور سنگساری کی صورت میں بیان کی گئی ہے، جبکہ اسلام نے اس تسلسل کو باقی رکھا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریمؐ کے سامنے ایک یہودی جوڑے کو زنا کے جرم میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے توریت منگوائی اور ان آیات کا

حوالہ دے کر دونوں کو سنگسار کر دیا جس میں زنا کی سزا سنگساری کی صورت میں موت بتائی گئی ہے۔اس کے علاوہ بھی مختلف جرائم پر موت کی سزا کی آیات آج بھی بائبل میں جوں کی توں موجود ہیں باوجودیکہ اس میں بہت سی تحریف ہو چکی ہے۔قرآن کریم نے بعض جزوی تبدیلیوں کے ساتھ ان سزاؤں کو باقی رکھا ہے اور اس کی حکمت بھی واضح کی ہے کہ انسانی نفسیات کا تقاضہ ہے کہ سنگین جرائم پر سنگین سزاؤں کو نافذ کیا جائے تاکہ انسانی معاشرہ ان جرائم سے پاک ہو اور جرائم پر کنٹرول کیا جا سکے۔

لیکن آج کی سیکولر قوتیں عالمی سطح پر مسلسل اس بات کے لیے سرگرم عمل ہیں کہ موت کی سزا کو سرے سے قانونی نظام سے نکال دیا جائے۔مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یہی مغربی لابیاں جو قتل، زنا، ارتداد اور توہین رسالت پر سزائے موت کی مخالفت کر رہی ہیں، مذہبی دہشت گردی اور منشیات کے استعمال پر موت کی سزا کی حوصلہ افزائی بھی انہیں کی طرف سے ہو رہی ہے، حتیٰ کہ مبینہ دہشت گردی کے بارے میں ان کا موقف اور طرز عمل یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ ان کے خیال میں مذہبی دہشت گردی کا مرتکب ہے، اس کے لیے اپنے رویے سے رجوع، اس سے معافی، اور اس کے ساتھ مذاکرات کا راستہ بھی انہوں نے بند کر رکھا ہے، اور یہ پالیسی عملاً اختیار کر رکھی ہے کہ ایسے افراد اور گروہوں کو مکمل فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے اور ان میں سے کسی کو بھی زندہ رہنے کا حق نہ دیا جائے۔ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے قوموں اور گروہوں کے خلاف فوجی کاروائیوں میں لاکھوں انسانوں کا کھلے بندوں قتل عام کرنے والوں کو کسی ملک میں کسی سنگین جرم کے مرتکب شخص کی ذاتی تکلیف کی تو فکر ہے کہ کوئی حکومت ایسے کسی مجرم کے قتل کی مرتکب نہ ہو، مگر عالمی اتحادوں کے پرچم تلے، اقوام متحدہ کے سائے میں ہر سال لاکھوں افراد کا قتل عام، جن میں ہمیشہ اکثریت بے گناہوں اور پرامن شہریوں کی رہی ہے، انہی مہذب حکومتوں کے نزدیک انسانیت کا تقاضہ اور نام نہاد سولائزیشن کی بقا اور تحفظ قرار پا چکا ہے، اور وہ اس عمل میں تندہی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔

سیکولر حکومتوں، قوتوں اور لابیوں کا یہ دوغلاپن اور منافقت سب کو دکھائی دے رہی ہے، البتہ مسیحیت کی مذہبی نمائندگی کرنے والے پاپائے روم کی طرف سے سزائے موت کے خاتمہ کی یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے اور اس تلخ اور مکروہ زمینی حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہے کہ مسیحیت کے مذہبی پیشوائیت نے بھی سیکولر سوچ اور فلسفہ کے سامنے بائبل کی

مذہبی تعلیمات کو سرنڈر کرانے کو اپنا مشن بنا لیا ہے۔ دراصل آج کی دنیا کا سب سے بڑا ثقافتی اور فکری مخمصہ یہی ہے کہ مسیحی دنیا کی مذہبی پیشوائیت نے بائبل کی آسمانی تعلیمات اور معاشرتی احکام سے دستبرداری اختیار کر لی ہے، اسی بنیاد پر عالم اسلام کی مذہبی قیادت پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ بھی مسیحی پیشوائیت کی طرح آسمانی تعلیمات کی معاشرتی عملداری سے دستبردار ہو جائیں جو کئی وجوہ سے ممکن نہیں:

- ایک اس وجہ سے کہ قرآن کریم کی تعلیمات اور نبی اکرمؐ کی طرف سے اس کی تشریحات، ملت اسلامیہ کے صدیوں کے اجماعی تعامل کی صورت میں، محفوظ حالت میں دنیا کے سامنے موجود ہیں، جس سے کوئی بھی ذی شعور شخص انکار نہیں کر سکتا۔
- دوسرا اس وجہ سے کہ مسیحی پاپائیت نے خود کو اللہ تعالیٰ کی منشا کے اظہار اور بائبل کی تشریح کی واحد اتھارٹی کا درجہ دے کر وحی الٰہی میں ردوبدل اور آسمانی تعلیمات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینے کی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ جبکہ اسلام میں قرآن و سنت کے صریح اور ثابت احکام میں ردوبدل کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہے، جس کی ایک جھلک قرآن کریم کی ایک آیت مقدسہ کے اس جملے میں دیکھی جا سکتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت کی ہے کہ "قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقآئ نفسی" آپ اعلان کر دیجئے کہ مجھے اس بات کا کوئی اختیار نہیں کہ قرآن کریم میں اپنی طرف سے تبدیلی کر سکوں۔

اس لیے مسیحیت کی مذہبی پیشوائیت جو کچھ بھی کرے مسلمانوں کی مذہبی قیادت سے اس بات کی کسی بھی درجہ میں توقع کرنا فضول ہے کہ وہ قرآن کے صریح احکام سے، جو بائبل کے احکام و قوانین کا تسلسل بھی ہیں، دستبرداری اختیار کر سکیں۔ چنانچہ پاپائے روم کی اس اپیل کو مسترد کرتے ہوئے ہم ان سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جن آسمانی تعلیمات کی نمائندگی کا وہ دعویٰ کرتے ہیں خدا کے لیے انہیں انسانی سوسائٹی کی خواہشات اور سیکولر لابیوں کی مذہب دشمنی پر قربان نہ کریں، اور یاددہانی کے لیے ہم آج کی بائبل میں موجود بیسیوں آیات میں سے صرف ایک کا بطور نمونہ حوالہ دینا چاہیں گے جو بائبل کی کتاب استثناء میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے:

”شریعت کی جو بات وہ تجھ کو سکھلائیں اور جیسا فیصلہ تجھ کو بتلائیں اسی کے مطابق کرنا، اور جو کچھ فتوی وہ دیں اس سے داہنے یا بائیں نہ مڑنا، اور اگر کوئی شخص گستاخی سے پیش آئے کہ اس کاہن کی بات جو خداوند تیرے خدا کے حضور کھڑا رہتا ہے یا اس قاضی کا کہانہ سنے تو وہ شخص مار ڈالا جائے، اور تو اسرائیل میں ایسی برائی کو دور کر دینا اور سب لوگ سن کر ڈر جائیں اور پھر گستاخی سے پیش نہیں آئیں گے۔“

قرآنِ کریم کے مروجہ نسخے اور ایک نئی بحث

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۱ فروری ۲۰۱۶ء)

بیت اللہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر کی تھی اور اس وقت سے اس کا تسلسل چلا آرہا ہے۔ مگر بیت اللہ شریف کی موجودہ عمارت ابراہیمی بنیادوں پر نہیں ہے کیونکہ جب قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ان کی بعثت سے قبل بیت اللہ تعمیر کیا تھا تو ابراہیمی بنیادوں میں کچھ تبدیلیاں کر دی تھیں۔ اس تعمیر میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حصہ لیا تھا بلکہ تعمیر کے دوران جب حجر اسود کو اس کے مقام پر نصب کرنے کا شرف حاصل کرنے پر قریش کے سرداروں میں اختلاف ہوا اور بات تنازعہ تک جا پہنچی تو اس تنازعہ کو جناب حضورؐ نے ہی کمال حکمت عملی کے ساتھ نمٹایا تھا جس پر قریش کے مختلف خاندان باہمی جھگڑے سے بچ گئے تھے۔

قریش نے اس تعمیر میں تین تبدیلیاں کی تھیں۔ ایک یہ کہ اس کے آمنے سامنے دو دروازے تھے جس سے بیت اللہ شریف کی زیارت اور طواف کرنے والوں کو سہولت حاصل تھی کہ وہ ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے باہر نکل جائیں اور انہیں بیت اللہ کے اندر جانے کی سعادت بھی مل جائے۔ مگر اس تعمیر کے دوران ایک دروازہ بند کر دیا گیا۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ پہلے دونوں دروازے زمین کے ساتھ تھے اور آسانی کے ساتھ اندر جایا جا سکتا تھا مگر اس موقع پر ایک دروازہ بند کر کے دوسرے دروازے کو زمین کی سطح سے اتنا بلند کر دیا گیا کہ کوئی شخص آسانی کے ساتھ اندر نہ جا سکے۔ جبکہ تیسری تبدیلی یہ کی گئی کہ ایک حصہ کو چھت سے نکال دیا گیا جو اب حطیم کہلاتا ہے۔ اسے ایک

چھوٹی دیوار سے گھیرا گیا ہے مگر وہ بیت اللہ شریف کا حصہ ہونے کے باوجود اس کی چھت کے نیچے نہیں ہے۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ام المومنین حضرت عائشہؓ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ بیت اللہ کی قریش کی تعمیر کردہ بلڈنگ کو شہید کر کے اسے از سر نو ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کر دیا جائے، لیکن رسول اکرمؐ نے خواہش کے باوجود ایسا نہ کیا اور اسے اسی حالت میں یہ فرما کر چھوڑ دیا کہ قریشی قوم نئی نئی مسلمان ہوئی ہے، وہ اس بات کو محسوس کریں گے کہ ابھی چند سال قبل تو ہم نے بیت اللہ تعمیر کیا تھا، اب اسے دوبارہ تعمیر کیوں کیا جا رہا ہے؟

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کا یہ ارشاد روایت کیا تو وہ ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے علم میں بھی آیا۔ حضرت امام حسینؓ کی کربلا میں شہادت کے بعد جب مدینہ منورہ کے لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ کر اس کی اطاعت میں رہنے سے انکار کر دیا تو اس موقع پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی حکومت کافی سالوں تک مکہ مکرمہ سمیت مختلف علاقوں پر قائم رہی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے دور میں حجاج بن یوسفؒ کو حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے خلاف جنگ پر مامور کیا گیا تو انہوں نے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کر لیا جو اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا پایۂ تخت تھا۔ حجاج بن یوسفؒ نے مکہ مکرمہ کے محاصرہ کے دوران گولہ باری کی جس سے بیت اللہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بیت اللہ شریف کو از سر نو تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مذکورہ روایت کی دوبارہ تصدیق کر کے بیت اللہ شریف کو ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کر کے وہ تینوں تبدیلیاں ختم کر دیں جو قریشی تعمیر کے موقع پر کی گئی تھیں۔ اور جن تبدیلیوں کو ختم کر دینے کی خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہش ظاہر کی تھی مگر مصلحتاً اس سے گریز کیا تھا۔

لیکن جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اس جنگ میں شہید ہو گئے اور مکہ مکرمہ کا کنٹرول حجاج بن یوسفؒ کے ہاتھ میں آ گیا تو اس نے خلیفۂ وقت عبدالملک بن مروانؒ کو یہ رپورٹ بھجوائی کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے بیت اللہ کی عمارت بھی تبدیل کر دی ہے جس پر خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے گرا کر دوبارہ قریشی بنیادوں پر تعمیر کر دیا جائے۔ چنانچہ حجاج بن یوسفؒ نے بیت

اللہ کو شہید کر کے قریشی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کر دیا جس سے وہ تینوں تبدیلیاں واپس لوٹ آئیں جنہیں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے ختم کر دیا تھا۔ اور اس وقت سے آج تک وہ تعمیر اسی حال میں چلی آ رہی ہے۔ اس کے بعد جب بنو امیہ کی حکومت ختم ہو گئی اور خلافت کی زمام کار ان کے سیاسی حریفوں بنو عباسؓ نے سنبھالی تو انہوں نے بیت اللہ کی اس عمارت کو امویوں کی تعمیر کردہ قرار دے کر اسے پھر سے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے طریقے پر تعمیر کرنے کے پروگرام بنا لیا جس پر اہل سنت کے امام حضرت امام مالکؒ نے فتویٰ جاری کیا کہ بیت اللہ کی تعمیر میں بار بار اس طرح کے ردوبدل سے کعبۃ اللہ سیاسی حریفوں کی باہمی محاذ آرائی کی آماجگاہ بن جائے گا جو بیت اللہ کے تقدس اور حرمت کے منافی ہوگا۔ اس لیے اب بیت اللہ کو شہید کر کے اسے ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اس فتوے پر آج تک عمل ہو رہا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے باوجود امت مسلمہ کعبۃ اللہ کی بلڈنگ کو ابراہیمی بنیادوں کی بجائے قریش کی بنیادوں پر قائم رکھے ہوئے ہے، کیونکہ بیت اللہ کی حرمت و تقدس اور امت مسلمہ کی اجتماعیت و وحدت کا تقاضہ یہی ہے۔

یہ سارا واقعہ اس کالم میں قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ قرآن کریم کی طباعت و اشاعت کے حوالہ سے ہم آج کل کم و بیش اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہیں۔ مصحف عثمانی کے دو نمونے اس وقت عالم اسلام میں اشاعت پذیر ہو رہے ہیں جو قراءت میں تو ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ہیں مگر رسوم و علامات کے حوالہ سے الگ الگ ہیں۔ عرب دنیا میں قرآن کریم کی طباعت ان رسوم و علامات کے ساتھ ہوتی ہے جو وہاں معروف ہیں۔ جبکہ جنوبی ایشیا یعنی بنگلہ دیش، پاکستان اور بھارت وغیرہ میں مطبوعہ قرآن کریم کی رسوم و علامات ان سے الگ ہیں جو اس قدر متعارف اور عام فہم ہو چکی ہیں کہ یہاں کے عام مسلمان کے لیے کسی دوسرے نسخہ سے قرآن کریم کی تلاوت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے حرمین شریفین میں دنیا بھر سے آنے والے لاکھوں مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کے جو نسخے تلاوت کی غرض سے سرکاری طور پر مہیا کیے جاتے ہیں ان میں دونوں طرح کے نسخوں کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ کسی بھی مسلمان کو تلاوت میں دقت نہ ہو۔

مگراب بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ ہمارے ہاں یعنی پاکستان وغیرہ میں چھاپے جانے والے قرآن کریم کے نسخوں میں بہت سی اغلاط موجود ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے جبکہ اس کے ساتھ ان کی رسوم وعلامات کو بھی عرب نسخوں کے مطابق تبدیل کیا جانا چاہیے۔ اس پر بحث و مباحثہ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی نظریاتی کونسل اور پنجاب قرآن بورڈ میں بھی اس پر گفتگو جاری ہے اور اس پر علمی وفنی دلائل دیے جارہے ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ مسئلہ علمی وفنی مکالمہ و مباحثہ کی حدود سے آگے نکل کر عرف و تعامل کے دائرہ میں آچکا ہے، اس لیے اسے علمی بحث وتمحیص کی بجائے عرف وتعامل کے حوالہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک قراءت کی ناقابل قبول غلطیوں کا تعلق ہے وہ جہاں بھی موجود ہوں ان کی اصلاح بہرحال ضروری ہے۔ لیکن رسوم وعلامات کا معاملہ منصوص نہیں بلکہ اجتہادی ہے۔ اس لیے جو رسوم و علامات متعارف ہو چکی ہیں اور صدیوں سے عوام ان سے مانوس ہو کر ان کے مطابق تلاوت کرتے آرہے ہیں وہ اگر ''خطاء اجتہادی'' قرار دے دی جائیں تب بھی امت کو کسی نئے مخمصے سے دوچار کرنے کی بجائے انہیں اسی حالت میں رہنے دینا چاہیے۔ اگر امت کو کسی فکری یا نفسیاتی خلفشار سے بچانے کے لیے بیت اللہ کی عمارت میں ابراہیمی بنیادوں سے ''عدول'' کو برقرار رکھا جاسکتا ہے تو قرآن کریم کی طباعت و اشاعت میں بھی عجمی رسوم و علامات کو برقرار رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ امت مسلمہ کی عمومی مصلحت کا تقاضہ یہی ہے۔

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱ فروری ۲۰۱۶ء)

اس سال الشریعہ اکیڈمی کے دوستوں نے فکری نشستوں کے لیے عنوان یہ تجویز کیا ہے کہ جن بزرگوں سے میں نے استفادہ کیا ہے اور جن بزرگوں کے ساتھ مل کر مجھے کام کرنے کا موقع ملا ہے ان کا تھوڑا تھوڑا تعارفی تذکرہ ہوجائے۔ ہم نے تقریباً اٹھارہ نشستیں اور اٹھارہ شخصیات مشورے میں طے کی ہیں۔ اس میں ایک بات کی پہلے وضاحت کردوں گا کہ مجھے سب سے زیادہ سب سے طویل عرصہ جن بزرگوں سے استفادے کا موقع ملا ہے وہ تو میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبد

الحمید خان سواتیؒ ہیں، میں نے سب سے زیادہ پڑھا بھی انہی سے ہے، سب سے زیادہ استفادہ بھی ان سے کیا ہے، سب سے زیادہ کام بھی ان کے ساتھ کیا ہے، لیکن یہ دونوں نام ہماری اس فہرست میں نہیں ہیں اس لیے کہ ان میں سے ایک نام بھی ایسا نہیں ہے جو دو چار نشستوں میں بھگت جائے۔ البتہ ان کے بارے میں لکھتا رہتا ہوں اور آئندہ بھی لکھتا رہوں گا، کبھی موقع ملے تو تفصیل سے بات ہوگی لیکن ان کے علاوہ ملک کی جن شخصیات کے ساتھ میرا استفادے کا اور رفاقت کا تعلق رہا ہے ان کا تھوڑا تھوڑا تذکرہ ہوگا۔ سب سے پہلے برکت کے لیے آج کی گفتگو کا عنوان ہوگا حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی قدس اللہ سرہ العزیز۔ ہر گفتگو کے دو حصے ہوں گے، ایک حصہ ہوگا ان کا مختصر سا تعارف جو تھوڑے سے وقت میں کرایا جا سکے اور دوسرا یہ کہ میرا ان کے ساتھ کیا تعلق تھا، اور کوشش یہ ہوا کرے گی کہ بات آدھ گھنٹے سے چالیس منٹ کے درمیان سمٹ جائے۔

حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ ہمارے دور کے اکابر علماء میں سے تھے جن کی امارت و سیادت کو ملک بھر کے علماء تسلیم کرتے تھے۔ بزرگ تھے، بڑے تھے، وہ ہم سب کے رہنما اور سربراہ تھے۔ سیاسی میدان میں بھی، روحانی دائرے میں بھی اور علمی ماحول میں بھی۔ ضلع رحیم یار خان میں خانپور کٹورہ کے ساتھ ایک بستی ہے دینپور شریف، جو ہمارے بڑے علمی اور روحانی مراکز میں سے ہے، تحریک آزادی کے دور میں حضرت خلیفہ غلام محمدؒ دینپور میں جا کر بیٹھے، اللہ والے بزرگ تھے، مجاہد بھی صف اول کے تھے اور صوفی بھی درجہ اول کے تھے، سلسلہ عالیہ قادریہ راشدیہ کے بڑے شیخ تھے، حضرت خلیفہ غلام محمد دینپوریؒ کے نام سے متعارف ہیں اور یہ بستی انہوں نے ہی آباد کی تھی دینپور کے نام پر۔ یہ ہمارے پرانے مراکز میں سے ہے، خانقاہ بھی ہے اور مجاہدین کا مرکز بھی تھا۔ تحریک ریشمی رومال اور تحریک آزادی میں اس کا بڑا مقام ہے، اور اس پورے علاقے میں، سندھ کا علاقہ بھی اور پنجاب بھی، اس میں ان کے روحانی اثرات اب تک محسوس کیے جاتے ہیں۔ حضرت درخواستیؒ اصل میں اس خانقاہ کے نمائندہ تھے، اس خانقاہ میں ایک بزرگ تھے۔ حافظ محمود الدینؒ حضرت درخواستیؒ کے والد تھے، اس کے قریب ہی ایک قصبہ ہے "درخواست" وہاں حضرت درخواستیؒ پیدا ہوئے، اسی نسبت سے درخواستی کہلاتے ہیں۔ تعلیم دینپور شریف میں حاصل کی اور روحانی تربیت بھی وہیں حاصل کی۔ حضرت خلیفہ غلام محمدؒ کے شاگردوں میں سے تھے اور ان کے مریدین میں سے بھی تھے۔

قرآن کریم کا درس حضرت درخواستیؒ کا خاص ذوق تھا، زندگی بھر قرآن کریم پڑھایا ہے۔ اس کے ساتھ خصوصی ذوق تھا حدیثیں یاد کرنے کا، ان کا لقب ہے حافظ الحدیث۔ یہ بھی ان کے شیخ کا فیض تھا کہ وہ حضرت درخواستیؒ سے کہا کرتے تھے کوئی حدیث سناؤ تو یہ روزانہ دو چار حدیثیں یاد کر کے اپنے شیخ کو سنایا کرتے تھے، حافظہ بہت اچھا تھا، یادداشت آخر وقت تک مضبوط تھی تو یاد کرتے کرتے ان کو دس ہزار حدیثیں متن اور سند کے ساتھ ایسے زبانی یاد ہو گئی تھیں کہ کوئی بھی حدیث الگ کر کے سنا سکتے تھے۔ اس لیے ان کو حافظ الحدیث کا لقب دیا گیا کہ وہ اپنے دور کے محدثین میں حدیث رسولؐ کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ یادداشت اللہ تعالیٰ نے بہت مضبوط دی تھی، جو بات ایک دفعہ سن لیتے تھے بھولتے نہیں تھے۔

ایک ذوق تو یہ تھا اور دوسرے یہ کہ فنافی الحدیث تھے۔ میں نے ان کے ساتھ خاصا وقت گزارا ہے، تقریباً تیس سال۔ پندرہ سولہ سال تو ایک نیاز مند کے طور پر اور پندرہ سولہ سال کی عملاً رفاقت بھی ہے ان کے ساتھ ایک کارکن کے طور پر۔ ایک شاگرد کے طور پر اکثر ساتھ رہا۔ میں نے جب قرآن کریم حفظ مکمل کیا ۱۹۶۰ء میں تو آخری سبق حضرت درخواستیؒ کو ہی سنایا تھا۔ آپ گکھڑ تشریف لائے، جلسہ تھا، اس جلسے میں آخری سبق انہی کو سنایا تھا۔ تب سے تعلق ہوا اور ان کی وفات (۱۹۹۲ء) تک یہ تعلق قائم رہا جو دن بدن بڑھتا گیا۔ میں نے زندگی میں ان کا سب سے بڑا ذوق دیکھا ہے وہ یہ کہ جہاں بیٹھے ہیں حدیث سنا رہے ہیں، کھانے کی مجلس ہو یا پبلک جلسہ ہو، جماعت کی میٹنگ ہو یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ ہو رہی ہو، بس میں جا رہے ہوں یا گاڑی میں بیٹھے ہوں، ہر موقع پر حدیث سنانا ان کا خاص ذوق تھا۔ اور وہ فارسی کا ایک شعر اکثر پڑھا کرتے تھے جو کہ واقعتاً ان کے حسب حال تھا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار میکنند

کہ ہم نے زندگی میں جو کچھ پڑھا ہے سب کچھ بھول گئے ہیں، صرف یار کی باتیں یاد ہیں انہیں دہراتے رہتے ہیں۔ یار سے مراد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ ایک ہی شغل تھا ان کا، حافظ الحدیث بھی تھے اور فنافی الحدیث بھی تھے۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز کی وفات ۱۹۶۲ء میں ہوئی تو ان کی جگہ حضرت درخواستیؒ کو جمعیت علماء اسلام پاکستان کا امیر منتخب کیا گیا۔ وہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے سب علماء کے متفقہ امیر تھے، اس دور میں جب مشرقی و مغربی پاکستان کے اکثر علماء جمعیت علماء اسلام کا حصہ تھے، آخر وقت تک امیر رہے ہیں۔ ان کی گفتگو کا انداز تقریباً عالم جذب کا ہوتا تھا، وہ بیان کرنے بیٹھتے تو کبھی حدیث بیان کر رہے ہیں، کبھی شعر سنا رہے ہیں، کبھی کوئی واقعہ سنا رہے ہیں، کبھی کسی سے نعرہ لگوا رہے ہیں، کبھی کسی سے نعت سن رہے ہیں، یہ انداز ہوتا تھا ان کا۔ تین تین، چار چار گھنٹے گفتگو کرتے رہتے، لوگ عقیدت میں بھی اور استفادے کے لیے بھی بیٹھے رہتے، محبت اور عقیدت و احترام کے ساتھ ساری ساری رات بیٹھے رہتے تھے اور وہ باتیں کر رہے ہوتے، ان کی تقریر ایسی مربوط نہیں ہوتی تھی جیسے خطابت ہوتی ہے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے ایک جلسے پر تشریف لے گئے لیکن پابندی تھی کہ تقریر نہیں کر سکتے۔ حضرتؒ بیٹھ گئے، کسی نے کہا حضرتؒ تقریر پر پابندی ہے۔ فرمایا، ہاں تقریر نہیں کر سکتا، دعا پر تو پابندی نہیں ہے، دعا تو کر سکتا ہوں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے اور دعا کے انداز میں ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو فرمائی۔ ساری باتیں دعا میں شامل تھیں، جو کچھ کہنا تھا وہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہنے کی بجائے اللہ سے کہیں کہ یا اللہ انہیں ایسا کر دے، ایسا کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے علم سے نوازا تھا، علم کا سمندر تھے، احادیث کا، فقہی جزئیات کا۔ میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے اس خطے یعنی پاکستان میں پہلے قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا رواج نہیں تھا، اب تو ایک ایک شہر میں تین تین دورۂ تفسیر ہوتے ہیں، اس دور میں پورے پنجاب میں ایک بھی نہیں ہوتا تھا۔ سب سے پہلا دورۂ تفسیر شروع کیا ہے رئیس الموحدین حضرت مولانا حسین علیؒ واں بھچراں میانوالی نے، دوسرا دورۂ تفسیر شروع کیا ہے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے، اور تیسرا دورۂ تفسیر شروع کیا حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ نے، چوتھا دورۂ تفسیر شروع کیا سندھ کے مولانا حماد اللہ ہالیجویؒ نے، یہ چار پانچ اکابر تھے دورۂ تفسیر کی ابتدا کرنے والے۔ پھر حضرت والد گرامی مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور مولانا غلام اللہ خانؒ دوسری صف کے لوگ تھے جنہوں نے دورۂ تفسیر کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت درخواستیؒ پہلی صف کے آدمی ہیں۔ تقریباً پینسٹھ سال مسلسل انہوں نے علماء کو قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر پڑھایا ہے، بڑے بڑے اکابر علماء ان کے سامنے بیٹھتے تھے۔

ہمارے چچا جان حضرت صوفی صاحبؒ بھی ان کے شاگرد ہیں، دورۂ تفسیر ان سے پڑھا تھا۔ تو حضرت درخواستیؒ اپنے دور کے بڑے استاد تھے۔ ایک ذوق ان کا یہ تھا قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر پڑھانا، ایک ذوق جو پہلے بیان کیا کہ حدیثیں سنانا اور سننا۔ امتحان بھی لیا کرتے تھے، ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے ہم لوگ ڈرتے تھے کہ اگر موڈ آگیا اور کوئی حدیث پوچھ لی تو ہم کیا کریں گے۔ بڑی پر بہار، پر رونق مجلس ہوتی تھی۔

ایک ان کا ذوق اور بطور خاص مشن تھا جو ساری زندگی رہا، وہ یہ کہ جہاں بھی جاتے ان کی کوشش ہوتی کہ یہاں اگر دینی مدرسہ نہیں ہے تو مدرسہ ہونا چاہیے۔ اور اگر مدرسہ ہے تو پوچھتے اس کی ترقی کا سامان کیا ہے؟ ملک میں سینکڑوں مدارس ان کی توجہ سے قائم ہوئے ہیں اور سینکڑوں مدارس کی سرپرستی کی ہے۔ ان کے اس ذوق پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، میں نے کہیں لکھا بھی ہے کہ مالاکنڈ کے قبائل کے علاقے میں سفر پر جا رہے تھے تو راستے میں ایک عقیدت مند نے، کوئی خان صاحب سردار عقیدت مند تھے، کہا حضرت! راستے میں میرا گھر ہے دس پندرہ منٹ ٹھہر کر چائے پیتے جائیں۔ فرمایا، ایک شرط پر کہ اپنے علاقے میں مدرسہ بنوانے کا وعدہ کرو، تب چائے پیوں گا آپ کے ہاں۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ ٹھیک ہے مدرسہ بنواؤں گا۔ فرمایا چلو۔ اس کے گھر پہنچے تو پوچھا، آپ کی زمینیں کدھر کدھر ہیں، اس نے کہا یہ گھر کے ساتھ ساتھ اپنی ہی جگہ ہے۔ فرمایا طے کرو کون سی جگہ مدرسہ بنوانا ہے، فیصلہ کرو۔ اس نے باہر نکل کر بتایا کہ جی یہ جگہ ہے۔ فرمایا اچھا! یہ جگہ کتنی ہے؟ جی اتنی۔ فرمایا، ٹھیک ہے دو چار اینٹیں منگواؤ میں سنگ بنیاد رکھ کر جاؤں گا۔ اینٹیں منگوائیں، سنگ بنیاد رکھا، دعا فرمائی اور کہا صبح ہی کام شروع کر دینا۔ یہ ان کا ذوق تھا کہ اگر کسی علاقے میں مدرسہ نہیں ہے تو انہیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ مدرسے بنوانا، مدرسوں کی سرپرستی کرنا، مدارس کی حوصلہ افزائی کرنا، لوگوں کو توجہ دلاتے تھے کہ مدرسوں کی خدمت کرو تعاون کرو۔ خود بھی تعاون کرتے تھے، میں نے ان کو کبھی چندہ مانگتے نہیں دیکھا، دیتے دیکھا ہے۔ اپنے دونوں بزرگوں مولانا عبداللہ درخواستیؒ اور مولانا عبید اللہ انورؒ دونوں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور گنے بغیر نکال کر دے دیتے۔ پہلے خود دیتے پھر دوسروں کو کہتے ہاں جی تم بھی نکالو۔ اور کبھی ذوق میں کسی کو کھڑا کر لیتے اور پوچھتے کتنا چندہ دیتے ہو؟ وہ اگر کہتا ہزار روپیہ تو کہتے بیوی کا بھی ہزار دو ناں۔ اس طریقے سے مدارس کی سرپرستی فرماتے تھے۔ یہ میں نے ان کی خصوصیت دیکھی ہے۔

حضرتؒ بڑے انتھک آدمی تھے، مسلسل سفر میں رہتے، میں بھی سفر کرنے میں کم نہیں ہوں، الحمد للہ مسافر آدمی ہوں، لیکن میرے جیسا آدمی بھی دو تین دن کے بعد واپس بھاگ آتا تھا کہ یہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے، نہ کھاتے ہیں، نہ سوتے ہیں۔ بس چلو چلو! بعض مواقع ایسے آئے ہیں، حالانکہ میں عادی ہوں سفر کا لیکن تیسرے چوتھے دن چپکے سے نکل آتا تھا کہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرتؒ پیچھے ڈھونڈتے رہتے کہ وہ راشدی والا کدھر گیا بڑا بے وفا ہے، سامری کہتے تھے، وہ کدھر بھاگ گیا۔ ان کو دوسرے دن پتہ چلتا کہ وہ چلا گیا ہے، میں تھک کر چلا آتا تھا، میرے بس کی بات نہیں ہوتی تھی، اتنا زیادہ سفر کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوا کہ رات جلسہ کیا ہے، صبح مسجد والے حضرت کے درس کی ترتیب بنا لیتے، تو فرماتے ٹھیک ہے دے دیں گے صبح نماز کے بعد دو گھنٹے درس بھی دے دیا کرتے، رات ایک بجے جلسے سے فارغ ہوئے ہیں اور صبح درس شروع ہو گیا ہے اور لگے ہوئے ہیں لگے ہوئے ہیں، ان کے ہاں وقت کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک جلسے میں مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت درخواستیؒ دونوں شریک تھے، اکثر اکٹھے ہوتے تھے۔ مفتی صاحبؒ کی تو اوقات کی اپنی ترتیب ہوتی تھی کہ فلاں وقت یہ کرنا ہے اور فلاں وقت یہ، جبکہ حضرت درخواستیؒ کا کوئی نظم نہیں ہوتا تھا، دو گھنٹے لگ جائیں، تین لگ جائیں، پورا دن لگ جائے، ان کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ آگے بھی کہیں جانا ہے تو اس جلسے کا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت درخواستیؒ نے تقریر شروع کر دی، مفتی صاحبؒ نے فلائٹ پکڑنی تھی۔ حضرت تقریر لمبی کرتے جا رہے ہیں لمبی کرتے جا رہے ہیں، مفتی صاحبؒ کو فکر لگی ہوئی ہے کہ میری فلائٹ نکل جائے گی اور میں نے ابھی تقریر کرنی ہے اور حضرت بس نہیں کر رہے۔ ادھر حضرت کو کچھ کہنے کا بھی ہم میں حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ حضرت بس کریں، یہ کون کہے ان کو؟ خیر جب تقریر ختم کی تو مفتی صاحبؒ نے تھوڑی سی تقریر کی اور بعد میں ہلکی سی خفگی کے ساتھ عرض کیا حضرت! آپ وقت کا خیال نہیں کرتے۔ فرمایا ہاں، میں نے اسی لیے گھڑی رکھی ہوئی نہیں ہے۔ حضرتؒ کے پاس کوئی گھڑی نہیں ہوتی تھی، مفتی صاحبؒ کو تھوڑا غصہ تھا کہ میرا اتنا وقت خرچ کر دیا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے اسی لیے گھڑی نہیں رکھی ہوئی ہے، تو حضرت مفتی صاحبؒ نے دل لگی کے طور پر کہا، حضرت! گھڑی نہیں رکھی ہوئی تو کیلنڈر تو ہو گا ناں، گھر میں تاریخوں کا تو پتہ ہو گا ناں آج کون سی تاریخ ہے، کہہ رہے ہیں کہ وقت کا پتہ نہیں چلتا۔ تو یہ نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

حضرت درخواستیؒ کھاتے پیتے بہت کم تھے، میں نے ان کے ساتھ بڑے سفر کیے ہیں معمولی سے دو چار لقمے کھاتے باقی کھلاتے تھے اور کھلاتے بھی کیسے کہ کبھی ایک کے منہ میں لقمہ ڈال رہے ہیں، کبھی دوسرے کے منہ میں اور ایسے بھی کرتے کہ بڑے بڑے علماء کی موجودگی میں کسی کے منہ میں انگوٹھا ڈال رہے کہ چوسو بھئی! اور وہ چوس رہا ہے۔ کبھی ایسے بھی کرتے کہ کوئی لقمہ منہ کی طرف لے جا رہا ہوتا تو اس کے ہاتھ سے لقمہ لے لیتے اور کہتے اچھا! بڑے لالچی ہو۔ خود میرے ساتھ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے۔ تو یہ دوستوں کی طرح بے تکلفی چلتی رہتی تھی اور اسی طرح انہوں نے ساری زندگی گزاری ہے، تو ایک آپ کا خاص مشن مدارس کی سرپرستی رہا۔

اور ایک اہم بات میں سمجھتا ہوں کہ جہاد کی تلقین شروع زمانے سے، جس وقت کوئی جہاد کا ماحول تو کیا تصور بھی نہیں تھا کہ کبھی جہاد بھی ہو گا۔ میں ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۰ء عرصے کی بات کر رہا ہوں۔ افغانستان کے جہاد کا بھی کوئی تصور نہیں تھا ابھی تک۔ اور حضرتؒ جلسوں میں وعدہ لیا کرتے تھے کہ کھڑے ہو کر وعدہ کرو کہ وقت آیا تو جہاد کرو گے، خاص طور پر قبائلی پٹی میں، قبائلی علاقے میں جب جاتے جہاد پر تقریر کرتے۔ حضرت درخواستیؒ اور حضرت مولانا عبد الحقؒ اکوڑہ والے یہ دو بزرگ میں نے دیکھے ہیں کہ جہاد افغانستان کے لیے جتنا بھی ذہن تیار کیا ہے وہ ان دو آدمیوں نے کیا ہے۔ جب افغانستان کا جہاد شروع ہوا ہے تو جو لوگ پاکستان اور قبائلی علاقے سے وہاں گئے ہیں وہ ساری پنیری ان دو حضرات کی تھی، جہاد افغانستان کی عملی سرپرستی فرمائی۔ جب جہاد افغانستان شروع ہوا تو پورے قبائلی علاقے کا تفصیلی دورہ کیا، لوگوں سے کہا اٹھو بھئی اپنے بھائیوں کی مدد کرو، یہ بھی ان کا ذوق تھا۔

سیاسی میدان میں حضرت درخواستیؒ کے دو بڑے موضوع تھے: (۱) ملک میں نفاذ شریعت، اسلامی قانون کا نفاذ جمعیت علماء اسلام کا تو مشن ہی یہی تھا، اس کے لیے متحرک رہتے تھے، ہر وقت جلسوں میں، میٹنگوں میں، تحریکوں میں، (۲) اور دوسرا ختم نبوت کے محاذ کی بڑی شخصیات میں سے تھے۔ ہر جلسے میں ہر موقع پر ختم نبوت کے لیے حلف لیتے تھے، وعدہ لیتے تھے، تلقین فرماتے تھے کہ ختم نبوت کے لیے کام کرو گے۔ میں اس پر دو واقعات کا بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا۔

ایک دفعہ معلوم ہوا کہ ایبٹ آباد میں قادیانیوں نے ربوہ کے بعد دوسرا بڑا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے کافی جگہ وغیرہ خرید چکے تھے۔ حضرت درخواستیؒ کو پتہ چلا وہاں

ایبٹ آباد میں جا کر بیٹھ گئے، حضرت حاجی ناول خان مرحوم ہوتے تھے جو آپؒ کے مرید تھے، ان کا ہوٹل تھا، ان کے پاس چلے گئے، ہوٹل میں رہائش پذیر ہوگئے، علاقے کے علماء کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ نہیں بھئی! یہ نہیں بنے گا، میں اس لیے آیا ہوں۔ جب تک مجھے یہ تسلی نہیں ہو جاتی کہ یہاں مرکز نہیں بنے گا میں نہیں جاؤں گا۔ یہاں سے۔ علماء کو اکٹھا کر کے ان سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے قادیانی ایبٹ آباد کو مرکز بنائیں۔ تقریباً دس دن بیٹھے رہے وہاں۔ تقریریں، جلسے کر کے وہاں ماحول ایسا بنایا کہ قادیانی بھاگ گئے اور اپنا فیصلہ ختم کر دیا ایبٹ آباد کو اپنا مرکز بنانے کا۔ یہ ذوق تھا ان کا، صرف زبانی باتیں نہیں کرتے تھے۔

بلوچستان میں ایک فرقہ ہے ذکری، ہمارے ملک میں ہے اور ہمیں عام طور پر پتہ نہیں ہے اس کا۔ بلوچستان میں ساحل کی پٹی تربت، مکران وغیرہ کے علاقے میں یہ فرقہ ہے۔ ملا نور محمد اٹکی تھا اٹھارویں صدی میں اس نے مہدی ہونے کا دعوی کیا، وحی اور نبوت کا دعوی کیا تھا، نماز منسوخ کر دی۔ یہ پوری پٹی ہے جو ملا نور محمد کو نبی اور رسول مانتے ہیں، نماز ان کے ہاں منسوخ ہے، نماز کی جگہ ذکر کے قائل ہیں، وہاں فرق کے لیے مسلمان نمازی کہلاتے ہیں اور یہ ذکری کہلاتے ہیں۔ ان کا وہاں حج اپنا ہوتا ہے، ستائیس رمضان کو حج کرتے ہیں کوہ مراد میں۔ وہاں ان کا بیت اللہ الگ ہے۔ ان کا اپنا وقوف عرفات ہوتا ہے، حج والے سارے کام ہوتے ہیں، وہاں ایک پتھر کو چومتے بھی ہیں۔ یہ وہاں لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور تقریباً ایک سو سال ان کی حکومت بھی رہی ہے اس علاقے میں۔ تین سو سال سے چلے آرہے ہیں اور آج بھی ہیں، میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جاتا۔ وہاں کی تازہ خبر یہ ہے کہ وہاں ذکری فرقے کے خلاف کام کرنے والے سب سے بزرگ شخصیت مفتی احتشام الحق آسیا آبادی پرسوں شہید کر دیے گئے ہیں۔ حضرت درخواستیؒ نے ایک دفعہ ان کے خلاف مہم چلائی اور سب سے پہلے پاکستان کو ذکریوں سے متعارف کروانے کے لیے حضرت درخواستیؒ سامنے آئے، ورنہ ہمارے ہاں کسی کو کوئی پتہ نہیں تھا بلکہ اب بھی کوئی نہیں پتہ۔ بلوچستان کا دورہ کیا اور وہاں علماء کو تیار کیا کہ لوگوں کو بتاؤ تو سہی۔ اور ان کے جعلی حج کے خلاف مہم چلائی، پورے بلوچستان میں آگاہی پیدا کی اور جب تک وہاں کے علماء کو منظم نہیں کر دیا وہاں سے نہیں نکلے۔ یہ حضرتؒ کا خاص ذوق تھا۔

حضرت درخواستیؒ نے تقریبا سو سال کے لگ بھگ عمر پائی ہے، آخر وقت تک متحرک رہے ہیں۔ ہمارے دور کی بڑی بابرکت شخصیات میں سے تھے، میں نے ان کی محنت بھی بہت دیکھی ہے، اور ان کی کرامات اور برکات بھی بہت دیکھی ہیں اور ان کی برکات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں ان بزرگوں کی وجہ سے ہیں، ہمارا تو اپنا کچھ بھی نہیں ہے، ہم تو صرف پائپ لائن ہیں۔

میرا ان سے تعلق کب سے ہوا، اس کا میں نے پہلے بھی کچھ ذکر کیا ہے۔ پہلا تعلق ان سے ۱۹۶۰ء میں ہوا جب میں نے انہیں آخری سبق سنایا۔ میرے ختم قرآن کا موقع تھا اور حضرت درخواستیؒ اتفاقا تشریف لائے تھے۔ میرے استاد محترم ہیں حضرت قاری محمد انور صاحبؒ اللہ تعالی سلامت رکھے۔ گزشتہ چھتیس سال سے مدینہ منورہ میں ہیں، پینتیس سال تک وہاں حفظ کروایا ہے، یہاں اکیڈمی بھی تشریف لائے تھے پچھلے سے پچھلے سال۔ میں نے ان سے قرآن کریم یاد کیا تھا، مجھے الحمد للہ بڑی محبت سے نوازتے ہیں۔ ابھی تین چار دن پہلے مجھے فون کیا فرمایا، او مولوی! میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ میں نے انہیں دعا کے لیے کہا، میرا تو سچی بات ہے دعاؤں کا خزانہ مدینہ میں بیٹھا ہوا ہے، وہ دعائیں کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالی نوازتے رہتے ہیں۔ خیر حضرت درخواستیؒ، حضرت والد گرامیؒ، حضرت مولانا قاری فضل کریم صاحب (مدرسہ تجوید القرآن لاہور کے بانی)، مولانا قاری سید محمد حسن شاہ صاحبؒ، ان چار بزرگوں کو میں نے اپنا آخری سبق سنایا تھا۔ چاروں اپنے وقت کے اکابر تھے اور میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے، تب سے تعلق ہوا اور بے شمار واقعات اور لطائف پیش آئے۔ ایک لطیفہ نما واقعہ سنا دیتا ہوں۔ میرا آخری سبق سورۂ مرسلات کا آخری رکوع تھا، جلسے میں سنایا تھا، سامنے بڑے بڑے اکابر علماء اور میں بارہ سال کا بچہ تھا تو میں سبق میں ایک آیت ”واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون“ بھول گیا۔ کسی نے بتایا اور میں نے پڑھ لیا، بات آئی گئی ہو گئی۔ دو سال کے بعد گوجرانوالہ تشریف لائے ختم نبوت کے دفتر میں جو شہر میں ہے، میں تب نصرۃ العلوم میں پڑھتا تھا۔ میں ملنے کے لیے چلا گیا، سامنے بیٹھ گیا حضرتؒ نے مجھے پہچان لیا اور بلا لیا اوئے! واذا قیل لھم ارکعوا، ادھر آؤ ملتے بھی نہیں ہو بے وفا ہو گئے ہو۔ میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ ان کو یاد ہے کہ اس بچے کا سبق سنا تھا اور یہ آیت بھولا تھا۔ فرمایا ادھر آؤ سبق پھر سناؤ۔ یاد ہے؟ میں نے پھر دوبارہ سبق سنایا، یہ محبت و عقیدت کا تعلق تھا۔

میں اسفار میں بھی ان کے ساتھ رہا، وہ جمعیت علماء اسلام میں کے مرکزی امیر تھے اور میں آہستہ آہستہ گوجرانوالہ شہر، ضلع، ڈویژن، بڑھتا ہوا آخری تقریبا سترہ سال ان کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات رہا ہوں، ان کی ٹیم اور کابینہ کا متحرک حصہ رہا ہوں، اور الحمد للہ مجھے یہ اعزاز حاصل رہا ہے، میں اپنے لیے اعزاز کی بات سمجھتا ہوں۔ تین چار بزرگوں کا مجھے آخر وقت تک اعتماد حاصل رہا ہے۔ ایک لطیفہ اور سنا دیتا ہوں، بڑے لطائف ہیں حضرت درخواستیؒ کے۔ قومی اتحاد کی تحریک تھی ۱۹۷۷ء میں مولانا مفتی محمود صاحبؒ، نوابزادہ نصر اللہ خان، سردار عبد القیوم خان، مولانا شاہ احمد نورانیؒ پیر صاحب آف پگارا، سردار شیرباز مزاری بڑے بڑے لیڈر تھے۔ یہ سارے گرفتار ہو گئے سوائے پیر آف پگارا کے۔ میں اور مولانا اجمل خان کیمپ جیل لاہور میں تھے، ہم نے مشورہ کیا کہ لیڈر سارے جیل میں ہیں اور تحریک کے تسلسل کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کسی لیڈر کا تحریک کے بارے میں روز بیان آئے، تو اب کیا کیا جائے؟ حضرت درخواستیؒ باہر تھے اور بہاولپور اسلامی مشن میں دورۂ تفسیر پڑھا رہے تھے۔ مولانا اجمل خان اور میں نے آپس میں مشاورت کی، مفتی صاحبؒ ہمارے سیکرٹری جنرل تھے اور امیر حضرت درخواستیؒ تھے، لیکن جمعیت کی قیادت مفتی صاحبؒ کی ہی سمجھی جاتی تھی، وہ جمعیت کے قائد کے طور پر گرفتار ہو گئے تو ہم نے کہہ دیا کہ جماعت کا ایک سربراہ ابھی باہر ہے دورۂ تفسیر پڑھا رہا ہے، ہم نے حضرت درخواستیؒ کے نام سے بیان بازی شروع کر دی۔ مجھے الحمد للہ یہ اعتماد حاصل تھا، سالہا سال تک ایسا ہوتا رہا کہ میں حضرت مفتی صاحبؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور حضرت درخواستیؒ کی طرف سے بیان دے دیتا تھا اور وہ چھپ جاتا تھا۔ ایک دفعہ مفتی صاحبؒ نے صرف اتنا کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ بیان پوچھ کر دیا کرو۔ ہاں یہ کہتا ہوں کہ دے کر بتا دیا کرو کہ آپ کے نام سے یہ بیان دیا ہے۔ تو ہم نے جیل سے بندوبست کیا، بیان بھجوانے کا۔ کیسے کیا؟ یہ میں نہیں بتاتا کیونکہ اپنا طریقۂ واردات نہیں بتایا جاتا۔ بہرحال ہم نے بندوبست کر لیا، روزانہ حضرت درخواستیؒ کی طرف سے بیان جاتا اور صبح اخبارات میں چھپا ہوتا کہ آج یہ کرنا ہے، آج یہ کرنا ہے۔ تین دن بیان آیا اور چوتھے دن حضرت درخواستیؒ گرفتار کر لیے گئے۔ حضرتؒ کو کچھ پتہ نہیں کہ کیوں گرفتار کر رہے ہیں۔ چوتھے دن انہیں اسلامی مشن سے اٹھایا اور ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کر دیا، کسی کو کوئی پتہ نہیں تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ اب ہم پریشان کہ اب کس کی طرف سے بیان دیں، پہلے تو ایک شخصیت تھی، خیر اتنے میں مذاکرات شروع

ہو گئے، مذاکرات شروع ہوئے تو مفتی صاحبؒ نے شرط لگا دی کہ میرے امیر کو تم نے گرفتار کیا ہوا ہے اور مجھ سے مذاکرات کر رہے ہو، ان کو پہلے رہا کرو۔ پانچ دن کے بعد رہا ہو گئے، لیکن گرفتار ہم نے کروائے تھے۔ یہ اعتماد اور محبت کی کیفیت تھی جو ہمیں الحمد للہ حاصل رہی ہے اور آخر وقت تک حاصل رہی ہے۔ ان سے نیاز مندی کا تعلق بھی تھا اور دوستی کا تعلق بھی تھا، آپس میں ہنسی مزاح بھی کر لیا کرتے تھے۔

ایک بات اور کہہ کر بات سمیٹتا ہوں، بے شمار باتیں ہیں، کئی لکھی بھی ہیں، کئی رہ بھی گئی ہیں۔ میرے ذاتی تعلق کی ایک بات۔ دو دفعہ ایسا ہوا ایک دفعہ لاہور میں اور ایک دفعہ گوجرانوالہ میں۔ ان کا یہ ذوق بھی تھا کہ علماء سے کسی نہ کسی چیز پر وعدہ لیتے تھے کھڑا کر کے۔ ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ کندیاں شریف والے، بڑے اکابر میں سے تھے، ان کو میں نے کبھی تقریر کرتے نہیں سنا، مائیک پر بولتے نہیں تھے، بس دعا کر لیتے تھے، ہاں ایک دفعہ سنا ہے نصرۃ العلوم میں جلسہ تھا اور حضرت درخواستیؒ کا طریقہ یہ تھا، بہت سارے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے حضرت مفتی صاحبؒ، مولانا اجمل خانؒ، مولانا خواجہ خان محمدؒ، مولانا سراج احمد دینپوریؒ، مولانا محمد شاہ امروٹیؒ یہ سب اکابر بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت درخواستیؒ نے حضرت خواجہ خان محمدؒ سے کہا کھڑے ہو جاؤ، مائیک پہ آکر کہو میرا نام خان محمد ہے، میں خانقاہ سراجیہ کا سجادہ نشین ہوں، میں جمعیت علماء اسلام کا ممبر ہوں، تحریک کا خادم ہوں، میں زندگی بھر شریعت کے نفاذ کی کوشش کرتا رہوں گا اور کبھی بے وفائی نہیں کروں گا۔ حضرت درخواستیؒ کہلواتے جا رہے ہیں اور وہ پیچھے پیچھے کہتے جا رہے ہیں، سب سے کہلوایا مولانا عبید اللہ انورؒ سے، مفتی عبد الواحدؒ سے، حضرت والد گرامی سے بھی کہلوایا، کہو میرا نام محمد سرفراز ہے، میں اس مدرسے کا شیخ الحدیث ہوں۔ یہ آپؒ کا طریقہ تھا۔

اور پھر دستار بندی کرتے تھے۔ یہ دستار بندی رسما ہوتی تھی، دو موقع ایسے آئے ایک یہاں شیرانوالہ گوجرانوالہ میں لمبی تقریر فرمائی، پھر دو چار آدمیوں کو کھڑا کیا، رومال وغیرہ بندھوائے، پھر کہا راشدی والا کدھر ہے؟ میں حاضر ہوا تو رومال وغیرہ اور کوئی نہیں تھا اپنا رومال بھی کسی کو باندھ چکے تھے، الحمد للہ اپنے سر سے ٹوپی اتاری، میرے سر پہ رکھ دی، گرم ٹوپی تھی، سردیوں کا موسم تھا، فرمایا چلو تمہاری دستار بندی ہو گئی ہے۔ ابھی تک میں نے الحمد للہ برکت کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ جامعہ مدنیہ لاہور میں علماء کی

دستار بندی کروا رہے تھے، میں ساتھ ہی بیٹھا تھا لیکن میری باری آنے تک دستاریں ختم ہو گئیں تو اپنی کپڑے کی کڑھائی والی ٹوپی سر سے اتار کر میرے سر پر پہنا دی، وہ بھی میں نے ابھی تک رکھی ہوئی ہے۔ حضرتؒ اس ٹوپی کا تو جلسوں میں اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے کہ راشدی والوں کو ہم نے ٹوپی پہنا دی ہے وہ اب اڑتا پھر رہا ہے۔ الحمد للہ اس وقت سے میرا معمول ہے ہر جمعے کو پگڑی کے نیچے یہ ٹوپی پہن کر جمعہ پڑھاتا ہوں، اور دوسری ٹوپی بھی سردیوں میں کبھی کبھی تبرک کے لیے پہنتا ہوں۔

حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ ہمارے اکابر تھے، بڑے تھے، جن بزرگوں کے ساتھ ہم نے کچھ وقت گزارا ہے اب وہ سامنے نہیں ہیں، میں ایک جملہ کہا کرتا ہوں کہ ہمارے گرد ہجوم بڑھتا جا رہا ہے لیکن تنہائی بھی بڑھتی جا رہی ہے، یہ میرا زندگی کا سب سے بڑا تجربہ ہے۔ اپنے ذوق کے اپنے دائرے کے وہ بزرگ نہیں مل رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے اور ہمیں آخر وقت تک ان کے ساتھ رفاقت نباہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

حکمت عملی کا جہاد

(آسٹریلیا مسجد، لاہور - پاکستان شریعت کونسل - ۱۲ جنوری ۲۰۱۶ء)

(پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام آسٹریلیا مسجد لاہور میں منعقدہ سیرت کانفرنس میں ''منافقین کے خلاف جہاد کی نبویؐ حکمت عملی'' کے موضوع پر خطاب۔)

بعد الحمد الصلوۃ۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے حوالہ سے ایک پہلو پر آج چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا، قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے جناب نبی اکرمؐ کو حکم دیا ''یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم'' (سورہ التحریم ۹) کہ اے نبیؐ! کافروں اور منافقین کے ساتھ جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔ چنانچہ آپؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے دس سالہ دور میں کافروں کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔ طبقات ابن سعدؒ کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ کے غزوات کی تعداد ستائیس ۲۷ ہے جو دس سال کے اندر ہوئے اور سارے جہاد کفار کے خلاف تھے جبکہ یہ بات غور طلب ہے کہ منافقین کے خلاف کون سا جہاد ہوا؟ اس لیے کہ دس سالہ مدنی دور میں منافقوں کے خلاف ایک بار

بھی ہتھیار نہیں اٹھایا گیا، وہ مدینہ منورہ میں رہے اور سارے معاملات میں شریک رہے، شرارتیں بھی کرتے رہے اور بڑے بڑے فتنے انہوں نے کھڑے کئے مگر ایک بار بھی ان کے خلاف تلوار استعمال نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ جناب نبی اکرمؐ سے بعض سرکردہ منافقوں کو قتل کرنے کی اجازت مانگی گئی مگر جناب سرور کائناتؐ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

منافقوں نے اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف جو بڑی بڑی حرکتیں اور شرارتیں کیں ان میں سے چند کا ذکر کروں گا۔ غزوۂ احد کے موقع پر حضورؐ ایک ہزار کا لشکر لے کر احد کے دامن میں آئے تھے جن میں سے تین سو افراد رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبی کی سربراہی میں میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے، یہ صریح غداری تھی اور وفاداری سے انحراف تھا۔ بعد میں وہ میدان احد میں مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات پر طعنے بھی دیتے رہے جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ غزوۂ احد سے فارغ ہونے کے بعد خود مسلمانوں میں سے ایک گروہ نے اس بات کی تحریک کی کہ میدان احد سے واپس آجانے والے ان منافقوں کے خلاف جنگ لڑنی چاہیئے اور جب اس پر باہمی اختلاف رائے ہو گیا تو قرآن کریم نے یہ فرما کر اس جنگ سے روک دیا کہ ”فما لکم فی المنافقین فئتین“ (سورہ النساء ۸۸) کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں کیوں بٹ گئے ہو؟ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حرکات کا قرآن میں تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا، ان کی مذمت بھی کی مگر مسلمانوں کو ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ پر قذف و تہمت کے حوالہ سے عبد اللہ بن اُبی اور دیگر منافقین کا طرز عمل سب کے سامنے ہے، انہوں نے ایک ماہ تک مدینہ منورہ میں فتنہ بپا کیے رکھا۔ خود جناب رسول اللہؐ وحی آنے تک پریشانی کا شکار رہے، مسجد نبویؐ میں اس مسئلہ پر صحابہ کرامؓ میں جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ قرآن کریم میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی کا اعلان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کی مذمت کی مگر ان کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت سعد بن معاذؓ نے کھلے اجتماع میں عبد اللہ بن اُبی کو قتل کر دینے کی بات کی مگر اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

ایک موقع پر عبد اللہ بن اُبی اور اس کے چند ساتھیوں نے سفر کے دوران مہاجرین کے خلاف باتیں کیں اور یہاں تک کہہ دیا کہ اب مدینہ منورہ واپس پہنچنے پر ”لیخرجن الاعز منها الاذل“ (سورہ المنافقون ۸) کہ ہم میں سے جو طاقتور ہو گا وہ دوسروں کو مدینہ منورہ سے

نکال دے گا۔ حضرت زید بن ارقمؓ یہ باتیں سن رہے تھے، انہوں نے حضورؐ کو بتایا تو طلب کرنے پر منافقین نے آپؐ کے سامنے اتنی قسمیں کھائیں کہ آقائے نامدارؐ نے حضرت زید بن ارقمؓ کو ڈانٹ دیا اور ان کی رپورٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس پر قرآن کریم میں سورۃ المنافقون نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ منافقوں کی قسمیں جھوٹی ہیں اور زید بن ارقمؓ نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔

یہ چند شرارتیں ہیں جو میں نے ذکر کی ہیں جبکہ مدینہ منورہ میں منافقوں نے شرارتوں اور فتنوں کا ماحول مسلسل قائم رکھا۔ حتیٰ کہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر ایک جگہ چودہ منافقین گھات لگائے کھڑے تھے جنہوں نے جناب رسول اللہؐ کے وہاں سے گزرنے پر ان کو شہید کرنے کے ارادے سے گھیر لیا، انہوں نے اپنے منہ لپیٹ رکھے تھے۔ وہ اپنے ناپاک منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکے مگر حضورؐ نے ان سب کو پہچان لیا۔ وہ سب کے سب مدینہ منورہ میں رہنے والے منافقین تھے، ان کے نام آپؐ نے اپنے ساتھی حضرت حذیفہؓ کو اس شرط کے ساتھ بتا دیے کہ وہ کسی اور کو اس سے آگاہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ نے ان ناموں کو مرتے دم تک راز میں رکھا جس کی وجہ سے وہ "صاحب سر رسول اللہ" یعنی رسول اللہؐ کے رازدار کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

اس قسم کی حرکتوں پر بعض منافقوں بالخصوص عبد اللہ بن ابی کو قتل کرنے کی اجازت مانگی گئی اور اجازت مانگنے والوں میں حضرت عمرؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ بھی شامل ہیں، مگر آنحضرتؐ نے اجازت دینے سے انکار فرما دیا۔ اور اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ اس طرح لوگ یہ کہیں گے کہ محمدؐ نے اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔

ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم میں منافقوں کے خلاف جہاد کرنے کے صریح حکم کے باوجود عملی صورت حال یہ رہی کہ حضورؐ نے نہ ان کے خلاف تلوار اٹھائی اور نہ ہی ان میں سے کسی کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ حتیٰ کہ آپؐ کو شہید کرنے کیلئے گھیر لینے والے چودہ منافقوں کے ناموں کو بھی خفیہ رکھا جن کا حضرت حذیفہؓ کے سوا کسی کو پتہ نہیں چل سکا، یہ وہ کلمہ گو کافر ہیں جنہیں خود قرآن کریم نے کافر قرار دیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں تو اس کی بنیاد کسی استدلال و استنباط پر ہوتی ہے جس میں خطا کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے۔ لیکن ان کلمہ گو منافقوں کو قرآن کریم نے "وماھم بموٴمنین" اور "انھم لکاذبون"

کہہ کر کافر قرار دیا مگر انہیں قتل کرنے اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں دی اس لیے کہ وہ کافر ہونے کے باوجود ”کلمہ گو“ تھے۔

سوال یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ان کلمہ گو کافروں کے خلاف جنگ نہیں لڑی اور ان میں سے کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی تو منافقوں کے خلاف جہاد کرنے اور ان پر سختی کرنے کے اس حکم کا کیا ہوا جو قرآن کریم میں آج بھی موجود ہے؟ کیا یہ سوچا بھی جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے اس قرآنی حکم پر عمل نہیں کیا؟ ایسا نہیں ہے بلکہ رسول اکرمؐ نے اس حکم پر پورا عمل کیا، منافقوں کے خلاف جہاد کیا، لیکن وہ جہاد تلوار کا نہیں بلکہ حکمت عملی کا تھا جس کے نتیجے میں حضورؐ کے دور میں ہی یہ منافقین ختم ہو گئے تھے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان منافقوں کا تاریخ میں کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

یہ حکمت عملی کا جہاد کیا تھا اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو وہی ہے جو میں نے ذکر کی ہے کہ جناب نبی اکرمؐ دنیا کو یہ تاثر اور پیغام نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں اس لئے کہ اس سے اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچتا ہے اور باقی دنیا کے سامنے مسلمانوں کا تعارف صحیح نہیں رہتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی حکمت عملی یہ تھی کہ منافقین کا یہ گروہ مدینہ منورہ میں اپنا الگ تشخص قائم نہ کر سکے، اس کا امکان سب سے پہلے غزوہ احد کے موقع پر پیدا ہوا تھا جب منافقین تین سو کی تعداد میں الگ ہو گئے تھے۔ ایک ہزار میں سے تین سو کا الگ ہو جانا ان کی طرف سے قوت کا اظہار تھا اور اپنے الگ تشخص کی علامت بھی تھی۔ اگر اس موقع پر ان کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے جاتے تو مدینہ منورہ کے اندر ایک مستقل محاذ قائم ہو جاتا اور مسلم سوسائٹی لوگوں کی نظروں میں دو حصوں میں بٹ جاتی۔ آنحضرتؐ نے اس صورت حال سے بچنے کیلئے ان کی اتنی بڑی حرکت کو نظر انداز کر دیا اور ان کے خلاف کوئی عملی کاروائی نہیں کی گویا ان کے اس وار کو حکمت عملی سے ناکام بنا دیا۔

دوسرا موقع ”مسجد ضرار“ کی تعمیر کا تھا۔ یہ بھی منافقین کی طرف سے اپنے الگ تشخص کے اظہار کی کوشش تھی جسے قرآن کریم نے ”کفرا وتفریقا بین المؤمنین وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ“ (سورہ التوبہ ۱۰۷) سے تعبیر کیا ہے۔ حضورؐ نے کمال حکمت عملی سے یہ مسجد تو ختم کر دی مگر ان منافقین کے خلاف کوئی ایکشن نہ لے کر ان کے الگ تشخص اور گروہ بندی کے امکانات بھی ناکام بنا دیے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد جس طرح تلوار سے ہوتا ہے اسی طرح حکمت عملی سے بھی ہوتا ہے۔ جہاں تلوار کی ضرورت ہے وہاں ہتھیار اٹھانا جہاد ہے اور جہاں حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں حکمت و دانش سے کام لینا اور ہتھیار نہ اٹھانا بھی جہاد ہی کہلاتا ہے۔ آج کے دور میں اور دنیا کے موجودہ حالات میں اس حکمت نبویؐ کو سمجھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

قادیانیوں کا ایک مغالطہ

(جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ جنوری ۲۰۱۶ء)

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کافی عرصہ سے ماہانہ اصلاحی بیان کا معمول ہے جس میں طلبہ سے تعلیمی، اخلاقی، فکری یا مسلکی حوالہ سے کسی موضوع پر مختصر گفتگو ہوتی ہے۔ ۱۱ جنوری کو اس کے ساتھ ساتھ جامعہ کے سہ ماہی امتحانات میں مختلف شعبوں کے نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ میں انعامات کی تقسیم کا پروگرام بھی تھا، اس موقع پر جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج آپ حضرات سے عام طور پر قادیانیوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے ایک مغالطہ کے بارے میں گفتگو کرنا چاہوں گا۔ قادیانی حضرات کا کہنا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے مستقل نبوت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے جو عقیدۂ ختم نبوت کے منافی نہیں ہے۔ مگر یہ بات محض ایک مغالطہ ہے اور میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تین بندوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ یمامہ کے مسیلمہ کذاب، بنو اسد کے طلیحہ بن خویلد، اور یمن کے اسود عنسی نے خود کو نبی کے طور پر پیش کیا اور ان کے گرد اچھے خاصے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جبکہ ایک خاتون سجاح بھی نبوت کی دعوے دار تھی۔

ان میں سے اسود عنسی اور طلیحہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اسود عنسی نے صنعا میں آپؐ کے مقرر کردہ گورنر کو شہید کر کے یمن کی حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ جبکہ طلیحہ بن خویلد نے نبی کریمؐ کے کمانڈر حضرت ضرار بن ازورؓ

کے مقابلہ میں جنگ لڑی تھی۔ لیکن مسیلمہ کا دعوی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مستقل نبوت کا نہیں تھا بلکہ وہ حضورؐ کی رسالت پر ایمان لانے کے بعد ان کی پیروی میں نبی ہونے کا دعویدار تھا۔ وہ اپنے ماننے والوں سے پہلے "محمد رسول اللہ" کا اقرار کرواتا تھا پھر اس کے بعد اپنی نبوت و رسالت کی بات کرتا تھا۔ ختم نبوت کے پہلے شہید حضرت حبیب بن زید انصاریؓ کو جب مسیلمہ نے شہید کیا تو پہلے یہ پوچھا تھا کہ کیا وہ حضرت محمدؐ کو رسول مانتے ہیں۔ اور پھر سوال کیا تھا کہ اس کے بعد کیا مجھے بھی اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہو؟ حبیب بن زیدؓ نے مسیلمہ کو رسول تسلیم کرنے سے انکار کیا تو مسیلمہ نے انہیں شہید کرادیا۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق مسیلمہ کذاب کے دو قاصد خط لے کر حضورؐ کے پاس آئے تو خط کا عنوان یہ تھا کہ "من مسیلمۃ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ"۔ یعنی وہ نبی کریمؐ کو رسول تسلیم کرتے ہوئے ان سے خطاب کررہا ہے۔ ان دو قاصدوں سے آپؐ نے دریافت کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیلمہ کو بھی رسول تسلیم کرتے ہیں۔ حتی کہ بعض روایات کے مطابق کلمہ کے ساتھ ساتھ ان کی اذان کی ترتیب بھی یہی تھی کہ پہلے "اشھد ان محمد رسول اللہ" اور پھر "اشھد ان مسیلمۃ رسول اللہ" کہا جاتا تھا۔

مسیلمہ کا دعوی یہ تھا جو اس نے اپنے خط میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا "انی اشرکت معک فی الامر" کہ مجھے کار نبوت میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہے اور میں مستقل اور مقابل ہونے کی بجائے "شریک نبی" ہوں۔ اس خط میں اس نے یہ شکوہ بھی کیا کہ قریشی حضرات سخت مزاج ہیں جو کسی دوسرے کا حق تسلیم نہیں کرتے۔ اس خط کا اور اس کو لانے والے دو قاصدوں کا واقعہ بخاری شریف میں موجود ہے جسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے روایت کیا ہے۔

ایک موقع پر مسیلمہ خود ایک بڑے وفد کے ساتھ مدینہ منورہ آیا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ براہ راست مذاکرات کیے۔ وہ اپنے ساتھ یہ پیش کش لے کر آیا تھا کہ آپؐ اپنے بعد مسیلمہ کو اپنا جانشین نامزد کردیں، اور اگر ایسا نہیں کرتے تو پھر علاقے تقسیم کرلیں۔ اس کا کہنا تھا کہ "لنا وبر ولک مدر" یعنی شہری علاقوں کے رسول آپ رہیں اور دیہاتی اور صحرائی علاقے مسیلمہ کے سپرد کردیں۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق

حضورؐ نے مسیلمہ کی اس پیشکش کے جواب میں قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی کہ ''ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ'' زمین کا مالک اللہ تعالی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔ یعنی خلیفہ نامزد کرنا یا شہری اور دیہاتی علاقوں کی تقسیم اللہ تعالی کا کام ہے، وہ جیسے چاہیں گے فیصلہ کریں گے۔ اور پھر حضورؐ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھجور کی ٹہنی دکھا کر مسیلمہ سے کہا کہ میں تو تمہیں یہ ٹہنی دینے کا روادار بھی نہیں ہوں۔ چنانچہ مسیلمہ اپنے وفد کے ساتھ ناکام واپس لوٹ گیا۔

یہ سارے شواہد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مسیلمہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مستقل نبوت ورسالت کا دعوی نہیں کیا تھا بلکہ آپؐ کو رسول اللہ تسلیم کرتے ہوئے آپؐ کی پیروی میں خود کو شریک اور معاون نبی کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس کا تقاضہ مستقل نبوت تسلیم کرانے کا نہیں بلکہ نبوت میں شراکت کا تھا اور وہ اس شراکت کو تسلیم کیے جانے کی صورت میں مکمل وفاداری اور اطاعت کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعوے کو تسلیم کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ مسیلمہ کو کذاب کا ایسا خطاب دیا جو آج تک اس کے نام کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا دعوی بھی اسی نوعیت کا تھا اور مرزا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وپیروی کے دعوی کے ساتھ خود کو متعارف کرانے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ نے مسیلمہ کے اس دعوے کو مسترد کر دیا تھا، مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے کو بھی پوری امت مسلمہ نے متفقہ طور پر مسترد کر دیا۔ اس لیے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مستقل یا غیر مستقل کسی طرح کی نبوت کا کوئی امکان نہیں ہے اور یہی چودہ سو سال سے امت کا اجماعی عقیدہ چلا آرہا ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ جنوری ۲۰۱۶ء)

۲۰۱۵ء

اعجاز قرآن کی ایک اور تاریخی شہادت

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۲۸ دسمبر ۲۰۱۵ء)

برمنگھم یونیورسٹی کی لائبریری میں قرآن کریم کے قدیم ترین نسخے کے اوراق کی دریافت نے علم و تحقیق کی دنیا کو دلچسپی کا ایک اور میدان فراہم کر دیا ہے اور مختلف ماہرین اس نسخہ کے حوالہ سے اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ اوراق قرآن کریم کے قدیم ترین نسخے کے ہیں اور ان کی تحریر کا دور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا دور سمجھا جا رہا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو یہ مقدس اوراق مصحف قرآنی کے اس نسخے کے ہو سکتے ہیں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے کاتب وحی حضرت زید بن ثابت انصاریؓ نے مرتب کیا تھا اور مسجد نبویؐ میں عام لوگوں کے استفادے کے لیے اس ستون کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا جو "اسطوانہ مصحف" کے نام سے معروف ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد یہ مصحف شریف ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رکھوا دیا گیا تھا اور جب حضرت عثمان بن عفانؓ نے اپنے دور خلافت میں قرآن کریم کو از سر نو قریش کی لغت پر لکھوایا تو حضرت زید بن ثابتؓ ہی کی قیادت میں ایک کمیٹی نے یہ فریضہ سرانجام دیا تھا۔ انہوں نے ام المومنین حضرت حفصہؓ سے مصحف شریف منگوایا اور اس کی نقلیں تیار کرنے کے بعد انہیں واپس کر دیا تھا۔ چنانچہ برمنگھم یونیورسٹی سے دریافت ہونے والے یہ اوراق اب تک کی تحقیق و ریسرچ کے مطابق اسی نسخہ کے محسوس ہوتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے جو نسخے تیار کرائے تھے وہ اسی ''مصحف صدیقیؓ'' کی نقل اور کاپی تھے صرف اس فرق کے ساتھ کہ ان میں قریش کی لغت و زبان کی پابندی کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ یہ نسخے قرآن کریم کے ''اسٹینڈرڈ نسخوں'' کے طور پر عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں بھجوائے گئے تھے جن میں سے چند مصاحف اصلی حالت میں آج بھی موجود و محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ استنبول کے ''توپ کاپی میوزیم'' میں ہے جس کی زیارت کے لیے ہزاروں لوگ استنبول جاتے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ اور حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کے ہمراہ لندن جاتے ہوئے میں بھی دو دن کے لیے استنبول رکا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر حاضری ہو جائے اور توپ کاپی میوزیم میں ''مصحف عثمانی'' کی زیارت کا شرف حاصل کرلیں۔ مگر میوزیم ان دنوں مرمت کے لیے بند تھا اس لیے اس سعادت سے ہم محروم رہے۔ البتہ سیدنا ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر حاضری اور دعا کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔

ایک نسخے کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ تاشقند کی مرکزی جامع مسجد کے میوزیم میں ہے جبکہ تیسرا نسخہ لندن کے برٹش میوزیم کے سیکشن ''انڈیا آفس لائبریری'' میں موجود ہے۔ اس نسخے کی زیارت میں نے کی ہے۔ حضرت سید نفیس الحسینی شاہؒ اور مولانا محمد عیسی منصوری کے ہمراہ ایک موقع پر انڈیا آفس لائبریری میں حاضری ہوئی اور دیگر بہت سے تبرکات و نوادرات کے ساتھ ساتھ ''مصحف عثمانی'' کی زیارت کی سعادت بھی حاصل کی بلکہ مصحف شریف کو ہاتھوں میں لے کر اس کی ورق گردانی اور اس کے آخر میں بعض ترکی، صفوی اور مغل حکمرانوں کی مہریں دیکھنے کا موقع ملا جن کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا یہ مصحف مبارک یہاں تک پہنچا تھا۔ میں اس سعادت پر تبصرہ کرتے ہوئے عام طور پر اپنے تاثرات یوں بیان کیا کرتا ہوں کہ قرآن کریم ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے میری نظر آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور زبان حال سے گویا ہوئیں کہ: ''اے اللہ! تو کتنا بے نیاز ہے کہ ''مصحف عثمانی'' کی حفاظت کن لوگوں کے ذریعہ کروا رہا ہے اور صرف حفاظت نہیں بلکہ اس کے اصلی ہونے کی شہادت بھی ان سے دلوا رہا ہے کہ مصحف شریف کے ساتھ اس کی تاریخ اور سند بھی درج ہے جس کے حوالہ سے وہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ کیا گیا ہے۔''

حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ جب پہلی بار پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تو یہ خبر اخبارات میں گردش کر رہی تھی کہ یمن کے دارالحکومت صنعا کے کسی کتب خانہ میں قرآن

کریم کا ایک قدیمی نسخہ دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تحریر فرمودہ ہے۔ مولانا چنیوٹیؒ اور راقم الحروف دونوں اس دور میں جمعیت علماء اسلام پاکستان درخواستی گروپ کے مرکزی عہدہ دار تھے اور راقم جمعیت کے آرگن ہفت روزہ ”ترجمان اسلام“ کا مدیر تھا۔ یہ مولانا چنیوٹیؒ کا حسن ذوق تھا کہ وہ مصحف علویؓ کی زیارت کے لیے خود یمن گئے اور پوری رپورٹ لے کر آئے جس کے مطابق جرمن ماہرین نے ریسرچ کے بعد اس بات کی تصدیق کی ہے کہ یہ مصحف حضرت علیؓ کے دور کا ہی ہے اور انہی کا تحریر کردہ معلوم ہوتا ہے۔ مولانا چنیوٹیؒ نے بطور خاص یہ بھی چیک کیا کہ اہم مقامات کے حوالہ سے مصحف عثمانیؓ اور مصحف علویؓ میں کوئی فرق تو نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں تک انہوں نے تقابل کر کے دیکھا ہے انہیں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ اس کی مختصر رپورٹ اس دور میں ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں ہم نے شائع کی تھی اور ”مصحف علویؓ“ کے ایک صفحہ کا عکس بھی غالباً شامل اشاعت کیا تھا۔

مصحف عثمانیؓ اور مصحف علویؓ کے حوالہ سے ان تاریخی شہادتوں کے بعد اب اگر برمنگھم یونیورسٹی سے دریافت ہونے والے مقدس اوراق کو ”مصحف صدیقیؓ“ کا مبینہ طور پر حصہ سمجھا جا رہا ہے تو یہ نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے خوشی اور مسرت کی بات ہے بلکہ قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی ایک اور تاریخی شہادت بھی ہے۔

رسول اکرمؐ کی معاشرتی اصلاحات

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۴ دسمبر ۲۰۱۵ء)

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت اور عقیدت و محبت کا اظہار ہمارے ایمانی تقاضوں میں سے ہے اور ہر مسلمان کسی نہ کسی انداز میں اس کا اظہار ضرور کرتا رہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جناب رسول اللہؐ کی بعثت کن مقاصد کے لیے ہوئی تھی؟ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبرؐ نے انسانی معاشرہ کو خیر کے کن کاموں کی تلقین کی تھی، شر کے کن کاموں سے روکا تھا، اور بھرپور محنت کے ساتھ انسانی سوسائٹی کو کن تبدیلیوں اور اصلاحات سے روشناس کرایا تھا جن کی وجہ سے انہیں پیغمبر انقلاب کہا جاتا ہے۔ اور مؤرخین اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی میں اتنی کم مدت میں اتنے مکمل انقلاب کی اور کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ حجۃ الوداع کے تاریخی

خطبہ میں رسول خدا نے ارشاد فرمایا تھا ''کل امر الجاہلیۃ موضوع تحت قدمی'' کہ آج جاہلیت کی ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جناب نبی اکرمؐ نے جاہلی معاشرہ کی اقدار کو پاؤں کے نیچے روند کر ایک پاکیزہ اور مثالی سوسائٹی کی طرف نسل انسانی کو گامزن کر دیا تھا۔

آئیے اس بات کا ہم تھوڑا سا جائزہ لے لیں کہ وہ کون سی اقدار تھیں جنہیں نبی اکرمؐ نے جاہلیت کی قدریں قرار دے کر ختم کیا تھا اور پھر یہ بھی دیکھ لیں کہ کیا وہ جاہلی قدریں پھر سے انسانی سوسائٹی کا حصہ تو نہیں بن گئیں؟ اس کا ایک سرسری سا منظر یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے:

- کفر و شرک اور بت پرستی کو جزیرۃ العرب میں اپنے دور میں مکمل طور پر ختم کر دیا تھا۔
- عریانی اس حد تک عام تھی کہ بہت سے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کا طواف بھی عریاں حالت میں کرتے تھے۔ مگر نبی اکرمؐ نے عریانی اور فحاشی کو ختم کر کے نہ صرف بیت اللہ کے عریاں حالت میں طواف پر پابندی لگا دی تھی بلکہ عام معاشرتی زندگی میں بھی ستر اور حجاب کے احکام لاگو کر دیے تھے۔
- جوا سرعام کھیلا جاتا تھا حتی کہ حرم پاک کی حدود میں اور عبادت کی بعض صورتوں میں بھی جوئے کا رواج تھا جسے نبی کریمؐ نے ممنوع قرار دے دیا۔
- سود کا لین دین عام تھا، تجارت اور قرض دونوں میں سود کا کاروبار چلتا تھا مگر نبی اکرمؐ نے سود کا خاتمہ کر کے سودی کاروبار کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے مترادف قرار دے دیا۔
- شراب نوشی پر فخر کیا جاتا تھا اور شراب لوگوں کی گھٹی میں شامل سمجھی جاتی تھی مگر نبی اکرمؐ نے اس کی مکمل ممانعت فرما دی اور عملی طور پر معاشرے کو شراب سے پاک کر دیا۔
- نسل، زبان، علاقہ اور قومیت کا تفاخر اس معاشرہ کا امتیاز تھا۔ اس بنیاد پر ایک دوسرے پر برتری جتائی جاتی تھی اور ایک دوسرے پر غلبہ اور تسلط قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ نبی اکرمؐ نے انہیں جاہلی عصبیت کی علامات قرار دے کر ختم کیا اور اعلان کیا کہ شرافت اور برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہوگی۔

• بیٹی کو عار اور بوجھ سمجھا جاتا تھا، اس کا زندہ رہنے کا حق باپ کے رحم و کرم پر ہوتا تھا اور اس دور میں ہزاروں بیٹیاں صرف اس وجہ سے زندہ دفن کر دی گئیں۔ مگر نبی اکرمؐ نے بیٹی کو نہ صرف زندہ رہنے کا حق دیا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دے کر عزت و توقیر بخشی۔

• ناچ گانا عام تھا۔ نبی اکرمؐ نے اسے ممنوع قرار دیا بلکہ اپنی بعثت کے مقاصد میں یہ فرما کر اس بات کو شامل کیا کہ مجھے ناچ گانے کے آلات توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

• حلال و حرام کا کوئی فرق نہیں تھا۔ لوگوں نے اپنے اپنے ضابطے بنا رکھے تھے اور دوسروں کا مال ہضم کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تراش لیے تھے۔ نبی اکرمؐ نے کھانے پینے، لین دین اور دیگر معاملات میں حلال و حرام کے مکمل ضابطے دیے اور فرمایا کہ حرام کھانے والے اور حرام طریقہ سے دوسروں کا مال کھانے والے جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

• یتیم بچے اور عورت بطور خاص معاشرہ میں مظلومیت کا شکار تھے، ان کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا اور بالادست افراد ان پر کسی قسم کا ظلم روا رکھنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے ان دونوں طبقوں کو معاشرتی ظلم اور ناانصافی سے نجات دلائی اور ان کے حقوق کا تعین کیا۔

یہ ان وسیع تر معاشرتی اصلاحات میں سے چند باتیں ہیں جو جناب رسول اللہؐ نے ۲۳ سالہ محنت کے ساتھ معاشرہ میں لاگو کی تھیں۔ اور یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ کا بپا کردہ انقلاب انسانی تاریخ کا کامیاب ترین انقلاب تھا۔ مگر بدقسمتی سے ان میں سے بہت سی جاہلی قدریں آج پھر انسانی معاشرے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ معاشرہ کو ان سے نجات دلانے کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہم بھی محنت کریں۔

غیر سودی بینکاری کی عالمی مقبولیت

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۵ دسمبر ۲۰۱۵ء)

ایک قومی اخبار نے ۵ دسمبر کو یہ خبر شائع کی ہے کہ روس کی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کے رکن اسمبلی دمتری سویولوو نے ایک قانون منظوری کے لیے پیش کیا ہے کہ روس میں بغیر سود اسلامی بینکاری کی اجازت دی جائے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے دمتری سویولوو اسمبلی میں ایک اور مسودہ قانون بھی پیش کر چکے ہیں جس میں اسلامی اصول کی بنیاد پر لیزنگ میں رکاوٹ ڈالے جانے کو غیر قانونی قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

غیر سودی بینکاری جسے عام طور پر اسلامی بینکاری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اب دنیا بھر میں نہ صرف توجہ حاصل کر رہی ہے بلکہ اس کی افادیت و ضرورت کو تسلیم کرنے کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ یقیناً اسلام اور آسمانی تعلیمات کی حقانیت کا اظہار ہے اور اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ انسانی معاشرہ آسمانی تعلیمات سے روگردانی کے نتائج بھگت کر اب وحی الٰہی اور فطرت سلیمہ کی طرف واپسی کے راستے تلاش کرنے لگا ہے۔

سود ایک ایسی معاشی اور معاشرتی بیماری ہے جسے قرآن کریم بلکہ اس سے قبل کی آسمانی کتابوں بالخصوص توراۃ میں بھی نحوست، بے برکتی اور لعنت کے اسباب میں شمار کیا گیا ہے اور قرآن کریم نے بنی اسرائیل سے خدا کی ناراضگی اور ان کے بالآخر ملعون ہونے کے اسباب میں کہا ہے کہ واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ ان کا سود کا لین دین اختیار کر لینا بھی ان پر اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث بنا تھا۔ قرآن کریم نے تجارت اور سود کو ایک دوسرے سے الگ معاملہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ واحل اللہ البیع وحرم الربوا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات اللہ تعالیٰ سود کی رقم کو بے برکت بنا دیتا ہے اور صدقہ میں برکت و اضافہ فرماتا ہے۔

چنانچہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان کرتے ہوئے ہر قسم کے سود کی صراحتاً ممانعت فرما دی اور اسلامی ریاست سے سود کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ حتیٰ کہ نجران کی مسیحی آبادی کو اسلامی ریاست کا حصہ بناتے ہوئے جو معاہدہ ہوا اس میں واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ وہ بھی سودی لین دین نہیں کریں گے۔ اور اگر ان کے کسی ذمہ دار شخص نے سودی کاروبار کیا تو ان کے ساتھ شہریت کا یہ معاہدہ ختم ہو جائے

گا۔ اس طرح سودی لین دین سے مکمل احتراز کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلامی ریاست کے تمام باشندوں کے لیے قطعی طور پر ممنوع قرار دے دیا جس سے اسلامی دنیا اور جزیرۃ العرب کا معاشی نظام اور معاشرتی ماحول سود کی لعنت سے پاک ہو گیا۔ سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ طائف کے قبیلہ بنو ثقیف کا وفد جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلہ کی طرف سے اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ منورہ حاضر ہوا تو انہوں نے مسلمان ہونے کے لیے چند شرائط پیش کیں جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ چونکہ دوسرے قبائل اور قوموں کے ساتھ ان کے تجارتی معاملات سود کی بنیاد پر چلتے ہیں اور سود کی ممانعت سے ان کی بین الاقوامی تجارت متاثر ہوگی اس لیے وہ سود کا لین دین ترک نہیں کر سکیں گے۔ مگر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بنو ثقیف کو اسلام قبول کرنے کے لیے ان شرائط سے دستبردار ہونا پڑا۔

دنیا میں جب تک اسلامی احکام و قوانین کی عملداری رہی اور خلافت یا سلطنت کے عنوان سے مسلم حکومتیں دنیا کے مختلف علاقوں میں برسراقتدار رہیں ان سب میں سود کا لین دین ممنوع رہا۔ اور مسلمانوں نے اجتماعی طور پر احکام خداوندی پر عملدرآمد کا ماحول قائم رکھا۔ مسلم معاشروں میں سود اس دور میں آیا جب وہ مغرب کے بہت سے استعماری ممالک کے تسلط کی وجہ سے ان کی کالونیاں اور نوآبادیاں بن گئے۔ اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے سود کی بنیاد پر ایک نیا معاشی نظام ترتیب دے کر اسے استعماری غلبہ کے ذریعہ دنیا بھر میں رائج کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جس سے باقی دنیا کی طرح مسلم ممالک اور معاشرے بھی سود کی لعنت میں جکڑے گئے۔ اور سود، سٹہ اور جوئے سے پاک فطری معاشی سسٹم دنیا میں ایک خواب بن کر رہ گیا، جبکہ اس دوران سودی نظام نے پوری دنیا کو تباہ کن معاشی ناہمواری سے دوچار کیا اور انسانی معیشت کو استحصال اور مفاد پرستی کے جال میں جکڑ کر انسانی معاشرہ کو لاینحل مشکلات کی دلدل میں پھنسا دیا، اس کا احساس اب آہستہ آہستہ اجاگر ہو رہا ہے۔ پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے قیام پاکستان کے بعد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر سودی معیشت کی انہی تباہ کاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ وطن عزیز پاکستان کے معاشی نظام کو مغرب کے اصولوں پر نہیں بلکہ اسلام کے اصولوں پر استوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے ملک میں قائداعظمؒ کی خواہش اور ہدایت کے باوجود ابھی تک سودی

نظام مسلط ہے اور باشندگان پاکستان کی مشکلات اور پریشانیوں میں مسلسل اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ:

• دستور پاکستان میں اس بات کی واضح ہدایت موجود ہے کہ حکومت جلد از جلد سودی نظام کے خاتمہ کا اہتمام کرے۔

• بانئ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی یہ خواہش ہنوز تشنۂ تکمیل ہے کہ پاکستان کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں کی بنیاد پر استوار کیا جائے۔

• اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی طرف سے کرائے جانے والے عوامی سروے میں ملک کے اٹھانوے فی صد باشندے سودی نظام کے خاتمہ کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔

• اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ آف پاکستان کا شریعت ایپلٹ بنچ ملک کے بینکاری نظام کو سود پر مبنی قرار دے کر سودی قوانین کے مکمل خاتمہ کا فیصلہ دے چکے ہیں۔

• عالمی سطح پر سودی نظام کی معاشی اور معاشرتی تباہ کاریوں کا اعتراف کرتے ہوئے غیر سودی بینکاری کو سرمایہ کاری کے لیے زیادہ محفوظ اور نفع بخش ذریعہ تسلیم کیا جا رہا ہے اور اس بنیاد پر بڑے بڑے عالمی بینکوں میں غیر سودی کاؤنٹر مسلسل کھولے جا رہے ہیں۔

• سابق پاپائے روم پوپ بینی ڈکٹ کی قائم کردہ معاشی ماہرین کی کمیٹی یہ سفارش کر چکی ہے کہ دنیا کو معاشی ناہمواری اور استحصال سے نجات دلانے کے لیے قرآن کریم کے بیان کردہ معاشی اصولوں (غیر سودی بینکاری) کو اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

• برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون لندن کو غیر سودی بینکاری کا مرکز بنانے کے لیے مسلسل سرگرم عمل نظر آ رہے ہیں۔

• اور اب روسی پارلیمنٹ میں بھی غیر سودی بینکاری کے لیے مذکورہ بالا مسودہ قانون پیش کر دیا گیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کے پاس اب غیر سودی معیشت کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا۔

اس پس منظر میں حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ لیت ولعل اور ٹال مٹول کی پالیسی ترک کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات، عوامی خواہشات اور دستوری تقاضوں کے مطابق ملک کو سودی نظام کی لعنت سے نجات دلانے کے لیے فی الفور عملی اقدامات کا آغاز کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں رائے عامہ کو بیدار کرنے اور سول سوسائٹی کو متحرک کرنے کے لیے مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور راہ نماؤں پر مشتمل مشترکہ فورم "تحریک انسداد سود پاکستان" کے نام سے قائم ہے جس کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کے طور پر ذمہ داری راقم الحروف کے سپرد ہے۔ اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسلامی تعلیمات، معاشی انصاف اور معاشرتی عدل کے تقاضوں پر یقین رکھنے والے تمام طبقات، حلقوں اور جماعتوں کو اس طرف توجہ دلائی جائے تاکہ ہم سب مل جل کر قوم کو اسلامی احکام اور قائد اعظمؒ کی خواہش کے مطابق قوم کو ایک منصفانہ نظام فراہم کرنے کی راہ ہموار کر سکیں۔

قدیم اور جدید تعلیم کی اصطلاحات

(جامعة العلوم الاسلامیة، میرپور، آزاد کشمیر - ۱۶ ستمبر ۲۰۱۵ء)

۱۶ ستمبر کو جامعۃ العلوم الاسلامیۃ میرپور آزاد کشمیر کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں حاضری اور کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا، ان کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ جامعہ علوم اسلامیہ کے مہتمم محترم حاجی بوستان صاحب ایک فکرمند اور باذوق بزرگ ہیں جو ایک عرصہ سے اس مشن پر کام کر رہے ہیں کہ دینی علوم اور عصری علوم میں امتزاج قائم کیا جائے اور قدیم تعلیم اور جدید تعلیم دونوں کے حوالہ سے نئی نسل کی ضروریات کا یکساں اہتمام کیا جائے۔ یہ جامعہ اسی مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا جو مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کے علاوہ پورے ملک میں اور بہت سے ادارے اس فکر و ذوق کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔

عام طور پر قدیم علوم سے مراد وہ علوم لیے جاتے ہیں جو دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ جبکہ عصری و جدید علوم کا اطلاق ان علوم و فنون پر کیا جاتا ہے جن کی سکولوں اور کالجوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ ان دونوں کا الگ الگ نظم ملک میں ہر سطح پر موجود ہے۔

قدیم اور جدید کی اصطلاح اور دینی و عصری علوم کا عنوان چونکہ رائج الوقت اصطلاح ہے اس لیے بات کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے میں بھی یہی اصطلاح استعمال کیا کرتا ہوں۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے اس عنوان یا اصطلاح سے اتفاق نہیں ہے، اور آج کی محفل میں اسی کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ قدیم علوم میں قرآن کریم، حدیث و سنت، اور فقہ و شریعت کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور انہیں دینی علوم کہا جاتا ہے۔ جبکہ جدید علوم یا عصری علوم انگریزی زبان، سائنس، میڈیکل، انجینئرنگ، قانون، سوشیالوجی، ریاضی اور ٹیکنالوجی وغیرہ کے وہ علوم و فنون سمجھے جاتے ہیں جن کی تعلیم کالج اور یونیورسٹی میں دی جاتی ہے۔ مجھے اس میں یہ اشکال ہے کہ قرآن کریم کو جدید کے مقابلے میں قدیم کہنا درست نہیں ہے۔ قرآن کریم حادث کے مقابلہ میں بلاشبہ قدیم ہے اور وہ ہمارا اعتقادی مسئلہ ہے۔ لیکن جدید کے مقابلے میں قرآن کریم یا حدیث و سنت کو قدیم قرار دینا یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ یہ پرانے علوم ہیں جن کا زمانہ گزر چکا ہے اور آج ان کی جگہ نئے علوم و فنون نے لے لی ہے۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے، اس لیے کہ قرآن و سنت قیامت تک کے لیے ہیں اور ماضی کی طرح حال کا زمانہ، بلکہ آنے والا مستقبل بھی قرآن و سنت کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ اور قرآن کریم کی ٹرم قیامت تک باقی رہے گی۔

قدیم اور جدید علوم کی اس تقسیم سے جو نفسیاتی اور ذہنی ماحول بنتا ہے وہ یہ ہے کہ آج کی اصل ضرورت تو وہ علوم و فنون ہیں جو جدید اور عصری کہلاتے ہیں جبکہ قرآن و سنت کا تعلق ماضی سے ہے اور ماضی کے ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھنے اور برکت و ثواب کے حصول کے لیے ان کی تعلیم حاصل کرنے کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس تاثر اور نفسیاتی ماحول کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی جگہ یہ ذہن بنانے کی ضرورت ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیم ہماری بنیادی ضروریات میں شامل ہے۔ یہ فرد کی ضرورت بھی ہے، خاندانی نظام و ماحول کی ضرورت بھی ہے، معاشرہ اور سوسائٹی کی ضرورت بھی ہے، اور قومی بلکہ بین الاقوامی ضروریات بھی قرآن و سنت کے علوم سے وابستہ ہیں۔

دوسری بات جو مجھے بہت کھٹکتی ہے بلکہ اس پر سخت غصہ آتا ہے کہ مدارس کے بارے میں جب بھی اصلاحات کی بات کی جاتی ہے، وہ اصلاحات صحیح ہوں یا غلط یہ الگ مسئلہ ہے، لیکن اسے عنوان یہ دیا جاتا ہے کہ ہم دینی مدارس کو قومی دھارے میں لانا چاہتے ہیں۔

حالانکہ دینی مدارس نہ صرف قومی دھارے کا حصہ ہیں بلکہ وہ نظریاتی اور تہذیبی بنیادیں فراہم کرتے ہیں جو قوم کی اساس اور بنیاد ہیں۔

یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قومی دھارے کا مطلب کیا ہے اور خود اس کا دائرہ کیا ہے؟ ہر وہ شعبہ جو قوم اور معاشرہ کی کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کر رہا ہے وہ قومی دھارے کا حصہ ہے۔ تاجر، وکلاء، انجینئر، ملازمین، سائنس دان، ڈاکٹر صاحبان، سیاست دان، صحافی، اساتذہ، اور دیگر شعبوں کے افراد قوم کی ضروریات پوری کرنے میں مصروف ہیں۔ اور ہر ایک صرف اپنے شعبہ میں کام کرتا ہے، دوسرے شعبوں میں اس کا کوئی کردار موجود نہیں ہے۔ انجینئر صرف اپنے شعبہ میں مصروف رہتا ہے اور ڈاکٹری اور وکالت کے کام میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ان میں کسی بھی شعبہ کے ماہرین صرف اپنے شعبہ تک محدود رہتے ہیں اور ان پر یہ الزام نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے شعبوں سے لاتعلق کیوں ہیں اور ان کا علم کیوں نہیں رکھتے؟

سوال یہ ہے کہ یہ اصول علماء کرام اور دینی علوم کے لیے تسلیم کیوں نہیں کیا جا رہا۔ حالانکہ وہ قوم کی ایک بڑی ضرورت پوری کرنے میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔ مسجد و مدرسہ قومی ضروریات میں سے ہیں اور ان کے لیے افرادی قوت کی فراہمی یہ مدارس ہی کر رہے ہیں۔ جس طرح قوم کی سیاسی راہ نمائی کے لیے ایک مستقل طبقہ اپنے دائرہ میں کام کر رہا ہے، اسی طرح دینی راہ نمائی کے لیے بھی ایک مستقل طبقہ مصروف عمل ہے۔ اگر ملک کی بنیاد اسلام پر ہے، دستور کی بنیاد اسلام پر ہے، اسلام قومی ضروریات کا اہم حصہ ہے اور دینی تعلیمات کی قوم کے ہر طبقہ کے لیے ہر سطح پر ضرورت موجود ہے تو یہ ضرورت پوری کرنے والے طبقہ کو قومی دھارے سے باہر تصور کرنے اور اسے قومی دھارے میں لانے کا عنوان اختیار کر کے اس کے امتیاز و تشخص سے محروم کرنے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟

یورپ اور امریکہ میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے، اس لیے کہ وہاں مذہب کا معاشرہ کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہنے دیا گیا اور مذہب صرف ذاتی اختیار کی بات بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن پاکستان میں یا کسی بھی اسلامی ملک میں مذہبی سرگرمیوں اور تعلیمات کو قومی دھارے سے خارج اور قومی ضروریات سے لاتعلق قرار دینا دراصل پاکستان کے نظریاتی تشخص اور دستور پاکستان کی اسلامی بنیادوں کی نفی ہے، اور اسلام کے معاشرتی کردار سے نعوذ باللہ دست برداری کے مترادف ہے۔

اس لیے میں علماء کرام اور ارباب دانش سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ دینی علوم کو عصری علوم سے الگ تسلیم کر کے اور قدیم و جدید کی تفریق کو قبول کر کے اس سازش کو کامیاب نہ بنائیں جو مسلم معاشرہ کے اجتماعی شعبوں کو دین سے الگ کرنے کے لیے کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ قرآن و سنت صرف ماضی کے علوم نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے علوم بھی ہیں۔ جبکہ عالمی حالات اس رخ کی طرف جاتے ہوئے واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں کہ پوری نسل انسانی کے مستقبل کی فکری، تہذیبی اور معاشرتی راہ نمائی کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن و سنت ہی ہوں گے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۵ء)

بخاری شریف کو ایک نظام حیات کے طور پر بھی پڑھیں

(جامعہ نعمانیہ، قاضی کوٹ، ضلع گوجرانوالہ - ۲۲ اگست ۲۰۱۵ء)

۲۲ اگست کو جامعہ نعمانیہ قاضی کوٹ ضلع گوجرانوالہ میں دورۂ حدیث شریف کے آغاز کی تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف کے سجادہ نشین حضرت مولانا خواجہ خلیل احمد مہمان خصوصی تھے۔ جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد طیب نے بخاری شریف کی پہلی روایت پڑھا کر دورۂ حدیث کا افتتاح کیا۔ جبکہ مولانا مفتی محمد حسن، لاہور اور راقم الحروف نے خطاب کیا۔ اس موقع پر جو گزارشات طلبہ کے سامنے پیش کیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوۃ۔ ابھی مولانا مفتی محمد طیب صاحب نے آپ حضرات کو بخاری شریف کا پہلا سبق پڑھایا ہے اور امام بخاریؒ کے امتیازات اور بخاری شریف کی خصوصیات پر بہت عمدہ اور مفید گفتگو فرمائی ہے، میں بھی اسی حوالہ سے دو چار گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

آپ سارا سال بخاری شریف پڑھیں گے اور آپ کے اساتذہ حدیث اور علم حدیث کے فیوض و افادات سے آپ کو آگاہ کریں گے۔ میری گزارش یہ ہے کہ اس بات کو ذہن میں رکھ لیں کہ آپ نے بخاری شریف کو کس طرح پڑھنا ہے اور کیا سمجھ کر پڑھنا ہے۔ بخاری شریف بنیادی طور پر احادیث نبویہؐ کا مستند ترین ذخیرہ ہے، اسے حدیث کی کتاب سمجھ کر

پڑھا جاتا ہے، اور یہ بات بالکل درست ہے۔ مگر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بخاری شریف کے تراجم ابواب پر اپنے رسالہ کے آغاز میں یہ فرمایا ہے کہ حضرت امام بخاریؒ نے ''الجامع الصحیح'' میں چار بڑے علوم کو سمو دیا ہے اور یہ بہت سے علوم کی جامع کتاب ہے۔ اس کتاب کا پورا نام اس طرح ہے ''الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ''۔ اس کا پہلا لفظ الجامع ہے اور اسی کے حوالہ سے میں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ارشاد کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بخاری شریف میں قرآن کریم کی تفسیر کے بارے میں ہزاروں روایات ذکر کی گئی ہیں اور ان کی تشریح حدیث نبویؐ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ بخاری شریف کا آغاز قرآن کریم کی ایک آیت سے ہوا ہے اور اختتام بھی قرآن کریم کی آیت پر ہی ہوگا۔ جبکہ درمیان میں شاید ہی آپ کو کوئی صفحہ قرآن کریم کی آیت یا کسی جملہ سے خالی ملے، اس لیے یہ تفسیر قرآن کریم کی کتاب ہے۔

امام بخاریؒ نے صرف احادیث بیان نہیں کیں بلکہ قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ہزاروں احکام و مسائل مستنبط کیے ہیں۔ وہ پہلے مسئلہ بیان کرتے ہیں، پھر اس کے مطابق قرآن کریم کی آیت، حدیث نبویؐ، اور آثار صحابہؓ و تابعینؒ لاتے ہیں، جس سے اہل سنت کے منہج استدلال کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ ہمارے دین کی کسی بھی بات کی بنیاد قرآن کریم کے بعد احادیث اور آثار صحابہؓ پر ہے۔ اور یہی اہل سنت کی اعتقادی و فقہی اساس ہے۔ قرآن و سنت سے احکام مستنبط کرنے کو فقہ کہتے ہیں۔ فقہ و شریعت قرآن و حدیث سے الگ کوئی علم نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث سے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل ہی فقہ کہلاتے ہیں۔

فقہ کا قرآن و حدیث کے ساتھ وہی تعلق ہے جو مکھن، پنیر، ملائی، کریم اور دہی کا دودھ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جبکہ امام بخاریؒ نے جو مسائل مستنبط کیے ہیں ان کی تعداد بخاری شریف میں ساڑھے چھ ہزار کے لگ بھگ ہے، اور تکرار کے بغیر روایات کی تعداد ساڑھے چار ہزار کے آگے پیچھے بیان کی جاتی ہے۔ گویا مسائل زیادہ بیان ہوئے ہیں اور احادیث و روایات ان سے کم ہیں۔ اس لیے بخاری شریف فقہ کی کتاب بھی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ''سیر و مغازی'' یعنی تاریخ کو بھی اس میں کمال درجہ میں شامل کیا ہے۔ امام بخاریؒ صف اول کے مؤرخ ہیں، انہوں نے تاریخی روایات کو جس ذوق و اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اسی طرح

امام بخاریؒ نے ”زھدو رقائق“ سے متعلقہ روایات کو بھی جمع کیا ہے جسے سلوک واحسان کہا جاتا ہے، اور اسے تصوف سے بھی تعبیر کر لیا جاتا ہے۔

اس طرح بخاری شریف اصلاً تو حدیث کی کتاب ہے، مگر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک یہ (۱) تفسیر (۲) فقہ (۳) تاریخ اور (۴) سلوک واحسان کی کتاب بھی ہے۔ چنانچہ پڑھنے پڑھانے والوں کو بخاری شریف کی اس جامعیت کو سامنے رکھ کر اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ بخاری شریف کی اس ”جامعیت“ کا ایک اور حوالہ دینا چاہوں گا جس کا ذکر مولانا مفتی محمد طیب نے بھی کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انسانی سوسائٹی میں زندگی کے چار بڑے دائرے ہیں۔ (۱) فردی زندگی (۲) خاندانی زندگی (۳) سوسائٹی اور قوم کی زندگی اور (۴) عالمی و بین الاقوامی زندگی۔ اسلامی تعلیمات انسانی زندگی کے ان چاروں دائروں کے حوالہ سے واضح طور پر موجود ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنے دور کے حوالہ سے زندگی کے ان سب شعبوں کے بارے میں قرآن و سنت اور آثار صحابہ و تابعین کے ذریعہ امت مسلمہ اور نسل انسانی کی راہ نمائی کی ہے۔ میں اسے یوں تعبیر کرتا ہوں کہ بخاری شریف کو اسلام کے مکمل نظام حیات کے طور پر بھی پڑھا جائے، اس میں صرف اعتقادات، عبادات، معاملات، آداب اور اخلاقیات ہی نہیں بلکہ زندگی کے اجتماعی شعبوں کے احکام و قوانین بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اگر آپ اس ذوق کے ساتھ بخاری شریف پڑھیں اور پڑھائیں گے تو آپ کو اس میں سیاسی نظام بھی ملے گا، معاشی نظام بھی ملے گا، خارجہ پالیسی بھی ملے گی، جنگ اور صلح کے احکام بھی ملیں گے، قومی زندگی کی ضروریات بھی اس میں موجود ہیں، بین الاقوامیت کے تقاضے بھی اس میں بیان کیے گئے ہیں، اور خاندانی نظام کے بارے میں تو اس سے زیادہ جامع اور فطری احکام کا کسی دوسری جگہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے ایک سیمینار میں ”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ پالیسی“ پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن کریم کی چند آیات اور بخاری شریف کی ایک تفصیلی روایت کا حوالہ دیا تو ایک انتہائی مقتدر شخصیت نے جو سیمینار کی صدارت فرما رہے تھے، بعد میں حیرانی کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ کیا قرآن و حدیث میں ”خارجہ پالیسی“ کا ذکر بھی موجود ہے؟ میں نے عرض کیا کہ بڑی تفصیل کے ساتھ ہے مگر اسے سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے توجہ اور ذوق کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں دورۂ حدیث کے طلبہ سے گزارش کروں گا کہ بخاری شریف کو

ایک نظام حیات کے طور پر بھی پڑھیں، اس لیے کہ آج کے دور میں سب سے زیادہ ضرورت اسی بات کی ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۵ اگست ۲۰۱۵ء)

دینی مدارس میں سالانہ تعطیلات کے مفید کورسز

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۹ مئی ۲۰۱۵ء)

شعبان المعظم اور رمضان المبارک دینی مدارس میں درجہ کتب کے طلبہ کے لیے تعطیلات کے ہوتے ہیں اور شوال المکرم کے وسط میں عام طور پر نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دوران حفاظ اور قرا کا زیادہ وقت قرآن کریم کی منزل یاد کرنے اور رمضان المبارک کے دوران تراویح میں سننے سنانے میں گزرتا ہے۔ جبکہ عام طلبہ کو تعلیمی مصروفیات میں مشغول رکھنے اور ان کے وقت کو مفید بنانے کے لیے مختلف کورسز کے اہتمام کی روایت کافی عرصہ سے چلی آرہی ہے۔ زیادہ تر قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کے دورے ہوتے ہیں جو شعبان کے آغاز سے شروع ہو کر رمضان المبارک کے وسط تک جاری رہتے ہیں۔ ان میں اساتذہ کرام اپنے اپنے ذوق کے مطابق طلبہ کو قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر مختصر دورانیہ میں پڑھاتے ہیں۔ ان میں حضرت مولانا حسین علیؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا حماد اللہ ھالیجویؒ، حضرت مولانا محمد عبد اللہ بہلویؒ، حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے دوروں نے بطور خاص شہرت حاصل کی، اور ہزاروں علماء و طلبہ نے ان سے استفادہ کیا۔

والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے ۱۹۷۶ء سے ۲۰۰۰ء تک مسلسل پچیس سال دورہ تفسیر پڑھایا۔ اس کے علاوہ بھی ان کا ذوق یہ تھا کہ جامعہ نصرۃ العلوم میں درس نظامی کی آخری کلاسوں کو پابندی کے ساتھ ترجمہ قرآن کریم پڑھاتے تھے جو دو سال میں مکمل ہوتا تھا۔ اور مدرسہ میں روزانہ تعلیم کا آغاز اسی سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ جبکہ عم محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کا خصوصی ذوق یہ تھا کہ وہ دورۂ حدیث کے طلبہ کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' مکمل یا کچھ ابواب ضرور پڑھاتے تھے جو مدرسہ کے نصاب کا باقاعدہ حصہ ہے۔ یہ دونوں کام اب بھی جاری ہیں اور دونوں بزرگوں

کی یہ روایت جاری رکھنے کی سعادت بحمد اللہ تعالیٰ مجھے حاصل ہے۔ دورۂ تفسیر قرآن کریم کے علاوہ مختلف مقامات پر میراث، صرف ونحو، منطق، اصول فقہ اور دیگر علوم وفنون کے ماہرین ان تعطیلات کے دوران اپنے اپنے فنون میں مختصر دورانیے کے کورسز کراتے ہیں جو بہت مفید اور ضروری ہیں۔

اب کچھ عرصہ سے عربی بول چال اور تحریر وتقریر کے کورسز کا اہتمام بھی ہونے لگا ہے، جس میں ہمارے فاضل دوست مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور کی شبانہ روز محنت کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ سب کورسز ہماری اجتماعی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں اور ان سے تعلیمی ذوق بڑھنے کے ساتھ ساتھ چھٹیوں کے اوقات کا صحیح مصرف بھی مل جاتا ہے اور تعلیمی ترقی بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے ادیان اور فرق باطلہ سے طلبہ کو متعارف کرانے کے لیے بھی کورسز ہوتے ہیں جن میں چناب نگر میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور چنیوٹ میں ادارہ مرکزیہ دعوت وارشاد کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے تربیتی دورے بطور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں دوسرے مذاہب کے ساتھ ساتھ قادیانیت کے دجل وفریب سے علماء وطلبہ کو واقف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس قسم کے کورسز کا دائرہ مسلسل پھیلتا جا رہا ہے جو بہت خوش آئند ہے۔ لیکن ان میں نظم وضبط اور باہمی رابطہ وتعاون کا ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اکثر اوقات ایک طرز کی دینی ضرورت کی طرف تو سب کی توجہ ہو جاتی ہے اور ایک ایک شہر میں متعدّد کلاسیں لگ جاتی ہیں، مگر دوسری طرز کی دینی ضرورت جو اسی درجہ کی اہمیت رکھتی ہے، نظر انداز ہو جاتی ہے اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ ہمارے خیال میں اگر کوئی بڑا دینی اور علمی ادارہ اس سال ملک بھر میں ایک سروے کا اہتمام کر سکے کہ کہاں کہاں کون کون سے مضامین میں یہ دورے ہوتے ہیں اور ملک کی عمومی دینی ضروریات کے حوالہ سے ان کا تناسب کیا ہے تو یہ بہت بڑی دینی خدمت ہوگی۔ یوں اگلے سال ان کاموں کی ترجیحات اور درجہ بندی کرنے میں آسانی رہے گی۔

گزشتہ دنوں ایک بڑے مدرسہ میں بخاری شریف کے آخری سبق کے موقع پر میں نے طلبہ سے عرض کیا کہ وہ فارغ ہونے کے بعد اور تعطیلات کے دوران اپنے وقت کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ اور کسی نہ کسی کورس میں اپنے ذوق کے مطابق ضرور شریک ہوں، یا کچھ وقت تبلیغی جماعت کے ساتھ لگا لیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ خود اپنے اوقات اور معمولات

کی ترتیب قائم ہو جاتی ہے اور طرح طرح کے لوگوں کے ساتھ میل جول اور گفتگو سے پبلک ڈیلنگ کا ذوق بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

ہمارے خیال میں دینی مدارس کے طلبہ کے ذوق، ضروریات اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے جس قسم کے کورسز کی ضرورت ہے، ان میں اہم عنوانات یہ ہو سکتے ہیں:

- ترجمہ قرآن کریم اور تفسیر۔ خاص طور پر انہیں عوام میں درس قرآن کی طرز اور ذوق سے بہرہ ور کرنا۔
- غیر اسلامی ادیان اور فرق باطلہ سے تعارف اور اس میں مسائل میں مناظرہ سکھانے کے ساتھ ساتھ ان مذاہب کی تاریخ، مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت، متنازعہ معاملات اور ان کی موجودہ پوزیشن سے متعارف کرانا بھی ضروری ہے، تاکہ باہمی معاملات کی صحیح پوزیشن سامنے آئے۔
- صرف، نحو، میراث اور دیگر فنون کے مطالعاتی اور تعارفی دورے۔
- آج کے دور میں اسلام کی دعوت و تعارف کی ضروریات اور تقاضوں سے آگاہی۔
- عربی بول چال اور تحریر و تقریر کی مشق اور اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے عملی تربیت۔
- موجودہ فکری تحریکات کے فکری اور تاریخی پس منظر اور ان کے نقصانات سے آگاہی۔
- اصول فقہ، اصول تفسیر اور اصول حدیث کے تعارفی کورسز۔
- موجودہ بین الاقوامی ماحول، عالمی قوانین و نظام اور مسلمانوں پر ان کے اثرات سے آگاہی۔
- اسلام اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مغربی مفکرین بالخصوص مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ۔
- شریعت اسلامیہ کے احکام و قوانین پر جدید اعتراضات و اشکالات کا جائزہ۔

• پاکستان میں نفاذ شریعت کی جدوجہد اور اس کے تقاضوں سے آگاہی۔

وغیر ذالک۔

ان مقاصد کے لیے اصل میں تو درس نظامی سے فراغت کے بعد بڑے جامعات کو ایک ایک سال کے کورسز کا اہتمام کرنا چاہیے جو ان میں سے کسی ایک موضوع پر ہوں۔ لیکن تعارفی سطح پر سالانہ تعطیلات کے دوران مختصر کورسز بھی فائدہ مند ہوسکتے ہیں۔ میرے خیال میں جامعۃ الرشید نے گزشتہ دنوں جسٹس (ر) خلیل الرحمن خان اور مولانا سید عدنان کاکاخیل کی سربراہی میں جو تھنک ٹینک قائم کیا ہے وہ اس کی منصوبہ بندی میں موثر کردار ادا کرسکتا ہے۔

ایک تجربہ محدود سطح پر ہم نے بھی الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں گزشتہ سال سے شروع کر رکھا ہے جو ''دورہ تفسیر قرآن کریم و محاضرات قرآنی'' کے عنوان سے ہے۔ اس سال یہ کلاس ۳ شعبان سے ۲۸ شعبان تک ہوگی اور اس میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں، بین الاقوامی قوانین اور خلافت و شریعت سمیت مختلف عنوانات پر بیسیوں محاضرات ہوں گے۔ اس سلسلہ میں زیادہ تر خدمت راقم الحروف خود سرانجام دے گا جبکہ معاون اساتذہ میں مولانا فضل الہادی، مولانا حافظ محمد یوسف، مولانا ظفر فیاض، مولانا حافظ وقار احمد اور حافظ محمد عمار خان ناصر شامل ہوں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

امام بخاریؒ کی علمی دیانت

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۷ مئی ۲۰۱۵ء)

بخاری شریف کی تکمیل کی تقریبات کا سلسلہ ابھی چل رہا ہے اور مختلف پہلوؤں پر متنوع گفتگو کا موقع مل رہا ہے۔ بعض احباب نے تقاضا ہے کہ اس بات چیت کو مربوط شکل دی جائے جو سر دست میرے لیے مشکل ہے، ارادہ ہے کہ رمضان المبارک کے دوران فرصت کے لمحات میسر آنے پر اس کی کوشش کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ سر دست چند پہلو تحریری صورت میں قارئین کی نذر کیے جا رہے ہیں۔

امام بخاریؒ کا ذوق یہ ہے کہ وہ ''الجامع الصحیح'' میں صرف احادیث بیان نہیں کرتے بلکہ ان سے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ بلکہ پہلے وہ مسئلہ بیان

کرتے ہیں جو ان کے نزدیک اس حدیث سے قائم ہو رہا ہے اور مسئلہ بیان کرنے کے بعد اس سے متعلقہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو مسئلہ وہ قائم کرتے ہیں اس کے بارے میں اکثر مقامات پر پوری حدیث بھی ذکر نہیں کرتے بلکہ حدیث کا صرف اتنا حصہ بیان کر دیتے ہیں جو اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ "فقہ البخاری فی تراجمہ" امام بخاریؒ کا تفقہ اور ان کی فقہ ان ابواب اور عنوانات میں موجود ہے جو انہوں نے احادیث پر قائم کیے ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی مدنظر رہے کہ تراجم ابواب کی تعداد ساڑھے چھ ہزار سے زیادہ ہے جبکہ تکرار حذف کر کے احادیث کی تعداد ساڑھے چار ہزار کے لگ بھگ رہ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری شریف میں احکام و مسائل کی تعداد زیادہ ہے اور احادیث کی تعداد ان سے بہت کم ہے۔ یہ ساری علامات فقہی ترتیب کی ہیں اس لیے میں ایک طالب علمانہ بات یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ بخاری شریف صرف حدیث کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فقہ کی کتاب بھی ہے جس میں امام بخاریؒ نے ایک فقیہ اور مجتہد کے طور پر اپنی ساری فقہ سمودی ہے۔

حدیث و فقہ الگ الگ علوم نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ماخذ کے مختلف اظہار ہیں اور آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ حدیث کو سند اور متن کے ساتھ بیان کرنا روایت اور حدیث کہلاتا ہے۔ جبکہ اس میں مسائل و احکام کا استنباط کرنا فقہ شمار ہوتا ہے۔ جہاں حدیث ہوگی وہاں ظاہر بات ہے کہ فقہ بھی ہوگی، اور جہاں فقہ ہوگی یقیناً اس کی پشت پر کوئی نہ کوئی حدیث بھی ہوگی۔ ان کا باہمی تعلق اسی طرح کا ہے جو دودھ اور مکھن کا ہے۔ دودھ اپنی اصل حالت میں دودھ کہلاتا ہے، جبکہ اس میں سے گھی نکلتا ہے، مکھن بنتا ہے، پنیر اور کھویا نکلتا ہے، ملائی اور کریم نکالی جاتی ہے اور برفی بھی اسی سے بنتی ہے۔ اب یہ ساری چیزیں بظاہر الگ الگ نظر آنے کے باوجود دودھ سے الگ نہیں ہیں بلکہ اسی کا حصہ اور ثمرہ ہیں۔ اس لیے حدیث اور فقہ الگ الگ علوم نہیں ہیں بلکہ ایک ہی علم کی مختلف صورتیں ہیں۔ فقہ کا یہی تعلق قرآن کریم کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم کی آیت پڑھی جائے تو یہ تلاوت و قراءت ہے لیکن اس میں سے مسائل و احکام کا استنباط کیا جائے تو وہ فقہ بن جاتا ہے اور وہ فقہی احکام و مسائل قرآن کریم کا حصہ ہی ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ کے ذوق اور ان کی عظمت کے بیسیوں پہلو بیان کیے جاتے ہیں جن میں سے ان کی علمی دیانت کے حوالہ سے ایک پہلو ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف آج کے دور میں

علماء کرام اور فضلاء کرام کو زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ امام بخاریؒ کے حوصلہ اور علمی دیانت کا یہ پہلو ہم سب کے لیے لائق تقلید ہے کہ ان کے اساتذہ میں امام محمد بن یحیی ذہلیؒ ایک بڑے محدث تھے جن کی مسند حدیث نیشاپور میں تھی۔ اور امام بخاریؒ نے ان سے استفادہ کے بعد نیشاپور میں ہی اپنی مجلس قائم کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ مگر استاذ محترم سے ایک علمی مسئلہ پر اختلاف ہوگیا۔ امام ذہلیؒ حنابلہ کے امام تھے اور خلق قرآن کے مسئلہ پر اس دور میں اس حد تک شدت آگئی تھی کہ "قرآن کریم مخلوق نہیں ہے" کا اطلاق ظاہری الفاظ اور قرآن کریم سے متعلقہ ہر چیز پر کیا جانے لگا تھا۔ اس کو متوازن کرنے کے لیے امام بخاریؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم اللہ تعالی کا کلام اور غیر مخلوق ہے، لیکن جو الفاظ میری زبان پر جاری ہوتے ہیں یہ مخلوق ہیں۔ انہوں نے جب یہ کہا کہ "لفظی بالقرآن مخلوق" تو ان کے استاذ محترم امام ذہلیؒ نے ان پر "ضال و مضل" ہونے کا فتوی صادر کردیا اور حدیث کے طلبہ کو منع کردیا کہ وہ امام بخاریؒ کی مجلس کا بائیکاٹ کریں۔ حتی کہ یہاں تک کہہ دیا کہ جو بخاریؒ کی مجلس میں جائے گا وہ میری مجلس میں نہ آئے۔ اس پر علمی حلقوں میں رد عمل کا اظہار ہوا۔ امام ابوزرعہؒ اور ابوحاتمؒ نے امام بخاریؒ کی روایات کا بائیکاٹ کردیا۔ امام مسلمؒ نے جو امام ذہلیؒ اور امام بخاریؒ دونوں کے شاگرد تھے، اپنی کتاب میں دونوں سے کسی کی روایت نہیں لی۔ امام بخاریؒ کو استاذ محترم کے فتوی کے بعد نیشاپور چھوڑنا پڑا اور اس فتوی نے علمی حلقوں میں خاصی گہما گہمی پیدا کردی۔ مگر امام بخاریؒ کی یہ عظمت ہے کہ انہوں نے امام ذہلیؒ کے فتوی کو قبول نہیں کیا اور اس کا مقابلہ بھی نہیں کیا، جبکہ اختلاف کے باوجود ان کے احترام میں بھی کوئی فرق ظاہر نہیں ہونے دیا۔ حتی کہ امام ذہلیؒ کی طرف سے اپنے گمراہ ہونے کے فتوی کے باوجود انہوں نے بخاری شریف میں اپنے اسی استاذ محترم سے تیس کے لگ بھگ روایات لی ہیں جو آج بھی بخاری شریف کا حصہ ہیں۔ ہمارے استاذ محترم الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃ رحمہ اللہ تعالی نے اس کی تفصیل حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی عظیم تصنیف "اعلاء السنن" کے مقدمہ کے حاشیہ میں تحریر کی ہے جو ہر صاحب علم کو پڑھنی چاہیے۔

امام بخاریؒ کی عظیم تصنیف "الجامع الصحیح" پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے اساتذہ اور طلبہ کو امام بخاریؒ کے ذوق و اسلوب اور بخاری شریف کی ان خصوصیات و امتیازات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ اس سے صحیح استفادہ کیا جاسکے۔

خلیفہ کی اصطلاح اور غامدی صاحب کا موقف

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۶ مارچ ۲۰۱۵ء)

محترم جاوید احمد غامدی صاحب نے اپنے ایک تازہ مضمون میں انکشاف فرمایا ہے کہ ”خلیفہ“ کوئی شرعی اصطلاح نہیں ہے بلکہ بعد میں مسلمانوں نے اپنے نظام حکمرانی کے لیے یہ اصطلاح اختیار کر لی تھی۔ اور اس کے ساتھ ان کا یہ بھی ارشاد ہے کہ غزالیؒ، ابن خلدونؒ، رازیؒ، ماوردیؒ اور ابن حزمؒ کے بنانے سے دینی اصطلاحات نہیں بنتیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے بنانے سے بنتی ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ بحث طلب ہے کہ اگر کوئی دینی اصطلاح مذکورہ بالا بزرگوں سے نہیں بنتیں تو خود غامدی صاحب کی ان اصطلاحات کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے جو انہوں نے قرآن و سنت اور فقہی اصولوں کے حوالہ سے از خود طے کر لی ہیں اور ان کی بنیاد پر وہ ایک عرصہ سے اسلام کے نظریاتی، علمی اور فقہی ڈھانچے کی ری کنسٹرکشن یا اکھاڑ پچھاڑ میں اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں تسلسل کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔

ہم اس بحث میں پڑے بغیر غامدی صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ حضور والا! مسلمان حکمران کے لیے ”خلیفہ“ کی اصطلاح اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے طے کی ہے اور اس کا ذکر قرآن کریم کے علاوہ صحیح احادیث میں بھی جا بجا ملتا ہے۔ سورہ ص کی آیت ۲۶ کا غامدی صاحب نے اس مضمون میں خود حوالہ دیا ہے اور اس کا ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر دہلویؒ کے قلم سے یہ نقل کیا ہے:

> ”اے داؤد! ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں، سو تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے۔“

اگر وہ صرف ترجمہ دیکھنے کی بجائے قرآن کریم کے اصل متن کو بھی دیکھ لیتے تو انہیں انا جعلناک خلیفۃ ارشاد باری تعالیٰ میں نظر آجاتا جس کا ترجمہ ”نائب“ کیا گیا ہے۔ لطف کی بات ہے کہ ترجمہ کا لفظ تو محترم غامدی صاحب کے ہاں قابل استدلال ہے مگر قرآن کریم میں ”خلیفہ“ کے صریح لفظ کو انہوں نے در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے کہ اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے اس لیے لوگوں میں انصاف کے ساتھ حکومت کرنا۔ یہاں حکومت کرنے والے کو خلیفہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اور خلیفہ کی یہ حیثیت متعیّن فرمادی ہے کہ اس کا کام حکومت کرنا ہے۔ غامدی صاحب محترم نے جناب

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا حوالہ بھی دیا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت انبیاء کرام علیہم السلام کرتے تھے لیکن میرے بعد چونکہ کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے ان کی جگہ اب ''خلفاء'' لیں گے۔ حدیث میں صراحتا خلفاء کا لفظ ہے جس کا ترجمہ حکمران کر کے غامدی صاحب نے اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے۔ مگر خلیفہ کا ترجمہ حکمران کر کے خود انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسلمان حکمران جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق بھی خلیفہ ہی کہلاتا ہے۔

اس حدیث کی سند میں کچھ کلام کی بات بھی انہوں نے فرمائی ہے حالانکہ یہ حدیث بخاری شریف اور مسلم شریف دونوں میں موجود ہے۔ اور غامدی صاحب کو حدیث و سنت کے بارے میں یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ بخاری اور مسلم کی مشترکہ روایت کو محدثین کے ہاں ''متفق علیہ'' کہا جاتا ہے اور اس کی سند پر کسی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمیں غامدی صاحب کو اس بات سے آگاہ کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ ہی کہا جاتا تھا اور ان کا سرکاری منصب ''خلیفۃ رسول اللہ'' کا عنوان رکھتا تھا۔ قاضی ابویعلیؒ نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بار کسی شخص نے حضرت صدیق اکبرؓ کو ''یا خلیفۃ اللہ'' کہا تو انہوں نے فوراً یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم، احادیث نبویہؐ، اور حضرت صدیق اکبرؓ کے اس ارشاد کی بنیاد پر ہی فقہاء کرامؒ نے خلیفہ کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ وہ مسلم حکمران خلیفہ کہلاتا ہے جو مسلمانوں کے اجتماعی (ریاستی و حکومتی) امور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کرتے ہوئے سرانجام دیتا ہے۔

خلافت کے مفہوم اور اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں کم و بیش تمام فقہاء کرام نے بحث کی ہے۔ اور فقہاء کرام جس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں وہ ان کا خود ساختہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی بنیاد قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کے شرعی اصولوں پر ہوتی ہے۔ مگر تعجب اس بات پر ہے کہ غامدی صاحب جس استدلال و استنباط اور تعبیر و تشریح کا حق امت کے چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل کو کراس کرتے ہوئے آزادانہ طور پر اپنے لیے طلب کر رہے ہیں، وہ اس کا حق غزالیؒ، ابن خلدونؒ، رازیؒ، ماوردیؒ اور ابن حزمؒ کے لیے تسلیم کرنے سے انکاری ہیں، حتیٰ کہ جمہور فقہاء امت کو بھی یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

خلافت کے بارے میں حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی مستقل تصنیف ''ازالۃ الخفاء'' میں تفصیلی بحث کی ہے اور اس کا اردو ترجمہ دلچسپی رکھنے والوں کے لیے دستیاب ہے۔ ہم اس کا صرف ایک پہلو اپنے موضوع کے حوالہ سے یہاں ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ خلافت کا قیام امت مسلمہ کے اجتماعی دینی فرائض میں سے ہے۔ اگر امت میں خلافت کا کوئی نظام سرے سے موجود نہ ہو تو پوری امت ایک شرعی فریضہ کی تارک اور گنہ گار قرار پاتی ہے۔ خلافت کے شرعاً فرض ہونے پر حضرت شاہ صاحبؒ نے جو دلائل دیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کے بہت سے احکام پر عمل درآمد حکومتی نظم پر موقوف ہے۔ جیسا کہ جہاد کے حوالہ سے خود غامدی صاحب کا موقف بھی یہ ہے کہ وہ حکومت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ تو قرآن کریم کے بہت سے احکام کا حکومت کے قیام پر موقوف ہونا اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ ایک ایسی حکومت موجود ہو جو قرآن و سنت کے احکام کے نفاذ کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہو۔ جبکہ خلافت کے واجب ہونے پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دوسری دلیل یہ بیان فرمائی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد امت کا سب سے پہلا اجماع اسی خلافت کے قیام پر ہوا تھا۔ حتیٰ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین پر بھی اسے مقدم کیا گیا تھا۔

جہاں تک خلافت کے احیا و قیام کے حوالہ سے مختلف تحریکات کے طریق کار کی بات ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور خود ہم نے بھی متعدّد بار اس اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ لیکن آج کی تحریکات کے طرز عمل اور طریق کار سے اختلاف کی وجہ سے خلافت کی شرعی حیثیت اور اس کی ضرورت و اہمیت ہی سے انکار کر دینا قرآن و سنت اور امت مسلمہ کی مسلمہ علمی روایت کے مطابق نہیں ہے، اور نہ ہی امت مسلمہ کی موجودہ معروضی صورت حال اور اس کے حال و مستقبل کی ضروریات سے کوئی مناسبت رکھتا ہے۔

قرآن کریم صرف ماضی کی کتاب نہیں!

(جامعہ خالد بن ولید، اسلام آباد - ۱۹ فروری ۲۰۱۵ء)

۱۹ فروری جمعرات کو مجلس صوت الاسلام کراچی کے خطباء کورس کی ہفتہ وار کلاس کے لیے مجلس کے اسلام آباد مرکز میں پہنچا اور آن لائن کلاس کے شرکاء کو صلیبی جنگوں کے پس منظر اور دیگر ضروری تفصیلات سے ایک لیکچر کی صورت میں آگاہ کیا۔ اس موقع پر پتہ چلا کہ

شام کو جامعہ خالد بن ولیدؓ گولڑہ موڑ اسلام آباد کا سالانہ جلسہ دستار بندی ہے۔ جامعہ کے منتظم مولانا فضل الرحمن خلیل اور مولانا محمد فاروق کشمیری سے بہت پرانا دوستانہ تعلق ہے۔ میں شام کو فارغ ہی تھا اس لیے مولانا جمیل الرحمن فاروقی اور مولانا محمد جاوید کے ہمراہ اچانک وہاں جا دھمکا۔ بے تکلف دوستوں کے ہاں اچانک چھاپہ مارنے میں مجھے لطف آتا ہے اور دوست بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔ جلسہ کے اسٹیج پر مولانا فضل محمد یوسف زئی اور مولانا عزیز الرحمن ہزاروی کی ملاقات نے اس لطف کو دوبالا کر دیا۔ جامعہ خالد بن ولیدؓ سے قرآن کریم حفظ کرنے والے اکتالیس حفاظ کی دستار بندی تھی، اس میں شرکت کی سعادت حاصل کی اور کچھ معروضات بھی پیش کیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج جامعہ خالد بن ولیدؓ اسلام آباد سے قرآن کریم حفظ کرنے والے اکتالیس حفاظ کی دستار بندی ہے، ان طلبہ کو اور ان کے والدین، اساتذہ اور جامعہ کے منتظمین و معاونین کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے قرآن کریم کی تعلیم اور دینی مدارس کے حوالہ سے عام طور پر پائے جانے والے دو مغالطوں پر تھوڑی سی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور حفظ و تلاوت کا سلسلہ دنیا بھر میں تمام تر مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس کے دائرے کو سمیٹنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی، جو بلاشبہ قرآن کریم کا اعجاز ہے۔ لیکن اس سے عالمی استعماری حلقے اس مغالطہ کا شکار ہو گئے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور قراءت و تلاوت کا یہ سلسلہ دینی مدارس کی وجہ سے باقی ہے۔ اس لیے وہ دینی مدارس کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور دینی مدارس کا کردار محدود کرنے اور انہیں غیر مؤثر بنانے کے لیے عجیب و غریب قسم کے حربے استعمال کرنے لگ گئے ہیں۔ یہ بات بظاہر ان کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے لیکن میں ان سے یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اس مغالطہ کو جتنی جلدی ہو سکے دور کر لو کہ قرآن کریم دینی مدارس کی وجہ سے باقی ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم دینی مدارس کی وجہ سے نہیں بلکہ دینی مدارس قرآن کریم کی وجہ سے باقی ہیں۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ نے اعلان کر رکھا ہے۔ وہ تو قیامت تک باقی رہے گا، اور جب تک وہ باقی رہے گا اس کی تعلیم و تدریس کا انتظام کرنے والے مدارس بھی باقی رہیں گے۔ اس لیے ان مدارس کے بارے میں حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہو جائیں مجھے بحمد اللہ تعالیٰ کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور ہمیشہ کی طرح آج بھی پوری طرح مطمئن ہوں کہ دینی مدارس کا یہ

کردار بہر حال جاری رہے گا اور کوئی سازش یا کوشش انہیں اس سعی و محنت سے محروم نہیں کر سکتی۔

اسی طرح ہم بھی بسا اوقات اس مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ہم قرآن کریم کی حفاظت کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بھی مغالطہ ہے، ہم قرآن کریم کے محافظ نہیں ہیں بلکہ قرآن کریم ہمارا محافظ ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے کی بجائے اس کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنی حفاظت کا اہتمام کر رہے ہیں، اور دنیا و آخرت میں اس کی برکات سے بہرہ ور ہونے کا سامان کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دینی مدارس میں بنیادی طور پر قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے بارے میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ قدیم تعلیم ہے۔ اور پھر عصری تعلیم کو جدید تعلیم کہہ کر قدیم و جدید تعلیم کی تقسیم کر دی جاتی ہے۔ مجھے اس میں اشکال ہے۔ قدیم و حادث کی بحث میں بھی میرا ایمان یہ ہے کہ قرآن کریم حادث نہیں بلکہ قدیم ہے۔ لیکن قدیم و جدید کی تقسیم میں قرآن کریم کو قدیم کہنا میری طالب علمانہ رائے میں درست نہیں، اس لیے کہ قرآن کریم کا زمانہ قیامت تک کا ہے۔ وہ ماضی کی طرح حال اور مستقبل میں بھی اپنا وہی کردار رکھتا ہے جس کے لیے چودہ سو برس قبل اس کا نزول ہوا تھا۔ توراۃ و انجیل کو ہم ماضی کی کتابیں کہہ سکتے ہیں، اس لیے کہ ان کا دور گزر چکا ہے، مگر قرآن کریم صرف ماضی کی کتاب نہیں ہے بلکہ حال اور مستقبل کی کتاب بھی ہے۔ جبکہ دنیا کی آج کی دانش بھی قرآن کریم کو نسل انسانی کے مستقبل کی ضروریات میں شمار کرنے پر مجبور ہو گئی ہے، جو کہ قرآن کریم کے اعجاز کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ پاپائے روم کی معاشی نظام کے لیے قائم کردہ کمیٹی کہہ چکی ہے کہ ہمیں دنیا کے معاشی نظام کو صحیح رخ پر لانے کے لیے قرآن کریم کے بیان کردہ معاشی اصولوں کو اپنانا ہوگا۔ اور برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے بین الاقوامی فورم پر واضح الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ قرآن کریم کے معاشرتی احکام و قوانین کی طرف رجوع نسل انسانی کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ بات صرف ہماری نہیں رہی کہ قرآن کریم نسل انسانی کی مستقبل کی بھی ضرورت ہے بلکہ آج کی عالمی دانش بھی اس ضرورت کو محسوس کر رہی ہے۔ اس لیے میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن و سنت کی تعلیم کو جدید کے مقابلے میں قدیم کہنا صحیح نہیں ہے، یہ حال اور مستقبل کی تعلیم بھی ہے۔ اور جب تک قرآن کریم کا دور باقی ہے اس کو اس معنی میں قدیم نہیں کہا جا سکتا۔

قرآن کریم کے بارے میں عام طور پر پائے جانے والے ان دو مغالطوں پر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے ساتھ میں آج دستار بندی کا شرف حاصل کرنے والے حفاظ کو ایک بار پھر مبارک باد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں قرآن کریم کا علم اور اس پر عمل نصیب فرمائیں اور دارین میں اس کی برکات سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۴ فروری ۲۰۱۵ء)

رسول اکرمؐ کا منافقین کے ساتھ طرز عمل

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۱۳ فروری ۲۰۱۵ء)

کچھ عرصہ سے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جمعۃ المبارک کے خطابات میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کا سلسلہ چل رہا ہے۔ گزشتہ جمعہ اس موضوع پر کچھ گزارشات پیش کیں کہ منافقین کا جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ طرز عمل کیا تھا اور آنحضرتؐ نے منافقین کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کیا؟ بعض دوستوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ گفتگو تحریر میں بھی آجانی چاہیے۔ اس لیے اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور اسے اپنا مرکز بنایا تو یہود اور مشرکین کے مختلف قبائل کے ساتھ ساتھ آپ کو ایک ایسے طبقہ سے بھی واسطہ پڑا جو کلمہ پڑھ کر بظاہر مسلمانوں میں شامل ہو گیا تھا لیکن دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا، اور اس کی تمام تر ہمدردیاں اور معاونتیں کفار کے ساتھ تھیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر موجود ہے۔

غزوہ احد میں یہ لوگ تین سو کی تعداد میں عبد اللہ بن ابی کی سرکردگی میں میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے جس سے آبادی میں اس وقت ان کے تناسب کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر مختلف اوقات میں ان کی شرارتیں اور منافقانہ حرکات سامنے آتی رہیں جن میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جھوٹی تہمت بھی شامل ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اس شر پسندانہ الزام کی صفائی قرآن کریم نے پیش کی۔ ایک موقع پر انہوں نے مل بیٹھ کر یہ سازش بھی کی کہ وہ مدینہ منورہ سے مہاجرین کو واپس چلے جانے پر مجبور کر دیں گے۔ اس سازش کی خبر جب آنحضرتؐ کو حضرت زید بن ارقمؓ نے دی تو ان لوگوں نے قسمیں اٹھا اٹھا کر حضورؐ

کے سامنے اپنی سچائی کا اتنی شدت سے اظہار کیا کہ آپؐ نے حضرت زید بن ارقمؓ کو ڈانٹ دیا۔ اس پر قرآن کریم کی سورۃ ”المنافقون“ نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ زید بن ارقمؓ کی رپورٹ سچی ہے اور یہ لوگ جھوٹی قسمیں اٹھا رہے ہیں۔ ایک مرحلہ میں ان منافقین نے مدینہ منورہ میں ”مسجد“ کے نام سے اڈہ قائم کر لیا جسے قرآن کریم نے مسجد ضرار سے تعبیر کر کے رسول اکرمؐ کو وہاں جانے سے منع کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسجد کے نام پر قائم ہونے والا یہ مرکز مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے اور دشمنوں کو گھات فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے، چنانچہ حضورؐ نے اسے مسمار کرنے کا حکم دے دیا۔

جناب رسول اللہؐ کی دس سالہ مدنی زندگی کے دوران منافقین کی اس قسم کی شرارتیں اور سازشیں عام رہیں جن کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے اور احادیث میں بھی ان کی بہت سی تفصیلات مذکور ہیں۔ جبکہ قرآن کریم نے ”وماھم بمؤمنین“ اور ”انھم لکاذبون“ کہہ کر واضح طور پر کہہ دیا کہ یہ مسلمان نہیں ہے اور ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان سے بچ کر رہنے کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کو سورۃ التحریم میں یہ کہہ کر ان کے خلاف سخت جہاد کرنے کا حکم بھی دیا گیا کہ ”جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم“ ان کے ساتھ جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔

لیکن یہ بات توجہ طلب ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے منافقین کے خلاف ”جہاد“ کا کونسا طریقہ کار اختیار کیا؟ یہ لوگ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے ساتھ رہے، مسجد نبویؐ میں نمازیں پڑھتے تھے، حضورؐ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے، اور معاشرتی زندگی میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ پوری طرح شریک کار رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے ان میں سے کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ حضرت عمرؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی اجازت مانگی مگر آپؐ نے اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ بظاہر کلمہ پڑھتے ہیں اس لیے انہیں قتل کرنے سے دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ محمدؐ اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنے لگے ہیں۔ ان میں سے کسی کو قتل کرنا تو درکنار حضورؐ نے ایک درجن سے زائد ان منافقین کے نام ظاہر کرنے سے انکار کر دیا جنہوں نے ایک سفر سے واپسی پر آپؐ کو شہید کرنے کے لیے ویرانے میں گھات لگائی تھی اور ننگی تلواروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان کا یہ حملہ ناکام ہوا مگر حضورؐ نے ان سب کو پہچان لیا تھا اور اپنے ساتھی حضرت حذیفہ بن الیمانؓ

کو اس شرط پر سب کے نام بتا بھی دیے تھے کہ وہ کسی اور کو ان میں سے کسی کا نام نہیں بتائیں گے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں بالخصوص حضرت عمرؓ کے شدید اصرار کے باوجود انہوں نے زندگی بھر ان میں سے کسی کا نام افشا نہیں کیا۔

یہ جناب نبی اکرمؐ کی حکمت عملی تھی کہ منافقین کی تمام تر شرارتوں اور سازشوں کے باوجود ان کے خلاف ''جہاد اور سختی'' کے قرآنی حکم کی تعمیل کے لیے آنحضرتؐ نے تدبر اور حکمت کا راستہ اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ منورہ میں کوئی معاشرتی خلفشار پیدا نہیں ہوا اور منافقین رفتہ رفتہ بے اثر ہو کر سوسائٹی میں تحلیل ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ خلفاء راشدینؓ کے دور میں ایک طبقہ کے طور پر ان کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا اور وہ ''نسیا منسیا'' ہو کر رہ گئے تھے۔

منافقین کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکیمانہ طرز عمل سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جہاد صرف لڑنے کا نام نہیں بلکہ حکمت عملی کے ساتھ دشمن کو ناکام بنا دینا بھی جہاد کہلاتا ہے اور کھلے کافروں کے ساتھ جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان کا ''کلمہ گو کافروں'' کے ساتھ اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ یہ بات نقصان دہ اور اسلام کی دعوت و تبلیغ میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہے۔ اس لیے آج کے حالات میں ہمیں حضورؐ کے اسوہ حسنہ سے راہ نمائی حاصل کرتے ہوئے ان معاملات پر اپنے طرز عمل کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ فروری ۲۰۱۵ء)

اسلام اور ریاست۔ غامدی صاحب کے حالیہ مضمون کا جائزہ

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۷ فروری ۲۰۱۵ء)

جناب جاوید احمد غامدی کا ایک حالیہ مضمون ان دنوں دینی حلقوں میں زیر بحث ہے جس میں انہوں نے بنیادی طور پر یہ تصور پیش کیا ہے کہ اسلام کا خطاب فرد سے ہے سوسائٹی سے نہیں ہے، اور اسلام کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے اس وقت عالم اسلام میں جو تحریکیں نفاذ اسلام یا دنیا میں اسلام کا غلبہ قائم کرنے کے لیے کام کر رہی ہیں وہ

اسلام کی روح کے مطابق نہیں ہیں۔ بہت سے اصحاب علم نے اس پر اظہار خیال کیا ہے اور میں بھی کچھ معروضات پیش کرنا مناسب خیال کر رہا ہوں۔ لیکن اب تک جن احباب کے مضامین اس حوالہ سے میری نظر سے گزرے ہیں وہ اپنے موقف کی وضاحت کی حد تک تو بالکل ٹھیک ہیں لیکن ان میں اس پہلو سے کسی حد تک خلاء محسوس ہو رہا ہے کہ غامدی صاحب کے افکار اور استدلال کے جواب کے لیے ہم اپنے مسلمات کی بنیاد پر بات کر رہے ہیں۔ جبکہ جن اصولوں اور حوالوں سے غامدی صاحب پر نقد کیا جا رہا ہے وہ سرے سے ان کے مسلمات میں شامل ہی نہیں ہیں۔

چونکہ غامدی صاحب نے مسلمات اور استدلالات کے باب میں امت کے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل اور جمہور اہل علم کے موقف کو نظر انداز کرتے ہوئے کچھ اصول اور اصطلاحات از سر نو خود وضع کر لی ہیں، اور استدلال و استنباط کے زاویے بھی از سر نو طے کیے ہیں۔ اس لیے میرے خیال سے غامدی صاحب اور ان کے حلقہ سے مباحثہ و مکالمہ کرنے کے لیے مسائل و احکام سے پہلے ان کے اصول و مسلمات کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہے۔ اور یہ واضح کرنا زیادہ ضروری ہے کہ امت کے اجماعی تعامل اور جمہور اہل علم کے مسلمات کو کراس کر کے اصول و مسلمات کی ”ری کنسٹرکشن“ وقت کا ضیاع اور بے جا تکلف ہونے کے ساتھ ساتھ استشراق کے عنوان سے مغرب کی اس علمی و فکری تحریک کی آبیاری کا باعث بھی بنتی ہے جو وہ گزشتہ تین صدیوں سے اسلام کے ساتھ امت مسلمہ کے اجتماعی اور معاشرتی تعلق کو کمزور کرنے کے لیے مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔

مثال کے طور پر ”سنت“ کا وہ مفہوم جو صحابہ کرامؓ سے لے کر اب تک پوری امت میں عام طور پر سمجھا جا رہا ہے اور اس پر معاشرتی طور پر عمل بھی ہو رہا ہے، اس پر غامدی صاحب کو اطمینان نہیں ہے۔ اس لیے انہیں سنت کا مفہوم اور دائرہ از سر نو طے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ سنت در اصل دین ابراہیمیؑ کی روایت کے تسلسل کا نام ہے۔ اس پر اور اس نوعیت کے بعض دیگر مسائل پر غامدی صاحب اور ان کے حلقہ کے ساتھ کچھ عرصہ قبل میرا تفصیلی مکالمہ ہوا تھا جو کتابی صورت (پی ڈی ایف فائل) میں الشریعہ اکادمی (پوسٹ بکس ۳۳۱ جی پی او) گوجرانوالہ کی طرف سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ مگر اس وقت اس ساری بحث کو ایک طرف رکھتے ہوئے غامدی صاحب کے اس موقف کا کہ ”اسلام کا مخاطب صرف فرد ہے اور اسلام کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں

ہے ’’ہم انہی کے طے کردہ اس اصول ومنہج کی روشنی میں جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ ’’سنت‘‘ دین ابراہیمیؑ کی روایت کے تسلسل کا نام ہے۔

مگر اس موقع پر پہلے اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ دین ابراہیمیؑ کا سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آغاز ہوا تھا، یا وہ بھی ماضی کے کسی تسلسل کا حصہ ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر اس تسلسل سے مراد وحی الٰہی اور سلسلہ نبوت ہے تو اس کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ اس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے جنت پر اترنے سے قبل ہی ہوگیا تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے فرمایا تھا کہ اب تم زمین پر اتر جاؤ۔ وہاں تمہارے پاس میری طرف سے ہدایات آئیں گی جن کی پیروی پر تمہاری فلاح ونجات کا مدار ہوگا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانی سوسائٹی کی آبادی کے آغاز پر ہی واضح فرما دیا تھا کہ زمین پر انسانی سوسائٹی کی بنیاد وحی الٰہی پر ہوگی اور آسمانی تعلیمات ہی انسانی سوسائٹی کی فلاح ونجات کی واحد اساس ہوں گی (البقرہ ۳۸)۔

جبکہ نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جتنے پیغمبر بھی آئے ہیں انہوں نے فرد کو خطاب کرنے کی بجائے ’’یا قوم‘‘ کہہ کر خطاب کیا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی تعلیمات کا خطاب ہمیشہ فرد کی بجائے قوم اور سوسائٹی سے رہا ہے، اور ان کی تعلیمات فرد، خاندان، سوسائٹی اور قوم کے تمام دائروں کا احاطہ کرتی آرہی ہیں۔

لیکن اگر ماضی کے تسلسل سے خدانخواستہ قطع نظر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے بات شروع کرنی ہے تو اس دائرہ میں بھی بات کو دیکھا جا سکتا ہے اور قرآن کریم سے ہی اس کی چند جھلکیاں انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں:

1. حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے حضرت یوسف علیہ السلام نے جو ظاہر ہے کہ دین ابراہیمی پر ہی تھے، مصر پر ایک عرصہ حکومت کی ہے۔ یہ اقتدار انہوں نے اپنی اہلیت وامانت کا حوالہ دے کر خود طلب کیا تھا، وہ نبوت بھی کرتے تھے اور ان پر وحی بھی نازل ہوتی تھی۔ بلکہ اپنے بھائی حضرت بنیامین علیہ السلام کو اپنے پاس رکھنے کے لیے انہوں نے جو تدبیر اختیار کی تھی اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ کذلک کدنا لیوسف کہ یہ تدبیر ہم نے انہیں سکھائی

تھی۔ اس لیے یہ کہنا آخر کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے کہ وحی الہی کا اجتماعی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

2. حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو جب کوہ طور پر نبوت ملی تو ان کے منصب میں صرف افراد کی اصلاح شامل نہیں تھی بلکہ ان ارسل معنا بنی اسرائیل کہہ کر اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم اور غلامی سے نجات دلانا بھی ان کے فرائض میں شامل کر دیا تھا۔ اور وہ بنی اسرائیل کی دینی راہ نمائی کے ساتھ ساتھ ان کی جدوجہد آزادی کے قائد بھی بن گئے تھے۔

3. وادی تیہہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا جو حکم دیا تھا وہ محض سیر و سیاست کے لیے نہیں تھا بلکہ جہاد کا حکم تھا جس کا مقصد "بیت المقدس" پر دشمنوں کا قبضہ ختم کرا کے وہاں اپنی ریاست قائم کرنا تھا۔ اس کی تفصیلات قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اور بعد میں حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جہاد کے ذریعہ یہ سلطنت قائم بھی ہو گئی تھی۔

4. حضرت طالوتؒ اور جالوت کی جنگ کا قصہ قرآن کریم نے خود بیان کیا ہے کہ جالوت بادشاہ کے جبر و ظلم سے نجات کے لیے جب بنی اسرائیل کے نوجوانوں نے مزاحمت کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنا بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست وقت کے پیغمبر علیہ السلام سے کی، اور انہوں نے اللہ تعالی کی طرف سے طالوت کو بادشاہ بنانے کا اعلان کیا جس کا مطلب واضح ہے کہ ابراہیمی روایت کے تسلسل میں بادشاہ کا تقرر اللہ تعالی کرتے تھے اور وہ وحی کے ذریعہ ہوتا تھا۔

5. سورۃ المائدہ کی آیت ۴۴ تا ۵۰ میں اللہ رب العزت نے دین ابراہیمؑ میں نازل ہونے والی وحی کا ذکر کیا ہے۔ پہلے توراۃ کا تذکرہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور بنی اسرائیل کے علماء کرام توراۃ کے مطابق لوگوں کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ اور لفظ یحکم کا ارشاد فرمایا ہے جس میں فیصلہ اور حکومت دونوں شامل ہیں۔ اس کے بعد انجیل کا ذکر کیا ہے اور اہل انجیل کے لیے اپنے

اس حکم کو بیان کیا ہے کہ وہ اپنے فیصلے انجیل کے مطابق کیا کریں۔ پھر ان کے ساتھ قرآن کریم کو جوڑا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ آپ کی طرف ہم نے کتاب نازل کی ہے اور اس لیے نازل کی ہے کہ ان احکم بینہم بما انزل اللہ آپ بھی وحی الٰہی کے مطابق لوگوں کے درمیان حکم کیا کریں۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ توراۃ، انجیل اور قرآن کریم تینوں کا نزول "حکم" کے لیے ہوا ہے۔ اور اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ (درجہ بدرجہ) کافر، فاسق اور ظالم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وحی الٰہی کے مطابق فیصلے نہ کرنے کو حکم الجاہلیۃ سے تعبیر فرمایا ہے۔

6. حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم نے خلافت کے عنوان سے کیا ہے اور اس کا مقصد بیان کیا ہے کہ فاحکم بین الناس بالحق لوگوں کے درمیان حق کے مطابق حکم و فیصلہ کریں۔ حتیٰ کہ ایک مرحلہ پر کسی مقدمہ میں ان کے فیصلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس مقدمہ میں ان کی بجائے حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ صائب تھا، اور ففھمنٰھا سلیمان وہ ہم نے انہیں سمجھایا تھا، جو واضح کرتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت و ریاست کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات تھیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق حکومت کرتے تھے۔

یہ بات کہ وحی الٰہی کا خطاب صرف فرد سے نہیں بلکہ خاندان، سوسائٹی اور قوم سے بھی ہوتا ہے اور ریاست و حکومت کا صحیح معیار ہمیشہ آسمانی تعلیمات رہی ہیں، قرآن کریم میں اس کے دیگر شواہد بھی موجود ہیں۔ مگر صرف چند مثالوں پر اکتفاء کرتے ہوئے یہ عرض کریں گے کہ اگر "سنت" کو صرف دین ابراہیمیؑ کی روایت تک ہی بالفرض محدود سمجھ لیا جائے تو اس دائرہ میں بھی سوسائٹی کے اجتماعی مسائل کو آسمانی تعلیمات کے دائرہ سے خارج قرار دینا اور ریاست کو وحی الٰہی کی پابندی سے آزاد سمجھنا قطعی طور پر غیر واقعی اور غیر منطقی بات ہے۔ جبکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس تسلسل کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ایک نبی کے چلے جانے کے بعد دوسرا نبی آجاتا تھا۔

میرے بعد چونکہ کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اس لیے میرے بعد خلفاء ہوں گے جو اس تسلسل کو جاری رکھیں گے۔

اس پس منظر میں ہماری گزارش ہے کہ اسلام کی بنیاد پر ریاست کا قیام اور حکومت کی تشکیل، نیز سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں آسمانی تعلیمات کا نفاذ اسلام کی اصل روح اور اس کے مقاصد میں سے ہے۔ اس لیے اسے لفظی موشگافیوں اور فکری تانوں بانوں کے ذریعے دھندلکوں میں گم کرنے کی کوشش کو اسلام کی صحیح تعبیر یا امت مسلمہ کی خدمت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

آسمانی تعلیمات کا مخاطب صرف فرد ہے یا سوسائٹی اور قوم بھی ہے، نیز اسلام کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ ان دو سوالوں کے حوالہ سے محترم جناب جاوید احمد غامدی کے ایک حالیہ مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے انہی کے فلسفہ کے مطابق دین ابراہیمیؑ کی روایت سے کچھ جھلکیاں پیش کی تھیں، اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے کچھ مزید مناظر قارئین کے سامنے لانے کو جی چاہتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور ان کے ساتھ بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی کے حکم پر اردن کے علاقہ کی طرف بطور نبی تشریف لے گئے تھے۔ انہیں جس قوم سے واسطہ پڑا وہ کافر و مشرک ہونے کے ساتھ ساتھ ”ہم جنس پرستی“ کی لعنت میں بھی مبتلا تھی، جس کی بہت سی تفصیلات قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس علاقہ کے لوگوں کو فرداً فرداً توحید و عبادت کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ”ہم جنس پرستی“ کے معاشرتی جرم کے خاتمہ کے لیے بھی جدوجہد کی۔ اس سلسلہ میں قوم سے جو باتیں انہوں نے فرمائیں اور آزمائش کے جن مراحل سے گزرے وہ اگر آج کے دور میں ہوتا تو انہیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دے کر میڈیا اور لابنگ کی قوتیں اپنا سب سے بڑا ہدف قرار بنا لیتیں۔ اور مغربی ملکوں کے بہت سے شہروں میں انہیں مخالفانہ مظاہروں کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کا کام صرف فرد کی اصلاح نہیں بلکہ معاشرہ کی مجموعی اصلاح اور معاشرتی خرابیوں کا سدباب بھی انبیاء کرامؑ کے فرائض منصبی میں شامل رہا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر بلکہ خسر بزرگوار تھے۔ اقبالؒ نے ان کے باہمی تعلق کو اس لہجے میں بیان کیا ہے کہ

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

وہ مدین کے علاقہ کی طرف مبعوث ہوئے اور اس قوم کا سامنا کیا جو ”تجارتی کرپشن“ میں مبتلا تھی اور سودا کاری میں بد دیانتی اس کے گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی جدو جہد کو صرف فرد کی اصلاح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس معاشرتی جرم کے خلاف بھی آواز بلند کی اور تجارتی بد دیانتی کو دنیا و آخرت کا خسارہ قرار دے کر قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید و عبادت کی طرف دعوت دینے کے ساتھ ساتھ تجارتی بد دیانتی سے باز آجانے کی بھی تلقین کی۔ حتیٰ کہ ان کی اس دعوت پر قوم کے لوگوں نے جو تبصرہ کیا وہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

”اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ تم ہمیں اس حق سے محروم کردو کہ ”ہم اپنے مال و دولت میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف کر سکیں۔“

یہ حلال و حرام کے تصور سے بے نیاز اسی ”فری اکانومی“ کی صدائے اولین تھی جو آج پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور جسے جواز فراہم کرنے کے لیے ہمارے بہت سے دانش وروں کو مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی کرنا پڑ رہی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت دنیا کی مسلمہ بادشاہتوں میں سے ہے اور اسی سلطنت کی یاد ابھی تک مٹھی بھر یہودیوں کو بے چین رکھے ہوئے ہے۔ اس بادشاہت کے متعدّد مناظر قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں، جن میں ایک کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو ”ہدہد“ نے آکر خبر دی کہ آپ کے پڑوس میں ایک سلطنت ہے جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ میں وہاں سے ہو کر آیا ہوں، ایک خاتون وہاں حکمران ہے اس کا تخت بڑا عظیم ہے اور وہ قوم اللہ تعالیٰ کی بجائے سورج کی پرستش کرتی ہے۔ یہ خبر سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو پہلا پیغام اس قوم کی ملکہ کی طرف بھیجا وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد صرف دو جملوں پر مشتمل تھا:

”مجھ پر سرکشی نہ کرو اور اطاعت قبول کر کے میرے پاس آجاؤ۔“

ایک اجنبی قوم جس کے ساتھ اس سے قبل کسی قسم کے مثبت یا منفی تعلقات نہیں تھے، اچانک اس طرح کا پیغام بھیجنے کا مطلب اس کے سوا کیا بنتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول اور خلیفہ حضرت داؤد علیہ السلام کے جانشین تھے۔ اور

"خلیفہ" ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں کی اصلاح بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ قوم کفر و شرک میں مبتلا ہے، اس کی آزادانہ حیثیت کو سرکشی سے تعبیر کرتے ہوئے پہلا پیغام ہی اطاعت قبول کرنے کا بھجوا دیا۔ قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات کے مطابق قوم سبا کی ملکہ بلقیس نے اس کے جواب میں صلح و مفاہمت کا پیغام بھجوایا۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے مسترد کرتے ہوئے اس ملک کے خلاف "فوج کشی" کی دھمکی اور ذلیل کر کے ملک سے باہر نکال دینے کا الارم دیا جس پر ملکہ سبا نے اسلام قبول کر کے غیر مشروط اطاعت کا اظہار کیا اور قوم کے نمائندوں کے ہمراہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ واقعہ اگر آج کے دور میں ہوتا تو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا باقاعدہ اجلاس ہوتا اور مختلف ملکوں کی مشترکہ فوج تشکیل دے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک پر چڑھائی کر دی جاتی کہ آپ کو دوسری قوموں کی اصلاح و ایمان کی کیا فکر پڑی ہوئی ہے؟

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مکالمے کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں چند سال قبل امریکہ کی ریاست ورجینیا کے ایک تعلیمی ادارے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ کچھ حضرات ملنے کے لیے آئے اور مختلف مسائل پر گفتگو کی۔ دوران گفتگو انہوں نے فرمایا کہ مغربی معاشروں میں مذہب کی طرف واپسی کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں اور اب واضح محسوس ہونے لگے ہیں، جس سے یہاں کے بعض ارباب حل و عقد کو پریشانی ہے کہ نفس مذہب کی واپسی تو کوئی ایسی بات نہیں ہے لیکن کیا مذہب سوسائٹی میں واپس آکر اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں پھر سے دخل دینا تو شروع نہیں کر دے گا؟ ان کا کہنا تھا کہ مغرب بالخصوص امریکہ کی دانش گاہوں میں اس نکتہ پر ریسرچ ہو رہی ہے اور مختلف لوگوں کا نقطہ نظر معلوم کیا جا رہا ہے۔

یہ پس منظر بتا کر انہوں نے میری رائے دریافت کرنا چاہی تو میں نے عرض کیا کہ دوستو! اگر تو واپس آنے والا مذہب "فی الواقع مذہب" ہوا تو وہ ضرور مداخلت کرے گا۔ اس لیے کہ نبی اور مذہب صرف فرد کی اصلاح کے لیے نہیں آتے بلکہ سوسائٹی کی اصلاح بھی ان کے مقاصد میں شامل رہی ہے۔ اب قرآن ہی کو لے لیجیے، وہ صرف فرد کی بات نہیں کرتا،

خاندان کی بات بھی کرتا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ احکام و قوانین دیتا ہے۔ جبکہ خاندان کے دائرہ سے نکل کر تجارت، عدالت، معیشت، سیاست اور دیگر قومی شعبوں کے لیے بھی اس کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ یہ سب ہدایات قرآن کریم نے ایک ہی لہجہ میں دی ہیں۔ انہیں لازمی اور اختیاری مضامین میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے قرآن کریم نے یہ بات پوری صراحت کے ساتھ کہہ دی ہے کہ

> ”اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔“

رسول اکرمؐ بحیثیت سیاستدان

(دارالسلام لائبریری، باغ جناح، لاہور - ۱۵ جنوری ۲۰۱۵ء)

باغ جناح لاہور کی دارالسلام لائبریری نے ۱۵ جنوری کو قائد اعظم پبلک لائبریری کے وسیع ہال میں ”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سیاستدان“ کے عنوان پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس کی صدارت جسٹس (ر) خلیل الرحمن خان نے کی، جبکہ خطاب کرنے والوں میں جناب اوریا مقبول جان اور جناب تاج دین کے علاوہ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ اس موقع پر جو معروضات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوۃ۔ جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کی سب سے بڑی صاحب کمالات شخصیت ہیں اور آپؐ کو کمال کی ہر صفت عروج کے اعلیٰ ترین درجہ پر عطا ہوئی ہے۔ آپؐ سب سے بڑے رسول و نبی ہیں، سب سے بڑے قانون دان ہیں، سب سے بڑے جرنیل ہیں، سب سے اعلیٰ حکمران ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑے سیاست دان بھی ہیں۔ آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کے مختلف اور متنوع پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک پر مستقل کام کی ضرورت ہے اور ہمارے ہاں سیرت نبویؐ کے ان پہلوؤں پر سب سے کم کام ہو رہا ہے۔ ہم نے قرآن کریم کی طرح جناب نبی اکرمؐ کی سنت و سیرت کو بھی صرف برکت و رحمت اور اجر و ثواب کے حصول کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اکرمؐ کا تذکرہ برکات و فیوض، رحمتوں اور اجر و ثواب کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن اس کا اصل مقصد راہ نمائی حاصل کرنا ہے اور اپنے مسائل و مشکلات کا حل اس میں سے تلاش کرنا ہے جس کی طرف ہماری توجہ بہت ہی کم ہے۔

سیاسیات کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک حصہ وہ ہے جن میں اسلام کے سیاسی نظام کا تعارف کرایا گیا ہے، اسلامی ریاست کی بنیادوں کا تعین کیا گیا ہے اور ایک مسلم حکومت کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔ آنحضرتؐ کی سینکڑوں احادیث اس سلسلہ میں موجود ہیں۔ جبکہ دوسرا حصہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ایک سیاستدان اور حاکم وقت کے طور پر سینکڑوں فیصلے کیے ہیں جن میں سے ہر فیصلہ ہمارے لیے سرمۂ بصیرت اور راہ نمائی کا سرچشمہ ہے، بشرطیکہ ہم ان فیصلوں اور واقعات کو سیاسی حکمت و تدبر کے تناظر میں دیکھیں اور ان میں اپنے دور کی مشکلات و مسائل کا حل تلاش کرنے کا ذوق ہم میں بیدار ہو جائے۔

آج کی محفل میں سیرت طیبہؐ کے اول الذکر پہلو کے بارے میں چند معروضات پیش کرنا چاہوں گا جس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے سیاسی اصولوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور اسلامی ریاست و حکومت کے فرائض اور حقوق کی وضاحت کی ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے اسلام کے سیاسی نظام کا تعارف بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس طرح کرایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاست و حکومت کے فرائض حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سرانجام دیتے تھے، ایک نبی چلا جاتا تو دوسرا اس کی جگہ آجاتا یعنی سیاست و حکومت کی بنیاد وحی الٰہی پر ہوتی تھی، لیکن میرے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور کوئی نیا نبی اب نہیں آئے گا۔ اس لیے میرے بعد سیاست و حکومت کا نظام خلفاء کے سپرد ہوگا۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کے بعد خلافت کا یہ نظام قائم ہوا اور مسلمانوں کی ریاست و حکومت کی بنیاد بنا۔ اسلامی خلافت کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں ملک کا نظام چلایا جائے اور امت مسلمہ کے اجتماعی امور سرانجام دیے جائیں، جیسا کہ خلفاء راشدینؓ اور ان کے بعد خلفاء کرام کرتے رہے ہیں۔

خلافت کے بارے میں ایک اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ خلافت کیسے قائم ہوگی اور خلیفہ کا تقرر کون کرے گا؟ اس کے لیے میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیا کرتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اسلامی ریاست و حکومت کے سربراہ کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ منصب نہ تو طاقت کے زور پر حاصل کیا تھا اور نہ ہی بادشاہی نظام کی طرح خاندانی استحقاق کی بنیاد پر انہیں حکومت ملی تھی۔ بلکہ امت

کی اجتماعی صوابدید اور عمومی مشاورت ان کے منصب خلافت کی اساس تھی۔ اس لیے خلافت کا قیام امت کی اجتماعی صوابدید کی بنیاد پر ہی عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ میں ہمیں نمائندگی کا اصول بھی ملتا ہے کہ ایک موقع پر بنو ہوازن کے قیدی واپس کرنے کے لیے جب ہزاروں افراد سے براہ راست رائے لینا مشکل نظر آیا تو آپؐ نے عرفاء کو درمیان میں ڈالا کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کی رائے معلوم کرکے بتائیں تاکہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جاسکے۔ یعنی جناب رسول اکرمؐ نے عوام کی اجتماعی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعے معلوم کی۔ عرفاء اور نقباء کی یہ اصطلاح قدیم سے چلی آرہی ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے نمائندگی کا یہ طریقہ بھی اسلامی ریاست کی ایک اہم بنیاد بن جاتا ہے۔

لیکن میں اس وقت سب سے زیادہ توجہ اسلامی ریاست کے اس پہلو کی طرف دلانا چاہوں گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فلاحی اور رفاہی ریاست کا نظام دیا جسے آج کی دنیا میں ویلفیئر سوسائٹی کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے ایک حدیث کے مطابق ارشاد فرمایا کہ معاشرہ میں جو لوگ بوجھ تلے دبے ہیں یا بے سہارا ہیں وہ میری ذمہ داری ہیں، یعنی ان کی کفالت بیت المال کرے گا۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے دور میں اور پھر خلفاء راشدینؓ کے دور میں بیت المال کا یہ نظام کفالت اس قدر مستحکم ہوگیا تھا کہ پورے ملک کے بے روزگاروں، معذوروں اور بے سہارا لوگوں کی کفالت بیت المال کے ذمہ سمجھی جاتی تھی اور یہ ضروریات بطریق احسن پوری کی جاتی تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق تین اصولوں پر ہے:

1. ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی اطاعت ریاست و حکومت کی سب سے بڑی اساس ہے۔
2. دوسرا یہ کہ حکومت کا قیام امت مسلمہ کی صوابدید پر عوامی مشاورت کے ذریعہ ہوگا۔

3. اور تیسرا یہ کہ اسلامی حکومت نظم مملکت کو چلانے کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اجتماعی کفالت اور تمام شہریوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔

اگر ہم ان اصولوں کو سامنے رکھ کر پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی طرف پیش رفت کریں تو قیام پاکستان کے اس مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے جس کے لیے لاکھوں مسلمانوں کی بے پناہ قربانیوں کے بعد یہ وطن عزیز وجود میں آیا تھا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۲ جنوری ۲۰۱۵ء)

۲۰۱۴ء

مطالعۂ قرآن کانفرنس اسلام آباد

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۵ نومبر ۲۰۱۴ء)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے علامہ اقبالؒ آڈیٹوریم میں اقبال بین الاقوامی ادارہ برائے تحقیق و مکالمہ اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کے تعاون سے ادارہ تحقیقات اسلامی نے ”پاکستان میں مطالعۂ قرآن کی صورت حال“ کے موضوع پر ۱۱ تا ۱۳ نومبر کو تین روزہ قومی کانفرنس کا اہتمام کیا جس کی دس کے لگ بھگ نشستوں میں مختلف ارباب علم و دانش نے قرآن کریم کی تعلیم و تدریس، تحقیق و مطالعہ اور فہم قرآن کی اہمیت و ضرورت کے بیسیوں پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ اور پاکستان میں قرآن کریم کی تدریس و تعلیم اور تحقیق و مطالعہ کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔

راقم الحروف کو ۱۲ نومبر کی دو نشستوں میں حاضری اور کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔ ایک نشست کی صدارت راقم الحروف نے کی جس میں پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر ڈاکٹر عارف خان، جناب عارف متین، ڈاکٹر قلب بشیر خاور اور جناب محبوب الرحمن شاہ نے خطاب کیا۔ جبکہ دوسری نشست کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمد الغزالی نے کی اور اس سے ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی، حافظ وقار احمد، ڈاکٹر محمد فاروق حیدر، ڈاکٹر سید عزیز الرحمن، ڈاکٹر نور حیات خان، جناب عزیز احمد اور پروفیسر سید متین احمد شاہ کے علاوہ راقم الحروف نے ”قرآن کریم کے حوالہ سے تخصصات کی ضرورت“ کے موضوع پر گفتگو کی۔

مختلف مقررین اور مقالہ نگار حضرات کی گفتگو میں جو نکات سامنے آئے ان کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے:

•قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کا سرکاری اور پرائیویٹ دونوں سطحوں پر اس طرح کا خاطر خواہ انتظام موجود نہیں ہے جو آج کی علمی، معاشرتی اور اخلاقی ضروریات کا احاطہ کر سکے۔ قومی نصاب تعلیم میں قرآن کریم کی تعلیم بہت محدود اور رسمی حد تک موجود ہے اور اس میں رفتہ رفتہ کمی آ رہی ہے۔

•پرائیویٹ سطح پر مساجد میں قرآن کریم حفظ و ناظرہ کا کسی نہ کسی حد تک بندوبست کیا جاتا ہے لیکن تجوید و قراءت اور معنی و مفہوم سے واقفیت کا اہتمام نہیں ہوتا جو عوامی سطح پر انتہائی ضروری ہے، تاکہ ہمارے بچے ابتدا سے ہی قرآن کریم صحیح تلفظ کے ساتھ صحیح لہجے میں پڑھ سکیں اور قرآن کریم کو معنی و مفہوم کے ساتھ سمجھنے کا ذوق ان میں پیدا ہو۔ اس کے لیے مساجد کے منتظمین کو ہر سطح پر منظم طور پر اپنے نظام کی اصلاح کرنا ہوگی۔

•دینی مدارس میں قرآن کریم ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے لیکن اس میں فقہی اور مسلکی ترجیحات کا رنگ غالب ہوتا ہے، جبکہ امت مسلمہ کی اجتماعی علمی و فکری ضروریات کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کو اولیت کا درجہ دیں۔ فقہی و مسلکی ترجیحات سے پہلے قرآن کریم کے عمومی پیغام اور اس کی دعوت پر توجہ دیں، اور سوسائٹی کی وہ بہت بڑی اکثریت جو مدارس کے ساتھ وابستہ نہیں ہے، انہیں قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لیے خصوصی کلاسوں اور کورسز کا اہتمام کریں۔

•قیام پاکستان کے بعد ایک نئی اسلامی ریاست کی تشکیل کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اور عمومی نظام کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظام میں بھی وہ ضروری تبدیلیاں نہیں لائی گئیں جو پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنانے کے لیے ناگزیر تھیں۔ جس کی وجہ سے قومی رجحانات میں تذبذب کی کیفیت بڑھتی جا رہی ہے اور قوم فکری و ثقافتی حوالہ سے دو ذہنی کا شکار ہو چکی ہے۔ اس تذبذب اور دو ذہنی کو ختم کرنے اور قوم کو ایک ہی فکری اور تہذیبی جہت پر لانے کے لیے نظام تعلیم کی وسیع تر اصلاح اور قرآن و سنت کی تعلیمات کے فروغ کی ضرورت ہے۔

•عربی زبان سے مسلسل بے اعتنائی بلکہ بتدریج اس سے دوری کے نقصانات بھی واضح ہیں کہ قرآن کریم اور دینی تعلیمات کے ساتھ عوام کا بعد بڑھتا جا رہا ہے۔ حالانکہ اگر آج کی دنیا اور سسٹم سے وابستہ ہونے کے لیے انگریزی زبان ضروری ہے تو قرآن و سنت اور اسلامی احکام و قوانین سے آگاہی کے لیے عربی زبان اس سے زیادہ ضروری ہے۔ مگر اس طرف توجہ نہیں دی جا رہی بلکہ عوام کو عربی زبان سے مزید دور کیا جا رہا ہے۔ اس خلا کو پر کرنا بھی ضروری ہے، ورنہ ہم قومی اور عوامی سطح پر قرآن و سنت سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکیں گے۔

•قرآن کریم کو عام طور پر دین کے محدود تصور یعنی صرف عقائد و عبادات اور اخلاقیات کے حوالہ سے پیش کیا جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم کی تعلیمات کو پوری نسل انسانی کی اجتماعی ضروریات کے مطابق سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی احکام و قوانین کی افادیت و ضرورت کو واضح کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ قرآن کریم کا بنیادی موضوع نسل انسانی کی ہدایت اور راہ نمائی ہے اور یہ ہر دور کے لیے ہے۔ قرآن کریم کے نزول کے بعد قیامت تک کے ہر دور کی علمی، تہذیبی اور معاشرتی راہ نمائی قرآن کریم میں موجود ہے۔ اور ہر دور میں اس وقت کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم کی ہدایات تک رسائی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے آج کے دور کی انسانی ضروریات کو پوری نسل انسانی کے حال اور مستقبل کے تناظر میں واضح کرنا اور قرآن کریم سے اس کی راہ نمائی کا حصول آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

•اس وقت دنیا کا ایک بڑا حصہ خاندانی نظام کے سبوتاژ ہو جانے کے کرب میں مبتلا ہے۔ معاشی نظام کے بحران نے نسل انسانی سوسائٹی کو پریشان کر رکھا ہے۔ ثقافتی اور تہذیبی کشمکش نے انسانی سوسائٹی میں افراتفری کا ماحول پیدا کیا ہوا ہے۔ اور دنیا موجودہ معاشی، معاشرتی اور تہذیبی نظام کی تباہ کاریوں سے پریشان ہو کر نئے نظام کی تلاش میں ہے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ نسل انسانی کی ان ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے تخصصات کے

موضوعات کا تعین کیا جائے اور قرآن و سنت کی روشنی میں انسانی سوسائٹی کے سلگتے ہوئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔

قرآن کریم کے ساتھ صرف تعلیمی اور معلوماتی وابستگی پر اکتفانہ کیا جائے بلکہ اس پر عمل، اس کے مطابق زندگی کو ڈھالنے، اور انسانی سوسائٹی میں قرآنی تعلیمات کے فروغ و نفوذ کو بھی اپنی محنت کا ہدف بنایا جائے۔ قرآن کریم کا تعلق ذہن و فکر کے ساتھ ساتھ قلب و روح سے بھی ہے۔ بلکہ قلب و روح کی وساطت سے قرآن کریم جسموں اور سوسائٹی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے روح و قلب کی قرآن کریم کے ساتھ وابستگی اور اس سب سے بڑے چشمۂ فیض سے استفادہ کا اہتمام کیا جائے، اور اس پر انفرادی اور اجتماعی طور پر سنجیدہ توجہ دی جائے۔

پاکستان کو ''سنی ریاست'' قرار دینے کا مطالبہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۴ء)

ہم چار آدمی یعنی مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا قاری محمد طیب حنفی، حاجی عبد اللطیف خالد چیمہ اور راقم الحروف آج کل اس کوشش میں ہیں کہ سنی شیعہ کشمکش جو صورت حال اختیار کرتی جا رہی ہے اس پر ملک کے عمومی دینی اور مسلکی ماحول میں پائے جانے والے سکوت بلکہ حبس کی کیفیت سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ خاموشی اور بے توجہی درست نہیں ہے اور صورت حال کو پوری طرح سمجھنے کے بعد جدوجہد کی حکمت عملی اور ترجیحات طے کیے بغیر جذباتی اور سطحی ردعمل اختیار کرنے میں بھی فائدہ کی بجائے نقصان ہے، اس لیے اس سلسلہ میں طویل مشاورت اور غور و خوض کی ضرورت ہے۔

ہماری یہ بھی رائے ہے کہ اس کے لیے کوئی نیا فورم قائم کرنے کی بجائے ۱۹۸۸ء میں اسی حوالہ سے قائم ہونے والے ''متحدہ سنی محاذ'' کو دوبارہ متحرک کیا جائے جو ۱۰، ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو شیرانوالہ گیٹ لاہور میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کی صدارت میں منعقد ہونے والے دو روزہ قومی سنی کنونشن میں حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ کی سربراہی میں تشکیل پایا تھا۔ اس میں دیوبندی مسلک کی کم و بیش تمام جماعتیں شریک تھیں۔ اور اس

میں اس وقت کے حالات کی روشنی میں موقف اور مطالبات طے کیے گئے تھے اور روزنامہ اسلام کے زیر نظر کالم میں ۷ مارچ ۲۰۱۳ء کو شائع ہو چکے ہیں۔

جبکہ اس سے قبل ۱۹۷۳ء میں اس وقت کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو ایک ہزار سنی علماء کرام کی طرف سے ”سنی مطالبات“ کے عنوان سے ایک عرضداشت پیش کی گئی تھی جو تحریک خدام اہل سنت پاکستان کے امیر حضرت قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ نے اس وقت کے حالات کے تناظر میں تحریر فرمائی تھی۔ اور اس پر مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا مفتی محمد حسین نعیمیؒ، مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ، مولانا عبد الستار تونسویؒ، مولانا سید حامد میاںؒ، مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، ڈاکٹر اسرار احمدؒ، مولانا محمد اجمل خانؒ، مولانا عزیز الرحمن جالندھری، مولانا تاج محمودؒ، اور مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ سمیت تمام سنی مکاتب فکر کے ایک ہزار کے لگ بھگ علماء کرام نے دستخط کیے تھے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں متفقہ دستاویزات کو آئندہ جدوجہد کی بنیاد بنایا جائے اور پاکستان کو دستوری طور پر ”سنی ریاست“ قرار دینے کے مطالبہ کے ساتھ منظم محنت کا آغاز کیا جائے۔ عاشورہ محرم الحرام کے بعد اس سلسلہ میں وسیع مشاورت کا اہتمام کیا جا رہا ہے، ان شاء اللہ تعالی۔ سردست ۱۹۷۳ء کی مذکورہ متفقہ یادداشت کا متن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جو اس وقت تحریک خدام اہل سنت کے چکوال کے دفتر نے کتابچہ کی صورت میں ایک ہزار علماء کرام کے ناموں کے ساتھ شائع کیا تھا۔

بخدمت جناب ذوالفقار علی بھٹو، وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان۔

سلام مسنون! عرض آنکہ پاکستان میں سنی مسلمانوں کی بہت غالب اکثریت پائی جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے قریبا ۲۵ سالہ طویل دور میں اصحاب اقتدار عموماً اقلیتی فرقوں کی ناحق دلجوئی اور ناز برداری کی خاطر، بلکہ اپنے مخصوص شخصی اور سیاسی مصالح و مفادات کے تحت سنی اکثریت کے حقوق کو نظر انداز بلکہ پامال کرتے رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں یہ عظیم اسلامی شاندار تاریخی کارناموں کی وارث قوم (سنی مسلمان) ہر پہلو سے انتہائی پستی اور بدحالی میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اب چونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا جدید آئین منظور ہو کر ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء سے نافذ ہو چکا ہے۔ اس لیے سواد اعظم (مسلمانان اہل السنت والجماعت) کے ملکی اور ملی حقوق کے تحفظ کی خاطر ہم بعض اہم مطالبات

پیش خدمت کر رہے ہیں، جو درج ذیل ہیں:۔

مطالبہ نمبر ۱: متعلقہ نصاب دینیات

1. سرکاری یا نیم سرکاری تعلیمی اداروں کے نصاب دینیات میں صرف سنی عقائد و احکام پر مشتمل دینیات کی تعلیم نافذ کی جائے جو بحیثیت اکثریت ان کا اسلامی اور جمہوری حق ہے۔ اور جو دوسرے جمہوری ممالک کے مروجہ دساتیر اور تعامل سے بھی ظاہر ہے۔ مثلاً آئرلینڈ کے دستور میں یہ الفاظ موجود ہیں:

"مملکت وہاں کے شہریوں کی غالب اکثریت کے عقیدہ کے محافظ کے طور پر اپاسٹامک اور رومن چرچ کی خاص حیثیت تسلیم کرتی ہے"۔

اسی طرح ناروے کی دستور یہ میں درج ہے کہ

"ایونیجبلیکل لوتھرن مذہب مملکت کا پبلک مذہب رہے گا۔ اس مذہب کے پیروکاروں کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش اسی مذہب کے مطابق کریں۔ جینورٹس کو برداشت نہیں کیا جائے گا، بادشاہ ہمیشہ ایونیجبلیکل لوتھرن مذہب کا پیرو ہوگا۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی ۱۱ مئی ۱۹۷۳ء)

اور خصوصاً اپنے پڑوسی ملک ایران کے نصاب تعلیم کی مثال بھی ہمارے لیے زبردست حجت ہے۔ کیونکہ وہاں حکومت کی طرف سے سرکاری تعلیمی اداروں میں صرف شیعہ اثنا عشریہ کی دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے۔ سنی دینیات کو نصاب تعلیم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ لہذا پاکستان کے تعلیمی نصاب میں بھی صرف سنی اکثریت کی دینیات کا نفاذ ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ شیعہ اقلیت کو سنی اکثریت کے مساوی درجہ دے دیا جائے۔

2. سنی دینیات کا انتظام حکومت کی طرف سے اہل سنت کے علمائے محققین کے مشورہ سے کیا جائے جس میں عقیدہ ختم نبوت اور کمالات رسالت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتحیہ کے علاوہ رحمت للعالمین، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض یافتہ مقدس جماعت (صحابہ کرامؓ) کے حالات، بالخصوص خلفائے راشدین حضرت

ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ۔ ازواج مطہرات حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، اور حضرت حفصہؓ وغیرہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک صاحبزادوں حضرت قاسمؓ، طاہرؓ، طیبؓ، اور بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ، اور خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا تذکرہ، تعلیم کا ضروری جز ہونا چاہیے۔ اور سنی دینیات کے معلم بھی صرف سنی اساتذہ ہونے چاہئیں۔

3. شیعہ وغیرہ اقلیتی فرقوں کو آئین پاکستان کی حسب ذیل دفعہ کے تحت ان کے مخصوص مذہبی اداروں میں ان کی مذہبی تعلیم کا حق دیا جا سکتا ہے کہ

"کسی مخصوص مذہبی گروہ کو اس گروہ کے طلبہ کے لیے مذہبی تعلیم کا بندوبست کرنے کی اجازت ہوگی اور انہیں اس سلسلے میں منع نہیں کیا جا سکے گا۔ اور وہ اپنے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں ایسا کرنے کے لیے بالکل آزاد ہوں گے۔" (آئین پاکستان دفعہ ۲۲ شق ۳ نمبر ا)

اور آئین کی مندرجہ شق سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں اکثریت کی دینیات کا انتظام ہوگا۔ اور اقلیتی فرقے اپنے اپنے مخصوص اداروں میں اپنی مذہبی تعلیمات کا انتظام کرنے کے مجاز ہو سکتے ہیں۔

4. شیعہ اقلیتی فرقہ کی طرف سے ان دنوں میں پھر یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے: (ا) کراچی کے اجلاس منعقد ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء میں "سنی شیعہ نصاب کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق سنی شیعہ مشترکہ نصاب نافذ کیا جائے۔" (ب) "اس مشترکہ نصاب کے مرتب ہونے تک ۱۹۷۰ء میں بارہ رکنی بورڈ کی منظور کردہ دینیات کی کتابیں پڑھانے کا حکم دیا جائے۔"

حالانکہ نصاب تعلیم کی یہ دونوں صورتیں اہل سنت کے اسلامی اور جمہوری حقوق کے خلاف ہیں۔ علاوہ ازیں اس سلسلہ میں یہ بھی گزارش ہے کہ کراچی کے اجلاس منعقدہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء میں سنی شیعہ نصاب کمیٹی نے جو یہ فیصلہ کیا ہے کہ "سنی و شیعی عقائد و عبادات کے

ابواب تو جدا جدا ہوں گے، لیکن دینیات کی کتاب ایک ہوگی، کلاس بھی ایک ہوگی، استاد بھی ایک ہوگا، اور امتحان بھی ایک ہوگا۔"

یہ ایک مضحکہ خیز تجویز ہے جو اہل سنت کے لیے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ

1. مشترکہ نصاب کی اس مجوزہ صورت میں شیعہ اقلیتی فرقہ کو سنی غالب اکثریت کے ساتھ مساوی درجہ پر رکھا گیا ہے۔

2. مجوزہ صورت میں استاذ اور کلاس ایک ہونے کی وجہ سے سنی اساتذہ پر اپنے عقیدہ وایمان کے خلاف دینیات کی تعلیم لازمی قرار پاتی ہے، اسی طرح سنی طلبہ کو ایک ہی کلاس میں شیعہ دینیات پڑھنی پڑے گی اور بلا ضرورت اپنے عقیدہ و ایمان کے خلاف کسی دوسرے مذہب کی تعلیمات چونکہ ناقابل برداشت ہوتی ہیں، اس لیے اس سے تعلیم و تعلم کا اصلی مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔

3. علاوہ ازیں نصاب تعلیم کی مروجہ صورت آئین پاکستان کی حسب ذیل دفعہ کے تحت بے اثر اور کالعدم ہوجاتی ہے کہ

"کسی شخص کو جو کسی تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم ہو ایسی مذہبی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکے گا، اور نہ کسی مذہبی رسم میں شرکت کے لیے کہا جائے گا، نہ مذہبی عبادت کرنا ہوگی، اگر یہ ہدایات اس کے اپنے مذہب کی بجائے کسی اور مذہب سے متعلق ہوں۔" (دفعہ ۲۲ نمبر ۱)

اسی طرح متبادل صورت میں شیعہ کا یہ مطالبہ بھی مسترد کردینا چاہیے کہ ۱۹۷۰ء کے بارہ رکنی بورڈ کی منظور کردہ دینیات کی کتابیں پڑھانے کا حکم دیا جائے"۔ کیونکہ جب سرکاری تعلیمی اداروں میں جمہوری اصول کے تحت صرف سنی اکثریت کی دینیات کا نفاذ ضروری ہے تو پھر شیعہ دینیات کے داخل نصاب ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہوجاتا ہے۔

5. شیعہ دینیات کا مطالبہ اس لیے بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ سنی

عقائد اصول اور شیعی عقائد اصول میں تضاد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سنی دینیات میں جن امور کا اثبات ضروری ہے، شیعہ دینیات میں ان میں سے اکثر امور کی نفی پائی جاتی ہے۔ مثلاً سنی دینیات میں خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ فاروق، حضرت عثمانؓ ذوالنورین اور حضرت علیؓ المرتضی کو بالترتیب برحق خلفاء تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے برعکس شیعہ دینیات میں حضرت علی المرتضی رضی اللہ تعالی عنہ کو خلیفہ بلافصل ماننا ان کے ایمان کی بنیاد ہے اور ان کی اذان میں بھی حضرت علی المرتضیٰؓ کے لیے خلیفۂ بلافصل کے الفاظ ادا کیے جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی ہی خلیفہ برحق ہیں۔ اور نعوذ باللہ خلفائے ثلثہ حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ فاروق، اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت علیؓ کی خلافت کو غصب کرنے والے ہیں، اور کسی درجہ میں بھی ان کے نزدیک برحق خلیفہ نہیں ہیں۔ تو کیا حکومت کے لیے ان دونوں متضاد عقائد و نظریات کی سرپرستی تعلیمی اداروں میں جائز اور معقول ہو سکتی ہے؟

6. سنی شیعہ مشترک نصاب ہو یا جداگانہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں متضاد و متخالف عقائد و نظریات کی تعلیم کی بنا پر سنی و شیعہ طلبہ میں مذہبی مباحثات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جس سے اساتذہ بھی متاثر ہوں گے اور تعلیمی نظام میں انتشار پیدا ہو کر فرقہ وارانہ فساد و منافرت کا باعث بن جائے گا۔

7. اگر شیعہ اقلیتی فرقہ کی دینیات کو کسی صورت میں بھی داخل نصاب ہونے کا حق دیا جائے تو اس کے بعد مرزائی، عیسائی اور ہنود تک مذہبی اقلیتوں کو بھی ان کی دینیات کو داخل نصاب کرنے کا حق دینا پڑے گا۔ جس کی وجہ سے خود حکومت سخت مشکلات میں مبتلا ہو جائے گی۔ لہذا مذکورہ وجوہات کی بنا پر ہمارا یہ مبنی برحق مطالبہ ہے کہ سنی اکثریت کے اسلامی اور جمہوری حقوق کے پیش نظر سرکاری تعلیمی اداروں میں صرف سواد اعظم اہل سنت کی دینیات کو ہی داخل نصاب کیا جائے اور شیعہ اقلیتی فرقہ کی طرف سے ان کی دینیات کو داخل نصاب کرنے کے

مطالبات کو مسترد کرکے اہل سنت کی عظیم اکثریت کو مطمئن کیا جائے۔

مطالبہ نمبر ۲: متعلقہ ماتمی جلوس شیعہ

شیعہ اقلیتی فرقہ کے ماتمی جلوسوں پر پابندی لگا دی جائے اور ان کے مخصوص مذہبی رسوم و شعائر کی ادائیگی کو ان کے امام باڑوں اور ان کی عبادت گاہوں میں محدود کر دیا جائے۔ کیونکہ

1. حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کی شہادت کے سلسلہ میں شیعوں کے جو ماتمی جلوس نکالے جاتے ہیں وہ مذہب شیعہ کے اصول کے تحت بھی عبادت میں شمار نہیں ہوسکتے۔ اور اگر وہ ان کو عبادت قرار دینے پر مصر ہیں تو عبادت کے لیے ان کو اپنی عبادت گاہیں استعمال کرنی چاہئیں نہ کہ عام شاہراہیں اور گلی کوچے۔

2. مروجہ ماتمی جلوس سواد اعظم اہل سنت کے عقیدہ کے تحت ناجائز اور حرام ہیں۔ لہذا اقلیتی فرقہ کو یہ حق نہیں ملنا چاہیے کہ ان کے ایسے مذہبی رسوم و مظاہر جو سنی سواد اعظم کے نزدیک ناجائز ہیں، اہل سنت کے گھروں کے سامنے، ان کی مساجد اور ان کے دینی مدارس کے سامنے، ان کی گلی کوچوں میں ادا کیے جائیں۔ یہ طریق عبادت صریح اشتعال انگیزی پر مبنی ہے جس کی وجہ سے دن بدن باہمی منافرت بڑھتی جارہی ہے۔ اور باوجود سنی مسلمانوں کے صبر و تحمل کے ہر سال محرم و چہلم کے ماتمی جلوسوں کی وجہ سے متعدّد مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر ایران جیسے ملک میں بھی شیعی ماتمی جلوسوں کی اس طرح اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ وہاں کا سرکاری مذہب شیعہ اثنا عشری ہے۔ لہذا اسلامی اور جمہوری حقوق کے تحفظ کی خاطر ہمارا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ ماتمی جلوسوں کے سابقہ لائسنس بالکل منسوخ کر دیے جائیں، تاکہ ان ماتمی جلوسوں کی بنا پر جو فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں، ان کا بالکلیہ انسداد ہوسکے۔

مطالبہ نمبر ۳

اہل سنت کے اوقاف کے لیے علیحدہ سنی اوقاف بورڈ قائم کردیا جائے اور سنی اوقاف کی آمدنی شرعی ضوابط کے تحت سنی مفادات پر صرف کی جائے اور ان کی

نگرانی اور انتظام کے لیے بھی صرف سنی افسران متعیّن کیے جائیں۔

مطالبہ نمبر ۴: متعلقہ نشریات ریڈیو و ٹیلی ویژن

1. ریڈیو اور ٹیلی ویژن بہترین ذرائع ابلاغ ہیں، لیکن عام طور پر ان کے ذریعے جو گانے بجانے وغیرہ کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں، وہ ساری قوم کے لیے عموماً، اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے خصوصاً مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں، اور اب جبکہ آئین پاکستان میں یہ دفعہ رکھ دی گئی ہے:

"پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگیوں کو اسلام کے بنیادی نظریے اور اصولوں کے مطابق ڈھال لیں، اور قرآن پاک اور سنت نبویؐ کے روشنی میں زندگی کے مطالب کو اچھی طرح سمجھ لیں"۔ (آئین دفعہ ۳۱)

اسلامی طرز زندگی اس بنا پر ضروری ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ کتاب و سنت کے خلاف ان مخرب اخلاق پروگراموں پر بالکل پابندی لگا دی جائے تاکہ پاکستان کے نوجوان مسلمان طاؤس و رباب کی بجائے شمشیر و سناں ہاتھ میں لے سکیں۔

2. ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جو مذہبی اور تبلیغی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں وہ عموماً شیعہ اقلیتی فرقے کے عقائد و نظریات کے تحت ہوتے ہیں اور خصوصاً محرم اور چہلم کی نشریات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ایک شیعہ اسٹیٹ ہے۔ سواد اعظم اہل سنت کے عقائد کے خلاف شہادت حسین رضی اللہ تعالی عنہ پر شام غریباں کے پروگرام اور ماتم اور سینہ کوبی اور ذوالجناح اور زنجیر زنی کے مناظر بذریعہ ٹیلی ویژن دکھائے جاتے ہیں، جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہ اہل بیت کے ارشادات و اعمال کے بھی خلاف ہیں۔ اہل سنت کے جذبات ان کے ذریعہ مجروح کیے جاتے ہیں۔ لہذا ہمارا یہ اہم مطالبہ ہے کہ شیعہ اقلیتی فرقہ کے ان پروگراموں پر بالکل پابندی لگا دی جائے۔

3. ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ جہاں شیر خدا حضرت علیؓ المرتضی، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہم کے فضائل و مناقب نشر کیے جاتے ہیں وہاں دیگر خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ فاروق اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر اصحاب مثلا سیف اللہ حضرت خالد بن ولیدؓ، فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ، امین امت حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، کاتب وحی حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین کے حالات و کمالات کو بھی قوم کے سامنے پیش کیا جائے، جنہوں نے محبوب خدا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست فیضان حاصل کیا اور رضائے الہی کی قرآنی سند حاصل کی۔ جو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک ما انا علیہ و اصحابي کے تحت ما بعد کی امت کے لیے معیار حق ہیں۔ جن کی تاریخی جانبازیوں اور مجاہدانہ قربانی سے طاغوتی طاقتیں سرنگوں ہوئیں۔ قیصر و کسری کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوا، روم و ایران مفتوح ہوئے، پرچم اسلام بلند ہوا، نور توحید سے بر و بحر روشن ہوئے، اور جن کے ذریعہ قرآن حکیم کی عظیم پیشگوئی "غلبہ اسلام" تکمیل پذیر ہوئی۔ رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین۔

4. جملہ اصحاب و اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و ناموس کو قانونی تحفظ دیا جائے، اور جو شخص کسی صحابي کی بھی توہین کا مرتکب ہو اس کو عبرت ناک سزا دی جائے۔

مطالبہ نمبر ۵ : متعلقہ مسئلہ ختم نبوت

کتاب اللہ، ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین کی روشنی میں تمام امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتحیۃ کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی آدمی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والا نبوت و رسالت کا دعوی کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج اور قطعی کافر ہے اور اس کو ماننے والے بھی قطعی کافر ہیں۔ اسی بنا پر

فرنگی دور کے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کو تمام علمائے امت نے کافر قرار دیا ہے۔ اور اس کو نبی یا مجدد ماننے کو بھی کافر کہا ہے۔

علاوہ ازیں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین جدید میں بھی صدر مملکت اور وزیر اعظم کے حلف نامہ میں عقیدہ ختم نبوت کو بایں الفاظ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ:

"میں قسم کھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، اور خدا پر میرا یقین کامل ہے، اور اس کی کتاب قرآن پاک پر جو کہ آخری کتاب ہے، آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر (جن پر خدا کی رحمت ہو) جن کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا، قیامت کے دن پر، رسول کی سنت و حدیث پر، قرآن پاک کے احکامات پر"۔ (آئین پاکستان تیسری شیڈول حلف صدر دفعہ ۴۲)

لیکن باوجود اس کے مرزائی گروہ کے افراد اسلام کے نام پر ملک کی اہم کلیدی آسامیوں پر متمکّن ہیں اور اس وجہ سے عروج و اقتدار حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے کسی طرح بھی اسلام اور پاکستان کے وفادار نہیں بن سکتے۔ آزاد کشمیر اسمبلی کے حالیہ اس فیصلے کے ردعمل میں کہ "مرزائی غیر مسلم اقلیت ہیں" مرزائیوں کی طرف سے شائع کردہ ٹریکٹ بعنوان "احمدیوں کے بارے میں آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد تجزیہ اور حقیقت حال" اور ربوہ کے ڈکٹیٹر مرزا ناصر احمد کے مطبوعہ خطبہ روزنامہ "الفضل" مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء میں انہوں نے اپنے ناپاک عزائم کو آشکارا کر دیا ہے۔ اور ۲۵ لاکھ مسلح مرزائیوں کی طاقت کے بل بوتے پر خونی انقلاب لانے کی دھمکی بھی دے دی ہے۔ اس بنا پر مرزائیت کے بارے میں ہمارا یہ کم از کم بنیادی مطالبہ ہے کہ:

1. مرزائیوں کو صراحتاً غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔
2. ان کو کلیدی آسامیوں سے فوری طور پر ہٹا دیا جائے۔
3. مرزا ناصر کے خطبہ اور مذکورہ ٹریکٹ کو ضبط کر کے ان کے خلاف سخت کاروائی کی جائے، اور ملک و ملت کے خلاف مرزائیوں کے ناپاک عزائم اور ان کی گہری سازشوں کا بالکلیہ سدباب کر دیا جائے۔

اللہ تعالی پاکستان اور مسلمانان پاکستان کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی شر سے محفوظ رکھیں اور دین اسلام کو غلبہ عطا فرمائیں، آمین، والسلام۔

شعر و شاعری کی اہمیت و ضرورت

(جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۴ء)

(جامعہ نصرۃ العلوم میں دیوان حماسہ کے سبق کے آغاز پر چند تمہیدی باتیں۔)

موزوں کلام یعنی وزن پر کلام کہنا شعر کہلاتا ہے۔ شعر اظہار کے ذرائع میں ایک بہت مؤثر ذریعہ ہے جس سے انسان اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے، دوسروں کو متاثر اور قائل کرتا ہے اور کبھی کبھی گھائل بھی کر دیتا ہے۔ بیان کے اسالیب میں ایک بڑا اسلوب شعر و شاعری ہے۔

شاعر ہونا انبیاء کرامؑ کے شایان شان نہیں

شعر و شاعری کی بنیاد تخیل پر ہوتی ہے کہ ایک آدمی بات کو بیان کرتے ہوئے جتنا مبالغہ کرے گا، جتنا زیادہ تخیل اونچا ہو گا، اتنا ہی شعر خوبصورت ہو گا۔ انبیاء کرامؑ کی بات تخیل پر نہیں بلکہ وحی اور یقین پر ہوتی ہے، اس لیے شعر و شاعری انبیاءؑ کے شایان شان اور مقام و مرتبہ کے مطابق نہیں ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ شاعر کہتے تھے مگر قرآن کریم میں ہے وماعلمنہ الشعر وماینبغی لہ اور نہیں سکھایا ہم نے آپؐ کو شعر اور نہ ہی وہ آپؐ کے شایان شان ہے۔ ایک اور جگہ قرآن کریم میں ہے والشعرآء یتبعھم الغاوون اور شعراء کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے شعر و شاعری کو رسالت کے اوصاف میں ذکر نہیں کیا۔

شعر فی نفسہ حضورؐ نے استعمال بھی کیا ہے اور اس کی تعریف بھی کی ہے، آپؐ نے شعر سنے بھی ہیں اور سنائے بھی ہیں۔ نفی کا مطلب مطلقاً نفی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر ہونا حضورؐ کے شایان شان نہیں۔ مطلقاً شعر کا وجود ایک ذریعہ ہے جو اظہار کے طور پر پہلے بھی موجود رہا ہے، آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ آنحضرتؐ نے شعر و شاعری کو اسلام کی دعوت و دفاع کے لیے استعمال کیا ہے، حضورؐ خود شعر نہیں کہتے تھے لیکن شعر کو حدی، رجز اور غزل کے طور پر آپؐ کے سامنے پڑھا گیا ہے جس پر آپؐ داد بھی دیتے تھے۔ سمرۃ بن جندبؓ کی شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ حضورؐ کی مجلس میں اشعار پڑھے جاتے تھے اور آپؐ داد بھی دیتے تھے جبکہ ترانے (رجز) تو حضورؐ نے خود بھی پڑھے ہیں۔

حضورؐ کے ایک حدی خواں تھے جو کہ اسی کام کے لیے تھے اور سفر میں ساتھ ہوتے تھے۔ اونٹوں کے ساتھ چلتے تھے اور بہت مزے کی حدی پڑھتے تھے، ان کا نام انجشہؓ تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک سفر میں حضورؐ اونٹ پر سوار تھے، انجشہؓ ساتھ تھے اور حدی پڑھ رہے تھے۔ اونٹ ایک باذوق جانور ہے، اس کا مزاج یہ ہے کہ جتنا اچھا گانے والا ہوگا وہ اتنا تیز دوڑے گا۔ تو انجشہؓ بڑے مزے کے ساتھ حدی پڑھ رہے تھے جبکہ اونٹ پر ازواج مطہراتؓ سوار تھیں۔ حضورؐ نے آواز دی رویدک یا انجشہؓ سوقک بالقواریر اے انجشہؓ! آہستہ پڑھ، ذرا ٹھہر ٹھہر کے پڑھ، تم آبگینے لے کر سفر کر رہے ہو۔ یعنی اونٹ زیادہ تیز دوڑے گا تو یہ شیشے جیسی عورتیں جو اونٹ پر سوار ہیں ٹوٹ جائیں گی۔

اسلام کے دفاع کے لیے شاعری

جناب نبی اکرمؐ کی قریشیوں کے ساتھ تین جنگیں ہوئیں۔ جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ احزاب۔ جب آنحضرتؐ احزاب کی جنگ سے فارغ ہوئے تو مسجد نبوی میں خطبہ ارشاد فرمایا کہ مسلمانو! اب قریشیوں کو حوصلہ نہیں ہوگا کہ وہ ہم پر حملہ کریں، ان کا آخری زور لگ چکا ہے۔ سارا عرب بھی اکٹھا کر کے لے آئیں تو کچھ نہیں کر پائیں گے۔ انہوں نے ایک مہینہ محاصرہ رکھا لیکن قرآن کہتا ہے لم ینالوا خیرا کہ کچھ بھی نہیں حاصل کر سکے اور پورا مہینہ ذلیل ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اب یہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے، اب جب بھی حملہ کریں گے تو ہم خود کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اور دوسری بات آپؐ نے یہ فرمائی کہ قریشیوں کو تمہارے خلاف اب تلوار کی جنگ کا حوصلہ نہیں ہوگا لیکن اب وہ زبان کی جنگ لڑیں گے، تمہارے خلاف پراپیگنڈا کریں گے، تمہاری مذمت اور کردار کشی کریں گے، شعر و شاعری کریں گے، تجارتی میلوں میں تمہارے خلاف نفرت پھیلائیں گے، اور تمہارے خلاف اعتراضات کا طوفان کھڑا کریں گے۔

آپؐ نے فرمایا کہ تلوار کی جنگ میں تم سب میرے ساتھ تھے، اس زبان جنگ میں کون کون میرے ساتھ ہوگا؟ اس پر تین آدمی کھڑے ہوئے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ۔ تینوں اپنے دور کے بڑے شاعر تھے اور تینوں انصاری تھے، تینوں نے ذمہ داری اٹھائی کہ شعر و شاعری کی جنگ ہم لڑیں گے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے فرمایا، یا رسول اللہؐ! میں اس زبان کے ساتھ کافروں کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ حضورؐ کی مدح اور نعت بیان کرتے تھے اور

کافر حضورؐ کی ہجو میں جو کلام کرتے تھے ان کا جواب دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ رجزیہ اور رزمیہ شعر کہتے تھے کہ اڑا دیں گے، کاٹ دیں گے، چیر پھاڑ دیں گے، تباہ کر دیں گے وغیرہ۔ جبکہ حضرت کعب بن مالکؓ توحید، اللہ کی صفات، اسلام کی خوبیاں، اسلام کے احکام اور عبادات کی باتیں کرتے تھے اور کفر و شرک کی برائیاں بیان کرتے تھے۔

چنانچہ یہ جنگ بہت عمدگی سے لڑی گئی۔ اتنے مزے سے لڑی گئی کہ ایک سال حدیبیہ میں حضورؐ عمرہ نہیں ادا کر سکے تھے اور واپس آ گئے تھے۔ آپؐ نے عمرہ قضا اگلے سال ان ہی صحابہؓ کے ساتھ کیا جو کہ پندرہ سو کے لگ بھگ تھے۔ احرام باندھے ہوئے تھے اور تلواریں میان میں تھیں، جب مکہ میں داخل ہوئے تو رسول اللہؐ کی اونٹنی کی مہار حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کے ہاتھ میں تھی۔ باقی لوگ لبیک اللّٰھم لبیک پڑھ رہے تھے جبکہ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ رجز پڑھ رہے تھے کہ مار دیں گے، کاٹ دیں گے۔ کفار مکہ وہیں موجود تھے اور یہ سب ان کے درمیان سے جا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھ لیا کہ باقی سب لوگ تلبیہ پڑھ رہے ہیں اور یہ رجزیہ اشعار پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے قریب آ کر زبان سے نہیں بلکہ اشارے سے بات کی کیونکہ ساتھ اونٹ پر آپؐ سوار تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ سے اشارتاً کہا کہ خدا کے بندے کعبہ سامنے ہے اور تم اپنی شاعری میں لگے ہوئے ہو۔ جناب نبی کریمؐ نے حضرت عمرؓ کو دیکھ لیا اور کہا دعہ یا عمر عمرا سے پڑھنے دو، اس کے اشعار کافروں کے سینوں میں تمہارے تیروں سے زیادہ نشانے پر لگ رہے ہیں۔

یہ واقعات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ ضرور کہا ہے کہ شعر و شاعری انبیاءؑ کے شایان شان نہیں، لیکن شعر و شاعری کی مطلق نفی نہیں کی ہے۔ اس لیے کہ حضورؐ نے دعوت اور دفاع اسلام کے لیے اظہار کے ذرائع کے طور پر خطابت اور شعر دونوں کو استعمال کیا ہے۔

شعر و شاعری کی اقسام

شعر و شاعری کی مختلف اقسام ہیں جیسے:

رجز: رجز جنگی ترانے کو کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب اسے رجز کہتے ہیں اور یہ حضورؐ نے خود پڑھے ہیں۔

حدی: چرواہے جانوروں اور اونٹ کو چرانے اور تیز چلانے کے لیے حدی پڑھتے ہیں۔
اونٹ اس حوالہ سے سب سے زیادہ باذوق جانور ہے کہ اس پر جتنا چاہے وزن ڈال دیا جائے لیکن ساتھ کوئی اچھی حدی پڑھنے والا ہو تو اونٹ تیز دوڑتا ہے۔ فارسی کا شعر ہے

حدی را تیز ترمی خواں چوں محمل راگراں بینی

کہ اگر اونٹ پر بوجھ زیادہ ڈال دیا ہے تو گھبرانے کی بات نہیں، حدی تیز کر دو۔ حدی پنجابی زبان میں ماہیہ کے طور پر پڑھی جاتی ہے۔

قصیدہ: کسی کی بہت زیادہ تعریف کرنا مبالغے کے ساتھ۔

ہجو: کسی کی برائیاں بیان کرنا، مذمت کرنا۔

مرثیہ: کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کرنا، کسی کے مرنے پر غم کا اظہار کرنا۔

تشبیب: کسی کے حسن کی تعریف کرنا یعنی کسی عورت کے محاسن کا ذکر چھیڑ دینا۔

غزل: صنف نازک کی باتیں کرنا اور حسن و عشق کا تذکرہ کرنا غزل کہلاتا ہے۔ وغیر ذلک۔

صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے شاعر تھے۔ ایک ہے شاعر ہونا اور ایک ہے سخن شناس ہونا کہ خود تو شاعر نہیں لیکن شعر کو سمجھتا ہے۔ سخن شناس ہونا بھی ایک مستقل ذوق ہے۔ شعر شناسی میں، شعر و شاعری کے ذوق میں اور اشعار کو سمجھنے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو کمال حاصل تھا۔ شعر سمجھنا اور موقع محل کے مطابق اسے استعمال کرنا ایک مستقل فن ہے۔ میں نے اپنے دور میں دو ایسے آدمی دیکھے ہیں جن کو موقع محل کے مطابق شعر فٹ کرنے کا ذوق حاصل تھا۔ تقریر میں نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم، جو خود بھی شاعر تھے اور گفتگو میں شعر کو ایسے لاتے تھے کہ جیسے شعر اسی بات کے لیے کہا گیا ہے۔ جبکہ تحریر میں امام اہل السنۃ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، ان کی کتابیں دیکھ لیں کہ بات بنا کر ایسے لاتے ہیں اور اس طرح شعر فٹ کرتے ہیں کہ جیسے کہا ہی اسی کے لیے گیا ہے۔ موقع محل کے مطابق شعر ذکر کرنے سے بات کا وزن بہت بڑھ جاتا ہے۔

شعراء عرب کی اقسام

شعراء عرب کے تین طبقات ہیں۔ (۱) جاہلی (۲) مخضرم (۳) اسلامی۔ جن کی اصطلاحات مندرجہ ذیل ہیں۔

جاہلی: وہ شاعر جنہوں نے جاہلیت کا دور پایا اور جاہلیت کے دور میں ہی تھے مسلمان نہیں ہوئے اور اسی حالت میں فوت ہو گئے، وہ جاہلی شاعر کہلاتے ہیں۔

مخضرم: وہ شاعر جنہوں نے جاہلی اور اسلامی دونوں دور پائے، جاہلی دور میں بھی شاعری کرتے رہے اور اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کرتے رہے، وہ مخضرم کہلاتے ہیں۔

اسلامی: وہ شاعر جو اسلام کے دور میں آئے، وہ مسلمان شاعر یعنی اسلامی شاعر کہلاتے ہیں۔

ادب جاہلی کی ضرورت

ادب (ادب، یؤدب، تادیبا) لفظی معنی اصلاح کرنا ہے۔ اور یہ اس لیے ہی پڑھا جاتا ہے کیونکہ اس سے زبان، اخلاق اور آداب کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس میں نصیحتیں بھی ہوتی ہیں، انسانی اخلاق و کمالات بھی بیان ہوتے ہیں، اور کمزوریوں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ کونسی بات خوبی کی ہے اور کونسی کمزوری و عیب کی ہے۔ انسان کو کس وقت کیا کرنا چاہیے یہ سب ادب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے اور اگر انسان اسے غور سے پڑھے تو اس میں بہت سے قیمتی اسباق ملتے ہیں اور بڑی اچھی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور انسان کو پتہ چلتا ہے کہ شرافت اور ذلت کی علامتیں کیا ہیں۔

جناب نبی کریمؐ اب سے چودہ سو سال پہلے جس زمانہ میں تشریف لائے، عرب دنیا میں خطابت اور شعر و شاعری میں فصاحت و بلاغت عروج پر تھی۔ اور آج بھی اسی کو معیار تسلیم کیا جاتا ہے، آج بھی جب ادب کی فصاحت و بلاغت کا معیار بیان کیا جاتا ہے تو سب سے اونچا معیار ادب جاہلی کا بیان ہوتا ہے۔ قرآن کریم اس دور کے ادب کے دائرے میں آیا ہے، جناب نبی کریمؐ بھی اسی دور کے آدمی تھے، آپؐ کی زبان مبارک پر بھی اسی دور کے الفاظ، محاورے، مثالیں اور کہاوتیں تھیں۔

ہر زمانے اور ہر علاقے کی اپنی اپنی زبان ہوتی ہے۔ زبان کے الفاظ، محاورے اور مثالیں زمانے کے اعتبار سے بھی اور مقام کے اعتبار سے بھی بدل جاتی ہیں۔ ہم بھی اردو بولتے ہیں اور دہلی والے بھی اردو ہی بولتے ہیں۔ لیکن دہلی والوں کی اور ہماری اردو مختلف ہے، جبکہ لکھنؤ والوں کی تو بالکل ہی مختلف ہے۔ کراچی کے محاورے الگ ہیں، پشاور کے الگ ہیں، لاہور کی مثالیں اور ہیں، اسلام آباد کی مثالیں اور ہیں۔ اب کوئی لکھنؤ والا تقریر کر رہا ہو تو اسے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے لکھنؤ کی اردو سمجھنا ضروری ہے۔ اور اگر کوئی مرزا غالب کے زمانے کی بات کر رہا ہے تو مرزا غالب کے زمانے کی اردو سمجھنا ضروری ہے۔

چونکہ قرآن کریم اس دور کی عربی میں آیا ہے اور جناب رسول اللہؐ کے ارشادات، فرمودات، احادیث اور آپؐ کی زبان مبارک اسی دور کی ہے، اس لیے قرآن کریم اور حدیث کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے اور حضورؐ ارشادات کا صحیح مصداق سمجھنے کے لیے اس دور کی عربی سے واقف ہونا ہماری دینی ضرورت ہے، اور شعر و شاعری کے اس اسلوب سے واقف ہونا قرآن فہمی کے لیے بھی ضروری ہے۔

ادب جاہلی ہم کیوں پڑھاتے ہیں اور یہ درس نظامی کے نصاب میں کیوں شامل ہے؟ اس لیے کہ یہ قرآن فہمی اور حدیث و سنت کو سمجھنے کی ضروریات میں سے ہے۔ اس دور کے محاورے، ضرب الامثال، کہاوتیں اور اس دور کی زبان کا معیار سمجھیں گے تو قرآن کریم اور حدیث کو صحیح سمجھیں گے۔ لیکن اگر اس دور کے محاوروں کو صحیح نہیں سمجھیں گے تو قرآن کریم اور حدیث صحیح سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہمیں حماسہ، متنبی اور سبعہ معلقہ وغیرہ کے ذریعے اس دور کے عربی اسلوب سے واقف کرایا جاتا ہے تاکہ ہم اس زمانے کے عربی اسلوب اور ذوق کو سمجھیں اور ہمیں قرآن کریم اور حدیث سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔

دیوان حماسہ کا مختصر تعارف

ایک شاعر کے اشعار کا مجموعہ جو کسی بھی ذوق سے مرتب ہو اسے دیوان کہتے ہیں۔ مثلاً دیوان حسان بن ثابتؓ، دیوان حضرت علیؓ، دیوان غالب وغیرہ۔ ایک دیوان وہ ہوتا ہے جو آدمی اپنے اشعار کا مجموعہ مرتب کرتا ہے۔ جبکہ بعض لوگوں کا ذوق ہوتا ہے کہ دوسروں کے منتخب اشعار کا مجموعہ مرتب کرتے ہیں۔ مختلف شعراء کے کلام میں سے جو شعر اچھے لگیں، جو نظم، غزل اچھی لگے، ان کا انتخاب کرتے ہیں۔ جیسے متنبی میں جتنا کلام ہے متنبی کا اپنا ہے، لیکن حماسہ میں جتنا کلام ہے وہ مرتب کا اپنا نہیں ہے بلکہ اس نے جاہلی، مخضرم اور مسلمان شعراء کے کلام میں سے جو جو باتیں اچھی لگیں ان کا مجموعہ بنایا ہے۔

حماسہ کا لفظی معنی بہادری ہے۔ یعنی بہادر لوگوں کا کلام یا بہادری کا کلام۔ صاحب حماسہ کا نام ابو تمام حبیب بن اوس تھا جو بنو طیٔ قبیلے کا تھا اور اپنے دور کے بڑے شاعروں میں سے تھا۔ اس زمانے کا یہ اسلوب تھا کہ شعراء بادشاہوں کے دربار میں جاتے تھے اور قصیدے پڑھتے تھے، دو چار مہینے ایک دربار میں گزارتے تھے اور قصیدے پڑھ کے کچھ پیسے کما لیتے تھے۔ پھر کسی دوسرے بادشاہ کے دربار میں چلے جاتے تھے۔ یعنی ان کا ذریعہ

آمدنی یہی تھااور اس زمانے کے بادشاہ بھی ادب پرور ہوتے تھے، شعراء اور خطیبوں کی قدر کرتے تھے۔

ایک دفعہ یوں ہوا کہ خراسان کا بادشاہ عبد اللہ بن طاہر جو اس وقت جوان تھا، ابو تمام حبیب بن اوس نے اس کے دربار میں قصیدہ پڑھا تو اسے ایک ہزار دینار ملے۔ دینار اس زمانے میں بڑی چیز ہوتی تھی۔ جب واپس آرہا تھا تو اس کا گزر ہمدان سے ہوا، وہاں اس کا ایک دوست ابوالوفاء بن ابی سلمہ رہتا تھا، اس نے سوچا دو چار دن کیلئے اس کے پاس ٹھہر جاتا ہوں۔ چنانچہ اس کے پاس ٹھہرا تو ایک دن گزرا ہی تھا کہ اتنی برف باری ہوئی کہ راستے بند ہو گئے، یہ پریشان ہو گیا کہ گھر جانا تھا اور ہزار دینار بھی جیب میں ہیں۔ مگر میزبان خوش تھا کہ اب یہ میرے پاس ہی رہے گا اور اس کی خاطر تواضع کروں گا۔ میزبان نے کہا کہ راستے تو بند ہو گئے ہیں، اب تین مہینے کے بعد ہی کھلیں گے۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر وغیرہ نہیں ہوتے تھے، اس لیے اس نے کہا کہ تسلی رکھو اور یہیں رہو، کتب خانہ موجود ہے، دو چار کتابیں لکھ دو۔

سردیوں میں برف باری میں پھنسے ہوئے ابو تمام نے مختلف اشعار کے دیوانوں میں سے ایک انتخاب کیا اور اسے مرتب کیا یعنی دیوان ابی تمام (دیوان حماسہ)۔ یہ دیوان جاہلی اور اسلامی دور کے بڑے بڑے شعراء کا منتخب کلام ہے۔ کسی بھی شاعر کے اشعار اسے کسی بھی حوالے سے اچھے لگے، وہ اس نے مرتب کیے ہیں۔ بہت خوبصورت مجموعہ ہے اور عجیب انتخاب ہے۔ اسے تقریباً ۱۲۰۰ سال گزر گئے ہیں اور یہ ایسا مقبول ہوا ہے کہ ابھی تک پڑھا جا رہا ہے، یونیورسٹیوں میں بھی پڑھایا جاتا ہے اور ہم مدارس میں بھی پڑھاتے ہیں۔

دین میں عُسر اور یُسر کا مفہوم

(جامع مسجد صدیقیہ، سیٹلائیٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ - ۲۲ جولائی ۲۰۱۴ء)

(۲۴ رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ کو نماز فجر کے بعد سیٹلائیٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں مولانا حافظ گلزار احمد آزاد کی زیر نگرانی جاری ''فہم قرآن وسنت کورس'' کی نشست سے خطاب۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوۃ۔ قرآن کریم کی جس آیت کریمہ میں ماہ رمضان میں قرآن کریم کے نزول اور روزے کی فرضیت کا تذکرہ ہے اور مسافر و مریض کے لیے روزہ دوسرے دنوں

میں قضا کر لینے کی سہولت بیان کی گئی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ’’یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر‘‘ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتے ہیں اور تنگی کا ارادہ نہیں فرماتے۔ آج قرآن کریم کے اس ارشاد گرامی کے حوالہ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یسر اور عسر کا مفہوم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے شریعت کے احکام میں تنگی اور آسانی کی کون سی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

پہلی بات تو روزے کے حوالہ سے دیکھ لیں کہ روزے پہلی امتوں پر بھی فرض تھے اور ہم پر بھی فرض کیے گئے ہیں لیکن ہمارے لیے دو بڑی سہولتوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ روزہ فرض ہے جو ہر حال میں رکھنا ہے لیکن اگر بیماری اور سفر کی وجہ سے روزے میں دشواری پیش آ رہی ہے تو اجازت دی گئی ہے کہ اس وقت روزہ نہ رکھیں اور بعد میں مناسب ایام میں قضا کر لیں۔ جبکہ اگر بڑھاپے اور بیماری کی نوعیت ایسی ہے کہ بعد میں بھی قضا نہیں ہو سکتی تو فدیہ دے دیں۔ یہاں ایک مسئلہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ روزہ رمضان المبارک میں نہ رکھ سکنے کی صورت میں فدیہ دیا جاتا ہے اور بعض لوگ معمولی بیماری پر بھی فدیہ دے کر خود کو بری الذمہ سمجھ لیتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ فدیہ روزہ نہ رکھ سکنے کی صورت میں نہیں ہے بلکہ قضا نہ کر سکنے کی صورت میں ہے، جو شخص رمضان المبارک میں روزہ نہیں رکھ سکتا مگر بعد میں قضا کر سکتا ہے اس کے لیے فدیہ نہیں بلکہ قضا ہے۔ البتہ جو بعد میں قضا بھی نہیں کر سکتا اس کے لیے فدیہ کی سہولت ہے، حتیٰ کہ فقہاء کرامؒ نے لکھا ہے کہ اگر یہ سمجھ کر فدیہ دے دیا کہ رمضان المبارک میں روزہ نہیں رکھ سکتا اور بعد میں قضا بھی اس کی استطاعت میں نہیں ہے، مگر بعد میں کسی وقت قضا کرنے کی استطاعت ہو گئی تو قضا ضروری ہو جائے گی اور دیا گیا فدیہ صدقہ شمار ہو گا۔ یہ روزے میں ایک بڑی سہولت ہے جو دو مرحلوں میں دی گئی ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بیماری یا سفر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا تو بعد میں قضا کرنے، اور دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر بعد میں قضا بھی نہیں کر سکتا تو فدیہ دے دے۔

روزہ میں دوسری سہولت ہمیں یہ دی گئی ہے کہ پہلی امتوں کا روزہ دن رات کا ہوتا تھا جو رات سونے سے شروع ہو جاتا تھا اور اگلے روز شام تک جاری رہتا تھا، سحری اس میں نہیں ہوتی تھی، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کا دورانیہ کم کر دیا اور رات اس سے نکال کر سحری کھانے کو سنت قرار دے دیا۔ اور اس کی وجہ

ہماری ایک کمزوری بیان کی کہ ’’علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم‘‘ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں کے ساتھ خیانت کرتے ہو۔ وہ یہ کہ روزے میں کھانے پینے کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کی مباشرت بھی منع ہے لیکن کچھ لوگوں سے رات کو اس سے صبر نہیں ہوتا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے خیانت سے تعبیر کر کے فرمایا ہے کہ ’’فعفا عنکم‘‘ پچھلی کوتاہیاں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دی ہیں اور آئندہ کے لیے رات کو روزے سے نکال دیا ہے، اب روزہ طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب تک رہتا ہے۔

یہ دو بڑی سہولتیں اللہ تعالیٰ نے روزے میں ہماری امت کو دی ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ تمہارے لیے سہولت اور یسر کا راستہ بتاتا ہے اور تمہیں تنگی اور عسر میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا عمومی ضابطہ یہ ہے کہ ’’لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا‘‘ اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اس کی ہمت اور طاقت سے زیادہ کام نہیں لگاتا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کوئی حکم جو کسی انسان کی طاقت میں نہ ہو شریعت میں اس سے اس کا تقاضہ نہیں کیا گیا اور اگر کوئی کام اس کی طاقت سے باہر ہو گیا ہے تو اس کے مطابق اسے سہولت دے دی گئی ہے جیسا کہ نماز کے بارے میں ہے کہ

- مسجد میں پڑھو، لیکن اگر کوئی عذر ہو تو گھر میں یا جہاں بھی ہو پڑھ لو۔
- کھڑے ہو کر پڑھو، اگر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو، بیٹھ بھی نہیں سکتے تو لیٹ کر پڑھ لو، اگر حرکت بھی نہیں کر سکتے تو اشاروں سے پڑھ لو۔
- نماز کے لیے طہارت ضروری ہے، اگر پانی میسر نہیں ہے یا پانی کے استعمال پر کسی وجہ سے قدرت نہیں ہے تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔

جبکہ روزے کے بارے میں مرحلہ وار سہولت کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، یہ سب سہولتیں انسانی طاقت اور ہمت کے حوالہ سے ہیں اور ان کا مقصد ہر مسلمان کو شرعی فریضہ کی ادائیگی میں آسانی مہیا کرنا ہے اور اس کی طاقت و ہمت کے مطابق اس سے کام لینا ہے۔

یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ انسان کے بس میں کون سا کام ہے اور کون سا نہیں ہے، اس کا فیصلہ کرنا کام کرنے والے پر نہیں چھوڑا گیا۔ ورنہ انسانی نفسیات عام طور پر یہ ہیں کہ اگر اس سے کہہ دیا جائے کہ یہ کام اگر تم سہولت سے کر سکتے ہو تو کر لو اور اگر سہولت نہ محسوس کرو تو نہ کرو، تو پھر صرف دین کے احکام نہیں بلکہ دنیا کے کام بھی اکثر رک جائیں

گے اور کوئی کام بھی نہیں ہو سکے گا۔ انسان فطرتاً سہل انگار ہے، اس لیے یہ فیصلہ کرنا کام کرنے والے کا اختیار نہیں ہے بلکہ شریعت نے خود ہی جہاں تنگی محسوس کی ہے وہاں سہولت دے دی ہے، اس لیے کہ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون سا کام کر سکتا ہے اور کونسا کام نہیں کر سکتا۔

ہمارے ہاں کوئی مشین ہے جس کے بارے میں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون سے کام کر سکتی ہے اور کون سا کام اس کے بس میں نہیں ہے، اس بات کا فیصلہ ہم مشین بنانے والی فرم سے پوچھ کر کرتے ہیں کہ بنانے والی فرم ہی بہتر جانتی ہے کہ اس کی بنائی ہوئی مشین سے کون سا کام لیا جا سکتا ہے اور کونسا کام وہ مشین نہیں کر سکتی۔ اسی طرح انسانی طاقت اور صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں اور انہوں نے اسی کے مطابق شریعت کے احکام و ضوابط مقرر فرمائے ہیں۔

اس طرح عسر اور یسر کا ایک دائرہ یہ بھی ہے کہ جوں جوں انسانی صلاحیتوں اور قوت میں کمزوری آتی گئی ہے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں کے احکام آسان ہوتے چلے گئے ہیں، اور آخری امت کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے معاملات میں ایسی آسانیاں فراہم کی ہیں جو پہلی امتوں کو حاصل نہیں تھیں، جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی ان میں شامل ہیں کہ پہلے غنیمت کا مال استعمال کرنا جائز نہیں تھا، اب اسے حلال و طیب کر دیا گیا ہے، پہلے قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بعد میدان میں ڈال دیا جاتا تھا اور آسمان سے آگ آکر اسے جلا دیتی تھی، اب قربانی کا گوشت کھانے کی اجازت دی گئی ہے، اور اس طرح کی بہت سی سہولتیں ہیں جو ہماری امت کو مرحمت فرمائی گئی ہیں۔

یہاں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کو جوں جوں اسباب اور وسائل کی فراوانی کی سہولت ملتی جا رہی ہے اس کی ذاتی قوت و صلاحیت کمزور ہوتی جا رہی ہے، مثلاً جب سواری عام میسر نہیں تھی لوگ میل ہا میل پیدل سفر کر لیتے تھے، اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ پہلے حکیم نبض پر ہاتھ رکھ کر بیماری اور اس کا سبب بیان کر دیتا تھا، اب معمولی بیماریوں کے تعین کے لیے ڈاکٹر صاحبان کو مختلف مشینوں کی رپورٹوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے بچپن تک لوگ دیے، موم بتی، لالٹین اور لیمپ کی روشنی میں لکھ پڑھ لیا کرتے تھے، اب کمرے میں ایک بلب یا ٹیوب کو لکھنے پڑھنے کے لیے کافی نہیں سمجھا جاتا وغیر ذلک۔ جوں جوں سائنسی ترقی بڑھ رہی ہے اور اسباب و وسائل کی سہولتوں میں اضافہ

ہو رہا ہے اسی حساب سے انسان کی ذاتی صلاحیتوں میں کمزوری بڑھتی جا رہی ہے۔ اس طرح ہم آج کے لوگ اسباب و وسائل کے حساب سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں جبکہ پہلے لوگ ذاتی استعداد اور صلاحیتوں کے حوالہ سے ہم سے کہیں زیادہ قوت و طاقت رکھتے تھے۔ گزشتہ شریعتوں کے احکام کے تسلسل میں جو سہولتیں فراہم کی جاتی رہی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے، لیکن جناب نبی اکرمؐ پر وحی کا سلسلہ مکمل اور نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد اب شریعت کے اصولی احکام مکمل ہو گئے ہیں اور منصوص احکام میں بنیادی تبدیلی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ البتہ احکام کی بجاآوری میں انسان کی ہمت و استطاعت کا لحاظ آج بھی موجود ہے اور فقہاء کرام ہر دور میں شریعت کے اصول و ضوابط کے دائرے میں اس حوالہ سے سہولتیں بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کی طرف سے علماء کرام سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ''اجتہاد'' سے کام لے کر ان کے لیے سہولتیں پیدا کریں۔ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شریعت میں اجتہاد کی گنجائش بلکہ حکم موجود ہے لیکن اجتہاد کا معنی یہ ہے کہ قرآن و سنت کے احکام اور فقہی اصولوں کی روشنی میں مسائل و مشکلات کا حل نکالا جائے، اور ایسا وہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جو علم و دیانت کے حوالہ سے اس کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جبکہ اجتہاد کا مطالبہ کرنے والوں کے ذہن میں اس کا مفہوم یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح کیتھولک عیسائیوں میں پاپائے روم اور ان کی کونسل کو مذہبی احکام میں ردوبدل کے صوابدیدی اختیارات حاصل ہیں اسی طرح شاید مسلمان علماء کے پاس بھی کوئی اختیار ہے جسے وہ استعمال نہیں کر رہے۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جسے دور کرنا چاہیے۔ فقہاء اسلام کو اجتہاد کا حق حاصل ہے اور وہ آج بھی اس کی حدود میں یہ عمل جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن وہ شریعت کی روشنی میں اور اصول و ضوابط کے دائرے میں کوئی سہولت بنتی ہو تو اسے بتا دیتے ہیں، اپنی طرف سے کوئی سہولت پیدا نہیں کر سکتے، وہ بتاتے ہیں بناتے نہیں ہیں۔

ہماری فقہی تاریخ گواہ ہے کہ فقہاء کرام نے ہر دور میں اس وقت کی ضروریات اور عرف و تعامل کی روشنی میں مسائل کی تشریح کی ہے اور سینکڑوں مسائل میں سہولت دی ہے، خاص طور پر عرف و تعامل کے تغیر، عموم بلویٰ اور مصلحت عامہ کے اصولوں کے تحت جہاں بھی ضرورت محسوس ہوئی فقہاء اسلام نے انسانی سوسائٹی کو جائز سہولت فراہم کرنے

میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں بہرحال ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اس سہولت کا فیصلہ کرنے والے حضرات اس فقہی مقام و صلاحیت کے حامل ہوں جو اس کے لیے ضروری ہے۔ اور دوسرا یہ کہ وہ سہولت کسی مسلمہ شرعی اصول سے متصادم نہ ہو۔

اس کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ اللہ تعالیٰ یسر کا ارادہ فرماتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ "الدین یسر" دین آسانی دیتا ہے۔ لیکن آسانی کا مطلب احکام شریعت سے فرار نہیں بلکہ ان کی بجاآوری میں ضرورت کے مطابق سہولت مہیا کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص یسر کے نام پر دینی احکام پر عمل سے ہی بچنا چاہتا ہے تو اس کا نام فرار ہے یسر نہیں ہے۔ یسر کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص شرعی حکم پر عمل کرنا چاہتا ہے لیکن عمل میں کوئی دشواری محسوس کر رہا ہے تو شریعت اس کی ہمت اور دشواری دونوں کو دیکھ کر ضرورت کے مطابق آسانی ضرور فراہم کرتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں احکام شریعت پر صدق دل کے ساتھ عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

قرآن کریم کے حقوق

(دنیا ٹی وی - ۸ جولائی ۲۰۱۴ء)

۸، ۹، ۱۰ جولائی کو دنیا ٹی وی کے سحری وافطاری کے پانچ نشریاتی پروگراموں میں شرکت کا موقع ملا جنہیں جناب انیق احمد بڑے ذوق و مہارت کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ پہلے پروگرام میں مولانا اسعد تھانوی، مولانا شجاع الملک اور مولانا قاری اکبر مالکی کے ساتھ رفاقت رہی۔ موضوع گفتگو عمومی طور پر "قرآن کریم کے حقوق" تھا جبکہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰ کا یہ جملہ بطور خاص زیر بحث آیا "کتابا فیہ ذکرکم"۔ کم و بیش تین گھنٹے پر مشتمل اس پروگرام میں بیسیوں نکات پر بات ہوئی۔ ناظرین کی طرف سے متعدّد سوالات کیے گئے اور اس طرح متنوع دینی معلومات کا ایک گلدستہ سج گیا۔ راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ سورۃ الانبیاء کی آیت کریمہ ۱۰ میں فرمایا گیا ہے کہ """ہم نے تمہارے اوپر کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟" یہاں ذکر سے مفسرین کرامؒ نے مختلف امور مراد لیے ہیں جو اپنی جگہ سب صحیح ہیں۔ مگر امت کے مفسرین کے

سردار حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں ذکر سے مراد شرف و افتخار ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے باعث شرف ہے اور باعث افتخار ہے۔ اس کی تائید جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ ہر امت کے لیے شرف و افتخار کی کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے، اور میری امت کے شرف و مباہات کا باعث قرآن کریم ہے۔ اس فخر و مباہات کے بیسیوں پہلو ہیں جن میں سے دور حاضر کے تناظر میں تین باتوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت و قراءت آج بھی اس ذوق و اہتمام کے ساتھ اور اس قدر وسیع پیمانے پر ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی اور کتاب اس حوالہ سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ مثال کے طور پر ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ دنیا کا کوئی ادارہ اگر یہ سروے کرنا چاہے کہ اس سال رمضان المبارک کے دوران دنیا بھر میں قرآن کریم کی تلاوت و قراءت کتنی مقدار میں ہوئی ہے، تو کسی بڑے سے بڑے اور منظم ادارے کے لیے بھی ایسا کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ یہ قرآن کریم کے اعجاز و اعزاز کا ایسا پہلو ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم آج بھی نسل انسانی کے لیے راہ نمائی اور ہدایت کا فطری ذریعہ ہے۔ دنیا کا کوئی بھی شخص اسے سمجھنے کے لیے پڑھے تو وہ اس سے ضرور ہدایت پاتا ہے۔ مثلاً ایک نومسلم انگریز ڈاکٹر یحیی برٹ نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ گزشتہ دس سال کے دوران یورپ میں یورپی نسلوں سے تعلق رکھنے والے کم و بیش تیرہ ہزار افراد مسلمان ہوئے ہیں۔ ان میں اسی فی صد لوگ وہ ہیں جن کی رسائی کسی نہ کسی طرح قرآن کریم تک ہوئی ہے اور وہ قرآن کریم پڑھ کر مسلمان ہوگئے ہیں۔ گویا قرآن کریم آج بھی ہدایت اور راہ نمائی کے میدان میں اپنا کام کر رہا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ اگر سمجھ کر راہ نمائی کے لیے پڑھے تو کافر بھی ہو تو یہ کلام پاک اس کی راہ نمائی کرتا ہے۔ جبکہ ہم محض ثواب و برکت کے لیے پڑھتے ہیں جس کے حصول سے انکار نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم بھی راہ نمائی اور ہدایت کے لیے پڑھیں گے تو کیا قرآن کریم ہماری راہ نمائی نہیں کرے گا، اور ہماری مشکلات و مسائل کا حل نہیں بتائے گا؟

تیسری بات یہ کہ عالمی سطح پر انسانی سوسائٹی کے مسائل کے حل کے لیے قرآن کریم کی طرف رجوع کی ضرورت کا کھلے بندوں اظہار ہونے لگا ہے۔ اس کی ایک ہلکی سی مثال یہ

ہے کہ سابق پاپائے روم پوپ بینی ڈکٹ کی قائم کردہ ایک کمیٹی نے صاف کہا ہے کہ دنیا کے معاشی نظام کو توازن و اعتدال پر لانا ہے تو اس کے لیے قرآن کریم کے معاشی اصولوں کی طرف آنا ہوگا۔ یہاں بھی توجہ طلب بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ عام انسانیت کے سامنے قرآن کریم کو اس کے مسائل کے حل کے لیے راہ نما اور ہادی کے طور پر پیش کریں۔

آج یہاں ایک اور سوال زیر بحث آیا ہے کہ ہمیں بحیثیت مسلمان قرآن کریم کے ساتھ فہم و شعور اور اطاعت و راہ نمائی کا تعلق بحال کرنے کے لیے کیا اقدامات عملی طور پر کرنے کی ضرورت ہے۔ تو میں اس سلسلہ میں اپنی تجاویز کو پانچ درجوں میں تقسیم کروں گا۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور حکومت پاکستان کی دستوری ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عام کرنے کے لیے اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر اور سنجیدگی کے ساتھ ادا کرے۔ اس سلسلہ میں کسی نئے فیصلے کی ضرورت نہیں ہے، اب تک دستوری طور پر اسلامی معاشرے کے قیام، قرآن و سنت کی تعلیمات کے فروغ اور عربی زبان کی تعلیم کے لیے جو امور طے کر دیے گئے ہیں اور اس حوالہ سے مختلف حکومتوں کے اعلانات اور خاص طور پر سپریم کورٹ آف پاکستان اور وفاقی محتسب اعلیٰ کے جو فیصلے ریکارڈ پر موجود ہیں انہیں دوبارہ سامنے لا کر ان پر عمل درآمد کا آغاز کر دیا جائے۔ اب تک کیے جانے والے فیصلوں پر عملدرآمد سے ہی صورت حال یکسر بدل جائے گی۔

دوسرا درجہ تعلیمی نظام اور اداروں کا ہے۔ ریاستی تعلیمی اداروں اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں، دونوں کو قرآن و سنت کی تعلیم کے بارے میں اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینا ہوگا اور ملی مقاصد کی تکمیل کے لیے دستور پاکستان کے متعیّن کردہ خطوط کے دائرے میں قرآن و سنت کی تعلیمات کا ہر سطح پر اہتمام کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں سب سے بڑی ذمہ داری انہی کی بنتی ہے۔

تیسرا درجہ ملک بھر میں پھیلی ہوئی مساجد اور دینی مدارس کا ہے۔ مساجد میں قرآن و حدیث کے عمومی درس کا اہتمام ضروری ہے، جبکہ دینی مدارس کو سنجیدگی کے ساتھ اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو تو تعلیم دے رہے ہیں جو خود چل کر ان کے پاس آتے ہیں۔ مگر معاشرے کی وہ غالب اکثریت جس کا دینی مدارس کے ساتھ تعلق نہیں ہے، اسے

قرآن و سنت کی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لیے وہ کیا کر سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ اگر دینی مدارس قوم کے مختلف طبقات کے لیے درس قرآن کریم، درس حدیث اور عربی زبان کے مختصر کورسز کا درجہ بندی کے ساتھ انتظام کر لیں تو اس خلا کو کافی حد تک پورا کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ اپنے مقصد قیام کے حوالہ سے دینی مدارس کی ذمہ داری میں شامل ہے۔

چوتھے درجے میں میڈیا کا ذکر کرنا چاہوں گا، جسے یہ احساس دلانے کی شدید ضرورت ہے کہ وہ مسلمانوں کا میڈیا ہے اور پاکستان کا میڈیا ہے۔ اس لیے اسے اپنی پالیسیوں اور پروگراموں میں اسلام اور پاکستانیت کا نمائندہ نظر آنا چاہیے جو کہ بدقسمتی سے اس وقت موجود نہیں ہے۔ میڈیا اگر اپنا قبلہ درست کر لے اور ملی اور قومی مقاصد کو اپنی ترجیحات میں صحیح مقام پر لے آئے تو سوسائٹی کا قرآن کریم کے ساتھ فہم و شعور اور اطاعت و فرمانبرداری کا رشتہ استوار کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

جبکہ پانچویں درجہ میں خاندان اور فیملی کی باری آتی ہے۔ اسے اگر نیچے سے اوپر جانے کی ترتیب سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ ذمہ داری خاندانی ماحول کی بنتی ہے کہ گھر کے اندر قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سنت کا تذکرہ عام کیا جائے اور قراءت و تعلیم کا ماحول بنایا جائے۔ گھر کے اندر قرآن کریم کی تلاوت و قراءت اور قرآن و سنت کی تعلیم و تفہیم کا اہتمام حد درجہ ضروری ہے۔ اور اس کے دو نقد فائدے تو بالکل ہمارے سامنے ہیں۔ پہلا یہ کہ گھر میں قرآن کریم کی تلاوت و قراءت کا جس قدر ماحول ہوگا، رحمتوں اور برکتوں کا اسی حساب سے نزول ہوگا۔ اور ہم اس نحوست اور بے برکتی سے نجات حاصل کر سکیں گے جس کا گھروں میں دن بدن عام ہوتے چلے جانے کی ہمیں اکثریت شکایت رہتی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ جب ہم اپنے بچوں کو قرآن و سنت اور دینی تعلیمات سے آراستہ کریں گے تو اس بے راہ روی اور گمراہی کا سدباب ہوگا جس میں نئی نسل کے مبتلا ہو جانے کا شکوہ ہر وقت ہماری زبانوں پر رہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اپنے بچوں کا قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کے ساتھ عقیدت و محبت کے ساتھ فہم و شعور کا تعلق بھی جوڑ دیں گے تو دنیا کی کوئی گمراہی اور بے راہ روی انہیں اپنا شکار بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۲ جولائی ۲۰۱۴ء)

رمضان المبارک اور قرآن کریم

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۳۰ جون ۲۰۱۴ء)

عالم اسلام میں رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا ہے اور دنیا بھر کے مسلمان عبادات کے نئے ذوق و شوق کے ساتھ رمضان المبارک کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ یہ مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے اور اسی میں لیلۃ القدر بھی ہے، اس رات کو ایک مہینے سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا نزول اسی ماہ میں ہوا، جو اگرچہ عملاً جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مسلسل ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا مگر لوح محفوظ سے آسمانی دنیا تک منتقل کرنے کا حکم اس رات میں دیا گیا جس کی وجہ سے یہ رات خصوصی اعزاز سے نوازی گئی۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو نسل انسانی کی راہ نمائی کے لیے نازل ہوا اور قیامت تک اولاد آدمؑ کی کو ہدایت و نجات کی راہ دکھاتا رہے گا۔ قرآن کریم اور رمضان المبارک کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں جس کی وجہ سے اس مہینہ میں قرآن کریم سب سے زیادہ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ شاید سارے سال میں قرآن کریم اتنی بار اور اس ذوق و شوق کے ساتھ نہیں پڑھا جاتا جتنا اس ماہ مبارک میں اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ اگر دنیا بھر میں سروے کر کے رمضان المبارک میں تلاوت کیے جانے والے قرآن کریم کی مقدار اور تعداد کو شمار کیا جائے تو کسی بڑے سے بڑے منظم ادارے کے لیے بھی یہ کام بہت مشکل ثابت ہوگا۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز اور اعزاز ہے جس میں دنیا کے کسی مذہب، کسی زبان اور کسی موضوع کی کوئی کتاب اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ اور رمضان المبارک قرآن کریم کے اس اعجاز اور اعزاز کے اظہار کا سالانہ سیزن ہوتا ہے۔

گزشتہ روز نوشہرہ سانسی گوجرانوالہ میں حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی کی مسجد میں نماز عصر کے بعد اس موضوع پر گفتگو کا موقع ملا تو ذہن کا رخ اس طرف مڑ گیا کہ یہ بھی تو قرآن کریم کے اعجاز کا ایک پہلو ہے کہ دنیا بھر کی لاکھوں مساجد میں تراویح کے دوران روزانہ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے اور ہر رنگ، نسل، زبان اور علاقے کے قاری و حافظ اللہ تعالیٰ کا یہ پاک کلام نماز کی حالت میں مسلمانوں کو سناتے ہیں۔ مگر کہیں بھی اس بات کا شبہ بلکہ اس کا امکان تک نہیں ہوتا کہ کہیں یہ حافظ صاحب دوسرے حضرات سے مختلف قرآن کریم نہ پڑھ رہے ہوں۔ مراکش کا حافظ جکارتہ میں قرآن کریم سنا رہا ہو، کوالالمپور کا

حافظ نیروبی میں پڑھ رہا ہو، ماسکو کا حافظ کیپ ٹاؤن میں پڑھ رہا ہو، لندن کا حافظ برلن میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا ہو، یا ہانگ کانگ کا حافظ پیرس میں قرآن کریم سنانے میں مصروف ہو، کہیں بھی ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ نہیں ہوتا کہ کہیں اس کا قرآن کریم دوسرے سے مختلف نہ ہو۔ پورے اعتماد کے ساتھ آنکھیں بند کر کے سنا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں قرآن کریم ایک ہی ہے۔ لہجے اور قراءت کا اختلاف تو مسلم ہے لیکن قرآن کریم کے متن، ترتیب اور جملوں میں کہیں کوئی فرق دکھائی نہیں دے گا۔ یہ حفاظ کرام دنیا بھر میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کئی سال قبل ایک امریکی ادارے کے سروے میں دنیا میں حافظوں کی تعداد تیرہ ملین کے لگ بھگ بتائی گئی تھی۔ اب اگر اس سے ڈبل نہیں تو اس کے قریب ضرور ہوگی۔ اور دنیا کا کوئی علاقہ ان حفاظ کرام کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا کے کسی بھی علاقے میں کوئی ادارہ قرآن کریم کا نعوذ باللہ غلط نسخہ چھاپ دے، یا آیات، سورتوں اور جملوں میں ردوبدل کر دے تو اس نسخے کو چیک کرنے کے لیے مدینہ منورہ یا کسی اور شہر بھجوانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ اسی علاقے میں دو چار حافظ موجود ہوں گے جو پڑھ کر بتا دیں گے کہ اس میں یہ جملہ غلط ہے، یہ آیت درست نہیں ہے اور یہ ترتیب اصل قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن کریم کو اس طرح یاد کرنے، رٹنے رٹانے، سننے سنانے اور بار بار دہرانے کا یہ عمل قرآن کریم کی حفاظت کا ایسا فول پروف سسٹم ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے قرآن کریم میں کسی طرح کے ردوبدل کا سرے سے کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اور خود قرآن کریم نے یہ بات چیلنج کے انداز میں بیان کی ہے کہ ”لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ“ (فصلت ۴۲) کہ باطل کو قرآن کریم میں در اندازی کا کہیں سے کوئی راستہ نہیں ملے گا۔

چنانچہ بہت دفعہ کوشش کی گئی مگر قرآن کریم جوں کا توں ایک ہی حالت میں دنیا میں ہر جگہ موجود ہے۔ یہ قرآن کریم کے حفظ کا اعجاز و کمال ہے، قرآن کریم کے کتابی نسخوں کا بھی ایک کمال دیکھ لیجئے کہ قرآن کریم کے جو اولین نسخے حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں لکھوائے گئے تھے ان میں سے دو تین اصلی نسخے استنبول، تاشقند اور لندن میں موجود ہیں۔ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں حضرت مولانا سید نفیس الحسینی شاہؒ کے ہمراہ حاضری کے موقع پر وہاں کا نسخہ میں نے دیکھا ہے۔ میں وہ نسخہ ہاتھوں میں اٹھائے دل میں

سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی دیکھیے کہ قرآن کریم کے اصل نسخے کی حفاظت کس جگہ اور کن لوگوں کے ہاتھوں کروا رہا ہے۔ اور صرف حفاظت نہیں بلکہ اس کے اوریجنل ہونے کی گارنٹی بھی انہی سے دلوا رہا ہے کہ جس جگہ یہ مبارک نسخہ رکھا ہوا ہے وہاں یہ تحریر موجود ہے کہ یہ قرآن کریم کا وہ اصل نسخہ ہے جو مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے دور میں لکھا گیا تھا اور ان مستند ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے۔

یہ قرآن کریم کے اعجاز کا صرف ایک پہلو ہے۔ اسی لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ مشرکین عرب نے قرآن کریم کے مقابلے سے عاجز ہو کر اسے ''جادو'' قرار دیا تھا جس کی قرآن کریم نے تردید کی ہے کہ نہ میں جادو ہوں اور نہ ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جادوگر ہیں۔ اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم جادو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ البتہ محاورہ کی زبان میں یہ کہنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ

''قرآن کریم جادو نہیں ہے لیکن اس کا جادو آج بھی دنیا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے''۔

عالمی تناظر میں دینی مدارس کا کردار

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۷ مئی ۲۰۱۴ء)

۲۳ مئی کو جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دستار بندی کی سالانہ تقریب تھی جس میں پاکستان شریعت کونسل صوبہ خیبر پختونخوا کے امیر مولانا عبد القیوم حقانی مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے جمعۃ المبارک کے اجتماع سے تفصیلی خطاب کیا اور جامعہ سے فارغ ہونے والے طلبہ کی دستار بندی کی۔

جامعہ نصرۃ العلوم ۱۹۵۲ء سے دینی خدمات سرانجام دے رہا ہے، اس کا تعارف پورے برصغیر کے علمی و دینی حلقوں میں ہزارہ سے تعلق رکھنے والے دو بھائیوں حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کے حوالہ سے ہے۔ اور سات عشروں کو محیط جامعہ کی خدمات کے تذکرہ کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ اب تک دورہ حدیث، دورہ تفسیر، تجوید و قراءت اور حفظ قرآن کریم کے شعبوں سے فراغت حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات کی تعداد کا اندازہ پندرہ سے بیس ہزار کے درمیان کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ کچھ عرصہ سے تجوید و قراءت کے شعبہ میں جامعہ نصرۃ العلوم کی خدمات کو عالمی

سطح پر امتیازی حیثیت سے دیکھا جا رہا ہے اور درجنوں بین الاقوامی اور قومی مقابلوں میں جامعہ کے حفاظ اور قراء نے نمایاں پوزیشنیں حاصل کی ہیں۔

راقم الحروف نے بھی انہی دو بزرگوں کے زیر سایہ جامعہ میں تعلیم حاصل کی جو میرے والد محترم اور چچا محترم ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں جامعہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سے بحمد اللہ تعالٰی کم و بیش دو عشرے مدرسہ انوار العلوم میں اور اس کے بعد جامعہ نصرۃ العلوم میں مسلسل تدریس و خطابت کی خدمات سرانجام دے رہا ہوں اور حضرت والد محترمؒ کے بعد جامعہ کے صدر مدرس کے طور پر ذمہ داریاں میرے سپرد ہیں۔ جامعہ سے اس سال دورہ حدیث سے پچاس طلبہ اور تیرہ طالبات نے سند فراغت حاصل کی، شعبہ تجوید و قراءت سے پچیس قراء کرام نے اسناد حاصل کیں، پندرہ حفاظ اور پندرہ حافظات نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا، جبکہ ترجمہ قرآن کریم کی کلاسوں کو شامل کر کے اس سال فارغ ہونے والے طلبہ اور طالبات کی تعداد ایک سو چھتیس کے لگ بھگ بنتی ہے۔ جامعہ کے مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی اور ناظم اعلٰی مولانا حمد ریاض خان سواتی ہیں۔ شعبہ تجوید و قراءت کے سربراہ مولانا قاری سعید احمد اور شعبہ حفظ کے سربراہ مولانا قاری عبید اللہ عامر ہیں۔

اسی شام کو مغرب کے بعد مرکزی جامع مسجد گکھڑ میں معارف اسلامی اکادمی کی سالانہ تقریب تھی۔ یہ دینی درسگاہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے قائم کی تھی اور اب ہمارے چھوٹے بھائی مولانا قاری حماد الزہراوی اپنے رفقاء سمیت اس کا انتظام چلا رہے ہیں۔ یہاں حفظ و ناظرہ اور تجوید و قراءت کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سال بارہ قراء اور چار حفاظ کی دستار بندی ہوئی۔ اس تقریب سے بھی مولانا عبد القیوم حقانی اور راقم الحروف نے خطاب کیا اور فراغت حاصل کرنے والے طلبہ کی دستار بندی کی۔

دونوں تقریبات میں مدارس دینیہ کی خدمات اور کردار ہی ہمارا موضوع گفتگو تھا۔ مولانا عبد القیوم حقانی نے دینی تعلیم کے فروغ، مسلمانوں میں جذبۂ حریت و آزادی کی بیداری اور عقیدۂ و ثقافت کے تحفظ کے حوالہ سے مدارس کی خدمات کا ذکر کیا اور ان کوششوں کا حوالہ دیا جو مدارس دینیہ کی آزادی کو سلب کرنے اور ان کے تعلیمی و تہذیبی کردار کو محدود کرنے کے لیے کی جاتی رہی ہیں۔ اور ان کے خیال میں قومی سلامتی کے حوالہ سے اس وقت پارلیمنٹ میں قانون کا جو مسودہ زیر بحث ہے اس میں مدارس دینیہ کے کردار کو محدود کرنے کی شقیں بھی اسی کوشش کا حصہ ہیں۔ مولانا نے کہا کہ اس قسم کی کوئی کوشش پہلے بھی

کبھی کامیاب نہیں ہوئی اور اب بھی کامیاب نہیں ہوگی جبکہ دینی مدارس اپنا کردار حسب سابق ادا کرتے رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں دینی حوالہ سے جو بیداری پائی جاتی ہے وہ مدارس دینیہ کی اسی محنت کا نتیجہ ہے اور اسے کسی صورت میں بھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔

راقم الحروف نے عالمی تناظر میں دینی مدارس کے کردار کا جائزہ لیا اور عرض کیا کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دینی مدارس ہزار سال پہلے کے علوم کی تعلیم دیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ان مدارس میں جو علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں انسانی معاشرہ کو ہر دور کی طرح مستقبل میں بھی ان کی ضرورت ہے۔ مغربی دنیا آج ویلفیئر اسٹیٹ اور سماجی انصاف میں حضرت عمرؓ کے دور کو آئیڈیل قرار دینے پر مجبور ہے اور سودی بینکاری کی تباہ کاریوں سے تنگ آکر غیر سودی بینکاری کی طرف واپسی کے راستے تلاش کر رہی ہے۔ جبکہ معاشرتی احکام و ضوابط کے حوالہ سے بھی قرآن و سنت کے احکام کی ضرورت اور برتری کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ آج جب ویٹی کن سٹی قرآن کریم کے معاشی اصولوں کی بات کرتا ہے، برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون غیر سودی بینکاری کو دنیا کی ضرورت قرار دے رہے ہیں، اور شہزادہ چارلس مسلسل وجدانیات کی طرف واپسی اور قرآن کریم کے معاشرتی احکام کی دہائی دے رہے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نسل انسانی کو اپنے مستقبل کے حوالہ سے بھی اسلامی تعلیمات کی ضرورت ہے۔ اور ان اصولوں کی تعلیم اس وقت یہی دینی مدارس دے رہے ہیں۔ میں اس کو یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ نسل انسانی کے مستقبل کی ضروریات کے حوالہ سے یہ دینی مدارس ''ایڈوانس اسٹڈی'' کے مراکز ہیں جو دنیا کو ان اصولوں اور احکام کی تعلیم دے رہے ہیں جن کی نسل انسانی کے دانشوروں کو دنیا کے بہتر مستقبل کے لیے ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

اس لیے دینی مدارس کے طلبہ کو پورے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ قرآن و سنت کے علوم حاصل کرنے چاہئیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حالات زمانہ سے واقف ہوں، آج کے دور کی نفسیات سے آگاہ ہوں، اور آج کی دنیا کی فریکونسی پر عبور حاصل کریں۔ تاکہ وہ دور جدید کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اسلام کا پیغام نسل انسانی کے تمام طبقات تک پہنچا سکیں۔

حدیث وسنت کی اہمیت اور امام بخاری کا اسلوبِ استدلال

(جامعہ نصرة العلوم، گوجرانوالہ - ۱۷ مئی ۲۰۱۴ء)

(۱۷ رجب ۱۴۳۵ھ کو جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں بخاری شریف کے آخری سبق کی تقریب سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ سب سے پہلے ان طلبہ و طالبات کو مبارک باد دینا چاہوں گا جو آج بخاری شریف کا آخری سبق پڑھ کر درس نظامی کے نصاب اور دورۂ حدیث کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا پڑھنا ان کے لیے، ان کے والدین کے لیے، اساتذہ کے لیے، ان کے ساتھی طلبہ کے لیے، اور جامعہ کے منتظمین و معاونین سب کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابیوں، برکتوں، سعادتوں اور خوشیوں کا ذریعہ بنائے، آمین یارب العالمین۔

یہ گلشن علم ہمارے بزرگوں کا، حضرات شیخین کریمین حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ اور ان کے رفقاء و معاونین کا لگایا ہوا ہے جس کی آبیاری انہوں نے زندگی بھر بڑی محنت اور ذوق کے ساتھ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور ہم سب کو اس گلشن کی آبیاری کرتے رہنے کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔ ابھی ایک عزیز طالب علم نے بخاری شریف کے آخری باب اور حدیث کی قراءت کی ہے، اس کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کروں گا لیکن اس سے پہلے تمہید کے طور پر چند باتیں عرض کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

عزیز طلبہ اور طالبات سے گزارش ہے کہ مدرسہ کے ماحول میں چند سال گزارنے کے بعد اب وہ عملی زندگی میں قدم رکھیں گے تو انہیں ایک نئے ماحول کا سامنا کرنا ہوگا، بہت سی نئی باتیں دیکھنے میں آئیں گی اور تغیرات محسوس ہوں گے۔ وہ مدرسہ کے محدود ماحول سے نکل کر سوسائٹی کے وسیع ماحول میں داخل ہو رہے ہیں جسے میں یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ وہ جزیرہ سے نکل کر سمندر میں کود رہے ہیں۔ ہمارے مدارس انسانی سوسائٹی کے اس وسیع سمندر میں علمی، تہذیبی اور دینی حوالوں سے جزیروں کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں ہم چند سال گزارتے ہیں، لیکن جب کھلے سمندر میں جاتے ہیں تو بالکل اجنبی سا ماحول ملتا ہے اور

عجیب و غریب قسم کی مخلوقات سے سابقہ پڑتا ہے۔ زبان، لہجہ، اسلوب، روایات و اقدار اور روز مرہ معمولات کا بہت سا فرق سامنے آتا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں کہ ہم راہ فرار اختیار کریں اور مسائل و ضروریات سے آنکھیں بند کر کے کنارہ کشی کی زندگی اختیار کر لیں، بلکہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مسائل کا سامنا کریں، معاشرتی ضروریات کو محسوس کریں، نئے ماحول سے مانوس ہونے کی کوشش کریں، لوگوں کی نفسیات کو سمجھ کر اور ان کی زبان و اسلوب سے واقف ہو کر ان کی علمی و عملی راہنمائی کا اہتمام کریں۔

نئے ماحول سے مانوس ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خود بھی اس کا رنگ اختیار کر لیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی اصل اور اساس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے ماحول اور اس کی ضروریات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کریں تاکہ لوگوں کی صحیح راہنمائی کر سکیں۔ مثال کے طور پر عرض کروں گا کہ آپ نے بخاری شریف کی آخری روایت پڑھی ہے، یہ حدیث نبویؐ کی کتاب ہے، امام بخاریؒ نے بڑی محنت اور ذوق و شوق کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنن کا ایک مستند ذخیرہ مرتب کیا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اس درجہ قبولیت سے نوازا ہے کہ ہر طبقہ میں، ہر زمانہ میں اور ہر علاقہ میں مسلسل پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔ حدیث مبارکہ کے بارے میں مدرسہ کے ماحول میں آپ نے جو مباحث پڑھے ہیں، وہ آج کے اس مقام تک پہنچنے کے لیے انتہائی ضروری تھے، لیکن مدرسہ کے ماحول سے باہر نکل کر آپ کو ان مباحث سے سابقہ درپیش نہیں ہو گا، بلکہ اس سے مختلف مباحث اور سوالات آپ کے سامنے آئیں گے۔ یہاں تو آپ نے یہ پڑھا ہے کہ حدیث صحیح کون سی ہے اور ضعیف کیا ہوتی ہے؟ حدیث کے مدارج کیا ہیں؟ ان کی صحت و ضعف کے اسباب و علل کیا ہیں؟ اور اس کو جانچنے کے معیارات کیا ہیں؟ لیکن جب آپ عام سوسائٹی میں جائیں گے تو آپ کو اس سے مختلف سوالات کا سامنا کرنا ہو گا اور آپ کو اس قسم کے سوالات سننے کو ملیں گے کہ:

- کیا حدیث پر ایمان لانا ضروری ہے؟
- کیا قرآن فہمی کے لیے حدیث کی ضرورت ہے؟
- کیا حدیث عقائد میں بھی حجت ہے؟
- اور کیا حدیث قانون و حکم کا خود بھی ماخذ ہے؟ وغیر ذلک

میں بات کو سمجھانے کے لیے ان سوالات کا مختصر اجائزہ لینا چاہوں گا:

1. یہ سوال آج کل عام ہونے لگا ہے کہ کیا قرآن کریم پر ایمان لانے کے بعد حدیث پر ایمان لانا بھی ضروری ہے؟ میں اس کے جواب میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کے بعد نہیں بلکہ اس سے پہلے حدیث پر ایمان لانا ضروری ہے، اس لیے کہ قرآن کریم ہمیں حدیث کے ذریعے ملا ہے اور حدیث سے ہٹ کر قرآن کریم تک رسائی کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ مثلاً ہم سب مانتے ہیں کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی وحی ''اقرأ باسم ربک الذی خلق والی'' پانچ آیات ہیں، لیکن یہ آیات ہمیں غار حرا کے واقعہ کے ذریعے ملی ہیں، اگر غار حرا کا واقعہ ہے تو یہ پانچ آیات بھی ہیں اور اگر غار حرا کا واقعہ نہیں ہے تو یہ پانچ آیات معلوم کرنے کا اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں۔ غار حرا کے واقعہ کی روایت حدیث کہلاتی ہے، اس لیے پہلے ہمیں حدیث پر ایمان لانا ہوگا اس کے بعد قرآن کریم پر ایمان کی بات ہوگی، حدیث پر ایمان نہیں ہوگا تو قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن ہی نہیں ہے۔

یہی صورتحال قرآن فہمی میں حدیث کی اہمیت و ضرورت کے حوالہ سے بھی ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت، جملہ یا لفظ میں اللہ تعالی کی منشا و مراد سے واقفیت حدیث کے بغیر ممکن نہیں ہے، یہ بات اصولاً بھی ہے اور واقعاتی تناظر میں بھی ہے۔ اصولاً اس لیے کہ قرآن کریم کا متکلّم اللہ تعالی ہے، کسی بھی کلام کی وضاحت کا پہلا حق متکلّم کا ہوتا ہے اور وہی اپنے کلام کی وضاحت کی سب سے بڑی اتھارٹی ہوتا ہے۔ وحی کا دروازہ بند ہو جانے کے باعث اب اللہ تعالی سے تو کسی آیت کا مطلب نہیں پوچھا جا سکتا لیکن جناب نبی اکرمؐ اللہ تعالی کے رسول اور نمائندہ کی حیثیت سے یہ اتھارٹی رکھتے ہیں کہ ان کی وضاحت کو اللہ تعالی کی وضاحت سمجھا جائے، اور وہ قرآن کریم کے کسی جملہ یا لفظ کی جو تشریح اپنے قول یا عمل کے ساتھ کریں اسے اللہ تعالی کی منشا اور مراد قرار دیا جائے، امت نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ واقعاتی تناظر میں اس طرح کہ صحابہ کرامؓ کو جب کسی آیت قرآنی کے سمجھنے میں دقت ہوتی تھی یا کوئی مغالطہ ہو جاتا تھا تو وضاحت کے لیے نبی کریمؐ سے رجوع کیا جاتا تھا اور آپؐ کی وضاحت کو حتمی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی بیسیوں مثالیں احادیث میں موجود ہیں اور بخاری شریف میں بھی

آپ حضرات نے بہت سے واقعات پڑھے ہیں کہ کسی صحابیؓ کو قرآن کریم کی کوئی آیت سمجھنے میں دشواری ہوئی تو اس نے جناب نبی اکرمؐ سے دریافت کر کے اطمینان حاصل کر لیا۔

ان میں سے ایک واقعہ کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ کو مختلف اطراف سے باغیوں کا سامنا کرنا پڑا اور آپ نے مرتدین، منکرین ختم نبوت، اور منکرین زکوۃ کے خلاف جہاد شروع کر دیا تو کچھ ذہنوں میں اشکال پیدا ہوا کہ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے کہ ”یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم“ اے ایمان والو! تم پر لازم ہے کہ اپنا فکر کرو، کوئی اگر گمراہ ہوتا ہے تو تمہیں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے اگر تم ہدایت پر قائم ہو۔ اس آیت کریمہ کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے منکرین ختم نبوت اور منکرین زکوۃ کے خلاف جہاد کی وجہ سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ نے خطبۂ جمعہ میں اس کا ذکر کیا اور فرمایا کہ لوگو! اس آیت کی وجہ سے کسی مغالطہ میں نہ پڑ جانا کیونکہ میں نے جناب نبی اکرمؐ سے سنا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اے ایمان والو! امر بالمعروف کرتے رہو اور نہی عن المنکر کا سلسلہ جاری رکھو حتی کہ ایک وقت آئے گا جب ہر طرف خواہش پرستی اور بخل کا دور دورہ ہوگا اور اپنا ایمان بچانا مشکل ہو جائے گا، اس وقت تمہاری ذمہ داری ہوگی کہ اپنے ایمان کی فکر کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ”علیکم اَنفسکم“ کا محل عام حالات نہیں بلکہ فتنوں کے عروج کا دور ہے۔

اسی طرح ترمذی شریف میں روایت ہے کہ ایک صاحب نے حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ سے اسی آیت کے بارے میں پوچھا کہ اگر ہم پر صرف اپنی فکر کرنا لازم ہے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ظالم و جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ”علی الخبیر سقطت“ جاننے والے پر گرے ہو یعنی اس شخص سے پوچھا ہے جو اس کی حقیقت کو جانتا ہے، اس لیے کہ اس آیت کریمہ کے بارے میں یہی اشکال مجھے بھی ہوا تھا اور میں نے جناب نبی

اکرمؐ سے پوچھ لیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں جناب نبی اکرمؐ نے وہی کچھ فرمایا جو حضرت صدیق اکبرؓ کے حوالہ سے ہم نے بیان کر دیا ہے۔

2. اب آتے ہیں اس سوال کی طرف کہ کیا عقائد میں بھی حدیث رسول حجت ہے اور کسی حدیث پر بھی عقیدہ کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے؟ یہ سوال آج کل عام طور پر ہوتا ہے اور بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ عقیدہ صرف قرآن کریم سے لیں گے۔ میں اس سلسلہ میں مسلم شریف کتاب الایمان کی روایت کا ذکر کروں گا جس میں مشہور تابعی حضرت یحییٰ بن یعمرؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں کچھ لوگوں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے تقدیر کے عقیدہ کے بارے میں تردد ہونے لگا تھا، ہم دو ساتھی حج پر جا رہے تھے، ہم نے دعا کی کہ کسی بزرگ صحابی سے اس سفر میں ملاقات ہو جائے تاکہ ہم ان سے تسلی کر لیں، حسن اتفاق سے ہمیں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہو گئی اور ہم نے ان سے عرض کیا کہ ہمارے علاقہ میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تقدیر کا کوئی عقیدہ نہیں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایسے لوگوں سے بیزاری کا اظہار فرمایا اور پھر وہ مشہور حدیث جبریل سنائی جس میں جناب نبی اکرمؐ نے "وما الایمان؟" کے سوال کے جواب میں ایک جملہ یہ فرمایا ہے کہ "وأن تؤمن بالقدر خیرہ وشرہ"۔ یہاں ایک نکتہ پر غور ضروری ہے کہ عقیدہ میں تردد کے موقع پر وضاحت کے لیے صحابی رسولؐ سے رجوع کیا گیا ہے اور انہوں نے عقیدہ کے اثبات میں حدیث رسولؐ پیش کی ہے، یہی اہل السنۃ والجماعۃ کا منہج اور اصول ہے۔

ایک اور تابعی حضرت یزید الفقیرؒ کی روایت بھی آپ حضرات نے پڑھی ہے کہ انہیں اور ان کے چند ساتھیوں کو شفاعت کے بارے میں تردد ہو گیا لیکن حج سے واپسی پر مدینہ منورہ سے گزر ہوا تو حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی مجلس میں شرکت کی سعادت مل گئی۔ حضرت جابرؓ شفاعت کا ذکر کر رہے تھے اور ان حضرات کے ذہنوں میں یہ تردد اس قدر راسخ ہو چکا تھا کہ ایک صاحب نے اٹھ کر سوال کر دیا کہ حضرت! آپ کون سی شفاعت کی بات کر رہے ہیں جبکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ دوزخ والے وہاں سے نکلنا چاہیں گے لیکن نکل نہیں سکیں

گے۔ حضرت جابرؓ نے اس کے جواب میں شفاعت کی تفصیلی حدیث سنائی، جس پر حضرت یزید الفقیرؒ اور ان کے چند ساتھیوں نے یہ کہہ کر اپنا مغالطہ دور کر لیا کہ حضرت جابرؓ بزرگ صحابی ہیں، وہ حدیث سنا رہے ہیں تو جھوٹ نہیں بول رہے اور جب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ ان کی شفاعت کی وجہ سے بہت سے لوگ جہنم سے نکالے جائیں گے تو یہی بات درست ہے۔ یہاں بھی عقیدہ کی وضاحت صحابیٔ رسول کر رہے ہیں اور اس کے ثبوت میں انہوں نے حدیث پیش کی ہے۔

3. اب میں آخری سوال کی طرف آتا ہوں کہ کیا حدیث بھی قانون اور حکم کا ماخذ ہے؟ اور کیا قرآن کریم کی طرح حدیث سے بھی احکام و قوانین اخذ کیے جا سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ قرآن و حدیث دونوں شرعی احکام و قوانین کا ماخذ ہیں اور شریعت کے احکام دونوں سے یکساں طور پر لیے جاتے ہیں۔ بلکہ بہت سے احکام ایسے ہیں جو قرآن و حدیث دونوں کو ماخذ بنائے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتے۔ مثلاً نماز ہے، جس کا حکم قرآن کریم میں ہے اور اس کی جا بجا تاکید بھی ہے، لیکن نماز کی ترتیب اور دیگر تفصیلات قرآن کریم میں موجود نہیں ہے اور وہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں حدیث نبویؐ سے ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اس کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ عرض کرنا چاہوں گا جس کی تفصیل تفسیر ابن کثیر میں ہے اور کچھ ذکر بخاری شریف میں بھی ہے کہ حضرت یعلی بن امیہؓ نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا کہ قرآن کریم نے دوران سفر نماز قصر کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے کہ ''ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا'' اگر تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں آزمائش میں ڈال دیں گے، یعنی اگر حالت جنگ میں کافروں کے حملے کا ڈر ہو تو چار رکعت کی بجائے دو پڑھ لو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصر حالت خوف اور حالت جنگ میں ہے، مگر ہم حالت امن میں بھی سفر کے دوران قصر ہی کرتے ہیں، اس کا ثبوت کیا ہے؟ حضرت یعلی بن امیہؓ کے سوال پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ حجۃ الوداع کے سفر سے واپسی پر یہی اشکال مجھے بھی ہوا تھا اور میں نے جناب نبی اکرمؐ سے پوچھ لیا تھا کہ آج تو ہم ہر

طرف سے امن میں ہیں اور کہیں سے کوئی خوف نہیں ہے تو ہم نمازیں قصر کیوں پڑھتے جا رہے ہیں؟ جناب نبی اکرمؐ نے بڑا دلچسپ جواب دیا کہ ”عمر! یہ اللہ تعالیٰ کا صدقہ ہے، اسے قبول کرو“ یعنی ہمارے اس عمل پر اللہ تعالیٰ نے خاموشی اختیار کر کے اس کی توثیق فرما دی ہے تو اس کے بارے میں تردد نہ کرو، اس لیے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا حکم اور مہربانی ہے۔

ایک بات پر غور کریں کہ ہم حدیث کی تعریف میں ”تقریری حدیث“ اس کو کہتے ہیں کہ صحابیؓ نے کوئی بات کہی ہے یا عمل کیا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے معلوم ہونے کے بعد اس پر خاموشی اختیار کر لی ہے اور نکیر نہیں فرمائی، تو صحابیؓ کا یہ قول اور فعل جناب نبی اکرمؐ کی حدیث اور سنت بن جاتا ہے۔ اسی طرح جناب نبی اکرمؐ نے کوئی بات فرمائی ہے یا عمل کیا ہے اور وحی کا سلسلہ جاری ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے سکوت فرما لیا ہے، تو نبی اکرمؐ کا قول اور عمل اللہ تعالیٰ کے حکم کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ اور میری طالب علمانہ رائے میں ”وحی حکمی“ اسے ہی کہتے ہیں۔ اب نتیجہ یہ نکلے گا کہ حالت خوف اور جنگ کا قصر تو قرآن کریم نے بیان کیا ہے مگر حالت امن کے قصر کی بنیاد جناب نبی اکرمؐ کا عمل مبارک ہے، اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جبکہ ابوداؤد شریف کی وہ روایت تو آپ حضرات کے ذہن میں ضرور ہوگی کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ مجھے قرآن کریم کے علاوہ اور احکام بھی دیے گئے ہیں اور جس چیز کو میں حرام قرار دیتا ہوں وہ بھی اسی طرح حرام ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔

میں نے ان سوالات کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ آپ کو عام سوسائٹی میں جانے کے بعد حدیث نبویؐ کے بارے میں اصطلاحی اور فنی سوالات کا سامنا نہیں ہوگا بلکہ اس سے مختلف قسم کے سوالات درپیش ہوں گے، جن میں سے چند ایک کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ اور ان میں ایک اور بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ قرآن کریم نے جناب نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ کو ”اسوۂ حسنہ“ قرار دے کر عمومی زندگی میں ان کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ اور جناب نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ میں اوامر و نواہی اور احکام و قوانین کے علاوہ بہت سے پہلو ہیں، ان کو معلوم کرنے کا ذریعہ بھی ہمارے پاس صرف حدیث نبویؐ ہے۔ اس لیے میری آپ حضرات سے گزارش ہے کہ مدرسہ سے نکل کر باہر کے ماحول کو اجنبی جانتے ہوئے گھبراہٹ کا شکار

نہ ہونا بلکہ حوصلہ و تدبر کے ساتھ حالات، ضروریات، اشکالات اور سوالات کا سامنا کرتے ہوئے سوسائٹی کی راہنمائی کی کوشش کرنا۔ البتہ اس کے لیے آپ کو مطالعہ کرنا ہوگا، تحقیق و تجزیہ کا ذوق پیدا کرنا ہوگا اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے رابطہ رکھنا ہوگا۔

اب میں اس حدیث کی طرف آتا ہوں جو ابھی ایک عزیز طالب علم نے بخاری شریف کے آخری سبق کے طور پر پڑھی ہے، زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا ورنہ بہت کچھ کہنے کی گنجائش موجود ہے، صرف ایک دو پہلوؤں کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ امام بخاریؒ کا اس کتاب میں شروع سے یہ اسلوب ہے کہ احادیث بھی بیان کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ان احادیث میں سے اپنے ذوق کے مطابق جو مسائل مستنبط ہوتے ہیں ان کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ حدیث کا متن اور سند بیان کرنا محدث کا کام ہے جبکہ احادیث سے مستنبط ہونے والے احکام بیان کرنا فقیہ کا کام ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی ہیں، دونوں کام کرتے ہیں۔ احادیث بھی بیان کرتے ہیں اور ان سے جو مسائل نکلتے ہیں وہ بھی بیان کرتے ہیں، بلکہ انہوں نے مسائل زیادہ بیان کیے ہیں کیونکہ احادیث کی تعداد مسائل سے کم ہے۔ اسی طرح وہ پہلے مسئلہ بیان کرتے ہیں اور پھر اس کی مطابقت میں حدیث کا متعلقہ حصہ لاتے ہیں، یہ فقہی ترتیب ہے اور اسی وجہ سے بعض علماء حدیث کا کہنا ہے کہ بخاری شریف اصلاً فقہ کی کتاب ہے، جبکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ بخاری شریف چار علوم کا مجموعہ ہے: (۱) تفسیر (۲) حدیث (۳) فقہ (۴) تاریخ۔ اور امام بخاریؒ نے ان چاروں علوم سے متعلقہ بیش بہا ذخیرہ اپنی اس عظیم کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

امام بخاریؒ نے آخری باب اور آخری حدیث میں بھی یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ ایک مسئلہ بیان کیا ہے، اس کی موافقت میں قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ ذکر کی ہے، اور دلیل میں ایک حدیث نبویؐ لائے ہیں۔ مسئلہ عقیدہ سے متعلق ہے کہ ”ان اعمال بنی آدم واقوالہم یوزن“ انسانوں کے اعمال اور اقوال دونوں قیامت کے دن ترازو پر تولے جائیں گے۔ یہ مسئلہ بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ امام بخاریؒ کے دور میں کچھ گمراہ فرقے وزن اعمال کا انکار کرتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ عمل اور قول تولی جانے والی چیزیں نہیں ہیں، کیونکہ قول اور عمل دونوں صادر ہونے کے بعد ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور ان کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا جسے تولا جا سکے۔ ان کے اور بھی دلائل ہیں لیکن اس مذکورہ اشکال کا سائنس نے حل پیش کر دیا ہے کہ زبان سے نکلنے والی بات اور بدن سے صادر ہونے والا

عمل معدوم نہیں ہوتا بلکہ ریکارڈ ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی مقدار بھی متعیّن ہو جاتی ہے۔ ایک محاورہ ہمارے ہاں بولا جاتا تھا کہ ''اذا تلفظ فتلاشی'' جب بات منہ سے نکلتی ہے تو معدوم ہو جاتی ہے، مگر اب یہ محاورہ خود ''فتلاشی'' ہو گیا ہے اور ہر چیز ریکارڈ ہو رہی ہے۔

امام بخاریؒ کا اسلوب یہ ہے کہ مسئلہ بیان کرتے ہیں، اس کے مطابق قرآن کریم کی کوئی آیت لاتے ہیں، پھر حدیث بیان کرتے ہیں، اور کوئی بات وضاحت طلب ہو تو آثار صحابہؓ اور آثار تابعینؒ کے ذریعے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہی اسلوب اہل سنت کا ہے، اور میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اہل سنت کے اسلوب استدلال اور دائرہ مستدلات میں امام بخاریؒ امت کے بہترین نمائندہ ہیں اور آج کے فتنوں کے دور میں ان کا یہ اسلوب زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ حدیث و سنت اور تعامل صحابہؓ کو بنیاد بنا لیا جائے تو کوئی فتنہ پریشانی کا باعث نہیں بن سکتا۔

آخری باب میں امام بخاریؒ نے یہی کیا ہے، یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال و اقوال کا وزن ہو گا، اس کی موافقت میں قرآن کریم کی آیت مبارکہ ''ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ'' کو ترجمۃ الباب کا حصہ بنایا ہے، اور دلیل میں حدیث رسولؐ بیان کی ہے جس میں جناب نبی اکرمؐ نے ذکر کے دو کلموں ''سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم'' کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ثقیلتان فی المیزان'' یہ دو جملے قیامت کے دن ترازو پر بہت وزنی ہوں گے۔ اور اسی جملہ سے انہوں نے وزن اعمال پر استدلال کیا ہے، اس کے ساتھ ہی ایک آیت کریمہ سے جو لفظ ''قسطاس'' آیا ہے، اس کی ایک تابعی حضرت قتادہؒ کے قول کے ساتھ تشریح کر دی ہے۔

ان گزارشات کے بعد میں طلبہ اور طالبات کو ایک بار پھر مبارک باد دیتے ہوئے بطور نصیحت یہ عرض کروں گا کہ:

- یہ جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اس کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ کوئی بھی کمائی ہو اگر اس کی حفاظت نہ کی جائے اور وہ ضرورت کے وقت کام نہ آئے تو وہ کمائی نہیں بلکہ صرف مشقت ہوتی ہے۔ جبکہ علم کی کمائی اور دین کی کمائی سے بہتر کوئی کمائی نہیں ہے، اس کی حفاظت عمل کے ساتھ اور پڑھنے پڑھانے کا شغل جاری رکھنے سے ہو گی۔ اس لیے تعلیم و تدریس کے ساتھ کسی نہ کسی

درجہ میں تعلق ضرور قائم رکھیں ورنہ سب کچھ بھول جائے گا اور محنت ضائع چلی جائے گی۔

• اس کے ساتھ ہی فتنوں کے اس دور میں اپنے اکابر و اسلاف کے ساتھ وابستہ رہیں اور امت کے اجماعی تعامل کے دائرے کو لازم پکڑیں۔ فتنوں سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ امت کے اجماعی تعامل کی پابندی کرتے ہوئے اسلاف و اکابر سے مسلسل راہنمائی حاصل کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں اور ہمارے بزرگوں کے اس گلشن علم و عمل کو ہمیشہ آباد رکھیں، آمین یارب العالمین۔

نعت رسولؐ کے آداب

(مسجد شہزادہ یوسف، موتی بازار، گجرات - ۳ مئی ۲۰۱۴ء)

۳ مئی کو جامعہ سرور کونینؐ بادامی باغ لاہور میں محفل حمد و نعت تھی جس میں ملک بھر کے نامور نعت خوان حضرات نے شرکت کی۔ جبکہ حضرت مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی اور مولانا مفتی محمد حسن کے خطابات ہوئے اور مجھے بھی کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس سے دو روز بعد مسجد شہزادہ یوسف موتی بازار گجرات میں جمعیت علماء اہل سنت ضلع گجرات کے زیر اہتمام ماہانہ درس قرآن کریم کے عنوان سے بھی کم و بیش یہی معروضات پیش کیں۔ ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہم اپنی نسبت کے اظہار اور شناخت کے لیے کرتے ہیں کہ اس سے انسانی سوسائٹی کی رنگا رنگ تقسیم میں ہمارا تعارف ہو جاتا ہے اور آپؐ کے ساتھ نسبت کے اظہار کے بعد مزید کسی تعارف کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہم یہ تذکرہ محبت کے اظہار کے لیے بھی کرتے ہیں کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کا ذکر بھی اکثر زبان پر رہتا ہے۔ اور یہ ذکر کرنا نہیں پڑتا بلکہ خود بخود ہو جاتا ہے کہ محبت اپنا اظہار خود کرتی ہے اور اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے ساتھ ہم جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ برکتوں اور رحمتوں کے حصول کے لیے کرتے ہیں کہ جہاں آقائے نامدار کا ذکر ہوتا ہے وہاں رحمتوں اور برکتوں کا صرف نزول نہیں ہوتا بلکہ

بارش ہوتی ہے۔ جبکہ ہم جناب رسول اللہؐ کا ذکر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بھی کرتے ہیں کہ آپؐ کے ذکر سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا تذکرہ نثر میں ہو یا نظم میں، مدح و نعت کی صورت میں ہو یا رہبری و راہ نمائی کے حوالہ سے ہو، ہر طرح باعث برکت ہے۔ لیکن اس مبارک تذکرہ کے کچھ آداب ہیں جنہیں ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ آداب اور تقاضے قرآن کریم نے بھی بیان کیے ہیں اور خود حضورؐ نے بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے دو تین کا تذکرہ کرنا اس وقت مناسب سمجھتا ہوں۔ مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ”لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا“ (سورہ النور ۲۴۔ آیت ۶۳) رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کے بلانے جیسا نہ سمجھو۔ اس کے مختلف معانی مفسرین کرامؒ نے بیان کیے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ جناب رسول اللہؐ کی دعا عام آدمی کی دعا کی طرح نہیں ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ حضورؐ کسی کو بلائیں تو ان کا بلانا عام آدمی کے بلانے کی طرح نہیں ہے۔ اور تیسرا معنی یہ ہے کہ حضورؐ کو اس طرح بے تکلفی سے نہ پکارو جس طرح ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ یہ مقام ادب ہے حتیٰ کہ اس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ اگر مجلس میں تمہاری آواز رسول اللہؐ کی آواز سے بلند ہو گئی تو یہ سوء ادب تصور ہو گی اور تمہاری نیکیاں اس طرح برباد ہو جائیں گی کہ تمہیں شعور تک نہ ہو گا۔

اس پر مجھے اپنا بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا ہے کہ ہمارے طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ میں ایک نعتیہ مشاعرہ تھا جس میں طرح مصرعہ یہ تھا:

دل زندہ جس سے ہے وہ تمنا تمھی تو ہو

یہ مولانا ظفر علی خان مرحوم کی ایک معروف نعت کا مصرعہ ہے۔ مگر ایک شاعر شہید جالندھری مرحوم نے یہ کہہ کر مصرعہ بدل لیا کہ میرا حضورؐ کو ”تمھی تو ہو“ کہہ کر خطاب کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں اسے ”آپ ہی تو ہیں“ میں تبدیل کر رہا ہوں۔ اس شاعر کی یہ بات میرے دل میں ایسی پیوست ہوئی کہ آج تک وہ منظر آنکھوں کے سامنے زندہ ہے۔ اس لیے نعت میں یا خطابت میں آنحضرتؐ کا تذکرہ اس طرح کی بے تکلفی کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے جیسی ہم آپس میں روا رکھتے ہیں اور ادب و احترام کے تقاضوں کو ہر طرح سے ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اسی طرح بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ ایک عید کے موقع پر انصار مدینہؓ کے کسی گھر میں گئے، وہاں چھوٹی بچیاں اپنے بڑوں کو یاد کر کے نظمیں گا رہی تھیں۔ حضورؐ سنتے رہے لیکن جب ایک بچی نے یہ پڑھا ''وفینا نبی یعلم مافی غد'' کہ ہمارے درمیان ایک پیغمبر موجود ہیں جو آنے والے کل کی بات بھی جانتے ہیں تو آپؐ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ بیٹی! اس کو چھوڑ دو اور باقی جو کچھ پڑھ رہی ہو، پڑھتی رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ کا تذکرہ کرتے ہوئے عقائد کا بالخصوص عقیدۂ توحید کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور کوئی ایسی بات آپؐ کے حوالہ سے نہیں کہنی چاہیے جو عقیدہ کے منافی ہو اور اس سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر زد پڑتی ہو۔

اس کے ساتھ ہی یہ روایت بھی ہے کہ جب جناب نبی اکرمؐ کے خلاف نعوذ باللہ عرب شاعروں کی طرف سے کی جانے والی ھجو کا جواب دینے کے لیے حضرت حسان بن ثابتؓ نے عزم کا اظہار کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! میں اپنی زبان کے ساتھ قریش کے شاعروں کو چمڑے کی طرح چیر کر رکھ دوں گا تو حضورؐ نے فرمایا ''کیف و فیھم نسبی؟'' کہ ان کی مذمت کیسے کرو گے جبکہ میرا نسب بھی ان میں ہے؟ تو حضرت حسانؓ نے کہا کہ میں قریش کی ھجو کرتے ہوئے آپ کو ایسے نکال لوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ اس پر حضورؐ نے انہیں ہدایت کی کہ وہ حضرت ابوبکرؓ سے مل کر ان سے نسب نامے کی تفصیل معلوم کر لیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قریش کی مذمت کرتے ہوئے آپؐ کی ذات گرامی بھی غیر شعوری طور پر زد میں آجائے۔

اس لیے میں نعت خوان حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نعت رسولؐ کا ناگزیر تقاضہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی عقائد بالخصوص توحید کا خیال رکھا جائے۔ اور حضورؐ کا تذکرہ اس طرح بے تکلفانہ انداز میں نہ کیا جائے جیسے ہم آپس میں ایک دوسرے کا کرتے ہیں اور آپؐ کے تذکرہ میں سوء ادب کے ہر ممکنہ پہلو سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۸ مئی ۲۰۱۴ء)

حدیث کا دین میں مقام و مرتبہ

(جامعہ بناء العلم، رائے ونڈ - ۲۷ اپریل ۲۰۱۴ء)

ان دنوں دینی مدارس میں تعلیمی سال کا اختتامی مہینہ چل رہا ہے اور اگلے ماہ سالانہ امتحانات کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ کچھ عرصہ سے بخاری شریف کی آخری حدیث کا سبق ایک تقریب کی صورت میں پڑھائے جانے کا رجحان بڑھ گیا ہے اور اس حوالہ سے باقاعدہ اجتماعات منعقد ہوتے ہیں جن میں بخاری شریف کے آخری سبق کے ساتھ ساتھ مدارس کی کارکردگی اور دیگر دینی ضروریات کی طرف بھی لوگوں کو توجہ دلائی جاتی ہے۔ ۲۷ اپریل کو صبح ۱۱ بجے رائے ونڈ کے جامعہ بناء العلم اور بعد نماز عشاء مکی مسجد گوجرانوالہ کے جامعہ فاطمۃ الزہراء میں طالبات کو بخاری شریف کا آخری سبق پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی اور اس موقع پر جو گفتگو ہوئی اس کے کچھ حصے قارئین کی نذر کیے جا رہے ہیں۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ چونکہ طالبات کو حدیث نبویؐ کا ایک سبق پڑھانے کی تقریب ہے اس لیے دو باتوں پر بطور خاص گفتگو کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ حدیث کیا ہے اور دین میں اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اور دوسری بات یہ کہ علم دین بالخصوص قرآن کریم، حدیث نبویہؐ اور فقہ اسلامی کے ساتھ خواتین کا تعلق کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہماری روایات کیا ہیں؟

حدیث نبویؐ کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا کہنا ہے کہ یہ علوم دینیہ میں داخلہ کا صدر دروازہ ہے۔ ہم دینی علوم میں سے کوئی علم بھی حاصل کرنا چاہیں تو اس کے لیے ہمارے پاس سب سے بڑا ذریعہ حدیث نبویؐ ہے، حتیٰ کہ قرآن کریم تک رسائی کا ذریعہ بھی حدیث نبویؐ ہے۔ اس کی ایک مثال عرض کرنا چاہوں گا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی پہلی وحی سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات ہیں جو ”اقراء“ سے شروع ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بات معلوم کرنے کے لیے کہ یہ پہلی پانچ آیات ہیں جن سے قرآن کریم کے نزول کا آغاز ہوا تھا، ہمارے پاس ذریعہ صرف غار حرا کا واقعہ ہے جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ غار حرا کے واقعہ کے ذریعے ہمیں ان آیات کا علم ہوا ہے اور ہم ان پر ایمان لائے ہیں، اگر غار حرا کا یہ واقعہ نہ ہو تو ان آیات تک رسائی کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

یہ بات میں نے اس لیے عرض کی ہے کہ بعض حضرات کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ کیا قرآن کریم پر ایمان لانے کے بعد حدیث پر ایمان لانا بھی ضروری ہے؟ تو میں ایسے دوستوں سے

عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کے بعد نہیں بلکہ اس سے پہلے حدیث پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اگر حدیث کو مانیں گے تو قرآن کریم تک رسائی ہوگی اور اگر خدانخواستہ حدیث پر ایمان نہیں ہے تو قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے پر ایمان لانا ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کرنے اور اسے امت تک پہنچانے میں جس طرح مردوں نے محنت کی ہے اسی طرح عورتوں نے بھی محنت کی ہے۔ ہزاروں صحابہ کرامؓ کی طرح سینکڑوں صحابیاتؓ بھی روایت حدیث کا حصہ ہیں۔ اور کہیں بھی یہ فرق نہیں کیا گیا کہ یہ روایت مرد سے ہے اس کا درجہ زیادہ ہے اور یہ روایت عورت سے ہے اس کا درجہ کم ہے۔ جس طرح مرد صحابہ کرامؓ کی روایات کو حجت سمجھا گیا ہے اسی طرح عورتوں کی روایات کو بھی اسی درجہ کی حجت کا مقام حاصل ہے۔ حدیث کی روایت میں یہ فرق تو محدثین اور فقہاء کرام کے ہاں پایا جاتا ہے کہ گھر کے اندر کے ماحول سے تعلق رکھنے والی روایات میں خواتین کی روایات کو ترجیح حاصل ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ خود جناب نبی اکرمؐ کے گھریلو ماحول کے بارے میں ازواج مطہراتؓ کی روایات کو فوقیت دیا کرتے تھے مگر یہ فرق کہیں بھی نہیں ہے کہ مردوں کی روایات کو مرد ہونے کی وجہ سے عورتوں کی روایات پر ترجیح دی جاتی ہو۔

قرآن کریم کی تفسیر کے حوالہ سے بھی یہی صورتحال ہے اور بخاری شریف کی کتاب التفسیر میں بیسیوں روایات موجود ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر وتشریح جس طرح مرد صحابہ کرامؓ کرتے تھے اسی طرح خواتین صحابیاتؓ نے بھی قرآن کریم کی آیات، جملوں اور الفاظ کی تفسیر وتشریح فرمائی ہے۔ کسی جگہ بھی یہ فرق دیکھنے میں نہیں آیا کہ قرآن کریم کی تفسیر وتشریح کے باب میں مردوں اور عورتوں کے درمیان امتیاز روا رکھا گیا ہو۔

فقہ و استنباط کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ مرد صحابہ کرامؓ اجتہاد کرتے تھے، قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبویہؐ سے استنباط واستدلال کر کے مسائل بیان کرتے تھے اور فتویٰ دیا کرتے تھے اور عورتیں بھی اس کام میں پیچھے نہیں تھیں۔ حافظ ابن القیمؒ نے صحابہ کرامؓ کے دور میں تئیس (۲۳) خواتین کا تذکرہ کیا ہے جو باقاعدہ فتویٰ دیا کرتی تھیں اور ان کا فتویٰ تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان میں سب سے بڑی مفتیہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ تھیں جو

اپنے معاصر مفتیوں کے فتاوی پر نقد بھی کرتی تھیں اور ان کے جواب میں اپنا فتوی صادر کرتی تھیں۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے عرض کرنا چاہتا ہوں جو تفسیر ابن کثیرؒ میں موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں ایک موقع پر خطبۂ جمعہ کے دوران مہر کی رقم پر پابندی لگانے کا اعلان کر دیا، فرمایا کہ چونکہ شادی میں مہر کی بڑی رقم طے کر لی جاتی ہے اور بعد میں ادائیگی کے موقع پر جھگڑے ہوتے ہیں اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ کسی شادی میں چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، اگر کسی شادی میں چار سو درہم سے زیادہ مہر دیا گیا تو زائد رقم بحق سرکار ضبط کر کے بیت المال میں جمع کر دوں گا۔ یہ اعلان فرمانے کے بعد جمعہ پڑھا کر باہر نکلے تو ایک خاتون نے روک لیا کہ امیر المؤمنین! آپ نے یہ اعلان کیسے کر دیا ہے، کیا آپ نے قرآن کریم نہیں پڑھا؟ حضرت عمرؓ کے اوصاف میں ایک خاص وصف امام بخاریؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ قرآن کریم کا حوالہ سامنے آتے ہی رک جایا کرتے تھے۔ انہوں نے خاتون سے حوالہ پوچھا تو اس نے کہا کہ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے کہ اگر تم نے اپنی بیویوں کو ''قنطار'' برابر دولت بھی دے دی ہے تو جو دے دی ہے وہ ان سے واپس نہ مانگو۔ قنطار ڈھیر کو کہتے ہیں، اس خاتون کا استدلال یہ تھا کہ جب قرآن کریم ہمیں خاوندوں سے ڈھیروں کے حساب سے دلواتا ہے تو آپ چار سو درہم سے زیادہ مہر پر پابندی کیسے لگا رہے ہیں؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ اسی وقت واپس مسجد میں گئے اور دوبارہ اعلان فرمایا کہ مجھ سے اعلان میں غلطی ہوگئی تھی، ایک عورت نے مجھے قرآن کریم کی آیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ ٹھیک کہتی ہے، اس لیے میں اپنا اعلان واپس لیتا ہوں۔

آج کہا جاتا ہے کہ اسلام عورت کو رائے کا حق نہیں دیتا اور علم کا حق نہیں دیتا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اسلام میں عورت کا رائے کا حق یہ ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر رہی ہے اور اس کے علم کا مقام یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے قرآن کریم سے استدلال کر رہی ہے اور حضرت عمرؓ اس کے استدلال کو قبول فرما رہے ہیں۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۳۰ اپریل ۲۰۱۴ء)

علامہ محمد اقبالؒ کا پاکستان

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۱ اپریل ۲۰۱۴ء)

حضرت مولانا بشیر احمد پسروریؒ کے پوتے مولانا حافظ محمد عثمان نے پسرور ڈسکہ روڈ پر دارالعلوم رشیدیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ وہاں مسجد اقصیٰ کی طرز پر اسی عنوان سے ایک وسیع مسجد کی تعمیر کا پروگرام ہے۔ مولانا محمد عثمان کی خواہش تھی کہ مسجد کے سنگ بنیاد کی اینٹ رکھنے کی سعادت میں حاصل کروں جو میرے لیے اعزاز کی بات تھی اور میں اس پر ان کا شکرگزار ہوں۔ جبکہ اس سے چند میل کے فاصلہ پر بن باجوہ میں معہد الرشید الاسلامی کے نام سے ایک دینی مرکز قائم ہے۔ ہمارے محترم دوست بھائی ذوالفقار صاحب اپنے دوستوں کے ہمراہ اس کا نظام چلا رہے ہیں۔ مڈل کے ساتھ حفظ القرآن کریم کا امتزاج قائم کر رکھا ہے اور مسلسل پیشرفت کر رہے ہیں۔ شہر کے محلہ امید پورہ میں بھی اس کی ایک شاخ مسجد بلال میں کام کر رہی ہے۔ وہاں تقسیم اسناد کا جلسہ تھا، معہد الرشید الاسلامی میں تعلیم حاصل کرنے والے چار حفاظ کی دستار بندی تھی، مجھے اس میں حفظ قرآن کریم کی اہمیت اور دینی مدارس کی خدمات پر گفتگو کرنا تھی۔ لیکن جب مسجد میں داخل ہوا تو کلاس کے لڑکے کھڑے ہو کر اجتماعی صورت میں علامہ محمد اقبالؒ کا مشہور ترانہ پڑھ رہے تھے جس کا ایک معروف شعر یہ ہے کہ

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بچوں سے یہ ترانہ سن کر میرے ذہن کا رخ بھی اقبالؒ کی طرف مڑ گیا اور میں نے گفتگو اقبالؒ اور قرآن کریم کے عنوان سے شروع کی جو چلتے چلتے ”اقبالؒ کا پاکستان“ کے موضوع میں تبدیل ہو گئی۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نوجوانوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ وہ قرآن کریم کا مطالعہ ضرور کریں، اگر سید احمد شہیدؒ کی طرح نہیں کر سکتے تو اقبالؒ کی طرح ہی مطالعہ کر لیں۔ اس کا حوالہ دے کر میں نے گزارش کی کہ آج کل ہمیں تلقین کی جا رہی ہے کہ اقبالؒ کے پاکستان کی بات کریں اور اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے پاکستان کا جو ذہنی نقشہ پیش کیا تھا، اسے سامنے رکھیں۔ میں یہ بتانا چاہوں گا کہ اقبالؒ کا پاکستان کیا تھا اور مفکر پاکستان نے ایک نئی اسلامی ریاست کی تجویز پیش کر کے اس ریاست کے جو خدوخال بیان

کیے تھے ان کو کس نے سامنے رکھا ہے اور کون ان سے منحرف ہو گیا ہے۔ ذرا ترتیب سے میری بات نوٹ کر لیں، تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ اقبالؒ اور اقبالؒ کا پاکستان کا نعرہ لگانے والوں نے اقبالؒ کے افکار و تعلیمات کا کیا حشر کر رکھا ہے۔ اور کون لوگ اقبالؒ کے تصورات کے مطابق پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

• اقبالؒ نے پنجاب اسمبلی میں سب سے پہلے یہ بل پیش کیا تھا کہ توہین رسالتؐ جرم ہے جس کی سزا مقرر ہونی چاہیے۔ توہین رسالتؐ پر سزا کی بات ہماری قانونی دنیا میں وہیں سے شروع ہوئی تھی جو ۲۹۵-C تک پہنچی۔ مگر آج اقبالؒ کے نام پر توہین رسالتؐ پر سزا کے قانون کی مخالفت کی جا رہی ہے اور اقبال اقبال کا ورد کرنے والے بہت سے دانش ور اس قانون کو ختم کرانے کے درپے ہیں۔

• اقبالؒ نے کہا تھا کہ پاکستان کے نام سے قائم ہونے والی نئی ریاست میں نفاذ اسلام پارلیمنٹ کے ذریعہ ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان کرتے ہوئے منتخب پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی حدود میں قانون سازی کرنی چاہیے۔ ملک کے دینی حلقوں نے اجتماعی طور پر اقبالؒ کے اس تصور کو قبول کر لیا مگر اقبالؒ کے پاکستان کا نعرہ لگانے والے بہت سے لوگ پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کا پابند قرار دینے کو پارلیمنٹ کی خود مختاری کے منافی کہہ کر پاکستان کے دستور کی اس نظریاتی اساس کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔

• اقبالؒ نے کہا تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور انہیں مسلم معاشرہ کا حصہ سمجھنے کی بجائے غیر مسلم اقلیتوں میں شمار کیا جائے۔ پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے اقبالؒ کی اسی تجویز کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا، مگر اس دستوری فیصلے کے خلاف مہم چلانے والے عناصر میں بعض اقبال اقبال پکارنے والے لوگ بھی نمایاں ہیں۔

• اقبالؒ نے کہا تھا کہ چونکہ پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کے دائرہ اور روشنی میں قانون سازی کرنی ہے جس کے لیے قرآن و سنت کا علم ضروری ہے، جبکہ عوامی نمائندوں کے لیے قرآن و سنت کا اس درجے کا عالم ہونے کی شرط موجودہ حالات میں قابل عمل نہیں ہے، اس لیے جید علماء کرام اور ماہرین قانون پر

مشتمل ایک کونسل ہونی چاہیے جو اس سلسلہ میں پارلیمنٹ کی راہ نمائی کرے۔
دستور میں اقبالؒ کی اسی تجویز پر ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مگر بہت سے ''اقبالی'' اسلامی نظریاتی کونسل کو غیر ضروری قرار دے کر اس کو ختم کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔

- اقبالؒ نے اسپین کے دورے سے واپسی پر کہا تھا کہ یہ دینی مدارس جس حالت میں کام کر رہے ہیں انہیں اسی طرح کام کرنے دو۔ یہ اگر اس طرح کام نہ کرتے تو ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو اسپین پر عیسائیوں کے قبضے کے بعد وہاں کے مسلمانوں کا ہوا تھا کہ آج وہاں مسلمانوں کی تعداد برائے نام ہے۔ مگر آج اقبالؒ کے کچھ نام لیوا دینی مدارس کے اس کردار اور محنت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش اور کوشش ہے کہ انہیں قومی دھارے میں لانے کی آڑ میں ان کے آزادانہ تعلیمی و دینی کردار سے محروم کر دیا جائے۔

حضرات گرامی قدر! ان باتوں سے آپ خود فیصلہ کریں کہ کون اقبالؒ کے پاکستان کی بات کر رہا ہے اور کون اقبالؒ سے منحرف ہو گیا ہے؟ میں ان لوگوں سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہی کی زبان میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم مولویوں کی بات تم نہیں سنتے، تمہاری مرضی۔ لیکن اقبالؒ سے دستبردار کیوں ہو رہے ہو؟ اس کی تو سنو کہ اسی کی فکر پر تمہیں پاکستان کی یہ عظیم نعمت ملی ہے اور اسی کے نام کے نعرے لگا کر تم اپنا قد بڑھاتے ہو۔

بچوں کی زبان سے اقبالؒ کا ترانہ سن کر میرا ذہن اس طرف مڑ گیا اور میں نے یہ باتیں عرض کر دی ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمت پر دین، قوم اور ملک کی خدمت کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حدیث نبویؐ۔ تمام علومِ دینیہ کا اصل ماخذ

(جامع مسجد پراچہ، منچن آباد - ۱۰ اپریل ۲۰۱۴ء)

جمعرات کو منچن آباد ضلع بہاول نگر میں عشاء کے بعد جامع مسجد پراچہ میں سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ کی فضیلت و منقبت پر سیمینار تھا۔ جامعہ اشرفیہ لاہور کے استاذ محترم مولانا حافظ زاہد علی ملک اور مولانا محمد افضال نے بھی ساتھ جانا تھا۔ اس لیے ترتیب یہ بنی کہ میں اسباق سے فارغ ہو کر جامعہ اشرفیہ پہنچ جاؤں گا اور وہاں سے اکٹھے منچن آباد کے لیے

روانہ ہوں گے۔ جامعہ اشرفیہ پہنچا تو مولانا حافظ زاہد علی ملک نے فرمائش کی کہ ظہر کے بعد ان کا سبق ہوتا ہے، وہ میں پڑھا دوں، پھر چلیں گے۔ سبق ’’شرح نخبۃ الفکر‘‘ کا تھا۔ ان کے حکم کی تعمیل میں کچھ گزارشات کلاس میں پیش کیں، جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آپ کے استاذ محترم کا حکم ہے کہ آج کا سبق میں پڑھاؤں، کتاب کا سبق تو نہیں پڑھاؤں گا تاکہ آپ کا تسلسل متاثر نہ ہو، البتہ چونکہ اصول حدیث کا سبق ہے اس لیے اسی حوالہ سے کچھ طالب علمانہ باتیں گوش گزار کر دیتا ہوں۔

حدیث کو ہمارے ہاں علوم دینیہ کی ایک قسم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور وہ بلاشبہ دلائل شرعیہ (۱) قرآن کریم (۲) حدیث و سنت (۳) اجماع اور (۴) قیاس میں ایک اہم دلیل شرعی ہے۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حدیث کا تعارف اس سے وسیع تناظر میں کرایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حدیث نبویؐ تمام علوم دینیہ کا اصل ماخذ اور منبع ہے اور اسی سے ہمیں قرآن و سنت سمیت تمام علوم شرعیہ حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآن کریم تک ہماری رسائی کا ذریعہ بھی حدیث ہے۔ جیسا کہ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی وحی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات ہیں۔ لیکن یہ آیات ہمیں غار حرا کے واقعہ سے معلوم ہوئی ہیں جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا اور صحابہ کرامؓ نے اسے روایت کیا۔ چنانچہ قرآن کریم کی پہلی پانچ آیات کا علم ہمیں حدیث کی روایت کے ذریعہ حاصل ہوا۔ یہی صورت حال قرآن کریم کی باقی آیات، ترتیب اور سورتوں کی ہے۔ اس لیے حدیث نبویؐ کے طلبہ سے میری گزارش ہے کہ وہ اسے وسیع تناظر میں پڑھیں۔ دلائل اربعہ میں سے ایک دلیل کی حیثیت سے بھی اور تمام علوم دینیہ کے اصل ماخذ اور اساس کی حیثیت کو بھی سامنے رکھیں۔

دوسری گزارش حدیث نبویؐ کے طلبہ سے یہ ہے کہ ہمارے ہاں حدیث کی کتابیں پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے فقہی مجادلہ کا ذوق غالب رہتا ہے اور ہم زیادہ تر فقہی اختلافات اور ان میں اپنی ترجیحات پر وقت صرف کرتے ہیں۔ مجھے اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں ہے بلکہ میں خود بھی ایسا کرتا ہوں۔ لیکن فقہی مجادلہ اور احکام و مسائل کی ترجیحات کی بحث میں ہمارے لیے امام ابو جعفر طحاویؒ بہترین نمونہ اور آئیڈیل ہیں۔ ہمیں ان کا اسلوب پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہی اسلوب ہماری اصل ضرورت ہے اور وہی فقہی مجادلہ کا صحیح معیار بھی ہے۔ امام طحاویؒ کسی بھی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اس سے متعلقہ

تمام موقف بیان کرتے ہیں اور ان کے دلائل کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کر کے ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر اپنی ترجیحات کو دلائل کے ساتھ واضح کر کے حنفی موقف بیان کرتے ہیں۔ اور دوسری بات وہ یہ کرتے ہیں کہ وہ کسی جگہ بھی یہ نہیں فرماتے کہ احناف کا موقف یہ ہے اور قرآن و حدیث اس کی تائید کر رہے ہیں، بلکہ احادیث سے ایک موقف ثابت کر کے آخر میں فرماتے ہیں کہ احناف کا موقف بھی یہی ہے۔ یہ ایک ایسا حکیمانہ طرز عمل ہے جو بہت سی الجھنوں کا خود ہی حل بن جاتا ہے اور میرے خیال میں آج بھی اسی ذوق اور طرز عمل کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

تیسری بات حدیث نبویؐ کے طلبہ سے یہ عرض کروں گا کہ احادیث کی تعلیم و تدریس میں فقہی احکام کے مباحث کے ساتھ ساتھ معاشرتی ضروریات اور عصر حاضر کے مسائل کو سامنے رکھ کر حدیث سے اس کا حل پیش کرنا بھی ایک اہم دینی ضرورت ہے۔ ہم فقہی مجادلہ کے ابواب سے ہٹ کر باقی ابواب کی طرف پوری توجہ نہیں دیتے جس کی بہت اہمیت اور ضرورت ہے۔ اس لیے زندگی کے تمام شعبوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے متعلقہ مسائل و ضروریات پر حدیث نبویؐ کے اطلاق اور تطبیق کا ذوق بھی عام ہونا چاہیے۔ اس میں حضرت امام بخاریؒ کا استنباط و استخراج کا اسلوب ہم سب کے لیے راہ نما کی حیثیت رکھتا ہے جسے ہم ترجمۃ الباب سے حدیث کا تعلق کے عنوان سے پیش کرتے ہیں جبکہ اس کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ امام بخاریؒ کا استدلال، استنباط اور استخراج کا ذوق کیا ہے اور آج کے دور میں اس سے کیسے راہ نمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

مثال کے طور پر یہ عرض کروں گا کہ حضرت امام بخاریؒ نے کتاب النکاح کی آخری روایت کے طور پر حضرت ام المومنین عائشہؓ کی طویل حدیث کا ایک مختصر جملہ بیان کیا ہے کہ میرے والد محترم حضرت ابوبکرؓ نے مجھے ڈانٹ ڈپٹ کی اور مکے بھی مارے، مگر میں حرکت نہیں کر رہی تھی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میری گود میں سر رکھے سو رہے تھے اور میں ان کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

امام بخاریؒ نے لمبی روایت کا اتنا حصہ نقل کر کے اس پر عنوان یہ قائم کیا ہے کہ کیا باپ غصے میں اپنی بیٹی کو ڈانٹ ڈپٹ سکتا ہے اور مکہ وغیرہ بھی مار سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ حدیث کے اس ٹکڑے کو اس کے جواز کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ مگر اس میں ایک طالب علمانہ اضافہ یہ بھی ہے کہ حدیث کا یہ حصہ کتاب النکاح کے آخر میں کیوں لایا گیا

ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ امام بخاریؒ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ بیٹی شادی شدہ ہو کر اپنے گھر بار والی ہو جائے تب بھی باپ کا ڈانٹ ڈپٹ کا حق باقی رہتا ہے۔

اس لیے حدیث کے طلبہ سے گزارش ہے کہ وہ تعلیم و تدریس میں ان امور کو بھی سامنے رکھیں تاکہ حدیث نبویؐ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ اپریل ۲۰۱۴ء)

اسکولوں میں عربی زبان کو لازم قرار دینے کا فیصلہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ اپریل ۲۰۱۴ء)

وفاقی وزیر مذہبی امور سردار محمد یوسف خان نے گزشتہ دنوں اسلام آباد میں قرآن کریم کے حفاظ میں انعامات کی تقسیم کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہ خوش خبری دی ہے کہ سرکاری سکولوں میں میٹرک تک عربی زبان کو لازمی قرار دیا جا رہا ہے جس کے لیے اصولی فیصلہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنے خطاب میں کہا ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کی تعلیم کی ضرورت ہے اور ہمارے ہاں اس سلسلہ میں مسلسل بے پروائی سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ مگر اب حکومت نے اس طرف توجہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور میٹرک تک عربی تعلیمی کو لازم کرنے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

عربی زبان ہماری دینی زبان ہے اور صرف قرآن کریم سے واقفیت کے لیے نہیں بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ وسنت تک براہ راست رسائی اور امت مسلمہ کے ماضی کے علمی ذخیرہ سے آگاہی کے لیے بھی عربی زبان بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد سے ہی جب کہ اس کی ضرورت اسی وقت سے محسوس کی جا رہی ہے، اس سے بے اعتنائی کا رویہ جاری ہے اور بار بار توجہ دلانے کے باوجود حکومتی حلقے اس کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

عربی زبان کی اہمیت و ضرورت تو اپنے مقام پر مگر ہماری رولنگ کلاس کا حال یہ ہے کہ قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کو بھی ابھی تک ہمارے سرکاری تعلیمی نصاب و نظام میں ضرورت کا درجہ نہیں دیا جا سکا۔ کچھ عرصہ قبل وفاقی محتسب اعلیٰ نے باقاعدہ آرڈر دیا تھا کہ سرکاری سکولوں میں مڈل تک قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ مگر یہ آرڈر کم از کم دو عشرے گزر جانے کے باوجود عملدرآمد کے مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ بتائی

گئی تھی کہ ملک بھر میں پرائمری اور مڈل سکولوں کی تعداد کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے ہر سکول کو کم از کم دو قاری مہیا کرنے کے لیے بھی قراء کرام موجود نہیں ہیں۔ اور اگر اتنی تعداد میں قاری حضرات میسر آ بھی جائیں تو ان کی تنخواہوں کے لیے بجٹ میں رقم کا بندوبست نہیں ہے۔ یہ کہہ کر پرائمری اور مڈل سکولوں میں قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کا اہتمام کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا اور اب بھی اس کے کوئی امکانات دکھائی نہیں دے رہے۔ حالانکہ ایک مسلم ریاست میں دینی تعلیم کا یہ بالکل ابتدائی لیول ہے کہ ایک مسلمان بچہ یا بچی کم از کم قرآن کریم ناظرہ پڑھنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

دوسری طرف جو دینی مدارس اتنی بڑی قومی ضرورت کو پورا کرنے میں اپنا کردار مؤثر طریقہ سے ادا کر رہے ہیں، وہ ہر دور میں حکومتوں کی منفی پالیسیوں کی زد میں رہتے ہیں اور ہر حکومت انہیں دباؤ میں رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ حالانکہ پرائمری اور مڈل سکولوں سے کہیں زیادہ تعداد میں موجود مساجد اور مدارس کو قرآن کریم پڑھانے والے حافظ اور قاری صاحبان مہیا کرنے کی خدمت یہی دینی مدارس سرانجام دے رہے ہیں اور وہ حکومت سے کسی بجٹ کا تقاضا بھی نہیں کر رہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس صورت حال پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دینی مدارس ہمارے معاشرے میں مسجد و مدرسہ کا نظام قائم رکھنے کے لیے حافظ، قاری، خطیب، امام، مدرس اور مفتی جتنی تعداد میں مہیا کر رہے ہیں، وہ پرائیویٹ سیکٹر میں فی الواقع حیرت انگیز بات ہے۔ مگر اس کا اعتراف اور تحسین کرنے کی بجائے مختلف حوالوں سے دینی مدارس کی کردار کشی اور ان کے خلاف منفی پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ ان کے کردار کو محدود بلکہ غیر مؤثر کرنے کی سرکاری پالیسیاں وقفے وقفے کے ساتھ سامنے آتی رہتی ہیں اور اب بھی قومی سلامتی پالیسی کے عنوان سے ان کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔

یہ بات ہم نے اس لیے عرض کی ہے کہ سردار محمد یوسف خان محترم عربی زبان کو میٹرک تک لازم قرار دینے کی جو خوش خبری دے رہے ہیں وہ لائق تحسین ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ سرکاری اسکولوں میں کم از کم قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کا تو اہتمام کیا جائے اور اس کے لیے کسی نئی پالیسی کی ضرورت نہیں بلکہ وفاقی محتسب اعلی کے اس حکم پر عملدرآمد کی کوئی صورت نکال لی جائے جو برس ہا برس سے معطل پڑا ہے۔ عربی زبان صرف ہماری دینی زبان نہیں بلکہ آج کی زندہ اور مروجہ بین الاقوامی زبانوں

میں بھی اہم مقام رکھتی ہے اور بیسیوں ممالک کی قومی زبان ہے جن کے ساتھ ہمارے برادرانہ تعلقات ہیں اور جن ممالک میں پاکستان کی افرادی قوت روزگار کے لیے لاکھوں کی تعداد میں ہروقت موجود رہتی ہے۔ ہمیں سردار محمد یوسف خان کے اس ارشاد سے سوفی صد اتفاق ہے کہ اگر ہمارے ہاں عربی زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے آغاز سے ہی اس کی ضرورت تعلیم کا اہتمام ہو جاتا تو ہمیں بہت سے الجھے ہوئے مسائل سے نجات مل سکتی تھی اور اب بھی عربی زبان کو اس کا صحیح مقام دے کر ان الجھنوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہماری اسٹیبلشمنٹ اور رولنگ کلاس ایسا ہونے دے گی؟ اگر قومی پالیسیوں کے فریزر کا دروازہ کھولا جائے تو اس میں سپریم کورٹ آف پاکستان، اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، وفاقی محتسب اعلیٰ، بلکہ حکومتوں کے بڑے بڑے اچھے فیصلے منجمد ملیں گے جو اصولی طور پر کر لیے گئے تھے اور ان پر عمل کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا مگر آج تک وہ حکومتوں کی توجہ کے طلب گار ہیں۔

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم فیصلہ کرنے میں بخل نہیں کرتے اور دینی ضرورت اور قومی مفاد کے لیے بہتر سے بہتر فیصلہ کرنے میں ہم پوری مہارت رکھتے ہیں لیکن خود اپنے کیے ہوئے فیصلوں پر عملدرآمد ہمارے لیے مشکل ہو جاتا ہے اور اندرونی و بیرونی مشکلات ہر اچھے کام کی طرف پیش رفت میں ہمارے پاؤں کی زنجیریں بن جاتی ہیں۔ اس لیے فیصلوں سے زیادہ ان پر عمل درآمد کے نظام کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ سردار محمد یوسف خان ایک محترم، شریف النفس، عوامی خدمت گار اور نظریاتی شخصیت کا تعارف رکھتے ہیں۔ ہم ان کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ایک اچھے فیصلے پر حکومت کو مبارک باد دیتے ہوئے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اچھے فیصلے کرتے ہوئے ان پر عملدرآمد کے نظام کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دیں کہ اصل ضرورت اسی کی ہے۔

”من احب شیئا اکثر ذکرہ“

(مسجد ختم نبوت، ابوبکر ٹاؤن، سیالکوٹ روڈ، گوجرانوالہ - ۲۱ مارچ ۲۰۱۴ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ ہم سب کے لیے سعادت کی بات ہے کہ جناب سرور کائناتؐ کے تذکرہ کے لیے منعقد ہونے والی مبارک محفل میں بیٹھے ہیں، مختلف حوالوں سے آقائے

نامداراُن کا ذکر کر رہے ہیں اور سن رہے ہیں، اللہ تعالی ہماری حاضری قبول فرمائیں اور عمل کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین یارب العالمین۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ کے ہزاروں پہلو ہیں جن میں سے آج کی مختصر گفتگو میں ایک دو کا تذکرہ ہی ہو سکے گا۔ میں خود کو اور آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہوں گا کہ ہم عام طور پر جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ کس مقصد کے لیے کرتے ہیں اور یہ تذکرہ کس حوالہ سے ہونا چاہیے؟

1. ہم حضور علیہ السلام کا تذکرہ ان کے ساتھ اپنی نسبت کے اظہار کے لیے کرتے ہیں جس سے یہ بتانا مقصد ہوتا ہے کہ ہم ان سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں اور نسل انسانی کی تقسیم میں ہم ان کے کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تذکرہ ہوتا تو نبی اکرمؐ کے ساتھ نسبت کے اظہار کے لیے ہے لیکن دراصل یہ ہماری شناخت ہوتی ہے کیونکہ کسی مسلمان کی واحد شناخت یہ ہے کہ وہ جناب نبی اکرمؐ کا امتی ہے اور اس شناختی کارڈ کے بعد ہمیں کسی اور شناخت کے اظہار کی ضرورت نہیں رہتی۔

2. دوسرے نمبر پر ہم جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ محبت کے اظہار کے لیے کرتے ہیں کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کا تذکرہ اکثر کیا جاتا ہے۔ عربی کا محاورہ ہے کہ ''من احب شیئا اکثر ذکرہ'' جو آدمی جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کا اکثر ذکر کرتا رہتا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے جناب نبی اکرمؐ سے زیادہ محبوب مخلوقات میں اور کوئی نہیں ہے اس لیے وہ اپنے محبوبؐ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے اور اس سے حظ اور لطف اٹھاتا ہے۔

3. تیسرے نمبر پر جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ ثواب اور اجر کے حصول کے لیے ہوتا ہے کہ آپؐ کا تذکرہ کریں گے تو ثواب ہوگا، اجر ملے گا اور درجات بلند ہوں گے۔ یقینا یہ ثواب ملتا ہے اور اجر حاصل ہوتا ہے، اور تذکرہ رسولؐ ہمارے لیے ثواب کمانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ دوسری کوئی بات ذہن میں آتی ہو یا نہیں کم از کم یہ بات تو ضرور ہے کہ نبی اکرمؐ کے تذکرہ کے ساتھ ایک بار درود شریف ضرور پڑھنا ہوتا ہے، اور اللہ تعالی کا وعدہ ہے کہ جو شخص نبی اکرمؐ پر

ایک بار درود پڑھتا ہے میں اسے دس گنا اجر عطا کرتا ہوں۔ اس لیے آقائے نامدارؐ کا تذکرہ ہمارے لیے کمائی کا بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔

4. چوتھے نمبر پر ہم جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور برکات ملتی ہیں۔ نبی کریمؐ خود سراپا رحمت ہیں اور آپ کا تذکرہ جہاں ہوتا ہے وہاں رحمتوں اور برکتوں کا صرف نزول نہیں ہوتا بلکہ ان کی بارش ہوتی ہے۔

5. پانچویں نمبر پر ہم جناب رسول اکرمؐ کا تذکرہ اس لیے بھی کرتے ہیں کہ اس سے اللہ تعالی راضی ہوتے ہیں، اس لیے کہ دوست کے ذکر سے ہر دوست کو خوشی ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے ہمارے کسی دوست کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا جائے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے اور ہم اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالی بھی اپنے حبیبؐ کے ذکر پر خوش ہوتے ہیں اور ذکر کرنے والے کو اللہ تعالی کی رضا نصیب ہوتی ہے۔

یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو ضرور حاصل ہوتی ہیں اور ان مقاصد کے لیے ذکر رسولؐ ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ یہ سب وہ فائدے ہیں جو ہم حاصل کرتے ہیں، اور جس طرح کسی کاروباری شخص کو سب سے زیادہ دلچسپی اپنے نفع اور فائدہ سے ہوتی ہے اسی طرح ہم بھی انہی امور کو ترجیح دیتے ہیں جن میں نفع ملتا ہو اور فائدہ حاصل ہوتا ہو، یہ کوئی غلط بات نہیں ہے ان فوائد کا حصول ہر مسلمان کی ضرورت ہے۔ البتہ ذکر رسولؐ کا ایک اور اہم پہلو جو ہماری نگاہوں سے اکثر اوجھل رہتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالی کے آخری رسولؐ کا تذکرہ راہنمائی حاصل کرنے کے لیے کریں اور ان کی جس بات کا ذکر کریں اس پر عمل کی کوشش بھی کریں، اس لیے کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ وہ تمہارے لیے "اسوۂ حسنہ" ہیں، نمونہ حیات ہیں اور آئیڈیل ہیں، اور تمہارا کام یہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلو، ان کی پیروی کرو اور ان کی عادات و اخلاق کو اپنانے کی کوشش کرو۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی اولین ترجیح یہی ہوتی تھی اور وہ رسول اللہؐ کی مختلف باتوں کا تذکرہ کر کے ان پر عمل کا اہتمام کرتے تھے۔ احادیث مبارکہ میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں، میں ان سے صرف ایک دو جھلکیاں آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو اللہ تعالی نے عجیب ذوق سے نوازا تھا، وہ صرف پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ وقت، مقام اور طریقہ بھی وہی اختیار کرتے تھے جو اس کام کے لیے نبی اکرمؐ نے اختیار کیا ہوتا تھا۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحی کے دن عید گاہ میں نماز پڑھانے کے بعد قربانی کا جانور ذبح کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ زندگی بھر یہی کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ اس بات کا اہتمام بھی کرتے تھے کہ جس جگہ پر حضور علیہ السلام نے جانور ذبح کیا ہے اسی مقام پر وہ بھی ذبح کرتے تھے۔ یہ اگرچہ ذوق کی بات ہے مسئلہ کی نہیں ہے لیکن حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اس کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، ان کے شاگرد حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابن عمرؓ نے مجھے فرمایا کہ نافع! مجھے ذرا بازار لے چلو میں ان کا ہاتھ تھام کر انہیں بازار لے گیا اور وہ بازار کا ایک چکر لگا کر واپس آ گئے۔ میں نے پوچھا کہ بازار کس کام کے لیے گئے تھے؟ اس لیے کہ انہوں نے بازار میں کوئی کام تو کیا نہیں صرف چکر لگا کر آ گئے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں جس کام کے لیے گیا تھا وہ کر کے آیا ہوں، آتے جاتے مجھے کچھ لوگ ملے جنہوں نے مجھے سلام کیا اور میں نے جواب دیا، کچھ کو میں نے سلام کیا اور انہوں نے جواب دیا، میں اسی کام کے لیے بازار گیا تھا۔ نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ وہ بازار جاتے ہوئے ملنے والوں کو سلام کہتے تھے اور ان کے سلام کا جواب دیتے تھے، میں کافی دنوں سے بازار نہیں گیا تھا اس لیے آج جی چاہا کہ اس سنت پر عمل ہونا چاہیے اور میں اسی کام کے لیے بازار گیا تھا جو کر کے واپس آ گیا ہوں۔ جناب نبی اکرمؐ کے تذکرہ کے حوالہ سے حضرات صحابہ کرامؓ کے اسی طرز اور ذوق کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے ذوق کے حوالہ سے ایک اور بات کا ذکر بھی آج کی محفل میں کرنا چاہوں گا جو اگرچہ مسئلہ کی بات نہیں لیکن ذوق کا معاملہ ضرور ہے اور اس سے مسئلہ اور ذوق کے درمیان فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا ذوق تھا کہ وہ سنت پر عمل بھی کرتے تھے اور اس کے وقت جگہ اور طریق کار کا بھی اسی طرح اہتمام کرتے تھے۔ وہ ہر سال حج کو جاتے تھے اور بعینہ اسی ترتیب کے ساتھ جاتے تھے جس ترتیب کے ساتھ نبی اکرمؐ نے حج فرمایا تھا اور اس ساری ترتیب کو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنے دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ کر رکھا تھا۔ جس جگہ نبی اکرمؐ نے احرام باندھا وہیں سے احرام باندھتے

تھے، جس مقام پر پہلی رات قیام کیا اسی جگہ قیام کرتے تھے، جس جگہ دوسرے دن ظہر پڑھی وہیں پڑھتے تھے اور جس پتھر کے ساتھ تیسرے دن قیلولہ کیا وہیں قیلولہ کرتے تھے۔ یہ مسئلہ کی نہیں بلکہ ذوق کی بات تھی جو اللہ تعالیٰ کسی کو نصیب فرمادیں تو بڑی سعادت کی بات ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ منیٰ میں جس جگہ نبی اکرمؐ کا خیمہ لگا تھا حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی اسی جگہ خیمہ لگاتے تھے۔ ایک بار منیٰ جاتے ہوئے کسی شخص نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ کیا آپ بتا سکیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ منیٰ میں کس جگہ لگایا گیا تھا؟ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ تجھے اس سے کیا؟ جہاں امیر حج کہتا ہے وہاں خیمہ لگاؤ اور جہاں جگہ ملتی ہے وہاں لگاؤ، محدثین کرامؒ فرماتے ہیں کہ اس بات سے حضرت ابن عمرؓ کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ مسئلہ کی بات نہیں بلکہ ذوق کی بات ہے جو ہر شخص کے لیے ضروری نہیں ہے، اور دوسرا یہ تھا کہ اگر اس نے میرے بتانے پر پہلے سے جا کر وہاں اپنا خیمہ گاڑ دیا تو میں کہاں خیمہ لگاؤں گا؟

اسی طرح کا واقعہ حضرت ابوہریرہؓ کا بھی ہے، احادیث میں آتا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن مسلمانوں کے وضو کے اعضا چمک رہے ہوں گے اور نبی اکرمؐ اس سے مسلمانوں کو پہچانیں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ ایک روز مسجد کی چھت پر وضو کر رہے تھے اور بازوؤں کو کہنیوں کی بجائے کندھوں تک دھو رہے تھے، اسی طرح پاؤں کو ٹخنوں کی بجائے گھٹنوں تک دھو رہے تھے۔ ایک شخص نے جو یہ منظر دیکھ رہا تھا ان سے پوچھ لیا کہ حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں؟ حضرت ابوہریرہؓ نے پہلے تو یہ فرمایا کہ اچھا تو بھی دیکھ رہا تھا؟ پھر وضاحت فرمائی کہ میں اپنے وضو کے اعضا کی چمک کو بڑھا رہا تھا یعنی پاؤں کے ساتھ ٹانگوں کو اور بازوؤں کے ساتھ کندھوں کو بھی اس چمک کا حصہ بنا رہا تھا۔ یہ بات حضرت ابوہریرہؓ نے بطور مسئلہ نہیں بتائی لیکن خود اس کی کوشش کی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بعض معاملات کا تعلق سنت اور مسئلہ سے ہوتا ہے اور بعض کا ذوق سے ہوتا ہے جو ہر ایک کے لیے ضروری نہیں ہوتا، ہمارے ہاں بعض مسائل اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

بہر حال میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ ہمیں اپنی نسبت کے اظہار کے لیے، اپنی شناخت کے لیے، ثواب کے لیے، محبت کے لیے، برکات کے

حصول کے لیے اور اللہ تعالی کو راضی کرنے کے لیے ضرور کرنا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ راہنمائی کا حصول بھی ہمارا مقصد ہونا چاہیے اور جس بات کا تذکرہ کریں اس پر عمل کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اللہ تعالی ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

سودی نظام کے خاتمہ کی مہم

(مرکزی جامع مسجد امام اہل سنتؒ، گکھڑ۔ ۱۴ فروری ۲۰۱۴ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کی جن اقدار کو انسانی معاشرہ سے ختم کیا ان میں ایک بڑی لعنت سود کی تھی، جاہلی معاشرہ میں سود کا چلن عام تھا اور ذاتی قرضوں اور تجارت دونوں میں سود کا لین دین ہوتا تھا۔ جب سود کی حرمت کا اعلان ہوا تو مشرکین کی طرف سے یہ اشکال پیش کیا گیا کہ ”انما البیع مثل الربوا“ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے، جب تجارت جائز ہے تو سود کیسے حرام ہے۔ اس پر اللہ تعالی نے فرمایا کہ ”احل اللہ البیع و حرم الربوا“ یہ دونوں ایک نہیں ہیں، تجارت کو اللہ تعالی نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

تجارت دو چیزوں کے تبادلہ کو کہتے ہیں۔ دونوں چیزیں مختلف جنس کی ہوں تو یہ تجارت کہلاتی ہے، اگر ایک ہی جنس کی دو چیزوں کا باہمی تبادلہ ہو تو اس میں کمی بیشی کو سود کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اس پر فرمایا کہ ”احل اللہ البیع و حرم الربوا“ اللہ تعالی نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربوا کو حرام ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ جناب نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ہر قسم کے سود کو سختی کے ساتھ حرام قرار دینے کا اعلان فرمایا اور قرآن کریم نے سود کے لین دین پر اصرار کو ”فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ“ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ سے تعبیر فرما کر کسی لچک کی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔

جناب نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں نہ صرف آئندہ کے لیے سود کے لین دین کی ممانعت فرمائی بلکہ ماضی میں سود پر لیے گئے قرضوں پر بھی سود کی رقم ختم کر کے اصل رقم کی واپسی کی ہدایت جاری کی، اور سب سے پہلے اپنے چچا محترم حضرت عباسؓ کے بارے میں اعلان کیا کہ ان سے جن لوگوں نے سود پر قرضے لے رکھے ہیں وہ صرف اصل رقم واپس کریں گے ان سے سود وصول نہیں کیا جائے گا۔ یہ سود ذاتی قرضوں کے ساتھ ساتھ

تجارتی معاملات میں بھی عام تھا، چنانچہ بنوثقیف کا وفد جب جناب نبی اکرمؐ کے پاس حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کے لیے کچھ شرائط پیش کیں، جن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ ہم سود کا لین دین ترک نہیں کریں گے اور اس پر ان کی دلیل یہ تھی کہ دوسری قوموں کے ساتھ ہماری تجارت سود کے ذریعے چلتی ہے اور سود کا لین دین ختم کرنے سے ہماری تجارت متاثر ہوگی۔ مگر آنحضرتؐ نے یہ شرائط قبول کرنے سے انکار فرما دیا اور بنوثقیف کو اپنی شرائط سے دستبردار ہوکر بالآخر غیر مشروط طور پر اسلام قبول کرنا پڑا۔

اسی طرح نجران کے عیسائیوں کے ساتھ نبی اکرمؐ نے جو معاہدہ فرمایا اس کے تحت عیسائیوں نے اسلام قبول کیے بغیر غیر مسلم کے طور پر مسلم ریاست میں ذمی کی حیثیت سے رہنے کا اعلان کیا۔ یہ معاہدہ نجران تاریخ کا اہم حصہ ہے جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ نجران کے عیسائی سود کا لین دین نہیں کریں گے، حتیٰ کہ اگر ان کے کسی ذمہ دار شخص نے سود کا کاروبار کیا تو اس سے معاہدہ متاثر ہوسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سود کی حرمت صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ اس کی پابندی ایک اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کے لیے بھی ضروری ہے۔

قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی سود کی ممانعت تھی جیسا کہ سورۃ النسآء کی ایک آیت ۱۶ میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کے نزول کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے ایک سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”وأخذھم الربوا وقد نھوا عنہ“ انہیں سود سے منع کیا گیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے سود کا لین دین شروع کر دیا جس کی وجہ سے وہ ملعون قرار پائے۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے خیبر کی طرف زکوۃ وعشر کی وصولی کے لیے نمائندہ بھیجا تو وہ ساری کھجوریں عمدہ قسم کی لے آیا۔ نبی اکرمؐ نے پوچھا کہ کیا خیبر میں ساری کھجوریں اس طرح کی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا نہیں دوسری کھجوریں بھی ہوتی ہیں مگر میں نے عام کھجوریں زیادہ دے کر ان کے عوض یہ عمدہ کھجوریں تھوڑی مقدار میں حاصل کر لی تھیں۔ آپؐ نے اسے سود قرار دے کر اس سے منع فرما دیا اور کہا کہ اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو کھجوروں کا کھجوروں سے براہ راست تبادلہ کرنے کی بجائے درہم و دینار کے ذریعے گھٹیا کھجوریں بیچ کر انہی کے عوض عمدہ کھجوریں خرید لیا کرو۔

بخاری شریف کی ایک اور روایت کے مطابق حضرت بلالؓ نے ایک بار جناب نبی اکرمؐ کو بتایا کہ انہوں نے ردی کھجوریں دو صاع کے حساب سے دے کر ان کے عوض ایک صاع کے حساب سے عمدہ کھجوریں خریدی ہیں، تو نبی اکرمؐ نے اسے "عین الربا" قرار دیا اور ہدایت کی کہ آئندہ اس سے اجتناب کرو اور اگر تبادلہ ضروری ہو جائے تو رقم کے عوض بیچ کر اسی رقم سے عمدہ کھجوریں خرید لیا کرو۔

دور نبویؐ کے ان واقعات اور جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ سود ذاتی قرض میں ہو یا تجارت میں، ہر قسم کے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے اس کی مکمل ممانعت فرما دی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب ملک کے نئے نظام کی تشکیل کا مرحلہ پیش آیا تو تحریک پاکستان کے قائدین نے جہاں ملک کے عمومی نظام کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو گا، وہاں معاشی نظام و قوانین کے بارے میں بھی دوٹوک طور پر وعدہ کیا کہ وہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں طے ہوں گے۔ چنانچہ قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں وضاحت سے کہا کہ وہ پاکستان کے معاشی نظام کو مغربی اصولوں پر نہیں بلکہ اسلامی اصولوں پر استوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مغربی نظام معیشت کی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ وہ دنیا میں جنگوں اور فساد کا ذریعہ بنا ہے اس لیے ہم اس کی پیروی نہیں کریں گے بلکہ اپنے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں تشکیل دیں گے۔ لیکن بانیٔ پاکستان کا یہ اعلان آج تک تشنۂ تکمیل ہے۔ پھر دستور پاکستان کے نفاذ کے وقت اس میں وعدہ کیا گیا کہ ملک میں سودی نظام کو جلد از جلد ختم کر کے غیر سودی اسلامی معیشت کے قوانین لاگو کیے جائیں گے مگر یہ دوٹوک دستوری وعدہ بھی حکمران طبقوں کی بے اعتنائی کی نذر ہو گیا ہے۔

اس کے بعد وفاقی شرعی عدالت، اسلامی نظریاتی کونسل اور سپریم کورٹ آف پاکستان نے بینک انٹرسٹ کو ربوا قرار دینے کا دوٹوک فیصلہ کر کے حکومت سے کہا کہ وہ سودی قوانین کو ختم کر کے اسلامی معاشی نظام کی ترویج کا اہتمام کرے مگر یہ فیصلہ اپیل در اپیل کے مراحل میں الجھا دیا گیا ہے اور وطن عزیز ابھی تک اسلامی معاشی نظام کی برکات سے محروم ہے۔ جبکہ سودی نظام کی نحوست اور بے برکتی دن بدن واضح ہوتی جا رہی ہے حتیٰ کہ اب

عالمی سطح پر غیر سودی بینکاری کی ضرورت و افادیت کو تسلیم کیا جانے لگا ہے اور پاکستان کے حکمران بھی غیر سودی بینکاری کی طرف توجہ دیتے نظر آرہے ہیں۔

اس صورتحال میں ملک کے مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور متعدّد دینی جماعتوں کے راہنماؤں نے باہمی مشاورت کی کئی نشستوں کے بعد یہ طے کیا ہے کہ سودی نظام کی نحوست اور اسلامی نظام کی برکات سے عوام کو آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ سودی نظام کے خاتمہ کے لیے عوامی بیداری کی مہم منظم کی جائے اور حکمرانوں سے مسلسل مطالبات کیے جائیں کہ وہ ٹال مٹول کا طرز عمل ختم کر کے سودی نظام و قوانین کے خاتمہ کے لیے دوٹوک لائحہ عمل کا اعلان کریں۔ اس مقصد کے لیے ''تحریک انسداد سود پاکستان'' کے نام سے ایک فورم قائم کیا گیا ہے جو صرف سودی نظام کے خاتمے کے ایک نکاتی ایجنڈے کے لیے محنت کرے گا اور تمام مکاتب فکر اور طبقات کو اعتماد میں لے کر قومی سطح پر اس جدوجہد کو منظم کیا جائے گا۔ اس جدوجہد کو منظم کرنے کے لیے تمام مکاتب فکر کے ذمہ دار راہنماؤں پر مشتمل ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی ہے اور اس کا کنوینر مجھے بنایا گیا ہے، جبکہ رابطہ کمیٹی میں مولانا عبد المالک خان، علامہ خلیل الرحمان قادری، پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی، مولانا عبد الرؤف فاروقی، پروفیسر حافظ عاطف وحید، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، مولانا عبد الرؤف ملک، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، ڈاکٹر راغب حسین نعیمی، حافظ غضنفر عزیز، مولانا قاری جمیل الرحمان اختر، اور مولانا قاری محمد یعقوب شیخ شامل ہیں۔ میں اگرچہ اب عمر کے اس مرحلہ میں ہوں کہ اتنا بڑا بوجھ اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہو لیکن جب دوستوں نے اعتماد کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی ناشکری سے بھی بچنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اور دوستوں کے تعاون کی امید پر یہ ذمہ داری قبول کرلی ہے اور اس کے لیے متحرک ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

گکھڑ میرا گھر ہے اور یہ جامع مسجد بچپن سے میرا مرکز ہے۔ یہ منبر جس پر بیٹھ کر میں گفتگو کر رہا ہوں والد محترم امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر قدس اللہ سرہ العزیز کا منبر ہے اور میں آج اس مسجد اور اس منبر سے سودی نظام کے خلاف رابطہ عوام مہم کا آغاز کر رہا ہوں۔ آپ سب دوستوں سے میری درخواست ہے کہ اس مہم میں ہر قسم کے تعاون سے نوازیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا بھی فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کار خیر میں خلوص و محنت کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور کامیابی سے ہمکنار کریں

تاکہ وطن عزیز سودی نظام کی نحوست ولعنت سے نجات پاکر اسلام کے بابرکت معاشی نظام سے بہرہ ور ہوسکے، آمین یارب العالمین۔

ویلفیئر اسٹیٹ، اسوۂ نبویؐ کی روشنی میں

(مدنی مسجد، سہنہ، ضلع گجرات - ۲۰ جنوری ۲۰۱۴ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ہزاروں پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک پر بات کی جا سکتی ہے، مگر میں آج ان میں سے صرف ایک پہلو پر کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آج دنیا میں رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کی بات کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک ریاست کو اپنی آبادی کے نادار، بے سہارا، ضرورت منداور بوجھ تلے دبے ہوئے شہریوں کی کفالت کی ذمہ داری اٹھانی چاہیے، اور بہت سی حکومتوں نے اسے اپنی ذمہ داری میں شامل کررکھا ہے۔ اس سلسلہ میں میری گزارش یہ ہے کہ ریاست کو شہریوں کی ضروریات کی کفالت کا ذمہ دار قرار دینے کا اعلان سب سے پہلے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور ایک ذمہ دار رفاہی ریاست کا تصور بلکہ عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس حوالہ سے جناب نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ سے چند جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کا کچھ عرصہ تک یہ معمول رہا کہ کوئی مسلمان فوت ہو جاتا تو اس کا جنازہ پڑھانے سے پہلے یہ پوچھتے تھے کہ اس کے ذمہ کوئی قرض تو نہیں ہے؟ جواب ملتا کہ نہیں ہے تو جنازہ پڑھا دیتے، اور اگر یہ بتایا جاتا کہ یہ مقروض فوت ہوا ہے تو سوال کرتے کہ اس کے ترکہ میں قرضہ ادا کرنے کی گنجائش موجود ہے؟ جواب ملتا کہ موجود ہے تو بھی جنازہ پڑھا دیتے، لیکن اگر یہ پتہ چلتا کہ مرنے والا مقروض فوت ہوا ہے اور اتنا ترکہ نہیں چھوڑا کہ اس کا قرض ادا کیا جا سکے تو آپؐ فرماتے ''صلوا علی صاحبکم'' اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو اور خود نبی اکرمؐ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے۔ ایک موقع پر ایک جنازے کے لیے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقروض ہے اور اس کے ترکہ میں ادائیگی کا بندوبست موجود نہیں ہے تو حضورؐ پیچھے ہٹ گئے اور ساتھیوں سے کہا کہ اس کا جنازہ تم لوگ پڑھ لو۔ ایک صحابی رسول حضرت ابو قتادہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے بھائی کو اس سعادت سے محروم نہ کریں اس کا قرضہ میرے ذمہ ہے میں ادا کردوں گا۔ اس پر نبی کریمؐ

نے جنازہ پڑھا دیا اور اس کے بعد اعلان فرمایا کہ ’’من ترک مالا فلورثتہ و من ترک کلا او ضیاعا فالی وعلی‘‘ جو شخص مال و دولت چھوڑ کر فوت ہوا اس کا مال اس کے وارثوں کو ملے گا اور جو شخص قرض کا بوجھ یا بے سہارا افراد چھوڑ کر مرا وہ میرے پاس آئیں گے اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہو گی۔

بے سہارا، معذور، ضرورت مند اور بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی امداد اور کفالت اس سے قبل بھی لوگ کرتے آرہے تھے، اور بہت سے بادشاہ اور سردار لوگ اپنی رعیت کے ایسے افراد سے فراخدلانہ تعاون کرتے تھے۔ لیکن میری طالب علمانہ رائے میں اسے اپنی ذمہ داری قرار دینے کا اعلان سب سے پہلے جناب رسول اکرمؐ نے فرمایا اور پھر اسے نباہ کر بھی دکھا دیا۔ اس لیے اگر رفاہی ریاست کا تصور یہ ہے کہ ریاست و حکومت کو رعیت کے نادار بے سہارا اور معذور لوگوں کی کفالت کا ذمہ دار اور مسئول قرار دیا جائے تو اس کا آغاز نبی کریمؐ کے اس اعلان سے ہوا ہے اور ویلفیئر اسٹیٹ کا نقطۂ آغاز رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ’’فالی وعلی‘‘ قرار پاتا ہے۔

جناب نبی اکرمؐ نے اس مقصد کے لیے ’’بیت المال‘‘ کا نظام قائم کیا جسے حضرات خلفاء راشدینؓ خصوصا حضرت عمرؓ نے ایک مربوط نظام کی شکل دی اور آج بھی پوری دنیا میں کسی رفاہی ریاست کے لیے اسے آئیڈیل سسٹم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں، جو اس رفاہی نظام کا ابتدائی اور اساسی دور تھا، اس کی بیسیوں جھلکیاں احادیث مبارکہ میں ملتی ہیں جن میں دو تین کا ذکر کروں گا۔

عام طور پر ضرورت مند پر لوگ حضورؐ کے پاس آتے تھے اور اپنی ضروریات کا اظہار کرتے تھے جنہیں آپؐ بیت المال سے پورا کر دیتے تھے۔ کسی کے ہاں کھانے کو نہیں ہے تو اسے غلہ یا کھجوریں مل جاتی تھیں، کسی کو سواری کی ضرورت ہے تو اسے سواری کا جانور دے دیا جاتا تھا، بلکہ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی ہے کہ ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! دوران سفر میرا اونٹ مر گیا ہے مجھے سفر کرنا ہے اس لیے سواری کا جانور دے دیں۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ٹھہرو میں تجھے اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں۔ وہ پریشان ہو گیا کہ مجھے تو سفر کے لیے جانور چاہیے، میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ مگر آپؐ نے یہ بات دل لگی کے طور پر فرمائی تھی اور اس قسم کی ہلکی پھلکی دل لگی اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبھی کبھی کر لیا کرتے

تھے۔ اسے جب زیادہ پریشان دیکھا تو فرمایا، خدا کے بندے میں تجھے اونٹ ہی دوں گا مگر وہ بھی تو کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہو گا۔

حضرت ابو موسی اشعریؓ اپنا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے خاندان کے کچھ لوگوں کو سفر پر جانا تھا اور ہمارے پاس سواریاں نہیں تھیں، خاندان والوں نے مجھے نبی اکرمؐ کے پاس بھیجا تاکہ دو چار اونٹ آپؐ سے حاصل کر لوں۔ میں جب مسجد نبوی میں آیا تو حضورؐ کسی وجہ سے ناراض بیٹھے تھے جس کا اندازہ مجھے نہ ہوا اور میں نے آتے ہی سوال کر دیا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے، میں نے دوبارہ سوال کیا تو آپؐ نے قسم اٹھائی "واللہ ما احملکم" خدا کی قسم میں تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا۔ ابو موسی اشعریؓ کہتے ہیں میں مایوس ہو کر گھر آگیا اور ابھی میں ساتھیوں کو بتا ہی رہا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں بلا رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو نبی اکرمؐ کے پاس اونٹوں کی دو جوڑیاں کھڑی تھیں، مجھے فرمایا کہ یہ اونٹ تم لے جاؤ، میں نے ان کی رسیاں تھامیں اور گھر کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں مجھے خیال آیا کہ آپؐ نے ہمیں کوئی سواری نہ دینے کی قسم اٹھائی تھی اور اب یہ سواریاں دے دی ہیں جبکہ میں نے قسم کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا، یہ بات مناسب نہیں ہے، واپس جا کر نبی اکرمؐ سے اس قسم کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نبی اکرمؐ کو اپنی قسم یاد نہ رہی ہو۔ چنانچہ میں پھر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا تو جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ جس وقت تم نے مجھ سے سواریاں مانگی تھیں اس وقت میرے پاس موجود نہیں تھیں، یہ بعد میں کہیں سے منگوائی ہیں۔ اور میں نے جو قسم اٹھائی تھی وہ مجھے یاد ہے لیکن میرا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی بات پر قسم اٹھا لوں اور دیکھوں کہ یہ قسم خیر کے کام میں رکاوٹ بن رہی ہے تو میں قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دیتا ہوں اور قسم کو خیر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں بننے دیتا۔ حضرت ابو موسی اشعریؓ کہتے ہیں کہ اس وضاحت کے بعد میں وہ اونٹ اطمینان کے ساتھ گھر لے آیا۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک شخص جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ مجھ سے رمضان المبارک میں روزے کے دوران غلطی ہوئی ہے کہ بیوی کے پاس چلا گیا ہوں اور روزہ توڑ بیٹھا ہوں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا اس کے کفارے میں دو ماہ کے مسلسل بلاناغہ روزے رکھنا ہوں گے۔ اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ میرے بس میں نہیں

ہے۔ فرمایا کہ ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلا دو۔ اس نے کہا کہ اس کی طاقت بھی میں نہیں رکھتا۔ تھوڑی دیر میں کھجوروں کا ایک بڑا ٹوکرا کہیں سے بیت المال میں آیا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلا کر وہ ٹوکرا دے دیا اور فرمایا کہ اپنے کفارے میں یہ خرچ کرلو۔ یہاں اس پہلو کی طرف توجہ دلا رہا ہوں کہ غلطی اس شخص کی ہے کہ اور وہ اپنے گناہ کی وجہ سے اپنے اوپر کفارہ واجب کر بیٹھا ہے لیکن ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو اس کا کفارہ بیت المال سے ادا کیا جا رہا ہے۔

اور یہ واقعہ بھی بخاری شریف میں مذکور ہے کہ یہودیوں کے علاقے میں ایک انصاری صحابیؓ کی لاش ملی جسے شہید کر دیا گیا تھا لیکن قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ نبی اکرمؐ نے مقتول کے وارثوں سے پوچھا کہ تم کسے ملزم ٹھہراتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں تو کچھ معلوم نہیں ہے البتہ چونکہ یہودیوں کے علاقہ میں واقعہ ہوا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے ہی کیا ہوگا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ان سے قسامہ (پچاس افراد کا حلف) لیا جائے گا، یعنی علاقہ کے پچاس منتخب افراد قسم اٹھائیں گے کہ نہ انہوں نے قتل کیا ہے اور نہ ہی انہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے اور اس حلف کے بعد وہ اس کیس سے بری ہو جائیں گے۔ مقتول کے وارثوں نے کہا کہ وہ تو یہودی ہیں آسانی سے قسم اٹھالیں گے، آپؐ نے فرمایا کہ اس کے سوا تو اور کچھ نہیں ہو سکتا، البتہ نبی اکرمؐ نے اس قتل کو رائیگاں ہونے سے بچانے کے لیے مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کر دی۔

یہاں ضمناً ایک اور بات بھی کہنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں عام طور پر قتل کے کسی کیس میں نامزد ملزم بری ہو جائیں تو کیس داخل دفتر ہو جاتا ہے اور دوبارہ قاتلوں کی تلاش نہیں کی جاتی۔ میں نے ہائیکورٹ کے ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس سے پوچھا کہ قتل کے کسی کیس میں نامزد ملزموں کو بری کرنے کے ساتھ عدالت کو چاہیے کہ وہ پولیس کو حکم دے کہ یہ قاتل نہیں ہیں اس لیے پولیس از سرِ نو اس کیس کی تفتیش کرے اور اصل قاتلوں کو تلاش کرے، کیونکہ اس طرح کیس کو داخل دفتر کر دینے سے تو قتل ہونے والے کا خون رائیگاں چلا جاتا ہے جو درست نہیں ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے اور ہمارے قانون میں یہ خلا موجود ہے، آپ کے خیال میں اس کا حل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس کا حل جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ میں موجود ہے کہ اگر قاتلوں کا سراغ نہ مل رہا ہو تو مقتول کے خون کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے۔

یہ بھی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عقبہؓ کو جناب نبی اکرمؐ نے بیت المال سے بکریوں کا ایک ریوڑ دیا اور فرمایا کہ یہ بکریاں صحابہ کرامؓ میں تقسیم کر دو تاکہ وہ قربانی کر سکیں۔ انہوں نے وہ بکریاں لوگوں میں تقسیم کر دیں، ایک بکری بچ گئی جو قربانی کی عمر سے کم تھی۔ نبی اکرمؐ نے انہیں اجازت دی کہ وہ اپنی طرف سے بکری کے اس بچے کی قربانی دے دیں مگر ان کے بعد کسی اور کو اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ غور فرمائیں کہ قربانی تو ان لوگوں پر واجب ہے مگر انہیں بکریاں بیت المال کی طرف سے دی جا رہی ہیں۔

حضرات محترم! میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے اس پہلو پر کچھ عرض کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے رفاہی ریاست کا تصور پیش کیا اور ریاست کو رعایا کے نادار، معذور، بے سہارا اور بوجھ تلے افراد کی کفالت کا ذمہ دار قرار دے کر ویلفیئر اسٹیٹ کا آغاز کیا، جسے حضرات خلفاء راشدینؓ خاص طور پر حضرت عمرؓ نے ایک منظم ادارے اور مستقل حکومتی شعبے کی شکل دی۔ آج افسوس کی بات ہے کہ عالم کفر کی حکومتوں نے تو اس نظام کو جزوی طور پر اختیار کیا ہوا ہے جیسا کہ برطانیہ اور ناروے وغیرہ میں اس طرز کا سوشل ویلفیئر کا نظام رائج ہے مگر ہمارے مسلم ممالک میں یہ نظام موجود نہیں ہے، دعا کریں کہ اللہ تعالی ہمارے حکمرانوں کو ہدایت دیں اور وہ جناب نبی اکرمؐ اور خلفاء راشدینؓ کے طرز حکومت کی پیروی کرتے ہوئے امت مسلمہ کی صحیح راہنمائی کریں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ایک صحیح رفاہی ریاست بنانے کی کوشش کریں، آمین یارب العالمین۔

ربیع الاول ۱۴۳۵ھ کی سرگرمیاں

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۱ جنوری ۲۰۱۴ء)

ربیع الاول کی آمد کے ساتھ ہی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک تذکرہ کی محافل کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ سلسلہ عام طور پر ربیع الثانی میں بھی جاری رہتا ہے اور مختلف مکاتب فکر کے لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق جناب سرور کائناتؐ کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں سے اس حوالہ سے جلسوں میں حاضری کے مسلسل تقاضے رہتے ہیں مگر اسباق کی وجہ سے سب دوستوں کی فرمائش پوری کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر بھی کچھ دوستوں کا اصرار حاوی ہو جاتا ہے اور بعض مقامات پر جانا ہی پڑ جاتا ہے۔

گزشتہ روز (۹ جنوری) کو جوہر آباد کی مسجد نمرہ میں ”جناب نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور انسانی حقوق“ کے موضوع پر مغرب کے بعد سیمینار تھا۔ سرگودھا میں مولانا محمد الیاس گھمن کو پتہ چلا تو تقاضہ کیا کہ جاتے ہوئے ان کے مرکز میں بھی حاضری اور بیان ہو جائے۔ چنانچہ ظہر ان کے ہاں پڑھی، مرکز اہل سنت کے نام سے ان کا ادارہ تعلیمی اور خانقاہی دونوں حوالوں سے علماء کرام اور طلبہ کی توجہات کا مرکز بنتا جا رہا ہے اور مختلف شعبوں بالخصوص دفاع حنفیت میں ان کا منظم اور مربوط کام دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ظہر کے بعد تخصص کی کلاس میں کم و بیش ایک گھنٹہ گفتگو کا موقع ملا جس میں ”حنفیت کے دفاع کے تاریخی پس منظر، اس کی دینی ضرورت اور عصر حاضر میں اس کے ضروری تقاضوں“ پر بات چیت کی اور عرض کیا کہ مجھے آپ کے ہاں کتاب، دلیل، مطالعہ اور افہام و تفہیم کا ماحول دیکھ کر مسرت ہوتی ہے اور اسی کو آج کی اہم دینی ضرورت سمجھتا ہوں۔ جامعہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا کے مہتمم مولانا اشرف علی صاحب وہیں تشریف لے آئے، وہ ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں، ان کے ساتھ اس خوشخبری پر کہ عصر کے وقت مولانا مفتی سید عبد القدوس ترمذی ان کے ہاں تشریف لا رہے ہیں، جامعہ محمودیہ میں حاضری کا وعدہ کر لیا۔ عصر کی نماز وہاں ادا کی اور دونوں دوستوں کے ساتھ مختصر محفل میں باہمی دلچسپی کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔

مغرب کے بعد جوہر آباد پہنچے تو جامعہ نصرۃ العلوم کے فاضل مولانا فیصل محمود اور مسجد نمرہ کے جلسہ کے منتظم مولانا مفتی حسین احمد کے ساتھ بزرگ دانشور جناب عبد الرشید ارشد کو بھی منتظر پایا جو معروف صاحب قلم ہیں اور مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ جوہر آباد میں جمعیت علماء اسلام کے پرانے بزرگ حکیم علی احمد خان صاحب کی خدمت میں ہمیشہ حاضری ہوتی رہی ہے اور وہ بھی شفقت سے نوازتے ہیں۔ صاحب فراش ہیں، حاضری پر بہت خوش ہوئے، پرانی یادیں تازہ کرتے رہے اور دعائیں دیں۔ جوہر آباد میں جمعیت علماء اسلام کے بزرگ مولانا غلام ربانیؒ بھی ہمارے پرانے رفقاء کار میں رہے ہیں، ان کے فرزند مولانا رشید ربانی سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا۔

سیمینار میں انسانی حقوق کے حوالہ سے مغربی فلسفہ اور اسلامی تعلیمات میں فرق پر کچھ معروضات پیش کیں اور گزارش کی کہ مغرب غلط طور پر اس بات کا دعویدار ہے کہ انسانی حقوق کا شعور اس نے بیدار کیا ہے اور انسانی حقوق سے سوسائٹی کو اس نے متعارف کرایا

ہے۔ مغرب کی معاشرتی بیداری سے ایک ہزار سال قبل جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انسانی معاشرے کو انسانی حقوق کا ایک جامع نظام دے چکے تھے اور انہوں نے لوگوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا جو شعور بیدار کیا، وہ قیامت تک اس حوالہ سے مشعل راہ رہے گا اور اسلام کا حقوق و فرائض کا نظام آج بھی دنیا کا متوازن ترین نظام ہے۔

گزشتہ دنوں گجرات میں جمعیت علماء اہل سنت کے زیر اہتمام ایک مسجد میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر گفتگو کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کے اظہار میں حضرات صحابہ کرامؓ کا ذوق بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ اپنے ذوق کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں کہ زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کا چہرۂ انور سامنے ہو اور زیارت کرتا رہوں۔ جبکہ حضرت عمر بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں جناب نبی اکرمؐ کے چہرہ مبارک کے خدوخال بیان نہیں کر سکتا اس لیے کہ محبت کے رعب میں کبھی جی بھر کر دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اسی طرح ہر صحابی کی تمنا ہوتی تھی کہ اسے مرتے وقت نبی کریمؐ کی زیارت نصیب ہو اور وہی اس کا جنازہ پڑھائیں، لیکن ایک صحابیؓ نے وصیت کی کہ اس کا جنازہ اگر رات کے وقت ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہ دی جائے اس لیے کہ دشمنوں کا علاقہ ہے، کہیں کوئی دشمن آپؐ کو نقصان نہ پہنچا دے۔

یہ محبت اور اس کے اظہار کے اپنے اپنے انداز ہیں لیکن ان میں یہ بات ضرور ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی پسند و ناپسند کا لحاظ رکھا جائے۔ شمائل ترمذی کی ایک روایت میں حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ مجلس میں تشریف لاتے تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ احترام میں اٹھ کھڑے ہوں لیکن ہم ایسا کرتے نہیں تھے ”لمکان کراھتہ“ اس لیے کہ آپؐ کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ لہٰذا ہمیں محبت و عقیدت کا اپنے اپنے انداز میں اظہار کرنا چاہیے لیکن اس میں جناب نبی اکرمؐ کی پسند و ناپسند کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

۲۰۱۳ء

مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا ابوالقاسم نعمانی کے ساتھ

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳ دسمبر ۲۰۱۳ء)

جوہانسبرگ میں مولانا محمد ابراہیم پانڈور کی رہائش گاہ پر دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی کے ساتھ نشست کی باتیں ادھوری رہ گئی تھیں، ان کا مکمل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نعمانی کی اس بات کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ بڑے بزرگوں کے جانے پر بعد والے لوگوں میں ان کی خصوصیات تلاش کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اس پر مولانا مفتی محمد اسماعیل نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہر دور کے لیے اس کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق صلاحیتوں کے ساتھ لوگوں کو کھڑا کرتا ہے اور چونکہ دین نے قیامت تک باقی رہنا ہے اس لیے یہ تسلسل بھی باقی رہے گا اور کوئی دور بھی اس کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق کام کرنے والوں سے خالی نہیں رہے گا۔ اس کی مثال انہوں نے دی کہ ہماری نئی نسل میں کمپیوٹر وغیرہ کے استعمال کی جو صلاحیت ہے وہ ہم بوڑھوں میں نہیں ہے، اور وہ جدید ذرائع کے استعمال کرنے میں ہم سے بہت آگے ہیں۔

اس پر کمپیوٹر کے نفع و نقصان کی بحث شروع ہوگئی اور حضرت مولانا نعمانی نے فرمایا کہ جدید ذرائع سے اسباب و وسائل تو بڑھ رہے ہیں لیکن ذاتی صلاحیتیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں اور اب تو صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ کسی نوجوان نے دس اور دس کو جمع کرنا ہو تو وہ ذہن پر زور دینے کی بجائے کیلکولیٹر پر اس کا حساب لگائے گا۔ اس لیے ذاتی صلاحیتوں کے حوالہ سے یہ جدید سہولتیں نقصان کا باعث بن رہی ہیں۔ مجلس میں کسی بزرگ نے کہا کہ کتابیں تو اب انٹرنیٹ پر آگئی ہیں جس سے بہت سہولت ہوگئی ہے۔ مولانا نعمانی فرمانے لگے کہ

اس سے بھی مطالعہ اور تحقیق کا ذوق کم ہوگیا ہے۔ بس انٹرنیٹ پر متعلقہ مواد جمع کیا اور کتاب مرتب کر دی۔ انہوں نے مثال کے طور پر کہا کہ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی قدس اللہ سرہ العزیز نے ''مصنف عبدالرزاق'' پر جو کام کیا ہے اس میں ان کی زندگی کے کئی سال لگے ہیں اور مطالعہ و تحقیق کی بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں۔ ایک عرب اسکالر نے بھی اس کے بعد اس کتاب پر کام کیا ہے جس پر کسی صاحب علم نے تبصرہ کیا کہ مولانا اعظمیؒ کی کتاب علم و تحقیق اور مطالعہ و تجزیہ کا نتیجہ ہے۔ جبکہ یہ بعد میں چند مہینوں میں سامنے آنے والی کتاب انٹرنیٹ کا کمال ہے۔ اس سے مواد تو جمع ہو جاتا ہے اور ترتیب و تدوین کا کام بھی ہو جاتا ہے، لیکن تحقیق کے پیچھے جو مطالعہ، غور و فکر اور تفقہ درکار ہے وہ مفقود ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ انٹرنیٹ اور سی ڈیز پر آنے والی کتابوں میں رد و بدل کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس پر مولانا نعمانی نے فرمایا کہ مثلاً حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم شریف کی جو شرح ''فتح الملہم'' کے نام سے لکھی تھی اور علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی ہے۔ کسی عرب ادارے نے اسے کمپیوٹر پر لاتے ہوئے اس میں رد و بدل کیا ہے۔ مجلس کے ایک بزرگ نے کہا کہ اس وقت تو اس قسم کی غلطی چیک ہو جائے گی لیکن مستقبل میں جب یادداشت اور کتاب کی بجائے انٹرنیٹ جیسے ذرائع ہی واحد ذریعہ ہوں گے، تو یہ تحریفات اور رد و بدل کتاب کا حصہ بن جائے گا۔ ایک صاحب نے ذکر کیا کہ انٹرنیٹ پر قرآن کریم میں تحریفات کا سلسلہ چل پڑا ہے اور خاص طور پر قادیانیوں نے اپنے تراجم بہت اہتمام کے ساتھ انٹرنیٹ پر پیش کیے ہیں جن میں معنوی تحریفات کی بھرمار ہے۔ مولانا نعمانی نے فرمایا کہ انٹرنیٹ پر موجود قرآن کریم میں لفظی تحریفات بھی موجود ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور قرآن کریم کے ایک متن کا متعلقہ حصہ نکال کر بتایا کہ فلاں آیت میں دو جگہ الفاظ میں یہ اضافے کیے گئے ہیں۔

مولانا مفتی محمد اسماعیل نے حضرت مولانا نعمانی سے عرض کیا کہ اس وقت دنیا میں اسلام کے خلاف علمی، تہذیبی، فکری اور ثقافتی محاذوں پر جو منظم کام ہو رہا ہے اس کا جواب دینے اور نئی پھیلائی جانے والی گمراہیوں کے ازالے کے لیے دارالعلوم دیوبند کو قیادت کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ کام صحیح طور پر اکابر علماء دیوبند ہی کر سکتے ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے کہا کہ اسی وجہ سے استعماری قوتوں کا سب سے بڑا ہدف بھی دیوبندی حلقہ

ہے۔ حتیٰ کہ بھارت کے ایک بڑے ہندو دانش ور نے واضح طور پر بعض دیگر مذہبی فرقوں کا نام لے کر کہا ہے کہ ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور علماء دیوبند کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہمارے لیے خطرہ صرف وہی ہیں۔

مولانا ابوالقاسم نعمانی کے ساتھ گفتگو اور مجلس بہت دلچسپ اور ایمان افروز رہی، مگر اس کا ابتدائی حصہ تذکرہ سے رہ گیا ہے کہ جب بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب وہ دہلی سے جدہ ایئرپورٹ پر پہنچے جہاں سے ہم اکٹھے آگے روانہ ہوئے، وہاں ان سے ملاقات کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد شاہد نے میرا تعارف کرایا تو حضرت مولانا نعمانی نے بہت محبت و شفقت کا اظہار فرمایا اور والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ فرمانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ان کی بہت سی کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور بہت استفادہ کیا ہے۔ حضرت والد گرامی کی بعض کتابوں کے بارے میں انہوں نے دریافت کیا کہ ان کی طباعت کی کیا صورت حال ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ ان کی تصنیفات "مکتبہ صفدریہ" کے زیر اہتمام مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ اس پر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

کیپ ٹاؤن میں جمعۃ المبارک کی شام کو مسلم جوڈیشل کونسل جنوبی افریقہ اور انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تین روزہ عالمی ختم نبوت کانفرنس کا آغاز ہو گیا ہے۔ افتتاحی نشست فضیلۃ الشیخ ابراہیم جلیل کی دعا سے شروع ہوئی۔ شیخ محمد فیلاندر نے قرآن کریم کی تلاوت کی جبکہ انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کے سربراہ مولانا عبد الحفیظ مکی اور مسلم جوڈیشل کونسل کے راہ نماؤں الشیخ ریاض فقار، الشیخ عبد الحمید خیبر اور مولانا عبد الخالق نے کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی کی دعا پر پہلی نشست اختتام پذیر ہوئی۔

جنوبی ایشیا کے فقہی واجتہادی رجحانات کا ایک جائزہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام "جنوبی ایشیا میں اسلامی قانونی فکر اور ادارے" کے عنوان سے منعقد ہونے والے سیمینار میں مجھ سے "جنوبی ایشیا میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے فقہی رجحانات اور اجتہاد کے ارتقائی عمل کا جائزہ" مرتب کرنے کی فرمائش کی گئی ہے۔ محترم ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

صاحب کے ارشاد پر اس سلسلے میں اپنی گزارشات ایک تجزیاتی مضمون کی صورت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہاہوں۔ خدا کرے کہ یہ طالبعلمانہ کاوش اہل فکرونظر کے ہاں کسی درجے میں قبولیت سے بہرہ ور ہو جائے، آمین یارب العالمین۔

۱۸۵۷ء کے معرکہ حریت میں جب مجاہدین آزادی کی پسپائی نے جنوبی ایشیا کی سیاسی تقدیر کو برٹش حکمرانوں کے سپرد کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ تاج برطانیہ نے براہ راست اس خطے کی زمام اقتدار سنبھال لی تو یہ خطہ زمین زندگی کے تمام شعبوں میں ہمہ گیر اور انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوا اور برصغیر کے مسلمانوں کے فقہی رجحانات بھی ان تبدیلیوں کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ تغیر و تبدل کا یہ عمل تاج برطانیہ کے نوے سالہ دور اقتدار میں مسلسل جاری رہا، مگر اس پر کچھ عرض کرنے سے پہلے ۱۸۵۷ء سے قبل کے فقہی دائروں اور رجحانات پر ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کے فقہی رجحانات

۱۸۵۷ء سے پہلے برصغیر (پاک و ہند و بنگلہ دیش و برما وغیرہ) کے قانونی نظام پر فقہ حنفی کی حکمرانی تھی اور اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں مرتب کیا جانے والا "فتاوی ہندیہ" قانون کی دنیا میں اس ملک کے دستور و قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ مسلم عوام کی اکثریت فقہ حنفی کی پیروکار تھی، حتی کہ قانون کی عملداری کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے غیر مسلم بھی فقہ حنفی اور فتاوی عالمگیری کے ذریعے ہی اس عمل میں درجہ بدرجہ شریک ہوتے تھے، البتہ اس اجتماعی رجحان کے ماحول میں کچھ مستثنیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا:

- امام ولی اللہ دہلویؒ نے جو خود اپنے ارشاد کے مطابق حنفی فقہ میں "مجتہد فی المذہب" کا مقام رکھتے تھے، فقہی حلقوں میں پائے جانے والے روایتی جمود کو توڑنے میں اس طرح پہل کی کہ فقہ حنفی کے اصولی دائرے کو قائم رکھتے ہوئے جزئیات میں اجتہادی عمل کی حوصلہ افزائی کی اور علماء و فقہاء پر زور دیا کہ وہ جزئیات و فروعات میں وقت کی ضروریات کے مطابق اجتہاد کے عمل کو آگے بڑھائیں اور مکمل جمود کے ماحول سے باہر نکلیں۔

• ۱۸۳۱ء کے معرکہ بالاکوٹ کے بعد امام ولی اللہ دہلویؒ کی درس گاہ کے مسند نشیں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ عبد الغنی محدث دہلویؒ کے حجاز مقدس ہجرت کر جانے پر دہلی میں درس حدیث کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ کی پیشرفت نے علماء کی ایک جماعت کو فقہ اور تقلید کا راستہ ترک کرنے کے رخ پر ڈالا اور یہی تغیر آگے چل کر ''اہل حدیث'' کے نام سے ایک مستقل مکتب فکر کا نقطہ آغاز ثابت ہوا جس میں مولانا محمد حسین بٹالویؒ اور نواب صدیق حسن خانؒ کی مساعی کو کلیدی مقام حاصل ہے۔

• بمبئی کے ساحلی علاقوں میں شوافع کا وجود قدیم دور سے چلا آ رہا تھا اور فقہ شافعی کے پیرو کار اس خطے میں مسلسل موجود رہے ہیں۔ میں نے لندن میں ایک عالم دین دوست کے پاس فارسی زبان میں فقہ شافعی کی مالابدمنہ (شافعی) دیکھی ہے جو بالکل حنفی مالابدمنہ کی طرز پر اور اسی حجم میں ہے اور یہ مالابدمنہ بمبئی کے ان علاقوں میں فقہ شافعی کے متن کے طور پر پڑھائی جاتی رہی ہے۔

• بہت سے علاقوں بالخصوص لکھنو میں فقہ جعفریہ کے پیرو کار بھی موجود تھے اور ان کے علماء کرام اس فقہ کے دائرے میں ان کی راہ نمائی کر رہے تھے اور اب بھی مسلسل کر رہے ہیں۔

لیکن ان استثنائی رجحانات کے باوجود ملک کے عمومی ماحول پر اصول و فروع کے دونوں دائروں میں فقہ حنفی کی بالادستی تھی اور اس کا معیار اپنی تمام تر تفصیلات سمیت فتاوی عالمگیری ہی تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد تاج برطانیہ نے برصغیر کا نظام براہ راست اپنے کنٹرول میں لے کر یہاں کا قانونی نظام تبدیل کیا اور عدالتوں میں فتاوی عالمگیریہ کی قانونی حیثیت کو ختم کر کے برٹش قوانین نافذ کرنے کا اعلان کیا تو اس خطے میں فقہ حنفی اور فتاوی عالمگیری کا قانونی حصار ٹوٹ گیا اور تمام فقہی رجحانات کو آزادانہ ماحول میں نئی صف بندی کا موقع ملا۔ اگرچہ یہ نئی صف بندی اس خطے کے مسلمان عوام کی غالب اکثریت کی فقہ حنفی کے ساتھ وابستگی پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکی، کیونکہ کم و بیش ڈیڑھ سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے اور اس دوران فقہ حنفی کے دائرے سے ہٹ کر علمی و فقہی پیشرفت کرنے والے مختلف حلقوں کی

مسلسل کوششوں کے باوجود پاکستان، بنگلہ دیش، برما اور بھارت کے مسلمانوں کی غالب اکثریت آج بھی فقہ حنفی سے وابستہ ہے، البتہ اس حقیقت سے انکار کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ غیر حنفی فقہی رجحانات نے اس دوران اپنے اہداف کی طرف خاصی پیشرفت کی ہے اور وہ ایک حد تک حنفی فقہی رجحانات پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے فقہی رجحانات

۱۸۵۷ء کے بعد فقہی رجحانات نے جو نئی کروٹ لی ہے، اسے ہم مندرجہ ذیل صورتوں میں بیان کرسکتے ہیں:

- فقہ حنفی کے روایتی حلقے میں دو الگ مکاتب فکر سامنے آئے۔ ایک بریلوی مکتب فکر جس کے بانی مولانا احمد رضا خان بریلویؒ تھے اور دوسرا دیوبندی مکتب فکر جس کے امتیازی رخ کو متعیّن کرنے کا سہرا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے سر ہے۔ ان دونوں مکاتب فکر میں بنیادی اختلاف بعض عقائد کی تعبیر و تشریح اور بعض علماء کرام کی عبارات پر اعتراضات کی بنیاد پر ان کے خلاف مولانا احمد رضا خان بریلویؒ اور ان کے رفقاء کی طرف سے لگائے جانے والے کفر کے فتوے پر ہے، جبکہ فقہی فتاوی میں دونوں کا بنیادی ماخذ فتاوی عالمگیری اور فتاوی شامی ہی چلا آرہا ہے، لیکن ایک فرق کسی حد تک بہرحال موجود ہے کہ دیوبندی مکتب فکر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اس اصلاحی تحریک کی نمائندگی کرتا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ مکمل فقہی جمود کے دائرے سے نکل کر قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی تعلیمات اور ان سے استفادہ کے رجحان کو عام کیا جائے اور فقہ کو اس کے بعد مسائل و احکام کے تیسرے بڑے ماخذ کے درجے میں رکھا جائے، جبکہ مولانا احمد رضا خان بریلویؒ اور ان کے رفقاء نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

احناف کے ہاں ایک عرصہ تک اسلوب یہ رہا ہے اور کسی حد تک اب بھی ہے کہ کسی مسئلہ کی دلیل میں بنیادی طور پر فقہی جزئیہ پیش کیا جاتا ہے اور اس کی تائید میں قرآن کریم اور حدیث نبوی سے حسب ضرورت شہادت لائی جاتی ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دراصل اس ترتیب کو بدلنے کی تحریک کی تھی۔ وہ فقہ حنفی کے دائرے سے بالکل نکل جانے

کے حق میں نہیں تھے، البتہ جزئیات و فروعات میں ضرورت سے زیادہ تصلب کے قائل نہیں تھے۔ میں بحمد اللہ تعالیٰ ایک شعوری حنفی ہوں اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اس اسلوب کو زیادہ قرین قیاس اور قرین انصاف سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک فقہائے احناف میں سے امام ابو جعفر طحاویؒ کا یہ اسلوب زیادہ آئیڈیل حیثیت رکھتا ہے کہ وہ کسی مسئلہ میں احناف کے موقف کی وضاحت یہ کہہ کر نہیں کرتے کہ امام ابو حنیفہؒ کا یہ فتوی ہے اور قرآن و حدیث اس کی یوں تائید کرتے ہیں، بلکہ وہ متعلقہ مسئلہ میں قرآن و حدیث سے تمام میسر آیات و روایات کو سامنے لاتے ہیں، ان سے پیدا ہونے والے ممکنہ پہلوؤں کا تعین کرتے ہیں، ان کا تجزیہ و تنقیح کر کے ترجیحات قائم کرتے ہیں اور پھر ایک پہلو کو ترجیح دے کر یہ کہتے ہیں کہ یہ بات جو انہوں نے قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے دلائل کے ساتھ ثابت کی ہے، امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔

بہر حال یہ ایک ضمنی بات تھی جو درمیان میں آگئی ہے۔ ہم دراصل ۱۸۵۷ء کے بعد احناف کے دائرے میں سامنے آنے والے دو مکاتب فکر یعنی دیوبندی اور بریلوی کے فقہی رجحانات میں فرق کی بات کر رہے تھے جو اگرچہ عملاً زیادہ نمایاں دکھائی نہیں دیتا، لیکن اس حد تک ضرور موجود ہے کہ دیوبندی مکتب فکر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصلاحی تحریک سے وابستگی کا کھلم کھلا اظہار کرتا ہے، مگر بریلوی مکتب فکر نہ صرف یہ کہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، بلکہ وہ اس قدیمی فقہی اور سماجی روایت کی مکمل نمائندگی کا دعویدار ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصلاحی تحریک سے قطع نظر برصغیر میں پہلے سے چلی آرہی تھی، البتہ فقہی دائروں میں اس اصولی ہم آہنگی اور عملی تنوع کے باوجود بعض عقائد کی تعبیر و تشریح اور بعض اکابر علماء کی عبارات کی توجیہ و تطبیق میں دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر کا شدید اختلاف آج بھی کفر و اسلام کا معرکہ سمجھا جاتا ہے۔

یہاں اسی دائرے کے ایک اور فقہی رجحان کا تذکرہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے جسے فرنگی محلی مکتب فکر کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ علمائے فرنگی محل بھی حنفی تھے اور انہوں نے حنفی فقہ کی بہت علمی خدمت کی ہے اور یہ اعزاز انہی کے

حصے میں جاتا ہے کہ درس نظامی کے نام سے جو نصاب تعلیم آج برصغیر کے دیوبندی، بریلوی بلکہ اہل حدیث مدارس میں بھی پڑھایا جاتا ہے، اس کا بنیادی ڈھانچہ فرنگی محل ہی کے ایک عالم دین ملا نظام الدین سہالویؒ کا طے کردہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اس فقہی رجحان کی نمائندگی میں حضرت مولانا عبدالحئی لکھنویؒ کا نام سب سے نمایاں رہا، لیکن مولانا عبدالحئی لکھنوی کے بعد اس فقہی مکتب فکر کو اس سطح کی کوئی علمی شخصیت میسر نہ آسکی جو اس کے الگ تشخص کو قائم رکھ سکتی، اس لیے یہ آہستہ آہستہ دیوبندی مکتب فکر میں ضم ہوتا چلا گیا۔

• فقہ حنفی سے انحراف پر ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی رکھی جا چکی تھی جب حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی حجاز مقدس ہجرت کے بعد دہلی میں حضرت مولانا میاں نذیر حسین دہلویؒ نے تقلید ترک کرنے کا اعلان کیا اور دہلی میں درس حدیث دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اہل حدیث حضرات اسی بنا پر اپنے اس مکتب فکر کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصلاحی تحریک کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ اس مکتب فکر نے بعد میں باقاعدہ طور پر اپنے لیے ''اہل حدیث'' کا عنوان اختیار کیا اور اسی عنوان کے ساتھ یہ مکتب فکر اب تک کام کر رہا ہے، جبکہ حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ کے تلامذہ میں سے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ اور حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے حلقہ نے اپنا مورچہ دیوبند میں لگایا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصلاحی تحریک کے تسلسل کو (بالخصوص فکری اور سیاسی محاذ پر) آگے بڑھانے کا اعلان کیا۔ دیوبند میں مدرسہ عربیہ کے نام سے ۱۸۶۵ء میں جس مدرسہ کا آغاز ہوا، اس کے بانیوں میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حاجی عابد حسینؒ نے اپنے اس نئے مدرسے میں، جو بعد میں دار العلوم دیوبند کے نام سے دنیا بھر میں متعارف ہوا، نصاب تعلیم کی بنیاد درس نظامی پر رکھی، لیکن اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمی اصلاحات اور سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے روحانی تربیتی ذوق کو بھی شامل کر لیا، چنانچہ ان تینوں کے امتزاج سے ایک مستقل فقہی مکتب فکر وجود میں آگیا جس کے اثرات و ثمرات آج دنیا بھر میں بالخصوص برصغیر

پاک و ہند و بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے علمی، دینی اور تعلیمی حلقوں میں نمایاں دکھائی دے رہے ہیں۔

دوسری طرف اہل حدیث مکتب فکر کا دائرہ بھی برابر پھیلتا جا رہا ہے اور دنیا کے بیشتر حصوں میں اس کے پیرو کار موجود ہیں۔ اہل حدیث مکتب فکر نے حنفی فقہ سے انحراف کرتے ہوئے الگ تشخص قائم کرنے کے لیے چند مسائل مثلاً ترک تقلید، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین، طلاق ثلاثہ اور دیگر بعض جزوی مسائل کو بنیاد بنایا اور قرآن و حدیث سے اپنے ذوق کے مطابق ان کے دلائل پیش کرنا شروع کیے تو اس کے جواب میں حنفی بالخصوص دیوبندی علماء نے بھی احادیث کی تدریس و تعلیم میں فقہ حنفی کے دفاع کا راستہ اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ اس مبحث میں تشدد اور فتوی بازی بھی در آئی جس سے احادیث نبویہ کی تدریس میں فقہ حنفی کے مسائل واحکام کے اثبات یا ان کے رد نے ایک مستقل معرکہ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کا آغاز حضرت مولانا میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ نے کیا۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فقہ حنفی کے دفاع کا مورچہ سنبھالا اور پھر ایک طرف سے مولانا محمد حسین بٹالویؒ، مولانا محمد جونا گڑھیؒ اور نواب صدیق حسن خانؒ جبکہ دوسری طرف سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی جیسے سر برآوردہ علماء کرام اور ان کے تلامذہ نے اس علمی معرکہ آرائی کو ایسی مستقل حیثیت دی کہ آج بھی دینی مدارس میں صحاح ستہ کی تدریس و تعلیم میں اسی بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہتا ہے۔

میری طالب علمانہ رائے میں اس بحث کے آغاز کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اہل حدیث علماء کرام کو اپنے الگ تشخص کے اظہار کے لیے اس کی ضرورت تھی جبکہ حنفی علماء کے لیے فقہ حنفی کے دفاع کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا، مگر اب جبکہ دونوں کی طرف پوزیشن، موقف، دلائل اور علمی مباحث پوری طرح واضح ہو چکے ہیں، دورۂ حدیث کی تدریس میں دونوں فریقوں کا سارا زور انہی مباحث پر اس حد تک صرف ہوتے چلے جانا کہ باقی بہت سے ضروری مباحث نظر

انداز ہو رہے ہیں، کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے، لیکن بہر حال یہ صورت حال اب تک قائم ہے اور اس میں کسی بنیادی تبدیلی کے امکانات سر دست دکھائی نہیں دے رہے۔

• ۱۸۵۷ء کے بعد ایک اور فقہی اور فکری مکتب فکر سامنے آیا جس نے فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث نبوی کو بھی احکام و مسائل کا ماخذ بنانے سے گریز کرتے ہوئے صرف قرآن کریم کو عقائد و احکام کی بنیاد قرار دینے کا اعلان کیا۔ یہ سر سید احمد خان مرحوم کا مکتب فکر ہے جس نے حدیث نبوی کو نہ صرف یہ کہ احکام و قوانین کا مستقل ماخذ تسلیم نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم کی تشریح میں بھی حدیث نبوی کو اتھارٹی ماننے سے انکار کر دیا اور کامن سینس کی بنیاد پر قرآن کریم کی تشریح کو بنیاد بنا کر اسلامی عقائد اور احکام و قوانین کی از سر نو تشریح و تعبیر کو مطمح نظر بنا لیا۔ یہ مکتب فکر بھی موجود و متحرک ہے اور ہمارے دور میں اس کی نمائندگی میں چودھری غلام احمد پرویز صاحب نے سب سے زیادہ شہرت پائی ہے۔ بعض حلقے مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کو بھی اسی مکتب فکر سے وابستہ قرار دیتے ہیں، لیکن میری طالب علمانہ رائے میں یہ بات درست نہیں ہے، اس لیے کہ علامہ اقبالؒ جس طرح جابجا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا حوالہ دیتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں، اس کے پیش نظر انہیں حدیث نبوی کی حجیت کا انکار کرنے والوں یا اس کی حیثیت کو کم کرنے والوں میں شمار کرنا علامہ محمد اقبالؒ کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔

• ایک اور فقہی رجحان اور علمی اسلوب بھی اس دوران سامنے آیا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس مکتب فکر نے فقہ سے بغاوت اور اس کی مذمت کرنے کے بجائے اس کی افادیت کو تسلیم کیا، البتہ فقہ حنفی کی پابندی کو ضروری نہ سمجھتے ہوئے قرآن و سنت سے براہ راست استدلال اور اس کے بعد چاروں فقہی مذاہب مثلاً حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی بلکہ ظاہری مذہب سے بھی حسب ضرورت استفادہ کو ترجیح دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو اسی زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ چند امتیازی مسائل سے ہٹ کر اہل حدیث علماء کرام اور مفتیان

کرام کا عمومی اور عملی اسلوب بھی یہی ہے، لیکن بعض اکابر اہل حدیث علماء کرام کی طرف سے فقہ کی مذمت اور اسے مطلقاً مسترد کر دینے کی واضح تصریحات کے باعث مذکورہ بالا اصحاب علم کا ان سے ہٹ کر الگ تذکرہ میں نے ضروری سمجھا ہے۔

یہ تو طالب علمانہ تاثرات ہیں ان فقہی رجحانات کے بارے میں جو ۱۸۵۷ء کے بعد سامنے آئے اور جن کی کارفرمائی نہ صرف ۱۹۴۷ء تک قائم رہی بلکہ وہ اس کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں اور اپنے اپنے دائروں میں پوری طرح مصروف عمل ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی اجتہادی مساعی اور ارتقائی عمل

اب ہم آتے ہیں ان اجتہادی کوششوں اور اجتہادی مساعی کے اس ارتقائی عمل کی طرف جو ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا اور مختلف دائروں میں اجتہاد کے نام پر یہ عمل آج بھی جاری ہے، لیکن اس کے عملی پہلوؤں پر گفتگو سے قبل ان مختلف فکری دائروں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جو ان اجتہادی کوششوں اور اجتہادی عمل کی بنیاد بنے۔

اجتہادی کوششوں کی بنیاد بننے والے فکری دائرے

- اجتہاد کا ایک فکری دائرہ تو یہ تھا اور اب بھی ہے کہ جس طرح یورپ میں مذہبی اصلاحات کی تحریک مارٹن لوتھر کی راہ نمائی میں چلی اور اس نے بائبل کی تشریح میں پاپائے روم اور چرچ کو فائنل اتھارٹی ماننے سے انکار کر کے پروٹسٹنٹ ازم کے عنوان سے مذہب کی تشریح نو بلکہ ری کنسٹرکشن کا راستہ اختیار کیا، اسی طرح ہم بھی پورے مذہبی ڈھانچے کی تشکیل نو کریں اور ماضی کے تمام اجتہادات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف قرآن کریم کی بنیاد پر اسلام کا نیا اعتقادی، عملی اور اخلاقی ڈھانچہ طے کریں۔ اس گروہ کے نزدیک ”اجتہاد“ صرف اس انتہائی عمل کا نام ہے اور اس سے کم وہ کسی درجہ کے عمل کو اجتہاد تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔
- اجتہاد کا دوسرا دائرۂ فکر یہ سامنے آیا کہ فقہی مذاہب کے حصار کو ختم کر کے قرآن و حدیث سے براہ راست استنباط و استدلال کیا جائے، البتہ ثانوی درجے

میں کسی خاص فقہی مذہب کی پابندی نہ کرتے ہوئے بوقت ضرورت کسی بھی فقہی مذہب سے استدلال کرلیا جائے۔

- اجتہاد کے نام پر ایک سوچ اور فکر یہ بھی پائی جاتی ہے کہ امت میں "اجتہاد مطلق" کا دروازہ بند ہوجانے کا جو نظریہ پایا جاتا ہے، اسے مسترد کر کے فقہ کی تشکیل نو کا کام اسی "زیرو پوائنٹ" سے دوبارہ شروع کیا جائے جہاں سے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین نے اس کا آغاز کیا تھا۔
- اجتہاد کا ایک نظریہ یہ بھی سامنے آیا کہ فقہ حنفی کے اصولی دائرے کا قائم رکھتے ہوئے فروعات و جزئیات میں دوسری مسلمہ فقہوں سے بھی بوقت ضرورت استفادہ کیا جائے۔
- ایک سوچ یہ بھی ہے کہ اصول و فروع دونوں میں فقہ حنفی کی پابندی کو بہر صورت قائم رکھا جائے اور جہاں حالات اور ضروریات کا تقاضا ہو، وہاں فقہ حنفی کے اصولوں کے تحت ہی فروعات و جزئیات کے درجے میں اجتہاد کیا جائے۔
- جعفری اور زیدی فقہ کے علماء کرام کے ہاں ان دو فقہوں کے الگ اصول وضوابط ہیں جن کے تحت وہ اجتہادی عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔
- بہت سے ذہنوں میں اجتہاد کے بارے میں یہ تصور بھی پایا جاتا ہے کہ اجتہاد کسی علمی، استنباطی اور استدلالی سعی و کاوش کا نام نہیں، بلکہ پاپائے روم کی طرح کا کوئی صواب دیدی اختیار علمائے کرام کو حاصل ہے اور انہیں سوسائٹی کی ضروریات اور مطالبات کو پورا کرنے کے لیے یہ صوابدیدی اختیار استعمال کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

یہ اجتہاد کے مختلف مفہوم ہیں جو مختلف حلقوں اور طبقات کے ذہنوں میں ہیں اور ہر طبقہ کا "اجتہاد" ایک الگ اور مستقل مفہوم کا حامل ہے۔

۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان کی اجتہادی کاوشیں

ان تمام امور کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم ان عملی کاوشوں میں سے مثال کے طور پر چند ایک کا تذکرہ کرنا چاہیں گے جن سے اس خطے کے مسلمان عوام نے ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان عرصے میں استفادہ کیا:

•۱۸۵۷ء کے بعد ایک عملی مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ حنفی فقہ میں جمعہ کی نماز اجتماعی طور پر ادا کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ امام حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ہو جبکہ دہلی کے اقتدار پر تاج برطانیہ کا قبضہ ہو جانے کے بعد کوئی مجاز حکومت موجود نہیں رہی تھی جو امام و خطیب کا تقرر کر سکے یا جس کا باضابطہ نمائندہ نماز جمعہ میں خطبہ و امامت کا فریضہ سرانجام دے سکے تو اب نماز جمعہ کی ادائیگی کیسے ہوگی؟ اس پر علمائے کرام نے اجتماعی طور پر یہ راستہ اختیار کیا کہ کسی امام پر مسلمانوں کی اکثریت کی رضامندی کو اسلامی حکومت کی طرف سے تقرری کا قائم مقام قرار دیتے ہوئے اس شرط میں لچک پیدا کی اور جمعۃ المبارک کو ساقط کرنے کے بجائے اس کا تسلسل باقی رہنے دیا۔ یہ بلاشبہ ایک اجتہادی عمل تھا جو ۱۸۵۷ء کے بعد سامنے آیا جبکہ بعض حلقوں میں اس صورت میں جمعہ کی ادائیگی کے ساتھ احتیاطاً ظہر کی نماز کی ادائیگی کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

•ملک کا قانونی نظام یکسر تبدیل ہو جانے کے باعث مسلمانوں کو سب سے زیادہ مشکل خاندانی معاملات مثلاً نکاح و طلاق اور وراثت و کفالت وغیرہ میں پیش آئی کہ ان خالص مذہبی معاملات میں غیر اسلامی قانون اور غیر اسلامی عدالتوں کے فیصلوں کو کیسے قبول کیا جا سکے گا؟ اس پر ایک طرف تو برطانوی حکومت نے یہ سہولت دے دی کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین میں ”محمڈن لا“ یعنی اسلامی شرعی قوانین کی اہمیت کو تسلیم کیا اور عدالتوں میں انہی قوانین کی پابندی کو لازمی قرار دیا، دوسری طرف علمائے کرام نے ایسے تنازعات میں ”قضا“ کا راستہ بند دیکھ کر ”تحکیم“ کے شرعی اصول کی طرف توجہ دی اور برصغیر کے مختلف علاقوں بالخصوص صوبہ بہار میں ”امارت شرعیہ“ یا اس سے ملتے جلتے ناموں کے ساتھ اس عمل کو آگے بڑھایا جس سے عام مسلمانوں کو یہ سہولت حاصل رہی کہ وہ اگر اپنے تنازعات کا فیصلہ خالصتاً شرعی بنیادوں پر کرانا چاہتے ہیں تو وہ ایسے اداروں سے استفادہ کر سکیں۔

•برطانوی استعمار کے قبضہ کے بعد برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے بہت سے اکابر علمائے کرام نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں ہی

ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر آزادی کے حصول کے لیے جہاد کو شرعی فریضہ قرار دے دیا تھا اور اس فتوی کی بنیاد پر درجنوں مسلح تحریکوں نے برطانوی استعمار کے خلاف جنگ لڑی ہے، لیکن ایک مرحلہ آیا کہ اس طریق کار پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آئی تو علمائے کرام نے مسلح جدوجہد کا راستہ ترک کر کے پرامن سیاسی تحریک کا طرز عمل اپنایا اور حصول آزادی کے لیے پرامن سیاسی جدوجہد کو ہی ''جہاد آزادی'' کا قائم مقام قرار دے کر اپنی تمام تر صلاحیتیں اور توانائیاں اس کے لیے وقف کر دیں۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ بھی ایک اجتہادی عمل تھا جو برصغیر کے علمائے کرام کی اجتہادی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

• مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعوی کیا اور برطانوی استعمار کے زیر سایہ ایک نئی امت پروان چڑھائی گئی تو ان کے ساتھ معاملات اور معاشرتی تعلقات کے تعین کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ایسی صورت میں فقہی احکام و قوانین کا ایک مستقل دائرہ موجود ہے جو ماضی کی اسلامی حکومتوں میں روبہ عمل بھی رہا ہے، لیکن معروضی حالات میں ان احکام و قوانین پر عمل دشوار تھا۔ اس لیے مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی اس تجویز کو علمائے کرام نے اجتماعی طور پر قبول کر لیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں پر فقہی احکام کا اطلاق کرنے کی بجائے انہیں مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم گروہ کے طور پر قبول کر کے ان کا اس حیثیت سے معاشرتی درجہ طے کیا جائے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ بھی علماء کرام کا ایک اجتہادی عمل تھا جس پر وہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی قائم رہے اور قادیانیوں پر فقہی احکام کے اطلاق کا مطالبہ کرنے کے بجائے انہوں نے انہیں دستوری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے پر قناعت کر لی۔

• تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں شریک علماء کرام کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی تو اس کی شرعی حیثیت اور اس کا شرعی ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں بھی فقہی احکام و قوانین کے مستقل ابواب موجود ہیں اور مغل بادشاہت اور عثمانی خلافت کے نظائر بھی تاریخ کے ریکارڈ پر ہیں، لیکن یہ دونوں صورتیں دور جدید کے لیے

قابل قبول نہیں تھیں، اس لیے علماء کرام نے ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے فقہی احکام و قوانین کے من وعن اطلاق پر اصرار نہیں کیا بلکہ قرآن و سنت کی پابندی کی شرط کے ساتھ جمہوری حکومت کے تصور کو قبول کر لیا جو بلاشبہ ایک اجتہادی عمل تھا جس کے تحت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی طرف سے پاکستان میں جمہوری حکومت اور قرآن وسنت کی بالادستی کی یقین دہانی پر اعتماد کرتے ہوئے علماء کرام کی ایک بڑی تعداد تحریک پاکستان میں شامل ہوئی اور قیام پاکستان کے بعد بھی قرارداد مقاصد، تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات کی صورت میں اسی اجتہادی سوچ اور عمل کو آگے بڑھایا گیا۔

یہ چند مثالیں اجتماعی اور قومی سطح کے ان اجتہادات کی ہیں جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے درمیانی عرصہ میں اس خطے میں عملاً رونما ہوئے جبکہ جزوی اجتہادات کا دامن بھی بہت وسیع رہا جس کا مشاہدہ مختلف مکاتب فکر کے بیسیوں بڑے مفتی صاحبان کے فتاویٰ اور مراکز فتاویٰ کے علمی فیصلوں کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ دار الافتاء کے نام سے قائم ان مراکز کا شمار سیکڑوں میں ہے مگر ان میں بیسیوں ایسے ہیں جو خود علماء کرام اور علمی حلقوں کے لیے مراجع کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایسے علمی مراکز پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور برما میں مختلف فقہی مکاتب فکر اور مذاہب کے حوالے سے مسلسل مصروف کار ہیں۔ ان مراکز کے جاری کردہ ہزاروں بلکہ لاکھوں فتاویٰ کا جائزہ لیا جائے تو ان میں سیکڑوں ایسے فتاویٰ ملیں گے جن میں مفتیان کرام نے ماضی کے فتاویٰ سے ہٹ کر زمانے کی ضروریات کے پیش نظر اجتہادی راستہ اختیار کیا ہے، البتہ ان میں اجتہادی دائرہ وہی ہے کہ اپنے اپنے فقہی مذاہب کے دائرے میں رہتے ہوئے اسی کے اصولوں کی روشنی میں نئے فتوے دیے گئے ہیں جبکہ بعض فتاویٰ میں فقہی مذاہب کے حصار کو کراس کرنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ مثال کے طور پر دو مسئلوں کا حوالہ دینا چاہوں گا:

- ایک یہ کہ رؤیت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟ اس میں احناف متقدمین کا موقف شروع سے یہ چلا آ رہا ہے کہ اختلاف مطالع کا وجود تو ہے لیکن رؤیت ہلال میں شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے اور کسی جگہ بھی چاند نظر آ جانے کے شرعی ثبوت اور مصدقہ خبر پر باقی سب مقامات پر روزے اور عید کا

اعلان ضروری ہے یا کم از کم یہ ہے کہ ایسا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ پوزیشن بریلوی مکتب فکر کے بانی مولانا احمد رضا خان بریلوی اور دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندی تک اسی طرح رہی ہے، لیکن اس کے بعد جب اختلاف مطالع کا اعتبار کرنے کا فتوی دیا گیا تو متقدمین احناف کے موقف اور فتوی کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔

- دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مفقود الخبر خاوند کی زوجہ کو نکاح ثانی کی اجازت کے بارے میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے قول کی بجائے عمومی ضرورت کی بنا پر مالکیہ کے قول پر فتوی دیا گیا ہے۔ یہ دو مسئلے میں نے مثال کے طور پر ذکر کیے ہیں۔ اگر اس رخ پر گزشتہ صدی کے ذمہ دار مفتیان کرام کے فتاوی کا جائزہ لیا جائے تو سیکڑوں ایسے فتاوی مل جائیں گے جن میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے اور یہ عمل محدود پیمانے پر ہی سہی، مگر بہرحال اجتہاد ہی کا عمل ہے۔

مسلمانوں کے تنازعات و مقدمات کے شرعی قوانین کے مطابق فیصلوں کے لیے قضا، تحکیم اور افتاء کے تین ادارے ہیں جن میں سے قضا کے پاس تنفیذ کی قانونی قوت اور تحکیم کے پاس اس کی اخلاقی قوت موجود ہوتی ہے جبکہ افتاء کا کام صرف مسئلہ کی شرعی پوزیشن کو واضح کر دینا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے عمومی قانونی نظام میں "قضا" کا شرعی ادارہ موجود نہیں رہا تھا، لیکن اندرونی طور پر نیم خود مختار مسلم ریاستوں میں قضا کا یہ ادارہ بھی کام کرتا رہا ہے۔ مثلاً بہاولپور، قلات، سوات اور دیگر ایسی ریاستوں میں ان کے دائرۂ اختیار کی حدود میں قضا کا شعبہ قائم تھا اور ان میں فقہی احکام و ضوابط کے مطابق ریاست کے مقرر کردہ قاضی مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ ان ریاستوں میں قضا کا یہ ادارہ ان کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق تک موجود رہا ہے، جبکہ تحکیم کے شعبہ نے مختلف علاقوں میں اس خلا کو بعض معاملات میں پر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے ہٹ کر بعض خطوں میں "امارت شرعیہ" کا باضابطہ نظام بھی موجود رہا ہے، البتہ فتوی کا شعبہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک برصغیر کے ہر علاقے میں اور ہر سطح پر قائم رہا ہے جس سے عام مسلمانوں کو کسی بھی معاملے میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کی سہولت حاصل رہی ہے اور مسلمانوں کی غالب اکثریت مسلسل اس سہولت سے استفادہ کرتی چلی آ رہی ہے۔

۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء کا تحفظاتی دور اس کے نتائج

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا نوے سالہ دور دراصل برصغیر یعنی پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور برما پر مشتمل خطے کے مسلمانوں کے لیے مجموعی طور پر ایک تحفظاتی دور تھا جس میں دین سے وابستہ ہر شخص اور طبقہ کا بنیادی ہدف صرف یہ تھا کہ جو کچھ بچایا جا سکتا ہو اور جس طریقے سے بھی بچایا جا سکتا ہو، بچا لیا جائے۔ اندلس کی مثال ہمارے سامنے تھی کہ کم و بیش آٹھ سو برس حکومت کرنے کے بعد جب مسلمانوں کو طاقت کے زور سے وہاں سے نکال دیا گیا تو اسلام کو بھی کسی شکل میں وہاں نہیں رہنے دیا گیا۔ یہی خطرہ برصغیر کے مسلمانوں کو بھی درپیش تھا اور ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شہادت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکمرانی اپنی پالیسی ترجیحات کے حوالے سے اس خطرہ کی مسلسل نشان دہی کر رہا تھا، اس لیے دین کی بات کرنے والے ہر طبقہ اور گروہ نے اس نتیجہ اور انجام سے برصغیر کے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے اپنے دائرے میں کردار ادا کیا۔ ان میں سے ہر ایک کے طرز عمل اور ترجیحات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور پوری شدت کے ساتھ کیا بھی گیا ہے، لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو باہمی تنوع، اختلاف بلکہ مسلسل کشمکش اور تنازعات کے باوجود یہ مساعی برصغیر کو اندلس بننے سے روکنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے سو سالہ دور حکومت اور پھر تاج برطانیہ کی نوے سالہ حکمرانی کے بعد جب اس خطے کے مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء کی آزاد فضا میں سانس لینا شروع کیا تو انہیں اپنے دین کے ساتھ عقیدہ و عمل دونوں حوالوں سے اپنی وابستگی میں کوئی جوہری فرق نظر نہیں آیا۔

میں یہاں دو پہلوؤں کی طرف بطور خاص توجہ دلانا چاہوں گا:

- ایک یہ کہ یورپ کی مسیحی قوتیں اندلس پر دوبارہ قبضے کے بعد جو نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں، وہ نتائج کم و بیش دو صدیوں کے مسلسل اقتدار کے باوجود برصغیر میں کیوں حاصل نہیں کر سکیں؟ اس کا جواب تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر یہ عرض کروں گا کہ اندلس میں اسلام تلوار کے ساتھ داخل ہوا تھا، اس لیے جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں تلوار رہی، وہ مضبوط و مستحکم رہے اور جونہی ان کی تلوار کند ہوئی، وہ اسلام سمیت وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، لیکن برصغیر میں اسلام کی آمد تلوار سے کہیں

زیادہ صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے ذریعے ہوئی ہے۔ مجھے ہندوستان کو اسلام سے متعارف کرانے میں محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور دیگر مسلم جرنیلوں کی شاندار خدمات سے انکار نہیں ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کے فروغ میں سید علی ہجویریؒ اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ جیسے اکابر اولیاء کرام کا کردار ان سے کہیں زیادہ اہم اور اساسی حیثیت رکھتا ہے اور میرا طالب علمانہ تجزیہ یہ ہے کہ یہاں اسلام دلوں کے راستے سے آیا تھا اور برطانوی استعمار کے دو سو سالہ اقتدار کے دوران ایسے ہی "اصحاب قلب و نظر" نہ صرف موجود بلکہ بیدار و متحرک بھی رہے ہیں، اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی اور تاج برطانیہ اپنے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود "دل دریا سمندروں ڈونگے" کی اس گہرائی تک رسائی حاصل نہیں کر پائے کہ یہاں کے مسلمانوں کی اپنے دین کے ساتھ وابستگی کو "تارپیڈو" کر سکیں۔

اس تحفظاتی کشمکش اور دفاعی جنگ میں سب سے نمایاں کردار ان دینی مدارس کا ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد دینی تعلیم کے تحفظ کے نام پر وجود میں آئے اور انہوں نے صرف دینی تعلیم کے تسلسل کو ہی باقی نہیں رکھا، بلکہ ایمان و عقیدہ، فکر و نظر، تمدن و ثقافت اور اقدار و روایات کا کوئی شعبہ بھی ان کی سعی مسلسل کی جولان گاہ سے باہر نہیں رہا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل جو دینی مدرسے سرکاری نظم کے تحت اور ریاستی وسائل کے ساتھ کام کر رہے تھے، وہ ۱۹۴۷ء کے بعد اپنے وجود اور کردار سے محروم ہو گئے تھے۔ ہزاروں مدارس جبراً بند کر دیے گئے، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں، سیکڑوں مدارس بلڈوز ہوئے، ہزاروں علماء گرفتار ہوئے اور پھانسیوں پر چڑھ گئے حتیٰ کہ یوں نظر آنے لگا کہ اب نہ صرف دینی مدرسہ بلکہ مولوی، امام، خطیب، مدرس اور مفتی نام کی کوئی چیز اس خطہ زمین میں موجود نہیں رہے گی، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد امداد باہمی کی بنیاد پر قائم ہونے والے ان دینی مدارس نے اس خلا کو اس کامیابی کے ساتھ پر کیا کہ برصغیر کی کوئی بستی مدرسہ، مولوی، مفتی، خطیب، حافظ اور قاری کے وجود سے خالی نہیں ہے بلکہ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے دینی مدارس اپنی اس پیداوار میں نہ صرف خود کفیل ہیں، بلکہ دنیا بھر میں

اپنا مال ایکسپورٹ بھی کر رہے ہیں کہ آپ دنیا کے کسی خطے میں چلے جائیں، آپ کو وہاں مسلمانوں کی مساجد و مکاتب میں برصغیر کے کسی نہ کسی مدرسہ کا کوئی فاضل اور تعلیم یافتہ دینی خدمات سرانجام دیتا ہوا نظر آئے گا۔

آج آپ کو ہزاروں مدارس بڑی بڑی بلڈنگوں میں نظر آئیں گے اور سیکڑوں مدارس ایسے ہیں جن کے سالانہ بجٹ کروڑوں روپے میں ہیں، جبکہ ان کی غالب اکثریت کسی قسم کی سرکاری امداد و تعاون سے بے نیاز ہو کر محض عوام کے رضاکارانہ تعاون کے ساتھ یہ نظام چلا رہے ہیں، لیکن ان مدارس کی ابتدائی صورت پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ دینی تعلیم سے بہرہ ور ایک عالم دین نے کسی مسجد میں ڈیرہ لگا لیا ہے، اس کے گرد چند طلبہ جمع ہو گئے ہیں، ان کی رہائش بھی مسجد میں ہے اور محلہ کے مسلمانوں نے انہیں اپنے گھر سے روٹی دینا شروع کر دی ہے جبکہ مولوی صاحب تنخواہ یا مراعات کے کسی تعین کے بغیر کام کیے جا رہے ہیں۔ برصغیر کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد نے اس طریقے سے تعلیم پائی ہے اور میں نے اپنے بچپن میں مدرسہ کا یہ نظام نہ صرف دیکھا ہے بلکہ ابتدائی چند سال اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ایثار و قناعت، صبر و حوصلہ اور عزیمت کی بنیاد پر تشکیل پانے والے اس رضاکارانہ تعلیمی نظام کے وسیع جال نے ''تحفظ و دفاع'' کی اس جنگ میں کلیدی کردار ادا کیا اور اسی کے بارے میں مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے یہ کہا تھا کہ اس مدرسے کو اسی حالت میں رہنے دو، اس لیے کہ یہ مدرسہ اگر موجود نہ رہا تو اس کا جو نتیجہ ہو گا، وہ میں اپنی آنکھوں سے اسپین میں دیکھ آیا ہوں۔

• دوسری بات جس کا تذکرہ میرے خیال میں یہاں ضروری ہے، یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی یہ ''تحفظاتی جنگ'' جہاں انہیں اسپین اور اندلس کے تناظر سے الگ کرتی ہے، وہاں مغربی استعمار کے تسلط میں آنے والے دیگر مسلم ممالک سے بھی انہیں اس حوالے سے ممتاز کرتی ہے کہ یہاں کے اہل دین نے صرف عقیدہ و علم کی حفاظت نہیں کی بلکہ اپنے معاشرتی ماحول اور سماجی روایات کا تسلسل بھی باقی رکھا ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ دنیا کے بہت سے مسلم ممالک میں استعماری تسلط سے پہلے اور بعد کے معاشرتی ماحول، بالخصوص

مذہبی حلقوں کی طرز معاشرت میں نمایاں فرق نظر آتا ہے، لیکن برصغیر کے تینوں بلکہ چاروں ممالک (پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور برما) کے مسلمانوں میں عام طور پر استعماری دور سے پہلے اور بعد کے ماحول میں آپ کوئی اساسی فرق نہیں دیکھ پائیں گے۔ ہمارے بہت سے دوست اسے تنگ نظری پر محمول کریں گے، لیکن آج کے عالمی ماحول میں اس کے ثمرات و نتائج دیکھ کر میں اسے دور اندیشی اور حکمت عملی سے تعبیر کروں گا جس کے نتیجے میں اس خطے کے مسلمان آج پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کھڑے ہیں کہ عالمی استعمار اپنے سو سالہ بالواسطہ، نوے سالہ براہ راست اور اس کے بعد ساٹھ سالہ ریموٹ کنٹرول تسلط کے باوجود ان کے ایمان و عقیدہ، فکر و نظر اور تمدن و ثقافت میں سے کسی چیز میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ گویا کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

ہو سکتا ہے کہ آپ حضرات میری اس گزارش سے اتفاق نہ کریں، لیکن میں تاریخ کے ایک شعوری طالب علم کی حیثیت سے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک برصغیر میں لڑی جانے والی اس تحفظاتی جنگ اور اس کی ترجیحات کو بھی ان چند درویش صفت بزرگوں کی "فقہی بصیرت" کا آئینہ دار قرار دوں گا جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کا صحیح ادراک کرتے ہوئے مسلمانوں کو ایسے راستے پر ڈال دیا کہ وہ عقیدہ و ثقافت، دونوں حوالوں سے آج بھی عالمی استعمار کے لیے سب سے بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سمندری کا سفر

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۱ ستمبر ۲۰۱۳ء)

خاصے عرصے کے بعد سمندری جانے کا اتفاق ہوا۔ حضرت مولانا محمد علی جانباز رحمہ اللہ تعالی ہمارے بزرگوں میں سے تھے، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے ساتھ ان کا گہرا تعلق تھا اور جمعیت علماء اسلام اور مجلس تحفظ ختم

نبوت کی جدوجہد میں مسلسل سرگرم عمل رہتے تھے۔ گھنٹہ گھر چوک کے پاس ایک مسجد میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ مجھے اس دور میں ان کی خدمت میں وہاں حاضر ہونے کا موقع ملا ہے، اس کے بعد ان کے فرزند مولانا ضیاء الرحمن فاروقی شہیدؒ کے ساتھ جمعیت طلباء اسلام اور جمعیت علماء اسلام میں طویل رفاقت کا دور گزرا۔ تحریک ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم میں ساتھ رہا۔ ہمارے درمیان بے تکلف دوستی اور رفاقت کا تعلق تھا، پھر ان کی رفتار تیز ہوگئی اور میری سست روی پاؤں کی زنجیر بن کر رہ گئی۔

گزشتہ روز سمندری حاضری کا موقع ملا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب تیسری پشت بھی دینی جدوجہد کے خاندانی ذوق سے پوری طرح بہرہ ور اور اس کے لیے مسلسل مصروف محنت ہے۔ مولانا ریحان محمود ضیاء، مولانا ابوبکر فاروقی اور مولانا محمد علی جانبازؒ کے دیگر پوتوں کی سرگرمیاں باعث مسرت ہوئیں۔ مجھے مولانا محمد ابوبکر فاروقی نے جمعرات کو حدیث نبویؐ کے حوالہ سے عشاء کے بعد ایک مجلس میں گفتگو کے لیے دعوت دی تھی۔ حسب معمول صبح اسباق سے فارغ ہو کر گوجرانوالہ سے روانہ ہوا اور ڈجکوٹ روڈ فیصل آباد میں حافظ محمد ریاض قادری کے قائم کردہ ''قرآن سنٹر'' میں کچھ وقت گزارا۔ یہ سنٹر بیک وقت تعلیمی، اشاعتی، تربیتی اور خانقاہی دائروں میں خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ نماز عصر کے بعد نمازیوں سے مختصر گفتگو کے بعد حافظ محمد ریاض قادری صاحب کے ہمراہ سمندری کا سفر ہوا۔ راستہ میں ڈجکوٹ کے مقام پر ایک بزرگ دوست مولانا عبد الجبار نے اپنے مدرسہ جامعہ تعلیم القرآن میں کچھ دیر رکنے کے لیے کہہ رکھا تھا، مغرب کی نماز وہاں ادا کی اور عشاء تک ہم سمندری پہنچ گئے۔

مولانا محمد ابوبکر فاروقی نے نوجوانوں میں حدیث نبویؐ کے مطالعہ کا ذوق بیدار کرنے کے لیے مہم شروع کر رکھی ہے اور ''حدیث کوئیز'' کے عنوان سے معلوماتی انعامی مقابلوں کا پروگرام طے کیا ہوا ہے۔ اس مقصد کے لیے سینکڑوں سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ایک معلوماتی کتاب انہوں نے ''علوم حدیث کا انسائیکلوپیڈیا'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کی ہے جو مختلف علوم حدیث کے بارے میں بیش بہا معلومات کا ذخیرہ اور مصنف کے ذوق وشوق کی علامت ہے۔ مجھے یہ سلسلہ اچھا لگا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس کار خیر کا دائرہ سمندری تک محدود نہ رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد جامع مسجد محمدی میں ایک

اجتماع میں حدیث نبویؐ کی حجیت اور افادیت وضرورت کے عنوان پر گفتگو کی اور عرض کیا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ارشاد کے مطابق حدیث نبویؐ قرآن کریم کی صرف شرح نہیں ہے بلکہ قرآن کریم تک رسائی کا ذریعہ بھی ہے، اس لیے کہ قرآن کریم کے الفاظ، آیات، سورتیں اور ترتیب سب کچھ ہمیں حدیث نبویؐ کے ذریعہ ملا ہے جس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ سورۃ القلم کی پہلی پانچ آیات کو ہم قرآن کریم کی سب سے پہلی وحی مانتے ہیں تو اس کا علم ہمیں غار حرا کے واقعہ کے ذریعہ ہوا ہے جو حدیث نبویؐ کے طور پر روایت ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ اگر اس واقعہ اور اس کی روایت پر ایمان ہو گا تو قرآن کریم کی ان پہلی آیات پر ایمان ہو گا اور اگر خدانخواستہ اس واقعہ اور روایت کو حجت نہ مانا جائے تو قرآن کریم کی سب سے پہلی آیات تک رسائی کے لیے ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے جب کوئی صاحب پوچھتے ہیں کہ قرآن کریم پر ایمان لانے کے بعد حدیث پر ایمان لانا بھی ضروری ہے؟ تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کے بعد نہیں بلکہ اس سے پہلے حدیث پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ حدیث پر ایمان ہو گا تو قرآن پر ایمان ہو گا اور حدیث کے بغیر قرآن کریم کی کسی سورت اور آیت تک رسائی ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

بہرحال سمندری کا یہ سفر مختلف حوالوں سے خوشی اور اطمینان کا باعث ہوا، اللہ تعالی حضرت مولانا محمد علی جانبازؒ اور مولانا ضیاء الرحمن فاروقی شہیدؒ کے خاندان کو دینی جدوجہد میں اپنے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھنے کی توفیق دیں اور نظر بد سے ان کی حفاظت فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۱ ستمبر ۲۰۱۳ء)

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے جب ۱۹۱۷ء میں لاہور میں رہائش اختیار کی تو ان کی حیثیت ایک نظر بند کی تھی کیونکہ تحریک آزادی کے نامور راہ نما شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا شاگرد اور مفکر انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تربیت یافتہ عالم دین اور رفیق کار ہونے کی وجہ سے انہیں اس ضمانت پر لاہور کی حدود میں پابند کر دیا گیا تھا کہ وہ انگریز سرکار کے خلاف سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوں گے۔ ویسے بھی

تحریک ریشمی رومال کی خفیہ تگ و دو کا راز کھل جانے کے باعث وقتی طور پر ایسی سرگرمیوں کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ حضرت لاہوریؒ نے اپنا رخ تعلیمی جدوجہد کی طرف موڑ لیا اور شیرانوالہ گیٹ کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد میں قرآن کریم کا درس دینا شروع کیا جوان کی نئی علمی وفکری محنت کا نقطۂ آغاز تھا اور پھر وہ ۱۹۶۲ء تک اسی راستے پر چلتے ہوئے اپنے مالک حقیقی کے حضور پیش ہو گئے۔

حضرت لاہوریؒ کا یہ درس قرآن کریم عوام کے لیے ہوتا تھا لیکن وہ علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے ان کی سطح پر بھی درس قرآن کریم کا اہتمام کرتے تھے اور اس کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ وفکر، خاص طور پر ان کی معرکۃ الآراء کتاب ”حجۃ اللہ البالغۃ“ کی تعلیم وتدریس بھی ان کے اس مشن کا حصہ تھا۔

ان سے اس دوران قدیم وجدید طبقات سے تعلق رکھنے والے ہزاروں ارباب علم نے استفادہ کیا جن میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، علامہ علاء الدین صدیقیؒ اور ڈاکٹر سید محمد عبد اللہؒ جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔

قرآن فہمی میں ان کا طرز حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی طرح حالات زمانہ پر قرآن کریم کی آیات واحکام کی تطبیق کا تھا اور وہ دور حاضر کی اصطلاحات وماحول کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی تفسیر وتشریح کے ساتھ ساتھ عقلی ومنطقی تعبیرات وتاویلات بھی پیش کرتے تھے جس پر ابتداء میں بعض اہل علم کی طرف سے تحفظات کا اظہار کیا جاتا رہا لیکن دھیرے دھیرے دینی حلقے اس طرز سے مانوس ہوتے چلے گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت لاہوریؒ کا یہ حلقۂ درس جنوبی ایشیا کی سطح پر فہم قرآن کریم کے بڑے مراکز میں شمار ہونے لگا۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی وفات کے بعد اس سلسلۂ درس کو تادیر قائم رکھنے میں ان کے جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کے ساتھ جن علماء کرام نے مسلسل محنت کی ان میں حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ اور حضرت مولانا حمید الرحمن عباسیؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد اسحاق قادریؒ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے، جبکہ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کے ساتھ دورۂ حدیث میں ہم سبق تھے۔ انہوں نے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں سالہا

سال رہ کر ان سے قرآن فہمی کا یہ ذوق سیکھا اور پھر ان کے جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی معاونت میں اپنے شیخ کی مسند پر بیٹھ کر سالہا سال تک اس سلسلۂ درس کو جاری رکھا۔ ان کا زندگی بھر کا معمول رہا کہ وہ بائیسکل پر لاہور کے مختلف علاقوں میں جاتے اور کئی مقامات پر ہفتہ وار درس دیتے۔ وہ ایک دور میں جمعیت علماء اسلام ضلع لاہور کے امیر رہے ہیں اور دینی تحریکات میں سرگرم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ وہ اللہ اللہ کرنے والے بزرگ تھے اور ذکر الٰہی کے حلقے سجا کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مگن رکھتے تھے۔

سزائے موت ختم کرنے کی مہم

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۵ ستمبر ۲۰۱۳ء)

ثناء نیوز کے حوالہ سے شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب جسٹس مشیر عالم نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے ماتحت عدالتوں سے انصاف نہ ملنے کے تاثر کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ سزائے قید کے قیدیوں کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔ کراچی کے نجی سکول کی تقریب کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ نے کہا کہ اعلیٰ اور ماتحت عدالتیں اپنی ذمہ داریاں بخوبی سرانجام دے رہی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر تفتیش صحیح خطوط پر ہو تو ملزمان سزا سے نہیں بچ سکتے۔

سزائے موت کے قیدیوں کو سزا ملنی چاہیے یا نہیں، یہ مسئلہ آج کل قومی اور عالمی سطح پر زیر بحث ہے اور عالمی فورم پر سزائے موت کو سرے سے ختم کر دینے کی مہم کے پس منظر میں ہمارے ہاں بھی نہ صرف یہ کہ سزائے موت کو تمام قوانین سے نکال دینے کی بات ہو رہی ہے بلکہ عملاً بھی کم و بیش ایک عشرہ سے سزائے موت پر عملدرآمد معطل ہے اور سزائے موت کے کسی ثابت شدہ مجرم کو بھی یہ سزا نہیں دی جا رہی۔

گزشتہ دنوں یہ خبر منظر عام پر آئی تھی کہ صدر آصف علی زرداری نے موجودہ حکومت سے کہا ہے کہ پچھلے پانچ سال کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے پارٹی پالیسی کے تحت سزائے موت پر عملدرآمد روکے رکھا تھا۔ اس بنا پر وہ نہیں چاہتے کہ ان کی صدارت کے دوران کسی مجرم کو سزائے موت دی جائے۔ اس لیے موجودہ حکومت اگر کسی مجرم کو پھانسی دینا چاہتی ہے تو وہ نئے صدر کے حلف اٹھانے کا انتظار کرے۔ جبکہ موجودہ حکومت

کی طرف سے بھی یہ خبر آچکی ہے کہ وہ سزائے موت پر عملدرآمد پر پابندی کو جاری رکھے گی۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے کچھ عرصہ قبل ایک اکثریتی قرارداد کے ذریعہ دنیا کے ممالک سے کہا تھا کہ وہ اپنے قوانین میں سزائے موت کو ختم کردیں۔ جبکہ یہ مہم اس سے قبل بھی ایک عرصہ سے جاری ہے جس پر بعض ممالک نے پیش رفت بھی کی ہے لیکن بہت سے ممالک میں جن میں پاکستان بھی شامل ہے، متعدّد جرائم میں موت کی سزا مقرر ہے۔ مثلاً پاکستان میں قتل عمد، توہین رسالتؐ اور بغاوت جیسے سنگین جرائم پر موت کی سزا کا قانون نافذ ہے اور ان سزاؤں کی بنیاد قرآن و سنت کے صریح احکام پر ہے جن میں مذکورہ اور اس نوعیت کے دیگر جرائم میں موت کی سزا کا حکم دیا گیا ہے۔

قصاص کے قانون کے تحت جان کے بدلے جان کا ضابطہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ قانون بائبل میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے بلکہ قرآن کریم نے اسے حکم کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۸ میں ہے کہ:

"اے ایمان والو! تم پر قصاص کا قانون فرض کیا گیا ہے۔"

اس سلسلہ میں یہ بات بطور خاص قابل توجہ ہے کہ یہ حکم انہی آیات کے ساتھ بیان ہوا ہے جن میں مسلمانوں پر روزے فرض کیے گئے ہیں اور دونوں حکموں کے الفاظ ایک جیسے ہیں کہ:

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔"

اس کا مطلب واضح ہے کہ مسلمانوں کے لیے قصاص کا قانون اسی طرح فرض کا درجہ رکھتا ہے جس طرح رمضان المبارک کے روزے ان پر فرض کیے گئے ہیں اور اس کے ضمن میں قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"اے اہل دانش! تمہارے لیے قصاص کے قانون میں زندگی ہے۔"

یعنی معاشرے میں امن کی ضمانت اس سے حاصل ہوگی کہ جان کے بدلے جان کا قانون نافذ کیا جائے، اسی طرح بغاوت کے جرم میں موت کی سزا ہمارے ملک کے قانون کا حصہ ہے جو بہت سے دیگر ملکوں میں بھی اسی طرح دستور و قانون کا حصہ ہے۔

ہمارے ہاں ایک عرصہ سے یہ مہم جاری ہے کہ توہین رسالتؐ کے سنگین جرم پر موت کی سزا کو ختم کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ بہت سے مغربی حلقے توہین رسالتؐ کو سرے سے "جرم"

تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ اس جرم کی سرپرستی کے لیے انسانی حقوق کا ٹائٹل استعمال کر کے اسے حقوق کی فہرست میں شمار کیا جارہا ہے۔ لیکن پاکستانی قوم نے مکمل اتحاد کے ساتھ اس ناروا مطالبے کو متعدّد بار مسترد کیا ہے جس کا اظہار ایک سے زیادہ مرتبہ قومی یک جہتی کی صورت میں ہو چکا ہے۔ چنانچہ ان حلقوں نے پینترا بدل کر سرے سے سزائے موت کے قانون کو ہی ختم کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے جو قومی حلقوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے لیے دو باتیں انتہائی فکر انگیز اور قابل توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ صدر آصف علی زرداری کا یہ ارشاد کہ ان کے دور میں سزائے موت پر عملدرآمد معطل رہا ہے، یہاں تک تو بات قابل فہم تھی کہ بین الاقوامی دباؤ کے تحت حکومتی مجبوریوں میں یہ بات شامل تھی، لیکن ان کا یہ ارشاد مستقل سوالیہ نشان ہے کہ ایسا "پارٹی پالیسی" کے تحت ہوتا رہا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی اسلام کو اپنا دین کہتی ہے اور دین کی سب سے بڑی بنیاد قرآن کریم میں قصاص کے قانون کا صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ کیا پاکستان پیپلز پارٹی نے خدانخواستہ اسلام سے دست برداری اور قرآن کریم کے صریح احکام سے انحراف کو پارٹی پالیسی کے طور پر اختیار کر لیا ہے؟ اس سوال کا جواب پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کے ذمہ ہے اور اسے زور یا بدیر عوامی سطح پر اس سوال کا سامنا کرنا ہوگا۔ جبکہ اس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز بیان پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حکومت کے ایک سرکاری ترجمان کا ہے کہ "سزائے موت پر پابندی کی پالیسی جاری رہے گی۔"

پاکستان مسلم لیگ تحریک پاکستان کی علمبردار کہلاتی ہے اور پاکستان کی بانی جماعت ہونے کا ٹائٹل رکھتی ہے جبکہ پاکستان مسلم لیگ نے ہی خان لیاقت علی خان مرحوم کے دور میں دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد منظور کرا کے قوم سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان میں وہی قوانین نافذ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ اور ان کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق ہوں گے۔ اس لیے سزائے موت پر پابندی کو جاری رکھنے کے سرکاری اعلان پر دو اصولی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر سزائے موت پر پابندی، ڈرون حملوں اور دیگر بہت سے معاملات پر مشرف دور کی پالیسیوں کا تسلسل ہی جاری رہنا ہے تو پھر انتخابات، عوامی مینڈیٹ اور حکومت کی تبدیلی کے اس تکلف بلکہ ڈھونگ کی کیا ضرورت

تھی جو گزشتہ دونوں انتخابات میں روا رکھا گیا ہے۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان مسلم لیگ بھی "قرارداد مقاصد" سے انحراف کی راہ پر چل نکلی ہے؟

اس پس منظر میں ہمیں لاہور کے ممتاز وکلاء جناب شہزاد حسن شیخ، سید اسد عباس زیدی، جناب ساجد بشیر شیخ، جناب قاسم حسن بٹر، کامران بشیر مغل، چودھری ندیم احمد اور محترمہ فضائلہ فرحین رانا کے اس بیان سے مکمل اتفاق ہے جو ۱۹ اگست کو ایک قومی اخبار نے ان الفاظ میں شائع کیا ہے کہ:

> "پاکستان میں سزائے موت کو ختم کرنے اور پھانسی کی سزاؤں پر عملدرآمد کو روکنے کے لیے انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کے صدر کی جانب سے حکومت پاکستان کو لکھے جانے والے خط پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ممتاز وکلاء نے کہا ہے کہ اسلام نے جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے اور قاتل کو سزائے موت دینا فساد فی الأرض کو روکنا ہے اور قرآن ہمیں جان کے بدلے جان اور خون کے بدلے خون کا قانون دیتا ہے۔ لہذا کسی بھی غیر ملکی این جی او، اور غیر اسلامی این جی اوز کے کہنے پر ملک میں سزائے موت ختم کرنا اور پھانسی کی سزا کو روکنا قرآن و حدیث کے منافی اقدام ہوگا جس کی اسلام ہمیں ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنے والے کا نام ہی مسلمان ہے اور اگر ہم اللہ تعالی اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی کریں گے تو پھر ہمیں مسلمان کہلوانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لہذا ملک سے سزائے موت کو ختم کرنا نہ صرف فساد فی الارض کو تحفظ دینا ہے بلکہ اللہ کے قانون اور شریعت سے انحراف کرنا ہے جو کسی حال میں بھی کسی اسلامی مملکت کو زیب نہیں دیتا۔"

ہماری پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادتوں سے گزارش ہے کہ وہ "مولویوں" کی بات بے شک نہ سنیں کہ اس سے بین الاقوامی چودھریوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتی ہیں لیکن جسٹس مشیر عالم اور لاہور کے ممتاز وکلاء کی بات تو کم از کم سن لیں جو ملک کے نظریاتی تشخص کے تحفظ اور فساد فی الارض کو روکنے کی دھائی دے رہے ہیں۔

مظفر آباد میں ایک دن

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۲۴ مئی ۲۰۱۳ء)

۱۹ مئی کو میں آزاد ریاست جموں و کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد میں تھا۔ جامعہ دارالعلوم اسلامیہ چھتر کے بنات کے شعبہ میں ختم بخاری شریف کی تقریب تھی اور جامعہ کے بانی و مہتمم مولانا قاضی محمود الحسن اشرف کی بیٹی کا نکاح بھی تھا جس کے لیے موصوف نے مجھے حاضری کے لیے بطور خاص فرمایا تھا۔ جامعہ اسلامیہ گزشتہ تیس برس سے اس علاقہ میں دینی علوم کی ترویج و تنفیذ کے لیے سرگرم عمل ہے اور مولانا قاضی محمود الحسن اشرف وفاق المدارس العربیہ کے لیے بھی بھرپور خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ میری ہمشیرہ (اہلیہ مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ جہلم) نے بخاری شریف کا آخری سبق پڑھایا اور مجھے بہت سے دیگر علماء کرام کے ساتھ تقریب میں کچھ گزارشات پیش کرنے کے علاوہ قاضی صاحب کی بیٹی کا ان کے ایک عزیز نوجوان قاضی معاذ خطیب الرحمن کے ساتھ نکاح پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔ میری مذکورہ ہمشیرہ نے اس دور میں والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ سے درس نظامی کی تعلیم حاصل کی جب طالبات کے مدارس کا عمومی مزاج و نظام موجود نہیں تھا۔ اب وہ کم و بیش گزشتہ تین عشروں سے جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم کے شعبہ بنات میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہی ہیں اور ایک عرصہ سے بخاری شریف ان کے زیر درس ہے۔

بنات کے باقاعدہ مدارس کا نظام بہت بعد میں قائم ہوا، جبکہ ہمارے حضرات شیخین رحمہا اللہ تعالیٰ کا شروع سے ذوق تھا کہ بچیوں کو درس نظامی کی تعلیم دی جائے اور انہوں نے کسی نظم کے بغیر بچیوں کو درس نظامی کی کتابیں پڑھائی ہیں، خود میری بیٹی کا نکاح جب حضرت چچا جانؒ کے بڑے فرزند مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی سے ہوا تو وہ میرا جماعتی طور پر متحرک ترین دور تھا اور میں بیٹی کے لیے درس نظامی کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کر پایا تھا، اس پر حضرت صوفی صاحبؒ مجھ سے سخت ناراض ہوئے اور اپنی بہو کو جو ان کی پوتی بھی لگتی تھی اپنی ایک بیٹی (اہلیہ مولانا ظفر فیاض) کے ساتھ درس نظامی کی باقاعدہ تعلیم دی۔ میری یہ بیٹی اب بحمد اللہ تعالیٰ جامعہ نصرۃ العلوم کے شعبہ بنات کی صدر معلمہ ہے اور دورہ حدیث کے اسباق پڑھا کر اپنے دونوں بزرگ دادوں کی یاد کو تازہ رکھے ہوئے ہے۔

جامعہ دارالعلوم اسلامیہ مظفر آباد کی اس سالانہ تقریب میں بہت سے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ آزاد کشمیر کے وزیر تعلیم میاں عبد الوحید اور جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم کے مہتمم مولانا قاری ابوبکر صدیق (جو میرے بھانجے ہیں) بھی شریک ہوئے اور خطاب کیا۔

مظفر آباد کی حاضری کے موقع پر مقامی اخبارات میں ایک خبر نظر سے گزری کہ دو روز قبل مظفر آباد میں توہین رسالتؐ کے ایک مبینہ واقعہ پر فساد ہوتے ہوتے رہ گیا ہے اور مقامی علماء کرام نے اس فساد کو رکوانے کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے جس پر پریس نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا کہ ایک چینی کمپنی کے چینی ملازم نے اپنی رہائش تبدیل کی اور اس کا سامان جب کمرے سے نکالا جا رہا تھا تو قرآن کریم کا ایک نسخہ زمین پر گر گیا جس پر کچھ لوگوں نے ارد گرد سے بہت سے لوگوں کو یہ کہہ کر جمع کر لیا کہ قرآن کریم کی توہین کی گئی ہے، لوگ جمع ہوئے اور احتجاج کا معروف طریقہ سامنے آنے لگا جس کے نتیجے میں کچھ املاک کو نقصان بھی پہنچا مگر ایک طرف ضلعی انتظامیہ کے افسران بروقت پہنچ گئے اور دوسری طرف علماء کرام نے بھی اس کا نوٹس لیا۔ ایک مقامی اخبار کی رپورٹ کے مطابق بزرگ عالم دین اور جمعیت علماء اسلام کے راہ نما مولانا قاری عبد المالک کہیں اور جمعہ پڑھا کر واپسی پر وہاں سے گزر رہے تھے کہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گئے۔ صورت حال معلوم کر کے انہوں نے لوگوں سے خطاب کیا اور کہا کہ اگر یہ واقعہ ارادتاً ہوا ہے تو اس کے ذمہ دار کو سزا دینا قانون کی ذمہ داری ہے اور وہ اس کے لیے پوری کوشش کریں گے لیکن لوگوں کو قانون کو ہاتھ میں لینے سے گریز کرنا چاہیے اور انتظامیہ پر اعتماد کرتے ہوئے پر امن طور پر واپس چلے جانا چاہیے۔ علاقہ کے دوسرے علماء مولانا قاضی محمود الحسن اشرف اور ان کے رفقاء بھی متحرک ہوئے اور انہوں نے حکمت عملی کے ساتھ صورت حال کو کنٹرول کر لیا۔

مظفر آباد کے علماء کرام کا یہ مثبت کردار معلوم کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا، اس موقع پر میرے بھانجے مولانا قاری ابوبکر صدیق نے بتایا کہ کچھ دنوں پہلے جہلم میں بھی اس قسم کی صورت حال پیدا ہونے لگی تھی اور بعض جذباتی حضرات نے ایک وقتی بات کو عنوان بنا کر اس طرح کے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی تھی مگر ضلعی انتظامیہ نے علماء کرام اور پادری صاحبان سے بروقت رابطہ کر لیا اور باہمی تعاون سے معاملات کو مزید آگے بڑھنے سے روک لیا گیا۔ اس پر مجھے بھی گوجرانوالہ کا دو سال

قبل کا واقعہ پھر سے یاد آگیا کہ کھوکھرکی میں جہاں مسیحیوں کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے، توہین رسالتؐ کا ایک مبینہ واقعہ سامنے آیا تو ارد گرد کے دینی مدارس کے طلبہ اور مذہبی کارکنوں نے جمع ہونا شروع کر دیا اور اشتعال و احتجاج کی لہر رونما ہونے لگی۔ یہاں بھی ضلعی انتظامیہ نے علماء کرام سے رابطہ کیا اور چند سرکردہ علماء کرام نے مل کر اس پر قابو پالیا۔ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ توہین رسالت کا وہ مبینہ واقعہ ایک سازش تھا جو علاقہ کی صورت حال کو خراب کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ اس پر ایک ذمہ دار ضلعی افسر نے دو روز بعد کہا کہ اگر چند سرکردہ علماء کرام (بحمد اللہ میں بھی ان میں شامل تھا) بروقت کردار ادا نہ کرتے تو کھوکھرکی کا ایک حصہ جل چکا ہوتا۔

بعد میں لاہور کی ایک مشترکہ تقریب میں بشپ آف پاکستان ڈاکٹر الیگزینڈر جان ملک نے گوجرانوالہ کے علماء کرام کے اس کردار کو سراہا، اور چونکہ میں وہاں موجود تھا اس لیے انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے بشپ آف پاکستان کے اس شکریہ کا ذکر تو کر دیا ہے مگر اب اس انتظار میں ہوں کہ عظیم عرب مجاہد امیر عبد القادر الجزائری رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرح مجھ پر بھی (عیسائیوں کا گماشتہ) ہونے کا فتویٰ کب صادر ہوتا ہے؟

تحفظ ناموس رسالتؐ کا قانون اپنے اصل اور جرم و سزا کے حوالہ سے ایک ناگزیر اسلامی قانون ہے جس کے دفاع میں خود میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہتا ہوں مگر اس کے اطلاق و تطبیق کے معاملات بہر حال توجہ طلب ہیں، اس لیے کہ اب تک کے ریکارڈ کے مطابق:

- بہت سے مقدمات ایسے ہیں جن میں کسی معمولی بات کو خوامخواہ بڑھا چڑھا کر توہین رسالتؐ کا کیس بنانے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ مظفر آباد کے مذکورہ واقعہ میں نظر آتا ہے، اور کچھ عرصہ قبل گوجرانوالہ کے علاوہ گرجاکھ میں ایک واقعہ ہوا کہ کسی مولوی صاحب نے مسجد کی الماریوں میں پڑے ہوئے قرآن کریم کے بوسیدہ اوراق کو تلف کرنے کے لیے انہیں جلانا شروع کر دیا، ارد گرد کے لوگوں نے دیکھا تو شور مچا دیا۔ ایک دو مخالفین نے یہ کہہ کر بہت سے لوگوں جمع کر لیے کہ قرآن کو جلا کر اس کی توہین کی جا رہی ہے۔ پولیس نے مولوی صاحب مذکور کو گرفتار کر لیا اور شہر کے علماء کرام سے دریافت کیا کہ اس واقعہ پر کیا کاروائی کی جائے؟ میں نے تحریری طور پر لکھ دیا کہ اس مولوی صاحب نے بے احتیاطی بلکہ بے وقوفی کی ہے اس پر اس کی سرزنش کی جائے

لیکن یہ توہین قرآن کریم کا کیس نہیں بنتا، اس پر مولوی صاحب مذکور کی جان چھوٹی۔

• درجنوں مقدمات ایسے ہیں جو مسلکی اختلافات کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خلاف درج کرائے جاتے ہیں اور خاصی پیچیدگی پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی سال ربیع الاول کے دوران دینہ ضلع جہلم میں ایک مسجد کی تعمیر کے تنازعہ میں ایک فریق نے میلاد النبیؐ کی جھنڈیوں کی بے حرمتی کا بہانہ بنا کر مخالفین کے خلاف توہین رسالتؐ کا باقاعدہ مقدمہ درج کرا دیا۔ اور جن کے خلاف یہ مقدمہ درج ہوا ان میں میرے مذکورہ بھانجے قاری ابوبکر صدیق مہتمم جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم بھی شامل ہیں۔ مقدمہ درج ہو جانے کے بعد شہر کے معززین نے جو اصل صورت حال سے واقف تھا، درمیان میں پڑ کر صلح کرائی اور مقدمہ واپس کروایا ورنہ معاملات کا بگاڑ خدا جانے کہاں تک پہنچتا۔

مظفر آباد کے مذکورہ واقعہ کے حوالہ سے یہ گزارشات پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے جو بہر حال توجہ طلب ہیں اور سنجیدہ دینی راہ نماؤں کو اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔

حفاظ قرآن کریم کی خدمت میں!

(چیمبر آف کامرس، گوجرانوالہ - ۱۷ فروری ۲۰۱۳ء)

(چیمبر آف کامرس گوجرانوالہ میں حفظ القرآن کریم کے مقابلوں کی سالانہ تقریب سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ میں بزم حفاظ کرام گوجرانوالہ اور اس کے امیر قاری محمد فاروق انور صاحب (مدرس جامعہ نصرۃ العلوم) کو مبارک باد دیتا ہوں کہ وہ تسلسل اور حوصلہ کے ساتھ حفظ قرآن کریم کے مقابلوں کی اس سالانہ تقریب کا اہتمام کر رہے ہیں، اور چیمبر آف کامرس کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک اچھی تقریب کے لیے یہ ہال فراہم کیا ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت اور اس طرز کی تقریبات ایسے اداروں میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہنی چاہئیں، اس سے برکات کا ماحول رہتا ہے اور اجر و ثواب بھی ملتا ہے۔ جبکہ میں باہر سے تشریف لانے والے معزز قراء کرام جناب قاری اخلاق احمد مدنی، جناب قاری محمد عارف سیالوی اور

قاری محمود الحسن صاحب کو خوش آمدید کہتا ہوں جنہوں نے اس تقریب کو رونق بخشی اور بزم حفاظ کرام کی حوصلہ افزائی کی، اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر سے نوازیں، آمین۔

میرا معمول یہ ہے کہ جب کوئی بچہ قرآن کریم حفظ مکمل کرتا ہے اور اس کے آخری سبق یا دستار بندی کی تقریب میں شرکت کا مجھے موقع ملتا ہے تو دو چار باتیں بطور نصیحت عرض کیا کرتا ہوں۔ چونکہ یہ تقریب بھی حفظ قرآن کریم کے حوالہ سے ہے اس لیے وہ باتیں یہاں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے حفاظ کو بہت فضیلت سے نوازا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف احادیث مبارکہ میں حفاظ کے بیسیوں اعزازات و امتیازات کا تذکرہ فرمایا ہے جو قیامت کے دن قرآن کریم کے حافظوں کو عطا ہوں گے۔ ان میں سے ایک کا تذکرہ کروں گا کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حافظ قرآن کریم کو اپنی برادری اور خاندان کے دس افراد کی سفارش کا حق دیں گے جو اس کی سفارش پر جنت میں داخل ہوں گے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اعزازات کا احادیث مبارکہ میں ذکر ہے لیکن آنحضرتؐ نے یہ اعزازات اور امتیازات ہر حافظ کے لیے بیان نہیں کیے بلکہ اس کی شرائط بھی بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ''من تعلم القرآن'' جس نے قرآن کریم سیکھا یعنی یاد کیا ''وحفظہ'' اور اس کو یاد رکھا ''وعمل بہ'' اور اس پر عمل کیا، اس کو اللہ تعالیٰ اس اعزاز سے نوازیں گے۔

اس لیے صرف قرآن کریم یاد کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ اسے زندگی بھر یاد رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی حافظ اپنی غفلت اور بے توجہی کی وجہ سے قرآن کریم یاد کرنے کے بعد بھول گیا تو اس کے لیے سخت وعید اور سزا کا بھی ذکر احادیث مبارکہ میں کیا گیا ہے۔ پھر قرآن کریم پر عمل بھی اس کا لازمی تقاضہ ہے اور قرآن کریم پر عمل کا ایک سادہ سا معیار آپؐ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ ''فاحل حلالہ وحرم حرامہ'' اس کے حلال کو حلال سمجھے اور حرام کو حرام سمجھے۔ یعنی قرآن کریم نے حلال و حرام کے جو دائرے بیان کیے ہیں ان کی پابندی کرے، اپنے معمولات میں، کھانے پینے میں، لین دین میں، کاروبار میں، معاملات میں اور زندگی کے تمام امور میں حلال و حرام کے فرق کو ملحوظ رکھے۔ چنانچہ حفاظ کرام سے گزارش ہے کہ وہ قرآن کریم کو یاد کرنے کا اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بعد میں

یاد رکھنے کا بھی اہتمام کریں اور خاص طور پر حفاظ کے والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔

دوسری بات حفاظ کرام سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ”ان افواھکم طرق القرآن“ کہ تمہارے منہ قرآن کریم کے راستے ہیں۔ اس ارشاد کی روشنی میں گزارش ہے کہ ہم منہ سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں اور کانوں سے سنتے ہیں، اس لیے منہ اور کان قرآن کریم کے آنے جانے کے راستے ہیں، ایک راستہ سے قرآن کریم آتا ہے اور دوسرے سے جاتا یعنی ادا ہوتا ہے، ان راستوں کو پاک صاف رکھنا بھی قرآن کریم کے ادب و احترام کا تقاضہ ہے۔

جب بڑوں سے دوستی لگاتے ہیں تو آنے جانے اور اٹھنے بیٹھنے کے مقامات ان کے مطابق رکھنے پڑتے ہیں۔ پنجابی کا ایک محاورہ ہے کہ ”اونٹوں والوں سے یاری لگائیں تو دروازے اونچے رکھنے پڑتے ہیں“۔ اگر کسی بادشاہ نے گھر آنا ہو تو اٹھنے بیٹھنے کی جگہ بھی ان کے شایان شان بنائی جاتی ہے اور آنے جانے کے راستوں کو بھی صاف رکھا جاتا ہے، گلیاں نالیاں صاف کی جاتی ہیں، راستے میں پھول بچھائے جاتے ہیں، چونا بکھیرا جاتا ہے اور خوشبو کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم بادشاہ کا کلام ہے اور کلاموں کا بادشاہ ہے۔ اس کے آنے جانے کے راستوں کو پاک صاف رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ اسی کان سے قرآن کریم سنا جائے اور اسی سے گانے بھی سنے جائیں، گالیاں بھی سنی جائیں، جھوٹ بھی سنا جائے، غیبت بھی سنی جائے اور فضول باتیں بھی سنی جائیں۔ اور یہ بات بھی ادب و احترام کے خلاف ہے کہ جس زبان سے قرآن کریم کی تلاوت کی جائے اسی سے جھوٹ بھی بولا جائے، گالیاں بھی دی جائیں، گانے بھی گائے جائیں اور بے ہودہ باتیں بھی کی جائیں۔ یہ باتیں ہمارے مزاج اور کلچر کا حصہ بن گئی ہیں اور ہمارے روز مرہ معمولات میں شامل ہو گئی ہیں اس لیے ہمیں زیادہ محسوس نہیں ہوتیں لیکن یہ سب کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتی ہیں۔ جھوٹ بولنا، کسی کی غیبت کرنا، کسی پر بہتان باندھنا، کسی کو گالی دینا، گانے گانا اور بے ہودہ گوئی کرنا سب کبیرہ گناہ ہیں۔

قرآن کریم نے ان باتوں سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے اس لیے قرآن کریم کی تلاوت اور سماع کو ان کے ساتھ خلط ملط کرنا قرآن کریم کے ادب و احترام کے منافی ہے اور ان سے

اللہ تعالی ناراض ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالی ناراض ہوتے ہیں تو اللہ تعالی کا کلام بھی ناراض ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اگر معزز مہمان کا اس کی شان کے مطابق احترام نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور دوبارہ اس گھر میں نہیں آتا۔ چنانچہ ہمیں اپنے گھر کے ماحول کو، اپنی زبانوں اور اپنے کانوں کو ایسی باتوں سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ قرآن کریم ہم سے خوش ہو اور اس کی برکات ہمیں حاصل ہوتی رہیں۔

اسلام کا نظام خلافت

(زوار اکیڈمی، کراچی - ۱ جنوری ۲۰۱۳ء)

گزشتہ ہفتے کراچی میں حاضری کے دوران معروف نقشبندی شیخ حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ رحمہ اللہ تعالی کی یاد میں قائم ''زوار اکیڈمی'' میں حضرتؒ کے پوتے ڈاکٹر سید عزیز الرحمن کی فرمائش پر خلافت کے موضوع پر کچھ معروضات دو نشستوں میں پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل کراچی میں ہی جامعہ اسلامیہ کلفٹن اور جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن کی تخصصات کی کلاسوں کے سامنے اس موضوع پر متعدّد نشستوں میں گزارشات پیش کر چکا ہوں اور ان کے کچھ حصے اس کالم میں پہلے بھی شائع ہوئے ہیں، مگر بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ یہ ساری گفتگو مربوط شکل میں ترتیب کے ساتھ تحریر میں آجانی چاہیے۔ چنانچہ ان دوستوں کے اصرار پر اب تک اس موضوع پر مختلف نشستوں میں کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ ترتیب کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ لیکن اس بات کی وضاحت گفتگو شروع کرنے سے قبل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ میرے ذاتی مطالعہ اور تجزیہ کا حاصل ہے اور مجھے ان میں سے کسی بات کے ہر حال میں ضروری ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ اس لیے کسی صاحب فکر کو میری کسی گزارش سے اختلاف ہو تو ان کا حق ہے کہ اس کا اظہار کریں، اسے ریکارڈ پر لائیں، یا مناسب سمجھیں تو مجھے اس سے آگاہ فرمائیں، میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔

۱۔ ''خلافت'' کا معنی

بعد الحمد والصلوۃ۔ خلافت کا لفظی معنی نیابت ہے جو قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالہ سے آیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق

سے پہلے اللہ رب العزت نے فرشتوں سے فرمایا کہ ”انی جاعل فی الأرض خلیفۃ“ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، اور حضرت داؤد علیہ السلام سے رب العزت نے فرمایا ”انا جعلناک خلیفۃ فی الارض“ ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا معنی بعض مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ زمین پر پہلے جن بستے تھے، ان کی جگہ زمین کا نظام انسانوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ یہ بات مشاہدہ میں بھی ہے کہ زمین پر بسنے والے ہزاروں قسم کے جانوروں میں سے زمین کے معاملات میں تصرف انسان ہی کر رہا ہے اور زمین کے ساتھ ہوا، پانی اور دیگر متعلقات پر بھی اسی کا تصرف ہے۔ یہ معنی بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی نیابت و خلافت عطا فرمائی ہے کہ زمین پر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے گا اور خدائی احکامات و قوانین کا نفاذ کرے گا۔ جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ قرار دے کر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ”لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا“۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کو سیاسی نظام کے طور پر بیان فرمایا ہے، بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا ”کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء“ کہ بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام فرمایا کرتے تھے، وہ خود حکمران ہوتے تھے یا حکمران کا تعین ان کے حکم سے ہوتا تھا، جیسا کہ جابر بادشاہ جالوت کے مقابلہ کے لیے بنی اسرائیل نے اپنے وقت کے پیغمبر سے درخواست کی کہ ان کے لیے بادشاہ کا تقرر کیا جائے تاکہ وہ اس کی قیادت میں جابر بادشاہ کا مقابلہ کر سکیں، چنانچہ ان کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام نے طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ جناب نبی اکرمؐ نے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاسی معاملات حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نمٹایا کرتے تھے، اس سے سوال پیدا ہوا کہ نبی اکرمؐ خاتم النبیین ہیں اور آپؐ کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے تو پھر آپؐ کے بعد سیاسی نظام کس کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس لیے مذکورہ بالا جملہ کے ساتھ ہی نبی اکرمؐ نے فرمادیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا ”وستکون بعدی خلفاء“ البتہ میرے بعد خلفاء ہوں گے جو اس سیاسی نظام کو سنبھالیں گے۔ اس طرح جناب نبی اکرمؐ نے خلافت کو امت مسلمہ کے سیاسی نظام کے طور پر بیان فرمایا ہے اور اسلام کے سیاسی نظام کا عنوان ”خلافت“ ہے۔

۲- خلیفہ کس کا نائب ہے؟

یہاں ایک دل چسپ بحث قابل توجہ ہے کہ خلیفہ شریعت اسلامیہ میں اللہ تعالی کا نائب تصور ہوتا ہے یا جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خلیفہ اللہ تعالی کا نائب ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ امام ابو یعلیؒ کی ''الاحکام السلطانیہ'' میں واقعہ مذکور ہے کہ ایک صاحب نے خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ کو ''یا خلیفۃ اللہ'' کہہ کر خطاب کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ''لست بخلیفۃ اللہ انا خلیفۃ رسول اللہ'' کہ میں اللہ تعالی کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کو ''یا خلیفۃ رسول اللہ'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کو ''یا خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ'' کہہ کر پکارا جانے لگا تو خطاب میں 'خلیفہ' کے لفظ کے تکرار سے انہیں الجھن ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ تیسرے اور چوتھے خلیفہ کے اس خطاب میں خلیفہ کے لفظ کا تکرار کتنی بار ہوگا اور اس سے کیا صورت حال پیدا ہوگی؟ اس پس منظر میں ایک دن حضرت عمرؓ کو حضرت عمرو بن العاصؓ نے ''یا امیر المومنین'' کہہ کر پکارا تو حضرت عمرؓ نے اس خطاب کو پسند کیا اور فرمایا کہ اب انہیں امیر المومنین کہہ کر ہی خطاب کیا جائے۔

اسی طرح فقہاء امت نے 'خلافت' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ خلیفہ اسے کہتے ہیں جو امت کے سیاسی اور اجتماعی امور سرانجام دے، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ''نیابتا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' اس کی یہ حیثیت جناب نبی اکرمؐ کے نائب کے طور پر ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی اگر ''خلافت و امامت'' کی بحث پر ایک نظر ڈال لی جائے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو اہل سنت اور اہل تشیع کے ہاں صدیوں سے جاری ہے۔

۳- خلافت اور امامت میں فرق

اہل سنت کے نزدیک جناب نبی اکرمؐ کے بعد مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی قیادت کا عنوان ''خلافت'' ہے جبکہ اہل تشیع اسے ''امامت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور دونوں میں مختلف حوالوں سے واضح فرق ہے:

- خلیفہ کا تقرر جناب نبی اکرمؐ نے خود نہیں کیا تھا بلکہ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا، اور حضرت صدیق اکبرؓ کا خلیفۂ اول کے طور پر انتخاب امت

مسلمہ نے خاصے بحث و مباحثہ کے بعد اپنی اجتماعی صوابدید کے مطابق کیا تھا۔ جبکہ اہل تشیع کے نزدیک امام کے طور پر حضرت علیؓ کا تقرر خود جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا، اسی لیے انہیں ''وصی'' کہا جاتا ہے۔

• امامت خاندانی ہے اور اہل تشیع کے بارہ اماموں میں سب کے سب ایک دوسرے کے نسبی وارث ہیں، جبکہ خلافت خاندانی نہیں ہے اور خلفاء راشدین میں سے کوئی بھی دوسرے کا نسبی وارث نہیں ہے۔

• امام اہل تشیع کے نزدیک ''معصوم'' ہوتا ہے اور اس کی بات خود دلیل ہے، وہ کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے مگر اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کی شرعی حیثیت ''مجتہد'' کی ہے، وہ قرآن و سنت کی دلیل کا پابند ہے، اس کا اپنا فیصلہ اجتہادی ہوتا ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس میں صواب کے ساتھ ساتھ خطا کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے جیسا کہ خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔

• امام براہ راست خدا کا نمائندہ ہے اور اس کی بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے مگر خلیفہ جناب نبی اکرمؐ کا نائب ہے اور اس کے کسی فیصلے کو خدائی فیصلے کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

• امام کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا، جبکہ خلیفہ کی بات سے عام آدمی بھی اختلاف کر سکتا ہے اور خلیفہ کو دلیل کی بنیاد پر اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے جس کے بیسیوں شواہد خلفاء راشدینؓ کے دور میں موجود ہیں۔

• اماموں کی تعداد بارہ پر پہنچ کر مکمل ہوگئی ہے اور اہل تشیع کے بقول بارہویں امام ہی آخری امام ہیں جو زندہ ہیں اور وہی قرب قیامت میں ظاہر ہو کر امت پر حکمرانی کریں گے۔ جبکہ اہل سنت کے نزدیک خلفاء کا سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا اور قیامت سے پہلے ''امام مہدی'' کا ظہور ہوگا، وہ اگرچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے لیکن اپنے دور میں پیدا ہوں گے اور ان کا ظہور ہوگا جس کے بعد وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد

سے امت کی قیادت کریں گے اور کفر کی طاقتوں کو شکست دے کر اسلامی حکومت قائم کریں گے۔

۴- خلافت پر تھیا کریسی ہونے کا الزام

خلافت اور امامت کے اس اصولی فرق کو سمجھ لینے سے ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت کے نظام پر تھیا کریسی کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے وہ درست نہیں ہے۔ تھیا کریسی خدا کے نام پر حکومت کرنے کو کہتے ہیں جہاں حکمران اللہ تعالی کا نائب کہلا کر ہر قسم کی تنقید اور اختلاف سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔ یہ تصور پاپائے روم کی حکمرانی کے دور میں سامنے آیا تھا کیونکہ پوپ کو خدا کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا، اس کی بات فائنل ہوتی تھی اور اسے آخری اتھارٹی کا درجہ حاصل تھا۔ مغربی دنیا میں پاپائے روم کو صدیوں تک حکمرانوں کے سرپرست اعلی کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس کی بات حکومت و سیاست میں بھی حرف آخر سمجھی جاتی تھی، اس لیے اس اتھارٹی کے خلاف بغاوت ہوئی اور حکومت و سیاست کو پوپ کی سرپرستی سے الگ کرتے ہوئے مذہب سے بھی آزاد کر دیا گیا۔ چنانچہ آج جب کسی جگہ اسلامی حکومت کی بات کی جاتی ہے تو اسے اسی پس منظر میں "تھیا کریسی" قرار دے کر بہت سے حلقوں میں قابل اعتراض قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن "خلافت" کے مذکورہ تصور اور دائرے کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر تھیا کریسی کا یہ الزام درست نہیں ہے، اس لیے کہ خلیفہ معصوم نہیں ہے، عوام کا منتخب نمائندہ ہوتا ہے، اس کی ہر بات سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے، عوام اس کا احتساب کر سکتے ہیں، حتی کہ اسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے، اور وہ خود اتھارٹی ہونے کی بجائے قرآن و سنت کی تعلیمات کا پابند ہوتا ہے جن میں رد و بدل کا اسے خود کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس لیے خلافت کو تھیا کریسی قرار دینا خلافت کے مفہوم و نظام سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ البتہ اہل تشیع کی امامت کا مفہوم تھیا کریسی کے قریب قریب ہے لیکن اہل سنت اسے قبول نہیں کرتے۔

۵- خلافت۔ دلیل و قانون کی حکومت

یہاں ایک اور نکتہ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ "خلافت" ہی دنیا میں وہ واحد سیاسی نظام ہے جسے دلیل اور قانون کی حکومت قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ:

• بادشاہت میں بادشاہ خود قانون کا سرچشمہ ہوتا ہے اور وہ خود ہی اس کا شارح بھی ہوتا ہے۔ قانون بنانے، اسے تبدیل کرنے اور اس کی تشریح کرنے کا اختیار صرف اس کے پاس ہوتا ہے۔

• ڈکٹیٹر شپ خواہ فوجی ہو یا پارٹی کی، اس کی صورت حال بھی اسی قسم کی ہے کہ شخصی یا اجتماعی ڈکٹیٹر شپ میں حکمران کے پاس ہی قانون سازی اور اس میں ردو بدل کے اختیارات ہوتے ہیں۔

• جمہوریت میں کہا جاتا ہے کہ اختیارات عوام کے پاس ہوتے ہیں لیکن یہ صرف ایک پردہ ہے، اس لیے کہ پارلیمنٹ کو ہر معاملہ میں بالادستی حاصل ہوتی ہے، وہ دستور و قانون بنانے کی مجاز ہوتی ہے، اس میں رد و بدل کا اختیار اسی کے پاس ہوتا ہے اور اسے معطل کرنے کا حق بھی اسے حاصل ہوتا ہے، اس لیے کسی ایسے دستور و قانون کی پابندی کو جسے معطل کرنے اور اس میں رد و بدل کا اختیار بھی خود عمل کرنے والے کو حاصل ہو، دلیل و قانون کی حکومت قرار دینا مشکل سی بات ہے۔

• خلافت میں حکمران شخص یا طبقہ ایک ایسے دستور و قانون کے ہر حال میں پابند ہوتے ہیں جس میں رد و بدل کا انہیں خود کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ خلیفہ اجتہادی دائرے میں فیصلوں کا مجاز ہے لیکن قرآن و سنت کے صریح احکام میں کسی قسم کے رد و بدل کا اختیار نہیں رکھتا بلکہ ان کے نفاذ کا وہ پابند ہے۔ اس لیے خالص دلیل و قانون کی حکمرانی صرف خلافت کی صورت میں دنیا کو میسر آسکتی ہے اس لیے کہ خلیفہ ایسے طے شدہ قوانین کے نفاذ کا پابند ہوتا ہے جس میں رد و بدل کا خود اسے کوئی اختیار نہیں ہے، اسی لیے اسلام کے سیاسی نظام میں حکومت کا تصور نہیں ہے بلکہ اسے خلافت و نیابت کا عنوان دیا گیا ہے۔

خلافت کے مفہوم کو ایک اور حوالہ سے بھی دیکھ لیا جائے کہ اللہ رب العزت نے جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارا تو دو باتیں واضح فرما دی تھی جن کی قرآن کریم میں صراحت ہے، ایک یہ کہ ”ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین“ تمہارے لیے زمین میں قرار گاہ بھی ہوگی اور زندگی کے اسباب بھی ہوں گے لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک

محدود مدت تک کے لیے ہوں گے۔ اور دوسری بات یہ کہ "اما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ہدای فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون" میری طرف سے ہدایات آئیں گی جو ان ہدایات کی پیروی کرے گا وہ خوف و حزن سے نجات پائے گا اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ جہنم میں جائے گا۔ اس طرح اللہ تعالی نے نسل انسانی کو ایک محدود مدت کے لیے زمین پر بھیج کر اسے ان ہدایات کا پابند کر دیا جو اس کی طرف سے آئیں گی، یہ ہدایات حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ آتی رہی ہیں جن کا فائنل ایڈیشن قرآن و سنت کی صورت میں آ چکا ہے۔ ان ہدایات کی پیروی کا نظام قائم کرنے کا نام خلافت ہے اور یہی خلافت کی اصولی بنیاد ہے۔

٦- نظام خلافت کا رفاہی پہلو

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ مال اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا "و من ترک کلا وضیاعا فالی وعلی" اور جو شخص قرض کا بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کریں گے اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ گویا آپؐ نے فرمایا کہ سوسائٹی کے نادار، مستحق اور بے سہارا اپنی ضروریات کے لیے میرے پاس آئیں گے، اور آپؐ نے بات صرف "فالی" پر نہیں چھوڑی بلکہ "وعلی" فرما کر خود کو اس کا ذمہ دار بھی قرار دیا۔ چنانچہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بیت المال کا تصور سامنے آیا جس کا دائرہ آنحضرتؐ کے دور میں یہ تھا کہ کسی شخص کو جو ضرورت بھی پیش آتی تھی وہ آپؐ سے رجوع کرتا تھا اور آپؐ بیت المال کے فنڈ سے اس کی ضرورت پوری فرما دیتے تھے۔ بیسیوں واقعات احادیث میں مذکور ہیں جن میں سے صرف دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

حضرت ابو موسی اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کو ایک سفر کے لیے کچھ اونٹ درکار تھے، میں خاندان کا نمائندہ بن کر جناب نبی اکرمؐ کے پاس گیا اور سواریوں کا تقاضہ کیا، اس وقت آنحضرتؐ کے پاس اونٹ موجود نہیں تھے اس لیے آپؐ نے نہیں دیے لیکن تھوڑی دیر کے بعد کہیں سے اونٹوں کا بندوبست ہو گیا تو مجھے واپس بلا کر دو جوڑے میرے حوالے کیے۔ اسی طرح ایک واقعہ جناب رسول اللہؐ کی خوش طبعی اور دل لگی کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ مجھے سفر کے لیے اونٹ کی ضرورت ہے۔ آپؐ نے فرمایا ٹھہرو میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں، وہ شخص فکر مند

ہوگیا کہ میں اونٹنی کے بچے کے ساتھ کیا کروں گا، تھوڑی دیر اس کی فکرمندی سے محظوظ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا خدا کے بندے جو اونٹ میں تجھے دوں گا وہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوگا۔

حکومت کو لوگوں کی ضروریات حسب موقع فراہم کرنے کا ذمہ دار قرار دینے کی بات سب سے پہلے جناب رسول اللہؐ نے کی ہے اور وہیں سے رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کا آغاز ہوتا ہے، اور آج بہت سی حکومتوں نے رفاہی ریاست کا یہ نظام اختیار کر رکھا ہے۔ یہ نظام خلفاء راشدینؓ کے دور میں باقاعدہ منظم ادارے کی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی ایک عملی صورت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت کے ایک واقعہ کا ذکر کر کے واضح کرنا چاہتا ہوں جبکہ اس وقت مدینہ منورہ میں جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے بیت المال کے آغاز کو کم و بیش ایک صدی گزر چکی تھی۔

کتاب الاموال میں امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور خلافت میں ان کے عراق کے گورنر عبد الحمید مرحوم نے ایک سال انہیں خط لکھا کہ صوبہ میں زکوۃ و عشر اور دیگر محصولات کی وصولی کے بعد پورے سال کا خرچہ اور بجٹ پورا کر کے کچھ رقم بچ گئی ہے، اس کے بارے میں بتایا جائے کہ ہم کیا کریں؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب لکھا کہ یہ سروے کرواؤ کہ تمہارے صوبے میں جو لوگ مقروض ہیں اور اپنا قرضہ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے قرضے اس رقم میں سے ادا کردو، گورنر نے جواب دیا کہ حضرت یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ امیر المؤمنین نے دوسرا خط لکھا کہ جن بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہیں ان کی شادیاں اس رقم میں سے کرادو۔ گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں، امیر المؤمنین نے تیسرا خط لکھا کہ جن خاوندوں نے ابھی تک بیویوں کے مہر ادا نہیں کیے اور وہ مہر ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے مہر اس رقم میں سے دلوادو، گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں۔ امیر المؤمنین نے چوتھا خط لکھا کہ زمینوں کا سروے کرواؤ اور بے آباد زمینوں کی کاشت کے لیے کسانوں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔

۷- خلافت کی شرعی حیثیت

اس کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ خلافت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ فقہائے کرام نے نظام خلافت کے قیام اور خلیفہ کے تقرر کو امت کے فرائض وواجبات میں شمار کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور خلافت کے فرض ہونے پر دو بڑی دلیلیں پیش فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے سب سے پہلے خلیفہ کا انتخاب کیا تھا، حتیٰ کہ جناب نبی اکرمؐ کی تدفین پر بھی اسے مقدم کیا تھا، اسے فقہاء کرامؒ نے ”بل جعلوہ اھم الواجبات“ سے تعبیر کیا ہے اور حضرات صحابہ کرامؓ کا اس پر مکمل اجماع ہوا ہے جو کسی چیز کے فرض اور واجب ہونے کی واضح دلیل ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دوسری دلیل یہ دی ہے کہ قرآن کریم کے بہت سے صریح احکام حکومت کے قیام پر موقوف ہیں۔ مثلاً حدود وقصاص کا نفاذ، امن وانصاف کا قیام، بیت المال اور زکوٰۃ کا نظام، جہاد کا تسلسل اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اجتماعی نظام حکومتی سسٹم کا تقاضہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اور ان جیسے بعض دیگر احکام قرآن حکومتی نظام کے بغیر نافذ وجاری نہیں کیے جا سکتے اور شرعی اصول یہ ہے کہ کسی فرض پر عمل جس چیز پر موقوف ہو وہ بھی فرض ہی کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔

اس بنیاد پر فقہاء کرامؒ نے خلافت کے قیام کو امت مسلمہ کے اجتماعی فرائض میں شمار کیا ہے اور اسے فرض کفایہ کا درجہ دیا ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصے میں شرعی خلافت موجود ہے تو پوری امت کی طرف سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے لیکن اگر کہیں بھی خلافت کا نظام موجود نہیں ہے تو امت مسلمہ پوری کی پوری بطور امت ایک شرعی فریضہ کی تارک قرار پاتی ہے، اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اس وقت دنیا میں کہیں بھی خلافت کا نظام کسی درجہ میں بھی خلافت کے عنوان سے اور خلافت کے مفہوم کے مطابق موجود نہیں ہے۔ اس لیے ہم سب بحیثیت امت ایک شرعی فریضہ کے تارک ہیں اور یہ گناہ ہم سب کے ذمے اس وقت تک رہے گا جب تک امت میں کسی نہ کسی سطح پر خلافت کا نظام قائم نہیں ہو جاتا۔ ۱۹۲۴ء تک خلافت کا عنوان کسی نہ کسی درجہ میں جیسا بھی تھا، دنیا کے نقشے پر موجود تھا لیکن اس کے ختم ہونے کے بعد ۱۹۲۴ء سے یہ قرضہ اور فریضہ امت کے ذمہ ہے۔ دنیائے اسلام میں خلافت کی بہت سی تحریکیں کام کر رہی ہیں جن پر آگے چل کر تبصرہ کروں گا لیکن

بیسیوں فورموں پر مختلف ممالک میں خلافت کے لیے آواز اٹھائے جانے کے باوجود سردست خلافت کا نظام قائم ہوتا نظر نہیں آتا۔

۸- خلافت کا تاریخی تسلسل

ان گزارشات کے بعد میں خلافت کے تاریخی تسلسل کے بارے میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ خلافت راشدہ کا آغاز جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ سے ہوا تھا جو تیس سال تک جاری رہا اور اس میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے اسماء گرامی شامل ہیں، جبکہ حضرت معاویہؓ سے صلح تک حضرت حسنؓ کا مختصر دور اقتدار بھی تیس سال کے اسی دائرہ میں آتا ہے۔ اس کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کا بیس سالہ دور خلافت ہے اور پھر بنو امیہ، بنو عباس اور بنو عثمان کی خلافتیں ہیں اور درمیان میں حضرت عبد اللہ بن الزبیرؓ کی خلافت کا دور بھی ہے۔ خلافت راشدہ کا دورانیہ تیس سال میں کیوں محصور ہے اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی خلافتوں کا شرعی مرتبہ کیا ہے؟ اس پر اہل علم کے ہاں خاصی بحث ہوئی ہے اور کسی درجہ میں اب بھی جاری ہے، لیکن اس ساری بحث سے قطع نظر میرا طالب علمانہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ امت مسلمہ کے لیے حضرات صحابہ کرامؓ قیامت تک اسوہ حسنہ اور معیار ہیں۔ اور چونکہ امت ہر دور میں عزیمت پر عمل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو سکتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر عزیمت اور رخصت کے دونوں دائرے حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں ہی دکھا دیے تاکہ امت کو اپنے اپنے وقت میں راہ نمائی حاصل کرنے میں کسی الجھن کا سامنا نہ ہو۔ حضرات خلفائے راشدین کا دور عزیمت کا دور ہے جو ہمارا اصل آئیڈیل ہے جبکہ حضرت معاویہؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی خلافتوں کو رخصت کا دور کہا جا سکتا ہے جو رخصتوں کے دائرے میں امت کے لیے قیامت تک معیار اور آئیڈیل رہے گا۔

''خلافت راشدہ تیس سال تک رہی ہے'' کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد اسلامی خلافت ختم ہو گئی تھی، اسلامی خلافت اس کے بعد بنو امیہ، بنو عباس اور بنو عثمان کی خلافتوں کی صورت میں ۱۹۲۴ء تک چلتی رہی ہے، اس میں اتار چڑھاؤ یقیناً آتے رہے ہیں لیکن مجموعی طور پر خلافت کا یہ تسلسل عثمانیہ خلافت کے خاتمہ تک قائم رہا ہے۔ اور جس خلافت پر بھی اپنے دور کے اہل علم اور امت کی رائے عامہ کا اعتماد رہا ہے وہ فقہی اصولوں کے مطابق خلافت اسلامیہ ہی شمار ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ اسلامی خلافت کے اعلیٰ ترین معیار

کا ٹائٹل ہے، اس اعلیٰ ترین معیار کے قائم نہ رہنے کا مطلب خلافت کے نظام کا خاتمہ نہیں ہے، اس اعلیٰ ترین معیار میں کسی حد تک کمی ہوئی ہے بلکہ اگر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ارشاد کو دیکھا جائے کہ "علی منہاج النبوۃ" یعنی خلافت راشدہ کے اعلیٰ ترین معیار کے لیے جو شرائط ضروری تھیں وہ پہلے چار بزرگوں پر ہی مکمل ہوگئی تھیں اور ان کے بعد ان شرائط کا پایا جانا مثلاً یہ کہ وہ براہ راست جناب نبی اکرمؐ کی تربیت میں رہے ہوں، بعد کے خلفاء میں اس درجہ میں ممکن ہی نہ تھا، اس لیے اس کا تعلق کسی شرعی ضابطے سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام سے معلوم ہوتا ہے۔

تاریخی ترتیب کے لحاظ سے خلافت راشدہ کے بعد حضرت معاویہؓ سے شروع ہونے والا خلافت بنی امیہ کا نوے سالہ دور، پھر خلافت عباسیہ کا مختلف مراحل پر مشتمل پانچ سو سالہ دور، اور اس کے بعد ۱۹۲۴ء تک خلافت عثمانیہ کا دور ہمارا وہ تاریخی تسلسل ہے جس میں خلافت کا ادارہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے اور مختلف شعبوں میں کام بھی کرتا رہا ہے۔

خلافت عثمانیہ ترکوں کے بنو عثمان کی حکومت تھی، عثمان اول نے ۱۲۹۹ء میں "برسا" کے مقام پر عثمانی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا، پھر مصر میں قائم خلافت عباسیہ نے اس کے حق میں دست برداری اختیار کر کے عثمانیوں کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور سلطان محمد فاتحؒ نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے اسے عثمانی خلافت کا دارالسلطنت بنا دیا۔ ایک دور میں خلافت عثمانیہ کا دائرہ سلطنت افریقہ کے بیشتر حصوں کے علاوہ مصر، عراق، جزیرۃ العرب، بلغاریہ، البانیہ، ہنگری اور روس کے بعض علاقوں تک وسیع تھا۔

۹- نظام خلافت کا خاتمہ

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک لڑی جانے والی پہلی جنگ عظیم میں جس میں ایک طرف جرمنی اور بلغاریہ وغیرہ تھے اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس، روس اور دوسرے ممالک کا متحدہ محاذ تھا، اس جنگ میں خلافت عثمانیہ جرمنی کے ساتھ تھی۔ مختلف ممالک کے درمیان لڑی جانے والی اس عالمی جنگ میں چار سال کے دوران ایک کروڑ کے لگ بھگ افراد لقمۂ اجل بنے اور دو کروڑ کے قریب زخمی اور ناکارہ ہوگئے۔ اس جنگ میں جرمنی اور خلافت عثمانیہ کو شکست ہوئی جس کے نتیجہ میں خلافت عثمانیہ کے مختلف علاقوں پر متحدہ فوجوں نے قبضہ کر لیا، حتیٰ کہ مشرق وسطیٰ میں عراق، فلسطین اور مصر وغیرہ پر فرانس اور برطانیہ نے تسلط جما

لیا۔ اس سے قبل ترکوں اور عربوں کو قومیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متنفر کرنے کا ماحول پیدا کر لیا گیا تھا۔ ترکی میں نوجوان انقلاب پسندوں کا گروہ مصطفی کمال اتاترک کی قیادت میں سامنے آچکا تھا جبکہ عرب ممالک میں برطانوی فوج کے ایک افسر کرنل تھامس ایڈورڈ لارنس (لارنس آف عریبیا) نے مسلمان اور عرب دانش ور کا روپ دھار کر عربوں کو ترکوں کے خلاف متنفر کرنے کی مہم کامیابی کے ساتھ آگے بڑھالی تھی۔ اسی کے نتیجے میں مکہ کے گورنر شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے جزیرۃ العرب سے خلافت عثمانیہ کی فوجوں کو نکال دیا تھا، اسی دوران فلسطین پر قبضہ کر کے برطانیہ نے وہاں دنیا بھر سے یہودیوں کو لاکر بسانے کا موقع فراہم کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اسرائیل کی ریاست وجود میں آئی اور اس طرح برطانیہ نے یہودیوں کو ان کا قومی وطن واپس دلانے کا وعدہ پورا کیا۔ خود ترکی میں فاتح متحدہ فوجوں نے ڈیرے لگا لیے تھے اور یونان نے ترکی کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ ترکی کے قوم پرست راہ نما مصطفی کمال نے جو اتاترک کے لقب سے متعارف ہیں ترکی کی خود مختاری کا پرچم اٹھایا اور یونانی فوجوں سے جنگ لڑ کر انہیں شکست دی، انہوں نے خلافت تو ختم کر دی لیکن ترکی کی خود مختاری قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس پس منظر میں ترکی کے مستقبل کے سوال پر سوئٹرز لینڈ کے شہر ''لوزان''میں بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں یورپ کے اتحادیوں نے اس شرط پر اور ترک قومیت کی بنیاد پر ترکی کی خود مختاری تسلیم کرنے کا وعدہ کیا کہ:

- ترکی خلافت سے دست بردار ہو کر خلیفہ کو جلاوطن کر دے۔
- خلافت کا نظام اور شریعت کا قانون یکسر منسوخ کر دیا جائے اور آئندہ خلافت کے قیام اور شریعت کے نفاذ سے باز رہنے کا وعدہ کیا جائے، اور
- عرب، افریقہ اور یورپ میں خلافت عثمانیہ کے مقبوضات سے بھی دست برداری کا اعلان کیا جائے۔

قوم پرست ترکی کے لیڈروں مصطفی کمال اتاترک اور عصمت ازنو نے ''لوزان معاہدہ'' کے تحت ان شرائط کو تسلیم کر کے خلافت سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور ۱۹۲۴ء کے دوران اس وقت کے عثمانی خلیفہ کو اس کی تمام املاک ضبط کر کے جلا وطن کر دیا گیا۔ یوں خلافت سے اس دست برداری کے بعد خلافت کا برائے نام ادارہ بھی ختم ہو گیا، ہم اس کے

بعد سے خلافت سے محروم چلے آرہے ہیں اور خدا جانے کب تک یہ محرومی ہمارے مقدر میں رہے گی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی دنیا آج پورے عالم اسلام میں کسی جگہ بھی خلافت کے قیام اور شریعت کے نفاذ کی مخالفت کررہی ہے، حتیٰ کہ سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر نے وزیراعظم کی حیثیت سے ایک تقریر میں واضح طور پر کہا تھا کہ ہم دنیا کے کسی خطہ میں نہ خلافت قائم ہونے دیں گے اور نہ ہی شریعت نافذ ہونے دیں گے، اور امریکہ کے سابق نائب صدر ڈک چینی نے بھی ایک موقع پر اسی طرح کی گفتگو کی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ ترکی نے عالم اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے خلافت اور شریعت سے دست بردار ہونے اور آئندہ خلافت و شریعت کو نافذ نہ کرنے کا "معاہدہ لوزان" میں وعدہ کیا تھا، اس لیے خلافت کا دوبارہ قیام اور شریعت کا نفاذ اس بین الاقوامی معاہدہ کی خلاف ورزی ہوگا جس سے مسلمانوں کو روکنے کا عالمی قوتوں کو حق حاصل ہے اور اسی لیے دنیائے اسلام میں نفاذ اسلام کی تحریکوں کی مخالفت کی جارہی ہے۔

۱۰- خلافت کا سیاسی ڈھانچہ

خلافت کے اس تاریخی تسلسل اور خلافت کے خاتمہ کے پس منظر کے بعد اب میں چاہوں گا کہ خلافت راشدہ کے سیاسی ڈھانچے کے بارے میں بھی کچھ عرض کردوں، اس لیے کہ خلافت کا سیاسی اسٹرکچر آج کی دنیا میں ایک اہم موضوع کے طور پر زیر بحث ہے اور بہت سا کنفیوژن لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ خلافت راشدہ کے تعارف کے ضمن میں یہ عرض کرچکا ہوں کہ خلافت کی بنیاد چند اصولوں پر ہے:

- خلیفہ عوام کی صوابدید پر منتخب ہوگا، البتہ اس کے دو پہلو قابل توجہ ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے میں اہل حل و عقد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کریں اور ابن تیمیہؒ اسے عامۃ المسلمین کا حق قرار دیتے ہیں۔
- خلیفہ خاندانی بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ خاندان کی قید کے بغیر کسی بھی مستحق شخص کو خلیفہ منتخب کیا جاسکے گا۔
- خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں واضح کردیا تھا کہ اگر میں صحیح راستے پر چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر قرآن و سنت سے ہٹ کر چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کردو۔ یہاں سیدھا کردینے

کے لفظ میں بھی ایک بلیغ اشارہ ہے کہ عوام کو صرف خلیفہ کی غلطی کی نشاندہی کر دینے کا حق نہیں دیا جا رہا بلکہ "فقومونی" کہہ کر سیدھا کر دینے کا حق انہیں دیا جا رہا ہے جسے میں اپنی طالب علمانہ رائے میں "حق احتساب" سے تعبیر کرتا ہوں اور اس کی عملی صورتیں زمانے کے حالات کے مطابق مختلف ہو سکتی ہیں۔

- خلیفہ خود مختار نہیں بلکہ قرآن و سنت کے احکام اور امت کے اہل حل و عقد کے ساتھ مشاورت کا پابند ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور بہت سے دوسرے فقہاء کرامؒ کا کہنا یہ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب عوام کا براہ راست حق ہے کیونکہ حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت و بیعت میں سب لوگ بلا امتیاز شریک تھے۔ میرا طالب علمانہ رجحان بھی اسی طرف ہے لیکن اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ انتخاب براہ راست ہو یا بالواسطہ دونوں صورتوں میں خلافت کے قیام اور خلیفہ کے انتخاب کے لیے امت کی اجتماعی صوابدید ہی بنیاد ہے اور اس اجتماعی صوابدید کے اظہار کے لیے کوئی بھی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ البتہ اس اصولی بحث کے ساتھ ساتھ خلیفہ کے انتخاب کے لیے فقہاء کرامؒ نے جو عملی صورتیں بیان فرمائی ہیں ان کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے۔ فقہاء کرام نے خلافت کے انعقاد کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں:

- امت کے عوام یا اہل حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں جیسا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا انتخاب ہوا تھا۔
- خلیفۂ وقت کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دے جیسا کہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ اول نے نامزد کیا تھا۔
- خلیفۂ وقت کچھ لوگوں کو خلیفہ کے تقرر کا اختیار دے دے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے چھ ممتاز افراد پر کمیٹی قائم کر دی تھی اور انہوں نے عوام سے اجتماعی مشاورت کے بعد حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا تھا۔
- خلافت کی مجلس شوریٰ کے ارکان کسی کو خلیفہ بنا لیں جیسا کہ حضرت علیؓ کا انتخاب ہوا تھا۔

• کوئی اہل شخص اقتدار پر قبضہ کرلے اور امت اسے قبول کرلے جیسا کہ حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد امت مسلمہ نے حضرت امیر معاویہؓ کو متفقہ امیر المومنین کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ ان پانچ صورتوں میں سے آج کے دور میں صرف پہلی اور آخری دو صورتیں قابل عمل ہیں، درمیان کی تینوں صورتیں عملا ممکن نہیں ہیں، اس لیے کہ ان تینوں صورتوں کا مدار خلافت اور خلیفہ کی موجودگی پر ہے اور چونکہ اس وقت خلافت اور خلیفہ شرعی طور پر موجود نہیں ہیں اس لیے درمیان کی تینوں صورتیں خارج از بحث ہوجاتی ہیں۔

خلافت کے قیام کی عملی صورتیں

اس بنیاد پر آج کے دور میں خلافت کے قیام اور خلیفہ کے انتخاب کی دو ہی صورتیں قابل عمل ہیں۔ ایک یہ کہ کسی مسلم ریاست کے عوام یا ان کے منتخب نمائندے خلافت کو اپنے ملک کا نظام قرار دے کر باقاعدہ خلیفہ کا انتخاب کرلیں اور دوسری یہ کہ کوئی اہل شخص کسی مسلم ریاست میں اقتدار پر قبضہ کرکے خلافت کے نظام کے قیام کا اعلان کرے اور عوام اسے بطور خلیفہ قبول کرلیں۔ اس کے سوا کوئی صورت آج کے دور میں ممکن اور قابل عمل نہیں ہے۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہمارے دور میں خلافت اور امامت کے دونوں تصورات کو دستور و قانون کی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

جناب آیت اللہ خمینی کی قیادت میں ایران میں مذہبی انقلاب آیا تو وہاں ”امامت“ کے فلسفہ کو دستوری شکل دی گئی اس لیے کہ اہل تشیع کے نزدیک حکمرانی کا حق امام غائب کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ امام غائب کے ظہور تک ”ولایت فقیہ“ کو دستوری طور پر ان کا نمائندہ اور قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور ولایت فقیہ کو ایرانی دستور میں عملا امام کا درجہ حاصل ہے۔ ایران کے منتخب صدر، وزیر اعظم اور پارلیمنٹ سے بالاتر ولایت فقیہ کے طور پر رہبر انقلاب کا درجہ ہے جنہیں پارلیمنٹ، عدلیہ اور حکومت سمیت کسی بھی اتھارٹی کے فیصلے کو مسترد کرنے کا حق حاصل ہے اور ان کے فیصلے کو کسی جگہ بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا، وہ تمام معاملات میں فائنل اتھارٹی ہیں۔ البتہ ان کے ساتھ ممتاز علماء اور وکلاء پر مشتمل ”شورائے نگہبان“ بنائی گئی ہے جسے امام کے مشیروں کی کونسل سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح ایران نے

”امام“ کا لفظ اختیار کیے بغیر امامت کو دستور کا حصہ بنالیا ہے اور اسی کے مطابق ایران کا نظام چل رہا ہے۔

جبکہ اسلام کے نام پر قائم ہونے کے بعد پاکستان میں بھی یہ سوال پیدا ہوگیا تھا کہ اس کا سیاسی ڈھانچہ کیسا ہوگا جو اسلام سے متصادم نہ ہو۔ اس کے لیے خلافت کا عنوان اختیار کرنے سے گریز کیا گیا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خلافت کا ماڈل اس وقت ”خلافت عثمانیہ“ کی صورت میں دنیا کے سامنے تھا جو خاندانی خلافت تھی اور پاکستان میں کسی خاندانی حکومت کا کوئی عملی امکان نہیں تھا۔ اس لیے قرارداد مقاصد اور اس کے ساتھ ساتھ تمام مکاتب فکر کے سرکردہ ۳۱ علماء کرام کے مرتب کردہ ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں چند اصول واضح طور پر طے کردیے گئے کہ:

- حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے۔
- حق حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہوگا۔
- منتخب پارلیمنٹ قرآن وسنت کی پابند ہوگی۔
- عوام کو حق احتساب حاصل ہوگا۔

میری طالب علمانہ رائے میں ہمارے ہاں بھی خلافت کی اصطلاح استعمال کیے بغیر خلافت کے اصولی مفہوم کو قرارداد مقاصد اور علماء کے ۲۲ نکات میں پوری طرح سمودیا گیا ہے اور میرے خیال میں اگر آج ہم کسی جگہ ”خلافت“ کے ٹائٹل کے ساتھ اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں گے تو اس کی اصولی اور دستوری بنیادیں اس سے مختلف نہیں ہوں گی۔

خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط

یہاں ایک اور بحث بھی قابل توجہ ہے کہ ایک عرصہ تک خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط کو لازمی سمجھا جاتا رہا ہے اور کم وبیش تمام فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔ لیکن عثمانی خلفاء قریشی نہیں تھے، اس کے باوجود ان کی خلافت پر صدیوں تک امت کے جمہور اہل علم کا اتفاق رہا ہے اور اس خلافت کو حرمین شریفین اور مسجد اقصیٰ میں بھی تسلیم کرکے جمعۃ المبارک کے خطبوں میں ان کا مسلسل تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ اس لیے یہ سوال سامنے آیا کہ اگر خلیفہ کے لیے قریشی ہونا ضروری ہے تو عثمانی خلفاء کی خلافت کو کیسے تسلیم کرلیا گیا۔

قدیم دور میں اس پر صرف ابن خلدونؒ نے بات کی ہے، انہوں نے یہ لکھا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی "الائمۃ من قریش" بطور حکم کے نہیں بلکہ بطور خبر اور پیش گوئی کے تھا جو پوری ہوگئی ہے، اس لیے آئندہ اس شرط کو لازمی قرار دینا ضروری نہیں ہے۔ اس موقف کے حق میں یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک ارشاد میں خلفاء کے قریشی ہونے کا ذکر کرتے ہوئے "ما اقاموا الدین" کا جملہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک وہ دین کو قائم کریں گے خلافت قریش میں رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قریشی اقامت دین کے فریضہ سے کوتاہی کریں گے تو خلافت ان کے پاس نہیں رہے گی۔ لیکن اس بحث کے باوجود جمہور فقہائے امت خلیفہ کے لیے لازمی شرائط میں قریشی ہونے کا برابر ذکر کرتے رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اس بحث نے اس وقت دلچسپ صورت اختیار کرلی جب متحدہ ہندوستان میں ترکوں کی خلافت عثمانیہ کی حمایت میں تحریک چلائی گئی تو کہا گیا کہ قریشی نہ ہونے کی وجہ سے ترکوں کا عثمانی خاندان تو سرے سے خلافت کا اہل ہی نہیں ہے۔ اور جب شریف مکہ حسین نے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرکے حجاز سے ترکی افواج کو نکالا تب ایک فتویٰ ترکوں کے خلاف مرتب کیا گیا تھا جس میں انہیں مختلف حوالوں سے خلافت کے لیے نااہل قرار دیا گیا تھا، ان میں ایک حوالہ قریشی نہ ہونے کا بھی تھا، اس پر بریلوی مکتب فکر کے امام مولانا احمد رضا خان کا ایک مستقل رسالہ "دوام العیش فی ان الائمۃ من قریش" کے نام سے مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ ہمارے دیوبندی اکابر علماء نے، جو ترکوں کی خلافت عثمانیہ کو شرعی خلافت قرار دے کر اس کی حمایت میں جدوجہد کر رہے تھے، اس کے جواب میں ابن خلدونؒ والا موقف اپنایا اور خلافت کے قریش میں ہونے کے بارے میں جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد گرامی کو انشاء اور حکم کی بجائے خبر اور پیش گوئی قرار دے کر ترکوں کی خلافت کی حمایت کی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے ایک خطبۂ صدارت میں اس موقف کا ذکر فرمایا ہے اور اسے صحیح موقف قرار دیا ہے۔

بہرحال دلائل اور مکالمہ کی تفصیل میں جائے بغیر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت کے بارے میں ہمارے دور کے اکابر علماء کرام نے باہمی مشاورت یا اجتہاد کے ساتھ یہ اصول طے کیا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کا سربراہ عوام کا منتخب کردہ ہوگا، اور خلافت کی شرائط پوری کرنے والا کوئی بھی شخص خلیفہ منتخب ہو سکتا ہے۔

۱۱- خلافت کی بحالی کی جدوجہد

خلافت کے بارے میں یہ صورت حال سامنے رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں اس مقصد کے لیے بیسیوں حلقے کام کر رہے ہیں کہ کسی جگہ خلافت اسلامیہ قائم ہو جائے۔ ان میں سے بعض حلقوں کے ساتھ میرا رابطہ ہے اور اصولی طور پر ان کی جدوجہد کی حمایت بھی کرتا ہوں لیکن اس سلسلہ میں میرے بعض تحفظات ہیں جن کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ کم و بیش ہر حلقہ میں خلافت کے ساتھ ساتھ خلیفہ کے لیے کسی شخصیت کو سامنے رکھ کر اس کے گرد لوگوں کو جمع کرنے کی بات بھی کی جاتی ہے جو درست نہیں ہے۔ میں ان دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ خلافت کے احیاء کی تحریک میں حمایت کرتا ہوں لیکن کسی کو خلافت کے لیے ابھی سے سامنے رکھ کر اس کے حق میں کیمپین (Campaign) کو درست نہیں سمجھتا۔ ابھی خلافت کے لیے رائے عامہ کو تیار کرنے کا دور ہے، لوگوں کی ذہن سازی کا دور ہے، اس کے لیے راہ ہموار کرنے کا دور ہے، اور خلافت کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں پائے جانے والے شکوک و شبہات کو دور کر کے انہیں منظم کرنے کا دور ہے۔ جب یہ مرحلہ گزر کر خلافت کی عملی تشکیل کا دور آئے گا تو پھر دیکھا جائے گا کہ خلافت کے لیے موزوں ترین شخصیت کون سی ہے۔ ایک دفعہ لندن کے ٹریفالیگر سکوائر میں حزب التحریر کے زیر اہتمام نکالی جانے والی خلافت ریلی میں مجھے شرکت کا موقع ملا، وہاں خلافت کے حق میں مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کے جذبات سے پر نعرے سن کر میری آنکھیں بھی بار بار نم ہوتی رہیں۔ اس موقع پر ایک ترک نوجوان کو دیکھا کہ وہ بادشاہوں والا لباس زیب تن کیے کھڑا ہے اور لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دے رہا ہے۔ اس نے مجھ سے بھی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ کیا آپ مجھ سے متفق ہیں، میں نے عرض کیا ”أتفق علی الخلافۃ لا علی الخلیفۃ“ کہ میں خلافت کے احیاء کے لیے آپ سے متفق ہوں لیکن آپ کو خلیفہ قرار دینے سے میں متفق نہیں ہوں۔

۱۲- خلافت اور رائے عامہ

کچھ لوگوں کے ذہن میں بعض فقہی جزئیات ہیں کہ اگر کسی شخص کو چند افراد خلیفہ منتخب کر لیں اور کچھ لوگ اس کی بیعت کر لیں تو باقی ساری امت پر اس خلافت کو تسلیم کرنا شرعاً ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اور میں علماء کرام سے گزارش کیا کرتا ہوں کہ

وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ کا بغور مطالعہ کریں جو انہوں نے اپنی شہادت سے قبل غالباً آخری خطبہ جمعہ کے طور پر مسجد نبویؐ میں ارشاد فرمایا تھا اور امام بخاریؒ نے اسے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کو بتایا گیا کہ چند افراد نے باہمی مشورہ میں طے کیا ہے کہ حضرت عمرؓ فوت ہو گئے تو ہم کچھ افراد فلاں بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کی خلافت کا اعلان کر دیں گے اور باقی سب لوگوں پر اسے ماننا ضروری ہو جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے خطبہ جمعہ میں اس کا ذکر کر کے خبردار کیا کہ ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اس خطبہ میں حضرت عمرؓ کے دو جملوں کا بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا، ایک یہ کہ انہوں نے فرمایا کہ جو لوگ عام مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر کسی کو خلیفہ بنانے کی بات کر رہے ہیں "یریدون أن یغصبوا امورھم" وہ عام مسلمانوں کا حق چھیننا چاہتے ہیں، اور دوسری بات یہ کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عمومی مشاورت کے بغیر اگر کسی شخص کی بیعت کی جائے تو تم اس کی بات ہرگز نہ ماننا اور نہ اس کی بیعت کرنا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے مسلمانوں کی عمومی مشاورت کو ضروری قرار دیا ہے اور اس کے خلاف کرنے سے منع کیا ہے۔

ایک اور مغالطہ بھی دور ہو جائے تو مناسب ہوگا کہ خلیفہ کی طرف سے نامزدگی کی صورت میں بھی عمومی مشاورت ایک ناگزیر امر ہے۔ حضرت عمرؓ نے چھ افراد کو نامزد کیا تھا، ان میں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے کے بعد تین رہ گئے تھے، ان تین میں سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کو اس صورت میں فیصلے کا اختیار دے دیا تھا کہ وہ خود یعنی عبد الرحمن بن عوفؓ امیدوار نہیں ہوں گے۔ اب فائنل راؤنڈ میں حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے حضرت عثمان اور حضرت علیؓ میں سے کسی کا انتخاب کرنا تھا۔ لیکن بخاری شریف کی تفصیلی روایت کے مطابق حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ منورہ میں مشورہ کے لیے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، تین دن تین رات تک مسلسل میں نے ہر طبقہ کے لوگوں سے مشاورت کی اور اس دوران میں نے نیند کا سرمہ تک آنکھوں میں نہیں لگایا، جبکہ تین دن تین رات کی مسلسل عوامی مشاورت کے بعد انہوں نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سنایا کہ میں نے سب لوگوں سے مشورہ کیا ہے اور اکثریت کی رائے کو حضرت عثمانؓ کے حق میں پایا ہے اس لیے میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ نامزدگی کی صورت میں بھی رائے عامہ

کو اعتماد میں لینا ضروری ہے اور عمومی مشاورت کے بغیر کسی کو خلیفہ مقرر کر لینا صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ پھر عام لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے مختلف طریقے ہیں، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے تو گھر گھر جا کر لوگوں کا رجحان معلوم کیا مگر لوگوں کی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعہ معلوم کرنا بھی سنت نبویؐ میں شامل ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ غزوۂ حنین کے بعد جب نبی اکرمؐ نے بنو ھوازن کے قیدی اور اموال صحابہ کرامؓ میں تقسیم کر دیے تو بنو ھوازن کے وفد نے حاضر ہو کر کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اس لیے ہمارے قیدی اور اموال واپس کر دیے جائیں۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میں کافی دنوں تک تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم نہیں آئے، میں نے قیدی اور اموال بطور غلام اور غنیمت اپنے مجاہدین میں تقسیم کر دیے ہیں اس لیے اب یہ ان کی ملکیت ہو گئے ہیں۔ تم مسلمان ہو کر آئے ہو تو میں دونوں چیزیں تمہیں واپس نہیں کر سکتا، قیدیوں اور اموال میں سے ایک کی بات کرو تو اس کی صورت نکل سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس صورت میں ہمارے قیدی واپس کر دیے جائیں۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے صحابہ کرامؓ کو، جو بارہ ہزار کے لگ بھگ تھے، جمع کیا اور فرمایا کہ میں بنو ھوازن کو ان کے قیدی واپس کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں اس لیے تم میں سے جو شخص اپنے حصے کا قیدی بخوشی واپس کر دے تو اس کی مرضی، ورنہ قیدی واپس کر دو میں اس کے بدلے اگلی جنگ میں تمہیں معاوضہ کے طور پر قیدی بطور غلام دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ صحابہ کرامؓ نے بیک آواز کہا کہ ہم سب بخوشی سب قیدی واپس کرتے ہیں، لیکن جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ نہیں اس طرح ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ تم میں سے کون بخوشی راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے، اس لیے تم واپس اپنے خیموں میں جاؤ اور "حتی یرفع الینا عرفاء کم امرکم" تمہارے نمائندے تمہاری رائے معلوم کر کے ہمیں بتائیں تب ہم حتمی فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ سب لوگ خیموں میں چلے گئے اور اگلے روز ان کے نمائندوں نے نبی اکرمؐ کو رپورٹ دی کہ سب لوگ راضی ہیں۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے بنو ھوازن کو ان کے قیدی واپس کر دیے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی رائے معلوم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعہ معلوم کر لی جائے۔ اور جہاں ان کے حقوق کی بات ہوگی وہاں عوام کی رائے معلوم کرنا ضروری ہوگا اور یہ بھی خلافت کے سیاسی ڈھانچے کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ اس بحث کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ خلافت کے قیام اور خلیفہ کے انعقاد کے

لیے رائے عامہ کو اعتماد میں لینا اور عوامی مشاورت کے ذریعہ اس کام کو مکمل کرنا ضروری ہے۔

۱۳۳- خلافت کی بحالی کی قابل عمل صورت

آخر میں آج کے دور میں خلافت کے قیام کی قابل عمل صورت کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں پاکستان کی معروضی صورت حال میں نفاذ اسلام کے حوالہ سے دو ذہن پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ سیاسی عمل اور پارلیمانی قوت کے ذریعہ اسلام نافذ ہو جائے گا، اور دوسرا یہ کہ ہتھیار اٹھائے بغیر اور مقتدر قوتوں سے جنگ لڑے بغیر اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ ایک طرف صرف پارلیمانی قوت پر انحصار کیا جا رہا ہے جبکہ دوسری طرف ہتھیار اٹھا کر عسکری قوت کے ذریعہ مقتدر قوتوں سے جنگ لڑنے کو ضروری قرار دیا جا رہا ہے، میری طالب علمانہ رائے میں یہ دونوں طریقے ٹھیک نہیں ہیں۔ صرف الیکشن، جمہوریت اور پارلیمانی قوت کے ذریعہ نفاذ اسلام اس ملک میں موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے، اور ہتھیار اٹھا کر حکمران طبقات کے ساتھ جنگ کرنا اس کے شرعی جواز یا عدم جواز کی بحث سے قطع نظر بھی عملاً مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ ہے کہ کسی مسلم ریاست میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی شرائط فقہاء کرامؒ نے کیا بیان کی ہیں، اور خاص طور پر جمہور فقہائے احناف کا موقف اس سلسلہ میں کیا لکھا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا عسکری گروپوں کے لیے ملک کی فوج اور اسٹیبلشمنٹ سے جنگ لڑ کر کوئی علاقہ حاصل کر لینا اور اس پر قبضہ برقرار رکھ کر اس میں کوئی نظام نافذ کر لینا ممکن بھی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہوش مند شخص اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس سلسلہ میں جدوجہد کے طریق کار کی حد تک ایران کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایران کی مذہبی قیادت نے شاہ ایران کی قیادت سے انحراف کر کے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو ذہن سازی اور فکری بیداری کی جولانگاہ بنایا، مسلسل سترہ برس تک محنت کے ذریعے اگلی نسل کو اس کے لیے تیار کر کے اسے اپنی قوت بنایا، اور اس قوت کے ذریعہ ہتھیار اٹھائے بغیر سٹریٹ پاور اور تحریکی قوت کے نتیجے میں شاہ ایران کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

میں ایرانیوں کے مذہب کی نہیں بلکہ ان کی جدوجہد کے طریق کار کی بات کر رہا ہوں کہ ان کے کامیاب تجربہ کو سامنے رکھ کر کیا ہم اپنی جدوجہد کا طریق کار طے نہیں کر سکتے؟ اگر

کچھ دوستوں کو یہ حوالہ میرے قلم سے پسند نہ آرہا ہو تو میں امریکہ کے سیاہ فاموں کی اس جدوجہد کا حوالہ دینا چاہوں گا جو اب سے صرف پون صدی قبل کالوں کو گوروں کے برابر شہری حقوق دلوانے کے لیے منظم کی گئی تھی۔ ایک مذہبی لیڈر مارٹن لوتھر کنگ نے سیاہ فاموں کی سٹریٹ پاور کو منظم کیا، پرامن احتجاجی تحریک کو آگے بڑھایا اور صرف دو عشروں کی جدوجہد سے ۱۹۶۴ء میں اس وقت کے امریکی صدر جان ایف کینیڈی سے سیاہ فام آبادی کے لیے سفید فاموں کے برابر شہری حقوق کی دستاویز پر دستخط کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، دونوں کے مراکز میں گیا ہوں، ان کے راہ نماؤں سے ملاقاتیں کی ہیں اور ان کی جدوجہد کے مختلف مراحل سے واقف ہوں۔ میں افغانستان بھی گیا ہوں، بار بار گیا ہوں، روسی استعمار کے خلاف جہاد میں مختلف جنگی محاذوں پر حاضری دی ہے، افغان مجاہدین کی روسی استعمار کے خلاف جنگ کو جہاد سمجھ کر اس میں شریک ہوا ہوں، امریکی استعمار کے خلاف ان کی جنگ کو بھی جہاد سمجھتا ہوں اور حتی الوسع اسے اخلاقی اور سیاسی طور پر سپورٹ کرتا ہوں۔ اس کے باوجود پورے شرح صدر اور دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ دینی تصلب اور حمیت و غیرت میں تو بلاشبہ افغان مجاہدین اور افغان طالبان ہمارے لیے مشعل راہ ہیں، لیکن نفاذ اسلام کی جدوجہد کے طریق کار کے حوالہ سے ہمیں ایران کی مذہبی تحریک کا مطالعہ کرنا ہو گا اور مارٹن لوتھر کنگ کی تحریک سے واقفیت حاصل کرنا ہو گی۔ اگر پرامن عوامی تحریک اور رائے عامہ کی منظم قوت کے ذریعہ "امامت" کو دستوری شکل دے کر اسے نافذ کیا جا سکتا ہے تو "خلافت" کے احیاء و قیام کے لیے یہ قوت آخر کیوں کام میں نہیں لائی جا سکتی؟

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۶ تا ۱۱ جنوری ۲۰۱۳ء)

دینی مدارس کا نصاب و نظام۔ والد محترمؒ اور عم مکرمؒ کے رجحانات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۲۰۱۳ء)

دینی مدارس کے نصاب و نظام کے بارے میں بہت سے دوست مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اس حوالے سے آپ کے والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالی کا

موقف اور طرز عمل کیا تھا؟ یہ سوال بہت سے ذہنوں میں آیا ہوگا، اس لیے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالی اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی نور اللہ مرقدہ کے تعلیمی رجحانات اور طریق کار کی بابت کچھ معروضات پیش کر رہا ہوں۔

اس حوالے سے پہلی گزارش تو یہ ہے کہ میری یہ مجبوری ہے جو بہت سے دوستوں کو سمجھ نہیں آ رہی اور بعض دوستوں کو تو ہضم بھی نہیں ہو رہی کہ میں نے ان دو بزرگوں کے زیر سایہ تعلیم و تدریس اور فکری و ذہنی تربیت کے ماحول میں چار عشروں سے زیادہ وقت گزارا ہے اور سب سے زیادہ انہی سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی جس خوبی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ علمی مسائل میں اختلاف کا حق دیتے تھے، اس اختلاف کو سنتے تھے، برداشت کرتے تھے، بڑے تحمل کے ساتھ دلیل اور منطق کے ساتھ اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کرتے تھے، اختلاف رائے کو اختلاف کے درجے میں رکھتے تھے اور اسے مسئلہ نہیں بنا لیتے تھے اور بحث و تمحیص اور تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر اگر اپنے کسی موقف اور رائے سے رجوع کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو اس میں کسی تامل سے کام نہیں لیتے تھے۔

چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کی یہ بات میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا کہ جب حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیت علماء اسلام دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو میں "درخواستی گروپ" کے متحرک ترین کارکنوں میں سے تھا اور حضرت درخواستیؒ کے موقف کے اظہار اور دفاع میں پیش پیش تھا۔ اس پر دوسرے گروپ کے بعض سرکردہ بزرگ میرے خلاف شکایت لے کر حضرت صوفی صاحبؒ کے پاس آئے تو حضرت صوفی صاحبؒ نے میرے بارے میں فرمایا کہ اگر اس نے کوئی اخلاقی یا مالی بد دیانتی کی ہے یا کسی بزرگ کی توہین کی ہے تو ابھی اسے آپ حضرات کے پاس بلا کر ڈانٹوں گا، لیکن اگر صرف رائے کی بات ہے تو رائے کا حق جیسے آپ حضرات کو ہے، اسے بھی وہی حق حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اسے کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ وہ اپنی رائے میں آزاد ہے۔

اس ضروری وضاحت کے بعد دوسری گزارش یہ ہے کہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالی کا اب سے نصف صدی قبل خیال تھا کہ درس نظامی کے مروجہ نصاب میں قرآن کریم ترجمہ و تفسیر کے ساتھ شامل نہیں ہے۔ صرف اوپر کے

درجوں میں جلالین اور بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھا دینا کافی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ ضرورت قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کی ہے۔ اس لیے انہوں نے جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ترجمہ قرآن کریم مناسب تفسیر کے ساتھ مستقل طور پر پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا جس میں اس دور میں کافیہ کے درجہ سے اوپر تک کے طلبہ کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ باقاعدہ حاضری ہوتی تھی، غیر حاضری پر ہمارے طالب علمی کے دور میں جرمانہ ہوتا تھا جو چار آنے (پچیس پیسے) فی غیر حاضری ہوتا تھا اور مدرسہ میں تعلیم کا آغاز درس قرآن کریم کے اسی پیریڈ سے ہوتا تھا۔ بحمد اللہ تعالیٰ اب یہ سعادت میرے حصہ میں ہے اور ترجمہ قرآن کریم کے پون گھنٹے کے اس پیریڈ کے بعد باقی اسباق کی ترتیب شروع ہوتی ہے۔ مکمل ترجمہ قرآن کریم دو سال میں مکمل ہوتا ہے، پندرہ پارے ایک سال اور پندرہ پارے دوسرے سال میں پڑھائے جاتے ہیں۔ دورۂ حدیث اور اس کے بعد کے دو درجات کے طلبہ کی شرکت لازمی ہوتی ہے اور اس کی باقاعدہ حاضری لگتی ہے، البتہ جرمانے کا سلسلہ اب نہیں ہے۔ جرمانے کے سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ میں نے یہ ترجمہ طالب علمی کے دور میں کم از کم تین بار حضرت والد محترمؒ سے پڑھا ہے۔ اس دوران غیر حاضریاں بھی ہوتی تھیں اور جرمانہ بھی دینا پڑتا تھا۔ حضرت والد محترمؒ جب جرمانے والوں کے نام پکار کر جرمانے کی رقم کا اعلان کرتے تو فہرست میں عام طور پر میرا نام بھی ہوتا تھا۔ میں اپنے نام کے ساتھ جرمانے کا اعلان سن کر حضرت والد محترمؒ کے جیب کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا کہ ادا تو وہیں سے ہونا ہے۔ اس پر تھوڑی بہت ڈانٹ پلا کر وہ جرمانہ ادا کر دیتے تھے۔

بعد میں ۱۹۷۶ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم اور اس کی ملحقہ جامعہ مسجد نور کو محکمہ اوقات پنجاب نے سرکاری تحویل میں لینے کا اعلان کیا تو اس کے خلاف مزاحمتی تحریک کے دوران یہ ضرورت پیش آئی کہ شعبان اور رمضان المبارک کی تعطیلات میں مدرسہ خالی نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ سالانہ تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر شروع کر دیا گیا جو اکیس برس تک (۱۹۷۶ء تا ۱۹۹۶ء) مسلسل جاری رہا اور ہزاروں علماء کرام اور طلبہ نے اس سے استفادہ کیا۔ یہ دورۂ تفسیر حضرت والد محترمؒ کی آواز میں آڈیو سی ڈی کی صورت میں مکمل طور پر موجود و محفوظ ہے، برادر عزیز مولانا عبد القدوس خان قارن اسے تحریری صورت میں مرتب کر رہے ہیں اور یہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کا ذوق رکھنے والے علماء کرام اور طلبہ کے لیے ایک عظیم علمی تحفہ ہوگا۔

کم و بیش اکیس برس تک مسلسل پڑھانے کے بعد یہ سلسلہ حضرت والد محترمؒ نے ترک کر دیا تو بہت سے دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ میں نے بھی ان سے عرض کیا کہ دورۂ تفسیر کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میں اب معذور ہو گیا ہوں اور مسلسل پڑھانا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں نے عرض کیا کہ چند پارے آپ پڑھا دیں، باقی میں اور قارن صاحب مکمل کر لیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ جو علماء اور طلبہ دورۂ تفسیر پڑھنے کے لیے آئیں گے، وہ اس اعتماد کے ساتھ آئیں گے کہ سارا قرآن کریم میں خود (یعنی حضرت شیخؒ) پڑھاؤں گا۔ اگر میں نے چند پارے پڑھا کر چھوڑ دیا تو ان کا اعتماد مجروح ہو گا جو دیانت کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے فرمایا کہ اب چونکہ وفاق المدارس نے مکمل ترجمہ قرآن کریم نصاب میں شامل کر دیا ہے جو مختلف مراحل میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے، اس لیے اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ چنانچہ سالانہ دورۂ تفسیر کا سلسلہ موقوف ہو گیا جبکہ دو سال والا ترجمہ قرآن کریم وفاق المدارس کے ترجمہ قرآن کریم کے نصاب کے باوجود الگ طور پر اب بھی ہوتا ہے اور حضرت والد محترمؒ کی زندگی میں ہی ان کے حکم پر یہ سعادت میرے حصہ میں آگئی تھی جو مسلسل جاری ہے، فالحمد للہ علی ذلک۔

میرے ساتھ ابتدائی سالوں میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ کے بھتیجے قاضی مشتاق احمد صاحب بھی شریک سبق رہے ہیں۔ غالباً شرح ملا جامی تک ہم نے اکٹھے پڑھا ہے۔ بڑے ذہین طالب علم تھے۔ بعض باتیں جو سبق کے دوران سمجھ میں نہیں آتی تھیں، میں تکرار کے دوران ان سے سمجھا کرتا تھا۔ انہوں نے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا اور میں نے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دینے کا ارادہ کر لیا۔ خیال تھا کہ انگریزی اور حساب کے علاوہ دوسرے مضامین میں کچھ زیادہ محنت درکار نہیں ہو گی، اس لیے پہلے مرحلہ میں انہیں کلیئر کر لیتا ہوں اور اگلے سال تیاری کر کے انگریزی اور حساب کا امتحان دے دوں گا۔ اس کے لیے میں نے داخلہ فارم حاصل کر لیا جس کا حضرت والد محترمؒ کو علم ہوا تو انہوں نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا حتیٰ کہ دھمکی دی کہ اگر تم نے امتحان دیا تو میں تم سے لاتعلقی اختیار کر لوں گا۔ چنانچہ میں نے ارادہ ترک کر دیا حتیٰ کہ جب میرے ساتھی قاضی مشتاق احمدؒ نے میٹرک کے امتحان میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے پر تعلیمی لائن بدل کر سکول و کالج کی لائن

اختیار کر لی تو مجھے حضرت والد محترمؒ کے اس فیصلے پر اطمینان بھی ہو گیا کہ ان کی ناراضگی اور دھمکی فراست وبصیرت پر مبنی تھی۔

لیکن اس کے بعد دو عشروں کا وقفہ نہیں گزرا تھا کہ ہم نے گوجرانوالہ میں جمعیۃ اہل سنت کے زیر اہتمام ''شاہ ولی اللہ یونیورسٹی'' کے قیام کا پروگرام بنا لیا جس کا ٹائٹل ''دینی وعصری تعلیم کا حسین امتزاج'' تھا اور اہداف میں یہ بات شامل تھی کہ علماء اور فضلاء کو یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کے باقاعدہ امتحانات دلوائے جائیں اور دو تین سال تک ہم نے بہت سے فضلاء کو بی اے اور ایم اے کے امتحانات دلوائے۔ اس سارے پروگرام کی سرپرستی حضرت والد محترمؒ اور حضرت عم مکرمؒ فرما رہے تھے۔ دونوں بزرگ شاہ ولی اللہ ٹرسٹ کے رکن بلکہ باقاعدہ سرپرست تھے۔ اس کے اجلاس عام طور پر مدرسہ نصرۃ العلوم میں ہوتے تھے اور حضرت والد محترمؒ ان کی صدارت کیا کرتے تھے۔ اس دوران ایک بات یہ ہوئی کہ ۱۹۸۶ء میں جمعیۃ علماء برطانیہ کی دعوت پر حضرت والد محترمؒ اس کی ''سالانہ توحید وسنت کانفرنس'' میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تو تین ہفتے وہاں کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ ہمارے محترم دوست اور حضرت والد محترمؒ کے عزیز شاگرد مولانا عبد الرؤف ربانی خطیب مکی مسجد رحیم یار خان ان کے رفیق سفر تھے۔ اس سفر سے واپسی پر ایک مجلس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے فرمایا کہ ''او خبطی!'' تم ٹھیک کہتے تھے۔ انگریزی زبان اور جدید تعلیم بھی ضروری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے کسی پروگرام میں سب لوگوں کے سامنے فرما دیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی ایک عمومی طرز کی نشست میں حضرت والد محترمؒ نے نہ صرف یہ بات فرما دی بلکہ عصری تعلیم کی ضرورت پر پندرہ بیس منٹ تک گفتگو بھی فرمائی جو اس ادارے کی آئندہ تعلیمی پالیسی کی بنیاد بنی۔

یہ ہمارے بزرگوں کا ذوق اور مزاج ہے کہ دینی اور قومی حوالے سے وہ جس چیز کی ضرورت محسوس کر لیتے تھے، اسے نظر انداز نہیں کرتے تھے اور انہیں اس کے لیے اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنا پڑتا تو وہ اس سے گریز نہیں کرتے تھے۔

عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی قدس اللہ سرہ العزیز کا ذوق اس بارے میں یہ تھا کہ وہ درس نظامی کی تعلیم کے دوران جہاں خلا محسوس کرتے تھے، اسے پر کرنے کی اپنے طور پر کوشش کرتے تھے، چنانچہ وہ دورۂ حدیث کے طلبہ کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' سبقا سبقا پڑھاتے تھے۔ صبح کا دو سالہ ترجمہ قرآن کریم اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی تدریس بحمد اللہ تعالیٰ جامعہ نصرۃ العلوم کے نصاب تعلیم کے امتیازی شعبے ہیں جو ہمارے ان دو بزرگوں کے ذوق کی علامت اور ان کا صدقۂ جاریہ ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ دورۂ حدیث کے نصاب میں اب بھی شامل ہے اور یہ خدمت بھی میرے سپرد ہے۔ البتہ اب اس کے چند ابواب پڑھائے جاتے ہیں اور مکمل تدریس کی حسرت ہی رہتی ہے۔

اس سلسلہ میں میرا ذاتی ذوق اور نقطۂ نظر یہ ہے کہ (۱) عصر حاضر کے مسائل کے تناظر میں احکام القرآن، (۲) طحاوی شریف اور (۳) حجۃ اللہ البالغۃ کی مکمل طور پر تدریس دورۂ حدیث سے قبل ہونی چاہیے کیونکہ اسی صورت میں دورۂ حدیث کے طلبہ احادیث نبویہؐ کے عظیم الشان ذخیرے سے صحیح طور پر استفادہ کر سکتے ہیں اور اگر پہلے نہ ہو سکے تو فضلاء درس نظامی کو فراغت کے بعد تکمیل یا تخصص کی صورت میں یہ کورس ضرور پڑھنا چاہیے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر باذوق فضلاء کی ایک مناسب تعداد ایک سال کا وقت فارغ کر سکے تو آج کی عالمی فکری و تہذیبی کشمکش کے تناظر میں احکام القرآن کے ساتھ ساتھ حجۃ اللہ البالغۃ اور طحاوی شریف کی مکمل تدریس کا موقع اور سعادت حاصل کر لوں مگر ذوق و شوق، وسائل اور فکری و علمی استعداد میں مسلسل کمی کی وجہ سے اس کی کوئی صورت نہیں بن رہی۔ اپنے اس ذوق کی کسی حد تک تکمیل کے لیے میں نے دورۂ حدیث شریف میں حجۃ اللہ البالغۃ کے ساتھ ایک اور پیریڈ کے اضافے کی ''بدعت'' شروع کر رکھی ہے جو سالہا سال سے جاری ہے اور اس کے نصاب میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ تقابلی مطالعہ اور دور حاضر کے معاصر ادیان و مذاہب کا اجمالی تعارف شامل ہے۔ یہ ہر جمعرات کو ہوتا ہے اور سال بھر کی پچیس نشستوں میں ''خلاصۃ الخلاصۃ'' کے درجے میں ان دو موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔

حضرت صوفی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس سلسلہ میں ایک ذوق یہ بھی تھا کہ وہ چند طلبہ کو منتخب کر کے انہیں نصاب سے ہٹ کر بعض کتابیں الگ طور پر پڑھاتے تھے۔ ان خوش نصیبوں میں میرا شمار بھی ہوتا ہے اور میں نے ملا علی القاریؒ کی شرح نقایہ، مقامات ہمدانی، کلیلہ و دمنہ، رسائل اخوان الصفاء، مصطفیٰ لطفی منفلوطیؒ کی العبرات اور الاستاذ محمد خضری بک کی کتاب نور الیقین ان سے سبقا سبقا پڑھی ہے۔ نور الیقین سیرت نبویؐ کی کتاب ہے،

حضرت صوفی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے درس نظامی کے (اس وقت کے) نصاب میں سیرت النبیؐ اور سیرت الخلفاء شامل نہیں ہے، حالانکہ اس کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے کئی سال تک طلبہ کی متعدّد کلاسوں کو ''نور الیقین فی سیرت سید المرسلین'' پڑھائی ہے۔ اس سلسلے میں لطیفہ کی بات یہ ہے کہ مدرسہ انوار العلوم میں تدریس کے دوران میں نے بعض طلبہ کو ''ورغلاکر'' سیرت النبیؐ کی ایک کتاب ''عین الیقین'' درسا پڑھائی جو مصری عالم عبد الحمید الخطیب کی تصنیف ہے اور مجھے وہ اس وقت اس مقصد کے لیے زیادہ موزوں محسوس ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی امام سیوطیؒ کی ''تاریخ الخلفاء'' کی تدریس بھی شروع کر دی مگر بمشکل ایک سال ایسا کر سکا اور اگلے سال کسی طالب علم کو ''ورغلانے'' میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

یہاں ایک اہم وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہم نے جب گوجرانوالہ میں جدید اور قدیم علوم کے امتزاج کے ٹائٹل کے ساتھ ایک نئے تعلیمی ادارے کے قیام کا پروگرام بنایا تو اس کا ابتدائی نام ''نصرۃ العلوم اسلامی یونیورسٹی'' تھا اور اس منصوبے کا پہلا تعارف پمفلٹ اور اشتہارات کی صورت میں اسی نام سے شائع ہوا تھا، اس سے عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختلاف کیا۔ وہ جامعہ نصرۃ العلوم کے مہتمم تھے اور ہمارے اس نئے تعلیمی پروگرام کے سرپرست تھے، انہوں نے فرمایا کہ اس نئے تعلیمی نظام کے لیے الگ نام سے ادارہ بناؤ، یہ بہت ضروری کام ہے لیکن اس کے لیے جو تعلیمی نظام تسلسل کے ساتھ دینی مدارس میں چلا آرہا ہے اسے ڈسٹرب نہ کرو، ان کے اس اختلاف کی وجہ سے ہم نے اس کا نام تبدیل کر کے ''فاروق اعظمؓ اسلامی یونیورسٹی'' رکھا اور پروگرام کا دوسرا تعارف اس نام سے شائع ہوا۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے اس سے بھی اختلاف کیا اور فرمایا کہ ''بھائی! جس کے مشن پر کام کرنا چاہتے ہو اس کا نام تمہیں کیوں یاد نہیں آرہا؟'' ان کا اشارہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی طرف تھا جن کے علوم کے وہ اپنے دور کے متخصصین میں شمار ہوتے تھے اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیمات پر ان کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ ہم نے اپنے اس نئے تعلیمی پروگرام کو شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کا نام دے دیا اور اس کے بعد کی پیشرفت گزشتہ کالم میں ذکر کر چکا ہوں۔

حضرت صوفی صاحبؒ کا موقف یہ تھا اور خود میرا ذاتی موقف بھی یہ ہے کہ دینی مدارس کا جو روایتی تعلیمی نظام تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے اسے چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ

عصری تقاضوں کے حوالہ سے ایک نئے تعلیمی تجربے کا اہتمام ضرور ہونا چاہیے جو بحمد اللہ تعالیٰ بہت سے اداروں کی صورت میں ہو رہا ہے، میرے نزدیک جس طرح عصری تقاضوں کو محسوس کرنا اور انہیں پورا کرنے کی محنت کرنا ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تعلیمی نظام کے روایتی تسلسل کو قائم رکھنا اور اس کا تحفظ کرنا بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ نصرۃ العلوم کا ذمہ دار فرد ہونے کے باوجود ایسے علمی وفکری مباحث کے لیے میں نے ''الشریعہ اکادمی'' اور ماہنامہ ''الشریعہ'' کے نام سے الگ فورم قائم کر رکھا ہے جن مباحث میں زیادہ سے زیادہ اور مختلف الخیال اصحاب فکر کا شریک ہونا مجھے ضروری محسوس ہوتا ہے۔

۲۰۱۲ء

حفظ قرآن کریم کا معیار کیسے بہتر بنایا جائے۔ الشریعہ اکادمی میں سیمینار

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۷ دسمبر ۲۰۱۲ء)

لوگوں میں قرآن کریم حفظ کرنے کا شوق و ذوق بحمد اللہ تعالی بڑھتا جا رہا ہے اور حفظ کے مدارس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ تعلیم کے معیار اور دینی و اخلاقی تربیت کے تقاضوں کے حوالہ سے مسائل بھی بڑھ رہے ہیں اور ان کی طرف اصحاب فکر کی توجہ کسی حد تک مبذول ہونے لگی ہے۔ اس سلسلہ میں ۲ دسمبر کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کا عنوان یہ تھا کہ قرآن کریم حفظ کرنے والے بچوں کی اخلاقی و دینی تربیت کا معیار کس طرح بہتر بنایا جائے۔ سیمینار کی صدارت راقم الحروف کے ذمہ تھی جبکہ مہمان خصوصی ہمارے فاضل دوست مولانا جہانگیر محمود تھے جو ایک عرصہ سے تعلیمی نصاب و نظام میں اصلاحات اور ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ شرکاء میں زیادہ تعداد حفظ و تجوید کے اساتذہ کی تھی اور خطاب کرنے والوں میں جامعہ نصرۃ العلوم کے شعبہ تجوید کے صدر مدرس مولانا قاری سعید احمد صفہ سکول سسٹم کے سربراہ جناب سلیم رؤف، دارالعلوم گوجرانوالہ کے استاذ مولانا قاری عبد الشکور اور الشریعہ اکادمی کے استاذ مولانا محمد عبد اللہ راتھر شامل تھے۔ مقررین نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

- بہت سے ماں باپ اپنے بچوں کو قرآن کریم حفظ کرانے کا شوق رکھتے ہیں جو بہت اچھی بات ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ سارے بچے قرآن کریم یاد کرنے

کی پوزیشن میں نہیں ہوتے، بعض بچے سالہاسال صرف کرنے کے باوجود مکمل نہیں کرپاتے اور جو کسی نہ کسی طرح مکمل کر لیتے ہیں وہ یاد نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ایک دو پارے تو ہر بچے کو یاد کرائے جائیں اور اس کے بعد اس کے استاذ سے رائے لی جائے، اگر استاذ کی رائے میں بچہ قرآن کریم یاد کرنے اور پھر اسے یاد رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اسے قرآن کریم مکمل حفظ کرایا جائے ورنہ اس کا رخ دینی تعلیم کے کسی اور شعبے کی طرف پھیر دیا جائے۔

•قرآن کریم کو مسلسل یاد رکھنا، اسے یاد کرنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے بچے کے ماں باپ کو اعتماد میں لے کر کوئی ایسا طریق کار بنایا جائے کہ بچہ حافظ قرآن کریم ہو جانے کے بعد اسے یاد رکھنے کے لیے قرآن کریم کی تلاوت اور سنانے کا کوئی معمول بنالے، ورنہ عام طور پر قرآن کریم حفظ کر لینے کے بعد بچہ اور والدین دونوں ذہنی طور پر اس حوالہ سے خود کو فارغ محسوس کرتے ہیں اور بہت سے بچے اس غفلت کی وجہ سے قرآن کریم بھول جاتے ہیں۔

•قرآن کریم یاد کرانے کے ساتھ ساتھ طلبہ کی دینی تربیت کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ نمازوں کی پابندی، سچ اور جھوٹ میں تمیز، حلال و حرام کا فرق، احکام شریعہ کی بجاآوری کا ذوق، گفتگو میں سنجیدگی اور دیگر ضروری امور کا دوران تعلیم ہی لحاظ رکھا جائے۔ کیونکہ بعد میں اس کا موقع نہیں ملے گا اور دوران تعلیم جو خامی کسی حوالہ سے رہ جاتی ہے اس کی اصلاح مشکل ہو جاتی ہے۔

•اسی طرح اخلاقی تربیت کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ عام طور پر یہ شکایت سامنے آتی ہے کہ بعض حفاظ کا رویہ اپنے گھر والوں کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ اور خاص طور پر ماں باپ کے ساتھ مناسب نہیں ہوتا۔ یہ تربیت کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے ہوتا ہے، اس کے معاشرہ اور خاندانوں میں منفی اثرات سامنے آتے ہیں اور خود حافظ قرآن کریم کی شخصیت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ استاذ کی ذمہ داری میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ وہ بچوں کو ماں باپ

کے ادب، رشتہ داروں سے حسن سلوک اور چھوٹے بڑے سے گفتگو کا سلیقہ سکھائیں تاکہ قرآن کریم حفظ کرنے والے بچے گھروں کے ماحول میں مثبت تبدیلی کا باعث بنیں۔

- قرآن کریم حفظ کرنے کے دوران ہی بچوں کے تعلیمی مستقبل کی لائن کے بارے میں سوچ لیا جائے تاکہ بعد میں وہ تذبذب کا شکار نہ ہوں، اس طرح بہت سے بچے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جو رخ متعیّن ہو جائے اس کے لیے اسے دوران حفظ ذہنی طور پر تیار بھی کیا جائے تاکہ وہ حفظ مکمل کرنے کے بعد کوئی وقت ضائع کیے بغیر اپنا تعلیمی تسلسل جاری رکھ سکے۔
- بچوں کو اگر دوران حفظ چھوٹی چھوٹی سورتوں، آیات اور جملوں کا سادہ سا ترجمہ اور مفہوم ذہن نشین کرانا شروع کر دیا جائے تو اس سے ان میں فہم قرآن کریم کا ذوق پیدا ہوگا اور دینی تعلیم کا رجحان بڑھے گا۔ بالخصوص حلال و حرام، سچ و جھوٹ، دیانت و امانت اور حقوق و معاملات کے بارے میں مختصر جملوں کا ترجمہ یاد کرانے سے ان کی اخلاقی تربیت کا مقصد بھی حاصل ہوگا۔
- بچوں کو تشدد اور مار پیٹ کی بجائے پیار اور شفقت سے سمجھانے کا طریقہ اپنایا جائے۔ مار پیٹ سے بچے کی شخصیت پر منفی اثر پڑتا ہے اور بسا اوقات اس سے باغی ہونے والا بچہ دین و دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ بچوں کو تعلیم کی طرف شوق دلانے کے لیے ترغیب کی صورتیں اختیار کی جائیں اور ابلاغ و تعلیم کے جدید اسلوب اور ذرائع سے جائز حد تک استفادہ کیا جائے۔

کم و بیش سبھی مقررین کی یہ رائے تھی کہ ان مقاصد کے لیے بچوں کے والدین اور اساتذہ دونوں کی خصوصی تربیت کی ضرورت ہے۔ والدین کو اعتماد میں لے کر انہیں یہ سمجھانا چاہیے کہ وہ بچوں کو گھروں میں بھی قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ماحول فراہم کریں ورنہ قرآن کریم حفظ کرانے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ بچے کو اگر نماز کے لیے مجبور کیا جائے اور اس کے ماں باپ خود نماز نہ پڑھیں تو اس بچے کے دل میں نماز کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ بچے کو دیانت و امانت کی تعلیم دی جائے اور اسے گھر میں اس قسم کا ماحول نہ ملے تو وہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر تضاد اور تذبذب کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے ماں باپ کو مسلسل اعتماد میں لینے اور ان سے رابطہ رکھنے کی ضرورت ہے اور تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں پیش آنے

والی مشکلات و مسائل کو ماں باپ کے علم میں لا کر ان کی مشاورت سے ان کا حل تلاش کیا جائے کیونکہ اسی صورت میں بچے کی تعلیمی اور ذہنی رجحان کو درست رکھا جا سکتا۔

اسی طرح اساتذہ کے لیے تربیتی کورسز کی شدید ضرورت ہے۔ قرآن کریم حفظ کرانے والے اساتذہ کی بڑی تعداد کو خود تعلیمی، تدریسی، دینی اور اخلاقی تربیت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے مختلف سطح پر کورسز اور ورکشاپس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ سینئر اور تجربہ کار اساتذہ ایسے کورسز اور ورکشاپس میں ان اساتذہ کو اپنے تجربات و مشاہدات سے آگاہ کریں اور انہیں تعلیم و تربیت کے ضروری تقاضوں سے واقف کرا کے ان کی تکمیل کے لیے ان کی راہنمائی کی جائے۔ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ طالب علم اپنے استاذ سے صرف تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ استاذ کی شخصیت، فکر اور کردار اس کے شاگرد پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے استاذ کو اخلاق و کردار میں بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرنا ہوگی۔

الشریعہ اکادمی کے استاذ مولانا محمد عبد اللہ راتھر نے اس موقع پر اعلان کیا کہ اگلے ماہ الشریعہ اکادمی میں حفظ و تجوید کے اساتذہ کے لیے تین روزہ تربیتی ورکشاپ کا اہتمام کیا جائے گا جبکہ گوجرانوالہ شہر کے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے ۲۲ دسمبر سے انگلش بول چال کے چالیس روزہ کورس کا آغاز کیا جا رہا ہے جس کی کلاس روزانہ عصر کی نماز کے بعد جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اسلامی تحقیق و مطالعہ کے حوالہ سے جدید تحدّیات

(پشاور یونیورسٹی - ۷ نومبر ۲۰۱۲ء)

"مجلس صوت الاسلام" جامعہ اسلامیہ کلفٹن کراچی کے ڈائریکٹر مولانا جمیل فاروقی کی دعوت پر ۶، ۷، ۸ نومبر کو پشاور اور مردان میں حاضری کا موقع ملا۔ پشاور میں مجلس صوت الاسلام کا تربیتی مرکز مولانا محمد حلیم صدیقی کی نگرانی میں کام کر رہا ہے جہاں فارغ التحصیل علماء کرام کے لیے عصری مسائل اور ضروریات کے ادراک کے حوالہ سے ایک سالہ کورس ہوتا ہے۔ اس کلاس میں "انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات" کے موضوع پر تین چار نشستوں میں تفصیلی گفتگو ہوئی، جبکہ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر دوست محمد کی دعوت پر شیخ زید اسلامک سنٹر میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کی نشست میں "اسلامی تحقیق و مطالعہ کے حوالہ سے جدید تحدیات" کے عنوان پر کچھ

گزارشات پیش کیں، اور اس سے اگلے روز مردان کی عبد الولی خان یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سربراہ مولانا ڈاکٹر صالح الدین حقانی کی دعوت پر وہاں کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ اور طالبات سے بھی مذکورہ بالا عنوان پر گفتگو کا موقع ملا۔ پشاور یونیورسٹی اور مردان یونیورسٹی کی دونوں نشستوں میں عنوان ایک ہی تھا اور گفتگو بھی ملی جلی تھی اس گفتگو کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ معزز اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ وطالبات! ارباب فکر و دانش کے اس اجتماع میں شرکت اور گفتگو کا موقع فراہم کرنے پر محترم ڈاکٹر دوست محمد صاحب، مولانا ڈاکٹر صالح الدین حقانی اور ان کے رفقاء کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اللہ تعالی انہیں جزائے خیر سے نوازیں، آمین۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ان طلبہ وطالبات سے مخاطب ہوں جو تعلیم کا ایک دور مکمل کر کے تحقیق، ریسرچ اور مطالعہ کے نئے دور میں داخل ہوئے ہیں اور نسل انسانی کی راہنمائی کا فریضہ سنبھالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ تحقیق و مطالعہ کے دائرے اور سطحیں تو بہت مختلف اور متنوع ہیں جو سینکڑوں شعبوں میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن چونکہ ہم شعبہ اسلامیات میں بیٹھے ہیں اور آپ سب حضرات کے موضوعات بھی اسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے میں ”اسلامیات“ اور ”تحدیات“ کے دو پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا، اور آغاز ایک ایسے پہلو سے کروں گا جس کا اسلامیات کے ساتھ براہ راست تعلق تو بظاہر دکھائی نہیں دیتا لیکن بالکل بے تعلق بھی نہیں ہے۔ وہ یہ کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں معاصر اقوام سے بہت پیچھے ہیں اور اس کا خمیازہ ابھی تک بھگت رہے ہیں۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ ہماری دو بڑی حکومتوں خلافت عثمانیہ اور مغل سلطنت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقا کے دور میں جو بے توجہی اور غفلت برتی ہے، آج امت مسلمہ کو اس کے تلخ نتائج اور ثمرات کا سامنا ہے اور خدا جانے کب تک ہم اس صورتحال سے دوچار رہیں گے۔ اندلس میں مسلمان حکومتوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دی تھی اور کام کا آغاز کر دیا تھا، آج مغرب کی سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کے ارتقا کی بنیاد اسی دور کی تحقیقات پر ہے، لیکن ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیادیں فراہم کر کے میدان سے ہٹ گئے اور اقتدار سے محروم ہو کر کارنر ہو گئے، جبکہ انہی بنیادوں پر مغرب نے سائنسی ترقی، صنعتی ایجادات اور ٹیکنالوجی کی بلند و بالا عمارت کھڑی

کردی۔ خلافت عثمانیہ اور مغل سلطنت اگر اس طرف توجہ دیتیں تو ہم اس ورثہ کو سنبھال سکتے تھے لیکن انہیں ان کاموں کی فرصت نہیں تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس میدان سے آؤٹ ہو گئے اور مسلسل دوسروں کے دست نگر ہیں۔

میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں امت مسلمہ کے معاصر اقوام سے پیچھے بلکہ بہت پیچھے رہ جانے میں صرف ہماری غفلت کارفرما نہیں ہے، بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر اجارہ داری حاصل کرنے والی قوموں کی اجارہ دارانہ ذہنیت کا بھی اس میں بڑا حصہ ہے۔ اسی وجہ سے آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ریسرچ، تحقیق اور تجربات کے مواقع مسلمانوں کو اس درجہ میں حاصل نہیں ہیں جو دوسری قوموں کو میسر ہیں۔ ایک خاص حد تک پہنچ جانے کے بعد کوئی نہ کوئی ریڈ لائن سامنے آجاتی ہے جو مسلمان محققین اور سائنس دانوں کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے اور ہم اس سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ڈاکٹر عبد القدیر خان ہیں جن کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک ان خفیہ ریڈ لائنز کی نشاندہی کرتا ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مسلمانوں کو ایک حد سے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے قائم کی گئی ہیں، یہ ریڈ لائنز بظاہر نظر نہیں آتی لیکن جونہی کوئی مسلمان انہیں کراس کرنے کی طرف بڑھتا ہے ان کی لائٹس خو بخود جلنے لگ جاتی ہیں۔

اس صورتحال کے نقصانات کا اندازہ کرنا ہو تو ایک مثال سامنے رکھ لیں کہ اب سے ایک صدی قبل عرب ممالک میں تیل کے زیر زمین چشمے دریافت ہوئے تو ہم مسلمان زمین کے اندر سے تیل نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی صلاحیت سے محروم تھے، اور ریفائن کر کے اسے مارکیٹ کرنے کی صلاحیت بھی ہمارے پاس نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے مغربی ممالک کی کمپنیوں کو بلایا اور یہ سارا کام ان کے حوالہ کر دیا۔ ان کمپنیوں کے سرمائے کو سنبھالنے کے لیے بینک آئے، پھر ان ملکوں کی فوجیں آئیں، اور آج جو کچھ ہو رہا یہ وہ سب کے سامنے ہے۔ اس لیے میرے خیال میں اس جال سے نکلنے کے راستے تلاش کرنا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں معاصر اقوام کے ساتھ برابری کی سطح پر آنے کی محنت کرنا بھی ملی اور دینی ضروریات میں سے ہے اور آج کی تحدیات اور چیلنجز میں سرفہرست ہے۔

اس کے بعد میں اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے تحدیات کی طرف آؤں گا اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہوں گا۔ ایک حصہ یہ کہ اس وقت عالمی سطح پر جو ثقافتی کشمکش جاری ہے اور مغربی فلسفہ و ثقافت کی یلغار سے اسلامی شریعت کے احکام اور مسلمانوں کی ثقافتی روایات واقدار کو جو خطرات لاحق ہیں ان کی نشاندہی اور ان کے سدباب کے لیے مطالعہ اور ریسرچ ہماری ملی ضروریات میں سے ہے، اور خاص طور پر انسانی حقوق کے عالمی منشور اور نظام و قانون کا تجزیہ اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ ان کی موافقت اور اختلاف کی حدود کا تعین اہم ترین علمی و فکری ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے، جس طرف ہمارے دینی علمی مراکز کے ساتھ جامعات اور یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں کو بھی توجہ دینی چاہیے۔

- مغرب کے خاندانی نظام اور مسلمانوں کے خاندانی نظام میں کیا فرق ہے؟
- عورت اور مرد میں مساوات کے عملی مسائل کیا ہیں؟
- آزادی رائے اور آزادئ مذہب کے دائرے کیا ہیں؟
- ریاست و حکومت کا مذہب کے ساتھ کیا تعلق ہے؟
- مذہبی اکثریت واقلیت کے باہمی معاملات کے اصول کیا ہیں؟
- رفاہی ریاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور روایات کیا ہیں؟
- پارلیمنٹ کی خود مختاری اور قرآن و سنت کی بالادستی کا باہمی جوڑ کیا ہے؟
- انسانی حقوق کے کون سے پہلوؤں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہمارے تحفظات ہیں؟
- اور مغربی جمہوریت اور اسلامی شورائیت میں حد فاصل کیا ہے؟

یہ اور اس نوعیت کے دیگر مسائل اس شعبہ میں ہمارے لیے "تحدیات" کا درجہ رکھتے ہیں اور تحقیق و مطالعہ کے ذوق سے بہرہ ور حضرات کی توجہ کے طالب ہیں۔ یہ مسائل اور چیلنجز تو وہ ہیں جن سے ہم اس وقت نبرد آزما ہیں اور جن کے حوالہ سے عالم اسلام میں فکری و تہذیبی کشمکش جاری ہے۔ ان مسائل کا قرآن و سنت اور اسلامی روایات کی روشنی میں حل تلاش کرنا اور اس سلسلہ میں امت مسلمہ کی راہنمائی کرنا ہمارے علمی و فکری مراکز کی ذمہ داری ہے، لیکن میں اس سے آگے کے ایک اور مرحلہ کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مغربی دانش کی ایک سطح وہ ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کے خلاف

صف آرا ہے اور اسلامی تعلیمات و روایات سے مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لیے سرگرم عمل ہے، جبکہ ایک سطح مغرب کی فکر و دانش کی یہ بھی سامنے آ رہی ہے کہ انسانی سوسائٹی کے مستقبل کے تناظر میں قرآن کریم کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے جس کے بارے میں چند حالیہ واقعات کو سامنے رکھنا مناسب ہو گا۔

کچھ عرصہ قبل عالمی معیشت کے بحران کے سلسلہ میں یہ خبر اخبارات کی زینت بنی کہ پاپائے روم پوپ بینی ڈکٹ نے اس بحران کا جائزہ لینے کے لیے اٹلی کے معاشی ماہرین کی کمیٹی تشکیل دی، جنھوں نے عالمی معیشت کے مروجہ نظام کے بارے میں اپنی رپورٹ میں واضح طور پر کہا کہ یہ نظام زیادہ دیر تک چلنے والا نہیں ہے اور عالمی معیشت کو صحیح ٹریک پر لانے کے لیے ان معاشی اصولوں سے راہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ان کی مراد غیر سودی معاشی نظام ہے کیونکہ عالمی معاشی ماہرین ایک عرصہ سے یہ کہہ رہے ہیں کہ سود نے معیشت کو فائدہ دینے کی بجائے نقصانات دیے ہیں اور موجود معاشی عدم توازن جس کا دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے اس کی بنیادی وجہ سودی معیشت ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات اور بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلامی بینکاری یعنی غیر سودی بینکاری کا رجحان خود مغربی ممالک کے بینکوں میں مسلسل بڑھ رہا ہے، غیر سودی سرمایہ کاری کو نسبتاً زیادہ محفوظ سمجھا جانے لگا ہے، اور مشارکت و مضاربت کی بنیاد پر غیر سودی سرمایہ کاری کو فروغ دینے کے لیے لندن اور پیرس میں درون خانہ یہ کشمکش شروع ہو گئی ہے کہ اس کا مرکز کون ہو گا؟ اس وقت غیر سودی بینکاری کا بڑا مرکز لندن ہے جبکہ فرانس کی خواہش ہے کہ اس مرکزیت کو پیرس کی طرف لے جایا جائے۔ مجھے ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا مفتی برکت اللہ نے بتایا ہے، جو انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں، فاضل دیوبند ہیں اور ایک عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں، ان کا کہنا ہے کہ فرانس جو مسلمان عورت کے چہرے پر نقاب برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اس کی کابینہ نے گزشتہ دنوں اپنے معاشی قوانین میں ایسی تبدیلیوں کی منظوری دی ہے جن کا مقصد اسلامی بینکاری کی مرکزیت کو پیرس کی طرف کھینچ لے جانے کی راہ ہموار کرنا ہے۔

مجھے اس سے اس وقت بحث نہیں ہے کہ جس اسلامی بینکاری کی مرکزیت کو اپنے پاس لے جانے کے لیے لندن اور پیرس میں کشمکش ہو رہی ہے اس کی اسلامیت کی سطح کیا ہے؟

میں صرف یہ بات محققین کی توجہ کے لیے پیش کر رہا ہوں کہ چونکہ مغرب کے نظام کی بنیاد صرف سرمایہ اور سرمایہ داری پر ہے اس لیے وہ محفوظ سرمایہ کاری اور دیگر معاشی مفادات کے لیے اسلامی بینکاری کو قبول کرنے میں بھی حجاب محسوس نہیں کرے گا۔ مغرب کو سرمائے سے غرض ہے اور سرمایہ دار کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ جدھر سے آئے اور جیسے بھی محفوظ رہے وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ چونکہ غیر سودی بینکاری میں معاشی مفادات نظر آنے لگے ہیں اس لیے اسلامی بینکاری کو راستہ دینے کے لیے مغرب کی بینکار سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو رہے ہیں۔ اور میں اسے بھی مسلمانوں کے علمی مراکز، دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اسلامیات کے لیے تحدی اور چیلنج ہی تصور کرتا ہوں۔

اسی نوعیت کی ایک اور پیشرفت پر بھی نظر ڈال لیں کہ ماحولیات کا مسئلہ اس وقت عالمی توجہ کے اہم ترین مسائل میں سے ہے، فضا کی آلودگی، تابکاری اثرات، کیمیاوی اثرات اور پانی کی آلودگی مستقل مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے سائنسدان مسلسل ڈرا رہے ہیں کہ پینے کے قابل پانی کا حصول مستقبل قریب میں انتہائی مشکل ہو جائے گا اور فضائی آلودگی اسی طرح بڑھتی رہی تو سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔ گزشتہ سال جون میں اس مسئلہ پر نیویارک میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی جہاں بین الاقوامی سطح کے ماہرین نے اس سلسلہ میں اپنے تجزیے اور تجاویز پیش کیں، اس موقع پر برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے بھی خطاب کیا اور ان کے خطاب کے جو جملے مختلف چھلنیوں سے گزرتے ہوئے امریکی پریس میں شائع ہوئے، ان میں سے ایک جملہ یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کو ماحولیات کے حوالہ سے کسی بڑی تباہی سے بچانے کے لیے ان معاشرتی قوانین کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو قرآن کریم نے بیان کیے ہیں۔ اس کی تفصیل وہی بتا سکیں گے لیکن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی طرف رجوع کی ضرورت اب عالمی سطح پر پھر سے محسوس ہونے لگی ہے جو اسلامی تعلیمات کے ماہرین سے توجہ کی طلبگار ہے۔

اس کے ساتھ اس بات کو بھی شامل کر لیں کہ مغربی ملکوں میں جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں ان کے بارے میں جہاں مغربی حلقوں میں تشویش پائی جاتی ہے وہاں اس بات پر ریسرچ اور تحقیق کا سلسلہ بھی جاری ہے کہ مغربی ممالک اور یورپین نسلوں کے لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کے اسلام قبول کرنے کی وجہ اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ چنانچہ ایک

معروف انگریز نومسلم دانشور ڈاکٹر یحیی برٹ نے اسے باقاعدہ طور پر اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع بنایا ہے اور تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ یورپ میں قبول اسلام کرنے والے یورپین نسل کے لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی سب سے بڑی وجہ قرآن کریم کا مطالعہ اور اسٹڈی ہے۔ ڈاکٹر یحیی برٹ کا کہنا ہے کہ پچھلے دس سال کے دوران یورپ میں یورپین نسلوں کے کم و بیش تیرہ ہزار افراد نے اسلام قبول کیا ہے اور ان میں اسی (۸۰) فیصد کے لگ بھگ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعہ اور اسٹڈی کے نتیجے میں مسلمان ہوئے ہیں۔

اس لیے میں یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں تحقیق اور ریسرچ کے شعبوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ حال کے موضوعات کے ساتھ ساتھ مستقبل کے ان امکانات پر بھی نظر رکھیں اور انسانی سوسائٹی کے مستقبل کی ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے تخصصات، ایم فل، پی ایچ ڈی اور دیگر دائروں میں تحقیقات کے نئے زاویوں اور پہلوؤں کی طرف توجہ دیں، یہ ہماری ضرورت بھی ہے اور ذمہ داری بھی ہے۔ مستقبل کے امکانات کو اجاگر کرنا اور متوقع خدشات و خطرات کی نشاندہی کرتے ہوئے صحیح سمت راہنمائی کرنا آج کے دور کی سب سے بڑی تحدی اور چیلنج ہے، اللہ تعالی ہمیں اس پر پورا اترنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ دسمبر ۲۰۱۲ء)

سزائے موت ختم کرنے کی مہم اور آسمانی تعلیمات

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ٦ نومبر ۲۰۱۲ء)

گزشتہ روز ایک قومی اخبار کے دفتر سے فون پر مجھ سے پوچھا گیا کہ حکومت ملک کے قانونی نظام میں موت کی سزا کو ختم کرنے کے لیے قومی اسمبلی میں بل لانے کی تیاری کر رہی ہے، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے اجمالاً عرض کیا کہ:

- اگر ایسا کیا گیا تو یہ قرآن کریم کے صریح حکم سے انحراف ہوگا اس لیے کہ قرآن کریم میں قصاص کے قانون کو مسلمانوں کے فرائض میں شمار کیا گیا ہے۔ (البقرہ ۱۷۸)

• پھر یہ دستور پاکستان کے بھی منافی ہوگا اس لیے کہ دستور میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکے گی۔

• نیز ایسا کرنے سے معاشرے میں جرائم کی حوصلہ افزائی ہوگی اور ان میں اضافہ ہوگا، اس لیے کہ انسانی نفسیات یہ ہے کہ جس قدر سنگین جرم سے روکنا مقصود ہو اس کی سزا بھی اتنی ہی سخت ہونی چاہیے ورنہ جرم پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ جن ملکوں میں سنگین جرائم پر موت کی سزا کا قانون موجود ہے اور اس پر عمل بھی ہوتا ہے، وہاں جرائم کی شرح کم ہے۔

مختلف جرائم پر قتل کی سزا کا قانون تمام آسمانی مذاہب کی تعلیمات کا حصہ رہا ہے اور یہ سزا ہر دور میں نافذ رہی ہے۔ یہودی اور مسیحی مذاہب میں یہ سزا پوری شدت کے ساتھ نافذ تھی جیسا کہ مسیحی اشاعت خانہ (فیروز پور روڈ، لاہور) کی شائع کردہ ''قاموس الکتاب'' کے مصنف ایف ایس خیر اللہ نے ''سزائے موت'' کے ضمن میں لکھا ہے کہ بائبل میں جن جرائم پر موت کی سزا بیان کی گئی ہے ان میں (۱) بت پرستی (۲) خدا کی توہین (۳) والدین کی بے حرمتی (۴) ہفتہ کے مقدس دن کی توہین (۵) جادوگری (۶) زنا کا ارتکاب (۷) اغوا (۸) اور جانور کے ساتھ بدفعلی کے جرائم شامل ہیں۔ جبکہ سزائے موت کے طریقوں میں انہوں نے بائبل کے حوالہ سے (۱) سنگسار کرنے (۲) آگ میں جلانے (۳) تلوار کے ساتھ قتل کرنے (۴) پھانسی دینے (۵) آرے کے ساتھ چیرنے (۶) پہاڑ سے دھکیل دینے (۷) اور لوہے کے کیلوں کے نیچے دبانے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔

جاہلیت کے دور میں قتل کرنے کے طریقوں میں (۱) ابلتے ہوئے تیل میں ڈالنے (۲) زندہ دفن کر دینے (۳) لوہے کا کفن پہنانے اور گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر ان کو الٹے سمت دوڑا دینے کے طریقوں کا تذکرہ بھی تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔ جیسا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے لوگوں میں سے مکہ مکرمہ کے ابتلا و ایمان کے دور میں جس خاتون حضرت سمیہؓ نے سب سے پہلے جام شہادت نوش کیا تھا، انہیں مشرکین مکہ نے یہی سزا دی تھی کہ ان کی ٹانگیں دو اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انہیں ایک

دوسرے کی مخالف سمت چلا دیا تھا جس سے حضرت سمیہؓ کے جسم کے دو ٹکرے ہو گئے تھے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلام نے موت کی سزا کو تو برقرار رکھا مگر اس کے اسباب اور طریقوں میں بہت سی اصلاحات کیں جن میں سے تین چار باتیں بہت زیادہ اہم ہیں:

1. ایک یہ کہ جاہلیت کے دور میں قصاص اور انتقام کا رواج قبائلی حوالہ سے تھا کہ ایک قبیلہ کے کسی شخص نے دوسرے قبیلے کے کسی شخص کو قتل کر دیا ہے تو اس کے بدلے میں قاتل کے قبیلے کا کوئی بھی شخص قتل کر دیا جاتا تھا۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس کی ممانعت فرما دی اور حکم دیا کہ بدلہ صرف قاتل سے لیا جائے گا اور اس کی جگہ اس کے خاندان یا قبیلہ کے کسی دوسرے فرد کو اس کے جرم کی سزا نہیں دی جائے گی۔

2. دوسرا یہ کہ سزائے موت کے اسباب بھی متعیّن اور محدود کر دیے کہ اب صرف ان جرائم میں کسی کو قتل کیا جا سکے گا۔ (۱) قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا (۲) شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے گا (۳) مرتد کو قتل کی سزا دی جائے گی (۴) گستاخ رسول کی سزا قتل ہو گی (۵) اسلامی حکومت کے باغی کو قتل کیا جا سکے گا (۶) اور میدان جنگ میں دشمن کا قتل جائز ہو گا۔ اس کے سوا ہر قسم کے قتل کو اسلامی شریعت نے ''قتل ناحق'' شمار کیا ہے اور اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کرنے کے ساتھ ساتھ قانونی جرم قرار دے کر اس کی سزا دنیا میں بھی مقرر کی ہے۔

3. تیسری بات یہ کہ جو قتل جائز قرار دیے گئے ہیں ان میں بھی عام شخص کو قتل کا حق دینے کی بجائے قاضی اور عدالت کو اس کا مجاز ٹھہرایا ہے کہ مجاز عدالت یا اتھارٹی کے باقاعدہ فیصلے کے بغیر کسی کو قتل کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لینا شریعت نے روا نہیں رکھا۔

4. اور چوتھی بات یہ کہ سزائے موت کے مروجہ طریقوں کو بھی محدود کر دیا۔ جناب نبی اکرمؐ نے آگ میں جلانے، مثلہ کرنے یعنی چہرے کو بگاڑنے، نشانہ بنا کر تیر اندازی کرنے، اور زندہ دفن کرنے کی صراحتاً ممانعت فرما دی۔ بلکہ

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ''لا قود الا بالسیف'' تلوار کے بغیر قصاص نہیں ہوگا۔ جس کی بنیاد پر فقہائے احناف کا موقف یہ ہے کہ کسی قاتل نے جس طریقہ سے بھی اپنے مقتول کو قتل کیا ہے اس سے قصاص اور بدلہ صرف تلوار کے ذریعے ہی لیا جائے گا۔

5. اسی طرح اسلام نے قصاص کو مقتول کے ورثاء کا حق قرار دیا ہے اس لیے کہ اس کے قتل سے وہ براہ راست متاثر ہوئے ہیں، چنانچہ انہی کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ اگر قصاص لینا چاہیں تو قصاص لیں اور عدالت انہیں جرم ثابت ہونے کی صورت میں قصاص دلوانے کی پابند ہے۔ لیکن اگر مقتول کے ورثاء اپنے قصاص کے حق سے دستبردار ہو کر قاتل کو معاف کر دیں یا اس سے دیت یعنی خون بہا لے کر اس کی گلوخلاصی کر دیں تو وہ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ صرف ان کا حق ہے، کسی اور کو قاتل کے لیے معافی کا فیصلہ کرنے کا اختیار اسلامی شریعت میں نہیں ہے۔

قرآن کریم نے قصاص کا جو قانون بیان کیا ہے اس میں جان کے بدلے جان کے ساتھ اعضا کا قصاص بھی شامل ہے کہ اگر کسی نے کسی شخص کا ہاتھ، پاؤں، کان، ناک یا جسم کا کوئی اور عضو کاٹ دیا ہے تو بدلے میں اس کا وہی عضو کاٹا جائے گا۔ اس سلسلہ میں بخاری شریف میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت انس بن نضرؓ کی ہمشیرہ نے کسی عورت کو مکا مار کر اس کا دانت توڑ دیا۔ وہ عورت قصاص کا مطالبہ لے کر آنحضرتؐ کے پاس آئی اور آپؐ نے قصاص میں دانت توڑنے کا حکم صادر فرما دیا۔ اس پر انسؓ بہت مضطرب ہوئے اور دربار رسالتؐ میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میری بہن کا دانت توڑ دیا جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ کتاب اللہ کا فیصلہ ہے اس پر عمل تو ہر حال میں ہوگا۔ اس طرح جناب نبی اکرمؐ نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے سے انکار کر دیا، مگر وہ عورت بعد میں بدلے کی بجائے معاوضے پر راضی ہو گئی جس کی وجہ سے حضرت انسؓ کی ہمشیرہ کا دانت ٹوٹنے سے بچ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ قصاص جان کا ہو یا عضو کا، یہ مقتول کے ورثاء اور متاثرہ شخص کا حق ہے، اسے وہی معاف کریں تو

معافی مل سکتی ہے ورنہ عدالت بھی مجاز نہیں ہے کہ وہ جرم ثابت ہو جانے پر اس سزا میں تبدیلی کر سکے۔

ان گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ قصاص یا دیگر جرائم میں موت کی سزا آسمانی تعلیمات کا حصہ ہے، بائبل اور قرآن کریم دونوں یہ سزائیں بیان کرتے ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اہم اصلاحات کے ساتھ موت کی سزا کے قانون کو برقرار رکھا ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے نہ صرف اسے مسلمانوں کے لیے واجب قرار دیا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ”ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب“ (البقرہ ۱۷۹) اے ارباب دانش! تمہارے لیے قصاص کے قانون میں زندگی اور امن ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ پاکستان کے ارباب اقتدار کو عالمی دباؤ کا سامنا ہے اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی وہ قرارداد انہیں اس بات کے لیے مجبور کر رہی ہے کہ وہ موت کی سزا کو ختم کرنے کے لیے قانون سازی کریں جس میں دنیا بھر کی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے قانونی نظام میں موت کی سزا کو ختم کر دیں۔ مگر ہماری گزارش ارباب حکومت اور ارکان پارلیمنٹ سے یہ ہے کہ ہمارے لیے قرآن و سنت کے احکام اور قوانین شریعت ہر چیز سے مقدم ہیں، اس لیے کہ ہم مسلمان ہیں اور قرآن و سنت پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے بھی کہ ہم نے مغرب کی طرح آسمانی تعلیمات سے دستبرداری کا کوئی فیصلہ نہیں کر رکھا کہ آنکھیں بند کر کے آسمانی تعلیمات کو مسترد کرتے چلے جائیں، اور اس لیے بھی ہمارے دستور کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے اور دستور نے صراحتاً یہ ضمانت دی ہے کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکے گی۔

عمل تدریس میں استاد کا کردار

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ نومبر ۲۰۱۲ء)

(انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد ایک آزاد، غیر سیاسی، علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو ملکی، بین الاقوامی اور اسلامی دنیا سے متعلق پالیسیوں پر تحقیق اور مکالمے کا اہتمام کرتا ہے۔ ۲۸ ستمبر ۲۰۱۱ء کو آئی پی ایس میں ”عمل تدریس میں استاد کا کردار“ کے موضوع پر ایک علمی مجلس کا انعقاد کیا گیا جس میں مولانا مفتی غلام الرحمن، مولانا زاہد الراشدی اور مولانا مفتی محمد زاہد نے اس موضوع پر گفتگو کی۔ مولانا راشدی کی

گفتگو کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ الشریعہ)

ا- آئی پی ایس کا شکریہ

سب سے پہلے تو آئی پی ایس کا شکریہ ادا کروں گا کہ آج کی اس تقریب میں حاضری کا اور کچھ سننے سنانے کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالی ہماری حاضری قبول فرمائے، مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائے، دین اور حق کی جو بات سمجھ میں آئے اللہ تعالی اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اس کے بعد آئی پی ایس کو دو باتوں پر مبارک باد پیش کرنا چاہوں گا۔ ایک تو کام کے تسلسل پر جو ہمارے ہاں عام طور پر نہیں ہوتا، بالخصوص فکری کاموں میں۔ ہمارا جو دائرہ ہے، اس میں فکر سازی اور ذہن سازی کے کام کی حیثیت ثانوی بھی نہیں بلکہ ثالثی درجے میں کہیں ہوتی ہے۔ حالانکہ جو کام فکری ادارے یا تھنک ٹینکس کرتے ہیں، یہ بنیادی کام ہے اور اسی پر قوموں کے مستقبل کے پروگرام استوار ہوتے ہیں۔ یہ تسلسل قابل مبارک باد ہے۔ یہ ایک عرصہ سے لگے ہوئے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں اور مجھے بھی ایک عرصہ سے ان کے ہاں حاضری کا موقع ملتا رہتا ہے۔ دوسرا اس نئی جگہ پر آنے کی مبارک باد دینا چاہوں گا، اللہ تعالی نے ایک اچھی اور کشادہ جگہ عطا فرمائی ہے جہاں کام زیادہ وسعت اور زیادہ تنوع کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

مجھ سے کہا یہ گیا ہے کہ اپنے تدریسی تجربات، مشاہدات اور تاثرات پیش کروں۔ پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مجھے بھی ایک چھوٹا سا مدرس ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور میرا تدریسی تجربہ تقریباً ۴۵ سال پر محیط ہے، الحمد للہ۔ چونکہ میں نے ایک تدریسی گھرانے میں ہوش سنبھالا تھا، اس لیے معلمی میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں نے جس گھرانے میں ہوش سنبھالا، میری والدہ صاحبہ خود استانی اور معلمہ تھیں۔ قرآن کریم پڑھاتی تھیں، ترجمہ، حفظ، تفسیر اور اس زمانے میں بہشتی زیور بھی پڑھاتی تھیں اور یہ بھی تحدیث نعمت کے طور پر عرض کروں گا کہ سابق صدر جناب رفیق تارڑ صاحب میری والدہ اور والد محترمؒ کے شاگرد ہیں۔ تدریسی ماحول مجھے گھر سے، ماں کی گود سے ملا ہے۔ والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہی کیا! وہ تو برصغیر کی سطح کے بڑے مدرسین میں سے ہیں۔ ان کا اپنا تدریسی دورانیہ کوئی ساٹھ سال سے زائد رہا ہے، انہوں نے ساٹھ سال دینی علوم کی تدریس کی ہے۔ میرے لیے

مشکل بات اس لیے نہیں تھی کہ ماحول ہی وہ تھا، تربیت ہی وہ تھی، ذوق ہی وہ تھا، ہر وقت اردگرد پڑھنے پڑھانے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔

میں نے تدریسی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں کر دیا تھا، شاید موقوف علیہ سے بھی پہلے۔ اس زمانے میں درجات کی تقسیم یہ ثالثہ، رابعہ وغیرہ کے عنوان سے نہیں ہوتی تھی۔ موقوف علیہ ہوتا تھا، کافیہ کا سال ہوتا تھا، جامی کا سال ہوتا تھا، اس حوالے سے ہم متعارف ہوتے تھے۔ شاید موقوف علیہ سے بھی پہلے کا سال تھا کہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے دو تین طلبہ نے مجھ سے کہا کہ آپ ہمیں ''مالا بد منہ'' پڑھائیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، پڑھا دوں گا۔ تو سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھائی، وہ ہے ''مالا بد منہ''۔ تین طلبہ تھے اور اسے ہم نے باقاعدہ کلاس کی صورت میں چلایا۔ یہ میری تدریسی زندگی کا آغاز تھا۔ میری تدریسی زندگی ۱۹۷۰ء میں باقاعدہ شروع ہوئی ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک بیس سال میں نے مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں پڑھایا جو کہ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے ساتھ گوجرانوالہ کا سب سے قدیمی مدرسہ ہے۔ یہ ۱۹۲۶ء میں قائم ہوا تھا اور میرے والد محترم اور چچا محترم حضرت صوفی صاحب دونوں نے بنیادی تعلیم وہیں حاصل کی۔ یہاں بیس سال مجھے تدریس کا موقع ملا، لیکن وہ تدریس ایسی تھی کہ میں ایک طرف تو جمعیت علماء اسلام کے سرگرم ترین حضرات میں سے تھا، میری صبح کہیں ہوتی تھی، دوپہر کہیں، شام کہیں اور رات کہیں ہوتی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب سے زیادہ متحرک تھا، لیکن متحرک ترین لوگوں میں سے تھا، الحمد للہ۔ ملک کے بیشتر حصوں میں میرا آنا جانا ہوتا تھا۔ جماعتی سرگرمیاں، سیاسی، تنظیمی سرگرمیاں، معرکہ آرائی، تحریکیں، گرفتاریاں سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ تحریکی اور سیاسی سرگرمیوں کے لحاظ سے یہ میرا کلائمیکس کا دور تھا، یعنی ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک۔ اس حوالے سے میں دو تین باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

۲۔ نوجوانوں کی سرپرستی اور رہنمائی

والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ میرے والد بھی تھے، شیخ بھی تھے، استاد بھی تھے، مربی بھی تھے، سب کچھ وہی تھے۔ ان کے ساتھ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ میرے چچا تھے، استاد تھے، مربی تھے۔ اس دور میں اتنی متنوع اور وسیع سیاسی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ میرا ذوق شروع ہی سے یہ ہے کہ میں تقریباً تمام مکاتب فکر سے رابطہ رکھتا تھا اور رابطہ رکھتا ہوں، اس درجے کا کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو ہم اکٹھے چل

سکیں۔ یہ رابطہ میرا طالب علمی کے زمانے میں تھا کہ کسی دینی تحریک میں ہمیں اکٹھا چلنا پڑے تو حجاب نہ ہو کہ وہ کون ہے، میں کون ہوں۔ اسے آپ میرا ذوق کہہ لیجیے، چالیس پینتالیس سال سے یہ میرا معمول ہے۔ مجھے یہ خدشہ ہوتا تھا کہ میرے والد محترم جس ماحول کے بزرگ ہیں، شاید میری یہ وسیع سرگرمیاں ان کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔ لیکن انہوں نے جماعتی، اتحادی، تحریکی یا سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ہاں، البتہ دو باتوں کی مجھ پر ہمیشہ پابندی رکھی اور ان باتوں پر وہ ڈانٹتے بھی تھے۔

ایک انہیں اس بات کی فکر ہوتی تھی کہ اس نے قرآن کریم حفظ کیا ہوا ہے، رمضان میں سنا رہا ہے یا نہیں سنا رہا؟ ماہ رجب میں ہی مجھ سے پوچھنا شروع کر دیتے تھے کہ کہاں سنا رہے ہو، کیا تیاری کر رہے ہو، کتنی منزل پڑھتے ہو؟ رمضان میں بلا کر پوچھتے تھے کہ کتنے پارے ہو گئے، کتنی غلطیاں روز آتی ہیں، سناتے کس کو ہو، دور کس سے کرتے ہو؟

دوسرا ان کا اصرار ہوتا تھا کہ تم جو مرضی کرو، لیکن دو چار کتابیں لازمی پڑھانی ہیں۔ سچی بات ہے کہ پہلے دس سال میں نے مجبوری سے پڑھایا۔ ڈر ہوتا تھا کہ والد صاحب ڈانٹیں گے، پوچھیں گے۔ رمضان کے بعد شوال میں ہی بلا لیا کرتے تھے اور پوچھتے تھے کیا پڑھا رہے ہو، کتنے سبق ہیں، کیا مطالعہ کرتے ہو؟ وہ تو پرانے مدرس تھے، اس لیے سبق کے بارے میں پوچھتے تھے کہ فلاں جگہ کیسے حل کی تھی، فلاں موقع طلبہ کو کیسے سمجھایا تھا؟ الحمد للہ مجھے یہ نگرانی حاصل رہی ہے۔

۳- تدریس کا ذوق پیدا کرنا

پہلے دس سال تک میں تقریباً یہ سمجھتا رہا کہ میں مجبوراً پڑھا رہا ہوں، لیکن آہستہ آہستہ ذوق بنتا گیا اور الحمد للہ آج یہ ذوق ہے کہ اگر دو چار سبق نہ پڑھاؤں تو دن گزرتا نہیں ہے۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔ پہلے پہلے غصہ آتا تھا کہ میں سیاسی لیڈر ہوں، اخبارات میں میرے مضامین چھپتے ہیں اور میرے بیانات آتے ہیں، جبکہ والد صاحب مجھ پر سختی کرتے ہیں کہ تم نے اصول الشاشی ضرور پڑھانی ہے، نور الانوار ضرور پڑھانی ہے اور ہدایہ ضرور پڑھانی ہے۔ میں اپنے مدرس دوستوں سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ والد صاحب کا جبر کہہ لیجیے یا کچھ اور کہ آہستہ آہستہ اپنا ذوق بن گیا کہ میں نے ایک عرصہ اس طرح گزارا کہ دوسری سرگرمیوں کے باوجود تدریس ضرور کی۔ البتہ میں نے ایک سہولت یہ لے رکھی تھی کہ سبق اپنی مرضی کے لیتا تھا، تین یا چار، اور اپنی مرضی کے وقت پر پڑھاتا تھا۔ اپنی سرگرمیوں

کے ساتھ مجھے اسباق کو ایڈجسٹ کرنا ہوتا تھا۔ بیس سال تک میرا یہ معمول رہا ہے کہ جامع مسجد میں فجر کی نماز پڑھاتا تھا (اب بھی پڑھاتا ہوں، درس دیتا ہوں) اور پھر مصلے پر تین چار سبق پڑھاتا تھا اور نماز کے ڈیڑھ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد فارغ ہو جاتا تھا۔ پھر میں آزاد ہوتا تھا کہ کبھی مردان جا رہا ہوں تو کبھی پشاور۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ساری رات سفر کر کے سحری کے وقت واپس آتا تھا، نماز سے ایک گھنٹہ پہلے مطالعہ کرتا تھا، نماز کے بعد پڑھاتا تھا۔ پھر اگر سونا ہے تو سو گیا، ورنہ بس پر جا کر سوار ہو گیا اور وہیں سو گیا۔ یہ میرا تقریباً بیس سال تک معمول رہا، اس زمانے میں میری نیند اکثر بس میں ہی پوری ہوتی تھی۔

یہاں ایک لطیفے کی بات یاد آگئی۔ ایک دن حضرت والد صاحب پوچھتے ہیں کہ خدا کے بندے! تم سوتے کہاں ہو؟ آج اخبار میں پڑھتے ہیں کہ کوئٹہ بیٹھا ہوا ہے، کل پڑھتے ہیں کراچی میں ہے، پرسوں پشاور میں ہے، ترسوں میرپور میں ہے، اور سبق بھی پڑھاتے ہو، آخر سوتے کدھر ہو؟ میں نے کہا جی بس سو جاتا ہوں۔ اس زمانے میں میری حالت یہ تھی کہ تین چار گھنٹے بس میں سونا میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی، اب بس میں نیند نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ والد صاحب کے ساتھ گوجرانوالہ سے ایک بارات پر جانا پڑ گیا۔ والد صاحب کے بہت قریبی تعلق والے دوست تھے اور انہوں نے مجبور کیا کہ آپ بیٹے کی بارات پر چلیں۔ چنیوٹ سے آگے لالیاں جانا تھا۔ بڑی ویگن تھی۔ ویگن میں باپ بیٹا دونوں کو ایک ساتھ سیٹ مل گئی۔ میں جب گوجرانوالہ سے نکلا تو مجھے اتنا یاد ہے کہ قلعہ دیدار سنگھ شاید گزرا تھا، اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہاں کہاں سے گزرے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد جب چنیوٹ پہنچے تو ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ والد صاحب نے مجھے کندھے سے پکڑ کر کہا کہ "اٹھو! نماز پڑھو۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ کہاں سوتے ہو۔" تو بیس سال میرا یہ معمول تھا اور میرا اختیار ہوتا تھا کہ میں اپنی مرضی کے اسباق لوں گا اور دوسرا یہ کہ وقت میری مرضی کا ہو گا کہ کچھ بھی ہو، صبح کی نماز کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے میں، میں نے سبق پڑھا کر فارغ ہو جانا ہے، اور الحمد للہ میں نے اس کو نبھایا ہے۔

میرا زیادہ تر تدریسی ذوق تھا فقہ، اصول فقہ، صرف اور ادب کا۔ میرے زیادہ تر اسباق جن کتابوں میں سے ہوتے تھے، ان میں نور الانوار، اصول الشاشی، حسامی، ہدایہ، کنز اور صرف کی کتابیں شامل تھیں اور (عربی ادب کی کتاب) حماسہ تو میری پکی کتاب تھی۔ الحمد للہ آج بھی میرا ذوق یہ ہے کہ والد صاحب کی تربیت اور سختی کی وجہ سے میری دیگر سرگرمیوں

کے باوجود پچھلے پورے سال میں میری صرف تین چھٹیاں تھیں، حالانکہ اٹھارہ چھٹیوں کی مدرسے کی طرف سے اجازت ہے۔ مدرسے کے قواعد و ضوابط میں ہے کہ اٹھارہ اتفاقی چھٹیاں استاد کا بنیادی حق ہے۔ پچھلے سال میں نے صرف تین استعمال کیں اور اس سال اللہ کرے وہ بھی نہ ہوں۔ تو والد صاحب کا سبق یہ ہوتا تھا کہ بھئی، ناغہ نہیں کرنا۔ وہ تو چھٹی کو گناہ کبیرہ سے بھی آگے کی کوئی شے سمجھتے تھے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ والد صاحب کی چھٹی ہو۔ سوائے سخت بیماری کے کوئی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ ایک تو میں نے مشاہدات اور تجربات میں حضرت والد صاحب سے سیکھا اور پھر اپنا ذوق بن گیا ہے کہ چھٹی نہ ہو، تن آسانی نہ ہو۔ یہ میری کوشش ہوتی ہے اور میں الحمد للہ کامیاب بھی ہوتا ہوں اس کوشش میں۔ میرا خیال ہے کہ کوشش اور ارادہ ہو تو ہر کام ہو جاتا ہے، جب ارادہ ڈھیلا پڑ جائے تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہ تھا میرا تدریسی زندگی کا بیس سال کا معمول۔ پھر اس کے بعد کچھ مسائل اس نوعیت کے پیدا ہو گئے کہ تدریسی عمل میں ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۸ء تک آٹھ سال کا ناغہ پڑ گیا۔ پھر ۱۹۹۸ء میں حضرت صوفی صاحبؒ (چچا محترم) نے فرمایا کہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں ایک دو سبق پڑھا دیا کرو تو میں نے وہاں موطا امام مالک اور سنن نسائی پڑھانا شروع کی۔ اس طرح ۱۴ سال مجھے نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورۂ حدیث کے اسباق پڑھاتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی معذوری کے بعد سے ترجمہ قرآن کریم، بخاری شریف، طحاوی شریف اور حجۃ اللہ البالغہ کے اسباق میرے پاس ہوتے تھے۔

۴۔ سبق کے لیے خصوصی تیاری

اس دوران جو باتیں میں نے محسوس کی ہیں، وہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ والد محترم کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے بخاری شریف میرے خیال سے چالیس بار سے زیادہ مرتبہ پڑھائی ہوگی، لیکن اس کے باوجود آخری دور میں بھی ان کو دیکھا ہے کہ رات کو مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دو چار مرتبہ پڑھا کر ایک کتاب سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یار پڑھائی ہوئی ہے، کوئی مسئلہ نہیں، پڑھا لیں گے۔ صبح دیکھی جائے گی، کیا ہوتا ہے۔ لیکن والد محترم مطالعہ لازمی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ اور بخاری شریف کا حاشیہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو مطالعے کی کیا ضرورت ہے؟ کہنے لگے کہ میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں کہ جتنی دفعہ دیکھا ہے، کوئی نیا نکتہ سامنے آیا ہے، کوئی نہ

کوئی نئی بات ذہن میں آئی ہے۔ الحمدللہ میرا ذوق بھی یہی ہے کہ حتی الوسع ان روایات کو نبھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ایک تو وہ سبق کے ناغے کو گناہ سمجھتے تھے، دوسری بات مطالعے کے بغیر سبق پڑھانے کو بھی وہ تقریباً گناہ ہی سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں جتنا اہتمام میں نے ان کا دیکھا ہے، حیران کن ہے۔

تیسری بات جو ہم نے ان میں دیکھی، وہ ہے وقت کی پابندی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ چھ بجے کے بجائے چھ بج کر ایک منٹ پر آئیں۔ پانچ بج کر انسٹھ منٹ ہو سکتے ہیں لیکن، چھ بج کر ایک منٹ نہیں ہو سکتا۔ بارہا میں نے تجربہ کیا ہے۔ ہمارے علاقے میں دو آدمیوں کے بارے میں یہ محاورہ مشہور تھا کہ ان کو دیکھ کر لوگ گھڑیاں درست کرتے ہیں۔ ایک مولانا ظفر علی خانؒ جو کہ وزیر آباد کے تھے، ان کی وقت کی پابندی ضرب المثل تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ مولانا ظفر علی خان کی سرگرمیاں دیکھ کر ہم گھڑی درست کرتے ہیں اور کہتے تھے کہ گھڑی غلط ہو سکتی ہے لیکن ظفر علی خان غلط نہیں ہو سکتے۔ اور دوسرے ہیں والد مرحوم۔ جو وقت کہا ہے، اسی وقت پر پہنچنا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ خود وقت سے آگے پیچھے ہو جائیں یا کسی اور کو ہونے دیں۔

۵- امانت اور دیانت کی مثال

میں ان کے تجربات اور اپنے مشاہدات و تاثرات عرض کر رہا ہوں۔ والد صاحب کا ایک معمول اور بھی تھا جو میں اپنے اساتذہ بھائیوں سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ پرانے بزرگوں کی جو بات ہم نے دیکھی کہ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ مدرسے کی کوئی چیز مدرسے کے کام کے علاوہ کہیں اور استعمال ہو سکے۔ تقریباً ربع صدی تک ان کا معمول رہا ہے کہ گکھڑ سے گوجرانوالہ ٹرین یا بس پر آتے تھے۔ ایک میل چلنا، پھر گاڑی میں بیٹھنا، پھر گاڑی سے اتر کر آگے ایک میل پیدل چلنا، تقریباً تیس سال یہ معمول رہا۔ آخری عمر میں مدرسہ والوں نے فیصلہ کیا کہ گاڑی لے لیتے ہیں جو گھر سے لے آیا کرے اور شام کو گھر چھوڑ آیا کرے۔ گکھڑ سے گوجرانوالہ جاتے وقت گاڑی میں جگہ ہوتی تو ہم بھی ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔ گاڑی جی ٹی روڈ پر گوندلانوالہ چوک سے گھنٹہ گھر کی طرف مڑ جاتی تھی، جبکہ میرا جی ٹی روڈ پر اس سے اگلا سٹاپ شیرانوالہ باغ ہوتا تھا، چنانچہ وہ مجھے چوک پر ہی اتار دیتے کہ یہاں اتر جاؤ۔ یہ آپ کے ابا کی نہیں، مدرسے کی گاڑی ہے۔ اہلیہ اور بچے ساتھ ہوتے، تب بھی اتار دیتے تھے کہ یہاں سے رکشے میں بیٹھ کر جائیں۔

٦- تدریس میں سادگی اور ترتیب

ایک بات اور میں نے دیکھی والد صاحب کے طریق تدریس میں۔ والد صاحب سے زیادہ فقہی مباحث کون کرتا ہوگا، اعتقادی مباحث، فقہی مباحث اور شوافع، مالکیہ، حنابلہ اور حنفیہ کی اختلافی بحثیں ان سے زیادہ کون کرتا ہوگا، لیکن ایسا وہ صرف ایک کتاب میں کرتے تھے۔ ساری بحثیں صرف ترمذی میں کرتے اور بخاری شریف اتنی سادہ پڑھاتے تھے کہ آپ اس سے زیادہ سادگی کا تصور نہیں کرسکتے۔ ترجمۃ الباب، ایک آدھ مسئلہ اور اگر کوئی متعلقہ بات ہو تو کہہ دیتے تھے، ورنہ آگے بڑھ جاتے اور کہتے تھے کہ حدیث کو حدیث کے طور پر پڑھو، بطور خاص بخاری شریف کو، مباحث کسی اور کتاب میں کرلیں۔

ان کا ایک دورانیہ طے ہوتا تھا، پورے سال کا ایک توازن ہوتا تھا، ایک ترتیب اور متعیّن مقدار کے حساب سے چلتے تھے۔ اور الحمدللہ میرا ذوق بھی کچھ تھوڑا بہت یہی ہے۔ میں تو ویسے بھی جھگڑے والا (یعنی فقہی اختلافی مسائل میں پڑنے والا) آدمی نہیں ہوں، تطبیق و توفیق کی دنیا کا آدمی ہوں، لیکن پھر بھی اختلافی بحثیں ضرورت کے مطابق کرتا ہوں۔ چونکہ بخاری شریف اور طحاوی دونوں میرے پاس ہوتی ہیں، اس لیے جب سال کے شروع میں اسباق کا آغاز ہوتا ہے تو میں طلبہ سے ایک بات کہہ دیا کرتا ہوں کہ جھگڑے سارے طحاوی میں کریں گے اور تسلی سے کریں گے۔ بخاری میں میری جانب سے آپ کو صرف تین باتیں ملیں گی: نفس حدیث، ترجمۃ الباب سے تعلق اور آج کا کوئی مسئلہ اس سے متعلق ہے تو وہ۔ بس اس سے زیادہ آپ کو بخاری میں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بات میں پہلے دن سے ہی بتا دیتا ہوں کہ میری کوشش یہ ہوگی کہ آپ نفس حدیث سمجھ جائیں اور حالات حاضرہ پر اس کی تطبیق سمجھ لیں۔

٧- وقت کی منصوبہ بندی

ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں تو سارا وقت لگ جاتا ہے چند ابواب پر، پھر باقی کتاب سے ایسے گزرتے ہیں جیسے گزر ہی گئے ہیں۔ طلبہ کو اکثر ابواب کا نفس مضمون بھی سمجھ میں نہیں آتا اور اب اکثر جگہوں پر یہ عادت سی بن گئی ہے۔ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ پہلی سہ ماہی تک استاد بھی سمجھتا ہے اور شاگرد بھی، دوسری سہ ماہی میں استاد سمجھتا ہے لیکن شاگرد نہیں سمجھتا، اور ششماہی کے بعد نہ استاد سمجھتا ہے اور نہ شاگرد۔ یعنی نہ استاد کو پتہ ہوتا کہ میں

کیا پڑھا رہا ہوں اور نہ شاگرد کو پتہ ہوتا ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ والد صاحب اس پر ناراض ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ غیر ضروری بحث میں نہ پڑیں، نصاب کی کتاب پوری پڑھائیں اور اچھے طریقے سے پڑھائیں۔ بحثیں دوسری کتابوں میں کر لیں، یہاں نفس حدیث پڑھادیں اور اگر کوئی متعلقہ بات ہے تو وہ کردیں۔

۸- دین کا جامع تصور

ایک طالب علمانہ بات میں کہنا چاہوں گا کہ بخاری شریف کا جو مکمل نام ہے یعنی ''الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ'' اس نام کے پہلے لفظ یعنی ''الجامع'' کا ترجمہ جو ہمارے متقدمین کرتے آئے ہیں، وہ درست ہے کہ یہ تمام علوم کی جامع کتاب ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی لکھا ہے، لیکن ایک طالب علمانہ ترجمہ میں بھی کیا کرتا ہوں۔ الجامع کا ترجمہ آج کے حوالے سے یہ ہے کہ ہمارا دعوی ہے کہ اسلام جامع مذہب ہے، مکمل نظام حیات اور دستوری زندگی ہے، زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ان کو آنکھوں سے دیکھنا ہو تو بخاری شریف کی فہرست پڑھ لیں۔ ایک نظر ڈالنے سے اسلام کی جامعیت آپ کے سامنے آجائے گی۔ ایک دفعہ نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ زندگی کا کون سا مسئلہ ایسا ہے جسے ٹچ نہیں کیا گیا، جس کے بارے میں حدیث یا قرآنی آیت نہ دی ہو۔ معاشرے کی عملی زندگی سے تعلق رکھنے والا کون سا مسئلہ ہے جو اس میں نہیں ہے۔ میں اس ''الجامع'' کا یہ ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ اسلام کی جامعیت کا اظہار بخاری شریف میں ہے۔ طلبہ کو بخاری اس انداز سے پڑھانی چاہیے کہ طلبہ کے سامنے کم از کم اسلام کے اجتماعی نظام کا ایک تصور اور خاکہ آجائے اور انہیں معلوم ہوجائے کہ اسلام میں کیا کچھ ہے۔ معاملات اور زندگی کے متعلقہ شعبوں کے ابواب تو ہمارے سامنے سے ایسے ہی گزر جاتے ہیں، حالانکہ میری طالب علمانہ رائے کے مطابق آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم قرآن کریم اور احادیث نبویہؐ کو آج کے عالمی تناظر اور عالمی ماحول میں ایک سسٹم اور نظام زندگی کے طور پر طلبہ کو پڑھائیں تاکہ آنے والا دور جو کہ فکری لحاظ سے پریشان کن ہے، اس دور میں ہمارے طلبہ اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکیں۔

۹- لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو

ایک اور تجربہ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں جس کے لیے ایک واقعہ عرض کروں گا جس میں سوچنے کا پہلو ہے۔ ہمارے زمانے میں تحریری امتحان نہیں ہوا کرتا تھا، زبانی امتحان ہوتا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ہمارا بخاری شریف کا امتحان ہو رہا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ ہوتے تھے حضرت مولانا بشیر احمد پسروریؒ، بڑے عالم دین تھے، وہ امتحان لینے آئے۔ چودہ طلبہ کی کلاس تھی۔ ان کی ایک بات بہت پسند آئی۔ ہمیں بٹھایا اور کہا کہ فلاں صفحہ کھولیں اور یہ عبارت پڑھیں۔ بلوچستان کے مولانا شمس الدین شہید آپ کے ذہن میں ہوں گے، وہ میرے دورے کے ساتھی تھے۔ انہوں نے ایک حدیث کی عبارت پڑھی۔ پھر مولانا پسروریؒ نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے اس کے مباحث نہیں پوچھوں گا کہ اس میں مسئلہ کیا بیان ہوا ہے اور یہ کہ شوافع و حنابلہ اس مسئلہ پر کیا رائے رکھتے ہیں، اس لیے کہ یہ سب تم نے رٹا ہوا ہے۔ میرا سوال تم سے یہ ہے کہ یہ حدیث آپ کو پنجاب کے دور دراز گاؤں میں ان پڑھ لوگوں کے سامنے بیان کرنی ہے، کیسے کرو گے، ان کو یہ حدیث کیسے سمجھاؤ گے؟ طلبہ میں مجھ سے سینئر لوگ موجود تھے، لیکن وہاں میرا داؤ لگ گیا۔ میں نے کہا، حضرت میں یہ کروں گا۔ پھر میں نے ٹھیٹھ پنجابی میں اس حدیث پر سات منٹ تقریر کی اور اعلیٰ نمبروں کا مستحق ٹھہرا، حالانکہ کلاس میں مجھ سے زیادہ لائق حضرات موجود تھے۔

یعنی یہ بھی ضروریات میں سے ہے کہ دیہاتی اور ان پڑھ لوگوں کے سامنے ان کے لہجے اور ضرورت کے مطابق قرآن و حدیث پہنچانے کا فن آتا ہو، کیونکہ درس گاہ میں کیے جانے والے مباحث میں اور عوام کے سامنے قرآن و حدیث پیش کرنے میں بہت فرق ہے۔ اس پر بھی مجھے ایک لطیفہ کی بات یاد آگئی۔ میرے بزرگ پھوپھی زاد بھائی تھے، فوت ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، آمین۔ میں چھوٹا طالب علم تھا، وہ ذرا سینئر تھے۔ وہ کہیں جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ مجھے ساتھ لے گئے اور جمعہ پڑھانے کے بعد مجھ سے کہتے ہیں کہ میں نے کیسی تقریر کی ہے؟ میں نے کہا، بیڑا غرق کر دیا ہے۔ کہتے ہیں میں ساری رات تقریر رٹتا رہا ہوں اور تم یہ کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا ہے کہ کل مولانا قاضی محمد اسلمؒ سے ملا حسن کا جو سبق پڑھا تھا، وہ آج جمعہ کے خطبہ میں دہرا دیا ہے کہ یہ لابشرط شئی ہے اور یہ بشرط شئی ہے، بشرط لا شئی ہے۔ یہ قضیہ شرطیہ ہے، اور یہ قضیہ سالبہ ہے۔ ان غریبوں کو کیا پتہ کہ قضیہ شرطیہ کیا ہوتا ہے اور بشرط شئی کیا ہوتا ہے؟

ہماری ذمہ داری ہے کہ طلبہ میں یہ ذوق پیدا کریں کہ وہ عام لوگوں سے بھی بات کر سکیں۔ اس کو فریکوینسی سیٹ کرنا کہتے ہیں۔ ہماری آپس کی فریکوینسی تو سیٹ ہوتی ہے، لیکن پبلک کے ساتھ ہماری فریکونسی سیٹ نہیں ہوتی۔ میں اپنا چالیس پینتالیس سال کا تجربہ آپ سے ذکر کرتا ہوں کہ ہم عام لوگوں کے ذہن کے مطابق بات نہیں کرتے جس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی نمازیوں کے ساتھ، متعلقین کے ساتھ جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے پچانوے فیصد ایسے ہیں جو فریکوینسی سیٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ہم کسی اور لہجے میں بات کر رہے ہوتے ہیں اور وہ کسی اور لہجے میں کر رہا ہوتا ہے، جبکہ بات دونوں ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں، لیکن ہم باہمی اتفاق نہیں کر پاتے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ بھی استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں اور تلامذہ میں اس بات کا ذوق پیدا کریں کہ وہ عام آدمی سے ان کے لہجے میں بات کر سکیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے الفوز الکبیر میں یہ بحث کی ہے کہ عام انسان سے بات کرنے کے لیے اللہ تعالی نے عام انداز استعمال کیا ہے اور عام آدمی کی نفسیات کے مطابق بات کی ہے۔ مکھیوں، مچھروں اور مکڑی کی مثالوں سے بات کی ہے، یعنی عام آدمی کی ذہنی سطح کا لحاظ کر کے بات کی ہے۔ ہمیں بھی عام آدمی کے لیول پر آنا سیکھنا چاہیے اور اپنے شاگردوں کو سکھانا چاہیے۔ آج کے حالات میں یہ بہت زیادہ ضروری ہے، آج کی صورتحال کیا ہے، میں بطور ایک امام اور مدرس کے بات کر رہا ہوں کہ اس بات کی تبدیلی ہمیں محسوس کرنی چاہیے جو ہم نہیں کر رہے۔

۱۰- حالات زمانہ سے آگاہی

آج سے پچاس سال پہلے لوگوں کے لیے دین کی معلومات کا ذریعہ صرف ہم ہوتے تھے۔ جو معلومات ہم نے دے دیں اور جو فیصلہ ہم نے کر دیا، وہی اس فرد کی معلومات اور فیصلہ ہے۔ اب عام آدمی کے پاس ہمارے علاوہ بھی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ غلط ہیں یا صحیح، میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ جو نوجوان رات کو انٹرنیٹ پر بیٹھتا ہے، وہ صرف ہم پر انحصار نہیں کرتا کہ مولوی صاحب نے کیا بتایا ہے، بلکہ وہ تلاش کرتا ہے کہ متعلقہ آیتیں اور حدیثیں کون کون سی ہیں۔ آج اور آج سے چالیس پچاس سال پہلے کے عام آدمی میں جو فرق ہے، اسے نظر انداز نہ کیجیے۔ پہلے عام آدمی کے پاس دین کی معلومات کے لیے واحد ذریعہ ہم تھے، اب صورت حال یہ ہے کہ اس کے پاس ہمارے

علاوہ بھی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں، اخبارات ہیں، میگزین ہیں، ٹی وی چینل ہیں، انٹرنیٹ ہے۔ تو جب وہ ہم سے بات کرتا ہے تو وہ صرف ہماری معلومات پر بنیاد رکھ کر بات نہیں کرتا بلکہ وسیع معلومات کی بنیاد پر سوال کرتا ہے، اس لیے جب ہم اسے محدود دائرے میں رہ کر جواب دیتے ہیں تو اسے وہ جواب مطمئن نہیں کر پاتا۔

یہ تبدیلی ہمیں محسوس کرنی چاہیے۔ رات کو اس نے چینل دیکھا، پروگرام میں کسی دانش ور نے کوئی بات کر دی تو اس نے آکر مجھ سے پوچھنا ہے کہ مولوی صاحب، فلاں نے یہ بات کہی تھی۔ اس پر میرا رویہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو میں ڈانٹ دیتا ہوں کہ فضول پروگرام مت دیکھا کرو۔ اب وہ میرے کہنے سے تو باز نہیں آئے گا، دوسری رات وہ دو پروگرام مزید دیکھے گا اور پھر مجھ سے کوئی مسئلہ پوچھنے آجائے گا۔ اب جبکہ میرے پاس اس حوالے سے معلومات مکمل نہیں تو میں یہ کہنا توہین سمجھتا ہوں کہ بیٹا، کل میں تیاری کر کے بتاؤں گا۔ میں اسے ادھورا سا جواب دوں گا اور ساتھ ڈانٹ دوں گا، بہر صورت وہ کنفیوژ ہو گا۔ اس کا نتیجہ جو نکلے گا، وہ میرے نزدیک آج کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ مولوی کا علمی مقام اور اس کی دینی ثقاہت سوسائٹی میں مجروح ہوگی اور ہو رہی ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کو تو دین کا کچھ پتہ نہیں ہے اور یہی حال عام معلومات کا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بطور خطیب یا مدرس ہمیں اپنا جنرل نالج اور عمومی مطالعہ اس قدر بڑھانا ہو گا کہ ہم تمام متعلقہ معلومات کا احاطہ کر کے بات کو صحیح تناظر میں پہچان سکیں۔ ہمیں اس قابل ہونا چاہیے کہ کلاس میں طلبہ کو بتا سکیں کہ یہ صورت حال آج یوں ہے، کل یوں تھی، حالات میں یا مسئلہ میں یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے تاکہ انہیں یہ معلوم کرنے کے لیے کسی اور کے پاس نہ جانا پڑے۔ طالب علم کو وہ بتائیں جو اس کی ضرورت ہے، لیکن خود اپنے مطالعے میں وسعت اور تنوع پیدا کرنا ہماری ذمہ داری ہے، ورنہ ہم نہ طالب علم کو مطمئن کر پائیں گے اور نہ بطور خطیب اپنے سننے والے کو۔ اور اگر ہم مطمئن نہ کر پائے تو ہماری ثقاہت مجروح ہوگی اور اگر یہ مجروح ہوگی تو دین کو نقصان ہو گا۔

۱۱۔ نئی نسل کی تیاری

اور آخر میں ایک بات کہہ کر اپنی بات ختم کروں گا۔ میں جب اپنی برادری (اساتذہ) سے بات کرتا ہوں تو دیوان حماسہ کا ایک شعر ضرور سنایا کرتا ہوں۔ دیوان حماسہ میں ایک شاعر

کا ذکر ہے کہ وہ جوان ہوا، قبیلے والوں نے کھلایا پلایا، لیکن لڑنا نہیں سکھایا۔ دشمن داری تھی، لڑائی ہوئی تو مار کھائی۔ اس پر اب وہ قبیلے والوں کو کوس رہا ہے۔ کہتا ہے ؂

فهلا أعدوني لمثلي تفاقدوا

إذ الخصم أبزي مائل الرأس أنكب

وهلا أعدوني لمثلي تفاقدوا

وفي الأرض مبثوث شجاع وعقرب

اپنے قبیلے کو کوس رہا ہے کہ جب ان کو پتہ تھا کہ میری دشمن داری بڑے متکبر آدمی سے ہے تو انہوں نے مجھے تربیت کیوں نہیں دی؟ جب انھیں پتہ تھا کہ زمین پر بچھو اور سانپ بکھرے پڑے ہیں تو مجھے بتایا کیوں نہیں، ان سے بچنے کا طریقہ کیوں نہیں سکھایا؟ اس میں اساتذہ کے لیے پیغام ہے کہ آج دنیا میں نظریاتی، ثقافتی، علمی اور فکری لحاظ سے شکوک و شبہات کا جو جنگل آباد ہے اور فکری انتشار، تہذیبی خلفشار اور ثقافتی یلغار کا جو دائرہ پھیل رہا ہے، اس سے اپنے طالب علم کو آگاہ کرنا، اس کو مستقبل کے خطرات سے نمٹنے کے لیے تیار کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر میں بحیثیت استاد آج کے علمی ماحول اور اس کے خطرات کو محسوس نہیں کروں گا اور اپنے طلبہ کو مدرسہ سے باہر جانے کے بعد جو صورت حال پیش آئے گی، اس سے آگاہ نہیں کروں گا تو وہ پھر میرے بارے میں یہی شعر دہرائے گا اور اسی لہجے میں مجھے کوسے گا۔

بس یہی میرا پیغام ہے اپنے لیے بھی، آپ کے لیے بھی۔ دنیا کے حالات کو محسوس کریں، علمی، فکری، ایمانی اور تہذیبی دنیا میں مستقبل کے خطرات کو محسوس کریں اور اپنے طلبہ کو اپنے نصاب کے دائرے میں ان سے آگاہ کریں۔ استاد سب کچھ کر لیتا ہے، استاد کے لیے کتاب نہیں بلکہ اس کا ذوق اہم ہے۔ کوئی بھی کتاب ہو، استاد کا فہم اصل اہمیت رکھتا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھیں کہ آج ہماری ذمہ داری کیا ہے اور ہمارے زیر تعلیم جو پود ہے، اس کو مستقبل میں کیا صورت حال پیش آنے والی ہے، اس کے لیے میں نے انہیں کیسے تیار کرنا ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

توہین رسالت، مغرب اور امت مسلمہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۲ء)

توہین رسالت کا مسئلہ ایک حالیہ امریکی فلم کے حوالے سے ایک بار پھر پوری دنیا میں موضوع بحث ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس سلسلہ میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں جوان کے ایمان و عقیدت کا مظہر ہے، اور اس حقیقت کا عالمی فورم پر ایک بار پھر بھرپور اظہار ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مسلمان کسی بھی حوالے سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کو برداشت نہیں کر سکتا اور اس سلسلے میں دنیا کے ہر خطے کے مسلمانوں کے جذبات ایک جیسے ہیں۔ میں نے وہ فلم نہیں دیکھی، نہ دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی شاید دیکھ سکوں، اس لیے کہ ایک عام انسان کی توہین پر بھی میرے دل میں کچھ نہ کچھ کسک ضرور پیدا ہوتی ہے، کائنات کی سب سے محترم شخصیت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کا منظر کیسے دیکھ سکوں گا؟ میں نے سلمان رشدی کی بدنام زمانہ تصنیف "شیطانی آیات" بھی چند صفحات پر نظر ڈال کر چھوڑ دی تھی کہ اس سے آگے پڑھنے کی مجھ میں سکت نہیں تھی۔

اخبارات میں اس شرمناک فلم کے ہدایتکار نکولا سبیلی نکولا کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں اس نے کہا کہ مسلمانوں میں برداشت اور حوصلہ نہیں ہے، انہیں اختلاف اور تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ یہ بات مغرب کے بہت سے دانشور عرصے سے کہتے آرہے ہیں اور آج بھی یہ بات سب سے زیادہ زور دے کر کہی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اندر اختلاف اور تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ میرا مغرب کے ان دانشوروں سے سوال ہے کہ اختلاف و تنقید اور اہانت و تحقیر میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اور کیا اختلاف و تنقید کے نام پر ہم سے تمسخر و استہزا اور توہین و تحقیر کا حق تو نہیں مانگا جارہا؟ جہاں تک اختلاف اور تنقید کا تعلق ہے اس کو مسلمانوں سے زیادہ کس نے برداشت کیا ہے؟ مغرب کے مستشرقین صدیوں سے اسلام، قرآن کریم، جناب نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کی تہذیب و کلچر کے خلاف مسلسل لکھتے آرہے ہیں اور مغرب کی یونیورسٹیوں کی لائبریریاں اس قسم کی کتابوں اور مقالات سے بھری پڑی ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ان کا جواب مقالات اور کتابوں کی صورت میں دلائل کے ساتھ دیا ہے اور اب بھی دلیل اور متانت کے ساتھ کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دلیل اور متانت کے ساتھ ہی دیا

جارہا ہے۔ لیکن تمسخر و استہزا اور توہین و تحقیر کو کسی دور میں بھی برداشت نہیں کیا گیا، وہ آج بھی برداشت نہیں ہے اور آئندہ بھی کبھی برداشت نہیں ہوگا۔

مسلمانوں میں اختلاف اور توہین کے درمیان فرق کا شعور بحمد اللہ قائم ہے اور وہ تنقید اور استہزا کے درمیان فاصلے کو بحمد اللہ اچھی طرح سمجھتے ہیں، البتہ مغرب نے یہ فاصلے ختم کر دیے ہیں۔ انہوں نے استہزا، تمسخر، توہین، تحقیر اور تذلیل کو بھی اختلاف اور تنقید کا عنوان دے رکھا ہے اور مسلمانوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اختلاف اور تنقید کو برداشت کرنے کے عنوان سے اسلام دشمنوں کو اس بات کی کھلی آزادی دے دیں کہ وہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ سمیت مسلمانوں کی کسی بھی محترم اور مقدس شخصیت کو استہزا و تمسخر اور توہین و تحقیر کا جب چاہیں نشانہ بناتے رہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا اور کبھی نہیں ہوگا۔ نکولا سیبلی نکولا اور اس کے ہمنوا مغربی دانشور اور میڈیا اس حقیقت کو جتنی جلدی سمجھ لیں ان کے لیے بہتر ہوگا۔ اس کے بغیر مسلمانوں سے امن یا برداشت کے نام پر کوئی اپیل کارگر نہیں ہوگی، اس لیے کہ مسلمان کا خمیر ہی غیرت وحمیت کے مقدس پانی میں گوندھا گیا ہے۔

توہین رسالت پر مبنی امریکی فلم کے علاوہ پاکستان میں بھی رمشا مسیح کیس کے تناظر میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے دو تین پہلو بہرحال ارباب فکر و دانش کی سنجیدہ توجہ کے مستحق ہیں۔

ایک یہ کہ اس عنوان سے بین الاقوامی سیکولر لابیاں مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے اور لابنگ کے لیے اس قسم کے کیسوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہیں اور خاص طور پر ورلڈ چرچ کونسل کی طرف سے آئندہ چند روز میں اس موضوع پر منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس سے قبل اس طرح کا ماحول بنایا جا رہا ہے کہ اس کانفرنس کو پاکستان میں توہین رسالت پر موت کی سزا کے قانون کو غیر مؤثر بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا سکے۔ بین الاقوامی سیکولر لابیاں پاکستان کے اسلامی تشخص، پاکستان میں نافذ چند اسلامی احکام وقوانین اور خاص طور پر ناموس رسالت کے تحفظ اور قادیانیوں کی غیر اسلامی سرگرمیوں کی روک تھام کے قوانین کے درپے ہیں اور ان کی مسلسل کوشش ہے کہ ان قوانین کو ختم کرا دیا جائے یا کم از کم عملی طور پر غیر مؤثر بنا دیا جائے۔ یہ صورتحال ملک کے دینی حلقوں اور علمی مراکز کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

ہمارا عمومی مزاج یہ بن گیا ہے کہ اس قسم کے معاملات میں وقتی دباؤ کے تحت ہم اکٹھے ہو جاتے ہیں اور احتجاجی میدان میں کچھ نہ کچھ کر بھی دیتے ہیں جس کے فوائد وقتی طور پر مل جاتے ہیں، لیکن اس بارے میں مستقل طور پر کوئی پروگرام ہمارے ہاں نظر نہیں آ رہا جس سے ہم عالمی سیکولر لابیوں کی اس مہم کا سنجیدگی کے ساتھ مستقل طور پر سامنا کر سکیں اور اس کے سدباب کا کوئی معقول راستہ تلاش کر سکیں۔ اگر مسلم حکومتیں اس سلسلے میں کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو دینی قوتوں کو ہی باہمی مشاورت کے ساتھ اس کا اہتمام کر لینا چاہیے۔

دوسری طرف یہ صورت حال بھی ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ ہم لاکھ انکار کریں، مگر توہین رسالت کی سزا کے قانون کا مبینہ طور پر غلط استعمال اس مسئلہ پر ہماری پوزیشن کو مسلسل کمزور کرتا جا رہا ہے اور مسلکی تنازعات میں توہین رسالت کے قانون کی آڑ میں ہم خود اس قانون کو غیر مؤثر بنانے کا باعث بن رہے ہیں۔ دوسرے واقعات کو ایک طرف رکھیں، گوجرانوالہ میں تین ایسے واقعات خود میرے مشاہدے میں موجود ہیں جو ہمارے لیے جگ ہنسائی کا باعث بن چکے ہیں۔

چند سال قبل گرجاکھ میں ایک مسجد کے امام صاحب قرآن کریم کے بوسیدہ اوراق تلف کرنے کے لیے جلا رہے تھے کہ ان کے ایک مسلکی مخالف نے دیکھ لیا اور شور مچا کر لوگوں کو جمع کر لیا۔ مولوی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا، مقدمہ کا اندراج ہوا اور توہین قرآن کریم کے جرم پر انہیں سزا دلوانے کی مہم شروع ہو گئی۔ پولیس نے ہم سے رابطہ کیا تو خود میں نے لکھ کر دیا کہ قرآن کریم کے بوسیدہ اوراق کو تلف کرنے کے لیے جلانے کی روایت موجود ہے اور فقہائے کرام نے بھی بعض صورتوں میں اجازت دی ہے، اس لیے اس عمل کو غیر محتاط اور ناپسندیدہ قرار دے کر اس پر سرزنش تو کی جا سکتی ہے مگر اس پر توہین کی دفعات کا اطلاق درست نہیں ہے۔ اس پر اس غریب امام صاحب کی جان چھوٹی۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد کھیالی میں ایک حافظ قرآن کو اسی طرح کے ایک عمل پر ان کے مخالف مسلک کے امام نے مسجد کا لاؤڈ اسپیکر کھول کر شور کر دیا اور لوگوں کو جمع کر کے اس قدر اشتعال دلایا کہ اس حافظ صاحب کو سڑک پر گھسیٹ پر تھانے لے جایا گیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس ساری کارروائی کے بعد بات کھلی کہ یہ اس کے خلاف مسلکی عناد کی وجہ سے کی گئی تھی۔

ابھی گزشتہ سال کھوکھر کی میں توہین رسالت کا ایک واقعہ سامنے آیا اور اس میں چند مسیحی افراد کو ملوث ظاہر کر کے ان کی گرفتاری کے لیے عوامی مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ کمشنر گوجرانوالہ نے دانشمندی کی کہ فوری طور پر شہر کے سرکردہ علماء کرام سے رابطہ کر لیا جنھوں نے بروقت مداخلت کر کے صورتحال کو کنٹرول کر لیا، ورنہ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کارروائی کسی کاروباری رقابت میں چند لوگوں کو پھنسانے کے لیے کی گئی تھی، لیکن مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام نے مداخلت کر کے صورتحال کو زیادہ سنگین ہونے سے بچا لیا۔

یہ تین واقعات میرے شہر کے ہیں اور میرے چشم دید ہیں، اس لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ توہین رسالت کی سزا کے قانون کا غلط استعمال نہیں ہو رہا، بلکہ اس قسم کے مقدمات کی چھان بین کی جائے تو گزشتہ دس سال میں درج ہونے والے مقدمات کی تعداد بیسیوں میں ہوگی۔ اس لیے ہمیں تحفظ ناموس رسالت کے قانون کا مکمل دفاع اور تحفظ کرتے ہوئے اس کے دوسرے پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے اور کوئی معقول موقف اور طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔

اچھے اور برے لوگوں کی علامات رسول اللہ ﷺ کی نظر میں

(جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۲۶ ستمبر ۲۰۱۲ء)

(جامعہ نصرۃ العلوم کے طلباء سے ماہانہ اصلاحی بیان۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ امام بخاریؒ نے ”الادب المفرد“ میں حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے ایک روایت بیان کی ہے جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اور برے مسلمانوں کی علامات بیان فرمائی ہیں۔

اسماء بنت یزیدؓ انصاریہ خاتون ہیں، صحابیہ ہیں اور ان کا لقب خطیبۃ الانصار بیان کیا جاتا ہے۔ بڑی خطیبہ تھیں اور عوتوں میں وعظ کیا کرتی تھیں۔ جس طرح حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ خطیب الانصار کہلاتے تھے، انہیں خطیب رسول اللہ بھی کہا جاتا تھا اور خطیب الاسلام کا لقب بھی سب سے پہلے انہی کے لیے بولا گیا تھا۔ حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں

کہ ایک دن جناب رسول اللہؐ نے فرمایا ”الا اخبرکم بخیارکم“ کہ کیا میں تمہیں تمہارے اچھے لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ضرور آگاہ فرمائیں۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ”الذین اذا رآوا ذکر اللہ“ وہ لوگ جنہیں دیکھا جائے تو خدا یاد آجائے۔ یعنی جن لوگوں کو دیکھ کر خدا یاد آئے وہ تم میں سے اچھے لوگ ہیں۔ اس کی دو صورتیں بیان کی جاتی ہیں:

1. ایک یہ کہ وہ اللہ تعالی کے نیک بندے جن کی عبادت، نیکی اور تقوی کی جھلک ان کے چہروں پر نور کی صورت میں دکھائی دیتی ہے اور انہیں دیکھ کر دل میں خیال آتا ہے کہ اس قدر بارونق اور پرنور چہرہ کسی اللہ والے کا ہی ہو سکتا ہے۔ عام طور پر انسان کے اندر کی کیفیات کا اس کے چہرے سے اندازہ ہو جاتا ہے اور چہرہ انسان کی باطنی حالت کا عکاس ہوتا ہے۔ غصہ ہو یا خوشی، غم ہو یا راحت، ناراضگی ہو یا رضا مندی، انسان کے چہرے سے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کے نیک اعمال اور برے اعمال کے اثرات بھی چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے اپنے ایک خواب کا منظر بیان فرمایا کہ میں نے ایسے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا جن کے چہروں کی کیفیت یہ تھی کہ چہرے کا نصف حصہ خوبصورت اور باقی نصف حصہ بدصورت تھا۔ فرشتوں سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو ”خلطوا عملا صالحا وآخر سیئا“ اچھے اور برے اعمال خلط ملط کرتے رہے ہیں۔ اعمال صالحہ بھی انہوں نے کیے ہیں اور اعمال سیۂ میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ ان کے نیک اعمال ان کے چہروں پر حسن کی صورت میں نظر آرہے ہیں اور برے اعمال چہروں پر بدصورتی کے طور پر نمایاں ہیں۔ اس لیے اللہ تعالی کے نیک اور مخلص بندوں کے چہروں پر ان کے خلوص اور نیک اعمال کا نور ہوتا ہے اور ان کے بارونق اور نورانی چہروں کو دیکھ کر خدا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

2. اس کا ایک معنی یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ لوگ جن کے اعمال و حرکات، ان کا اٹھنا بیٹھنا، لین دین، عبادات و معمولات اور اخلاق و معاملات اللہ تعالی

اور رسولؐ خدا کے احکام کے مطابق ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایک مسلمان کی عملی زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور خدا یاد آتا ہے۔ بہر حال جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تم میں سے اچھے لوگ وہ ہیں جنہیں دیکھ کر خدا یاد آجائے۔

پھر فرمایا ”ألا أخبرکم بشرارکم؟“ کیا میں تمہیں تمہارے برے لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ”بلی“ یا رسول اللہ! ضرور بیان فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا ”المشاؤون بالنمیمۃ، المفسدون بین الأحبۃ، الباغون البراء العنت“۔ آپؐ نے تین باتوں کا ذکر فرمایا۔

1. ایک یہ کہ ”المشاؤون بالنمیمۃ“ چغلیاں کھانے والے یعنی ایک دوسرے کی چغلی کرنے والے لوگ۔ چغلی کہتے ہیں ایک دوسرے کو خواہ مخواہ ان کی باتیں پہنچانے والے۔ ایک کی بات دوسرے کے آگے، دوسرے کی تیسرے کے آگے اور تیسرے کی بات چوتھے کے آگے۔ اس کا ہمارے ہاں عام طور پر رواج پایا جاتا ہے اور ہم میں سے بہت سے لوگوں کی یہ عادت بن گئی ہے کہ بلا وجہ لوگوں کو یہ بتاتے رہتے ہیں کہ فلاں تمہارے بارے میں یہ کہہ رہا تھا اور فلاں جگہ تمہارے بارے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ بلا ضرورت ایسی بات کرنا شرعاً گناہ کبیرہ شمار کیا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں سرے سے اس کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ یہ باتیں اکثر جھگڑوں کا باعث بن جاتی ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں ہونے والے باہمی تنازعات اور جھگڑوں کی وجوہ تلاش کی جائیں تو اکثر تنازعات کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی چغلی کار فرما ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بہت برا عمل ہے اور اسے جناب نبی اکرمؐ نے برے لوگوں کی علامت قرار دیا ہے۔ البتہ طلبہ کے لیے ایک بات عرض کرتا ہوں کہ ”المشاءون“ مبالغہ کا صیغہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کا مزاج چغل خوری کا بن جائے وہ اس زمرے میں شمار ہوگا۔

2. دوسری بات فرمائی ”المفسدون بین الأحبۃ“ کہ دوستوں کے درمیان فساد ڈالنے والے برے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک معاشرتی بیماری ہے کہ چند دوست اکٹھے محبت و اعتماد کے ساتھ رہ رہے ہیں، اگر کوئی آدمی ان کے درمیان غلط فہمیاں ڈال کر ان کی دوستی کو دشمنی میں بدل دیتا ہے تو وہ بہت

بری حرکت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک خاندان محبت واعتماد کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے اور کوئی شخص دخل دے کر ان کی محبت و اعتماد کی فضا کو خراب کر دیتا ہے تو وہ کوئی اچھا کام نہیں کر رہا۔ محبت و اعتماد کی فضا خاندانوں میں ہو، دوستوں میں ہو، مشترکہ کام کرنے والوں میں ہو، اس میں فساد ڈالنے والوں کو جناب رسول اللہؐ نے برے لوگوں میں شمار کیا ہے۔

3. تیسری بات حضورؐ نے فرمائی کہ ”الباغون البراء العنت“ شریف اور باعزت لوگوں میں عیب تلاش کر کے انہیں بدنام کرنے والے بھی برے لوگ ہوتے ہیں۔ عیب اور کمزوری سے کوئی شخص پاک نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے ساتھ اکثر لوگوں کا پردہ رکھتے ہیں۔ اب ایک شخص عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے، لوگ اس کا احترام کرتے ہیں اور اسے اچھا آدمی سمجھتے ہیں لیکن کوئی شخص بلاوجہ اس کی ٹوہ میں رہتا ہے کہ اس کی کوئی کمزوری ہاتھ لگے تو اسے بدنام کروں، اس کا کوئی عیب میرے علم میں آئے تو اس کا پروپیگنڈہ کر کے اس کی عزت کو خراب کروں۔ لوگوں کے عیب تلاش کرنے کے لیے ٹوہ میں رہنا خاص طور پر معزز اور شریف لوگوں کے حالات کا تجسس کر کے ان کے عیوب ڈھونڈنا اور پھر انہیں منتشر کر کے ان کی بدنامی اور بے عزتی کا باعث بنانا کوئی اچھی صفت نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے ایسا مزاج رکھنے والوں کو برے لوگ قرار دیا ہے۔

میں عزیز طلبہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تینوں خرابیاں آج ہمارے درمیان موجود ہیں اور چونکہ ہم ان کے عادی ہو گئے ہیں، اس لیے ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتیں اور ہم بلا تکلف یہ حرکتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا بار بار مطالعہ کرنا چاہیے، اس پر غور کرنا چاہیے اور پھر اپنے معمولات اور مزاج و عادات پر نظر ڈال کر اپنی کمزوریوں کو محسوس کرتے ہوئے اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

سیدنا حضرت عیسٰی علیہ السلام اور عیسائی مصنف

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ ستمبر ۲۰۱۲ء)

روزنامہ ’’اردو نیوز‘‘ جدہ میں ۱۴ جولائی ۲۰۱۲ء کو شائع ہونے والی ایک خبر ملاحظہ فرمائیے:

’’امریکی ریاست ایوا کی لوتھر یونیورسٹی میں مذاہب اور عقائد کے شعبہ کے سربراہ عیسائی اسکالر ڈاکٹر روبرٹ شیڈنگر نے ایک کتاب تصنیف کر کے امریکی عیسائیوں کو برہم کر دیا ہے۔ کتاب کا عنوان ہے ’’کیا حضرت عیسی علیہ السلام مسلمان تھے؟‘‘ امریکی اسکالر آسمانی کتابوں کے مسلسل مطالعہ اور دنیا بھر کے علمائے دینیات کی آرا جمع کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام صحیح معنوں میں ’’مسلم‘‘ تھے۔

شیڈنگر کا کہنا ہے کہ ان کی اس عظیم الشان ریسرچ کا محرک ایک مسلم مصری طالبہ بنی جس نے مجھے یہ باور کرایا کہ آپ کا تصور اسلام غلط ہے جو میرے جیسے ’’مسلم خاتون‘‘ کے تصور اسلام سے میل نہیں کھاتا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ۲۰۰۱ء کے دوران ہدی نامی مصری طالبہ کو پڑھایا کرتے تھے، اس نے اسلام کے تصور اور اس کی عبادات سے متعلق کئی سوالوں کے جواب چیلنجنگ انداز میں دیے، جس کے بعد میں اسلام کا مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ جو ہم اسلام کو انگریزی میں ریلیجن کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں غلط ہے۔ میں عیسائی ہوتے ہوئے یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ عیسائیوں کے تمام تر اعتراضات اور تنقیدوں کے باوجود حضرت عیسی علیہ السلام صحیح معنوں میں مسلم ہی تھے۔

شیڈنگر کی کتاب نے امریکہ میں گرجاگھروں کو مصنف کا بدترین دشمن بنا دیا ہے، تاہم لوتھر یونیورسٹی اپنے اسکالر کی پشت پناہی پوری قوت سے کر رہی ہے، یونیورسٹی کے ارباب کا کہنا ہے کہ ریسرچ پر جتنا شور و ہنگامہ ہو رہا ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ حضرت انبیاء کرام علیہم السلام سب کے سب آپس میں علاتی بھائی ہیں۔ ’’امہا تنا شتی وابونا واحد‘‘ کہ ہماری مائیں الگ الگ ہیں لیکن ہمارا سب کا باپ ایک ہے۔ اس کی تعبیر حضرات محدثین کرام یوں

فرماتے ہیں کہ عقیدہ سب انبیاء کرامؑ کا ایک ہے البتہ احکام کے لحاظ سے شریعتیں مختلف ہیں اور احکام و قوانین میں فرق موجود ہے۔

جبکہ قرآن کریم نے اپنا تعارف پہلی کتابوں کے حوالہ سے اس طرح کرایا ہے کہ ”مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب و مھیمنا علیہ“ قرآن کریم پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ان کی اصل تعلیمات کا محافظ ہے۔ مفسرین کرامؒ کی تشریحات کے مطابق پہلی کتابوں میں اور قرآن کریم میں دو باتوں کا اصولی فرق ہے، ایک یہ کہ پہلی کتابیں تحریف شدہ ہیں اور محفوظ نہیں ہیں جبکہ قرآن کریم محفوظ حالت میں اسی طرح جوں کا توں موجود ہے جیسا جناب نبی اکرمؐ نے امت کے سپرد کیا تھا۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں احکام و قوانین کے حوالہ سے بہت سے احکام منسوخ ہو چکے ہیں اور احکام شریعت کی مکمل، محفوظ اور حتمی شکل اب قرآن کریم ہی کی صورت میں نافذ العمل ہے۔

اس لیے اسلام اور پہلی شریعتوں میں مشترکات زیادہ ہیں اور اختلافی باتیں ان سے کم ہیں۔ اور ہماری طالب علمانہ رائے میں جو شخص بھی دیانتداری کے ساتھ آسمانی کتابوں کے مشترکات کا مطالعہ کر کے ان سے نتائج اخذ کرنا چاہے گا تو اس کے ذہن میں ”اسلام“ کی وہی تصویر ابھرے گی جو مذکورہ امریکی مصنف شیڈ نگر کے ذہن میں ابھری ہے۔ بعض احکام و قوانین میں ردوبدل اور سابقہ کتابوں میں تحریفات کے دو پہلوؤں سے قطع نظر آپ اللہ تعالٰی کے کسی بھی پیغمبر کی حیات طیبہ اور تعلیمات کا مطالعہ کریں گے تو ان کی عملی زندگی اور اعتقادی بنیادیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے مختلف نظر نہیں آئیں گی، اور ہمارے خیال میں اسی کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”وابونا واحد“ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جبکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا معاملہ تو اس حوالہ سے بھی اس کا مصداق ہے کہ وہ اہل اسلام کے عقیدہ کے مطابق آسمانوں پر زندہ موجود ہیں، قیامت سے پہلے دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر عمل کریں گے، اور دجال کے خلاف امت محمدیہؐ کی قیادت کریں گے۔

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر روبرٹ شیڈ نگر کی یہ تحقیق اس حقیقت کا ایک تازہ اظہار ہے کہ احکام و قوانین کے فرق کے ساتھ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی بنیادی تعلیمات اور مشن ایک ہی ہے۔ جس کا مکمل اظہار ”اسلام“ کی صورت میں آج دنیا کے سامنے موجود

ہے اور جو بھی حقیقت پسندی سے مذاہب کا مطالعہ کرے گا اسے اس حقیقت کو بہر حال قبول کرنا ہوگا۔

تمام علوم دینیہ کا سرچشمہ حدیث نبویؐ ہے

(مدرسہ آسیہ للبنات، محلہ رسول پورہ، گوجرانوالہ - ۳۱ اگست ۲۰۱۲ء)

رمضان المبارک اور عید الفطر کی مصروفیات ختم ہونے کے ساتھ ہی دینی مدارس میں نئے تعلیمی سال کے آغاز کی تیاری شروع ہوگئی ہے اور بعض مدارس اپنی سرگرمیوں کا آغاز بھی کر چکے ہیں۔ گزشتہ روز محلہ رسول پورہ گوجرانوالہ کے مدرسہ آسیہ للبنات میں بخاری شریف کے سبق کا آغاز تھا، اس موقع پر جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوۃ۔ دینی مدارس میں نئے تعلیمی سال کی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے اور آج آپ کے مدرسہ میں اسی سلسلہ میں یہ تقریب ہے۔ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں قرآن کریم، حدیث و سنت اور فقہ اسلامی علوم مقصودہ ہیں جنہیں ”علوم عالیہ“ کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ جبکہ باقی علوم و فنون مثلاً صرف و نحو، لغت، ادب، معانی اور منطق وغیرہ ان علوم تک رسائی کا ذریعہ ہیں اور ان کے ذریعے علوم عالیہ کو سمجھنے کی صلاحیت و استعداد پیدا کی جاتی ہے، اس لیے یہ ”علوم آلیہ“ کہلاتے ہیں۔ علوم عالیہ تو وحی اور اس سے استنباط کی بنیاد پر ہر دور میں یکساں رہے ہیں اور ہمیشہ وہی رہیں گے، لیکن علوم آلیہ میں وقت گزرنے کے ساتھ زمانے اور حالات کے مطابق ردوبدل ہوتا آرہا ہے اور آئندہ بھی اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔

آج چونکہ ہم بخاری شریف کے سبق کا آغاز کر رہے ہیں اس لیے حدیث نبویؐ اور بخاری شریف کے حوالہ سے میں کچھ معروضات پیش کروں گا تاکہ بچیوں کے ذہن میں ہو کہ وہ کونسے علم کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں؟ اور جو کتاب انہوں نے آج شروع کی ہے اس کا درجہ و مقام کیا ہے؟ جہاں تک حدیث نبویؐ کا تعلق ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام علوم دینیہ کا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کی ہر بات ہمیں حدیث کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، حتیٰ کہ قرآن کریم بھی ہمیں حدیث نبویؐ کے واسطے سے ملا ہے۔ مثلاً ہمارا یقین ہے کہ قرآن کریم کی ابتدائی پانچ آیات سورۃ العلق کی پہلی آیات ہیں جنہیں نزولی اعتبار سے قرآن کریم کی پہلی آیات کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ آیات ہم

تک غار حرا کے واقعہ کی روایات کے ذریعے پہنچی ہیں جو حدیث کہلاتی ہیں۔ اگر غار حرا کے واقعہ پر ایمان ہو تو پہلی وحی پر ایمان بنتا ہے ورنہ اس پہلی وحی تک رسائی کے لیے ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بات ہم مانتے ہیں کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات منسوخ ہو گئی تھیں جو تلاوت میں تو موجود ہیں مگر حکما منسوخ ہو چکی ہیں۔ یہ ساری تفصیلات ہمیں حدیث نبویؐ سے ملتی ہیں، اگر حدیث نبویؐ موجود نہ ہو تو یہ معلومات کسی اور ذریعے سے ہمیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔

اسی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے علاوہ بھی اللہ تعالی کے سینکڑوں ارشادات بیان فرمائے ہیں جو ''احادیث قدسیہ'' کہلاتے ہیں۔ آنحضرتؐ ''قال اللہ تعالی'' اور ''یقول اللہ تعالی'' کے ساتھ اللہ تعالی کے بہت سے ارشادات روایت کرتے ہیں لیکن وہ قرآن کریم کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ فرق بھی ہمیں حدیث نبویؐ کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ نے ''قال اللہ تعالی'' کے عنوان کے ساتھ جو ارشادات ربانی بیان فرمائے ہیں ان میں سے کون سا ارشاد قرآن کریم کا حصہ ہے اور کون سا ارشاد ''حدیث قدسی'' کے دائرے میں آتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث نبویؐ تمام علوم دینیہ کا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔ اسی سے ہمیں قرآن کریم کے بارے میں ضروری معلومات ملتی ہیں، اسی سے ہمیں سنت ملتی ہے اور اسی کے ذریعے ہماری فقہ تک رسائی ہوتی ہے۔

بخاری شریف احادیث نبویہؐ کا سب سے مستند مجموعہ ہے جسے اللہ تعالی نے امت مسلمہ میں وہ قبولیت عطا فرمائی ہے جو حدیث کے دوسرے مجموعوں کو حاصل نہیں ہوئی اور اس میں امام بخاریؒ کے خلوص، محنت اور للّٰہیت کے ساتھ ساتھ بخاری شریف کی جامعیت کا بھی دخل ہے کہ امام بخاریؒ نے اس میں بہت سے علوم کو یکجا کر دیا ہے۔ عام طور پر بخاری شریف کو حدیث کی کتاب سمجھ کر پڑھایا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بنیادی طور پر یہ حدیث ہی کی کتاب ہے لیکن امام بخاریؒ نے اس میں تفسیر قرآن کریم کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ بخاری شریف کے باب ''کتاب التفسیر'' سے قطع نظر عام تراجم ابواب میں بھی قرآن کریم کی آیات والفاظ کی تفسیر وتشریح کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ یہ فقہ واستنباط کی کتاب ہے کہ اس میں امام بخاریؒ نے قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبویہؐ سے استنباط کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ امام موصوف کے مجتہدانہ مقام اور علمی کمال کا ایک

مستقل باب ہے۔ پھر امام بخاریؒ محدث، مجتہد اور مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ مؤرخ بھی ہیں اور انہوں نے اہم تاریخی واقعات کو جس ذوق اور اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

میرا عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بخاری شریف کو پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے یہ ساری باتیں ذہن میں رہیں گی تو اس سے صحیح استفادہ ہو سکے گا، اس لیے بخاری شریف پڑھانے والے اساتذہ اور پڑھنے والے طلبہ و طالبات سے گزارش کر رہا ہوں کہ وہ حدیث، فقہ، تفسیر اور تاریخ کی اس عظیم کتاب کو اس کے موضوعات کے وسیع تر تناظر میں پڑھنے کی کوشش کریں تاکہ ہم علوم کے اس ذخیرے سے کماحقہ استفادہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲ستمبر ۲۰۱۲ء)

”عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین“

(جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۲۰ اگست ۲۰۱۲ء)

(جامع مسجد نور ملحقہ جامعہ نصرۃ العلوم، گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ میں عید الفطر کے اجتماع سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج عید کا دن ہے جو رمضان المبارک میں روزے رکھنے اور دیگر عبادات کی توفیق ملنے پر شکرانے کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحمتوں اور برکتوں کا یہ مہینہ زندگی میں ایک بار پھر نصیب فرمایا ہے اور تھوڑی بہت عبادات کی توفیق بھی دی ہے جس پر ہم آج عید کا دن منا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ٹوٹی پھوٹی عبادات کو قبول فرمائیں اور صحت و عافیت اور توفیق عمل کے ساتھ زندگی میں ایسے رمضان اور عیدیں بار بار عطاء فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

دنیا کی ہر قوم میں عید کا کوئی نہ کوئی دن ہوتا ہے جس دن قوم اجتماعی طور پر خوشی کا اظہار کرتی ہے اور مختلف طریقوں سے لوگ خوشی مناتے ہیں۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں دو عیدیں دی ہیں۔ ایک رمضان المبارک کی تکمیل کی خوشی میں عید الفطر اور دوسری حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم قربانی کی یاد میں عید الاضحی۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم نے ان دو عیدوں کا اعلان فرمایا اور خود بھی یہ عیدیں منائیں اس لیے اس دن کو خوشی کے دن کے طور پر منانا سنت نبویؐ ہے۔

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں مختلف اقوام کی بعض عیدوں کا ذکر ہے جن کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کا نبی بنا کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف یہ دعوت او رمشن دے کر بھیجا کہ فرعون کو اللہ تعالی کی توحید کا عقیدہ بتائیں اور اس سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کریں جو کئی سالوں سے فرعون اور اس کے خاندان کے غلام چلے آرہے تھے۔ اللہ تعالی کے ان پیغمبروں نے فرعون کو اللہ تعالی کی توحید اور اطاعت کی دعوت دینے کے بعد عصا اور ید بیضاء کے دو معجزے اپنی صداقت کے اظہار کیلئے دکھائے تو فرعون نے اسے جادو قرار دیا اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں جادوگر اکٹھے کر کے مقابلہ کی دعوت دی۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ مقابلہ ''یوم الزینۃ'' (سورہ طہ ۵۹) یعنی ان کی عید کے دن ہوا تھا اور اس میں اللہ تعالی نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے جادوگروں پر واضح فتح دی تھی جس کے نتیجے میں وہ جادوگر ایمان لے آئے تھے۔

اسی طرح قرآن کریم نے سورہ المائدہ میں ذکر کیا ہے کہ سیدنا حضرت عیسی علیہ السلام سے ان کے حواریوں نے مطالبہ کیا کہ اللہ تعالی سے درخواست کریں کہ وہ ہم پر آسمان سے پکے پکائے کھانوں کا دسترخوان اتاریں۔ حضرت عیسیٰؑ نے پہلے تو ڈانٹا اور ''قال اتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین'' (سورہ المائدہ ۱۱۲) کہا کہ اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ مگر پھر حواریوں کے اصرار پر اللہ تعالی سے دعا کر دی کہ یا اللہ! ان پر آسمان سے پکے پکائے کھانوں کا دسترخوان نازل فرما دے، وہ ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے ''عید'' کا دن ہوگا اور آپ کی قدرت کی نشانی ہوگا۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ دسترخوان کئی روز تک اترتا رہا جس کے ساتھ اللہ تعالی کی یہ وعید تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس کی ناشکری کی تو ''فانی اعذبہ عذابا لا اعذبہ احدا من العالمین'' (سورہ المائدہ ۱۱۵) میں اسے ایسی سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی۔ مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی کی کسی بھی نعمت کی ناشکری عذاب کا باعث ہوتی ہے لیکن جو نعمت خود مانگ کر لی جائے اس کی ناشکری پر عذاب بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ ان لوگوں پر پابندی تھی کہ دسترخوان پر خود کھا سکتے ہو لیکن ذخیرہ کر کے گھر نہیں لے

جاسکتے مگر انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی جس پر انہیں بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضورؐ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کے یہودیوں کو دیکھا کہ وہ دس محرم (عاشوراء) کا روزہ رکھتے ہیں۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ اس روز بنی اسرائیل کو فرعون کے جبر اور غلامی سے نجات ملی تھی، فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں آزادی حاصل کر لی تھی۔ آپؐ نے فرمایا ''نحن احق بموسی منکم'' کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہمارا تعلق اور حق تم سے زیادہ ہے، اس لیے ہم بھی اس دن روزہ رکھا کریں گے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ عاشوراء کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشوراء کا روزہ فرض تھا، بعد میں اس کی حیثیت نفلی روزے کی ہو گئی۔ جبکہ آخری سال جناب نبی اکرمؐ نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ یہودیوں کے ساتھ عبادت میں فرق قائم رکھنے کے لیے وہ اگلے سال اس کے ساتھ ایک روزہ زائد رکھیں گے، مگر اگلے سال سے قبل آنحضرتؐ وفات پا گئے۔

بخاری شریف ہی کی روایت ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک یہودی عالم نے کہا کہ قرآن کریم میں ایک آیت ایسی ہے اگر وہ ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے نزول کے دن کو عید بنا لیتے۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے: ''الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا'' (سورہ المائدہ ۵۔ آیت ۳) آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے تین باتیں فرمائی ہیں:

1. ایک یہ کہ میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے کہ جو وحی اور دین حضرت آدم علیہ السلام سے نازل ہونا شروع ہوا تھا وہ حضرت محمدؐ پر قرآن کریم کی صورت میں مکمل ہو گیا ہے اور اب کسی نئی وحی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

2. دوسری بات یہ فرمائی کہ دین ہی اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے جو تمام ہو گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر احسان عظیم ہے کہ جناب رسول اللہؐ جیسی جامع شخصیت اور قرآن کریم جیسی مکمل کتاب تمہیں عطا فرمائی ہے۔

3. اور تیسری بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اسی دین پر راضی ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے ''ان الدین عند اللہ الاسلام'' (سورہ ال عمران ۱۹) کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین یعنی انسانوں کے زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ صرف اسلام ہے۔ جبکہ ایک اور جگہ یہ بات یوں بیان فرمائی ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین یا ضابطہ حیات تلاش کرے گا ''فلن یقبل منہ'' (سورہ ال عمران ۸۵) اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ یہ تکمیل دین اور اتمام نعمت کی آیت ہے جس کے بارے میں یہودی عالم نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یہ اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اسے عید کا دن بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہمارا وہ عید کا دن ہی تھا جس روز یہ آیت کریم نازل ہوئی تھی اور میں اس کا گواہ ہوں۔ وہ عرفہ کا دن تھا اور جمعہ کا دن بھی تھا۔ اس لیے جس روزہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وہ ہمارے لیے دوہری عید کا دن تھا۔

عید کے حوالہ سے قرآن و حدیث میں ان چند ایام کا ذکر ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں اور ہمارے لیے ان سب میں سبق موجود ہے۔

عید کا مفہوم اور مقصد کیا ہے؟ اس حوالہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک ارشاد گرامی ہے کہ ''کل یوم لا یعصی اللہ فیہ عزوجل فھو لنا عید''۔ ہر وہ دن جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے بغیر گزر جائے وہ ہمارے لیے عید کا دن ہے۔ یعنی مسلمان کی اصل عید یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور اس کی رضا کا حق دار قرار پائے۔ ایک انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اسے ہدایت مل جائے اور وہ دوزخ سے بچ کر جنت میں چلا جائے اور ایسا اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہی مسلمان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، حتیٰ کہ جنت میں داخل ہونے والوں کو بھی ساری نعمتیں مل جانے کے بعد جو سب سے بڑی اور آخری نعمت ملے گی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی جسے ''ورضوان من اللہ اکبر'' (سورہ التوبہ ۷۲) کہا گیا ہے۔ اس لیے حضرت علیؓ عید کا مفہوم و مقصد یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انسان محفوظ رہے اور اس کی رضا کا مستحق ٹھہرے۔

میں اس بارے میں ایک بات علامہ اقبالؒ کے حوالہ سے بھی کرنا چاہوں گا، اس لیے کہ امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ایک عجیب ارشاد میں نے کسی جگہ پڑھا ہے، وہ فرماتے تھے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو قرآن کریم کا مطالعہ کرنا چاہیے اگر وہ سید احمد شہیدؒ

کی طرح نہیں پڑھ سکتے تو کم از کم علامہ اقبالؒ کی طرح ہی پڑھ لیں۔ اور علامہ اقبالؒ نے عید کے بارے میں کہا ہے کہ

عید آزاداں شکوہ ملک و دین

کہ آزاد قوموں کی عید تب ہوتی ہے جب ملک باوقار ہو اور دین سربلند ہو۔ آج ہمارا دین کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور ہمارے ملک کی کیا حالت ہے؟ ہماری اصل عید تو اس دن ہوگی جب ملک کو حقیقی آزادی حاصل ہوگی، قوم خود مختار ہوگی، دین سربلند ہوگا، اور ہم اپنے دین کے نفاذ اور سربلندی کے لیے سرگرم عمل ہوں گے۔ اس لیے کہ غلاموں اور مجبوروں کی عید بھی کیا عید ہوتی ہے؟

آئیے مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالی ہمیں حقیقی عید نصیب فرمائیں، ملکی آزادی، قومی خود مختاری اور دین کی سربلندی کی منزل سے ہمکنار کریں۔ اور ہماری رمضان المبارک کی عبادات کو قبول فرماتے ہوئے آئندہ بھی خلوص اور ذوق کے ساتھ عبادت کی توفیق دیتے رہیں، آمین یارب العالمین۔

تسخیرِ کائنات اور قرآنِ کریم

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۸ اگست ۲۰۱۲ء)

مریخ تک رسائی بلاشبہ انسانی تاریخ کا اہم واقعہ اور سائنس کی غیر معمولی پیش رفت ہے جس پر امریکی سائنسدان مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے ہیوسٹن میں واقع ناسا ہیڈکوارٹر میں عام وزیٹر کے طور پر ایک سے زیادہ مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا ہے اور چاند پر اترنے والی خلائی گاڑی اپالو میں بیٹھنے کا موقع بھی ملا ہے جو عام نمائش کے لیے وہاں رکھی ہوئی ہے۔ جبکہ ناسا ہیڈکوارٹر کے مین گیٹ کے سامنے گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے قاری مطیع الرحمان مرحوم کے قائم کردہ حفظ قرآن کریم کے مدرسہ میں بھی حاضری ہوئی جو پہلے کرائے کی ایک بلڈنگ میں تھا، اب اس کی جگہ ایک عرب اسکالر کی کاوش سے تھوڑے فاصلے پر بہت بڑی مسجد اور اس کے ساتھ دینی مرکز تعمیر ہو چکا ہے۔ مریخ تک رسائی کا یہ مشن نصف صدی قبل شروع ہوا تھا اور اس کے لیے امریکہ اور سوویت یونین میں مسابقت بھی رہی ہے جس میں بالآخر امریکہ نے کامیابی حاصل کی اور اس کی بھیجی ہوئی خلائی گاڑی مریخ پر کامیابی کے ساتھ لینڈ کر کے وہاں زندگی کے آثار تلاش کرنے کی مہم میں مصروف ہے۔

خلائی تسخیر سائنس کا ایک اہم موضوع اور ایجنڈا ہے جس میں مختلف ممالک کے سائنسدان مسلسل مصروف عمل ہیں اور مریخ تک ناسا کے خلائی مشن کی یہ رسائی بھی اس کا ایک کامیاب مرحلہ ہے۔ اس مشن کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہمارے بس میں نہیں اس لیے کہ نہ تو ہم اس کا علم رکھتے ہیں اور نہ ہی زیادہ مطالعہ کا موقع ملا ہے، البتہ اس سے متعلق دلچسپی کے کچھ دیگر پہلوؤں پر چند گزارشات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مریخ پر ناسا کے خلائی مشن کے کامیابی کے ساتھ اترنے کی خبر پڑھ کر مجھے برطانیہ کے ایک نومسلم مورس عبد اللہ یاد آگئے جو خلائی تسخیر کا تذکرہ قرآن کریم میں پڑھ کر مسلمان ہوئے تھے اور اسکاٹ لینڈ کے ایک شہر ڈنز میں قیام پذیر ہیں۔ ڈنز میں مجھے چند سال قبل اپنے بھانجے ڈاکٹر سبیل رضوان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا تو ان کے گھر میں میری مورس عبد اللہ سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے انٹرویو کیا جس کی تفصیل اسی کالم میں ان دنوں شائع ہوئی تھی، اس کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کے لیے دوبارہ درج کر رہا ہوں۔

نیوکاسل کا رہنے والا مورس نامی انگریز پیشہ کے لحاظ سے انجینئر ہے، ایک موقع پر اس کی ڈیوٹی دو سال کے لیے مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں لگ گئی جہاں اس کے ساتھ مسلمان انجینئر بھی شریک کار تھے۔ مورس کا کہنا ہے کہ اس نے ایک مصری انجینئر فہمی کے سامنے جب خلائی تسخیر میں مغربی ممالک کی پیش رفت کا ذکر کیا تو فہمی نے اسے بتایا کہ خلا میں جانے کے امکانات کا قرآن کریم نے تذکرہ کیا ہے۔ اس پر مورس کو تعجب ہوا اور اس نے فہمی سے قرآن کریم میں اس کا حوالہ دکھانے کا تقاضہ کیا۔ فہمی نے اسے حوالہ دکھانے کی بجائے کلام پاک کا انگلش ترجمہ مہیا کر کے خود اسٹڈی کرنے کے لیے کہا جو اس کے لیے ہدایت کا باعث بن گیا۔ اور اس نے قرآن کریم کے انگلش ترجمے کے مطالعہ سے محسوس کیا کہ قرآن کریم فطرت اور نیچر کی سب سے بہتر ترجمانی کر رہا ہے اور اس نے اس پر قبول اسلام کا فیصلہ کر لیا۔ مصری انجینئر نے خلائی تسخیر کے حوالہ سے سورۃ الرحمان کی آیت نمبر ۳۳ کی طرف اس کی توجہ دلائی جس میں کہا گیا ہے کہ:

> ”اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تمہارے بس میں ہو کہ زمین اور آسمان کے کناروں سے نکل سکو تو نکل جاؤ، مگر تم جہاں بھی نکلو گے اللہ تعالیٰ کی سلطنت ہی پاؤ گے۔“

اس ترجمہ کے ساتھ قرآن کریم کی یہ آیت مورس کے دل میں اتر گئی، چنانچہ وہ قبول اسلام کے بعد نیو کاسل سے ترک وطن کر کے اسکاٹ لینڈ کے شہر ڈنز میں فیملی سمیت مقیم ہے اور ایک چھوٹا سا زرعی فارم بنا کر اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت اور قرآنی تعلیمات کے فروغ میں مصروف رہتا ہے۔ اس نے اپنا اسلامی نام عبداللہ رکھ کر مورس کو بھی اس کے ساتھ شامل رہنے دیا ہے اور مورس عبداللہ کہلاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی مریخ تک انسان کی رسائی کا یہ پہلو بھی بار بار ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اس مشن کا مقصد مریخ میں انسانی زندگی کے آثار کی تلاش بتایا جاتا ہے اور عجیب سی صورتحال سامنے آ رہی ہے کہ جس زمین پر انسان بس رہا ہے وہاں زندگی کے آثار تابکاری اور کیمیائی اثرات کے باعث کمزور پڑتے جا رہے ہیں اور ماحولیات کے ماہرین اس پر سر پکڑے بیٹھے ہیں جبکہ چاند، مریخ اور دیگر سیاروں میں زندگی کے آثار کی تلاش جاری ہے۔ ہمارے ماہرین ماحولیات میں ہمیں مسلسل ڈرا رہے ہیں کہ مٹی، ہوا اور پانی مسلسل متاثر ہو رہے ہیں اور مستقبل میں پینے کے قابل پانی اور سانس لینے کے لیے صاف ہوا کا میسر ہونا ایک مشکل مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ اس سے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ دیگر سیاروں میں زندگی کے آثار کی تلاش کے ساتھ ساتھ اپنے سیارے میں زندگی کے آثار کو خراب کرنے کے لیے کون متحرک و مصروف ہے؟ یہ کام بھی تو ہم ہی کر رہے ہیں، آسمان سے فرشتے اتر کر تو یہ سب کچھ نہیں کر رہے۔ اس کا حل کیا ہے اور اس صورتحال سے ہم جان کیسے بچا سکتے ہیں؟

اس بارے میں دو سال قبل نیویارک میں ماحولیات کے مسائل پر منعقدہ ایک بین الاقوامی سیمینار کی خبر یاد آ رہی ہے جس کے مطابق اس سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے کہا تھا کہ اگر ہم ماحولیات کے حوالے سے دنیا کو کسی بڑی تباہی سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں زندگی کے ان معاشرتی اصولوں کو عمل میں لانا ہو گا جو قرآن کریم نے بیان کیے ہیں۔ اللہ کرے کہ ہمارے سائنسدان خلائی تسخیر میں کامیابی کے ساتھ ساتھ قرآن کریم میں زندگی گزارنے کے طور طریقوں پر بھی غور کر سکیں تاکہ اس سیارے پر موجود زندگی ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے ختم نہ ہو جائے۔

رمضان المبارک، تربیت کا مہینہ

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۵ اگست ۲۰۱۲ء)

رمضان المبارک قرآن کریم اور روزوں کا مہینہ ہے، برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ ہے، مغفرت اور نجات کا مہینہ ہے، جو اپنی بہاریں دکھا کر چند دنوں میں رخصت ہونے والا ہے۔ مبارکباد کے مستحق ہیں وہ سعادت مند جنھوں نے ان مبارک ساعات سے فیض حاصل کیا اور اپنے ذخیرۂ آخرت میں اضافہ کرلیا۔ اس کے ساتھ ساتھ رمضان المبارک صبر و مواخاۃ کا مہینہ بھی ہے کہ اس ماہ میں مسلمانوں کو بھوک پیاس پر صبر کر کے اپنے بھوکے پیاسے بھائیوں کی تکالیف کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس ان میں بھوکوں پیاسوں کے لیے ہمدردی اور غم خواری کے جذبات کو ابھارتا ہے۔

قرآن کریم نے بیسیوں آیات میں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں ارشادات میں سوسائٹی کے غربا، مساکین اور مستحقین کے دکھ درد میں شریک ہونے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کو ایمان کا تقاضا قرار دیا ہے اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھو اور ضرورت مندوں کو تلاش کر کے انہیں خوشیوں میں شریک کرو۔ قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے کہ "وفی اموالہم حق للسائل والمحروم" جن لوگوں کو ہم نے مال و دولت سے نوازا ہے ان کے مال میں سوسائٹی کے سائل اور محروم دونوں طبقوں کا حق ہے۔ مفسرین نے بتایا کہ سائل اس ضرورت مند کو کہتے ہیں جو اپنی ضروریات کا اظہار کرتا ہے اور ان کے لیے اپنے بھائیوں کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے، جبکہ محروم وہ شخص ہے جو ضرورت مند تو ہے مگر اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کرتا اور سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ مالدار کے مال میں ان دونوں کا حق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ان لوگوں کی امداد کر دینا کافی نہیں ہے جو اپنی ضروریات کا اظہار کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں بلکہ سفید پوشی کے پردے میں چھپے ہوئے ان افراد کی تلاش بھی مالدار لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اپنی ضرورت کا اظہار کرنے اور کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے میں حجاب محسوس کرتے ہیں۔ پھر قرآن کریم نے اسے "حق" قرار دیا ہے اور احسان کے زمرے میں شمار نہیں کیا، حتیٰ کہ کسی ضرورت مند اور مستحق پر خرچ کر کے اسے بعد میں یاد دلانے اور اس پر احسان جتانے کو قرآن کریم نے نیکی ضائع ہو جانے کا باعث بتایا ہے۔ اسی لیے رمضان

المبارک اور روزوں کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس ماہ مبارک کے دوران انسان میں بھوک پیاس برداشت کر کے بھوکوں اور پیاسوں کی تکلیف کا احساس پیدا ہوتا ہے اور ارد گرد کے ضرورت مندوں کے ساتھ تعاون کا جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے عمال اور سرکاری افسران و حکام پر پابندی لگا دی تھی کہ ان میں سے کوئی شخص (۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا (۲) چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائے گا (۳) باریک لباس نہیں پہنے گا (۴) اور اپنے مکان کے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنائے گا۔ یہ سب باتیں اس دور میں معاشرتی امتیاز اور تعیش کے اسباب میں شمار ہوتی تھیں اور حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری حکام اور افسران عام سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے لوگوں کے درمیان رہیں اور انہی جیسی زندگی گزاریں تاکہ انہیں لوگوں کے مسائل کا علم رہے اور ان کی مشکلات و تکالیف کا احساس ہو۔ ظاہر بات ہے کہ بھوک اور پیاس کی تکلیف کا احساس اسی شخص کو ہوگا جس نے خود بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کی ہے یا آج کی زبان میں لوڈشیڈنگ کے عذاب کا اندازہ وہی شخص کر سکے گا جس کے اپنے گھر میں دن اور رات کا زیادہ حصہ بجلی بند رہتی ہے۔

خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی ہر قسم کی سہولتوں پر دسترس ہونے کے باوجود اختیاری فقر کی جو زندگی بسر کی اس کی ایک حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ آنحضرتؐ عام لوگوں کی طرح رہنے کو پسند فرماتے تھے تاکہ ان کی تکالیف اور ضرورتوں کا علم ہوتا رہے اور ان کی مجبوریوں کا احساس موجود رہے، حتیٰ کہ نبی کریمؐ نے ایک موقع پر ازواج مطہراتؓ کی طرف سے بعض سہولتوں کے تقاضے پر ان سے علیحدگی اختیار کر لینے کی پیشکش بھی فرما دی تھی۔ ہمارے آج کے مسائل اور مشکلات کی سنگینی میں مسلسل اضافے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ معاشرے کی طبقاتی تقسیم نے ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس ختم کر دیا ہے اور سہولت و تعیش کی فراوانی نے مال و دولت کی کثرت رکھنے والے طبقات کو عام آدمی کی تکالیف اور اذیتوں سے بے خبر کر رکھا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں نماز، روزہ اور حج کی تینوں عبادتیں اس فرق کو مٹانے کا ذوق پیدا کرتی ہیں۔

نماز کسی امتیاز کے بغیر سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتی ہے، روزہ سب کو ایک ہی طرح بھوکا اور پیاسا رکھتا ہے، اور حج سب کو ایک لباس میں بیت اللہ کے گرد جمع کر کے

مساوات کا عملی نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی عبادات کی اس روح کو معاشرتی زندگی اور معاشی سرگرمیوں کی بنیاد بنایا جائے اور ایک دوسرے کے دکھ درد اور تکلیف و مصیبت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ رپورٹ کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو دہلی سے شائع ہونے والے اخبار سہ روزہ دعوت نے ۲۶ جولائی ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع کی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ دو امیر زادوں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ غربت کیا ہوتی ہے چند روز تک ایک سو روپیہ یومیہ میں گزارہ کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ ان میں ایک ہریانہ کے اعلی پولیس افسر کا بیٹا ہے جس نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی ہے جبکہ دوسرا امریکہ میں ہی والدین کے ساتھ قیام پذیر ہے۔ ان دونوں نے چند دن کے اس تلخ تجربے کے بعد جو تاثرات بیان کیے ہیں وہ اس رپورٹ کے مطابق کچھ اس طرح ہیں:

> ”اب وہ اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ اس ادھیڑ بن میں گزارتے تھے کہ دو وقت کے کھانے کا انتظام کس طرح کریں؟ اب ان کی زندگی کا دائرہ بہت محدود ہو گیا تھا، سستی غذائی اشیا کی تلاش ان کا روزمرہ معمول بن گیا تھا، بس کا سفر پانچ کلو میٹر سے زائد کا نہیں کر سکتے تھے، بجلی کا استعمال بھی بمشکل پانچ چھ گھنٹے کر پاتے تھے، اور نہانے کا صابن دونوں فرد آدھا کاٹ کر استعمال کرتے تھے۔ ان نوجوانوں کا کہنا ہے کہ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ہماری پیدائش امیر گھرانوں میں ہوئی جس کی وجہ سے ہم آرام دہ زندگی گزار سکتے ہیں، لیکن ان لوگوں کے بارے میں ہم کیا جانتے ہیں جو اپنے حالات کی وجہ سے سخت جدوجہد کرنے پر مجبور ہیں، ان سوالات کے جوابات تو ہمیں نہیں معلوم لیکن اب ہم اتنا ضرور جان گئے ہیں کہ غربت کے معنی کیا ہوتے ہیں؟“

غربت ہمارے ہاں پاکستان میں بھی ایک بڑا مسئلہ ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے ہر دور میں کوششیں ہوتی رہتی ہیں لیکن کاغذی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو طبقات غربت کو کم کرنے کی پالیسیاں بناتے ہیں انہیں خود پتہ نہیں کہ غربت کیا ہوتی ہے اور غریب کے شب و روز کس کرب میں گزرتے ہیں۔ وہ غربت کو بھی اعداد و شمار کا ہی مسئلہ سمجھتے ہیں اور اعداد و شمار کے الٹ پھیر سے لیپا پوتی کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ رمضان المبارک رحمتوں کا مہینہ ہے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کم از کم کچھ لوگوں کو اندازہ تو ہو جائے کہ بھوک اور پیاس کیا ہوتی ہے اور بھوکوں اور پیاسوں پر کیا گزرتی ہے۔

خطابت۔ ضروریات اور دائرے

(مرکزی جامع مسجد، کورنگ ٹاؤن، اسلام آباد - ۳ جولائی ۲۰۱۲ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ بیس روزہ خطابت کورس کے منتظم مرکزی جامع مسجد کورنگ ٹاؤن اسلام آباد کے خطیب مولانا شبیر احمد عباسی کا شکر گزار ہوں کہ علماء و خطباء کے اس اجتماع میں کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع عطا کیا، اللہ تعالی ہمارے اس مل بیٹھنے کو ہم سب کے لئے با مقصد اور بابرکت بنائیں، آمین یارب العالمین۔

خطابت کی ضرورت

"نطق" انسان کے امتیازات اور خواص میں سے ہے جس کی وجہ سے مناطقہ کے ہاں انسان کو "حیوان ناطق" کہہ کر دوسرے حیوانات سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالی نے انسان کو قوت گویائی سے نوازا ہے جس کے مختلف مدارج ہیں اور ایک انسان جب بہت سے انسانوں کو خطاب کر کے اپنے جذبات و احساسات اور مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے تو اسے خطابت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس خطابت میں جس قدر فصاحت ہوگی اور مخاطبین کو سمجھانے کا بہتر انداز ہوگا اسی قدر وہ کمال کی حامل ہوگی۔

خطابت زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح دین کی ضروریات میں بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا حضرت موسی علیہ السلام کو جب اللہ رب العزت نے مدین سے واپسی پر کوہ طور پر بلا کر نبوت و رسالت سے سرفراز کیا اور انہیں فرعون کے پاس جانے کی ہدایت دے کر اللہ تعالی کی وحدانیت کے اظہار اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی آزادی کو ان کی نبوی ذمہ داری قرار دیا تو حضرت موسی علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنانے اور اپنے معاون و مددگار کا درجہ دینے کی درخواست کی جسے بارگاہ ایزدی میں قبول کر لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ حضرت موسیٰؑ نے یہ بیان فرمائی کہ ھو افصح منی لسانا کہ وہ زبان اور گفتگو میں مجھ سے زیادہ فصیح ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی زبان میں قدرے لکنت تھی جسے دور کرنے کی انہوں نے اللہ تعالی

سے دعا کی تھی۔ اور فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی آمد اور دعوت کے بعد اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے ان پر جو طعن و اعتراض کیے ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ والایکاد یبین وہ تو اپنی بات بھی پوری طرح بیان نہیں کرسکتے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین عرب اور مشرکین مکہ نے ''ساحر'' کا جو خطاب دیا تھا، اس کی وجہ قرآن کریم کے اعجاز کے ساتھ ساتھ خود آنحضرتؐ کی فصاحت و بلاغت کا کمال بھی تھا کہ اللہ رب العزت نے آپؐ کو خطابت و فصاحت کے اس اعلیٰ ترین مقام و معیار سے نوازا تھا جسے اپنے الفاظ میں تعبیر کرنے کے لیے منکرین کے پاس ''جادو'' کے علاوہ کوئی اور لفظ موجود ہی نہیں تھا۔

دینی حوالہ سے خطابت کی ضرورت کے تین بڑے دائرے ہیں۔

خطابت اور دعوت دین

پہلا دائرہ دعوت کا ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید و بندگی، جناب رسالتمآبؐ کی رسالت و نبوت، اور قرآن کریم کا ہدایت و دعوت کا پیغام پہنچانا ہم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ اس وقت دنیا کی آبادی سات ارب سے زیادہ بیان کی جاتی ہے جس میں سے پونے دو ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کو الگ کر لیا جائے تو کم و بیش سوا پانچ ارب انسان دنیا میں ایسے بستے ہیں جو جناب نبی اکرمؐ کی امت دعوت کا حصہ ہیں مگر وہ اسلام، قرآن کریم اور آپؐ کی ذات گرامی سے متعارف نہیں ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان تک توحید، رسالت اور قرآن کریم پہنچانے اور انہیں اسلام سے متعارف کرانے کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے، یہ کام اس وقت موجود پونے دو ارب کے لگ بھگ مسلمانوں نے ہی کرنا ہے، انہی پر اس کی ذمہ داری ہے اور وہی اس کے بارے میں عند اللہ مسؤل ہوں گے۔ جبکہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ سرکاری یا غیر سرکاری طور پر مسلم دنیا میں کوئی ایسا عالمی نظام موجود نہیں ہے جو اس فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے محنت کر رہا ہو۔ بعض علاقوں میں مقامی طور پر ایسے افراد اور حلقے ضرور پائے جاتے ہیں جو یہ کام کر رہے ہیں لیکن جس طرح مسیحیوں کے مشنری ادارے ایک بین الاقوامی نظم کے تحت دنیا بھر میں غیر عیسائیوں کو عیسائی بنانے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں سرگرم عمل ہیں اس طرح کا کوئی ادارہ یا نظام مسلمانوں کی طرف سے متحرک نہیں ہے۔

مسیحی مشنریوں کی کارکردگی کا اس بات سے اندازہ کر لیجیے کہ گزشتہ پون صدی کے دوران انہوں نے افریقہ میں رقبہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے سب سے بڑے ملک سوڈان کے جنوب میں بت پرست قبائل کو عیسائی بنا کر اس خطہ میں عیسائی اکثریت قائم کی ہے اور اس کی بنیاد پر اقوام متحدہ کے زیر اہتمام وہاں ریفرنڈم کرا کے جنوبی سوڈان کے نام سے ایک آزاد مسیحی ریاست قائم کر لی ہے۔ اسی طرح کی محنت کر کے وہ انڈونیشیا کے صوبہ تیمور کے ایک حصہ کو ایسٹ تیمور کے نام سے انڈونیشیا سے الگ کر چکے ہیں۔ اور اب بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق پاکستان میں بھی خدانخواستہ ایک آزاد مسیحی ریاست قائم کرنے کے منصوبے پر کام جاری ہے۔ جنوبی سوڈان اور مشرقی تیمور کو جس طرح مسیحی ریاستوں کی شکل دی گئی ہے اور فلسطین کے ایک بڑے حصے کی آبادی کو یہودی اکثریت میں تبدیل کر کے جس طرح اسرائیل قائم کیا گیا ہے اس کے پیش نظر پاکستان کے کسی حصے میں کسی آزاد مسیحی ریاست کے قیام کی بات کو ناقابل عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جبکہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ دینی حلقوں میں سے کسی کی سرے سے اس طرف توجہ ہی نہیں ہے۔

خیر میں خطابت کی اہمیت وضرورت کے بڑے دائرے کا تذکرہ کر رہا تھا کہ ہمیں دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ بسنے والے پانچ ارب سے زیادہ انسانوں تک اسلام کی دعوت اور پیغام پہنچانے کے لیے ابلاغ کے دوسرے ذرائع کے ساتھ ساتھ خطابت کی بھی ضرورت ہے اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔

خطابت اور اصلاح امت

خطابت کی اہمیت وضرورت کا دوسرا دائرہ امت کی اصلاح اور اسے دین کے اعمال اور ماحول کی طرف واپس لانا ہے۔ ہم سب یہ سمجھتے ہیں اور بار بار اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ امت مسلمہ کی موجودہ زبوں حالی اور کسمپرسی کا سب سے بڑا سبب امت کا عمومی طور پر دین سے دور ہونا ہے۔ امت کی اکثریت دین کے اعمال پر نہیں ہے اور مسلم معاشروں کا عمومی ماحول دینی نہیں ہے۔ چنانچہ اس اکثریت کی دین کے اعمال واحکام کی طرف واپسی اور مسلم معاشروں میں دینی ماحول دوبارہ قائم کیے بغیر ہم زوال، ذلت اور مشکلات ومسائل کی اس دلدل سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ اس دائرہ میں اگرچہ تبلیغی جماعت کے نام سے ہمارا ایک بین الاقوامی نظام موجود اور متحرک ہے اور لاکھوں حضرات امت کو دین کے اعمال پر واپس لانے کے لیے دنیا بھر میں محنت کر رہے ہیں جس کے ثمرات ونتائج بھی حوصلہ افزا

ہیں۔ لیکن اس دائرہ کی ضروریات کی مختلف سطحوں اور دائروں کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس کام کو کہاں کہاں اور کس کس سطح پر منظم و متحرک کرنے کی ضرورت ہے اور کہاں کہاں اس سلسلہ میں خلاء اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔

ہمارے دینی مدارس اور مساجد بھی علاقائی سطح پر یہی کام کر رہے ہیں اور خوب کر رہے ہیں لیکن جب بات عالمی سطح پر اور امت کی مجموعی ضروریات کے حوالہ سے ہو رہی ہے تو اس کام کی ترجیحات اور ترتیب کو اس کے مطابق منظم کرنا بھی اس کی اہم ترین ضرورت ہے۔

خطابت اور دفاع اسلام

خطابت کی ضرورت کا تیسرا دائرہ دفاع کا ہے کہ اسلام پر، قرآن کریم پر، جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر، اور شریعت کے احکام و قوانین پر جو اعتراضات ہو رہے ہیں ان کا جواب دینا اور شکوک و شبہات کو علمی و تحقیقی طور پر رد کرنا بھی ہماری دینی ذمہ داری ہے اور خطابت اس کا اہم ذریعہ ہے۔ دفاع کو میں دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔ ایک حصہ عالمی سطح پر دوسری اقوام ، مذاہب اور فکری و تہذیبی تحریکات کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات ہیں جن کے ذریعہ قرآن کریم کی حقانیت وصداقت کو چیلنج کیا جا رہا ہے، حضرت محمدؐ کی ذات گرامی کو (نعوذ باللہ) طعن و اعتراض کا ہدف بنایا جا رہا ہے، اور خلافت کے اسلامی نظام اور شرعی احکام و قوانین پر شدید تنقید کی جا رہی ہے۔ یہ ایک مستقل میدان کار ہے جو آج کی عالمی فکری و تہذیبی کشمکش کے ماحول میں بہت زیادہ بلکہ میری طالب علمانہ رائے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جبکہ دوسرا حصہ امت مسلمہ کے اندر اسلامی احکام و قوانین کے حوالہ سے پائے جانے والے اور پیدا کیے جانے والے شکوک و شبہات ہیں جن کا دائرہ مسلسل پھیلتا جا رہا ہے اور ہماری ہی عدم توجہ کی وجہ سے دن بدن سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے شیخ محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اسے ”فکری ارتداد“ سے تعبیر کرتے تھے۔

ان تین دائروں میں سے آج کی نشست میں اس آخری دائرے کے حوالہ سے کچھ ضروری باتیں عرض کرنا چاہوں گا اور آپ علماء کرام سے، جو خطابت کے محاذ پر موجود ہیں یا اس طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، ان امور کی طرف سنجیدہ توجہ کی درخواست کروں گا۔ اسلام، قرآن کریم، جناب نبی اکرمؐ، شرعی احکام و قوانین، اور اسلام کے معاشرتی و سیاسی

نظام پر اعتراضات اور ان کے جوابات کا سلسلہ اسلام کے آغاز سے جاری ہے اور ہر دور کے علمائے کرام اس دور کے تقاضوں اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس محنت میں مصروف چلے آرہے ہیں۔ اس پس منظر میں ہمیں آج کے عصری تقاضوں اور ضروریات کو پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ ہم یہ ذمہ داری اچھے طریقہ سے نباہ سکیں۔

میڈیا وار میں خطابت کا کردار

پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ کام چیلنج سمجھ کر قبول کرنا ہوگا اور پوری ذمہ داری اور حوصلہ سے کرنا ہوگا۔ اسلام کے دفاع کے حوالہ سے خطابت اور شاعری ہمارے لیے جناب نبی اکرمؐ کے دور میں بھی چیلنج رہی ہے، جس کی دو شہادتیں آپ حضرات کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر جب قریش اور ان کے اتحادی قبائل مدینہ منورہ کے محاصرہ میں ناکام ہو کر خائب و خاسر واپس لوٹے، جسے قرآن کریم نے لم ینالوا خیرا سے تعبیر کیا ہے، تو جناب نبی اکرمؐ نے مسجد نبویؐ میں صحابہ کرامؓ سے خطاب کرتے ہوئے دو تاریخی اعلان کیے۔ ایک یہ کہ اب قریش کو مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوگی، اب ان کے ساتھ جنگ کے لیے ہم ہی ان کی طرف جائیں گے۔ اور دوسرا یہ کہ اب قریش اور ان کے حلیف قبائل ہمارے خلاف تلوار اور ہتھیار کی جنگ نہیں لڑیں گے بلکہ زبان کی جنگ لڑیں گے جس میں خطابت اور شاعری ان کا بڑا ہتھیار ہوگی۔ وہ عرب قبائل کو تمہارے خلاف بھڑکائیں گے، تمہارے خلاف نفرت پھیلائیں گے، اور انہیں تمہارے قریب آنے سے روکیں گے۔ میں اسے ''میڈیا وار'' سے تعبیر کیا کرتا ہوں کہ اس وقت کا میڈیا یہی تھا۔ اور عرب قبائل نے مسلمانوں کے خلاف یہی میڈیا وار چھیڑ دی تھی جس کا ذکر جناب نبی اکرمؐ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے کیا اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ اس جنگ کے لئے تیار ہیں؟ روایات میں آتا ہے کہ اس پر تین شاعر صحابی سامنے آئے اور اعلان کیا کہ یہ جنگ ہم لڑیں گے، (۱) حضرت حسان بن ثابتؓ (۲) حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور (۳) حضرت کعب بن مالکؓ (۴) ان کے ساتھ ایک چوتھے بزرگ حضرت قیس بن ثابت بن شماسؓ کو بھی شامل کرلیں جنہوں نے خطابت کے میدان میں وہی خدمات سرانجام دیں جو پہلے تین بزرگوں نے شاعری کے محاذ پر سرانجام دیں، انہیں خطیب الانصار کہا جاتا تھا اور سب سے پہلے ''خطیب الاسلام'' کا خطاب انہی کو ملا تھا۔

ان شعراء اور خطیب اسلام نے اس محاذ کو کس شان اور ذوق کے ساتھ سنبھالا اس کی دو تین جھلکیاں آپ دوستوں کو یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت حسان بن ثابتؓ مسجد نبویؐ میں منبر رسولؐ پر کھڑے ہو کر جناب نبی اکرمؐ کی مدح کرتے تھے اور کافروں کی طرف سے کی گئی ہجو کا جواب دیتے تھے جبکہ آپؐ سامنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ بیٹھ کر انہیں داد اور دعا دیا کرتے تھے۔

جناب نبی اکرمؐ جب عمرۃ القضاء پر ڈیڑھ ہزار صحابہ کرامؓ کے ہمراہ تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہوئے آپؐ کی اونٹنی کی مہار حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بھی احرام کی حالت میں تھے اور عمرہ کے لیے آئے تھے لیکن ان کی زبان پر تلبیہ کی بجائے رجزیہ اشعار تھے اور وہ جنگی ترانوں کے لہجے میں رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے حالت احرام میں عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے تھے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے انہیں ایسا کرتے دیکھ کر اشارے سے بیت اللہ کی طرف توجہ دلائی اور رجزیہ اشعار پڑھنے سے روکا تو جناب نبی اکرمؐ کی نظر پڑ گئی۔ آپؐ نے دعہ یا عمر کہہ کر حضرت عمرؓ کو منع کرنے سے روک دیا اور فرمایا کہ اسے پڑھنے دو، اس کے اشعار کافروں کے سینوں میں تمہارے تیروں سے زیادہ نشانے پر لگ رہے ہیں۔

بنو تمیم عرب کا ایک مغرور قبیلہ تھا جنہیں اپنی خطابت، شاعری اور فصاحت و بلاغت پر بہت ناز تھا، ان کا وفد مدینہ منورہ آیا تو جناب نبی اکرمؐ سے ملاقات کر کے خطابت و شاعری میں مقابلہ کا چیلنج دے دیا۔ حضورؐ نے چیلنج قبول کیا اور مقابلہ کی باقاعدہ مجلس منعقد کی جس میں بنو تمیم کے شاعر و خطیب نے اپنی فصاحت، شاعری اور خطابت کے جوھر دکھائے جس کے جواب میں حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ نے شاعری اور خطاب کے ذریعہ اسلام کے محاسن اور جناب نبی اکرمؐ کے خصائل و محامد کا تذکرہ کیا۔ بنو تمیم کے سردار حضرت اقرع بن حابسؓ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ مسلمانوں کا شاعر اور خطیب دونوں ہمارے شاعر اور خطیب سے برتر ہیں اور پھر بنو تمیم نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج بھی یہ میڈیا وار ہمارے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمیں اسے چیلنج سمجھ کر ہی اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

خطابت کا انداز و معیار

دوسری بات آپ حضرات سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خطابت وفصاحت کے معیار دور کے بدلنے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ہم درس نظامی میں حریری اور ہمدانیؒ کے مقامات درساً پڑھتے ہیں اور ان کے کلام اور خطبات سے محظوظ ہوتے ہیں، یہ ماضی کے ادبی ماحول سے شناسائی اور قدیم لٹریچر تک رسائی کے لیے تو بہت مفید ہیں لیکن اگر آج آپ اس اسلوب میں خطبہ دیں گے تو آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے سامعین یہ سوچ کر آنکھیں اور کان بند کرلیں گے کہ مولوی صاحب شاید کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔

آج سے پون صدی پہلے خطابت کا معیار مولانا ابوالکلام آزادؒ تھے اور ان کا اسلوب خطابت کی دنیا کا حکمران تھا۔ اس دور میں نادر الفاظ اور مشکل تراکیب کے ساتھ بلند آہنگ لہجہ اور بلند پایہ محاورے خطابت کے ضروری عناصر شمار ہوتے تھے۔ آج وہ دور نہیں ہے آج کے دور میں آپ جتنے سادہ الفاظ، سہل تراکیب اور عام فہم اسلوب میں بات کرسکیں اتنے ہی آپ کامیاب خطیب سمجھے جائیں گے۔ ہمارے ایک مخدوم ومحترم بزرگ حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ خطابت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ سامنے بیٹھے ہوئے لوگ اگر تمہاری بات سمجھ رہے ہیں تو تم خطیب ہو ورنہ کچھ بھی نہیں ہو۔

اسی طرح اب سے پون صدی قبل خطابت پر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی حکمرانی تھی اور ان کی خطابت کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ وہ ہزاروں کے اجتماع میں عشاء کے بعد خطاب کے لیے بیٹھتے تو صبح کی اذانیں سن کر لوگوں کو احساس ہوتا تھا کہ رات بیت چکی ہے اور امیر شریعت کی خطابت کے سحر نے انہیں پوری رات جگائے رکھا ہے۔ آج خطابت کا کمال یہ نہیں ہے، آج اگر آپ مختصر وقت میں مکمل اور جامع بات کہنے اور سمجھا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو آپ کامیاب خطیب ہیں ورنہ لوگوں کے پاس اب اتنا وقت نہیں رہا اور نہ ہی انہیں اتنی دلچسپی ہے کہ وہ زیادہ دیر بیٹھے آپ کا خطاب سنتے رہیں۔

خطابت کا لہجہ و اسلوب

تیسری بات اس حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان اور خطابت میں ابھی تک مناظرے اور فتوے کا اسلوب غالب ہے۔ ہم دار الافتاء، مسند تدریس اور خطابت کے منبر میں کوئی فرق نہیں کرپا رہے۔ ہمارے ہاں عمومی طور پر یہ ذوق پایا جاتا ہے کہ جس انداز میں ہم مسند تدریس پر گفتگو کرتے ہیں، عوامی خطابت اور درس میں بھی کم و بیش ہمارا

وہی انداز ہوتا ہے۔ اور جو اسلوب کسی شرعی سوال کا جواب دیتے ہوئے ہم فتوی نویسی میں اختیار کرتے ہیں، اسی اسلوب میں ہم عام مسلمانوں کو خطبہ اور درس میں مسائل سمجھانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ مجھے فتوی اور تدریس میں سے کسی کی اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن خطابت کا دائرہ بہر حال ان سے مختلف ہے اور اس کی ضروریات الگ ہیں کیونکہ خطابت میں کسی پر حکم لگانے کی بجائے اسے حکم سمجھانے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

نئی نسل اور معلومات کے نئے ذرائع

چوتھی بات اس ضمن میں آپ دوستوں سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا معلومات کی دنیا کہلاتی ہے اور معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ دینی حوالہ سے اب سے نصف صدی قبل لوگوں کے پاس معلومات کا ذریعہ صرف ہم (علماء و خطباء) ہوتے تھے، ہم کسی دینی مسئلہ میں انہیں جو معلومات مہیا کرتے تھے وہی ان کا مبلغ علم ہوتا تھا اور اسی پر انحصار کر کے وہ ہماری رائے اور فتووں کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتے تھے۔ آج یہ صورت حال نہیں ہے کیونکہ اخبارات، جرائد، کتابوں کے اردو تراجم اور سب سے بڑھ کر انٹرنیٹ کی صورت میں لوگوں کے پاس معلومات کے متبادل ذرائع موجود ہیں۔ وہ وہاں سے معلومات حاصل کرتے ہیں، ہماری مہیا کردہ معلومات کے ساتھ ان کا تقابل کرتے ہیں اور اس تقابل میں جو بات ان کے ذہن کے قریب ہو وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ صورت حال آئیڈیل نہیں ہے بلکہ میں علم کے بغیر معلومات کی وسعت کو فتنہ کا باعث سمجھتا ہوں۔ لیکن ہم اس صورت حال کو تبدیل نہیں کر سکتے، یہ اسی طرح جاری رہے گی اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگ خصوصاً نوجوان حضرات جب دوسرے ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کے مقابلہ میں ہماری مہیا کردہ معلومات کو کمزور پاتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں ہماری ثقاہت مشکوک ہو جاتی ہے جو صرف ہمارا نہیں بلکہ دین کا بھی نقصان ہے۔

ہمیں اس تبدیلی پر نظر رکھنا ہو گی اور اس مشکل کا حل اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ ہم اپنے خطبوں میں لوگوں کو مستند مواد فراہم کریں۔ ہمارے سامعین اب ہم سے لفاظی کی بجائے مواد اور معلومات کا تقاضہ کرتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں اس مواد کے لیے حوالہ اور استثناء کا سوال بھی ضرور موجود ہوتا ہے۔ اس لیے ایک کامیاب خطیب کو زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے اور مستند معلومات کو اس انداز سے پیش کرنے کی مشق کرنی چاہیے

کہ اس کے سامعین اس سے وہی نتائج اخذ کریں جو نتائج وہ ان کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک مستقل فن ہے جو خطابت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس حوالہ سے دین کی خدمت کرنے اور اپنی ذمہ داریاں صحیح طریقہ سے سرانجام دینے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

لوڈشیڈنگ اور عوام

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۳ جون ۲۰۱۲ء)

لوڈشیڈنگ کے عذاب سے تنگ عوام بار بار سڑکوں پر آکر اپنے غصے اور جذبات کا اظہار کر رہے ہیں مگر منصوبہ سازوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ نائن الیون کے بعد پاکستان کو پتھر کے دور میں واپس لے جانے کی جو دھمکی دی گئی تھی، شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں کے ہاتھوں اس پر عمل کرایا جا رہا ہے۔ لوڈشیڈنگ تو غریب عوام کے لیے اس شدید گرمی اور تپش میں عذاب بنی ہوئی ہے لیکن اس کے ردعمل میں جگہ جگہ ہونے والے احتجاجی مظاہروں نے بھی مستقل پریشانی کی صورت اختیار کر لی ہے اور قومی املاک کے نقصان کے علاوہ سڑکوں کے بلاک ہو جانے پر رکی ہوئی ٹریفک سے پیدا ہونے والے مسائل نے اضطراب اور بے چینی کا ایک اور ماحول پیدا کر دیا ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں اپنے تاثرات و مشاہدات کا ذکر کرنے سے پہلے ایک چھوٹی سی خوشی کی خبر قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ گزشتہ دنوں ایک پروگرام میں شرکت کے لیے فیصل آباد جاتے ہوئے کھرڑیانوالہ میں ایک دوست کے ہاں چائے کے لیے رکا تو یہ سن کر خوش کن حیرت ہوئی کہ اس قصبہ میں لوڈشیڈنگ بالکل نہیں ہوتی اور وہاں ایک محدود سے علاقے کے لوگ لوڈشیڈنگ کی ”لذت“ تک سے ناآشنا ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کھرڑیانوالا اور گردونواح کے کچھ دیہات میں بجلی اردگرد کی بڑی فیکٹریاں فراہم کرتی ہیں اور ان کا بجلی کا اپنا نظام ہے جن میں بطور خاص ستارہ فیکٹری کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ معلوم کر کے دہری خوشی ہوئی، ایک تو اس لیے کہ ہمارے ملک میں کوئی خطہ تو ایسا ہے جہاں کے باشندے لوڈشیڈنگ کے عذاب سے محفوظ ہیں اور دوسری اس بات پر کہ پاکستان میں ایسے صنعتکار بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے مزدوروں اور ان کے ساتھ پڑوسیوں کو بھی ضروری سہولتیں فراہم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور کچھ غریب عوام کے لیے آسانیاں مہیا کر

رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ملک کے باقی علاقوں کے صنعتکار بھی ان کی پیروی کریں اور اپنے اردگرد کے جن عوام کو وہ زندگی کی جو سہولت بھی فراہم کر سکتے ہوں اس کے لیے عملی پیش رفت کریں۔

مجھے ۱۶ جون کو پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے بھوربن مری جانا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ تو یہ ہوا کہ دوران سفر کراچی سے ایک دوست کا فون آیا کہ مبارک ہو پاکستان شریعت کونسل اتنی ترقی یافتہ ہوگئی ہے کہ بھوربن کے پی سی ہوٹل میں سالانہ اجلاس منعقد کر رہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مبارکباد کا شکریہ مگر ہم اپنا اجلاس پی سی ہوٹل میں نہیں بلکہ اس کے سامنے واقع مدرسہ تعلیم القرآن میں کر رہے ہیں جہاں بہت سی دینی جماعتوں کے اجتماعات موسم گرما میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے محترم عطاء الحق قاسمی کا ایک کالم یاد آگیا اور میں نے بہت سے دوستوں کو اس دوست کی مبارکباد کے حوالے سے اس کالم کا اقتباس سنایا جس میں قاسمی صاحب نے ”سفید پوشی“ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ ماسی برکتے کے تندور سے روٹی کھا کر پی سی کے سامنے ٹہلتے ہوئے دانتوں میں خلال کرنے والے کو سفید پوش کہا جاتا ہے۔ ہم بھی وہی سفید پوش ہیں، سال میں ایک آدھ بار اجلاس کے بہانے وہاں جمع ہوتے ہیں، اس مدرسہ کی مسجد میں ہمارا اجلاس ہوتا ہے اور اس کے قریب کسی عوامی ہوٹل میں دو تین کمرے کرائے پر لے کر ایک دو روز وہاں گزار لیتے ہیں۔

مدرسہ تعلیم القرآن بھوربن مری کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد ۱۹۵۰ء میں جالندھر سے ایک بزرگ ہجرت کر کے اس خطہ میں آکر آباد ہوئے جنہیں حافظ غلام محمد جالندھریؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے مدنی مسجد اور مدنی مدرسہ تعلیم القرآن کی بنیاد رکھی اور قرآن کریم حفظ و ناظرہ کی کلاس کا آغاز کر دیا۔ برصغیر کے معروف روحانی پیشوا حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ حضرت حافظ غلام محمد جالندھریؒ نے اس مسجد و مدرسہ کو پورے علاقہ میں قرآن کریم کی تعلیم اور دینی حمیت و غیرت و فروغ کا ایسا مرکز بنایا کہ مری اور اردگرد کے علاقے کا شاید ہی کوئی گاؤں ایسا ہو جہاں حافظ صاحب مرحوم کا کوئی نہ کوئی شاگرد کسی نہ کسی انداز میں دینی خدمات سرانجام نہ دے رہا ہو۔ یہ مسجد دینی تحریکوں کا مرکز بھی چلی آرہی ہے اور ملک کے بڑے بڑے علمائے کرام وقتاً فوقتاً یہاں تشریف لا چکے ہیں۔ حافظ صاحب مرحوم تو کچھ عرصہ بعد

ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے جہاں وہ سالہا سال تک مسجد نبویؐ کے صف اول کے نمازی رہے ہیں اور اب وہیں جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ بھوربن میں ان کی مسند ان کے فرزند مولانا قاری محمد طیب نے سنبھالی، ان کا بھی گزشتہ سال انتقال ہو گیا ہے اور اب تیسری نسل دین کی دعوت و تعلیم کے کام کو سنبھالے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ ترقیات و قبولیت سے نوازیں، آمین۔

میں صبح آٹھ بجے گوجرانوالہ کے جنرل بس اسٹینڈ سے راولپنڈی کے سواں کیمپ اڈے جانے والی ویگن پر سوار ہوا، خیال تھا کہ ظہر تک مری پہنچ جاؤں گا لیکن گجرات کا بائی پاس عبور کیا تو جلیانی کے قریب روڈ بلاک تھا اور گاڑیوں کی لمبی قطاروں کے آگے سڑک پر اٹھتے ہوئے دھوئیں سے اندازہ ہو گیا کہ بپھرے ہوئے نوجوانوں کا کوئی ہجوم اپنے غصے کا اظہار کر رہا ہے۔ ہمارے ساتھ ویگن میں سوار ایک صاحب نے کہا کہ اس شدید گرمی میں گھر میں پنکھا بھی نہ چل رہا ہو تو لوگ سڑکوں پر ہی آئیں گے اور جب وہ گھبرا کر سڑکوں کا رخ کریں گے تو یہی کچھ کریں گے جو وہ کر رہے ہیں۔ سڑک پر دونوں طرف گاڑیوں کی میلوں لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں اور اوپر سے تیز دھوپ نے لوگوں کو بے حال کر دیا۔ کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ تک تو میں نے انتظار کیا لیکن جب ٹریفک کھلنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو لالہ موسیٰ کے قریب گلیانہ قصبہ میں رہنے والے اپنے ایک شاگرد مولانا حافظ محمد عمر عثمانی کو فون کیا جو جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فضلا میں سے ہیں جبکہ گلیانہ میرا سسرالی گاؤں بھی ہے۔ حافظ محمد عمر عثمانی صورتحال معلوم کر کے موٹر سائیکل پر وہاں آ گئے، انہیں آتے ہوئے آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ چنانچہ دو گھنٹے کے لگ بھگ جی ٹی روڈ پر کھڑے رہنے کے بعد ان کے ساتھ وہاں سے نکلا۔ ہم آگے گئے تو کلیوال کے پاس دو اور مقامات پر ٹائر جلا کر راستہ روکا گیا تھا اور ایک جگہ موٹر سائیکل والوں کو بھی روکا جا رہا تھا۔ ہمیں وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھ کر ایک پر جوش نوجوان لمبی ڈانگ لہراتے ہوئے ہماری طرف بڑھا مگر قریب آ کر شاید سفید ڈاڑھی دیکھ کر اس نے ہاتھ روک لیا اور ہم وہاں سے بعافیت نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ حافظ محمد عمر عثمانی مجھے کھاریاں تک موٹر سائیکل پر لے گئے جہاں سے راولپنڈی جانے والی ویگن پر سوار ہو کر میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ اور جب عصر کے لگ بھگ اجلاس کے مقام تک پہنچا تو میرا برا حال تھا اور دیکھنے والے بھی میری حالت پر ترس کھا رہے تھے۔

واپسی کا سفر اس سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوا۔ اگلے روز ۱۷ جون کو اجلاس سے فارغ ہو کر مولانا قاری جمیل الرحمان اختر کے ہمراہ ان کی گاڑی پر ایبٹ آباد روانہ ہوا۔ جب ہم مری سے نتھیا گلی کے راستے ایبٹ آباد پہنچے تو وہاں بھی مین روڈ لوڈ شیڈنگ کے خلاف ہنگامہ کی وجہ سے بلاک تھی اور وہاں سے شہر کی طرف جانے والی گاڑیاں واپس ہو رہی تھیں۔ چنانچہ ہم نے بھی گاڑی کا رخ موڑا اور متبادل راستہ اختیار کر کے میر عالم ٹاؤن پہنچے جہاں ہمیں مولانا قاضی ارشد الحسینی کے مدرسے میں قیام کرنا تھا۔ ۱۹ جون کو مجھے واپس گوجرانوالہ آنا تھا، ڈائیوو پر ایبٹ آباد سے راولپنڈی پہنچا اور وہاں سے تین بجے گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہونے والی ڈائیوو کوچ پر سیٹ بک کرا کے مولانا رمضان علوی کے ہمراہ کچھ دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ پونے تین بجے ڈائیوو کے ٹرمینل پر واپس آئے تو وہاں کوئی ایک گاڑی بھی موجود نہیں تھی۔ پتہ چلا کہ موٹروے انٹرچینج کے قریب لوڈ شیڈنگ کے خلاف ہنگامے کی وجہ سے ٹریفک بلاک ہے اور کوئی گاڑی ٹرمینل تک نہیں پہنچ پا رہی۔

اتفاقاً ڈائیوو ٹرمینل پر مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہیدؒ کے بیٹے مولانا محمد عثمان شیخوپوری سے ملاقات ہوگئی جو وہاں سفر کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے اور میری طرح غیر معینہ مدت کے انتظار میں تھے۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ ہمارے بہت اچھے ساتھیوں میں سے تھے جنہیں گزشتہ دنوں کراچی میں شہید کر دیا گیا ہے۔ وہ سانگلہ ہل کے علاقہ کے رہنے والے تھے اور دونوں ٹانگوں سے معذور تھے۔ انہوں نے مختلف دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی اور جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کراچی کو اپنی تعلیمی اور دعوتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ جامعہ بنوریہ اور جامعۃ الرشید میں کچھ عرصہ تک تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کا ذوق قرآن کریم کے درس کا تھا اور انہوں نے گلشن معمار میں مسجد توابین تعمیر کر کے اسے دعوت قرآن کے حوالے سے اپنی سرگرمیوں کا مستقل مرکز بنا لیا۔ انہوں نے انٹرنیٹ پر درس قرآن کریم کا سلسلہ شروع کیا اور پوری دنیا میں اپنا ایک بڑا حلقہ بنا لیا۔ وہ مثبت انداز اور دھیمے لہجے میں قرآن کریم کے مضامین بیان کرتے تھے اور معاشرے میں دینی اقدار و روایات کے فروغ کی بات کرتے تھے۔ گروہی اور مسلکی تنازعات سے کوسوں دور رہتے تھے اور نوجوانوں کو دین کی بنیادی باتوں کی طرف لانے کے مشن پر گامزن تھے۔ مولانا شیخوپوری شہیدؒ دونوں ٹانگوں سے معذور ہونے کے باوجود نہ صرف ملک بھر کے دینی اجتماعات میں شریک ہوتے تھے بلکہ اپنا کاروبار بھی کرتے

تھے جو بین الاقوامی سطح کا کاروبار تھا۔ وہ شہد کا بیوپار کرتے تھے اور مختلف ممالک میں ان کی مصنوعات پورے اعتماد کے ساتھ فروخت ہوتی ہیں۔ ان کے بیٹے عثمان شیخوپوری نے بتایا کہ وہ کراچی چیمبر آف کامرس کے باقاعدہ ممبر تھے اور ان کی فرم رجسٹرڈ کمپنی کے طور پر کام کر رہی ہے۔ انہوں نے اپنے لیے مخصوص گاڑی بنوا رکھی تھی جسے وہ خود ڈرائیو کرتے تھے۔ میں نے بھی ایک موقع پر ان کے ساتھ اس گاڑی میں مختصر سفر کیا ہے اور انہوں نے مجھے خود بتایا کہ وہ اس گاڑی پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے کراچی سے مری تک کا سفر کر چکے ہیں۔ مجھے ان کی ہمت پر رشک آتا تھا اور دعوت دین کے حوالے سے ان کا سادہ اور مثبت انداز مجھے بہت پسند تھا۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کی شہادت کو کئی ہفتے گزر گئے ہیں مگر سچی بات ہے کہ میں ابھی تک نہیں سمجھ پایا کہ انہیں آخر کس لیے ٹارگٹ کلنگ کا نشانا بنایا گیا؟ وہ تو کسی کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے اور مثبت لہجے میں دینی تعلیمات کے فروغ کے لیے کوشاں تھے۔ ایک ماہ قبل میں کراچی میں تعزیت کے لیے ان کے گھر حاضری دے چکا ہوں، اب راولپنڈی کے ڈائیو ٹرمینل میں ان کے بیٹے مولانا محمد عثمان شیخوپوری سے دوبارہ اچانک ملاقات ہوگئی اور کیس کے ساتھ ساتھ گھر کے حال احوال کے بارے میں بھی ان سے بات چیت ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد گاڑیوں کی آمد و رفت کے ساتھ ٹرمینل کی رونق بحال ہوئی تو کچھ وقفہ کے بعد سیالکوٹ جانے والی کوچ بھی آگئی جس پر میں نے گوجرانوالہ کے لیے سفر کرنا تھا۔ چنانچہ اپنے مقررہ وقت سے دو گھنٹے لیٹ پانچ بجے کے لگ بھگ یہ کوچ سیالکوٹ کے لیے روانہ ہوئی مگر ٹرمینل سے نکلتے ہی چند منٹ کے بعد وہ جی ٹی روڈ کی دوسری جانب ڈائیو کی ورکشاپ میں گھس گئی جہاں ایک مکینک نے اس کا ٹی وی چیک کیا اور کوچ کو غسل بھی دیا گیا۔ ڈائیو ہمارے آج کے دور میں ایک آرام دہ ذریعۂ سفر ہے اس لیے جہاں موقع ملتا ہے میں اسے ترجیح دیتا ہوں۔ مگر ۱۵ جون کے اس سفر کے دوران چند باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں جن کا ذکر کر رہا ہوں، شاید ڈائیو سروس کا کوئی ذمہ دار میری اس الجھن کو دور کر سکے اور مسافروں کا کچھ فائدہ ہو جائے۔

- میں نے سوا ایک بجے کے لگ بھگ ٹرمینل سے خود ٹکٹ خریدا، کاؤنٹر پر مجھے بتایا گیا کہ آخری صف کی اونچی سیٹوں میں ایک سیٹ خالی ہے، میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ خیر ہے ہم ویسے بھی اسٹیج کے لوگ ہیں، وہیں جگہ مل جائے۔

چنانچہ مجھے ۴۱ نمبر سیٹ دی گئی، لیکن جب کوچ ٹرمینل سے سیالکوٹ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوئی تو آگے کی سیٹوں میں کم از کم ایک تہائی سیٹیں خالی تھیں۔

- میں نے دیکھا کہ ورکشاپ میں کم و بیش چودہ پندرہ گاڑیاں کھڑی تھیں جس سے مجھے احساس ہوا کہ آخر یہ سب تو ناقابل استعمال نہیں ہوں گی، اگر سیالکوٹ سے کوچ بروقت نہیں آئی تھی تو ان میں سے کوئی گاڑی وقت پر بھجوائی جا سکتی تھی۔ یہاں یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ شاید قواعد و ضوابط کے خلاف ہوتا مگر پھر یہ سوال ہوگا کہ کیا قواعد و ضوابط مرتب کرتے وقت مسافروں کی سہولت کا خیال نہیں رکھا جا سکتا؟ ڈائیوو پبلک ٹرانسپورٹ ہمارے ملک کی مہنگی ترین سواری ہے جسے ذریعۂ سفر بنانے والوں کے ذہن میں سہولت اور آرام کے ساتھ وقت کی بچت اور پابندی بھی ہوتی ہے۔ اگر ایک گاڑی وقت پر نہیں آئی تو اس سے دوسری گاڑی کا وقت متاثر نہیں ہونا چاہیے اور ایسا کوئی متبادل بندوبست ضرور موجود رہنا چاہیے کہ گاڑی کو وقت مقررہ پر روانہ کیا جا سکے۔
- تیسری بات جو ابھی تک میرے ذہن کے دروازے پر دستک دے رہی ہے کہ ٹرمینل سے منزل کی طرف روانہ ہو جانے کے بعد بس کی چیکنگ اور دھلائی کے لیے ورکشاپ کا رخ کرنے کی کیا تک ہے؟ اور جو کوچ پہلے ہی دو گھنٹے لیٹ ہے اسے مزید پندرہ بیس منٹ لیٹ کرنے کا کیا جواز ہے؟ آخری پیر ودھائی کی بس سروس اور ڈائیوو ٹرمینل کی بس سروس میں کوئی فرق تو باقی رہنا چاہیے۔ یہ کوچ ٹرمینل سے روانہ ہونے سے قبل کم و بیش نصف گھنٹہ وہاں کھڑی رہی ہے، چیکنگ وغیرہ کے کام وہاں ہونے چاہییں تھے۔

سفر کے احوال تو کچھ نہ کچھ عرض کر دیے ہیں مگر مقصد سفر یعنی پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس کے بارے میں کچھ نہیں لکھ سکا، یہ آئندہ کسی نشست میں سہی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

علماء کرام کی شہادت، استعمار کی سازش!

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۸ مئی ۲۰۱۲ء)

گزشتہ دو روز سے مولانا محمد اسلم شیخوپوری کی المناک شہادتؒ پر تعزیتی پروگراموں کا سلسلہ جاری ہے:

• جامعہ نصرۃ العلوم میں طلبہ کے اجتماع میں راقم الحروف نے مولانا شہیدؒ کی دینی و تعلیمی خدمات کا مختصر تذکرہ کیا، انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا، ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی ہوئی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

• ۱۵ مئی کو دارالعلوم گجرات میں جمعیۃ علماء اہل السنۃ کے زیر اہتمام ایک تعزیتی نشست ہوئی جس میں علماء کرام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

• دارالعلوم جی ٹی روڈ گجرات کے فیکٹری ایریا میں پاک فین کے عقب میں اسی سال شروع ہوا ہے اور مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ نے ہی شوال المکرم میں اس کا افتتاح کیا تھا۔ پروفیسر مولانا محمد اشفاق اور ان کے فرزند مولانا صہیب اشفاق اس کے منتظم ہیں اور دونوں باپ بیٹا جامعہ نصرۃ العلوم کے فضلاء میں سے ہیں۔ اس تعزیتی نشست میں مولانا شیخوپوری کے حالات زندگی اور خدمات کے تذکرہ کی سعادت حاصل ہوئی اور مختلف علماء کرام نے ان کی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا۔ ہمارے عزیز شاگرد مولانا حافظ محمد عمر عثمانی اس نشست کے اہتمام میں پیش پیش تھے۔

• ظہر کے بعد مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جمعیۃ اہل السنۃ ضلع گوجرانوالہ کی مجلس شوریٰ کا اجلاس تھا جس میں مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ، مولانا سید محسن شاہؒ، مولانا نصیب خانؒ اور دیگر شہداء کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے المناک قتل کی شدید مذمت کی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ علماء کرام کے قتل عام کے سلسلہ کو روکنے کے لیے سنجیدہ اقدامات کیے جائیں اور قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یہ اجلاس جمعیۃ اہل السنۃ کا انتخابی اجلاس تھا جس کی صدارت مولانا محمد ایوب صفدر نے کی اور اس میں حاجی عثمان عمر ہاشمی کو جمعیۃ اہل السنۃ کا ضلعی صدر اور بابر رضوان باجوہ کو سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

• اسی روز عصر کے بعد الشریعہ اکادمی میں تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مولانا سید غلام کبریا شاہ نے کی اور اس سے مولانا جمیل احمد گجر، بابر رضوان باجوہ، مولانا حافظ محمد یوسف، حافظ عبد الرشید اور راقم الحروف نے خطاب کیا۔ میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ مولانا نصیب خانؒ، مولانا سید محمد محسن شاہؒ اور مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ سب ہمارے محترم تھے اور سب کی شہادت اور جدائی پر ہم غمزدہ ہیں لیکن مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کی شہادت پر ہمارا صدمہ دوہرا ہے اس لیے کہ وہ ہمارے ساتھی تھے اور انہوں نے طالب علمی کا ایک دور ہمارے درمیان گزارا ہے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ نے دینی تعلیم کا آغاز باغبانپورہ لاہور میں ہمارے مخدوم حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ کے ہاں کیا تھا جو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا شیخوپوریؒ نے صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی اور ان کے بچوں کے ساتھ کچھ عرصہ ان کے گھر میں رہے، حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ کی اہلیہ محترمہ ان سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں اور وہ بھی ان سے بہت مانوس تھے۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ نے درس نظامی کی تکمیل جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کی اور وہیں دورۂ حدیث کر کے فراغت حاصل کی۔ بعد میں وہ کراچی تشریف لے گئے اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے دورۂ حدیث میں بھی شریک ہوئے۔

قرآن کریم کے درس کا ذوق انہوں نے اپنے دو بزرگ اساتذہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ سے پایا اور وہ اس کا مختلف مواقع پر تذکرہ بھی کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اپنے شاگردوں کو بطور خاص اس کی تلقین کیا کرتے تھے کہ جہاں بھی جاؤ درس قرآن کریم کا سلسلہ ضرور قائم کرو، وہ نوجوانوں کے لیے ترجمۂ قرآن کریم اور ہلکی پھلکی عربی گرامر کی تعلیم پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ جبکہ مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہیدؒ آج کے دور میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی اس تعلیمی و فکری جدوجہد کا اہم کردار تھے جو حضرت شیخ الہند نے مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس پہنچنے پر شروع کی تھی کہ مسلمانوں میں اجتماعیت کے فروغ کی محنت کی جائے اور قرآنی تعلیمات عام مسلمانوں تک پہنچانے کی جدوجہد کی جائے۔ مولانا شیخوپوریؒ

نے قرآن کریم کے درس کے لیے جو اسلوب اختیار کیا وہ آج کے نوجوان علماء کرام کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

علماء کرام کے اس المناک اور مسلسل قتل عام کے سلسلہ میں راقم الحروف نے عرض کیا کہ افغانستان میں روس کی شکست اور روسی افواج کی واپسی کے بعد جو نیوورلڈ آرڈر امریکہ کی طرف سے جاری ہوا تھا اس کی ایک باقاعدہ شق تھی کہ مسلم سوسائٹی میں جو علماء کرام اور دانشور عوام تک رسائی رکھتے ہیں اور جن کی باتیں رائے عامہ پر اثرانداز ہوتی ہیں انہیں عام مسلمانوں سے دور رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہی دینی مدارس کے خلاف نفرت انگیز مہم چلائی گئی تھی جواب بھی جاری ہے اور اس کا ہدف یہ ہے کہ عام مسلمانوں کو دینی تعلیم اور دینی مدارس سے دور کیا جائے۔ لیکن یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ مہم الٹ پڑ گئی، جوں جوں دینی مدارس کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈا بڑھتا گیا اور کردارکشی کی مہم زور پکڑتی گئی اس کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور طلبہ و طالبات کی تعداد بھی مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ دینی قیادت اور دینی مدارس کی کردارکشی کی اس مہم میں عالمی استعمار کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ علماء کرام کا یہ قتل عام اسی مہم کا ایک اور رخ ہے، بالخصوص کراچی کے بارے میں گزشتہ دو عشروں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ دینی حوالہ سے جو شخصیت بھی عوام میں مقبولیت حاصل کرتی ہے اور جس کے گرد عوام کا ہجوم جمع ہونا شروع ہوتا ہے اسے شہید کر دیا جاتا ہے۔ مولانا انیس الرحمان درخواستیؒ کی شہادت سے لے کر مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کی شہادت تک ہمارے جتنے بزرگ اور ساتھی شہید ہوئے ہیں ان سب میں مشترک بات یہ تھی کہ وہ دین کے لیے ہمہ وقت متحرک تھے اور ان کے گرد علماء کرام کے ساتھ ساتھ عوام بھی جمع ہو رہے تھے۔ یہ آج کے عالمی استعمار کے ایجنڈے کا سب سے اہم ہدف ہے کہ علماء کرام اور خاص طور پر وہ علماء کرام جو دینی و فکری بیداری کا ذریعہ بنتے ہیں اور آج کے حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر عوام کی راہنمائی کرتے ہیں انہیں عوام سے دور رکھا جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ استعمار کی یہ مہم بھی ناکامی سے دوچار ہوگی، علماء کرام کی شہادتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن علماء اور عوام کا رشتہ توڑنے کی مذموم کوشش ان شاء اللہ تعالیٰ بالآخر دم توڑ جائے گی بلکہ علماء کرام کی شہادتوں اور ان کے مقدس خون کی برکت سے یہ رشتہ اور مضبوط ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہم غمزدہ ضرور ہیں مگر مایوس قطعاً نہیں ہیں اور نہ ہی شہادتوں کا یہ سلسلہ ہمارے حوصلوں کو ناکام بنا سکتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کی جدوجہد ہے جو اپنی روایات کے مطابق آگے بڑھتی رہے گی، اللہ تعالیٰ تمام شہداء کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق سے نوازے، آمین یا رب العالمین۔

قرآن وسنت کی تعلیم و تدریس میں حکومتی ذمہ داری

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ اپریل ۲۰۱۲ء)

پنجاب اسمبلی نے گزشتہ دنوں ایک متفقہ قرارداد کے ذریعے حکومت سے سفارش کی ہے کہ قرآن کریم کو سرکاری تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم کا باقاعدہ حصہ بنایا جائے اور اس کی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے وسائل فراہم کیے جائیں۔ روزنامہ اسلام لاہور ۹ مارچ ۲۰۱۲ء کی خبر کے مطابق یہ قرارداد ایک خاتون رکن اسمبلی محترمہ عاصمہ ممدوٹ نے پیش کی ہے جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ:

> ”قرآنی تعلیمات کے فروغ اور موجودہ نسل کی قرآن کریم سے آشنائی کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو بطور نصابی کتاب تعلیمی نصاب کا حصہ بنا کر اسے باقاعدہ ترجمہ کے ساتھ پڑھایا جائے نیز تدریس قرآن و حدیث کے لیے جامع پروگرام تشکیل دیا جائے اور اس کے لیے تمام وسائل فراہم کیے جائیں۔“

یہ قرارداد قرآن کریم کی تعلیم کے حوالہ سے قرارداد پیش کرنے والی خاتون اور دیگر ارکان اسمبلی کے جذبات کی آئینہ دار اور خوش آئند ہے جس پر تمام ارکان اسمبلی مبارکباد کے مستحق ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ صرف ایک قرارداد ہے جس کی حیثیت سفارش سے زیادہ کچھ نہیں ہے جبکہ اس پر ایک مستقل بل لانے کی ضرورت ہے جو منظور ہونے کے بعد باقاعدہ قانون کا درجہ حاصل کر سکے اور قرآن کریم کی تعلیم کو یقینی بنایا جا سکے۔ دوسری یہ بات اس حوالہ سے ذہن کو توجہ دلاتی ہے کہ اسلام کے نام پر پاکستان کو قائم ہوئے پینسٹھ برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ہم ابھی تک اس مرحلہ میں نظر آ رہے ہیں کہ:

- ہمارے سرکاری تعلیمی اداروں میں قرآن کریم کی تعلیم ہونی چاہیے یا نہیں؟

- پورا قرآن کریم پڑھایا جانا چاہیے یا نہیں؟
- اور ترجمہ سمیت پڑھانے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

یہ صورتحال اس قرارداد پر خوش ہونے کے باوجود ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے اور قوم کے ہر طبقہ اور حلقہ کو اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ کچھ عرصہ قبل وفاقی محتسب اعلیٰ نے ایک حکم صادر کیا تھا کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں میٹرک تک طلبہ و طالبات کو قرآن کریم ناظرہ پڑھانے کا اہتمام کیا جائے مگر وسائل کی کمی کے بہانے اس پر عملدرآمد سے گریز کیا گیا تھا۔ جبکہ سرکاری تعلیمی اداروں میں پڑھانے والے اساتذہ کا کہنا ہے کہ مڈل تک قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم اس وقت بھی سرکاری سکولوں میں ضروری ہے لیکن قرآن کریم باقاعدہ طور پر پڑھائے جانے کی بجائے اسے صرف امتحانی نمبروں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور سکولوں کے سربراہوں اور اساتذہ کا مجموعی طور پر طرز عمل یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم ہو یا نہ ہو مگر اس کے نمبر ضرور طلبہ کے پرچوں میں شامل کیے جائیں تاکہ دوسرے مضامین میں ان کے نمبروں کی کمی کو ان نمبروں کے ساتھ پورا کیا جائے۔ چنانچہ اکثر سکولوں میں قرآن کریم پڑھائے بغیر اور اس کا امتحان لیے بغیر یہ نمبر لگا دیے جاتے ہیں۔ یہ بات اگر درست ہے تو اور زیادہ افسوسناک ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم سے بے پرواہی کے اس جرم میں حکومتی پالیسی اور محکمہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ بھی برابر کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں اور معاملہ انتہائی شرمناک صورت اختیار کر جاتا ہے۔

۲۲ مارچ کو اس سلسلہ میں الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس میں سکولوں، کالجوں اور دینی مدارس کے اساتذہ نے باہم مل بیٹھ کر پنجاب اسمبلی کی مذکورہ قرارداد کی روشنی میں موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا اور یہ تجاویز دیں کہ:

- قومی تعلیمی پالیسی کے حوالہ سے سرکاری ہدایات اس سلسلہ میں خاموش ہیں جبکہ قومی تعلیمی پالیسی میں قرآن کریم اور سنت نبویؐ کی تعلیمات کے حوالہ سے واضح ہدایات موجود ہونی چاہئیں۔
- قرآن کریم کی جو تعلیم اس وقت سرکاری نظام و نصاب میں ضروری قرار دی گئی ہے اس پر عملدرآمد نہیں ہو رہا اور اس سلسلہ میں مجرمانہ غفلت برتی جا رہی ہے۔ محکمہ تعلیم کو اس حوالہ سے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے

اس بے عملی اور غفلت کا نوٹس لینا چاہیے اور سرکاری نظام ونصاب کے مطابق قرآن کریم کی تعلیم اور امتحان کو یقینی بنانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

- پنجاب قرآن بورڈ کو، جو ایک سرکاری ادارہ ہے، سرکاری اداروں میں قرآن کریم کی تعلیم کے سلسلہ میں نگرانی کو اپنی ذمہ داریوں میں شامل کرنا چاہیے اور پنجاب اسمبلی کی مذکورہ متفقہ قرارداد کے مطابق سرکاری تعلیمی اداروں میں قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس کو یقینی بنانے کے لیے ایک باقاعدہ قانونی بل تیار کر کے اسے اسمبلی سے منظور کرانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔
- سرکاری تعلیمی اداروں کے سربراہوں اور اساتذہ کو اس بات کا احساس کرنا چاہیے اور انہیں اس کا احساس دلایا جانا چاہیے کہ قرآن کریم کی تعلیم سے بے پرواہی اور اسے صرف نمبروں کے لیے استعمال کرنے کی روش قانون کی خلاف ورزی کے ساتھ ساتھ شرعاً بھی درست نہیں ہے اور قرآن کریم کی تعلیم سے نعوذ باللہ غفلت ایک سنگین جرم ہے اس لیے سرکاری تعلیمی اداروں کے سربراہوں اور اساتذہ کو اس سلسلہ میں سابقہ جرم سے توبہ کرتے ہوئے اس کی تلافی کے لیے پوری توجہ اور محنت سے کام کرنا چاہیے۔

جہاں تک سرکاری تعلیمی نصاب ونظام میں قرآن وحدیث کی تعلیم کو ضروری قرار دینے کا تعلق ہے اس کے بارے میں سردست صرف اتنا عرض کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن وسنت کی تعلیم وتدریس کسی بھی مسلمان حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ جیسا کہ مسلم شریف کتاب المساجد کی ایک روایت کے مطابق امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ جمعہ میں سرکاری حکام کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "لیعلمھم دینھم وسنۃ نبیھم" امراء الامصار یعنی شہروں کے حکام کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے دین کی تعلیم دیں اور جناب نبی اکرمؐ کی سنت کی تعلیم کا اہتمام کریں۔

نیز ہمارے خیال میں دینی جماعتوں کو بھی یہ مسئلہ اپنے ایجنڈے میں شامل کرنا چاہیے اور پنجاب اسمبلی کی اس قرارداد پر عملدرآمد کے لیے باقاعدہ مہم چلانی چاہیے۔

تعلیمی اداروں میں قرآن کریم کی تعلیم اور پنجاب اسمبلی کی قرارداد

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۹ مارچ ۲۰۱۲ء)

پنجاب اسمبلی نے ۸ مارچ ۲۰۱۲ء کو محترمہ عاصمہ ممدوٹ کی پیش کردہ ایک قرارداد متفقہ طور پر پاس کی ہے جس میں قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

- سرکاری تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم میں قرآن کریم کو نصابی کتاب کے طور پر شامل کیا جائے۔
- مکمل قرآن کریم ترجمہ سمیت پڑھایا جائے۔
- اس کے لیے حکومت کی طرف سے تمام ضروری وسائل فراہم کیے جائیں۔
- قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس کو تعلیمی اداروں میں یقینی بنانے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں۔

یہ اگرچہ ایک قرارداد ہے جس کی حیثیت صرف سفارش کی ہے، اس کے باوجود اس حوالہ سے یہ خوش آئند ہے اور اسے منظور کرنے پر تمام ارکان اسمبلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ یہ قرآن کریم کے ساتھ ملک کے سب سے بڑے صوبے کی منتخب اسمبلی کی طرف سے تعلق کا اظہار ہے اور اس سے پاکستان کی نظریاتی شناخت ایک بار پھر جمہوری انداز میں سامنے آئی ہے۔

اس سلسلہ میں ۲۲ مارچ کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ایک اجلاس کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف ماہر تعلیم اور المشرق سائنس کالج گوجرانوالہ کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر عبد الماجد حمید المشرقی نے کی۔ اجلاس میں مختلف تعلیمی شعبوں سے تعلق رکھنے والے مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت کی۔ ڈاکٹر محمود احمد (سکول ٹیچر)، مولانا داؤد خان نوید (دینی مدرس)، خرم شہزاد (طالب علم رہنما)، پروفیسر ڈاکٹر انوار اعجاز (ایس ایس اکنامکس)، حافظ عبد الرشید (سکول ٹیچر)، صفدر محمود (سبجیکٹ اسپیشلسٹ)، مولانا محمد عبد اللہ راتھر

(الشریعہ اکادمی)، مفتی محمد شفیق (دینی مدرس)، حافظ محمد شفیق (مدرس جامعہ)، ڈاکٹر خالد محمود، جناب عثمان عمر ہاشمی (سماجی راہنما) اور راقم الحروف ابو عمار زاہد الراشدی۔

اجلاس میں پنجاب اسمبلی کی مذکورہ قرارداد کی روشنی میں قرآن و حدیث کی تعلیم کے حوالہ سے موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا گیا اور اس قرارداد کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے پیش کرنے والی خاتون رکن اسمبلی محترم عاصمہ ممدوٹ اور منظور کرنے والے تمام ارکان اسمبلی کو مبارکباد دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ قرارداد کے بعد اس سلسلہ میں کوئی باقاعدہ بل بھی اسمبلی میں اس طرح پیش ہو کر متفقہ طور پر منظور ہونا چاہیے تاکہ محض سفارش کی بجائے باضابطہ قانون سازی کے ذریعے ارکان اسمبلی کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ اجلاس میں اس امر کو لمحۂ فکریہ سے تعبیر کیا گیا کہ قیام پاکستان کو ۶۵ برس گزر جانے کے باوجود ابھی ہم اس مرحلہ میں ہیں کہ ملک کے سب سے بڑے صوبے کی اسمبلی صرف یہ سوچ رہی ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم ہمارے تعلیمی اداروں میں کس حد تک ہونی چاہیے، ترجمہ کے ساتھ ہونی چاہیے اور کیا حکومت کو اس کے لیے ضروری وسائل فراہم کرنے چاہئیں؟

اجلاس میں بتایا گیا کہ سرکاری تعلیمی نظام میں اس وقت بھی ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم مڈل تک ضروری ہے اور اس کے لیے امتحان میں نمبر بھی مختص کیے گئے ہیں لیکن عملاً اس کا کوئی اہتمام موجود نہیں ہے۔ نہ قومی تعلیمی پالیسی کے تحت جاری ہونے والی ہدایات میں اس سلسلہ میں کوئی رہنمائی ہوتی ہے، نہ سرکاری تعلیمی اداروں کے سربراہ اور اساتذہ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں، اور نہ ہی قرآن کریم کی تعلیم اور امتحان کا کوئی اہتمام ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر اداروں میں تعلیم اور امتحان کے بغیر ہی قرآن کریم کے نمبر امتحانی پرچوں پر لگا دیے جاتے ہیں اور اسے دوسرے مضامین کے امتحانات میں طلبہ کے نمبروں کی کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک سکول ٹیچر نے اجلاس کے دوران بتایا کہ انہوں نے ایک کلاس کے امتحان میں قرآن کریم کا باقاعدہ امتحان لے کر طلبہ کو ان کی حیثیت کے مطابق نمبر دیے تو سکول کے دوسرے اساتذہ نے ان سے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ نے طلبہ پر ظلم کیا ہے، اس لیے کہ یہی نمبر تو طلبہ کے دوسرے مضامین میں نمبروں کی کمی کو پورا کرتے ہیں اور امتحان میں ان کے پاس ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اجلاس میں اس صورتحال کو محکمہ

تعلیم، تعلیمی اداروں کے سربراہوں اور ایسا کرنے والے اساتذہ کی غفلت اور لاپروائی قرار دے کر سخت افسوس کا اظہار کیا گیا اور اس کی تلافی کے لیے مختلف تجاویز پر غور کیا گیا:

- ایک تجویز میں کہا گیا کہ قومی تعلیمی پالیسی کے تحت دی جانے والی ہدایات میں یہ ہدایت شامل کی جائے کہ سرکاری نصاب کے مطابق قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور امتحان کو تعلیمی اداروں میں یقینی بنایا جائے اور جس طرح ڈینگی کے بارے میں باقاعدہ مہم چلائی جارہی ہے اسی طرح قرآن کریم کی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے مہم چلائی جائے۔
- ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ مڈل یا میٹرک کی سند کو قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ مشروط کیا جائے اور قرآن کریم ناظرہ کا باقاعدہ امتحان لینے کے بعد سند جاری کی جائے۔ البتہ اس سے غیر مسلم طلبہ کو مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔
- ایک تجویز اس سلسلہ میں یہ سامنے آئی کہ اس حوالہ سے اساتذہ کے تربیتی کورسز کا اہتمام کیا جائے جن میں اساتذہ کو قرآن کریم کی تعلیم کی اہمیت و ضرورت کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ ان کی عملی رہنمائی اور ٹریننگ کا انتظام کیا جائے۔
- ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ ہر سکول میں پہلا پیریڈ قرآن کریم کے لیے مخصوص کیا جائے جس میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ نماز اور ضروریات دین کی تعلیم کو ضروری قرار دیا جائے اور متعلقہ استاد کو ہدایت کی جائے کہ محض وقت گزاری کی بجائے سنجیدگی اور دلچسپی کے ساتھ یہ تعلیم دے۔

اجلاس میں اس صورتحال کا جائزہ لیا گیا کہ یہ تو قرآن کریم کی تعلیم کے اس حصہ کی بات ہے جو آج بھی تعلیمی نصاب و نظام کا حصہ ہے مگر محکمۂ تعلیم اور اساتذہ دونوں کی کوتاہی کی وجہ سے اس پر عملدرآمد نہیں ہورہا، جبکہ پنجاب اسمبلی کی قرارداد میں مکمل قرآن کریم یا ترجمہ کی بات کی گئی ہے اور اس کی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اجلاس میں ''پنجاب قرآن بورڈ'' کا کردار بھی زیر بحث آیا جو حکومت پنجاب کی طرف سے باقاعدہ طور پر قائم ہے اور مختلف حوالوں سے متحرک ہے۔ اجلاس میں طے پایا کہ قرآن بورڈ سے رابطہ کر کے اسے اس کی اس طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ:

- پنجاب کے تعلیمی اداروں میں قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لے جو مبینہ طور پر انتہائی افسوسناک ہے اور جس کی اصلاح کے لیے خاصی محنت کی ضرورت ہے۔ اس افسوسناک صورتحال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے کر اس سلسلہ میں پائی جانے والی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی اصلاح کے لیے جامع رپورٹ مرتب کرے اور سرکاری تعلیمی اداروں میں قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس کی باقاعدہ نگرانی کا نظام وضع کرے۔
- پنجاب اسمبلی کی متذکرہ قرارداد پر عملدرآمد کو اپنے باقاعدہ پروگرام میں شامل کرے اور اسے قانونی بل کے طور پر اسمبلی میں پیش کرانے اور منظور کرانے کے لیے لابنگ اور بریفنگ کا کردار ادا کرے۔

اجلاس میں راقم الحروف نے عرض کیا کہ نئی نسل کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے روشناس کرانا دستوری طور پر بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور شرعی حوالے سے بھی کسی مسلم حکومت کی ذمہ داریوں میں یہ شامل ہے کہ وہ عام شہریوں کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے۔ مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ جمعہ میں مسلم حکام کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مختلف شہروں اور علاقوں میں انہوں نے جن حکام کو مقرر کیا ہے ان کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ ”لیعلمھم دینھم و سنت نبیھم“ یعنی وہ لوگوں کو ان کے دین کی تعلیم دیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی تعلیم کا اہتمام کریں۔

ہمارے ہاں اس سلسلہ میں مسلسل کوتاہی سے کام لیا جا رہا ہے اور حکومتی اداروں کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں کے سربراہ اور اساتذہ بھی اس کوتاہی میں شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نئی نسل میں اخلاقی بے راہ روی اور فکری انتشار بڑھتا جا رہا ہے اور سیکولر لابیاں اور غیر ملکی امداد سے چلنے والی این جی اوز ہماری نئی نسل کی قرآن و سنت کی تعلیمات سے اس بے خبری کی آڑ میں اپنے گمراہ کن ایجنڈے کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔ اس لیے حکومتی ادارو کو توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ ہم سب کی اپنی اپنی جگہ بھی یہ ذمہ داری ہے کہ نئی نسل کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے کردار ادا کریں اور نور علم کے ذریعے جہالت اور جاہلیت دونوں کا مؤثر مقابلہ کریں۔

منصب رسالتؐ ــ دین کے تمام شعبوں کی اتھارٹی

(پنجاب یونیورسٹی، لاہور - ۱۸ مارچ ۲۰۱۲ء)

(۱۸ مارچ ۲۰۱۲ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ علوم اسلامی میں سیرت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت شعبہ کے ڈین پروفیسر حافظ ڈاکٹر محمود اختر نے کی جب کہ مولانا زاہد الراشدی مہمان خصوصی تھے اور پروفیسر ڈاکٹر سعد صدیقی نے نقابت کے فرائض سرانجام دیے۔ مولانا زاہد الراشدی کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج کی اس کانفرنس کا موضوع سیرت النبیؐ ہے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو گفتگو کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ سیرت نبوی کے ہزاروں پہلو ہیں جو گفتگو کے لیے توجہ کو کھینچتے ہیں اور منصب کے بھی بیسیوں پہلو ایسے ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور جن پر گفتگو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، لیکن میں منصب کو ''اتھارٹی'' کے مفہوم پر فوکس کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرمؐ دین کے تمام شعبوں میں فائنل اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسے چند مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالی کا کلام ہے اور اللہ تعالی کی کتاب ہے جو رسول اکرمؐ پر نازل ہوا اور قیامت تک نسل انسانی کی ہدایت اور راہنمائی اس سے وابستہ ہے۔ جبکہ قرآن کریم تک ہماری رسائی کا ذریعہ نبی کریمؐ کی ذات گرامی ہے اور آنحضرتؐ کی وساطت کے بغیر نہ ہم قرآن کریم کے الفاظ تک پہنچ سکتے ہیں، نہ اس کی ترتیب و جمع تک ہماری رسائی ممکن ہے، اور نہ ہی اس کے مفہوم اور اس کے الفاظ اور جملوں سے اللہ تعالی کی منشاو مراد کو معلوم کر لینا رسول اللہ سے راہنمائی حاصل کیے بغیر ہمارے بس میں ہے۔ مثلاً ہم یہ بات مانتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی سب سے پہلے آیات جو نازل ہوئیں وہ سورہ العلق کی پہلی پانچ آیات ہیں، لیکن یہ بات معلوم ہونے کا واحد ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے کہ آپؐ نے ہمیں یہ واقعہ بتایا اور اپنے غار حراء میں عبادت کے لیے جانے کی تفصیلات بتاتے ہوئے فرمایا کہ غار میں فرشتہ آیا تھا اور اس نے مجھے یہ پانچ آیات سنائیں اور پڑھنے کے لیے کہا۔ اگر غار حراء کے واقعہ کو نہ مانا جائے اور اس پر یقین نہ ہو تو ان پہلی پانچ آیات تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے اور نہ ہی غار حراء

کے واقعہ اور جناب نبی اکرمؐ کی بیان کردہ تفصیلات کو تسلیم کیے بغیر ہم ان آیات پر ایمان لا سکتے ہیں۔

اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے جو قرآن کریم مصحف عثمانی کی صورت میں موجود ہے اور جسے دنیا بھر کے مسلمان پڑھتے ہیں، وہی اصلی قرآن کریم ہے اور اسی پر جناب نبی اکرمؐ اپنی امت کو چھوڑ کر گئے ہیں۔ یہ قرآن کریم اس طرح کتابی شکل میں جناب نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ میں موجود نہیں تھا بلکہ رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں حضرت عمرؓ کی تجویز و تحریک پر حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کریم کو موجودہ کتابی صورت میں تحریر کیا۔ آنحضرتؐ کے دور میں قرآن کریم کو یاد کرنے کا ذوق زیادہ تھا اور سینکڑوں حفاظ کرام صحابہؓ موجود تھے اس لیے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، ویسے بھی آپؐ کے وصال تک وحی جاری تھی اور قرآن کریم کی مکمل صورت نے حضور علیہ السلام کے وصال کے بعد ہی سامنے آنا تھا۔ یہاں حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ کے بیان کردہ ایک نکتہ کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے آیت کریمہ ”بل ھو ایات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم“ (سورہ العنکبوت ۴۹) کے ضمن میں لکھا ہے کہ قرآن کریم کی اصل جگہ سینہ ہے اور کتابت امر زائد ہے۔ اس کا مفہوم میں اپنے انداز میں یوں بیان کیا کرتا ہوں کہ کتابت قرآن کریم کی ضروریات میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہماری کمزوریوں سے ہے کہ جو یاد نہ کر سکتا ہو وہ لکھا ہوا دیکھ کر پڑھ لے۔

بہرحال اس ضرورت کو سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے محسوس کیا اور خاص طور پر انہیں اس صورتحال نے اس بات کا احساس دلایا کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں ہونے والی جنگوں میں حافظ قرآن کریم صحابہ کرامؓ کی کثرت سے شہادتوں کی خبریں آرہی تھیں، حتیٰ کہ صرف مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں ستر حفاظ قرآن صحابہ کرام شہید ہو گئے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے خدشہ محسوس کیا اور حضرت صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ قرآن کریم کا ایک نسخہ لکھوا کر محفوظ کر لیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ کو پہلے اس کام میں تردد تھا مگر بعد میں انہوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو بلا کر حکم دیا کہ وہ قرآن کریم کو مکمل کتابی شکل میں تحریر کر دیں۔ جس پر حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کریم لکھنا شروع

کر دیا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اصول طے کیا کہ وہ آیت کریمہ قرآن کریم میں درج کروں گا جس پر کم از کم دو صحابیؓ شہادت دیں گے کہ انہوں نے بھی یہ آیت جناب نبی اکرمؐ سے اسی طرح سنی ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ خود قرآن کریم کے حافظ تھے بلکہ نبی اکرمؐ کے دور مبارک میں قرآن کریم کا بیشتر حصہ ان کے قلم سے لکھا گیا تھا، لیکن انہوں نے طے کیا کہ وہ اپنے علاوہ کم از کم دو اور گواہ صحابہ کرامؓ میں سے ہر آیت اور سورۃ پر تلاش کریں گے تاکہ غلطی کا کوئی امکان نہ رہے۔

چنانچہ صحابہ کرامؓ سے وسیع پیمانے پر رابطے اور رجوع کر کے انہوں نے اس فارمولے پر قرآن کریم لکھنا شروع کیا، اور جب پورے قرآن کریم کی کتابت مکمل کر لی تو معلوم ہوا کہ دو آیات ایسی ہیں جن پر صرف ایک گواہ مل رہا ہے اور دوسرا گواہ دستیاب نہیں ہے۔ ایک آیت ”لقد جآءکم من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم“ (سورہ التوبہ ۱۲۸) والی اور دوسری ”من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ“ (سورہ الاحزاب ۲۳) والی ہے۔ ان آیات پر صرف ایک گواہ مل رہا ہے اور وہ حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ ہیں جبکہ دوسرا گواہ دستیاب نہیں ہو رہا۔ البتہ حضرت خزیمہ بن ثابتؓ وہ بزرگ ہیں جن کی گواہی کو ایک مقدمہ میں جناب نبی اکرمؐ نے دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ اور ہدایت کے مطابق ان کی گواہی کو ڈبل گواہی قرار دے کر قرآن کریم کی کتابت مکمل کر لی گئی اور قرآن کریم کے اس مکتوب مصحف کو مسجد نبویؐ میں ایک ستون کے ساتھ عام مسلمانوں کی راہنمائی اور استفادہ کے لیے رکھوا دیا گیا، جو آج بھی ”استوانۂ مصحف“ کے نام سے معروف ہے۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ قرآن کریم جو مصحف کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا بھر میں پڑھا جا رہا ہے حضرت زید بن ثابتؓ کا تحریر کردہ ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کو مرتب صورت میں لکھنے کے لیے حضرت زید بن ثابتؓ کا سورس اور ماخذ کیا تھا؟ انہوں نے قرآن کریم کی جو آیات اور سورتیں جناب نبی اکرمؐ سے خود سنی تھیں اور جن کے بارے میں دوسرے صحابہ کرامؓ نے بتایا کہ انہوں نے یہ آیات اور سورتیں آنحضرتؐ سے سنی ہیں، وہی آیات اور سورتیں اس مرتب کتاب کی شکل اختیار کر گئیں اور اس طرح قرآن کریم کی کسی بھی سورۃ آیت یا جملے تک رسائی کا ہمارے لیے واحد ذریعہ جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی قرار پائی۔ اس لیے میں ایک بات عام طور پر عرض کیا

کرتا ہوں کہ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ قرآن کریم کے بعد کیا حدیث نبویؐ پر ایمان رکھنا بھی ضروری ہے؟ میری گزارش یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے بعد نہیں بلکہ قرآن کریم سے پہلے حدیث نبویؐ پر ایمان لانا ضروری ہے، اس لیے کہ حدیث نبوی پر ایمان نہ ہو تو قرآن کریم پر ایمان ممکن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بھی دیکھ لیں کہ ہم سب یہ مانتے ہیں کہ قرآن کریم کی سب سے پہلے پانچ آیتیں نازل ہوئیں جو سورۃ العلق کا حصہ ہیں، لیکن جب ہم قرآن کریم کھول کر اس کی تلاوت شروع کرتے ہیں تو سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کی بجائے سورۃ الفاتحہ کی سات آیات سے تلاوت کا آغاز کرتے ہیں، جبکہ سورۃ العلق موجودہ مصحف میں ۹۶ نمبر پر پڑھی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ترتیب کیسے تبدیل ہوگئی؟ اور وہ کون سی اتھارٹی ہے جس نے سورۃ الفاتحہ کو پہلے نمبر پر اور سورۃ العلق کو ۹۶ نمبر پر رکھ دیا؟ ظاہر بات ہے کہ یہ تبدیلی بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمل میں آئی ہے اور مصحف کی موجودہ ترتیب آپؐ ہی کی قائم کردہ ہے۔ اور اگر خدانخواستہ اس حوالہ سے جناب نبی اکرمؐ کی اتھارٹی اور آپؐ کی حدیث کو نہ مانا جائے تو قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کے ساتھ تلاوت کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

حضرات محترم! میں نے اس وقت تک یہ عرض کیا ہے کہ قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس کے الفاظ، جملوں، آیات، سورتوں اور ترتیب تک پہنچنے کے لیے ہمارے پاس واحد سورس اور مأخذ جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے، اور قرآن کریم کی کسی بھی آیت تک رسائی کے لیے نبی کریمؐ ہی اتھارٹی بلکہ واحد اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بالکل اسی طرح قرآن کریم کی آیات اور جملوں کے مفہوم و معنی اور ان میں اللہ تعالیٰ کی منشا و مراد کو معلوم کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس واحد ذریعہ جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ "رسول اللہ" کے طور پر اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہیں اور نمائندہ جو بات بھی کہے وہ اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ اس کی بات شمار کی جاتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہوتا ہے۔ کسی ادارے کا کوئی نمائندہ آپ کے پاس گفتگو کے لیے آئے تو آپ کو یہ حق تو حاصل ہے کہ اس کے نمائندہ ہونے کی تسلی کریں اور یہ بھی حق ہے کہ اسے نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں، لیکن اگر آپ اس کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے گفتگو شروع کر دیں تو پھر آپ کو اس کی کسی بات پر یہ پوچھنے کا حق نہیں رہتا کہ وہ یہ بات کس کی طرف سے

کررہا ہے؟ اس لیے کہ وہ نمائندہ ہونے کی حیثیت سے جو بات کررہا ہے وہ اس کی نہیں بلکہ اس کے ادارے کی بات ہوگی، وہ اپنے ادارے سے پوچھ کر کررہا ہے تب بھی وہ ادارے کی بات ہے اور اگر پوچھے بغیر کررہا ہے تب بھی وہ بات ادارے ہی کی بات تصور کی جاتی ہے۔ اس لیے جس طرح قرآن کریم کی آیات، سورتوں اور ترتیب میں جناب نبی اکرمؐ اتھارٹی ہیں اسی طرح اس کے مفہوم اور اللہ تعالیٰ کی منشا کی وضاحت میں بھی آپ کو واحد اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے۔ اور اگر قرآن کریم کی کسی سورت یا آیت کا کوئی مفہوم آنحضرتؐ نے اپنے قول یا عمل کی صورت میں طے کر دیا ہے تو وہی اس کا حتمی مفہوم ہے۔ اس بات کی تو بحث ہو سکتی ہے کہ روایت کا درجہ کیا ہے؟ سند کی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر دو مختلف مفہوم مروی ہیں تو ترجیح کس کو ہے؟ مگر جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے کسی آیت قرآنی کا مفہوم متعیّن صورت میں صحیح سند کے ساتھ سامنے آجائے تو پھر کسی بھی شخص کے لیے اس بات کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس آیت کا اپنی طرف سے کوئی مفہوم طے کرنے کی کوشش کرے اور فہم قرآن کے لیے کوئی اور معیار قائم کرنے کے درپے ہو۔

اس اصولی بات کے بعد اس سلسلہ میں کچھ واقعاتی شہادتوں کی طرف توجہ دلانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ احادیث کے ذخیرے میں بیسیوں ایسی شہادتیں موجود ہیں جن کے مطابق قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے کا مفہوم سمجھنے میں صحابہ کرامؓ کو دقت پیش آئی تو انہوں نے اس کی وضاحت کے لیے جناب رسول اللہ سے رجوع کیا اور جب آپؐ نے ایک مفہوم بیان کر دیا تو اس کے بعد اس کی کسی مزید وضاحت کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی، ان بیسیوں شہادتوں میں سے دو تین کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جن سے اس بات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

حضرت عدی بن حاتمؓ عیسائی سے مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے جب قرآن کریم پڑھا تو اس آیت کریمہ پر ذہن اٹک گیا کہ ”اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم“ (سورہ التوبہ ۳۱) عیسائیوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے نیچے اپنا رب بنا لیا تھا اور مسیحؑ بن مریمؑ کو بھی رب مانتے تھے۔ حضرت عدیؓ نے جناب نبی اکرمؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم نے تو اپنے احبار و رہبان کو رب کا درجہ نہیں دیا تھا، قرآن کریم نے ہمارے بارے میں یہ کیا فرما دیا ہے؟ نبی کریمؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے ہاں علماء و مشائخ کو یہ اتھارٹی حاصل تھی کہ وہ جس چیز کو چاہیں حلال قرار دے دیں اور جسے چاہیں حرام

کر دیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ تو تھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ رب بنانے کا یہی مطلب ہے۔

ویسے میں عرض کروں گا کہ آج بھی یہی صورتحال ہے کہ کیتھولک مسیحیوں کے ہاں اب بھی حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے کی فائنل اتھارٹی پاپائے روم ہیں، جبکہ ہمارے ہاں اس کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی شخصیت کو حلال و حرام میں اس قسم کا کوئی اختیار حاصل ہوتا تو اس کے لیے جناب نبی اکرمؐ سے زیادہ حقدار اور کوئی شخصیت نہیں ہو سکتی تھی، لیکن جب آپؐ نے اپنی ذات کے لیے شہد کو حرام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ایک مستقل سورۃ کے ذریعہ ٹوک دیا ''لم تحرم ما احل اللہ لک'' (سورہ التحریم ۱) جو چیز اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کی ہے وہ آپ نے کیسے حرام کر دی ہے؟ یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت کے مفہوم و مصداق کے بارے میں صحابیِ رسول حضرت عدی بن حاتمؓ کو الجھن ہوئی تو اس کی وضاحت کے لیے جناب نبی اکرمؐ سے انہوں نے رجوع کیا اور آپؐ نے جو وضاحت فرمادی اس نے اس الجھن کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

بسا اوقات قرآن کریم کی دو آیات بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں اور دونوں کا ظاہری مفہوم ایک دوسرے کے خلاف دکھائی دیتا ہے، اس کی وضاحت کے لیے بھی نبی اکرمؐ ہی اتھارٹی ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت کے مطابق ایک شخص نے حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ سے دریافت کیا کہ قرآن کریم میں جا بجا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تذکرہ موجود ہے اور اسے مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن ایک آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اے ایمان والو ''علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم'' (سورہ المائدہ ۱۰۵) تم پر لازم ہے کہ اپنا فکر کرو اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو اس کا تمہیں کوئی ضرر نہیں ہے، اگر تم ہدایت پر ہو۔ تو اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور اس عمل کو ترک کرنے پر وعید سنائی جا رہی ہے اور دوسری طرف یہ کہا گیا ہے کہ تم پر صرف اپنا فکر کرنا ضروری ہے۔ حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ نے اس پر پہلی بات تو یہ فرمائی کہ ''علی الخبیر سقطت'' خبردار پر گرے ہو یعنی تم نے بات اس شخص سے پوچھی ہے جس کو یہ معلوم ہے، اس لیے کہ جو اشکال تمہارے ذہن میں آیا ہے میرے ذہن میں بھی آیا تھا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر حال میں کرتے رہو البتہ جب ایسا زمانہ آجائے کہ فتنوں کی کثرت کے باعث

اپنا ایمان بچانا مشکل ہو جائے تو پھر پہلے اپنی فکر کرو۔ گویا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم عمومی ہے اور صرف اپنا فکر کرنے کا حکم مخصوص حالات میں ہے۔ اس طرح قرآن کریم کے دو حکموں میں بظاہر دکھائی دینے والے تعارض کی بات جناب رسول اکرمؐ کی وضاحت کے بعد ختم ہو گئی۔

بسا اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کریم کچھ اور کہہ رہا ہے اور جناب نبی اکرمؐ حدیث میں کچھ اور فرما رہے ہیں۔ ایسی صورت میں بھی وضاحت کی اتھارٹی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ بخاری شریف میں روایت ہے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک موقع پر نبی کریمؐ نے فرمایا ''من حوسب عذب'' جس کا حساب کتاب ہوا اسے ضرور عذاب ہو گا۔ فرماتی ہیں اس پر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ جس کو نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا ''فسوف یحاسب حسابا یسیرا'' (سورہ الانشقاق ۸) اس کا حساب آسان ہو گا اور وہ خوش خوش اپنے گھر والوں کے پاس واپس پلٹے گا، بلکہ ایک جگہ قرآن کریم میں یہ ہے کہ ''فیقول ھاءم اقرءوا کتابیہ'' (سورہ الحاقہ ۱۹) وہ اپنے امتحان کا نتیجہ لوگوں کو پڑھاتا پھرے گا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں، جبکہ آپؐ فرما رہے ہیں کہ جس کا حساب ہوا وہ عذاب سے نہیں بچے گا۔ بظاہر یہ قرآن کریم اور حدیث کا تعارض ہے کہ قرآن کریم کچھ اور کہہ رہا ہے اور جناب نبی اکرمؐ اس سے مختلف بات فرما رہے ہیں۔ اس کی وضاحت بھی آنحضرتؐ سے مانگی گئی اور آپؐ کی وضاحت کے بعد بات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ نبی کریمؐ نے ایک جملے میں بات صاف کر دی کہ ''ذاک العرض یا عائشۃ'' جس حساب کی تم بات کر رہی ہو تو وہ باقاعدہ حساب نہیں بلکہ صرف عدالت میں پیشی ہے ''اما من نوقش فقد عذب'' البتہ جس کا مناقشہ ہوا اور ریکارڈ کھول لیا گیا وہ عذاب سے نہیں بچے گا۔

حضرات محترم! جناب نبی اکرمؐ کے منصب رسالت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ دین کے ہر معاملہ میں فائنل اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسے تسلیم کیے بغیر دین کا ڈھانچہ ہی سرے سے مکمل نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع نصیب فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

قرآن کریم کی حرمت کے تقاضے

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۹ مارچ ۲۰۱۲ء)

آج (۷ مارچ) کا روزنامہ اسلام میرے سامنے ہے اور قرآن کریم کے حوالہ سے دو اہم خبریں توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا رہی ہیں۔

ایک خبر یہ ہے کہ سینٹ آف پاکستان نے افغانستان میں قرآن کریم کی توہین کے مرتکب امریکی فوجیوں کو سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ قائدین ایوان نیر حسین بخاری کی پیش کردہ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ایوان بالا اس واقعہ کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتا ہے، یہ انتہائی مکروہ فعل تھا جو کہ نیٹو افواج کے سپاہیوں نے کیا ہے، اس واقعہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں، امریکہ اور نیٹو ممالک اس واقعہ کی تحقیقات کرائیں اور اس میں ملوث فوجیوں کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔

افغانستان میں نیٹو فوجیوں کی طرف سے قرآن کریم کی توہین کے سانحہ کے بعد افغانستان میں احتجاج و اضطراب کی جو لہر چل رہی ہے وہ اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ افغانوں کی دینی حمیت اور ملی غیرت ابھی نہ صرف باقی ہے بلکہ جبر، لالچ اور پروپیگنڈا کے تمام تر ہتھیار استعمال کرنے کے باوجود اس کے درجۂ حرارت میں کوئی کمی نہیں کی جا سکی۔ گزشتہ دنوں ایک امریکی تھنک ٹینک نے اس صورتحال کو انتہائی تشویشناک قرار دیا تھا کہ افغانستان میں طالبان کی اقتدار میں واپسی کے امکانات دوبارہ دکھائی دینے لگے ہیں مگر تمام تر کوششوں کے بعد بھی اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا کہ وہ دوبارہ حکومت میں آکر سخت قوانین (شریعت اسلامیہ) نافذ نہیں کریں گے اور اس صورتحال کو افغانستان میں اتحادی فوجیوں کی اپنے اہداف کے حوالہ سے ناکامی پر محمول کیا جا رہا ہے۔

ہمیں تو پہلے ہی یقین تھا کہ اتحادی فوجوں کی لشکر کشی اور جبر و تشدد افغانوں کے دینی جذبہ اور قومی غیرت میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکے گا مگر اب دنیا نے بھی ایک بار پھر دیکھ لیا ہے کہ افغان قوم آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں وہ برطانوی فوجوں کی یلغار کے وقت تھی اور جہاں وہ روسی استعمار کی لشکر کشی کے وقت کھڑی تھی۔ اب تیسرے راؤنڈ یعنی امریکی استعمار اور اس کے اتحادیوں کی دس سالہ یلغار کے اختتامی مراحل میں بھی افغان قوم کے پائے استقلال میں کوئی لغزش دکھائی نہیں دے رہی اور اس استقامت و عزیمت پر افغان قوم کو سلام عقیدت پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

جہاں تک سینٹ آف پاکستان کی مذمتی قرارداد کا تعلق ہے، یہ خوش آئند ہے مگر کافی نہیں ہے اس لیے کہ اصل مسئلہ مذمت کا نہیں بلکہ عالمی سطح پر حرمت قرآن کریم، حرمت نبی اکرمؐ اور حرمت انبیاء کرامؑ کے مسئلہ کو اٹھانے کا ہے۔ اور عالمی اداروں کو اس بات کے لیے آمادہ کرنے کا ہے کہ وہ وحی الٰہی، آسمانی کتابوں اور انبیاء کرامؑ کے احترام کو مذاہب کے پیروکاروں کا حق تسلیم کریں اور اس کے لیے عالمی سطح پر قانون سازی کریں۔ مسلم حکومتوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے اور جب تک وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی طرف عملی پیشرفت نہیں کریں گے اس وقت تک اس قسم کے افسوسناک حادثات پیش آتے رہیں گے جبکہ اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اس مہم میں پیش پیش ہونا چاہیے۔

دوسری خبر بھی قرآن کریم کے حوالہ سے ہے اور وہ یہ کہ پنجاب اسمبلی نے قرآن کریم کو نصاب تعلیم میں باضابطہ طور پر شامل کرنے کی سفارش کی ہے اور یہ سفارش ایک قرارداد کی متفقہ منظوری کی صورت میں کی گئی ہے جو فنکشنل لیگ کی رکن اسمبلی محترمہ عاصمہ ممدوٹ نے پیش کی اور کسی اختلاف کے بغیر ایوان نے اسے منظور کرلیا۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ:

> ”قرآنی تعلیمات کے فروغ اور موجودہ نسل کی قرآن کریم سے آشنائی کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو بطور نصابی کتاب تعلیمی نصاب کا حصہ بنا کر اسے باقاعدہ ترجمہ کے ساتھ پڑھایا جائے۔ نیز تدریس قرآن و حدیث کے لیے جامع پروگرام تشکیل دیا جائے اور اس کے لیے تمام وسائل فراہم کیے جائیں۔“

قرآن و سنت کی تعلیم و تدریس اور اپنے شہریوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے ریاستی ذمہ داریوں اور حکومتی فرائض میں شامل ہے اور ایسا قیام پاکستان کے بعد سے ہی ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس سے مسلسل گریز کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ریاستی نظام تعلیم میں قرآن و حدیث کی تعلیمات جزوی طور پر تو کچھ نہ کچھ شامل ہوتی آرہی ہیں لیکن حکومتوں کی پالیسیوں کے تحت ان میں کمی بیشی بھی ہوتی رہی ہے، اور یہ المیہ ہمارے ساتھ شروع سے چلا آرہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو ریاستی ذمہ داریوں میں شامل سمجھنے کی بجائے حکومتی پالیسیوں کے تابع رکھا گیا ہے اور حکومتوں کے رجحانات کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کا دائرہ بھی گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔

مسلم شریف (کے باب) کتاب المساجد کی ایک روایت کے مطابق امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے آخری عمر میں ایک خطبہ جمعہ کے دوران ارشاد فرمایا کہ

انہوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مرغ نے ان کے سر پر تین ٹھونگے لگائے ہیں جس سے وہ یہ سمجھے ہیں کہ ان کی وفات کا وقت قریب آگیا ہے۔ پھر اس حوالہ سے انہوں نے کچھ خصوصی ہدایات ارشاد فرمائیں اور ان میں ”امراء مصار“ یعنی مختلف علاقوں کے مسلم حکام کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ان علاقائی حکام کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ (۱) شہریوں کو عدل و انصاف فراہم کریں (۲) قرآن و سنت کی تعلیم دیں (۳) اور قومی خزانے سے ان کے حصہ کی صحیح تقسیم کار کا اہتمام کریں۔ یعنی حضرت عمرؓ نے قرآن و سنت کی تعلیم کو مسلم حکمرانوں کی بنیادی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے۔

ہمارے خیال میں محترمہ عاصمہ ممدوٹ کی پیش کردہ یہ قرارداد حکومت پاکستان کو اسی ذمہ داری کی طرف توجہ دلانے کی کوشش ہے جس کی متفقہ منظوری پر پنجاب اسمبلی کے تمام ارکان مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ اور خاص طور پر قرارداد کے دو جملے بہت اہم ہیں جن کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم کو باقاعدہ نصابی کتاب کے طور پر ترجمہ کے ساتھ پڑھایا جائے اور دوسرا یہ کہ اس کے لیے تمام وسائل فراہم کیے جائیں۔ ہمیں یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل وفاقی محتسب اعلیٰ نے ایک حکم جاری کیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اسکولوں میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ مڈل تک طلبہ اور طالبات کو ناظرہ قرآن کریم پڑھایا جائے۔ لیکن اس حکم پر یہ کہہ کر عملدرآمد سے گریز کیا گیا تھا کہ اس کے لیے اسکولوں کے پاس وسائل نہیں ہیں اور تعلیم کے لیے سرکاری طور پر مختص کیے جانے والے بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس دور میں وفاقی وزارت تعلیم کے ایک ذمہ دار افسر سے اس مسئلہ پر ہماری بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ملک بھر کے تمام مڈل اسکولوں میں ایک ایک قاری بھی تعینات کیا جائے تو ہزاروں قاریوں کی ضرورت ہوگی اور ان کی تنخواہیں اور مراعات بھی اسی حساب سے درکار ہوں گی جبکہ تعلیمی بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے اس پر عرض کیا کہ اس کے لیے دینی مدارس کا شکریہ ادا کیجئے کہ وہ کسی قسم کے سرکاری بجٹ کے بغیر باہمی تعاون کی بنیاد پر ملک بھر کی لاکھوں مساجد کو نہ صرف حافظ و قاری بلکہ عربی درس نظامی کے مدرس و معلم اور مفتی و خطیب بھی فراہم کر رہے ہیں اور اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک میں بھی وسیع پیمانے پر اپنی اس ”پیداوار“ کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔

بہرحال ہم پنجاب اسمبلی کی اس متفقہ قرارداد کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن اس کے لیے صرف قرارداد اور سفارش کافی نہیں بلکہ ایک باقاعدہ بل لانے اور اسے اسی طرح متفقہ طور پر پاس کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ارکان اسمبلی کی اس اچھی خواہش کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

دینی شعبوں میں کام کا دائرہ کار بڑھانے کی ضرورت

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۹ فروری ۲۰۱۲ء)

دارالعلوم مدنیہ ڈسکہ میں ان دنوں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیراہتمام طلبہ، طالبات اور شہریوں کے لیے ایک تربیتی کورس شروع ہے جس میں تھوڑی دیر کے لیے مجھے بھی حاضری کا موقع ملا۔ مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی، مولانا فقیر اللہ اختر اور مولانا محمد ایوب خان ثاقب اس کورس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ اور قادیانیت کے تعاقب کے حوالہ سے دارالعلوم مدنیہ ڈسکہ کی اپنی ایک تاریخ ہے۔

حضرت مولانا محمد فیروز خان ثاقبؒ جب دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے شرف تلمذ حاصل کر کے ڈسکہ آئے تو انہوں نے معروف قادیانی لیڈر چودھری ظفر اللہ خان آنجہانی کے گھر کے سامنے غیر مسلموں کی ایک متروکہ عبادت گاہ میں ڈیرہ لگا لیا۔ ظفر اللہ خان آنجہانی کے بھائی چودھری شکر اللہ خان وہاں رہائش پذیر تھے اور علاقہ کے بڑے چودھریوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولانا محمد فیروز خان ثاقب پرجوش اور باحمیت نوجوان عالم دین تھے جبکہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے دیندار خاندانوں کا تعاون انہیں حاصل تھا اور شیخ برادری اور اس کے ایک جرأت مند راہنما شیخ عبد الحق مرحوم بھی ان کے ساتھ تھے۔ دارالعلوم مدنیہ کی بنیاد رکھی گئی اور مولانا محمد فیروز خان ثاقب نے، جو معقولات اور ادب عربی کے صاحب اسلوب و فن مدرس تھے، تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ تعلیم و تدریس اور مسجد کی خطابت کے ساتھ ساتھ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ اور قادیانیت کے تعاقب کا بھرپور ذوق رکھتے تھے جس کی وجہ سے دارالعلوم مدنیہ قادیانیت کے خلاف ایک مورچہ کی شکل اختیار کر گیا، حتیٰ کہ چودھری ظفر اللہ خان قادیانی کا خاندان وہاں سے نقل مکانی کر گیا۔

میں نے اپنے طالب علمی کے دور میں دارالعلوم مدنیہ کے جلسوں میں خطیب پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ اور سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی کے پرجوش خطابات سنے ہیں اور انہیں قادنیوں کو للکارتے دیکھا ہے۔ مجھے وہ منظر اب بھی یاد ہے جب مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے دارالعلوم مدنیہ کے پرہجوم جلسہ عام سے خطاب کیا تو حضرت مولانا محمد فیروز خان ثاقبؒ ہاتھ میں رائفل پکڑے اسٹیج کے اردگرد گھوم رہے تھے اور ان کا جوش وجذبہ سامعین وحاضرین کے جذبوں کو دوچند کر رہا تھا۔

میں کچھ عرصہ سے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور اس محاذ پر کام کرنے والی دیگر جماعتوں کے قائدین سے گزارش کر رہا ہوں کہ آج کی نسل کو قادیانیت کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے کہ یہ لوگ کون ہیں، ان کا عقیدہ و مذہب کیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے اختلافات کی نوعیت اور سطح کیا ہے؟ حتیٰ کہ خود ہمارے دینی مدارس کے فاضلین اور فاضلات کی غالب اکثریت اس سے قطعی طور پر بے خبر ہے، اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مختلف سطحوں پر اس سلسلہ میں ایسے اجتماعات کا اہتمام کیا جائے جن میں طلبہ، طالبات، اساتذہ، صحافیوں اور دینی و سیاسی کارکنوں کو عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ قادیانیوں کے تاریخی پس منظر اور ان کے موجودہ طریق کار سے واقف کرایا جائے تاکہ وہ اس دام ہمرنگ زمین سے عام مسلمانوں بالخصوص نئی نسل کو روشناس کرانے اور اس سے ان کو بچانے کے لیے اپنا کردار صحیح طور پر سرانجام دے سکیں۔

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار اسلام، اور انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ اس سلسلہ میں مختلف دائرں میں محنت کر رہی ہیں جو قابل قدر ہے، لیکن قادیانیوں نے عالمی سطح پر اور ملک کے اندر اپنی سرگرمیوں کو جس وسعت اور تنوع کے ساتھ جاری رکھا ہوا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے اس محاذ پر ہونے والی محنت کو از سر نو منظم کرنے کی ضرورت ہے اور سب کو باہمی مشاورت کے ساتھ تقسیم کار اور جدوجہد کی نئی ترجیحات کا جائزہ لینا چاہیے۔

مجھے بتایا گیا کہ حال ہی میں کسی علاقہ میں قادیانی خواتین نے مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں میں اپنی دعوت کے فروغ کے سلسلہ میں کام کا آغاز کیا تو ایک قادیانی خاتون نے کہا کہ وہ

مختلف فیہ مسائل پر مسلمانوں کے ساتھ گفتگو کے لیے تیار ہیں، اس پر علاقہ کے بعض سرکردہ علماء کرام گفتگو کے لیے اس کے پاس گئے تو اس نے کہا کہ کیا آپ کے پاس کوئی خاتون عالمہ ایسی نہیں ہیں جو مجھ سے بات کر سکیں؟ اس پر علاقہ میں تلاش کی گئی تو پتا چلا کہ دینی مدارس کی فاضلات تو علاقہ میں بہت ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جس کی اس مسئلہ پر تیاری ہو اور جو کسی قادیانی خاتون کے ساتھ مسلم قادیانی تنازع کے موضوعات پر بات کرنے کی پوزیشن میں ہو، یا کم از کم وہ اس مسئلہ کی نوعیت اور سطح سے ہی باخبر ہو۔ یہ بات ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے اور یہ کسی ایک علاقہ کی بات نہیں، ملک بھر کی اجتماعی صورتحال کم و بیش ہر جگہ اسی طرح کی ہے، جس کا سنجیدگی کے ساتھ نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔

اس پس منظر میں دارالعلوم مدنیہ ڈسکہ میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کا یہ تربیتی پروگرام خوش آئند ہے اور ملک بھر کے دینی مدارس کے لیے راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ میں نے اس کورس کی افتتاحی نشست میں حاضری دی اور اصولی طور پر یہ عرض کیا کہ فتنوں سے باخبر ہونا اور ان کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے سدباب کی بروقت تدابیر اختیار کرنا بھی دین کے اہم تقاضوں میں سے ہے اور ہماری ذمہ داری ہے:

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یمامہ کی جنگ میں حفاظ قرآن کریم کی بڑی تعداد میں شہادت سے اندازہ کیا اور خطرہ محسوس کرتے ہوئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ وہ قرآن کریم کو کتابی شکل میں محفوظ کرنے کا اہتمام کریں جس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا اور قرآن کریم کو کتابی شکل میں مرتب کر کے محفوظ کر لیا گیا۔
- اسی طرح حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے آذربائیجان کے علاقہ میں دو عجمی مسلمانوں کو عربی کی مختلف لغتوں اور قراءتوں کے اختلاف کے حوالہ سے قرآن کریم کے بعض الفاظ کے تلفظ پر آپس میں جھگڑتے ہوئے دیکھا تو خطرہ محسوس کیا کہ قراءتوں اور لہجوں کا یہ اختلاف عجمیوں کو ہضم نہیں ہو گا اور وہ ہمیشہ قرآن کریم کے الفاظ کے تلفظ اور لہجوں پر جھگڑتے رہیں گے۔ انہوں نے اس خطرہ سے امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کو مدینہ منورہ پہنچ کر آگاہ کیا

اور ان کی تجویز پر قرآن کریم کو قریش کی لغت اور تلفظ پر از سر نو لکھوا کر حضرت عثمانؓ نے باقی مصاحف کو تلف کرنے کا حکم دے دیا۔

میں نے عرض کیا کہ فتنوں کو محسوس کرنا، ان کی نشاندہی اور ان کے سدباب کی طرف توجہ دلانا دین کا ایک مستقل شعبہ ہے اور ہمارے ہاں حجیت حدیث، تحفظ ختم نبوت، تحفظ ناموس صحابہؓ اور دیگر شعبوں میں جو محنت ہو رہی ہے وہ اسی شعبہ کی مختلف شاخیں ہیں، البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ محنت ہر شعبہ میں ذوق و جذبہ کے ساتھ ساتھ تدبر و حوصلہ اور حکمت و مصلحت کے ضروری دائروں کو ملحوظ رکھ کر کی جائے۔

نبی اکرمؐ کی خارجہ پالیسی

(دارالسلام لائبریری، باغ جناح، لاہور - ۱۱ فروری ۲۰۱۲ء)

۱۱ فروری ۲۰۱۲ء کو جناح باغ لاہور میں واقع دارالسلام لائبریری میں ’’نبی اکرمؐ کی خارجہ پالیسی‘‘ کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر نے کی جبکہ جنرل (ر) ضیاء الدین بٹ مہمان خصوصی تھے۔ راقم الحروف کو بھی اس موقع پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ ’’خارجہ پالیسی‘‘ کا جملہ جب بولا جاتا ہے تو سب سے پہلا یہ تاثر سامنے آتا ہے کہ ایک ریاست اور حکومت ہے جسے دوسری ریاستوں، حکومتوں اور قوموں کے ساتھ اپنے معاملات چلانے اور دنیا میں ان کے ساتھ مل جل کر رہنے کے لیے کوئی طریق کار اور اصول و قوانین طے کرنے ہیں۔ اس مفہوم میں جب ہم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ پالیسی کے لیے ان کے طے کردہ اصولوں اور ہدایات کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو گفتگو کا دائرہ یہ بنتا ہے کہ مدینہ منورہ کی ریاست وجود میں آنے اور اس میں آنحضرتؐ کی حکومت و اقتدار قائم ہونے کے بعد خارجہ پالیسی کے بارے میں آپؐ نے کیا طرز عمل اختیار کیا تھا اور کیا ہدایات دی تھیں، اس کے لیے ہمیں بنیادی طور پر

1. حضورؐ کے ان خطوط کا مطالعہ کرنا ہوگا جو آپؐ نے دنیا کے مختلف ممالک کے حکمرانوں کو ارسال فرمائے تھے،

2. ان معاہدات کا جائزہ لینا ہوگا جو متعدّد اقوام اور ریاستوں کے ساتھ آپؐ نے کیے تھے، اور

3. ان وفود کے ساتھ رسالت مابؐ کی گفتگو اور رویے کو سامنے رکھنا ہوگا جو مختلف مواقع پر مختلف اقوام کی طرف سے مدینہ منورہ آئے اور انہوں نے حضورؐ کے ساتھ باہمی معاملات پر گفتگو کی۔

دوسری قوموں کے ساتھ معاملات کے بارے میں قرآن کریم نے بیسیوں آیات میں احکام دیے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ آنحضرتؐ کی خارجہ پالیسی کی بنیاد انہی آیات قرآنیہ پر تھی۔ ان ساری باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو صورتحال سامنے آتی ہے اس کے پیش نظر میری طالب علمانہ رائے میں حضورؐ کی خارجہ پالیسی کے بعض حصوں کو درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

• جناب نبی اکرمؐ رسول انسانیت ہیں اور آپؐ کی دعوت و نبوت پوری نسل انسانی کے لیے ہے۔ آپؐ نے مکہ مکرمہ میں نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو سب سے پہلا خطاب کیا تھا وہ یا ایھا الناس کے عنوان سے تھا کہ قریشیوں یا عربوں سے خطاب کرنے کی بجائے نبی آخر الزمانؐ پوری نسل انسانیت سے مخاطب ہوئے تھے۔ آج گلوبلائزیشن کے حوالے سے مغربی دنیا کچھ بھی کہے، مگر تاریخی حقیقت یہ ہے کہ رنگ و نسل، قومیت، جغرافیہ، اور زبان وغیرہ کی حدود سے بالاتر ہو کر پوری نسل انسانیت کو اپنی دعوت و خطاب کا عنوان سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا تھا اور گلوبلائزیشن کے اولین بانی پوری تاریخ انسانی میں حضورؐ ہی تھے۔ اس لیے آپؐ نے دوسری قوموں، حکومتوں، اور سرداروں کو جو خطوط لکھے ان میں سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت اسلام کے تعارف اور دعوت کو حاصل تھی جو جناب رسول اللہؐ کی عالمگیر نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا۔

• جناب نبی اکرمؐ چونکہ دین فطرت لے کر آئے تھے جس کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر ہے اور آپؐ کا دین تمام آسمانی دینوں کا آخری اور فائنل ورژن ہے، چنانچہ پوری نسل انسانی کو فطری اور وحی کی طرف لانا بھی آنحضرتؐ کے مقاصد نبوت میں سے تھا جس کے لیے اسلام کا غلبہ اور برتری نسل انسانی

کی ناگزیر ضرورت تھا۔ اس لیے آپؐ نے دنیا کے تمام انسانوں کو دعوت دی کہ وہ اسلام قبول کریں۔ اور اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو نسل انسانی تک اس دین کے پہنچنے اور انسانوں کے اس مذہب کو قبول کرنے میں مزاحمت نہ کریں اور رکاوٹ نہ بنیں، یعنی وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی اسلام کے فروغ اور غلبے کی راہ میں حائل نہ ہوں۔

یہ بات میرے خیال میں ایسی ہی ہے جیسے آج مغرب دنیا کے تمام ممالک و اقوام سے کہہ رہا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک مغربی تہذیب و ثقافت سب سے بہتر اور ایک آئیڈیل فلسفہ و تہذیب کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے دنیا کے تمام اقوام و ممالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ ویسٹرن سولائزیشن کی بالادستی کو قبول کریں اور اپنی اپنی علاقائی تہذیبوں اور ثقافتوں کو مغربی تہذیب و ثقافت کی حدود میں لے آئیں۔ مغرب اس کے لیے قوت، لابنگ، اور دھونس کے سارے حربے استعمال کر رہا ہے اور دنیا بھر میں اپنی ثقافت کی بالادستی قائم کرنے کی جنگ لڑ رہا ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اسلام کا موقف بھی کم و بیش یہی ہے کہ چونکہ وہ دین فطرت ہے اس لیے اس کی بالادستی کے سامنے دنیا کی تمام اقوام و ممالک کو سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ چنانچہ اصل جھگڑا یہ نہیں ہے کہ کسی تہذیب و ثقافت کی بالادستی تسلیم کرانے کے لیے طاقت کا استعمال درست ہے یا نہیں، بلکہ اصل تنازع یہ ہے کہ مغرب کے دعوے کے مطابق دنیا پر بالادستی کا حق ویسٹرن سولائزیشن کو ہے، جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ نسل انسانی کی قیادت کا حق دین فطرت کو حاصل ہے اور انسانیت کی بھلائی اسی دین و ثقافت کو قبول کرنے میں ہے۔

بہرحال جناب نبی اکرمؐ کی خارجہ پالیسی کا دوسرا بڑا نکتہ اسلام کا غلبہ اور اس کی بالادستی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنا تھا۔ اسی وجہ سے حضورؐ یہ ہدایت دیا کرتے تھے کہ پہلے دوسری قوموں کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر اسے قبول نہ کریں تو اس بات کی دعوت دو کہ وہ اسلام کی بالادستی اور برتری تسلیم کریں اور اس کے فروغ و نفاذ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ اور اگر وہ اسلام بھی قبول نہ کریں اور اس کی اشاعت میں رکاوٹ بھی بنیں تو ان سے جہاد کرو۔ گویا جہاد اور

جنگ اسلام قبول نہ کرنے پر نہیں ہے، بلکہ اس کی راہ میں مزاحم ہونے پر ہے۔

• اسلام قبول نہ کرنے والی اقوام کے ساتھ معاملات میں قرآن کریم نے جو ہدایات دی ہیں ان کی روشنی میں ان اقوام و ممالک کی درجہ بندی تین دائروں میں کی جاسکتی ہے:

1. سورۃ الممتحنہ کی آیت ۸ کے مطابق جو قومیں مسلمانوں کے ساتھ دین کے حوالے سے جنگ نہیں کرتیں اور مسلمانوں کو ان کے ملک اور زمین سے محروم کرنے کے عمل میں شریک نہیں ہیں، ان کے ساتھ حسن سلوک اور برابری کی بنیاد پر تعلقات کی اجازت ہے۔ انہیں فقہائے کرام کی اصطلاح میں غیر محارب اقوام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

2. اس سے اگلی آیت کریمہ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ دین کے حوالے سے مسلمانوں سے جھگڑا کرتے ہیں، مسلمانوں کو ان کی زمین اور وطن سے محروم کرنے کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں، اور ایسا کرنے والوں کے ساتھ اس معاملہ میں معاون ہوتے ہیں، ان قوموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی اجازت نہیں ہے۔

3. جبکہ سورہ آل عمران کی آیت ۲۸ میں حکم الٰہی یہ ہے کہ مسلمان کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو مسلمان کافروں کو دوست بنائیں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ کسی بات پر نہیں ہیں۔ البتہ کافروں کے شر سے بچنے کے لیے ظاہری تعلقات رکھے جا سکتے ہیں۔ اسے ”تحفظاتی دائرے“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح یہ تین اصول ہیں جنہیں اسلام کی خارجہ پالیسی کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

• جناب نبی اکرمؐ کی خارجہ پالیسی میں یہ بات ایک بڑی حکمت عملی سمجھی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں جب آپؐ نے ”میثاق مدینہ“ کی صورت میں یہودیوں کے ساتھ ایک مشترکہ ریاست تشکیل دی تھی جس پر یہودی قائم نہ رہے اور

معاہدہ شکنی کی پاداش میں یکے بعد دیگرے یہودیوں کے تینوں قبائل بنوقینقاع، بنونضیر، اور بنوقریضہ مدینہ منورہ سے جلاوطن ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے خیبر کو مرکز بنا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور مسلمانوں کو یہودیوں کے ساتھ یہ فیصلہ کن جنگ نظر آنے لگی۔ اس پر جناب رسول اللہؐ نے خیبر کی جنگ سے پہلے قریش مکہ کے ساتھ "معاہدۂ حدیبیہ" کر کے اس محاذ کو خاموش کیا اور اس کے فوراً بعد خیبر پر حملہ کر کے یہودیوں سے نمٹ لینے کا اہتمام کیا جو کہ جنگی اور سفارتی فراست و تدبر کا شاہکار ہے۔

• جناب نبی اکرمؐ نے بین الاقوامی سطح پر برابری اور رواداری کے باوجود اگر کہیں سے کوئی چیلنج سامنے آیا تو اسے قبول کرنے میں کمزوری نہیں دکھائی اور چیلنج کو قبول کر کے اس کا بروقت سامنا کیا۔ جیسا کہ حضورؐ کے ایک سفیر کو شام کے علاقے میں قتل کیا گیا تو آپؐ نے اس دور کے عالمی عرف کے مطابق اسے اعلان جنگ تصور کرتے ہوئے حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں لشکر شام کی طرف روانہ کیا جس نے موتہ کے مقام پر جنگ لڑی اور اس میں حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ شہید ہوئے۔

• غزوہ خندق کے بعد جناب رسول اللہؐ نے اعلان فرمایا کہ قریش مکہ ہمارے خلاف آخری زور لگا چکے ہیں، اب وہ ہمارے خلاف جنگ کے لیے میدان میں نہیں آئیں گے بلکہ اب ہم ان کی طرف جنگ کرنے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ اب قریش اور ان کے ہمنوا تلوار کی جنگ نہیں لڑیں گے بلکہ شعر و شاعری اور ادب و خطابت کے ذریعے اسلام کی توہین اور مسلمانوں کی کردارکشی کی جنگ لڑیں گے۔ اسے میں آج کے عرف کے مطابق "میڈیا وار" سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ جناب نبی اکرمؐ نے یہ جنگ لڑنے کے لیے صحابہ کرامؓ کو دعوت دی تو تین بڑے شاعر حسان بن ثابتؓ، عبد اللہ بن رواحہؓ، اور کعب بن مالکؓ سامنے آئے اور ان کے ساتھ ایک بڑے خطیب ثابت بن قیسؓ بھی میدان میں ڈٹ گئے اور ان چاروں نے شاعری او رخطابت کے میدان میں کفر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

- اس کے ساتھ ہی عسکری قوت میں بھی قرآن کریم نے مسلمانوں کو اس حد تک آگے بڑھنے کا حکم دیا کہ مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے اس قدر طاقتور ہونا چاہیے کہ دشمن اس سے خوفزدہ ہوں اور طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے کہ ایک مؤثر خارجہ پالیسی کے لیے جہاں داخلی استحکام اور قومی وحدت ضروری ہے وہاں عسکری قوت میں بالادستی اور رعب بھی اس کا ناگزیر تقاضا ہے، اور قرآن کریم نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔

سامعین کرام! یہ چند نکات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ پالیسی کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں آئے جو عرض کر دیے ہیں۔ جبکہ اجتماعیت اور نظام کے حوالے سے جناب نبی اکرمؐ کی تعلیمات اور پالیسیوں کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کرنے اور انہیں آج کی زبان واسلوب میں سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ ہم مسلمان بالخصوص دینی حلقے اس اہم دینی وملی ضرورت کی طرف توجہ دے سکیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۵ فروری ۲۰۱۲ء)

نبی اکرمؐ کے معمولاتِ زندگی

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۳ فروری ۲۰۱۲ء)

امام ترمذیؒ نے ''شمائل ترمذی'' میں سیدنا حضرت امام حسینؓ سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزمرہ کے معمولات اور شب و روز کی مصروفیات کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے اپنے سوال کو تین حصوں میں تقسیم کیا:

1. گھر کے اندر جناب رسول اللہؐ جو وقت گزارتے تھے اس کی ترتیب کیا تھی؟
2. گھر سے باہر کے معمولات اور انداز کیا تھا؟
3. مجلسی زندگی کے آداب اور انداز کیا تھا؟

حضرت علیؓ نے بتایا کہ آنحضرتؐ نے اپنے گھر کے اوقات اور معمولات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وقت کا ایک حصہ اپنے ذاتی کاموں پر صرف کرتے تھے، دوسرا حصہ گھر والوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا، اور تیسرا حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہوتا تھا۔

حضورؐ اپنے ذاتی کاموں کے لیے مخصوص وقت میں ان خواص کے ساتھ ملاقات بھی کرتے تھے جو آپؐ کی خدمت میں گھر میں حاضر ہوتے تھے اور آپؐ کی مخصوص مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ یہ مجلس روزانہ ہوتی تھی، کوئی ضرورت مند ہوتا تو وہ اپنا سوال لے کر آتا اور حضورؐ حسب موقع اس کی ضرورت پوری فرما دیتے تھے۔ آپؐ اس مجلس کے شرکاء کے ساتھ امت کے اجتماعی مسائل پر گفتگو فرماتے اور عام لوگوں کے معاملات میں ہدایات دیتے تھے۔ آپؐ نے مجلس میں خاص طور پر دو باتوں کی تلقین فرما رکھی تھی کہ مسلمانوں کے عمومی مفاد اور مصلحت کی کوئی بات ہو تو اسے دیگر لوگوں تک پہنچاؤ، اور یہ کہ کوئی شخص اپنی ضرورت اور حاجت کو حضورؐ تک براہ راست پہنچانے میں کوئی دقت یا حجاب محسوس کرتا ہو تو اس کا مسئلہ آپؐ تک پہنچایا جائے۔ اس سلسلہ میں نبی اکرمؐ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی ضرورت اور مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچانے کا موقع نہیں پاتا، اس کا مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچانے والے مسلمان کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ثابت قدمی عطا فرمائیں گے۔ مجلس میں آنے والے جو لوگ سوالی ہو کر آتے تھے حضورؐ کے گھر سے کوئی چیز چکھے بغیر واپس نہیں جاتے تھے۔ اس مجلس میں جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ شریک ہونے والے بہترین افراد ہوتے تھے جو مجلس سے باہر کے لوگوں کے لیے رہنما کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ مجلس اسی قسم کی باتوں پر مشتمل ہوتی تھی اور ان سے ہٹ کر کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

گھر سے باہر کی عمومی مجالس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ جناب نبی اکرمؐ مجلس کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ کرتے تھے اور مجلس کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہوتا تھا۔ حضورؐ جب کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں تک مجلس پہنچ چکی ہوتی وہیں بیٹھ جاتے اور اس بات کی تلقین بھی فرماتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حضورؐ جس جگہ بیٹھ جاتے وہی جگہ مجلس کا صدر مقام بن جاتی تھی۔ ہر صاحب مجلس کو حضورؐ اس کا حصہ دیتے تھے اور کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے دوسرے اصحاب مجلس سے کم توجہ مل رہی ہے۔ حضورؐ کے سامنے کوئی شخص اپنا مسئلہ پیش کرتا یا کسی مسئلے پر بات کرتا تو آپؐ اس کی پوری بات سنتے تھے اور جب تک وہ اپنی بات مکمل نہ کر لیتا اس سے رخ نہیں پھیرتے تھے۔ کوئی شخص حضورؐ کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کرتا تو آپ اس کی ضرورت پوری کرتے یا نرمی کے ساتھ تسلی کی کوئی بات فرما دیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس علم کی مجلس ہوتی تھی،

حیا کی مجلس ہوتی تھی، کسی پر الزام تراشی نہیں ہوتی تھی، کسی پر تہمت نہیں لگائی جاتی تھی، کسی کی غلطی کو اچھالا نہیں جاتا تھا، اور آپؐ اپنے ساتھیوں کے لیے باپ جیسے شفیق ہوتے تھے۔

مجلس سے ہٹ کر جناب نبی اکرمؐ کا عمومی انداز اور طرز عمل یہ ہوتا تھا کہ بے مقصد باتوں سے اپنی زبان کو بچاتے تھے اور وہی بات فرماتے تھے جس کی ضرورت ہوتی تھی۔ لوگوں کو قریب کرنے کی بات کرتے تھے، دور کرنے والی باتوں سے گریز کرتے تھے۔ کسی قوم کا بڑا آپ کے پاس آتا تو اس کا اکرام کرتے تھے اور اس کے ساتھ اسی سطح کا معاملہ فرماتے تھے۔ لوگوں کو اللہ کا خوف دلاتے رہتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے مگر کسی کو بے رخی کا احساس بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے حالات معلوم کرتے تھے اور اگر کوئی غیر حاضر ہوتا تو اس کی تحسین فرماتے اور اسے تقویت دیتے۔ آپؐ اگر کوئی قبیح معاملہ دیکھتے تو اس کی قباحت کا ذکر کرتے اور حوصلہ شکنی کرتے تھے۔

حضورؐ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ لوگ خیر کے معاملات سے غافل نہ ہو جائیں اور اس بات کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ وہ اکتا نہ جائیں۔ ہر قسم کے معاملے کا آپ کے پاس حل تیار ہوتا تھا اور ہر صورتحال کے لیے مستعد ہوتے تھے۔ آپؐ حق بات کہنے سے نہیں کتراتے تھے اور ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ لوگوں میں سے آپؐ سے زیادہ قریب وہی حضرات ہوتے تھے جو اچھے لوگ ہوتے تھے۔ جناب نبی اکرمؐ کے ہاں سب سے زیادہ قابل احترام وہی شخص ہوتا تھا جو لوگوں کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہو اور آپؐ کے ہاں اس شخص کو زیادہ قدر حاصل ہوتی تھی جو عام لوگوں کے ساتھ غم خواری اور مدد میں پیش پیش ہوتا تھا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزمرہ معمولات اور طرز عمل کے بارے میں یہ ارشادات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہیں۔ جبکہ بخاری شریف کی ایک راویت کے مطابق ایک بار چند نوجوان صحابہ کرامؓ نے باہمی مشورہ کر کے حضورؐ کے گھر کے اندر کے معمولات معلوم کرنا چاہے تاکہ وہ بھی ان معمولات کی پیروی کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے امہات المومنینؓ کی خدمت میں باری باری حاضری دی اور دریافت کیا کہ آنحضرتؐ جب گھر کے اندر تشریف لاتے ہیں تو آپؐ کے معمولات کیا ہوتے ہیں؟ ازواج مطہراتؓ میں سے ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ گھر کے اندر آپؐ کے معمولات کم و بیش وہی

ہوتے ہیں جو ہر گھر کے سربراہ کے ہوتے ہیں۔ آپؐ آرام فرماتے ہیں، بیوی بچوں کو وقت دیتے ہیں، اللہ تعالی کی عبادت کرتے ہیں، آنے جانے والوں کے حالات دریافت کرتے ہیں، گھر کا کوئی کام کاج ہو تو اس میں ازواج مطہراتؓ کا ہاتھ بٹاتے ہیں، حتی کہ جوتا گانٹھ لیتے ہیں، چارپائی کی مرمت کر لیتے ہیں اور اس طرح کے ضرورت کے کام آپؐ خود کر لیا کرتے ہیں۔

حدیث وسنت اور جدید تشکیکی ذہن

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ فروری ۲۰۱۲ء)

(ڈاکٹر محمد اکرم ورک کی کتاب ''متون حدیث پر جدید ذہن کے اشکالات: ایک تحقیقی جائزہ'' کے پیش لفظ کے طور پر لکھا گیا۔)

نحمدہ تبارک وتعالی ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع کو بھی دین کا تقاضا قرار دیا گیا ہے اور متعدّد آیات قرآنی کے ذریعے جناب نبی اکرمؐ کی اس حیثیت کو واضح کیا گیا ہے کہ وہ صرف قاصد اور پیغام بر نہیں ہیں، بلکہ مطاع، اسوہ اور متبع بھی ہیں۔ اور جس طرح قرآن کریم کے احکامات وارشادات کی اطاعت لازم ہے، اسی طرح جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات واعمال اور احکام وہدایات کی اتباع اور پیروی بھی ضروری ہے، جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۳۲ میں فرمایا گیا ہے کہ:

قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکافرین۔

''آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر وہ پھر گئے تو بے شک اللہ تعالی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔''

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کے فہم اور آیات قرآنی میں اللہ تعالی کی منشا ومراد کے تعین کے لیے بھی جناب نبی اکرمؐ کو ہی معیار اور اتھارٹی قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۸۰ میں ارشاد ربانی ہے کہ:

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ومن تولی فما ارسلناک علیھم حفیظا۔

''جو رسول اللہ کی اطاعت کرتا ہے، پس تحقیق اس نے اللہ تعالی کی اطاعت کی اور جو پھر گیا، پس ہم نے آپ کو ان پر ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی تین واضح حیثیتیں ہیں:

1. وہ اللہ تعالیٰ کے احکام وارشادات کو نسل انسانی تک پہنچانے والے ہیں۔
2. اللہ تعالیٰ کے احکام وفرمودات کے شارح اور ان کی وضاحت کی اتھارٹی ہیں۔
3. اور اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ایک مطاع اور اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ میں اور ان کے وصال کے بعد بھی حضرات صحابہ کرامؓ کا معمول یہ تھا کہ:

• جناب نبی اکرمؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی بیان کرتے، صحابہ کرامؓ بلا تامل اس پر ایمان لے آتے اور اسے حکم خداوندی تسلیم کرتے تھے۔

• جس وحی کو نبی اکرمؐ قرآن کریم کا حصہ قرار دیتے، وہ قرآن کریم میں شامل کر لی جاتی اور جسے قرآن کریم کا حصہ بتائے بغیر جناب نبی اکرمؐ اللہ تعالیٰ کے ارشاد یا حکم کے طور پر بیان فرماتے، وہ ''حدیث قدسی'' قرار پاتی۔

• قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے کے معنی ومفہوم کے بارے میں کسی قسم کا اشکال پیدا ہوتا تو حضرات صحابہ کرامؓ اس کی وضاحت کے لیے جناب نبی اکرمؐ سے ہی رجوع کرتے اور نبی اکرمؐ اس کی وضاحت کے لیے جو بھی ارشاد فرما دیتے وہی اس آیت کریمہ کی حتمی تشریح سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بیسیوں شواہد حدیث وتاریخ کے ریکارڈ پر محفوظ وموجود ہیں۔

• حتیٰ کہ کسی موقع پر خود جناب نبی اکرمؐ کا کوئی قول یا عمل قرآن کریم کی کسی آیت کے ظاہری مفہوم سے متعارض محسوس ہوتا تو اس کی وضاحت بھی جناب نبی اکرمؐ سے ہی مانگی جاتی اور نبی اکرمؐ اس کی وضاحت میں جو کچھ فرما دیتے وہی قرآن کریم کی منشا سمجھی جاتی، جیسا کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہؓ نے جناب نبی اکرمؐ سے پوچھا کہ آپ فرماتے ہیں ''من حوسب عذب'' کہ جس کا حساب لیا گیا اسے عذاب دیا جائے گا، جبکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جس کا ''حساب یسیر'' ہو وہ خوش خوش اپنے گھر والوں کے پاس پلٹے گا۔ بظاہر یہ قرآن کریم کے ارشاد اور جناب نبی اکرمؐ کے

فرمان میں تعارض بنتا ہے، لیکن اس تعارض کا سوال جناب نبی اکرمؐ سے کیا گیا اور جو بات نبی اکرمؐ نے اس کے جواب میں فرمادی وہی قرآن کریم کا منشا قرار پائی۔

یہی وجہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ کا یہی تعامل رہا کہ وہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ سنت و حدیث کو بھی دین کی مستقل دلیل اور ماخذ سمجھتے تھے اور عقائد و احکام دونوں میں قرآن کریم کی طرح جناب نبی اکرمؐ کی سنت اور حدیث سے بھی استدلال کرتے تھے، جیسا کہ امام بیہقی السنن الکبری (ج ا، ص ۱۱۴) میں حضرت میمون بن مہران کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ:

ان ابابکر کان یقضی بکتاب اللہ، فان لم یجد قضی بسنۃ رسول اللہ، فان لم یجد سال المسلمین، فان اخبروہ بقضاء رسول اللہ قضی بہ، فان اعیاہ ذالک دعاروٗس المسلمین وعلماءھم، فان اجتمع رایھم علی الامر قضی بہ۔

”جناب نبی اکرمؐ کے جانشین اور خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا معمول یہ تھا کہ کوئی مسئلہ پیش آتا تو قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ اگر قرآن کریم میں اس کا حل نہ پاتے تو پھر جناب نبی اکرمؐ کا کوئی فیصلہ ان کے علم میں ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اور اگر ان کے علم میں جناب نبی اکرمؐ کا کوئی فیصلہ نہ ہوتا تو صحابہ کرامؓ سے دریافت کرتے اور وہ انہیں جناب نبی اکرمؐ کا کوئی فیصلہ بتادیتے تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اور اگر تمام تر کوشش کے باوجود جناب نبی اکرمؐ کا کوئی ارشاد نہ ملتا تو علماء کرام اور بڑے لوگوں کو جمع کرکے ان سے مشاورت کرتے اور جس بات پر ان کا اتفاق ہوجاتا اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔“

اسی طرح مسلم شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے تقدیر کے عقیدہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ تقدیر کا عقیدہ نہ رکھنے والوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور دلیل کے طور پر جناب نبی اکرمؐ کے اس ارشاد گرامی کا حوالہ دیا جس میں آپ نے ایمان کی وضاحت کرتے ہوئے ”ان تؤمن بالقدر“ کو اس میں شامل کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ حضرات صحابہ کرام کے ہاں عقائد و احکام، دونوں معاملات میں جناب نبی اکرمؐ کی سنت و حدیث مستقل دلیل سمجھی جاتی تھی اور قرآن کریم کی طرح حدیث و سنت سے بھی بطور ماخذ استدلال کیا جاتا تھا۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پورے دور میں ان کا اجماعی تعامل یہی رہا ہے، لیکن جب خوارج و معتزلہ جیسے گروہوں کو اپنے خود ساختہ عقائد و نظریات کے لیے قرآن کریم کی تعبیر نو کی ضرورت پیش آئی تو اس کی راہ میں ''حدیث و سنت'' کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہوئے اس کے انکار یا اسے کمزور اور غیر معتبر قرار دینے کے راستے تلاش کیے گئے۔ ظاہر بات ہے کہ سنت و حدیث اور تعامل صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں قرآن کریم کی کوئی نئی تعبیر و تشریح ممکن ہی نہیں ہے، اور اسی وجہ سے خوارج و معتزلہ بلکہ ان کے بعد اس راہ پر چلنے والے ہر گروہ کو ہر دور میں اس کی ضرورت پیش آتی رہی ہے کہ وہ حدیث و سنت اور تعامل صحابہ کرامؓ کی اہمیت و ضرورت سے انکار کریں اور ان کی حجیت کو مشکوک و متنازعہ بتا کر قرآن کریم کی من مانی تعبیر و تشریح کی راہ نکالیں، جیسا کہ آج کے ''متجددین'' کا طریق واردات بھی یہی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو خوارج کے ساتھ گفتگو کے لیے بھیجا تو اسی خدشے کے پیش نظر ان سے فرمایا تھا کہ:

اذھب الیھم فخاصمھم، ولا تحاجھم بالقرآن فانہ ذو وجوہ ولکن خاصمھم بالسنۃ.....

قال لہ: یا امیر المومنین فانا اعلم بکتاب اللہ منھم، فی بیوتنا نزل، قال: صدقت ولکن القرآن حمال ذو وجوہ، تقول ویقولون، ولکن خاصمھم بالسنن، فانھم لن یجدوا عنھا محیصا۔ (الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۴۱۰)

''ان کے پاس جاؤ اور ان سے بحث کرو لیکن ان کے سامنے قرآن کریم سے استدلال نہ کرنا، اس لیے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں مختلف معانی کا احتمال ہوتا ہے، بلکہ ان کے ساتھ سنت کے حوالے سے گفتگو کرنا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اے امیر المومنین، میں قرآن کریم کو ان سے زیادہ جاننے والا ہوں، یہ تو ہمارے گھروں میں اترا ہے (یعنی قرآن کریم کے حوالے سے گفتگو میں بھی وہ مجھ پر غالب نہیں آسکتے)۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن قرآن کریم احتمالات کا حامل ہے، تم ایک مطلب بیان کرو گے تو وہ دوسرا مطلب نکال لیں گے۔ تم ان کے ساتھ سنن کی بنیاد پر بحث کرنا کیونکہ ان سے بھاگنے کی راہ انہیں نہیں مل سکے گی۔''

حضرت علیؓ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ سنت رسولؐ سے ہٹ کر اگر قرآن کریم سے براہ راست استدلال کرو گے تو الفاظ اور جملوں میں مختلف معانی کے احتمالات کی وجہ

سے وہ اس سے کوئی بھی استدلال کر سکیں گے۔ اس کے برعکس سنت رسولؐ کو بنیاد بناؤ گے تو وہ ان احتمالات سے اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے اور قرآن کریم کے ایک متعیّن مفہوم کا انہیں سامنا ہو گا۔

ظاہر بات ہے کہ کسی بھی کلام کے الفاظ، جملوں اور محاوروں میں مختلف معانی کا احتمال موجود ہوتا ہے اور یہ فطری بات ہے، اس لیے ان احتمالات میں سے کسی ایک معنیٰ کی تعیین کے لیے کسی اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو مختلف معنوں اور احتمالات میں سے ایک کا تعین کر دے۔ قرآن کریم کے حوالے سے یہ اتھارٹی جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے، اس لیے حضرت علیؓ نے عبد اللہ بن عباسؓ سے فرمایا کہ تم سنت رسولؐ کی بنیاد پر گفتگو کرنا تاکہ وہ قرآن کریم کے ظاہری احتمالات سے غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ اس کی مثال موجودہ دور میں ایسے ہے جیسے ملک کے دستور کی کسی بھی دفعہ میں عام طور پر ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہوتی ہے اور آئینی ماہرین ان گنجائشوں کے حوالے سے دستوری دفعات کی مختلف تعبیرات پیش کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کے لیے حتمی اتھارٹی ہائیکورٹ یا سپریم کورٹ کو سمجھا جاتا ہے اور باقاعدہ اتھارٹی کی طرف سے کی جانے والی تعبیر ہی دستور کی حتمی تعبیر و تشریح قرار پاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ کے آخری دور اور اس کے بعد کے قریبی ادوار میں قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے معتزلہ، خوارج اور ان جیسے دیگر گروہوں نے امت کے اجماعی موقف سے الگ راستے اختیار کیے جنہیں ایک حد تک ظاہر پرستی اور عقل پرستی کی دو انتہائیں قرار دیا جا سکتا ہے، جبکہ اہل سنت کا موقف ان دو انتہاؤں کے درمیان اعتدال، توازن اور حقیقت پسندی پر مبنی چلا آ رہا ہے۔ مگر مغرب کی ''تحریک استشراق'' نے مسلمانوں کے لیے جو علمی و فکری سوالات پیدا کیے، ان کی جڑ بھی بالآخر اسی طریق واردات میں جا کر پیوست ہو گئی جو معتزلہ اور خوارج نے اختیار کیا تھا کہ قرآن کریم کو سنت رسولؐ، تعامل صحابہ کرامؓ اور امت کے جمہوری تسلسل سے الگ کر دیا جائے تاکہ اس کی من مانی تشریح آسان ہو جائے۔

''استشراق'' کی فکری اور علمی تحریک کے دو مراحل تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کا آغاز تو تیرہویں صدی عیسوی میں اس وقت ہوا جب تاتاریوں نے ۱۲۵۸ھ میں بغداد کو پامال کرنے کے صرف دو سال بعد ۱۲۶۰ھ میں عین جالوت میں سلطان المظفرؒ

کی سربراہی میں کمانڈر ظاہر بیبرس کے ہاتھوں خوفناک شکست کھا کر ہمیشہ کے لیے پسپائی اختیار کرلی اور اس کے بعد صلیبی جنگوں میں بھی صلیبی قوتوں کو پے در پے شکستوں نے بدحواس کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ ۱۲۹۱ھ میں سلطان الملک الاشرفؒ کے ہاتھوں عکہ کی آخری اور فیصلہ کن شکست سے دوچار ہوئے تو صلیبیوں کی مذہبی قیادت کو دو باتوں نے سخت پریشان کر دیا۔ ایک یہ کہ اگر تاتاریوں نے مسلمانوں کا مذہب قبول کر لیا تو مسلمانوں کی قوت کئی گنا بڑھ جائے گی، اور دوسرا یہ کہ پوپ اربن ثانی کی شروع کردہ صلیبی جنگوں کے عبرتناک خاتمہ کے بعد مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اب کون سی مسیحی قوت سامنے آ سکے گی؟ چنانچہ اس دور کے معروف مسیحی مبلغ ریمنڈس للس (Reymundus Lullus) نے، جس نے تیونس اور دیگر علاقوں میں نصف صدی تک مسیحی دعوت کے لیے مشنری خدمات سرانجام دیں، ان خدشات کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ:

> ”اگر نسطوری عیسائیوں کو اپنی صف (کیتھولک) میں شریک کر لیا جائے اور تاتاریوں کو عیسائی بنالیا جائے تو سارے سراسین (مسلمان) بآسانی تباہ کیے جاسکتے ہیں، لیکن خوف یہ بھی ہے کہ اگر ان تاتاریوں نے ترغیب یا تحریص کے باعث شریعت محمدیہ تسلیم کرلی تو پھر عالم عیسائیت کے لیے شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا۔“
> (بحوالہ ”اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین کا انداز فکر“ از ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی، ص ۱۶۹)

یہ خوف بالآخر سامنے آ گیا اور تاتاریوں نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کر لیا بلکہ وہ اسلام کا بازوئے شمشیر زن بن گئے تو عسکری میدان جنگ سے مکمل مایوس ہو کر مسلمانوں کو مسیحیت کی دعوت دینے اور ان کے ساتھ علمی و فکری مباحثوں کا راستہ اختیار کیا گیا جس کے لیے ریمنڈس للس نے کلیسا کو دعوت دی کہ

> ”علوم شرقیہ کے مطالعہ کو روحانی صلیبی جنگ کے طور پر استعمال کیا جائے۔“

چنانچہ ریمنڈس للس نے تیونس کو اپنی روحانی صلیبی جنگ کا میدان بنایا، علوم شرقیہ کے مطالعہ کے مدارس قائم کیے، مسلم علماء کے ساتھ مناظروں کا بازار گرم کیا اور نصف صدی کی مسلسل تگ و دو کے بعد تیونس میں ہی قتل ہو کر اس مشن کے لیے اپنی جان بھی دے دی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: Philip Schaff, "History of the Christian Church", vol. 5, p. 433-437)

اس کے ساتھ ایک اور مسیحی دانشور بیکن کو بھی اسی فکر کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں مسیحیت کے عمومی علمی اور دینی ماحول کو تو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے لیکن علوم شرقیہ کے مطالعہ کی استشراقی تحریک کی بنیاد فراہم کر گئے اور ''روحانی صلیبی جنگ'' کے عنوان سے اس کا ہدف بھی انہوں نے طے کر دیا۔ البتہ سولہویں صدی عیسوی میں، جو بائبل کی تعبیر وتشریح میں پاپائے روم کی اتھارٹی بلکہ اجارہ داری کو مارٹن لوتھر کی طرف سے چیلنج کیے جانے کی صدی ہے اور پروٹسٹنٹ فرقے کا دور آغاز ہے، تحریک استشراق نے نئی کروٹ لی اور اسے یہ امکان دکھائی دینے لگا کہ اگر مسیحیت میں اصلاح علوم اور مذہبی ڈھانچے کی ری کنسٹرکشن کے ذریعے سے قدیم مذہبی روایات سے بغاوت ہو سکتی ہے تو مسلمانوں میں اس تجربے کو دہرانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اور یہ بغاوت اگر کامیاب ہو گئی تو مسلمانوں کو ان کے علمی ماضی سے کاٹ کر نئے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے اور عسکری میدان کی شکست کو فکری میدان کی فتح میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

تاریخی ترتیب کے لحاظ سے ہمیں نظر آتا ہے کہ مارٹن لوتھر کی وفات کے بعد اگلی نصف صدی کے اندر ہندوستان کے مغل بادشاہ اکبر نے ''دین الٰہی'' کے نام سے جو نیا دینی ڈھانچہ قوت کے زور پر متعارف کرانے کی ناکام کوشش کی، وہ اسی طرح کی ری کنسٹرکشن کا نمونہ تھا جسے مارٹن لوتھر اور اس کے قائم کردہ پروٹسٹنٹ فرقہ نے یورپ میں کامیابی کے ساتھ عملی وجود دے دیا تھا۔ لیکن اسلام کی مضبوط علمی روایت کے سامنے اکبر بادشاہ کی قوت اور اقتدار کا زور نہ چل سکا اور اکبر بادشاہ کے منظر سے ہٹتے ہی ''دین الٰہی'' کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔

یہ ایک الگ بحث طلب نکتہ ہے کہ جس مقصد میں مارٹن لوتھر کو یورپ میں کامیابی حاصل ہو گئی، اس میں اکبر بادشاہ کو ہندوستان میں کامیابی کیوں حاصل نہ ہو سکی، جبکہ مارٹن لوتھر ایک عام مذہبی راہنما تھا اور اکبر بادشاہ ہندوستان کا سب سے باجبروت بادشاہ متصور ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت ہمارا یہ موضوع نہیں ہے کیونکہ ہم تحریک استشراق کے اس نئے دور کی بات کر رہے ہیں جس میں یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ مسلمانوں کو اب مناظروں اور مباحثوں میں زیر کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرنے کی بجائے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی تحریک پیدا کر دی جائے جو ایک ہزار سال سے چلی آنے والی مذہبی اتھارٹی کو مشکوک بنا دے اور مسیحیت کی طرح اسلام میں بھی اصلاح علوم اور دین کی تشکیل نو کا ذہن پیدا کر دیا

جائے۔ جس کا ایک مشاہداتی منظر ہم نے ہندوستان پر برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار کے بعد اس ملک کے نئے نظام تعلیم کی بنیاد رکھنے والے برطانوی دانشور لارڈ میکالے کے اس تاریخی مقولے کی صورت میں دیکھا کہ میں نے ایک ایسا نظام تعلیم ترتیب دیا ہے جس سے گزر کر مسلمان اگر مسیحی نہیں ہوگا تو مسلمان بھی نہیں رہے گا۔

تحریک استشراق کا ہدف یہی تھا اور اب بھی یہی ہے۔ بلا شبہ مستشرقین نے علوم اسلامیہ کے مطالعہ و تحقیق میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں اور علمی حوالے سے ان خدمات کا اعتراف نہ کرنا، ناانصافی اور بخل ہوگا۔ لیکن مقاصد کے اعتبار سے مستشرقین کی علمی خدمات اور لارڈ میکالے کے تعلیمی منصوبے میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ نتائج و ثمرات کے معاملے میں اکبر بادشاہ کی طرح انہیں بھی مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو پا رہے، اس لیے کہ نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی فیصلہ کن اکثریت اپنی قومی مذہبی روایت اور علمی تسلسل کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہے جس طرح آج سے دو صدیاں پہلے تھی، اور مسلمانوں کے اعتقادی اور علمی قلعے میں شگاف ڈالنے کی مغربی کوششوں کا نتیجہ خود مغرب کو اپنا سر پھوڑنے کے سوا اب بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔

البتہ اس ضمن میں مستشرقین کے اٹھائے ہوئے مختلف اعتراضات سے بعض مسلمان اہل دانش یقیناً متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے خیال کے مطابق اسلام اور پیغمبر اسلام کو جدید مغربی ذہن کے اعتراضات سے بچانے کا آسان نسخہ یہ تجویز کیا ہے کہ ذخیرۂ حدیث میں ایسے اعتراضات کی بنیاد بننے والی احادیث کا ہی سرے سے انکار کر دیا جائے۔ گزشتہ دنوں بعض اصحاب قلم نے اخبارات میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کے نکاح کے وقت ان کی عمر کی بحث چھیڑی اور کہا کہ ہمیں احادیث کی وہ تمام روایات مسترد کر دینی چاہئیں جو جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے بارے میں آج کی دنیا، بالخصوص مغرب کے اعتراضات کا باعث بنتی ہیں۔ اور چونکہ مغرب کم سنی کی شادی کو قابل اعتراض سمجھتا ہے اس لیے بخاری شریف کی وہ روایت ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہونی چاہیے جس میں بتایا گیا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال تھی۔

جہاں تک اس جذبے کا تعلق ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر مغرب کے اعتراضات کا محققانہ جواب دینا ضروری ہے، یہ انتہائی قابل قدر ہے۔ اسی طرح نکاح اور رخصتی کے وقت ام المومنین حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں یہ بحث ایک عرصے سے

جاری ہے اور بحث و تحقیق کی حد تک اس میں کوئی اشکال کی بات بھی نہیں ہے۔ ہر مؤرخ اور محقق کا حق ہے کہ روایات کی بنیاد پر اپنی تحقیق کے مطابق کوئی رائے قائم کرے اور اس کا اظہار بھی کرے۔ اس نوعیت کے سیکڑوں مسائل امت کے اہل علم میں مختلف فیہ چلے آ رہے ہیں اور ان پر بحث و تمحیص کا سلسلہ بھی جاری ہے جبکہ آئندہ بھی قیامت تک ان مباحث کا دروازہ کھلا ہے۔ البتہ بحث کا یہ پہلو کہ جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے بارے میں مغرب کے اعتراضات اور طعن و تشنیع کا جواب دینے کے لیے ہم اپنی ہی روایات اور علمی اثاثے کی اکھاڑ پچھاڑ میں لگ جائیں، بہرحال قابل توجہ ہے اور ہمارے خیال میں ایسے مسائل میں اپنے علمی ذخیرے کے درپے ہونے سے پہلے ہمیں اس بات کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ مغرب کے اعتراضات کی فکری اساس کیا ہے اور اس طعن و تشنیع کی اپنی علمی حیثیت کیا ہے جس کی بنیاد پر اسلام کی تعلیمات یا جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کو مورد طعن قرار دیا جا رہا ہے۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مغرب کے اٹھائے ہوئے مطاعن و اعتراضات کی علمی حیثیت کا تجزیہ کیا جائے اور ہر مغربی اعتراض کو درست تسلیم کرنے کی بجائے اس کی خامی کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر ہمارا المیہ ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ کے بعد مغربی فلسفہ و ثقافت کا اس سطح پر ناقدانہ جائزہ لینے والا اور کوئی مفکر سامنے نہیں آیا اور اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ خود اقبالؒ کا نام لینے والے اس معاملے میں اقبالؒ کی راہ پر چلنے کی بجائے مغربی فلسفہ و ثقافت کی نام نہاد علمی برتری کے سامنے سربسجود دکھائی دے رہے ہیں۔

بہرحال مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے اپنی علمی و فکری جدوجہد کا ہدف مسلمانوں کے علمی ماضی بالخصوص حدیث نبویؐ اور سنت رسولؐ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کو قرار دے رکھا ہے اور اس کے لیے مسلسل علمی، تحقیقی اور مطالعاتی کام جاری ہے۔ لیکن مسلم علماء نے مغربی یورپ کی مسیحی مذہبی قیادت کی طرح سرنڈر کر دینے کی بجائے علمی اور تحقیقی میدان میں پوری جرأت کے ساتھ اس کا سامنا کیا ہے اور تحقیق و استدلال کی قوت سے اس کا راستہ روکنے میں مجموعی طور پر وہ کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ حدیث و سنت کی حجیت و اہمیت کے انکار کی وجہ ہمارے نزدیک وہی ہے جس کا ہم نے سطور بالا میں تذکرہ کیا ہے اور اسی لیے مستشرقین کی طرف سے اس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، مگر مسلم علماء کی کاوشیں انتہائی قابل قدر ہیں کہ انہوں نے مسلم امہ کی اکثریت کو حدیث و سنت کے

بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہونے سے عالم اسباب میں بچا رکھا ہے اور چند محدود حلقوں کے علاوہ حدیث و سنت کے بارے میں امت مسلمہ اپنے قدیم موقف اور روایت پر بحمد اللہ تعالیٰ پوری دلجمعی کے ساتھ قائم ہے۔

حدیث و سنت کے بارے میں مستشرقین اور ان کے زیر اثر بعض مسلمان اہل دانش کی طرف سے اٹھائے جانے والے سوالات اور شکوک و شبہات پر ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد اکرم ورک نے بھی قلم اٹھایا ہے جو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ایک عرصہ سے ہمارے رفیق کار ہیں اور علمی، تحقیقی اور فکری سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ انہوں نے جس محنت، نکتہ رسی اور گہرائی کے ساتھ ان سوالات اور شکوک و شبہات کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے جوابات دیے ہیں، اس پر وہ داد کے مستحق ہیں اور ان کی یہ علمی کاوش یقیناً بہت سے نوجوان اہل علم کے لیے راہنمائی کا باعث بنے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبولیت سے نوازیں اور دونوں جہانوں میں ثمرات و برکات سے بہرہ ور فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

اسلامی خلافت ۔ دلیل و قانون کی حکمرانی

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۳۰ جنوری ۲۰۱۲ء)

۲ تا ۴ جنوری کو جامعہ اسلامیہ کلفٹن کراچی کی مجلس صوت الاسلام کے زیر اہتمام فضلائے درس نظامی کے ایک تربیتی کورس میں مسلسل تین روز تک ''خلافت'' کے عنوان پر گفتگو کا موقع ملا۔ یہ کورس ایک تعلیمی سال کے دورانیے پر مشتمل ہوتا ہے اور کئی سالوں سے جاری ہے، مختلف اصحاب فکر و دانش اپنے اپنے پسندیدہ موضوعات پر اس میں گفتگو کرتے ہیں، مجھے بھی ہر سال دو تین روز کے لیے حاضری کی سعادت حاصل ہوتی ہے اور منتظمین کے ساتھ ساتھ فضلائے درس نظامی کا ذوق اور طلب دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اس سال کراچی میں حاضری کے موقع پر مجھے تین نشستوں میں بات کرنا تھی، میں نے خود ہی اپنے لیے یہ موضوع منتخب کیا کہ ''خلافت'' کے بارے میں کچھ عرض کرنا زیادہ مناسب بات ہوگی۔ اس کے بعد ۱۲ جنوری کو اسلام آباد کے آبپارہ کمیونٹی سنٹر میں ''مسلم سٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں بھی اسی موضوع کے بعض پہلوؤں پر گزارشات پیش کیں، کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ ان معروضات کو قلمبند ہو جانا چاہیے

چنانچہ ان حضرات کی فرمائش بلکہ اصرار پر مذکورہ محافل میں اس موضوع پر ہونے والی گفتگو کو ترتیب کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

”خلافت“ کا لفظی معنی نیابت ہیں، خلف کے معنی ہیں ”وہ کسی کے پیچھے چلا۔ اور کسی کے جانے کے بعد اس کی جگہ سنبھالنے والے کو ”خلیفہ“ کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں خلیفہ کا لفظ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے بولا گیا ہے جس کی ایک تعبیر یہ ہے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی نسل نے زمین پر بسنے والی پیشرو مخلوق یعنی جنوں کی جگہ سنبھالی ہے اور وہ ان کے خلیفہ ہیں۔ ایک مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنی خلافت عطا فرمائی ہے کہ زمین میں انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں:

- ایک یہ کہ زمین پر بسنے والے ہزاروں قسم کے جانوروں میں سے زمین پر تصرف کا ملکہ اور مواقع انسان ہی کو عطا ہوئے ہیں۔ زمین کی سطح پر، اس کے اندر، فضا میں اور سمندر میں بسنے والی مخلوقات کو شمار کیا جائے تو اس کی ہزاروں انواع گنی جاتی ہیں لیکن ان سب میں زمین کے اندر، سطح، فضا اور سمندر میں تصور کی صلاحیت انسان کو ہی حاصل ہے اور وہی سارے نظام کو کنٹرول کر رہا ہے، گویا زمین پر تکوینی تصرف کی ایک صورت انسان کے پاس ہے۔
- جبکہ انسان کے اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی اور دوسری زمینی مخلوقات کے لیے جو نظام اور قوانین مقرر فرمائے ہیں ان کے نفاذ کی ذمہ داری انسان پر ہے۔ وہ خدا کی زمین پر خدا کا نظام نافذ کرنے پر مامور ہے اور اس کی ڈیوٹی ہے کہ انسانی سوسائٹی اور زمین کا نظام اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق چلائے۔

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ کہا گیا ہے اور ارشاد ربانی ہے کہ:

> ”اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، پس آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کریں اور خواہش کی پیروی نہ کریں۔“

یہاں خلیفہ کا لفظ حکمرانی اور قوانین و نظام کے حوالے سے استعمال ہوا ہے اور سیدنا حضرت داؤدؑ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ یہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہشات کی پیروی اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹا دیتی ہے اور گمراہ کر دیتی ہے۔ گویا حضرت داؤدؑ کو خطاب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ صحیح

قانون وہی ہے جو حق یعنی وحی کی روشنی میں ہو جبکہ انسانی خواہشات پر بننے والا قانون و نظام گمراہی کا نظام و قانون ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں خلافت کا مفہوم اور پس منظر یوں بیان فرمایا ہے کہ:

"بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت انبیاء کرام علیہم السلام کیا کرتے تھے، ایک نبی فوت ہو جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کی جگہ آجاتا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، البتہ خلفاء ہوں گے۔" (بخاری شریف)

بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت کی مختلف صورتیں تھیں۔ بعض پیغمبر خود ہی حکمران ہوتے تھے جیسے حضرت یوسف، حضرت موسی، حضرت یوشع بن نون، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام۔ اور بعض نبی بادشاہ گر تھے جیسے حضرت سموئیلؑ سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ ان پر کسی کو بادشاہ بنایا جائے تاکہ وہ اس کی قیادت میں ظالم بادشاہ جالوت کے خلاف جہاد کر سکیں، چنانچہ انہوں نے اللہ تعالی کے حکم کے مطابق حضرت طالوت کو بادشاہ بنا دیا جن کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جالوت کے خلاف فلسطین میں جنگ لڑی۔ اس جہاد کی تفصیلات سورۃ البقرہ کی آیات میں بیان ہوئی ہیں۔

جناب نبی اکرمؐ کے اس ارشاد گرامی کی رو سے "خلافت" سیاسی معاملات میں آنحضرتؐ کی نیابت کا نام ہے۔ اور اسلام کے سیاسی نظام کا بنیادی اصول یہ قرار پاتا ہے کہ وہ سیاسی قیادت جو اس سے پہلے حضرات انبیاء کرامؑ کیا کرتے تھے وہ جناب نبی اکرمؐ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے باعث اب خلفاء کے ہاتھ میں ہوگی اور یہ خلفاء آپؐ کی نیابت کریں گے۔ چنانچہ فقہاء کرام جب خلافت کی تعریف کرتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ "نیابتا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم" امت کے اجتماعی معاملات کو جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے چلانا۔ اسی وجہ سے خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو "خلیفۃ رسول اللہ" (اللہ کے رسول کا جانشین) کہا جاتا تھا۔ لیکن ان کے بعد ان کے جانشین حضرت عمرؓ کو "خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ" (اللہ کے رسول کے جانشین کا جانشین) کہا جانے لگا تو ان کو الجھن ہوئی کہ تیسرے اور چوتھے خلیفہ کو کس لقب سے یاد کیا جائے گا؟ ایک دن غالبا حضرت عمرو بن العاصؓ نے انہیں "امیر المؤمنین" کے لقب سے خطاب کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ خطاب صحیح ہے، اب اس کے بعد انہیں امیر المؤمنین ہی کہا جائے۔

یہاں ایک نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی نظام میں ''خلیفہ'' اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں کہلاتا بلکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا حامل تصور کیا جاتا ہے، جیسا کہ فقہاء کرام نے خلیفہ کی تعریف میں لکھا ہے۔ بلکہ قاضی ابو یعلیٰ نے ''الاحکام السلطانیۃ'' میں روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت صدیق اکبرؓ کو ''یا خلیفۃ اللہ'' کہہ کر خطاب کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اسے ٹوک دیا کہ ''لست بخلیفۃ اللہ، انا خلیفۃ رسول اللہ'' یعنی میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوں۔ اسلامی سیاست کے ایک طالب علم کے طور پر میرا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ فرما کر خلافت کا ایک بڑا اصول بیان فرمایا ہے اور پاپائیت کی جڑ کاٹ دی ہے۔

پاپائیت کا تصور یہ ہے کہ پاپائے روم جو کیتھولک مسیحیوں کے عالمی مذہبی پیشوا کے طور پر اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہیں اور وہ مذہب کی کسی بات کی جو تشریح کریں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھا جائے۔ وہ مذہب کی تعبیر کی فائنل اتھارٹی ہیں اور ان کے کسی فیصلے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر خلیفہ کو بھی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ قرار دیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے فائنل اتھارٹی تصور کیا جائے گا اور اس کی بات کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کے برعکس جناب رسول اکرمؐ کے خلیفہ کے طور پر خلیفۂ وقت قرآن و سنت کا پابند ہوتا ہے کہ اس کی ہر بات کی دلیل قرآن کریم سے یا آنحضرتؐ کی سنت و حدیث سے تلاش کرنا ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کا منصب سنبھالتے ہی اپنے پہلے خطبہ میں اس بات کو واضح کر دیا اور فرمایا کہ میں قرآن و سنت کی اتباع کا وعدہ کرتا ہوں اور تمہیں حق دیتا ہوں کہ اگر مجھے قرآن کریم یا سنت نبویؐ کے خلاف چلتا ہو دیکھو تو مجھے سیدھا کر دو۔ اسے دلیل اور قانون کی حکومت کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ایک ایسے قانون و دستور کی پابندی کا اعلان کر رہا ہے جو نہ اس نے خود بنایا ہے اور نہ ہی اسے اس میں ترمیم کا اختیار حاصل ہے۔

بادشاہت میں بادشاہ خود قانون بنانے والا ہوتا ہے اور خود ہی اس میں ترمیم کا اختیار رکھتا ہے، اس لیے اگر بادشاہ قانون کی پابندی کی بات کرتا ہے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ دستور و قانون بناتی ہے اور وہ اس میں ترمیم بھی کر سکتی ہے، اس لیے اس کی طرف سے دستور و قانون کی پابندی کا دعویٰ محل نظر ہے۔ ان دونوں کے برعکس اسلامی خلیفہ قرآن و سنت کا پابند ہوتا ہے اور خود حکمران کہلانے کی بجائے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا منصب رکھتا ہے۔ جبکہ اسے قرآن و سنت میں ردو

بدل یا اس کی من مانی تشریح کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس لیے صحیح معنوں میں اگر کسی حکومت کو قانون کی حکومت کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف اسلامی خلافت ہے جس کی بنیاد قوت یا خاندانی بالادستی پر نہیں بلکہ دلیل پر ہوتی ہے۔ اس لیے دنیا کی تاریخ میں حضرات انبیاء کرامؑ کے بعد اگر دلیل اور قانون کی بنیاد پر کوئی حکومت قائم ہوئی ہے تو وہ اسلامی خلافت ہے جس کے بنیادی اصول خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پہلے خطبہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد ان کی جانشینی کے بارے میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک امامت کا اور دوسرا خلافت کا۔ اہل تشیع امامت کے علمبردار ہیں اور اہل سنت خلافت کی بات کرتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ان دونوں میں بنیادی فرق بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میری طالبعلمانہ رائے میں خلافت اور امامت میں درج ذیل فرق پائے جاتے ہیں:

- امامت منصوص ہے یعنی اس کا قیام نص اور مبینہ طور پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے ذریعے عمل میں آیا اور اس میں امت کی رائے کا کوئی دخل نہیں۔ اس لیے اہل تشیع حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں ”وصی رسول اللہ“ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ جبکہ خلافت منصوص نہیں ہے، یعنی خلیفہ کا تقرر کسی نص یا وصیت کے ذریعے نہیں ہوا بلکہ خلیفہ اول کا انتخاب امت کی اجتماعی صوابدید کی بنیاد پر عمل میں لایا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت اور عمومی بحث و مباحثہ کے بعد آزادانہ رائے کے ذریعے جناب رسول اللہ کا جانشین منتخب کیا تھا۔
- امامت نسبی اور خاندانی ہے کہ جن بزرگوں کو اہل تشیع بارہ اماموں کا درجہ دیتے ہیں وہ ایک دوسرے کے نسبی وارث تھے۔ جبکہ خلافت راشدہ کے چاروں بزرگوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا نسبی وارث نہیں ہے۔
- اہل تشیع کے عقیدہ کے مطابق امام معصوم ہوتا ہے۔ اہل سنت خلیفہ کو معصوم نہیں سمجھتے بلکہ وہ شرعی طور پر مجتہد کا درجہ رکھتا ہے۔ معصوم سے خطا کا احتمال نہیں ہوتا اس لیے اس کی بات حتمی ہوتی ہے جس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ مجتہد کے فیصلوں میں خطا و صواب دونوں کا احتمال موجود ہوتا ہے،

اس کے کسی بھی فیصلے سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے اور خلفاء راشدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔

• خلیفہ اپنی رعیت اور رائے عامہ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اپنے ابتدائی خطبوں میں اس کی وضاحت کی ہے۔ جبکہ امام کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا۔

• عوام کو خلیفہ کے احتساب کا حق حاصل ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے ایک بدوی نے کھلے اجتماع میں چادر کے بارے میں پوچھ لیا تھا اور حضرت عثمانؓ خود پر لگائے گئے الزامات کے بارے میں حج کے موقع پر کھلی عدالت لگا کر اپنے حکام سمیت عوامی احتساب کے لیے پیش ہو گئے تھے، بلکہ اس عوامی احتساب کا خود سرکاری طور پر اہتمام کیا تھا۔ مگر عوام امام کا احتساب کرنے کا حق نہیں رکھتے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ تصور ہوتا ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا۔

• اثنا عشری اہل تشیع کے ہاں امامت کا تسلسل بارہویں امام پر رک گیا ہے، جو ان کے خیال میں زندہ ہیں اور ان کے عقیدہ کے مطابق آخری دور میں انہیں واپس آنا ہے اور اس فہرست میں مزید اضافہ ممکن نہیں ہے۔ جبکہ خلافت کا تسلسل ہر دور میں قائم رہا ہے اور آج بھی شرعی شرائط اور طریق کار کے مطابق کسی بھی مسلمان کو خلیفہ منتخب کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ”پاپائیت“ اور ”تھیا کریسی“ کا یہ تصور کہ ایک شخص خدا کے نمائندہ کے طور پر حکومت کرے، قانون و دستور کی تعبیر میں حتمی اتھارٹی کا درجہ رکھتا ہو اور کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو، یہ تصور اہل سنت کے نظام خلافت میں تو سرے سے موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی امکان ہے۔ البتہ اہل تشیع کے فلسفہ امامت میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

اس حوالہ سے ایک اور بات بھی ذہن میں رکھ لینی چاہیے کہ آج کے دور میں امامت اور خلافت کے ان دونوں فلسفوں کو دستوری شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے اور خلافت و امامت کی معروف اصطلاحات پر زور دیے بغیر یہ دونوں دستوری ڈھانچے آج موجود ہیں:

• مثلاً ایران کا دستور امامت کے تصور پر تشکیل دیا گیا ہے کہ اصل حاکم تو "امام غائب" ہیں لیکن چونکہ ان کی غیبوبت کا زمانہ ہے اس لیے ان کی نمائندگی وقت کے سب سے بڑے فقیہ کریں گے جو امام غائب کی نمائندگی اور اختیارات کے ساتھ اصل حاکم ہوں گے۔ اسے "ولایت فقیہ" کا عنوان دیا گیا ہے، ایرانی انقلاب کے بعد ولایت فقیہ کا یہ منصب جناب خمینی کے پاس رہا اور ان کی وفات کے بعد سے جناب خامنہ ای اس منصب پر فائز ہیں، انہیں ایران کے دستوری و قانونی نظام میں فائنل اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے۔ وہ حکومت، پارلیمنٹ اور عدلیہ سمیت کسی بھی ادارے کے فیصلے کو ویٹو کر سکتے ہیں اور ان کے فیصلے پر نظر ثانی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے۔ گویا وہ "امام معصوم" کہلائے بغیر عملاً امام معصوم ہی ہیں اور میرے خیال میں "پاپائیت" کا تصور بھی کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔

• دوسری طرف پاکستان میں "قرارداد مقاصد" کے ذریعے یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے، حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے پابند ہوں گے اور قرآن و سنت کے دائرے سے تجاوز نہیں کریں گے۔ میرے خیال میں اگر آج "خلافت" کو دستوری شکل دی جائے تو اس کی بنیاد یہی ہوگی کہ (۱) اعلیٰ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے (۲) خلیفۂ وقت اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین نافذ کرنے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے (۳) خلیفہ کا انتخاب عوامی رائے سے ہوگا (۴) خلیفہ اور اس کی حکومت قرآن و سنت کے مطابق حکومت کرنے کی پابند ہوں گے (۵) خلیفہ اور اس کے حکام عوام کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں یہ اصول "خلافت" کی اصطلاح اختیار کیے بغیر شامل کر لیے گئے ہیں، اگر ان پر عمل ہو جائے تو ایک صحیح اسلامی ریاست قائم ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایران کی قیادت اپنے فلسفہ کے ساتھ مخلص معلوم ہوتی ہے اور پورے خلوص و دیانت کے ساتھ اس پر عمل کر رہی ہے، جبکہ پاکستان کے مقتدر طبقات کے نزدیک دستور کی اسلامی حیثیت اور دفعات و قوانین کی پوزیشن

صرف ''شوپیس'' اور نمائش کی ہے اس لیے دستور کے ساتھ مسلسل منافقت روا رکھی جا رہی ہے۔

اس کے بعد میں اس طرف آؤں گا کہ آج کے دور میں اسلامی خلافت کس طرح قائم کی جا سکتی ہے؟ ہمارے فقہاء کرام نے انعقاد خلافت کی جو عملی صورتیں بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

1. امت اپنی اجتماعی صوابدید پر خلیفہ کا انتخاب کرے۔ یہ عوامی رائے سے ہو یا ارباب حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں اس کے بارے میں بحث کی گنجائش موجود ہے۔
2. خلیفۂ وقت کسی کو ارباب حل و عقد کی مشاورت کے ساتھ اپنا جانشین نامزد کر دے۔
3. خلیفہ براہ راست جانشین نامزد کرنے کی بجائے کوئی کمیٹی بنا دے جو اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لے۔
4. مجلس شوریٰ خلیفہ کا انتخاب کر لے۔
5. کوئی شخص جو خلافت کی اہلیت رکھتا ہو بزور طاقت اقتدار پر قبضہ کر لے اور امت اسے قبول کر لے۔

فقہاء کرام کے ہاں مسلمہ فقہی اصولوں کے مطابق خلافت کے انعقاد کی یہی پانچ صورتیں ہیں جن میں سے کسی ایک صورت کے ذریعے خلافت قائم ہو سکتی ہے اور خلیفہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے آج کے حالات میں دوسری، تیسری اور چوتھی صورت قابل عمل نہیں ہے اس لیے کہ اس وقت کوئی شرعی خلیفہ موجود نہیں ہے جو کسی کو نامزد کر سکے یا کمیٹی بنا سکے اور کسی شرعی خلیفہ کی مقرر کردہ کوئی شوریٰ بھی موجود نہیں ہے جو انتخاب خلیفہ کا حق رکھتی ہو۔ آج کے دور میں خلافت کے قیام کی پہلی اور آخری صورت ہی قابل عمل ہے کہ امت خود کسی خلیفہ کا انتخاب کرے یا کوئی اہل شخص طاقت کے ذریعے کسی مسلم ملک کے اقتدار پر قبضہ کر کے خلافت کا اعلان کر دے اور ملک کے عوام اسے قبول کر لیں۔ اس لیے میرے خیال میں اب اگر ہم خلافت قائم کرنا چاہیں تو عملی صورت یہ ہوگی کسی مسلم ملک کی منتخب پارلیمنٹ خلافت کے نظام کو اپنانے کا فیصلہ کرے اور اس کے تمام شرعی و دستوری تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنے ملک کو ''اسلامی امارت'' قرار دے۔ اور

چند اسلامی ریاستیں وجود میں آجانے کے بعد وہ آپس میں مل کر ”خلافت اسلامیہ“ قائم کر کے خلیفہ کا انتخاب کر لیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خلافت کے نظام کو عالمی نظام قرار دیا ہے جو مختلف ریاستوں اور حکومتوں کے درمیان انصاف کے قیام اور شرعی قوانین کے نفاذ کی نگرانی کرتا ہے۔ اس لیے علاقائی اسلامی حکومتوں کو خلافت کی بجائے ”امارت اسلامیہ“ کا نام دینا ہی زیادہ مناسب ہے جیسا کہ طالبان نے افغانستان میں شرعی حکومت قائم کرنے کے بعد خلافت کے اعلان کی بجائے اسے ”امارت اسلامیہ افغانستان“ قرار دے دیا تھا۔ اور میرے خیال میں یہ انتہائی دانشمندانہ فیصلہ تھا اس لیے کہ ہر علاقے میں الگ الگ خلافت قائم ہوگی تو باہمی ٹکراؤ اور خلفشار کی انتہائی افسوسناک صورتحال پیدا ہو جائے گی۔

اس وقت عالم اسلام میں خلافت کی بحالی کی بیسیوں تحریکات موجود ہیں جن کے ساتھ حالات کے مطابق مناسب مواقع پر تعاون کرتا رہتا ہوں، مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ ہم خلافت کی بحالی کی جدوجہد میں تعاون کریں گے جبکہ خلیفہ کا انتخاب اپنے وقت پر منطقی طریقہ کار کے مطابق ہوگا اس لیے ہم خلافت کے کسی موجودہ امیدوار کی حمایت نہیں کرتے۔ چند سال قبل لندن میں جبہ قبہ پہنے ہوئے ایک صاحب ایک اجتماع میں ملے، انہوں نے اپنی ہیئت اس طرح کی بنا رکھی تھی جیسے وہ واقعتاً ”خلیفۃ المسلمین“ ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جرمنی میں رہتے ہیں، ترکی کے خاندان خلافت سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے خلافت کے استحقاق کا دعویٰ کیا ہے، کچھ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں، مجھ سے انہوں نے بیعت کا تقاضا کیا۔ عربی میں گفتگو کر رہے تھے، ان کے استفسار پر میں نے عرض کیا کہ خلافت کی بحالی کے موقف سے ہم متفق ہیں لیکن خلیفہ کے نتخاب کے اس طریق کار سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں اسباق کے دوران ایک بزرگ تشریف لائے جو پاکستان ہی کے ایک علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے ملا تو انہوں نے بیعت کا تقاضا رکھ دیا کہ میں امیر المؤمنین ہوں آپ میرے ہاتھ پر بیعت کریں۔ میں نے معذرت کر دی کہ اس طرح کوئی شخص خلیفہ نہیں بن سکتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ لاہور میں خلافت کے موضوع پر سیمینار تھا جس میں مجھے بھی بلایا گیا، میں نے خلافت کی اہمیت و ضرورت اور برکات و ثمرات کے حوالہ سے گزارشات پیش کیں جن کے آخر میں دل لگی کے انداز میں عرض کیا کہ مجھے اس ہال میں پانچ چھ خلیفہ نظر آرہے

ہیں، اگر لاہور میں اتنے ہیں تو پاکستان میں کتنے ہوں گے، پھر عالم اسلام کی کیا صورتحال ہوگی اور خلافت کے نام پر کتنی خوفناک دھما چوکڑی مچ جائے گی۔

ایسی صورتحال میں جبکہ پورا مغرب "خلافت" کی واپسی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے اور عالمی قوتوں نے طے کر رکھا ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں خلافت قائم نہیں ہونے دی جائے گی اور نہ ہی شریعت نافذ ہونے دی جائے گی، اس ماحول میں خلافت کا قیام بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔ یہ ہماری شرعی و دینی ذمہ داری بھی ہے کہ جلد از جلد خلافت قائم ہو جائے لیکن اس سے کہیں زیادہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ خلافت کے نام پر امت میں کوئی نیا خلفشار پیدا نہ ہو جائے اور ہم پہلے مسائل کو سمیٹتے سمیٹتے عالم اسلام کے لیے کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ کر دیں۔

جہاں تک خلافت کی ضرورت اور اس کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے، فقہاء کرام نے اسے امت کی اجتماعی ذمہ داری اور فرض کفایہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں خلافت شرعیہ موجود ہو جس سے امت کے افراد متعلقہ امور و معاملات میں رجوع کر سکتے ہوں تو گزارہ ہو جائے گا لیکن اگر کہیں بھی خلافت اسلامیہ کا وجود نہیں ہے تو امت مسلمہ بحیثیت امت مجموعی طور پر دینی فریضہ کی تارک اور گناہگار ہوگی۔ میرے خیال میں آج کی صورتحال یہی ہے کہ ہم سب دینی فریضہ کے تارک اور گناہگار ہیں۔ فقہاء کرام نے خلافت کے وجوب پر ایک دلیل یہ دی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد سب سے پہلے یہی کام کیا تھا حتیٰ کہ آنحضرتؐ کی تجہیز و تدفین سے بھی اس کو مقدم کیا۔ اس لیے یہ صرف واجب نہیں بلکہ اہم الواجبات ہے۔ فقہاء کرام خلافت کے وجوب کی ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ قرآن و سنت کے بہت سے صریح احکام مثلاً جہاد، قیام عدل، حدود کا نفاذ اور بیت المال وغیرہ اس بات پر موقوف ہیں کہ کوئی صاحب اقتدار انہیں قائم و نافذ کرے۔ اور اصول یہ ہے کہ فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے، اس لیے قرآن و سنت کے اجتماعی اور معاشرتی احکام کے نفاذ کے لیے خلافت کا قیام فرض اور واجب ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ہم سب خلافت کے تارک ہیں۔ حکمران اس درجہ میں کہ ان کے پاس اختیار ہے مگر وہ نہیں کر رہے، جبکہ سیاسی راہنما اور علماء کرام اس طور پر کہ وہ منظم محنت کر کے ملک میں ایسی فضا قائم کر سکتے ہیں مگر ان کی اس طرف توجہ نہیں ہے۔ اسی طرح خلافت کے احیا کی جو تحریکیں اس وقت عالم اسلام میں موجود ہیں ان میں سے ہر

ایک کا ہدف صرف یہ ہے کہ کسی طرح وہ دنیا کے کسی خطہ میں اقتدار حاصل کر لیں او رخلافت کے قیام میں ان کی طرف سے پہل ہو جائے، لیکن جو اصل ضرورت ہے کہ امت میں عمومی طور پر خلافت کی بحالی کا ذوق بیدار ہو، آج کے حالات اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے رائے عامہ کو خلافت کی بحالی کے لیے منظم کیا جائے اور بھرپور عوامی قوت کے ساتھ خلافت کے قیام کی جدوجہد کی جائے، یہ کام دنیائے اسلام میں کسی جگہ نہیں ہو رہا۔

اس کے برعکس ''امامت'' کا تصور رکھنے والوں نے مربوط اور منظم محنت کر کے اسے نہ صرف عملاً قائم کر لیا ہے بلکہ کامیابی کے ساتھ اسے چلا بھی رہے ہیں۔ ایران میں شاہ کے خلاف مذہبی طبقہ نے بیداری اور بیزاری دونوں کا پوری قوت کے ساتھ اظہار کیا، جناب خمینی صاحب نے اپنی جدوجہد اور محنت کا ہدف یونیورسٹیوں کو بنایا، ان کے اساتذہ و طلبہ کی ذہن سازی کی، انہیں اپنے مذہبی فلسفہ کے مطابق حکومت کی تشکیل اور اس میں مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دینے کے لیے تیار کیا، رائے عامہ کو منظم کیا، شاہ ایران کے خلاف ذہن رکھنے والے تمام طبقوں حتیٰ کہ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کو بھی ساتھ ملایا اور پہلے شاہ کو شکست دی اور پھر اپنی تربیت، ذہن سازی اور منظم تیاری کی بنیاد پر حکومت پر قبضہ کر کے کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کو دھیرے دھیرے پس منظر کی طرف دھکیل دیا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس انقلاب کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں کو سنبھالنے اور ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تربیت یافتہ اور ذہنی طور پر پختہ افراد کی کھیپ موجود تھی جس نے انقلاب کے بعد ملک کے نظام کو سنبھال لیا اور اب تک سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس سب کچھ کی تیاری انقلاب کے بعد نہیں کی گئی بلکہ انقلاب سے پہلے یہ سارے کام درجہ بدرجہ مکمل ہو چکے تھے، اس لیے ان کا انقلاب کامیاب ہوا اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

مگر ہمارے ہاں صورتحال کیا ہے؟ مجھے اگر اس گستاخی پر معاف کر دیا جائے تو عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں خلافت کی تمام تر بحث صرف ایک دو نقطوں کے گرد گھومتی ہے کہ ''خلیفہ اول'' کون تھے اور خلافت راشدہ میں کون کون بزرگ شامل ہیں؟ ان دو باتوں سے ہٹ کر خلافت کا کوئی اور پہلو ہمارے ہاں سرے سے زیر بحث نہیں آتا اور نہ ہی ہم اس پر

غور کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، حالانکہ خلافت کا اپنا ایک مستقل نظام ہے جو سیاسی بھی ہے، معاشی بھی ہے، قانونی بھی ہے، انتظامی بھی ہے اور معاشرتی بھی ہے۔

آج کی دنیا جن معاشی مشکلات سے دوچار ہے خود دنیا نے اس کے معاشرتی پہلو کا حل یہ نکالا ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرح "ویلفیئر اسٹیٹ" کا اصول اپنایا ہے۔ برطانیہ اور ناروے سمیت بعض مغربی ملکوں نے حضرت عمرؓ کے بیت المال کے نظام پر ریسرچ کی ہے اور اس کا بہت سا حصہ اپنے نظام میں شامل کیا ہے جس کا وہ اعتراف بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کے علمی و سیاسی حلقوں کو اس کی توفیق نہیں ہے کہ وہ آج کے حالات اور معاشرتی ضروریات کو سامنے رکھ کر خلافت راشدہ کے معاشی نظام اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کے بیت المال کے سسٹم کو اسٹڈی کریں اور اسے آج کی اصطلاحات میں ایک پورے نظام کی شکل دیں۔ میں مثال کے طور پر ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں، امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جب خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تو انہیں سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ بیت المال کے دو تہائی سے زیادہ اثاثے حکمران خاندان کے قبضے میں تھے اور قومی خزانہ خالی تھا۔ انہوں نے قومی خزانے کے یہ اثاثے واپس لینے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے فدک کا باغ واپس کیا جو ان کے ذاتی قبضہ میں تھا، پھر اپنی اہلیہ فاطمہ بنت عبد الملک کے زیورات اترواکر بیت المال کو واپس بھجوائے اور پھر حکمران خاندان کا اجتماع کر کے ان سے تقاضا کیا اور چند ہفتوں کے اندر وہ بیت المال کے اثاثے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔

ہمارا آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ قومی خزانہ خالی ہے اور ملکی دولت بڑے بڑے لوگوں کے بیرونی اکاؤنٹس میں منتقل ہو چکی ہے اور اس کی واپسی کے لیے چیخ و پکار جاری ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے، اگر ہم آج کے مسائل کو سامنے رکھ کر خلافت راشدہ کے نظام کو ان کے حل کے طور پر پیش کریں اور عام لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں تو خلافت کے نظام کے لیے امت کو تیار کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔

تجارت و ابلاغ اور اسلامی تعلیمات

(رفاہ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی، راولپنڈی - ۱۰ جنوری ۲۰۱۲ء)

”رفاہ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی“ کا نام سن رکھا تھا مگر کبھی حاضری کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ۱۰ جنوری کو یونیورسٹی کے ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن (MBA) کے شعبے کی ایک تقریب میں شرکت کا موقع ملا جو راولپنڈی صدر میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی سابقہ عمارت میں واقع رفاہ یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس میں منعقد ہوئی۔ شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر عمیر صاحب اور دیگر اساتذہ سے ملاقات و گفت و شنید ہوئی اور تجارت میں تشہیر و ابلاغ کی اخلاقیات و آداب کے حوالہ سے منعقدہ تقریب میں کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا۔ رفاہ یونیورسٹی جناب پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد کی سربراہی میں پرائیویٹ سیکٹر میں ایک معیاری تعلیمی ادارے کے طور پر خدمات سرانجام دے رہی ہے اور مجھے اس میں مختلف دینی مدارس کے فضلاء کو ایم بی اے کرتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ دینی مدارس کے فضلاء کے لیے بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بطور خاص فرمایا تھا کہ دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ذہین فضلاء کو عصری تعلیمی اداروں میں جا کر دیگر علوم و فنون میں بھی مہارت حاصل کرنی چاہیے، مگر ان کا یہ ارشاد ابھی تک دینی مدارس کی تحفظاتی پالیسی کا شکار چلا آ رہا ہے، البتہ اب بعض یونیورسٹیوں میں کچھ فضلاء کو ایسا کرتے دیکھ کر مجھے بہرحال خوشی ہوتی ہے۔

سیمینار کا موضوع یہ تھا کہ مارکیٹنگ اور تجارت کے لیے جو تشہیری ذرائع اور طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں ان کی شریعت میں کس حد تک اجازت ہے اور انہیں جائز حدود میں لانے کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟ راقم الحروف نے اس سلسلہ میں جو معروضات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج کی محفل میں تجارت اور ابلاغ کے دو مختلف شعبے زیر بحث ہیں، ان میں سے ہر ایک کے مستقل تقاضے ہیں اور اپنی اپنی اخلاقیات ہیں۔ لیکن آج کے سیمینار کے موضوع میں دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے اس لیے دونوں پر تھوڑی گفتگو ہوگی۔

تجارت و صنعت

تجارت انسانی سوسائٹی کی ایک اہم ضرورت ہے اور اس پر فرد، خاندان اور سوسائٹی کی بہت سی ضرورتوں کا مدار ہے۔ لیکن آج اس حوالے سے ایک بڑا مسئلہ یہ زیر بحث ہے کہ تجارت کی اخلاقیات اور تجارت میں جائز و ناجائز کی حدود مارکیٹ نے از خود طے کرنی ہیں یا اس مسئلہ میں کسی اور کی رہنمائی بھی درکار ہے۔ آج کا عالمی فلسفہ کہتا ہے کہ انسانی سوسائٹی کو باہر سے کسی رہنمائی کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں ہے اور وہ اپنی اخلاقیات اور جائز و ناجائز کی حدود طے کرنے میں خود ہی اتھارٹی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے تجارت اور مارکیٹنگ کو بھی یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ اپنی اخلاقیات خود طے کرے اور جائز و ناجائز کی حدود خود متعیّن کرے۔ لیکن اسلام اس فلسفہ کو قبول نہیں کرتا اور آسمانی تعلیمات نے زندگی کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ تجارت و معیشت کے شعبے کو بھی وحی الٰہی کا پابند بنانے کی بات کی ہے۔

سابقہ آسمانی مذاہب کے حوالے سے بھی انسانی سوسائٹی میں اس کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا تذکرہ قرآن کریم میں اس طور پر کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کے ساتھ ساتھ تجارت میں دیانت و امانت اختیار کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ ماپ تول میں کمی نہ کرو اور خرید و فروخت کی جانے والی اشیا کا معیار مت خراب کرو، یعنی صحیح چیزیں بیچو اور صحیح وزن کے ساتھ بیچو۔ اس پر ان کی قوم نے کہا:

> ”اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کی دعوت پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور اپنے اموال میں اپنی مرضی کے ساتھ تصرف نہ کر سکیں۔“ (سورہ ہود ۸۷)

گویا ان کی قوم نے اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے ساتھ آزادانہ تصرف کو اپنا حق قرار دیا اور حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے لگائی جانے والی قدغنوں کو ان کی نماز کے حوالے سے طعن و اعتراض کا نشانہ بنایا۔ میرا خیال ہے کہ ہم بھی آج کم و بیش اسی نوعیت کی صورتحال سے دوچار ہیں۔ جبکہ اسلام نے مال اور اس کے لین دین کو اس قدر آزاد نہیں چھوڑا اور اموال و اشیا کی تجارت پر مختلف قسم کی قدغنیں عائد کی ہیں، بلکہ سرے سے مال کو انسان کی مطلقاً ملکیت کی حیثیت نہیں دی اور اسے اللہ تعالیٰ کی امانت قرار دے کر دنیا اور آخرت دونوں جگہ اس کی مسئولیت کی بات کی ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن کوئی شخص اپنی جگہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے گا جب تک کہ وہ چند سوالوں کا جواب نہیں دے چکے گا۔ ان میں سے ایک سوال مال و دولت کے بارے میں ہو گا کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں پر خرچ کیا؟ آمدنی کا ذریعہ اور خرچ کا مصروف دونوں اسے بتانا پڑیں گے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ کی رو سے انسانی سوسائٹی یا مارکیٹ اپنی حدود، قواعد و ضوابط اور اخلاقیات طے کرنے میں خود ہی واحد اتھارٹی نہیں ہے بلکہ وہ آسمانی تعلیمات کی پابند ہے اور اسے وحیٔ الٰہی یعنی قرآن و سنت کی تعلیمات کے دائرے میں اپنے معاملات سرانجام دینے ہیں۔

جناب رسول اکرمؐ نے تجارت کی بڑی فضیلت بیان کی ہے، خود تجارت کی ہے اور تجارت کے احکام و قوانین کی تفصیل کے ساتھ وضاحت فرمائی ہے۔ ان ساری باتوں کو آنحضرتؐ کے ایک جامع ارشاد میں مختصراً سمو دیا گیا ہے کہ ''سچا اور ایماندار تاجر جنت میں انبیائے کرام، شہداء اور صالحین کا ساتھی ہو گا''۔ تاجر کو جنت میں انبیائے کرامؑ کی رفاقت نصیب ہو گی لیکن اس کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گفتگو میں سچا ہو اور دوسری یہ کہ وہ سودے میں کھرا ہو۔ یہ دو شرطیں بظاہر بڑی سادہ سی ہیں لیکن عملاً سب کچھ ہیں۔ اور اگر ان پر عمل ہو جائے کہ سوداکاری میں جھوٹ کا عنصر شامل نہ ہو اور سودے میں ملاوٹ اور کھوٹ نہ ہو تو سارا نظام تجارت ہی سیدھا ہو جاتا ہے۔

تجارت میں دیانت بہت عظمت اور عزیمت کی بات ہے اور مسلمانوں میں تو دیانتدارانہ تجارت اسلام کی دعوت و تبلیغ کا مستقل ذریعہ رہی ہے، لیکن خیانت کی شکایات بھی کسی نہ کسی درجہ میں ہر دور میں رہی ہیں۔ صحابیٔ رسول حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی وفات ۳۵ھ میں ہوئی۔ گویا انہوں نے حضورؐ کے وصال کے بعد ربع صدی کا زمانہ پایا ہے اور وہ اپنے آخری دور میں شکایت کر رہے ہیں کہ تجارت میں امانت و دیانت کا معیار بدل گیا ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق وہ فرماتے ہیں کہ ''ہمارے پہلے دور میں تجارت کے عمومی ماحول پر اعتماد ہوتا تھا اور ہم جس سے چاہتے تھے خرید و فروخت کر لیتے تھے، لیکن اب آخری دور میں یہ اعتماد قائم نہیں رہا اور خال خال تاجروں کے بارے میں شہرت ہوتی ہے کہ وہ ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ تجارت کرتے ہیں''۔ بخاری شریف کی اس روایت میں حضرت حذیفہؓ نے ایک دلچسپ بات یہ بھی فرمائی ہے کہ ہم پہلے دور میں بڑے اعتماد کے ساتھ ہر شخص سے سودے کی خرید و فروخت کر لیتے تھے، اگر وہ

مسلمان ہوتا تھا تو اس کا مسلمان ہونا ہی ہمارے اعتماد کے لیے کافی ہوتا تھا، اور اگر غیر مسلم ہوتا تو ہمیں تسلی ہوتی تھی کہ وقت کا حاکم اور نظام اسے بددیانتی سے روک لے گا۔ دوسرے لفظوں میں مسلمان اور امانت و دیانت لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے اور غیر مسلم ہونے کی صورت میں ہمیں سسٹم اور نظام پر اعتماد ہوتا تھا کہ یہ نظام اور سسٹم کسی غیر مسلم کو بھی بددیانتی کی گنجائش فراہم نہیں کرے گا۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا یہ ارشاد گرامی آج ہمارے لیے لمحۂ فکریہ بلکہ تازیانہ عبرت ہے، اس لیے کہ آج صورتحال بالکل برعکس ہو گئی ہے۔ آج تجارت میں دیانت و امانت کا اعتماد دوسری قوموں میں منتقل ہو گیا ہے اور بددیانتی اور بے ایمانی مسلمان قوموں کا تعارف بن گئی ہے، جبکہ سسٹم کا اعتماد بھی کرپشن کی دلدل میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ عالمی مارکیٹ اور بین الاقوامی تجارت کو دیکھ لیں کہ ہم مسلمانوں کی ساکھ کیا ہے؟ اور بحیثیت پاکستانی ہماری تجارتی ساکھ دنیا کی منڈیوں میں کیا ہے؟ اس لیے تجارت و مارکیٹ کے حوالے سے ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنا وہ اعتماد بحال کریں جو حضرت حذیفہؓ کے ارشاد گرامی میں مذکور ہے اور جو کسی دور میں ہم مسلمانوں کا امتیازی نشان اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عنوان ہوتا تھا۔

ابلاغ و تشہیر

اب میں مسئلہ کے دوسرے رخ کی طرف آتا ہوں کہ ذرائع ابلاغ اور تشہیر و ابلاغ کے حوالے سے ہماری صورتحال کیا ہے اور ہم نے تجارت کے باب میں تشہیر کے لیے کیا کیا حربے اختیار کر رکھے ہیں؟ جہاں تک ابلاغ کی بات ہے، یہ سوسائٹی کی اجتماعی ضرورت ہے لیکن اس کی بھی کچھ حدود و قیود ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں دو پابندیوں کا بطور خاص تذکرہ ہے:

1. ایک یہ کہ کوئی خبر آئے تو اس کی تحقیق کے بعد اسے نشر کرو اور بلا تحقیق کسی خبر کو عام نہ کرو (سورہ الحجرات ۶)۔ مگر ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ سنی سنائی باتوں کو ایسے سنسنی خیز انداز میں بلا تحقیق نشر کر دیا جاتا ہے کہ بہت سے مسائل بلاوجہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے اپنے سفر معراج کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کچھ لوگوں کو دی جانے والی سزاؤں کے مناظر کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک منظر آپؐ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص کے منہ میں درانتی ڈال کر اس کی باچھیں گردن تک بار بار

چیری جارہی ہیں، چیرنے والا ایک بار یہ عمل مکمل کرتا ہے تو وہ باچھیں درست ہو جاتی ہیں، پھر وہ انہیں دوبارہ چیر دیتا ہے، پھر وہ صحیح ہوتی ہیں تو دوبارہ انہیں چیر دیا جاتا ہے۔ یہ عمل اس کے ساتھ مسلسل جاری ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے فرشتوں سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ شخص ہے جو جھوٹ گھڑتا ہے اور اسے دنیا کے کناروں تک پھیلا دیتا ہے۔ خبر گھڑ کر اسے دنیا کے کناروں تک پہنچا دینے کی بات اب سے پون صدی قبل شاید عملاً سمجھ میں نہ آتی ہو مگر آج اسے سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ اور میں حدیث کے طلبہ کے سامنے اس کی تشریح یوں کیا کرتا ہوں کہ یہ وہ نیوز ایڈیٹر ہے جو ٹیبل نیوز بناتا ہے اور چینل پر اس کی پٹی چلا دیتا ہے۔ جھوٹی خبر ٹیبل پر بنائی جائے یا محض سنی سنائی بات کو بلا تحقیق نشر کر دیا جائے، ایک ہی بات ہے اور دونوں کے نتائج ایک جیسے ہی نکلتے ہیں۔

2. قرآن کریم نے ابلاغ کے سلسلہ میں دوسری پابندی یہ لگائی ہے کہ جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں فاحشہ کی اشاعت کی جائے، ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے (سورہ النور ۱۹)۔ مسلمان سوسائٹی میں ”فاحشہ“ کے فروغ اور اشاعت کی قرآن کریم نے مذمت کی ہے اور ایسا کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب کی خبر دی ہے۔ یہ فاحشہ کیا ہے؟ اس کا آسان سا مفہوم یہ ہے کہ بدکاری اور اس کا ذریعہ بننے والے اسباب و اعمال کی تشہیر جرم قرار دی گئی ہے۔ بدکاری اور زنا کے بارے میں قرآن کریم اور جناب رسول اکرمؐ نے بہت سخت لہجہ اختیار کیا ہے اور صرف بدکاری کو جرم قرار نہیں دیا بلکہ اس کا ذریعہ بننے والے تمام اعمال و حرکات کو بھی، جنہیں شریعت کی اصطلاح میں ”دواعی“ کہا جاتا ہے، جرم قرار دیا ہے اور اس پر سزا مقرر کی ہے۔ اس لیے ہر وہ تشہیر جو انسان کے اندر سفلی جذبات کو ابھارتی ہے اور انسانی ذہن کو بدکاری کی طرف متوجہ کرتی ہے، فاحشہ شمار ہوتی ہے اور قرآن کریم نے اس کی مذمت فرمائی ہے۔

لیکن ہمارے ہاں تو عورت اور اس کی کم لباسی تشہیر کے فن کا نقطۂ کمال تصور ہوتی ہے۔ ہم ماچس کی ڈبیا فروخت کرنے کے لیے بھی عورت کی تصویر اور اس کی زیب و زینت کو ذریعہ بناتے ہیں۔ عورت کی تصویر اور اس کی زیب و زینت

کو اپنے سامان کی فروخت کے لیے بے تحاشا استعمال کر کے ہم یہ تصور دے رہے ہیں کہ عورت کی عزت میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہم عورت کو معاشرے میں عزت کا مقام دے رہے ہیں۔ کسی کو اس میں عورت کی عزت دکھائی دیتی ہو تو میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے خیال میں تو یہ عورت کی تحقیر ہے، اس کی توہین ہے اور اس کی تذلیل ہے اور آج کے دور میں عورت پر روا رکھے جانے والے مظالم میں سے ایک بڑا ظلم ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ تجارتی تشہیر کے حوالے سے ایک اور بڑے مسئلہ کی طرف بھی توجہ دلانا چاہوں گا کہ مارکیٹنگ کے لیے غیر ضروری ترغیبات کے ذریعے عام آدمی کے معاشی بوجھ میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ انسانی زندگی کے معاشی اعتبار سے تین درجے ہیں: (۱) ایک درجہ ضروریات کا ہے (۲) دوسرا سہولیات کا ہے (۳) اور تیسرا درجہ تعیشات کا ہے۔ ضروریات کا دائرہ تو ناگزیر ہے، سہولیات کا بھی جواز ہے، مگر تعیشات کا درجہ مسلم سوسائٹی میں جواز کا درجہ نہیں رکھتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے سوسائٹی میں معیشت کا توازن بگڑتا ہے اور دیگر بہت سی معاشرتی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں تجارتی تشہیر کا زیادہ حصہ تعیشات کے فروغ اور اس کی طرف ترغیب دلانے کے لیے مخصوص ہے۔ مقصد صرف اپنی مصنوعات کی فروخت ہے، مگر اس سے عام آدمی کی ضروریات کا مصنوعی دائرہ پھیل رہا ہے، غریب اور متوسط گھرانے کا بجٹ تباہی کا شکار ہو رہا ہے اور ناجائز کمائی کے ذرائع بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہ بھی تجارتی تشہیر کے حوالے سے ایک بڑا مسئلہ ہے جسے سنجیدگی کے ساتھ کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام معیار زندگی میں اس طرز کی "ریس" کی اجازت نہیں دیتا جو تعیشات کا ماحول پیدا کر کے سوسائٹی کو معاشی عدم توازن اور معاشرتی عدم استحکام کا شکار کر دے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۹ جنوری ۲۰۱۲ء)

فکری مرعوبیت اور اس کا سدّباب

(جامعہ بنوری ٹاؤن، کراچی - ۱ جنوری ۲۰۱۲ء)

حسب معمول سہ ماہی امتحان کی تعطیلات کے دوران کراچی میں ہوں۔ کل اتوار کو ظہر کے لگ بھگ کراچی پہنچا، ملیر کینٹ کی ایک مسجد میں مختصر بیان ہوا اور تین بجے جامعہ بنوری

ٹاؤن میں ’’مجلس علمی‘‘ کی ایک تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ مجلس علمی کراچی کے اکابر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ، حضرت مولانا محمد طاسین رحمہم اللہ تعالی اور دیگر اہل علم کی یادگار ہے۔ مجلس علمی کی لائبریری جب ٹاور پر ہوتی تھی اس وقت حضرت مولانا محمد طاسینؒ کی خدمت میں حاضری ہوتی رہتی تھی، اب یہ لائبریری جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے قریب جمشید روڈ پر ہے اور مولانا مرحوم کے فرزند ڈاکٹر عامر طاسین لائبریری کی دیکھ بھال اور مختلف علمی و فکری سرگرمیوں کے اس تسلسل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے علماء کرام اور دیگر صاحب نظر حضرات کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں کچھ گزارشات ’’فکری مرعوبیت اور اس کا سدباب‘‘ کے عنوان سے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور اس کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ اس گفتگو کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ محترم ڈاکٹر عامر طاسین کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اہل علم کے ساتھ اس ملاقات اور کچھ کہنے سننے کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالی یہ مل بیٹھنا ہم سب کے لیے باعث خیر بنائیں، آمین۔ فکری مرعوبیت کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فکر کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے کہ فکر کا دائرہ کیا ہے اور اس کے حوالے سے سرگرمیوں کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

عام طور پر علم و فکر کی بات کی جاتی ہے، علم کا دائرہ اپنا ہے اور فکر کا دائرہ اس سے قدرے مختلف ہے۔ فکر کا ایک اہم دائرہ جو میں سمجھا ہوں، صحابیؓ رسول حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ ذوق ہے جس کا وہ خود ان الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں کہ ’’کان الناس یسألون رسول اللہ عن الخیر و کنت اسألہ عن الشر‘‘ اصحاب رسول عام طور پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی بات پوچھا کرتے تھے جبکہ میں شر کے بارے میں دریافت کرتا رہتا تھا۔ خیر کے بارے میں علم اور معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ شر کے بارے میں علم اور معلومات حاصل کرنا بھی ضروری ہے اور کسی شر سے اسی وقت صحیح طور پر بچا جا سکتا ہے جب اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوں۔

میرے نزدیک فکر کا دائرہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی مجموعی صورتحال پر نظر رکھتے ہوئے فتنوں اور خرابیوں پر نظر رکھی جائے، ان کے اسباب و عوامل کے بارے میں مسلسل غور

ہوتا رہے، ان کی نشاندہی کی جائے، ان کی طرف متعلقہ لوگوں کو توجہ دلائی جائے اور ان کے سدباب کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کی ایک مثال سامنے رکھ لیجئے کہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ آذربائیجان کے علاقے میں ایک غزوہ کے سفر میں تھے اور فوج کے کمانڈر تھے، راستے میں کسی جگہ پڑاؤ تھا، ایک دن صبح کی نماز کے بعد اپنے خیمہ میں معمولات میں مصروف تھے کہ ساتھ والے خیمہ میں جھگڑے کا شور سنا، وہاں گئے تو دو ساتھیوں کو آپس میں الجھتے دیکھا۔ ایک روایت کے مطابق ان کا جھگڑا اس قدر بڑھ گیا کہ قریب تھا کہ تلواریں نکل آتیں۔ وجہ پوچھی تو ان میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ اس شخص نے ایک لفظ پر مجھے ٹوک دیا اور کہا کہ میں غلط پڑھ رہا ہوں حالانکہ میں نے بالکل صحیح پڑھا ہے کیونکہ میں نے حضرت ابوالدرداءؓ سے یہ لفظ یوں ہی سنا ہے۔ دوسرے صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ غلط پڑھ رہا تھا میں نے اسے صحیح تلفظ بتایا جو میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے خود سنا تھا تو یہ جھگڑنے لگ گیا۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے دونوں سے ان کے الفاظ سنے تو قراءت کے اختلاف کے ساتھ دونوں صحیح پڑھ رہے تھے اور فرق صرف تلفظ اور قراءت کا تھا۔

ان دونوں کو سمجھا کر ان کا جھگڑا ختم کرایا لیکن حضرت حذیفہؓ خود سوچ میں پڑ گئے کہ تلفظ، لغت اور قراءت کا اختلاف اہل زبان میں تو چل سکتا ہے اور وہ اس کے متحمل ہو سکتے ہیں لیکن قرآن کریم کے حوالہ سے یہ فرق غیر اہل زبان اور عجمیوں میں مسلسل جھگڑوں کا باعث بنے گا۔ انہوں نے اس بات کو محسوس کیا اور مدینہ منورہ جا کر امیرالمومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کی خدمت میں یہ سارا واقعہ بیان کر کے ان سے درخواست کی کہ غیر عربوں کو تلفظ و قراءت کے اس اختلاف کے متوقع نتائج سے بچانے کی کوئی صورت نکال لیجئے ورنہ وہ ہمیشہ قرآن کریم کے الفاظ اور قراءتوں پر جھگڑتے رہیں گے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ کے توجہ دلانے پر حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کو از سر نو قریش کی لغت اور قراءت کی پابندی کے ساتھ دوبارہ مرتب کروایا اور اس متوقع فتنے کا سدباب کر دیا۔

حضرت حذیفہؓ کا یہ ذوق اور محنت میرے خیال میں دینی حوالہ سے فکر کا ایک بڑا دائرہ ہے کہ خرابیوں اور فتنوں کے امکانات کو محسوس کیا جائے، ان کا جائزہ لیا جائے، نشاندہی کی جائے اور اس کے سدباب کے لیے متعلقہ حضرات کو توجہ دلائی جائے اور ایسا ہر دور میں ہوتا آرہا ہے۔

ایک اور بات جس کی طرف توجہ دلانا اس حوالے سے ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر دور میں تحفظات اور ضروریات کے دائرے الگ الگ رہے ہیں اور ان میں کشمکش بھی ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ تحفظات کا دائرہ یہ ہے کہ کوئی ایسی نئی بات نہ ہونے پائے جس سے دین کا کوئی نقصان ہو جائے اور ضروریات کا دائرہ یہ ہے کہ وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ جو نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں یا نئے تقاضے جنم لیتے ہیں ان کو پورا کرنے کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ یہ دونوں دائرے دین کا حصہ ہیں، دونوں ضروری ہیں اور ہر زمانے میں بظاہر ان میں کشمکش بھی ہوتی رہی ہے۔

اس سلسلہ میں دو مثالیں بات سمجھنے کے لیے عرض کروں گا۔ ایک یہ کہ کوئی واقعہ پیش آئے بغیر محض اس کی صورت فرض کر کے اس کا حکم طے کرنا، جسے فقہ فرضی سے تعبیر کیا جاتا ہے" حضرات صحابہ کرامؓ اور کبار تابعینؒ کے دور میں پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی تھی اور وہ اس بات سے منع کرتے تھے کہ جب تک کوئی مسئلہ عملاً پیش نہ آجائے اس کا حکم معلوم کرنے کا تکلف نہ کیا جائے۔ اس بارے میں حضرت قتادۃؓ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ایک مکالمہ بھی تاریخ میں مذکور ہے کہ حضرت امام صاحبؒ نے حضرت قتادۃؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا، انہوں نے دریافت کیا کہ کیا ایسا کوئی مسئلہ پیش آیا ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مسئلہ پیش تو نہیں آیا۔ اس پر حضرت قتادۃؓ نے کہا کہ مجھ سے ایسا کوئی مسئلہ مت پوچھا کرو جو پیش نہ آیا ہو۔ یہ حضرت قتادۃؒ کا ذوق اور ان کا ذہنی تحفظ تھا، جبکہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے فقہاء کی مجلس قائم کر کے ۸۰ ہزار سے زائد جو مسائل مرتب کر کے امت کو دیے اور جن پر پوری فقہ حنفی کی عمارت کھڑی ہے اسی "فقہ فرضی" سے عبارت ہے۔ اسی طرح عقائد کے بارے میں عقلی بحثیں ابتدائی دور میں پسند نہیں کی جاتی تھیں اور انہیں گمراہی کا باعث سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ "التوضیح والتلویح" کے ایک محشی نے لکھا ہے کہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے فتویٰ دے دیا تھا کہ عقائد میں عقلی بحثیں کرنے والے متکلّم کی اقتدا میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ لیکن بعد میں یونانی فلسفہ کی یلغار نے ایسی صورتحال پیدا کر دی کہ عقائد کی زیادہ تر بحثیں عقلیات ہی کے حوالے سے ہونے لگیں اور علم العقائد نے باقاعدہ علم الکلام کا عنوان اختیار کر لیا۔

اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ تحفظات اور ضروریات کے دونوں دائرے ہمارے دینی ضرورت ہیں اور دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، نہ

ضروریات کے لیے تحفظات کو چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ تحفظات کے لیے ضروریات سے اعراض کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے درمیان توازن قائم رکھنا ہی دین کی اصل ضرورت ہے۔ یہ گاڑی کے دو پہیے ہیں، جس طرح گاڑی کے پہیوں کے درمیان توازن جسے ”وہیل بیلنسنگ“ کہتے ہیں قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ گاڑی کسی ایک طرف لڑھک جاتی ہے، اسی طرح تحفظات اور ضروریات کے درمیان توازن قائم رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ دین کے علمی و فقہی ڈھانچے کا توازن بگڑ سکتا ہے۔

ان دو گزارشات کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ فکری مرعوبیت ہمارے لیے کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سدباب کی راہیں تلاش کرنے کے لیے کسی نئی تگ و دو کی ضرورت ہے۔ ہم اس مسئلہ سے اس سے قبل بھی دوچار ہو چکے ہیں اور ہمارے اکابر و اسلاف نے اس سے بہت خوبی کے ساتھ نمٹا ہے۔ آج ہمارے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی اس کشمکش کے بارے میں علم حاصل کریں اور انہی بزرگوں کے نقش قدم کو اپنانے کی کوشش کریں۔ یہ صورتحال ہمیں سب سے پہلے اس وقت پیش آئی تھی جب یونانی فلسفہ و منطق نے ہماری صفوں میں گھس کر عقائد کے باب میں شکوک و شبہات کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ معتزلہ کا وجود اسی پس منظر میں سامنے آیا تھا اور ایک دور میں امت کے ایک حصے کی اس سے مرعوبیت کا عالم یہ تھا کہ اہل دین اور اہل علم کے لیے آزمائشوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اسی معاملے میں کوڑے کھائے تھے اور بہت سے دیگر اہل علم نے اسی پر قید و بند اور کوڑوں کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ مامون الرشید کے دور میں اس فتنہ کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی تھی اور علماء اہل سنت پر آزمائش اور مصائب کا دور شروع ہو گیا تھا۔ عقائد کے بارے میں عقلیات کے یہ مباحث یونانی فلسفہ و منطق کی آمد سے پیدا ہوئے تھے اور ہمارے اس وقت کے بزرگوں نے ان کے سدباب کے لیے دو راستے اختیار کیے تھے جو دونوں ضروری تھے:

- ایک راستہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے رفقاء کا تھا کہ ظاہر پر سختی سے قائم رہتے ہوئے اس کے لیے قربانیاں دیں اور مکمل عزیمت و استقامت کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئے۔

• جبکہ دوسرا راستہ امام ابوالحسن اشعری کا تھا کہ یونانی فلسفہ و منطق پر عبور بلکہ تفوق حاصل کر کے یونانی فلسفہ کے پیدا کردہ اعتقادی شبہات کا فلسفہ کی زبان اور اس کی اصطلاحات میں رد کیا۔

امام احمد بن حنبلؒ کا راستہ تحفظات کا تھا اور امام ابوالحسن اشعری کا دائرہ ضروریات کا تھا۔ حنابلہ (حنبلیوں) اور اشاعرہ (اشعریوں) کے درمیان کشمکش بھی موجود رہی ہے جواب بھی موجود ہے لیکن دین کو دونوں کی ضرورت تھی اور دونوں نے امت کے اعتقادی نظام کی حفاظت میں اہم کردار ادا کیا۔

میں ایک اور حوالہ سے بھی بات کرنا چاہوں گا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کوڑے کھائے ہیں اور سختیاں برداشت کی ہیں اس بات پر کہ ”القرآن کلام اللہ غیر مخلوق“ قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے۔ مگر امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کو نیشاپور سے جلاوطن ہونا پڑا اس قول پر کہ ”لفظی بالقرآن مخلوق“ میری زبان سے قرآن کا تلفظ مخلوق ہے۔ اس لیے کہ بعض حنابلہ امام احمد بن حنبل کے ارشاد پر اس انتہا پر چلے گئے تھے کہ ”کلام نفسی“ کے ساتھ ساتھ ”کلام لفظی“ کو بھی غیر مخلوق سمجھنے لگے تھے اور اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ ہم قرآن کریم کے جن الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں وہ بھی مخلوق نہیں ہیں۔ مناظروں اور مباحثوں میں عام طور پر ایسا ہو جاتا ہے کہ دونوں فریق انتہا پر چلے جاتے ہیں جنہیں متوازن کرنے کے لیے کچھ اور شخصیات کو سامنے آنا پڑتا ہے۔ امام بخاریؒ نے ”لفظی بالقرآن مخلوق“ کہہ کر اسے متوازن کیا مگر اس پر اپنے حنبلی شیخ امام محمد بن یحیی الذہلی کی طرف سے گمراہی کا فتوی اور نیشاپور سے جلاوطنی کا حکم سننا پڑا جس پر امام بخاری نیشاپور چھوڑ کر بخارا چلے گئے۔ اس لیے میری گزارش یہ ہے جو بہت سے دوستوں کو میں سمجھا نہیں پا رہا کہ تحفظات اور ضروریات کے دونوں دائرے دین کا حصہ ہیں اور ان کی باہمی کشمکش کے باوجود ہمیں دونوں کی ضرورت ہے۔

”فکری مرعوبیت“ کے بارے میں عرض کر رہا تھا کہ یونانی فلسفہ و منطق کی یلغار کے بعد اس فکری مرعوبیت کا ہمیں اجتماعی طور پر سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر اہل حق اور اکابر اہل علم مرعوب نہیں ہوئے تھے، نہ طاقت اور جبر سے مرعوب ہوئے تھے اور نہ ہی فکر و فلسفہ اور استدلال و منطق میں معتزلہ انہیں مرعوب کر سکے تھے۔ لیکن بہت سے حلقے مرعوب بھی ہو گئے تھے حتی کہ اس عقل پرستی نے سرکاری سرپرستی بھی حاصل کر لی تھی جو ارباب علم و

دین کے لیے سخت آزمائشوں کا باعث بن گئی تھی۔ اس مرعوبیت کے سدباب کے لیے علمی و فکری میدان میں ابوالحسن اشعری، ابو منصور ماتریدی، ابن رشد، امام غزالی اور ابن تیمیہ جیسے اساطین علم سامنے آئے۔ انہوں نے یونانی فلسفہ و فکر پر عبور حاصل کر کے اس کی زبان و اصطلاح میں اس کے پیدا کردہ اعتقادی مسائل و شکوک کا جواب دیا اور یونانی فلسفہ کو اسی کے میدان میں شکست دے کر اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کا تحفظ کیا۔

آج بھی وہی صورتحال ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ یونانی منطق و فلسفہ کی جگہ مغربی فکر و فلسفہ نے لے لی ہے جو "ہیومینٹی کا فلسفہ" کہلاتا ہے، انسانی حقوق کا فلسفہ کہلاتا ہے، فکر و رائے کی آزادی کا فلسفہ کہلاتا ہے اور فرد کی آزادی کا فلسفہ کہلاتا ہے۔ اس فکر و فلسفہ نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو لپیٹ میں لے رکھا ہے مگر اسلام اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور امت مسلمہ کے اہل دین اس فکر و فلسفہ کو قبول کرنے سے انکار کر کے اس پر سختیاں جھیل رہے ہیں۔ ہماری درخواست صرف اتنی ہے کہ اس فکر و فلسفہ کو قبول کرنے سے انکار ضروری ہے اور ہمارا موقف بھی انکار کا ہے، لیکن اس فکر و فلسفہ سے واقفیت حاصل کر کے اور اس پر عبور بلکہ گرفت حاصل کر کے اس کی زبان اور اصطلاحات میں اس کا جواب اور رد بھی اسی طرح ضروری ہے، جس طرح یونانی فکر و فلسفہ کا جواب اور رد اس کی زبان میں اور اسی کی اصطلاحات میں دیا گیا تھا، چنانچہ اہل علم اور اہل دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں۔

ان معروضات کے بعد سوال و جواب کا مرحلہ بھی تھا جس میں بہت سے سوالات کیے گئے، ان میں سے چند اہم سوالات کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں۔

ایک سوال یہ تھا کہ مغربی فکر و فلسفہ کا مطالعہ کرنے والے بعض لوگ اس کی بعض باتوں کو قبول کر لینے کی بات بھی کرنے لگتے ہیں، اس کا حل کیا ہے اور کیا یہ مرعوبیت نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اصولی طور پر مرعوبیت کے بارے میں سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا دائرہ کیا ہے۔ اگر مغرب یا کسی بھی دشمن کی کوئی ایسی بات قبول کر لی جائے جو قرآن و سنت کی نصوص کے خلاف ہو اور اس کے لیے ہمیں اپنے کسی مسلمہ اصول اور قانون سے دستبردار ہونا پڑے تو یہ بلاشبہ مرعوبیت ہے اور اس کو کسی سطح پر بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر ایسی کوئی بات اگر سامنے آتی ہے جو ہمارے ہاں بھی موجود تھی اور اب متروک ہو چکی ہے اور

اس سے ہمارے دینی مسلمات پر کوئی زد نہیں پڑتی تو اسے قبول کر لینے کو مرعوبیت قرار دینا درست بات نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دو مسئلوں کا حوالہ دوں گا:

• جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانشین کے طور پر امت کی حکمرانی کے لیے نامزدگی کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب امت نے کیا تھا اور اس کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ میں عمومی بحث و مباحثہ ہوا تھا۔ جس سے یہ اصول قائم ہوا کہ خلافت کا انعقاد اور حکمرانی کا حق امت کی اجتماعی صوابدید کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اسے اگر مغرب نے جمہوریت کے نام سے ایک نیا رنگ دیا ہے تو ہم اسے مکمل طور پر قبول نہ بھی کریں مگر اس کی وجہ سے اس اصول سے انکار تو نہیں کر دیں گے کہ اسلام عوام اور امت کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے حکمران کا خود انتخاب کرے۔ مجھے اس کی اصطلاح سے بحث نہیں ہے لیکن اگر آج کی دنیا کو یہ اصول سمجھانے کے لیے آج کی اصطلاح میں بات کر بھی دی جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟

• دوسری بات یہ ہے کہ ایک فلاحی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کے لیے حضرت عمر فاروقؓ نے جو قواعد و ضوابط طے کیے تھے اور بیت المال کو معاشرے کے تمام نادار افراد کی کفالت کا ذمہ دار بنا دیا تھا، اس کو آج مسلم ممالک کی اکثریت نے متروک قرار دے رکھا ہے۔ مگر مغرب کے بعض ممالک اسے اپنائے ہوئے ہیں اور اس امر کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ یہ سسٹم ہم نے حضرت عمرؓ سے لیا ہے۔ یہ بات اصل میں ہماری تھی جو ہم نے چھوڑ دی اور مغرب نے اپنا لی، اب کیا اسے صرف اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ اسے مغرب نے اپنا لیا ہے؟ میرے خیال میں ہمیں اعتدال و توازن سے کام لینا چاہیے اور وہ باتیں جو ہماری تعلیمات کا حصہ رہی ہیں اور اب ہمارے معاشرے میں متروک سمجھی جا رہی ہیں، انہیں دوبارہ اپنا لینے کی بات کو مرعوبیت قرار دینا کسی طرح بھی انصاف کا تقاضا نہیں ہے۔ البتہ منصوصات اور مسلمات کے بارے میں ہمیں بے لچک رویہ قائم رکھنا چاہیے اور ان کے بارے میں کوئی سودے بازی یا رواداری برداشت نہیں کرنی چاہیے۔

ایک سوال جناب جاوید احمد غامدی کے بارے میں میرے طرز عمل کے سلسلہ میں ہوا کہ میں انہیں سپورٹ کر رہا ہوں۔ جس کے جواب میں یہ گزارش کی کہ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے، جاوید غامدی صاحب کو میں نے ہمیشہ ''متجددین'' میں شمار کیا ہے، ان کے بہت سے افکار و خیالات پر میں نے کھلے بندوں تنقید کی ہے اور میرے ایک درجن کے لگ بھگ تنقیدی مضامین مختلف اوقات میں روزنامہ اوصاف، روزنامہ پاکستان، روزنامہ اسلام اور ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ میں شائع ہو چکے ہیں جو کتابی شکل میں بھی مکتبہ امام اہل سنت (جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ) کی طرف سے طبع ہوئے ہیں۔ البتہ میرا جرح و تنقید کا اسلوب روایتی انداز سے مختلف ہے، میں تنقید کو علمی اور فکری دائرے میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے ذاتی یا شخصی مسئلہ بنانے سے میں نے ہمیشہ گریز کیا ہے اور اسی کو صحیح طرز عمل سمجھتا ہوں۔

ایک سوال یہ ہوا کہ ہم نے ماہنامہ الشریعہ میں علمی مسائل پر کھلے بحث و مباحثہ کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اور جس پر ہم بہت سے دوستوں کے عتاب کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، کیا اسے جاری رکھنا ضروری ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں کھلے علمی مباحثہ کو دو حوالوں سے ضروری سمجھتا ہوں:

- اس حوالہ سے کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کا طرز استدلال یہی ہے اور اسی وجہ سے میں فقہ حنفی کو شخصی فقہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے اجتماعی فقہ کہتا ہوں جو کم و بیش چالیس فقہاء کی اجتماعی مجلس میں کھلے علمی مباحثہ کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ اس مجلس میں حضرت امام اعظمؒ کی رائے سے اختلاف کیا جاتا تھا، ایک دوسرے کے موقف کے خلاف دلائل دیے جاتے تھے، مباحثہ ہوتا تھا اور بعض مسائل پر مسلسل کئی روز تک بحث جاری رہتی تھی۔ اور اگر مجلس میں شریک کسی بزرگ کو مجلس کے اجتماعی فیصلے سے اتفاق نہیں بھی ہوتا تھا تو اسے اپنا قول الگ طور پر درج کرانے کا حق ہوتا تھا جسے ہم آج کی اصلاح میں اختلافی نوٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ میری طالبعلمانہ رائے میں آج جو علمی و فکری مسائل سامنے آ رہے ہیں ان کے بارے میں بھی اسی کھلے مباحثے کا طرز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

• دوسری وجہ یہ ہے کہ جو نوجوان اہل علم آج کے دور میں قدیم اور جدید دونوں علوم سے مناسبت رکھتے ہیں اور دونوں قسم کے لٹریچر پر ان کی وسیع نظر ہے، وہ اگر کوئی رائے دیتے ہیں تو اسے رائے کے درجہ میں سننا ضرور چاہیے، قبول کرنا یا نہ کرنا بعد کی بات ہے مگر انہیں رائے کے حق سے محروم کر دینا درست بات نہیں ہے۔ ہمیں ان لوگوں کو اپنی بات کہنے کا موقع دینا چاہیے، ان کی بات کھلے دل سے سننی چاہیے، اس سے اختلاف علمی انداز میں دلائل کے ساتھ کرنا چاہیے اور افہام وتفہیم کے لہجے میں ان کی رائے کی غلطی کو واضح کرنے کی طرز اختیار کرنی چاہیے۔

ماہنامہ الشریعہ میں کھلے علمی مباحثے کی پالیسی اسی وجہ سے ہے، میں اسے صرف درست نہیں کہتا بلکہ ضروری سمجھتا ہوں اور بہت سے دوستوں کے تحفظات کے باوجود ہم اس طرز عمل اور پالیسی کے اثرات محسوس کر رہے ہیں اور نوجوان اہل علم کو گھٹن کے ماحول سے نکالنے میں یہ مفید نظر آنے لگی ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۴ تا ۶ جنوری ۲۰۱۲ء)

۲۰۱۱ء

طلاق، انتہائی ناپسندیدہ فعل

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۴ نومبر ۲۰۱۱ء)

روزنامہ پاکستان میں ۲۲ اکتوبر کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ملک میں طلاق کی شرح تشویشناک حد تک بڑھ گئی ہے اور معاشرتی ناہمواری، غیر ملکی ثقافتی یلغار اور ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کو اس کی اہم وجوہات شمار کیا جا رہا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ دس سال کے دوران پنجاب کی ماتحت عدالتوں میں صرف طلاق کے ایک لاکھ سے زائد دعوے دائر ہوئے ہیں اور مجموعی طور پر بیس ہزار سے زائد خواتین کو طلاق کی ڈگریاں جاری کی گئی ہیں۔ لاہور بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری سید فرہاد علی شاہ کا کہنا ہے کہ بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار نے عائلی زندگی کو متاثر کیا ہے اور پہلے کی نسبت طلاق کو اس قدر معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ لاہور بار ایسوسی ایشن کے سابق سیکرٹری جی اے خان طارق کا تبصرہ یہ ہے کہ ماتحت عدالتوں میں طلاق کے کیسوں کے انبار لگے ہوئے ہیں، انٹرنیٹ، ٹی وی، کیبل اور بھارتی فلموں کی یلغار بھی طلاق کی شرح میں اضافے کی اہم وجوہات ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے عائلی قوانین خود بھی کسی حد تک طلاق کی شرح میں اضافے کا موجب ہیں۔ جبکہ ایڈووکیٹ عرفان صادق تارڑ کا یہ کہنا ہے کہ اسلام سے دوری طلاق کی شرح میں اضافے کا باعث ہے، اگر ہم اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں تو طلاق کی شرح کبھی اس قدر نہ بڑھے۔

طلاق کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ابغض المباحات“ فرمایا ہے یعنی وہ کام جنہیں کرنے کی شرعاً اجازت دی گئی ہے ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے،

جسے کسی انتہائی صورت میں آخری آپشن کے طور پر ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی طلاق ایک فیشن کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اور ایسی چھوٹی چھوٹی وجوہات کی بنا پر بھی طلاقیں ہونے لگی ہیں جنہیں سن کر انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ بات بھی کسی تنازع یا طلاق جیسی انتہائی صورت کی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ جناب رسالت مآبؐ نے میاں بیوی دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت و اعتماد کا رشتہ رکھنے اور ایک دوسرے کی کمزوریاں برداشت کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ قرآن کریم نے دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ ’’ھن لباس لکم وانتم لباس لھن‘‘ وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ یعنی دونوں کا کام ایک دوسرے کے عیوب کو چھپانا اور ایک دوسرے کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنا ہے۔ مگر ہمارے ہاں صورت اس سے الٹ ہو گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی، عیب جوئی اور طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر خلع کے مقدمات میں کیس کی بنیاد کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے درخواست میں عورت سے وہ کچھ کہلوایا جاتا ہے اور وہ کچھ عدالت میں کہہ دینے کی باقاعدہ تلقین اور تیاری کرائی جاتی ہے کہ الامان والحفیظ۔

ہمارے پاس بھی اس قسم کے کیس مشورہ کے لیے آتے رہتے ہیں اور سچی بات ہے کہ بعض درخواستوں پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ سب کچھ اکیلی عورت نہیں کرتی بلکہ اسے اس پر تیار کرنے کے لیے خاندان کے افراد اور وکلا بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ’’بیدہ عقدۃ النکاح‘‘ کہ نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔ جبکہ عورت کو ’’مطالبۂ حق‘‘ کا حق دیا ہے جسے خلع کہا جاتا ہے۔ اس مطالبۂ طلاق میں خاوند واحد مختار نہیں ہے بلکہ اگر شکایات جائز ہونے کے باوجود مرد طلاق نہیں دیتا تو خاندان کی پنچایت اور عدالت کی صورت میں خاوند کے علاوہ بھی اتھارٹی موجود ہے جو عورت کی دادرسی کر سکتی ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق کے فیصلے کی مجاز ہے۔

اسلام نے نکاح و طلاق اور خاندانی زندگی کے حوالے سے خاوند اور عورت کے لیے واضح قوانین و احکام دیے ہیں اور ان کے حقوق و اختیارات اور ذمہ داریوں کے درمیان ایسا توازن قائم کر دیا ہے کہ بلاوجہ طلاق کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن ہماری اصل الجھن یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے احکام و قوانین کو مغرب کے فلسفہ و ثقافت اور اپنے علاقائی کلچر

اور قبائلی روایات کے ساتھ گڈمڈ کر کے ایک ایسا کلچرل ملغوبہ بنا لیا ہے، جس کے پیدا کردہ مسائل کا حل نہ اسلام کے پاس ہے، نہ مغرب کی ثقافت ان کا سامنا کر سکتی ہے اور نہ ہی علاقائی کلچر ان مسائل کی حل کی ہمت رکھتا ہے۔ اسلام کا نام تو ہمیں صرف وہاں یاد آتا ہے جہاں مشکلات و مسائل کو ہماری مرضی کے مطابق حل کرنے کے لیے اسلام کے کسی قانون سے ہمیں فائدہ ہوتا ہو۔ حالانکہ اسلام کی رہنمائی ہمیں صرف اس صورت میں حقیقی فائدہ دے سکتی ہے جب ہم ''ادخلوافی السلم کافۃ'' کے ارشاد ربانی کے مطابق پورے کے پورے اسلامی سسٹم کو اختیار کریں اور اس کے مکمل نیٹ ورک کے ساتھ اپنی مشکلات کے حل کا راستہ تلاش کریں۔ مگر ہم اسلام کی خوبیوں کو دوسری ثقافتوں اور نظاموں کے فریم ورک میں فٹ کر کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے معاملات سلجھنے کی بجائے مزید بگڑ جاتے ہیں اور ہم بہتری کی بجائے ابتری کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔

برسوں قبل ایک صاحب کی بیان کردہ مثال میرے ذہن سے ابھی تک چپکی ہوئی ہے کہ کسی ملکۂ حسن کی ناک یقیناً خوبصورت ناک کہلاتی ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک وہ اسی چہرے کا حصہ ہو۔ اگر اسے الگ کر کے کسی دوسرے چہرے پر فٹ کر دیا جائے تو وہ اس چہرے کو خوبصورتی بخشنے کی بجائے اپنی خوبصورتی سے بھی محروم ہو جائے گی۔ اس لیے ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم اسلام کی خوبصورت ناک کو دوسرے چہروں پر فٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے تہذیبی افراتفری اور ثقافتی خلفشار کے سوا ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہو رہا۔

جہاں تک طلاق کی شرح میں تشویشناک اضافے کے ان اسباب کا تعلق ہے جو ہمارے قانون دان دوستوں کے حوالے سے سطور بالا میں مذکور ہوئے ہیں، ہمیں ان سے مکمل اتفاق ہے مگر ہم ان میں ایک بات کا اضافہ کرنا چاہیں گے کہ اس میں ہمارے گھریلو ماحول کا سب سے بڑا حصہ ہے جو روز بروز بگڑتا جا رہا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ گھر میں اگر قرآن کریم کی تلاوت ہوگی اور نماز کا ماحول ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اتریں گے، برکتوں کا نزول ہوگا اور باہمی محبت و اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ یہ بات ہمارے گھروں میں ناپید ہوتی جا رہی ہے اور اسی رفتار سے گھروں میں رحمتوں اور برکتوں کا نزول بھی کم ہوتا جا رہا ہے اور باہمی محبت و اعتماد کا رشتہ کمزور پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ شیطان لعین یعنی بڑا شیطان پانی پر تخت بچھائے

بیٹھا ہے اور اس کے کارندے دنیا بھر میں گھوم پھر کر ڈیوٹی دیتے رہتے ہیں۔ یہ کارندے واپس آکر بڑے شیطان کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے ہیں اور داد و انعام کے حقدار قرار پاتے ہیں۔ شیطان اپنے کارندوں میں سے سب سے زیادہ اس شیطان کی رپورٹ پر خوش ہوتا ہے جو یہ رپورٹ دیتا ہے کہ میں فلاں گھر میں گیا تھا اور میں نے ان کے درمیان اتنا جھگڑا ڈالا کہ بالآخر میاں بیوی میں طلاق ہوگئی۔ یہ رپورٹ سن کر بڑا شیطان تخت پر کھڑا ہو جاتا ہے اور رپورٹ دینے والے کو بلا کر سینے سے لگاتا ہے اور یہ کہہ کر شاباش دیتا ہے کہ اصل کام تو نے کیا اور میرا اصل کارندہ تو ہے۔

طلاق کی شرح میں اس تشویشناک اضافے کے دیگر اسباب کا جائزہ لے کر انہیں دور کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے گھروں کے ماحول کو بہتر بنانے کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ اس لیے کہ جب گھروں میں قرآن کریم کی تلاوت ہوگی، نماز کا ماحول ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نبی کریمؐ پر درود شریف ہماری گھریلو زندگی اور معاملات کا حصہ ہوگا تو رحمت کے فرشتے آئیں گے، برکتوں کا نزول ہوگا اور سکون و محبت کی فضا بنے گی۔ جبکہ ہمارے گھروں کا ماحول جو رخ اختیار کرتا جا رہا ہے اور جس مخلوق کی دلچسپی کے اسباب میں ہمارے ہاں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس پر تو جھگڑے ہی ہوں گے اور طلاق کی شرح میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت

(مسجد امام بخاری، بروکلین، نیویارک، امریکہ - ۱۴ نومبر ۲۰۱۱ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اس مسجد میں پہلے بھی کئی بار حاضری اور آپ حضرات کے ساتھ ملاقات ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل اور مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں ایک بار پھر اس مسجد میں جمع ہونے، نماز عشاء با جماعت پڑھنے اور اس کے بعد دین کی کچھ باتیں کہنے اور سننے کے لیے جمع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری نماز قبول فرمائیں، مل بیٹھنا قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں، اور دین کی جو بات سمجھ میں آئے اس پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین یا رب العالمین۔ آج آپ حضرات سے دو تین مسئلوں پر تھوڑی بات کرنا چاہوں گا۔

اللہ اور رسولؐ دونوں کی اطاعت لازمی ہے

ایک یہ کہ قرآن کریم میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالی کی اطاعت کریں اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اس کے رسولؐ کی بھی اطاعت کریں۔ یعنی اللہ تعالی اور اس کے رسولؐ دونوں ہمارے مستقلا مطاع ہیں۔ اس لیے ہم پر جس طرح اللہ تعالی کے احکام کی بجاآوری ضروری ہے اسی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی بجاآوری بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جس طرح اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ہمیں بہت سے کاموں کا حکم دیا ہے، ان کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ نے بھی ہمیں بہت سے احکام دیے ہیں۔ چنانچہ دین اللہ و رسولؐ دونوں کے احکام کی پیروی کا نام ہے اور جب تک دونوں کی اطاعت نہیں ہوگی، دین مکمل نہیں ہوگا۔

مثلا نماز ہی کو لے لیجیے جو اسلام کے فرائض میں سب سے اہم فریضہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے سینکڑوں آیات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، اس کی پابندی کی تلقین کی ہے، اس کے ترک پر اپنی ناراضگی اور جہنم کے عذاب سے ڈرایا ہے اور اس کی اہمیت واضح فرمائی ہے، لیکن کہیں یہ نہیں بتایا کہ دن رات میں ہم نے کتنی نمازیں پڑھنی ہیں، نمازوں کے اوقات کیا ہیں، اس کی رکعات کتنی ہیں، ہر رکعت میں رکوع اور سجدے کتنے ہیں، اور نماز کی ترتیب اور کیفیات کیا ہیں؟ یہ سب باتیں ہمیں آنحضرتؐ کے ارشادات اور سنت سے ملتی ہیں۔ چونکہ نماز کی تفصیلات سے آپؐ نے امت کو آگاہ فرمایا ہے، اس لیے اللہ تعالی کے احکام اور حضورؐ کے ارشادات و اعمال دونوں کو جمع کریں گے تو نماز مکمل ہوگی اور ہم صحیح طریقہ سے نماز پڑھ سکیں گے۔ لیکن اگر ہم آپؐ کی حدیث و سنت کو (نعوذ باللہ) نظر انداز کر کے صرف قرآن کریم کی بنیاد پر نماز پڑھنا چاہیں گے تو ایک نماز بھی نہیں پڑھ سکیں گے۔ یہی صورت حال اسلام کے باقی فرائض اور دین کے دوسرے احکام کی ہے کہ ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول“ (سورہ النساء ۵۹) ان دونوں کو جمع کر کے ہی ہم ان کی بجاآوری کر سکیں گے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے قرآن کریم کی دو آیات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ جب مسلمانوں کو اجازت ملی کہ وہ سفر میں نماز قصر کر سکتے ہیں اور چار رکعتوں کی بجائے سفر میں وہ دو رکعت ادا کریں گے تو قرآن کریم میں اس حکم کے ساتھ یہ شرط مذکور ہے کہ ”واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین

کفروا" (سورہ النساء ۱۰۱) اور جب تم سفر کے لیے نکلو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں سے کچھ کم کر دو، اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔ یعنی حالت جنگ میں یا دشمنوں کے علاقہ سے گزرتے ہوئے تمہیں خطرہ ہو کہ دشمن کہیں اچانک حملہ نہ کر دیں تو چار کی بجائے دو رکعتیں پڑھ لو اور سنت و نفل کو چھوڑ دو۔ اس طرح یہ قصر اور دوگانہ نماز حالت جنگ اور دشمن کے حملہ کے خطرہ کے ساتھ مشروط قرار پاتی ہے۔ لیکن جناب نبی اکرمؐ جب حجۃ الوداع کے سفر پر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو آتے جاتے نماز قصر پڑھتے رہے حالانکہ کسی طرف سے کوئی خطرہ کی بات نہیں تھی اور نہ ہی دشمن کے خطرے کا کوئی دور دور تک امکان تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ کو اشکال ہوا کہ قصر کی نماز تو قرآن کریم نے حالت خوف کے ساتھ مشروط کی ہے مگر ہم حالت امن میں بھی قصر نماز پڑھتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ اشکال حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تو جناب رسول اللہؐ نے بہت خوبصورت جواب دیا کہ "اللہ تعالیٰ کا صدقہ کیوں واپس کرتے ہو؟" اس کا میں اپنی زبان میں یوں ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ ہم حالت امن میں قصر کرتے جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے نہیں روکا تو تم کیوں اس بارے میں بات کرتے ہو؟ ظاہر بات ہے کہ وحی کا سلسلہ تو جاری تھا، اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی اجازت نہ ہوتی تو وحی آجاتی کہ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ جب وحی میں اس عمل سے منع نہیں کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی حالت امن میں قصر کی اجازت ہو گئی ہے۔ اس طرح حالت جنگ میں قصر نماز اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے اور حالت امن میں قصر نماز جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ سے ہے۔ اور جس نکتہ کی طرف میں توجہ دلانا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ دونوں قصروں میں احکام اور ثواب و اجر کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ایک اور آیت مقدسہ کو بھی دیکھ لیں کہ جب یہ حکم نازل ہوا کہ مسلمانو! آپس میں جب تجارت کا کوئی بڑا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور اس پر گواہ بنا لیا کرو تاکہ بعد میں کوئی تنازعہ کھڑا نہ ہو، اس کے ساتھ ہی یہ حکم ہوا کہ "وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھان مقبوضۃ" (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۸۳) اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو گروی کو قبضہ میں دے دیا جائے۔ یعنی اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے کی سہولت موجود نہیں پاتے تو رہن کا معاملہ کر لیا کرو کہ جس کے ذمہ قرض ہے وہ ضمانت کے لیے کوئی چیز رہن کے طور پر دوسرے فریق کے قبضہ میں دے دے، جو رقم کی ادائیگی کے بعد واپس کر دی

جائے۔ رہن کے احکام واضح ہیں جو آپ حضرات نے متعدّد بار سنے ہوں گے اور یہ رہن کاروبار اور قرضوں میں آج بھی ہر جگہ چلتا ہے۔ لیکن یہاں جو بات توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے رہن کو سفر کی حالت اور لکھنے کی سہولت موجود نہ ہونے کی صورت کے ساتھ خاص کیا ہے، اقامت کی حالت اور لکھنے کی سہولت موجود ہونے کے حالات اس میں شامل نہیں ہیں۔ مگر رہن کے احکام وضوابط میں فقہاء کرام نے کہیں بھی اس کا فرق نہیں رکھا اور سفر و حضر ہر حالت میں رہن کا تعامل امت میں جاری چلا آرہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ حالت اقامت کا رہن کہاں سے آگیا؟ اس پر محدثین اور فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہؐ کے ایک واقعہ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ آپؐ نے مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن رکھ کر اس سے غلہ ادھار لیا تھا جبکہ یہ نہ سفر کا معاملہ تھا اور نہ ہی لکھنے کی سہولت مفقود تھی۔ یہاں فقہاء فرماتے ہیں کہ حالت سفر کا رہن تو قرآن کریم سے ثابت ہے جبکہ حالت اقامت کا رہن جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ سے ثابت ہے۔ اور دونوں رہنوں میں احکام و مسائل کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ دین صرف قرآن کریم کے احکام کو ماننے اور اللہ تعالیٰ کے فرامین کی اطاعت کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات اور سنن مبارکہ بھی اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح قرآن کریم کے احکام کی اطاعت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت آنحضرتؐ کی اطاعت پر موقوف ہے

دوسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو بھی جناب نبی اکرمؐ کی اطاعت پر موقوف کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ ’’من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ‘‘ (سورہ النساء ۴۔ آیت ۸۰) کہ جس نے رسول اکرمؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے احکام و فرامین کی شرح و تعبیر میں فائنل اتھارٹی جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے۔ قرآن کریم کی کسی آیت، جملہ یا لفظ کی جو تشریح حضورؐ نے کی ہے وہی اس کا اصل معنی ہے اور وہی اس آیت، جملہ یا لفظ سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کے کسی حکم پر جس طرح آپؐ نے عمل کیا ہے، وہی اس پر عمل کی حتمی شکل ہے، اس سے ہٹ کر قرآن کریم کے کسی حکم پر عمل کی کوئی اور کیفیت اختیار کی جائے گی تو وہ قرآن کریم پر عمل تصور نہیں ہوگا۔

قرآن کریم پڑھتے ہوئے اور اس کے احکام کو سمجھتے ہوئے بعض جگہ اشکال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اس لیے کہ خود حضرات صحابہ کرامؓ کو بھی بعض آیات قرآنی کے سمجھنے میں اشکال ہو جاتا تھا، احادیث میں بیسیوں واقعات اس سلسلہ میں مذکور ہیں۔ اور بسا اوقات تو قرآن کریم کی آیت اور جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد میں بظاہر تعارض محسوس ہونے لگتا تھا لیکن اس قسم کا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو حضرات صحابہ کرامؓ حضورؐ سے ہی رجوع کرتے تھے اور اس کی وضاحت میں آپؐ جو بھی فرما دیتے وہی اس آیت کریمہ کا صحیح مصداق سمجھا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی منشا و مراد قرار پاتا تھا۔ اس سلسلہ میں بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا ”من حوسب عذب“ کہ جس کا حساب کتاب ہوا اسے ضرور عذاب ہو گا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! قرآن کریم تو فرماتا ہے کہ ”فاما من اوتی کتابہ بیمینہ۔ فسوف یحاسب حسابا یسیرا۔ وینقلب الی اھلہ مسرورا“ (سورۃ الانشقاق ۷ تا ۹) پھر جس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو اس سے آسانی کے ساتھ حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے اہل و عیال میں خوش واپس آئے گا۔ بلکہ ایک جگہ قرآن کریم میں یوں ہے کہ ”فیقول ھاؤم اقرءوا کتابیہ۔ انی ظننت انی ملاق حسابیۃ۔ فھو فی عیشۃ راضیۃ“ (سورہ الحاقہ ۱۹ تا ۲۱) کہ وہ کہے گا آؤ میرا نامہ اعمال اور رزلٹ کارڈ دیکھو، مجھے یقین تھا کہ مجھے یہی نتیجہ ملے گا، پس وہ خوشی کی زندگی میں ہو گا۔ حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کریم کی ان آیات کی رو سے حساب کتاب کے بعد بھی بہت سے لوگوں کو نجات اور خوشی ملے گی جبکہ آپؐ فرما رہے ہیں کہ ”من حوسب عذب“ جس کا حساب ہوا اسے عذاب دیا جائے گا۔

بظاہر یہ تعارض قرآن کریم اور حدیث نبویؐ میں نظر آتا ہے کہ قرآن کریم کچھ اور فرما رہا ہے جبکہ حضورؐ کچھ اور۔ لیکن آپؐ نے یہاں ایک جملہ میں جواب دیا اور بات صاف کر دی ”ذاک العرض یا عائشۃ“ اے عائشہؓ جس حساب کی بات قرآن کریم میں کی گئی ہے وہ صرف پیشی ہے، یعنی سرسری پیشی پر ایک آدھ سوال کے ساتھ نجات کا پروانہ مل جائے گا۔ ”اما من نوقش فقد عذب“ لیکن جس کا مناقشہ ہوا یعنی جس کا ریکارڈ طلب کر لیا گیا وہ عذاب سے نہیں بچے گا۔ میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں انکم ٹیکس کی ادائیگی کے لیے

تاجر حضرات حساب کتاب کا گوشوارہ پیش کرتے ہیں۔ انکم ٹیکس آفیسر نے اگر اس گوشوارے پر ایک دو سوال کر کے بات نمٹا دی تو جان چھوٹ گئی، لیکن اگر اس نے تفصیلی حساب کتاب کے لیے ریکارڈ طلب کر لیا تو مارے گئے۔

یہاں جس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بظاہر ایک تعارض قرآن کریم کی آیت اور حضورؐ کے ارشاد میں دکھائی دے رہا ہے مگر یہاں بھی وضاحت کی اتھارٹی جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے کہ انہوں نے جو وضاحت کر دی وہی فائنل ہے اور وہی اس آیت کریمہ سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ”من یطع الرسول فقد اطاع اللہ“ (سورہ النساء ۸۰) کا یہ مطلب ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا جو مطلب اور مفہوم جناب نبی اکرمؐ نے اپنے قول یا عمل سے طے کر دیا ہے اس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت شمار ہوگی اور اگر کوئی اپنی مرضی کرنا چاہے گا کہ میں تو قرآن کریم کی اس آیت یا جملے سے یہ سمجھتا ہوں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

قرآن کریم کی تعبیر و تشریح کی فائنل اتھارٹی کون؟

جبکہ تیسری بات آپ حضرات کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے کا مفہوم سمجھنے میں بسا اوقات اس کا شان نزول معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دقت پیش آتی ہے اور جب تک وہ پس منظر معلوم نہ ہو آیت کریمہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اس پر بھی احادیث میں متعدّد واقعات موجود ہیں جن میں سے ایک کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

قدامہ بن مظعونؓ بدری صحابی ہیں، حضرت عمرؓ کے برادر نسبتی اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے ماموں تھے۔ انہیں حضرت عمرؓ نے ایک صوبے کا گورنر بنایا تو وہاں سے رپورٹ آئی کہ حضرت قدامہ بن مظعونؓ کبھی کبھی شراب پیتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے انکوائری کرائی تو بات درست ثابت ہوئی جس پر انہیں مدینہ منورہ طلب کر لیا گیا۔ وہ جب پیش ہوئے تو امیر المؤمنینؓ کے استفسار پر انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ کبھی کبھی شراب پیتے ہیں۔ اس کی دلیل انہوں نے یہ بیان کی کہ کبھی کبھی شراب پینے کی قرآن کریم نے اجازت دی ہے کہ جن آیات میں شراب کی حرمت بیان کر کے اس کے پینے سے حتمی طور پر منع کیا گیا اور شراب نوشی کو شیطانی عمل اور نری گندگی قرار دیا گیا ہے، ان میں سے ایک آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ”لیس علی الذین امنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا“ (سورہ المائدہ ۹۳)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان پر کوئی گناہ نہیں اگر انہوں نے اس چیز میں سے کچھ کھا پی لیا۔ حضرت قدامہ بن مظعونؓ کا استدلال ”فیما طعموا“ سے تھا کہ تھوڑی بہت چکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے میں کبھی کبھار پی لیتا ہوں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ”الاصابۃ“ میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کر کے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت قدامہؓ کے اس استدلال کو مسترد کر دیا اور ان پر شراب نوشی کی حد جاری کی۔
مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حتمی حکم جاری ہوا اور اسے ”رجس“ قرار دے کر اس سے قطعی طور پر منع کر دیا گیا تو بعض صحابہ کرامؓ کو اشکال ہوا کہ جب یہ گند اور نجاست ہے تو ہمارے جو ساتھی اس کی حرمت کے اعلان سے پہلے شراب پیتے تھے اور ان میں سے بہت سے اسی حالت میں فوت بھی ہو گئے ہیں، ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جو ایمان اور عمل صالح والے لوگ ایمان وتقوی کے ساتھ اس سے قبل شراب پیتے رہے ہیں ان پر کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ جب شراب حرام نہیں ہوئی تھی تو پینے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ گویا اس ”فیما طعموا“ کا تعلق مستقبل سے نہیں بلکہ ماضی سے ہے۔
میں آپ حضرات سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اگر اس آیت کریمہ کا یہ پس منظر ہمیں معلوم نہ ہو تو کیا اس کا صحیح مطلب اور مصداق ہم سمجھ پائیں گے؟ بہت سے لوگوں کو قرآن کریم کی بعض آیات کو سمجھنے اور ان کے صحیح مطلب تک پہنچنے میں دشواری اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ اس آیت کریمہ کے حوالہ سے جناب نبی اکرمؐ کی قولی یا عملی تشریح کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور آیت کے شان نزول سے واقفیت کی زحمت گوارا نہیں کرتے بلکہ اپنے فہم اور علم کے زور سے آیت کریمہ کا مفہوم ومصداق طے کرنے کی کوشش میں گمراہ ہو جاتے ہیں۔
اس لیے آج کی میری ان گزارشات کے خلاصہ کے طور پر یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ہم پر صرف قرآن کریم کے احکام کی اطاعت فرض نہیں بلکہ ان کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کے احکام کی پیروی بھی اسی طرح فرض ہے۔ اور قرآن کریم کی کسی آیت، جملہ یا لفظ کی وہی تشریح وتعبیر حتمی ہے جو جناب نبی اکرمؐ نے اپنے قول یا عمل کے ساتھ کی ہے۔ اور اگر قرآن کریم کی کسی بات کو سمجھنے میں دقت پیش آئے تو اس کے لیے آنحضرتؐ کی حدیث وسنت کے ساتھ ساتھ اس آیت کریمہ کے شان نزول اور پس منظر کو سمجھنا بھی ضروری ہے، اس کے

بغیر قرآن کریم کا صحیح معنی و مفہوم متعیّن نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالی ہم سب کو قرآن و سنت پر صحیح طریقہ سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

تلاوتِ قرآنِ کریم کے تقاضے

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱۹ اکتوبر ۲۰۱۱ء)

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ہفتہ وار درس قرآن کریم کی افتتاحی تقریب سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ ہمارے اس سال کے تعلیمی پروگرام میں ہفتہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام بھی شامل ہے جو ہر اتوار کو نماز مغرب کے فوراً بعد ہوا کرے گا۔ کوشش کروں گا کہ میں خود اس کو جاری رکھوں، البتہ کسی وقت میری غیر حاضری ہوئی تو اکادمی کے کوئی سینئر استاذ درس دیں گے اور درس قرآن کریم کے اس سلسلہ کی پابندی کی کوشش کی جائے گی، ان شاء اللہ تعالی۔ آج تمہید اور آغاز کے طور پر چند گزارشات پیش کر رہا ہوں دعا کریں کہ اللہ تعالی اس کار خیر کو جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔ قرآن کریم نے خود اپنے بارے میں متعدّد ہدایات اور احکامات بیان فرمائے ہیں جن میں سے دو تین کا تذکرہ کرنا چاہوں گا، مثلاً:

1. ایک جگہ ارشاد ربانی ہے کہ "لایمسہ الا المطھرون" قرآن کریم کو پاک لوگ ہی ہاتھ لگاتے ہیں۔ اس سے فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ قرآن کریم کو طہارت کے بغیر ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ طہارت کے دو درجے ہیں:

- ایک یہ کہ جب انسان پر غسل واجب ہو، مرد ہو یا عورت، اگر اس پر غسل واجب ہو گیا ہے تو قرآن کریم کو ہاتھ سے چھونا اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ اور فقہاء کرام نے اس حالت میں قرآن کریم کی تلاوت سے بھی منع کیا ہے۔ الا یہ کہ کوئی جملہ دعا کے طور پر پڑھ لیا جائے مگر تلاوت کی غرض سے قرآن کریم کی کوئی آیت زبانی پڑھنا اس کیفیت میں جائز نہیں ہے جب تک کہ غسل کر کے طہارت حاصل نہ کر لی جائے۔

• دوسرا درجہ یہ ہے کہ کسی شخص کا وضو نہ ہو، بے وضو شخص کے لیے قرآن کریم کی زبانی تلاوت تو جائز ہے وہ جتنی چاہے تلاوت کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم کو ہاتھ لگانا اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم کو ہاتھ میں لینا ہو اور اسے پکڑ کر یا ہاتھ سے اس کے ورق الٹ کر تلاوت کرنی ہو تو اس کے لیے وضو ضروری ہے، اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے بے وضو حالت میں قرآن کریم کو پکڑنا یا ہاتھ لگانا ضروری ہو جائے تو کسی پاک کپڑے کے ساتھ اسے پکڑے مگر ننگے ہاتھوں سے قرآن کریم کو نہ چھوئے۔

2. دوسرا مسئلہ قرآن کریم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''ورتل القرآن ترتیلا'' قرآن کریم کو ٹھہر ٹھہر کر آرام سے پڑھا جائے۔ اس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت اتنی تیزی سے نہ کی جائے کہ اس کے حروف کٹ جائیں، یا لفظوں کی ہیئت بدل جائے، یا تلفظ خراب ہو۔ مگر ہم عجمی لوگوں کے لیے، جن کی زبان عربی نہیں ہے، اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم کو صحیح تلفظ کے ساتھ اور صحیح لہجے میں پڑھا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت عربی زبان میں ہی ہوگی، دوسری زبانوں میں اس کی تعلیم تو ہو سکتی ہے اور اس کا ترجمہ اور اس کے احکام و مسائل کی تشریح ہو سکتی ہے، لیکن تلاوت کسی اور زبان میں جائز نہیں ہے۔ دنیا کے کسی علاقے یا کسی بھی قوم کا کوئی بھی مسلمان جب قرآن کریم کی تلاوت کرے گا تو اسے عربی زبان میں ہی کرنا ہوگی۔ تلاوت کا ثواب اور اس کی برکات عربی زبان میں تلاوت کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں جبکہ عجمی لوگ جن کی زبان عربی نہیں ہے اور وہ عربی زبان کا تلفظ اور لہجہ سیکھے بغیر عربی میں صحیح طریقے سے تلاوت نہیں کر سکتے۔ ہر زبان کے اپنے حروف ہوتے ہیں۔ ان حروف کے الگ الگ مخارج ہوتے ہیں، ہر زبان کا اپنا تلفظ اور لہجہ ہوتا ہے۔ حروف کی صحیح ادائیگی اور الفاظ کے صحیح تلفظ کے بغیر کسی بھی زبان کے کلام کو پڑھنا ممکن نہیں ہوتا اور اس کے بغیر پڑھنے سے بسا اوقات معنی، مفہوم اور مقصد سب کچھ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

قرآن کریم کا معاملہ تو ان سب سے بالاتر ہے اس لیے کہ وہ اللہ رب العزت کا کلام ہے۔ بسا اوقات صرف تلفظ اور زیر زبر کے فرق سے معنی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور بے پرواہی کے ساتھ ایسا کرنے سے ثواب ملنے کی بجائے گناہ ذمہ لگ جاتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ ہے ''انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء'' اس آیت کریمہ میں اللہ کی ہ پر زبر ہے اور العلماء کی ہمزہ پر ضمہ ہے، جس سے معنی یہ بنتا ہے کہ اللہ تعالی سے اس کے علم والے بندے ہی صحیح معنوں میں ڈرتے ہیں۔ لیکن اگر اللہ کی ہ پر ضمہ پڑھ دیں اور العلماء کی ہمزہ پر فتحہ پڑھا جائے تو معنی بالکل الٹ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالی (نعوذ باللہ) اپنے علم والے بندوں سے ڈرتا ہے۔

اسی طرح ہم جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو السلام علیکم کہتے ہیں اور وعلیکم السلام کے ساتھ اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس کا صحیح تلفظ ''السلام علیکم'' ہے مگر ہمارے ہاں اکثر جلدی سے جب سلام کہا جاتا ہے تو درمیان میں لام کا حرف کٹ جاتا ہے اور جملہ یوں بن جاتا ہے ''سام علیکم''۔ سام کا معنی عربی میں موت ہے۔ اگر ہم السلام علیکم کہیں تو اس کا معنی ہے تم پر سلامتی ہو اور جواب میں وعلیکم السلام کہا جائے تو اس کا مطلب ہے اور تم پر بھی سلامتی ہو۔ گویا دو مسلمان جب ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں مگر تیزی کے ساتھ سلام کی بجائے سام بول دیں تو اس کا مطلب بنتا ہے کہ تم پر موت آئے جواب میں دوسرا شخص کہتا ہے کہ تم پر بھی موت آئے۔ مدینہ منورہ کے یہودی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جان بوجھ کر شرارت سے یہ لفظ اس طرح کہا کرتے تھے ''السام علیکم''۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جس دور میں پردے کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا جناب نبی کریمؐ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا کہ ''السام علیکم''۔ حضورؐ نے جواب دیا ''وعلیکم''۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو سخت غصہ آیا اور اس شخص سے کہا ''علیک السام واللعنۃ'' تم پر موت آئے اور تم پر لعنت ہو۔ وہ جب چلا گیا تو نبی کریمؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تم اس قدر غصے میں کیوں آگئی تھیں؟ حضرت عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ نے سنا نہیں کہ اس نے کیا لفظ کہا

ہے؟ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ تم نے میرا جواب نہیں سنا، میں نے تو اسے جواب دے دیا تھا۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اگر جواب میں ''وعلیکم'' واؤ کے ساتھ کہا جائے تو معنی بنے گا کہ ''اور تم پر بھی ہو''، لیکن اگر واؤ کے بغیر ''علیکم'' کہا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ''تم پر ہو'' (مجھ پر نہیں)۔ تو ان مثالوں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ کسی حرف کے کٹ جانے سے یا اس کا تلفظ صحیح نہ کرنے سے یا زیر زبر کا فرق ہو جانے سے معنی بالکل بدل جاتا ہے اور جملہ کا مفہوم الٹ ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے لیے عربی حروف، الفاظ، تلفظ اور لہجے کو سیکھا جائے تاکہ ہم قرآن کریم کی تلاوت صحیح طور پر کر سکیں، ورنہ معنی کچھ کا کچھ ہو جائے گا جس سے نماز میں بھی فرق پڑتا ہے اور تلاوت بھی صحیح طریقہ سے نہیں ہوتی۔ تو دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے ضروری ہے اور اسے باقاعدہ طور پر سیکھنے کی ضرورت ہے۔

3. تیسرا مسئلہ قرآن کریم کے حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جب ابھی شراب حرام نہیں ہوئی تھی اور اکثر لوگ شراب پیتے تھے۔ شراب زیادہ پینے سے نشہ ہو جاتا ہے، نشے کی حالت میں انسان کو اپنی گفتگو اور الفاظ پر کنٹرول نہیں رہتا اور اسے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے؟ ہمارے ہاں ایک لطیفہ عام طور پر مشہور ہے کہ کوئی شرابی آدھی رات کو نشے کی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا تو اس سے دروازے کا تالا نہیں کھل رہا تھا، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ تالا کھولنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا، گلی سے گزرنے والے ایک شخص نے دیکھا تو اس کی مدد کرنے کے خیال سے کہا کہ چابی مجھے دو میں تالا کھول دیتا ہوں، اس نے جواب میں کہا کہ تالا تو میں خود ہی کھول لوں گا، تم ذرا اس دیوار کو پکڑ کر رکھو کیونکہ یہ ہل رہی ہے اور اس کی وجہ سے تالا نہیں کھل رہا۔ مطلب یہ ہے کہ نشے کی حالت میں آدمی کو اپنی گفتگو پر اور اپنی چال ڈھال پر کنٹرول نہیں رہتا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک بزرگ صحابی نشے کی حالت میں نماز پڑھا رہے تھے، سورۃ الکافرون کی تلاوت نماز میں کی تو ''لا اعبد'' کی بجائے ''اعبد'' پڑھ گئے جس سے آیت کریمہ کا مفہوم ہی الٹ ہو گیا۔ اس پر قرآن کریم میں حکم اترا کہ اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک اس ذہنی کیفیت میں واپس نہ آجاؤ کہ جو کچھ تم پڑھ رہے ہو اس کا تمہیں خود بھی علم ہو۔ یہاں قرآن کریم کا جملہ یوں ہے کہ ''حتی تعلموا ما تقولون'' حتی کہ تمہیں علم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس حوالہ سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نماز میں جو کچھ ہم پڑھتے ہیں اس کا ہمیں علم ہونا چاہیے کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں؟

نماز اللہ تعالی کے ساتھ مناجات کا نام ہے جس کا طریق کار متعیّن ہے اور اس کے آداب و شرائط طے شدہ ہیں۔ ہم وضو کر کے پاک جسم اور پاک کپڑوں کے ساتھ پاک جگہ پر قبلہ رخ ہو کر اللہ تعالی کے حضور میں کھڑے ہوتے ہیں اور تکبیر تحریمہ ''اللہ اکبر'' کہہ کر ساری دنیا کے ساتھ تعلقات کو منقطع کر کے تھوڑی دیر کے لیے اللہ تعالی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہم کھڑے، بیٹھے، سجدے میں پڑے، ہاتھ باندھ کر، ہاتھ چھوڑ کر اور مختلف کیفیات میں اپنے مالک اور رب سے باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ عجیب سا معاملہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی ہم سے باتیں کرتے ہیں اور ہم اپنی زبان سے ان باتوں کو دہراتے ہیں، جبکہ نماز میں ہم خدا سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن ہم نہ اللہ کی باتیں سمجھتے ہیں اور نہ ہی اپنی باتیں ہماری سمجھ کے دائرے میں ہوتی ہیں، ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اللہ تعالی ہم سے کیا فرما رہے ہیں اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اللہ تعالی سے کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کیفیت قرآن کریم کے اس ارشاد سے مطابقت نہیں رکھتی کہ ''حتی تعلموا ما تقولون'' نماز اس حالت میں پڑھو کہ جو تم زبان سے کہہ رہے ہو اس کا تمہیں علم بھی ہو۔ کیونکہ قول زبان سے لفظ ادا کرنے کو کہتے ہیں جبکہ علم کا تعلق مفہوم اور معنی سے ہوتا ہے۔

یہ باتیں میں نے آج کی تمہیدی گفتگو میں اس لیے عرض کی ہیں کہ قرآن کریم کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اور کم از کم نماز میں کی جانے والی تلاوت اور پڑھے جانے والے دیگر جملوں، دعاؤں اور اذکار کا ہمیں علم ہونا چاہیے اور ان کا مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہونا چاہیے۔ یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے ضروری ہے اور باقاعدہ سیکھنے کے بغیر یہ دونوں چیزیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ میں درس کے شرکاء کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ یہ چیزیں سیکھنے کے لیے خود بھی وقت نکالیں اور اپنے دیگر دوستوں کو بھی تیار کریں اور اس کے لیے روزانہ دس پندرہ منٹ کا وقت فارغ کریں۔ الشریعہ اکادمی کے اساتذہ اس خدمت کے لیے حاضر ہیں آپ رابطہ کر کے جو وقت آپ کے پاس آپ کی سہولت کے مطابق فارغ ہو سکتا ہو ہم اس وقت میں آپ کی یہ خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

میری علمی و مطالعاتی زندگی

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۱ء)

(جناب عرفان احمد، مدیر ماہنامہ "نوائے کسان" لاہور کے مرتب کردہ سوال نامہ کے جوابات)

سوال نمبر۱۔ کچھ ذاتی حالات زندگی کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔

جواب: ہمارا تعلق ضلع مانسہرہ، ہزارہ میں آباد سواتی خاندان سے ہے جس کے آباو اجداد کسی زمانے میں سوات سے نقل مکانی کر کے ہزارہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ہمارے دادا نور احمد خان مرحوم شنکیاری سے آگے کڑمنگ بالا کے قریب چیڑاں ڈھکی میں رہتے تھے اور زمینداری کرتے تھے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ کی نو عمری میں ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ یہ دونوں حضرات دینی تعلیم کی طرف آ گئے۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر پنجاب کے مختلف مدارس، بالخصوص مدرسہ انوار العلوم، مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں درس نظامی کا بڑا حصہ پڑھا۔ ۱۹۴۱ء۔ ۱۹۴۲ء میں دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ دار العلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے

ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ وہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث رہے ہیں اور کم و بیش ساٹھ سال تک تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ دیوبندی مسلک کے علمی ترجمان سمجھے جاتے تھے اور کم و بیش پچاس کے لگ بھگ کتابوں کے مصنف تھے۔

میری ولادت ۱۹۴۸ء میں ۲۸ اکتوبر کو ہوئی۔ میری والدہ محترمہ کا تعلق راجپوت خاندان سے تھا اور ہمارے نانا مرحوم مولوی محمد اکبر صاحب گوجرانوالہ میں ریلوے اسٹیشن کے قریب تالاب دیوی والا، رام بستی کی ایک مسجد کے امام تھے۔ ان کا تعلق راجپوت جنجوعہ برادری سے بتایا جاتا ہے۔ میں نے قرآن مجید گکھڑ کے مدرسہ تجوید القرآن میں مختلف اساتذہ سے حفظ کیا جس میں سب سے آخری اور بڑے استاد قاری محمد انور صاحب ہیں جو کہ آج کل مدینہ منورہ میں تحفیظ القرآن کے استاد ہیں۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو میرا حفظ مکمل ہونے پر گکھڑ کی جامع مسجد میں جو تقریب ہوئی، اس میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا قاری فضل کریمؒ اور حضرت مولانا قاری محمد حسن شاہؒ نے شرکت فرمائی تھی اور میں نے آخری سبق ان بزرگوں کو سنایا تھا۔ درس نظامی کے بڑے حصہ کی تعلیم میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں حاصل کی اور میرے اساتذہ میں حضرت والد محترم اور حضرت عم مکرم کے علاوہ حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی مدظلہ، حضرت مولانا قاضی محمد اسلم، حضرت مولانا قاضی عزیز اللہ اور حضرت مولانا جمال احمد بنوی مظاہری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم سے میں نے فراغت حاصل کی۔

دوران زمانہ طالب علمی مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی معاونت کے لیے بطور نائب خطیب میرا تقرر ہو چکا تھا، جبکہ اس سے قبل کم و بیش دو سال تک گتہ مل راہوالی کی کالونی کی مسجد میں خطابت کے فرائض سر انجام دیتا رہا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی وفات کے بعد مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے مستقل خطیب کی حیثیت سے میں نے ذمہ داری سنبھال لی تھی جو کہ بحمد اللہ تعالیٰ اب تک حسب استطاعت نباہ رہا ہوں۔ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے مدرسہ انوار العلوم میں ہی ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک درس نظامی کی تدریس کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہوں، جبکہ گزشتہ دس گیارہ سال سے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تدریسی خدمات میرے سپرد ہیں اور والد محترم کے بعد صدارت تدریس اور نظامت تعلیمات کی ذمہ داری بھی میرے ناتواں کندھوں پر

ہے۔

صحافتی زندگی میں طالب علمی کے دوران ۱۹۶۵ء میں روزنامہ وفاق لاہور کے نامہ نگار کی حیثیت سے داخل ہوا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں گکھڑ پر بھارتی فضائیہ کی بمباری کے حوالہ سے پہلا فیچر لکھا اور شہری دفاع کے رضا کار کے طور پر خدمات بھی سرانجام دیں۔ اس کے بعد جمعیت علماء اسلام کے آرگن ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کے ساتھ تعلق رہا اور متعدّد بار کئی برس تک ایڈیٹر کے طور پر فرائض سرانجام دیے۔ روزنامہ پاکستان اسلام آباد اور روزنامہ اوصاف اسلام آباد میں کئی سال مستقل کالم نگار کے طور پر وابستہ رہا اور ''نوائے قلم'' کے نام سے ہفتہ وار کالم لکھتا رہا۔ اب یہ کالم روزنامہ پاکستان لاہور میں لکھ رہا ہوں جبکہ روزنامہ اسلام میں بھی ''نوائے حق'' کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھتا ہوں۔ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے ترجمان ماہنامہ نصرۃ العلوم کا اداریہ بھی کئی برسوں سے تحریر کر رہا ہوں، اور میری ادارت میں ماہنامہ الشریعہ بھی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

بیرون ملک ختم نبوت کانفرنسوں اور ورلڈ اسلامک فورم کی سرگرمیوں کے علاوہ دیگر تعلیمی، دعوتی اور مطالعاتی مقاصد کے لیے کئی ممالک میں جانا ہوا جن میں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر، جنوبی افریقہ، بھارت، بنگلہ دیش، ایران، افغانستان، ازبکستان، ترکی، ہانگ کانگ، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور کینیا شامل ہیں۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کی سالانہ تعطیلات کے دوران شعبان المعظم اور اس کے ساتھ رمضان المبارک کا کچھ حصہ برطانیہ اور امریکہ میں تعلیمی سرگرمیوں میں مصروفیت رہتی ہے اور متعدّد دینی اداروں سے مشاورت اور معاونت کا تعلق ہے۔

سیاسی و تحریکی ذوق طالب علمی کے دور سے چلا آرہا ہے۔ جمعیت طلباء اسلام پاکستان کو منظم کرنے میں حصہ لیا۔ گکھڑ میں انجمن نوجوانان اسلام کے نام سے نوجوانوں کی تنظیم بنائی اور جمعیت علماء اسلام میں بتدریج شہر، ضلع، صوبہ اور مرکزی سطح پر سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا۔ مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے میرا انتخاب حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی تجویز پر ۱۹۷۵ء میں ہوا اور پھر ان کی وفات تک ان کی معاون ٹیم کے ایک متحرک رکن کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۷۴ء اور ۱۹۸۴ء کی تحریک ختم نبوت میں عملی حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۸۴ء کی تحریک ختم نبوت میں مرکزی مجلس عمل کے سیکرٹری اطلاعات کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد قائم ہوا تو اس

کی دستور ساز اور منشور ساز کمیٹیوں اور پارلیمانی بورڈ میں جمعیت کی نمائندگی کی۔ پنجاب کا قومی اتحاد کا نائب صدر اور پھر سیکرٹری جنرل رہا۔ ۱۹۸۸ء میں اسلامی جمہوری اتحاد قائم ہوا تو اس میں بھی دستور ساز اور منشور ساز کمیٹیوں میں جمعیت علماء اسلام (درخواستی گروپ) کی نمائندگی کی اور صوبائی نائب صدر رہا۔ ۱۹۹۰ء میں جمعیت علماء اسلام پاکستان کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے منصب سے مستعفی ہو کر عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گیا۔

تحریک ختم نبوت، تحریک نظام مصطفی، گوجرانوالہ میں مسجد نور کو محکمہ اوقاف سے واگزار کرانے کی تحریک، اور دیگر متعدّد تحریکات میں حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بھٹو دور میں کئی بار جیل یاترا کی۔ مسجد نور کی تحریک میں کم و بیش چار ماہ اور تحریک نظام مصطفی میں ایک ماہ جیل کاٹی۔ اس کے علاوہ بھی متعدّد بار تھوڑی مدت کے لیے جیل جانے کا موقع ملا۔

سیاسی طور پر جمعیت علماء اسلام پاکستان سے وابستہ رہا۔ کم و بیش پچیس برس تک صوبائی اور مرکزی سطح پر مختلف عہدوں پر متحرک کردار ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے رفیق کار اور اسسٹنٹ کے طور پر سالہا سال خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔ اب ایک عام کارکن کے طور پر جمعیت علماء اسلام کے ساتھ شریک ہوں جبکہ انتخابی سیاسی سے ہٹ کر فکری اور علمی حوالہ سے اسلامائزیشن کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کر رہا ہوں جس کے امیر مولانا فداء الرحمن درخواستی آف کراچی ہیں۔

گزشتہ عشرہ کے اوائل میں لندن میں مولانا محمد عیسی منصوری اور مفتی برکت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر عالمی سطح پر ایک فکری اور علمی فورم "ورلڈ اسلامک فورم" کے نام سے قائم کیا جو کہ علمی اور فکری میدان میں عصر حاضر کے تقاضوں کا احساس اجاگر کرنے میں مصروف ہے اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ برطانیہ، بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دیگر شرکاء و معاونین میں ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ، ڈاکٹر سلمان ندوی الحسینی اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ شامل رہے ہیں۔

۱۹۸۹ء میں الشریعہ اکادمی قائم کی جس کا مقصد دعوت اسلام اور دینی تعلیم کے حوالے سے عصری تقاضوں کو اجاگر کرنا اور ان کی طرف دینی حلقوں کو توجہ دلانا تھا۔ یہاں ہم دینی تعلیم کے ساتھ عصری تقاضوں کے امتزاج کا تجربہ کر رہے ہیں اور اس

ضمن میں مختلف کورسز ہر سال ہوتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء سے ماہنامہ الشریعہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جو اسلام اور ملت اسلامیہ کو درپیش معروضی مسائل کے حوالے سے اپنی بساط کے مطابق خدمت کر رہا ہے اور علمی حلقوں میں بحمد اللہ تعالیٰ اسے توجہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ الشریعہ اکادمی کی باقاعدہ بلڈنگ ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ میں تعمیر کی گئی ہے جس میں مسجد اور لائبریری بھی شامل ہے اور اس میں سال بھر فکری اور تعلیمی سرگرمیاں جاری رہتی ہے۔ دینی مدارس اور اسکول و کالج کے طلبہ کے لیے سال میں انگریزی بول چال، عربی بول چال، کمپیوٹر ٹریننگ وغیرہ کے مختصر دورانیے کے مختلف کورسز ہوتے ہیں اور علمی و فکری عنوانات پر محاضرات، سیمینارز اور ورکشاپس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر ۲۔ آپ کے اندر ذوق مطالعہ کب نمایاں طور پر پیدا ہوا؟ آغاز کیسے ہوا؟ اس کی نشوونما کس طرح ہوئی؟ خاندانی نظام تربیت کا اثر کہاں تک ہوا؟

جواب: کتاب کے ساتھ میرا تعارف بحمد اللہ تعالیٰ بہت پرانا ہے اور اس دور سے ہے جبکہ میں کتاب کے مفہوم اور مقصد تک سے آشنا نہیں تھا۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا گھر میں زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کے اردگرد الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں ہوتی تھیں۔ اس لیے کتاب کے چہرہ سے شناسائی تو تب سے ہے جب میں نے اردگرد کی چیزوں کو دیکھنا اور ان میں الگ الگ فرق کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد کتاب سے دوسرے مرحلے کا تعارف اس وقت ہوا جب میں نے دو چار حرف پڑھ لیے اور کم از کم کتاب کا نام پڑھ سکتا تھا۔ والد صاحب ایک چارپائی پر بیٹھ کر لکھا کرتے تھے اور حوالہ کے لیے کوئی کتاب دیکھنے کی ضرورت ہوتی تو خود اٹھ کر متعلقہ الماری سے وہ کتاب لے لیا کرتے تھے، مگر جب میں اور میری بڑی ہمشیرہ الفاظ کی شناخت کے قابل ہو گئے تو پھر اس کام میں ہماری شرکت بھی ہو گئی، اس حد تک کہ ہم میں سے کوئی موجود ہوتا تو والد صاحب کو کتاب کے لیے خود الماری تک نہیں جانا پڑتا تھا بلکہ وہ ہمیں آواز دیتے کہ فلاں کتاب کی فلاں جلد نکال لاؤ، اور ہم میں سے کوئی یہ خدمت سرانجام دے دیتا۔ ابتدا میں والد صاحب کو ہمیں یہ بتانا پڑتا تھا کہ فلاں الماری کے فلاں خانے میں اس نام کی کتاب ہے، اس کی اتنے نمبر کی جلد نکال لاؤ۔ بعد میں کتابوں سے ہمارا تعارف گہرا ہو گیا تو وہ صرف کتاب اور جلد نمبر کا کہتے اور ہم کتاب نکال لاتے اور اس کے

لیے بسا اوقات ہم دونوں بہن بھائیوں میں مقابلہ بھی ہوتا کہ کون پہلے کتاب نکال کر لاتا ہے۔ اس وقت کی جن کتابوں کے نام ابھی تک ذہن کے نقشے میں محفوظ ہیں، ان میں السنن الکبریٰ، لسان المیزان، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، تاریخ بغداد اور نیل الاوطار بطور خاص قابل ذکر ہیں جو علم حدیث اور اسماء رجال کی کتابیں ہیں اور یہ حضرت والد صاحب کے خصوصی ذوق کے علوم ہیں۔ ان کتابوں کے نام، ٹائٹل اور جلدیں بچپن میں ہی ذہن پر نقش ہو گئی تھیں اور یہ نقش ابھی تک اس طرح تازہ ہیں جیسے آج ہی ان کتابوں کو دیکھا ہو۔

پھر ایک قدم اور آگے بڑھا اور کتابوں کو خود پڑھنے کی منزل آ گئی۔ اس کے لیے میں گکھڑ کے ایک مرحوم بزرگ ماسٹر بشیر احمد صاحب کشمیری کا ممنون احسان ہوں کہ ان کی بدولت کتاب کے مطالعہ کی حدود میں قدم رکھا۔ ماسٹر بشیر احمد کشمیریؒ پرائمری سکول کے ٹیچر تھے اور حضرت والد محترم کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ان کے خاندان سے ہمارا گہرا خاندانی تعلق تھا۔ انہیں ہم چاچا جی کہا کرتے تھے اور وہ بھی ہم سے بھتیجوں جیسا تعلق رکھتے تھے۔ ان کی والدہ محترمہ کو ہم بے جی کہتے تھے اور ان کی ہمشیرگان ہماری پھوپھیاں کہلاتی تھیں۔ انہی میں سے ایک پھوپھی اب میرے چھوٹے بھائی مولانا عبد القدوس قارن کی خوشدامن ہیں۔ والد محترم کو جب کسی جلسہ یا دوسرے کام کی وجہ سے رات گھر سے باہر رہنا پڑتا تو بے جی اس روز ہمارے ہاں رات گزارتی تھیں اور ہمیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنایا کرتی تھیں جس کی وجہ سے ہم بہت خوش ہوتے تھے اور ہمیں ایسی رات کا انتظار رہتا تھا۔

ماسٹر بشیر احمد صاحب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے شیدائی اور احرار کے سرگرم کارکن تھے۔ وہ حضرت شاہ جیؒ کی گکھڑ تشریف آوری اور جلسہ سے خطاب کا واقعہ اکثر سنایا کرتے تھے اور میرے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ میں بالکل گود کا بچہ تھا اور مجھے حضرت شاہ جیؒ نے گود میں اٹھایا تھا۔ اس لیے مجھ سے اگر کوئی دوست پوچھتا ہے کہ کیا تم نے امیر شریعتؒ کی زیارت کی ہے تو میں کہا کرتا ہوں کہ مجھے تو یاد نہیں ہے، البتہ شاہ جیؒ نے مجھے دیکھا ہے۔ ماسٹر صاحب کے ہاں ہفت روزہ خدام الدین، ترجمان اسلام، ماہنامہ تبصرہ، ہفت روزہ پیام اسلام، ہفت روزہ چٹان اور دیگر دینی جرائد آیا کرتے تھے۔ میں ان جرائد سے انہی کے ہاں متعارف ہوا اور وہیں سے رسالے پڑھنے کی عادت شروع ہوئی۔ حضرت والد صاحب کے پاس دہلی سے ماہنامہ برہان، ملتان سے ماہنامہ الصدیق، چوکیرہ (سرگودھا) سے ماہنامہ

الفاروق اور فیصل آباد (تب لائل پور) سے ہفت روزہ پاکستانی آیا کرتے تھے جو میری نظر سے گزرا کرتے تھے۔ جامع مسجد بوہڑ والی گکھڑ کے حجرہ کی الماری میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جس کے انچارج ماسٹر صاحب مرحوم تھے۔ اس میں زیادہ تر احرار راہنماؤں کی کتابیں تھیں۔ وہیں سے میں نے وہ کتابیں لیں جو میری زندگی میں مطالعہ کی سب سے پہلی کتابیں ہیں۔ چودھری افضل حق مرحوم کی کتاب ”زندگی“ اور ”تاریخ احرار“، مولانا مظہر علی اظہر کی ”دنیا کی بساط سیاست“ اور آغا شورش کاشمیری کی ”خطبات احرار“ پہلی کتابیں ہیں جن کا میں نے باقاعدہ مطالعہ کیا۔ کچھ سمجھ میں آئیں اور اکثر حصے ذہن کے اوپر سے ہی گزر گئے لیکن بہرحال میں نے اپنی مطالعاتی بلکہ فکری زندگی کا آغاز ان کتابوں سے کیا۔

ہماری والدہ مرحومہ گوجرانوالہ سے تھیں، شیرانوالہ باغ کے سامنے ریلوے پھاٹک سے دوسری طرف واقع پولیس تھانے کے عقب میں رام بستی نامی محلہ کی مسجد میں ہمارے نانا مرحوم مولوی محمد اکبر صاحب امام مسجد تھے جو راجپوت جنجوعہ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے باذوق بزرگ تھے، قرآن کریم معروف لہجے میں اور اچھے انداز میں پڑھا کرتے تھے جو اس زمانہ میں بہت کمیاب تھے۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن میں نے بہت سے معیاری علمی جرائد ان کے ہاں سے ڈاک میں باقاعدہ آتے دیکھے جن میں الفرقان، النجم، برہان، خدام الدین اور دروس قرآن جیسے رسالے بھی شامل تھے۔ وہ ان کا مطالعہ کرتے اور اہتمام سے ان کی جلدیں بنواتے تھے۔

اس کے بعد جب ۱۹۶۳ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں داخل ہوا اور مدرسہ کے دارالاقامہ میں ایک آزاد طالب علم کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کیا تو میں نے اس آزادی کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ گھومنا، پھرنا، جلسے سننا، لائبریری تلاش کرنا، رسالے ڈھونڈنا، کتابیں مہیا کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا میرے روز مرہ معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔ درسی کتابوں کے ساتھ میرا تعلق اتنا ہی تھا کہ سبق میں حاضر ہوتا تھا اور واجبی سے مطالعہ و تکرار کے ساتھ سبق کو کسی حد تک قابو میں رکھنے کی کوشش بھی بسا اوقات کر لیتا تھا، لیکن اس کے علاوہ میری مصروفیات کا دائرہ پھیل چکا تھا اور اس میں شب و روز کی کوئی قید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس دور میں مدرسہ نصرۃ العلوم کے کتب خانے کے علاوہ عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کی ذاتی لائبریری میری دسترس میں تھی، اور چوک نیائیں میں اہلحدیث

دوستوں کا ''اسلامی دارالمطالعہ'' میری جولان گاہ میں شامل تھا جہاں میں اکثر عصر کے بعد جاتا، دینی جرائد اور رسالوں پر نظر ڈالتا اور مطالعہ کے لیے کوئی نہ کوئی کتاب وہاں سے لے آتا۔ طالب علمی کے دور میں سب سے زیادہ استفادہ میں نے ان تین لائبریریوں سے کیا ہے۔

کتاب کے ساتھ تعارف کا اس سے اگلا مرحلہ میرے طالب علمی کے آخری دور میں شروع ہوا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد کے دور کی بات ہے۔ گوجرانوالہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے جہاں آج کل سفینہ مارکیٹ ہے، ان دنوں یہاں خیام ہوٹل ہوا کرتا تھا جہاں ہر اتوار کی شام کو ''مجلس فکر و نظر'' کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست جمتی تھی۔ ارشد میر ایڈووکیٹ مرحوم اس مجلس کے سیکرٹری تھے۔ ان سے اسی محفل میں تعارف ہوا جو بڑھتے بڑھتے بے تکلفانہ اور برادرانہ دوستی تک جا پہنچا۔ اس ادبی محفل میں کوئی نہ کوئی مقالہ ہوتا اور ایک آدھ نظم یا غزل ہوتی جس پر تنقید کا میدان گرم ہوتا اور ارباب شعر و ادب اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے۔ پروفیسر اسرار احمد سہاروی، سید سبط الحسن ضیغم، ایزد مسعود ایڈووکیٹ، پروفیسر عبد اللہ جمال، پروفیسر افتخار ملک مرحوم، پروفیسر محمد صادق، پروفیسر رفیق چودھری، اثر لدھیانوی مرحوم اور ارشد میر ایڈووکیٹ مرحوم اس مجلس کے سرکردہ ارکان تھے۔ میں بھی ہفتہ وار ادبی نشست میں جاتا تھا اور ایک خاموش سامع کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا۔ ایک روز اگلی محفل کا پروگرام طے ہو رہا تھا لیکن کوئی صاحب مقالہ کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو کہا کہ اگر اجازت ہو تو اگلی محفل میں مضمون میں پڑھ دوں؟ دوستوں نے میری طرف دیکھا تو میری ہیئت کذائی دیکھ کر تذبذب کا شکار ہو گئے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی خاموشی کے بعد ارشد میر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کس موضوع پر مضمون پڑھیں گے؟ میں نے جواب دیا کہ ''فلپ کے ہٹی کی کتاب ''عرب اور اسلام'' پر ایک تنقیدی نظر''۔ ہٹی کی اس کتاب کا ترجمہ انہی دنوں آیا تھا اور میں نے تازہ تازہ پڑھ کر اس کی بہت سی باتوں کو نشان زد کر رکھا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ میں اگلے اتوار تک کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات کو قلم بند کر لوں گا۔ مگر میرا یہ کہنا ایک دھماکہ ثابت ہوا، میری پہلی بات ہی بعض دوستوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری بات نے تو ان کے چہروں کی کیفیات کو یکلخت تبدیل کر دیا اور مجھے بعض چہروں پر خندۂ استہزا کی جھلک صاف دکھائی دینے لگی، مگر میں اپنے موقف پر قائم رہا جس پر ارشد میر

صاحب نے اگلی محفل میں میرے مضمون کا اعلان کر دیا۔

میں نے اپنے مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے میں ان واقعاتی غلطیوں کی نشاندہی کی جو ہٹی سے تاریخی طور پر چند واقعات کو بیان کرنے میں ہو گئی تھی اور ان کی تعداد دس سے زیادہ تھی۔ دوسرے حصے میں اس اصولی بحث پر کچھ گزارشات پیش کیں کہ ہٹی اور دیگر مستشرقین اسلام کو ایک تحریک (Movement) کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ اسلام تحریک نہیں بلکہ دین ہے، اور پھر اس کے ساتھ ہی تحریک اور دین کے فرق کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ اس مضمون کا پہلا حصہ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں اس دور میں شائع ہو گیا تھا مگر دوسرے حصے کے بارے میں ترجمان اسلام کے مدیر محترم ڈاکٹر احمد حسین صاحب کمال مرحوم نے مجھے بتایا کہ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے میرے پاس اس کی کاپی نہیں تھی اور مزید بدقسمتی یہ کہ اس کے بعد اس حصے کو لکھنے کی کئی بار کوشش کر چکا ہوں، مگر ابھی تک اس معیار پر نہیں لکھ پا رہا۔ کسی کتاب کے پوسٹ مارٹم اور آپریشن کے حوالے سے یہ میرا پہلا مضمون تھا جو میں نے ”مجلس فکر و نظر“ کی ہفتہ وار ادبی نشست میں پڑھا جسے بے حد پسند کیا گیا اور اس کے بعد مجلس میں میری شمولیت نے خاموش سامع کے بجائے متحرک رکن کی شکل اختیار کر لی۔ بلکہ ایک موقع پر ”اسلام میں اجتہاد کا تصور“ کے عنوان پر مجھ سے مضمون پڑھنے کی فرمائش کی گئی جس پر میں نے بڑی محنت سے ایک مقالہ مرتب کر کے پڑھا۔ یہ نشست پروفیسر اسرار احمد سہارویؒ کی صدارت میں تھی اور شیخ ایزد مسعود نے میرے مقالہ پر اپنی تنقید میں اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی۔ بعد میں اسی مجلس کے ایک محترم دوست نے وہ مقالہ مجھ سے مطالعہ کے لیے لیا مگر ان کی وفات ہو گئی اور وہ مضمون پھر دستیاب نہ ہو سکا۔

سوال نمبر ۳۔ کون سی شخصیتیں تھیں جنھوں نے آپ کے ذوق مطالعہ کو مہمیز کیا اور اس سفر میں آپ کی رہنمائی کی؟ آپ کے مطالعہ کے مختلف ادوار کیا رہے؟ پسندیدہ موضوعات، ذوق میں ارتقائی تبدیلیاں؟

جواب: حضرت والد محترم کے علاوہ چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی اور ماسٹر بشیر احمد صاحب کشمیریؒ بنیادی شخصیات ہیں جنھوں نے مجھے مطالعہ کی طرف راغب کیا، مختلف موضوعات پر کتابیں مہیا کرتے رہے اور میرے مطالعہ کی

حوصلہ افزائی اور نگرانی کرتے رہے۔ لکھنے پڑھنے کی عادت طالب علمی کے زمانہ میں ہی تھی۔ مضامین لکھنا، خبریں بنانا اور اخبارات میں پہنچانا اور پھر ان کی اشاعت پر خوش ہونا اسی دور سے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ اس میں گوجرانوالہ کے معروف صحافی صاحبزادہ سید جمیل الحسن مظلوم مرحوم اور راشد بزمی مرحوم کی حوصلہ افزائی کا بہت دخل رہا ہے۔ اس زمانہ میں پاکستان کے قومی اخبارات میں نسیم حجازی مرحوم کا روزنامہ کوہستان خاصی اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ ایک بار میرا ایک مضمون روزنامہ کوہستان میں ادارتی صفحہ پر شائع ہوا جس نے میرا دماغ ''خراب'' کر دیا اور میں نے دماغ کی اس خرابی میں ایک تعلیمی سال ضائع کر دیا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میرے مضامین ہفت روزہ ترجمان اسلام میں شائع ہوتے تھے اور میں روزنامہ وفاق لاہور کا باقاعدہ نامہ نگار بن گیا تھا۔ ''کوہستان'' کے ادارتی صفحے پر مضمون کی اشاعت نے میرے ذہن میں یہ بات پیدا کر دی کہ میرا اصل میدان صحافت ہے، اس لیے تعلیم وتعلم میں میری توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ حضرت والد صاحب نے یہ دیکھ کر مجھے مدرسہ سے اٹھا کر گکھڑ میں گھر لے آئے اور وہاں اپنی نگرانی میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں گکھڑ کے مدرسہ میں استاذ حضرت مولانا غلام علی صاحبؒ سے میں نے ''فصول اکبری'' اور ''گلستان'' کا کچھ حصہ پڑھا اور حضرت مولانا قاری عبد الحلیم سواتی مدظلہ سے قرآن کریم کے کچھ حصے کی مشق کی۔ حضرت والد صاحب کا انداز سختی کا ہوتا تھا اور سختی کے سارے حربے وہ اختیار کرتے تھے جس سے میں بے بسی کے عالم میں ایک روبوٹ کی طرح تعمیل حکم تو کر لیا کرتا تھا مگر سوچ سمجھ کے دروازے اکثر بند ہی رہتے تھے، اس لیے یہ سختی مجھ پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی۔

اس دوران ایک روز گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں آیا تو چچا محترم حضرت صوفی عبد الحمید سواتی صاحبؒ نے پاس بٹھا کر مجھے بڑی شفقت سے سمجھایا اور ان کی یہ بات میرے دل و دماغ میں نقش ہو گئی کہ بیٹا! صحافت اور خطابت لوگوں تک کوئی بات پہنچانے کا ذریعہ ہے، یہ ضرور آدمی کے پاس ہونا چاہیے، لیکن پہنچانے کے لیے کوئی چیز بھی پاس موجود ہونی چاہیے۔ اگر اپنے پاس کچھ ہوگا تو دوسروں تک پہنچاؤ گے اور اگر اپنا سینہ علم سے خالی ہوگا تو دوسروں کو کیا دو گے؟ ٹونٹی کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، وہی چیز باہر نکالے گی جو ٹینکی میں ہوگی اور اگر ٹینکی میں کچھ نہیں ہوگا تو ''شاں شاں'' کرے گی۔ حضرت صوفی صاحبؒ کے اس محبت بھرے لہجے اور ''شاں شاں'' کی مثال نے ایک لمحے میں دل و دماغ کا کانٹا بدل دیا اور یہ جملے اب بھی

میرے کانوں میں ”شاں شاں“کرتے رہتے ہیں۔

میرے مطالعہ کا آغاز ”زندگی“ اور ”تاریخ احرار“ سے ہوا۔ پھر تاریخی ناولوں کی طرف ذہن مڑ گیا اور نسیم حجازی مرحوم اور محمد اسلم مرحوم کا مطالعہ کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ ہفت روزہ خدام الدین، ہفت روزہ چٹان اور ہفت روزہ ترجمان اسلام میرے مستقل مطالعہ میں شامل ہو گئے۔ اخبارات بھی شوق سے پڑھتا تھا اور طالب علمی کے زمانے میں نوائے وقت، کوہستان اور امروز میرے روز مرہ مطالعہ کا حصہ ہوتے تھے۔ طالب علمی کے دور میں مطالعہ کے لیے مجھے جس نوعیت کی کوئی کتاب یا رسالہ میسر آجاتا، سمجھ میں آتا یا نہ آتا، میں اس پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش ضرور کرتا۔ البتہ ترجیحات میں بالترتیب مزاحیہ تحریریں، تاریخی ناول اور جاسوسی ادب سر فہرست رہے اور اب بھی اختیاری مطالعہ میں حتی الامکان ترجیحات کی یہ ترتیب قائم رہتی ہے۔ مگر یہ بات تفریحی مطالعہ کی ہے یعنی فارغ وقت گزارنے کے لیے ذہن کو دیگر مصروفیات سے فارغ کرنے کے لیے اور تھوڑی بہت ذہنی آسودگی حاصل کرنے کے لیے۔ ورنہ عملی و فکری ضرورت کے لیے میرے مطالعہ کی ترجیحات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو چکی ہیں اور اب حدیث نبوی اور اس سے متعلقہ علوم وفنون، تاریخ اور حقائق وواقعات کا پس منظر، اقوام وافکار کا تقابلی مطالعہ اسی ترتیب کے ساتھ میری دلچسپی کے موضوعات ہیں۔

شعر وشاعری بھی میرے مطالعہ کا اہم موضوع رہی ہے اور کسی حد تک اب بھی ہے۔ ایک دور میں دیوان حافظ اور دیوان غالب میرے سرہانے کے نیچے مستقل پڑے رہتے تھے۔ دیوان حافظ کے بہت سے اشعار سمجھ میں نہیں آتے تھے اس لیے میں نے مترجم دیوان رکھا ہوا تھا اور اس کی مدد سے ضروری باتیں سمجھ لیا کرتا تھا۔ عربی ادب میں دیوان حماسہ مطالعہ اور تدریس دونوں کے لیے پسندیدہ کتاب ہے اور مصر کے قومی شاعر عبدالعزیز شوقی کی کوئی چیز مل جائے تو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شعر گوئی میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا، البتہ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، حضرت والد محترمؒ اور حضرت چچا محترمؒ کی وفات پر اپنے جذبات غم منظوم طور پر پیش کیے جو چھپ چکے ہیں اور دوستوں میں پسند کیے گئے ہیں۔

اردو ناول کی شاید ہی کوئی صنف میں نے چھوڑی ہو۔ جاسوسی، تاریخی اور رومانوی ہر قسم کے ناول میں نے پڑھے ہیں اور سیکڑوں ناول پڑھ ڈالے ہیں۔ نسیم حجازی سے لے کر ابن صفی تک کوئی ناول نگار میرے دائرے سے باہر نہیں رہا۔ جاسوسی

ادب میں ابن صفی اور اکرم الہ آبادی میرے سب سے زیادہ پسندیدہ مصنف تھے اور جاسوسی کرداروں میں کرنل فریدی کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ ادبی جرائد میں چٹان، اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، حکایت اور قومی ڈائجسٹ اور علامت سالہا سال تک میرے مطالعہ کا حصہ رہے ہیں۔ معاشرتی، جاسوسی اور تاریخی افسانے بھی بہت پڑھے ہیں اور اب بھی میسر ہوں تو ضرور پڑھتا ہوں۔ کسی رسالہ کے مطالعہ کا آغاز عام طور پر لطائف کے صفحہ سے ہوتا ہے۔

طالب علمی کے دور میں تعلیم کچھ آگے بڑھی تو حدیث نبویؐ کے مطالعہ کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ تاریخ، سیرت اور حدیث نبوی کی کتابیں میرے مطالعہ میں اولین ترجیح تھیں اور اب بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رومانوی ناول اور طنز و مزاح بھی مطالعہ میں میرے پسندیدہ موضوعات رہے۔ اخبارات کے مزاحیہ کالموں میں شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس اور احمد ندیم قاسمی کے کالم شوق سے پڑھتا تھا۔ ان موضوعات پر سیکڑوں کتابیں نظر سے گزری ہوں گی۔ اب جس مطالعہ کا تعلق درس و تدریس اور میری عملی زندگی سے ہے، وہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے ہٹ کر تاریخی موضوعات، حدیث نبوی اور اس سے متعلقہ مباحث اور عالمی حالات کے سیاسی تجزیے اہتمام کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر اب وقت کم ملتا ہے اور جوں جوں ”فرصتے و کتابے و گوشہ چمنے“ کا ذوق بڑھتا جا رہا ہے اسی رفتار سے مصروفیات میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ خواہش بتدریج حسرت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

میرے لکھنے پڑھنے کے ذوق کو دونوں بزرگوں یعنی والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کی عملی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں حضرت والد صاحبؒ نے فاتحہ خلف الامام پر اپنی ضخیم کتاب ”احسن الکلام“ کی تلخیص مجھ سے اپنی نگرانی میں کرائی جو ”اطیب الکلام“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس پر دو تین صفحات کا پیش لفظ میں نے خود تحریر کیا جو کتابچہ میں موجود ہے اور مجھے یاد ہے کہ میرے لکھے ہوئے پیش لفظ میں حضرت والد صاحب نے صرف ایک جملہ کی اصلاح کی تھی۔ میں نے ایک جگہ ”بیک بندش چشم“ کی اصطلاح استعمال کی تھی جسے انہوں نے ”چشم زدن“ کے محاورہ سے بدل دیا۔ اس کا علاوہ انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی جس پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے اپنی

تصنیف ''فیوضات حسینی'' کی تسوید و ترتیب کے کام میں مجھے شریک کیا اور اس کا بیشتر حصہ حضرت صوفی صاحبؒ کی نگرانی میں ان کی ہدایات کے مطابق میں نے مرتب کیا، جس پر مجھے انہوں نے پارکر کا ایک خوبصورت قلم انعام میں دیا۔ دونوں بزرگوں کی یہ خواہش اور کوشش رہی کہ میں ان کے تصنیف و تحقیق کے کام میں معاون اور دست راست بنوں مگر کسی شخص کے لیے اپنے ''خون کا گروپ'' خود اختیار کرنے کی سہولت اللہ تعالی نے نہیں رکھی اور میرے خون کے جراثیم قدرے مختلف تھے، اس لیے اس فطری تنوع نے میری تحریر و تقریر کا میدان کسی حد تک ان سے مختلف کر دیا۔ جمعیت طلباء اسلام اور جمعیت علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر سیاسی سرگرمیوں میں متحرک ہو جانے کے بعد میرے فکر و نظر کا زاویہ قدرے مختلف ہو چکا تھا اور میرے لکھنے پڑھنے کے موضوعات میں اسلامی نظام کی اہمیت و ضرورت، مغربی فلسفہ و ثقافت کی یلغار، اسلام پر مغرب کی طرف سے کی جانب سے کیے جانے والے اعتراضات و شبہات، آج کے عالمی تناظر میں اسلامی احکام و قوانین کی تشریح، اسلامائزیشن کے علمی و فکری تقاضے، نفاذ اسلام کے حوالے سے دینی حلقوں کی ضروریات اور ذمہ داریاں، اسلام دشمن لابیوں کی نشاندہی اور تعاقب، اور ان حوالوں سے طلبہ، دینی کارکنوں اور باشعور نوجوانوں کی راہنمائی اور تیاری کو اولین ترجیح کا درجہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ گزشتہ پینتالیس برس سے انہی موضوعات پر مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ بحمد اللہ تعالی ہزاروں مضامین ان عنوانات پر شائع ہو چکے ہیں جن کا انتخاب الشریعہ اکادمی کی ویب سائٹ کے مقالات و مضامین کے سیکشن میں موجود ہے۔ کچھ اہم موضوعات پر چند کتابی مجموعے بھی الشریعہ اکادمی نے شائع کیے ہیں۔

سوال نمبر ۴۔ آپ اردو کے علاوہ اور کن زبانوں میں مطالعہ کرتے ہیں؟ انگریزی، عربی، فارسی، ہندی، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، دیگر زبانیں؟

جواب: اردو میرے مطالعہ کا اصل دائرہ ہے۔ عربی میری تدریس کا حصہ ہے، اس لیے زیادہ تر مطالعہ انہی دو زبانوں میں ہوتا ہے۔ فارسی سے معمولی شدبد ہے۔ کتابی فارسی تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہوں، اس لیے بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت اس کے مطالعہ کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ پنجابی میری مادری زبان ہے مگر پڑھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے، اگر کوئی چیز مل جائے تو شوق پورا کرنے کی کوشش ضرور کرتا

ہوں۔ اس کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا اور ضروری امور میں تراجم کے ذریعے مقصد پورا کر لیتا ہوں۔

سوال نمبر ۵۔ آپ کے پسندیدہ مصنفین؟ آپ کی پسندیدہ کتابیں؟ آپ کے پسندیدہ رسائل؟ پسندیدہ افسانہ نگار؟ کالم نگار؟ پسندیدہ مزاح نویس؟ طنز نگار؟

جواب: پسندیدہ مصنفین میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، چودھری افضل حقؒ، مولانا مودودیؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سرفہرست ہیں۔ حدیث نبوی، تاریخ اور سیاسی تجزیہ کی کوئی بھی قابل فہم کتاب میرے نزدیک قابل ترجیح ہوتی ہے۔ کالم نگاروں میں ارشاد احمد حقانی مرحوم، احسان بی اے مرحوم، جاوید چودھری، منو بھائی اور حامد میر کو زیادہ پڑھا ہے اور مزاح نگاروں میں شوکت تھانویؒ، احمد ندیم قاسمیؒ اور ابراہیم جلیس کو پڑھتا رہا ہوں اور اب یونس بٹ کو پڑھ لیتا ہوں۔

سوال نمبر ۶۔ آپ اپنی دنیائے مطالعہ میں کس ایک مصنف کو بلند ترین مقام پر رکھتے ہیں جس کا آپ کی ذہنی نشوونما پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہو؟ (خصوصا اردو لکھنے والوں میں سے؟)

جواب: علمی و تحقیقی دنیا میں متقدمین میں امام محمدؒ، امام بخاریؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ، جبکہ دور حاضر میں والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، عم مکرم مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ، مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور الاستاذ وہبہ زحیلی، اور فکری دنیا میں علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور چودھری افضل حقؒ نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

سوال نمبر ۷۔ کن کن اخبارات و رسائل کا روزانہ مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں کتنا وقت صرف کرتے ہیں؟

جواب: کسی زمانے میں چار پانچ اخبارات کا روزانہ بالاستیعاب مطالعہ کیا کرتا تھا، اب وقت نہیں ملتا، اس لیے معمول یہ ہے کہ نوائے وقت، ایکسپریس، پاکستان اور اسلام پر ایک سرسری نظر ڈال کر دلچسپی کی خبر اور کالم تفصیل سے پڑھ لیتا ہوں۔ ”الشریعہ“ کے تبادلے میں درجنوں جرائد آتے ہیں، ان سب کو ایک نظر ضرور دیکھتا ہوں، فہرست پر نظر ڈال کر اگر کوئی مضمون دلچسپی یا ضرورت کا ہو تو وہ رسالہ مطالعہ کے لیے الگ کر لیتا ہوں اور اگر موقع مل جائے تو مطالعہ بھی کر لیتا ہوں، ورنہ اس

طرح الگ کیے ہوئے رسالے اور کتابیں مہینوں پڑی رہتی ہیں۔

سوال نمبر ۸۔ کیا دوران سفر میں بھی مطالعہ کرتے ہیں؟ اور کس طرح کی کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں؟

جواب: دوران سفر پہلے مطالعہ کر لیا کرتا تھا اب نہیں ہوتا۔ مگر کوئی اخبار یا کتاب ضروری پڑھنی ہو تو اپنے اوپر تھوڑا جبر کر لیا کرتا ہوں۔ کسی سیمینار یا کانفرنس میں گفتگو کے لیے کوئی عنوان میں خود طے کروں یا میرے ذمہ لگ جائے تو خواہش یہ ہوتی ہے کہ باقاعدہ تیاری کروں، مگر اکثر اس کا موقع نہیں ملتا۔ وقتی طور پر انتہائی ضروری مطالعہ پر قناعت کرنا پڑتی ہے اور عام طور پر زبانی گفتگو کے بعد اسے قلمبند کرنے کی عادت سی بن گئی ہے۔

سوال نمبر ۹۔ عام طور پر مطالعہ کے اوقات کیا ہوتے ہیں؟ پروگرام کس طرح چلتا ہے، نشست کس طرح کی پسند کرتے ہیں، رفتار مطالعہ کیا ہوتی ہے؟

جواب: اب کوئی وقت متعیّن نہیں ہے، مصروفیات میں جو وقت بھی نکل آئے اخبارات و جرائد پر نظر ڈال لیتا ہوں۔ تکیہ کے ساتھ فرشی نشست کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ عام طور پر سیدھا بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ تھکاوٹ ہو تو نیم دراز ہو جاتا ہوں لیکن لیٹ کر پڑھنے کی عادت نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۰۔ آپ کا حافظہ آپ کی وسعت مطالعہ کا کہاں تک ساتھ دیتا ہے، کیا پڑھی گئی کتب کے نام، مضامین، مصنف، پوری طرح یاد رہتے ہیں؟

جواب: ضرورت اور دلچسپی کی بات اجمالاً یاد رہتی ہے اور بوقت ضرورت مراجعت میں فائدہ دیتی ہے، لیکن زیادہ تر باتیں ذہن سے عام طور پر محو ہو جاتی ہیں۔ دوبارہ کہیں دیکھنے پر یاد آتا ہے کہ پہلے بھی یہ بات کہیں پڑھی ہے۔ کسی لائبریری میں جاؤں تو ایک سرسری نظر سب کتابوں پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ کوئی نئی کتاب آئی ہو تو معلوم ہو جائے، اور کبھی کسی حوالہ سے کسی کتاب کی ضرورت محسوس ہو تو ذہن میں عام طور پر یہ بات محفوظ رہتی ہے کہ یہ کتاب فلاں لائبریری میں دیکھی تھی۔

سوال نمبر ۱۱۔ تنہائی اور خاموشی آپ کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے، یا آپ ہجوم اور شور و شغب میں بھی پڑھ لیتے ہیں؟

جواب: مطالعہ کے لیے تنہائی کی کوشش کرتا ہوں۔ بوقت ضرورت شور و شغب

میں بھی کام چل جاتا ہے۔ ایک مرحوم دوست مولانا سعید الرحمن علوی میرے لیے ہمیشہ قابل رشک رہے ہیں جو مجلس میں بیٹھے ہوئے گپ شپ بھی کرتے تھے، مطالعہ بھی چلتا تھا اور ساتھ ساتھ لکھتے بھی رہتے تھے اور ان میں سے کوئی بات دوسری پر اثرانداز نہیں ہوتی تھی۔ ویسے گھر والے کہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں کتاب یا رسالہ ہو تو آپ کو ارد گرد کا ہوش نہیں رہتا۔

سوال نمبر ۱۲۔ کیا مطالعہ کے دوران آپ کتاب پر نشان لگاتے ہیں؟ یا آپ الگ نوٹ کر لیتے ہیں؟ کبھی خلاصہ لکھنے کا شوق رہا؟

جواب: کتاب پر نشان لگانے سے گریز کرتا ہوں اور کوئی بات پسند یا ضرورت کی ہو تو نوٹ بک پر درج کر لیتا ہوں۔ کسی کتاب پر حاشیہ لکھنے کا معمول بھی نہیں ہے، البتہ ضروری حوالہ یا عبارت نوٹ بک پر محفوظ کر لیتا ہوں۔ اس قسم کے نوٹس دو تین مختصر کاپیوں میں موجود ہیں جو کبھی کبھی پھر سے دیکھتا رہتا ہوں۔

سوال نمبر ۱۳۔ آپ اپنے مطالعہ، حاصل مطالعہ اور ذوق مطالعہ میں کیا اپنے گھر کے لوگوں خصوصاً بچوں کو بھی حصہ دار بناتے ہیں؟ بچوں کی تربیت ذوق کے لیے آپ کے تجربات کیا ہیں؟

جواب: بچوں کو کتاب کی طرف متوجہ کرتا ہوں اور ان کے مطلب یا ذہنی سطح کی کوئی کتاب نظر آجائے تو مہیا کرتا ہوں اور انہیں مطالعہ کرتے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔

سوال نمبر ۱۴۔ کیا آپ کی ذاتی لائبریری ہے؟ اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ اس میں اہم ترین کتابیں کون سی ہیں؟ کچھ خاص کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے اگر آپ کو کوئی خاص معرکہ سر کرنا پڑا ہو تو درج فرمائیے؟ نمایاں شخصیتوں کی طرف سے ہدیہ میں آئی ہوئی کتابیں کون کون سی ہیں؟

جواب: زندگی میں اپنے جیب خرچ اور کمائی کا ایک بڑا حصہ میں نے کتاب پر صرف کیا ہے۔ ذاتی اور گھریلو اخراجات کے بعد سفر، کتاب، اسٹیشنری و ڈاک میری کمائی کے اہم ترین مصارف رہتے ہیں۔ مجھے جب بھی اپنے اخراجات میں کوئی گنجائش ملی ہے (بسا اوقات اس کے بغیر بھی) تو میری رقم کے مصارف میں یہی تین چیزیں شامل رہی ہیں اور اب بھی یہی صورتحال ہے۔ میں نے زندگی میں جتنی کتابیں خریدی ہیں اگر سب میرے پاس موجود ہوتیں تو انہیں سنبھالنے کے لیے

ایک اچھی خاصی لائبریری درکار ہوتی، مگر میرے ساتھ المیہ یہ رہا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک کتاب خریدنے میں جس قدر ''فضول خرچ'' تھا اسی طرح کتاب دینے میں بھی فراخ دل رہا ہوں۔ مجھ سے جس دوست نے بھی کسی ضرورت کے لیے کوئی کتاب مانگی ہے میں انکار نہیں کر سکا، اور اس طرح دی ہوئی کتابوں میں شاید ہی چند کتابیں مجھے واپس ملی ہوں، ورنہ اکثر کتابیں دوستوں ہی کے کام آ رہی ہیں۔ یہ ''واردات'' میرے ساتھ انفرادی کے علاوہ اجتماعی بھی ہوئی ہے اور کئی بار ہوئی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ گکھڑ میں انجمن نوجوانان اسلام قائم ہوئی جس کے بانیوں میں میرا نام بھی شامل ہے۔ اس انجمن نے عوامی خدمت کے لیے دارالمطالعہ قائم کیا تو میں نے اپنی زیادہ تر کتابیں وہاں دے دیں کہ عمومی استفادہ ہوگا اور محفوظ بھی رہیں گی، مگر دو چار سال کے بعد انجمن بکھری تو کتابوں کا بھی کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گئیں۔

اس کے بعد گوجرانوالہ میں اسلامیہ کالج روڈ پر کچھ نوجوانوں نے انصار الاسلام لائبریری کے نام سے ایک دینی دار المطالعہ قائم کیا تو اس وقت جمع ہونے والی کتابوں کا بڑا حصہ ان کی نذر کر دیا۔ یہ دارالمطالعہ آٹھ دس سال چلتا رہا اور اب اس کا بھی کوئی سراغ موجود نہیں ہے۔ اس کے کافی عرصہ بعد شاہ ولی اللہ یونیورسٹی وجود میں آئی اور اس میں لائبریری قائم کی گئی تو میں نے ایک بار پھر کتابوں کی چھانٹی کی اور اچھا خاصا ذخیرہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی لائبریری میں منتقل کر دیا، مگر یونیورسٹی کا سلسلہ تعلیم چند سال بعد منقطع ہو گیا تو لائبریری بھی بند ہو گئی۔ خدا جانے کوئی کتاب اب وہاں موجود ہے یا نہیں۔ اب میری ساری توجہ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی لائبریری کی طرف مبذول ہے اور کوشش کر رہا ہوں کہ ایک اچھی سی لائبریری اصحاب ذوق کو میسر آ جائے۔ اس کار خیر میں عزیزم محمد عمار خان ناصر سلمہ بھی میرے ساتھ شریک ہے جو کتابی ذوق سے بخوبی بہرہ ور ہے اور لکھنے پڑھنے کے سوا اس کی کوئی اور دلچسپی نہیں ہے۔ اس کا بڑا بیٹا طلال خان بھی کتابوں اور رسالوں میں ہی غرق رہتا ہے، حتیٰ کہ کھانا بھی ماشاء اللہ اس کیفیت میں کھاتا ہے کہ کتاب یا رسالہ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور پاس بیٹھی ماں یا دادی اس کے منہ میں لقمے ڈالتی رہتی ہے، اللہ پاک نظر بد سے بچائیں۔ مجھے اور عمار میں سے جس کو بھی کوئی کتاب میسر آ جائے اور وہ ہماری وقتی یا ذاتی ضرورت کے دائرہ کی نہ ہو تو الشریعہ اکادمی کی لائبریری کی نذر ہو جاتی ہے۔ الشریعہ اکادمی کی لائبریری کو بہت چھوٹی ہونے کے باوجود شہر کی اہم

لائبریریوں میں بحمد اللہ تعالیٰ شمار کیا جا سکتا ہے۔

بعض کتابوں کے حصول میں غیر معمولی صورتحال سے بھی واسطہ پڑا۔ میری طالب علمی کے زمانے میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ایک شاگرد مولانا محمد صدیق ولی اللٰہی وقتاً فوقتاً آیا کرتے تھے۔ مجذوب طرز کے بزرگ تھے، مگر کتاب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور کوئی نہ کوئی نادر کتاب ان کے تھیلے میں موجود ہوتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے ان کے پاس ہندوستان کی زمینوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کا رسالہ دیکھ لیا جو ان دنوں نایاب تھا۔ مجھے اس کی تلاش تھی، میں نے ان سے درخواست کی کہ چند روز کے لیے مرحمت فرما دیں، میں نقل کر لوں گا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے گزارش کی کہ رات آپ نے یہیں رہنا ہے اس لیے ایک رات کے لیے دے دیں صبح واپس کر دوں گا۔ انہوں نے وہ رسالہ مجھے اس شرط پر دے دیا۔ میں نے رات بھر جاگ کر وہ رسالہ نقل کر لیا اور صبح کو انہیں واپس کر دیا۔

صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے سود کی حرمت اور اس کے متبادل شرعی نظام کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کی تھی۔ ان دنوں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹوں کی اشاعت پر پابندی ہوا کرتی تھی۔ مجھے اس رپورٹ کی تلاش تھی اور معمول کے ذرائع سے دستیاب نہیں ہو رہی تھی، البتہ قومی اسمبلی کے ارکان میں وہ تقسیم کی گئی تھی۔ میں ایک دن بلوچستان سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے ایک رکن سے، جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، ملنے کے لیے ایم این اے ہاسٹل میں ان کے کمرے میں گیا تو وہ رپورٹ ان کی میز پر پڑی دیکھی۔ میرا جی للچایا اور میں نے ان جانے سے انداز میں ان سے پوچھا کہ یہ کون سی کتاب ہے؟ انہوں نے بھی اسی انجانے سے لہجے میں کہا کہ پتہ نہیں، کوئی صاحب دے گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی ضرورت کی تو نہیں، کیا میں لے لوں؟ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے وہ کتاب اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لی۔ اس رپورٹ کے اس طرح اچانک حصول پر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں وہ کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے محفوظ کر لیا کہ برطانیہ کے سفر کے دوران فراغت سے مطالعہ کر لوں گا، مگر ساؤتھال لندن کی ابوبکر مسجد میں ورلڈ اسلامک فورم کی ایک میٹنگ میں انڈیا کے محقق عالم دین حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ ہمارے ساتھ شریک تھے۔ میں نے کسی ضرورت کے تحت اپنا بیگ ان کے سامنے کھولا تو ان کی نظر اس رپورٹ پر پڑ

گئی۔ انہوں نے مجھ سے مانگ لی اور فرمایا کہ میں تو ایک عرصہ سے اس کی تلاش میں تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے بھی بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔ انہوں نے یہ فرما کر بے تکلفی کے ساتھ وہ رپورٹ اپنے بیگ میں رکھ لی کہ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے، تم کوئی اور نسخہ تلاش کر لینا۔ مجھے کتاب کھو جانے کا افسوس تو ہوا، مگر اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی کہ وہ رپورٹ مجھ سے زیادہ اہل اور مستحق بزرگ کے پاس پہنچ گئی۔

لندن ہی میں ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا مفتی برکت اللہ کی ذاتی لائبریری میں ایک کتاب میری نظر سے گزری جو ایک عرب محقق الاستاذ عبد الحلیم ابو شقۃؒ نے ”تحریر المراۃ فی عصر الرسالۃ“ کے عنوان سے چار جلدوں میں لکھی ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عورتوں کو حاصل ہونے والی آزادیوں کے بارے میں انتہائی مستند مواد جمع کر دیا ہے۔ انسانی حقوق اور خاص طور پر عورتوں کے حقوق میرے مطالعہ اور گفتگو کا ہمیشہ سے اہم موضوع رہے ہیں، اس لیے یہ کتاب میری دلچسپی اور ضرورت کی تھی۔ میں نے مولانا مفتی برکت اللہ کے ساتھ وہی کیا جو میرے ساتھ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے کیا تھا۔ مفتی برکت اللہ صاحب کے نہ نہ کرتے بھی میں نے وہ کتاب اپنے بیگ میں رکھ لی اور ان سے کہا کہ آپ دوسرا نسخہ منگوا لیں، یہ میں لے جا رہا ہوں۔ یہ نسخہ الشریعہ اکادمی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کا مکمل اردو ترجمہ اب اسلامی نظریاتی کونسل نے اسلام آباد سے شائع کر دیا ہے، جبکہ ایک جلد میں اس کی تلخیص بھی ”عورت عہد رسالت میں“ کے عنوان سے لاہور کے ایک اشاعتی ادارے نے شائع کی ہے۔

یہودیوں کی ایک اہم کتاب ”تالمود“ ہے جس کا وہ عام طور پر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل مجھے اس کی تلاش تھی کہ اس کا اردو یا عربی ترجمہ مل جائے تو یہ معلوم کر لوں کہ مواد کس نوعیت کا ہے۔ مختلف دوستوں سے پوچھتا رہا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ برطانیہ میں ایک کتاب شناس دوست سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ تالمود کے منتخب حصوں کا اردو ترجمہ تو آپ کے گوجرانوالہ سے شائع ہوا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے اپنی لائبریری سے وہ کتاب نکال کر مجھے دکھائی تو اس پر ناشر کے طور پر ”بیت المومنین سادھوکی گوجرانوالہ“ لکھا تھا۔ واپسی پر میں نے سادھوکی کے قریب جی ٹی روڈ پر واقع جامعہ اسلامیہ کے مہتمم مولانا عبد الرؤف

فاروقی کو بتایا تو انہیں بھی حیرانی ہوئی۔ ہم دونوں سادھوکی کے ریلوے پھاٹک کے ساتھ واقع ادارہ "بیت المومنین" پہنچے تو دیکھا کہ وہ کیتھولک مسیحیوں کا ایک عالمی سطح کا معیاری اشاعتی ادارہ ہے جہاں سے ویٹی کن سٹی کی مطبوعات کے معیاری اردو تراجم شائع ہوتے ہیں۔ عجیب اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ اس وقت جو انچارج پادری صاحب وہاں موجود تھے، ان کا تعلق بھی ہمارے آبائی شہر گکھڑ سے تھا۔ انہوں نے ہمیں پہچان لیا، خوب آؤ بھگت کی اور تالمود کے اردو ترجمے کے علاوہ کیتھولک بائبل اور چند دیگر کتابیں بھی ہمیں ہدیے کے طور پر پیش کیں۔

آج کل مطلب کی کسی کتاب کے حصول کے لیے مجھے عام طور پر تین ذرائع میسر ہیں۔ کسی صاحب علم دوست کے ہاں جاتا ہوں تو ان کی لائبریری پر ایک نظر ضرور ڈالتا ہوں۔ کوئی نئی کتاب دلچسپی کی نظر میں آئے تو اس کا نام اور مصنف و ناشر کا تعارف ذہن نشین کر لیتا ہوں اور بعد میں موقع ملے تو حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ ہمارے دوستوں میں ایک کتاب دوست اور کتاب شناس ساتھی شبیر احمد میواتی ہیں۔ اچھی کتابوں کی تلاش، ان کا حصول اور متعلقہ دوستوں تک انہیں پہنچانا (اگرچہ بعض اوقات اس کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے) میواتی صاحب کا خصوصی مشغلہ ہے۔ ہمارے ہاں اکثر آتے رہتے ہیں اور ہر مرتبہ ان کی زنبیل میں نئی اور پرانی کتابوں کا ایک اچھا انتخاب موجود ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی کتاب میرے مطلب کی ہو تو وہ دے دیتے ہیں یا میں مانگ لیتا ہوں، ورنہ مطالعہ کے لیے تو رکھ ہی لیتا ہوں جو زیادہ تر واپس بھی کر دیتا ہوں۔ ہمارے ایک اور دوست محمد رفیق صاحب ہیں۔ نادر عربی کتابوں کی خرید و فروخت ان کا مشغلہ ہے۔ کبھی کبھی آتے ہیں تو ان کا تھیلا کھلوا کر دیکھتا ہوں۔ کوئی دلچسپی یا ضرورت کی کتاب جیب کی گنجائش کے دائرے میں ہو تو خرید لیتا ہوں، یا عمار سے کہتا ہوں کہ الشریعہ اکادمی کے فنڈ میں گنجائش ہو تو لائبریری کے لیے خرید لو۔ بصورت دیگر کتاب خاموشی کے ساتھ واپس کر دیتا ہوں۔

سوال نمبر ۱۵۔ کتابیں مستعار دینے اور لینے کے متعلق آپ کے تجربات کیا ہیں اور اس معاملے میں آپ کا نظریہ و مسلک کیا ہے؟ کیا کچھ واقعات ایسے ہیں کہ بعض اہم کتابوں سے آپ ہاتھ دھو بیٹھے ہوں؟

جواب: اس بارے میں بہت تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ بہت سی کتابیں ضائع کر چکا

ہوں۔ ایک اہم کتاب جو مجھ سے کسی صاحب نے مطالعہ کے لیے لی، کئی برس بعد مجھے ایک فٹ پاتھ پر کتابیں بیچنے والے سے دوبارہ خریدنی پڑی۔ حتیٰ کہ فلپ کی ہٹی کی جس کتاب کا میں سطور بالا میں ذکر کر چکا ہوں، اس پر میرے لکھے ہوئے نوٹس بھی موجود تھے، وہ اور قاضی عیاضؒ کی ''الشفاء'' جو ایک دوست نے مجھ سے مطالعہ کے لیے لی تھیں، یہ دونوں ذاتی کتابیں میں نے فٹ پاتھ سے دوبارہ خریدیں۔

سوال نمبر ۱۶۔ کیا مطالعہ سے عمر کے ساتھ ساتھ کوئی ذہنی، فکری تبدیلی پیدا ہوئی؟

جواب: مطالعہ کے ارتقا سے فکر و ذہن کا ارتقا ایک فطری امر ہے، میں بھی اس تجربہ سے دوچار ہوا ہوں۔ بہت سی باتیں جن پر ابتدائی دور میں لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے تھے، اب ہلکی پھلکی معلوم ہوتی ہیں اور مطالعہ نے رفتہ رفتہ فکر میں توسع اور تنوع پیدا کیا ہے۔ خاص طور پر یہ کہ آج کے حالات میں آزادانہ بحث و مباحثہ کے بغیر کسی بھی مسئلے میں منطقی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، اور عالمی ذرائع ابلاغ اور تعلیمی مراکز نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مختلف اطراف سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے، اس کے اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارا روایتی اسلوب کافی نہیں ہے۔ ماضی نے اپنا علمی خزانہ کتابوں اور سی ڈیز کی شکل میں اگل دیا ہے اور آج کوئی بھی ذی استعداد اور باصلاحیت نوجوان اپنے چودہ سو سالہ علمی ماضی کے کسی بھی حصہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے یا کسی بھی طبقے کا موقف اور دلائل معلوم کرنا چاہے تو اسے اس کے بھرپور مواقع اور وسائل ہر وقت میسر ہیں۔ اس ماحول میں یہ کوشش کرنا کہ نوجوان اہل علم صرف ہمارے مہیا کردہ علم اور معلومات پر قناعت کریں اور علم اور معلومات کے دیگر ذرائع سے آنکھیں اور کان بند کر لیں، نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں بلکہ فطرت کے بھی منافی ہے۔ اس لیے آج کے دور میں ہماری ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور یہ بات ہمارے فرائض میں شامل ہو جاتی ہے کہ مطالعہ اور تحقیق کے اس سمندر سے نئی نسل کو روکنے کی بجائے خود بھی اس میں گھسیں اور ان متنوع اور مختلف الجہات ذرائع معلومات میں حق کی تلاش یا حق کے دائرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی راہنمائی کریں۔ چنانچہ علم و فکر کی دنیا میں میرا ذوق روکنے یا باز رکھنے کا نہیں بلکہ سمجھانے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہر ممکن مدد کرنے کا ہے۔ کسی دوست کو یہ طریقہ پسند ہو یا نہ ہو، لیکن میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے بحث و

مباحثہ ضروری ہے، مسائل کا تجزیہ و تنقیح اور دلائل کی روشنی میں ان کا خالص علمی انداز میں تلاش کرنا ضروری ہے۔ ایک عرصہ تک میرا بھی یہ ذوق اور ذہن رہا ہے کہ تحقیق کا دائرہ صرف یہ ہوتا ہے کہ جو بات ہم اپنے ذہن میں پہلے سے طے کر چکے ہیں، اسے کسی نہ کسی طرح ثابت کر دیا جائے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بات ذہن میں راسخ ہوتی گئی کہ خود اپنی بات کو دلائل اور حقائق کے معیار پر پرکھنا بھی تحقیق کا اہم ہدف ہوتا ہے۔ بہت سے مسائل میں اکابر اہل علم کا رجوع الی الحق بالخصوص حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف سے اس کا باقاعدہ اہتمام میرے ذوق میں اس تبدیلی کا باعث بنا۔

سوال نمبر ۱۷۔ اگر آپ کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں آپ باقی دنیا سے کٹ گئے ہوں اور آپ کو باقی زندگی کے لیے (قرآن مجید کے علاوہ) صرف تین کتابوں کے انتخاب کا موقع دیا جائے تو کن کتابوں کا انتخاب کریں گے؟

جواب: اللہ نہ کرے ایسی کوئی صورت پیش آئے لیکن اگر خدانخواستہ کوئی ایسی صورت پیش آجائے تو قرآن کریم کے علاوہ احادیث نبویہ کے کسی اچھے سے مجموعہ، تاریخی واقعات کی کوئی ضخیم کتاب اور دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابل فراموش'' کا تقاضا کروں گا۔

سوال نمبر ۱۸۔ کیا کبھی کسی تحریر کے مطالعے سے منفی احساس بھی ہوا، مایوسی یا غصے کی کیفیت؟

جواب: قرآن کریم، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات صحابہ کرامؓ و اہل بیت عظامؓ اور بڑی دینی شخصیات کا کہیں توہین و تمسخر کے انداز میں ذکر ہو تو غصہ آتا ہے اور وہیں مطالعہ چھوڑ دیتا ہوں۔ اختلاف رائے کا حق بلا جھجک استعمال کرتا ہوں اور بلا تامل دوسروں کو اختلاف رائے کا حق دیتا ہوں۔ سنجیدہ علمی اختلاف کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا ہوں، مگر توہین، استہزا اور تمسخر میرے لیے ہمیشہ ناقابل برداشت رہا ہے اور استحقار و استخفاف کا لہجہ کسی بھی شخصیت کے بارے میں اختیار کیا جائے، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تنقید و اعتراضات پر مشتمل پنڈت دیانند سرسوتی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کے چودھویں باب کا کئی بار مطالعہ کیا ہے اور اب بھی ضرورت پڑنے پر اسے دیکھتا ہوں، مگر راج پال کی بدنام زمانہ کتاب ''رنگیلا رسول'' کو پڑھنے کا اپنے

اندر کبھی حوصلہ نہیں پایا۔

سوال نمبر ۱۹۔ کچھ ایسے مصنفین جن کو ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا ہو، ملاقات میں کامیاب ہوئے، ملنے کے بعد تاثرات ؟

جواب: اقبالؒ اور چودھری افضل حقؒ تو میری ولادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے، البتہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور الاستاذ وہبہ زحیلیؒ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی زیارت پہلی بار ۱۹۸۴ء کے دوران مکہ مکرمہ میں کی جہاں وہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ہمراہ غالباً رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ بیٹھنے اور گفتگو کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو اپنے بازوؤں کے حصار میں بیت اللہ شریف کا طواف کرانے کا شرف بھی حاصل کیا۔ مولانا ندویؒ سے بعد میں میرا بیعت کا تعلق قائم ہوا اور انہوں نے تحریری طور پر اپنی تمام اسناد کے ساتھ روایت حدیث نبویؐ کی اجازت کے شرف سے بھی نوازا، فالحمد للہ علی ذلک۔ امریکی مصنف ”ڈیل کارنیگی“ بھی میرے پسندیدہ مصنفین میں سے ہیں مگر ملاقات کا موقع نہیں مل سکا، شاید وہ بھی میری ہوش کی عمر سے پہلے ہی دنیا چھوڑ چکے ہوں۔ نسیم حجازی مرحوم سے ملاقات کر کے خوشی ہوئی۔ مولانا مودودیؒ سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے ساتھ برطانیہ میں گزرے ہوئے چند دن میری زندگی کے یادگار ایام میں سے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے ساتھ ملاقات بھی خوشی کا باعث بنی، جبکہ ڈاکٹر حمید اللہؒ کی زیارت و ملاقات کی زندگی بھر حسرت رہی۔

درسگاہ نبویؐ کے دو طلبہ

(جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۷ ستمبر ۲۰۱۱ء)

(۱۸ شوال المکرم ۱۴۳۲ھ کو جامعہ نصرۃ العلوم کے نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر اساتذہ و طلبہ سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج ہم بحمد اللہ تعالیٰ اپنے نئے تعلیمی سال کا آغاز کر رہے ہیں اور اس پر میں مدرسہ کی انتظامیہ، اساتذہ، طلبہ اور معاونین سب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ گلشن علم ہمارے بزرگوں کی بالخصوص حضرات شیخینؒ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ کی یادگار اور ان کا صدقۂ جاریہ ہے۔ ان

کارگوں نے اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ جس خلوص، محنت اور لگن سے اس گلشن علم وفکر کی آب یاری کی، اگر ہم کسی موقع پر ان کا نام نہ لیں تب بھی اس مرکز میں ہونے والے ہر علمی و دینی کام کے ثواب واجر کے اولین مستحق وہی ہیں۔ لیکن یہ ہم پر ان کا حق ہے کہ ہم ان کا نام بھی لیں، ان کا تذکرہ کریں اور بارگاہ ایزدی میں ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعائیں کرتے رہیں، اس لیے کہ ہم آج جو کچھ بھی ہیں انھی کی وجہ سے ہیں اور ان کی برکت کے باعث ہیں۔ ہمارا تعارف اور ہماری عزت انہیں بزرگوں کی وجہ سے ہے ورنہ ہمارا حال وہی ہے جو غالب مرحوم نے کہا تھا۔

بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہمارے ایک بڑے بزرگ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ اپنے خطاب میں اکثر کہا کرتے تھے کبرنی موت الکبراء کہ مجھے بڑوں کی موت نے بڑا بنا دیا ہے۔ مگر وہ اس کے ترجمہ میں ایک چھوٹے سے جملے کا اضافہ کر دیا کرتے تھے جس سے اس معنویت میں اضافہ ہو جاتا تھا اور میں خاص طور پر اس سے بہت محظوظ ہوا کرتا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ ”بڑوں کی موت نے ہم جیسوں کو بھی بڑا بنا دیا“۔ حضرت درخواستیؒ تو کسر نفسی کرتے تھے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمارا معاملہ فی الواقع اسی طرح کا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرات شیخینؒ اور ان کے رفقاء کے آباد کردہ اس گلشن کو ہمیشہ آباد رکھیں، ہمیں اس کی آبیاری کرتے رہنے کی توفیق دیں، اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین۔ میں تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر عزیز طلبہ کو برکت کے لیے درسگاہ نبویؐ کے دو طلبہ کا واقعہ سنانا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے راہ نمائی کا سرچشمہ وہی لوگ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں انا سادس فی الاسلام میں نے چھٹے نمبر پر اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے قبول اسلام کا واقعہ مؤرخین نے کچھ اس طرح لکھا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ اور سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ ایک دن دوپہر کے وقت مکہ مکرمہ کی کسی پہاڑی پر جا رہے تھے، دوپہر کا وقت تھا، گرمی تھی، انہیں پیاس محسوس ہوئی تو ارد گرد پانی تلاش کیا جو نہ ملا۔ قریب ہی ایک لڑکا بکریاں چرا رہا تھا، اس کے پاس گئے اور پوچھا کہ کیا تمہارے پاس پانی ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ کوئی بکری دودھ والی ہے تو اس کا دودھ پلا دو۔

لڑکے نے کہا کہ دودھ والی بکریاں ہیں لیکن دودھ نہیں پلاؤں گا اس لیے انا امین کہ میں امین ہوں، بکریاں میری نہیں ہیں اور مالک کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ یہ لڑکا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ تھے جو عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے پوچھا کہ کوئی ایسی بکری بھی ہے جس کا دودھ خشک ہو چکا ہو، اس لڑکے نے جواب دیا کہ ہاں اس قسم کی بکریاں ہیں۔ آنحضرتؐ نے ان میں سے ایک بکری منگوائی اور اس کے تھنوں پر ہاتھ رکھ کر اللہ تعالیٰ کا نام لیا تو اس کے تھن دودھ سے بھر گئے۔ نبی اکرمؐ نے دودھ دوہ کر خود بھی پیا اور حضرت صدیق اکبرؓ کو بھی پلایا پھر بکری کے تھنوں پر ہاتھ رکھا تو وہ پہلے کی طرح خشک حالت میں واپس چلے گئے۔ یہ جناب نبی اکرمؐ کا معجزہ تھا اور ایسے اور بھی بہت سے معجزات احادیث میں مذکور ہیں۔

شام کو حضورؐ واپس گھر تشریف لا رہے تھے تو وہ لڑکا راستے میں انتظار میں کھڑا تھا۔ پوچھا کیسے آئے ہو؟ جواب دیا کہ آپ نے آج دن کے وقت ایک خشک تھنوں والی بکری کے تھنوں پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھا تھا جس سے بکری کے خشک تھن دودھ سے بھر گئے تھے میں وہ منتر سیکھنے آیا ہوں۔ نبی اکرمؐ اس کی بات سن کر مسکرائے اور فرمایا انک غلام معلم کہ تم تو پڑھائے ہوئے لڑکے ہو۔ محدثینؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ جناب نبی اکرمؐ نے لڑکے کی دو باتوں پر خوش ہو کر حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا تھا۔ ایک بات تو اس کا وہ صبح والا جملہ تھا کہ انا امین اور دوسرا اس کا کچھ سیکھنے کا جذبہ تھا جو اسے آپؐ کی خدمت میں لے آیا تھا۔ حضورؐ نے لڑکے سے فرمایا تم میرے پاس آیا کرو۔

میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ باقی حضرات صحابہ کرامؓ تو حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایمان قبول کرنے کے لیے آئے تھے مگر یہ لڑکا پڑھنے اور سیکھنے کیلئے آیا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے بھی نوازا اور علم میں بھی بلند مقام پر فائز کیا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس کے بعد جس لگن اور شوق کے ساتھ علم حاصل کیا اس نے انہیں امت کے فقہاء کا سردار بنا دیا۔ احادیث میں مذکور ہے کہ یہ طالب علم مختلف القاب سے پکارا جاتا تھا۔ صاحب النعلین، صاحب السواک، صاحب السوری، صاحب المطھرۃ جیسے القاب مختلف احادیث میں ان کے لیے مذکور ہیں۔ یہ واحد نوجوان ہیں جنہیں پردہ کے احکام اترنے کے بعد یہ کہا گیا تھا کہ جناب نبی اکرمؐ کے گھر میں آنے کے لیے ان کے لیے استیذان کی شرط نہیں ہے، انہیں اجازت تھی کہ جب نبی اکرمؐ کے گھر کا دروازہ کھلا ہو اور

اندر سے نبی اکرمؐ کی آواز آرہی ہو تو وہ اجازت مانگے بغیر اندر جا سکتے ہیں۔ حضرت ابو موسی اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم یمن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو عبداللہ بن مسعودؓ کے جناب نبی اکرمؐ کے گھر میں کثرت سے آنے جانے کی وجہ سے کافی عرصہ تک ہم انہیں رسول اللہؐ کے خاندان کا فرد سمجھتے رہے۔

تاریخی روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں کوفہ نئے شہر کے طور پر آباد ہوا تو وہاں سے ایک وفد نے امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ شہر بس گیا ہے، بازار، مساجد اور دیگر مقامات بارونق ہو گئے ہیں مگر ایک کمی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی بڑا مسئلہ پیش آتا ہے تو راہ نمائی کے لیے مدینہ منورہ آنا پڑتا ہے جو مشکل کام ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ اپنے اعتماد کا کوئی بڑا عالم دین وہاں بھجوادیں جس سے ہم وہیں راہ نمائی حاصل کر لیا کریں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک عالم میں نے اپنی ضرورت کے لیے رکھا ہوا ہے لیکن وفد کو خالی ہاتھ بھیجنا مناسب نہیں ہے اس لیے وہ عالم میں تمہارے ساتھ روانہ کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو امیر المؤمنینؓ نے پابند کر رکھا تھا کہ وہ انہیں بتائے بغیر مدینہ منورہ سے باہر نہ جائیں، یہ سزا نہیں تھی بلکہ ان کا ایک طرح سے اعزاز تھا کہ مشورہ کے لیے امیر المؤمنینؓ کو کسی وقت بھی ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی اور اسی لیے یہ پابندی لگائی گئی تھی۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے انہیں بلایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ظاہری ہیئت یہ تھی کہ چھوٹا سا قد، دبلا پتلا جسم، چھوٹا سا سر اور اس پر بڑی پگڑی۔ انہیں اس کیفیت میں دیکھ کر وفد کا سربراہ ہنس پڑا اور کہا استہزئ بنایا امیر المومنین؟ کہ امیر المؤمنین آپ ہمارے ساتھ استہزاء کر رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں استہزاء نہیں کر رہا بلکہ یہ شخص جو تمہیں نظر آرہا ہے سر کے بالوں سے پاؤں کے تلووں تک سراپا علم ہے اور یہ علم کا بھرا ہوا برتن ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ

دوسرا تذکرہ درسگاہ نبویؐ کے ایک اور طالب علم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے وقت میں پندرہ سال کا تھا، مجھے احساس ہوا اور میں نے ایک ہم عمر انصاری صحابی کے سامنے اس کا ذکر کیا کہ اس وقت تو بڑے بڑے صحابہ کرامؓ موجود ہیں اور لوگ دینی و علمی راہ نمائی کے لیے ان سے رجوع کرتے ہیں لیکن بیس تیس سال کے بعد جب یہ بڑے صحابہ کرامؓ موجود نہیں ہوں گے، اگر

اس وقت ہم موجود ہوئے تو لوگ ہمیں بڑا سمجھ کر ہمارے پاس آئیں گے اور راہ نمائی کے طالب ہوں گے اس لیے ہمیں وقت سے فائدہ اٹھا کر اکابر صحابہ کرامؓ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے اور اپنا علم مکمل کرنا چاہیے تاکہ کل جب لوگ ہم سے رجوع کریں تو ہمیں شرمندگی نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ہم عمر انصاری صحابیؓ کو اس بات پر قائل نہ کر سکا، اس نے کہا کہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں ہمیں کون پوچھے گا؟ مگر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تنہائی میں یہ عمل شروع کر دیا، جن صحابیؓ کے بارے میں مجھے معلوم ہوتا کہ علم کی فلاں بات وہ جانتے ہیں تو میں ان کی خدمت میں جاتا اور وہ علم حاصل کرتا۔

فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے یہ بات معلوم کرنے کے لیے مجھے ایک سال تک مناسب موقع کا انتظار کرنا پڑا کہ سورۃ التحریم میں ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما میں کن دو عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور جب میں نے موقع پا کر یہ سوال کیا اور عرض کیا کہ اس سوال کے لیے ایک سال تک موقع کی تلاش میں رہا ہوں تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ اس آیت کریمہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور انہوں نے مجھ پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ سوال کرنے میں تاخیر کیوں کی اور فرمایا کہ جب کوئی بات معلوم کرنی ہو تو بلا جھجک پوچھ لیا کرو۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میرا معمول تھا کہ جب کسی بزرگ کے پاس کوئی بات معلوم کرنے کے لیے جاتا تو ان کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا تھا بلکہ دروازے سے باہر ایک طرف کھڑا ہو کر انتظار کرتا تھا کہ جب اپنے معمول کے مطابق باہر آئیں گے تو پوچھ لوں گا، اس لیے کہ میں اپنی ضرورت کے لیے آیا ہوں انہیں تنگ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی کبھی زیادہ وقت گزر جاتا تو دروازے سے باہر ایک طرف چادر بچھا کر انتظار میں بیٹھ جاتا تھا اور کبھی کبھار لیٹ بھی جایا کرتا تھا اور جب وہ اپنے معمول کے مطابق آتے تو ان سے وہ بات معلوم کرتا جس کے لیے حاضر ہوا تھا۔ فرماتے ہیں کہ بعض بزرگ میری اس بات پر ناراض ہوتے اور کہتے کہ تم جناب رسول اللہؐ کے چچازاد ہو اس لیے تمہارا حق ہے کہ کوئی ضرورت ہو تو ہمیں اپنے پاس بلاؤ۔ لیکن اگر خود ہی آتے ہو تو دروازہ کھٹکھٹا کر ہمیں مطلع کیا کرو، یہ باہر اتنی دیر انتظار میں کیوں کھڑے رہتے ہو اور چادر بچھا کر گلی میں کیوں بیٹھ جاتے ہو؟ میں انہیں بتاتا ہوں کہ میں اپنی غرض سے آیا ہوں آپ کو تنگ کرنا مجھے مناسب نہیں لگتا۔

حضرت ابن عباسؓ دراصل یہ بات بتا کر اپنے شاگردوں کو سمجھا رہے ہیں کہ آج میں تمہارے سامنے اس کیفیت میں بیٹھا ہوں کہ دنیا بھر سے لوگ میرے پاس آتے ہیں تو وہ ایسے ہی بلاسبب نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے طلب اور محنت ہے۔

ان دو اصحاب رسولؐ کا تذکرہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ علم کے حصول کا راستہ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دیں اور یہ تعلیمی سال ہمیں شوق و ذوق اور محنت کے ساتھ اچھے طریقہ سے مکمل کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

قرآن کریم کی بعض آیات سمجھنے میں اشکال

(مدینۃ العلوم، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۱ ستمبر ۲۰۱۱ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ جیسا کہ حضرت شیخ عبد الحمید مدظلہ نے فرمایا ہے کہ کل امید ہے رمضان کا آغاز ہو جائے گا۔ پھر رمضان کے جتنے دن میں یہاں موجود ہوں، نماز تراویح کے بعد کچھ باتیں بیان ہو جایا کریں گی۔ ان شاءاللہ العزیز۔

آج کی گفتگو کا عنوان یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی بات سمجھنے میں کوئی الجھن پیش آتی تو صحابہ کرامؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے تھے اس لیے کہ حضورؐ قرآن مجید کے شارح ہیں۔ حضورؐ کی سنت اور حضورؐ کے ارشادات قرآن کریم کی تشریح ہے۔ چنانچہ تابعین یعنی خیر القرون اور قرون اولیٰ کے لوگ صحابہ کرامؓ سے رجوع کرتے تھے اس لیے کہ انہی کے سامنے قرآن کریم نازل ہوا تھا اور وہ اس کے پس منظر اور موقع محل کو زیادہ بہتر جانتے تھے اور اس کی زیادہ بہتر تشریح کر سکتے تھے۔ جبکہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو الجھن پیش آتی تو حضورؐ سے سوال کیا جاتا کہ یارسول اللہ! اس آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ چنانچہ حضورؐ اس کی وضاحت فرما دیتے۔ البتہ تابعین میں سے اگر کسی کو قرآن کریم کے متعلق کوئی بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش آتی تو وہ کسی صحابیؓ سے رجوع کرتے کہ جناب یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، آپ چونکہ وحی کے گواہ ہیں اور موقع محل سے واقف ہیں اس لیے آپ بتائیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس پر حدیث کی کتابوں میں بہت سے واقعات ہیں، ان میں سے ایک روایت بخاری شریف کے حوالہ سے میں آج عرض کروں گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے لیے حضورؐ کی دعا

اللہ رب العزت نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو یہ اعزاز بخشا تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر، تعبیر اور قرآن کریم کی مختلف روایات کا صحیح مصداق بیان کرنا ان کا خاص ذوق تھا۔ اس میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی اور دعا بھی شامل تھی۔ حضورؐ کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ چودہ پندرہ سال کے بچے تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریمؐ کا وصال ہوا تو میں پندرہ سال کا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضور کے چچازاد بھی تھے اور حضور کے بھانجے بھی لگتے تھے۔ بھانجے اس طرح سے کہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ ان کی حقیقی خالہ تھیں، اس طرح رسول اللہؐ ان کے چچازاد بھی لگے اور خالو بھی لگے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنے لیے حضورؐ کی دعا کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی خالہ کے ہاں رات بھی رہتا تھا۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ ایک دن حضرت میمونہؓ کے ہاں تشریف فرما تھے اور میں بھی وہاں موجود تھا۔ حضورؐ اچانک اٹھ کر باہر تشریف لے گئے، باہر جانے کے لیے یہ آپ کے معمول کا کوئی وقت نہیں تھا۔ نماز کا وقت بھی نہیں تھا، کسی نے بلایا بھی نہیں تھا اور گھر والوں نے بھی کوئی کام نہیں کہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ حضورؐ قضائے حاجت کے لیے باہر تشریف لے گئے ہوں گے۔ اس زمانے میں لوگ قضائے حاجت کے لیے باہر ہی جایا کرتے تھے، گھروں میں تو نظم نہیں ہوتا تھا، کسی چٹان کی اوٹ میں، کسی گڑھے میں یا کسی بھی مناسب جگہ پر چھپ کر بیٹھتے تھے اور مٹی کے ڈھیلے وغیرہ سے استنجا کرتے تھے۔ بعد میں جیسے ہی پانی میسر ہوتا استعمال کرتے تھے۔

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ حضورؐ کو پانی کی ضرورت ہوگی، میں یہ سوچ کر پانی کا بھرا ہوا برتن لے کر باہر نکل گیا۔ میرا اندازہ درست نکلا کہ حضورؐ باہر تشریف لے گئے اور ایک چٹان کے پیچھے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ گئے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے احتیاط کے ساتھ ایک مناسب فاصلے پر جا کر لوٹا رکھ دیا اور خود ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ پانی کا برتن میں نے ایسے رکھا کہ حضورؐ کی نظر پڑ جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے دیکھا کہ پانی کا لوٹا پڑا ہوا ہے، حضورؐ نے پانی استعمال کیا اور پھر وضو کیا۔ فارغ ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو عبداللہ بن عباسؓ کھڑے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ حضورؐ نے پوچھا عبداللہ! پانی تم لائے ہو؟ جواب دیا جی یا رسول اللہ! میں لے کر آیا ہوں۔ پوچھا، کس

نے کہا تھا؟ حضورؐ کو خیال ہوا کہ شاید خالہ نے کہا ہو۔ حضرت عبد اللہؓ نے جواب دیا یا رسول اللہ! کسی نے نہیں کہا میں نے خود سوچا کہ آپ شاید اس کام کے لیے آئے ہیں تو آپ کو پانی کی ضرورت ہوگی۔ اس پر حضورﷺ کو خوشی ہوئی۔

محدثین فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ بچہ سمجھدار ہے کیونکہ یہ سمجھداری ہی کی بات ہے کہ موقع محل دیکھنا اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا۔ بسا اوقات آدمی کے ذہن میں بات آجاتی ہے لیکن وہ عمل کے معاملے میں سستی کر دیتا ہے۔ یعنی حضرت عبد اللہؓ سمجھدار بھی تھے اور کام کا ذوق بھی تھا۔ حضورؐ نے پوچھا، عبد اللہ! بتاؤ تمہارے لیے کیا دعا مانگوں؟ ایک تیرہ چودہ سال کے لڑکے کے لیے حضورؐ ہاتھ اٹھا کر پوچھ رہے ہیں کہ بتاؤ تمہارے لیے کیا دعا مانگوں؟ جواب دیا، یا رسول اللہ! مجھے قرآن کریم کا علم چاہیے۔ حضورؐ نے دو جملوں کی دعا کی اللّٰھم علمہ الکتاب وقہ سوء الحساب اے اللہ اس بچے کو قرآن کریم کا علم عطا فرما اور حساب کتاب کی سختی سے بچا۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے علم کے پیچھے حضورؐ کی دعا بھی تھی اور شفقت بھی۔ ان کا شمار قرآن کریم کے بڑے علماء میں ہوتا ہے اور وہ رئس المفسرین کہلاتے ہیں۔ علوم قرآن کے مختلف شعبے ہیں۔ استنباط، استخراج اور مسائل کا ذوق حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کا زیادہ تھا اس لیے وہ فقہاء کے سردار کہلاتے ہیں۔ جبکہ آیت کا مطلب، مصداق اور تاویل کا ذوق حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا زیادہ تھا اس لیے یہ مفسرین کے سردار کہلاتے ہیں۔

قرآن کریم کی بعض آیات کے متعلق چند اشکالات

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اشکال ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے بسا اوقات آدمی کو کوئی بات سمجھنے میں دقت پیش آجاتی ہے لیکن قرآن و سنت اور دینی معاملات کے متعلق اشکالات کے حل کے لیے راسخ العلم لوگوں سے راہنمائی لینی چاہیے۔ بخاری شریف کی روایت ہے حضرت سعید ابن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا یا حضرت! قرآن کریم کی کچھ آیات کے بارے میں میرے کچھ اشکالات ہیں جنہیں میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا، پوچھو بھئی، کیا اشکالات ہیں؟ اس شخص نے قرآن کریم کے حوالے سے چار باتیں پوچھیں۔

قرآن کریم کے تین مواقع کے بارے میں بتایا کہ مجھے ان میں آپس تضاد نظر آتا ہے کہ بظاہر قرآن ایک جگہ کچھ اور بات کہتا ہے جبکہ دوسری جگہ اس سے متضاد کچھ اور بات کہتا ہے۔

پہلا اشکال

ایک جگہ کے بارے میں بتایا کہ قرآن کریم میں ہے فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساء لون جب قیامت کا دن ہوگا تو لوگ آپس میں نہ ایک دوسرے سے کوئی بات کر سکیں گے اور نہ باہمی نسب کام آئیں گے۔ یعنی لوگ ہر شے بھول جائیں گے اور کوئی باپ بیٹا بہن بھائی ایک دوسرے کے کام نہیں آئیں گے۔ ولا یتساء لون یہاں تک کہ ایک دوسرے سے پوچھ بھی نہیں پائیں گے کہ بھئی تمہارا کیا حال ہے، فلاں کیسا ہے اور فلاں کے ساتھ کیا ہوا وغیرہ۔ ایک جگہ تو قرآن کریم یہ کہتا ہے جبکہ دوسری جگہ کہتا ہے کہ واقبل بعضھم علی بعض یتساء لون پہلی آیت میں لا یتساء لون ہے جبکہ یہاں یتساء لون ہے کہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ یعنی ایک جگہ قرآن کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے لیکن دوسری جگہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے۔

دوسرا اشکال

دوسرا اشکال اس نے یہ پیش کیا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے ولا یکتمون اللہ حدیثا اور اللہ تعالی سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔ دنیا ہو یا آخرت، اللہ تعالی سے کہیں بھی کوئی بھی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ لیکن دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ مشرکین قیامت کے روز کہیں گے واللہ ربنا ما کنا مشرکین یا اللہ! تیرے رب ہونے کی قسم ہم نے تو کوئی شرک نہیں کیا تھا۔ یعنی ایک جگہ ہے کہ اللہ تعالی سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے لیکن دوسرے مقام پر ہے کہ مشرکین اپنے شرک سے منکر ہو جائیں گے۔ تو اس شخص نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے سامنے قرآن میں تضاد کے متعلق یہ دوسرا اشکال پیش کیا۔

تیسرا اشکال

تیسرا اشکال یہ پیش کیا کہ قرآن کریم ایک مقام پر کہتا ہے ءأنتم اشد خلقا أم السماء بناھا رفع سمکھا فسواھا وأغطش لیلھا وأخرج ضحاھا والأرض بعد ذلک دحاھا یعنی ترتیب یہ ہوئی کہ پہلے آسمان بنایا پھر زمین بنائی۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین و تجعلون لہ اندادا کہہ دو کیا تم اس کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں

زمین بنائی اور تم اس کے لیے شریک ٹھہراتے ہو۔ پھر آگے چل کر فرمایا ثم استوی الی السماء فسوھن سبع سماوات پھر اللہ تعالی آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور سات آسمان بنا دیے۔ یعنی ایک جگہ یہ ہے کہ پہلے آسمان بنائے اور پھر زمین۔ جبکہ دوسرے مقام پر یہ ہے کہ پہلے زمین بنائی اور پھر آسمان۔ اس شخص نے پوچھا کہ قرآن کریم میں یہ تضاد کیوں ہے؟ یہ تیسرا اشکال تھا جو اس شخص نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے پیش کیا۔

چوتھا اشکال

چوتھا اشکال اس شخص نے یہ پیش کیا کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی اللہ تعالی کی کسی صفت کا ذکر آیا ہے، لفظ کان کا ذکر ہے کہ اللہ ایسا "تھا"۔ کان اللہ غفورا رحیما۔ کان اللہ سمیعا بصیرا۔ کان اللہ عزیزا حکیما یعنی اللہ غفور اور رحیم تھا۔ اللہ سننے والا اور دیکھنے والا تھا۔ اللہ عزیز اور حکیم تھا۔ "تھا" کا مطلب تو یہ بنتا ہے کہ اللہ ایسا تھا لیکن اب نہیں ہے۔

اس شخص نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ یہ میرے چار اشکالات ہیں جن کے متعلق مجھے راہنمائی چاہیے کہ یہ دو چار باتیں قرآن کریم کے بارے میں میرے ذہن میں کھٹکتی ہیں۔ اگر بادی النظر میں دیکھا جائے تو یہ بڑے سخت قسم کے اشکالات ہیں کہ قرآن کریم کی آیات کا آپس میں ہی تضاد نظر آتا ہے۔

پہلے اشکال کا جواب

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ بھئی قیامت دو چار گھنٹوں کی بات نہیں ہے، قیامت پچاس ہزار سال کے عرصے پر مشتمل ہوگی اور قیامت کے مختلف مراحل ہوں گے۔ نفخہ اولی کے بعد اور، نامہ ہائے اعمال ملنے سے پہلے جب ہر ایک کو یہ فکر ہوگی کہ پتہ نہیں میرا کیا بنتا ہے، میرا نامہ اعمال مجھے دائیں ہاتھ میں ملے گا یا بائیں ہاتھ میں اور میرا ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ ایسے وقت میں تو افراتفری ہوگی اور ہر ایک کو اپنی اپنی فکر ہوگی۔ اور پھر جب لمبا عرصہ گزر جائے گا اور ہر ایک کو نامہ اعمال مل جائیں گے، کسی کو دائیں ہاتھ میں اور کسی کو بائیں ہاتھ میں، پھر یہ وہ وقت ہوگا جب سب ایک دوسرے سے پوچھتے پھریں گے کہ بھئی تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ ایک پوچھے گا تمہارا کیا نتیجہ نکلا؟ دوسرا پوچھے گا تمہارا کونسا گریڈ آیا ہے، تیسرا پوچھے گا تمہیں کونسی پوزیشن ملی۔ یعنی سوال نہ کرنے کا مرحلہ اور ہے جبکہ سوال کرنے کا مرحلہ اور ہے۔

اسی طرح قرآن کریم کے متعلق ایسا ہی ایک اور اشکال پایا جاتا ہے جو کہ حضرت عبداللہؓ والی اس روایت میں نہیں ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوں گے کہ لا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا ینظر الیھم نہ اللہ قیامت کے دن ان سے کلام کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھے گا۔ جبکہ دوسرے مقام پر ہے کہ فوربک لنسئلنھم اجمعین تیرے رب کی قسم ہم ہر ایک سے پوچھیں گے۔ اشکال یہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک مقام کے مطابق تو اللہ تعالی کچھ لوگوں سے کلام ہی نہیں کرے گا اور ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں جبکہ دوسرے مقام کے مطابق اللہ تعالی قسم کھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم سب سے پوچھیں گے۔ تو یہاں بھی علماء کہتے ہیں کہ جب حساب کتاب کی باری آئے گی تو اللہ تعالی پوچھیں گے ہی۔

تو حضرت عبداللہ نے یہی بات فرمائی کہ یہ قیامت کے مختلف مراحل ہوں گے کہ سوال نہ کرنے کا اور افراتفری کا وقت اور ہے، لیکن جب لوگوں کے معاملات طے ہو جائیں گے اور ان کے اعمال نامے ان کو مل جائیں گے پھر اس وقت لوگ ایک دوسرے سے نتائج کے متعلق پوچھتے پھریں گے۔

دوسرے اشکال کا جواب

ولا یکتمون اللہ حدیثا کہ اللہ تعالی سے بات چھپا نہیں سکیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کا جواب یہ دیا کہ لوگ اللہ تعالی سے چھپانے کی کوشش کریں گے لیکن چھپا نہیں سکیں گے۔ یہی بات قرآن کریم نے دوسرے مقام پر اس طرح بیان کی ہے الیوم نختم علی افواھھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون کہ زبان جھوٹ بولنے کی کوشش کرے گی، ہم زبان پر مہر لگا دیں گے اور ہاتھوں کو قوت گویائی دیں گے اور پھر ہاتھ بولیں گے کہ ہم نے یہ کام کیا تھا، پاؤں گواہی دیں گے وقالوا الجلودھم لم شھدتم علینا اور اس دن چمڑا گواہی دے گا کہ یا اللہ یہ یہ کام ہوئے ہیں۔ آدمی اپنے جسم کے اعضاء سے پوچھے گا کہ تم کیوں گواہی دے رہے ہو کہ سزا تو تم ہی بھگتو گے۔ وہ اعضاء کہیں گے أنطقنا اللہ الذی أنطق کل شیء جو خدا باقی چیزوں سے بلواتا ہے اس نے ہم سے بھی بلوا دیا۔ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وہ چھپائیں گے لیکن اللہ تعالی ان کی زبانوں پر مہر لگا کر ان کے اعضاء سے گواہی دلوائیں گے۔ یعنی چھپانے کی کوشش کرنا اور بات ہے اور چھپا سکنا اور بات ہے۔

اسی طرح مستدرک حاکم کی ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مجرم پیش ہوگا جس کے بارے میں فرشتے کہیں گے کہ یا اللہ اس نے فلاں فلاں کام کیے۔ وہ کہے گا کہ یا اللہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ مدعا علیہ انکاری ہو جائے گا کہ یہ فرد جرم ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ تعالی فرشتوں سے فرمائیں گے کہ بھئی تم نے فرد جرم عائد کیا ہے، چارج شیٹ پیش کی ہے جس پر مدعا علیہ انکاری ہے، اس لیے گواہ لے کر آؤ۔ فرشتے کہیں گے کہ یا اللہ ہم گواہ کہاں سے لائیں ہمارے پاس تو صرف ریکارڈ ہی ہے۔ اللہ تعالی فرمائیں گے کہ ریکارڈ کو ہی لاؤ، جس عمل سے یہ انکار کر رہا ہے اسے وہ عمل کرتا ہوا دکھاؤ۔ اللہ کے پاس تو بہت اقسام کا ریکارڈ ہے۔ اللہ تعالی کو کائنات کی ہر چیز کا علم ہے لیکن عدالت کا پراسیس بھی تو پورا کرنا ہے۔ فرشتے پھر وہ منظر سامنے لے کر آئیں گے جب وہ شخص اپنے آپ کو وہ عمل کرتا ہوا دیکھ لے گا تو پھر اللہ تعالی پوچھیں گے، ہاں بھئی اب بتاؤ یہ عمل کیا تھا یا نہیں؟ جس پر وہ شخص سر جھکا لے گا کہ ہاں کیا تھا۔ تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ چھپانا اور چیز ہے اور چھپا سکنا اور چیز ہے۔

تیسرے اشکال کا جواب

اللہ رب العزت نے پہلے زمین بنائی اور پھر اس کے گرد آسمان پھیلائے اور پھر زمین کو بچھایا۔ خلق الارض فی یومین دو دن میں زمین بنائی۔ اب اللہ کے حساب سے یہ دو دن کتنے بڑے تھے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ پھر اللہ تعالی آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور آسمان کا سارا نظام بنا کر پھر اس کے بعد زمین کو بچھا دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی وضاحت میں ایک مفسر نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ ایک ہے زمین کا بنانا اور دوسرا ہے زمین کے نظام کی بحالی یعنی درختوں کا اگنا اور زمین پر زندگی کے پورے ماحول کا بن جانا۔ زمین اکیلے یہ کام نہیں کر سکتی ان چیزوں پر فضا اثر انداز ہوتی ہے، سورج اثر انداز ہوتا ہے، چاند بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور ستاروں کی گردش بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ مختلف عوامل کا ایک مکمل نیٹ ورک ہے جو زمین کے اوپر حیات تشکیل دیتا ہے۔ اسی لیے فطری ترتیب بھی یہی ہے کہ زمین بنا کر اس کے گرد سارا آسمانی نظام ترتیب دیا اور پھر اس کے بعد زمین کو بچھایا اور پانی، ہوا وغیرہ کا نظام قائم کیا۔

چوتھے اشکال کا جواب

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ کان کے لفظ کا استعمال بھی اللہ تعالی کی طرف سے ایک لطیف اشارہ ہے کہ تمہاری طرح اللہ تعالی نے علم سیکھا نہیں بلکہ وہ شروع سے اور ہمیشہ سے ہی عالم ہے۔ یہ ''تھا'' کا لفظ ماضی کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالی کے قدیم ہونے اور ہمیشہ سے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ ہمیشہ سے عزیز ہے، ہمیشہ سے سمیع ہے، ہمیشہ سے بصیر ہے، ہمیشہ سے علیم ہے۔ اللہ تعالی کی صفت میں تمہاری طرح حدوث نہیں ہے کہ پہلے نہیں تھا، اب ہو گیا ہے۔ پہلے علم نہیں تھا، اب حاصل کر لیا۔ پہلے طاقت نہیں تھی، اب آ گئی۔ ایسی بات نہیں ہے بلکہ اللہ شروع ہی سے ایسا ہے۔

میں نے یہ عرض کیا کہ قرآن کریم کی کسی آیت کو سمجھنے میں کسی الجھن کا پیش آجانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، یہ کبھی بھی اور کسی کو بھی پیش آسکتی ہے۔ لیکن ایسی الجھنوں اور ایسے اشکالات کے لیے اہل حق علماء سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ صحابہ کرامؓ کو اگر کوئی الجھن اور اشکال ہوتا تھا تو وہ حضورؐ سے رجوع کرتے تھے، اور اگر تابعین کو کوئی الجھن ہوتی تھی تو وہ صحابہ کرامؓ سے رجوع کرتے تھے اور پھر ان کی وہ الجھن دور بھی ہوتی تھی۔

اشکالات کے حل کے لیے اہل علم سے رجوع

آج کے دور میں بھی ہمیں قرآن کریم کے متعلق اشکالات پیش آتے ہیں۔ لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے اشکال خود حل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ معلوم کرنا چاہیے کہ حضورؐ نے اس کی کیا وضاحت کی ہے۔ اگر حضورؐ کی براہ راست وضاحت نہ ملے تو یہ دیکھیں کہ صحابہ کرام میں سے کسی نے اس کی وضاحت کی ہے یا نہیں۔ اگر وہاں سے مل جائے تو وہی صحیح وضاحت ہے۔ اگر وہاں سے بھی نہ ملے تو پھر قرآن کے اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے اس اشکال کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ لیکن قرآن کریم کے کسی اصول کی وضاحت اگر حضورؐ سے مل جاتی ہے یا صحابہؓ سے مل جاتی ہے تو پھر کسی نئی وضاحت کے لیے تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اور حدیث میں کوئی تضاد نظر آتا ہے کہ قرآن کچھ اور کہہ رہا ہے جبکہ حدیث کچھ اور۔ بظاہر نظر ایسا آتا ہے کہ دونوں میں تضاد ہے۔ ایسا اشکال صحابہ کو بھی ہوتا تھا۔ وہاں بھی اصول یہی ہے کہ یہ پتہ کیا جائے کہ قرآن کریم کی وضاحت حضورؐ نے کیا کی ہے۔ نبی کریمؐ نے آیت پر کیسے عمل کیا۔ عمل یا قول کے حوالے

سے کوئی آیت سمجھ میں نہ بھی آئے لیکن یہ پتہ چل جائے کہ حضورؐ نے اس آیت کے مطابق یوں عمل کیا تو پھر اس کے بعد تردد کی ضرورت نہیں ہے، حضورؐ کا یہ عمل اس آیت کی تشریح سمجھا جائے گا۔ یا حضورؐ سے اس آیت کے متعلق قولی وضاحت مل جائے تو بھی یہی طریقہ ہوگا۔ اس پر ایک دو واقعات عرض کرنا چاہوں گا۔

قرآن کریم کی تشریح میں حضورؐ کے عمل سے حضرت عمرؓ کا استدلال

قرآن کریم کی آیت کریمہ ہے اذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوۃ۔ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا۔ یہ جو مسافر کے لیے قصر شرعی ہے کہ فرض نماز کی چار رکعت کی جگہ دو رکعت پڑھے گا، جبکہ مؤکدہ سنتیں غیر مؤکدہ ہو جائیں گی۔ قرآن کریم نے قصر نماز کے لیے دو شرطیں لگائی ہیں کہ اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں کافروں سے ڈر ہے تو کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کر لو۔ یعنی اس آیت میں جو شرط ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم حالت جنگ کے لیے مخصوص ہے۔ یعنی نماز تب قصر کرو جب تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں فتنے میں ڈال دیں گے۔ اس آیت کا سیاق و سباق یہ بتاتا ہے کہ قصر نماز کا حکم عام حالت میں نہیں ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس پر ایک صحابیؓ کو اشکال ہوا اور وہ حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں آئے کہ یا حضرت اب تو ہمیں کوئی خوف نہیں ہے۔ خوف تو فتح مکہ تک یا پھر اس کے بعد تھوڑا بہت حجۃ الوداع تک تھا۔ جب حجۃ الوداع پر ہم نے اپنی قوت کا اظہار کر دیا اور جزیرۃ العرب پر ہماری حکومت کو دنیا نے تسلیم کر لیا اب تو کوئی خوف کی بات نہیں ہے۔ پھر یہ حالت امن میں قصر نماز کا حکم کیسا؟ حضرت عمرؓ نے بڑا سادہ سا جواب دیا کہ کیا نبی کریمؐ نے فتح مکہ کے بعد اپنے اسفار میں نماز قصر کی ہے یا نہیں؟ صحابی نے کہا جی ہاں، آپؐ نے نماز قصر کی تھی۔ حضورؐ جب حجۃ الوداع سے واپس مدینہ تشریف لے گئے تو راستے میں نماز قصر کی یا نہیں؟ صحابی نے کہا، ہاں کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا، پھر اس کے بعد تمہیں کیا اشکال ہے؟ یعنی اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کا عمل ہی قرآن کریم کی اصل تشریح ہے۔

بلکہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے بھی حجۃ الوداع سے واپسی پر نماز قصر کرتے ہوئے یہ اشکال ہوا تھا اور میں نے جناب نبی کریمؐ سے دریافت کر لیا تھا۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ اے عمرؓ! یہ اللہ تعالیٰ کا صدقہ ہے اسے کیوں واپس کرتے

ہو؟ یعنی جب ہمیں خوف اور جنگ کی حالت کے بغیر نمازیں قصر کرتے ہوئے اللہ تعالی نے منع نہیں فرمایا جبکہ وحی ابھی جاری ہے تو تم اس پر کیوں اشکال کر رہے ہو؟

قرآن کریم کی تشریح میں حضورؐ کے قول پر حضرت عائشہؓ کا استدلال

اسی پر ایک واقعہ اور عرض کرتا ہوں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے جب بھی کوئی اشکال ہوتا تھا تو میں حضورؐ کی خدمت میں عرض کر دیتی تھی کہ یا رسول اللہ ! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اور پھر فرماتی ہیں کہ میں حضورؐ کے سامنے سوال کرتی تھی اور اس وقت تک سوال کرتی رہتی تھی جب تک میں مطمئن نہیں ہو جاتی تھی۔ حضرت عائشہؓ ذہین خاتون تھیں۔ یہ ذہانت ہی ہے کہ بات سے بات نکالی اور مسئلے کا مکمل حل معلوم کیا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا من حوسب عذب (قیامت کے روز) جس کا حساب کتاب ہوگا اسے ضرور عذاب ہوگا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں سن رہی تھی میں نے حضورؐ سے پوچھا، یا رسول اللہ یہ آپ کیا فرما رہے تھے کہ جس کا حساب ہوگا اسے لازماً عذاب ہوگا؟ قرآن کریم تو کچھ اور کہتا ہے اما من اوتی کتابہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابا یسیرا، وینقلب الی اھلہ مسرورا جس کو قیامت کے دن نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اس کا سرسری اور آسان سا حساب ہوگا جس کے بعد وہ خوش خوش گھر والوں کے پاس واپس آئے گا، بڑا مسرور کہ میں پاس ہو گیا، کامیاب ہو گیا۔

نبی کریمؐ نے ایک جملے میں ہی معاملہ حل کر دیا۔ فرمایا ذاک العرض یا عائشہ کہ عائشہ جس حساب کی بات قرآن کر رہا ہے وہ حساب نہیں بلکہ صرف پیشی ہے۔ یعنی پیشی تو ہر ایک کی ہونی ہے لیکن وہ لوگ جن کا سرسری سا حساب ہوگا کہ ایک دو سوالات کیے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ جاؤ بھئی۔ پھر آپؐ نے فرمایا اما من نوقش فقد عذب جس کا مناقشہ (باقاعدہ حساب کتاب) ہوگا اسے عذاب ہوگا۔

یوں کہہ لیں کہ جس کا ریکارڈ طلب ہو گیا، جس کا رجسٹر کھل گیا اور جس پر جرح شروع ہو گئی وہ نہیں بچے گا۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ جس حساب کی بات اس آیت میں قرآن کر رہا ہے وہ تو صرف سرسری پیشی ہے۔

ہم لوگ تو سرسری پیشی کے قابل بھی نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حساب یسیر یعنی سرسری پیشی کیا ہوگی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دو چار سرسری سوالات ہوں گے۔

فرشتے ایک آدمی کو پیش کریں گے جس کے متعلق اللہ تعالی پوچھیں گے کہ ہاں بھئی عقیدہ ٹھیک ہے؟ فرشتے بتائیں گے کہ ٹھیک ہے۔ نماز روزہ وغیرہ؟ وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس نے حلال و حرام کا خیال کیا؟ جی کیا۔ کوئی لین دین تو نہیں ہے؟ نہیں ہے۔ بس یہ سرسری حساب ہے۔

میں نے آج کی گفتگو میں اصولی بات یہ عرض کی کہ قرآن کریم کی تشریح میں جناب نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ، آپ کا ارشاد مبارک اور صحابہ کرامؓ کی تشریحات، یہی بنیاد ہیں۔ ایک اور بات پر غور فرمالیں کہ ہم جو اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہم قرآن کو اور اسلامی احکام کو سنت رسول کی روشنی میں اور پھر جماعت صحابہؓ کے ارشادات واعمال کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ یعنی حضورؐ کی سنت کو اور جماعت صحابہؓ کو معیار سمجھنے والے اہل السنت والجماعت ہیں۔ اللہ تعالی ہمیں ان کے نقش قدم پر چلتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

قرآن و سنت کا باہمی ربط

(نامعلوم - ۱ ستمبر ۲۰۱۱ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حدیث اور سنت کیا ہے؟ اس کے حجت اور دلیل ہونے کا کیا درجہ ہے؟ شریعت کے دلائل میں اور شرعی احکام میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

حدیث گفتگو کو کہتے ہیں اور سنت طریقے کو۔ محدثین کی اصطلاح میں حدیث اور سنت میں فرق بھی ہے اور یہ دونوں مترادف بھی ہیں۔ بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا نام حدیث ہے اور عمل کا نام سنت ہے۔ محدثین نے یہ بھی کہا ہے کہ حدیث وہ ہے جو ایک آدھ مرتبہ بیان ہوئی جبکہ سنت وہ ہے جو معمول یا قانون کا درجہ اختیار کر گئی۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آپؐ کی ساری زندگی کے ارشادات حدیث ہیں، جبکہ جن ضوابط اور قوانین پر آپؐ دنیا سے رخصت ہوئے یعنی آپؐ کی زندگی کے جو آخری اقوال و اعمال ہیں وہ سنت کا درجہ رکھتے ہیں۔

حدیث اور سنت کی مختلف تعبیرات ہیں۔ اسی وجہ سے بہت سے علماء نے یہ کہا ہے کہ حدیث مطلقاً واجب العمل نہیں ہے جبکہ سنت مطلقاً واجب العمل ہے۔ اصولیین کے ہاں

یہ بات بھی ہے کہ حدیث میں عموم ہے اور ہر حدیث حجت نہیں ہے، اس لیے کہ بہت سی احادیث منسوخ ہیں اور بہت سی بچپن کی یا نبوت سے پہلے کی باتیں ہیں۔ امام زہری نے اصول حدیث کے بارے میں ایک جملہ کہا ہے جس سے حدیث و سنت کا یہ فرق مزید واضح ہو جاتا ہے انما یوخذ من امر رسول اللہؐ الاخر فالاخر الخ حضورؐ کے ارشادات میں جو آخری ہو گا وہ لیا جائے گا۔ حضورؐ کی حیات میں بہت سے معاملات ایسے تھے کہ پہلے عمل کچھ اور تھا لیکن بعد میں بدل کر کچھ اور ہو گیا۔ یہ فطری بات ہے کہ انسان جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس کا عمل زیادہ پختہ ہوتا جاتا ہے، یوں انسان کا آخری عمل اس سے پہلے عمل سے ارتقاء کا عمل ہوتا ہے۔

عمومی طور پر حدیث و سنت کو مترادف معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اگر مذکورہ بالا فرق ملحوظ رکھے بغیر حدیث کا ذکر ہو تو اس سے عام طور پر حضورؐ کی نبوی زندگی کے اقوال و افعال مراد لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث کہتے کس کو ہیں؟

1. حدیث یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے کوئی بات زبان مبارک سے ارشاد فرمائی، صحابہ کرامؓ نے سنی، ان میں سے ایک یا ایک سے زیادہ حضرات نے آگے نقل کر دی کہ حضورؐ نے یوں فرمایا۔

2. حدیث یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے کوئی بات زبان سے نہیں فرمائی بلکہ کوئی عمل کیا جسے صحابہؓ نے دیکھا، ان میں سے کسی صحابیؓ نے اس عمل کو آگے روایت کر دیا کہ میں نے حضورؐ کو یہ عمل کرتے دیکھا کہ حضورؐ نے یہ کام یوں کیا تھا۔

3. حدیث یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے زبان سے کچھ نہیں فرمایا اور خود کوئی عمل بھی نہیں کیا بلکہ کسی صحابیؓ نے کوئی کام کیا جو حضورؐ نے خود دیکھا یا حضورؐ کے علم میں آیا اور پھر حضورؐ نے اس سے منع نہیں کیا۔ یعنی صحابیؓ کا قول یا عمل حدیث رسولؐ کہلائے گا اس شرط پر کہ وہ حضورؐ کے سامنے ہوا یا حضورؐ کے علم میں آیا لیکن آپؐ نے اس سے منع نہیں کیا۔ حضورؐ کا یہ خاموش رہنا اس بات کی تصدیق سمجھی جائے گی کہ اس صحابیؓ نے جو کہا ٹھیک کہا یا جو کام کیا ٹھیک کیا۔ مثلاً نماز میں ہم رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ اور ربنا لک الحمد کے بعد حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ کا اضافی جملہ پڑھتے ہیں۔ یہ ایک صحابیؓ کا عمل ہے جس کی

تصدیق حضورؐ نے کی۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے نماز سے فارغ ہوکر پوچھا کہ بھئی کسی نے نماز میں عام معمول سے ہٹ کر کوئی خاص جملے کہے ہیں؟ ایک صحابیؓ کہنے لگے یارسول اللہؐ جب میں قومہ میں کھڑا ہوا تو ربنا لک الحمد کہا اور ساتھ یہ جملے کہے۔ آپؐ نے فرمایا کوئی بات نہیں، میں نے دیکھا کہ ان جملوں کو وصول کرنے کیلئے الگ طور پر فرشتے آئے۔ چنانچہ یہ جملہ یا عمل ایک صحابیؓ کا ہے لیکن یہ آپؐ کی سنت شمار ہوگی۔

4. یہ تو حدیث کی تین معروف قسمیں ہیں جو میں نے ذکر کیں لیکن محدثین کے ہاں ایک اور بات بھی حدیث کہلاتی ہے۔ صحابیؓ کا وہ عمل جو حضورؐ کی زندگی میں ہوا، جو حضورؐ نے دیکھا یا آپؐ کے علم میں آیا اور آپؐ نے اس سے نکیر نہیں فرمائی، یہ تو حدیث ہے۔ لیکن وہ عمل جو صحابیؓ نے حضورؐ کی حیات مبارکہ کے بعد کیا، یا وہ بات جو ایک صحابیؓ نے حضورؐ کے وصال کے بعد کہی تو صحابیؓ کے ایسے عمل یا ایسی بات کی کیا حیثیت ہے؟ آپؐ کی وفات کے سو سال بعد تک صحابہؓ زندہ رہے۔ فقہاء کرام اور محدثین عظام کہتے ہیں کہ اگر بات ایسی ہے کہ جس کا تعلق رائے یا عقل سے ہے، وہ تو صحابیؓ کا اپنا قول ہے۔ لیکن اگر صحابیؓ نے کوئی بات ایسی کہی جو وحی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی تو وہ بھی حدیث رسولؐ ہے۔ یعنی ایک بات صحابیؓ نے کہی اور اس بات کی نسبت حضورؐ کی طرف نہیں کی لیکن بات ایسی ہے جو وحی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی، جس کا تعلق عقل، قیاس اور رائے سے نہیں ہے۔ مثلاً ایک صحابیؓ کہتا ہے کہ قبر میں یہ ہوگا۔ اب ایسی بات وحی کے بغیر تو معلوم نہیں ہو سکتی۔ یا مثلاً کوئی صحابیؓ یہ کہے کہ قیامت کے دن پل صراط پر یہ کچھ ہوگا، یہ بات بھی وحی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ قول صحابیؓ کا ہے اور صحابیؓ نے اس کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف بھی نہیں کی لیکن بات ایسی ہے کہ اس کا معلوم ہونا وحی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو محدثین یہ کہتے ہیں کہ ایسے موقع پر ہم یہ کہیں گے کہ یہ بات صحابیؓ اپنی طرف سے نہیں کر رہا بلکہ یقیناً اس نے حضورؐ سے یہ بات سنی ہے۔ چنانچہ یہ بھی حدیث رسولؐ ہے۔

اللہ تعالٰی نے قرآن کریم میں واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا کہ وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا (سورۃ الحشر) اللہ کا رسولؐ جو چیز تمھیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے تمہیں روکے اس سے رک جاؤ۔ پھر نبی اکرمؐ نے اپنی زندگی میں جو بھی اقوال و افعال فرمائے اللہ تعالیٰ نے ان کی تصدیق بھی فرمائی۔ وہ ایسے کہ قرآن کریم میں چند مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کے عمل پر ٹوکا کہ آپ کو فلاں کام یوں نہیں بلکہ یوں کرنا چاہیے تھا۔ مثلاً عفا اللہ عنک لم اذنت لھم اللہ آپ سے درگزر کرے آپ نے ان لوگوں کو (تبوک کی جنگ سے پیچھے رہنے کی) اجازت کیوں دی؟ اسی طرح یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک اے نبی! اللہ نے آپ کے لیے جو (شہد) حلال کیا آپ اپنے لیے وہ کیوں حرام کرتے ہیں؟ اور ایک جگہ فرمایا ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی نبی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگے۔

یہ میں نے ان باتوں میں سے چند ذکر کی ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو ٹوکا۔ چنانچہ حضورؐ کی ان چند باتوں پر اللہ تعالیٰ کا ٹوکنا دراصل باقی سب باتوں کی تصدیق ہے اس لیے کہ وحی کا سلسلہ تو حضورؐ کے اس دنیا سے رخصت ہونے تک جاری رہا کیونکہ حضرت عزرائیلؑ اکیلے نہیں آئے بلکہ حضرت جبرائیلؑ کو ساتھ لے کر آئے۔ پھر حضرت جبرائیلؑ نے ہی آپؐ سے جان قبض کرنے کی اجازت طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے اگر حضورؐ کے ان چند کاموں کے علاوہ کسی اور کام کی نکیر نہیں کی تو اس کا واضح طور پر یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے باقی تمام کاموں کی تصدیق کر دی ہے۔

جناب نبی کریمؐ نے بہت سی ایسی باتیں اور بہت سے ایسے احکامات ارشاد فرمائے جن کا قرآن کریم کی وضاحت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی ایسی باتیں جن میں صراحتاً یہ تعلق نہیں بتایا جا سکتا کہ آپؐ کا فلاں ارشاد قرآن کریم کی فلاں آیت کی تشریح میں ہے۔ لیکن آپؐ کے ایسے بہت سے ارشادات اسلامی قوانین کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ حضورؐ کے وہ احکامات یا وہ ارشادات بھی اللہ ہی کی طرف سے سمجھے جائیں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان احکامات کی نکیر نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے زندگی بھر کے تمام ارشادات میں سے پانچ سات احکامات کی نکیر فرما کر باقی سب کی تصدیق کر دی۔ یوں آپؐ کے وہ ارشادات و

احکامات جن کا براہ راست قرآن کریم کی وضاحت سے صریحا تعلق نہیں، وہ بھی ایسے ہی حجت اور دلیل ہیں جیسے کہ قرآن کریم میں آنے والے احکامات۔

بات ذرا سخت ہے لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ دلائل کی ترتیب میں قرآن پہلے ہے جبکہ ایمان کی ترتیب میں حدیث پہلے ہے۔ یعنی کسی مسئلے میں ہم دلیل تلاش کرتے ہیں تو پہلے قرآن میں دیکھتے ہیں، پھر سنت میں اور اس کے بعد اجماع و قیاس کی باری آتی ہے۔ لیکن جب ہم ایمان لاتے ہیں تو پہلے حدیث پر ایمان لاتے ہیں اور پھر قرآن کریم پر۔ اس لیے کہ سب سے پہلے ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ حضورؐ اللہ تعالی کے رسول ہیں، اس کے بعد ہم حضورؐ کی اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے۔

فہم قرآن کے کچھ اصول ہیں جو دنیا کی کسی بھی گفتگو کے اصولوں سے مختلف نہیں ہیں۔ کسی بھی زبان میں ہونے والی گفتگو کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر تین باتیں ضروری ہوتی ہیں۔

1. پہلی بات یہ کہ اس زبان سے واقفیت ہو جس زبان میں وہ گفتگو کی گئی ہے۔ یہ سادہ سی بات ہے کہ فارسی کا کلام ہوگا تو فارسی جاننا ضروری ہے، اردو کا کلام ہوگا تو اردو زبان کا جاننا ضروری ہے۔ لیکن یہاں ایک بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ جس معیار کا کلام ہو اسی معیار کی زبان سمجھنا لازمی ہے۔ مثلا اردو کا ایک روزنامہ اخبار پڑھنے کے لیے ایک عام آدمی کے معیار کی اردو زبان کا جاننا کافی ہے لیکن غالب، مومن خان مومن اور میر تقی میر وغیرہ کو پڑھنے کے لیے زبان کا یہ معیار کافی نہیں ہوگا، اس کے لیے اسی سطح کی اردو جاننا ضروری ہوگا۔ اسی طرح ایک عام انگریزی اخبار پڑھنے کے لیے جس معیار کی انگلش کافی ہے، شکسپیئر کو پڑھنے کے لیے اس معیار کی انگریزی جاننا کافی نہیں ہے۔

2. دوسری بات جو کسی کلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کلام سے متکلّم کی منشاء معلوم کی جا سکے۔ اس لیے کہ ظاہری جملوں سے عام طور پر ایک سے زائد معانی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ کلام کرنے والا ایسے مبہم جملوں کی خود وضاحت کردے کہ جناب میری

بات کا مطلب وہ نہیں جو آپ سمجھ بیٹھے ہیں بلکہ میری بات کا مطلب یہ ہے۔ چنانچہ سامعین گفتگو کا کوئی بھی مطلب سمجھ رہے ہوں لیکن جب متکلّم کی وضاحت سامنے آجائے تو پھر اس وضاحت کو ہی بات کا اصل مطلب سمجھا جاتا ہے۔

3. تیسری بات جو کسی کلام کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ گفتگو کس پس منظر اور کس ماحول میں ہوئی۔ اس لیے کہ ماحول اور پس منظر کے بدلنے سے جملوں کے معانی بدل جاتے ہیں۔ ایک بات ایک جگہ پر کہی جائے تو اس کا مطلب اور ہوتا ہے جبکہ وہی بات کسی دوسرے سیاق اور ماحول میں کہی جائے تو اس کا مطلب مختلف ہوتا ہے۔

دینی جدوجہد اور اس کی اخلاقیات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ ستمبر ۲۰۱۱ء)

آج میں اپنی ’’قادیانیت نوازی‘‘ کی داستان قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے الزام کا مجھے گزشتہ چار پانچ برسوں سے بعض دوستوں کی طرف سے سامنا ہے اور اب اس الزام کا ہدف ہونے میں عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر بھی میرے ساتھ شریک ہو گیا ہے۔

چند برس پہلے کی بات ہے، پسرور کے ایک سن رسیدہ بزرگ قاضی عطاء اللہ صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ وہ ایک سابق قادیانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر نصف صدی قبل مسلمان ہو گئے تھے اور اب بحیثیت مسلمان زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے قرآن کریم کے مختلف تراجم کو سامنے رکھ کر ترجمہ قرآن کریم کو منظوم شکل میں پیش کیا ہے اور ’’مفہوم القرآن‘‘ کے نام سے اسے شائع کر رہے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ ان کے پاس تھا اور وہ اس پر مجھ سے تقریظ لکھوانا چاہتے تھے۔ میں ان سے براہ راست واقف نہیں تھا اور ان کے ساتھ سابق قادیانی ہونے کا لاحقہ بھی ان کی گفتگو سے میرے علم میں آچکا تھا، اس لیے میں نے ان سے کتاب لے کر رکھ لی اور عرض کیا کہ چند روز کتاب دیکھنے کے بعد کچھ لکھ سکوں گا۔ اس قسم کے معاملات میں میرا معمول یہ ہے کہ مقامی علماء کرام سے رجوع کرتا ہوں اور ان کی جو رائے ہو اس پر عمل کرتا ہوں۔

بادشاہی مسجد پسرور کے خطیب حضرت مولانا مفتی رشید احمد پسروری ان دنوں حیات تھے اور میرے بزرگ دوستوں میں سے تھے، ان سے ایک جگہ ملاقات ہوئی اور میں نے قاضی عطاء اللہ صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ قادیانی تھے مگر اب صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ اس پر میں نے اس کتاب کو چند جگہ سے دیکھا اور کچھ سطروں میں تقریظ لکھ دی جو انہوں نے کتاب کے اگلے ایڈیشن میں شامل کر دی۔

اس پر بعض دوستوں کی طرف سے اعتراض ہوا کہ میں نے ایک قادیانی کی تفسیر قرآن کریم پر تقریظ لکھ دی ہے۔ صرف اعتراض نہیں ہوا بلکہ ملک بھر میں اس کی خوب تشہیر کی گئی۔ چنانچہ مختلف شہروں سے مجھے فون آنے لگے بلکہ عام حلقوں میں تقسیم کیے جانے والے ایک پمفلٹ میں اس اعتراض کا ذکر کیا گیا۔ جس پر میں نے قاضی عطاء اللہ موصوف سے رابطہ کیا تو وہ ایک بڑی فائل لے کر میرے پاس آ گئے جو ان کے قادیانی ہونے کے اخباری پراپیگنڈا اور ان کی طرف سے جوابات پر مشتمل تھی اور ان کا ایک حلف نامہ بھی اس میں شامل تھا جس میں پوری وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں اور قادیانی نہیں ہیں۔ اس حلف نامہ میں انہوں نے اپنے عقائد کا بھی دوٹوک انداز میں ذکر کیا ہے اور اس پر پسرور کے دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث مکاتب فکر کے معروف علماء کرام کی تصدیقات ہیں۔ اس کے بعد ایک موقع پر میں پسرور گیا تو مختلف علماء کرام سے براہ راست بھی اس مسئلے پر بات کی، انہوں نے پورے اطمینان کے ساتھ بتایا کہ قاضی صاحب موصوف پر قادیانی ہونے کا الزام غلط ہے اور وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ اس کے باوجود نہ صرف پراپیگنڈا مہم جاری رہی بلکہ مسلسل لابنگ بھی ہوتی رہی، چنانچہ ہمارے اپنے مدرسہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے دو بزرگ اساتذہ حضرت مولانا سید عبد المالک شاہ صاحب اور حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس کی تحریری وضاحت طلب کی اور تقاضا کیا کہ میں قاضی عطاء اللہ موصوف کی کتاب ”مفہوم القرآن“ پر اپنی تقریظ سے رجوع کا اعلان کروں۔ اس پر میں نے ایک بار پھر پسرور کے علماء کرام سے رابطہ کیا مگر صورتحال میں کوئی تبدیلی نہ پاکر تقریظ واپس لینے سے معذرت کر دی اور دونوں بزرگوں کو تحریری طور پر اصل صورتحال اور اپنے موقف سے آگاہ کر دیا۔

میرا خیال تھا کہ اس کے بعد یہ مہم ختم ہو جائے گی مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا، البتہ اس کا رخ بدل گیا اور معترض دوستوں نے پنجاب حکومت کی طرف سے قائم کردہ ''متحدہ علماء بورڈ'' کو درخواست دی کہ یہ کتاب ایک قادیانی نے لکھی ہے اور اس میں قادیانی عقائد کا پرچار کیا گیا ہے، اس لیے اس پر پابندی لگائی جائے۔ متحدہ علماء بورڈ کے سربراہ حضرت مولانا پیر سید امین الحسنات شاہ صاحب آف بھیرہ شریف ہیں، وہ میرے مہربان اور بزرگ دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے کتاب پر میری تقریظ دیکھی تو چونک گئے کہ ایک قادیانی کی کتاب پر میری تقریظ کیسے ہو سکتی ہے؟ انہوں نے مہربانی فرما کر مجھ سے فون پر براہ راست رابطہ کر لیا، میں نے انہیں صورتحال سے آگاہ کیا اور گزارش کی کہ آپ جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں لیکن میری درخواست صرف اتنی ہے کہ اس سلسلے میں میرے پاس متعلقہ کاغذات کی ایک فائل ہے اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ اس کے بعد جو فیصلہ چاہیں کر لیں۔ حضرت پیر صاحب محترم کے ارشاد پر میں نے وہ فائل انہیں بھجوادی۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا فیصلہ فرمایا۔

مگر بات یہاں بھی نہیں رکی اور پاکستان شریعت کونسل میں میرے قریب کے ساتھیوں سے رابطہ کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ مجھے اپنے موقف پر نظر ثانی کے لیے کہیں۔ مولانا عبد الحق خان بشیر میرے حقیقی بھائی ہیں اور پنجاب شریعت کونسل کے امیر ہیں جبکہ لاہور باغبانپورہ کے مولانا قاری جمیل الرحمن اختر میرے حقیقی بھائیوں کی طرح ہیں اور مرکزی شریعت کونسل کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل ہیں۔ دونوں حضرت میرے پاس الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں تشریف لائے اور اس مسئلے پر مجھ سے تفصیلی بات کی۔ میں نے گزارش کی کہ مجھے اپنے موقف پر اس قدر اصرار نہیں ہے کہ اس پر کسی کی بات نہ سنوں۔ آپ دونوں حضرات خود پسرور تشریف لے جائیں اور اپنے طور پر وہاں کے علماء کرام سے بات کر کے تحقیق کریں۔ اس کے بعد آپ دونوں حضرات جو بھی کہیں گے، میں اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات پسرور تشریف لے گئے اور اپنے طور پر صورتحال معلوم کی۔ واپسی پر انہوں نے جو رپورٹ پیش کی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قاضی عطاء اللہ صاحب کو قادیانی قرار دینے کی بات تو درست نہیں ہے، البتہ ان کی اس کتاب کے بعض مندرجات پر اشکالات ہیں اور ان سے یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ان عبارات سے قادیانیوں کی بعض باتوں کی حمایت کا تاثر ملتا ہے۔ ان کی اگر وضاحت ہو جائے تو مناسب ہوگا۔ اس

حوالے سے قاضی صاحب سے میری بات اس سے قبل بھی ہو چکی تھی اور انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ عالم دین نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے قرآن کریم کا از سرنو کوئی ترجمہ کیا ہے بلکہ انہوں نے اردو تراجم کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کے اردو ترجمہ کو منظوم شکل دی ہے، اس لیے علماء کرام جہاں بھی کوئی اشکال محسوس کریں اس کی نشاندہی کر دیں، میں اس عبارت کی اصلاح کر دوں گا۔ مگر مولانا عبد الحق خان بشیر اور مولانا قاری جمیل الرحمن اختر کی پسرور سے واپسی کے بعد میں نے دوبارہ قاضی عطاء اللہ صاحب سے رابطہ کیا اور وہ میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا موقف اب بھی وہی تھا کہ علماء کرام کتاب کا مطالعہ کر کے نشاندہی کریں، جو عبارت بھی مشتبہ ہوگی، وہ اسے تبدیل کر دیں گے۔ چنانچہ اب وہ کتاب میں نے نظر ثانی اور تفصیلی مطالعہ کے لیے مولانا عبد الحق خان بشیر کو دے دی ہے اور ان کی ابتدائی رپورٹ یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی واضح عبارت تو نظر نہیں آئی البتہ بعض عبارات سے اشتباہ ہوتا ہے جن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

یہ تو میرے ”قادیانی نواز“ ہونے کی داستان ہے اور اب عزیزم عمار خان بھی اس الزام میں میرے ساتھ شریک ہو گیا ہے۔ عمار خان نے اسلامی نظریاتی کونسل کے رسالہ ”اجتہاد“ میں اجتہادی رویوں اور دینی تحریکات کی حکمت عملی کے حوالے سے ایک مضمون لکھا جو ”اجتہاد“ کے بعد ماہنامہ الشریعہ کے دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارہ میں بھی شامل ہوا۔ اس میں اس نے قادیانیوں کے بارے میں اختیار کی جانے والی حکمت عملی کے حوالے سے لکھا کہ:

> ”اگر کسی معاشرے میں کشف و الہام انفرادی دائرے سے اٹھ کر ایک باقاعدہ اداراتی صورت اختیار کر چکے ہوں، ان کی بنیاد پر شخصیات اور جماعتوں کے عند اللہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کے فیصلے کیے جاتے ہوں، لوگوں کو ان کی طرف دعوت جاتی اور ان کے ساتھ وابستہ ہونے والوں کو نجات کی بشارت دی جاتی ہو، القاو الہام کی بنیاد پر مراقبہ و سلوک کے نظام مرتب کیے جاتے بلکہ سیاسی و مذہبی اختلافات میں بھی حق و باطل کی تفریق کرنا ایک عام چلن ہو، جہاں خواب اور بشارات کسی کے مامور من اللہ ہونے کا ایک مستند ذریعہ سمجھے جاتے ہوں، ایسی فضا میں اگر کوئی شخص ”شبانی سے کلیمی دو قدم ہے“ کا نعرۂ مستانہ بلند کر دے اور عام لوگ اس کے فریب میں مبتلا ہو کر اسے ایک ”امتی نبی“ مان لیں تو نہیں کس حد تک اس کا قصور وار ٹھہرایا جا سکتا اور راہ راست پر لانے کی ہمدردانہ کوشش کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے محض ان

کا معاشرتی مقاطعہ کرنے اور قانونی اقدامات کے ذریعے سے انہیں مسلمانوں سے الگ کر دینے پر اکتفا کے طرز عمل کو کس حد تک اخلاق، حکمت اور دعوت دین کے تقاضوں کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے؟" (الشریعہ، دسمبر ۲۰۱۰، ص ۴۸)

عزیزم عمار کی اس عبارت پر ملک کے مختلف دینی جرائد میں تبصرہ شائع ہوا ہے اور اس عبارت سے یہ مطلب اخذ کیا گیا ہے کہ "امتی نبی" ہونا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے اور قادیانیوں کے معاشرتی مقاطعہ اور ان کے خلاف قانونی اقدامات کا طرز عمل درست نہیں ہے۔ حالانکہ تھوڑے سے غور و خوض کے بعد یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس عبارت میں:

- تصوف میں مبالغہ آرائی کی بعض صورتوں پر طنز کیا گیا ہے جو خود میرے نزدیک بھی مناسب بات نہیں ہے۔ یہ بات اس سے بہتر اسلوب میں بھی کہی جا سکتی تھی۔
- اس طرز عمل کو عام مسلمانوں کے قادیانی فریب سے متاثر ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے اور
- فریب کاری سے متاثر ہونے والے سادہ لوح مسلمانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہیں ہمدردی کے ساتھ اس فریب سے نکالنے اور اسلام میں واپس لانے کی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں۔

یہ مضمون الشریعہ کے دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، جبکہ اس سے قبل مارچ ۲۰۱۰ء کے شمارے میں مولانا مشتاق احمد چنیوٹی کی تصنیف "اقبالؒ اور قادیانیت" پر تبصرہ کرتے ہوئے عمار خان اپنا یہی موقف ان الفاظ میں لکھ چکا ہے کہ:

"انیسویں صدی کے آخر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی ظلی نبوت کے عنوان سے برصغیر میں ایک نیا باب الفتن کھولا تو سادہ لوح عوام کو اس کے دجل و فریب سے آگاہ کرنے کے لیے اہل حق کو میدان میں آنا پڑا اور اہل علم نے علمی و تحقیقی اور مناظرانہ و مجادلانہ، ہر دو انداز میں پوری مستعدی سے قادیانی نبوت کی تاویلات و تحریفات کا پردہ چاک کیا۔ اہل دین کی کم و بیش پون صدی کی مسلسل جدوجہد قادیانی فرقے کو عالم اسلام میں قانونی اور آئینی سطح پر غیر مسلم قرار دینے پر منتج ہوئی۔ اس تحریک کی قیادت اور راہ نمائی بنیادی طور پر علماء نے کی، تاہم اس کی کامیابی میں بہت سی ایسی شخصیات کا حصہ بھی کم نہیں جو روایتی مذہبی حلقے کی نمائندہ نہیں سمجھی جاتیں۔

ان شخصیات میں علامہ محمد اقبالؒ کا نام سرفہرست ہے۔

قادیانی گروہ نے اپنی معاشرتی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے لوگوں کو مذہبی تاویلات اور گورکھ دھندوں میں الجھانے کے ساتھ ساتھ کئی سیاسی اور سماجی عوامل کا بھی سہارا لینے کی کوشش کی۔ برصغیر کی فضا مختلف مذہبی گروہوں کی طرف سے ایک دوسرے کی تکفیر کے واقعات سے مانوس تھی، جبکہ مرزا غلام احمد دعوائے نبوت سے پہلے کئی سال تک ہندوؤں اور عیسائیوں کے مقابلے میں دفاع اسلام کے محاذ پر محنت کر کے اپنے حق میں ہمدردی کی فضا بڑے پیمانے پر پیدا کر چکے تھے، چنانچہ جب ان کے دعوائے نبوت پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا تو ایک وقت تک ناواقف مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اسے روایتی مذہبی فتوے بازی ہی کا ایک نمونہ سمجھتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف انگریز سرکار بلکہ اسلام سے محض نسبت کا تعلق رکھنے والے نام نہاد لبرل طبقات کی ہمدردیاں بھی اس نوزائیدہ گروہ کو حاصل تھیں۔ اس تناظر میں علامہ اقبالؒ جیسی قد آور اور معتبر ملی شخصیت کا قادیانی نبوت کے خلاف دو ٹوک اور واضح موقف اختیار کرنا ان تمام طبقات پر مذہبی علماء کے موقف کا وزن واضح کرنے میں بے حد مؤثر ثابت ہوا جو کسی بھی وجہ سے اس معاملے میں تردد یا دو ذہنی کا شکار تھے۔

زیر نظر کتابچہ میں مولانا مشتاق احمد چنیوٹی نے، جو اس موضوع کے متخصّص ہیں، قادیانیت کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ کی تحریروں، گفتگوؤں اور بیانات کا ایک مختصر مگر نمائندہ انتخاب جمع کر دیا ہے جو اس حوالے سے ان کے زاویۂ نظر اور استدلال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اقبالؒ کے طرز استدلال کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے عقیدۂ ختم نبوت کے حوالے سے مسلمانوں کا مقدمہ خالص کلامی بنیاد پر پیش کرنے کے بجائے اپنے مخاطب طبقات کی ذہنی رعایت سے، اس عقیدے کی اہمیت کو سماجی اصولوں کی روشنی میں واضح کیا اور یہ بتایا کہ بحیثیت ایک گروہ کے مسلمانوں کے مذہبی تشخص کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے اور اس کی حفاظت کے لیے یہ ان کا مذہبی، اخلاقی اور جمہوری حق ہے کہ کسی نئی نبوت پر ایمان لانے والے گروہ کو ان کا حصہ سمجھنے کے بجائے ایک نیا مذہبی گروہ قرار دے کر قانونی اعتبار سے ان سے الگ کر دیا جائے۔ (ص ۱۶، ۱۷)

اسی طرح انہوں نے قادیانی گروہ پر زندقہ وارتداد کے روایتی فقہی احکام (یعنی سزائے موت) جاری کرنے کے بجائے جدید جمہوری تناظر میں یہ تجویز کیا کہ

قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لیا جائے اور پھر مسلمان ان کے بارے میں ویسے ہی مذہبی اور معاشرتی رواداری سے کام لیں گے جیسے وہ دوسرے مذاہب کے بارے میں لیتے ہیں۔ (ص ۱۱) یہ بات اس پہلو سے بہت اہم اور حکیمانہ تھی کہ قانونی تکفیر کے باوجود اس سے آگے چل کر ان ہزاروں لوگوں کے لیے اسلام کی طرف واپسی کا راستہ کھلا رہتا جو مختلف وجوہ سے قادیانیت کے پر فریب جال کا شکار ہو کر جادۂ حق سے بھٹک گئے، جبکہ موجودہ صورت حال میں مسلمان مناظرین کے اختیار کردہ لب و لہجہ اور طرز استدلال نیز قادیانیوں کی نئی نسل کا مسلمانوں کے ساتھ اختلاط بالکل مفقود ہونے کی وجہ سے یہ راستہ کم و بیش بند دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ مرزا طاہر احمد کے دست راست حسن محمود عودہ نے بیس سال قبل اپنے قبول اسلام کے موقع پر ایک انٹرویو میں قادیانی امت کے اپنی گمراہی پر قائم رہنے کا ایک بڑا سبب اس چیز کو قرار دیا تھا کہ ان کی مسلمان علماء تک رسائی نہیں ہے اور قادیانی قیادت اس خلیج کو برقرار رکھنے میں ہی اپنا بھلا سمجھتی ہے۔"

'الشریعہ' کے مارچ ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اس تفصیلی موقف پر نظر ڈالنے کے بعد دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والے مضمون کے اس اجمالی اقتباس کو پھر سے ملاحظہ فرما لیا جائے کہ اس میں قادیانیوں کی حمایت کی گئی ہے یا ان کے فریب کا شکار ہونے والے سادہ لوح مسلمانوں کو فریب کے اس دائرے سے ہمدردی کے ساتھ نکال لانے کی بات کہی گئی ہے؟ ہم تو ان دوستوں سے صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ

سخن فہمی عالم بالا معلوم شد

۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کی بات ہے۔ میں اس وقت کل جماعتی مجلس تحفظ ختم نبوت ضلع گوجرانوالہ کا سیکرٹری تھا اور مرکزی جامع مسجد چونکہ تحریک کا مرکز تھی، اس لیے تحریک کے تنظیمی اور دفتری معاملات کا انچارج بھی تھا۔ ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے میں تحریک کے جلسے کا پروگرام تھا جس میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت کے لیے اے سی (اسسٹنٹ کمشنر) کو درخواست دے رکھی تھی۔ راقم الحروف تحریک ختم نبوت کے ایک اور راہنما کے ساتھ اے سی گوجرانوالہ سے ملا کہ وہ اجازت دے دیں۔ انہوں نے حالات کی خرابی اور جھگڑے کے خدشے کے عنوان سے ٹال مٹول کرنا چاہی۔ میرے ساتھ جانے

والے دوست نے اچانک ان سے کہہ دیا کہ آپ قادیانی تو نہیں ہیں؟ اے سی کچھ گھبرا سا گیا اور یہ کہہ کر منظوری کے دستخط کر دیے کہ مولوی صاحب! اتنا بڑا الزام مجھ پر نہ لگائیں اور جائیں جا کر جلسہ کریں۔ اے سی کے دفتر سے باہر نکلے تو مولوی صاحب سے میں نے کہا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ اس کے بغیر وہ اجازت نہ دیتا۔ اس وقت تو میں نے بھی محسوس نہ کیا کہ ہم جس کام کے لیے گئے تھے وہ ہو گیا تھا، لیکن بعد میں یہ بات آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی کہ ہم بسا اوقات اپنا کام نکلوانے کے لیے یا کوئی غصہ نکالنے کے لیے بھی کسی اچھے بھلے مسلمان کو قادیانی کہہ دینے سے گریز نہیں کرتے۔ اس کے بعد تحریکی زندگی میں بہت سے مراحل ایسے آئے کہ اچھے خاصے بزرگوں کی طرف سے بھی اسی قسم کے طرز عمل کا مشاہدہ کرنا پڑا۔

پنجاب کے سابق آئی جی پولیس احمد نسیم چودھری گکھڑ کے رہنے والے ہیں، میرے ذاتی دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے قرآن کریم کی ابتدائی تعلیم ہمارے گھر میں ہماری والدہ محترمہ سے حاصل کی ہے اور ہمارے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر قدس اللہ سرہ العزیز کے خاص عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ ضلع جھنگ کے ایس ایس پی تھے۔ ایک روز حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ گوجرانوالہ میرے پاس تشریف لائے اور باتوں باتوں میں فرمایا کہ ہمارے ضلع کا ایس ایس پی مرزائی ہے۔ میں نے چونک کر دریافت کیا کہ کیا ضلع جھنگ کا ایس ایس پی تبدیل ہو گیا ہے؟ فرمایا کہ نہیں، وہی احمد نسیم ہے۔ میں نے حیرت سے کہا کہ حضرت! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ فرمانے لگے کہ میں نے تحقیق کر لی ہے، وہ قادیانی ہے اور اس کا نام بھی قادیانیوں والا ہے۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ اسے نہیں، مجھے قادیانی کہہ رہے ہیں۔ مولانا چنیوٹی بھی چونکے اور فرمایا، کیا تم اسے جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے، بھائی ہے، کلاس فیلو ہے اور حضرت والد صاحب کے شاگردوں میں سے ہے۔ پھر میں نے مولانا چنیوٹی کو احمد نسیم چودھری کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا تو بڑے پریشان ہوئے۔ قارئین کی معلومات کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ جس زمانے میں احمد نسیم چودھری لاہور کے ایس ایس پی تھے، اخبارات میں ان کے خلاف بعض حلقوں کا بیان شائع ہوا تھا کہ لاہور کے ایس ایس پی نے لاہور کے تھانوں کی مساجد میں دیوبندی اماموں کی بھرمار کر دی ہے۔

مولانا چنیوٹی میری بات سن کر الجھن میں پڑ گئے اور فرمایا کہ مجھے اس کے ایک ڈی ایس پی نے بڑے وثوق کے ساتھ بتایا ہے کہ وہ قادیانی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اس بات کی تحقیق کریں کہ اس ڈی ایس پی نے ایسا کیوں کہا ہے؟ کچھ دنوں بعد مولانا چنیوٹی نے خود مجھے بتایا کہ تمہاری بات ٹھیک ہے۔ اس ڈی ایس پی کا کوئی کام ایس ایس پی نے نہیں کیا تھا اور اس نے غصہ نکالنے کے لیے اس عنوان سے مجھے استعمال کرنا چاہا، مگر تم نے اچھا کیا کہ مجھے بروقت آگاہ کر دیا اور میں اس سے بچ گیا۔ اس کے بعد میری درخواست پر احمد نسیم چودھری اور مولانا چنیوٹی کی باہم ملاقات ہوئی اور پھر ان کے درمیان بہت اچھے دوستانہ مراسم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولانا چنیوٹی چونکہ اس محاذ کے جرنیل تھے اور ان کی بات کو اس حوالے سے سند سمجھا جاتا تھا، اس لیے بعض لوگ مولانا موصوف کی اس پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ناروا کوشش کرتے تھے۔ اسی سلسلے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا چنیوٹی کہیں جاتے ہوئے میرے پاس گوجرانوالہ میں رکے اور بریف کیس سے ایک فائل نکال کر مجھے دکھائی کہ گکھڑ کا ایک شخص غالباً بحرین کے پاکستانی سفارت خانے میں افسر ہے جس کے بارے میں وہاں سے بعض پاکستانیوں کے خطوط آئے ہیں جن کی ساہیوال کے ایک بڑی دینی جامعہ نے بھی تصدیق کی ہے کہ وہ شخص قادیانی ہے اور بحرین کے پاکستانیوں کو تنگ کر رہا ہے۔ چونکہ وہ گکھڑ کا رہنے والا ہے، اس لیے تمہارے ساتھ مشورہ کے لیے آیا ہوں۔ میں نے نام پوچھا تو بتایا کہ اس کا نام شعبان اپل ہے۔ میرے دونوں ہاتھ بے ساختہ کانوں تک چلے گئے کہ اس کا معاملہ بھی احمد نسیم چودھری کی طرح کا تھا۔ وہ ہمارا پڑوسی تھا۔ ہمارا بچپن اکٹھے گزرا، میں نے لکھنا پڑھنا اس کی ہمشیرہ سے سیکھا اور اس نے قرآن کریم میری والدہ مرحومہ سے پڑھا۔ اس کی والدہ اور میری والدہ آپس میں سہیلیاں بنی ہوئی تھیں اور ہم اس کی والدہ کو خالہ جی کہا کرتے تھے۔ آج بھی ان کی یاد آتی ہے تو اس دور کی حسین یادیں دل میں گدگدی کرنے لگتی ہیں۔ میں نے وہ فائل ایک نظر دیکھی اور یہ کہہ کر مولانا چنیوٹی کو واپس کر دی کہ اس نے کسی کا کام نہیں کیا ہو گا اور اس نے بدلہ لینے کے لیے یہ حرکت کر دی ہے۔ مولانا چنیوٹی بھی فرمانے لگے کہ اچھا ہوا میں نے تم سے پوچھ لیا ورنہ میں بحرین کی حکومت اور پاکستان کی حکومت دونوں کو باضابطہ خط لکھنے والا تھا کہ اس افسر کو بحرین کے پاکستانی سفارت خانے سے واپس کیا جائے۔

بعض واقعات تو اس سے بھی زیادہ خوفناک ہیں جو میرے حافظے میں محفوظ ہیں، مگر ایک اور واقعہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک دفعہ گوجرانوالہ میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر میں سرکردہ علماء کرام کا ڈویژنل سطح پر اجلاس تھا۔ اس میں ضلع سیالکوٹ کے ایک محترم بزرگ نے بڑے وثوق کے ساتھ اپنے خطاب میں کہا کہ پنجاب کا سیکرٹری تعلیم قادیانی ہے، اس کے بارے میں آواز اٹھانی چاہیے۔ اجلاس کے بعد میں نے ان سے علیحدگی میں پوچھا کہ کیا آپ کو یقین ہے اور آپ نے تحقیق کر لی ہے؟ انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ ہاں، وہ بہت پکا قادیانی ہے۔ ضیاء الحق مرحوم کا دور حکومت تھا اور ان کے ایک مشیر کے ساتھ جو تعلیم کے شعبہ ہی کے مشیر تھے، میری علیک سلیک تھی۔ کچھ دنوں کے بعد میرا اسلام آباد جانے کا پروگرام بن گیا اور میں نے طے کیا کہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے اس مشیر سے اس سلسلے میں خود بات کروں گا۔ ان دنوں میرے ایک پرانے دوست پروفیسر افتخار احمد بھٹہ وفاقی وزارت تعلیم میں افسر تھے۔ پہلے میں نے ان سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا اور خیال کیا کہ انہیں بھی ملاقات میں ساتھ لے جاؤں گا۔ انہوں نے میری بات سنی تو فرمایا کہ تم نے بہت اچھا کیا کہ مجھ سے بات کر لی ورنہ بہت گڑبڑ ہو جاتی، اس لیے کہ جن صاحب کے پاس تم یہ شکایت لے کر جا رہے ہو، یہ ان صاحب کے داماد ہیں جن کی شکایت کرنے آئے ہو اور دونوں میں سے کوئی بھی قادیانی نہیں ہے۔ میرے کچھ اور کام بھی تھے مگر پروفیسر افتخار احمد بھٹہ کی یہ بات سن کر میں اتنا کنفیوژ ہوا کہ میں نے سرے سے ان مشیر صاحب سے ملاقات کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور واپس گوجرانوالہ چلا آیا۔

عقیدۂ ختم نبوت کے لیے جدوجہد کرنا عبادت ہے اور قادیانیوں کا ہر محاذ پر تعاقب کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے لیکن ہر جدوجہد اور محاذ کی کچھ اخلاقیات بھی ہوتی ہیں۔ پھر ہمارا دین تو ”دین اخلاق“ کہلاتا ہے اور ہم ساری دنیا کے سامنے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اخلاق عالیہ کا اعلان کرتے رہتے ہیں، کیا خود ہمارے لیے ان اخلاقیات کا لحاظ کرنا ضروری نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

تین صحابہ کرامؓ کی معافی

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۵ اگست ۲۰۱۱ء)

بروکلین نیویارک کی مکی مسجد میں تراویح کے دوران حافظ صاحبان نے گیارھواں پارہ پڑھا، تراویح کے بعد مجھے کچھ بیان کرنا تھا، میں نے انہی آیات کریمہ میں سے ایک واقعہ کا انتخاب کیا اور قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔ قارئین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

یہ واقعہ تین صحابہ کرامؓ حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت ہلال بن امیہؓ اور حضرت مرارہ بن ربیعؓ کا ہے جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسلسل پچاس دن تک سوشل بائیکاٹ کی سزا دی تھی۔ قرآن کریم کی سورہ التوبہ کی آیت ۱۱۸ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اور بخاری شریف کی تفصیلی روایت میں خود حضرت کعب بن مالکؓ نے یہ واقعہ بیان فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک ایسے موقع پر پیش آیا جب فصلیں پک چکی تھیں، گرمی کا موسم تھا اور سفر لمبا تھا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ کسی غزوہ پر جاتے ہوئے اپنے ہدف کا اعلان نہیں کرتے تھے تاکہ دشمن کو کسی ذریعے سے خبر نہ ہو جائے۔ مگر تبوک کا سفر چونکہ رومیوں سے جنگ کے لیے تھا جس کے لیے شام کی سرحد تبوک تک جانا تھا۔ ایک ماہ کا سفر تھا اور واپسی پر بھی ایک ماہ لگنا تھا جبکہ وہاں کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں تھا اس لیے کہ قیصر روم خود ایک لاکھ فوج لے کر شام میں پہنچ چکا تھا اور مسلمانوں پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ مگر جناب نبی اکرمؐ اسے حملے کا موقع دینے کی بجائے خود وہاں جا کر سرحد پر اس سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ مقابلہ بڑی طاقت سے تھا اس لیے نبی اکرمؐ نے عام لام بندی کا اعلان کر دیا اور واضح طور پر بتا دیا کہ رومیوں کے مقابلے میں جانا ہے تاکہ سب لوگ پوری طرح تیار ہو جائیں، حکم یہ تھا کہ جو بھی لڑنے کے قابل ہے وہ ساتھ چلے۔

کعب بن مالکؓ کا کہنا ہے کہ میں پوری طرح تیار تھا، دو سواریاں بھی خرید رکھی تھیں اور ویسے بھی ٹھیک حال میں تھا لیکن روانگی کے موقع پر مجھ سے سستی ہو گئی کہ آج تیاری کرتا ہوں، کل سامان خریدوں گا اور اسی آج کل میں جناب نبی اکرمؐ روانہ ہو گئے۔ میں پھر بھی مطمئن تھا کہ اچھی سواری رکھتا ہوں، ایک دو روز بعد بھی روانہ ہوا تو قافلے سے جا ملوں گا مگر سستی بدستور چلتی رہی حتیٰ کہ کئی روز گزر گئے اور میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ اب نہیں پہنچ

سکوں گا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے بعد مدینہ منورہ میں یا معذور لوگ رہ گئے تھے یا ایسے لوگ جنہیں ہم منافقین شمار کرتے تھے۔ مجھے اپنے آپ کو ان کے درمیان دیکھ کر شرمندگی سی ہوتی تھی مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ دوران سفر ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ کعبؓ نے کیا کیا؟ ایک شخص نے کہا کہ اس کو مزاج کی نزاکت اور نخرے نے روک لیا ہے۔ حضرت جابرؓ بھی موجود تھے انہوں نے ٹوک دیا کہ وہ مخلص صحابی ہے اس کے بارے میں ایسی بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ جوں جوں جناب رسول اللہؐ کی واپسی کی خبریں مل رہی تھیں مجھے فکر لاحق تھی کہ آپؐ کے سامنے کیا عذر پیش کروں گا؟ اتنے میں تقریباً تین ماہ کے بعد رسول اکرمؐ مدینہ منورہ تشریف لے آئے جبکہ میں نے ایک روز پہلے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی بہانہ نہیں تراشوں گا اور صاف صاف اصل بات عرض کر دوں گا اس پر جو فیصلہ ہوگا وہ میرے لیے بہتر ہی ہوگا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرتے تھے اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد گھر تشریف لے جاتے تھے۔ آپؐ جب تشریف لا کر مسجد میں بیٹھے تو لوگوں نے آنا شروع کر دیا جو مختلف قسم کے عذر بہانے کر کے اس غزوہ میں اپنی غیر حاضری پر معذرت کرتے اور حضور علیہ السلام اسے قبول فرما لیتے۔ یہ کم و بیش ۸۰ افراد تھے جنہیں ہمارے ہاں عام طور پر منافقین میں شمار کیا جاتا تھا۔ میں بھی حاضر ہوا، جناب نبی اکرمؐ نے غضب آلود تبسم کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کہ میں ان کے ساتھ سفر پر کیوں نہیں گیا جبکہ میری تیاری بھی حضورؐ کے علم میں تھی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میں بھی بظاہر کوئی معقول بہانہ پیش کر کے وقتی طور پر آپؐ کو مطمئن کر سکتا ہوں لیکن اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کل وحی کے ذریعے آپؐ کو اصل صورتحال سے آگاہ کر دیا جائے گا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے سچ سچ عرض کرتا ہوں کہ میرا کوئی عذر نہیں تھا اور کوئی رکاوٹ نہیں تھی بس آج کل کرتے کرتے سستی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا۔ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا تم نے چونکہ سچ بولا ہے اس لیے تم اپنے بارے میں فیصلے کا انتظار کرو اور عام مسلمانوں کو حکم دیا کہ تاحکم ثانی اس کے ساتھ بول چال اور لین دین بند رکھو۔

کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ اس سوشل بائیکاٹ کی وجہ سے مدینہ منورہ کی سرزمین میرے لیے تنگ ہو گئی۔ نہ کوئی مجھ سے بات کرتا ہے، نہ سلام کہتا ہے، نہ سلام کا جواب

دیتا ہے اور نہ ہی میری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مجھے مدینہ منورہ کے درودیوار اجنبی لگ رہے تھے اور میں اپنے ہی شہر میں انجانا مسافر ہو کر رہ گیا تھا۔ چند ہی روز میں میرا سانس گھٹنے لگا۔ میری پریشانی کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ اگر اس دوران میرا انتقال ہو گیا تو نبی اکرمؐ میرا جنازہ نہیں پڑھیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ اس کیفیت میں خود جناب نبی اکرمؐ چل بسے تو میری باقی ساری زندگی اس سوشل بائیکاٹ کے ماحول میں گزرے گی۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ دو اور بدری صحابی حضرت ہلال بن امیہؓ اور حضرت مرارہ بن ربیعؓ بھی اسی صورتحال سے دوچار ہیں تو پریشانی کچھ کم ہوئی کہ میں اس سزا میں اکیلا نہیں ہوں۔ وہ دونوں کمزور اور بوڑھے تھے اس لیے گھروں میں بیٹھ گئے جبکہ میں نسبتاً جوان اور صحت مند تھا اس لیے مسجد نبوی میں نمازوں میں حاضری اور بازار میں آنے جانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

ایک روز میں بازار جا رہا تھا تو دیکھا کہ شام سے آنے والا ایک قبطی تاجر آواز دے رہا ہے کہ کوئی مجھے کعب بن مالکؓ کا گھر بتائے گا؟ بازار سے گزرنے والے کسی شخص نے اشارے سے میرے بارے میں بتایا کہ وہ جا رہا ہے۔ وہ قبطی آکر مجھ سے ملا اور ایک خط پیش کیا جو غسان کے بادشاہ کی طرف سے تھا اور اس میں لکھا ہوا تھا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے سردار کی طرف سے ذلت اور توہین کا سامنا کر رہے ہو حالانکہ تم محترم شخصیت ہو اور ایسے سلوک کے مستحق نہیں ہو۔ اس لیے میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہیں سیاسی پناہ دیں گے اور عزت و اکرام کا معاملہ کریں گے۔ میں نے خط پڑھ کر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا کہ کیا یہ امتحان ابھی باقی رہ گیا تھا؟ میں اس قبطی کو ساتھ لے کر اپنے محلے کے ایک تنور پر گیا جس میں آگ جل رہی تھی، میں نے وہ خط جلتی ہوئی آگ میں پھینک کر اس قبطی سے کہا کہ اپنے بادشاہ سے جا کر کہہ دینا کہ یہ اس کے خط کا جواب ہے۔

ہم مسلسل چالیس روز تک اسی کیفیت میں رہے کہ ایک روز جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیغام آیا کہ اپنی بیویوں سے الگ ہو جاؤ اور ان کے قریب نہ جاؤ۔ ہلال بن امیہؓ کی بیوی نے یہ کہہ کر گھر میں رہنے کی اجازت لے لی کہ یا رسول اللہؐ! اس کا تو روٹی پکانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ آپؐ نے یہ فرما کر اجازت دے دی کہ ضروری کاموں کے لیے تم گھر میں رہ سکتی ہو لیکن تم ایک دوسرے کے قریب نہیں جاؤ گے۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ اس قسم کی اجازت میں بھی حاصل کر لوں مگر میں نے کہا کہ میں جوان آدمی ہوں نباہ نہیں

سکوں گا۔ اس لیے میں نے بیوی سے کہا کہ تم میکے چلی جاؤ اور کوئی فیصلہ ہونے تک وہیں رہو۔ اس دوران میں مسجد نبوی میں جاتا رہا، نماز میں شریک ہوتا تھا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتا تھا۔ حاضر ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں سلام عرض کرتا اور منہ دوسری طرف کر کے کن انکھیوں سے دیکھتا کہ کیا آپؐ نے میرے سلام کا جواب دیا ہے؟ مگر ادھر مکمل خاموشی رہتی تھی۔

اسی امتحان و آزمائش میں روز و شب گزر رہے تھے کہ ایک روز میں اپنے چچا زاد بھائی اور گہرے دوست ابو قتادہؓ کے پاس اس کے گھر چلا گیا۔ میں نے سلام کیا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم اس بات کو نہیں جانتے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ قلبی محبت رکھتا ہوں؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، میں نے دوبارہ سہ بارہ قسم دلا کر پوچھا تو اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس پر میں انتہائی مایوسی کے عالم میں روتے ہوئے اس گھر سے نکل آیا۔

ہمارے ساتھ مدینہ منورہ کے لوگوں کے اس سوشل بائیکاٹ پر پچاس راتیں گزر چکی تھیں اور ہماری پریشانی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا کہ ایک روز میں فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو مجھے گھر کے سامنے کے پہاڑ ”سلع“ سے آواز سنائی دی کہ اے کعب! خوش ہو جاؤ! میں سمجھ گیا کہ ہماری معافی کا اعلان آگیا ہے۔ ہوا یوں کہ رات کو وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہماری معافی کا فیصلہ سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت کریمہ کے ذریعے صادر فرما دیا تھا اور جناب نبی اکرمؐ نے صبح نماز فجر کے بعد جب مسجد نبوی میں اس کا اعلان فرمایا تو دو حضرات مجھے اس کی خبر دینے کے لیے دوڑ پڑے اور ان میں مجھے یہ خبر پہلے دینے میں مقابلہ ہو گیا۔ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے میری طرف تیزی سے آرہا تھا جبکہ دوسرا پیدل ہی دوڑ پڑا اور درمیانی راستوں سے ہوتے ہوئے میرے گھر کے بالکل قریب جبل سلع تک پہنچ گیا، یہ صاحب حضرت حمزہ اسلمیؓ تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ گھڑ سوار ان سے پہلے کعبؓ کے گھر پہنچ جائے گا تو انہوں نے اسی پہاڑ سے میرے گھر کی طرف رخ کر کے میرے لیے خوشخبری کی آواز لگا دی جو مجھے فوراً پہنچ گئی اور وہ گھڑ سوار پر سبقت لے گئے۔

میں دیوانہ وار گھر سے نکلا، اپنے کپڑے خوشخبری دینے والے کو انعام کے طور پر دیے اور خود پڑوسی سے مانگ کر کپڑے پہنے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو وہ صحابہ کرامؓ کے جھرمٹ میں انتہائی خوشی کے عالم میں تشریف فرما تھے۔ حضرت طلحہؓ نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا اور جناب رسول اللہؐ نے مجھے اس آزمائش میں سرخرو ہونے پر مبارکباد دی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے سچ بولنے کی وجہ سے یہ اعزاز ملا ہے اس لیے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا اور آج میں اعلان کرتا ہوں کہ اس خوشی میں میرا سارا مال و جائیداد اللہ کی راہ میں صدقہ ہے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ سارا نہیں اپنے لیے بھی کچھ روک لو، میں نے عرض کیا ٹھیک ہے، خیبر میں ملنے والا باغ میں اپنے لیے روک لیتا ہوں اس کے سوا باقی میرا سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ ہے۔

مکالمہ بین المذاہب اور اس کے راہنما اصول

(صفہ اسلامک اسکول، گوجرانوالہ - ۱۹ اگست ۲۰۱۱ء)

۱۹ اور ۲۰ اگست کو نماز فجر کے بعد صفہ اسلامک اسکول گوجرانوالہ میں ''مکالمہ بین المذاہب'' کے عنوان پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا، اس کے ایک حصے کا خلاصہ نذر قارئین ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مکالمہ بین المذاہب کے عنوان سے اس وقت دنیا بھر میں مختلف سطحوں پر اور متعدّد دائروں میں گفتگو ہو رہی ہے۔ آج کی نشست میں صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مختلف مذاہب کے راہنماؤں کے ساتھ جو مکالمات ہوئے ان کا تذکرہ قرآن و حدیث میں موجود ہے، ان میں سے چند مکالمات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وحی کے نزول کے بعد اعلان نبوت کیا اور لوگوں کو توحید اور قرآن کریم کی طرف دعوت دی تو مشرکین کے ردعمل کا پہلا دور یہ تھا کہ انہوں نے طعنہ زنی، الزامات اور افتراءات کے ذریعے اس دعوت کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ جادوگر، مجنوں، کاہن، شاعر اور طرح طرح کے الزامات اور طعنوں کے ذریعے آنحضرتؐ کو خوفزدہ اور ناکام کرنے کی مہم چلائی گئی۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر نبی کریمؐ اور آپ کے ساتھیوں کو اذیتیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا جو کم و بیش ایک عشرے تک چلتا

رہا اور اس میں اذیت اور تکلیف دہی کا ہر حربہ آزمایا گیا جس کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور جب اس میں بھی ناکامی ہوئی اور طعن و تشنیع اور جبر و اذیت کے باوجود اسلام کا دائرہ پھیلتا گیا تو ایک وقت آیا جب مشرکین مکہ نے اسلام اور مسلمانوں کا وجود تسلیم کرتے ہوئے مصالحت و مفاہمت کی پیشکش کی جسے قرآن کریم نے "ودوا لو تدھن فیدھنون" (القلم ۹) سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ مشرکین مکہ کے سرکردہ سرداروں کا ایک بڑا وفد جناب رسول اکرمؐ کے چچا محترم جناب ابو طالب کے پاس آیا اور ان کی موجودگی میں آنحضرتؐ کو پیشکش کی کہ آپ ہمارے بتوں کی نفی کرنا چھوڑ دیں اور ہم اللہ تعالی کی صفات کے اظہار اور نماز و قرآن کریم میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہو جایا کریں گے۔ اللہ تعالی نے اس کا جواب قرآن کریم میں سورۃ الکافرون کی شکل میں دلوایا جس کا دوٹوک مطلب یہ ہے کہ عقیدہ اور توحید پر سمجھوتا نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالی کی وحدانیت کے معاملے میں کوئی لچک ممکن نہیں ہے۔ یہ مشرکین مکہ کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کے مکالمے کی ایک صورت تھی۔

قرآن کریم نے مذہبی معاملات میں مشرکین مکہ کے ایک مطالبے کا ذکر کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کریم بہت سخت ہے، اسے تبدیل کر دیں یا کم از کم اس میں کچھ ردوبدل کریں۔ سورۃ یونس کی آیت ۱۵ میں اس کا ذکر ہے اور اس میں اللہ تعالی نے جناب نبی اکرمؐ کو اس مطالبے کا یہ جواب دینے کی ہدایت فرمائی ہے کہ مجھے قرآن کریم میں اپنی طرف سے کسی ردوبدل کا سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں ہے اور میں صرف اس وحی کا پابند ہوں جو میری طرف نازل کی گئی ہے۔

مسیحیوں کے ساتھ ہمارا پہلا مکالمہ حبشہ کے بادشاہ اصحمہؓ کے دربار میں ہوا تھا جب مکہ مکرمہ کے قریش سرداروں کی اذیتوں سے مجبور ہو کر صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت ہجرت کر کے وہاں چلی گئی تھی۔ اور قریش نے (حضرت) عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) کی قیادت میں ان کے تعاقب میں وفد بھیج کر شاہ حبشہ سے ان مہاجرین کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس موقع پر قریش کے نمائندے عمرو بن العاص اور مسلمانوں کے قائد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے درمیان شاہ حبشہ کے دربار میں جو مکالمہ ہوا اس میں حضرت جعفر طیارؓ نے حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں کے

عقیدے کی قرآن کریم کے ذریعے وضاحت کی۔ اس صاف گوئی اور سچائی سے متاثر ہو کر شاہ حبشہ اصحمہؓ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ بھی مکالمہ بین المذاہب کی ایک صورت تھی۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کے تین قبائل آنحضرتؐ کے انتظار میں تھے۔ بنو قینقاع، بنو نظیر اور بنو قریظہ۔ تینوں یہودی قبائل تھے جو اس سے پہلے پیغمبر آخر الزمان کا نام لے کر اور ان کا حوالہ دے کر دشمنوں پر رعب جمایا کرتے تھے اور نبی آخر الزمانؐ کی برکت سے جنگوں میں فتح کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو یہودیوں نے آپؐ کو پہچاننے کے باوجود آپؐ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دشمنی پر اتر آئے۔ تاریخ کا عجیب سا سوال ہے کہ جب مدینہ منورہ کے یہودی پیغمبر آخر الزمانؐ کا انتظار کر رہے تھے اور تشریف آوری پر پہچان بھی لیا تھا تو پھر انکار کیوں کر دیا؟ اس سوال کا جواب ہمیں قیصر روم اور (حضرت) ابو سفیان (رضی اللہ عنہ) کے اس مکالمے میں ملتا ہے جو بخاری شریف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور جس میں قیصر روم نے صاف طور پر کہا تھا کہ ابو سفیان نے میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ کہا ہے اگر یہ درست ہے تو حضرت محمدؐ واقعتا نبی ہیں، مجھے بھی پیغمبر آخر الزمان کا انتظار تھا اور لگتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں، لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ آخری پیغمبر عرب کے بدوؤں میں پیدا ہو جائیں گے۔ گویا بنی اسرائیل کی طرف سے خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی، آنحضرتؐ کے انکار اور آپؐ کو قبول نہ کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپؐ عربوں میں پیدا ہوئے تھے اور بنی اسرائیل کے لیے نسلی عصبیت کی وجہ سے عربوں میں پیدا ہونے والے نبی آخر الزمان کو قبول کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

یہود کے ساتھ آنحضرتؐ نے ان کے انکار اور دشمنی کے باوجود بقائے باہمی کی بنیاد پر ”میثاق مدینہ“ کی صورت میں اکٹھے رہنے کا معاہدہ کر لیا تھا۔ اس بقائے باہمی کا فیصلہ میثاق مدینہ کی تشکیل بھی مکالمہ بین المذاہب کی ایک عملی شکل تھی۔ اس کے علاوہ یہودیوں کے ساتھ مذہبی معاملات پر باہمی گفتگو کے بارے میں مختلف روایات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جن میں خاص طور پر وہ روایت قابل ذکر ہے جس میں تورات میں زنا کی سزا کے بارے میں یہودی علماء کے ساتھ جناب رسول اکرمؐ کی گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے۔

مسیحیوں کے ساتھ ہمارا اس دور کا سب سے بڑا مکالمہ نجران سے آنے والے مسیحی علماء و مشائخ کے ساتھ جناب رسول اکرمؐ کی گفتگو ہے۔ انہیں آنحضرتؐ نے پورے اعزاز اور

پروٹوکول کے ساتھ مسجد نبویؐ میں ٹھہرایا اور کئی روز تک ان سے توحید خداوندی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت پر گفتگو ہوتی رہی جو کسی نتیجے تک نہ پہنچی تو مباہلہ کی نوبت آگئی۔ مگر جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے مباہلہ کی دعوت کو مسیحی علماء نے قبول نہ کیا اور جزیہ و ماتحتی پر معاہدہ کر کے وہ واپس نجران چلے گئے۔ اس مکالمے کی خاص بات جس کا ذکر کرنا چاہوں گا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حوالے سے قرآن کریم میں اہل کتاب کے ساتھ مکالمے کے لیے اس واضح اصول کا اعلان کر دیا کہ اہل کتاب سے کہہ دیجئے کہ (۱) اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا (۲) اور انسانوں پر انسانوں کی خدائی کی نفی، یہ دو باتیں آسمانی مذاہب کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، ان پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اور اہل کتاب کو یہ دو اصول بہر حال قبول کرنا ہوں گا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں مختلف مذاہب کے ساتھ مکالمے اور گفتگو کے چند واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، آج بھی ہمارے لیے اس معاملے میں یہی راہنما اصول ہیں، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۲۲ اگست ۲۰۱۱ء)

نیویارک کے مسلمانوں کی قرآن فہمی میں دلچسپی

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۵ اگست ۲۰۱۱ء)

میں ان دنوں نیویارک میں ہوں اور کوئنز کے علاقہ جمیکا میں واقع دارالعلوم نیویارک میں قیام پذیر ہوں۔ رات کو تراویح کے بعد تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن کریم کے خلاصے کے طور پر کچھ گزارشات پیش کر دیتا ہوں اور نماز فجر کے بعد ایک حدیث نبویؐ مختصر وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کا معمول ہے۔ اس کے علاوہ باقی دن رات کا وقت تھوڑے سے دیگر معمولات کے ساتھ سوتے جاگتے گزرتا ہے اور میرے لیے یہ دن پورے سال میں سب سے زیادہ آرام کے دن ہوتے ہیں۔ رمضان المبارک کے ابتدائی چار دن دارالعلوم میں اور اس سے اگلے چار دن بروکلین کی مکی مسجد میں اسی ترتیب سے گزار کر ان شاء اللہ تعالیٰ وطن واپس آجاؤں گا اور پھر وہی دن رات کی گہما گہمی ہوگی جس میں کبھی کبھار ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ چند سال قبل رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اہلیہ نے مجھ سے میری ڈائری دکھانے کا تقاضا کیا، میں نے مقصد پوچھا تو کہنے

لگیں کہ ڈائری دیکھ کر عید سے قبل افطاری کے لیے ایک دن ہمیں بھی دے دیں۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

گزشتہ شب دارالعلوم کی مسجد میں حافظ صاحب نے تراویح میں پانچواں پارہ پڑھا جس کی چند آیات کا مختصر مفہوم میں نے بیان کیا۔ یہاں نمازیوں میں یہ دلچسپی ہر جگہ نظر آتی ہے کہ وہ تراویح کے بعد تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن کریم کا خلاصہ شوق سے سنتے ہیں اور گھر جانے کی اتنی جلدی نہیں ہوتی جتنی ہمارے ہاں کے نمازیوں کو ہوتی ہے۔ یہاں کا روزہ ہمارے روزے سے بڑا ہوتا ہے اور اسی حساب سے راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ چار اگست کو یہاں سحری چار بج کر انتیس منٹ پر ختم ہوئی اور شام کو روزہ آٹھ بج کر نو منٹ پر افطار ہوا۔ رات کو تراویح وغیرہ سے سوا گیارہ بجے کے لگ بھگ فراغت ہوتی ہے، اس کے بعد بھی بیان سننے کے لیے نمازیوں کی بڑی تعداد بیٹھتی ہے۔ میرا معمول پندرہ بیس منٹ بیان کرنے کا ہے مگر سننے والوں کا تقاضا باقی رہتا ہے اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اتنا ہی مزید بیان ہو لیکن میں سحری کے خیال سے اس سے گریز کرتا ہوں۔ گزشتہ رات کو یہاں کیے جانے والے خلاصے کا تھوڑا سا حصہ نذر قارئین ہے۔

پانچواں پارہ سورۃ النساء کے بڑے حصے پر مشتمل ہے۔ سورۃ النساء کا آغاز اللہ تعالیٰ نے خاندانی نظام اور اس کے احکام کے تذکرے سے کیا ہے۔ تین چار رکوع خاندانی زندگی کے مسائل کے بارے میں ہیں جن میں نکاح، وراثت، میاں بیوی کے معاملات و حقوق، زیر کفالت یتیموں کے حقوق، جن خواتین سے نکاح حرام ہے ان کا تذکرہ، بدکاری کی حرمت و سزا اور اس نوعیت کے دیگر احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں۔ جبکہ دوران میں ایک اصولی بات قرآن کریم نے یہ کہی ہے کہ چونکہ خاندان ایک ادارہ ہے اور سوسائٹی کا ایک یونٹ ہے اس لیے اس کا نظام ایک ہاتھ میں رہے گا تو یہ کامیابی سے چلے گا اور اگر اختیارات ایک سے زیادہ ہاتھوں میں ہوں گے تو یہ بکھر جائے گا۔ قرآن کریم نے اسے دو جملوں میں بیان فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ ”الرجال قوامون علی النسآء“ خاندانی زندگی میں مرد کو گھر کے حکمران کی حیثیت حاصل ہے۔ جبکہ دوسرا جملہ قرآن کریم میں ایک اور جگہ ہے کہ ”وللرجال علیھن درجۃ“ مردوں کو عورتوں پر سنیارٹی حاصل ہے۔

یہ کامن سینس کی بات ہے کہ کسی فیکٹری یا ادارے میں برابر کے اختیارات کے دو منیجر ہوں گے تو وہ ادارہ نہیں چل سکے گا۔ کسی ایک کو بہرحال سنیارٹی دے کر فائنل اتھارٹی بنانا

ہو گا۔ اسی طرح خاندان کے ادارے میں بھی فائنل اتھارٹی ایک ہی ہو گی البتہ اس کے ماتحت رہ کر عورت بھی رائے اور اختیار سے محروم نہیں ہے۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ''والمرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا'' (عورت اپنے خاوند کے گھر میں حاکم ہے) فرما کر اسے وزیر داخلہ بہر حال بنا دیا ہے۔

اللہ تعالی نے یہ بات قرآن کریم میں ایک اور انداز سے بھی سمجھائی ہے اور فرمایا ہے کہ کائنات کا نظام ایک طے شدہ ترتیب کے ساتھ صحیح اس لیے چل رہا ہے کہ کنٹرول ایک ہاتھ میں ہے، اگر اس کے ساتھ کسی اور کی پاور شیئرنگ ہوتی تو یہ نظام فساد کا شکار ہو چکا ہوتا۔ اس لیے خاندان میں بھی کنٹرول ایک ہاتھ میں ہو گا تو خاندان صحیح طور پر سوسائٹی میں اپنا کردار ادا کرے گا ورنہ وہی کچھ ہو گا جو خاندانی نظام کے حوالے سے مغربی دنیا میں ہو رہا ہے۔

اسی طرح حافظ صاحب نے تراویح میں ایک اور آیت کریمہ پڑھی جس میں انسانی حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳۶ ہے۔ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ حقوق کی بات کرتا ہے اور بیسیوں آیات قرآن میں حقوق کی وضاحت کی گئی ہے جن میں فرد کے حقوق بھی ہیں، سوسائٹی کے حقوق بھی ہیں، ریاست و حکومت کے حقوق بھی ہیں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق بھی ہیں اور ماں باپ اور اولاد کے حقوق بھی ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ہر جگہ آغاز حقوق اللہ سے کیا ہے اور ''انسانی حقوق'' کی بجائے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے عنوان سے بات کی ہے۔ مغرب کا فلسفہ و نظام حقوق کی بات کرتا ہے لیکن اس میں حقوق اللہ کا کہیں بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے، وہ صرف انسانی حقوق کی بات کرتا ہے اور اس میں بھی وہ جامعیت اور ترتیب نہیں ہے جو قرآن و سنت کے بیان کردہ حقوق میں ہے۔ اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے اسی ترتیب سے حقوق کا ذکر کیا ہے اور دیگر بہت سی آیات کریمہ میں حقوق کے حوالے سے قرآن کریم کا اسلوب بیان یہی ہے کہ حقوق اللہ کا ذکر پہلے ہے اور اس کے بعد حقوق العباد کا تذکرہ ہے۔

سورۃ النساء کی مذکورہ آیت ۳۶ کا مفہوم یہ ہے کہ (۱) اللہ تعالی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، (۲) اور حسن سلوک کرو ماں باپ کے ساتھ (۳) قریبی رشتہ داروں کے ساتھ (۴) یتیموں کے ساتھ (۵) مساکین کے ساتھ (۶) پڑوسی رشتہ داروں کے ساتھ (۷) اجنبی پڑوسیوں کے ساتھ (۸) پہلو میں بیٹھنے والوں کے ساتھ یعنی

ملازمت اور کاروبار وغیرہ کے ساتھیوں کے ساتھ (۹) مسافروں کے ساتھ (۱۰) اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ، ان دس طبقوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم صرف اس ایک آیت کریمہ میں آتا ہے۔ جبکہ دیگر تفصیلات بیسیوں دوسری آیات قرآنی میں موجود ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نوعیت کے ارشادات سینکڑوں احادیث نبویہؐ کا حصہ ہیں۔

حافظ صاحب نے ایک اور آیت کریمہ کی تلاوت کی جس میں اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے رہو گے تو تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ ہم مٹا دیں گے اور تمہیں عزت کے گھر (جنت) میں داخل کریں گے۔ اللہ تعالی نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے بچنے کی صورت میں صغیرہ گناہ وہ خود ہی معاف کر دیں گے، یہ سورۃ النسآء کی آیت ۳۱ ہے۔

کبیرہ گناہ اور صغیرہ گناہ کی تقسیم ہمارے ہاں عام طور پر چلتی ہے، ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ محدثین کرامؒ یہ فرماتے ہیں کہ جس گناہ کے ساتھ قرآن کریم یا حدیث نبویؐ میں سزا کا ذکر ہے، وہ دنیا کی سزا ہو یا آخرت کی، وہ کبیرہ گناہ ہے۔ اسی طرح جس جرم کے ساتھ لعنت اور غضب خداوندی کا ذکر ہے، جہنم کی وعید ہے، اللہ تعالی یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام کرنے والے سے برأت اور لاتعلقی کا اظہار کیا ہے، ایسے تمام گناہ کبیرہ گناہ ہیں۔ حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے اس اصول پر اپنی کتاب ''الکبائر'' میں ستر گناہ بیان کیے ہیں۔

مگر صوفیائے کرامؒ کا اسلوب بیان مختلف ہوتا ہے، ایک اللہ والے بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ کبیرہ گناہ اور صغیرہ گناہ میں کیا فرق ہے؟ تو انہوں نے عجیب سا جواب دیا، انہوں نے فرمایا کہ بڑے سے بڑے گناہ پر توبہ کر لو اور معافی مانگ لو تو وہ صغیرہ ہو جاتا ہے، چھوٹی سی غلطی پر اکڑ جاؤ تو وہ کبیرہ گناہ بن جائے گی۔ گویا اصل بات گناہ کا احساس اور اس پر توبہ ہے، اگر یہ نصیب ہو جائے تو چھوٹے بڑے گناہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں معافی کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح پانچویں پارے کے آخر میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالی تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم ایمان اور شکر گزاری کا راستہ اختیار کرو، اور اللہ تبارک و تعالی شکر قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔'' یعنی اللہ تبارک و تعالی کو تمہیں سزا دینے اور عذاب میں ڈالنے سے کوئی دلچسپی نہیں مگر اس کے لیے شرط ہے کہ تم ایمان اور شکر گزاری کا راستہ

اختیار کرو جبکہ اللہ تعالی بندوں کے شکر قبول کرتے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ کون سا بندہ کس نیت اور جذبے کے ساتھ کون سا عمل کر رہا ہے۔

حدیثِ نبویؐ کی ضرورت واہمیت

(مکی مسجد، بروکلین، نیویارک - ۵ اگست ۲۰۱۱ء)

(رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ کے پہلے عشرہ کے دوران مکی مسجد بروکلین نیویارک میں مختلف نشستوں سے خطاب کا مجموعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ مکی مسجد کے خطیب وامام مولانا حافظ محمد صابر صاحب نے فرمایا ہے کہ میں چار پانچ روز تک یہاں مقیم ہوں تو نماز فجر کے بعد ایک حدیث بیان کر دیا کروں، میں نے سوچا ہے کہ حدیث بیان کرنے کی بجائے حدیث نبویؐ کے بارے میں مختصراً کچھ بیان ہو جائے، جو تھوڑا تھوڑا کر کے چار پانچ روز میں مکمل کر دوں گا، انشاء اللہ تعالی۔

''حدیث'' عربی زبان میں بات چیت اور گفتگو کو کہتے ہیں، لیکن جب ہم مذہبی حوالہ سے حدیث کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے مراد ہر وہ بات ہوتی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول و منسوب ہو، یا ان کے بارے میں کسی روایت میں مذکور ہو۔ گویا کسی قول، عمل یا واقعہ میں جناب نبی اکرمؐ کا ذکر آ جائے تو وہ حدیث بن جاتا ہے اور حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے بقول حدیث نبویؐ تمام دینی علوم کا سرچشمہ ہے۔

رمضان المبارک میں ہم قرآن کریم عام دنوں سے زیادہ پڑھتے سنتے ہیں، اور یہاں بھی تراویح میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد روزانہ قرآن کریم سماعت کر رہی ہے۔ قرآن کریم کے ساتھ حدیث کا کیا تعلق ہے؟ اس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

1. پہلی بات یہ ہے کہ حدیث نبویؐ قرآن کریم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ہم قرآن کریم کے الفاظ ` جملوں اور آیات تک حدیث کے ذریعہ ہی پہنچتے ہیں، اگر حدیث کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو قرآن کریم تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ ہمارے علم میں ہے کہ قرآن کریم کی پہلی آیات جو نازل ہوئی تھیں وہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات ہیں۔ ''اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربک الاکرم۔ الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم''۔ کم وبیش ہر مسلمان یہ جانتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ پانچ آیات قرآن کریم کی

وہ پہلی آیات ہیں جو غار حرا میں جناب نبی اکرمؐ پر نازل ہوئی تھیں۔ مگر یہ بات ہمیں معلوم کیسے ہوئی؟ اور کس ذریعہ سے ہم نے ان پانچ آیات تک رسائی حاصل کی؟ یہ ذریعہ حدیث نبویؐ کی وہ روایت ہے جس میں غار حراء کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور جناب نبی اکرمؐ پر وحی کے نزول کے آغاز کی کیفیات ذکر کی گئی ہیں۔ اگر یہ واقعہ اور اس کے بارے میں یہ روایات ہمارے علم میں نہ ہوں اور ہم ان پر یقین نہ رکھیں تو قرآن کریم کی ان پانچ آیات تک رسائی کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اسی طرح ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ پہلی آیات کریمہ سورۃ العلق والی ہیں، جب ہم قرآن کریم کی تلاوت شروع کرتے ہیں تو سورۃ العلق کی پانچ آیات سے نہیں بلکہ سورۃ الفاتحہ کی سات آیات کی تلاوت سے آغاز کرتے ہیں، یعنی قرآن کریم کی تلاوت اس ترتیب سے نہیں کرتے جس ترتیب سے وہ نازل ہوا تھا۔ ترتیب کی اس تبدیلی کا ہمارے پاس کیا جواز ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی دلیل یہی ہوگی کہ جناب نبی اکرمؐ نے اسے اس ترتیب کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نبی کریمؐ نے کون سی آیت اور سورت کس ترتیب کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا ہے، یہ بات ہمیں کس ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے؟ اور قرآن کریم کی ترتیب نبویؐ معلوم کرنے کا ذریعہ ہمارے پاس کیا ہے؟ یہی کہ کوئی صحابی نبی اکرمؐ سے روایت کرے گا کہ فلاں سورۃ نبی اکرمؐ نے اس ترتیب کے ساتھ پڑھی ہے اور فلاں آیت کو اس ترتیب کے ساتھ تلاوت کیا ہے۔ یہ روایت جو قرآن کریم کی ترتیب کے بارے میں کوئی صحابی بیان کر رہا ہے یہی حدیث کہلاتی ہے، اور قرآن کریم کی اس ترتیب تک رسائی کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

پھر قرآن کریم کے اس مصحف کو دیکھ لیجئے جو ہمارے پاس موجود ہے اور "مصحف عثمانی" کہلاتا ہے۔ قرآن کریم کو اس ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں حضرت زید بن ثابتؓ نے خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم سے لکھا تھا۔ جناب نبی اکرمؐ کے دور میں قرآن کریم کتابی شکل میں مرتب نہیں تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، اس لیے کہ حفاظ کرام بکثرت موجود تھے اور ویسے بھی

اس معاشرے میں حافظہ اور یادداشت پر اس قدر اعتماد کیا جاتا تھا کہ لکھنے پڑھنے کو کمزوری سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ضرورت حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں مختلف جنگوں میں حافظ قرآن کریم صحابہ کرامؓ کی کثرت کے ساتھ شہادت کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے محسوس کی۔ اس کی بنیاد احتیاط اور تحفظ پر تھی کہ حفاظ کرام کثرت کے ساتھ جام شہادت نوش کر رہے ہیں، کہیں قرآن کریم کی حفاظت کے بارے میں کوئی مشکل نہ پیدا ہو جائے۔ اس تحفظ اور احتیاط کے ذہن سے حضرت عمرؓ کی تجویز بلکہ اصرار پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے قرآن کریم کا ایک نسخہ کتابی شکل میں لکھوا کر محفوظ کر لیا، جسے بعد میں حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں کچھ ضروری تحفظات اور احتیاطات کے حوالہ سے دوبارہ لکھوا کر اس کے چند نسخے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بھجوا دیے۔

سوال یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کریم کا یہ کتابی مصحف کس بنیاد پر مرتب کیا تھا اور ان کے پاس اس کا ذریعہ کیا تھا؟ حضرت زید بن ثابتؓ خود قرآن کریم کے حافظ تھے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ اصول قائم کر لیا تھا کہ ہر آیت پر جناب نبی اکرمؐ سے سننے والے کم از کم دو اور صحابی شہادت دیں گے تو وہ اسے تحریر میں لائیں گے۔ اس اصول پر انہوں نے سارا قرآن کریم تحریر کر لیا مگر سورہ یونس کی آخری دو آیات اور سورہ الاحزاب کی ایک آیت پر انہیں الجھن پیش آگئی کہ ان پر صرف ایک صحابی ان آیات کو جناب نبی اکرمؐ سے سننے کی گواہی دے رہے تھے، وہ حضرت خزیمہ بن ثابتؓ تھے، ان کے ساتھ دوسرا گواہ نہیں مل رہا تھا۔ لیکن چونکہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک واقعہ میں حضرت خزیمہؓ کی شہادت کو دو گواہوں کی شہادت قرار دے رکھا تھا، اس لیے ان آیات کو اسی بنیاد پر قرآن کریم میں تحریر کیا گیا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جن روایات کی بنیاد پر قرآن کریم کا یہ مصحف مرتب اور تحریر کیا وہ احادیث ہی ہیں اور انہی احادیث کے ذریعہ ہم نے یہ مصحف حاصل کیا ہے۔ اس لیے میری پہلی گزارش یہ ہے کہ حدیث نبویؐ قرآن کریم تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے، اس ذریعہ کو درمیان سے

ہٹا دیں تو ہمارا قرآن کریم کی آیات، سورتوں اور ترتیب تک رسائی حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے بعد حدیث پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآن کریم سے پہلے حدیث پر ایمان لانا ضروری ہے، اس لیے کہ حدیث پر ایمان نہیں ہو گا تو قرآن کریم پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔

2. دوسری بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کو بھی مطاع اور واجب الاتباع قرار دیا ہے اور نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کو قیامت تک مسلمانوں کے لیے اسوہ حسنہ کا درجہ دیا ہے جس کی قدم بہ قدم پیروی ضروری ہے۔ جناب نبی اکرمؐ کی اطاعت اور اسوۂ حسنہ کے طور پر آپ کی قدم بہ قدم پیروی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں آنحضرتؐ کے ارشادات واقوال، احوال وافعال اور واقعات کا علم ہو، اس کے بغیر ہم اس فریضہ کی انجام دہی میں سرخرو نہیں ہو سکتے۔ اور یہ اقوال وافعال اور واقعات وکیفیات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیث نبویؐ ہے، اسی کے ذریعے ہم کسی معاملہ میں جناب نبی اکرمؐ کی سنت اور آپؐ کی منشا معلوم کر کے اس پر عمل کر سکتے ہیں۔

3. تیسرے نمبر پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کی کسی آیت کریمہ کے سمجھنے میں الجھن پیش آئے تو اسے حل کرنے کے لیے سب سے پہلے جناب نبی اکرمؐ سے رجوع کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ صاحب قرآن ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ بھی ہیں، وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو جب کسی آیت یا جملہ کا مفہوم سمجھنے میں الجھن ہوتی تھی تو وہ نبی اکرمؐ سے رجوع کرتے تھے، اس سلسلہ میں بیسیوں واقعات حدیث وتفسیر کے ذخیرے میں موجود ہیں جن میں سے مثال کے طور پر ایک کا ذکر کر دیتا ہوں۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے کہ ”یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم“ (سورہ المائدہ ۱۰۵) اے ایمان والو! تم پر لازم ہے کہ اپنا فکر کرو دوسرا کوئی اگر گمراہ ہوتا ہے تو وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا اگر تم خود ہدایت پر ہو۔ اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ دوسروں کی گمراہی کے بارے

میں فکر اور تردد کرنے کی ضرورت نہیں، حالانکہ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خود بھی جہنم کی آگ سے بچیں، اپنے گھر والوں کو بھی بچائیں، اور معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ماحول قائم کریں۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب مرتدین، منکرین ختم نبوت اور مانعین زکوۃ کے خلاف عملی جہاد کا اعلان کیا تو کسی نے یہ آیت کریمہ پڑھ دی۔ اس ماحول میں اس آیت کریمہ کا حوالہ دینے کا مطلب آپ سمجھتے ہیں کہ کیا ہو سکتا تھا؟ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے باقاعدہ خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا کہ لوگو! اس آیت کریمہ سے مغالطے میں نہ پڑنا اس لیے کہ میں نے جناب نبی اکرمؐ سے خود سنا ہے، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب خواہش پرستی اور بخل کے فتنوں کے باعث اپنا ایمان بچانا مشکل ہو جائے، تو پھر سب سے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرو۔ یعنی "علیکم انفسکم" کا حکم عام حالات میں نہیں ہے بلکہ فتنوں کے اس دور میں ہے جب فتنوں کی کثرت اور غلبہ کی وجہ سے خود اپنے ایمان کی حفاظت مشکل ہو جائے۔ جبکہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ اس آیت کریمہ کے حوالہ سے یہی اشکال ایک صاحب نے حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم نے باخبر آدمی سے سوال کیا ہے اس لیے کہ مجھے بھی اس آیت پر یہی اشکال ہوا تھا اور میں نے جناب نبی اکرمؐ سے دریافت کیا تو انہوں نے اس پر یہی فرمایا تھا کہ اس آیت کریمہ کا حکم فتنوں کے دور کے بارے میں ہے اور اس سے اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے۔

اب دیکھیے کہ ایک آیت کریمہ کا مفہوم و مصداق سمجھنے میں صحابہ کرامؓ کو الجھن پیش آئی اور جناب نبی اکرمؐ نے اس کی وضاحت فرما دی۔ اس قسم کی الجھنیں بیسیوں آیات کریمہ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کو پیش آئی ہیں جن کی وضاحت حضورؐ نے فرمائی ہے۔ اور یہ احادیث نبویہ ہی ہیں جن کے ذریعہ ان وضاحتوں تک ہماری رسائی ہوتی ہے جو جناب نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کی مختلف آیات

کے بارے میں فرمائی ہے، اور احادیث نبویہؐ اور روایات کے بغیر ہمارے پاس ان کا علم حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔

4. چوتھی بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی مختلف آیات کریمہ کے بارے میں غیر مسلموں کی طرف سے اعتراضات کیے گئے جن کا جواب حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرامؓ نے نبی اکرمؐ سے رجوع کیا اور آپؐ نے ان کی وضاحت فرما دی۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ ”اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح بن مریم“ (سورہ التوبہ ۳۱) عیسائیوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ساتھ ساتھ اپنے احبار اور رہبان یعنی علماء اور مشائخ کو بھی اللہ تعالیٰ کے بعد رب بنا لیا تھا۔ اس پر حضرت عدی بن حاتمؓ نے، جو اسلام قبول کرنے سے پہلے مسیحی سردار تھے، اشکال پیش کیا کہ ہمارے ہاں تو ایسا نہیں ہوتا تھا، قرآن کریم نے ہمارے بارے میں یہ کیا کہہ دیا ہے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم تو اپنے مشائخ اور علماء کو رب کا درجہ نہیں دیا کرتے تھے۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس کے جواب میں ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے علماء و مشائخ کو حلال و حرام کا اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کی اتھارٹی حاصل تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ اتھارٹی تو انہیں حاصل ہے۔ اور میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اتھارٹی آج بھی کیتھولک عیسائیوں میں پاپائے روم کو حاصل ہے کہ وہ جس چیز کو حلال کہہ دیں وہ حلال سمجھی جاتی ہے اور جس کو حرام کہہ دیں وہ حرام قرار پاتی ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ رب بنانے کا مطلب یہی ہے کہ حلال و حرام میں ردوبدل کا اختیار، جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے، عیسائیوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اس اختیار کا حامل قرار دے رکھا ہے۔

اس سلسلہ میں اسلام کا عقیدہ کیا ہے؟ ذرا غور کر لیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی شخصیت کو حلال و حرام میں ردوبدل کا صوابدیدی اختیار دیتا تو اس کا حق سب سے زیادہ جناب نبی اکرمؐ کا ہو سکتا تھا لیکن جب حضورؐ نے اپنی ذات کے لیے شہد کو حرام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ”یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک“ (سورہ التحریم ۱) اے نبی! جو چیز ہم نے آپ کے حلال کی ہے وہ آپ

نے کیسے حرام قرار دے دی؟ چنانچہ آپؐ نے حکم خداوندی کے تحت قسم توڑی اس کا کفارہ دیا اور شہد استعمال کیا۔ اسی طرح کا ایک اعتراض حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر ہوا جب وہ نجران کے علاقے میں دعوت اسلام کے لیے گئے۔ ترمذی شریف کی روایت کے مطابق وہاں کے مسیحی علماء نے قرآن کریم میں سورۃ مریم کی آیت ۲۸ پر اعتراض کیا جس میں ''یا اخت ہارون'' کہہ کر حضرت مریم علیہا السلام کو ہارون کا بھائی قرار دیا گیا ہے، جبکہ حضرت ہارونؑ تو حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے اور ان کے اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور مدینہ منورہ واپسی پر یہ سوال نبی اکرمؐ کے سامنے پیش کر دیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ حضرت مریمؑ کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا اور وہ حضرت موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارونؑ نہیں تھے، بنی اسرائیل میں لوگ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام علیہم السلام کے نام پر رکھا کرتے تھے۔

میں نے آپ حضرات کے سامنے جو گزارشات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ جملوں، آیات اور سورتوں تک رسائی کی بات ہو، اس کی ترتیب کا مسئلہ ہو، مصحف قرآنی کی اساس، اور ماخذ کا معاملہ ہو، کسی آیت کا مفہوم سمجھنے میں الجھن درپیش ہو، یا قرآن کریم کی کسی بات پر غیر مسلموں کے کسی اعتراض کا مسئلہ ہو، ہر معاملہ میں ہم حدیث نبویؐ کے محتاج ہیں اور ان میں سے کوئی مسئلہ بھی حدیث نبویؐ کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی پس منظر میں فرمایا ہے کہ تمام علوم دینیہ کا سر چشمہ اور اساس حدیث نبویؐ کا علم ہے، (۱) اسی سے ہمیں قرآن ملتا ہے، (۲) اسی سے سنت حاصل ہوتی ہے، (۳) اور اسی کی بنیاد پر فقہ تشکیل پاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حدیث نبویؐ کا صحیح یقین اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

امریکہ کے دینی مراکز

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۹ جولائی ۲۰۱۱ء)

میں سات جولائی کو نیویارک پہنچا تھا، دو دن دارالعلوم نیویارک میں قیام رہا، نماز جمعہ کی امامت کی اور ہفتے کے روز گیارہ حفاظ کے آخری سبق کی تقریب میں شرکت کے بعد اتوار کو ورجینیا پہنچ گیا۔ مولانا عبدالحمید اصغر نے دارالہدیٰ سے الگ ہونے کے بعد مدینۃ العلم کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی ہے جہاں بچیوں اور بچوں کو حفظ قرآن کریم اور درس نظامی کے ساتھ اسکول کی تعلیم دی جاتی ہے اور طلبہ و طالبات کا رجحان بحمد اللہ تعالیٰ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ وہاں دو روز مغرب کے بعد بیان ہوا اور ۱۳ جولائی کو بالٹی مور پہنچ گیا۔

مولانا مفتی محمد حامد کا تعلق بھارت سے ہے اور وہ ایک مصلی قائم کر کے برسہا برس سے دینی و تعلیمی کاموں میں مصروف ہیں۔ یہ مصلی جو پہلے ایک مکان کے تہہ خانے میں تھا اب ایک وسیع عمارت کرایہ پر لے کر کھلے ہال میں منتقل کر دیا گیا ہے جسے "مسجد فاطمہ" کا نام دیا گیا ہے۔ وہاں مغرب کے بعد بیان ہوا اور جمعۃ المبارک کے اجتماع سے بھی خطاب کیا۔ اس کے علاوہ شہر کی بڑی جامع مسجد "الرحمہ" میں احباب کے ایک اجتماع سے مغرب کے بعد گفتگو کا موقع ملا۔

ہفتے کے روز دارالعلوم نیویارک کی سالانہ تقریب تھی جو لانگ آئی لینڈ کی مسجد حمزہ میں منعقد ہوئی۔ مختلف شہروں سے طلبہ و طالبات کے والدین اور علماء کرام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ بچوں نے مختلف موضوعات پر اردو، انگریزی، عربی اور ہسپانوی زبانوں میں تقریریں کیں، حمد و نعت پر مشتمل نظمیں ان زبانوں میں پڑھیں اور قرآن کریم کی تلاوت کی۔ کم و بیش تین گھنٹوں پر مشتمل بچوں کا یہ پروگرام بہت خوب تھا، بچوں نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے بڑوں کے سامنے بہترین کارکردگی پیش کی۔ حتیٰ کہ ایک بچے نے جب جمعۃ المبارک کا خطبہ پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ ہم کسی باقاعدہ خطیب سے جمعۃ المبارک کا خطبہ سن رہے ہیں، اس کا انداز، حرکات و سکنات، درمیان میں مسنون طریقہ سے بیٹھنا اور لہجہ بالکل خطیبوں والا تھا۔ میں نے مغربی ممالک میں بہت سے خطیبوں کو کتاب ہاتھ میں لے کر خطبہ پڑھتے ہوئے دیکھا ہے لیکن اس بچے نے پورے اعتماد کے ساتھ خطیبانہ لہجے میں دونوں خطبے زبانی پڑھے تو بہت خوشی ہوئی۔

میں نے اپنے بیان میں اس پر دل لگی کے انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج اس تقریب کی برکت سے ہفتے کے روز ہمیں جمعۃ المبارک کا خطبہ سننے کو مل گیا ہے اور اس کے ساتھ ایک واقعاتی لطیفہ بھی سنایا کہ اب سے ربع صدی قبل ۱۹۸۷ء میں جب میں پہلی بار امریکہ آیا تو ریاست جارجیا کے ایک شہر میں گکھڑ کے ایک دوست کے ہاں چند روز قیام ہوا۔ ان کی بچی نے، جواب خود بھی ماشاء اللہ بچوں والی ہے، ایک دن مجھ سے کہا کہ انکل آپ سنڈے تک ہمارے ساتھ رہیں ہم سنڈے کو جمعہ پڑھتے ہیں آپ بھی ہمارے ساتھ جمعہ پڑھیں۔ میں نے حیرت سے اس کے باپ کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑا کہ اتوار کو چھٹی کے روز ہم یہاں کے چند مسلم گھرانوں کے افراد ایک کمیونٹی سنٹر میں جمع ہوتے ہیں، اکٹھے کھانا کھاتے ہیں اور ظہر کی نماز باجماعت پڑھتے ہیں اس کو یہ جمعہ سمجھتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ایک وقت تھا جب یہاں مسلم گھرانوں کے بچے سنڈے کو جمعہ سمجھا کرتے تھے لیکن اب بچے تلاوت کرتے ہیں، نظمیں پڑھتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں اور خطبے سناتے ہیں۔ یہ پیش رفت بہت مبارک ہے اور امریکہ میں یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کی آبادی اور گھرانوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے بلکہ مسلم خاندانوں میں دینی تعلیم کا رجحان اور مساجد میں نمازوں کے لیے حاضری بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

نیویارک سے ہفتہ کے روز مجھے ہیوسٹن جانا تھا، علی الصباح نماز فجر پڑھتے ہی روانگی ہوئی، مولانا حافظ اعجاز احمد اور قاری محمد یوسف عثمانی نے ایئرپورٹ پر رخصت کیا۔ درمیان میں ایک اسٹاپ کے ساتھ چار گھنٹے کا ہوائی سفر تھا۔ ہیوسٹن میں چشتیاں کے مولانا حافظ محمد اقبال کے مدرسہ اسلامیہ میں قیام رہا اور فیصل آباد کے قاری احمد صدیق صاحب میرے میزبان تھے۔ حسن اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ مصر کے معروف قاری ڈاکٹر احمد نعینع بھی ان دنوں امریکہ کے دورے پر تھے اور قاری احمد صدیق ان کے ہمراہ تھے۔ ہفتہ کے روز ڈیٹرائٹ میں ان کی محفل قراءت تھی اور اتوار کو انہیں شارلٹ کے راستے ہیوسٹن جانا تھا، میرا درمیان کا اسٹاپ بھی شارلٹ تھا۔ وہاں سے اگلی پرواز ان کی بھی وہی تھی جو میری تھی۔ شارلٹ کے ایئرپورٹ پر اچانک ایک دوسرے کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی اور اگلا سفر ہم نے اکٹھے کیا۔

ہیوسٹن پہنچ کر قاری احمد نعینع کو ہوٹل پہنچا کر ہم سیدھے ریڈیو کے ایک پروگرام میں پہنچے جو ہر اتوار کو مدرسہ اسلامیہ کے تحت ہیوسٹن کے مسلمانوں کے لیے ہوتا ہے اور

جامعہ بنوریہ کراچی کا تعاون بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ لاہور کے مولانا قاری امتیاز الرحمان تھانوی جو ایک عرصہ تک ایچی سن کالج کے پروفیسر رہے ہیں اور اب مدرسہ اسلامیہ ہیوسٹن میں استاذ ہیں، ایئرپورٹ پر انہوں نے ہمارا استقبال کیا اور ریڈیو پروگرام میں ہمارے شریک کار رہے۔ مولانا حافظ محمد اقبال، مولانا امتیاز الرحمان تھانوی، جناب عاطف فتح اور راقم الحروف نے اس پروگرام میں مختلف عنوانات پر گفتگو کی اور سامعین کے سوالات کے جوابات دیے۔

پچھلے پہر بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکٹر صاحب کے ہاں کھانے کی دعوت تھی، ڈاکٹر احمد نعینع مہمان خصوصی تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد گھر والوں کی فرمائش پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں قرآن کریم کی تلاوت کی۔ میرے لیے ان کی تلاوت سننے کا پہلا موقع تھا اور وہ بھی ایک نجی محفل میں، بہت لطف آیا اور یہ مختصر سی محفل یادگار بن گئی۔ مغرب کے بعد ایک مسجد میں محفل قراءت تھی لیکن میں دن بھر کی تھکاوٹ کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہوسکا البتہ اگلے روز ان کی قاہرہ واپسی سے پہلے کھانے کی دعوت قاری صدیق صاحب کے ہاں تھی، وہاں قاری احمد نعینع صاحب کے ساتھ الوداعی ملاقات ہوئی۔ اس رات مغرب کے بعد مدرسہ اسلامیہ میں مغرب کے بعد تفصیلی بیان ہوا اور عشاء کے بعد "لائٹ آف اسلام" کے عنوان سے ایک اور ریڈیو پروگرام میں شرکت ہوئی جو استقبال رمضان کے حوالے سے تھا۔ مولانا قاری امتیاز الرحمان تھانوی اور راقم الحروف نے اس میں فضائل قرآن کریم اور رمضان المبارک کی اہمیت اور برکات کے موضوع پر گفتگو کی۔

اس سے اگلے روز مولانا حافظ محمد اقبال اور مولانا قاری امتیاز الرحمان تھانوی کے ہمراہ ڈیلاس جانا ہوا اور ہم نے ایک رات علامہ اختر کاشمیری کے ہاں گزاری جو کسی زمانے میں ہفت روزہ خدام الدین اور ہفت روزہ چٹان کے مدیر رہے ہیں اور ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ میرے ہم عمر ہی ہوں گے مگر بڑھاپا انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا، گفتگو کا انداز اور لہجے کی کاٹ ابھی تک قائم رکھی ہوئی ہے، پرانی یادیں تازہ کرکے رات دیر تک ہم خوش ہوتے رہے۔

ہیوسٹن میں چار پانچ دن گزار کر جمعرات کو اٹلانٹا جانا تھا جو کراچی سے لاہور کا سفر سمجھ لیجیے۔ مولانا قاری امتیاز الرحمان تھانوی اور قاری احمد صدیق نے بائی روڈ جانے کا پروگرام

بنا رکھا تھا۔ ظہر کے بعد ہیوسٹن سے روانہ ہو کر ہم رات ایک بجے کے لگ بھگ برمنگھم الاباما پہنچے جہاں میرے گکھڑ کے ایک دوست افتخار رانا رہتے ہیں۔ رات ان کے ہاں قیام کیا اور صبح ان کے ہمراہ جمعہ تک اسلامک کمیونٹی سنٹر اٹلانٹا پہنچ گئے۔ فیصل آباد کے دوست قاری خالد رشید صاحب اس سنٹر کے امام و خطیب ہیں۔ عرب، پاکستانی، انڈین اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کا مخلوط ماحول ہے اور بہت بارونق مرکز ہے۔ میں کم و بیش ربع صدی سے مغربی ممالک میں گھوم پھر رہا ہوں مگر اتوار کے روز فجر کی نماز میں نمازیوں کا ہجوم اس پورے عرصہ کے دوران میں نے پہلی بار اس سنٹر میں دیکھا ہے۔ ورنہ مغربی ممالک کی بہت سی مساجد میں اتوار کے روز فجر کی نماز میں اکا دکا نمازی ہی ملتے ہیں۔ جبکہ اسلامک سنٹر اٹلانٹا میں اتوار کے روز فجر کی نماز کے بعد راقم الحروف اور مولانا امتیاز الرحمان تھانوی کے تفصیلی بیانات ہوئے، نمازیوں کی بڑی تعداد جم کر بیٹھی رہی اور بعد میں سب نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ تھانوی صاحب کے بیانات عام طور پر انگلش زبان میں ہوتے رہے جبکہ میری گفتگو اردو میں ہوتی اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی تھانوی صاحب انگلش ترجمہ کی بھی زحمت فرماتے۔

اٹلانٹا میں ”جارجیا اسلامک انسٹیٹیوٹ“ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ اور دینی مرکز جو بنوں کے مولانا ڈاکٹر حافظ عبد الغفار کی نگرانی میں کام کر رہا ہے، کئی ایکڑوں پر محیط بہت سی خوبصورت اور وسیع بلڈنگوں میں دعوت و تعلیم کا وسیع سلسلہ جاری ہے۔ ان سے ملاقات کے لیے حاضری میرے پروگرام کا حصہ تھی مگر یہاں بھی یہ حسن اتفاق ہوا کہ اسی روز ان کے ہاں استقبال رمضان کا جلسہ تھا جس میں ہمارے پرانے دوست مولانا قاضی فضل الٰہ صاحب (سابق رکن قومی اسمبلی پاکستان) تشریف لا رہے تھے۔ حافظ عبد الغفار کسی زمانے میں جمعیت علماء اسلام کے سرگرم راہنماؤں میں رہے ہیں اور میں ان کے اس مرکز میں دو سال قبل اہلیہ سمیت چند دن گزار چکا ہوں۔ حافظ صاحب ہماری اچانک حاضری پر بہت خوش ہوئے اور مجھے جلسہ کی صدارت کا اعزاز بخشا۔ قاضی فضل اللہ صاحب کے ساتھ کم و بیش بیس برس کے بعد ملاقات ہوئی اور کسی پبلک جلسہ میں ان کی تقریر پہلی بار سنی۔ خالص پشتون لہجے میں ترنم کے ساتھ انگریزی میں تقریر، اسی انداز میں قرآن کریم کی تلاوت اور موقع محل کے مطابق اشعار کے جوڑنے بہت مزہ دیا۔ قاضی صاحب موصوف

کئی برسوں سے کیلیفورنیا میں مقیم ہیں اور دعوت و تعلیم کے میدان میں مسلسل خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

۲۴ جولائی کو اٹلانٹا سے ڈیٹرائٹ حاضری ہوئی اور دو روز مولانا قاری محمد الیاس صاحب آف فیصل آباد کے گھر میں قیام رہا۔ ان کی مسجد بلال میں مختصر بیانات ہوئے جبکہ دونوں روز انہوں نے علاقہ کی دو بڑی مساجد میں مغرب کے بعد بیانات کا اہتمام کر رکھا تھا۔ بہت سے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں، ان دنوں یہاں عام طور پر رؤیت ہلال کا مسئلہ زیر بحث رہتا ہے اور دینی حلقے تین حصوں میں تقسیم ہیں۔ ایک حلقہ فلکیات کے حساب سے پہلے ہی یکم رمضان اور عیدین کے ایام کا فیصلہ کر کے اعلان کر دیتا ہے، دوسرا حلقہ مقامی طور پر رؤیت ہلال کو ضروری سمجھتا ہے، اور تیسرا طبقہ سعودی عرب کے اعلان پر رمضان المبارک اور عیدین کا اہتمام کرتا ہے۔ اس سے امریکہ کے مسلمانوں میں خاصا خلفشار ہے اور بسا اوقات ایک ہی گھر کے افراد مختلف دنوں میں عید کرتے ہیں اور روزوں کا حساب رکھتے ہیں۔ مجھ سے اکثر جگہ اس کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میری طالب علمانہ رائے میں رؤیت ہلال تو بہرحال ضروری ہے البتہ اس کی دو صورتوں میں سے مقامی طور پر رؤیت ہلال کے اہتمام کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ ہاں اگر امت کو خلفشار سے بچانے اور وحدت کا ماحول قائم کرنے کے لیے سعودی عرب یا کسی بھی دوسرے ملک کی رؤیت ثابتہ کو بنیاد بنا لیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔

مسجد بلال کی انتظامیہ نے ڈیٹرائٹ کے علاقہ کنٹن میں ایک بڑا چرچ خرید لیا ہے جو قاری شاہد صاحب نے مجھے وہاں لے جا کر دکھایا، چھ ایکڑ زمین کے ساتھ ۲۰۰۲ء میں تعمیر کیا گیا ہے، یہ تازہ چرچ اب ایک خوبصورت مسجد کی صورت میں دور نو کا آغاز کر رہا ہے جو بلاشبہ مسلمانوں کے دینی ذوق اور اسلام کی صداقت و اعجاز کی ایک واضح علامت ہے۔

دینی مدارس کی تعلیم اور انسانی معاشرہ کی ضروریات

(مسجد حمزہ، لانگ آئی لینڈ، نیویارک، امریکہ - ۱۶ جولائی ۲۰۱۱ء)

(دارالعلوم نیویارک کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ۔ دار العلوم نیویارک کے مختلف اجتماعات میں کئی سالوں وقتاً فوقتاً حاضری کا موقع ملتا رہتا ہے اور اساتذہ و منتظمین کے ذوق و محنت کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔

آج اللہ تعالی نے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد و انعامات میں شرکت کی توفیق دی ہے، علماء کرام، اساتذہ، طلبہ اور طلبہ و طالبات کے والدین کے اس بڑے اجتماع میں آپ حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے جس پر اللہ تعالی کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ سب حضرات کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس سال دار العلوم سے گیارہ طلبہ نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ہے اور آٹھ طلبہ نے درس نظامی کے نصاب کی تکمیل کی ہے جس پر آج انہیں اسناد دی جا رہی ہیں۔

ابھی آپ کے سامنے دو تین گھنٹوں سے دار العلوم سے فیض یافتہ طلبہ اور نوجوان مختلف عنوانات پر تقاریر کر رہے تھے، چھوٹے چھوٹے بچوں نے مختلف زبانوں میں خطابات کیے ہیں، نظمیں اور نعتیں پڑھی ہیں اور اچھے انداز میں قرآن کریم کی تلاوت کی ہے جس سے ہمارے ایمان اور حوصلہ کو تازگی ملی ہے۔ میں اس سلسلہ میں آپ حضرات کو ایک سوال پر غور کی دعوت دینا چاہتا ہوں کہ یہ بچے جو پڑھ رہے تھے، بول رہے تھے اور اظہار خیال کر رہے تھے کیا یہ خود پڑھ رہے تھے یا ان کے پیچھے کوئی اور بول رہا تھا؟ میرے خیال میں ان کے پیچھے ان کے اساتذہ پڑھ رہے تھے اور مدرسہ کے منتظمین بول رہے تھے، اس لیے کہ انہوں نے ہی ان کو پڑھایا ہے اور ان کو تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ ذوق اور تربیت دی ہے۔ اس لیے مبارکباد اور داد کے مستحق اصل میں یہ اساتذہ، والدین اور منتظمین ہیں جن کا حسن ذوق اور تعلیم و تربیت کی محنت ان طلبہ کی زبانوں سے بول رہی تھی، اللہ تعالی ان اساتذہ و منتظمین کو جزائے خیر اور قبولیت و ثمرات سے نوازیں، آمین۔

میں اس سے آگے ایک اور سوال بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا کہ ان اساتذہ اور منتظمین کے پیچھے کون بول رہا تھا؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پیچھے آپ سب حضرات کھڑے نظر آتے ہیں، اور وہ اصحاب خیر دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے تعاون کیا ہے، پیسے خرچ کیے ہیں اور دار العلوم کے انتظامات اور اخراجات میں حصہ لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ”پیسہ بولتا ہے“ اس محاورہ سے لوگ اپنا اپنا مطلب مراد لیتے ہیں لیکن مجھے یہاں ان تلاوت کرتے ہوئے تقریریں کرتے ہوئے اور حمد و نعت پڑھتے ہوئے بچوں کے پیچھے آپ حضرات کا پیسہ بولتا نظر آرہا ہے اور اس پر میں ایک تاریخی واقعہ آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

تابعین کے دور کے ممتاز ارباب علم میں ایک بڑا نام ''ربیعۃ الرائے'' کا ہے جو بہت بڑے محدث تھے، فقیہ تھے اور علماء و فضلاء کی راہنمائی کا مرجع تھے۔ امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کے اساتذہ میں سے ہیں اور ان کے علم و فضل اور کمال کے بارے میں اس حوالہ کے بعد میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ان کا نام ربیعہؒ تھا، والد محترم فروخؒ تھے۔ حضرت ربیعہؒ اپنی رائے کی پختگی اور اصابت میں اس قدر معروف تھے کہ ان کا نام ہی ''رائے'' پڑ گیا تھا۔ علم و دینی مسائل میں ان کی رائے حکمت و دانش سے پر ہوتی تھی اور عام طور پر اس قدر صائب ہوتی تھی کہ انہیں صائب الرائے کہا جانے لگا اور رائے ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ ان کے والد محترم فروخؒ مجاہد تھے اور میدان جنگ میں ہمیشہ کفار کے خلاف جنگ میں مصروف رہتے تھے۔ تاریخی روایات میں آتا ہے کہ ربیعہؒ ابھی پیدا ہوئے تھے یا پیدا ہونے والے تھے کہ حضرت فروخؒ کو جہاد کا سفر پیش آ گیا، وہ اپنی جمع پونجی، جو ہزاروں دینار کی مقدار میں بتائی جاتی ہے، اہلیہ محترمہ کے حوالہ کر کے اور بچے کی دیکھ بھال کی تلقین کر کے جہاد کے لیے روانہ ہو گئے۔ خدا کی قدرت ایک جہاد کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، اور تیسرے کے بعد چوتھا، جہاد کے اس تسلسل نے اس قدر مصروف رکھا کہ فروخؒ کو کم و بیش ستائیس سال کے بعد گھر واپس آنا نصیب ہوا۔ جب وہ مدینہ منورہ میں اچانک اپنے گھر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک وجیہ نوجوان نے دروازہ کھولا۔ فروخؒ نے ایک خوبصورت نوجوان کو اپنے گھر میں دیکھا تو اندیشوں کا شکار ہو گئے اور غصے سے بولے کہ تم میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟ اس نوجوان نے ایک اجنبی مرد کو گھر کے دروازے سے اندر آتے دیکھا تو وہ بھی غصے میں آ گئے کہ تم میرے گھر میں کیوں گھس رہے ہو؟ دونوں باپ بیٹا تھے لیکن ایک دوسرے کو دیکھا ہوا نہیں تھا اس لیے دونوں کا غصہ بجا تھا۔ آپس میں الجھ پڑے اور اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا، جھگڑا دیکھ کر پڑوسی آ گئے، اندر سے ربیعہؒ کی والدہ نے بھی باہر جھانک کر دیکھا تو فروخؒ کو پہچان لیا اور ربیعہؒ کو آواز دی کہ یہ تمہارے والد محترم ہیں ان کو اندر آنے دو، اور فروخؒ سے کہا گیا کہ یہ آپ کا بیٹا ہے۔ اس پر دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے سے گلے لگ گئے، فروخؒ گھر میں داخل ہوئے، مدتوں کے بعد اہل خانہ کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی، جب دو چار روز آرام وغیرہ سے فارغ ہوئے تو فروخؒ نے اہلیہ سے اس رقم کے بارے میں پوچھا، اہلیہ نے کہا کہ وہ خزانہ مدفون ہے مناسب وقت پر ظاہر کر دوں گی۔

ربیعہؒ نوجوان تھے اور اللہ تعالی نے علم وفضل کی دولت سے اس قدر نوازا تھا کہ مسجد نبویؐ میں ان کا تعلیمی حلقہ لگتا تھا اور سینکڑوں علماء وطلبہ ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ایک دن فروخؒ مسجد نبویؐ میں نماز ادا کرنے گئے تو نماز کے بعد مختلف تعلیمی حلقوں کو دیکھا کہ اساتذہ بیٹھے ہیں اور ارد گرد طلبہ اور معتقدین کا ہجوم ہے جو ان سے فیض حاصل کر رہا تھا، وہ ان حلقوں میں سے سب سے بڑے حلقہ کی طرف بڑھے کہ شیخ کی زیارت کریں تو دیکھا کہ ان کا بیٹا ربیعہؒ اس حلقہ کا شیخ ہے جو علم کے پیاسوں کی تشنگی دور کر رہا ہے اور علم وفضل کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ اپنے بیٹے کی یہ قدر ومنزلت دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور گھر جا کر اہلیہ کے سامنے اس خوشی اور فخر کا اظہار کیا تو اس نے موقع غنیمت جان کر خاوند سے پوچھا کہ آپ کو وہ دولت درکار ہے یا اپنے بیٹے کے اس مقام ومرتبہ کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں؟ فروخؒ نے کہا کہ مجھے اپنے بیٹے کا یہ مقام اور اعزاز اس دولت سے کہیں زیادہ محبوب ہے۔ اہلیہؒ نے کہا کہ میں نے وہ ساری دولت اس بیٹے کی تعلیم وتربیت پر خرچ کی ہے اور ربیعہؒ کے اس علم وفضل اور مقام ومرتبہ کے پیچھے تمہاری وہ دولت جھلک رہی ہے جو تم میرے حوالہ کر کے گئے تھے۔ فروخؒ نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا اور اہلیہ کی تعریف کی کہ اس نے عقلمندی اور دانش سے کام لیا ہے۔

اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ تعلیم وتعلم اور تدریس وتربیت میں صرف اساتذہ، منتظمین، طلبہ، طالبات اور ان کے والدین کا کردار ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کے ساتھ وہ معاونین بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں جن کی رقم اور دولت صرف ہوتی ہے اور جو اپنے مال کے ساتھ مدارس کی معاونت کرتے ہیں۔ میں آپ دوستوں سے عرض کرتا ہوں کہ پیسہ تو ہر جگہ بولتا ہے، عیاشی کے گھروں میں بولتا ہے، گناہ کے مقامات پر بھی بولتا ہے، اور ظلم وناانصافی کی شکلوں میں بھی بولتا ہے، لیکن مبارک ہے وہ پیسہ جو ان طلبہ اور طالبات کی شکل میں بول رہا ہے، تلاوت قرآن کریم کی صورت میں بول رہا ہے، حمد ونعت کے لہجے میں بول رہا ہے، اور مختلف زبانوں میں طلبہ کی تقریروں اور خطابات کی شکل میں بول رہا ہے۔

دوسری بات جو میں آج کی اس محفل میں آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ دینی مدارس جو آج دنیا کے مختلف حصوں میں دین کی تعلیم دے رہے ہیں، قرآن وسنت کی روشنی پھیلا رہے ہیں اور آسمانی تعلیمات نسل انسانی کے سامنے پیش کر رہے ہیں، ان

کے بارے میں ایک سوال عام طور پر کیا جاتا ہے کہ ان کی تعلیم کا آج کی عملی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ انسانی معاشرہ کے مسائل سے کیا تعلق ہے؟ اور پریکٹیکل لائف میں یہ تعلیم ہمیں کس جگہ کام آتی ہے۔

ہماری عملی زندگی کے مختلف دائرے ہیں، فرد کی زندگی ہے، خاندان کی زندگی ہے، سوسائٹی کی زندگی ہے اور گلوبل انسانی معاشرہ کی زندگی ہے اور پھر ان کے بھی بیسیوں پہلو ہیں جن پر اس سوال کے جواب میں گفتگو کی ضرورت ہے اور معروضات پیش کی جا سکتی ہیں مگر وقت کا دائرہ بہت تنگ ہے، آپ حضرات تین گھنٹوں سے مسلسل بیٹھے ہوئے ہیں اور عصر کی نماز کا وقت بھی محدود ہوتا جا رہا ہے اس لیے صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کر سکوں گا اور وہ فرد کے دائرے کا پہلو ہے۔ مغرب میں فرد کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور جس جگہ میں بیٹھ کر ہم یہ گفتگو کر رہے ہیں یہاں کے فلسفۂ حیات کی بنیاد ”انڈویجول ازم“ یعنی فرد کی آزادی اور اہمیت پر ہے اس لیے اسی حوالہ سے ایک دو گزارشات پیش کروں گا۔

میں اس انسانی معاشرہ کا ایک فرد ہوں جس کے افراد کی تعداد اس وقت ساڑھے چھ ارب سے زیادہ بتائی جاتی ہے ان میں سے ایک میں بھی ہوں اور اس معاشرتی اجتماعیت کی ایک اکائی ہوں، اگر ایک فرد کے طور پر اپنے مقام اور کردار کے حوالہ سے بات کروں تو مجھے سب سے پہلے اپنا تعارف درکار ہے کہ میں کون ہوں اور اس انسانی معاشرہ میں میرا مقام اور کردار کیا ہے؟ کسی بھی چیز کے مقام و کردار کا تعین کرنے سے پہلے اس کی پہچان ضروری ہوتی ہے، یہ میرے سامنے مائیک ہے جس کے ذریعہ میں آپ حضرات سے مخاطب ہوں اس کے صحیح تعارف کے لیے مجھے تین سوالوں کا جواب درکار ہے (۱) یہ کیا ہے؟ (۲) یہ کیوں بنایا گیا ہے؟ (۳) اسے کس نے بنایا ہے؟

1. یہ کیا ہے؟ اس میں دیکھنا ہوگا کہ یہ کس چیز سے بنا ہے، اس کا مٹیریل کیا ہے، اس میں کون کون سے پرزے ہیں، اس کا نیٹ ورک کیا ہے اور اس کا میکنزم کیا ہے؟

2. یہ کیوں ہے؟ اس میں دیکھا جائے گا کہ اس کا مقصد کیا ہے، یہ کیا کام کرتا ہے اور کس غرض سے اس کا استعمال کیا جاتا ہے؟

3. جبکہ اسے کس نے بنایا ہے؟ اس میں یہ سوال فطری طور پر ذہن میں آتا ہے کہ یہ کون سی فرم نے بنایا ہے؟ یہ میڈ ان چائنہ ہے، میڈ ان جاپان ہے، میڈان کوریا ہے یا میڈان جرمنی ہے؟

ان تینوں سوالوں کا جواب حاصل کیے بغیر ذہن میں کسی بھی چیز کا تعارف مکمل نہیں ہوتا اور کوئی بھی اس سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ان تینوں سوالوں کا جواب مجھے اپنی پہچان کے لیے بھی درکار ہے اور ان سوالوں کا جواب حاصل کیے بغیر میں نہ خود کو پہچان سکتا ہوں اور نہ ہی انسانی معاشرہ میں اپنے مقام و کردار کا صحیح طور پر تعین کر سکتا ہوں۔

میں اس بات کے اعتراف میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتا کہ ان میں ایک سوال پر آج کی سائنس خوب بحث کر رہی ہے جبکہ میڈیکل سائنس کا موضوع ہی یہ ہے کہ انسان اپنے جسم، اپنی مشینری اور اپنے مٹیریل کے حوالہ سے کیا ہے؟ انسانی باڈی میڈیکل سائنس کا سبجیکٹ ہے اور وہ اس پر ہزاروں سال سے بحث کرتی آرہی ہے کہ انسانی چمڑے کے اندر چھپی ہوئی کائنات کی اس پیچیدہ ترین مشینری میں کیا کچھ ہے؟ یہ کیسے کام کرتی ہے، اس کی ضروریات کیا ہیں اور اس کے نفع و نقصان کا دائرہ کیا ہے؟ ہزاروں میڈیکل سائنٹسٹ ہزاروں سال سے اس پر بحث کر رہے ہیں، ہزاروں لیبارٹریوں میں انسانی جسم کے اعضا کی ہزاروں بار چیر پھاڑ کی جا چکی ہے جو اب بھی جاری ہے۔ ایک محاورہ ہمارے ہاں چلتا ہے کہ ”بال کی کھال اتارنا“۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ محاورہ کہیں اور فٹ بیٹھتا ہو یا نہیں میڈیکل سائنس پر ضرور صادق آتا ہے، اس لیے کہ ہمارے میڈیکل سائنٹسٹ نہ صرف بال کی کھال اتارتے ہیں بلکہ کھال کی بھی کھال اتار دیتے ہیں اور یہ عمل مسلسل جاری ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔

یہاں ضمناً ایک اور بات بھی عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سال کی اس محنت اور تگ و دو کے باوجود آج بھی دنیا بھر کے میڈیکل سائنٹسٹ اجتماعی طور پر یا کوئی سائنسدان انفرادی طور پر یہ دعوی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس انسانی باڈی کو مکمل طور پر سمجھ لیا گیا ہے اور اب اس میں کسی اور چیز یا صلاحیت کے انکشاف کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ کیونکہ تحقیق قیامت تک چلتی رہے گی، نئی نئی باتیں سامنے آتی رہیں گی اور قیامت تک اس میں انکشافات ہوتے رہیں گے۔ اور اس پس منظر میں قرآن کریم کے اس ارشاد

کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے کہ ”وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا“۔ اگر تم اللہ تعالی کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو انہیں شمار نہیں کر سکو گے۔ یہ آیت کریمہ ہمیں بتاتی ہے کہ تم تو اپنے وجود کے اندر کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے، کائنات میں ہر طرف بکھری ہوئی نعمتوں کو کیسے شمار کر سکو گے؟

لیکن اس پہلو پر مزید کسی گفتگو کی بجائے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ میڈیکل سائنس مجھے میرے بارے میں صرف ایک سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ (۱) میں کیا ہوں؟ لیکن دوسرے دو سوال کہ (۲) میں کیوں ہوں؟ (۳) اور مجھے کس نے بنایا ہے؟ اس کے بارے میں نہ صرف میڈیکل سائنس بلکہ عمومی سائنس بھی مکمل طور پر خاموش ہے۔ اور سائنس کا کوئی شعبہ سرے سے اس سوال کو ٹچ ہی نہیں کر رہا کہ انسان کو کیوں بنایا گیا ہے اور کس نے بنایا ہے؟ عجیب سی بات لگتی ہے کہ میں اپنے کرتے پر ٹانکے ہوئے ایک بٹن کے بارے میں تو جانتا ہوں کہ یہ کیوں بنایا ہے اور کس مقصد کے لیے بنایا ہے؟ مگر خود اپنے بارے میں یہ دو سوال میری بحث سے خارج ہیں۔

جبکہ ان دو سوالوں کا جواب کہ مجھے کس نے بنایا ہے اور کس مقصد کے لیے بنایا ہے، مجھے وحی الٰہی میں ملتا ہے، آسمانی تعلیمات میں ملتا ہے، قرآن کریم میں ملتا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ملتا ہے، اور ان باتوں کی معلومات مجھے ان مدارس کی تعلیم سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ دو سوال آج کی کسی یونیورسٹی کا سبجیکٹ نہیں ہیں، نہ آکسفورڈ کے مضامین میں یہ سوال شامل ہیں، نہ کیمبرج اس پر گفتگو کرتی ہے اور نہ ہی ہارورڈ یونیورسٹی کے مضامین کا یہ باقاعدہ حصہ ہے۔ اس لیے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ دینی مدرسہ کی تعلیم کے بغیر تو میں اپنی پہچان اور تعارف مکمل نہیں کر سکتا، انسانی معاشرہ میں اپنے مقام اور کردار کا ادراک کس طرح حاصل کر سکتا ہوں، اور سوسائٹی میں اپنا دائرہ کار صحیح طور پر کیسے متعیّن کر سکتا ہوں؟

اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال ایک فرد کی حیثیت سے میری زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس کے بغیر اپنے کردار اور انسانی معاشرت میں اپنے حصے کے بارے میں میرا علم مکمل نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ ہے کہ میرا فیوچر کیا ہے اور میرا مستقبل کیا ہے؟ آج کی دنیا نے تو فیوچر دنیا کی باقی ماندہ زندگی کو قرار دے رکھا ہے، جس کے بارے میں کسی کے پاس کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ منٹوں میں ہے، گھنٹوں میں ہے، دنوں میں ہے، ہفتوں میں ہے یا سالوں

میں ہے؟ یہ ان گارنٹیڈ زندگی ہمارا فیوچر کہلاتی ہے، جبکہ اصل فیوچر کی طرف سرے سے ہماری توجہ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ ہمارا مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ زندگی صرف اس دنیا کی زندگی کا نام نہیں بلکہ اس سے آگے زندگی کے بہت سے مراحل ہیں اور بہت لمبے مراحل ہیں۔ قبر کی زندگی ہے، حشر کی زندگی ہے، پل صراط کا مرحلہ ہے اور اس سے آگے جنت اور جہنم کی ان لمیٹڈ زندگی ہے اور زندگی کے وہ طویل ترین مراحل بھی ہمارے مستقبل کا اور ہمارے فیوچر کا حصہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے مستقبل اور فیوچر کے یہ مراحل آج کی سائنس اور تعلیم کا کس قدر حصہ ہیں؟ اور آکسفورڈ، کیمبرج اور ہارورڈ سمیت دنیا کی کون سی یونیورسٹی کا یہ سبجیکٹ ہے کہ قبر کیا ہے اور اس میں انسان کے ساتھ کیا معاملات پیش آنے والے ہیں۔ اس صورتحال کو قرآن کریم نے یوں بیان فرمایا ہے ”یعلمون ظاھرا من الحیاۃ الدنیا وھم عن الاخرۃ ھم غافلون“ یہ دنیا کی ظاہری زندگی کا ہی علم رکھتے ہیں جبکہ آخرت سے وہ بے خبر اور غافل ہیں۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اس دنیا کی باقی ماندہ زندگی کے لیے مجھے ضرور اسباب مہیا کرنے چاہئیں، اس کے لیے محنت کرنی چاہیے، اس کو بہتر بنانے کے لیے کام کرنا چاہیے، لیکن اس سے آگے جو میرا اصل فیوچر ہے اور یقینی فیوچر ہے جس نے بہرحال آ کر رہنا ہے، اس کی تیاری کرنا اس کے لیے اسباب فراہم کرنا اور اس کے لیے محنت کرنا بھی میری ضرورت ہے۔ اور یہ معلوم کرنا بھی میری ضرورت ہے کہ مجھے اس زندگی سے آنکھیں بند ہونے کے بعد فنا ہو جانا ہے یا کسی اور جہاں میں منتقل ہونا ہے؟ اور اگر مجھے ایک اور جہاں میں جانا ہے اور یقینا جانا ہے، جسے ہم آنکھیں بند ہونا کہتے ہیں، یہ حقیقت میں آنکھیں بند ہونا نہیں بلکہ ایک اور جہاں میں آنکھیں کھلنا ہے جہاں مجھے حساب کتاب کا مرحلہ پیش آئے گا، سوال جواب سے گزرنا ہو گا، الم و راحت کی کیفیات پیش آئیں گی اور سزا و جزا کا سامنا کرنا ہو گا، وہاں میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور مجھے کیا کرنا ہے؟ اس کی تعلیم مجھے وحی الٰہی سے ملتی ہے، آسمانی تعلیمات سے ملتی ہے اور قرآن و سنت سے ملتی ہے، جس کی تعلیم یہ مدرسہ دیتا ہے اور صرف تعلیم نہیں دیتا بلکہ اس کا عملی ماحول بھی فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے تربیت بھی مہیا کرتا ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ میں دارالعلوم نیویارک کی اس تعلیمی پیشرفت پر اور اس کی ترقی اور آج نظر آنے والے ثمرات و نتائج پر دارالعلوم کے منتظمین، اساتذہ، طلبہ، طالبات، ان

کے والدین اور آپ سب معاونین و متعلقین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ یہ مبارک ماحول اور ثمرات آپ سب کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ سب دوستوں کو جزائے خیر سے نوازیں اور دارالعلوم اور دوسرے مدارس دینیہ کو ترقیات و ثمرات اور قبولیت و رضا سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

دفاعِ اسلام اور استحکامِ پاکستان

(ڈسٹرکٹ پریس کلب، خانیوال - ۱۱ جون ۲۰۱۱ء)

۱۱ جون کو خانیوال کے ڈسٹرکٹ پریس کلب میں ”دفاع اسلام اور استحکام پاکستان“ کے عنوان سے منعقدہ ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا جس کا اہتمام جمعیت علماء اسلام (مولانا سمیع الحق گروپ) نے کیا تھا۔ مولانا عباس اختر نے سیمینار کی صدارت کی جبکہ مولانا عبدالکریم نعمانی اور مفتی خالد محمود کے علاوہ ہفت روزہ شب و روز کے مدیر جناب امتیاز اسعد نے بھی خطاب کیا۔ راقم الحروف نے اس موقع پر جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سیمینار کے عنوان کے حوالے سے مجھے دو امور کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ ایک دفاع اسلام اور دوسرا استحکام پاکستان۔ دفاع اسلام پر گفتگو کو میں تین دائروں میں تقسیم کروں گا۔ ذاتی دائرہ، قومی دائرہ اور عالمی دائرہ۔

1. ذاتی دائرے میں مجھے اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ میں اور ہم میں سے ہر فرد اسلام کے ساتھ کس درجے کی کمٹمنٹ رکھتا ہے اور اس کے احکام پر کس قدر عمل پیرا ہے؟ اسلام میرا دین ہے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میں اس بات کا پابند ہوں کہ میری زندگی قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کے مطابق بسر ہو۔ جبکہ اسلام سے ہٹ کر بہت سے تصورات و خیالات اور اقدار و روایات نے مجھ پر یلغار کر رکھی ہے اور میں مسلسل ان کی زد میں ہوں۔ اس لیے مجھے ہر وقت اس بات کی فکر رہنی چاہیے کہ یہ خارجی اثرات مجھ پر اس قدر حاوی نہ ہو جائیں کہ میں قرآن کریم اور جناب نبی کریمؐ کی تعلیمات و احکام سے ہی خدانخواستہ بے پروا ہو جاؤں۔

2. قومی دائرہ یہ ہے کہ ہم فرد کے ساتھ ساتھ سوسائٹی اور قوم کی سطح پر بھی اسلام کے احکام و قوانین پر عملدرآمد کے پابند ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے تو ظاہر ہے کہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں ہی، مگر پاکستانی ہونے کے ناتے سے بھی ہمارا یہ اجتماعی فریضہ ہے، اس لیے کہ پاکستان کا قیام اسی مقصد کے تحت عمل میں آیا تھا۔ جبکہ دنیا کے بہت سے حلقے، جن کے ساتھ ہمارے بعض پاکستانی حضرات بھی شریک ہیں، مسلسل اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ پاکستان کی اسلامی شناخت کو ختم کر کے اسے ایک سیکولر ملک کا روپ دے دیا جائے۔ اس لیے دفاع اسلام کا تقاضا ہے کہ ہم پاکستان کے اسلامی تشخص کے بارے میں ہر وقت متفکر رہیں اور اسے ختم کرنے کی سازشوں پر نظر رکھتے ہوئے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نظریاتی شناخت اور تہذیبی تشخص کے تحفظ کے لیے سرگرم کردار ادا کرتے رہیں۔

3. عالمی سطح پر دفاع اسلام کی صورتحال یہ ہے کہ مسلم ممالک اور اقوام استعماری قوتوں کی زد میں ہیں اور ان کی آزادی و خودمختاری عالمی استعماری قوتوں کی ہوس زر اور ہوس اقتدار کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی شریعت کے احکام و قوانین بھی ہر سطح پر اعتراضات اور شکوک و شبہات کی زد میں ہیں، جس کا مقصد اسلام کے ایک قابل عمل ضابطۂ حیات ہونے کی نفی اور مسلمانوں کو خود ان کے دین اور تہذیب سے برگشتہ کرنا ہے۔ میڈیا، لابنگ، لالچ، دباؤ اور خوف کے تمام حربے اس مہم میں بے دریغ استعمال کیے جا رہے ہیں اور نہ صرف استعماری حکومتوں بلکہ مختلف لابیوں کو بھی اس کے لیے استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ لہذا یہ بھی ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس صورتحال پر نظر رکھیں اور اسلامی عقیدہ و ثقافت کے خلاف اس عالمی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے مربوط اور منظم کوشش کریں۔

استحکام پاکستان کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کو چھ عشروں سے زیادہ وقت گزر چکا ہے مگر ہم ابھی تک اپنا قومی رخ متعیّن نہیں کر سکے۔ ہم نے آزادی اور قیام پاکستان کے بعد اپنی قومی شناخت کے لیے اسلام اور

جمہوریت دونوں کو بنیاد بنایا تھا، اور اس خوبصورت توازن کے ساتھ بنایا تھا کہ ہمارے ہاں حکومت کی تشکیل عوام کے ووٹوں سے ہوگی اور خاندانی بادشاہت یا جبری نظام حکومت نہیں ہوگا، البتہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والی حکومت ملکی نظام اور اپنی پالیسیوں کے حوالے سے قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی پابند ہوگی۔ مگر گزشتہ چھ عشروں کے دوران ہم قومی سطح پر اسلام اور جمہوریت دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی مخلص نہیں رہے۔ ہم نے اپنے دستور میں تو ان دونوں بنیادوں کو تسلیم کیا ہے لیکن قومی طرز عمل ان دونوں کے ساتھ منافقت کا چلا آرہا ہے۔

اسلام کے ساتھ ہم نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اگر ہم جمہوریت کے ساتھ مخلص ہوتے تو بھی حالات اس قدر خراب نہ ہوتے اور غالب مسلم اکثریت رکھنے والے ملک کی رائے عامہ اس راستے سے بھی ہمیں اسلامی تشخص کی طرف ہی لے جاتی، لیکن ہم نے اس کے ساتھ بھی وفا نہیں کی اور آج اس منافقت اور دو عملی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ملک کے دینی حلقوں نے جب ''شریعت بل'' کے عنوان سے ملکی نظام میں قرآن و سنت کی بالادستی کو دستوری طور پر یقینی بنانے کی بات کی تو اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ عوام کی منتخب پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی بالادستی قبول کرنے کا پابند بنا کر پارلیمنٹ کی ساورنٹی اور خود مختاری کو ختم کیا جا رہا ہے۔ لیکن قرآن و سنت کے سامنے غیر مشروط سرنڈر نہ ہونے والی پارلیمنٹ کی ساورنٹی آج عالمی قوتوں کی یرغمال بن کر رہ گئی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالہ سے منتخب پارلیمنٹ کی ایک متفقہ قرارداد پہلے ہی عالمی طاقتوں کے مفادات کے فریزر میں منجمد پڑی ہے، اب پارلیمنٹ کی دوسری متفقہ قرارداد بھی اسی فریزر کے دوسرے کونے میں منجمد کی جا رہی ہے۔

گزشتہ عام انتخابات میں عوام نے جن پالیسیوں کو ووٹ کے ذریعے کھلے بندوں مسترد کر دیا تھا وہ پالیسیاں تسلسل کے ساتھ جاری ہیں اور رائے عامہ کے فیصلے کو کلیتاً مسترد کر دیا گیا ہے۔ ہم نے قرآن و سنت کی بالادستی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا تو قدرت نے ہمیں دشمن کی بالادستی کے سامنے سرنڈر کر دیا ہے۔ آج ہم استعماری قوتوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے بے بسی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہے۔ بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کے لیے اب بھی ہم قومی سطح پر تیار نہیں ہیں۔ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں قوموں کو

دی جانے والی سزاؤں میں سے ایک خوفناک سزا کا یوں ذکر کیا ہے کہ ”لا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم“، ”تم لوگوں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے خدا کو بھلا دیا تو اللہ تعالی نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔

آج ہماری صورتحال یہ ہے کہ ہم اجتماعی طور پر اپنے نفع ونقصان سے غافل ہو چکے ہیں، اپنی قومی حیثیت کو بھول چکے ہیں اور اپنی الگ شناخت اور پہچان کھوتے جا رہے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ بھی سزا کی ایک صورت ہے جو خدا کو بھول جانے والی قوموں کو دی جاتی ہے اور ہم اس خدائی سزا کا عملی طور پر شکار ہو گئے ہیں۔ ہماری قومی حالت اس مریض جیسی ہے جس کے جسم کی چیر پھاڑ کرنے سے پہلے ڈاکٹر اس کے جسم کو سن کر دیتا ہے مگر بے ہوش نہیں کرتا۔ پھر اس کی نظروں کے سامنے اس کا آپریشن کرتا ہے، وہ اپنے جسم کی چیر پھاڑ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے مگر اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی، وہ بے حس ہو جاتا ہے اور اپنے جسم پر چلنے والی قینچی کے عمل کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جبکہ ہماری قومی بے حسی کی حالت یہ ہے کہ ہم اپنے جسم کے مختلف حصوں کی چیر پھاڑ کو صرف دیکھ ہی نہیں رہے بلکہ ”انجوائے“ بھی کر رہے ہیں، ہم نے خود کو مکمل طور پر ایک ایسے دشمن کے سپرد کر رکھا ہے جو آپریشن کے نام پر ہمارے قومی جسم کے حصے بخرے کرتا جا رہا ہے اور ہم اسے ”مسیحا“ سمجھ کر اس کی ان حرکتوں پر اسے داد بھی دیے جا رہے ہیں۔

استحکام پاکستان پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اس صورتحال کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں کہ ہماری قومی خود مختاری سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے، ہماری سرحدوں کا تقدس ڈرون حملوں اور ایبٹ آباد آپریشن نے بری طرح پامال کر کے رکھ دیا ہے، ملکی رائے عامہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی، عوام کے ووٹ کے فیصلے کو مسترد کر دیا گیا ہے، منتخب پارلیمنٹ کی متفقہ قراردادوں کو فریز کر دیا گیا ہے اور ہمارے دینی تشخص اور اقدار و روایات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود عالمی قوتوں کے مفادات کا جہنم بھرنے نہیں پا رہا اور وہ ’ھل من مزید“ کی چیخ و پکار میں مصروف ہیں۔

1. آج استحکام پاکستان کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنا قومی رخ واضح کریں، تذبذب کی فضا سے نکلیں اور تحریک پاکستان اور دستور پاکستان کے حقائق

کو تسلیم کرتے ہوئے پاکستان کے اسلامی تشخص اور نظریاتی شناخت کے خلاف سازشوں کو مسترد کر دیں۔

2. اس کے بعد استحکام پاکستان کا دوسرا بڑا تقاضا ہے کہ ہم قومی خود مختاری کی بحالی کی فکر کریں اور اپنے فیصلے خود کر سکنے کا اختیار واپس لیں، ملکی سالمیت اور سرحدوں کے تقدس کی پامالی کو روکنے کے لیے متحد ہو جائیں، اور ملی وقار اور آزادی کی بحالی کو اپنی اولین ترجیح قرار دیں۔ یہ ذمہ داری علماء کرام کی بھی ہے مگر صرف ان کی نہیں ہے بلکہ سیاستدانوں، دانشوروں، اساتذہ، صحافیوں اور قوم کے دیگر تمام طبقات کی بھی ہے۔ جب تک ہم قومی وقار، آزادی اور خود مختاری کے لیے متحد نہیں ہو جاتے اور بیرونی مداخلت کو مسترد کرنے کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں پکڑتے "استحکام پاکستان" کو اس بھنور سے نکالنے کا کوئی اور راستہ ہمیں نہیں مل سکتا۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۰ جون ۲۰۱۱ء)

دینی اور دنیاوی علوم کی ضرورت

(مدینۃ العلوم، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۱ جون ۲۰۱۱ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سب سے پہلے تو میں ورجینیا امریکہ میں اس نئی دینی درسگاہ مدینۃ العلوم کے آغاز، سرگرمیوں اور پیش رفت پر خوشی کا اظہار کرنا چاہوں گا اور اس کے بانی مولانا عبد الحمید اصغر نقشبندی و منتظمین اور آپ سب حضرات کو مبارک باد دینا چاہوں گا۔ خیر کا کوئی کام جہاں بھی ہو پورے علاقے اور اس کے مکینوں کے لیے برکت کا باعث ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام متعلقین کے لیے اس کار خیر کو دنیا و آخرت کے لیے برکت کا ذریعہ بنائے، سعادتوں کا ذریعہ بنائے اور خوشیوں و کامیابیوں کا ذریعہ بنائے، آمین یارب العالمین۔

کار خیر میں حصہ دار

ہم دیکھتے ہیں کہ پڑھنے والے پڑھتے ہیں، پڑھانے والے پڑھاتے ہیں، انتظام کرنے والے انتظام کرتے ہیں اور تعاون کرنے والے حضرات تعاون کرتے ہیں۔ بظاہر یوں

معلوم ہوتا ہے کہ بس یہی لوگ ہیں جو اس نیک کام میں حصہ دار ہیں لیکن در حقیقت ہم اس بات کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے کہ اس کار خیر کا دائرہ اثر کتنا وسیع ہوتا ہے اور اس میں کون کون کس درجے میں شریک ہوتا ہے، یہ اللہ تعالی ہی بہتر جانتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی وقت کسی پڑھنے والے بچے یا بچی کو پڑھتے دیکھ کر کسی بزرگ مرد یا خاتون یا خاندان کے کسی فرد نے اس بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی حوصلہ افزائی کی تو اللہ کے ہاں وہ بزرگ بھی اس کار خیر میں شریک ہے۔ اللہ تعالی خبیر بھی ہیں اور لطیف بھی، وہ چھوٹے سے چھوٹے حصے کو بھی جانتے ہیں، وہ کسی کا حصہ بھولتے بھی نہیں ہیں اور کسی کا حصہ ضائع بھی نہیں کرتے۔ اللہ تعالی کو معلوم ہے کہ کون کون کس کس درجے میں اور کس نیت کے ساتھ شریک ہے۔

اور علم تو روشنی ہے۔ روشنی جہاں روشن ہوتی ہے اس سے روشنی کرنے والا بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور جس کے لیے روشنی کی جاتی ہے وہ بھی فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اردگرد کا سارا ماحول مستفید ہوتا ہے۔ وہ لوگ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں جو روشنی کرنے والوں کے شاید ذہن میں بھی نہیں ہوتے اور پھر شاید ان لوگوں کی اپنی نیت بھی فائدہ اٹھانے کی نہ ہو۔ لیکن جب کسی جگہ پر روشنی جلتی ہے تو اردگرد جہاں جہاں وہ پہنچتی ہے سب کو فائدہ ہوتا ہے۔ علم بھی روشنی ہے یہ جہاں جہاں اپنا آپ دکھاتی ہے اس سے پورا ماحول متاثر ہوتا ہے اور اردگرد کے لوگوں پر اس کے کسی نہ کسی طرح اثرات ضرور ہوتے ہیں۔

اچھی صحبت کا فائدہ

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ۔ بہت بڑے اللہ والے تھے، چشتیہ سلسلے کے بڑے شیخ تھے۔ اللہ کی قدرت دیکھیں کہ علمائے دیوبند کے جو بڑے بڑے مشائخ ہیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، یہ سب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء ہیں۔ اور پھر بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ بھی حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ ہیں۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ حضرت حاجی صاحبؒ دیوبندیوں اور بریلویوں سب کے مشترکہ پیر ہیں۔ دونوں انہی سے فیض حاصل کرتے ہیں اور وہ سب کے سانجھے پیر ہیں۔ ایک دفعہ حضرت حاجی صاحبؒ اپنے عقیدت مندوں کی محفل میں تشریف فرما تھے کسی شخص نے سوال کیا کہ یا حضرت! بہت سے لوگ خواہش کا

اظہار کرتے ہیں کہ میری قبر فلاں نیک آدمی کے ساتھ ہو تو اس کی کیا حیثیت ہے۔ یعنی اس عقیدت مند کا سوال یہ تھا کہ قبر تو اپنے ایمان و اعمال کی کیفیات کے ساتھ ہوتی ہے اور ہر آدمی کی اپنی اپنی قبر ہوتی ہے تو یہ جو لوگ کوشش کرتے ہیں اور وصیت کرتے ہیں کہ فلاں نیک آدمی کے ساتھ میری قبر ہو تو کیا اس کا مرنے والے کو کوئی فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بجلی کے پنکھے نہیں ہوتے تھے، ہاتھ سے جھلنے والے پنکھے ہوتے تھے جنہیں خادم لے کھڑے ہوتے تھے اور مجلس میں پنکھا ہلاتے رہتے تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس خادم کی طرف دیکھا جو پنکھا جھل رہا تھا۔ حاجی صاحبؒ نے پوچھا کہ یہ پنکھا کس کو جھل رہا ہے؟ جواب ملا جی آپ کو۔ پھر پوچھا کہ کیا باقی مجلس والوں کو اس کی ہوا پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ جواب ملا کہ جی پہنچ رہی ہے۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ قبر کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک نیک آدمی کی قبر پر اللہ کی برکتوں کی بارش برستی ہے تو ارد گرد والوں کو بھی ٹھنڈی ہوا پہنچتی ہے۔

کہیں دور بارش ہو رہی ہو اور ہمیں نظر بھی نہ آ رہی ہو لیکن جب ٹھنڈی ہوا پہنچتی ہے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ضرور کسی جگہ بارش ہو رہی ہے۔ بعض حضرات یہ وصیت بھی کرتے ہیں کہ انہیں فلاں بزرگ یا فلاں نیک آدمی کی قبر کے قریب دفنایا جائے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو خواہش کے مطابق کسی نیک آدمی کی قبر کے ساتھ جگہ مل بھی جاتی ہے۔ حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ ہمارے گوجرانوالہ کے ایک بڑے بزرگ تھے، اکابر علماء میں سے تھے اور ہمارے والد حضرت شیخ الحدیث سرفراز خان صفدرؒ کے استاذ تھے۔ اس طرح مفتی صاحب ہمارے دادا استاذ بنتے ہیں۔ میں نے ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۲ء مسلسل بارہ سال ان کی نیابت میں کام کیا ہے۔ وفات سے چند روز قبل ہسپتال میں بیماری کی حالت میں تھے۔ میں عیادت و بیمار پرسی کے لیے گیا تو فرمانے لگے کہ زاہد مجھے لگتا ہے کہ میں جا رہا ہوں اس لیے میری دو وصیتیں ہیں۔ ایک تو میری خواہش ہے کہ میرا جنازہ حضرت درخواستیؒ پڑھا دیں۔ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ ہمارے ملک کے بڑے بزرگ تھے اور حافظ الحدیث تھے کہ انہیں ہزاروں حدیثیں یاد تھیں۔ مفتی عبد الواحدؒ صاحب نے کہا کہ میری دوسری خواہش یہ ہے کہ مجھے حافظ نظام الدینؒ کی قبر کے پاس جگہ مل جائے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ حافظ نظام الدینؒ ہمارے شہر گوجرانوالہ میں ایک پرانے بزرگ تھے بہت نیک آدمی تھے اور ساری زندگی انہوں نے قرآن مجید پڑھایا۔

مفتی عبد الواحدؒ نے یہ دو وصیتیں کیں۔ پہلے تو مجھے یہ اشکال ہوا کہ حضرت درخواستیؒ خانپور میں ہوتے ہیں جو کہ کافی دور ہے اور آتے جاتے پورا دن گزر جاتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ حضرت درخواستیؒ کیسے دستیاب ہوں گے اور میں کیسے انہیں گوجرانوالہ جنازے کے لیے لے کر آؤں گا۔ اس زمانے میں آمد و رفت کا سلسلہ اتنا آسان نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ بہرحال میں نے مفتی صاحبؒ کو تسلی دی کہ ان شاء اللہ ہم اس کی پوری کوشش کریں گے۔ اللہ کی قدرت دیکھیں کہ جب حضرت مفتی صاحبؒ کا انتقال ہوا تو میں نے فوری طور پر رابطہ کر کے معلوم کیا کہ حضرت درخواستیؒ اس وقت کہاں ہیں؟ پتہ چلا کہ وہ لاہور آئے ہوئے تھے، مجھے تسلی ہوگئی کہ یہ والا کام تو بن گیا ہے۔ اور پھر حافظ نظام الدینؒ صاحب کی قبر کے نزدیک مفتی صاحب کو قبر بھی مل گئی۔ حافظ نظام الدینؒ کے گھر والوں نے کہا کہ ہم نے اپنے گھر کے ایک فرد کے لیے اس قبر کی جگہ رکھی ہوئی تھی لیکن مفتی صاحبؒ اللہ کے نیک بندے تھے۔ ان کی اگر خواہش تھی تو ٹھیک ہے ان کے لیے ترجیح ہے کہ وہ ہمارے بزرگ تھے۔ چنانچہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ باذوق لوگ خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ میری قبر فلاں نیک آدمی کے پاس ہو۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جہاں اللہ کی رحمت کی بارش ہوتی ہے، جہاں اللہ کے دین کی روشنی پھیلتی ہے اور جہاں علم کا چراغ جلتا ہے تو اس سے پورا ماحول فائدہ اٹھاتا ہے اور اردگرد اس کے مثبت اثرات ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ چار ساتھی پڑھ لیتے ہیں اور دو اساتذہ پڑھا دیتے ہیں تو چلو اس سے چند لوگوں کو ثواب مل جاتا ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے اور یہ اتنی معمولی سی بات نہیں ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور پورے ماحول پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس دینی ادارے مدینۃ العلوم کی شکل میں اس کار خیر کو قبول فرمائیں اور اس کے اثرات کو زیادہ سے زیادہ وسیع فرمائیں۔

دنیاوی زندگی کے بعد کی خبریں

دینی اداروں میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں ان سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہماری اس دنیاوی زندگی کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ برزخ کی زندگی، حشر کی زندگی اور پھر جنت و جہنم کی زندگی وغیرہ۔ ہمارے ہاں ایک مزاج بن گیا ہے اور ایک رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ ہم قیامت کے متعلق دریافت کرتے رہتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمؐ سے بھی یہ سوال اکثر ہوتا رہا۔ متی الساعۃ؟ سوال کرنے والے دو قسم کے لوگ

تھے۔ استہزاء وتمسخر والے لوگ بھی تھے اور ایمان ویقین والے لوگ بھی تھے۔ سوال کرنے والے کافر بھی تھے اور مومن بھی۔ دونوں طرح کے لوگوں نے یہ سوال کیا۔ کافروں کا سوال کرنے کا مقصد تو تمسخر اور مذاق اڑانا تھا کہ کہاں ہے جی وہ آپ کی قیامت کب آئے گی ہمیں تو آتی نظر نہیں آرہی۔ متی ہذا الوعد ان کنتم صادقین اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں تو وہ قیامت کہاں ہے آتی کیوں نہیں ہے؟ یہ تو کافروں کا رویہ تھا۔ لیکن یہ سوال کرنے والے اہل ایمان بھی تھے کہ اپنی معلومات، یقین اور تسلی کے لیے پوچھتے تھے کہ یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی؟

اللہ تعالی نے بھی قرآن مجید میں اس سوال کا مختلف حوالوں سے ذکر کیا ہے اور جناب نبی کریمؐ نے بھی مختلف مقامات پر مختلف لہجوں میں اس کا جواب دیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے ایک جگہ تو یہ فرمایا یسالونک عن الساعۃ أیان مرسھا۔ فیم أنت من ذکرھا۔ الی ربک منتھھا۔ انما أنت منذر من یخشھا (سورہ النازعات ۴۲ تا ۴۵) آپ سے قیامت کی بابت پوچھتے ہیں کہ اس کا قیام کب ہوگا، آپ کو اس کے ذکر سے کیا واسطہ، اس کے علم کی انتہا آپ کے رب ہی کی طرف ہے، بے شک آپ تو صرف اس کو ڈرانے والے ہیں جو اس سے ڈرتا ہے۔ جبکہ سورہ الاعراف میں اللہ رب العزت نے اس سوال کے جواب میں جناب نبی کریمؐ سے کہلوایا یسالونک عن الساعۃ أیان مرسھا قل انما علمھا عند ربی لا یجلیھا لوقتھا الا ھو ثقلت فی السموات والارض لا تاتیکم الا بغتۃ (سورہ الاعراف: ۱۸۷) قیامت کے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں کہ اس کی آمد کا کونسا وقت ہے، کہہ دیجئے کہ اس کی خبر تو میرے رب ہی کے ہاں ہے، وہی اسے اس کے وقت پر ظاہر کر دکھائے گا، وہ (قیامت) آسمانوں اور زمین میں بھاری بات ہے، یہ تم پر محض اچانک آجائے گی۔

فرمایا کہ جتنے ہلکے انداز سے تم قیامت کے متعلق پوچھتے ہو یہ اتنی ہلکی چیز نہیں ہے، قیامت تو اس زمین و آسمان سے بھاری ہے۔ پھر فرمایا کہ جب بھی آئے گی اچانک آئے گی۔ چنانچہ اللہ رب کریم نے قرآن مجید میں ان لوگوں کے سوال کا جواب جناب نبی کریمؐ سے دلوایا۔ جناب نبی کریمؐ سے ایک تو حضرت جبریلؑ نے یہ سوال کیا تھا۔ یہ مشہور حدیث ہے کہ جبریلؑ انسانی شکل میں آئے اور آپؐ سے کچھ سوالات کیے ما الاسلام، ما الایمان، ما الاحسان، متی الساعۃ کہ اسلام کیا ہے، ایمان کیا ہے، احسان کیا ہے، قیامت کب آئے گی؟ حضورؐ نے جواب دیا تھا کہ ما المسئول عنھا باعلم من السائل فی خمس لا یعلمھن الا اللہ کہ پوچھنے

والے کو جتنا معلوم ہے، پوچھے جانے والے کو اس سے زیادہ معلوم نہیں ہے، قیامت کا وقت ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اس (اللہ کے) سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔ یعنی حضورؐ نے جبریلؑ سے کہا کہ بھئی جتنا آپ جانتے ہیں میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں۔ قیامت کا علم اور قیامت کا وقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر جبریلؑ نے کہا کہ جناب وقت نہ سہی کوئی علامتیں ہی بتا دیں۔ ما أمارا تھا؟ چنانچہ حضورؐ نے پھر علامتیں بتا دیں۔

اگرچہ جناب رسول اللہؐ نے دوٹوک یہ بتلا دیا تھا کہ قیامت کا وقت اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا لیکن اس کے باوجود قیامت کے وقت کے متعلق جستجو کا یہ ذوق زمانہ در زمانہ چلا آرہا ہے اور آج بھی ہے۔ بعض لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ مولوی صاحب حساب لگا کر بتائیں کہ قیامت کب آئے گی۔ کونسی نشانیاں پوری ہو گئی ہیں کونسی باقی ہیں کونسی نشانی کتنا وقت لے گی۔ بہت سے لوگوں کا تو یہ ایک مستقل شغل ہے۔

ظہور قیامت کی پیشین گوئیاں

یہاں کیلی فورنیا، امریکہ کے ایک پادری صاحب ہیں فادر کمبنگ، اس وقت ۹۰ سے اوپر ان کی عمر ہے۔ انہوں نے بائبل کی علامات اور نشانیوں سے حساب لگا کر یہ بتایا تھا اور چند مہینوں سے اس کی تشہیر دنیا بھر میں ہو رہی تھی کہ قیامت ۱۲ اپریل ۲۰۱۱ء میں آئے گی۔ پادری صاحب نے قیامت کے آنے کا وقت بھی بتایا کہ یہ شام ۶ بجے آئے گی۔ ہم پاکستان میں پادری فادر کمبنگ کی اس پیشین گوئی کی یہ کہانی اخبارات میں پڑھتے رہے اور پھر آپس میں دل لگی کے لیے یہ حساب لگاتے رہے کہ جب امریکہ میں شام کے ۶ بجے کا وقت ہو گا تو پاکستان میں کیا وقت ہو گا۔ مجھ سے کچھ دوستوں نے اس کے متعلق پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی لوگ ایسی پیشین گوئیاں کرتے رہے ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے گوجرانوالہ میں ڈاکٹر ای چارلس نامی ایک بڑے پادری تھے انہوں نے بھی ایک زمانے میں قیامت کے ظہور کے متعلق پیشین گوئی کی تھی۔ کھوکھرکی، گوجرانوالہ میں عیسائیوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے یہ وہاں کے پادری تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کیتھولک عیسائیوں کا پورے ایشیا کا سب سے بڑا مرکز ہے، وہاں پادری تیار ہوتے ہیں اور عیسائیت کی نشر و اشاعت کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ یہ اتنا بڑا ادارہ ہے کہ یوں سمجھ لیں کہ کیتھولک عیسائیوں کے لیے وہ دار العلوم دیوبند ہے۔ چنانچہ پادری ای چارلس نے آئینۂ

احوال کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کہ ۱۹۴۰ء میں یعنی میری پیدائش سے آٹھ برس قبل چھپی تھی۔ یہ کتاب میرے پاس موجود ہے جس سے میں نے ساتھیوں کو اقتباسات سنائے کہ بھئی اس سے پہلے بھی یہ پیشین گوئیاں ہو چکی ہیں۔ پادری ای چارلس نے بائبل کی پیشین گوئیوں کے حوالے سے ایک لمبا چارٹ بنایا تھا جو کتاب کے ساتھ تہہ کر کے منسلک کیا گیا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں یہ ہو گا، ۱۹۴۵ء میں یہ ہو گا اور فلاں سن میں یہ ہو گا فلاں سن میں یہ ہو گا اور پھر بالآخر ۱۹۹۴ء میں قیامت آجائے گی۔ پادری صاحب کی بہت سی پیشین گوئیوں میں چند پیشین گوئیاں پوری بھی ہوئیں۔ تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یار جیسے ۱۹۹۴ء گزر گئی ہے ایسے ہی ۲۰۱۱ء بھی گزر جائے گی، ان شاء اللہ العزیز۔ اس لیے کہ قیامت کا اصل وقت اللہ ہی کو معلوم ہے۔

ہمارے ہاں اس حوالے سے ایک اور بحث بھی چلتی رہتی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی یہ دعوی بڑے طمطراق سے کرتے رہے ہیں کہ چودھویں صدی ہجری آخری صدی ہے۔ میں آخری صدی کا مجدد بھی ہوں اور امام مہدی بھی اور یہ کہ پندرہویں صدی نہیں آئے گی۔ مرزا صاحب نے بہت سے دعوے کیے کہ میں یہ بھی ہوں، وہ بھی ہوں اور فلاں بھی ہوں۔ ان دعوؤں کی بنیاد یہ تھی کہ چونکہ چودھویں ہجری صدی آخری صدی ہے اس لیے وہ شخصیات جن کے ظہور کی اسلام میں پیشین گوئیاں ہیں آئندہ تو ان کے ظہور کا امکان نہیں ہے اس لیے میں ہی وہ سب شخصیات ہوں۔ حضرت مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی ہمارے بڑے مجاہد اور بزرگ تھے۔ ان کی مرزا صاحب کے ان دعوؤں پر ایک دلچسپ تقریر ہوتی تھی کہ چودھویں صدی ہجری آخری صدی نہیں ہے۔ بہر حال چودھویں صدی بھی گزر گئی اور اب ہم پندرہویں صدی ہجری میں ہیں۔

میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے ہاں بھی یہ رجحان ہے۔ لوگ آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ مولوی صاحب کون سی علامت گزر گئی ہے کون سی علامت باقی ہے اندازہ لگا کر بتائیں کہ قیامت کب آئے گی۔ میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ اللہ کے بندو! جب اللہ رب العزت نے دو باتیں واضح طور پر کہہ دی ہیں، پہلی لا یجلیھا لوقتھا الا ھو کہ اللہ کے سوا قیامت کا وقت کوئی نہیں جانتا، اور دوسری لا تأتیکم الا بغتۃ کہ قیامت اچانک آئے گی۔ اب اس کے بعد اس بحث میں پڑنے کا کیا فائدہ ہے؟ ہاں علامات کی بات درست ہے ۔لیکن قیامت کا

وقت متعیّن کرنا کہ اتنے سال بعد آئے گی یا اگلی صدی میں آئے گی، یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

روز قیامت کے لیے تیاری

جناب نبی کریمؐ نے ایک سوال کے جواب میں ایک اور بات فرمائی جو میں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک صحابیؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ متی الساعۃ؟ کہ اے اللہ کے رسول قیامت کب آئے گی؟ یہ وہی سوال ہے جو کافر بھی کیا کرتے تھے اور جو جبرائیلؑ نے کیا تھا۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ ما أعددت لھا؟ کہ (قیامت کا تو پوچھ رہے ہو) کوئی تیاری بھی کر رکھی ہے؟ یعنی جناب نبی کریمؐ نے سوال کا رخ موڑ دیا کہ ایک مسلمان کا یہ سوال کرنا نہیں بنتا کہ قیامت کب آئے گی بلکہ مسلمان کا سوال یہ ہونا چاہیے کہ میری قیامت کے لیے تیاری کتنی ہے؟ ایک چیز نے آنا ہے، بتائے بغیر آنا ہے، اچانک آنا ہے اور کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ تو اصل کام وقت معلوم کرنا ہے یا اصل کام اپنی تیاری کا حساب لگانا ہے۔ اس پر صحابی نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ما أعددت لھا کثیر ولکنی أحب اللہ ورسولہ یا رسول اللہ میں نے کوئی زیادہ تیاری تو نہیں کر رکھی لیکن مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ضرور ہے۔ حضورؐ نے فرمایا انت مع من احببت جس کے ساتھ تیری محبت ہوگی اسی کے ساتھ تو شمار ہوگا۔

چھوٹی قیامت

ایک اور حدیث میں جناب نبی کریمؐ نے ایک دوسرا جواب دیا۔ فرمایا کہ بڑی قیامت تو تب آئے گی جب اس کا وقت ہوگا لیکن چھوٹی قیامت تو تمہارے سر پر کھڑی ہے۔ فرمایا من مات فقد قامت قیامتہ کہ جس کی موت ہوگئی پس اس کے لیے قیامت کا آغاز ہوگیا۔ یعنی فرمایا کہ تم کس قیامت کی بات کر رہے، جونہی سانس نکلا تمہاری قیامت تو شروع ہوگئی۔ قیامت نام ہے حساب کتاب کا اور ایک انسان کا حساب کتاب کب شروع ہوگا؟ جیسے ہی آنکھ بند ہوئی حساب کتاب شروع۔ چنانچہ نہ چھوٹی قیامت کے وقت کا کسی کو پتہ ہے اور نہ بڑی قیامت کے وقت کا کسی کو پتہ ہے۔ آپؐ فرمایا اس بڑی قیامت کے وقت کا انتظار مت کرو بلکہ اپنی قیامت کے لیے تیاری کرو اور اس کا انتظار کرو۔

جناب رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ جب انسان کو قبر میں ڈالا جاتا ہے اور ابھی گھر والے قبرستان سے باہر نہیں نکلتے تو سوال کرنے والے یعنی منکر نکیر آجاتے ہیں۔ اس جہان میں یعنی عالم برزخ میں مرنے والے کو بیٹھا کر پوچھتے ہیں کہ ہاں بھئی اپنا تعارف کرواؤ من ربک

ما دینک من نبیک ؟ تمہارا رب کون ہے، تمہارا دین کیا ہے، تمہارا رسول کون ہے ؟ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کہ تمہاری قیامت تو مرتے ہی شروع ہو جاتی ہے اس لیے بڑی قیامت کے چکر میں مت پڑو کسی لمحے بھی سوئچ آف ہو سکتا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفانؓ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ جب کسی قبر کے پاس سے گزرتے تھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو جاتے تھے اور ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی داڑھی بڑی گھنی تھی۔ حضرت عثمانؓ زار و قطار رونے لگ جاتے تھے۔ کسی نے پوچھا امیر المؤمنین ! آپ تو اللہ کے بزرگ بندے ہیں آپ کے سامنے جہنم کی ہولناکیوں کا ذکر ہوتا ہے حشر کے ہولناکیوں کا ذکر ہوتا ہے اور قیامت کے مناظر کا ذکر ہوتا ہے تو آپ نہیں روتے لیکن قبر کو دیکھتے ہی آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے ؟ یعنی قرآن مجید نے قیامت کے اور جہنم کے بڑے بڑے خوف ناک مناظر بیان کیے ہیں انہیں سن کر اور پڑھ کر آپ کی کیفیت یہ نہیں ہوتی لیکن قبر کو دیکھتے ہی آپ کی کیفیت یکسر بدل جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ حضرت عثمانؓ فرمانے لگے بھئی بات یہ ہے کہ یہ پہلا مرحلہ ہے، جو یہاں سے صحیح گزر گیا آئندہ مراحل سے بھی اس کے صحیح گزرنے کی توقع ہے۔ لیکن جو بنیادی پرچے میں ہی فیل ہو گیا تو آئندہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا۔ حضرت عثمانؓ وہ بزرگ ہیں جن کو حضور نبی کریمؐ نے اپنی زبان مبارک سے کم از کم چار دفعہ نام لے کر جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو یہ فرمایا اعمل ماشئت عثمان آج کے بعد جو مرضی کرو اللہ نے تمہاری بخشش کر دی ہے۔ یہ حضرت عثمانؓ کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔

میں نے عرض کیا کہ آج کل ہمارا یہ ذوق بنتا جا رہا ہے کہ خبروں میں، مضامین میں، مختلف چینلز کے پروگراموں میں اور مختلف مباحثوں میں ہم قیامت کے وقت کے بارے میں بات کرتے رہتے ہیں۔ میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ نہیں بھئی ! ہماری جستجو یہ نہیں ہونی چاہیے کہ قیامت کب آئے گی بلکہ ہمارا سوال یہ ہونا چاہیے کہ اس کے لیے ہماری تیاری کیا ہے ؟

دینی و دنیاوی علوم کی ضرورت

میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں جس کے متعلق مجھے کوئی اشکال نہیں ہے کہ یہ دنیاوی علوم و فنون یہ سب ہماری ضرورت کی چیزیں ہیں۔ زبان، لکھائی پڑھائی، حساب کتاب،

بیالوجی، سوشیالوجی، سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ یہ سب ہماری ضرورت کی چیزیں ہیں جن کے بغیر ہماری دنیا کی زندگی منظم نہیں ہوتی اور ہم سلیقے کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کی ضرورت ہمیں کب تک ہے؟ ظاہر بات ہے کہ آنکھ بند ہونے تک۔ کیا آنکھ بند ہونے کے بعد ان میں سے کوئی بھی چیز ہمارے کام کی ہے؟ کیا کوئی مرتا ہوا آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ بھئی آج کل ٹیکنالوجی بہت ترقی کر گئی ہے اس لیے میرے فوت ہونے کے بعد ایک اچھا سا موبائل اور دو تین کمپنیوں کی سمیں میرے پاس رکھ دینا تاکہ میرا وقت ذرا مصروف گزرے۔ یا پھر یہ کہ انٹرنیٹ کنکشن کے ساتھ ایک لیپ ٹاپ رکھ دینا میرا وقت ذرا اچھا گزرے گا۔ یہ ساری چیزیں ہماری ضریات ہیں لیکن آنکھ بند ہونے سے پہلے پہلے کی، آنکھ بند ہوتے ہی ماحول بدل جاتا ہے۔

ایک بات میرے اور آپ کے سوچنے کی ہے کہ آنکھ بند ہوتی ہے یا کھلتی ہے؟ تو عرض ہے کہ اس دنیا میں تو آنکھ بند ہوتی ہے جبکہ اگلے جہان میں آنکھ کھل جاتی ہے۔ حضرت امام محمدؒ ہمارے احناف کے ایک بڑے امام گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بہت سے اعزازت سے نوازتے ہیں۔ امام محمدؒ نے وفات پائی تو کچھ عرصے کے بعد خواب میں کسی دوست کی ان سے ملاقات ہوئی۔ دوست نے پوچھا حضرت! کیا گزری؟ یعنی دنیا و آخرت کی سرحد پار کرنے کے بعد آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ یار کچھ پتہ نہیں چلا۔ مکاتبت کے ایک مسئلہ کا ایک جزئیہ تھا جس پر میں غور کر رہا تھا، ایک دم دیکھا کہ سارا کچھ بدلا ہوا ہے۔ فقہاء کا کام یہی ہے کہ دینی مسائل اور ان کی جزئیات پر غور و فکر کرنا۔

دنیا میں تو یہ ہوتا ہے کہ جب ہم کسی دوسرے ملک جاتے ہیں تو کچھ پابندیاں ہوتی ہیں کہ جی فلاں چیز آپ کے ساتھ جا سکتی ہے لیکن فلاں فلاں چیز ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ایئرپورٹ پر باقاعدہ چیکنگ ہوتی ہے۔ ایئرپورٹ والوں کے پاس ایک فہرست جائز اشیاء کی ہوتی ہے جبکہ دوسری ممنوعہ اشیاء کی۔ اس کے مطابق وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ آپ کی کس چیز کو بارڈر پار لے جانے دیں گے اور کس چیز کو منع کریں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کون سی چیز ہمارے ساتھ دنیا اور آخرت کی سرحد پار کرے گی۔ آنکھ بند ہونے سے پہلے پہلے دنیاوی علوم کی یہ چیزیں ہمارے کام کی ہیں لیکن آنکھ بند ہونے کے بعد ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہماری ضرورت کی ہے اور نہ فائدے کی۔ نہ سائنس نہ ٹیکنالوجی نہ سوشیالوجی نہ بیالوجی کچھ بھی نہیں۔ وہاں قبر کی تنہائی کا ساتھی کون ہوگا؟ وہاں تو اللہ تعالیٰ کے بارے

میں پوچھا جائے گا، دین کے بارے میں پوچھا جائے گا، حضورؐ کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کیا ان صاحبؐ کو جانتے ہو؟ حدیث میں مذکور ہے کہ قبر میں جو سوال و جواب ہوں گے وہاں حضورؐ کا چہرہ مبارک پیش کیا جائے گا، پردے ہٹائے جائیں گے یا چہرے کی شبیہ پیش کی جائے گی، یعنی وہاں کے حالات کے مطابق حضورؐ کی زیارت کروائی جائے گی کہ ان بزرگ کو جانتے ہو کہ یہ کون ہیں؟ چنانچہ موت کی سرحد پار کر کے جو چیزیں ہماری کام آئیں گی وہ قرآن مجید اور سنت نبویؐ کے مطابق اعمال صالحہ ہیں۔

دانا لوگ کہتے ہیں کہ جتنی دیر جہاں رہنا ہو وہاں کے لیے انتظام بھی اتنا ہی کرنا چاہیے۔ اور یہ کامن سینس کی بات ہے اس کے لیے کسی لمبی چوڑی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اگر ایک جگہ تین دن رہنا ہے تو ظاہر ہے تین دن کا بندوبست کروں گا یا چلیں احتیاطاً پانچ دن کا بندوبست کر لوں گا۔ اسی طرح اگر کسی جگہ ایک سال رہنا ہے تو اس کا بندوبست اسی حساب سے کروں گا۔ اور اگر میں نے کسی جگہ مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ظاہر ہے بندوبست بھی ویسا ہی ہوگا۔ تو میں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج کل ہم جب اپنے بچے یا بچی کے متعلق یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اسے دینی درس گاہ میں پانچ، چھ سات سال کے لیے بھیجیں گے کہ یہ دین کا علم سیکھ جائے، تو عام طور پر ہمارے ارد گرد کوئی نہ کوئی مشورہ دینے والا ہوتا ہے کہ یار ٹھیک ہے تم اس بچے کو دینی تعلیم کے لیے بھیج رہے ہو لیکن کیا تم نے اس بچے کے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ کیا ہوگا؟ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک فیوچر اور مستقبل دنیا کے انہی پچاس ساٹھ سال کا نام ہے ان کے حساب سے تو یہ ایک جائز سوال ہے۔ اس وقت ہم جس ملک میں بیٹھے ہیں یہاں کا ماحول تو یہی ہے، ان کے نزدیک تو سب کچھ یہی ہے۔ وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین (الانعام ۲۹) اور کہتے ہیں اس دنیا کی زندگی کے سوا ہمارے لیے اور کوئی زندگی نہیں ہے اور ہم اٹھائے نہیں جائیں گے۔ دراصل یہ بات عقیدے کی ہے، جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہی دنیا کی زندگی ہے اور بس، ایسے لوگوں کے لیے تو یہی فیوچر ہے۔ دس سال، بیس سال، تیس سال جتنا جس کا مقدر ہے۔ لیکن کیا ہم مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ہمارا مستقبل یہی دنیا کی زندگی ہے؟ اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ دنیاوی زندگی تو ہمارے مستقبل کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ ہے۔ کیا برزخ کی زندگی ہمارا فیوچر ہے یا نہیں؟ اور پھر حشر کے پچاس ہزار سال بھی ہمارا فیوچر ہے یا نہیں؟ اور اس سے آگے

غیر معینہ فیوچر خالدین فیھا۔ تو میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ بحیثیت مسلمان ہمیں اپنے فیوچر کے سارے مراحل سامنے رکھنے چاہئیں۔

اگر مجھے اس بات کی فکر ہو کہ دنیا کی زندگی کے فلاں مرحلے میں مجھے فلاں چیز کی ضرورت پیش آئے گی تو مجھے بہر حال اس کی تیاری کرنی چاہیے اور اس کے لیے معلومات اور تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن اس دنیاوی زندگی کے بعد قبر میں جو مراحل مجھے پیش آئیں گے اس کی تعلیم مجھے کہاں سے ملے گی؟ اور پھر حشر میں جو کچھ ہوگا اور مجھے جو مراحل پیش آئیں گے ان معاملات کے لیے مجھے تعلیم کہاں سے ملے گی؟ اور پھر مجھے پل صراط سے بھی گزرنا ہے۔ جناب نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جب پل صراط سے گزریں گے تو کچھ لوگ بجلی کی طرح گزریں گے، کچھ ہوا کی طرح گزریں گے، کچھ گھوڑے کی طرح جائیں گے، کچھ اونٹ کی طرح گزریں گے، اور کچھ لوگ تو گھسٹتے ہوئے جائیں گے۔ چنانچہ یہ دنیاوی زندگی کے بعد کے مراحل طے کرنے کے لیے مجھے معلومات و ترکیبات کہاں سے ملیں گی؟ یہ آخرت کا کورس کس یونیورسٹی میں ہوتا ہے؛ ہارورڈ، کیمبرج یا آکسفورڈ؟ اور کونسا کالج مجھے یہ باتیں بتاتا ہے؟

حضرات محترم! یہ مدارس اور دینی درس گاہیں ہی ہمارے اصل مستقبل کی ہمیں تعلیم دیتی ہیں۔ اس دنیا کی تعلیم بھی ضروری ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ جتنا عرصہ ہم نے اس دنیا میں رہنا ہے اس قدر تعلیم یہاں کے لیے ضروری ہے اور جتنا عرصہ ہم نے اگلی دنیا میں رہنا ہے اسی قدر تعلیم و تیاری وہاں کے لیے ضروری ہے۔

دینی تعلیم کا سوسائٹی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

آج کل بعض دوست سوال کر دیتے ہیں کہ یہ جو کچھ دینی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے اس کا سوسائٹی سے معاشرے کی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ دیکھیں میں کوئی چھوٹی سی چیز بھی استعمال کرتا ہوں تو پہلے اس کی پہچان حاصل کرتا ہوں، مثلاً یہ ایک بوتل ہے۔

1. پہلی بات میں دیکھتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے؟ مجھے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک پلاسٹک کی بنی ہوئی بوتل ہے اور اس کے اندر پانی ہے۔

2. دوسری بات میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ تو یہ پانی میری پیاس بجھانے کے لیے ہے اور میری سہولت کے لیے یہ ایک ڈھکن والی بوتل میں بند ہے۔

3. پھر تیسری بات میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ بوتل کس کمپنی یا فرم کی بنی ہوئی ہے؟ اس سے مجھے یہ اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ میں کس معیار کی چیز استعمال کر رہا ہوں۔

چنانچہ ایک پانی کی بوتل کے تعارف کے لیے میرے لیے یہ تین باتیں معلوم کرنا ضروری ہے کہ یہ کیا چیز ہے، کس مقصد کے لیے ہے اور کس نے بنائی ہے۔ سوال یہ ہے کہ بحیثیت انسان میرے لیے اپنی ذات کا تعارف حاصل کرنا بھی ضروری ہے یا نہیں؟ اس بات پر ذرا غور فرمائیں کہ آج کی سائنس نے انسان کے بارے میں بہت کام کیا ہے لیکن یہ علوم انسان کے بارے میں صرف پہلے سوال کا جواب دیتے ہیں باقی دو سوالوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میڈیکل سائنس کا تو موضوع ہی انسان ہے۔ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے تلووں تک میڈیکل سائنس کا موضوع یہی انسانی جسم ہے اور تحقیق کی خاطر ہزاروں بلکہ لاکھوں بار انسانی جسم کی چیر پھاڑ ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں محاورے میں جسے بال کی کھال اتارنا کہتے ہیں تو واقعتاً میڈیکل سائنس یہی کام کرتی ہے۔ یہ بال کی کھال بھی اتارتے ہیں اور پھر کھال کی کھال بھی اتار دیتے ہیں۔ میڈیکل سائنس ہمیں انسانی جسم کے متعلق بے تحاشا معلومات فراہم کرتی ہے کہ بال کیا ہیں، ہڈی کیا ہے، گوشت کیا ہے، خون کیا ہے، پٹھے اور اعصاب کیا ہیں۔ ہم نے تو یہ تجزیہ بھی کر لیا ہے کہ یہ جو ڈیڑھ دو من کا اور پانچ چھ فٹ کا جسم ہے اس میں فارسفورس کی مقدار کیا ہے، اس میں پانی کتنا ہے، اور فلاں چیز کتنی ہے وغیرہ۔ بہت ساری تحقیق ہو چکی ہے اور مزید ہو رہی ہے۔ لیکن اس ساری جدوجہد کے باوجود مجھے یہ معلومات تو ملتی ہیں کہ میں کیا ہوں اور ان معلومات کے فائدے سے انکار بھی نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی بڑے یقین سے کہی جاتی ہے کہ کائنات کی سب سے پیچیدہ مشینری انسانی جسم ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا کی کوئی مشینری اتنی پیچیدہ نہیں ہے۔ ہزاروں سال سے اس کے میڈیکل تجزیے ہو رہے ہیں اور جدید سائنس نے تو حد کر دی ہے لیکن اس سب کے باوجود آج بھی کوئی ایک سائنس دان یا کوئی ایک سائنسی ادارہ یہ دعوی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ ہم نے اس مشینری کو پوری طرح سمجھ لیا ہے۔ ہر چند سال کے بعد کوئی نئی بات سامنے آجاتی ہے کہ فلاں چیز کا ہمیں پتہ نہیں تھا، یا یہ بات ہمیں اب پتہ چلی ہے کہ فلاں چیز ان مخصوص حالات میں اس طرح کام کرتی ہے۔ اور یہ سلسلہ تو قیامت تک جاری رہے گا۔

عرض یہ ہے کہ کیا میرے لیے اس ایک سوال کا جواب کافی ہے کہ میں بحیثیت انسان کیا چیز ہوں؟ اور یہ جو باقی دو سوالات ہیں کہ میری موجودگی کا مقصد کیا ہے اور مجھے کس نے بنایا ہے؟ کیا ان سوالوں کا جواب مجھے درکار نہیں ہے؟ اور اگر مجھے ان سوالوں کے جوابات چاہئیں تو مجھے یہ کہاں سے ملیں گے؟ ایک پانی کی بوتل کیوں بنائی گئی ہے یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن میں خود کیوں بنایا گیا ہوں کیا مجھے یہ بات معلوم ہے؟ اور اگر معلوم ہے تو کس نے بتائی ہے؟ یعنی میرا اس دنیا میں مقصد وایجنڈا کیا ہے، اور پھر یہ بات کہ میں ''میڈ ان'' کیا ہوں؟ کیا سائنس کا کوئی شعبہ مجھے یہ باتیں بتاتا ہے؟

حضرات گرامی! میری بات کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اس مدرسے کے بغیر میری اپنی ذات کا تعارف مکمل نہیں ہوتا۔ یعنی ایک سوال کا جواب مجھے میڈیکل سائنس دیتی ہے اور باقی دو باتوں کا جواب مجھے یہ دینی مدرسہ دیتا ہے۔ یہ باتیں مجھے قرآن وحدیث سے پتہ چلتی ہیں کہ میں کیوں بنایا گیا ہوں اور مجھے بنانے والا کون ہے۔ تو میں نے یہ چند گزارشات آپ کے اس مدرسے کے قیام کے حوالے سے خوشی کے اظہار کے طور پر کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں، پڑھانے والے اور پڑھانے والیاں، انتظام کرنے والے اور تعاون کرنے والے، سب کو اس علم کی برکات سے دنیا وآخرت میں بہرہ ور فرمائے، آمین یارب العالمین۔

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کا اعزاز

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۷ مئی ۲۰۱۱ء)

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میرے لیے مادر علمی کی حیثیت رکھتا ہے اور میری تدریسی سرگرمیوں کی جولانگاہ بھی ہے۔ میں نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۹ء تک یہاں درس نظامی کی تعلیم حاصل کی ہے اور دورۂ حدیث کے ساتھ رسمی تعلیم سے فراغت بھی یہیں سے پائی ہے۔ عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ نے ۱۹۵۲ء میں اس درسگاہ کا آغاز کیا، پھر ایک دو سال کے بعد والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ بھی شریک کار ہو گئے اور تعلیمی نظام کی سربراہی انہوں نے سنبھال لی۔ ان کے ساتھ ہمارے ایک بزرگ استاذ حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی دامت برکاتہم بھی اس جدوجہد میں ابتدا سے شامل تھے جو آج کل

جامعہ محمدیہ چائنہ چوک اسلام آباد میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں اور ضعف و علالت کے باوجود مسلسل تدریسی خدمات میں مصروف ہیں۔ مجھے تعلیمی و تدریسی ذوق حضرت والد صاحبؒ سے ملا ہے، فکری اور نظریاتی تربیت حضرت صوفی صاحبؒ کے زیر سایہ ہوئی ہے اور عملی سیاست اور تحریکی زندگی میں میرے سب سے پہلے استاذ اور مربی حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی ہیں۔ پہلے دو بزرگ دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ درجات سے نوازیں اور استاذ محترم حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی دامت برکاتہم کا سایہ صحت و عافیت کے ساتھ ہمارے سروں پر تا دیر سلامت رکھیں، آمین یارب العالمین۔

اس وقت جامعہ نصرۃ العلوم کے تذکرے کا باعث گزشتہ دنوں کویت میں تجوید وقراءت کے حوالے سے منعقد ہونے والا بین الاقوامی مقابلہ ہے جس میں جامعہ نصرۃ العلوم کے شعبہ تجوید کے استاذ قاری وسیم اللہ امین نے عالمی سطح پر تیسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ قاری وسیم اللہ امین کا تعلق قلعہ دیدار سنگھ سے ہے، انہوں نے تجوید و قراءت کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم باغبانپورہ گوجرانوالہ میں حاصل کی اور پھر جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تجوید وقراءت کا کورس مکمل کر کے وہیں تدریس کا آغاز کر دیا۔ جامعہ نصرۃ العلوم کے شعبہ تجوید وقراءت کے صدر مدرس مولانا قاری سعید احمد ہمارے عزیز شاگردوں میں سے ہیں، سبع عشرہ کے مستند قاری ہیں اور درس نظامی کے بھی فاضل ہیں، انہوں نے دورۂ حدیث جامعہ نصرۃ العلوم میں کیا، بہت اچھے لہجے میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، تجوید پر ان کا تصنیف کردہ ایک کتابچہ بھی ہے، فن پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے استاذ ہیں، اور اگرچہ جسمانی طور پر معذور ہیں مگر تدریسی اور انتظامی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کا خوبی کے ساتھ مظاہرہ کر کے جامعہ کی نیک نامی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ جامعہ نصرۃ العلوم کے بعض فضلاء اس سے قبل بھی متعدّد بین الاقوامی مقابلوں میں امتیازی پوزیشنیں حاصل کر چکے ہیں:

- ۲۵ جنوری ۲۰۰۷ء کو مکہ مکرمہ میں تحفیظ القرآن کا بین الاقوامی مقابلہ سعودی عرب کے محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام منعقد ہوا جس میں ۴۵ ممالک کے حفاظ شریک ہوئے، اس میں جامعہ نصرۃ العلوم کے فاضل تجوید قاری محمد

فرقان نے پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے پانچویں پوزیشن حاصل کی اور قیمتی انعامات کے حقدار قرار پائے۔

• ۲۳ستمبر ۲۰۰۹ء کو مکہ مکرمہ میں منعقدہ عالمی مقابلے میں پچاس سے زائد ممالک کے حفاظ کے ساتھ شریک ہو کر جامعہ نصرۃ العلوم کے فاضل تجوید قاری محمد طیب اشرفی نے ساتویں پوزیشن حاصل کی۔

• سال رواں کے آغاز یعنی جنوری ۲۰۱۱ء کے پہلے ہفتے کے دوران مکہ مکرمہ میں تحفیظ القرآن الکریم کا بین الاقوامی مقابلہ منعقد ہوا جس کا اہتمام مسجد الحرام میں کیا گیا۔ اس میں پاکستان کی نمائندگی جامعہ نصرۃ العلوم کے شعبہ حفظ کے استاذ قاری محمد یاسین کے فرزند حافظ عمار یاسر نے کی اور تیسری پوزیشن حاصل کر کے ایک لاکھ روپے نقد انعام اور شیلڈ کے مستحق قرار پائے۔ قاری محمد یاسین کا تعلق آزاد کشمیر ضلع باغ کے علاقہ تھب سے ہے اور حافظ عمار یاسر نے نصرۃ العلوم میں حفظ و تجوید کی تعلیم حاصل کی ہے۔

• مذکورہ بالا عالمی مقابلہ ۱۳ اپریل تا ۲۰ اپریل ۲۰۱۱ء دولت کویت کی وزارت اوقاف و شئون اسلامیہ کے زیر اہتمام کویت کے شیراٹن ہوٹل میں ہوا جس میں ۵۵ کے لگ بھگ ممالک کے قراء کرام نے حصہ لیا اور اس میں قاری وسیم اللہ امین نے تیسری پوزیشن حاصل کر کے امیر کویت سے ۹ لاکھ روپے کا نقد انعام اور اعزازی شیلڈ وصول کی۔ یہ بلاشبہ جہاں جامعہ نصرۃ العلوم کے لیے اعزاز ہے وہاں گوجرانوالہ شہر اور پاکستان کے لیے بھی اعزاز ہے کہ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے قاری وسیم اللہ امین نے یہ امتیازی پوزیشن حاصل کی۔

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ۹ مئی ۲۰۱۱ء کو ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جامعہ نصرۃ العلوم کے مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی نے کی جبکہ ملک کے معروف خطیب مولانا عبد الکریم ندیم مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ پاکستان شریعت کونسل کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل مولانا قاری جمیل الرحمان اختر، جمعیت علماء اسلام آزاد جموں و کشمیر کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الحیٔ آف دھیر کوٹ اور باغ آزاد کشمیر کے ضلع مفتی مولانا مفتی عبد الشکور شریک ہوئے جبکہ شہر کے علماء کرام اور طلبہ کی ایک

بڑی تعداد نے بھی شرکت کی۔ مولانا قاری سعید احمد، قاری وسیم اللہ امین اور حافظ عمار یاسر نے تلاوت کلام پاک سے حاضرین کو محظوظ کیا اور مولانا عبد الکریم ندیم نے اپنے مخصوص انداز میں قرآن کریم کی عظمت و حفاظت اور اعجاز و اعزاز کا تذکرہ کرتے ہوئے اس اعزاز پر جامعہ نصرۃ العلوم اور اس کے مذکورہ سپوتوں کو خراج تحسین پیش کیا، جبکہ راقم الحروف نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے شرکائے محفل کا شکریہ ادا کیا۔

اسی طرح ۲۰ مئی کو جامع مسجد صدیق اکبر پیپلز کالونی گوجرانوالہ میں بھی ایک خصوصی تقریب ہوئی جس میں راقم الحروف کے علاوہ مفتی فخر الدین عثمانی، مولانا طارق جیلانی، مولانا ندیم احمد ندیم اور دیگر حضرات نے خطاب کیا اور قاری وسیم اللہ امین اور حافظ عمار یاسر سمیت جامعہ نصرۃ العلوم کے ممتاز فرزندوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس تقریب میں جامع صدیق اکبر کے خطیب مولانا ندیم احمد ندیم کے فرزند کی دستار بندی بھی کی گئی جنہوں نے حال ہی میں قرآن کریم مکمل حفظ کیا ہے۔

راقم الحروف نے اپنی گزارشات میں کہا کہ خیر کے کاموں میں مقابلے کی قرآن کریم نے ترغیب دی ہے اور اچھے کاموں میں صحت مندانہ مقابلہ پر ہی معاشرے اور تمدن کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر انسان میں آگے بڑھنے اور مقابلہ کرنے کا جذبہ نہ ہوتا تو انسانی معاشرہ اور تمدن کبھی تشکیل نہ پاتا اور جنگل کے جانوروں کی طرح انسانی سوسائٹی بھی اسی معیار پر زندگی بسر کرتی۔ قرآن کریم نے ”وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون“ کہہ کر خیر کے کاموں میں مقابلے کی ترغیب دی ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدّد مواقع پر اس مقابلے کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے بلکہ بعض مقابلوں میں خود بھی حصہ لیا ہے۔ آج ہمارے مقابلے جن میدانوں میں ہوتے ہیں وہ مسابقت کے صحیح اور اصل میدان نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور مسابقت کا اصل میدان دین اور علم ہے، خیر کے کام ہیں اور دینی خدمات ہیں۔ اس سے صلاحیتوں میں ترقی ہوتی ہے، استعداد بڑھتی ہے، معاشرے میں خیر کے کاموں کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ اجر و ثواب اور اللہ تعالی کی رضامندی بھی حاصل ہوتی ہے۔

قومی و ملی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت (۲)

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ مئی ۲۰۱۱ء)

مذکورہ بالا عنوان پر مولانا محمد یونس قاسمی، حافظ عبد المنان معاویہ اور راقم الحروف کی گزارشات 'الشریعہ' کے مارچ اور اپریل کے شماروں میں قارئین کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ دونوں طرف سے ضروری باتیں سامنے آچکی ہیں اور اب کسی مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی، مگر مولانا محمد یونس قاسمی نے اپنے تازہ مضمون میں ایک دو باتیں ایسی فرمائی ہیں جن کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

انہوں نے راقم الحروف کے بارے میں فرمایا ہے کہ میں نے قرآن کریم کی کسی منسوخ آیت سے استدلال کیا ہے۔ حیرت کے ساتھ یہ بات پڑھنے کے بعد میں نے اس سلسلے کے اپنے مضامین پر پھر ایک نظر ڈالی ہے، اس لیے کہ میں نے تو اپنے مضامین میں قرآن کریم کی صرف ایک ہی آیت کریمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''وماھم بمومنین'' وہ مومن نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور آیت کریمہ کا حوالہ میرے مضامین میں استدلال کے طور پر موجود نہیں ہے اور اس آیت کے منسوخ ہوجانے کا مجھے علم نہیں ہے۔ اگر اس کے منسوخ ہوجانے پر کوئی حوالہ موجود ہو تو میں اس سے باخبر ہونا چاہوں گا، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ قرآن کریم کے اس جملے میں ان منافقین کے مومن نہ ہونے کی ''خبر'' دی گئی ہے جبکہ نسخ صرف احکام میں ہوتا ہے۔ ایمانیات اور اخبار نسخ کے دائرے کے امور نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے قرآن کریم کے حوالے سے ''مسجد ضرار'' کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے نسخ کی کوئی صورت بھی کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے اپنے سارے استدلال کی بنیاد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی طرز عمل اور معاشرتی رویے پر رکھی ہے کہ ان منافقین کے مومن نہ ہونے کے باوجود معاشرتی معاملات میں یہ لوگ نبی اکرمؐ کے ساتھ مسلسل شریک رہے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہ صرف معاشرتی امور بلکہ مذہبی معاملات میں بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے میں ہی مصلحت سمجھی ہے اور یہ سلسلہ نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ میں آخر تک رہا ہے۔ ''اخرج فانک منافق'' قسم کا کوئی واقعہ اگر ہوا بھی ہے تو وہ شخصی واقعہ ہے جسے نبی اکرمؐ کے عمومی رویے اور پالیسی کا آئینہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ طرز استدلال اہل

حدیث حضرات کا ہے کہ کسی جزوی واقعہ یا ایک آدھ روایت کو بنیاد بنا کر پورے موقف کی عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ احناف کا طرز استدلال اس سے بالکل مختلف ہے، ان کے ہاں مجموعی صورتحال کو سامنے رکھا جاتا ہے، صحابہ کرامؓ کے اجماعی تعامل کو دیکھا جاتا ہے، اور تمام متعلقہ روایات جو میسر ہوں ان کا جائزہ لے کر موقف طے کیا جاتا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ان منافقین کے بارے میں یہ تھا کہ چند معروف منافقین کے علاوہ صحابہ کرامؓ کی صفوں میں موجود ان منافقین کی نشاندہی تک نہیں کی گئی۔ انہیں الگ کرنے اور معاشرتی طور پر انہیں علیحدہ قرار دینا تو بعد کی بات ہے، اس سے قبل ان کی جو نشاندہی ضروری قرار پاتی ہے اس کا مرحلہ بھی نہیں آیا۔ جناب نبی اکرمؐ نے صرف چودہ منافقین کے نام بتائے اور وہ بھی صرف حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان میں سے کسی کا نام اور کسی کو نہیں بتائیں گے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے انہیں کئی بار کرید کر پوچھنا چاہا مگر حضرت حذیفہؓ نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو بھی ان میں سے کسی منافق کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ جس پر حضرت عمرؓ نے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ کسی عام شخص کے جنازے پر اگر حضرت حذیفہؓ موجود ہوتے تو حضرت عمرؓ جنازہ پڑھتے تھے ورنہ یہ سوچ کر جنازہ پڑھنے سے گریز کرتے تھے کہ یہ میت کہیں ان چودہ منافقین میں سے کسی کی نہ ہو۔ جہاں منافقین کے ناموں تک کو خفیہ رکھنے کا اس قدر اہتمام موجود تھا وہاں معاشرتی طور پر انہیں الگ کر دینے اور ان کا بائیکاٹ کر دینے کی بات عملی طور پر کس طرح ممکن ہے؟

مولانا محمد یونس قاسمی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ منافقین کے معاشرتی بائیکاٹ کی بات خود قرآن کریم نے ایک جگہ کی ہے جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۵ میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو منافقین جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں آئے تھے، ان سے کہا گیا کہ اگلی جنگ میں تم مسلمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکو گے۔ چنانچہ غزوۂ خیبر میں وہ لوگ خواہش کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ نہیں جا سکے تھے۔ لیکن یہ مقاطعہ وقتی اور عارضی تھا اس لیے کہ سورۃ الفتح کی اس سے اگلی آیت ۱۶ میں ان منافقین سے کہا گیا ہے کہ:

> ”تمھیں عنقریب ایک اور قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی جو بڑی سخت پکڑ والی قوم ہے۔ تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں اچھا اجر عطا کریں گے اور اگر تم

پھر گئے جیسے تم اس سے پہلے پھر جاتے رہے ہو تو اللہ تعالیٰ تمھیں سخت عذاب سے دوچار کر دے گا۔"

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ یہ سخت پکڑ والی قوم (اولی باس شدید) جس کے مقابلے کے لیے منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کی قرآن کریم خود دعوت دے رہا ہے، مسیلمہ کذاب کی قوم تھی اور وہ قبیلے تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ اس لیے یہ کہنا کہ جناب نبی اکرمؐ نے آخری دور میں منافقین کو مسجدوں سے نکال دیا تھا اور انہیں اپنی صفوں سے الگ کر دیا تھا، ایک خواہش تو ہو سکتی ہے مگر امر واقعہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جب منافقین نے اپنی الگ مسجد بنا کر جداگانہ تشخص قائم کرنا چاہا تو قرآن کریم نے اسے "مسجد ضرار" قرار دے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں جانے سے منع کر دیا تھا اور جناب نبی اکرمؐ نے اس "مسجد ضرار" کو گرا کر بلکہ نذر آتش کر کے ان کے علیحدہ تشخص کے امکان کو ہی ختم کر دیا تھا۔

میری طالب علمانہ رائے کے مطابق وہ منافقین جنہیں قرآن کریم نے صراحتاً "وما ہم بمومنین" قرار دیا ہے اور وہ متذبذب اعرابی مسلمان جن کا قرآن کریم نے "لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا" کے عنوان سے ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی پالیسی یہ رہی ہے کہ انہیں الگ تشخص قائم نہ کرنے دیا جائے بلکہ انہیں اپنے ساتھ رکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی سرگرمیوں پر پوری نظر رکھتے ہوئے ان کے شر سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی حکیمانہ پالیسی کا نتیجہ تھا کہ وہ منافقین جن کی تعداد غزوۂ احد کے موقع پر ایک ہزار میں سے تین سو بتائی جاتی ہے، اپنا الگ تشخص اور مورچہ قائم نہ کر سکنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ مسلم سوسائٹی میں تحلیل ہوتے چلے گئے اور جنگ یمامہ اور مرتدین کے خلاف جہاد کے بعد ان کا کوئی اکا دکا نشان بھی تاریخ کے تذکرے میں موجود نہیں ملتا۔

مولانا محمد یونس قاسمی نے ایک بار پھر فتووں کی بات چھیڑی ہے جبکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ معاملہ فتاویٰ کے دائرے کا نہیں بلکہ معاشرتی اور قومی ضروریات کے دائرے کا ہے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمیں اس فتوے سے پوری طرح اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے خاندانی شرعی قوانین کے تحفظ کے لیے "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کے عنوان سے جو مشترکہ فورم کام کر رہا ہے اور اہل تشیع بھی اس کا حصہ ہیں، کیا دارالعلوم دیوبند اس سے الگ تھلگ ہے؟ اس بورڈ کی

تو بنیاد ہی حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قدس اللہ سرہ العزیز کی صدارت میں رکھی گئی تھی اور وہ تا حیات اس کے صدر رہے ہیں۔ اور کیا حرمین شریفین میں اہل تشیع کو مسلمانوں کے ساتھ نمازوں، روزوں، حج، تراویح اور دیگر عبادات میں شریک ہونے سے روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا ہے؟ جن چند بزرگوں نے مقاطعہ کی بات کی ہے، وہ بھی ہمارے بزرگ ہیں، اکابر ہیں اور قابل احترام ہیں، لیکن آج بھی علماء امت کا اجماعی تعامل کیا ہے؟ اور ہمارے مراکز کی عملی پالیسی کیا ہے؟ اگر ہم شخصی آرا اور اجماعی تعامل میں فرق محسوس کرتے ہوئے اپنے اندر معروضی حقائق اور ملی ضروریات کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکیں تو اکابر کے عملی فیصلوں کی حکمتوں کو سمجھنا آج بھی مشکل نہیں ہے۔

تلاوتِ قرآن کریم کا ذوق اور ضرورت

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۲۲ اپریل ۲۰۱۱ء)

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں حفظ قرآن کریم کی کلاس کے آغاز کی تقریب سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ بحمد اللہ تعالیٰ آج ہم الشریعہ اکادمی میں حفظ قرآن کریم کی کلاس کا باقاعدہ آغاز کر رہے ہیں، ناظرہ اور قاعدہ کی کلاس تو اکادمی کے آغاز سے جاری ہے اور روزانہ صبح محلہ کے بچے یہاں آکر قاعدہ اور ناظرہ قرآن کریم کے ساتھ ضروری دینی امور کی تعلیم حاصل کرتے ہیں مگر حفظ قرآن کریم کی باقاعدہ کلاس آج شروع ہو رہی ہے جس میں بچوں کو حفظ قرآن کریم اور ضروریات دین کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ ریاضی اور انگلش کی ضروری تعلیم بھی دی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ، تاکہ وہ حفظ قرآن کریم کی تکمیل کے بعد حسب استعداد مڈل یا میٹرک کا امتحان دے سکیں۔ ابھی میری گفتگو کے بعد ہمارے فاضل دوست مولانا قاری سعید احمد، جو ہمارے عزیز شاگرد ہیں اور جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شعبہ تجوید کے صدر مدرس ہیں، حفظ کی کلاس کو پہلا سبق پڑھا کر اس کار خیر کا آغاز کریں گے۔ میں اس موقع پر اس پیشرفت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے قرآن کریم کی تعلیم بالخصوص حفظ کی اہمیت و ضرورت کے حوالہ سے کچھ ضروری گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

قرآن کی تلاوت اور حفظ ہماری ضروریات میں سے ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جس گھر میں قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی نہیں پڑھا جاتا وہ ویران اور اجڑا ہوا گھر ہے۔ جبکہ ایک روایت کے مطابق ارشاد نبویؐ یہ ہے کہ جس دل میں قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی نہیں ہے وہ اجڑے ہوئے گھر کی طرح ہے۔ گھر میں قرآن کریم کا کچھ حصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہو اور گھر کے افراد کا قرآن کریم کی تلاوت کا کچھ نہ کچھ معمول ہو، جبکہ دل میں قرآن کریم کا کچھ حصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان مرد یا عورت کو قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد ہو اور وہ وقتاً فوقتاً اس کی تلاوت کرتا رہے۔ گھر میں قرآن کریم کی تلاوت ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے نازل ہوں گے، سکون و طمانیت کا ماحول ہوگا اور روحانی آبادی میسر آئے گی۔ جس کا ہمارے گھروں میں فقدان ہوتا جا رہا ہے اور جس کے کم ہونے سے گھروں میں بے برکتی، جھگڑے اور تنازعات مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ ہمیں عام طور پر یہ شکایت تو ہوتی ہے کہ گھروں میں نحوست بڑھ رہی ہے، بے برکتی میں اضافہ ہو رہا ہے اور بے اعتمادی اور بے سکونی جڑ پکڑتی جا رہی ہے لیکن ہم نے اس کے اسباب پر کبھی غور نہیں کیا، جبکہ جناب نبی اکرمؐ نے اس کی نشاندہی فرمائی ہے۔

آنجنابؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ آباد نہیں بلکہ اجڑا ہوا گھر ہے اور ایک حدیث نبویؐ میں فرمایا کہ گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ گویا جس گھر میں نماز نہیں پڑھی جاتی وہ قبرستان ہے اور جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ اجڑا ہوا گھر ہے، ہمیں اگر اپنے گھروں کو اجڑنے سے بچانا ہے اور قبرستان کی بجائے آبادی کا ماحول دینا ہے تو اس کے لیے قرآن کریم کی تلاوت، نماز کی ادائیگی، ذکر الٰہی کا اہتمام، درود شریف کا معمول اور خیر کے کاموں کا ماحول اپنے گھروں میں پیدا کرنا ہوگا۔ یہ ہماری گھریلو ضرورت ہے، اس ضرورت کو پورا کرنے میں یہ دینی مدارس ہماری مدد کرتے ہیں جو ہمارے بچوں کو قرآن کریم پڑھاتے ہیں اور حفظ کراتے ہیں تاکہ ہمارے گھروں میں قرآن کریم کی تلاوت و قراءت کا ماحول قائم ہو سکے۔

قرآن کریم کے کچھ نہ کچھ حصے کا یاد ہونا بحیثیت مسلمان ہماری شخصی ضرورت بھی ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہم پر فرض ہے جو ہم نے بہر حال ادا کرنی ہے، ان پانچ نمازوں کے فرائض اور مؤکدہ سنتوں کی رکعتیں شمار کر کے اندازہ کر لیں کہ ایک مسلمان مرد یا عورت کو

پانچ نمازیں سنت کے مطابق ادا کرنے کے لئے کم از کم کتنا قرآن کریم یاد ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی تین چار سورتیں یاد کر کے ساری نمازیں انہی کے ساتھ پڑھ لی جاتی ہیں اور زندگی بھر اسی کا معمول رہتا ہے۔ نماز ادا ہو جانے کی حد تک تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے نماز ہو جاتی یہ لیکن سنت کے مطابق نمازیں ادا نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ آپ نمازوں میں سورتیں بدل بدل کر پڑھتے تھے، فجر میں سورتیں اور ہوتی تھیں، ظہر میں سورتیں اور ہوتی تھیں، عصر میں اس سے مختلف ہوتی تھیں اور مغرب و عشاء میں ان سے الگ سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ پھر فجر میں لمبی سورتیں پڑھتے تھے اور ظہر، عصر اور عشاء میں درمیانی سورتوں کی قراءت کرتے تھے، جبکہ مغرب میں عام طور پر چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے۔ اس ساری صورتحال کو سامنے رکھ کر حساب لگائیے کہ سنت کے مطابق نمازیں پڑھنے کے لیے ایک مسلمان کو کم سے کم کتنا قرآن کریم زبانی یاد ہونا چاہیے۔ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اس مسئلہ کا جائزہ لے کر طے کریں کہ قرآن کریم کا کتنا حصہ اس حوالہ سے ہمیں بہرحال یاد ہونا چاہیے۔ میرا ایک محتاط سا اندازہ ہے کہ کم از کم آخری نصف پارہ یاد کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے بہرحال لازمی ہے، اس سے کم میں کسی طرح گزارہ نہیں ہو گا۔ اس لیے قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد ہونا ہم سب کی ضرورت ہے اور یہ سہولت ہمیں ان دینی مدارس و مکاتب سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

ہماری ضروریات کے بہت سے دائروں میں قرآن کریم کا پڑھنا اور یاد کرنا لازمی ہے جس میں سے صرف دو کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ ہماری اس دنیا کی ضروریات ہیں اور شخصی اور خاندانی ضروریات ہیں جن سے ہم کسی طرح صرف نظر نہیں کر سکتے۔ جبکہ ہماری اصل زندگی جو آخرت کی زندگی ہے وہاں کی تو ساری ضروریات اور تقاضے قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی سیرت و سنت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس حافظ نے قرآن کریم یاد کرنے کے بعد اسے یاد رکھا اور اس پر عمل کیا اسے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ اپنے خاندان اور برادری کے ایسے دس افراد اپنے ساتھ جنت میں لے جاؤ جن کے لیے جہنم واجب ہو چکی ہے۔ یہ حافظ کا کوٹہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے خاندان کے جہنم کے حقدار دس افراد کو جنت میں لے جائے گا۔ اب ہمیں اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم لوگ جس طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہمارا اٹھنا بیٹھنا اور کھانا

پینا جس طرح کا ہے اس کو سامنے رکھ کر ہم دیکھ لیں کہ قیامت کا دن تو ہوگا، اللہ تعالیٰ کی عدالت بھی ہوگی، حشر کا میدان بھی ہوگا اور عدالت میں پیشی بھی ہوگی، اگر ہماری پیشی پر اللہ تعالیٰ یہ فرمادیں کہ تمہارا فیصلہ میرٹ پر ہوگا اور تمہاری فائل کے مطابق ہوگا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ کیا ہم اپنے میرٹ اور فائل کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم کے ساتھ ہماری حفاظت فرمائیں، ہم سب اپنی فائل اور میرٹ کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم میں سے کسی میں یہ حوصلہ نہیں ہے کہ حشر کے میدان میں کسی جگہ بھی اپنے میرٹ اور فائل کا حوالہ دے سکے۔ دنیا میں کسی جگہ اگر میرٹ کام نہ دے اور کامیابی کے درجہ تک نہ پہنچ سکے تو ہم کوٹہ تلاش کیا کرتے ہیں اور سفارش ڈھونڈتے ہیں، اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ قیامت کے دن حشر میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیشی سے قبل یا تو اپنا میرٹ درست کرلینا چاہیے یا پھر ایک دو کوٹے والے سفارشیوں کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ اور ہر خاندان کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اس کے پاس ایک دو ایسے حافظ ضرور ہوں جو دس بیس افراد کے لیے سفارش اور نجات کا ذریعہ بن سکیں۔

قرآن کریم کی تلاوت کا کچھ نہ کچھ معمول رکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور اس کی جناب نبی اکرمؐ نے تلقین فرمائی ہے۔ خود جناب نبی کریمؐ کا یہ ذوق تھا اور حضرات صحابہ کرامؓ کا ذوق اور معمول بھی تھا۔ صحابہ کرامؓ میں سے دو بزرگوں نے جو بڑے قاریوں میں سے تھے اس سلسلہ میں اپنا اپنا ذوق بیان کیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے ایک بار حضرت معاذ بن جبلؓ نے سوال کیا کہ آپ قرآن کریم کس طرح پڑھتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت قرآن کریم پڑھتا رہتا ہوں۔ مگر جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے یہی سوال کیا تو انہوں نے اپنا ذوق اس سے مختلف بیان فرمایا، انہوں نے کہا کہ میں رات کو اچھی طرح نیند کر کے تازہ دم اور فریش ہونے کے بعد پورے اہتمام کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہوں اور اس نیت کے ساتھ نیند کو بھی عبادت شمار کرتا ہوں کہ اٹھ کر تازہ دم ہو کر قرآن کریم کی تلاوت کروں گا۔

چلتے پھرتے قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہنے کا معمول میں نے ایک بزرگ میں دیکھا ہے۔ مولانا حافظ شفیق الرحمنؒ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے پرانے بزرگوں میں سے تھے اور مدرسہ کی کمیٹی کے صدر بھی رہے ہیں۔ بازار سید نگری میں کریانہ کی دکان کرتے تھے، ان سے دکان پر کافی طلبہ نے قرآن کریم حفظ کیا ہے جہاں ان کی مستقل کلاس ہوتی

تھی۔ وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں قرآن کریم پڑھتے رہتے تھے۔ ہم جب بھی دیکھتے ان کے ہونٹ ہل رہے ہوتے اور وہ قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف رہتے۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! آپ دکان بھی کرتے ہیں، باقی سارے کام بھی کرتے ہیں اور بچوں کو پڑھاتے بھی ہیں، اس سب کچھ کے ساتھ آپ روزانہ کتنی تلاوت کر لیتے ہیں، فرمانے لگے کہ کم و بیش اٹھارہ پارے یومیہ تو میرا معمول ہے اس سے زیادہ بھی کبھی پڑھ لیتا ہوں اور بائیس پاروں تک بھی ایک بار پڑھ لیا تھا۔ ایک اور سوال بھی میں نے ان سے کیا جسے دل لگی سمجھ لیجئے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ غسل خانے میں بھی قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہوں، ہنس کر کہا کہ ہاں کبھی بے خیالی میں ایسا ہو جاتا ہے مگر خیال آنے پر میں چونک کر منہ بند کر لیا کرتا ہوں۔

بہر حال قرآن کریم کی تلاوت کسی بھی طریقہ سے اور کسی بھی ذوق کے ساتھ کی جائے، ہماری دینی ضرورت ہے اور ہمارے دلوں اور گھروں کی آبادی اور خیر و برکت کا ذریعہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

بوسیدہ مصاحف و اوراق کو بے حرمتی سے بچانے کی عملی صورتیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱ اپریل ۲۰۱۱ء)

قرآن کریم کے بوسیدہ اوراق اور شہید ہو جانے والے نسخوں کا مسئلہ ہر دور میں زیر بحث رہا ہے۔ ان بوسیدہ مصاحف اور اوراق کو بے حرمتی سے بچانے کی مختلف عملی صورتیں سامنے آتی رہی ہیں جن میں انہیں نذر آتش کر کے راکھ کو کسی محفوظ جگہ دفن کر دینے، کسی پرانے کنویں میں ڈال دینے یا الگ تھلگ زمین میں دفن کر دینے کے طریقے ہمارے ہاں قابل استعمال رہے ہیں۔ جبکہ نذر آتش کر دینے کے طریقے پر بحث بھی ہوتی رہی ہے کہ کیا یہ بجائے خود بے حرمتی کے زمرے میں تو شمار نہیں ہوتا؟ اس پر بعض مقامات پر جھگڑوں اور تنازعات کی صورت بھی پیدا ہو جاتی رہی ہے۔ ان میں ایک صورت یہ بھی تھی کہ کسی جاری نہر میں ایسے اوراق کو ڈال دیا جائے تاکہ پانی کے ساتھ وہ بھی بہہ جائیں لیکن لاہور کے اندر گندے نالے والی نہر میں، جس میں شہر کا گندا پانی بھی شامل ہو جاتا ہے،

ایسے مقدس اوراق کو بہتا دیکھ کر کچھ حساس مسلمان پریشان ہو گئے۔ پھر جب اس بات کا انہوں نے قدرے تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا تو صورتحال پریشانی سے بڑھ کر اضطراب اور بے چینی کا موجب بنتی گئی کہ گندگی کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ مقدار میں مقدس اوراق اس نہر میں موجود پائے گئے۔

ان حساس مسلمانوں میں ایک ناظم الدین صاحب بھی ہیں جو لاہور کے ایک کاروباری بزرگ ہیں اور گزشتہ ۲۵ برس سے مقدس اوراق کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ انہوں نے نہر سے ایسے مقدس اوراق کو نکال کر صاف کرنے اور شہر کی مساجد سے جمع کرنے کا کام سنبھال لیا اور کوئٹہ میں واقع ایک پہاڑ کے غار میں جو ''جبل نور القرآن'' کے نام سے معروف ہو گیا ہے، ہزاروں بوریاں پہنچائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وسیع غار میں دس لاکھ بوریاں ذخیرہ کرنے کی گنجائش موجود ہے جبکہ ناظم الدین صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے دو سال کے عرصے میں ۲۳ ہزار بوریاں اس غار تک پہنچانے کی سعادت حاصل کی۔ دوسری طرف وہ ارباب اقتدار کو بھی توجہ دلاتے رہے کہ وہ اس سلسلہ میں قانون سازی کریں کیونکہ قرآن کریم کے مقدس مصاحف اور اوراق کے جلد بوسیدہ ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کریم بہت ہلکے کاغذ پر طبع ہوتا آ رہا ہے جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ ہلکے کاغذ پر قرآن کریم کی طباعت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عام آدمی کو کم ہدیہ پر قرآن کریم میسر آ سکے لیکن اس سے جو مسائل پیدا ہوئے وہ پریشان کن ہیں۔

- اس سلسلہ میں سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں قومی اسمبلی نے ایک ایکٹ منظور کیا جس میں پابندی لگا دی گئی کہ ۵۲ گرام وزن سے کم معیار کے کاغذ پر قرآن کریم طبع نہیں کیا جا سکتا۔ پابندی تو لگا دی گئی مگر اس پر کوئی ایسی سزا مقرر نہ کی گئی جس سے یہ عمل رک سکے۔
- ۲۰۰۹ء میں اس ایکٹ میں ترمیم کر کے تین سال قید اور ۲۵ ہزار روپے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ ناظم الدین صاحب کی کوششوں سے یہ مسئلہ قومی اسمبلی، سینٹ آف پاکستان اور ضلع کونسل لاہور میں بھی زیر بحث آتا رہا۔

• ۲۰۰۲ء میں سٹی گورنمنٹ لاہور کے ۱۶۶ ارکان کے دستخطوں سے یہ طے پایا کہ قرآن کریم کی طباعت کم از کم ۶۸ گرام وزن کے کاغذ پر ہوگی اور اس مقصد کے لیے اس سے کم معیار کا کاغذ استعمال کرنا جرم ہوگا۔

• ۲۰۰۴ء کے دوران قومی اسمبلی میں مولانا عبد المالک اور جناب لیاقت بلوچ کی تحریک پر ”قرآن بل“ زیر بحث آیا جبکہ سینٹ میں متحدہ مجلس عمل کی ڈاکٹر فردوس کوثر نے اس بل کی تحریک کی جس پر مولانا سمیع الحق کی سربراہی میں اسٹینڈنگ کمیٹی بنائی گئی مگر کوئی عملی پیشرفت نہ ہوسکی۔

• ۲۰۰۸ء میں اس وقت کی قومی اسمبلی میں چودھری برجیس طاہر، مسز شکیلہ خانم راشد، مسز بشریٰ رحمان اور ڈاکٹر دانیال عزیز نے یہ مسئلہ اٹھایا مگر یہ مسئلہ طے ہوجانے کے مرحلے میں تھا کہ دستور پاکستان کی ۱۹ویں ترمیم کے تحت اس قسم کے مسائل صوبائی حکومتوں کے دائرۂ اختیار میں منتقل ہوگئے۔

• اور اب جہاں پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں اس مسئلہ پر ایک بل لانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں وہاں لاہور ہائی کورٹ میں ایک رٹ بھی جسٹس شیخ احمد فاروق کے ہاں زیر بحث ہے۔ اس سے قبل جب یہ بل قومی اسمبلی میں زیر بحث تھا تو صوبائی حکومتوں سے بھی استفسار کیا گیا جس پر پنجاب، سندھ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی حکومتوں نے اس سے اتفاق کا اظہار کیا۔

اس کے ساتھ اس سلسلہ میں پنجاب قرآن بورڈ کی جدوجہد پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جو چودھری پرویز الٰہی کی حکومت کے دوران قائم ہوا اور ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے بورڈ نے مختلف مسائل کے حوالے سے خاصی سرگرمی دکھائی۔ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری پنجاب قرآن بورڈ کے چیئرمین تھے جو ذاتی طور پر بھی بہت متحرک شخصیت ہیں۔ اس دور میں تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کو جمع کر کے مشورہ کیا گیا کہ بہتر اور معیاری کاغذ پر قرآن کریم کی طباعت کو یقینی بنانے کے لیے قانونی اقدامات کے ساتھ ساتھ بوسیدہ اور ناقابل استعمال ہوجانے والے کاغذات کو باوقار طریقے سے ٹھکانے لگانے کے لیے کیا صورت اختیار کی جانی چاہیے۔ راقم الحروف بھی پنجاب قرآن بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے ان اجلاسوں میں شریک ہوتا رہا اور ان سرگرمیوں کا حصہ چلا آرہا ہے۔ چنانچہ تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کی باہمی مشاورت کے ساتھ طے پایا کہ اس مسئلہ کا سب سے بہتر حل

یہ ہے کہ ایسے مقدس اوراق کو جمع کرنے کا اہتمام کیا جائے اور انہیں ری سائیکل کر کے دوبارہ کاغذ کی شکل دینے کی عملی صورت پیدا کی جائے۔ اس پر محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام مختلف شہروں میں ’’قرآن محل‘‘ قائم کیے گئے تاکہ مساجد و مدارس اور دیگر مراکز سے ایسے مقدس اوراق کو وہاں جمع کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی لاہور کی ایک فیکٹری کے ساتھ ان اوراق کی ری سائیکلنگ کا معاملہ طے پا گیا جس کے تحت یہ کام ایک حد تک تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔

پنجاب قرآن بورڈ نے ایک اہم فیصلہ یہ کیا کہ قرآن کریم کے مقدس اوراق کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی تعلیمات کے فروغ پر بھی کام کیا جائے اور اس کے لیے ایک بڑا مرکز لاہور میں تعمیر کیا جائے۔ اس فیصلہ پر لاہور کے علاقے اپر مال اسکیم میں ’’قرآن کمپلیکس‘‘ کے نام سے ایک وسیع اور خوبصورت عمارت تعمیر کی جا چکی ہے اور اس میں قرآن کریم کی تعلیمات پر ریسرچ اور فروغ کے مختلف پروگراموں کو ترتیب دینے کے علاوہ سیرت اکیڈمی کے عنوان سے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور اسوہ و سنت کے مختلف پہلوؤں پر ریسرچ اور ان کے فروغ کا پروگرام بھی زیر تجویز ہے۔ یہ پروگرام اگر سنجیدگی کے ساتھ تکمیل کی طرف پیشرفت کر سکے تو بہت بڑی علمی اور دینی خدمت ہوگی۔ پنجاب قرآن بورڈ کی نئی تشکیل میں علامہ احمد علی قصوری اس کے چیئرمین ہیں جو فاضل عالم دین اور دانشور ہیں اور دینی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ لیکن ان کے چیئرمین بننے کے بعد سے بورڈ کے ارکان کو شکایت ہے کہ پنجاب قرآن بورڈ پہلے کی طرح متحرک نہیں رہا جبکہ مولانا احمد علی قصوری کو شکوہ ہے کہ انہیں بورڈ کے پروگراموں کو آگے بڑھانے اور متحرک کرنے کے لیے مطلوبہ وسائل اور ضروری اسباب میسر نہیں ہیں۔

چند روز قبل پنجاب قرآن بورڈ کا اجلاس قرآن کمپلیکس میں علامہ احمد علی قصوری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں حکومت پنجاب کے سیکرٹری اوقاف و مذہبی امور جناب طارق محمود پاشا بھی شریک تھے۔ راقم الحروف بھی اس اجلاس میں حاضر تھا، اس موقع پر ہلکے پھلکے انداز میں ان دونوں شکووں کا اظہار ہوا جس پر صوبائی سیکرٹری اوقاف نے وعدہ کیا کہ وہ بورڈ کے کاموں اور قرآن کمپلیکس کے پروگراموں کے لیے ضروری فنڈز فراہم

کرنے میں ذاتی دلچسپی لیں گے اور نئے مالی سال میں بورڈ کے چیئرمین صاحب کی یہ شکایت باقی نہیں رہے گی۔

اس وقت قرآن کریم کے تقدس کا یہ مسئلہ تین مختلف فورموں پر زیر بحث ہے۔ صوبائی اسمبلی میں قرآن بل لانے کی تیاری ہو رہی ہے بلکہ بتایا گیا ہے کہ بل وزارت قانون کی طرف سے تیار ہے صرف اسمبلی میں پیش کر کے اس کی منظوری لینا باقی ہے۔ مگر اس سلسلہ میں بعض حلقوں کے کچھ تحفظات بھی ہیں مثلاً یہ کہ اس بل کی تیاری اور اس کی تفصیلات طے کرنے میں پنجاب قرآن بورڈ کو اعتماد میں نہیں لیا گیا جو خود حکومت پنجاب کا قائم کردہ ادارہ ہے۔ دوسری طرف پنجاب قرآن بورڈ اپنے فورم پر اس اہم کام کے لیے متحرک ہے اور تیسری طرف لاہور ہائی کورٹ میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث ہے۔

ہماری خواہش اور درخواست ہے کہ ان تینوں کاموں کو یکجا ہونا چاہیے۔ صوبائی وزارت قانون کو چاہیے کہ وہ بل اسمبلی میں پیش کرنے سے قبل لاہور ہائی کورٹ اور پنجاب قرآن بورڈ دونوں کو اعتماد میں لے کر "قرآن بل" کو آخری شکل دے اور اسے جلد از جلد منظور کروانے کا اہتمام کیا جائے۔ صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ خان اور وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف میں سے کسی کو اس مسئلہ کی اہمیت اور باہمی مفاہمت کی ضرورت سے انکار نہیں ہوگا، بات صرف دلچسپی اور توجہ کی ہے، اگر ان دونوں حضرات کی توجہ اور دلچسپی کا تھوڑا سا رخ اس جانب ہو جائے تو یہ محنت بہت اچھے طریقے سے نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم کو نذر آتش کرنے کی مذموم کاروائی

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ اپریل ۲۰۱۱ء)

امریکی پادری ٹیری جونز کی طرف سے قرآن کریم کو نذر آتش کرنے کی مذموم کاروائی کے بعد پاکستان بھر میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے جن میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہو رہے ہیں اور امریکی پادری کی مذمت کرتے ہوئے امریکی حکومت سے اس کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جبکہ صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری نے بھی امریکی حکومت سے کہا ہے کہ وہ اس ملعون پادری کے خلاف کاروائی کرے کیونکہ اس نے یہ شرمناک حرکت کر کے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مکافرت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے اس کا اعجاز اور تاثیر آج بھی دنیا میں پورے وقار کے ساتھ ایک زندہ حقیقت کے طور پر لوگوں کے مشاہدہ میں ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت اور حفظ و تجوید کا دائرہ پوری دنیا میں وسیع سے وسیع ہوتا جا رہا ہے، اس کے مطالعہ کی طرف رغبت بڑھ رہی ہے، اس کے درس و تعلیم کے حلقے پھیلتے جا رہے ہیں، اسے پڑھ کر ہزاروں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں اور اس کے احکام و قوانین میں آج کے عالمی مسائل کے لیے راہنمائی تلاش کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے ایسی مذموم حرکات سے قرآن کریم پر تو کسی پہلو سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ معاندین کی یہ مذموم حرکات قرآن کریم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور پھیلتے ہوئے دائرہ اثر پر ان کی شدید جھنجھلاہٹ اور مایوسانہ ردعمل کی علامت ہے، البتہ مسلمانوں کے جذبات ضرور مجروح ہوتے ہیں اور ان کے جذبات و اشتعال میں اضافہ ہوتا ہے جو قرآن کریم کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کا اظہار اور ان کی ایمانی غیرت کا تقاضہ ہے۔

ہمارے خیال میں اس قسم کی شرمناک حرکتوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا بھر میں قرآن کریم کی طرف لوگوں کے مسلسل رجوع سے پریشان ہو کر جان بوجھ کر ایسا کیا جا رہا ہے تاکہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان خلیج کو بڑھایا جائے اور منافرت کی فضا فروغ دے کر مسیحی دنیا میں قرآن کریم کے مطالعہ کے فروغ کو روکا جا سکے، مگر کیا ایسے ہو سکے گا؟ ماضی کے تجربات اس کی نفی کرتے ہیں، مغرب کے متعصب جنونیوں نے جب بھی قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں منفی اور معاندانہ کاروائیاں کی ہیں ان کی یہ حرکتیں قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی سے واقفیت حاصل کرنے کے رجحان میں اضافہ کا سبب بنی ہیں اور اب بھی یقیناً ایسا ہی ہو گا، اس لیے اس حوالہ سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ البتہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور مسلسل کرتے چلے جانے سے دنیا میں جو فضا فروغ پا رہی ہے مغربی قوتوں کو اس کے نتائج سے ضرور آگاہ رہنا چاہیے کہ خود ان کا اپنا مفاد اسی میں ہے۔

ہم اس سلسلہ میں قومی جذبات و اضطراب کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور جہاں اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ دیانت و انصاف سے کام لیتے ہوئے مذہبی شعائر و شخصیات کی توہین کو عالمی سطح پر جرائم میں شامل کرے اور ان کے بارے میں قانون سازی کرے، وہاں مغربی حکومتوں سے بھی ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ ایسے جنونیوں کو کنٹرول

کریں اور انہیں قرار واقعی سزا دے کر دنیا بھر کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے احترام کا مظاہرہ کریں۔ ہمارے خیال میں یہ سب سے زیادہ مسلم سربراہ کانفرنس (او آئی سی) کی ذمہ داری ہے کہ وہ توہین قرآن کریم اور توہین رسالتؐ جیسے حساس مسائل پر سنجیدگی اختیار کرے اور اپنی ترجیحات میں اسے اولین درجہ دے کو عالمی سطح پر مسلمانوں کے جذبات کے احترام کی طرف دنیا بھر کی حکومتوں کو توجہ دلائے۔

حرمین شریفین سے دارالعلوم دیوبند تک

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۳۱ مارچ ۲۰۱۱ء)

حرمین شریفین کے امام محترم معالی الدکتور الشیخ عبد الرحمان السدیس حفظہ اللہ تعالیٰ ان دنوں بھارت کے دورے پر ہیں۔ انہوں نے بہت سے دیگر پروگراموں میں شریک ہونے کے علاوہ جمعۃ المبارک کا خطبہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد الرشید میں دیا اور دہلی میں جمعیت علماء ہند کی کانفرنس سے خطاب کیا۔ شیخ السدیس کو حرمین شریفین کا امام محترم ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی پرسوز تلاوت کے حوالے سے بھی پورے عالم اسلام میں محبوبیت کا مقام حاصل ہے۔ مسلمان جہاں بھی بستے ہیں حرمین شریفین کے ائمہ کرام کے ساتھ گہری عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور ان سے قرآن کریم کی تلاوت سننے کے ساتھ ساتھ ان کے پیچھے نماز کی ادائیگی کو باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ چند سال قبل وہ پاکستان تشریف لائے تو چند محافل میں ان کے ساتھ شرکت اور ان کی پر مغز گفتگو سننے کا مجھے بھی شرف حاصل ہوا۔ شیخ السدیس ایک بیدار مغز دانشور اور آج کے عالمی حالات پر گہری نظر رکھنے والے فکری راہنما ہیں، حرمین شریفین میں ان کے خطبات جمعہ بہت فکر انگیز ہوتے ہیں اور امت مسلمہ کی راہنمائی کا باعث بنتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں شیخ محترم کی تشریف آوری ہمارے لیے اس حوالے سے بھی خوشی اور اطمینان کا باعث ہے کہ دارالعلوم دیوبند ہمارا علمی، فکری اور تہذیبی مرکز ہے اور بہت سے حوالوں سے ہمارے لیے راہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ جبکہ حرمین شریفین کے ساتھ ایمان و عقیدت کے تعلق کے ساتھ ساتھ ہمارے بہت سے تاریخی رشتے بھی ہیں۔ دیوبند کی تاریخ کا نقطۂ آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہے جو برطانوی استعمار سے آزادی کے لیے آخری ملک گیر مسلح تحریک تھی۔ اس جنگ میں ہمارے بزرگوں نے مختلف محاذوں میں

شمولیت کے علاوہ شاملی کے محاذ کو سنبھالا تھا جہاں شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی امارت میں سرکردہ علماء کرام کے اس گروہ نے جہاد میں عملی حصہ لیا تھا جن میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حافظ ضامن شہیدؒ شامل تھے۔ اس جہاد آزادی میں باشندگان وطن کی ناکامی کے بعد بظاہر ہمارا سب کچھ ختم ہوگیا تھا اور قومی زندگی کے تمام ادارے ٹوٹ پھوٹ کی نذر ہو گئے تھے۔ جہاد شاملی کا محاذ گرم کرنے والے بزرگوں میں سے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ مکہ مکرمہ سدھار گئے تھے جبکہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دیوبند کے قصبہ میں ایک نئے تعلیمی نظام کے آغاز کے لیے نئے عزم کے ساتھ متحرک ہو گئے تھے۔

ایک روایت ہے کہ دیوبند میں مدرسہ قائم ہونے کے کچھ عرصہ بعد ایک بزرگ حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ گئے اور حضرت حاجی صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تو انہیں بتایا کہ ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ ”ہماری پیشانیاں یہاں اس مقصد کے لیے سجدوں میں دعائیں کرتے کرتے گھس گئی ہیں اور تم کہتے ہو کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔“ بہرحال یہ روایت جس درجہ کی بھی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں رہ کر کام کا از سرنو آغاز کرنے والوں کی پشت پر حرمین شریفین سدھار جانے والے ان بزرگوں کی مخلصانہ دعائیں ہی کام کر رہی تھیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا جو آج بھی تعلیمی خدمات میں مصروف ہے اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے پڑپوتے مولانا حشیم صاحب اس کے مہتمم ہیں۔ تاریخی روایات کے مطابق مکہ مکرمہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے دو تین کارنامے بہت اہم شمار کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے قبل مکہ مکرمہ میں ڈاک کی تقسیم کا کوئی مربوط نظام نہیں تھا، لوگ حرم پاک کے دروازوں پر خط رکھ جاتے تھے جہاں سے تلاش کے بعد متعلقہ لوگ خود ہی اپنی ڈاک اٹھا لیا کرتے تھے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے ڈاک کے نظام کو مربوط بنایا اور خطوط باقاعدہ طور پر متعلقہ لوگوں تک پہنچانے کی ترتیب قائم کی۔ دوسرا کارنامہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ”نہر زبیدہ“ جو امیر المومنین ہارون الرشید کے زمانے میں ان کی زوجہ محترمہ زبیدہ خاتون نے مکہ مکرمہ تک پانی پہنچانے کے لیے تعمیر کرائی تھی وہ بند پڑی تھی جسے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے لوگوں کو ساتھ ملا کر

دوبارہ کھدوایا اور مکہ مکرمہ کے لوگوں تک پانی کی فراہمی اس نہر کے ذریعے پھر سے شروع ہوگئی۔ تیسرا کارنامہ ان کا تاریخ میں یہ مذکور ہے کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کا مکہ مکرمہ میں کوئی باقاعدہ بندوبست نہیں تھا، مولانا کیرانویؒ نے صنعت و حرفت سکھانے کا مرکز قائم کیا جبکہ مدرسہ صولتیہ کا قیام تو ان کی خدمات میں شمار ہوتا ہی ہے۔

ہمارے ایک اور بزرگ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے کہ انہوں نے کم و بیش سترہ برس تک مسجد نبوی میں حدیث نبوی کی تعلیم و تدریس کی خدمات سرانجام دیں اور وہاں بیٹھ کر بھی انہیں عالم اسلام کی آزادی کی فکر رہتی تھی۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان دنوں الجزائر فرانسیسی استعمار کا غلام تھا، وہاں کے ایک عالم دین نے جو بعد میں الشیخ عبد الحمید بن بادیسؒ کے نام سے متعارف ہوئے، مدینہ منورہ میں شیخ مدنی سے حدیث پاک کی تعلیم حاصل کی اور پھر اجازت طلب کی کہ وہ مدینہ منورہ ہی میں تدریس کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا سید حسین احمدؒ مدنی نے ان سے کہا کہ وہ اپنے وطن واپس جائیں اور علماء کرام کو ساتھ ملا کر آزادی کے لیے جدوجہد کریں۔ شیخ بن بادیسؒ اس مشورہ پر الجزائر واپس گئے اور ”جمعیت علماء الجزائر“ بنا کر تحریک آزادی میں حصہ لیا، وہ الجزائر کی تحریک آزادی کے اہم راہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔

حرمین شریفین کے ساتھ ہماری تحریک آزادی کے ایک اور باب کی تاریخ بھی وابستہ ہے کہ جب وہاں خلافت عثمانیہ کی حکمرانی تھی اور ہماری تحریک آزادی کے سرخیل شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ خلافت عثمانیہ کے حکمرانوں سے متحدہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے لیے مدد حاصل کرنے کی بات چیت کرنے کے لیے مکہ مکرمہ پہنچے اور بعض ترک حکمرانوں سے ان کی ملاقات بھی ہوئی۔ اس دوران مکہ مکرمہ میں خلافت عثمانیہ کے گورنر شریف حسین نے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر دی، اس بغاوت کی حمایت نہ کرنے پر حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اور پھر برطانوی حکومت نے انہیں دیگر رفقاء سمیت مالٹا کے جزیرہ میں قید کر دیا جہاں سے ساڑھے تین سال کے بعد انہیں رہائی حاصل ہوئی۔ حسین شریف مکہ سے انگریزوں نے یہ کہہ کر خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کروائی تھی کہ اسے پورے عرب کا بادشاہ بنا دیا جائے گا مگر شریف مکہ کی دال نہ گلی اور اس کی بغاوت کی کامیابی کے بعد آل سعود نے حرمین شریفین کا کنٹرول حاصل کر کے وہاں سعودی حکومت قائم کر لی۔

حرمین شریفین کے ساتھ ہمارے تاریخی تعلقات کا ایک مرحلہ یہ بھی ہے کہ اس مقدس سرزمین میں قرآن کریم کے حفظ و تجوید کا پہلا باقاعدہ مدرسہ ہمارے ایک بزرگ حاجی سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے قائم کیا جن کا تعلق ایک نومسلم خاندان سے تھا۔ ان کے والد محترم نے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ سیٹھی محمد یوسف مرحوم ضلع گوجرانوالہ کے قصبہ راہوالی کی گتہ مل کے مالک تھے اور ان کا خاص ذوق تھا کہ مختلف علاقوں میں حفظ قرآن کریم کے مدارس قائم کرواتے تھے اور ان کی مالی مدد کیا کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں انہوں نے پہلا مدرسہ قائم کیا اور پاکستان سے قاری خلیل احمد صاحب کو لے کر وہاں گئے جنہوں نے مسجد حرام میں حفظ قرآن کریم کی کلاس شروع کی۔ بتایا جاتا ہے کہ حرمین شریفین کے امام محترم الشیخ عبد اللہ بن السبیل حفظہ اللہ تعالیٰ انہی کے شاگرد ہیں۔

حرمین شریفین کے ساتھ ہمارے تاریخی روابط کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے بہت سے اکابر اور بطور خاص شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا عاشق الٰہیؒ، حضرت مولانا سعید احمد خانؒ اور حضرت مولانا خیر محمدؒ (آف ٹھل حمزہ) نے برس ہا برس تک حرمین شریفین میں تعلیمی و تدریسی اور اصلاحی خدمات سرانجام دی ہیں۔ جبکہ اس سے قبل دہلی کی ولی اللّٰہی درسگاہ کے مسند نشین حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، حضرت شاہ عبد الغنی دہلویؒ اور ان کی عظیم محدثہ بیٹی الشیخہ امۃ اللہ محدثہ دہلویہؒ کو حدیث نبوی کی تعلیم و سند میں مراجع کی حیثیت حاصل رہی ہے اور یہ سب کے سب بزرگ حرمین شریفین کی مقدس خاک میں آسودہ ہیں۔

شیخ محترم عبد الرحمان السدیس ایک مستقل علمی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جس کی اپنی تاریخ ہے اور حرمین شریفین میں کم و بیش ایک صدی سے اس علمی مکتب فکر کی حکمرانی ہے۔ سعودی عرب میں دینی اقدار و روایات کے تحفظ، دنیا بھر کے مسلمانوں کی مدد و راہنمائی، حرمین شریفین کی قابل رشک اور مسلسل خدمت، اور عالم اسلام میں قرآن کریم کی تلاوت کے عمدہ اسلوب کا تعارف و فروغ اس تاریخ کے اہم ابواب ہیں۔ اور اس کا تازہ ترین پہلو یہ ہے کہ امریکی تھنک ٹینک رینڈ کارپوریشن کی حالیہ رپورٹ کے مطابق آج کے عالمی استعمار کو سب سے زیادہ شکایت دیوبندی اور سلفی مکاتب فکر ہی سے ہے۔ اس پس منظر میں دارالعلوم دیوبند میں معالی الدکتور الشیخ عبد الرحمان السدیس حفظہ اللہ تعالیٰ کی قدم

رنجہ فرمائی پر ہمیں بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان باہمی رابطوں، قربتوں اور محبتوں میں مزید اضافے کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہیں، آمین یا رب العالمین۔

دنیا کو حقوق کا شعور کس نے عطا کیا؟

(آسٹریلیا مسجد، لاہور - ۲۴ مارچ ۲۰۱۱ء)

(مولانا زاہد الراشدی نے گزشتہ چار ماہ کے دوران جامعہ عثمانیہ آسٹریلیا مسجد بالمقابل ریلوے سٹیشن لاہور میں ”انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ اور اسلامی تعلیمات“ کے عنوان پر آٹھ لیکچر دیے جو بالترتیب ۱۶ دسمبر ۲۰۱۰ء، ۶ جنوری ۲۰۱۱ء، ۲۰ جنوری، ۳ فروری، ۱۷ فروری، ۳ مارچ، ۱۷ مارچ، اور ۲۴ مارچ کو بعد نماز ظہر ہوئے۔ ان پروگراموں میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ لاہور کے سرکردہ علماء کرام، دینی کارکن اور دیگر طبقات کے حضرات شریک ہوتے رہے اور کورس کے اختتام پر پاکستان شریعت کونسل کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل مولانا قاری جمیل الرحمن اختر نے کورس کے شرکاء کو شریعت کونسل کی طرف سے انعامات اور کتابیں تقسیم کیں۔ ۲۴ مارچ ۲۰۱۱ء کو کورس کی اختتامی نشست سے مولانا زاہد الراشدی کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوۃ۔ میں جامعہ عثمانیہ کے منتظمین مولانا حافظ محمد سلیم، مولانا شاہد اور ان کے رفقاء بالخصوص اپنے پرانے بزرگ دوست مولانا عبد الرؤف ملک (فاضل نصرۃ العلوم) کا شکرگزار ہوں جن کی وجہ سے آپ دوستوں کے ساتھ مختلف نشستوں میں انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات کے عنوان پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔

گزشتہ سات نشستوں میں ہم نے انسانی حقوق کے حوالہ سے جن پہلوؤں پر بات کی ہے، ان میں انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ، انسانی حقوق کا اسلامی فلسفہ، انسانی حقوق کا بین الاقوامی چارٹر، اسلامی احکام و قوانین پر انسانی حقوق کے حوالہ سے اعتراضات، موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش میں اسلامی شریعت اور مغرب کے فلسفہ، انسانی حقوق کے درمیان محاذ آرائی کے مختلف محاذ اور قادیانیت، تحفظ ناموس رسالتؐ، خاندانی نظام، آزادی رائے اور مذہبی آزادی کے بارے میں مغربی لابیوں کی فکری یلغار کے عنوانات بطور خاص قابل ذکر

ہیں۔ جبکہ آج کی نشست میں، جو اس موضوع پر اس سلسلہ کی آخری نشست ہے، اسلامی تعلیمات اور سنت نبویؐ میں انسانی حقوق کی پاسداری کے حوالہ سے کچھ واقعات عرض کرنا چاہوں گا تاکہ مغرب کے اس پروپیگنڈا اور دعوے کی حقیقت واضح ہو سکے کہ دنیا کو اس نے حقوق کا شعور عطا کیا ہے اور انسانی حقوق کی پاسداری کا دور مغرب کے تہذیبی انقلاب سے شروع ہوا ہے۔ حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ انسانی سوسائٹی میں انسانی حقوق کے شعور اور ان حقوق کی عملداری کا علم چودہ صدیاں قبل اسلام نے پیش کیا تھا اور جناب نبی اکرمؐ کی تعلیمات اس سلسلہ میں بنیادی سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو اور طویل مباحثہ کی بجائے چند واقعاتی شہادتوں کی طرف اشارہ کروں گا کیونکہ اس سے زیادہ کے لیے وقت متحمل نہیں ہے جبکہ ہر پہلو تفصیل کے ساتھ گفتگو کا متقاضی ہے۔

مثلاً بچوں کے حقوق کے سلسلہ میں دیکھیے کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مجلس میں تشریف فرما تھے، آپ کے دائیں جانب حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیٹھے تھے جو اس وقت تیرہ چودہ سال کے لڑکے تھے جبکہ بائیں جانب حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے بزرگ صحابہ کرامؓ مجلس میں تھے، کسی صاحب نے اس دوران جناب نبی اکرمؐ کو مشروب پیش کیا جو آپؐ نے نوش فرمایا اور چند گھونٹ پیالے میں بچ گئے۔ نبی اکرمؐ کی خواہش یہ پیالہ بائیں طرف حضرت ابوبکرؓ کو دینے کی تھی مگر حق دائیں طرف عبد اللہ بن عباسؓ کا بنتا تھا۔ آپؐ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے باقاعدہ دریافت کیا کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو یہ پیالہ بائیں طرف دے دوں؟ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ میں آپؐ کے تبرک کے بارے میں کسی کو اپنے اوپر ترجیح نہیں دیتا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس پر جناب نبی اکرمؐ نے قدرے ناگواری کے ساتھ "فتلہ فی یدہ" زور سے پیالہ عبد اللہ بن عباسؓ کے ہاتھ میں تھما دیا، یعنی عبد اللہ بن عباسؓ کے انکار پر اگرچہ نبی اکرمؐ کو قدرے ناگواری ہوئی مگر اس کے باوجود پیالہ اسی کو دیا جس کا حق بنتا تھا۔

اسی طرح عورتوں کے حقوق کی بات کی جاتی ہے اور اکثر اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام عورت کو رائے کا حق نہیں دیتا اور اظہار رائے کی آزادی کا موقع نہیں دیتا۔ اس عنوان سے اسلام کے خلاف ایک عرصہ سے مسلسل پروپیگنڈا جاری ہے جبکہ حقائق یہ ہیں

کہ مجھ سے بعض دوست پوچھتے ہیں کہ کیا اسلام عورت کو رائے کا حق دیتا ہے؟ تو میں عرض کرتا ہوں کہ اسلام عورت کو صرف رائے کا نہیں بلکہ مجادلہ کا حق دیتا ہے اور ''المجادلۃ'' کے نام سے قرآن کریم کی ایک پوری سورت اس کی گواہ ہے۔ عورت کا مزاج و نفسیات یہ ہے کہ وہ صرف رائے پیش نہیں کرتی بلکہ اس کے لیے مجادلہ بھی کرتی ہے، اس لیے اس کے حوالہ سے قرآن کریم نے ذکر کیا ہے کہ ایک عورت نے مجادلہ کیا اور وہ بھی جناب نبی اکرمؐ سے کیا، اللہ تعالی نے اس کی بات سنی اور اسی کے حق میں قرآن کریم میں فیصلہ صادر کر دیا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ہم جاہلیت کے دور میں عورتوں کو کوئی مقام و حیثیت نہیں دیتے تھے بلکہ انہیں کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے اور اس بات کا ہمارے ہاں تصور بھی نہیں تھا کہ عورت اپنے خاوند یا باپ کو کسی بات پر ٹوک سکتی ہے۔ جب اسلام آیا تو ہمیں پتہ چلا کہ معاشرہ میں عورتوں کی بھی ایک حیثیت ہے اور انہیں رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ حضرت عمرؓ اسی روایت میں فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک روز میں نے گھر میں کوئی بات کی تو بیوی نے مجھے ٹوک دیا جس پر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے اسے ڈانٹ دیا کہ تمہارا کیا کام ہے کہ تم میرے معاملات میں روک ٹوک کرو اور کوئی رائے دو۔ اس نے کہا کہ مجھے ڈانٹنے کی بجائے اپنی بیٹی حفصہؓ کی خبر لو کہ جناب نبی اکرمؐ کی ازواج مطہرات بھی گھر میں روک ٹوک کرتی ہیں اور بعض معاملات پر ناراضگی کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں یہ سن کر فوراً اٹھا اور سیدھا ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے گھر گیا جو حضرت عمرؓ کی بیٹی اور جناب نبی اکرمؐ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہاں ہمارے گھر میں میاں بیوی کے درمیان روک ٹوک ہوتی ہے اور ہم آپس میں کبھی ناراضگی کا اظہار بھی کر لیا کرتے ہیں جیسا عام طور پر میاں بیوی میں ہو جایا کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ کو ڈانٹا کہ جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ روک ٹوک اور ناراضگی کا معاملہ مت کیا کرو، جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بتا دیا کرو مگر حضورؐ کو ناراض مت کرو۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں حفصہؓ کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے گھر گیا اور ان سے بات کی، وہ حضرت عمرؓ کی کزن تھیں انہوں نے الٹا حضرت عمرؓ کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ آپ ہر معاملہ میں دخل دیتے ہیں اور اب میاں بیوی کے معاملہ میں بھی دخل دینے آگئے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''فکسرتنی'' اس نے تو میرا حوصلہ ہی توڑ

دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ سنا دیا وہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے حضرت ام سلمہؓ کا ذکر کیا تو ”فتبسم و قال ھی ام سلمۃ“ جناب نبی اکرمؐ مسکرائے اور فرمایا کہ ”وہ ام سلمہؓ ہے“۔ اس واقعہ کے ساتھ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اب مجھے پتہ چلا کہ عورت کی بھی رائے ہوتی ہے اور اس کا مقام و مرتبہ اور اس کی کوئی معاشرتی حیثیت ہے۔

حضرت بریرہؓ کا واقعہ بھی مشہور ہے جو امام بخاریؒ نے مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ”حدیث بریرہؓ“ سے فقہاء نے ایک سو سے زیادہ مسائل مستنبط کیے ہیں۔ وہ لونڈی تھیں مگر جب حضرت عائشہؓ کی مہربانی سے آزاد ہوئیں تو انہیں ”خیار عتق“ حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے خاوند حضرت مغیثؓ کے نکاح میں رہنا چاہتی ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ ان کے نکاح میں نہیں رہنا چاہتیں تو انہیں الگ ہونے کا حق حاصل ہے، یہ حق استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر لی جس پر حضرت مغیثؓ بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے بریرہؓ کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے مگر وہ تیار نہ ہوئی، ایک دن جناب نبی اکرمؐ نے دیکھا کہ مغیثؓ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ”کوئی ہے جو بریرہؓ کو منا دے؟“ یہ کیفیت دیکھ کر جناب نبی اکرمؐ نے خود بریرہؓ سے بات کرنے کا فیصلہ اور بریرہؓ کو بلا کر فرمایا کہ مغیثؓ بہت ہی پریشان ہے، کیا تم اپنا فیصلہ واپس نہیں لے سکتیں؟ بریرہؓ نے صرف اتنا پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ سمجھدار لڑکی تھی، سمجھتی تھی کہ حکم کی صورت میں تو کسی مسلمان کی مجال نہیں ہے کہ وہ جناب نبی اکرمؐ کے حکم سے سرتابی کر سکے، اس لیے اس نے پوچھ لیا۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ یہ حکم نہیں ہے بلکہ صرف مشورہ ہے تو اس نے بے ساختہ جواب دیا کہ ”لا حاجۃ لی بھا“ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خیال فرمائیے کہ ایک آزاد شدہ لونڈی ہے مگر اپنا حق ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جبکہ جناب نبی اکرمؐ نے اس کے بعد نہ اسے دوسری بار فرمایا اور نہ ہی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا۔

چند واقعات میں نے اس لیے عرض کیے ہیں کہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ نسل انسانی کو حقوق کا شعور اسلام نے دیا اور آسمانی تعلیمات نے انسان کو بتایا کہ اس کے ذمہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کیا ہیں اور جن انسانوں کے ساتھ وہ زندگی گزار رہا ہے اس کے ذمہ ان کے

حقوق کیا ہیں؟ محنت کشوں اور مزدوروں کے بارے میں دیکھ لیجیے، اس زمانہ میں غلام ہوتے تھے جو اب نہیں رہے لیکن ہاری، مزدور، کسان، پانڈی اور دوسرے نوکر ہمارے معاشرہ میں وہی درجہ رکھتے ہیں اور جناب نبی اکرمؐ نے ان کے ساتھ مہربانی اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔

حضرت ابو مسعود انصاریؓ کی ایک لونڈی ان کی بکریاں چرا رہی تھی، اس کی غفلت کی وجہ سے بھیڑیا اس کے ریوڑ سے ایک بکری لے گیا۔ حضرت ابو مسعودؓ نے اسے غصہ میں تھپڑ مار دیا، جناب نبی اکرمؐ دیکھ رہے تھے، آپؐ نے فرمایا کہ اے ابو مسعودؓ، اللہ تعالیٰ تم پر اس سے کہیں زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنا تم اس لونڈی پر طاقت رکھتے ہو۔ حضرت ابو مسعودؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! کیا میں اسے اس زیادتی کے کفارے میں آزاد نہ کر دوں؟ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اگر تم اسے آزاد نہیں کرو گے تو "للفحتک النار" آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ چنانچہ ابو مسعودؓ نے اس لونڈی کو آزاد کر دیا۔

اس طرح حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر فرمایا کہ یہ جو تمہارے غلام اور ماتحت لوگ ہیں یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، یہ تقدیر سے تمہارے ماتحت ہو گئے ہیں، اس لیے کسی شخص کے ہاتھ کے نیچے یعنی اس کے ماتحت کوئی نوکر، خادم یا غلام ہو تو اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اس کے ذمہ کوئی ایسا کام نہ لگائے جو اس کی ہمت سے زیادہ ہو اور اگر کوئی ایسا کام اس کے ذمہ لگا دیا ہے تو خود اس کے ساتھ معاونت کرے۔

بیسیوں ارشادات میں جناب نبی اکرمؐ نے ماتحتوں اور غلاموں کے بارے میں حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کے حقوق بیان فرمائے ہیں جن میں سے صرف ایک دو کا ذکر کر سکا ہوں۔ میری گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ انسانی حقوق کے بارے میں جناب نبی اکرمؐ کی تعلیمات اور اسلامی احکام و قوانین مغرب میں انسانی حقوق کی طرف پیشرفت سے کم از کم بارہ سو سال قبل انسانی سوسائٹی میں اپنی عملداری قائم کر چکے تھے، مگر مغرب اس کو نظر انداز کر کے خود اس بات کے لیے چیمپئن بننے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس نے نسل انسانی کو حقوق کا شعور بخشا ہے اور حقوق انسانی کے دور کا آغاز کیا ہے۔ اس سلسلہ میں علماء کرام، خطباء وائمہ اور مدرسین و اساتذہ سے میں بطور خاص عرض کروں گا کہ وہ اپنے شاندار ماضی سے واقفیت حاصل کریں، خلافت راشدہ کے نظام اور روایات کا بطور خاص مطالعہ کریں، اور

آج کے حالات و مسائل اور ضروریات و مشکلات کو سامنے رکھ کر قرآن و سنت سے ان کے لیے راہنمائی تلاش کریں اور قرآن و سنت کی روشنی میں نسل انسانی کی راہنمائی کریں۔ میں پورے اعتماد اور شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں آج کے کسی انفرادی یا اجتماعی مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں مایوسی نہیں ہوگی، تھوڑی دماغ سوزی اور جگر سوزی کرنا پڑے گی اور ہر مسئلہ کا حل مل جائے گا۔

ہم نے آج کے مسائل کا حل یہ سمجھا ہوا ہے کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے اور آنکھیں بند کرتے ہوئے ان کے پاس سے گزر جایا جائے، یہ حل نہیں بلکہ فرار ہے، اسلام فرار کی اجازت نہیں دیتا بلکہ مسائل کا سامنا کرنے اور انہیں حل کرنے کی ہدایت دیتا ہے، جس کی ذمہ داری سب سے زیادہ علماء کرام بالخصوص دینی مدارس کے اساتذہ پر عائد ہوتی ہے، اللہ تعالی ہم سب کو صحیح رخ پر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

حضور اکرمؐ کی زندگی احادیث کے آئینے میں

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۶ فروری ۲۰۱۱ء)

محدثین کرامؒ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اوصاف و کمالات اور معمولات کو علم حدیث کے ایک مستقل شعبے کی صورت میں مرتب کیا ہے جسے ”شمائل نبویؐ“ کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ بعض محدثین نے اس پر الگ کتابیں لکھی ہیں اور باذوق اہل علم نے بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے حسن ذوق کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کی اجتماعی، معاشرتی، اور علمی و عملی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ذاتی زندگی کی جزئیات تک روایت کی ہیں جنہیں محدثین کرام نے حدیث کے مستقل ابواب کی صورت میں جمع کر کے قیامت تک امت مسلمہ کی رہنمائی کا اہتمام کر دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا تو ذوق ہی یہ تھا کہ وہ ہر کام اسی ترتیب اور جزئیات کی پاسداری کے ساتھ کرتے تھے جس طرح حضورؐ نے وہ کام کیا تھا۔ جناب رسول اللہؐ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا تھا جو ”حجۃ الوداع“ کہلاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس حج میں حضورؐ کے ساتھ تھے اور انہوں نے اس سفر کے آنے جانے کی تفصیلات اس جزرسی کے ساتھ یاد کر رکھی تھیں کہ باقی صحابہ کرامؓ اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ

بن عمرؓ نے اس کے بعد زندگی بھر ہر سال حج کیا اور اسی ترتیب کے ساتھ کیا جیسے حضورؐ کے ساتھ کیا تھا۔ جہاں سے آپؐ نے احرام باندھا وہیں سے وہ احرام باندھتے تھے، جہاں آپؐ نے پہلی رات قیام فرمایا وہیں پہلی رات قیام فرماتے تھے، جہاں آپؐ نے دوسرے روز ظہر کی نماز پڑھی وہیں نماز پڑھتے۔ حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق عبداللہ بن عمرؓ اس مبارک سفر کے دوران پیشاب بھی اسی جگہ کرتے تھے جہاں انہوں نے آپؐ کو پیشاب کرتے دیکھا تھا۔ منیٰ میں وہ اسی جگہ خیمہ لگاتے جہاں حضورؐ کا خیمہ حجۃ الوداع میں نصب تھا اور قربانی بھی اسی جگہ کرتے تھے جہاں آپؐ نے قربانی کے جانور ذبح کیے تھے۔ ایک صاحب نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ ہم آپ کو بعض کام بڑے اہتمام سے کرتا دیکھتے ہیں مگر باقی صحابہ کرامؓ وہ کام ویسے نہیں کرتے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو ہر کام اسی انداز اور ترتیب سے کرتا ہوں جس طرح میں نے جناب رسول اللہؐ کو وہ کام کرتے دیکھا ہے۔

اس قدر جزرسی اور تفصیلات اگرچہ ضروری نہیں ہیں مگر جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ حد درجہ محبت و عقیدت کی علامت ضرور ہیں۔ کیونکہ محبوب کی ہر ادا اور ہر چیز محبت کرنے والے کو محبوب ہوتی ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی طرح ہو جائے اور اس کی ہر ادا کو اپنا لے۔ اس کی ایک جھلک ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں کہ ہمارے بچے کھلاڑیوں کو کھیلتے دیکھتے ہیں تو جس کھلاڑی کی کوئی ادا کسی نوجوان کو پسند آجاتی ہے وہ اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً کرکٹ کے حوالے سے آپ کو اپنے ماحول میں کئی چھوٹے چھوٹے میانداد نظر آئیں گے، کئی عمران خان ملیں گے، اور کئی شاہد آفریدی دکھائی دیں گے۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں لیکن بیٹ ایسے پکڑیں گے جیسے جاوید میانداد پکڑتے ہیں، گیند ایسے کرائیں گے جیسے عمران خان کراتے رہے ہیں، اور ایکشن ایسے لیں گے جیسے انہیں شاہد آفریدی کا ایکشن دکھائی دیتا ہے۔ یہ پسند کی علامت ہے، محبت کا اظہار ہے، اور دل میں بس جانے کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ذوق بھی یہی تھا اور وہ اس معاملے میں تمام صحابہ کرامؓ میں امتیازی شان رکھتے تھے۔

جناب رسول اللہؐ کے ذاتی اوصاف و خصائل اور معمولات پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث محدثین کرامؒ نے روایت کی ہیں جن میں بطور نمونہ چند ایک کا تذکرہ کرنے کی سعادت ہم حاصل کر رہے ہیں، اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اس ذکر کی برکت سے اس ذوق کا

کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب فرمادیں جو قیامت کے روز حضورؐ کی شفاعت اور ان کے ساتھ قربت کا ذریعہ بن جائے، آمین یارب العالمین۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کو انسانی خصال میں سے سب سے زیادہ نفرت جھوٹ سے تھی (بیہقی)۔ اور اپنے خاندان کے کسی شخص کے بارے میں جھوٹ کی کسی بات پر مطلع ہوتے تو اس سے اس وقت تک اعراض فرماتے تھے جب تک اس کی توبہ مشاہدے میں نہ آجاتی (مسند احمد)۔

حضرت ابو موسی اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کسی شخص کو کسی علاقے کا حاکم بنا کر بھیجتے تو یہ نصیحت بطور خاص فرماتے تھے کہ لوگوں سے انہیں قریب لانے والی باتیں کرنا، دور کرنے والی باتوں سے گریز کرنا۔ آسانی والی بات کرنا، مشکل اور تنگی والی بات نہ کرنا (ابوداؤد)۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ جب کسی سے بیعت لیتے اور کسی کام کے کرنے کا عہد لیتے تو اس عہد میں یہ گنجائش رکھنے کی تلقین فرماتے کہ فیما استطعت کہ جہاں تک میرے بس میں ہوگا اطاعت کروں گا (مسند احمد)۔

حضرت ابو امامہؓ فرماتے تھے کہ جناب رسول اللہؐ کسی کو امیر (حاکم) بنا کر بھیجتے تو یہ تلقین فرماتے کہ تقریر مختصر کرنا اور باتیں تھوڑی کرنا اس لیے کہ کلام میں تبھی جادو جیسی تاثیر ہوتی ہے (طبرانی)۔ ایک طالب علم کے طور پر اس کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضورؐ حاکموں سے فرما رہے ہیں کہ لوگوں کو اپنی جادو بیانی اور گفتگو کے سحر میں ہی نہ جکڑے رکھنا بلکہ ان کے مفاد کے عملی کاموں کو ترجیح دینا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ جب کسی ساتھی کو رخصت کرتے تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے اور اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ خود ہاتھ نہ چھوڑتا، اور اسے رخصت کرتے وقت دعا سے بھی نوازتے (مسند احمد)۔

حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ سب لوگوں سے زیادہ خوش مزاج اور سب سے زیادہ مسکرانے والے تھے (طبرانی)۔

حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ جب بھی گفتگو فرماتے، مسکراہٹ آپ کے چہرے پر نظر آتی تھی۔ (مسند احمد)۔

حضرت حنظلہ بن خدیمؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کسی شخص کو بلاتے تو اس کے پسندیدہ نام اور کنیت کے ساتھ اس کو پکارتے (طبرانی)۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ اکثر اوقات اپنے سر مبارک کو ڈھانپ کر رکھتے یعنی سر پر اکثر کپڑا ہوتا تھا (ترمذی)۔

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کثرت سے اللہ تعالی کا ذکر کرتے، بے مقصد بات نہ کرتے، نماز لمبی پڑھتے، اور خطبہ مختصر ارشاد فرماتے۔ آپؐ کسی بات پر ناک نہیں چڑھاتے تھے اور کسی بیوہ، یتیم یا غلام کے ساتھ اس کے کام کے لیے چلنے میں تکبر نہیں کرتے تھے اور جب تک اس کا کام نہیں ہو جاتا تھا ساتھ رہتے تھے (مستدرک حاکم)۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہؐ اپنے کام اکثر خود کر لیتے تھے۔ کپڑے کو ٹانکا لگا لیتے، بکری کا دودھ دوہ لیتے، اور ذاتی خدمت کے کام بھی خود کر لیتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ دوسرے روز کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہیں رکھتے تھے اور جو کچھ ہوتا اسی روز خرچ کر ڈالتے تھے (ترمذی)۔

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا بھی ہو تو میں اپنے پاس تین دینار سے زیادہ ذخیرہ نہیں رکھوں گا اور سب کا سب اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کر دوں گا (بخاری شریف)۔

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کی خوراک بہت کم تھی۔ وہ اگر دوپہر کا کھانا کھاتے تو رات کا نہیں کھاتے تھے اور رات کا کھانا کھا لیتے تو دوپہر کا نہیں کھاتے تھے (حلیہ)۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خادموں سے پوچھتے رہتے تھے کہ تمہاری کوئی ضرورت تو نہیں؟ تمہیں کوئی کام تو نہیں؟ (مسند احمد)۔ گویا حضورؐ اپنے خادموں کی ضروریات کا بھی بطور خاص خیال رکھتے تھے۔

اللہ تبارک وتعالی ہمیں بھی ان خصائل مبارکہ کو اپنانے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی

(النور ریسٹورنٹ، پنجن کسانہ، کھاریاں - ۱۹ فروری ۲۰۱۱ء)

(جمعیت علماء اہل سنت ضلع گجرات کے زیر اہتمام منعقدہ سیرت کانفرنس سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ میرے اور آپ سب کے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ ہم یہاں جناب سرور کائناتؐ کے ذکر مبارک کے لیے جمع ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کے تذکرہ کے حوالہ سے مل بیٹھے ہیں، اللہ تعالی ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں، اور جو بات دین کی علم میں آئے اس پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین۔

جناب سرور کائناتؐ کا تذکرہ جس حوالہ سے بھی ہو اور جس پہلو سے بھی ہو باعث برکت ہے، باعث ثواب ہے، باعث رحمت ہے، باعث ہدایت ہے، اور آنحضرتؐ کے ذکر مبارک سے اللہ تعالی راضی ہوتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ میرے سامنے آپ میرے کسی دوست کا اچھے انداز میں تذکرہ کریں گے تو مجھے خوشی ہوگی، اللہ تعالی کے حبیب کا ذکر کرنے سے اللہ تعالی بھی خوش ہوتے ہیں اور رحمت و برکات سے نوازتے ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ کے ذکر سے اجر و ثواب بھی ہوتا ہے، رحمت و برکت کا نزول بھی ہوتا ہے، اور ہدایت و راہنمائی بھی ملتی ہے۔ بلکہ سب سے بڑا پہلو یہی ہے کہ ہم سرور کائناتؐ کا ذکر کر کے ان کی سنت و سیرت سے راہنمائی حاصل کریں، اسی سے ہمیں دنیا و آخرت کی سعادت اور نجات حاصل ہوگی۔

جناب نبی اکرمؐ کے تذکرہ کے سینکڑوں پہلو ہیں اور ہر پہلو کے بیسیوں رخ ہیں، اس لیے سیرت طیبہ پر گفتگو کرنے والوں کو سب سے پہلے اس امتحان کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ سیرت مبارکہ کا کون سا پہلو بیان کیا جائے اور کون سا پہلو چھوڑ دیا جائے؟ جبکہ یہ "کون سا چھوڑ دیا جائے" کا پہلو زیادہ آزمائش والا ہوتا ہے کہ حبیب خدا کی سیرت کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں جسے چھوڑ دینے کا آسانی کے ساتھ فیصلہ کیا جا سکے، مگر ظاہر ہے کہ مختصر وقت میں بات صرف ایک ہی پہلو پر ہو سکتی ہے اور وہ بھی اختصار کے ساتھ۔ اس لیے میں آج کی اس

محفل میں آپ حضرات کے سامنے سیرت طیبہؐ کے صرف ایک پہلو پر چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا کہ کیا جناب نبی اکرمؐ کا منصب صرف یہ تھا کہ وہ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا دین اور احکام پہنچا دیں یا دین میں خود بھی کوئی اتھارٹی رکھتے تھے؟

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرمؐ کی اطاعت کا حکم اور اس کے ساتھ ساتھ اتباع کا حکم بھی دیا ہے۔ اطاعت کا معنی ہے حکم ماننا جبکہ اتباع کا مفہوم اس سے کچھ مختلف ہے جس میں حکم ماننے کے ساتھ نقش قدم پر چلنا بھی شامل ہے، جسے ہم ''فالو'' کرنا کہتے ہیں۔ نبی اکرمؐ جو حکم دیں اس کی تعمیل ہم پر ضروری ہے اور جس طریقے سے وہ کام کر کے دکھائیں اس کی پیروی بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ یعنی جو حکم وہ دیں وہ مانیں اور جیسے وہ کریں ویسے ہم کریں۔ دین میں جس طرح قرآن کریم اتھارٹی ہے اسی طرح جناب اکرمؐ بھی اتھارٹی ہیں اور قرآن کریم نے ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' (سورہ النساء ۵۹) کہہ کر دونوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آج کے دور میں یہ بیماری مسلسل پھیلتی جا رہی ہے کہ جب کوئی مسئلہ بیان کیا جائے، خواہ وہ جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد کے حوالہ سے ہی بیان کیا جائے، تو کوئی نہ کوئی صاحب یہ سوال کر دیتے ہیں کہ کیا یہ مسئلہ قرآن کریم میں ہے؟ بظاہر یہ سوال اس لیے ہوتا ہے کہ قرآن کریم سے بھی یہ مسئلہ بیان ہو جائے لیکن اس کے پیچھے اکثر یہ ذہن کارفرما ہوتا ہے کہ اگر قرآن کریم میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے پھر تو ٹھیک ہے لیکن اگر قرآن کریم اس مسئلہ میں خاموش ہے تو پھر اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات بہت خطرناک ہے کیونکہ کسی مسئلہ میں یہ شرط لگانا کہ وہ صرف قرآن کریم سے بیان کیا جائے اس سے جناب نبی اکرمؐ کے خود اتھارٹی ہونے کی نفی ہوتی ہے، العیاذ باللہ۔

یہ سوال کہ کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا جائے کہ کیا یہ قرآن کریم میں موجود ہے؟ بہت پرانا ہے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ایک بار بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کسی شخص کو دیکھا کہ وہ طواف کر رہا ہے اور اس نے احرام کی دو چادریں باندھنے کے علاوہ کوئی سلا ہوا کپڑا بھی پہن رکھا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اسے متوجہ کر کے فرمایا کہ بھائی! احرام کی حالت میں مرد کے لیے سلا ہوا کپڑا پہننے کی اجازت نہیں ہے، اس نے پلٹ کر سوال کیا کہ کیا یہ مسئلہ قرآن کریم میں ہے؟ میں اس موقع پر عرض کیا کرتا ہوں کہ کوئی ہمارے جیسا ڈھیلا ڈھالا مولوی ہوتا تو کہتا کہ جی یہ مسئلہ

قرآن کریم میں تو نہیں ہے، مگر وہ بہت تگڑا مولوی تھا، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ تھے۔ فرمایا کہ ہاں یہ مسئلہ قرآن کریم میں موجود ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ ”وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا“ (سورۃ الحشر ۷) اور جناب نبی اکرمؐ سے میں نے خود سنا ہے کہ احرام کی حالت میں مرد کے لیے سلا ہوا کپڑا پہننا جائز نہیں ہے۔

جناب نبی اکرمؐ اللہ تعالی کے نمائندہ اور رسول ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ وہ جو کہیں وہ کرو اور جس سے روکیں رک جاؤ، اس لیے کہ نمائندہ اور رسول کی حیثیت سے جناب نبی اکرمؐ کی ہر بات اللہ تعالی ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے تو اس سوال کا جواب اس انداز سے دیا مگر حضرت عمران بن حصینؓ اس قسم کے سوال پر غصے میں آگئے تھے۔ مسند دارمی کی ایک روایت کے مطابق ان سے کسی شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا اور ساتھ شرط لگا دی کہ مسئلہ قرآن کریم سے بیان فرمائیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے اس سوال کو پسند نہیں کیا اور الٹا اس شخص سے سوال کر دیا کہ تم نے آج صبح کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھی تھیں؟ اس نے جواب دیا کہ دو رکعتیں پڑھی تھیں، پوچھا کہ کیا صبح کی دو رکعتوں کا ذکر قرآن کریم میں ہے؟ قرآن کریم تو نہ نمازوں کی تعداد بیان کرتا ہے، نہ رکعتوں کا ذکر کرتا ہے اور نہ ہی یہ بتاتا ہے کہ ایک رکعت میں سجدے کتنے ہیں اور رکوع کتنے ہیں؟ یہ ساری تفصیلات جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ سے ملتی ہیں، اس لیے جس طرح قرآن کریم کے حکم پر نماز پڑھنا فرض ہے اسی طرح جناب نبی اکرمؐ کی بتلائی ہوئی تفصیلات اور طریقے کے مطابق نماز پڑھنا بھی فرض ہے۔ یہی صورتحال باقی فرائض مثلاً زکوۃ، روزہ اور حج کی بھی ہے۔

میں اس کی ایک مثال اور بھی دینا چاہوں گا کہ حالت سفر میں نماز دوگانہ پڑھنے کا حکم ہے مگر قرآن کریم میں اس اجازت کے ساتھ یہ شرط ہے ”لا جناح علیکم ان تقصروا من الصلوۃ ان خفتم أن یفتنکم الذین کفروا“ (سورہ النساء ۱۰۱) سفر میں نماز قصر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر تم دشمن کی طرف سے آزمائش میں ڈالے جانے کا خوف رکھتے ہو۔ یعنی اگر دشمن کا خوف ہو تو نماز دوگانہ پڑھ سکتے ہو، اس کا ظاہری مطلب یہ بنتا ہے کہ قصر نماز کا تعلق حالت جنگ اور حالت خوف سے ہے اور حالت امن میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

یہ اشکال سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے ذہن میں آیا جب وہ حجۃ الوداع میں نبی اکرمؐ کے

ساتھ تھے، سارے سفر میں آتے ہوئے اور جاتے ہوئے جناب نبی اکرمؐ نے دوگانہ نماز پڑھی۔ حضرت عمرؓ کو خیال آیا کہ فتح مکہ اور جزیرۃ العرب پر غلبہ اور کنٹرول کے بعد تو حالت خوف باقی نہیں رہی اور خاص طور پر حجۃ الوداع کا سفر اسلام کے غلبہ اور قوت کے بھرپور اظہار کا سفر ہے، اب ہم دوگانہ نماز کیوں پڑھ رہے ہیں جبکہ قرآن کریم نے قصر نماز کو ''ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا'' کے ساتھ مشروط کیا ہے؟ انہوں نے اس اشکال کا تذکرہ جناب نبی اکرمؐ سے کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہربانی ہے، اسے واپس کیوں کر رہے ہو؟ میں اس کا ترجمہ یوں کیا کرتا ہوں کہ ہم حالت امن میں قصر کر رہے ہیں اور وحی کا سلسلہ بھی جاری ہے مگر اللہ تعالیٰ اس سے منع نہیں فرما رہے تو تم اس مہربانی پر اشکال کا اظہار کیوں کر رہے ہو؟

میں یہاں جس بات پر بطور خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حالت خوف میں قصر نماز ہم قرآن کریم کے حکم کے مطابق پڑھتے ہیں مگر حالت امن میں قصر نماز جناب نبی اکرمؐ کی سنت کی وجہ سے پڑھتے ہیں، اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ جس طرح قرآن کریم دین میں اتھارٹی ہے اسی طرح جناب نبی اکرمؐ بھی اللہ تعالیٰ کے رسول اور نمائندہ ہونے کی وجہ سے اتھارٹی ہیں، اور جس طرح قرآن کریم کے حکم سے کوئی عمل واجب ہوتا ہے اسی طرح جناب نبی اکرمؐ کے حکم سے بھی عمل واجب ہو جاتا ہے، کیونکہ جناب نبی اکرمؐ کا کوئی بھی ارشاد یا عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے نکیر نہ ہونے کی صورت میں حکماً وحی کا درجہ اختیار کر لیتا ہے اور وحی کی خاموشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا حکم بن جاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ اس مسئلہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں، تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت امام شافعیؒ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ کیا حالت احرام میں بھڑ مارنا جائز ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں جائز ہے۔ سوال ہوا کہ کیا یہ قرآن کریم میں ہے؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''وما اتاکم الرسول فخذوہ'' اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم پر میرے ساتھ میرے خلفاء راشدینؓ کی سنت بھی لازم ہے''۔ یہ مسئلہ حضرت عمرؓ نے بتایا کہ حالت احرام میں بھڑ مارنا جائز ہے۔ گویا حضرت عمرؓ کا فرمان جناب نبی اکرمؐ کا فرمان ہے اور نبی اکرمؐ کا فرمان اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

یہاں ایک فرق کی وضاحت ضروری ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کا ہر ارشاد براہ راست قرآن کریم کا حصہ تو نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ''وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ

فانتہوا“ کے مطابق قرآنی تعلیمات کا حصہ ضرور ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ارشاد کا مطلب یہی ہے اور حضرت امام شافعیؒ کے فرمان کا مقصد بھی یہی ہے۔ جبکہ ابوداؤد شریف کی ایک روایت جناب نبی اکرمؐ نے خود بھی اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ ”الا وانی اُوتیت القرآن ومثلہ معہ“ خبردار مجھے قرآن کریم بھی دیا گیا ہے اور اس جیسے اور احکام بھی دیے ہیں۔ اسی ارشاد گرامی میں جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس چیز کو میں حرام قرار دیتا ہوں وہ بھی ویسے ہی حرام ہے، جیسے وہ چیز حرام ہے جسے قرآن کریم نے حرام کہا ہے۔

اس موقع پر ایک صاحب نے چٹ کے ذریعے سوال کیا کہ جناب نبی اکرمؐ نے اپنے اوپر شہد حرام کیا تھا جس سے قرآن کریم نے منع فرما دیا تھا، اس کا جواب مولانا زاہد الراشدی نے یہ دیا کہ جناب نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں صورتحال یہ تھی کہ آپ کی کوئی بات اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہوتی تو اس پر وحی کے ذریعہ نکیر ہو جاتی تھی، اور ایسی چند باتوں کا قرآن کریم میں ذکر موجود ہے۔ لیکن جناب نبی اکرمؐ کے وصال اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد آپؐ کا ہر وہ ارشاد اور عمل وحی کا درجہ اختیار کر گیا ہے جس پر آپؐ کی زندگی میں وحی کے ذریعہ نکیر نہیں ہوئی۔ مثلاً قرآن کریم نے خنزیر کو حرام کیا ہے مگر کتے کا ذکر نہیں کیا، اور کتے کے حرام ہونے کا اعلان جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا جس پر وحی خاموش رہی ہے، اس لیے جیسے خنزیر حرام ہے اسی طرح کتا بھی حرام ہے۔

حضرات محترم! میں نے جناب نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے صرف ایک پہلو پر مختصراً کچھ گزارشات پیش کی ہیں کہ نبی اکرمؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف پیغامات پہنچانے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ وحی اور پیغامات پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کے لیے نمونہ اور اسوہ بھی تھے اور دین پر عملدرآمد کے حوالہ سے آئیڈیل اور اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے جس طرح قرآن کریم کے ارشادات کی تعمیل ضروری ہے اسی طرح جناب نبی اکرمؐ کے فرمودات اور سنتوں کی پیروی بھی لازم ہے، بلکہ قرآن کریم نے یہ فرمایا ہے کہ ”من یطع الرسول فقد اطاع اللہ“ (سورہ النساء ۸۰) جس نے رسول اللہؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی وہی قبول ہوگی جو جناب نبی اکرمؐ کی اتباع کی صورت میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

مسلمانوں کا قرآن و سنت سے تعلق اور مغرب کا مطالبہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۹ فروری ۲۰۱۱ء)

دارالعلوم عیدگاہ کبیر والا میں کافی عرصے کے بعد حاضری کا اتفاق ہوا، حضرت مولانا منظور الحق صاحبؒ اور حضرت مولانا عبد الخالق صاحبؒ کی زیارت تو مجھے یاد نہیں البتہ حضرت مولانا علی محمدؒ کی خدمت میں حاضری اور دعاؤں کی سعادت حاصل ہوتی رہی ہے۔ مولانا محمد انورؒ میرے دوستوں اور بے تکلف ساتھیوں میں سے تھے، جماعتی اور تحریکی زندگی میں ان کے ساتھ ایک عرصہ رفاقت رہی ہے۔ حضرت مولانا ارشاد احمد زید مجدہم میرے دعاگو بزرگوں میں سے ہیں، ہمیشہ شفقت فرماتے ہیں اور دعاؤں سے نوازتے ہیں، متعدّد بار انہوں نے دارالعلوم کے کئی پروگراموں میں حاضری کے لیے فرمایا مگر ہر بار ایسا ہوتا رہا کہ میں نے مطلوبہ وقت کہیں اور دے رکھا ہوتا تھا، اور میری عادت ہے کہ ایک وقت کسی جگہ دے دوں تو اپنی امکانی بساط تک اس میں ردوبدل نہیں کرتا۔

۳ فروری کو دارالعلوم میں ختم نبوت کانفرنس تھی، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر مخدوم العلماء حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی دامت برکاتہم اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ برادرم مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے خطاب فرمانا تھا۔ اس لیے میں نے حکم کی تعمیل میں حاضری دی اور تحفظ ناموس رسالتؐ کی موجودہ صورتحال کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کیں۔ دارالعلوم کی روایات کے مطابق پرجوش اجتماع تھا، علمائے کرام کی ایک کثیر تعداد شریک تھی جبکہ عوام کا جم غفیر تھا اور رات گئے تک لوگوں کی بڑی تعداد مختلف دینی جماعتوں کے راہنماؤں کے ارشادات سماعت کرتی رہی۔ میں نے جو معروضات پیش کیں ان میں سے دو باتوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

ایک یہ کہ مغرب کا کہنا ہے کہ مسلمان جذباتی قوم ہے، قرآن کریم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی بات برداشت نہیں کرتی اور ان کے حوالے سے جذباتی ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس بات سے اختلاف نہیں ہے کہ ہم واقعی جذباتی قوم ہیں اور قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی بات برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، مگر ہمارے نزدیک یہ بات عیب کی نہیں بلکہ خوبی اور کمال کی ہے،

اس لیے کہ یہ قرآن کریم اور جناب نبی کریمؐ کے ساتھ محبت اور کمٹمنٹ کی علامت ہے۔ جہاں تعلق ہوتا ہے وہاں غصہ ضرور آتا ہے اور جہاں محبت ہوتی ہے وہاں غیرت کا ہونا بھی فطری بات ہے۔ غصہ بھی فطرت ہے اور غیرت بھی فطرت ہے اس لیے کہ اللہ تعالی نے انسان میں کوئی بات بھی غیر ضروری پیدا نہیں کی، البتہ ہر چیز کے استعمال کی حدود متعیّن کی ہیں اور جائز و ناجائز کے دائرے بیان کیے ہیں کہ غصہ صحیح جگہ پر آنا چاہیے اور غلط مقام پر نہیں آنا چاہیے۔

ایک مغربی دانشور نے لکھا کہ ہمیں تو کسی بات پر غصہ نہیں آتا، ہمارے سامنے کوئی بائبل کی بات کرے یا حضرت عیسی علیہ السلام کی بات کرے ہمیں کوئی غصہ نہیں آتا۔ میں نے اس پر عرض کیا کہ جس کو کسی بات پر غصہ نہیں آتا اسے کسی سائیکالوجسٹ کے پاس جا کر اپنا علاج کرانا چاہیے، اس لیے کہ جس طرح بات بات پر غصہ آنا نفسیاتی بیماری ہے اسی طرح کسی بات پر غصہ نہ آنا بھی نفسیاتی بیماری ہے اور اس کا علاج ضروری ہو جاتا ہے۔

دوسری گزارش میں نے یہ کی کہ مغربی دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہم نے اپنے اجتماعی اور معاشرتی معاملات میں بائبل اور حضرت عیسیٰؑ کا حوالہ ترک کر دیا ہے اور ہم اپنے قومی اور معاشرتی امور آزاد ذہن کے ساتھ طے کرتے ہیں، جبکہ مسلمانوں نے اپنے ذہنوں پر ابھی تک قرآن کریم اور حضرت محمدؐ کا حوالہ بقول ان کے "مسلط" رکھا ہوا ہے اور وہ اس کے دائرے سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مغربی دانشوروں کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہم مسلمانوں کی تمام تر کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود آج بھی ہمارا سب سے بڑا حوالہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے۔ اور یہ حوالہ بحمد اللہ اتنا مضبوط ہے کہ بش، ٹونی بلیئر اور اوباما کو بھی مسلمانوں کے کسی اجتماع میں بات کرنا ہوتی ہے تو قرآن کریم کی کوئی آیت یا جناب رسول اکرمؐ کا کوئی ارشاد یاد کر کے اس کا حوالہ دینا پڑتا ہے۔

مغربی اقوام اور ہمارے درمیان یہ فرق بلاشبہ موجود ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مغرب کے پاس نہ اصل توریت موجود ہے اور نہ ہی اصل انجیل تک ان کی رسائی ہے۔ اور آج کی عملی صورتحال یہ ہے کہ کوئی یہودی توریت کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہنے کا حوصلہ نہیں پاتا کہ یہ وہی توریت ہے جو حضرت موسی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، اور کسی مسیحی میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ انجیل کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکے کہ یہ وہ انجیل ہے جو حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ جبکہ دنیا کا کوئی بھی مسلمان قرآن کریم کے کسی

بھی نسخے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر کے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ وہ قرآن کریم ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ قرآن کریم کے وہ نسخے جو حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں لکھے گئے تھے ان میں سے ایک اوریجنل نسخہ لندن میں برٹش میوزیم کی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے جس کی زیارت کی مجھے سعادت حاصل ہوئی ہے۔ حضرت سید نفیس شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد عیسی منصوری کے ہمراہ میں وہاں گیا اور دیگر بہت سے نوادرات کے ساتھ قرآن کریم کا وہ نسخہ بھی دیکھا اور اسے ہاتھوں میں اٹھانے کا شرف حاصل کیا۔ اس نسخے کو دیکھ کر اللہ تعالی کی بے نیازی پر میرے ایمان کو مزید اطمینان حاصل ہوا کہ قرآن کریم کے اصلی نسخے کی حفاظت برطانیہ میں ہو رہی ہے اور اس کی اصلیت کی ضمانت غیر مسلم دے رہے ہیں۔

آپ حضرات کی دلچسپی کے لیے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سیدنا حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصحف قرآنی بھی دریافت ہوا ہے اور یمن کے دارالحکومت صنعاء کے میوزیم میں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ جب پہلی بار صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، ان دنوں کا قصہ ہے کہ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ یمن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصحف علوی دریافت ہوا ہے جس پر تحقیق ہو رہی ہے۔ میں ان دنوں جمعیت علماء اسلام (درخواستی گروپ) کا ڈپٹی سیکرٹری جنرل اور ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کا چیف ایڈیٹر تھا، جبکہ مولانا چنیوٹی جمعیت کے سیکرٹری اطلاعات تھے۔ انہوں نے ایک گفتگو میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ یہ کہیں کوئی شرارت یا سازش نہ ہو، مجھے بھی تشویش ہوئی۔ مولانا چنیوٹی نے اس خدشے کو سنجیدگی سے لیا اور اس مقصد کے لیے صنعاء کا مستقل سفر کیا، کچھ دن وہاں رہے، اس نسخے کی زیارت کی اور جہاں جہاں انہیں کوئی شبہ ہو سکتا تھا وہاں سے چیک کیا اور واپسی پر رپورٹ دی جو ہم نے ہفت روزہ ترجمان اسلام میں شائع کی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یمن کے کسی پرانے کتب خانہ سے قدیمی رسم الخط میں لکھا ہوا قرآن کریم کا ایک نسخہ دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں معروف ہے کہ یہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یمن کی حکومت نے اس مصحف علوی کو اپنی تحویل میں لے کر جرمنی کے ماہرین کی ایک ٹیم سے انکوائری کرائی ہے اور انہوں نے تفصیلی تحقیقات کے بعد یہ رپورٹ دی ہے کہ کاغذ، سیاہی، رسم الخط اور دیگر حوالوں سے یہ بات درست ہے کہ یہ اسی زمانے کا لکھا ہوا قرآن

کریم ہے اور حضرت علیؓ نے اسے تحریر کیا ہے۔ مولانا چنیوٹی کا فرمانا تھا کہ مجھے جہاں جہاں کوئی شبہ ہو سکتا تھا میں نے اسے چیک کیا ہے اور مجھے پورا اطمینان ہے کہ مصحف عثمانی اور مصحف علوی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا کہ یہ بات قرآن کریم کی حفاظت کے حوالے سے اس کے اعجاز کی ایک اور دلیل ہے جسے اللہ تعالی نے آج کے دور میں ہمارے لیے ظاہر کیا ہے۔ بات اصل میں مغربی دانشوروں کے اس اعتراض کی ہو رہی تھی کہ ہم نے تو بائبل اور مسیح علیہ السلام کا حوالہ ترک کر دیا ہے مگر مسلمانوں نے قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے حوالے ابھی تک باقی رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ یہ بات درست ہے اور مسلمانوں کے ساتھ مغرب کی تہذیبی اور ثقافتی کشمکش کی یہی سب سے بڑی بنیاد ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے کے مسلمان اپنے اجتماعی اور معاشرتی معاملات میں اسلام کے کردار اور قرآن و سنت کے حوالے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حکمران طبقات کی بات الگ ہے کہ وہ مغرب کے پروردہ اور تربیت یافتہ ہیں لیکن عام مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہیں قرآن و سنت کے ساتھ اپنے اس تعلق پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں اور مسلم دنیا کے ساتھ مغربی اقوام کے اختلاف کی اصل وجہ بھی یہی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفے کا ذکر بھی مناسب رہے گا کہ دو دوست آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر اللہ تعالی تمہیں دو گاڑیاں دے تو کیا کرو گے ؟ اس نے کہا کہ ایک تمہیں دے دوں گا۔ اس نے پھر پوچھا کہ اگر دو موٹر سائیکل مل جائیں تو کیا کرو گے ؟ اس نے کہا کہ ایک تمہیں دے دوں گا۔ پھر سوال کیا کہ اللہ تعالی تمہیں دو مکان دے تو کیا کرو گے ؟ اس نے کہا کہ ایک تمہیں دے دوں گا۔ اس نے پوچھا اگر اللہ تعالی تمہیں دو گائیں دے تو کیا کرو گے ؟ اس نے کہا کہ ان کی بات نہ کرو وہ میرے پاس موجود ہیں۔ بھئی ! ہمارے پاس تو قرآن و سنت دونوں موجود ہیں ہم سے انہیں چھوڑ دینے کی توقع حماقت کے سوا کیا ہو سکتی ہے ؟

قرآن و سنت کی عملداری، کس کی ذمہ داری؟

(روزنامہ پاکستان، لاہور- ۶ فروری ۲۰۱۱ء)

محترم غلام جیلانی خان نے قرآن کریم کے حوالے سے بہت اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ملا صاحبان اپنے بیانات اور خطبات میں سورہ الانعام کی آیت ۱۵۱ تا ۱۵۳ کے بارے میں بیان کرتے ہیں تو صرف برتھ کنٹرول سے متعلقہ حکم کا تذکرہ کرتے ہیں مگر وہ ۱۹ احکام جو ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں انہیں بیان نہیں کرتے۔ یہ احکام (۱) شرک (۲) ماں باپ کی فرمانبرداری (۳) فاقہ کے ڈر سے اولاد کے قتل سے ممانعت (۴) بے حیائی سے بچنے کی تلقین (۵) کسی انسان کے ناحق قتل کی حرمت (۶) یتیم کے مال کے قریب نہ جانا (۷) ناپ تول کو پورا کرنا (۸) ہر حال میں انصاف کی بات کرنا (۹) اور اللہ تعالیٰ سے کیا گیا عہد پورا کرنے سے متعلق ہیں۔

ہمیں بھی ملا صاحبان سے یہی شکایت رہتی ہے کہ وہ اپنے عمومی بیانات و خطبات میں قرآن کریم کی جامعیت کا عام طور پر لحاظ نہیں رکھتے اور صرف انہی موضوعات پر بات کرتے ہیں جو کسی نہ کسی حوالہ سے ان کی اپنی دلچسپی کے ہوں۔ البتہ محترم غلام جیلانی خان کا یہ شکوہ اصولاً صحیح ہونے کے باوجود مکمل طور پر صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ جو علماء کرام اپنی مساجد میں قرآن کریم کے مسلسل ترجمہ و درس کا اہتمام کرتے ہیں اور ترتیب کے ساتھ مکمل قرآن کریم ترجمہ و تفسیر کے ساتھ اپنے مقتدیوں کو سناتے ہیں ان کے ہاں یہ صورتحال نہیں ہے، وہ قرآن کریم کی ہر آیت اور ہر حکم پر بحث کرتے ہیں اور ہر جملے اور لفظ کا ترجمہ لوگوں کو بتاتے ہیں۔ ایسی مساجد اور علماء کرام کو اگر شمار کیا جائے تو صرف لاہور شہر میں ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوگی اور اس میں ہر مکتبہ فکر کے علماء کرام اور مساجد شامل ہیں۔

لیکن اس سے ہٹ کر ہم اپنے عمومی قومی رویے کے بارے میں عرض کریں تو صورتحال ایسی ہی ہے کہ ملا صاحبان کی تخصیص کیے بغیر کم و بیش ہمارے ہر طبقے کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ قرآن کریم بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنن میں سے بھی ہم عام طور پر صرف انہی آیات و ارشادات کی طرف توجہ دیتے ہیں جن سے ہمارا کوئی فائدہ وابستہ ہو یا اپنے کسی مخالف پر اس کے حوالہ سے چوٹ کر سکتے ہوں۔ ورنہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کے کچھ نیک بندوں کی ضرور توجہ ہوگی اور وہ ان

کے بارے میں مناسب مواقع پر بات بھی کرتے ہوں گے، لیکن عمومی رجحان جسے قومی رویے سے تعبیر کیا جاتا ہے یہی ہے کہ ہم ان آیات کو پڑھتے ہوئے ان سے کان لپیٹ کر یوں گزر جاتے ہیں جیسے یہ آیات ہمارے بارے میں نازل ہی نہ ہوئی ہوں یا ہمارا وقت آنے تک شاید یہ خدانخواستہ منسوخ ہو چکی ہوں۔ ان میں سے چند آیات کریمہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

سورہ البقرہ کی آیت ۲۰۸ میں ارشاد ربانی ہے:

”اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

سورہ المائدہ کی آیت ۴۹ و ۵۰ میں ہے:

”اور فیصلے کرو لوگوں کے درمیان ان احکام کے مطابق جو اللہ تعالی نے نازل کیے ہیں اور سوسائٹی کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، اور ان لوگوں سے بچتے رہو کہ وہ تمہیں اللہ تعالی کے کسی حکم سے بہکا نہ دیں کیونکہ بہت سے لوگ نافرمان ہوتے ہیں۔ کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں، اور ایمان والوں کے لیے اللہ تعالی کے حکم سے اچھا حکم کس کا ہے؟“

سورہ الحج کی آیت ۴۱ میں فرمان خداوندی ہے:

”ان لوگوں کو جب ہم زمین میں اقتدار دیتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں، معروف کاموں کا حکم دیتے ہیں اور منکر باتوں سے منع کرتے ہیں۔

سورہ البقرہ کی آیت ۱۷۸ و ۱۷۹ میں ہے:

”اے ایمان والو! قصاص کا قانون تم پر فرض کیا گیا ہے، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت (کو قتل کرو)، پس جس کو اس بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے جان کی معافی دے دی جائے تو (دیت کے لیے) پیچھا معروف طریقے سے کیا جائے اور ادائیگی بھی اچھے طور پر کر دی جائے۔ یہ (دیت کی سہولت) تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور مہربانی ہے، پس جو اس کے بعد حد سے تجاوز کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے اور تمہارے لیے اے ارباب دانش! قصاص کے قانون میں ہی زندگی ہے تاکہ تم متقی ہو جاؤ“

سورہ المائدہ کی آیت ۴۵ میں ارشاد ربانی ہے:

”اور ہم نے ان پر فرض کیا ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ،

ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ ہے۔ پس جس نے معاف کر دیا وہ اس کے لیے کفارہ ہے، اور جو لوگ اللہ تعالی کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہ لوگ کافر ہیں۔"

سورہ البقرہ آیت ۲۷۵ تا ۲۷۹ میں فرمان الٰہی ہے:

"وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے دن قبروں سے اس طرح اٹھیں گے جیسے جنوں کے چھونے سے بدحواس ہو جانے والے اٹھتے ہیں، اس لیے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ تعالی نے بیع و تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے، پس جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ باز آ گیا تو اس کی پچھلی غلطی معاف ہے اور جو لوگ اس کے بعد بھی اس کام کی طرف لوٹیں وہ دوزخ والے ہیں وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالی سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالی کسی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، انہوں نے اچھے اعمال کیے، نماز قائم کی اور زکوۃ دیتے رہے، ان کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے اور ان پر کوئی خوف نہیں ہو گا اور نہ وہ غم میں پڑیں گے۔ اے ایمان والو! اللہ تعالی سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ پس اگر تم سود کھانا نہیں چھوڑو گے تو اللہ تعالی اور اس کے رسولؐ کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے اصل مال تمہارے ہیں، نہ تم زیادتی کرو اور نہ تمہارے ساتھ زیادتی کی جائے۔"

سورہ النساء آیت ۷۵ میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

"اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالی کی راہ میں لڑتے نہیں ہو، حالانکہ مغلوب کیے جانے والے مرد اور عورتیں (تمہارے علم میں ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نجات دلا جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے کوئی حمایتی اور مددگار اپنی طرف سے بنا دے۔"

سورہ النور آیت ۴۷ تا ۵۱ میں خالق کائنات کا ارشاد گرامی ہے:

"اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسولؐ پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی اطاعت قبول کی، پھر ان میں ایک گروہ اس سے پھر جاتا ہے، وہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ اور جب اللہ تعالی اور اس کے رسولؐ کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں اچانک ایک گروہ ان میں سے منہ موڑنے لگتا ہے۔ اور اگر اس

میں ان کا کچھ مفاد ہو تو اس کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ خوف رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ ان سے انصاف نہیں کریں گے، بلکہ وہ لوگ خود ہی ظالم ہیں۔ بے شک ایمان والوں کی بات تو یہ ہے کہ جب انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو وہ یہ کہیں کہ ہم نے حکم سن لیا اور ہم نے اس کی اطاعت کی اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔"

سورہ النساء آیت ۱۰۵ میں فرمان خداوندی ہے:

"بے شک ہم نے آپ کی طرف قرآن کریم اس لیے اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلے کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سمجھایا ہے، اور آپ دغابازوں کی طرف سے فریق نہ بنیں۔"

ہم نے قرآن کریم کی چند آیات کریمہ کا حوالہ دیا ہے، ورنہ قرآن کریم کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور قوم کے ہر طبقہ کو قران کریم اور جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی پیروی کا حکم دیتا ہے اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین سے انحراف کو کفر اور ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔ جبکہ احکام شریعت کو ظاہری طور پر تسلیم کرتے ہوئے عملاً ان کو زندگی کے دائرے میں نہ لانے کو قرآن کریم نے منافقت قرار دیا ہے۔ مگر ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں اور جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات و حالات بھی سنتے رہتے ہیں لیکن ہماری عملی زندگی اس سے کوسوں دور ہے۔

قرآن و سنت کے وہ احکام جن کا تعلق ہماری اجتماعی زندگی اور ہمارے قومی و ریاستی نظام سے ہے اور جن کے اجراء و نفاذ کا ہم نے دستور میں عہد بھی کر رکھا ہے ان کی تفصیلات الگ ہیں۔ مگر نہ ہمارے حکمران طبقات کو اس سے دلچسپی ہے، نہ پارلیمنٹ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے تیار ہے، نہ بیوروکریسی اور فوج اس کے بارے میں خود کو ذمہ دار سمجھتی ہے اور نہ ہی عدلیہ ان احکام و قوانین کے ساتھ انصاف کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ستم کی بات یہ ہے کہ سب طبقات نے اس کو "ملا صاحبان" کے کھاتے میں ڈال رکھا ہے کہ اگر کچھ کرنا ہے تو انہوں نے ہی کرنا ہے، باقی طبقات کا خدانخواستہ نہ قرآن و سنت کے احکام کے ساتھ کوئی معاملہ ہے اور نہ ہی دستور کے وعدوں سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ جبکہ ملا صاحبان کا قصہ یہ ہے کہ ان کی ترجیحات میں بھی اسلام کے معاشرتی کردار، قرآن و سنت کے اجتماعی احکام، ایک نظریاتی ریاست اور رفاہی معاشرے کی تشکیل اور قوم کے تمام

طبقات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے لیے تیار کرنے کی عمومی جدوجہد ان کی ترجیحات میں صحیح جگہ حاصل نہیں کر سکی۔ ہمارا حال یہ ہے کہ قرآن و سنت کے جو چند قوانین ہم نے دستوری پابندی یا عوامی دباؤ کی وجہ سے نافذ بھی کر لیے ہیں تو سالہا سال گزر جانے کے باوجود ان میں کسی پر عملدرآمد کی نوبت نہیں آئی بلکہ ہم کسی نہ کسی بہانے سے ان سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں رہتے ہیں اور ان کو غیر مؤثر بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

قرآن کریم کے احکام کی طرف توجہ دلانے پر محترم غلام جیلانی خان کا تہہ دل سے شکریہ، مگر کیا اس ساری صورت حال کی ذمہ داری صرف ملا صاحبان پر ہے؟

دل صاحب انصاف سے انصاف طلب ہے

سائنس اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے

(نیو کشمیر کالونی، گوجرانوالہ - ۲۴ جنوری ۲۰۱۱ء)

گزشتہ ہفتہ کے دوران نیو کشمیر کالونی گوجرانوالہ میں ایک کمپیوٹر لیب کے افتتاح کے موقع پر اور اس کے ایک ہفتے بعد شالامار ٹاؤن لاہور میں میرے پرانے دوست اور دور طالب علمی کے ساتھی مولانا محمد نعیم جالندھری مرحوم و مغفور کے بیٹے محمد طیب کی قائم کردہ طیب سائنس اکیڈمی کی سالانہ تقریب میں ”اسلام اور سائنس“ کے موضوع پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا، ان معروضات کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ کمپیوٹر سائنس کی ایک اہم ایجاد ہے اور سائنس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ سائنس کی بدولت ہمیں زندگی میں قدم قدم پر سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور انسانی زندگی کا معیار روز بروز بہتر سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ اس سائنس کے ذریعے ہمیں اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور اللہ رب العزت نے غیب کی دنیا میں جو بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں چھپا رکھی ہیں وہ وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہتی ہیں جن سے ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ رب العزت کی ذات اور قدرتوں پر یقین بڑھتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ہوا میں موجود لہریں جن کے ذریعے گفتگو اور تصویریں ایک جگہ سے دوسری جگہ آناً فاناً منتقل ہو جاتی ہیں، ہمیں کچھ عرصہ پہلے تک ان کا علم نہیں تھا اور دکھائی تو اب بھی نہیں دیتیں، لیکن سائنس نے نہ صرف انہیں دریافت کیا بلکہ ان

کے استعمال کا طریقہ بھی ترتیب دیا۔ خدا جانے اس جیسی کتنی قوتیں اس فضا کے عالم غیب میں پوشیدہ ہیں جو وقفے وقفے سے ظاہر ہوتی رہیں گی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہمارے ایمان میں اضافے کا سبب بنتی رہیں گی۔

سائنس جہاں قدرت خداوندی کے اظہار کا ذریعہ ہے وہاں وہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات کو صحیح طور پر سمجھنے کا بھی ذریعہ ہے کیونکہ بہت سی باتیں ہیں جن پر ایمان تو تھا لیکن وہ مشاہدات اور محسوسات کے دائرے میں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ جوں جوں سائنس آگے بڑھ رہی ہے ایسی باتیں ایک ایک کر کے سمجھ میں آتی جا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر چند باتوں کا تذکرہ کروں گا۔

- قرآن کریم میں جب یہ عقیدہ بیان کیا گیا کہ انسان کی یہ زندگی عارضی ہے اور مرنے کے بعد اسے قبر سے دوبارہ اٹھایا جائے گا اور حساب کتاب کے بعد جنت یا دوزخ میں بھیج دیا جائے گا تو بہت سے لوگوں کو اشکال ہوا کہ جب ہم مر کر مٹی میں مل جائیں گے اور ہڈیاں بوسیدہ ہو کر بکھر جائیں گی تو ان ہڈیوں کو کون جمع کرے گا اور جسم کے بکھرے ہوئے ذرات کو کون تلاش کرے گا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ القیامہ میں فرمایا کہ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں دوبارہ جمع نہیں کر پائیں گے، کیوں نہیں؟ بلکہ ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پوروں کو بھی دوبارہ سیٹ کر دیں۔ یہاں انسان کو دوبارہ زندہ کرنے کے حوالے سے انگلیوں کے پوروں کا خاص طور پر ذکر ایک عرصے تک سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے خصوصی ذکر کی وجہ کیا ہے۔ لیکن جب سائنس نے فنگر پرنٹس کے حقائق منکشف کیے تو بات سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ ہڈیاں جمع کرنا اور ان کو دوبارہ منظم کرنا تو رہا ایک طرف ہم مرنے والے انسان کے دوبارہ زندہ ہونے پر اس کے پہلے والے فنگر پرنٹس دوبارہ سیٹ کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔
- بخاری شریف میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک بار سورج کو گرہن لگا تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مسجد نبویؐ میں نماز پڑھائی اور بہت لمبی نماز پڑھائی۔ جب تک سورج دوبارہ روشن نہیں ہوا آپؐ نماز کی کیفیت میں ہی رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر جناب رسول اکرمؐ نے

خطبہ ارشاد فرمایا اور بہت سی دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ مجھے نماز کے دوران اس قبلہ والی دیوار کی سطح پر بہت سی ایسی چیزیں دکھائی گئی ہیں جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھیں، حتیٰ کہ جنت اور دوزخ کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں اور میں نے لوگوں کو جنت میں خوشی کی زندگی بسر کرتے اور جہنم میں جلتے دیکھا ہے۔ دیوار کی سطح پر مناظر دیکھنے کی یہ بات ایک عرصے تک قابل توجیہ رہی اور محدثین اپنے اپنے انداز میں اس کی کیفیات بیان کرتے رہے کہ دیوار کی سطح پر مناظر کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ مگر اب ویڈیو کی ایجاد نے یہ بات سمجھائی کہ دیوار کی سطح پر بھی مناظر دیکھے جا سکتے ہیں اور ہم خود اپنے ہی مناظر ریکارڈ کرنے کے بعد سامنے بیٹھ کر انہیں دیکھتے ہیں۔

• قرآن کریم اور احادیث نبویہؐ میں قیامت کے دن اقوال اور اعمال کے تولے جانے کا ذکر ہے جس پر بہت سے لوگوں کو صدیوں تک الجھن رہی کہ قول بھی منہ سے نکل کر فضا میں گم ہو جاتا ہے اور عمل اور ایکشن بھی رونما ہونے کے بعد فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے، یہ تو گرفت اور قابو میں ہی نہیں آتے ان کو تولا کیسے جا سکتا ہے؟ یہ بحث اس قدر بڑھی کہ ایک گروہ نے سرے سے وزن اعمال اور وزن اقوال کا ہی انکار کر دیا کہ چونکہ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اس لیے قرآن کریم کی ایسی آیات اور جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات کو جوں کا توں ماننے کی بجائے اس کی تاویل کی جائے گی۔ مگر آج سائنسی ترقی کی بدولت انسان کے اعمال بھی ریکارڈ ہوتے ہیں اور اقوال بھی قابو میں آجاتے ہیں کہ یہ آڈیو اور ویڈیو کا سسٹم انسان کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ میں لانے کا ہی عمل ہے۔ عربی کے ایک محاورے نے ہزاروں سال تک انسانی ذہنوں پر حکمرانی کی ہے کہ ”اذا تلفظ فتلاشی“ جب بات منہ سے نکلتی ہے تو فضا میں تحلیل ہو کر معدوم ہو جاتی ہے لیکن آڈیو اور ویڈیو نے اس محاورے کو غلط ثابت کر دیا اور بتایا ہے کہ لفظ بھی قابو میں آتا ہے اور عمل بھی ریکارڈ میں آجاتا ہے۔

• بخاری شریف کی ایک حدیث کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جب انسان قبر میں جا کر مٹی میں مل جاتا ہے تو اس کے جسم کی ہر چیز فنا ہو جاتی ہے مگر ایک جزو باقی رہتا ہے۔ اسے جناب نبی اکرمؐ نے

’’عجب الذنب‘‘ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کا آسان ترجمہ ’’دمچی کا مہرہ‘‘کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ یہ عجب الذنب فنا نہیں ہوتا موجود رہتا ہے ’’وفیہ یرکب الخلق‘‘ اور اسی سے انسانی جسم کی دوبارہ تشکیل ہوگی۔ یہ بات بھی ایک عرصہ تک بظاہر نہ سمجھ میں آنے والی باتوں میں شامل رہی ہے مگر سائنس دان ہر جاندار کے جسم میں جس کلون کی بات کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر ’’کلوننگ‘‘ کے مسلسل تجربات کیے جا رہے ہیں میری طالب علمانہ رائے میں یہ وہی عجب الذنب ہے جس کا ذکر جناب رسول اکرمؐ نے چودہ سو سال قبل فرما دیا تھا۔ انسانی کلوننگ کی مذہب اور اخلاقیات کے حوالے سے مخالفت کی جا رہی ہے جبکہ میرا وجدان کہتا ہے کہ کوئی سائنسدان یہ حرکت کر گزرے گا اور یاجوج ماجوج کے جس خوفناک لشکر کے ہاتھوں انسانی سوسائٹی کی تباہی کا ذکر احادیث نبویہؐ میں موجود ہے شاید اسی کا کرشمہ ہو۔

- جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جب ماں کے پیٹ میں بچے کا حمل قرار پکڑتا ہے تو اس پر ایک فرشتے کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے جو اس کی مرحلہ وار نگرانی کرتا ہے اور اس کی رپورٹ دیتا رہتا ہے۔ جب ماں کے پیٹ میں حمل کو چار ماہ گزر جاتے ہیں تو وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ سے پوچھتا ہے کہ اس کی عمر کتنی ہوگی، اس کا رزق کتنا ہوگا، اس کے اعمال کیسے ہوں گے اور یہ کس کیٹیگری میں ہوگا، شقی لوگوں میں سے ہوگا یا سعادت مند ہوگا۔ فرشتہ یہ ساری باتیں پوچھ کر اس کی فائل بناتا ہے اور فائل مکمل ہو جانے کے بعد بچے میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ یہ بچہ پیدا ہو کر اور جوان ہو کر کرے گا وہی جو اس کا جی چاہے گا اور اسی پر اس کے اعمال کی جزا یا سزا کا مدار ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے کامل علم کے حوالے سے اسے روح کا کنکشن دینے سے پہلے ہی اس کی فائل مکمل کرا دیتے ہیں۔ آج کل سائنسدان جس ’’جین‘‘ کی بات کر رہے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس میں سب کچھ ریکارڈ پر موجود ہے، انسانی زندگی کے ہر لمحے کی تفصیلات اس میں درج ہیں اور اگر اس جین کا کوڈ کھل سکے تو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ شخص اپنی عمر کے کس مرحلے میں کیا کام کرے گا اور اس کے ساتھ زندگی کے کون سے دور میں کیا ہوگا؟ میری طالب علمانہ رائے ہے کہ یہ جین وہی

فرشتے کی فائل ہے جس کا بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا ہے کہ وہ روح اور جسم کا کنکشن جڑنے سے قبل ہی مکمل ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں لطیفے کی بات یہ ہے کہ چند ماہ قبل ایک برطانوی سائنسدان کا بیان اخبارات کی زینت بنا کہ ہمارے اردگرد کوئی غیبی مخلوق محسوس کی جا رہی ہے اور اس سائنس دان نے مشورہ دیا کہ اگر یہ مخلوق کسی انسان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے تو اسے اپنے راز اور معلومات فراہم نہ کیے جائیں کیونکہ وہ غیبی مخلوق ہمارے سسٹم کو ڈسٹرب کر سکتی ہے۔ مجھے یہ بیان پڑھ کر بہت ہنسی آئی کہ اس شریف آدمی کو کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ غیبی مخلوق کے ساتھ ہمارا رابطہ اور تعلق تو پیدا ہونے سے بھی پہلے سے ہے بلکہ ہماری فائل بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہمارے اردگرد ہر وقت موجود رہتی ہے حتیٰ کہ ہمارا سارا نظام اسی کے کنٹرول میں رہتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے تو اس کے اعمال و اقوال کی ریکارڈنگ کے لیے ہر وقت موجود رہتے ہیں، کچھ حفاظت کے فرشتے بھی ہوتے ہیں اور کچھ خاص مواقع پر آنے والے فرشتے ہوتے ہیں۔ ایک حدیث نبویؐ میں ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے فرشتے ہیں جو ہر وقت دنیا کے گرد چکر لگا کر ایسی مجالس تلاش کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہو، وہ ایسی مجالس کو گھیرے میں لے لیتے ہیں اور جب تک مجلس قائم رہتی ہے وہ فرشتے مجلس کے شرکاء کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ہم جتنے لوگ اس مجلس میں موجود ہیں ہمیں گھیرے میں لینے کے لیے اسی حساب سے فرشتے ہونے چاہئیں۔

خدا جانے یہ بات ہمارے درمیان کیسے آگئی ہے کہ سائنس اور مذہب میں کوئی دشمنی ہے یا سائنس اسلام سے متصادم ہے یا اسلام سائنس کے خلاف ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ سائنس اسلام کی خدمت گزار ہے کہ وہ قرآن و سنت کے بیان کردہ حقائق کو دنیا پر منکشف کرتی جا رہی ہے اور جو باتیں ابھی تک لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہیں مستقبل میں سائنسی ترقی کی بدولت سمجھ میں آتی رہیں گی۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۴ جنوری ۲۰۱۱ء)

دینی طلبہ کے لیے تین نصیحتیں

(دار العلوم مدنیہ، ماڈل ٹاؤن، بہاولپور - ۹ جنوری ۲۰۱۱ء)

(دار العلوم مدنیہ ماڈل ٹاؤن بہاولپور کے مہتمم حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمن مدظلہ کی دعوت پر مولانا زاہد الراشدی نے جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے سہ ماہی امتحان کی تعطیلات کے موقع پر ۸ و ۹ جنوری ۲۰۱۱ء کو بہاولپور کا دورہ کیا اور دار العلوم مدنیہ، جامعہ نظامیہ، جامعہ عباسیہ اور جامعہ صدیقیہ میں اساتذہ اور طلبہ کے مختلف اجتماعات سے خطاب کیا، ان خطابات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ دار العلوم مدنیہ بہاولپور میں حاضری اور اساتذہ و طلبہ سے ملاقات میرے لیے اس حوالہ سے زیادہ خوشی اور سعادت کی بات ہے کہ اس ادارے کے قیام میں میرے ایک بزرگ دوست حضرت مولانا غلام مصطفی بہاولپوریؒ کا بنیادی کردار ہے اور یہ ان کی یادگار اور صدقہ جاریہ ہے۔ انہوں نے حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمن صاحب اور دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر اس دینی ادارے کی بنیاد رکھی جو آج ملک کے معروف مدارس میں شمار ہوتا ہے، اور ان کے فرزندان حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمن کی سرپرستی میں اس دینی و علمی جدوجہد کو مسلسل آگے بڑھا رہے ہیں۔ حضرت مولانا غلام مصطفی بہاولپوریؒ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور جمعیت علماء اسلام پاکستان کے سرگرم راہنماؤں میں سے تھے اور تحریک ختم نبوت، تحریک نفاذ شریعت، شریعت بل کی جدوجہد اور تحریک نظام مصطفیٰ میں ان کے ساتھ میری مسلسل جماعتی و تحریکی رفاقت رہی ہے اور ہم نے حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کی راہنمائی اور رفاقت میں دینی جدوجہد میں شرکت کا شرف حاصل کیا ہے، فالحمد للہ علی ذلک۔

دینی مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہیں اور مجھے ان کی خدمت میں کچھ معروضات پیش کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ تعمیل حکم میں پہلی بات تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں انسانی سوسائٹی میں اپنے کام کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں سمجھنا چاہیے کہ

- ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ کیا ہے اور اسے دنیا کس نظر سے دیکھ رہی ہے؟
- دینی مدارس کی مخالفت کرنے والے ان مدارس کے خلاف کیوں ہیں؟
- اور مدارس کے خلاف اہل مغرب کے غصہ و اضطراب کی وجہ کیا ہے؟

ہمارا کام تو واضح ہے کہ ان مدارس میں قرآن و سنت کی تعلیم دی جاتی ہے اور آسمانی تعلیمات کے تحفظ اور فروغ کے ساتھ ساتھ عام انسان کا آسمانی تعلیمات کے ساتھ تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ مدرسہ نہ صرف آسمانی تعلیمات، وحی الٰہی اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین پڑھا رہا ہے بلکہ اسلام کے معاشرتی کردار کی بحالی کے لیے بھی محنت کر رہا ہے۔ جبکہ دنیا کی اکثریت مذہب کے معاشرتی کردار سے دستبردار ہو چکی ہے اور عقیدہ، دین اور مذہب کو فرد کا ذاتی اور اختیاری معاملہ قرار دے کر اجتماعی معاملات اور معاشرتی مسائل میں مذہبی راہنمائی کو اس نے مسترد کر رکھا ہے۔ یہ بات کہ انسانی سوسائٹی کے معاملات اور معاشرہ کے اجتماعی مسائل میں آسمانی تعلیمات کی راہنمائی اور بالادستی ہونی چاہیے، اس میں دنیا کی باقی اقوام ایک طرف ہیں اور اہل اسلام دوسری طرف ہیں۔ مسلمان امت بحمد اللہ تعالیٰ آج بھی اپنے معاشرتی مسائل میں قرآن و سنت کی راہنمائی کو تسلیم کرتی ہے اور اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک مغربی دانشور نے لکھا تھا کہ ہم نے حکومت و ریاست اور معاشرت کے معاملات میں خدا، رسول اور کتاب کا حوالہ ختم کر دیا ہے اور سب قومیں اور ممالک آزادانہ مرضی کے ساتھ اپنے معاملات طے کرتے ہیں مگر مسلمانوں نے آج بھی قرآن و سنت کا حوالہ قائم رکھا ہوا ہے، ان سے جس مسئلہ پر بات کی جائے وہ خدا کا حوالہ دیتے ہیں، قرآن کریم کا حوالہ دیتے ہیں اور جناب نبی اکرمؐ کے حوالہ سے بات کرتے ہیں۔ میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ بات درست ہے، الحمد للہ آج بھی ہمارا سب سے بڑا حوالہ اللہ تعالیٰ، قرآن کریم اور جناب نبی کریمؐ کے ارشادات ہیں، یہ حوالہ اس قدر مضبوط و مستحکم ہے کہ اوباما، بش اور ٹونی بلیئر کو بھی مسلمانوں سے جب بات کرنا ہوتی ہے تو قرآن کریم کی کوئی آیت یا جناب نبی اکرمؐ کی کوئی حدیث یاد کر کے انہیں اس کا حوالہ دینا پڑتا ہے۔ آج جس چیز کو غزو فکری، ثقافتی کشمکش، تہذیبی جنگ اور سولائزیشن وار قرار دیا جا رہا ہے وہ یہی نکتہ ہے اور مغرب اور اس کی ممنوع قوموں کو پریشانی لاحق ہے کہ عام مسلمان دنیا کے کسی بھی حصہ میں اپنے معاملات و مسائل میں خدا اور رسولؐ کا حوالہ ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مسلمان حکمرانوں اور حکمران طبقات کی صورتحال اس سے مختلف ہے مگر عام مسلمانوں کی صورتحال پوری دنیا میں یہی ہے کہ وہ قرآن و سنت پر اور اسلام کے معاشرتی

کردار پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے معاملات خدا اور رسولؐ کے حوالہ سے ہی طے کرنا چاہتے ہیں۔

آج عالمی صورتحال یہ ہے کہ مغربی استعمار سیاسی، معاشی، سائنسی، تجارتی اور عسکری شعبوں میں ہم پر کتنا ہی حاوی کیوں نہ ہو اور اس نے عالم اسلام کو ان شعبوں میں کتنے ہی مضبوط شکنجے میں کیوں نہ جکڑ رکھا ہو مگر فکری، دینی اور ثقافتی محاذ پر اسے شکست کا سامنا ہے اور وہ دو بلکہ تین صدیوں کی محنت کے باوجود عام مسلمان کا تعلق قرآن و سنت سے توڑنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے، اسے اس ناکامی پر سخت پریشانی لاحق ہے اور اب اس کی یہ پریشانی جھلاہٹ اور جھنجلاہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے جس کا مظاہرہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔

مغرب کا تجزیہ ہے کہ اس صورتحال کا سبب دینی مدارس ہیں جو قرآن و سنت کی نہ صرف تعلیم دیتے ہیں بلکہ انہوں نے دینی ماحول بھی قائم رکھا ہوا ہے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی روایات و مظاہر کو دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ مغرب ثقافتی محاذ پر اپنی ناکامی کا سب سے بڑا سبب دینی مدارس کو سمجھتا ہے اور اس مقصد کے لیے اپنے تمام تر وسائل اور صلاحیتیں صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح ان مدارس کا وجود ختم ہو جائے یا کم از کم ان کے معاشرتی کردار کو غیر مؤثر بنا دیا جائے مگر اس میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی۔ کیونکہ اہل مغرب کا مغالطہ ہے اور کبھی کبھی ہم بھی اس مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ دینی مدارس دین کی حفاظت کر رہے ہیں اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ ظاہری طور پر بات ایسی ہی نظر آ رہی ہے مگر یہ بات مغرب کی سمجھ سے بالاتر ہے، البتہ ہمیں ضرور ہر وقت اسے پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دینی مدارس کی وجہ سے قرآن و سنت کی تعلیمات باقی نہیں بلکہ قرآن و سنت کی وجہ سے دینی مدارس کا وجود قائم ہے۔ قرآن کریم نے اور جناب نبی اکرمؐ کی تعلیمات نے تو باقی رہنا ہے اور قیامت تک رہنا ہے اس لیے کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھی ہے، اور جب قرآن کریم نے باقی رہنا ہے تو دینی مدارس نے بھی بہر حال قائم رہنا ہے کہ وہ اس حفاظت کے اسباب میں سے ہیں۔

محترم اساتذہ اور طلبہ! آپ حضرات اس ماحول میں قرآن و سنت، فقہ اسلامی اور دیگر علوم کی تعلیم دے رہے ہیں اور حاصل کر رہے ہیں، اس لیے یہ رسمی اور عام تعلیم و تدریس

نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خاص ہدف ہے اور منزل ہے۔ وہ یہ کہ آج کے دور میں جب دنیا کی بیشتر اقوام آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار سے دستبرداری اختیار کر چکی ہے، صرف مسلمان ہیں جو نہ صرف آسمانی تعلیمات کی بات کرتے ہیں اور ان کی بقا و تحفظ کے لیے کوشاں ہیں بلکہ پڑھتے پڑھاتے بھی ہیں، ان پر عملدرآمد کا ماحول باقی رکھے ہوئے ہیں اور انسانی معاشرے میں آسمانی تعلیمات کی واپسی اور بالادستی کی جدوجہد بھی ہمارے اہداف میں شامل ہے۔ اس لیے میں آپ حضرات کی خدمت میں دو تین باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں انہیں آپ مشورہ سمجھ لیں یا نصیحت قرار دے لیں مگر ان پر توجہ ضرور دیں۔

1. ایک یہ کہ ہمیں قرآن و سنت کی تعلیمات حاصل کرنے اور فقہ و شریعت پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد کے ماحول اور اس وقت کی عالمی صورتحال کو بھی سمجھنا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو جس سوسائٹی میں ہم فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس سوسائٹی کی ضروریات، نفسیات، ذہنی سطح اور تقاضوں کو سمجھنا اور ان کا علم حاصل کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم اپنے بزرگوں کا یہ قول نقل ضرور کرتے ہیں کہ ”من لم یعرف اہل زمانہ فھو جاہل“ مگر اس سے سبق حاصل نہیں کرتے۔ اس جملہ کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ جو شخص اپنے زمانے کے لوگوں کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے، لیکن ہمارے حوالے سے اس کا مقصد یہ ہے کہ عالم بننے کے لیے صرف کتابی علم کافی نہیں بلکہ سوسائٹی اور زمانے کا علم بھی ضروری ہے۔ جبکہ ہماری صورتحال یہ ہے کہ ہم دنیا کے حالات بلکہ اپنے ملک کے حالات سے واقفیت کے لیے بسا اوقات اخبار کے مطالعہ کو بھی ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اسے فضول قرار دیتے ہیں۔ میں نے بعض مدارس میں دیکھا ہے کہ مدرسہ کی حدود میں اخبار کا داخلہ بند ہے، ہم نے حالات سے واقف نہ ہونے کو مسائل کا حل سمجھ رکھا ہے، یہ بات درست نہیں ہے اور اس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم سب کے لیے بالخصوص اساتذہ کے لیے یہ بہت زیادہ ضروری ہے کہ حالات سے واقفیت حاصل کریں اور دنیا میں روزمرہ رونما ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر رہیں تاکہ وہ اپنے طلبہ کو کتابی علم کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ سوسائٹی پر اس کے اطلاق اور حالات کے ساتھ ادا کی تطبیق کی

صورتیں بھی بتا سکیں اور انہیں آنے والے حالات میں ان کی ذمہ داریوں کے لیے تیار کر سکیں۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے جو انتہائی افسوسناک اور تشویشناک بات ہے۔ میں ایک ذاتی واقعہ اس سلسلہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے طالب علمی کے زمانے میں والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا معمول تھا کہ سال کے دوران جو کتابیں میں نے پڑھی ہوتی تھیں سالانہ تعطیلات کے دوران ان میں ایک دو کا انتخاب کر کے وہ مجھ سے سنتے تھے، اور اس سنانے میں مجھے کتاب خود حل کر کے بیان کرنا ہوتی تھی۔ ''شرح عقائد'' میں نے حضرت والد محترمؒ سے ہی پڑھی تھی اور چھٹیوں میں انہیں سنائی بھی تھی، میں نے اپنی سہولت کے لیے حضرت مولانا عبد العزیز فرہارویؒ کی کتاب ''النبراس'' رکھی ہوتی تھی جو عربی میں ''شرح عقائد'' کی بہت اچھی شرح ہے۔ ایک دن حضرت والد محترمؒ نے میرے پاس وہ کتاب دیکھ لی اور اس بات پر غصہ ہوئے کہ میں ''النبراس'' دیکھ کر شرح عقائد کی عبارات کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انہوں نے وہ مجھ سے لے کر ضبط کر لی اور فرمایا کہ نفس کتاب سے مسئلہ حل کرو۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ایک وقت وہ تھا کہ طالب علم کے کتاب کے حل کے لیے عربی شرح دیکھنے کو پسند نہیں کیا جاتا تھا، مگر آج صورتحال یہ ہے کہ بہت سے اساتذہ اپنی تپائی کے نیچے کتاب کا اردو ترجمہ اور شرح رکھ کر اس کی مدد سے پڑھاتے ہیں، یہ تدریس و تعلیم کے معیار کا انحطاط ہے جو دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، اساتذہ کو اس طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

اس سلسلہ میں لطیفہ کی بات یہ ہے کہ ''النبراس'' کی ضبطی کے بعد ایک عرصہ تک والد محترم سے وہ کتاب مانگنے کا حوصلہ نہیں ہوا اور ان کی وفات سے شاید ایک دو سال قبل میں نے ایک دن ہنستے ہنستے کہا کہ حضرت! میری وہ کتاب تو واپس کر دیں تو انہوں نے ایک الماری کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں پڑی ہے لے لو۔ اور اس طرح میں نے کم و بیش چالیس سال کے بعد ''النبراس'' دوبارہ حاصل کی۔ پندرہ بیس سال قبل کی بات ہے کہ ایک بار میں نے حضرت والد

محترمؒ سے دل لگی کے انداز میں عرض کیا کہ ہمیں آپ پڑھائی کے دوران بہت ڈانٹا کرتے تھے اب سنائیں آپ کے شاگردوں کا کیا حال ہے؟ فرمانے لگے کہ ”سنگیو! تم لوگ پھر بھی بہتر تھے کہ عبارت تو پڑھ لیا کرتے تھے“۔ المیہ یہ ہے کہ یہ انحطاط مسلسل بڑھ رہا ہے اور اس کے سدباب کے لیے مدارس کے وفاقوں کو جو توجہ دینی چاہیے ان کے پاس اس کے لیے فرصت ہی نہیں ہے۔

3. تیسری بات عزیز طلبہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ عالم دین بننے جا رہے ہیں اور آپ کا مقصد یہ ہے کہ علم دین حاصل کر کے اس پر عمل کریں گے اور اسے آگے پہنچائیں گے۔ اس آگے پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم آپ کے پاس موجود بھی رہے۔ آپ ایک چیز لوگوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود آپ کے پاس بھی ہونی چاہیے ورنہ تقسیم کیا کریں گے؟ علم آپ کے پاس موجود ہو گا اور اپنے علم پر آپ کا اعتماد ہو گا تو لوگوں تک صحیح طریقہ سے پہنچا سکیں گے اور آپ کے پاس خود اگر علم نہیں ہو گا یا ہو گا مگر ادھورا ہو گا تو خرابی پھیلانے کا باعث بنیں گے۔

ایک عام محاورہ ہے کہ ”نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان“۔ حکیم اگر ادھورا ہو اور اناڑی ہو تو وہ لوگوں کی جانوں کے لیے خطرہ ہوتا ہے اور اگر ملا ادھورا اور اناڑی ہو تو وہ لوگوں کے ایمان کے لیے خطرہ بن جاتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے۔ اس لیے کہ اس وقت آپ جن فتنوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور ان کے سدباب کے لیے متفکر رہتے ہیں، ان کا اگر تجزیہ کریں گے تو ہر فتنہ کے پیچھے آپ کو کوئی نہ کوئی ”نیم ملا“ کھڑا نظر آئے گا جو تعلیم و تربیت یا فکری و روحانی اصلاح کے کسی نہ کسی حوالہ سے ادھورا ہو گا اور ملا کی بجائے نیم ملا ہو گا۔ ہمارے دینی مسائل اور معاملات زیادہ تر نیم ملاؤں کے ہاتھوں ہی بگڑے ہیں۔ اس لیے عزیز طلبہ سے میری گزارش ہے کہ وہ ملا بنیں نیم ملا نہ بنیں۔ اور ملا بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دیں، سبق پابندی کے ساتھ پڑھیں، ناغے سے گریز کریں، مطالعہ اور تکرار کا اہتمام کریں اور سب سے بڑی بات کہ وہ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ یہ آٹھ دس سال جو آپ کو پڑھنے کے لیے ملے ہیں ان کو غنیمت سمجھیں اور پڑھائی کے علاوہ اور کاموں

کی طرف دھیان نہ دیں۔ باقی کاموں کے لیے ساری زندگی پڑی ہے، یہ دور آپ کا تعلم کا دور ہے، سیکھنے کا دور ہے، تربیت کا دور ہے اور تیاری کا دور ہے۔ ان اوقات کو انہی کاموں میں صرف کریں اور یاد رکھیں کہ اس دوران اگر کوئی کمی رہ گئی تو وہ ساری زندگی اسی طرح رہے گی، نہ اس کمی کو دور کرنے کا موقع ملے گا اور نہ ہی اس کے لیے آپ کے پاس فرصت ہوگی۔

میں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے بحمد اللہ تعالیٰ آٹھ دس سال مدرسہ کے ماحول میں گزارے ہیں، اس دور میں وفاق کی درجہ بندی ہمارے ہاں نہیں ہوتی تھی اور کتابوں کی ترتیب سے ہی پڑھا جاتا تھا۔ میں کسی جھجک کے بغیر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ جن فنون میں دوران تعلیم کمزوری رہ گئی ہے بخدا چالیس سالہ تدریسی دور میں بھی اسے ختم نہیں کر سکا۔ نہ مصروفیات میں سے اس کے لیے وقت نکل سکا ہے اور نہ ہی اس کے مواقع میسر آتے ہیں۔ اس لیے طلبہ سے عرض ہے کہ اس تعلیمی دورانیہ کو پوری توجہ اور ہمت و صبر کے ساتھ تعلیمی محنت میں صرف کریں تاکہ صحیح "ملا" بن کر دین و قوم کی صحیح خدمت کر سکیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات کی اچانک خبر ملک بھر کے علمی و فکری حلقوں کی طرح میرے لیے بھی بہت بڑا دھچکا ثابت ہوئی۔ میں اس روز ڈیرہ اسماعیل خان میں تھا۔ ایک روز قبل مولانا عبد الرؤف فاروقی اور مولانا قاری جمیل الرحمن اختر کے ہمراہ کلاچی گیا تھا۔ جمعیت علماء اسلام کے بزرگ راہنما مولانا قاضی عبد اللطیف کی وفات کے بعد وہاں نہیں جا سکا تھا، ان کے برادر بزرگ حضرت مولانا قاضی عبد الکریم صاحب مدظلہ اور دیگر اہل خاندان سے تعزیت کی اور رات کو ہم ڈیرہ اسماعیل خان آگئے۔ ڈیرہ میں موبائل فون کی سروس سکیورٹی کے عنوان سے ایک عرصے سے بند ہے۔ اپنے پروگراموں سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت ہم ڈیرہ اسماعیل خان سے روانہ ہوئے تو شہر سے باہر نکلتے ہی موبائل فون کی

گھنٹی بجی اور ہمارے گوجرانوالہ کے ساتھی حافظ محمد یحیی میر نے اطلاع دی کہ آپ کے اسلام آباد والے دوست ڈاکٹر محمود احمد غازی انتقال کر گئے ہیں۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ان سے خبر کا ذریعہ پوچھا تو بتایا کہ ٹیلی وژن کے ایک چینل پر پٹی چل رہی ہے۔ اسلام آباد کے ایک دو دوستوں کو فون کیا تو انہوں نے تصدیق کر دی کہ ڈاکٹر صاحب کا صبح نماز فجر کے وقت انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جنازے کے بارے میں بتایا گیا کہ دو بجے اسلام آباد میں ہے۔ اس وقت ایک بجے دن کا وقت تھا، جنازے میں شریک نہ ہو سکنے کا صدمہ بھی ڈاکٹر غازی مرحوم کی اچانک جدائی کے غم کا ساتھی بن گیا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ۳۱ اکتوبر کو ہمارے ہاں گوجرانوالہ تشریف آوری کا پروگرام طے کر رکھا تھا۔ الشریعہ اکادمی میں ''دینی مدارس میں تدریس قرآن کریم کی اہمیت اور تقاضے'' کے موضوع پر ایک سیمینار کا پروگرام طے تھا جس کے مہمان خصوصی ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ تھے اور تاریخ انہی کے مشورے سے طے ہوئی تھی۔ ہم اس سیمینار کی تیاری کر رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی تشریف آوری سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ مزید چھوٹے چھوٹے پروگرام بھی ترتیب دے رہے تھے کہ اچانک انہیں مالک حقیقی کی طرف سے بلاوا آگیا اور وہ سارے پروگرام چھوڑ کر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے خاندان سے تھا۔ انہوں نے ابتدائی دینی تعلیم جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں حاصل کی اور دورۂ حدیث دار العلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی میں کیا۔ ان کے حدیث کے استاذ صوبہ خیبر پختون خواہ کے معروف محدث حضرت مولانا عبد الرحمن المینویؒ اور قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کے استاذ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ تھے۔ وہ اپنے استاذ محترم کی طرز پر مختلف یونیورسٹیوں میں چند روز کے اندر دورۂ تفسیر بھی کراتے تھے۔ ایک دفعہ ان سے نوٹنگھم (برطانیہ) کے جامعہ الہدیٰ میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ لیسٹر کے ادارہ اسلامک فاؤنڈیشن میں دس روزہ دورۂ تفسیر قرآن کریم کرانے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس طرز کے دورۂ تفسیر قرآن کریم کراتے رہتے ہیں۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم میں پیشرفت کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے کہ بین الاقوامی

اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے صدر کے منصب پر فائز ہوئے، مگر ان کا اصل تعارف ان کی ڈگریوں کے حوالے سے نہیں، بلکہ ان کے علمی مقام اور دینی و علمی خدمات کے حوالے سے جس نے انہیں دینی و عصری علوم کے ماہرین میں ایک متفق علیہ شخصیت اور معتمد راہنما کے مقام پر فائز کر دیا۔

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کے ساتھ پہلی ملاقات یاد نہیں، مگر بیسیوں ملاقاتوں کے مناظر ذہن کی اسکرین پر جھلملا رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے ابتدائی دور میں ڈاکٹر غازی مرحوم ہماری دعوت پر گوجرانوالہ تشریف لائے، یونیورسٹی میں ایک تقریب سے خطاب کیا اور تعلیمی نظام میں بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔ اس موقع پر انہوں نے جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے بھی خطاب کیا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم میرے علمی و فکری معاملات میں سب سے بڑے مشیر تھے اور ہمارے درمیان امت مسلمہ کے علمی و فکری مسائل پر تبادلہ خیالات اور مشاورت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ لندن میں مولانا محمد عیسی منصوری اور مولانا مفتی برکت اللہ کے ساتھ مل کر ہم نے ”ورلڈ اسلامک فورم“ قائم کیا جو گزشتہ دو عشروں سے علمی و فکری محاذ پر سرگرم عمل ہے۔ فورم کا مقصد ملت اسلامیہ کو درپیش علمی و فکری مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کی تلاش میں کاوشوں کو منظم کرنا ہے۔ اس فورم کی تشکیل اور سرگرمیوں میں ہمیں جن نمایاں علمی شخصیتوں کا تعاون حاصل رہا ہے ان میں مولانا عتیق الرحمن سنبھلی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ڈاکٹر سید سلمان ندوی، مولانا سید سلمان الحسینی اور مولانا محمد عبداللہ پٹیل کاپودروی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ایک بار ہماری دعوت پر برطانیہ کا دورہ بھی کیا اور فورم کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے علاوہ مختلف شہروں میں علمی اور فکری اجتماعات سے خطاب کیا۔

ورلڈ اسلامک فورم کی طرف سے ہم نے مغربی ممالک کے لیے اسلامی تعلیمات کے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کرنا چاہا تو ہمیں دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا کورس پسند آیا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب مرحوم دعوہ اکیڈیمی کے سربراہ تھے۔ انہوں نے نہ صرف بھرپور تعاون کیا بلکہ باقاعدہ معاہدے کی صورت میں اردو اور انگلش نصابات کی کاپیاں فراہم کیں اور سالہا سال تک اس پروگرام کی سرپرستی کرتے رہے۔ یہ کورس جامعۃ الہدیٰ ٹونگھم کے ذریعے کئی سال تک چلتا رہا ہے اور مختلف مغربی ممالک کے

ہزاروں لوگوں نے اس سے استفادہ کیا ہے اور اب یہ ''اسلامک ہوم اسٹڈی کورس'' کے عنوان سے انٹرنیٹ پر موجود ہے اور سینکڑوں افراد اس سے مستفید ہورہے ہیں۔ اللہ کی قدرت کہ جن دنوں اس کورس کے سلسلے میں بات چیت چل رہی تھی، ڈاکٹر صاحب کی جگہ دعوہ اکیڈمی کے نئے ڈائریکٹر جنرل کا تقرر ہوگیا۔ ہمیں بہت پریشانی لاحق ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب سے ہمارے مذاکرات چل رہے ہیں اور نئے آنے والے ڈائریکٹر جنرل کے مزاج سے ہم واقف نہیں ہیں، پتہ نہیں کہ وہ ہماری ضروریات کے مطابق تعاون کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ میری برطانیہ کے سفر سے واپسی ہوئی تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے فون پر رابطہ کیا اور نئے آنے والے ڈائریکٹر جنرل کے حوالے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ اسلام آباد تشریف لائیں۔ میں اسلام آباد گیا اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے ایک ڈرافٹ دیا اور کہا کہ اس پر دستخط کریں۔ ان دنوں میں ورلڈ اسلامک فورم کا چیئرمین تھا اور میرے وہاں دستخط ہونے تھے۔ میں نے دستخط کردیے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ دعوہ اکیڈمی کا منصب چھوڑنے سے پہلے میں نے آپ کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے پر دستخط کردیے تھے اور مجھے یاد تھا کہ میں نے ان سے معاہدہ کیا ہوا ہے۔ یہ ہمارا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم نے جنرل پرویز مشرف کی حکومت میں وزارت مذہبی امور کا منصب سنبھالا تو مجھے بھی تعجب ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس میدان اور ذوق کے آدمی نہیں تھے، مگر رفتہ رفتہ ان کی حکمت عملی سمجھ میں آنے لگی تو میں ان کی ذہانت اور صلاحیتوں کا پہلے سے زیادہ معترف ہوتا گیا اور جب وہ وزارت سے الگ ہوئے تو میں اسلام آباد کے چند علماء کرام کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گیا۔ باتوں باتوں میں، میں نے انہیں مبارکباد پیش کی اور شکریہ ادا کیا تو وہ چونکے اور میرے ساتھ جانے والے علماء کرام بھی متعجّب ہوئے کہ میں شکریہ اور مبارکباد کس حوالے سے پیش کررہا ہوں! میں نے عرض کیا کہ دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینے کے لیے جنرل پرویز مشرف کا پروگرام طے پا چکا تھا اور اس پر عملدرآمد کی تیاریاں ہورہی تھیں کہ ڈاکٹر غازی مرحوم نے فائل ورک، پیپر ورک اور بیرونی دوروں کا جال بچھا دیا۔ مختلف مسلم ممالک کے تعلیمی نظاموں کا جائزہ لینے کے لیے وفود جانا شروع ہوئے اور ملک کے اندر مختلف حوالوں سے کمیٹیوں اور مذاکرات کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اتنے میں دینی مدارس کے مختلف وفاقوں کو اپنی صف بندی

اور موقف و پالیسی میں یکسانیت پیدا کرنے کا موقع مل گیا اور وہ متحد ہو کر رائے عامہ کی قوت کے ساتھ سامنے آگئے جس سے دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینے کا پروگرام آگے نہ بڑھ سکا۔ میں نے کہا کہ میں ڈاکٹر صاحب کو اس کامیاب حکمت عملی پر مبارک باد دے رہا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ یہ سن کر ڈاکٹر غازیؒ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا کہ صرف آپ میری اس حکمت عملی کو سمجھ سکے ہیں ورنہ اسلام آباد کے علماء کرام تو مجھے ابھی تک برا بھلا ہی کہہ رہے ہیں۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے کچھ عرصہ قبل بڑے دینی مدارس میں تخصصات کے نصابات کا جائزہ لینے کے لیے کمیٹی بنائی اور مجھے اس کا مسئول بنایا تو میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب سے مشورہ ضروری سمجھا۔ انہوں نے نہ صرف متعدّد مفید مشوروں سے نوازا بلکہ ایک باقاعدہ رپورٹ دینی مدارس کے تخصصات کے بارے میں تحریر کی جو ماہنامہ الشریعہ میں شائع ہو چکی ہے، مگر بدقسمتی سے یہ اہم کام جو بتدریج آگے بڑھ رہا تھا، وفاق المدارس کی بیورو کریسی کی داخلی مصلحتوں اور ترجیحات کی نذر ہو کر معطل پڑا ہے۔

آخری ملاقات چند ماہ قبل اسلام آباد میں ان کی رہائشگاہ پر ہوئی جب میں گوجرانوالہ میں شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے پراجیکٹ کے حوالے سے ان سے مشورے کے لیے گیا۔ ربع صدی قبل شروع کیا جانے والا ہمارا یہ پراجیکٹ مختلف وجوہ کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ زمین کا ایک بڑا رقبہ اور تین چار بلڈنگیں موجود تھیں۔ ہم دس پندرہ سال کے تعلیمی پروگرام میں اتار چڑھاؤ کے بعد یہ طے کر چکے تھے کہ اب مزید اس کام کو آگے بڑھانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے جن حضرات سے مشاورت ہوئی ان میں ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ سرفہرست تھے۔ ہم ان کے پاس یہ تجویز لے کر گئے تھے کہ اگر یہ جگہ اور بلڈنگیں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے کسی منصوبے میں کام آسکتی ہوں تو وہ اس کے لیے ہماری مدد کریں۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا مگر کہا کہ پہلے کراچی کے کسی بڑے دینی ادارے سے بات کر کے دیکھ لیں، وہ زیادہ بہتر رہیں گے۔ اگر وہاں بات نہ بن سکی تو پھر میں آپ حضرات کی تجویز پر پیشرفت کر سکتا ہوں۔ نام بھی تجویز کیا کہ اگر دارالعلوم کراچی تیار ہو تو زیادہ بہتر ہوگا مگر وہ شاید ایسا نہ کریں، اس لیے جامعۃ الرشید سے بات کر لیں، وہ سنبھال بھی لیں گے اور بہتر انداز میں کوئی تعلیمی پروگرام بھی منظم کر لیں گے۔ یہ بات ایک آپشن

کے طور پر ہمارے ذہن میں بھی تھی، ڈاکٹر صاحب کی تائید سے پختہ ہوگئی۔ ہم نے جامعة الرشید سے بات کی اور انہوں نے جگہ اور بلڈنگیں سنبھال کر ”جامعہ شاہ ولی اللہ“ کے نام سے تعلیمی پروگرام کا آغاز گزشتہ سال شوال سے کر دیا ہے، فالحمد للہ علی ذالک۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کے صدقات جاریہ میں سے ہے اور اس تعلیمی پروگرام کے اجر و ثواب میں وہ مسلسل شریک رہیں گے۔

اسی دوران ڈاکٹر صاحب مرحوم سے میری ایک ملاقات دارالعلوم اسلامیہ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں دینی مدارس کے اساتذہ کے تربیتی پروگرام میں ہوئی جس میں مختلف امور پر باہمی تبادلہ خیالات ہوا۔ میرا بیان ظہر سے قبل ہو چکا تھا مگر میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات اور ان کا خطاب سننے کے لیے مغرب تک رکا۔ اب یہ میرے ذہن میں نہیں ہے کہ ان دونوں ملاقاتوں میں سے پہلے کون سی ہوئی اور دوسری کون سی، مگر یہ ہماری آخری دو ملاقاتیں ہیں جن کی یاد ہمیشہ ذہن میں تازہ رہے گی۔

ایک دفعہ خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ڈاکہ پڑ گیا ہے اور رات کے وقت ڈاکوؤں نے غازی صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر غزالی پر تشدد بھی کیا ہے۔ مجھے پریشانی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر ڈاکو کیا لینے آئے تھے۔ مجھے تو معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں کیا ہو گا۔ جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تو ان سے معاملہ دریافت کیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب! ان کو کس طرح حوصلہ ملا کہ آپ کے گھر میں کوئی چیز مل سکتی ہے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ اصل میں ان ڈاکوؤں کو مغالطہ لگ گیا، وہ اس طرح کہ جب بھی مجھے کسی دوسرے ملک میں کسی پروگرام میں جانا ہوتا ہے تو وہاں سے کوئی نہ کوئی تحفہ یا اعزاز ملتا ہے اور وہ جن ڈبوں میں بند ہوتے ہیں وہ زیورات کے ڈبوں کی طرح سجے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ میرے گھر میں ڈھیروں پڑے ہوئے ہیں اور تین چار الماریاں بھری پڑی ہیں۔ کسی آنے جانے والے کو مغالطہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر اتنا زیور ہے۔ وہ مغالطہ ڈاکوؤں کو یہاں لے آیا اور بے چارے غزالی پر تشدد کر کے چلے گئے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم کو عام طور پر یونیورسٹی کی دنیا کا آدمی سمجھا جاتا رہا ہے حالانکہ وہ اصلاً دینی مدارس کے ماحول کے آدمی تھے اور جدید تعلیم کی دنیا میں روایتی دینی حلقوں کی بھرپور اور کامیاب نمائندگی کر رہے تھے۔ جدید ماحول میں آج کے اسلوب اور اصطلاحات میں دین اسلام اور امت مسلمہ کے روایتی اور اجماعی موقف کے جس کامیابی

اور اعتماد کے ساتھ وہ نمائندگی کرتے تھے، مجھے اس معاملے میں اس حوالے سے بلا مبالغہ ان کا کوئی ثانی دکھائی نہیں دے رہا۔ علمی محاذ پر بہت سی شخصیات ان پر تفوق رکھتی ہیں، لیکن علم کے صحیح اور بروقت استعمال اور علم و فکر میں توازن کے حوالے سے وہ اپنے معاصرین میں سب سے نمایاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب دینی اور عصری علوم پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ عربی اور انگلش سمیت نصف درجن کے لگ بھگ زبانوں میں قادر الکلام تھے اور تحریر و تقریر پر ان کی مکمل دسترس تھی۔ بے پناہ مطالعہ اور تجزیہ و تنقیح کی اعلی صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ کی گہرائی تک اترتے اور اس کا قابل عمل حل نکالتے تھے۔ نامساعد حالات میں بھی اعتماد اور خوش اسلوبی کے ساتھ کام کرنے اور اپنا کام کر گزرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں اسلام کی نمائندگی اور جمہور اہل علم کے موقف کی ترجمانی کے لیے پوری دنیائے اسلام میں گنتی کے جن چند حضرات کا نام لیا جا سکتا تھا، ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر محمود احمد غازی کا بھی تھا۔ کسی سطح کی کانفرنس ہو اور کوئی بھی موضوع ہو، وہ پورے اعتماد، حوصلے اور جرأت کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کرتے تھے۔ اور مطالعہ اور گفتگو کے عصری اسلوب پر ان کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ فکر و دانش کی کوئی بھی سطح اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی۔

ڈاکٹر غازی مرحوم کے علمی تبحر، مطالعہ کی وسعت اور دینی و عصری تقاضوں کے مکمل ادراک کے ساتھ ساتھ مجھے ان کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ موقع و محل کے مطابق محفل کی ذہنی سطح کا لحاظ کرتے ہوئے مؤثر اور ثمر آور گفتگو کی صلاحیت تھی۔ اور اس کے علاوہ ان کی سادگی، انکساری اور درویش مزاجی تھی جو ان کے حلقۂ احباب میں ان کی مقبولیت کا باعث تھی۔ میرا احساس ہے کہ وہ اپنی علمی سطح اور منصبی مقام کو سامنے رکھتے ہوئے پروٹوکول کے تکلف میں پڑے رہتے تو شاید اتنے زیادہ لوگ ان سے علمی استفادہ نہ کر پاتے۔ میرے خیال میں پروٹوکول کا تکلف علمی دنیا میں استفادہ اور افادہ دونوں کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور میں اس سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ کے اس قول کا اکثر حوالہ دیا کرتا ہوں کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ ایک غریب اور معمولی خاندان کا فرد ہوتے ہوئے علم و فضل کے اس قدر بلند مقام تک کیسے پہنچے ہیں تو فرمایا کہ ”ما استنکرت من الاستفادۃ وما بخلت بالافادۃ“۔ میں اس کا اپنی زبان میں ترجمہ یوں کیا کرتا ہوں کہ ”علم کے حصول اور فروغ میں میرا کبھی کوئی پروٹوکول نہیں رہا“۔ میں نے ڈاکٹر غازی مرحوم کو

حضرت امام ابویوسفؒ کے اس ارشاد کا عملی مصداق پایا ہے اور کم و بیش دو عشروں تک اس کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ میرا تعلق مخلص بھائیوں اور بے تکلف دوستوں والا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بڑے بھائی کا احترام دیا اور میرے لیے ہمیشہ وہ سب سے زیادہ معتمد اور مخلص مشیر ثابت ہوئے۔ وہ اپنی زندگی پوری وضعداری کے ساتھ گزار کر چل دیے ہیں اور بارگاہ ایزدی میں ان کی قبولیت کی علامت یہ ہے کہ رات کو ان کو دل کا دورہ پڑا، وہ فجر تک ہسپتال میں رہے، فجر کے وقت ہوش میں آئے تو نماز کا وقت پوچھا اور یہ معلوم کر کے کہ فجر کا وقت ہو گیا ہے، نماز فجر ادا کی اور اس کے چند لمحوں بعد جان جاں آفرین کے سپرد کر دی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ رسم و محاورہ کی بات نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ ہم اپنے دور کی ایک بڑی علمی شخصیت اور معتمد فکری راہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں، آخرت کی منزلیں آسان فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ اور امتِ مسلمہ

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱ جنوری ۲۰۱۱ء)

آج کا دور انسانی حقوق کا دور کہلاتا ہے اور مغرب کا دعوی ہے کہ اس نے دنیا کو انسانی اقدار اور انسانی حقوق سے متعارف کرایا اور نسل انسانی کے مختلف طبقات بالخصوص کمزور طبقوں کو حقوق کا شعور بخشا۔ اس سے قبل انسانی معاشرہ جہالت، جبر، ظلم اور تشدد کی ظلمتوں اور تاریکیوں کا شکار تھا، مغرب نے اس تاریکی اور ظلمت سے نسل انسانی کو نجات دلا کر روشن خیالی اور علم کے نئے دور کا آغاز کیا۔ مغرب کے معاشرتی، سائنسی اور ثقافتی انقلاب سے پہلے کا دور تاریکی، جبر اور جہالت کا دور کہلاتا ہے، جبکہ انقلاب فرانس کے بعد سے شروع ہونے والا دور روشنی، انصاف اور علم کا دور سمجھا جاتا ہے۔

مغرب اس دعوے کے ساتھ پوری دنیا کو مسخر کرنے میں مصروف ہے اور نسل انسانی کی مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کو ہمہ گیر یلغار کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ آج کی گفتگو میں ہم مغرب کے اس دعوے کا ایک نظر میں جائزہ لینا چاہتے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ

مغرب، دنیا کو تہذیب و ثقافت اور انسانی حقوق سے متعارف کرانے کے اس دعوے میں کہاں تک صداقت رکھتا ہے؟

جہاں تک مغربی ممالک کے اپنے پس منظر کا تعلق ہے، یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یورپ میں بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کی تکون نے صدیوں تک عام انسانی آبادی کو انسانی عزت و وقار اور بنیادی حقوق سے محروم کیے رکھا ہے۔ اس دور میں مغربی معاشرے میں انسانی شرف اور شہری حقوق کا تصور کرنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا اور عام انسان کی زندگی جانوروں سے بدتر دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ اس تکون کے خلاف عوامی بغاوت کے شعلے بھڑکے تو بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کے تینوں اداروں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے خلاف نفرت کی بنیاد پر جس انقلاب نے مغربی معاشرے کو اپنے دامن میں سمیٹا، اس نے بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کو کارنر ہونے پر مجبور کر دیا۔ صدیوں کو محیط اس زمانے میں، جسے تاریک صدیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگر عام آدمی کی زندگی، اس کی بے بسی اور مجبوری کو دیکھا جائے تو ان میں سے کسی ایک کا نام لینے پر بھی مغربی باشندوں پر اضطراب اور بے چینی کی جو کیفیت دکھائی دینے لگتی ہے اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں ہے۔

اس حوالے سے مغربی دنیا کا ماضی بلاشبہ قابل رحم ہے، لیکن کیا باقی دنیا کا پس منظر بھی یہی تھا؟ بالخصوص عالم اسلام کی صورتحال بھی کیا اسی طرح کی تھی، جسے مغرب تاریک دور قرار دے کر اپنے ردعمل کی لاٹھی سے ہانکنا چاہتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیتی اور اس پہلو سے دیکھا جائے تو مغرب کا یہ طرز عمل سراسر دھاندلی نظر آنے لگتا ہے اور وہ اپنے مخصوص پس منظر کو پوری دنیا کا پس منظر قرار دے کر اس کے ردعمل میں اپنے اقدامات کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہے۔ خاص طور پر امت مسلمہ کا گزشتہ ڈیڑھ ہزار سالہ دور تو قطعی طور پر اس سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔

اس موضوع پر بات کو آگے بڑھانے سے قبل ایک اور پہلو کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ مغرب کو چونکہ تاریک صدیوں کا سامنا کرنا پڑا اور شدید کرب و مجبوری کے طویل دور سے گزرنا پڑا ہے، اس لیے اس کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید ہے جس میں وہ اعتدال اور توازن کا دامن ہاتھ میں نہیں رکھ سکا اور جبر کے مقابلے میں آزادی کی اس انتہا تک نسل انسانی کے ایک بڑے حصے کو لے جا کر اب پچھتانے پر مجبور نظر آتا ہے، جس انتہا نے انسانی

معاشرے کی بنیادی اقدار کو پامال کر کے رکھ دیا ہے اور فرد کی آزادی اور انڈو یجول ازم کے ہاتھوں خاندانی سسٹم کی تباہی مغربی معاشرے کا المیہ بن کر رہ گئی ہے۔ جبکہ اس سے ایک ہزار سال قبل اسلام نے جبر و ظلم اور وحشت و جہالت کی نفی کرتے ہوئے انسانی معاشرے کے ہر طبقے اور ہر فرد کو اس کے جائز حقوق سے نہ صرف روشناس کرایا تھا بلکہ عملاوہ حقوق حقداروں کو دے کر اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا تھا۔

مثال کے طور پر عورت کے حقوق کو دیکھ لیجئے کہ جاہلیت کے دور میں عورت پر ہونے والے مظالم کا سدباب کر کے اسلام نے اسے انصاف اور حقوق سے بہرہ ور کیا، لیکن خاندانی نظام کے ناگزیر تقاضوں کو کراس کرنے کی بجائے مرد اور عورت دونوں کو اس فطری دائرے میں رکھتے ہوئے خاندانی نظام کا تحفظ بھی کیا۔ اس سلسلہ میں دور نبویؐ کے دو واقعات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا جو امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں روایت کیے ہیں۔

1. حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ ہم قریش کے لوگ جاہلیت کے دور میں عورت کو کسی معاملے میں رائے کا حق نہیں دیتے تھے، مگر جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو انصار کی عورتوں میں رائے دینے اور کسی بات پر خاوند کو ٹوک دینے کا ماحول پایا جاتا تھا جس سے ہماری عورتوں نے بھی رنگ پکڑا۔ ایک روز کسی بات پر میری بیوی نے مجھے ٹوک دیا تو مجھے سخت غصہ ایا اور میں نے اسے ڈانٹ دیا کہ تم عورتوں کا ان کاموں میں کیا دخل ہے؟ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر ناراض ہونے کی بجائے اپنی بیٹی کی خبر لو کہ وہ بھی رسول اکرمؐ کے ساتھ سوال و جواب کرتی ہے اور نبی اکرمؐ کی ازواج مطہرات میں عام طور پر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں فوری طور پر اپنی بیٹی حفصہؓ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ کیا جناب نبی اکرمؐ کی بیویاں کسی بات پر آپؐ کے ساتھ روک ٹوک کرتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں اس طرح ہوتا ہے اور بسا اوقات بطور میاں بیوی ہمارے درمیان ناراضگی بھی ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ میں نے حفصہؓ کو سختی سے منع کیا کہ کم از کم تم نبی کریمؐ کے ساتھ اس طرح نہ کیا کرو، جو ضرورت ہو مجھ سے کہہ دیا کرو مگر آپؐ کے ساتھ کوئی سوال جواب نہ کیا کرو۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ حفصہؓ سے بات کرنے کے بعد جناب نبی اکرمؐ کی ایک اور زوجہ محترمہ ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس گیا جو رشتہ میں حضرت عمرؓ کی کزن لگتی تھیں، ان سے بھی وہی بات کی تو ام المومنین ام سلمہؓ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور الٹا حضرت عمرؓ کو ڈانٹ دیا کہ آپ ہر معاملے میں مداخلت کرتے ہیں اور اب میاں بیوی کے معاملات میں بھی دخل اندازی کے لیے آ گئے ہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ام سلمہؓ کی بات سن کر میرا حوصلہ ٹوٹ گیا اور میں کسی اور سے بات کرنے کی بجائے سیدھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور سارے واقعہ کی رپورٹ دی۔ جب میں نے ام سلمہؓ کی بات کا ذکر کیا تو حضورؐ مسکرائے اور فرمایا کہ ”ھی ام سلمہ“ (وہ آخر ام سلمہ ہے)۔

یہ واقعہ بیان کر کے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم جاہلیت کے دور میں عورتوں کو کسی درجہ میں شمار نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی حق سمجھتے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر ہمیں عورت کے مقام و مرتبہ اور حقوق سے آگاہ کیا اور ہم نے عورتوں کو اہمیت دینا شروع کی۔

2. اس کے ساتھ بخاری شریف میں مذکور ایک اور واقعہ پر نظر ڈال لیجئے کہ بریرہؓ نامی ایک صحابیہ جو لونڈی تھی اور مغیثؓ نامی نوجوان کے نکاح میں تھی۔ اس لونڈی کو حضرت عائشہؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تو آزاد ہونے کے بعد اس عورت نے اپنا ایک حق استعمال کرتے ہوئے مغیثؓ کی بیوی کے طور پر اس کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ مغیثؓ بہت پریشان ہوئے اور مختلف لوگوں سے سفارشیں کروائیں مگر بریرہؓ نے کسی کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ جناب نبی اکرمؐ نے ایک دن مدینہ منورہ کی گلیوں میں مغیثؓ کو گھومتے دیکھا کہ وہ روتے ہوئے جا رہے ہیں اور یہ آوازیں دے رہے ہیں کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو منا دے اور وہ مجھ سے الگ نہ ہو؟ یہ کیفیت دیکھ کر حضورؐ نے خود بریرہؓ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتی ہے؟ بریرہؓ نے صرف اتنا پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! کیا آپ مجھے حکم دے رہے ہیں یا بطور مشورہ یہ بات کہہ رہے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ میری یہ بات حکم نہیں بلکہ صرف مشورہ ہے۔ تو بریرہؓ نے بے ساختہ کہہ دیا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت

نہیں ہے۔ چنانچہ وہ مغیثؓ کے پاس واپس نہیں گئی اور آزادی کے بعد حاصل ہونے والا حق پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا۔

یہ دو واقعات میں نے اس لیے عرض کیے ہیں کہ عورت کے حقوق کا تصور مغربی دنیا نے شروع نہیں کیا بلکہ اس سے بارہ سو سال قبل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے حقوق اور ظلم و جبر سے اس کی آزادی کی بات کی اور معاشرے میں عورت کی عزت و وقار کو بحال کیا۔ عورت کے حقوق اور آزادی کے حوالے سے اس نوعیت کے بیسیوں واقعات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو دور نبویؐ اور خلافت راشدہ کے دور میں پیش آئے جن کی تفصیلات کا موقع نہیں ہے، مگر یہ بات تاریخی طور پر طے شدہ ہے کہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقات اور عام شہریوں کے حقوق اور ان کی بنیادی ضروریات کی طرف مغرب کے معاشرتی انقلاب سے صدیوں پہلے جناب نبی اکرمؐ نے حقوق کی بات کی اور عورتوں، غلاموں، بچوں اور ماتحتوں کے حقوق کی نشاندہی کر کے ان کی ادائیگی اور بحالی کو اسلام کے عادلانہ نظام کا حصہ بنا دیا۔

انسانی اور شہری حقوق کے حوالے سے مغرب کے اس یکطرفہ دعوے کا چند اور حوالوں سے بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

- حکومت کا قیام جبر کی بجائے عوام کی رائے پر ہو، اس کا عملی نمونہ سب سے پہلے جناب رسول اکرمؐ نے پیش کیا کہ اپنا جانشین نامزد کرنے کی بجائے امت کی اجتماعی رائے پر اعتماد کیا اور آپؐ کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے باہمی بحث و مباحثہ کے ذریعے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ اول کے طور پر منتخب کیا۔
- حاکم وقت کا رائے عامہ کے سامنے جوابدہ ہونے کا تصور بھی اسلام نے دیا کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں عوام کو یہ حق دینے کا اعلان کیا کہ اگر میں صحیح طریقے سے حکومت کروں تو میرا ساتھ دو اور اگر غلط رخ پر چلنے لگوں تو مجھے پکڑ کر سیدھا کر دو۔ چنانچہ دنیا نے یہ مناظر دیکھے کہ حضرت عمرؓ جیسے بارعب حکمران کو بھی ایک عام آدمی خطبہ جمعہ کے دوران ٹوک دیا کرتا تھا۔
- شخصی یا گروہی حکومت کی بجائے دلیل اور قانون کی حکومت کا تصور بھی ہمیں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس اعلان سے ملتا ہے کہ میں قرآن و

سنت کے مطابق حکومت کروں گا، اگر میں اس دستور و قانون کا پابند رہوں تو تم پر میری اطاعت واجب ہے، اور اگر میں قرآن و سنت کی خلاف ورزی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں ہے۔ شخصی حکمرانی کی بجائے قانون اور دستور کی حکمرانی کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا یہ تاریخی اعلان اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام دلیل اور قانون کی حکمرانی کا قائل ہے، اور مغرب میں دستوری حکومتوں کا آغاز ہونے سے ایک ہزار قبل دنیا نے اس کا عملی مشاہدہ کر لیا تھا۔

• قانون کے سامنے سب کے برابر ہونے اور حکمرانوں کے عدالتی نظام کا پابند ہونے کی بات بڑے فخر کے ساتھ کی جاتی ہے، مگر یہ خوشگوار منظر بھی تاریخ کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال قبل دیکھ چکی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ امیر المومنین ہونے کے باوجود قاضی شریح کی عدالت میں ایک فریق کے طور پر پیش ہوئے اور مقدمہ گواہی مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ہار گئے۔

• حکمرانوں اور عوام کے مل کر رہنے اور ان کے معیار زندگی میں یکسانیت کی بات بھی کی جاتی ہے۔ جبکہ اس سلسلہ میں بھی اسلامی خلافت کو سبقت حاصل ہے کہ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جب بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو یہ طے پایا کہ مدینہ منورہ کے ایک متوسط شہری کے معیار زندگی کو سامنے رکھ کر خلیفہ کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے پوری خلافت کے دوران اسی وظیفے پر گزارا کیا۔ جبکہ حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ ان کا کوئی افسر باریک لباس نہیں پہنے گا، چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائے گا، ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا، اور گھر کے باہر ڈیوڑھی نہیں بنائے گا۔ یہ باتیں اس دور میں معاشرتی امتیاز اور اسٹیٹس سمبل سمجھی جاتی تھیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہ اعلان کر کے اصول بتا دیا کہ ایک اسلامی ریاست کے حکمران عام شہریوں سے امتیاز رکھنے والا معیار زندگی اختیار نہیں کریں گے اور عام لوگوں جیسی زندگی گزاریں گے۔

یہ چند مثالیں اس لیے ہم نے عرض کی ہیں کہ مغرب کا یہ کہنا کہ انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کے تصور کا آغاز وہاں سے ہوا ہے، اسے مغربی ممالک کی حد تک تو تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن دنیا کی باقی اقوام بالخصوص اسلام پر اس پس منظر کا اطلاق کرنا اور تاریک صدیوں

کے ردعمل میں تشکیل پانے والے مغربی فلسفے کو عالم اسلام پر مسلط کرنے کی مہم سراسر ناانصافی ہے۔ اس لیے کہ اسلام اس سے بہت پہلے سے انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کی بات کر رہا ہے، حتیٰ کہ امت مسلمہ کی تاریخ میں جن حکمرانوں کو خلافت کی بجائے ملوکیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان کے ادوار حکومت میں بھی عوام کو ان کے حقوق عام طور پر حاصل رہے ہیں، بالخصوص عدلیہ کا آزادانہ کردار تو بدنام ترین مسلم حکمرانوں کے دور میں بھی پورے وقار اور اعتماد کے ساتھ جاری رہا ہے۔ جبکہ انقلاب فرانس سے پہلے مغربی معاشروں میں عورتوں، مزدوروں، کسانوں اور عام شہریوں کو جس اندوہناک صورتحال کا صدیوں تک سامنا رہا ہے وہ صورتحال مسلم خلافت کے کسی دور میں بھی اس درجے پر نظر نہیں آتی۔

پھر یہ امتیاز بھی اسلامی تاریخ کا حصہ ہے کہ ملت اسلامیہ میں مذہبی قیادت کا ادارہ بحیثیت ادارہ ہمیشہ عوام کے ساتھ رہا ہے اور ظلم و جبر کے خلاف مسلم علماء کی قربانیاں تاریخ کے ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے مغرب کی تاریک صدیوں کے حوالے سے مغرب کے پس منظر اور ردعمل کو مغرب کی حد تک تسلیم کرتے ہوئے ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مغرب کے پس منظر کو عالم اسلام کے ساتھ نتھی نہ کیا جائے اور اس کا ردعمل مسلم امہ پر مسلط کرنے کی روش پر نظر ثانی کی جائے، کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے مغرب کے انقلاب سے بارہ سو سال قبل نسل انسانی کو حقوق، انصاف اور علم کی شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا۔

۲۰۱۰ء

"قرآنِ کریم خاموش ہے" کی منطق

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۰ دسمبر ۲۰۱۰ء)

توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اصحاب فکر و دانش اپنے اپنے انداز میں اس پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ایک سوال عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ کیا اس سزا کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے؟ اور سوال کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر قرآن کریم میں یہ سزا مذکور نہیں ہے تو اس پر اس قدر زور دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بہت سے علماء کرام اس کے جواب میں قرآن کریم کی متعدّد آیات کا حوالہ دیتے ہیں جن سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے، مگر اس سے قطع نظر ہم سوال کے اس پہلو کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم میں تلاش کرنا ضروری ہے اور کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک اتھارٹی کی حیثیت نہیں رکھتے؟

قرآن کریم نے متعدّد آیات میں اطاعت خداوندی کے ساتھ اطاعت رسولؐ کا حکم دیا ہے اور نبی اکرمؐ کی یہ حیثیت بیان کی ہے کہ آپؐ ایک مستقل اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جس طرح قرآن کریم کے بیان کردہ احکام کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح نبی اکرمؐ کے ارشادات کی اطاعت بھی ایک مسلمان کے لیے واجب اور ضروری ہے، خواہ وہ قرآن کریم میں مذکور نہ ہوں۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم یا فیصلہ سامنے آجانے کے بعد یہ سوال کرنا کہ کیا یہ حکم قرآن کریم میں موجود ہے، نہ صرف یہ کہ غیر

ضروری ہے بلکہ آنحضرتؐ کے مطاع اور اتھارٹی ہونے کی (خدانخواستہ) نفی کے بھی مترادف ہے۔

گزشتہ روز ایک معروف محقق اور دانشور کے بارے میں یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا کہ انہوں نے کہا ہے کہ توہین رسالتؐ کی سزا کے بارے میں "قرآن کریم خاموش ہے"۔ تعجب اس لیے کہ قرآن کریم تو دینی احکام کے ایک بڑے حصے کے بارے میں خاموش ہے اور بے شمار احکام ایسے ہیں جو جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمائے ہیں جبکہ ان کا قرآن کریم میں کسی جگہ بھی تذکرہ نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ان صاحب کی یہ منطق تسلیم کرلی جائے تو صرف توہین رسالتؐ کے قانون سے نہیں بلکہ احکام شریعت کے ایک بڑے ذخیرے سے دستبرداری اختیار کرنا پڑے گی۔ مسند دارمیؒ میں معروف صحابیٔ رسولؐ حضرت عمران بن حصینؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے کسی صاحب نے کوئی مسئلہ پوچھا اور یہ شرط لگا دی کہ مجھے یہ مسئلہ صرف قرآن کریم کے حوالے سے بتائیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے اس سوال پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ تم جو نماز پڑھتے ہو اس کی ترتیب و تفصیل قرآن کریم میں کہاں بیان ہوئی ہے؟

قرآن کریم کی سینکڑوں آیات میں نماز کی تلقین کی گئی ہے، اس کی فضیلت و اہمیت بیان کی گئی ہے، اس کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے، اس کے ترک پر سخت عذاب کی وعید بیان کی گئی ہے اور بے نمازی کے لیے اللہ تعالی کی طرف سے غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن کہیں بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ دن رات میں کتنی نمازیں پڑھنی ہیں، نماز کی رکعتیں کتنی ہیں، ایک رکعت میں سجدے کتنے ہیں اور نماز کی ترتیب کیا ہے۔ چودہ سو سال سے امت مسلمہ اس بارے میں جناب رسول اکرمؐ کے ارشادات اور سنت کو بنیاد بنا کر نمازیں پڑھتی آرہی ہے۔ اب اگر "قرآن کریم خاموش ہے" کی منطق کو قبول کر کے کوئی صاحب سرے سے نمازوں کی تعداد، رکعات کی ترتیب اور اوقات سے ہی انکار کردیں تو انہیں اس بات سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟

حضرت عمران بن حصینؓ نے تو حدیث نبویؐ کی اہمیت و ضرورت کو اس پہلو سے بیان فرمایا ہے کہ حدیث نبویؐ قرآن کریم کی ایسی شرح ہے جس کے بغیر قرآن کریم کے احکام کی عملی صورتوں کا تعین ہی ممکن نہیں۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے یہ بات سمجھانے کے لیے ایک اور اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ

بن مسعودؓ نے ایک بار کوفہ کی جامع مسجد میں اپنے ہفتہ وار درس کے دوران یہ بات فرمائی کہ بعض مخصوص قسم کے فیشن اختیار کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ اس پر ایک خاتون ام یعقوبؓ نے ان سے بر سرِ عام سوال کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کا ذکر کر رہے ہیں تو کیا یہ بات قرآن کریم میں موجود ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہاں موجود ہے۔ اس خاتون نے کہا کہ میں نے بھی قرآن کریم پڑھا ہے اس میں یہ بات کہیں بھی نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم نے قرآن کریم پڑھا ہی نہیں ہے۔ وہ عورت بولی کہ خدا کی قسم میں نے حرف بہ حرف قرآن کریم کی تلاوت کی ہے اس میں یہ مسئلہ مذکور نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ سورۃ الحشر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

”اللہ کا رسول تمہیں جو چیز دے وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔“

اور میں نے جناب رسول اللہؐ سے خود سنا ہے کہ ایسا فیشن کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے، اس لیے حضورؐ کا یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور قرآن کریم کا حصہ ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ تفسیر قرطبی میں سورۃ الحشر کی اسی آیت کریمہ کے تحت درج ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک شخص کو حالت احرام میں احرام کی دو چادروں کے ساتھ کوئی سلا ہوا کپڑا پہنے دیکھا تو اس سے کہا کہ حالت احرام میں مرد کو سلا ہوا کپڑا پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ اس شخص نے ہمارے آج کے بہت سے دانشوروں کی طرح یہ سوال کیا کہ کیا آپ اس بات پر قرآن کریم سے کوئی دلیل دیں گے؟ اسے بھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہی جواب دیا کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ ”رسول اللہؐ تمہیں جس کام سے روکیں اس سے رک جاؤ“ اور میں نے خود اللہ کے نبی سے سنا ہے کہ مرد کے لیے حالت احرام میں سلا ہوا کپڑا پہننا جائز نہیں ہے، اس لیے نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد قرآن کریم کی طرف سے ہی ہے۔

کسی مسئلہ پر صرف قرآن کریم سے دلیل طلب کرنے پر یہ ردعمل اور جواب دو بزرگ صحابہ کرام حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمران بن حصینؓ کا ہے جبکہ صاحب مشکوۃ نے حضرت ابو رافعؓ، حضرت مقدامؓ اور حضرت عرباض بن ساریہؓ کی روایت سے خود جناب نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی بھی نقل کیا ہے کہ

"کوئی شخص گھمنڈ میں آکر یہ نہ کہتا پھرے کہ صرف قرآن کریم کی پابندی لازم ہے، اس لیے اس میں جو حرام قرار دیا گیا ہے وہی حرام ہے، خبردار! مجھے قرآن کریم بھی دیا گیا ہے اور قرآن کریم سے ہٹ کر بھی احکام دیے گئے ہیں۔"

اس لیے اللہ کا رسول جس چیز کو حرام قرار دے وہ بھی اسی طرح حرام ہے جیسے قرآن کریم کی طرف سے حرام قرار دی ہوئی چیز حرام ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ توہین رسالتؐ کی سزا کا ذکر قرآن کریم میں ہے یا نہیں، اس لیے کہ جب اس کے بارے میں آنحضرتؐ کے واضح ارشادات اور فیصلے موجود ہیں تو ان کے واجب العمل ہونے کے لیے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ جناب رسول اکرمؐ دین کے احکام میں خود ایک مستقل اتھارٹی ہیں اور آپؐ کے مستقل اتھارٹی ہونے کا اعلان قرآن کریم نے درجنوں مقامات پر واضح طور پر کر رکھا ہے۔

آسیہ مسیح کیس: سیکولر لابی کی دیدہ دلیری اور دینی قوتوں کا امتحان

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۶ نومبر ۲۰۱۰ء)

آسیہ مسیح کا کیس توہین رسالت کے سابقہ درجنوں کیسوں سے مختلف نہیں ہے اور نہ ہی اس پر سیکولر حلقوں کا ردعمل اور ان کی سرگرمیاں غیر متوقع ہیں۔ البتہ دینی حلقوں کی بیداری اور ان کے ردعمل کی کیفیت بہرحال پہلے جیسی نہیں ہے اور اہل دین کے لیے اصل لمحۂ فکریہ یہی ہے۔ ایک مسیحی خاتون نے مبینہ طور پر توہین رسالتؐ کا ارتکاب کیا، اس کے خلاف مقدمہ درج ہوا، عدالت میں کیس چلا اور تمام ضروری عدالتی مراحل سے گزرنے کے بعد مجاز عدالت نے اسے موت کی سزا سنادی۔ اس کے لیے بالائی عدالت میں فیصلے کے خلاف اپیل کے مراحل ابھی موجود ہیں اور مقدمہ کا نتیجہ ابھی آخری مرحلہ تک نہیں پہنچا کہ درمیان میں پورا کیس "ہائی جیک" ہو گیا۔ اور اور ہائی جیک کرنے والی شخصیت ملک کے سب سے بڑے صوبے کا گورنر ہے جس نے گورنری کا یہ منصب دستور کی وفاداری اور قانون کی پاسداری کے حلف کے تحت سنبھالا ہے۔

اس کیس نے ہائی جیک ہونا ہی تھا کہ اس قسم کے کیسوں کے ساتھ یہی ہوتا آرہا ہے مگر اس دفعہ تکنیک بدل گئی ہے۔ پہلے ان کیسوں کو بین الاقوامی ایجنڈے اور فنڈز پر کام کرنے والی این جی اوز ہائی جیک کرتی تھیں اور سرکاری مناصب پر فائز سیکولر شخصیات انہیں درپردہ سپورٹ کیا کرتی تھیں، مگر اب خود ایک ذمہ دار سرکاری شخصیت سامنے آئی ہے اور اس نے اپنے منصب، حلف اور قانونی ذمہ داریوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اس سے اس کیس کی اہمیت و نزاکت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کل مجھ سے ایک ذمہ دار اور اچھے خاصے سمجھدار دوست نے فون پر پوچھا کہ مولانا صاحب! کیا کوئی غیر مسلم قرآن کریم کو ہاتھ لگا لے تو اس کی سزا موت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ہم تو دعوت کے مقصد کے لیے خود غیر مسلموں میں قرآن کریم کے نسخے تقسیم کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آسیہ مسیح نے تو صرف قران کریم کو ہاتھ ہی لگایا ہے اسے سزائے موت کیوں دی جا رہی ہے؟ میں نے ان سے گزارش کی کہ کیا آپ کے خیال میں پاکستان کا کوئی سیشن جج ایسا شخص ہو سکتا ہے جو کسی غیر مسلم کو قرآن کریم کو ہاتھ لگانے پر موت کی سزا سنا دے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پھر اسے سرکاری حلقوں کا پروپیگنڈا اور میڈیا کی سیکولر لابی کی کارستانی سمجھیں جو اس معاملے کو یہ کہہ کر گول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایک غیر مسلم خاتون کو صرف قرآن کریم کو ہاتھ لگانے پر موت کی سزا دی جا رہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ توہین رسالتؐ کا مقدمہ درج کرانے کے طریق کار میں تو عرصہ سے تبدیلی کی جا چکی ہے، اب کئی سالوں سے کیفیت یہ ہے کہ توہین رسالت کا کیس براہ راست درج نہیں ہوتا بلکہ اس کی انکوائری ہوتی ہے اور تسلی کے بعد کیس کا اندراج ہوتا ہے۔ یہ کیس بھی اسی طرح درج ہوا ہے، پھر اس کے بعد پورے عدالتی پراسیس سے گزرا ہے، گواہیاں ہوئی ہیں، جرح ہوئی ہے، باقاعدہ عدالتی بحث و مباحثہ ہوا ہے اور قانونی طور پر ایک مجاز عدالت نے تمام تر عدالتی تقاضوں کی تکمیل کے بعد سزا سنائی ہے۔ اگر یہ سب کچھ صرف قرآن کریم کو ہاتھ لگانے پر ہو گیا ہے تو پھر آپ کو مولویوں کو کوسنے کی بجائے اپنے عدالتی نظام کا ماتم کرنا چاہیے۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے ذاتی طور اس کیس کی تفصیلات کا علم نہیں ہے مگر میں کسی صورت میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ پاکستان کے قانون میں کسی شہری کو سزائے موت سنانے تک کے جو مراحل ہیں، کسی مجاز عدالت نے ان مراحل سے گزرے بغیر اور قانونی اور

اخلاقی تقاضوں کو پورا کیے بغیر موت کی سزا سنا دی ہو۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ گورنر پنجاب نے پورے عدالتی نظام پر بے اعتمادی کا اظہار کیا ہے اور کیس کو درمیان میں ہائی جیک کر کے ان لابیوں کے ایجنڈے کو سپورٹ کیا ہے جو اس ملک میں قرارداد مقاصد، تحفظ عقیدۂ ختم نبوت، اور تحفظ ناموس رسالت کے قوانین کے خلاف مسلسل مصروف عمل ہیں اور انہیں ختم کرانے کے درپے ہیں۔ اور یہ بات گورنر کے اس حلف کی خلاف ورزی ہے جو انھوں نے یہ منصب سنبھالتے ہوئے آئین کی وفاداری اور قانون کی پاسداری کے حوالے سے اٹھایا تھا۔

جہاں تک مغربی ممالک اور بین الاقوامی سیکولر لابیوں کا تعلق ہے انہوں نے تو یہ بطور پالیسی طے کر رکھا ہے کہ نہ صرف اپنے ممالک میں توہین مذہب اور توہین رسالت کے واقعات کی سرپرستی کرتی رہیں گی بلکہ مسلم ممالک میں بھی ایسے افراد اور لابیوں کی پشت پناہی کریں گی جو مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیلتی رہیں اور مذہبی اقدار و شخصیات کی اہانت اور بے توقیری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ برطانیہ کے سلمان رشدی، بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین، مصر کے ڈاکٹر نصر ابوزید، گوجرانوالہ پاکستان کے سلامت مسیح اور بہت سے دیگر افراد کو اسی بنیاد پر مغربی ممالک میں پناہ دی گئی ہے۔ اور ان کے اخراجات اور تحفظ کی سرکاری طور پر ذمہ داری اٹھائی گئی ہے کہ وہ توہین مذہب کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے توہین رسالت کے قبیح اور مذموم جرم کا ارتکاب کر کے بین الاقوامی سیکولر لابیوں کو نفسیاتی تسکین مہیا کی ہے۔ آسیہ مسیح کے ساتھ مغربی ملکوں اور لابیوں کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا بلکہ مبینہ طور پر ایک مغربی ملک نے تو آسیہ مسیح کو پورے خاندان سمیت سیاسی پناہ اور تحفظ کی پیشکش بھی کر دی ہے۔

البتہ اس سلسلہ میں ملک کے دینی حلقوں کے ردعمل اور پروگرام کا معاملہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ہم ابھی تک رسمی احتجاج اور اخباری بیانات سے آگے نہیں بڑھ سکے اور اس سلسلہ میں اصل کام جو کرنے کا ہے اس کی طرف ہماری سرے سے توجہ نہیں ہے۔ دینی تحریکات کے ایک شعوری کارکن کے طور پر میری رائے یہ ہے کہ محترمہ عاصمہ جہانگیر کے سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کا صدر منتخب ہونے کے بعد اس طرح کے دینی معاملات میں نئی صف بندی سامنے آگئی ہے۔ قرارداد مقاصد کا معاملہ ہو، قادیانیوں کے بارے میں دستور و قانون کی بات ہو، یا تحفظ ناموس رسالت ؐ کا مسئلہ ہو، اب دینی حلقوں کے خلاف

سب سے بڑا مورچہ سپریم کورٹ بار اور وکلاء کا فورم ہوگا اور آسیہ مسیح کیس میں بھی یہ فورم گورنر پنجاب کی پشت پر پوری طرح متحرک نظر آرہا ہے۔ اس کے لیے دینی حلقوں کو اب نئی صف بندی کرنا ہوگی، وکلاء برادری میں اپنے ہم خیال تلاش کرنا ہوں گے، ان میں باہمی رابطے کا اہتمام کرنا ہوگا، انہیں متحرک کرنا ہوگا اور اس کے لیے حکمت عملی اور طریق کار بھی از خود طے کرنے کی بجائے سینئر اور تجربہ کار وکلاء کے مشورہ سے اور ان کی راہنمائی میں مرتب کرنا ہوگا۔ ورنہ آسیہ مسیح کیس صرف ٹیسٹ کیس ہے، اس سے بڑے بہت سے کیس مستقبل قریب میں دینی حلقوں کو چیلنج کرنے کے لیے لائن میں لگے ہوئے ہیں۔

اس پس منظر میں گزشتہ روز گوجرانوالہ میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کا ایک مشترکہ اجلاس مولانا قاری محمد سلیم زاہد کی دعوت پر راقم الحروف کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں مولانا سید غلام کبریا شاہ، مولانا خالد حسن مجددی، مولانا قاری محمد سلیم زاہد، مولانا اظہر حسین فاروقی، مولانا مشتاق احمد چیمہ، حافظ ابرار احمد ظہیر، جناب محمد جمیل بٹ، حافظ محمد یعقوب اور دیگر حضرات کے علاوہ شیعہ راہنما جاب کاظم ترابی بھی شریک ہوئے۔ سب حضرات نے صورتحال کی نزاکت اور سنگینی کا احساس کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اس موقع پر باہمی اتفاق واتحاد کے مظاہرے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہیں اس لیے مقامی طور پر اشتراک وتعاون کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ تمام مسالک اور دینی جماعتوں کے مرکزی قائدین سے بھی گزارش کی جائے کہ وہ موجودہ صورتحال اور مستقبل کے خدشات و خطرات کے پیش نظر جلد از جلد مل بیٹھ کر ان معاملات میں قوم کی متفقہ راہنمائی کا اہتمام کریں۔

اجلاس میں طے پایا کہ آسیہ مسیح کیس کے حوالے سے گورنر پنجاب کے رویہ کے خلاف جمعۃ المبارک کے دن مشترکہ احتجاجی ریلی نکالی جائے گی جو نماز جمعۃ المبارک کے بعد اڑھائی بجے شیرانوالہ باغ سے شروع ہوگی اور گوندلانوالہ چوک پر اختتام پذیر ہوگی۔ جبکہ تاجر راہنماؤں حاجی نذیر احمد، ڈاکٹر محمود احمد اور میاں فضل الرحمان چغتائی نے بھی اس پروگرام کے ساتھ مکمل اتفاق کا اعلان کیا ہے۔

النور ٹرسٹ فیصل آباد کا ”قرآن و سنت کورس“

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

گزشتہ ماہ کے آخری روز محترم جناب مجیب الرحمان شامی کے ہمراہ فیصل آباد کی ایک بابرکت تقریب میں شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ تقریب النور ٹرسٹ کے زیراہتمام ملک کے مختلف شہروں میں چالیس روزہ قرآن و سنت کورس کے کامیاب انعقاد پران کورسز کے منتظمین اور اساتذہ میں انعامات اور سرٹیفکیٹس تقسیم کرنے کے لیے منعقد کی گئی تھی اور محترم شامی صاحب اس میں مہمان خصوصی تھے۔ فیصل آباد کا النور ٹرسٹ محترم حافظ ریاض احمد قادری چشتی کی سربراہی میں ایک عرصہ سے مختلف دینی شعبوں میں سرگرم عمل ہے۔ بزرگ صحافی اور عالم دین مولانا مجاہد الحسینی اس کے سرپرست اعلیٰ ہیں اور لاہور کے محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد سعد صدیقی کے علاوہ راقم الحروف کا نام بھی انہوں نے سرپرستوں کی فہرست میں درج کر رکھا ہے۔ جبکہ اس کے سرکردہ حضرات میں مولانا محمد خان، مولانا مفتی سعید احمد اور قاری لائق علی نمایاں ہیں۔ حافظ ریاض احمد، قادری اور چشتی سلسلہ کے صاحب نسبت بزرگ ہیں اور سلوک وارشاد کے اس سلسلہ میں سینکڑوں لوگ ان سے منسلک ہیں۔ جھنگ روڈ فیصل آباد کی ایوب کالونی میں سنٹرل ملز کے ایریا میں ان کا ہوزری کا کارخانہ ہے جو فیکٹری کم اور مدرسہ وخانقاہ کا زیادہ منظر پیش کرتا ہے۔ دینی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے، لوگوں کو اللہ کی طرف راغب کرنے اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے دین کی تعلیم و تبلیغ کا ماحول قائم کرنے میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں، توانائیوں اور اوقات کے ساتھ ساتھ اپنے مال کو اس راہ میں دل کھول کر خرچ کرتے رہتے ہیں۔

قرآن و سنت کی تعلیمات اور ضروریات دین کی تعلیم کے مختصر کورسز کا رجحان کچھ عرصہ سے ملک کے مختلف حصوں میں بڑھ رہا ہے اور چالیس روزہ سے لے کر ایک سال تک کے مختلف دورانیوں کے کورسز ملک میں اس وقت سینکڑوں مقامات پر پڑھائے جا رہے ہیں۔ جن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات، تاجر، ملازمت پیشہ افراد اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے شہریوں کو اسلامی عقائد، عبادات، حلال و حرام، معاملات، اخلاقیات اور آداب کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی جائیں، اور زیادہ سے زیادہ دینی معلومات حاصل کرنے کا ذوق پیدا کیا جائے۔ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ نے بھی چند سال قبل ”فہم دین کورس“ کے عنوان سے چار ماہ اور چالیس روز کے

دو کورس شروع کیے تھے جو بیسیوں مقامات پر ہوئے اور اب بھی بعض جگہوں پر تسلسل کے ساتھ جاری ہیں۔

النور ٹرسٹ فیصل آباد کا کام اس سلسلہ میں تسلسل اور اہتمام کے ساتھ ہو رہا ہے اس لیے وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے لیے مولانا مفتی سعید احمد، مولانا محمد خان اور ان کے رفقاء نے باقاعدہ ایک کورس مرتب کیا ہے جو کتابی شکل میں شائع شدہ موجود ہے اور نصاب کی صورت میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کورس کا روزانہ دورانیہ صرف ایک گھنٹہ ہے جو شرکاء کی سہولت کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔ اس میں تجوید کے ساتھ قرآن کریم کے تلفظ اور قرأت کی اصلاح کے علاوہ ترجمہ و تفسیر قرآن، حدیث نبویؐ، عقائد و نظریات، فقہ و احکام اور سنن و آداب کے مضامین شامل ہیں جو کسی تجربہ کار استاد کے ذریعے پڑھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور سکول و کالج کے طلبہ و طالبات کے لیے بطور خاص فائدہ مند ہے۔ اس سال یہ کورس فیصل آباد کے درجنوں مقامات سمیت ملک بھر میں ۱۳۰ سے زیادہ جگہوں میں پڑھایا گیا جن میں شاہ پور صدر، ملتان، جھنگ، چیچہ وطنی، ڈیرہ اسماعیل خان، گوجرانوالہ، ہارون آباد، لودھراں، لاہور، سیالکوٹ، فقیر والی، گوجر خان، اٹک شہر، رحیم یار خان، تلہ گنگ، دنیا پور، جڑانوالہ، احمد پور شرقیہ، حاصل پور، راولپنڈی، جہانیاں منڈی، شاہ کوٹ، چارسدہ اور سرائے عالمگیر شامل ہیں، اور ان مقامات کی پوری فہرست النور ٹرسٹ کی مطبوعہ سالانہ رپورٹ میں موجود ہے۔ کورس میں بحث و مجادلہ کے مسائل سے گریز کرتے ہوئے خالصتاً تعلیم و تفہیم کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ یہ کورس پڑھنے والے مسلمان مردوں اور عورتوں کو ضروری دینی معلومات اس حد تک ضرور حاصل ہو جائیں کہ وہ اپنے روز مرہ کے دینی فرائض اور معمولات کو آسانی کے ساتھ سرانجام دے سکیں۔ اسی وجہ سے بحمد اللہ تعالیٰ اسے ہر جگہ قبولیت حاصل ہو رہی ہے اور اس کی طرف لوگوں کی رغبت بڑھتی جا رہی ہے۔

مختلف مقامات پر ان مختصر تعلیمی کورسز کے علاوہ النور ٹرسٹ نے اذان ٹی وی کے نام سے ایک تعلیمی ٹی وی چینل بھی شروع کر رکھا ہے جس پر ”قرآن و سنت کورس“ کے علاوہ قرآن کریم کی روزانہ باقاعدہ کلاس لگتی ہے اور مختلف علماء کرام کے دروس و تقاریر ریکارڈ کر کے قارئین اور ناظرین کو سنوائے جاتے ہیں۔ اسی نام سے کراچی کے کچھ احباب نے بھی

انٹرنیٹ پر ٹی وی چینل شروع کیا ہوا ہے جس کے ذریعے دینی معلومات کے مفید پروگرام پیش کیے جارہے ہیں۔

مذکورہ بالا تقریب ایوب کالونی جھنگ روڈ فیصل آباد میں واقع سنٹرل ملز ایریا کے ایک گراؤنڈ میں منعقد ہوئی جس میں جناب مجیب الرحمان شامی نے بطور مہمان خصوصی مفید اور معلوماتی خطاب سے نوازا اور آخر تک پوری دلچسپی کے ساتھ تقریب میں شریک رہے اور النور ٹرسٹ کی دینی اور تعلیمی سرگرمیوں پر مسرت کا اظہار کرتے رہے۔ ان کے علاوہ مولانا مجاہد الحسینی، پروفیسر ڈاکٹر محمد سعد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر لدھیانوی اور دیگر سرکردہ حضرات کے ساتھ ساتھ راقم الحروف نے بھی کچھ معروضات پیش کیں۔ یہ تقریب مختلف مقامات پر ان کورسز کا انتظام کرنے والے اصحاب خیر اور اساتذہ پر مشتمل تھی جنہیں حسن کارکردگی پر اسناد اور انعامات سے نوازا گیا۔

بعض سرکردہ شرکاء نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا جس میں زیادہ توجہ اس بات پر دی گئی کہ چونکہ یہ کورس مثبت انداز میں ضروری معلومات پر مشتمل ہے اور تعلیم و تفہیم کے اسلوب کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لیے یہ بہت فائدہ مند ثابت ہوا ہے اور اس کے شرکاء نے اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا تھا کہ قرآن کریم صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کا سلیقہ اور ذوق انہیں اس کورس سے ملا ہے۔ کچھ حضرات نے کہا کہ نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کے بعض ضروری مسائل جو انہیں اس سے قبل معلوم نہیں تھے اس کورس کے ذریعے معلوم ہوئے۔ ایک صاحب کا کہنا تھا کہ وہ حلال و حرام کے بعض ضروری مسائل سے واقف نہیں تھے جو اس کورس کے دوران انہیں معلوم ہوئے ہیں۔ غرضیکہ جس صاحب کو اپنی دینی زندگی کے حوالے سے جو خلا محسوس ہوا ہے اور اس کورس نے اس معاملے میں اس کی تشنگی کو دور کیا ہے وہ اس حوالہ سے کورس کی خوبی بیان کر رہے تھے۔

سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں یہ کورس پڑھانے والے مفتی عزیز الرحمان نے لکھا ہے کہ ”پہلی بار اتنی کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات شریک ہوئے، حالانکہ اس سے قبل میں کئی بار کورس کروا چکا ہوں آٹھ دس روز کے بعد ذوق و شوق ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کورس میں اول تا آخر لوگ ذوق و شوق سے شریک رہے۔“

ڈی ایس پی جیل گجرات مسز عطا فرماتی ہیں کہ ”ہم نے چالیس روزہ ”قرآن و سنت کورس“ پڑھا ہے اس میں ہمیں بہت ہی معلومات حاصل ہوئی ہیں جس کے بارے میں ہم

پہلے نہیں جانتے تھے۔ اس سے ہمیں قرآن کریم پڑھنے میں مدد مل رہی ہے اور مسائل و احکامات سے ہماری فرض نماز، روزہ اور زکوۃ کے بارے میں جو پہلے غلط معلومات تھیں ان کو ہم نے ٹھیک کیا ہے۔"

کرنل مسز رفعت کمال اور مسز شہباز ملک (گوجرانوالہ) نے لکھا ہے کہ "اس چالیس روزہ کورس سے ہمیں بہت فائدہ ہوا ہے، ہماری معلومات میں اضافہ ہوا ہے اور قرآن کریم کو صحیح طریقے سے پڑھنے کے علاوہ قرآن کریم سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے۔"

اور بھی مختلف طبقات کے افراد نے اسی طرح کے جذبات و تاثرات کا اظہار کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ مخلص دوستوں نے چند برس پہلے اللہ تعالی کی رضا کے لیے جس کار خیر کا آغاز کیا تھا اسے بارگاہ ایزدی میں قبولیت سے نوازا گیا ہے اور اسے دھیرے دھیرے وسعت حاصل ہو رہی ہے۔ اس قسم کے دینی معلومات کورسز وقت کی اہم ضرورت ہیں اور ملک کے کسی بھی حصے میں ایسے کورسز کے آغاز کے لیے "النور ٹرسٹ" فیصل آباد ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہے جس کے لیے مندرجہ ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ کیا جاسکتا ہے alnoortrust486@yahoo.com

نظامِ حج میں اسلام کی اصلاحات اور حج کا سب سے بڑا سبق

(جامع مسجد کوثر، لنڈا بازار، لاہور- ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

(بعد نماز عصر لنڈا بازار لاہور کی جامع مسجد کوثر میں عازمین حج سے خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ۔ جو حضرات حج بیت اللہ کے لیے جارہے ہیں اللہ تعالی ان کے لیے اسے مبارک کریں اور سب مسلمانوں کو اپنے گھر کی حاضری نصیب فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔ حج اسلام کے بنیادی فرائض اور ارکان میں سے ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: (۱) کلمہ شہادت کا اقرار (۲) نماز (۳) زکوۃ (۴) روزہ (۵) اور حج۔ جبکہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ "وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا" (سورہ آل عمران ۹۷) اللہ تعالی کے لیے ان لوگوں پر حج فرض ہے جو بیت اللہ شریف تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

استطاعت کی حد فقہاء کرام نے یہ بیان کی ہے کہ حرم پاک تک پہنچنے اور واپسی کا کرایہ، جتنے دن وہاں رہنا ہے ان کا خرچہ، اور اس دوران گھر کے معمول کے اخراجات کا خرچہ جس مسلمان کے پاس ہو اس پر حج فرض ہے۔ اس کے ساتھ آمد و رفت کی سہولت اور راستے کا پرامن ہونا بھی اس میں شامل ہے۔ یہ اللہ تعالی کے گھر کی حاضری ہے اور جناب نبی اکرمؐ کے روضۂ اطہر کی حاضری ہے جو بہت بڑی سعادت اور برکت کی بات ہے اور جنہیں نصیب ہو جائے وہ بہت خوش نصیب ہیں۔

حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں مال بھی لگتا ہے، وقت بھی لگتا ہے، اور مشقت بھی اٹھانا پڑتی ہے۔ یہ بہت مشقت کا عمل ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ اگر میسر آجائے تو جوانی میں ہی کر لینا چاہیے، بڑھاپے میں اتنی مشقت اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۸۵ء میں حج کے موقع پر جب ہم منی سے سامان اٹھا کر واپسی کی تیاری کر رہے تھے تو ہمارے ساتھ والے خیمے میں ایک ضعیف بڑھیا سامان کی گٹھڑی باندھے اپنے کسی ساتھی کا انتظار کر رہی تھی۔ کافی دیر انتظار کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ بیٹا یہ گٹھڑی میرے سر پر رکھ دو، میں نے جب وہ گٹھڑی بڑھیا کے سر پر رکھی تو اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ ”پتر! رب گناہ تے معاف کر دا ای پر منجھ کڈھ کے کر دا ای“۔ مجھے اب تک بڑھیا کے یہ الفاظ اور اس کا لہجہ یاد ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی گناہ تو معاف کرتا ہے مگر کچومر نکال کر کرتا ہے۔ بڑھاپے میں ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے اس لیے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ حج جوانی میں ہو جائے تاکہ اطمینان کے ساتھ سارے مناسک ادا کیے جا سکیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حج کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے حج کا طریقہ اور اس کے مسائل سیکھ لیے جائیں اور اس کا نقشہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ کیونکہ وہاں ہجوم ہوتا ہے، رش ہوتا ہے اور بسا اوقات نفسانفسی کا عالم ہو جاتا ہے، اگر پہلے سے معلوم نہ ہو اور وہاں ہر جگہ آدمی یہ پوچھتا پھرے کہ اب کیا کرنا ہے اور اب کدھر جانا ہے، تو بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ حج کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اس کا طریقہ، مسائل، آداب اور احکام اچھی طرح معلوم کر لیے جائیں اور کسی معتمد عالم دین سے جس نے حج کر رکھا ہو اس کی تربیت حاصل کر لی جائے۔

اتنی محنت کا عمل جب کوئی شخص کرتا ہے تو اس کی فطری طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ عمل قبول بھی ہو، اور ہر شخص کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی یہ محنت اور عمل قبولیت کے

قابل ہو جائے۔ کیونکہ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس کو ’’حج مقبول‘‘ نصیب ہو جائے وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے پیدا ہوتے وقت پاک تھا۔ حج مقبول کی علامت کیا ہے جس سے پتہ چل جائے کہ حج قبول ہو گیا ہے؟ اصل علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کس کا حج قبول ہوا ہے، مگر بعض بزرگوں نے اس کی علامت یہ بیان کی ہے اگر حج کے بعد کی زندگی اس سے پہلے کی زندگی سے مختلف ہے اور حج نے اس کے اعمال اور اخلاق و عادات میں بہتر تبدیلی پیدا کی ہے تو یہ خوشی کی بات ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ حج قبول ہو گیا ہے۔ لیکن اگر حج کے بعد خدانخواستہ پہلے جیسے اچھے اعمال بھی نہیں رہے اور حاجی صاحب کی ’’چھری‘‘ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی ہے تو فکر کرنے کی بات ہے کیونکہ یہ اشارہ ہے کہ حاجی صاحب نے حج کا کچھ اثر بھی قبول نہیں کیا۔

بیت اللہ کا یہ حج جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی ہوتا تھا اور جاہلیت کے زمانے میں لوگ اللہ تعالیٰ کے گھر کے طواف کے لیے آتے تھے لیکن اس میں بہت سی رسوم اور خرافات شامل ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے حج کا اصل مقصد ہی فوت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس لیے اسلام نے اس میں بہت سی اصلاحات کی ہیں، قرآن کریم نے اس کی بہت سی جاہلی رسوم کو ختم کیا ہے، اور جناب نبی اکرمؐ نے بعض سابقہ روایات کو تبدیل کیا ہے۔ ان میں سے چند اصلاحات کا میں آج کی مجلس میں آپ حضرات کی معلومات کے لیے تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

بت پرستی کا خاتمہ

جاہلیت کے دور میں بیت اللہ اور اس کے اردگرد سینکڑوں بت لوگوں نے کھڑے کر رکھے تھے جن کی پوجا ہوتی تھی، اور بیت اللہ کے طواف کے لیے آنے والے لوگ ان بتوں کی بھی عبادت کرتے تھے۔ جناب نبی اکرمؐ نے بیت اللہ کو اور اس کے پورے ماحول کو بتوں سے پاک کیا اور سب بتوں کو توڑ کر یہ تعلیم دی کہ ساری دنیا میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے مگر بیت اللہ اور حرم پاک کے ماحول کو بالخصوص شرک اور بت پرستی سے مکمل طور پر پاک رکھا جائے اور ہر قسم کی عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے مخصوص کی جائے۔

غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع

جناب نبی اکرمؐ کے حج کے لیے تشریف لے جانے سے قبل ہر قسم کے لوگ بیت اللہ کے طواف عمرہ اور حج کے لیے آتے تھے اور مسلم کافر کی کوئی تمیز نہیں تھی، مگر قرآن کریم نے حرم مکہ میں یہ کہہ کر مشرکین کے داخلہ کی مخالفت کر دی کہ ’’فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا‘‘ (سورہ التوبہ ۲۸) اس سال کے بعد مشرک اور کافر مسجد حرام کے قریب نہیں آسکیں گے۔ اور فتح مکہ کے بعد ۹ھ والے حج کے موقع پر جناب نبی اکرمؐ نے باقاعدہ اعلان کرایا کہ اگلے سال کوئی مشرک و کافر حج کے لیے نہیں آئے گا۔ اس طرح حج، عمرہ اور طواف کی عبادت کو صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور اس میں کسی کافر کی شرکت ممنوع قرار دے دی گئی، چنانچہ اس کے بعد سے حرم پاک اور حج صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص چلا آرہا ہے اور کسی غیر مسلم کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے، چوری چھپے بھیس بدل کر اور مسلمانوں کا روپ اختیار کر کے بہت سے لوگ وہاں چلے جاتے ہیں لیکن باقاعدہ شرعاً اور قانوناً کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جاتی۔

ننگے طواف کی ممانعت

جاہلیت کے دور میں حج کے لیے آنے والے بہت سے قبائل کے لوگ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے اور ان کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ یہ ہماری نیچرل حالت ہے کہ ہم دنیا میں ننگے آئے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کے گھر میں ننگے حاضری دیتے ہیں۔ مرد بھی ننگے ہوتے تھے اور عورتیں بھی پہلوانوں جیسی ایک لنگوٹی کے سوا کوئی لباس نہیں پہنتی تھیں، بلکہ عورتیں طواف کرتے ہوئے تلبیہ کے ساتھ ساتھ یہ شعر بھی پڑھا کرتی تھیں کہ ’’الیوم یبدو کلہ او بعضہ، فالذی یبدو فلا احلہ ‘‘آج کے دن میرا بدن سارا ننگا ہو یا اس کا کچھ حصہ ننگا ہو مگر جتنا جسم ننگا ہے میں اس کو کسی کے لیے حلال نہیں کرتی، یعنی کسی کو اسے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ گویا اس دور میں اتنی حیا بہرحال باقی تھی کہ عورتیں اپنی عریانی کی طرف لوگوں کو دعوت نظارہ نہیں دیتی تھیں۔ آج کی عورت ننگی بھی ہوتی ہے اور سب لوگوں کو کھلم کھلا دعوت نظارہ بھی دے رہی ہوتی ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس بے حیائی کی بھی ممانعت فرما دی اور اپنے حج پر تشریف لے جانے سے ایک سال قبل باقاعدہ اعلان کرا دیا کہ اگلے سال سے کوئی مرد یا عورت ننگی حالت میں بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکیں گی، مرد کے لیے دو

چادریں ضروری ہوں گی اور عورت مکمل لباس میں ہوگی۔ اس طرح حج بیت اللہ کو جاہلیت کی اس بے حیائی سے بھی پاک کردیا گیا۔

وی آئی پی سسٹم ختم

عرفات کی حاضری اور ۹ ذی الحجہ کا دن وہاں گزارنا حج کا بنیادی رکن ہے، مگر قریش وہاں نہیں جایا کرتے تھے اور حرم کی حدود میں ہی رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ''نحن حمس'' اس کا ترجمہ میں یہ کیا کرتا ہوں کہ ''ہم وی آئی پی ہیں'' عرفات کی حاضری باقی لوگوں کے لیے ہے ہمارے لیے نہیں ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ میں ۹ ذی الحجہ کو اپنے اونٹوں کی تلاش میں عرفات تک گیا تو وہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ بھی دیکھا جس پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے لوگوں سے پوچھا کہ ان کا یہاں کیا کام، یہ تو قریشی ہیں۔ اسلام نے یہ وی آئی پی سسٹم بھی ختم کردیا اور قریش کو حکم دیا کہ ''ثم افیضوا من حیث افاض الناس واستغفروا اللہ'' (سورہ البقرہ ۹۹) تم بھی وہیں (عرفات میں) وقوف کرو جہاں باقی لوگ کرتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرو۔ اس طرح یہ وی آئی پی سسٹم ختم کردیا گیا۔ ویسے بھی حج اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب برابر ہیں نہ کوئی وی آئی پی ہے اور نہ ہی کسی کا پروٹوکول اور پرسٹیج ہے۔ انسانوں میں مساوات کا حقیقی منظر اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہی نظر آتا ہے کہ کوئی بادشاہ ہے یا رعیت، امیر ہے یا غریب، مالک ہے یا مزدور، پیر ہے یا مرید، بڑا ہے یا چھوٹا سب کے سب ایک ہی رنگ کی دو سفید چادروں میں اپنے رب کے حضور عاجزی اور زاری کررہے ہیں اور کوئی تفریق یا امتیاز باقی نہیں رہ گیا۔

صفا اور مروہ کی سعی

جاہلیت کے زمانے میں حج اور عمرہ کے لیے بیت اللہ کا طواف تو سب لوگ کرتے تھے مگر صفا اور مروہ کی سعی سب نہیں کرتے تھے، صرف قریش اور ان کے حلیف قبائل صفا مروہ کی سعی کرتے تھے، باقی قبائل نے اس کی جگہ اپنے اپنے الگ بت خانے بنا رکھے تھے جہاں وہ طواف بیت اللہ کے بعد چلے جاتے تھے اور ان بت خانوں کی حاضری کو صفا مروہ کی سعی کا متبادل قرار دیتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سعی چونکہ حضرت ھاجرہؑ کی یاد میں ہے جو قریش کی ماں تھی اس لیے یہ سعی انہی کے لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں ہے۔

صفامروہ کی سعی نہ کرنے والوں میں انصار مدینہ کے دونوں قبائل اوس اور خزرج بھی شامل تھے، حضرت انس بن مالکؓ جو انصار میں سے تھے فرماتے ہیں کہ ہم اسے جاہلیت کی بات سمجھتے تھے کہ ماں نے ایک دفعہ دوڑ لگائی ہے تو قیامت تک اس کے بیٹے بھی دوڑتے رہیں۔ انصار مدینہ کے دونوں قبائل جاہلیت کے زمانے میں بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد قدید کے مقام پر اپنے بت خانے ''مناۃ'' میں چلے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری سعی یہاں کی حاضری ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب نبی اکرمؐ نے دوسرے بت خانوں کی طرح مناۃ کا بھی صفایا کر دیا تو انصار مدینہ کے لیے مسئلہ بن گیا کہ ہمارے مہاجر بھائی تو طواف کے بعد صفامروہ کی سعی کر لیں گے مگر ہم کہاں جائیں گے؟ ہمارا مناۃ تو ختم کر دیا گیا ہے اور صفامروہ کی سعی کو ہم جاہلیت کی روایت سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ انصار مدینہ کی طرف سے اس بارے میں سوال کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ ''ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما'' (سورہ البقرہ ۱۵۸) بے شک صفا اور مروہ اللہ تعالٰی کے شعائر میں سے ہیں، پس جو شخص حج یا عمرہ کرے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان کی سعی بھی کر لے۔ پہلے ذہن صاف کیا کہ صفامروہ کی سعی صرف قریش کی ماں کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ دو پہاڑیاں خود شعائر اللہ میں سے ہیں، پھر فرمایا کہ صفا مروہ کی سعی کو جاہلیت سمجھنے والوں کی سوچ درست نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح صفامروہ کی سعی جو اس سے پہلے صرف قریش اور ان کے دوست قبائل کیا کرتے تھے اسے باقاعدہ حج اور عمرے کا حصہ بنا کر سب لوگوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔

گھروں میں دروازے سے داخل ہو

جاہلیت کے زمانے میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ مکہ مکرمہ کے لوگ جب احرام باندھ کر حج کے لیے گھر سے روانہ ہو جاتے تھے، اس کے بعد حج مکمل ہونے سے پہلے اگر کسی کام سے گھر آنا پڑتا تو گھر میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ عقب سے چھت پھلانگ کر یا نقب لگا کر گھر میں داخل ہوتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ حج مکمل ہوئے بغیر احرام کی حالت میں دروازے سے گھر میں آنا اچھا شگون نہیں ہے۔ قرآن کریم نے یہ رسم بھی ختم کر دی اور فرمایا کہ ''وأتوا البیوت من ابوابھا'' (سورہ البقرہ ۱۸۹) احرام کے دوران گھر میں کسی ضرورت سے آنا پڑے تو گھر کے دروازے سے ہی گھر میں داخل ہو۔

مزدلفہ اور منیٰ کی روانگی

جاہلیت کے زمانے کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں دن گزار کر شام کو مزدلفہ جانے کے لیے غروب آفتاب سے پہلے ہی لوگ روانہ ہو جاتے تھے، جبکہ اگلے روز مزدلفہ سے منیٰ جانے کے لیے سورج طلوع ہو جانے کے کافی دیر بعد روانگی کرتے تھے۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس کی ممانعت فرما دی اور فرمایا کہ ہم عرفات سے مزدلفہ کی طرف غروب آفتاب کے بعد روانہ ہوں گے اور مزدلفہ سے منیٰ کی طرف ۱۰ ذی الحجہ کو سورج طلوع سے قبل روانگی کریں گے۔ یہ وہ چند تبدیلیاں اور اصلاحات ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کے جاہلیت کے دور سے چلے آنے والے نظام میں کیں اور جاہلی رسوم و خرافات کا خاتمہ کر کے اسے ایک صحیح عبادت کی شکل دی۔

مگر اس کے ساتھ حج کے حوالہ سے میں ایک اور بات کا تذکرہ بھی کرنا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں ایک جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ ”کل اُمر الجاہلیۃ موضوع تحت قدمی“ جاہلیت کی ساری روایات اور رسوم آج میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ گویا آپؐ نے اعلان فرمایا کہ میں دور جاہلیت کا خاتمہ کر کے اسلام اور روشنی کی طرف اپنی امت کو لے کر جا رہا ہوں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضورؐ نے آخری حج کے موقع پر جاہلیت کی جن رسموں کو قدموں کے نیچے روندنے کا اعلان کیا تھا، کیا وہ ہماری سوسائٹی میں دوبارہ تو واپس نہیں آگئیں؟ شرک، بت پرستی، باہمی قتل و قتال، شراب، جوا، سود، عریانی، ناچ گانا، زنا، نسلی تفاخر، اور قبائلی عصبیت جیسی جاہلی رسوم و عادات جنہیں نبی کریمؐ نے سوسائٹی سے ختم کر کے مسلم معاشرے کو ان سے پاک کر دیا تھا اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں تلقین فرمائی تھی کہ ”لا ترجعوا بعدی ضلالا“ میرے بعد پھر گمراہی کے دور میں واپس نہ چلے جانا، وہ ساری کی ساری جاہلی رسوم و خرافات آج پھر سوسائٹی میں واپس آگئی ہیں اور ہم عملاً جاہلیت اور گمراہی کے دور کی طرف واپس چلے گئے ہیں۔

اس لیے آج ہمارے لیے حج کا سب سے بڑا اسبق یہ ہے کہ جاہلیت کے دور سے نکلنے کی کوشش کریں اور اسلام کی روشن تعلیمات کو سوسائٹی میں عملی طور پر واپس لانے کی جدوجہد کریں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

گلوبل ہیومن سوسائٹی کا مستقبل اور قرآن کریم

(دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۴ اگست ۲۰۱۰ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ میں نے آپ حضرات کے سامنے قرآن کریم کی دو آیات پڑھی ہیں جو بیسویں پارے کی آخری آیات ہیں اور ان میں اللہ رب العزت نے قرآن کریم ہی کے بارے میں ایک بات ارشاد فرمائی ہے۔ مشرکین مکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے، حالانکہ بیسیوں کھلے معجزات کا انہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود ان کا معجزات اور نشانیوں کے لیے مطالبہ جاری رہتا تھا اور وہ اپنی طرف سے طے کر کے کہا کرتے تھے کہ جو نشانیاں ہم مانگتے ہیں وہ دکھائی جائیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالی نے ان کے مطالبات کی ایک فہرست بیان کی ہے جس میں یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ ان باتوں میں سے کوئی پوری نہ کر دیں:

- ہمارے لیے زمین سے پانی کا چشمہ نکالیں۔
- یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو اور اس کے درمیان پانی کے کھال بہتے ہوں۔
- یا اپنے دعوی کے مطابق ہم پر آسمان گرا دیں۔
- یا اللہ تعالی اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لائیں۔
- یا آپ کے لیے سونے کا محل ہو۔
- یا آپ آسمان کی طرف چڑھ جائیں اور آسمان سے کتاب لے کر آئیں، وغیر ذلک۔

یہ آیات جو میں نے تلاوت کی ہیں ان میں بھی اسی قسم کے سوال کا ذکر ہے کہ مشرکین کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ان کے رب کی طرف سے نشانی کیوں نہیں اترتی؟ حالانکہ نشانیاں تو وہ بہت سی دیکھ چکے تھے مگر وہ اپنی مرضی اور مطالبے کی نشانی کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالی نے ان آیات میں دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں:

1. ایک یہ کہ آپؐ ان سے کہہ دیجیے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں اس کے عذاب سے ڈرانے والا اور اس کا پیغام بیان کرنے والا ہوں۔ یہ اللہ تعالی کی مرضی ہے کہ وہ کونسی نشانی نازل کرے اور کونسی نشانی کا مطالبہ پورا نہ

کرے، اس کی حکمت ہو تو چاند کے دو ٹکڑے کر دے اور حکمت نہ ہو تو مکہ میں ایک باغ نہ دے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیں کہ یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے کیونکہ میں تو صرف پیغام پہنچانے اور خدا کے عذاب سے ڈرانے کے لیے آیا ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ کوئی نشانی دے یا نہ دے۔

2. جبکہ دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے، اس میں ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے۔ مشرکین کی طرف سے نشانیوں کے مطالبے کے جواب میں یہ ارشاد ربانی کہ ’’کیا قرآن کریم کا اتارا جانا کافی نہیں ہے؟‘‘ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ ہے جس کے بعد کسی اور نشانی اور معجزہ کے مطالبہ کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

ہمارا جناب نبی کریمؐ کے تمام معجزات پر ایمان ہے جو کسی صحیح سند اور روایت کے ساتھ ثابت ہوں۔ مگر قرآن کریم اور دیگر معجزات میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ باقی معجزات پر ہمارا ایمان ہے لیکن ہم نے ان میں سے کوئی دیکھا نہیں ہے، مثلاً ایک موقع پر آنحضرتؐ کی مبارک انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹے جو سینکڑوں لوگوں نے پیا، ہمارا اس پر ایمان ہے مگر نہ ہم نے پانی دیکھا اور نہ ہی پینے والے دیکھے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن کریم وہ معجزہ ہے جس پر ہمارا ایمان ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کے معجزہ ہونے کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں کیونکہ قرآن کریم قیامت تک رہے گا، وہ آج بھی اپنا اعجاز دکھا رہا ہے اور ایک دنیا اس کے اعجاز کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ مشرکین مکہ نے قرآن کریم کو جادو کہا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کیا اور فرمایا یہ جادو نہیں بلکہ میرا کلام ہے۔ اس لیے قرآن کریم یقیناً جادو نہیں ہے لیکن محاورے کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم اگرچہ خود جادو نہیں ہے مگر اس کا ’’جادو‘‘ آج بھی دنیا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

مفسرین کرام نے قرآن کریم کے اعجاز کی بیسیوں وجوہ اور پہلو بیان کیے ہیں، میں ان میں سے تین چار ایسی وجوہ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو آج بھی دنیا سے اپنا لوہا منوا رہی ہیں اور ہماری گناہگار آنکھیں کھلے بندوں ان کا مشاہدہ کر رہی ہیں، مثلاً:

• یہ اعجاز کہ رمضان المبارک کے دوران دنیا بھر میں لاکھوں کی تعداد میں قراء کرام اور حفاظ تراویح اور نوافل میں قرآن کریم سناتے ہیں اور کروڑوں مسلمان بڑے شوق اور اہتمام کے ساتھ سنتے ہیں۔ حفظ قرآن کریم کا یہ اعزاز اور اعجاز دنیا کی کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

• اسی طرح قرآن کریم کی تلاوت و قراءت کے مختلف سحر انگیز لہجوں نے بھی آج ایک دنیا کو مسحور کر رکھا ہے کیونکہ اتنے شوق اور اہتمام کے ساتھ خوبصورت سے خوبصورت لہجے کے ساتھ نہ کوئی کتاب پڑھی جاتی ہے اور نہ ہی سنی جاتی ہے۔ اور اس باب میں بھی قرآن کریم آج کی دنیا کے لیے ایک چیلنج اور معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔

• اس کے علاوہ قرآن کریم اپنے مفہوم اور پیغام و دعوت کے حوالہ سے بھی معجزہ ہے کہ جو کوئی اسے سمجھنے اور راہنمائی حاصل کرنے کے لیے پڑھتا ہے یہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور مثبت سوچ کے ساتھ اسے پڑھنے والا کوئی بھی شخص اس کی تاثیر کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتا۔ ایک معروف نومسلم یحییٰ برٹ نے، جس کا تعلق برطانیہ کے ایک نامور انگریز خاندان سے ہے، اس پر ریسرچ کی ہے کہ مغرب میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہونے والے افراد کے قبول اسلام کا سبب کیا ہے؟ اس کا کہنا ہے کہ مغربی دنیا میں مسلمان ہونے والے لوگوں کی غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو قرآن کریم پڑھ کر مسلمان ہوئے ہیں اور قرآن کریم کی اسٹڈی نے انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہے۔ خود میری ملاقات بعض نومسلموں سے ہوئی ہے مثلاً یوسف حمزہ، یوسف اسلام، مورس عبد اللہ اور یحییٰ برٹ وغیرہ، ان میں زیادہ تر وہ ہیں جنہوں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا اور قرآنک اسٹڈی کے نتیجے میں وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

گویا قرآن کریم کے الفاظ بھی معجزہ ہیں، اس کی قراءت و تجوید بھی معجزہ ہے اور اس کا مفہوم اور پیغام بھی معجزہ ہے۔ مگر میں آج قرآن کریم کے اعجاز کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا جس کی طرف اشارہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تین سو سال پہلے کیا تھا کہ انسانی سوسائٹی اور تمدن کے لیے قرآن کریم کے احکام و قوانین بھی معجزہ ہیں

جن کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی اور آج کی دنیا میں اس کا مختلف صورتوں میں اظہار ہو رہا ہے جن میں سے دو تین کا تذکرہ کرنا چاہوں گا:

- مسیحی دنیا کے سب سے بڑے مذہبی مرکز ویٹی کن سٹی کے سرکاری ترجمان (L'Osservatore Romano) نے چند ماہ قبل دنیا کے موجودہ معاشی بحران کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جو اٹلی کے ماہرین معیشت کے ایک گروپ کی تحریر کردہ ہے اور اس میں لکھا گیا ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام ناکام ہو گیا ہے اس لیے معاشی بحران کے حل کے لیے قرآن کریم کے بیان کردہ معاشی اصولوں سے رجوع کیا جائے۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس کے بیان کردہ جن معاشی اصولوں کو آج سے ربع صدی قبل تک فرسودہ اور ناقابل عمل قرار دیا جاتا تھا، آج وہی اصول مغربی دنیا میں معاشی بحران کے بہترین حل کے طور پر سامنے آرہے ہیں اور غیر سودی معیشت کا مذاق اڑانے والے آج اس کی پناہ لینے پر مجبور نظر آرہے ہیں۔
- اسی طرح برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس نے گزشتہ سے پیوستہ ماہ کے دوران ماحولیات کے حوالہ سے دنیا کے موجودہ بحران پر ایک بین الاقوامی کانفرنس میں کہا کہ اسلامی قوانین پر عمل کر کے دنیا کو ماحولیاتی خطرات سے بچایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے گلوبل وارمنگ کے باعث ہونے والی تبدیلیوں اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹنے کے لیے عالمی ماہرین پر زور دیا ہے کہ قرآن کریم میں بتائے گئے معاشرتی اصولوں پر عمل کر کے دنیا کو کسی بڑے نقصان سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔
- اس کے ساتھ ایک اور شہادت کو بھی سامنے رکھ لیں کہ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے پروفیسر ڈاکٹر نوہ فلڈمین (Noah Feldman) نے گزشتہ سال نیویارک ٹائمز میں "شریعہ کیوں؟" کے عنوان سے اپنے ایک سلسلہ وار مضمون میں لکھا تھا کہ مغربی حکمران دنیا کے کسی بھی حصے میں اسلامی شریعہ کے نفاذ کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں کہ شریعت اور اس کے قوانین میں

کوئی کمزوری ہے بلکہ یہ لوگ شریعت کا راستہ روک کر اپنے نظام و قانون کی کمزوریوں اور کھوکھلے پن کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ قرآن کریم کے احکام و قوانین کے اعجاز پر آج کی دنیا کی شہادتیں ہیں اور میں اس پر یہ جملہ ایک بار پھر دہرانا چاہوں گا کہ قرآن کریم خود جادو نہیں ہے لیکن اس کا ''جادو'' آج بھی دنیا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ میری دنیا بھر کے مسلمان بھائیوں سے درخواست ہے کہ رمضان المبارک کے دوران قرآن کریم پڑھتے ہوئے اعجاز قرآن کریم کے اس پہلو کی طرف بھی توجہ دیں اس لیے کہ نہ صرف امت مسلمہ بلکہ گلوبل ہیومن سوسائٹی کا بہتر مستقبل بھی اسی سے وابستہ ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۹ اگست ۲۰۱۰ء)

نیویارک کی امیگریشن / قرآن کریم کا مقصدِ نزول

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۳ اگست ۲۰۱۰ء)

۲۲ جولائی کو نیویارک پہنچا تھا اور کم و بیش چار پانچ دن مصروف رہنے کے بعد اب بالٹیمور میں ہوں۔ جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر ہمارے جیسے لوگوں کے لیے امیگریشن کا مرحلہ بہت سخت ہوتا ہے جس سے کم و بیش ہر دفعہ گزرنا پڑتا ہے، اس سال بھی اس آزمائشی مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ گزشتہ سال اہلیہ بھی ساتھ تھیں اور امیگریشن کے عملے نے ہم دونوں کو جہاز سے اترتے ہی قابو کر لیا تھا، میں اس صورتحال کا عادی تھا مگر اہلیہ کے لیے یہ پہلا موقع تھا وہ بہت گھبرائیں مگر میں نے تسلی دی کہ پریشان نہ ہونا دو تین گھنٹے کی پوچھ گچھ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور کم و بیش تین گھنٹے کاغذات کی جانچ پڑتال، سامان کی تلاشی اور سوالات و جوابات کے بعد ہمیں انٹری دے دی گئی۔ دراصل ''محمد'' اور ''خان'' دونوں میرے نام کا حصہ ہیں، ان میں سے کوئی لفظ بھی نام میں شامل ہو تو اسے چیکنگ کے لیے الگ کر لینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میرا معاملہ تو ڈبل ہے کہ میرا نام پاسپورٹ میں ''محمد عبد المتین خان'' درج ہے، اس لحاظ سے میں دو آتشہ ہوں اور نیویارک ایئرپورٹ پر کئی بار ان دو نسبتوں کے ثمرات سمیٹ چکا ہوں۔

مگر اس سال ایک اور الجھن کھڑی ہو گئی جس نے دو گھنٹے زیادہ لے لیے اور میں امیگریشن، سکیورٹی چیکنگ اور کسٹم کے مراحل کم و بیش ساڑھے پانچ گھنٹے میں عبور کر پایا۔ وہ

الجھن یہ تھی کہ میرا پورا نام جو شناختی کارڈ پر درج ہے ”محمد عبد المتین خان زاہد“ ہے۔ گزشتہ پاسپورٹوں پر یہ پورا نام درج ہوتا تھا مگر کمپیوٹرائزڈ پاسپورٹ میں نام کی طوالت کی وجہ سے ”زاہد“ حذف کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ پوچھی گئی تو بتایا گیا کہ نئے پاسپورٹ میں اتنے لمبے نام کی گنجائش نہیں ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ گزشتہ پاسپورٹ کے حوالے سے لگے ہوئے ویزوں میں آخری نام ”زاہد“ ہے جبکہ اس پاسپورٹ میں آخری نام ”خان“ درج ہے۔ اس کیفیت میں بھی چار پانچ انٹرنیشنل سفر کر چکا ہوں کہیں کوئی الجھن پیش نہیں آئی مگر اس بار نیویارک ایئرپورٹ پر جس امیگریشن آفیسر سے واسطہ پڑا وہ شک میں پڑ گیا۔ میں اس الجھن کو حل کرنے کے لیے پرانا پاسپورٹ ساتھ رکھتا ہوں جو اس شک کو دور کر دیتا ہے مگر امیگریشن آفیسر نے مجھ سے کچھ پوچھے بغیر دو گھنٹے اس عقدے کو حل کرنے میں صرف کر دیے۔ کمپیوٹر پر ریکارڈ کو بار بار چیک کرنے کے علاوہ مختلف مقامات پر ٹیلی فون بھی کرتا رہا اور دو گھنٹے کی تگ و دو کے بعد مجھے کہا کہ ویزا پر نام اور ہے جبکہ پاسپورٹ میں مختلف نام درج ہے اس لیے۔ مگر ”اس لیے“ سے آگے کچھ کہنے سے پہلے میں نے اسے مزید گفتگو سے روک دیا اور بیگ سے پرانا پاسپورٹ نکال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے دونوں پاسپورٹوں کو بار بار دیکھا اور بالآخر اس کا شک دور ہو گیا۔ پھر سامان کی تلاشی اور کاغذات کی چیکنگ وغیرہ میں تین گھنٹے مزید لگ گئے اور میں صبح ۹ بجے کے لگ بھگ جہاز سے اترنے کے بعد اڑھائی بجے ایئرپورٹ سے باہر نکل پایا۔ اس بار سوالات میں ایک نئے سوال کا سامنا بھی کرنا پڑا کہ تم یہاں تقریروں کے پروگرام پر آتے ہو؟ میں نے کہا کہ پروگرام طے کر کے تو نہیں آتا لیکن چونکہ مذہبی معلم ہوں اس لیے کہیں تقاضہ ہوتا ہے تو انکار بھی نہیں کرتا اور حسب موقع تقریر وغیرہ کر دیتا ہوں۔

یہ صورتحال کم و بیش ہر دفعہ پیش آتی ہے اس لیے میں استقبال کرنے والے دوستوں کو قبل از وقت ایئرپورٹ آنے اور اتنا طویل انتظار کرنے کی زحمت نہیں دیتا بلکہ تمام مراحل سے فراغت کے بعد انہیں فون کرتا ہوں اور وہ آکر مجھے لے جاتے ہیں۔ نیویارک میں میرا پہلا پڑاؤ ”دارالعلوم نیویارک“ ہوتا ہے جو کوئینز کے علاقے جمیکا میں واقع ہے اور جے ایف کے ایئرپورٹ سے آدھ پون گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ وہاں فون کیا تو دارالعلوم کے مہتمم مولانا محمد یامین خان، بھائی برکت اللہ، مولانا حافظ اعجاز احمد اور مولانا قاری محمد یوسف عثمانی آ گئے جن کے ہمراہ میں دارالعلوم پہنچ گیا۔ اول الذکر دونوں حضرات کا تعلق بنگلہ

دیش سے ہے اور دارالعلوم کے ذمہ دار ہیں جبکہ دوسرے دونوں بزرگ گوجرانوالہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا حافظ اعجاز احمد دارالعلوم سے وابستہ ہیں اور وہیں مقیم ہیں جبکہ قاری یوسف عثمانی میری طرح وزٹ ویزے پر آئے ہوئے ہیں۔ چند روز قبل ان کے بیٹے محمود عثمانی کی بروکلین میں شادی ہوئی ہے اور قاری صاحب اسی سلسلہ میں تشریف لائے ہیں۔

جمعۃ المبارک ۲۳ جولائی کا خطبہ میں نے دارالعلوم کی مسجد میں دیا۔ ان دنوں دارالعلوم کے سالانہ امتحانات چل رہے تھے، میں نے اصول حدیث کی ایک کتاب کے طلبہ کا امتحان لیا۔ یہاں اساتذہ اور طلبہ میں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش تینوں ملکوں سے تعلق رکھنے والے حضرات شامل ہیں اس لیے تعلیم زیادہ تر اردو میں ہوتی ہے۔ شام کو لانگ آئی لینڈ کے ''سیلڈن اسلامک سنٹر'' میں حاضری ہوئی جہاں میرے پرانے دوست اور جمعیت علماء اسلام کے سابق مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا عبد الرزاق عزیز امام و خطیب ہیں۔ نماز مغرب کے بعد بیان کا اہتمام تھا، رمضان المبارک کی آمد آمد ہے اس لیے میں نے قرآن کریم کے حوالے سے گفتگو کی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے، قرآن کریم کا نزول اسی مبارک مہینے میں ہوا اور اسی میں زیادہ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں رمضان المبارک کے دوران قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا معمول بڑھ جاتا ہے اور تراویح کے ساتھ ساتھ تہجد اور دیگر نوافل میں کثرت سے قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس مناسبت سے میں آج کی محفل میں اس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہم قرآن کریم کس مقصد کے لیے پڑھتے ہیں اور اسے پڑھنا کس مقصد کے لیے چاہیے؟

1. ہم عام طور پر قرآن کریم پڑھتے اور سنتے ہیں کہ اس سے اجر و ثواب حاصل ہوگا جو بلاشبہ حاصل ہوتا ہے۔
2. ہم قرآن کریم گھروں میں، کاروباری مراکز میں اور دفاتر میں برکت کے لیے پڑھتے ہیں اور قرآن کریم کی تلاوت سے ہمیں برکات حاصل ہوتی ہیں۔
3. ہم قرآن کریم کو شفا کے لیے پڑھتے ہیں اور قرآن کریم روحانی بیماریوں کے ساتھ ساتھ جسمانی بیماریوں میں بھی شفا کا باعث بنتا ہے۔

4. ہم اپنے مرحوم دوستوں اور بزرگوں کو ایصال ثواب اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی نسبت سے قرآن کریم پڑھتے ہیں اور یہ مقصد بھی یقیناً حاصل ہوتا ہے۔

مگر یہ وہ فوائد ہیں جو ہم قرآن کریم سے حاصل کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کا اپنا مقصد اور ایجنڈا کیا ہے اس پر ہماری توجہ نہیں ہوتی۔ ہمارا معاملہ قرآن کریم کے ساتھ کچھ اس طرح کا ہوگیا ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی بہت ہی معزز ہستی مہمان بن کر آجائے تو ہم اسے احترام اور پروٹوکول تو پورا دیں، اس کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں اور اس کی آمد سے جتنے فوائد حاصل کر سکتے ہوں وہ بھی کریں مگر اس سے یہ نہ پوچھیں کہ آپ کس مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں اور آپ کی آمد کا کوئی ایجنڈا بھی ہے یا نہیں؟ اسے خود غرضی کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے ہمارا معاملہ قرآن کریم کے ساتھ اسی خود غرضی والا ہے۔ ہم بحمد اللہ تعالیٰ قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے ساتھ عقیدت و محبت بھی رکھتے ہیں، اس کا ادب و احترام بھی کرتے ہیں، اس کی بے حرمتی پر ہماری غیرت بھی جوش میں آجاتی ہے اور اس سے اجر و ثواب، رحمت و برکت اور شفاو مغفرت کے سارے فوائد بھی حاصل کرتے ہیں۔ مگر اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ آپ کیسے تشریف لائے ہیں اور آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟ جبکہ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کے نزول کے اصل مقصد کی طرف توجہ دیں۔

قرآن کریم نے اپنا ایجنڈا، موضوع اور مقصد آغاز میں ہی واضح کر دیا ہے۔ سورہ البقرہ کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے کہ اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ ”ھدی للمتقین“ ہے۔ قرآن کریم کا موضوع اور مقصد ”ہدایت“ ہے۔ یہ ھدی للناس بھی ہے اور ھدی للمتقین بھی ہے۔ یہ نسل انسانی کی رہنمائی کے لیے آیا ہے، انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھانے آیا ہے اور دنیا و آخرت کے معاملات میں ہمیں گائیڈ کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے ہمیں قرآن کریم سے برکات و ثواب سمیٹنے کے ساتھ ساتھ رہنمائی حاصل کرنے کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب کا اصل مقصد یہی ہے۔

دورِ جدید اور علماء کرام۔ تین غور طلب باتیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۱ اگست ۲۰۱۰ء)

میں نے گزشتہ عشرہ سعودی عرب میں گزارا۔ ۱۲ جولائی کو جدہ پہنچا تھا اور ۲۲ جولائی کو جدہ سے سفر کر کے ایک روز قبل نیویارک آگیا ہوں۔ اس دوران بیت اللہ شریف کی حاضری، عمرہ اور روضۂ اطہر پر صلوۃ و سلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ مختلف تقریبات میں شرکت کا موقع ملا۔ میرے چھوٹے بھائی قاری عزیز الرحمان خان شاہد، میرے ایک برادر نسبتی حافظ عبد العزیز اور میرے ہم زلف قاری محمد اسلم شہزاد جدہ میں مقیم ہیں۔ قاری شاہد خان کے بچے ارسلان خان نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ہے جبکہ حافظ عبد العزیز کی بچی کا نکاح تھا۔ دونوں نے مسجد میں مشترکہ تقریب کا اہتمام کیا۔ میرے ایک اور بھائی مولانا عبد القدوس خان قارن سلمہ بھی عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ آئے ہوئے تھے وہ بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ مسجد حرام میں اپنے عزیز بھتیجے ارسلان خان کا حفظ قرآن کریم کا آخری سبق سنا اور برادر نسبتی حافظ عبد العزیز کی بیٹی کا نکاح پڑھایا۔

مدینہ منورہ میں میرے استاذ حضرت قاری محمد انور صاحب گزشتہ تیس برس سے مقیم ہیں اور تحفیظ القرآن کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں، ان سے میں نے قرآن کریم حفظ کیا تھا جب وہ گکھڑ میں حفظ قرآن کریم کے مدرسہ کے بڑے استاذ تھے۔ میں نے حفظ قرآن کریم ۱۹۶۰ء میں مکمل کیا تھا جسے اب نصف صدی ہوگئی ہے۔ قاری صاحب کی خدمت میں حاضری ہوئی اور ان کی شفقتیں اور دعائیں حاصل کیں۔ جدہ میں ہمارے ایک پرانے دوست قاری محمد رفیق صاحب نے بہت سے علماء کرام کو شام کے کھانے پر بلا رکھا تھا ان کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کیں۔ مدرسہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ میں قاری سیف اللہ صاحب نے خواتین کے لیے دینی معلومات کا ''سمر کورس'' شروع کیا ہوا ہے اس کورس میں شریک طالبات اور خواتین سے خطاب کیا۔

۲۲ جولائی کو نیویارک پہنچا ہوں اور رمضان المبارک کے وسط میں گوجرانوالہ واپسی کا ارادہ ہے ان شاء اللہ تعالی۔ امریکہ میں مصروفیات کے حوالے سے قارئین کی خدمت میں اگلے چند روز میں معروضات پیش کروں گا، سردست جدہ میں قاری محمد رفیق صاحب کی رہائش گاہ پر علماء کرام کی نشست میں پیش کی گئی معروضات کا کچھ حصہ نذر قارئین کر رہا ہوں۔

میری علماء کرام سے اکثر یہ گزارش رہتی ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور ان کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے تقاضوں پر ہمیشہ نظر رکھا کریں اور ان کے مطابق اپنی گفتگو، لہجہ اور جدوجہد کے انداز پر بھی نظر ثانی کرتے رہا کریں کیونکہ اس کے بغیر ہم دین کی دعوت و تبلیغ اور لوگوں کی صحیح دینی رہنمائی کی ذمہ داری سے پوری طرح سرخرو نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر دو تین باتوں کا حوالہ دوں گا:

1. ایک یہ کہ اب سے پون صدی قبل تک اردو زبان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اسلوب کا سکہ چلتا تھا۔ اس اسلوب اور لہجے نے جس میں پر شکوہ الفاظ، مشکل تراکیب اور بھاری بھرکم جملوں کی فراوانی ہوتی تھی ایک عرصہ تک ادب، صحافت اور خطابت کی دنیا پر حکمرانی کی ہے۔ لیکن اب یہ اسلوب متروک ہو چکا ہے اور اس اسلوب میں بات کر کے آپ آج کی نسل تک اپنا پیغام منتقل نہیں کر سکتے۔ آج کا اسلوب یہ ہے کہ آپ کتنے سادہ الفاظ، آسان لہجے اور عام فہم انداز میں لوگوں کے سامنے بات کر سکتے ہیں یا اپنا مافی الضمیر تحریر میں لا سکتے ہیں۔ آپ مولانا مودودیؒ، جاوید احمد غامدی اور غلام احمد پرویز سے ہزار اختلاف رکھیں، مجھے بھی بہت سے معاملات میں ان سے اختلاف ہے لیکن آپ اس بات کو بہر حال تسلیم کریں گے کہ ان کے پیغام نے بہت سے لوگوں کے ذہنوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سادہ انداز میں بات کرتے ہیں، کامن سینس میں بات کرتے ہیں اور غیر ضروری مباحث میں الجھے بغیر ٹو دی پوائنٹ بات کرتے ہیں۔ علماء کرام کو بھی یہی اسلوب اختیار کرنا ہوگا اور اسی انداز میں بات کر کے وہ نئی نسل تک اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں۔

2. اسی طرح یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اب سے نصف صدی قبل تک دنیائے خطابت میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے طرز خطابت کی حکمرانی تھی۔ انہیں اردو زبان کا سب سے بڑا عوامی خطیب کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ ان کی خطابت کے دیگر کمالات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک بڑا کمال شمار ہوتا تھا کہ وہ گھنٹوں اپنے سامعین کو خطابت کے سحر میں جکڑے رکھتے تھے اور لوگ وقت کی رفتار سے بے پروا ہو جایا کرتے تھے۔

بہت سے واقعات ہیں کہ امیر شریعتؒ نے عشاء کی نماز کے بعد بیان شروع کیا اور فجر کی اذانوں نے لوگوں کو چونکا کر احساس دلایا کہ رات بیت چکی ہے۔ غلام محمد خان لوند خوڑ مرحوم معروف مسلم لیگی لیڈر اور شاہ جیؒ کے سیاسی مخالفین میں سے تھے۔ انہوں نے ایک واقعہ لکھا ہے جو میں نے کسی زمانے میں آغا شورش کاشمیری مرحوم کے ہفت روزہ چٹان میں پڑھا تھا کہ خان صاحب مرحوم ایک بار اپنی گاڑی پر عشاء کے بعد دہلی دروازہ لاہور کے باہر سے گزر رہے تھے اور امیر شریعتؒ وہاں ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے۔ خان صاحب مرحوم اس خیال سے رک گئے کہ ان کی خطابت کا بہت شہرہ ہے تھوڑی دیر سن لیتے ہیں کہ ان کے خطاب کا انداز کیا ہے۔ خان مرحوم کہتے ہیں وہ ایک سائیڈ پر جہاں آواز آ رہی تھی، گاڑی کھڑی کر کے اس سے باہر نکلے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ خان صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوا کہ وہ ساری رات کھڑے رہے ہیں اور صبح کی اذانوں کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت کا سحر اور کمال تھا لیکن آج کا اسلوب یہ نہیں ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ اسلوب بھی رخصت ہو چکا ہے۔ آج کی خطابت کا کمال یہ ہے کہ آپ کتنے مختصر وقت میں اپنی بات مکمل کر سکتے ہیں۔ بات بھی مکمل ہو اور وقت بھی کم سے کم صرف ہو۔ آپ اگر کسی بڑی کانفرنس میں اپنی بات دس بارہ منٹ میں پوری طرح بیان کر سکتے ہیں تو آپ کامیاب خطیب ہیں ورنہ لوگوں کے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ گھنٹوں آپ کے سامنے بیٹھے سر دھنتے رہیں۔ وقت بھی لوگوں کے پاس نہیں ہے اور ذوق بھی مصروفیات کے ہجوم میں غائب ہو چکا ہے۔

3. تیسری بات جو میں علماء کرام سے عرض کرتا ہوں کہ اب سے ربع صدی قبل تک صورتحال یہ تھی کہ عام لوگ دین کے بارے میں وہی معلومات رکھتے تھے جو علماء کرام انہیں فراہم کر دیتے تھے اور کسی مسئلہ کے حوالے سے ہم جو کچھ ہم بتا دیتے وہی ان کا مبلغ علم ہوتا تھا اس لیے ہماری رائے بھی ان کے لیے حتمی درجہ رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس دینی مسائل کے

بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کوئی متبادل ذریعہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب صورتحال یہ نہیں ہے اس لیے کہ لوگوں کے پاس دینی مسائل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے دیگر ذرائع بھی موجود ہیں۔ اردو اور انگریزی میں دینی لٹریچر کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے۔ میڈیا چینلز، اخبارات و جرائد اور مطالعاتی حلقوں نے عام لوگوں کے سامنے دینی معلومات کا انبار لگا دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے جسے میں آج کے دور کا المیہ سمجھتا ہوں کہ علم کا دائرہ دن بدن سمٹتا جا رہا ہے اور معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ اس لیے معلومات صحیح ہوں یا غلط اور معلومات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کسی میں ہو یا نہیں مگر بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں لوگوں کا معلومات کا دائرہ صرف ہماری مہیا کردہ معلومات تک محدود نہیں رہا اور وہ دوسرے ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کا ذوق اور سہولت رکھتے ہیں۔

اس ماحول میں ہم اگر اپنی محدود معلومات کی بنیاد پر بات کریں گے تو وہ مؤثر نہیں ہوگی بلکہ ہماری ثقاہت اور اعتماد بھی مجروح ہوگا۔ اس لیے علماء کرام کو اپنے مطالعہ اور معلومات میں وسعت پیدا کرنا ہوگی اور کسی بھی مسئلہ پر ہمہ پہلو معلومات کے دائرے اور تناظر میں بات کرنا ہوگی ورنہ ہم اپنی دینی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔

قرآن کریم پڑھنے کے سات مقاصد

(ایشیا اسلامک سنٹر، ہیوسٹن، ٹیکساس، امریکہ - ۳۰ جولائی ۲۰۱۰ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے، اسی مبارک مہینہ میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور اسی میں زیادہ پڑھا اور سنا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سال کے بعد اس ماہ میں قرآن کریم کے ساتھ ہمارے تعلق کو تازہ کر دیتے ہیں، کچھ بیٹریاں چارج ہو جاتی ہیں اور قرآن کریم کے ساتھ امت مسلمہ کے ربط میں تازگی آجاتی ہے، اسی حوالہ سے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

قرآن کریم ہم پڑھتے بھی ہیں سنتے بھی ہیں اور کچھ نہ کچھ یاد بھی کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو کس غرض اور مقصد کے لیے پڑھتے ہیں اور اسے اصل میں کس مقصد

کے لیے پڑھنا چاہیے؟ اس کا اپنا مقصد اور ایجنڈا کیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس پاک کلام کو پڑھنے اور سننے کی ضرورت ہے۔ ہم عام طور پر قرآن کریم کو چند مقاصد کے لیے پڑھتے ہیں جن کا تذکرہ اس وقت مناسب سمجھتا ہوں، مثلاً:

1. قرآن کریم پڑھنے سے ہمارا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ نماز ہم پر فرض ہے اور نماز میں قرآن کریم پڑھنا ضروری ہے اس لیے ہم تھوڑا بہت قرآن کریم یاد کرتے ہیں تاکہ نمازوں میں پڑھ سکیں اور ہماری نمازیں صحیح طور پر ادا ہو جائیں، ہر مسلمان چند سورتیں یاد کرنے کی ضرور کوشش کرتا ہے تاکہ وہ انہیں نمازوں میں پڑھ سکے۔ اس مسئلہ میں ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرائض و واجبات اور مؤکدہ سنتیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ادا ہو جائیں اس کے لیے کم از کم کتنا قرآن کریم یاد کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے؟ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ چند سورتیں یاد کر لی جاتی ہیں اور انہی کو بار بار ہر نماز اور ہر رکعت میں دہرایا جاتا ہے، اس سے نماز ہو تو جاتی ہے لیکن سنت کے مطابق نہیں ہوتی۔ جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ مختلف نمازوں اور رکعتوں میں مختلف سورتیں پڑھی جائیں اور ایک ہی سورت کو بار بار نہ دہرایا جائے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے میرا اندازہ ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کو قرآن کریم کا کم از کم نصف آخری پارہ ضرور یاد کرنا چاہیے، اس کے بغیر پانچ نمازیں سنت نبویؐ کے مطابق ادا کرنا میرے خیال میں مشکل ہے۔ بہرحال ہمارا قرآن کریم پڑھنے سے ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ سورتیں یاد کر لیں تاکہ انہیں نمازوں میں پڑھ سکیں اور ہماری نمازیں صحیح طور پر ادا ہو جائیں۔

2. قرآن کریم پڑھنے اور سننے سے ہمارا دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ثواب حاصل کریں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ اجر ملے، اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم پڑھنے اور سننے سے اجر ملتا ہے، ثواب حاصل ہوتا ہے اور ہمارے کھاتے میں نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ پڑھنے پر بھی ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور سننے پر بھی ہر حرف پر دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور دس کا یہ عدد متعیّن نہیں ہے بلکہ یہ کم از کم کی حد ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ

”من جاء بالحسنة فلہ عشر امثالھا و من جاء بالسیئۃ فلا یجزیٰ الا مثلھا“ (سورہ الانعام ۱۶۰) جس نے نیکی کا کوئی کام کیا اس کے لیے دس گناہ اجر ہے اور جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اسے اس کے برابر بدلہ ملے گا۔ نیکی کے ہر کام پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کا اجر و ثواب دس گنا سے شروع ہوتا ہے یہ کم از کم کی حد ہے، ثواب میں زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، وہ کام کرنے والے کے خلوص و توجہ اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی پر موقوف ہے۔ یہ سینکڑوں میں بھی ہو سکتا ہے، ہزاروں میں بھی ہو سکتا ہے اور لاکھوں کروڑوں اور اربوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ کسی سطح پر بھی کوئی اشکال نہیں ہے اس لیے کہ اشکال وہاں ہوتا ہے جہاں دینے والے کو کوئی بجٹ پرابلم ہو کہ اس مد میں اتنی رقم موجود بھی ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ کی کوئی بجٹ پرابلم نہیں ہے اس لیے اس نے کسی نیکی میں زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ آپ کے کنکشن کی پاور پر منحصر ہے کہ وہ کتنے وولٹیج کھینچ سکتا ہے، ادھر سے کوئی کمی نہیں ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل توجہ ہے کہ نیکی اور ثواب کسے کہتے ہیں اور یہ جو دس، بیس، سو، ہزار نیکیاں ملنے کی بات کی جاتی ہے، ان میں عملاً ملتا کیا ہے؟ ایک صاحب نے یہی سوال کیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ آخرت کی کرنسی ہے، اس لیے کہ جس طرح دنیا میں ہمارے معاملات اور لین دین ڈالر، یورو، پونڈ، ریال، درہم اور روپے کے ذریعے طے پاتے ہیں اور ہم ان کرنسیوں کے تبادلے سے اپنے معاملات نمٹاتے ہیں، اسی طرح آخرت میں ہمارے معاملات، نیکیوں اور گناہوں کے تبادلے سے طے پائیں گے۔ وہاں ڈالر، ریال اور روپیہ نہیں چلے گا بلکہ کسی بھی شخص کے ساتھ لین دین نمٹانے کے لیے یا نیکیاں دینا پڑیں گی اور یا اس کے گناہ اپنے سر لینے پڑیں گے۔ اس لیے نیکی اور گناہ دونوں آخرت کی کرنسیاں ہیں۔ ایک پازیٹو ہے اور دوسری نیگیٹو ہے اور انہی کے ذریعے ہمارے آخرت کے معاملات نمٹائے جائیں گے۔ ہم دنیا کے کسی ملک میں جاتے ہیں تو جانے سے پہلے وہاں کی کرنسی کا انتظام کرتے ہیں تاکہ وہاں صحیح طور پر وقت گزار سکیں، اسی طرح آخرت کے دور میں داخل

ہونے سے پہلے ہمیں وہاں کی زیادہ سے زیادہ کرنسی کا بندوبست کر لینا چاہیے تاکہ وہاں کی زندگی بہتر ہو سکے۔ چنانچہ ہم قرآن کریم اس نیت سے بھی پڑھتے ہیں کہ ثواب حاصل ہو گا۔

3. تیسرے نمبر پر ہم قرآن کریم کی تلاوت برکت کے لیے کرتے ہیں۔ نیا مکان بنائیں، کاروبار شروع کریں، یا دفتر کھولیں تو برکت کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں۔ ویسے بھی باذوق حضرات اپنے گھروں دکانوں، دفاتر، کھیتوں اور کاروباری مراکز میں قرآن کریم کی تلاوت اور ذکر و افکار کا معمول رکھتے ہیں اور قرآن کریم سے ہمیں یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ جہاں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے وہاں رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے گھروں میں برکت و رحمت کا ماحول نہیں رہا کیونکہ قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی، نماز کا ماحول نہیں ہے، ذکر و اذکار کا معمول نہیں ہے اور درود شریف پڑھنے کا ذوق نہیں ہے۔ ہمیں اکثر شکایت رہتی ہے کہ گھروں میں برکت نہیں رہی، باہمی اعتماد کی فضا نہیں رہی، کاروبار میں رکاوٹ رہتی ہے، رشتوں میں جوڑ نہیں ہے اور بے سکونی کی فضا ہے، یہ ماحول جب بڑھتا ہے تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے اور ہم علماء کرام کے پاس اور عاملوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں کسی نے کچھ کر دیا ہے آپ بھی کچھ کریں، وہ غریب کچھ نہ کچھ کرتے بھی ہیں، مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ کرنے والے کرتے ہیں، ان کے اثرات بھی ہوتے ہیں اور علاج کرنے والوں کا علاج بھی مؤثر ہوتا ہے، لیکن کیا ہمارے گھروں میں سب کچھ یہی ہو رہا ہے؟ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، ہماری گھروں میں برکت نہ رہنے اور نحوست و بے برکتی کے پھیلنے کا اصل سبب کچھ اور ہے جس پر ہمیں ضرور غور کرنا چاہیے اور میں پڑھے لکھے دوستوں کو اس پہلو پر غور کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔

اس سلسلہ میں اس بات پر غور کر لیجئے کہ رحمتیں اور برکتیں لے کر فرشتے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ کام عالم اسباب کے درجے میں انہی کے سپرد کر رکھا ہے، مگر ہمارے گھروں کا ماحول فرشتوں کی آمد و رفت کے لیے سازگار نہیں

ہے۔ فرشتے وہاں آتے ہیں جہاں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے، جہاں نماز پڑھی جاتی ہے، ذکرواذکار کا ماحول ہوتا ہے، درود شریف پڑھا جاتا ہے اور خیر کے اعمال ہوتے ہیں۔ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”البیت الذی لیس فیہ القرآن کالبیت الخرب“ وہ گھر جس میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ ویران گھر کی طرح ہے۔ دوسری حدیث میں جناب نبی اکرمؐ فرماتے ہیں کہ ”صلوافی بیوتکم ولا تجعلوھا قبورا“ گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔ گویا گھروں کی آبادی نماز اور تلاوت قرآن کریم سے ہے، اور جن گھروں میں نماز اور تلاوت کا معمول نہیں ہے وہ آباد گھر نہیں ویران اور اجڑے ہوئے گھر اور قبرستان ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے گھروں میں عام طور پر اس کا معمول نہیں رہا اس لیے فرشتوں کا آنا جانا بھی نہیں رہا۔

اس کے برعکس ہمارے گھروں میں جو کچھ ہوتا ہے اس پر بھی ایک غیبی مخلوق کی آمد و رفت رہتی ہے، جو فرشتے بہرحال نہیں ہیں، وہ مخلوق جن و شیاطین کی ہے۔ وہ آتے ہیں تو اپنے اثرات لے کر آتے ہیں اور اپنی نحوستیں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ شیاطین کی نحوستیں کس قسم کی ہوتی ہیں اس پر جناب نبی اکرمؐ کا ایک ارشاد گرامی سن لیجئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ شیاطین کا ایک پورا نظام ہے جو دنیا میں کام کر رہا ہے اور دنیا کے مختلف اطراف میں شیاطین کی بڑی تعداد ہر وقت کام کرتی ہے اور بڑے شیطان کو اس کی رپورٹ بھی پیش کرتی ہے، جو پانی پر تخت بچھائے ہوئے ہے اور اپنے شیطانی نیٹ ورک کے کام کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان اپنے جس کارندے کو سب سے بڑی شاباش دیتا ہے اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے سینے سے لگاتا ہے، اسے اس بات پر شاباش ملتی ہے کہ وہ کسی گھر میں جھگڑے کا ایسا ماحول پیدا کر دے کہ میاں بیوی میں طلاق ہو جائے، کسی گھر میں طلاق کا ہو جانا شیطان کے نزدیک اس کے کسی کارندے کا سب سے اچھا عمل ہوتا ہے جس پر وہ بہت خوش ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے گھروں میں شیطانوں کی آمد و رفت ہوگی تو اسی طرح کی بے برکتی اور نحوست ہوگی اور اسی بے اتفاقی اور بے اعتمادی کا دور دورہ ہوگا۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں شیاطین کی آمد و رفت کو روکیں اور

فرشتوں کی آمد و رفت کا ماحول بنائیں جو قرآن کریم کی تلاوت اور نماز و ذکر کی کثرت سے بنے گا۔ ایک مثال سے بات سمجھ لیجئے کہ میرا گھر اگر صاف ستھرا ہے، غسل خانے اور نالیوں میں صفائی ہے، گھر کے صحن میں کیاری موجود ہے جس میں پھول کھلے ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس ماحول میں بلبل آئے گی، تتلیاں آئیں گی، جگنو آئیں گے۔ لیکن اگر میرے گھر میں صفائی نہیں ہے، غسل خانہ اور نالیاں گندی ہیں اور کوڑا کرکٹ ہر طرف بکھرا ہوا ہے تو مکھیاں بھنبھنائیں گی، مینڈک ٹرائیں گے، مچھروں اور کاکروچوں کا ہر طرف بسیرا ہوگا، اس پر میں یہ کہنا شروع کردوں کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے اور سارے محلے کے کاکروچ اکٹھے کر کے میرے گھر میں بھیج دیے ہیں تو کس قدر عجیب بات ہوگی۔ میرے گھر میں بلبل اور جگنو کا ماحول ہوگا تو وہ آئیں گے اور مچھروں اور مکھیوں والی فضا ہوگی تو وہ ڈیرہ ڈالیں گے، اس کے لیے کسی کو ملامت کرنے کی بجائے مجھے اپنے گھر کے ماحول کی صفائی کرنا ہوگی اور اسے بہتر بنانا ہوگا۔ اسی طرح میرے گھر میں اگر فرشتوں کی آمد و رفت ہوگی تو وہ آئیں گے اور رحمت و برکت لائیں گے اور اگر ہر وقت شیاطین ڈیرہ ڈالے رہیں گے تو ان سے بے برکتی، نحوست اور نا اتفاقی ہی ملے گی اور وہی کچھ ہوگا جس کی ہمیں اپنے گھروں میں اس وقت شکایت رہتی ہے۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ تیسرا مقصد جس کے لیے ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں برکت کا حصول ہے اور وہ اس عمل پر بلاشبہ حاصل ہوتی ہے۔

4. چوتھا مقصد جس کے لیے ہم عام طور پر قرآن کریم پڑھتے ہیں شفا کا حصول ہے اور وہ بھی قرآن کریم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کریم ہماری جسمانی بیماریوں کی شفا بھی ہے اور روحانی و اخلاقی بیماریوں کا بھی علاج ہے۔ خود قرآن کریم نے اپنے آپ کو شفا کہا ہے اور فرمایا ہے کہ "قد جاء تکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور" (سورہ یونس ۵۷) تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی ہے اور وہ سینوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ یہ شفا اصلاً تو روحانی بیماریوں کی ہے لیکن اس کے ساتھ جسمانی بیماریوں کے لیے بھی شفا ہے۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت ابو سعید خدریؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ چند ساتھیوں کے ہمراہ سفر پر تھے کہ ایک بستی کے قریب رات کا وقت ہو گیا اور انہوں نے بستی والوں سے کہا کہ وہ مسافر ہیں انہیں کھانا کھلا دیا جائے۔ بستی والوں نے اس سے انکار کر دیا تو وہ بستی کے قریب ایک جگہ ڈیرہ لگا کر سو گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بستی کے سردار کو کسی زہریلی چیز نے ڈس لیا، زہر کا اثر دماغ تک پہنچا تو وہ بے قابو ہونے لگا، بستی والوں نے اپنے تئیں علاج وغیرہ کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، انہیں خیال آیا کہ جو لوگ بستی سے باہر ٹھہرے ہوئے ہیں ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی علاج موجود ہو، وہ نصف شب کے وقت ان کے پاس آئے اور کہا ہمارے سردار کو کسی زہریلی چیز نے ڈس لیا ہے اور ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے، تمہارے پاس کوئی علاج ہو تو ہمارے ساتھ آؤ اور ہم پر مہربانی کرو۔ ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں یہ بات تھی کہ انہوں نے ہمیں کھانا نہیں کھلایا اس لیے ہم نے کہا کہ علاج ہمارے پاس ہے مگر ہم معاوضہ کے بغیر علاج نہیں کریں گے اور معاوضہ تیس بکریاں ہو گا، وہ آمادہ ہو گئے، ہم نے جا کر اسے دم کیا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ ہم بکریاں لے کر واپس آئے تو خیال ہوا کہ یہ بکریاں جو ہم نے دم کے عوض لی ہیں شاید ہمارے لیے جائز نہ ہوں، اس لیے جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کریں گے، اس کے بعد ان بکریوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ کو سارا واقعہ سنایا گیا تو آپ نے دل لگی کے طور پر فرمایا کہ ان بکریوں میں سے میرا حصہ بھی نکالو، یہ اشارہ تھا کہ بکریاں لے کر تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ نبی اکرمؐ نے اس موقع پر پوچھا کہ دم کس نے کیا تھا اور کیا پڑھا تھا؟ ابو سعید خدریؓ نے کہا کہ میں نے دم کیا تھا اور سورۃ فاتحہ پڑھی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرت نے پوچھا کہ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ اس میں شفا ہے تو ابو سعید خدریؓ نے عرض کیا کہ ایک بار آپ کی زبان سے سنا تھا کہ اس سورۃ کا نام ''الشفاء'' بھی ہے، اسی یقین پر میں نے دم کر دیا اور اللہ تعالی نے شفا دے دی۔

اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی اکرمؐ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے آخری تین سورتیں جو "معوذات" کہلاتی ہیں یعنی، قل ھواللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے تھے اور ان ہاتھوں کو پورے جسم پر پھیرتے تھے۔ آخری ایام میں جب کمزوری بڑھ گئی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر نبی اکرمؐ کے ہاتھوں پر پھونکتی تھی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے جسم پر پھیرتی تھی۔ معوذات کا یہ پڑھنا برکت کے لیے تھا اور شفا کے لیے تھا۔ اور قرآن کریم کی تلاوت سے یہ دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

5. قرآن کریم کی تلاوت سے ہمارے ذہنوں میں پانچواں مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وفات پانے والے کسی بزرگ، دوست، ساتھی اور رشتہ دار کو ایصال ثواب کے لیے ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ قرآن کریم سے یہ مقصد اور فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے، ایصال ثواب بھی ہوتا ہے اور قرآن کریم کی برکت سے اللہ تعالی مغفرت اور بخشش بھی فرماتے ہیں۔

6. جبکہ قرآن کریم کی تلاوت سے ہمارا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ قراء کرام عام جلسوں میں اچھے سے اچھے لہجے میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں جس سے لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے کی طرف رغبت ہوتی ہے، قرآن کریم کے اعجاز کا اظہار ہوتا ہے، اور غیر مسلموں کے سامنے قرآن کریم کی اچھے لہجے میں تلاوت ان کی قرآن کریم کی طرف کشش کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہ پانچ چھ مقاصد جن کا میں نے ذکر کیا ہے دراصل وہ فوائد ہیں جو ہمیں قرآن کریم سے حاصل ہوتے ہیں اور ہم قرآن کریم کی تلاوت یا سماع سے یہ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت سے یہ سارے فائدے ملتے ہیں اور اللہ تعالی نے قرآن کریم کو ان فوائد کا منبع بنایا ہے، مگر سوال یہ ہے جس کی طرف میں خود کو اور آپ سب حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کا اپنا ایجنڈا اور مقصد کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ دنیا کی کوئی کتاب ہم پڑھتے ہیں تو اس کا موضوع اور مقصد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کس موضوع پر اور کس مقصد کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن قرآن کریم کو پڑھتے

ہوئے ہمارا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ اس کا اپنا موضوع اور مقصد کیا ہے اور یہ کس سبجیکٹ کی کتاب ہے؟ تاریخ کی ہے، سائنس کی ہے، سیاست کی ہے، طب کی ہے، ادب کی ہے، یا کون سے فن کی ہے۔ ہم اس کتاب اللہ کو اپنے اپنے ذوق کے موضوعات کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش تو کرتے رہتے ہیں کہ سائنس سے دلچسپی والا مفسر اس کی تفسیر میں پوری سائنس بیان کر دے گا، جغرافیہ کے ذوق کا عالم اس میں جغرافیے کو سمونے کی کوشش کرے گا، منطق و فلسفہ کا عالم اسے منطق و فلسفہ کا نمائندہ بنانے میں قوت صرف کرے گا اور طب کی دنیا کا شناور اسے علاج و معالج کی کتاب بنانے میں صلاحیتوں کو استعمال کرے گا، مگر اللہ تعالی کے اس آخری کلام کا اپنا موضوع کیا ہے؟ اس کی طرف کم لوگوں کی توجہ ہوتی ہے۔

7. قرآن کریم نے اپنا موضوع صرف ایک لفظ میں بیان کیا ہے اور وہی اس کا اصل مقصد ہے جو تلاوت کا آغاز کرتے ہی سامنے آجاتا ہے۔ سورہ البقرہ کا آغاز اسی سے ہوتا ہے کہ ''ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین'' (سورہ البقرہ ۲) یہ کتاب شک و شبہ سے بالاتر ہے اور متقین کے لیے ''ہدایت'' ہے۔ یعنی اس کا اصل موضوع ہدایت ہے، یہ نسل انسانی کی راہنمائی کے لیے آئی ہے کہ اسے دنیا میں کس طرح رہنا ہے اور انسانوں کو اس دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے۔ قرآن کریم کا اصل موضوع ''ھدی'' ہے۔ یہ ھدی للناس بھی ہے اور ھدی للمتقین بھی ہے۔ اپنے خطاب کے حوالہ سے یہ ھدی للناس ہے مگر نفع کے اعتبار سے ھدی للمتقین ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھ لیا جائے کہ کسی گاؤں میں بجلی نہیں تھی، گاؤں والوں کی کوشش سے بجلی منظور ہو گئی اور گاؤں سے باہر اس مقصد کے لیے ٹرانسفارمر لگا دیا گیا۔ اب یہ ٹرانسفارمر سارے گاؤں کے لیے ہے لیکن بلب اس کا روشن ہو گا جس کا کنکشن ہو گا۔ دو میل دور اگر کسی گھر کا کنکشن ہے تو اس کی ٹیوب بھی چلے گی اور اے سی بھی چلے گا، مگر ساتھ والے مکان کا کنکشن نہیں ہے تو اس کا زیرو کا بلب بھی روشن نہیں ہو گا۔ اسی طرح قرآن کریم بھی اپنے خطاب کے حوالہ ہے ھدی للناس ہے لیکن فائدہ اسی کو ہو گا جس کا ایمان کا کنکشن ہو گا۔

یہ ”ھدی“ کیا ہے؟ اس پر بھی غور کر لیجئے۔ اللہ تعالی نے جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارا تو دو باتیں اسی وقت فرما دی تھیں۔ (۱) ایک یہ کہ ”ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین“ (سورہ الاعراف ۲۴) تمہیں زمین میں رہنے کو جگہ اور زندگی کے اسباب ملیں گے لیکن یہ ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک مقررہ مدت کے لیے ہوں گے۔ یہ مقررہ مدت ایک فرد کے لیے چالیس پچاس ساٹھ سال کی وہ زندگی ہے جو وہ اس دنیا میں بسر کرتا ہے، اور نسل انسانی کے لیے وہ چند ہزار سال کا وقت ہے جو اس کے لیے اس دنیا میں مقرر ہے۔ (۲) جبکہ دوسری بات اللہ رب العزت نے یہ واضح طور پر فرما دی تھی کہ ”اما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون“ (سورہ البقرہ ۳۸) جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آئیں گی تو جس نے میری ہدایات کے مطابق دنیا کی زندگی بسر کی وہ خوف و حزن سے نجات پائے گا یعنی جنت میں واپس آئے گا، اور جس نے میری ہدایات کو جھٹلا دیا اسے دوزخ میں جانا ہوگا۔ گویا اللہ تعالی نے فرمایا کہ دنیا کی محدود زندگی تم اپنی مرضی کے مطابق گزارنے میں آزاد نہیں ہو بلکہ میری ہدایات کے پابند ہو جو میری طرف سے تمہارے پاس آتی رہیں گی۔ قرآن کریم اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ میں وہ ”ھدی“ ہوں جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے تم سب پابند ہو۔ یعنی قرآن کریم نسل انسانی کے تمام طبقات اور تمام افراد کو یہ بتانے آیا ہے کہ تم نے اس دنیا میں کیسے رہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ یہ سیاستدانوں کی بھی راہنمائی کرتا ہے، حکمرانوں کی بھی، سائنس دانوں کی بھی، ڈاکٹروں کی بھی، انجینئروں کی بھی، جغرافیہ دانوں کی بھی، اور فلسفیوں اور منطقیوں کی بھی راہنمائی کرتا ہے۔

اس لیے قرآن کریم کا اصل موضوع اور مقصد یہ ہے کہ ہم اسے ہدایت اور راہنمائی کے لیے پڑھیں اور اس کی ہدایات کی روشنی میں اپنی زندگی کے معاملات طے کریں۔ اللہ تعالی معاف فرمائے ہمارا معاملہ قرآن کریم کے ساتھ کچھ اس طرح کا ہے کہ جیسے کسی کے ہاں کوئی بہت ہی معزز مہمان آجائے وہ اسے پورا پروٹوکول دے، اس کی خدمت کرے اور اس کی آمد سے جتنے فوائد حاصل ہو سکتے ہوں وہ بھی حاصل کرے، لیکن اس سے اس کی آمد کا مقصد نہ

پوچھے کہ آپ کس مقصد کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ یہ طرز عمل خود غرضی کہلاتا ہے اور ہمارا قرآن کریم کے ساتھ خدانخواستہ یہی خود غرضی والا معاملہ چل رہا ہے۔ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، اس سے محبت و عقیدت بھی ہمارے دلوں میں ہے، اس کا ادب و احترام بھی کرتے ہیں، اس سے سارے فائدے بھی حاصل کرتے ہیں، مگر اس سے یہ نہیں دریافت کرتے کہ اس کی آمد کا مقصد کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟

قرآن کریم کے ساتھ ہماری عقیدت اور اس کا ادب و احترام ہمارا قیمتی اثاثہ ہے، اور میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم آج کے مسلمانوں نے اپنا بہت کچھ گنوا دیا ہے مگر قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے ساتھ تعلق اور محبت و عقیدت بحمد اللہ تعالیٰ آج بھی قائم ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں کوئی بھی مسلمان نہ قرآن کریم کی بے حرمتی برداشت کرتا ہے اور نہ ہی جناب نبی اکرمؐ کی شان اقدس میں گستاخی اس کے لیے قابل برداشت ہوتی ہے۔ اسے غصہ آتا ہے اور وہ غیرت و جذبات کا بے ساختہ اظہار کرتا ہے، جو آج کی دنیا کے لیے تعجب و حیرت کا باعث ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلمان بڑی جذباتی قوم ہے اور غصہ والی قوم ہے۔ مگر قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے ساتھ یہ جذباتی محبت ہی ہمارا اصل اثاثہ ہے اور سرمایہ حیات ہے۔ البتہ ہمیں صرف اس پر قناعت کرنے کی بجائے قرآن کریم اور سنت نبویؐ کو اپنی زندگی کا راہنما بنانا چاہیے کہ قرآن و سنت کا اصل مقصد یہی ہے اور اسی راستے پر چل کر ہم دنیا و آخرت میں نجات اور سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین ثم آمین۔

قرآن کریم کے احکام اور شہزادہ چارلس

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جولائی ۲۰۱۰ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ۸ جون ۲۰۱۰ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق نیویارک میں ماحولیات کے حوالہ سے حال ہی منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے کہا ہے کہ دنیا کو ماحولیاتی تباہی سے بچانے کے لیے قرآنی احکام و قوانین پر عمل ضروری ہے انہوں نے اس موقع پر کہا ہے کہ اگر ہم دنیا کو ماحولیات کے حوالہ سے کسی بڑی تباہی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے

لیے قرآن کریم کے قوانین پر عمل کرنا ہوگا اور اس مقدس کتاب کے احکام کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

یہ قرآن کریم کے اعجاز کا ایک نمایاں پہلو ہے کہ اس کی صداقت اور اس کے قوانین کی افادیت کا اعتراف ہر دور کے انصاف پسند دانشوروں نے کیا ہے اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم نے دنیا بھر کو اس کی کسی ایک سورت جیسی سورت پیش کرنے کا جو چیلنج دے رکھا ہے اور جسے قبول کرنے سے دنیا آج تک عاجز ہے اس کا تعلق صرف فصاحت و بلاغت سے نہیں ہے، بلکہ اس کے قوانین و احکام کی ہر دور میں تاثیر و افادیت بھی قرآن کریم کے اعجاز کا حصہ ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے بقول ان کے بعد آنے والا دور قرآن کریم کے اسی اعجاز کے اظہار کا دور ہے۔

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جوں جوں دنیا کے خودساختہ نظام انسانی سوسائٹی کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں، اسلامی شریعت اور قرآنی احکام کی افادیت و ضرورت بھی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے اور مختلف حوالوں سے اس کا وقتاً فوقتاً اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کے عالمی حالات اور ضروریات کے تناظر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کی روشنی میں قرآن و سنت کے احکام و قوانین کا بھرپور اور مربوط مطالعہ کیا جائے اور انہیں آج کی زبان و اسلوب میں دنیا کے سامنے لانے کا اہتمام کیا جائے۔ خدا کرے کہ ہمارے علمی ادارے اس کی ضرورت کا احساس کریں اور اس کی تکمیل کے لیے کوئی مناسب منصوبہ بندی کر سکیں، آمین یا رب العالمین۔

قرآن کریم اور دستور پاکستان

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جون ۲۰۱۰ء)

اسلامی جمہوریہ پاکستان کی عدالت عظمی میں اس وقت حکومت اور حکمرانوں کے حوالے سے بہت سے مقدمات زیر سماعت ہیں اور اس سلسلہ میں عدالت میں پیشی سے صدر اور وزیر اعظم کی استثنا پر ملک بھر میں بحث و تمحیص جاری ہے۔ ایک جانب سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اسلامی روایات و تعلیمات کے مطابق حاکم وقت بھی اسی طرح عدالت کے سامنے پیش ہونے کا پابند ہے جس طرح رعیت کے دوسرے لوگ پابند ہیں، جیسا کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمے میں عدالت کے سامنے پیش ہو کر اس کا اظہار

کیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف سے اس بات پر دلائل دیے جا رہے ہیں کہ حاکم اعلیٰ کی عدالت میں پیشی سے استثنا ضروری اور مستحسن ہے۔ اس پس منظر میں وفاقی وزیر اطلاعات محترمہ فوزیہ وہاب نے یہ کہا ہے کہ حضرت عمرؓ عدالت میں اس لیے پیش ہو گئے تھے کہ اس وقت صرف قرآن تھا اور کوئی دستور موجود نہیں تھا۔ اب چونکہ دستور موجود ہے اس لیے صدر اور وزیر اعظم عدالت میں پیش ہونے سے مستثنیٰ ہیں۔ اس پر اخبارات میں ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا ہے جس میں دن بدن تیزی کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں۔

ہم اس وقت اس مسئلہ کے صرف ایک پہلو کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری خیال کر رہے ہیں کہ کیا قرآن کریم خود کسی اسلامی ریاست کے لیے دستور کی حیثیت نہیں رکھتا اور کیا قرآن کریم کو ریاست و مملکت کے تمام معاملات میں بالادستی حاصل نہیں ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی امت کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ ”اپنے حکمران کی اطاعت کرو خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، جب تک وہ تمھارے معاملات کو قرآن کریم کے مطابق چلاتا رہے“ (مایقودکم بکتاب اللہ) تو یہ قرآن کریم کی اسی حیثیت کا اعلان تھا کہ وہ اسلامی ریاست کا دستور ہے اور ریاست و حکومت کے تمام معاملات کا اسی دستور کے دائرے میں رہنا ضروری ہے۔

1. جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبے (پالیسی خطاب) میں فرمایا تھا کہ میں تم سے کتاب و سنت کے مطابق چلنے کا وعدہ کرتا ہوں، جب تک میں کتاب و سنت کے مطابق حکمرانی کروں، تم پر میری اطاعت واجب ہے، اور اگر میں قرآن و سنت کی اطاعت سے ہٹ جاؤں تو تم پر میری ضروری نہیں ہے۔ خلیفہ اول نے یہ بھی فرمایا کہ اگر میں قرآن و سنت کے مطابق چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر اس سے ٹیڑھا ہونے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ اعلان قرآن و سنت کی دستوری حیثیت کا اعلان تھا اور خلافت راشدہ کا آغاز قرآن و سنت کو اپنا دستور اور بالاتر قانون تسلیم کرنے کے ساتھ ہوا تھا۔

2. خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنے پہلے خطبے میں یہی اعلان کیا تھا اور اس میں یہ اضافہ فرمایا تھا کہ میں قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ اپنے پیش رو خلیفہ کی روایات بھی قائم رکھوں گا۔

3. جبکہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کی خلافت کا فیصلہ کرتے وقت اس کی مجاز اتھارٹی حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے امیر المومنین کی حیثیت سے حضرت عثمان بن عفانؓ کی بیعت ہی اس شرط پر کی تھی کہ ''ابایعک علی سنۃ اللہ و رسولہ و الخلیفتین من بعدہ'' (بخاری، کتاب الاحکام) یعنی میں آپ کی بیعت اس شرط پر کرتا ہوں کہ آپ کتاب و سنت کی پیروی کریں گے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دو خلفاء حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی روایات کی پاسداری کریں گے۔

4. ان کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی اپنی حکومت کی بنیاد اسی اصول کو قرار دیا تھا۔

جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن و سنت اور خلفائے راشدین کے فیصلوں کو اسلامی ریاست میں صرف راہنما اصول یا Source of Law (ماخذ قانون) کا درجہ حاصل نہیں ہے بلکہ یہ خود قانون اور دستور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور قرآن و سنت کی اسی اصولی حیثیت سے انکار آج کے دستور سازوں اور قانون سازوں کے ہاتھ میں قرآن و سنت سے انحراف کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

ہمارے ہاں قیام پاکستان کے بعد سے ہی یہ بحث جاری ہے کہ قرآن و سنت خود قانون ہیں یا انہیں صرف ''سورس آف لا'' کی حیثیت حاصل ہے؟ اور محترمہ فوزیہ وہاب کے اس بیان کے پس منظر میں بھی ہمیں اسی تردد اور ابہام کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ لیکن جب ہم بانی پاکستان قائد اعظم جناب محمد علی جناح مرحوم کے ان بیانات و اعلانات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو انہوں نے قیام پاکستان کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمائے تھے تو ان میں ہمیں اس قسم کا کوئی ابہام نظر نہیں آتا۔ چنانچہ انہوں نے اگست ۱۹۴۴ء میں کانگرسی راہنما جناب گاندھی کو جو تفصیلی خط تحریر کیا، اس میں کہا کہ:

> ''قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی غرضیکہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ وہ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ امور حیات تک، روح کی نجات سے جسم کی

صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق و فرائض تک، اخلاق سے لے کر انسداد جرم تک، زندگی میں سزا و جزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا و سزا تک ہر ایک فعل، قول، حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔"

جبکہ اس سے قبل ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم یہ فرما چکے تھے:

"مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرز حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان کا طرز حکومت متعیّن کرنے والا میں کون؟ یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کا طرز حکومت آج سے تیرہ سو قبل قرآن حکیم نے فیصل کر دیا تھا۔"

قائداعظم کے بیان کردہ دونوں نکتوں پر غور کر لیجیے:

1. مسلمانوں کا طرز حکومت تیرہ سو قبل قرآن کریم نے طے کر دیا تھا۔
2. پاکستان کا طرز حکومت طے کرنا پاکستان میں رہنے والوں کا کام ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ دستوری حیثیت قائداعظم کے ذہن میں بے غبار اور واضح تھی اور پاکستان کے رہنے والوں نے بھی طویل دستوری جدوجہد کے بعد ۱۹۷۳ء کے دستور کی صورت میں یہ بات طے کر دی تھی کہ قرآن و سنت کو ملک میں بالاتر حیثیت حاصل ہوگی اور دستور و قانون دونوں کو ان کے دائرے میں رہنا ہوگا۔ اس لیے محترمہ فوزیہ وہاب اور ان کے ہمنواؤں سے ہماری گزارش ہے کہ وقتی اور گروہی سیاسی مفادات کے لیے قرآن و سنت کی بالاتر اور دستوری حیثیت کو زیر بحث لانے سے گریز کریں۔ قرآن و سنت کو خلافت راشدہ میں بالاتر درجہ حاصل تھا اور پاکستان کا دستور بھی انہیں بالاتر تسلیم کرتا ہے، اس لیے قرآن و سنت کی اس اصولی حیثیت کے بارے میں تردد اور ابہام پیدا کرنے کی کوئی بھی کوشش اسلامی تعلیمات اور دستور پاکستان، دونوں سے انحراف کے مترادف تصور ہوگی۔

عامر عبد الرحمان شہیدؒ کی یاد میں ایک کانفرنس

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۳۰ مئی ۲۰۱۰ء)

۲۷ مئی جمعرات کو چند گھنٹے فیصل آباد کی نیشنل ٹیکسٹائل یونیورسٹی میں گزارنے کا موقع ملا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و ناموس پر جان کا نذرانہ پیش کرنے والے

قوم کے قابل فخر سپوت عامر عبدالرحمان شہیدؒ کی یاد میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ عامر چیمہ شہید نے اسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ٹیکسٹائل انجینئرنگ میں ڈگری کے حصول کے بعد مزید تعلیم کے لیے جرمنی میں مقیم تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخانہ خاکوں کی صورت میں سامنے آنے والی توہین و بے حرمتی پر بے چین ہو گیا اور حرمت رسولؐ پر جان کی قربانی کی سعادت پا گیا۔

نیشنل ٹیکسٹائل یونیورسٹی کی لٹریری سوسائٹی نے ''عامر چیمہ شہید کانفرنس'' کے عنوان سے اس تقریب کا اہتمام کیا۔ عامر شہیدؒ کے والد محترم پروفیسر محمد نذیر چیمہ اور ان کی اہلیہ محترمہ کانفرنس میں مہمان خصوصی تھے اور راقم الحروف کو مہمان مقرر کے طور پر اظہار خیال کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں پروفیسر نذیر احمد چیمہ صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ہی گوجرانوالہ سے فیصل آباد پہنچا تھا۔ یونیورسٹی میں جتنی دیر رہے، عامر چیمہ شہیدؒ کا تذکرہ رہا، اس کے متعدّد اساتذہ سے گفتگو ہوئی۔ اس کے ساتھی طلبہ نے اپنے شہید ساتھی کے دلچسپ واقعات و حالات سے آگاہ کیا۔ بالخصوص شہیدؒ کے بے تکلف دوست اور ساتھی ہارون نے اپنے ساتھی کی زندگی کے کئی دلچسپ گوشوں سے پردہ اٹھایا جن میں سے ایک کا تذکرہ اس موقع پر کرنا چاہوں گا۔

ہارون نے بتایا کہ جب وہ دونوں تعلیم کے آخری سال میں تھے تو ٹیکسٹائل کالج میں داخلہ اور تعلیم کی فیسوں میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا جس پر احتجاج کے لیے انہوں نے ''کالج بچاؤ تحریک'' کا آغاز کیا۔ اور طلبہ کی تحریکیں جیسی ہوتی ہیں، اسی رخ پر یہ تحریک آگے بڑھی۔ اس موقع پر عامر شہیدؒ کے والد محترم پروفیسر نذیر چیمہ نے بتایا کہ انہوں نے عامر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ تم آخری سال میں ہو اور فیسیں فرسٹ ایئر کی بڑھی ہیں، تمہیں اس قدر تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ عامر شہیدؒ نے جواب دیا کہ فرسٹ ایئر والے تو احتجاج کی پوزیشن میں نہیں ہیں، انہیں معلوم ہی نہیں کہ کرنا کیا ہے، اس لیے یہ ذمہ داری ہم سینئرز کی ہے کہ ہم ان کے لیے جدوجہد کریں اور انہیں زیادتی سے بچانے کی کوشش کریں۔ ہارون نے بتایا کہ جب اس سلسلہ میں ہم گفتگو کے لیے متعلقہ محکمہ کے سیکرٹری کے پاس گئے تو ان سے بات چیت کرتے ہوئے عامر شہیدؒ نے کہا کہ سر! فیسیں جس طرح بڑھائی گئی ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ اپنی تنخواہ اور جائز مراعات کے دائرے میں اپنی اولاد

میں سے کسی کو ٹیکسٹائل کالج میں پڑھانا چاہیں تو کیا موجودہ فیسوں کے ساتھ آپ اپنے کسی بچے کو یہ تعلیم دلا سکتے ہیں؟ ہارون کا کہنا ہے کہ عامر شہیدؒ کی یہ بات سیکرٹری صاحب کو اپیل کر گئی اور وہ فیسوں میں کمی کرانے کی مہم میں کامیاب ہو گیا۔

عامر چیمہ مرحوم کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ کالج میں کسی بھی حوالہ سے اور کسی بھی طرف سے زیادتی کا شکار ہونے والے طلبہ کی پناہ گاہ تھا۔ اور جس طالب علم کو کوئی شکایت ہوتی وہ اس اعتماد کے ساتھ عامر چیمہ شہید کی طرف رجوع کرتا کہ اب اس کا کام ہو جائے گا اور اکثر ایسا ہو جایا کرتا تھا۔

عامر چیمہ شہیدؒ کی یاد میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں اس کے والد محترم، والدہ محترمہ اور اس کے دوست ہارون کے علاوہ لٹریری سوسائٹی کے سرپرست جناب اسحاق بھٹی، صدر اسماعیل عثمان اور شہیدؒ کے دیگر ساتھیوں نے بھی خطاب کیا اور اپنے شہید ساتھی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تحفظ ناموس رسالتؐ کے سلسل میں اس کے مشن کے ساتھ ہم آہنگی اور اسے جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔ راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں ان میں سے چند ایک کا خلاصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

مغرب کو یہ اعتراض ہے کہ مسلمان جذباتی قوم ہے، اس میں برداشت نہیں ہے، اختلاف سننے کا حوصلہ نہیں ہے اور قرآن کریم اور حضرت محمدؐ کے بارے میں ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہم قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے حوالہ سے جذباتی ہیں اور اسے ایمان وغیرت کی علامت سمجھتے ہیں۔ دنیا میں آج بھی کوئی مسلمان آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو جناب رسول اللہؐ کی توہین یا قرآن کریم کی بے حرمتی کو برداشت کر لے۔ اسے اس پر غصہ آئے گا اور وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ یہ قرآن کریم اور جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ مسلمانوں کی محبت اور تعلق کی علامت ہے جو بحمد اللہ تعالیٰ آج بھی قائم ہے اور اس کی قوت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ ہم اختلاف برداشت نہیں کرتے اور علمی تنقید پر بھی سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ تین صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ مغرب کی یونیورسٹیاں اور دانش گاہیں اسلام پر، قرآن کریم پر، جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر، اور اسلامی احکام وقوانین پر مسلسل اعتراضات کر رہی ہیں۔ بہت سے مستشرقین کا تو موضوع ہی یہی ہے، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مقالات اور کتابیں اب تک سامنے آچکی ہیں مگر کسی پر مسلمانوں نے برا نہیں منایا۔ دلیل کا

جواب دلیل سے دیا ہے، کتاب کا جواب کتاب کی صورت میں آیا ہے اور تحقیق واستدلال کا سامنا تحقیق و استدلال کے ساتھ کیا گیا ہے۔ لیکن ہم نے اختلاف اور استہزاء میں فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، تنقید اور توہین کے درمیان فاصلوں کو کراس کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دی اور نہ ہی آئندہ کسی کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار ہیں۔

سر ولیم میور نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پر کتاب لکھ کر اعتراضات کیے تو اس کا جواب سرسید احمد خان مرحوم نے کتاب کی صورت میں دیا، لیکن سلمان رشدی نے اسی طرز کی باتیں تمسخر اور توہین کے لہجے میں لکھیں تو وہ مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگئیں۔

نامور ہندو مذہبی رہنما پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں قرآن کریم پر اور آنحضرتؐ کی ذات گرامی پر سینکڑوں اعتراضات کیے تو ان کا جواب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پنڈت دیانند سرسوتی کے ساتھ روبرو مناظرہ کی صورت میں دیا۔ جبکہ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے اس کے جواب میں ''حق پرکاش'' کے نام سے کتاب لکھ کر اس کا قرض چکایا۔ لیکن جب راجپال نے ''رنگیلا رسول'' کے نام سے گستاخانہ کتاب لکھی تو اس کا جواب علماء کرام نے نہیں بلکہ غازی علم الدین شہیدؒ نے دیا۔

مغرب اور اس کے ہمنوا دانشوروں کو اس بات پر پریشانی ہوتی ہے کہ آزادیٔ رائے کے اس دور میں مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کو آخر جرم ہی کیوں سمجھتے ہیں؟ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا کون سا ملک ہے جس میں ''ازالۂ حیثیت عرفی'' کے حوالہ سے قانون موجود نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں ہر صاحب حیثیت شخص کو اپنی ''حیثیت عرفی'' کے تحفظ اور دفاع کا حق حاصل ہے۔ اور کسی ملک میں یہ صورتحال نہیں ہے کہ اپنی حیثیت عرفی کے مجروح ہونے پر کوئی شخص قانون کا دروازہ کھٹکھٹائے تو اسے یہ جواب ملے کہ تحمل سے کام لو، برداشت کرو، صبر کرو اور خواہ مخواہ غصے میں نہ آؤ قانون ہر جگہ اس کو دادرسی کی سہولت دیتا ہے اور ہتک عزت اور حیثیت عرفی کے مجروح ہونے کا نوٹس لیتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہم میں سے تو ہر شخص کی حیثیت عرفی ہے جس کے دفاع کا اسے حق حاصل ہے، لیکن کیا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کے معصوم پیغمبروں کی (نعوذ باللہ) کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے جس کے مجروح ہونے پر قانون کو حرکت میں لانا ضروری ہو؟ جناب رسول اکرمؐ کی ''حیثیت عرفی'' کے

بارے میں مائیکل ہارٹ سے پوچھ لیجئے جو آج بھی دنیا کے سو بڑے آدمیوں کی فہرست بناتے ہوئے حضرت محمدؐ کو پہلا نمبر دینے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

عورت کی ملازمت۔ فطرت کے اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۳ مئی ۲۰۱۰ء)

بھارتی اخبارات میں ان دنوں عورت کے حوالے سے تین موضوعات پر بطور خاص بات ہو رہی ہے اور مختلف اطراف سے ان پر اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہے۔

اسقاط حمل کا رجحان

ایک عنوان یہ ہے کہ الٹراساؤنڈ کے ذریعے یہ معلوم ہونے پر کہ پیدا ہونے والا بچہ صنف نازک سے تعلق رکھتا ہے ہزاروں حمل گرا دیے جاتے ہیں، اور اسقاط حمل کے تناسب میں مسلسل اضافے نے سنجیدہ حضرات کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ گزشتہ دنوں دہلی کے ایک اخبار میں اس سلسلے میں ایک سیمینار کی رپورٹ نظر سے گزری جس میں کہا گیا ہے کہ بچی کی پیدائش کو عام طور پر معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے الٹراساؤنڈ کے ذریعے معلوم کر کے اگر حمل بچی کا ہو تو اسے گرا دیا جاتا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں معصوم بچیاں اس ظلم کا شکار ہوتی ہیں۔

اسلام سے پہلے عرب کے جاہلی معاشرے میں بھی یہ رواج عام تھا جس کا قرآن کریم میں ذکر موجود ہے۔ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق اس وقت لڑکیوں کو ولادت کے بعد زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اور ہزاروں لڑکیاں اس ظلم کا شکار ہوتی تھیں جس کی دو وجہیں قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ لڑکی کی پیدائش کو باعث عار سمجھا جاتا تھا، اور دوسری وجہ یہ کہ انہیں خاندان پر معاشی بوجھ تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کی مکمل ممانعت کی اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ اس مکروہ رواج کو ختم کیا۔ مگر آج کے جدید معاشرے میں بچے کو ولادت کے بعد زندہ دفن کرنے کی جگہ ولادت سے قبل اسقاط حمل نے لے لی ہے۔ اور نہ صرف بھارت میں بلکہ مغربی دنیا میں بھی اس کا چلن عام ہے،

بلکہ اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں کے ذریعے دنیا بھر کے ملکوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے ہاں اسقاط حمل کو قانونی جواز فراہم کریں۔

مغرب میں اسقاط حمل کی کثرت کی وجہ سے یہ ہے کہ وہاں زنا عام ہے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کی کفالت سے بچنے کے لیے اسقاط حمل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ گویا یہ قرآن کریم کی زبان میں "خشیۃ املاق" یعنی معاشی بوجھ کی ایک صورت ہے جس کی وجہ سے ہزاروں بلکہ لاکھوں بچے ماں کی کوکھ سے پیدا ہونے سے پہلے ہی موت کی نیند سلا دیے جاتے ہیں اور اس میں لڑکی یا لڑکے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ جبکہ بھارت میں صرف بچیوں کے حمل گرائے جاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ بچیوں کی ولادت کو عار یا معاشی بوجھ سمجھا جاتا ہے۔

شادی کے بغیر جنسی تعلق

دوسری بحث بھارتی سپریم کورٹ کے تین جج صاحبان کے ان ریمارکس کے حوالے سے ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ شادی سے قبل لڑکے اور لڑکی کے درمیان جنسی تعلقات میں کوئی حرج نہیں، اور اگر جوڑا شادی کے بندھن کے بغیر جنسی تعلقات کے ساتھ اکٹھا رہنا چاہتا ہے تو اس میں کوئی گناہ یا حرج کی بات نہیں ہے۔

یہ بات بھی عرب جاہلیت کی ان اقدار میں سے ہے جنہیں جناب رسول اللہؐ نے ختم کیا تھا اور باقاعدہ نکاح کے سوا جنسی تعلقات کی باقی تمام صورتوں کو ناجائز قرار دے دیا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق اسلام سے قبل عرب معاشرے میں رضامندی کا زنا جرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی مرد اور عورت باہمی رضامندی سے اس عمل کا ارتکاب کرتے تھے تو سوسائٹی کی طرف سے انہیں تحفظ فراہم کیا جاتا تھا اور بچہ پیدا ہونے کی صورت میں ان کا نسب بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس جاہلی روایت کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا اور قرار دیا کہ زنا ایک قبیح جرم ہے جس کا مرتکب سنگین سزا کا مستحق ہے اور آئندہ زنا کے عمل سے نسب کا ثبوت قانونی جواز کا درجہ حاصل نہیں کر سکے گا۔

عورت کی ملازمت اور کاروبار

تیسری بحث دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب ایک فتوے کے حوالے سے بھارتی اخبارات میں زوروں پر ہے جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی

صاحبان نے فتویٰ صادر کیا ہے کہ عورت ملازمت یا کاروبار نہیں کر سکتی اور اس کی کمائی ہوئی رقم حرام ہے۔ ہم نے جب اس فتوے کی بات سنی تو ذہن نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ تجارت کیا کرتی تھیں اور جناب رسول اکرمؐ کی ازواج مطہرات میں حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت زینبؓ اپنے گھر میں کام کرتی تھیں اور مختلف چیزیں تیار کر کے بازار میں فروخت کیا کرتی تھیں۔ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی ازواج مطہرات بھی تجارت اور حرفت کے کام کرتی تھیں اور کمائی کیا کرتی تھیں۔ اس لیے یہ بات تو کوئی عام سا مولوی بھی نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ دارالعلوم دیوبند جیسے ذمہ دار ادارے کے مفتی صاحبان یہ فتویٰ دیں۔

آج ایک ای میل کے ذریعے بھارت کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا عتیق الرحمان سنبھلی کا ایک وضاحتی بیان موصول ہوا تو معلوم ہوا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ یہ بیان قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بات کا بتنگڑ کیسے بنایا جاتا ہے۔

"جماعت دیوبند کے بزرگ عالم اور معروف دانشور و مصنف مولانا عتیق الرحمان سنبھلی (مقیم لندن) نے دارالعلوم دیوبند کے فتوؤں کے خلاف میڈیا کی حالیہ مہم کو نہایت غیر ذمہ دارانہ بلکہ معاندانہ قرار دیا ہے۔ مولانا نے اپنے ایک اخباری بیان میں جو آج دہلی سے جاری کیا گیا، کہا کہ دارالعلوم صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک اہم دینی و علمی مرکز ہے۔ میڈیا کے کچھ حلقے اور مسلم دشمن گروہ اس کو مستقل ایک بدنام کن مہم کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ مولانا نے دارالعلوم کے دفتر اہتمام سے فرمائش کر کے متعلقہ فتوؤں کی کاپی منگوا کر خود دیکھی اور صاف محسوس کیا کہ میڈیا نے توڑ موڑ کر بات کو پیش کیا ہے۔

مولانا کا کہنا ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے بعض اخبارات اور ٹی وی چینلز نے بالکل جھوٹ یہ بات نشر کی کہ دارالعلوم کی طرف سے عورت کی کمائی کو حرام کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس دارالعلوم کے فتوؤں میں صراحت ہے کہ "کمائی پر حرام ہونے کا حکم نہیں"۔ بعض فتوؤں میں یہ بھی صراحت ہے کہ "عورت کے لیے کمانا ممنوع نہیں"۔ ہاں بجا طور پر شرعی لباس اور حیا کے تقاضوں کی پابندی کی شرط ہے۔

مولانا کا کہنا تھا کہ چونکہ اس زمانے میں دفتروں اور بازاروں کا ماحول نہایت بے

حیائی کا ہے اور مغربی تہذیب و تعلیم نے ذہن ناپاک بنا دیے ہیں، دفتروں میں صنف نازک کے ساتھ زیادتیوں کے جس طرح کے واقعات عام ہیں اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے دارالعلوم کے فتوؤں میں خواتین کو بلاضرورت سروس کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ نہایت معقول بات ہے۔ مولانا نے بڑا افسوس ظاہر کیا کہ بعض مسلمان بھی حقیقت جانے بغیر میڈیا کے خلاف حقیقت پروپیگنڈا سے متاثر ہو جاتے ہیں اور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند ہمارے عقیدے و تہذیب کی آخری دفاعی لائن ہے۔ مولانا نے مزید کہا کہ نہایت حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ ہمارے بعض اردو کے اخبارات بھی بسا اوقات اس مہم کا حصہ بن جاتے ہیں حالانکہ ان سے توبجا طور پر یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ دارالعلوم سے رابطہ کر کے اصل حقیقت جان لیں اور فتوؤں کو ان کے صحیح تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کریں۔

مولانا نے پوری دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ یہ وقت دارالعلوم کی تائید و حمایت اور مغربی تہذیب کے مقابلے میں اس کے راہنما کردار کو تقویت پہنچانے کا ہے، نہ کہ اسلام دشمن طاقتوں کے سامنے سپر اندازی کرنے کا۔"

اسلام نے عورت اور مرد کے میل جول کی حدود متعیّن کی ہیں اور پردے و حجاب کے ضابطے نافذ کیے ہیں جن کی پابندی بہر حال ضروری ہے۔ ان حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے عورت ملازمت بھی کر سکتی ہے، کاروبار بھی کر سکتی ہے اور جائز کمائی کے دیگر ذرائع بھی اختیار کر سکتی ہے جس کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی طبقہ ملازمت اور کاروبار وغیرہ کے جواز کے نام پر مرد اور عورت کے درمیان اس فطری فرق کی نفی کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد پر اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لیے قوانین میں فرق رکھا ہے تو فطرت سلیمہ کے طے کردہ اس فرق کو ختم کرنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی عملاً اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ مئی ۲۰۱۰ء)

گزشتہ ماہ کے دوران ملک کے معروف مذہبی دانشور محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا رات انتقال ہو گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی وفات سے پاکستان میں نفاذ شریعت کی جدوجہد، جس کا میں خود بھی ایک کارکن ہوں، ایک باشعور اور حوصلہ مند رہنما سے محروم ہو گئی۔ میری ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس جدوجہد کے حوالے سے طویل رفاقت رہی ہے اور بہت سی تحریکات میں اکٹھے کام کرنے کا موقع ملا۔

انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز جمعیت طلبہ سے کیا اور پھر جماعت اسلامی کے قافلے کا حصہ بنے، مگر مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کے بعض افکار اور طریق کار سے اختلاف کے باعث الگ ہو گئے۔ جماعت اسلامی سے اپنا راستہ الگ کیا لیکن نفاذ اسلام کی جدوجہد سے دستبرداری اختیار نہیں کی اور آخر وقت تک مصروف عمل رہے۔ اس بڑھاپے میں نفاذ شریعت کے لیے ان کی تڑپ اور محنت قابل رشک تھی جسے دیکھ کر جوانوں کو بھی حوصلہ ملتا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے برطانوی استعمار کے خلاف آزادئ وطن کی جدوجہد میں مالٹا جزیرے میں ساڑھے تین سال کی قید و بند کے بعد واپسی پر اپنی جدوجہد کا جو راستہ اختیار کیا تھا، وہی اس محنت کا صحیح راستہ ہے، اور وہ خود کو شیخ الہندؒ کی اس تحریک کا تسلسل قرار دیتے ہوئے آخر عمر تک اس پر گامزن رہے۔

مالٹا جزیرے میں ساڑھے تین سال گزارنے کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ واپس ہندوستان پہنچے تو انہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف مسلح جدوجہد کا راستہ ترک کر کے پرامن جدوجہد کا راستہ اختیار کیا اور اپنے پیروکاروں کو تلقین کی کہ وہ اب ہتھیار اٹھانے کی بجائے آزادئ وطن کے لیے سیاسی جدوجہد کریں اور پرامن عوامی جدوجہد کے ذریعے آزادی کی منزل کی طرف پیشرفت کریں۔ اس موقع پر شیخ الہندؒ نے، جو نہ صرف اس وقت دیوبندی فکر اور تحریک کے سب سے بڑے قائد تھے بلکہ اب بھی انہیں دیوبندی مسلک کے تمام داخلی مکاتب فکر میں متفقہ قائد کی حیثیت حاصل ہے، آئندہ جدوجہد کے لیے تین نکات کا ایجنڈا پیش کیا:

- مسلمان باہمی اختلافات سے گریز کرتے ہوئے متحدہ کردار ادا کریں۔

•قرآن کریم کی تعلیمات کے فروغ اور عام مسلمان کو قرآن کریم سے شعوری طور پر وابستہ کرنے کے لیے ہر سطح پر دروس قرآن کا اہتمام کیا جائے۔

•مسلمان اپنے شرعی معاملات طے کرنے کے لیے امارت شرعیہ کا قیام عمل میں لائیں اور ایک باقاعدہ امیر منتخب کر کے اس کی اطاعت میں کام کریں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا موقف تھا کہ وہ شیخ الہندؒ کے اسی تین نکاتی پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ جبکہ ان کے بقول شیخ الہندؒ کے تلامذہ اور ان کے حلقے کے لوگ اس ایجنڈے پر قائم نہیں رہ سکے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے اس موقف سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ وہ خود اسی ایجنڈے پر کام کرتے رہے اور انہوں نے اس مقصد کے لیے ملک بھر میں احباب اور رفقاء کا ایک پورا حلقہ تیار کیا تھا جو اب "تنظیم اسلامی" کے نام سے ڈاکٹر صاحبؒ کے فرزند جناب حافظ محمد عاکف سعید کی امارت میں متحرک اور سرگرم عمل ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے قرآن فہمی کے ذوق کو فروغ دیا اور ہر سطح پر اس کے حلقے قائم کیے۔ انہوں نے قرآن کالج کے ذریعے ہزاروں نوجوانوں کا قرآن کریم کے ساتھ فہم و شعور کا تعلق قائم کرایا۔ لاہور میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ذوق اور رہنمائی کے مطابق قرآن کریم کے دروس کے آغاز کا اعزاز شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور ان کے تلامذہ کو حاصل ہے، مگر ان کے حلقہ سے باہر اس ذوق کو بڑھانے میں اگر میری اس بات کو مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے تو ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی جدوجہد سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔

وہ نفاذ شریعت کی ہر جدوجہد اور تحریک کا حصہ رہے اور انہوں نے اسلامی تحریکات میں ہمیشہ ہراول دستہ کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے نفاذ اسلام کے لیے مسلسل جدوجہد ہی نہیں کی بلکہ اسلامی نظام کی اصل اصطلاح "خلافت" کو زندہ رکھنے اور نئی نسل کو خلافت کی اصطلاح سے مانوس کرنے کے لیے بھی اہم کردار ادا کیا۔ وہ ایک امیر کی بیعت اور اس کی اطاعت میں کام کرنے کی ترغیب دیتے رہے اور ان کا زندگی بھر اصرار رہا کہ ایک امیر اور اس کے ساتھ سمع و طاعت کا تعلق دینی تقاضوں میں سے ہے۔ وہ خلافت، امام مہدی کے ظہور اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے حوالہ سے بعض تعبیرات میں تفرد بھی رکھتے تھے جس سے بہت سے علمائے کرام کو اتفاق نہیں تھا۔ خود راقم الحروف نے بھی ان متعدّد ملاقاتوں میں ان کی بعض تعبیرات پر تحفظات کا اظہار کیا، لیکن ان کا خلوص اور اپنے مشن کے ساتھ ان

کی بے لچک اور جذباتی وابستگی ہمیشہ قابل احترام اور قابل رشک رہی۔ وہ میرے بزرگ دوست تھے، تحریک نفاذ اسلام کے فکری رہنما تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ایک ایسے عقیدت مند تھے جو آج کے دور میں بھی شیخ الہندؒ کا نام لینے اور انہیں رہنما قرار دینے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دینِ اسلام۔خالق و مخلوق کے حقوق میں توازن

(پاکستان ایئرفورس بیس، لاہور- ۲۳ فروری ۲۰۱۰ء)

(ماہ ربیع الاول کی مناسبت سے پاکستان ایئرفورس بیس لاہور کے تربیتی کیمپ کی مسجد میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت بیس کے کمانڈر جناب محمد افضل عباسی نے کی۔ اس تقریب سے مولانا راشدی کا خطاب پیش کیا جارہا ہے۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حیات مبارکہ کے سینکڑوں پہلو ایسے ہیں جن پر گفتگو کا ذہن میں تقاضا ہوتا ہے، بسا اوقات اس موضوع پر بات کرتے ہوئے اس بحر ناپیدا کنار کے کسی ایک رخ کا تعین مشکل ہوجاتا ہے لیکن آج میں اس پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ بحیثیت نبی اور رسول، تاریخ کے ریکارڈ میں جناب نبی اکرمؐ کا پہلا تعارف کیا تھا؟

جناب رسول اکرمؐ مکہ مکرمہ کے ماحول میں اپنی زندگی کے ۴۰ برس گزار چکے تھے اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے کفر و شرک سے پریشان ہوکر حالات کی اصلاح کے امکانات اور طریقوں پر غور و خوض فرماتے رہتے تھے۔ غار حرا میں کئی کئی روز تک خلوت گزین رہتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ساتھ قوم اور انسانیت کی حالت زار پر غور کرتے تھے۔ اس ماحول میں غار حرا کی خلوت گزینی کے دوران حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آنحضرتؐ کو وحی الٰہی کا سب سے پہلا پیغام پہنچایا جو قرآن کریم کی ابتدائی پانچ آیتوں پر مشتمل تھا۔ اس میں یہ حکم دیا گیا کہ:

"اپنے رب کے نام پر پڑھیے جس نے انسان کو پیدا کیا اور قلم کے ذریعے تعلیم دی۔"

میں ان آیات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ان میں تین اہم باتوں کا حوالہ دیا گیا ہے: قراءت، تعلیم اور قلم۔ اور تینوں باتیں اس ماحول میں کہی گئی ہیں جو قلم سے متعارف نہیں تھا اور جسے امیوں کا معاشرہ کہا جاتا تھا۔ اس لیے امت مسلمہ کی حیثیت سے ہمارا پہلا سبق قراءت، علم اور قلم کے حوالے سے ہے۔ اگر اس کے ساتھ جناب رسول اکرمؐ کے اس ارشاد کو بھی شامل کر لیں کہ:

"میں معلم اور استاد بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

تو بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی الٰہی کے نزول کے بعد پہلا تعارف ہے جو ہمیں تاریخ کے ریکارڈ میں ملتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا تعارف ہمارے سامنے تاریخ یہ پیش کرتی ہے کہ جب غار حرا کے اس اچانک واقعہ پر آنحضرتؐ پر کچھ گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہوئی اور اسی گھبراہٹ میں آپؐ گھر تشریف لائے تو ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کو تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں ہونے دے گا، اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بیواؤں اور یتیموں کا سہارا بنتے ہیں، محتاج لوگوں کو کما کر کھلاتے ہیں، مسافروں کی خدمت کرتے ہیں، اور ناگہانی آفتوں پر متاثرین کی امداد کرتے ہیں۔"

یہ جناب نبی اکرمؐ کا دوسرا تعارف ہے جو وحی کے نزول کے حوالے سے حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اور میں اس بات کو آگے بڑھانے سے پہلے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ اس دور کی بات ہے جب نسل انسانی اس حوالے سے افراط و تفریط کا شکار تھی:

1. ایک طرف رہبانیت تھی کہ بہت سے لوگ سوسائٹی سے لاتعلق ہو کر اور تمام رشتوں و تعلقات کو منقطع کر کے ویرانوں اور جنگلوں میں جا بیٹھتے تھے، اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے تھے، نفس کشی کی ریاضتیں کرتے تھے اور زندگی کے بہت سے معاملات کو ترک کر دیتے تھے۔

2. جبکہ دوسری طرف سوسائٹی کے لوگوں کی اکثریت ایسے افراد کی تھی جو خدا کو بالکل ہی بھلا چکے تھے۔ قرآن کریم نے انہی کو سامنے رکھ کر فرمایا تھا کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔

ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رضا کی خاطر سوسائٹی سے لاتعلق ہو جانے کا طرز عمل تھا اور دوسری طرف سوسائٹی کے معاملات میں پھنس کر خدا کو بھول جانے کا رویہ تھا۔ ان دونوں انتہاؤں کے ماحول میں جناب رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ کا یہ حصہ پوری نسل انسانی کے لیے سبق کی حیثیت رکھتا ہے کہ ایک ہی وقت میں غار حرا کی خلوت بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کے نادار افراد کی خدمت بھی۔ دونوں کام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور انسانوں کو خالق اور مخلوق کے ساتھ معاملات میں توازن قائم کرنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

جناب نبی اکرمؐ نے زندگی بھر خدا اور بندوں کے ساتھ تعلقات میں توازن قائم کرنے کا سبق دیا ہے۔ ایک طرح سے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ پیدا کرنے والے خدا اور اردگرد رہنے والے انسانوں کے ساتھ معاملات کو توازن میں رکھو اور دونوں کے حقوق کو اپنے اپنے وقت میں پورا کرنے کی کوشش کرو۔ حقوق کی بات دنیا بھی کرتی ہے اور اسلام بھی کرتا ہے۔ لیکن اسلام نے حقوق میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو شمار کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اردگرد رہنے والے انسانوں کے حقوق بھی تمہارے ذمے ہیں لیکن اس کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے پیدا کرنے والے، روزی دینے والے اور بے شمار نعمتوں سے نوازنے والے رب کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ ان حقوق کے درمیان توازن کا نام ہی اسلام ہے اور جناب رسول اکرمؐ نے نسل انسانی کو یہی سب سے بڑا پیغام دیا ہے۔

یہاں میں اس بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہوں گا کہ حضرت محمدؐ تاریخ انسانی کی پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے علاقائی، نسلی اور لسانی دائروں سے بالاتر ہو کر نسل انسانی سے خطاب کیا ہے اور اپنی دعوت کا آغاز ''ایھا الناس'' کے ساتھ کیا ہے۔ جناب نبی اکرمؐ کا پیغام اور تعلیم پوری نسل انسانی کے لیے ہے اور آپؐ گلوبل رسول اور نبی ہیں۔ اس حوالہ سے میں ایک روایت کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا جو ہم کم و بیش نکاح کی ہر تقریب میں پڑھے جانے والے خطبہ میں سنتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ:

> ''نکاح میری سنت ہے، جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔''

یہ جملہ تو ہم اکثر پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں لیکن اس کا پس منظر بھی سامنے آجائے تو لطف دوبالا ہو جائے گا، بلکہ نسل انسانی کے نام جناب نبی اکرمؐ کے بنیادی پیغام کے عنوان سے میں جو بات عرض کر رہا ہوں، وہ بھی زیادہ نکھر کر سامنے آجائے گی۔ مدینہ منورہ میں

نبی کریمؐ کے چند صحابہ کرامؓ نے باہمی مشورہ کیا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے دنیا کے تعلقات اور سوسائٹی کے معاملات میں کمی کرنی چاہیے، اس کے لیے انہوں نے آپس میں معاہدہ کیا۔ ایک نے کہا کہ میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں ساری زندگی رات کو سونے کی بجائے تمام رات عبادت کیا کروں گا، اور تیسرے نے کہا کہ میں ساری زندگی بلاناغہ روزہ رکھا کروں گا۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو طلب فرمالیا اور اس بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے واقعی ایسا کیا ہے۔ اس پر آپؐ نے ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ میں تم سب سے زیادہ خدا خوفی رکھتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ میرے دل میں ہے، اس کے باوجود میں نے شادیاں بھی کی ہیں، بچے بھی پال رہا ہوں، کھاتا پیتا بھی ہوں اور نیند بھی کرتا ہوں، پھر فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے، جس نے میری سنت سے منہ موڑا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ نسل انسانی کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا اور بنیادی پیغام یہ ہے کہ اپنے رب کو بھی یاد رکھو اور سوسائٹی اور تمدن کے تقاضے بھی پورے کرو، پیدا کرنے والے خالق کے حقوق بھی ادا کرو اور ساتھ رہنے والے انسانوں کے حقوق بھی پورے کرو، دونوں کے حقوق بیک وقت اور توازن کے ساتھ ادا کرنے کا نام اسلام ہے، اور یہی جناب رسول اکرمؐ کی دعوت اور آپؐ کی سنت مبارکہ ہے۔

حدیث نبویؐ کی تین نمایاں حیثیتیں

(مسجد اقدس، مسلم روڈ، گوجرانوالہ - ۱۷ فروری ۲۰۱۰ء)

(مسجد اقدس، مسلم روڈ، گوجرانوالہ میں نماز عشاء کے بعد درس حدیث)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج مجھے حدیث نبویؐ کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنی ہیں۔

حدیث لغوی طور پر گفتگو اور بات چیت کو کہتے ہیں مگر شریعت میں اسے جناب نبی اکرمؐ کے حوالہ سے گفتگو کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے، اور حدیث نبویؐ میں جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات اور افعال و اعمال کے علاوہ صحابہ کرامؓ کے ایسے اقوال و اعمال کو بھی شمار کیا جاتا ہے جو نبی اکرمؐ کے علم و مشاہدہ میں آئے اور آپؐ نے ان پر خاموشی اختیار کر کے ان کی تصویب و توثیق فرمادی۔ صحابہ کرامؓ نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ان احادیث کو یاد رکھا

اور روایت کر کے امت کی اگلی نسل تک پہنچایا، اور پھر محدثینؒ نے بڑی محنت اور اہتمام کے ساتھ ان احادیث کو جمع و ترتیب اور چھان پھٹک کے ساتھ سینکڑوں کتابوں اور مجموعوں میں محفوظ کر دیا۔ حدیث نبویؐ کی مختلف حیثیتیں ہیں اور اس بحر ذخار کے مختلف پہلوؤں سے مسلسل استفادہ کیا جا رہا ہے جن میں سے دو تین کا آج کی مختصر گفتگو میں ذکر کرنا چاہوں گا۔

1. حدیث نبویؐ کی سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ یہ تمام علم دینیہ کا مأخذ اور سر چشمہ ہے، دین کے حوالہ سے ہمیں جو چیز بھی حاصل کرنی ہے اس کا ذریعہ حدیث نبویؐ ہے۔ قرآن کریم بھی اسی کے ذریعے ملا ہے، سنت کا تعین بھی اسی کی بنیاد پر ہوتا ہے، فقہ و احکام کی ترتیب میں بھی یہی اساس ہے، اور جناب نبی اکرمؐ کی سیرت و سوانح بھی اسی کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الاراء کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" کا آغاز اس جملہ سے کیا ہے کہ "ان عمدۃ العلوم الیقینیۃ ورأسہا ومبنی الفنون الدینیۃ وأساسہا ھو علم الحدیث النبوی الشریف"۔ علوم یقینیہ (یعنی وحی سے متعلقہ علوم) کی بنیاد اور فنون دینیہ کی اساس علم حدیث نبویؐ ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وحی اور دین سے متعلقہ تمام علوم و فنون کے لیے حدیث نبویؐ بنیادی ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور علم و فن کی ہر بات ہمیں اسی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔

حدیث نبویؐ قرآن کریم کا مأخذ بھی ہے کہ قرآن کریم کی کسی سورۃ اور آیت کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ قرآن کریم ہی کی سورۃ اور آیت ہے ہمارے پاس حدیث نبویؐ کے سوا اور کوئی ذریعہ اور واسطہ موجود نہیں ہے۔ قرآن کریم کو صحابہ کرامؓ نے اسی طرح یاد کیا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے، یہ فلاں سورۃ کا حصہ ہے اور اسے وہاں فلاں آیت کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ یہی قرآن کریم کے حفظ و ترتیب کی سب سے پہلی بنیاد ہے اور اس میں ہمیں سب سے پہلے "جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے" پر ایمان لانا ہوتا ہے اس کے بعد اس آیت یا سورۃ پر ہم ایمان لا سکیں گے۔ اگر "جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے" پر ایمان نہیں ہے تو قرآن کریم کی کسی سورۃ اور کسی آیت

پر ایمان ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ دلائل کی ترتیب میں قرآن کریم مقدم ہے اور حدیث نبویؐ کا نمبر دوسرا ہے، لیکن ایمان کی ترتیب میں حدیث نبویؐ مقدم ہے اور قرآن کریم پر ایمان حدیث نبویؐ پر ایمان پر موقوف ہے۔

مثال کے طور پر یہ دیکھ لیجئے کہ سورۃ الکوثر قرآن کریم کی سورۃ ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے، مگر اس کی ترتیب یہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ حضرت جبریلؑ لے کر آئے ہیں اور یہ قرآن کریم کی سورۃ ہے۔ اب یہاں "جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے" پر ہم پہلے ایمان لائے ہیں اور "سورۃ الکوثر قرآن کریم کی سورۃ ہے" پر ہم بعد میں ایمان لاتے ہیں۔ اس ترتیب کے بغیر قرآن کریم کے کسی لفظ اور جملے پر ایمان نہیں لایا جا سکتا، اس لیے حدیث نبویؐ نہ صرف تمام علوم دینیہ کا مأخذ اور سرچشمہ ہے بلکہ قرآن کریم تک رسائی کا ذریعہ بھی یہی ہے اور اس پر قرآن کریم کی طرح بلکہ اس سے پہلے ایمان لانا ضروری ہے۔

2. حدیث نبویؐ کی دوسری بڑی حیثیت یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کی تشریح ہے اور قرآن کریم کے کسی جملہ اور لفظ کا مفہوم طے کرنے کے لیے سب سے بڑی اتھارٹی ہے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کسی بھی کلام میں اس کے کسی جملے اور محاورے یا ضرب المثل کا مفہوم و مصداق طے کرنے کا سب سے پہلا حق متکلّم کا ہوتا ہے۔ اگر متکلّم خود اپنے کسی جملے اور قول کا مفہوم و مصداق متعیّن کر دے تو پھر کسی اور کا یہ حق باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس کا کوئی اور مفہوم اپنی طرف سے طے کرے۔ مثال کے طور پر میں آپ حضرات سے گفتگو کر رہا ہوں، میری کسی بات میں ابہام ہے یا کسی صاحب کو میری کوئی بات سمجھ نہیں آئی، یا میری کسی بات کا کوئی صاحب غلط مطلب سمجھے ہیں، تو مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟ اور اگر میں یہ کہہ دوں گا کہ میری اس بات کا یہ مطلب ہے اور اس سے میری مراد یہ ہے تو پھر اس کا وہی مطلب ہوگا اور کسی دوسرے شخص کا یہ حق باقی نہیں رہ جائے گا کہ وہ اس کا کوئی الگ مفہوم قرار دے۔

قرآن کریم میں متکلّم اللہ تعالیٰ ہیں اور یہ ان کا کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم طے کرنے یا کسی الجھن اور اشکال کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست بات تو نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی کا اللہ تعالیٰ سے کوئی براہ راست رابطہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نمائندے کے ساتھ رابطہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ موجود ہے۔ رسول اللہ کا مطلب یہی ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے نمائندے ہیں، اور نمائندہ جب کوئی بات کرتا ہے تو وہ بات اس کی نہیں ہوتی بلکہ جس کا نمائندہ ہوتا ہے اس کی بات شمار کی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنے کاروبار کے دفتر میں بیٹھے ہیں اور کسی فرم کا کوئی نمائندہ آپ کے پاس کاروباری معاملات طے کرنے کے لیے آیا ہے، آپ کا یہ حق ہے کہ اس کے نمائندہ ہونے کے بارے میں تسلی کریں، اس سے انٹرویو کریں، کاغذات چیک کریں، فون کر کے معلومات حاصل کریں اور پورا اطمینان حاصل کریں کہ یہ صاحب اس کے نمائندہ ہیں یا نہیں، اس کے بعد آپ کا یہ بھی حق ہے کہ آپ ان کو نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن جب آپ نے ان صاحب کو اس فرم کا نمائندہ تسلیم کر لیا اور اس حیثیت سے ان کے ساتھ گفتگو شروع کر دی تو پھر آپ کو ان سے کسی بات پر یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ یہ بات آپ اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں یا فرم کی طرف سے؟ یا کیا یہ بات آپ اپنی فرم سے پوچھ کر کہہ رہے ہیں؟ کیونکہ یہ دردِ سر آپ کا نہیں ہے کہ وہ کوئی بات فرم سے پوچھ کر کہہ رہے ہیں یا بغیر پوچھے، وہ جو بات بھی کہہ رہے ہیں فرم کی نمائندہ کے طور پر کہہ رہے ہیں، پوچھ کر کہیں تو بھی فرم کی بات ہے اور بغیر پوچھے کہیں تو بھی وہ فرم کی بات ہے۔

اس لیے قرآن کریم کی کسی بات پر کوئی اشکال ہو گا یا الجھن ہو گی تو متکلّم کے نمائندے سے یعنی رسول اللہؐ سے رجوع کیا جائے گا اور وہ جو تشریح و تعبیر فرما دیں گے وہ متکلّم کی طرف سے سمجھی جائے گی۔ اور اگر قرآن کریم کی کسی آیت یا جملہ کی تشریح میں جناب نبی اکرمؐ سے صحیح روایت کے ساتھ کوئی بات ثابت ہو جائے گی تو وہی حتمی تعبیر ہو گی۔ اور اس کے بعد کسی صاحب کا یہ حق باقی نہیں رہ جائے گا کہ وہ یہ کہے کہ ٹھیک ہے اس آیت کا مطلب جناب نبی اکرمؐ یہ سمجھے

ہوں گے لیکن میری سمجھ میں تو اس کا یہ مطلب آرہا ہے۔ اس لیے کہ رسول اکرمؐ سے کسی تشریح کے ثابت ہوجانے کے بعد "میں یہ سمجھا ہوں" کا حق ختم ہو جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے حضرات کو ٹھوکر لگ جاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ کا معمول یہی تھا کہ قرآن کریم کی کسی آیت کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی تو جناب نبی اکرمؐ سے رجوع کرتے تھے اور نبی اکرمؐ اس کا جو مفہوم بیان کر دیتے وہی حتمی سمجھا جاتا تھا، اس پر احادیث نبویہؐ کے ذخیرے سے بیسیوں شواہد پیش کیے جاسکتے ہیں، جن میں مثال کے طور پر ایک کا ذکر کروں گا۔

قرآن کریم کی آیت کریمہ ہے "یاایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اھتدیتم" (المائدہ ۱۰۵) اے ایمان والو! تم پر لازم ہے کہ اپنی فکر کرو اگر کوئی اور شخص گمراہ ہوتا ہے تو تمہیں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے اگر تم ہدایت پر ہو۔ اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ بنتا ہے کہ ہر مسلمان کو صرف اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے اور کسی دوسرے شخص کے ہدایت پر آنے یا گمراہ ہونے کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ اگر اس آیت کریمہ کو اس ظاہری مفہوم پر رکھا جائے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وہ اہمیت باقی نہیں رہ جاتی جو اسے دین میں حاصل ہے۔ بلکہ اس آیت کریمہ نے تو حضرت صدیق اکبرؓ کے اس جہاد کے بارے میں بھی اشکال کھڑا کر دیا تھا جو انہوں نے مرتدین کے خلاف اور منکرین زکوۃ اور منکرین ختم نبوت کے خلاف کیا تھا، حتیٰ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ کو خطبہ میں اس کی باقاعدہ وضاحت کرنا پڑی تھی۔ لیکن میں یہاں ترمذی شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا کہ ایک صاحب نے حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا اور اس سلسلہ میں اسی اشکال کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے اس آیت کریمہ کے بارے میں جناب نبی اکرمؐ سے پوچھ لیا تھا اور آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ "بل ائتمروا بالمعروف وتناھوا عن المنکر حتی اذا رایت شحا مطاعا وھوی متبعا ودینا مؤثرۃ واعجاب کل ذی رائی برأیہ فعلیک بخاصۃ نفسک ودع العوام فان من ورائکم ایاما الصبر

فیھن مثل القبض علی الجمر۔۔ الخ“ بلکہ تم امر بالمعروف کرتے رہو اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہو حتیٰ کہ جب وہ دور آئے گا جب بخل انسانوں پر حکمرانی کرنے لگے گا، خواہشات کی پیروی عام ہو جائے گی، دین کو ثانوی درجہ دے دیا جائے گا اور ہر شخص اپنی ہی رائے پر خوش ہونے لگے گا، تو پھر تم صرف اپنی فکر کرنا اور عام لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا، اس لیے کہ اس کے بعد وہ زمانہ ہو گا جس میں دین پر صبر کرنا انگارے ہاتھ میں لینے کے مترادف ہو گا۔

گویا جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ آیت اپنے ظاہری مفہوم پر نہیں ہے بلکہ اس کا خاص مفہوم ہے اور خاص حالات میں اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے حدیث نبویؐ کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کی شرح ہے اور قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے کا مفہوم متعیّن کرنے میں فائنل اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔

3. حدیث نبویؐ کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی سیرۃ و اسوۃ اور حالات و واقعات کا مأخذ اور سرچشمہ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے امت کے لیے مطاع قرار دیا ہے اور قرآن کریم کے ساتھ سنت نبویؐ کی پیروی کا بھی حکم دیا ہے۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ”من یطع الرسول فقد اطاع اللہ“ (النساء ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت موقوف ہے جناب نبی اکرمؐ کی اطاعت پر، اور رسول اکرمؐ کی اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ممکن ہی نہیں ہے۔ اس طرح جناب نبی کریمؐ کو اللہ تعالیٰ نے مطاع اور اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرما کر ہمارے لیے یہ راستہ کھلا نہیں چھوڑ دیا کہ ہم قرآن کریم کو پڑھیں اور جیسے ہماری سمجھ میں آئے اس کے مطابق عمل کریں، قرآن کریم پر عمل کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے لیے آئیڈیل اور معیار جناب نبی اکرمؐ کو بنایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے کسی حکم پر عمل اگر جناب نبی اکرمؐ کی سنت اور اسوہ کے مطابق ہو گا تو وہ قرآن کریم کی پیروی شمار ہو گا، ہمیں حکم یہ ہے کہ عمل قرآن کریم پر کرو لیکن اس کے لیے فالو جناب نبی اکرمؐ کو کرو۔ اس

طرح قرآن کریم کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرمؐ کی سنت کو بھی واجب الاتباع اور مطاع کا درجہ حاصل ہے اور جناب نبی اکرمؐ کی سیرت و سنت کا اصل ماخذ احادیث نبویہ ہی ہیں۔

حضورؐ کے ارشادات و اقوال، اعمال و احوال اور واقعات کی تفصیل میں احادیث کے ذخیرہ میں ملتی ہے اور اس طرح سنت رسولؐ کا ماخذ بھی حدیث نبویؐ ہے۔ یہ جناب نبی اکرمؐ کا اعزاز و اعجاز ہے کہ آپ کی سیرت طیبہ، احوال و واقعات اور ارشادات و اقوال جس تفصیل کے ساتھ حدیث و تاریخ کے ریکارڈ میں موجود و محفوظ ہیں، نسل انسانی کی کسی اور شخصیت کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا۔

ہم آنحضرتؐ کی حیات مبارکہ کے جس حصے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور زندگی کے جس مسئلہ کے بارے میں جناب نبی اکرمؐ کی سنت و سیرت سے راہنمائی حاصل کرنا چاہیں ہمیں مل جاتی ہے، یہ اللہ تعالی کا امت مسلمہ پر احسان ہے، جناب نبی اکرمؐ کا معجزہ اور قیامت تک اسلام کی صداقت اور تسلسل کا اظہار ہے۔

اس لیے حدیث نبویؐ کو دین میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے، جو نہ صرف قرآن و سنت کا ماخذ ہے بلکہ جناب نبی اکرمؐ کی سیرت و اسوہ کا بھی سرچشمہ ہے، اللہ تعالی ہم سب کو حدیث نبویؐ پر ایمان میں استقامت سے نوازیں اور قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

معاشرتی عدل وانصاف میں پولیس کا کردار

(محکمہ پولیس، سول لائن، گوجرانوالہ - ۱۳ فروری ۲۰۱۰ء)

گوجرانوالہ کے ڈی آئی جی پولیس جناب ذوالفقار احمد چیمہ وقتاً فوقتاً اپنے محکمہ کے افسران کے لیے سول لائن گوجرانوالہ میں ریفریشر کورسز کا اہتمام کرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی مجھے بھی یہ اعزاز بخشتے ہیں کہ پولیس افسران کے سامنے کچھ معروضات پیش کروں۔ اسی سلسلہ کے ایک کورس میں ۱۳ فروری ۲۰۱۰ء کو ”معاشرتی عدل وانصاف میں پولیس کا کردار“ کے موضوع پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے:

بعد الحمد والصلوۃ۔ ہمارے ڈی آئی جی صاحب باذوق آدمی ہیں، سال میں ایک آدھ بار ہماری آپ حضرات سے ملاقات کی کوئی صورت نکال لیتے ہیں، ہم گھنٹہ بھر کے لیے جمع ہوتے ہیں، بات چیت ہوتی ہے اور کم از کم اتنا ضرور ہو جاتا ہے کہ ہمارا کچھ خوف کم ہو جاتا ہے، اور شاید آپ حضرات کا خوف بھی کچھ کم ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سال بھر ہم آپ حضرات سے ڈرتے رہتے ہیں جبکہ یہ گھنٹہ پون گھنٹہ ہمیں میسر آجاتا ہے کہ ہم آپ حضرات کو ڈرا سکیں۔ بہرحال اس طرح کی کوئی صورت بن جاتی ہے جس کے لیے میں ڈی آئی جی صاحب کا شکر گزار ہوں۔

معاشرتی امن اور عدل وانصاف سوسائٹی کی اجتماعی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ تمدن اور معاشرت کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ امن ہو، عدل ہو اور انصاف ہو۔ اس کے بغیر تمدن کا قائم رہنا اور اپنے مقاصد حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا معروف قول ہے کہ حکومتیں کفر کے ساتھ تو قائم رہ سکتی ہیں مگر ظلم کے ساتھ ان کا زیادہ دیر تک قائم رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ ریاست، سوسائٹی اور حکومت تینوں کے لیے عدل ناگزیر ہے اور عدل وانصاف کے بغیر ان کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

عدل، امن اور انصاف جس طرح سوسائٹی کی اجتماعی ضرورت ہے اسی طرح اس کے قیام کی ذمہ داری بھی مشترک ہے اور سوسائٹی کا ہر فرد اور ہر طبقہ اس کا کسی نہ کسی درجے میں ذمہ دار ہے۔ کوئی ایک طبقہ اگر چاہے بھی تو سوسائٹی کو اکیلا امن اور انصاف فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے تمام افراد اور تمام طبقات اپنی اپنی ذمہ داری پوری کریں گے تو معاشرے کو امن ملے گا اور عدل وانصاف میسر آئے گا۔ البتہ یہ تقسیم کار ہے کہ اس ذمہ داری کا ایک حصہ ایک طبقے کے سپرد ہے اور دوسرے حصے کی ذمہ داری دوسرے طبقے پر عائد ہوتی ہے۔ اسی تقسیم کار میں پولیس کا بھی ایک حصہ ہے اور اس کا بھی ایک کردار ہے۔ لیکن چونکہ ہمیں اس حوالہ سے پولیس فرنٹ پر دکھائی دیتی ہے اس لیے بسا اوقات ذہن میں یہ تاثر قائم ہونے لگتا ہے کہ یہ سارا کام پولیس کا ہی ہے، اور اگر ساری ذمہ داری اس کی ہے تو پھر ساری ناکامیاں بھی اسی کے کھاتے میں شمار ہونے لگتی ہیں۔ ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح آپ حضرات پولیس افسران کی حیثیت سے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ان امور کے ذمہ دار ہیں، منبر رسولؐ پر بیٹھ کر اپنے دائرے میں اسی درجے میں میں بھی ذمہ دار ہوں، اور سب کے اپنی اپنی ذمہ داری پوری کرنے پر معاشرتی انصاف کا مدار ہے۔ پولیس

چونکہ حکومت کا ایک حصہ ہے، اس کے پاس طاقت ہے، اختیارات ہیں اور ڈنڈا ہے، اس لیے بہر حال اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ ہے۔

میں آپ حضرات کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوسائٹی کو امن و انصاف کے ایک ایسے تصور سے متعارف کرایا تھا جو آج تک آئیڈیل اور مثالی سمجھا جاتا ہے اور دنیا کی قومیں اس سے استفادہ کر رہی ہیں۔ اس حوالہ سے میں اس نکتہ کی طرف متوجہ کرنا چاہوں گا کہ آخر وہ کیا طریق کار تھا جس کے ذریعے جناب نبی کریمؐ نے چند برسوں میں عرب معاشرے کو ایک صحت مند انقلاب سے دوچار کر دیا تھا، اور نہ صرف یہ کہ سونے چاندی سے لدی ہوئی عورتیں کھلے راستوں میں بلا خوف و خطر چلنے لگی تھیں بلکہ سوسائٹی میں زکوٰۃ اور صدقات کے مستحق افراد کو تلاش کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں جناب رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے چند باتیں پیش کروں گا کہ ہمارے لیے رہنمائی کا سرچشمہ وہی ہیں اور آپؐ ہی کی پیروی ہمارے لیے دنیا و آخرت میں سرخروئی اور کامیابی کا ذریعہ ہے۔

حاتم طائی دنیا کی معروف شخصیت ہے جسے سخاوت کا سمبل تصور کیا جاتا ہے، اس کے بیٹے عدی بن حاتمؓ صحابیٔ رسولؐ ہیں۔ وہ اپنا واقعہ بتاتے ہیں کہ جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے، ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ چند روز تک اپنی طرف سے چیک کرتے رہے کہ یہ صاحب جو کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں، ان میں نبیوں والی کوئی بات بھی ہے یا یہ دنیا دار بادشاہوں اور سرداروں کی طرح کے ایک حکمران ہیں۔ اس لیے کہ جو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوتا ہے، اس کا مزاج دنیا دار بادشاہوں سے مختلف ہوتا ہے، اس کے ہر کام کی بنیاد خدا کا خوف ہوتا ہے اور اس کے ہر عمل سے خوف خدا جھلکتا ہے۔

اسلام میں خوف خدا ہی سارے کاموں کی اساس ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیشی اور جوابدہی کا عقیدہ انسان کو بہت سی برائیوں اور غلط کاریوں سے روکتا ہے۔ جوابدہی تو کسی نہ کسی کے سامنے ہماری ہوتی ہی رہتی ہے، آفیسرز کے سامنے جوابدہی، محکمے کے سامنے جوابدہی، سوسائٹی کے سامنے جوابدہی اور آج کل میڈیا کے سامنے جوابدہی۔ یہ سب جوابدہی کے مختلف دائرے ہیں جن کے سامنے ہم پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی جوابدہی کے منفی نتائج سے بچنے کے لیے ہم کوئی نہ کوئی

حیلہ ضرور نکال لیتے ہیں اور اکثر اوقات بچ بھی جاتے ہیں۔ صرف ایک جوابدہی ایسی ہے جس سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا اور کوئی تدبیر بن نہیں پاتی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیشی اور جوابدہی کا عقیدہ ہے جس سے ہم اپنی کوئی بات نہیں چھپا سکتے اور اپنا کوئی عمل اس سے مخفی نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے اسلام یہ کہتا ہے کہ خدا کا خوف اور اس کے سامنے جوابدہی کا ڈر ہر وقت پیش نظر رکھو اور کوئی بھی کام کرتے ہوئے یہ سوچ لو کہ اس کا ہم نے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دینا ہے۔ بس یہی فلسفہ ہے کسی شخص کو جرم سے روکنے کا اور بدعملی سے باز رکھنے کا۔ اور یہ فلسفہ کسی دنیاوی نظام میں نہیں ملے گا، یہ صرف انبیاء کرامؑ کی تعلیمات سے ملے گا، وحی الٰہی سے ملے گا، قرآن وسنت سے ملے گا اور اسلام کے عادلانہ نظام میں ملے گا۔

میں بات کر رہا تھا حاتم طائی کے بیٹے عدیؓ کی جو کہتے ہیں کہ میں اسلام قبول کرنے سے پہلے چند روز نبی اکرمؐ کی مجلس میں حاضر ہو کر یہ چیک کرتا رہا کہ یہ صاحب دنیادار حکمرانوں میں سے ہیں یا واقعتاً خدا کے ساتھ بھی ان کا کوئی تعلق ہے؟ عدیؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ جناب رسول اللہؐ مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک عورت آئی جو بظاہر دیوانی سی لگتی تھی، اس نے آنحضرتؐ سے کہا میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں، آپؐ مجلس سے اٹھ گئے اور ایک طرف ہو کر اس کی باتیں سننے لگے۔ اس عورت نے خاصی دیر آنحضرتؐ کو مصروف رکھا مگر جس انداز سے اور جس توجہ اور مہربانی کے ساتھ آپؐ اس کی باتیں سن رہے تھے اس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ یہ دنیادار حکمران نہیں ہیں اور فی الواقع خدا کے رسول اور فرستادہ ہیں۔ اس کے بعد میں نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

یہ بظاہر ایک سادہ اور عام سی بات ہے لیکن اس سے عدی بن حاتمؓ نے جو نتیجہ اخذ کیا اس پر غور فرمائیے کہ کسی حکمران کا خوف خدا اور مخلوق کے ساتھ ہمدردی سے بہرہ ور ہونا اس کے اچھا ہونے کی علامت ہے اور یہی اسلام کا مزاج اور امتیاز ہے۔ اس لیے میں پہلی گزارش یہ کرنا چاہوں گا کہ خوف خدا ہی ہمارے سب کاموں کی بنیاد ہے اور یہی ہمارا اصل کنٹرولر ہے جو ہمیں کسی بھی قسم کی بے راہ روی اور غلطی سے بچا سکتا ہے۔

اس کے بعد میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیسیوں ارشادات میں سے چند ایک کا تذکرہ کروں گا جو اپنی اپنی ذمہ داری اور فرض کو صحیح طریقے سے ادا کرنے میں ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔

ایک واقعہ ہم اکثر سنتے رہتے ہیں کہ بنو مخزوم کی ایک عورت فاطمہؓ نے چوری کی تو جناب نبی اکرمؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس پر اس کی برادری کے لوگوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارشی بنایا کہ کسی طرح ہاتھ کاٹنے کی سزا معاف ہو جائے لیکن جناب رسول اللہؐ نے سفارش مسترد کرتے ہوئے فاطمہ مخزومی کا ہاتھ کٹوا دیا۔ اس موقع پر نبی کریمؐ نے مسجد نبویؐ میں جو خطبہ ارشاد فرمایا، بخاری شریف کے حوالہ سے اس کا ایک جملہ ذکر کروں گا جس میں آپؐ نے فرمایا کہ ''تم سے پہلی امتیں اس لیے ہلاک اور برباد ہوئیں کہ ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا تھا لیکن کوئی عام یا غریب شخص چوری کرتا تو اس کو سزا دی جاتی تھی''۔ گویا قانون کی یکسانیت اور سب پر قانون کا یکساں اطلاق معاشرے میں امن و انصاف کی ضمانت ہے۔ اور اگر قانون کی عملداری میں چھوٹے بڑے کا فرق ہو گا تو سوسائٹی تباہی کا شکار ہو گی۔

ایک حدیث میں جناب رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے دائرے میں سوال ہو گا۔ حدیث میں ''مسئول'' کا لفظ ہے کہ وہ جوابدہ ہے۔ اس میں آپؐ نے ہمیں یہ فرمایا ہے کہ اپنے اپنے دائرے کو دیکھ لو، اپنی اپنی ذمہ داری کو دیکھ لو، اپنے دائرہ کار اور دائرہ اختیار میں مسئولیت کا تصور ذہن میں رکھ کر کام کرو۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اگر اس تصور کو ذہن میں بٹھا لے تو ہمارے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

حضرت عمر ایک رات معمول کے گشت پر تھے کہ ایک گھر کے اندر سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ حضرت عمرؓ مکان کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر کود گئے اور گانے بجانے والوں کو ڈانٹا تو صاحب خانہ نے کہا کہ حضرت میں نے تو ایک غلطی کی ہے کہ گانے بجانے کی محفل سجائی ہے لیکن آپ نے قرآن کریم کے تین حکم توڑے ہیں۔ قرآن کریم کا حکم ہے کہ (۱) کسی کے گھر میں داخل ہو تو پہلے اجازت لو جبکہ آپ بغیر اجازت اندر کود پڑے ہیں۔ (۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ گھروں کے اندر کی جاسوسی نہ کیا کرو جبکہ آپ نے اس حکم کی پروا نہیں کی۔ (۳) اسی طرح قرآن کریم کا حکم ہے کہ گھروں میں دروازے سے داخل ہوں جبکہ

آپ دیوار پھلانگ کر اندر آگئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات سن کر وہیں اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور انہی قدموں واپس چلے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیوٹی کے دوران اور اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کہیں غلطی کا احساس ہو جائے تو اس پر اڑنا نہیں چاہیے۔

ایک اور بات کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم کرنا چاہتے ہیں اور ان کے کرنے میں فائدہ محسوس کرتے ہیں لیکن اجتماعی نظم اور سسٹم کی وجہ سے ایسا نہیں کر پاتے۔ میں یہاں سسٹم اور نظام سے بغاوت کی بات نہیں کروں گا لیکن اتنی بات ضرور کہوں گا کہ سسٹم اور نظم کے دائرے میں رہتے ہوئے اور اس کی پابندی کرتے ہوئے اس کام کو جس درجے میں کیا جا سکتا ہو اس کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ اصلاح احوال کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی نظام کو تبدیل کیا جائے اور سسٹم کو بدلا جائے، اس کے لیے جائز دائرے میں کوشش کرنا بھی ضروری ہے، لیکن اصلاح کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنے دائرے میں خود کو بدلنے کی کوشش کرے اور اپنی اصلاح کرے۔ ظاہر بات ہے کہ جب ہر شخص خود کو بدلنے کی کوشش کرے گا اور اپنے فرائض کو صحیح طریقے سے سرانجام دینے کی فکر کرے گا تو نظام کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ میں سب سے پہلے اپنے آپ کو اور پھر آپ حضرات کو دعوت دوں گا کہ ہم سب اپنا اپنا احتساب کریں، اپنی اصلاح کی کوشش کریں اور اپنے فرائض کو پہچانتے ہوئے ان کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۰ فروری ۲۰۱۰ء)

فہم قرآن کے دو صحیح راستے

(جامع مسجد امین، فیصل آباد - ۷ جنوری ۲۰۱۰ء)

(شیخ الحدیث حضرت مولانا زاہد الراشدی نے ۷ جنوری ۲۰۱۰ء کو فیصل آباد کا دورہ کیا اور مختلف اجتماعات سے خطاب کیا۔ (۱) نماز ظہر کے بعد سینا ٹاؤن لاہور روڈ میں نئی تعمیر شدہ جامع مسجد الرشید میں قاری خالد رشید صاحب کی دعوت پر حفظ قرآن کریم کی کلاس کے آغاز کے حوالہ سے گفتگو کی اور دعا کے ساتھ تعلیمی سلسلہ کا افتتاح کیا۔ (۲) نماز عصر کے بعد النور ٹرسٹ کے تحت اذان ٹی وی کے لیے درس قرآن کریم ریکارڈ کرایا۔ (۳) نماز مغرب کے جامع مسجد امین کوٹ خان محمد پیپلز کالونی

میں درس قرآن کریم کے اختتام کی تقریب سے خطاب کیا، اس مسجد میں مولانا مفتی محمد سعید نے چار سال قرآن کریم کا درس مکمل کیا ہے۔ (۴) اس کے بعد جامعہ اسلامیہ امدادیہ میں مولانا مفتی محمد طیب، مولانا مفتی محمد زاہد اور دیگر اساتذہ سے ملاقات کی اور متعدّد امور پر ان سے تبادلۂ خیالات کیا جبکہ نماز عشاء کے بعد جامعہ امدادیہ اسلامیہ کے قریب ایک مسجد میں نوجوانوں کے لیے فہم دین کورس کے آغاز کی تقریب سے خطاب کیا۔ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے مدرس مولانا حافظ محمد عامر اس دورے میں آپ کے ہمراہ تھے۔ جامع مسجد امین میں درس قرآن کریم کی تکمیل کے موقع پر خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوۃ۔ ہم قرآن کریم کے حوالہ سے ایک تقریب میں جمع ہیں، آپ کے خطیب و امام مولانا مفتی محمد سعید صاحب نے چار سال میں آپ کو درس کے ذریعے پورا قرآن کریم ترجمہ و تفسیر کے ساتھ سنایا ہے جو بڑی سعادت کی بات ہے، امید ہے کہ وہ اس مبارک سلسلہ کو دوبارہ شروع کریں گے۔ میں اس سعادت پر مفتی صاحب اور آپ سب دوستوں کو مبارک باد دیتے ہوئے فہم قرآن کریم کے ایک پہلو پر کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا، دعا کریں کہ اللہ رب العزت کچھ مقصد کی باتیں عرض کرنے کی توفیق دیں اور پھر ان پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین یارب العالمین۔

فہم قرآن کے حوالہ سے بیسیوں پہلو ہیں جن کے بارے میں عرض کیا جاسکتا ہے اور ان کی ضرورت بھی ہے لیکن آج میں صرف اس ایک پہلو پر گزارش کروں گا کہ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتے ہوئے کسی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہوئے یا درس سنتے ہوئے قرآن کریم کی کسی آیت کے مفہوم کے بارے میں ذہن الجھ جائے، مغالطہ لگ جائے، غلط فہمی پیدا ہو جائے، کنفیوژن ہو جائے، کوئی اشکال سامنے آجائے تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ جہاں تک مغالطہ لگ جانے یا الجھن پیدا ہونے کی بات ہے یہ فطری بات ہے، انسانی ذہنوں میں بہت زیادہ تفاوت ہے اس لیے کہیں نہ کہیں غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے اور ذہن کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کو مغالطے لگ جاتے ہیں، حضرات صحابہ کرامؓ کو بھی بعض آیات کے سمجھنے میں غلطی لگ جاتی تھی اور وہ الجھنوں کا شکار ہو جاتے تھے، لیکن ان کے پاس اس کا ایک سیدھا سا حل موجود تھا کہ وہ ایسی کسی بھی الجھن پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے تھے اور حضورؐ اس آیت کا جو مفہوم بیان کرتے اور اشکال کا جو حل پیش کرتے اس پر ان کا اطمینان ہو جاتا۔ ظاہر بات ہے کہ نبی اکرمؐ اللہ تعالیٰ کے رسول

ہیں اور اللہ کے نمائندے ہیں، وہ قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالی کی طرف سے ہی ہوتا ہے اور وہی اس آیت میں اللہ تعالی کی منشا ہوتی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس سلسلہ میں بیسیوں واقعات موجود ہیں ان میں سے بات سمجھانے کے لیے ایک دو کا تذکرہ کرتا ہوں۔

حضرت عدی بن حاتمؓ جناب نبی اکرمؐ کے معروف صحابی ہیں، حاتم طائی کے بیٹے ہیں، اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھے، اسلام قبول کیا، قرآن کریم پڑھا تو ایک جگہ ان کا ذہن اٹک گیا۔ قرآن کریم نے عیسائیوں کے بارے میں کہا ہے کہ ”اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ“ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالی کے ورے رب بنا لیا تھا۔ عدیؓ کہتے ہیں کہ ہم جب عیسائی تھے تو اپنے علماء اور مشائخ کو رب نہیں کہتے تھے اور نہ ہی رب کا درجہ دیتے تھے، انہوں نے یہ اشکال جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں پیش کیا، جس کی ظاہری صورت یہ تھی کہ خدانخواستہ قرآن کریم نے ایک خلاف واقعہ بات کہہ دی ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے عدیؓ سے پوچھا کہ کیا تمہارے ہاں علماء و مشائخ کو حلال و حرام میں ردوبدل کا اختیار تھا یا نہیں؟ عدیؓ نے کہا کہ یہ تو تھا، یعنی مسیحیوں کے ہاں ان کے علماء و مشائخ کو یہ اتھارٹی حاصل تھی کہ وہ جس چیز کو حلال کہہ دیں وہ حلال ہے اور جسے حرام کہہ دیں وہ حرام ہے۔

یہ اختیار آج بھی کیتھولک عیسائیوں میں پاپائے روم کو اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں آرچ بشپ آف کنٹربری کو حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے سکتے ہیں۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ علماء و مشائخ کو اس اختیار اور اتھارٹی کا حامل سمجھنا ہی ان کو ”اربابا من دون اللہ“ سمجھنا ہے اور قرآن کریم نے اسی کی نشاندہی کی ہے۔ جبکہ اسلام میں یہ اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالی کی حلال کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر سکیں یا اللہ تعالی کی حرام قرار دی ہوئی کسی چیز کو حلال بتا سکیں۔ تھوڑی دیر کے لیے سوچیں کہ اگر اللہ تعالی اپنے سوا کسی کو یہ اختیار دیتے تو کس کو دیتے؟

ظاہر بات ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو جناب نبی اکرمؐ ہی اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے کہ انہیں حلال و حرام میں ردوبدل کا اختیار دیا جاتا، لیکن یہ بات نبی اکرمؐ سے ہی اللہ تعالی نے فرمائی ہے کہ ”لم تحرم ما احل اللہ لک؟“ جو چیز اللہ تعالی نے آپ کے لیے حلال کی ہے اسے آپ کیسے حرام قرار دے رہے ہیں؟ اس لیے ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی نے جس چیز کو

حلال یا حرام کہا ہے اسے تبدیل کرنے کا اگر جناب نبی اکرمؐ کو اختیار نہیں ہے تو پھر کائنات میں کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسے حلال و حرام میں ردوبدل کی اتھارٹی تسلیم کیا جائے۔ لیکن میں اسی حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی اس آیت کے مفہوم میں حضرت عدیؓ کو اشکال ہوا تو انہوں نے جناب نبی اکرمؐ سے رجوع کیا اور آنحضرتؐ نے اس کی جو وضاحت فرمائی اس پر ان کا اطمینان ہو گیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ معروف صحابہ کرامؓ میں سے ہیں، صف اول کے جرنیل تھے اور بہت بڑے ڈپلومیٹ بھی تھے، ترمذی شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے انہیں نجران کے علاقے میں اسلام کی دعوت کے لیے بھیجا جو عیسائیوں کا علاقہ تھا، انہوں نے وہاں جا کر جب قرآن کریم پر ایمان لانے کی دعوت دی تو وہاں کے عیسائی علماء نے قرآن کریم پر اعتراض کر دیا جس کا جواب مغیرہ بن شعبہؓ نہ دے سکے اور وہاں سے واپس آ گئے۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ قرآن کریم نے حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ ایک مقام پر ”یا اخت ھارون“ کہہ کر کیا ہے اور انہیں ہارون کی بہن قرار دیا ہے، عیسائی علماء نے کہا کہ حضرت ہارونؑ تو حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے جبکہ مریم حضرت عیسیٰؑ کی والدہ محترمہ تھیں، دونوں کے درمیان صدیاں حائل ہیں اس لیے حضرت ہارون اور حضرت مریم علیہما السلام کیسے آپس میں بہن بھائی ہو سکتے ہیں؟

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے اس کا جواب نہ بن پڑا اور انہوں نے مدینہ منورہ واپسی پر جناب نبی اکرمؐ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بندۂ خدا تو اتنی سادہ سی بات بھی ان سے نہیں کہہ سکا کہ وہ لوگ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام علیہم السلام کے ناموں پر برکت کے لیے رکھا کرتے تھے اور حضرت مریمؑ کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا جو حضرت ہارونؑ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہاں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے میں الجھن میں ڈالا گیا تو انہوں نے جناب نبی اکرمؐ سے رجوع کیا اور آپؐ کی وضاحت پر ان کا اطمینان ہو گیا۔

اس لیے میں آپ حضرات سے پہلی گزارش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش میں کہیں نہ کہیں الجھن ہو سکتی ہے، مغالطہ لگ سکتا ہے، جہاں ایسا ہو تو سب سے پہلے جناب نبی اکرمؐ کی طرف رجوع کریں، اپنی طرف سے دھکا نہیں کریں۔ اور جب کسی

آیت کے بارے میں نبی اکرمؐ کے ارشاد یا عمل سے راہنمائی مل جائے تو پھر کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ بسا اوقات کسی بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس کے بیک گراؤنڈ سے واقفیت ضروری ہو جاتی ہے اور جب تک اس کی بیک گراؤنڈ سامنے نہ آئے صحیح مفہوم تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے، اس حوالہ سے بھی احادیث میں متعدّد واقعات موجود ہیں، ان میں سے ایک دو واقعات عرض کرنا چاہوں گا۔

قرآن کریم میں صفا اور مروہ کی سعی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بہما'' جو شخص حج کرے یا عمرہ کرے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ صفا مروہ کی سعی بھی کرے۔ اس جملہ کے ظاہری مفہوم کا تقاضہ یہ ہے کہ صفا مروہ کی سعی کی صرف اجازت دی گئی ہے اور وہ حج یا عمرہ میں کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ یہ اشکال صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی سامنے آیا، بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عروۃ بن زبیرؒ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں یہ اشکال پیش کیا، ام المومنینؓ نے جواب دیا کہ جاہلیت کے دور میں قریش اور ان کے بعض حلیف قبائل تو حج اور عمرہ میں بیت اللہ کے طواف کے بعد صفا مروہ کی سعی کرتے تھے لیکن انصار مدینہ اوس اور خزرج کے لوگ صفا مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کی جگہ قدید کے مقام پر واقع بت خانے مناۃ میں جایا کرتے تھے اور صفا مروہ کی سعی کو جاہلیت کی علامت قرار دیا کرتے تھے۔ لیکن جب فتح مکہ کے بعد مناۃ اور دیگر بت خانے توڑ دیے گئے تو اوس اور خزرج کو، جو دونوں انصار مدینہ کے قبیلے تھے، اشکال ہوا کہ وہ بیت اللہ کے طواف کے بعد کہاں جائیں گے؟ اس پر اللہ تعالی نے انصار مدینہ سے کہا کہ صفا مروہ کی سعی جاہلیت کی بات نہیں بلکہ شعائر اللہ کی تعظیم کی بات ہے اس لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ بیت اللہ کے طواف کے ساتھ صفا مروہ کی سعی بھی کر لی جائے۔ ام المومنینؓ کا ارشاد ہے کہ ''لا جناح علیہ'' کا جملہ انصار مدینہ کے لیے کہا گیا ہے جو اسے حرج اور جاہلیت کی بات سمجھا کرتے تھے۔ ام المومنینؓ کی اس وضاحت کی روشنی میں غور فرمائیں کہ اگر یہ وضاحت سامنے نہ ہو اور اس آیت کا یہ پس منظر، جسے ہماری اصطلاح میں شان نزول کہا جاتا ہے، علم میں نہ ہو تو اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اور اسی وجہ سے آج بھی بعض متجددین اسی شبہ کا شکار ہیں جس کا اظہار حضرت عروہ

بن زبیرؓ نے کیا تھا لیکن ان کا شبہ ام المومنینؓ کی وضاحت کے بعد دور ہو گیا تھا جبکہ ہمارے دور کے متجددین مسلسل مغالطہ کا شکار ہیں۔

حضرت قدامہ بن مظعونؓ بدری صحابی تھے، حضرت عمرؓ کے برادر نسبتی تھے اور ان کے دور خلافت میں بحرین کے گورنر تھے۔ ان کے بارے میں رپورٹ ملی کہ وہ کبھی کبھی شراب پیتے تھے، انکوائری کرائی گئی تو رپورٹ درست ثابت ہوئی، حضرت عمرؓ نے انہیں طلب کر لیا اور پوچھا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ کبھی کبھی تھوڑی بہت پیتے ہیں اور اس لیے پیتے ہیں کہ قرآن کریم نے اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ یہ انہیں قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ سے مغالطہ ہوا تھا جو شراب کی حرمت و ممانعت کے بعد ہے اور جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ”لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا“ جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے ان پر کوئی حرج نہیں جو انہوں نے تھوڑی بہت چکھ لی۔ حضرت عمرؓ کو ان کی زبان سے یہ سن کر سخت غصہ آیا اور فرمایا کہ اگر تم بدری صحابی نہ ہوتے تو میں تمہاری چمڑی اتار دیتا۔ خدا کے بندے یہ تمہارے بارے میں نہیں کہا گیا بلکہ جب شراب کی حرمت و ممانعت کا اعلان ہوا اور اسے قرآن کریم میں ”رجس“ گندگی قرار دیا گیا تو بعض صحابہؓ کو اشکال ہوا کہ ہمارے جو بھائی شراب کی حرمت کے اعلان سے پہلے پیتے تھے اور اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں تو کیا یہ ”رجس“ گندگی ان کے پیٹوں میں ان کے ساتھ گئی ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے انہوں نے شراب کی حرمت سے پہلے جو شراب پی لی ہے اس میں ان پر کوئی حرج نہیں ہے۔ گویا ”لا جناح“ شراب کی حرمت کے بعد کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے کے حوالہ سے ہے۔

یہاں بھی میں اس بات پر غور و فکر کی دعوت دوں گا کہ اگر اس آیت کا یہ شان نزول سامنے نہ ہو جو حضرت عمرؓ بیان کر رہے ہیں تو اس کا صحیح مفہوم سمجھنا ممکن نہیں ہے، اور اسی وجہ سے اس آیت کے بارے میں بھی بعض متجددین مغالطے کا شکار ہیں اور لوگوں کو مغالطہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حضرات محترم! میں نے چند واقعات آپ کو یہ بات سمجھانے کے لیے پیش کیے ہیں کہ قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے مغالطے اور الجھن کا شکار ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، یہ فطری چیز ہے اور بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے مغالطوں کا شکار ہوتے رہے

ہیں، لیکن اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم ان مغالطوں پر اڑ جائیں یا انہیں اپنی عقل اور سمجھ سے ہی حل کرنے کی کوشش کرتے رہیں، بلکہ ایسے کسی بھی مغالطے، الجھن، غلط فہمی، کنفیوژن اور اشکال کو دور کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت تلاش کی جائے اور اسے اللہ تعالی کی منشا سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ جبکہ دوسرے نمبر پر یہ ضروری ہے کہ جس آیت کریمہ کے بارے میں الجھن پیدا ہو رہی ہے اس کے پس منظر اور شان نزول کو معلوم کرنے کی کوشش کی جائے جو ظاہر ہے کہ کسی صحابیؓ سے معلوم ہو گی۔ کوئی صحابیؓ ہی یہ بتائے گا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی تھی اور کسی ماحول اور تناظر میں اس کا نزول ہوا تھا۔

اس طرح قرآن کریم کے صحیح فہم کے لیے ہمارے پاس دو ہی راستے اور معیار ہیں: ایک سنت رسولؐ اور دوسرا اقوال صحابہ کرامؓ۔ ان دو اصولوں کو اگر ہم پلے باندھ لیں تو قرآن کریم کو سمجھنے میں کہیں بھی کوئی الجھن پیش نہیں آئے گی۔ اللہ تعالی ہمیں فہم قرآن کریم کی نعمت سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

مرد و عورت کا میل جول

(مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۲۰۱۰ء)

(نماز فجر کے بعد درس حدیث کا ایک حصہ۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کسی عورت کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ یعنی شرعی مسافت کا سفر کرے مگر اس کے ساتھ محرم ہو۔ محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔ تین دن سے مراد شرعی مسافت ہے جو آج کل ۴۸ میل یا ۸۰ کلو میٹر کے لگ بھگ بنتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ عورت اپنے گھر میں بھی کسی مرد کے ساتھ تنہا نہ ہو جبکہ ساتھ کوئی محرم نہ ہو۔

اللہ رب العزت نے مرد و عورت کے اختلاط میں، مرد و عورت کے میل جول میں کچھ حدود رکھی ہیں۔ اس لیے کہ یہیں سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے جناب نبی کریمؐ نے فرمایا، کوئی مرد اور عورت اگر اکٹھے ہوں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ شیطان کے ہاتھ میں سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ انسان کو گمراہ کرے۔ فرمایا، مرد و عورت جب اکٹھے ہوتے ہیں، تنہا ہوتے ہیں، کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا، تو تیسرا شیطان ہوتا ہے اور

شیطان ان کے درمیان سفیر کا کام کرتا ہے۔ ان کے خیالات، ان کے جذبات کو ابھارنا، احساسات پیدا کرنا، وسوسے ڈالنا یہ شیطان کا کام ہے۔

چنانچہ یہ بھی پابندی لگائی کہ مرد و عورت اکٹھے نہ ہوں، ہاں اگر محرم ساتھ ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ کیونکہ یہ بھی اسباب میں سے ہے۔ قرآن کریم نے جہاں بدکاری اور زنا کی مذمت فرمائی ہے وہاں یہ بھی فرمایا ''ولا تقربوا الزنا'' کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ۔ باقی گناہوں کے بارے میں فرمایا یہ گناہ نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، سود نہ کھاؤ، شراب نہ پیو، لیکن زنا کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ زنا نہ کرو بلکہ کہا کہ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔

اس سے مفسرین یہ استدلال کرتے ہیں کہ زنا کے جو دواعی ہیں وہ بھی حرام ہیں۔ وہ اسباب جو کسی انسان کو زنا تک پہنچاتے ہیں وہ بھی حرام ہیں۔ حتی کہ جناب نبی کریمؐ نے اس بات پر بھی پابندی لگائی کہ کسی غیر محرم عورت کو نہ دیکھو اور اگر اتفاقاً نگاہ پڑ گئی ہے تو نگاہ ہٹا لو۔ یہ پہلا سبب ہوتا ہے، آنکھ پہلا دروازہ ہے۔ اس کے بعد گفتگو، پھر خلوت، پھر باقی معاملات۔ تو یہ جو اسباب ہیں جن سے گزر کر انسان گناہ تک پہنچتا ہے شریعت نے وہ بھی حرام قرار دیے ہیں۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے یہ ارشاد فرمایا تو ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! دیور ہو تب بھی؟ فرمایا وہ تو نری موت ہے۔ کیا مطلب؟ کیونکہ میل جول زیادہ ہے، امکانات بھی زیادہ ہیں۔ میل جول، گفتگو، دیکھنا، یہ چونکہ اسباب ہیں اس لیے شریعت نے ان اسباب پر پابندی لگائی ہے۔ حدود مقرر کی ہیں، اس کی صورتیں متعیّن کی ہیں۔ اور ایسی صورت جو انسان کے گناہ کا سبب بنے وہ شریعت نے حرام قرار دی ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ کوئی عورت اکیلی سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ محرم ہو۔ تو یہ دو پابندیاں فقہاء لگاتے ہیں کہ اگر دن میں اپنی ضرورت کے تحت کسی کام کے لیے جاتی ہے تو جا سکتی ہے لیکن رات کو گھر واپس آئے۔

حضرت سوداء رضی اللہ عنہا ایک دفعہ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئیں، اس وقت تک پردے وغیرہ کے احکام آ گئے تھے، سودا رضی اللہ عنہا گئیں تو حضرت عمرؓ نے پہچان لیا، قد لمبا تھا جسم بھاری تھا۔ مطلب یہ تھا کہ آپ باہر کہاں جا رہی ہیں؟ یہ ڈانٹنے کا انداز تھا۔ ام المومنینؓ ہیں۔ سوداؓ واپس گئیں جناب نبی کریمؐ کے پاس۔ حضورؐ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ جا کر عرض کیا کہ یا رسول

اللہ! میں قضائے حاجت کے لیے گئی تھی تو عمرؓ نے مجھے آواز دی ہے، ٹوکا ہے مجھے۔ کہا کہ میں کیا کروں، ضرورت کے لیے بھی باہر نہ جاؤں؟ تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کچھ دیر حضورؐ نے خاموشی اختیار کی، حضورؐ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔۔۔۔ رسول اللہؐ نے فرمایا، اللہ رب العزت نے تمہیں ضروریات کے لیے جانے کی اجازت دی ہے۔

ضرورت کی حد فقہاء یہ کرتے ہیں کہ ایسا کام جو ضروری ہے اور کرنے والا اور کوئی نہیں ہے، تو ایسی ضرورت کے لیے عورت جا سکتی ہے۔ لیکن دو شرطوں کے ساتھ کہ رات باہر نہیں رہے گی اور شرعی مسافت سے زیادہ نہیں جائے گی۔ جبکہ ایک پابندی اور لگائی ہے کہ سادہ لباس میں جائے، خوشبو یا ایسا لباس نہ ہو کہ خواہ مخواہ لوگوں کی نظریں اٹھیں۔ لباس سادہ ہو، پردہ ہو، حدود میں چلے، بلاوجہ باہر نہ رہے۔

حضورؐ خطبہ فرما رہے تھے، ایک شخص کھڑا ہو گیا، کہا کہ یا رسول اللہ! میری بیوی حج پر جا رہی ہے اور میرا نام مجاہدین میں لکھ دیا گیا ہے۔ تو جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تم جہاد پر نہیں جاؤ گے بلکہ اپنی بیوی کے ساتھ حج پر جاؤ گے۔ تم اپنی بیوی کے ساتھ جا کر حج کرو تاکہ اس کا حج ادا ہو جائے۔ تو یہ فرمایا کہ عورت اگر حج کے لیے جائے گی تو اپنے خاوند کے ساتھ یا کسی محرم کے ساتھ۔

ہم قرآن کس لیے پڑھتے ہیں؟

(جامعہ عثمانیہ، معین آباد، لانڈھی، کراچی - ۱ جنوری ۲۰۱۰ء)

کراچی سے گزشتہ جمعرات کو گوجرانوالہ واپس پہنچ کر اپنی معمول کی مصروفیات میں محو ہو چکا ہوں مگر دو تین حاضریوں کا تذکرہ باقی ہے۔ سہراب گوٹھ کی جامع مسجد گلشن عمرؓ میں واقع جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کی شاخ کے سامنے سے تو بیسیوں مرتبہ گزر ہوا ہو گا، مگر حاضری پہلی بار ہوئی۔ جامعہ کے اساتذہ کی فرمائش تھی کہ حاضری کی کوئی صورت نکلے اور طلبہ سے کچھ معروضات بھی کی جائیں۔ چنانچہ بدھ کی شب کو مولانا محمد شفیع چترالی کے ہمراہ عشاء کی نماز وہاں ادا کی، عشاء کے بعد طلبہ سے چند گزارشات کیں اور اس کے بعد کھانے پر حضرات اساتذہ کے ساتھ مختلف امور پر تبادلۂ خیالات ہوا۔

ایک بزرگ استاذ مولانا قاری محمد ابراہیم شاہ نے اس بات کا شکوہ کیا کہ میں نے جماعتی زندگی کیوں ترک کر دی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نہ میں نے جماعت چھوڑی ہے اور نہ ہی

عملی زندگی سے کنارہ کش ہوا ہوں، اب بھی جمعیت علماء اسلام پاکستان کا باقاعدہ رکن ہوں اور جمعیت کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے ہی عملی کام کر رہا ہوں۔ میں نے اپنا محاذ تبدیل نہیں کیا البتہ مورچہ ضرور بدلا ہے۔ انتخابی و تنظیمی سیاست کے مورچے سے فکری اور تعلیمی مورچے میں منتقل ہو گیا ہوں اور بحمد اللہ تعالیٰ گزشتہ دو عشروں سے پوری دلجمعی کے ساتھ مصروف عمل ہوں۔ میری یہ حکمت عملی بہت سے دوستوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی، اور ان کا اس بات کو سمجھ نہ پانا خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔

جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن میں حسب معمول حاضری ہوئی اور ایک رات وہاں قیام رہا، مگر تعطیلات کی وجہ سے کوئی کلاس نہ ہو سکی۔ پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمان درخواستی کو جامعہ اشرفیہ لاہور کے اجلاس کی تفصیلات اور ملی مجلس شرعی کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا، اور پاکستان شریعت کونسل کے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں باہمی تبادلۂ خیالات ہوا۔

کالعدم سپاہ صحابہؓ کے مرکزی رہنما مولانا عبد الغفور ندیم کی اپنے فرزند سمیت المناک شہادت پر تعزیت کے لیے ان کی مسجد میں حاضری ہوئی اور ان کے صاحبزادوں کے ساتھ ملاقات کر کے ان کے رنج و غم میں شرکت کی، جبکہ مولانا عبد الغفور ندیم شہیدؒ کی قبر پر حاضری اور دعا کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

جمعرات کو صبح واپسی سے قبل معین آباد لانڈھی کے جامعہ عثمانیہ میں مولانا حافظ اقبال اللہ کے ہاں ناشتہ تھا، انہوں نے اساتذہ و طلبہ سے خطاب کے علاوہ علاقہ کے بہت سے علماء کرام سے ناشتے پر ملاقات کا اہتمام کر رکھا تھا۔ طلبہ سے خطاب کے دوران قرآن کریم کی تلاوت اور سماع کی اہمیت پر گفتگو کی جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے، ہم اس سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں، اس کا ادب واحترام کرتے ہیں اور ذوق و شوق کے ساتھ اسے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ لیکن ہمیں ایک بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم قرآن کریم کو کس مقصد کے لیے پڑھتے ہیں؟ جبکہ قرآن کریم کو اصلاً کس مقصد کے لیے پڑھنا چاہیے اور اس کے پڑھنے اور سننے کا بنیادی تقاضا کیا ہے؟ ہم عام طور پر چند مخصوص مقاصد کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، مثلاً:

1. ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم پڑھنے اور سننے سے ثواب ملتا ہے اور نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے، یہ بات بلاشبہ درست ہے کہ قرآن کریم پڑھنے اور سننے پر ہر حرف پر کم از کم دس نیکیاں ملتی ہیں اور ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔

2. دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے برکت و رحمت کا حصول ہوتا ہے اور ہم اپنے گھروں میں، دکانوں اور کاروباری مراکز میں برکات حاصل کرنے کے لیے تلاوت قرآن کریم کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور برکات کی بارش ہوتی ہے۔

3. تیسرا مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم پڑھنے سے شفا حاصل ہو گی۔ یہ بات بھی درست ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے روحانی بیماریوں کی شفا تو ملتی ہی ہے جسمانی امراض کے لیے قرآن کریم کا پڑھنا بھی باعث شفا ہے اور سنت نبویؐ بھی ہے۔

4. چوتھا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے ذریعے بخشش کے طالب ہوتے ہیں، ہمارا کوئی بزرگ یا دوست دنیا سے رخصت ہو جائے تو ہم اس کو ایصال ثواب کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں اور بخشش و مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اور یہ بات بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن کریم کے ذریعے مغفرت اور بخشش حاصل ہوتی ہے۔

5. پانچواں مقصد قرآن کریم پڑھنے سے یہ ہوتا ہے کہ دلی اور ذہنی پریشانیوں سے نجات حاصل ہو۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق نماز اور تلاوت قرآن کریم کے ذریعے ذہنی طور پر پریشان شخص کو سکون واطمینان کی دولت ملتی ہے۔

6. چھٹے نمبر پر ہم اپنے بچوں کو قرآن کریم اس شوق سے یاد کراتے ہیں کہ قیامت کے دن حافظ کے ماں باپ کو سونے چاندی کا تاج پہنایا جائے گا، اور خود حافظ کو بہت سے اعزازات ملیں گے۔

7. ساتویں نمبر پر ہمارے قاری صاحبان قرآن کریم کو اچھے سے اچھے لہجے میں پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کے فن اور مہارت کا اظہار ہوتا ہے اور اس کے ذریعے قرآن کریم کا امتیاز و اعجاز بھی سامنے آتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم کا اپنا ایجنڈا بھی یہی ہے؟ یہ تو وہ فوائد ہیں جو ہم قرآن کریم سے حاصل کرتے ہیں اور قرآن کریم ان میں سے ہر فائدہ دیتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا اپنا مقصد اور ایجنڈا جو اس نے واضح طور پر بیان کیا ہے یہ ہے کہ وہ نسل انسانی کی راہنمائی کے لیے آیا ہے، ھدی للناس ہے، ھدی للمتقین ہے، یہ راہنمائی کی کتاب ہے، گائیڈنس کی کی کتاب ہے اور زندگی کے معاملات میں ڈائریکشن کی کتاب ہے۔ مگر ہم اسے راہنمائی کے لیے اور زندگی کے معاملات میں گائیڈنس کے لیے پڑھنے کی مجموعی طور پر ضرورت محسوس نہیں کر رہے، جو ہمارا اصل المیہ ہے اور قرآن کریم کی حق تلفی ہے۔

اس کی مثال اسی طرح ہے جیسے ہمارے ہاں کوئی معزز شخصیت مہمان آجائے، اسے پورا احترام اور پروٹوکول دیں، اس کی خدمت بھی کریں اور اس سے جتنے فائدے اٹھا سکتے ہوں، اٹھائیں۔ مگر اس سے یہ نہ دریافت کریں کہ جناب آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے اور آپ کس غرض کے لیے ہمارے ہاں تشریف لائے ہیں؟ یہ طرز عمل خود غرضی کہلاتا ہے اور بدقسمتی سے ہم نے یہی طرز عمل قرآن کریم کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے کہ اس سے فائدے تو سارے اٹھا رہے ہیں لیکن اس سے یہ دریافت نہیں کر رہے کہ وہ کس مقصد کے لیے آیا ہے اور اس کا اپنا ایجنڈا کیا ہے؟

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں قرآن کریم سے جتنے فائدے مل سکتے ہیں ضرور حاصل کرنے چاہئیں، مگر اسے راہنمائی اور ہدایت کے لیے بھی پڑھنا چاہیے کہ اس کا سب سے بڑا اور اصل مقصد یہی ہے۔

۲۰۰۹ء

مولانا محمد عمر لدھیانویؒ

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۹ء)

گزشتہ دنوں علماء لدھیانہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ عالم دین مولانا محمد عمر لدھیانوی کا ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں ۱۰ دسمبر جمعرات کو اتفاقاً فیصل آباد میں تھا، وہیں خبر ملی تو جنازے کے موقع پر حاضری اور مولانا مرحوم کے آخری دیدار کا شرف حاصل ہوگیا۔ مجھے اس روز چنیوٹ میں اپنے ایک عزیز شاگرد حافظ محمد عمیر کے ختم قرآن کریم کے پروگرام میں حاضر ہونا تھا جو بعد نماز عشاء تھا۔ حافظ محمد عمیر نے مسجد بلال میں جہری نمازوں میں مسلسل قرآن کریم پڑھنے کا معمول رکھا ہوا ہے اور اس روز ان کا دوسرا ختم تھا۔ یہ ذوق کہ قرآن کریم رمضان المبارک میں تراویح اور نوافل کے علاوہ سارا سال جہری نمازوں میں ترتیب سے پڑھا جائے، میں نے سب سے پہلے برادرم مولانا محمد سعید الرحمان علویؒ کا دیکھا جو ہفت روزہ خدام الدین لاہور کے مدیر تھے اور شاہ جمال کی مسجد الشفاء میں امام و خطیب تھے۔ انہوں نے نماز فجر میں ترتیب کے ساتھ کئی مرتبہ قرآن کریم مکمل کیا۔ اس کے بعد ہمارے گوجرانوالہ کے ایک دوست پروفیسر حافظ محمد شریف میرے علم میں آئے جنہوں نے گکھڑ میں استاذ محترم قاری محمد انور صاحب مدظلہ سے قرآن کریم حفظ کیا۔ وہ میرے حفظ کے دور کے ساتھی ہیں، مدرسہ نصرۃ العلوم کے فضلاء میں سے ہیں، اور اس وقت گورنمنٹ ڈگری کالج میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے مسجد حذیفہ پاپولر نرسری گوجرانوالہ میں جہری نمازوں میں متعدّد بار قرآن کریم مکمل کیا۔ تیسرے ساتھی حافظ محمد عمیر ہیں جنہیں یہ ذوق و سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ملک

میں اور بھی بہت سے دوست اس ذوق کے ہوں گے مگر ہمارے علم میں یہ تین دوست ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ تینوں حضرات یعنی مولانا محمد سعید الرحمان علوی، پروفیسر حافظ محمد شریف، اور حافظ محمد عمیر جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فضلاء میں سے ہیں۔

میں نے اس روز چنیوٹ جانا تھا مگر راستہ فیصل آباد کا اختیار کیا کہ وہاں ہمارے دوستوں نے النور ٹرسٹ کے عنوان سے ”اذان ٹی وی“ کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور مختلف دعوتی و تعلیمی پروگرام اس کے ذریعہ روزانہ لوگوں کو پیش کیے جاتے ہیں۔ اس پروگرام اور اس کو چلانے والے گروپ کے سربراہ حافظ ریاض احمد چشتی صاحب ہیں جو ایک فیکٹری کے مالک ہیں اور حضرت مولانا ظفر احمد قادریؒ آف واھگہ لاہور کے خلیفۂ مجاز ہیں۔ انہوں نے مجھے اذان ٹی وی میں درس قرآن کریم ہفتہ وار پروگرام لیے پابند کر رکھا ہے اور میں وقتاً فوقتاً اس کے لیے پروگرام ریکارڈ کرا دیتا ہوں۔ اس روز میں نے فیصل آباد کا راستہ اسی مقصد کے لیے اختیار کیا تھا کہ ایک پروگرام ریکارڈ کرادوں لیکن جب فیصل آباد حافظ ریاض احمد چشتی صاحب کے ہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد عمر لدھیانویؒ کا ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انتقال ہو گیا ہے اور عصر کے بعد جنازہ ہے۔ مولانا عبد الرشید انصاری نے بھی جانا تھا اس لیے طے ہوا کہ ہم اکٹھے وہاں چلے جاتے ہیں اور فیصل آباد والا پروگرام پھر کسی دن ہو جائے گا۔ چنانچہ میں وہاں سے مولانا عبد الرشید انصاری، مولانا محمد خان، اور حافظ ریاض احمد چشتی کے ہمراہ روانہ ہوا۔ ہم بمشکل جنازے تک پہنچ سکے اور مولانا محمد عمر لدھیانویؒ کی آخری زیارت کی۔ اس موقع پر محترم جناب حمزہ صاحب سے بھی طویل عرصہ کے بعد ملاقات ہوگئی۔ حمزہ صاحب بھی علمائے لدھیانہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، کئی بار قومی اسمبلی کے رکن رہے ہیں، ملکی سیاست میں ایک نظریاتی اور با اصول راہنما کے طور پر ان کا نمایاں نام ہے، وہ ایک دور میں پاکستان قومی اتحاد صوبہ پنجاب کے صدر تھے جبکہ میں صوبائی سیکرٹری جنرل تھا۔ ہمارے ساتھ اقبال احمد خان مرحوم، مولانا فتح محمدؒ، ملک اکبر خان ساقی، علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ، رانا نذر الرحمان مرحوم، اور جناب سعید الدین مرحوم پر مشتمل ٹیم تھی جو تحریک نظام مصطفی اور پاکستان قومی اتحاد کے صوبائی معاملات کی ذمہ دار تھی۔

مولانا محمد عمر لدھیانویؒ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کے بھتیجے اور حضرت مولانا محمد یحیی لدھیانویؒ کے فرزند تھے۔ پاکستان بننے کے بعد حضرت مولانا محمد

یحیی لدھیانویؒ پاکستان تشریف لائے اور فیصل آباد میں آباد ہو گئے۔ گورونانک پورہ فیصل آباد میں مدرسہ اشرف المدارس جو ایک دور میں ملک کے بڑے مدارس میں شمار ہوتا تھا، حضرت مولانا محمد یحیی لدھیانویؒ کا قائم کردہ ہے۔ مولانا محمد عمر لدھیانویؒ جمعیت علمائے اسلام کے سرگرم راہ نماؤں میں سے تھے اور حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے معتمد رفقاء میں سے تھے۔ اس دور میں فیصل آباد ڈویژن میں جمعیت علمائے اسلام کو منظم کرنے میں ان کا اہم اور متحرک کردار رہا ہے اور وہ کچھ عرصہ جمعیت علمائے اسلام کے ڈویژنل امیر بھی رہے۔ ان کے ساتھ اس زمانے میں مولانا عزیز الرحمان انوری، مولانا عبدالعلیم جالندھری، مولانا محمد اختر صدیقی، احمد یعقوب چودھری، مولانا عبدالرشید انصاری، ملک محمد صدیق، عبدالمجید انور، مولانا عابد نعیم، اور دیگر سرگرم حضرات جمعیت علمائے اسلام کی تنظیمی و تحریکی خدمات میں پیش پیش تھے۔ جبکہ میرے جماعتی دوروں میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مولانا محمد عمر لدھیانویؒ کی شخصیت اور احمد یعقوب چودھری کا گھر ایک اہم جنکشن کی حیثیت رکھتا تھا۔

مولانا محمد عمر لدھیانویؒ کے حوالہ سے ایک یادگار واقعہ بھی میری یادداشت کا اہم حصہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر میں جب دیوبند گیا تو قافلہ کے ساتھ واپسی نہیں کی بلکہ گھومنے پھرنے کے شوق میں چند روز مزید وہاں رہا۔ اس دوران دہلی، سہارنپور، مظفر نگر، لدھیانہ، امرتسر، اور انبالہ وغیرہ دیکھا۔ اس زمانے میں اتنی سختی نہیں تھی اور باوجودیکہ میرے پاس ان شہروں کا ویزا نہیں تھا مجھے گھومنے پھرنے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ میں دہلی سے سیدھا لدھیانہ پہنچا، میرے پاس کسی کا ایڈریس نہیں تھا اور نہ ہی کسی سے رابطہ تھا۔ بس اللہ توکل دہلی سے نکل پڑا اور راستہ میں پانی پت سے گزرتے ہوئے دور سے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے مزار کی زیارت کر کے رات عشاء کے کچھ دیر بعد لدھیانہ پہنچ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ وہاں کی معروف شخصیت رہے ہیں، کسی نہ کسی سے ان کے گھر کا پتا مل ہی جائے گا اور وہاں پہنچ کر کسی نہ کسی طرح اپنا تعارف کرا لوں گا۔ چنانچہ لدھیانہ کے جنرل بس اسٹینڈ سے ایک بوڑھے سکھ رکشہ ڈرائیور سے پتا مل گیا اور اس کے کہنے پر ایک اور رکشہ ڈرائیور نے مجھے مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کے گھر پہنچا دیا۔ دروازے پر کھڑے مجھے ایک لمحہ کے لیے خیال آیا کہ تعارف تو ہے نہیں، اگر انہوں نے پہچاننے یا بطور مہمان قبول کرنے سے

انکار کر دیا تو پھر کیا کروں گا؟ یہ سوچتے ہوئے اللہ تعالی کا نام لے کر دروازے پر بیل دی اور تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا تو دیکھا کہ دروازہ کھولنے والے بزرگ مولانا محمد عمر لدھیانویؒ تھے۔ میری جان میں جان آئی، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا اور پھر گلے لگ گئے۔ وہ اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد یحیی لدھیانوی کے ہمراہ چچا کے گھر میں تھے اور اللہ تعالی نے انہیں میرے لیے رحمت کا فرشتہ بنا دیا تھا۔ بہر حال مولانا نے دو تین روز تک خوب مہمان نوازی کی اور پھر میں امرتسر کے راستے پاکستان واپس آ گیا۔

مولانا محمد عمر لدھیانویؒ سادہ منش بزرگ، انتھک کارکن، اور حمیت و غیرت سے بہرہ ور عالم دین تھے۔ ان کا جوش و جذبہ اور جہد و حرکت تحریکات کے دوران دیکھنے والی ہوتی تھی۔ وہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے صرف عقیدت مند نہیں تھے بلکہ ان کے مزاج اور ذوق کا بھی وافر حصہ رکھتے تھے اور انہیں دیکھ کر ان دو بزرگوں کی یاد تازہ ہو جایا کرتی تھی۔ ایثار و قناعت، سادگی، دینی حمیت، جرأت و حوصلہ کی صفات سے موصوف تحریکی کارکنوں کی یہ جنس اب نایاب ہوتی جا رہی ہے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے یہ شعر بے ساختہ نوک قلم پر آ رہا ہے کہ

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

آسمانی مذاہب میں قربانی کا تصور

(مرکزی عید گاہ اہل سنت، مبارک شاہ روڈ، گوجرانوالہ - ۲۸ نومبر ۲۰۰۹ء)

(مرکزی عید گاہ اہلسنت مبارک شاہ روڈ گوجرانوالہ میں نماز عید الاضحی کے اجتماع سے خطاب۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج عید کا دن ہے، قربانی کی عید جس میں دنیا بھر کے مسلمان اللہ تعالی کی بارگاہ میں نذرانہ پیش کرنے کے لیے جانور ذبح کرتے ہیں اور اللہ تعالی کی رضا کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ یہ قربانی نسل انسانی کے آغاز سے چلی آ رہی ہے، قرآن کریم نے سب سے پہلی قربانی کا حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ ان کا رشتے پر جھگڑا ہو گیا تھا، فیصلے کے لیے انہیں قربانی پیش کرنے کو کہا

گیا، دونوں نے قربانی پیش کی، ایک کی قبول ہوئی جو اس کے حق میں فیصلے کی علامت تھی، لیکن دوسرے نے غصے اور انتقام میں بھائی کو قتل کر دیا۔

اس دور میں قربانی کی قبولیت کی علامت یہ ہوتی تھی کہ قربانی، خواہ جانور کی صورت ہو میں یا کسی اور شکل میں، اسے میدان میں رکھ دیا جاتا تھا، آسمان سے آگ آکر اسے جلا دیتی تھی، جو اس قربانی کے قبول ہو جانے کی علامت ہوتی تھی۔ آسمانی آگ سے جل جانے والی یہ قربانی موسی علیہ السلام کی شریعت میں بھی تھی جس کا ذکر بائبل میں ''سوختنی قربانی'' کے نام سے موجود ہے، اور قرآن کریم میں بھی اس حوالہ سے اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب یہود مدینہ نے جناب نبی اکرمؐ سے کہا کہ وہ کسی رسول پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک وہ ''حتی یاتینا بقربان تاکلہ النار'' (سورہ آل عمران ۱۸۳) ایسی قربانی نہ پیش کر دے جسے آگ جلا ڈالے۔ یہ وہی سوختنی قربانی ہے جو بنی اسرائیل میں رائج تھی اور اسی کا جناب نبی اکرمؐ سے مدینہ منورہ کے یہودیوں نے تقاضا کیا تھا۔ اس کا جواب قرآن کریم نے یہودیوں کو یہ دیا کہ پھر تم نے بنی اسرائیل کے ان انبیاء اکرام علیہم السلام کو کیوں قتل کر دیا تھا؟ جو دیگر واضح دلائل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تمہارے کہنے کے مطابق سوختنی قربانی بھی پیش کر چکے تھے۔

یہاں یہ بات عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قربانی کی تاریخ بہت پرانی ہے، اس کا ذکر حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کے حوالہ سے ملتا ہے، بنی اسرائیل کے حوالہ سے بھی موجود ہے، اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا تو قرآن کریم نے اہتمام اور تفصیل کے ساتھ کیا ہے کہ انہوں نے جب خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں تو اسے حکم خداوندی سمجھتے ہوئے اس کے لیے تیار ہو گئے۔ اللہ تعالی کے نبی کا خواب وحی ہوتا ہے، حجت ہوتا ہے اور دلیل ہوتا ہے۔ یہ ہمارے آپ کے خواب کی بات نہیں کہ کبھی سچا بھی ہو جاتا ہے مگر اکثر غلط ہی ہوتا ہے اسی لیے وہ حجت اور دلیل نہیں ہے۔ جبکہ پیغمبر کے خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور جیسے پیغمبر پر بیداری میں نازل ہونے والی بات وحی ہوتی ہے اسی طرح خواب میں ہونے والا اشارہ بھی وحی کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ خواب اپنے جواں سال اور اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بتایا تو وہ بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ یہ پیغمبر کا خواب ہے اس لیے

کسی تردد اور تذبذب کے بغیر تیار ہو گئے۔ کوئی تفصیل نہیں پوچھی، کوئی وجہ دریافت نہیں کی، بے ساختہ جواب دیا ''یا أبت افعل ما تؤمر'' (سورہ الصافات ۱۰۲) ابا جان جو حکم ہوا ہے کر گزریے، مجھے آپ صبر و حوصلہ کے ساتھ تعمیل کرنے والا پائیں گے۔ ''فلما اسلما وتلہ للجبین'' (الصافات ۱۰۳) دونوں یعنی باپ بیٹا اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھک گئے اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا۔ باپ نے اپنی طرف سے ذبح کر دیا اور بیٹا اپنے تئیں ذبح ہو گیا، مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، آواز آئی ''قد صدقت الرؤیا'' (الصافات ۱۰۵) اے ابراہیم! آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ یہ آزمائش تھی جس میں پورا اترنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کی زندگی بھی بچا لی اور باپ بیٹے کو قربانی کی قبولیت کا پروانہ بھی دے دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو ذبح عظیم سے نوازا اور ''وترکنا علیہ فی الآخرین'' (الصافات ۱۰۸) ہم نے اس سنت پر بعد والوں کو قائم کر دیا۔

اسی لیے جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ''ما ھذہ الأضاحی یا رسول اللہ؟'' یا رسول اللہ یہ قربانی کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ ''سنۃ ابیکم ابراہیم'' تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ نبی اکرمؐ نے اسے حضرت ابراہیمؑ کی سنت بھی فرمایا اور خود اپنی سنت سے بھی تعبیر کیا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے عید کی نماز ادا کرنے کے بعد قربانی کی ''فقد أصاب سنتنا'' اس نے ہماری سنت کو پا لیا۔ اس لیے قربانی حضرت ابراہیمؑ کی سنت بھی ہے اور جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ بھی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے دس سال مدینہ منورہ میں قیام فرمایا اور ہر سال قربانی کرتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ ہر سال دو مینڈھے قربانی کیا کرتے تھے اور میں بھی دو مینڈھے قربانی دیتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ قربانی میں دو مینڈھے ذبح کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ایک جانور اپنی طرف سے قربان کر رہا ہوں اور دوسرا اپنی امت کے ان افراد کی طرف سے ذبح کر رہا ہوں جو قربانی نہیں کر سکیں گے۔ یہاں ایک فرق ذہن میں رکھیں کہ نبی اکرمؐ نے قربانی امت کے ان افراد کی طرف سے کی ہے جو قربانی نہیں کر سکیں گے اور اس کی استطاعت نہیں رکھتے ہوں گے، ان کی طرف سے نہیں کی جو استطاعت رکھتے ہوئے بھی قربانی نہیں کریں گے۔ ان کے بارے میں الگ حکم بیان فرمایا کہ ''من وجد سعۃ ولم یضح فلا یقربن مصلانا''

جس نے قربانی کی استطاعت پائی اور قربانی نہیں کی وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے۔ یہ لا تعلقی ہے اور برأت کا اظہار ہے ان لوگوں سے جو استطاعت رکھتے ہوئے بھی قربانی نہیں کریں گے۔ البتہ جو لوگ استطاعت نہیں رکھتے ہوں گے اور ناداری کی وجہ سے قربانی نہیں کر سکیں گے انہیں بھی محروم نہیں رکھا اور فرمایا کہ ان کی طرف سے میں قربانی کر کے جا رہا ہوں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اپنی قدر و قیمت اور عظمت کے اعتبار سے کون سی قربانی بڑی ہے؟ ان کی قربانی جو خود قربانی کر رہے ہیں یا ان کی قربانی جن کی طرف سے نبی اکرمؐ نے قربانی کی تھی، میرا ایمان ہے کہ نبی اکرمؐ کی ایک قربانی پوری امت کے لیے کافی ہے اور نبی اکرمؐ کے مبارک ہاتھوں سے کی جانے والی قربانی کی طرف نسبت بھی ایک مسلمان کے لیے باعث سعادت و نجات ہے۔

بہر حال نبی اکرمؐ نے خود قربانی کی ہے اور امت کو قربانی کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ عید الاضحی کے موقع پر جناب نبی اکرمؐ نے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ میرے سپرد کیا اور فرمایا کہ اسے میرے صحابہ میں قربانی کے لیے تقسیم کر دو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ دو جانور عید قربان پر ذبح کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھے نبی اکرمؐ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کی طرف سے بھی قربانی دیا کروں اس لیے میں ایک جانور آپؐ کی طرف سے ذبح کیا کرتا ہوں۔

آج کل بعض لوگوں کی طرف سے یہ شوشہ چھوڑا جاتا ہے کہ قربانی صرف اس لیے تھی کہ حج کے موقع پر منیٰ میں حاجیوں کی بڑی تعداد جمع ہو جاتی ہے، ان کی مہمان نوازی کے لیے کچھ جانور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن یہ بہت بڑا مغالطہ ہے، اس لیے کہ میں نے آپ کے سامنے قربانی کے بارے میں جتنی روایات کا ذکر کیا ہے ان سب کا تعلق مدینہ منورہ سے ہے اور یہ ساری قربانیاں مدینہ منورہ میں ہوئی ہیں، کوفہ میں ہوئی ہیں، اور بصرہ میں ہوتی رہی ہیں۔

قربانی کے بارے میں ایک مغالطہ اور بھی دیا جاتا ہے کہ قربانی کے لیے جانور ذبح کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کی بجائے نقد رقم خرچ کر کے بھی یہ ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے اور قربانی کا مقصد پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی قطعی طور پر غلط ہے اس لیے کہ قربانی عبادت ہے اور کسی عبادت کی جو صورت جناب نبی اکرمؐ نے متعیّن فرما دی ہے وہ اسی صورت میں ادا ہو گی تو عبادت شمار ہو گی ورنہ نہیں ہو گی۔ مثلاً فجر کی نماز میں دو رکعت فرض ہیں جو ایک خاص

کیفیت میں ادا کی جاتی ہیں، کوئی صاحب ان کی بجائے فجر کا سارا وقت قرآن کریم کی تلاوت میں گزار دیں اور کہیں کہ میں نے عبادت ہی تو کی ہے بلکہ زیادہ وقت صرف کیا ہے، تو ان کی دو گھنٹے تلاوت آٹھ دس منٹ میں پڑھی جانے والی دو رکعتوں کا متبادل نہیں ہوگی، اور وہ فرض نماز کے تارک متصور ہوں گے۔ اسی طرح اگر کسی شخص پر حج فرض ہو گیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں حج پر دو لاکھ روپے خرچ کرنے کی بجائے دس لاکھ روپے کسی مسجد پر لگا دیتا ہوں، تو دس لاکھ نہیں بلکہ دس کروڑ لگا کر اگر وہ انتہائی خوبصورت اور وسیع مسجد تعمیر کر دے تب بھی یہ اس کے حج کا متبادل نہیں ہو گا، اور وہ شخص فریضۂ حج کے ترک کا مرتکب قرار پائے گا۔ اسی طرح قربانی اسی صورت میں قبول ہوگی جس شکل میں جناب نبی اکرمؐ نے اس کا حکم دیا ہے، اس سے ہٹ کر اس کی جگہ دس گنا رقم بھی خرچ کر دی جائے تو وہ قربانی متصور نہیں ہوگی۔ میں اس پر بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا، اس روایت کی تفصیل سن کر خود آپ لوگ فیصلہ کر لیں کہ قربانی کس شکل میں قبول ہوتی ہے اور کس صورت میں قبول نہیں ہوتی۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے ایک بار عید الاضحی کے خطبہ میں فرمایا کہ قربانی کے دن کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے عید کی نماز ادا کی جائے اور اس کے بعد قربانی کی جائے، جس نے نماز سے پہلے قربانی کی ہے اس کی قربانی نہیں ہوئی اور اسے دوبارہ قربانی کرنا ہوگی۔ یہ سن کر ایک صحابی حضرت ابو بردہ بن نیارؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو نماز کے لیے گھر سے روانہ ہونے سے قبل قربانی کی نیت سے جانور ذبح کر کے آیا ہوں۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ وہ عام گوشت کی طرح ہے جو تم نے اپنے گھر والوں کو کھلایا ہے، اس کی جگہ تمہیں دوسرا جانور ذبح کرنا ہو گا۔ حضرت ابو بردہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں مگر میرے پاس اب ایک جانور ہے جو عمر میں کم ہے اور قربانی کے لیے عمر کی شرط پوری نہیں کرتا، کیا میں اسے ذبح کر سکتا ہوں؟ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ تمہیں بطور خاص اس کی اجازت دے رہا ہوں تم اس کم عمر والے جانور کو ذبح کر سکتے ہو، لیکن تمہارے علاوہ کسی اور کو یہ رعایت حاصل نہیں ہوگی۔

اس روایت سے دو باتیں بالکل واضح ہیں (۱) ایک یہ کہ قربانی میں جانور ہی ذبح کرنا ہے (۲) اور دوسری یہ کہ جانور بھی عمر اور وقت کی شرط کے مطابق ذبح ہو گا تو قربانی ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔ اس لیے میں آپ سب حضرات سے عرض کرتا ہوں کہ قربانی سنت کے

مطابق اور جناب نبی اکرمؐ کی ہدایات کے مطابق ادا کریں اور آج کل کے ''زیادہ پڑھے لکھے'' لوگوں کی باتوں کی طرف نہ جائیں جو خود بھی کنفیوژڈ ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو بھی کنفیوژن کا شکار کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

قربانی کے حوالہ سے ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ قربانی کا ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور وہ انسان کا خلوص اور اس کی نیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں تمہارے جانور کے گوشت اور خون سے کوئی غرض نہیں ہے ''ولکن ینالہ التقوی منکم'' (سورہ الحج ۳۷) اللہ تعالیٰ کے پاس تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے یعنی تمہاری نیت اور خلوص کا اعتبار ہوتا ہے۔ یہ تو قربانی کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور یہ خدا اور اس کے بندے کا معاملہ ہے، جبکہ قربانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی مہمانی ہے، یعنی کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ ذریعہ بناتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندے بن کر اس کے بندوں کو ان دنوں میں کھلائیں پلائیں۔ گویا قربانی کرنے والے کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے کارندے کی ہے اور یہ بہت بڑی سعادت اور خوش بختی کی بات ہے۔ اس لیے اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے کہ اپنے محلہ میں، برادری میں اور اردگرد کے ماحول پر نظر رکھیں کہ کوئی شخص اس سے محروم نہ رہ جائے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک بار عید الاضحی کے موقع پر کچھ قبائل کے مفلوک الحال لوگ مدینہ منورہ آئے ہوتے تھے، ان کی رعایت کرتے ہوئے جناب نبی اکرمؐ نے عید کے خطبے میں اعلان فرما دیا کہ کسی شخص کے گھر میں تیسرے دن کے بعد گوشت کا کوئی حصہ باقی نہ رہے۔ مقصد یہ تھا کہ قربانی کے گوشت کو بچا کر نہ رکھا جائے بلکہ سارے کا سارا لوگوں کو کھلا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور کسی صحابی نے گوشت کی ایک بوٹی بھی تین دن کے بعد گھر میں بچا کر نہ رکھی۔ اگلے سال عید الاضحی کے موقع پر صحابہ کرامؓ نے نبی اکرمؐ سے دریافت کیا کہ کیا تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت گھر میں نہ رکھنے کا حکم اب بھی باقی ہے یا وہ صرف گزشتہ سال کے لیے تھا؟ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ وہ حکم صرف گزشتہ سال کے لیے تھا، اب تم گوشت کھا بھی سکتے ہو اور ذخیرہ بھی کر سکتے ہو۔ اتفاق سے حضرت ابو سعید خدریؓ کو یہ دوسرا حکم معلوم نہیں تھا، وہ سفر پر تھے، واپس آئے تو گھر والوں نے کھانے میں گوشت پیش کیا اور بتایا کہ قربانی کا گوشت ہم نے بچا کر رکھا ہوا تھا، انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک نبی اکرمؐ سے خود نہ پوچھ لوں میں یہ گوشت نہیں کھاؤں

گا۔ نبی اکرمؐ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ پابندی والا حکم صرف گزشتہ سال کے لیے تھا کہ اس موقع پر کچھ مفلوک الحال اور نادار لوگ آئے ہوئے تھے ان کی وجہ سے میں نے یہ پابندی لگا دی تھی، اور اس سال میں نے اجازت دے دی ہے کہ قربانی کا گوشت کھا سکتے ہو اور ذخیرہ بھی کر سکتے ہو۔

اس روایت کے حوالہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چند مفلوک الحال لوگوں کے مدینہ منورہ آنے کی وجہ سے نبی اکرمؐ نے تین دن سے زیادہ گوشت گھر میں رکھنے پر پابندی لگا دی تھی تو آج بھی ہمیں ارد گرد ضرور دیکھنا چاہیے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جنہیں ہفتہ میں ایک بار بھی گوشت نصیب نہیں ہوتا اور کتنے ایسے ہیں جن کو پورا پورا مہینہ گوشت کی بوٹی دیکھنا نصیب نہیں ہوتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ گوشت بالکل ذخیرہ نہ کریں، شوق سے ایسا کریں لیکن اپنے ارد گرد کے قبیلہ برادری کے اور گلی محلے کے ان لوگوں کو بھی یاد رکھیں جنہیں مہینوں گوشت کھانے کو نہیں میسر آتا۔ یہ قربانی کا معاشرتی پہلو ہے اور سوسائٹی کی ضروریات سے اس عبادت کا عملی تعلق ہے جس کا ہمیں ضرور لحاظ رکھنا چاہیے۔

میں آج کے اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قربانی کے ایک اور پہلو کی طرف بھی آپ حضرات کو متوجہ کرنا چاہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، لیکن آج ہمارا حال کیا ہے؟ ہماری قربانیاں کس کے لیے ہیں؟ قربانیاں ہم بھی دے رہے ہیں لیکن کن چیزوں کی قربانیاں دے رہے ہیں؟ ہمارا قومی المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے ایمان کی قربانی دے رہے ہیں، عقیدہ کی قربانی دے رہے ہیں، ثقافت کی قربانی دے رہے ہیں، ملکی سالمیت کی قربانی دے رہے ہیں، عوام کے جان ومال کی قربانی دے رہے ہیں، قومی حمیت اور ملی غیرت کی قربانی دے رہے ہیں، اور قومی وحدت اور خود مختاری کی قربانی دے رہے ہیں۔ کس کے لیے؟ امریکہ کے لیے، ایک عالمی قوت کو خوش کرنے کے لیے اور ایک استعماری قوت کو راضی رکھنے کے لیے ہم نے اپنی زندگی اور موت کے فیصلے بھی امریکی استعمار کے سپرد کر دیے ہیں کہ وہ جسے چاہے زندہ رہنے دے اور جسے چاہے ڈرون حملوں کے ذریعے موت کی نیند سلا دے۔ ہمارے قومی فیصلے اور پالیسی کے معاملات اسلام آباد میں نہیں واشنگٹن میں ہو رہے ہیں، اور ہمارے حکمران روبوٹ کی طرح ان احکام کی تعمیل کیے جا رہے ہیں۔

ہمارا حال یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام ہمارے سامنے ہیں مگر ہماری ان کی طرف توجہ نہیں ہے، جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات شب و روز ہم سنتے ہیں مگر ہمارے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن رات دو بجے امریکہ کا حکم آجائے تو ہم اڑھائی بجے تک اس پر عمل کر کے اس کی رپورٹ بھی دے چکے ہوتے ہیں، ہمیں اسی کی سزا مل رہی ہے اور ایک اللہ کے سامنے سرنڈر نہ ہونے کے نتیجے میں خدا جانے کون کون سے دروازے پر ناک رگڑنا پڑ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ کتاب اللہ کے فیصلوں سے انحراف کرنے والوں پر ہم دنیا میں رسوائی اور ذلت مسلط کر دیتے ہیں، ہماری صورتحال آج کل یہی ہے کہ ہم نے شریعت پر عملدرآمد سے انکار کیا، قرآن و سنت کی بالادستی سے منہ موڑا، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکام و قوانین سے اعراض کیا، تو ہر طرف سے ہم پر ذلت اور رسوائی مسلط ہے اور عزت و وقار کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا۔ قربانی ہمیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ قربانی اللہ تعالیٰ کے لیے دنیا کو قربان کرنے کا نام ہے، دنیا کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے کا نام نہیں ہے۔ دنیا کی خاطر دین کی قربانی اور دنیا والوں کی خاطر اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسولؐ کی شریعت اور احکام کی قربانی سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔

آج بھی اگر ہم اللہ کے در پر جھک جائیں، جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات و تعلیمات کے سامنے جھک جائیں، اور شریعت اسلامیہ کے سامنے سرنڈر ہو جائیں، تو ساری صورتحال بدل سکتی ہے، اس دلدل سے نجات مل سکتی ہے، اور ہم قومی طور پر عزت و وقار کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے اجتماعی طور پر توبہ و استغفار کی ضرورت ہے، ملی حمیت و غیرت کو جگانے کی ضرورت ہے، اور عوامی سطح پر بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

الطاف حسین اور سلمان تاثیر کے بیانات پر ایک نظر

(چناب نگر، چنیوٹ - ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۹ء)

(۱۵ و ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو چناب نگر میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام

امیر مرکزیہ حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب دامت برکاتہم کی زیر صدارت منعقد ہونے والی دو روزہ سالانہ ختم نبوت کانفرنس سے خطاب۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد و الصلاۃ۔ میرے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ تحفظ عقیدۂ ختم نبوت کے مقدس مقصد کے لیے منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں شریک ہوں، اور اس سے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ تحریک ختم نبوت کے قافلہ سالار حضرت مولانا خواجہ خان محمد دامت برکاتہم کو کئی برسوں کے بعد اس سٹیج پر دیکھ رہا ہوں اور ان کی زیارت کر رہا ہوں، وہ ہمارے بزرگ ہیں، مخدوم ہیں، اور اس محاذ پر ہمارے قائد ہیں، ایک عرصہ سے صاحب فراش ہیں، اللہ تعالی انہیں صحت کاملہ وعاجلہ سے نوازیں اور صحت وعافیت کے ساتھ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھیں، آمین یارب العالمین۔

میں آج آپ حضرات کی وساطت سے جناب الطاف حسین (قائد ایم کیو ایم) اور جناب سلمان تاثیر (گورنر پنجاب) سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے گزشتہ دنوں (۱) تحفظ ناموس رسالتؐ کے قانون، (۲) قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے، (۳) اور اسلام کے نام پر انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ سے روکنے کے قوانین پر اعتراض کیا ہے اور ان قوانین کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق تحفظ ناموس رسالتؐ اور امتناع قادیانیت کے قوانین کے بارے میں اس وقت عالمی سطح پر لابنگ ہو رہی ہے اور بین الاقوامی لابیاں حدود آرڈیننس کی طرح ان دو قوانین کو ختم کرانے کے لیے بھی پوری طرح متحرک ہیں۔ پارلیمنٹ کی قائم کردہ خصوصی کمیٹی اس وقت ملک کے دستور کا عمومی جائزہ لے رہی ہے، اس پر شق وار غور کیا جا رہا ہے، اور ترامیم تجویز کی جا رہی ہیں۔ گویا پورے دستور کی ''اوورہالنگ'' ہونے جا رہی ہے کیونکہ مختلف حلقوں کی طرف سے دستور میں متعدّد ترامیم تجویز کی گئی ہیں، جن میں تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے قوانین کے ساتھ ساتھ قرارداد مقاصد کو دستور کا حصہ بنانے والی دفعہ اور دیگر اسلامی دفعات بھی شامل ہیں، جبکہ سیکولر حلقوں کی مسلسل کوشش ہے کہ اسلامی دفعات کو دستور سے نکال دیا جائے یا کم از کم غیر مؤثر بنا دیا جائے۔ میں ان میں سے دو مسئلوں یعنی تحفظ ناموس رسالتؐ اور تحفظ عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ ان قوانین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی حقوق کے منافی ہیں، امتیازی قوانین ہیں، ان کا استعمال غلط ہو رہا ہے اور ان قوانین کو باہمی دشمنیوں اور انتقامی کارروائیوں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے،

اس لیے ان قوانین کو ختم کیا جانا چاہیے۔ اور ہمارے دو اہم سیاسی، راہنماؤں جناب الطاف حسین اور جناب سلمان تاثیر نے بھی اسی قسم کی باتیں کہی ہیں۔

جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے میں آج تک نہیں سمجھ پایا کہ جناب نبی اکرمؐ یا دیگر انبیاء کرام علیہم السلام یا قرآن کریم یا مذہبی شعائر کی توہین کو جرم قرار دینے اور اس پر سزا مقرر کرنے کا انسانی حقوق کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ کیا اللہ تعالی کے رسولؐ، قرآن کریم یا مذہب کی توہین اب حقوق میں شامل ہوگئی ہے؟ کل تک تو یہ جرائم میں شمار ہوتی تھی، اب بھی کسی عام شخص کی توہین کو جرم سمجھا جاتا ہے، ملک کے کسی بھی شہری کی توہین قانونا جرم ہے، ہر شخص کو اپنی توہین پر عدالت سے رجوع کا حق حاصل ہے اور قانون اسے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ایک عام شہری کی توہین تو قانونا جرم ہے، کیا نعوذ باللہ جناب نبی اکرمؐ کی توہین جرم نہیں ہے؟ اور اگر ایک عام شہری کی بلاوجہ توہین پر سزا دی جا سکتی ہے تو جناب نبی اکرمؐ کی توہین پر سزا کیوں نہیں دی جا سکتی؟ دنیا کے ہر ملک کی طرح ہمارے ملک میں ایک قانون موجود ہے جسے ''ازالۂ حیثیت عرفی'' کا قانون کہتے ہیں۔ میں اس معاشرے میں رہتا ہوں میں ایک عرفی حیثیت اور اس سوسائٹی میں میرا ایک سٹیٹس ہے جس کے تحفظ کا مجھے قانونا حق حاصل ہے۔ کوئی شخص اگر میری اس عرفی حیثیت اور اسٹیٹس کو مجروح کرتا ہے تو مجھے حق ہے کہ میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں اور قانون اس بات کے لیے مجھے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ میں تحفظ ناموس رسالتؐ کے قانون کو انسانی حقوق کے منافی قرار دینے والوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی حیثیت عرفی تو ہے، میری بھی ایک حیثیت عرفی ہے جسے مجروح کرنے کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے، تو کیا نعوذ باللہ جناب نبی اکرمؐ کی کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے جسے مجروح کرنا جرم ہو اور اس پر سزا دی جا سکے؟

آج کوئی شخص کسی پولیس مین کی وردی کی توہین کرے یا اس کے کندھے پر لگے ہوئے سٹار کی توہین کرے تو یہ جرم ہے، کسی فوجی کی وردی کی توہین جرم ہے اور اس کے سٹار کی توہین جرم ہے، قومی پرچم کی توہین جرم ہے، قائد اعظمؒ کی توہین جرم ہے، قومی علامتوں کی توہین جرم ہے اور ان پر باقاعدہ سزائیں مقرر ہیں، تو کیا قرآن کریم، جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی اور اسلام کے مذہبی شعائر کی توہین نعوذ باللہ جرم نہیں ہے؟ اور ان پر کسی کو سزا دینا

امتیازی قانون اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کیسے قرار پا جاتا ہے؟ میں اہل دانش کو سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کی دعوت دیتا ہوں۔

ان قوانین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا عام طور پر غلط استعمال ہوتا ہے اور ان قوانین کو مختلف گروہ اور طبقات ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور انتقام لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں، جبکہ توہین رسالتؐ کی سزا موت ہے اور یہ سخت ترین سزا ہے اس لیے اسے ختم ہونا چاہیے۔ میں ان دوستوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کسی قانون کا غلط استعمال اس کو ختم کرنے کی دلیل بن جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پاکستان میں کوئی قانون باقی نہیں رہنا چاہیے اس لیے کہ ہمارے ہاں کم و بیش ہر قانون کا غلط استعمال ہوتا ہے، یہ ہمارا غلط معاشرتی رویہ ہے جس کی اصلاح کے لیے معاشرتی اصلاح کی تحریک کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں قتل کے جرم کی سزا بھی موت ہے اور اس کے لیے دفعہ ۳۰۲ کا قانون نافذ ہے، میرا سوال یہ ہے کہ کیا ملک بھر میں موت کی سنگین سزا والے اس قانون کا غلط استعمال نہیں ہوتا؟ اس دفعہ کے تحت ملک بھر کے قانون میں درج مقدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس کی صورتحال بھی یہ ہے کہ لوگ اسے انتقامی کارروائیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں، اس میں غلط نام لکھوائے جاتے ہیں، مخالفین کو خواہ مخواہ اس میں پھنسا دیا جاتا ہے اور محتاط اندازے کے مطابق اس دفعہ کا پچاس فی صد بھی صحیح استعمال نہیں ہو رہا، تو موت کی سنگین سزا اور قانون کے غلط استعمال کا بہانہ بنا کر اس قانون کو ختم کر دیا جائے گا؟

میرا ان دوستوں سے سوال یہ ہے کہ پاکستان کے کون سے قانون کا غلط استعمال نہیں ہو رہا؟ اور قانون تو قانون ہے کیا دستور کا غلط استعمال نہیں ہو رہا؟ غریب دستور کا حال تو یہ ہے کہ جس طاقتور کا جی چاہتا ہے اس کی ناک اور کان مروڑ دیتا ہے تو کیا پاکستان سے دستور اور تمام قوانین کی چھٹی کرا دی جائے گی؟

قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور اسلام کے نام پر جھوٹے مذہب کی اشاعت سے روکنے کے قوانین کے بارے میں عام طور پر دو مغالطے پائے جاتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ الطاف حسین صاحب بھی انہی دو مغالطوں کا شکار ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ قادیانی مسئلہ بھی مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی طرح کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ ہے، (۲) اور دوسرا یہ کہ چلو وہ کافر ہی سہی مگر ان کے شہری حقوق تو ہیں اور مذہبی حقوق تو ہیں، انہیں ان حقوق سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے؟ میں ان دونوں مغالطوں کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

1. پہلی بات یہ کہ قادیانیوں کا مسئلہ مسلمانوں کے باہمی فرقوں کے اختلافات کی طرح کا نہیں ہے، مسلمانوں کے باہمی اختلافات بہت ہیں، مگر ان میں سے کوئی فرقہ کسی نئ وحی کی بات نہیں کرتا، کسی نئے نبی کی بات نہیں کرتا، اور کسی بھی مسئلہ میں اپنی آخری دلیل قرآن کریم سے اور جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات سے پیش کرتا ہے۔ جبکہ قادیانی گروہ نئ وحی کا قائل ہے اور نئے نبی کی بات کرتا ہے، ان کے نزدیک کسی بھی مسئلہ میں آخری دلیل اور اتھارٹی مرزاغلام احمد قادیانی ہیں۔ اور یہ مذاہب کا طے شدہ اصول ہے کہ وحی بدل جائے، نبی بدل جائے اور دلیل کی حتمی اتھارٹی بدل جائے تو مذہب تبدیل ہو جاتا ہے، نئ وحی نئے اور نئ اتھارٹی کے ساتھ نیا مذہب وجود میں آتا ہے۔ اس لیے قادیانیوں کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں ہے بلکہ الگ اور مستقل مذہب کا ہے، اور قادیانی گروہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے ایک الگ مذہب رکھتا ہے، اس لیے اس کے ساتھ ایک الگ مذہب کے طور پر ہی معاملات طے کیے جائیں گے۔

2. دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ چلو قادیانی کافر ہی سہی مگر ان کے مذہبی اور شہری حقوق سے کیوں انکار کیا جا رہا ہے؟ اور انہیں ان کے جائز حقوق کیوں نہیں دیے جا رہے؟ الطاف حسین نے اسی حوالہ سے قادیانیوں کو مظلوم قرار دیا ہے اور ان کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ میری گزارش یہ ہے کہ یہ بہت بڑا مغالطہ اور دھوکہ ہے جس کا جال پوری دنیا میں قادیانیوں نے پھیلا رکھا ہے اور وہ عالمی سطح پر بھی دنیا کو یہی فریب دے رہے ہیں۔ جبکہ اصل مسئلہ حقوق کا نہیں بلکہ حقوق کے ٹائیٹل کا ہے، ہمیں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر قادیانیوں کے شہری اور مذہبی حقوق سے کوئی انکار نہیں ہے، جب ہم ہندوؤں کے مذہبی حقوق سے انکار نہیں کرتے، عیسائیوں کے مذہبی حقوق پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، اور سکھوں کی مذہبی سرگرمیوں پر ہم معترض نہیں ہوتے تو قادیانیوں کے جائز مذہبی حقوق سے ہم کیوں انکار کریں گے؟ ہمارے معاشرے میں عیسائی، ہندو، سکھ اور دوسرے مذاہب کے لوگ اپنی

مذہبی سرگرمیاں دن رات جاری رکھے ہوئے ہیں اور بسا اوقات اپنی حدود سے تجاوز بھی کر جاتے ہیں مگر ہم نے کبھی مزاحمت نہیں کی۔
قادیانی بھی ان مذاہب کی طرح اپنی مذہبی سرگرمیاں جائز حدود میں کرنا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن قادیانی اس معروضی حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہے کہ وہ مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار ہیں۔ وہ نہ دستور اور پارلیمنٹ کا فیصلہ مان رہے ہیں، نہ عدالت عظمیٰ کے فیصلے کو تسلیم کر رہے ہیں، اور نہ ہی پوری دنیا کی امت مسلمہ کے اجماعی فیصلوں کو قبول کر رہے ہیں۔ اور وہ ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر حقوق طلب کرنے کی بجائے مسلم اکثریت والے حقوق کا تقاضہ کر رہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور پاکستان کی باقی ساری آبادی کافر ہے اس لیے مسلمانوں والے حقوق انہیں الاٹ کر دیے جائیں۔ وہ مسلم اکثریت کے حقوق کے طلبگار ہیں جو کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ آخر میں اپنے نام پر کسی اور کو کاروبار کا حق کیسے دے سکتا ہوں؟ کوئی شخص میرے نام پر کمیٹی بنائے، دوکان کھولے یا کوئی ادارہ قائم کرے تو میں کبھی اسے برداشت نہیں کروں گا، جب میں اپنے نام پر کسی اور کو کاروبار کرنے کا حق نہیں دیتا تو اپنے نام پر کسی کو نیا مذہب بنانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں، یہ کل بھی ممکن نہیں تھا، آج بھی ممکن نہیں ہے اور قیامت تک ممکن نہیں ہوگا۔

الطاف حسین نوٹ کر لیں، سلمان تاثیر بھی اس حقیقت کو سمجھ لیں، اور قادیانی حضرات بھی اس معروضی حقیقت کا اچھی طرح ادراک کر لیں کہ اصل مسئلہ ان کے حقوق کا نہیں بلکہ حقوق کے ٹائیٹل کا ہے۔ ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر ان کے سارے جائز حقوق تسلیم ہیں اور ان کا مکمل احترام کیا جائے گا لیکن مسلمانوں کے نام پر اور اسلام کے ٹائیٹل کے ساتھ ہم ان کے کسی حق کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا کہ وہ مسلمان کہلا کر اس ملک میں حقوق حاصل کر سکیں۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بخاری شریف کے امتیازات۔ حدیث شریف کی طالبات سے ایک خطاب

(جامعہ تعلیم القرآن للبنات، گوجرانوالہ - ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۹ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ سب سے پہلے ان طالبات کو جو آج دورۂ حدیث شریف اور بخاری شریف کے سبق کا آغاز کر رہی ہیں اس تعلیمی پیشرفت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں علم حدیث کا ذوق عطا فرمائیں، فہم نصیب کریں، عمل کی توفیق اور خدمت کے مواقع سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔ آپ نے اس سے قبل حدیث نبویؐ کی بعض کتابیں پڑھی ہیں اور اس سال بھی بخاری شریف کے ساتھ ساتھ دیگر کتابیں آپ پڑھیں گی لیکن میں آپ کو بخاری شریف کی اہمیت اور اس کی چند خصوصیات و امتیازات کی طرف توجہ دلانا چاہا ہوں تاکہ پڑھنے کے دوران آپ کی ان پر نظر رہے اور اس عظیم کتاب سے آپ زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔

• بخاری شریف کی ایک خصوصیت اس کی جامعیت ہے جس کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے اس کتاب میں فقہ و احکام فقہ، سیر و مغازی، تفسیر، وجدانیات و روحانیات اور اخلاق و آداب کے مختلف شعبوں کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایمان و عقائد کی روایات کو بھی کتاب کا حصہ بنایا ہے اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کسی نہ کسی عنوان کے ساتھ امام بخاریؒ نے روایات پیش نہیں کیں۔ چنانچہ محدثین کی اصطلاح میں ”الجامع“ اسی کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں صرف احکام کی روایات نہ ہوں بلکہ ایمانیات، تفسیر، اخلاقیات اور دیگر ضروری شعبوں کی روایات و ابواب بھی اس کا حصہ ہوں اور اس حوالہ سے بخاری شریف کو صحیح معنوں میں ”الجامع“ کا مقام حاصل ہے۔

• بخاری شریف کا دوسرا امتیاز اس کا صحت کا معیار ہے۔ امام بخاریؒ نے روایت کو قبول کرنے کے لیے اس کے مسند اور مرفوع ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی صحت کی ایسی شرائط قائم کی ہیں اور ان کی پابندی کا اہتمام کیا ہے جس

نے جمہور محدثین کے ہاں بخاری شریف کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کا درجہ دلا دیا ہے۔

• بخاری شریف کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف روایات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ فقہ و استنباط بھی اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ عام طور پر محدث کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ روایات اور اس کی سند پیش کرتا ہے اور حدیث کے درجہ سے بحث کرتا ہے، جبکہ حدیث سے کسی مسئلہ کا استنباط اور کسی حکم کے لیے اس سے استدلال فقیہ کا کام ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ یہ دونوں کام کرتے ہیں اور ایک روایت کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اور متعدّد جگہوں پر اسے درج کر کے بعض روایات سے انہوں نے درجنوں مسائل نکالے ہیں۔ امام بخاریؒ محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، مفسر بھی ہیں، مؤرخ بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ متکلّم بھی ہیں۔ وہ چونکہ مؤرخ بھی ہیں اس لیے تاریخی روایات ان کے ہاں سب سے زیادہ ملتی ہیں۔ انہوں نے مغازی کا ذکر جس تفصیل کے اور ذوق کے ساتھ کیا ہے وہ آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا اور تاریخی اہمیت کی دیگر روایات مثلاً جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفہ کے طور پر حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب، پھر حضرت عمرؓ کا انتخاب، پھر حضرت عثمانؓ کا انتخاب، اور دیگر تاریخی اہمیت کے حامل واقعات امام بخاریؒ نے اہتمام کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

• بخاری شریف کی کتاب التفسیر بھی آپ کو حدیث کی دیگر بہت سی کتابوں سے ممتاز نظر آئے گی۔ وہ قرآنی آیات کی تفسیر روایات کے ساتھ تو کرتے ہی ہیں، ان کے الفاظ کی تشریح بھی کرتے ہیں اور لغوی بحث بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں امام بخاریؒ کے ذوق کے ایک پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہوں گا کہ وہ قرآن کریم کی کسی آیت کی تشریح میں پہلے قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت پیش کریں گے، اس کے ساتھ کوئی حدیث لائیں گے اور پھر صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے آثار و اقوال نقل کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ حدیث و سنت کے ساتھ ساتھ آثار صحابہ اور آثار تابعین بھی قرآن فہمی کا ایک اہم ذریعہ ہیں اور انہیں قرآن کریم کی تعبیر و تشریح میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

• میری طالب علمانہ رائے میں امام بخاریؒ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ وہ ایک متکلّم اور عقائد کے شارح کے طور پر محدثین کے ذوق کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ انہوں نے صرف ایمانیات و عقائد پیش نہیں کیے بلکہ ان کی تعبیر وتشریح بھی مستقل طور پر کی ہے۔ وہ بخاری شریف کے آغاز میں کتاب الایمان کے تحت ایمانیات و عقائد کی بات کرتے ہیں اور بخاری شریف کے اختتام پر عقائد کی تعبیر وتشریح سے بحث کرتے ہیں۔ اور دونوں جگہ ان کا انداز یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات پیش کرتے ہیں، احادیث پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ جہاں ضرورت پیش آتی ہے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے اقوال و آثار بھی پیش کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ یہ بتاتے اور سمجھاتے ہیں کہ جس طرح عقائد کا ماخذ قرآن کریم، سنت رسولؐ اور آثار صحابہؓ ہیں اسی طرح عقائد کی تعبیر وتشریح کی اساس بھی انہی تین امور پر ہے اور یہی اہل السنۃ والجماعۃ کی علمی اور فکری بنیاد ہے۔

• آج کے دور میں جبکہ فکری گمراہی کا چلن عام ہے اور یہ بات کھلے بندوں کہی جاتی ہے کہ عقیدہ صرف قرآن کریم سے لیں گے اور اس کی تعبیر وتشریح عقل عام (کامن سینس) کے ذریعے کریں گے، فکر و عقیدہ کی بہت سی گمراہیوں کی بنیاد اسی سوچ پر ہے۔ اس لیے میرے خیال میں بخاری شریف کی تعلیم و تدریس کے دوران امام بخاری کے اس اسلوب کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ایمان و عقیدہ ہو یا فقہ و احکام ہوں، ہمارے استدلال اور تعبیر وتشریح کا ماخذ قرآن و سنت اور آثار صحابہؓ ہیں اور کسی عقیدہ کا تعین اور اس کی تشریح وتعبیر ہم اسی دائرے میں کریں گے۔

• اسی طرح یہ بات بھی بخاری شریف پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے پیش نظر رہنی چاہیے کہ امام بخاریؒ کسی حدیث سے مسئلہ اور حکم کا استنباط کیسے کرتے ہیں۔ بخاری شریف میں عنوان کا حدیث کے ساتھ تعلق یہی ہوتا ہے جسے بخاری شریف کی مشکلات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس پر بھی بطور خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے اس لیے کہ استدلال سے فقہی ذوق پیدا ہوتا ہے اور فکرو

ذہن کو بلندی اور گہرائی دونوں نصیب ہوتی ہیں۔ اگر اس پہلو پر ضروری توجہ دی جائے تو قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کے صحیح فہم کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔

بخاری شریف میں میری اصل سند تو تعلیمی سند ہے جو والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے حوالہ سے ہے کہ میں نے بخاری شریف مکمل ان سے پڑھی ہے اور انہوں نے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور دیگر اساتذہ سے پڑھی ہے۔ یہ سند معروف ہے لیکن مجھے بحمد اللہ تعالیٰ دیگر بہت سے اکابر محدثین سے بھی روایت حدیث کی اجازت حاصل ہے جن میں الشیخ عبد الفتاح ابو غدہ، الشیخ عبد اللہ بن احمد الناخبی الحضرمی اور الشیخ سید ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ ان میں شیخ محمد یاسین فادانیؒ کی سند کے ساتھ میں آپ کے سامنے روایت پڑھوں گا، ایک تو اس لیے کہ اس میں واسطے کم ہیں اور دوسرا اس لیے کہ شیخ فادانی اپنے دور کی ایک عظیم محدثہ خاتون الشیخۃ امۃ اللہ محدثہ دہلویہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت شاہ عبد الغنی محدث دہلوی کی بیٹی اور شاگرد ہیں اور وہ اپنے والد محترم سے روایت کرتی ہیں۔ اس عظیم محدثہ خاتون کی نسبت سے میں طالبات کے سامنے عام طور پر اسی سند کے ساتھ روایت پڑھا کرتا ہوں تاکہ آپ طالبات بھی اس نسبت کی برکت میں شامل ہو جائیں۔

امام بخاریؒ ابتدا میں ''بدء الوحی'' کا باب لا کر یہ سبق دے رہے ہیں کہ ہمارے تمام معاملات کی بنیاد وحی پر ہے۔ عقیدہ و ایمانیات سے لے کر اخلاق و معاملات تک ہم ہر معاملہ میں وحی سے راہنمائی حاصل کریں گے۔ یہ بات آج کے دور میں جبکہ پوری دنیا آسمانی تعلیمات کو ماننے یا ان سے صاف انکار کرنے کے حوالہ سے دو واضح حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے، بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ ہم آج کے عالمی تناظر میں وحی الٰہی کے ساتھ اور آسمانی تعلیمات کے ساتھ اپنی دوٹوک وابستگی اور کمٹمنٹ کا اظہار کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز نیت والی روایت سے کیا ہے جس سے وہ یہ سبق دے رہے ہیں کہ اصل بات نیت ہے اور نیت پر ہی عمل کا مدار ہے۔ اگر نیت درست ہے تو اعمال بھی درست ہیں اور اگر خدانخواستہ نیت میں گڑبڑ ہے تو اعمال بھی اسی کے مطابق شمار ہوں گے۔ اس لیے ہمیں اس کار خیر کے آغاز سے پہلے اپنی نیتوں کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ ہم کس نیت اور غرض کے ساتھ یہ کام کر رہے ہیں اور اگر اس میں

کوئی جھول یا کجی ہو تو اسے درست کر لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیت کی اصلاح کے ساتھ صحیح عمل کا ذوق اور اس کی تکمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین ثم آمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۶ اکتوبر ۲۰۰۹ء)

ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں؟

(سلطان میرج ہال، پیپلز کالونی، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۹ء)

(سلطان میرج ہال پیپلز کالونی گوجرانوالہ میں ۲۷ روزہ ''تعلیم دین کورس'' کی آخری نشست سے خطاب۔)

بعد الحمد و الصلوۃ۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ گزشتہ سال میں نے اسی جگہ آپ کے اس کورس کی آخری نشست سے خطاب کرتے ہوئے اس موضوع پر گفتگو کی تھی کہ ''ہم سنی کیوں کہلاتے ہیں؟'' اور اہل سنت کے تاریخی پس منظر، علمی و فکری مسلمات اور دائروں کے حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کی تھیں۔ اسی وقت سے میرے ذہن میں ترتیب یہ تھی اور میں نے بعض دوستوں سے عرض بھی کر دیا تھا کہ اگلے سال میری گفتگو ''ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں؟'' کے عنوان پر ہو گی۔ اور اس سے اگلے سال انشاء اللہ تعالیٰ ''ہم دیوبندی کیوں کہلاتے ہیں؟'' کے موضوع پر گفتگو کروں گا۔ چنانچہ اس ترتیب کے مطابق آج آپ حضرات کی خدمت میں حنفیت کے حوالہ سے کچھ معروضات پیش کرنا چاہوں گا۔

ہم عقیدہ کے حوالہ سے اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، فقہی مذہب کے حوالہ سے حنفی ہیں اور علمی مشرب و مسلک کے حوالہ سے دیوبندی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا دائرہ ہے، اپنا اپنا پس منظر ہے، اپنا اپنا تعارف ہے اور یہ ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں ہونا چاہیے۔ اہل سنت کے بارے میں گزشتہ سال معروضات پیش کر چکا ہوں، حنفیت کے بارے میں آج گفتگو ہو گی اور دیوبندیت کے بارے میں زندگی کے ساتھ صحت و توفیق شامل حال رہی تو اگلے سال اسی پروگرام میں انشاء اللہ تعالیٰ آپ حضرات سے مخاطب ہوں گا۔

حنفی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم فقہی احکام، فقہی اصول اور فروعات میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں۔ یعنی ہم ان کے علم، ثقاہت، دیانت اور فراست پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے اقوال و فتاویٰ کو دلائل کی بحث میں پڑے بغیر قبول کرتے ہیں اور انہیں

دوسرے ائمہ کرامؒ کے اقوال وفتاوی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لیے چند اصولی باتوں کو پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔

نیک شخصیات کی اتباع

پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں قرآن کریم کے اس اسلوب سے واقف ہونا چاہیے کہ قرآن کریم میں ہدایت اور راہنمائی کے لیے صرف اصول واحکام اور قوانین وضوابط کی بات نہیں کی گئی بلکہ ان اصول واحکام پر عملدرآمد کے لیے افراد وشخصیات کو بطور نمونہ اور آئیڈیل پیش کیا گیا ہے اور ان کی اقتدا واتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ میں جہاں ہمیں اللہ تعالی کی بارگاہ میں ہر روز اور بار بار صراط مستقیم پر چلائے رکھنے کی دعا کرنے کے لیے کہا گیا ہے وہاں صراط مستقیم کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے "صراط الذین انعمت علیھم" کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام فرمایا۔ گویا صراط مستقیم کا تعین کرتے وقت ہمارے سامنے صرف راستے کے نشانات ہی نہیں بلکہ اس پر چلنے والے لوگ بھی ہونے چاہئیں اور ہم انہی کو دیکھ کر یہ طے کر سکیں گے کہ صراط مستقیم کون سا ہے؟

ان افراد وطبقات میں سب سے پہلا طبقہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے جن میں سے چند بزرگوں کا ذکر کر کے سورۃ الانعام کی آیت ۹۰ میں کہا گیا ہے "فبھداھم اقتدہ" کہ ان کی ہدایت پر چلو اور ان کی پیروی کرو۔ اس طرح ہدایت کا معیار شخصیات کو قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا طبقہ حضرات صحابہ کرامؓ کا ہے جن کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور انہیں حق کا معیار بتایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ آیت ۱۳ میں کہا گیا ہے کہ

"واذا قیل لھم امنوا کما آمن الناس قالوا انؤمن کما آمن السفھآء الآ انھم ھم السفھآء ولکن لایعلمون"۔ (سورہ البقرہ ۲۔ آیت ۱۳)

"اور جب انہیں کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح بے وقوف ایمان لائے ہیں، خبردار وہی بے وقوف ہیں لیکن نہیں جانتے"۔

یہاں "الناس" سے مراد صحابہ کرامؓ ہیں اور انہی کو ایمان کے لیے آئیڈیل اور مثال بتایا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرہ کی آیت ۱۳۷ میں صحابہ کرامؓ سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ "فان امنوا بمثل مآ امنتم بہ فقد اھتدوا وان تولوا فانما ھم فی شقاق"۔ (سورہ البقرہ ۲

۔آیت ۱۳۷)

”پس اگر وہ بھی ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی ہدایت پا گئے اور اگر وہ نہ مانیں تو وہی ضد میں پڑے ہوئے ہیں“۔

اس آیت کریمہ میں صحابہ کرامؓ کو ایمان کے لیے صرف مثال اور آئیڈیل نہیں کہا گیا بلکہ معیار بھی قرار دیا گیا ہے کہ ان کے طریقے سے پھر جانا گمراہی ہے۔ اسی طرح سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ میں فرمایا گیا ہے کہ

”ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ماتولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا“۔(سورہ النساء ۴۔آیت ۱۱۵)

”اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ اس پر سیدھی راہ کھل چکی ہو اور سب مسلمانوں کے راستہ کے خلاف چلے تو ہم اسے اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا ہے اور اسے دوزخ میں ڈالیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے“۔

یہاں بھی اولین مصداق صحابہ کرامؓ ہیں اور ان کے راستے سے ہٹ جانے کو جہنم کے راستے پر چلنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر سورۃ لقمان میں حضرت لقمان حکیمؒ کی اپنے بیٹے کیلئے وصیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات فرمائی گئی ہے کہ

”واتبع سبیل من اناب الی“۔(سورہ لقمان ۳۱۔آیت ۱۵)

”اور ان لوگوں کی راہ پر چل جو میری طرف رجوع ہو گئے“۔

ان آیات کریمہ کا حوالہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم نے صرف اصول و ضوابط اور احکام و قوانین کی پیروی کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کے لیے کچھ طبقات اور افراد کو معیار اور آئیڈیل قرار دے کر ان کی اتباع کی تلقین فرمائی ہے۔

تقلید کے لیے پیشوا کا انتخاب

دوسری اصولی بات جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد گرامی ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ جو شخص کسی شخصیت کو اپنا مقتداء اور پیشوا بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے ان لوگوں میں سے انتخاب کرے جو فوت ہو چکے ہیں، اس لیے کہ زندہ شخص کسی وقت بھی فتنہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد گرامی مشکوۃ شریف میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

”من کان مستنا فلیستن بمن قدمات فان الحی لاتؤمن علیہ الفتنۃ اولئک اصحاب

محمد کانوا افضل ھذہ الأمۃ ابرھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولا قامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوھم علی اثرھم و تمسکوا بما ستطعتم من اخلاقھم و سیرھم فاھم کانوا علی الھدی المستقیم"۔

"جو شخص کسی کی پیروی کرنا چاہتا ہے تو ان کی کرے جو فوت ہو چکے ہیں اس لیے کہ زندہ آدمی فتنہ سے محفوظ نہیں ہے اور وہ لوگ اصحاب محمدؐ ہیں جو سب سے زیادہ نیک دل تھے، سب سے زیادہ گہرے علم والے تھے اور سب سے کم تکلف والے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے چنا تھا پس ان کے فضل کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک تمہارے بس میں ہو ان کے اخلاق و عادات کو مضبوطی سے تھام لو کیونکہ وہی لوگ سیدھے راستے پر ہیں"۔

چنانچہ طبقات کے حوالہ سے حضرات انبیاء کرامؑ اور حضرات صحابہ کرامؓ واجب الاتباع ہیں اور ہم اسی وجہ سے اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ کی سنت اور حضرات صحابہ کرامؓ کی جماعت ہماری علمی اور فکری اساس ہیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد اتباع و اقتداء اور پیروی کے لیے شخصیات کا چناؤ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس کے پاس دین کا علم زیادہ ہے، کون دینی تفقہ کی دولت سے مالا مال ہے اور کس کے تقویٰ و دیانت پر امت کو زیادہ اعتماد ہے۔ یہاں میں جناب رسول اللہؐ کا ایک ارشاد گرامی پیش کرنا چاہوں گا جو مسند دارمی میں حضرت جبیر بن معطمؓ سے روایت ہے کہ

"نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فوعاھا ثم اداھا الی من لم یسمعھا فرب حامل فقہ لا فقہ لہ ورب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ"۔

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی اسے یاد رکھا اور پھر اسے آگے ایسے شخص تک پہنچا دیا جس نے اسے نہیں سنا۔ اس لیے کہ بعض سننے والے ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس کی سمجھ نہیں ہوتی اور بعض سننے والے اسے خود سے زیادہ سمجھنے والے تک پہنچا دیتے ہیں"۔

اس ارشاد نبویؐ کی روشنی میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ حدیث اور چیز ہے اور فقہ اس سے مختلف چیز ہے اور دونوں دین کا مطلوب ہیں۔ قرآن کریم بھی "لیتفقھوا فی الدین" کے تحت اس کی اہمیت بیان کرتا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے بھی ایک اور حدیث

میں فرمایا ہے کہ جس شخص کے ساتھ اللہ تعالی خیر کا ارادہ فرماتے ہیں ”یفقھہ فی الدین“ اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔

حدیث محض سننے، یاد کرنے اور آگے پہنچا دینے سے پوری ہو جاتی ہے لیکن اسے سمجھنے کے لیے عقل درکار ہے، درایت کی ضرورت ہے اور دانش مطلوب ہے۔ اور اس عقل و دانش کے درجات مختلف ہیں جن میں سے ”افقہ منہ“ کی تلاش دینی ضروریات میں سے ہے۔ اس لیے ہمارا طریق کار یہ ہے کہ ہم خالی روایت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے بعد تفقہ کی ناگزیر ضرورت کی طرف بھی توجہ دیتے ہیں اور ہم حدیث و فقہ کے امتزاج کو اپنے فقہی مذہب کی اساس سمجھتے ہیں۔

یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہوں گا کہ خالی روایت حدیث کہلاتی ہے جبکہ اس کے ساتھ درایت اور تفقہ شامل ہو جائے تو اس سے سنت مستنبط ہوتی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”سنت“ کو واجب الاتباع قرار دیا ہے جو کہ حدیث و فقہ کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے اور یہی اہل السنۃ والجماعۃ کی بنیاد ہے۔

اتباع کے لیے امام ابو حنیفہؒ کی شخصیت ہی کیوں؟

صحابہ کرامؓ کے بعد فقہاء کرامؒ کی پیروی کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر فقہاء کرامؒ کی اتنی بڑی جماعت میں سے ہم نے امام ابو حنیفہؒ کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ چنانچہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی ترجیح کی وجوہ میں دو تین باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

1. پہلی بات وہی کہ حدیث نبوی میں ”من ھو افقہ منہ“ فرمایا گیا ہے اور حضرات فقہاء کرامؒ میں سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ”افقہ“ ہونا ایک ایسی متفق علیہ بات ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے بارے میں حضرت امام شافعیؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ

”من اراد الفقہ فھو عیال علی ابی حنیفۃ“۔

”جو شخص بھی فقہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابو حنیفہؒ کے سامنے بچوں کی طرح ہے“۔

اور حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ ”افقہ الناس ابو حنیفۃ“ لوگوں میں سے بڑے فقیہ ابو حنیفہؒ ہیں ”و ما رأیت فی الفقہ مثلہ“ اور میں نے فقہ میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

2. ہماری دوسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے عقل و قیاس کو اس کے صحیح مقام پر رکھا ہے۔ نہ اس سے انکار کیا ہے اور نہ ہی اتنا سرچڑھا دیا ہے کہ نصوص پر حکومت کرنے لگے۔ عقل اللہ تعالی کی نعمت ہے جس کے استعمال سے گریز اس نعمت کی ناشکری ہے لیکن اس کی حدود متعیّن ہیں جن سے آگے اس کو بڑھانا بھی جائز نہیں ہے۔

اس بارے میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کی ترتیب ملاحظہ فرمائیے کہ وہ دلیل میں سب سے پہلا درجہ قرآن کریم کو دیتے ہیں اور اس کے بعد حدیث نبویؐ کو۔ اور حدیث نبویؐ کے بارے میں ان کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر ضعیف حدیث بھی موجود ہو تو وہ اس کے مقابلہ میں قیاس نہیں کریں گے اور حدیث کو ترجیح دیں گے۔ بلکہ وہ تو صحابہ کرامؓ کے اقوال کو بھی قیاس سے مقدم رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے کسی مسئلہ میں اقوال مختلف ہوں تو وہ انہی میں سے ایک کا انتخاب کریں گے اور صحابہؓ کے اقوال سے باہر نہیں نکلیں گے۔ گویا وہ صحابی کے قول کو قیاس پر مقدم قرار دیتے ہیں اور وہ ان سب کے بعد قیاس کا درجہ تسلیم کرتے ہیں۔ اور عقل کا صحیح مقام بھی یہی ہے کہ وہ نصوص کی تفہیم اور استنباط و استدلال میں معاون ہے۔ اور نصوص کے درجات ختم ہو جانے کے بعد وہ اس پوزیشن میں آتی ہے کہ اسے کسی فیصلے یا حکم کی بنیاد بنایا جائے۔ اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے وحی اور عقل کے درمیان حقیقی توازن قائم کیا ہے اور ان کی فقہ کی مقبولیت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

3. ہماری تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی فقہ شخصی نہیں بلکہ شورائی ہے۔ یعنی اس فقہ کی بنیاد کسی ایک شخصیت کے استدلال و استنباط پر نہیں بلکہ پورے ایک شورائی نظام پر ہے جس میں فقہاء کرام کی ایک بڑی جماعت نے اجتماعی غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے بعد ہزاروں مسائل مستنبط کیے ہیں۔ اور ان ہزاروں مسائل میں ایک بڑی تعداد ان مسائل و احکام کی ہے جن میں ہم امام ابو حنیفہؒ کی بجائے ان کی مجلس مشاورت کے دوسرے شرکاء کے اقوال کو قبول کرتے ہیں۔ اس بناء پر مجھے ان حضرات کی بات سے اتفاق نہیں ہے جو احناف کو تقلید شخصی کا طعنہ دیتے ہیں۔ مجھے تقلید شخصی سے بھی انکار نہیں ہے

کیونکہ دیگر فقہی مذاہب مثلاً مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کی بنیاد تقلید شخصی پر ہی ہے۔ لیکن احناف کے بارے میں یہ بات قبول کرنے میں مجھے تامل ہے اس لیے کہ ہمارے فقہی نظام کی بنیاد صرف حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اقوال وفتاوی پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ شریک دوسرے فقہاء کرام کے اقوال و فتاوی بھی ہمارے فقہی احکام کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی اجتماعی اور شورائی ہے جس میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کو اس شورائی نظام کے سربراہ اور علمی و فکری راہ نما کی حیثیت حاصل ہے اور اسی وجہ سے یہ فقہ ان کی طرف منسوب ہے لیکن عملی طور پر یہ فقہ شخصی نہیں بلکہ اجتماعی اور شورائی ہے۔

4. ہماری چوتھی وجہ ترجیح یہ ہے کہ فقہ حنفی عملی اور پریکٹیکل ہے اور اسے اللہ تعالی نے ہر دور میں قبولیت عطا فرمائی ہے۔ خلافت عباسیہ میں اسے ملکی قانون کا درجہ حاصل رہا ہے اور خلافت عثمانیہ میں بھی یہی ملک کا عام قانون تھی۔ اسی طرح مغل حکمرانوں کے دور میں جنوبی ایشیا میں بھی اسے دستور و قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فقہ متوازن ہے، قابل عمل ہے اور سوسائٹی کی ضروریات کا لحاظ رکھتی ہے۔

حضرات محترم! وقت کی قلت کے باعث میں اس عنوان پر تفصیلی گفتگو نہیں کر سکا البتہ اصولی طور پر میں نے چند اشارات میں یہ بات عرض کی ہے کہ ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں اور فقہی احکام و مسائل میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ان کی جماعت و رفقاء کو ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ اللہ تعالی ہم سب کو صحیح باتوں پر عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

امریکہ میں درس قرآن کی چند محافل

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۸ ستمبر ۲۰۰۹ء)

حسب سابق اس سال بھی رمضان المبارک کا پہلا جمعہ دارالہدی، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا میں پڑھایا اور دو تین روز تک تراویح کے بعد تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن کریم کے خلاصہ کے طور پر کچھ معروضات پیش کیں۔ اس کے علاوہ بالٹی مور، نیوجرسی، برونکس

اور لانگ آئی لینڈ کی متعدّد مساجد میں قرآن کریم کے حوالہ سے گفتگو ہوئی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوۃ۔ قرآن کریم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ ہے جس کے اعجاز کے بیسیوں پہلو مفسرین کرام نے بیان فرمائے ہیں اور ان میں دو تین ایسے ہیں جن کا ہم آج کے دور میں بھی کھلے بندوں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ مثلاً یہی کہ قرآن کریم کا دائرہ مسلسل پھیلتا جا رہا ہے اور اس کے حفظ و تدریس کے مدارس و مکاتب ہم مسلمانوں کی تمام تر زبوں حالی کے باوجود دنیا کے ہر خطے میں قائم ہو رہے ہیں اور حفاظ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گزشتہ روز اٹلانٹا میں ایک بچے سے میں نے مختلف مقامات سے قرآن کریم کی تلاوت سنی جس نے چھ سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ مکمل کیا اور پھر دو سال میں تجوید کا کورس مکمل کیا۔ میں سوچتا ہوں کہ جس کتاب کو امریکہ میں بھی چھ سال کا حافظ میسر ہے اس کے اعجاز کے لیے کسی اور دلیل کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

قرآن کریم کے اعجاز کا ایک اور پہلو ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کچھ عرصہ سے امریکہ اور یورپ کے ہزاروں افراد نے اسلام قبول کیا ہے جن میں اکثر حضرات کا کہنا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے اور اس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی تاثیر آج بھی پوری طرح قائم ہے اور جو شخص بھی اسے راہنمائی کی نیت سے پڑھے قرآن کریم اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں عام طور پر قرآن کریم تین چار مقاصد کے لیے پڑھا جاتا ہے:

1. ایک یہ کہ اس کے پڑھنے سے اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کریم پڑھنے اور سننے سے ہر حرف پر کم از کم دس نیکیاں ملتی ہیں۔

2. دوسرا مقصد اس سے برکت و رحمت کا حصول ہوتا ہے اور یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جہاں قرآن کریم پڑھا جاتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔

3. تیسرے نمبر پر ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں اس خیال سے کہ اس سے شفا حاصل ہوگی اور یقیناً قرآن کریم پڑھنے سے روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی بیماریوں سے شفایابی ہوتی ہے۔

4. جبکہ چوتھے نمبر پر ہم قرآن کریم کی تلاوت اس لیے کرتے ہیں کہ ایصال ثواب کر کے ہم اپنے کسی فوت ہونے والے دوست یا بزرگ کی بخشش اور مغفرت کا سامان کرتے ہیں اور تلاوت قرآن کریم سے یہ فائدہ بھی ضرور ملتا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر قرآن کریم ان چار میں سے کسی مقصد کے لیے پڑھا جاتا ہے اور ان میں سے کسی فائدے سے انکار نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کا اپنا مقصد کیا ہے اور اس کا ایجنڈا کیا ہے؟ کوئی بھی کتاب ہم دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے یہ معلوم کرتے ہیں کہ یہ کس موضوع کی کتاب ہے اور کس فن اور علم سے اس کا تعلق ہے۔ قرآن کریم کے بارے میں بھی ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ یہ کس فن کی اور کس موضوع کی کتاب ہے تاکہ اس کو سامنے رکھ کر ہم اس کی تلاوت کریں۔

قرآن کریم نے اپنے موضوع اور ایجنڈے کا تعارف صرف ایک لفظ میں کر دیا ہے اور بالکل آغاز میں بتا دیا ہے کہ یہ "ہدی للمتقین" ہے یعنی نسل انسانی کے لیے ہدایت اور راہنمائی کی کتاب ہے۔ یہ "ہدی للناس" بھی ہے اور "ھدی للمتقین" بھی ہے۔ اپنے خطاب کے حوالہ سے ہدی للناس ہے اور عملی فائدہ اور استفادہ کے حوالہ سے ہدی للمتقین ہے۔ لیکن اس کا اصل موضوع "ہدی" ہی ہے کہ یہ ہدایت اور راہنمائی کی کتاب ہے اور ہر انسان کی زندگی کے لیے گائیڈ بک ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی تلاوت اور سماع میں مذکورہ بالا چار فوائد کے ساتھ راہنمائی اور گائیڈنس کو بھی ہمیں اپنے مقاصد میں شامل کرنا چاہیے کہ قرآن کریم کا اصل مقصد یہی ہے۔ اور ہم یہ بات قرآن کریم کے کھلے اعجاز کے طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آج کے دور میں اگر کسی غیر مسلم نے قرآن کریم کو راہنمائی حاصل کرنے کے لیے پڑھا ہے تو قرآن کریم نے اس کی راہنمائی کی ہے۔ کم از کم گزشتہ دو عشروں سے میں خود اس بات کا مشاہدہ کر رہا ہوں کہ مغرب کے پڑھے لکھے لوگوں میں سے جس نے بھی اسلام قبول کیا ہے اس نے کہا ہے کہ میں قرآن کریم کی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوا ہوں۔ دور حاضر کے چند نامور نومسلموں مثلاً یوسف

اسلام، ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن، مورس عبد اللہ، یحیی برٹ اور حمزہ یوسف سے خود میری ملاقاتیں ہوئی ہیں ان حضرات کا کہنا ہے کہ انہیں قرآن کریم کی تعلیمات نے متاثر کیا ہے اور قرآن کریم ہی ان کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا ہے۔

اس لیے میرے خیال میں آج کے دور میں ہم مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے کہ ہم اس سے دوسرے فوائد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے پڑھیں اور اپنی زندگی کے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل کریں۔

یکم ستمبر کو میری پاکستان واپسی کے لیے روانگی تھی، اس سے قبل ایک روز نیوجرسی میں اور دو روز نیویارک میں رہنے کا موقع ملا۔ نیوجرسی میں بھارت کے ایک فاضل اور نوجوان عالم دین مولانا یاسر ندیم سے ملاقات ہوئی جو دارالعلوم دیوبند کے ایک نامور استاذ مولانا ندیم الواجدی کے فرزند ہیں اور باخبر اہل دانش میں سے ہیں۔ گلوبلائزیشن اور میڈیا کے اثرات پر ان کی ایک کتاب خاصی معروف ہوئی ہے جو میری نظر سے بھی گزر چکی ہے۔ آج کل وہ ایک تعلیمی پروگرام کے لیے تعارفی مہم چلا رہے ہیں جو انٹرنیٹ پر درس نظامی کے باقاعدہ کورس کے حوالہ سے ہے۔ یہ کورس پانچ سال کا ہے اور انگلش زبان میں ہے جس کا اہتمام یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے ممالک کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ کورس آن لائن تدریس کے ذریعے ہوگا اور تینوں براعظموں کے اوقات کو سامنے رکھ کر ان کے لیے الگ الگ کلاسوں کا نظام بنایا گیا ہے۔ درس نظامی کے پانچ سالہ باقاعدہ کورس کے علاوہ عربی زبان اور ترجمہ قرآن کریم کے کورسز بھی ترتیب دیے گئے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے ساتھ اس کا باقاعدہ الحاق بتایا گیا ہے۔ یہ کورسز ”دارالعلوم آن لائن“ کے عنوان سے ہیں جن کی ویب سائیٹ کا ایڈریس یہ ہے darululum.org اسے وزٹ کر کے مزید معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ میری ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ انٹرنیٹ پر اس قسم کا کوئی آن لائن پروگرام جاری ہو اور کسی ذمہ دار تعلیمی ادارے کی طرف سے ہو تاکہ وہ حضرات جو کسی مدرسہ میں باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکیں۔

امریکہ میں قیام کے آخری روز نیویارک میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ العالی سے ملاقات ہوگئی جو میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے اس سے قبل لندن میں بھی ملاقات ہو چکی

ہے جب انہوں نے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے آفس میں ورلڈ اسلامک فورم کے زیراہتمام منعقد ہونے والی ایک فکری نشست خطاب فرمایا تھا لیکن اسے کم و بیش دو عشرے گزر چکے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ نیویارک تشریف لائے ہوئے ہیں اور شریعہ بورڈ کے مولانا مفتی روح الامین اور مولانا مفتی نعمان وزیر کے ہاں مقیم ہیں۔ میں اپنے پرانے دوست مولانا عبد الرزاق عزیز کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ گفتگو زیادہ تر حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی کے حوالہ سے رہی کہ ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد ہماری یہ پہلی ملاقات تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے دونوں بزرگوں کی علمی و دینی خدمات کو سراہا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اس طرح امریکہ میں تقریباً ۴۵ دن گزارنے کے بعد یکم ستمبر کو نیویارک سے روانہ ہو کر تین ستمبر کو گوجرانوالہ واپس پہنچ گیا ہوں۔

ہم نے حضرت والد محترم کی حیات و خدمات کے حوالہ سے ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کی خصوصی اشاعت کا ''امام اہل سنت نمبر'' کے عنوان سے اعلان کر رکھا تھا جس کی تیاری اور طباعت میں بوجوہ تاخیر ہوتی رہی اور مجھے اس سلسلہ میں پریشانی تھی کہ بیرون ملک بھی بہت سے احباب اس کے انتظار میں ہیں اور بار بار پوچھ رہے ہیں۔ واپس پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کم و بیش ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل یہ نمبر مکمل ہو کر پریس جا چکا ہے اور امید ہے کہ رمضان المبارک کا دوسرا عشرہ مکمل ہونے سے پہلے مارکیٹ میں آجائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس خصوصی نمبر کے حصول اور اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لیے حافظ محمد طاہر سے فون نمبر ۰۳۴۴۴۵۸۲۵۶ پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

مشی گن کی قدیم ترین مسجد

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۳۱ اگست ۲۰۰۹ء)

امریکی ریاست مشی گن کے سب سے بڑے شہر ڈیٹرائٹ میں چار روزہ قیام کے دوران نصف درجن کے لگ بھگ مساجد میں حاضری ہوئی، ان میں سے اکثر میں بیان بھی ہوئے۔ آج کل رمضان المبارک کے حوالے سے روزوں، قرآن کریم کی تلاوت اور رمضان المبارک سے متعلقہ دیگر اعمال خیر کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان بیانات میں ابتداء سے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ بیان اردو میں ہوگا اور اردو نہ سمجھنے والوں کے لیے ایک کونے میں

انگریزی میں ساتھ ساتھ ترجمے کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ مگر کم و بیش ہر جگہ میں نے دیکھا کہ نمازیوں کی اکثریت اردو سمجھنے والوں کی تھی جبکہ الگ کونے میں انگریزی ترجمے سے استفادہ کرنے والے چند حضرات بھی تھے۔ حتیٰ کہ ڈیٹرائٹ میں بنگلہ دیشی مسلمانوں کے مرکز مسجد نور میں بھی یہی منظر دیکھنے میں آیا۔

مجھے ہانگ کانگ، جنوبی افریقہ، نیروبی، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور بنگلہ دیش میں گزشتہ تین عشروں کے دوران سینکڑوں اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا، ہر جگہ اردو سمجھنے والے لوگ موجود تھے۔ گزشتہ روز ایک دوست کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں اردو کے فروغ میں دو باتوں کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ دینی حلقوں میں تبلیغی جماعت کی محنت کا اور دوسرے حلقوں میں انڈین فلموں اور گانوں کا کہ دونوں جگہ اظہار کا اصل ذریعہ اردو ہی ہے۔ ایک دوست نے ذکر کیا کہ اب سے پون صدی قبل تک پورے شمالی امریکہ میں تین یا چار مسجدیں ہوتی تھیں جن میں سے ایک مسجد ڈیٹرائٹ کی بھی تھی جبکہ اب صرف ڈیٹرائٹ میں چالیس سے زیادہ مسجدیں موجود اور آباد ہیں۔ میں نے مشی گن کی سب سے قدیمی مسجد دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میرے میزبان مولانا قاری محمد الیاس وہاں لے گئے۔

مولانا قاری محمد الیاس کا تعلق فیصل آباد سے ہے، بکر منڈی میں ایک بڑے دینی مدرسے جامعہ مدینۃ العلم کے بانی و مہتمم ہیں، دو عشروں تک رمضان المبارک میں قرآن کریم سنانے کے لیے ڈیٹرائٹ جاتے رہے ہیں، اب چار سال سے وہیں مقیم ہیں اور مسجد بلال میں خطابت اور امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ اس مسجد کے ساتھ ساڑھے چار ایکڑ جگہ میں وسیع مسجد اور مدرسے کی تعمیر کے لیے نقشے کی منظوری آخری مراحل میں ہے۔ مسجد میں حفظ قرآن کریم کا مدرسہ چل رہا ہے اور دو بچوں نے میری موجودگی کے دوران حفظ قرآن کریم مکمل کیا ہے، درس نظامی کی کلاسیں شروع کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں، نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے جمعہ کی نماز قریب ہی ایک جم خانہ کے ہال میں پڑھتے ہیں جس کی مالکہ ایک غیر مسلم خاتون ہیں اور وہ جمعہ کی نماز کی خاطر دو گھنٹے کے لیے یہ وسیع ہال کسی کرائے کے بغیر دے دیتی ہیں۔ ۱۴ اگست کا جمعہ میں نے وہیں پڑھا اور نمازیوں سے مختصر خطاب بھی کیا۔ جم خانہ کے ہال میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے میرے ذہن میں ۱۴ اگست کا تصور آ گیا کہ اس روز ہم نے اسلام کے لیے دنیا کے نقشے پر

ایک نئی ریاست کو نمودار ہوتے دیکھا تھا، اللہ تعالی اسے سلامت رکھے کہ نہ صرف پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں بلکہ عالم اسلام کی امیدوں کا مرکز یہی ہے، آمین یارب العالمین۔

مجھے خیال آیا کہ اس جم خانہ میں ہفتہ میں صرف دو گھنٹے کے لیے خدا اور رسولؐ خدا کا نام لیا جاتا ہے اور چند مسلمان اپنی پیشانی خالق کائنات کے حضور سجدے میں رکھتے ہیں، پھر اس کے بعد ہفتہ بھر کے لیے جم خانہ اپنے ماحول کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ اس طرح ہم نے بھی پاکستان میں خدا اور رسولؐ کی بات کو چند اوقات کے دائرے میں محدود کر رکھا ہے، باقی اوقات میں وہی جم خانہ کا ماحول باقی رکھنے کی کوشش جاری رہتی ہے۔ میں گفتگو تو جمعۃ المبارک کے نمازیوں سے رمضان المبارک کی برکات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے موضوع پر کر رہا تھا لیکن میرے دماغ میں یہی سوچیں بار بار کروٹ لے رہی تھیں جن کا سلسلہ اس سوال پر پہنچ کر ڈیڈلاک کا شکار ہو گیا کہ اس اجتماع کے نمازی تو مسجد بلال کی نئی تعمیر مکمل ہو جانے پر وہاں منتقل ہو جائیں گے اور انہیں شب و روز کے لیے اللہ تعالی اور اس کے آخری رسولؐ کی باتوں اور تعلیمات کا ماحول میسر آجائے گا مگر پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کا کیا بنے گا اور انہیں قرآن و سنت کی تعلیمات کا ہمہ وقتی ماحول آخر کب میسر آئے گا؟

بہرحال میں مولانا قاری محمد الیاس کا ذکر کر رہا تھا کہ وہ مجھے مشی گن کی سب سے پرانی مسجد دکھانے کے لیے وہاں لے گئے۔ اس مسجد کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ جب ۱۹۲۰ء میں امریکی صنعتکار ہنری فورڈ نے اپنے کارخانے ڈیٹرائٹ میں منتقل کیے تو ڈیربورن کے علاقے میں اس کے مسلمان ملازمین نے، جن میں زیادہ تر لبنانی تھے، نماز کے لیے جگہ مخصوص کرنے کا مطالبہ کیا جس کے نتیجے میں ایک مصلی قائم ہوا جو مشی گن کے علاقے میں پہلی مسجد تھی اور حسین خروب صاحب اس کے امام بنے۔ ۱۹۳۸ء میں ڈیربورن کے مسلمانوں نے امیریکن مسلم سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اس مصلی کو باقاعدہ مسجد کی حیثیت دے کر اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۲ء میں اس مسجد کی توسیع ہوئی اور نماز کے ہال کے علاوہ دفاتر اور کلاس روم بنائے گئے تاکہ نماز کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دینی تعلیم کا بھی انتظام کیا جا سکے۔ ۱۹۵۷ء میں مسجد پر دو گنبد اور دو چھوٹے مینار تعمیر کیے گئے جس سے یہ دور سے باقاعدہ مسجد نظر آنے لگی۔ ارد گرد مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی، نئے آباد ہونے والوں میں زیادہ آبادی یمنی مسلمانوں کی تھی۔ اس وقت تک یہ مسجد بارہ

ہزار مربع فٹ کے رقبے میں تھی جسے ۱۹۸۶ء میں ڈبل کر کے مسجد اور اس کے متعلقات کا دائرہ چوبیس ہزار مربع فٹ تک پھیلا دیا گیا۔ ۲۰۰۰ء تک یہ مسجد بھی ناکافی ہوگئی تو اس میں ڈبل توسیع کر کے اس کا تعمیری رقبہ اڑتالیس ہزار مربع فٹ تک بڑھا دیا گیا جبکہ پارکنگ وغیرہ سمیت اس کا مجموعی رقبہ ایک لاکھ مربع فٹ بتایا جاتا ہے۔

ہم نے مسجد کے مین ہال کی صفیں شمار کیں تو وہ ستائیس تھیں جبکہ ہر صف میں ستائیس مصلے ہیں جن سے ہم نے اندازہ کیا کہ اس ہال میں کم و بیش بارہ سو افراد نماز ادا کرتے ہوں گے۔ اس پر ہمیں بتایا گیا کہ اس کے ساتھ ایک اور نماز ہال بھی ہے جو جمعہ اور عیدین میں استعمال ہوتا ہے اور دونوں ہالوں میں مجموعی طور پر دو ہزار افراد بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ گزشتہ عید پر نمازیوں کے اجتماع کی یہ کیفیت تھی کہ نماز کے دو ہالوں اور کلاس روموں کے بھر جانے کے بعد باہر پارکنگ میں بھی صفیں بچھی ہوئی تھیں اور ہر طرف نمازی ہی نمازی نظر آ رہے تھے۔ ہم عصر اور مغرب کی نماز کے دوران اس مسجد میں گئے تھے، ہر طرف یمنی مسلمانوں کی ٹولیاں دکھائی دے رہی تھیں اور مسجد کے اردگرد عرب مسلمانوں کے سٹور، دکانیں اور دفاتر دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے ہم امریکہ کے شہر ڈیٹرائٹ میں نہیں بلکہ یمن کے شہر صنعا کے کسی حصے میں گھوم رہے ہیں۔

امریکہ میں عرب مسلمانوں کی سرگرمیاں اور مراکز دوسرے علاقوں کے مسلمانوں سے زیادہ ہیں۔ یہ عربوں کا حق بھی ہے کہ اب علمی حلقوں میں عرب دانشوروں کے اس دعوے پر توجہ دی جانے لگی ہے کہ براعظم امریکہ کولمبس کی نہیں بلکہ عربوں کی دریافت ہے۔ اس لیے کہ کولمبس نے جب امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو امریکہ کے بعض علاقوں میں عرب پہلے سے موجود تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کولمبس اندلس کو فتح کرنے والی مسیحی ملکہ ازابیلا کا نمائندہ تھا اور کولمبس کی اس مہم کی سرپرستی وہی کر رہی تھی جبکہ عرب ملکہ ازابیلا کے ہاتھوں اسپین میں شکست کھا چکے تھے اس لیے اسپین پر ملکہ ازابیلا کے تسلط کے ساتھ ساتھ امریکہ کی دریافت کے دعوے میں بھی اس کا اور اس کے نمائندے کولمبس کا حق فائق سمجھ لیا گیا اور ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ کا محاورہ اپنا جادو دکھا گیا۔ اس مسجد کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ مشی گن کی واحد مسجد ہے جس میں باہر کے لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے اور مسجد کے چاروں طرف دن میں پانچ وقت اللہ اکبر کی آواز گونجتی ہے۔ یہ حق یہاں کے مسلمانوں نے باقاعدہ ایک عدالتی جدوجہد کے ذریعے حاصل کیا ہے۔

مسجد میں حفظ قران کریم کے لیے مدرسہ عبد اللہ بن عباسؓ کے نام سے درسگاہ قائم ہے جس میں اس وقت پانچ سو بچے حفظ قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان میں نصف تعداد لڑکیوں کی ہے۔ عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کے لیے تعلیم و ثقافت کے الگ الگ گروپ کام کر رہے ہیں، باقاعدہ تعلیمی نظام کے علاوہ مختلف موضوعات پر ہفتہ وار لیکچرز کا اہتمام ہوتا ہے، مسجد میں وسیع لائبریری اور کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر موجود ہے جس سے سینکڑوں لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ مدرسۃ الفرقان کے نام سے ویک اینڈ مدرسہ کام کر رہا ہے جس میں ہفتہ وار کلاسیں ہوتی ہیں۔ اس وقت سات سو سے زیادہ طلبہ اور طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مسجد کی اپنی ویب سائیٹ masjiddearborn.org کے نام سے موجود ہے جس سے مزید معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

سوات آپریشن کے متاثرین کی امداد اور دینی مدارس

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ اگست ۲۰۰۹ء)

گزشتہ دنوں ایک روز کے لیے کراچی جانے کا اتفاق ہوا اور جامعہ دار العلوم کورنگی، جامعہ اسلامیہ کلفٹن اور جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن کی مختلف علمی نشستوں میں شرکت کے ساتھ ساتھ کراچی کے مختلف دینی اداروں کی طرف سے سوات آپریشن کے متاثرین کی امداد کی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں اور بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارے بڑے دینی مدارس اپنے مظلوم اور متاثر بھائیوں کی امداد اور بحالی کے لیے پوری دلچسپی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں، مجھے بتایا گیا کہ:

- جامعہ دار العلوم کورنگی کراچی کے تحت تخت بھائی میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے نام سے اور مردان میں حضرت سعد بن معاذؓ کے نام سے امدادی کیمپ قائم ہیں جن میں ایک ہزار کے لگ بھگ خاندانوں کو ضروریات زندگی فراہم کی جا رہی ہیں اور سینکڑوں متاثرہ علماء کرام کو پانچ ہزار روپے ماہانہ کے حساب سے امداد دی جا رہی ہے، جبکہ کیمپوں میں سکول اور مدرسہ کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

- جامعۃ الرشید کراچی کی طرف سے کاکاخیل ویلفیئر ٹرسٹ کے عنوان سے متعدّد امدادی مراکز قائم کیے گئے ہیں اور شیر گڑھ کے مرکز میں اٹھارہ سو خاندانوں کو ضروریات زندگی مہیا کی جارہی ہیں، نیز میڈیکل کیمپ اور ایمبولینس بھی مہیا کی گئی ہے۔
- خدوپل پر ایک دینی جماعت کی طرف سے اکیس ہزار کے لگ بھگ افراد کے لیے امدادی مرکز کام کر رہا ہے جس کی نگرانی مولانا مفتی ابولبابہ کر رہے ہیں۔
- شیوہ اڈہ میں ایک مقامی سردار لیاقت خان کے قائم کردہ کیمپ میں بیس ہزار کے قریب افراد کی امداد کی جارہی ہے۔
- اس کے علاوہ جامعہ فاروقیہ کراچی اور جامعہ اشرف المدارس کراچی نے متاثرین کی امداد و بحالی کے لیے مسلسل سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں اور دیگر بہت سے دینی ادارے بھی ان خدمات میں مصروف ہیں۔
- جبکہ حکومتی اداروں اور بعض این جی اوز کی امدادی سرگرمیاں اخبارات کے ذریعے سامنے آرہی ہیں۔

یہ سب کچھ بجا ہے اور متاثرین کا حق ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری دینی ذمہ داری بھی ہے، البتہ اس حوالہ سے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ بے گھر ہونے والے افراد کی امداد اور ان سے تعاون بہت بڑا عمل خیر ہے لیکن کیا ان کے بے گھر ہوجانے کے اسباب کا جائزہ لینا اور اس کی ذمہ داری کا تعین کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے؟ اس موقع پر ہمیں قرآن کریم کا وہ ارشاد اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک میثاق کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہائیں گے اور ایک دوسرے کو گھروں سے نہیں نکالیں گے اور اگر ان میں سے کوئی قیدی بن گیا تو فدیہ دے کر اسے چھڑا لیں گے۔ قرآن کریم نے اس میثاق کے حوالہ سے بنی اسرائیل سے خطاب کر کے فرمایا ہے کہ تمہیں اس عہد کا آخری حصہ تو یاد رہا کہ ایک دوسرے کے قیدی ہوجانے پر اسے فدیہ دے کر چھڑوا لیتے ہو اور اس کے لیے ایک دوسرے کی مالی امداد بھی کرتے ہو مگر تمہیں عہد کے پہلے دو تقاضے کیوں یاد نہیں رہے جن میں تمہیں ایک دوسرے کا خون بہانے اور ایک دوسرے کو گھروں سے نکالنے سے منع کیا گیا ہے؟ (سورۃ البقرۃ

آیت ۸۴۔۸۵)۔ پھر قرآن کریم نے اس عمل کو کتاب اللہ کے بعض حصوں کو ماننے اور بعض کا انکار کر دینے سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ایسا کرنے والوں کو دنیا کی زندگی میں رسوائی اور آخرت میں سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ہماری موجودہ صورتحال بھی کم و بیش اسی طرح کی ہے کہ ہمیں قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے وہ احکام تو یاد رہتے ہیں جو ہماری کسی وقتی ضرورت اور مشکل کا حل بتاتے ہیں لیکن قرآن و سنت کے جن احکام و فرامین کا تعلق ہمارے نظام کی تبدیلی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و انقلاب سے ہے وہ ہم نے یکسر نظر انداز کر رکھے ہیں اور اسی وجہ سے ہم موجودہ بحران اور ابتلا کا شکار ہوئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سب کو قومی سطح پر اس صورتحال کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے اور حکمران طبقات کے ساتھ ساتھ دینی حلقوں اور جماعتوں کو بھی اپنی ترجیحات کا از سر نو تعین کرنا چاہیے، اس لیے کہ قومی ابتلا و آزمائش کے اصل اسباب و عوامل سے خلاصی حاصل کیے بغیر اس دلدل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

معراج النبیؐ: ایک سبق، ایک پیغام

(جامع مسجد جلال آباد، پیٹرسن، نیوجرسی، امریکہ - ۲۰ جولائی ۲۰۰۹ء)

(۲۷ رجب ۱۴۳۰ھ کو معراج النبیؐ کے موقع پر جامع مسجد جلال آباد (پیٹرسن، نیوجرسی، امریکہ) میں ایک دینی اجتماع سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ معراج اور اسراء جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہیں۔ اسراء اس سفر کو کہتے ہیں جو نبی اکرمؐ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کیا، اور معراج وہ سفر ہے جو زمین سے ساتوں آسمانوں اور اس سے آگے سدرۃ المنتہیٰ تک ہوا، اور اس میں رسالتمآبؐ نے سات آسمانوں، عرش و کرسی اور جنت و دوزخ کے بہت سے مناظر دیکھے جن کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی ہے اور سینکڑوں احادیث میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں۔ عام طور پر روایات میں آتا ہے کہ یہ دونوں سفر ایک ہی رات میں ہوئے اور نبوت کے گیارہویں سال ۲۷ ویں رجب کو اس عظیم الشان معجزے کا ظہور ہوا۔ اور اسی کو جناب نبی اکرمؐ کے عظیم الشان معجزات میں شمار کیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ دونوں سفر بیداری کی

حالت میں جسم مبارک کے ساتھ ایک ہی رات میں ہوئے۔ چونکہ یہ سب کچھ عام حالات واسباب میں ممکن نہیں ہے اسی لیے یہ سفر معجزہ کہلاتا ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار معجزات عطا فرمائے ہیں اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی سے بھی سینکڑوں معجزات کا ظہور ہوا ہے۔ معجزات کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ کسی معجزاتی واقعہ کے ثبوت کے لیے روایت میں تو بحث واختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ رونما ہوا ہے یا نہیں، اس کی سند درست ہے یا نہیں، لیکن اگر کوئی واقعہ صحیح روایت اور سند کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس کے بعد اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو عقل اور مشاہدہ کے خلاف ہے، وغیرہ۔ اس لیے کہ معجزہ اگرچہ پیغمبر کے ہاتھ پر اس کی صداقت کے اظہار کے لیے ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار اور فعل سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی وقت اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اس لیے ہمارا ایمان اور عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جناب نبی اکرمؐ کو معراج کی شب مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور زمین سے سات آسمانوں، عرش وکرسی اور جنت و دوزخ کی سیر کرائی اور یہ سارا سفر حالت بیداری میں جسم مبارک کے ساتھ ہوا، اس کی تفصیلات خود آنحضرتؐ نے بیان فرمائیں جو سینکڑوں احادیث مبارکہ میں مذکور و محفوظ ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ متعدّد مواقع پر خواب میں بھی آپؐ کو جنت و دوزخ اور کائنات کے مختلف مناظر دکھائے گئے جن کا تذکرہ احادیث میں خواب کے حوالہ سے موجود ہے۔ اور یہیں سے کچھ حضرات کو مغالطہ ہوا ہے کہ معراج بھی شاید خواب کا واقعہ ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے خواب کے واقعات بھی ہوئے اور معراج و اسراء کا معروف واقعہ بیداری کے ساتھ جسمانی طور پر ہوا۔ اور اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے ورنہ خواب کی بات ہو تو اسے معجزہ کا عنوان دینے کی ضرورت نظر نہیں آتی اس لیے کہ خواب میں تو ہم بھی خدا جانے کہاں کہاں کی سیر کرتے رہتے ہیں اور اس میں کوئی معجزاتی بات نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے خواب میں اور حضرات انبیاء کرامؑ کے خواب میں فرق ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارا خواب ضروری نہیں کہ سچا اور درست ہو شیطانی خیالات بھی ہو سکتے ہیں، نفسانی تخیلات بھی ہو سکتے ہیں اور فرشتوں کی طرف سے

بھی ہوسکتے ہیں۔ اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر کے سوا کسی کا خواب حجت اور دلیل نہیں بن سکتا جبکہ پیغمبر کا خواب حجت اور دلیل ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نبی کے خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں ہے اور بیداری کی طرح خواب کی وحی بھی حجت اور دلیل ہے۔ پیغمبر کا خواب اس درجہ کی وحی اور حجت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی والد محترم کے سامنے اپنی گردن ذبح کے لیے پیش کر دی بلکہ اپنی طرف سے باپ نے ذبح کر دیا اور بیٹا ذبح ہو گیا، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح ہونے سے اپنی قدرت کے ساتھ بچا لیا۔ اس سارے واقعہ کی بنیاد خواب پر ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر کا خواب بھی اس کی بیداری کی طرح وحی کا درجہ رکھتا ہے۔

اس بنیاد پر یہ عرض کرنا شاید نامناسب بات نہ ہو کہ جناب نبی اکرمؐ کے حوالہ سے تو ان کے خواب کے اسفار اور بیداری کے سفر میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں قسم کے مشاہدات حقیقی اور واقعاتی ہیں، البتہ ہمارے لیے دونوں کی حیثیت اس پہلو سے الگ الگ ہے کہ حضورؐ کا بیداری کی حالت میں معراج واسراء کا سفر معجزہ ہے، جبکہ خواب کے اس قسم کے اسفار کو معجزات میں شمار نہیں کیا جاتا۔

اس تمہید کے ساتھ یہ گزارش کروں گا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج اور اسراء کا ہمارے ساتھ تعلق ایک تو اس حوالہ سے ہے کہ یہ ہمارے ایمان و عقیدہ کا حصہ ہے، اور دوسرا تعلق اس پہلو سے ہے کہ ان میں ہمارے لیے سبق اور عمل کے بہت سے پہلو ہیں۔ ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم ان واقعات سے سبق حاصل کریں اور ان میں ہمارے لیے جو پیغامات اور تعلیمات ہیں ان پر عملدرآمد کا اہتمام کریں۔ چنانچہ خواب اور بیداری کے ان واقعات میں سے، جو سینکڑوں احادیث مبارکہ میں بکھرے ہوئے ہیں، دو واقعات کا تذکرہ کروں گا۔ ایک واقعہ خواب کا ہے اور دوسرا بیداری کے معراج کا ہے۔

جناب نبی اکرمؐ کا معمول مبارک یہ تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد اشراق کے وقت تک مسجد میں ہی تشریف فرما ہوتے تھے اور اس دوران مختلف نوعیت کی باتیں ہوتی رہتی تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ کسی صحابیؓ نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو وہ اپنا خواب بیان کرتا تھا اور آنحضرتؐ اس کی تعبیر بتا دیتے تھے۔ بسا اوقات آپؐ پوچھ بھی لیتے تھے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو تو بیان کرے، کبھی حضورؐ اپنا خواب بیان فرماتے تھے کہ میں نے یہ خواب

دیکھا ہے اور اس کی تعبیر بیان فرماتے تھے۔ بخاری شریف میں حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی روایت سے جناب نبی اکرمؐ کا ایک طویل خواب مذکور ہے جس کا ایک حصہ عرض کر رہا ہوں۔

رسول اکرمؐ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ دو شخص میرے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا، ہم چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچے جو بہت خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت بستی میں نے اس سے قبل نہیں دیکھی تھی، خوبصورت عمارتیں، کشادہ راستے، صاف ستھرا ماحول، غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ عمارتیں سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ میں نے ساتھ والے دو شخصوں سے پوچھا کہ یہ بستی کون سی ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ آگے چلیں بعد میں بتائیں گے۔ ہم آگے چلے تو بستی کے ایک طرف صاف ستھرے پانی کی ایک بڑی نہر ہے جس میں روانی کے ساتھ پانی چل رہا ہے، میں نے دیکھا کہ بستی کی دوسری طرف لوگوں کا ایک بڑا ہجوم ہے جو بستی کی طرف بڑھ رہا ہے مگر ان کے چہرے عجیب ہیں ''نصفھم کاحسن مارأیت و نصفھم کاقبح مارأیت'' چہرے کا نصف حصہ اتنا خوبصورت ہے جتنا خوبصورت تم دیکھ سکو اور چہرے کا باقی نصف اتنا بدصورت ہے جتنا بدصورت تم دیکھ سکو۔ میں نے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ آگے چلیں بعد میں بتائیں گے۔ اتنے میں میرے ساتھیوں نے ہجوم والوں کو آواز دی کہ سب اس نہر میں کود جاؤ وہ سب نہر میں کود گئے اور اس میں دو دو چار چار غوطے لگاتے ہوئے تیر کر دوسرے کنارے سے بستی میں داخل ہونا شروع ہو گئے، میں نے دیکھا کہ نہر میں چھلانگ لگانے اور غوطے کھانے سے ان کے چہروں کی ساری بدصورتی غائب ہو گئی اور وہ انتہائی خوبصورت چہروں کے ساتھ اس بستی میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد میرے ان دو ساتھیوں نے جو مجھے لے کر آئے تھے بتایا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں اور ہماری آج کی ڈیوٹی آپ کو یہ مناظر دکھانے کی ہے۔ یہ بستی عدن ہے جو جنت کا وہ حصہ ہے جہاں آنجناب کا قیام ہو گا، یہ بستی کی طرف بڑھنے والے لوگوں کا ہجوم آپ کی امت کے ان لوگوں کا ہے جو ''خلطوا عملا صالحا وآخر سیئا'' نیکی اور بدی کے کام گڈمڈ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اچھے اعمال بھی کیے اور برے اعمال بھی کرتے رہے اور ان کے معمولات میں نیکی اور گناہ کے اعمال خلط ملط چلتے رہے۔ ان کے چہروں پر ان کے اپنے اعمال کا پرتو ہے، نیکی اور خیر کے اعمال حسن کی صورت میں جبکہ گناہ اور شر کے اعمال

قبح کی صورت میں ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اور جس نہر میں چھلانگ لگا کر انہوں نے قبح اور بدصورتی سے نجات پائی ہے یہ توبہ اور استغفار کی نہر ہے جس میں نہانے سے ان کے چہروں سے ساری بدصورتی صاف ہوگئی اور وہ خوبصورت چہروں کے ساتھ جنت میں داخل ہو گئے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کا یہ قصہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں گناہوں سے نجات اور اعمال شر کے اثرات ختم کرنے کے لیے توبہ اور استغفار کا راستہ بتایا ہے اور تلقین فرمائی ہے کہ ہم توبہ اور استغفار کرتے رہیں تاکہ گناہوں سے اور ان کے اثرات سے پاک ہو سکیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے جسم پر میل کچیل جمتی ہے، پسینہ آتا ہے اور بدبو پیدا ہوتی ہے، جس کا علاج یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً غسل کرتے رہیں۔ اگر غسل کرتے رہیں گے تو جسم کی بدبو، پسینہ اور میل کچیل ساتھ ساتھ صاف ہوتی رہے گی اور اگر غسل کی عادت اور معمول نہیں ہوگا تو رفتہ رفتہ یہ میل کچیل جسم کا حصہ بن جائے گی اور ایک وقت آئے گا کہ غسل بھی فائدہ نہیں دے گا۔ یا جیسے استعمال ہونے والے کپڑے ہیں کہ ان پر گرد بھی لگے گی، داغ بھی جمیں گے، پسینہ اور میل کچیل بھی ان کو میلا کرے گی اور ان سے بدبو بھی آئے گی۔ ان سب کا علاج یہ ہے کہ ان کو وقفہ وقفہ سے دھویا جاتا رہے، کپڑے استعمال ہوں گے اور ساتھ ساتھ وقفہ وقفہ سے دھلتے رہیں گے تو صاف رہیں گے، لیکن اگر استعمال تو ہو رہے ہیں مگر دھل نہیں رہے تو یہ میل کچیل اور داغ ان کے ساتھ پختہ ہوتے چلے جائیں گے اور ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ کپڑوں کو دھونے کا بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہمارا جسم اور اس کے ساتھ روح ہے۔ اور ہمیں ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ اگر روح کا کنکشن ہے تو یہ انسان ہے ورنہ خالی جسم تو کباڑ کی طرح ہے کہ اسے کوئی بھی گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ باپ بیٹے کو دفن کر دیتا ہے اور بیٹا اپنے ہاتھوں باپ کو سپرد خاک کرتا ہے، بیوی خاوند کو گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہے اور خاوند بیوی کو گھر میں نہیں رکھتا۔ جیسے موبائل فون میں کنکشن ہو تو وہ رابطے کا کام کرتا ہے، اور ہم اپنے موبائل فون کو کارآمد رکھنے کے لیے سیٹ اور کنکشن دونوں کی حفاظت کرتے ہیں اور دونوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ سیٹ کی ضرورت یہ ہے کہ اس کی مشینری صحیح کام کرے اور اس کی بیٹری چارج ہوتی رہے جبکہ

کنکشن کی ضرورت یہ ہے کہ وہ برقرار رہے اور اس کو ضرورت کے مطابق بیلنس ملتا رہے۔ اسی طرح انسان ہے جو جسم اور روح دونوں سے مرکب ہے، جسم کی ضروریات کی طرف تو ہماری توجہ ہوتی ہے اور ہم اس دنیا میں اس کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہو کرتے رہتے ہیں لیکن روح کی ضروریات کی طرف ہماری توجہ نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ جسم کے ساتھ کنکشن رکھتے ہوئے بھی ڈیڈ ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح جسم میلا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ گرد اور بدبو لگتی ہے جس کا علاج ہم غسل کے ساتھ کرتے ہیں، اسی طرح روح بھی میلی ہوتی ہے، نفسانی خواہشات، گناہ، شیطانی خیالات اور برے اعمال انسان کی روح کو میلا کر دیتے ہیں، اسے بدبودار بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کا غسل بھی اگر ساتھ ساتھ ہوتا رہے تو وہ صاف رہتی ہے ورنہ میل اور بدبو رفتہ رفتہ اسے اس حال میں کر دیتی ہے کہ میل اور بدبو کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے، اسی حالت کو قرآن کریم نے دلوں کے گرد غلاف چڑھ جانے سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ پھر دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور ان میں حق اور خیر کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ روح کا غسل نماز کے ساتھ ہوتا ہے، اللہ تعالٰی کے ذکر کے ساتھ ہوتا ہے، قرآن کریم کی تلاوت سے ہوتا ہے، جناب نبی اکرمؐ پر درود شریف پڑھنے سے ہوتا ہے اور توبہ و استغفار کی کثرت سے ہوتا ہے۔ اور جناب رسول اکرمؐ کے اس خواب کے ذریعے اللہ تعالٰی نے ہمیں اسی کی بات کی تعلیم دی ہے۔

دوسرا واقعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تاریخی سفر معراج و اسراء کا بیان کروں گا جو ایک بڑا معجزہ ہے، بیداری کی حالت میں ہوا ہے، جسم مبارک کے ساتھ ہوا ہے اور اس کی مختلف تفصیلات آنحضرتؐ سے سینکڑوں احادیث مبارکہ میں منقول ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے جب جنت میں سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی تو حضرت ابراہیمؑ نے آنحضرتؐ کی امت کے لیے آپ کو دو پیغام دیے۔ وہ دو پیغام میں آج کی اس محفل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ حضرات کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آنحضرتؐ کی اس سفر معراج و اسراء میں تین بار ملاقات ہوئی۔ پہلی بار جب تمام انبیاء کرامؑ بیت المقدس میں جمع ہوئے اور سب نے نبی اکرمؐ کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے۔ دوسری بار فرشتوں کے قبلہ بیت المعمور کے پاس ان دو بزرگوں کی ملاقات کا ذکر روایات میں ملتا ہے۔ اور تیسری

ملاقات کا ذکر ترمذی شریف کی اس روایت میں ہے جو جنت میں ہوئی ہے اور اس میں حضرت ابراہیمؑ نے جناب نبی اکرمؐ کے ذریعے آپؐ کی امت کے لیے دو پیغامات دیے۔

1. ایک یہ کہ اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہہ دیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ ہمیں سلام بھیج رہے ہیں، اور وہ بھی جناب نبی اکرمؐ کے ذریعہ سے۔ اس لیے یہ سلام سن کر ہم سب کو سنت کے مطابق اس کا جواب دینا چاہیے۔

2. دوسرا پیغام یہ ہے کہ اپنی امت سے فرما دیجئے کہ ''ان الجنۃ ارضہا طیب وماءہا عذب وانما ہی القیعان، غرسہا سبحان اللہ والحمد للہ واللہ اکبر ولا الہ الا اللہ'' بے شک جنت کی زمین عمدہ ہے اور پانی میٹھا ہے لیکن وہ چٹیل میدان ہے، اسے ذکر الٰہی کے ذریعے خود آباد کرنا ہوگا۔

یعنی جنت انسانوں کے رہنے کے قابل ہے لیکن خالی پلاٹ ملے گا اور وہاں تعمیر اور آبادی خود کرنا ہوگی۔ دنیا میں کسی بھی جگہ آبادی کے لیے اور بسنے کے لیے سب سے پہلے زمین اور پانی کو چیک کیا جاتا ہے اور پھر وہاں بستی بسانے اور انسانوں کو آباد کرنے کا پلان کیا جاتا ہے۔ آج کل ہمارے سائنسدان مختلف سیاروں میں انسانی زندگی کے امکانات تلاش کررہے ہیں، پانی آکسیجن اور ہوا وغیرہ کی تلاش جاری ہے اور اس بات کا جائزہ لیا جارہا ہے کہ انسانوں کو اگر کسی دوسرے سیارے میں آباد ہونا پڑے تو اس کے لیے کونسا سیارہ مناسب رہے گا۔ ویسے بھی ہم نے اس سیارۂ ارضی کا خود اپنے ہاتھوں جو حشر کردیا ہے بلکہ مسلسل کیے جارہے ہیں اس کے پیش نظر متبادل جگہ کی تلاش نسل انسانی کی ضرورت بھی ہے کہ ہماری بداعمالیوں اور حرکتوں کی وجہ سے یہ سیارۂ ارضی خدانخواستہ کسی وقت بھی تباہی کا شکار ہوسکتا ہے۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے سائنسدان تو ابھی امکانات کی تلاش میں سرگرداں ہیں جبکہ حضرت ابراہیمؑ نے چودہ سو سال قبل ایک پیغام کے ذریعے یہ رپورٹ ہمیں بھجوادی ہے کہ جنت انسانوں کے رہنے کے قابل ہے اور اس کی زمین اور پانی دونوں حیات انسانی کے لیے خوشگوار ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دے دی ہے کہ جنت چٹیل میدان ہے اور جس کو بھی ملے گی خالی پلاٹ کی صورت میں ملے گی، اسے آباد خود کرنا ہوگا اور اس پر شجرکاری، باغات اور سبزہ وغیرہ کا اہتمام انسانوں کو خود کرنا پڑے گا۔

مختلف احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر انسان کو اس کی دنیا میں پیدائش کے ساتھ ہی دو پلاٹ الاٹ ہو جاتے ہیں ایک جنت کا اور دوسرا دوزخ کا، دونوں پلاٹ اس کے ساتھ مختص ہو جاتے ہیں۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو آباد کرتا ہے اور کس کو ویران رہنے دیتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں جب سوال و جواب کا مرحلہ مکمل ہو جاتا ہے تو جنتی اور نیک شخص کے لیے پہلے جہنم کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر تو نیکی اور ایمان کا راستہ اختیار نہ کرتا تو تیرا یہ ٹھکانہ ہوتا، یہ بتا اور دکھا کر دوزخ کی وہ کھڑکی بند کر دی جاتی ہے اور اس کے لیے جنت کی کھڑکی کھولی جاتی ہے۔ اسی طرح بدکار اور دوزخی کے لیے پہلے جنت کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ نیکی اور ایمان کا راستہ اختیار کرتا تو اس کا یہ ٹھکانہ ہوتا، اس کے بعد وہ کھڑکی بند کر کے اس کے لیے جہنم کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ کسی بھی انسان کو دنیا میں اس کی پیدائش کے ساتھ ہی جنت اور دوزخ کا ایک ایک پلاٹ الاٹ کر دیا جاتا ہے اور فیصلہ اس کی دنیا کی زندگی اور اس کے ایمان اور اعمال کے حوالہ سے ہوتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد کون سا پلاٹ باقی رہ گیا ہے اور کون سا منسوخ ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی اپنے پیغام میں اسی بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ جنت کا خالی پلاٹ تو انسان کو مل جاتا ہے لیکن اس کی آبادی اور اس میں سبزہ کاری انسان کی دنیا کی زندگی کے اعمال و ایمان پر موقوف ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ یہ فرما کر کہ "انما ہی القیعان" جنت چٹیل میدان کا نام ہے، اس کی آباد کاری کا طریقہ بھی یہ فرما کر بتاتے ہیں کہ "غرسھا سبحان اللہ والحمد للہ واللہ اکبر ولا الہ الا اللہ" جنت کے اس بے آب و گیاہ اور چٹیل میدان کو سرسبز بنانے کے لیے دنیا میں جتنا اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرو گے اور جتنا اپنے مالک و رازق کا ذکر کرو گے اتنا ہی تمہارے جنت کے پلاٹ میں سبزہ اگے گا اور اتنے ہی وہاں درخت پیدا ہوں گے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ نسل انسانی کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ زمین کے تباہ ہو جانے کے بعد تمہارے لیے رہنے کے قابل جگہ جنت ہی ہے لیکن اس کے لیے تمہیں محنت دنیا میں کرنی ہو گی اور مرنے سے قبل اس کی تیاری کرنی ہو گی ورنہ وہ پلاٹ کینسل بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور بات عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں جنت میں اپنے پلاٹ کو آباد کرنے کے لیے ہمیں اس دنیا میں محنت کرنی ہے اور ہمارے موت سے پہلے

کے اعمال اور ایمان کے ساتھ ہی ہمارا جنت کا پلاٹ محفوظ رہے گا اور آباد ہو گا، وہاں ہمیں اس پلاٹ کے سائز کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے تاکہ محنت اس کے مطابق ہو۔ جنت کی بے پناہ وسعت اور اس کی لمبائی اور چوڑائی کا تذکرہ مختلف احادیث میں ملتا ہے، مثلاً جناب نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ جنت کے ایک درخت کے سائے میں تیز رفتار گھوڑا سو سال تک دوڑتا رہے تو اس کا سایہ پھر بھی ختم نہیں ہو گا۔ مگر میں اس حوالہ سے ایک روایت کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو مسلم شریف میں ہے اور جس میں اس شخص کا ذکر کیا گیا ہے جو سب سے آخر میں جنت میں داخل ہو گا۔

یہ ایک لمبی روایت ہے لیکن میں اس کا صرف ایک حصہ بیان کروں گا کہ جب جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونے والا شخص جنت کے دروازے سے اندر جائے گا تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو گا کہ جا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔ وہ ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد عرض کرے گا کہ یا الٰہی مجھے تو کوئی خالی جگہ نہیں مل رہی، سب زمینیں ریزرو ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ پھر فرمائیں گے کہ جا کر اپنی جگہ تلاش کرو، وہ دوبارہ گھوم پھر کر واپس آئے گا اور عرض کرے گا مولائے کریم! مجھے تو کوئی خالی جگہ نظر نہیں آ رہی۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ بتاؤ کتنی جگہ چاہیے؟ جس زمین پر تم رہ کر آئے ہو، اس پوری زمین جتنی جگہ دے دوں؟ وہ عرض کرے گا "اتستھزء بی وانت رب العالمین؟" یا اللہ! رب العالمین ہو کر میرے ساتھ استہزا کر رہے ہو؟ مسلم شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ بات سن کر ہنسیں گے اور فرمائیں گے کہ میں تم سے استہزا نہیں کر رہا "لک الارض وعشرۃ امثالھا" بلکہ پوری زمین اور اس جیسی دس زمینیں اور میں نے تمہیں عطا کر دی ہیں۔ یعنی یہ کرہ ارضی اور اس جیسی دس زمینیں اس شخص کو ملیں گی جو سب سے آخر میں جنت میں جائے گا، اسی سے جنت کے پلاٹوں کے سائز کا اندازہ کر لیں اور اس بات کا بھی اندازہ کر لیں کہ اس پلاٹ کو آباد کرنے اور اسے اپنے لیے محفوظ رکھنے کی خاطر ہمیں دنیا میں کس قدر محنت درکار ہے۔

حضرات محترم! میں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج و اسراء کے دونوں پہلوؤں یعنی بیداری کے معراج اور خواب کے معراج کے حوالہ سے دو مختصر واقعات آپ کے سامنے بیان کیے ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ ہم آنحضرتؐ کے معجزات پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اپنے لیے سبق اور پیغام بھی تلاش کریں اور ان

پر عمل کریں تاکہ ہماری یہ دنیا کی زندگی کار آمد ہو اور ہم یہاں سے سرخرو واپس جائیں، اللہ تعالی ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت عمرؓ کی گڈ گورننس کی بنیاد

(جامعہ اسلامیہ، کلفٹن، کراچی - ۲ جولائی ۲۰۰۹ء)

۲ جولائی کو ایک روز کے لیے کراچی جانے کا اتفاق ہوا، یہ سفر جامعہ اسلامیہ کلفٹن کی دعوت پر ختم بخاری شریف کی تقریب اور سالانہ جلسہ دستار بندی میں شرکت کے لیے ہوا مگر حسب معمول صبح نماز فجر کے بعد جامعہ انوار القرآن (آدم ٹاؤن، نارتھ کراچی) میں تخصص فی الفقہ کے شرکاء کے ساتھ اور نماز ظہر کے بعد جامعہ دارالعلوم کورنگی میں تخصص فی الدعوۃ والارشاد کے شرکاء کے ساتھ بھی ایک ایک نشست ہوئی۔ جامعہ اسلامیہ کلفٹن کی سالانہ تقریب صبح ۹ بجے سے شروع ہو کر نماز ظہر تک جاری رہی اور اس میں جامعہ خیر المدارس ملتان کے شیخ الحدیث مولانا محمد صدیق، مولانا عبد القیوم حقانی، مولانا مفتی محی الدین اور دیگر علماء کرام کے خطابات ہوئے جبکہ مولانا مفتی حبیب اللہ شیخ نے دورۂ حدیث کے طلبہ کو بخاری شریف کا آخری سبق پڑھایا۔ راقم الحروف نے اس موقع پر جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ ہم ایک دینی درسگاہ کی سالانہ تقریب میں شریک ہیں اور آج یہ دینی مدارس دنیا بھر میں گفتگو، مباحثہ اور طعن و اعتراضات کا ہدف ہیں بلکہ اب تو بموں اور ڈرون حملوں کا بھی نشانہ ہیں۔ ڈیڑھ سو برس سے جب سے دینی مدارس کا یہ آزادانہ نظام قائم ہے دنیا کی بہت سی قوتوں کی کوشش ہے کہ یہ مدرسہ ختم ہو جائے یا کم از کم اپنے آزادانہ تعلیمی و معاشرتی کردار سے محروم ہو جائے۔ لیکن یہ دینی تعلیم کا اعجاز ہے کہ جوں جوں ان مدارس کی مخالفت بڑھ رہی ہے، ان پر اعتراضات میں اضافہ ہو رہا ہے اور انہیں ختم کر دینے کے نت نئے پروگرام بن رہے ہیں، اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، دائرہ کار میں وسعت پیدا ہو رہی ہے اور قوت کار میں ترقی ہو رہی ہے جو مستقبل میں بھی ان شاء اللہ تعالی ہوتی رہے گی۔ اور اس حوالے سے میں ایک شعر پڑھتے ہوئے اپنے موضوع گفتگو کے اصل نکتہ کی طرف بڑھنا چاہوں گا کہ:

میری بنیاد ہلا دے مجھے پسپا کر دے
اتنی ہمت تو ابھی گرشِ دوراں میں نہیں ہے

میں آج دینی مدارس کے حوالے سے ایک نکتہ پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کے دور میں ان مدارس کی کیا ضرورت ہے؟ اور آج کی ترقی یافتہ، گلوبل اور کلچرڈ انسانی سوسائٹی کے عملی مسائل و مشکلات کے ساتھ ان مدارس کا کیا تعلق ہے؟ آج ہی کے اخبارات میں ہمارے عزت مآب چیف جسٹس جناب افتخار محمد چودھری کا ایک بیان شائع ہوا ہے کہ ملک کے حکمرانوں کو گڈ گورننس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ مثالی حکمران اور گڈ گورننس کے لیے آئیڈیل اور مثالی شخصیت ہیں اور انہی کے نقش قدم پر چل کر ہم اپنے نظام و کردار کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

میں جناب چیف جسٹس کے اس بیان کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ انہوں نے ملک کے حکمرانوں کی صحیح سمت راہنمائی فرمائی ہے اور یہ صرف ان کا کہنا نہیں ہے بلکہ تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کے لیے جن چند شخصیات کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے ان میں حضرت عمرؓ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن میں اس کے ساتھ چند اور باتوں کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

1. ایک یہ کہ کچھ عرصہ قبل ہمارے ایک محترم سیاستدان نے فرمایا تھا کہ ہمیں مولویوں والا اسلام نہیں چاہیے بلکہ حضرت عمرؓ والا اسلام چاہیے۔ میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ میرے بھائی! اتنا اونچا ہاتھ مت مارو یہ ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم سے تو اپنے پڑوس میں ایک چھوٹا سا ”عمر“ ہضم نہیں ہوا اتنے بڑے ”عمر“ کے ساتھ کیسے چل سکیں گے؟ اس لیے کہ حضرت عمرؓ ڈنڈے والے خلیفہ تھے، ان کے ہاتھ میں ہر وقت کوڑا ہوتا تھا اور وہ کسی کا لحاظ نہیں کیا کرتے تھے اور ان کے سامنے تو بڑے بڑے نیکوکاروں پر بھی کپکپی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اس لیے کسی صلاح الدین ایوبی، اورنگزیب عالمگیر اور شمس الدین التمش طرز کے حکمران کی بات کرو۔

2. دوسری گزارش اس حوالے سے میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت عمر بلاشبہ گڈ گورننس میں آئیڈیل تھے اور اپنے پرائے سب ان کی اس تاریخی حیثیت و مقام کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس گڈ گورننس کی بنیاد کس بات پر تھی

ہمیں اس کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ میرے سامنے تپائی پر بخاری شریف رکھی ہے، اس میں امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے دو اوصاف کا ذکر کیا ہے اور میرے نزدیک یہی حضرت عمرؓ کی گڈ گورننس کی بنیاد تھی۔

• ایک یہ کہ وہ قرآن کریم کا حکم سامنے آنے پر رک جایا کرتے تھے۔ ”کان وقافا عند کتاب اللہ“ کہ قرآن کریم کا ارشاد معلوم ہونے پر اس کے سامنے سرنڈر ہو جایا کرتے تھے، اسٹاپ ہو جاتے تھے اور ارشاد خداوندی سامنے آنے کے بعد ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے قرآن کریم کے حکم اور ارشاد کے سامنے رک جانے، اسٹاپ ہو ہونے اور سپر انداز ہو جانے پر امام بخاریؒ نے بعض واقعات بھی بیان کیے ہیں مگر میں اس کی تفصیل میں جائے بغیر عرض کروں گا کہ حضرت عمرؓ کی حکمرانی کی بنیاد قرآن کریم پر تھی اور وہ اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے حکومت کرتے تھے۔

• حضرت عمرؓ کے طرز حکمرانی کا دوسرا امتیاز امام بخاریؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ اپنی مشاورت و معاونت کے لیے وہ افراد اور ٹیم کا انتخاب قرآن کریم کے علم کی بنیاد پر کرتے تھے۔ جس شخص کے پاس قرآن کریم کا علم زیادہ ہوتا تھا اسے حضرت عمرؓ کی مجلس میں زیادہ قرب حاصل ہوتا تھا، پروٹوکول زیادہ ملتا تھا اور اس کے مشوروں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں نوجوان اور بوڑھے کی تمیز نہیں ہوتی تھی اور بعض نوجوانوں کو صرف اس وجہ سے وہ بزرگ صحابہ کرامؓ کے ساتھ بٹھایا کرتے تھے کہ انہیں اللہ تعالی نے قرآن کریم کے علم سے نوازا ہے۔ امام بخاریؒ نے اس سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت حر بن قیس فزاریؓ کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس لیے اگر حضرت عمرؓ کی گڈ گورننس سے ہم نے استفادہ کرنا ہے اور اسے اپنے لیے مثال بنانا ہے تو اس کے لیے قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور ان اصولوں کو عملی زندگی اور اجتماعی نظام میں لانا ہوگا جن کی وجہ سے حضرت عمرؓ کو انسانی تاریخ میں گڈ گورننس کی آئیڈیل شخصیت کا مقام حاصل ہوا۔

3. جبکہ تیسری گزارش میں یہ کرنا چاہوں گا کہ حضرت عمرؓ کی گڈ گورننس اور ان کی تعلیمات اور ارشادات کی طرف راہنمائی ہمیں آکسفورڈ، کیمبرج اور ہاورڈ کی یونیورسٹیوں میں نہیں ملے گی، ان کی تعلیمات کے مراکز یہی غریب مدارس ہیں جو تمام تر مشکلات، بے سروسامانی اور طعن و تشنیع کے عالمی ماحول کے باوجود حضرت عمرؓ کی تعلیمات کو سنبھالے ہوئے ہیں، ان کا تحفظ کر رہے ہیں اور انہیں اگلی نسل کی طرف منتقل کر رہے ہیں اور اسی وجہ سے عالمی استعمار کے غصہ اور انتقام کا سب سے بڑا ہدف بھی ہیں۔ ہمارے چیف جسٹس محترم نے پاکستان کے نظام حکمرانی کے حوالہ سے بات کی ہے مگر میں عرض کروں گا کہ اب تو پوری دنیا کے پاس اس کے سوا کوئی آپشن باقی نہیں رہا کہ وہ حضرت عمرؓ کی گڈ گورننس کی طرف رجوع کرے اور ان کی ویلفیئر اسٹیٹ کے نظام و تصور سے استفادہ کرے۔ دنیا کو جلد یا بدیر اسی طرف واپس آنا ہوگا۔ کیونکہ یہ دینی مدرسہ صرف ماضی کے علمی ورثہ کی حفاظت نہیں کر رہا بلکہ انسانی سوسائٹی کے مستقبل کی ناگزیر ضرورت کو بھی سنبھالے ہوئے ہے، اس لیے آج کے دانشوروں کو دینی مدرسہ کے اس کردار کا احترام و اعتراف کرتے ہوئے اس کی مخالفت کرنے کی بجائے اسے سپورٹ کرنا چاہیے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۴ جولائی ۲۰۰۹ء)

پاکستان۔ نعمت کی ناقدری اور ناشکری

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۳۱ مئی ۲۰۰۹ء)

گزشتہ شب جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور گزشتہ سال انتقال کرنے والے ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا صوفی عبد

الحمیدؒ سواتی کی یاد میں ’’شیخین سیمینار‘‘ کے عنوان سے تعزیتی اجتماع تھا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے ان کے تلامذہ اور عقیدت مندوں نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی اور متعدّد سرکردہ علماء کرام نے دونوں بزرگوں کی علمی و دینی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا جن میں جسٹس (ر) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے اس موقع پر خطاب میں دونوں بزرگوں کی علمی خدمات کے تذکرہ اور انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے علاوہ ملکی صورتحال کا بھی ذکر کیا اور تیزی سے بگڑتے ہوئے حالات پر صدمہ اور بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ان سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان کی کسی صالح اور ثقہ خاتون کو گزشتہ دنوں خواب میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو مرتبہ زیارت ہوئی ہے اور دونوں مرتبہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ہے کہ پاکستان پر آزمائش کا شدید دور آنے والا ہے اور عذاب کا خطرہ ہے اس لیے قرآن کریم کی سورہ الشمس کا زیادہ سے زیادہ ورد کیا جائے۔ اس خاتون کے مطابق آقائے نامدارؐ نے ۷۵ ہزار کا عدد بھی بتایا ہے کہ اس سورہ کی قرأت کو اس عدد میں مکمل کیا جائے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے یہ بیان کرتے ہوئے مسئلہ کی وضاحت بھی کی کہ پیغمبر کے سوا کسی اور کا خواب شرعی دلیل نہیں ہوتا کہ اس پر عمل ضروری ہو جائے۔ البتہ خواب میں اگر جناب رسول اکرمؐ کی زیارت ہوئی ہے تو یہ تسلی رکھنی چاہیے کہ آپؐ ہی کی زیارت ہوئی ہے، اور اگر آنحضرتؐ نے کوئی ایسی بات فرمائی ہے جو خود آپؐ کے اپنے ارشادات اور قرآن کریم کے احکام کے منافی نہیں ہے تو اس پر عمل بھی کرنا چاہیے۔ چنانچہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے مشورہ دیا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سورہ مبارکہ کی تلاوت کا اہتمام کریں اور ملک بھر میں رجوع الی اللہ اور توبہ و استغفار کا ماحول پیدا کیا جائے تاکہ ہم وطن عزیز کو درپیش موجودہ مشکلات اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات سے بچ سکیں۔

قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے کسی بھی حصے کی قرأت ہمارے لیے ہر وقت خیر و برکت کا باعث اور شرور سے بچاؤ کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آزمائش، فتنہ اور مصیبت کے ہر لمحہ میں نماز، ذکر و اذکار اور قرآن کریم کی تلاوت کی تلقین فرمائی ہے جس پر موجودہ حالات میں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مفتی صاحب سے یہ بات سننے کے بعد میں مسلسل اس سوچ میں تھا کہ بطور خاص اس سورہ کی تلاوت اور

ورد کی تلقین کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ جب اس سورہ کے معانی پر غور کیا تو دو باتیں سمجھ میں آئیں جو موجودہ صورتحال میں ہمارے حالات سے مناسبت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ تلاوت کریں گے تو معنی پر غور کا ذوق پیدا ہو گا اور جب اس سورہ مبارکہ کے معانی پر غور کریں گے تو اس طرف ضرور توجہ جائے گی جو میری طالب علمانہ رائے میں اس تلقین خاص کی وجہ بن سکتی ہے۔

سورۃ الشمس قرآن کریم کی سورہ نمبر ۹۱ ہے جو آخری پارہ میں ہے۔ اور اس کی مختصر سی ۱۵ آیات ہیں جن کی ترتیل کے ساتھ تلاوت میں بھی دو تین منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ جبکہ اس کے نفس مضمون میں دو باتیں شامل ہیں:

1. ایک یہ کہ سورہ کے آغاز میں اللہ تعالی نے سورج، چاند، دن، رات، آسمان، زمین اور دیگر مختلف مظاہر کو گواہ بنا کر یہ فرمایا ہے کہ ہم نے نفس انسانی کو نافرمانی اور فرمانبرداری کے دونوں راستے دکھا دیے ہیں اور اب انسان کی نجات وفلاح کا مدار اس پر ہے کہ وہ اپنے نفس کی اصلاح کر کے اسے پاک صاف رکھتا ہے یا اسے رذائل میں ملوث کر کے ناکامی اور نامرادی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ گویا اللہ تعالی یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ تمہاری کامیابی یا ناکامی اور فلاح یا خسارہ کا مدار اس بات پر ہے کہ تم اپنی اصلاح کے لیے کس حد تک تیار ہو؟ کیونکہ یہ قانون فطرت ہے کہ جب تک انسان خود اپنی اصلاح کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اس کے ضروری تقاضے پورے نہیں کرتا اللہ تعالی کسی کو جبرا اصلاح کے راستے پر گامزن نہیں کرتا۔

اس ارشاد گرامی کی روشنی میں ہم اپنی مجموعی حال پر ایک نظر ڈال لیں تو اس حقیقت کا ادراک کوئی مشکل بات نہیں ہے کہ ہمارا تو "آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے"۔ کچھ افراد ہر طبقہ میں ضرور مستثنی ہوں گے جو اصلاح احوال کی سوچ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے منطقی اور فطری تقاضے پورے کرنے کے لیے بھی آمادہ ہوں گے۔ مگر مجموعی طور پر قوم کا کوئی طبقہ بحیثیت طبقہ اصلاح کا عمل قبول کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتا۔ ہم سب دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں لیکن خود اپنی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ہم میں سے ہر طبقہ، گروہ اور فرد خود ہی حق اور انصاف کا معیار بن گیا ہے اور اسی معیار پر ساری

قوم کو لانے پر تلا ہوا ہے۔ کرپشن عام ہے، خود غرضی نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں، محدود مفادات نے ہمارے ذہن وقلب کو ماؤف کر دیا ہے اور ہم شخصی یا زیادہ سے زیادہ گروہی یا طبقاتی سوچ اور مفاد سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں ہیں۔

ان حالات میں ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ صدر مملکت سے لے کر ایک عام فرد تک ہر شخص اپنی موجودہ پوزیشن کا جائزہ لے، اس پر نظر ثانی کرے اور ملک و قوم کی بہتری کے لیے اپنی ترجیحات اور معمولات میں جو تبدیلی بھی ضروری نظر آئے اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہے۔ میرے خیال میں ہمیں قرآن کریم کی اس سورہ مبارکہ کی طرف توجہ دلا کر یہ کہا گیا ہے کہ ''نفس کی اصلاح اور ہر نفس کی اصلاح'' اس وقت ہماری سب سے بڑی ''قومی ضرورت'' ہے۔ اگر ہم خدانخواستہ اس طرف متوجہ نہیں ہوں گے تو قومی آزمائش کے نئے مرحلے ہمارے لیے عذاب خداوندی کی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالی ہمیں اس سے اپنی حفظ و امان میں رکھیں، آمین یا رب العالمین۔

2. اس سورہ مبارکہ کے دوسرے حصے کا مضمون یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کو اس کی درخواست پر اللہ تعالی نے حضرت صالحؑ کے معجزہ کے طور پر چٹان کے پیٹ سے ایک اونٹنی دی تھی جو ایک زندہ اونٹنی کے طور پر ان کے درمیان موجود رہی۔ مگر اللہ تعالی کے پیغمبر نے اس کے ساتھ یہ وارننگ بھی دی کہ یہ ''اللہ تعالی کی خاص اونٹنی'' ہے اگر اس کو نقصان پہنچایا تو خدا کا عذاب آئے گا۔ ان کی قوم نے اس وارننگ کی پروا نہ کی اور اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں جس پر خدا کا عذاب آیا اور پوری کی پوری قوم صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔

کیا اس سورہ مبارکہ کی تلاوت کی تلقین فرما کر ہمیں یہ سوچنے کی دعوت تو نہیں دی گئی کہ غور کرو اور سوچو کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں بحیثیت قوم اللہ تعالی نے تمہاری دعا اور درخواست پر کوئی خاص نعمت دی ہو اور تم اس کی ناقدری اور ناشکری کر رہے ہو۔ کیونکہ اللہ تعالی کا قانون یہ ہے کہ وہ عام نعمتوں کی ناشکری

پر بھی ناراض ہوتے ہیں لیکن جو نعمت لوگوں کو ان کی درخواست پر دی جاتی ہے اس کی ناقدری اور ناشکری اللہ تعالی کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کا باعث بن جاتی ہے، پھر خدا کا عذاب ان ناقدروں اور ناشکروں کا مقدر بن جایا کرتا ہے۔

مجھے یہ عرض کرتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے کہ پاکستان اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے جو رب العالمین نے ہماری اجتماعی درخواست پر ہمیں معجزے کے طور پر عطا فرمایا تھا۔ ہم نے یہ نعمت مانگتے ہوئے اپنے رب سے ایک وعدہ کیا تھا جو ہم ساٹھ سال میں بھی پورا نہیں کر سکے اور اب خدانخواستہ اس وعدے سے پیچھا چھڑانے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ "قوم ثمود" کی طرز کی یہ بغاوت ہمارے لیے اسی قوم جیسے انجام کا باعث بن جائے، اس کے لیے فکر کی ضرورت ہے اور شاید ہمیں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ: الشریعہ اکادمی کا تعزیتی ریفرنس

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۲۷ مئی ۲۰۰۹ء)

۲۷ مئی کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی یاد میں تعزیتی ریفرنس منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا مشتاق احمد چنیوٹی نے کی اور اس میں مولانا موصوف کے علاوہ راقم الحروف اور عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے حضرت کو خراج عقیدت پیش کیا جبکہ اکادمی کے اساتذہ، طلبہ اور معاونین کے ساتھ ساتھ شہر کے بہت سے علماء کرام اور اہل دانش نے بھی شرکت کی۔ مولانا مشتاق احمد چنیوٹی نے اپنے استاذ محترم کے ساتھ دور طالب علمی سے وابستہ یادوں کا تذکرہ کیا اور عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ عمار ناصر نے اپنے دادا محترم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا اور راقم الحروف نے والد محترم کی زندگی کے مختلف حالات اور ان کی تگ و تاز کے دائروں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا جس کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ ہم عام طور پر ایک محاورہ سنتے اور پڑھتے ہیں جو کسی بڑی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بولا جاتا ہے کہ ”وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے“۔ میں کسی مبالغہ اور جذباتیت کے بغیر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کے دور میں اس محاورہ کے سب سے بڑے مصداق حضرت والد محترم تھے جن کی جدوجہد اور تگ و تاز کے مختلف شعبوں اور دائروں کا تذکرہ بھی اچھا خاصا وقت لے لیتا ہے۔ مثلاً وہ ایک مسجد کے امام و خطیب تھے، انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں جی ٹی روڈ پر واقع ایک مسجد کی امامت و خطابت ۱۹۴۳ء میں سنبھالی جسے مسجد بوہڑ والی کہا جاتا تھا اور ۲۰۰۰ء تک مسلسل یہ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے پوری طرح پابند امام تھے، پانچ وقت کی نماز خود پابندی سے پڑھاتے تھے اور عین وقت پر ان کا مصلی پر موجود ہونا ضرب المثل بن چکا تھا۔ کسی شدید مجبوری کے بغیر چھٹی اور ناغے کا ان کے ہاں تصور تک نہ تھا، سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا آندھی وہ اپنے وقت پر نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں موجود ہوتے تھے۔

پانچ وقت نمازوں کی امامت اور جمعہ کے خطبہ و نماز کے علاوہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد درس ان کے معمولات کا حصہ تھا۔ ہفتہ میں تین دن قرآن کریم کا اور تین دن حدیث نبویؐ کا درس ہوتا تھا جس کے لیے وہ باقاعدہ تیاری کرتے تھے۔ انہوں نے گکھڑ کے لوگوں کو کئی بار قرآن کریم ترجمہ و تفسیر کے ساتھ سنایا اور حدیث نبویؐ کے باب میں صحاح ستہ کی ساری کتابوں کے علاوہ مسند ابن حبان، مجمع الزوائد، الجامع الصغیر، مستدرک حاکم اور متعدّد دیگر کتب احادیث بھی انہوں نے اپنے نمازیوں کو سبقاً سبقاً سنائیں۔

ان کا دوسرا دائرہ کار تدریس کا تھا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۲ء تک وہ گکھڑ کی اسی مسجد میں درس نظامی کے اسباق پڑھاتے تھے، مختلف علاقوں سے طلبہ جمع ہو جاتے تھے، پرانے رواج اور طریقہ کے مطابق گکھڑ کے لوگ انہیں کھانا مہیا کر دیتے تھے اور طلبہ مسجد میں رہائش رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں حضرت والد محترم کا سب سے بڑا مشغلہ تدریس ہوتا تھا، وہ صبح نماز فجر سے عشاء کی نماز کے بعد تک مسلسل پڑھاتے تھے اور بسا اوقات ایک ایک دن میں تیس تیس اسباق بھی پڑھاتے تھے۔ ۱۹۵۲ء کے دوران گوجرانوالہ میں ان کے برادر صغیر حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی نے مدرسہ نصرۃ العلوم قائم کیا تو وہ اس کی تدریس سے وابستہ ہو گئے اور ۲۰۰۰ء تک مسلسل روزانہ گوجرانوالہ جا کر اسباق پڑھاتے

رہے۔ ابتداء میں ایک عرصہ تک ریل گاڑی سے آتے جاتے تھے، گھر سے ریلوے سٹیشن تک پیدل جانا اور گوجرانوالہ ریلوے اسٹیشن سے مدرسہ نصرۃ العلوم تک پیدل آنا جانا سالہا سال تک ان کا معمول رہا۔ پھر کئی برس تک بسوں کے ذریعے آنا جانا رہا اور پھر ایک وقت آیا کہ مدرسہ نصرۃ العلوم نے گاڑی لے لی جو انہیں گکھڑ سے لے آتی تھی اور اسباق سے فراغت کے بعد گھر چھوڑ آتی تھی۔

ان کا دن کا پہلا پہر گوجرانوالہ آنے جانے اور مدرسہ کے اسباق میں گزر جاتا تھا۔ دوپہر تک واپس آتے، کھانا کھاتے، اخبار پڑھتے اور ظہر تک آرام کرتے۔ ظہر سے عصر تک ان کا ایک اور تعلیمی سلسلہ ہوتا تھا کہ گکھڑ کے مختلف گھرانوں کی بچیاں ان سے قرآن کریم کا ترجمہ اور درس نظامی کے اسباق پڑھتی تھیں۔ اس دور میں جبکہ ملک میں طالبات کے دینی مدارس کا ماحول نہیں تھا گکھڑ کے بیسیوں گھرانوں کی بچیوں نے ان سے تعلیم حاصل کی۔ خود ہماری بہنوں نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی اور بحمد اللہ تعالیٰ وہ مسلسل پڑھا رہی ہیں۔

اس کے علاوہ ان کا تدریس کا ایک اور سلسلہ بھی تھا کہ گکھڑ میں اساتذہ کی ٹریننگ اور تربیت کا ایک ادارہ بہت عرصہ سے چلا آرہا ہے جو عام حلقوں میں نارمل اسکول کہلاتا ہے، وہاں وہ زیر تربیت اساتذہ کو جو عام طور پر سی ٹی، ایس وی، جے وی وغیرہ کورسز کے ہوتے تھے، روزانہ سبقی انداز میں قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے۔ موسم گرما میں عصر کی نماز کے بعد اور سردیوں میں عشاء کی نماز کے بعد یہ درس ہوتا تھا جس سے ہزاروں اساتذہ نے استفادہ کیا اور اب ملک کے مختلف حصوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ان کی جدوجہد کا تیسرا دائرہ تالیف و تصانیف کا ہے جس میں انہوں نے مختلف علمی موضوعات پر پچاس کے لگ بھگ تصانیف یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں۔ ان کی تصانیف کے علمی معیار، انداز تحریر کی سنجیدگی اور اسلوب تحقیق کی ثقاہت پر ان کے مخالفین بھی انہیں خراج تحسین پیش کرتے تھے۔ وہ ایک ایک حوالہ کے لیے کئی کئی لائبریریاں چھانتے اور ایک ایک نکتہ کے لیے گھنٹوں مطالعہ کرتے۔ گزشتہ دنوں ایک محفل میں چند اہل دانش گفتگو کر رہے تھے کہ وہ زندگی میں اور کوئی کام نہ کرتے تو صرف ان کی کتابیں بڑی بڑی اکیڈمیوں کی اجتماعی محنت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور بلا مبالغہ ان کتابوں سے ہزاروں لوگوں کے عقائد و افکار کی اصلاح ہوئی۔

حضرت والد محترم کی محنت اور جدوجہد کا چوتھا دائرہ تحریکی تھا۔ انہوں نے آزادی کی جدوجہد میں ایک طالب علم کے طور پر جمعیت علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے مسلسل حصہ لیا۔ وہ اجتماعات اور اجتماعی مظاہروں میں شریک ہوتے تھے اور تحریک آزادی میں اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو تحریک آزادی میں سرگرم کردار کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تو اس گرفتاری کے خلاف دیوبند میں طلبہ کے احتجاجی جلوس اور تحریک کی قیادت انہوں نے ہی کی تھی۔ یہ مظاہرے کئی روز جاری رہے، دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام معطل ہوگیا اور بالآخر جمعیت علماء ہند کے قائد حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی مداخلت پر تعلیمی سلسلہ بحال ہوا۔ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ ان مذاکرات میں بھی طلبہ کی نمائندگی مولانا محمد سرفراز خان نے کی۔ وہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں گرفتار ہوئے اور کم وبیش دس ماہ تک ملتان سنٹرل جیل میں رہے۔ اسی دوران انہیں جیل میں خواب کے دوران سیدنا حضرت عیسی علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوئی اور اسی جیل میں انہوں نے ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کی کتاب ''دو اسلام'' کا جواب ''صرف ایک اسلام'' لکھا جس پر انہیں خود ڈاکٹر برق مرحوم نے بھی دوسرے ایڈیشن میں خراج تحسین پیش کیا۔

حضرت والد محترم ایک عرصہ تک جمعیت علماء اسلام ضلع گوجرانوالہ کے امیر رہے اور جمعیت کے اجتماعات اور پروگراموں میں مسلسل شریک ہوتے رہے۔ اسی حیثیت سے انہوں نے ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفی میں قائدانہ کردار ادا کیا اور اسی دوران گکھڑ میں وہ تاریخی واقعہ پیش آیا کہ ان کی قیادت میں مرکزی جامع مسجد سے نکلنے والے ایک جلوس کو روکنے کے لیے فیڈرل سیکیورٹی فورس کے کمانڈر نے سڑک پر ایک لکیر کھینچ کر وارننگ دی کہ جس نے یہ لائن عبور کی اسے گولی ماردی جائے گی، اس کے ساتھ ہی فورس کے جوانوں نے فائرنگ کے لیے پوزیشنیں سنبھال لیں لیکن حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے وہ لکیر عبور کر گئے کہ مسنون عمر تریسٹھ سال پوری کر چکا ہوں اور اب شہادت کی تمنا رکھتا ہوں۔

اس کے علاوہ بھی ان کی زندگی کے مختلف دائرے ہیں جن میں سے ہر ایک کے مستقل تذکرہ کی ضرورت ہے اور ان شاء اللہ یہ تذکرہ مختلف حوالوں سے مسلسل ہوتا رہے گا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۱ مئی ۲۰۰۹ء)

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ بھی رخصت ہوئے

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۰ مئی ۲۰۰۹ء)

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ میرے والد گرامی تھے، استاذ محترم تھے، شیخ ومربی تھے، اور ہمارے درمیان دوستی اور بے تکلفی کا وہ رشتہ بھی موجود تھا جو باپ اور اس کے بڑے بیٹے کے مابین ہوتا ہے۔ وہ ۵ مئی کو رات ایک بجے کے لگ بھگ کم وبیش ایک صدی اس دنیا میں گزار کر دار آخرت کی طرف کوچ کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں خود ہجری اعتبار سے تریسٹھ برس کا ہو چکا ہوں اور میرے جذبات و تاثرات کا وہی عالم ہے جو حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کا اپنے والد گرامی حضرت مولانا سید محمد زکریا بنوریؒ کی وفات پر تھا۔ وہ مولانا سید یوسف بنوریؒ کی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل اس جہان فانی سے رخصت ہوئے تھے۔ جب اپنے بزرگ باپ کی وفات پر مولانا بنوریؒ رو رہے تھے تو کسی نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کے والد بزرگوار نے ماشاء اللہ خاصی عمر پائی اور بہت اچھی زندگی گزاری ہے، آپ روتے کیوں ہیں؟ فرمایا کہ روتا اس لیے ہوں کہ اب مجھے "ابے یوسف" کہہ کر بلانے والا نہیں رہا۔ چنانچہ میری کیفیت بھی کچھ اس طرح کی ہے اور سوچتا ہوں کہ اب "زاہد کو بلاؤ" کون کہے گا؟ اور "زاہد ادھر آؤ" کہہ کر بلانے والا کون ہوگا؟

وفات کے وقت ان کی عمر ہجری حساب سے اٹھانوے برس تھی کہ وہ اپنا سن ولادت ۱۳۳۲ ہجری بتایا کرتے تھے۔ ان کے والد محترم جناب نور احمد خان مرحوم شاہراہ ریشم پر واقع شنکیاری سے چند میل کے فاصلے پر کڑمنگ کے قریب ایک پہاڑی چوٹی "چیراں ڈھکی" پر رہتے تھے اور چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ سوات کے معروف روحانی پیشوا حضرت اخوند زادہ عبد الغفورؒ سواتی سے ان کا بیعت و عقیدت کا تعلق تھا اور وہ ضلع مانسہرہ کے طول وعرض میں آباد سواتی قوم میں سے تھے۔ والد محترمؒ نے دینی تعلیم اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبد الحمیدؒ سواتی، جن کا گزشتہ سال اپریل میں انتقال ہوا، کے ہمراہ مانسہرہ، گوجرانوالہ، جہانیاں منڈی، وڈالہ سندھواں اور دیگر علاقوں کے دینی مدارس میں حاصل کی اور ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم دیوبند پہنچے جہاں دونوں بھائیوں نے دورۂ حدیث کیا اور حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی سے شرف تلمذ کے ساتھ سند فراغت حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں وہ

گکھڑ ضلع گوجرانوالہ آگئے اور جی ٹی روڈ پر واقع مسجد بوہڑ والی میں امامت و خطابت کا سلسلہ شروع کیا جو ۲۰۰۰ء تک مسلسل جاری رہا۔ پانچ وقت نمازوں کی امامت، نماز فجر کے بعد بلاناغہ درس قرآن و حدیث، اور جمعہ و عیدین کے خطبوں کے علاوہ درس نظامی کے مختلف درجات کی تدریس کم و بیش ساٹھ برس تک ان کا روزمرہ کا معمول رہی۔ وقت کی پابندی میں لوگ مولانا ظفر علی خان مرحوم کے ساتھ والد گرامیؒ کا نام بھی لیا کرتے تھے اور عام طور پر ان کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ لوگ ان کے معمولات کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں سیدھی کیا کرتے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں چچا محترم مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی نے گھنٹہ گھر گوجرانوالہ کے قریب مدرسہ نصرۃ العلوم قائم کیا تو والد محترمؒ اس کی تدریس سے وابستہ ہوئے اور صدر مدرس، شیخ الحدیث، اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے ۲۰۰۰ء تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ میں اساتذہ کی تربیت کے لیے جے وی، ایس وی، اور سی ٹی طرز کے کورسز کے شرکاء کو روزانہ درس قرآن کریم کی صورت میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر سے بہرہ ور کرنے کا سلسلہ بھی کم و بیش ربع صدی تک جاری رہا۔ ایک بار ہم نے ان اداروں سے تعلیم پانے والے حضرات کے اعداد و شمار کا محتاط اندازے سے حساب لگانا چاہا تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ والد مرحوم کے براہ راست شاگردوں کی تعداد تیس ہزار سے کسی طرح کم نہیں ہوگی جو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی شعبے میں دینی اور تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مجھے دنیا کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً جانے کا موقع ملتا رہتا ہے، امریکہ، یورپ، افریقہ، مشرق بعید، مشرق وسطی، اور وسط ایشیا کا کوئی علاقہ ایسا نہیں دیکھا جہاں ان کا کوئی شاگرد موجود نہ ہو اور دینی خدمات سر انجام نہ دے رہا ہو۔

والد محترم نے دو شادیاں کی تھیں۔ ہماری دونوں ماؤں سے ہم بارہ بھائی اور تین بہنیں پیدا ہوئے۔ تین بھائی بچپن میں ہی فوت ہوگئے جبکہ نو بھائی جوان ہوئے جو سب کے سب دینی تعلیم سے آراستہ ہیں، عالم ہیں، قاری ہیں، حافظ ہیں اور دینی تعلیم کے کسی نہ کسی شعبے سے وابستہ ہیں۔ تینوں بیٹیاں دینی تعلیم سے بہرہ ور ہیں، قرآن کریم کی حافظہ ہیں، درس نظامی کی تعلیم سے بھی فیض یافتہ ہیں، اور دینی علوم کی تدریس میں مصروف ہیں۔ والد محترم خود حافظ قرآن نہیں تھے مگر سب بیٹوں اور بیٹیوں کو قرآن کریم حفظ کرایا۔ جب ان

سے کوئی پوچھتا کہ حضرت کیا آپ حافظ ہیں؟ تو جواب میں کہتے کہ ”میں حافظوں کا باپ ہوں“۔ ایک بار ہم نے ان کے بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں، پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں اور باقی اولاد میں قرآن کریم کے حافظوں کا شمار کیا تو ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی، چنانچہ وہ فی الواقع حافظوں کے باپ تھے۔

وقت کی پابندی کے ساتھ ساتھ ان کی یادداشت اور علوم کا ذہنی استحضار بھی ضرب المثل تھا۔ گزشتہ نو برس سے صاحب فراش تھے، کروٹ اپنے اختیار سے نہیں بدل سکتے تھے، مگر یادداشت کا یہ عالم تھا کہ کتاب کے باب اور صفحہ نمبر کے ساتھ حوالہ بتایا کرتے تھے۔ اس حالت میں بھی ہمیں کسی مسئلے یا حوالے کے بارے میں تردد ہوتا تو ان سے پوچھتے اور وہ جس کتاب اور جس صفحے کا حوالہ دیتے وہ وہیں مل جاتا تھا۔ ضعف کی عمر میں اخبار باقاعدگی سے سنتے، حالات سے باخبر رہتے اور ان پر تبصرہ بھی کیا کرتے تھے۔ جمعہ کے روز شام کو تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس میرا حاضری کا معمول تھا۔ وہ مجھ سے ملکی حالات کے بارے میں دریافت کرتے تھے، مجاہدین کی سرگرمیاں، اور سوات و دیگر شمالی علاقوں کے حالات ان کی دلچسپی اور پریشانی کے خاص موضوعات تھے۔ آخری دنوں میں سوات کے بارے میں خبریں سن کر اور حالات معلوم کر کے آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ کتاب اور علم کے ساتھ دلچسپی آخر وقت تک قائم رہی، کسی نئی کتاب کے بارے میں معلوم ہوتا تو فرمائش کر کے منگواتے تھے اور کچھ نہ کچھ سنتے رہتے تھے۔

میں والد گرامیؒ کی وفات سے چند روز قبل برطانیہ اور سعودی عرب کے سفر سے واپس آیا ہوں۔ جانے سے پہلے میں نے انہیں بتایا اور دعا کی درخواست کی تو دعا کے ساتھ کہنے لگے سنا ہے کہ حدیث کی کتاب ”مسند ابی یعلی“ چھپ گئی ہے، وہ میرے لیے لیتے آنا۔ اس کتاب کا محدثین کے ہاں اکثر تذکرہ ملتا ہے اور اس کے حوالے بھی دیے جاتے ہیں مگر مطبوعہ صورت میں کافی عرصے سے ناپید تھی۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، اور جدہ کے نصف درجن سے زائد کتب خانوں میں تلاش کے بعد وہ کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ مگر گزشتہ جمعہ کے روز میں نے جب مسند ابی یعلی ان کی خدمت میں پیش کی تو وہ معذوری کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے تھے اور گفتگو بھی اشاروں میں ہی کر پا رہے تھے۔

والد گرامیؒ عمر بھر دینی و قومی تحریکات میں حصہ لیتے رہے، تحریک آزادی میں جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا، ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں کم و بیش دس ماہ اور

۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفی میں ایک ماہ تک جیل میں رہے۔ ایک طویل عرصہ تک جمعیت علمائے اسلام ضلع گوجرانوالہ کے امیر رہے اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ وہ اہل سنت کے دیوبندی مکتب فکر کے علمی ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے مسلکی اختلافات کے حوالہ سے مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ ضخیم کتابیں لکھی ہیں جن کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے انداز تحقیق، اسلوب بیان، اور علمی ثقاہت کا ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم نے بھی کھلے دل کے ساتھ اعتراف کیا ہے جن کی کتاب ''دو اسلام'' کا تحقیقی جواب والد محترمؒ نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران ملتان جیل میں تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر برق مرحوم نے اپنی کتاب ''دو اسلام'' کے آخری ایڈیشن میں لکھا ہے کہ اس کتاب کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں میں سے جس کتاب کے اسلوب بیان، تحقیق، اور متانت سے وہ متاثر ہوئے ہیں وہ مولانا سرفراز خان صفدر کی کتاب ''صرف ایک اسلام'' ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی وفات پر لوگوں کو روتے ہوئے دیکھ کر مولانا سید حسین احمدؒ مدنی نے کہا تھا کہ ''تم کیوں روتے ہو، تمہارے لیے تو ہم ہیں۔ رونے کا حق تو ہمارا ہے کہ ہمارے لیے کوئی نہیں رہا''۔ آج اہل علم یتیم ہو گئے ہیں کہ مشکل وقت میں رہنمائی کے لیے جن سے رجوع کیا کرتے تھے وہ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہمیں ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز

(مسجد زکریا، ڈیوزبری، برطانیہ - ۱۹ اپریل ۲۰۰۹ء)

(مسجد زکریا، ڈیوزبری، برطانیہ میں ظہر کی نماز کے بعد خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اللہ تعالیٰ کا بے حساب شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو اپنے گھر میں نماز ادا کرنے کے بعد دین کی کچھ باتیں کہنے سننے کے لیے مل بیٹھنے کی توفیق عطا فرمائی، اللہ رب العزت کچھ بامقصد باتیں عرض کرنے کی توفیق دیں اور ان پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین یارب العالمین۔ میرے میزبان دوست جناب سلیمان قاضی نے فرمائش کی ہے کہ ''ملت اسلامیہ کو درپیش چیلنجز'' کے عنوان پر کچھ معروضات پیش کی جائیں، یہ ایک وسیع

اور متنوع موضوع ہے جس کے مختلف پہلوؤں پر ایک مجلس میں بات کرنا مشکل ہے، البتہ اس کے چند بنیادی پہلوؤں پر کچھ گزارشات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ امت مسلمہ کو کیا مسائل درپیش ہیں اور کن چیلنجز کا سامنا ہے؟ اسے دینی نقطۂ نظر سے چند تدریجی مراحل میں تقسیم کرنا چاہوں گا:

1. پہلا مرحلہ ایک فرد کا ہے کہ ایک مسلمان فرد کے طور پر اسلام ہم سے کیا تقاضہ کرتا ہے؟ یہ بہت اہم مرحلہ ہے اس لیے کہ سوسائٹی اور اجتماعیت کی بنیاد فرد پر ہوتی ہے، افراد مل کر اجتماعیت اور سوسائٹی کی شکل اختیار کرتے ہیں، جس طرح ایک مشین بہت سے پرزوں پر مشتمل ہوتی ہے، اگر ہر پرزہ اپنی جگہ درست اور صحیح کام کر رہا ہو تو مشین بھی صحیح کام کرے گی، اور اگر کوئی پرزہ درست نہیں ہے اور اس میں خرابی ہے تو مشین بھی صحیح کام نہیں کرے گی۔ کسی مشین کے صحیح طور پر کام کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے تمام پرزے صحیح ہوں، ان میں کوئی خرابی نہ ہو۔ اور اس کے بعد یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کا آپس کا جوڑ صحیح ہو اور نیٹ ورک درست ہو، کیونکہ اگر پرزے صحیح ہیں لیکن باہمی جوڑ صحیح نہیں ہے تو بھی مشین صحیح کام نہیں کر سکے گی۔ اسی طرح سوسائٹی کا معاملہ ہے کہ اگر فرد صحیح ہے اور بحیثیت مسلمان صحیح کام کر رہا ہے، اور پھر افراد کا باہمی جوڑ صحیح ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کے معاملات درست ہیں تو سوسائٹی کا نظام صحیح ہو گا، ورنہ بگڑ جائے گا۔

اسی لیے حضرات صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی توجہ سب سے زیادہ فرد پر ہوتی ہے، وہ فرد اور نفس کی اصلاح کو اپنا ہدف بناتے ہیں اور اسی پر محنت کرتے ہیں، اس لیے کہ اگر کوئی مسلمان بطور مسلمان صحیح ہے تو وہ سوسائٹی کا مفید اور کار آمد پرزہ بنے گا، لیکن اگر وہ صحیح مسلمان نہیں ہے تو سوسائٹی میں بھی خرابی پیدا کرے گا۔ چنانچہ سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب صحیح مسلمان بننے کی کوشش کریں، ایک مسلمان کے طور پر اللہ تعالیٰ اور ان کے آخری رسولؐ کے احکام و فرامین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں، اور ایمان و عقائد، فرائض و عبادات، حلال و حرام، باہمی حقوق و معاملات اور آداب و اخلاق کے حوالہ سے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔ یہ ہمارے

لیے پہلا مرحلہ اور دائرہ ہے جس پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

2. اس کے بعد دوسرا دائرہ خاندان اور فیملی کا ہے اور اسلام ہم سے تقاضہ کرتا ہے کہ ہمارا گھر کا ماحول دینی ہو، اس میں قرآن و سنت کے احکام پر عمل ہو رہا ہو، گھر کے اندر اللہ تعالی اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین کی عملداری ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ اپنے گھر والوں کو بھی نماز کی تلقین کرو اور اس پر صبر و حوصلہ سے کام لو، یعنی ایک آدمی کا خود اپنے آپ کو نماز کا پابند بنا لینا کافی نہیں ہے بلکہ گھر میں نماز کا ماحول پیدا کرنا اور گھر والوں کو نماز و روزہ کا پابند کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایک جملہ اور کہا گیا ہے کہ اس پر صبر کرو۔ اس کا ایک معنی بعض مفسرین کرامؒ یہ بیان کرتے ہیں کہ گھر والوں کو نماز کا کہنا مشکل کام ہوتا ہے اس لیے اس پر صبر و استقامت کا مظاہرہ بھی کرنا ہوگا۔ یہ بات ویسے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ساری دنیا کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا آسان ہے لیکن یہ کام اپنے گھر میں کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح ساری دنیا سے لڑنا آسان ہے مگر اپنے آپ سے لڑنا اور اپنے نفس کے خلاف جنگ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حضرات صوفیاء کرامؒ فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے جناب نبی اکرمؐ کے ایک ارشاد گرامی میں نفس کے خلاف جہاد کو ”جہاد اکبر“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہرحال فرد اور نفس کی اصلاح کے بعد دوسرا دائرہ فیملی اور خاندان کا ہے اور آج ہمیں درپیش چیلنجز اور تحدیات میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے گھروں کا ماحول دینی نہیں رہا اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری ہمارے گھروں کے اندر کم ہوتی جا رہی ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے ایک ارشاد گرامی میں فرمایا ہے کہ گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، یعنی جس گھر میں نماز کا ماحول نہیں ہے وہ حضورؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق آباد گھر نہیں ہے بلکہ قبرستان ہے۔ اس طرح ایک حدیث میں آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ ویران گھر کی طرح ہے۔ اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے گھروں کو ویرانی سے نکالیں اور انہیں آباد

کرنے کی کوشش کریں جو نماز کا ماحول بنانے، قرآن کریم کی تلاوت اور احکام اسلامی پر عمل کرنے سے ہو گا۔

3. تیسرے مرحلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایک مسلم سوسائٹی اور مسلم کمیونٹی میں ہم مسلمانوں کا آپس میں جوڑ کیسا ہے؟ اور ہم ایک دوسرے کے حقوق و آداب میں اسلامی احکام کی پیروی کس حد تک کر رہے ہیں؟ اسلام نے باہمی حقوق و آداب اور معاشرتی اخلاقیات کی جتنی تفصیل بیان کی ہے اور کسی نظام میں اس کی مثال نہیں ملتی لیکن بدقسمتی ہے کہ ہماری باہمی معاشرت ان حقوق و آداب اور اخلاقیات سے خالی ہوتی جا رہی ہے جن کی قرآن کریم نے اور جناب نبی اکرمؐ نے تلقین فرمائی ہے۔ اس کی صرف ایک مثال سے اندازہ کر لیجئے کہ دیانت اور امانت کے حوالہ سے ہماری معاشرتی صورتحال کیا ہے۔ آج دنیا کی اقوام میں دیانت اور کرپشن کے حوالہ سے ہمارا کیا تعارف ہے؟ پرانے ادوار میں دین اور دیانت کو مترادف سمجھا جاتا تھا، اور دیانت کے لیے بھی دین ہی کا لفظ بولا جاتا تھا۔ لیکن آج دیانت و امانت کا تعلق ہماری دینداری کے ساتھ قائم نہیں رہا، ایک شخص جو دینداری میں معروف ہے اور اسے عام طور پر مذہبی آدمی سمجھا جاتا ہے لیکن دیانت کے باب میں وہ ناگفتہ بہ حد تک دین سے دور ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں دیانت اس کو سمجھا جاتا ہے کہ کہیں داؤ نہ لگ سکے۔ اور کہیں داؤ لگ گیا ہے تو کوئی بھی معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا، افراد ضرور مستثنیٰ ہوں گے اور ہیں، لیکن مجموعی طور پر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے داؤ نہ لگ سکنے کا نام دیانت رکھ لیا ہے۔ ہماری اس حالت نے ہمیں دین سے تو دور کر ہی رکھا ہے، ہم دنیا سے بھی اس کی وجہ سے دور ہیں کہ بین الاقوامی معاملات میں، تجارت میں، لین دین میں اور معاہدات میں ہمارا اعتماد باقی نہیں رہا۔ حالانکہ ہم سب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کرپشن سے نجات حاصل کر لیں اور دیانت و امانت کے خوگر ہو جائیں تو ہمارے پچاس فیصد مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور ہم اقوام عالم کی برادری میں اپنا مقام حاصل کر لیں گے۔ اس لیے ہمیں درپیش آج کی تحدیات اور چیلنجز میں سے ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ ہم اپنے داخلی معاشرہ میں بددیانتی اور کرپشن سے کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ اور دیانت و

امانت کے اسلامی احکام ہماری معاشرتی زندگی میں کس حد تک اثرانداز ہوتے ہیں؟

4. یہ مرحلہ تو دنیا کے کسی بھی ملک میں موجود مسلم کمیونٹی اور سوسائٹی کے لیے ہے، لیکن اس سے اگلا ایک مرحلہ یہ بھی ہے کہ مختلف ممالک میں آباد مسلم سوسائٹیوں کا آپس میں جوڑ اور معاملہ کیسا ہے؟ انڈونیشیا میں مسلمان رہتے ہیں، مراکش میں رہتے ہیں، پاکستان میں رہتے ہیں، ترکی میں رہتے ہیں اور بیسیوں ممالک میں مسلمان اکثریت میں رہتے ہیں۔ ان کا ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ مسلم کمیونٹیزاور مسلم سوسائٹیز میں اسلامی احکام و قوانین کی عملداری کس درجہ میں ہے؟ وہاں قرآن و سنت کے احکام نافذ ہیں یا نہیں۔ پھر ان احکام و قوانین کا ایک درجہ یہ ہے کہ حکومتی سطح پر اسلامی قوانین کے نفاذ کا اہتمام ہو، ان ممالک میں نظام شرعی نافذ ہو۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ جن احکام و قوانین کا حکومت و اقتدار سے تعلق نہیں ہے ان کا سوسائٹی میں فروغ ہو، رواج ہو اور مسلم سوسائٹیوں میں اسلامی احکام و قوانین اور معاشرتی اخلاقیات پر عمل کا اہتمام پایا جاتا ہو۔

یہ صورتحال بھی ہمارے سامنے ہے لیکن میں اس سے ہٹ کر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلم ممالک کے مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟ کیا دنیا بھر کے مسلم ممالک ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں؟ ایک دوسرے کی مشکلات کو اپنی مشکلات سمجھتے ہیں؟ اور مصیبت کے وقت ایک دوسرے کے کام آتے ہیں؟ یہ بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے کہ ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمان دنیا میں آباد ہیں لیکن مختلف مقامات پر الگ الگ پٹ رہے ہیں، مار کھا رہے ہیں اور مصائب و آلام کا شکار ہیں، لیکن ملت کی سطح پر کوئی اجتماعی آواز نہیں ہے اور ایک دوسرے کے کام آنے کا کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں ملی سطح پر درپیش چیلنجز میں سے یہ بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔

5. اس سے آگے بڑھیں تو ایک اور دائرہ اور مرحلہ سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ہم اس کرۂ ارضی میں کم و بیش سات ارب انسانوں کے درمیان رہتے ہیں اور

ان سات ارب کے لگ بھگ انسانوں کے درمیان فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس گلوبل سوسائٹی میں ہم مسلمانوں کا رول کیا ہے؟ اسی تناظر میں آپ حضرات بھی خود کو دیکھ لیں جو غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں رہتے ہیں اور خاص طور پر مغربی ملکوں میں رہائش پذیر ہیں، میں اس حوالہ سے غیر مسلموں کو تین درجوں میں تقسیم کر کے ان کے بارے میں مسلمانوں کے طرز عمل کا ایک جائزہ پیش کرنا چاہوں گا:

- غیر مسلموں کی ایک سطح وہ ہے جو تعداد میں اگرچہ بہت کم ہے لیکن وسائل پر کنٹرول کی وجہ سے بہت طاقتور ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مختلف محاذوں پر حالت جنگ میں ہے۔ سیاست، معیشت، اقتصادیات، عسکریت، سائنس، ٹیکنالوجی، اور تہذیب و ثقافت، ہر محاذ پر مسلمانوں کو مغلوب کرنے اور مسلسل مغلوب رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور بہت سے شعبوں میں مسلمانوں کو مغلوب کر لینے کے بعد اب تہذیب و ثقافت اور عقیدہ و نظریہ کے محاذ پر مسلمانوں کے خلاف برسر جنگ ہے۔ اس کی پوری کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت و عقیدہ کو مکمل شکست دے کر انہیں مغربی فلسفہ و ثقافت کے سانچے میں ڈھال لیا جائے، اس کے لیے وہ میڈیا، لابنگ اور بریفنگ کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہے۔ سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کے اس طبقہ کا سامنا کرنے اور ان کی مسلط کردہ جنگ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ ان افراد اور اداروں کی خدمات سے انکار نہیں ہے جو مختلف مقامات پر اس سلسلہ میں انفرادی طور پر مصروف عمل ہیں لیکن اجتماعی طور پر عالمی سطح پر اور ملی دائرے میں اس چیلنج کا ہم کس طرح سامنا کر رہے ہیں؟ یہ ہمارے لیے چیلنج ہے اور لمحۂ فکریہ ہے اور خاص طور پر علمی اداروں اور دینی مراکز کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صورتحال کو سمجھیں

اور اسلام اور مسلمانوں کے عقیدہ و ثقافت کو اس خوفناک یلغار سے بچانے کے لیے کردار ادا کریں۔

• غیر مسلموں کا دوسرا دائرہ ان لوگوں کا ہے جو اسلام سے کسی حد تک متعارف تو ہیں لیکن کنفیوژن کا شکار ہیں، وہ اسلام کے دشمن نہیں ہیں، اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں اور اس کے قریب آسکتے ہیں لیکن شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ جیسا کہ برطانیہ کے ایک دانشور جم مارشل نے، جو پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے ہیں، ایک دفعہ ایک جلسہ میں کہا تھا کہ ہمارے سامنے اسلام کی تین الگ الگ تصویریں ہیں: (۱) ایک تصویر وہ ہے جو ہمارے بڑوں نے ہمارے ذہنوں میں بٹھا رکھی ہے اور نسل در نسل ہمارے ذہنوں میں منتقل ہوتی آرہی ہے، (۲) دوسری تصویر وہ ہے جب ہم تاریخ میں اسلام اور تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسلام کی ایک بالکل مختلف تصویر ہمارے ذہنوں میں بنتی ہے، (۳) لیکن جب ہم اپنے درمیان رہنے والے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو ان دونوں تصویروں سے مختلف ایک الگ تصویر بن جاتی ہے۔ اسلام کی ان تین الگ الگ تصویروں نے ہمارے ذہنوں میں کنفیوژن قائم کر رکھا ہے، اگر مسلمان اس کنفیوژن کو دور کرنے کی کوئی صورت نکال سکیں تو مغرب میں مقیم بہت سے لوگ اسلام کو سمجھنے کے لیے خواہش رکھتے ہیں اور اس کے لیے تیار ہیں۔ جم مارشل کی یہ بات بالکل درست ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ غیر مسلموں کی ایک بڑی اکثریت اس دائرہ میں ہے جو اسلام کے نام سے متعارف ہے، اس کی کچھ تعلیمات سے بھی واقف ہے اور مسلمانوں کو دیکھ رہی ہے، لیکن اسلامی احکام و قوانین کے بارے میں شکوک و شبہات سے دوچار ہے اور کنفیوژن کا شکار ہے۔ ان کے اس کنفیوژن کو دور کرنے کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے، یہ کام ہمیں کو کرنا ہو گا لیکن

ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی اہتمام موجود نہیں ہے اور میں اسے بھی مسلمانوں کو درپیش چیلنجز میں سے ایک چیلنج سمجھتا ہوں،

• دنیا میں آباد غیر مسلموں کا تیسرا دائرہ ان لوگوں کا ہے جن تک اسلام کا نام اور اسلام کی دعوت نہیں پہنچی۔ ایک بڑی تعداد ایسے غیر مسلموں کی دنیا میں موجود ہے جو اسلام کے نام سے بھی متعارف نہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں رکھتی، ان لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانا، اور انہیں اللہ تعالی کی ذات، نبی کریمؐ کی شخصیت و نبوت، اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف کرانا ہماری ذمہ داری ہے۔ بدقسمتی سے اس حوالہ سے بھی دنیا میں اجتماعی طور پر کوئی نظم واہتمام موجود نہیں ہے، افراد اور اداروں کی سطح پر کام ہو رہا ہے لیکن ملی طور پر اور اجتماعی سطح پر اس حوالہ سے کوئی فکر نہیں پائی جاتی۔

یہاں تک تو میں نے بات کی ہے ان تحدیات اور چیلنجز کی جو ہمیں آج کی انسانی سوسائٹی میں دینی حوالہ سے مختلف سطحوں پر درپیش ہیں۔ اور اب آخر میں اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ان سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

1. میرے خیال میں ہماری ذمہ داری کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم صورتحال سے باخبر ہوں، مطالعہ کریں، معلومات حاصل کریں، اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے بے خبری کو مسائل کا حل سمجھ رکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ بے خبری کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوتی، شترمرغ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صحرا میں طوفان کو دیکھ کر اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں طوفان سے بچ جاؤں گا، ہم بھی حالات سے آنکھیں بند کر کے ان کی سنگینی سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں، جو غلط طریقہ ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے باخبر رہنا ہوگا، اس صورتحال کو نظروں کے سامنے رکھنا ہوگا اور حالات کو پوری طرح سمجھنا ہوگا۔

2. اس کے بعد دوسرا مرحلہ ہے کہ مختلف سطحوں، دائروں اور شعبوں کے بارے میں معلومات اور واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہم جس شعبہ میں اور جس سطح پر کچھ کر سکتے ہوں اس کے لیے ہمیں تیار ہونا چاہیے اور کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ اسلام اور مسلمانوں کو درپیش چیلنجز اور تحدیات سے بے خبر رہنا جرم ہے، جبکہ لاتعلق رہنا تو اس سے بھی بڑا جرم ہے، ایمان کے تقاضوں کے منافی ہے اور دینی ذمہ داریوں سے فرار کے مترادف ہے۔ آپ وہی کچھ کریں جو کر سکتے ہیں اور اتنا ہی کریں جتنا کر سکتے ہیں، لیکن کچھ نہ کچھ ضرور کریں، لاتعلق نہ رہیں، بے خبر نہ رہیں اور اپنی ذات کے خول میں بند نہ ہوں۔ اس لیے ہم میں سے ہر شخص کو حالات اور مسائل و مشکلات کا پوری طرح ادراک کرتے ہوئے اپنی محنت کا شعبہ اور میدان منتخب کرنا چاہیے، اور اپنے ذوق اور حالات کے دائرے میں جو کچھ کسی بھی سطح پر ہم کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں اور قبولیت و ثمرات سے بھی بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

مسلم خواتین کی دینی اور معاشرتی ذمہ داریاں

(ورلڈ اسلامک فورم، برطانیہ - ۲ اپریل ۲۰۰۹ء)

۲ اپریل کو لندن کے علاقہ ٹوٹنگ میں ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام خواتین کے ایک اجتماع میں ''مسلم خواتین کی دینی اور معاشرتی ذمہ داریاں'' کے عنوان پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا، ان کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ مرد اور عورت انسانی معاشرت اور سوسائٹی کا لازمی حصہ ہیں اور معاشرہ کی ترقی اور بقا کا دونوں پر مدار رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی جسمانی ساخت اور نفسیات میں کچھ فرق رکھا ہے اور اس کے مطابق ذمہ داریوں اور فرائض کی تقسیم کی ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جو مرد کے کرنے کے ہیں عورت وہ کام نہیں کر سکتی، اور کچھ کام عورت کے کرنے کے ہیں مرد ان کاموں کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس فرق اور تقسیم کار

پر انسانی سوسائٹی کی فلاح و ترقی کا مدار ہے اور اسلام نے اسی کے مطابق دونوں کی معاشرتی ذمہ داریوں کا تعین کیا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد گرامی ہمارے ہاں عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا۔ یعنی وہ اس حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں مسئول ہوگا۔ راعی عربی زبان میں چرواہے کو کہتے ہیں اور ہم حدیث مبارکہ کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کا محاورے کا ترجمہ ذمہ دار اور حاکم بھی کر دیتے ہیں۔ اسی حدیث میں ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ ''والمراۃ راعیۃ فی بیت زوجھا'' عورت اپنے خاوند کے گھر کے اندر کے معاملات کی ذمہ دار ہے۔ اس لیے جب ہم راعی کا ترجمہ حاکم کرتے ہیں تو یہاں بھی یہ ترجمہ کیا جاسکتا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے گھر کے اندر کی حاکم ہے یعنی گھر کی چار دیواری کے اندر کے معاملات کی وہ ذمہ دار ہے۔ جبکہ عملاً بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ گھر کے اندر کے معاملات جس طرح عورت چلا سکتی ہے مرد نہیں چلا سکتا۔ گھر کو بنانا، سنوارنا، اس کی ترتیب، زیبائش اور آرائش وغیرہ خالصتاً نسوانی ذوق ہے اور یہ کام عورت ہی بہتر طور پر کر سکتی ہے۔ اسی طرح بچوں کی پرورش اور ان کے امور کی دیکھ بھال اور ایک خاص عمر تک ان کی تربیت، ذہن سازی اور شخصیت کی تعمیر بھی عورت ہی زیادہ بہتر انداز میں کر سکتی ہے۔ اور کسی بچے کی فکری، ذہنی اور اخلاقی تربیت و نشوونما کی اصل بنیاد اسی دور میں ہوتی ہے جو وہ ماں کی نگرانی اور تربیت میں گزارتا ہے۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتاً معصوم ہوتا ہے اور اس کے مسلمان، عیسائی یا یہودی بننے کا مدار اس کے ماحول اور ماں باپ کی تربیت پر ہوتا ہے۔ فطری تعلیمی نظام کا پہلا مرحلہ ماں کی گود اور گھر کا ماحول ہے۔ اور یہ ماں باپ دونوں کی اور خاص طور پر ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت اور ذہنی و اخلاقی نشوونما میں اس بات کا بطور خاص خیال رکھے کہ بچہ انہیں دیکھ رہا ہے، والدین کی ہر بات کو نوٹ کر رہا ہے، ان کی حرکت کا اثر لے رہا ہے اور جو کچھ وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسی کے مطابق اس کی شخصیت ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا تعلیم و تربیت صرف الفاظ رٹانے اور مضامین میں ازبر کرا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ تاثرات و محسوسات کے حوالہ سے وہ ماحول مہیا کرنا بھی تعلیم و تربیت کا لازمی حصہ ہے جس کے مطابق بچے کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک مسلم خاتون کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کے ماحول کو پاک صاف رکھنے کی کوشش کرے اور گھر میں ایسا ماحول بنائے جس میں بچوں کی از خود تربیت ہوتی چلی جائے۔ ہمارے ہاں اکثر یہ ہوتا ہے کہ بچے کو جس بات کی تلقین کی جاتی ہے وہ اسے اپنے ماحول میں عملی طور پر نہیں ملتی جس کی وجہ سے وہ کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے، الجھن میں پڑ جاتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتا لیکن یہ الجھن اور کنفیوژن رفتہ رفتہ اس کے ذہن و فکر میں رچ بس جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک باپ اپنے بچے کو سچ بولنے کی تلقین کرتا رہتا ہے مگر بچے کو سامنے نظر آرہا ہوتا ہے کہ باپ خود جھوٹ بول رہا ہے، کسی کو دھوکہ دے رہا ہے، فراڈ کر رہا ہے اور بد دیانتی کر رہا ہے تو وہ کبھی سچ کا عادی نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک بچی کو اس کی ماں دیانت و امانت کی تلقین کرتی ہے لیکن بچی کو اپنی ماں کے معاملات اور معمولات میں دیانت و امانت دکھائی نہیں دیتی تو وہ ذہنی تضاد کا شکار ہو جائے گی اور دیانت و امانت اس کے کردار و عادات کا حصہ نہیں بن پائے گی۔ اس لیے میں یہ گزارش کروں گا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کی اخلاقی نشو و نما اور ان کی ذہنی و فکری اصلاح کے لیے گھر کے ماحول کو اس کے مطابق بنانا ماں باپ دونوں کی اور خاص طور پر عورت کی ذمہ داری ہے۔

پھر گھر کے ماحول کو بہتر رکھنا ایک اور حوالہ سے بھی ضروری ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ شکایت رہتی ہے کہ گھروں میں برکت نہیں رہی، نحوست کے اثرات ہیں، کاموں میں رکاوٹ ہے، رشتوں میں رکاوٹ ہے اور محبت و اعتماد کا ماحول نہیں رہا۔ ہم اس کی وجہ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے، اس کے لیے عاملوں کے پاس جاتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم پر کس نے وار کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ جادو کرنے والے کرتے ہیں اور اس کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گھر میں نماز ہوگی، ذکر ہوگا، درود شریف اور خیر کے اعمال ہوں گے تو فرشتوں کی آمد و رفت زیادہ ہوگی اور جب فرشتوں کا آنا جانا زیادہ ہوگا تو رحمتوں اور برکتوں کا ماحول ہوگا۔ لیکن جو کچھ ہمارے گھروں میں ہوتا ہے اس پر شیاطین اور جنوں کی آمد و رفت ہی زیادہ ہو سکتی ہے اور جب ان کی آمد و رفت کی کثرت ہوگی تو ماحول بھی بے برکتی اور نحوست کا ہوگا۔ چنانچہ گھروں میں برکت و رحمت اور اعتماد و احترام کا ماحول قائم کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ گھر کے ماحول کو اسلامی تعلیمات کے

مطابق درست رکھنے کا اہتمام ہو۔ اور یہ کام عورت ہی زیادہ بہتر طور پر کر سکتی ہے کیونکہ گھر کی چار دیواری کے اندر عملی طور پر اس کی حکمرانی ہوتی ہے، وہ گھر کے ماحول کو جیسا بنانا چاہے بنا سکتی ہے اس لیے یہ اسی کی ذمہ داری ہے۔

یہاں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا حوالہ دوں گا کہ "صلوا فی بیوتکم ولا تجعلوھا قبورا" گھروں میں نماز پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جس گھر میں نماز نہیں ہوتی وہ گھر نہیں بلکہ قبرستان ہے۔ اس لیے جس طرح گھر کی ایک ظاہری خوبصورتی ہوتی ہے کہ وہ صاف ستھرا ہو، ضرورت کی تمام چیزیں اس میں موجود ہوں، اس میں سلیقہ اور ترتیب ہو، اس کی آرائش و زیبائش ہو اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش ہوتی رہے، اسی طرح گھر کی روحانی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں نماز و ذکر کا ماحول ہو، فرشتوں کی آمد و رفت ہو، رحمت اور برکتوں کا نزول ہو، خیر و برکت کا تسلسل ہو اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم گھروں کی اسی آبادی کے بارے میں تلقین فرما رہے ہیں۔

اسی طرح ایک اور ارشاد گرامی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس سینے میں قرآن کریم کا کوئی حصہ نہیں ہے یعنی جس مسلمان کو قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی یاد نہیں ہے اور جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ "کالبیت الخرب" وہ اجڑے ہوئے گھر کی طرح ہے۔ اس لیے کہ انسان کے سینے یعنی دل کی دنیا کی آبادی قرآن کریم کی تلاوت اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہے اور اس کے گھر کی آبادی بھی قرآن کریم کی تلاوت، اللہ تعالیٰ کے ذکر اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی کثرت سے ہے۔

اس لیے میں بہنوں اور بیٹیوں سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک مسلمان خاتون کی سب سے بڑی معاشرتی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کے ماحول کو صحیح رکھنے کی کوشش کرے اور یہ صرف نماز، روزہ اور قرآن کریم کی تلاوت کی حد تک نہیں بلکہ معاملات میں بھی، اخلاق و دیانت میں بھی اور دوسروں کے ساتھ ڈیلنگ اور طرز عمل کے حوالہ سے بھی ضروری ہے۔ کیونکہ آپ اپنے گھر میں جیسا ماحول بنائیں گی اسی کے مطابق بچوں کا مزاج اور رویہ بھی تشکیل پائے گا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۸ اپریل ۲۰۰۹ء)

ہانگ کانگ میں مسلمانوں کی سرگرمیاں

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ اپریل ۲۰۰۹ء)

ربیع الاول کے وسطی عشرہ میں مجھے چار پانچ روز کے لیے ہانگ کانگ جانے کا موقع ملا۔ ہانگ کانگ مشرق بعید کا ایک اہم جزیرہ ہے جو کم و بیش ایک صدی تک برطانیہ کے زیر نگیں رہا اور ۱۹۹۷ء میں عوامی جمہوریہ چین نے اسے برطانیہ سے واپس لیا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب پوری دنیا میں برطانیہ کا طوطی بولتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت اس قدر وسیع ہے کہ اس میں سورج غروب ہی نہیں ہوتا بلکہ چوبیس گھنٹہ کے دوران ہر وقت برطانیہ کے زیر تسلط کسی نہ کسی ملک پر چمکتا رہتا ہے، اس دور میں برطانیہ نے ہانگ کانگ کے ایک حصے پر قبضہ کیا تھا اور دوسرا حصہ چین سے ننانوے سال کی لیز پر لے کر پورے ہانگ کانگ پر اپنا اقتدار قائم کر دیا تھا۔

ہانگ کانگ میں برطانوی اقتدار کی وجہ سے مغربی طرز معاشرت کا غلبہ رہا، یہی وجہ ہے کہ جب بیسویں صدی کے آخری عشرہ میں چین نے لیز کی مدت ختم ہونے پر برطانیہ سے یہ جزیرہ واپس لینے کی بات کی تو ہانگ کانگ کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو اس بات پر تشویش ہوئی کہ مغربی طرز کے آزاد ماحول میں ایک صدی گزارنے والی آبادی کے لیے عوامی جمہوریہ چین کے پابند اور ماحول میں رہنا کیسے ممکن ہو گا؟ اس پر کم و بیش دس سال تک مذاکرات چلتے رہے اور اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ہانگ کانگ برطانیہ کے تسلط سے نکل کر چین میں دوبارہ شامل تو ہو جائے گا لیکن اگلے پچاس سال تک اس کا داخلی نظام پہلا ہی رہے گا۔ چنانچہ ۱۹۹۷ء میں چین کا دوبارہ حصہ بن جانے کے باوجود ہانگ کانگ کا نظام حسب سابق ہے، فوج اور خارجہ پالیسی چین کی ہے مگر کرنسی، ویزا اور باقی معاملات کا سسٹم الگ ہے حتیٰ کہ عوامی جمہوریہ چین کے پرچم کے ساتھ ہانگ کانگ کا پرچم بھی الگ لہراتا ہے۔

ہانگ کانگ کے علاقہ کولون میں جب برطانوی فوج کی چھاؤنی تھی تو اس میں شامل مسلمان فوجیوں کے تقاضے پر ایک جگہ ان کے لیے مخصوص کر دی گئی جہاں وہ نماز وغیرہ کا اہتمام کرتے رہے۔ ایک عرصہ تک وہ جگہ مصلیٰ کے طور پر رہی، پھر وہاں باقاعدہ مسجد قائم کر دی گئی اور اب وہ ہانگ کانگ کی سب سے بڑی جامع مسجد کے طور پر پورے علاقہ کی دینی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس مسجد کے امام و خطیب مولانا مفتی محمد ارشد نے مجھے ہانگ کانگ کی مساجد کے بورڈ آف ٹرسٹیز کی طرف سے سیرت النبیؐ کے چند جلسوں میں شرکت

کے لیے ہانگ کانگ آنے کی دعوت دی۔ مفتی محمد ارشد کا تعلق شجاع آباد ضلع ملتان سے ہے اور ان کے والد محترم مولانا رشید احمد جمعیت علماء اسلام میں ہمارے ساتھ متحرک اور فعال ساتھی کی حیثیت سے شریک کار رہے ہیں۔

میں ۴ مارچ کو رات اسلام آباد سے روانہ ہو کر ۵ مارچ کو ظہر تک ہانگ کانگ پہنچا، میرا پہلا سفر تھا، امیگریشن حکام نے کم و بیش دو اڑھائی گھنٹے کے سوال و جواب اور تحقیق و تفتیش کے بعد انٹری کی مہر لگائی اور میں ہانگ کانگ میں داخل ہو گیا۔ میرپور آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک مخلص دوست حاجی شبیر احمد صاحب کے ہاں قیام رہا اور انہوں نے مفتی محمد ارشد صاحب کے ہمراہ مجھے ہانگ کانگ کے مختلف حصوں کی سیر بھی کرائی۔ بلند و بالا عمارتوں کا ایک وسیع سلسلہ کئی میلوں تک پھیلا ہوا ہے اور درمیان میں سمندر مختلف اطراف سے گزرتا ہے۔ رات کے وقت لائٹوں کا ایسا نظام ترتیب دیا گیا ہے کہ عجیب د لفریب و خوشنما منظر ہوتا ہے۔ پہاڑی علاقہ ہے، مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں سے نیچے جھانکیں تو سمندر، بلند و بالا عمارتوں اور روشنیوں کا مسحور کن منظر آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ لیکن ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ ہم مختلف جانبوں سے پہاڑوں کی چوٹیوں پر گئے مگر دھند کی وجہ سے نیچے کا منظر نہ دیکھ سکے۔

۶ مارچ کا جمعہ میں نے ختم نبوت موومنٹ کے مرکز میں پڑھایا جہاں شورکوٹ سے تعلق رکھنے والے ہمارے پرانے دوست مولانا قاری محمد طیب خطیب و امام ہیں۔ انہوں نے مختلف دوستوں کے ساتھ مل کر قرآن کریم حفظ و ناظرہ کے مدارس کا ایک نظم قائم کر رکھا ہے جس کے تحت سات مدارس میں کم و بیش نو سو کے لگ بھگ بچے اور بچیاں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

ہانگ کانگ میں چھچھ کے علاقہ سے تعلق والے حضرات زیادہ ہیں اور ان کا دینی ذوق بھی وہاں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ضلع گجرات سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی خاصے ہیں اور گوجرانوالہ کے دوست بھی وہاں دکھائی دیے۔ مجھے بتایا گیا کہ ہانگ کانگ میں پاکستانیوں کی تعداد کم و بیش تیس ہزار کے قریب ہے۔

- ہفتہ کے روز پاکستان کلب میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام سیرت کانفرنس تھی جس کی صدارت پاکستان کے قونصل جنرل جناب ڈاکٹر بلال احمد نے کی جو لاہور سے تعلق رکھتے ہیں اور اچھا دینی ذوق رکھتے ہیں۔

•اتوار کو کولون کی مرکزی جامع مسجد میں اس دورے کا مرکزی پروگرام تھا جو صبح دس بجے سے عصر تک جاری رہا اور ایران کے قونصل جنرل جناب عبد اللہ نیکونام نے اس کی صدارت کی۔

•سوموار کو ختم نبوت موومنٹ کے زیر اہتمام چلنے والے چند مدارس میں جانا ہوا اور اسی شب ادارہ منہاج القرآن کے زیر اہتمام سیرت کانفرنس سے میں نے خطاب کیا۔ حافظ غلام فرید صاحب اس مرکز کے امام ہیں، ڈسکہ ضلع سیالکوٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کے حلقہ سے ہیں۔ ان کی خصوصی دعوت پر میں وہاں حاضر ہوا اور ”جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واطاعت“ کے موضوع پر تفصیلی خطاب کیا۔

ہانگ کانگ میں دو تین باتیں ایسی دیکھیں جن سے دل بہت خوش ہوا۔

1. ایک یہ کہ مسلم کمیونٹی کے لیڈروں اور مساجد کے ائمہ و خطباء کے درمیان باہمی تعاون و مفاہمت کی فضا موجود ہے، دونوں مل جل کر مسلم کمیونٹی کو راہنمائی فراہم کرتے ہیں اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

2. دوسری بات یہ خوش آئند ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کے درمیان بھی باہمی مفاہمت و تعاون کی فضا موجود ہے اور وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

3. اور تیسری بات جس پر بے حد خوشی ہوئی کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ایک مربوط نظام موجود ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ پندرہ بیس سال قبل تک ہانگ کانگ کی چند مساجد میں بھی تراویح کے لیے باہر سے حفاظ منگوانا پڑتے تھے مگر اب نہ صرف چین کے مختلف علاقوں بلکہ جاپان اور کوریا وغیرہ میں بھی رمضان المبارک میں قرآن کریم سنانے کے لیے یہاں سے حفاظ بھیجے جاتے ہیں۔ میرے وہاں جانے سے چند روز قبل مدارس کے طلبہ کے درمیان حسن قراءت کا مقابلہ ہوا تھا جس میں اول آنے والے حافظ بچے نے کولون کی جامع مسجد کے مرکزی جلسہ میں تلاوت کی اور بہت اچھے لہجے میں عمدہ تلفظ کے ساتھ قرآن کریم پڑھا۔

جمعرات سے منگل تک کم و بیش چھ روز قیام کے دوران ہانگ کانگ کے مسلمانوں اور ان کے دینی و علاقائی راہنماؤں کی سرگرمیاں دیکھ کر دل کو اطمینان ہوا کہ اس خطہ میں رہنے والے مسلمان نہ صرف دین کے ساتھ وابستگی کو قائم رکھے ہوئے ہیں بلکہ وہ اگر تھوڑی سی محنت اور کریں تو اس علاقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا بھی مؤثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

چند روز ہانگ کانگ میں

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۵ مارچ ۲۰۰۹ء)

ہانگ کانگ کی مساجد کے بورڈ آف ٹرسٹیز کی دعوت پر ”تذکرہ خیر الوری“ کے عنوان سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے حوالے سے منعقد ہونے والے متعدّد اجتماعات میں شرکت کے لیے ۵ مارچ سے ۹ مارچ تک ہانگ کانگ میں وقت گزارنے کا موقع ملا۔ شجاع آباد ضلع ملتان میں ہمارے ایک بزرگ دوست مولانا رشید احمد تھے جن کا قائم کردہ مدرسہ جامعہ فاروقیہ ایک عرصہ سے تعلیمی و دینی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ ان کے فرزند مولانا مفتی محمد ارشد یہاں کی ایک بڑی مسجد ”کولون جامع مسجد“ کے امام و خطیب ہیں جبکہ شورکوٹ سے تعلق رکھنے والے مولانا قاری محمد طیب ”ختم نبوت موومنٹ“ کے نام سے ایک مرکز میں امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ یہاں کے دوست کہتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کی آمد سے ہانگ کانگ میں دینی سرگرمیوں کو ایک نئی جہت ملی ہے، مساجد میں دینی پروگراموں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، قرآن کریم کی تعلیم کے مکاتب قائم ہوئے ہیں اور لوگوں میں نماز روزہ، تعلیم قرآن کریم اور دینی پروگراموں کا شوق بڑھ رہا ہے جبکہ بورڈ آف ٹرسٹیز، پاکستان ایسوسی ایشن اور ختم نبوت موومنٹ کے مختلف فورموں پر کیپٹن شہزادہ سلیم، حاجی شبیر احمد، جہانزیب خان اور ان جیسے دیگر باذوق احباب ان دینی اور تعلیمی سرگرمیوں میں معاونت اور سرپرستی کر رہے ہیں۔ بورڈ آف ٹرسٹیز کی دعوت پر ایران سے خوش الحان قراء اور نعت خوانوں کا ایک گروپ بھی ان دونوں ہانگ کانگ آیا ہوا تھا۔

۷ مارچ کو پاکستان ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام پاکستان کلب میں سیرت کانفرنس تھی جس میں راقم الحروف نے موجودہ عالمی تناظر اور تہذیبی کشمکش کے ماحول میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا۔ ہانگ کانگ میں اسلامی

جمہوریہ پاکستان کے قونصل جنرل محترم جناب ڈاکٹر بلال احمد صاحب نے، جن کا تعلق لاہور سے ہے اور ان کے والد محترم دیال سنگھ کالج کے پرنسپل رہے ہیں، اس کانفرنس کی صدارت کی اور جناب صالح مہدی کی قیادت میں ایرانی مہمانوں کے گروپ نے نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی دہشت گردی کا شکار ہونے والے فلسطینی شہر ''غزہ'' کا عربی میں مرثیہ بھی پڑھا۔ پاکستان ایسوسی ایشن کے چیئرمین کیپٹن شہزادہ سلیم اور کولون جامع مسجد کے امام مولانا مفتی محمد ارشد نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا جبکہ صدر محفل ڈاکٹر بلال احمد نے سیرت طیبہ کے حوالے سے فکر انگیز گفتگو کی۔

۸ مارچ اتوار کو اجتماعات کے اس سلسلے کا مرکزی پروگرام کولون کی جامع مسجد میں ہوا جو صبح گیارہ بجے سے شام چار بجے تک جاری رہا۔ ''تذکرۂ خیرالوری کانفرنس'' کے عنوان سے اس اجتماع کی صدارت ہانگ کانگ میں اسلامی جمہوریہ ایران کے قونصل جنرل جناب عبد اللہ نیکونام نے کی اور ایرانی مہمانوں کے گروپ نے تلاوت قرآن کریم، حمد باری تعالی اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگوں کے جذبات کو گرمایا۔ گزشتہ دنوں ہانگ کانگ میں قرآن کریم کی تعلیم کے مدارس (جن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے) کے طلبہ میں حسن قراءت کا مقابلہ ہوا تھا۔ اس میں اول آنے والے ایک بچے نے خوب صورت انداز میں قرآن کریم کی تلاوت کی اور ننھے ایرانی حافظ محمد علی اسلامی نے شرکائے محفل کی فرمائش پر چار مختلف مقامات سے قرآن کریم کی آیات سنائیں۔ راقم الحروف نے اس محفل میں اپنی تفصیلی گفتگو میں اس نکتہ پر بطور خاص زور دیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا اصل تعلق یہ ہے کہ وہ ہمارے آئیڈیل ہیں اور ہم ان کے پیروکار ہیں۔ جس طرح ہر پیروکار کو اپنے آئیڈیل کی ہر بات اور ہر ادا پسند ہوتی ہے اور وہ اس کی پیروی کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا سے محبت اور اس کی پیروی کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہانگ کانگ کے مختلف مقامات کی سیر کے ساتھ ساتھ متعدّد دوستوں سے اس خطہ اور یہاں رہنے والے مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جن کی تفصیلات انہی صفحات میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا، ان شاء اللہ تعالی۔ البتہ سردست اس کے ایک پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہانگ کانگ کم وبیش ایک سو سال تک برطانیہ کا حصہ اور اس کی نوآبادی رہا ہے۔ اس کے

ایک حصے پر برطانوی فوجوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور ایک حصہ برطانیہ نے چین سے ۹۹ سال کی لیز پر لے لیا تھا جو ۱۹۹۷ء کو ختم ہوئی اور چین کے مطالبے پر برطانیہ کو لیز والے حصے کے ساتھ مقبوضہ علاقہ بھی چین کو واپس کرنا پڑا۔ ہانگ کانگ کی برطانیہ سے چین کو واپسی کے اس مرحلے پر یہ سوال کھڑا ہو گیا تھا کہ ہانگ کانگ کی آبادی، جس نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک برطانیہ کے تحت اس کے مخصوص ماحول میں زندگی گزاری تھی، وہ چین کے تحت اس سے بالکل مختلف ماحول میں کیسے رہ سکے گی؟

اس سوال نے کم و بیش ایک عشرے تک ہانگ کانگ کی آبادی میں ہلچل مچائے رکھی اور اس پر چین اور برطانیہ کی حکومتوں میں مسلسل مذاکرات ہوتے رہے اور بالآخر اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ہانگ کانگ چین کا حصہ تو بنے گا لیکن اس کا نظام چین سے مختلف ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہانگ کانگ چین کا صوبہ ہے، پرچم، دفاع اور خارجہ پالیسی چین کی ہے لیکن کرنسی، نظام، ویزا اور طرز زندگی اس سے الگ ہے جسے ”ون کنٹری ٹو سسٹم“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ معلوم کر کے میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا ہے کہ اگر ہانگ کانگ کو چین کا حصہ ہونے کے باوجود اپنے مخصوص کلچر اور معاشرت کے حوالے سے الگ نظام کا حق دیا جا سکتا ہے تو پاکستان میں سوات اور اس جیسے دیگر علاقوں کو ”ون کنٹری ٹو سسٹم“ کی یہ سہولت فراہم کرنے میں آخر کیا حرج ہے؟

ہانگ کانگ میں چار روز

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۲ مارچ ۲۰۰۹ء)

ہانگ کانگ میں چار دن گزار کر آج وطن واپس جا رہا ہوں۔ اس وقت بینکاک کے ایئر پورٹ پر ہوں اور کراچی کے لیے فلائٹ میں دو گھنٹے کے وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ سطور قلمبند کر رہا ہوں۔ ہانگ کانگ کی مساجد کے بورڈ آف ٹرسٹیز نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں سالانہ اجتماعات میں شرکت کے لیے مجھے دعوت دی تھی اور ”تذکرۂ خیر الوریٰ“ کے عنوان سے ان اجتماعات کا سلسلہ مسلسل چار روز تک جاری رہا۔

ہانگ کانگ میں باضابطہ مساجد پانچ ہیں جن کے لیے ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کام کر رہا ہے جس میں پاکستان اور انڈیا سے تعلق رکھنے والے حضرات کے علاوہ چینی مسلمانوں کے نمائندے بھی شامل ہیں۔ سب سے بڑی مسجد کولون مسجد کہلاتی ہے اس میں مولانا مفتی

محمد ارشد امام و خطیب ہیں بلکہ وہ تمام مساجد کے چیف خطیب بھی ہیں اور بورڈ کے تحت مساجد کے نظام اور سرگرمیوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ مفتی محمد ارشد شجاع آباد سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے بزرگ ساتھی مولانا رشید احمد مرحوم کے فرزند ہیں جو جمعیت علماء اسلام میں ایک عرصہ تک سرگرم عمل رہے اور شجاع آباد میں جامعہ فاروقیہ کے نام سے دینی ادارہ ان کی یادگار ہے۔ مفتی محمد ارشد نے جامعہ خیر المدارس ملتان میں دورہ کیا، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں ایم اے کیا اور آرمی میں تین سال تک خطابت کے فرائض سرانجام دے کر ایئرفورس میں چلے گئے جہاں وہ کیپٹن کے طور پر آٹھ سال تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ پھر ہانگ کانگ چلے گئے جہاں کم و بیش دس سال سے کولون کی مرکزی جامع مسجد میں خطابت و امامت کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ اردو، انگلش اور عربی پر عبور رکھتے ہیں اور خطابت کے ساتھ تحقیق و مطالعہ کے ذوق کے حامل بھی ہیں۔ جبکہ بورڈ آف ٹرسٹیز اور پاکستان ایسوسی ایشن میں کیپٹن شہزادہ سلیم، جناب سعید الدین، حاجی شبیر احمد اور دیگر مخلص احباب پر مشتمل ایک بھرپور ٹیم ان کی معاون ہے۔

مجھے ہانگ کانگ میں یہ ماحول دیکھ کر خوشی ہوئی کہ علماء کرام اور کمیونٹی لیڈروں کے درمیان رابطہ اور ہم آہنگی موجود ہے بلکہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام بھی باہمی روابط اور مفاہمت کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ گزشتہ شب میں نے اپنے پروگرام کا آخری خطاب جس مسجد میں کیا اس کے امام و خطیب ڈسکہ سے تعلق رکھنے والے مولانا حافظ غلام فرید ہیں جو پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کے ادارہ منہاج القرآن سے وابستہ ہیں، انہوں نے خود ہمیں دعوت دی اور پورے اعزاز کے ساتھ ہماری میزبانی کی۔

جمعہ کے روز میں نے ختم نبوت موومنٹ کے مرکز میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کیا۔ اس مرکز کے سربراہ مولانا مفتی محمد طیب ہیں جن کا تعلق کبیروالا سے ہے اور ہمارے پرانے دوست ہیں۔ متحرک بزرگ ہیں اور یہاں کے مسلکی دوستوں کا کہنا ہے کہ ہانگ کانگ میں دینی بیداری پیدا کرنے اور مسلکی ذوق کو اجاگر کرنے میں سب سے زیادہ محنت مولانا قاری محمد طیب نے کی ہے۔ وہ اچھے قاری ہیں اور حفظ و تجوید کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی محنت سے ختم نبوت موومنٹ نے ہانگ کانگ کے مختلف علاقوں میں مساجد کے بورڈ آف ٹرسٹیز سے ہٹ کر کرائے کے مکانات میں قرآن کریم کے حفظ کے سات مدارس اب تک قائم کیے ہیں جن میں مجموعی طور پر نو سو کے لگ بھگ بچے قرآن کریم کی

تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ چھچھ سے تعلق رکھنے والے جہانزیب خان صاحب مومنٹ کے سیکرٹری ہیں اوران کے ساتھ مخلص رفقاء کا ایک گروپ ہے جو نئی نسل کو قران کریم اور دینی تعلیمات کے ساتھ وابستہ رکھنے کے جذبہ کے ساتھ کام کررہا ہے۔ میں نے ان سات میں سے تین مدارس دیکھے اور وہاں کا تعلیمی ماحول اور طلبہ کی گہما گہمی دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے بتایا گیا کہ اب سے دس پندرہ سال قبل ہانگ کانگ میں تراویح کے لیے پاکستان یا انڈیا سے حافظ منگوائے جاتے تھے مگر اب چین، جاپان، ہانگ کانگ اور اردگرد دیگر علاقوں کی مساجد کو یہاں سے حفاظ فراہم کیے جاتے ہیں اور حفظ قرآن کریم کا یہ سلسلہ بحمد اللہ تعالی دن بدن پھیل رہا ہے۔

ہفتہ کے روز پاکستان کلب میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیراہتمام سیرت کانفرنس تھی جس کی صدارت ہانگ کانگ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قونصل جنرل ڈاکٹر بلال احمد نے کی۔ ان کا تعلق لاہور سے ہے اور ان کے والد دیال سنگھ کالج کے پرنسپل رہے ہیں، اچھا دینی ذوق رکھتے ہیں اور دینی سرگرمیوں میں تعاون کرتے ہیں۔ بورڈ آف ٹرسٹیز کی دعوت پر ایران سے قراء کرام اور نعت خواں حضرات کا ایک گروپ بھی ہانگ کانگ آیا ہوا ہے جو مختلف محافل میں قرآن کریم کی تلاوت، حمد باری تعالی اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان سرگرمیوں میں شریک ہے۔ پاکستان کلب کی سیرت کانفرنس میں بھی اس گروپ نے اپنے فن اور ذوق کا مظاہرہ کیا اور آخر میں انہوں نے اسرائیل کے ہاتھوں غزہ کی تباہی پر عربی زبان میں ایک پرسوز مرثیہ پیش کیا جس میں غزہ کی مظلوم خواتین اور بچوں کے ساتھ بطور خاص ہمدردی اور ہم آہنگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ مجھے اس کانفرنس میں بطور مہمان خصوصی خطاب کی دعوت دی گئی اور میں نے اپنے تفصیلی خطاب میں اس بات پر بطور خاص زور دیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اجاگر کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

اتوار کو محافل کے اس سلسلہ کا مرکزی پروگرام کولون کی جامع مسجد میں تھا جو صبح دس بجے سے عصر تک جاری رہا اور اس کی صدارت ایران کے قونصل جنرل جناب عبد اللہ نیکونام نے کی جبکہ ایرانی مہمانوں کے گروپ نے بھی تفصیل کے ساتھ اپنا پروگرام پیش کیا۔ راقم الحروف نے اپنی گفتگو میں خصوصی طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت وعقیدت کا صرف زبانی اظہار کافی نہیں ہے بلکہ ہماری

عملی زندگی میں بھی اس کے آثار نظر آنے چاہئیں اس لیے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا اصل تعلق یہ ہے کہ وہ ہمارے آئیڈیل ہیں اور ہم آپؐ کے پیروکار ہیں۔ اور کسی آئیڈیل کا اصل پیروکار وہ ہوتا ہے جو اس کی ہر ادا سے محبت کرتا ہے اور اسے اپنانے کی بے ساختہ کوشش کرتا ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرمودات پر عمل اور رسول اکرمؐ کے معمولات و سنت کی اتباع کے ساتھ ساتھ ذاتی ذوق اور ادا کی بھی پیروی کرتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک دفعہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کدو شوق سے کھاتے دیکھا تو انہیں کدو سے محبت ہو گئی، حتیٰ کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں انہیں بصرہ میں زمین الاٹ کی تو انہوں نے وہاں کدو ہی بونا شروع کر دیے جو محبت و اطاعت کی بہترین مثال ہے۔

میں نے عرض کیا کہ آج کی دنیا کو اور بالخصوص مغربی اقوام کو قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی جذباتی وابستگی پر تعجب ہوتا ہے اور وہ اسے سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے پاس اپنے پیغمبروں کی تعلیمات محفوظ حالت میں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں ان کی آسمانی کتابیں اصل صورت میں میسر ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے پاس قرآن کریم اصلی اور محفوظ حالت میں موجود ہے، مسلمان اسے پڑھ بھی رہے ہیں اور اس سے استفادہ بھی کر رہے ہیں۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم پوری دنیا کے ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم کی تعلیمات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو دنیا کی اقوام تک پہنچانے کی طرف توجہ دیں۔

پیر کو گجرات سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان دوست جاوید صاحب نے پاکستان کلب میں پر تکلف ظہرانے کا اہتمام کیا جس کی وجہ مناسبت یہ تھی کہ میرا سسرالی گاؤں گلیانہ ضلع گجرات ہے اور جاوید صاحب کا گاؤں بھی اس کے قریب ہے۔ انہوں نے اس خوشی میں بہت سے دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا اور پاکستان ایسوسی ایشن کے عہدے داروں نے بھی بطور خاص اس میں شرکت کی۔ مغرب کے بعد مجھے ختم نبوت موومنٹ کے ایک مدرسہ میں گفتگو کے لیے کہا گیا، میں نے گزارش کی کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری نجات ایمان اور اعمال صالحہ میں رکھی ہے اور ہم نیک اعمال اسی لیے کرتے ہیں کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی رضا

حاصل ہوگی اور اجر و ثواب ملے گا۔ اللہ تعالی اچھے اعمال پر بہت اجر دیتے ہیں اور نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔

ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ یہ نیکیاں کیا ہوتی ہیں اور ہمیں کس شکل میں ملتی ہیں؟ میں نے گزارش کی کہ یہ آخرت کی کرنسی ہے، جس طرح دنیا کے معاملات روپے، ڈالر اور ریال وغیرہ کے ذریعے طے ہوتے ہیں آخرت کے معاملات نیکیوں کے ذریعے طے پائیں گے۔ اسی لیے اللہ تعالی نے ہمیں ہدایت فرمائی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمانے کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت کا بھی بندوبست کریں اور ان کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ اس لیے کہ کمائی وہی فائدہ مند ہوتی ہے جو ضرورت کے وقت کام آجائے، جو کمائی ضرورت پڑنے سے پہلے ہی ضائع ہوجائے وہ کسی کام کی نہیں ہوتی۔ نیکیوں کی ضرورت آخرت میں حساب کتاب کے وقت ہوگی، اگر وہ دنیا میں ہی ضائع ہوگئیں تو آخرت میں شرمندگی کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالی اور اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اعمال کی بھی نشاندہی کی ہے جو نیکیوں کے برباد ہوجانے کا باعث ہوتے ہیں، مثلاً فرمایا کہ شرک کرنے سے نیکیاں ضائع ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ اچھے اعمال کے ساتھ ساتھ ان اعمال سے بچنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے جو نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں اور اجر و ثواب کے ضائع ہونے کا باعث بنتے ہیں۔

مجھے مختلف ممالک میں وقتاً فوقتاً جانے کا موقع ملتا ہے اور میرے زیادہ تر مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں جو اردو سمجھتے ہیں اور پاکستان، بھارت یا بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ یہ بات شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ اگر ہم ان ملکوں کے لوگوں سے ان کی زبانوں میں بات کرسکیں اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو ان کی زبان میں ان کی نفسیات کے مطابق پیش کرسکیں تو ہمارے ان تبلیغی اسفار کی افادیت میں کئی گنا اضافہ ہوجائے اور وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کا بھی شاید کوئی راستہ نکل آئے۔ یہ بات ملک کے بڑے بڑے اور باوسائل دینی مدارس کے سوچنے کی ہے کہ وہ اس ضرورت کو محسوس کریں اور اس کو پورا کرنے کے لیے کوئی عملی پروگرام تشکیل دیں۔

زندگی کی حقیقت اور اس کیلئے فائدہ مند کام

(جامع مسجد ختم نبوت، شام شیو پو، ہانگ کانگ - ۶ مارچ ۲۰۰۹ء)

(ہانگ کانگ کے علاقہ ''شام شیو پو'' کی جامع مسجد ختم نبوت میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ زندگی میں پہلی بار ہانگ کانگ میں حاضری کا موقع ملا ہے، ہانگ کانگ کی مساجد کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا شکرگزار ہوں جس کی دعوت پر یہ حاضری ہوئی ہے، اور مولانا قاری محمد طیب کا شکرگزار ہوں جنہوں نے اپنے اس مرکز میں آپ حضرات کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا اعزاز بخشا ہے اللہ تعالی سب کو جزائے خیر سے نوازیں، ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں، اور دین کی جو بات علم اور سمجھ میں آئے اس پر عمل کی توفیق بھی عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔ میں ابھی مسجد کے ہال میں داخل ہوا تو آپ کے خطیب مولانا قاری محمد طیب صاحب جو میرے پرانے دوستوں اور ساتھیوں میں سے ہیں، آپ سے خطاب کر رہے تھے اور دینی مدارس کے حوالہ سے گفتگو فرما رہے تھے، جی چاہتا ہے کہ میں بھی اسی موضوع پر آپ سے گفتگو کروں اس لیے کہ یہ آج کی دنیا کا ایک بڑا موضوع ہے جس پر ہر سطح پر گفتگو ہو رہی ہے اور دینی مدرسہ کے کردار کے بارے میں دنیا بھر میں سوالات اٹھائے جا رہے ہیں کہ عمومی اور ریاستی تعلیم کے اجتماعی دھارے سے ہٹ کر اس مدرسہ کی الگ سے ضرورت کیا ہے، سوسائٹی میں اس کا کردار کیا ہے؟ اور ہماری عملی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟

1. یہ آج کی دنیا کا ایک اہم سوال ہے کہ دینی مدرسہ کی تعلیم کا ہماری پریکٹیکل لائف کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس بات پر غور کی دعوت دینا چاہوں گا کہ ''لائف'' کیا ہے، اور ہمارے ذہنوں میں ''زندگی'' کا تصور کیا ہے؟ کیا زندگی اور لائف دنیا میں پیدا ہو جانے سے لے کر مر جانے تک کا نام ہے؟ کیا یہ پچاس، ساٹھ یا ستر برس کی زندگی ہی صرف زندگی ہے؟ یا اس سے آگے پیچھے کسی اور زندگی کا وجود بھی ہے؟ اگر تو زندگی صرف اتنے پیریڈ کا نام ہے، جیسا کہ آج کی بہت سی اقوام یا افراد کا خیال ہے، تو ان کا یہ سوال کسی حد تک درست ہے۔ لیکن ہمارا مسلمانوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے، ہمارے یقین اور عقیدہ کے مطابق زندگی کا اصل اور بڑا مرحلہ اس

سے آگے کا ہے، ہمارے نزدیک موت فنا ہونے کا نام نہیں بلکہ ایک جہاں سے دوسرے جہاں کی طرف منتقل ہو جانے کا نام ہے، اور دنیا کا بارڈر کراس کر کے آخرت کے دور میں داخل ہونے کا نام ہے۔ اسی لیے ہم مرنے والے کے لیے یہ نہیں کہتے کہ وہ ختم ہو گئے ہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہ انتقال فرما گئے ہیں، یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں، اور عارضی زندگی سے مستقل زندگی کی طرف رحلت کر گئے ہیں۔

دنیا میں بے شمار لوگوں نے اسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھ رکھا ہے اور اپنی تمام تر سرگرمیوں کو اسی کے دائرے میں محصور کر لیا ہے، لیکن ہمارے عقیدہ میں یہ زندگی عارضی اور ناپائیدار ہے، اور اصل زندگی وہ ہے جو مرنے کے بعد شروع ہو گی۔ اس کا ایک مرحلہ قبر کی زندگی کا ہے، برزخ کی زندگی کا ہے جو نہ جانے سینکڑوں سال کا ہے یا ہزاروں سال کا ہے۔ دوسرا پیریڈ حشر کے دن کا ہے جو پچاس ہزار سال کا بیان کیا جاتا ہے، اور تیسرا پیریڈ اس سے آگے کا ہے جو ان لمیٹڈ ہے، غیر محدود ہے، ادھر گئے تو "خالدین فیھا" اور ادھر گئے تب بھی "خالدین فیھا"۔ جبکہ دنیا کی زندگی کیا ہے؟ یہی چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر اور اسی برس ہیں۔ اس کے بعد کوئی نوے تک پہنچ بھی گیا تو اس کی زندگی کیا زندگی ہے اور اس زندگی کے بارے میں قرآن کریم نے کیا خوبصورت تبصرہ کیا ہے اور اس کے مختلف مراحل کا کیا عجیب تجزیہ کیا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ دنیا کی زندگی کے پانچ مراحل ہیں، وہ بھی اس کے لیے جسے طبعی زندگی کے پچاس ساٹھ سال مل جائیں۔ "اعلموا انما الحیاۃ الدنیا لعب و لھو وزینۃ وتفاخر بینکم و تکاثر فی الاموال والاولاد" (سورہ الحدید ۲۰)۔

- پہلا مرحلہ لعب کا ہے یعنی بچپن کا دور ہے جو کھلونوں کا دور ہے،
- دوسرا مرحلہ لہو کا ہے یعنی کھیل تماشہ، یہ لڑکپن کا دور ہے جس میں سب سے بڑا شوق گھومنے پھرنے اور کھیل تماشے دیکھنے کا ہوتا ہے،

- تیسرا مرحلہ زینت کا ہے، یعنی بننے سنورنے کا دور، نوجوانی کا دور جو میک اپ کا دور ہے، بیوٹی پارلر کا دور ہے اور کنگھی شیشے کا دور ہے،
- چوتھا مرحلہ ”تفاخر بینکم“ کا ہے، یعنی باہمی مقابلہ کا دور، بھرپور جوانی کا دور اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا دور جس میں ریس اور مقابلہ ہی زندگی کا سب سے بڑا ہدف ہوتا ہے، زندگی کے وسائل حاصل کرنے، قوت حاصل کرنے، دولت میں اضافہ کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے،
- جبکہ زندگی کا پانچواں اور آخری دور قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ”وتکاثر بینکم فی الاموال والاولاد“ ریس میں تھک جانے اور ریٹائر ہو جانے کے بعد اپنی کمائی کو شمار کرنے کا دور، جس میں انسان اپنی اولاد اور اموال کو گن گن کر اور ایک دوسرے پر کثرت جتا کر خوش ہوتا رہتا ہے۔

بس یہی زندگی ہے، اسی کا نام دنیا ہے اور قرآن کریم اسے دھوکے کا سامان کہہ کر ہم سے یہ فرماتا ہے کہ اصل زندگی آگے کی ہے اور عقلمند انسان وہی ہے جو اس دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی کی بہتری کے لیے استعمال کرے۔

2. دوسرا سوال جس کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کا آخرت کی زندگی کے ساتھ تناسب کیا ہے؟ دنیا کی زندگی اگر کسی کی بہت لمبی بھی ہو گئی تو اسی نوے سے آگے کیا بڑھے گی، جبکہ قبر کی زندگی ہزاروں سال کی ہو سکتی ہے، حشر کا پیریڈ پچاس ہزار سال کا بتایا جاتا ہے، اور اس کے آگے توان لمیٹڈ زندگی ہے، غیر محدود زندگی ہے۔ پھر دنیا کی زندگی کے یہ ساٹھ ستر سال ہمیں اس دنیا میں ہی ساٹھ ستر سال نظر آتے ہیں، آخرت کے مقابلہ میں اس کی حیثیت کا اندازہ قرآن کریم کے اس ارشاد کی روشنی میں کر لیں کہ ”وان یوما عند ربک کالف سنۃ مما تعدون“ (سورہ الحج ۴۷) اور تیرے رب کا ایک دن ان ایک ہزار سال کی طرح ہے جو تم شمار کرتے ہو۔ اب اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار

سال والے ایک دن میں اپنے ان ساٹھ ستر سال کا حساب کرلو کہ کتنے بنتے ہیں اور ان کا کیا تناسب ٹھہرتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے بھی ایک جگہ بیان فرمایا ہے کہ تمہیں دنیا میں یہ ساٹھ ستر اور اسی سال دکھائی دیتے ہیں لیکن جب آخرت میں جاکر پیچھے مڑکر دیکھو گے کہ کتنا رہ کر آئے ہو تو خود تمہارا کہنا یہ ہوگا کہ "کانھم یوم یرونھا لم یلبثوا الا عشیۃ أو ضحاھا" (سورہ النازعات ۴۶) دنیا میں دن کا پہلا پہر یا پچھلا پہر رہ کر آئے ہیں، اس سے زیادہ اس زندگی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اسی لیے بزرگان دین اور صوفیاء کرامؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کی زندگی کے لیے اسباب فراہم کرو اور ضرور کرو لیکن صرف اتنے جتنا یہاں رہنا ہے، لیکن جتنا عرصہ قبر میں رہنا ہے، حشر میں رہنا ہے اور اس سے آگے جانا ہے اس کے لیے بھی اسباب فراہم کرو، وسائل تلاش کرو اور اس کی تیاری کرو۔ سیدھی سی بات ہے مجھے کسی شہر میں تین دن رہنا ہے تو اس کے مطابق انتظام کروں گا، ایک سال رہنا ہے تو اس کے لیے تین دن والی تیاری نہیں ہوگی، اور اگر کہیں مستقل رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس کے لیے ایک سال والے انتظامات کافی نہیں ہوں گے۔ ہمارے تبلیغی دوست جماعت کے ساتھ جاتے ہیں، سہ روزہ والوں کی تیاری اور ہوتی ہے، چلہ والوں کا بندوبست اس سے مختلف ہوتا ہے، اور سال والوں کا اہتمام اس سے بھی مختلف ہوتا ہے۔ یہ کامن سینس کی بات ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

3. ان گزارشات کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ سکول، کالج، اور یونیورسٹی کی تعلیم کی ضرورت سے انکار نہیں ہے، ان اداروں میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ ہماری ضرورت ہیں اور ہم ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرسکتے ہیں۔ انگلش اور مختلف دیگر زبانیں ہماری ضرورت ہے، لکھنا پڑھنا ہماری ضرورت ہے، حساب اور ریاضی ہماری ضرورت ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری ضرورت ہے، انجینئرنگ اور میڈیکل سائنس ہماری ضرورت ہے، سوشیالوجی اور بیالوجی ہماری ضرورت ہے، ان میں سے کسی مضمون کی ضرورت و اہمیت سے کوئی عقلمند انکار نہیں کرسکتا اور ان علوم و فنون کو حاصل

کیے بغیر ہم زندگی صحیح طریقے سے نہیں گزار سکتے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ سارے علوم و فنون صرف اس دنیا کی زندگی کے لیے ہیں، ان میں سے کوئی علم اگلی زندگی میں ہمارے کام نہیں آئے گا۔ یہ سب کچھ اس وقت تک ہے جب تک سانس چل رہا ہے، سانس بند ہو جانے کے بعد ہمیں نہ سائنس کی ضرورت رہے گی، نہ ٹیکنالوجی کی کوئی اہمیت باقی رہے گی، اور نہ ہی انجینئرنگ اور میڈیکل ہمارے کام آئے گی، وہاں صرف ایمان، نیک اعمال، اور قرآن کریم کام آئے گا جن کی تعلیم یہ مدرسہ دیتا ہے۔

ایک چھوٹی سی بات سے اندازہ کر لیجیئے کہ سانس ختم ہونے سے قبل مریض کے گرد ڈاکٹروں کا ہجوم ہوتا ہے، مشینیں لگی ہوتی ہیں اور زندگی بچانے کے لیے ہر ممکن اسباب اختیار کیے جاتے ہیں، جو منع نہیں ہیں بلکہ زندگی کے تحفظ کے لیے تمام ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ لیکن جونہی سانس ختم ہوا ڈاکٹر صاحبان وہاں سے اٹھ جاتے ہیں، مشینیں ہٹالی جاتی ہیں اور کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارا کام یہیں تک تھا، اب ہمارا کام ختم ہوا، اب مولوی صاحب کو بلاؤ کہ ان کا کام اب شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے ہم سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے نہیں روکتے بلکہ اسے حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں، لیکن یہ عرض کرتے ہیں کہ آنے والی زندگی کے لیے بھی تیاری کرو جو اصل اور دائمی زندگی ہے، وہاں قرآن کریم کام آئے گا اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کام آئے گی۔ آخرت کی زندگی کی کامیابی کا مدار ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے، وہاں اس کے ساتھ سفارش اور شفاعت بھی ہوگی اور قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی شفاعت سب سے زیادہ مؤثر ہوگی۔

جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن دو سفارشی سب سے زیادہ مضبوط سفارشی ہوں گے جو اصرار اور مان کے ساتھ سفارش کریں گے، قرآن کریم کی دو سورتوں کے بارے میں فرمایا کہ ”لجوجتان“ وہ دونوں جھگڑالو سورتیں ہیں اور اپنے پڑھنے والے کے لیے سفارش پر اللہ تعالی سے ضد اور اصرار کریں گی۔ یہ ایسے ہی سمجھ لیں جیسے دنیا میں بھی کوئی مان والا سفارشی کہہ دیتا ہے کہ اب تو میں آگیا ہوں کام کرا کے ہی جاؤں گا۔ قرآن کریم کی یہ دو سورتیں بھی

بڑے مان کے ساتھ اللہ تعالی سے اصرار کریں گی کہ ہم تو اس شخص کو بخشوا کر ہی ہٹیں گی، یہ دو سورتیں قرآن کریم کی سب سے لمبی سورتیں ہیں سورۃ البقرۃ اور آل عمران۔ جو جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق جھگڑالو سورتیں ہیں، جن کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے کہ مان رکھنے والی سورتیں ہیں، جو اللہ تعالی سے اپنی سفارش منوا کر ہی ہٹیں گی۔ جبکہ خود اپنے بارے میں جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میں اس وقت تک سجدے میں پڑا رہوں گا اور سفارشیں کرتا رہوں گا جب تک میری امت کا آخری آدمی بھی جہنم سے نجات حاصل کر کے جنت میں نہیں چلا جائے گا۔

اس لیے قبر میں اور حشر کے دن ایمان کی ضرورت ہو گی، اعمال صالحہ کی ضرورت ہو گی اور قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی شفاعت و سفارش کی ضرورت ہو گی، ان باتوں کی تعلیم یہ مدرسہ دیتا ہے اور ان کی تیاری صرف اس مدرسہ میں کرائی جاتی ہے۔ جن افراد کا اور قوموں کا آخرت کی زندگی پر یقین نہیں ہے اور وہ اس دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں ان کے نزدیک دینی مدرسہ کی تعلیم کی اہمیت نہیں ہو گی، لیکن جن کا آخرت پر ایمان ہے قبر و حشر پر ایمان ہے اور جنت و دوزخ پر ایمان ہے وہ دینی مدرسہ کی اس تعلیم کے بغیر نہیں رہ سکتے، ان کے نزدیک اس تعلیم کی ضرورت سکول و کالج کی تعلیم سے کہیں زیادہ ہے اور وہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ دینی مدرسہ کی تعلیم کو بھی اپنی پریکٹیکل لائف کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں۔

4. اس کے ساتھ یہ بات عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دینی مدرسہ کی تعلیم ہماری صرف آخرت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ دنیا کی بھی ضرورت ہے کیونکہ دنیا کی زندگی میں بھی ہم ان تعلیمات کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو یہ مدرسہ ہمیں فراہم کرتا ہے۔ ہماری دنیا کی زندگی کی بیسیوں ضروریات ہیں جو دینی مدرسہ کی تعلیم پورا کرتی ہے ان میں سے مثال کے طور پر صرف ایک کا بات سمجھانے کے لیے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے معاشرے کی عام سی شکایت ہے کہ گھروں میں سکون نہیں رہا، باہمی اعتماد اور بھروسہ کم ہوتا جا رہا ہے، جھگڑے اور تنازعات بڑھ رہے ہیں،

رشتوں اور کاروبار میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں اور برکت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ ہم نے اس کا ایک حل سوچ رکھا ہے کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے، جادو ہو گیا ہے، کسی نے کالا علم کر دیا ہے، اور بند باندھ دیا ہے، شریکوں نے کچھ کیا ہے، پڑوسیوں نے کر دیا ہے۔ ہم یہ سوچ کر مولوی صاحب کے پاس بھاگتے ہیں کہ مولوی صاحب یہ دیکھو کہ کس نے کیا ہے اور کیا کر دیا ہے، اس کا کچھ علاج کرو۔ مولوی صاحب غریب کچھ نہ کچھ کرتا ہے، مجھے اس سے انکار نہیں کہ ہمارے گھروں میں یہ شکایات پائی جاتی ہیں اور کرنے والے کرتے بھی ہیں، ان کے اثرات بھی ہوتے ہیں اور ان کا علاج بھی ضرور ہونا چاہیے، لیکن کیا سب کچھ اسی وجہ سے ہو رہا ہے؟ مجھے اس میں کلام ہے اور میں اس بات کو نہیں مانتا کہ یہ سارا کچھ کسی کے کرنے سے ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ اصل بات کچھ اور ہے جس کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے غور فرمائیں کہ ہمارے گھروں میں اگر نماز کا ماحول ہو، قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہو، اللہ تعالی کا ذکر ہوتا ہو، جناب نبی اکرمؐ پر درود پڑھا جاتا ہو اور نیکی کی باتیں ہوتی ہوں تو اس پر کوئی غیبی مخلوق آتی ہے یا نہیں؟ یقیناً فرشتے آتے ہیں۔ جبکہ ہمارے گھروں میں آج کل جو کچھ ہو رہا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا، آپ بخوبی سمجھتے ہیں، لیکن جو کچھ بھی ہوتا ہے کیا اس پر بھی کوئی غیبی مخلوق آتی ہے یا نہیں؟ یقیناً اس پر جنات آتے ہیں، شیاطین آتے ہیں۔ اب دیکھیں کہ جو بھی آئے گا وہ اپنے اثرات چھوڑ کر جائے گا، فرشتے آئیں گے تو رحمت و برکت ہوگی، شیاطین آئیں گے تو نحوست اور بے برکتی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ انہیں کون بھیجتا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ میں خود بلاتا ہوں، میں اپنے گھر کا ماحول فرشتوں والا بناؤں گا تو وہ آئیں گے اور جب وہ آئیں گے تو برکتیں اور رحمتیں ساتھ لے کر آئیں گے، لیکن اگر میں نے اپنا گھر شیاطین اور جنات کی دلچسپی والا بنا رکھا ہے تو وہی آئیں گے اور اپنے اثرات لے کر آئیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنات اور شیاطین تو میرے گھر میں آئیں اور اپنے اثرات لے کر نہ آئیں اور پھر واپس جائیں تو اپنے اثرات میرے گھر میں چھوڑ کر نہ جائیں۔

میں ایک چھوٹی سی مثال سے بات سمجھانا چاہوں گا کہ اگر میرا گھر صاف ستھرا ہے، غسل خانہ اور نالیاں صاف ہیں، اور گھر کے صحن میں پھولوں کی کیاریاں ہیں تو اس پر تتلیاں آئیں گی، جگنو آئیں گے، بلبلیں آئیں گی۔ لیکن اگر میرا گھر صاف نہیں ہے، نالیاں گندی ہیں اور غسل خانہ گندا ہے تو ظاہر بات ہے کہ مکھیاں آئیں گی، مچھر آئیں گے اور کاکروچ آئیں گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس نے بھیجے ہیں، کسی نے نہیں بھیجے بلکہ میں نے خود انہیں بلوایا ہے۔ اس لیے کہ میں گھر میں تتلیوں اور جگنوؤں کا ماحول بناؤں گا تو وہ آئیں گے، اور اگر مکھیوں اور مچھروں والا ماحول رکھوں گا تو وہی آئیں گے۔ نہ تتلیاں اور جگنو کوئی بھیجتا ہے اور نہ ہی مچھر اور مکھیاں کسی کے بھیجنے سے آتے ہیں۔ میرا گھر مکھیوں، مچھروں اور کاکروچوں سے بھرا ہوا ہو اور میں گھر کی صفائی کرنے کی بجائے پڑوسیوں کو کوستا رہوں کہ انہوں نے ان سب کو میرے گھر میں دھکیل دیا ہے، تو یہ بے وقوفی کی بات ہوگی، مجھے ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے گھر کی صفائی کرنا ہوگی اور گندگی کو باہر نکالنا ہوگا، اسی طرح اگر میں اپنے گھر کو نحوست اور بے برکتی سے پاک کرنا چاہتا ہوں تو مجھے جنات اور شیاطین کے ماحول سے نکلنا ہوگا اور فرشتوں کا ماحول پیدا کرنا ہوگا، اس لیے کہ فرشتوں کا آنا جانا ہوگا تو رحمتیں نازل ہوں گی، برکتوں کا ڈیرہ ہوگا اور بے برکتی اور نحوستوں سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔

فرشتوں کا ماحول ہمیں قرآن کریم کی تلاوت سے ملے گا، نماز سے ملے گا، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ملے گا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کی کثرت سے ملے گا، اور یہ باتیں ہمیں دینی مدرسہ سکھاتا ہے اور ان کی تعلیم ہمیں اس مدرسہ سے ملتی ہے۔

اس لیے ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دینی مدرسہ ہماری صرف آخرت کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا بلکہ دنیا کی بہت سی ضروریات بھی پوری کرتا ہے، اس لیے اگر ہم دنیا کی اس زندگی میں سکون چاہتے ہیں، اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں، رحمت و برکت کا نزول چاہتے ہیں، اور باہمی اعتماد و محبت کی زندگی کے طلبگار ہیں تو دینی مدارس کے ساتھ

تعلق جوڑنا ہوگا، دینی مدارس قائم کرنا ہوں گے، انہیں آباد کرنا ہوگا اور ان کی تعلیمات سے استفادہ کرنا ہوگا، اللہ رب العزت ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

تدریس حدیث کے چند اہم تقاضے

(الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ - ۱۵ فروری ۲۰۰۹ء)

(۱۵ فروری ۲۰۰۹ء کو الشریعہ اکادمی میں "عصر حاضر میں تدریس حدیث کے تقاضے" کے موضوع پر منعقدہ سیمینار سے خطاب)

یہ سیمینار جو "عصر حاضر میں تدریس حدیث کے اہم تقاضے" کے زیر عنوان منعقد ہو رہا ہے، اس میں اپنے معزز مہمان جناب حضرت مولانا مفتی برکت اللہ صاحب کو، جو ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل اور لندن کے معروف علماء اور اہل دانش میں سے ہیں، اور حضرت مولانا مفتی محمد زاہد صاحب زید مجدہم کو جو جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد کے استاذ الحدیث اور ہمارے مخدوم و محترم حضرت مولانا نذیر احمد قدس سرہ کے فرزند ہیں، اور حضرت مولانا محمد رمضان علوی کو جو اسلام آباد کے بڑے علماء میں سے ہیں، میں ان سب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ حضرات کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائے اور جس مقصد کے لیے جمع ہیں، اس میں کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائے۔

تدریس حدیث کے حوالے سے، آج کے معروضی تناظر کے حوالے سے اپنے آپ کو بھی اور حدیث کے دوسرے اساتذہ کو بھی چند پہلوؤں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

1. پہلی بات پرانی بھی ہے اور نئی بھی ہے:

- امام بخاریؒ نے حضرت علیؓ کا یہ قول تعلیقاً نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا "حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ؟" کہ لوگوں کے سامنے حدیث ایسے بیان کرو یا وہ حدیث بیان کرو جو لوگوں کے معروفات و مسلمات کے دائرے میں ہو۔ ایسی بات مت کرو جس سے ان کے ذہن میں نفرت پیدا ہو اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی منزل پر

چلے جائیں۔ یعنی معروفات کو سامنے رکھو اور اس کے مطابق حدیث کی بات کرو۔

• ایک قول امام مسلمؒ نے مقدمہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا نقل کیا ہے، فرماتے ہیں ”ما انت بمحدث قوما حدیثا لا تبلغہ عقولھم الا کان لبعضھم فتنۃ“ اگر تم لوگوں کے سامنے کسی گروہ کے سامنے ایسی حدیث بیان کرو گے یا ایسے انداز سے بیان کرو گے کہ ان کی عقلوں کی جہاں تک رسائی نہیں ہے تو تمہارا یہ بیان کرنا ان میں سے بعض لوگوں کے لیے فتنہ بن جائے گا، آزمائش بن جائے گا۔

• اس کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد بھی ملا لیا جائے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا ہے وہ ”وعائین“ (دو برتن) ہیں۔ ایک برتن تو میں نے تمہارے سامنے پھیلا دیا ہے، اور اگر دوسرے کو بکھیروں تو میری یہ گردن کٹ جائے۔

صحابہؓ میں حدیث کے تین بنیادی راویوں کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ حدیث کو بیان کرنے میں اور اس کے انداز میں اس دور کے معروفات و مسلمات کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور حدیث کو لوگوں کے ایمان میں اضافہ کا ذریعہ بننا چاہیے، اس میں تشکیک و شبہات کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے۔

2. میں بھی حدیث کا ایک پرانا طالب علم ہوں، پڑھتے پڑھاتے نصف صدی گزر گئی ہے۔ جب ہم حدیث پڑھا رہے ہوں تو جس طرح پبلک کے ایک اجتماع میں حدیث بیان کرتے ہوئے پبلک کی ذہنی نفسیات اور ذہنی سطح اور اس کے معروفات و مسلمات کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اسی طرح ہمارے سامنے جو کلاس بیٹھی ہے، اس کی ذہنی سطح کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ یہ کلاس کس لیول ہے، کون سی بات ان کے ذہن میں جائے گی اور کون سی نہیں جائے گی۔ کیونکہ آج ہمارے سامنے جو طلبہ حدیث پڑھنے بیٹھتے ہیں، ان کا لیول آج سے پچاس سال پہلے والا نہیں ہے۔ چالیس پچاس سال پہلے

ہوتا یہ تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ کی اکثریت مطالعہ کر کے آتی تھی۔ استاد کو بس اشارہ کرنا پڑتا تھا۔ استاد روایت سناتا اور اشارہ دیتا تھا۔ ایک دن میں بیس بیس صفحے ویسے ہی نہیں پڑھے جاتے تھے۔ ایک روایت پڑھی گئی ہے جو طلبہ کے ذہن میں پہلے سے ہے، استاد نے اشارہ کر دیا کہ یہ بات یوں ہے، بس بات آگے نکل گئی۔ اب میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اب تو ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ اگر نفس حدیث سمجھ لیں کہ حدیث کیا کہتی ہے اور اس حدیث کا ترجمۃ الباب سے تعلق کیا ہے، بس وہ اتنی بات سمجھ لیں تو ان کی ہم پر بڑی مہربانی ہے کہ وہ نفس حدیث سمجھ گئے ہیں اور اس کا مضمون سمجھ گئے ہیں کہ کس مضمون کی یہ روایت ہے۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہمارا استعداد کا لیول کم ہوتے ہوتے اس مقام پر آ گیا ہے، لیکن ہماری بیشتر تقریریں پچاس سال پہلے کی اسی سطح کی ہیں۔ اور یہ ایک عملی بات ہے جو میں محسوس کر رہا ہوں کیونکہ ہم نے اسٹڈی وہاں سے کی ہوئی ہے، لیکن سننے والے کا لیول اور فریکونسی اس سے نہیں ملتی۔ آج میرے نزدیک حدیث کی تدریس میں ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ پہلے نفس حدیث سمجھائیں کہ حدیث کیا کہتی ہے اور مضمون کیا ہے، اس کے بعد اگر کوئی بات ضروری ہے تو ان کے فہم کے مطابق بیان کر دیں، ورنہ تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ایک بات میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ لوگوں کی ذہنی سطح، ان کے فہم کا دائرہ اور اس کا لیول ہمیں دیکھنا چاہیے اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ حدیث کے ساتھ ان کا فہم کا تعلق زیادہ سے زیادہ قائم ہو۔

3. تیسری بات میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ حضرت امام طحاویؒ ہمارے احناف کے بہت بڑے وکیل ہیں اور ان کی کتاب ”شرح معانی الآثار“ ہمارے مستدلات کا بھی اور استدلال کا بھی بہت بڑا ماخذ ہے، لیکن امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار لکھی کیوں تھی۔ انہوں نے اس کو لکھنے کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔ مضمون اس کتاب کا یہی ہے کہ ترتیب سے احناف اور دوسرے فقہاء کا موقف اور اختلافی مسائل میں دلائل بیان کرتے ہیں، پھر استدلال و

ترجیح ثابت کرتے ہیں۔ لیکن امام طحاویؒ اپنی کتاب کی وجہ تصنیف کیا بیان فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب کیوں لکھی ہے؟ وہ فرماتے ہیں:

سالنی بعض اصحابنا من اہل العلم ان اضع لہ کتابا اذکر فیہ الآثار المذکورۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الاحکام التی یتوھم اہل الالحاد والضعفۃ من اہل الاسلام بعضھا ینقض بعضا، لقلۃ علمھم بناسخہا من منسوخہا وما یجب العلم منہا لما یشہد لہ من الکتاب الناطق والسنۃ المجتمع علیھا۔

کہتے ہیں کہ کتاب میں نے اس لیے لکھی کہ فقہاء کے اختلاف کے حوالے سے جو مختلف احادیث لوگوں کے سامنے آتی ہیں تو عام آدمی کا یہ تاثر بنتا ہے کہ حدیثوں میں بہت تناقض ہے، بہت تعارض ہے۔ ایک بات میں دس دس حدیثیں متعارض ہیں، اس لیے عام کمزور مسلمان تشویش میں پڑتا ہے اور ملحدین اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک مسئلہ میں دس حدیثیں مختلف آگئیں۔ ایک میں کچھ ہے اور دوسری میں کچھ ہے، تیسری میں کچھ ہے اور چوتھی میں کچھ ہے۔ اس سے عام کمزور آدمی سوچے گا کہ یہ کیا معاملہ ہے، مسئلہ ایک ہے اور حدیثیں اتنی اور بالکل متعارض ہیں۔ جبکہ ملحدین اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ان حدیثوں میں تعارض ہے۔ حالانکہ تناقض و تعارض نہیں ہے۔ تیئس سالہ زندگی میں پھیلی ہوئی حدیثیں ہیں، کوئی کسی موقع کی ہے، کوئی کسی موقع کی ہے، کسی کا پس منظر اور ہے، کسی کا پس منظر اور ہے، کسی کا محل اور ہے، کوئی پہلے کی ہے اور کوئی بعد کی ہے، کوئی ناسخ ہے کوئی منسوخ ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ عام آدمی کہ چونکہ معلوم نہیں ہے، اس لیے وہ وہم میں پڑ جاتا ہے اور اس سے الحاد والوں کو فائدہ پہنچتا ہے کہ حدیث سے لوگوں کا اعتماد ختم کریں۔ تو امام طحاویؒ کہتے ہیں کہ میں نے مختلف احادیث کو الگ الگ محل کے ساتھ بیان کر کے اور ترجیحات قائم کر کے اس تاثر کو ختم کرنے کی کوشش ہے کہ حدیثوں میں تعارض ہے۔ امام طحاویؒ کہتے ہیں کہ میں نے یہ تاثر ختم کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے تاکہ تعارض کا تاثر ختم ہو اور یہ بتایا جائے کہ یہ حدیث اس موقع کی ہے اور اس کا محل یہ ہے۔ یہ راجح ہے اور یہ مرجوح ہے اور یہ ناسخ ہے اور یہ منسوخ ہے اور ہر حدیث اپنی جگہ صحیح ہے۔ میں نے یہ بتانے کی کوشش کی اور بڑی کامیابی سے بتائی بھی ہے۔ امام طحاویؒ کا یہ کمال ہے کہ بڑی

کامیابی سے ایک واقعہ کی متعارض حدیثوں کا الگ الگ محل بیان کر کے انہوں نے یہ بتایا بھی ہے کہ شاید یہ چند حدیثیں منسوخ ہوں، باقی ساری راجح مرجوح ہوں یا اس میں ایک کا محمل یہ ہے، ایک کا یہ ہے۔
میرے خیال میں اگر تیسری صدی ہجری میں یہ صورت حال تھی تو آج کی پندرھویں صدی میں بھی یہی صورت حال ہے اور اس سے کہیں زیادہ ہے۔ امام طحاویؒ تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے آغاز کے بزرگ ہیں۔ اگر تیسری صدی کے آخر میں یہ صورت حال تھی کہ حدیثوں کا ظاہری تعارض اور ظاہری اختلاف و تناقض لوگوں میں شکوک و شبہات کا باعث بنتا تھا اور ملحدین کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا تو میرے خیال میں آج بھی تدریس میں اس ذوق کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم احادیث کے تعارض کو جھگڑے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اس میں تطبیق اور ہم آہنگی کے پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے سب سے بڑے امام، امام طحاویؒ کا موقف ہے۔
4. چوتھی بات حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے کروں گا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک تو حدیث کا بالکل ایک الگ تصور ہے، کہتے ہیں کہ حدیث تمام علوم دینیہ کا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کا ماخذ بھی حدیث ہے۔ یہ بات کہ قرآن کی فلاں آیت قرآن کی ہے، ہمارے پاس اس کی دلیل حدیث ہی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ شاہ صاحب فرما رہے ہیں کہ حدیث Raw material (عمومی مال کا ذخیرہ) ہے کہ اس سے قرآن بھی مستنبط ہوتا ہے، سنت بھی مستنبط ہوتی ہے، اور فقہ بھی مستنبط ہوتی ہے۔ اصل ماخذ اور اساس علم حدیث ہے۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ اس سے تمام علوم مستنبط ہوتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک حدیث کا درجہ تو یہ ہے کہ قرآن پاک کی تشریح بھی ہے اور قرآن پاک کا ماخذ بھی ہے۔ شاہ صاحب نےؒ اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں، جو علم اسرار دین پر لکھی ہے، علم اسرار دین کو علم حدیث کا شعبہ بتایا ہے۔ علم حدیث کے چار شعبے کیے ہیں، چوتھا شعبہ ان میں اسرار دین اور علم حکمت ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آج کے دور میں اور آئندہ دور میں علماء پر واجب کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے اعجاز کا ایک پہلو یہ تھا کہ قرآن فصاحت و بلاغت میں تمام کلاموں سے برتر ہے۔ یہ کلام الملوک ملوک الکلام، بادشاہ کا کلام ہے اور بادشاہی درجہ کا ہے۔ فصاحت و بلاغت میں اللہ تعالی کا کلام تمام کلاموں میں برتر ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دور وہ تھا جو گزر گیا کہ لوگوں نے دلائل دیے، کوئی دلائل کا جواب نہیں دے سکا۔ قرآن کریم کے مقابلہ میں کوئی نہیں آیا۔ لیکن قرآن پاک کے اعجاز کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آئندہ زمانے میں بات کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم نے سوسائٹی کے لیے جو ضوابط و قوانین پیش کیے ہیں، سوسائٹی کے مصالح کے پیش نظر، سوسائٹی کی ضروریات کے پیش نظر، ایسے مکمل ضوابط اور قوانین کوئی نہیں پیش کر سکتا۔ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم جیسے قوانین اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے احکام و ضوابط وضع کرے جو سوسائٹی کے منافع کے لیے ہوں، فوائد کے لیے ہوں۔ مصلحت کے اعتبار سے، سوسائٹی کی ضروریات کے اعتبار سے جتنا مکمل قانون قرآن کریم کا ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، دنیا میں کوئی اور نظام اور قانون اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> وجب ان یکون فی الائمۃ من یوضح وجوہ ہذا النوع من الاعجاز والآثار الدالۃ علی ان شریعتہ صلی اللہ علیہ وسلم اکمل الشرائع وان اتیان مثلہ بمثلہا معجزۃ عظیمۃ کثیرۃ مشہورۃ'۔

یعنی علماء پر واجب ہے کہ قرآن پاک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور قوانین کی حکمت، ان کی فلاسفی، ان کا نفع، ان کی مصلحت، سوسائٹی کے لیے ان کی ضرورت، اور سوسائٹی میں اس کے اثرات، یہ واضح کیے جائیں۔ آج کی یہ ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث پڑھنے پڑھانے والے کو شاہ صاحب کا یہ سبق بھی، اگرچہ تین سو سال کے بعد ہے، یاد کر لینا چاہیے کہ حدیث بیان کرتے ہوئے ہم آج کے زمانے کے مطابق اس پہلو کو پیچ کریں کہ اس پر عمل نہ کرنے کا یہ نقصان ہے اور عمل کرنے کا یہ فائدہ ہے۔ تو یہ

حکمت اور اس کی لم و سر بیان کرنا، یہ بھی تدریس حدیث کی ضروریات میں ہے۔

5. ایک بات مزید کہہ کر میں اپنی بات ختم کروں گا کہ حدیث کی تدریس کے تقاضوں میں ایک تقاضا میری طالب علمانہ رائے میں یہ بھی ہے کہ آج کی جدید تحقیقات کو سامنے رکھا جائے۔ حدیث کے مدرس کو جدید تحقیقات کا مطالعہ کرنا چاہیے اور تطبیق دینی چاہیے۔ بیسیوں باتیں آپ کو ملیں گی۔ میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ کچھ دن پہلے یہ حدیث اتفاق سے سبق میں آگئی کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ماں کے پیٹ میں نطفہ چالیس دن ٹھہرتا ہے، پھر علقہ ہوتا ہے، پھر مضغہ ہوتا ہے۔ فرشتہ تو پہلے دن سے ہی مقرر ہو جاتا ہے۔ جب سے نطفہ ٹھہرتا ہے، پہلے دن ہی فرشتے کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔ وہ رپورٹ دیتا رہتا ہے کہ اے اللہ چالیس دن گزر گئے، اے اللہ دوسرا چلہ گزر گیا۔ اس کے بعد روح کا تعلق جوڑنے سے پہلے اللہ پاک کچھ چیزوں کو لکھواتے ہیں اور اس کی فائل بنتی ہے کہ رزق کتنا ہے؟ عمر کتنی ہے؟ اس کی صحت، سقم کیا ہے؟ شقی ہے یا سعید؟ کس کیٹگری کا ہے اور کس کھاتے میں جائے گا۔ یہ کچھ سوالات وہاں لکھوائے جاتے ہیں اور یہ فائل روح کا کنکشن دینے سے پہلے بنتی ہے۔ پوری زندگی کا پروگرام لکھوایا جاتا ہے اور پھر روح کا تعلق جسم کے ساتھ جوڑنے کا آرڈر ہوتا ہے۔ میں نے اس پر کہا کہ بات سنو، آج کی سائنس کہتی ہے کہ انسان کے جین میں اس کا پروگرام فیڈ ہے، ہماری رسائی ہوگئی ہے مگر پڑھ نہیں پا رہے ہیں، جس دن پڑھ لیا تو اس دن پتہ چل جائے گا کہ اس کے دسویں سال میں کیا ہونا ہے اور چالیسویں سال میں کیا ہونا ہے، یوں ہم بہت سا بندوبست پہلے سے کرلیں گے۔ تو کیا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا اعجاز نہیں ہے کہ آپ نے یہ بات چودہ سو سال پہلے فرمادی تھی کہ بھئی سارا پروگرام پہلے بن جاتا ہے، فیڈ ہو جاتا ہے اور فائل بن جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کی جدید تحقیقات کو سامنے رکھنا اور طلبہ کو ان سے متعارف کرانا، اس سے حدیث پر ایمان بھی بڑھے گا اور تفہیم بھی بڑھے گی۔

میں نے زیادہ لمبی بات نہیں کی، تین چار اشارے دیے ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ معزز مہمانان گرامی زیادہ تفصیل سے آپ سے مخاطب ہوں۔

استحکامِ پاکستان اور اس کے تقاضے

(مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن - ۱ جنوری ۲۰۰۹ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ میں مسلم سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (MSO) کو اس بر وقت اجتماع پر مبارک باد دینا چاہوں گا۔ آج پاکستان کا استحکام، پاکستان کی سالمیت اور پاکستان کی وحدت بہت سی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کی وجہ سے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں وہ نوجوان جو دین کی بات کرتے ہیں اور دین سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا استحکام پاکستان کے عنوان پر اکٹھے ہونا پاکستان کے اچھے مستقبل کی علامت ہے۔ اللہ تبارک وتعالی آپ حضرات کے جذبات قبول فرمائیں۔

مجھ سے پہلے ہمارے فاضل دوست جناب قمر الزمان صاحب جس صورت حال کی طرف اشارہ کر رہے تھے، یہ کشمکش تو ہماری صدیوں سے جاری ہے۔ کردار کشی اور حق و باطل کی کشمکش صدیوں سے جاری ہے۔ ہم اس وقت تک گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں دو سامراج بھگت چکے ہیں جبکہ تیسرے سے نبرد آزما ہیں۔ برطانوی اور روسی استعمار ہم نے بھگتے ہیں جبکہ امریکی استعمار کو بھگت رہے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ راؤنڈ بھی ہمارا ہو گا، آپ حوصلہ رکھیں۔ آزمائش تو ہوگی اور یہ آزمائشیں بڑھیں گی۔ آج ہمارے دینی اداروں کو ختم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں، ان مدرسوں کو ختم کرتے کرتے برطانیہ رخصت ہوا، روس رخصت ہوا اور اب امریکہ بھی رخصت ہو گا۔ اور ان شاء اللہ دین کی بقا اور حفاظت کے لیے نہ صرف یہ مدرسے باقی رہیں گے بلکہ مؤثر کردار بھی ادا کریں گے۔

استحکام پاکستان کے حوالے سے میں اپنے حکمرانوں سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔ آج ہمارے حکمرانوں کو یہ فکر ہے کہ ملک کے سیاسی استحکام کے لیے کوئی ترکیب کارگر نہیں ہو رہی۔ اور یہ کہ ملک کا نظام صحیح رخ پر نہیں جا رہا۔ میں اس پر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس بارے میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے۔ ہمارے آج کے دستوری مسائل، قانونی مسائل، سسٹم کے مسائل، ہماری معاشرت، ہماری تہذیب اور ہماری نفسیات کے مختلف لیول، ان کے متعلق ہمیں حضورؐ کے اسوہ

حسنہ میں کیا روشنی ملتی ہے، کیا رہنمائی ملتی ہے۔ دو تین مختصر جھلکیاں پیش کر کے میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔

ایک مشہور واقعہ ہے جو آپ نے کئی بار سنا ہوگا اور کئی بار سنیں گے۔ جناب نبی کریمؐ کے زمانے میں چوری کی ایک واردات ہوئی تھی اور چور پکڑا گیا تھا جو کہ بنو مخزوم قبیلہ سے تعلق رکھنے والی فاطمہ نامی ایک خاتون تھی۔ اس خاتون پر کیس چلا اور چوری کا جرم ثابت ہونے پر ہاتھ کٹنے کا فیصلہ ہوگیا۔ جب کسی وی آئی پی فیملی کے فرد پر جرم ثابت ہوتا ہے تو بہت سے عوامل متحرک ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپروچ تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ چیف جسٹس یعنی جناب نبی کریمؐ کے لیے اپروچ تلاش کی گئی۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ جو حضورؐ کے پسندیدہ نوجوان تھے اور حضورؐ کے منہ بولے پوتے لگتے تھے، انہیں حضورؐ کے لیے اپروچ بنایا گیا۔ اسامہؓ نے حضورؐ کی خدمت کرتے ہوئے پاؤں دباتے دباتے ہلکا ہلکا ذکر شروع کیا کہ یا رسول اللہ وہ بنو مخزوم کی فاطمہ پر چوری کا جرم ثابت ہوگیا ہے، آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا ہے۔ کیا ہاتھ کٹے گا؟ آپؐ نے فرمایا، کٹے گا۔ اسامہؓ نے کہا یا رسول اللہ اس خاتون کا ہاتھ تو کٹے گا لیکن اس سے تو بنو مخزوم کی ناک کٹ جائے گی۔ یا رسول اللہ، قانون میں ان (وی آئی پی لوگوں) کے لیے کوئی گنجائش، کوئی نرمی؟ رسول اللہؐ لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پہلے تو یہ کہہ کر اسامہؓ کو ڈانٹا کہ اَتشفع فی حد من حدود اللہ؟ کیا اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو؟ پھر صرف اس ڈانٹ پر قناعت نہیں کی بلکہ مسجد میں تشریف لے گئے اور جا کر عوامی خطبہ ارشاد فرمایا۔ فرمایا، کیا تم لوگ اللہ کے قانون میں سفارشیں تلاش کرتے ہو؟ اور ایک جملہ ارشاد فرمایا جو میں آج کے حکمرانوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں انما ہلک من کان قبلکم سے پہلے قومیں کیوں برباد ہوئی ہیں؟ ان کی تباہی کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ تھا کہ جب کوئی غریب آدمی جرم کرتا تھا تو سزا بھگتا تھا، لیکن جب کوئی امیر آدمی جرم کرتا تھا تو اسے اپروچ اور سفارش مل جاتی تھی جس کی مدد سے وہ سزا سے بچ جاتا تھا۔ فرمایا، تم میں بھی جب یہ بات آئے گی تو تم بھی برباد ہو جاؤ گے۔

میں پاکستان کے حکمرانوں سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ بڑی سیدھی سی بات ہے۔ قانون اور اس کا اطلاق یکساں کر دیجیے، بیشتر مسائل حل ہو جائیں گے۔ صرف کاغذوں میں نہیں بلکہ عمل میں، نفسیات میں، سوچ اور ذہنیت میں۔ قانون کا ہمارے صدر پر بھی اطلاق ہو اور لاہور کی ایک کچی آبادی کے کسی فرد پر بھی اطلاق ہو۔ جب تک سوسائٹی میں

جناب نبی کریمؐ کے اس ارشاد پر عمل کا اہتمام نہیں ہوگا اور قانون کا یکساں اطلاق نہیں ہوگا، آپ امن کے خواب دیکھ کر خود کو دھوکہ اور فریب مت دیجئے۔ انصاف، استحکام اور امن کے راستے پر نہ چلنا بلکہ صرف نعرے لگاتے رہنا، یہ خود فریبی ہوتی ہے اور قوموں کی زندگی میں خودکشی ہوتی ہے۔

غزوہ احزاب کا موقع تھا اور نبی کریمؐ مدینہ منورہ کا دفاع کر رہے تھے۔ عرب قبائل متحد ہو کر مدینے پر چڑھ دوڑے تھے اور اتحادی فوجوں نے مدینے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ مدینے کے دفاع کے لیے خندق کھودی جا رہی تھی۔ سینکڑوں صحابہؓ انصار و مہاجرین مدینے کے لیے خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ ایسے میں کمانڈر انچیف کسی ایئر کنڈیشنڈ ہاؤس میں بیٹھ کر لشکر کو کمان نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کے ہاتھ میں بھی کدال تھی اور سر پر مٹی کی ٹوکری تھی۔ ام سلمہؓ فرماتی ہیں مٹی اٹھا اٹھا کر حضورؐ کی داڑھی مبارک میں مٹی اٹک جاتی تھی جسے میں ہاتھ سے جھاڑتی تھی۔ اس کیفیت میں آنحضرتؐ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا، یا رسول اللہؐ بھوک لگی ہے۔ آپؐ نے فرمایا، صبر کرو۔ کہا، یا رسول اللہ صبر نہیں ہو رہا۔ فرمایا، حوصلہ کرو۔ کہا یا رسول اللہ برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ اس نے پیٹ سے کپڑا اٹھایا اور دکھایا کہ یا رسول اللہ میں نے بھوک کی شدت کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے بھی اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھایا اور فرمایا، برخوردار تم نے ایک پتھر باندھ رکھا ہے جبکہ میں نے دو باندھ رکھے ہیں۔

میں نے یہ دو جھلکیاں جناب نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے پیش کی ہیں۔ جب تک دنیا اس طرح کے مناظر دوبارہ نہیں دیکھے گی، دنیا کو انصاف، استحکام اور امن نہیں ملے گا۔

چند ماہ قبل ہمارے چیف جسٹس جناب افتخار محمد چودھری نے ایک کیس میں ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کرپشن ہے۔ ہمارے ملک کو بد دیانتی، نا اہلی اور اقربا پروری دیمک کی طرح کھا رہے ہیں۔ پھر کہا کہ کرپشن کا علاج گڈ گورننس ہے۔ اس کے بعد ایک جملہ کہا جو میں اکثر لوگوں کو یاد دلاتا ہوں۔ چیف جسٹس نے کہا کہ گڈ گورننس ہمیں حضرت عمر فاروقؓ کے دروازے سے ملے گی۔ ہم تو یہ بات کہتے ہی تھے اور کہتے رہیں گے لیکن اب یہ پاکستان کے چیف جسٹس فرما رہے ہیں کہ گڈ گورننس ہماری ضرورت

اصل ہے اور یہ ملے گی ہمیں حضرت عمرؓ کی پیروی کرنے سے۔ یعنی جناب نبی کریمؐ کے ایک خلیفہ کی پیروی کرنے سے ہمیں پتہ چلے گا کہ گڈ گورننس کیا ہوتی ہے۔

گڈ گورننس کی ایک ہلکی سی جھلک بھی آپ کے سامنے پیش کر دوں کہ جب گڈ گورننس ہوتی تھی تو معاملہ کیا ہوتا تھا۔ اور یہ جھلک چھوٹے حضرت عمر یعنی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی ہے۔ میں اس وقت بڑے حضرت عمرؓ کی بات نہیں کرتا، ہم ابھی شاید اس کے متحمل نہیں ہیں۔ چند سال ہوئے ہمارے ایک معروف سیاست دان نے بیان دیا کہ ہمیں مولویوں والا اسلام نہیں چاہیے بلکہ حضرت عمرؓ والا اسلام چاہیے۔ میں نے کہا بھئی ''ہتھ ہولا رکھ، اسی اینے جوگے نئیں'' (ہاتھ ہلکا رکھو ہم اس قابل نہیں ہیں)۔ ایک لمحے کے لیے تصور کریں کہ حضرت عمرؓ چوبیس گھنٹے کے لیے ہمارے درمیان ایک چکر لگا جائیں تو ہمارے بارے میں کیا سمجھیں گے کہ ہم کون ہیں؟ کیا وہ ہم میں سے کسی کو مسلمان بھی سمجھیں گے؟ تو میں نے کہا سیاست دان صاحب سے کہا کہ بھئی نیچے نیچے کوئی شخصیت تلاش کرو، جس شخصیت کی تم بات کر رہے ہو، اس صورت حال میں ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

چھوٹے حضرت عمر یعنی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی مثال پیش کرتا ہوں۔ ''کتاب الاموال'' ہماری اسلامی معاشیات کی کلاسیکل کتاب ہے، تیسری صدی ہجری میں امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ نے لکھی تھی اور یہ مستند کتابوں میں سے ہے۔ اس میں اسلامی معیشت کے حوالے سے بہت سی باتیں مذکور ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ پہلی صدی ہجری کے اختتام پر دنیائے اسلام کے واحد حکمران تھے اور دمشق میں بیٹھتے تھے۔ عراق کے علاقے میں ان کے ایک گورنر تھے عبد الحمید۔ عراق کے گورنر نے خط لکھا کہ یا امیر المؤمنین! اس سال صوبے کا ریونیو (زکوٰۃ وغیرہ) وصول ہو کر سالانہ اخراجات پورے ہونے کے بعد بجٹ میں کچھ پیسے بچے ہیں۔ ہماری ضروریات پوری ہوگئی ہیں، تو اس فاضل بجٹ کا ہم کیا کریں؟ امیر المؤمنین نے جواب دیا، ایسا کرو، اعلان کرو کہ تمہارے صوبے میں جو لوگ مقروض ہیں، انکوائری کر کے ان کی تحقیق کرو، جو لوگ اس درجے کے ہوں کہ اپنا قرضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں ان تمام کے قرضے بیت المال سے ادا کر دو۔ عبد الحمید صاحب نے جواب میں لکھا کہ امیر المؤمنین یہ کام ہم نے کر دیا ہے۔ دوسرا خط آیا کہ جو لڑکے اور لڑکیاں شادی کے قابل ہیں

اور شادی کا خرچہ برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، ان کی شادیاں بیت المال کے خرچے سے کروادو۔ جواب میں لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں۔ کتاب الاموال کی روایت میں ہے کہ تیسرا خط آیا کہ شادی شدہ لوگ جن کی شادیاں ہو چکی ہیں اور بال بچے دار ہیں لیکن وہ اپنی بیویوں کا مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، انکوائری کر کے ان کے مہر بھی بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنر صاحب نے لکھا، یا حضرت! یہ بھی کر دیا ہے لیکن بجٹ میں اب بھی کچھ پیسے بچے ہوئے ہیں۔ چوتھے خط میں امیر المؤمنین نے کہا ایسا کرو کہ زمینوں کا سروے کرواؤ، جو قابل کاشت زمینیں ہیں، آباد نہیں ہو رہیں، کاشت کاروں کو آسان قسطوں پر قرضے دے کر وہ زمینیں آباد کرا دو۔

یہ ایک جھلکی ہے اس سوسائٹی کی جو جناب نبی اکرمؐ کی سیرت پر چلنے والوں نے قائم کی تھی۔ یہ واقعہ میں نے ایک جگہ ذکر کیا تو ایک نوجوان نے مجھ سے سوال کیا مولوی صاحب ایک صوبے کے پاس اتنا ریونیو کدھر سے آ گیا۔ آپ کے ذہن میں بھی یہ سوال آیا ہو گا۔ یعنی وہ ریونیو تھا یا کیا تھا، کتنے محصولات وصول ہوئے ہوں گے کہ سال کا بجٹ بھی پورا ہو رہا ہے، مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہو رہے ہیں، کنواروں کی شادیاں بھی ہو رہی ہیں، شادی شدہ لوگوں کے مہر بھی ادا کیے جا رہے ہیں اور کسانوں کو آسان قسطوں پر قرضے بھی دیے جا رہے ہیں۔ تو اس نوجوان نے یہ سوال کیا کہ ایک صوبے کے پاس اتنا ریونیو کہاں سے آیا؟ میں نے کہا میں بتاتا ہوں کہاں سے آیا۔

میں نے کہا، انہی حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ کا ایک واقعہ بتاتا ہوں جس سے پوری بات سمجھ میں آ جائے گی۔ ایک دفعہ اپنے گھر آئے، آ کر اپنی بیوی سے کہا کہ فاطمہ تمہارے پاس کوئی ایک آدھ درہم بچا ہوا ہو تو دو مجھے ضرورت ہے۔ ان کی بیوی تھیں فاطمہ بنت عبد الملک۔ درہم چاندی کا سکہ ہوتا تھا ساڑھے تین ماشے کا۔ موجودہ دور میں مارکیٹ کی ویلیو کے حساب سے تقریباً ایک برطانوی پونڈ سمجھ لیں۔ بیوی نے پوچھا کیا کرنا ہے؟ یہ بات ذرا حوصلے کے ساتھ سننے کی ہے۔ اپنے وقت کی آباد دنیا میں بڑے حصے کا جبکہ عالم اسلام کا واحد حکمران ہے اور اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے کہ میں گھر آ رہا تھا راستے میں ایک ریڑھی پر انگور لگے ہوئے ہیں، انگور اچھے ہیں کھانے کو جی چاہتا ہے لیکن جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ فاطمہ نے کہا آپ کے پاس نہیں ہیں تو میرے پاس کدھر سے آئے؟ ایک جواب تو یہ دیا، جبکہ دوسرا جواب بیویوں والا دیا۔ کہا، آپ امیر المؤمنین ہیں ایک درہم کا انگور بازار سے

نہیں منگوا سکتے؟ اس بات کا کیا مطلب ہے؟ میں آج کی زبان میں اس کا ترجمہ کرتا ہوں کہ کیا آپ کے پاس کوئی صوابدیدی فنڈ نہیں ہے؟ امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جو جواب دیا میں آج کے حکمرانوں سے عرض کرتا ہوں۔ امیر المؤمنین نے کہا، فاطمہ جس درہم کی تم بات کرتی ہو وہ درہم نہیں آگ کا انگارہ ہے۔

میں نے اس نوجوان سے کہا کہ جس ملک کا سربراہ سرکاری خزانے کو آگ کا انگارہ سمجھے گا اس ملک کے ریونیو میں پیسے ہی پیسے ہوں گے۔ اس ملک کو پیسوں کے لیے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے، کشکول سے نجات کے لیے قربانی دینے پڑے گی اور ہمارے حکمرانوں کو اس بات پر آنا پڑے گا کہ ہمارے لیے سرکاری خزانہ آگ کا انگارہ ہے۔

حضرات محترم! استحکام پاکستان کے لیے کچھ بھی کر لیں لیکن بات وہی ہے جس پر میں اپنی گفتگو کا اختتام کروں گا جو ہمارے چیف جسٹس صاحب نے فرمائی ہے کہ اگر ملک کو کرپشن سے نجات دلانی ہے، ملک کو انصاف مہیا کرنا ہے، ملک کو گڈ گورننس فراہم کرنی ہے اور ملک کو مستحکم کرنا ہے تو ہمیں حضرت عمرؓ کا دروازہ کھٹکھٹانا ہو گا۔ جس دن ہم حضرت عمرؓ کا دروازہ کھٹکھٹانے چلے گئے، ہمارے لیے امن، انصاف اور استحکام کے سارے راستے کھل جائیں گے۔ اللہ پاک مجھے اور آپ کو عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

۲۰۰۸ء

طلاق کا حق۔ دین اسلام کیا کہتا ہے؟

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۳ دسمبر ۲۰۰۸ء)

اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک حالیہ سفارش ملک کے علمی حلقوں میں زیر بحث ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا جائے اور یہ قانون بنا دیا جائے کہ اگر عورت خاوند سے طلاق کا تحریری مطالبہ کرے تو خاوند ۹۰ روز کے اندر اسے طلاق دینے کا پابند ہوگا، اور اگر وہ اس دوران طلاق نہ دے تو ۹۰ روز گزر جانے پر طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی۔ ملک کے دینی حلقے عمومی طور پر اسے قرآن و سنت کے منافی قرار دے رہے ہیں جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل کے بعض ارکان اور ان کے ساتھ ملک کے بعض دانشور اس کا دفاع کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ یہ سفارش قرآن و سنت کے منافی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

یہ مسئلہ نیا نہیں ہے، بلکہ جب سے مغرب نے مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات کا نعرہ لگا کر مرد اور عورت کے درمیان فطری امتیازات کو مصنوعی طریقے سے ختم کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے تب سے ہمارے ہاں بھی یہ آواز مسلسل اٹھ رہی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات قائم کی جائے، اور جہاں جہاں مردوں اور عورتوں کے لیے قواعد و ضوابط اور قوانین میں کوئی فرق اور امتیاز پایا جاتا ہے اسے ختم کر دیا جائے، حتیٰ کہ قرآن و سنت کے جو احکام اس حوالہ سے امتیازی سمجھے جا رہے ہیں ان میں ترامیم کر کے انہیں بھی مغرب کے اس فلسفہ کے مطابق بنایا جائے کہ مرد اور عورت کے درمیان کسی بھی معاملے میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔

یہ مسئلہ صرف پاکستان میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں ہے۔ دنیا کے ہر مسلمان ملک میں آپ یہی صورتحال دیکھیں گے کہ ایسے قوانین واحکام کو جنہیں مرد اور عورت کے درمیان امتیاز کے قوانین کہا جاتا ہے ختم کرنے یا ان میں ترامیم کرنے کے مطالبات کیے جا رہے ہیں۔ جبکہ ہر جگہ کے دینی حلقے اور علمی مراکز اس کی مزاحمت کرتے ہوئے قرآن و سنت کے احکام میں کوئی تبدیلی قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ ہمارے ہاں صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں جب عائلی قوانین نافذ ہوئے تو اس مقصد کے لیے بہت سے شرعی احکام میں ردوبدل کیا گیا اور عورت کو طلاق کا حق دینے کے بارے میں یہ طریق کار اختیار کیا گیا کہ نکاح نامے کے فارم میں ایک خانے کا اضافہ کر دیا گیا کہ:

"کیا خاوند نے عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے؟"

یہ خانہ دنیا میں عورت کو طلاق کا حق دلانے کا تاثر قائم کرنے کے لیے بڑھایا گیا اور اسلامی فقہ میں اس کی کسی حد تک گنجائش بھی موجود ہے لیکن نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ تصور پاکستان کے عوام میں قبولیت حاصل نہیں کر سکا۔ چنانچہ شاید ایک فیصد نکاحوں میں اسے سنجیدگی سے لیا جاتا ہو ورنہ عام طور پر اس خانہ میں ہاں یا ناں لکھنے کی ذمہ داری نکاح رجسٹرار ہی فریقین میں سے کسی کو پوچھے بغیر سرانجام دے دیتا ہے۔ میں جب بھی کسی کا نکاح پڑھاتا ہوں بڑی دلچسپی سے نکاح رجسٹرار کو یہ خانہ پر کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ مجھے نہیں یاد کہ گزشتہ تیس برس کے دوران میں نے کسی نکاح رجسٹرار کو اس خانے کے بارے میں دونوں فریقوں میں سے کسی سے دریافت کرتے دیکھا ہو۔ وہ خود ہی اس پر کراس کا نشان لگاتے ہوئے آگے گزر جاتا ہے اور فریقین میں سے کوئی بھی اس پر اعتراض نہیں کرتا حالانکہ دونوں فریق اپنے سامنے نکاح نامہ پر کراتے اور اس پر دستخط بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہیں اس خانے کی موجودگی کا علم نہیں ہوتا بلکہ وہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی صرف اس لیے چشم پوشی کر جاتے ہیں کہ ان کے ذہنوں میں نکاح وطلاق کا جو تصور شرعی طور پر موجود ہے اور ان کے علاقائی کلچر میں نکاح وطلاق کا جو ڈھانچہ صدیوں سے قائم چلا آرہا ہے اس میں یہ خانہ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لیے ان کے نزدیک اس خانے کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہتی اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ نکاح وطلاق کے نظام میں ایک ایسی جزوی تبدیلی جس کی فقہی طور پر گنجائش بھی موجود ہے اس ملک کے عوام کے دلوں میں جگہ حاصل نہیں کر پا رہی تو ہمارے بہت سے دانشوروں

نے قرآن و سنت کے صریح احکام سے متصادم تبدیلیوں کو پاکستان کے مسلمانوں سے قبول کرانے کی توقعات آخر کس طرح وابستہ کر رکھی ہیں؟

نکاح کے فارم میں ''تفویض طلاق'' کے اس خانے کے اضافے کو نصف صدی بعد مکمل طور پر ناکام ہوتا ہوا دیکھ کر ہمارے بعض دانشوروں نے پینترا بدلا ہے اور خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دینے کی مہم شروع کر دی ہے جس کا ایک مرحلہ اسلامی نظریاتی کونسل کی حالیہ سفارش بھی ہے۔ اسلام میں طلاق اور خلع کی حیثیت کیا ہے اور ان کے حوالے سے مرد اور عورت کے حقوق و اختیارات کا دائرہ کیا ہے؟ اس پر گفتگو سے پہلے ہم چند اصولی باتیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً:

1. اجتہاد کا شرعی مفہوم کیا ہے؟
2. مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا قیام کہاں تک قابل عمل ہے؟
3. اسلامی نظریاتی کونسل کی حدود کار کیا ہیں؟
4. اور ان حوالوں سے پاکستان کے زمینی حقائق اور صورت حال کا منظر کیا ہے؟

اجتہاد کا شرعی مفہوم

اجتہاد کی بات اس لیے کہ قرآن و سنت کے احکام میں ترامیم کے یہ سارے مطالبات اجتہاد ہی کے نام پر کیے جا رہے ہیں۔ بلکہ ہمارے بعض فاضل دوست تو ''روایتی اسلام'' اور ''اجتہادی اسلام'' کو آمنے سامنے کھڑا کر کے ان کے درمیان کوئی معرکہ بپا کرنے کے موڈ میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے یہ مغالطہ پہلے مرحلے ہی میں دور ہو جانا چاہیے کہ اجتہاد کا شرعی مفہوم کیا ہے اور ہمارے ان دوستوں نے اجتہاد کا کون سا تصور اپنے ذہنوں میں بٹھا رکھا ہے؟

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اجتہاد اور روایت میں کوئی تعارض یا مقابلہ نہیں بلکہ یہ دونوں چودہ سو سال سے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے دور سے مسلسل یہ صورتحال ہے کہ روایت کرنے والے روایت کر رہے ہیں اور اجتہاد کرنے والے انہی روایات کی بنیاد پر اجتہاد کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اہل علم کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو روایت بھی کرتے ہیں اور خود ہی ان کے حوالے سے اجتہاد بھی کرتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی الہ عنہ کو دیکھ لیجئے جنہیں امت کے مجتہدین کا سرخیل

سمجھا جاتا ہے، وہ اجتہاد کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ روایت بھی کرتے ہیں اور اجتہاد میں روایت ہی کو بنیاد بناتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ہاں روایت کو قبول کرنے کا معیار دوسروں سے قدرے سخت ہے لیکن اس کا مطلب روایت کی نفی نہیں، ان کے سینکڑوں اجتہادات اور فتاویٰ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جن کی بنیاد روایت پر ہے۔ اس لیے یہ تصور انتہائی گمراہ کن ہے کہ روایت اور درایت، یا روایت اور اجتہاد ایک دوسرے کے مقابل کی چیزیں ہیں۔ روایت کی دنیا میں اصول استناد کے حوالے سے سب سے بلند مقام امام بخاریؒ کو دیا جاتا ہے لیکن وہ صرف روایت نہیں کرتے بلکہ ہر روایت کے ساتھ اجتہاد بھی کرتے ہیں اور درایت کا دامن مسلسل تھامے ہوئے ہیں۔

ہمارے ہاں روایت اور درایت، یا روایت اور اجتہاد کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کرنے کا تصور یورپ میں مسیحیت کے مذہبی ڈھانچے کے خلاف پروٹسٹنٹ انقلاب کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے اور ہمارے بہت سے دانشور آنکھیں بند کر کے اسی لکیر کو پیٹتے چلے جا رہے ہیں۔ یورپ میں بائبل کی تعبیر و تشریح اور شرعی احکام کے تعین و وضاحت میں فائنل اتھارٹی پاپائے روم اور چرچ کو حاصل تھی جس کے خلاف مارٹن لوتھر اور ان کے رفقاء نے بغاوت کی اور اسے مسترد کرتے ہوئے یہ تصور دیا کہ بائبل کی تعبیر و تشریح ”کامن سینس“ کی بنیاد پر ہر مسیحی کا حق ہے اور اس پر پوپ یا چرچ کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔ اس کشمکش میں پوپ اور چرچ کی تعبیرات و تشریحات نے روایت کا عنوان اختیار کر لیا جبکہ کامن سینس کو درایت کا نام دے دیا گیا اور ان دونوں کے درمیان معرکہ آرائی کا بازار گرم ہو گیا۔

ہمارے ہاں اس کی پیروی سب سے پہلے اکبر بادشاہ نے کی اور اسلام کے فقہی ذخیرے کو تقلیدی اور روایتی اسلام قرار دے کر مسترد کرتے ہوئے ”اجتہاد مطلق“ کے نام سے اسلامی عقائد و احکام کی تشکیل نو (ری کنسٹرکشن) کا کام کر ڈالا۔ لیکن اسے مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اس کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں جس شخص یا گروہ نے یہ راستہ اختیار کیا آج تک اسے کامیابی اور قبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے والے دوست یورپ کے پس منظر اور مسلمانوں کے پس منظر میں فرق کو محسوس کرنے اور ملحوظ رکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرما رہے۔ ایک پنجابی محاورے کے مطابق پڑوسیوں کا منہ سرخ دیکھ کر اپنا منہ تھپڑ مار مار کر سرخ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یورپ میں مارٹن

لوتھر کی اس تحریک کا جواز اور اس کی کامیابی کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسیحیت کے پاس آسمانی تعلیمات کا کوئی مستند، محفوظ اور متفقہ متن موجود نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ جس کی وجہ سے خدا کی منشا بیان کرنے، بائبل کی حتمی تعبیر کرنے اور شرعی احکام و قوانین کے تعین میں پوپ اور چرچ کو فائنل اتھارٹی کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور یہ اتھارٹی دلیل کی نہیں بلکہ شخصیت کی تھی۔ اسی طرح پوپ کو مسیحیت میں ''خدا کے نمائندے'' کا مقام حاصل ہے کہ وہ جو بات کرتا ہے خدا کی طرف سے کرتا ہے اس لیے اس کی کسی بات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام میں یہ صورتحال دونوں حوالوں سے موجود نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے پاس قرآن کریم کا مستند، محفوظ اور متفقہ متن موجود ہے۔ اس کی تعبیر و تشریح میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اعمال، بلکہ صحابہ کرامؓ کا تعامل بھی مکمل استناد اور اعتماد کے ساتھ موجود و محفوظ ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں کسی بڑے سے بڑے مجتہد اور امام کو بھی کوئی بات کرنا ہوتی ہے تو اسے اس کے لیے ان میں سے کوئی دلیل پیش کرنا پڑتی ہے اور کوئی حوالہ دینا ہوتا ہے، بلکہ دلائل اور حوالوں کے انبار میں سے اپنے موقف کا ثبوت فراہم کرنا پڑتا ہے۔ پھر ان میں سے کسی کو ''خدا کا نمائندہ'' ہونے کی سند حاصل نہیں ہے جیسا کہ خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کسی نے ''خدا کا خلیفہ'' کہہ کر خطاب کیا تو انہوں نے اسے فوراً یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ میں خدا کا نہیں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مجھے خدا کی نمائندگی کے نام پر شخصی اتھارٹی حاصل نہیں بلکہ میں جناب رسول اللہؐ کے نمائندے کے طور پر ان کی تعلیمات و ارشادات کا پابند ہوں۔

چنانچہ ہمارے ہاں دینی تعبیرات کا نظام پاپائے روم کی طرح شخصی اور صوابدیدی نہیں بلکہ اس کی بنیاد قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے معلوم اور محفوظ ذخیرے اور دلیل و استدلال پر ہے۔ اس لیے اسے یورپ کی مسیحیت پر قیاس کرنا اور اسے مسترد کرنے کے لیے مارٹن لوتھر طرز کی تحریک کے راستے نکالنا مسئلہ کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے ایسی کسی کوشش کو اکبر بادشاہ سے لے کر اب تک مسلم معاشرہ میں پذیرائی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ پھر مارٹن لوتھر کی ایک اور مجبوری یہ بھی تھی کہ چرچ اور پاپائے روم کی اتھارٹی اور صوابدیدی اختیارات کو مسترد کرنے کے بعد اس کے پاس کوئی متبادل علمی بنیاد اور ذخیرہ موجود نہیں تھا جس کے ذریعے وہ بائبل کی تعبیر و تشریح کا کوئی ''علمی ڈھانچہ'' تشکیل دیتا۔ اسی وجہ سے اسے بائبل کی تعبیر و تشریح کے لیے ''کامن

سینس ''کو بنیاد قرار دینا پڑا اور اس کا یہ نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ مسیحیت کا فکری شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا ہے۔

''کامن سینس'' بہت اچھی چیز ہے اور بہت سے معاملات طے کرنے کے لیے اچھی بنیاد ہے۔ لیکن یہ کوئی ایک جگہ ٹھہرنے والی چیز تو نہیں ہے۔ یہ میسر معلومات و مشاہدات اور معلوم تجربات و تاثرات کی بنیاد پر سوسائٹی کی اجتماعی سوچ کے تعین اور اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جوں جوں معلومات، مشاہدات، تجربات اور تاثرات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، کامن سینس کے ذریعے قائم ہونے والی رائے بھی تبدیل ہوتی جائے گی۔ اگر انسانی معلومات و مشاہدات کو کسی ایک جگہ قرار نہیں ہے تو ان کی بنیاد پر تشکیل پانے والی رائے کو کسی ایک مقام پر کیسے روکا جا سکتا ہے؟ اس کا دائرہ زمانے کے لحاظ سے بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے اور علاقے کے حوالے سے بھی مختلف ہوتا ہے۔ ایک بات آج سے ایک سو سال قبل معیوب سمجھی جاتی تھی مگر آج وہ معیوب نہیں رہی۔ ایک بات امریکہ میں عام طور پر ناپسندیدہ نہیں سمجھی جاتی مگر پاکستان یا چین کا معاشرہ اسے پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ نہ تو ایک زمانے کی کامن سینس کو دوسرے زمانے کے لیے معیار قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایک علاقے کی کامن سینس کو دوسرے علاقے پر ٹھونسا جا سکتا ہے۔ خود مغرب میں دیکھ لیں کہ:

- نصف صدی قبل تک شادی کے بغیر مرد اور عورت کے اکٹھا رہنے کو معیوب اور بداخلاقی تصور کیا جاتا تھا، مگر اب یہ بات وہاں کے ''معروفات'' میں شامل ہے۔
- ہم جنس پرستی کو اب سے نصف صدی قبل تک بداخلاقی اور بدکاری تصور کیا جاتا تھا، مگر اب اسے حقوق میں شمار کیا جاتا ہے۔
- شراب نوشی امریکہ میں پون صدی قبل تک جرم تھی، آج جائز سمجھی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ آسمانی تعلیمات کو مسترد کر کے کامن سینس کو مذہب قرار دے لینے کا منطقی نتیجہ ہے۔ جہاں بھی یہ راستہ اختیار کیا جائے گا نتیجہ یہی ہوگا۔ پھر سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ مغرب نے کامن سینس کو حتمی معیار قرار دینے سے پہلے سوسائٹی کے ساتھ مذہب کے تعلق کو مسترد کیا تھا مگر ہمارے دانشور اس کا حوصلہ اور اخلاقی جرأت نہ

رکھتے ہوئے سوسائٹی کو اسلام کے ساتھ جوڑے رکھنے کی بات بھی کرتے ہیں اور ہر لمحہ تغیر پذیر کامن سینس کو اسلام کے ابدی اصولوں اور صریح احکام کی تعبیر و تشریح کا واحد معیار قرار دینے پر بھی اصرار کیے جا رہے ہیں۔ ان دانشوروں کی نظر اس سب سے بڑی معروضی حقیقت سے عام طور پر چوک جاتی ہے کہ قرآن کریم اور سنت نبویؐ کا ذخیرہ محفوظ حالت میں مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ یہ ذخیرہ ایک زندہ زبان میں ہے اور وہ زبان عام طور پر پڑھی جاتی ہے اور سمجھی جاتی ہے۔ کوئی بھی عام مسلمان اس ذخیرے تک براہ راست رسائی حاصل کرنا چاہے تو اسے اس کے مواقع میسر ہیں اور ہر مسلم معاشرے میں علماء کرام اور دینی مدارس کی ایک اچھی خاصی تعداد اس علمی ذخیرے تک رسائی حاصل کر کے اس سے عام مسلمانوں کو وابستہ رکھنے میں مسلسل مصروف ہے۔ اس فضا اور ماحول میں اگر کسی شخص یا حلقے کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کی کسی نئی تعبیر و تشریح سے مانوس کر سکے گا تو اس کے لیے ہم دعائے صحت کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

ہم اجتہاد کے حوالے سے عرض کر رہے تھے، اس لیے اس بحث کو اس گزارش پر سمیٹ رہے ہیں کہ "اجتہاد" ہمارے روایتی علمی نظام ہی کا ایک حصہ ہے، اسے اس سے الگ کر کے یا اس کے مقابل کھڑا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جبکہ اجتہاد کے نام پر دینی احکام پر نظر ثانی کی خواہش رکھنے والے بہت سے دوست اجتہاد کے اس شرعی مفہوم اور علمی ڈھانچے کی بجائے پوپ طرز کے صوابدیدی اختیارات یا مارٹن لوتھر کی طرح کامن سینس کو پورے دین کی تعبیر نو کی بنیاد قرار دینے کو اجتہاد کا نام دے رہے ہیں، جس کا قرآن و سنت کے اصولوں کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ اجتہاد اپنے شرعی مفہوم میں الگ چیز ہے اور کامن سینس اس سے مختلف چیز ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان مساوات

دوسرے نمبر پر ہم یہ بات کرنا چاہیں گے کہ مغرب مرد اور عورت کے درمیان جس مساوات کی بات کرتا ہے اور اس حوالے سے تمام امتیازی قوانین کو ختم کرنے کے درپے ہے، کیا وہ قابل عمل بھی ہے؟ اور کیا مغرب نے تمام تر دعوؤں کے باوجود خود وہ منزل حاصل کر لی ہے؟ فطرت نے مرد اور عورت کے درمیان امتیاز قائم کر رکھا ہے۔ یہ امتیاز ان کی جسمانی ساخت میں بھی ہے، ان کے فطری فرائض اور معاشرتی کردار میں بھی ہے، اور ان کی ذہنی و عملی صلاحیتوں میں بھی ہے۔ میں اس کی تازہ ترین مثال دوں گا:

• امریکہ کے حالیہ صدارتی انتخاب میں ڈیموکریٹک پارٹی سے امیدواری کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے باراک اوباما اور ہیلری کلنٹن میں مقابلہ تھا، اس کے ابتدائی دور میں ایک ریاستی سطح کی ووٹنگ میں ہیلری کلنٹن کو اوباما کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس خاتون کی آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے۔ اس پر امریکی حلقوں میں تبصرہ شروع ہوگیا کہ جو شخصیت اتنی سی شکست گوارا نہیں کرسکی وہ ملکی معاملات کو کیسے سنبھالے گی؟ چنانچہ عورت کے وہ آنسو جو عام طور پر عورت کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھارنے کا باعث بنتے ہیں، ہیلری کلنٹن کی شخصیت کا تاثر مجروح کرنے کا باعث بن گئے۔

• اسی الیکشن کے دوران ایک فوٹو بعض پاکستانی اخبارات میں بھی شائع ہوئی جس میں ہیلری کلنٹن، اوباما کی بیوی اور نائب صدارت کی امیدوار سارہ پالین کو دکھایا گیا اور یہ بتایا گیا کہ تینوں خواتین کا دلکش میک اپ اور دیدہ زیب لباس پورے الیکشن میں لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا رہا۔ یہ فوٹو دیکھتے ہی میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ کیا عورت امریکہ کے صدارتی الیکشن تک اپنے حسن اور دلکشی کے ”امتیاز“ کی نفی میں مساوات کا مقام حاصل کرپائی ہے؟

ان امتیازات کی کون نفی کرسکتا ہے اور عورت کو ان امتیازات سے آخر کیسے محروم کیا جا سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ جب یہ امتیازات قائم ہیں اور قائم رہیں گے اور عورت کو ان امتیازات سے کسی صورت میں محروم نہیں کیا جاسکتا تو ان امتیازات کی بنیاد پر ان کے لیے الگ احکام و قوانین کی نفی بھی نہیں کی جاسکتی۔ آپ ان امتیازات میں توازن قائم رکھنے کی بات کرسکتے ہیں، آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان امتیازی قوانین میں عورت پر بلکہ مرد پر بھی ظلم نہیں ہونا چاہیے، کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے اور ایک دوسرے کے حقوق و مفادات کا پوری طرح لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ لیکن سرے سے امتیاز اور امتیازی قوانین و احکام کی نفی کریں گے تو یہ فطرت کی نفی ہوگی، قدرت کے قوانین کی نفی ہوگی اور زمینی حقائق کی نفی ہوگی، جو غیر منطقی اور غیر فطری ہونے کے علاوہ ناقابل عمل بھی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ کی بات یہ ہے کہ چند سال قبل ایک ملک میں مردوں کی طرف سے یہ مطالبہ سامنے آیا کہ جس طرح عورت کو بچہ جننے کے موقع پر زچگی کی چھٹیاں مع تنخواہ دی جاتی ہیں اس کے خاوند کو بھی ان دنوں اسی طرح چھٹیاں دی جائیں تاکہ مرد اور

عورت کے درمیان مساوات کا تصور مجروح نہ ہو۔ خبر یہ تھی کہ اس ملک کی حکومت اس مطالبے پر غور کر رہی ہے۔ مجھ سے بعض دوستوں نے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ وہ عورت تو بے چاری بچہ جنے گی اور بچے کی پرورش کرے گی جبکہ زچگی کا یہ عمل عام طور پر ہسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ خاوند اتنے دن چھٹی لے کر کیا کرے گا؟ ایک صاحب فرمانے لگے کہ کچھ کرے یا نہ کرے مرد اور عورت کے درمیان مساوات تو قائم ہو جائے گی۔

فطرت کے خلاف یہ ”مصنوعی مساوات“ قائم کرنے میں خود مغرب کو بھی کامیابی حاصل نہیں ہو رہی۔ مغربی دنیا میں شائع ہونے والے اعداد و شمار ملاحظہ کر لیجئے جو گواہی دے رہے ہیں:

- یہ مساوات مردوں اور عورتوں کے درمیان ملازمتوں کی تقسیم میں بھی نہیں ہے۔
- تنخواہوں اور مراعات کے معیار میں بھی نہیں ہے۔
- سیاسی قیادت اور اعلی مناصب میں بھی نہیں ہے۔
- اور عام معاشرتی رویوں میں بھی نہیں ہے۔

جب یہ بات عملاً ممکن نہیں تو اس سراب کے پیچھے بھاگے چلے جانے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ:

- مرد اور عورت کے درمیان فطری امتیاز کو تسلیم کر لیا جائے۔
- اس فطری امتیاز کو ان کے درمیان حقوق و فرائض کی بنیاد قرار دے کر دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں واپس لایا جائے۔
- اور باہمی حقوق و فرائض کے نظام کو اس طرح استوار کیا جائے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو اور ہر ایک اپنے فطری فرائض مکمل حوصلے اور اعتماد کے ساتھ سرانجام دے سکے۔

ہمیں عورت کے ساتھ انسانی معاشرے میں ہونے والی زیادتیوں سے انکار نہیں ہے، یہ زیادتیاں ہر جگہ ہو رہی ہیں۔ بعض حوالوں سے مغرب کی عورت زیادہ مظلوم ہے جبکہ بعض حوالوں سے مشرق اور مسلم دنیا کی عورت زیادہ مظلوم نظر آتی ہے۔ ان زیادتیوں کا مذہب اور اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، یہ معاشرتی رویے ہیں جو ظلم اور زیادتی کا

عنوان بن جاتے ہیں۔ ان کا علاج اور حل مرد اور عورت کے درمیان امتیاز کی نفی کرتے ہوئے مساوات کا مصنوعی ماحول پیدا کرنا نہیں بلکہ فطرت کے قائم کردہ امتیاز اور تقسیم کار کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے دائرے میں توازن و اعتدال قائم کرنا اور معاشرتی اصلاح کے لیے محنت کرنا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی حدود کار

اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں اس حوالے سے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ ایک دستوری ادارہ ہے اور اسے دستور کے اندر ہی رہنا چاہیے۔ دستور نے قرآن و سنت کو قانون سازی کا ماخذ قرار دیا ہے اور اس کا ایک طویل پس منظر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بعض دانشوروں نے قرآن کریم کو اسلامی قانون سازی کا واحد ماخذ قرار دیتے ہوئے سنت رسولؐ کو اس کے دائرے سے خارج کرنے کی کوشش کی جو سالہا سال تک علمی مباحث اور فکری معرکوں کی صورت میں جاری رہی۔ پاکستان کی رائے عامہ نے اس میں واضح فیصلہ صادر کیا کہ قرآن کریم کی طرح سنت رسولؐ بھی اسلامی قانون سازی کا مستقل ماخذ ہے۔ چنانچہ دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ فیصلہ کر کے اس قضیہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ دستور کی نمائندگی کرنے والے اداروں کو اس کا ہر حالت میں لحاظ رکھنا ہوگا ورنہ وہ دستوری تقاضوں سے انحراف کے مرتکب ہوں گے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ”سنت“ سے مراد کوئی نیا اور خودساختہ مفہوم نہیں بلکہ وہ ہے جسے امت مسلمہ مجموعی طور پر سنت سمجھتی آرہی ہے اور اب بھی اس کے نزدیک سنت کا مفہوم وہی ہے۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ سنت رسولؐ کو قانون سازی سے الگ سمجھنے والے دانشوروں کا پرنالہ پاکستانی رائے عامہ کے اس فیصلے اور دستور پاکستان کی اس واضح بنیاد کے باوجود اسی جگہ بہہ رہا ہے اور انہوں نے پاکستانی پولیس کی طرح ”نگ“ پورا کرنے کے لیے سنت کا ایک خودساختہ مفہوم متعیّن کر کے اسے ”قرآن و سنت“ کی اصطلاح کے ساتھ نتھی کر دیا ہے جو فریب کاری کی انتہا ہے۔ یہ دانشور اسلامی نظریاتی کونسل میں بیٹھ کر سنت کا خودساختہ مفہوم امت پر مسلط کرتے ہوئے اس معروضی حقیقت سے آنکھ بند کیے ہوئے ہیں کہ پاکستان کے وہ عوام جن کے اکثریتی فیصلے اور رجحان کے باعث دستور میں سنت رسولؐ کو قرآن کریم کے ساتھ قانون سازی کا مستقل ماخذ قرار دیا گیا ہے، وہ عوام سنت رسولؐ کے ساتھ صرف عقیدت اور کمٹمنٹ ہی نہیں رکھتے بلکہ سنت کا ایک واضح اور غیر مبہم مفہوم بھی اپنے ذہن

میں رکھتے ہیں۔ وہ سنت کو اسی مفہوم کے ساتھ ملک میں قانون سازی کا ماخذ تسلم کرتے ہیں۔ گنتی کے چند دانشور اگر عوام کے اکثریتی رجحانات کے خلاف سنت کا کوئی الگ مفہوم اپنے ذہن میں رکھتے ہیں تو انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کا دستوری فورم استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل دستوری ادارہ ہے اور دستور پاکستان کے عوام کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس فورم میں بیٹھ کر پاکستان کے عوام کی اکثریت کے رجحانات کی نفی کرنا قانونا اور اخلاقا کسی بھی حوالے سے درست نہیں ہے۔ وہ اپنی فکر کو عام کرنا چاہتے ہیں تو اس ادارے کو چھوڑیں اور عوام میں آئیں، انہیں اپنی دانش کے حدود واربعہ کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔

جہاں تک پاکستان کے معروضی حالات اور زمینی حقائق کا تعلق ہے ہم سطور بالا میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ وہ یورپ کے مسیحیوں کی طرح اپنے مذہب کے ساتھ صرف رسمی تعلق نہیں رکھتے بلکہ شعوری طور پر اپنے مذہب سے وابستہ ہیں۔ یہ وابستگی صرف عقیدہ وایمان کی حد تک نہیں بلکہ دین کی چودہ سو سالہ اجتماعی تعبیر وتشریح کے ساتھ ان کی وابستگی اور کمٹمنٹ بھی ایمان وعقیدے ہی کے درجہ کی ہے۔ وہ قرآن وسنت اور صحابہ کرامؓ کو دین کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں، اسی وجہ سے ان کی غالب اکثریت اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتی ہے۔ یہ صرف رسمی ٹائٹل نہیں ہے بلکہ ان کے عقیدے وایمان اور وابستگی کا شعوری اظہار ہے۔ ان کے اس اجتماعی رجحان اور وابستگی کو نہ چیلنج کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی انہیں اس سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اکبر بادشاہ سے بڑا کوئی حکمران اور سرسید احمد خان سے بڑا دانشور اب نہیں آسکتا۔ جب ان دو عظیم اور عبقری شخصیتوں کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو کسی اور کو بھی یہ خواب نہیں دیکھنا چاہیے۔

پاکستانی عوام کا یہ جائز حق ہے کہ ان کے عقیدہ، وابستگی اور اجتماعی رجحانات کا احترام کیا جائے اور جس کام کے لیے انہیں گزشتہ چار صدیوں میں تیار نہیں کیا جا سکا اس میں مزید وقت اور صلاحیتیں ضائع نہ کی جائیں۔ پاکستان کے علماء نے قیام پاکستان کے بعد جب اور جہاں ضرورت پڑی اجتہاد سے کام لیا ہے۔ لیکن یہ اجتہاد علمی روایت کے ساتھ چلنے والا شرعی اجتہاد ہے، اسے مسترد کر کے اس کے متوازی دین کی تشکیل کے تصور پر مبنی نہیں ہے۔ اجتہاد اور تشکیل نو میں واضح فرق ہے، اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اجتہاد کے مسلمہ اصولوں اور طے شدہ دائروں میں جو بات بھی کی جائے گی ہم اس کا خیر مقدم کریں گے اور

ہمیشہ کرتے آرہے ہیں۔ لیکن امت کے اجتماعی تعامل اور چودہ سو سالہ علمی روایت کو مسترد کر کے نیا دین کھڑا کرنے کی بات نہ پہلے قبول ہوئی ہے نہ اب ہوگی۔

نکاح و طلاق کا مسئلہ

ان گزارشات کے بعد ہم نکاح و طلاق کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں اور اس سلسلہ میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مغرب کے خاندانی نظام کی بنیاد دو باتوں پر ہے:

1. ایک یہ کہ مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات ہے۔

2. اور دوسری یہ کہ نکاح محض سوشل کنٹریکٹ ہے اس لیے اسے صرف سوشل کنٹریکٹ کے طور پر ہی ڈیل کرنا چاہیے۔

اسلام ان دونوں باتوں کو قبول نہیں کرتا۔ مرد اور عورت میں مکمل مساوات کے حوالے سے ہم تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔ اور سول کنٹریکٹ کے بارے میں گزارش ہے کہ اسلام نکاح اور شادی کو صرف سوشل کنٹریکٹ نہیں سمجھتا بلکہ ایک مذہبی فریضہ گردانتا ہے، اسے سنت نبویؐ اور سنت المرسلینؑ قرار دیتا ہے، اسے خاندانی نظام کے استحکام کا ذریعہ اور اجر و ثواب کا باعث بھی سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کے حدود کار کو صرف دو فریقوں کی صوابدید پر چھوڑ دینے کی بجائے قرآن و سنت کے احکام کے ذریعے ان کا تعین کیا گیا ہے اور میاں بیوی کو اس کا پابند بنایا گیا ہے۔ قرآن کریم صاف طور پر کہتا ہے کہ:

- مرد اور عورت کا جنسی تعلق صرف خواہش کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ خاندان کی بنیاد کے طور پر جائز بلکہ ضروری ہے۔
- یہ تعلق خفیہ اور صرف دو طرفہ دوستی کی بنیاد پر نہیں بلکہ کھلے بندوں ہوگا اور ریکارڈ پر ہوگا۔
- یہ تعلق خاوند کی طرف سے مالیاتی ذمہ داریاں قبول کرنے کی صورت میں ہوگا۔
- یہ تعلق جو فریق جب چاہے چھوڑ دے کی بنیاد پر نہیں بلکہ زندگی بھر کے لیے دائمی ہوتا ہے۔ کیونکہ طلاق کو صرف مجبوری کے درجے میں روا رکھا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاوجہ طلاق پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ''ابغض المباحات'' (مبغوض ترین) قرار دیا ہے۔

- ”بیدہ عقدۃ النکاح“ کی واضح نص قرآنی کی صورت میں نکاح کو قائم رکھنے یا توڑنے کی فائنل اتھارٹی صرف اور صرف مرد کو قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ دو ہاتھوں میں برابر کے اختیارات کی صورت میں خاندان کا نظام کسی صورت میں قائم نہیں رہ سکتا۔ کسی بھی ادارے میں دو ہاتھوں میں یکساں اختیارات ہمیشہ اس ادارے کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ خاندان بھی ایک ادارہ ہے اور اس کا نظام صحیح طور پر چلانے کے لیے فائنل اتھارٹی صرف ایک ہاتھ میں ہونا ضروری ہے۔ مغرب نے مرد اور عورت کو یکساں طور پر طلاق کا اختیار دے کر اس کا نتیجہ خاندانی نظام کی تباہی اور اخلاقی انارکی کی صورت میں دیکھ اور بھگت لیا ہے۔ لہذا دنیا میں کسی جگہ بھی کوئی مسلم معاشرہ اس صورتحال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اسلام میں عورت کو طلاق کے حق سے یکسر محروم نہیں کیا گیا بلکہ خلع کی صورت میں مطالبۂ طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ خلع طلاق کا حق نہیں بلکہ مطالبۂ طلاق کا حق ہے اور اس کا پورا کرنا صرف خاوند کی صوابدید پر نہیں ہے بلکہ خاندان کی پنچایت اور عدالت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر عورت خاوند کی زیادتی ثابت کر دے تو عدالت خاوند کی مرضی کے بغیر تفریق کا حکم صادر کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر عدالتی نظام اور معاشرتی ماحول کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ بے چاری عورت کہاں عدالتوں کے دھکے کھاتی پھرے گی؟ جبکہ یہ صورتحال صرف عورتوں کے حوالے سے نہیں بلکہ عدالتی نظام کی یہ کمزوریاں اور معاشرتی خرابیاں ملک کے ہر قانون کے حوالے سے موجود ہیں۔ اگر کسی بے چارے کے دھکے کھانے کو قانون میں تبدیلی کی وجہ کے طور پر قبول کر لیا جائے تو ملک کا کوئی قانون تبدیلی سے محفوظ نہ رہے۔ عدالتی نظام کی کمزوریوں اور معاشرتی خرابیوں کا علاج قانون کا حلیہ بگاڑنا نہیں بلکہ کمزوریوں اور خرابیوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔

سوسائٹی کی منہ زور خواہشات کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کو اسلام قبول نہیں کرتا اور قرآن و سنت کی نصوص صریحہ کے مقابلے میں سوسائٹی کی خواہشات کی پیروی کو گمراہی قرار دیتا ہے۔ جبکہ مغرب نے سوسائٹی کی سوچ اور خواہشات کو ہی حق و باطل کا واحد معیار قرار دے رکھا ہے جس کے نتیجے میں شراب، زنا اور ہم جنس پرستی جیسی واضح خرابیوں کو صرف اس لیے قبول کر لیا گیا ہے کہ سوسائٹی کی اجتماعی سوچ اور خواہش یہی ہے۔ اب مغربی ملکوں

میں ہیروئن جیسے نشوں کے بارے میں یہ مطالبات شروع ہو گئے ہیں کہ چونکہ سوسائٹی اسے ترک کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے اس کا قانونی جواز فراہم کرنے کے راستے تلاش کیے جائیں۔ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ نکاح مغربی معاشرے میں غیر ضروری ہوتا جارہا ہے، شادی کے بغیر اکٹھے رہنے کا رجحان دن بدن بڑھتا جارہا ہے، جبکہ سنگل پیرنٹ (single parent) کے قانون نے نسب اور خاندان کے رہے سہے تصور اور باہمی رشتوں کے تقدس کو، جسے اسلام نے صلہ رحمی کے عنوان سے عبادت کا درجہ دے رکھا ہے، پامال کر کے رکھ دیا ہے۔

ان ساری خرابیوں کی واحد وجہ خاندانی نظام کے بارے میں یہ تصور ہے کہ یہ محض سوشل کنٹریکٹ ہے اور مرد اور عورت کو ہر معاملے میں مساوی حقوق حاصل ہیں۔ جبکہ اس تصور کی وکالت کرنے والے دوست، غیر شعوری طور پر سہی، وہی ماحول مسلم معاشرے میں قائم کرنے کے درپے ہیں۔ اس لیے کہ ایک عمل نے جو نتائج مغربی معاشرے میں پیدا کیے ہیں اس کے منطقی نتائج سے مسلم معاشرہ کو آخر کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟ لطف کی بات یہ ہے کہ خاندانی نظام کے تحفظ کی بات اقوام متحدہ کا چارٹر بھی کرتا ہے اور خاندان کو ہی معاشرے کی بنیادی اکائی قرار دیتا ہے، لیکن اس نے خاندانی نظام کے لیے جو بنیادیں فراہم کی ہیں وہ نظم اور اجتماعیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بجائے فردیت (individualism) کو اس کے مقابلہ میں فروغ دیتی ہیں۔ اسلام کے نظام اور مغرب کے فلسفہ میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ اسلام اجتماعیت کی بات کرتا ہے اور اس اجتماعیت کے تحفظ کے لیے، خواہ وہ خاندان کی سطح پر ہو یا سوسائٹی کی سطح پر ہو، فرد پر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فرد پابندیاں قبول نہیں کرے گا اور ہر جگہ فردیت کو بالاتر رکھنے کی کوشش کی جائے گی تو اجتماعیت کسی سطح پر بھی قائم نہیں ہو سکے گی اور نظم و ڈسپلن کہیں وجود میں نہیں آپائے گا۔

خاندانی نظام اپنے وجود اور استحکام دونوں کے لیے فرد پر پابندیوں کو ضروری قرار دیتا ہے اور باہمی رشتوں کا تقدس اور احترام بھی انہی پابندیوں کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اگر فرد اپنی خواہشات پر قدغنیں قبول نہیں کرے گا اور ناگزیر پابندیوں کو آزادی کے حق کے منافی سمجھنے لگے گا تو نہ خاندان وجود میں آسکتا ہے اور نہ ہی رشتوں کا وہ تقدس اور احترام قائم رہ سکتا ہے جسے اسلام نے صلہ رحمی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس لیے اگر ہم نے خاندانی نظام اور

رشتوں کے تقدس کو قائم رکھنا ہے تو وہ ساری پابندیاں اور ترجیحات قبول کرنا ہوں گی جو قرآن و سنت نے بیان کی ہیں۔ اگر خدانخواستہ اس سے دستبردار ہو کر مغربی معاشرے کے مقام تک جانے کا تہیہ کر لیا گیا ہے تو پھر جو چاہے کریں۔ لیکن ہمارے دانشور خاطر جمع رکھیں کہ پاکستان کے عوام نے اسے پہلے کبھی قبول کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی انہیں اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے (ان شاء اللہ تعالیٰ)۔

حضرت ابراہیمؑ اور مذاہب عالم

(نور علیٰ نور اکیڈمی، فیصل آباد - ۴ دسمبر ۲۰۰۸ء)

(''سیدنا حضرت ابراہیمؑ کا پیغام توحید اور مذاہب عالم'' کے عنوان سے منعقدہ سیمینار سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیغام توحید پر ہمارے فاضل دوستوں نے مختلف حوالوں سے گفتگو کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا سب سے بڑا پیغام توحید کا تھا اس لیے وہی اہل مذاہب و اقوام ابراہیمی ہونے کے دعوی کا حق رکھتے ہیں جو توحید کے علمبردار ہیں، چنانچہ آج کی دنیا میں یہ اعزاز صرف مسلمانوں کو حاصل ہے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ حضرت ابراہیمؑ کا بنیادی پیغام توحید ہی ہے لیکن ان کا یہ امتیاز بھی ہے کہ ان کی توحید صرف فکری اور قولی نہیں بلکہ عملی اور فعلی بھی تھی۔ اس لیے کہ انہوں نے بت پرستی کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ کھلم کھلا پوری قوم کو بت پرستی ترک کر کے ایک اللہ کی بندگی کرنے کی تلقین کی اور بت پرستی کے خلاف عملی کاروائی بھی کی۔ اور جہاں حضرت ابراہیمؑ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ تمام آسمانی مذاہب ان کی طرف اپنی نسبت کرنے پر فخر کرتے ہیں وہاں یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات گرامی اور شخصیت کو اسلام کا راستہ روکنے کے لیے بطور شیلٹر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ چودہ سو سال قبل بھی ایسا ہوا تھا اور آج بھی عالمی سطح پر یہ کام ہو رہا ہے۔

جب جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اور شرک و بت پرستی سے توبہ کر کے ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف واپس آنے کا پیغام دیا تو نہ صرف مشرکین عرب نے حضرت ابراہیمؑ کی آڑ میں اپنے شرک اور رسوم و رواج کا تحفظ

کرنا چاہا بلکہ اہل کتاب کے دونوں گروہوں یہود و نصاریٰ نے بھی اپنے حق پر ہونے کے لیے ابراہیمی ہونے کا حوالہ دیا۔ لیکن قرآن کریم نے واضح طور پر اعلان کیا کہ

ماکان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما وما کان من المشرکین ()
ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین امنوا واللہ ولی المؤمنین ()
(سورہ آل عمران ۳۔ آیت ۶۷ و ۶۸)

"ابراھیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی لیکن سیدھے راستے والے مسلمان تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ لوگوں میں سب سے زیادہ قریب ابراھیم کے وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کی تابعداری کی، اور یہ نبی اور جو اس نبی پر ایمان لائے، اور اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔"

ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے، نہ نصرانی تھے، اور نہ ہی بت پرست اور مشرک تھے بلکہ وہ توحید کے علمبردار تھے، اس لیے ان کی نسبت کے صحیح حقدار وہی ہیں جو عقیدۂ توحید میں ان کے پیروکار ہیں۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ اور ان کے متبعین ہی اس کا صحیح مصداق ہیں۔ اسی طرح آج کی دنیا میں جب عالمی دانشور یہ دیکھ رہے ہیں کہ سوسائٹی کو وحی اور آسمانی تعلیمات کی راہنمائی سے الگ کرنے کے منفی اور تلخ نتائج سامنے آرہے جن سے نجات کے لیے آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی ضروری ہوتی جارہی ہے، اور انہیں یہ بات نظر آرہی ہے کہ انسانی سوسائٹی جب آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کرے گی تو آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کا مستند ذخیرہ صرف مسلمانوں کے پاس ملے گا، چنانچہ وہ مستقبل میں اسلام کا راستہ روکنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے نام کو سامنے لا رہے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف نسبت کا اظہار کرنے والے سارے مذاہب برحق ہیں، ان میں سے کسی کو دوسرے کی نفی نہیں کرنی چاہیے اور سب کو مل جل کر رواداری اور مفاہمت و یگانگت کے ساتھ انسانی سوسائٹی کی راہنمائی کرنی چاہیے۔

اس پس منظر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو پیغامات کا ذکر کرنا چاہوں گا، ایک اہل کفر کے لیے ہے جبکہ دوسرا اہل ایمان کے لیے ہے۔ اور ان دونوں پیغامات میں حضرت ابراہیمؑ نے خود ان طبقوں کو مخاطب کیا ہے۔ اہل کفر کے نام حضرت ابراہیمؑ کا پیغام قرآن کریم میں جبکہ اہل ایمان یعنی مسلمانوں کے نام پیغام حدیث نبویؐ میں ہے کہ وہ جناب رسول اللہؐ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے۔

سورہ الممتحنہ کی آیت نمبر ۴ میں اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں سے کہا ہے کہ

قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ اذ قالوا لقومھم انا برآء منکم ومما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضآء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ۔

(سورہ الممتحنہ ۶۰۔ آیت ۴)

”بے شک تمہارے لیے ابراہیم میں اچھا نمونہ ہے اوران لوگوں میں جو اس کے ہمراہ تھے، جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا بے شک ہم تم سے بیزار ہیں اور ان سے جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ہم نے تمہارا انکار کر دیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان دشمنی اور بیر ہمیشہ کے لیے ظاہر ہو گیا یہاں تک کہ تم ایک اللہ پر ایمان لاؤ۔“

یعنی تمہارے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کا یہ طرز عمل بطور خاص اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے جب انہوں نے اہل کفر سے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ ہم تم سے اور تمہارے معبودوں سے برأت کا اعلان کرتے ہیں اور تمہاری بات قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، بلکہ ہمارے اور تمہارے درمیان کھلی دشمنی اور عداوت ظاہر ہو چکی ہے جو اس وقت تک ہمیشہ قائم رہے گی جب تک تم اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں لے آتے۔

گویا حضرت ابراہیمؑ نے دوٹوک یہ کہہ دیا کہ اہل توحید اور اہل شرک کے درمیان یگانگت اور مفاہمت کا رشتہ نہیں بلکہ عداوت اور بغضاء کا تعلق ہے۔ اور جب تک وہ کفر و شرک کو ترک کر کے توحید و ایمان کا راستہ اختیار نہیں کرتے تب تک یہ دشمنی دوستی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں حضرت ابراہیمؑ کے نام پر توحید اور شرک کے عقائد کو گڈمڈ کرنے اور حق اور باطل کے درمیان امتیاز کو ختم کرنے کی جو تحریک عالمی سطح پر جاری ہے اس میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ پیغام بالکل واضح ہے جسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔

جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ جب نجران کے مسیحیوں کا مکالمہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ دوٹوک موقف دے دیا کہ

قل یآھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سوآء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔ (سورہ آل عمران ۳۔ آیت ۶۴)

”کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! ایک بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے

درمیان برابر ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور سوائے اللہ کے کوئی کسی کو رب نہ بنائے، پس اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو فرمانبردار ہونے والے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کی توحید اور انسان پر انسان کی خدائی یعنی حکمرانی کی نفی کو قرآن کریم نے آسمانی مذاہب کے درمیان قدر مشترک قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دو باتوں پر سمجھوتہ نہیں ہوسکتا اور ان دونوں اصولوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ہی کسی مزید مکالمہ کی بات ہوسکتی ہے۔

یہ پیغام تو وہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اہل کفر کو دیا، جبکہ ہم مسلمانوں کے نام ان کا پیغام ترمذی شریف کے باب فضیلت ذکر میں آنحضرتؐ کے سفر معراج کی تفصیلات میں بیان ہوا ہے۔ جنت میں جب حضورؐ کی حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ

یا محمد اقرا امتک منی السلام واخبرھم ان الجنۃ طیبۃ التربۃ عذبۃ الماء وانھا قیعان وان غراسھا سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔

”اے محمد! آپ میری طرف سے اپنی امت کو سلام کہنا اور ان بتانا کہ جنت کی زمین بہت پاکیزہ ہے عمدہ پانی والی ہے اور ہموار میدان ہے اور اس کی شجرکاری سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہنے سے ہوتی ہے۔“

یعنی حضرت ابراہیمؑ فرما رہے ہیں کہ جنت کی زمین عمدہ ہے اور پانی بہت میٹھا ہے لیکن یہ چٹیل میدان ہے۔ دنیا میں تم جس قدر اللہ کا ذکر کرو گے اور تحمید و تسبیح کرو گے اتنا ہی جنت میں تمہارے حصے کی زمین سرسبز و شاداب ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت میں خالی پلاٹ الاٹ ہوجاتے ہیں جنہیں مسلمانوں نے دنیا میں رہ کر تعمیر کرنا ہے اور اس کا طریقہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ یہ تعمیر اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر سے ہوگی۔

گویا اہل کفر کے لیے ابراہیم علیہ السلام کا پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف واپس آؤ اور شرک و بت پرستی کو ترک کردو۔ جبکہ اہل ایمان کے لیے پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے ایمان و عقیدہ کو مضبوط بناؤ اور جس قدر ہوسکے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو۔ یہ ماضی کی طرح نہ صرف آج کی دنیا کے لیے بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

قبلِ اسلام اور ظہورِ اسلام کے بعد ادائیگی حج میں فرق

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲ دسمبر ۲۰۰۸ء)

حج کا مہینہ شروع ہو چکا ہے اور لاکھوں خوش نصیب مسلمان دنیا کے کونے کونے سے اس مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب پہنچ چکے ہیں۔ حرم کعبہ کی فضائیں ”لبیک اللھم لبیک“ کی صداؤں سے گونج رہی ہیں اور حرم مدینہ میں لاکھوں مسلمان شب و روز اطمینان اور سکون کے ساتھ روضۂ اطہر کی مقدس جالیوں کے سامنے باادب کھڑے ہو کر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نذرانۂ درود و سلام پیش کر رہے ہیں۔

حج اسلام کے بنیادی ارکان و فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ادا ہوتا تھا، بلکہ جب سے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ تعمیر کیا ہے تب سے حج کا فریضہ اب تک مسلسل ادا ہو رہا ہے اور منیٰ میں حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یاد بھی ہر سال تازہ کی جا رہی ہے۔ اسلام نے اس فریضہ اور قربانی دونوں کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اسے اور زیادہ تقدس و حرمت سے نوازا ہے۔ البتہ جاہلیت کے دور کے حج کے معمولات میں اسلام نے کچھ اہم تبدیلیاں کی ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم ان اصلاحات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ نے حج کے نظام اور معمولات میں نافذ کیں۔ ان اصلاحات کے بعد گزشتہ چودہ سو برس سے یہ فریضہ ایک خالص اسلامی عبادت کے طور پر ادا ہوتا چلا آ رہا ہے۔

- حضور نبی اکرمؐ سے پہلے ہر عقیدہ اور مذہب کے لوگ حج کے لیے آتے تھے۔ مشرک و مؤحد اور کافر و مسلمان اکٹھے حج کیا کرتے تھے لیکن اسلام نے اسے صرف اور صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دیا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد ۹ ہجری کو آنحضرتؐ خود حج پر تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امارت میں مسلمانوں کو حج کے لیے بھجوایا تھا۔ البتہ اس موقع پر حرم مکہ میں اہتمام کے ساتھ یہ اعلان کرا دیا کہ اگلے سال سے کوئی کافر اور مشرک حج کے لیے بیت اللہ میں نہیں آ سکے گا۔ چنانچہ ۱۰ ہجری میں جناب نبی اکرمؐ نے

جب خود حج کی امارت وقیادت فرمائی تو اس موقع پر صرف مسلمان ہی ان کے ساتھ تھے، کسی کافر و مشرک کو حج میں شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

• جاہلیت کے دور میں حج کرنے والوں میں سے بیشتر افراد بیت اللہ کا طواف برہنہ حالت میں کرتے تھے۔ عورتیں ایک معمولی سی لنگوٹی باندھتی تھیں جبکہ مرد بالکل برہنہ ہوتے تھے۔ ان میں سے کسی کو قریش مکہ (بیت اللہ کے مجاورین) میں سے کوئی لباس دے دیتا تو وہ پہن لیتا تھا ورنہ بے لباس ہو کر طواف کرنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اور ان کی دلیل وہی ہوتی تھی جو آج کل مغرب کے نیچرل کلبوں میں جانے والے پیش کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں چونکہ برہنہ آئے ہیں اس لیے ہماری نیچرل کیفیت وہی ہے اور ہم اسی کیفیت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا پسند کرتے ہیں۔ لیکن جناب رسول اکرمؐ نے اس پر پابندی لگا دی۔ چنانچہ جہاں کافروں اور مشرکوں کو حج بیت اللہ کے لیے حرم کعبہ میں آنے سے روک دیا وہاں یہ بھی اعلان کرا دیا کہ آج کے بعد کوئی بھی برہنہ شخص بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکے گا۔

• جاہلیت کے دور میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ حج کا احرام باندھ کر منیٰ جانے والوں میں سے کسی شخص کو اگر کسی ضرورت کے لیے مکہ مکرمہ میں اپنے گھر آنا پڑتا تو وہ گھر کے عام دروازے سے داخل نہیں ہوتا تھا بلکہ پشت کی جانب سے چھت کے ذریعے گھر میں آتا، یا دیوار میں نقب لگا کر راستہ بناتا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ حج مکمل ہونے سے پہلے گھر کے دروازے سے واپس آنے کی صورت میں شاید حج ناقص رہ جاتا ہے اس لیے انہوں نے یہ حیلہ اختیار کیا تھا۔ مگر قرآن کریم نے اس سے منع فرما دیا اور کہا کہ احرام کی حالت میں اگر کسی ضرورت سے گھر واپس آنا پڑے تو عام دروازے سے ہی گھر میں داخل ہوں، اس سے حج پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

• جاہلیت کے دور میں ایک رسم یہ تھی کہ باہر سے آنے والے حاجی حضرات تو عرفات کے وقوف کے لیے عرفات میں ہی جاتے تھے لیکن قریشی حضرات حرم کی حدود سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم ''حمس'' ہیں اس لیے ہم عرفات نہیں جائیں گے۔ حمس کا لفظی ترجمہ بہادر ہے لیکن اگر

اس کا ترجمہ ''وی آئی پی'' کر لیا جائے تو زیادہ بہتر طور پر اس کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے کہ ہم چونکہ وی آئی پی ہیں اس لیے ہم پر عرفات تک جانا ضروری نہیں ہے۔ لیکن اسلام نے اس رسم کو توڑ دیا اور حضور نبی اکرمؐ نے خود عرفات میں وقوف کیا۔ جبکہ قرآن کریم میں قریشیوں کو ہدایت کی گئی کہ حج کے وقوف کے لیے جہاں دوسرے لوگ جاتے ہیں تم بھی وہاں جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کوئی وی آئی پی سسٹم نہیں ہے۔

• جاہلیت کے دور میں حج کے ایام میں عمرہ ادا نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی اسے پسند کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ حج کے دنوں میں صرف حج کیا جائے، عمرہ کے لیے باقی سارا سال پڑا ہے۔ لیکن جناب رسول اللہؐ نے یہ رسم توڑ دی اور حجۃ الوداع میں اپنے ساتھ آنے والے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ عمرہ ادا کر کے احرام کھول دیں اور آٹھ ذی الحجہ کو حج کے لیے نیا احرام باندھیں۔ بہت سے لوگوں کو اس پر تعجب ہوا لیکن آپؐ نے حج کے ایام میں لوگوں سے عمرہ کرایا۔ اس پر ایک صحابی حضرت سراقہ بن مالکؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ سہولت صرف اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ سہولت ہمیشہ کے لیے ہے کہ حج کے لیے آؤ تو عمرہ بھی کر لو تاکہ ایک ہی سفر میں دونوں سعادتیں حاصل ہو جائیں۔

• جاہلیت کے دور میں حج کے دوران ایک اور بات بھی ہوتی تھی کہ صفا و مروہ کی سعی سارے حاجی نہیں کرتے تھے، اسے صرف قریش کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ قریش اور ان کے حلیف قبائل بیت اللہ کے طواف کے بعد صفا و مروہ کی سعی کرتے تھے۔ جبکہ دوسرے قبائل جن میں انصار مدینہ کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج بھی شامل ہیں، طواف کعبہ کے بعد اپنے اپنے بت خانوں کا رخ کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ صفا و مروہ کی سعی صرف قریش کے لیے ہے اس لیے کہ جس خاتون (حضرت ہاجرہؓ) کی سنت کے طور پر یہ سعی کی جاتی ہے وہ قریش کی ماں تھی۔ لیکن آنحضرتؐ نے فتح مکہ کے بعد تمام بت خانے ختم کرا دیے اور پورے جزیرۂ عرب میں کوئی بت خانہ باقی نہ رہنے دیا تو انصار مدینہ کو بطور خاص یہ الجھن پیش آئی کہ وہ طواف کعبہ کے بعد کیا کریں

گے ؟ اس پر قرآن کریم میں حکم نازل ہوا کہ صفا و مروہ بھی بیت اللہ کی طرح شعائر اللہ میں سے ہیں، اس لیے جو لوگ حج یا عمرہ کے لیے آئیں وہ بیت اللہ کے طواف کے ساتھ صفا و مروہ کی سعی بھی کریں۔ اس طرح حج یا عمرہ کے لیے آنے والے تمام حضرات کے لیے صفا و مروہ کی سعی کو ضروری قرار دیا گیا۔

• سب سے بڑی تبدیلی یہ کی گئی کہ بیت اللہ اور اس کے اردگرد کے ماحول میں مشرکین عرب نے سینکڑوں بت نصب کر کے اسے بت خانہ بنا رکھا تھا جہاں اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ساتھ ساتھ ان بتوں کی پوجا پاٹ بھی ہوتی تھی۔ جناب رسول اللہؐ نے بیت اللہ اور مسجد حرام کو ان بتوں سے پاک کر کے اس ماحول کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے خاص کر دیا کہ اب یہاں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوگی، اس کے علاوہ کسی اور کو یہاں نہیں پکارا جائے گا۔

یہ وہ چند تبدیلیاں اور اصلاحات ہیں جو حج کے پہلے سے چلے آنے والے نظام میں حضور نبی کریمؐ نے نافذ فرمائیں۔ انہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس مقدس فریضہ سے اسلام کا مقصود کیا ہے اور وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس مرکز میں ہر سال جمع کر کے انہیں کیا سبق دینا چاہتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی!

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جمعۃ المبارک کا خطبہ دیتے ہوئے مجھے بحمد اللہ تعالیٰ چالیس برس مکمل ہو گئے ہیں۔ گزشتہ چند ماہ سے قرآن کریم کی وہ آیات مبارکہ خطبات جمعہ کا موضوع ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو“ کے عنوان کے ساتھ اہل ایمان کو بطور خاص مخاطب کیا ہے۔ ماہ رواں کے دو جمعۃ المبارک کے خطبوں میں سورۃ المائدہ کی آیت ۵۱ و ۵۲ پر گفتگو ہوئی جن میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ

> ”یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور اگر تم میں سے کسی نے ان سے دوستی کی تو اس کا شمار انہی کے ساتھ ہوگا۔“

آج کے عالمی وملکی حالات کے تناظر میں اس گفتگو کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان آیات کریمہ میں اصولی طور پر جو باتیں بیان ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

• مسلمانوں کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست بنائیں یا انہیں اپنا دوست سمجھیں۔ دوست نہ بنانے کا مطلب یہ نہیں کہ ان سے کسی قسم کے تعلقات یا معاملات نہ ہوں۔ کیونکہ ایک جائز اور باوقار حد کے اندر ان کے ساتھ تعلقات و معاملات کا قرآن کریم نے خود حکم دیا ہے اور وہ قوموں کی برادری میں باعزت طور پر رہنے کے لیے ضروری بھی ہیں۔ البتہ انہیں اپنا حقیقی دوست سمجھنے، انہیں راز دار بنانے اور ان کی دوستی پر اعتماد کرنے سے منع کیا گیا ہے اور چودہ سوسالہ تاریخ نے یہ بات ثابت کی ہے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد حرف بہ حرف سچ ہے۔

• یہ کہا گیا ہے کہ ”یہودی اور عیسائی آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں“۔ قرآن کریم کا یہ جملہ دنیا کے علمی حلقوں میں گزشتہ ایک صدی پہلے تک زیر بحث رہا ہے کہ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں کو ایک دوسرے کا دوست کہا ہے حالانکہ دونوں کے درمیان ابتداء سے دشمنی چلی آرہی ہے اور ان کی باہمی دشمنی، عداوت اور قتل و قتال کا سلسلہ کم و بیش دو ہزار سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ تو قرآن کریم نے انہیں ایک دوسرے کا دوست کیسے قرار دے دیا ہے؟ لیکن اس آیت کریمہ کے نزول کے تیرہ سوسال بعد یہودیوں اور عیسائیوں میں باہمی دوستی اور تعاون کا رشتہ قائم ہوا جو آج ساری دنیا کو نظر آرہا ہے اور تاریخ نے قرآن کریم کی اس بات کو سچ کر دکھایا۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم صرف اپنے نزول سے پہلے یا نزول کے وقت کے حقائق کی بات نہیں کرتا بلکہ اپنے نزول کے بعد قیامت تک پیش آنے والے حقائق و معاملات کا بھی ذکر کرتا ہے جو اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے آرہے ہیں اور ظاہر ہوتے رہیں گے۔ اور یہ بھی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے دلائل میں سے ایک اہم دلیل ہے۔

• تیسری بات ان آیات کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ قرآن کریم کے اس حکم کے بعد بھی جو مسلمان یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست سمجھے گا یا ان کی دوستی پر اعتماد کرے گا تو اس کا شمار بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں انہی کے ساتھ ہوگا۔

• اس کے بعد آیت ۵۲ میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اس ارشاد ربانی کے بعد بھی وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف دوڑے دوڑے جاتے ہیں اور عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمیں زمانہ کے حالات اور گردش سے ڈر لگتا ہے کہ وہ ہمارے خلاف کوئی مصیبت نہ کھڑی کردیں، اس لیے ہم ان سے دوستی رکھنے پر مجبور ہیں۔

• پھر اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ ڈر اور خوف بے جا ہے اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو کامیابی سے نواز دیں یا کوئی اور حکم صادر فرمادیں تو گردش زمانہ کے بہانے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ دوستی گانٹھنے والوں کو شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مفسرین کرامؒ اور محدثین عظامؒ نے ان آیات کریمہ کے شان نزول (پس منظر) کے طور پر یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں یہود کے تین بڑے قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ آباد تھے۔ جو کسی دور میں نبی آخر الزمانؐ کی آمد کے انتظار میں یہ دیکھ کر وہاں آباد ہوگئے تھے کہ نبی کریمؐ کی آمد کے علاقے کی جو علامات گزشتہ کتابوں میں بیان ہوئی ہیں وہ اس علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جب نبی کریمؐ تشریف لائے تو ان یہود قبائل نے پہچان لینے کے باوجود صرف اس وجہ سے انکار کردیا کہ نبی آخر الزمانؐ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔ ان قبائل کے ساتھ آنحضرتؐ نے مدینہ منورہ (یثرب) میں باہمی رہن سہن کے حقوق و معاملات کا باضابطہ معاہدہ کیا جو ''میثاق مدینہ'' کہلاتا ہے۔ مگر یہ یہودی قبائل اس معاہدے کی پاسداری نہ کرسکے اور معاہدہ توڑنے کے جرم میں یکے بعد دیگرے انہیں مدینہ منورہ سے جلاوطن ہونا پڑا۔ سب سے پہلا قبیلہ جس نے معاہدے سے انحراف کیا، بنو قینقاع ہے، جو مالدار اور طاقتور قبیلہ تھا، اس کا سونے کا کاروبار اور اپنا مستقل بازار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جناب نبی کریمؐ کے

ساتھ ان کے اپنے قبیلہ قریش کی مخاصمت چل رہی ہے اس لیے قریش خود ہی ان سے نمٹ لیں گے لیکن جب بدر کی جنگ میں قریش کی کمر ٹوٹ گئی اور مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی تو یہودیوں میں تشویش اور اضطراب پیدا ہونا شروع ہوا اور درون خانہ سازشوں کا سلسلہ چل نکلا۔

اس دوران ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایک مسلمان خاندان کی خواتین بنو قینقاع کے صرافہ بازار میں زیورات بنوانے کے لیے گئیں تو ایک یہودی نوجوان نے ان سے دکان کے اندر چھیڑ چھاڑ کی جس پر غیرت میں آکر اس مسلمان خاندان کے افراد نے چھیڑ چھاڑ کرنے والے یہودی کو قتل کر دیا۔ یہودی خاندان کے لوگ اٹھے تو انہوں نے مسلمان نوجوان کو قتل کر دیا۔ اس پر دونوں طرف کشیدگی اور اشتعال بڑھنے لگا تو جناب نبی کریمؐ بنو قینقاع کے بڑے لوگوں کے پاس خود تشریف لے گئے اور ان سے کہا کہ وہ باہمی معاہدے کی پاسداری کریں اور معاملات کو مزید بگڑنے سے بچائیں ورنہ حالات زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔ بنو قینقاع کے سرداروں نے آنحضرتؐ کے ارشاد پر سنجیدگی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے رعونت اور تکبر کے ساتھ جواب دیا کہ ہمیں آپ قریشی نہ سمجھیں جن سے ایک جنگ جیت کر آپ اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں، ہم سے پالا پڑے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جنگ کسے کہتے ہیں۔ اس پر بات اور آگے بڑھی اور یہودی سرداروں نے کہہ دیا کہ انہیں معاہدے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے یہ صورتحال دیکھ کر صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ بنو قینقاع کے محلے کا محاصرہ کر لیں۔ یہ محاصرہ کچھ دن جاری رہا جس کے بعد یہودیوں کا یہ قبیلہ ایک معاہدے کے تحت مدینہ منورہ سے جلاوطن ہو کر شام کی طرف نقل مکانی کر گیا۔

اس موقع پر جناب رسول اللہؐ کے ساتھیوں میں سے دو حضرات بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوئے۔ ایک حضرت عبادہ بن صامتؓ اور دوسرے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی، یہ دونوں بنو قینقاع کے حلیف تھے، دونوں کی ان سے دوستیاں تھیں اور دونوں کے ان کے ساتھ مفادات اور معاملات وابستہ تھے۔ مگر آزمائش کے اس مرحلہ میں دونوں کا طرز عمل اور کردار مختلف تھا۔ حضرت

عبادہ بن صامتؓ نے کہا یارسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ میری بنو قینقاع کے ساتھ کتنی دوستی چلی آرہی ہے اور میرے ان کے ساتھ کتنے مفادات اور معاملات وابستہ ہیں لیکن میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ان سب کو قربان کرتا ہوں اور بنو قینقاع سے لاتعلقی اور برأت کا اعلان کرتا ہوں۔ جبکہ عبد اللہ بن ابی نے کہا کہ میں ان نقصانات کا متحمل نہیں ہو سکتا جو بنو قینقاع سے دوستی ترک کرنے پر مجھے ہوں گے اس لیے میں ان سے دوستی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ زمانے کے حالات میرے خلاف ہو جائیں گے اور گردش زمانہ مجھے کسی نئی مصیبت میں مبتلا کر دے گی۔ تاریخ نے دیکھا کہ عبادہ بن صامتؓ سرخرو ہوئے اور عبد اللہ بن ابی کے دامن میں شرمندگی کے سوا کچھ نہ بچا۔

آج کا عالمی تناظر اور ملکی ماحول بھی ایک بار پھر تاریخ کو دہرا رہا ہے اور دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ عبد اللہ بن ابی کے پیروکاروں کے قدم دھیرے دھیرے ”گردش زمانہ“ کی اس دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں جس کی تہہ میں شرمندگی اور ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اسلامی شریعت کی تعبیر و تشریح: علمی و فکری سوالات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

(محمد عمار خان ناصر کی تصنیف ”حدود و تعزیرات: چند اہم مباحث“ کے دیباچہ کے طور پر لکھا گیا۔)

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

مسلم ممالک میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور اسلامی احکام و قوانین کی عمل داری کا مسئلہ جہاں اپنی نوعیت و اہمیت کے حوالے سے ہمارے ملی فرائض اور دینی ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے، وہاں اس کی راہ میں حائل متنوع مشکلات اور رکاوٹوں کے باعث وہ ایک چیلنج کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور مسلم معاشروں میں اس سے نمٹنے کے لیے مختلف اطراف سے کوششیں جاری ہیں۔

ان مشکلات اور رکاوٹوں میں سیاسی، تہذیبی، اقتصادی اور عسکری امور کے ساتھ ساتھ یہ علمی رکاوٹ بھی نفاذ اسلام کی راہ روکے کھڑی ہے کہ آج کے بین الاقوامی حالات اور جدید عالمی تہذیبی ماحول میں اسلامی احکام و قوانین کی مقامی و بین الاقوامی سطح پر تطبیق کی عملی صورتیں کیا ہوں گی، اور گلوبلائزیشن کی اس فضا میں جبکہ دنیا کی کوئی قوم دوسری اقوام کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور اقوام عالم میں ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے اور ایک دوسرے کا اثر قبول کرنے کا دائرہ دن بدن وسیع اور ناگزیر ہوتا جارہا ہے، اسلامی احکام و قوانین کی اس کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کی قابل قبول اور قابل عمل شکل کیا ہو سکتی ہے؟

مسلم ممالک میں اس حوالے سے تین رجحانات عام طور پر پائے جاتے ہیں اور ان کے درمیان امتیاز بلکہ کشاکش دن بدن واضح ہوتی جارہی ہے:

- آج کے عالمی ماحول، جدید ثقافتی فضا اور بین الاقوامی مطالبات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اسلامی احکام و قوانین کو اس علمی ورثے اور فقہی ذخیرے کی بنیاد پر بالکل اسی طرح نافذ کر دیا جائے جس طرح وہ ترکی کی خلافت عثمانیہ اور جنوبی ایشیا کی مغل سلطنت میں نافذ تھے اور جن کی اس وقت تک کی ارتقائی شکل ہمارے پاس ”مجلۃ الاحکام العدلیہ“ اور ”فتاوی عالمگیری“ کی صورت میں موجود ہے۔
- اس علمی ورثے اور فقہی ذخیرے کو ایک طرف رکھتے ہوئے جدید عالمی تقاضوں اور بین الاقوامی مطالبات کو سامنے رکھ کر قرآن و سنت بلکہ بعض حلقوں کے نزدیک صرف قرآن کریم کی بنیاد پر نئی فقہ تشکیل دی جائے اور اسے مسلم ممالک میں قانون سازی کی اساس قرار دیا جائے۔
- گزشتہ چودہ سو سال کے علمی ورثے اور فقہی ذخیرے سے ترک تعلق اور اس سے براءت کا اظہار کرنے کی بجائے اسی کی بنیاد پر اور اس کے مسلمہ اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے نئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے، جدید قانون سازی کے تقاضوں کی تکمیل کی جائے اور جن بین الاقوامی مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرنے کی عملی صورتیں اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے نکالی جاسکتی ہیں، ان سے گریز نہ کیا جائے۔

پورے عالم اسلام میں ان تین حوالوں سے علمی کام جاری ہے اور ہر حلقہ اپنی سوچ کو آگے بڑھانے کے لیے تگ و تاز میں مصروف ہے۔ راقم الحروف خود کو اس تیسرے حلقے میں شمار کرتا ہے اور پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ پہلی دونوں صورتیں غیر متوازن اور غیر عملی ہیں، اس لیے کہ نہ تو یہ ممکن ہے کہ ہم آج کے عالمی ماحول کو کلیتاً نظر انداز کر دیں اور جدید بین الاقوامی تمدنی تقاضوں سے آنکھیں بند کرتے ہوئے دو سو سال قبل کے اجتہادی فیصلوں اور عمل کو آج کے لیے بھی مکمل طور پر واجب العمل قرار دے دیں، اور نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ ہم امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل، فقہائے امت کی علمی کاوشوں اور دنیا بھر کے مسلم معاشروں میں اسلامی احکام و قوانین کی حکمرانی کے کم و بیش ایک ہزار سالہ تسلسل کو بین الاقوامیت کے جدید ماحول کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے قرآن کریم یا قرآن و سنت کی نئی تعبیر و تشریح کرنے بیٹھ جائیں، کیونکہ ایسا کوئی بھی عمل مسلمہ اسلامی اصولوں کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کی غالب ترین اکثریت کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں ہوگا اور اس کا عملی نتیجہ مسیحیت میں مارٹن لوتھر کی پراٹسٹنٹ تحریک کی طرح سوسائٹی کو دین سے کلیتاً لاتعلق کر دینے کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے راقم الحروف کے نزدیک اسلامی قوانین و احکام کی تعبیر و تشریح کے لیے صحیح، قابل عمل اور متوازن راستہ یہ ہے کہ:

- امت مسلمہ کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کے دائرہ کی بہر حال پابندی کی جائے۔
- امت مسلمہ کی غالب اکثریت کی فقہی وابستگیوں کا احترام کرتے ہوئے ہر ملک میں وہاں کی اکثریت کے فقہی رجحانات کو قانون سازی کی بنیاد بنایا جائے، البتہ قانون سازی کو صرف اسی دائرے میں محدود رکھنے کی بجائے دوسری فقہوں سے استفادہ یا بوقت ضرورت قرآن و سنت سے براہ راست استنباط کا دروازہ بھی کھلا رکھا جائے۔ مثلاً انڈونیشیا میں شوافع کی اکثریت ہے تو اس اکثریت کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ ان کے ملک میں قانون سازی کی بنیاد فقہ شافعی پر ہو، کیونکہ یہ ایک اصولی اور معقول بات ہونے کے علاوہ وہاں کی اکثریتی آبادی کا جمہوری حق بھی ہے۔

• جدید عالمی ثقافتی ماحول اور گلوبلائزیشن سے پیدا ہونے والے مسائل اور بین الاقوامی مطالبات اور تقاضوں کو نہ تو حق اور انصاف کا معیار تصور کیا جائے کہ ہم ہر تقاضے کے سامنے سپر انداز ہوتے چلے جائیں اور اس کے لیے اسلامی اصولوں اور احکام سے دست برداری یا ان کی مغرب کے لیے قابل قبول توجیہ و تعبیر ہی ہماری علمی کاوشوں کا ہدف بن کر رہ جائے، اور نہ ہی ہم انہیں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے نفاذ اسلام کے لیے اپنی پیشرفت کا راستہ خود ہی روکے کھڑے رہیں۔ بلکہ جن مطالبات اور تقاضوں کو ہم قرآن و سنت کی تعلیمات، اہل سنت کے علمی مسلمات اور اجتہاد شرعی کے دائرے میں قبول کر سکتے ہیں انہیں کھلے دل سے قبول کریں، اور جو امور قرآن و سنت کی نصوص صریحہ اور اجتہاد شرعی کے مسلمہ اصولوں سے متصادم ہوں ان کے بارے میں کسی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے بغیر پوری دلجمعی کے ساتھ ان پر قائم رہیں۔

اس پس منظر میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذ شریعت اور اسلامی قوانین و احکام کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے مختلف اطراف میں جو کام ہو رہا ہے، اس کے بارے میں بھی کچھ اصولی گزارشات ضروری سمجھتا ہوں:

1. صرف قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد بنانا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنا قطعی طور پر ناقابل قبول اور خود قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔

2. سنت رسول سے مراد وہی ہے جو امت مسلمہ چودہ سو سال سے اس کا مفہوم سمجھتی آرہی ہے اور اس سے ہٹ کر سنت کا کوئی نیا مفہوم طے کرنا اور جمہور امت میں اب تک سنت کے متوارث طور پر چلے آنے والے مفہوم کو مسترد کر دینا بھی عملاً سنت کو اسلامی قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے۔

3. ایک رجحان آج کل عام طور پر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ سنت مستقل ماخذ قانون نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ثانوی ہے، اور قرآن کریم کے ساتھ اس کی مطابقت کی صورت میں ہی اسے احکام و قوانین کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ

بظاہر بہت خوبصورت بات ہے لیکن اس صورت میں اصل اتھارٹی سنت نہیں بلکہ مطابقت تسلیم کرنے یا نہ کرنے والے کا ذہن قرار پاتا ہے کہ وہ جس سنت کو قرآن کریم کے مطابق سمجھ لے وہ قانون کی بنیاد بن سکتی ہے، اور جس سنت کو اس کا ذہن قرآن کریم کے مطابق قرار نہ دے وہ احکام و قوانین کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

یہاں ایک بات یہ بھی مغالطہ کا باعث بنتی ہے کہ قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں مطابقت کے لیے عقل عام کو معیار تسلیم کر لیا جائے تو معاملہ قرین قیاس ہو جاتا ہے، مگر یہ سراسر مغالطہ ہے، اس لیے کہ عقل عام کی بنیاد میسر معلومات، مشاہدات اور تجربات پر ہوتی ہے جن کے دائرے زمان و مکان دونوں حوالوں سے تغیر پذیر رہتے ہیں، اس لیے عقل عام کو قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح یا ان کے درمیان تطبیق و توفیق کا حتمی معیار قرار دینے کا مطلب قرآن و سنت کو کسی ایک دور یا علاقہ کی عقل عام کا پابند بنا دینے یا ہر زمانہ اور علاقہ کے لیے الگ الگ تعبیر و تشریح کا دروازہ کھول دینے کے مترادف ہوگا، اس لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ سنت کو ثانوی درجہ کا ماخذ قانون قرار دینے کی بجائے اسلامی قانون سازی کا مستقل ماخذ اور قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کا حتمی معیار تسلیم کیا جائے، جیسا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں ہوتا تھا اور اسی پر امت مسلمہ کا اجماعی تعامل چلا آ رہا ہے۔

البتہ ان حدود کی پابندی کی یہ بات فیصلہ کے مراحل کی ہے اور میرے نزدیک علامہ محمد اقبالؒ کی طرف سے قانون سازی کے لیے منتخب پارلیمنٹ کو حتمی اتھارٹی قرار دینے کی تجویز کا ایک افادی پہلو یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کو مسترد کر کے کسی ایک گروہ کی رائے کو مسلط کر دینے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں جس کا تجربہ ہم پاکستان میں اس طرح کر چکے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک عرصہ تک سنت نبوی کو نظر انداز کر کے صرف قرآن کریم کو قانون سازی کا ماخذ قرار دینے کی تحریک چلتی رہی اور اس کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بہت محنت کی گئی، لیکن جب عوام کی منتخب دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۷۳ء میں قانون سازی کی دستوری بنیادیں طے کیں تو اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ موجود نہیں تھا کہ وہ رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے قرآن و سنت، دونوں کو قانون سازی کی بنیاد کے طور پر تسلیم

کرے، بلکہ اگر کسی معاملے میں پارلیمنٹ نے بھی عوام کی جمہوری رائے اور رجحانات کو نظر انداز کیا ہے تو رائے عامہ نے اسے قبول نہیں کیا، جیسا کہ مروجہ عائلی قوانین کو اگرچہ پارلیمنٹ نے قبول کررکھا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی قرآن وسنت سے متصادم شقوں کے بارے میں آج بھی عوام کی غالب اکثریت اپنے سابقہ رجحانات پر قائم ہے اور ذہنی طور پرانہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس لیے مجھے اس بارے میں کوئی شبہہ یا پریشانی نہیں ہے کہ جب بھی حتمی فیصلہ کا مرحلہ آئے گا، عوام کے جمہوری اور اکثریتی رجحانات کو نظر انداز کر دینا کسی کے بس میں نہیں ہوگا اور نہ ہی ان سے ہٹ کر کیا جانے والا کوئی فیصلہ امت مسلمہ کو باور کرایا جاسکے گا، البتہ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے علمی بحث و مباحثہ کا میدان محدود نہیں رہنا چاہیے اور نہ ہی ماضی میں اہل علم کے ہاں اس کا دائرہ کبھی تنگ رہا ہے۔ ہماری علمی روایت یہ چلی آرہی ہے کہ کسی بھی مسئلہ پر بحث و مباحثہ ہمیشہ کھلے دل و دماغ سے کیا گیا ہے، مسئلہ کے ہر پہلو پر بات ہوئی ہے، تجزیہ و تنقیح کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا اور استدلال و استنباط کی کوئی گنجائش ادھوری نہیں رہنے دی گئی، کیونکہ جس طرح کسی مقدمے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے تفتیش کے کسی امکانی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح کسی علمی مسئلے میں صحیح نتیجے تک رسائی کے لیے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو کھنگالنا بھی ضروری ہوتا ہے اور اسی وجہ سے میں اہل علم میں بحث و مباحثہ کے لیے کھلے ماحول کو پسند کرتا ہوں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہوں۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے جب حدود و تعزیرات کے حوالے سے اپنی کاوش اس کتابچہ کی صورت میں پیش کی جو اسلامی نظریاتی کونسل نے شائع کیا ہے تو مجھے اس کے تمام مندرجات سے اتفاق نہیں تھا، لیکن اس نوعیت کے مسائل میں علمی بحث و مباحثہ کے کھلے ماحول کو میں نے ہمیشہ نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ اسے ضروری بھی سمجھتا ہوں، جیسا کہ مجھ سے مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے ”خطبہ اجتہاد“ کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ بطور موقف اور فیصلے کے میں اسے قبول نہیں کرتا، لیکن بحث و مباحثہ کی بنیاد اور ایجنڈے کے طور پر اس کا احترام کرتا ہوں اور اس میں اٹھائے گئے نکات پر سنجیدہ علمی بحث و مباحثہ کی حمایت کرتا ہوں۔

آج کے نوجوان اہل علم جو اسلام کے چودہ سو سالہ ماضی اور جدید گلوبلائزیشن کے ثقافتی ماحول کے سنگم پر کھڑے ہیں، وہ نہ ماضی سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں اور نہ مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھیں بند کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماضی کے علمی ورثہ کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے قدیم و جدید میں تطبیق کی کوئی قابل قبول صورت نکل آئے۔ مگر انہیں دونوں جانب سے حوصلہ شکنی کا سامنا ہے اور وہ بیک وقت 'قدامت پرستی' اور 'تجدد پسندی' کے طعنوں کا ہدف ہیں۔ مجھے ان نوجوان اہل علم سے ہمدردی ہے، میں ان کے دکھ اور مشکلات کو سمجھتا ہوں اور ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس نہ ہو، کیونکہ اس دائرے سے آگے بہرحال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے اسی علمی کاوش کا سلسلہ آگے بڑھایا ہے اور زیادہ وسیع تناظر میں حدود و تعزیرات اور ان سے متعلقہ امور و مسائل پر بحث کی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو سے اتفاق کیا جائے، البتہ اس علمی کاوش کا یہ حق ضرور بنتا ہے کہ اہل علم اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، بحث و مباحثہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے مثبت و منفی پہلوؤں پر اظہار خیال کریں اور جہاں کوئی غلطی محسوس کریں، اسے انسانی فطرت کا تقاضا تصور کرتے ہوئے علمی مواخذہ کا حق استعمال کریں تاکہ صحیح نتیجے تک پہنچنے میں ان کی معاونت بھی شامل ہو جائے۔

میں دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت عزیزم عمار سلمہ کی اس کاوش کو حق تک رسائی کا ذریعہ بنائیں اور آج کے دور میں نفاذ اسلام کے حوالے سے درپیش علمی و فکری چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے ہم سب کو اپنا اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

جدید دور میں عورت کے لیے زندگی کا حق

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۱ ستمبر ۲۰۰۸ء)

بلوچستان میں پانچ عورتوں کو زندہ دفن کر دیا گیا ہے اور اسے قبائلی روایات کا حصہ قرار دیا جا رہا ہے۔ ملک بھر میں اس کی شدید مذمت کی جا رہی ہے اور عورتوں کے حقوق کے

تحفظ کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں اس سلسلہ میں مسلسل متحرک ہیں۔ سینٹ آف پاکستان نے بھی مذمت کی قرارداد منظور کی ہے اور اس سانحہ کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات تو انکوائری کی رپورٹ سامنے آنے پر ہی معلوم ہوں گی لیکن کسی انسان کی روح کو لرزا دینے کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ پانچ عورتوں کو ایک قبائلی رسم کی بھینٹ چڑھا کر زندگی کے حق سے محروم کر دیا گیا اور پھر ایک گڑھے میں دبا کر ان پر زمین برابر کر دی گئی۔

جاہلیت کے دور میں عرب معاشرے میں بھی بعض قبائل اس انسان سوز رسم پر عمل پیرا تھے جس کی قرآن کریم نے مذمت کی ہے۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قبائلی روایات کو اپنی تیئس سالہ جانگسل جدوجہد کے ساتھ عرب معاشرے سے عملاً ختم کیا تھا ان میں ایک مذموم روایت اور رسم بد یہ بھی تھی، حتیٰ کہ ”دیوان حماسہ“ میں ایک شاعر کے کلام میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک عرب سردار سے کسی نے لڑکی کا رشتہ مانگا تو اس نے انکار کرتے ہوئے اپنے شاعرانہ جواب میں یہ مصرع کہا کہ ”جب سے یہ نبی کھڑا ہوا ہے، ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہو گئی ہیں“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نبی کریمؐ کی دعوت و تبلیغ کے باعث لڑکیوں کی کثرت ہو گئی ہے اس لیے رشتے کے لیے میری طرف مت دیکھو۔ اس طرح جناب رسول اللہؐ کا تاریخ میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آپؐ عورتوں کو زندگی کا حق دلوانے والے نبی ہیں۔

عرب جاہلیت میں عورت نفرت اور حقارت کا عنوان تھی، لڑکی کی ولادت کو شرمندگی کی علامت سمجھا اور بوجھ تصور کیا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے سورۃ النحل آیت ۵۷ تا ۵۹ میں اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ ”جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی ولادت کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور اس کا دم غصے سے گھٹنے لگتا ہے، وہ اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا اسے مٹی میں دبا دے“۔ مشرکین عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن کریم نے اس پر طعن کرتے ہوئے سورۃ النجم آیت ۲۱ و ۲۲ میں کہا کہ اپنے لیے تو تم بیٹیاں پسند نہیں کرتے مگر خدا کے کھاتے میں تم نے بیٹیاں ڈال رکھی ہیں، یہ کتنی بری تقسیم تم نے کی ہے۔ لڑکیوں کو باعث عار ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر بوجھ بھی تصور کیا جاتا تھا کہ ساری زندگی ان کو کھلانا پڑے گا اس لیے انہیں

پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کرنے میں عافیت سمجھی جاتی تھی۔ قرآن کریم نے سورۃ الانعام آیت ۱۵۱ میں فرمایا کہ ’’اپنی اولاد کو فاقے کے خوف سے قتل مت کرو اس لیے کہ تمہیں بھی ہم رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی ہم ہی رزق دیتے ہیں‘‘۔

ایک شخص جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کیا اسلام قبول کرنے سے میرے جاہلیت کے دور کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اسلام کا ضابطہ یہی ہے کہ کوئی کافر اسلام کے دائرے میں داخل ہو جائے تو اس کے کفر کے دور کے سب کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یارسول اللہ! میں نے اپنے ہاتھوں اپنی آٹھ بیٹیاں زندہ دفن کی ہیں، پھر اس نے سب سے آخری بیٹی کو دفن کرنے کا واقعہ تفصیل سے سنایا۔ اس نے کہا کہ میں سفر پر روانہ ہو رہا تھا اور میری بیوی اس وقت حاملہ تھی، میں نے سال دو سال کے بعد واپس آنا تھا، بیوی کو وصیت کی کہ اگر اس حمل سے لڑکا پیدا ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ لڑکی کی صورت میں اسے زمین میں دبا دینا تاکہ میں واپسی پر اس کی شکل نہ دیکھوں۔ خدا کی قدرت کہ میرے چلے جانے کے بعد لڑکی پیدا ہو گئی مگر ماں کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ اسے زندہ دفن کر دے۔ وہ بچی گھر میں پلتی رہی، کچھ عرصہ بعد میں واپس آیا تو ایک بچی کو گھر میں کھیلتے دیکھا، بیوی پوچھا تو اس نے کہا کہ رشتہ داروں کی بچی ہے اور پھر اسے کسی رشتہ دار کے ہاں بھجوا دیا، مجھے بتایا کہ تمہاری بچی پیدا ہوئی تھی جو میں نے زندہ دفن کر دی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر کسی سفر پر گیا اور اچانک واپس آیا تو اس بچی کو پھر گھر کے صحن میں دیکھا۔ مجھے شک ہوا، میں نے بیوی سے سختی سے پوچھا تو اس نے اصل بات بتا دی کہ یہ تمہاری ہی بچی ہے میرا حوصلہ نہیں ہوا تھا کہ اسے زندہ درگور کر سکوں۔ میں نے کہا کہ خیر ہے کوئی بات نہیں اور پھر میں نے خاموشی اختیار کر لی مگر موقع کی تاک میں رہا۔ بچی تین چار سال کی ہو گئی تو میں نے بیوی سے کہا کہ اسے تیار کر دو میں اسے میلہ دکھانے ساتھ لے جاؤں گا، اس نے بچی کو تیار کر دیا۔ میں اسے لے کر جنگل میں گیا اور ایک گڑھا کھود کر اسے اس میں بٹھا دیا اور اوپر سے مٹی ڈالنے لگا۔ وہ معصوم اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے میری داڑھی کی مٹی جھاڑتی تھی اور توتلی زبان کے ساتھ مجھ سے پوچھتی تھی کہ ابو یہ آپ کیا کر رہے ہیں اور مجھے میلہ دکھانے کیوں نہیں لے جا رہے، اس مرحلے میرا دل کچھ پسیجا مگر اپنے اوپر جبر کر کے میں نے اسے دفن کر ہی دیا۔

یہ قصہ سنا کر اس شخص نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا میرے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اس نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، آپؐ نے فرمایا، تم نے بہت ظلم کیا ہے مگر ضابطہ یہی ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پچھلے گناہ سب معاف ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کی داستانیں اس معاشرے میں عام تھیں اور عورت کی زندگی کا حق بہت سے قبائل کی روایات کی بھینٹ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن بعض نیک دل لوگ بھی ہوتے تھے جو ایسی بچیوں کو بچانے کی کوشش کرتے تھے اور نیکی کماتے تھے۔ ایک صاحب کا قصہ ہے جو غالباً مشہور عرب شاعر فرزدق کے دادا تھے۔ وہ اپنے کسی گم شدہ اونٹ کی تلاش میں تھے کہ ایک جگہ خیمہ نظر آیا، قریب گئے تو ایک خاندان اس میں قیام پذیر تھا۔ اندر خواتین تھیں اور غالباً کسی عورت کے ہاں بچہ ہونے والا تھا اور اس کا خاوند خیمے سے باہر لکڑی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ یہ صاحب کہتے ہیں کہ میں جب قریب گیا تو اس شخص کو یہ کہتے سنا کہ اگر لڑکا ہوا تو مجھے خوشخبری دینا اور اگر لڑکی ہوئی تو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے پچھلے دروازے سے لے جا کر اسے زمین میں دبا دینا۔ یہ صاحب کہتے ہیں کہ میں بھی پاس بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد اندر سے آواز آئی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ اس نے زور سے کہا کہ مجھے مت دکھاؤ پیچھے سے لے جا کر زمین میں دبا دو۔ میں نے اس سے کہا کہ اس معصوم بچی کو نہ مارو بلکہ ایک اونٹ کے عوض مجھے دے دو۔ اس نے وہ بچی اونٹ کے عوض مجھے دے دی اور میں اسے گھر لے آیا۔ پھر میں نے اپنی عادت بنا لی کہ جہاں بھی مجھے معلوم ہوتا کہ بچی پیدا ہوئی ہے اور گھر والے اسے دفن کرنا چاہتے ہیں تو میں فوراً وہاں پہنچتا اور ایک اونٹ کے عوض اسے لے لیتا۔ ان صاحب کے بارے میں تاریخی روایات میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام کا دور آنے تک تین سو کے لگ بھگ بچیاں اسی طرح لوگوں سے لے کر پالی تھیں اور ان کی پرورش کرنے کے بعد ان کی شادیاں کی تھیں۔ سوسائٹی میں ایسے رحم دل لوگ بھی موجود تھے لیکن لڑکی کی پیدائش عام طور پر شرمساری کا باعث اور زندگی بھر کا بوجھ سمجھی جاتی تھی اور اسے بچپن میں زندہ درگور کر دینے کو ہی بہتر تصور کیا جاتا تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم بد کی نہ صرف یہ کہ مذمت کی اور اسے سختی کے ساتھ روکا بلکہ اپنے عمل کے ساتھ بھی بتایا کہ بچی شفقت اور پیار کی مستحق ہے اور عورت کو بھی زندگی کا اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح مرد کو ہے۔ آپؐ نے اپنی چار

بیٹیوں کی محبت اور شفقت کے ساتھ پرورش کر کے دنیا کو سبق دیا کہ بچیوں کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ نبی اکرمؐ کی نواسی امامہ اور ام المؤمنین ام سلمہؓ کی پہلے خاوند سے بیٹی زینبؓ نے بھی رسول اکرمؐ کی گود میں پرورش پائی ہے۔ آپؐ نے دنیا کو اپنے عمل کے ساتھ بتایا کہ لڑکی نہ عار کی چیز ہے اور نہ ہی بوجھ کا باعث ہے۔

مگر آج کی دنیا پھر جاہلیت کی طرف پلٹتی نظر آ رہی ہے اور یہ صرف بلوچستان کے بعض قبائل کی روایت کے طور پر نہیں ہے بلکہ مغرب کی مہذب دنیا بھی اسی ذہنیت کا شکار ہے۔ ہزاروں حمل صرف اس لیے ماؤں کے پیٹ میں ختم کر دیے جاتے ہیں کہ ان کی پرورش کون کرے گا؟ حضورؐ نے اسقاط حمل کو قتل سے تعبیر کیا ہے۔ پاپائے روم بھی اس کی مخالفت کر رہے ہیں مگر مغربی دنیا میں اسے عورت کا حق قرار دینے پر زور دیا جا رہا ہے۔ پھر مغرب کا اسقاط حمل تو لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے یکساں ہے مگر ہمارے پڑوس بھارت میں یہ اسقاط حمل صرف اس لیے ہوتا ہے کہ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم کر لیا جاتا ہے کہ پیدا ہونے والی بچی ہے اس لیے اسے پیٹ میں ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے ماں کے پیٹ میں بچے یا بچی کے بارے میں معلوم کر لینا سائنس کے کمالات میں سے ہے مگر بھارت میں یہ لڑکیوں کے لیے عذاب کا باعث بن گیا ہے کہ بھارتی حکومت کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق اب ایسے اسقاط حمل کے واقعات کی تعداد سالانہ لاکھوں تک جا پہنچی ہے جن میں الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے یہ معلوم ہو جانے پر حمل ساقط کرا دیا جاتا ہے کہ بچی جنم لینے والی ہے۔ اس خطرناک اور عورت دشمن رجحان کو روکنے کے لیے اب وہاں کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کیے جا رہے ہیں۔

عورت آج پھر زندگی کے حق سے محروم ہو رہی ہے، بلوچستان میں بھی، بھارت میں بھی اور مغربی دنیا میں بھی، صرف طریق کار مختلف ہے۔ اس لیے اگر عورت کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والی این جی اوز بلوچستان میں پانچ عورتوں کے اس وحشیانہ قتل کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں، اس ظلم کی تلافی کے ساتھ ساتھ عورت کی جان اور حقوق کے تحفظ کی بات کرتی ہیں اور سینٹ آف پاکستان اور حکومت پاکستان بھی اس کے لیے سنجیدہ اور متحرک ہو گئی ہیں تو یہ بہت خوشی اور اطمینان کی بات ہے، ہم ان کے ساتھ ہیں۔ البتہ اس موقع پر بلوچستان میں زندہ دفن کی جانے والی عورتوں کے بارے میں جائز طور پر آواز اٹھانے والی این جی اوز، سینٹ آف پاکستان اور حکومت پاکستان سے ہم یہ سوال کرنے کی

جسارت ضرور کریں گے کہ ایک سال قبل اسلام آباد کے جامعہ حفصہ میں زندہ جلائی جانے والی بچیاں بھی تو عورت کی صنف سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ کیا آگ میں زندہ بھسم کر دی جانے والی ان معصوم بچیوں کی دادرسی کے لیے بھی کوئی حکومت، کوئی سینٹ اور کوئی این جی او آواز اٹھانے کے لیے تیار ہے؟

بخاری شریف اور اہل سنت کے علمی مسلّمات

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۸ ستمبر ۲۰۰۸ء)

گزشتہ ماہ کے دوران مختلف شہروں کے دینی مدارس میں ختم بخاری شریف کی تقریبات میں حاضری اور بخاری شریف کی آخری حدیث کے حوالہ سے معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، ان تمام مجالس میں ہونے والی گفتگو کا مجموعی خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف کا آغاز اس روایت سے کیا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے، اور آخری حدیث یہ لائے ہیں کہ قیامت کے دن اقوال و اعمال کا وزن ہوگا۔ اس سے امام بخاریؒ یہ اشارہ دے رہے ہیں کہ کسی بھی عمل کا ابتدائی مرحلہ اس کی نیت اور ارادہ ہوتا ہے مگر اس کی آخری منزل قیامت کے دن وزن اعمال ہے۔ درمیان میں بہت سے مراحل آتے ہیں، اگر ایک مسلمان کا عمل نیت کے اعتبار سے صحیح ہے اور وزن اعمال کے مرحلہ تک محفوظ رہا تو وہ اس کے کام آئے گا، لیکن اگر درمیان کے کسی مرحلہ میں ہی ضائع ہوگیا تو وہ عمل انسان کے کسی کام کا نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاں بہت سے اعمال انسان کے لیے اجر و ثواب اور ترقی درجات کا باعث بنتے ہیں وہاں ایسے اعمال بھی ہیں جو اچھے اعمال کو ضائع کر دینے والے وائرس ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے ”حبط اعمال“ اور ”بطلان اعمال“ کے حوالہ سے بہت سی باتوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کے اچھے اعمال کی بربادی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے امام بخاری کی اس ترتیب میں ہمارے لیے یہ اشارہ موجود ہے کہ جہاں عمل کی قبولیت کے لیے نیت کا صحیح ہونا ضروری ہے وہاں اس کے اصل وقت میں کام آنے اور وزن اعمال تک اس کے باقی رہنے کے لیے اعمال کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے تصحیح نیت کی روایت کے بعد بدء الوحی سے کتاب کا آغاز کیا اور اس کے بعد ایمان و عقائد، اعمال و عبادات، معاملات و اخلاقیات، نکاح و طلاق، تجارت و معیشت، امارت و جہاد اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں روایات پیش کرتے چلے گئے ہیں۔ اس حوالہ سے دو باتیں آج کے عالمی تناظر میں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ امام بخاریؒ یہ فرما رہے ہیں کہ ہمارے تمام تر معاملات کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر ہے۔ جبکہ آج کا مغربی فلسفہ کہتا ہے کہ انسانی سوسائٹی اپنے مسائل و معاملات خود حل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اسے کسی بیرونی ڈکٹیشن کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی وہ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات سے راہنمائی حاصل کرنے کی محتاج ہے۔ اس کے برعکس امام بخاریؒ یہ بتا رہے ہیں کہ عقائد و ایمانیات سے لے کر آداب و اخلاق تک ہم ہر معاملہ میں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے نہ صرف محتاج ہیں بلکہ اس کے پابند بھی ہیں۔

اسلام انسانی عقل کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا، عقل شخصی ہو یا اجتماعی اس کا احترام کرتا ہے اور اس کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے لیکن وہ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی متبادل نہیں ہے۔ انسانی عقل کی جہاں انتہا ہوتی ہے وہاں سے وحی الٰہی کا آغاز ہوتا ہے، عقل انسانی بہت کچھ دیتی ہے لیکن اس کی کسی بات کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ عقل اپنی طرف سے کچھ نہیں دیتی، وہ ایک اچھا آلہ ہے جو میسر معلومات و مشاہدات سے نتیجہ نکال دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک معیاری کمپیوٹر ہوتا ہے جو اپنی تمام تر خوبی اور کمال کے باوجود خود کچھ نہیں دیتا بلکہ جو پروگرام اس میں فیڈ کیا جاتا ہے اس کے مطابق رزلٹ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی کمپیوٹر اس میں فیڈ کیے ہوئے پروگرام سے ہٹ کر کچھ نہیں دے پاتا۔ اسی طرح انسانی عقل بھی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسے فیصلہ کرتے وقت جو معلومات اور مشاہدات میسر ہوتے ہیں اس کے مطابق نتیجہ فراہم کر دیتی ہے۔ اب انسانی معلومات، مشاہدات، محسوسات، تجربات اور مدرکات کو کسی ایک جگہ قرار تو نہیں ہے بلکہ ان میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور قیامت تک مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے عقل کے فیصلے اور اس کے غور و فکر کے نتائج بھی مختلف ہوتے رہتے ہیں اور قیامت تک مختلف ہوتے رہیں گے۔ اس وجہ سے انسانی عقل کے کسی فیصلے کو حتمی اور آخری قرار دینا ممکن ہی نہیں ہے۔ جبکہ وحی جو بات کہتی ہے وہ یقین اور علم کا درجہ رکھتی ہے اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کا علم ہر حال میں یکساں اور کائنات کے تمام

امور پر محیط ہے۔ لہذا انسانی سوسائٹی یقین اور علم حقیقی کی منزل سے ہمکنار ہونے کے لیے کسی لمحہ بھی وحی الٰہی سے بے نیاز نہیں ہو سکتی اور امام بخاریؒ نے انسانی زندگی سے متعلقہ مسائل و روایت بیان کرنے سے پہلے بدء الوحی سے کتاب کا آغاز کر کے یہ بتایا ہے کہ ہمارے تمام معاملات و مسائل کی بنیاد وحی پر ہے اور ہم قدم قدم پر آسمانی تعلیمات کے محتاج ہیں۔

دوسری بات یہ کہ بخاری شریف کو ''الجامع الصحیح'' کہا جاتا ہے جس کا مطلب اہل علم کے نزدیک یہ ہے کہ یہ کتاب علم حدیث کی تمام اصناف کو جامع ہے۔ لیکن اس کا ایک مفہوم اور بھی ہے کہ یہ کتاب انسانی زندگی اور انسانی سوسائٹی کے تمام مسائل اور شعبوں کو محیط ہے۔ میں بخاری شریف کا اختتام کرنے والے طلبہ سے، جو آج کے بعد رسمی طور پر فضلاء اور علماء کہلائیں گے، یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بخاری شریف کے ابواب کی فہرست پر ایک بار پھر نظر ڈال لیں اور اس کے بعد اس بات پر غور کریں کہ انسانی زندگی کا کون سا شعبہ اور کون سا مسئلہ ہے جس کے بارے میں امام بخاریؒ نے عنوان قائم نہیں کیا اور اس کے بارے میں قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پیش نہیں کیے۔ بخاری شریف کی جامعیت کا یہ پہلو آج کے تناظر میں بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے اس لیے کہ آج کا عالمی فلسفہ یہ کہتا ہے کہ مذہب اور دین کا دائرہ صرف عقائد و عبادات یا زیادہ سے زیادہ اخلاقیات تک محدود ہے اس سے زیادہ دین و مذہب کا انسانی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، جبکہ عقائد و عبادات اور اخلاقیات کے حوالہ سے بھی مذہب و دین ایک اختیاری چیز ہے کوئی شخص اسے اختیار کرے یا نہ کرے سوسائٹی کی اجتماعیت کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ امام بخاریؒ اپنی کتاب کی جامعیت کے ذریعے یہ بتا رہے ہیں کہ دین و مذہب کا انسانی زندگی کے ہر معاملہ سے تعلق ہے اور یہ تعلق محض اختیاری نہیں ہے کیونکہ آسمانی تعلیمات کی خلاف ورزی پر دنیا اور آخرت دونوں جگہ سزا و جزا اور دیگر ثمرات کا تعین کیا گیا ہے۔

امام بخاریؒ نے الجامع الصحیح کے آغاز میں ایمانیات کا ذکر کیا ہے اور اس کا اختتام بھی ایمانیات پر کیا ہے۔ آغاز میں کتاب الایمان ہے اور آخری کتاب ''الرد علی الجھمیۃ وغیرھم التوحید'' کے عنوان سے ہے۔ دونوں کا تعلق ایمان و عقیدہ سے ہے، فرق صرف یہ ہے کہ کتاب الایمان میں ایمانیات کی فہرست بیان کی ہے کہ کون کون سے امور ایمان و عقائد میں

شامل ہیں اور امام بخاریؒ چونکہ محدثین کے اصول پر اعمال کو ایمان کے حصے کے طور پر بیان کرتے ہیں اس لیے انہوں نے کتاب الایمان میں وہ روایات زیادہ بیان کی ہیں جن میں اعمال کو شعب الایمان کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مگر آخری کتاب میں جو جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ کے رد میں ہے، عقائد کی تعبیر و تشریح کے اصول ذکر فرمائے ہیں اور چونکہ اس دور میں عقائد کی تعبیر و تشریح کے حوالہ سے زیادہ تر صفات باری تعالیٰ پر بحث ہوتی تھی اس لیے امام بخاریؒ نے وہ روایات کثرت کے ساتھ اس باب میں ذکر کی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن میں ”کتاب الرد علی الجہمیۃ وغیرھم التوحید“ کے آخری باب اور آخری حدیث کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے اس کتاب کے مجموعی تناظر کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

1. ایک تو یہ بات قابل توجہ ہے کہ امام بخاری نے کتاب الایمان میں توحید کے اثبات پر دلائل دیے ہیں لیکن آخری باب میں جہمیہ اور معتزلہ کی توحید کا رد کیا ہے۔ گویا آغاز میں توحید کا اثبات ہے اور آخر میں توحید کا رد ہے جس سے امام بخاریؒ یہ بتا رہے ہیں کہ توحید اور اس کی تعبیرات وہ قابل قبول نہیں ہیں جو لوگ اپنے ذہن اور عقل و فلسفہ کی بنیاد پر طے کر لیں بلکہ توحید اور اس کے تمام متعلقات کا تعین بھی وحی الٰہی کی بنیاد پر ہوگا اور وہی توحید قابل قبول ہوگی جو قرآن و سنت کی تشریحات کی روشنی میں سمجھی جائے گی۔

2. دوسری بات جس کی طرف علماء کرام اور طلبہ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے کتاب الایمان میں عقائد و ایمانیات کے تعین کے لیے بھی اور کتاب الرد علی الجہمیۃ میں عقائد کی تعبیرات و تشریحات میں بھی دلائل کے طور پر تین چیزیں پیش کی ہیں۔ پہلے قرآن کریم کی آیات کا حوالہ دیا ہے، پھر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بیان کیے ہیں اور اس کے بعد جہاں ضرورت پڑی ہے وضاحت کے لیے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے اقوال و آثار پیش کیے ہیں۔ اور اپنے اس طرز عمل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ عقائد و ایمانیات کا تعین بھی قرآن و سنت اور آثار صحابہؓ کی بنیاد پر ہوگا اور ان کی تعبیر و تشریح بھی ان تین دلائل کی بنیاد پر قابل قبول ہوگی۔

یہ بات بھی آج کے حالات میں بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے اس لیے کہ جس طرح اعتزال قدیم نے یہ موقف اختیار کر رکھا تھا کہ جو بات عقل اور سمجھ میں نہیں آئے گی وہ قرآن کریم میں بھی ہو تو اس کی تاویل کریں گے اور اگر تاویل ممکن نہ ہو تو انکار کر دیں گے، اسی طرح اعتزال جدید نے بھی یہ موقف طے کر لیا ہے کہ عقائد و ایمانیات کے باب میں صرف وہ بات قبول ہوگی جو قرآن کریم میں صراحتاً مذکور ہوگی اور جو بات قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ موجود نہیں وہ عقیدے کے درجے میں قابل قبول نہیں ہے۔ یہ آج کے اعتزال جدید کا موقف ہے اور اس کی بنیاد پر ہمارے متجددین اور بہت سے دانشور اسلامی عقائد و احکام کی نئی تعبیر و تشریح میں شب و روز مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات انتہائی گمراہ کن ہے اور میں اس سلسلہ میں امام بخاریؒ کے اسلوب و ترتیب کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ امام بخاریؒ نے عقائد کے ثبوت اور ان کی تعبیر و تشریح دونوں میں قرآن کریم کے ساتھ سنت نبویؐ اور آثار صحابہؓ کو ماخذ اور دلائل کے طور پر پیش کیا ہے۔

اور اہل السنۃ والجماعۃ کی اصطلاح کا بھی یہی مطلب ہے، ہم اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں اور یہ کوئی ٹائٹل یا تمغہ نہیں ہے جو کسی حکومت نے ہماری خدمات کے صلے میں عطا کیا ہو بلکہ یہ ہمارا علمی تعارف ہے کہ ہم قرآن کریم کی تعبیر و تشریح میں سنت رسولؐ اور آثار صحابہؓ دونوں کو حجت مانتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ایک ارشاد کا حوالہ بھی دینا چاہوں گا کہ اگر حدیث و سنت کی بات ہے تو علی الراس والعین (سر آنکھوں پر)، اگر اقوال و آثار صحابہ کرامؓ کی بات ہے تو ہم ان میں سے انتخاب کریں گے اور ان سے باہر نہیں جائیں گے، اور اگر بات ان کے بعد کے لوگوں کی ہے تو ہم رجال و نحن رجال (یعنی جیسے انہوں نے اجتہاد کیا ہم بھی کریں گے)۔ امام صاحب چونکہ تابعی ہیں اس لیے اپنے معاصر لوگوں کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ ”ہم رجال و نحن رجال“۔ جبکہ صحابہ کرامؓ کے اقوال و آثار کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہم ان کے دائرہ سے باہر نہیں جائیں گے اور کسی مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کے اقوال مختلف ہونے کی صورت میں انہی سے انتخاب کریں گے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کی بنیاد اسی اصول پر ہے اور آج کے دور میں دین کی تعبیر و تشریح کے نئے فتنوں کا سامنا کرنے کے لیے اس اصول کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہے۔

میں اس موقع پر یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن کریم کی تعبیر و تشریح، سنت رسولؐ اور آثار صحابہؓ کی بنیاد پر کرنے کا یہ اصول بعد میں طے نہیں ہوا بلکہ خود حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں اصول و اسلوب یہی تھا جس کے لیے ان دو روایات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو امام مسلمؒ نے صحیح مسلم کی کتاب الایمان میں بیان فرمائی ہیں۔

ایک روایت حضرت یحییٰ بن یعمرؒ کی ہے جو فرماتے ہیں کہ ہمارے علاقے میں بعض لوگوں نے تقدیر کا انکار شروع کر دیا تو میں نے اور میرے ایک ساتھی نے حج بیت اللہ کے لیے جاتے ہوئے یہ ارادہ کر لیا کہ اگر کسی صحابیِ رسول سے ملاقات ہوگئی تو ان سے اس کے بارے میں دریافت کریں گے۔ حسن اتفاق سے ہمیں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی زیارت و ملاقات نصیب ہوگئی اور ہم نے ان سے عرض کیا تو انہوں نے جواب میں دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک تو یہ کہا کہ جو لوگ تقدیر کا انکار کرتے ہیں انہیں میری طرف سے پیغام دے دیں کہ جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہیں لائیں گے میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میں ان سے برأت کا اعلان کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ میں نے خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپؐ نے حدیث جبریل میں جب ایمانیات کا ذکر کیا تو اس میں فرمایا ''ان تؤمن بالقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ'' یہ بھی ایمان کا حصہ ہے کہ تم تقدیر پر ایمان لاؤ۔

دوسری روایت امام مسلمؒ نے حضرت یزید الفقیرؒ کی بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم کچھ دوست تھے جو خوارج کی اس بات سے متاثر ہوگئے تھے کہ جب قرآن کریم کہتا ''کلما ارادوا ان یخرجوا منہا اعیدوا فیہا'' کہ جہنم والے جب بھی جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو اسی میں واپس لوٹا دیے جائیں گے۔ تو پھر شفاعت کے اس عقیدے کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ بہت سے لوگوں کی شفاعت کی وجہ سے جہنم سے لوگ نکال کر جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ لیکن جب ایک حج یا عمرہ کے موقع پر ہمارا گزر مدینہ منورہ سے ہوا تو ہم نے مسجد نبویؐ میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ کو ایک مجلس میں شفاعت کی بات کرتے ہوئے سنا۔ یزید الفقیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ سے سوال کر دیا کہ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ جہنم سے کسی کو نکلنے نہیں دیا جائے گا تو آپ کس شفاعت کی بات کر رہے ہیں جس کی وجہ سے لوگ جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہوں گے؟ حضرت جابرؓ نے اس کے جواب میں شفاعت کی وہ طویل روایت بیان کی جو بخاری شریف اور مسلم شریف دونوں میں موجود ہے۔ اور حضرت

جابرؓ نے کہا کہ میں نے شفاعت کی یہ ساری تفصیلات خود جناب رسول اللہ سے سنی ہیں۔ یزید الفقیرؒ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت جابرؓ کی زبان سے یہ روایت سن کر آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ یہ بزرگ صحابیؓ آخر جھوٹ تو نہیں بولتے، چنانچہ ہم میں سے ایک شخص اپنی بات پر اڑا رہا اور باقی سب ساتھیوں نے غلط عقیدے سے توبہ کرلی۔

یہ دونوں واقعات صحابہ کرامؓ کے دور کے ہیں، دونوں میں عقیدہ کی بات ہے، عقیدہ کی اصلاح کے لیے صحابہ کرامؓ سے رجوع کیا گیا، صحابہ کرامؓ نے عقیدہ کے ثبوت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی پیش کیا اور پوچھنے والوں کا اطمینان ہوگیا۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی اسلوب ہے، یہی حق ہے اور آج کے فتنوں کے دور میں اسی اسلوب کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

امام بخاریؒ نے اس میں معتزلہ وغیرہ کے اس قول کا رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وزن اعمال نہیں ہوگا اور اس کی ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اعمال جواہر میں سے نہیں بلکہ اعراض میں سے ہیں اور اعراض کا وزن نہیں کیا جاسکتا، اعراض کا کوئی الگ وجود نہیں ہے کہ انہیں تولا جاسکے۔ یہ بات اس دور کے سائنسی مشاہدات کی روشنی میں درست ہوسکتی ہے کہ اس دور میں اعراض کو تولنے کا کوئی نظام موجود نہیں تھا لیکن آج تو خود سائنس اعراض کو تول رہی ہے اور ایسے سائنسی آلات ہر طرف دکھائی دے رہے ہیں جو اعراض و کیفیات کا وزن کرتے ہیں اور ان کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر اب سے کچھ عرصہ پہلے تک یہ محاورہ بولا جاتا تھا کہ ”اذا تلفظ فتلاشی“ لفظ جب منہ سے بول دیا جاتا ہے تو وہ لا شئ ہوجاتا ہے یعنی اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ لیکن آج کے آڈیو سسٹم نے اس محاورے کو غلط ثابت کردیا ہے، لفظ بولے جانے کے بعد نہ صرف باقی رہتا ہے بلکہ مستقل طور پر محفوظ بھی ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایک دور میں کہا جاتا تھا کہ انسان جب ایک عمل یا حرکت کرتا ہے تو وہ فضا میں تحلیل ہوجاتا ہے اور اس کا کوئی نشان موجود نہیں رہتا لیکن آج کا ویڈیو سسٹم اس تصور کو جھٹلا رہا ہے، ہم ایک کام کرتے ہیں اور ویڈیو سسٹم کے ذریعے پھر کئی بار خود کو وہ کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور وہ عمل ریکارڈ میں محفوظ ہوجاتا ہے۔ اس لیے امام بخاریؒ فرما رہے ہیں کہ قول اور عمل دونوں تولے جائیں گے، یہ بات اگر ایک صدی قبل کے سائنسی مشاہدات و تجربات کے دائرے میں قابل فہم نہیں تھی تو آج کی سائنس اس کو خود ایک حقیقت کے طور پر پیش کررہی ہے اور میں یہ عرض کروں گا کہ وحی الٰہی کی بہت سی باتیں جو

آج کے سائنسی مشاہدات کے دائرہ میں سمجھ میں نہیں آرہیں جوں جوں سائنس کے تجربات و مشاہدات بڑھتے جائیں گے وہ بھی یقیناً سمجھ میں آتی جائیں گی۔

اسی لیے ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ عقائد و ایمانیات کی بنیاد سائنس اور عقل پر نہیں بلکہ وحی الٰہی پر ہے۔ اسی وجہ سے امام بخاریؒ اس بحث میں سرے سے نہیں پڑے کہ عقل و فلسفہ کیا کہتے ہیں اور سائنس اور مشاہدہ کیا کہتا ہے۔ انہوں نے عنوان قائم کیا ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال کا وزن ہوگا اور دلیل کے طور پر قرآن کریم کی آیت اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کیا ہے۔ قرآن کریم کی آیت میں ارشاد ربانی ہے کہ ہم قیامت کے دن انصاف کے لیے ترازو رکھیں گے۔ اور جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ دو کلمے (سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم) جو زبان پر ہلکے پھلکے ہیں قیامت کے دن ترازو پر بہت وزنی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کو یہ کلمے محبوب ہیں۔ یہ روایت امام بخاریؒ نے دو جگہ اور بھی ذکر کی ہے۔ ایک جگہ تو ذکر کی فضیلت میں اور دوسری جگہ اس مسئلہ کے پس منظر میں کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھالے کہ وہ کلام نہیں کرے گا تو کیا اللہ تعالیٰ کے ذکر کا کوئی کلمہ مثلاً سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر وغیر ذلک پڑھنے سے حانث ہوگا یا نہیں؟ فقہاء کرامؒ نے اس میں اختلاف کیا ہے، بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ نماز کلام کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے مگر سبحان اللہ اور اس قسم کا جملہ کہنے سے نہیں ٹوٹتی، اس لیے ایسے جملوں پر کلام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ چونکہ ان جملوں کو نبی اکرمؐ نے کلمہ قرار دیا ہے اور کلام کلمات ہی سے مرکب ہوتا ہے اس لیے یہ جملے کہنے سے بھی قسم اٹھانے والا حانث ہو جائے گا۔ امام بخاریؒ نے اس باب میں ''کلمتان'' کے لفظ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ذکر اللہ کے جملوں پر بھی کلمہ اور کلام کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہاں اس حدیث اور اس کے ترجمۃ الباب کے بارے میں طالب علمانہ طور پر بہت کچھ عرض کرنے کی گنجائش ہے اور بہت کچھ بیان کیا جاتا ہے لیکن میں چند اصولی باتوں پر اکتفا کرتے ہوئے دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہونے والے طلبہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جتنا علم آپ حضرات نے حاصل کیا ہے اس سے اس غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں کہ آپ لوگ عالم ہوگئے ہیں، جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اس سے صرف اتنا ہوا ہے کہ آپ علم کے دروازے تک پہنچ گئے ہیں اور حصول علم کا راستہ آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اب آپ لوگوں کی ہمت پر منحصر ہے کہ علم میں کتنا آگے بڑھتے ہیں اور اس میں سے کتنا حصہ حاصل کر پاتے

ہیں۔ اس لیے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھیں، مطالعہ کا ذوق بڑھائیں اور علم و معلومات میں جس قدر اضافہ کا موقع ملے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اور اس کے ساتھ اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات اور امت کے اجماعی تعامل کے دائرہ سے باہر نہ نکلیں جس کا ہمارے زمانے سے قریب تر دور اکابر علماء دیوبند کا دور ہے۔ امت کے اجماعی تعامل اور اہل سنت کے مسلمات کے دائرہ سے باہر نکلنا گمراہی ہے، اس لیے اکابر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین اور علم کی خدمت کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

ناسا مصلیٰ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۵ ستمبر ۲۰۰۸ء)

ڈیٹرائٹ امریکہ کے اہم شہروں میں سے ہے اور مشی گن ریاست میں ہے۔ مجھے اب سے بیس برس قبل اس کے ایئرپورٹ سے کئی چکر لگانے کا موقع ملا تھا مگر شہر میں داخل ہونے اور مسلمان دوستوں سے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس زمانے میں وزٹ پر آنے والوں کو بعض فضائی کمپنیوں کی طرف سے فضائی سفر کے سستے کوپن مل جایا کرتے تھے جن پر وہ اس فضائی کمپنی کے جہازوں پر کسی بھی روٹ پر سفر کر سکتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے یہ کوپن لندن سے غالباً ساڑھے تین سو پاؤنڈ میں ساٹھ کی تعداد میں خریدے تھے اور ان کے ذریعے میں نے امریکہ کے اندر تیرہ چودہ شہروں کا سفر کیا تھا۔

ڈیٹرائٹ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے ایک نئے گروہ ''نیشن آف اسلام'' کی جائے پیدائش بھی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں یہاں ایک صاحب آئے جنہیں ماسٹر فارد محمد کے نام سے پکارا جاتا ہے، انہوں نے سیاہ فام امریکیوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا۔ ان صاحب کے ہاتھ پر ایلج پول نامی ایک سیاہ فام نے اسلام قبول کیا جو کسی پادری کا بیٹا تھا وہ دونوں مل کر اپنے ذہن کے مطابق اسلام کی تبلیغ کرتے رہے مگر ۱۹۳۴ء میں اچانک ماسٹر فارد محمد صاحب غائب ہوگئے اور ایلیج پول نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ ایلج پول اب ایلج محمد کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہ صاحب ۱۹۷۰ء تک نبوت کے نام پر عجیب و غریب عقائد کے ساتھ اپنا کام چلاتے رہے اور اب ''نیشن آف اسلام'' کے نام سے پکارے جانے

والے اس گروہ کی قیادت لوئیس فرخان صاحب کے ہاتھ میں ہے جو امریکہ کے سیاہ فام مسلم لیڈر کے طور پر دنیا کے مختلف ممالک کے دورے کرتے رہتے ہیں۔

ڈیٹرائٹ کے علاقہ میں اپسی لانٹی میں فیصل آباد کے ہمارے پرانے دوست مولانا قاری محمد الیاس (مہتمم جامعہ مدینۃ العلم بکر منڈی، فیصل آباد) گزشتہ تین برس سے مقیم ہیں۔ وہ سالہا سال سے رمضان المبارک میں قرآن کریم سنانے کے لیے امریکہ میں آرہے تھے، یہاں کے دوستوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ یہاں مستقل طور پر رہائش اختیار کریں اور علاقہ کے لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کا کوئی نظم قائم کریں۔ چنانچہ وہ مسجد بلال اپسی لانٹی مشی گن میں گزشتہ تین برس سے امامت و خطابت اور حفظ قرآن کریم کی تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اب مسجد بلال کے ساتھ چار ایکڑ زمین خرید لی گئی ہے اور وہاں وسیع مسجد کے ساتھ ساتھ درس نظامی اور حفظ و تجوید کی بڑی درسگاہ کے قیام کا پروگرام ترتیب دیا جارہا ہے۔ رحیم یار خان کے ایک دینی گھرانے سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر ظفر محمود اس پروگرام میں سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں اور پورے ذوق و شوق کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔

میں ۲ اگست کو امریکہ پہنچا اور مولانا قاری محمد الیاس صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع دی تو انہوں نے فرمایا کہ اس دفعہ آپ ہمارے ہاں ضرور آئیں۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا اور ۱۷ اگست سے ۱۹ اگست تک کا وقت ان کے ساتھ گزارا۔ دو مسجدوں میں بیانات ہوئے اور متعدّد علماء کرام کے ساتھ علاقہ کے مسلمانوں کی دینی ضروریات اور راہنمائی کے حوالہ سے مفید گفتگو ہوئی۔ یہاں علماء کرام میں علاقہ کے لوگوں کی دینی راہنمائی کے لیے اجتماعی مشاورت کا ماحول آہستہ آہستہ قائم ہورہا ہے۔ بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے مولانا مفتی عبد السلام کے ساتھ مل کر مولانا قاری محمد الیاس صاحب نے ”علماء کونسل آف ڈیٹرائٹ مشی گن“ کے نام سے ایک علمی فورم قائم کیا ہے۔ قاری صاحب اس کے چیئرمین ہیں اور کونسل کے مقاصد میں (۱) دارالافتاء کا قیام (۲) رؤیت ہلال کمیٹی (۳) اسلامی ذبیحہ کی نگرانی (۴) دینی علوم کی ترویج و اشاعت (۵) فوت ہونے والے مسلمانوں کی تجہیز و تکفین کا اہتمام (۶) ائمہ و خطباء کی یہاں کے ماحول کے مطابق تربیت (۷) اہم موضوعات پر وقتاً فوقتاً سیمینارز کا انعقاد اور دیگر ضروری امور کے علاوہ مسلمانوں کو نکاح و طلاق اور وراثت و وصیت کے معاملات میں دینی راہنمائی اور تحکیم و قضا کی سہولت فراہم کرنا بھی شامل ہے۔

اس کار خیر میں علاقہ کے دوسرے علماء کرام اور اصحاب خیر ان کے ساتھ شریک ہیں اور دھیرے دھیرے اجتماعی مشاورت اور محنت کا ماحول بن رہا ہے، فالحمد للہ علی ذلک۔

مشی گن سے واپسی پر میرا ہیوسٹن جانے کا پروگرام تھا۔ ہیوسٹن امریکہ کی باعتبار رقبہ سب سے بڑی ریاست ٹیکساس کا ایک بڑا شہر ہے اور وہاں خاصے پاکستانی آباد ہیں۔ مدرسہ اسلامیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ اور مسجد گزشتہ تیس برس سے پاکستانی مسلمانوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ مولانا حافظ اقبال اس کے منتظم ہیں جو چشتیاں کے رہنے والے ہیں اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فضلاء میں سے ہیں۔ ایک اور مرکز ایشیا سنٹر کے نام سے ہے جس کے سربراہ مولانا محمد حافظ ثناء الحق صاحب ہیں۔ گزشتہ سال دونوں مراکز میں حاضری ہوئی تھی اور بیان بھی کیا تھا۔ اس سال مولانا حافظ ثناء الحق صاحب کا خیال تھا کہ ایشیا سنٹر میں چار پانچ روز کا پروگرام کسی متعیّن موضوع پر ہو۔ نیویارک پہنچنے پر میں نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع دی تو انہوں نے یہ فرمائش کی، میں نے وعدہ کرلیا کہ چار پانچ روز کے لیے حاضر ہوں گا، آپ کسی موضوع پر مسلسل محاضرات کا پروگرام بنالیں مگر وہاں جانے سے دو روز قبل اطلاع ملی کہ مولانا حافظ ثناء الحق صاحب کے والد محترم کا پاکستان میں انتقال ہوگیا ہے اور انہیں اچانک پاکستان جانا پڑ گیا ہے۔ ان کے والد محترم حضرت مولانا حافظ ظہور الحق ظہورؒ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ کے رفقاء خاص میں سے تھے، توحید و سنت ان کا خاص موضوع تھا اور زندگی بھر اسی کی اشاعت میں مگن رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

حافظ ثناء الحق صاحب کے پاکستان چلے جانے کے باعث کسی موضوع پر مسلسل محاضرات کا پروگرام تو نہ ہوسکا البتہ جمعہ کا خطبہ میں نے ان کے مرکز میں دیا اور مغرب کی نماز کے بعد ”فہم قرآن کریم کے بنیادی اصول“ کے عنوان پر گفتگو کی۔ جبکہ اتوار کو ایک ریڈیو پروگرام میں شرکت کی اور ”اہل سنت والجماعت کا تعارف، تاریخی پس منظر اور دائرہ کار“ کے موضوع پر معروضات پیش کرنے کے علاوہ کچھ سوالات کے جوابات بھی دیے جو زیادہ تر قادیانیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں تھے۔ یہ ریڈیو پروگرام ہر اتوار کو ہوتا ہے جس کا اہتمام مولانا حافظ محمد اقبال اور عاطف فتح صاحب کرتے ہیں۔ معلوماتی پروگرام ہوتا

ہے اور دور دور تک سنا جاتا ہے، اس کے ذریعے ہمارے یہ احباب پاکستانی کمیونٹی کی مختلف دینی وملی امور میں راہنمائی کرتے ہیں اور قرآن وسنت کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

امریکی خلائی تحقیقاتی مرکز ''ناسا'' کے مین گیٹ کے قریب ایک چھوٹی مسجد مارکیٹ میں واقع ''ناسا مصلی'' میں گزشتہ سال بھی ایک نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اور اس سال بھی اتوار کو مغرب کی نماز وہاں پڑھنے کا موقع ملا۔ فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے بزرگ ڈاکٹر عبد الغفور کے ہاں شام کے کھانے کا پروگرام تھا۔ میں نے فیصل آباد ہی سے تعلق رکھنے والے دوستوں قاری خالد رشید اور قاری احمد صدیق کے ہمراہ ناسا مصلی میں مغرب کی نماز ادا کی، یہ دونوں دوست اس پورے دورے میں میرے میزبان رہے ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ رہے اور بہت خدمت کی، اللہ تعالیٰ انہیں دونوں جہانوں میں جزائے خیر سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔ ڈاکٹر عبد الغفور ان حضرات میں سے ہیں جنہوں نے مل جل کر ''ناسا مصلی'' قائم کیا تھا، انہوں نے بتایا کہ گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے قاری عبید الرحمان صاحب مرحوم کے ساتھ مل کر ہم چند دوستوں نے یہ مصلی قائم کیا تھا جہاں پنج وقتہ نماز باجماعت کے ساتھ قرآن کریم حفظ و ناظرہ کا اہتمام بھی تھا۔ قاری عبید الرحمان صاحب کے بارے میں بتایا گیا کہ انہوں نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ قاری صاحب نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس مرکز کا آغاز کیا اور کچھ عرصہ امامت و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ پھر اچانک شدید بیمار ہوکر پاکستان چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے بعد یہ مصلی سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے ایک فاضل شیخ ولید حفظہ اللہ تعالیٰ نے سنبھال لیا اور اب یہ پانچ وقت باجماعت کے ساتھ ساتھ سلفی دوستوں کی تعلیمی اور دعوتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔

ہیوسٹن میں پانچ روزہ قیام کے دوران قاری خالد رشید اور قاری احمد صدیق کے ہمراہ ایک روز تھوڑی دیر کے لیے ڈیلاس میں بھی حاضری ہوئی جو یہاں سے چار پانچ گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ وہاں ہمارے پرانے دوست علامہ اختر کاشمیری رہائش پذیر ہیں جو کسی دور میں ہفت روزہ خدام الدین لاہور کے مدیر رہے ہیں، ان کے ساتھ کچھ دیر گپ شپ رہی اور پرانی یادیں تازہ کیں۔ ڈیلاس کے بارے میں بتایا گیا کہ امریکہ کے سابق صدر جان ایف کینیڈی اسی شہر میں قتل ہوئے تھے۔ ہیوسٹن میں ایک پرانے دوست حافظ عبد

الوحید صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور ان کے گھر بھی حاضری ہوئی۔ ان کا تعلق سوہدرہ وزیر آباد سے ہے، پاکستان کے نامور اہل حدیث عالم دین حضرت مولانا عبد المجید خادم سوہدرویؒ کے فرزند اور شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے نواسے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک عرصہ تک جمعیت علماء اسلام تحصیل وزیر آباد کے سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کرتے رہے اور اس دور کے سرگرم ہمارے ساتھیوں میں سے ہیں۔ اب کئی برسوں سے ہیوسٹن میں مقیم ہیں اور ریاض سعودی عرب کے مشہور اشاعت ادارہ ''دارالسلام'' کی شاخ کے طور پر ''بک اینڈ گفٹ شوز'' چلا رہے ہیں۔

ہیوسٹن میں میرے میزبانوں میں جلال پور پیر والا سے تعلق رکھنے والے قاری محمد ہاشم عباسی بھی شامل ہیں جو مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے شعبہ حفظ میں ابتداء سے کام کرنے والوں میں سے ہیں، بہت باذوق استاذ ہیں، خود بھی اچھا پڑھتے ہیں اور شاگردوں کو بھی اچھا پڑھنے کا ذوق اور سلیقہ منتقل کرتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد اس علاقہ میں قرآن کریم کی قراءت و تعلیم کی خدمات سرانجام دے رہی ہے جو ان کے حسن ذوق کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

روزے کا تاریخی پس منظر اور رمضان المبارک کی فضیلت

(مدینۃ العلوم، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۱ ستمبر ۲۰۰۸ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے رمضان المبارک اور اس کے ساتھ روزے کا ذکر فرمایا ہے اور یہ بات بتائی ہے کہ تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں اور بھوکا پیاسا رہنا تمہارے لیے عبادت قرار دیا گیا ہے۔ پھر یہ بتایا کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی امتوں پر روزے فرض کیے گئے تھے۔ اور جب سے یہ مذہب اور انسان چلے آرہے ہیں نماز، روزہ اور دیگر عبادات بھی چلی آرہی ہیں۔ یعنی تم سے پہلے لوگ بھی روزے رکھتے تھے اور ان پر بھی روزے ایسے ہی فرض تھے جیسے تم پر فرض کیے گئے ہیں۔ البتہ روزے کا جو طریقہ و نظم پہلی امتوں میں تھا اسلام

نے اس میں کچھ اصلاحات اور تبدیلیاں کیں۔ میں اس وقت دو بڑی تبدیلیوں کا ذکر کروں گا۔

1. ایک تبدیلی تو یہ کی کہ روزے کا دورانیہ کم کر دیا۔ پہلی امتوں میں آٹھ پہر کا روزہ ہوتا تھا، رات کو سونے سے پہلے کھانے پینے کی اجازت تھی لیکن رات کو جونہی سو گئے تو روزہ شروع ہو گیا، پھر دوسرے دن سورج کے غروب ہونے تک روزہ چلتا تھا۔ ہماری اصطلاح میں اسے آٹھ پہر کا روزہ کہتے ہیں۔ پہلی امتوں میں یہی تھا۔ ہم مسلمانوں کے لیے بھی آغاز میں روزے کا یہی دورانیہ تھا۔ ابتداء میں جب روزے فرض ہوئے تو آٹھ پہر کا روزہ ہی تھا۔ اللہ تعالی نے امت محمدیہ ؐ کو یہ سہولت عطا فرمائی کہ رات کو روزے سے نکال دیا۔

اس پر محدثین نے ایک کاشتکار انصاری صحابی کا واقعہ نقل کیا ہے جنہوں نے پرانے طریقہ کے مطابق آٹھ پہر کا روزہ رکھا ہوا تھا، دن بھر کاشتکاری کر کے شام کو گھر آئے اور نماز وغیرہ پڑھ کر فارغ ہوئے کہ اب کھانا کھاتا ہوں، گھر والوں سے کھانے کے متعلق دریافت کیا۔ گھر والوں نے کہا آپ بیٹھیں ہم تیار کرتے ہیں۔ جونہی کھانے کے انتظار میں یہ صحابیؓ بیٹھے تو ان کی آنکھ لگ گئی اور سو گئے۔ جیسے ہی سوئے اگلا روزہ شروع ہو گیا۔ آٹھ پہر کا روزہ تو پہلے ہی تھا، اور اب آٹھ پہر کا اگلا روزہ شروع ہو گیا۔ دوسرے دن وہ لڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔ ایک محنت کش آدمی اور دو دن کی بھوک۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو پوچھا، کیا ہوا بھئی؟ صحابیؓ نے بتایا کہ یا رسول اللہ میرے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی کی طرف سے یہ اجازت، یہ گنجائش بلکہ حکم نازل ہوا کہ رات روزے سے خارج ہو گی اور روزے کا آغاز طلوع فجر سے ہو گا۔

اللہ تعالی نے قرآن مجید میں فرمایا کہ کھاؤ پیو جب تک کہ صبح کے وقت سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ظاہر ہو جائے، پھر روزوں کو رات تک پورا کرو۔ یہ اجازت دی گئی کہ اس وقت تک کھا پی سکتے ہو جب تک پو نہ پھٹ جائے یعنی طلوع فجر نہ ہو جائے۔ جب فجر طلوع ہو رہی ہو تو آسمان کے افق پر مشرق کی جانب دو لکیریں دکھائی دیتی ہیں، ایک صبح کی روشنی کی سفید لکیر اور دوسری رات

کی تاریکی کی سیاہ لکیر۔ یہ جو دو لکیریں آسمان پر الگ الگ نظر آتی ہیں اسے پو پھٹنا کہتے ہیں اور یہی دراصل طلوع فجر کا وقت ہے۔ چنانچہ ایک اصلاح اسلام نے روزے کے نظام میں یہ کی کہ روزے کا دورانیہ کم کر دیا اور طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک روزے کا دورانیہ مقرر کر دیا۔ سحری کی صرف اجازت نہیں دی گئی بلکہ سحری کو سنت قرار دیا گیا۔ سحری کھانا جناب نبی کریمؐ کا معمول مبارک تھا۔ اس طرح روزے کو سنت کے مطابق بنانے کے لیے سحری کھانا ضروری ہو جاتا ہے۔

2. اسلام نے روزے کے نظام میں دوسری اصلاح یہ کی کہ فرض روزوں کو رمضان المبارک میں مخصوص کر دیا۔ بعض روایات کے مطابق پہلی امتوں میں بھی رمضان ہی کے روزے تھے لیکن انہوں نے اپنی سہولت کی خاطر روزوں کے ایام اور موسم میں تبدیلی کر لی تھی جیسا کہ مسیحیوں میں مارچ کے روزے رکھے جاتے ہیں اور اپریل کے آغاز میں عید الفطر ”ایسٹر“ کے عنوان سے منائی جاتی ہے۔ اسلام نے وہ تبدیلی ختم کر کے سابقہ صورت یعنی رمضان کے روزے بحال کر دیے۔ تفسیر مظہری میں حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے روایات نقل کی ہیں کہ پہلی امتوں میں بھی فرض روزے رمضان کے مہینے میں ہی ہوتے تھے۔

دنیا میں وقت اور دن کا نظام سورج کی گردش کے حساب سے چلتا ہے جبکہ ایام کے تعین کا نظام چاند کی گردش کے حساب سے ہوتا ہے۔ سورج کی گردش والا سال شمسی سال کہلاتا ہے اور جنوری، فروری، مارچ، اپریل وغیرہ کے مہینے شمسی سال کے مہینے ہیں۔ جبکہ چاند کی گردش والا سال قمری سال کہلاتا ہے اور محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی وغیرہ قمری سال کے مہینے ہیں۔ اسلامی کیلنڈر اس لحاظ سے قمری ہے کہ اسلام میں دنوں اور مہینوں کا حساب چاند کے لحاظ سے ہے۔ مگر اسلامی عبادات کا نظام دونوں گردشوں سے متعلق ہے، سورج سے بھی اور چاند سے بھی۔ ہماری عبادات اور شرعی معاملات میں سورج کی گردش کا اعتبار بھی ہے اور چاند کی گردش کا اعتبار بھی ہے۔

اسلامی شریعت میں ایام کا تعین چاند سے ہوتا ہے۔ ہم جب ایام اور مہینے طے کرتے ہیں تو چاند کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ شب برات، شب معراج، شب قدر، ایام بیض،

یوم عاشورہ اور ایام حج وغیرہ قمری مہینوں کے اعتبار سے معلوم کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح روزے کے دنوں کا تعین کہ یہ پہلا روزہ ہے، یہ اکیسواں ہے، یہ ستائیسواں ہے، یہ انتیسواں ہے وغیرہ، یہ رمضان کے مہینے کے اعتبار سے ہیں جو کہ چاند کا مہینہ ہے۔ اسی طرح حج کے ایام کا تعین بھی چاند کے مہینے یعنی ذی الحج کے حساب سے طے ہوتے ہیں کہ آج یوم الترویہ ہے، آج یوم الحج ہے اور آج یوم الاضحی ہے وغیر ذالک۔ لیکن ہم جب اوقات طے کرتے ہیں تو ان میں سورج کا اعتبار ہوتا ہے۔ ہم نمازوں کے اوقات سورج کی گردش سے طے کرتے ہیں۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور دیگر نفلی نمازوں کے اوقات کا تعلق سورج کی گردش سے ہوتا ہے۔ سورج کی گردش کا دورانیہ بڑھ جائے تو نمازوں میں وقفہ زیادہ ہوجاتا ہے، اور سورج کی گردش کا دورانیہ کم ہوجائے تو نمازوں کے درمیان وقفہ کم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ہماری روزمرہ نمازیں سورج کے اعتبار سے ہیں۔ اسی طرح رمضان یا غیر رمضان کے روزوں کا دورانیہ بھی سورج کے حساب سے ہی ہے۔ طلوع فجر سے روزے کا آغاز ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر روزے کا اختتام ہوتا ہے۔ ایسے ہی حج کے اعمال میں بھی اوقات کا تعلق سورج سے ہے کہ رمی کس وقت کرنی ہے، مزدلفہ کب جانا ہے، عرفات سے کب آنا ہے وغیرہ۔

عام طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ اسلام میں صرف چاند کا اعتبار ہے، ایسی بات نہیں ہے۔ چاند کا اعتبار دنوں کے تعین میں ہے لیکن عبادات کے اوقات میں ہم روزمرہ سورج کی گردش کے مطابق چلتے ہیں۔ اس طرح ہمارے ہاں عبادات میں چاند اور سورج دونوں کا یکساں اعتبار ہے۔ البتہ چاند کا سال سورج کے سال سے چھوٹا ہوتا ہے۔ تقریبا دس دن کا فرق ہے۔ مفسرین اس میں بہت سی حکمتیں بیان فرماتے ہیں۔ ایک حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ چاند کا مہینہ ہر تینتیس میں چکر مکمل کرلیتا ہے۔ یعنی تینتیس سال میں چاند چاروں موسموں (دنیا میں جہاں جہاں چار موسم ہوتے ہیں) میں گردش پوری کرلیتا ہے۔ اگر ایک مسلمان کو بالغ ہونے کے بعد طبعی عمر کو پہنچنے تک تیس پینتیس سال مل جائیں تو وہ سال کے ہر موسم کے روزے رکھ لیتا ہے۔ اسے ٹھنڈے روزے بھی مل جاتے ہیں اور گرم بھی۔ چھوٹے، درمیانے اور لمبے روزے سبھی مل جاتے ہیں۔ حج کا بھی یہی معاملہ ہے، حج بھی تینتیس سال میں موسموں کی گردش پوری کرتا ہے۔ یہاں ضمنا ایک بات قابل ذکر ہے۔ فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ زکوۃ کا حساب قمری سال کے اعتبار سے کرنا چاہیے اور ایسا کرنا شرعا

ضروری ہے۔ ورنہ اگر ہم شمسی سال کے اعتبار زکوۃ کا حساب کریں گے تو تینتیس سال میں ایک سال کی زکوۃ کم ادا ہوگی۔ جیسا کہ ہمارے زندگی کے عام حسابات شمسی مہینوں یعنی جنوری اور فروری وغیرہ کے حساب سے چلتے ہیں۔ اگر کوئی اپنی سالانہ زکوۃ بھی اسی حساب سے دیتا ہے تو تینتیس شمسی سالوں میں چونتیس قمری سال گزریں گے۔ اس حساب سے ایک سال کی زکوۃ ادا ہونے سے رہ جائے گی۔

آج سے بیس پچیس سال قبل جب گرمیوں کے روزوں کا دور تھا تو ہمارے ہاں پاکستان میں ایک بحث چلی کہ کیا یہ ضروری ہے کہ روزے گرمیوں میں رکھے جائیں؟ ایک صاحب نے اخبار میں مضمون لکھا جسے ان کے ہم خیال لوگوں نے بہت سراہا کہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ان صاحب نے کہا کہ یہ گرمیوں یعنی جون، جولائی اور اگست وغیرہ کے روزے بھٹی پر کام کرنے والے مزدور کے لیے اور مونجی کاشت کرنے والے کاشت کار کے لیے بہت سخت ہوتے ہیں۔ یہ کدو کرنا (مونجی کاشت کرنا) بڑا مشکل کام ہوتا ہے، سخت گرمی اور حبس کے موسم میں اوپر سے دھوپ پڑ رہی ہوتی ہے اور نیچے زمین میں گرم پانی ہوتا جس میں کاشت کار ایک ایک کر کے پودے زمین میں پیوست کرتے ہیں۔ تو ان صاحب نے کہا کہ یہ جو رمضان سارا سال گھومتا ہے کہ کبھی جولائی میں آجاتا ہے اور کبھی اگست میں آجاتا ہے تو علماء کرام کو امت پر ترس کرنا چاہیے کہ وہ اجتہاد کر کے رمضان کا گھومنا پھرنا بند کریں۔ یہ باقاعدہ مضمون چھپا اور اس پر بحث و مباحثہ ہوا کہ چونکہ علماء اجتہاد کر سکتے ہیں اس لیے علماء کو اس معاملے میں اجتہاد کرنا چاہیے۔

آج کل ہمارے ہاں اجتہاد کا ایک خاص تصور پیدا ہو گیا ہے۔ ایک تو اجتہاد کا شرعی تصور ہے، وہ پہلے بھی تھا، اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ شریعت میں اجتہاد کا تصور یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا نیا مسئلہ پیدا ہو جائے جس کے بارے میں قرآن مجید یا نبی کریمؐ کی سنت میں کوئی واضح ہدایت موجود نہیں ہے تو ایسی صورت حال میں علماء کرام قرآن و سنت کی روشنی میں کچھ شرائط کے ساتھ اس مسئلے کا حل تلاش کریں۔ یعنی علماء کرام قرآن و حدیث میں ملتی جلتی مثالوں کو سامنے رکھ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔ شریعت میں جو اجتہاد کا تصور ہے میں نے مختصرا اس کی تعریف عرض کی ہے۔ لیکن ایک اجتہاد کا تصور نیا ہے۔ ہمارے ہاں اجتہاد کا یہ تصور بن چکا ہے اور جدید ذہن کے نوجوانوں کا یہ خیال ہے کہ علماء کرام کو دین کی طرف سے شاید کوئی صوابدیدی اختیار حاصل ہوتا ہے جو اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے اسے

استعمال نہیں کرتے۔ اس کی مثال کے لیے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں کہ کافی عرصہ پہلے میں ٹرین پر لندن سے مانچسٹر جا رہا تھا۔ ایک نوجوان نے میری وضع قطع سے دیکھا کہ مولوی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں تو وہ آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ سلام جواب کے بعد اس نے پوچھا کہ کیا آپ مولانا صاحب ہیں؟ میں نے کہا، لوگ یہی کہتے ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا آپ اجتہاد کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا بھئی مسئلہ بتاؤ، بات کیا ہے۔ اس نے پھر پوچھا، نہیں پہلے آپ بتائیں کہ کیا آپ کے پاس اجتہاد کی اتھارٹی ہے؟ میں نے کہا بھئی مسئلہ بتاؤ، اگر میری سمجھ میں آیا اور میرے پاس اس کا حل ہوا تو بتا دوں گا۔ بہرحال اس نے بتایا کہ میں بحمد اللہ مسلمان ہوں اور پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میری جاب ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے ظہر اور عصر کی نمازیں بروقت ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا جس کا میں نے اپنے طور پر ایک حل نکال رکھا ہے، وہ یہ کہ میں ظہر کی نماز فجر کے ساتھ جبکہ عصر کی نماز مغرب کے ساتھ پڑھ لیتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اس کی اجازت دے دیں اس سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ بھئی یہ جو عصر کی نماز تم مغرب کے ساتھ پڑھتے ہو اس کی گنجائش تو شریعت میں ہے کہ نماز قضا ہوئی لیکن بہرحال ادا ہو گئی۔ لیکن یہ جو ظہر کی نماز تم فجر کے ساتھ پڑھتے ہو اس کی گنجائش دینے کی میرے پاس کوئی اتھارٹی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اجتہاد کے غلط استعمال کی ہمیں ضرورت نہیں ہے، میں تمہیں اس کا ایک حل بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایسی جاب کی تلاش کی کوشش جاری رکھو جہاں تم اپنی ساری نمازیں وقت پر پڑھ سکو، لیکن جب تک ایسی جاب نہیں ملتی تب تک ظہر اور عصر دونوں نمازیں مغرب کے ساتھ پڑھ لیا کرو، یہ نمازیں قضا ہوں گی لیکن بہرحال ہو جائیں گی۔

میں نے یہ واقعہ اس لیے عرض کیا ہے کہ آج کل اجتہاد کا ایک غلط تصور پایا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام کو عیسائیت کے پاپائے روم کی طرح کے کوئی اختیارات حاصل ہیں۔ یعنی وہ کسی بھی حلال کو حرام اور کسی بھی حرام کو حلال قرار دے سکتے ہیں۔ اور پھر یہ خیال کہ یہ مولوی صاحبان ضدی ہوتے ہیں اور عوام کو کوئی سہولت نہیں دینا چاہتے اس لیے یہ اپنا اجتہاد کا اختیار استعمال نہیں کرتے۔

خیر میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ مضمون نگار نے تجویز پیش کی کہ علماء کرام مل بیٹھ کر اجتہاد کریں اور رمضان کے مہینے کو کسی اچھے سے موسم میں بند کر دیں۔ ان صاحب نے کہا کہ میری ذاتی تجویز یہ ہے کہ فروری کا مہینہ رمضان کا ہو جبکہ یکم مارچ کو عید الفطر ہو، اس

طرح رمضان کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور عید کا جھگڑا بھی طے ہو جائے گا۔ یہ لوکل و گلوبل مون سائٹنگ کمیٹیاں اور یہ چاند دیکھنے کے جھگڑے وغیرہ، سب ختم ہو جائیں گے۔ اس پر بحث مباحثہ ہوا، میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ انہی دنوں جب میں نے اس موضوع پر روایات وغیرہ تلاش کیں تو میرے سامنے یہ ساری باتیں آئیں۔ تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں بھی رمضان ہی کے روزے تھے، ان کا رمضان بھی سارا سال گھومتا تھا، انہیں بھی جولائی اور اگست کے روزے تنگ کرتے تھے اور انہوں نے بھی یہی تجویز اپنے علماء کے سامنے پیش کی۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کے علماء نے ان کی بات مان لی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے علماء نے فیصلہ کیا کہ ٹھیک ہے لوگوں کو یہ سہولت دے دیتے ہیں کہ کسی اچھے موسم میں روزے رکھ لیا کرو۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ چونکہ یہ ہم روزوں کے اصل نظام میں گڑبڑ کر رہے ہیں، اس لیے تیس روزے تو پورے رکھیں گے لیکن ساتھ دس روزے کفارے کے بھی رکھیں گے۔ چنانچہ یہ جو مذہبی عیسائی چالیس روزے رکھتے ہیں اور ایسٹر ان کی عید الفطر ہوتی ہے جو اپریل کے پہلے عشرے کے دوران میں کسی اتوار کو یہ قرار دے دیتے ہیں۔ گویا مارچ کا مہینہ اور اپریل کا کچھ حصہ، یعنی تیس روزے پورے اور ساتھ دس کفارے کے۔

میں نے مضمون نگار سے کہا کہ بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل والوں نے گڑبڑ کی تھی تو تیس سے چالیس روزوں پر گئے تھے۔ جبکہ تم ہم سے گڑبڑ کروا رہے ہو تو تیس سے کم کر کے اٹھائیس روزوں پر لے جا رہے ہو۔ میں نے کہا، کچھ خدا کا خوف کرو یار۔ تین سال اٹھائیس کے اور چوتھے سال انتیس کے جبکہ تیسواں روزہ بالکل ختم جو کہ سب سے مشکل روزہ ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ تفسیری روایات کے مطابق بنی اسرائیل میں بھی رمضان چاند کا مہینہ تھا، اور وہ بھی سارے سال میں گھومتا تھا، انہوں نے اپنی سہولت کے لیے اس میں ردوبدل کی۔ لیکن اسلام نے سابقہ پوزیشن بحال کر دی کہ روزے رمضان کے ہی ہوں گے اور سارے موسموں میں اسی طرح گردش کریں گے۔ جبکہ روزے کا دورانیہ کم کر کے رات خارج کر دی گئی کہ صبح طلوع فجر سے روزہ شروع ہو گا اور غروب آفتاب تک رہے گا۔ یہ اسلام نے روزے کے نظام میں دو بڑی اصلاحات کیں۔

رمضان المبارک میں جناب نبی کریمؐ کے معمولات کیا ہوتے تھے؟ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان اور غیر رمضان میں حضورؐ کے معمولات میں تین باتوں کا فرق ہوتا تھا۔

1. پہلا فرق تو روزے کا ہی تھا کہ باقی سال کسی مہینے میں حضورؐ پورا مہینہ روزے نہیں رکھتے تھے۔ پیر و جمعرات یا پھر قمری مہینے کے درمیان کے تین روزے رکھتے تھے۔ آپؐ شعبان میں کثرت سے روزے رکھتے تھے اور پھر رمضان کے مکمل روزے رکھتے تھے۔ رمضان کے مکمل روزے ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہیں، بلا مجبوری اس کا ترک کبیرہ گناہ ہے، مجبوری کے ساتھ ترک کرنے پر قضا واجب ہے، جبکہ بعض سورتوں میں کفارہ یا فدیہ دینا ضروری ہے۔

2. دوسرا فرق حضرت عائشہؓ یہ بتلاتی ہیں کہ رمضان میں حضورؐ کی قرآن مجید کی تلاوت باقی سال سے دگنی ہو جاتی تھی۔ باقی سارا سال بھی حضورؐ کا معمول یہ ہوتا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت کثرت سے کرتے تھے۔ آپؐ خود تلاوت کرتے تھے اور دوسروں سے سنتے بھی تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی عبادت ہے اور اہتمام کے ساتھ قرآن مجید سننا بھی عبادت ہے۔ دونوں پر حضورؐ نے یکساں ثواب بتلایا ہے۔ فرمایا کہ قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی ہو تو پڑھنے والے کو بھی ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور سننے والے کو بھی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ باقاعدہ نیت کے ساتھ سنا جائے، سننے کا خاص اہتمام ہو اور آداب کے ساتھ سنا جائے۔

قرآن مجید سننے کے آداب کیا ہیں، اس کا دو باتوں سے اندازہ کر لیجئے۔ ایک تو حکم ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ کے ساتھ سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر (اللہ کی) رحمت ہو۔ یعنی کان متوجہ ہوں جبکہ زبان بے حرکت ہو، یہ تلاوت قرآن مجید سننے کے آداب میں سے ہے۔ جب حضرت جبریلؑ حضورؐ کے پاس وحی لے کر آتے اور آپؐ کو قرآن مجید کی تلاوت سناتے تو حضورؐ ان سے قرآن مجید سنتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ پڑھتے بھی جاتے تھے۔ ابتداء میں آپؐ کا یہ معمول رہا، اس خیال سے کہ جو کچھ سنا ہے وہ بھول نہ جائے اور

کوئی لفظ آگے پیچھے نہ ہو جائے۔ لیکن اللہ رب العزت نے یہ کہہ کر اس بات سے منع فرمادیا کہ آپ (وحی ختم ہونے سے پہلے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کریں تاکہ آپ اسے جلدی جلدی پڑھ لیں، بے شک اس کا (آپ کے دل میں) جمع کرنا اور (آپ سے) پڑھا دینا ہمارے ذمے ہے، پھر جب آپ اس کی قرأت کر چکیں تو اس کی قرأت کا اتباع کیجیے، پھر بے شک اس کا کھول کر بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ اللہ تعالی نے حضورؐ سے فرمایا کہ قرآن مجید سن رہے ہوں تو زبان کو حرکت مت دیں اور جلدی نہ کریں، یہ فکر دل سے نکال دیں کہ یہ آپ سے بھول جائے گا۔ اللہ رب العزت نے نبی کریمؐ سے قرآن مجید کے حوالے سے تین باتوں کا وعدہ کیا ہے۔ (۱) آپؐ کے سینے میں قرآن محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ (۲) آپ کی زبان سے قرآن کی صحیح تلاوت کروانا ہماری ذمہ داری ہے۔ (۳) اور پھر قرآن کا مفہوم اور مطلب آپ کے دل میں ڈالنا ہماری ذمہ داری ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ حضورؐ قرآن مجید سنتے ہوئے قرآن مجید ہی پڑھتے تھے کوئی اور بات نہیں کرتے تھے لیکن اللہ تعالی نے اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ قرآن مجید کی اس آیت سے ہمیں اندازہ کر لینا چاہیے کہ قرآن مجید کے سننے کے آداب کیا ہیں۔ آج کل ہم جس طرح قرآن مجید سنتے ہیں، کیا اس کی اجازت ہوگی؟ قرآن مجید پڑھا جا رہا ہوتا ہے اور ہماری گپ شپ چل رہی ہے، ہماری توجہ اور رخ کہیں اور ہوتے ہیں۔ قرآن مجید اگر آداب کے ساتھ سنا جائے تو اس کا ثواب و اجر بہت ہے۔ یہ عبادت بھی ہے، سنت بھی ہے اور ثواب میں قراءت کے بالکل برابر ہے۔ جناب نبی کریمؐ جس طرح اہتمام سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے اسی طرح اہتمام کے ساتھ قرآن مجید سنتے بھی تھے۔

صحابہ کرامؓ میں قرآن مجید کے بڑے بڑے قاری تھے، میں اس وقت ان میں سے دو قاریوں کا ذکر کرتا ہوں۔ حضورؐ نے خود چند صحابہؓ کو بڑا قاری کہا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے متعلق کہا کہ یہ سب سے بڑا قاری ہے۔ پھر حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو موسی اشعریؓ، حضرت سالم مولی ابی حذیفہؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ۔ یہ چار پانچ صحابہ کرامؓ ہیں جن کو حضورؐ نے امت

کے بڑے قاری قرار دیا ہے۔ حضرت ابو موسی اشعریؓ کا لہجہ بہت اچھا تھا، ان کی سر اور آواز بہت اچھی تھی، خوبصورت انداز میں قرآن مجید پڑھتے تھے۔ ان سے جناب نبی کریمؐ نے فرمایا لقد اوتیت من مزامیر آل داوود کہ ابو موسی تیری گردن میں تو داوود علیہ السلام کے خاندان کی سر فٹ ہوگئی ہے۔ ”مزمار“ سر کو کہتے ہیں۔ یہ حضورؐ کی طرف سے ابو موسیؓ کے لیے ایک تمغہ تھا۔ اس بارے میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک دفعہ نبی کریمؐ نے ابو موسی اشعری سے کہا کہ ابو موسی! رات میں اور عائشہؓ، ہم دونوں میاں بیوی تمہارے محلے میں کسی کام سے گئے تھے، واپس آتے ہوئے آدھی رات کا وقت تھا، تمہارے گھر کے سامنے سے گزرے تو تم گھر میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اور باہر آواز آرہی تھی۔ تمہاری آواز سن کر ہم دونوں وہیں کھڑے ہوگئے اور کچھ دیر باہر کھڑے کھڑے تمہارا قرآن سنتے رہے۔ ابو موسیؓ نے حسرت سے کہا، یا رسول اللہ! مجھے پتہ نہیں چلا، اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ آپ باہر کھڑے ہیں تو میں اور زیادہ لے اور مزے سے پڑھتا۔ وہ کیا عجیب تلاوت ہوگی جس نے حضورؐ کے قدم روک لیے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ بھی بڑے قاری تھے۔ یہ وہ قاری تھے جن کے بارے میں جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جو آدمی قرآن مجید ایسا تازہ پڑھنا چاہتا ہے جیسے نازل ہو رہا ہو تو ابن ام عبد کے طریقے پر پڑھو۔ عبد اللہ ابن مسعودؓ کی کنیت ابن ام عبد تھی۔ عبد اللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھے ایک دن بلایا اور فرمایا، عبد اللہ مجھے قرآن مجید سناؤ۔ عبد اللہؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ پر تو قرآن مجید نازل ہوتا ہے، میں آپ کو سناؤں؟ جناب نبی کریمؐ نے فرمایا، ہاں تم مجھے قرآن مجید سناؤ اس لیے کہ میں جس طرح قرآن مجید پڑھنے کا ثواب حاصل کرتا ہوں اسی طرح سننے کا ثواب بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں محدثین فرماتے ہیں کہ یہ ہماری تعلیم کے لیے تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جس طرح پڑھنا سنت ہے اسی طرح سننا بھی سنت ہے۔ جس طرح قرآن مجید پڑھنا عبادت ہے اسی طرح توجہ کے ساتھ سننا بھی عبادت ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ پڑھتے بھی تھے اور سنتے بھی تھے۔

حضرت ابو موسی اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ دونوں بڑے قاری، عالم اور فقیہ تھے۔ ان دونوں کو حضورؐ نے یمن کے ایک ایک حصے کا گورنر بنا دیا تھا۔ یعنی یمن کے ایک حصے کا گورنر ایک کو جبکہ دوسرے حصے کا گورنر دوسرے کو۔ دونوں ایک دوسرے کے پاس ملاقات کے لیے آیا جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں میں مکالمہ ہوا۔ معاذ ابن جبلؓ نے ابو موسی اشعریؓ سے پوچھا کہ بھئی تم قرآن مجید کیسے پڑھتے ہو، تمہارا کیا معمول ہے۔ ابو موسی اشعریؓ نے کہا کہ میں تو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر وقت بس پڑھتا ہی رہتا ہوں۔ ان کے جواب میں ابو موسی اشعریؓ نے معاذ ابن جبلؓ سے پوچھا کہ آپ قرآن مجید کیسے پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھئی مجھ سے تو ایسے نہیں ہوتا، میرا تو قرآن مجید پڑھنے کا وقت بھی مقرر ہے اور طریقہ بھی۔ آدھی رات سو کر اٹھتا ہوں، وضو کر کے تازہ دم ہوتا ہوں اور پھر نماز میں کھڑے ہو کر تسلی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہوں۔ مجھ سے تو یہ چلتے پھرتے نہیں پڑھا جاتا۔ یہ دونوں کا اپنا اپنا ذوق تھا اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک تھے۔ دونوں صحابیؓ ہیں اور دونوں بڑے قاری ہیں۔

ہمارے گوجرانوالہ میں ایک بزرگ ہوتے تھے حضرت مولانا حافظ شفیق الرحمانؒ جامعہ خیر المدارس جالندھر کے فاضل تھے، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کی انتظامیہ کے صدر رہے ہیں، اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائیں۔ ان کی کریانے کی دکان تھی، دکان پر ہی بچوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ بہت اچھے حافظ تھے، مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں انہوں نے پچیس سال قرآن مجید سنایا۔ ان کے بعد اتنا ہی عرصہ اللہ تعالی نے مجھے توفیق عطا فرمائی، الحمد للہ۔ تو حافظ شفیق الرحمن صاحب ہر وقت پڑھتے رہتے تھے، سودا بیچتے ہوئے، بازار میں جاتے ہوئے، لیٹے ہوئے، بیٹھے ہوئے، میں جب بھی انہیں دیکھتا تھا وہ قرآن مجید پڑھ رہے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے ان سے دو سوالات کیے۔ ایک سوال تو سنجیدہ تھا جبکہ دوسرا سوال ذرا دل لگی کا تھا۔ میں نے پوچھا حضرت آپ کاروبار بھی کرتے ہیں، بچوں کو بھی پڑھاتے ہیں اور باقی معمولات بھی ہیں، آپ دن رات میں کتنا قرآن مجید پڑھ لیتے ہیں؟ حافظ

صاحب نے جواب دیا کہ ساری مصروفیات کے ساتھ ایک دن میں اٹھارہ پارے تو میرا معمول ہے لیکن بائیس تک بھی گیا ہوں۔ دوسرا سوال میں نے یہ کیا کہ حافظ صاحب آپ ہر وقت قرآن مجید پڑھتے رہتے ہیں، کہیں غیر اختیاری طور پر غسل خانے میں بھی تو نہیں پڑھتے رہتے۔ حافظ صاحب نے جواب دیا، یار کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اچانک مجھے خیال آتا ہے تو میں اپنی زبان روک لیتا ہوں کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں۔ خیر یہ بڑا اچھا زمانہ تھا، لوگوں کا اچھا ذوق تھا، لوگ کثرت سے قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ آج کل تو ہم ایک دو پارے پڑھ کر تھک جاتے ہیں۔

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں پہلی بار تراویح میں قرآن کریم ۱۹۶۲ء میں گکھڑ کے نواح میں ایک گاؤں بدوکی گوسائیاں میں سنایا۔ میں نے ۱۹۶۰ء میں قرآن مجید حفظ مکمل کیا تھا۔ اس دور کی بات ہے کہ ایک دفعہ ہم نے بدوکی گوسائیاں کی ایک بڑی مسجد میں شبینہ رکھ لیا، سردیوں کی لمبی راتیں تھیں، ہم باری باری ایک ایک پارہ پڑھتے تھے۔ ایک بزرگ حافظ صاحب ہوتے تھے حافظ یامین صاحب، اللہ غریق رحمت فرمائے، وہ بھی دکان دار تھے اور پانی پت کے تھے۔ پہلی رات میں نے تیسرا پارہ پڑھا تو حافظ یامین صاحب یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ بھئی یہ آپ لوگ کیسے پڑھ رہے ہیں، ذرا مجھے پڑھنے دیتے ہو؟ ہم نے کہا، ٹھیک ہے آپ پڑھ لیں۔ حافظ صاحب کھڑے ہوئے اور چوتھا پارہ شروع کر دیا۔ اب حافظ صاحب پڑھتے جا رہے ہیں اور پڑھتے جا رہے ہیں کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ یہاں تک کہ ہم سوچ میں پڑ گئے کہ یا اللہ حافظ صاحب کب رکوع کریں گے، لوگوں میں سے کچھ تو تھک کر بیٹھ گئے، کچھ نے نماز ہی توڑ دی۔ لیکن حافظ صاحب تو ایسے تھے کہ کہیں بھولتے بھی نہیں تھے کہ انہیں کوئی رکاوٹ ہو۔ چنانچہ سحری کا وقت ختم ہونے میں بیس پچیس منٹ رہ گئے تو ہم نے شور مچایا کہ خدا کے لیے بس کرو لوگوں کی سحری چلی جائے گی۔ چنانچہ حافظ صاحب نے سورہ یس پڑھ کر رکوع کیا۔ یہ تو میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ چوتھے پارے سے شروع کر کے سورہ یس ختم ہونے تک وہ پڑھتے رہے، اور رکے بھی ہمارے شور مچانے پر۔

تو میں نے عرض کیا کہ نبی کریمؐ کا رمضان میں قرآن مجید کی تلاوت کا معمول بڑھ جاتا تھا۔ آپ کی رات کی معمول کی تلاوت تو چلتی ہی تھی لیکن دن میں روزانہ حضرت جبرائیلؑ آتے تھے اور حضورؐ کے ساتھ قرآن مجید کا دور کرتے تھے۔ ہمارے ہاں جو حفاظ ایک دوسرے کو باری باری سناتے ہیں، ہم اسے دور کرنا یا تکرار کرنا کہتے ہیں۔ یہ جناب نبی کریمؐ اور جبرائیلؑ کی سنت ہے۔ دونوں رمضان میں روزانہ عصر سے مغرب تک دور کیا کرتے تھے یعنی ایک دوسرے کو قرآن مجید سنایا کرتے تھے۔

3. حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کا تیسرا معمول یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں عام دنوں سے زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔ حضورؐ سارا سال تو سخی ہوتے ہی تھے لیکن رمضان میں سخاوت کی حد ہو جاتی تھی۔ تمام سال حضورؐ کا معمول یہ ہوتا تھا کہ آپؐ کے دروازے سے کوئی سائل خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ جس سوالی یا ضرور تمند کی ضرورت آپؐ اپنے پاس سے پوری کر سکتے تھے، آپؐ کرتے تھے۔ لیکن جس کی ضرورت آپؐ خود پوری نہیں کر سکتے تھے، اس کی سفارش کر دیتے تھے، یعنی کسی ایسے آدمی سے کہہ دیتے تھے جس سے امید ہوتی کہ یہ اس ضرور تمند کی ضرورت پوری کر دے گا۔ اب جب حضورؐ کے کہنے پر کسی نے نیکی کی تو پہلا ثواب تو حضورؐ کو ہی پہنچا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ نہ خود ضرورت پوری کر سکتے تھے اور نہ کوئی ایسا آدمی ہی ملتا تھا جو سوالی کی ضرورت پوری کر سکتا۔ ایسے ہی ایک واقعہ میں ایک شخص آیا کہ یا رسول اللہ میں آپ کا مہمان ہوں، آپ مجھے کھانا کھلائیں۔ آپؐ نے اپنے سب گھروں سے باری باری پتہ کیا لیکن کسی گھر سے کھانے کے لیے کچھ نہ ملا۔ حضورؐ نے مجلس میں کہا کہ کوئی ہے جو میرے مہمان کو کھانا کھلا دے۔ ابو طلحہ انصاریؓ اٹھے اور کہا یا رسول اللہ! میں کھلاتا ہوں۔ ابو طلحہؓ گھر گئے، جا کر بیوی سے پوچھا کہ کھانے کے لیے کچھ ہے؟ بیوی نے کہا، ہاں ایک آدمی کا کھانا ہے، یا تم کھا لو، یا میں کھا لوں یا پھر مہمان کو کھلا دو۔ بچے بھی بھوکے ہیں۔ ابو طلحہؓ نے کہا کہ حضورؐ کا مہمان ہے، اب اسے تو ہم واپس نہیں کر سکتے۔ بچوں کو کسی طریقے سے بہلا پھسلا کر سلا دو اور کھانا دستر خوان پر رکھ دو۔ مجھے تو اخلاقاً ساتھ

بیٹھنا ہے اس لیے تم ایسا کرنا کہ کسی بہانے چراغ بجھا دینا۔ میں ساتھ بیٹھ کر بہانے سے اپنا منہ ہلاتا رہوں گا، اس طرح مہمان کھانا کھالے گا۔ چنانچہ اس طرح انہوں نے مہمان کو کھانا کھلایا۔ اس صحابی کی شان میں قرآن کی یہ آیت اتری ”ویوثرون علی انفسہم“ (سورہ الحشر:۹) اور وہ (مہاجرین کو) اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان پر فاقہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں انصار مدینہ کی شان ذکر فرمائی۔ یعنی حضورؐ کو خود میسر ہوتا تو دے دیتے ورنہ سفارش کر دیتے۔ لیکن اگر پھر بھی کام نہ بنتا تو دعا دے دیتے تھے کہ اللہ تمہاری ضرورت پوری کرے۔ میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ ان میں سے بڑا عطیہ کون سا تھا؟ ایک آدمی کو حضورؐ سے کھانا مل گیا لیکن دوسرے کو حضورؐ کی دعا مل گئی۔ تو زیادہ کس کو ملا، جس کو کھانا ملا یا جس کے لیے حضورؐ کے ہاتھ اٹھے؟ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کے در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا اور رمضان میں تو حضورؐ اتنے سخی ہوتے تھے ”کالریح المرسلۃ“ کہ گرم موسم میں چلنے والی ٹھنڈی ہوا کی طرح حضورؐ کی سخاوت ہوتی تھی۔ یہاں (ورجینیا، امریکہ) میں پتہ نہیں کیسا موسم ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں سخت حبس کے موسم اور شدید گرمی کے عالم میں جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو کیا مزے کا وقت ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان میں تو کوئی بھی حضورؐ کے فیض سے محروم نہیں رہتا تھا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے رمضان المبارک کے حوالے سے حضورؐ کے یہ تین معمولات بیان کیے ہیں۔

حضرات محترم۔ رمضان شروع ہو رہا ہے، ہمیں اس کی تیاری کرنی چاہیے اور اس کے لیے اپنے اوقات کو فارغ کرنا چاہیے۔ ہماری عام تیاری تو یہ ہوتی ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء کے متعلق اہتمام کرتے ہیں کہ گھی پورا ہے، پراٹھے ملیں گے یا نہیں، دہی تو کم نہیں پڑ جائے گا وغیرہ۔ لیکن ہمیں جناب نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے طریقے کے مطابق تیاری کرنی چاہیے۔ اپنے اوقات کو نماز، تلاوت قرآن، تراویح اور تہجد کے لیے فارغ کرنا چاہیے۔ اور اس مقصد کے لیے ہمیں رمضان المبارک کے دوران اپنی باقی سال کی روز مرہ کی مصروفیات کو کم کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہمیں اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ و خیرات کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ رمضان المبارک کا مہینہ عبادات کا سیزن ہوتا ہے۔ جناب نبی

کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو آدمی اس سیزن میں خدا کو راضی نہ کر سکا وہ بڑا بد نصیب ہے۔ وہ آدمی جس کو صحت، تندرستی اور عافیت کی حالت میں رمضان ملا لیکن وہ اللہ کو راضی نہ کر سکا تو ظاہر ہے کہ وہ خوش نصیب نہیں ہے۔ میں اس کا محاورے کی زبان میں اس طرح ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ جس کاروباری آدمی نے سیزن میں کمائی نہیں کی تو اس نے باقی سارا سال کیا کمانا ہے؟ جس نے سیزن میں چار پیسے نہیں بنانے اس نے باقی سال کیا بنانا ہے۔

چنانچہ رمضان المبارک عبادات کا سیزن ہے، اس میں تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ ثواب ملتا ہے۔ بسا اوقات ہمیں یہ اشکال ہوتا ہے کہ یار اتنا چھوٹا سا عمل ہے اور مولوی صاحب اتنا بڑا ثواب بتا رہے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس میں مولوی صاحب کا کوئی دخل نہیں ہے، مولوی صاحب کا کام تو صرف بتانا ہوتا ہے، اصل احکامات تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اب یہی ثواب والی بات قرآن مجید سے پوچھ لیں۔ رمضان کی ایک رات زیادہ سے زیادہ کتنی لمبی ہوگی۔ سات آٹھ گھنٹے، سردیوں میں بارہ چودہ گھنٹے، اگر ناروے بھی چلے جائیں تو بیس گھنٹے کی ہو جائے گی۔ لیکن اللہ تعالی ایک رات پر ثواب کتنا دے رہے ہیں کہ ایک شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ رات وہی دس بارہ گھنٹے کی ہے لیکن اللہ تعالی ایک رات کی عبادت کے بدلے میں ایک ہزار مہینہ نہیں بلکہ ایک ہزار مہینے سے بہتر کا بدلہ دے رہے ہیں۔ اللہ تعالی تو نیت دیکھتے ہیں۔ فارسی کا ایک چھوٹا سا شعر ہے۔

رحمت حق بہا، نہ می جوید

رحمت حق بہانہ می جوید

کہ اللہ کی رحمت یہ نہیں دیکھتی کہ عمل کتنا بڑا کیا ہے بلکہ اللہ کی رحمت عمل کرنے والے کی نیت دیکھتی ہے اور بہانہ تلاش کرتی ہے کہ مجھے کچھ دینے کے لیے بہانہ دو۔ اللہ کے ہاں ثواب کا مدار عمل کی مقدار پر نہیں بلکہ ان دلی کیفیات پر ہوتا ہے جو اس عمل کے پیچھے کار فرما ہوتی ہیں۔ نیت، خلوص، توجہ اور عمل کی کیفیات۔ میں حوالے کے لیے ایک اور بات عرض کرتا ہوں، جناب نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ میرا صحابیؓ ایک مد جو خرچ کرے اور تم ایک احد پہاڑ سونے کا خرچ کرو تو یہ میرے صحابیؓ کی ایک مد جو کے برابر نہیں ہے۔ اب احد پہاڑ سونے کا اور دو چار کلو جو، ان کا آپس میں کیا موازنہ ہو سکتا ہے؟ حضورؐ کے فرمان کے

مطابق یہ دونوں برابر نہیں ہیں، اس لیے کہ صحابیؓ کے عمل کے پیچھے جو قلبی کیفیات ہیں وہ دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔

ایک بات مزید عرض کر کے میں اپنی بات سمیٹتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کم از کم ثواب کی حد تو بتائی ہے کہ کسی عمل پر دس سے کم نیکیاں نہیں دوں گا لیکن کسی بھی نیکی کی زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں بتائی کہ اس سے زیادہ نہیں دوں گا۔ یہ وعدہ تو قرآن مجید میں کیا ہے کہ دس سے کم نہیں دوں گا۔ ایک نیکی کے بدلے دس، ستر یا سات سو نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ جس فارمولے پر بھی بات کر لیں یہ سب کم سے کم کے فارمولے ہیں۔ کسی نیکی اور عبادت پر زیادہ سے زیادہ ثواب کی اللہ تعالیٰ نے کوئی حد نہیں بتائی۔ اب یہ ہماری ہمت اور خلوص پر ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کی حد اسے بتانی پڑتی ہے جسے کوئی بجٹ پرابلم ہو کہ اس سے زیادہ میرے پاس نہیں ہیں، کہاں سے دوں گا۔ جیسے حکومتوں کو بجٹ پرابلمز ہوتے ہیں کہ فلاں مد میں ہمارے پاس اتنا فنڈ ہے، اس سے زیادہ ہم نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی بجٹ پرابلم نہیں ہے وہ جتنا چاہے دے سکتا ہے۔ میں ان گزارشات کے ساتھ عرض کروں گا کہ رمضان المبارک شروع ہونے والا ہے، ہمیں کوشش بھی کرنی چاہیے، دعا بھی کرنی چاہیے اور رمضان المبارک کے لیے بطور خاص تیاری بھی کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اس رمضان المبارک کو ہمارے لیے دنیا و آخرت دونوں حوالوں سے بابرکت بنائے، باعث ثواب بنائے، باعث اجر بنائے، اور ہمیں اس مہینے، اس سیزن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

تعلیم اور دہشت گردی: حکومت کی ذمہ داری کیا ہے؟

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۶ اگست ۲۰۰۸ء)

وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی نے یوم پاکستان کی تقریب کے موقع پر بچوں اور ان کے والدین سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ بچوں کو تعلیم کے لیے سکول نہ بھیجنے والے والدین کو جرمانے کیے جائیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ تعلیم کو عام کیا جا سکے۔ انہوں نے کہا

کہ دہشت گردی کو روکنے کے لیے بھی تعلیم ضروری ہے کیونکہ دہشت گردی وہیں ہو رہی ہے جہاں جہالت ہے۔

جہاں تک تعلیم کے فروغ کے لیے سختی کرنے کی ضرورت ہے ہم وزیر اعظم سے اتفاق کرتے ہیں اور اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان سے گزارش کرتے ہیں کہ تعلیم کے فروغ اور خواندگی کے تناسب میں اضافہ کے لیے حکومت کو سختی کے ساتھ سنجیدہ پیش رفت کرنی چاہیے۔ بلکہ وزیر اعظم نے تو پرائمری کی سطح تک تعلیم کو لازمی کرنے کی بات کی ہے جبکہ ہم میٹرک تک تعلیم کو لازمی قرار دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کو بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جس سطح تک تعلیم قانونی طور پر لازمی ہو وہاں تک تعلیم مفت بھی ہو اور اس کے مناسب انتظامات حکومت کی طرف سے کیے جائیں۔ صرف تعلیم کو لازمی قرار دینے اور بچوں کو سکول نہ بھیجنے والوں کو جرمانہ کر دینے سے بات نہیں بنے گی بلکہ ملک کی آبادی کے تناسب سے تعلیم کے لیے مناسب ماحول پیدا کرنا اور اس کے لیے ضروری وسائل بلامعاوضہ فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

تعلیم کا فروغ اور ملک کے ہر شہری کو ضروری تعلیم سے آراستہ کرنا ہماری ملکی و قومی ذمہ داری اور ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی دینی ذمہ داری بھی ہے۔ اس سلسلہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا ایک واقعہ پیش کرنا چاہوں گا۔ حضرت امام بخاریؒ نے ''الوحدان'' کے نام سے ایک الگ رسالہ لکھا ہے جس میں ان صحابہ کرامؓ کی روایات بیان کی ہیں جن سے صرف ایک ایک روایت منقول ہے۔ ان میں ایک صحابیؓ حضرت ابزی خزاعیؓ بھی ہیں۔ حضرت ابزی خزاعیؓ سے امام بخاریؒ واقعہ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک روز جمعۃ المبارک کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے اردگرد کے لوگوں کو سکھاتے پڑھاتے نہیں ہیں، انہیں سمجھاتے نہیں ہیں اور انہیں نیکی اور بدی کا فرق نہیں بتاتے۔ پھر فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے درمیان موجود اہل علم سے پڑھتے سیکھتے نہیں ہیں، ان سے فہم و دانش حاصل نہیں کرتے اور علم و تفقہ سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ ان دو طبقوں کا ذکر کرنے کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ دونوں طبقے اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں ورنہ میں ان دونوں کے لیے اس دنیا میں سزا مقرر کروں گا۔

یہ روایت فقہ حنفی کے امام محمد حسن شیبانیؒ نے بھی اپنی کتاب ''الکسب'' میں بیان کی ہے اور فقہاء کرامؒ نے اس حدیث سے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ حکومت کو تعلیم کے معاملے میں لوگوں پر جبر کا حق حاصل ہے، اس لیے کہ جناب رسول اکرمؐ تعلیم حاصل نہ کرنے والوں اور تعلیم نہ دینے والوں کے لیے اس دنیا میں سزا مقرر کرنے کا اعلان فرما رہے ہیں۔

حضرت ابزی خزاعیؓ کہتے ہیں کہ خطبۂ جمعہ کے دوران جناب رسول اللہؐ کے اس اعلان کے بعد مدینہ منورہ میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ رسالت مآبؐ نے یہ بات عمومی طور پر کی ہے یا کسی خاص طبقے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ لوگوں میں بات چلتے چلتے اس نتیجہ پر پہنچی کہ آپؐ نے یہ بات اشعری خاندان کے بارے میں فرمائی ہے کیونکہ ان کا ماحول ایسا ہے کہ درمیان میں پڑھے لکھے لوگوں کی بستی ہے اور اردگرد چاروں طرف ان پڑھ اور بدو لوگ بستے ہیں اور ان میں تعلیم و تعلم کے حوالہ سے کوئی باہمی رابطہ نہیں ہے۔ حضرت ابو موسی اشعریؓ اور ان کے ساتھ بنو اشعر قبیلہ کے کچھ خاندان یمن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے اور عام آبادی سے ہٹ کر انہوں نے اپنا الگ محلہ بسا لیا تھا جسے اشعریوں کا محلہ کہا جاتا تھا۔ اشعریوں کو صحابہ کرامؓ میں قراء و فقہاء کا خاندان کہا جاتا تھا یعنی وہ پڑھی لکھی فیملی تھی۔ بلکہ حضرت ابو موسی اشعریؓ امت کے بڑے قاریوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے حسن قراءت کی تعریف آنحضرتؐ نے بھی کی ہے۔ اشعریوں کے اس محلے کے اردگرد کسان، باغبان اور دیہاتی لوگ رہتے تھے جن کا پڑھنے لکھنے سے زیادہ واسطہ نہیں تھا اس لیے عام لوگوں کی نظر ادھر چلی گئی کہ جناب نبی اکرمؐ نے یہ بات ان کے بارے میں فرمائی ہے۔ اشعریوں کو معلوم ہوا تو وہ تشویش سے دوچار ہوئے، باہمی مشورہ کیا اور تصدیق کے لیے ان میں سے کچھ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت ابزی خزاعیؓ کا کہنا ہے کہ اشعریوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کہ عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ آپؐ نے خطبہ جمعہ میں جو یہ بات فرمائی ہے وہ ہم اشعریوں کے بارے میں فرمائی ہے، کیا یہ بات درست ہے؟ آنحضرتؐ نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا اور اس کے ساتھ جمعہ کے موقع پر کہی گئی وہ بات اشعریوں کے اس وفد کے سامنے پھر دہرا دی۔ ان حضرات نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! کیا دوسرے لوگوں کی کوتاہی کی سزا ہمیں ملے گی؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے تو تعلیم حاصل کر لی ہے اگر ہمارے اردگرد

کے دوسرے لوگ تعلیم حاصل نہیں کرتے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے اور اس کی سزا ہمیں کیوں ملے گی؟ آپؐ نے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیا جس کا مطلب محدثین یہ بیان فرماتے ہیں کہ جہاں علم نہ رکھنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ماحول میں اہل علم کو تلاش کر کے ان سے تعلیم حاصل کریں وہاں اہل علم کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھیں اور جو لوگ تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہیں انہیں تعلیم دینے کا اہتمام کریں۔ یہ مشترکہ ذمہ داری ہے جس میں دونوں طبقے شریک ہیں اور اس کے بارے میں دونوں مسئول ہیں۔ رسالت مآبؐ کی زبان مبارک سے یہ جواب سن کر اشعریوں نے درخواست کی کہ ہمیں اس کوتاہی کی تلافی کے لیے ایک سال کی مہلت دی جائے جو نبی اکرمؐ نے عطا فرما دی۔ چنانچہ اس کے بعد اشعریوں نے ایک سال تک بھرپور وقت لگا کر اپنے اردگرد کے لوگوں میں تعلیم کا ماحول پیدا کیا اور اپنی گزشتہ کوتاہی کی تلافی کی۔

اس لیے جہاں تک معاشرے میں تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے کے لیے حکومتی اقدامات بلکہ سختی کا تعلق ہے یہ تو اسلامی تعلیمات کا تقاضہ اور سنت نبویؐ ہے۔ ہم وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کے اس عزم کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں، اللّٰہم ربنا آمین۔ لیکن انہوں نے اس کے ساتھ یہ جو فرمایا ہے کہ ہم تعلیم کو اس لیے فروغ دینا چاہتے ہیں تاکہ دہشت گردی پر قابو پایا جا سکے اور یہ بھی کہا ہے کہ دہشت گردی وہاں ہو رہی ہے جہاں تعلیم عام نہیں ہے۔ وزیراعظم محترم کی ان باتوں سے ہمیں اختلاف ہے اور ان کے اس ارشاد کو ہم بہت بڑے مغالطے کا نتیجہ سمجھتے ہوئے اس کی وضاحت میں کچھ معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

1. ہمارے خیال میں دہشت گردی پر قابو پانا تعلیم کے فوائد میں تو ہو سکتا ہے مگر یہ اس کے مقاصد میں سے نہیں ہے۔ تعلیم تو صرف تعلیم کے لیے ہونی چاہیے، اگر وہ سوسائٹی کو تعلیم یافتہ بنانے کے مقصد کو سامنے رکھ کر ہوگی تو اس کے فوائد خود بخود حاصل ہوں گے۔ لیکن اگر کسی خاص فائدے کو ہدف بنا کر تعلیم کا ماحول قائم کیا جائے گا تو تعلیم کا دائرہ صرف اس ایک فائدے کے گرد گھومتا رہے گا اور تمام تر تعلیمی ترجیحات اسی کے حوالے سے طے پائیں گی جس سے تعلیم کا اصل مقصد اور اس کے دیگر فوائد نگاہوں سے اوجھل رہیں گے۔ اس لیے تعلیم کے پروگرام کو کسی ایک فائدے پر ''فوکس'' نہ کیا جائے بلکہ

عمومی ملی مقاصد اور بے شمار متنوع فوائد کے مجموعی تناظر میں تعلیمی پالیسیاں مرتب کی جائیں۔

2. دوسری بات یہ کہ کیا دہشت گردی کی وجہ صرف غربت اور جہالت ہے؟ یہ بات معروضی حقائق کے حوالے سے درست نہیں ہے اس لیے کہ عالمی سطح پر مبینہ دہشت گردی کا الزام سب سے زیادہ جن افراد پر عائد کیا جا رہا ہے وہ نہ ان پڑھ ہیں اور نہ ہی غریب ہیں بلکہ وہ اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ اور آج کے معیار کی اعلیٰ تعلیم کے حامل ہیں۔ ان تعلیم یافتہ لوگوں کی اسلحہ برداری اگر دہشت گردی ہے تو اس کی وجہ غربت یا جہالت نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف مغرب کا معاندانہ رویہ اور فلسطینیوں، کشمیریوں، عراقیوں اور افغانیوں کے خلاف وحشیانہ جارحیت ہے جس کے خلاف ردعمل کے طور پر امت مسلمہ کے کچھ لوگوں نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ ہمارے نزدیک مغرب اس ردعمل کو دہشت گردی قرار دے کر اور اس کی وجہ غربت اور جہالت بتا کر اپنے جرائم پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے منتخب وزیراعظم کو اس سلسلہ میں بات کرتے ہوئے محتاط رہنا چاہیے۔

حدیثِ قُدسی کسے کہتے ہیں؟

(دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۱ جولائی ۲۰۰۸ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عنایت اور اس کی مہربانی وفضل ہے کہ سال میں ایک مرتبہ آپ حضرات سے ملاقات ہو جاتی ہے اور یوں دین کی کچھ باتیں کہنے اور سننے کا موقع مل جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ میری اس حاضری قبول فرمائیں اور دین کے حوالے سے جو بھی گفتگو ہو، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق بھی عطا فرمائیں۔ میرا چند سالوں سے معمول ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے کسی ایک پہلو پر گفتگو ہوتی ہے۔ ایک سال بخاری شریف کی ”ثلاثیات“ پر بات ہوئی، ایک سال مسلم شریف کے ”باب الفتن“ کے بارے میں گفتگو ہوئی، اور ایک سال ابن ماجہ کی ”کتاب السنن“ پر خطاب کا موقع ملا۔ اس سال بھی احادیث مبارکہ ہی کے ایک پہلو ”احادیث قدسیہ“ کا انتخاب کیا ہے جو کہ احادیث کریمہ میں ایک مستقل شعبہ ہے۔

حدیث و سنت کسے کہتے ہیں؟

اہل علم کے ہاں حدیث اور سنت میں تھوڑا سا تکنیکی فرق ہے لیکن عام لوگوں کے ہاں یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی میں سمجھے جاتے ہیں۔ محدثین کی اصطلاح میں ایک قولی حدیث ہے، ایک فعلی حدیث ہے اور ایک تقریری حدیث ہے۔

1. ''قولی حدیث'' یہ ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے کوئی بات ارشاد فرمائی اور کسی صحابیؓ نے وہ بات سن کر آگے روایت کر دی کہ میں نے حضورؐ سے یہ بات یوں سنی ہے۔

2. ''فعلی حدیث'' کا معنی یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تو کچھ نہیں لیکن کسی صحابیؓ نے جناب نبی کریمؐ کو کوئی کام کرتے دیکھا اور آگے روایت کر دیا کہ میں نے حضورؐ کو فلاں کام یوں کرتے دیکھا۔

3. ''تقریری حدیث'' یہ ہے کہ حضورؐ نے خود نہ کچھ فرمایا اور نہ کوئی عمل کیا، لیکن کسی صحابیؓ نے کوئی بات کہی یا کوئی عمل کیا جو رسول اللہؐ کے علم میں آیا، اس پر حضورؐ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ خاموشی کا معنی یہ ہے کہ حضورؐ نے منع نہ فرما کر صحابیؓ کے اس قول یا عمل کی تصدیق کر دی۔

4. ایک اور بات بھی محدثین کے ہاں حدیث میں شمار کی جاتی ہے کہ کسی صحابیؓ نے حضورؐ کا حوالہ دیے بغیر کوئی ایسی بات کہی جو عقل، قیاس اور رائے سے معلوم نہیں کی جا سکتی۔ تو ایسی بات بھی حدیث میں شمار کی جاتی ہے کہ اس صحابیؓ نے لازماً یہ بات حضورؐ سے ہی سنی ہے۔ مثلاً کوئی صحابی قیامت کے بارے میں کوئی بات کہتا ہے کہ قیامت کے روز ایسا ہوگا۔ اب قیامت کے بارے میں کوئی بات آدمی اپنی عقل یا رائے سے تو نہیں بتا سکتا۔ اور یہ بات بھی طے ہے کہ حضورؐ کا صحابی عمداً کوئی غلط بات نہیں کہتا۔ لہٰذا یہاں یہ کہا جائے گا کہ صحابیؓ نے ضرور یہ بات حضورؐ سے سنی ہوگی۔ یا مثال کے طور پر کوئی صحابی انسانی تخلیق سے پہلے کی کوئی بات بیان کرتا ہے کہ فلاں کام یوں ہوا تھا۔ اب یہ بات بھی عقل، قیاس یا رائے سے معلوم نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ظاہر بات ہے کہ صحابیؓ نے یہ بات حضورؐ سے سنی ہوگی۔ اسی طرح قبر، جنت اور دوزخ

وغیرہ کے متعلق باتیں جن کا علم حضورؐ کے بتائے بغیر معلوم نہ ہو سکے، ایسی تمام باتیں حدیث ہی شمار ہوں گی۔

حدیث قدسی کسے کہتے ہیں؟

احادیث مبارکہ میں ایک شعبہ ہے احادیث قدسیہ کا۔ ”حدیث قدسی“ اسے کہتے ہیں کہ جناب نبی کریمؐ اللہ تعالیٰ سے روایت فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا۔ یعنی ان احادیث میں حضورؐ راوی ہیں۔ ایسی باتیں ماضی کی بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا تھا، حال کی بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یوں ارشاد فرما رہے ہیں، اور مستقبل کی بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یہ ارشاد فرمائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے جو بات جناب نبی کریمؐ نقل فرماتے ہیں اسے حدیث قدسی کہتے ہیں۔ ایسی باتیں حضورؐ کے ارشادات میں نہیں شمار ہوتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات میں شمار ہوتی ہیں۔

قرآن کریم بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور حدیث قدسی بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے۔ قرآن کریم کا ایک ایک جملہ، ایک ایک آیت، اور ایک ایک سورت اللہ کا کلام ہے۔ قرآن کریم کو ہم تک پہنچانے والے جناب نبی کریمؐ ہیں۔ اسی طرح حدیث قدسی بھی اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی بات ہے۔ حدیث قدسی کو بھی ہم تک پہنچانے والے جناب نبی کریمؐ ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم اور حدیث قدسی میں کیا فرق ہے؟ قرآن کریم اور حدیث قدسی میں دو بنیادی فرق ہیں۔

1. پہلا فرق یہ ہے کہ قرآن کریم میں بات بھی اللہ تعالیٰ کی ہے اور الفاظ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ جبکہ حدیث قدسی میں بات تو اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن الفاظ اللہ تعالیٰ کے ضروری نہیں ہیں بلکہ جناب نبی کریمؐ نے اپنے الفاظ میں اللہ کا پیغام ہم تک پہنچایا۔ جس طرح ہم روزمرہ زندگی میں کسی شخص سے یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی تک میرا یہ پیغام پہنچا دو۔ اب اس شخص کے لیے بعینہ میرے الفاظ میں پیغام پہنچانا ضروری نہیں ہوتا بلکہ وہ میرا پیغام اپنے الفاظ میں مطلوبہ شخص تک پہنچا سکتا ہے۔ احادیث مبارکہ میں بھی یوں ہوتا ہے کہ اکثر احادیث کے الفاظ صحابہ کرامؓ کے اپنے ہوتے ہیں لیکن ان میں پیغام حضورؐ کی طرف سے ہوتا ہے۔ بہت سی احادیث میں حضورؐ کے اپنے الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں لیکن اصل بات حضورؐ کے پیغام کا نقل ہونا ہے، آپؐ کے اپنے الفاظ کا نقل ہونا

ضروری نہیں ہے۔ قرآن کریم میں الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے ہیں اور پیغام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لیکن حدیث قدسی میں یہ ضروری نہیں ہے کہ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہوں۔ جناب نبی کریمؐ اپنے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی بات کا مفہوم بیان فرماتے ہیں۔

2. دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ، آیات اور سورتیں قطعی ہیں۔ ان میں کوئی تردد نہیں ہے کہ فلاں آیت قرآن کی ہے یا نہیں، یا فلاں سورت قرآن کی ہے یا نہیں۔ لیکن حدیث قدسی میں باقی احادیث کی طرح سند کے اعتبار سے فیصلہ کریں گے کہ یہ حدیث کس درجے کی ہے، صحیح ہے یا ضعیف۔ جس طرح باقی احادیث میں یہ امکان موجود ہے کہ کوئی کمزور راوی حضورؐ کی بات بیان کرتا ہے کہ حضورؐ نے یوں فرمایا، اسی طرح احادیث قدسیہ میں بھی یہ امکان موجود ہے کہ محدثین یہ بات کہہ دیں کہ فلاں حدیث کی سند کمزور ہے۔ باقی احادیث کی طرح یہ سارے امکانات احادیث قدسیہ میں بھی موجود ہیں کہ حدیث صحیح بھی ہو سکتی ہے، ضعیف بھی ہو سکتی ہے، متواتر بھی ہو سکتی ہے اور موضوع بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ امکان نہیں ہے کہ الحمد للہ رب العالمین سے لے کر من الجنۃ والناس تک ہر حرف قطعی ہے اور کسی بھی حرف پر شک جائز نہیں ہے۔ جبکہ احادیث قدسیہ میں سند پر بات ہوگی۔ جتنی مضبوط سند ہوگی حدیث بھی اتنی صحیح شمار ہوگی۔ سند صحیح ہے تو روایت صحیح ہے، سند کمزور ہے تو روایت بھی کمزور ہے، اور سند اگر جعلی ہے تو روایت بھی جعلی ہے۔

احادیث قدسیہ سینکڑوں ہیں اور ہر درجہ کی ہیں۔ یہ مجموعہ جو اس وقت میرے سامنے موجود ہے یہ چالیس احادیث قدسیہ کا منتخب مجموعہ ہے۔ مصر کے ایک عالم الشیخ علی الدین محمد ابراہیم نے اس مجموعہ کا انتخاب اس اہتمام کے ساتھ کیا ہے کہ ان تمام احادیث کی سندیں صحیح ہیں۔ ان میں زیادہ تر تو بخاری و مسلم کی ہیں، چند ایک دوسری احادیث کی کتب سے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ خیال کیا ہے کہ ایسی احادیث لیں جن کی روایت کے صحیح ہونے میں انہوں نے پوری تسلی کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کے غضب پر رحمت غالب رہے گی

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما قضی اللہ

الخلق کتب فی کتابہ علی نفسہ فھو موضوع عندہ ان رحمتی تغلب غضبی او کما صلی اللہ علیہ وسلم او کما قال اللہ عزوجل۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں لکھ دیا جو اس کے پاس موجود ہے کہ بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔

یہ حدیث صحاح ستہ کی چار کتابوں میں روایت ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ اس حدیث میں حضورؐ مخلوقات کے آغاز کی بات فرما رہے ہیں کہ اللہ رب العزت نے جب کائنات اور اس کی مخلوقات کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تو اس سے پہلے ایک اور فیصلہ کر کے لکھ لیا۔ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں صفات ہیں جن میں اثباتی بھی ہیں اور سلبی بھی۔ اثباتی یہ کہ اللہ تعالیٰ رحم کرنے والے ہیں اور رزق دینے والے ہیں۔ سلبی یہ کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ جھوٹ نہیں بولتے اور اللہ تعالیٰ کوئی برا کام نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ’اللہ‘ ہے جبکہ باقی جتنے نام بھی ہم پڑھتے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے معروف ۹۹ نام ہم پڑھتے ہیں جو کہ احادیث میں بھی ہیں، ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اور بھی بہت سے صفاتی نام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے دو بڑے نام ہیں القہار اور الرحیم۔ ان بطش ربک لشدید اسی طرح ان اللہ غفور الرحیم۔

اللہ کی صفات میں قہر بھی ہے اور جبر بھی، رحم بھی ہے اور مغفرت بھی۔ جب اللہ تعالیٰ کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو ان کی پکڑ بھی بہت سخت ہے لیکن اللہ تعالیٰ رحمان اور رحیم بھی ہیں۔ اسی لیے ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا الایمان بین الرجاء والخوف کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان کی کیفیت کا نام ہے۔ انسان ایک ہی پہلو پر اعتقاد رکھ لے کہ اللہ تعالیٰ بہت قہار اور جبار ہے، اللہ تعالیٰ تو سزا دے کر ہی رہیں گے۔ یا پھر انسان بالکل یہی بات دل میں بٹھا لے کہ اللہ تعالیٰ کسی بات پر پکڑے گا ہی نہیں، جو مرضی کرتے رہیں اللہ تو غفور و رحیم اور مہربان و رحمان ہے۔ یہ دونوں باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ بلکہ ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا بھی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے رحمت و مغفرت کی امید بھی رکھنی چاہیے۔ نبی کریمؐ کی اس حدیث مبارکہ کی رو سے آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف بھی ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے رحم کی امید بھی۔

چنانچہ اس حدیث قدسی میں یہ فرمایا کہ لما قضی اللہ الخلق اللہ تعالیٰ نے جب مخلوقات کو پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اس سے پہلے کتب فی نفسہ علی نفسہ وھو موضوع عندہ اللہ

تعالیٰ نے اپنے بارے میں ایک فیصلہ کیا اور اسے لکھ لیا۔ وہ فیصلہ یہ تھا ان رحمتی تغلب غضبی کہ میرے غصے پر میری رحمت ہمیشہ غالب رہے گی۔ یعنی جب بھی غصے اور رحمت کا مقابلہ ہوگا، رحمت کو غلبہ حاصل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کو جھٹلانا اور گالی دینا

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قال اللہ تعالیٰ کذبنی ابن ادم ولم یکن لہ ذلک وشتمنی ولم یکن لہ ذلک اَما تکذیبہ ایای فقولہ لن یعیدنی کما بدأنی ولیس اول الخلق باھوی علی من اعادتہ واما شتمہ ایای فقولہ اتخذ اللہ ولدا وانا الاحد الصمد لم الد ولم اولد ولم یکن لی کفوا احد او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلا دیا جو اس کے لیے مناسب نہیں ہے اور آدم کے بیٹے نے مجھے گالی دی ہے جو اس کے لیے مناسب نہیں ہے، اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں اسے مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھاؤں گا اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے حالانکہ میں اکیلا ہوں نہ میں کسی سے پیدا ہوا اور نہ مجھ سے کوئی پیدا ہوا۔

لن یعیدنی کما بداءنی کہ جب انسان موت کے بعد اپنے دوبارہ اٹھائے جانے سے انکار کرتا ہے کہ جب میں ختم ہو جاؤں گا کہ تو اللہ تعالیٰ مجھے کیسے دوبارہ اٹھائیں گے، تو یہ دراصل میری قدرت کو جھٹلاتا ہے۔ حضرات انبیاءؑ نے بنیادی طور پر تین عقیدوں کی تعلیم دی۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اللہ تعالیٰ کا رسولوں کے ذریعے بندوں کو ہدایات دینا، اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی، جس میں حساب کتاب ہوگا۔ انسان جب فوت ہو جاتا ہے تو بعث بعد الموت یعنی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کم و بیش ہر پیغمبر کے مخاطبین نے موت کے بعد کی زندگی کو جھٹلایا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر مختلف انبیاء کی قوموں کی طرف سے اس عقیدے کو جھٹلانے کا ذکر کیا ہے ءاذا کنا ترابا وعظاما ءانا لمخرجون اور ءاذا متنا وکنا ترابا وعظاما ءانا لمبعوثون۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بعث بعد الموت کا انکار دراصل میری قدرت کا انکار ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں کما بدءنا اول خلق نعیدہ وعدا علینا۔ انا کنا فاعلین کہ جیسے ہم نے پہلے پیدا کیا ایسے ہی ہم دوبارہ پیدا کریں گے اور یہ ہمارا وعدہ ہے ہم یہ ضرور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلے بھی ہم نے بنایا اب بھی ہم ہی

بنائیں گے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا افعیینا بالخلق الاول کیا ہم ایک بار بنا کر تھک گئے ہیں؟ بلکہ ایک مقام پر تو عجیب بات فرمائی کہ ایحسب الانسان الن نجمع عظامہ بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی بکھری ہوئی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکتے؟ بلکہ ہم تو یہ بھی قدرت رکھتے ہیں کہ تمہاری انگلیوں کے پوروے دوبارہ بنا دیں۔ انسان کی ہڈیاں جب خاک میں مل جائیں گی ریزہ ریزہ ہوجائیں گی توکیا ہم اکٹھی نہیں کر سکتے؟ اس بھول میں نہ رہنا، ہم تو یہ قدرت بھی رکھتے ہیں کہ تمہاری انگلیوں کے فنگر پرنٹس بھی دوبارہ وہی بنادیں۔ یعنی ہم اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ تمہیں بعینہ ایسے ہی بنادیں جیسے کہ تم مرنے سے پہلے تھے۔ پوروے برابر کرنے کا معنی یہ ہے کہ فنگر پرنٹس بھی وہی ہوں گے جو مرنے سے پہلے تھے۔ جب انسان یہ اعتراض کرتا ہے کہ کون ہڈیاں جمع کرے گا اور کون دوبارہ زندہ کرے گا تو اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ یہ دراصل میری قدرت کو جھٹلاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا ولیس اول الخلق باھون علی من اعادتہ کہ ان بے وقوفوں سے پوچھو کہ پہلی دفعہ بنانا مشکل ہوتا ہے یا دوبارہ بنانا؟ جب اللہ تعالی نے پہلی دفعہ انسان کو بنالیا تو اس کا اعادہ کرنا کیا مشکل ہے؟

پھر اللہ تعالی نے انسان کے گالی دینے کا مطلب بیان فرمایا کہ جب انسان یہ کہتا ہے کہ فلاں اللہ کا بیٹا ہے یا فلاں اللہ کی بیٹی ہے تو وہ دراصل اللہ تعالی کو گالی دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے اس بات کو اتنی بڑی گالی قرار دیا ہے کہ تکاد السموت یتفطرن منہ و تنشق الارض وتخر الجبال ہدا، ان دعوا للرحمن ولدا۔ اس لیے کہ اولاد انسان کی حاجت و ضرورت ہے جبکہ اللہ ہر قسم کی ضرورت سے پاک ہے۔ اب یہ بات کہنا کہ اللہ تعالی کو فلاں چیز کی ضرورت ہے یا اللہ تعالی فلاں چیز کا محتاج ہے، یہ دراصل اللہ تعالی کو گالی دینا ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا کہ میں تو احد ہوں، نہ میں کسی سے پیدا ہوا اور نہ مجھ سے کوئی پیدا ہوا۔

چنانچہ اس حدیث قدسی میں اللہ تعالی نے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ پہلی یہ کہ جو آدمی مرنے کے بعد کی زندگی سے انکار کرتا ہے وہ دراصل میری قدرت کا انکار کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو آدمی میرے لیے بیٹا یا بیٹی کا عقیدہ رکھتا ہے وہ دراصل مجھے محتاج قرار دیتا ہے جو کہ میرے لیے ایک گالی ہے۔

اسلام اور شہری حقوق و فرائض۔ غیر مسلم معاشرے کے تناظر میں

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جولائی ۲۰۰۸ء)

(برطانیہ کے ایک تحقیقاتی فورم کی طرف سے موصولہ سوالنامہ کے جواب میں حسب ذیل گزارشات پیش کی گئی ہیں۔ یہ ذاتی مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں جن کے کسی بھی پہلو سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ راشدی)

۱- جمہوریت اور انصاف

سوال ۱: سماجی زندگی پر اثر انداز ہونے کے لیے فیصلہ سازی اور انتخابی عمل میں فعال حصہ لینے، ایک شہری کی حیثیت سے متحرک کردار ادا کرنے اور جمہوریت کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: اسلام ایک مسلمان کو اور کسی اسلامی مملکت کے ایک شہری کو سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں حصہ لینے اور سوسائٹی کی بہتری کے لیے کردار ادا کرنے کا نہ صرف حق دیتا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ قرآن کریم میں "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کے تحت جو ہدایت دی گئی ہے، وہ اس کی واضح علامت ہے، اس لیے کہ بر و تقوی اور اثم و عدوان کا اطلاق صرف ذاتی نیکی اور بدی پر نہیں ہوتا بلکہ سوسائٹی کا اجتماعی خیر و شر اور نفع و ضرر بھی اس کے دائرے میں شامل ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک سے جو مسلمان نقل مکانی کر کے مغربی ممالک میں گئے ہیں اور انہوں نے ان ممالک کو اپنا وطن بنا لیا ہے تو جہاں وہ ان ممالک کے وسائل اور سہولتوں سے استفادہ کر رہے ہیں، وہاں اس سوسائٹی کا بھی ان پر حق ہے کہ وہ اسے کچھ دیں۔ اس ملک اور سوسائٹی نے مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے اور وہ اسے بھرپور طریقے سے وصول کر رہے ہیں، لیکن صرف لینا اور لیتے ہی چلے جانا انصاف کی بات نہیں ہے اور اس سوسائٹی کو کچھ دینا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

اس سلسلے میں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور ہم انہیں بہت کچھ

دے سکتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے پاس دنیا کے وسائل اور سہولتوں کی فراوانی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے اور یہ ہمیں ان سے بہرہ ور کر رہے ہیں، لیکن ان کے پاس روح کا سکون اور آخرت کی نجات کا سامان نہیں جو بحمد اللہ تعالی تمام تر خرابیوں کے باوجود ہمارے پاس موجود ہے، وہ ہم انہیں دے سکتے ہیں اور یہ ہماری دینی ذمہ داری بھی ہے کہ ہم وہ انہیں مہیا کریں۔ میں نے چند سال قبل ٹونگھم برطانیہ میں ایک بڑے پادری صاحب سے اس سلسلے میں بات کی اور ان سے پوچھا کہ مغربی سوسائٹی میں خاندانی سسٹم کی بربادی اور روحانی سکون کے فقدان کے حوالے سے جو صورت حال ہے، کیا وہ اس سے مطمئن ہیں؟ انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ یہ صورت حال ہمارے لیے بڑی پریشان کن ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اس کا حل کیا ہے؟ تو انہوں نے بڑے صاف انداز میں یہ بات کہہ دی کہ ”ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے، ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں“۔

جمہوریت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

- حکومت کی تشکیل عوام کی رائے اور مشورہ سے ہوگی، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانشین نامزد کرنے کی بجائے اس کا انتخاب لوگوں کی اجتماعی صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔
- حکومت خاندانی نہیں ہوگی، جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں بننے والے خلفاء حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا نسبی وارث نہیں تھا۔
- حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہوگی، جیسا کہ حضرت ابوبکر نے اپنے پہلے خطبے میں عام لوگوں کا یہ حق تسلیم کیا کہ ”میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔“ یا جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اور بعد میں بھی عام لوگ خلفاء کے طرز عمل پر کھلے بندوں انہیں ٹوک دیا کرتے تھے اور خلفاء کو بعض اوقات اپنے فیصلے واپس بھی لینا پڑتے تھے۔
- حکمران اپنے معاملات عوام کے مشورہ سے چلائیں گے۔ عوامی معاملات عام لوگوں کے مشورہ سے اور علمی و فنی معاملات اہل علم و فن کی مشاورت سے چلانے کے بارے میں خلفائے راشدینؓ کے طرز عمل

کا ذکر تاریخ کی بہت سی روایات میں موجود ہے، بلکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے امور میں جن میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی، عام لوگوں یا متعلقہ لوگوں سے مشاورت کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنی رائے کے خلاف عمومی مشاورت کی رائے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمائی ہے، جیساکہ غزوۂ احد کے موقع پر ہوا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر حملہ آور لشکر کا مقابلہ کیا جائے، لیکن نوجوان صحابہ کے اصرار پر آپ نے مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

- ایک اسلامی ریاست میں قرآن و سنت کی بالادستی کو تسلیم کرنا اور ان کے واضح احکام کی پابندی حکمرانوں اور رعیت، دونوں کے لیے ضروری ہے اور ان میں سے کوئی بھی قرآن و سنت کے صریح احکام سے انحراف کا مجاز نہیں ہے، نیز قرآن و سنت کے صریح احکام کو بطور قانون نافذ کرنا مسلمان حکمرانوں کی منصبی ذمہ داری ہے، جیساکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا تھا کہ ”اپنے حکمران کی اطاعت کرو، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، جب تک کہ وہ تم میں کتاب اللہ کے احکام کو نافذ کرے“، اور خلیفہ اول سیدنا ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں اعلان کیا تھا کہ ”میری اطاعت تم پر واجب ہے، جب تک میں قرآن و سنت کی پابندی کروں اور اگر اس سے انحراف کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔“

سوال ۲: اسلام اس بات کی کیسے حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ (سیاسی دائرے میں) مختلف صورت حال میں جائز اور ناجائز کے مابین امتیاز ہوجائے، تاکہ نوجوان درست فیصلہ کر سکیں؟

جواب: اسلام ہر شخص کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس بات کو قانون کے حوالے سے غلط اور باہمی حقوق کے حوالے سے زیادتی سمجھتا ہو، اس کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ سوسائٹی کے اجتماعی نقصان کی صورت میں یہ آواز اٹھانا اور معروف ذرائع سے اس کے سدباب کی عملی کوشش کرنا اس کے مذہبی فرائض میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی میں خیر کے فروغ اور شر کے سدباب کے لیے محنت کرنا بھی ہر

شخص کا حق بلکہ اس کی ذمہ داری ہے۔

ایک اسلامی ریاست میں قرآن و سنت کی خلاف ورزی اور غیر مسلم ریاست میں مسلمہ دستور و معاہدات کی خلاف ورزی پر ایسا کرنے والوں کو ٹوکا جا سکتا ہے اور جہاں حق تلفی ہو رہی ہو اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، اور اس روک ٹوک، نشان دہی اور احتجاج کے لیے وہ سب ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں جو اس دور اور علاقے میں معروف اور تسلیم شدہ ہوں۔ حضرت معاویہؓ رومیوں کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے اپنا لشکر لے کر روم کی سرحد کی طرف جا رہے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ مدت ختم ہونے تک سرحد تک پہنچ جائیں گے اور مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر دیں گے، لیکن حضرت عمرو بن عبسہؓ نے انہیں روک دیا اور کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی رو سے اگر کسی قوم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ ہو تو جنگ بندی کی میعاد ختم ہونے سے پہلے اس کے خلاف فوجوں کو حرکت میں لانا درست نہیں۔ حضرت معاویہؓ یہ سن کر راستے سے ہی واپس آ گئے اور فوج کو چھاؤنی میں بھیج دیا۔ اس طرح کے درجنوں واقعات خلفائے اسلام کے مختلف ادوار میں ملتے ہیں۔

سوال ۳: ایک جمہوری ڈھانچے میں انصاف کے حوالے سے اسلام کا تصور کیا ہے؟ (کیا عمومی عدالتی نظام قابل قبول نہیں اور مسلمانوں کی علیحدہ عدالتیں قائم کرنا ضروری ہے؟)

جواب: جمہوری ڈھانچے میں انصاف کے حوالے سے اسلام کا تصور حالات اور زمینی حقائق کی روشنی میں مختلف دائروں میں تقسیم ہے:

- جہاں مسلم اکثریت یا مسلم اقتدار ہے، وہاں اسلامی عدالتوں کا قیام ضروری ہے جو قرآن و سنت کے مطابق لوگوں کو انصاف فراہم کریں، مگر غیر مسلم اقلیتیں اپنے خاندانی معاملات اور مذہبی معاملات میں ان عدالتوں کی پابند نہیں ہوں گی اور ان کے فیصلے ان دو حوالوں سے ان کے مذہب و روایات کے مطابق کیے جائیں گے جس کے لیے عدالتی نظام بھی ان کے اطمینان کے مطابق فراہم کیا جائے گا۔
- جن ممالک میں مسلمان اکثریت یا اقتدار میں نہیں ہیں، وہاں چونکہ وہ ایک سماجی معاہدے کے تحت رہ رہے ہیں، اس لیے اس سماجی

معاہدہ (نیشنیلٹی کے قوانین) کی پابندی ان کے لیے ضروری ہے جو وہاں کی ریاستی عدالتوں کے ذریعے ہی ہوگا، البتہ مذہبی معاملات اور خاندانی احکام وقوانین میں ان کے مذہب کے مطابق عدالتی نظام کا فراہم کیا جانا ان کا حق ہے۔ اس حق کے لیے وہ کوشش کرتے رہیں گے اور اس کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کریں گے۔ نیز اس ملک کے عمومی قوانین میں اگر کوئی بات قرآن وسنت کے صریح احکام اور مسلمانوں کے کسی اجماعی عقیدہ سے ٹکراتی ہے تو وہ اس کے خلاف احتجاج کریں گے، اسے تبدیل کرانے کی کوشش کریں گے اور حکمرانوں کو اس کی طرف توجہ دلائیں گے اور اگر اس کے باوجود وہ تبدیل نہیں ہوتے تو مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں کہ یا وہ ملک چھوڑ دیں اور یا مجبوری کے درجے میں وہاں رہتے ہوئے اپنا احتجاج مسلسل ریکارڈ کراتے رہیں، مگر قانون کو ہاتھ میں لینے یا مروجہ سسٹم سے بغاوت کرنے کا ان کو اس سماجی معاہدہ کی رو سے حق نہیں ہوگا۔

سوال ۴: سماج میں امن قائم رکھنے کے لیے قانون کی اہمیت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ (سیاسی فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے قانون کی پابندی کرنے کی کیا اہمیت ہے؟)

جواب: اسلام سوسائٹی میں امن کو برقرار رکھنے اور اس کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے اور رائج الوقت قانون کی پابندی کا حکم دیتا ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”حاکم وقت اگر تمھاری حق تلفی بھی کر رہا ہو تو اس کی اطاعت کرو“۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور احتجاج کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ ان دونوں ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ ظلم وزیادتی کے خلاف احتجاج کرنا، اپیل کرنا اور آواز اٹھانا تو مظلوم کا حق ہے، لیکن قانون سے انحراف اور فیصلوں سے بغاوت کا اسے حق نہیں ہے۔ البتہ مسلم اقتدار کی صورت میں مسلمان حکمران کی طرف سے صریح کفر (کفر بواح) کے ارتکاب پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام مسلمانوں کو بغاوت کی اجازت دیتے ہیں جس کے لیے فقہائے کرام نے شرط لگائی ہے کہ اگر ”کفر بواح“ یعنی صریح کفر کے مرتکب مسلم حکمران کو عوامی بغاوت کے ذریعے تبدیل

کر دینے کا غالب امکان نظر آ رہا ہو تو ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ خواہ مخواہ عام لوگوں کو بدامنی کا شکار بنانا اور ان کی جان و مال کو خطرے میں ڈال دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ حکم اسلامی ریاست کے لیے ہے۔ غیر مسلم ریاست کے لیے ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ایسی صورت میں مسلمان یا ملک چھوڑ دیں اور یا اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے وہاں رہیں، لیکن قانون کی پابندی ان کے لیے ضروری ہوگی۔

اس وقت عالمی تناظر میں عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان وغیرہ کے حوالے سے مغربی حکومتوں کا جو طرز عمل ہے، اس کے بارے میں صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، بلکہ عالمی رائے عامہ اور غیر جانب دار مبصرین کا کہنا بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اس لیے مسلمانوں بالخصوص گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں اس کا ردعمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔ اس لیے آج کے ورلڈ میڈیا کی کھلی فضا میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں ردعمل کے پیدا ہونے کو تو کسی صورت میں نہیں روکا جا سکتا اور نہ ہی اس کے اظہار پر کوئی قدغن لگائی جا سکتی ہے، البتہ اس ردعمل کے اظہار کو مناسب حدوں کا پابند ضرور کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً برطانیہ میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ عراق، فلسطین، کشمیر، افغانستان یا کسی اور جگہ کے مسلمانوں کی مظلومیت پر ردعمل کا شکار نہ ہوں یا اپنے ردعمل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ ان سے یہ کہنا صریحاً زیادتی اور ناانصافی کی بات ہوگی، البتہ ہم ان سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اپنے جذبات اور ردعمل کے اظہار میں اپنے ملک کے احوال و ظروف، دستور و قوانین اور اپنے دیگر ہم وطنوں کے جذبات و احساسات کی ضرور پاس داری کریں اور اپنی حکومت، مسلمان بھائیوں اور دیگر برادران وطن کے لیے مشکلات پیدا نہ کریں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عبسہؓ کو قبول اسلام کے بعد اپنے قبیلے میں جا کر خاموشی کے ساتھ وقت گزارنے اور غلبہ اسلام کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ جانے کی ہدایت کی تھی۔ (صحیح مسلم) آپ نے حضرت ابوذر غفاری کو بھی قبول اسلام کے بعد اسی قسم کی ہدایت کی تھی۔ (صحیح بخاری) جنگ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور ان کے والد محترم دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ رہے تھے کہ راستے میں کافروں نے پکڑ لیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ آپ دونوں ہمارے خلاف جنگ میں حضرت محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ کفار کی قید سے رہا ہو کر دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہہ کر جنگ میں شرکت سے روک دیا کہ چونکہ آپ دونوں نے کفار کی یہ شرط منظور کر لی تھی، اس لیے آپ ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹا موجود ہوتے ہوئے بھی غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے۔ ان واقعات سے اس سلسلے میں اصولی راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

میری رائے میں حالیہ عالمی کشمکش میں ہمیں مغربی ممالک و اقوام کو اقوام و ممالک کی حیثیت سے اپنا حریف نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ جس طرح مسلم ممالک میں حکومتوں کے اہداف عوام کے اہداف و مقاصد سے مختلف ہیں، اسی طرح مغربی ممالک میں بھی حکومتوں اور بالادست قوتوں کے اہداف و عزائم کا عوام کے اہداف و مقاصد سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ان دونوں میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے مغرب کی رائے عامہ سے اس کی نفسیات اور ذہنی سطح کے مطابق براہ راست مخاطب ہو کر اس کے سامنے اپنا مقدمہ صحیح طور پر پیش کیا جا سکے تو مسلمان اپنے اختلاف اور احتجاج کو زیادہ مؤثر طریقے سے ریکارڈ کرا سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ جس ملک میں رہتے ہیں، وہاں کے دستور و قانون کی پوری طرح پابندی کریں اور اس کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے دین اور ملت کے لیے جو بھی کر سکتے ہوں، اس سے گریز نہ کریں۔ میں ایسی سرگرمیوں کے حق میں نہیں ہوں جن سے ملک کے دستور و قانون کی پابندی کا عہد متاثر ہوتا ہو اور عام مسلمانوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہو اور ایسی خاموشی کو بھی جائز نہیں سمجھتا جس میں اسلام اور مسلمانوں کے جائز حقوق اور ان کے حصول و تحفظ کے قانونی استحقاق سے بھی دستبرداری اختیار کر لی جائے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے درمیان اعتدال اور توازن کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور پوری ہوشیاری اور بیداری کے ساتھ اپنے ملی اور معاشرتی حقوق و مفادات کا تحفظ کرنا چاہیے۔

سوال ۵: رواداری اور احترام کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے، بالخصوص ان لوگوں کے حوالے سے جو مختلف اعتقادات اور پس منظر کے حامل اور مختلف روایتوں سے وابستہ ہیں؟

جواب: اسلام عقیدہ و مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے احترام کا حکم دیتا ہے، ایک دوسرے کے معبودوں اور مسلمہ بڑوں کے خلاف بدزبانی سے روکتا ہے، اپنے اپنے دائرے میں مذہبی احکام و روایات پر عمل کا حق دیتا ہے اور مذہبی آزادی کو تسلیم کرتا ہے، لیکن ایک اسلامی ریاست میں اسلامی روایات و اقدار کو کھلے بندوں چیلنج کرنے کا حق نہیں دیتا اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی بھی ریاست اپنے تمام شہریوں کو اپنے اپنے دائرے میں اپنے عقائد، کلچر اور روایات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیتی ہے، لیکن ریاست کے عمومی دستور و قانون اور ریاست کی تہذیبی بنیادوں کو چیلنج کرنے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہوتا۔

جہاں تک معاشرتی اور سماجی تعلقات کا تعلق ہے تو اسلام ابراہیمی مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ رواداری اور احترام کے رویے کی خصوصی تلقین کرتا ہے۔ سیرت نبوی میں اس کی جھلک حسب ذیل چند واقعات میں دیکھی جا سکتی ہے:

- مکی عہد نبوت میں جب روم کے مسیحیوں اور فارس کے مجوسیوں کے مابین جنگ میں رومیوں کو شکست ہوئی تو مسلمان بہت غمگین ہوئے۔ رومیوں کے ساتھ اس ہمدردی کو قرآن مجید نے بنظر استحسان دیکھا اور مسلمانوں کی تسلی کے لیے یہ وعدہ فرمایا کہ عنقریب رومیوں کو ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہوگا اور اس دن مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوگی۔
- ہجرت کے بعد ایک مخصوص عرصے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی تالیف قلب کے لیے ان کے قبلہ یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتے رہے۔
- فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کے نجات پانے کی خوشی میں مدینہ منورہ کے یہود محرم کی دس تاریخ کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موافقت میں عاشورا کا روزہ رکھنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا اور فرمایا کہ ”ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تم سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔“

• ایک انصاری نے یہ جملہ زبان سے ادا کرنے پر ایک یہودی کو تھپڑ مار دیا کہ: ”اس اللہ کی قسم جس نے موسی علیہ السلام کو تمام انسانوں پر فضیلت عطا کی ہے“ اور کہا کہ تم موسی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل قرار دیتے ہو؟ یہودی شکایت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ اس کی شکایت سن کر انصاری سے شدید ناراض ہوئے اور یہود کے مذہبی جذبات کی رعایت سے صحابہ کو اس بات سے منع فرما دیا کہ وہ ان کے سامنے انبیاء میں سے بعض کو بعض سے افضل قرار دیں۔

• ۹ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ جب عصر کی نماز کا وقت آیا اور انہوں نے نماز پڑھنی چاہی تو صحابہ نے ان کو روک دیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں نماز پڑھنے دو۔ چنانچہ انہوں نے مسجد نبوی ہی میں مشرق کی سمت میں اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی۔

• ایک شخص کا جنازہ گزرا تو آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو فرمایا: ”کیا وہ انسان نہیں ہے؟“

• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ان کے ساتھ معاشرتی اور قانونی معاملات میں ہر موقع پر عدل وانصاف کا رویہ اختیار فرمایا جس کی شہادت ایک موقع پر خود یہود نے یوں دی کہ: ”یہی وہ حق اور انصاف ہے جس کے سہارے زمین اور آسمان قائم ہیں۔“

• جن معاملات میں آپ کو کوئی واضح ہدایت نہیں ملی ہوتی تھی، ان میں آپ اہل کتاب کے قوانین اور طریقوں کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔

• لباس اور وضع قطع سے متعلق امور میں بھی آپ مشرکین کے مقابلے میں اہل کتاب کے طریقے کی موافقت کو پسند فرماتے تھے۔

سوال ٦: دوسرے مسلم گروہ، جو کسی مختلف مکتب فکر سے متعلق ہیں، ان کے ساتھ طرز عمل کے بارے میں اسلام کی کیا تعلیم ہے؟

جواب: اسلام کے دائرے میں شمار کیے جانے والے تمام مسلمان گروہوں کو جنہیں اسلامی اصطلاح میں اہل قبلہ کہا جاتا ہے، ایک اسلامی ریاست میں برابر کے حقوق حاصل ہیں اور تمام گروہوں کے معتقدات و جذبات کے احترام کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ فقہی اور اعتقادی اختلافات کی صورت میں ملک کا عمومی قانون اکثریت کے رجحانات کے مطابق ہوگا اور اقلیتی گروہوں کو اپنے مذہبی اور خاندانی معاملات اپنی اپنی فقہ کے مطابق طے کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ البتہ اہل قبلہ کے تعین میں یہ فرق ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ مثلاً ختم نبوت سے منحرف گروہوں (قادیانیوں اور بہائیوں وغیرہ) کو اسلام کے دعوے کے باوجود اس دائرے میں شامل نہیں کیا جائے گا اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے اجماعی فیصلے اور جذبات کا احترام ضروری ہوگا۔

جہاں تک مسلمانوں کے باہمی اعتقادی مسائل اور فقہی اختلافات کا تعلق ہے تو ان اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات مسلمانوں کے سامنے واضح ہونی چاہیے اور انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ کون سی بات کفر و اسلام کی ہے اور کون سی بات اولی اور غیر اولی کی ہے، کس اختلاف پر سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہے اور کون سے اختلاف کو کسی مصلحت کی خاطر نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر نظری، فقہی اور فروعی مباحث میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کے احترام اور برداشت کا رویہ باقی نہ رہے تو خالصتاً فروعی حتیٰ کہ اولی و غیر اولی کے جزوی اختلافات بھی بحث و مباحثہ میں اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ کفر و اسلام میں معرکہ آرائی کا تاثر ابھرنے لگتا ہے اور بیشتر اوقات اس سے خود اسلام کے تعارف میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر برطانوی معاشرہ اسلام کی تبلیغ و دعوت کا ایک وسیع اور ہموار میدان ہے، لیکن اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں یہاں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات، بالخصوص دیوبندی بریلوی کشیدگی ہے جس کے دل خراش اور سنگدلانہ مظاہروں نے یہاں کی مقامی آبادی کے سامنے اسلام اور مسلم معاشرہ کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جسے کشش، پسندیدگی یا قبولیت کا باعث کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کشیدگی کا اہتمام کرنے والے عناصر خواہ کوئی ہوں، انہوں نے اس کے ذریعے اپنے فرقہ وارانہ جذبات کی وقتی تسکین کا سامان شاید فراہم کر لیا ہو مگر اسلام کی قطعاً کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔

سوال ۷: عقیدہ و طرز حیات کے تنوع اور ان کے مابین انتخاب کی آزادی کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: عقیدہ اور طرز حیات کے تنوع کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور اسے سوسائٹی کا ناگزیر حصہ تصور کرتا ہے، لیکن چونکہ اسلام کے نزدیک آسمانی تعلیمات کی پابندی اور وحی الٰہی کو قبول کرنا ہی انسان کے لیے صحیح راستہ ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی محفوظ اور فائنل صورت قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و سنت ہے، اس لیے وہ اس سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا، بالکل اسی طرح جیسے آج کی مغربی قیادت ویسٹرن کلچر کو انسانی کلچر کی صحیح ترین اور فائنل شکل قرار دیتے ہوئے دنیا میں کسی قوم یا طبقہ کو اس سے انحراف کی اجازت نہیں دے رہی اور جہاں بھی ویسٹرن کلچر سے ہٹ کر کسی دوسرے کلچر کے سوسائٹی میں اسٹیبلش ہونے کا امکان نظر آتا ہے، وہاں مغربی ممالک طاقت کے اندھا دھند استعمال کے ذریعے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس معاملے میں اسلام اور مغرب کے نقطہ نظر میں اصولی طور پر اتفاق پایا جاتا ہے اور صرف اتنا فرق ہے کہ اسلام آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کو اس کی فائنل صورت (قرآن و سنت) میں انسانی سوسائٹی کی صحیح ترین اور حتمی شکل قرار دیتا ہے اور اس سے انحراف کو برداشت نہیں کرتا، جبکہ مغرب اپنے موجودہ کلچر کو حتمی اور فائنل سمجھتا ہے اور دنیا میں کسی کو اس سے ہٹ کر کوئی اور کلچر اختیار کرنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

سوال ۸: حکومت اور معاشرہ کے حوالے سے ایک شہری کے کردار اور ذمہ داریوں کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: اسلام ایک عام شہری کو ملکی معاملات میں شریک ہونے، ملک کے مشاورتی نظام کا حصہ بننے، خیر کے کاموں میں تعاون کے راستے تلاش کرنے اور شر کی راہ میں رکاوٹ بننے کا نہ صرف حق دیتا ہے، بلکہ اس کی تلقین کرتا ہے اور اسے مذہبی فرائض میں شمار کرتا ہے۔

سوال ۹: اسلام میں ارباب حل و عقد کو ان کے اعمال کے لیے جوابدہ ٹھہرانے کا طریقہ کیا ہے؟ (حکومت کے فیصلوں سے اختلاف اور ان پر تنقید کا درست طریقہ کیا ہے؟)

جواب: خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کا پہلا خطبہ اس سلسلے میں اسلامی مزاج کی صحیح

عکاسی کرتا ہے کہ اگر میں قرآن و سنت (یعنی قانون) کے مطابق چلوں تو میرا ساتھ دیتے رہو، اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام حاکم وقت کو عوام کے سامنے جوابدہ بناتا ہے اور عوام کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ حاکم وقت کو قانون کے خلاف چلنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ ٹوک دیں بلکہ اسے سیدھا کر دینے کے جو ذرائع میسر ہوں، وہ بھی اختیار کریں۔ حکام کو روک ٹوک کرنے اور انہیں سیدھا کر دینے کا کوئی متعیّن طریقہ اسلام نے نہیں طے کیا، بلکہ اسے حالات اور مواقع کی مناسبت سے کھلا چھوڑ دیا ہے اور اس کے لیے حالات زمانہ کے حوالے سے کوئی بھی مناسب طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آج کے دور میں ووٹ، سیاسی عمل، احتجاج اور میڈیا و لابنگ اس کی مروجہ اور معروف صورتیں ہیں۔

۲- حقوق اور فرائض

سوال ۱: حقوق اور فرائض کی ان مختلف قسموں کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے جن کا اثر فرد اور سماجی گروہوں، دونوں پر پڑتا ہے؟ (دوسروں کے حقوق کا کیسے خیال رکھا جائے، حقوق میں ٹکراؤ کی صورت میں کیا کرنا چاہیے اور اختلاف کے حدود اور آداب کیا ہیں؟)

سوال ۲: اسلام کی نظر کی اس بات کو یقینی بنانے کے حوالے سے حکومت کی ذمہ داری کیا ہے کہ مختلف تنظیموں اور افراد کے حقوق کے مابین توازن قائم رہے اور ان حقوق کو تحفظ فراہم کیا جائے؟

سوال ۳: ایسے مسائل کو اسلام کیسے ڈیل کرتا ہے جہاں حقوق کے مابین تصادم کی کیفیت پیدا ہو جائے؟ تصادم کے حل کے لیے اس کا تجویز کردہ طریقہ کیا ہے؟

جواب: مختلف افراد، طبقات یا گروہوں کے درمیان حقوق کے باہمی تصادم اور ٹکراؤ کی صورت میں اسلام انصاف، عدل اور قانون کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے اور کسی فریق کی ناجائز طرف داری سے روکتا ہے۔ اسی طرح وہ متصادم گروہوں کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کا ماحول قائم کرنے پر زور دیتا ہے اور ثالثی، محاکمہ اور گفت و شنید کے ذریعے ایک دوسرے کو قریب لانا اسلامی تعلیمات کا ایک مستقل باب ہے۔

عدل و انصاف کو قائم رکھنے اور افراد اور طبقات کو ایک دوسرے کی زیادتی سے

بچانے کے حوالے سے سب سے زیادہ ذمہ داری حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس ضمن میں خلفائے اسلام کے بہت سے واقعات بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں نقل کیا ہے کہ فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ شہر کا دورہ کرتے ہوئے مسیحیوں کی ایک عبادت گاہ میں گئے اور وہاں نماز کا وقت آ گیا تو وہ نماز کی ادائیگی کے لیے باہر آ گئے اور الگ جگہ نماز ادا فرمائی۔ اس پر بعض ساتھیوں نے دریافت کیا کہ امیر المومنین! وہ بھی تو عبادت گاہ تھی۔ اس جگہ نماز ادا کرنے میں کیا حرج تھا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں اس جگہ نماز ادا کر لیتا تو بعد میں تم نے وہاں مستقل قبضہ کر لینا تھا کہ یہاں ہمارے امیر المومنین نے نماز ادا کی ہے، اس لیے ہم اس جگہ مسجد بنائیں گے۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں پر اس طرح قبضہ کیا جائے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے خلافت کا منصب قبول کیا اور ذمہ داریاں سنبھال کر گزشتہ حکومتوں کے مظالم کی تلافی کا سلسلہ شروع کیا تو ان کے عدل وانصاف کے واقعات سن کر سمرقند کے غیر مسلم باشندوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ اب سے پندرہ سال قبل جب مسلم کمانڈر قتیبہ بن مسلم نے سمرقند فتح کیا تو اس شہر پر حملے سے قبل اسلامی احکام کے مطابق نہ تو انہیں اسلام کی دعوت دی اور نہ ہی دوسری شرائط پیش کیں بلکہ اچانک حملہ کر کے فتح کر لیا، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور اس کی تلافی ہونی چاہیے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبد العزیز کے خلیفہ بننے سے پندرہ برس قبل ہوئی تھی، لیکن انہوں نے اسے ماضی کے حوالے سے ٹالنے کی بجائے غیر مسلموں کی شکایت کی تلافی ضروری سمجھی اور جمیع بن حاضر الباجی کو اس شکایت کی انکوائری اور تصفیے کے لیے خصوصی قاضی مقرر کر دیا۔ انہوں نے تحقیقات کے بعد شکایت کو درست پایا تو اس پر فیصلہ صادر کر دیا کہ شہر پر قبضہ چونکہ اسلامی احکام کے مطابق نہیں ہوا، اس لیے مسلم افواج سمرقند شہر خالی کر دیں، چنانچہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہو گیا اور اسلامی افواج اس عدالتی فیصلے کا احترام کرتے ہوئے پندرہ سال قبل فتح کیا ہوا شہر خالی کر کے باہر کھلے میدان میں نکل آئیں۔

۳۔ تشخص اور تنوع

سوال ۱: کیا "مسلم تشخص" نام کی کوئی چیز موجود ہے؟ ایک غیر مسلم ریاست میں رہتے ہوئے مسلمان اپنے مذہبی تشخص اور اعتقادات کے ساتھ کس طرح وابستہ رہ سکتے ہیں؟ اس ریاست سے متعلق ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

جواب: "مسلم تشخص" یہی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک عقیدہ پر قائم ہیں، قرآن و سنت کے ساتھ واضح کمٹمنٹ رکھتے ہیں، اپنی تہذیبی شناخت کو باقی رکھنے پر مصر ہیں، خاندانی نظام میں مذہبی احکام سے ہٹ کر کسی مداخلت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کی مساجد و مکاتب اور دینی تعلیم کا بنیادی نظام یکساں ہے اور وہ دینی روایات کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان تمام معاملات میں دنیا بھر کے مسلمانوں میں پائی جانے والی یکسانیت واضح طور پر نظر آنے والی معروضی حقیقت ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے مرکز بیت اللہ شریف اور مدینہ منورہ میں بلا امتیاز حاضری دے کر ایک ہی طریقے سے اپنی کمٹمنٹ کا مسلسل اظہار کرتے رہتے ہیں۔

ایک مسلمان کے کسی غیر مسلم ملک (مثلاً برطانیہ) کا شہری ہونے کا مطلب اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ ہے کہ وہ:

- خود کو برطانیہ کا شہری تصور کرے۔
- جس معاہدے کے تحت وہ شہری بنا ہے، اس کی پابندی کرے۔
- قانون و دستور اور سسٹم کو چیلنج نہ کرے۔
- اپنے مذہب اور کلچر پر برقرار رہنے کے مسلمہ حق سے دستبردار نہ ہو۔
- ملکی قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہبی احکام پر عمل کرے اور اپنے دیگر مسلمان برادران وطن بلکہ ملک سے باہر کے مسلمانوں کے ساتھ بھی بھائی چارے اور باہمی تعاون و حمایت کا قانونی حق استعمال کرے، البتہ قانون اور سسٹم کو چیلنج نہ کرے اور اس حوالے سے میرے نزدیک دنیا کے کسی بھی ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جن حقوق کو یہودی اس ملک کے قانون کی پابندی اور عالمی سطح پر یہودیوں کے مفادات و حقوق کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

- ملک کے سیاسی نظام میں شریک ہو اور مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے ساتھ ساتھ ملک کی عمومی آبادی اور عام شہریوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ اور ملک و قوم کے اجتماعی مفاد کے لیے کردار ادا کرے۔
- اگر ملک کے دستور و قانون میں کوئی بات اپنے عقیدہ اور مسلمہ حق کے خلاف سمجھتا ہے تو اس کے لیے معروف طریقوں سے آواز اٹھائے، لابنگ کرے اور پالیسی سازوں کو اپنے موقف پر قائل کرنے کی ہر ممکنہ صورت اختیار کرے۔

سوال ۲: کیا وقت کے ساتھ ساتھ 'تشخص' کے بدلنے کے حوالے سے کوئی اسلامی نقطہ نظر موجود ہے جس میں اس امر کی گنجائش مانی جاتی ہو کہ "کسی ملک (مثلاً برطانیہ) کا شہری ہونے کا کیا مطلب ہے؟" کے سوال کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جا سکتا ہے؟

جواب: اسلام ایک مسلمان کے بنیادی تشخص (مثلاً اسلام پر قائم رہنے اور قرآن و سنت کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ برقرار رکھنے) میں تغیر کو قبول نہیں کرتا اور ہر حال میں ایک مسلمان کو اس کی پابندی کا حکم دیتا ہے، البتہ وقت کے ساتھ ساتھ تشخص و تنوع میں جزوی تغیر کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور یہ فطری بات ہے۔ آج کے عالمی ماحول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گلوبلائزیشن کا دور ہے اور تہذیبوں کے اختلاط کا دور ہے کیونکہ فاصلے اس قدر سمٹ گئے ہیں کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان صدیوں سے قائم سرحدیں پامال ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان حدود اور فاصلوں کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا، منطقی طور پر یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کہ مختلف تہذیبوں کے اختلاط کے دور میں اسلام کیا راہ نمائی کرتا ہے؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات میں اس بارے میں واضح راہ نمائی موجود ہے اور احادیث کے ذخیرے میں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا جو امام بخاریؒ نے کتاب النکاح میں بیان کی ہے اور اس تفصیلی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کے بہت سے خاندان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو مہاجرین اور انصار کی خاندانی روایات میں واضح فرق موجود تھا۔ مہاجرین کے ہاں کسی عورت کا

خاوند کو کسی بات پر ٹوکنا یا اس کی کسی بات کو رد کرنا سرے سے متصور نہیں تھا جبکہ انصار کے خاندانوں میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ خاوند کو کسی بات پر ٹوک سکتی ہیں، کسی بات کا جواب دے سکتی ہیں اور کسی بات سے انکار بھی کر سکتی ہیں۔ حضرت عمرؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انہیں ایک روز ان کی بیوی نے کسی بات پر ٹوک دیا تو انہیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے بیوی کو ڈانٹا۔ بیوی نے جواب دیا کہ مجھے ڈانٹنے کی ضرورت نہیں، یہ تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی ہوتا ہے کہ ان کی ازواج مطہرات کسی بات پر ٹوک دیتی ہیں اور کسی بات کا جواب بھی دے دیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اسے اس بات سے تعبیر کیا کہ انصار کی عورتوں کی عادات ہماری عورتوں پر اثر انداز ہوتی جا رہی ہیں چنانچہ حضرت عمرؓ اسی غصے کی حالت میں سیدھے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے گھر پہنچے جو ان کی بیٹی تھیں اور انہیں سمجھایا بجھایا کہ ایسا مت کیا کرو۔ وہ تو بیٹی تھیں، خاموش رہیں مگر یہی بات جب حضرت عمرؓ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے کہنا چاہی تو انہوں نے آگے سے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ "آپ نے میاں بیوی کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی ہے؟" حضرت عمرؓ نے یہ واقعہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ فرمایا کہ "آخر ام سلمہ ہے"۔

یہ دو علاقائی ثقافتوں اور معاشرتی روایات کے اختلاط اور ٹکراؤ کا قصہ ہے اور میری طالب علمانہ رائے ہے کہ تہذیبوں کے اختلاط اور مختلف ثقافتوں کے باہمی میل جول کے مسائل میں یہ روایت اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس سے ہمیں راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے اور دور نبوی کے اس طرز کے واقعات اور روایات و احادیث کی روشنی میں آج کے عالمی حالات کے تناظر میں اصول و ضوابط وضع کرنے چاہئیں کہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تال میل میں کہاں ایڈجسٹمنٹ کی گنجائش ہے، کہاں صاف انکار کی ضرورت ہے اور کہاں کوئی درمیان کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ دین اور ثقافت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کے درمیان حد فاصل قائم رہنی چاہیے اور دونوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ دین کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے اور اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے جبکہ ثقافت کی بنیاد ایک علاقہ میں رہنے والے لوگوں کے درمیان خود بخود تشکیل پا جانے والی معاشرتی اقدار و روایات پر ہوتی ہے اور اس کا سرچشمہ سوسائٹی اور اس کا ماحول

ہوتا ہے۔ اگر علاقائی ثقافتوں پر دین و شریعت کا لیبل لگا کر انہیں ساری دنیا سے ہر حال میں منوانے کی بات جائے گی تو اس سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوں گے۔

سوال ۳: عالمی سطح پر (مثلاً برطانیہ، یورپ کے باقی ممالک اور وسیع تر دنیا کے مابین) باہمی تعلقات کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ کیا دنیا کے ایک عالمی کمیونٹی ہونے کے حوالے سے اسلام کوئی منفرد نقطہ نظر رکھتا ہے؟

جواب: اسلام خود گلوبل سوسائٹی کا علم بردار ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کی دعوت کے لیے پوری نسل انسانی کو خطاب کیا ہے اور حجۃ الوداع کے خطبے میں (دنیا کی تاریخ میں پہلی بار) گلوبل انسانی سوسائٹی کے خدوخال واضح کیے ہیں اور اس کے بنیادی اصول بیان فرمائے ہیں، البتہ اسلام گلوبل سوسائٹی کی نظریاتی بنیاد آسمانی تعلیمات کو سمجھتا ہے اور قرآن و سنت کو اس کی محفوظ اور فائنل شکل قرار دیتا ہے جیسا کہ مغرب ویسٹرن کلچر کو گلوبل سوسائٹی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور اسے دنیا بھر سے منوانے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کر رہا ہے۔

سوال ۴: کیا ایک یکجان اور آپس میں جڑی ہوئی کمیونٹی وجود میں لانے کے بارے میں کوئی اسلامی نقطہ نظر پایا جاتا ہے؟

جواب: آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار کی نفی اور وحی الٰہی سے انحراف کی بنیاد پر کمیونٹی کے باہمی اتحاد کو اسلام قبول نہیں کرتا۔

سوال ۵: اسلام میں رضا کارانہ خدمت اور (غریبوں کی) مالی امداد اتنی اہم کیوں ہے؟

جواب: وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات نے ہر دور میں انسان کو راستی کی تعلیم دی ہے، امن کا راستہ دکھایا ہے، باہمی محبت اور رواداری کا سبق دیا ہے، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کی ہے، نادار اور بے سہارا افراد کی خدمت پر آمادہ کیا ہے، سچائی اور دیانت و امانت کو انسانی سوسائٹی کی اساسی اقدار قرار دیا ہے اور حیا و پاک دامنی کو انسان کا زیور بتایا ہے۔ بائبل اور قرآن کریم کے سینکڑوں اوراق وحی الٰہی کی ان تعلیمات پر گواہ ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے متعدّد ارشادات مقدس کتابوں میں اس حوالہ سے موجود و محفوظ ہیں۔ ہم اس حوالے سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں سے دو حوالے دینا مناسب سمجھیں گے:

ایک یہ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی وحی کے نزول کے بعد غار حرا سے اتر کر گھر آئے اور اس اچانک واقعہ پر کچھ گھبراہٹ کا اظہار کیا تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ گھبرائیں نہیں، اس لیے کہ آپ

"(۱) صلہ رحمی کرتے ہیں (۲) ناداروں اور بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں (۳) مہمانوں اور مسافروں کی خدمت کرتے ہیں (۴) ناگہانی آفتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں (۵) محتاجوں کو کما کر کھلاتے ہیں۔"

دوسرا حوالہ اس موقع کا ہے جب بخاری شریف ہی کی روایت کے مطابق سلطنت روما کے فرمانروا شاہ ہرقل کے نام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی پہنچا اور شاہ ہرقل نے عرب دنیا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وقت کے سب سے بڑے حریف جناب ابو سفیانؓ کو دربار میں بلا کر ان سے حضرت محمد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو ابو سفیانؓ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور پیغام کا تعارف قیصر روم کے دربار میں ان الفاظ میں کرایا کہ:

1. وہ ہمیں اللہ تعالی کی وحدانیت کا عقیدہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں،
2. اللہ تعالی کی بندگی اور نماز کا حکم دیتے ہیں،
3. سچائی کی تلقین کرتے ہیں،
4. صلہ رحمی کو ضروری قرار دیتے ہیں،
5. اور پاک دامن رہنے کا سبق دیتے ہیں۔

سوسائٹی اور تمدن کا قیام چونکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور سوسائٹی اور تمدن کی بنیاد باہمی تعاون پر ہے، اس لیے باہمی تعاون کی رضاکارانہ صورتوں کو اسلام نہ صرف ضروری قرار دیتا ہے، بلکہ انہیں مذہبی فرائض میں شمار کرتا ہے اور ان سے انحراف کو گناہ اور جرم تصور کرتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث نبوی میں ہے کہ:

"جو شخص خود پیٹ بھر کر رات کو سویا رہا اور اس کے پڑوسی نے بھوک کی حالت میں رات گزار دی، جبکہ اسے اس کے بارے میں معلوم بھی ہے تو ایسے شخص کو مومن کہلانے کا حق حاصل نہیں ہے۔"

اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث میں سماجی ضروریات اور خدمات سے غفلت برتنے کو مذہبی طور پر گناہ اور جرم قرار دیا گیا ہے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام

کی تعلیمات کا یہی خلاصہ ہے۔ نسل انسانی نے جس دور میں بھی ان تعلیمات کو اپنایا ہے، اسے سکون واطمینان کی وافر دولت ملی ہے اور انسانوں نے باہمی محبت واعتماد کی زندگی بسر کی ہے اور جب بھی ان آسمانی تعلیمات کے بارے میں افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے، انسانی سوسائٹی میں امن اور سکون کا توازن بگڑ گیا ہے۔

سوال ۶: صنفی مساوات کے حوالے سے اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: اسلام مرد اور عورت کو سوسائٹی اور تمدن کی دو ناگزیر بنیادیں تصور کرتا ہے اور باہمی برتری اور فضیلت کے لیے بر وتقویٰ کو بنیاد قرار دیتا ہے، لیکن معاشرتی معاملات میں دونوں کے درمیان مکمل فطری مساوات کا قائل نہیں ہے اور اس کے نزدیک یہ غیر فطری اور مصنوعی بات ہے، اس لیے کہ مرد اور عورت کی جسمانی تخلیق، نفسیات اور ان کے فطری فرائض میں ایسا تنوع موجود ہے جس سے نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے تبدیل کرنے کی کوئی صورت ممکن ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان جسمانی تخلیق، نفسیاتی رجحانات اور فطری ذمہ داریوں میں جو واضح فرق موجود ہے، اسلام ان کے باہمی حقوق وفرائض کے تعین وتقسیم میں اسی کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اس کے مطابق دونوں کے لیے احکام وقوانین میں اس نے فرق وامتیاز قائم رکھا ہے۔

اسلام نے عورت کے معاشی حقوق اور تحفظات کا متوازن نظام پیش کیا ہے۔ یہ شعبہ ایسا ہے جہاں بڑے بڑے نظام افراط وتفریط کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن اسلام نے اعتدال اور توازن کا اصول یہاں بھی پوری طرح قائم رکھا ہے۔ اسلام نے فرائض کی ایک فطری تقسیم کر دی ہے کہ گھر کے اندر کی ذمہ داری عورت کی ہے اور باہر کی ذمہ داری مرد پر ہے اور مرد وعورت کی خلقت میں فطرت نے جو طبعی فرق رکھا ہے، اس کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے سوا کوئی تقسیم ممکن ہی نہیں ہے۔ چونکہ گھر کے اندر کا نظام عورت کی سپرداری میں ہے، اس لیے باہر کی کوئی ڈیوٹی اس کے سپرد کرنا اس پر ظلم ہے۔ اسی لیے عورت کے تمام اخراجات مرد کے ذمہ لگا دیے گئے ہیں اور ان اخراجات کے سلسلہ میں عورت کو عدالتی تحفظات بھی فراہم کیے گئے ہیں تاکہ کوئی مرد اس معاملے میں عورت کے ساتھ ناانصافی نہ کر سکے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام عورت کے ملازمت کرنے پر کلی پابندی لگاتا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ اسلام عورت کو ایسی ہر ملازمت کی اجازت دیتا ہے جس سے اس پر

اس کی طاقت وصلاحیت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

اسی طرح اسلام کے نزدیک "خاندان" سوسائٹی کی بنیادی اکائی ہے جس کا تحفظ ضروری ہے اور خاندان کا یونٹ اس کے سوا قائم نہیں رہ سکتا کہ رشتوں کا تقدس تسلیم کیا جائے، مرد وعورت کے کسی ایسے باہمی میل جول کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے جس کے نتیجے میں آزادانہ جنسی ملاپ اور رشتوں کے تقدس کی پامالی اور خاندان کے بکھر جانے کی صورت پیدا ہو جائے۔ نیز خاندان کے یونٹ کا ڈسپلن اور نظم برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ گھر کے سسٹم میں فائنل اتھارٹی ایک ہو، اس لیے اسلام خاندان کے نظام میں مرد کی برتری کی تعلیم دیتا ہے، البتہ مرد کی سنیارٹی کو خاندان کے تحفظ کی ضمانت قرار دیتے ہوئے عورت کو وہ تمام حقوق فراہم کرتا ہے جو ایک شہری، ایک مسلمان اور سوسائٹی کے ایک فرد کے طور پر اس کے لیے ضروری ہیں۔ نسل انسانی کی نشوونما اور ترقی میں عورت کا بھی اتنا ہی عمل دخل ہے جتنا مرد کا ہے، اس لیے اسلام نے عورت کے وجود کو نہ صرف تقدس واحترام بخشا بلکہ ان کی اہمیت وافادیت کا بھرپور اعتراف کیا ہے اور اسے ان تمام حقوق اور تحفظات سے نوازا ہے جو مرد اور عورت کے فطری فرائض کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

مثال کے طور پر آزادی رائے کو انسانی حقوق میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ یہ منظر پیش کرتی ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک بوڑھی خاتون خولہ بنت حکیمؓ امیر المومنین حضرت عمر کو سرعام روک کر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے: "عمر! وہ دن یاد رکھو جب تمہیں عکاظ کے بازار میں صرف عمر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور آج تم امیر المومنین کہلاتے ہو، اس لیے خدا سے ڈرتے رہو اور انصاف کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو"۔ حضرت عمرؓ اس بڑھیا کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں اور اپنے عمل کے ساتھ دنیا کو بتا رہے ہیں کہ انسانی معاشرہ میں مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ راہ چلتے امیر المومنین کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے اور انصاف کی تلقین کرے۔

اسلام مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے جائز حق کے لیے ڈٹ جائے اور اس کے خلاف کسی بڑے سے بڑے دباؤ کی پروانہ کرے۔ حضرت عائشہؓ کی باندی بریرہ کو آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اپنے سابقہ خاوند مغیثؓ کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اس سے الگ ہو جائے۔ بریرہؓ نے اپنا

یہ حق استعمال کیا تو مغیثؓ پریشان ہوگئے۔ وہ مدینہ کی گلیوں میں روتے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو دوبارہ میرے ساتھ رہنے پر آمادہ کرے؟ اس کی حالت دیکھ کر خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے بات کی اور اسے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کے لیے کہا۔ بریرہؓ نے صرف یہ پوچھا کہ یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف مشورہ ہے، تو بریرہؓ نے دوٹوک کہہ دیا کہ میں یہ مشورہ قبول نہیں کر سکتی۔ چنانچہ بریرہؓ مغیثؓ سے الگ رہنے کے فیصلے پر قائم رہی اور اپنے عمل کے ساتھ اسلام کا یہ اصول دنیا کے سامنے پیش کیا کہ عورت اپنے جائز حق سے از خود دستبردار نہ ہونا چاہے تو اسے اس کے حق سے کسی صورت میں محروم نہیں کیا جا سکتا۔

خلافت راشدہ کے دور میں عورت اجتماعی معاملات میں بھی مشاورت کے دائرہ میں شامل رہی ہے، بالخصوص ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن کو تو اس دور میں امت مسلمہ کی اجتماعی راہنمائی کا مقام حاصل تھا۔ اہم امور میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا اور ان سے اجتماعی معاملات میں راہ نمائی حاصل کی جاتی تھی، حتی کہ ایک موقع پر مدینہ منورہ کے امیر مروانؓ بن حکم نے یہاں تک کہہ دیا کہ ”جب تک ازواج مطہرات موجود ہیں، ہمیں دوسرے لوگوں سے مسائل دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے!“ اور عورتوں سے متعلقہ امور میں تو مشورہ ہی عورتوں سے کیا جاتا تھا۔ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ذمہ لگایا کہ وہ سمجھدار عورتوں سے مشورہ کر کے بتائیں کہ ایک عورت خاوند کے بغیر کتنا عرصہ آسانی کے ساتھ گزار سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی رائے پر حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا کہ ہر فوجی کو چھ ماہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے ضرور گھر بھیجا جائے۔

خلافت راشدہ کے دور میں خواتین کو علم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کے آزادانہ مواقع میسر تھے۔ حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھ سینکڑوں خواتین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات امت تک پہنچانے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے شاگردوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ وہ نہ صرف احادیث بیان کرتی تھیں، بلکہ فتوی بھی دیتی تھیں اور ان کے فتوے پر عمل کیا جاتا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے جو فتاوی منقول ہیں، ان سے ایک بڑا مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے علماء صحابہ مسائل میں رجوع کرتے تھے اور اپنے اشکالات کا تسلی بخش جواب پاتے تھے۔ اسی طرح حضرت ام سلمہؓ سے بھی علمی

معاملات میں رجوع کیا جاتا تھا۔ الغرض علم اور افتاء کا میدان بھی خواتین کے لیے کھلا تھا اور اس میں ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔

الغرض اسلام عورت کو انسانی زندگی کی گاڑی کا برابر کا پہیہ تسلیم کرتا ہے اور اس کو وہ تمام حقوق دیتا ہے جو انسانی معاشرہ میں اپنا فطری کردار ادا کرنے کے لیے اسے درکار ہیں، البتہ فرائض کی تقسیم وہ مرد اور عورت کے طبعی تقاضوں اور فطری ضروریات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے اور عورت کو ہر ایسے عمل سے روکتا ہے جو اس کے نسوانی وقار، فطری ذمہ داریوں اور طبعی مناسبت کے منافی ہو اور اسلام کا یہ اصول حق تلفی نہیں بلکہ عین انصاف ہے جس کے بغیر انسانی معاشرت کو متوازن رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

۴۔ جستجو، تنقیدی غور و فکر اور اختلاف رائے

سوال ۱: اسلام جستجو اور تنقیدی غور و فکر کو کیسے پروان چڑھاتا ہے تاکہ نوجوان نسل مختلف آرا اور آپشنز میں ذہنی دلچسپی لے اور ان پر غور کر سکے؟

سوال ۲: کیا تحقیق اور جستجو کے حوالے سے کوئی اسلامی اپروچ پائی جاتی ہے؟

سوال ۳: اسلام طالب علموں کو اپنا استدلال پیش کرنے اور اپنی رائے کو بیان اور واضح کرنے کے حوالے سے کیا مدد فراہم کر سکتا ہے؟

سوال ۴: اسلام نوجوانوں کو دوسرے کے ایسے خیالات کو سمجھنے اور انہیں بیان کرنے کے حوالے سے کیا مدد دے سکتا ہے جن سے ضروری نہیں کہ وہ متفق ہوں؟

جواب: قرآن کریم غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، تاریخ کے حوالے سے بھی، اقوام کے عروج و زوال کے حوالے سے بھی، اردگرد کے زمینی اور ماحولیاتی حقائق کے مشاہدہ کے حوالے سے بھی، آیات قرآنی پر تدبر کے حوالے سے بھی، کائنات کے مشاہدات اور سائنسی ارتقا کے حوالے سے بھی اور سوسائٹی کے مسائل پر بحث و مباحثہ کے حوالے سے بھی۔ اسلام سوسائٹی کے ہر فرد کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے، حکمرانوں اور مقتدر طبقات پر تنقید کرے اور سوسائٹی کے مفاد کے لیے ہر سطح پر مشورہ دے۔ اسلام جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بات حرف آخر ہے۔ وہ خلفائے راشدین کو بھی مجتہد کے درجے میں تسلیم کرتا ہے جن کی ہر بات میں خطا اور صواب

دونوں کا احتمال موجود ہے اور ان کے کسی بھی فیصلے اور رائے سے اختلاف کی نہ صرف گنجائش موجود ہے، بلکہ بے شمار لوگوں نے ان کی بہت سی آرا سے عملاً اختلاف کیا ہے اور علمی اختلاف سے اسلامی کتب بھری پڑی ہیں۔ اسلام بنیادی طور پر تحقیق و جستجو کا دین ہے اور ایسے معاملات میں اسلامی لٹریچر سے ہزاروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اختلاف رائے انسانی فطرت کا اظہار اور عقل و دانش کا خوش ذائقہ ثمر ہے جو اپنی جائز حدود کے اندر اور جائز طریقہ سے ہو تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق امت کے لیے رحمت بن جاتا ہے اور اسے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالی نے نہایت خوب صورت انداز میں یوں بیان فرمایا ہے کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مسائل میں اختلاف نہ ہوتا تو مجھے یہ بات بالکل اچھی نہ لگتی، کیونکہ اس طرح امت ہر مسئلہ میں ایک لگے بندھے راستے پر چلنے کی پابند ہو جاتی۔ اب اختلاف ہے، ایک ایک مسئلہ میں چار چار پانچ پانچ قول ہیں، تنوع ہے، چوائس ہے اور امت کے ارباب علم و دانش اپنے اپنے فہم، ذوق، ضرورت، حالات اور سہولت کے مطابق ان میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق رکھتے ہیں جس سے علم و دانش کی دنیا رنگا رنگ خوشنما پھولوں کے ایک چمنستان کا روپ اختیار کر گئی ہے۔

اسلام گفتگو اور مکالمہ میں انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت بھی کرتا ہے اور دوسروں کے موقف کو صحیح طور پر دیانت داری کے ساتھ سمجھنا، بیان کرنا اور دلیل کے ساتھ اس کا جواب دینا ''وجادلھم بالتی ھی احسن'' کا مصداق ہے جو اس سلسلے میں قرآن کریم کی ہدایت ہے۔ اسی طرح مقابل فریق کے طرز عمل کی خامیوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنا بھی اسلامی اخلاقیات کا حصہ ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک روز مستورد قرشی رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''قیامت سے پہلے رومی لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے گی۔'' روم اس دور میں مسیحی سلطنت کا پایہ تخت تھا اور رومیوں سے عام طور پر مغرب کے مسیحی حکمران ہوتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو چونکے اور پوچھا کہ ''دیکھو! کیا کہہ رہے ہو؟'' مستورد قرشی نے کہا کہ میں وہی کہہ رہا ہوں جو میں

نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر ان رومیوں میں چار خصلتیں موجود ہوں گی (جن کی وجہ سے وہ انسانی سوسائٹی پر غالب آئیں گے):

پہلی یہ کہ وہ فتنے اور آزمائش کے وقت دوسرے لوگوں سے زیادہ تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کریں گے۔ دوسری یہ کہ وہ مصیبت گزر جانے کے بعد سنبھلنے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ تیز ہوں گے۔ تیسری یہ کہ وہ شکست کے بعد دوبارہ جلدی حملہ آور ہونے والے ہوں گے۔ چوتھی یہ کہ وہ اپنے یتیموں، مسکینوں اور کمزوروں کے لیے اچھے لوگ ثابت ہوں گے۔ اتنا کہہ کر حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ ان میں ایک اور پانچویں خصلت بھی ہوگی جو اچھی اور خوب ہوگی کہ وہ لوگوں کو حکمرانوں کے مظالم سے روکنے میں پیش پیش ہوں گے۔

آج مغرب سے ہمیں شکوہ ہے کہ مغرب ہمارے خلاف صف آرا ہے اور ہمیں اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ کر زیر کرنے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتا ہے، کر رہا ہے۔ مغرب سے ہمیں یہ بھی شکایت ہے کہ وہ ہم پر اپنی ثقافت مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور انسانی حقوق کے خود ساختہ فلسفے کے ہتھیار سے ہماری اخلاقی، دینی اور معاشرتی اقدار کو ملیامیٹ کرنے کے درپے ہے۔ یہ سب شکایات بجا ہیں، لیکن ہمیں حضرت عمرو بن العاصؓ کے مذکورہ ارشاد کے حوالے سے مغرب کے ساتھ اپنا تقابل بھی کر لینا چاہیے کہ:

1. مصیبت اور مشکل کے وقت مغربی اقوام اور ہمارے طرز عمل میں کیا فرق ہوتا ہے؟
2. مصیبت کے گزر جانے کے بعد سنبھلنے میں ہم کتنا وقت لیتے ہیں؟
3. شکست کے بعد اس کی تلافی کرنے یا ماتم کرتے رہنے میں سے ہم کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں؟
4. معاشرہ کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی کفالت کے لیے ہمارے پاس کون سا نظام موجود ہے؟
5. عام لوگوں کو حکام کے مظالم اور ریاستی جبر سے بچانے کے لیے ہمارا "معاشرتی شعور" کس مرحلے میں ہے۔

انسانی حقوق کے حوالے سے مغرب کا گزشتہ نصف صدی کا ریکارڈ سامنے رکھا جائے تو یہ شکایت ضرور سامنے آتی ہے کہ مسلم ممالک کے بارے میں مغرب دوہرا

معیار رکھتا ہے اور جن ممالک کی حکومتیں مغرب کے مفادات کی نگہبانی کر رہی ہیں، وہاں کے عوام کے انسانی اور سیاسی حقوق کے معاملے میں مغرب نے مجرمانہ غفلت اور خاموشی اختیار کر رکھی ہے، لیکن اس سے ہٹ کر عمومی تناظر میں دیکھا جائے تو اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ آج مغربی ممالک دنیا بھر کے مختلف خطوں کی حکومتوں کے ستائے ہوئے مظلوموں کی سب سے بڑی پناہ گاہ بھی ہیں اور معاشرے کے نادار اور معذور افراد کے لیے اگر زندگی کی سب سے زیادہ سہولتیں میسر ہیں تو وہ بھی انہی مغربی ممالک میں ہیں۔

۵-درست معلومات پر مبنی اور ذمہ دارانہ عملی اقدام

سوال ۱: معاصر دنیا میں درست معلومات پر مبنی اور ذمہ دارانہ اقدام کرنے کے بارے میں اسلام نوجوان مسلمانوں کی کیسے مدد کر سکتا ہے؟

سوال ۲: معاصر ذرائع ابلاغ سے نبرد آزما ہونے اور سچ کو جھوٹ سے الگ کرنے کے حوالے سے اسلام نوجوان مسلمانوں کی کیسے راہنمائی کر سکتا ہے؟

جواب: قرآن کریم نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ محض سنی سنائی خبروں پر کوئی فیصلہ نہ کریں جب تک کہ ان کی تحقیق نہ کر لیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ نادانی میں کسی گروہ کو نقصان پہنچا بیٹھیں اور پھر انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے، (سورۃ الحجرات)۔

اسی طرح قرآن کریم کی ہدایت ہے کہ جو لوگ امن یا خوف کی ہر خبر کو پھیلا دیتے ہیں، ان کا رویہ غیر ذمہ دارانہ ہے اور اگر وہ خبر کی تحقیق اور اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں تک خبر پہنچائیں تو یہ زیادہ بہتر ہے، (سورۃ النساء)۔

”احسان شناسی“ اور حسین حقانی کا شکوہ!

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۲ جون ۲۰۰۸ء)

جناب حسین حقانی واشنگٹن میں پاکستان کے سفیر محترم ہیں اور ملک کے معروف دانشوروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہیں شکوہ ہے کہ پاکستانی لوگ امریکہ سے شکایتیں تو بہت کرتے ہیں اور تنقید و اعتراض کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن امریکہ کے احسانات انہیں یاد نہیں رہتے اور امریکہ نے پاکستان اور اس کے عوام پر جو مہربانیاں کی ہیں

ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ حقانی صاحب کا یہ شکوہ گزشتہ روز ایک اخبار میں نظر سے گزرا جو خدا جانے انہوں نے کس پس منظر میں کیا ہے مگر ہمیں یاد آیا کہ ایک بار خود ایک امریکی حکمران نے بھی فرمایا تھا کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ اتنی مہربانیاں کرتے ہیں مگر انہیں بھلا دیا جاتا ہے اور احسانات پر سراپا تشکر ہونے کی بجائے مسلمان ہر وقت غم و غصہ کا اظہار ہی کرتے رہتے ہیں۔

ہم اس موقع پر اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ امریکہ نے پاکستان اور اس کے باشندوں پر گزشتہ چھ عشروں میں کیا کیا احسانات کیے ہیں اور کون کون سی مہربانیوں سے ہمیں نوازا ہے۔ اس لیے کہ سب باتیں ریکارڈ پر ہیں جو کچھ امریکہ نے پاکستان کے لیے اور پاکستان کے ساتھ کیا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں ہے اور جو کچھ پاکستان اور پاکستانی عوام نے امریکہ کے لیے کیا ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اور اگر ان دونوں پہلوؤں کا کوئی گوشہ عام لوگوں کے علم میں نہیں ہے تو وہ واشنگٹن ڈی سی میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سفارت کے منصب پر فائز ایک دانشور سے تو یقیناً مخفی نہیں ہوگا۔ اس لیے ہم اس بحث کو ایک طرف رکھتے ہوئے تاریخ انسانی کے ایک پرانے دور کا قصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں اور اسے جناب حسین حقانی کی نذر کر رہے ہیں کہ مہربانیوں اور احسانات کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کی مصر میں آمد حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی۔ جب ان کے فرزند حضرت یوسف علیہ السلام جیل سے نکل کر مصر کے وزیر خزانہ بنے اور اس کے بعد حکمرانی کے منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے اپنے پورے خاندان کو کنعان سے مصر بلا لیا جن میں ان کے گیارہ بھائیوں کے ساتھ ان کے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام اور والدہ محترمہ بھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو نبوت اور حسن کے ساتھ حکمرانی بھی دی اور خاندان پر ایسی فضیلت عطا کی جو ان کے اس پرانے خواب کی تعبیر بن گئی جو انہوں نے بچپن میں اپنے والد محترم کو سنایا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، انہی کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے اور ان کی زندگی میں ہی بنی اسرائیل مصر کے اقتدار میں شریک ہوگئے تھے جس کے بعد مدتوں یہ خاندان مصر پر حکمران رہا۔ مگر

اس کے بعد زوال کا شکار ہوئے تو آل فرعون کی غلامی ان کا مقدر بن گئی اور یہ نسل در نسل آل فرعون کی غلامی کا عذاب سہتے رہتے۔

فرعونوں کی غلامی میں بنی اسرائیل کا وہی حال ہوا جو غلام قوموں کا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس غلامی کی ایک بدترین شکل یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جاتا تھا۔ اس کا پس منظر بعض روایات میں یوں بیان ہوا ہے کہ فرعون کو اس کے کسی خواب کی تعبیر میں یہ بتایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہو گا جو تمہاری بادشاہت کے خاتمہ کا ذریعہ بنے گا۔ اس پر بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر لڑکے کو قتل کر دینے کا شاہی حکم صادر ہو گیا اور تاریخی روایات کے مطابق ستر ہزار کے لگ بھگ معصوم بچے اس حکم کے تحت قتل کیے گئے۔ مگر جس بچے نے فرعون کی بادشاہت کے خاتمے کا ذریعہ بننا تھا اسے قتل نہ کیا جا سکا بلکہ خود فرعون کے گھر میں اس کی پرورش ہوئی اور فرعون کے خرچ پر وہ پلا بڑھا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے جن کی ولادت پر ان کی والدہ محترمہ کی پریشانی اور پھر انہیں فرعون کے گھر پہنچا کر اس کے گھر میں ان کی پرورش کا اہتمام کرنے کا واقعہ قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس طرح اپنی بے نیازی اور قدرت کا اظہار کیا کہ جس بچے کے خوف سے فرعون نے ستر ہزار کے لگ بھگ معصوم بچے قتل کیے اس کی پرورش خود فرعون نے کی اور فرعون کے گھر میں اس کے خرچ پر پرورش پا کر حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے مفادات کے محافظ بن گئے۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں فرعون کے شاہی خاندان کے ایک فرد کے قتل کا جو قصہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے اس کا پس منظر بھی یہ ہے کہ ایک اسرائیلی سر بازار ایک قبطی (شاہی خاندان کے فرد) کے ظلم پر واویلا کر رہا تھا کہ حضرت موسیٰؑ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھے اور قبطی کو ایک مکا رسید کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ کا اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا مگر مکا جلالی پیغمبرؑ کا تھا، وہ قبطی ایک ہی مکے سے ڈھیر ہو گیا اور اسے قتل کرنے کے الزام میں حضرت موسیٰؑ کے خلاف جوابی کاروائی کے خطرے نے انہیں مصر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ قسمت انہیں اپنے وقت کے ایک اور پیغمبرؑ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس مدین میں لے گئی جہاں وہ دس سال رہے اور حضرت شعیبؑ کی خدمت کے ساتھ ساتھ ان کی دامادی کے شرف سے بھی فیضیاب

ہوئے۔ حضرت شعیبؑ کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے اسی تعلق کے حوالے سے اقبالؒ نے کہا ہے:

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

وہاں سے واپسی پر وہ اہلیہ سمیت مصر تشریف لا رہے تھے کہ کوہ طور پر نبوت ورسالت سے بہرہ ور ہوئے۔ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے دونوں بھائیوں کو نبوت اور معجزات کے ساتھ فرعون مصر کے پاس دو مشن دے کر بھیجا۔ ایک یہ کہ فرعون کو یہ پیغام دو کہ وہ اللہ رب العزت کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور توحید کا اقرار کرے، اور دوسرا یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کرے۔ قرآن کریم نے اس کی تفصیلات متعدّد مقامات پر بیان کی ہیں اور فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کے مکالمہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے جادوگروں کے ساتھ ان دو برگزیدہ پیغمبروں کے مقابلہ کی تفصیل بھی بتائی ہے۔ مگر ہم ان میں سے صرف دو مکالموں کا کچھ حصہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب میدان مقابلہ میں فرعون کے جادوگر اور حضرت موسیٰؑ آمنے سامنے ہوئے اور فرعون سمیت ایک بڑا ہجوم اس مقابلہ کو دیکھنے کے لیے جمع تھا تو مقابلہ سے پہلے فرعون نے جادوگروں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے بارے میں کہا کہ:

”یہ دو جادوگر ہیں جو تمہیں تمہارے ملک سے نکالنے اور تمہارے مثالی نظام کو ختم کرنے کے لیے آئے ہیں، اس لیے تدبیر کی پوری قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو۔“ (سورۃ طٰہٰ ۶۳ و ۶۴)

مگر اس مقابلہ میں جادوگروں کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ وہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان بھی لے آئے اور فرعون کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرا یہ کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور بنی اسرائیل کی آزادی کا پیغام لے کر گئے اور فرعون کو یہ پیغام سنایا تو فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے احسانات یاد دلائے اور کہا کہ:

”کیا ہم نے تمہاری بچپن میں پرورش نہیں کی تھی اور کیا تم نے زندگی کا ایک حصہ ہمارے پاس نہیں گزارا تھا اور کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم نے ہمارا ایک آدمی بھی قتل کر دیا تھا۔“

حضرت موسیٰؑ نے جواب میں فرمایا کہ قتل تو مجھ سے غلطی سے ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے میں تمہارے خوف سے یہ ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت عطا فرمائی ہے۔ مگر یہ احسانات کون سے یاد دلا رہے ہو؟

"اور تمہارا یہی احسان ہے جس کو تم جتلا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟" (الشعراء ۲۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ایک جملے کے پیچھے مطالب و معانی کا ایک پورا جہان آباد ہے جن تک رسائی کے لیے بہت زیادہ عقل و دانش کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم محترم جناب حسین حقانی اور ان کے ذریعے امریکی حکمرانوں کو یہی پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں پاکستان پر امریکہ کے "احسانات" ایک ایک کر کے سب یاد ہیں لیکن ہمیں ان نوازشات اور مہربانیوں کے سنہری ورق میں لپٹی ہوئی غلامی کی زنجیریں بھی نظر آ رہی ہیں بلکہ اب تو ان کی تپش اور روز افزوں تنگی ہمارے لیے "عذاب الیم" کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جناب حسین حقانی صرف اپنی قوم کو "احسان شناسی" کا سبق دیتے رہیں گے یا مظلوم پاکستانی قوم کے گرد غلامی کی زنجیروں کا حصار توڑنے میں بھی کوئی کردار ادا کر سکیں گے؟

مسلمانوں کے اختلافات: ایک نومسلم کے تاثرات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جون ۲۰۰۸ء)

برطانیہ کے حالیہ سفر کے دوران مجھے دو روز اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت ایڈنبرا کے قریب ایک بستی ڈنز میں اپنے بھانجے ڈاکٹر سبیل رضوان کے ہاں گزارنے کا موقع ملا۔ رضوان کو اللہ تعالیٰ نے گزشتہ دنوں تیسری بچی دی ہے اور ۱۸ اپریل کو اس کی بڑی بچی کی سالگرہ تھی۔ رضوان نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے پوچھا کہ اس کی اہلیہ کہہ رہی ہے کہ اگر ہم بچی کی سالگرہ پر کیک کاٹ لیں تو ماموں ناراض تو نہیں ہوں گے؟ میں نے کہا کہ نہیں بیٹا، ناراضگی کی کون سی بات ہے؟ اصل میں اس کا یہ خیال تھا کہ ایک غیر شرعی رسم ہونے کی وجہ سے میں اس پر غصے کا اظہار کروں گا جبکہ ایسے معاملات میں میرا موقف اور طرز عمل یہ ہے کہ اس قسم کی علاقائی اور ثقافتی رسمیں اگر دین کا حصہ نہ سمجھی جائیں اور انہیں ثواب کے ارادے سے انجام دینے کے بجائے محض خوشی کی علاقائی اور ثقافتی رسم کے طور پر کیا

جائے تو اس پر شریعت کے منافی ہونے کا فتویٰ لگا دینا اور غیظ و غضب کا اظہار کرنا مناسب بات نہیں ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں کسی چیز کا غیر شرعی (شریعت سے ثابت نہ ہونا اور بات ہے اور شریعت کے منافی ہونا اس سے مختلف امر ہے اور ہمیں ان دونوں کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

رضوان فیملی کی خوشی میں شامل ہونے کے ساتھ ایک فائدہ اور بھی ہوا کہ شام کو ایک نو مسلم مورس سے ملاقات ہوگئی۔ مورس نے اپنے قبول اسلام کا واقعہ اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات و احساسات کا بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اظہار کیا جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مورس نے اسلام اور قرآن مجید کے ساتھ اپنے تعارف کے پس منظر کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد کہا کہ ایک دن میں نیو کاسل میں اپنے گھر میں تھا کہ صبح بیدار ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے میں گھر سے باہر جا رہا ہوں اور قریب ہی ایک مسجد میں چلا گیا۔ اس سے قبل میں یہاں کسی مسلمان سے نہیں ملا تھا۔ میں نے ان کو بتایا تو انہوں نے مجھے کلمہ شہادت پڑھایا اور میرا نام تبدیل کر کے مورس بڈن کی بجائے مورس مجید رکھ دیا۔ اس کے بعد تبلیغی جماعت والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے مجھے دوبارہ کلمہ پڑھایا اور نام مورس عبد المجید رکھ دیا۔ پھر میرا کچھ عرصہ ان سے تعلق رہا۔ ان کے ساتھ مختلف مقامات پر جاتا رہا اور نیو کاسل میں کتابوں کی ایک دکان ”بیت الحکمۃ“ کے نام سے میں نے کھول لی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ”بیت الحکمۃ“ کا نام یہاں کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا، اس لیے اس کا نام ”House of Wisdom“ رکھا جائے مگر انہوں نے میری بات نہیں مانی اور میں ”بیت الحکمۃ“ کے نام سے کچھ عرصہ دکان کرتا رہا۔

پھر میں نے یہ سوچ کر نیو کاسل کو چھوڑ دیا کہ یہاں مسلمان کم ہیں اور مسلمانوں والا ماحول نہیں ہے۔ میں بیوی بچوں سمیت بلیک برن چلا گیا، اس لیے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی بہت ہے، مسجدیں اور مدرسے بہت ہیں اور اسلامی ماحول موجود ہے، اس سے بچوں کی تعلیم بھی اچھی ہوگی، مگر یہ تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ دینی معلومات میں اضافہ ہوگا، ماحول اور تربیت کا فائدہ ہوگا، مگر لوگوں نے مجھے چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا دیا۔ مختلف گروہ تھے، ہر ایک مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ کوئی کہتا نماز میں پاؤں یوں

رکھو، دوسرا کہتا یوں نہیں بلکہ اس طرح رکھو۔ کوئی کہتا ہاتھ اس جگہ باندھو، دوسرا کہتا کہ یہاں نہیں بلکہ یہاں باندھو۔ کوئی کہتا کہ شہادت کی انگلی ایک بار اٹھاؤ، دوسرا کہتا کہ نہیں بار بار اٹھاتے رہو۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ میں اسی کے کہنے پر چلوں، کسی دوسرے کی بات مانتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ میرے مزاج میں تجسس تھا اور سوالات بہت کرتا تھا۔ ہر شخص اپنی بات کی دلیل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نہ کوئی حدیث سنا دیتا۔ حدیثوں میں اس قدر تضاد دیکھ کر مجھے ان سے نفرت ہونے لگی۔

میں لوگوں سے کہتا کہ مجھے قرآن سے سمجھاؤ۔ وہ کہتے کہ قرآن کریم اس وقت تک تم نہیں سمجھ سکتے جب تک حدیث نہ پڑھو اور حدیث پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی سیکھو اور کئی سال مدرسے میں رہ کر دینی تعلیم حاصل کرو۔ مجھے سخت پریشانی ہونے لگی۔ میرے سوالات کی کثرت دیکھ کر وہ لوگ مجھے گمراہ اور کافر کہنے لگے۔ ہر گروہ مجھے اپنی کتابیں دیتا اور حدیثیں سناتا۔ مجھے ان میں واضح تضاد دکھائی دیتا، چنانچہ سخت پریشانی کی حالت میں بلیک برن کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور میں نے طے کر لیا کہ اب ایسی جگہ جا کر رہوں گا جہاں مسلمانوں کی آبادی نہ ہو اور پھر اسکاٹ لینڈ کے اس علاقے میں آ کر آباد ہو گیا۔

مورس نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ کسی مسلمان کی دعوت پر مسلمان نہیں ہوا اور نہ ہی کسی مسلمان کو دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر مسلمان ہوا ہے، بلکہ وہ صرف اور صرف قرآن کریم کے مطالعہ سے مسلمان ہوا ہے بلکہ وہ دوسرے جن نومسلموں کو جانتا ہے، ان میں سے کوئی بھی کسی مسلمان کی دعوت پر یا اس سے متاثر ہو کر مسلمان نہیں ہوا بلکہ سب کے سب قرآن کریم پڑھ کر مسلمان ہوئے ہیں، البتہ مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں نے ان نومسلموں کو الجھایا ضرور ہے۔ وہ انہیں پکا مسلمان بنانے اور اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم دینے کے بجائے پہلے حنفی، شافعی، دیوبندی، بریلوی، تبلیغی اور شیعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ کسی شخص کے مسلمان ہونے پر کوئی مسلمان اس سے یہ تو نہیں پوچھتا کہ تمھیں مسلمان ہونے کے بعد کیا پریشانی لاحق ہوئی ہے؟ اپنے خاندان کے ساتھ تمہارے تعلقات کا کیا حال ہے؟ تمہیں کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے؟ کسی معاشرتی الجھن سے تو تم دوچار نہیں ہوئے ہو؟ اور تمھیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے؟ کسی نومسلم سے یہ بات کوئی نہیں پوچھتا، البتہ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس کے فرقے میں شامل ہو

جائے، کسی دوسرے فرقے کی بات نہ سنے اور کسی اور کی مسجد میں نہ جائے۔ مجھے خود اس کا تلخ تجربہ ہوا ہے، اس لیے میں نے سب کو چھوڑ دیا ہے۔

اس نے کہا کہ مجھے ایک بات سے اور پریشانی ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ان کے سارے مسئلے خدا نے ہی حل کرنے ہیں، اس لیے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے قدرت کے کسی معجزے کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور پچھلے واقعات سنا سنا کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں موقع پر خدا نے اس طرح ان کی مدد کی تھی۔ اسی طرح بہت سے مسلمان اس انتظار میں ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئیں گے اور دجال ظاہر ہوگا تو اس وقت سب کچھ ہوگا۔ مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ انہیں اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے خود کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ اس طرح انتظار میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ انہیں اپنے حالات درست کرنے کے لیے محنت کرنی چاہیے اور خود بھی کچھ کرنا چاہیے۔

مورس نے کہا کہ ایک اور بات پریشانی کی وجہ بنتی ہے کہ نومسلم کو اسلامی احکام و فرائض کے ساتھ ساتھ بعض لوگ اپنے اپنے علاقائی کلچر کا بھی پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ لباس بھی ان جیسا پہنے اور وضع قطع بھی انہی کی اختیار کرے۔ اس پر اس قدر سختی کی جاتی ہے کہ وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ جو باتیں اسلام میں ضروری نہیں ہیں، ان کے بارے میں نومسلموں پر اس قدر سختی نہ کی جائے اور انہیں سادہ طریقہ سے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔ مورس نے بتایا کہ وہ ایک موقع پر مسلمانوں کی اس عمومی حالت سے پریشان ہو کر یونیورسٹی کی مسجد میں گیا کہ وہاں قدرے پڑھا لکھا ماحول ہوگا، مگر وہاں بھی صورت حال اسی طرح تھی۔ شیعہ حضرات اپنی نماز کے لیے مٹی کی ٹھیکریاں سجدے کی جگہ رکھنے کے لیے الگ نظر آتے اور دوسرے فرقوں کے لوگ اپنی اپنی علامتوں کے ساتھ الگ دکھائی دیتے تھے۔ اس نے تبلیغی جماعت کے ساتھ کئی بار وقت لگایا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اسے دین کی معلومات حاصل ہوں گی اور علم میں اضافہ ہوگا، مگر وہاں بھی اسے تبلیغی نصاب اور کچن کی صفائی کے کاموں کے سوا کچھ نہیں ملا۔

اس نے قرآن کریم کا سالہا سال تک مطالعہ کیا تھا۔ اس کے حوالے سے جب وہ کوئی سوال کرتا تو اسے جواب ملتا کہ تم قرآن کریم کو کیا جانتے ہو؟ تمہارے پاس کیا علم ہے؟ اس سے اس کی مایوسی میں اضافہ ہوا۔ مجھے ایک بار ایک دوست ایک مجلس میں لے گیا۔ غریب

لوگوں کا علاقہ تھا، مگر ایک بڑی گاڑی میں سبز چغہ پہنے ایک شیخ صاحب آئے تو ان کے گرد گلی میں بہت سے لوگ گھیرا ڈال کر بلند آواز سے اللہ ہو کا ورد کرنے لگے۔ ارد گرد کے مقامی آبادی کے لوگ کھڑکیوں سے یہ منظر دیکھ کر تعجب کر رہے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں بھی یہ منظر دیکھ کر وہاں سے چلا آیا۔ ایک مسجد میں رمضان المبارک کے دوران دیکھا کہ کھانے پینے کا سامان بہت ضائع ہو رہا ہے اور کھانے کا انداز بھی مجھے اچھا نہ لگا۔ اس قسم کے مناظر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جس اسلام کی میں تلاش میں تھا یہ وہ اسلام نہیں ہے، اس لیے میں اب مسلمانوں کی آبادی سے الگ تھلگ یہاں زندگی بسر کر رہا ہوں۔

میں نے مورس سے سوال کیا کہ اسلام کی دعوت دینے والوں کو نومسلموں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟ اس پر مورس عبداللہ نے کہا کہ:

- انہیں مسائل اور اختلافات میں نہ الجھائیں اور دین کی بنیادی باتوں کی سادہ انداز میں تعلیم دیں۔
- انسانیت کے حوالے سے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کی تلقین کریں۔
- اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ پیش آنے والے مسائل اور مشکلات معلوم کریں اور انہیں حل کرنے کے لیے ان سے تعاون کریں۔
- انہیں قرآن کریم کے حوالے سے بات سمجھانے کی کوشش کریں اور احادیث کے اختلافات سے انہیں دور رکھیں۔ اس سے ان کے ذہنوں میں کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔
- دین کے مسائل سمجھانے کے لیے ”کامن سینس“ کا زیادہ استعمال کریں۔ مثلاً یہ بات سمجھانے کے لیے کہ مونچھیں تراشنی چاہئیں، انہیں فرض اور واجب کہہ کر بات نہ کریں بلکہ انہیں اس کے فائدے بتائیں کہ مونچھیں تراشنے سے انہیں یہ فائدہ ہوگا، وغیر ذالک۔
- انسانی ہمدردی کی بنیاد پر عام لوگوں کی خدمت کا ایسا نظام بنائیں جس سے سب لوگ مذہب کی کسی تفریق کے بغیر فائدہ اٹھا سکیں تاکہ نومسلموں کو ضرورت پڑنے پر الگ سے چیریٹی کی ضرورت نہ پڑے اور نہ یہ محسوس ہو کہ ان کی الگ سے اس حوالے سے مدد کی جا رہی ہے۔

- اسلام کے بارے میں ان کے مطالعہ اور اسٹڈی کا احترام کریں اور انہیں اس بات کا بار بار طعنہ نہ دیں کہ تم کیا جانتے ہو؟ تمھیں کیا آتا ہے؟ اور تمھارے پاس کیا علم ہے؟
- انہیں قرآن کریم کے بتائے ہوئے اچھے کاموں کو بجالانے کی تلقین کریں، دیانت و امانت کی اہمیت سے آگاہ کریں اور خیر کے کاموں کی طرف رغبت دلائیں۔

مورس عبد اللہ کی گفتگو جاری تھی اور اس کے لہجے کا جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی خاموشی سے آسمان کی طرف سر اٹھا کر گہری سوچ میں چلا جاتا۔ اس کا جی اور بھی بہت سی باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا، مگر رات کا وقت تھا، دیر ہو رہی تھی، مجھے صبح سفر کرنا تھا اور اس سے قبل یہ رپورٹ بھی لکھنا تھی، اس لیے بادل نخواستہ گفتگو کا سلسلہ روک کر معذرت کرتے ہوئے شکریہ کے ساتھ ہم وہاں سے رات گیارہ بجے کے لگ بھگ رخصت ہوئے۔

غامدی صاحب کا تصور سنت

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جون ۲۰۰۸ء)

محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے تصور سنت کے بارے میں 'الشریعہ' کے صفحات میں ایک عرصے سے بحث جاری ہے اور دونوں طرف سے مختلف اصحاب قلم اس سلسلے میں اپنے خیالات پیش کر رہے ہیں۔ راقم الحروف نے بھی بعض مضامین میں اس کا تذکرہ کیا تھا اور یہ عرض کیا تھا کہ غامدی صاحب نے سنت نبوی کے بارے میں جو انوکھا تصور پیش کیا ہے، اس کے جزوی پہلوؤں پر گفتگو کے ساتھ ساتھ اس کی اصولی حیثیت کے بارے میں بھی بحث و مکالمہ ضروری ہے تاکہ وہ جس تصور سنت سے آج کی نسل کو متعارف کرانا چاہتے ہیں، اس کا صحیح تناظر سامنے آئے اور اس کو قبول یا رد کرنے کے بارے میں متعلقہ حضرات پورے اطمینان کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

اسی پس منظر میں گفتگو کے آغاز کے طور پر چند گزارشات قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ محترم غامدی صاحب اپنے موقف کی وضاحت کے لیے اس مکالمہ میں خود شریک ہوں گے اور اپنے قارئین، سامعین اور مخاطبین کی راہ نمائی کے لیے کردار ادا کریں گے۔

محترم جاوید احمد غامدی اور ان کے مکتب فکر کے ترجمان ماہنامہ ''اشراق'' لاہور کا اپریل ۲۰۰۸ء کا شمارہ اس وقت میرے سامنے ہے جس میں غامدی صاحب کے رفیق کار جناب محمد رفیع مفتی نے سوال و جواب کے باب میں دو سوالوں کے جواب میں سنت نبوی کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف پیش کیا ہے اور ان کے یہی ارشادات ہماری ان گزارشات کی بنیاد ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں محمد رفیع مفتی صاحب فرماتے ہیں:

''قرآن مجید میں ہر چیز کے موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو دعوت دی گئی ہے اور حق کی شہادت کے حوالے سے جو استدلال کیا گیا ہے، اس میں کوئی کمی نہیں ہے اور وہ ہر پہلو سے جامع ہے، چنانچہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ کتاب اجزائے دین کے بیان اور ان کی تفصیلات کے پہلو سے مکمل ہے۔ اجزائے دین کے حوالے سے کئی چیزوں کو اس میں بیان ہی نہیں کیا گیا، مثلاً نماز کی رکعتیں، اوقات اور دیگر تفصیلات، زکوۃ کی شرحیں، مونچھیں پست رکھنا، عید الفطر اور عید الاضحی وغیرہ، شریعت سے متعلق یہ اہم چیزیں قرآن مجید میں موجود ہی نہیں۔ چنانچہ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید اس پہلو سے جامع ہے کہ اس میں اللہ تعالی نے دین کے سب اجزا بیان کر دیے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہمیں اپنا دین ایک رسول کے ذریعے سے دیا ہے اور یہ بات ایک تاریخی سچائی ہے کہ اس رسول نے خدا کا یہ دین ہمیں علم کی صورت میں بھی دیا ہے اور عمل کی صورت میں بھی۔ جو دین ہمیں علم کی صورت میں ملا ہے، وہ سارے کا سارا قرآن مجید میں ہے اور جو عمل کی صورت میں ملا ہے، وہ سنت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں جاری کیا ہے۔

چنانچہ اگر ہم قرآن کے علاوہ سنت کے اس ذریعے کا انکار کرتے ہیں تو پھر ان سب اعمال کو ہم بطور دین قبول ہی نہیں کر سکتے۔ بے شک ان میں سے بعض چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے، لیکن اس میں وہ ذکر اس طرح سے موجود ہے کہ گویا یہ پہلے سے موجود اور متعارف چیزیں ہیں جن پر لوگ عمل کر رہے ہیں اور قرآن محض کسی خاص پہلو سے ان کا ذکر کر رہا ہے۔ جب یہ حقیقت ہے تو پھر پورا دین حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن و سنت دونوں کی طرف رجوع کریں۔''

جبکہ اسی باب میں ایک اور سوال کے جواب میں، جس میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک سنت سے کیا مراد ہے اور یہ کون کون سی ہیں، محمد رفیع مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”سنت دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک یہ درج ذیل ہیں:

عبادات

(۱) نماز (۲) زکوۃ اور صدقہ فطر (۳) روزہ و اعتکاف (۴) حج و عمرہ (۵) قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں

معاشرت

(۱) نکاح و طلاق اور اس کے متعلقات (۲) حیض و نفاس میں زن و شوہر کے تعلقات سے اجتناب

خورد و نوش

(۱) سور، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت (۲) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ

رسوم و آداب

(۱) اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا (۲) ملاقات کے موقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب (۳) چھینک آنے پر الحمد للہ اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ (۴) نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت (۵) مونچھیں پست رکھنا (۶) زیر ناف کے بال کاٹنا (۷) بغل کے بال صاف کرنا (۸) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا (۹) لڑکوں کا ختنہ کرنا (۱۰) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی (۱۱) استنجا کرنا (۱۲) حیض و نفاس کے بعد غسل (۱۳) غسل جنابت (۱۴) میت کا غسل (۱۵) تجہیز و تکفین (۱۶) تدفین (۱۷) عید الفطر (۱۸) عید الاضحی“۔

محمد رفیع مفتی صاحب کی ان دونوں عبارتوں کو سامنے رکھ کر ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں، وہ کچھ اس طرح ہے کہ:

• غامدی صاحب سنت نبوی کے حجت ہونے کے قائل ہیں اور اس بارے میں وہ جمہور امت کے ساتھ ہیں، مگر سنت کی تعریف اور تعین میں وہ جمہور امت سے ہٹ کر ایک الگ مفہوم طے کر رہے ہیں۔

• وہ سنت کے صرف عملی پہلوؤں پر یقین رکھتے ہیں اور سنت کے ذریعے علم میں کسی نئے اضافے کے قائل نہیں ہیں۔

• سنت کے عملی پہلوؤں میں بھی وہ اسے صرف دین ابراہیمی کی سابقہ روایات کی تجدید و اصلاح اور ان میں جزوی اضافوں تک محدود رکھتے ہیں اور ان کے نزدیک دین ابراہیمی کی سابقہ روایات سے ہٹ کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نیا عمل اور ارشاد سنت میں شامل نہیں ہے۔

• سنت کے ساتھ ساتھ وہ قرآن کریم کا وظیفہ بھی صرف اس دائرے میں محدود کر رہے ہیں کہ وہ پہلے سے موجود و متعارف چیزوں کا ذکر کرتا ہے۔ گویا پہلے سے موجود و متعارف چیزوں سے ہٹ کر کوئی نیا حکم دینا یا دین میں کسی نئی بات کا اضافہ کرنا قرآن مجید کے دائرۂ کار میں بھی شامل نہیں ہے۔

• ان کے نزدیک سنت کسی اصول و ضابطہ پر مبنی نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی بھی کام کے سنت یا غیر سنت ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہو، بلکہ سنت لگی بندھی اشیا کی ایک فہرست کا نام ہے جس میں کسی حوالے سے کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

• اس فہرست سے ہٹ کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا عمل غامدی صاحب کے نزدیک سنت کہلانے کا مستحق نہیں ہے اور نہ ہی اسے حجت کا درجہ حاصل ہے۔

• سنتوں کی اس فہرست میں شامل تمام امور کا تعلق ایک مسلمان کی ذاتی زندگی اور زیادہ سے زیادہ خاندانی معاملات سے ہے جبکہ سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے تعلق رکھنے والے امور میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اعمال کو سنت کا درجہ حاصل نہیں ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حاکم، قاضی، کمانڈر اور ڈپلومیٹ وغیرہ کے طور پر جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ فرمایا ہے، وہ بھی سنت کے اس مفہوم سے خارج ہے۔

چنانچہ سنت کے اس مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے جو ہم نے مندرجہ بالا دو عبارتوں سے سمجھا ہے، یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سنت نبوی کا یہ مفہوم نہ صرف یہ کہ جمہور امت بالخصوص خیر القرون کے اجماعی تعامل کے منافی ہے بلکہ انتہائی گمراہ کن اور عملاً سنت کے حجت ہونے سے انکار کے مترادف ہے۔ سنت اور حدیث کے حوالے سے محدثین کے بعض فنی مباحث سے قطع نظر جمہور امت کے نزدیک سنت و حدیث میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تمام ارشادات و اعمال شامل ہیں جو کسی بھی حوالے سے صحیح سند کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ ان میں ناسخ و منسوخ اور راجح و مرجوح کی ترجیحات، صحیح وضعیف کی چھان پھٹک اور واجب العمل ہونے یا نہ ہونے کی درجہ بندی اپنے مقام پر مسلم ہے، لیکن سنت نبوی کی تعیین کا بنیادی ماخذ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات و اعمال ہیں جنھیں محدثین کرام نے پورے استناد و اعتماد کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ احادیث کے اسی ذخیرے سے سنت کا تعین اور انتخاب ہوتا ہے، اس لیے دین میں سنت کے حجت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے ماخذ کی حیثیت سے حدیث نبوی بھی حجت کا درجہ رکھتی ہے اور یہ حدیث و سنت صرف دین ابراہیمی کی سابقہ روایات کی خبر کا فائدہ نہیں دیتی بلکہ انشا کے درجے میں بہت سے نئے احکام اور قوانین کا اضافہ بھی کرتی ہے، اس لیے اگر قرآن و سنت دونوں کے کردار کو دین ابراہیم کی سابقہ روایات کی خبر دینے اور ان میں تھوڑی بہت اصلاح و ترمیم نیز پہلے سے موجود و متعارف امور کے تذکرہ تک محدود کر دیا جائے تو نہ قرآن کریم مستقل طور پر ''الکتاب'' کے درجے پر فائز رہتا ہے اور نہ ہی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''مستقل رسول'' قرار دینا آسان ہوگا بلکہ (نعوذ باللہ) دونوں کی حیثیت عملاً بنی اسرائیل کے ان انبیاء کرام علیہم السلام اور ان پر نازل ہونے والی وحی کی طرح ہو جائے گی جو موسوی شریعت کے تسلسل کو آگے بڑھانے اور بعض ترامیم اور جزوی ردوبدل کے ساتھ بنی اسرائیل کو اس شریعت پر چلاتے رہنے کے لیے تشریف لاتے رہے ہیں۔

اسی طرح جمہور امت کے نزدیک حدیث و سنت صرف عمل کا فائدہ نہیں دیتی، بلکہ وہ علم کا ماخذ بھی ہے اور ہر دور میں علمائے امت نے حدیث و سنت کے ذخیرے سے عمل میں راہ نمائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے ''علم'' کے باب میں بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً عقیدہ کا تعلق خالصتاً ''علم'' سے ہے اور جمہور امت کے نزدیک جو باتیں عقائد و

ایمانیات میں شامل ہیں، ان کی بنیاد صرف قرآن کریم پر نہیں ہے، بلکہ حدیث و سنت کو بھی ایمانیات و عقائد کے تعین اور تعبیر و تشریح دونوں حوالوں سے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اور جس طرح قرآن کریم کے ارشادات ہمارے عقیدہ و ایمان کا حصہ بنتے ہیں، اسی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات بھی ایمان و عقیدہ کی بنیاد اور اساس ہیں۔

میں اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ کے دور کے دو واقعات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ خیر القرون میں عقیدہ کے تعین اور تعبیر، دونوں میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث نبوی کو بھی ماخذ کی حیثیت حاصل تھی اور ان دونوں کی وضاحت اور ان کے صحیح مصداق کے تعین کے لیے صحابہ کرامؓ سے رجوع کیا جاتا تھا۔

امام مسلم نے ''صحیح مسلم'' کی ایک روایت میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ یحیی بن یعمرؒ نے، جو تابعین میں سے ہیں، بیان کیا کہ جب بصرہ میں معبد جہنی نے تقدیر کے انکار کی بات کی تو میں اور حمید بن عبد الرحمن حج یا عمرہ کے لیے روانہ ہوئے اور ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں صحابہ کرامؓ میں سے کسی بزرگ کی زیارت نصیب ہوگئی تو ہم ان سے معبد جہنی کے اس عقیدے کے بارے میں دریافت کریں گے۔ ہمیں اس سفر میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی زیارت کا شرف حاصل ہوگیا۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگ ہیں جو قرآن کریم بھی پڑھتے ہیں اور علم کی باتیں بھی خوب کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے اور دنیا میں جو کام بھی ہوتا ہے، نئے سرے سے ہوتا ہے (یعنی پہلے سے اس کے بارے میں کچھ لکھا ہوا نہیں ہے)۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ جب تم واپس جا کر ایسے لوگوں سے ملو تو انھیں میری طرف سے کہہ دو کہ میں ان سے براءت کا اعلان کرتا ہوں اور وہ جب تک تقدیر پر ایمان نہیں لائیں گے، اگر احد پہاڑ جتنا سونا بھی اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کر دیں تو ان سے وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث سنائی جس میں ایمانیات کا ذکر کرتے ہوئے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ۔ تم تقدیر پر بھی ایمان لاؤ کہ خیر اور شر سب کچھ اللہ تعالی کے علم کے مطابق ہوتا ہے۔

دوسرا واقعہ بھی امام مسلم نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے، اس میں ایک اور تابعی بزرگ حضرت یزید الفقیر فرماتے ہیں کہ میں خوارج کے اس عقیدہ سے متاثر تھا کہ جو شخص

ایک بار جہنم میں چلا گیا، وہ وہاں سے کبھی نہیں نکلے گا اور شفاعت کوئی چیز نہیں ہے، مگر مجھے ایک مرتبہ بہت سے دوستوں کے ساتھ حج کے لیے جانے کا موقع ملا تو مدینہ منورہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کو مسجد نبوی میں دیکھا کہ وہ ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے لوگوں کو وعظ فرما رہے تھے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں کچھ لوگوں کے جہنم سے نکل کر جنت میں جانے کا ذکر کیا تو میں نے سوال کر دیا کہ حضرت! قرآن کریم تو کہتا ہے کہ ربنا انک من تدخل النار فقد اخزیتہ۔ اے اللہ، جس کو تو نے جہنم میں داخل کیا تو اسے رسوا کر دیا۔ اور قرآن کریم میں ہے کہ کلما ارادوا ان یخرجوا منہا اعیدوا فیہا، جہنم سے جب بھی لوگ نکلنے کا ارادہ کریں گے تو اسی میں لوٹا دیے جائیں گے۔ تو اس کے بعد آپ حضرات یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ شفاعت ہوگی اور کچھ لوگوں کو جہنم میں سے نکالا جائے گا؟ حضرت جابرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم نے قرآن کریم پڑھا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا کہ کیا اس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ''مقام محمود'' کا تذکرہ بھی پڑھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں پڑھا ہے تو اس پر حضرت جابر بن عبد اللہ نے ایک طویل حدیث سنائی جس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ قیامت کے دن ''مقام محمود'' میں کھڑے ہو کر شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت پر بے شمار لوگوں کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا، جبکہ وہ آگ میں جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے۔ یزید الفقیر فرماتے ہیں کہ حضرت جابر سے یہ حدیث سن کر ہم نے آپس میں گفتگو کی اور ایک دوسرے سے کہا کہ تمہارے لیے بربادی ہو، کیا یہ بزرگ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جھوٹ بول رہے ہیں؟ چنانچہ ایک شخص کے سوا ہم سب رفقاء نے اپنے سابقہ عقیدے سے رجوع کر لیا۔

ان دونوں واقعات کو ایک بار پھر پڑھ لیجیے بلکہ ہم نے انھیں مختصراً نقل کیا ہے، ہو سکے تو صحیح مسلم میں انھیں براہ راست بھی دیکھ لیجیے، ان میں عقیدہ کی بات ہے۔ اور ایک واقعہ میں تو اشکال کے لیے قرآن کریم کی دو آیات کا حوالہ دیا گیا ہے، عقیدہ کی وضاحت کے لیے صحابہ کرام سے رجوع کیا گیا ہے، دونوں بزرگوں یعنی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے عقیدہ کی وضاحت کے لیے حدیث نبوی پیش کی ہے، اور پوچھنے والوں نے اسے کافی سمجھتے ہوئے اپنے عقیدہ کو درست کر لیا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا اسلوب یہی ہے کہ وہ دین کے حوالے سے سنت و حدیث کو ماخذ و معیار سمجھتے ہیں، جبکہ اس کی وضاحت کے لیے صحابہ کرام سے رجوع کرتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ عقائد کے باب میں جو رسالے عقائد کے بحث و مباحثہ کے آغاز میں لکھے گئے تھے، ان میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کا رسالہ ”الفقہ الاکبر“، امام محمد کا رسالہ ”عقیدۃ الشیبانی“، امام احمد بن حنبل کا رسالہ ”العقیدۃ“ اور امام طحاوی کا رسالہ ”العقیدۃ الطحاویہ“ معروف رسائل ہیں۔ ان میں جتنے عقائد کا ذکر ہے اور جن پر ایمان لانا ایک مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، ان میں سے بیشتر کا ماخذ حدیث نبوی ہے اور قرآن کریم کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرمودات سے بھی عقائد و ایمانیات میں استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری جمہور امت اور اہل سنت کے اسلوب کا بہترین نمونہ ہے جس میں حضرت امام بخاریؒ نے ”الجامع الصحیح“ کے سب سے پہلے باب ”کتاب الایمان“ میں عقائد و ایمانیات بیان کیے ہیں اور سب سے آخری باب ”کتاب الرد علی الجہمیۃ“ میں عقائد کی تعبیرات و تشریحات کا ذکر کیا ہے اور دونوں ابواب میں یعنی عقیدہ کے تعین اور اس کی تعبیر و تشریح دونوں میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ کو بھی بنیاد بنایا ہے، ان دونوں کی وضاحت اور ان کے مصداق کے تعین کے لیے حضرات صحابہ کرام کے ارشادات و توضیحات سے استدلال کیا ہے، اور یہی قرآن و سنت کی بنیاد پر دین کی تعبیر و تشریح کا صحیح اسلوب اور معیار ہے۔

اس ضمن میں ماہنامہ ”اشراق“ کے مذکورہ شمارے (اپریل ۲۰۰۸) کے صفحہ ۸ میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بارے میں جناب جاوید احمد غامدی کے اس ارشاد کا حوالہ دینا بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ:

> ”اصل الفاظ ہیں: بل رفعہ اللہ الیہ۔ اس رفع کی وضاحت قرآن نے سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۵۵ میں اس طرح فرمائی ہے کہ وفات کے بعد اللہ تعالیٰ انھیں اپنی طرف اٹھالیں گے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ روح قبض کر کے ان کا جسم بھی اٹھا لیا جائے گا تاکہ ان کے دشمن اس کی توہین نہ کر سکیں۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بارے میں غامدی صاحب کا یہ کہنا امت کے اجماعی عقیدہ کے منافی ہے، اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ان کے نزدیک عقیدہ کے تعین و تعبیر میں سنت و حدیث کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور ان کے خیال میں

قرآن کریم سے اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو روح قبض کیے بغیر زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا گیا تھا۔ اگرچہ ان کا یہ موقف بھی محل نظر ہے کہ قرآن کریم سے حضرت عیسی علیہ السلام کے زندہ حالت میں آسمانوں کی طرف اٹھائے جانے کا ثبوت نہیں ملتا، لیکن اس وقت ہمارا یہ موضوع گفتگو نہیں ہے اور ہم سردست یہ عرض کرنا چاہ رہے ہیں کہ چونکہ غامدی صاحب سنت و حدیث کو علم کا ذریعہ نہیں سمجھتے اور عقائد کے ماخذ کے طور پر تسلیم نہیں کرتے، اس لیے انھیں امت کے اس اجماعی عقیدہ سے انحراف کرنا پڑ رہا ہے۔ اور بات صرف اس ایک عقیدہ تک محدود نہیں ہے، اور بھی بہت سے معاملات میں جمہور امت کے اجماعی تعامل سے غامدی صاحب کے انحراف کی وجہ یہی ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک محترم جاوید احمد غامدی صاحب کا یہ "تصور سنت" صرف امت کے اجماعی تعامل و عقیدہ ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ و من یشاقق الرسول اور ویتبع غیر سبیل المؤمنین کی حدوں کو چھوتا ہوا بھی نظر آ رہا ہے۔ اس لیے ہم 'الدین النصیحۃ' کے تحت پورے خلوص کے ساتھ انھیں اس گمراہ کن تصور سے رجوع کا برادرانہ مشورہ دینا اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

نومسلموں سے مسلمانوں کا سلوک

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۴ مئی ۲۰۰۸ء)

میں اس وقت اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت ایڈنبرا کے قریب ایک بستی ڈنز میں اپنے بھانجے ڈاکٹر سبیل رضوان کے گھر میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ اس سے قبل دو روز میں نے گلاسگو میں گزارے اور مختلف احباب سے ملاقات کے علاوہ دو تین اجتماعات سے خطاب بھی کیا۔ ۱۶ اپریل کی شب ڈاکٹر رضوان مجھے گلاسگو سے لے کر گھر پہنچے تو رات کے دو بج چکے تھے اور میرا پروگرام یہ تھا کہ ظہر تک کا وقت ان کے پاس گزار کر واپس گلاسگو جاؤں گا تاکہ شام نو بجے برمنگھم کے لیے فلائٹ پکڑ سکوں جس کے لیے میں نے سیٹ بک کروا رکھی تھی۔ مگر رضوان کا اصرار تھا کہ میں ایک رات ان کے ہاں اور بسر کروں چنانچہ ان کے اصرار پر میں نے پروگرام تبدیل کر دیا اور بدھ کو بذریعہ طیارہ برمنگھم جانے کی بجائے جمعرات کو بذریعہ ٹرین سفر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ رضوان کو اللہ تعالی نے گزشتہ دنوں تیسری

بچی دی ہے اور آج اس کی بڑی بچی کی سالگرہ تھی اس لیے میں نے اس کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کہ بچوں کی اس طرح کی خوشیوں میں شرکت کا موقع کبھی کبھی ملتا ہے اور میں نے اس موقع کو ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

میں نے برمنگھم سے گلاسگو اور پھر گلاسگو سے برمنگھم کا ہوائی جہاز کا دوطرفہ ٹکٹ ۸۱ پاؤنڈ میں خریدا تھا اور واپسی کے لیے جمعرات کی شام ایڈنبرا سے برمنگھم کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ ۲۸ پاؤنڈ میں مل رہا تھا مگر اس صورت میں برمنگھم میں پہلے سے طے شدہ پروگرام میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ جبکہ رضوان نے میرے لیے بیروک سے برمنگھم کے لیے ٹرین کا جو ٹکٹ خریدا وہ ۶۷ پاؤنڈ میں ملا اور میرا گلاسگو سے برمنگھم کا ہوائی جہاز والا ٹکٹ ضائع ہو گیا۔ ہم پاکستان سے آنے والے جب اس قسم کے نقصان کو پاکستانی کرنسی کے حساب سے دیکھتے ہیں تو دل پریشان ہونے لگتا ہے مگر رضوان نے اسے نارمل بات قرار دیا اور اس سے مجھے رضوان فیملی کی خوشی حاصل ہونے کے ساتھ ایک فائدہ اور بھی ہوا کہ شام کو ایک نومسلم سے ملاقات ہو گئی جس کی تفصیلات آگے چل کر عرض کروں گا۔

لطیفہ کی بات یہ ہوئی کہ رضوان نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے پوچھا کہ اس کی اہلیہ کہہ رہی ہے کہ اگر ہم بچی کی سالگرہ پر کیک کاٹ لیں تو ماموں ناراض تو نہیں ہوں گے؟ میں نے کہا کہ نہیں بیٹا ناراضگی کی کون سی بات ہے۔ اصل میں اس کا یہ خیال تھا کہ ایک غیر شرعی رسم ہونے کی وجہ سے میں اس پر غصے کا اظہار کروں گا جبکہ ایسے معاملات میں میرا موقف اور طرز عمل یہ ہے کہ اس قسم کی علاقائی اور ثقافتی رسمیں اگر دین کا حصہ نہ سمجھی جائیں اور انہیں ثواب کے ارادے سے سرانجام دینے کی بجائے محض خوشی کی علاقائی اور ثقافتی رسم کے طور پر کیا جائے تو اس پر شریعت کے منافی ہونے کا فتویٰ لگا دینا اور غیظ و غضب کا اظہار کرنا مناسب بات نہیں ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں کسی چیز کا غیر شرعی ہونا اور بات ہے اور شریعت کے منافی ہونا اس سے مختلف امر ہے، ہمیں ان دونوں کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

بہرحال میں نے بدھ کا پورا دن رضوان کے ساتھ ڈنز میں گزارا، وہ مجھے چند میل کے فاصلے پر سمندر کے کنارے لے گیا جہاں ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر موسم کو انجوائے کرتے رہے کہ یہاں کے لوگوں کے مطابق خاصے عرصہ کے بعد اس علاقے میں اتنا صاف اور خوشگوار موسم میسر آیا ہے کہ مسلسل کئی روز سے دھوپ ہے اور درجہ حرارت ۲۲ سینٹی گریڈ تک

پہنچا ہے۔ رضوان اپنے بچوں کے بارے میں بتا رہا تھا کہ گزشتہ روز وہ اس درجہ حرارت پر بھی دوپہر کے وقت گرمی کی شکایت کر رہے تھے۔ ساحل سمندر سے واپسی پر ہم ایک زرعی فارم پر رکے، وہاں ایک گھر کی طرف اشارہ کرکے رضوان نے مجھے بتایا کہ یہ مورس کا گھر ہے جو نومسلم ہے اور ڈنز کے علاقہ میں رہنے والے تین چار مسلم گھرانوں میں سے ایک گھر یہ بھی ہے۔ ہمیں دیکھ کر مورس کے بیوی بچے باہر نکل آئے اور سلام کرنے لگے۔ رضوان نے بتایا کہ وہ چھٹی کے روز بچوں سمیت اس فارم پر آجاتے ہیں اور دن کا ایک حصہ یہاں گزارتے ہیں۔ اس لیے مورس کے چھوٹے چھوٹے بچے اس سے مانوس تھے۔ اسے دیکھ کر سلام کرنے لگے اور ایک بچے نے میری طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ رضوان نے بتایا کہ یہ میرے انکل ہیں تو وہ بچہ کہنے لگے کہ ہمارے بھی انکل ہیں۔

مورس گھر میں نہیں تھے اس لیے ہم گاڑی سے نہیں اترے اور چند لمحے وہاں رک کر گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ البتہ شام کو ڈنز میں جناب محمد سعید چودھری کی رہائش گاہ پر مورس سے تفصیلی ملاقات ہوگئی۔ محمد سعید کا تعلق میاں چنوں سے ہے، ہمارے محترم بزرگ مکتبہ رشیدیہ لاہور والے مولانا حافظ عبدالرشید ارشدؒ کے رشتہ داروں میں سے ہیں اور ڈنز میں آباد ہونے والی پہلی مسلمان فیملی ان کی ہے۔ ان کے بعد مورس کا خاندان یہاں آیا پھر ڈاکٹر رضوان کی فیملی آئی اور اب ایک اور مسلمان گھرانہ آباد ہوا ہے۔ اس طرح ڈنز کے علاقے میں اس وقت چار مسلمان خاندان آباد ہیں جن کے آپس میں گہرے تعلقات ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ہاں اس طرح بے تکلفی سے آتے جاتے ہیں جیسے وہ ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار ہوں۔ مجھے یہ ماحول دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ شام کو رضوان مجھے محمد سعید صاحب کے گھر لے گیا جہاں مورس بھی موجود تھا۔ میں نے رضوان سے کہا کہ میں مورس کے ساتھ انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ مورس پہلے تو ہچکچائے اور پھر کچھ تردد کے بعد گفتگو پر آمادہ ہوگئے اور ہماری یہ گفتگو کم و بیش دو گھنٹے تک جاری رہی جس کے دوران ہم نے کھانا بھی کھایا اور مغرب کی نماز بھی باجماعت ادا کی۔ مورس نے اپنے قبول اسلام کا واقعہ اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات و احساسات کا بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اظہار کیا جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مورس کا پرانا نام ”مورس بڈن“ ہے اور قبول اسلام کے بعد اس کا پہلا نام مورس عبد المجید تھا جسے بعد میں اس نے تبدیل کر کے مورس عبداللہ رکھ لیا مگر عام طور پر مورس کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ اس کا تعلق برطانیہ کے شہر نیو کاسل سے ہے، اس کا کہنا ہے کہ بچپن سے ہی اس کے مزاج میں تجسس تھا اور توہمات سے اسے نفرت تھی۔ وہ کرسمس فادر اور روحوں وغیرہ کے آنے پر یقین نہیں رکھتا تھا اور اسکول کی تعلیم کے دوران بھی کثرت سے سوالات کیا کرتا تھا۔ وہ کبھی چرچ نہیں گیا اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے پر یقین رکھتا تھا۔ البتہ خدا پر اس کا یقین تھا اور اپنے طور پر خدا سے سیدھا راستہ دکھانے کی دعا کیا کرتا تھا۔ غریب لوگوں سے ہمدردی تھی اور جنگ سے سخت نفرت تھی بلکہ یہ دعا کرتا تھا کہ اے خدا! دنیا میں جتنا اسلحہ بھی ہے وہ سب پگھل جائے تاکہ جنگ نہ ہو اور لوگ امن کے ساتھ رہ سکیں۔

مورس عبداللہ نے بتایا کہ مجھے بچپن سے ہی ڈراؤنے خواب آتے تھے اور میں ہر وقت سوچ بچار کرتا رہتا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ خدا ہے مگر بائبل پر یقین نہیں تھا اور میں مسلسل اس تلاش میں تھا کہ خدا کہاں ہے؟ میں نے ایک روز ان الفاظ میں دعا مانگی کہ اے خدا! مجھے یقین ہے کہ تو ہے مگر تجھ سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا اس لیے آج کے بعد میں ہر وہ کام کروں گا جسے میں اچھا سمجھوں گا اور ہر اس کام سے بچوں گا جسے اچھا نہیں سمجھوں گا۔ اس کے بعد میں نے بہت سے ایسے کام بھی زندگی میں کیے جنہیں میں اچھا سمجھتا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ اچھے کام نہیں تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں آرمی میں چلا گیا اور امریکہ، ڈنمارک، قبرص، فرانس، یونان، روڈس اور مصر وغیرہ میں فوجی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ اس دوران بھی حقیقت کی تلاش میں میرا تجسس جاری رہا اور میں اپنے ساتھیوں سے بحث و مباحثہ کرتا رہا۔ میں نشہ بھی کرتا تھا، شراب بھی پیتا تھا اور ہر برے سے برا کام کر گزرتا تھا حتیٰ کہ جب انتہا ہو گئی تو واپسی کا خیال پیدا ہوا۔

آرمی سے فارغ ہونے کے بعد میں بطور انجینئر مصر چلا گیا جہاں دو سال رہا اور اس دوران مصر کے انجینئر دوستوں سے مختلف معاملات پر میرے بحث و مباحثے کا سلسلہ جاری رہا۔ زیادہ تر غیب لوگوں کے حالات زیر بحث آئے۔ میں انہیں یہ کہتا کہ دیکھو ہمارا مغرب کا ڈیموکریسی کا نظام کتنا اچھا ہے، تمہارے ہاں یہ نظام نہیں ہے۔ ہمارے ہاں صفائی ہے، ڈسپلن ہے، تمہارے ہاں گندگی ہے، غربت ہے اور عام لوگوں کے حالات

ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم لوگ چاند پر پہنچ گئے ہیں اور تمہاری حالت کیا ہے! اس دوران مصر میں مجھے بھنگ اور حقے کی بھی عادت ہوگئی اور اس قسم کے بحث مباحثوں میں بھی میرا جوش وخروش بڑھتا رہا۔ ایک مصری انجینئر جس کا نام فہمی تھا، مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ جو صورتحال تم ہمارے مسلمانوں کی دیکھ رہے ہو یہ اسلام نہیں ہے۔ اسلام تو کتابوں میں ہے اس لیے اسلام کا مطالعہ کرو۔ اسی دوران جب میں نے اسے کہا کہ ہم لوگ چاند پر پہنچ گئے ہیں اور تم لوگ ابھی تک گندگی اور غربت میں ہو تو اس نے مجھے کہا کہ چاند پر جانے اور خلاء کے جس سفر کی تم بات کر رہے ہو اس کا ذکر تو قرآن کریم نے صدیوں پہلے کر دیا تھا۔ مجھے تعجب ہوا اور میں نے پوچھا کہ کیا تم قرآن کریم میں مجھے یہ بات دکھا سکتے ہو؟ اس نے کہا ہاں دکھا سکتا ہوں، میں نے اس پر خاموشی اختیار کرلی اور سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

ایک دن میں اپنی رہائش گاہ کی کھڑکی سے نیچے گلی میں جھانک رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ میں نے دیکھا کہ ایک ضعیف شخص آیا اور اندر چلا گیا جو تھوڑی دیر کے بعد اکیلا ہی اندر سے باہر نکلا اور واپس چلا گیا۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ ایک ہی آدمی ہے جس نے عبادت کی ہے، پھر کچھ دیر کے بعد اذان کی آواز سنائی دی وہ شخص آیا اور مسجد میں چلا گیا۔ میں اپنی عمارت سے اترا اور مسجد میں گیا، وہاں باہر جوتوں کا ایک ہی جوڑا پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے بھی جوتے اتارنے چاہئیں چنانچہ میں جوتے اتار کر مسجد کے اندر گیا تو وہ ضعیف شخص نماز پڑھ رہا تھا اور سجدے میں تھا۔ میں نے بھی اسے دیکھ کر اسی طرح سجدہ کیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے دیکھتا میں مسجد سے باہر نکل آیا۔

اس کے بعد میں نے اپنے مصری انجینئر دوست سے تقاضا کیا کہ وہ مجھے خلائی سفر کا تذکرہ قرآن کریم میں دکھائے اور کوئی اچھا سا انگریزی ترجمہ قرآن کریم کا مجھے مہیا کرے۔ اس پر وہ مجھے ایک مارکیٹ میں لے گیا جو بہت خوبصورت اور سجی ہوئی دکانوں پر مشتمل تھی، اس کے درمیان میں ایک پرانی سی دکان میں ایک ضعیف شخص بیٹھا تھا، دکان کی حالت بہت خستہ تھی، کتابوں پر گرد جمی ہوئی تھی، وہاں سے میں نے قران کریم کا یوسف طلال علی والا انگلش ترجمہ خریدا اور اپنے دوست سے تقاضا کیا کہ وہ مجھے قرآن کریم کی وہ آیت دکھائے جس میں خلائی سفر کا ذکر ہے۔ وہ سمجھدار آدمی تھا اس نے کہا کہ قرآن کریم ساتھ لے جاؤ اس کا مطالعہ کرو تمہیں خود ہی وہ آیت بھی مل جائے گی۔ میں نے قرآن کریم کا مطالعہ شروع کر دیا۔ سورۃ الفاتحہ اور اس کے بعد سورۃ البقرہ کی چالیس پچاس آیات پڑھیں، یہاں تک مجھے

وہ خلائی سفر والی آیت تو نہ ملی مگر میرے دل میں یہ بات اترنے لگی کہ یہ کتاب بہرحال سچی ہے اور ہدایت کا وہ راستہ اس میں موجود ہے جس کی مجھے بچپن سے تلاش تھی۔ میں نے قرآن کریم کا مطالعہ جاری رکھا، دو سال کے مطالعہ کے بعد مجھے وہ آیت مل گئی جس میں خلائی سفر کا تذکرہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالی جنوں اور انسانوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ اگر تم میرے حکم کے بغیر زمین اور آسمان کے کناروں سے باہر نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ مگر میرے حکم کے بغیر تم ایسا نہیں کر سکو گے۔

مورس نے بتایا کہ میں نے قرآن کریم کا مطالعہ کم و بیش چھ سال جاری رکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل میں دنیا سے بے رغبتی بڑھنے لگی، زندگی بے مقصد نظر آنے لگی اور بے مزہ سی ہو کر رہ گئی۔ مجھے ویسٹرن طرز زندگی سے نفرت ہونے لگی مگر میری حالت یہ تھی کہ قرآن کریم پڑھ کر روتا رہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ نشہ بھی کرتا تھا۔ ایک دن میں نیو کاسل میں اپنے گھر میں تھا کہ صبح بیدار ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے میں گھر سے باہر جا رہا ہوں اور پھر میں قریب ہی واقع ایک مسجد میں چلا گیا۔ اس سے قبل میں یہاں کسی مسلمان سے نہیں ملا تھا، میں نے انہیں بتایا تو انہوں نے مجھے کلمۂ شہادت پڑھایا اور میرا نام تبدیل کر کے مورس بڈن کی بجائے مورس مجید رکھ دیا۔ اس کے بعد تبلیغی جماعت والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے مجھے دوبارہ کلمہ پڑھایا اور نام مورس عبدالمجید کر دیا۔ پھر میرا کچھ عرصہ ان سے تعلق رہا اس کے بعد مختلف مقامات پر جاتا رہا اور نیو کاسل میں کتابوں کی ایک دکان ”بیت الحکمۃ“ کے نام سے میں نے کھول لی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ”بیت الحکمۃ کا نام یہاں کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا اس لیے اس کا نام ”ہاؤس آف وزڈم“ رکھا جائے مگر انہوں نے میری بات نہ مانی اور میں یہ دکان کچھ عرصہ کرتا رہا۔

پھر میں نے یہ سوچ کر نیو کاسل چھوڑ دیا کہ یہاں مسلمان کم ہیں اور مسلمانوں والا ماحول نہیں ہے۔ میں بیوی بچوں سمیت بلیک برن چلا گیا اس لیے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے، بہت مسجدیں و مدرسے ہیں اور اسلامی ماحول موجود ہے، اس سے بچوں کی تعلیم بھی اچھی ہو گی۔ مگر یہ تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ دینی معلومات میں اضافہ ہو گا، ماحول اور تربیت کا فائدہ ہو گا مگر لوگوں نے مجھے چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا دیا۔

مختلف گروہ تھے ہر ایک مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا، ایک کہتا کہ نماز میں پاؤں یوں رکھو، دوسرا کہتا نہیں بلکہ اس طرح رکھو۔ ایک کہتا ہاتھ اس جگہ باندھو، دوسرا کہتا کہ یہاں نہیں بلکہ یہاں باندھو۔ ایک کہتا کہ شہادت کی انگلی ایک بار اٹھاؤ، دوسرا کہتا کہ نہیں بار بار اٹھاتے رہو۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ میں اسی کے کہنے پر چلوں، کسی دوسرے کی بات مانتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ ہر شخص اپنی بات کی دلیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نہ کوئی حدیث سنا دیتا۔ حدیثوں میں اس قدر تضاد دیکھ کر مجھے ان سے نفرت ہونے لگی۔ میں لوگوں سے کہتا کہ مجھے قرآن سے سمجھاؤ وہ کہتے کہ قران کریم اس وقت تک تم نہیں سمجھ سکتے جب تک حدیث نہ پڑھو۔ اور حدیث پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی سیکھو اور کئی سال مدرسے میں رہ کر دینی تعلیم حاصل کرو۔ مجھے سخت پریشانی ہونے لگی۔

مورس نے بتایا کہ میرے مزاج میں تجسس تھا اور میں سوالات بہت کرتا تھا، میرے سوالات کی کثرت دیکھ کر وہ لوگ مجھے گمراہ اور کافر کہنے لگے۔ ہر گروہ مجھے اپنی کتابیں دیتا اور حدیثیں سناتا، مجھے ان میں واضح تضاد دکھائی دیتا۔ چنانچہ سخت پریشانی کی حالت میں بلیک برن کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور میں نے طے کر لیا کہ اب ایسی جگہ جا کر رہوں گا جہاں مسلمانوں کی آبادی نہ ہو، اس طرح میں اسکاٹ لینڈ کے اس علاقے میں آکر آباد ہو گیا۔

مورس نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ کسی مسلمان کی دعوت پر مسلمان نہیں ہوا اور نہ ہی کسی مسلمان کو دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر مسلمان ہوا ہے بلکہ وہ صرف اور صرف قرآن کریم کے مطالعہ سے مسلمان ہوا ہے۔ بلکہ وہ دوسرے جن نومسلموں کو جانتا ہے ان میں سے کوئی بھی کسی مسلمان کی دعوت پر یا اس سے متاثر ہو کر مسلمان نہیں ہوا، سب کے سب قرآن کریم پڑھ کر مسلمان ہوئے ہیں۔ البتہ مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں نے ان نومسلموں کو الجھایا ضرور ہے، وہ انہیں پکا مسلمان بنانے اور اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم دینے کی بجائے پہلے حنفی، شافعی، دیوبندی، بریلوی، تبلیغی اور شیعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ کسی شخص کے مسلمان ہونے پر کوئی مسلمان اس سے یہ تو نہیں پوچھتا کہ تمہیں مسلمان ہونے کے بعد کیا پریشانی لاحق ہوئی ہے، اپنے خاندان کے ساتھ تمہارے تعلقات کا کیا حال ہے، تمہیں کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے، کسی معاشرتی الجھن سے تو تم دوچار نہیں ہوتے ہو، اور تمہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے؟ نومسلم سے یہ باتیں

کوئی نہیں پوچھتا البتہ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس کے فرقے میں شامل ہوجائے، کسی دوسرے فرقے کی بات نہ سنے اور کسی اور کی مسجد میں نہ جائے۔ مجھے اس کا تلخ تجربہ ہوا ہے اس لیے میں نے سب کو چھوڑ دیا ہے۔

مورس نے کہا کہ مجھے ایک بات سے اور پریشانی ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ان کے سارے مسئلے خدا نے ہی حل کرنے ہیں، اس لیے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے قدرت کے کسی معجزے کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور ماضی کے واقعات سنا سنا کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ فلاں موقع پر خدا نے اس طرح ان کی مدد کی تھی۔ اسی طرح بہت سے مسلمان اس انتظار میں ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئیں گے اور دجال ظاہر ہوگا تو اس وقت سب کچھ ہوگا۔ مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ انہیں اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے خود کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا، اس طرح انتظار میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ انہیں اپنے حالات درست کرنے کے لیے محنت کرنی چاہیے۔ مورس نے کہا کہ نومسلم کو اسلامی احکام وفرائض کے ساتھ ساتھ بعض لوگ اپنے اپنے علاقائی کلچر کا بھی پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ لباس بھی ان جیسا پہنے اور وضع قطع بھی انہی کی اختیار کرے۔ اس پر اس قدر سختی کی جاتی ہے کہ وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ حالانکہ جو باتیں اسلام میں ضروری نہیں ہیں ان کے بارے میں نومسلموں پر اس قدر سختی نہیں ہونی چاہیے اور انہیں سادہ طریقے سے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا جانا چاہیے۔

مورس نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ مسلمانوں کی اس عمومی حالت سے پریشان ہوکر یونیورسٹی کی مسجد میں گیا کہ وہاں قدرے پڑھا لکھا ماحول ہوگا مگر وہاں بھی صورتحال ویسی ہی تھی۔ اس نے تبلیغی جماعت کے ساتھ کئی بار وقت لگایا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اسے دین کی معلومات حاصل ہوں گی اور علم میں اضافہ ہوگا مگر وہاں بھی اسے تبلیغی نصاب اور کچن کی صفائی کے کاموں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اس نے قرآن کریم کا سالہا سال تک مطالعہ کیا تھا اس کے حوالے سے جب وہ کوئی سوال کرتا تو اسے جواب ملتا کہ تم قرآن کریم کو کیا جانتے ہو، تمہارے پاس کیا علم ہے؟ اس سے اس کی مایوسی میں اضافہ ہوا۔ ایک مسجد میں رمضان المبارک کے دوران دیکھا کہ کھانے پینے کا سامان بہت ضائع ہورہا ہے اور کھانے کا انداز بھی مجھے اچھا نہ لگا۔ اس قسم کے مناظر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جس

اسلام کی میں تلاش میں تھا یہ وہ اسلام نہیں ہے، اس لیے میں اب مسلمانوں کی آبادی سے الگ تھلگ یہاں زندگی بسر کر رہا ہوں۔

میں نے مورس عبداللہ سے سوال کیا کہ اسلام کی دعوت دینے والوں کو نومسلموں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، اس نے کہا کہ

- انہیں مسائل اور اختلافات میں نہ الجھائیں اور دین کی بنیادی باتوں کی سادہ انداز میں تعلیم دیں۔
- انسانیت کے حوالے سے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کی تلقین کریں۔
- اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ پیش آنے والے مسائل اور مشکلات معلوم کریں اور انہیں حل کرنے کے لیے ان سے تعاون کریں۔
- انہیں قرآن کریم کے حوالے سے بات سمجھانے کی کوشش کریں اور احادیث کے اختلافات سے انہیں دور رکھیں اس سے ان کے ذہنوں میں کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔
- دین کے مسائل سمجھانے کے لیے ”کامن سینس“ کا زیادہ استعمال کریں۔ مثلاً یہ بات سمجھانے کے لیے کہ مونچھیں تراشنی چاہئیں، انہیں فرض یا واجب کہہ کر بات نہ کریں بلکہ انہیں اس کے فائدے بتائیں کہ مونچھ تراشنے سے انہیں یہ فائدہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔
- انسانی ہمدردی کی بنیاد پر عام لوگوں کی خدمت کا ایسا نظام بنائیں جس سے لوگ مذہب کی کسی تفریق کے بغیر فائدہ اٹھا سکیں تاکہ نومسلموں کو ضرورت پڑنے پر الگ سے چیریٹی کا اہتمام نہ پڑے۔
- اسلام کے بارے میں ان کے مطالعہ اور اسٹڈی کا احترام کریں اور انہیں اس بات کا بار بار طعنہ نہ دیں کہ تم کیا جانتے ہو، تمہیں کیا آتا ہے اور تمہارے پاس کیا علم ہے؟
- نومسلموں کو قرآن کریم کے بتائے ہوئے اچھے کاموں کو بجالانے کی تلقین کریں، دیانت و امانت کی اہمیت سے آگاہ کریں اور خیر کے کاموں کی طرف رغبت دلائیں۔

مورس عبداللہ کی گفتگو جاری تھی اور اس کے لہجے کا جوش و خروش بڑھ رہا تھا، وہ کبھی کبھی خاموشی سے آسمان کی طرف سر اٹھا کر گہری سوچ میں چلا جاتا، اس کا جی اور بھی بہت سی باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا مگر رات کا وقت تھا اور دیر ہو رہی تھی۔ مجھے صبح سفر کرنا تھا اور اس سے قبل یہ رپورٹ بھی لکھنی تھی اس لیے بادل نخواستہ گفتگو کا مزید سلسلہ روک کر معذرت کرتے ہوئے شکریہ کے ساتھ ہم وہاں سے رات گیارہ بجے کے لگ بھگ رخصت ہو گئے۔

علم الکلام اور اس کے جدید مباحث

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۱ مئی ۲۰۰۸ء)

گزشتہ دنوں جامعہ عثمانیہ پشاور، جامعہ انوار القرآن کراچی اور بعض دیگر مدارس میں اساتذہ اور طلبہ کی مختلف نشستوں میں ”علم العقائد کا مروجہ تعلیمی نصاب اور عصر حاضر کا چیلنج“ کے عنوان پر گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا، ان کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ علم العقائد اور علم الکلام کے حوالے سے اس وقت جو مواد ہمارے ہاں درس نظامی کے نصاب میں پڑھایا جاتا ہے وہ اس بحث و مباحثہ کی ایک ارتقائی صورت ہے جس کا صحابہ کرامؓ کے ہاں عمومی طور پر کوئی وجود نہیں تھا۔ اور اس کا آغاز اس وقت ہوا جب اسلام کا دائرہ مختلف جہات میں پھیلنے کے ساتھ ساتھ ایرانی، یونانی، قبطی اور ہندی فلسفوں سے مسلمانوں کا تعارف شروع ہوا اور ان فلسفوں کے حوالے سے پیدا ہونے والے شکوک و سوالات نے مسلمان علماء کو معقولات کی طرف متوجہ کیا۔

ابتدائی دور میں عقیدہ صرف اس بات کا نام تھا کہ قرآن کریم نے ایک بات کہہ دی ہے یا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات ارشاد فرما دی ہے، بس اسی کو بے چون و چرا مان لینے کا نام عقیدہ ہے۔ ان عقائد کے حوالے سے صحابہ کرامؓ کو اس سے زیادہ کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ قرآن کریم نے یا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بات فرما دی ہے، اور نہ ہی انہیں اس بات سے کوئی غرض ہوتی تھی کہ وہ بات ہماری عقل و فہم کے دائرے میں آتی ہے یا نہیں، یا ہمارے محسوسات و مشاہدات اس کو قبول کرتے ہیں یا نہیں، اور وہ ان باتوں سے بے نیاز ہو کر قرآن و حدیث کی تصریحات پر ایمان رکھتے تھے بلکہ معقولات کے حوالے سے عقائد پر بحث و مباحثہ کو بھی پسند نہیں کیا کرتے تھے۔ البتہ بیرونی فلسفوں کے در آنے سے جب عقلی سوالات کھڑے ہوئے اور علماء اسلام کو ان

سوالات کے جواب میں اسلامی عقائد کی وضاحت کی ضرورت پیش آئی تو صحابہ کرامؓ کے آخری دور میں اس قسم کے مباحثوں کا آغاز ہوا اور تابعین و اتباع تابعین کے دور میں یہ مباحث اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔

معقولات کے حوالے سے جب عقائد کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثہ شروع ہوا تو ایک دور تک اس کے مسائل کی نوعیت اس طرح تھی کہ

- اللہ تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہے یا نہیں؟
- اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا باہمی تعلق کیا ہے؟
- قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یا اس کی مخلوق ہے؟
- کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے کوئی مسلمان ایمان کے دائرے سے نکل جاتا ہے یا نہیں؟
- جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو جانے پر ان کی نیابت امامت کے حوالے سے ہوگی یا خلافت کے عنوان سے ہوگی؟ وغیر ذلک۔

اس دور میں اس علم یا فن کو ''فقہ'' کا حصہ تصور کیا جاتا تھا اور فقہ صرف احکام و قوانین تک محدود نہیں ہوتی تھی، بلکہ ایمانیات یعنی عقائد اور وجدانیات یعنی تصوف و سلوک بھی فقہ ہی کے شعبے شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ عقائد پر حضرت امام ابوحنیفہؒ کا رسالہ ''الفقہ الاکبر'' کہلاتا ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ عقائد کے اس عقلی مباحثے کو علم التوحید والصفات، علم النظر والاستدلال اور علم اصول الدین بھی کہا جاتا تھا۔ چونکہ ان مسائل پر عام طور پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا اور اس مباحثہ میں معتزلہ پیش پیش ہوتے تھے، اس لیے امام شہرستانیؒ کے بقول سب سے پہلے معتزلہ نے اسے ''علم الکلام'' کا نام دیا۔ جبکہ اہل سنت کے اکابر علماء نے اسے پسند نہیں کیا، چنانچہ اصول فقہ کی متداول کتاب ''التوضیح والتلویح'' کے محشی نے نقل کیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عمرو بن عبید کو تباہ کرے کہ اس نے کلام کا دروازہ کھولا ہے، امام ابو یوسفؒ نے فتویٰ دیا کہ متکلّم کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے، امام احمد بن حنبلؒ نے اس کی مذمت کی، اور امام شافعیؒ نے اسے شرک کے بعد بدترین برائی سے تعبیر کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بحث و مباحثہ آگے بڑھتا گیا اور ان علماء اسلام نے بھی جو اس بحث و کلام کو پسند نہیں کرتے تھے، اسلامی عقائد کی عقلی وضاحت اور

اثبات کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے اپنے علمی معمولات میں شامل کر لیا، چنانچہ علم الکلام کے نام سے ایک پورا نصاب اب ہمارے دینی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔

قرآن و حدیث کے بیان کردہ عقائد پر عقلی بحث و مباحثہ اور ان کی عقلی توجیہات و تعبیرات کے نتیجے میں اس دور میں جو فرقے وجود میں آئے، ان میں معتزلہ، جبریہ، قدریہ، مرجئہ، خوارج، اہل تشیع اور اہل سنت وغیرہ کے نام معروف ہیں۔ ان میں سے اہل سنت اور اہل تشیع اب تک اپنے پورے تعارف کے ساتھ موجود چلے آ رہے ہیں جبکہ باقی فرقوں کا اپنے نام اور تعارف کے ساتھ وجود نظر نہیں آتا، البتہ ان کا ذہن اور سوچ کا انداز مختلف حوالوں سے اب بھی اس سابقہ تعارف اور تشخص کے بغیر امت میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سے اہل السنۃ والجماعۃ خود کو امت کا اجتماعی دھارا قرار دیتے ہیں جن کی بنیاد دو اصولوں پر ہے:

1. ایک یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دینیات بالخصوص عقائد کی کیا صورت ارشاد فرمائی ہے۔

2. اور دوسری یہ کہ صحابہ کرامؓ نے اجتماعی طور پر اسے کیسے سمجھا ہے؟

اہل سنت کے نزدیک یہی وہ دو معیار ہیں جن کی بنیاد پر عقیدہ سمیت دین کی کسی بھی بات کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" کے مقدمہ میں اہل سنت کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل سنت وہ ہیں جو قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر اسی صورت میں ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے۔ اور وہ ان ارشادات کی عقلی توجیہ کو ضروری نہیں سمجھتے اور نہ ہی عقلی توجیہ و تعبیر کو قرآن و سنت کے کسی فرمان پر یقین کا معیار تصور کرتے ہیں، البتہ جہاں کسی عقیدہ کی وضاحت یا کسی عقلی سوال کے جواب کے لیے ضرورت محسوس کرتے ہیں، وہاں وضاحت کی حد تک اس عقلی بحث و مباحثہ کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے اور ضرورت کے مطابق اس مباحثہ میں شریک ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآن و سنت کی تصریحات کو ان کی ظاہری صورت میں تسلیم کرنے والے تمام لوگ اہل سنت ہیں، البتہ ظاہری صورت پر فی الجملہ ایمان رکھنے کے بعد اس کی تعبیر و توضیح میں اختلافات خود اہل سنت کے اندر بھی موجود ہیں اور ایسے کسی اختلاف سے کوئی شخص اہل سنت کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا۔ اہل سنت

کے دائرے میں عقائد کی ایسی تعبیرات، تشریحات، توجیہات اور توضیحات کے حوالے سے جو مختلف مکاتب فکر موجود چلے آرہے ہیں، ان میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور ظواہر کے گروہ متعارف ہیں جو امام ابوالحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی اور امام ابن حزم ظاہری کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں عقائد کی تعبیر وتشریح کرتے ہیں اور بہت سے امور میں ان کے درمیان اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔

یہ تومختصر تعارف ہے اس علم الکلام کا جو ہمارے دینی نصاب کا باقاعدہ حصہ ہے اور اب تک انہی خطوط پر استوار ہے جن پر صدیوں قبل اس کی تشکیل ہوئی تھی۔ اب ہم ان تبدیلیوں اور ان کے حوالے سے پیدا ہونے والی ضروریات کی طرف آتے ہیں جو گزشتہ تین صدیوں کے دوران بتدریج رونما ہوئی ہیں اور ہمارے خیال میں ہم اپنے تنزل اور غلامی کے اس دور میں ''تحفظات'' کے دائرے میں محصور ہو جانے کی وجہ سے ان کی طرف توجہ نہیں دے سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ''علم العقائد والکلام'' ان تبدیلیوں اور ضروریات کو اپنے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کرسکا اور ہم آج کے عالمی تناظر میں ایمانیات و عقائد کے ضروری تقاضوں کے ساتھ اس کو ہم آہنگ نہیں پاتے جس کی طرف مختلف اصحاب فکرودانش ہمیں وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے رہتے ہیں، لیکن ہم ابھی تک اس کا پوری طرح احساس وادراک نہیں کرپارہے۔

ہمارے ''علم العقائد والکلام'' کے بیشتر مباحث یونانی فلسفہ اور اس کے ساتھ ساتھ ایرانی، ہندی اور قبطی فلسفہ کے ساتھ ہمارے علمی تعارف کی پیداوار ہیں اور ہمارے ہاں اسے ''معقولات'' کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے، جبکہ خود اس فلسفہ کی اپنی ہیئت تبدیل ہوچکی ہے اور ارتقائی مراحل نے اس کی شکل وصورت تک بدل کر رکھ دی ہے۔ مثلاً ماضی میں سائنس کو معقولات کا شعبہ تصور کیا جاتا تھا اور وہ فلسفہ کا حصہ سمجھی جاتی تھی، چنانچہ ہمارے ہاں فلکیات اور طبعیات کو معقولات ہی کے ایک حصے کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ جبکہ سائنس ایک عرصہ سے فلسفہ و معقولات سے الگ ہوکر ایک مستقل علم کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اب وہ معقولات اور فلسفہ کا حصہ نہیں ہے بلکہ مشاہدات و محسوسات کے دائرے میں شامل ہے، لیکن ہم درس نظامی کے نصاب میں اس تبدیلی کا ابھی تک ادراک نہیں کرسکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فلسفہ اور سائنس کی علیحدگی کے باعث عقائد اور ان کی تعبیرات کے ضمن میں جو نئے سوالات پیدا ہوئے ہیں، ہم ان کا جواب دینے کی سرے

سے ضرورت محسوس نہیں کر رہے۔ مثلاً فلکیات و طبیعیات جب تک فلسفہ و معقولات کا حصہ تصور ہوتے تھے، ان کی کسی بات سے قرآن و سنت کے کسی ارشاد کے تعارض و تضاد کی صورت میں ہم آسانی سے یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ ہماری عقل کا دائرہ محدود ہے، جبکہ معقولات کا دائرہ اور اس کے امکانات بہت وسیع ہیں، اس لیے کوئی بات اگر ہماری معروضی اور محدود عقل کے دائرے میں نہیں آتی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ معقولات کے وسیع دائرے اور اس کے مستقبل کے امکانات سے بھی متصادم ہے۔ اور ہمارا یہ جواب نہ صرف یہ کہ اطمینان کی صورت پیدا کر دیتا تھا بلکہ بہت سی صورتوں میں عملاً بھی ایسا ہو جاتا تھا۔ لیکن سائنس کے عقل و فلسفہ کے دائرے سے نکل کر مشاہدات و محسوسات اور تجربات کے زمرہ میں شامل ہو جانے کے بعد یہ جواب کافی نہیں ہے اور ہمیں ایسے سوالات کے جوابات کے لیے کوئی اور اسلوب اختیار کرنا ہوگا اور میری طالب علمانہ رائے میں آج کے دور میں ہمارے علم عقائد کے لیے یہ وقت کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے پہلو بہ پہلو ایک اور علم بھی بہت سے سوالات لیے ہمارے سامنے کھڑا ہے اور وہ عمرانیات اور سوشیالوجی کا علم ہے۔ جس نے اس قدر ترقی کی ہے کہ جدید تہذیب اور گلوبل سولائزیشن میں اس نے وحی اور آسمانی تعلیمات کی جگہ حاصل کر رکھی ہے اور انسانی سوسائٹی کے بیشتر مسائل اب اسی کے حوالے سے طے ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں اس سے بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ابن خلدونؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے بعد اس درجہ کا کوئی اور عالم نظر نہیں آتا جس نے عمرانیات کو باقاعدہ موضوع بنا کر اس پر بحث کی ہو اور ہمارے دینی حلقوں کو اس علم سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کے ذہنوں میں عمرانیات اور سوسائٹی کے ارتقا کے حوالے سے سوالات اور شکوک کا ایک جنگل آباد ہے مگر ہمارے دینی حلقوں کے پاس ان سوالات کا نہ کوئی جواب ہے اور نہ ہی ان میں سے بیشتر کو سرے سے ان سوالات کا ادراک ہی حاصل ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ عالمی افق پر گزشتہ تین صدیوں کے درمیان رونما ہونے والی علمی تبدیلیوں اور خاص طور پر فلسفہ، سائنس اور عمرانیات کی انسانی ذہنوں پر حکمرانی سے پیدا شدہ صورتحال میں ہمیں ''علم العقائد والکلام'' کے نصاب کا ازسرنو جائزہ لینا ہوگا۔ اس کا مطلب عقائد میں تبدیلی نہیں ہے بلکہ ان کی تعبیرات و تشریحات کے

اسالیب اور ترجیحات کی ازسرنو تشکیل ہے جو وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ماضی میں یونانی اور دیگر فلسفوں کی آمد پر ہم نے اسلامی عقائد پر پوری دلجمعی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے ان کی علمی و عقلی توجیہات و تعبیرات کا ایک نیانظام تشکیل دیا تھا جس کے ذریعے ہم نے اپنے عقائد وایمانیات کے خلاف فلسفہ و معقولات کی یلغار کا رخ موڑ دیا تھا۔ آج بھی اسی کام کے احیا کی ضرورت ہے اور عقائد وایمانیات کے باب میں جدید فلسفہ، سائنس اور عمرانیات کے پیدا کردہ مسائل اور اشکالات کسی اشعری، ماتریدی، ابن حزم، غزالی، ابن رشد، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کی تلاش میں ہیں جو ظاہر ہے کہ انہی مدارس کی کوکھ سے جنم لیں گے۔ اس لیے دینی مدارس کو اس پہلو سے اپنے ”بانجھ پن“ کے اسباب کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے اور اس کے علاج کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ان کے ذمہ آج کے دور کا سب سے بڑا قرض یہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی بطور نمونہ عقائد وایمانیات سے تعلق رکھنے والے چند سوالات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو آج کے علمی تناظر میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنوں میں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ اور ان کے قابل اطمینان جوابات فراہم کرنا ہماری اسی طرح کی ذمہ داری ہے جس طرح ابوالحسن اشعری اور ابو منصور ماتریدی نے اپنے دور کے علمی چیلنج کا منطق و استدلال کے ساتھ سامنا کیا تھا:

- انسان کو جب نفع و نقصان کے ادراک کے لیے عقل دی گئی ہے تو پھر مذہب کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے؟
- وحی کی ماہیت کیا ہے اور کیا یہ انسانی عقل و وجدان سے ہٹ کر کوئی الگ چیز ہے؟
- وحی اور عقل کا باہمی تعلق کیا ہے؟
- انسانی سوسائٹی جب مسلسل ارتقا کی طرف بڑھ رہی ہے تو نبوت کا دروازہ درمیان میں کیوں بند ہو گیا ہے؟
- سائنس اور مذہب کا باہمی جوڑ کیا ہے؟
- مذاہب کی مشترکہ صداقتوں پر یکساں ایمان رکھنے اور ان کے مشترکہ مصالح پر مشتمل احکام پر عمل کرنے میں کیا حرج ہے اور کسی ایک مذہب کی پابندی کیوں ضروری ہے؟

• سوسائٹی کے ارتقا اور تجربات کی بنیاد پر تشکیل پانے والے افکار و نظریات اور تہذیب کو مسترد کرنے کا کیا جواز ہے؟
• قرآن و سنت کے معاشرتی احکام اس دور کی عرب ثقافت یا رواجات کے پس منظر میں تھے یا اس سے مختلف ثقافتوں کے ماحول میں بھی واجب العمل ہیں؟
• احکام و قوانین میں مصالح و منافع اور اہداف و مقاصد معتبر ہیں یا ظاہری ڈھانچہ بھی ضروری ہے؟
• اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ وغیر ذلک۔

یہ مسائل نئے نہیں ہیں، بلکہ ہر دور میں کسی نہ کسی عنوان سے زیر بحث رہے ہیں، لیکن آج کے عالمی تناظر میں یہ زیادہ ابھر کر سامنے آئے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان کو اسلامی اعتقادات و ایمانیات کے معیار پر باقی رکھنے کے لیے ان سوالات اور ان جیسے دیگر بہت سے سوالات کے ایسے جوابات ضروری ہیں جو آج کے علمی تناظر اور ہمہ نوع معلومات کے افق میں قابل اطمینان ہوں۔

اسلامی سربراہ کانفرنس کا مایوس کن اجلاس

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ اپریل ۲۰۰۸ء)

روزنامہ ایکسپریس گوجرانوالہ ۱۵ مارچ کے مطابق سینیگال کے دارالحکومت ڈاکار میں منعقد ہونے والے اسلامی کانفرنس تنظیم کے سربراہی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے او آئی سی کے سیکرٹری جنرل جناب اکمل الدین اوغلو نے کہا ہے کہ مغربی اور اسلامی ممالک کے مابین ”اسلام فوبیا“ کے خاتمہ کے لیے سنجیدہ سرگرمیوں، مذاکرات اور باہمی تعاون کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مذہب، ہمارے پیغمبر اور ہمارے بھائیوں کو ہدف بنانے والے غیر ذمہ دارانہ حملوں کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

اسلامی کانفرنس تنظیم کے سربراہی اجلاس سے تنظیم کے سیکرٹری جنرل کا یہ خطاب توہین رسالت کے حوالے سے مغربی دانشوروں کی مہم کے معروضی تناظر میں اصولی طور پر درست ہونے کے باوجود ہمارے نزدیک انتہائی مایوس کن ہے اور مسلم عوام کی امیدوں اور توقعات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ دنیا بھر کے اسلامی حلقوں کو توقع تھی کہ اسلامی کانفرنس

تنظیم کے سربراہی اجلاس میں قرآن کریم اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اور گستاخی کے حالیہ واقعات کا سنجیدگی سے نوٹس لیا جائے گا اور مسلم حکومتوں کے نمائندے باہم مل بیٹھ کر اس سلسلے میں مغرب کے ساتھ دوٹوک بات کرنے کی حکمت عملی اختیار کریں گے، لیکن حسب سابق اس اجلاس میں بھی بات تقاریر اور رسمی قراردادوں سے آگے نہیں بڑھی اور اس کی کارروائی پڑھ کر ہمیں یوں محسوس ہوا ہے کہ یہ حکومتوں کی سطح کا کوئی اجلاس نہیں تھا، بلکہ کسی بین الاقوامی این جی او کی رسمی سی میٹنگ تھی جس میں موقف کے اظہار اور اس کے حق میں تقاریر اور قراردادوں پر قناعت کرنے میں ہی عافیت سمجھی گئی ہے۔

دوسری طرف ڈنمارک کے اخبارات میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکوں کی بار بار اشاعت اور ہالینڈ میں قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات کے حوالے سے ایک تحقیر آمیز فلم کی تیاری کے ساتھ ساتھ امریکہ کے ایک جریدے ہفت روزہ ”ہیومن ایونٹس“ نے اعلان کیا ہے کہ وہ جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں ایک کتاب مفت تقسیم کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے جس کے بارے میں مسلمان حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ توہین آمیز کتاب ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور ۲۰ مارچ ۲۰۰۸ کی خبر کے مطابق اس دل آزار کتاب کا نام ”دنیا کا عدم برداشت پر مبنی مذہب اور اس کے بانی محمد کی حقیقت“ بتایا جاتا ہے۔ اس کا مصنف رابرٹ اسپنسر ہے۔ یہ کتاب ہفت روزہ ”ہیومن ایونٹس“ نے شائع کی ہے اور اسے پورے امریکہ اور یورپ میں مفت تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مسلم حکومتوں کی بے حسی اور عدم سنجیدگی کا نتیجہ ہے کہ مغرب میں توہین رسالت اور توہین قرآن کریم کے واقعات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور دنیائے اسلام کے عوامی اور دینی حلقوں کی طرف سے مسلسل احتجاج کے باوجود وقفہ وقفہ سے نئے دل آزار واقعات سامنے آ رہے ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں پر عدم برداشت کے الزام کا تعلق ہے، یہ واضح طور پر مغرب کی دھاندلی اور فریب کاری ہے، اس لیے کہ مغرب کی یونیورسٹیاں اور علمی ادارے صدیوں سے اسلام، قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور مقالات، مضامین اور تجزیے لکھتے آ رہے ہیں، جن میں اختلاف بھی ہوتا ہے اور تنقید بھی موجود ہوتی ہے، لیکن مسلمانوں نے ان کے بارے میں کبھی عدم برداشت کا

مظاہرہ نہیں کیا بلکہ دلیل کا جواب ہمیشہ دلیل سے دیا ہے۔ البتہ اختلاف اور توہین میں ہم نے ہمیشہ فرق کیا ہے اور سنجیدہ تنقید اور استہزاو تمسخر کے درمیان فاصلوں کو قائم رکھا ہے۔ اسلامیان عالم کو قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے حوالے سے جو بے پناہ محبت اور عقیدت ہے، اس کا فطری تقاضا ہے کہ وہ ان دونوں کے حوالے سے توہین، استہزااور تمسخر کی کوئی بات برداشت نہ کریں۔ اس لیے اگر وہ ایسے کسی واقعہ پر غصہ کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے جذبات میں گرمی پیدا ہوتی ہے تو یہ بالکل فطری بات ہے اور مغرب کو اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔

مغرب اگر اپنی کتاب مقدس اور حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کی راہنمائی سے عملاً دستبرداری اختیار کر لینے کے بعد ان کے ساتھ عقیدت و محبت سے محروم ہو چکا ہے اور اس کی جذباتیت بے حس ہو چکی ہے تو اسے اس کا بدلہ مسلمانوں سے نہیں لینا چاہیے۔ اور نہ ہی یہ توقع رکھنی چاہیے کہ مسلمان بھی مغرب کی مسیحی امت کی طرح دینی تعلیمات کی راہنمائی سے دستبردار ہو جائیں گے اور قرآن کریم اور رسول اکرمؐ کے ساتھ جذباتی وابستگی کو خیرباد کہہ دیں گے۔

باقی رہی بات آزادئ رائے اور آزادئ صحافت کی تو ہم مغرب کا یہ موقف تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس لیے کہ مغرب کے ہر ملک میں ''ازالہ حیثیت عرفی'' کے عنوان سے اپنے شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کا قانون موجود ہے اور کسی بھی شہری کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت عرفی اور معاشرتی سٹیٹس کو مجروح ہوتا محسوس کرے تو اس کے تحفظ کے لیے قانون سے رجوع کرے۔ اور صرف مغرب نہیں بلکہ دنیا کے ہر ملک کا قانون اپنے ہر شہری کو یہ تحفظ فراہم کرتا ہے، اس لیے اگر ایک عام شہری اپنی حیثیت عرفی کے قانونی تحفظ کا حق رکھتا ہے تو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام، بالخصوص حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہ حق ہے کہ ان کے تاریخی مقام اور عرفی حیثیت کے تحفظ کے لیے عالمی سطح پر قانون بنایا جائے اور دنیا کے کسی بھی شخص کو یہ حق نہ دیا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبروں اور دنیا کے اربوں انسانوں کے محبوب مذہبی پیشواؤں کے بارے میں استہزا، تمسخر، تحقیر اور گستاخی کا لہجہ اختیار کر سکے۔

اسلامی کانفرنس تنظیم کے مذکورہ سربراہی اجلاس میں عالم اسلام کے دیگر مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں جن میں فلسطین کی صورتحال کو بطور خاص زیر غور لایا گیا ہے لیکن ان

مسائل میں بھی رسمی خطابات اور قراردادوں سے ہٹ کر کوئی سنجیدہ پیشرفت اور لائحہ عمل سامنے نہیں آیا جس سے مایوسی میں اضافہ ہوا ہے اور ہمارے خیال میں مسلم حکومتوں سے دنیا بھر کے مسلم عوام کی اسی مایوسی سے اس ردعمل نے جنم لیا ہے جسے انتہا پسندی، دہشت گردی اور بنیاد پرستی قرار دے کر اس کے خلاف عالمی سطح پر باقاعدہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس مبینہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے اسباب میں جہاں مغرب کی سیاسی قیادت اور نام نہاد سیکولر دانش کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جانب دارانہ اور معاندانہ رویہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے، وہاں مسلم ممالک کے حکمران طبقات کا غیر سنجیدہ طرز عمل، مجرمانہ تغافل اور مغرب کے سامنے ان کا فدویانہ رویہ بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے جسے دور کیے بغیر اس مبینہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کا راستہ روکنا ممکن نہیں ہے جو اصلاح احوال کے معروف طریقوں پر مسلمانوں کے رہے سہے اعتماد کو بھی دھیرے دھیرے پسپائی کی طرف دھکیلتی جا رہی ہے۔

ہمارے خیال میں اس صورتحال میں سب سے زیادہ ذمہ داری مسلم حکومتوں اور عالم اسلام کے حکمران طبقات پر عائد ہوتی ہے کہ وہ حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم کو رسمی قراردادوں اور خطابات کے بجائے عملی اقدامات اور مسلم امہ کی جرأت مندانہ قیادت کا فورم بنائیں کیونکہ اس کے بغیر معاملات کا رخ صحیح سمت میں موڑنے کا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

ترکی: احادیث نبویؐ کی تعبیر و تشریح کا سرکاری منصوبہ

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۹ مارچ ۲۰۰۸ء)

روزنامہ پاکستان میں ۲۸ فروری ۲۰۰۸ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق برادر مسلم ملک ترکی کی وزارت مذہبی امور نے انقرہ یونیورسٹی میں علماء کی ایک ٹیم کی خدمات حاصل کی ہیں جسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا از سر نو جائزہ لینے کا کام سونپا گیا ہے۔ خبر کے مطابق ترکی حکومت کے خیال میں بہت سی احادیث متنازعہ ہیں اور ان سے معاشرے پر منفی اثر پڑ رہا ہے، ان احادیث سے اسلام کی اصل اقدار بھی دھندلا گئی ہیں اس لیے ان کی از سر نو تشریح کرانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ اس طرح اسلام کے عقائد کی از سر نو تشریح کی جا رہی ہے۔ جبکہ ترکی کی وزارت مذہبی امور

کے ایک عالم پروفیسر گورمیز نے اپنے انٹرویو میں عورتوں اور مردوں میں مساوات کے حوالے سے بعض اسلامی احکام کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس دور میں اکثر خواتین پر جبر کے لیے اسلام کا نام غلط طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے وزارت مذہبی امور کے اس کام کے بارے میں کہا ہے کہ ایسا کرنے کے لیے ریاست ایک نیا اسلام بنا رہی ہے، جو کلیسا میں اصلاح کی طرز کا کام ہے لیکن بالکل وہی نہیں ہے، البتہ یہ مذہب کے بنیادی عقائد میں تبدیلی ہے۔

حدیث و سنت جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل کا نام ہے جسے جمہور امت کے نزدیک دین کے مستقل ماخذ اور قرآن کریم کی مستند تشریح کا مقام حاصل ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو قرون اولی سے اب تک قرآن کریم کے بعد اسلامی قانون سازی کا دوسرا بڑا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور قرآن کریم کی تعبیر و تشریح میں فیصلہ کن اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن دو حوالوں سے گزشتہ چند صدیوں کے دوران احادیث نبویہؐ کو نقد و جرح کا مسلسل ہدف بنایا گیا ہے اور مختلف حلقوں کی طرف سے احادیث نبویہؐ کو تحقیق کا موضوع بناتے ہوئے احادیث کی حفاظت کے نظام اور بہت سی احادیث کے مفہوم و مصداق پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اور ان اعتراضات کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم امہ کے بعض دانشوروں نے بھی احادیث نبویہؐ کے سلسلہ میں گزشتہ فقہاء و محدثین کے کام کو ناکافی قرار دے کر ان کے ''ری ویو'' کو نہ صرف ضروری سمجھا ہے بلکہ بہت سے دانشوروں نے یہ خدمت سرانجام دینے کی کوشش بھی کی ہے۔

دوسرا یہ کہ انسانی سوسائٹی نے مغرب کے فکر و فلسفہ اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کے زیر سایہ جو مسلسل تمدنی اور معاشرتی پیش رفت کی ہے اور اس سے جو نئے معاشرتی تصورات اور اقدار اجاگر ہوئی ہیں، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنن کا روایتی ذخیرہ اور اس پر فقہاء کرام اور محدثین عظام کی سابقہ علمی تعبیرات و تشریحات ان جدید معاشرتی اقدار اور تمدنی تصورات میں سے اکثر کے ساتھ مبینہ طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اور ہمارے بہت سے دانشوروں کا یہ خیال ہے کہ تمدن و معاشرت کے اس ارتقائی ماحول سے ہم آہنگ ہونے کے لیے جناب نبی اکرمؐ کی متعدّد احادیث کی نئی تعبیر و تاویل ناگزیر ہو گئی ہے۔

اس سلسلہ میں اب تک ہمارے ہاں جو علمی ورجحانات سامنے آئے ہیں اور جن پر سنجیدگی کے ساتھ کام ہو رہا ہے انہیں بنیادی طور پر چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. جناب نبی اکرمؐ کی احادیث و سنن کے موجود ذخیرے اور ان کی روایتی تعبیر و تشریح کو حتمی قرار دیتے ہوئے ان کے بارے میں کوئی بھی بات سننے سے انکار کر دیا جائے اور کسی بھی اعتراض پر مطلقاً توجہ نہ دی جائے۔

2. جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات و اعمال کے حوالہ سے روایات و احادیث پر کیے جانے والے اعتراضات و شکوک سے جان چھڑانے کے لیے سرے سے حدیث و سنت کی حجیت اور اسے شریعت کا بنیادی ماخذ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ اور یہ کہا جائے کہ حدیث و سنت کی حیثیت دین کے ماخذ کی نہیں ہے بلکہ وہ محض تاریخی روایات کی حیثیت و درجہ رکھتی ہیں جن میں سے "کامن سینس" کی بنیاد پر کسی بھی روایت کو قبول یا رد کیا جاسکتا ہے۔

3. حدیث وسنت کو دین کے بنیادی ماخذ اور قرآن کریم کی تشریح و تعبیر کی حتمی اتھارٹی کے طور پر تسلیم کیا جائے، البتہ ان کے بارے میں کیے جانے والے اعتراضات و شکوک کا علمی بنیاد پر جائزہ لیا جائے۔ اور مغرب کے فکر و فلسفہ کو اس سلسلہ میں حتمی معیار قرار دینے کی بجائے دینی و معاشرتی ضروریات و مسلمات کے حوالے سے عدل و انصاف کی روشنی میں جو اعتراضات و شکوک درست ہوں ان کا حل نکالا جائے، اور جو اعتراضات صرف مغربی فلسفہ و معاشرت کو "معیار حق" قرار دینے کی بنیاد پر ہوں انہیں رد کر کے علمی انداز میں ان کا جواب دیا جائے۔

4. چوتھا رخ ہمارے ایک معاصر دانشور جناب جاوید احمد غامدی نے اختیار کیا ہے کہ سنت کے حجت ہونے سے انکار تو نہ کیا جائے لیکن حدیث و سنت کی نئی تعریف طے کر کے حدیث و سنت کے اس مجموعی اور اجماعی مفہوم کو ہی اس سے خارج کر دیا جائے جسے امت مسلمہ اب تک حدیث و سنت سمجھتی آرہی ہے۔ بلکہ حدیث و سنت کے نام سے ایک نیا علمی ڈھانچہ ترتیب دے کر اسلام کو مغربی فکر و فلسفہ اور موجودہ تمدنی و معاشرتی ارتقاء کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا مقصد "سنت" ہی کے عنوان سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

آج کے دور میں حدیث و سنت کے حوالے سے مختلف حلقوں میں ہونے والے علمی کام کو ان چار پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے اور اس پس منظر میں ترکی کی وزارت مذہبی امور کا یہ پروگرام سامنے آیا ہے کہ وہ احادیث نبویہؐ کی از سر نو درجہ بندی اور تعبیر و تشریح کے کام کا آغاز کر رہی ہے جو اس حوالہ سے یقیناً خوش آئند ہے کہ یہ ترکی کی حکومت کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ترکی نے خلافت عثمانیہ کے عنوان سے صدیوں عالم اسلام کی سیاسی اور علمی قیادت کی ہے مگر اب سے کم و بیش ایک صدی قبل خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے موقع پر ترکی نے ریاستی طور پر مذہب سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی اور سیکولر جمہوریہ کے نام سے ایک نئے قومی سفر کا آغاز کیا تھا۔ جس کے تحت معاشرے اور ریاست کے اجتماعی معاملات سے دین کو لاتعلق کر دیا گیا تھا اور کسی بھی اجتماعی حوالے سے اسلام کا نام لینا دستوری طور پر جرم قرار پا گیا تھا۔ حتیٰ کہ عربی زبان ممنوع اور کھلے بندوں اسلامی شعائر کا اظہار بھی جرم سمجھ لیا گیا تھا۔ سیکولرازم کی اس شدت پسندانہ شکل سے رجوع کا آغاز ترکی کے سابق وزیر اعظم عدنان میندریس شہیدؒ کے دور میں ہو گیا تھا لیکن پھر اسے بریک لگ گئی اور سیکولرازم کے تحفظ کو ہی سب سے بڑا قومی مقصد قرر دے دیا گیا۔

اس پس منظر میں جناب عبد اللہ گل اور جناب رجب طیب اردگان کی قیادت میں ترکی کی موجودہ حکومت کی طرف سے سرکاری سطح پر احادیث نبویہؐ کے پورے ذخیرے کی از سر نو چھان بین اور تعبیر و تشریح کے اس عمل کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ترکی ریاست کا مذہب کے ساتھ رشتہ دوبارہ جوڑے جانے کا نقطۂ آغاز ہے اور اسی پہلو سے ہم اس کا خیر مقدم بھی کر رہے ہیں۔ لیکن مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دو تحفظات کا تذکرہ اس مرحلہ پر ضروری ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے ترکی کے گزشتہ صدی کے آغاز میں رونما ہونے والے ثقافتی انقلاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ترکی قوم بنیادی طور پر ایک عسکری قوم ہے جو مغربی ثقافتی یلغار کے مقابلے میں علمی اور اجتہادی صلاحیتوں کا اظہار نہ کر سکی اور اسے مغرب کے فکر و فلسفہ کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ جبکہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا کہنا ہے کہ ترکی کے علماء و مشائخ مغرب کی علمی، فکری اور ثقافتی یلغار کی اہمیت و سنگینی کا بروقت ادراک نہ کر سکے اور اس کے سدباب کے لیے اپنے اوقات فارغ نہ کر سکے جس کی وجہ سے یہ عظیم سانحہ رونما ہوا۔

ہمارے خیال میں یہ دو تحفظات آج بھی موجود و قائم ہیں اور ترکی کے علمی حلقوں کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کے علمی و فکری حلقوں کے لیے بھی لمحۂ فکریہ اور چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

توہینِ رسالت کے خلاف بیداری کا مظاہرہ کیا جائے

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۱۶ مارچ ۲۰۰۸ء)

ڈنمارک کے اخبارات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکوں کی دوبارہ اشاعت کی بات چل رہی ہے اور اس پر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے کہ ہالینڈ کے ایک رکن پارلیمنٹ نے قرآن مجید کے حوالے سے فلم کا مسئلہ کھڑا کر کے ”یک نہ شد دو شد“ والا معاملہ کر دیا ہے۔ اور عالم اسلام کے حکمرانوں کا رویہ وہی روایتی سا ہے کہ رسمی احتجاج کر کے وہ مطمئن ہیں کہ انہوں نے قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ اپنے تعلق کا ثبوت فراہم کر دیا ہے اور اس حوالہ سے انہوں نے اپنے اپنے ملکوں کے عام مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی بھی کر دی ہے۔ او آئی سی نے ڈاکار (سینیگال) میں ہونے والے اپنے سربراہی اجلاس میں اس مسئلہ پر محض رسمی احتجاج پر اکتفا کر لیا ہے جبکہ دنیائے اسلام کی رائے عامہ کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلم حکومتیں ڈنمارک اور ہالینڈ کی حکومتوں سے باضابطہ بات کریں اور اس سلسلہ میں دوٹوک لائحہ عمل طے کیا جائے جس کا بنیادی ہدف مغرب پر سرکاری سطح پر یہ واضح کر دینا ہو کہ اسے عالم اسلام کے ساتھ اپنے تعلقات کو باقی رکھنے اور بہتر بنانے کے لیے قرآن کریم اور جناب رسول اکرمؐ کی حرمت و تقدس کے احترام کے ساتھ ساتھ اسلامی عقیدہ و ثقافت کے جداگانہ وجود اور امتیاز کو تسلیم کرنا ہو گا۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مغرب عالم اسلام کے ساتھ مختلف حوالوں سے مکالمہ کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس مبینہ مکالمہ اور مباحثہ کی بنیاد دو تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان بقائے باہمی کے لیے مفاہمت کے تصور پر نہیں بلکہ اسلامی عقیدہ و ثقافت کی سرے سے نفی کرتے ہوئے مسلمانوں کو مغرب کے طرز عمل اور ثقافت کو قبول کرنے پر بہر حال آمادہ اور مجبور کرنے کے طرز عمل پر ہے۔ اور مغرب کی تمام تر علمی و فکری صلاحیتیں اور ابلاغی بلکہ عسکری وسائل بھی اسی ایک نکتہ پر صرف ہو رہے ہیں کہ دنیا بھر کے

مسلمانوں کو قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی بے لچک وابستگی کو ختم کرنے اور مغرب کے فلسفہ و ثقافت کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ جبکہ دوسری طرف صورتحال یہ ہے کہ مسلمانوں کے عقیدے اور کمٹمنٹ کا تعلق قرآن کریم اور جناب رسول اکرمؐ کے ساتھ نہ صرف یہ کہ بدستور قائم ہے بلکہ بحمد اللہ تعالیٰ مسلم معاشرے میں قرآن و سنت کی تعلیمات سے وابستگی کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اور نئی نسل کے قرآن و سنت کی طرف رجوع میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو مغرب کے لیے پریشان کن بات ہے اور مغرب اس فضا میں اپنے ثقافتی ایجنڈے کی پیشرفت میں رکاوٹ کو کم ہونے کی بجائے بڑھتا دیکھ کر جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہا ہے۔

گزشتہ دنوں ایک محفل میں اس بات کا ذکر ہو رہا تھا کہ مغرب عالم اسلام میں اپنے ثقافتی ایجنڈے کی راہ میں قرآن و سنت کی تعلیمات کو رکاوٹ سمجھتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ مسلم معاشرہ میں قرآن و سنت کی تعلیمات کی موجودگی اور فروغ کا باعث دینی مدارس ہیں، اس لیے وہ دینی مدارس کو بند کرنے یا مغرب کے زیر اثر مسلم ممالک کے ''اجتماعی دھارے'' میں تحلیل کر دینے کے لیے کوشاں ہے۔ میں نے اس پر عرض کیا کہ یہ مغرب کا مغالطہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں دینی تعلیمات اس وجہ سے موجود ہیں کہ دینی مدارس کا نظام موجود ہے اور اسے ختم کر کے شاید مسلم عوام کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے بیگانہ کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ اصل صورتحال یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات دینی مدارس کی وجہ سے نہیں بلکہ دینی مدارس اس لیے قائم ہیں کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات دے رہے ہیں۔ قرآن و سنت نے تو بہرحال موجود رہنا ہے اور قیامت تک رہنا ہے، ان کے ساتھ جو بھی منسلک ہو گا اسے بھی تحفظ اور بقا مل جائے گی۔ اس لیے بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ دینی مدارس قرآن و سنت کی حفاظت کر رہے ہیں، یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہو گا کہ دینی مدارس کا وجود اور تحفظ و بقا قرآن و سنت کا مرہون منت ہے۔

بہرحال بنیادی مسئلہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی موجودگی اور ان کے ساتھ عام مسلمان کی بے لچک وابستگی کا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی کسی بات پر عمل کرے یا نہ کرے مگر وہ قرآن کریم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، دونوں میں سے کسی کی توہین برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور نہ ہی کسی سے یہ بات سننے کا روادار ہے کہ قرآن کریم کی کوئی بات یا آنحضرتؐ کا کوئی ارشاد گرامی نعوذ باللہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ آپ دنیا کے

کسی حصے میں چلے جائیں اور مسلمانوں کے عقیدہ و جذبات کو پرکھ لیں کوئی بھی مسلمان آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو بے عملی بلکہ بدعملی کے باوجود قرآن کریم کی توہین اور حضورؐ کی شان اقدس میں گستاخی برداشت کرنے کے لیے تیار ہو یا ان میں سے کسی کے ارشاد کے بارے میں یہ بات سننے کا روادار ہو کہ وہ درست نہیں۔ مغرب مسلمانوں کی رسول اور کتاب کے ساتھ اس وابستگی کو کمزور کرنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے اور آزادیٔ اظہار رائے، برداشت، رواداری اور تحمل کے نام پر مسلمانوں کو اس سطح پر لے آنا چاہتا ہے کہ وہ قرآن کریم کی کسی بات کا مذاق اڑانے اور آنحضرتؐ کے کسی بھی حوالہ سے گستاخانہ تذکرہ پر احتجاج نہ کریں بلکہ اسے برداشت کرتے ہوئے آزادیٔ رائے کے مغربی تصور و فکر کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں، مگر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ مغرب نے اسے آزادیٔ اظہار رائے کا عنوان دے رکھا ہے مگر یہ اس کی سراسر دھاندلی ہے اس لیے کہ اختلاف اور تنقید میں اور توہین و استہزا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہماری تاریخ گواہ ہے کہ مستشرقین نے اسلامی تعلیمات پر، قرآن کریم کے ارشادات پر اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات پر ہر دور میں اعتراضات کیے ہیں، اختلاف کیا ہے اور ایسے سینکڑوں مواقع آئے ہیں کہ مسلمانوں نے ان کی باتوں پر جذباتی ہونے کی بجائے دلیل اور منطق کے ساتھ ان کا جواب دیا ہے لیکن توہین، استخفاف اور استہزا کو کبھی برداشت نہیں کیا۔ جس دور میں سلمان رشدی کی شیطانی کتاب کا تذکرہ اور اس پر احتجاج عام تھا، برطانیہ کے شہر برمنگھم میں ایک جلسہ کے دوران کسی نوجوان نے یہ سوال اٹھایا کہ علماء کرام سلمان رشدی کی شیطانی کتاب پر جذباتیت کا اظہار کرنے کی بجائے اس کا جواب کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے اسی مجلس میں اس پر عرض کیا کہ جواب ہمیشہ دلیل کا دیا جاتا ہے جبکہ گالی کا جواب دلیل نہیں بلکہ ہمیشہ تھپڑ ہوا کرتا ہے۔ آپ کسی شخص کے سامنے اس کے باپ کی کسی بات سے اختلاف کریں اور احترام کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنا موقف بیان کریں تو وہ بھی آپ کی بات کا جواب دلیل سے دے گا اور آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اگر آپ اس کے سامنے اس کے باپ کی توہین کریں گے، اس کا تمسخر اڑائیں گے اور استہزا کریں گے تو وہ آپ کے طرز عمل کے جواب میں استدلال اور منطق کا سہارا نہیں لے گا بلکہ غیرت و حمیت کا ہر ممکن مظاہرہ کر کے اس بے ہودگی کا آپ کو جواب دے گا۔

مگر مغرب اس معروضی حقیقت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنے لیے یہ حق حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ مسلمانوں سے جس لہجے میں چاہے بات کرے، اسلام کی تعلیمات کا جس انداز میں چاہے مذاق اڑائے، قرآن کریم کی جیسے جی چاہے توہین کرے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح چاہے تمسخر اڑائے، مسلمان اسے خاموشی کے ساتھ برداشت کریں بلکہ اسے داد دیں کہ وہ آزادیٔ اظہار رائے کا علمبردار ہے۔ چنانچہ اسی نام نہاد آزادیٔ رائے کا ہدف اللہ تعالیٰ کا دین اور اس کے رسول و نبی بھی بن رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے دنیا کے ہر ملک میں یہ قانون موجود ہے کہ کسی بھی شخصیت کی ''حیثیت عرفی'' مجروح ہونے پر اسے قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق حاصل ہے اور دنیا کا ہر قانون فرد کی حیثیت عرفی کا تحفظ کرتا ہے۔ لیکن اگرچہ مغرب خود حضور نبی کریمؐ کو نسل انسانی کے مصلحین میں سرفہرست شمار کرتا ہے مگر اس ذات گرامی کی حیثیت عرفی کے تحفظ کے لیے مغرب کوئی اصول یا قانون متعارف کرانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

بہرحال اس فضا اور پس منظر میں دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان کے مختلف شہروں میں غیرت و حمیت سے مسلمان ڈنمارک اور ہالینڈ کے حوالہ سے احتجاج کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں اور احتجاج ریکارڈ کروا رہے ہیں۔ ہم نے بھی گزشتہ دنوں گوجرانوالہ کے مختلف مکاتب فکر کے دینی راہنماؤں کو مل جل کر اس سلسلہ میں اجتماعی احتجاج کا پروگرام منظم کرنے کی دعوت دی تھی جس پر دینی جماعتوں کے راہنماؤں کا ایک مشترکہ اجتماع گزشتہ روز جامعہ محمدیہ اہل حدیث گوجرانوالہ میں منعقد ہوا جس میں طے پایا کہ کل جماعتی مجلس تحفظ ناموس رسالت کا باقاعدہ قیام عمل میں لا کر منظم احتجاجی مہم چلائی جائے۔ بحمد اللہ تعالیٰ اس مجلس میں تمام مذہبی مکاتب فکر کے زعماء اور دینی جماعتوں کے راہنما شریک ہیں اور اس مشترکہ پلیٹ فارم کے ذریعے ۱۱ مارچ کو نماز جمعۃ المبارک کے بعد جی ٹی روڈ پر ایک شاندار احتجاجی مظاہرے کے ذریعے اپنے مشترکہ جذبات کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ ادھر راولپنڈی اور اسلام آباد کے علماء کرام بھی متحرک ہو گئے ہیں اور پاکستان شریعت کونسل اور جمعیت اہل سنت کے زیر اہتمام ۷ مارچ سوموار کو نماز ظہر کے بعد جامعہ اسلامیہ کشمیر روڈ راولپنڈی صدر میں ایک احتجاجی کنونشن منعقد ہو رہا ہے۔ دوسرے شہروں کے علماء کرام اور راہنماؤں سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلہ میں بیداری کا مظاہرہ

کریں اور مسلمانوں کو قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت اور غیرت و حمیت کے اظہار کے لیے پلیٹ فارم مہیا کریں۔ یہ ہمارے دین و ایمان کی علامت ہے اور اس کا تقاضا بھی ہے جس کا بروقت اور پرجوش اظہار کر کے ہم مغرب کی اس ثقافتی یلغار اور تہذیبی دھاندلی کا راستہ روک سکتے ہیں۔

حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۲۰۰۸ء)

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے بانی حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی نور اللہ مرقدہ ۱۶ اپریل ۲۰۰۸ء کو طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے چھوٹے بھائی اور راقم الحروف کے چچا محترم تھے۔ انہوں نے ہجری اعتبار سے ۹۴ برس کے لگ بھگ عمر پائی اور تمام عمر علم کے حصول اور پھر اس کے فروغ میں بسر کر دی۔ وہ اس دور میں ماضی کے ان اہل علم و فضل کے جہد و عمل، زہد و قناعت اور علم و فضل کا نمونہ تھے جن کا تذکرہ صرف کتابوں میں رہ گیا ہے اور جن کے دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں۔

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب فراش تو کافی برسوں سے تھے مگر گزشتہ دو ماہ سے طبیعت زیادہ خراب تھی، گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، خوراک بھی نالی کے ذریعے معدے میں جا رہی تھی، کمزوری حد سے بڑھ گئی تھی مگر امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔ دعائیں بھی ہو رہی تھیں اور ڈاکٹر صاحبان بھی اپنی کوشش کر رہے تھے۔ چند روز قبل والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اپنی علالت اور ضعف کے باوجود صوفی صاحب کو دیکھنے کے لیے آ گئے اور ان کی حالت دیکھ کر خاصے پریشان ہو گئے۔ دونوں بھائیوں میں مثالی محبت اور جوڑ تھا۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے رفیق تھے۔ اکٹھے تعلیم حاصل کی، اکٹھے نصف صدی تک پڑھایا اور ایک ہی سال ضعف کی وجہ سے پڑھانا چھوڑا۔ میں عام طور پر جمعہ کے دن شام کو گکھڑ جایا کرتا ہوں، نماز مغرب کے بعد حضرت والد صاحب کی مسجد میں درس ہوتا ہے اور اس بہانے ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ میں جب بھی والد صاحب سے ملا، ان کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا کہ ”صوفی کا کیا حال ہے؟“۔ مجھے یاد نہیں کہ ہماری کوئی کوئی ملاقات اس سوال کے بغیر شروع ہوئی ہو۔

اسی کیفیت میں وہ گذشتہ روز ہمیں داغ مفارقت دے کر خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اتوار کے روز جب حسب معمول مدرسہ نصرۃ العلوم میں اسباق سے فارغ ہو کر دس بجے کے لگ بھگ گھر جا رہا تھا، ابھی نصف راستہ طے کیا ہو گا کہ اردو بازار سے گزرتے ہوئے برادرم مولانا محمد ریاض خان سواتی کا فون آگیا۔ انہوں نے بتایا "ابا جی کا انتقال ہو گیا ہے"۔ زبان پر بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا اور میں وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ حضرت صوفی صاحب کے چھوٹے بیٹے مولانا محمد عرباض خان سواتی ان کی آنکھیں بند کر رہے تھے اور ٹانگیں سیدھی کر رہے تھے۔ پتہ چلا کہ تھوڑی دیر قبل ان کے معالج ڈاکٹر صاحب آئے تھے اور انہوں نے چیک کر کے کہا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ گھر کے افراد کا اصرار تھا کہ ایک بار اور چیک کرا لیا جائے کیونکہ پہلے بھی ایک بار ایسی کیفیت ہو گئی تھی مگر وہ بے ہوشی تھی۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب کو بلایا گیا، انہوں نے بھی چیک کر کے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ دیا جس سے امید کی ایک موہوم سی کرن بھی ختم ہو گئی اور ہم تجہیز و تکفین اور دوسرے معاملات کے لیے مشاورت میں مصروف ہو گئے۔

تدفین کے بارے میں طے پایا کہ ان کی اپنی خواہش عام قبرستان میں دفنائے جانے کی تھی، اس لیے شہر کے بڑے قبرستان میں قبر کی تیاری شروع کر دی گئی۔ جنازے کے بارے میں مشورہ ہوا کہ دن کے وقت مشکل ہے، اگلے روز تک رکھنا مناسب نہیں ہے اور رات کے وقت جنازے کے لیے سب سے مناسب اور محفوظ جگہ خود مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور ہے، اس لیے طے پایا کہ جنازہ رات کو نو بجے مدرسہ نصرۃ العلوم میں ادا کیا جائے گا اور اس کے بعد عام قبرستان میں تدفین ہو گی۔ یہ طے پانے کے بعد احباب کو اطلاعات دینے اور شہر میں اعلانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر طرف سے احباب جمع ہونے لگے، حضرت والد محترم کو اطلاع دی گئی تو وہ بھی شام کو تشریف لے آئے۔ انہیں کرسی پر بٹھا کر حضرت صوفی صاحبؒ کی چارپائی کے پاس لایا تو ان کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر رونے لگ گئے۔ میں چونکہ گذشتہ ساٹھ برس سے ان کے تعلق اور باہمی محبتوں کا گواہ ہوں، میں نے قریب ہو کر حضرت والد صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا کہ "آج آپ دونوں کی جوڑی ٹوٹ گئی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں بھی چھلک پڑیں اور مزید کوئی بات کہنا میرے بس میں نہ رہا۔

نماز عصر کے بعد سے جامعہ نصرۃ العلوم میں اجتماع اور خطابات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف علماء کرام تشریف لا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے اور حضرت صوفی صاحبؒ کی دینی و علمی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ خطاب کرنے والوں میں حضرت مولانا قاری سعید الرحمن، حضرت مولانا محمد فیروز خان، حضرت صاحبزادہ پیر عبد الرحیم نقشبندی، حضرت مولانا قاضی محمد اویس خان ایوبی، مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا قاری محمد نذیر فاروقی، مولانا ظہور احمد علوی، مولانا قاری جمیل الرحمن اختر، مولانا عبد الحق خان بشیر، مولانا میاں عبد الرحمن اور دیگر سرکردہ علماء کرام شامل تھے۔ رات نو بجے تک خطابات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ طے پایا کہ حضرت صوفی صاحبؒ کے بڑے فرزند اور جانشین مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی نو بجے نماز عشاء پڑھائیں گے اور فرض پڑھاتے ہی سنتوں سے قبل نماز جنازہ بھی وہی پڑھائیں گے۔ چنانچہ نماز عشاء سے قبل میں نے اس کا اعلان کیا اور وہاں پر موجود سرکردہ علماء کرام سے گزارش کی کہ وہ حضرت صوفی صاحبؒ کے جانشین کے طور پر مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی کی دستار بندی کر دیں۔ چنانچہ دستار بندی ہوئی اور اس کے بعد مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی کی امامت میں نماز عشاء اور نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد حضرت صوفی صاحبؒ کے جسد خاکی کو بڑے قبرستان لے جایا گیا۔ ہزاروں افراد اپنے اس محبوب استاذ اور مربی کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ ساتھ تھے جبکہ نماز جنازہ میں مذکورہ بالا علماء کرام، ہزاروں دیگر علماء کرام اور دینی کارکنوں کے علاوہ حضرت صاحبزادہ حافظ فضل الرحیم اشرفی، مولانا پیر سیف اللہ خالد، مولانا حافظ حسین احمد سابق ایم این اے، مولانا سیف الدین سیف، مولانا مفتی عبد الشکور کشمیری، مولانا مجیب الرحمن انقلابی، مولانا حافظ منیر محمد میانوالی اور بہت سے دیگر سرکردہ علماء کرام بھی پہنچ گئے۔ چنانچہ رات کو کم و بیش گیارہ بجے کے لگ بھگ علم و حکمت کے اس عظیم خزانے کو مادر زمین کی آغوش میں اتار دیا گیا۔

حضرت صوفی صاحبؒ میرے چچا تھے، استاذ تھے، مربی تھے، سرپرست تھے اور میرے سمدھی بھی تھے کہ ان کے بڑے فرزند اور جانشین مولانا محمد فیاض خان سواتی میرے داماد ہیں۔ ان رشتوں کے امتزاج نے جو کیفیت پیدا کر رکھی تھی اسے الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں۔ چند ماہ پہلے کی بات ہے، وہ صاحب فراش تو تھے لیکن تھوڑی بہت گفتگو کر لیتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو چچی محترمہ نے ان سے

پوچھا کہ کون آیا ہے؟ غور سے دیکھ کر کہنے لگے کہ زاہد ہے۔ پوچھا کہ زاہد کون ہے؟ فرمانے لگے "میرا پتر ہے"۔ بس میرے لیے اتنی بات ہی کافی تھی اور اس کی سرشاری ابھی تک ذہن میں قائم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا وہ حصہ جو ذہن کی نشوونما اور شخصیت کی تشکیل کا ہوتا ہے، انہی کی سرپرستی اور تربیت میں گزارا ہے۔ میں نے ۱۹۶۰ء میں بارہ سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا اور ۱۹۶۲ء میں چودہ سال کی عمر میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں آگیا تھا۔ پھر ۱۹۷۰ء یعنی دورۂ حدیث سے فراغت تک انہی کے پاس رہا اور ان کی تربیت اور فیضان سے بہرہ ور ہوتا رہا۔ اس لیے کسی تکلف کے بغیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اس میں حضرت والد صاحب مدظلہ کے بعد سب سے بڑا اور کلیدی حصہ حضرت صوفی صاحبؒ کا ہے۔

حضرت صوفی صاحبؒ کی جس بات سے سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ ان کی حق گوئی اور بے باکی تھی اور اس کے بعد اپنے شیخ حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ حق بات کہنے میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے، انہوں نے اس کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور مقدمات اور پابندیوں کے مراحل سے بھی کئی بار گزرے۔ جامع مسجد نور میں ان کا خطبہ جمعہ "اظہار حق" کا اعلیٰ نمونہ ہوتا تھا اور دور دراز سے لوگ ان کا نعرہ حق سننے کے لیے مسجد نور میں آیا کرتے تھے۔ وہ بات دلیل کے ساتھ کرتے تھے لیکن دوٹوک کرتے تھے اور لہجے کی کاٹ بھی متاثر کن ہوتی تھی۔

ان کی یادوں کا تذکرہ کسی اور موقع کے لیے چھوڑتے ہوئے سردست قارئین کو ان کے سفر آخرت کی روداد سے آگاہ کر رہا ہوں۔ وہ اگرچہ تہہ خاک جا چکے ہیں لیکن ان کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں اور ان کا چلنا پھرنا ابھی تک نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے اس لیے ان کے لیے مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کرتے ہوئے اس موقع پر یہی کہہ سکتا ہوں کہ

رفتید و لے نہ از دل ما

ایک صدی پہلے کا قصہ ہے، ہزارہ میں شاہراہ ابریشم پر واقع شنکیاری سے چند میل آگے کڑمنگ بالا کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹا سا ڈیرہ تھا جسے "چیڑاں ڈھکی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ڈیرہ نور احمد خان مرحوم کا تھا جو سواتی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ تھوڑی

سی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کر کے زندگی بسر کر رہے تھے۔ بے اولاد تھے اور میاں بیوی کو فطری طور پر اس بات کی تمنا تھی کہ ان کے صحن میں پھول کھلیں مگر جب خاصے انتظار کے بعد امید بر نہ آئی تو بیوی کی خواہش اور کوشش پر دوسری شادی ہوئی جس سے نور احمد خان مرحوم کو اللہ نے دو بیٹیاں اور دو بیٹے دیے۔ بیٹوں میں سے ایک کا نام محمد سرفراز خان ہے جو ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے اور دوسرے کا نام عبد الحمید خان جن کی ولادت ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ ابھی بچپن کے حصار میں ہی تھے کہ والدہ مرحومہ کا انتقال ہو گیا اور والد محترم نے ان دونوں بچوں کو تعلیم و تربیت کے لیے ان کے پھوپھی زاد بھائی مولوی سید فتح علی شاہ صاحبؒ کے سپرد کر دیا جو اسی علاقہ میں بٹل کے قریب ایک بستی "لمی" میں مقیم تھے، جبکہ طالب علمی کے ابتدائی مراحل کے دوران ہی والد محترم بھی رحلت کر گئے۔

ان دونوں بھائیوں نے ابتدائی تعلیم سید فتح علی شاہ صاحبؒ سے حاصل کی، پھر ملک پور اور کھکھو نامی مقامات میں کچھ دیر پڑھتے رہے اور بعد میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ سے بھی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد یہ دونوں بھائی اس دور کے روایتی طلبہ کی طرح مختلف علاقوں کے دینی مدارس میں گھومتے رہے اور جن جگہوں میں انہوں نے تعلیم پائی، ان میں لاہور کا محلہ میراں شاہ، وڈالہ سندھواں ضلع سیالکوٹ، سرگودھا اور جہانیاں منڈی شامل ہیں۔ دورۂ حدیث سے پہلے آخری چند سال انہوں نے مدرسہ انوار العلوم مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانولہ میں پڑھا اور پھر ۱۹۴۱ء میں دار العلوم دیوبند چلے گئے جہاں انہوں نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور دیگر اساتذہ سے دورہ حدیث کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی۔

دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بڑے بھائی نے گوجرانولہ کے قریب گکھڑ میں ڈیرہ لگا لیا اور تعلیم و تدریس اور خطابت و امامت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور وہ آج کی دنیا میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے نام سے متعارف ہیں، جبکہ چھوٹے بھائی مزید تعلیم کے لیے لکھنو چلے گئے۔ حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ سے فن مناظرہ سیکھا اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں استفادہ کیا۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد دکن گئے اور طبیہ کالج میں چار سال کا کورس مکمل کر کے حکیم حاذق کی سند حاصل کی۔ یہ مولانا عبد الحمیدؒ سواتی ہیں جو اپنے نام کے ساتھ عبد الحمید خان اختر کا تخلص اور سواتی کی نسبت لکھتے تھے۔ وہ ایک مستند طبیب کے طور پر گوجرانولہ آئے اور چوک نیائیں

کے قریب ایک دکان میں مطب کا آغاز کیا مگر انہیں مطب راس نہ آیا کہ قدرت انہیں کسی اور کام کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ چنانچہ ان کے بزرگوں اور دوستوں نے انہیں اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ وہ گھنٹہ گھر چوک کے قریب محلہ طوطیانوالہ میں واقع ایک بڑے جوہڑ کے کنارے ڈیرہ لگائیں اور ایک دینی مدرسہ اور مسجد کی بنیاد رکھ کر اس جوہڑ کو بھرنا شروع کر دیں، چنانچہ وہ ۱۹۵۲ء میں دکانداری چھوڑ کر اس چھپڑ کے کنارے آبیٹھے اور ایک چھوٹی سی کچی مسجد اور اس کے ساتھ مدرسہ کے دو تین کمرے بنا کر دینی مرکز کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ یہ مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور کا نقطۂ آغاز تھا جن کا شمار آج شہر نہیں بلکہ ملک کے بڑے دینی اداروں میں ہوتا ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کرام پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، برما، افغانستان، چین، وسطی ایشیا، برطانیہ، امریکہ، سعودی عرب اور دیگر ممالک میں مختلف حوالوں سے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

صوفی صاحبؒ کے بڑے بھائی مولانا محمد سرفراز خان صفدر بھی جو اس سے قبل گکھڑ کی جامع مسجد میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے تھے، اس کار خیر میں ان کے ساتھ شریک کار ہو گئے اور پھر ان دونوں بھائیوں نے نصف صدی تک اس گلشن علم کی ایسی آبیاری کی کہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کو آج کی علمی دنیا میں بعض حوالوں سے سند اور مرجع کا مقام حاصل ہے اور دنیا بھر کے اہل علم راہ نمائی کے لیے اس مرکز سے رجوع کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحمیدؒ سواتی کی تدریس اہل علم اور علماء و طلبہ کے لیے تو تھی مگر گوجرانوالہ عوام بھی محروم نہیں رہے۔ ان کا نصف صدی تک معمول رہا کہ نماز فجر کے بعد ہفتہ میں چار دن قرآن کریم اور دو دن حدیث نبویؐ کا پابندی سے درس دیا کرتے تھے۔ ان کے قرآن کریم کے دروس کتابی شکل میں مرتب ہو کر بیس ضخیم جلدوں میں ”معالم العرفان“ کے نام سے طبع ہو چکے ہیں اور انہیں اردو زبان میں قرآن کریم کی سب سے بڑی تفسیر کہا جاتا ہے۔ ان کا اسلوب یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ کرتے تھے اور تشریح میں شان نزول اور متعلقہ واقعات کے ساتھ ساتھ دور حاضر کے مسائل کی وضاحت اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ و حکمت کا خاص طور پر تذکرہ کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ و حکمت اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے افکار کی جس طرح ترجمانی کی ہے، اس کی وجہ سے انہیں فلسفہ امام ولی اللہ دہلویؒ کا شارح اور ترجمان سمجھا جاتا ہے۔

مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی ایک بے باک عوامی خطیب بھی تھے، ان کا خطبہ جمعہ علمی معلومات اور دینی راہ نمائی کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر بھرپور تبصرہ کا حامل ہوتا تھا اور وہ لگی لپٹی رکھے بغیر مسائل حاضرہ پر دینی حوالے سے دو ٹوک بات کیا کرتے تھے۔ وہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں اسی حق گوئی کے باعث گرفتار ہوئے اور سات ماہ تک جیل میں رہے۔ اس کے بعد متعدّد بار پابندیوں، زبان بندی، ضلع بدری اور مقدمات کے مراحل سے گزرے حتیٰ کہ صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں انہیں اشتہاری ملزم بھی قرار دے دیا گیا۔ وہ اپنے اساتذہ اور اکابر کے ساتھ عقیدت کا تعلق رکھتے تھے اور کھلم کھلا اظہار کرتے تھے، مگر حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے ساتھ ان کی عقیدت و محبت سب سے زیادہ تھی اور ان کے انداز گفتگو سے ان بزرگوں کے ساتھ ان کی عقیدت و محبت چھلکتی تھی۔

انہوں نے نصف صدی تک مدرسہ نصرۃ العلوم میں اہتمام و تدریس اور جامع مسجد نور میں خطابت کے فرائض سر انجام دیے۔ ان سے ہزاروں علماء کرام اور لاکھوں عام مسلمانوں نے استفادہ کیا۔ انہوں نے ساری زندگی مدرسہ نصرۃ العلوم کی چار دیواروں میں گزار دی، کسی شدید مجبوری کے بغیر مدرسہ سے باہر نہیں نکلتے تھے اور اس کا موقع بھی بمشکل سال میں ایک آدھ بار ہی آتا تھا۔ انہیں گوشہ نشین بزرگ سمجھا جاتا تھا مگر ان کے علوم و فیوض کی وسعت دنیا کے ہر براعظم میں دیکھی جا سکتی ہے۔

عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی کے حوالہ سے یادداشتوں کو ترتیب دینے کے لیے کئی بار قلم اٹھایا مگر اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا میں سمجھ رہا ہوں، اس لیے کہ جہاں اتنا قریبی تعلق ہو اور اتنا طویل عرصہ ہو، وہاں یادداشتوں کی ترتیب قائم کرنا، ان میں سے انتخاب کرنا اور پھر پوری طرح بیان کر دینا مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ بہرحال حضرت صوفی صاحب نور اللہ مرقدہ کے بارے میں ماہنامہ ”نصرۃ العلوم“ کی خصوصی اشاعت کی مناسبت سے چند باتیں تحریر میں لا رہا ہوں جبکہ یہ سلسلہ تو ان شاءاللہ تعالیٰ زندگی بھر چلتا رہے گا اور کسی نہ کسی حوالہ سے یہ یادداشتیں قلمبند ہوتی رہیں گی۔

میں نے اپنی طالب علمی کا زیادہ تر عرصہ حضرت صوفی صاحبؒ کی سرپرستی اور شفقت میں گزارا ہے۔ جب قرآن کریم یاد کرتا تھا، تب بھی چند ماہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں رہا اور اٹھارہواں پارہ میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم میں حضرت قاری محمد یاسینؒ سے یاد کی۔ وہ

صاحب فن اور صاحب ذوق استاذ تھے، میں نے تلفظ کی تصحیح اور تلاوت وقراءت کے آداب کی رعایت میں ان سے زیادہ باذوق اور کوئی استاذ نہیں دیکھا۔ ہزارہ کے دو بھائی مولانا محمد شفیق صاحب اور مولانا محمد رفیق صاحب اور ان کے بھتیجے مولانا محمد یوسف گلفام، جو آج کل کراچی میں ہوتے ہیں، ان دنوں مدرسہ میں زیر تعلیم تھے اور مولانا محمد شفیق صاحب جامع مسجد نور میں نمازیں پڑھانے پر مامور تھے۔ والد محترم مدظلہ نے میری نگرانی ان کے سپرد کر رکھی تھی جبکہ صبح کا ناشتہ میں حضرت صوفی صاحبؒ کے دسترخوان پر کیا کرتا تھا۔ اس وقت حضرت صوفی صاحبؒ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مدرسہ کے ایک کمرہ میں رہتے تھے اور ان کی خدمت میں صوفی محمد کریم صاحب، صوفی محمد عالم صاحب، مستری رشید احمد مرحوم اور مستری منیر احمد صاحب ہوا کرتے تھے۔ ان حضرات کو حضرت صوفی صاحبؒ کے خصوصی خدام کی حیثیت حاصل تھی۔ ان میں سے کوئی صاحب حضرت صوفی صاحبؒ کی صبح کی چائے بنایا کرتے تھے جو ان کے ذوق کے مطابق خاص چائے ہوتی تھی اور بیکری سے کیک رس منگوا کر چائے کے ساتھ استعمال ہوتے تھے۔ میرے لیے الگ کپ میں دودھ ڈال کر اس میں کیک رس بھگو دیے جاتے تھے اور میں چمچ کے ساتھ کھاتا۔ نصف صدی کے لگ بھگ وقت گزر گیا ہے مگر اس کا منظر اور ذائقہ اب تک یاد ہے۔

اس زمانے میں لوگ حج کے لیے بحری جہاز کے ذریعہ جاتے تھے اور کئی ماہ لگ جایا کرتے تھے۔ کراچی سے جانا ہوتا تھا، حاجی حضرات کو بڑے اہتمام کے ساتھ رخصت کیا جاتا تھا، خاندان کے لوگ حاجی صاحبان کو رخصت کرنے اور پھر واپسی پر وصول کرنے کے لیے کراچی جایا کرتے تھے اور باقاعدہ جشن کی کیفیت ہوتی تھی۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے جب حج کیا تو وہ بھی میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں ہی تھا۔ مجھے ان کے سفر حج کی دو تین باتیں یاد ہیں۔ ایک یہ کہ بڑی خاموشی کے ساتھ ٹرین پر سوار ہو کر کراچی گئے اور واپسی کا ہمیں تب پتہ چلا کہ اچانک کسی نے کہا کہ حضرت صوفی صاحبؒ تو آبھی گئے ہیں۔ ہم دوڑتے دوڑتے دروازے کی طرف گئے تو وہ مسجد کی ٹوٹیوں پر سامان کی گٹھڑی ایک طرف رکھے وضو کر رہے تھے۔ وضو کے بعد انہوں نے مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی اور پھر اپنے کمرے میں آگئے، ورنہ یہاں بعض دوستوں میں مشورہ ہو رہا تھا کہ حضرت صوفی صاحبؒ کی واپسی کے پروگرام کا پتہ چلے تو ایک دو ساتھی انہیں لانے کے لیے کراچی جائیں گے۔ مگر انہوں نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور خاموشی کے ساتھ

واپس پہنچ گئے۔ اس سفر حج میں وہ میرے لیے ایک چھوٹا سا سنہری رومال لائے تھے جو پگڑی نما تھا اور کافی عرصہ میرے زیر استعمال رہا۔

مجھے غلطیوں اور کوتاہیوں بلکہ بعض اوقات حماقتوں پر حضرت صوفی صاحبؒ زیادہ تر سمجھانے کا طریقہ اختیار کرتے تھے، کبھی غصہ بھی ہوتے تھے اور ڈانٹ دیا کرتے تھے، مگر ان سے مار کھانے کی نوبت صرف ایک بار اور صرف ایک تھپڑ کی صورت میں پیش آئی جو ابھی تک یاد ہے۔ میں عصر کے بعد عام طور پر شیرانوالہ باغ کے سامنے پھاٹک کی دوسری جانب واقع محلہ رام بستی میں اپنے نانا مرحوم مولوی محمد اکبرؒ کے ہاں جایا کرتا تھا جو وہاں ایک مسجد میں امام تھے اور مسجد کے مکان میں ہی رہتے تھے۔ میں وہاں جاکر ان سے اور نانی مرحومہ سے مل آیا کرتا تھ۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شیخوپورہ موڑ کے سامنے میدان میں ایک سرکس لگ گئی جو کئی روز جاری رہی۔ میں عصر کے بعد نانا مرحوم کے گھر جانے کی بجائے وہاں جانے لگ گیا۔ دو تین دن گھر نہیں گیا تو نانا مرحوم کو جنہیں ہم میاں جی کہا کرتے تھے، تشویش ہوئی اور وہ عصر کے بعد میرا پتہ کرنے کے لیے مدرسہ نصرۃ العلوم جا پہنچے۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے انہیں بتایا کہ وہ تو آپ ہی کی طرف گیا ہے، انہوں نے کہا کہ وہ دو تین روز سے نہیں آیا۔ اس کیفیت میں جب مغرب کے بعد میں مدرسہ واپس پہنچا تو حضرت صوفی صاحبؒ نے پوچھا کہ کہاں گئے تھے؟ مجھے نانا مرحوم کی آمد کا کوئی علم نہیں تھا، میں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ میاں جی کے ہاں گیا تھا۔ اس پر اچانک ایک زوردار تھپڑ میری گال پر پڑا اور فرمایا کہ بکواس کرتے ہو؟ وہ تو ابھی تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے تھے، مجھے بتانا پڑا کہ میں سرکس دیکھنے لگ گیا تھا، چنانچہ انہوں نے مجھے سمجھایا بھی اور غصے کا اظہار بھی کیا، اس کے بعد پھر مجھے سرکس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت صوفی صاحبؒ سفر میں بہت کم جایا کرتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت مدرسہ کی چار دیواری میں ہی گزرتا تھا مگر ان کے ساتھ دو تین سفر مجھے یاد ہیں، ایک بار لاہور تشریف لے گئے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ وہ صوفی کہلاتے تھے اور تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ حضرت صوفی صاحبؒ کے وحدت الوجود پر مستقل مقالے بھی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت مجدد صاحبؒ کے بارے میں سنا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے بارے میں مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ صوفی صاحبؒ نے کہا کہ جس کی سمجھ میں نہیں آئے گا وہ یہی کہے گا۔ تصوف کا عملی رنگ بھی صوفی صاحبؒ پر غالب تھا جس کی ایک جھلک میں

نے یہ دیکھی کہ لاہور کے ایک سفر میں، جس میں وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، وہ حضرت سید علی ہجویریؒ المعروف حضرت گنج بخشؒ کی قبر پر مراقب ہوئے اور کافی دیر مراقبہ کی کیفیت میں رہے۔ اس کے بعد وہ حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزار پر گئے اور وہاں بھی ان کی قبر پر مراقبہ کیا۔ پھر ایک بار گجرات گئے، میں بھی ساتھ تھا، وہاں انہوں نے حضرت شاہ دولہؒ کی قبر پر مراقبہ کیا۔ مگر سب سے دلچسپ صورت حال دیوبند کے سفر میں پیش آئی۔

دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ دونوں بزرگ گئے۔ میں کسی وجہ سے بروقت نہیں پہنچ سکا اور جب اجلاس کے آخری روز دیوبند پہنچا تو قاری محمد طیب صاحبؒ اختتامی خطاب فرما رہے تھے۔ والد صاحب اور صوفی صاحب مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گوجرانوالہ کے قافلے میں قاری محمد یوسف عثمانی، حاجی عبد المتین چوہان مرحوم، مولانا حکیم محمود سلفیؒ اور مولانا مفتی نعیم اللہ صاحب بھی تھے۔ یہ حضرات باہر برآمدے میں قیام پذیر تھے اور اندر کمرے میں دونوں بزرگوں یعنی والد صاحب اور صوفی صاحبؒ کے بستر لگائے گئے تھے۔ جب میں پہنچا تو میرا بستر دونوں بزرگوں کے درمیان لگا دیا گیا۔ میں نے حال احوال پوچھا تو والد صاحب نے کہا کہ کوئی حال نہیں، صوفی رات کو خراٹے لیتا ہے اور سونے نہیں دیتا۔ صوفی صاحبؒ کہنے لگے کہ خراٹے خود لیتے ہیں اور ذمے دوسروں کے لگا دیتے ہیں۔ اب جب رات ہوئی اور ہم بستر پر لیٹے تو میں نے دیکھا کہ دونوں بزرگ زور زور سے خراٹے لے رہے ہیں، میں نے منہ پر ہاتھ رکھا اور بھاگتا ہوا باہر آ گیا اور پھر میری ہنسی چھوٹ گئی۔

صد سالہ اجلاس سے فارغ ہو کر ایک روز دونوں بزرگوں نے میرے بارے میں مشورہ کیا کہ اسے دیوبند کی سیر کرانی چاہیے، چنانچہ مجھے لے کر دونوں حضرات نے دیوبند کا چکر لگایا۔ میں نے ان کے ہمراہ حضرت حسین احمد مدنیؒ کا مکان اور مسجد دیکھی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے گھر حاضری دی جہاں ان کے فرزند مولانا محمد ازہر شاہ قیصرؒ اور داماد حضرت مولانا احمد رضا بجنوریؒ سے ملاقات ہوئی۔ مسجد چھتہ میں انار کا وہ درخت دیکھا جس کے نیچے بیٹھ کر حضرت ملا محمودؒ نے مولانا محمود حسنؒ کو پہلا سبق پڑھایا تھا اور دار العلوم دیوبند کا آغاز ہوا تھا اور دیگر بہت سے مقامات مجھے دکھائے۔ چلتے چلتے والد صاحب نے پوچھا کہ "مڑھیاں" بھی دیکھنی ہیں؟ (یعنی قبرستان جانا ہے؟) میں نے کہا کہ جی۔ ہم

قبرستان گئے تو بالکل دل کی بات کرتا ہوں کہ واقعتاً حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنی کی قبروں پر، جو ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں، عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں، اس عظیم المرتبت استاذ اور جلیل القدر شاگرد کو اکٹھے آرام فرما دیکھ کر تاریخ کے کئی مناظر ایک تیز رفتار فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر گھوم گئے۔ حضرت صوفی صاحبؒ کا شیخ الاسلام حضرت مدنی کے ساتھ شاگردی کے ساتھ ساتھ بیعت کا تعلق بھی تھا، وہ تو قبر کو دیکھ کر سیدھے وہاں پہنچے اور مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ اب منظر یہ تھا کہ حضرت صوفی صاحبؒ مراقبہ میں بیٹھے ہیں، حضرت والد صاحبؒ تھوڑے فاصلے پر کھڑے کچھ پڑھ رہے ہیں اور میں درمیان میں کھڑا ہوں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی چچا جان کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھ جاؤں، مگر پیچھے کھڑے والد صاحب سے ڈر بھی رہا ہوں۔ تھوڑی دیر گزری تو حضرت والد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ ”اٹھا ایس بدعتی نوں، جھنڈ مار کے بہہ گیا اے“۔ (اس بدعتی کو اٹھاؤ، یہ کیا چادر میں سر دے کر بیٹھ گیا ہے)۔ اب میں انہیں کیا اٹھاتا کہ میرا تو خود جی ان کے ساتھ بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ کم و بیش دس بارہ منٹ تسلی سے مراقبہ میں بیٹھے رہے۔ پھر اٹھے اور کہا کہ ”چلیں، آپ کو ہر کام بدعت نظر آتا ہے“۔ اور پھر ہم تینوں کوئی اور بات کیے بغیر اگلی منزل کی طرف چل پڑے۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دیوبندیت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے الگ الگ ذوقوں کے اجتماع اور امتزاج کا نام ہے۔ دونوں الگ الگ بلکہ بظاہر متضاد ذوق نظر آتے ہیں مگر حضرت قاری صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ ان دونوں ذوقوں کو جمع کیا جائے تو دیوبندیت تشکیل پا جاتی ہے۔ میں اس پر کہا کرتا تھا کہ ہمارے گھر میں دونوں ذوق موجود ہیں۔ والد محترم شیخ الاسلام حضرت ابن تیمیہؒ کے ذوق کی نمائندگی کرتے ہیں اور حضرت صوفی صاحبؒ شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے ذوق کے نمائندہ ہیں، اس لیے ہمارا گھرانہ دیوبندیت کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔ خود میرا حال یہ ہے کہ میں نے کئی بار اپنے دل و دماغ کو ٹٹولا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ میرا دل و دماغ ابن تیمیہؒ اور ابن عربیؒ میں سے کس کو ترجیح دیتا ہے؟ مگر آج تک فیصلہ نہیں کر پایا، مجھے دونوں سے یکساں دلی محبت ہے اور دونوں کے الگ الگ ذوق کو دین کا اہم اور ضروری حصہ سمجھتا ہوں۔

حضرت صوفی صاحبؒ کے حالات اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے اوقات کی بہت تفصیلات ہیں جن میں سے کچھ ذہن میں تازہ ہیں جبکہ کچھ کو ذہن کی سکرین پر لانے کے لیے وقت لگے گا اور کسی نہ کسی بہانے وقتاً فوقتاً یہ سامنے آتی رہیں گی ان شاءاللہ تعالیٰ، سر دست ان چند باتوں پر اکتفا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت صوفی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ہم سب کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت صوفی عبد الحمیدؒ سواتی کی ایک نومسلم خاتون دانشور سے ملاقات

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۲۰۰۸ء)

۱۹۹۰ء کی بات ہے ایک دن ہمارے محترم دوست پروفیسر عبد اللہ جمال صاحب کا فون آیا کہ امریکہ سے ایک محترمہ خاتون جو پروفیسر ہیں اور نومسلم ہیں، پاکستان آئی ہوئی ہیں اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی سے ملنا چاہتی ہیں مگر حضرت صوفی صاحبؒ نے معذرت کر دی ہے، آپ اس سلسلہ میں کچھ کریں۔ میں نے عرض کیا کہ اگرچہ یہ بات بہت مشکل ہے کہ حضرت صوفی صاحبؒ کے انکار کے بعد انہیں اس ملاقات کے لیے آمادہ کیا جا سکے مگر میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ چنانچہ میں حاضر خدمت ہوا اور گزارش کی کہ ملاقات میں کیا حرج ہے؟ پہلے تو یہی فرماتے رہے کہ میرے ساتھ ملاقات سے آخر اس کی کیا غرض ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا کہ کچھ تو غرض ہو گی جو وہ ملنے پر اصرار کر رہی ہے تو تھوڑے ردوکد کے بعد وہ ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ خاتون ڈاکٹر مارسیا کے ہرمینسن (Marcia K Hermansen) ہیں اور کیلی فورنیا کی سن ڈیگو یونیورسٹی میں اس وقت فلسفہ کے شعبہ میں استاذ تھیں۔ اصلاً کینیڈا کی رہنے والی ہیں۔ انہوں نے سین ڈیگو یونیورسٹی میں فلسفہ کے مضمون میں ماسٹرز ڈگری لی، قرآن کریم کے مطالعہ نے مسلمان کر دیا، مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات و فلسفہ کو اپنی ریسرچ کا موضوع بنایا اور "مغربی دنیا میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم کا تعارف" کے عنوان پر سین ڈیگو یونیورسٹی سے ہی ڈاکٹریٹ کیا اور پھر اس کے تعلیمی شعبہ سے منسلک ہو

گئیں۔ وزیر آباد سے تعلق رکھنے والے پروفیسر محمد علوی صاحب سے ان کی شادی ہوئی، ان کے ساتھ ہی پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات پر ریسرچ بالخصوص پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تیاری میں انہیں حضرت مولانا صوفی عبدالحمیدؒ سواتی کی بعض تصنیفات سے استفادہ کا موقع ملا ہے، اس لیے وہ ان سے ملاقات کی خواہش مند ہیں اور بعض علمی اشکالات پر ان سے گفتگو بھی کرنا چاہتی ہیں۔

حضرت صوفی صاحبؒ کی طرف سے کلیئرنس ملنے کے بعد محترمہ ایم کے ہر مینسن اپنے خاوند کے ہمراہ میرے گھر تشریف لائیں، تھوڑی دیر ٹھہریں اور ظہر کی نماز بھی انہوں نے ہمارے ہاں ادا کی۔ انہوں نے بتایا کہ گوجرانوالہ میں وہ دو کاموں کے لیے آئی ہیں۔ ایک تو وہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی دیکھنا چاہتی ہیں اور اس کے ساتھ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحبؒ سواتی سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ ان دنوں گوجرانوالہ کے قریب جی ٹی روڈ پر اٹاوہ کے ساتھ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی تعمیر کا آغاز ہوا تھا جو دراصل حضرت صوفی صاحبؒ ہی کی توجہات کا ثمرہ تھا، مگر وہ بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھی اور اس میں کسی بیرونی مہمان کی دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں تھا، اس لیے انہیں اس وقت ہونے والی پیش رفت اور آئندہ کے عزائم سے آگاہ کیا گیا جس پر انہوں نے بہت مسرت کا اظہار کیا۔

اس مرحلہ میں شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی تھوڑی سی تاریخ بھی قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ گوجرانوالہ شہر میں دیوبندی مسلک کے مسائل بالخصوص مساجد پر مخالفانہ قبضوں کی مہم کے پس منظر میں اس دور میں ایک مسلکی تنظیم جمعیۃ اہل السنۃ والجماعت کے نام سے کام کر رہی تھی جس میں زیادہ تر حضرت صوفی صاحبؒ کے حلقہ درس کے لوگ شامل تھے اور اسی حلقہ درس سے وابستہ ایک مخیر صنعت کار الحاج میاں رفیق ان دنوں جمعیۃ کے صدر تھے اور راقم الحروف بھی اس میں شامل تھا۔ ایک مرحلہ میں جمعیۃ اہل السنۃ کے احباب نے مشورہ کیا کہ شہر سے باہر جی ٹی روڈ پر مسلکی بنیاد پر ایک بڑا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہیے، چنانچہ اس کا فیصلہ کر کے جی ٹی روڈ پر لاہور کی جانب جاتے ہوئے ایمن آباد موڑ سے پہلے واقع گاؤں اٹاوہ میں ریلوے لائن کے ساتھ تقریباً بتیس ایکڑ جگہ خریدی گئی۔ ابتداء میں اس منصوبے کو "نصرۃ العلوم اسلامی یونیورسٹی" کے نام سے موسوم کیا گیا اور اسی نام سے اس منصوبے کی تفصیلات جمعیۃ اہل السنۃ کی طرف سے شائع کی گئیں مگر بعد میں مشورہ ہوا کہ یہ ادارہ الگ نام سے ہونا چاہیے اور اس کا نام "فاروق اعظمؓ اسلامی یونیورسٹی"

تجویز کیا گیا اور اس منصوبے کا دوسرا تعارف اس نام سے شائع ہوا۔ حضرت مولانا محمد سر فراز خان صفدر دامت برکاتہم اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ جمعیۃ اہل السنۃ کے سرپرست کی حیثیت سے اس منصوبے کے بھی سرپرست تھے اور صرف نام کے نہیں بلکہ عملی سرپرست تھے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن ہم چند دوست حضرت صوفی صاحبؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور اسی تعلیمی منصوبے پر گفتگو کر رہے تھے۔ زیر بحث موضوع یہ تھا کہ اس تعلیمی ادارے میں قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج ہونا چاہیے اور دینی علوم کے طلبہ کو جدید علوم و فنون سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون کے طلبہ کو دینی علوم سے آراستہ کرنے کا پروگرام تشکیل دیا جانا چاہیے۔ گفتگو کے دوران تعلیمی ادارے کا نام بھی زیر بحث آیا تو حضرت صوفی صاحبؒ نے فرمایا کہ جس کے ذہن اور فلسفہ کے مطابق کام کرنا چاہتے ہو، اس کا نام کیوں نہیں لیتے ہو؟ ان کی مراد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تھے۔ بات ہمارے ذہن میں بھی آگئی، چنانچہ ہم نے دوبارہ مشاورت کا اہتمام کیا اور اس تعلیمی ادارے کو "شاہ ولی اللہ یونیورسٹی" کا نام دے کر اس کے لیے باقاعدہ "شاہ ولی اللہ ٹرسٹ" قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کام کا آغاز کر دیا گیا۔ "شاہ ولی اللہ ٹرسٹ" جب قائم ہوا اور قانونی مراحل سے گزر کر اس نے باضابطہ ٹرسٹ کی شکل اختیار کی تو وہ چھ ارکان پر مشتمل تھا:

(۱) حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر

(۲) حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ

(۳) محترم میاں محمد رفیق صاحب،

(۴) الحاج عزیز ذوالفقار صاحب،

(۵) شیخ محمد اشرف صاحب مرحوم (مسلم لیگی رہنما ایس اے حمید کے بھائی)،

(۶) راقم الحروف ابو عمار زاہد الراشدی،

اس کے ساتھ تعلیمی و انتظامی امور کے لئے شاہ ولی اللہ ایجوکیشنل سوسائٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر الحاج میاں محمد رفیق اور سیکرٹری جنرل شیخ محمد اشرف مرحوم تھے جبکہ ٹرسٹ کے باقی چاروں حضرات کو سرپرست کا درجہ دیا گیا اور سرپرست اعلیٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر قرار پائے۔ اس سوسائٹی کے تحت شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور اس کا آغاز شاہ ولی اللہ کالج سے کیا گیا جس کے لئے

تعلیمی کمیٹی بنائی گئی اور راقم الحروف کو اس کا چیئرمین اور ڈاکٹر پروفیسر محمد اقبال لون صاحب کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

اس نظم کے ساتھ شاہ ولی اللہ کالج کا آغاز کیا گیا جس کے اہداف میں تھا کہ ایک کالج قائم کر کے عصری تعلیم کے طلبہ کو مروجہ عصری نصاب کے ساتھ ساتھ ضروری دینی تعلیم سے آراستہ کیا جائے اور دینی مدارس کے فضلاء کو جدید علوم کا ایک کورس پڑھا کر پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کرا دیا جائے، اس لیے کہ پنجاب یونیورسٹی نے دینی مدارس کے شہادۃ العالمیہ کی سند کو ایم اے کے برابر تسلیم کرنے کے لیے شرط لگا رکھی تھی کہ وہ پانچ سو نمبر کا بی اے کریں۔ چنانچہ اس دائرہ میں دونوں کورس شروع کر دیے گئے اور کئی برس تک وہ جاری رہے مگر بعد میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اس بی اے کو مزید تعلیم کے لیے بنیاد تسلیم نہ کیے جانے کی بنا پر اور یونیورسٹی کے تعلیمی نظام کے حوالے سے خود ہمارے درمیان ہم آہنگی قائم نہ رہنے کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اس سارے عمل میں دونوں بزرگوں یعنی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی کی ہمیں مکمل اور عملی سرپرستی حاصل رہی، تمام معاملات کی مشاورت میں شریک رہے اور حوصلہ افزائی اور معاونت سے نوازتے رہے، مگر شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے اصل اہداف کے حوالہ سے اس نظام کے چلانے والے احباب کے درمیان ہم آہنگی قائم نہ رہنے پر جب راقم الحروف نے دوستوں سے مشاورت کی کہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے اصل اہداف و مقاصد کے لیے معاملات کو خود کنٹرول کرنے کی کوئی صورت اختیار کی جائے تو دونوں بزرگوں یعنی حضرت مولانا سرفراز خان صفدر اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی نے مجھے سختی کے ساتھ منع کر دیا اور میں خاموشی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ چنانچہ اب وہاں کیڈٹ کالج چل رہا ہے، ہسپتال بن چکا ہے اور میڈیکل کالج کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس کے موجودہ ٹرسٹ میں راقم الحروف اور حضرت صوفی صاحبؒ کے فرزند مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی شامل ہیں مگر عملی طور پر اس کے معاملات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ ہمارے تحفظات بدستور قائم ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر ایم کے ہرمینسن نے شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کا نام کہیں پڑھ لیا تھا اور وہ اسے دیکھنے کے شوق میں تشریف لائی تھیں مگر اس وقت وہ بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھی اس لیے انہیں وہاں لے جانا مناسب نہ تھا، البتہ حضرت صوفی صاحبؒ کے ساتھ ان کی ملاقات ہو

گئی۔ یہ ملاقات مدرسہ نصرۃ العلوم کی لائبریری میں ہوئی جس میں محترمہ کے شوہر پروفیسر محمد علوی صاحب، پروفیسر محمد عبد اللہ جمال صاحب اور راقم الحروف بھی شریک تھے۔

ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے حضرت صوفی صاحبؒ سے وحدت الوجود کے فلسفہ کے حوالہ سے کچھ سوالات کیے جن کی تفصیل اب مجھے یاد نہیں ہے، البتہ اتنی بات ذہن میں محفوظ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کہ اس مسئلہ پر اور کن حضرات سے بات کی جا سکتی ہے تو حضرت صوفی صاحبؒ نے حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور حضرت مولانا خواجہ خان محمد دامت برکاتہم کے نام لیے۔ اس موقع پر حضرت صوفی صاحبؒ نے محترمہ ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن سے ایک دلچسپ سوال کیا جو اس طرح تھا کہ آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں اور ہم مسلمانوں میں اس وقت ایسی کوئی بات نہیں کہ کوئی ہمیں دیکھ کر متاثر ہو اور مسلمان ہو جائے۔ آپ آخر کیسے مسلمان ہوئی ہیں؟ ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے جواب دیا کہ وہ کسی مسلمان کی دعوت پر یا کسی مسلمان کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوئیں بلکہ ان کے قبول اسلام کی وجہ قرآن کریم بنا ہے اور قرآن کریم کا مطالعہ کر کے وہ مسلمان ہوئی ہیں۔ اس کی تفصیل انہوں نے یوں بیان کی کہ سین ڈیگو یونیورسٹی میں فلسفہ میں ماسٹرز ڈگری کرنے کے بعد وہ ایک مرحلہ میں اسپین کی کسی یونیورسٹی میں کوئی کورس کر رہی تھیں کہ ایک روز ہاسٹل میں صبح کے وقت ریڈیو کی سوئی گھماتے ہوئے ایک جگہ سے ایسی پرکشش آواز سنائی دی جس نے ان کی دلی توجہ حاصل کی اور انہیں کشش اور سکون محسوس ہونے لگا، مگر یہ پتہ نہ چلا کہ زبان کون سی ہے اور کلام کیا ہے؟ دو تین روز وہ تلاش کر کے یہ آواز سنتی رہیں جس سے انہیں روحانی سکون ملتا تھا۔ پھر کوشش کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ مراکش ریڈیو ہے اور اس سے مسلمانوں کی مقدس کتاب "قرآن کریم" کی تلاوت ہوتی ہے۔ چند روز وہ سنتی رہیں، پھر قرآن کریم کا انگلش ترجمہ حاصل کر کے اس کا مطالعہ شروع کر دیا، مگر خیال ہوا کہ اس کتاب کو اس کی اصل زبان میں اسٹڈی کرنا چاہیے، چنانچہ انہوں نے عربی زبان کا باقاعدہ کورس کیا اور اس کے بعد قرآن کریم کا مطالعہ کیا تو قرآن کریم نے انہیں مسلمان بنا دیا۔

مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے اسلامی تعلیمات کی طرف توجہ دی، ان کا کہنا ہے کہ انہیں سب سے زیادہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے متاثر کیا۔ انہوں نے شاہ صاحبؒ کی تعلیمات پر کام شروع کیا اور انہی پر سین ڈیگو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ محترمہ ایم کے ہر مینسن کی اپنی زبان انگلش ہے مگر انہیں عربی، فارسی، اردو اور سنسکرت پر

بھی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے سین ڈیگو یونیورسٹی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کے فروغ کے لیے "شاہ ولی اللہ چیئر" قائم کر رکھی ہے جس کی وہ چیئر پرسن ہیں اور انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ کا انگلش ترجمہ بھی کیا ہے جو چھپ چکا ہے۔

محترمہ نے ماہنامہ الشریعہ میں اشاعت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ پر لکھے گئے اپنے چند مضامین بھی دیے جو ہم نے ترجمہ کے لیے اپنے محترم دوست حافظ مقصود صاحب آف شیخوپورہ کے سپرد کیے، انہوں نے ایک مضمون کا ترجمہ کیا جو الشریعہ میں چھپ گیا مگر اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی اور ان کے کاغذات میں باقی مضامین نہ مل سکے۔

ڈاکٹر ایم کے ہرمینسن سے حضرت صوفی صاحبؒ نے ایک سوال اور کیا کہ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ منافقت بہت زیادہ ہے، قول اور عمل میں تضاد ہے اور اسلام کے احکام پر عمل کی فضا موجود نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کی عمومی صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ مغرب سے اسلام کے حوالہ سے بات کرنے کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فلسفہ و اسلوب سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ اس میں عقل و فکر بھی ہے اور روحانی سکون کا سامان بھی موجود ہے، اس لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم پر کام ہونا چاہیے اور ان کی زبان و اسلوب میں مغرب کو اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔

حضرت صوفی صاحبؒ نے مہمان خاتون کے قبول اسلام، اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے ان کی محنت اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ و فکر پر ان کی جدو جہد کو سراہا اور ان کے لیے استقامت و ترقی کی دعا فرمائی۔

توہین رسالت کا قانون اور جرمن پارلیمنٹ کی ہیومن رائٹس کمیٹی کا مطالبہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱ جنوری ۲۰۰۸ء)

جرمن پارلیمنٹ کی ہیومن رائٹس کمیٹی کے ارکان ان دنوں پاکستان کے دورے پر ہیں اور انہوں نے گزشتہ روز وفاقی وزیر قانون سے ملاقات کر کے دیگر امور کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ توہین رسالت کی سزا کے قانون میں ترمیم کی جائے اور اس جرم کی سزا کو کم کیا

جائے۔ جرمن پارلیمنٹ کی اس کمیٹی کے ارکان کرسٹا کلز انجلیکا گروف اور ارد گارڈ بچور نے اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پاکستان کی وزیر قانون نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ توہین رسالت کی سزا کے قانون میں ترمیم کر دی جائے گی۔

پاکستان میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کے مطابق توہین رسالت پر موت کی سزا کا قانون نافذ ہے جس پر ایک عرصہ سے مغربی حلقوں کی طرف سے اعتراض کیا جا رہا ہے کہ انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کی رو سے یہ سزا آزادی رائے اور شہری حقوق کے منافی ہے اس لیے اس سزا کو ختم کیا جائے۔ مگر پاکستان کے عوام اس مسئلہ پر ملک گیر ہڑتال کر کے یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ ان کے عقیدہ و ایمان کا مسئلہ ہے اس لیے اس قانون میں کوئی ترمیم برداشت نہیں کی جائے گی۔

اس سلسلہ میں پاکستان پر دباؤ ڈالنے میں جرمنی بھی پیش پیش ہے۔ چند سال قبل ضلع گوجرانوالہ کے گاؤں رتہ دوہتڑ میں توہین رسالت کے مرتکب مسیحی ملزمان کو جرمنی لے جا کر سیاسی پناہ دینے کی کارروائی بھی جرمن حکومت نے خصوصی انتظامات کے تحت کی تھی اور جرمن چانسلر نے اس موقع پر خود پاکستان کا دورہ کر کے توہین رسالت کی سزا کے قانون پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی پس منظر اور تسلسل میں جرمن پارلیمنٹ کی ہیومن رائٹس کمیٹی کے ارکان پاکستان آئے ہیں اور انہوں نے اس مسئلہ کو دوبارہ اٹھایا ہے جس پر ان کے بقول پاکستان کے وزیر قانون نے قانون میں ترمیم کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ یہ ترمیم کیا ہوگی اور کیسے نافذ کی جائے گی، اس کے بارے میں تو وفاقی وزیر قانون ہی زیادہ بہتر طور پر وضاحت کر سکیں گے۔

البتہ اس موقع پر ہم توہین رسالت کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کے حوالہ سے قرن اول کا ایک واقعہ عرض کرنا چاہتے ہیں جس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں کے احساسات کیا ہیں۔ یہ واقعہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا ہے اور بخاری شریف میں مذکور ہے جس کی کچھ تفصیلات بخاری کے شارح حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "فتح الباری" میں بیان کی ہیں اور انہی کی روشنی میں اس واقعہ کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔

جناب رسول اللہ کی مخالفت اور توہین میں یہود میں سے دو آدمی پیش پیش رہتے تھے۔ ایک کعب بن اشرف تھا جو مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھا، اور دوسرا ابو رافع تھا جو خیبر میں رہتا

تھا۔ انصار مدینہ کے دو قبیلوں اوس اور خزرج میں خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ چنانچہ بنو اوس کے نوجوان صحابی محمد بن مسلمہؓ نے اپنے دیگر رفقاء کے ہمراہ جناب نبی اکرمؐ کی اجازت سے گستاخ رسول کعب بن اشرف کو جہنم رسید کیا تو بنو خزرج کے نوجوانوں کو بھی جوش آیا کہ ہم اس کار خیر میں بنو اوس سے کیوں پیچھے رہیں؟ انہوں نے ابو رافع کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور آنحضرتؐ سے اجازت لے کر اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ اس مہم میں جن صحابہ کرامؓ نے حصہ لیا ان میں عبداللہ بن عتیکؓ، عبداللہ بن عتبہؓ، مسعود بن سنانؓ، عبید اللہ بن انیسؓ، ابو قتادہؓ اور اسود بن حرامؓ کے نام مختلف روایات میں بیان کیے گئے ہیں۔

عبداللہ بن عتیکؓ واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابو رافع نے خیبر سے باہر حجاز کی زمین کی طرف ایک قلعہ بنا رکھا تھا جس میں وہ رہتا تھا۔ ہم اس قلعہ تک پہنچے، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ کسی جگہ ٹھکانہ بنا کر موقع کا انتظار کریں، میں قلعہ کے اندر داخل ہونے کی کوئی صورت نکالتا ہوں۔ باقی ساتھیوں کو ایک جگہ بٹھا کر میں قلعہ کے بڑے دروازے کی طرف گیا، شام کا وقت تھا، لوگ باہر سے قلعہ میں داخل ہو رہے تھے اور چند افراد ایک گدھے کو تلاش کر رہے تھے جو گم ہو گیا تھا۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو مجھے خطرہ ہوا کہ دربان مجھے اجنبی سمجھ کر روک نہ دے، تو میں پیچھے ہٹ کر کچھ فاصلے پر چادر لپیٹ کر اس انداز سے بیٹھ گیا جیسے کوئی قضائے حاجت کے لیے بیٹھا ہو۔

دربان کو دروازہ بند کرنے کی جلدی تھی، اس نے آواز دی کہ جس نے قلعہ میں جانا ہو جلدی آ جائے میں گیٹ بند کرنے لگا ہوں۔ میں تیزی سے اٹھا اور دروازے سے اندر چلا گیا، دروازے کے اندر ایک جانب جانوروں کے باندھنے کی جگہ تھی میں وہیں گھس کر چھپ گیا اور دربان پر نظر رکھی جو گیٹ بند کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دربان نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور چابیاں سامنے دیوار کے ایک خانے میں کھونٹے پر لٹکا دیں۔ میں نے وہیں سے قلعہ کے اندر کی صورتحال کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ ابو رافع کا ٹھکانہ ایک بالا خانے میں ہے اور چند لوگ اس کی طرف اوپر جا رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں رات کو کھانے کے بعد گپ شپ کی مجلس جمتی ہے، کچھ دیر انتظار کیا اور جب لوگ مجلس سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو میں اٹھا، دیوار کے خانے سے چابیاں اٹھائیں اور سب سے پہلے مین گیٹ

کا تالہ کھول دیا تاکہ مجھے بھاگنا پڑے تو آسانی رہے۔ پھر سب لوگوں کے کمروں کے دروازوں کو باہر سے بند کردیا تاکہ کوئی ابورافع کی مدد کو نہ آسکے۔ اس کے بعد میں آہستہ سے بالاخانے کی طرف گیا تو دیکھا کہ اندھیرا ہے اور تاریک کمرے میں ابورافع اپنے اہل وعیال سمیت سونے کے لیے لیٹ گیا ہے۔ مگر مجھے یہ اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ ان میں ابورافع کس جگہ پر لیٹا ہوا ہے۔ میں نے آہستہ سے آواز دی جسے سن کر ابورافع نے پوچھا کہ کون ہے؟ میں کوئی جواب دیے بغیر آواز کی سمت لپکا اور تلوار کا وار کردیا جو کارگر نہ ہوا اور میں پیچھے ہٹ کر اندھیرے میں ایک جانب کھڑا ہوگیا۔

چند لمحوں کے بعد میں دوسری سمت سے آگے بڑھا اور آواز بدل کر پوچھا کہ ابورافع یہ کون تھا اور کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ کسی شخص نے مجھ پر تلوار سے حملہ کیا ہے، میں نے پھر آواز کی جگہ کا اندازہ کرکے تلوار کا وار کیا جس سے وہ زخمی ہوگیا مگر کام تمام نہ ہوسکا۔ میں پھر پیچھے ہٹا اور تیسری سمت سے اس انداز سے آیا جیسے کوئی مدد کے لیے آرہا ہو، میں نے دیکھا کہ ابورافع زخمی حالت میں سیدھا زمین پر پڑا ہے، میں نے تلوار کی نوک اس کے پیٹ پر رکھ کر اوپر اپنا وزن ڈال دیا اور جب ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی تو یہ سمجھ کر اب یہ مر چکا ہوگا پیچھے ہٹ گیا اور قلعہ سے باہر نکل آیا لیکن تیزی میں بالاخانے کی سیڑھی سے اترتے ہوئے میں زمین پر گرا اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی جسے میں نے کپڑے سے کس کر باندھ لیا اور لنگڑاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے ساتھیوں سے کہا کہ میں تو ابورافع کی موت کا اعلان سنے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، تم جاؤ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری سنادو کہ ان کی توہین اور گستاخی کے مرتکب ابورافع کو ہم نے قتل کردیا ہے۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے جب قلعہ کی دیوار سے ابورافع کی موت کا اعلان سنا تو میں بھی تسلی کرکے مدینہ منورہ کی طرف چل پڑا اور لنگڑاہٹ کے باوجود اتنا تیز چلا کہ مدینہ منورہ پہنچنے سے قبل اپنے ساتھیوں سے مل گیا۔ پھر ہم نے جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر انہیں خبر دی اور سارا واقعہ سنایا، واقعہ سنانے کے بعد میں نے اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ آنحضرتؐ کو دکھائی جس پر آپؐ نے اپنا مبارک ہاتھ پھیرا اور وہ حضورؐ کا ہاتھ لگتے ہی ایسے سیدھی ہوگئی جیسے کبھی اس میں کوئی تکلیف ہی نہیں ہوئی تھی۔

وفاقی وزیر قانون سے گزارش ہے کہ وہ جرمن پارلیمنٹ کے ارکان سے کوئی وعدہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایمانی جذبات کو بھی ذہن میں رکھیں کیونکہ نبی اکرمؐ کی عزت و ناموس کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے غیرت وحمیت کا سوال ہے، وہ اس کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا بھی باعث فخر وسعادت تصور کرتے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ حضورؐ کے گستاخوں کو ٹھکانے لگاتے ہوئے کسی مسلمان کو کوئی گزند اور تکلیف پہنچتی ہے تو اسے آپؐ کا دست شفقت بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ کیا وفاقی وزیر قانون اور ان کے رفقاء توہین رسالت کی سزا کے قانون میں ترمیم کر کے جناب نبی اکرمؐ کے دست شفقت کے دائرہ سے باہر نکلنا پسند کریں گے؟

۲۰۰۷ء

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات۔ مولانا سید سلمان ندوی کے خیالات

(روزنامہ پاکستان، لاہور- ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ء)

سلمان ندوی نام کے تین بزرگ اس وقت ہمارے معاصر اہل علم ودانش میں معروف ہیں، تینوں سے بحمد اللہ تعالٰی مجھے نیاز مندی حاصل ہے اور یہ تینوں ورلڈ اسلامک فورم میں شریک ہیں۔

1. ایک ڈاکٹر سید سلمان ندوی ہیں جو معروف کتاب ''سیرت النبیؐ'' کے مصنف علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ہیں، ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ میں شعبہ اسلامیات کے سربراہ رہے ہیں، اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد مختلف بین الاقوامی تعلیمی اداروں میں وقتاً فوقتاً اسلامی تعلیمات کے حوالے سے لیکچر دیتے رہتے ہیں۔

2. دوسرے مولانا سید سلمان الحسینی ندوی ہیں جو رشتہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نواسے لگتے ہیں، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے استاذ الحدیث ہیں، اور علمی دنیا میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے جانشین اور نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔

3. جبکہ تیسرے مولانا سلمان ندوی میرپور ڈھاکہ میں دارالارشاد کے نام سے ایک علمی ادارے کے ذریعے دینی و علمی خدمات میں مسلسل مصروف رہتے ہیں، اور وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فیض یافتہ ہیں۔

یہ تینوں بزرگ مختلف اوقات میں ہمارے پاس الشریعۃ اکادمی گوجرانوالہ تشریف لا چکے ہیں۔ اول الذکر دونوں بزرگ ورلڈ اسلامک فورم کے باقاعدہ سرپرستوں میں شامل ہیں جبکہ ڈھاکہ والے مولانا سلمان ندوی فورم کے نائب صدر ہیں۔

لکھنؤ والے مولانا سید سلمان ندوی کے ساتھ اکثر بیرون اسفار میں رفاقت رہتی ہے، لندن، دوبئی، ڈھاکہ وغیرہ میں ان کے ساتھ متعدّد اجتماعات میں شریک ہوا ہوں اور مختلف دینی وعلمی امور میں ہم ذوقی سے ہم دونوں حظ اٹھاتے رہتے ہیں۔ ان کی بیعت کا تعلق دنیائے اسلام کے معروف خطاط اور روحانی بزرگ حضرت مولانا سید نفیس الحسینی مدظلہ سے ہے جن کی لاہور میں قائم کردہ خانقاہ سید احمد شہیدؒ طالبان سلوک کے لیے مرجع کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ یہ خانقاہ دریائے راوی پر سگیاں پل سے شیخوپورہ کی طرف جاتے ہوئے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر مغربی جانب واقع ہے اور روڈ پر خانقاہ سید احمد شہیدؒ کا ایک چھوٹا سا بورڈ اس سمت جانے والوں کی رہنمائی کے لیے موجود ہے۔ حضرت شاہ صاحب کچھ عرصہ سے مسلسل صاحب فراش ہیں اور ان دنوں ہسپتال میں ہیں۔ گزشتہ ہفتے مجھے اچانک معلوم ہوا کہ لکھنؤ والے مولانا سید سلمان ندوی لاہور آئے ہوئے ہیں اور خانقاہ سید احمد شہیدؒ میں قیام پذیر ہیں۔ میں اپنے رفقاء مولانا قاری جمیل الرحمن اختر، ڈاکٹر فضل الرحمن، اور حاجی محمد لقمان میر کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ رات ہی حضرت شاہ صاحب کی بیمار پرسی کے لیے لاہور پہنچے ہیں اور چند روز قیام کریں گے۔ چنانچہ میری گزارش پر انہوں نے ۱۲ دسمبر کو تھوڑی دیر کے لیے گوجرانوالہ آنا منظور کیا جس پر ہم نے مغرب کے بعد الشریعۃ اکادمی گوجرانوالہ میں علمائے کرام اور دیگر اہل دانش کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کر لیا۔

علمائے کرام، پروفیسر صاحبان، وکلاء اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد ان کا نام سن کر جمع ہوگئی اور مولانا سلمان ندوی نے بھی اس موقع پر مختلف مسائل کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ انہوں نے اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے اور اسلام کے اس طرح حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے کہ جس بات پر جی چاہا عمل کر لیا اور جسے چاہا نظر انداز کر دیا۔ قرآن کریم ہم سے اس ”الدین“ کو مکمل طور پر قبول کرنے کا مطالبہ کرتا ہے جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام پر نازل ہوتا رہا ہے اور جس کی مکمل شکل اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کی

ہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس دین کے حصے بخرے کر دیے تھے، اس طرح کہ وہ توراۃ کے کچھ احکام پر ایمان رکھتے تھے اور کچھ احکام سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ قرآن کریم کے بقول اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت اور رسوائی مسلط کر دی تھی اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق قرار پائے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون جس طرح بنی اسرائیل کے لیے تھا ہمارے لیے بھی ہے اور قرآن کریم میں اس کا تذکرہ بھی ہماری رہنمائی کے لیے کیا گیا ہے، اس لیے کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنی امت سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ تم لوگ بھی بنی اسرائیل کی قدم قدم پیروی کرو گے حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی شخص گوہ نامی جانور کے سوراخ میں داخل ہوا ہے تو تم بھی ایسا ضرور کرو گے۔ اسی لیے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ آج دنیا میں ہمارا جو حال ہے کہیں اسی کا نتیجہ تو نہیں ہے؟

مولانا نے کہا کہ آج ہم نے دین کو صرف عبادات تک محدود کر رکھا ہے اور زندگی کے دیگر شعبے دین سے غیر متعلق سمجھے جا رہے ہیں۔ جبکہ دین نے جہاں عبادات کے طریقے اور ضوابط بتائے ہیں وہاں تجارت، معیشت، عدالت، سیاست، معاشرت، اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کے اصول و قواعد بھی بیان کیے ہیں اور یہ سب دین کا حصہ ہیں۔ مگر آج ان شعبوں کو حتیٰ کہ نکاح، طلاق اور خاندانی زندگی کو بھی دین سے لاتعلق دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور کم و بیش اسی قسم کی صورتحال پیدا ہو گئی ہے جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے خطاب کر کے فرمایا تھا کہ کیا تم کتاب اللہ کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ اور تشویش کی بات یہ ہے کہ علمائے کرام بھی جب دین کی بات کرتے ہیں تو صرف عبادات کے حوالے سے کرتے ہیں اور زندگی کے دوسرے شعبوں کے بارے میں قرآن و سنت کی ہدایات و تعلیمات کو لوگوں کے سامنے لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ یہ بات دین کے تصور کو محدود کرنے والی ہے اور دین کے مزاج کے خلاف ہے جس پر بہر حال نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

مولانا سید سلمان الحسینی ندوی نے جس دوسری بات کی طرف زیادہ اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی وہ دینی مدارس کا نظام تعلیم اور اس کا محدود دائرہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علمائے کرام نے دینی تعلیم کے حوالے سے صرف مساجد اور دینی مدارس کی حدود پر قناعت کر رکھی ہے اور معاشرے کے جن لوگوں کا مسجد و مدرسہ کے ساتھ تعلق نہیں ہے انہیں دینی تعلیم سے آراستہ کرنے اور ان تک دینی تعلیمات پہنچانے کا کوئی نظم ان کے ہاں موجود نہیں

ہے۔ اور یہ دین کو ایک محدود دائرے میں محصور کرنے اور دین کے بارے میں ایک محدود تصور کو قبول کر لینے کے مترادف ہے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سوسائٹی کے ہر طبقے اور ہر فرد کو ضروری دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کی فکر کی جائے اور زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں قرآن و سنت کے احکام و ہدایات کو متعلقہ شعبوں کے لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔

انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ نئی نسل کو قرآن کریم اور سنت نبویؐ کے ساتھ براہ راست متعارف کرانے کی ضرورت ہے اور اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ مناسب عربی گرامر کے ساتھ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھایا جائے۔ اور پہلے سے کوئی تصور قائم کر کے قرآن کریم کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنے کی بجائے قرآن کریم کو سامنے رکھ کر اس سے براہ راست رہنمائی حاصل کی جائے۔ دینی تعلیم کی اصل ترتیب یہ ہے کہ پہلے قرآن کریم، پھر سنت نبویؐ، پھر فقہ اسلامی اور اس کے بعد دوسرے درجات ہیں لیکن ہمارے ہاں ترتیب اس کے برعکس ہوتی ہے۔ ہم منطق و فلسفہ اور دیگر فنون ذہنوں میں بٹھا کر پھر قرآن کریم تک پہنچتے ہیں تو قرآن کریم کے اصل پیغام اور رہنمائی تک رسائی نہیں ہو پاتی، اس لیے ہمیں اس ترتیب کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

نشست کے شرکاء نے مولانا سید سلمان ندوی کے بیان کو پورے انہماک سے سنا اور اکثر دوستوں نے بعد میں اس تاثر کا اظہار کیا کہ اس خطاب سے انہیں رہنمائی کے ساتھ ساتھ نئے انداز میں کام کرنے کا ولولہ ملا ہے۔ مولانا ندوی کے ساتھ مولانا قاری سیف اللہ اختر اور دیگر رفقاء بھی لاہور سے تشریف لائے تھے۔ قاری سیف اللہ اختر ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں، جہاد افغانستان میں ان کا ایک عرصے تک متحرک کردار رہا ہے، ان کا تعلق بھی حضرت مولانا سید نفیس شاہ صاحب سے ہے اور وہ اپنے شیخ کی ہدایت پر آج کل خانقاہ سید احمد شہیدؒ میں خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

بعد ازاں ان حضرات نے واپڈا ٹاؤن گوجرانوالہ میں الشریعۃ اکادمی کے ایک معاون ساتھی حاجی محمد معظم میر کی رہائش گاہ پر ان کی طرف سے دیے گئے عشائیے میں شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا سلمان ندوی نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دین کا ایک بہت اہم شعبہ آج کل ہماری توجہ کا طالب ہے جس کی طرف علمائے کرام اور دینی حلقوں کی توجہ نہیں ہے، اور وہ شعبہ خدمت خلق کا ہے۔ حالانکہ وحی کے نزول کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا

سب سے پہلا تعارف احادیث وروایات میں یہی ملتا ہے کہ وہ صلہ رحمی کرنے والے تھے، بیواؤں اور مسکینوں کی کفالت کرتے تھے، معذوروں اور حاجت مندوں کے کام آتے تھے، مسافروں اور مہمانوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے، اور نادار لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ یہ دین کا بہت اہم شعبہ ہے اس لیے اگر ہم اس طرف توجہ دیں اور عام لوگوں کی خدمت کو اپنا شعار بنالیں تو اجر و ثواب کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کی ہمدردیاں اور محبتیں بھی ہمارے حصے میں آئیں گی۔ انہوں نے کہا کہ آج ہمارے دینی مدارس میں خطباء اور ائمہ تو پیدا کیے جا رہے ہیں مگر خادم بنانے کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی اور اس خلاء سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرے لوگ مسلم سوسائٹی میں اثر ورسوخ بڑھا رہے ہیں۔ یہ مولانا سید سلمان الحسینی ندوی کا پاکستان کے علمائے کرام اور دینی حلقوں کے نام دردمندانہ پیغام ہے، خدا کرے کہ ہم اس پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دے سکیں، آمین یا رب العالمین۔

جدید سیاسی نظام اور اجتہاد

(علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد - ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

(۲۹ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام "اقبالؒ کا تصور اجتہاد" کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار کے چوتھے اجلاس میں پڑھا گیا۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ "اقبال کا تصور اجتہاد" کے عنوان سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام یہ تین روزہ سیمینار ایسے وقت میں ہو رہا ہے جبکہ پوری دنیائے اسلام میں اجتہاد کے بارے میں نہ صرف یہ کہ بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے مختلف اور متنوع پہلو ارباب علم و دانش کی گفتگو کا موضوع بنے ہوئے ہیں، بلکہ مختلف سطحوں پر اجتہاد کا عملی کام بھی پہلے سے زیادہ اہمیت اور سنجیدگی کے ساتھ پیشرفت کر رہا ہے اور امت مسلمہ میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔

جنوبی ایشیا میں مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ آنے والے دور کی ضرورت کا قبل از وقت اندازہ کرتے ہوئے انہوں نے اجتہاد کی جدید ضروریات اور تقاضوں پر علمی انداز میں بحث کی اور اپنے معروف خطبہ اجتہاد میں اہل علم کو ان

ضروریات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بحث وتمحیص کا ایک عملی ایجنڈا بھی ان کے سامنے رکھ دیا۔ قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے ایک طالب علم کے طور پر علامہ اقبال کے خطبہ اجتہاد کے بارے میں دوسرے بہت سے حضرات کی طرح میرے بھی بعض تحفظات ہیں، لیکن مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی حجاب نہیں ہے کہ تمام تر تحفظات کے باوجود اقبال کا یہ خطبہ اجتہاد آنے والے دور کی ضروریات اور تقاضوں کے پیش نظر اجتہاد پر بحث ومباحثہ کے لیے ایک قابل توجہ اور لائق غور علمی اور عملی ایجنڈا ہے، اسی لیے اس کے بعد سے اجتہاد کے جدید تقاضوں کے حوالہ سے جب بھی گفتگو ہوئی ہے، اسے کسی بھی مرحلہ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکا۔ اس سے قبل سرسید احمد خان مرحوم نے بھی اس رخ پر کام کیا تھا مگر میری طالب علمانہ رائے میں سرسید احمد خان اور علامہ اقبال کے کام میں ایک واضح فرق ہے جس نے دونوں کے نتائج کو مختلف بنادیا ہے۔

سرسید احمد خان نے جس دور میں بات کی وہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے علمی اور معاشرتی ڈھانچوں کی ٹوٹ پھوٹ کا زمانہ تھا۔ اس وقت صرف اور صرف تحفظ ہی ہر صاحب فکر مسلمان کے ذہن میں تھا اور ہر طرف ایک ہی سوچ تھی کہ جو کچھ بچایا جا سکتا ہو، بچا لیا جائے۔ اس کے لیے روایتی علمی و دینی حلقوں نے اپنے انداز میں اور سرسید احمد خان نے اپنے انداز میں محنت کی۔ ظاہر بات ہے کہ تحفظات کے دور میں حساسیت بھی اسی حساب سے بڑھ جاتی ہے اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے سرسید احمد خان کے اصل کام کی بجائے ان کے تفردات زیادہ تر موضوع بحث بنے اور روایتی دینی حلقوں میں سر سید احمد خان کے اصل کام کو پذیرائی حاصل نہ ہوسکی۔ جبکہ علامہ اقبال نے اس دور میں بات کی جب ہم غلامی کا ایک دور گزار کر آزادی کی طرف بڑھ رہے تھے، امید کی کرنیں روشن ہونے لگی تھیں اور بہتر مستقبل کے کچھ آثار دکھائی دینا شروع ہو گئے تھے، اس لیے علامہ اقبال کے تفردات کی بجائے ان کے کام کی مقصدیت کی طرف نظریں زیادہ اٹھنے لگیں۔ اور جہاں ان کا ''خطبۂ اجتہاد'' جدید علمی حلقوں کی توجہات کا مرکز بنا، وہاں روایتی دینی حلقوں کے لیے بھی اسے یکسر نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ دینی حلقوں نے علامہ اقبال کے خطبۂ اجتہاد کو من وعن قبول کر لیا، اس لیے کہ جب خود اس کے بارے میں اپنے تحفظات کا ذکر کر رہا ہوں تو یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جس شدت کے ساتھ سرسید احمد خان کے تفردات کو مسترد کر دیا گیا تھا، جس کی

وجہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس دور کا مخصوص ماحول تھا، علامہ اقبال کو اس طرح کے شدید ردعمل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ خود روایتی دینی حلقوں نے اس کے بعد جب اجتہاد کی طرف عملی قدم بڑھایا تو علامہ اقبال کے بیان کردہ دائرے ہی ان کے کام آئے۔

اس تمہید کے ساتھ ''اقبالؒ کا تصور اجتہاد'' کے مرکزی عنوان کے سائے میں ''جدید سیاسی نظام اور اجتہاد'' کے موضوع پر اس سیمینار میں ارباب علم و دانش کے سامنے کچھ طالب علمانہ گزارشات پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

جدید سیاسی نظام میں اجتہاد کے حوالہ سے گفتگو کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں کچھ عرض کروں، اس لیے کہ اس کا کوئی خاکہ سامنے رکھے بغیر جدید سیاسی نظام کے اجتہادی تقاضوں پر گفتگو کرنا ایک ایسی یکطرفہ بات ہوگی جس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکے گا۔ اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کے چند بنیادی اصول تو بیان کیے گئے ہیں، جن سے ایک اسلامی حکومت کے دائرۂ کار اور حدود کا تعین ہو جاتا ہے، لیکن سیاسی نظام کا کوئی متعیّن ڈھانچہ قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے۔ اسے امت کی صوابدید پر ہر دور کے حالات کے تناظر اور ضروریات کے لیے اوپن چھوڑ دیا گیا ہے جو بہت بڑی حکمت کی بات ہے۔ اس کا مطلب اس اہم کام کو نظر انداز کر دینا نہیں ہے بلکہ ایسا کر کے حالات کے اتار چڑھاؤ، نسل انسانی کے معاشرتی ارتقا، زمانہ کے تغیرات اور مختلف علاقوں اور زمانوں کے لوگوں کے مزاج و نفسیات میں پائے جانے والے فطری تنوع کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر قسم کے جائز امکانات کا راستہ کھلا رکھا گیا ہے، جو مسلسل تغیر پذیر انسانی سوسائٹی کے فطری تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ البتہ بنیادی اصول اور حدود قرآن و سنت میں بیان کر دیے گئے ہیں تاکہ کسی دور میں کوئی اسلامی حکومت ان بنیادی مقاصد اور دائرۂ کار سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۴۳ سے آیت ۵۰ تک بنی اسرائیل کے سیاسی نظام کا ذکر کیا ہے اور اس کی حدود بیان فرمائی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے توراۃ اتاری جس میں ہدایت اور نور ہے۔ انبیائے کرام، علمائے کرام اور خدا پرست لوگ اس کے مطابق حکم کرتے تھے۔ پھر ہم نے انجیل نازل کی جو توراۃ کے احکام

کی تصدیق کرنے والی ہے اور پھر قرآن کریم کا نزول ہوا۔ انہی آیات میں اللہ تعالی نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالی کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتے، وہ ظالم، فاسق اور کافر ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ان آیات میں جناب نبی اکرمؐ کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ تعالی کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے کریں اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ اور یہ فرمان خداوندی بھی انہی آیات میں موجود ہے کہ لوگوں کی خواہشات کو فیصلوں کی بنیاد بنانا جاہلیت اور گمراہی کا ذریعہ ہے۔ پھر یہیں یہ بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ لوگوں کی خواہشات کی مطلقاً نفی نہیں ہے بلکہ ''ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق'' کا جملہ واضح کرتا ہے کہ لوگوں کی ان خواہشات کی پیروی سے منع کیا گیا ہے جو حق یعنی وحی الہی سے متصادم ہوں۔ اس کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی سامنے رکھ لیں جو بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہوا ہے کہ: ''بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کرام علیہم السلام کرتے تھے، ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا، اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اس لیے میرے بعد خلفاء ہوں گے۔''

گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں وحی الہی کی بنیاد پر انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے چلنے والے حکومتی نظام کا تسلسل اب بھی قائم ہے، البتہ اب چونکہ کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے یہ تسلسل اب خلفاء کے ذریعے آگے بڑھے گا اور یہی اسلام کا نظام خلافت ہے۔

نظام خلافت کے حوالے سے ایک اہم بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جس کی طرف علامہ محمد اقبال نے اپنے خطبہ میں اشارہ کیا ہے کہ اہل سنت کے نزدیک یہ نظام ''خلافت'' کے عنوان سے ہے جبکہ اہل تشیع اسے ''امامت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور میرے خیال میں ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ:

1. ''خلافت'' کی بنیاد نامزدگی پر نہیں بلکہ امت کی صوابدید اور اختیار پر ہے، جبکہ ''امامت'' منصوص ہے اور نامزدگی کے ذریعے اس کا تعین ہوتا ہے۔

2. ''خلافت'' کسی خاندان اور نسل میں محدود نہیں، جبکہ ''امامت'' صرف ایک خاندان میں محدود ہے۔

3. ”خلیفہ“ کا دینی درجہ مجتہد کا ہے جس کے فیصلوں اور احکام میں صواب اور خطا دونوں کا احتمال موجود رہتا ہے، جبکہ ”امام“ معصوم ہے، اس کی رائے میں خطا کا احتمال نہیں اس لیے کسی بھی معاملہ اس کی رائے حتمی ہوتی ہے۔

4. ”خلیفہ“ اپنی خلافت میں خدا کی نمائندگی نہیں کرتا، جبکہ ”امام“ خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو ”خلیفۃ الرسول“ کہا جاتا تھا۔ قاضی ابو یعلیؒ نے ”الاحکام السلطانیہ“ میں روایت نقل کی ہے کہ ایک بار کسی شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو ”یا خلیفۃ اللہ“ کہہ کر پکارا تو خلیفہ اول نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ میں اللہ تعالی کا خلیفہ نہیں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ میری طالب علمانہ رائے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا کی نمائندگی کے نام پر کوئی پاپائی اختیارات نہیں رکھتا بلکہ رسول اللہ کے نمائندہ کے طور پر ان کی ہدایات اور تعلیمات کا پابند ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد پہلے خطبہ میں صاف طور پر فرما دیا کہ میں اگر اللہ تعالی اور اس کے آخری رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے، اور اگر ایسا نہ کروں تو میری اطاعت تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔ اسے دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ یہ تھیاکریسی کی نفی تھی اور شخصیت کی بجائے دلیل کی حکومت کے قیام کا اعلان تھا جس سے اسلام کے نظام خلافت آغاز ہوا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اہل سنت کے موقف اور روایات کے مطابق) اپنا جانشین نامزد نہیں کیا تھا بلکہ خلیفہ کے انتخاب کو امت کی صوابدید اور اختیار پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ فرمایا لیکن پھر یہ کہہ کر ارادہ ترک کر دیا کہ ”یابی اللہ والمومنون الا ابا بکر“ ابوبکر کے سوا کسی اور کو خلیفہ بنانے سے اللہ تعالی بھی انکار کرتا ہے اور مومنین بھی اس پر راضی نہیں ہوں گے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے امت کی اجتماعی صوابدید پر اعتماد کا اظہار تھا اور حکمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کسی کو نامزد کر کے نامزدگی کو ہمیشہ کے لیے قانون نہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کی خلافت کا فیصلہ عوامی رائے

بلکہ اچھے خاصے عوامی بحث و مباحثہ کے بعد ہوا اور اس طرح امت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے حکمران کا خود انتخاب کرے۔

اس کے ساتھ اگر مسلم شریف کی ایک اور روایت کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تمہارے اچھے حکمران وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم ان سے محبت کرو، اور تمہارے برے حکمران وہ ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم ان سے نفرت کرو"۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ حاکم اور رعیت کے درمیان اعتماد کا رشتہ ضروری ہے، البتہ اس اعتماد کے اظہار کی عملی صورت ہر زمانہ کے حوالہ سے مختلف ہو سکتی ہے۔

اس لیے قرآن پاک اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل کے حوالہ سے اسلامی حکومت کی تین بنیادیں نظر آتی ہیں:

1. حکومت کا قیام عوام کی مرضی سے ہو گا۔
2. خلیفہ کو استبدادی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے بلکہ وہ قرآن و سنت کے احکام کا پابند ہو گا۔
3. قرآن و سنت کے صریح احکام کے مقابلہ میں عوامی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا۔

اس کے ساتھ اگر حضرت ابوبکرؓ کے پہلے خطبہ کا یہ جملہ شامل کر لیا جائے کہ "اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو" تو اس سے ایک اور اصول بھی اخذ ہوتا ہے کہ:

4. حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہے، اور عوام کو حکومت کے احتساب کا حق حاصل ہے۔

ان اصولوں کی وضاحت کے بعد اب میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ خلیفہ کے انتخاب کے طریق کار، حکومتی ڈھانچہ اور عوام کے حق احتساب کو عملی شکل دینے کے تمام امور حالات پر چھوڑ دیے گئے ہیں اور اس کے لیے ہر دور میں اس وقت کے حالات اور ضروریات کے مطابق کوئی بھی طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے چودہ سو سالہ تعامل میں مختلف طرز ہائے حکومت کو عوامی اور علمی حلقوں کی طرف سے جواز کا درجہ اور سند حاصل ہوتی رہی ہے۔

اس کے بعد میں آج کے جدید سیاسی نظام کی طرف آتا ہوں جس کی بنیاد چار اہم اصولوں پر ہے:

1. مذہب اور ریاست کی علیحدگی،
2. عوامی رائے کی بنیاد پر حکومت کی تشکیل،
3. پارلیمنٹ کی مطلق خود مختاری،
4. انسانی حقوق کی پاسداری۔

جہاں تک مذہب اور سیاست میں علیحدگی کی بات ہے، اسلام اس کو تسلیم نہیں کرتا اور قرآن کریم صراحت کے ساتھ یہ بات کہتا ہے کہ اللہ تعالی کے اتارے ہوئے فرامین کو بنیاد بنائے بغیر احکام دیے جائیں گے تو وہ گمراہی کا باعث اور جاہلیت کے مترادف ہوں گے۔ البتہ حکومت کے قیام کے لیے عوام کی رائے کا حق اسلام نے تسلیم کیا ہے، بلکہ آج کے جدید سیاسی نظام کے وجود میں آنے سے ایک ہزار سال قبل عوامی رائے کی بنیاد پر حکومت تشکیل دے کر اس کو بطور اصول اختیار کیا ہے۔ پارلیمنٹ کا وجود بھی اسلام کے اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے، کیونکہ جناب نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں نقابہ اور عرافہ کا تصور اور عریف اور نقیب کا منصب اسی عوامی نمائندگی کی علامت تھے، اور وہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک ناگزیر حصہ تصور ہوتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق خود جناب نبی اکرمؐ نے غزوۂ حنین کے بعد قیدیوں کی واپسی کا فیصلہ متعلقہ لوگوں کی مرضی سے کیا تھا اور ان کی مرضی معلوم کرنے کے لیے ان کے نمائندوں کو ذریعہ بنایا تھا جنہیں "عریف" کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی متعدّد روایات کے مطابق جناب نبی اکرم نے عرفاء اور نقباء کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان کی ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ان روایات کو سامنے رکھتے ہوئے آج کے بلدیاتی نظام اور پارلیمنٹری سسٹم کو اس کا متبادل یا اس کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا جا سکتا ہے، البتہ پارلیمنٹ کی مطلق خود مختاری جسے "ساورنٹی" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ محل نظر ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام میں پارلیمنٹ قرآن و سنت کی حدود میں ہی قانون سازی کی مجاز ہوتی ہے، چنانچہ اسے قرآن و سنت کے کسی صریح حکم کو منسوخ یا تبدیل کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، اور اس کی خود مختاری مطلقاً نہیں بلکہ اللہ تعالی اور رسول اکرمؐ کی ہدایات کے دائرے میں تسلیم کی جائے گی۔

اسی طرح انسانی حقوق کی پاسداری کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے، اس لیے کہ اسلام صرف انسانی حقوق کی بات نہیں کرتا بلکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پاسداری کا ایک مربوط نظام پیش کرتا ہے، اور انسانوں کے باہمی حقوق کی عملداری اور نگرانی کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کی ادائیگی کے اہتمام کو بھی ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۱ میں اللہ تعالی نے مسلمان حکمرانوں کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب ہم انہیں اقتدار عطا کرتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں، امر بالمعروف کرتے ہیں اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ کے ضمن میں تفسیر ابن کثیر میں امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ایک خطبہ کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ ہم حقوق اللہ کے بارے میں بھی تم سے مواخذہ کریں گے اور تمہارے باہمی حقوق کے حوالے سے بھی مواخذہ کریں گے۔ اس لیے ایک مسلم ریاست میں جب حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کا اہتمام اور نگرانی حکومت کی ذمہ داری قرار پائے گی تو انسانی حقوق کے موجودہ فلسفہ و نظام پر، جس کی بنیاد اقوام متحدہ کے چارٹر پر ہے، نظر ثانی ناگزیر ہو جائے گی۔ کیونکہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی بنیاد صرف حقوق العباد پر ہے اور اس کے بہت سے قوانین اور ضابطے حقوق اللہ اور وحی الٰہی سے متصادم ہیں۔ اس بنیاد پر اصولی طور پر انسانی حقوق کی پاسداری تو ایک اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے، لیکن ایسا حقوق اللہ کے ساتھ توازن کے ساتھ ہوگا اور حقوق اللہ کو نظر انداز کر کے صرف حقوق العباد کی پاسداری یکطرفہ اور نامکمل بات ہوگی۔

اس پس منظر میں جب ہم اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے جدید سیاسی تقاضوں کو اس کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کے لیے اجتہادی ضروریات کا جائزہ لیتے ہیں اور پاکستان کے علماء کے طرز عمل کو دیکھتے ہیں تو اطمینان ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سے صرف نظر نہیں کیا۔ کیونکہ پاکستان کے قیام کے بعد جب علمائے کرام کے سامنے ایک نئی اسلامی ریاست کی بنیاد طے کرنے کا مرحلہ آیا تو یہ اجتہادی عمل اور اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع تھا۔ علماء کے سامنے خلافت عثمانیہ کا صرف ربع صدی قبل ختم ہونے والا ڈھانچہ بھی تھا اور سعودی عرب میں اس کے متبادل کے طور پر وجود میں آنے والا حکومتی نظام بھی ان کے پیش نظر تھا، لیکن یہ دونوں جدید دور کے سیاسی تقاضوں اور ضروریات کو

پورا کرنے والے نہیں تھے۔ اس لیے علمائے پاکستان نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اسلام کے نام پر قائم ہونی والی اس نئی مملکت میں اللہ تعالی کی حاکمیت اعلی اور قرآن و سنت کی بالادستی کی شرط کے ساتھ عوام کے ووٹوں سے حکومت کے قیام کا اصول اختیار کیا جائے، عوام کے منتخب نمائندوں کے لیے اقتدار کا حق تسلیم کیا جائے، اور یہ بھی حتمی طور پر طے کر لیا کہ تمام تر قانون سازی پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگی۔ یہی وہ اصول ہیں جن کی طرف علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے خطبۂ اجتہاد میں توجہ دلائی تھی، چنانچہ ''قرارداد مقاصد'' کے ساتھ ساتھ تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علمائے کرام کے ۲۲ دستوری نکات اسی اجتہادی پیشرفت کا ثمرہ ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے علمائے کرام نے نظام حکومت کے بارے میں اجتہادی ضروریات کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور علامہ اقبال کے تصور اجتہاد کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

پھر قومی تاریخ کے ایک اور مرحلہ کو بھی اس سلسلے میں سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جب ۱۹۷۳ء کا دستور تشکیل پا رہا تھا، اس وقت دستور ساز اسمبلی میں مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ اور معتمد علماء عوام کے منتخب نمائندوں کی صورت میں موجود تھے جن کی مشاورت و اشتراک کے ساتھ دستور تشکیل پایا۔ اس دستور کی نظریاتی حیثیت کا تعین، حکومتی ڈھانچے کی نوعیت کا فیصلہ، آج کے عالمی نظام اور جدید سیاسی تقاضوں کے ساتھ اس کی ایڈجسٹمنٹ کے راستے تلاش کرنا، اور ان سب کے ساتھ قرآن و سنت کی بالادستی کے اصول کو برقرار رکھنا بہت بڑا اجتہادی عمل تھا۔ جس میں ہمارے علمائے کرام پوری طرح سرخرو ہوئے اور ایک ایسا دستور قوم کو فراہم کیا جس پر ملک کے تمام طبقوں کے ساتھ ساتھ روایتی دینی حلقوں کا بھی اتفاق ہے اور جدید سیاسی نظاموں کے ناگزیر تقاضوں کی بھی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح قادیانیت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بھی ملک کے روایتی دینی حلقوں نے اجتہاد سے کام لیا اور اپنے قدیم روایتی موقف پر اصرار کرنے کی بجائے علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دینے پر اکتفا کر لیا، اس لیے کہ جدید سیاسی نظام کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا تقاضا یہی تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں حکومتی ڈھانچے اور دستوری نظام کی تشکیل اور قادیانیوں کی حیثیت طے کرنے کے بارے میں ملک کے تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر جو فیصلے کیے، وہ اسی رخ پر ہوئے ہیں جن کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا، بلکہ

ہم نے تو افغانستان میں طالبان کی امارت اسلامیہ قائم ہونے کے بعد وہاں بھی اس بات کے لیے کوشش کی ہے کہ کسی طرح وہاں دستوری حکومت کا کوئی راستہ نکل آئے۔ میں خود ایک دور میں قندھار گیا ہوں، امیر المومنین ملا محمد عمر سے ان کے دور اقتدار میں ملاقات کی ہے اور اگرچہ ان سے براہ راست اس مسئلہ پر بات نہیں ہوسکی، لیکن ان کی شوریٰ کے ذمہ دار حضرات سے میں نے بات کی۔ میں اپنے ساتھ قرارداد مقاصد، علماء کے ۲۲ دستوری نکات اور جمعیت علمائے اسلام پاکستان کا ۱۹۷۰ء کا انتخابی منشور لے کر گیا تھا اور میں نے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ علمائے پاکستان کی طرح قرآن و سنت کی بالادستی کی شرط کے ساتھ عوامی نمائندگی اور دستوری حکومت کا اہتمام کریں، کیونکہ آج کے دور میں کسی حکومت کے جواز کو عالمی سطح پر تسلیم کرانے کے لیے یہ ناگزیر تقاضے ہیں۔ اور چونکہ اس کا تعلق اجتہادی امور سے ہے اور حالات کے مطابق ایسے معاملات میں کوئی بھی مناسب فیصلہ کرنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے، اس لیے انہیں اس مشورہ پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی تھی یا حالات کا جبر تھا کہ معاملات کو اس رخ پر لانے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے برعکس ہمارے ایک اور پڑوسی ملک ایران میں جب مذہبی قیادت برسر اقتدار آئی اور ابھی تک برسر اقتدار ہے، اس نے اپنے روایتی موقف کو جدید سیاسی تقاضوں کے سانچے میں ڈھالا، دستوری حکومت اور عوامی نمائندگی کا اہتمام کیا اور باوجودیکہ اہل تشیع کا امامت کا سسٹم اہل سنت کے خلافت کے سسٹم کی بہ نسبت زیادہ سخت اور تھیاکریسی کے زیادہ قریب ہے، انہوں نے اسے بھی ''ولایت فقیہ'' کے عنوان سے دستوری نظام کا حصہ بنا دیا، اس لیے وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

دستور کی حد تک پاکستان میں ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اگر پاکستان اور ایران کے دساتیر کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ایک اسلامی حکومت کے بارے میں اہل سنت کے نقطۂ نظر اور اہل تشیع کے نقطۂ نظر کا فرق جدید دستوری زبان اور آج کی سیاسی اصطلاحات میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ایران میں چونکہ حکومتی طبقات اور حکومتی نظام چلانے والے افراد اس کے مطابق تعلیم و تربیت بھی رکھتے ہیں، اس لیے انہیں اس کے مطابق ملک کا نظام چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آرہی، مگر ہمارے ہاں مقتدر طبقات اور اسٹیبلشمنٹ پاکستان اور اس کے دستور کی نظریاتی بنیاد کے حوالے سے ابھی تک تذبذب اور گومگو کا شکار ہیں، بلکہ عوامی دباؤ کے تحت قبول کیے جانے والے اس دستور اور اس کی اسلامی دفعات

سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، اس لیے پاکستان کا دستور اور اس کی اسلامی دفعات قومی زندگی میں عملی پیشرفت کے مواقع سے ابھی تک محروم ہیں۔

گفتگو کے اختتام سے قبل میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ جہاں تک جدید سیاسی نظام کے ناگزیر تقاضوں اور آج کے ورلڈ سسٹم کے تناظر کو سمجھنے اور اس سے ممکنہ طور پر ہم آہنگ ہونے کا تعلق ہے، اس کی اہمیت وضرورت سے نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی باشعور اہل علم نے کبھی اس سے گریز کیا ہے، لیکن اس کا مطلب اسلام کے اصولوں سے دستبرداری اور قرآن وسنت کی حدود سے تجاوز نہیں ہے۔ اس لیے اجتہاد کا جو تقاضا ہماری ملی اور قومی ضروریات سے تعلق رکھتا ہے اور قرآن وسنت کے اصولوں کی روشنی میں اس میں اجتہاد کی گنجائش پائی جاتی ہے، اس کے لیے ضرور کام ہونا چاہیے اور احکام وقوانین کے حوالے سے اس کا وسیع دائرہ موجود ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں روایتی دینی حلقوں اور مراکز کی سست روی کا احساس ہے اور میں انہیں ان تقاضوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے گزشتہ ربع صدی سے بساط بھر کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن اجتہاد کے نام پر مغرب کی پیروی اور اس کے فلسفہ وفکر کو قبول کرنے سے ہمیں قطعی طور پر انکار ہے، اس لیے کہ سیاسی نظام کے حوالے سے ان کی آخری منزل بہرحال ریاست اور مذہب کی علیحدگی ہے جس کے لیے مغرب ہم پر مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے، مگر ہمارے لیے وہ کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہے اور اقبالؒ نے بھی یہ کہہ کر ہمیں اسی بات کی تلقین کی ہے کہ:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

قرآن کریم اور حضرت عمرؓ کا ذوق

(جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میری مادر علمی ہے اور تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کی جولانگاہ بھی ہے۔ اس کا قیام ۱۹۵۲ء میں عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم اور ان کے رفقاء کی مساعی سے عمل میں آیا تھا، اور اپنے برادر گرامی مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے ساتھ مل کر انہوں نے کم وبیش نصف صدی تک اس گلشن علم کی آبیاری کی ہے۔ گزشتہ پانچ چھ برس سے دونوں بھائی معذور اور صاحب فراش ہیں اور

ان کے حکم اور ہدایت پر ان کی جگہ یہ خدمت سرانجام دینے کی ہم ناکارہ لوگ کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالی ان بزرگوں کا سایہ صحت وعافیت کے ساتھ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھیں اور ہمیں ان کا یہ عظیم دینی سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

جامعہ نصرۃ العلوم میں ایک عرصہ سے بنات کی تعلیم کو باضابطہ کرنے کی خواہش تھی اور اس کے لیے کوشش بھی ہو رہی تھی مگر بعض رکاوٹوں کے باعث تاخیر ہوتی رہی۔ اب مدرسہ کے عقب میں دو تین مکان خرید کر جامعہ نصرۃ العلوم للبنات کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے جس میں کم وبیش ایک کروڑ روپے کی لاگت کا اندازہ بتایا جاتا ہے۔ احباب سے التماس ہے کہ وہ اس سلسلے میں تعاون کے ساتھ ساتھ اس کی تکمیل اور آبادی کے لیے خصوصی دعاؤں کا بھی اہتمام کریں۔ گزشتہ روز رمضان المبارک کی ۲۹ویں شب کے موقع پر مدرسہ نصرۃ العلوم کی جامع مسجد نور میں تراویح کے دوران قرآن کریم مکمل ہونے پر حسب معمول احباب کے سامنے کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس سال تراویح میں قرآن کریم مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم کے سب سے چھوٹے فرزند مولانا حافظ محمد عرباض خان سواتی سلمہ (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم) نے سنایا اور ختم قرآن کریم کی تقریب سے مدرسہ کے مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی اور ناظم اعلی مولانا محمد ریاض خان سواتی کے علاوہ حسب سابق راقم الحروف نے بھی کچھ گزارشات پیش کیں جن کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے، اس ماہ میں قرآن کریم نازل ہوا اور اسی میں قرآن کریم کی سب سے زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔ اللہ تعالی اس مہینہ میں قرآن کریم کی تلاوت و سماع اور دیگر اعمال خیر کی توفیق زیادہ دیتے ہیں، مواقع زیادہ مہیا فرماتے ہیں اور اجر و ثواب بھی کئی گنا زیادہ دیتے ہیں۔ تراویح میں قرآن کریم سنانے اور اور سننے کی اس سعادت پر برادر عزیز مولانا محمد عرباض خان سواتی سلمہ اور جامع مسجد نور کے نمازیوں کو مبارکباد دیتے ہوئے اس مناسبت سے قرآن کریم کے حوالے سے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا ایک مکتوب گرامی آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے بصرہ کے عامل حضرت ابو موسی اشعریؓ کو لکھا تھا جس سے قرآن کریم

کے بارے میں حضرت عمرؓ کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور رہنمائی اور سبق حاصل ہوتا ہے۔

حضرت امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں قرآن کریم کے بارے میں حضرت عمرؓ کے ذوق کی دو باتوں کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے:

1. ایک یہ کہ ”کان وقافا عند کتاب اللہ“ قرآن کریم کا حوالہ سامنے آنے پر وہ رک جایا کرتے تھے، یعنی قرآن کریم کا کوئی حکم سامنے آتا تو تھوڑی دیر رک کر اور توقف کر کے اس بات کا جائزہ لیتے تھے کہ قرآن کریم کا حکم کیا ہے اور اس کے بارے میں میرا عمل اور رویہ کیا ہے؟

2. جبکہ دوسری بات امام بخاریؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ میں قرآن کریم کا علم رکھنے والوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، خواہ وہ بزرگ ہوں یا نوجوان۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ان کی مشاورت کے حلقہ میں بڑے بڑے بزرگوں کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حر بن قیسؓ جیسے نوجوان صحابہ بھی شامل تھے اور انہیں مشاورت میں بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

طبقات ابن سعدؒ میں روایت ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں اسلامی سلطنت کے صوبائی عمال کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے صوبوں میں قرآن کریم کے حافظوں کی فہرست مرتب کر کے انہیں بھجوائیں تاکہ وہ ان کا بیت المال سے وظیفہ جاری کریں اور مختلف علاقوں میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے ان کا تقرر کریں۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کریم حفظ مکمل کرنے والے ہر شخص کے لیے اڑھائی ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ درہم چاندی کا سکہ تھا جس کا وزن ساڑھے تین ماشے بتایا جاتا ہے، اگر بازار میں چاندی کی قیمت تین سو روپے فی تولہ ہو تو آج کی کرنسی میں اس درہم کی قیمت پچھتر یا اسی روپے بنتی ہے جو امریکی ڈالر سے زیادہ ہے اور یورپی یونین کے یورو کے لگ بھگ ہے، سرسری اندازے میں پاکستانی کرنسی کے حساب سے یہ وظیفہ کم و بیش دو لاکھ روپے سالانہ بنتا ہے۔

یہ عالم اسلام میں حفاظ قرآن کریم کی تعداد کے بارے میں پہلا سروے تھا جس میں حافظوں کا شمار کیا گیا اور ان کی فہرستیں مرتب کی گئیں جبکہ مجھے امریکہ کے حالیہ کے سفر کے

دوران مکی مسجد بروکلین نیویارک میں خطاب کے موقع پر اسلامک سوسائٹی نارتھ آف امریکہ (ISNA) کی ویب سائٹ کے حوالے سے بتایا گیا کہ تازہ ترین سروے کے مطابق دنیا میں اس وقت قرآن کریم کے حفاظ کی تعداد تیرہ ملین یعنی ایک کروڑ تیس لاکھ کے لگ بھگ ہے، جو بلاشبہ آج کے دور میں جو ہم مسلمانوں کے زوال اور ادبار کا دور ہے، قرآن کریم کے اعجاز کا کھلا اظہار ہے۔ یہ اللہ تعالی کی قدرت اور بے نیازی ہے کہ ہم مسلمانوں کا حال دن بدن پتلا ہوتا جارہا ہے اور ہمارا ہر آنے والا دن گزرنے والے دن سے بدتر ہوتا ہے لیکن اس دور میں قرآن کریم کا دائرہ دن بدن پھیلتا جارہا ہے جو قرآن کریم کی حقانیت اور اعجاز کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ کے مکتوب گرامی کے جواب میں بصرہ کے عامل حضرت ابو موسی اشعریؓ نے انہیں بصرہ کے حفاظ کی فہرست بھجوائی جو تین سو حفاظ پر مشتمل تھی، اور حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسی اشعریؓ اور بصرہ کے حافظ قرآن مسلمانوں کے نام ایک مکتوب ارسال فرمایا جو دوسری بہت سی کتابوں کے علاوہ کنزالاعمال (ج ۱، ص ۲۱۷) میں بھی مذکور ہے اور اس کا ترجمہ و مفہوم یہ ہے:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللہ کے بندے عمر بن الخطابؓ کی طرف سے عبداللہ بن قیسؓ (ابو موسی اشعری) اور حفاظ قرآن کے نام۔

السلام علیکم۔

- واضح ہو کہ یہ قرآن کریم تمہارے لیے باعث اجر و ثواب ہونے والا ہے لہذا اس کی تعلیم پر عمل کرو اور اسے اپنے مقاصد کا آلۂ کار نہ بناؤ۔
- جو قرآن کریم کو اپنا قائد و متبوع بنائے گا قرآن کریم اسے جنت کی سیر کرائے گا۔
- قرآن کریم کو خدا کے حضور تمہارا سفارشی ہونا چاہئے نہ کہ تمہارے خلاف شکایت کرنے والا، کیونکہ قرآن جس کا سفارشی ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جس کے خلاف شکایت کرے گا وہ دوزخ میں جلے گا۔
- جب خدا کا بندہ رات میں اٹھتا ہے اور مسواک کر کے وضو کرتا ہے، پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھتا ہے تو فرشتہ اس کا منہ چومتا ہے اور کہتا ہے کہ پڑھو پڑھو، تم پاک و صاف ہو گئے، قرآن کریم پڑھ کر تمہیں لطف آئے

گا۔

- قرآن کریم ہدایت کا سرچشمہ، علم کا پھول اور رحمن کا تازہ کلام ہے۔
- اگر رات میں اٹھنے والا بغیر مسواک کے وضو کرتا ہے تو فرشتہ اس کی نگرانی تو کرتا ہے لیکن منہ نہیں چومتا۔
- نماز میں قرآن پڑھنا ایسا ہے جیسے کسی کو چھپا ہوا خزانہ مل جائے اور مخفی دولت حاصل ہو جائے۔
- قرآن کریم پڑھا کرو، نماز نور ہے، زکوۃ برہان ہے، صبر روشنی ہے، روزہ ڈھال ہے اور قرآن تمہارے بارے میں ایک دلیل ہے۔
- قرآن کریم کا احترام کرو اور اس سے بے اعتنائی نہ برتو کیونکہ خدا اس کی عزت کرتا ہے جو قرآن کریم کی عزت کرتا ہے اور اس کو بے آبرو کر دیتا ہے جو قرآن کریم کی بے حرمتی کرتا ہے۔
- جو شخص قرآن کریم پڑھے، اس کو یاد کرے اور پھر اس کے مطابق عمل کرے، اللہ تعالی اس کی دعا قبول کرتا ہے، دعا کرنے والا چاہے تو خدا دنیا میں اس کی دعا کو پورا کر دیتا ہے ورنہ اس کی مانگی ہوئی چیز آخرت کے لیے جمع ہو جاتی ہے۔
- یاد رکھو خدا کا انعام بہترین اور ہمیشہ رہنے والا ہے اور یہ ان لوگوں کو نصیب ہو گا جو صاحب ایمان ہیں اور اپنے مالک پر بھروسہ کرتے ہیں۔“

یہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے مکتوب گرامی کا خلاصہ ہے جس میں انہوں نے قرآن کریم کے حقوق کی طرف توجہ دلائی ہے اور ہمیں اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی تلقین کی ہے، اللہ تعالی ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

اس کے ساتھ ہی اپنے حالیہ سفر امریکہ کے حوالے سے اور ایک بات کی آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ رمضان المبارک سے چند روز قبل نیویارک اسٹیٹ پولیس کے دو بڑے افسروں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا، اور جب ان سے ایک پریس کانفرنس میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے اور اسے نسل انسانی کی رہنمائی کے لیے سب سے بہتر کتاب پایا ہے اور اس سے متاثر ہو کر وہ اسلام کے دائرہ

میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ خبر جب میں نے پڑھی تو ذہن میں ایک سوال ابھرا جسے آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ان دو پولیس افسروں نے قرآن کریم کو ایک رہنما کتاب کے طور پر پڑھا اور انہیں رہنمائی مل گئی، مگر ہم ابھی تک قرآن کریم کو تبرک اور تعوذ کی کتاب سمجھے ہوئے ہیں کہ اس کے پڑھنے سے اجر و ثواب کے ساتھ ساتھ کاروبار میں برکت حاصل ہوگی اور گھر کے ماحول سے شیطانی اثرات دور ہوں گے۔ مجھے ان تینوں میں سے کسی بات سے بھی انکار نہیں ہے لیکن قرآن کریم کا اصل عنوان ''ھدی للناس'' اور ''ھدی للمتقین'' ہے جس کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے، میرا ایمان ہے کہ جس دن ہم مسلمانوں نے بحیثیت امت قرآن کریم کو ہدایت اور رہنمائی کے لیے رہنما کتاب کے طور پر پڑھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تو ہمارے سارے راستے سیدھے ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

سیدنا حضرت عیسٰی علیہ السلام اور قرآنی تعلیمات

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

جدہ سے شائع ہونے والے روزنامہ اردو نیوز نے ۲۰ اگست ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں خبر دی ہے کہ برطانیہ کا ایک ٹی وی چینل آئی ٹی وی سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایک خصوصی پروگرام پیش کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کو قرآن کریم کی نظر سے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس دستاویزی فلم کی بنیادی بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نہ تو مسیحا تھے اور نہ ہی انہیں مصلوب کیا گیا۔ فلم کا اسکرپٹ لارڈ براگ نے لکھا ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ یہ جان کر سخت حیرت اور شاک کے عالم میں پڑ گئے ہیں کہ اسلام میں حضرت عیسیٰؑ کا مقام اتنا ارفع اور اعلیٰ ہے مگر بہت سے لوگ اس کے بارے میں نہیں جانتے، انہوں نے کہا کہ ذاتی طور پر وہ عیسائیوں کے اینجلک فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑی تحقیق کے بعد انہوں نے یہ اسکرپٹ تیار کیا ہے جو یقینی طور پر کافی فکر انگیز ہوگا۔

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم نے جو کچھ فرمایا ہے اور مسلمانوں کا ان کے بارے میں جو عقیدہ ہے وہ چونکہ حقیقت اور فطرت پر مبنی ہے، اس لیے وہ ہر دور میں عقل سلیم رکھنے والوں کے لیے دلچسپی اور کشش کا باعث رہا ہے اور آج

بھی اگر اسے صحیح انداز میں پیش کیا جائے تو تعصب اور ضد سے بالاتر ہو کر سوچنے والے مسیحیوں کے ذہنوں اور دلوں کو اپیل کرتا ہے۔ خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا یہ واقعہ تاریخ کا حصہ ہے کہ جب مکی دور میں بہت سے صحابہ کرامؓ، جن میں حضرت عثمانؓ اور حضرت جعفر طیارؓ بھی شامل تھے، اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آکر ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تو مکہ والوں نے حبشہ کے عیسائی بادشاہ اصحمہ نجاشیؒ کے پاس وفد بھیجا تاکہ وہ مہاجروں کو مکہ مکرمہ واپس جانے پر مجبور کر دے۔ اس وفد نے پہلے تو یہ موقف اختیار کیا کہ یہ ہمارے بھاگے ہوئے غلام ہیں اس لیے انہیں واپس کیا جائے، مگر انصاف پسند بادشاہ نے تحقیق کے بعد اس خلاف حقیقت بات کو قبول نہ کیا تو قریش کے وفد نے چال کے طور پر حبشہ کے مسیحی بادشاہ سے کہا کہ یہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں توہین آمیز خیالات رکھتے ہیں۔ جس پر بادشاہ کے دربار میں مسلمانوں سے وضاحت طلب کی گئی تو حضرت جعفر ابن ابی طالبؓ نے مسیحی حکمران کے دربار میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں قرآنی آیات پڑھ کر سنائیں اور اللہ تعالیٰ کے آخری کلام میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے حبشہ کے بادشاہ اور اس کے درباریوں کو آگاہ کیا۔ اس پر مسیحی حکمران کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے اعتراف کیا کہ حضرت عیسیٰؑ وہی کچھ ہیں جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اور اس کے بعد شاہ حبشہ اصحمہ نجاشیؒ نے اسلام بھی قبول کر لیا۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے جس کا ہر دور میں اظہار ہوتا رہا ہے اور آج بھی اس کا تسلسل جاری ہے، والفضل ما شھدت بہ الأعداء۔

تجارت اور سیرت نبویؐ

(دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۸ ستمبر ۲۰۰۷ء)

تجارت وہ ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی معاشرے کا نظام نہیں چل سکتا، اللہ تعالیٰ نے تجارت کو انسانوں کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق زراعت، تجارت، ملازمت، اور مال غنیمت کمائی کے وہ حلال اور جائز طریقے ہیں جن کے ذریعے انسان اپنی ضروریات زندگی مہیا کر سکتا ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے تجارت کو کمائی کے بہترین ذرائع میں ارشاد فرمایا ہے، بہت سی روایات ہیں جن میں نبی کریمؐ نے تجارت کی فضیلت و اہمیت ذکر فرمائی ہے،

درجات بیان فرمائے ہیں اور تجارت کے متعلق احکامات ارشاد فرمائے ہیں۔ احادیث میں کتاب البیوع کے عنوان سے مستقل کتابیں ہیں اور تجارت و کاروبار کے حوالے سے جناب رسول اللہؐ کی تعلیمات واضح ہیں۔

جناب نبی کریمؐ نے خود بھی نبوت سے پہلے تجارت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور اس پر بہت سی روایات ہیں کہ آپؐ لین دین کیسے کرتے تھے اور کاروباری معاملات کیسے طے فرماتے تھے۔ جناب رسول اللہؐ کی بعثت سے پہلے ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضورؐ کی شادی کا سبب بھی تجارت ہی تھا۔ حضرت خدیجہؓ قریش کی ایک باعزت تاجر خاتون تھیں اور ان کا تجارتی قافلہ شام کے علاقے میں جایا کرتا تھا۔ وہ خود تو تجارت کے لیے نہیں جاتی تھیں لیکن ان کے نمائندے اور کارندے جاتے تھے۔ تجارت کے سارے عمل کا انحصار صرف نمائندوں پر ہو تو معاملہ اتنا قابل بھروسہ نہیں رہتا اس لیے حضرت خدیجہؓ کو تلاش ہوتی تھی کہ کوئی دیانت دار اور قابل اعتماد آدمی ان کی تجارت کو سنبھالے۔ جناب نبی کریمؐ کے بارے میں مکہ مکرمہ میں یہ مشہور تھا کہ آپ امین ہیں، صادق ہیں، سچے ہیں، دیانت دار ہیں، بااخلاق اور قابل اعتماد ہیں۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جو کچھ انہوں نے حضورؐ کے متعلق سن رکھا ہے یہ کہاں تک ٹھیک ہے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو پیغام بھیجا اور پیشکش کی کہ آپ ایک سال میرے تجارتی قافلے کی سربراہی کریں۔ اس پر حضورؐ حضرت خدیجہؓ کا تجارتی قافلہ لے کر شام گئے اور پھر واپس آئے، یہ تجارتی سفر حضرت خدیجہؓ کے حضورؐ پر اعتماد کا باعث بنا اور پھر حضورؐ کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کے رشتے کا سبب بھی بنا، یوں آنحضرتؐ کی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ یہ شادی اتنی بابرکت ثابت ہوئی کہ حضورؐ کی بعثت اور نبوت کے اعلان کے بعد حضرت خدیجہؓ کا سارا مال حضورؐ پر ہی خرچ ہوا۔

سچے اور دیانت دار تاجر کا رتبہ

جناب رسول اللہؐ نے تجارت کے حوالے سے مختلف مسائل بیان فرمائے اور آداب بھی۔ اس بارے میں آپؐ کی ایک جامع حدیث روایت ہوئی ہے ”التجار الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین“ کہ سچا اور دیانت دار تاجر (جنت میں) نبیوں، صدیقین، شہداء اور صالح لوگوں کے ساتھ ہو گا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اس ارشاد میں حضورؐ نے دونوں باتوں کا احاطہ کیا ہے۔ پہلی یہ کہ گفتگو میں سچا ہو، دوسرا یہ کہ مال کے

معاملے میں دیانت دار ہو۔ یعنی بات طے کرتے وقت جھوٹ نہ بولتا ہو اور فروخت کے وقت مال میں گڑبڑ نہ کرتا ہو۔ یہی دو باتیں تجارت کی بنیاد ہیں کہ بات سچی ہونی چاہیے اور مال خالص ہونا چاہیے، لیکن بطور تاجر ان دونوں باتوں پر عمل آسان کام نہیں ہے۔ ایک تاجر کے لیے اس رتبے کا حصول ناممکن تو نہیں ہے لیکن مشکل ضرور ہے۔ گفتگو میں سچائی کے متعلق جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ وہ آدمی جو قسم اٹھا کر مال بیچتا ہے اس کا مال تو بک جاتا ہے لیکن اس میں برکت نہیں رہتی، یعنی ایسا آدمی جو قسمیں اٹھا کر اپنے مال کے متعلق لوگوں کو یقین دلاتا ہے۔

اسی طرح نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی ہیں جن پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ ایک ''المنان'' وہ آدمی جو کسی کے ساتھ احسان کر کے جتلائے یعنی کسی کی مشکل میں کام آیا اور اس کے ساتھ نیکی کی لیکن بعد میں کسی موقع پر جتلا بھی دیا کہ میں نے فلاں وقت تمہارے ساتھ یہ نیکی کی تھی۔ قرآن کریم میں ہے کہ جتلانے کے ساتھ نیکی برباد ہو جاتی ہے۔ فرمایا ایسا شخص جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ دوسرے آدمی کے متعلق فرمایا ''مدمن الخمر شراب'' پر دوام کرنے والا، یعنی شراب کا عادی شخص جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ تیسرے آدمی کے متعلق فرمایا ''المنفق سلعتہ بالحلف الکاذب'' جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچنے والا۔ یعنی ایسا شخص بھی جنگ کی خوشبو نہیں سونگھ پائے گا جو جھوٹی قسم کے ذریعے اپنے گاہکوں کو اعتماد دلا کر خراب مال بیچتا ہو۔

تجارت کے اصول وضوابط

جناب رسول اللہؐ نے تجارت کی ہر ایسی قسم کی مذمت فرمائی ہے جس میں دھوکہ اور فریب ہو، جس میں جھوٹ اور بددیانتی ہو، یا جس میں عام لوگوں کو پریشانی اور نقصان ہو۔ حضورؐ نے ایسی صورتوں کو ''غش'' یعنی دھوکے سے تعبیر کیا اور انہیں ممنوع قرار دیا۔

دھوکے سے خراب مال بیچنا

ایک روایت میں آتا ہے کہ جناب نبی کریمؐ ایک مرتبہ بازار میں تشریف لے جا رہے تھے دیکھا کہ ایک صاحب غلہ بیچ رہے تھے، گندم یا جو کا ڈھیر تھا۔ حضورؐ گزرتے ہوئے اس کے پاس رکے اور معائنے کی غرض سے غلے کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ وہ غلہ اوپر سے خشک تھا لیکن اندر سے گیلا تھا۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ بیچنے والے نے کہا یا رسول اللہ بارش ہو گئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا کیا بارش غلے کے اندر ہو گئی تھی؟ اس موقع پر

آپؐ نے فرمایا ''من غشنا فلیس منا'' جس نے ہمیں تجارت میں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ خراب مال چھپا کر صحیح مال کے ساتھ بیچنا بھی دھوکے کی ایک قسم ہے۔ تو جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تاجر جنت میں نبیوں کا ساتھی ہوگا لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ گفتگو میں سچا ہو اور مال میں دیانت دار ہو۔

جھوٹی بولی دینا

ایک روایت میں نبی کریمؐ نے فرمایا ''لا تناجشوا'' کہ نجش مت کرو۔ نجش یہ ہے کہ خریدنے کے ارادے کے بغیر صرف مال کی قیمت بڑھانے کے لیے بولی دینا۔ مثلاً کسی چیز کی نیلامی ہو رہی ہے جس کے لیے لوگ اپنی اپنی بولی دے رہے ہیں، ان میں سے ایک آدمی خریدنا تو نہیں چاہتا لیکن صرف بھاؤ میں گڑبڑ کرنے کے لیے بولی دے رہا ہے۔ آپؐ نے اسے حرام اور جھوٹ قرار دیا۔

تجارتی مال پر اجارہ داری

جناب رسول اللہؐ نے ''تلقی'' سے منع فرمایا۔ اس زمانے کے عرف میں جو تجارت کے اندر خرابی کی باتیں ہوتی تھیں حضورؐ نے ان کی نشاندہی کی۔ تلقی کیا ہے؟ اس دور میں بھی تجارت کی منڈیاں لگتی تھیں جس میں باہر سے قافلے آتے تھے اور سامان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ آج کا زمانہ تو ترقی یافتہ ہے، سڑکیں ہیں، ریل گاڑیاں اور جہاز ہیں جن کی وجہ سے سامان کی آمد و رفت اور خرید و فروخت بہت جلد ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں منڈیاں تو ایسے ہی لگتی تھیں لیکن آمد و رفت کا سلسلہ بہت سست رفتار ہوتا تھا، مہینوں بعد دور دراز سے قافلے آتے تھے جن سے مقامی خریدار سامان خرید لیتے تھے، اس کے بعد پھر اگلے قافلے کا انتظار ہوتا تھا۔ اسی طرح مقامی لوگ بھی تجارتی قافلے لے کر دوسرے علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ سال میں چند قافلے آتے تھے جن پر سارے سال کے گزر اوقات کا دارومدار ہوتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ جب بیرونی قافلے آتے تو مقامی علاقے کے بڑے تاجر قافلے کے پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں جا کر انہیں روک لیتے تھے اور ان سے سارا سامان خرید کر انہیں رخصت کر دیتے تھے۔ یعنی انہیں شہر میں داخل ہونے ہی نہیں دیتے تھے اور چند میل کے فاصلے پر جا کر قافلے والوں سے سارا سامان خرید لیتے تھے اور انہیں واپس بھیج دیتے تھے۔ اب یہ سارا سامان چند بڑے تاجروں کے پاس ہوتا تھا جسے وہ اپنی مرضی کے وقت پر اور اپنی مرضی کی قیمت پر بیچتے تھے۔ اس زمانے میں یہ صورت مقامی لوگوں کے

لیے سخت نقصان دہ ہوتی تھی۔ ”نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تلقی الرکبان“ جناب رسول اللہؐ نے تاجروں کو اس طرح منڈی میں پہنچنے سے پہلے قافلوں سے سامان خریدنے سے منع فرما دیا۔ یعنی آپؐ نے فرمایا کہ مال کو منڈی میں آنے دو، منڈی میں مقابلے پر جو ریٹ لگے گا اس کے مطابق لوگ اسے خریدیں گے۔ ایک آدمی یا چند آدمیوں کا سارے سامان پر اجارہ داری بنا لینا اور پھر اسے اپنی مرضی کے بھاؤ پر بیچنا عام خریداروں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس لیے کہ جب منڈی میں مال آتا ہے تو زیادہ خریدار ہوتے ہیں اور مال کا بھاؤ کھلے ماحول میں طے ہوتا ہے۔

جمعہ کے اوقات میں تجارت

جناب رسول اکرمؐ ایک دفعہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک کسی نے باہر سے آکر آواز لگائی کہ تجارت کا قافلہ آگیا ہے۔ اب ہر ایک کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر دیر ہوگئی تو قافلے کا سارا سامان شام تک بک جائے گا اور میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا، پھر اگلے قافلے کا انتظار کرنا پڑے گا جو کہ ایک صبر آزما کام ہوگا۔ لوگوں کو یہ خدشہ تھا کہ یہ قافلہ اگر نکل گیا تو اگلا قافلہ دو چار مہینے کے بعد آئے گا اور یوں انہیں مقامی لوگوں سے مال خریدنا پڑے گا جو مہنگا دیں گے، یا معلوم نہیں مال کی مطلوبہ مقدار بھی ان سے ملتی ہے یا نہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنا مفاد دیکھتا ہے۔ چنانچہ ایک ایک کر کے لوگ اٹھنا شروع ہوگئے، روایت میں آتا ہے کہ مجمع میں گیارہ آدمی رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کے بارے میں تنبیہ فرمائی ”واذا راو تجارتا او لھون انفضوا الیھا وترکوک قائما قل ما عند اللہ خیر من اللھو ومن التجارۃ واللہ خیر الرازقین“ (سورۃ الجمعۃ ۱۱) اور جب لوگ تجارت یا تماشہ دیکھتے ہیں تو اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، کہہ دو جو اللہ کے پاس ہے وہ تماشے اور تجارت سے کہیں بہتر ہے اور اللہ بہتر روزی دینے والا ہے۔ فرمایا، پہلے اطمینان سے نماز پڑھو اور پھر نماز کے بعد تجارت کرو۔ ویسے بھی جمعہ کی اذان سے لے کر نماز کے اختتام تک تجارت کے لیے ممنوع وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”یا ایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون“ (سورۃ الجمعۃ: ۹) اے ایمان والو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو ذکر الٰہی (خطبہ و نماز) کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، تمہارے لیے یہی بات بہتر ہے اگر تم سمجھو۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ ذہن میں آگیا کہ حضرت امام مالکؒ کے ایک شاگرد تھے امام یحیی بن یحیی اندلسیؒ جن کی روایت سے موطا امام مالک ہمارے ہاں پڑھائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت امام مالکؒ پڑھا رہے تھے اور سینکڑوں شاگرد سامنے بیٹھے ہوئے تھے، ان میں یحیی بن یحیی بھی تھے جو اندلس سے پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کسی نے آواز لگادی کہ مدینہ میں ہاتھی آگیا ہے۔ ہاتھی عرب کا جانور نہیں ہے اور انجانی چیز دیکھنے کا ہر آدمی کو شوق ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا، شاگرد وہاں سے کھسکنا شروع ہو گئے کہ جا کر دیکھتے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے، امام صاحبؒ تو یہیں ہوتے ہیں پھر پڑھ لیں گے لیکن ہاتھی پتہ نہیں شام تک رہتا ہے یا نہیں۔ تھوڑی دیر میں سارا مجمع غائب تھا اور صرف یحیی بن یحیی بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت امام مالکؒ نے پوچھا کہ یہ کیا ہوا؟ انہیں بتایا گیا کہ سب لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے ہیں۔ یحیی سے پوچھا کہ بھئی تم کیوں نہیں گئے؟ انہوں نے کہا استاد محترم! میں اندلس سے ہاتھی دیکھنے نہیں آیا آپ سے حدیث پڑھنے کے لیے آیا ہوں۔ میں اتنی دور سے سفر کر کے آپ سے علم حاصل کرنے آیا ہوں جنہیں ہاتھی دیکھنا ہے جا کر دیکھیں۔ امام مالکؒ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں ہوگی لیکن اللہ تعالی نے یحیی بن یحیی کو یہ اعزاز بخشا کہ آج ہمارے ہاں جو موطا امام مالک پڑھی جاتی ہے وہ اسی شاگرد کی روایت کی ہوئی ہے، یہ اللہ تعالی کی طرف سے ان کے لیے صلہ تھا۔

ذخیرہ اندوزی

اسی طرح ذخیرہ اندوزی سے جناب نبی کریمؐ نے منع فرمایا۔ اس زمانے میں بھی یہ ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے کہ بڑے تاجر بہت زیادہ مال خرید کر ذخیرہ کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے منڈی میں مال کی کمی واقع ہوتی ہے اور اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ پھر حسب موقع یہ تاجر اس ذخیرہ کیے ہوئے مال کو مہنگے داموں بیچتے ہیں۔ فقہاء نے اس کی درجہ بندی کی ہے کہ اگر کسی چیز کے ذخیرہ کرنے سے مارکیٹ میں عام لوگوں کو نقصان ہوتا ہو کہ لوگوں کو مال ہی میسر نہیں آتا یا عام بھاؤ سے زیادہ قیمت میں خریدنا پڑتا ہے تو ایسا ذخیرہ کرنا حرام ہے۔ مثلاً کسی تاجر نے ضرورت کی کوئی چیز خرید کر ذخیرہ کر لی جس کی وجہ سے منڈی سے وہ چیز عدم دستیاب ہوگئی تو ایسا کرنا تاجر کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر تاجر کے بہت زیادہ مال خرید کر ذخیرہ کرنے سے منڈی میں مال کی سپلائی میں فرق نہیں پڑا اور لوگوں کو دوسرے ذرائع سے وہ چیز میسر ہے، لیکن تاجر کی نیت یہ ہے کہ جب مال کی قیمت بڑھے گی تو میں اپنا مال منڈی

میں لاؤں گا تو ایسا کرنا کراہت کے درجے میں ہوگا۔ اگر تاجر کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے منڈی میں مال کی سپلائی بند ہو جاتی ہے یا مال مہنگا ہو جاتا ہے تو پھر یہ حرام اور کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے۔

سودی کاروبار

تجارت کے حوالے سے ایک بہت اہم مسئلہ سود کا ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں ذکر ہے۔ تجارت کہتے ہیں ایک جنس سے دوسری جنس کے تبادلے کو۔ یعنی ایک چیز میرے پاس ہے اور دوسری چیز آپ کے پاس ہے، ہم اپنی اپنی ضرورت کے مطابق جب ان چیزوں کا آپس میں تبادلہ کریں گے تو اس میں مجھے بھی نفع ہو سکتا ہے اور آپ کو بھی۔ ایک جنس کا دوسری جنس سے تبادلہ تجارت کہلاتا ہے، لیکن ایک جنس کا اسی جنس سے تبادلہ کمی بیشی کی صورت میں سود کہلاتا ہے۔ جاہلیت کے دور میں دونوں باتیں چلتی تھیں۔ تجارت بھی ہوتی تھی کہ گندم کا کھجوروں سے تبادلہ، سونے کا چاندی سے تبادلہ، غلے کا کپڑے سے تبادلہ وغیرہ۔ اس طرح سود بھی چلتا تھا کہ روپے کا روپے سے تبادلہ اور اس میں کمی بیشی وغیرہ۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا اور سختی کے ساتھ اس سے منع فرمادیا۔ قرآن کریم نے جب سود کو حرام قرار دیا تو مشرکین نے اس پر اعتراض کیا ”قالوا انما البیع مثل الربوا“ (سورۃ البقرۃ ۲۷۵) انہوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو سود کے جیسی ہی ہے۔ مشرکین مکہ کا کہنا تھا کہ اس میں اور اس میں کیا فرق ہے، یہ بھی تجارت ہے اور وہ بھی تجارت ہے۔ آج بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ سود بھی تجارت ہی ہے۔ اس دور میں بھی یہی بات کہی گئی کہ ایک جنس کے ساتھ دوسری جنس کے تبادلے میں بھی نفع ہے، اور ایک جنس کے ساتھ اسی جنس کے تبادلے میں بھی نفع ہے۔ لیکن قرآن کریم نے صاف بتایا کہ تجارت اور سود متضاد چیزیں ہیں۔ ”احل اللہ البیع و حرم الربوا“ (سورۃ البقرۃ: ۲۷۵) اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

یعنی قرآن کریم نے اس اعتراض کا ذکر کیا اور پھر وہی بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے جبکہ سود کو حرام قرار دیا ہے۔ آج ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ کسی مجبور کو پیسے دینا اور اس سے اصل رقم سے زائد وصول کرنا قرض کی ایک صورت ہے جس کا تجارت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے جبکہ قرآن کریم نے سود کو تجارت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں جناب نبی کریمؐ کے ساتھ پیش آنے والے دو واقعات کا ذکر کرنا

چاہوں گا۔ مسلم شریف میں بھی اس کا ذکر ہے اور ابو داؤد میں بھی۔ جناب رسول اللہؐ کے گھر کے لین دین کے معاملات کے ذمہ دار حضرت بلالؓ تھے یعنی گھر کے لیے سودا سلف لینا، کھجوریں، آٹا، اور دیگر گھریلو ضروریات کی خرید و فروخت وغیرہ۔ حضرت بلالؓ نے ایک دفعہ کھجوریں خریدیں اور حضورؐ کی خدمت میں لا کر پیش کیں کہ یا رسول اللہؐ میں آپ کے لیے یہ کھجوریں خرید کر لایا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا، یہ اتنی اچھی کھجوریں کہاں سے لے آئے ہو؟ حضرت بلالؓ نے بتایا کہ یا رسول اللہ! وہ آپ کے حصے میں جو خمس کی عام قسم کی کھجوریں آئی تھیں میں نے وہ زیادہ کھجوریں بازار میں دے کر ان کے بدلے میں اچھی قسم کی تھوڑی کھجوریں لے لیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ''عین الربوا'' یہ تو بالکل سود ہے، انہیں واپس کر کے آؤ۔ حضرت بلالؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! پھر اچھی کھجوریں لانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں؟ آپؐ نے فرمایا کہ رقم کے عوض عام قسم کی کھجوریں بیچو اور پھر اس رقم کے عوض اچھی قسم کی کھجوریں خریدو، یعنی درمیان میں تیسری جنس لے آؤ۔

اسی طرح مسلم شریف کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جناب نبی کریمؐ نے خیبر کے علاقہ میں وہاں کی پیداوار سے بیت المال کا حصہ وصول کرنے کے لیے ایک عامل بھیجا جب وہ واپس آیا تو اس کے پاس ساری کھجوریں اچھی قسم کی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو بہت اچھی کھجوریں ہیں۔ پھر پوچھا کیا خیبر میں ساری کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟ عامل نے بتایا کہ یا رسول اللہ نہیں ہر قسم کی کھجوریں ہوتی ہیں۔ حضورؐ نے پوچھا پھر تمہارے پاس یہ سب کھجوریں اچھی قسم کی کیسے آگئیں؟ عامل نے بتایا کہ یا رسول اللہ مجھے موصول تو ہر قسم کی کھجوریں ہوئی تھیں لیکن میں نے وہ سب کھجوریں دے کر ان کے عوض اچھی قسم کی کھجوریں لے لیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ تو تم نے سود کا کاروبار کیا ہے۔ عامل نے پوچھا یا رسول اللہ پھر میں کیا کرتا؟ آپؐ نے فرمایا کہ پیسوں کے عوض وہ کھجوریں بیچتے اور پھر ان پیسوں کے عوض یہ اچھی کھجوریں خریدتے۔

آنحضرتؐ نے جاہلیت کے زمانے میں رائج سود کو، جو کہ بیع کا ایک طریقہ سمجھا جاتا تھا، اسے حرام قرار دے دیا۔ آپؐ نے جوا بھی حرام قرار دیا، لاٹری بھی حرام قرار دی اور سٹہ بھی حرام قرار دے دیا۔ یہ ساری صورتیں وہ ہیں جن میں غیر متوقع اور غیر فطری منافع ملتا ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی نفسیات کی تخریب کا باعث بنتی ہیں۔

اسلام کے اور مروجہ نظام تجارت میں فرق

جناب نبی کریمؐ نے تجارت میں حصہ لیا ہے، تجارت کی تلقین کی ہے، تجارت کے مسائل و احکام بیان کیے ہیں اور تجارت کے متعلق ایک مستقل نظام دیا ہے جس پر اسلام میں تجارت کی بنیاد ہے۔ اسلام کے نظام تجارت میں اور آج کے مروجہ نظام تجارت میں ایک بنیادی فرق ہے جو ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ دنیا کا جو مروجہ سسٹم ہے اس میں جائز اور ناجائز کی بنیاد مارکیٹ کی طلب پر ہے کہ جو چیز مارکیٹ کی ضرورت بن جائے وہ جائز ہو جاتی ہے اور جو چیز مارکیٹ کے لیے فضول ہو جائے وہ ناجائز ہو جاتی ہے۔ یعنی جائز اور ناجائز کا مدار مارکیٹ کی ڈیمانڈ پر ہے۔ سوسائٹی شراب مانگتی ہے تو شراب دے دو، سوسائٹی زنا کے کاروبار کا تقاضا کرتی ہے تو اس کی اجازت دے دو، سوسائٹی جوے کے اڈے مانگتی ہے تو اس کی یہ ڈیمانڈ پوری کر دو، سوسائٹی نشہ آور ادویات مانگتی ہے تو وہ دے دو۔ جیسا کہ آج کل کچھ مغربی ممالک میں یہ صورتحال عام ہے جس کے نتیجے میں ادویات کی شکل میں نشہ آور اشیاء کو لوگوں کے لیے جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ یعنی بنیادی اصول یہ ہے کہ مارکیٹ میں جس چیز کی کھپت ہے اس کی سہولیت مہیا کر دو۔ لیکن اسلام میں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کا فیصلہ آسمانی تعلیمات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اسلام تجارت کے انہی اصولوں کو جائز قرار دیتا ہے جو انسانی اخلاقیات، انسان کی حقیقی ضروریات اور انسانی معاشرے کے دنیوی اور اخروی نفع کے لیے بہتر ہیں۔

جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ایک آدمی سے قیامت کے دن مال کے حوالے سے دو چیزوں کے متعلق سوال ہو گا ''من این اکتسب وفیما أنفق'' مال کمایا کہاں سے تھا اور خرچ کہاں پر کیا؟ کمائی کے ذرائع جائز تھے یا ناجائز؟ اور جن چیزوں پر خرچ کیا وہ جائز تھیں یا ناجائز؟ ان دو باتوں میں سارا معاملہ آجاتا ہے۔ کمائی کے ذرائع اور مصرف کے مقامات دونوں جائز ہوں گے تب بات بنے گی ورنہ آدمی گناہ گار ٹھہرے گا۔ اسلام نے کمائی کے ذرائع بھی محدود کیے ہیں کہ فلاں ذریعۂ آمدن جائز ہے اور فلاں ناجائز ہے۔ اور خرچ کرنے کے معاملے میں بھی انسان کو کھلی چھٹی نہیں دی گئی کہ جہاں چاہو خرچ کر لو بلکہ مصرف کے مقامات کے متعلق بھی واضح کیا گیا ہے کہ فلاں جگہ خرچ کرنے کے لیے جائز ہے اور فلاں ناجائز۔ اور یہی اسلامی معیشت و تجارت کا بنیادی دائرہ ہے۔

حدود و تعزیرات سے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

(ویب سائٹ - ۷ ستمبر ۲۰۰۷ء)

(محمد عمار خان ناصر کی تصنیف ”حدود و تعزیرات: اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ“ کے دیباچے کے طور پر لکھا گیا۔)

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جسے اس غرض سے تشکیل دیا گیا تھا کہ دستور پاکستان میں ملک کے تمام مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی جو ضمانت دی گئی ہے، وہ اس کی تکمیل کے لیے حکومت پاکستان کی مشاورت کرے۔ اس کی عملی شکل یہ ہے کہ جدید قانون کے ممتاز ماہرین اور جید علمائے کرام پر مشتمل ایک کونسل تشکیل دی جاتی ہے جو حکومت کے استفسار پر یا اپنے طور پر ملک میں رائج کسی قانون کا اس حوالے سے جائزہ لیتی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں، اور اگر وہ اس قانون کو اسلامی تعلیمات کے منافی تصور کرتی ہے تو اس کی خامیوں کی نشان دہی کرتی ہے اور اس کے متبادل قانون کا مسودہ سفارش کی صورت میں مرتب کر کے حکومت کے سپرد کر دیتی ہے۔ دستور کی رو سے حکومت اس بات کی پابند ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی یا صوبائی اسمبلی میں پیش کر کے اس کے مطابق قانون سازی کرے۔

۱۹۷۳ء کے دستور سے قبل یہ ادارہ ”اسلامی مشاورتی کونسل“ کے نام سے اور اس سے پہلے ”تعلیمات اسلامیہ بورڈ“ کے نام سے قائم رہا ہے اور ملک کے بہت سے سرکردہ ماہرین قانون اور ممتاز علمائے کرام مختلف اوقات میں اس میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے قیام کے بعد سے اب تک سینکڑوں قوانین کا جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی تجاویز اور سفارشات حکومت پاکستان کے سامنے پیش کی ہیں، جن کے حوالے سے دستور کا یہ تقاضا کہ انہیں متعلقہ اسمبلیوں میں پیش کر کے قانون سازی کے مرحلہ سے گزارا جائے، ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔ بلکہ اب تک یہ صورتحال رہی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور اس کے مرتب کردہ مسودہ ہائے قانون کی پیشانی پر ”صرف سرکاری استعمال کے لیے“ کا لیبل چسپاں کر کے اس کی اشاعت کو شجرۂ ممنوعہ قرار دیا جاتا رہا ہے، لیکن جب سے ڈاکٹر خالد مسعود اسلامی نظریاتی کونسل کے

چیئرمین بنے ہیں، یہ صورتحال قدرے تبدیل ہو رہی ہے۔ وہ کونسل کو عوامی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور کونسل سے ہٹ کر علماء اور دانشوروں کے وسیع حلقے کو اپنی مشاورت کے دائرے میں شامل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ ان کی سربراہی کے دور میں کونسل کی طرف سے اسلامی احکام و قوانین کے حوالے سے مختلف سیمینارز کے انعقاد اور متعدّد سفارشات پیش کرنے کے علاوہ ''اجتہاد'' کے نام سے ایک سہ ماہی مجلہ کا اجرا بھی کیا گیا ہے، جس کا مقصد عالم اسلام کے مختلف اطراف میں اجتہاد کے حوالے سے ہونے والی علمی کاوشوں سے پاکستان کے دینی و علمی حلقوں کو متعارف کرانا اور اس طرح باہمی ربط و مشاورت کا ماحول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جدید مسائل کے بارے میں اجتہادی ضروریات سے انہیں آگاہ کرنا ہے۔

اجتہاد کے بارے میں ہم اس وقت دو انتہا پسندانہ رویوں سے دوچار ہیں۔ ایک طرف سرے سے اجتہاد کی ضرورت سے انکار کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اجتہاد کے نام پر امت کے چودہ سو سالہ علمی مسلمات اور اجماعی اصولوں کا دائرہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جبکہ حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ امت مسلمہ کے اجماعی اصولوں اور علمی مسلمات کے دائرے میں رہتے ہوئے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں امت مسلمہ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جائے، اور خاص طور پر نئے پیش آمدہ مسائل کے قابل قبول دینی و علمی حل کی کوئی صورت نکالی جائے۔

اس وقت اسلامی قوانین، دستوری دفعات اور عدالتی فیصلوں پر نظر ثانی کے تقاضے مختلف حلقوں کی طرف سے سامنے آ رہے ہیں اور دھیرے دھیرے ایسی فضا قائم ہو رہی ہے کہ اگر ان تقاضوں کے حوالہ سے اصولی ترجیحات کا ابھی سے تعین نہ کیا گیا تو اسلامائزیشن کے حوالہ سے سپریم کورٹ آف پاکستان، وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کا اب تک کا پورے کا پورا عمل نظر ثانی کی زد میں آجائے گا۔ یہ ادارے اس سلسلہ میں مزید کسی پیشرفت کی بجائے اپنے سابقہ کام کی صفائیاں پیش کرنے اور ان میں ردوبدل کرنے میں ہی مصروف رہیں گے اور یہ ''ریورس گیئر'' پاکستان میں اسلامائزیشن کے عمل کو ایک بار پھر ''زیرو پوائنٹ'' تک واپس لے جائے گا۔

ہمیں اسلام کے نام پر نافذ ہونے والے قوانین پر نظر ثانی کی ضرورت سے انکار نہیں ہے اور اگر کسی مسودہ قانون میں کوئی فنی سقم رہ گیا ہے یا اس پر عملدرآمد کی راہ میں کوئی

رکاوٹ موجود ہے تو قرآن و سنت کے اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس پر نظر ثانی سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ عمل ہمارے داخلی تقاضوں اور ضروریات کے حوالہ سے ہونا چاہیے اور اس سلسلہ میں بیرونی عوامل اور دباؤ کو قبول کرنے کا کسی سطح پر بھی تاثر قائم نہیں ہونا چاہیے، ورنہ ضروری اور جائز نظر ثانی بھی شکوک و شبہات کا شکار ہو کر اس عمل پر عوام اور دینی حلقوں کے اعتماد کو مجروح کرنے کا باعث بن جائے گی۔ اس لیے میں اسلامائزیشن کی راہ میں حائل داخلی مشکلات اور اسلامی قوانین پر نظر ثانی کے دونوں حوالوں سے "اسلامی نظریاتی کونسل" کے سامنے مندرجہ ذیل تجاویز رکھنا چاہوں گا:

1. اسلامی قوانین پر نظر ثانی کے خارجی دباؤ یعنی بین الاقوامی تقاضوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک الگ "ورکنگ گروپ" قائم کرنے کی ضرورت ہے جو بین الاقوامی قوانین اور تقاضوں کے ساتھ شرعی قوانین کے تضادات کی نشاندہی کرے، ان تضادات کے اسباب اور پس منظر کی وضاحت کرے اور ان کے حوالہ سے شرعی قوانین کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہوئے اس سلسلہ میں عالمی سطح پر اٹھائے جانے والے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جدید اسلوب اور خالصتاً علمی انداز میں جواب دے۔

ہم اس وقت اس معاملہ میں قومی سطح پر "تذبذب" کا شکار ہیں اور اسلامی قوانین کے بارے میں عالمی تقاضوں اور دباؤ کو نہ پوری طرح قبول کر رہے ہیں اور نہ ہی مسترد کر رہے ہیں۔ یہ طرز عمل درست نہیں ہے اور اس سے پاکستان میں اسلامائزیشن کے بارے میں ابہام اور کنفیوژن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمیں علمی انداز میں ان سوالات کا سامنا کرنا چاہیے اور علم و دانش کی اعلیٰ ترین سطح پر ان سوالات کا جائزہ لیتے ہوئے شکوک و شبہات کا علمی جواب دینا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس کام کے لیے "اسلامی نظریاتی کونسل" سب سے بہتر فورم ہے البتہ کونسل اس کام کے لیے حسب معمول دوسرے اہل علم کا تعاون بھی حاصل کر سکتی ہے۔

2. داخلی تقاضوں، ضروریات اور مشکلات کا جائزہ لینے اور اسلامی قوانین کے مسودات کی خامیوں کی نشاندہی کے لیے "ورکنگ گروپ" قائم ہونا چاہیے جس میں سیشن کورٹس کی سطح کے جج صاحبان، دینی مدارس میں فقہ و

حدیث کا کم از کم بیس سالہ تجربہ رکھنے والے مدرسین اور اسی سطح کے وکلاء صاحبان کو شامل کیا جائے جو متعلقہ قوانین کا تفصیلی اور شق وار جائزہ لے کر انہیں مؤثر بنانے کے لیے تجاویز دیں۔ آزاد کشمیر میں چونکہ سیشن جج اور ضلع قاضی مل کر مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں، اس لیے ان کا عملی تجربہ زیادہ ہے اور ورکنگ گروپ میں ایسے جج صاحبان اور قاضی حضرات کی شمولیت زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔

3. دور جدید میں اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے دنیا کے مختلف اسلامی ممالک میں مسلسل کام ہو رہا ہے اور بہت سے تحفظات کے باوجود اس سلسلے میں پیشرفت جاری ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں "اجتہاد" کے عنوان سے ہونے والے کام سے پاکستان کے اہل علم و دانش کو آگاہ کیا جائے۔ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے واقفیت کے ساتھ ساتھ مختلف جہات سے ہونے والی اجتہادی کاوشوں کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہونے چاہئیں۔ اتفاق یا اختلاف اس سے بعد کا مرحلہ ہے کہ ہم کس بات کو قبول کرتے ہیں اور کون سی بات ہمارے نزدیک قبولیت کے معیار پر پوری نہیں اترتی، مگر اس سے پہلے ان کاوشوں سے اور ان کے دلائل و نتائج سے واقفیت ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بعد ہی کسی بات سے اتفاق یا اختلاف کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

4. جہاں تک کسی تعبیر و تشریح کو قانون سازی کے دائرے میں عملاً قبول کرنے یا نہ کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے صرف کسی صاحب علم یا مکتب فکر کا اسے پیش کر دینا اور اس پر اپنے خیال میں دلائل قائم کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ امت میں اسے قبولیت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ امت میں حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، لیث بن سعدؒ اور امام بخاریؒ کے درجے کے بیسیوں فقہائے کرام موجود ہیں جن کے علم و فضل اور کردار و تقویٰ کے تمام تر احترام کے باوجود ان کی فقہی آرا اور تعبیرات و تشریحات کو امت نے اجتماعی طور پر قبول نہیں کیا، اسی لیے ان پر عمل بھی نہیں ہو رہا۔ تو آج بھی کسی صاحب علم کو یہ

توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان کی تعبیر وتشریح کو امت میں قبولیت کا درجہ حاصل ہوئے بغیر واجب العمل سمجھ لیا جائے گا۔

صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں عائلی قوانین کے نام سے نکاح، طلاق اور وراثت کے شرعی قوانین کو ردوبدل کا نشانہ بنایا گیا تھا اور حکومت نے دینی و علمی حلقوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے قانون اور حکومت کے زور پر عائلی قوانین ملک میں نافذ کر دیے تھے، مگر ساری دنیا اس حقیقت کا مشاہدہ کر رہی ہے کہ نصف صدی کے قریب عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ قوانین اب بھی قوم میں متنازعہ ہیں۔ جہاں تک قانون کا جبر کام کرتا ہے اس سے زیادہ عائلی قوانین کا کوئی اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ لوگ اب بھی نکاح، طلاق اور وراثت کے معاملات میں مسائل علمائے کرام ہی سے پوچھتے ہیں اور انھی پر عمل کرتے ہیں۔ قوم نے ان قوانین کو آج تک سنجیدگی سے نہیں لیا اور نہ ہی انہیں ذہنی طور پر قبول کیا ہے۔

اس کے اسباب پر نظر ڈالی جائے تو دو باتیں بطور خاص سامنے آتی ہیں۔ ایک کی طرف ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شرعی احکام و قوانین میں ردوبدل کی کوئی بات سرکاری حلقوں کی طرف سے سامنے آئے تو اس کا داعیہ داخلی ضروریات نہیں بلکہ خارجی دباؤ اور مغرب کے مطالبات ہوتے ہیں، اور یہ بات کسی بھی مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں ہوتی۔ جبکہ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر شرعی احکام و قوانین کی تعبیر وتشریح میں عام مسلمانوں اور جمہور اہل علم کے مسلمات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر حدود و تعزیرات کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی زیر نظر سفارشات کو ہی دیکھ لیا جائے۔ کونسل نے ان سفارشات میں صرف قرآن کریم کو بنیاد بنایا ہے اور شرعی احکام کے باقی تینوں مسلمہ مآخذ (۱) سنت، (۲) اجماع اور (۳) قیاس سے صرف نظر کیا ہے۔ چنانچہ رجم کے شرعی حد ہونے اور ارتداد کی شرعی سزا سے انکار اور متعلقہ سفارشات میں شامل دیگر بہت سی باتوں کا ہمارے نزدیک پس منظر یہی ہے۔ جبکہ معروضی صورتحال یہ ہے کہ

ملک کی آبادی کی غالب اکثریت اہل السنۃ والجماعۃ پر مشتمل ہے جن کا تعارف ہی سنت اور جماعت کے حوالہ سے ہے کہ وہ قرآن کریم کی تشریح اور احکام شرعیہ کی تعبیر میں سنت رسولؐ اور جماعت صحابہؓ کو معیار سمجھتے ہیں۔ اور اہل السنۃ والجماعۃ کے جمہور اہل علم کے نزدیک احکام شرعیہ اور اسلامی قوانین کی بنیاد چار ماٰخذ پر ہے: (۱) قرآن کریم، (۲) سنت رسولؐ، (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔ مگر اسلامی نظریاتی کونسل کی ان سفارشات میں قرآن کریم کو بطور ماخذ اپنایا گیا ہے اور اس کی تشریح و تعبیر میں قیاس محض یعنی عقل عام کو ذریعہ کے طور پر اختیار کیا گیا ہے جس سے سنت رسولؐ ' اجماع اور قیاس شرعی تینوں اس معاملہ سے بے دخل ہو گئے ہیں۔

سنت رسولؐ کے اسلامی قوانین کا بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کونسل اس بات کو بھی بھول گئی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سنت رسولؐ کی اس حیثیت کا بعض حلقوں کی طرف سے شدومد کے ساتھ انکار ہوا تھا اور اس پر بہت دیر تک بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہا تھا مگر ملک کی رائے عامہ نے اسے سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور قوم کے منتخب نمائندوں نے جب ۱۹۷۳ء کا دستور ترتیب دیا تو اس میں صرف قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد نہیں بنایا بلکہ سنت کو اس کے ساتھ شامل کر کے قرآن و سنت کو دستور اور قانون کے معاملات میں مشترکہ معیار اور ماخذ قرار دیا تھا۔

ان تحفظات کے ساتھ ساتھ بہرحال یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ دینی، علمی اور ملی مسائل پر باہمی تبادلۂ خیالات اور مکالمہ کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ اور اس پس منظر میں عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ اللہ تعالیٰ نے حدود و تعزیرات کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا فقہی اصول اور دلائل کی روشنی میں جائزہ لیا ہے جو اس بحث و مباحثہ کو علمی انداز میں آگے بڑھانے کی ایک مفید کوشش ہے۔ آج کے ایسے نوجوان اصحاب علم کو جو علمی استعداد اور وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ معروضی حالات و مسائل اور پیش آمدہ علمی و فکری مشکلات کا کسی حد تک ادراک بھی رکھتے ہیں، فکری و فقہی جمود اور مطلق آزادئ فکر کی دو انتہاؤں کے درمیان متوازن راستہ تلاش کرنے میں جن دشواریوں کا سامنا ہے، مجھے پوری طرح ان کا احساس ہے، اس لیے اہل السنۃ والجماعۃ کے

علمی مسلمات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کے لیے آزادانہ بحث و مباحثہ اور تحقیق و تمحیص کا حق تسلیم کرتا ہوں اور ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ اس کی کچھ جھلک اس جائزہ میں بھی قارئین کو نظر آئے گی مگر میرے نزدیک یہ علمی مباحثہ و مکالمہ کا ناگزیر حصہ ہے اور ان مراحل سے گزرے بغیر کسی مسئلہ کے صحیح حل تک پہنچنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔

ضروری نہیں ہے کہ اس جائزہ کی ہر بات سے اتفاق کیا جائے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور دور حاضر کے وسیع عالمی تناظر میں اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح کے حوالہ سے جو مشکلات و ضروریات اسلامی نظریاتی کونسل کی ان سفارشات اور ان پر عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ کے اس تبصرہ سے ظاہرا یا بین السطور جھلکتی دکھائی دے رہی ہیں، علمی رسوخ و اعتماد سے بہرہ ور شخصیات اور ادارے ان کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو کر اس سلسلے میں امت مسلمہ کی راہنمائی کا فرض ادا کریں کہ یہی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

صلح و جنگ اور سیرت نبویؐ

(دارالہدٰی، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۷ ستمبر ۲۰۰۷ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگیں بھی کی ہیں اور صلحات بھی۔ حضورؐ نے جو جنگیں کیں ان کا مقصد کیا تھا اور وہ کن اصولوں کے تحت لڑی گئیں؟ اور آپؐ نے جو صلحیں کیں وہ کن مصلحتوں کے تحت کی گئیں اور حضورؐ نے ان صلحوں کو کیسے نبھایا؟ اس حوالے سے مختصراً چند باتیں عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ جناب نبی کریمؐ نے جو دین پیش کیا وہ صرف اخلاقیات اور عبادات پر ہی مشتمل نہیں بلکہ یہ دین پوری زندگی کا انسانی ضابطہ حیات ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ یہ دین زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب محمد رسول اللہؐ تک جتنے پیغمبر بھی آئے سب کی تعلیمات زندگی کے تمام شعبوں پر محیط رہی ہیں۔

یہ انسانوں کی بدقسمتی ہے کہ آج انسانی سوسائٹی کے ایک بڑے حصے نے آسمانی تعلیمات سے قطع تعلق اختیار کرلی ہے، اس کے اسباب کچھ بھی ہوں ان پر بحث ہو سکتی ہے لیکن یہ بدبختی کی بات ہے کہ انسانی سوسائٹی کا ایک بڑا حصہ اپنی عملی زندگی میں آسمانی تعلیمات سے لا تعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع بحث اور پریشان کن مسئلہ ہے کہ آج انسانوں

کا ایک بڑا طبقہ عقیدتاً یہ بات کہتا ہے کہ آسمانی تعلیمات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور دنیا بھر میں مسلمان جن اعتراضات اور تنقیدات کا نشانہ ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ مسلمان آسمانی تعلیمات سے لاتعلقی کے موقف کو قبول نہیں کر رہا۔ یہ بات کہ عملی زندگیوں میں آسمانی تعلیمات سے لاتعلقی اختیار کر لی جائے مسلمان کسی طور قبول نہیں کر پا رہے جبکہ دنیا کی باقی قومیں مجموعی طور پر یہ بات ہضم کر چکی ہیں۔ یہ مسئلہ الگ ہے کہ ان قوموں کے پاس آسمانی تعلیمات اصلی ہیں یا تحریف شدہ ہیں، ان کے پاس آسمانی تعلیمات جس شکل میں بھی ہیں وہ انہیں تاریخی یادگار، تبرک اور آثار قدیمہ سے زیادہ کوئی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آج کی موجودہ بائبل دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہے لیکن اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر کوئی بھی عمل کے لیے تیار نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ قرآن کریم سے پہلے کی آسمانی کتابوں کے صرف تراجم ہی موجود ہیں اور وہ بھی تحریف شدہ ہیں لیکن بنیادی تعلیمات ان میں آج بھی موجود ہیں۔ میں بائبل بھی پڑھتا ہوں اور تالمود بھی جو کہ اردو میں آگئی ہے۔ تحریفات کے باوجود آج بھی بائبل اور تالمود کی بنیادی تعلیمات قرآن کی بنیادی تعلیمات سے ملتی جلتی ہیں۔ چنانچہ دنیا کی باقی قوموں اور مسلمانوں کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دنیا کی قومیں اپنی آسمانی تعلیمات سے دستبردار ہوگئی ہیں کہ گویا آسمانی تعلیمات ان کے نزدیک اب میوزیم کی چیزیں ہیں۔ جبکہ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم آسمانی تعلیمات سے راہنمائی لیتے ہیں اور اپنی عملی زندگیوں میں قرآن و سنت کے پابند ہیں۔ یہ ایک مستقل تنازعہ اور جھگڑا ہے۔

ایک انسان کی بحیثیت انسان کسی کے ساتھ دوستی ہوگی اور کسی کے ساتھ دشمنی ہوگی، یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ کسی کو اچھا سمجھتا ہے اور کسی کو برا سمجھتا ہے۔ چونکہ سوسائٹی انسانوں سے بنتی ہے اس لیے یہی نیچر سوسائٹی کی بھی ہے۔ جب مختلف قوموں کے فلسفہ و فکر سامنے آتے ہیں تو ان میں ٹکراؤ بھی پیدا ہوتا ہے، اس طرح اجتماعیات میں جنگوں کے مواقع بھی پیدا ہوتے ہیں اور صلح کے مواقع بھی۔ قوموں کی آپس میں جنگیں بھی ہوتی ہیں اور مصالحتیں بھی، دشمنیاں بھی ہوتی ہیں اور دوستیاں بھی۔ یہ فرد کی فطرت بھی ہے اور سوسائٹی کی فطرت بھی ہے۔ اسلام نے صلح اور جنگ کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے بڑی تفصیل سے اصول و ضوابط دیے ہیں، قرآن کریم میں اور سنت رسول میں اس کی

تفصیلات ملتی ہیں اور اس کا ایک پورا نظام سامنے آتا ہے کہ کس سے جنگ کرنی ہے کب کرنی ہے کیوں کرنی ہے اور کیسے کرنی ہے۔ یہی معاملہ صلح کے حوالے سے بھی ہے۔

اسلام میں جنگ کا تصور

آج کے دور میں عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے دنیا میں پھیلا ہے، طاقت کے زور پر لوگوں سے تسلیم کرایا گیا ہے اور یہ کہ اسلام میں تبلیغ کا ذریعہ جنگ ہے۔ یہ آج کی دنیا کا مسلمانوں پر اعتراض ہے کہ اسلام میں ہتھیار اٹھانا اس لیے ہے تاکہ اس سے لوگوں کو مسلمان کیا جائے- یہ اعتراض بالکل خلاف واقعہ ہے اس لیے کہ امت مسلمہ کے مجاز حکام نے کبھی کسی قوم کو مسلمان کرنے کے لیے طاقت استعمال نہیں کی۔ خلافت راشدہ کا دور ہو یا خلافت بنوامیہ کا، خلافت بنوعباس کا زمانہ ہو یا خلافت بنوعثمان کا، کبھی کسی اسلامی حکومت نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ انفرادی طور پر شاید ایسے کچھ واقعات مل جائیں لیکن بحیثیت امت اور بحیثیت خلافت ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ مجاز اتھارٹیز جو تیرہ سو سال سے چلی آرہی تھیں جن میں سخت حکومتیں بھی تھیں اور ڈھیلی بھی، خلافت کا نظام مسلمانوں میں جیسا کیسا بھی رہا لیکن ہر دور میں یہ گارنٹی دی گئی کہ کسی قوم پر اسلام قبول کرنے کے لیے جبر نہیں کیا جائے گا۔ اور اس پر مثالیں موجود ہیں کہ کچھ لوگوں نے اپنے طور پر جبر کرنا چاہا لیکن خلفاء نے اور مجاز حکام نے انہیں روک دیا کہ بھئی ایسا نہیں ہو گا۔

بنو تغلب عیسائیوں کا عرب قبیلہ تھا اور اسلامی حکومت کے زیر اثر تھا، حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا۔ بنوامیہ کے دور میں وہاں کے مقامی مسلمان حاکم نے قبیلے والوں سے کہا کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ میں تمہارے خلاف جنگ کروں گا۔ اس پر قبیلے والوں نے خلیفۂ وقت سے شکایت کی تو ان کی شکایت پر اس مقامی حاکم کو معزول کر دیا گیا کہ تمہارا اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں ہے، یہ ان کی مرضی پر ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ یہ بات تو قطعی طور پر خلاف واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور پر کسی کو مسلمان کیا ہو۔ البتہ یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ مسلمانوں کو تلوار کے زور پر عیسائی بنایا گیا ہے، جب اسپین پر عیسائیوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو انہوں نے اجتماعی طور پر مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنایا لیکن مسلمانوں نے کسی قوم کو جبراً مسلمان کیا ہو اس کی مثال

تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، میں مجاز حکام کی بات کر رہا ہوں انفرادی اور شخصی واقعات کا ذکر نہیں کر رہا۔

جہاد کس لیے؟

جہاد کیا ہے اور اسلام میں جنگ کس لیے ہے؟ جہاد آج کی دنیا کے اہم ترین موضوعات میں سے ہے۔ میں مختصراً عرض کرتا ہوں کہ جہاد کا اصولی مفہوم وہی ہے جو آج کی برتر قوتیں اپنے فکر و ثقافت کی بالادستی کے لیے کر رہی ہیں۔ یہ ایک پیچیدہ سی بات ہے لیکن ذرا غور کریں کہ آج کی برتر قوتیں کیا کر رہی ہیں؟ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہمارا ایک فلسفہ و تہذیب ہے جسے ہم ہر طرح کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے دنیا تک پہنچائیں گے اور جو بھی ہمارے فلسفہ و تہذیب کی اشاعت میں رکاوٹ بنے گا ہم اس کے ساتھ جنگ کریں گے۔ یہ وہی بات ہے جو ایک دور میں مسلمانوں نے کہی تھی۔ جب پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی تو اس کے بعد یہ کہا گیا کہ اسلام وہ فلسفۂ حیات ہے جو تمام انسانیت کے لیے یکساں مفید ہے اور یہ کہ مسلمان اس تہذیب کو لے کر دنیا کے کونے کونے میں جائیں گے۔ البتہ ہر کسی کی مرضی ہوگی کہ وہ اسلام قبول کرے یا نہ کرے لیکن جو بھی تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنے گا اس کے ساتھ جنگ کی جائے گی۔ چنانچہ جہاد کے فلسفے کو آج کی قوتیں تسلیم کیے ہوئے ہیں اور اس پر عمل کر رہی ہیں۔

یہ بات الگ ہے کہ کونسا فلسفہ اور تہذیب ٹھیک ہے اور کونسی غلط۔ لیکن جو قوت اپنے فلسفے کو، اپنی ثقافت کو، اپنی تہذیب کو صحیح سمجھتی ہے وہ طاقت کے ساتھ پوری دنیا میں اسے پھیلانے کی کوشش کرتی ہے۔ آج جس فلسفے کو دنیا کے لیے بہتر سمجھا جا رہا ہے یہ ہیومن رائٹس کا فلسفہ ہے لبرٹی کا فلسفہ ہے عورتوں کے حقوق کا فلسفہ ہے اور مرد و عورت کے مابین مساوات کا فلسفہ ہے۔ آج مغربی تہذیب کو بڑے خوش نما عنوانات کے ساتھ پوری دنیا میں پھیلانے کے لیے طاقت کا استعمال ہو رہا ہے اور جہاں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فلسفے کی راہ میں لوگ رکاوٹ بن رہے ہیں تو وہاں انہیں طاقت کے ساتھ دبایا اور ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ فلسفہ کہ نسل انسانی کے لیے جو تہذیب بہتر ہے اس سے نسل انسانی کو روشناس کرانے کے لیے کسی رکاوٹ کو برداشت نہ کیا جائے، اسی کا نام جہاد ہے۔ یعنی اس بات میں زبردستی نہیں ہے کہ کوئی اس تہذیب کو قبول کرتا ہے یا نہیں لیکن یہ تہذیب دوسروں تک پہنچانے

میں کوئی رکاوٹ نہ بنے۔ یہ الگ بحث ہے کہ فلسفہ ان کا ٹھیک ہے یا ہمارا، نسل انسانی کے لیے ان کی تہذیب بہتر ہے یا ہماری۔

اشاعت اسلام کے لیے جبر

اشاعت اسلام کے پہلے مرحلے کے متعلق آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اسلام کی دعوت دو اگر مان جائیں تو ٹھیک ورنہ ان سے کہو کہ ہمارے راستے میں رکاوٹ مت بنو۔ یعنی مسلمان نہیں بنتے نہ بنو لیکن ہمیں دوسروں تک اسلام کی دعوت پہنچانے دو۔ اگر تم بطور کافر ہماری رعیت میں رہنا چاہتے ہو تو ہم تمہاری ذمہ داری اٹھائیں گے اور تمہاری حفاظت کریں گے لیکن اگر تم اسلام کی دعوت دینے میں رکاوٹ بنو گے تو ہم تم سے لڑیں گے۔ جناب نبی کریمؐ کو جہاں کہیں بھی شبہ ہوا کہ کسی نے دوسروں کو مسلمان بنانے کے لیے زبردستی کی وہاں نبی کریمؐ نے سختی سے منع فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں اس کے متعلق واضح طور پر فرمایا ”لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی“ (سورۃ البقرۃ ۲۵۶) کہ دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے بے شک ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کافر کو زبردستی مسلمان کرے، لوگوں کو اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ”وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر“ (سورۃ الکہف ۲۹) اور کہہ دو سچی بات تمہارے رب کی طرف سے ہے پھر جو چاہے مان لے اور جو چاہے انکار کر دے۔ اسلام کی بات پہنچانا اور اسلام کی دعوت دینا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، اس دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی کہا کہ جو قوتیں تمہاری دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں ان کے ساتھ دوستی، معاملات اور تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے ”لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین“ (سورۃ الممتحنۃ ۸) کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں لیکن جو برتر قوت کی مخالفت میں آئے، جھگڑا کرے اور رکاوٹ بنے تو اس کے متعلق دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ لڑائی کی جاتی ہے اور انہیں راستے سے ہٹایا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا منشور جو آج کی دنیا کا مروجہ فلسفہ ہے اس میں بھی یہی بات مذکور ہے کہ اگر کوئی ملک یا قوم اس فلسفے اور اس نظام کی راہ میں رکاوٹ بنے گا تو اس کے خلاف اقوام متحدہ کی اجازت کے ساتھ طاقت استعمال کی جاسکے گی۔ اسلام میں طاقت کے استعمال کا تصور موجود ہے لیکن اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں کیونکہ اسلام میں مسلمان بنانے کے لیے طاقت کے استعمال کا حق کسی کو نہیں ہے۔ البتہ جہاں لوگ دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنیں اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ جنگ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کے متعلق حضورؐ نے واضح احکامات جاری کیے کہ دوران جنگ کسی بوڑھے کو قتل نہیں کرو گے، کسی بچے کو نہیں مارو گے، مخالف لشکر کے ایسے لوگ جو تمہارے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے ہوئے اور ویسے ہی لشکر کی خدمت کر رہے ہیں انہیں بھی نہیں مارو گے اور جو ہتھیار پھینک کر بھاگ جائے گا اسے نہیں مارو گے۔ سچی بات یہ ہے کہ آج کے مہذب دور میں ان باتوں پر عمل نہیں ہوتا۔ آج کے اس دور میں کوئی یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جنگ میں غیر متعلقہ آدمی نہیں مارا جائے گا بلکہ آج تو غیر متعلقہ لوگ ہی زیادہ مارے جاتے ہیں۔ لیکن جناب نبی کریمؐ نے اس دور میں اس کی ہدایات دیں اور پھر ان ہدایات کی پابندی بھی کروائی۔ ایک جنگ میں حضورؐ نے ایک عورت کی لاش دیکھی تو آپؐ نے پوچھا کہ اس عورت کو کس نے مارا ہے؟ حضورؐ نے اس کی باقاعدہ باز پرس کی کہ جنگ میں ایک عورت کیسے قتل ہوگئی۔

اشاعت اسلام کا سبب

آج یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے طاقت کے ذریعے لوگوں کو مسلمان کیا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی جو حضورؐ نے صبر آزما حالات میں گزاری اس دور میں جو لوگ مسلمان ہوئے انہیں کس طاقت نے مسلمان کیا؟ بڑے بڑے مسلمان تو اسی دور میں ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو کس طاقت نے مسلمان کیا تلوار تو ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ حضورؐ کے قتل کے ارادے سے حضورؐ کے پاس آئے تھے جبکہ حضورؐ نہتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابوذر غفاریؓ بنو غفار سے جب مکہ آئے تو یہ جناب رسول اللہؐ کا شعب ابی طالب میں محصور ہونے کا دور تھا۔ ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس زمانے میں ہی بت پرستی سے نفرت تھی میں خدا کو مانتا تھا اور اپنے ذوق سے اس کی عبادت کیا کرتا تھا۔ مجھے اپنے قبیلے میں پتہ چلا کہ مکہ میں کوئی صاحب ہیں جو میرے جیسی باتیں کرتے ہیں، میں

نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ جا کر پتہ کر کے آؤ۔ بھائی گیا اور جا کر سرسری معلومات لے کر آیا لیکن مجھے اس سے تسلی نہ ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود جا کر پتہ کرتا ہوں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میں مکہ میں جب پہنچا تو وہاں سہما سہما سا ماحول تھا مجھے کسی سے یہ بات پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ محمدؐ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں تا کہ میں ان سے مل سکوں۔ میں حرم میں آکر بیٹھ گیا۔ شام کو ایک صاحب آئے اور پوچھا کہ مسافر ہو؟ میں نے بتایا کہ ہاں مسافر ہوں۔ کہنے لگے کہ آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ میں ان کے ساتھ گیا اور کھانا کھا کر واپس آکر پھر حرم میں بیٹھ گیا۔ دوسرے دن وہی صاحب آئے تو میں پھر حرم میں تھا اور زم زم پی رہا تھا۔ ان صاحب نے پوچھا اے مسافر! تمہیں ابھی تک تمہاری منزل نہیں ملی۔ میں نے کہا نہیں۔ انہوں نے پھر مجھے ساتھ لے جا کر کھانا کھلایا۔ تیسرے دن پھر یہی ہوا۔

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ تین دن یہی ہوتا رہا کہ وہ صاحب مجھے کھانا کھلانے کے لیے لے جاتے اور میں کھانا کھا کر واپس آجاتا۔ نہ مجھ میں ان صاحب سے پوچھنے کا حوصلہ ہوا اور نہ ہی وہ صاحب مجھ سے میرا مقصد پوچھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تیسرے دن میں نے دل سخت کر کے پوچھ ہی لیا کہ بھئی میں یہاں اس مقصد سے آیا ہوں کہ ان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جو توحید کی بات کرتے ہیں اور بتوں کی مخالفت کرتے ہیں، اگر تم میرے ساتھ جھگڑا نہ کرو تو میں تم سے یہ بات پوچھ لوں؟ یہ میزبان حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ حضرت علیؓ ہنس پڑے اور فرمایا کہ تم صحیح آدمی سے ملے ہو کسی اور سے یہ بات کہتے تو نہ جانے کیا معاملہ ہوتا۔ رات آرام کرو میں تمہیں صبح ملاقات کے لیے لے جاؤں گا۔ حضورؐ زید بن ارقمؓ کے مکان میں تھے جو انہوں نے ایک خفیہ ٹھکانہ بنایا ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوئے اور آپؐ کی دعوت کے متعلق دریافت کیا۔ آپؐ نے انہیں اپنی دعوت کے متعلق بتایا کہ میں توحید کی بات کرتا ہوں اور بت پرستی کی مخالفت کرتا ہوں اور یوں حضرت ابوذر غفاریؓ مسلمان ہو گئے۔ نبی کریمؐ نے انہیں ہدایت دی کہ سیدھے اپنے قبیلے چلے جاؤ اور یہاں کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا، اپنے قبیلے میں جا کر کام کرو۔ جب تمہیں یہ خبر ملے کہ میں نے مکہ چھوڑ کر کہیں اور اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہے تو تم میرے پاس آجانا۔ جبکہ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو یہاں اعلان کر کے جاؤں گا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ چنانچہ وہ بیت اللہ کے قریب گئے جہاں سب

قریشی اکٹھے تھے وہاں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں ابوذر ہوں بنو غفار سے آیا ہوں اور میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے ”اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداعبدہ ورسولہ“۔اس ماحول میں یہ بم پھٹنے والی بات تھی۔ فرماتے ہیں کہ لوگ آگئے کسی کے ہاتھ میں جوتا ہے کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے کوئی مکہ مار رہا ہے کوئی تھپڑ مار رہا ہے حتیٰ کہ میں زمین پر گر گیا اور لوگ مجھ پر پل پڑے۔ حضرت عباسؓ جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے یہ منظر دیکھ رہے تھے انہوں نے آکر مجھے درمیان سے نکالا اور لوگوں کو مار پیٹ سے روکا اور کہا کہ لوگو کیا کر رہے ہو یہ بنو غفار کا آدمی ہے، شام کی طرف تمہارے تجارت کے قافلے جاتے ہیں تو ان کا قبیلہ راستے میں ہے، تم لوگوں نے اسے مار دیا تو تمہاری تجارت کا راستہ بند ہو جائے گا۔ حضرت عباسؓ نے یہ کہہ کر ان کی جان چھڑوائی۔ ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں رات وہیں رہا اگلے دن جب چاشت کا وقت آیا اور بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تو میں نے پھر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا ”اشھد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداعبدہ ورسولہ“۔ فرماتے ہیں کہ میری ایک بار پھر پٹائی ہوئی۔

میں جو بات عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ابوذر غفاریؓ کو کس طاقت نے مسلمان کیا کہ طاقت والے لوگ تو دوسری طرف تھے۔ یہ دین کی ایمان کی اخلاق کی اور کردار کی قوت تھی جس نے اس جماعت کی بنیاد بنائی۔ اسلام کی پہلی جماعت تو ماریں کھا کر بھوک برداشت کر کے طعن و تشنیع کا سامنا کر کے اور ظلم وستم سہہ کر تیار ہوئی تھی۔ حضرت خباب بن ارتؓ کہتے ہیں کہ میں جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مہربانی کا معاملہ فرمائیں ہماری حالت تو بہت خراب ہے۔ وہ غلام تھے انہوں نے بتایا کہ میرا مالک کوئلے جلاتا ہے اور مجھے کوئلوں پر سیدھا لٹا کر اوپر میرے سینے پر بیٹھ جاتا ہے۔ چربی پگھلتی ہے خون نکلتا ہے جس سے کوئلے بجھتے ہیں۔ یارسول اللہ کب تک یہ معاملہ رہے گا؟ آپؐ نے فرمایا صبر کرو۔ خبابؓ نے کمر سے چادر اٹھائی اور کہا کہ یارسول اللہ میری کمر کی حالت دیکھیں۔ پیپ رستی ہے گڑھے پڑے ہوئے ہیں بوٹیاں سامنے نظر آرہی ہیں۔ آپؐ نے پھر فرمایا حوصلہ کرو صبر کرو۔ فرمایا کہ تم سے پہلے ایمان قبول کرنے پر لوگوں پر یہ وقت بھی آیا کہ ایک انسان کو سر پر آری رکھ کر پاؤں تک دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ لوہے کی کنگھیاں بنا کر جسم سے گوشت کی آخری بوٹی تک نوچ لی گئی۔

میں نے یہ عرض کیا کہ جنگ اور جہاد لوگوں کو مسلمان کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ اسلام کی راہ سے رکاوٹ دور کرنے کے لیے تھا چنانچہ اسی بنا پر اسلامی تاریخ میں جہاد ہوا ہے۔ اسلام کی دعوت تو جناب رسول اللہ ؐ نے مظلومیت کی حالت میں دی اور ظلم کے اس دور میں جاںنثاروں کی ایک جماعت تیار کی۔ اور یہ اسلام کی تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں پر جتنے زیادہ ظلم ڈھائے گئے ہیں اسلام کی دعوت اتنی زیادہ دنیا میں پھیلی ہے۔ آج بھی دیکھ لیں کہ جتنا مسلمانوں کی مظلومیت میں اضافہ ہوا ہے اتنا زیادہ اسلام کی تعلیمات سے لوگ روشناس ہوئے ہیں۔ اسلام کی ابتدائی جنگیں تو سراسر دفاعی جنگیں تھیں، اور بعد کی جنگیں بھی بظاہر اقدامی نظر آتی ہیں لیکن وہ دفاعی ہی تھیں کہ جن قوتوں سے مسلمانوں نے خطرہ محسوس کیا اور جن طاقتوں نے مسلمانوں کے خلاف عزائم کا اظہار کیا ان کے خلاف مسلمانوں نے بروقت اقدامات کیے۔ جناب نبی کریمؐ نے فرمایا ''انا نبی الملاحم'' میں جنگوں کا نبی ہوں۔ حضورؐ کے وصال کے وقت بھی آپؐ کے ترکے میں ہتھیار ہی تھے، تلواریں اور زریں تھیں۔ لیکن حضورؐ کی اور بعد میں آنے والوں کی جنگیں لوگوں کو مسلمان کرنے کے لیے نہیں تھیں بلکہ مسلمانوں اور دعوت اسلام کو تحفظ دینے کے لیے تھیں۔

اسلام میں صلح کا تصور

نبی کریمؐ نے بوقت ضرورت صلح بھی کی اور صلح کے معاہدوں کی پاسداری بھی کی۔ جب قریش مکہ کے ساتھ صلح ہوئی کہ دس سال جنگ نہیں کریں گے، یہ صلح بظاہر بہت کمزور شرطوں پر تھی، اس معاہدے کے وقت آپؐ اپنی جماعت کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکہ کے باہر موجود تھے لیکن کفار مکہ نے یہ شرط بھی رکھ دی کہ مسلمان اس سال عمرہ نہیں ادا کر سکیں گے اس کے لیے انہیں اگلے سال کا انتظار کرنا ہوگا۔ ایک شرط انہوں نے یہ بھی رکھی کہ معاہدے کے دس سالوں کے دوران مسلمانوں کا کوئی ساتھی انہیں چھوڑ کر مکہ مکرمہ گیا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا لیکن اگر کفار مکہ کا کوئی ساتھی انہیں چھوڑ کر مسلمانوں کے پاس گیا تو وہ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یا رسول اللہ کن شرطوں پر صلح کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا میں نبی ہوں اور اللہ کے حکم سے ایسا کر رہا ہوں اور ایک وقت آئے گا کہ یہی صلح فتح میں تبدیل ہوگی۔ صلح نامہ کا معاہدہ کرنے کے لیے قریش کا نمائندہ سہیل بن عمرو تھا جبکہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے یہ معاہدہ لکھوایا۔ قریش کی رعونت کا عالم دیکھیں کہ حضورؐ نے جب یہ لکھوایا ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' تو سہیل بن عمرو

نے کہا کہ ''ما الرحمن'' یہ رحمان کیا ہے اسے مٹاؤ۔ ہم جس طرح ''باسمک اللھم'' لکھا کرتے ہیں ویسے ہی لکھو۔ اور جب حضرت علیؓ نے معاہدہ لکھا کہ ''ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ و سہیل بن عمرو'' تو اس پر سہیل بن عمرو نے اعتراض کر دیا کہ اگر معاہدے میں ہم انہیں رسول اللہؐ مان لیں تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے اس لیے محمد رسول اللہ کی جگہ محمد بن عبد اللہ لکھو۔ اس پر وہاں بڑی جذباتی فضا بن گئی، کون مسلمان ہے جو اپنے ہاتھ سے محمد رسول اللہ کا جملہ لکھ کر اسے کاٹے؟ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے کہا ''امح'' کاٹو۔ حضرت علیؓ نے کہا یا رسول اللہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپؐ نے پھر فرمایا ''امح یا علی'' علی اسے کاٹو۔ حضرت علیؓ نے کہا ''واللہ لا امحوہ'' اللہ کی قسم نہیں کاٹوں گا۔ حتیٰ کہ حضور نے خود وہ جملہ کاٹا۔

اسی طرح جب یہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا تو سہیل بن عمرو کا اپنا بیٹا ابو جندلؓ جو مسلمان ہو گیا تھا اسے گھر میں زنجیروں میں باندھ کر رکھا گیا تھا وہ کسی طرح زنجیر توڑ کر آ گیا کہ جناب میں آپؐ کا ساتھی ہوں اور آپؐ کے ساتھ جاؤں گا۔ سہیل نے کہا کہ جناب آپ نے معاہدے میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ ہمارا کوئی آدمی آپ کے پاس آئے گا تو آپ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ابھی معاہدہ مکمل نہیں ہوا۔ سہیل نے کہا کہ پھر ہمیں یہ معاہدہ منظور نہیں ہے، میرا بیٹا واپس مکہ واپس جائے گا تو یہ معاہدہ ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔ چنانچہ آپ نے معاہدہ تسلیم کر لیا۔ ابو جندل نے کہا کہ یا رسول اللہ مجھے کن لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں کیا آپ میرا حال نہیں دیکھ رہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہم معاہدے کی رو سے پابند ہیں اس لیے تمہیں واپس جانا ہو گا۔ یہ ایسی صورتحال تھی کہ صحابہؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں منظر کو دیکھ نہیں پا رہا تھا اور میں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن حضورؐ نے حالات کی ضرورت کے پیش نظر صلح کا یہ معاہدہ کیا اور اسے نبھایا۔ اس معاہدے کے بعد انہی مکہ کے مجبور و بے بس مسلمانوں میں سے ابو بصیرؓ مدینہ منورہ گئے تو قریش کا نمائندہ بھی وہاں پہنچ گیا کہ جناب ہمارا ساتھی آپ کے پاس آیا ہے اسے واپس کریں۔ حضورؐ نے معاہدے کی پاسداری کرتے ہوئے ابو بصیرؓ کو واپس کر دیا۔

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ جناب نبی کریمؐ نے جنگ بھی کی ہے اور صلح بھی اور دونوں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی پاسداری بھی کی۔ تاریخ آج بھی جنگ اور صلح دونوں حوالوں سے اگر کوئی آئیڈیل شخصیت پیش کر سکتی ہے تو وہ جناب رسول اکرمؐ کی ذات گرامی ہے۔ جبکہ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم جناب رسول اللہؐ کی تعلیمات کو نظر انداز کرتے ہوئے

دوسری طرف چل پڑے ہیں۔ آج بھی اگر ہم جناب نبی کریمؐ کی صلح وجنگ کے اصولوں کو اپنائیں تو اسلام ہی آئیڈیل قانون اور ضابطہ ہے۔

غلامی کا تصور اور سیرت نبویؐ

(دارالہدٰی، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۵ ستمبر ۲۰۰۷ء)

غلامی کیا ہوتی ہے، آج کے دور میں غلام موجود ہیں یا نہیں اور غلامی کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ یہ آج کی دنیا کے نازک موضوعات میں سے ہے۔ اسلام پر جو اعتراضات ہوتے ہیں ان میں سے ایک اعتراض غلامی کے حوالے سے بھی ہے۔ جب اقوام متحدہ نے غلامی کو انسانی حقوق کے عالمی منشور میں کلیتا ممنوع قرار دیا تو اس سے کچھ عرصہ پہلے تک یہاں امریکہ میں بھی غلامی کا سلسلہ قائم تھا۔ لیکن جب غلامی کو ممنوع قرار دینے کی بات ہوئی تو یہ کہا گیا کہ اسلام بھی ان مذاہب میں سے ہے جنھوں نے غلامی کو جائز قرار دیا اور اپنے نظام میں غلامی کا رواج برقرار رکھا۔ اس بات کی بظاہر تائید بھی ہوتی ہے اس لیے کہ قرآن کریم میں غلامی کے بارے میں آیات موجود ہیں، احادیث میں ان کا ذکر ہے اور غلامی کے متعلق فقہ کے ابواب ہیں۔ اگرچہ آج کے دور میں عملاً غلامی موجود نہیں ہے لیکن اسلام کے اندر غلامی کا ایک مستقل تصور ہے جو پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ غلامی کیا تھی اور اسلام نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔

غلامی کیا ہے؟

غلامی یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو ہر طرح سے اپنا تابع بنا لے۔ غلام بننے والا آدمی مکمل طور پر اپنے مالک کے حکم کے تابع ہو جاتا ہے کہ جو وہ کہے گا یہ وہی کرے گا، غلام اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس کی خرید وفروخت بھی جائز ہوتی تھی کہ غلام ایک مالک کے ہاں سے بکتا تھا اور دوسرے کے ہاں جاتا تھا، منڈی میں اس کی قیمت پڑتی تھی اور بولی لگتی تھی۔ ایک آزاد آدمی اسے بیچتا تھا اور دوسرا آزاد آدمی اسے خریدتا تھا ایسے ہی جیسے جانور خریدے و بیچے جاتے ہیں اور جس طرح جانوروں سے جو چاہے کام لیں اسی طرح غلام انسانوں سے بھی ان کی مرضی اور منشاء کے بغیر کام لیا جاتا تھا۔ غلام آدمی کی

ضروریات زندگی اس کے مالک کے ذمے ہوتی تھیں۔ ایک غلام کا معیار زندگی کیسا ہوتا تھا؟ اس کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ اس کا مالک کتنا سخی اور رحمدل ہے۔

ایک آدمی دوسرے آدمی کا غلام کیسے بنتا تھا اس کے دو طریقے رائج تھے۔ ایک یہ کہ آزاد آدمی کو جبراً غلام بنالیا جاتا اور دوسرا یہ کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاتا۔

آزاد آدمی کا غلام بننا

ایک طریقہ یہ تھا کہ کوئی طاقتور آدمی یا گروہ کسی کمزور آدمی کو پکڑ کر بیچ دیتا تھا، اسے ''بیع الحر'' کہتے ہیں جس کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک آزاد آدمی نے کوئی ایسا جرم کیا کہ جس کی سزا میں قبیلے کی پنچایت یا سردار نے اسے غلام بنا دیا کہ اب تم غلامی کی زندگی بسر کرو گے۔ یا پھر ویسے ہی کسی طاقتور گروہ نے راہ چلتے مسافر کو پکڑ کر کسی کے ہاتھ بیچ دیا، بے شمار لوگ اس طرح بک جاتے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک آزاد گھرانے کے فرد تھے، مجوسیت چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے اور عیسائیت میں ایک عرصہ گزارا۔ وہ گھر سے مذہبی تعلیم کے حصول کے لیے نکلے ہوئے تھے کہ راستے میں لوگوں نے پکڑا اور غلام بنا کر بیچ دیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ غلام بن کر مدینہ منورہ کے ایک یہودی خاندان کے پاس آ گئے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے وہ بھی آزاد باپ کے بیٹے تھے اور آزاد گھرانے کے فرد تھے۔ بھائیوں نے اپنے حسد کی وجہ سے انہیں کنویں میں پھینک دیا جہاں سے کسی قافلے والوں نے نکالا اور آگے کسی کے ہاتھ بیچ دیا۔ اسے بیع الحر کہتے ہیں کہ کوئی طاقتور کسی آزاد آدمی کو پکڑے اور اس کے دام کھرے کرے۔ اس طرح سے بکنے والا آدمی ساری زندگی غلامی کی بسر کرتا تھا۔ بیع الحر کی ایک اور مثال حضرت زید بن حارثہؓ تھے جو کہ غلام بن کر حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تھے اور حضرت خدیجہؓ نے انہیں حضورؐ کی خدمت میں دے دیا تھا۔ حضورؐ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا اس کا ذکر آگے آئے گا۔ آزاد آدمی کو غلام بنانے کا ایک طریقہ وہ ہوتا تھا جو چند دہائیاں قبل تک یہاں (امریکہ) میں رائج رہا کہ افریقہ سے جہاز بھر کر لائے جاتے تھے اور بطور غلام بیچ دیے جاتے تھے۔ وہاں سے روزگار کے لالچ میں لائے جاتے تھے اور یہاں پر غلام بنا لیے جاتے تھے، امریکہ میں غلامی کا یہ سلسلہ صدیوں تک رہا ہے۔ غلامی کے حوالے سے اگر تاریخ سامنے رکھی جائے تو سب سے سنگین اور سب سے صبر آزما تاریخ یہیں کی ہے۔

جنگی قیدی کا غلام بننا

دوسرا طریقہ غلام بنانے کا یہ ہوتا تھا کہ دو قوموں کے درمیان جنگ کے نتیجے میں جو قیدی ہاتھ میں آتے تھے انہیں غلام بنالیا جاتا تھا۔ اب قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا اس بارے میں بھی مختلف طریقے رائج تھے، مثلاً:

- قیدیوں کا تبادلہ کرلیا جاتا۔
- احسان کے طور پر یا فدیہ لے کر قیدی چھوڑ دیے جاتے۔
- قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا۔
- قید کرلیا جاتا۔

جب جنگوں کے نتیجے میں گرفتار ہونے والے افراد کو قیدی بنانے کا فیصلہ کیا جاتا تو پھر یہ مسئلہ درپیش ہوتا تھا کہ انہیں قید کہاں کیا جائے۔ چونکہ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے اس لیے یہ قیدی مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے، ان قیدیوں کی حیثیت غلاموں کی ہوتی تھی۔ یعنی جنگوں میں جو لوگ پکڑے جاتے اگر ان کو فدیہ لے کر یا ویسے چھوڑنا مناسب نہ ہوتا، تبادلہ کی بھی کوئی صورت نہ بنتی، قتل کرنا بھی مصلحت کے خلاف ہوتا تو پھر آخری صورت یہ ہوتی تھی کہ انہیں قیدی بنا لیا جائے۔ پھر قیدی بنانے کی شکل یہ ہوتی تھی کہ قید خانے میں ڈالنے کے بجائے انہیں غلام اور لونڈی بنا کر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان جنگی قیدیوں کو غلام سمجھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ غلامی کے اصولوں پر ہی معاملہ ہوتا تھا، ان سے کام بھی لیا جاتا تھا اور ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ جب کوئی عورت قید ہو کر لونڈی بنتی تو اس کا پچھلا ازدواجی رشتہ ختم ہو جاتا تھا اور جس کی ملک میں وہ آجاتی تھی اسی کے ساتھ وہ رہتی تھی۔ جس شخص کی ملک میں یہ لونڈی ہوتی تھی اس کے لیے لونڈی کے ساتھ جنسی تعلقات بھی جائز ہوتے تھے۔ مالک خود اس لونڈی سے جنسی تعلق رکھ سکتا تھا یا اسے کسی اور شخص کے نکاح میں دے سکتا تھا، حتیٰ کہ جاہلیت کے دور میں لونڈیوں کو فحاشی اور زنا کے کاروبار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

اسلام میں غلامی کا تصور

پہلی بات یہ ہے کہ غلامی مسلمانوں نے رائج نہیں کی اس لیے کہ مسلمانوں سے پہلے یہ طریقہ دنیا میں چلا رائج آرہا تھا۔ غلامی کے ساتھ جیسے باقی قوموں کو واسطہ پڑا اسی طرح

مسلمانوں کو بھی اس کے ساتھ واسطہ پڑا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ غلامی کے اس رواج کے ساتھ سب سے اچھا برتاؤ کس نے کیا۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کے پہلے طریقے ''بیع الحر'' کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا، احادیث میں اور فقہ کی کتابوں میں اس کے متعلق مستقل ابواب ہیں۔ جبکہ غلامی کے دوسرے طریقے یعنی جنگوں میں قیدی بنانے کو برقرار رکھا۔ وہ ایسے کہ جب قیدیوں کے ساتھ کوئی اور معاملہ کرنے کی صورت نہ ہوتی کہ احسانا چھوڑ دینا، فدیہ لے کر چھوڑ دینا، یا قتل کرنا وغیرہ جنگ کی حکمتوں کے خلاف ہوتا تو پھر انہیں قید کرلیا جاتا۔

غزوۂ بدر جو کہ اسلام اور کفر کی پہلی فیصلہ کن جنگ تھی اس میں ستر کافر مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے تھے۔ قید میں آنے والوں کے بارے میں جناب رسول اللہؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ مختلف مشورے سامنے آئے کہ انہیں قتل بھی کر سکتے ہیں، احسانا بھی چھوڑ سکتے ہیں، فدیہ لے کر بھی چھوڑ سکتے ہیں اور غلام بھی بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ فدیہ لے کر قیدی چھوڑنے کا فیصلہ ہوا۔ اسی طرح غزوۂ حنین میں سارے قیدی ویسے ہی احسانا چھوڑ دیے گئے۔ لیکن بہت سی جنگوں میں گرفتار ہونے والوں کو قید کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ جب قیدی بنانے کی نوبت آتی تو چونکہ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے اس لیے ان قیدیوں کو غلاموں کی صورت میں مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ غلامی کی یہ شکل اسلام نے برقرار تو رکھی لیکن اس میں اصلاحات کیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے غلاموں کے متعلق ایسے احکامات دیے جن سے لوگ غلاموں کے ساتھ سلوک میں محتاط ہوگئے۔ اللہ تعالی نے انسانی غلطیوں کے بدلے میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً قسم کھا کر توڑ دی تو اس کے بدلے میں غلام آزاد کرو، قتل خطا ہوگیا تو غلام آزاد کرو، بیوی کو غلطی سے محرمات میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دے دی جسے ظہار کہتے ہیں تو غلام آزاد کرو۔ اسی طرح یہ حکم دیا گیا کہ اگر لونڈی سے بچہ پیدا ہو گیا ہے تو اس ماں کو 'ام الولد' کہا جاتا ہے اور اس کو فروخت کرنا حرام ہے اور مالک کے مرنے کے بعد وہ آزادی کی مستحق ہوگی۔ اسلام نے ان اصلاحات کے ساتھ غلامی کی اس شکل کو جائز رکھا اس صورت میں کہ جب جنگی قیدیوں کے ساتھ اور کوئی سلوک کرنے کی گنجائش نہ ہو۔

بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایات میں جناب رسول اللہؐ کا ارشاد ہے "اطعموھم مما تطعمون والبسوھم مما تلبسون" کہ جو خود کھاتے ہو انہیں بھی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو انہیں بھی پہناؤ، ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام مت لو، اگر کام ان کی ہمت سے زیادہ ہے تو خود ساتھ مل کر ان کی مدد کرو۔ یعنی اسلام نے غلاموں کے معاشرتی مقام میں ایک عملی تبدیلی کرتے ہوئے یہ تعلیم دی کہ ان کا مقام یہ نہیں ہے کہ وہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کریں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور کام کاج کے معیار میں وہ تمہارے برابر ہوں یعنی عملی طور پر ان کا مقام خادم کا ہو نہ کہ غلام کا۔

حضرت زید بن حارثہؓ بھی ایک آزاد خاندان کے فرد تھے راستے میں سفر کرتے ہوئے کسی نے پکڑا اور بیچ دیا، یہ حضرت خدیجہؓ کی ملکیت میں آئے انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضورؐ نے انہیں آزاد کر دیا لیکن وہ آزادی کے بعد بھی آپؐ کی خدمت میں رہے۔ حضورؐ نے انہیں متبنی یعنی منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا اور وہ اس وقت تک حضورؐ کے منہ بولے بیٹے رہے جب تک اس کی ممانعت کے احکامات نازل نہیں ہوئے۔ یہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن کریم میں ہے۔ حضرت زید بن حارثہؓ کے خاندان کو معلوم ہوا تو وہ لوگ انہیں ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب حضورؐ زید بن حارثہؓ کو آزاد کر چکے تھے۔ خاندان کے لوگ آئے کہ ہمارا ایک بچہ تھا جسے کچھ لوگوں نے غلام بنا کر بیچ دیا ہے ہم اس کی تلاش میں ہیں، اس طرح وہ زید بن حارثہؓ تک پہنچ گئے۔ خاندان والوں نے حضورؐ سے کہا کہ ہم اسے واپس لے جانا چاہتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ خاندان کے لوگ چچا اور بھائی وغیرہ آئے اور کہا کہ ہمارے ساتھ چلو۔ حضرت زید بن حارثہؓ نے کہا یہ ٹھیک ہے کہ آپ میرے خاندان کے لوگ ہیں چچا ہیں تایا ہیں بھائی ہیں لیکن جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے مجھے کائنات میں اور کہیں نہیں ملے گا، میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ ایک غلام کے ساتھ جناب نبی کریمؐ کے حسن سلوک کی یہ ایک بہترین مثال ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی کہہ رہے ہیں کہ میں تو غلام ہی بہتر ہوں۔ پہلے غلام بنانے سے بنا تھا اب اپنی مرضی سے بن رہا ہوں۔ اس غلامی سے مراد حضورؐ کی خدمت تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کا خادم بنانے میں سعادت سمجھی۔ یہ حضورؐ کا حسن سلوک تھا کہ ایک اجنبی غلام جسے اس کا خاندان مل جاتا ہے لیکن وہ اپنے خاندان کے ساتھ جانے کے بجائے جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔

غلاموں کے ساتھ آپؐ نے کیا سلوک کیا اور اپنے اصحابؓ کو کس سلوک کی تلقین کی اس کے متعلق بیسیوں روایات ہیں۔ ایک انصاری صحابیؓ حضرت ابو مسعودؓ نے اپنے غلام کو کسی بات پر تھپڑ مار دیا۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے غلام کو تھپڑ مارا ہے؟ صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ ہاں میں نے اس سے ایک کام کہا تھا جو اس نے نہیں کیا تو میں نے اس پر اسے تھپڑ مارا۔ فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے اوپر بھی کوئی طاقت ہے جو تمہارے تھپڑ پر تمہیں سزا دے سکتی ہے۔ صحابیؓ نے کہا یا رسول اللہ غلطی ہوگئی۔ آپؐ نے پوچھا اس غلطی کی تلافی؟ صحابیؓ نے کہا یا رسول اللہ میں اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو اللہ کے عذاب کا شکار ہوتے۔

اسلام نے غلامی کا وہ تصور پیش کیا کہ جس میں مالک اپنے غلام کو اپنے جیسے کپڑے پہنائے اپنے جیسا کھانا کھلائے اور اپنے جیسی زندگی کی سہولتیں مہیا کرے۔ ایسی غلامی کہ جس میں مالک کے اپنے غلام کو تھپڑ تک مارنے پر وعید ہے۔ جنگی قیدیوں کے لیے ایسی غلامی تو کسی آسان قید سے بھی کئی گنا بہتر ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے اپنی تعلیمات سے غلاموں کا معاملہ اتنا حساس بنا دیا کہ لوگوں نے معمولی زیادتی ہو جانے پر غلاموں کو آزاد کرنا شروع کر دیا۔ ایک غزوہ میں جناب نبی کریمؐ کو فتح حاصل ہوئی اور مخالف قبیلے کے لوگ قیدی ہو کر آگئے جن میں غلام بھی تھے اور لونڈیاں بھی۔ حضورؐ کے حصے میں قبیلے کے سردار کی بیٹی آگئی، کسی نے کہا کہ یا رسول اللہ اس شہزادی کو اگر آپؐ اپنی بیوی ہونے کا اعزاز دیں تو پورا قبیلہ مسلمان ہو سکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں شہزادی کو آزاد کرتا ہوں۔ آزاد کرنے کے بعد حضورؐ نے شادی کی پیشکش کی تو شہزادی نے اسے اپنے لیے ایک بہت بڑا اعزاز سمجھا اور ہاں کر دی۔ یہ ام المؤمنین حضرت جویریہؓ تھیں۔ جب یہ شادی ہوئی تو صحابہؓ نے سوچا کہ حضورؐ کے سسرال والے ہماری غلامی میں رہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تمام صحابہؓ نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ حضورؐ کے سسرال کی کوئی بندی یا کوئی بندہ ہماری غلامی میں نہیں رہے گا۔ حضرت جویریہؓ سے لوگ کہا کرتے تھے کہ تم اپنے خاندان کے لیے کتنی خوش قسمت ثابت ہوئی ہو کہ خود ام المؤمنین بن گئی ہو اور تمہارا قبیلہ نہ صرف تمہاری وجہ سے آزاد ہوا بلکہ مسلمان بھی ہو گیا۔

آج کے دور میں غلامی

لوگ پوچھتے ہیں کہ آج کے دور میں غلامی کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟ غلاموں اور لونڈیوں کا قرآن کریم میں بھی ذکر ہے اور حدیث میں بھی اور یہ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں غلامی مسلمانوں میں رائج بھی رہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آج کے دور میں غلامی کے اسباب موجود نہیں ہیں اور آج کے دور میں جو جنگی قیدی ہوتے ہیں ان کے متعلق بین الاقوامی معاہدات موجود ہیں۔ اسلام بین الاقوامی معاہدات کا احترام کرتا ہے۔ بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں ایک اصولی بات عرض کروں گا کہ جو بات ہمارے کسی شرعی حکم سے نہ ٹکراتی ہو، اسلام ہمیں ایسے بین الاقوامی معاہدات کے احترام کا درس دیتا ہے۔ ہاں اگر کوئی معاہدہ یا کوئی بات نص صریح سے ٹکرائے اور ہمارے شرعی اصولوں میں اس کا کوئی جواز نہ نکلتا ہو تو اس کی بات الگ ہے۔ ایک مثال سے دیکھ لیں کہ اسلام بین الاقوامی عرف اور معاہدات کا کس حد تک احترام کرتا ہے۔ جناب نبی کریمؐ کے پاس مسیلمہ کذاب کے دو نمائندے آئے، مسیلمہ نبوت کا دعوے دار تھا اور یمامہ کا سردار تھا، اس کے پاس بڑی فوج تھی۔ خط کا عنوان کچھ اس طرح تھا ''من مسیلمہ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ''۔ اس نے کہا کہ میں بھی اللہ کا رسول ہوں اور آپ بھی اللہ کے رسول ہیں اس لیے میرے ساتھ معاملات طے کریں۔ نبوت کا دائرہ عمل تقسیم کر لیں کہ ''لنا وبر ولک مدر'' شہروں کے پیغمبر آپ بن جائیں اور دیہات کا پیغمبر میں بن جاتا ہوں۔ یعنی اس نے پیش کش کی کہ ہم دونوں مل کر نبوت کرتے ہیں، اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو پھر مجھے اپنا جانشین مقرر کر دیں کہ آپ کے بعد میں نبی ہوں گا۔ آپؐ نے مسیلمہ کے دونوں نمائندوں سے پوچھا کہ کیا تم مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ''نشھد انک رسول اللہ'' ہاں آپ کے بارے میں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ''نشھد ان مسیلمۃ رسول اللہ'' ہم گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ مسیلمہ کی اذان بھی یہی تھی ''اشھد ان محمد رسول اللہ'' اس کے بعد ''اشھد ان مسیلمۃ رسول اللہ''۔ اس پر رسول اللہؐ نے ایک جملہ فرمایا جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں ''لولا ان الرسل لاتقتل لضربت أعناقکما'' اگر (دنیا میں) یہ ضابطہ نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہیں کیے جاتے تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔

یہاں سے فقہاء یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ ہم ان بین الاقوامی قوانین کا، عرف کا اور تعامل کا احترام کریں گے جو نص قطعی سے ٹکراتے نہ ہوں۔ اس اصول کی رو سے اسلام نے جو غلامی کا ایک طریقہ برقرار رکھا تھا وہ بھی آج کے دور میں عملاً باقی نہیں رہا اس لیے کہ بین الاقوامی معاہدات کی رو سے آج دنیا میں جنگی قیدیوں سے متعلق واضح اصول اور ضابطے موجود ہیں، ان ضابطوں کی کوئی بھی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آج دنیا میں کہیں بھی غلامی کا کوئی امکان موجود نہیں ہے حتیٰ کہ گزشتہ ایک صدی کے دوران دنیا میں کہیں بھی جہاد کے عنوان سے کوئی جنگ لڑی گئی ہے تو اس میں کسی کو غلام یا لونڈی نہیں بنایا گیا اور نہ ہی آج دنیا میں جہاد کے نام سے لڑی جانے والی جنگوں میں کسی کو غلام یا لونڈی بنایا جا رہا ہے۔ یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں آج کے بین الاقوامی معاہدات کو امت مسلمہ نے قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ غلامی کے امکان کے نہ ہونے کو ہماری شریعت تسلیم کرتی ہے۔ لیکن اگر کسی وقت دنیا کے حالات تبدیل ہو کر ایسے ہو جائیں کہ پرانی طرز کا کوئی دور واپس آجائے تو اسلام نے اس کی گنجائش رکھی ہے اور اس کے متعلق اسلام کی تعلیمات موجود ہیں۔

میں نے مختصراً یہ بات عرض کی کہ اسلام نے غلام بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ آخری درجے میں اس کی گنجائش رکھتے ہوئے اجازت دی ہے اور وہ بھی حکم کے طور پر نہیں بلکہ ایک آپشن کے درجہ میں ہے۔ پھر اس کے ساتھ خاص ہدایات اور تعلیمات ہیں کہ جن پر عمل پیرا رہنے سے وہ غلامی کا آخری درجہ بھی کچھ عرصہ بعد عملاً ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ کہ آج کے دور میں غلامی کا کوئی تصور اور اسباب موجود نہیں ہیں اور غلامی سے ممانعت کے بین الاقوامی معاہدات موجود ہیں جن کا اسلامی شریعت احترام کرتی ہے۔

غیر مسلموں سے سلوک اور سیرت نبویؐ

(دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۴ ستمبر ۲۰۰۷ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ غیر مسلموں کے ساتھ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات کی نوعیت کیا تھی یہ ایک بڑا موضوع ہے جس کے بیسیوں پہلو ہیں۔ یہ ایک حساس اور پیچیدہ موضوع بھی ہے جس پر میں اصولی طور پر چند گزارشات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ قرآن کریم اور جناب رسول اللہؐ کی سنت و سیرت کے حوالے سے کافروں کے ساتھ

تعلقات دیکھے جائیں تو اس کی الگ الگ نوعیتیں اور درجات سامنے آتے ہیں جن کے الگ الگ احکام ہیں۔

نبی کریمؐ کی امت دعوت

مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی سب سے پہلی نوعیت وہ ہے جس کا دائرہ پوری دنیا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں جناب نبی کریمؐ کی امت دعوت ہیں۔ رسول اللہؐ کی امت دو طبقوں میں منقسم ہے، ایک امت دعوت اور دوسری امت اجابت۔ امت دعوت تو ہر انسان ہے خواہ کسی نسل کسی علاقے اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اس لیے کہ حضورؐ کی سب سے پہلی دعوت یہ تھی "یا ایھا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا" کہ اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ جناب نبی کریمؐ نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر کھلے بندوں یہ سب سے پہلی دعوت دی تو آپؐ کے سامنے عرب والے، قریش والے اور مکہ والے بیٹھے تھے۔ لیکن حضورؐ نے "یا اہل عرب" کہہ کر "یا اہل مکہ" کہہ کر "یا قریش" کہہ کر خطاب نہیں کیا بلکہ "یا ایھا الناس" کہہ کر خطاب کیا۔ آپؐ کے سامنے جو لوگ موجود تھے وہ محدود اور مقامی تھے لیکن آپؐ کی دعوت صرف ان کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے تمام بنی نوع انسانوں کے لیے تھی۔ قرآن کریم نے حضورؐ کی اس دعوت کی تائید اس طرح سے کی "قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السماوات والارض (سورۃ الاعراف ۱۵۸) کہ آپ کہہ دیجیے کہ اے (دنیا جہان کے) لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔

آج کے دور میں جدید تہذیب کے علمبرداروں کا ایک بڑا مغالطہ ہے کہ گلوبلائزیشن اور انٹرنیشنلزم کے داعی وہ ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں گلوبلائزیشن کا سب سے پہلا اعلان صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر جناب رسول اللہؐ نے کیا، یہ گلوبلائزیشن کا اور انٹرنیشنلزم کا پہلا اعلان تھا۔ حضورؐ نے جب یہ اعلان فرمایا تو اس کے ٹھیک اکیس سال بعد اسی صفا کے دامن میں منیٰ کے مقام پر حضورؐ نے خطبہ حجۃ الوداع کی صورت میں گلوبلائزیشن کے چارٹر کا اعلان کیا۔ میں نے عرض کیا کہ پوری نسل انسانی جناب نبی کریمؐ کی امت دعوت ہے اور ظاہر بات ہے کہ جب ہم مسلمان کسی کو دعوت دیں گے تو دعوت کا ماحول پیدا کرنا بھی ضروری ہے اس لیے کہ دعوت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ہم عملی طور

پر جیسے کیسے بھی ہیں بہرحال جناب رسول اکرمؐ کے مشن کے نمائندے ہیں۔ جناب رسول اللہؐ نے اس کام میں جو تکلیفیں برداشت کیں، بھوک برداشت کی، طعنے برداشت کیے اور جس طرح سے اس مشن کی راہ میں آپؐ نے صبر و حوصلے سے کام لیا، یہ دعوت کے اس میدان میں آج بھی آپؐ کی سنت ہے اور قیامت تک آپؐ کی سنت رہے گی۔ چنانچہ جب ہم دعوت کی بات کریں گے اور نسل انسانی کو اسلام کے دائرے میں لانے کی کوشش کریں گے تو ہمیں دعوت کے یہ تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔

غیر مزاحم کفار

غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات کی دوسری نوعیت میں وہ کافر آتے ہیں جنہیں اسلام کی دعوت ملی لیکن انہوں نے نہ تو اس دعوت کو قبول کیا اور نہ ہی اس کی راہ میں مزاحم بنے۔ کافروں کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جنہیں ہماری دعوت پہنچتی ہے تو وہ اسے قبول نہیں کرتے لیکن ہماری دعوت میں رکاوٹ بھی نہیں بنتے۔ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ تم دنیا میں لوگوں کو مسلمان بناتے رہو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ہم مسلمان نہیں بنیں گے۔ ایسے کافر جو دعوت اسلام بھی قبول نہ کریں اور اس کی راہ میں رکاوٹ بھی نہ بنیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی کیٹیگری اس طرح بیان کی ہے ”لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین“ (سورۃ الممتحنۃ: ۸) کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ کافر جو تم سے لڑتے نہیں، تمہاری دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے، تم پر ظلم و ستم نہیں کرتے اور ایسے لوگ بطور انسان تمہارے ساتھ معاملات رکھنا چاہتے ہیں، تمہارے خلاف کسی مہم میں شریک نہیں ہیں تو اسلام کہتا ہے کہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ کاروبار بھی کر سکتے ہو اور حسن سلوک و برابری کا معاملہ بھی کر سکتے ہو۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جیسے دنیا میں اقوام کے ساتھ برابری کے اور خوش اسلوبی کے تعلقات ہوتے ہیں ایسے ہی تم بھی بین الاقوامی برادری میں رہتے ہوئے ان کافروں کے ساتھ برابری کے معاملات رکھ سکتے ہو۔

دعوت اسلام کی راہ میں حائل کفار

مسلم و غیر مسلم تعلقات کی تیسری نوعیت میں وہ کافر آتے ہیں جو دعوت اسلام میں رکاوٹ ہوں۔ ’’انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم‘‘ (سورۃ الممتحنۃ ۹) کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں (کے ساتھ دوستی) سے منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور تمہیں گھر سے نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی ہو اور جو شخص ایسوں سے دوستی کرے گا سو وہ گناہ گار ہوں گے۔ یعنی جو غیر مسلم دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، تم سے لڑتے ہیں، تم پر ظلم و ستم کرتے ہیں، تمہیں گھروں سے نکالتے ہیں ان کے ساتھ دوستی نہیں کرو بلکہ ان کے ساتھ جیسے دنیا میں دشمنی کا معاملہ ہوتا ہے ویسے ہی معاملہ ہونا چاہیے۔ جناب نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ بھی یہی ہے۔

اسلامی ریاست میں رہنے والے کفار

مسلم و غیر مسلم تعلقات کی چوتھی نوعیت میں وہ کافر آتے ہیں جو مسلمان ریاست میں رہتے ہوئے ریاست کی بالادستی کو قبول کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو ذمی کہا جاتا ہے۔ ذمی حقارت کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اعزاز ہے کہ اسلامی ریاست اپنے اندر رہنے والے غیر مسلموں کی جان، مال اور آبرو کی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے زخمی ہونے کے بعد جب طبیبوں نے ان سے کہا کہ اب تو بظاہر زندگی کا امکان نہیں ہے اس لیے جو وصیت وغیرہ کرنی ہے کر دیں۔ حضرت عمرؓ زخمی ہونے کے بعد گھر لائے گئے تھے، انہیں دودھ پلایا گیا تو وہ زخمی انتڑیوں کے راستے سے باہر نکل گیا، پھر شہد پلایا گیا تو وہ بھی انتڑیوں کے راستے نکل گیا۔ طبیبوں نے کہہ دیا کہ حضرت ہمارے حساب سے تو آپ کا وقت آ گیا ہے اللہ زندگی دے تو دے بظاہر امکان نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس حالت میں چند وصیتیں کیں، ان میں سے ایک وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں بطور خاص ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے درمیان رہنے والے غیر مسلموں کی جان، مال اور آبرو کے تم محافظ ہو، ان کی بابت قیامت کے دن تم سے پوچھا جائے گا۔

محدثین فرماتے ہیں کہ اس وصیت کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کو زخمی کرنے والا ایک غیر مسلم مجوسی شخص تھا، حضرت عمرؓ کو یہ خدشہ تھا کہ مسلمان کہیں ردعمل میں غیر مسلموں پر

نہ چڑھ دوڑیں۔ امیر المؤمنین کے قتل سے زیادہ سنگین جرم کیا ہوگا، کسی غیر مسلم کا مسلمانوں پر اس سے بڑا حملہ کیا ہوگا کہ حضرت عمرؓ جیسے امیر المؤمنین کو شہید کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ کافروں کی چوتھی کیٹیگری ہے کہ وہ اسلامی ریاست کی بالادستی کو قبول کرتے ہوئے ایک مسلمان ملک میں رہتے ہیں، ریاست ان کی جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔

منافقین

مسلم و غیر مسلم تعلقات کی پانچویں نوعیت میں وہ لوگ آتے ہیں جنہیں قرآن کریم نے منافقین کے نام سے ذکر کیا ہے۔ رسول اللہؐ کے دور میں جب حضورؐ مدینہ منورہ کے حکمران تھے اور ریاست کا انتظام آپؐ کے ہاتھ میں تھا اس دور میں منافقین سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ غزوۂ احد میں ان کا تناسب یہ تھا کہ ایک ہزار میں سے تین سو منافقین نکل گئے تھے اور مسلمان لشکر میں سات سو باقی بچے تھے۔ منافقین نے فتنے بھی پیدا کیے اور سازشیں بھی کیں۔ قرآن کریم میں ان کے فتنوں کا ذکر ہے، غزوہ تبوک کے حوالے سے بھی اور دیگر متعدّد حوالوں سے بھی۔ منافقین نے مسجد کے نام پر مخالف مورچہ بھی لگایا جسے قرآن کریم نے مسجد ضرار کا نام دیا "والذین اتخذوا مسجدا ضرارا وکفرا وتفریقا بین المؤمنین وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ" (سورۃ التوبہ ۱۰۷) اور جنہوں نے نقصان پہنچانے اور کفر کرنے اور مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کے لیے مسجد بنائی ہے اور ان لوگوں کے لیے مورچہ بنانے کے واسطے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے لڑ چکے ہیں۔ چنانچہ مدینہ کے منافقین نے منافقت کی وہ ساری حرکتیں کیں جو وہ کر سکتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے متعلق صاف کہا "اذا جاءک المنافقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک لرسولہ واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون" (سورۃ المنافقون ۱) کہ جب منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ (یہ بات) جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک منافقین (دل سے گواہی دینے میں) جھوٹے ہیں۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ لوگ آپؐ کو دل سے اللہ کا رسول ماننے میں جھوٹ بولتے ہیں۔ یعنی ان کے کافر اور منافق ہونے پر قرآن کریم نص قطعی کے طور پر گواہی دے رہا ہے۔ ایک موقع پر تو یہ کہا "ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمؤمنین۔

یخدعون اللہ والذین امنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون" (سورۃ البقرہ: ۸۔۹) اور کچھ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم میں یہ صراحتیں موجود ہیں کہ یہ مومن نہیں ہیں بلکہ جھوٹے اور دھوکے باز ہیں۔

بظاہر تو یہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ رہے، صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر نمازیں بھی پڑھتے رہے، روزے بھی رکھتے رہے اور جہاد میں بھی جاتے رہے۔ لیکن درپردہ وہ فتنے کھڑے کرتے تھے اور سازشوں کے تانے بنتے تھے۔ چند مرتبہ تو ایسا ہوا کہ جناب نبی کریمؐ سے اس بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا ان منافقین کو قتل نہ کر دیا جائے؟ حضرت خالد بن ولیدؓ نے بھی حضورؐ سے سوال کیا اور حضرت عمرؓ نے بھی۔ ایک دفعہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بیٹے نے بھی آپؐ سے سوال کیا۔ باپ اور بیٹے دونوں کا نام عبداللہ تھا۔ باپ پکا منافق جبکہ بیٹا پکا مسلمان تھا۔ عبداللہ بن عبداللہ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ لوگ اتنا فتنہ پھیلاتے ہیں اتنا شر پیدا کرتے ہیں کیا ہم انہیں قتل نہ کر دیں؟ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے منع کر دیا اور آپؐ نے پھر اس کی وجہ بیان کی۔ آپؐ اللہ کے پیغمبر تھے اور اللہ کے پیغمبر سے زیادہ صاحب بصیرت کون ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ یہ بات تو صرف تم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ لوگ بے ایمان ہیں، باقی دنیا کی نظر میں تو یہ مسلمان ہیں، انہیں قتل کرو گے تو دنیا میں یہ پروپیگنڈہ ہو گا کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ ہمارے ساتھ دین و دنیا کے تمام معاملات میں شریک ہوتے ہیں اور ان میں ایسی بات نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ لوگ کافر اور منافق ہیں۔ اس لیے چند مخصوص مسلمانوں کے علاوہ باقی لوگ تو یہی کہیں گے کہ محمدؐ نے کسی وجہ سے اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیا ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے عمومی تاثر کا لحاظ رکھتے ہوئے ان منافقین کی شر پسندی کو برداشت کیا۔ یہ جناب نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ ہے کہ کوئی بھی کام کرنے اور بالخصوص اجتماعی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے معاشرتی اثرات و نتائج اور پبلک ری ایکشن دیکھا جائے کہ لوگ اسے کس نظر سے دیکھیں گے۔ حضرت عمرؓ نے تو آپؐ سے اجازت مانگی کہ یا رسول اللہ! منافق کی گردن اڑا دوں؟ آپؐ نے فرمایا خدا کے بندے! لوگ کیا کہیں گے کہ

مسلمانوں نے اپنے ساتھی کو مار دیا، یہ بات دعوت اسلام میں رکاوٹ بنے گی۔ گویا جناب نبی کریمؐ نے یہ تعلیم دی کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے عمومی تاثر دیکھا جانا چاہیے۔

یہ دیکھنا کہ جو کام ہم کرنے جارہے ہیں اس کا عوام میں کیا اثر ہوگا، اسلام کے حق میں ہوگا یا اسلام کے خلاف، اس کا لحاظ رکھنا حکمت کے تقاضوں میں سے ہے۔ بیت اللہ شریف کی موجودہ عمارت ابراہیمیؑ بنیادوں پر نہیں ہے۔ کعبہ کے باہر جو حطیم کی جگہ ہے یہ اصل میں بیت اللہ کا حصہ تھی۔ کعبہ کے دو دروازے ہوا کرتے تھے اور یہ دروازے زمین کی سطح کے برابر ہوتے تھے۔ قریش نے جب حضورؐ کی بعثت سے پہلے آپؐ کی جوانی کے زمانے میں خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی تو یہ تبدیلیاں انہوں نے کیں کہ حطیم کو کعبہ کی عمارت سے باہر نکال دیا، دو کی جگہ صرف ایک دروازہ باقی رہنے دیا اور دروازے کی سطح زمین سے اونچی کر دی۔ ایک دفعہ رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے بعد خانہ کعبہ کی تعمیر کو پرانی طرز پر واپس لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا، بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں قریش کی اس تعمیر کو ختم کر کے ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کر دوں۔ پھر آپؐ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ابراہیمی تعمیر کیا تھی۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ میں ایسا نہیں کروں گا اس لیے کہ ”لولا حدیث عہد قوم بالجاھلیۃ“ تیری قوم قریش نئی نئی مسلمان ہوئی ہے کہیں یہ تاثر نہ لے لے کہ ان لوگوں نے ہمارا تعمیر کیا ہوا قبلہ بھی برداشت نہیں کیا۔ ورنہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس تعمیر کو گرا کر ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کروں۔

اللہ کی قدرت کہ عبد اللہ بن زبیرؓ نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے یہ بات سن رکھی تھی کہ رسول اللہؐ کی یہ خواہش تھی کہ خانہ کعبہ کی ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر ہو۔ جب عبد اللہ بن زبیرؓ حجاز کے حاکم بنے تو انہوں نے حجاج بن یوسف کے ساتھ جنگ کے دوران خانہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچنے کے بعد خالہ محترمہ کی روایت کے مطابق رسول اللہؐ کی خواہش کی تکمیل کے لیے بیت اللہ کی عمارت گرائی اور اسے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کر دیا۔ زمین کی سطح کے برابر کعبہ کے دو دروازے بنائے اور حطیم کو چھت کے اندر کر دیا۔ عبد اللہ بن زبیرؓ کے خلاف حجاج بن یوسف نے چڑھائی کر کے بیت اللہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اس لڑائی میں عبد اللہ بن زبیرؓ شہید ہو گئے اور حجاز پر بنو امیہ کی خلافت کا قبضہ ہو گیا۔ حجاج بن یوسفؒ نے بیت اللہ کی عمارت گرا کر دوبارہ قریش کی طرز پر کعبہ تعمیر کروا دیا۔ بنو امیہ کی

خلافت کا زمانہ ختم ہوا تو بنو عباس کی خلافت کا زمانہ آگیا، بنو عباس کے ابتدائی دور میں انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم اسے پھر گراتے ہیں اور ابراہیمی طرز پر دوبارہ تعمیر کر دیتے ہیں۔ یہ حضرت امام مالکؒ کا دور تھا جو کہ اس وقت کے علمی فرمانروا تھے، اس وقت عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم حضرت امام مالکؒ تھے۔ امام دارالھجرہ، امام اہل سنت، امام المدینۃ، ان کا عالم اسلام میں فتوی چلتا تھا۔ انہوں نے یہ فتوی دیا کہ میں امام مالک بن انسؒ بطور امام مدینہ کے فتوی دیتا ہوں کہ یہ بیت اللہ شریف جس طرز تعمیر پر ہے، قیامت تک اسی طرز تعمیر پر رہے گا۔ یہ تم لوگوں نے کیا تماشا لگایا ہوا ہے کہ جو صاحب اثر خلیفہ آتا ہے وہ پہلے سے موجود عمارت گرا کر اپنی مرضی کا کعبہ تعمیر کر دیتا ہے، ایسے تو کعبہ حکمرانوں کے لیے کھلونا بن جائے گا، اس لیے اب اس کعبہ کو ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالی نے امام صاحبؒ کے فتوے میں اتنی برکت دی کہ کعبہ کی طرز تعمیر آج تک قائم ہے۔ مسلمانوں کے علمی حلقوں میں اب بھی ایک ایسی تحریک موجود ہے اور میری نظر سے ان کی ایک کتاب گزری ہے کہ کعبہ کی تعمیر ابراہیمی بنیادوں پر ہونی چاہیے لیکن امام صاحبؒ کے فتوے میں اللہ تعالی نے اتنی جان ڈال دی تھی کہ یہ بحث صرف علمی حلقوں تک ہی محدود رہی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ کسی بھی عمل کا ردعمل کیا ہوگا اور اس کے نتیجے میں عوام الناس کا تاثر کیا ہوگا، اس کا خیال رکھنا رسول اللہؐ کی سنت ہے۔ چنانچہ باوجود معلوم ہونے کے کہ یہ لوگ منافقین ہیں اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، حالات کے تقاضوں کے مطابق ان کے ساتھ عمومی طور پر مسلمانوں والا معاملہ ہی کیا گیا۔

نبی کریمؐ کا کفار کے ساتھ معاملہ

میں نے اصولی طور پر کافروں کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں جن کے متعلق اسلام میں الگ الگ احکام ہیں۔ کفار کے معاملے میں جناب رسول اللہؐ کا طرز عمل کیا تھا اس کے لیے میں چند واقعات ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ میں یہودی اور منافق کا آپس میں جھگڑا ہوگیا، یہ زمین کی حد بندی کے متعلق ایک تنازعہ تھا۔ دونوں اپنا مقدمہ رسول اللہؐ کے پاس لے گئے، ایک طرف کلمہ گو تھا جبکہ دوسری طرف یہودی تھا۔ کلمہ گو در اصل ایک منافق تھا اور نبی کریمؐ کے پاس اس ارادے سے گیا تھا کہ آپؐ بہرحال اس معاملے میں ایک مسلمان کا لحاظ کریں گے۔ یعنی آپؐ اپنی جماعت کے اور اپنے دھڑے

کے آدمی کا خیال کریں گے۔ لیکن اگر اللہ کے پیغمبرؐ نے بھی دھڑے بندی کی بنیاد پر ہی فیصلے کرنے تھے تو پھر دنیا میں انصاف کا فیصلہ اور کون کرتا۔ حضورؐ نے ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر فرمایا تھا ''من یعدل اذلم اعدل'' کہ اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو اور کون انصاف کرے گا۔ چنانچہ جناب نبی کریمؐ نے انصاف کے مطابق یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حضورؐ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے مفاد سے بالاتر ہو کر اور قانونی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انصاف پر مبنی فیصلہ کرو۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر جناب نبی کریمؐ نے خیبر کے قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا، آپؐ اپنے لشکر کے ساتھ اچانک وہاں جا پہنچے تھے۔ یہ حضورؐ کی جنگی حکمت عملی ہوتی تھی کہ مدینہ سے نکلتے وقت عام اعلان نہیں فرماتے تھے کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ صرف تبوک کی جنگ سے پہلے حضورؐ نے یہ اعلان کیا کہ ایک بڑی طاقت رومیوں سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے اس لیے پوری تیاری کر لو۔ چنانچہ جب آپؐ کا لشکر خیبر پہنچا تو ان لوگوں کو بالکل خبر نہ تھی، ان کے کسان صبح کے وقت زمینوں پر کام کاج کے لیے نکل رہے تھے، دیکھا کہ اسلام کا لشکر آن پہنچا ہے۔ وہ بھاگے بھاگے یہ کہتے ہوئے واپس گئے ''محمد والخمیس، محمد والخمیس'' محمد آ گئے، لشکر آ گیا۔ محمد آ گئے، لشکر آ گیا۔ قلعے کے دروازے وغیرہ بند ہو گئے اور اسلامی لشکر نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ عبد اسود کے نام سے ایک غلام تھا جو وہاں کسی خاندان کی بکریاں چرا رہا تھا۔ اس نے حضورؐ سے آپؐ کی دعوت کے متعلق دریافت کیا، آپؐ نے بتایا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے اور ایک مسلمان جنت کا مستحق ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں اس لیے آپ مجھے کلمہ پڑھائیے۔ آپؐ نے فرمایا ٹھیک ہے لیکن یہ بکریاں جو تم چرا رہے ہو یہ کس کی ہیں؟ اس نے بتایا کہ یہ بکریاں فلاں شخص کی ہیں اور وہ قلعے کے اندر ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ اور اس کی بکریاں واپس کر کے آؤ۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں تو اب مسلمان ہو گیا ہوں واپس کیسے جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم مسلمان ہو گئے ہو لیکن بکریاں تو بہرحال اسی کی ملکیت ہیں اس لیے جاؤ اور واپس کر کے آؤ۔ جناب نبی کریمؐ نے حالت جنگ میں ایک دشمن کی بکریاں اسے واپس دلوا کر یہ تعلیم دی کہ جنگ اپنے مقام پر ہے جبکہ دیانت و امانت اپنے مقام پر ہے۔ صلح و جنگ اور دیانت و انصاف کے تقاضوں کو بیک وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کا طرز عمل

مجھ سے بہت سے دوست پوچھتے ہیں کہ یہاں امریکہ کے مسلمانوں کو نائن الیون کے بعد کی اس مسلم و غیر مسلم کشمکش کی فضا میں کیا کرنا چاہیے۔ یہ ایک نازک، سنگین اور لازمی سوال ہے۔ دنیا میں اس وقت صورتحال یہ ہے کہ بہت سی جگہوں پر مسلمان اور کافر حالت جنگ میں ہیں۔ اس صورتحال میں ایسے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے جو ان غیر مسلم ممالک میں رہتے ہیں جو کسی نہ کسی درجے میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں ملوث ہیں۔ میں اس کے دو جواب دیا کرتا ہوں۔

پہلا جواب یہ کہ انہیں وہی کرنا چاہیے جو حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے کیا تھا۔ غزوۂ بدر اسلامی تاریخ کا سب سے سنگین معرکہ تھا جب مسلمانوں کے پاس بقدر ضرورت نہ تو افرادی قوت تھی اور نہ اسلحہ تھا۔ چند تلواریں، چند گھوڑے، ستر اونٹ اور بچے اور بوڑھے ملا کر ۳۱۳ افراد تھے۔ مقابلے پر ۱۰۰۰ کا قریشی لشکر جو ہر طرح کے اسلحہ کے ساز و سامان سے لیس تھا۔ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ، یہ اپنے وطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے نکلے کہ اب مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان لڑائی کا مرحلہ آنے والا ہے اس لیے ہم حضورؐ کی خدمت میں جاتے ہیں تاکہ قریشیوں کے ساتھ جنگ کی صورت میں ہم حضورؐ کے لشکر شامل ہو سکیں۔ راستے میں کفار مکہ کے قافلے نے پکڑ لیا انہوں نے پوچھا کہ تم دونوں باپ بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ یثرب جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا! ہمارے خلاف لڑائی میں شریک ہونے کے لیے جا رہے ہو؟ ان باپ بیٹا نے گول مول جواب دینے کی کوشش کی لیکن کفار کے لوگ ان کی اصل نیت بھانپ گئے۔ چنانچہ انہوں نے گرفتار کر کے چند دن انہیں اپنے پاس رکھا پھر قافلے والوں نے کہا کہ ہم تم باپ بیٹے کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ تم ہمارے ساتھ وعدہ کرو کہ ہمارے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہوگے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد نے کفار مکہ سے جان چھڑانے کی خاطر یہ حلف اٹھا لیا کہ ہم مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان ہونے والی اس جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ یہ مدینہ منورہ پہنچ کر حضورؐ کو تلاش کرتے ہوئے بدر کے میدان میں آ گئے۔ حضورؐ کی خدمت میں پہنچتے ہی انہوں نے سارا واقعہ آپؐ سے عرض کر دیا کہ ہم گرفتار ہو گئے تھے اور ہمیں اس شرط پر چھوڑا گیا ہے کہ ان کے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم لوگوں نے حلف

اٹھایا؟ حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! ہاں ہم نے حلف اٹھایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم دونوں یثرب جاؤ تم لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ اسلام اور کفر کے درمیان پہلا معرکہ تھا جب اسلامی لشکر کو ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ کفار کے ساتھ اپنے وعدہ کی پاسداری میں بدر کے میدان میں موجود ہوتے ہوئے بھی لڑائی میں شریک نہ ہو سکے، حضورؐ نے انہیں مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ چنانچہ غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو میرا پہلا جواب یہ ہوتا ہے کہ آپ ان ممالک میں رہتے ہوئے جن معاہدات کے پابند ہیں ان کی پاسداری کرنا اسلام کی رو سے آپ پر لازمی ہے۔

دوسرا جواب اس سے ذرا نازک ہے۔ نائن الیون کے کچھ عرصہ بعد میں لندن گیا تو وہاں ایک ٹی وی والوں نے مجھے ایک پروگرام میں بلا لیا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ یہاں (غیر مسلم ممالک) کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ بے حد جذباتی فضا میں ایک بہت حساس سوال تھا۔ میں نے کہا کہ میرا یہاں کے مسلمانوں کو مشورہ ہے کہ انہیں اس معاملے میں یہودیوں کی پیروی کرنی چاہیے۔ انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ ایک مولوی صاحب مسلمانوں کو یہ کیا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک یہودی اپنی کمیونٹی کے لیے مشکلات پیدا نہیں کرتا، قانون اور معاہدات کی پابندی بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دین اور اپنی ریاست اسرائیل کے لیے کام بھی کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہمیں یہودیوں سے طریقہ سیکھ کر اپنا کام کرنا چاہیے۔ جناب نبی کریمؐ نے فرمایا ''کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن'' کہ دانائی کی بات جہاں سے ملے لو وہ مومن کی گمشدہ میراث ہے۔

میں نے عرض کیا کہ جناب رسول اللہؐ نے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں دیانت و عدل کی تلقین کی ہے اور ہر معاملے میں اخلاقیات کی پاسداری کا سبق دیا ہے۔ آپؐ نے غیر مسلموں کے ساتھ معاملات میں توازن قائم کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سنت نبویؐ کی صحیح معنوں میں پیروی کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

گھریلو زندگی اور سیرت نبویؐ

(دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۳ ستمبر ۲۰۰۷ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ انسان گھریلو زندگی کا آغاز ماں باپ کے زیر سایہ ایک بچے کی حیثیت سے کرتا ہے، بڑا ہوتا ہے تو بہن بھائیوں کا ساتھ میسر آتا ہے، خود مختار ہوتا ہے تو میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہوتا ہے جس کے بعد اولاد کی نوبت آتی ہے، یہ ہر شخص کی گھریلو زندگی کا ایک عمومی خاکہ ہے۔ اور گھر معاشرے کی ایک بنیادی اکائی ہے، اللہ تعالی نے اکیلے انسان کو اس دنیا میں نہیں بھیجا بلکہ جنت سے میاں بیوی کا ایک جوڑا زمین پر اتارا، حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی صورت میں ایک کنبہ بھیجا۔ ایک عام سوال یہ کیا جاتا ہے کہ معاشرے کا آغاز ایک فرد سے ہوتا ہے یا خاندان سے۔ ہمارے خیال میں سوسائٹی کا بنیادی یونٹ فیملی ہے، ہم فرد کو معاشرے کی بنیادی اکائی تصور نہیں کرتے اس لیے کہ اللہ تعالی نے جنت سے ایک جوڑے کو بھیجا تھا نہ کہ تنہا ایک فرد کو۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک بھرپور خاندانی زندگی گزاری ہے، جس طرح رسول اللہؐ کی زندگی کے دوسرے پہلو ہمارے لیے آئیڈیل ہیں اسی طرح خاندانی معاملات میں بھی آپؐ ہی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہم نے ہر معاملے میں جناب رسول اللہؐ کی زندگی کو دیکھنا ہے اور انہی کے طرز زندگی کی پیروی کرنی ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں یہی بات فرمائی ”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ“ (سورۃ الاحزاب ۲۱) البتہ تمہارے لیے رسول اللہؐ میں اچھا نمونہ ہے۔

حضورؐ کی گھریلو زندگی

آنحضرتؐ کی گھریلو زندگی کیسی تھی، گھر کی چار دیواری کے اندر آپ کے معمولات کیا تھے اور دینی و دنیوی معاملات میں آپ نے کیسے توازن قائم کیا؟ اس کے متعلق بہت سی احادیث روایت ہوئی ہیں، انہی میں سے ایک روایت ہے کہ بعض صحابہؓ جن میں عثمان بن مظعونؓ بھی تھے اور عبد اللہ بن عمرؓ بھی، انہوں نے آپس میں گفتگو کی کہ رسول اللہؐ کی گھر سے باہر کی زندگی تو ہمارے سامنے ہے لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر حضورؐ کے معمولات کیا ہوتے ہیں یہ ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ حضورؐ کی گھریلو زندگی ہماری نظروں سے اوجھل ہے چنانچہ ہمیں اس کے متعلق معلوم کرنا چاہیے اور پھر اپنے گھروں میں اس کی پیروی کرنی

چاہیے۔ اب حضورؐ کی گھر کے اندر کی زندگی تو ازواج مطہرات ہی جانتی تھیں اس لیے وہی اس کے متعلق بہتر راہنمائی کر سکتی تھیں۔ چنانچہ ان اصحاب نے آپس میں مشورہ کیا کہ ازواج مطہرات کی خدمت میں جاتے ہیں اور جاکر اس بارے میں پوچھتے ہیں۔ اس کے لیے طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جاکر دروازہ کھٹکھٹایا جاتا تھا اور بتایا جاتا تھا کہ ہم فلاں لوگ ہیں اور اس مقصد سے آئے ہیں، اس پر ازواج مطہرات حسب ضرورت اندر سے جواب دے دیتی تھیں۔ چنانچہ یہ اصحاب مل کر جناب نبی کریمؐ کی ایک زوجہ کے دروازے پر گئے اور عرض کیا کہ ام المؤمنین ہم فلاں لوگ ہیں اور آپ سے یہ بات معلوم کرنے آئے ہیں کہ حضورؐ کے گھر کی چار دیواری کے اندر کیا معمولات ہوتے ہیں۔ ام المؤمنین نے بتایا کہ حضورؐ کے گھر کے معمولات ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے دوسرے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو تو کھانا کھاتے ہیں، گھر کا کوئی کام کاج ہو تو وہ کر دیتے ہیں، کوئی سودا وغیرہ منگوانا ہو تو وہ منگوا دیتے ہیں، ہمارا حال احوال پوچھتے ہیں، ہمارے ساتھ گپ شپ بھی کرتے ہیں، گھر کی کسی چیز کی مرمت کرنی ہو تو وہ بھی کر دیتے ہیں، کوئی جوتا گانٹھنا ہو تو گانٹھ دیتے ہیں، چارپائی سیدھی کرنی ہو تو کر دیتے ہیں، کسی کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہو تو ہاتھ بٹا دیتے ہیں۔ الغرض حضورؐ کے معمولات دوسرے لوگوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔

ان اصحاب نے ایک زوجہ سے پوچھا پھر دوسری سے پوچھا پھر تیسری سے پوچھا۔ اسی طرح چند ازواج مطہرات سے پوچھنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ سب کا جواب ایک جیسا ہی تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے آپس میں بیٹھ کر بات کی کہ ہم نے جو سوچا تھا ویسی بات تو سامنے نہیں آئی، حضورؐ کی گھر کی زندگی تو عام معمول کے مطابق ہے اس میں کوئی بہت زیادہ خاص بات نظر نہیں آتی۔ ''کأنهم تقالوها'' گویا انہوں نے اسے اپنے تصور سے کم پایا۔ ان حضرات کا شاید یہ خیال تھا کہ حضورؐ گھر پہنچتے ہی مصلی پر کھڑے ہو جاتے ہوں گے، لگاتار عبادات میں مصروف رہتے ہوں گا، پھر مصلی سے اٹھ کر باہر آجاتے ہوں گے، لیکن حضورؐ کے گھریلو معمولات ان کی توقعات سے برعکس نکلے۔ اس پر انہوں نے خود ہی ایک توجیہ کر لی کہ حضورؐ چونکہ اللہ تعالی کے پیغمبر ہیں، معصوم ہیں اور اللہ تعالی کے محبوب ہیں اس لیے حضورؐ کو ضرورت بھی نہیں ہے کہ وہ لمبی چوڑی عبادت کریں۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اللہ تعالی کی بہت زیادہ عبادت کی ضرورت تو ہم امتیوں کو ہے۔ ان روزمرہ کے معمولات سے ہمارا کام نہیں بنے گا ہمیں تو بہت زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے۔

پھر انہوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اپنے لیے عبادت کے اعمال تجویز کیے۔ ایک نے کہا کہ میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا اور مجرد زندگی گزاروں گا تاکہ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کر سکوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں ساری زندگی رات بھر نہیں سوؤں گا اور اللہ اللہ کیا کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ساری زندگی بلاناغہ روزے رکھوں گا۔

جناب نبی کریمؐ کو ان اصحاب کے بارے میں معلوم ہوا تو آپؐ نے انہیں بلا لیا اور ان سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے آپس میں یہ یہ حلف اٹھائے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سارا قصہ سنایا کہ یوں ہم نے ازواج مطہرات سے آپؐ کے گھریلو معمولات کا پتہ چلایا اور پھر اپنے لیے یہ اعمال تجویز کیے۔ اس پر رسول اللہؐ ناراض ہوئے۔ فرمایا ''انا اخوفکم باللہ واتقکم بہ'' کہ میں خدا کا خوف بھی تم سے زیادہ رکھتا ہوں اور تقویٰ بھی۔

نکاح، سنت نبویؐ

آپؐ نے فرمایا کہ میں نے شادیاں بھی کیں، میری اولاد بھی ہے، روزے بھی رکھتا ہوں، کھاتا پیتا بھی ہوں اور لوگوں کے ساتھ سودا وغیرہ بھی کرتا ہوں۔ یعنی آپؐ نے فرمایا کہ میں ضروریات زندگی کے سارے کام کرتا ہوں۔ آپؐ نے اس موقع پر وہ جملہ ارشاد فرمایا جو ہم عام طور پر نکاح کے خطبہ میں پڑھتے ہیں ''النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی'' کہ نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جناب نبی کریمؐ گھر کے معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ آدمی جب گھر آباد کرتا ہے تو گھر کی ضروریات کا خیال بھی کرتا ہے۔ نیکی اس کا نام نہیں ہے کہ بندہ گھر کے کام کاج اور ضروریات کو نظر انداز کر کے یہ کہے کہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گا بلکہ ضروریات زندگی کا خیال رکھنا اور گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنا بھی نیکی ہے۔ اسی لیے جناب نبی کریمؐ نے گھر کے معمول کے کاموں کے ساتھ ساتھ گھر کے اندر نیکی کا ماحول بھی پیدا کیا تھا اور آپؐ اس ماحول کو قائم بھی رکھتے تھے۔ ایک طرف گھر کی ضروریات، گھر کے مسائل اور گھر کے تقاضے ہیں جنہیں نظر انداز کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ ضروریات زندگی کو پورا کرنا بھی دین کا حصہ ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ آدمی گھر کی ضروریات میں ہی الجھ کر رہ جائے کہ گھر میں دین کا اور عبادات کا ماحول ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ نبی کریمؐ کا معمول یہ تھا کہ آپؐ فرض نماز مسجد میں پڑھا کرتے تھے جبکہ نوافل اور سنتیں زیادہ تر گھر میں پڑھتے تھے۔

نبی کریمؐ کا رات کی عبادت کا معمول

جناب رسول اللہؐ کی رات کی عبادت تو معروف ہے جو آپؐ کی ازواج مطہرات سے مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رات کا ایک حصہ حضورؐ کی عبادت کا ہوا کرتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ عشاء کے بعد جلد سو جاتے تھے اور نصف لیل تک آرام کرتے تھے، پھر جاگ کر ثلث لیل عبادت کیا کرتے تھے اور اس کے بعد پھر سدس لیل آرام کیا کرتے تھے۔ یعنی رات اگر چھ گھنٹوں کی ہو تو تین گھنٹے آپؐ آرام فرماتے تھے پھر دو گھنٹے عبادت فرماتے تھے اور اس کے بعد ایک گھنٹہ پھر آرام فرماتے تھے۔ یہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے رسول اللہؐ کی رات کا معمول بتایا۔ جناب نبی کریمؐ کی رات کی عبادت کیا ہوتی تھی اس کے متعلق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نماز کے قیام میں قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، یہی تہجد کی نماز کہلاتی ہے۔ یہ تہجد بھی ہوتا تھا اور قرآن کریم کی تلاوت بھی ہوتی تھی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''فاقرءوا ما تیسر من القران'' (سورۃ المزمل ۲۰) کہ پس پڑھو جتنا قرآن میں سے آسان ہو۔

ابتداء میں زیادہ تر سورتوں کے حساب سے تلاوت کی جاتی تھی، کبھی سورۃ البقرہ پڑھ لی کبھی سورۃ آل عمران پڑھ لی کبھی سورۃ الانبیاء پڑھ لی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور ام المؤمنین حضرت سلمہؓ دونوں فرماتی ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کھڑے کھڑے حضورؐ کی ٹانگیں سوج جاتی تھیں اور پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔ کبھی کبھار تو ایڑیاں پھٹ جاتی تھیں اور ان میں سے خون رسنے لگتا تھا۔ فرماتی ہیں کہ ہمیں جناب رسول اللہؐ پر ترس آتا تھا کہ حضورؐ اس مشقت کی کیفیت میں عبادت فرما رہے ہیں، یہ بات حضرت ام سلمہؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں نے اپنے اپنے انداز سے حضورؐ سے پوچھی کہ آپؐ یہ مشقت کیوں فرماتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! کیا آپؐ اللہ کے پیغمبر نہیں ہیں؟ فرمایا ہاں پیغمبر ہوں۔ پھر پوچھا کیا آپؐ اللہ کے حبیب نہیں ہیں۔ فرمایا ہاں میں اللہ کا حبیب ہوں۔ پھر پوچھا کیا جنت آپ کے لیے واجب نہیں ہے؟ فرمایا ہاں جنت میرے لیے واجب ہے۔ پھر پوچھا اس سب کے باوجود آپ اتنی زیادہ مشقت کیوں کرتے ہیں کہ آپؐ کی ٹانگیں سوج جاتی ہیں، پاؤں میں ورم آجاتے ہیں، ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں ان میں سے خون رسنے لگتا ہے اور ہم دیکھنے والوں کو آپؐ پر ترس آتا ہے کہ حضورؐ کس مشقت میں پڑے ہوئے ہیں۔

جناب نبی کریمؐ نے اس کے جواب میں ایک جملہ کہہ کر ایک مسئلہ سمجھا دیا ’’افلا اکون عبدا شکورا‘‘ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

حضرات صوفیائے عظام کا اپنا انداز ہوتا ہے بات کو کہنے کا۔ وہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اس جملے میں ایک بنیادی بات سمجھائی ہے۔ حضرت عائشہؓ کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ انسان مشقت کسی نہ کسی چیز کی طلب میں کرتا ہے۔ نماز پڑھنا روزہ رکھنا حج کرنا زکوۃ دینا اور دیگر عبادات کرنا تاکہ اللہ تعالی سے ان کے بدلے میں انعامات ملیں۔ ہمارے ہاں بعض لوگ یہ بات بھی کر دیتے ہیں کہ بھئی ہم نے تو اللہ کی بہت عبادت کی بہت نمازیں پڑھیں لیکن اس کے بدلے میں ہمیں ملا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے اس ذہن کی نفی کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ عائشہ! اگر اللہ تعالی کے مجھ پر احسانات زیادہ ہیں تو کیا میں اللہ تعالی کا شکر بھی زیادہ نہ ادا کروں؟ گویا یہ جو مشقت اٹھا رہا ہوں یہ پچھلے احسانات کا شکرانہ ہے۔ اگر ہم اس بارے میں تصور کریں کہ اللہ تعالی کے ہم پر کتنے احسانات ہیں کیا ان میں سے کسی ایک احسان پر بھی ہم اللہ تعالی کا شکر ادا کر سکتے ہیں؟ ہماری ساری عبادات اگر پچھلے احسانات کے شکرانے میں قبول ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ چنانچہ جناب نبی کریمؐ کا اپنے گھر میں عبادت کا معمول تھا، حضورؐ کی رات کی عبادت اپنی جگہ پر تھی لیکن آپؐ دن میں بھی نفل اور سنت نماز گھر پر پڑھتے تھے۔ آپؐ نے گھر پر نماز پڑھنے کی ترغیب بھی دی۔

گھروں میں نماز پڑھنے کی ترغیب

مسلم شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا ’’صلوا فی بیوتکم ولا تجعلوھا قبورا‘‘ کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ جس گھر میں نماز نہیں ہوتی وہ دراصل قبرستان ہی ہے، جس گھر میں اللہ تعالی کی عبادت نہیں ہوتی وہ روحانی طور پر مردہ انسانوں کا گھر ہے۔ آباد گھر وہ ہے جس میں اللہ تعالی کی عبادت ہوتی ہے۔ گھر میں نماز پڑھنے کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے رحمت کے فرشتے آتے ہیں جو گھر میں برکت کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ہمیں اپنے گھروں کے ماحول کے متعلق بہت تشویش ہوتی ہے، عام طور پر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ گھروں میں برکت نہیں رہی نحوست کا ماحول ہے، کسی نے کاروبار میں رکاوٹ ڈال دی، کسی نے رشتوں میں رکاوٹ ڈال دی اور یہ کہ کسی نے کوئی جادو ٹونہ وغیرہ کر دیا ہے۔ جادو

کے اثرات سے انکار نہیں ہے لیکن اس بات کو ہم نے اپنے اعتقاد میں بہت زیادہ جگہ دے دی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر ہم گھر میں رحمت کا ماحول پیدا کریں گے تو رحمت آئے گی لیکن اگر اس کے برعکس لعنت والے کاموں کا ماحول پیدا کریں گے تو لعنت آئے گی۔

میں اس کی مثال پیش کیا کرتا ہوں کہ گھر میں اگر صفائی ہوگی تو خوشبو ہوگی لیکن گھر میں اگر گندگی ہوگی تو بدبو کا ماحول ہوگا۔ اگر گھر میں باغیچہ ہوگا تو تتلیاں اور بلبلیں آئیں گی لیکن اس کے برعکس گھر کے صحن میں گندگی پڑی ہوگی تو اس میں کیڑے مکوڑے پیدا ہوں گے اور اس پر مکھیاں و مچھر آئیں گے۔ اسی طرح اگر گھر میں نماز کا اور قرآن کریم کی تلاوت کا ماحول ہوگا تو اللہ کی رحمت کے فرشتے آئیں گے اور برکات نازل ہوں گی لیکن آج کل جو کچھ ہمارے گھروں میں ہوتا ہے اس کی دلچسپی والی مخلوق بھی دنیا میں موجود ہے، ہم اپنے گھروں کے ماحول سے شیطانی مخلوق کو دعوت دیں گے تو پھر لازمی بات ہے کہ وہ اپنے اثرات بھی چھوڑ کر جائیں گے۔ یہ اثرات نحوست، بے برکتی اور بے چینی کی صورت میں ہوتے ہیں۔ گھر کا ماحول بنانا گھر کے مکینوں کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے حضورؐ کے اس فرمان "صلوا فی بیوتکم" پر عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے رحمت کے فرشتے گھروں میں آتے ہیں اور جہاں اللہ کی رحمت کے فرشتے آتے ہیں وہاں شیطانی مخلوق کا داخلہ ممنوع ہو جاتا ہے۔

دوسرا بڑا فائدہ اس کا محدثین یہ بیان فرماتے ہیں کہ جب گھر میں نماز کا ماحول ہوگا تو پھر گھر کے بچوں کو اور دیگر افراد کو نماز کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ وہ خود اس ماحول کے اثرات سے نمازیں پڑھیں گے۔ یوں گھروں میں نماز پڑھنے سے تربیت کا ماحول پیدا ہوگا کہ بچے ماحول کے اثرات کو بہت تیزی کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ جناب رسول اللہؐ نے گھر کے معمولات کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور ضروریات زندگی کو نظر انداز نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ آپؐ نے گھر میں نماز کا اور قرآن کریم کی تلاوت کا ماحول بھی رکھا۔ چنانچہ امہات المؤمنین یہ بات فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریمؐ گھر کے ماحول میں جہاں گھر کی ضروریات اور تقاضوں کا لحاظ رکھتے تھے وہاں گھر میں دینی ماحول بھی قائم رکھتے تھے۔

گھر میں دینی ماحول، گھر کے سربراہ کی ذمہ داری

جناب رسول اللہؐ کی تعلیمات کی رو سے گھر کے اندر دینداری کا ماحول پیدا کرنا گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہے۔ آپؐ نے فرمایا ''کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ'' کہ تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ راعی چرواہے کو کہتے ہیں۔ ایک روایت میں حضورؐ نے خود اس کی تشریح فرمائی کہ چرواہے کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے، فرمایا کہ چرواہے کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی بکریوں اور بھیڑوں کو اچھی چراگاہ میں لے کر جائے کہ وہ اچھی غذا کھا سکیں، انہیں اچھے چشمے پر لے جائے کہ انہیں پینے کے لیے صاف پانی میسر ہو اور انہیں موسمی اثرات سے اور دشمن سے بچائے۔ پھر جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بھیڑ بکری کا دشمن بھیڑیا ہے جبکہ انسان کا دشمن شیطان ہے۔ یوں گھر کے سربراہ کی بھی یہی ذمہ داری ہے کہ ضروریات زندگی مہیا کرے، یعنی خوراک، تعلیم، لباس، رہائش وغیرہ اور اس کے ساتھ شیطان کے نرغے سے اپنی اولاد کو بچانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ گھر کی عورت کے متعلق آپؐ نے فرمایا ''والمراءۃ راعیۃ فی بیت زوجہا'' کہ عورت اپنے خاوند کے گھر کی نگہبان ہے۔ یعنی مرد گھر سے باہر کے کاموں کا ذمہ دار ہے جبکہ عورت گھر کے اندر کے معاملات کی ذمہ دار ہے۔ آپ نے فرمایا ''کلکم مسئول عن رعیتہ'' کہ ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ قیامت کے دن ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ یہ معاملہ تمہارے سپرد کیا گیا تھا تم نے یہ ذمہ داری کس طرح نبھائی۔ مرد و عورت دونوں اپنے اپنے دائروں کے اندر معاملات کے ذمہ دار ہیں، ہر ایک سے اس کے اختیار کے مطابق اس کی ذمہ داریوں کے متعلق باز پرس ہوگی۔

رمضان المبارک میں حضورؐ کا معمول

ایک روایت میں آتا ہے کہ جب رمضان المباک کا آخری عشرہ آتا تھا تو ''احیی لیلہ وشد مئزرہ وأیقظ أھلہ''۔ کمر باندھنا ایک محاورہ ہے۔ یعنی حضورؐ رمضان کے آخری عشرے میں نماز، روزہ اور عبادات کے لیے کمر کس لیتے تھے۔ دوسرا یہ کہ آپ رات کو زندہ کرتے تھے یعنی عام دنوں میں آپؐ رات کا تیسرا حصہ عبادت کرتے تھے جبکہ رمضان میں ساری رات عبادت فرمایا کرتے تھے۔ تیسرا جملہ یہ ہے کہ اکیلے نہیں بلکہ گھر والوں کو بھی عبادت کے لیے بیدار کیا کرتے تھے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ حضورؐ گھر والوں کو ترغیب بھی دیتے تھے

اور اس پر کچھ سختی بھی فرمایا کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ رمضان کی ایک رات میں حضورؐ عبادت کر رہے تھے کہ اچانک فرمایا دیکھو اللہ کی کتنی انوار و برکات نازل ہو رہی ہیں، کوئی جا کر ان حجرے والیوں کو بھی جگائے کہ اللہ کی بندیو! اللہ کی رحمتیں بانٹی جا رہی ہیں، اٹھو اور اللہ کی ان رحمتوں اور برکتوں سے اپنا حصہ وصول کرو۔

حضرت انس بن مالکؓ حضورؐ کے ذاتی خادم تھے۔ جب حضورؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت انس بن مالکؓ دس سال کے تھے۔ ان کی والدہ بہت سمجھدار خاتون تھیں وہ حضرت انسؓ کو حضورؐ کی خدمت میں لے کر آئیں اور کہا کہ یا رسول اللہؐ میرے پاس اور تو کچھ نہیں ہے لیکن یہ میرا بیٹا آپ کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ حضرت انسؓ نے دس سال تک حضورؐ کی خدمت میں صرف کیے، آپؐ کے وصال کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ حجاب کے احکامات تک تو ان کا حضورؐ کے گھر میں آنا جانا تھا لیکن بعد میں پردے کا لحاظ رکھ کر خدمت بجا لاتے تھے۔ ایک روایت میں حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریمؐ نے زندگی بھر کسی عورت پر، کسی بچے پر اور کسی خادم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ گھر کے کام کاج کا کوئی نقصان ہو جاتا کوئی برتن ٹوٹ جاتا کوئی چیز ضائع ہو جاتی تو حضورؐ نے اس پر کبھی ڈانٹا نہیں۔ البتہ دینی کاموں میں کمی و کوتاہی پر حضورؐ سختی فرمایا کرتے تھے۔

جناب نبی کریمؐ کے گھر کے ماحول کے متعلق ازواج مطہرات نے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ میں نے اصولی طور پر یہ بات عرض کی ہے کہ گھر کے ماحول کے بارے میں جناب نبی کریمؐ نے دونوں باتوں کی طرف بیک وقت تلقین فرمائی ہے کہ سب کے حقوق بھی بوقت ضرورت ادا کرنے ضروری ہیں اور اللہ کے ساتھ تعلق برقرار رکھنا بھی لازمی ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے ان دونوں معاملات کے درمیان توازن قائم کر کے اپنی امت کے لیے ایک عملی نمونہ پیش کیا۔ جناب نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے آپؐ کی گھریلو زندگی کی ایک جھلک میں نے آپ سامنے پیش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جناب رسول اللہؐ کے اسوہ کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

نبی اکرمؐ کا خطبہ حجۃ الوداع

(دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۳ ستمبر ۲۰۰۷ء)

(دارالہدیٰ، اسپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ میں ۳ تا ۷ ستمبر ۲۰۰۷ء منعقد ہونے والی مختلف نشستوں کے بیانات کا مجموعہ۔)

حجۃ الوداع کی اصطلاح

جناب سرور کائنات، فخر موجودات، شفیع المذنبین، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ واتباعہ وسلم کا ہر ایک ارشاد، ہر جملہ اور ہر لفظ اہمیت کا حامل ہے اور ان میں ہمارے لیے ہدایت اور راہنمائی کے بہت سے پہلو ہیں۔ لیکن جناب نبی کریمؐ کے ہزاروں ارشادات عالیہ میں جن چند ارشادات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ان میں حجۃ الوداع کا خطبہ بھی شامل ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے جو آخری حج کیا، اسے دو حوالوں سے حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ ایک اس حوالہ سے کہ آپؐ نے آخری حج وہی کیا، اور اس حوالے سے بھی کہ نبی کریمؐ نے خود اس خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ

ایھا الناس انی واللہ لا ادری لعلی لا القاکم بعد یومی ھذا۔ (دارمی، ۲۲۹۔ مسند ابی یعلی، ۴۱۳۷۔ مستدرک حاکم، ۲۹۴)

"اے لوگو! بخدا مجھے معلوم نہیں کہ آج کے بعد میں اس جگہ تم سے مل سکوں گا یا نہیں"۔

یعنی حضورؐ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ میں اپنے صحابہؓ سے آخری اجتماعی ملاقات کر رہا ہوں۔ آپؐ نے بطور خاص فرمایا کہ مجھ سے باتیں پوچھ لو، سیکھ لو، جو سوال کرنا ہے وہ سوال کر لو، شاید اس سال کے بعد میں تم لوگوں سے اس طرح کی ملاقات نہ کر سکوں، گویا حضورؐ خود بھی الوداع کہہ رہے تھے۔ اس مناسبت سے اس حج کو حجۃ الوداع کہتے ہیں۔

نبی کریمؐ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا اور وہ حج یہی تھا۔ جب حضورؐ کا ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں قیام تھا، ۵۳ سال کی عمر تک آپؐ حج کرتے رہے۔ آپؐ نے کتنے حج ادا کیے ان کی تعداد ذکر نہیں ہے۔ محدثین یہ فرماتے ہیں کہ جب سے حضورؐ نے ہوش سنبھالا اور مکہ میں رہے تو ظاہر ہے کہ ہر سال حج میں شریک ہوتے رہے ہوں گے۔ روایات میں یہ ذکر آتا ہے کہ حج کے موقع پر جو اجتماع ہوتا تھا، منیٰ میں، عرفات میں، لوگ دنیا کے

مختلف حصوں سے حج کے لیے آتے تھے، تو نبی کریمؐ اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ آپؐ مختلف خیموں میں جاتے تھے، لوگوں سے ملتے تھے اور دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ انصار مدینہ کے دونوں گروہوں اوس اور خزرج کے ساتھ رسول اللہؐ کا جو رابطہ ہوا، وہ حج ہی کے موقع پر ہوا۔ ان دونوں قبائل کے لوگ حج کے لیے آئے ہوئے تھے، حضورؐ مختلف خیموں میں جاکر دعوت دے رہے تھے تو انہوں نے آپؐ کی بات توجہ سے سنی اور قبولیت کا اظہار کیا۔

حجۃ الوداع کی پیشگی تیاری

رمضان المبارک ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ ۹ھ میں مسلمانوں نے اجتماعی طور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امارت میں پہلا حج ادا کیا۔ حضورؐ اس حج میں خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ حضرت ابوبکر صدیق کو مدینہ سے امیر حج بناکر بھیجا اور ان کے ذریعے حج کے موقع پر کچھ اعلانات کروائے۔ ان کے بعد حضرت علیؓ کو بھیجا، کچھ اعلانات ان کے ذریعے کروائے اور آئندہ سال اپنے حج کے لیے تیاری کی (بخاری، رقم ۳۵۶)۔ اس تیاری میں دو تین باتیں اہم تھیں۔ پہلی یہ کہ مختلف عرب قبائل کے ساتھ جو معاہدات تھے، ان میں سے کچھ کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرنا تھا اور کچھ کو ختم کرنے کا۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ آئندہ سال اپنے حج سے پہلے حضورؐ مکہ کے ماحول میں کچھ صفائی چاہتے تھے۔ مثلاً پہلے ہر قسم کے لوگ حج کے لیے آجاتے تھے، آپؐ نے اعلان کروادیا کہ آج کے بعد کوئی غیر مسلم یہاں نہیں آئے گا، یہ بیت اللہ صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے، یہ بیت اللہ ابراہیمی ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے لیے مخصوص ہے۔ اسی طرح پہلے بہت سے لوگ حج کے لیے آتے تو ننگے طواف کرتے، مرد بھی اور عورتیں بھی۔ عورتوں نے معمولی سا لنگوٹی طرز کا کوئی کپڑا پہن رکھا ہوتا تھا۔ اور کہتے تھے کہ یہ نیچر ہے کہ ہم دنیا میں بھی ننگے آئے تھے اس لیے ہم اللہ کے دربار میں ننگے ہی پیش ہوں گے۔ بعض روایات (مسلم، رقم ۵۳۵۳) میں ذکر ہے کہ مرد تو تلبیہ پڑھتے تھے لیکن عورتیں کچھ اشعار پڑھتی تھیں، مثلاً

الیوم یبدو بعضہ أو کلہ فما بدا منہ فلا أحلہ

جن کا مطلب یہ تھا کہ ہم اللہ کے دربار میں اس کیفیت (ننگی حالت) میں پیش ہیں۔ ہمارا سارا ستر یا اس کا کچھ حصہ دکھائی دے گا لیکن ہم اپنے آپ کو کسی پر حلال نہیں کرتیں کہ وہ ہماری طرف دیکھے۔ عورتیں اس طرح کے اشعار پڑھتی ہوئی طواف کیا کرتی تھیں۔ نبی

کریمؐ نے یہ اعلان بھی کروا دیا کہ آج کے بعد کوئی شخص ننگا طواف نہیں کرے گا۔ عورتیں تو مکمل لباس میں ہوں گی اور باحیا و باوقار طریقہ سے آکر طواف کریں گی۔ اور مرد بھی اپنا جسم مکمل طور پر ڈھانپیں گے لیکن دو چادروں سے۔

یہ دو اعلان حضورؐ نے اگلے سال کے لیے کروا دیے کہ اگلے سال کوئی غیر مسلم حج کے لیے نہیں آئے گا اور کوئی ننگا طواف نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ اور بھی متفرق اعلانات کروائے کہ آج کے بعد حج میں فلاں عمل ہوگا اور فلاں نہیں ہوگا۔ پھر اس اہتمام کے ساتھ نبی کریمؐ نے پورا سال مختلف قبائل میں پیغامات بھیجے کہ آئندہ سال رسول اللہؐ حج کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں اس لیے جو مسلمان بھی اس موقع پر پہنچ سکتا ہے، پہنچے۔ چنانچہ پورا سال یہ اعلانات ہوتے رہے، لوگوں تک یہ پیغام پہنچتا رہا کہ جس مسلمان نے حضورؐ کی رفاقت حاصل کرنی ہے، معیت حاصل کرنی ہے، جس نے آپؐ سے کوئی بات پوچھنی ہے تو وہ حج پر پہنچے۔ اس طرح ۱۰ھ کے حج کے لیے پورے اہتمام کے ساتھ جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں سے لوگ آئے۔ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حجۃ الوداع کے موقع پر جمع ہوئے۔ یہ جناب نبی کریمؐ کی حیات مبارکہ میں صحابہؓ کا سب سے بڑا اجتماع تھا، حضورؐ کی حیات میں اس سے بڑا صحابہؓ کا اجتماع نہیں ہوا۔ صحابہ کرامؓ مختلف علاقوں سے آئے اور انہوں نے نبی کریمؐ کے ساتھ حج ادا کیا۔

حجۃ الوداع کے خطبات

اس حج کے موقع پر حضورؐ نے بہت سی ہدایات فرمائیں۔ خطبہ حجۃ الوداع جسے کہتے ہیں، یہ حضورؐ کی مختلف ہدایات کا مجموعہ ہے۔ ان میں دو تو بڑے خطبے ہیں۔ ایک خطبہ حضورؐ نے عرفات میں ارشاد فرمایا، یہی خطبہ سنت رسولؐ کے طور پر اب بھی ۹ ذی الحجہ کی دوپہر کو عرفات کے میدان میں پڑھا جاتا ہے۔ دوسرا خطبہ وہ ہے جو حضورؐ نے منیٰ میں ارشاد فرمایا۔ یہ دو تو باقاعدہ خطبے ہیں۔ جبکہ امام قسطلانیؒ نے ''المواہب اللدنیۃ'' میں حضرت امام شافعیؒ کے حوالہ سے چار خطبات کا ذکر کیا ہے۔ اس موقع پر صحابہ کرامؓ کثیر تعداد میں تھے، انہوں نے نبی کریمؐ سے خطبات سنے، جس کو جو بات یاد رہی اس نے وہ آگے نقل کر دی۔ اس کے علاوہ آنحضرتؐ سے بہت سے سوالات پوچھے گئے جن کے آپؐ نے جوابات دیے۔ حضورؐ نے حج کے مختلف مسائل کے بارے میں بھی ہدایات دیں۔ صحابہ کرامؓ سے عرفات اور منیٰ میں نبی کریمؐ نے جو کچھ فرمایا، صحابہ کرامؓ نے جو جو بات یاد رکھ کر آگے منتقل

کی، اس کو محدثین نے محفوظ کیا۔ ان سب کا مجموعہ محدثین کی اصطلاح میں ''حجۃ الوداع کا خطبہ'' کہلاتا ہے۔ اس میں عرفات و منیٰ کے دو خطبے بھی شامل ہیں اور مختلف مواقع پر نبی اکرمؐ کے دیگر عمومی خطابات بھی شامل ہیں۔ وہ زمانہ لکھنے پڑھنے کا زمانہ نہیں تھا بلکہ یادداشت کا زمانہ تھا اور یادداشت پر لوگ اعتماد کرتے تھے۔ یہ حجۃ الوداع کا خطبہ بیسیوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سینکڑوں روایات میں نقل ہوا ہے۔

اس حجۃ الوداع کے خطبہ پر محدثین نے مختلف ادوار میں کام کیا ہے۔ حجۃ الوداع کی اہمیت کی ایک بات تو یہ ہے کہ یہ حضورؐ کی حیات مبارکہ میں صحابہؓ کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ دوسرا یہ کہ حضورؐ نے خود اپنی زبان مبارک سے فرمایا کہ شاید یہ میری تمہاری آخری اجتماعی ملاقات ہو۔ اور پھر ایک بہت اہمیت والی بات یہ ہے کہ اس موقع پر ہی آیت تکمیل دین نازل ہوئی۔

دور جاہلیت کا خاتمہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر بہت اہم اعلانات فرمائے۔ مثلاً آپؐ نے ایک بڑی اہم اور تاریخی بات یہ فرمائی کہ یاد رکھو! جاہلیت کا دور ختم ہوگیا ہے اور اسلام کا دور شروع ہوگیا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ

الا کل شئ من امر الجاہلیۃ تحت قدمی موضوع۔ (مسلم، ۲۱۳۷)

''آگاہ رہو! جاہلیت کا ہر کام میں اپنے ان دونوں قدموں کے نیچے دفن کر رہا ہوں۔''

آج کل دنیا میں ایک مسئلہ چلتا ہے روشن خیالی اور تاریک خیالی کا۔ دور علم کا اور دور جاہلیت کا۔ ہمیں تلقین ہوتی ہے کہ دور علم اختیار کریں اور دور جاہلیت چھوڑیں۔ جاہلیت کی بات چھوڑیں اور علم کا راستہ اختیار کریں۔ اب روشن خیالی سے کون انکار کرے گا؟ کوئی عقل مند اور دانش ور آدمی روشن خیالی اور علم کی بات سے انکار نہیں کر سکتا اور جاہلیت کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن اصطلاحات کا فرق ہے۔ روشن خیالی کسے کہتے ہیں اور تاریک خیالی کسے کہتے ہیں؟ جاہلیت کا دور کون سا ہے اور علم کا دور کون سا ہے؟ اپنی اپنی اصطلاحات اور تعریفات ہیں۔ چنانچہ چند بنیادی فرق ہیں جن کو اس کشمکش میں سمجھنا ضروری ہے اور اس میں بنیادی کردار رسول اللہؐ کا یہ ارشاد ادا کرتا ہے کہ آج جاہلیت کی ساری قدریں میرے ان پاؤں کے نیچے ہیں۔

مغرب کی روشن خیالی اور اسلام

مغرب کی روشن خیالی میں اور ہماری روشن خیالی میں تین بنیادی فرق ہیں۔

دور علم اور دور جاہلیت: پہلا بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب کی روشن خیالی کی عمر تقریباً سوا دو سو سال ہے، جبکہ ہماری روشن خیالی کی عمر تقریباً چودہ سو سال ہے۔ مغرب کی روشن خیالی کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوتا ہے۔ جب بھی مغرب میں روشن اور تاریک دور کی بات ہوتی ہے تو حد فاصل انقلاب فرانس قرار پاتی ہے۔ مغرب کے ہاں اس سے پہلے کا دور جاہلیت اور جبر کا دور کہلاتا ہے جبکہ اس کے بعد کا دور ترقی اور روشن خیالی کا دور کہلاتا ہے۔ ان سے آپ پوچھ لیں کہ یہ قرون وسطی، قرون مظلمہ، تاریک دور (Dark ages) کسے کہتے ہیں تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ یہ انقلاب فرانس سے پہلے کی دو چار صدیاں ہیں۔ جبکہ انقلاب فرانس اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہوا۔ جس طرح مغرب کے حلقوں میں یہ بات معروف ہے کہ فلاں بات تاریک دور کی بات ہے اور فلاں بات روشن دور کی بات ہے، اسی طرح ہمارے ہاں بھی ایک اصطلاح معروف ہے۔ رسول اللہؐ کی بعثت سے پہلے کا کوئی واقعہ ذکر کرنا مقصود ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ دور جاہلیت کی بات ہے۔ یعنی یہ ٹرمینالوجی ہمارے ہاں بھی ہے کہ حضورؐ سے پہلے کا دور جاہلیت کا دور تھا اور حضورؐ کے آنے سے علم کا، روشنی کا دور شروع ہوا۔

وحی الٰہی اور انسانی سوسائٹی: دوسرا بنیادی فرق مغرب کی اور ہماری روشن خیالی میں یہ ہے کہ مغرب نے روشن خیالی کے نام پر بادشاہت سے نجات حاصل کی، جاگیرداری سے نجات حاصل کی، اور ساتھ ہی ساتھ بائبل اور چرچ سے بھی نجات حاصل کر لی۔ یعنی وہ وحی کی بالادستی سے بھی دستبردار ہو گئے اور کہا کہ ہم کسی کی ڈکٹیشن نہیں مانتے، ہم آزاد ذہن سے فیصلے کرتے ہیں۔ مغرب نے اپنے تمام تر فلسفے، عقائد اور فیصلوں کی بنیاد انسانی سوسائٹی کی خواہشات پر رکھی ہے۔ ہر چیز کی بنیاد اس پر ہے کہ سوسائٹی کیا چاہتی ہے۔ جمہوریت تو سوسائٹی کی خواہش معلوم کرنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن اصل بنیاد سوسائٹی کی خواہشات پر ہے کہ سوسائٹی کیا سوچتی ہے اور سوسائٹی کیا چاہتی ہے۔ یہی حلال و حرام کی بنیاد ہے، یہی جائز ناجائز کی بنیاد ہے اور یہی قانون اور لاقانونیت کی بنیاد ہے۔ چنانچہ مغرب نے آسمانی تعلیمات سے دستبرداری اختیار کی اور انسانی سوسائٹی کی خواہشات کو اپنے تمام تر معاملات کی بنیاد بنایا اور کہا کہ یہ روشن خیالی ہے۔

قرآن کریم نے روشن خیالی کا اور معنی بیان کیا ہے۔ قرآن کریم نے بیسیوں مقامات پر اس کے متعلق بیان فرمایا، مثلا

وان احکم بینھم بمآ انزل اللہ ولا تتبع اھوآء ھم واحذرھم ان یفتنوک عن بعض مآ انزل اللہ الیک۔ (المائدہ ۵۔ آیت ۴۹)

"اور یہ کہ تو ان لوگوں میں اس کے موافق حکم کر جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر اور ان سے بچتا رہ کہ تجھے کسی ایسے حکم سے بہکا نہ دیں جو اللہ نے تجھ پر اتارا ہے"۔

جناب نبی کریمؐ کو قرآن کریم نے حکم دیا کہ لوگوں کے معاملات کو وحی کے مطابق طے کیجیے اور وحی کے مقابلے میں ان کی خواہشات کی طرف مت دیکھیے۔ مطلق خواہشات کی نفی نہیں ہے بلکہ ایسی خواہشات کی نفی ہے جو وحی یعنی اللہ کے نازل کردہ احکامات وہدایات کے مقابلے پر آئیں۔ اگر سوسائٹی کوئی جائز بات چاہتی ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں لیکن بالادستی وحی کی ہے۔ فرمایا کہ جہاں اللہ کی ہدایات کا مسئلہ آئے وہاں ان کی خواہشات کی طرف مت دیکھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی فرمایا کہ اس بات سے ڈرتے رہیں کہ سوسائٹی کی خواہشات کے پیچھے اگر آپ چلیں گے تو یہ اللہ کے احکام کے بارے میں آپ کو فتنے میں ڈال دیں گے۔

تو ہمارے نزدیک روشن خیالی نام ہے سوسائٹی کی خواہشات سے نکل کر وحی کی پیروی کا، جبکہ مغرب کے نزدیک روشن خیالی نام ہے وحی کے دائرہ سے نکل کر انسانی خواہشات کی پیروی کا۔ چنانچہ جو چیز ہمارے نزدیک علم ہے وہ مغرب کے نزدیک جہالت ہے، اور جو چیز ہمارے نزدیک تاریکی اور جہالت ہے وہ مغرب کے نزدیک روشن خیالی ہے۔ یہ ایک جوہری فرق ہے مغرب کی اور ہماری اصطلاح میں۔ اور اس بات کا ہم نے بیسیوں بار تجربہ کیا ہے کہ کسی بھی مسلم ملک میں قرآن کریم کے کسی حکم یا نبی کریمؐ کے کسی ارشاد کے بطور قانون نفاذ کا مطالبہ کیا جائے تو مغرب اور مغرب زدہ حلقوں سے ہمیں ایک بات مشترکہ طور پر جواب میں ملتی ہے کہ یہ لوگ تاریکی کے دور کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں، یہ قرون مظلمہ کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔

جاہلی قدروں کی طرف واپسی: تیسرا فرق مغرب اور ہماری روشن خیالی میں یہ ہے کہ جب جناب نبی اکرمؐ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ جاہلیت کی ساری قدریں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ گویا آپؐ ارشاد فرما رہے ہیں کہ جاہلیت کا دور ختم ہوا اور میں جاہلیت کی ساری

قدریں اپنے پاؤں کے نیچے روند کر نسل انسانی کو علم کے دور کی طرف لے کر آگے بڑھ رہا ہوں۔ اس سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے مبارک قدموں کے نیچے کون کون سی قدریں پامال ہوئیں؟ ہمیں اس کا ذرا تجزیہ کر لینا چاہیے کہ وہ کون سی قدریں تھیں جو حضورؐ کے اعلان نبوت سے پہلے عرب معاشرہ میں موجود تھیں لیکن اعلان تکمیل دین تک مٹ چکی تھیں۔

ان قدروں میں ایک قدر تھی شرک۔ یہ بیس سال پہلے پورے عروج پر تھا لیکن اب جزیرۃ العرب میں کوئی بت خانہ باقی نہیں تھا۔ اور حضورؐ نے مکہ مکرمہ میں لوگوں کو اپنی دعوت کا بنیادی پیغام یہ بتایا تھا کہ

یا ایھا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا۔ (مسند احمد، رقم ۱۵۴۴۸)

"اے لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تاکہ تم فلاح پا جاؤ"۔

ایک قدر نسل پرستی کی تھی کہ عرب معاشرے میں عرب اور عجم، کالے اور گورے کا فرق تھا، حضورؐ نے اسے ختم کیا۔ اس کے علاوہ شراب تھی، لاٹری اور جوا تھا، سود تھا، بے حیائی اور زنا تھا، ہم جنس پرستی تھی، یہ ساری قدریں بیس سال پہلے اپنے پورے عروج پر تھیں۔ لیکن جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہ ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں تو ان قدروں کا عرب معاشرے میں کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا۔ اور جو سوسائٹی حضورؐ نے متعارف کروائی وہ حقیقی انسانی قدروں سے مالا مال تھی۔ چنانچہ حضورؐ نے صرف ان جاہلی قدروں کو ختم کرنے کا اعلان ہی نہیں کیا بلکہ دنیا کو ایک ایسی سوسائٹی بنا کر دکھا دی جس میں شرک، زنا، شراب، سود، ناچ گانا، فحاشی، جوا، نجوم پرستی اور نسل پرستی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اور جب اپنے اعلان نبوت کے بائیس تیئس سال بعد منیٰ کے مقام پر کھڑے ہو کر حضورؐ نے کل امر الجاھلیۃ موضوع تحت قدمی کہہ کر اپنی دعوت کے نتیجے کا اعلان کیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے جو کام آپؐ کو دے کر بھیجا تھا آپؐ اس میں کامیاب ہو چکے تھے۔

تاریخ میں اور کوئی شخصیت آپ کو ایسی نہیں ملے گی جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں اپنا کام، اپنا مشن مکمل کر کے جا رہا ہوں۔ تاریخ انسانی میں حضورؐ وہ واحد شخصیت ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنا مشن پورا کیا۔ اور نہ صرف پورا کیا بلکہ تکمیل پر اپنے صحابہؓ کو اس پر گواہ بنایا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا وانتم تسئلون عنی کہ قیامت کے روز تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ جب قیامت کا دن ہوگا، اللہ کی عدالت ہوگی تو اللہ تم لوگوں سے پوچھے گا کہ تمہاری طرف ایک پیغمبر کو مشن دے کر، پیغام دے کر

بھیجا تھا، اس نے اپنا فرض ادا کیا یا نہیں، تو تم لوگ کیا جواب دو گے؟ اس پر صحابہؓ نے اجتماعی آواز سے کہا بلغت وادیت ووفیت آپ نے پیغام پہنچا دیا اور پہنچانے کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ حضورؐ نے اس پر آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا اللّھم اشھد یا اللہ تو گواہ رہنا۔

آج جب ہم روشن خیالی اور تاریک خیالی کی بحث میں پڑتے ہیں تو میں ایک سوال کیا کرتا ہوں کہ مغرب نے روشن خیالی کے نام پر ان قدروں میں کون سی قدر کا اضافہ کیا ہے؟ یہ تو وہی پامال قدریں ہیں جنہیں آج سے چودہ سو سال پہلے رسول اللہؐ نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ مغرب ایک بہت اچھا بیوٹی پارلر ہے جس نے پرانی اور گھسی پٹی قدروں کو بیوٹی پارلر سے گزار کر نئے میک اپ کے ساتھ دنیا کے سامنے نئی تہذیب بنا کر پیش کر دیا ہے، جبکہ حقیقت میں یہ وہی جاہلیت قدیمہ ہے جو ابو جہل کے حوالے سے منسوب ہو تو وہ جاہلی قدر کہلاتی ہے اور آج مغرب کے حوالے سے منسوب ہو تو اسے آرٹ اور کلچر کا نام دیا جاتا ہے۔

آسمانی تعلیمات یا انسانی خواہشات؟

چنانچہ نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ ایک تاریخی اعلان فرمایا کہ جاہلیت کا دور ختم ہو گیا ہے اور علم کا دور شروع ہو رہا ہے۔ حضورؐ نے علم کس چیز کو قرار دیا؟ آنحضرتؐ نے وحی کو، آسمانی تعلیمات کو، انبیاء کو، کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کو علم قرار دیا۔ آج بھی دنیا میں اسی بات کا جھگڑا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ کلچرل وار ہے، سولائزیشن کی جنگ ہے اور تہذیب و ثقافت کی جنگ ہے، اصل میں بنیادی اختلاف اسی پر ہے کہ ہم نے اپنی خواہشات پر چلنا ہے یا آسمانی تعلیمات کی بالادستی قبول کرنی ہے۔ اس کو آپ کچھ بھی عنوان دے دیں، جھگڑا دراصل یہی ہے۔ یہ پچھلے سال کارٹونوں کا مسئلہ چلا تھا۔ ڈنمارک کے صحافی فلیمنگ روز نے جناب نبی اکرمؐ کی توہین پر مبنی کے کارٹون چھاپے تھے، اس پر بڑی بحث چلی تھی اور خود فلیمنگ روز کا ایک طویل مضمون چھپا تھا۔ اس مضمون میں چند ایک باتیں اس گفتگو سے متعلق ہیں، میں وہ عرض کرتا ہوں۔ فلیمنگ نے کہا کہ ہم میں اور مسلمانوں میں فکری، ثقافتی یا تہذیبی طور پر کیا فرق ہے۔ اور کہا کہ ہم نے تو خدا، رسول اور کتاب کا حوالہ اپنے ذہنوں سے اتار دیا ہے۔ ہم کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ بائبل میں کیا لکھا ہے، کوئی قانون طے کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کیا کہتا ہے، اور کوئی بات کہتے وقت عیسیٰ کا حوالہ نہیں دیتے کہ انہوں نے اس بارے میں کیا کہا تھا۔ ہم تو آزاد ذہن سے فیصلے

کرتے ہیں۔ پھر کہا کہ مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول اور کتاب کا حوالہ اپنے ذہنوں پر مسلط رکھا ہوا ہے۔ یہ فرق ہے جس کی وجہ سے ہم میں اور مسلمانوں میں ایڈ جسٹمنٹ نہیں ہو رہی۔

فلیمنگ روز کی یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مسلمان کتنے ہی بے عمل اور بد عمل کیوں نہ ہوں لیکن آج کے زمینی حقائق میں یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ ہماری کمٹمنٹ آج بھی قائم ہے۔ خدا اور رسول کا حوالہ ہمارے ذہنوں سے اترا نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے لیے تو خوشی کا باعث ہے لیکن دنیا کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ اور یہ حوالہ اتنا مضبوط ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں بھی بد عمل سے بد عمل اور بے عمل سے بے عمل مسلمان کو بھی اگر آپ نے خطاب کرنا ہے تو آپ کو خدا اور رسول کے حوالے سے بات کرنا ہوگی ورنہ آپ کی بات نہیں سنی جائے گی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی وہ لوگ جو سراسر قرآن و سنت کے خلاف بات کرتے ہیں، وہ حوالہ خدا اور رسول کا ہی دیں گے اور وہیں سے کوئی بات تاویل کر کے نکالیں گے۔ اگر یہ حوالہ نہیں دیں گے تو اس معاملہ میں ان کی بات نہیں سنی جائے گی۔

مغربی صحافی نے یہ تشویش ظاہر کی کہ ہم نے تو یہ حوالہ چھوڑ دیا لیکن مسلمان یہ حوالہ کیوں نہیں چھوڑ رہے۔ میں بھی لکھنے پڑھنے کے شعبہ کا آدمی ہوں، کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ اس پر میں نے فلیمنگ روز سے ایک مضمون میں سوال کیا کہ تم لوگوں کے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا ہے؟ کس بات کا رعب جماتے ہو ہم پر؟ تمہاری انجیل دنیا میں اس وقت ہے کہیں؟ تورات کا وجود ہے کہیں دنیا میں؟ لیکن ہمارے پاس تو کتاب اللہ موجود ہے اور سنت رسولؐ موجود ہے۔ یہ بہت بڑا بنیادی فرق ہے۔ دنیا کا کوئی یہودی دنیا کے کسی حصے میں تورات کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہے کہ یہ وہ تورات ہے جو موسی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اور دنیا کا کوئی عیسائی دنیا کے کسی حصے میں انجیل کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہے کہ یہ وہ انجیل ہے جو عیسی علیہ والسلام پر نازل ہوئی تھی۔ کوئی یہودی اور کوئی عیسائی یہ دعوی نہیں کر سکتا۔ جبکہ دنیا کا کوئی بھی مسلمان دنیا کے کسی بھی خطے میں قرآن کریم کے کسی بھی نسخے پر ہاتھ رکھ کر پوری تسلی کے ساتھ یہ کہہ دے گا کہ یہ وہ قرآن ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔

آج کل ایک فلم حضرت عیسی علیہ السلام پر بن رہی ہے۔ ایک فلم اس سے پہلے بھی بن چکی ہے۔ اس فلم کے حوالے سے دنیا میں ایک بحث چلی، ایک مغربی دانشور نے سوال کیا کہ بھئی عیسی پر فلم تو تم نے بنالی لیکن اس کا مواد کہاں سے لیا؟ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس عیسی کی حیات پر چند واقعات سے زیادہ کوئی مستند مواد نہیں ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ایک مستند حوالہ تصور کیا جاتا ہے۔ تو اس مغربی دانشور نے یہ حوالہ دے کر سوال اٹھایا کہ تم نے فلم تو بنالی لیکن مواد کہاں سے لائے ہو؟

الحمدللہ ہم مسلمانوں کے پاس حضرت عیسیٰ پر اس سے کہیں زیادہ مواد موجود ہے۔ ہم عیسی علیہ السلام کا خاندانی پس منظر جانتے ہیں کہ ان کی والدہ کب اور کیسے پیدا ہوئیں اور ان کی پرورش کہاں ہوئی۔ ہم جانتے ہیں کہ عیسی علیہ السلام کی ولادت کہاں ہوئی، کیسے ہوئی، بچپن میں کیا کرتے تھے، جوانی میں کیا کرتے تھے بلکہ یہاں تک جانتے ہیں کہ اب کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں، اور جب دنیا میں ان کا دوبارہ نزول ہوگا تو تب وہ یہاں آکر کیا کریں گے۔ ہم تو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ فلاں مسجد کے مینارہ پر نازل ہوں گے، فلاں شہر میں آئیں گے اور آکر اس دنیا میں کتنا عرصہ رہیں گے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی شادی کہاں ہوگی، کس قبیلے میں شادی ہوگی اور بچے کتنے ہوں گے۔ ان کے بچے پیدا نہیں ہوئے لیکن نام ہمیں معلوم ہیں، اور یہ کہ ان کی وفات کہاں ہوگی اور پھر وہ کہاں دفن ہوں گے۔ ان کی قبر مبارک کی جگہ ہم نے محفوظ رکھی ہوئی ہے اور اس کے اوپر اب بھی درج ہے کہ ھذا موضع قبر النبی عیسی ابن مریم علیھما الصلوۃ والسلام۔ چنانچہ ہم حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں ان سے کہیں زیادہ اور مستند مواد کے ساتھ جانتے ہیں۔

قرآن کریم بھی مکمل، کسی اشتباہ کے بغیر، کسی ابہام کے بغیر ہمارے پاس موجود ہے۔ اور جناب نبی کریمؐ کی حیات مبارکہ، آپؐ کے ارشادات عالیہ، آپؐ کے فرمودات، آپؐ کی تعلیمات اصل حالت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ہم حضورؐ کی حیات مبارکہ کے کسی حصے کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں، ہمیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔

میں ایک بات آپ کے علم کے لیے عرض کردوں کہ جن دنوں یہ بات چل رہی تھی تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا حضورؐ کی حیات مبارکہ کے بارے میں سال بہ سال تفصیلات ہمارے پاس ریکارڈ پر موجود ہیں کہ پہلے سال کیا ہوا تھا، دوسرے سال کیا ہوا تھا،

اور تیسرے سال کیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کوئی اللہ کا بندہ ہمت کر کے کوشش کرے تو ماہ بہ ماہ تفصیلات بھی مرتب ہو سکتی ہیں کہ مواد تو ہمارے پاس ہے بس محنت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس بارے میں ایک اشتہار سامنے آگیا۔ لاہور میں سید قاسم محمود ہیں شاہکار انسائیکلوپیڈیا والے، بڑا کام کر رہے ہیں، اللہ تعالی ان کو جزائے خیر دے۔ اشتہار یہ تھا کہ ہم نے جناب نبی کریمؐ کی حیات مبارکہ پر ماہ بہ ماہ تفصیلات مرتب کر لی ہیں۔ یہ تین ہزار صفحہ کی کتاب ہے جو دو مہینوں میں مارکیٹ میں آجائے گی۔

جب میں نے فلیمنگ روز کے جواب میں لکھا کہ تمہارے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا جبکہ ہمارے پاس تو یہ موجود ہے، تو اس پر میں نے ایک لطیفہ لکھا کہ دو دوست آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اللہ تمہیں اگر دو گاڑیاں دے دے تو تم کیا کرو گے؟ دوسرے نے کہا، ایک تمہیں دے دوں گا۔ پہلے نے پھر کہا، تمہیں اللہ دو مکان دے دے تو کیا کرو گے؟ دوسرے نے کہا، ایک تمہیں دے دوں گا۔ پہلے نے کہا، اگر اللہ تمہیں دو گائیں دے دے تو کیا کرو گے؟ دوسرے نے جواب دیا، بھائی صاحب! وہ میرے پاس پہلے سے موجود ہیں، ان پر نظر مت رکھو۔

تو بھئی ہمارے پاس وحی بھی ہے، قرآن کریم بھی ہے، حضورؐ کی تعلیمات بھی ہیں، اور بالکل اصل حالت میں کسی شبہ کے بغیر ہیں۔ اگر دنیا کا کوئی آدمی ہم سے یہ توقع رکھتا ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں گے تو اسے اپنی عقل کا علاج کروانا چاہیے۔ ذرا خود سوچیے کہ جو لوگ واشنگٹن میں، ماسکو میں، لندن میں بیٹھ کر سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں قرآن کریم پڑھتے ہیں اور رسول اللہؐ کی سیرت کے ایک ایک جزو کو بیان کرتے اور سنتے سناتے ہیں، حضورؐ کا ایک ایک ارشاد نقل کرتے ہیں، ان سے کوئی یہ توقع رکھے کہ وہ یہ سب کچھ چھوڑ دیں گے تو وہ کہاں کا عقلمند ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ حضورؐ کا یہ ارشاد کہ جاہلیت کی ہر قدر آج میرے پاؤں کے نیچے ہے، تہذیبی کشمکش میں، ثقافتوں کی جنگ میں، اور دور جاہلیت و دور علم کی نشان دہی میں بہت بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے لیے راہ نما ہے۔

نسلی اور لسانی تفاخر کا خاتمہ

جاہلیت کے دور میں عرب معاشرہ نسل، زبان اور رنگ کے تفاخر کا معاشرہ تھا۔ قریشی غیر قریشیوں کو برابر نہیں سمجھتے تھے، عرب غیر عربوں کو برابر نہیں سمجھتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی ہے، بے شک اس پر جتنی چاہے لیپا پوتی کی جائے لیکن رنگ اور نسل کی بنیاد پر تفاخر اور

برتری کا یہ جذبہ آج بھی دنیا میں صاف نظر آتا ہے۔ علاقائی سطح پر بھی اور عالمی سطح پر بھی۔ یہ بات اس زمانے میں عروج پر تھی۔ آپ اس سے اندازہ کیجیے کہ نبی کریمؐ نے مکہ فتح کرنے کے بعد جب کعبہ کا کنٹرول سنبھالا، چابیاں منگوائیں اور کعبہ کو بتوں سے پاک کیا تو حضورؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بیت اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دو۔ یہ اعلان ایک طوفان تھا اس معاشرہ میں کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ بلالؓ ایک تو آزاد کردہ غلام ہیں، پھر کالے رنگ کے ہیں، عربی بھی نہیں بلکہ حبشی ہیں۔ کیا یہ بیت اللہ کی چھت پر کھڑا ہو کر اذان دے گا، وہاں طوفان مچ گیا۔ لیکن اعلان چونکہ نبی اکرمؐ نے کیا تھا تو کس کی مجال تھی کہ کچھ کہے۔ لیکن ایک قریشی سردار نے یہ منظر دیکھ کر جو جملہ کہا اسے تاریخ والے یوں نقل کرتے ہیں کہ

"اے میرے باپ! تو بڑا خوش قسمت ہے کہ یہ منظر دیکھنے کے لیے آج زندہ نہیں ہے"۔

بعد میں یہ قریشی سردار صحابیؓ ہو گئے تھے۔ لیکن اس وقت جب یہ منظر دیکھا تو روایت ہے کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور اپنے باپ کا نام لے کر کہا کہ میرے باپ تو بڑا خوش قسمت ہے جو اس منظر کو دیکھنے سے پہلے دنیا سے سے چلا گیا کہ ایک کالے رنگ کا غیر عرب آدمی بیت اللہ کی چھت پر کھڑا ہے اور اللہ کا نام بلند کر رہا ہے۔ عام رواج یہ تھا کہ قریش اور غیر قریش کا خون برابر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ قریشی اگر کسی غیر قریشی کو قتل کر دیتا تو جواب میں قریشی قتل نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ غیر قریشی اگر کسی قریشی کو قتل کرتا تو بدلے میں دو آدمی قتل ہوتے۔ اور پھر عرب و غیر عرب کا بھی فرق تھا کہ عربوں کو اپنی زبان پر بڑا فخر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی زبان واقعی فخر کی چیز ہے لیکن اتنا بھی فخر کیا کہ دوسروں کو گونگا ہی کہنا شروع کر دیں۔ اس لیے کہ "عجمی" کا معنی گونگا ہے۔ وہ ہمیں عجمی کہتے تھے کہ یہ گونگے ہیں، ان کو زبان نہیں آتی۔ جبکہ "عرب" فصیح کو کہتے ہیں۔ عرب کا لفظی معنی فصیح، بلیغ، عمدہ گفتگو کرنے والا۔ اور عجمی کا معنی گونگا کہ جس کے منہ میں زبان نہ ہو، جو بول نہ سکتا ہو۔ چنانچہ یہ لسانی تفاخر تھا۔ نبی کریمؐ نے فتح مکہ پر اس رسم کو توڑ کر سب کو برابر کھڑا کر دیا اور پھر حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی تاکید فرمائی کہ

یا ایھا الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا اسود علی احمر الا بالتقوی ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ (بیہقی، شعب الایمان، ۷۔۵۱۳۳، ج ۴، ص ۲۸۹۔ ابو نعیم، حلیۃ الاولیاء ۱۰۰/۳۔ مسند احمد، ۲۲۳۹۱)

"اے لوگو! بے شک تمھارا رب بھی ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک۔ آگاہ رہو! کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر اور کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ عزت کا مستحق وہ ہے جو زیادہ حدود کا پابند ہے۔"

یعنی حضورؐ نے فرمایا کہ میں آج تمام قسم کے نسلی ولسانی تفاخرات کا خاتمہ کرنے کا اعلان کر رہا ہوں، تم میں سے کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے، اور کسی سرخ کو کالے پر فضیلت نہیں ہے۔ آپؐ نے صرف یہ اعلان نہیں فرمایا بلکہ ایک ایسی سوسائٹی قائم کی کہ واقعتاً لوگوں نے دیکھا کہ یہ سارے امتیازات ختم ہو گئے تھے۔

تابعین میں ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں عطاء ابن ابی رباحؒ۔ بڑے محدث، بڑے فقیہ اور بڑے امام ہیں۔ وہ غلاموں کے خاندان سے تھے اور آزاد کردہ غلام تھے۔ سیاہ رنگ کے تھے، کہتے ہیں کہ شکل زیادہ مناسب نہ تھی اور ناک ایسے تھی جیسے لوبیہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ مکہ کے سب سے بڑے فقیہ تھے، بڑے بڑے علما کو بھی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو ان سے پوچھتے تھے کہ حضرت، یہ مسئلہ کیا ہے۔ سلیمان ابن عبدالملک جو اس زمانہ میں آدھی دنیا پر مسلم حکومت کے خلیفہ تھے، وہ حج پر آئے۔ ایک موقع پر عطاء ابن ابی رباحؒ نماز پڑھ کر بیٹھے تھے اور امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین سلیمان ابن عبدالملک کو حج کے متعلق دو تین مسئلے پوچھنے تھے۔ اپنے بیٹوں کو ساتھ لائے اور آکر بیٹھے۔ حضرتؒ نماز سے فارغ ہوئے اور ایسے ہی بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر پوچھا، جی فرمائیے۔ امیر المؤمنین صاحب نے مؤدب بیٹھے ایک مسئلہ پوچھا، پھر دوسرا پوچھا، جب مطلوبہ مسئلے پوچھ لیے اور اٹھ کر جانے لگے تو اپنے بیٹوں سے کہا، بیٹو! علم حاصل کرو، یہ علم ہی ہے جس کی وجہ سے مجھے اس کالے کے سامنے نیچا ہونا پڑا۔ یہ علم ہی ہے جس نے اس کو یہ مقام بخشا کہ مجھے امیر المؤمنین ہو کر اس کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھنا پڑا۔ بیٹوں سے کہا کہ علم حاصل کرو، علم انسان کے عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جناب نبی کریمؐ نے عملاً ایسی سوسائٹی دنیا میں قائم کی کہ جہاں عطاء ابن ابی رباحؒ کے سامنے امیر المؤمنین سلیمان ابن عبدالملک کو بھی مؤدب ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ امام مالکؒ بڑے لوگوں میں سے تھے، بہت بڑے امام تھے۔ ہارون الرشید کا زمانہ تھا، اس نے امام مالکؒ کو پیغام بھیجا کہ میں آپ سے شاگردی کا

شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں تو کبھی آپ تشریف لائیں اور مجھے کچھ پڑھا دیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا، نہیں بھائی! آپ امیر المؤمنین ہیں اور قابل احترام ہیں لیکن میں کسی کے ہاں پڑھانے نہیں جاتا۔ فرمایا کہ پڑھنا ہے تو یہاں آجائیے۔ یعنی پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا پڑے گا اور کلاس میں بیٹھنا پڑے گا۔ ہارون الرشید نے دوسرا پیغام بھیجا کہ حضرت ٹھیک ہے میں حاضر ہوتا ہوں لیکن بہرحال کچھ پروٹوکول تو چاہیے کہ میں امیر المؤمنین ہوں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جب آؤ گے، جہاں جگہ ہوگی وہیں بیٹھنا پڑے گا۔ روایات میں آتا ہے کہ ہارون الرشید اپنے بیٹے مامون اور امین کے ساتھ آیا تو مجلس میں پیچھے جگہ ملی، وہاں بیٹھا، حدیثیں سنیں اور پھر یہ کہا کہ میں خود کو اس بات کا اہل نہیں سمجھتا کہ روایت حدیث میں اپنے آپ کو راوی شمار کروں لیکن اس عظیم المرتبت شخصیت کا شاگرد ہونے کے لیے میں نے ایسا کیا ہے۔ یہ صرف اس لیے کیا کہ مجھے شاگردی کا شرف حاصل ہو جائے کہ حدیث کی کسی سند میں، کسی کونے میں میرا نام بھی لکھا جائے کہ یہ فلاں محدث کا شاگرد ہے اور فلاں حدیث روایت کرتا ہے۔

نبی اکرمؐ نے جاہلیت کے جتنے امتیازات تھے وہ ختم کیے اور حجۃ الوداع کے موقع پر خاص اس کا اعلان فرمایا۔ اور یہ قرآن کریم میں بھی ہے کہ

> یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ؕ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ؕ ان اللہ علیم خبیر۔ (الحجرات ۴۹۔ آیت ۱۳)
>
> ”اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قبائل اور برادریوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ تقوی والا ہے۔“

قرآن کریم نے بنیادی اصول بیان فرمایا کہ دیکھو ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا، آدم اور حوا سے۔ ہاں قبائل اور برادریاں ہم نے بنائی ہیں تعارف کے لیے اور پہچان کے لیے۔ قبائل کا، ان کی شاخوں کا، خاندانوں کا اور قوموں کا وجود بھی ہے لیکن تفاخر کے لیے نہیں بلکہ تعارف کے لیے ہے۔ اگر یہ فطری تقسیم نہ ہو تو معاملہ مشکل ہو جائے۔ اگر یہ پتہ نہ ہو کہ یہ امریکی ہے، یہ افریقی ہے، یہ فلاں نسل کا ہے، یہ فلاں قوم کا ہے، تو پھر نمبرنگ کرنی پڑے گی جو کہ مشکل کام ہے۔ لیکن اللہ کے ہاں عزت تقوی کی ہے۔ تقوی کو یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ کے ہاں عزت انسان کے کریکٹر کی ہے، کردار کی ہے، اس کے ایمان اور عمل صالح کی ہے۔

اسلام عزت کی بنیاد رنگ، نسل، علاقے اور زبان کو قرار نہیں دیتا۔ آدمی ذرا توجہ سے پڑھے تو قرآن کریم کی ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ آپ صرف ایک بات سے اندازہ کر لیجیے کہ حضرت لقمان علیہ السلام سوڈانی تھے اور جھونپڑی میں رہنے والے غریب آدمی تھے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ وہ کوئی بڑے سردار نہیں تھے لیکن قرآن کریم میں ایک مکمل سورت ان کے نام پر اتاری گئی اور قرآن کریم نے بڑے مزے مزے سے ان کے واقعات ذکر کیے ہیں۔ لیکن دوسری طرف دیکھیں کہ ابولہب جو خاندان اور رشتہ کے لحاظ سے حضورؐ کا چچا ہے۔ اس سے بڑا خاندان کیا ہوگا دنیا میں، کائنات میں اس سے زیادہ معزز خاندان کون سا ہوگا۔ اور آنحضرتؐ کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے کہ آپؐ کا چچا ہے۔ اور حسن کا اندازہ کیجیے کہ ابولہب اس کی کنیت تھی۔ نام عبدالشمس تھا، ابولہب نہیں تھا۔ لہب شعلے کو کہتے ہیں۔ اس کے رخسار شعلے کی طرح چمکتے تھے جس کی وجہ سے ابولہب کا لقب ملا یعنی شعلے جیسے رخساروں والا۔ خوبصورت بھی ہے، مال بھی ہے، مکہ میں رہتا ہے، مکہ کے مجاوروں میں سے ہے اور خاندان بھی بڑا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے یوں ذکر کیا کہ

تبت یدآ ابي لهب وتب۔ (اللہب ۱۱۱۔ آیت ۱)

”ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہوگیا“۔

روایات میں آتا ہے کہ اس کی بیوی ام جمیل جب زیورات پہن کر بیٹھتی تھی تو زیورات کے بوجھ سے اٹھ نہیں سکتی تھی، عورتیں سہارا دے کر اٹھایا کرتی تھیں۔ لیکن قرآن میں ہے کہ

مآ اغنی عنہ مالہٗ وماکسب۔ (اللہب ۱۱۱۔ آیت ۲)

”بڑا مال تھا اس کے پاس جو کسی کام نہیں آیا“۔

چنانچہ قرآن کریم نے معیار بتا دیا کہ لقمان علیہ السلام اگر تقوی کے معیار پر پورا اترتے ہیں تو وہ حکمت والے ہیں۔ اور ابولہب اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو لعنت کا مستحق ہے اور اللہ تعالی کی طرف سے غضب کا مستحق ہے۔ ایک اور جگہ پر قرآن کریم یہ ذکر کرتا ہے کہ

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین۔ (التین ۹۵۔ آیت ۴ و ۵)

”بے شک ہم نے انسان کو بڑے عمدہ انداز میں پیدا کیا ہے۔ پھر ہم نے اسے سب سے نیچے پھینک دیا ہے“۔

یعنی انسان احسن تقویم بھی ہے اور اسفل سافلین بھی ہے۔ سب سے اوپر کا نمبر بھی اسی کا ہے اور سب سے نیچے کا نمبر بھی اسی کا ہے لیکن کس بنیاد پر؟ ایمان، کردار اور عمل کی بنیاد پر۔

طبقاتی امتیاز کا خاتمہ

زمانۂ جاہلیت سے حج کے حوالے سے ایک طریقہ یہ چلا آ رہا تھا کہ قریشی عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ حج کی ترتیب تو یہ ہے کہ منیٰ میں چند دن رہتے ہیں، اس دوران ۹ ذی الحج کو عرفات جاتے ہیں، شام کو مزدلفہ جاتے ہیں اور مغرب و عشا اکٹھی پڑھتے ہیں، پھر رات کو مزدلفہ میں ہی رہتے ہیں، اور صبح کو فجر پڑھ کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ چنانچہ سب لوگ عرفات جاتے تھے لیکن قریشی نہیں جاتے تھے۔ کہتے تھے نحن حمس اس کا ترجمہ میں یوں کرتا ہوں کہ ”ہم وی آئی پی ہیں“۔ مطلب یہ تھا کہ ہم بہادر لوگ ہیں اور ممتاز لوگ ہیں۔ چونکہ قریش کا ہی وہاں کنٹرول تھا اور واقعتاً وہ بہت بڑا قبیلہ سمجھا جاتا تھا اور عرب میں ان کو بڑا احترام حاصل تھا۔ اس لیے قریشیوں نے اپنے کچھ امتیازات رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ حرم کی حدود سے باہر نہیں جاتے تھے۔ منیٰ اور مزدلفہ کا ایک کونہ حرم میں ہے جبکہ باقی عرفات جو ہے وہ حرم سے باہر ہے۔ قریشی حرم کی حدود سے باہر نہیں جاتے تھے کہ ہم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اور یہ کہ یہ حرم کی حدود سے باہر جانا عام لوگوں کے لیے ہے، ہمارے لیے نہیں ہے۔

جناب نبی کریمؐ نے یہ رسم توڑ دی۔ اگر حج میں بھی یہ امتیازات ختم نہیں ہوں گے اور وی آئی پی سسٹم باقی رہے ہے تو پھر یہ ختم کب ہو گا۔ حج ہی تو وہ موقع ہے کہ جس پر اللہ سب کو دو چادریں پہنا دیتا ہے۔ تھری پیس والا بھی دو چادریں پہنے گا اور لنگوٹی والا بھی دو چادریں پہنے گا۔ یہی تو مقام ہے مساوات کا کہ اس موقع پر صحیح معنوں میں مساوات کا منظر نظر آتا ہے۔ کوئی غریب ہے، کوئی امیر ہے، کوئی گورا ہے، کوئی کالا ہے، کوئی حاکم ہے، کوئی فقیر ہے، کوئی عربی ہے، کوئی عجمی ہے، لیکن ہیں سب دو چادروں میں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا کہ میں وقوف عرفات کے لیے جاؤں گا اور پھر آپ تشریف لے گئے۔

آنحضرتؐ جب ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں تھے تو وہاں بھی آپؐ قریش کی روایت کے برعکس وقوف عرفات کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے، جیسا کہ جبیر ابن مطعمؓ کی ایک روایت میں بیان ہوا ہے۔ یہ جبیر رضی اللہ عنہ، مطعم ابن عدی کے بیٹے ہیں جو مشرک

سرداروں میں سے تھے۔ جب طائف میں جناب آپؐ پر پتھر برسائے گئے تھے اور آپ زخمی ہو گئے تھے تو راستے میں مطعم ابن عدی کا ڈیرا تھا اور اس نے آپؐ کو پناہ دی تھی۔ جب حضورؐ زخمی ہو کر واپس آئے تو راستے میں اس کا باغ تھا، اس نے حضورؐ کو پناہ دی اور لوگوں کو ہٹایا کہ نہیں بھئی، اب یہ میری پناہ میں ہیں، ان کے نزدیک کوئی نہ آئے۔ حضورؐ اس کا بڑا احسان مانتے تھے اور بدر کے موقع پر حضورؐ نے اس کے احسان کا ذکر کیا۔ مطعم بڑے سردار تھے، بڑے آدمی تھے لیکن کفر کی حالت میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ جبیرؓ ان کے بیٹے تھے جو مسلمان ہوئے اور صحابیٔ رسول تھے۔ بدر کے موقع پر جب قیدیوں کا مسئلہ پیش آیا تو حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا کہ اگر مطعم زندہ ہوتا اور وہ ان قیدیوں کی سفارش کرتا تو میں اس کی سفارش کو قبول کر لیتا۔ یعنی میں ان سے فدیہ نہ لیتا اور ان کو ویسے ہی معاف کر دیتا۔ (بخاری، رقم ۲۹۰۶)

جبیرؓ ابن مطعم کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حج کے موقع پر میرے کچھ اونٹ گم ہو گئے تھے، میں ان کی تلاش کے لیے گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محمدؐ عرفات میں موجود ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ تو حمس میں سے ہیں، یہ عرفات میں کیا کر رہے ہیں؟ (بخاری، ۱۵۵۳)۔ یہ تو قریشی وہاشمی ہیں اور وہ تو ممتاز لوگ ہوتے ہیں اور حرم کی حدود سے باہر نہیں آتے۔ مسند احمد کی روایت (رقم ۱۶۱۷۵) میں تصریح ہے کہ یہ آپ کو نبوت ملنے کے بعد کا واقعہ ہے۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے یہ رسم بھی توڑ دی۔ قرآن کریم میں بھی یہ حکم آیا ہے کہ

ثم افیضوا من حیث افاض الناس واستغفروا اللہ ان اللہ غفور رحیم۔ (بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۹)

”پھر تم لوٹ کر آؤ جہاں سے لوگ لوٹ کر آتے ہیں اور اللہ سے بخشش مانگو“۔

انتقام در انتقام کی رسم کا خاتمہ

پھر جناب نبی کریمؐ نے جہاں جاہلیت کے دور کے خاتمے کا اعلان فرمایا کہ جاہلیت کی رسمیں میں نے ختم کر دی ہیں۔ ایک عمومی اعلان تھا کہ جاہلیت کی ساری قدریں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ لیکن دو کا آپؐ نے بطور خاص ذکر فرمایا:

الا وان کل دم کان فی الجاہلیۃ موضوع واول دم وضع من دماء الجاہلیۃ دم الحارث بن عبد المطلب کان مسترضعا فی بنی لیث فقتلتہ ہذیل۔ (ترمذی، ۳۰۱۲)

”آگاہ رہو! جاہلیت کے زمانے کا ہر خون معاف کیا جاتا ہے، اور زمانہ جاہلیت

کے خونوں میں سے پہلا خون جس کو معاف کیا جاتا ہے، وہ حارث بن عبدالمطلب کا خون ہے۔ (راوی بتاتے ہیں کہ) حارث کو دودھ پلانے کے لیے بنولیث کے ہاں بھیجا گیا تھا جہاں اسے بنوہذیل نے قتل کر دیا۔"

آپؐ نے اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے دور میں جو بدلے اور خون کا رواج تھا، وہ میں نے ختم کر دیا ہے۔ قبائل میں بدلہ در بدلہ کا رواج تھا۔ قبائل میں یوں ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ کا آدمی قتل ہوا تو بدلے میں قاتل قبیلہ کا آدمی قتل ہوگا۔ اور ضروری نہیں کہ قاتل ہی قتل ہو، بس اس قبیلہ کا کوئی آدمی مارا جائے گا۔ جب وہ مرا ہے تو اب پھر اس پہلے قبیلہ کا آدمی مرے گا اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ "حرب بعاث" دو قبیلوں کی ایک مشہور جنگ تھی جو ایک سو بیس سال چلتی رہی۔ بات شروع کہاں سے ہوئی تھی؟ کہتے ہیں کہ بات یہاں سے شروع ہوئی کہ ایک آدمی کا درخت تھا جس پر کبوتری نے گھونسلا بنا رکھا تھا اور انڈے دے رکھے تھے۔ کسی نے اسے پتھر مار کر گھونسلہ اور انڈے توڑ دیے۔ پہلے آدمی نے کہا کہ اچھا! میری زمین پر اور میرے درخت پر اس نے یہ کر دیا، یہ تو میری توہین ہوئی ہے۔ کبوتری کا انڈا نہیں ٹوٹا یہ تو میری تو ناک کٹ گئی ہے۔ اس نے پتھر مارنے والے کو قتل کر دیا۔ بس پھر دونوں کے قبائل کے درمیان ایک سو بیس سال تک جنگ رہی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا ایک بڑی عجیب بات فرماتی ہیں کہ اوس اور خزرج کے درمیان کئی نسلوں تک جنگ رہی ہے۔ یہ دونوں انصار کے قبیلے تھے، انہوں نے ایک دوسرے کے جوان قتل کر دیے، بہت بربادی ہوئی۔ پھر تنگ آکر بڑے بوڑھے اکٹھے ہوئے کہ بھائی کوئی راستہ نکالو، آخر ہم کب تک لڑیں گے۔ جب اس طرح کی جنگ ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے پر اتفاق نہیں ہوتا۔ طے ہوا کہ کوئی تیسرا آدمی تلاش کیا جائے جس پر ہم دونوں اکٹھے ہو جائیں۔ جناب نبی کریمؐ جب اوس اور خزرج کے لوگوں کو حج کے موقع پر منیٰ میں ان کے خیموں میں دعوت دینے آئے تو انہوں نے آپس میں کھسر پھسر کی اور کہا کہ بھئی، یہ آدمی ٹھیک ہے۔ ان کو جگہ کی ضرورت ہے اور ہمیں آدمی کی ضرورت ہے۔ تو یہ تھی شروعات۔ حضورؐ طائف کے واقعہ کے بعد اس تلاش میں تھے کہ مجھے کوئی ٹھکانہ ملے تو میں وہاں اپنا مرکز بناؤں، یعنی کوئی قبیلہ ہامی بھرے تو میں وہاں جاؤں۔ اس کے لیے آپؐ خیموں میں جا کر مختلف قبائل کو دعوت دے رہے تھے۔ ادھر اوس اور خزرج اس تلاش میں تھے کہ کوئی ایسا آدمی ملے جس پر ہم اکٹھے ہو جائیں۔ چنانچہ یہ دو باتیں اکٹھی ہو گئیں اور ان قبائل نے کہا کہ ہم تیار ہیں، آپ ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ پھر اگلے سال بیعت

عقبہ اولیٰ ہوئی اور اس سے اگلے سال بیعت عقبہ ثانیہ، سارے معاہدات ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ ہجرت کر جائیں۔

حضرت عائشہؓ ان واقعات کی حکمت اور اس کے فلسفہ پر ایک خوبصورت تبصرہ کرتی ہیں۔ یہ بھی ایک مستقل موضوع ہے یعنی علم اسرار دین۔ وہ فرمایا کرتی تھیں کہ جنگ بعاث میں اوس اور خزرج کے بڑے بڑے سردار قتل ہو گئے تھے اور انصار مدینہ انتشار وافتراق کا شکار تھے لیکن یہ جنگ اس بات کا باعث بن گئی کہ حضورؐ مدینہ منورہ تشریف لے آئے (بخاری، رقم ۳۴۹۳)۔ اگر یہ جنگ نہ ہوتی، یہ اسباب پیدا نہ ہوتے تو انصار حضورؐ کو دعوت نہ دیتے اور یہ صورتحال پیدا نہ ہوتی۔ تو حکمت کی بات یہ ہے کہ بظاہر ایک واقعہ بڑا ہی خوفناک ہوتا ہے، لیکن اللہ رب العزت اس کے اندر سے کوئی خیر نکال دیتے ہیں۔

میں اس پر بات کر رہا تھا کہ جاہلیت کے زمانہ میں بدلہ در بدلہ کا رواج تھا۔ یہاں تک کہ مائیں اپنے بچوں کو لوریاں دے دے کر سبق پڑھایا کرتی تھیں کہ تمہارے باپ کا قاتل فلاں ہے، تم نے بڑے ہو کر اس کا بدلہ لینا ہے۔ یعنی انہیں بچپن سے تیار کیا جاتا تھا کہ تمہارے باپ کو فلاں نے قتل کیا، تمہارے دادا کو فلاں نے قتل کیا، تمہارے چچا کو فلاں نے قتل کیا، اس لیے فلاں کا بدلہ بھی تمہارے ذمہ ہے اور فلاں کا بدلہ بھی تمہارے ذمہ ہے۔ اور ہمارے ہاں آج بھی دیہات اور قبائل میں انتقام اور بدلہ کا یہ رواج موجود ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا دماء الجاھلیۃ موضوعۃ کہ جاہلیت کے سارے خون، بدلے آج میں ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ آج کے بعد کسی پرانے قتل پر کوئی کسی سے بدلہ نہیں لے گا۔ اس لیے کہ آخر کہیں تو بریک لگنی تھی، معاملہ تبھی صاف ہونا تھا۔ فرمایا کہ تمہارے آپس میں پچھلے جتنے بدلے تھے، سب ختم۔ اور فرمایا کہ میں یہ اپنے گھر سے شروع کر رہا ہوں۔ ربیعہ ابن حارث کا بیٹا بچپن میں کسی خاندان میں دودھ پینے کے لیے بھیجا گیا تھا تو وہاں کسی نے قتل کر دیا۔ قبائلی روایت کے مطابق اس کا بدلہ لینا ان کے ذمے تھا۔ فرمایا میرے گھر کا بچہ قتل ہوا تھا اور قبائلی روایات کے مطابق ہمارے ذمہ اس کا بدلہ بنتا ہے لیکن میں اس کو ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ چنانچہ میں پہلے اپنے گھر کا خون معاف کرتا ہوں اور پھر تمام خونوں کے ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ آج کے بعد پچھلے کسی قتل کے حوالے سے کوئی کسی سے بدلہ نہیں لے گا۔ فرمایا جاہلیت کی یہ قدر میں توڑنے کا اعلان کرتا ہوں۔

سود کا خاتمہ

ایک جاہلی قدر جس کا حضورؐ نے بطور خاص ذکر کیا وہ سود ہے۔ فرمایا کہ

الا وان کل ربا فی الجاہلیۃ موضوع لکم رؤوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون غیر ربا العباس بن عبد المطلب فانہ موضوع کلہ۔ (ترمذی، ۳۰۱۲)

"آگاہ رہو! زمانہ جاہلیت کا ہر سود کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔ تم صرف اپنے اصل مال کے حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ ہاں عباس بن عبد المطلب کا لوگوں کے ذمے جو سودی قرض ہے، وہ سارے کا سارا معاف کیا جاتا ہے۔"

آپؐ نے فرمایا کہ جاہلیت میں تم سود کا لین دین کرتے تھے، میں اس کے خاتمے کا اعلان کر رہا ہوں۔ جس کے ذمے کسی کی کوئی رقم ہے، اس کو اصل رقم ملے گی، سود نہیں ملے گا۔ قرآن نے بھی اس کی حرمت کا اعلان فرما دیا کہ

یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا ان کنتم مؤمنین۔ (بقرہ ۲۔ آیت ۲۷۸)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ باقی سود رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو"۔

آج بھی دنیا میں یہ ایک بڑی بحث ہے کہ سود تو کاروبار ہے۔ قرآن کریم نے جب اس کی حرمت کا اعلان کیا تو اس وقت بھی اس پر بڑا مباحثہ ہوا۔ کہا گیا کہ سود میں اور تجارت میں کیا فرق ہے؟ یہ بھی کاروبار کی ایک شکل ہے کہ چیزیں نہ بیچیں، پیسہ بیچا۔

قالوآ انما البیع مثل الربا ۘ واحل اللہ البیع و حرم الربا ؕ (بقرہ ۲۔ آیت ۲۷۵)

"انہوں نے کہا کہ تجارت بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے"۔

اس وقت بھی یہی دلیل پیش ہوئی تھی لیکن یہ دلیل ذکر کر کے قرآن کریم نے پھر دو ٹوک کہا کہ نہیں بھئی یہ بزنس نہیں ہے، یہ بزنس سے الگ چیز ہے۔ اس بارے میں ایک اہم واقعہ ہے جو سیرت کی تقریباً تمام کتب میں موجود ہے کہ طائف والے جب نبی کریمؐ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لیے آئے تو اس پس منظر میں آئے کہ فتح مکہ کے بعد حنین کی لڑائی میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی اور پھر طائف کا معرکہ پیش آیا۔ طائف کا حضورؐ نے سترہ دن تک محاصرہ کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی تو محاصرہ اٹھا کر واپس آنا پڑا۔

طائف والے بہت خوش تھے کہ یہ ہمیں فتح نہیں کر سکے، اور یہ بات درست بھی تھی۔ طائف والوں کا اپنا وفد مدینہ منورہ گیا کہ جناب آپ تو ہمیں فتح نہیں کر سکے مگر ہم خود کلمہ پڑھنے آگئے ہیں، لیکن ہماری کچھ شرطیں ہیں۔ اس کے پیچھے گھمنڈ یہ تھا کہ ہم فتح نہیں ہو سکے اس لیے ہم برابر کی سطح پر اور برابر کی شرطوں پہ بات کریں گے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اور دیگر سیرت نگاروں نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے۔ طائف والوں نے کہا کہ ہم کلمہ تو پڑھیں گے لیکن ہماری کچھ شرطیں ہیں۔ ان شرطوں میں چار بڑی شرطیں تھیں۔ ایک شرط یہ تھی کہ جناب آپ شراب کو حرام کہتے ہیں ہم شراب نہیں چھوڑ سکتے اور دلیل دی کہ یہ ہماری معیشت کا مسئلہ ہے۔ آج بھی طائف کی بڑی پیداوار انگور ہے۔ کہا کہ ہمارے ہاں انگور پیدا ہوتا ہے، کچا انگور مارکیٹ میں پھینکیں تو کچھ خاص نفع نہیں ملتا۔ نچوڑ کر اور پکا کر دیتے ہیں تو چار پیسے نکل آتے ہیں۔ انہوں نے دلیل دی کہ یہ ہمارا کاروبار ہے، اس کے بغیر ہمارا سال نہیں گزرتا۔ دوسری شرط یہ رکھی کہ آپؐ کہتے ہیں کہ سود حرام ہے۔ ہمارا تو سارا کاروبار سود پر چلتا ہے، سود نہیں چھوڑ سکیں گے۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ کہتے ہیں زنا حرام ہے، یہ بھی ہم سے نہیں چھوٹے گا۔ اس کی وجہ بتائی کی کہ یہ ہمارا کلچرل مسئلہ ہے کہ ہمارے ہاں شادیاں بہت دیر سے کرنے کا رواج ہے، گزارا نہیں ہوتا، اس لیے ہم زنا بھی نہیں چھوڑیں گے۔ پھر ایک بات اور کہ ہم نماز پڑھیں گے تو سہی لیکن اتنے ٹائٹ شیڈول کے ساتھ نہیں، اوقات اور تعداد ہم اپنی مرضی سے منتخب کریں گے۔ نماز سے انکار نہیں لیکن یہ پانچ وقت کی نماز کی پابندی ہم سے نہیں ہو سکتی۔ ہم خود اپنی سہولت سے اس کا انتخاب کرلیں گے کہ کب پڑھنی ہے اور کتنی پڑھنی ہے۔ اگر آپ ان شرطوں کو قبول کرتے ہیں تو ہم اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، ہمیں کلمہ پڑھا دیجیے۔

جناب نبی کریمؐ نے انکار فرما دیا کہ یہ ممکن نہیں ہے (شبلی نعمانی، سیرت النبی، ۲/۳۳)۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مکہ میں اسلام مختلف ہو اور ستر میل کے فاصلے پر طائف میں اسلام بالکل مختلف ہو۔ مکہ میں تو سود حرام ہو اور طائف میں حلال ہو۔ مکہ میں پانچ نمازیں ہوں اور طائف میں تین ہوں۔ مکہ میں شراب ممنوع ہو اور طائف میں جائز۔ فرمایا، نہیں بھئی کوئی شرط قبول نہیں ہے۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ تو طائف والوں کی شرطیں تھیں، ذرا دیکھیے کہ ہماری آج کی شرطیں کیا ہیں۔ سوسائٹی میں اسلام کو بحیثیت سسٹم قبول کرنے میں ہماری آج کی شرطیں

بھی یہی ہیں کہ نماز میں زبردستی نہ کرو اور باقی معاملات میں بھی دنیا کے ساتھ چلو تو باقی کا اسلام ہمیں قبول ہے۔ تو یہ معاملات جو آج کل ہمارے سامنے ہیں یہ حضورؐ کے زمانے میں بھی ایسے ہی چلتے رہے ہیں۔ شرطوں والے بھی اور دلیلوں والے بھی اور بزنس والے بھی۔

لیکن اس کے باوجود نبی کریمؐ نے یہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں صاف اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سود ختم۔ آج کے بعد جو بھی اس معاملہ میں ہے صرف اصل رقم کا حق دار ہے، سود کی رقم ختم۔ یہاں بھی فرمایا کہ میں اپنے گھر سے آغاز کر رہا ہوں۔ حضرت عباسؓ سود کا کاروبار کرتے تھے کہ سود پر لوگوں کو رقمیں دیتے تھے۔ بہت سے لوگوں کے ذمے ان کی رقمیں تھیں۔ فرمایا، میں عباسؓ کی سود کی ساری رقمیں ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ میرے چچا عباسؓ جو مکہ میں سود کا کاروبار کرتے تھے، ان کی رقمیں جن کے ذمے ہیں، ان کے ذمہ سود نہیں ہوگا، صرف اصل رقم واپس کرنا ہوگی۔

جان و مال کی حرمت

بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ منیٰ میں کھڑے تھے، قربانی کا دن تھا، یوم النحر تھا۔ آپؐ نے پوچھا ای شھر ھذا کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ جریر ابن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا اللہ ورسولہ اعلم۔ معلوم تو ان کو تھا کہ مہینہ کون سا ہے۔ صحابہؓ کا معمول تھا کہ حضورؐ کوئی سوال کرتے تو پہلے مرحلے پر جواب یہی ہوتا تھا کہ اللہ بہتر جانتا ہے اور اللہ کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کیا یہ حج کا مہینہ نہیں ہے؟ کہا یا رسول اللہ! ہاں حج کا مہینہ ہے۔ آپؐ نے پوچھا ای یوم ھذا آج کا دن کون سا ہے؟ کہا اللہ ورسولہ اعلم۔ پوچھا کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ کہا، یا رسول اللہ! ہاں قربانی کا دن ہے۔ آپؐ نے پوچھا ای بلد ھذا یہ شہر کون سا ہے؟ کہا اللہ ورسولہ اعلم۔ فرمایا کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ کہا، یا رسول اللہ! بلدۃ الحرام ہی ہے۔ تو آپؐ نے تین حرمتوں کا حوالہ دیا۔ بسا اوقات بات کی اہمیت بیان کرنے کے لیے آدمی پہلے ذہنی طور پر تیار کرتا ہے۔ آپؐ نے بات کی اہمیت بتانے کے لیے ذکر کیا کہ یہ شہر محترم ہے، مہینہ حرمت والا ہے اور دن حرمت والا ہے۔ پھر فرمایا کہ

فان دماءکم واموالکم قال محمد واحسبہ قال واعراضکم (وابشارکم) علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا۔ (بخاری، ۴۰۵۴، ۶۵۵۱)

”بے شک تمہاری جانیں، تمہارے مال، تمہاری آبروئیں (اور تمہارے چمڑے) تم

پر اسی طرح حرام ہیں جیسے اس شہر اور اس مہینے میں تمہارے اس دن کی حرمت ہے۔"

یہ بخاری کی روایت میں ہے کہ جس طرح تم اس دن کی، اس شہر کی اور اس مہینہ کی حرمت کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح ایک دوسرے کی جان کی حفاظت کرو۔ تمہارے اموال بھی ایک دوسرے پر محترم ہیں کہ تم کسی کے مال پر ہاتھ نہیں ڈالو گے۔ جس طرح جان کی ایک دوسرے پر حرمت ہے، اسی طرح مال کی حرمت بھی ہے۔ چوری، ڈکیتی، دھوکہ، یعنی کوئی بھی شکل مال کو ہڑپ کرنے کی اختیار نہیں کرو گے۔ اور تمہاری عزتیں بھی ایک دوسرے پر محترم ہیں۔ جس طرح کسی دوسرے کی جان و مال پر دست درازی حرام ہے، اسی طرح کسی دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالنا بھی حرام ہے۔ اس کی لمبی تفصیل ہے کہ کسی کی عزت پر حملہ نہیں کرو گے، کسی کو بے عزت نہیں کرو گے، کسی کا مذاق نہیں اڑاؤ گے، کسی کو گالی نہیں دو گے، کسی کی توہین نہیں کرو گے، یہ ساری باتیں اس میں شامل ہیں۔ تو فرمایا جس طرح مکہ، حج کے دن اور حج کے مہینہ کا احترام کرتے ہو، اسی طرح ایک دوسرے کی عزت کا احترام کرو۔ اور ایک دوسری روایت میں وابشارکم بھی ہے کہ تمہارے چمڑے بھی ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ جس طرح کسی کی جان لینا جائز نہیں، اس طرح کسی کو تھپڑ مارنا بھی جائز نہیں، بلا جواز کسی کو چھڑی مارنا بھی جائز نہیں، بلا جواز کسی پر ہاتھ اٹھانا بھی جائز نہیں۔ فرمایا یہ چاروں چیزیں تم پر حرام ہیں۔

ایک حدیث میں ذکر ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے بیت اللہ سے خطاب کیا۔ فرمایا، اے اللہ کے گھر! تو اللہ کے ہاں بہت محترم ہے لیکن ایک مسلمان کے خون کی حرمت تجھ سے بھی زیادہ ہے (طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۰۹۶۶۔ المعجم الاوسط، ۵۷۱۹)۔ یہ بات سمجھانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ جیسے ایک دفعہ حضرت عمرؓ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے حجر اسود کے پاس آئے، اسے بوسہ دیا اور سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ تو محض ایک پتھر ہے، تیرے پاس نفع و نقصان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ خدا کی قسم! اگر میں رسول اللہؐ کو تمہیں بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں تمہیں کبھی نہ چومتا (بخاری، رقم ۱۴۹۴)۔ پتھر کو کچھ کہنا مقصود نہیں تھا، دراصل یہ بات سمجھانے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ مقصد اردگرد کے لوگوں کو بات سنانا تھا کہ لوگوں کا عقیدہ درست رہے۔

چنانچہ یہ بھی حجۃ الوداع کے موقع کا ایک بہت اہم اعلان ہے کہ ایک دوسرے کی جان کی، مال کی، عزت کی اور ایک دوسرے کے چمڑے کی حفاظت کرو۔ کسی کو قتل نہیں کرو، کسی

کا مال نہ ہضم کرو، کسی کی عزت خراب نہیں کرو، کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ۔ فرمایا کہ یہ تمہارے آپس کے حقوق ہیں۔

منہ بولے رشتوں کا خاتمہ

جاہلی قدروں میں سے ایک جاہلی قدر جس کے خاتمے کا جناب نبی اکرمؐ نے اعلان ان الفاظ کے ساتھ فرمایا کہ

الولد للفراش وللعاہر الحجر و من ادعی الی غیر ابیہ او تولی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین لا یقبل اللہ منہ صرفا ولا عدلا۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۶/۱۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۲/۱۸۳)

"بچے کا نسب اسی سے ثابت ہوگا جس کے نکاح میں عورت ہوگی، جبکہ بدکاری کرنے والے کا بچے پر کوئی حق نہیں، اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔ جو شخص اپنی نسبت اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف اور جو غلام اپنی نسبت اپنے آقاؤں کے علاوہ کسی اور کی طرف کرے گا، اس پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالی اس سے کوئی معاوضہ یا تاوان قبول نہیں کریں گے۔"

جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ زبان سے معاہدہ کر کے رشتے طے ہو جاتے تھے کہ یہ میرا باپ ہے، یہ میرا بیٹا ہے۔ بھائی بھائی کہہ دیا تو بھائی ہو گئے۔ باپ بیٹا کہہ دیا تو بس یہ رشتہ بن گیا۔ کسی کو ماں کہہ دیا تو وہ ماں ہو گئی۔ کسی عورت نے کسی کو بیٹا بنا لیا تو بس یہ رشتہ قائم ہو گیا۔ یہ زبان سے اور معاہدے سے رشتہ دار بننا جاہلیت کے زمانے میں تھا اور اس کو معاشرہ میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج بھی بہت سے معاشروں میں اسے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہاں امریکہ میں بھی میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی صورت ہے کہ اگر کسی کو اپنا وارث قرار دے دیا جائے تو اسے وارث تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یعنی کسی کو اگر بیٹا یا بھائی لکھ دیا جائے، وصیت کر دی جائے تو وہ بیٹا یا بھائی شمار ہو جاتا ہے۔

جاہلیت میں بھی ایسا تھا اور اتنا عام تھا کہ خود جناب نبی اکرمؐ نے ایک نوجوان زید ابن حارثہ کو بیٹا بنا لیا تھا۔ یہ واحد صحابیؓ ہیں جن کا نام قرآن کریم میں ہے۔ قرآن کریم میں صحابہؓ کا ذکر تو ہے، بعض صحابہؓ کی خصوصیات کی طرف اشارات بھی ہیں لیکن کسی کا نام نہیں ہے۔ اگر کسی صحابیؓ کا نام قرآن کریم میں ہے تو وہ زید ابن حارثہؓ کا ہے۔ فلما قضی زید منھا وطرا زوجنا کھا (الاحزاب ۳۳۔ آیت ۳۷)۔ یہ رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام تھے اور غلاموں

میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے تھے۔ زید ابن حارثہؓ سے حضورؐ کو بڑی محبت تھی۔ اور حضورؐ کو ان سے بھی محبت تھی اور ان کے بیٹے اسامہ بن زیدؓ سے بھی۔ رسول اللہؐ نے نہ صرف حضرت زیدؓ کو بیٹا بنایا بلکہ ان کا اپنی پھوپھی زاد سے نکاح بھی کر دیا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اپنے خاندان میں رشتہ کروا کر ان کا یہ اسٹیٹس بھی قائم کر دیا کہ قریش کے داماد ہیں، ہاشمیوں کے داماد ہیں۔ اور وہ زید بن محمد کہلانا شروع ہو گئے جبکہ حضورؐ کی کنیت ابوزید ہو گئی کہ یہ زید کے باپ ہیں۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے جاہلیت کی یہ رسم توڑی اور حضورؐ سے تڑوائی۔ یہ اتنی بڑی رسم تھی کہ حضورؐ کے توڑنے سے ہی اس رسم نے ٹوٹنا تھا ورنہ باقی دنیا میں اب تک یہ رسم باقی ہے۔ قرآن کریم نے واضح طور پر فرما دیا کہ

ادعوھم لاٰبآئھم ھو اقسط عند اللہ ج (احزاب ۳۳۔ آیت ۵)

”انہیں ان کے اصلی باپوں کے نام سے پکارو، اللہ کے ہاں یہی پورا انصاف ہے“۔

چنانچہ حضورؐ کو بھی منع فرما دیا گیا۔ حضورؐ نے کنیت ترک کر دی اور زید بن محمد پھر زید بن حارثہ کہلانا شروع ہو گئے۔ بلکہ اس سے اگلی بات کہ جب زید ابن حارثہؓ نے زینب بنت جحش کو طلاق دے دی، نباہ نہیں ہوا، آپس میں مزاج نہیں ملے تو اللہ تعالیٰ نے زینب بنت جحشؓ کا نکاح حضورؐ سے کروا دیا۔ یہ اتنی بڑی بات تھی جاہلیت کے اس معاشرہ میں کہ ایک طوفان کھڑا ہو گیا کہ بہو سے نکاح کر لیا۔ بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے فرمایا کہ میں نے یہ نکاح کروایا ہے، یہ نہیں کہا کہ میں نے آپ کو اجازت دی ہے کہ یہ نکاح کر لیں۔ ایک بہت پرانی رسم توڑنی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسی سطح پر یہ بات کی۔ قرآن کریم میں کہا کہ جب زیدؓ نے طلاق دے دی زینب کو تو زوجنا کھا ہم نے اس کا نکاح آپؐ سے کرا دیا۔ زینب بنت جحشؓ بڑے فخر سے دوسری ازواج مطہرات سے یہ ذکر کیا کرتی تھیں کہ تمہارے نکاح فرش پر ہوئے ہیں اور میرا نکاح عرش پر ہوا ہے۔ (بخاری، رقم ۶۸۷۰)

ازواج مطہرات میں آپس میں نوک جھوک چلتی رہتی تھی، جیسا کہ سوکنوں میں عام طور پر ہوتا ہے۔ انسان تھیں اور عورتیں تھیں۔ بخاری کی روایت ہے کہ ازواج مطہرات کے دو گروپ تھے۔ ایک گروپ میں حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت صفیہؓ اور حضرت سودہؓ تھیں جبکہ دوسرے گروپ میں حضرت ام سلمہؓ اور باقی ازواج مطہرات تھیں (بخاری، رقم ۲۳۹۳)۔ ان کی آپس میں نوک جھوک چلتی رہتی تھی جو کہ فطری بات ہے۔ حضرت

عائشہؓ کہتی ہیں کہ میری جب بھی زینبؓ سے کوئی بات ہوئی ہے تو میں جیتی ہوں لیکن ایک بات میں ان کی برتری تھی۔ دونوں اپنے اعزازوں کا ذکر کرتیں، ایک کہتی کہ میں یہ ہوں دوسری کہتی کہ میرا یہ اعزاز ہے۔ لیکن جب زینبؓ یہ کہتی تھی کہ تمہارے نکاح فرش پر ہوئے ہیں اور میرا نکاح عرش پر ہوا ہے تو میں لاجواب ہو جایا کرتی تھی، زینبؓ کی اس بات کا میرے پاس جواب نہیں ہوتا تھا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک دفعہ یوں ہوا کہ میں حضورؐ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تو زینبؓ آگئیں۔ انہوں نے کوئی شکایت کی جس سے بات شروع ہوگئی، وہ بولتی رہیں اور میرے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ میں حضورؐ کے چہرے کی طرف چپ کر کے دیکھتی رہی کہ حضورؐ کیا کہتے ہیں۔ پھر جب زینبؓ نے اپنا سارا غصہ نکال لیا تو حضورؐ نے میری طرف دیکھا تو پھر میں شروع ہوگئی اور ایسی شروع ہوئی کہ میں نے زینب کو چپ کرا دیا۔ میں نے جب بالکل لاجواب کر دیا تو حضورؐ نے اور کچھ نہیں کہا بس آخر میں اتنا ہی تبصرہ کیا کہ آخر ابوبکرؓ کی بیٹی ہے (بخاری، رقم ۲۳۹۳)۔ معاصرت آپس میں اس درجے کی تھی لیکن دیانت اور امانت کی یہ بات دیکھیں کہ جب حضرت عائشہؓ پر تہمت لگی، الزام لگا تو حضورؐ نے گھر کی بیویوں سے بھی پوچھا ہے کہ عائشہؓ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت زینبؓ سے بھی پوچھا۔ اس سے بہتر کوئی موقع کسی سوکن کو نیچا دکھانے کا نہیں ہو سکتا۔ پوچھا کہ عائشہؓ کے بارے میں لوگ یہ باتیں کرتے ہیں، تمہارا کیا خیال ہے؟ حضرت زینبؓ کہنے لگیں یا رسول اللہ! اللہ کو جان دینی ہے، عائشہؓ میں کوئی خرابی نہیں، میں گواہی دیتی ہوں (بخاری، رقم ۲۴۶۷)۔ یہ امانت اور دیانت کی بات ہے۔ جھگڑے آپس میں ہوتے رہتے تھے وہ فطری بات ہے۔ حالانکہ زینب بنت جحشؓ کی اپنی بہن حمنہؓ بنت جحش اس پراپیگنڈے کا حصہ تھی لیکن حضورؐ نے جب حضرت زینب سے پوچھا تو کہا نہیں حضورؐ! عائشہ بالکل پاک ہے اور اس بات کا عائشہؓ میں تصور بھی نہیں ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے آپؐ کا زینبؓ سے نکاح کر دیا۔ اور سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے یہ ضابطے بیان فرمائے کہ آج کے بعد جو شخص بھی جس باپ کا حقیقی بیٹا ہے، اسی کے حوالے سے پہچانا جائے گا، نسب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

آج بھی یہ مسئلہ دنیا کی کچھ سوسائٹیوں میں ہے اور ہمارے ہاں بھی ایک دو جزوی باتوں کے حوالے سے یہ موجود ہے۔ ہمارے ہاں یہ مسئلہ چلتا ہے اور ہمارے پاس بھی ایسے بہت سے معاملے آتے ہیں۔ جب کوئی بے اولاد جوڑا کسی بچے کو لے کر پالتا ہے، وہ بچہ حقیقت میں ان کا نہیں ہے لیکن وہ اس کا تعارف اپنے حوالے سے لکھواتے ہیں کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ جب نکاح نامے میں اندراج کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ شناختی کارڈ میں تو ایسے ہی لکھا ہوا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ بھئی یہ اس کا باپ نہیں ہے۔ ایک کیس میں تو اچھا خاصا مسئلہ بن گیا۔ میرے محلے کا خاندان تھا اور میں ان سے واقف تھا، کہنے لگے کہ اس کا باپ وہ ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا باپ وہ نہیں ہے میرے سامنے انہوں نے بچہ گود لیا ہے۔ کہنے لگے کہ جی کاغذات میں تو یہی باپ لکھا ہے، میں نے کہا کہ میں اب کیا کر سکتا ہوں؟ تو ہمارے ہاں یہ مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جبکہ شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ بچہ لے کر پالنا تو ٹھیک ہے لیکن وہ اپنے ماں باپ کے حوالے سے ہی پہچانا جائے گا۔ قرآن کریم میں بھی نسبت تبدیل کرنے سے روکا گیا ہے اور خود نبی کریمؐ نے بھی اس سے منع فرمایا ہے۔

حج یا عمرہ کے لیے خود ساختہ محرم

ہمارے ہاں پاکستان میں اس حوالے سے ایک اور مسئلہ پیش آتا ہے۔ حج پر جانے کے لیے شریعت کا بھی اور سعودیہ کا بھی قانون ہے کہ عورت محرم کے سوا نہیں جا سکتی۔ سعودی حکومت اس کی تصدیق مانگتی ہے۔ ہمارے پاس ایسے کئی معاملے آتے ہیں کہ مولوی صاحب! حج پر جانا ہے تو میں نے فلاں کو بھائی بنا لیا ہے، آپ تصدیق کر دیں۔ بھئی ہم کیسے تصدیق کر دیں، یہ تمہارا حقیقی بھائی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ محرم بنا کر حج پر جانے والا معاملہ ہوتا ہے۔ فلاں کو میں نے بیٹا بنا لیا ہے، تصدیق کر دیں۔ جہاں اس بات کا ہمیں علم ہو، ہم تصدیق نہیں کرتے۔ ایک بی بی تو یہاں تک کہنے لگی کہ مولوی صاحب! میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنا بیٹا بنایا ہے۔ میں نے کہا بی بی! یہ بیٹے بنانے سے نہیں بنتے، یہ تو اللہ کی طرف سے بنے بنائے آتے ہیں، یہ خود کار سسٹم ہے۔ چنانچہ شریعت تین حوالوں سے رشتے تسلیم کرتی ہے۔ درمیان میں بات آگئی ہے تو عرض کر دیتا ہوں۔

رشتوں کے شرعی اسباب

شریعت نسب کے حوالے سے، صہر کے حوالے سے اور رضاعت کے حوالے سے رشتہ تسلیم کرتی ہے۔ یہ تین اسباب ہیں شریعت میں رشتہ قائم ہونے کے۔

1. پہلا سبب نسب کا ہے کہ جس کے ہاں کوئی پیدا ہو۔ اس حوالے سے باقی رشتے قائم ہوتے ہیں جیسے باپ، ماں، بھائی، چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ وغیرہ۔

2. دوسرا سبب صہر کا ہے۔ صہر کہتے ہیں سسرال کو، یعنی سسرال کا رشتہ۔ اب جس عورت کے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے تو اس عورت کی ماں اس کی ماں بن گئی ہے، وہ اس پر حرام ہے۔ اب وہ اس عورت کی ماں سے شادی نہیں کر سکتا، اس کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اسے صہر کا یعنی سسرالی رشتہ کہتے ہیں۔

3. تیسرا سبب رضاعت کا رشتہ ہے جو ہمارے ہاں اکثر نظر انداز ہو رہا ہے۔ رضاعت کا رشتہ یہ ہے کہ ایک بچے نے دودھ کی عمر میں اپنی حقیقی ماں کے علاوہ کسی عورت کا دودھ پی لیا ہے تو بس اب وہ اس کی ماں بن گئی ہے۔

رضاعت کے رشتے کے بارے میں قرآن کریم نے اسے اس طرح ذکر کیا ہے کہ

وامھاتکم اللاتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعۃ (النساء ۴۔ آیت ۲۳)

”اور (تم پر حرام ہیں) جن ماؤں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں“۔

جہاں قرآن کریم نے محرمات کا ذکر کیا کہ فلاں فلاں عورت سے تمہاری شادی جائز نہیں ہے، وہاں یہ بھی ذکر کیا کہ وہ عورتیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، اب وہ تمہاری مائیں بن گئی ہیں اور ان کی بیٹیاں تمہاری بہنیں بن گئی ہیں۔ جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ

یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔ (بخاری، رقم ۲۴۵۱)

”جو رشتے نسب میں حرام ہیں، رضاعت میں بھی حرام ہیں“۔

جس عورت کا دودھ پیا ہے، اس کی بہن اب اس کی خالہ بن گئی ہے۔ یعنی نسب کی خالہ سے شادی حرام ہے تو رضاعت کی خالہ سے بھی حرام ہے۔ جس عورت کا دودھ پیا ہے، اس کا خاوند اس کا باپ ہے اور خاوند کا بھائی اس کا چچا ہے۔ چچا نسب میں بھی حرام ہے اور رضاعت میں بھی حرام ہے۔ اس باپ کی بہن اس کی پھوپھی لگی۔ پھوپھی نسب میں بھی حرام ہے، رضاعت میں بھی حرام ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب میں حرام ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اس سے لاپرواہی برتی جاتی ہے اور اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس سلسلہ میں بے شمار روایات ہیں۔

پردے کے احکام آنے سے پہلے رشتہ دار وغیرہ گھر میں آتے جاتے تھے۔ جب شریعت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی تو لوگ بھی ایسی کوئی پابندی نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب پردے کا حکم آیا کہ کوئی غیر محرم سامنے نہیں آئے گا تو ایک صاحب آئے، حضرت عائشہؓ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ خاندان کے آدمی تھے۔ بتایا کہ میں افلح ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ نہیں بھئی! میں رسول اللہؐ سے پوچھوں گی کہ تمہیں اندر آنے کی اجازت دے سکتی ہوں کہ نہیں۔ چنانچہ بعد میں رسول اللہؐ سے پوچھا کہ وہ افلح آئے تھے تو میں نے اجازت نہیں دی۔ آپؐ نے فرمایا کہ آنے دیتی وہ تمہارا چچا لگتا ہے۔ یارسول اللہ! وہ میرا چچا کدھر سے لگتا ہے؟ فرمایا اس کے بھائی کی بیوی کا تم نے دودھ نہیں پیا؟ یارسول اللہ! پیا ہے۔ فرمایا کہ بس وہ تمہارا چچا لگا۔ حضرت عائشہؓ نے مذاق سے کہا، یارسول اللہ! دودھ تو میں نے عورت کا پیا ہے۔ فرمایا، ہاں عورت کا ہی پیا ہے لیکن عورت کا خاوند تمہارا باپ ہے اور باپ کا بھائی تمہارا چچا ہے (بخاری، رقم ۴۸۳۸)۔ تو جیسے دوسرا چچا گھر آسکتا ہے یہ رضاعت کا چچا بھی آسکتا ہے۔

انصار اور مہاجرین میں مؤاخاۃ

میں عرض کر رہا تھا کہ جناب نبی اکرمؐ نے جاہلیت کی جن رسموں کے خاتمے کا اعلان فرمایا، ان میں ایک رسم تبنی اور تآخی کی بھی تھی۔ یہ حضورؐ کے زمانے میں بھی ابتدا میں رہی ہے۔ باپ بیٹا بننے کی رسم حضورؐ نے اپنائی ہے اور بھائی بھائی بننے کی رسم بھی۔ آپؐ نے اسی پرانی رسم کے مطابق مواخات کروائی اور انصار مدینہ کو مہاجرین کا بھائی بنایا۔ اس وقت تک وراثت اور دیگر اس طرح کے تفصیلی احکامات نہیں آئے تھے۔ جب مہاجر مدینہ منورہ آئے تو سینکڑوں کی تعداد میں تھے جنہیں سنبھالنا اجتماعی طور پر مشکل تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے آسان حل نکالا اور ایک ایک مہاجر ایک ایک انصاری خاندان کے حوالے کر دیا اور کہا کہ تم بھائی بھائی ہو۔ اسے مواخات کہتے ہیں جو کہ سیرت کے واقعات میں یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ جب تک وراثت کے تفصیلی احکامات نہیں آئے، یہ ایک دوسرے کے وارث تھے۔ یعنی مہاجر فوت ہوتا تو اس کا انصاری بھائی وارث ہوتا۔ اسی طرح کوئی انصاری فوت ہوتا تو اس کا مہاجر بھائی اس کا وارث ہوتا۔ جناب نبی کریمؐ کا معمول مبارک یہ رہا ہے کہ کسی معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب تک کوئی حکم نہیں آیا اس وقت تک پرانی روایات پر عمل کرتے تھے۔ ہاں اگر حکم آگیا تو پہلی روایت ختم کر کے نئی بات نافذ کر دی جاتی۔ چنانچہ

مواخات حضورؐ نے خود کروائی لیکن بعد میں پھر منع فرما دیا۔ ایک تھا تبنی یعنی باپ بیٹا بننا، دوسرا تھا تاخی یعنی بھائی بھائی بننا۔ اور پھر ایک تیسری چیز تھی موالات۔

پہلی باتیں تو آج کے ماحول میں بھی سمجھ میں آتی ہیں لیکن موالات کی بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آئے گی۔ موالات یہ ہے کہ کسی خاندان نے ایک غلام آزاد کر دیا تو وہ غلام آزاد ہو جانے کے باوجود اسی خاندان کا مولی کہلاتا ہے۔ مولی کا معنی ہے آزاد کردہ غلام۔ آزاد تو وہ ہو گیا لیکن پھر بھی اس کا کچھ تعلق اس خاندان سے باقی رہتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وراثت کا جو آخری درجہ ہے کہ جب خاندان کا اور کوئی وارث نہ ہو تو وراثت میں پھر مولی وارث ہوتا ہے۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ نے جب آزاد کروانا چاہا تو آزاد کرنے والے خاندان نے ولا کی شرط لگائی کہ ولا ہماری ہوگی۔ تو حضور نے فرمایا کہ مولی تبدیل نہیں ہو سکتا، وہ جس خاندان کا مولی ہے اسی خاندان کا رہے گا۔ جاہلیت کے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ کسی نے ناراض ہو کر مولی تبدیل کر لیا کہ یہ اب میرا مولی نہیں ہے۔ یا غلام ناراض ہو کر چلے جاتے تھے کہ میں اب اس خاندان کا مولی نہیں ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں بھئی ایسا نہیں ہوگا۔ حضرت بریرہؓ کے شخصی واقعہ میں حضورؐ نے اس کی اجازت نہیں دی۔

نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی یہ ہے جو آدمی اپنے باپ سے ہٹ کر کسی اور کی طرف منسوب ہوا اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ لیکن معلوم ہونا شرط ہے، اگر کوئی مغالطہ ہے یا کسی افراتفری میں نسب تبدیل ہو گیا ہے تو وہ بات الگ ہے۔ لیکن اگر معلوم ہے کہ یہ میرا باپ نہیں ہے اور پھر نسبت اس کی طرف کرتا ہے، یہ ملعونوں کا کام ہے اس کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ یہ جاہلیت کی رسم حضورؐ نے ختم کر دی کہ آج کے بعد رشتہ وہی ہوگا جو نسب سے ہوگا، صہر سے ہوگا، یا رضاعت سے ہوگا۔ آسان لفظوں میں سمجھ لیجیے کہ منہ بولے رشتے حضورؐ نے ختم کر دیے۔

اسلام کا رشتہ

پھر نبی کریمؐ نے ایک اور بات کا اعلان فرمایا۔ اخوت کے جاہلی رشتوں کی نفی کی اور فرمایا کہ اخوت کا رشتہ تمہارے درمیان اسلام کا رشتہ ہے۔ اس پر آپؐ نے کچھ ہدایات دیں۔

قرآن کریم نے ذکر کیا کہ

انما المؤمنون اخوۃ (الحجرات ۴۹۔ آیت ۱۰)

”بے شک مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔“

آپؐ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ

ان المسلم اخوالمسلم لایغشہ ولایخونہ ولایغتابہ۔

”ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس کے ساتھ دھوکا نہیں کرتا اور اس کے ساتھ خیانت نہیں کرتا اور اس کی غیبت نہیں کرتا“۔

غش‘ کہتے ہیں ملاوٹ کرنے کو۔ اس کا مطلب چیزوں میں ملاوٹ بھی ہے اور معاملات وتعلقات میں ملاوٹ بھی ہے۔ یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کو کسی معاملے میں دھوکہ نہیں دیتا۔ اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے مال میں خیانت نہیں کرتا۔ یہ خیانت کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے کہ خیانت صرف مال کی نہیں ہوتی۔ خیانت کا بڑا پہلو یہی ہے کہ مال میں، لین دین میں، یا امانت میں خیانت کی جائے۔ صرف ایک بات سے سمجھ لیں کہ خیانت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ مثال کے طور پر جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا المستشار مؤتمن (ترمذی، رقم ۲۷۴۷)۔ ایک آدمی آپ سے مشورہ طلب کرتا ہے اور آپ دیانت داری سے مشورہ نہیں دیتے تو یہ خیانت ہے۔ یا مثلاً اگر اس کو زیادہ وسیع دائرہ میں دیکھیں کہ آپ ایک آدمی کو منتخب کر رہے ہیں، کسی کو آپ نے ووٹ دینا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ آدمی اس کا اہل نہیں ہے، لیکن آپ اپنے کسی مفاد کی وجہ سے اس کے حق میں رائے دیتے ہیں تو یہ بالکل خیانت ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الیٰ اھلھاؗ (النساء ۴۔ آیت ۵۸)

”بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دو“۔

اس میں ہر طرح کی امانت آجاتی ہے، چاہے یہ علم کی امانت ہو، مال کی امانت ہو، ووٹ کی امانت ہو، مشورہ کی امانت ہو، کوئی بھی امانت ہو۔ اور پھر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی غیبت بھی نہیں کرتا۔ غیبت پر پہلے بھی بات ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے بھی جہاں مسلمانوں کو بھائی بھائی کہا وہیں یہ بھی کہا کہ

ولایغتب بعضکم بعضاؑ (الحجرات ۴۹۔ آیت ۱۲)

”اور نہ کوئی کسی سے غیبت کیا کرے“۔

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ اس کے عیب کا کسی دوسری جگہ بلا ضرورت تذکرہ نہ کیا جائے۔ قرآن پاک نے غیبت کی وضاحت فرماتے ہوئے اس کی تشبیہ یوں دی کہ اگر بھائی کی لاش پڑی ہو تو کیا اس لاش سے گوشت نوچ کر کھاؤ گے؟ غیبت کرنا

ایسا ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کی لاش سے گوشت نوچ کر کھانا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ غیبت کہتے ہی اس بات کو ہیں کہ ایک شخص میں کوئی عیب موجود ہو اور آپ بلا ضرورت اس بات کا کسی جگہ تذکرہ کریں۔ ہمارے ہاں عام طور پر غیبت اس بات کو سمجھا جاتا ہے کہ کسی کے خلاف کوئی جھوٹی بات کہہ دینا۔ حالانکہ ایسا کرنا غیبت نہیں ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے جب فرمایا کہ غیبت کبیرہ گناہ ہے تو ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کسی میں اگر وہ عیب ہو تب بھی غیبت ہے؟ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ اس شخص میں یہ عیب نہیں ہے اور ہم ذکر کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ اسی کا نام تو غیبت ہے۔ اگر اس میں وہ خرابی نہیں ہے اور آپ کسی جگہ اس کا تذکرہ کر رہے ہیں تو وہ بہتان ہے فقد بہتہ پھر تو تم نے بہتان باندھا ہے (مسلم، رقم ۴۶۹۰)۔ میں نے ایک جملہ ساتھ کہا ہے، بلا ضرورت۔ ضرورت کے مقام پر اس کا ذکر درست ہے۔ مثلاً آپ کو عدالت کے کسی کیس میں کسی شخص پر گواہی دینی ہے تو وہاں یہ غیبت شمار نہیں ہوگی۔ یعنی کسی کیس کا فیصلہ آپ کی گواہی پر موقوف ہے تو وہاں آپ کسی شخص کی کیس سے متعلقہ خرابی کا ذکر کر سکتے ہیں۔ البتہ غیر متعلقہ کا وہاں بھی ذکر نہیں کر سکتے۔ یا پھر مثال کے طور پر ایک شخص کی کسی بات سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے تو آپ اس کے خطرہ سے دوسرے شخص کو آگاہ کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا غیبت نہیں ہے۔ لیکن یہ بالکل آپ کی دیانت پر ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

غیبت تو ہمارے ہاں عام ہے۔ ہمارا تو کلچر ہی یہ ہے کہ جہاں دو آدمی بیٹھتے ہیں وہاں کوئی تیسرا زیر بحث ہوتا ہے اور اس کو پوری طرح بے نقاب کرنے میں ہم کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے باہمی حقوق کے خلاف ہے۔ فرمایا ولا یغشہ ولا یخونہ ولا یغتابہ۔ ایک اور روایت میں یہ بات اس طرح فرمائی کہ

المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ۔ (بخاری، ۲۲۶۲)

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا اور اسے رسوا نہیں کرتا"۔

ولا یسلمہ بڑا خطرناک جملہ ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر کے حوالے بھی نہیں کرتا کہ وہ اس پر ظلم کرے اور یہ بیٹھ کر تماشا دیکھتا رہے۔ اس کو دشمن کے سپرد بھی نہیں کر دیتا کہ اس کے ساتھ جو مرضی کرے۔ یہ حضورؐ نے مسلمانوں کے آپس کے حقوق بیان فرمائے۔

حدیث جبریلؑ میں حضورؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! ما الایمان ایمان کیا ہے؟ فرمایا کہ

ان تؤمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ

والبعث بعد الموت۔

”ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر، اللہ کی طرف سے اچھی اور بری تقدیر پر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر ایمان لاؤ“۔

اور اسلام کے بارے میں فرمایا کہ

ان تشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ و تقیم الصلوۃ و توتی الزکوۃ و تصوم رمضان و تحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا۔ (مسلم، رقم ۹)

”یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور اللہ کے گھر کا حج ادا کرو جو اس کی استطاعت رکھتا ہے“۔

حدیث جبریل میں حضورؐ نے یہ مطلب بیان فرمایا کہ مسلم وہ ہے جو اسلام کے احکامات پر عمل کرتا ہے۔ مومن وہ ہے جس کا ایمانیات پر یقین پختہ ہو۔ اور مہاجر کسے کہتے ہیں؟ ہجرت کا معنی یہ ہے کہ ایک آدمی ایک جگہ رہتا ہے اور وہاں وہ اپنے دین پر آزادی سے عمل نہیں کر پاتا تو وہ اس جگہ سے ایسی جگہ پر ہجرت کر جائے جہاں وہ اپنے دین پر آزادی سے عمل کر سکے۔ ایک آدمی کو ایک جگہ نماز پڑھنے کی، قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی اور دیگر شعائر اسلام پر عمل کرنے کی اجازت نہیں ہے تو اس کے لیے اسلام کی رو سے وہاں رہنا جائز نہیں ہے۔ وہ وہاں سے کسی دوسری جگہ پر چلا جائے گا جہاں وہ شعائر اسلام پر آزادی سے عمل کر سکے۔ تو اس طرح ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کے عمل کو ہجرت اور ایسے شخص کو مہاجر کہتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے حضورؐ نے خود مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی اور بہت سے صحابہؓ نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔

مسلم، مومن اور مہاجر کا اصطلاحی معنی تو وہی ہے جو حضورؐ نے حدیث جبریل میں بیان فرمایا لیکن یہاں ایک اور معنی حضورؐ نے فرمایا کہ

الا اخبرکم بالمومن من امنہ الناس علی اموالھم وانفسھم والمسلم من سلم الناس من لسانہ ویدہ والمجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ والمھاجر من ھجر الخطایا والذنوب۔ (مسند احمد، ۲۲۸۳۳۔ صحیح ابن حبان، ۴۸۶۲)

”کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ مومن کون ہے؟ وہ جس سے لوگ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کو محفوظ سمجھیں۔ اور مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کے شر) سے

لوگ بچے رہیں۔ اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے۔ اور مہاجر وہ ہے جو گناہوں اور غلطیوں کو ترک کر دے۔“

مسلم وہ ہے کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں۔ کسی دوسرے کو ضرر دینے کی دو ہی چیزیں ہیں، یا آدمی زبان سے کسی کو نقصان پہنچائے گا یا ہاتھ سے نقصان پہنچائے گا۔ اگر مسلمان سلامتی والا ہے اور سوسائٹی کے باقی لوگ اس کے شر سے محفوظ ہیں تو وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہے۔ پھر فرمایا مومن وہ ہے جس کو لوگ اپنے مالوں اور جانوں پر محافظ اور امین سمجھیں، یعنی لوگوں کا اس پر اعتماد ہو کہ یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اور ہجرت کا لفظی معنی ترک کرنا ہے، گویا مہاجر وہ ہے جو گناہ اور نافرمانی کو ترک کر دے۔

حضورؐ نے ایک اصطلاح کے دو معنی بیان فرمائے۔ ایک تو ظاہری معنی اور دوسرا اس کی روح۔ ظاہرا مسلمان وہ ہے جو کلمہ پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، زکوۃ دیتا ہے اور بیت اللہ کا حج کرتا ہے۔ لیکن اپنی روح کے اعتبار سے مسلمان وہ ہے کہ جس کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اسی طرح ظاہرا مومن وہ ہے جو اللہ، رسولوں، فرشتوں، اللہ کی کتابوں، قیامت کے دن، اچھی بری تقدیر اور مرنے کے بعد آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن اپنی روح کے اعتبار سے مومن وہ ہے کہ جس کا ایمان اتنا پختہ ہو اتنا مضبوط ہو کہ لوگ اسے اپنی جانوں اور اپنے مالوں پر امین سمجھیں، اور اس پر اعتماد کریں۔

حضرات صوفیائے کرام کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ وہ ایک چیز کے ظاہری معنی کے ساتھ اس کی روح کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اور یہ جناب نبی کریمؐ کی سنت ہے۔ مثلا ایک عمل ہے نماز پڑھنا۔ نماز کے ظاہری ارکان کیا ہیں؟ قیام ہے، رکوع ہے، سجدہ ہے اور قاعدہ ہے جن کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ لیکن جب آپ کسی اللہ والے سے پوچھیں گے تو وہ آپ کو یہ تلقین کرے گا کہ نماز میں توجہ پوری ہو، خشوع و خضوع ہو، فلاں بات نماز میں ہو اور فلاں نہ ہو۔ وہ نماز کے ایسے اوصاف بیان کرے گا کہ آپ کو نماز کی روح سے آشنا کرے گا۔ اسی طرح روزہ دیکھ لیجیے۔ روزہ کا عام معنی یہ ہے کہ آدمی سحری سے افطار تک کھانے پینے کی چیزوں سے اور ازدواجی تعلقات سے بچا رہے۔ لیکن اللہ والے آپ کو روزہ کی روح سے آگاہ کریں گے کہ خیالات کو پاک رکھو، ہاتھ کو بھی ٹھیک رکھو، نگاہ بھی صحیح رکھو، کانوں اور زبان کا بھی

ٹھیک استعمال کرو۔ تو یہ جناب نبی کریمؐ کی سنت ہے کہ جس طرح ایمان اور اسلام کے ظاہری معانی بیان فرمائے، اسی طرح ان کی روح بھی بیان فرمائی۔

سوسائٹی کے کمزور طبقات

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں دو کمزوروں، دو ضعیفوں کے بارے میں بطور خاص وصیت کرتا ہوں کہ ان کے حقوق کا خیال کرنا کیونکہ وہ اپنا حق اپنے طور پر وصول کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ ایک یتیم اور دوسرا عورت۔ فرمایا کہ یہ دو کمزور ہیں، میں ان کے حقوق کے بارے میں تمہیں بطور خاص وصیت کرتا ہوں۔ اور تیسرا طبقہ جس کے بارے میں فرمایا کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں غلاموں کے بارے میں، ماتحتوں کے بارے میں۔ اس زمانے میں غلام ہوتے تھے، آج بھی ہیں لیکن ذرا عنوان بدل گئے ہیں۔ فرمایا کہ میں غلاموں کے بارے میں بطور خاص وصیت کرتا ہوں کہ وہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں۔ رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت جو معاشرہ تھا، اس میں یہ تینوں طبقے فی الواقع مظلوم تھے۔ اور یہ آج بھی مظلوم ہیں، ذرا پہلو بدل گئے ہیں، رخ بدل گئے ہیں، حوالے بدل گئے ہیں، لیکن ہیں۔ قرآن کریم نے بھی یتیم اور عورت کا ذکر کیا ہے۔

یتیموں کے ساتھ سلوک

اس سوسائٹی کو سمجھنے کے لیے قرآن کے حوالے سے ایک بات میں ذرا تفصیل سے بیان کروں گا۔ حضرت عروہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت زبیرؓ کے بیٹے تھے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے بھی تھے اور شاگرد بھی، بلکہ علمی جانشین تھے۔ میں نے پہلے بھی کسی جگہ ذکر کیا تھا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے علوم کو امت تک منتقل کرنے والے تین بڑے آدمی ہیں۔ ایک ان کے بھتیجے قاسم ابن محمدؒ۔ دوسرے ان کے بھانجے عروہ ابن زبیرؒ۔ اور تیسری خاتون ہیں عمرہ بنت عبد الرحمنؒ جن کو حضرت عائشہؓ کی اصل جانشین سمجھا جاتا ہے۔ وہ بڑی محدثہ اور فقیہ تھیں۔ تو عروہؒ شاگرد بھی تھے اور بھانجے بھی۔ حضرت عائشہؓ کی گود میں پلے ہیں بیٹوں کی طرح۔ عروہؒ بہت سے حوالوں سے اپنے سوالات کا ذکر کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی کسی آیت کو سمجھنے میں کوئی اشکال ہوتا تو حضرت عائشہؓ سے پوچھتے کہ اماں جان! یہ آیت سمجھ میں نہیں آرہی۔ ان میں سے ایک آیت کا میں اس وقت تذکرہ کروں گا۔

عروہؓ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی ایک آیت سمجھ میں نہیں آرہی تھی، میں نے اماں جان سے پوچھا۔ یہ سورۃ النساء کی آیت ہے

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنی وثلاث ورباع ج (النساء ۴۔ آیت ۳)

"اور اگر تم یتیم لڑکیوں سے بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کرلو"۔

عروہؓ کہتے ہیں کہ میں نے خالہ جان سے پوچھا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے کہ یتیموں سے اگر انصاف نہ کرسکو تو شادیاں کرو؟ اس بات کا آپس میں کیا جوڑ ہے، یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرنے کا شادیوں کے ساتھ کیا تعلق؟ حضرت عائشہؓ نے کہا بیٹا بات یہ ہے کہ جب تک اس معاملے کا تمہیں پس منظر پتہ نہ چل جائے، یہ آیت تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

گفتگو کا یہ اصول صرف قرآن کریم ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں گفتگو ہو جب تک وہ اس کے بیک گراؤنڈ میں نہ دیکھی جائے اس وقت تک اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی بات کہاں اور کس ماحول میں کہی گئی ہے۔ گفتگو کو اس کے اصل پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کا مطلب سمجھ میں آتا ہے ورنہ آدمی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم دنیا کی اصطلاحات میں اسے پس منظر، ماحول اور بیک گراؤنڈ کہتے ہیں جبکہ قرآن کریم کی تفسیر کی اصطلاح میں اسے شان نزول کہتے ہیں۔ مثلاً یہ آیت کب نازل ہوئی تھی، کیوں نازل ہوئی تھی اور وہ مسئلہ کیا تھا جو اس آیت کے نزول کا سبب بنا۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں، چونکہ اس آیت کا پس منظر تمہارے سامنے نہیں ہے اس لیے تمہیں یہ آیت سمجھنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ پھر انہوں نے اس کے پس منظر کی وضاحت فرمائی۔ یہ عرب کا قبائلی نظام تھا جس میں ایک قبیلہ کا سردار اپنے قبیلہ کے تمام معاملات کا مختار اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ کوئی شخص فوت ہو جاتا اور اس کی بچی یتیم ہو جاتی تو اس کا فیصلہ بھی خاندان کا سردار ہی کرتا۔ بچی کا باپ اگر جائیداد وغیرہ چھوڑ جاتا یا یہ کہ بچی خوبصورت ہوتی تو سردار کی نیت خراب ہو جاتی اور وہ اس بچی کو اپنے حرم میں ڈال لیتا۔ یہ کہہ کر کہ میں اسے اپنے نکاح میں لیتا ہوں لیکن در حقیقت وہ اپنے سرپرست ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے مہر اور دیگر حقوق میں اس کی حق تلفی کرتا۔

سورۃ النساء کی اس آیت میں قرآن کریم نے دراصل اس بات پر پابندی لگائی کہ یتیم بچیوں

کے ساتھ اگر تم انصاف کر سکتے ہو تو نکاح کرنا منع نہیں ہے لیکن اگر انصاف نہیں کر سکتے تو ان بچیوں کو خواہ مخواہ اپنے حرم میں ڈال کر انہیں ان کے حقوق سے محروم نہ کرو۔ (بخاری، ۲۳۱۴)

اس کے علاوہ بیویوں کی تعداد پر بھی کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ کئی سرداروں نے تو سو سو بھی رکھی ہوئی تھیں۔ دس، بیس، پچاس بیویاں تو سرداروں کے پاس ہوتی تھیں۔ اب جہاں بیس پچیس بیویاں ہوں گی آپ خود اندازہ کر لیں کہ ان کے حقوق کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ نہ تو انہیں حقوق مل رہے ہیں اور نہ آزادی! وہ بس ایسے ہی اس کے حرم میں پڑی ہیں۔ اس لیے پابندی لگا دی گئی کہ چار سے زیادہ عورتوں سے شادی نہیں کر سکتے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ چار کی حد اجازت کے لیے نہیں ہے بلکہ چار سے زیادہ کی ممانعت کے لیے ہے۔ چنانچہ جب یہ حکم نازل ہوا تو نبی کریمؐ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دے دیا کہ جس کے پاس چار سے زیادہ ہیں وہ انہیں فارغ کر دے۔ ایک صحابیؓ کے پاس پانچ تھیں، اس نے ایک فارغ کر دی۔ ایک کے پاس دس تھیں، چھ فارغ کر دیں۔

اب خود نبی کریمؐ کے حوالے سے یہ مسئلہ پیش آگیا کہ حضورؐ کے پاس نو تھیں۔ یہ بھی ایک بہت بڑا سوال ہے کہ باقیوں سے تو حضورؐ نے چار سے زیادہ چھڑوا دیں لیکن خود کیوں نہیں چھوڑیں۔ نو کی نو رکھیں اور کسی کو طلاق نہیں دی۔ جناب نبی کریمؐ کے لیے حکم مختلف تھا۔

لا یحل لک النسآء من بعد ولآ ان تبدل بھن من ازواج ولو اعجبک حسنھن (احزاب ۳۳۔ آیت ۵۲)

"اس کے بعد آپ کے لیے عورتیں حلال نہیں اور نہ یہ کہ آپ ان سے اور عورتیں تبدیل کریں اگرچہ آپ کو ان کا حسن پسند آئے"۔

حکم یہ تھا کہ جناب اس کے بعد آپ نیا نکاح نہیں کر سکتے لیکن ان کو نہیں چھوڑیں گے۔ اور گنتی برقرار رکھنے کے لیے کسی کو چھوڑیں گے بھی نہیں کہ ایک کو چھوڑ کر کسی اور سے نکاح کر لیا۔ یہ دو پابندیاں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر لگا دیں اور اس بات کی وجہ قرآن کریم ہی سے اشارتاً سمجھ میں آتی ہے۔ باقی لوگوں نے جو چار سے زائد چھوڑیں، ان کا بعد میں کہیں نہ کہیں نکاح ہو گیا۔ لیکن جناب نبی کریمؐ کی ازواج مطہرات کا ٹائٹل "امہات المؤمنین" ہے یعنی یہ مومنوں کی مائیں ہیں۔ اس لیے ان کے لیے حکم یہ ہے کہ

ولآ ان تنکحوٓا ازواجہٗ من بعدہٖ ابدًا (احزاب ۳۳۔ آیت ۵۳)

”اور نہ آپؐ کی بیویوں سے آپؐ کے بعد کبھی بھی نکاح کرو“۔

باقیوں کے لیے تو چھوڑ دینا عزت افزائی تھی اور ان کا نکاح کہیں اور ہو گیا۔ حضورؐ اگر پانچ کو چھوڑ دیتے تو وہ کدھر جاتیں؟ کوئی ان سے نکاح تو کر نہیں سکتا تھا کہ مائیں ہیں۔ تو حضورؐ کے لیے حکم تھا کہ ان ازواج مطہرات کو نہ چھوڑیں تاکہ ان کا اعزاز و احترام برقرار رہے۔

خیر، میں یتیم کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ یتیم اس زمانے میں بھی ایک مظلوم طبقہ تھا اور آج بھی ہے۔ یتیم اس حوالے سے بھی یتیم طبقہ ہے کہ وہ بڑوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اگر اس کا ولی دیانت دار ہے، ایمان دار ہے تو یتیم کی تعلیم و تربیت بھی ہوگی، اس کی جائیداد کی حفاظت بھی ہوگی، اور اس کو وراثت کا حصہ بھی پورا ملے گا۔ لیکن اگر ولی کی نیت میں کھوٹ ہے تو سارے معاملات گڑبڑ ہو جائیں گے اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے۔

وراثت کے احکام

جاہلیت کے زمانے میں وراثت کے حصے متعیّن نہیں ہوتے تھے۔ مرنے والے کی مرضی ہوتی تھی کہ اپنی وصیت میں جس کو جتنا مرضی دے جاتا۔ اگر کسی کو نہ دے کر جاتا تو قبائل کا عام رواج یہ تھا کہ اس کا سارا مال بڑے بیٹے کے قبضہ میں آجاتا۔ حتیٰ کہ یہ بھی ہوتا تھا کہ باپ کی منکوحہ بھی بڑے بیٹے کے قبضہ میں آجاتی تھی۔ یعنی باپ نے کہیں نکاح کیا، بعد میں فوت ہو گیا تو اس کی منکوحہ بڑے بیٹے کے نکاح میں خود بخود آجاتی تھی کہ یہ وراثت میں ہے۔ اس لیے ایک تو قرآن کریم نے یہ کیا کہ وراثت کے حصے متعیّن کر دیے۔ بیوی کا بھی، بچوں کا بھی، ماں باپ کا بھی۔ قرآن کریم کا پہلا حکم یہ تھا کہ مرنے والا مرنے سے پہلے وصیت کر جائے کہ کس کو کتنا حصہ دینا ہے۔ یعنی وراثت کی تقسیم میں اس کا اختیار تھا کہ کس کو کتنا حصہ دیتا ہے۔ لیکن بعد میں قرآن کریم نے حصے متعیّن کر دیے اور فرمایا کہ یہ طے شدہ بات ہے، اب اس میں کسی کو ردوبدل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

وراثت کا مسئلہ اس زمانے میں بھی نازک تھا اور آج بھی ہے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کوئی مرد یا عورت ساٹھ سال تک عبادت کرتے ہیں، اللہ کی بندگی میں گزارتے ہیں اور آخر وقت میں اپنی وصیت میں گڑبڑ کر کے اپنے رشتہ داروں میں سے کچھ کو محروم کر دیتے ہیں تو ساٹھ سال کی عبادت کے باوجود جہنم ان کے لیے واجب ہو جاتی ہے (ترمذی، رقم ۲۰۴۳)۔ کیونکہ اگر قرآن کریم کے مقرر کردہ حصوں سے ہٹ کر وصیت

کریں گے تو کسی نہ کسی کا حق تو مارا ہی جائے گا۔ قرآن کریم نے یتیموں کو یہ تحفظ دیا اور ساتھ ہی یہ تلقین وتنبیہ بھی فرمائی کہ

ان الذین یاکلون اموال الیتامی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا ؕ وسیصلون سعیرا۔ (النساء ۴۔ آیت ۱۰)

"بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں، اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے"۔

اس مسئلے کی حساسیت کا آپ اس واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ ایک دفعہ اپنے ایک بیمار دوست کی بیمار پرسی کے لیے گئے۔ مریض بہت زیادہ بیمار تھا، ابھی حال احوال پوچھ رہے تھے کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ وہاں ایک دیا جل رہا تھا امام صاحبؒ نے پھونک مار کر اسے بجھا دیا۔ اپنی جیب سے ایک آدمی کو پیسے دیے کہ جاؤ بازار سے دیا لے کر آؤ اور یہاں جلاؤ۔ کسی نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ کہنے لگے کہ بھئی بات یہ ہے کہ جب تک یہ زندہ تھا، ہم اس کے مہمان تھے اور یہ دیا اس کی ملکیت تھی۔ اس کے مرنے کے بعد یہ اس کی ملکیت نہیں رہا بلکہ ورثا میں مشترک ہوگیا ہے۔ اور میں مشترک مال بغیر اجازت کے استعمال نہیں کرتا۔ مشترک مال کے لیے شرط ہے کہ سب کی اجازت ہو تو استعمال ہو سکتا ہے، اس لیے میں اس دیے کی روشنی میں نہیں بیٹھنا چاہتا اور میں نے اپنا دیا الگ منگوایا ہے۔ امام صاحبؒ کا یہ عمل فتوی کی بات نہیں ہے بلکہ احتیاط کی بات ہے کہ جو لوگ اس معاملہ کی حساسیت سمجھتے تھے، وہ کس قدر احتیاط سے کام لیتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ کوئی بیچارہ فوت ہو جائے تو ہم کتنا کتنا عرصہ وہاں سے اٹھتے ہی نہیں اور مشترک مال کو استعمال میں لاتے ہیں جو کہ مرنے والے کی ملکیت میں نہیں رہا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ جناب نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ بات خاص طور پر ارشاد فرمائی کہ میں تمہیں دو کمزوروں کے بارے میں بطور خاص وصیت کرتا ہوں، ایک یتیم کے بارے میں اور دوسرا عورت کے بارے میں۔

عورت کی مظلومیت

جناب نبی کریمؐ نے فرمایا فاتقوا اللہ فی النساء کہ عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ عورت کا مسئلہ بھی یہی ہے، اس زمانے میں بھی تھا اور آج بھی مختلف حوالوں سے ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور اس مسئلہ کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ عورت کا مسئلہ

یہ ہے کہ اس کے ساتھ آج دوطرفہ ظلم ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں شاید دس فیصد عورتوں کو وراثت ملتی ہے جبکہ نوے فیصد کو سرے سے وراثت ملتی ہی نہیں۔ میں اپنے پاکستان کے معاشرے کی بات کر رہا ہوں۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے ایک خاتون کا فون آیا، شاید اخبارات میں میرے مضامین پڑھتی رہتی ہوگی، اس حوالہ سے جانتی ہوگی۔ کسی کالج کی لیکچرار تھی۔ کہنے لگی کہ میرے والد فوت ہو گئے ہیں اور ان کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سے میرا وراثت کا حصہ بنتا ہے اور ایک بازار میں کوئی سات آٹھ دکانیں میرے حصے میں آتی ہیں۔ میں نے اپنے بھائیوں سے اپنا حصہ مانگا ہے کہ یہ میرا حق ہے، مجھے ملنا چاہیے۔ تو بھائی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، ہم دکانیں تو دے دیتے ہیں لیکن پھر زندگی بھر کے لیے تمہارے ساتھ ہمارا تعلق ختم، جینا مرنا ختم۔ یا دکانیں لے لو یا تعلق باقی رکھو۔ اب آپ بھی اس معاشرے کو جانتے ہیں کہ جہاں عورت جائیداد کی قربانی تو دے سکتی ہے لیکن بھائیوں کی قربانی نہیں دے سکتی۔ پتہ نہیں کہ زندگی میں کیا مراحل پیش آئیں گے۔ وہ خاتون مجھ سے مشورہ لے رہی تھی کہ میں دکانیں لوں یا بھائیوں کو رکھوں؟ میں نے کہا کہ بی بی یہ دونوں مسئلے نازک ہیں اور میں آپ کے علاقے کے ماحول سے میں واقف نہیں ہوں، اس لیے وہاں کے مقامی علما سے مشورہ لیں، وہ زیادہ بہتر آپ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں پچھلے سال اسمبلی میں عورتوں کے حقوق کے نام سے ایک معاملہ چل رہا تھا۔ حقوق نسواں بل پر بحث ہوتی رہی۔ حکومت اور اپوزیشن نے علما کی ایک کمیٹی بنائی، میں بھی اس میں تھا۔ ہم اس دوران اسلام آباد میں بیٹھے رہے اور مذاکرات کرتے رہے۔ حدود آرڈیننس میں کچھ ترمیمات پر بھی بات چل رہی تھی، کافی لمبا مسئلہ تھا۔ ہم نے حکومت اور اپوزیشن والوں سے کہا کہ بھئی بات یہ ہے کہ بل کا عنوان رکھا گیا ہے ”تحفظ حقوق نسواں،، یعنی عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا بل۔ لیکن ہماری پاکستان کی سوسائٹی میں عورتوں کے جو حقوق عملاً متاثر ہو رہے ہیں، ان میں سے کسی کا بھی اس بل میں ذکر نہیں ہے۔ ہم نے حکومت اور اپوزیشن والوں کو بتایا کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی مظلومیت کے حوالے سے عملی مسائل کیا ہیں۔

- ہم نے کہا کہ عورت کو یہاں وراثت نہیں ملتی، بل میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ نوے فیصد عورتوں کو وراثت نہیں ملتی اور تقریباً پچھتر فیصد عورتوں کو مہر نہیں ملتا۔

• عورت کو طے کردہ مہر نہیں ملتا، اس کا ذکر نہیں ہے۔ مختلف حیلوں بہانوں سے ہم ہڑپ کر جاتے ہیں۔ میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر، اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھیں، ان کے پاس ایک صاحب آئے۔ انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران ذکر کیا کہ میرا مہر تو بیوی نے مجھے معاف کر دیا۔ والد صاحب نے پوچھا، بھائی معاف کیسے کیا؟ تم نے اسے مہر دیا تھا اور پھر اس نے واپس کر دیا یا ویسے ہی زبانی معاف کر دیا؟

• ہمارے معاشرے میں عورت کی جبری شادی کر دی جاتی ہے، جوان بچی کی اس کا باپ اس کی مرضی کے بغیر شادی کر رہا ہے اور وہ بیچاری بے بس ہے۔ اس بات کی شریعت قطعاً اجازت نہیں دیتی۔ ہم نے پوچھا کہ بھئی، جبری شادی کے بارے میں آپ لوگوں نے کیا کیا؟

• ہم نے کہا کہ ہمارے معاشرے میں عورت باقاعدہ بکتی ہے، بعض علاقوں میں باپ اپنی بیٹی کی قیمت وصول کرتا ہے لیکن آپ کے بل میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

• ہمارے بعض جاگیردار علاقوں میں لڑکی کی قرآن سے شادی کر دی جاتی ہے اور یہ بات قرآن کریم کی توہین بھی ہے کہ قرآن کریم سے شادی کے مقدس عنوان پر اپنی بیٹی کے حصے کی جائیداد اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک جاگیردار اپنی بیٹی کی شادی جب کرے گا تو قانونی و شرعی طور پر اسے اپنی جائیداد کا ایک حصے اس کے نام کرنا پڑے گا، چنانچہ وہ اس کی شادی قرآن سے کر دیتا ہے تاکہ جائیداد تقسیم نہ ہو جائے۔ یعنی جائیداد بچانے کے لیے قرآن کریم کے مقدس نام کو استعمال کیا جاتا ہے کہ دو چار چھ مربع زمین نہ کسی کو دینی پڑ جائے۔ ہم نے کہا کہ تمہارے بل میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

ہم نے کہا کہ عنوان تو اس بل کا حقوق نسواں ہے لیکن عورتوں کی مظلومیت کا ایک عملی مسئلہ بھی اس میں ذکر نہیں کیا گیا۔ خیر، وہ بل تو انہوں نے ایسے ہی منظور کر لیا لیکن بعد میں ایک الگ بل ہماری تجاویز کے مطابق لے کر آئے اور منظور کیا۔

مغرب میں عورت کے ساتھ دھوکہ

اب یہاں مغرب کے حوالہ سے بھی عورت کی مظلومیت دیکھ لیں۔ ایک سوال میں اکثر کیا کرتا ہوں، آپ بھی اس پر ذرا غور فرما لیں، ہماری بہنیں بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہاں مغرب میں یہ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو ہم نے برابر کے حقوق دیے ہیں۔ روس کے ایک سابق وزیر اعظم گورباچوف نے اس دعوے کا بھانڈا پھوڑا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ”پیرسٹرویکا“ میں اس کی پوری تفصیل لکھی ہے۔ انہوں نے یورپ کی بات کرتے ہوئے کہا کہ اصل میں یوں ہوا کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران قتل عام ہوا، لاکھوں کروڑوں افراد مارے گئے جس سے مغربی ممالک میں افرادی قوت کا خلا پیدا ہو گیا، فیکٹریاں بند ہو گئیں، دفتر خالی ہو گئے اور سکول ویران ہو گئے۔ گورباچوف کا کہنا ہے کہ ہم نے اپنی افرادی قوت کے خلا کو پر کرنے کے لیے عورت سے یہ کہا کہ تمہیں ہم برابر کے حقوق دیتے ہیں، تم گھر سے باہر نکلو اور فیکٹری میں، دفتر میں، سکولوں میں آؤ اور ہمارے لیے کام کرو۔ یعنی گھر کا کام بھی کرو اور باہر کا بھی۔ ہم عورت کو ورغلا کر گھر سے باہر لائے۔ ہم نے یہ کام کر کے اپنی افرادی قوت کے خلا کو تو پورا کر لیا لیکن ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا۔ گورباچوف کہتے ہیں کہ اب ہم چاہتے ہیں کہ وہ واپس گھر چلی جائے اور اپنے گھر کا نظام سنبھالے لیکن اسے واپس بھیجنے کا ہمیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔

مغرب نے بیچاری عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا، میرا یہ ایک بہت سنجیدہ سوال ہے۔ عورت کے جو فطری فرائض ہیں وہ تو اسی کے کھاتے میں ہیں۔ بچہ جننا بھی عورت نے ہے اور پالنا بھی اسی نے ہے۔ ایک خاص عمر تک بچے کی عورت نے ہی پرورش کرنی ہے۔ مرد یہ کام نہیں کر سکتا کہ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ قدرت کی تقسیم تو بالکل فطری ہے کہ گھر کا نظام عورت کی ذمہ داری ہے اور گھر کے باہر کے معاملات کا انتظام مرد کے سپرد ہے۔ یہ قدرت کی تقسیم کار ہے جس میں کوئی حقارت یا عظمت کا پہلو نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مغرب نے عورت کو کارخانے اور دفتر میں لا کر اس کے حقوق میں اضافہ کیا یا فرائض میں؟ یعنی مغرب کے مرد نے عورت کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے کہ اس کی کسی ڈیوٹی کو شیئر کیے بغیر اسے اپنے ساتھ اپنی ڈیوٹی میں شامل کر لیا ہے۔ اس کی کسی نیچرل ڈیوٹی میں مرد نے شیئر نہیں کیا اور نہ ہی وہ کر سکتا ہے لیکن اپنی ڈیوٹی میں اسے ساتھ ملا لیا کہ ہمارے ساتھ مل کر کام بھی کرو۔ اور عورت بجائے اس بات کو سمجھنے کے کہ دونوں طرف

کی ڈیوٹی میرے کھاتے میں پڑ گئی ہے، اس عنوان پر خوش ہے کہ ہمارے حقوق برابر ہو گئے ہیں۔

جناب نبی کریمؐ کے ارشاد کے حوالے سے میں عرض کر رہا تھا کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں دو کمزوروں کے بارے میں خاص وصیت کرتا ہوں کہ وہ خود تو اپنا حق وصول کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے، اس لیے تم ان کا ضرور خیال رکھنا۔ ایک یتیم اور دوسرا عورت۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضورؐ کا یہ ارشاد جیسے اس سوسائٹی کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا، ہماری آج کی سوسائٹی کے لیے بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یتیم اور عورت آج بھی مظلوم اور بے بس ہیں۔

عورت کا رائے کا حق

عورت کے حقوق کے حوالے سے ایک روایت بخاری میں ہے، میں اس کا بھی یہاں ذکر کر دیتا ہوں۔ روایت یوں ہے کہ بریرہؓ ایک خاندان کی لونڈی تھی، اس نے ان سے بات کی کہ مجھ سے پیسے لے کر مجھے آزاد کر دو۔ خاندان والوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، طے ہوا کہ اتنی رقم ہوگی اور قسط وار نو سال میں ادا ہوگی۔ جب پیسے پورے ہو جائیں گے تو تم آزاد ہو جاؤ گی۔ بریرہؓ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آئی اور گزارش کی کہ اماں جان! میں نے اپنے مالکوں سے اپنی آزادی کا سودا کر لیا ہے، اب نو سال تک قسطیں دے کر آزاد ہو جاؤں گی، آپ میری اس معاملہ میں کچھ مدد کریں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ اپنے مالکوں سے بات کرو کہ میں سارے پیسے دے کر تمہیں آزاد کرانے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ ولا میری ہوگی۔

یہ ولا ایک مستقل مسئلہ ہے، یہ وراثت کا آخری درجہ ہے۔ کوئی آدمی فوت ہو جائے اور اس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو تو وراثت کسے ملے گی؟ غلام عام طور پر ایسے ہی ہوتے تھے کیونکہ وہ باہر سے آتے تھے اس لیے ان کا کوئی رشتہ دار، کوئی برادری نہیں ہوتی تھی۔ اب اگر کوئی غلام فوت ہو گیا ہے اور اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے تو اس کا ترکہ کس کو ملے گا؟ اس کو حق ولا کہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ میں سارے پیسے دے دیتی ہوں لیکن حق ولا میرا ہوگا۔ بریرہؓ گئی اور جا کر اپنے مالکوں سے بات کی لیکن وہ حق ولا دینے پر نہ مانے۔ جناب نبی کریمؐ سے پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ خرید لو الولاء لمن اعتق جس نے آزاد کرایا ہے ولا اس کی

ہے۔ شرطیں لگانے سے ولا نہیں بدلتی، یہ شریعت کا قانون ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے بریرہ کو خرید لیا۔ (بخاری، رقم ۴۳۶)

اب بریرہؓ آزاد ہونے کے بعد حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آ تو گئی لیکن ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس کی ایک نوجوان مغیثؓ سے شادی ہو چکی تھی۔ غلامی کے مسائل میں ایک مسئلہ یہ تھا کہ اگر مالک نے اپنی لونڈی کی شادی کسی سے کر دی ہے تو آزاد ہونے پر اب اس کو حق حاصل ہے کہ وہ خاوند کے نکاح میں رہنا چاہتی ہے یا نہیں رہنا چاہتی۔ وہ جو آزادی کی صورت میں ایک لڑکی کے نکاح کے وقت حق ہوتا ہے کہ وہ اسے تسلیم کرے یا نہیں، وہ حق اب بحال ہو گیا۔ اسے خیار عتق کہتے ہیں یعنی آزادی کی وجہ سے حاصل ہونے والا حق۔ چنانچہ بریرہؓ جب آزاد ہو کر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ان کے گھر آ گئیں تو انہوں نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مغیث صاحب کی چھٹی کرا دی۔ مغیثؓ پریشان ہو گئے۔ حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا، آپؐ نے فرمایا کہ اس کا حق ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔ اب مغیثؓ مختلف لوگوں سے سفارشیں کراتے پھر رہے ہیں کہ کوئی میری بریرہؓ سے صلح کرا دے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ میں نے دیکھا کہ مغیثؓ گلیوں میں روتا ہوا بریرہؓ کے پیچھے پھر رہا ہے اور اس کے آنسو اس کی ڈاڑھی پر بہہ رہے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ اس کی محبت دیکھو کہ بیچارہ گلیوں میں روتا پھر رہا ہے جبکہ وہ اس کا نام نہیں سننا چاہتی۔ مغیثؓ کی درخواست پر حضورؐ نے بریرہؓ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بریرہؓ بطور خادمہ حضرت عائشہؓ کے پاس ہی رہتی تھیں۔ حضورؐ نے بریرہؓ سے پوچھا کہ مغیثؓ کا کیا قصہ ہے؟ بتایا کہ یا رسول اللہ! میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا، وہ تو بیچارہ گلیوں میں روتا پھرتا ہے۔ کہا، یا رسول اللہ! میں نے تو اپنا حق استعمال کیا ہے۔ حضورؐ نے پوچھا، کیا تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتی ہو؟ آخر وہ تمھارے بچوں کا باپ ہے۔ حضورؐ نے مغیثؓ کی سفارش کی۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ سفارش کون کر رہا ہے؟ وہ لڑکی بھی بہت سمجھدار تھی، حدود سمجھتی تھی، معاملہ کو بھانپ گئی۔ آخر حضرت عائشہؓ کے گھر میں رہتی تھی۔ پوچھا، یا رسول اللہ! حکم فرما رہے ہیں یا مشورہ دے رہے ہیں؟ مطلب یہ تھا کہ اگر تو یہ حکم ہے تو پھر کسی مسلمان کی کیا مجال ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، حکم نہیں ہے بلکہ مشورہ ہے۔ تو فوراً کہتی ہے لا حاجۃ لی بہ پھر مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا بس کر لیا بات ختم ہو گئی۔ (بخاری، رقم ۴۸۷۵۔ ابوداؤد، ۱۹۰۴)

آج دنیا میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اسلام عورت کو رائے کا حق دیتا ہے یا نہیں۔ میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ اسلام عورت کو رائے کا ایسا حق دیتا ہے کہ ایک عورت رسول اللہؐ کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کے بعد بریرہؓ اسی گھر میں رہی ہیں، حضورؐ نے پھر کبھی بات دہرائی بھی نہیں کہ بریرہؓ تم نے میری بات نہیں مانی۔

ماتحتوں اور غلاموں کے ساتھ سلوک

جناب نبی کریمؐ نے تیسرا طبقہ غلاموں کا بتلایا۔ اس زمانے میں غلام تھے پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ آج دنیا میں غلامی کا وجود بھی نہیں ہے اور غلامی کے اسباب بھی موجود نہیں ہیں لیکن آج کے بعد جب بھی دنیا میں کہیں ایسے حالات پیدا ہوں کہ غلامی دوبارہ وجود میں آئے تو اسلام کے احکام اس سلسلے میں موجود ہیں۔ حضورؐ کے زمانہ میں غلام تھے، چنانچہ آپؐ نے ان کے حقوق اور معاشرتی مقام کے حوالے سے بڑی واضح باتیں ارشاد فرمائیں۔

حضورؐ نے غلاموں کے بارے میں بطور خاص یہ وصیت کی کہ تمہارے اور ان کے معیار زندگی میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اخوانکم خولکم تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ یہ بھی آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، یہ بھی انسان ہیں، ان کی بھی تمہاری طرح ضروریات ہیں، یہ بھی تمہاری طرح انسانی عزت و شرف کے مستحق ہیں۔ جعلھم اللہ تحت ایدیکم یہ تو بس اللہ تعالی کا نظام ہے کہ یہ تمہارے ہاتھ کے نیچے آ گئے ہیں۔ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لو، اگر کوئی کام ان کی ہمت سے زیادہ ہے تو فاعینوھم ان کا ہاتھ بٹاؤ، خود ساتھ مل کر وہ کام کرو (بخاری، رقم ۲۹)۔ حجۃ الوداع کے خطبے میں آپ نے فرمایا کہ

> ارقاءکم ارقاءکم ارقاءکم اطعموھم مما تاکلون واکسوھم مما تلبسون فان جاء وا بذنب لا تریدون ان تغفروہ فبیعوا عباد اللہ ولا تعذبوھم۔ (مسند احمد، ۱۵۸۱۳۔ مصنف عبد الرزاق، ۱۷۹۳۵)

> ”اپنے غلام لونڈیوں کا خیال رکھو۔ اپنے غلام لونڈیوں کا خیال رکھو۔ اپنے غلام لونڈیوں کا خیال رکھو۔ جو تم خود کھاتے ہو، انھیں بھی کھلاؤ۔ جو تم خود پہنتے ہو، انھیں بھی پہناؤ۔ اگر ان سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے جسے تم معاف نہیں کرنا چاہتے تو اللہ کے ان بندوں کو بیچ دو لیکن انھیں عذاب نہ دو۔“

ایک صحابی حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کی پٹائی کر رہا تھا کہ مجھے پیچھے سے آواز آئی، ابو مسعود! جتنی قدرت تم اس پر رکھتے ہو، اس سے کہیں زیادہ قدرت والا تمہارے اوپر بھی موجود ہے۔ تم نے اپنے آپ کو مالک سمجھ کے مارا ہے، تو تمہارا بھی کوئی مالک ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جناب نبی کریمؐ تھے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! میں نے اللہ کی خاطر اسے کو آزاد کر دیا۔ فرمایا اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں لپیٹ میں لے لیتی۔ (مسلم، رقم ۳۱۳۵، ۳۱۳۶)

ہمارا اخلاقی بحران

جناب نبی اکرمؐ نے باہمی حقوق کے حوالے سے ایک بات اور ارشاد فرمائی۔ دور جاہلیت میں تو اخلاقیات کا بہت بڑا بحران تھا کہ کوئی کسی کے ہاتھ سے اور کسی کی زبان کے شر سے محفوظ نہیں تھا۔ کسی کے پاس کسی کا مال یا امانت آگئی تو ہڑپ ہو گئی۔ ہمارے آج کے مسلم معاشروں کا سب سے بڑا بحران بھی اخلاقیات کا ہی ہے۔ اگر ہم اس طرف ذرا توجہ دے سکیں تو ہماری آپس کی اخلاقیات کا بھی برا حال ہے اور دوسری اقوام کے ساتھ معاملات بھی ایسے ہی ہیں۔ ہمارے ہاں وہی شخص داؤ نہیں لگاتا جس کا داؤ لگتا نہیں ہے۔ اور جس شخص کا داؤ لگتا ہے وہ معاف نہیں کرتا، الا ماشاء اللہ۔ افراد کی بات نہیں کر رہا، افراد ہمیشہ مستثنیٰ رہے ہیں اور افراد کی استثناء سے ہی نظام چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کی برکت سے معاملات چلاتے رہتے ہیں۔ میں اپنے مجموعی حالات کی بات کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں آج کا سب سے بڑا بحران اخلاقیات کا ہے۔ آج ہماری بین الاقوامی سطح پر تجارتوں میں ناکامی کے اسباب میں ایک بڑا سبب بھی یہی ہے کہ ہم اخلاقیات اور دیانت کی پاسداری نہیں کر پاتے۔ ہم مال میں، لین دین میں، معاملات میں اور معاہدات میں مار کھا جاتے ہیں۔ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں، بتاتے کچھ ہیں اور دیتے کچھ ہیں۔

ایک واقعہ ذہن میں آیا ہے اخلاقیات کے حوالے سے، ذکر کر دیتا ہوں۔ پاکستان میں ایک بڑی یونیورسٹی میں مجھے لیکچر کے لیے بلایا گیا اور لیکچر بھی اخلاقیات پر تھا۔ میں نے وہاں لیکچر دیا۔ ان کا طریقہ ہے کہ وہ آنے والے مہمانوں کو کرایہ وغیرہ دیتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ مولانا صاحب آپ کیسے آئے ہیں؟ میں نے بتایا کہ بھئی میں پبلک ٹرانسپورٹ پر آیا ہوں۔ پوچھا، آپ کرائے کی گاڑی نہیں لائے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں، میں تو نہیں لایا۔ کہنے لگے کہ مولوی صاحب! گاڑی کا کوئی فرضی سا نمبر لکھ دیں، ہم یونیورسٹی کی مد

سے آپ کو ٹیکسی کا کرایہ دے دیتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ خدا کا خوف کرو بھئی! میں ایک گھنٹہ کس چیز پر لیکچر دیتا رہا ہوں؟ یعنی میرے اخلاقیات پر ایک گھنٹہ بولنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے؟ میں پبلک ٹرانسپورٹ سے آیا ہوں اور اسی سے جاؤں گا، میں کوئی ٹیکسی ویکسی نہیں لایا۔ تو یہ ہماری آج کی اخلاقی حالت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہم جو دنیا کی دوسری اقوام کا مقابلہ نہیں کر پا رہے، اس کے ظاہری اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم اخلاقیات کے بہت خوفناک بحران کا شکار ہیں۔ نبی کریمؐ نے ان ہدایات میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی۔ جہاں یہ فرمایا کہ دھوکہ نہیں دو گے، خیانت نہیں کرو گے، غیبت نہیں کرو گے، ایک دوسرے پر ظلم نہیں کرو گے، وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

اسمعوا منی تعیشوا، الا لا تظلموا، الا لا تظلموا، الا لا تظلموا، انہ لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ۔ (مسند احمد، ۲۰۶۹۵)

"میری بات سنو، زندگی پا جاؤ گے۔ سنو، ظلم نہ کرو۔ سنو، ظلم نہ کرو۔ سنو، ظلم نہ کرو۔ کسی شخص کا مال اس کے دل کی خوشی کے بغیر لینا حلال نہیں۔"

یعنی آپؐ نے فرمایا کہ زندگی کی کامیابی اسی میں ہے کہ ظلم کا راستہ اختیار نہ کرنا، کسی پر زیادتی نہ کرنا، کسی کے ساتھ ناانصافی نہ کرنا۔ اگر ان سے بچو گے تو سوسائٹی کی زندگی اسی میں ہے، معاشرے کی حیات اس میں ہے۔

حج کے ساتھ عمرہ کی سہولت

حضورؐ نے اس موقع پر حج کیا تو حج کے ساتھ آپؐ نے عمرہ بھی ادا کیا۔ پہلے آپؐ نے عمرہ ادا کیا اور پھر بعد میں حج کیا۔ صحابہ کرامؓ نے بھی پہلے عمرہ ادا کیا اور پھر حج کیا۔ لیکن اس میں فرق تھا۔ اس زمانہ میں یہ معمول تھا کہ اصحاب ذوق اپنے گھر سے قربانی کا جانور لے کر چلتے تھے کہ وہاں منیٰ میں ذبح کریں گے۔ یہ کوئی فرض واجب نہیں ہے لیکن ایک اچھی بات ہے۔ اس کو ہدی کا جانور کہتے ہیں اور اس کا بڑا ثواب اور اجر ہے۔ رسول اللہؐ بھی ہدی ساتھ لے کر گئے تھے۔ پھر یمن سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ آئے تو وہ بھی حضورؐ کے لیے ہدی کے جانور لے کر آئے۔ آج کل ایسا کرنا مشکل ہے، سعودیہ والے تو کر سکتے ہیں لیکن باہر والے نہیں کر سکتے۔ یہاں سے آپ گائے یا اونٹ لے کر جانا چاہیں گے تو مشکل ہو جائے گا۔ لیکن بہر حال اگر کوئی لے جا سکے تو بڑے اجر و ثواب کی بات ہے۔

رسول اللہؐ نے باقی صحابہؓ کو حکم دیا کہ جو لوگ ہدی کا جانور ساتھ لائے ہیں جب تک ہدی کا جانور قربانی والے دن ذبح نہیں ہوگا، تب تک وہ اپنا احرام نہیں کھولیں گے اور ان کا جو حج ہے وہ حج قران ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے عمرہ ادا کیا اور پھر اسی احرام میں حج بھی ادا کیا۔ ایک ہی احرام میں عمرہ اور حج دونوں ادا کرنے کو قران کہتے ہیں۔ اس کی نیت ابتدا میں ہی کرنی ہوتی ہے کہ یا اللہ میں عمرہ اور حج دونوں کی نیت کر رہا ہوں۔ حضورؐ نے خود یہی کیا تھا اور سب سے زیادہ اجر اور ثواب اسی کا ہے۔ لیکن یہ کام ہے ذرا مشکل کہ احرام کی پابندیاں قائم رکھنا آسان نہیں رہتا۔

باقی صحابہؓ کو حضورؐ نے حکم دے دیا کہ تم عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور عام کپڑوں میں احرام کی پابندیوں کے بغیر چلو پھرو۔ یوم الترویہ یعنی ۸ ذی الحجہ کو پھر احرام باندھنا اور ارکان حج ادا کرنا۔ ایسے حج کو حج تمتع کہتے ہیں۔ یہ حج سہولت والا ہے کہ اس میں جانے والا صرف نیت کی عمرہ کر کے جائے اور پھر عمرہ ادا کر کے احرام کھول دے۔ اس کے بعد حج کے دن آئیں تو حج کے لیے پھر الگ سے احرام باندھے۔ قرآن کریم میں بھی ہے کہ

فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الھدی ؏ (بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۶)

"عمرہ سے حج تک فائدہ اٹھائے تو قربانی سے جو میسر ہو (دے)"۔

جبکہ حج کی ایک تیسری قسم بھی ہے۔ اس میں جانے والے کسی شخص نے اگر صرف حج کی نیت کی ہے، اسے حج افراد کہتے ہیں۔ اور احرام اس میں بھی نہیں کھلے گا جب تک حج ادا نہ کر لے، چاہے دو مہینے وہاں رہے۔

چنانچہ نبی کریمؐ ہدی کے جانور ساتھ لے کر گئے اور فرمایا کہ میں اگر ہدی کے جانور ساتھ نہ لایا ہوتا تو میں بھی احرام کھول دیتا۔ لیکن میں چونکہ ہدی کے جانور ساتھ لایا ہوں اس لیے میں احرام نہیں کھولوں گا۔ البتہ تم لوگ عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو، پھر بعد میں حج کے لیے الگ احرام باندھ لینا۔ حضرت علیؓ یمن سے آئے، آتے ہی وہ حضورؐ سے ملے تو آپ * نے پوچھا کہ بھئی احرام باندھتے وقت کیا نیت کی تھی؟ کہا، یا رسول اللہ! میں نے نیت کی تھی کہ جو نیت نبی اکرمؐ نے کی ہے وہی نیت میری ہے۔ آپؐ نے پوچھا کہ ہدی ساتھ لائے ہو؟ کہا، یا رسول اللہ! لایا ہوں۔ فرمایا، ٹھیک ہے تم احرام اب میرے ساتھ ہی کھولو گے۔

ابو موسی اشعریؓ بھی یمن سے ہی آئے تھے۔ ان سے حضورؐ نے پوچھا کہ ابو موسی کیا نیت کی ہے؟ کہا، یا رسول اللہ! میں نے بھی وہی نیت کی ہے جو آپ کی نیت ہے۔ میں نے احرام باندھتے وقت نیت کی تھی کہ یا اللہ! جو نیت رسول اللہؐ نے کی ہے، وہی نیت میری

ہے۔ حضورؐ مدینہ سے تشریف لا رہے تھے جبکہ ابو موسی اشعریؓ یمن سے آ رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا کہ ہدی کا جانور ساتھ لائے ہو؟ کہا، یارسول اللہ! وہ تو ساتھ نہیں لے کر آیا۔ فرمایا کہ تم احرام کھول دو، تمہاری نیت میرے والی نہیں ہے۔

یہ ایک تبدیلی آئی تھی عرب معاشرے میں حج اور عمرہ کے حوالے سے۔ اس سے پہلے حج کے دنوں میں، حج کے مہینے میں عمرہ ادا کرنے کو لوگ معیوب سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ حج کے دنوں میں صرف حج اور باقی سارا سال عمرہ کے لیے ہے۔ رسول اللہؐ نے جب یہ کہا کہ پہلے عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو تو لوگوں کو تعجب ہوا۔ لوگوں نے سمجھا کہ چونکہ بہت مدت بعد آنے کا اتفاق ہوا ہے اس لیے حضورؐ نے بطور خاص اجازت دی ہے کہ چلو اس دفعہ ان ایام میں حج اور عمرہ دونوں ادا کر لو۔ لیکن حضورؐ نے حج کے ایام میں صرف حج ادا کرنے کی یہ رسم توڑ دی۔ سراقہ ابن مالکؓ نے پوچھا لنا اولأبد؟ یہ رعایت کہ حج کے لیے آئے ہیں تو ساتھ عمرہ بھی کر لیں، یہ صرف ہمارے لیے خاص ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے؟ فرمایا بل للابد (بخاری، رقم ۲۳۲۳) یہ ہمیشہ کے لیے ہے۔

ننگے طواف کی جاہلی رسم کا خاتمہ

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرمؐ نے ایک رسم اور بھی توڑی جس کا اعلان پہلے ہی فرما دیا تھا۔ قریش نے اپنا ایک اور امتیاز قائم رکھا ہوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ بہت سے قبائل کے لوگ اس زمانے میں بیت اللہ کا طواف کرنے آتے تو ننگے طواف کرتے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ عورتوں نے برائے نام سے کوئی لنگوٹی پہنی ہوتی تھی جبکہ مرد بالکل ننگے ہوتے تھے۔ دلیل ان کی یہ ہوتی تھی کہ ہم نیچرل حالت میں جا رہے ہیں۔ انہوں نے شاید اسے کوئی نیچرل کلب سمجھ رکھا تھا۔ کہتے تھے کہ جس حالت میں ہم دنیا میں آئے تھے، اسی حالت میں ہم اللہ کے گھر کا طواف کرتے ہیں۔ قریشی جس کو چاہتے تھے لباس پہنا دیتے تھے۔ قریشیوں نے اپنا یہ اعزاز رکھا ہوا تھا کہ وہ جس کو کرتا، چادر دے دیں وہ پہن لیتا تھا جبکہ باقی بغیر کپڑوں کے ہی رہتے تھے۔ اس بات کو بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا کہ مجھے قریش نے لباس پہنایا ہے۔ بہرحال نبی اکرمؐ نے تو ننگی حالت میں طواف کرنے کو ختم ہی کروا دیا تھا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ذریعے اس کا اعلان اس سے پچھلے سال ۹ ہجری کو ہی کروا دیا تھا کہ اگلے سال کوئی مرد یا عورت اس حالت میں طواف نہیں کرے گا۔ عورت کے لیے پورا لباس ضروری ہوگا جبکہ مرد کے لیے دو چادریں۔ تو یہ رسم بھی نبی اکرمؐ نے حج کے موقع پر توڑ دی۔

اسلامی مملکت کے شہریوں کی ذمہ داری

رسول اللہؐ نے جہاں حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں اور ہدایات فرمائیں، ان میں سے ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ

ان امر علیکم عبد مجدع حسبتھا قالت اسود یقودکم بکتاب اللہ تعالی فاسمعوا لہ واطیعوا۔ (مسلم، ۲۲۸۷)

"اگر کسی کٹے ہوئے کان والے سیاہ فام غلام کو بھی تم پر امیر مقرر کیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔"

یہ کان کٹا ہونا ایک محاورہ ہے۔ گویا رسول اللہؐ نے یہ اصول بیان فرمایا کہ امیر کے لیے کتاب اللہ کا پابند ہونا ضروری ہے، باقی جو لوگوں کے امتیازات ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی جناب نبی کریمؐ نے پیدا کی جس پر علمائے سیاسیات بڑی بحث کرتے ہیں۔ بحیثیت حکمران آنحضرتؐ نے اپنے بعد کیا نظام دیا؟ ہم اس کو خلافت کا سسٹم کہتے ہیں۔ خلافت کا لفظی معنیٰ نیابت ہے لیکن یہ خلافت یا نیابت کس کی؟ اللہ کا خلیفہ یا پھر رسول اللہ کا خلیفہ؟ یہ ایک باریک لیکن انتہائی اہم فرق ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ایک شخص نے یوں مخاطب کیا یا خلیفۃ اللہ اے اللہ کے خلیفہ! فرمایا لست بخلیفۃ اللہ ولکنی خلیفۃ رسول اللہ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۷۰۴۸) کہ نہیں بھئی، میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ میں رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔

اللہ کا خلیفہ ہونے کا مطلب ہے کہ بندہ اللہ کا نمائندہ بن کر حکومت کرے، اسی کو تھیا کریسی کہتے ہیں۔ جس طرح کسی زمانے میں پاپائے روم کی حکومت ہوتی تھی، یعنی خدا کا نمائندہ جو کہہ دے، وہ خدا کی طرف سے سمجھا جائے۔ شیعہ کے ہاں امام کے اللہ کا نمائندہ ہونے کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی اس کا اللہ سے جوڑ ہے، وہ جو کہے گا وہ اللہ کی طرف سے کہا تسلیم ہوگا اور اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دو باتیں بڑی وضاحت سے کہیں۔ پہلی بات یہ کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ میں رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں اور مجھے کوئی خدائی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ امرت علیکم میں تم پر امیر بنا دیا گیا ہوں لست بخیرکم میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں، تمہارے جیسا ہی ہوں۔ یہ ان کی عاجزی اور تواضع تھی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ

کے مطابق چلوں گا۔ اگر میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے مطابق چلوں تو میرا ساتھ دو۔ وان انا زغت فقوموني اور اگر میں ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کردو (طبرانی، المعجم الاوسط، رقم ۸۵۹۷)۔

یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ واضح کیا کہ میں خدا کا نمائندہ نہیں ہوں کہ جو کہوں گا وہ بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا۔ بلکہ میں رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں، آپؐ کا نمائندہ ہوں۔ اور میں قرآن وسنت کا پابند ہوں اس لیے اگر ان کے مطابق چلوں تو تمہاری ذمہ داری ہے کہ میرا ساتھ دو۔ لیکن اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں، صحیح راستہ سے ہٹ جاؤں، قرآن کریم اور سنت رسولؐ کی پابندی نہ کرسکوں تو مجھے سیدھا کردو۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے عجیب جملہ فرمایا۔ یہ نہیں کہا کہ مجھے بتادینا کہ میں غلطی پر ہوں، کہا کہ مجھے سیدھا کردینا۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام میں رائے عامہ کو یہ اختیار اور قوت حاصل ہے کہ وہ حاکم وقت کو قانون اور دستور کے خلاف نہ چلنے دے۔ گویا خلافت اسلامی شخصیت کی بجائے دلیل اور قانون کی حکومت کا نام ہے۔ یہاں سے اصولیین بہت سے اصول اخذ کرتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اسلام کی حکومت پبلک کے سامنے جواب دہ ہے۔ پبلک کو حاکم کے احتساب کا حق حاصل ہے۔ حاکم اپنی مرضی کا مختار نہیں ہے بلکہ قانون اور دستور کا پابند ہے۔ وہ قرآن وسنت کے دائرہ میں رہے گا۔ اگر وہ اس دائرہ میں نہیں رہے گا تو کسی کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اس سے پوچھے کہ بھائی کیا کر رہے ہو؟

آج اصل صورت حال کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں۔ جناب نبی کریمؐ نے اپنا جانشین نامزد نہیں کیا۔ اشارات بہت کیے کہ مصلے پر کھڑا کیا اور حج کا امیر بنایا۔ بخاری شریف کی روایت میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں، جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ ابوبکر کو بلاؤں اور ان کے بارے میں وصیت کردوں، لیکن پھر میں نے سوچا کہ

یابی اللہ والمؤمنون الا ابابکر۔ (بخاری، رقم ۵۲۳۴)

”اللہ اور مومنین ابوبکر کے سوا کسی کو منتخب نہیں کریں گے“۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اہل السنۃ والجماعۃ کی تو بنیاد ہی اس پر ہے کہ نبی کریمؐ نے کسی کو اپنا خلیفہ نامزد نہیں کیا اور اپنے جانشین کا انتخاب امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اگر حضورؐ اپنا خلیفہ نامزد کردیتے تو پھر اس کے بعد نامزدگی ہی چلتی رہتی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اپنے امیر کی اطاعت کرو۔ لیکن امیر کی اطاعت تب کرو جب وہ

تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق اور میری سنت کے مطابق حکومت کرے۔ اس موقع پر جناب نبی کریمؐ نے اس کا دوسرا پہلو ذکر کیا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مسلمان حاکم کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق حکومت کرتا ہے تو اس کی اطاعت کرو، تمہارا مفاد اگر مجروح ہوتا ہے تب بھی اس کی اطاعت کرو، تم پر ظلم کر رہا ہے، تب بھی اطاعت کرو۔ اور صبر کرو، برداشت کرو تا کہ فتنہ و فساد نہ پیدا ہو۔ ہاں اگر کفر کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر اطاعت واجب نہیں ہے (بخاری، رقم ۶۵۳۲)۔ اس کی پھر الگ تفصیل ہے جس کا اس وقت موقع نہیں۔

شیطانی مکروفریب سے بچاؤ

نبی کریمؐ نے اس موقع پر ایک اعلان یہ بھی فرمایا کہ

الا وان الشیطان قد ایس من ان یعبد فی بلادکم ھذہ ابدا ولکن ستکون لہ طاعۃ فی ما تحتقرون من اعمالکم فیسرضی بہ۔ (ترمذی، ۲۰۸۵)

''آگاہ رہو! شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ تمہارے اس علاقے میں اس کی دوبارہ کبھی عبادت کی جائے۔ ہاں ان اعمال میں ضرور اس کی اطاعت کی جائے گی جنھیں تم حقیر خیال کرتے ہو، اور وہ اسی پر خوش رہے گا۔''

جزیرۃ العرب ہمیشہ توحید کے دائرہ میں رہے گا۔ مکہ کے گرد اور بیت اللہ میں یہ بتوں کی موجودگی اور یہ ساری جاہلی قدریں شیطان ہی کا کاروبار تھا اور اس نے ہی یہ سارا کھیل رچا رکھا تھا۔ لیکن فرمایا کہ یہ جزیرۃ العرب توحید پر قائم رہے گا لیکن شیطان بالکل بے دخل نہیں ہو گا۔ یعنی شیطان اپنی باتیں منوائے گا بظاہر چھوٹے چھوٹے کاموں میں جن کو تم بہت حقیر سمجھو گے، اور شیطان تم سے وہ کام کروا کر خوش ہو گا۔ توحید اور عقیدے کی بات میں تم اس کے پیچھے نہیں چلو گے لیکن چھوٹے چھوٹے کاموں میں شیطان تم سے اپنی بات منوائے گا۔ یہ تو ترمذی کی روایت میں ہے، جبکہ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ شیطان ایک بات میں ضرور کامیاب ہو گا کہ

الا ان الشیطان قد ایس ان یعبدہ المصلون ولکنہ فی التحریش بینھم۔ (مسند احمد، ۱۹۷۷۴)

''سنو! شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ عبادت گزار اس کی عبادت کریں، لیکن وہ اہل ایمان کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے کی پوری کوشش کرے گا۔''

شیطان تمہارا عقیدہ نہیں بگاڑ سکے گا لیکن ایک کو دوسرے پر ابھارے گا، برانگیختہ کرے گا، ایک دوسرے کے ساتھ لڑائے گا، خانہ جنگی ہوگی اور خون بہایا جائے گا۔ یہ شیطان کے میدان ہوں گے۔ گویا آپؐ نے خبردار کیا کہ شیطان شکست کھا چکا ہے لیکن آرام سے نہیں بیٹھے گا اس لیے اس سے بچ کر رہنا۔

مستقبل کے فتنوں سے آگاہی

رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں ہدایات دیں، نصائح فرمائے، تلقین فرمائی، قواعد و ضوابط بیان فرمائے، وہاں امت کو آنے والے فتنوں سے بھی آگاہ کیا۔ یہ بھی دین کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ سینکڑوں روایات میں جناب نبی کریمؐ نے امت کو آنے والے دور کے فتنوں سے آگاہ کیا۔ بخاری کی ایک روایت میں حضرت اسامہ ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضورؐ مدینہ میں ایک بڑی حویلی کی دیوار پر کھڑے تھے۔ مدینہ میں بڑی حویلیاں یا چھوٹے قلعے ہوتے تھے۔ ہم دیوار کے اس طرف کھڑے تھے۔ فرمایا، کیا میں تمہیں بتاؤں مجھے دیوار کے اس طرف کیا نظر آرہا ہے؟ عرض کیا، یارسول اللہ! فرمائیں۔ آپ نے فرمایا

انی لأری مواقع الفتن خلال بیوتکم کمواقع القطر۔ (بخاری، رقم ۱۷۴۵)

”میں فتنوں کو تمہارے درمیان برستا ہوا دیکھ رہا ہوں، ایسے جیسے بارش برستی ہے“۔

یعنی فتنے تمہارے درمیان اتنی کثرت سے آئیں گے جیسے بارش کے قطرے آتے ہیں۔

ایک روایت میں یوں فرمایا کہ جب فتنوں کا زمانہ آئے گا تو فتنے یوں گریں گے جیسے تسبیح کا دھاگا ٹوٹ جائے اور اس میں سے دانے گرنے لگیں۔ یعنی ایک فتنہ کھڑا ہوا، اسے ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوگے کہ دوسرا فتنہ سامنے آجائے گا۔ اس سے ابھی نمٹنے کی بات ہو رہی ہوگی کہ تیسرا آجائے گا۔ تو فرمایا کہ بارش کے قطروں اور تسبیح کے دانوں کی طرح فتنے تم پر برسیں گے۔ ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ فتنوں میں یہ کیفیت بھی آئے گی کہ وہاں دین اور حق کی بات کرنا، اپنے آپ کو مسلمان کہنا اتنا مشکل ہو جائے گا کالقابض علی الجمر (ترمذی، رقم ۲۱۸۶) کہ جیسے انگارے ہاتھ میں لینا ہو۔ حضورؐ نے فتنوں کی سینکڑوں نوعیتیں بیان فرمائیں۔

ان میں سے ایک بڑے فتنے کا ذکر حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر کیا جسے دجال کا فتنہ کہتے ہیں۔ جناب نبی کریمؐ خود بھی دعا میں دجال کے فتنے سے پناہ مانگتے تھے اور ہمیں بھی

اس کی تلقین فرمائی ہے اعوذبک من فتنۃ المسیح الدجال (بخاری، رقم ۷۸۹kh) میں مسیح دجال کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں۔

مسیح دو شخصیتوں کا لقب ہے۔ دونوں ایک ہی زمانہ میں آئیں گے اور دونوں کا ٹکراؤ ہوگا۔ ایک مسیح دوسرے مسیح کو قتل کر دے گا۔ ایک مسیح الدجال اور دوسرے مسیح ابن مریم علیہما الصلوۃ والتسلیمات۔ جناب نبی کریمؐ نے اس کی بڑی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ فرمایا کہ ایک بہت بڑا دجال امت میں آئے گا اور دجل اور فتنہ پھیلائے گا۔ وہ امت کی ایک بڑی تعداد کو گمراہ کر دے گا۔ آپؐ نے امت کو خبردار کیا کہ اس سے بچنا۔ راوی کہتے ہیں کہ ذکر المسیح الدجال واطنب فی ذکرہ نبی کریمؐ نے دجال کا بڑا تفصیل سے ذکر کیا۔ اس کی نشانیاں بیان کیں، اس کی علامتیں بیان کیں۔ اور فرمایا ما بعث اللہ من نبی الا وقد انذرہ قومہ اللہ کے ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو اس کے فتنے سے خبردار کیا ہے۔ اور میں بھی تمہیں خبردار کرتا ہوں اور تمہیں ایک بات زائد بتاتا ہوں کہ وہ تم میں آئے گا کیونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں۔

حضرت حذیفہؓ کا خصوصی ذوق

میں نے عرض کیا کہ امت میں آنے والے فتنے علم دین کا مستقل شعبہ ہیں۔ حدیث کی کوئی کتاب کھول کر دیکھ لیں، آپ کو ایک مستقل باب ملے گا ابواب الفتن اور کتاب الفتن وغیرہ کے نام سے۔ ان میں جناب نبی کریمؐ کے وہی ارشادات مذکور ہیں جو فتنوں کے حوالے سے ہیں۔ اور میں یہ اکثر ذکر کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی مختلف لوگوں کو مختلف ذوق عطا فرماتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں یہ ذوق حضرت حذیفہؓ کا تھا۔ جس طرح احادیث کا یاد کرنا ابوہریرۃؓ کا ذوق تھا، قرآن کریم کی تفسیر و تاویل حضرت ابن عباسؓ کا ذوق تھا، استنباط و اجتہاد حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کا ذوق تھا، اور قرأت حضرت ابی ابن کعبؓ کا ذوق تھا۔ مختلف صحابہؓ کے مختلف ذوق تھے۔ فتنوں کے حوالے سے باتیں معلوم کرنا اور دوسروں کو بتانا حضرت حذیفہؓ کا ذوق تھا۔ حذیفہؓ ابن الیمان اپنا ذوق خود ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

> کان الناس یسألون رسول اللہ عن الخیر و کنت اسألہ عن الشر۔ (بخاری، رقم ۳۳۳۸)
>
> "باقی لوگ رسول اللہؐ سے خیر کی بات پوچھتے تھے اور میں شر کی بات پوچھتا تھا"۔

شر کی بات پوچھنے سے مراد یہ ہے کہ یا رسول اللہ! خرابیاں کیسے پیدا ہوں گی؟ فتنے کیسے پیدا ہوں گے؟ ان فتنوں اور خرابیوں سے ہم کیسے نمٹیں گے؟ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں اس طرح کی باتیں زیادہ پوچھتا تھا۔ چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر ابن الخطابؓ بیٹھے ہوئے تھے، صحابہؓ کی مجلس تھی۔ پوچھا کہ بھئی تم میں سے کون آدمی ہے جو فتنوں کے بارے میں حضورؐ کے ارشادات کو زیادہ جانتا ہے۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا انا جی میں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ تمہیں ہی اس بارے میں زیادہ پتہ ہوگا۔ تو پھر ہمیں بتاؤ کہ فتنوں کے بارے میں نبی کریمؐ نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔ یعنی جب فتنے شروع ہوں گے تو کیا ہوگا؟ حضرت حذیفہؓ کہنے لگے، یا حضرت! میں نے حضورؐ سے بہت سی باتیں پوچھی ہیں۔ بعض فتنے ایسے ہیں کہ جن کا کفارہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور صدقہ وغیرہ ہے۔ یعنی کوئی مسلمان شخصی طور پر کسی فتنے کا شکار ہو تو ان کا کفارہ نیک اعمال ہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں ان فتنوں کے بارے میں نہیں پوچھ رہا، میں تو اجتماعی فتنوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ تموج کموج البحر میں جس فتنے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں وہ تو سمندر کی موجوں کی طرح جوش مارتا ہوگا۔ میں تم سے شخصی خرابیوں کے بارے میں نہیں پوچھ رہا۔ تو حضرت حذیفہؓ کہنے لگے، یا حضرت! آپ تسلی رکھیں، آپ کے اور ان فتنوں کے درمیان ایک بڑا مضبوط دروازہ ہے اور وہ دروازہ بند ہے۔ حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ بات خود ان کی ذات کے بارے میں ہے۔ حضرت عمرؓ خود فتنوں کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ میں حضرت عمرؓ کو ڈنڈے والا خلیفہ کہا کرتا ہوں۔ اللہ کا ایک پیغمبر ڈنڈے والا (حضرت موسیٰؑ) تھا اور رسول اللہؐ کا ایک خلیفہ ڈنڈے والا تھا۔

حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا یفتح او یکسر یہ بتاؤ کہ یہ دروازہ کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا۔ یہ کوڈ ورڈز میں بات ہو رہی تھی۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا بل یکسر یہ دروازہ توڑا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اذا لا یغلق ابدا یہ دروازہ توڑ دیا گیا تو پھر کبھی بند نہیں ہوگا (بخاری، رقم ۴۹۴)۔ اب باقی صحابہؓ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کسی نے بعد میں حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے، یہ دروازہ اور اس کے ٹوٹنے کا معاملہ کیا تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں حضرت عمرؓ کو بتا رہا تھا کہ فتنوں کی راہ میں رکاوٹ یہ خود حضرت عمرؓ کی ذات ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں شہید کیا جاؤں گا یا طبعی موت

مروں گا۔ تو میں نے بتایا کہ یہ دروازہ ٹوٹے گا یعنی آپ شہید ہوں گے۔ پھر کہنے لگے کہ میں نے حدیث کی رو سے یہ بات کہی ہے، کوئی بجھارت نہیں ڈالی۔ تمہارے لیے شاید یہ بجھارت ہو لیکن جس سے میں بات کر رہا تھا وہ میری بات سمجھ رہے تھے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ کا وجود فتنوں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ ایک ضمنی واقعہ حضرت عمرؓ کے حوالے سے اور یاد آگیا۔ خالد ابن ولیدؓ شام کے فاتحین میں سے ہیں۔ جب دمشق فتح ہوا تو آپ شام میں ہی بس گئے، ان کی قبر بھی شام میں ہی ہے۔ ایک دن ایسے ہی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے دوستانہ انداز میں اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے کہ یار امیر المؤمنین کو دیکھو کہ ہم نے لڑ لڑ کر شام فتح کیا، فلاں جنگ لڑی، فلاں جنگ لڑی، اور اب جب شام کا کنٹرول مکمل ہو گیا ہے اور شام نے شہد اور گندم مدینہ بھیجنی شروع کر دی ہے تو امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کسی اور کو شام کا گورنر بنا رہے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تم ہندوستان جاؤ۔ حضرت عمرؓ کا شاید ہندوستان کوئی لشکر وغیرہ بھیجنے کا منصوبہ ہو گا۔ شام کا گورنر بنایا گیا تھا یزید ابن ابی سفیانؓ کو۔ اس پر ایک ساتھی نے حضرت خالد ابن ولیدؓ کو مشورہ دیا کہ اگر آپ ہندوستان جہاد پر نہیں جانا چاہتے تو آپ انکار کر دیں۔ دوسرا آدمی بولا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے اس طرح امیر المؤمنین کے حکم سے انکار کرنے پر فتنہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر حضرت عمرؓ حکم دیں کہ پرچم پکڑو اور ہندوستان لڑنے کے لیے جاؤ لیکن حضرت خالد بن ولیدؓ ایسا کرنے سے انکار کر دیں تو اس بات سے فتنہ پیدا ہو گا۔ اس نے جونہی یہ کہا تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے فوراً جواب دیا، نہیں بھئی! اما فی عھد عمر فلا کہ عمرؓ کے زمانے میں فتنہ نہیں پیدا ہو گا۔ یہ بڑا عجیب جملہ ہے۔ حضرت عمر کو اتنا بڑا اخراج عقیدت حضرت خالد بن ولیدؓ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا، تسلی رکھو بھئی۔ عمرؓ کے زمانے میں تو ایسا نہیں ہو گا، بعد میں دیکھا جائے گا۔

تو خیر میں فتنوں کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ جناب نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دجال کے فتنے کا ذکر کیا اور اپنی امت کو خبردار کیا کہ دجال کا فتنہ جب ظاہر ہو گا تو اس کے شر سے اور اس کے دجل سے بچ کر رہنا۔ لیکن یہ اس بچاؤ کی تدبیر کیا ہو گی؟

قرآن و سنت کی پناہ گاہ

اس پر نبی کریمؐ نے ایک اصولی بات فرمائی۔ میں نے اب تک حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ کے ارشادات بارے میں جو گفتگو کی ہے، اس کا خلاصہ اس ایک جملہ میں آگیا ہے۔

حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں ہمیں دیگر بہت سی نصیحتیں اور تلقینات فرمائیں، وہاں یہ فرمایا کہ

یاایھا الناس انی قد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابدا کتاب اللہ وسنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مستدرک حاکم، ۳۱۸)

"اے لوگو! میں تم میں وہ چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں کہ جب تک تم ان کا دامن تھامے رکھوگے، کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔"

فرمایا کہ قیامت تک کے لیے تمہیں یہ راہنما دے کر جارہا ہوں۔ ایک دوسرے مقام پر اپنے وصال سے چند دن پہلے یہ جملہ ایک اور موقع پر بھی فرمایا کہ

انی ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ نبیہ۔ (موطا امام مالک، رقم ۱۳۹۵)

"میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جارہا ہوں جب تک انہیں تم مضبوطی سے تھامے رکھوگے، گمراہ نہیں ہوگے، قرآن کریم اور سنت رسول"۔

ایک اور روایت میں جناب نبی کریمؐ نے یہ بات ایک اور انداز سے بیان فرمائی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہؓ سے روایت ہے، جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ

یاتی علی الناس الزمان لا تطاق المعیشۃ فیہ الا بالمعصیۃ فاذا کان کذالک الزمان فعلیکم بالھرب الی اللہ والی کتاب اللہ و الی سنۃ نبیہ۔ (الدیلمی، الفردوس بماثور الخطاب، ۸٦۸۷)

"لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ گناہ کے بغیر زندگی بسر کرنا کسی کی طاقت میں نہیں ہوگا، جب ایسا زمانہ آجائے تو تم اللہ کی کتاب اور اللہ کے پیغمبر کی سنت کی طرف بھاگنا"۔

گویا آپؐ نے فرمایا کہ جب ہر طرف گناہ کا دور دورہ ہوگا، زندگی گزارنے کا جو طریقہ بھی اختیار کروگے، گناہ اس کا گھیرا ڈالے ہوئے ہوگا۔ 'ہرب' بھاگنے کو کہتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ایسا زمانہ آجائے تو تم پر لازم ہے کہ بھاگ جاؤ۔ لیکن بھاگ کر کدھر جائیں؟ خرابی اگر کسی شہر میں ہو تو شہر چھوڑ جائیں، ملک میں ہو تو ملک چھوڑ جائیں، ایک براعظم میں ہے تو براعظم چھوڑ دیں، لیکن آپ تو زمانہ فرما رہے ہیں۔ آپؐ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب مسلمان کے لیے اپنا اخلاق بچانا مشکل ہو جائے گا، جب ہر طرف سے فتنے مسلمان کو گھیر

لیں گے اور مسلمانوں کے لیے ابتلائیں و مشکلات ہوں گی، تو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت تمہاری پناہ گاہ ہوگی۔ اس طرف بھاگ کر آؤ گے تو بچ جاؤ گے ورنہ دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

ہدایت کے بعد گمراہی

حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے ہمیں ایک تنبیہ فرمائی کہ

وستلقون ربکم فیسالکم عن اعمالکم الا فلا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض۔ (بخاری ۴۰۵۴)

"اور جلد ہی تمھاری اپنے رب سے ملاقات ہوگی اور وہ تم سے تمھارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا۔ آگاہ رہو! میرے بعد دوبارہ گمراہی کی طرف نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارتے رہو۔"

گویا آپ فرما رہے ہیں کہ تمہیں دور جاہلیت سے نکالنے کے لیے میں نے بڑی محنت کی ہے، بڑے مقابلے کیے ہیں اور بڑی تکالیف اٹھائی ہیں۔ وہ کفر، ضلالت اور گمراہی کا دور تھا، اس دور کی طرف کہیں واپس نہ چلے جانا۔ اس کی سب سے بڑی علامت کیا ہوگی؟ دور جاہلیت کی اقدار میں سب سے مکروہ قدر کی نشان دہی کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنا نہ شروع کر دینا۔ فرمایا کہ ایسا کرنا جاہلیت کے دور کی طرف واپس جانا ہوگا اور اس امت پر اس کیفیت کو امت پر خدا کے عذاب کی سب سے خوفناک شکل قرار دیا۔ قرآن کریم میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ

قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض ؕ (الانعام ۶۔ آیت ۶۵)

"کہدو وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر عذاب اوپر سے بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف فرقے کر کے ٹکرا دے اور ایک کو دوسرے کی لڑائی کا مزا چکھا دے"۔

عذاب کی کئی شکلیں ہیں، ایک شکل اس آیت میں یہ بیان فرمائی کہ تمہارے لیے یہ عذاب بھی ہو سکتا ہے کہ خود تمہیں ایک دوسرے کے لیے عذاب بنا دوں۔ عذاب کی سب سے خوفناک صورت یہ ہے کہ نہ اوپر سے عذاب آئے نہ نیچے سے اللہ تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے۔ اس کا محاورے کا ترجمہ میں یہ کرتا ہوں کہ تمہیں خانہ جنگی، باہمی قتل اور

خونریزی کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے عذاب بنا دے۔ فرمایا ایسا کرنا جاہلیت کے دور کی طرف واپس جانا ہوگا۔

صحیح مسلم (رقم ۵۱۴۵) کی روایت میں ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت پر خدا کا عذاب نازل ہوگا تو عذاب کی وہ صورتیں نہیں ہوں گی جو پہلی امتوں پر تھیں۔ نجی طور پر ہوں گی لیکن اجتماعی طور پر پہلی امتوں جیسا عذاب نہیں آئے گا۔ حضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ یا اللہ! میری امت ساری کی ساری قحط سالی سے برباد نہ ہو جائے۔ اللہ نے کہا، نہیں ہوگی۔ پھر درخواست کی، یا اللہ! میری امت یکبارگی پانی میں غرق ہونے تباہ نہ ہو جائے۔ اللہ نے کہا، نہیں ہوگی۔ پھر درخواست کی، یا اللہ! میری امت آپس میں نہ لڑے۔ اللہ نے کہا، ایسا تو ہوگا۔ اس امت کی بداعمالیوں کا عذاب یہی ہوگا کہ یہ لڑیں گے اور دنیا تماشا دیکھے گی۔

بیہقی (السنن الکبری، رقم ۶۱۹۱) کی روایت میں ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں انصاف کے بجائے ظلم عام ہو جائے گا تو خدا کا عذاب آئے گا تو کان البأس بینھم یعنی خدا کے عذاب کی صورت یہ ہوگی کہ آپس میں خانہ جنگی ہوگی، آپس میں خون بہائیں گے۔ نسل پر، رنگ پر، پیسے پر، علاقہ پر، زبان پر، اور پتہ نہیں کس کس چیز پر لڑیں گے۔

عذاب کی ایک دوسری شکل بعض روایات میں یہ آئی ہے کہ جب امت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیا جائے گا تو سوسائٹی پر خدا کے عذاب کی عملی شکل یہ ہوگی کہ

لیؤمرن علیکم شرارکم ثم یدعو خیارکم فلا یستجاب لکم۔ (مسند احمد، رقم ۲۲۲۲۳)

یعنی امت کے شریر لوگ چن چن کر امت پر مسلط کر دیے جائیں گے۔ امت کی قیادت شرفاء کے ہاتھ میں نہیں ہوگی اور پھر امت کے نیک لوگ دعائیں کریں گے لیکن ان کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔ چنانچہ جہاں نبی کریمؐ نے دور جاہلیت کے خاتمے کا اور دور علم کے آغاز کا اعلان فرمایا وہاں یہ بھی فرمایا کہ دیکھنا کہیں میرے بعد کفر کے دور کی طرف واپس نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنا شروع کر دو۔ اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہنا، یہ تمہارے لیے روشنی کا راستہ ہے، علم کا راستہ ہے اور انسانیت کا راستہ ہے۔

ختم نبوت کا اعلان

نبی کریمؐ نے اس موقع پر ایک اعلان یہ فرمایا کہ

ایھا الناس لا نبی بعدی ولا امۃ بعدکم فاعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شھرکم وادوا زکاۃ اموالکم طیبۃ بھا انفسکم واطیعوا ولاۃ امرکم تدخلوا جنۃ ربکم۔ (مسند الشامیین، ۵۴۳۔ الآحاد والمثانی، ۲۷۷۹)

”اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمھارے بعد کوئی امت نہیں۔ پس اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت کی نماز ادا کرو، رمضان کے مہینے کے روزے رکھو، پوری خوش دلی سے اپنے مالوں کی زکاۃ ادا کرو اور اپنے حکمرانوں کی اطاعت کرو۔ ایسا کرو گے تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔“

گویا اسلام کا خلاصہ حضورؐ نے ان جملوں میں ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کرو گے تو یہ اعمال تمہارے جنت میں داخلے کا سبب بن جائیں گے۔ اور فرمایا کہ یاد رکھو میں آخری نبی ہوں اور میرے بعد قیامت تک کوئی نہیں آئے گا۔ اور تم انبیا کی امت میں سے آخری امت ہو، تمہارے بعد اب کوئی امت نہیں ہوگی۔ رسول اللہؐ نے اس کو بنیادی عقیدہ قرار دیا۔ عقیدۂ ختم نبوت یہ ہے کہ نبی کریمؐ کے بعد قیامت تک کسی پر نئی وحی، نئی نبوت نہیں آئے گی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی یہ اعلان فرمایا گیا اور دیگر بہت سے ارشادات میں نبی کریمؐ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ میرے بعد قیامت تک کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اور تکمیل دین کا معنی ہی یہ ہے۔ فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تمہارے لیے دین مکمل کر دیا اور تمہارے لیے نعمت تمام کر دی۔ اس کے بعد اب کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی، اور وہی وحی قیامت تک حجت ہے۔

آنحضرتؐ نے ایک مثال سے اس کو واضح فرمایا کہ انبیاء کرامؑ کی اور میری مثال ایسے ہے جیسے ایک عمارت بن رہی ہے، ایک ایک اینٹ رکھی جا رہی ہے، اور عمارت مکمل ہو گئی ہے، لیکن آخر میں ایک اینٹ کی جگہ باقی ہے۔ فرمایا کہ وہ آخری اینٹ میں ہوں فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین (بخاری، رقم ۳۲۷۱)۔ گویا جس اینٹ کے ساتھ نبوت کی عمارت مکمل ہوئی ہے، وہ آخری اینٹ میں ہوں، میرے بعد اب اس میں کسی نئی اینٹ کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا اس پر مستقل رسالہ ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے عقیدہ ختم نبوت کا جن ارشادات میں ذکر کیا ہے وہ روایات انہوں نے اس رسالہ میں جمع کی ہیں اور مجموعی طور پر یہ ایک سو سے زیادہ روایات ہیں جن میں نبی کریمؐ نے اپنے آخری نبی ہونے کا اور اس عقیدہ کا ذکر فرمایا کہ میرے بعد کسی کو نبوت نہیں ملے گی۔

آپ حضرات اس حوالہ سے اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ کر لیں کہ کہیں تھوڑا سا اشتباہ بھی اگر ہوا، کہیں ابہام پیدا ہونے کا کوئی امکان ظاہر ہوا تو نبی اکرمؐ نے فوراً وہاں وضاحت کی۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جناب نبی کریمؐ نے عام حکم دیا کہ میرے ساتھ چلو اور نہ جانے والوں پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ لیکن اس موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ آپ پیچھے رہیں گے۔ حضرت علیؓ پریشان ہوئے کہ عرب کی حدود سے باہر یہ پہلا معرکہ ہے اور میں اس میں شریک نہیں ہوں گا۔ عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے آپ چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہم نے زیادہ دیر باہر رہنا ہے اور پیچھے کے معاملات ایسے ہیں کہ میرے گھر کا کوئی آدمی معاملات سنبھالنے کے لیے یہاں رہنا چاہیے۔ ویسے حضورؐ نے مدینہ منورہ کا امیر عبد اللہ بن عمرو بن ام مکتوم کو بنایا تھا۔ اس غزوہ میں ایک مہینہ جانے میں لگا، ایک مہینہ وہاں رہے اور ایک مہینہ واپسی میں لگا۔ حضرت علیؓ درخواست کر رہے تھے کہ یا رسول اللہ! خود آپ جہاد پر جا رہے ہیں اور مجھے بچوں میں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ تو حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا کہ

اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسی۔

”کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرا اور تیرا وہی تعلق ہو جو موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کا تھا؟“

حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر جاتے تھے تو پیچھے اپنا قائم مقام ہارون علیہ السلام کو بنا کر جاتے تھے۔ اب یہاں سے ایک ہلکا سا خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ ہارون علیہ السلام تو پیغمبر تھے۔ حضورؐ نے فوراً ساتھ ہی کہہ دیا کہ

الا انہ لیس نبی بعدی۔ (بخاری، ۴۰۶۴)

”لیکن میرے بعد نبی کوئی نہیں ہوگا“۔

آپؐ نے بتا دیا کہ نبوت نہیں ملے گی بھئی، نبوت میرے بعد کوئی نہیں ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اس مسئلے کی حساسیت دیکھئے، ذرا سا شبہ آیا ذہن میں کہ ہارون علیہ السلام تو پیغمبر تھے اور جناب نبی کریمؐ حضرت علیؓ کو ہارونؑ سے تشبیہ دے رہے ہیں، تو شبہ دور کرنے کے لیے ساتھ ہی وضاحت فرما دی۔ بلکہ نبی کریمؐ نے اس بات کو ایک اور انداز سے تعبیر کیا۔ ایک موقع پر ہاتھ کی دو انگلیوں کو جوڑتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا کہ

بعثت انا والساعۃ کھاتین۔ (بخاری ۶۰۲۳)

”میں اور قیامت یوں (ان انگلیوں کی طرح) ہیں“۔

یعنی درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں میرے بعد بس قیامت ہے۔ میرا دور جب ختم ہوگا تو کسی اور کا دور اب نہیں آئے گا بس قیامت آئے گی۔ گویا آپؐ نے فرمایا کہ میں قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی ہوں اور آخری نبی میں ہوں اور اس کے بعد قیامت ہے، درمیان میں کوئی اور نبی نہیں۔

آج کل کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ End of the history ہم ہیں، ہم پر تہذیب مکمل ہو رہی ہے اور ہم آخری دور ہیں۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ نہیں بھئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ End of the history میں ہوں، تاریخ کا آخری مرحلہ اور آخری دور میں ہوں۔ میں جناب نبی کریمؐ کے اس ارشاد کی روشنی میں عرض کیا کرتا ہوں کہ مغرب کا آخری تہذیب ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں ہے بلکہ آخری تہذیب ہم ہیں۔

دین کی تکمیل کا اعلان

بخاری شریف (رقم، ۴۲۴۰) کی روایت ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ سے ان کے دور خلافت میں ایک یہودی عالم نے کہا یا حضرت! آپ کے قرآن میں ایک آیت ایسی ہے کہ وہ آیت اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے نازل ہونے کے دن کو عید بنا لیتے۔ ہم اس پر باقاعدہ ڈے مناتے کہ فلاں دن یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کون سی آیت؟ اس نے کہا

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ؑ(المائدہ ۵۔ آیت ۳)

”آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے“۔

تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے وحی کا نزول شروع ہوا تھا اور اس کے بعد مختلف پیغمبروں کے ذریعے ہدایات واحکام نازل ہوتے رہے۔ جناب نبی کریمؐ تک وحی کا یہ سلسلہ چلتا رہا، احکام آتے بھی رہے، منسوخ بھی ہوتے رہے اور ان میں ترامیم بھی ہوتی رہیں۔ یہ ایک ارتقا کا اور تدریج کا عمل تھا۔ نبی کریمؐ پر اللہ تعالیٰ نے وحی کا کام مکمل کر دیا۔ اب قیامت تک کوئی وحی نہیں ہوگی اور نہ احکام میں ردوبدل ہوگا اور نہ ہی کوئی نیا حکم آئے گا۔ چنانچہ تکمیل کا معنی یہ ہے کہ وہ وحی جو آدم علیہ السلام پر نازل ہونا شروع ہوئی تھی، وہ تدریج اور ارتقا کے مراحل طے کرتے ہوئے نبی کریمؐ پر مکمل ہوئی ہے۔

جب غلبۂ دین مکمل ہوا تو حجۃ الوداع اس کا سب سے بڑا مظہر تھا کہ اتنی شان و شوکت اس سے پہلے مسلمانوں کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اللہ تعالی نے اس موقع پر اعلان فرمایا کہ آج کے دن میں تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور میں تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں۔ آج کے بعد میں کسی انسان سے اسلام ہی کا دین قبول کروں گا اور کوئی دین قبول نہیں کروں گا۔ تو اس یہودی عالم نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یا امیر المؤمنین! یہ آیت اگر ہم پر تورات میں نازل ہوئی ہوتی تو ہم آیت کے نزول والے دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اللہ کی قدرت ہے کہ ہم پر یہ آیت نازل ہی عید والے دن ہوئی ہے۔ تم تو اس کے نزول کے دن کو خود عید بناتے۔ فرمایا یوم النحر کو منی میں یہ آیت نازل ہوئی تھی اور میں اس موقع پر موجود تھا۔ یوم النحر یعنی عید الاضحی اور قربانی کا دن۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ ہماری تو دو عیدیں تھیں کہ سالانہ عید بھی تھی اور ہفتہ وار عید بھی تھی، یعنی وہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔

آنحضرتؐ کا صحابہؓ سے شہادت لینا

حجۃ الوداع کے موقع پر جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ

وانتم تسالون عنی فما انتم قائلون؟ قالوا نشھد انک قد بلغت وادیت ونصحت فقال باصبعہ السبابۃ یرفعھا الی السماء وینکتھا الی الناس اللھم اشھد اللھم اشھد ثلاث مرات۔ (مسلم، ۲۱۳۷)

”تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا، پس تم کیا کہو گے؟ لوگوں نے کہا، ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے پیغام پہنچا دیا اور پوری خیر خواہی کے ساتھ ذمہ داری ادا کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور اس کے ساتھ لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: اے اللہ، گواہ رہنا۔ اے اللہ گواہ رہنا۔ اے اللہ گواہ رہنا۔“

آپؐ نے فرمایا کہ ایک سوال خود تم سے تمہارے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔

وستلقون ربکم فیسالکم عن اعمالکم۔ (بخاری ۴۰۵۴)

”اور جلد ہی تمھاری اپنے رب سے ملاقات ہوگی اور وہ تم سے تمھارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا۔“

اللہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا کہ تم کیا کر کے آئے ہو؟ پیغمبر نے کیا کیا تھا یہ بھی سوال ہوگا اور تم امتی کیا کر کے آئے ہو دنیا میں یہ بھی پوچھا جائے گا۔ اور امتی

سے تو یہ سوال مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جائے گا۔ جناب نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ انسان اللہ کے دربار میں پیش ہو گا، اس وقت تک قدم آگے نہیں اٹھا سکے گا جب تک ان سوالوں کا جواب نہیں دے گا عن عمرہ فیم افناھکہ میں نے تمہیں عمر دی تھی، ساٹھ، ستر، پچھتر سال کی زندگی دی تھی، کیا کیا اس کا؟ وعن شبابہ فیم ابلاہ میں نے تمہیں جوانی دی تھی، جوانی کی صلاحیتیں کدھر خرچ کیں؟ ومالہ من این اکتسبہ وفیم انفقہ اور میں نے تمہیں مال دیا تھا، رزق دیا تھا، وہ کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ وماذا عمل فی ماعلم اور جتنا علم اس کو حاصل تھا، اس پر کتنا عمل کیا؟ (ترمذی، رقم ۲۳۴۰)۔

کائنات کی ہر چیز ٹل سکتی ہے لیکن رب کا سامنا نہیں ٹل سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو کوئی جھٹلائے تب سامنا ہو گا اور نہ مانے تب سامنا ہو گا۔ چنانچہ آپؐ نصیحت فرما رہے ہیں کہ قیامت کے روز تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا، اپنے اعمال کو سیدھا رکھو تا کہ کل اللہ کا سامنا کر سکو، سوال کا جواب دے سکو اور تمہاری پیشی صحیح ہو۔

دین کی بات دوسروں تک پہنچانا

جناب نبی کریمؐ نے ہمیں ہدایات دی ہیں، ہمیں اپنی معاشرتی، انفرادی، اجتماعی زندگیاں گزارنے کے اصول بتائے ہیں، طریقے سمجھائے ہیں، سلیقے سکھائے ہیں۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ایک بات یہ بتائی کہ میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں، یہ تم تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ انہیں ان لوگوں تک پہنچاؤ جو یہاں نہیں ہیں۔

الا لیبلغ الشاہد الغائب فلعل بعض من یبلغہ ان یکون اوعی لہ من بعض من سمعہ۔ (بخاری، ۴۰۵۴)

”سنو، جو موجود ہیں، وہ یہ باتیں ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جن کو یہ باتیں پہنچیں، ان میں سے کچھ ان کی بہ نسبت ان کو زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والوں ہوں جنہوں نے براہ راست مجھ سے سنی ہیں۔“

اور حجۃ الوداع ہی کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ایھا الناس انی واللہ لا ادری لعلی لا القاکم بعد یومی ھذا بمکانی ھذا فرحم اللہ من سمع مقالتی الیوم فوعاھا فرب حامل فقہ ولا فقہ لہ ورب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ۔ (دارمی، ۲۲۹۔ مسند ابی یعلی، ۷۴۱۳۔ مستدرک حاکم، ۲۹۴)

”اے لوگو! بخدا مجھے معلوم نہیں کہ آج کے بعد میں اس جگہ تم سے مل سکوں گا

یا نہیں۔ پس اللہ اس شخص پر رحمت کرے جس نے آج کے دن میری باتیں سنیں اور انہیں یاد کیا، کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں سمجھ داری کی باتیں یاد ہوتی ہیں لیکن انہیں ان کی سمجھ حاصل نہیں ہوتی۔ اور بہت سے لوگ سمجھ داری کی باتوں کو یاد کر کے ایسے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔"

چنانچہ اسلام دعوت اور اجتماعیت کا دین ہے، اسے دوسروں تک پہنچانا ہر مسلمان کے ذمے ہے۔ دین کی کوئی بات علم اور سمجھ میں آئے اسے آگے پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے، خود عمل کر کے مطمئن ہو جانا کافی نہیں ہے۔ اور اس کا سب سے پہلا اور بنیادی دائرہ گھر کا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا پہلا دائرہ یہ بیان فرمایا کہ

یاآیھاالذین امنواقوآا انفسکم واھلیکم ناراوقودھاالناس والحجارۃ (تحریم ٦٦۔ آیت ٦)

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں"۔

انسانی زندگی میں حادثات پیش آتے ہیں۔ کسی مکان میں آگ لگ جائے اور گھر کا مالک موجود ہو، کیا وہ چھلانگ لگا کر باہر چلا جائے گا کہ جی میں تو بچ گیا ہوں باقی جانیں اور ان کا کام جانے؟ نہیں بلکہ وہ اپنی جان خطرے میں ڈالے گا اور گھر کے دوسرے افراد کو نکالنے کی کوشش کرے گا۔ جب تک وہ گھر کے سارے افراد کو آگ سے نکال کر باہر نہیں لے جائے گا، اس کا دل مطمئن نہیں ہوگا۔ اسی لیے قرآن کریم نے آگ کی مثال دی ہے کہ دنیا میں اگر آگ سے سابقہ پیش آجائے تو انسان خود بچ کر خوش اور مطمئن نہیں ہو جاتا کہ میں تو بچ گیا ہوں۔ قرآن کریم نے کہا کہ جس طرح دنیا کی آگ سے گھر والوں کو بچاتے ہو اسی طرح آخرت کی آگ سے بھی انہیں بچاؤ۔ اس آگ کا تو ایندھن ہی انسان اور پتھر ہوں گے۔ خیر خواہی کے درجات اس طرح ہیں کہ سب سے پہلے گھر کے افراد، پھر محلہ، پھر برادری، پھر سوسائٹی، پھر شہر، پھر قوم، پھر ملک اور پھر دنیا۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ جو باتیں میں تم سے کہہ رہا ہوں انہیں اپنے آپ تک محدود نہ رکھنا بلکہ انہیں دنیا تک پہنچاؤ۔ آپؐ نے ایک تو یہ فریضہ بتلایا اور پھر اس کی حکمت بھی بیان کی جس کا مشاہدہ ہم پچھلے چودہ سو سال کے عرصہ میں کرتے آئے ہیں۔ فرمایا کہ بسا اوقات ایک آدمی کوئی بات سنتا ہے اور اسے آگے کسی اور تک پہنچا دیتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ سننے والا اس بات پہنچانے والے سے زیادہ سمجھدار ہو اور اس بات سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ جس

تک بات پہنچائی گئی ہے ممکن ہے کہ اللہ تعالی نے اسے زیادہ عقل دے رکھی ہو۔ پہلا آدمی گویا پائپ لائن کا کام دے رہا ہے۔ فرمایا رب حامل فقہ غیر فقیہ بسا اوقات ایک بات سن کر آگے پہنچانے والا بات کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتا لیکن پہنچانے کا فریضہ اگر انجام دے گا تو کسی ایسے آدمی تک پہنچا دے گا جو اس سے بہت فائدے اٹھائے گا۔ اور تاریخ اسلام میں ایسا ہوا۔ حدیث کے راویوں اور حدیث کے بیان کرنے والوں نے حضورؐ کے ارشادات کو نقل کیا، اوروں تک پہنچایا، اور پھر آگے امت کے فقہا نے ان ارشادات پر محنت کی، ان پر کام کیا، ان میں سے مسائل مستنبط کیے، ان میں سے نتیجے نکالے، رہنمائی کے اصول اخذ کیے، اور یوں دین کی ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ اہل علم اور اہل دانش نے حضورؐ کے ارشادات سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دنیا کو بھی فائدہ پہنچایا۔

محدثین کا کام ہے حدیث بیان کرنا۔ فقہا کا کام ہے اس میں سے مسئلے نکالنا۔ ایک نے روایت بیان کی کہ حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ دوسرے نے اس کا تجزیہ کیا اور اس میں سے مسائل نکالے۔ علما بتاتے ہیں کہ ایک ایک حدیث سے فقہا نے بیس بیس مسائل مستنبط کیے۔ بریرہؓ کے آزاد ہونے کے بارے میں جس روایت کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ فقہا نے اس سے ایک سو سے زیادہ مسائل نکالے ہیں۔ واقعہ ایک ہے لیکن اس میں سے وضع کیے جانے والے قوانین اور مسائل سو سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ روایت کرنے والے نے تو بات آگے پہنچا دی، اور آگے فقہاء کو اللہ رب العزت نے اس عقل، دانش اور حکمت سے نوازا کہ انہوں نے اس بات کو زیادہ سمجھا، خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسرے لوگوں تک بھی اس کا فائدہ پہنچایا۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جو مجھ سے سنتے ہو، اسے اپنے تک محدود نہ رکھو بلکہ آگے اور لوگوں تک پہنچاؤ۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ دین کی بات عام ہوگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے تم سے وہ بات سننے والا تم سے زیادہ سمجھدار ہو۔ یہ بات پہنچانا، دعوت دینا اور دین کا مسئلہ لوگوں میں عام کرنا، یہ بحیثیت مسلمان ہماری ذمہ داریوں میں سے ہے۔

انسانی حقوق کا پہلا عالمی منشور

آج دنیا میں انسان کی معاشرتی ذمہ داریوں اور حقوق کے حوالہ سے اقوام متحدہ کا ہیومن رائٹس چارٹر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ سیاسی طور پر ایک بڑے سمبل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور بعض حوالوں سے وہ سمبل ہے بھی۔ جبکہ بہت سے حوالوں سے یہ

اسلامی تعلیمات سے ٹکراتا بھی ہے۔ لیکن اگر ہم اس ارتقا کو دیکھیں جو چودہ سو سال میں ہوا ہے، جو دنیا کو ان اصولوں پر لایا ہے، جناب نبی کریمؐ نے انسانیت کی رہنمائی کے یہ اصول چودہ سو سال پہلے ہمیں بڑی وضاحت کے ساتھ عطا فرمائے تھے۔ اور یہ اصول انسانی برادری کے حوالے سے تھے کسی علاقائی یا نسلی حوالے سے نہیں تھے۔ آج لوگ گلوبلائزیشن اور انٹرنیشنلزم کا نعرہ لگاتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ نسل، رنگ، وطن اور قومیت سے بالاتر ہو کر سب سے پہلے جس شخصیت نے دنیا کو خطاب کیا ہے اس کا نام محمدؐ ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سب سے پہلی دعوت دی تو یہ کہہ کر مخاطب ہوئے کہ

یا ایھا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا۔ (مسند احمد، رقم ۱۵۴۴۸)

”اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تم کامیاب ہو جاؤ گے“۔

تب آپ کے مخاطب عرب اور مکی تھے اور یہ بالکل ابتدائی دعوت تھی کہ ابھی دو چار لوگ ہی مسلمان ہوئے تھے۔ اس وقت بھی حضورؐ نے نہ عرب کا ٹائٹل اختیار کیا، نہ قریش کا، نہ علاقے کا، بلکہ کہا ایھا الناس۔ اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا میں سب سے پہلے گلوبلائزیشن کی بات جناب نبی اکرمؐ نے کی۔ آپؐ نے قوم، رنگ، نسل اور جغرافیہ سے بالاتر ہو کر نسل انسانی کو مخاطب کیا۔ اور صرف مخاطب ہی نہیں کیا بلکہ اس کے اصول بتائے ہیں، اس کے ضوابط بتائے ہیں، اخلاقیات بتائی ہیں، اور پھر عملی طور پر ایک سوسائٹی بنا کر دکھائی ہے۔

جناب نبی کریمؐ کا یہ خطبۂ مبارکہ بین الاقوامیت کا پہلا اور سب سے جامع منشور تھا۔ آج بھی ہمارے لیے اور دنیائے انسانیت کے لیے یہی رہنما منشور ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم اس کو پیش کرنے کے قابل ہو جائیں۔ میں بڑی سخت بات کہہ رہا ہوں۔ ایک یہ ہے کہ شائع کر کے دنیا تک پہنچا دینا، اور ایک یہ ہے کہ ہم عملی طور پر اس کا نمونہ پیش کر سکیں، حوالہ پیش کر سکیں، لوگ ہمیں دیکھ کر سمجھیں کہ یہ لوگ اس منشور پر عمل کرنے والے لوگ ہیں تو پھر آج بھی یہ منشور دنیا کے لیے ہدایت اور امن کا پیغام ہے۔ لیکن یہ موقوف اس پر ہے کہ کس دن ہم اپنے قول، عمل اور کردار کے حوالے سے دنیا کو دعوت دینے کی پوزیشن میں آتے ہیں۔

حضرات محترم! جناب نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو ارشادات فرمائے، ان کے کچھ اہم حصے کسی خاص ترتیب کے بغیر چار پانچ مجالس میں آپ کے سامنے عرض کیے ہیں۔ یہ رسول اللہؐ کی زندگی بھر کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں اور ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معاف فرماتے ہوئے ہمیں قرآن کریم اور سنت رسولؐ پر صحیح طور پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

عورتوں کے حقوق اور سیرت نبویؐ

(دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۲ ستمبر ۲۰۰۷ء)

عورتوں کے حقوق، آج کی دنیا کے موضوعات میں سے ایک بہت اہم موضوع ہے۔ اسلام میں عورت کو رائے دینے کا حق ہے یا نہیں، تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے یا نہیں، اسے مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں یا نہیں اور یہ کہ عورت کو معاشرے کے اندر عام زندگی کے معاملات میں شرکت کا مساوی موقع ملنا چاہیے یا نہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے کئی پہلوؤں پر گفتگو ہو سکتی ہے لیکن میں چند ایک ضروری نکات پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین سنت کے چند واقعات کے حوالے سے کچھ ضروری گزارشات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

زندگی کا حق

ہمارے ہاں ”دیوان حماسہ“ کے نام سے عربی ادب کی ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے، دینی اداروں کے نصاب میں بھی یہ کتاب ہے اور ایم اے عربی کے نصاب میں بھی یہ کتاب شامل ہے۔ یہ عربی ادب کی کلاسیکل کتابوں میں سے ہے جس میں مختلف شعراء کا کلام ہے، اس میں ایک شاعر کا قصیدہ مذکور ہے جس کا ایک مصرعہ عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک عرب سردار سے کسی نے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو اسے یہ رشتہ مانگنا پسند نہ آیا، اس نے رشتہ مانگنے والے کو اشعار میں جواب دیا جن کا ایک مصرعہ یہ ہے:

غدا الناس مذ قام النبی الجواریا۔

کہ جب سے یہ نبی آیا ہے، دنیا میں ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہو گئی ہیں۔

اس لیے مجھ سے رشتہ مانگنے کیوں آئے ہو، جاؤ کسی اور سے مانگو، اب تو رشتوں کی بہتات ہوگئی ہے۔ یعنی اس عرب سردار کا دور جاہلیت کی اس رسم بد کی طرف اشارہ تھا جو رسول اللہؐ نے آکر عرب معاشرے میں سے ختم کردی تھی۔ اکثر عرب قبائل میں یہ رواج تھا کہ لوگ بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا "واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسودا وھو کظیم" (سورۃ النحل ۵۸) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری دی جائے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غمگین ہو جاتا ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے یہ رسم بد ختم کی اور عورت کے لیے زندگی کا حق بحال کیا، اسلام نے عورت کو زندہ رہنے کا حق دلوایا۔

عرب کے بڑے شعراء میں سے ایک شاعر ہیں فرزدق، ان کے دادا صعصعہ اپنا واقعہ ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میرا اونٹ گم ہو گیا تو میں اس کی تلاش میں جنگل کی طرف نکل گیا، اتنے میں رات ہوگئی۔ میں ایک خیمے کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ سردی سے بچنے کے لیے ایک آدمی آگ سینک رہا تھا، میں بھی اس کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور اسے بتایا کہ میرا اونٹ گم ہو گیا ہے جس کی تلاش میں رات ہوگئی ہے اس لیے میں آج رات تمہارے پاس ہی رہوں گا اور پھر کل نکل کر پھر اپنے اونٹ کو تلاش کروں گا۔ لیکن تم یہاں باہر کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا کہ میری بیوی اندر خیمے میں ہے جس کے ہاں ولادت متوقع ہے اور میں یہاں باہر اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ صعصعہ کہتے ہیں کہ میرے بیٹھے بیٹھے اس نے اندر آواز دی کہ اگر بیٹا پیدا ہوا تو مجھے بتانا لیکن اگر بیٹی ہوئی تو خیمے کے پچھلے دروازے سے نکل کر اسے گڑھے میں دبا دینا۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے آواز آئی کہ بچی پیدا ہوئی ہے۔ صعصعہ کہتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ یہ لوگ تو اس بچی کو زندہ دفن کر دیں گے، میں نے اس آدمی پیشکش کی کہ اگر تم یہ بچی مجھے دے دو تو میں اس کے عوض تمہیں ایک اونٹ دوں گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اونٹ کے عوض بچی بیچ دی۔ صعصعہ کہتے ہیں کہ میں اس بچی کو لے کر آ گیا اور پھر اس کے بعد اللہ تعالی نے میرے دل میں ایسی بات ڈالی کہ جہاں کہیں مجھے پتہ چلتا کہ کسی خاندان میں بچی ہوئی تو وہ اسے دفن کر دیں گے میں جا کر اونٹ کے عوض بچی لے آتا۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے اسلام قبول کیا تو میری حویلی میں تین سو بچیوں کی پرورش ہوری تھی۔

ہمارے معاشرے میں یہ بات اب بھی ہے کہ بچے کی ولادت پر جیسی خوشی ہوتی ہے بچی کی ولادت پر ویسی خوشی نہیں ہوتی۔ میں نے کچھ عرصہ قبل یہ خبر پڑھی کہ انڈین گورنمنٹ نے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ ماں کے پیٹ میں بچے کی جنس معلوم کرنے پر پابندی لگا دی، اس لیے کہ جب شادی شدہ جوڑے کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ بچی پیدا ہوگی تو وہ حمل گرا دیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالی کی حکمت دیکھیں کہ رسول اللہؐ کے گھر میں کوئی بیٹا جوان نہیں ہوا جبکہ بیٹیاں ساری جوان ہوئیں اور سب کی شادیاں ہوئیں۔ حضورؐ نے ان کی پرورش کر کے دنیا کو دکھایا کہ بچیوں کے ساتھ معاملہ کیسے کیا جاتا ہے۔ حضورؐ کے ہاں بیٹے پیدا ہوئے لیکن بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ بچیاں سب جوان ہوئیں حضورؐ نے ان کے ناز اٹھائے اور یہ بتایا کہ بچیوں کے سر پر دست شفقت کیسے رکھا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالی کی تکوینی حکمت تھی کہ اس معاشرے میں جہاں بچیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں وہاں اللہ کے پیغمبر کے گھر میں چار بچیوں کی پرورش کر کے اور ان کی شادیاں کر کے ایک نمونہ قائم کیا کہ لڑکیاں اس سلوک کی مستحق ہوتی ہیں۔ حضورؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ جب آپؐ سے ملنے آتے تھے تو آپؐ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کو بٹھانے کے لیے اپنی چادر بچھا دیا کرتے تھے۔ حضرت رقیہ جب سختؓ بیمار تھیں تو رسول اللہؐ نے حضرت عثمانؓ کو جنگ بدر میں شریک ہونے سے روک دیا اور حکم دیا کہ گھر میں اپنی اہلیہ کی تیمارداری کرو۔ حضورؐ نے دنیا کو یہ نمونہ دکھایا کہ بچی اور باپ کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔

تعلیم کا حق

جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا ”طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ“ کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازمی ہے۔ حصول علم کی اہمیت مرد و عورت کے لیے یکساں ہے۔ جناب رسول اللہؐ سے مرد و عورت دونوں نے تعلیم حاصل کی اور پھر دونوں نے آگے امت تک یہ علم منتقل کیا۔ محدثین کرام جب روایات بیان کرتے ہیں تو مرد اور عورتوں کی روایات کو یکساں حیثیت دیتے ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یعنی جو درجہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت کا ہے وہی درجہ ان کی بیٹی حضرت عائشہؓ کی روایت کا بھی ہے، اور جو درجہ حضرت عمرؓ کی روایت کا ہے وہی درجہ ان کی بیٹی حضرت حفصہؓ کی روایت کا بھی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں خواتین نے جس طرح تعلیم حاصل کر کے آگے دوسروں کو تعلیم دی حضرت عائشہؓ اس کی بہترین مثال ہیں۔ حضرت عائشہؓ براہ راست

جناب رسول اللہؐ کی شاگرد تھیں، حضورؐ کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ کے جو بڑے بڑے علمی مراکز قائم ہوئے ان میں ایک بڑا علمی مرکز حضرت عائشہؓ کا بھی تھا۔ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کی رحلت کے بعد تقریباً چالیس سال تک تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ جاری رکھا، ان کا علمی مقام یہ تھا کہ وہ خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی فتویٰ دیا کرتی تھیں اور بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ پر نقد کیا کرتی تھیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو خود فقیہ ہیں اور حدیث کے بڑے راویوں میں سے ہیں، فرماتے ہیں ''ما اشکل علینا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم قط الا وجدنا فیہ عندھا علما'' کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم صحابہ کسی مشکل میں پھنسے ہوں اور حضرت عائشہؓ کے پاس راہنمائی اور علم نہ ملا ہو۔

اسلامی تاریخ میں تعلیم و تعلم کے حوالے سے، معاملات میں راہنمائی کے حوالے سے اور لوگوں تک علم پہنچانے کے حوالے سے خواتین کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ حضرت امام مالک بن انسؒ کی بیٹی اس مقام کی محدثہ تھیں کہ وہ اپنے والد کی درسگاہ کے ایک طرف پردے کے پیچھے بیٹھی ہوتی تھیں اور جب امام صاحبؒ کے شاگرد پڑھنے میں کوئی غلطی کر جاتے، جو امام مالکؒ کی توجہ میں نہ آتی، تو ان کی بیٹی پردے کے پیچھے سے تپائی پر ہاتھ مار کر ان کو توجہ دلاتی کہ پڑھنے والے سے غلطی ہو گئی ہے لہٰذا دوبارہ پڑھوایا جائے۔ اسی طرح حضرت امام شافعیؒ کی والدہ ایک مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہوئیں، ان کے ساتھ ایک دوسری عورت گواہ بھی تھی۔ مقدمے کے دوران قاضی نے کہا کہ میں تم دونوں سے الگ الگ گواہی لوں گا تاکہ میں جان سکوں کہ تمہارے بیانات آپس میں ملتے ہیں۔ امام شافعیؒ کی والدہ نے قاضی سے کہا کہ قرآن کی رو سے آپ ایسا نہیں کر سکتے اس لیے کہ قرآن نے دو عورتوں کی گواہی کی وجہ ہی یہ بتائی ہے کہ ''ان تضل احدھما فتذکر احدھما الاخریٰ'' (سورۃ البقرہ ۲۸۲) تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا دے۔ چنانچہ ہمارے اچھے زمانوں میں عورتوں کے علم کا یہ معیار ہوتا تھا کہ ایک خاتون عدالت کے اندر قاضی کے سامنے قرآن کریم سے دلیل پیش کر کے اسے اپنا طریقہ کار تبدیل کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، انہوں نے اسلامی تاریخ میں سے تقریباً آٹھ ہزار محدثات کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ یہ الوفاء فی اخبار النساء کے نام سے چالیس جلدوں پر مشتمل کتاب ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور مسلم تاریخ میں تعلیم و تعلم کے حوالے سے عورتوں کا کیا کردار رہا ہے۔

رائے کا حق

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں ہماری گھریلو عورتوں کو رائے دینے کا اور کسی معاملے میں آواز اٹھانے کا حق نہیں ہوتا تھا۔ ہم مرد جو فیصلہ کر دیتے تھے بس وہی آخری ہوتا تھا، عورت سے اس کے متعلق کوئی مشورہ نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن جب ہم ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں کا ماحول ذرا مختلف تھا، یہاں عورتیں گھر کے معاملات میں رائے دیا کرتی تھیں کہ یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہونی چاہیے۔ خاوند کوئی غلط بات کرتا تھا تو بیوی خاوند کو ٹوک دیتی تھی کہ یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری بیوی نے گھر کی کسی بات پر مجھے ٹوک دیا کہ یہ بات ایسے نہیں بلکہ ویسے ہونی چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ میں تو ہکا بکا رہ گیا کہ یہ کیا ہو گیا، میں نے کہا کہ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے کہ تم مجھے مشورہ دے رہی ہو اور مجھے ٹوک رہی ہو۔ وہ کہنے لگی کہ میرا بھی یہ حق ہے کہ میں معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات ناگوار گزری کہ عورتوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ رائے اور مشورہ دیں۔ فرماتے ہیں کہ اس پر میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ حضرت میرے ساتھ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ایسا تو رسول اللہؐ کے گھر میں ہوتا ہے۔ حضورؐ کی ازواج مطہرات حضورؐ کو مشورہ بھی دیتی ہیں اور آپؐ کو معاملات میں جواب بھی دیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حیرانی سے پوچھا کہ کیا ازواج مطہرات حضورؐ کو جواب بھی دیتی ہیں! ان کی اہلیہ نے کہا کہ ہاں بالکل۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے اٹھا اور بھاگا بھاگا اپنی بیٹی اور حضورؐ کی زوجہ حضرت حفصہؓ کے پاس پہنچ گیا۔ پوچھا کہ حفصہ! میں نے سنا ہے کہ تم گھر میں رسول اللہؐ کو مشورہ بھی دیتی ہو اور کسی معاملے میں جواب بھی دیتی ہو۔ انہوں نے بتایا کہ ہاں ساری ازواج ایسا کرتی ہیں۔ اب حضرت عمرؓ کے ذہن میں ایک بات تو یہ تھی مکہ مکرمہ میں عورتیں ایسا نہیں کرتی تھیں، دوسری بات یہ ذہن میں تھی کہ ان کے خاوند تو رسول اللہؐ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے کہا کہ بیٹی! ایسا نہ کیا کرو تم شاید عائشہؓ کو دیکھ کر ایسا کرتی ہو، عائشہؓ کی بات اور ہے ایسا نہ ہو کہ حضورؐ تم سے ناراض ہو جائیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے اور پوچھا کہ کیا ازواج ایسا کرتی ہیں، انہوں نے بتایا کہ ہاں ایسا ہوتا ہے کبھی حضورؐ ہم سے ناراض ہو جاتے ہیں کبھی ہم میں سے کوئی حضورؐ سے ناراض ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں حضورؐ کی اہلیہ ام سلمہؓ

کے پاس گیا، حضرت ام سلمہؓ حضرت عمرؓ کی کزن بھی تھیں اور نسبتاً بڑی عمر کی سمجھدار خاتون تھیں۔ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ ان سے ذرا سنجیدگی سے بات کرتا ہوں، حضرت عمرؓ نے ام سلمہؓ سے پوچھا کہ مجھے یہ شکایت ملی ہے اور میرے لیے یہ ایک نئی بات ہے کیا ایسا ہوتا ہے؟ انہوں نے تصدیق کی کہ ہاں ایسا ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی بندیو! ایسا مت کیا کرو۔ ام سلمہؓ الٹا حضرت عمرؓ سے جھگڑ پڑیں اور کہنے لگیں عمر! تم ہر معاملے میں مداخلت کرتے ہو، اب میاں بیوی کے معاملے میں بھی دخل اندازی کرنے آگئے ہو۔ ہم جانیں اور حضورؐ جانیں، تمہارا اس میں کیا کام ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے اٹھا اور جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں گیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! آج تو میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب سارا قصہ سنایا تو حضورؐ خاموشی سے سنتے رہے اور جب حضرت عمرؓ نے یہ بتایا کہ ام سلمہؓ نے تو مجھے ڈانٹ دیا ہے تو حضورؐ مسکرائے اور فرمایا کہ آخر ام سلمہؓ ہے۔

اسلام نے دور جاہلیت کے عرب معاشرے کی حالت کیسے بدلی اور نبی کریمؐ نے اپنے اصحابؓ کی تعلیم و تربیت کس انداز سے کی۔ یہی حضرت عمر فاروقؓ جو فرماتے تھے کہ عورت کے لیے رائے کا حق ماننا میرے لیے حیرانگی اور تعجب کی بات تھی، انہی کے متعلق تفسیر ابن کثیر میں ایک واقعہ نقل ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں مسجد نبوی میں جمعے کے خطبے کے دوران ایک اعلان فرمایا کہ آج کل لوگ شادی میں مہر کے لیے بڑی بڑی رقمیں مقرر کرنے لگ گئے ہیں، بعد میں لوگ یہ رقمیں ادا نہیں کرسکتے جس کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور آپس میں جھگڑوں کی نوبت آجاتی ہے، اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ کسی شادی میں چار سو درہم سے زیادہ مہر کی رقم مقرر نہ کی جائے۔

یہ مسئلہ آج کے دور میں بھی ایک پریشان کن مسئلہ ہے کہ لوگ شادی کے وقت تو جوش و خروش میں مہر کی بڑی بڑی رقمیں مقرر کرلیتے ہیں لیکن بعد میں جب ادائیگی کی باری آتی ہے تو مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمیں پاکستان کے ماحول میں ایسی صورتحال سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے ایک جگہ نکاح پڑھاتے وقت پوچھا کہ بھئی مہر کی رقم کیا مقرر کی ہے؟ کہنے لگے کہ وہی شرعی مہر بتیس روپے چھ آنے۔ میں نے کہا خدا کے بندو! یہ شرعی مہر تم لوگوں نے کہاں سے نکال لیا۔ فیصل آباد سے بارات آئی تھی، میں

نے دولہے سے پوچھا کہ بارات کے ساتھ کتنی گاڑیاں لائے ہو؟ کہنے لگا کہ پانچ فلائنگ کوچز لے کر آیا ہوں۔ میں نے پوچھا انہیں کتنے پیسوں میں بک کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ گیارہ ہزار روپے میں۔ میں نے کہا اللہ کے بندے اس غریب دلہن کو کم از کم دس ہزار روپے مہر تو دو۔ ہمارے ہاں شادی کی غیر ضروری رسموں پر لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں لیکن دلہن بیچاری کو دینے کے لیے نہ جانے کس شریعت کی رو سے بتیس روپے چھ آنے کا مہر مقرر کرتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ کوئی شرعی مہر نہیں ہے، شرعی مہر تو لڑکے کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مہر کا اصول یہ ہے کہ اس کی رقم لڑکے پر بوجھ نہ ہو اور لڑکی کے لیے باعث عار نہ ہو، یعنی لڑکے کو قرض لے کر نہ دینا پڑے اور لڑکی کے لیے اس کی سہیلیوں اور رشتہ داروں کے سامنے شرمندگی کا باعث نہ ہو۔

ایک اور شادی میں ایسا ہوا کہ نکاح پڑھاتے وقت میں نے پوچھا کہ کتنا مہر مقرر کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دو لاکھ روپے۔ میں اس خاندان کو جانتا تھا کہ لڑکے کی حیثیت اتنی نہیں ہے کہ وہ دو لاکھ روپیہ دے سکے۔ میں نے اس کے والد سے بات کی کہ اتنا زیادہ مہر مقرر کر رہے ہو لڑکا کیسے دے گا؟ باپ کہنے لگا ''اللہ کولوں خیر منگو، اساں کیہڑا دینا اے'' (اللہ سے خیر مانگیں، ہم نے کونسا اتنا مہر دینا ہے)۔ میں نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ مہر تب ادا کرنا پڑتا ہے جب بیوی کو طلاق دینی ہو۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی عام پائی جاتی ہے کہ مہر تب دینا ہوتا ہے جب جھگڑا ہو جائے اور طلاق کی نوبت آ جائے۔ میں نے کہا کہ بھئی مہر کا تعلق طلاق سے نہیں بلکہ نکاح سے ہے، نکاح ہو جائے اور میاں بیوی گھر میں آباد ہو جائیں تو مہر واجب ہو جاتا ہے۔ مہر کی حیثیت قرضے کی ہے، جس طرح کسی سے لیا ہوا قرضہ واپس کرنا ضروری ہے اسی طرح بیوی کا مہر ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر خاوند فوت ہو جائے اور اس نے بیوی کا مہر ادا نہیں کیا ہوا تو ترکہ میں سے جو قرضہ ادا ہو گا اس میں سے مہر بھی ادا ہو گا اور بیوی کو وراثت سے جو حصہ ملے گا وہ مہر کی رقم کے علاوہ ہو گا۔

خیر بات دور نکل گئی، حضرت عمر فاروقؓ نے حکم نامہ جاری کر دیا کہ آج کے بعد چار سو درہم سے زیادہ کوئی مہر کی رقم مقرر نہ کرے۔ درہم ساڑھے تین ماشے چاندی کا سکہ ہوتا تھا، پاکستان میں آج کل کے ریٹ کے حساب سے چار سو درہم کی رقم کا اندازہ کر لیا جائے۔ جمعہ پڑھ کر باہر نکلے تو قریش کی ایک عورت نے حضرت عمرؓ کو روک لیا اور پوچھا، امیر

المومنین آپ نے مہر کی رقم پر پابندی لگا دی ہے۔ فرمایا ہاں لگا دی ہے۔ اس نے پوچھا کہ آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ چار سو درہم سے زیادہ کسی عورت کو مہر نہ دیا جائے۔ فرمایا ہاں میں نے یہ کہا ہے۔ اس عورت نے کہا آپ کو اس کا اختیار کس نے دیا ہے کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ اندازہ فرمائیں کہ ایک عورت مسجد نبوی کے دروازے پر امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو ٹوک رہی ہے اور اپنی بات پر قرآن کریم کا حوالہ دے رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، خدا کی بندی! قرآن کریم میں یہ مسئلہ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے اور میں آپ کو بتاتی ہوں۔ قرآن کریم میں ہے ”فاٰتیتم احدھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا (النساء ۲۰) کہ اگر تم (خاوندوں) نے اپنی عورتوں کو انبار برابر رقم بھی دے دی ہے تو واپس نہ مانگنا شروع کر دو۔ اس آیت میں خاوند سے بیوی کو ملنے والی رقم کا ذکر کیا گیا ہے، خاوندوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اگر تم خاوندوں نے اپنی بیویوں کو ڈھیروں رقم بھی دے دی ہے تو اب واپس نہ مانگنا شروع کر دو، جو دے دیا بس دے دیا۔ عورت کہنے لگی، امیر المومنین! قرآن کریم تو ہمیں خاوندوں سے ڈھیروں دلواتا ہے جبکہ آپ کہتے ہیں کہ چار سو درہم سے زیادہ مت دو۔

حضرت عمرؓ کی جو صفات بیان ہوتی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ بھی آتی ہے کہ ”کان وقافا عند کتاب اللہ“ کہ قرآن کریم کا حکم سامنے آنے پر وہ فوراً رک جایا کرتے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ انہی قدموں پر واپس مسجد نبوی میں گئے اور لوگوں کو بلایا کہ بھئی بات سنو۔ فرمایا کہ میں نے ابھی تمہارے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، مجھے مسجد کے دروازے پر ایک خاتون نے روکا ہے اور قرآن کریم کی آیت کا حوالہ دیا ہے۔ خدا کی قسم اس آیت کی طرف میرا پہلے دھیان نہیں تھا اس عورت نے میری توجہ اس طرف دلائی ہے، وہ ٹھیک کہتی ہے جبکہ میرا اعلان غلط تھا ”امرأۃ أصابت وأخطأ رجل“ لہٰذا میں اپنا اعلان واپس لیتا ہوں۔ پھر حضرت عمرؓ نے ایک جملہ ہنستے ہنستے دل لگی کے انداز سے فرمایا کہ اب تو مدینہ کی عورتیں عمر سے بھی زیادہ قرآن جاننے لگی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ اس زمانے میں عورت کی رائے کا اور عورت کے علم کا معیار کیا تھا کہ ایک عورت حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ راشد کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر سکتی تھی۔ آج کی عورت بھی یہ کر سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے پاس علم اور دلیل ہو۔

شرعی حق

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بریرہؓ نامی ایک لونڈی آئی اور عرض کیا کہ میں نے اپنے مالک خاندان سے یہ سودا کیا ہے کہ اتنے پیسے مجھ سے لے لو اور مجھے آزاد کردو۔ غلامی کے دور میں ایک طریقہ یہ بھی ہوتا تھا کہ غلام پیسے دے کر آزاد ہو جائے۔ بریرہؓ نے کہا کہ میرے مالک خاندان والے طے شدہ رقم قسطوں میں لے کر مجھے آزاد کرنے پر راضی ہیں۔ میں آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ میں خود بہت غریب ہوں اگر آپ میرے ساتھ کچھ تعاون فرماتی رہیں تو میں کچھ سالوں میں وہ قسطیں ادا کر کے آزاد ہو جاؤں گی۔ حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ لڑکی سمجھدار ہے اور اچھی ہے، عقلمند آدمی چہرے مہرے سے اور گفتگو سے اندازہ کرلیتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے بریرہؓ سے کہا کہ جاؤ اپنے خاندان والوں سے معلوم کرو کہ اگر میں سارے پیسے اکٹھے ادا کر دوں تو کیا وہ تمہیں مجھ پر بیچ دیں گے؟ میں تمہیں ابھی خرید کر آزاد کر دیتی ہوں۔ بریرہؓ پوچھ کر واپس آئی اور بتایا کہ وہ مجھے بیچنے پر راضی ہیں لیکن ان کی شرط یہ ہے کہ ”ولا“ ان کی ہوگی۔ ولا وراثت کے درجات میں ایک آخری درجہ ہے۔ کوئی ایسا شخص فوت ہو جائے جس کا کوئی والی اور کوئی وارث نہ ہو، رشتہ داروں اور متعلقین میں ایسا کوئی بھی نہیں ہو جو وراثت کا حق دار بن سکے تو ایسے شخص کا ترکہ وراثت کے آخری درجہ ولا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر وہ شخص آزاد کردہ غلام ہو تو پھر یہ ولا اس کا حق ہوتی ہے جس نے اس غلام کو آزاد کیا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ولا کا معاملہ انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا جو کہیں سے غلام بنا کر لائے گئے ہوتے تھے اور ان کا کوئی رشتہ دار وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ بریرہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ وہ مجھے سارے پیسے اکٹھے لے کر بیچنے پر راضی ہیں لیکن وہ حق الولاء مانگ رہے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب سارے پیسے میں دے رہی ہوں تو ولا کا حق ان کا کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے جناب نبی کریمؐ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ اس طرح میں لونڈی کو آزاد کرنے کے لیے پورے پیسے دے رہی ہوں لیکن وہ ولا کا حق مانگ رہے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے پیسے دے کر لونڈی کو خریدا ہے ولا کا حق اسی کا ہے۔

یہ لونڈی بریرہؓ ایک شخص مغیثؓ کے نکاح میں تھی۔ لونڈی کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر لونڈی کے مالکان نے اس کا نکاح اپنی مرضی سے کہیں کر دیا ہو تو آزاد ہونے کے بعد اس کے پاس یہ اختیار آجاتا ہے کہ وہ یہ نکاح توڑ سکتی تھی۔ اسے فقہ کی

اصطلاح میں خیار عتق کہتے ہیں۔ بریرہؓ لونڈی تھی، اس لیے مالکوں نے اپنی مرضی سے مغیثؓ کے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی۔ اب شادی میں عورت کی اپنی مرضی ہونی چاہیے جبکہ لونڈی ہونے کی وجہ سے بریرہؓ کا یہ حق استعمال نہیں ہوا تھا۔ جب حضرت عائشہؓ نے بریرہؓ کو آزاد کروایا تو بریرہؓ نے کہا کہ میں رہوں گی تو آپ کی خدمت میں ہی لیکن مغیثؓ کے ساتھ میں اپنا نکاح ختم کرتی ہوں۔ مغیثؓ کو پتہ چلا تو وہ بہت رنجیدہ ہوا، پہلے تو اس نے خود بریرہؓ سے بات کی پھر کسی سے سفارش کروائی لیکن وہ نہ مانی۔ کہا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، ایسا کرنا میرا حق تھا جو میں نے استعمال کیا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ مغیثؓ مدینہ کی گلیوں میں روتا پھرتا تھا اور کہتا پھرتا تھا کہ کوئی ہے جو بریرہؓ سے میری سفارش کرے۔ عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہؐ بازار میں جا رہے تھے دیکھا کہ ایک طرف سے مغیث آرہا تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آواز لگائے جا رہا تھا کہ کوئی ہے جو بریرہؓ سے میری سفارش کر دے۔ حضورؐ نے عبد اللہ بن عباسؓ فرمایا اس کی محبت دیکھو اور اس کی نفرت دیکھو۔ اس کا حال یہ ہے کہ اس کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے اور وہ اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔ یہ منظر دیکھ کر جناب نبی کریمؐ نے خود سفارش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب ذرا تصور کیجیے کہ بریرہؓ کون تھی؟ ایک آزاد کردہ لونڈی تھی، حضرت عائشہؓ کی خادمہ تھی اور انہی کے گھر میں رہتی تھی۔ اور اس سے سفارش کر رہے ہیں جناب رسول اللہؐ۔ کیا اس سے بڑی سفارش کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضورؐ نے بریرہؓ کو بلایا اور مغیثؓ کی بابت پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ بریرہؓ نے معاملہ بتایا اور پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا ایسا کرنا میرا حق تھا یا نہیں؟ فرمایا حق تو بہر حال تھا۔ بریرہؓ نے کہا کہ بس میں نے اپنا حق استعمال کیا۔ آپؐ نے فرمایا، نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہے، کیا تم اس فیصلے سے رجوع کر سکتی ہو؟ بریرہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہؐ! جو آپ فرما رہے ہیں یہ حکم ہے یا مشورہ؟ بریرہؓ بھی ایک صحابیہ تھی اور جانتی تھی کہ اگر آپؐ کا حکم ہے تو پھر کسی مسلمان کی یہ مجال نہیں کہ اس سے اعراض کر سکے، مرضی ہو یا نہ ہو، جی چاہے یا نہ چاہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ حکم نہیں ہے بلکہ مشورہ ہے۔ بریرہؓ نے کہا ”لا حاجۃ لی فیہ“ پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ ذرا سوچیے کہ اسلام عورت کو رائے کا حق دیتا ہے یا نہیں۔ ایک عورت اپنی رائے کا حق کس ہستی کے سامنے استعمال کر رہی ہے اور کس شخصیت کا مشورہ رد کر رہی ہے۔ اس کے

بعد بھی بریرہؓ بطور خادمہ حضورؐ کے گھر میں اور حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہی لیکن حضورؐ نے کبھی یہ نہیں جتایا کہ بریرہؓ تم نے میری بات نہیں مانی۔ اسلام عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ کسی دباؤ کے بغیر آزادانہ طور پر اپنی رائے کا استعمال کرے، اس بات کا اس واقعہ سے بڑا مظاہرہ کیا ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنی گفتگو میں رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے قرآن و سنت کی رو سے نہ صرف عورتوں کے حقوق کا تعین کیا ہے بلکہ آپؐ نے اور آپؐ کے اصحاب نے ان حقوق کی ادائیگی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے اور جناب نبی کریمؐ کا عورتوں کے ساتھ معاملہ کیسا تھا، عورتوں کی آزادی کے حوالے سے، ان کے حقوق کے حوالے سے اور ان کی رائے کے احترام کے حوالے سے۔ یہ بتانے کے لیے میں نے چند واقعات کے ذریعے آپ کے سامنے عورتوں کے حقوق کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کی ہیں۔

عدل وانصاف اور سیرت نبویؐ

(دارالہدٰی، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۱ ستمبر ۲۰۰۷ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ عدل قرآن کریم کی اصطلاح ہے ”ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان“ (سورۃ النحل ۹۰) کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی میں بھی ایک اسم ”عادل“ ہے یعنی اللہ تعالیٰ عدل کرنے والے ہیں۔ اور جناب نبی کریمؐ کے اسماء میں بھی ایک اسم ”عادل“ ہے یعنی رسول اللہؐ بھی عدل کے پیکر تھے، عدل کرنے والے تھے۔ ہر چیز کا حق ادا کرنے کو عدل کہتے ہیں۔ عدل کے مقابلے میں ظلم کا لفظ آتا ہے۔ ظلم کہتے ہیں کسی کے ساتھ ناحق سلوک کرنے کو، کسی کے حق کو ضبط کرنا یا کسی کا حق دوسرے کو دے دینا۔ لغوی اصطلاح میں ”وضع الشیٔ فی غیر محلہ“ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے اصل مقام کے بجائے کسی دوسری جگہ پر رکھنا۔ اسی طرح ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنے کو عدل کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عادل ہیں، جناب نبی کریمؐ عادل ہیں اور ہمیں بھی عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمیں یہ تلقین کی گئی ہے کہ ہم عدل کریں اور ظلم نہ کریں۔ جس طرح عدل کا دائرہ بہت وسیع ہے اسی طرح ظلم کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، حقوق کا دائرہ جتنا وسیع ہے عدل وانصاف کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ صفات حمیدہ میں جتنی بھی عمدہ صفات ہیں جناب رسول اللہؐ پوری دنیا میں ان صفات کے سب سے بڑے مظہر ہیں، اسی طرح عدل میں بھی جناب نبی کریمؐ مخلوقات میں سب سے بڑے عادل ہیں۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ غزوۂ حنین کے موقع پر غنیمت کا بہت زیادہ مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، یہ مال بہت قسموں میں تھا جس میں بکریاں، اونٹ، سونا، چاندی اور دیگر بہت سا سامان تھا۔ رسول اللہؐ نے یہ مال مجاہدین میں تقسیم کیا لیکن جو نئے نئے مسلمان ہونے والے عرب قبیلوں کے سردار تھے ان کو زیادہ دیا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ مانوس کیا جائے کہ یہ اپنے قبیلوں کے سردار تھے اور اسلام کی ظاہری شان و شوکت دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ اس پر ایک آدمی ذوالخویصرہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ منافقین میں سے تھا اس نے اعتراض کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس تقسیم میں تو عدل کا لحاظ نہیں رکھا گیا، حالانکہ حضورؐ نے امت کی ضرورت کے پیش نظر ایک مصلحت کے تحت یہ تقسیم فرمائی تھی۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ کسی نے ذوالخویصرہ کی یہ بات رسول اللہؐ کو بتادی کہ یا رسول اللہؐ فلاں شخص نے یہ بات کہی ہے۔ اس پر حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا ''من یعدل اذلم اعدل'' کہ اگر میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون عدل کرے گا؟ چنانچہ یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ مخلوقات میں سب سے زیادہ عدل کرنے والے ہیں۔ حضورؐ نے عدل اور ظلم کا تقابل بہت وسیع مفہوم میں بیان فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عدل

ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ظلم نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عدل کرو اور ظلم نہ کرو۔ اب اللہ تعالیٰ کے ساتھ کون ظلم کر سکتا ہے؟ ہمارے ہاں ظلم کا معنی محدود ہے کیونکہ ہم ظلم کا معنی یہ لیتے ہیں کہ کسی کے ساتھ زیادتی یا ناانصافی کا معاملہ کیا جائے لیکن جناب نبی کریمؐ نے اسے وسیع مفہوم میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عدل کیا ہے اس کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی ''الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون'' (سورۃ الانعام ۸۲) کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس نہ ہونے دیا ان کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت پر ہوں گے۔ یعنی ایمان کے ساتھ اگر ظلم خلط ملط ہو گیا تو پھر امن اور ہدایت نہیں ہے اور اگر ایمان کے ساتھ ظلم کا اختلاط نہیں ہے تو پھر نجات بھی ہے اور ہدایت بھی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ

ایمان کی قبولیت کی شرط یہ قرار پائی کہ ایمان کے ساتھ ظلم شامل نہ ہونے پائے۔ اس آیت کریمہ کے متعلق صحابہ کرامؓ پریشان ہوگئے کہ یہ تو بہت سخت شرط ہے، ان کے ذہنوں میں ظلم کا عام مفہوم تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ اس آیت سے گھر کے افراد سے، رشتہ داروں سے، دوست احباب سے اور زندگی کے عام معاملات میں زیادتی اور کمی بیشی مراد ہے۔ چھوٹی موٹی زیادتی تو انسان سے ہوتی ہی رہتی ہے۔ صحابہ کرامؓ کو خطرہ لاحق ہوگیا کہ اگر آپس کے حقوق میں کمی بیشی نجات کی شرط قرار پائی ہے تو پھر کسی کا بھی ایمان قبول نہیں ہوگا۔

چنانچہ بعض صحابہ کرامؓ آپس میں اکٹھے ہوئے اور چہ میگوئیاں ہوئیں، پھر چند صحابہؓ مل کر جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یارسول اللہؐ "ھلکنا" ہم تو مارے گئے۔ آپؐ نے پوچھا کیا ہوا؟ صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی مذکورہ آیت کے متعلق بتایا کہ ایمان کی قبولیت کی بہت سخت شرط لگ گئی ہے۔ پھر کہا کہ "اینالم یظلم یارسول اللہ" کہ یارسول اللہ ہم میں سے کون ہے جس سے تھوڑی بہت زیادتی نہیں ہو جاتی۔ انبیاء کرام تو معصوم ہوتے ہیں لیکن عام انسانوں سے معاملات میں کہیں نہ کہیں کمی بیشی ہو ہی جاتی ہے۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی پریشانی بجا ہے لیکن تم اس آیت کا معنی غلط سمجھے ہو، اس آیت میں ظلم سے مراد وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ اس آیت میں ظلم سے مراد وہ ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا "یا بنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم" (سورۃ لقمان: ۱۳) کہ اے بیٹے! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

ایک ظلم وہ ہے جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے لیکن ایک ظلم وہ ہے جو انسان اپنے خالق سے کرے۔ کسی انسان کا حق مارنا تو ظلم ہے ہی، اللہ تعالیٰ کا حق مارنا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔ اب اگر اس آیت کا ترجمہ کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ شرک کو شامل نہ ہونے دیا تو ان کا ایمان قبول ہوگا اور وہ ہدایت پر ہوں گے۔ متقدمین کی پرانی اصطلاح میں توحید کو عدل کہا جاتا ہے۔ معتزلہ خود کو اہل العدل والتوحید کہتے تھے۔ توحید کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، حتیٰ کہ بعض فرقے شرک کے وہم سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو بھی اس کی ذات کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔

اپنی ذات کے ساتھ عدل

ہمیں اپنے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا گیا، جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اپنے نفس کے ساتھ بھی عدل کرو۔ بہت سی روایات ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اپنے ساتھ سختی کا ارادہ کیا تو حضورؐ نے اس سے منع فرمایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک مرتبہ حضرت ابوالدرداءؓ کے ہاں مہمان ٹھہرے تو دیکھا کہ ان کے میزبان رات کو حسب ضرورت آرام کرنے اور اپنے گھر والوں کو وقت دینے کے بجائے ساری رات نماز میں کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہتے ہیں۔ اس پر حضرت سلمان فارسیؓ نے ان سے کہا ”ان لربک علیک حقا، ولنفسک علیک حقا، ولأھلک علیک حقا، (وفی روایۃ: ولزورک علیک حقا)، فأعط کل ذی حق حقہ“ (بخاری، رقم ۱۹۶۸) کہ تیرے رب کے بھی تجھ پر حق ہیں، تمہارے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، آنے جانے والے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔ حضورؐ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ ”صدق سلمان“ کہ سلمانؓ نے سچ بات کہی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ نے ارادہ کر لیا کہ ساری زندگی رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کروں گا اور ساری زندگی روزانہ ایک قرآن کریم پڑھوں گا۔ حضورؐ نے اس سے منع فرمایا کہ یہ اپنے اوپر ظلم ہے۔ تمہارے بدن کا تجھ پر حق ہے کہ اسے خوراک اور آرام دو، اور تمہاری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے کہ اسے نیند دو۔ چنانچہ اپنے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا گیا۔

اہل خانہ کے ساتھ عدل

گھر کے ماحول میں عدل کا حکم دیا گیا ہے، خود جناب نبی کریمؐ بھی اپنے گھر میں عدل برقرار رکھتے تھے۔ حضورؐ کی بیک وقت ۹ بیویاں تھیں جن کے حقوق میں حضورؐ نے برابری کی۔ طبعی انس انسان کے اختیار میں نہیں ہے، جہاں حضورؐ نے دیکھا کہ یہ معاملہ میرے اختیار میں نہیں ہے تو وہاں فرما دیا ”اللھم ھذا قسمی فیما املک فلا تواخذنی فیما لا أملک“ کہ اے اللہ! اپنی استطاعت کی حد تک میں برابر تقسیم کرتا ہوں، اس لیے جو بات میرے بس میں نہیں ہے اس میں میرا مواخذہ نہ کرنا۔ حضورؐ کا طبعی تعلق حضرت عائشہؓ سے زیادہ تھا لیکن ظاہری معاملات کی تقسیم تمام ازواج کے ساتھ برابر کی تھی، حتیٰ کہ جہاں ضرورت محسوس

ہوتی وہاں اجازت لیتے تھے۔ عام ایام میں تو آپؐ نے ازواج کے گھروں میں رات گزارنے کی باریاں مقرر کی ہوئی تھیں لیکن زندگی کے آخری ایام میں جب جناب نبی کریمؐ بیمار ہوئے تو یہ معمول قابل عمل نہ رہا۔ آپؐ کی ازواج مطہرات نے محسوس کیا کہ آپؐ ایک ہی جگہ اپنی بیماری کا وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ انتظامی طور پر تو مشکل تھا ہی لیکن آپؐ کی طبیعت کا بھی تقاضا تھا کہ ایک ہی جگہ بیماری کے ایام گزاروں جو کہ حضرت عائشہؓ کا حجرا تھا۔ چنانچہ تمام ازواج اکٹھی ہوئیں آپس میں مشورہ کیا اور پھر حضورؐ کو اس بات کی اجازت دی کہ یا رسول اللہ! ہم اپنی باریوں کے دنوں سے دستبردار ہوتی ہیں تاکہ آپؐ ایک ہی گھر میں اطمینان سے یہ وقت گزار سکیں۔ پھر نبی کریمؐ نے اپنے آخری ایام بیماری کی حالت میں حضرت عائشہؓ کے حجرے میں گزارے۔ حتیٰ کہ حضورؐ دعا فرمایا کرتے تھے کہ یا اللہ! جو میرے اختیار میں ہے ان میں تو میں برابر تقسیم کرتا ہوں لیکن جو چیز میرے اختیار میں نہیں ہے، جیسے طبعی میلان، یا اللہ! مجھ سے اس کے بارے میں مواخذہ نہ کرنا۔

قرآن کریم نے جہاں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے وہاں ایک شرط بھی لگائی ہے ”فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنٰی وثلاث وربع وان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ“ (سورۃ النساء ۳) کہ جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں خطرہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی نکاح کرو۔ یعنی اگر دو شادیاں کر سکتے ہو تو کرو، تین شادیاں کر سکتے ہو تو کرو، حد یہ ہے کہ چار تک شادیاں کر سکتے ہو لیکن عدل اس کی شرط ہے۔ عدل کا معنی ہے تمام معاملات میں برابری کرنا، ہر بیوی کو اس کا پورا حق ادا کرنا اور کسی کو ترجیح نہ دینا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو معلق کر دیا یعنی اس کے حقوق ادا کرنے بند کر دیے تو قیامت کے دن اس کے جسم کا ایک حصہ مفلوج ہوگا۔ حقوق کا معاملہ صرف ازدواجی تعلقات نہیں ہیں بلکہ اس میں روزمرہ زندگی کے باقی حقوق بھی شامل ہیں، مثلاً خرچے میں اور کھانے پینے میں کمی بیشی کر دی کہ ایک بیوی کو بہتر دیا اور دوسری کو اس کے برابر نہیں دیا، یا پھر رہائش میں کمی بیشی کر دی کہ ایک کو تو اچھی رہائش دی لیکن دوسری کو اس معیار کی رہائش نہیں دی، یا عزت و توہین کے معاملات میں ایک کی عزت و وقار کا لحاظ ہے اور دوسری سے بے پرواہی ہے۔ غرض یہ کہ حقوق میں روزمرہ زندگی کی تمام ضروریات شامل ہیں، قرآن کریم نے بھی یہی شرط لگائی کہ اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہے کہ تم اپنی بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک بیوی تک ہی

محدود رہو۔ دوسرے لفظوں میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت اس صورت میں ہے جب ایک آدمی سب بیویوں کے حقوق برابر ادا کر سکے۔ اگر آدمی یہ محسوس کرے کہ اس سے انصاف کا معاملہ نہیں ہو گا تو پھر ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت نہیں ہے۔ یہ میاں بیوی کے معاملے میں قرآن کریم اور نبی کریمؐ کی تعلیم ہے کہ اتنا ہی معاملہ اپنے ذمے لو جتنا بخوبی نبھا سکتے ہو۔

اولاد کے معاملے میں بھی عدل کا حکم دیا گیا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک صاحب رسول اللہؐ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری اولاد میں سے ایک لڑکا ایک بیوی سے ہے جبکہ باقی دوسری بیویوں سے ہیں۔ میری بیوی تقاضا کر رہی ہے کہ میں اپنی جائیداد میں سے اپنے اس بیٹے کو حصہ دوں، میں اسے حصہ دینے پر تیار ہوں لیکن اس پر میں آپؐ کو گواہ بنانا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے پوچھا، کیا تم نے باقی بیٹوں کو بھی جائیداد میں سے حصہ دیا ہے؟ اس نے کہا، یارسول اللہ نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، ظلم پر مجھے گواہ مت بناؤ۔ چنانچہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اپنی جان کے ساتھ، اپنے گھر کے ساتھ، سوسائٹی کے ساتھ، جس کا جو حق ہے وہ اسے ادا کرو، عدل اسی کا نام ہے۔ اگر کہیں حق تلفی ہوگی تو یہ ظلم شمار ہوگا۔

قانون کی نظر میں برابری

آج کے حالات میں ایک بات کا چرچا عام ہے کہ قانون کی نظر میں سب کے حقوق میں برابری ہونی چاہیے، یہ بات بھی عدل کے تقاضوں میں سے ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے یہی فرمایا ہے، بخاری شریف کی روایت کے مطابق قانون کی نظر میں سب کے برابر نہ ہونے کو سوسائٹی کی تباہی اور بربادی کا سبب بتایا گیا ہے۔ ایک مرتبہ یہودیوں کا ایک جوڑا بدکاری میں پکڑا گیا، یہودی مقدمہ لے کر حضورؐ کی عدالت میں آئے، جوڑا گرفتار تھا اور ان پر بدکاری کا جرم ثابت ہو گیا۔ آپؐ نے یہودیوں سے پوچھا، یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاں اس جرم کی سزا کیا ہے؟ تم یہودی ہو اور ایک شریعت کو مانتے ہو تمہارے ہاں بھی ایک قانون اور ضابطہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں اس جرم کی سزا یہ ہے کہ دونوں کے منہ کالے کیے جائیں اور گدھے پر بٹھا کر پورے شہر کا چکر لگایا جائے اور ساتھ مار پٹائی بھی کی جائے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور اب مسلمان ہو چکے تھے، حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تورات میں اس جرم کی سزا یہی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یا

رسول اللہ! یہ لوگ غلط بیانی کررہے ہیں کیونکہ تورات میں یہ سزا نہیں ہے بلکہ یہ سزا انہوں نے خود گھڑلی ہے، تورات میں رجم یعنی سنگسار کی سزا ہے۔ لیکن جب ان لوگوں نے اصرار کیا کہ تورات میں یہی لکھا ہوا ہے جو ہم نے بتایا ہے تو اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تورات لے کر آؤ۔ چنانچہ مجلس میں تورات لائی گئی اور یہودی عالم سے کہا گیا کہ اس جرم کی سزا پڑھ کر سناؤ، اس نے اس سزا کے متعلق آیتیں اس طرح پڑھیں کہ درمیان کی آیت چھوڑ دی۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس کی خیانت پکڑلی اور کہا "یا عدو اللہ! اقرأ ھذا" کہ اللہ کے دشمن یہ بھی تو پڑھ یہ کیا لکھا ہوا ہے۔ یہاں حضرت عبداللہؓ بن سلام نے بتایا کہ یا رسول اللہ! تورات میں اس جرم کی اصل سزا تو رجم ہی تھی لیکن جوں جوں زمانہ بدلا یہودی علماء نے اس سزا کے اطلاق میں خیانت کرنا شروع کردی کہ جب کوئی غریب آدمی اس جرم میں پکڑا جاتا تو اسے سنگسار کردیتے لیکن کوئی امیر اور صاحب ثروت آدمی پکڑا جاتا تو اس کو نرم سی سزا دے کر خانہ پری کردیتے۔

پنجابی کی ایک کہاوت کے مطابق اسے "ہل لمبا ڈال لینا" کہتے ہیں۔ کہاوت یہ ہے کہ کسی گاؤں کے ایک مولوی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ فلاں جرم کی سزا کیا ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ ہل (زمین کھودنے والا زراعتی آلہ) زمین پر کھڑا کرکے اس کے برابر روٹیوں کا ڈھیر لگایا جائے اور پھر وہ ڈھیر صدقہ کردیا جائے۔ اس شخص نے بتایا کہ مولوی صاحب! یہ جرم آپ کے بیٹے نے کیا ہے۔ مولوی صاحب فوراً بولے کہ اگر ہل زمین پر لٹا کر اس کے برابر روٹیوں کا ڈھیر اکٹھا کیا جائے تو بھی ٹھیک ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے بتایا کہ یہودیوں کا یہ طرز عمل تھا کہ عام آدمی کو تو اصل سزا دیتے لیکن اثر و رسوخ والے کی سزا میں ترمیم کردیتے۔ یہاں نبی کریمؐ نے ایک بات فرمائی جو کہ کسی بھی معاشرے میں انصاف کی بنیاد ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں یہ بات آجائے کہ عام آدمی جرم کرے تو سزا مختلف ہو اور کوئی بڑا آدمی جرم کرے تو سزا مختلف ہو، پھر اس قوم کو تباہی سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایسی قوم کی تباہی کا آغاز ہی یہیں سے ہوتا ہے کہ قانون کی نظر میں اونچ نیچ آجائے۔

رسول اللہؐ اور عدل

اس معاملہ میں خود جناب نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ کیا تھی؟ مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ تشریف فرما تھے صحابہ کرامؓ کی مجلس لگی ہوئی تھی، ایک صحابیؓ آکر بیٹھے

جنھوں نے جسم پر صرف ایک ہی چادر باندھی ہوئی تھی اور ان کی کمر ننگی تھی۔ اس زمانے میں دو چادریں کم ہی لوگوں کو میسر ہوتی تھیں، زیادہ تر لوگوں کے پاس جسم ڈھانپنے کے لیے صرف ایک ہی چادر ہوا کرتی تھی۔ حضورؐ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی آپؐ نے بیٹھے بیٹھے بے تکلفی سے ان صحابیؓ کی ننگی کمر پر چھڑی مار دی۔ حضورؐ کا ہاتھ ذرا سخت لگ گیا اور صحابیؓ کی کمر پر خراشیں آگئیں۔ صحابیؓ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! آپ نے مجھے چھڑی ماری ہے میں تو اس کا بدلہ لوں گا۔ آج کے زمانے میں تو سربراہ مملکت کو عدالت میں ویسے بھی نہیں طلب کیا جا سکتا اور جہاں طلب کیا جا سکتا ہے وہاں بھی حکومتی اثر و رسوخ عدالتی کاروائی میں آڑے آجاتا ہے۔ دنیا بھر میں یہ بات عام ہے کہ بادشاہ ہو یا سربراہ مملکت جب تک وہ اپنے منصب پر فائز رہتا ہے عدالت میں طلبی سے مستثنی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی بات حضورؐ کی مجلس میں بھی کہی جا سکتی تھی کہ بھئی حضورؐ سے بدلے کا حق مانگنے کی یہ جسارت تم نے کیسے کی! حضورؐ سے بڑا وی آئی پی اس دنیا میں کون ہوگا؟ لیکن جناب نبی کریمؐ نے صحابی کے مطالبے پر کیا ردعمل ظاہر کیا؟ آپؐ نے چھڑی ان صحابی کے ہاتھ میں دے کر اپنی کمر سامنے کر دی، آپؐ نے اس بارے میں کوئی عذر پیش نہیں کیا اور کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور میں حاکم وقت ہوں اس لیے کوئی مجھ سے بدلہ لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ حالانکہ کوئی بات بھی امتیاز کی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ میں نہیں تھی۔ ان صاحب نے چھڑی پکڑی اور کہا کہ یا رسول اللہ! بدلہ برابر نہیں ہے اس لیے کہ آپ نے میری ننگی کمر پر چھڑی ماری ہے جبکہ آپ نے کرتا پہن رکھا ہے، آپؐ پہلے اپنا کرتا اتاریے۔ ہم تو آج کے ماحول میں اپنے پیر و مرشد کے لیے، اپنے استاد کے لیے ایسی بات برداشت نہیں کرتے۔ حضورؐ مسکرائے کرتا اتارا اور کمر سامنے کر دی، ان صحابیؓ نے چھڑی پھینکی اور حضورؐ سے لپٹ گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! وہ ہاتھ ٹوٹ نہ جائیں جو آپ پر اٹھیں، میں تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے جسم سے جسم ملانے کا بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن جناب نبی کریمؐ نے عدل کا تقاضا پورا کیا اور یہ تصور دیا کہ قانون کی نظر میں انصاف سے کوئی مستثنی نہیں ہے۔

اسی طرح آپؐ نے چوری کے ایک مقدمہ میں فاطمہ مخزومیہ کے حوالے سے فرمایا کہ کیا تم ایک عورت کی اس لیے سفارش کرتے ہو کہ وہ بڑے خاندان کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔ اب حضورؐ سے بڑا خاندان کس کا ہو سکتا ہے لیکن نبی کریمؐ نے یہ تعلیم دی کہ جرم کی سزا یکساں

ہے چاہے کسی بڑے خاندان کا فرد جرم کرے یا کسی چھوٹے خاندان کا۔ معاشرے میں عدل قائم ہوگا تو مساوات کا ماحول پیدا ہوگا۔

انبیاء کرامؑ کے ساتھ عدل

یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والتسلیمات کے درجات میں ترجیحات رکھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے "تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض" (سورۃ البقرہ ۲۵۳) کہ یہ رسول ہیں، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرامؑ میں سب سے افضل جناب نبی کریمؐ کی ذات گرامی ہے، پھر دیگر بڑے انبیاء جیسے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت نوحؑ اور ان کے بعد دوسرے انبیاء ورسول ہیں۔ لیکن یہ درجہ بندی ترازو پر تولنے کے لیے نہیں ہے کہ یہ دیکھنا شروع کر دیا جائے کہ کون انیس ہے اور کون بیس ہے۔ بسا اوقات ہم ایسا کر دیتے ہیں لیکن ایسے موازنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق دو واقعات بخاری شریف میں آتے ہیں۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ دو ساتھیوں میں انبیاء کرام کے متعلق کچھ اس طرح گفتگو ہو رہی تھی کہ فلاں موقع پر حضرت یونسؑ تھے اس لیے ایسا ہوا اگر ہمارے پیغمبر ہوتے تو معاملہ یوں نہ ہوتا بلکہ مختلف ہوتا۔ حضورؐ کو یہ بات پتہ چلی تو آپؐ ناراض ہوئے اور فرمایا "لا تفضلونی علی یونس ابن متی" کہ مجھے یونس علیہ السلام پر فضیلت مت دو۔ یعنی آپؐ نے فرمایا کہ مجھے انبیاء پر اس طرح تقابل کر کے فضیلت مت دو کہ یہ بات فلاں نبی میں نہیں تھی لیکن رسول اللہؐ میں ہے۔ ایک ہے ترجیح کہ حضورؐ کا درجہ سب انبیاء سے افضل ہے لیکن ایک ہے تقابل کہ آمنے سامنے رکھ کر موازنہ کیا جائے کہ یہ بات فلاں نبی میں نہیں تھی جبکہ فلاں نبی میں تھی۔ کیونکہ جس نبی کے بارے میں یہ بات کہیں گے کہ اس میں فلاں صفت نہیں تھی، اس سے اہانت کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی نبیؑ کے بارے میں اہانت کا کوئی پہلو بھی ہو اس سے ایمان ضائع ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے حوالے سے ایک واقعہ مسلم شریف میں ہے۔ ایک زمانے میں مدینہ منورہ میں یہودی بھی رہتے تھے اور مسلمان بھی۔ ایک یہودی اور مسلمان بازار میں آپس میں جھگڑ پڑے، دونوں آپس میں کوئی سودا کر رہے تھے کہ یہودی نے یہ کہہ کر قسم اٹھائی "والذی فضل موسی علی الانبیاء" کہ اس پروردگار کی قسم جس نے حضرت موسیٰؑ کو سارے

انبیاء پر فضیلت دی۔ مسلمان کو اس بات پر غصہ آیا کہ اس یہودی نے حضرت موسیٰؑ کو ہمارے پیغمبر رسول اللہؐ سے افضل کہا ہے، اس نے یہودی کو تھپڑ مار دیا۔ مسلمان نے کہا کہ انبیاء پر فضیلت تو جناب نبی کریمؐ کو ہے۔ اس پر یہودی استغاثہ لے کر حضورؐ کی خدمت میں آیا اور کہا یا محمد! آپ کے ساتھی نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ آپؐ نے پوچھا کیوں تھپڑ مارا ہے؟ اس نے معاملہ بتایا تو اس پر حضورؐ اپنے ساتھی سے ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تقابل کی فضا قائم کر کے ہم انبیاء کا موازنہ مت کرو۔ حضورؐ نے اسے بھی عدل کا تقاضا قرار دیا۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ حق کے تعین میں کسی کے ساتھ زیادتی مت کرو۔ قرآن وحدیث میں عدل کے سینکڑوں پہلو بیان ہوئے ہیں جن میں سے جناب نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے چند ایک پہلو میں نے آپ کی خدمت میں ذکر کر دیے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

صلہ رحمی اور سیرت نبویؐ

(دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۱ ستمبر ۲۰۰۷ء)

رشتوں کا لحاظ رکھنا، رشتوں کو ملانا، رشتوں کو جوڑ کر رکھنا اور ان کا احترام کرنا، قرآن کریم نے اس کا حکم دیا ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے قول وعمل سے اس کی تعلیم دی ہے۔ قرآن کریم نے اپنے رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کو صلہ رحمی سے تعبیر کیا ہے۔ گھر کی چار دیواری سے باہر کا دائرہ خاندان کا دائرہ ہوتا ہے جس میں باپ کی طرف کے رشتہ دار چچا، پھوپھیاں، چچا زاد، پھوپھی زاد، اور اسی طرح ماں کی طرف کے رشتہ دار خالہ، ماموں، خالہ زاد اور ماموں زاد وغیرہ آتے ہیں۔ اسلام نے زندگی کے بہت سے معاملات میں اس دائرے کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا ہے، قرآن کریم میں ہے ”والذین یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویخشون ربھم ویخافون سوء الحساب“ (سورۃ الرعد ۲۱) اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جس کے ملانے کو اللہ نے فرمایا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔

اسلام میں صلہ رحمی کو مستقل نیکی قرار دیا گیا ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات بحال رکھنے کے حوالے سے، ان کے ساتھ امداد و تعاون کے حوالے سے، آپس میں ایک دوسرے کی عزت و احترام کو ملحوظ رکھنے کے حوالے سے اور دیگر معاشرتی حوالوں سے

جناب رسول اللہؐ نے بہت سے ارشادات فرمائے ہیں۔ مثلاً رسول اللہؐ نے زکوۃ اور صدقہ و خیرات کے حوالے سے فرمایا کہ آدمی اللہ تعالی کی خوشنودی کے لیے لوگوں پر خرچ کرتا ہے تو یہ اجر و ثواب کی بات ہے لیکن وہی خرچ اگر اپنے رشتے داروں پر کرے گا تو دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ اسے صدقے کا اجر بھی ملے گا اور صلہ رحمی کا ثواب بھی حاصل ہوگا۔ جناب نبی کریمؐ نے صدقہ و خیرات میں رشتہ داروں اور قرابت داروں کو ترجیح دینے کا حکم دیا۔

رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو ترجیح دینے کی وجہ

محدثین فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے جو صدقہ و خیرات کے معاملے میں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو ترجیح دینے کا حکم دیا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔

1. پہلی وجہ تو یہ ہے کہ دو نیکیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں، ایک صدقہ و خیرات کی اور دوسری صلہ رحمی کی۔

2. دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی جب صدقہ و خیرات کرتا ہے تو کوشش ہوتی ہے کہ مستحق کو ملے۔ جبکہ رشتہ داروں کے عمومی حالات کے متعلق ہر آدمی جانتا ہے کہ کون شخص یا خاندان امداد کا زیادہ مستحق ہے۔

قریبی پڑوسیوں کی حالت کے متعلق بھی معلوم ہوتا ہے اور رشتہ داروں کے متعلق بھی، یا یوں کہہ لیں کہ ان کے حالات آدمی زیادہ آسانی سے معلوم کر سکتا ہے۔ رشتہ داروں کے علاوہ خرچ کرنے کا بھی ثواب ہے لیکن وہاں اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کہ امداد کسی مستحق کو ملی ہے یا غیر مستحق کو۔ لیکن اپنے رشتہ داروں میں آدمی کو اندازہ ہوتا ہے کہ کس کی معاشی حالت کیا ہے اس لیے خرچ کرتے وقت آدمی زیادہ اطمینان و اعتماد کے ساتھ خرچ کرتا ہے۔ یہی معاملہ پڑوسیوں کے ساتھ بھی ہے۔ چنانچہ صلہ رحمی کا نہ صرف حکم دیا گیا ہے بلکہ اسے مسلمان معاشرے کے بنیادی تقاضوں میں سے قرار دیا گیا ہے۔ آج کے اس نفسانفسی کے دور میں رشتے، برادری اور تعلقات کے وہ سلسلے ختم ہو کر رہ گئے ہیں جو اچھے زمانوں میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن اسلام نے بطور خاص رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور میل جول رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ میل جول حقارت کی وجہ سے ترک کیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالی کی رحمت سے محروم رہے گا۔

جناب نبی کریمؐ اپنے رشتہ داروں اور میل جول والوں کے ساتھ حسن سلوک فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ اپنے خاندان کے ساتھ میل جول کا سلسلہ قائم رکھتے تھے اور معاشرتی حوالے سے عزت و احترام کا معاملہ فرمایا کرتے تھے۔ اسلام کے اعلان کے بعد جن رشتہ داروں کے ساتھ رسول اللہؐ کا معاملہ تھا ان میں ایک حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ تھے جو حضورؐ کے چچا بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی تھے۔ حضورؐ نے بھی ثویبہؓ کا دودھ پیا تھا اور حضرت حمزہؓ نے بھی۔ حضرت حمزہؓ احد میں شہید ہو گئے تھے۔ فتح مکہ کے بعد حضرت حمزہؓ کا خاندان جب مدینہ منورہ آیا تو حضرت حمزہؓ کی بیٹی جوان تھیں۔ کسی نے نبی کریمؐ سے ذکر کیا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کی چچازاد ہے آپ اسے اپنے نکاح میں لے لیں۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا خدا کے بندو! حمزہ میرے چچا بھی تھے اور میرے رضاعی بھائی بھی، اس حساب سے یہ میری بھتیجی لگتی ہے۔ یعنی نسب کے حوالے سے چچازاد جبکہ رضاعت کے حوالے سے بھتیجی۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے لیے اس کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ حضورؐ کے چچازاد بھی تھے اور داماد بھی تھے۔

رشتہ داروں سے حسن سلوک

جناب رسول اللہؐ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ خود بھی حسن سلوک کرتے تھے اور دوسروں کے حسن سلوک کی تعریف بھی فرمایا کرتے تھے۔ رسول اللہؐ کے بڑے داماد حضرت ابوالعاصؓ بن ربیع تھے جو کہ حضرت زینبؓ کے خاوند تھے۔ حضورؐ کی چار بیٹیاں تھیں۔ حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ۔ حضرت زینبؓ کے خاوند ابوالعاصؓ بن ربیع خاصا عرصہ مسلمان نہیں ہوئے اور کافروں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑتے رہے۔ جنگ بدر میں بھی وہ کفار مکہ کی طرف سے لڑے اور مسلمان لشکر کے ہاتھوں قید ہوئے، بہت بہادر اور دلیر آدمی تھے۔ ایک موقع پر رسول اللہؐ نے ابوالعاصؓ سے فرمایا کہ میری بیٹی کو واپس بھیج دو، حضرت ابوالعاصؓ نے حضرت زینبؓ کو حضورؐ کے پاس بھیج دیا۔ اب حضرت زینبؓ مدینہ میں تھیں اور ابوالعاصؓ مکہ میں تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں اور کافروں کے نکاح ابھی قائم تھے۔ ایک موقع پر ابوالعاصؓ گرفتار ہو کر بطور مجرم مدینہ منورہ میں حضورؐ کی قید میں آ گئے، اس دور میں قید خانے تو ہوتے نہیں تھے اس لیے قیدی کو لا کر مسجد نبوی میں ستون کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا۔ حضورؐ مناسب موقع پر اس کے متعلق فیصلہ فرما دیتے کہ اسے فدیہ لے کر

چھوڑنا ہے، قتل کرنا ہے یا پھر غلام بنانا ہے۔ مجرم ایک آدھ دن وہیں بندھا رہتا تھا۔ ابوالعاصؓ کو بھی اسی طرح ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا کہ وہ دشمن تھے اور جنگی قیدی تھے۔ نبی کریمؐ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد مجرم کا فیصلہ کرتے تھے، چنانچہ آپؐ نے فجر کی نماز پڑھائی۔ حضرت زینبؓ کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ میرا خاوند قید ہو کر مسجد نبوی میں ستون کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ابوداؤد شریف کی روایت ہے کہ فجر کی نماز ہو چکی تھی حضرت زینبؓ اپنے حجرے سے نکلیں اور مسجد نبوی کے دروازے کے ساتھ آکر کھڑی ہوگئیں۔ حضورؐ جونہی نماز پڑھا کر نمازیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور ابھی مقدمہ شروع ہونے والا تھا کہ حضرت زینبؓ نے دروازے کے اندر جھانک کر کہا ”یا رسول اللہ قد أجرت ھذا الاسیر“ میں نے اس قیدی کو پناہ دے دی ہے۔

اسلام کا ضابطہ یہ ہے کہ قیدی مجرم ہو تو جس طرح فوج کا سپہ سالار کسی دشمن کو پناہ دے سکتا ہے اسی طرح ایک عام شہری بھی پناہ دے سکتا ہے۔ اگر عام شہری بھی کسی کافر کو پناہ دے دے تو اس کی جان بخشی ہو جاتی ہے اور اسے قتل کرنا جائز نہیں رہتا۔ حضورؐ مسکرائے اور فرمایا ”قد أجرنا من أجرت“ تم نے پناہ دے دی ہے تو ہم نے بھی پناہ دے دی ہے۔ ابوالعاصؓ بن ربیع آزاد ہو کر سیدھا مکہ گئے اور جا کر کہا کہ لوگو! میں وہیں مدینہ میں مسلمان ہو گیا تھا لیکن میں نے وہاں پر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان اس لیے نہیں کیا کہ تم یہ نہ کہو کہ ابوالعاص قید یا قتل سے بچنے کے لیے مسلمان ہو گیا ہے۔ اس لیے یہاں مکہ میں تمہارے سامنے اعلان کر رہا ہوں ”اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ“۔ یہ اعلان کرنے کے بعد ابوالعاصؓ نے کہا کہ جس کا میرے ساتھ کوئی حساب کتاب ہے وہ میرے ساتھ معاملہ کر لے۔ اور میں مدینہ جا رہا ہوں جس کو مجھے روکنا ہے وہ مجھے روک کر دیکھ لے۔ جناب نبی کریمؐ نے ایک دفعہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبے کے دوران ابوالعاصؓ کی تعریف کی، فرمایا وہ بہت اچھا داماد ہے اس نے میرے ساتھ جو بات بھی کی پکی کی جو وعدہ بھی کیا پورا کیا۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ اپنے رشتہ داروں کا لحاظ بھی کرتے تھے اور جہاں تعریف کرنی ہوتی وہاں تعریف بھی کرتے تھے۔

حضرت عثمانؓ بدر کی لڑائی میں شریک نہیں ہو سکے اس وجہ سے کہ حضرت عثمانؓ کے نکاح میں جناب نبی کریمؐ کی دوسری بیٹی حضرت رقیہؓ تھیں۔ حضرت رقیہؓ سخت بیماری کی حالت میں گھر پر تھیں اور حضرت عثمانؓ کے علاوہ کوئی ان کی تیمارداری کرنے والا نہیں تھا۔

بدر کے معرکے میں جانے لگے تو حضرت عثمانؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ میں بھی جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہوں، حضورؐ نے انہیں منع کرتے ہوئے فرمایا کہ تم گھر میں رہو اس لیے کہ رقیہؓ بیمار ہے اور کوئی اسے پانی دینے والا بھی نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اصرار کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ جو ثواب وہاں جنگ میں شریک ہونے والوں کو ملے گا تمہیں یہاں گھر میں رہ کر ملے گا۔ جناب نبی کریمؐ نے سخت ترین جنگی حالات میں بھی اپنی بیٹی کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو جنگ میں جانے سے روک دیا۔ چنانچہ اسی بیماری کے دوران حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے اپنی تیسری بیٹی ام کلثوم حضرت عثمانؓ کے نکاح دے دی، حضرت ام کلثومؓ کا بھی بعد میں انتقال ہو گیا۔ اس پر حضورؐ نے اس پر ایک ایسا جملہ فرمایا جو کوئی خسر کم ہی اپنے داماد کے متعلق کہتا ہے۔ فرمایا، عثمانؓ میری اور کوئی بیٹی تمہارے لیے دستیاب نہیں ہے، اگر میری سو بیٹیاں بھی ہوتیں تو ایک ایک کر کے تمہارے نکاح میں دے دیتا۔ یہ ایک خسر کا اپنے داماد پر بے انتہا اعتماد کا اظہار تھا۔ تو جناب نبی کریمؐ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا اور عزت و احترام کا معاملہ فرماتے تھے۔

خاندان اور نسب کا لحاظ

حضرت حسان بن ثابتؓ نے اپنی رزمیہ شاعری کے ذریعے کفار مکہ کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا تو اس پر حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر تم قریش کو اپنے اشعار میں برا بھلا کہو گے تو اس کی زد میں میرے آباؤ اجداد بھی آئیں گے۔ یعنی حضورؐ نے یہ بات پسند نہ کی کہ کوئی ان کے آباؤ اجداد کو اور ان کے نسب میں سے کسی کی مذمت کرے۔ واقعہ یوں ہوا کہ غزوۂ خندق کے بعد جب مشرکین مکہ نے دیکھا کہ ہم لڑائی کے میدان میں شکست نہیں دے پا رہے تو انہوں نے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اسلام اور مسلمانوں کی مذمت میں شاعروں نے اشعار کہنے شروع کر دیے، خطیبوں نے خطبے دینے شروع کر دیے اور مسلمانوں کی کردار کشی کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب آدمی میدان میں مقابلہ نہ کر سکے تو پھر زبان سے سارا غصہ نکالتا ہے، قریش نے بدر میں شکست کھائی تھی، احد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور پھر خندق میں اپنا پورا زور لگانے کے باوجود ناکام ہو گئے تھے۔ خندق قریش کے ساتھ مسلمانوں کا آخری معرکہ تھا جس کے بعد حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ آج کے بعد انہیں ہم پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہو گی، اب جب بھی جائیں گے ہم

جائیں گے۔ فرمایا اب یہ لوگ ہمارے خلاف تلوار کی جنگ نہیں لڑیں گے بلکہ یہ ہمارے خلاف زبان کی جنگ لڑیں گے۔ یہ لوگ ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کریں گے، شعر کہیں گے، خطبے دیں گے، عرب قبائل کو ہمارے خلاف بھڑکائیں گے اور ہمارے خلاف نفرت و غصے کی فضا گرم کریں گے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ حضورؐ نے دراصل فرمایا کہ یہ لوگ ہمارے خلاف میڈیا کی جنگ لڑیں گے، یہ ہمارے خلاف لوگوں کو اشتعال دلائیں گے اور ہماری کردارکشی کریں گے۔ مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کا مجمع تھا آپؐ نے فرمایا کہ تلوار کی جنگ میں تم لوگ میرے ساتھ تھے لیکن اس زبان کی جنگ میں کون میرے ساتھ ہو گا؟ حافظ ابن عبدالبر نقل کرتے ہیں کہ تین آدمی کھڑے ہوئے، تینوں انصاری تھے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ۔ یہ تینوں شاعر کھڑے ہوگئے کہ یارسول اللہ! یہ جنگ ہم لڑیں گے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے تو اپنی زبان پکڑ کر کہا کہ یارسول اللہؐ! میں اپنی اس زبان کے ساتھ ان کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ تینوں میں کام کی تقسیم کار اس طرح تھی کہ حسان بن ثابتؓ جناب رسول اللہؐ کی مدح بیان فرماتے تھے اور مشرکین جو ہجو کرتے تھے اس کا جواب دیتے تھے۔ حضرت کعب بن مالکؓ کفار کی مذمت کیا کرتے تھے کہ مشرک ایسے ہوتے ہیں کافر ایسے ہوتے ہیں اور ان میں یہ یہ اخلاقی خرابیاں ہوتی ہیں۔ جبکہ عبداللہ بن رواحہؓ کی شاعری رزمیہ تھی کہ مار دیں گے، تباہ کر دیں گے، جڑ سے اکھاڑ دیں گے وغیرہ۔ بلکہ ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں آتا ہے کہ عمرۃ القضا کے موقع پر جب حضورؐ مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو عبداللہ بن رواحہؓ کے ہاتھ میں حضورؐ کی اونٹنی کی لگام تھی اور وہ اپنے اشعار پڑھتے جا رہے تھے۔ یہ واقعہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کا ہے۔ وادی سے نیچے اتر رہے تھے حضورؐ کی اونٹنی کی لگام عبد اللہ بن راوحہؓ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اپنے جذبے سے اشعار پڑھتے جا رہے تھے کہ ہم کافروں کو تباہ کر دیں گے، اڑا دیں گے، چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو قریب آکر منہ کے اشارے سے کہا کہ خاموش ہو جاؤ سامنے دیکھو کعبہ نظر آرہا ہے اور تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ جناب رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ کا عبداللہؓ کو اس طرح روکنا دیکھ لیا۔ فرمایا "دعہ یا عمر" چھوڑو اسے اور پڑھنے دو۔ خدا کی قسم اس کے اشعار کافروں کے سینوں میں تیروں سے زیادہ نشانے پر لگ رہے ہیں۔

اسی طرح بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، حضرت حسان بن ثابتؓ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے اور رسول اللہؐ کی مدح میں بڑے مزے سے اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ پاس سے گزرے تو گھور کے دیکھا کہ خدا کے بندے مسجد میں بیٹھے ہو، دیکھ بھال کر یا آہستہ پڑھو۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے فوراً کہا کہ امیر المؤمنین! کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں، میں اسی مسجد میں یہ اشعار پڑھا کرتا تھا اور رسول اللہؐ مجھے داد دیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی حضرت ابو ہریرہؓ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت حسان بن ثابتؓ نے کہا کہ ابو ہریرہ! تم میرے گواہ ہو کہ اسی مسجد میں حضورؐ بھی ہوتے تھے باقی صحابہ بھی ہوتے تھے اور میں کفار کی ھجو کا جواب دیا کرتا تھا اور حضورؐ کی مدح کیا کرتا تھا حضورؐ اس پر خوش ہوتے تھے مجھے داد دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ حسان! اور اشعار کہہ تمہاری پشت پر روح القدس کھڑا ہے۔ پھر حضرت حسانؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا، کیوں ابو ہریرہ! یہ بات اسی طرح ہے جیسے میں کہہ رہا ہوں؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ ہاں یہ بات اسی طرح ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ خاموش ہو کر وہاں سے چل دیے۔

میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ حضرت حسان بن ثابتؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں یہ جنگ ایسی لڑوں گا اور ان قریشیوں کی ایسی مذمت کروں گا کہ دنیا یاد کرے گی۔ اس پر رسول اللہؐ نے ایک جملہ فرمایا ''فیھم نسبی یا حسان'' اگر تم ان کی مذمت کرو گے تو اس میں میرے خاندان اور میرے نسب کے لوگ بھی آئیں گے جو قابل احترام ہیں، ان کے ساتھ تم کیا معاملہ کرو گے؟ حضرت حسانؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں مذمت کرتے ہوئے آپ کے نسب کو ایسے درمیان سے نکال دوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ یعنی میں آپ کے نسب کا لحاظ رکھوں گا اور اس پر کوئی زد نہیں آنے دوں گا۔ پھر حضورؐ نے حضرت حسانؓ سے کہا کہ ہمارے جو نسب نامے ہیں ان کا ابوبکرؓ کو سب معلوم ہے ان سے جا کر یہ معلوم کر لو کہ کس کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے۔ چنانچہ حضرت حسان بن ثابتؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس گئے اور ساری تفصیل معلوم کی پھر آ کر رسول اللہؐ کو بتایا کہ میں نے آپ کا نسب سیکھ لیا ہے، اب آپ تسلی رکھیں میں ھجو بھی کروں گا اور آپ کے نسب کو بھی بچاؤں گا۔ چنانچہ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اپنے خاندان والوں کی عزت کا لحاظ رکھنا

بھی سنت ہے۔ خاندان کے حوالے سے جناب نبی کریمؐ کا اپنا طرز عمل بھی یہی تھا اور دوسروں کو تلقین بھی یہی تھی۔

خاندان میں سب سے بڑا حق

خاندان میں سب سے بڑا حق ماں باپ کا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ مسلمان ہوئے تو ان کی والدہ ناراض ہوگئیں کہ میرا بیٹا مسلمان کیوں ہوا ہے، اپنے بیٹے سے کہا کہ تم کلمہ چھوڑو ورنہ میں تمہارے ساتھ بولنا چھوڑ دوں گی۔ حضرت سعدؓ پریشان ہوگئے اور حضورؐ کی خدمت میں جاکر عرض کیا کہ یارسول اللہؐ میری ماں تو میرے کلمہ پڑھنے پر ناراض ہوگئی ہے۔ آپؐ نے انہیں اپنی ماں کے احترام کی تلقین کی۔ جب ماں نے کچھ دن دیکھا کہ بیٹا کلمہ نہیں چھوڑ رہا تو ایک دن گھر سے نکل کر کھلے میدان میں جاکر بیٹھ گئی اور اپنے بال بکھیر لیے، اعلان کر دیا کہ میں اس وقت تک نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور نہ سائے میں بیٹھوں گی جب تک تم کلمہ نہیں چھوڑو گے۔ اب سعدؓ مزید پریشان ہوگئے کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہوا۔ ماں دھوپ میں بیٹھی ہوئی ہے نہ سائے میں بیٹھتی ہے نہ کھانا کھاتی ہے نہ پانی پیتی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ والدین کی اطاعت ضروری ہے لیکن ”وان جاھدک علی ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا“ (سورۃ لقمان ۱۵) اور اگر تجھ پر (والدین) اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک بنائے جس کو تو جانتا بھی نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی سے پیش آنا۔ یعنی اگر ماں باپ کفر اور شرک کا حکم دیں پھر ان کی اطاعت لازم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود دنیا کے معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک میں کمی نہ آئے۔ باپ اگر کفر اور گناہ کی بات کرتا ہے تو اس کی وہ بات مت مانو لیکن دنیا کے معاملات یعنی خدمت واحترام، حسن سلوک اور تعاون میں کمی نہ آئے خواہ وہ باپ کافر اور مشرک ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اسلام نے مستقل نیکی شمار کیا ہے۔

خاندانی زندگی کے حوالے سے جناب نبی کریمؐ کی تعلیم یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ رشتوں کو جوڑ کر رکھو، آپس میں میل جول پیدا کرو، تعاون کی فضا قائم کرو اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کا سلسلہ رکھو۔ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا ”صل من قطعک“ کہ کوئی تم سے تعلق توڑے تب بھی اس سے تعلق جوڑ کر رکھو۔ آپؐ نے یہ تعلیم دی کہ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرو، اس سے خاندان میں جوڑ پیدا ہوتا ہے آپس میں محبت

بڑھتی ہے اور ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد اور تعاون میسر ہوتا ہے۔ یہ اسلام کی تعلیمات ہیں اور جناب نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ ہے۔

کیا مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین جرم نہیں ہے؟

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جولائی ۲۰۰۷ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ۱۸ جون ۲۰۰۷ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق امریکہ کے مذہبی آزادی کے بین الاقوامی کمیشن نے پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بش حکومت سے کہا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں پاکستان سے سرگرمی کے ساتھ رجوع کرے، اور کمیشن نے اس کے ساتھ حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ توہین مذہب کو غیر مجرمانہ فعل قرار دے۔

تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ کے تحت مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین قانونی طور پر جرم ہے جس میں سزائے موت تک کی مختلف سزائیں مقرر کی گئی ہیں اور توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کا قانون بھی اسی کا حصہ ہے، لیکن اسے ایک عرصہ سے بین الاقوامی حلقوں میں تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ یہ آزادی رائے اور آزادی مذہب کے اس حق کے منافی ہے جس کی ضمانت اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر میں دی گئی ہے۔

سلمان رشدی کی بیہودہ تصنیف ''شیطانی آیات'' کے خلاف جب دنیا بھر کے مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا تھا اور برطانیہ سمیت مختلف ممالک میں زبردست عوامی مظاہروں کے ذریعے مسلمانوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا تو مغربی حکومتوں کی طرف سے یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے مظاہرے اور بعض حلقوں کی طرف سے اس کے واجب القتل ہونے کے فتوے آزادی رائے اور آزادی مذہب کے حق کے منافی ہیں۔ اس بنا پر برطانوی حکومت نے سلمان رشدی کو تحفظ فراہم کیا تھا جو اب بھی جاری ہے اور حکومت برطانیہ اس ملعون گستاخ رسولؐ کی حفاظت کے لیے لاکھوں پونڈ سالانہ خرچ کر رہی ہے۔

مگر مسلمانوں نے مغربی حکومتوں کے اس موقف کو تسلیم نہیں کیا اور ڈنمارک اور ناروے کے اخبارات میں جناب نبی اکرمؐ کے گستاخانہ کارٹونوں کے خلاف دنیا بھر میں اپنے جذبات کا پرجوش مظاہرہ کرکے ایک بار پھر ثابت کردیا کہ وہ آنحضرتؐ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین اور گستاخی کے معاملہ کو آزادی رائے اور آزادئ مذہب کے دائرہ کی بات نہیں سمجھتے اور ان کے نزدیک رائے اور مذہب کا اختلاف توہین گستاخی اور طنز و استہزا سے مختلف چیز ہے۔ جبکہ مغرب کی حکومتیں اور دانشور ابھی تک اس بات پر مصر ہیں کہ توہین، استہزا، تمسخر اور تحقیر بھی رائے کے اختلاف کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں اس لیے جس طرح مسلمان اپنے مذہب اور پیغمبر کے بارے میں رائے اور دلیل کے اختلاف کو برداشت کرتے ہیں اور اس پر جذبات میں نہیں آتے اسی طرح وہ اپنے مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین، استہزا اور تمسخر کو بھی برداشت کریں اور اس پر غصے میں آنے کی بجائے تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کریں۔

جہاں تک رائے اور دلیل کے اختلاف کا تعلق ہے چودہ سو سال کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اسے ہمیشہ برداشت کیا ہے اور دلیل کا جواب دلیل سے دیا ہے۔ گزشتہ کئی صدیوں سے مغرب کے مستشرقین اسلام، قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں لکھتے آرہے ہیں، اعتراضات کرتے ہیں اور سینکڑوں باتوں سے اختلاف کرتے ہیں لیکن مسلمان کبھی ان پر سیخ پا نہیں ہوئے بلکہ کتاب کا جواب کتاب سے، مقالہ کا جواب مقالہ سے اور دلیل کا جواب دلیل سے دیا گیا ہے، جس پر مغرب کی بہت سی یونیورسٹیوں کی لائبریریاں گواہ ہیں۔ البتہ توہین، استہزا، تحقیر اور تمسخر کی بات مختلف ہے، دین اسلام، پیغمبر اسلامؐ، قرآن کریم بلکہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے حوالہ سے بھی مسلمانوں نے کبھی یہ لہجہ برداشت نہیں کیا اور نہ آئندہ کبھی برداشت ہوسکتا ہے، ہم تاریخ کے حوالہ سے اس سلسلہ میں ایک عام سی مثال دیا کرتے ہیں کہ معروف ہندو مصنف پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ”ستیارتھ پرکاش“ میں قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ پر سینکڑوں اعتراضات کیے ہیں جن کے علماء کرام کی طرف سے دلیل کے ساتھ جوابات دیے گئے ہیں، خاص طور پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دلیل اور مکالمہ کے میدان میں پنڈت دیانند سرسوتی کا بالمشافہہ سامنا کرکے اسے میدان سے فرار ہونے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن اسی معاشرہ میں ایک اور ہندو مصنف راج پال نے ”رنگیلا رسول“ نامی کتاب لکھ کر

جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں گستاخانہ لہجہ اختیار کیا تو اسے برداشت نہیں کیا گیا اور غازی علم دین شہیدؒ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اس ملعون گستاخ رسول کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

سلمان رشدی کے حوالہ سے جب مختلف ممالک میں اس کے خلاف جلسے اور مظاہرے ہو رہے تھے، برطانیہ کے شہر برمنگھم میں اسی سلسلہ میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے راقم الحروف نے سلمان رشدی کی مذمت کی تو جلسہ میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ آپ لوگ سلمان رشدی کی کتاب کا جواب کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے عرض کیا کہ جواب دلیل کا ہوتا ہے گالی کا نہیں، اگر کسی کے باپ کو گالی دی جائے تو وہ جواب میں دلیل نہیں دیا کرتا، اس کا جواب وہی ہوتا ہے جس کا اظہار مسلمان کر رہے ہیں۔

ہم رائے کے اختلاف اور توہین و تحقیر کے فرق کو بخوبی سمجھتے ہیں اور ہم نے ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا ہے لیکن مغرب اس فرق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، چنانچہ سلمان رشدی کو نائٹ ہڈ (سر) کا خطاب دے کر ایک بار پھر مغرب کے اس موقف کا اعادہ کر دیا ہے کہ وہ توہین، تمسخر، استہزا اور تحقیر کو بھی آزادی رائے کا حصہ سمجھتے ہیں اور اس معاملہ میں ان کے نزدیک عام لوگوں اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جبکہ امریکہ کے مذہبی آزادی کے کمیشن نے مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین کو سرے سے جرائم کی فہرست سے نکالنے کا مطالبہ کر کے اسی مضحکہ خیز موقف کا اعادہ کیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ دنیا کے کم و بیش ہر ملک میں ایک عام شہری کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص کے طرز عمل میں اپنے لیے اہانت اور تحقیر محسوس کرے تو "ازالہ حیثیت عرفی" کے تحت عدالت سے رجوع کرے اور اپنی توہین کرنے والے کو عدالت کے کٹہرے میں لا کر اپنی حیثیت عرفی کے تحفظ کا حق استعمال کرے۔ لیکن یہ لوگ مذہب اور مذہبی شخصیات کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کی "حیثیت عرفی" مجروح ہو رہی ہو تو ان کی نمائندگی کرنے والے حضرات اس حیثیت عرفی کے تحفظ کے لیے آواز بلند کر سکیں۔ گویا مغرب اور ان کے ہمنوا ایک عام شخص کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنی عزت اور حیثیت عرفی کے تحفظ کے لیے قانونی کاروائی کرے اور وہ کسی عام شخص کی عزت اور حیثیت عرفی کو مجروح کرنے کو جرم سمجھتے ہیں لیکن حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور مذہبی شعائر کی توہین کو وہ جرم نہیں

سمجھتے اور اسی بنیاد پر پاکستان سے یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ توہین مذہب کو غیر مجرمانہ فعل قرار دے۔

اس پس منظر میں ملکہ برطانیہ کی طرف سے سلمان رشدی کو سر کا خطاب دینے کا عمل اور امریکہ کے مذہبی آزادی کمیشن کی طرف سے مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین کو ''غیر مجرمانہ'' قرار دینے کی یہ وارننگ جہاں اہل علم ودانش کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور آزادی رائے اور آزادی مذہب کے نام پر مغرب کی طرف سے پھیلائے جانے والے اس خطرناک کنفیوژن سے نئی نسل کو نکالنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں، وہاں یہ بات ملک کے ارباب حکومت وسیاست اور دینی قیادت کے لیے بھی دعوت فکر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ گزشتہ سال ستمبر کے دوران امریکی وزارت خارجہ نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں:

1. حدود آرڈیننس،

2. تحفظ ناموس رسالتؐ کے قانون اور

3. قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی دستوری اور قانونی دفعات

کے خاتمہ کے لیے پاکستان پر مسلسل دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ حدود آرڈیننس کے ساتھ تو جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے کہ ''تحفظ حقوق نسواں ایکٹ'' کے نام سے حدود شرعیہ کو سبوتاژ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اب تحفظ ناموس رسالتؐ کے قانون کی باری ہے جس کے لیے امریکہ کے مذہبی آزادی کے کمیشن نے حکومت پاکستان سے باضابطہ طور پر مطالبہ کر دیا ہے کہ وہ توہین مذہب کو جرائم کی فہرست سے خارج کرے اور مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین کو غیر مجرمانہ فعل قرار دے۔ خدا کرے کہ ہماری دینی اور سیاسی قیادت اس سلسلہ میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناموس رسالتؐ کے تحفظ کے لیے کوئی مؤثر کردار ادا کر سکے، آمین۔

توہین رسالتؐ اور آزادئ رائے کے حوالہ سے مغرب کا افسوسناک رویہ

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۰ جون ۲۰۰۷ء)

ملکۂ برطانیہ ایلزبتھ دوم نے سلمان رشدی کو نائٹ ہڈ (سر) کا خطاب دے کر مسلمانوں کے پرانے زخموں کو ایک بار پھر تازہ کر دیا ہے اور اس پر عالم اسلام میں احتجاج کی ایک نئی لہر شروع ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ ملکۂ برطانیہ نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے نزدیک ایک انتہائی قابل نفرت شخص کو اس اعزاز کے لیے کس بنیاد پر چنا ہے اس کی باقاعدہ وضاحت تو وہی کر سکتی ہیں لیکن ایک عام مسلمان کا دنیا کے کسی بھی خطے میں تاثر یہی ہے کہ اس سے سلمان رشدی کی ان خرافات کی ملکۂ برطانیہ کی طرف سے تائید جھلکتی ہے جن کے ذریعے اس نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شخصیت کے خلاف خبث باطن کا اظہار کیا تھا اور جس پر دنیا بھر کے مسلمانوں کا شدید احتجاج اور غیظ و غضب ریکارڈ پر ہے۔ خود لندن کی تاریخ میں مسلمانوں کے اس قدر بھرپور مظاہرے اور کسی حوالے سے کبھی سامنے نہیں آئے جس طرح مسلمانان برطانیہ نے لندن اور دیگر برطانوی شہروں کی سڑکوں پر آ کر سلمان رشدی کے خلاف اپنے ایمان اور جذبات کا اظہار کیا تھا۔

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ سلمان رشدی کی اس حرکت کا نوٹس لیا جائے اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے اور ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان اقدس میں گستاخی کے الزام میں اس کے خلاف کارروائی کی جائے۔ لیکن حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کے اس مطالبہ کو منظور کرنے کی بجائے سلمان رشدی کو سرکاری طور پر تحفظ فراہم کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ سلمان رشدی کو تحفظ فراہم کر کے دراصل ''آزادئ رائے'' کے حق کا تحفظ کر رہی ہے۔ مسلمانوں نے برطانوی حکومت کا یہ موقف کبھی تسلیم نہیں کیا اور ان کا موقف مسلسل یہی چلا آ رہا ہے کہ آزادئ رائے کا مطلب کسی قوم کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اور اللہ تعالیٰ کے مقدس رسولوں کی شان میں گستاخی کرنا نہیں ہے۔ چنانچہ جب اس سے کئی سال بعد ناروے، ڈنمارک اور دیگر یورپی ممالک کے اخبارات نے ''آزادئ رائے'' کی آڑ میں جناب نبی اکرمؐ کے گستاخانہ کارٹون چھاپے تو دنیا بھر کے مسلمان ایک بار پھر سراپا احتجاج بن گئے اور عامر عبد الرحمان شہیدؒ کی شہادت مسلمانوں کے ان جذبات کی علامت

کی صورت اختیار کر گئی۔ اس طرح مسلمانوں نے مغرب کا یہ موقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور مقدس مذہبی شخصیات کی توہین اور ان کا مذاق اڑانا آزادیٔ رائے کے زمرے میں آتا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنی بے ہودہ کتاب ”سٹینک ورسز“ (شیطانی آیات) میں جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور رسول اکرمؐ کے پاکباز ساتھیوں کے حوالے سے جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ کسی طرح بھی تحقیق اور ریسرچ کے دائرے میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس میں طنز، استہزا، تحقیر اور گستاخی کے سوا کوئی مواد شامل نہیں ہے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ برطانیہ کے شہر برمنگھم میں اس سلسلہ میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا جس میں مجھے بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی، جب میں خطاب کر رہا تھا تو ایک صاحب نے اٹھ کر سوال کیا کہ مولانا صاحب آپ اس کتاب کے خلاف شور مچانے کی بجائے اس کا جواب کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے عرض کیا کہ جواب دلیل اور منطق کا ہوتا ہے گالی کا نہیں۔ گالی کا جواب باغیرت قوموں کے ہاں صرف تھپڑ ہے اور کوئی شخص بھی گالیوں کے جواب میں دلائل پیش نہیں کیا کرتا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مغرب کے جن دانشوروں نے اسلام، قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دلیل سے بات کی ہے ان کا جواب دلیل سے دیا گیا ہے، کتاب کے جواب میں کتاب لکھی گئی اور مقالے کے جواب میں مقالہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں بات استہزا، تحقیر اور توہین کی ہو وہاں دلیل کا کوئی کام باقی نہیں رہ جاتا۔ میں اس سلسلہ میں جنوبی ایشیا کی صورتحال کا حوالہ دیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں ہندو مصنفین میں سے پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ”ستیارتھ پرکاش“ میں اسلام، قرآن کریم اور جناب نبی کریمؐ پر سینکڑوں اعتراضات کیے جو اس کتاب میں اب بھی موجود ہیں۔ لیکن بات مباحثے کے انداز میں کی اور دلیل کا اسلوب اختیار کیا تو اس کے خلاف مسلمانوں نے کبھی جلوس نہیں نکالا اور اس کو مارنے کے درپے نہیں ہوئے بلکہ دلیل کا جواب دلیل سے دیا اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس کے مقابلے میں مباحثے اور مکالمے کے لیے کھلے میدان میں آئے مگر اسے مولانا نانوتویؒ کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں تفصیل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے رسائل اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کی باقاعدہ جواب تصنیف ”حق پرکاش“ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جبکہ اسی معاشرے میں ایک

ہندو مصنف راج پال نے دلیل کے بجائے گستاخی کا لہجہ اختیار کیا اور ''رنگیلا رسول'' نامی کتاب لکھ کر مسلمانوں کے ایمان اور غیرت کو للکارا تو اس کے جواب میں دلیل کا کوئی کردار باقی نہیں رہا تھا۔ اس کا جواب غازی علم الدین شہیدؒ ہی تھا جس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اس شاتم رسول کو ٹھکانے لگا دیا۔

مسلمانوں نے اپنے اس موقف کی ہمیشہ دوٹوک وضاحت کی ہے کہ استدلال، منطق اور تحقیق کا میدان اور ہے جبکہ طنز، استہزا، توہین اور تحقیر کا دائرہ اس سے مختلف ہے جسے کسی صورت میں بھی آزادئ رائے کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا، مگر مغرب ان دونوں میں فرق نہیں کر رہا۔ اب ملکہ برطانیہ کے حالیہ اقدام سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ان کے نزدیک سر ولیم مور کی کتاب ''لائف آف محمد'' اور سلمان رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' ایک ہی زمرے کی کتابیں ہیں۔ ورنہ اگر یہ فرق ملکہ برطانیہ اور ان کے ہمنواؤں کے ذہنوں میں ہوتا تو وہ ''شیطانی آیات'' جیسی متنازعہ کتاب کے مصنف کو کسی اعزاز سے نوازنے کا تصور بھی نہ کرتیں۔ اس طرح سلمان رشدی نے مسلمانوں کے دلوں پر جو زخم لگائے تھے انہیں ملکۂ برطانیہ کی طرف سے اسے سر کا خطاب دیے جانے کے اس عمل نے پھر سے کرید ڈالا ہے۔

بات صرف اس ایک زخم کی نہیں ہے، اس کے ساتھ اور بھی بہت سے زخم تازہ ہو رہے ہیں۔ بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین جب سلمان رشدی کے نقش قدم پر چلی تو اسے یورپی یونین نے تحفظ فراہم کیا۔ اس نے قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں گستاخانہ لہجہ اختیار کیا اور بنگلہ دیش کے عوام نے حکومت سے اسے سزا دینے کا مطالبہ کیا جو بنگلہ دیش کے قانون کے مطابق سزائے موت سے بہت کم تھی، مگر یورپی یونین نے آزادئ رائے کے نام پر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ مصر کے ڈاکٹر نصر ابو زید نے اپنی تصنیفات میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے بارے میں توہین آمیز ریمارکس دیے اور قاہرہ کے بعض وکلاء نے اسے عدالت میں گھسیٹا تو یہاں بھی آزادئ رائے کا مغربی تصور آڑے آیا اور وہ گستاخ رسول اب یورپی یونین کے خرچ پر یورپ کے کسی ملک میں عیش کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں گوجرانوالہ ضلع کے ایک گاؤں رتہ دوہتڑ میں گستاخیٔ رسول کا کیس ہوا اور ملزموں کو گرفتار کر کے عدالت تک پہنچایا گیا تو آزادئ رائے کے عنوان سے جرمنی کی حکومت متحرک ہو گئی، اس کیس کے ملزم اب جرمنی میں مزے کر رہے ہیں۔

میں نے ان زخموں میں سے چند ایک کا حوالہ دیا ہے جو سلمان رشدی کو ملکۂ برطانیہ کی طرف سے ’’نائٹ ہڈ‘‘ کا خطاب ملنے پر پھر سے تازہ ہو رہے ہیں ورنہ اگر باقاعدہ تحقیق کی جائے تو ان کی فہرست خاصی طویل ہو سکتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ ہمارے وفاقی وزیر محترم شاہ محمود قریشی نے تو یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی کہ یہ برطانیہ کا داخلی معاملہ ہے، گویا ان کے نزدیک جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حرمت اور مسلمانوں کا ایمان و غیرت بھی ’’نیشنلائزڈ‘ ہو گئے ہیں کہ ان کے حوالے سے برطانیہ میں کوئی بات ہو تو محترم قریشی صاحب کا ردعمل اور ہو گا اور اگر وہی بات خدانخواستہ پاکستان میں ہو تو پیپلز پارٹی کے رہنما اس پر اس سے مختلف ردعمل کا اظہار فرمائیں گے۔ البتہ دوسرے بہت سے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے جس ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ ایمانی جذبات کے حوالے سے حوصلہ افزا ہے مگر اسے منظم اور مربوط انداز میں آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ جذبات کا اظہار اور غیرت و حمیت کا مظاہرہ بہت اچھی بات ہے، یہ ایمان اور غیرت کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ مسئلہ کو قوت فراہم کرتا ہے اور اسے زندہ رکھتا ہے لیکن اصل ضرورت اس قوت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی ہے۔ ہمارے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ’’آزادیٔ رائے‘‘ کی حدود اور دائرے کے حوالہ سے مغرب کے ساتھ سنجیدہ اور دوٹوک بات کی جائے اور آزادیٔ رائے کے نام پر اسلام، قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اور گستاخی کے اس مذموم عمل کے نقصانات سے مغرب کو باور کرانے کے لیے باقاعدہ علمی اور فکری جنگ لڑی جائے۔

امام کعبہ الشیخ عبد الرحمان السدیس کے ساتھ ایک نشست

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۹ جون ۲۰۰۷ء)

امام حرم مکہ الشیخ عبد الرحمان السدیس حفظہ اللہ تعالیٰ کی پاکستان تشریف آوری پر زندہ دلان پاکستان نے عقیدت و محبت کا جو اظہار کیا ہے وہ اسلام اور اسلامی شعائر کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کی علامت ہے۔ مقامات مقدسہ کے حوالے سے اہل پاکستان نے ہمیشہ

محبت و عقیدت اور جوش و جذبے کا اظہار کیا ہے۔ الشیخ السدیس مسجد حرام کے امام و خطیب ہیں اور نہ صرف یہ کہ نماز میں ان کی قراءت لاکھوں نمازیوں کے لیے اطمینان و مسرت کا باعث ہوتی ہے بلکہ ان کا جمعۃ المبارک کا خطبہ بھی موجودہ عالمی تناظر میں مسلمانوں کے لیے علمی و فکری رہنمائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ ممتاز حافظ و قاری ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی شریعت میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھتے ہیں اور سرکردہ سعودی علماء اور دانشوروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

راقم الحروف کو متعدّد بار حرم مکہ میں ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے مگر جب ان کی لاہور تشریف آوری کا علم ہوا تو دل چاہا کہ سرزمین پاکستان میں بھی ان کی امامت میں نماز پڑھنے کا شرف مل جائے۔ جامعہ اشرفیہ میں فجر کی نماز کے وقت گوجرانوالہ سے حاضر ہونا مشکل نظر آ رہا تھا اس لیے اپنے طور پر ارادہ کر لیا کہ نماز مغرب بادشاہی مسجد میں ان کے پیچھے پڑھ لی جائے مگر اس میں بھی بے پناہ رش کی توقع تھی جو میرے جیسے پیدل شخص کے لیے بہر حال سوچنے کا مرحلہ تھا۔ اتنے میں پنجاب قرآن بورڈ کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہو گیا کہ بورڈ کے سرپرست اعلیٰ اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی نے امام حرم کے ساتھ پنجاب قرآن بورڈ کی ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا ہے جس میں بورڈ کے رکن کے طور پر مجھے بھی شریک ہونا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے امام حرم کی زیارت اور ان کے ساتھ ملاقات کا محفوظ طریقہ سمجھ کر اس میں شرکت کا پروگرام بنا لیا۔

پنجاب قرآن بورڈ کی طرف سے امام حرم کے لیے استقبالیہ کے عنوان سے یہ تقریب سیون کلب روڈ پر واقع وزیر اعلیٰ ہاؤس میں تھی۔ وہاں پہنچا تو علماء کرام، سرکاری افسران، ممتاز دانشوروں اور عوامی نمائندگان کا ایک ہجوم تھا جو فضیلۃ الشیخ عبد الرحمان السدیس کے لیے چشم براہ تھا۔ مجھے اسٹیج کی دائیں جانب جگہ اس طرح مل گئی کہ مولانا حافظ عبد الرحمان مدنی اپنے بیٹوں سمیت اس طرف بیٹھے تھے، ان کے ساتھ ایک نشست کی گنجائش تھی انہوں نے آواز دے کر مجھے اپنے پاس بلا لیا ورنہ اسٹیج سے اس قدر قریب جگہ حاصل نہ کر پاتا۔ منتظمین میں صوبائی وزیر مذہبی امور صاحبزادہ سید سعید الرحمان شاہ، پنجاب قرآن بورڈ کے چیئرمین مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، اور ڈائریکٹر مذہبی امور ڈاکٹر طاہر رضا بخاری نمایاں تھے اور وہی کارروائی کو چلا رہے تھے۔ اسٹیج کے سامنے پہلی صف میں محترم جناب مجیب الرحمان شامی، چیف سیکرٹری جناب سلمان صدیقی اور آئی جی پنجاب پولیس چودھری

احمد نسیم نمایاں تھے اور پنڈال میں مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام اور سرکاری افسران کے پہلو میں مختلف شہروں کے ناظم حضرات اور بعض صوبائی وزراء بھی موجود تھے۔

امام حرم کو پنجاب قرآن بورڈ کے مقصد قیام اور اس کی دو سالہ کارکردگی کے اہم پہلوؤں سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے مسرت کا اظہار کیا اور قرآن کریم کے حقوق پر پر مغز گفتگو فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم صرف تلاوت اور برکت کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ قرآن کریم کا یہ حق ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اس سے رہنمائی حاصل کریں اور اپنی زندگیوں کو قرآن کریم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھالیں۔ امام حرم مکہ نے قرآن بورڈ کی سرگرمیوں اور کارکردگی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قرآن کریم کے ساتھ ان سرگرمیوں کے دائرے میں سنت نبویؐ کی ترویج و اشاعت کو بھی شامل کیا جائے کیونکہ قرآن و سنت دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اس پر امام حرم مکہ کو بتایا گیا کہ پنجاب قرآن بورڈ کے زیر اہتمام ایک بڑا علمی مرکز جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے حوالہ سے قائم کیا جا رہا ہے جس کے ذریعے قرآن کریم اور سیرت نبویؐ کے سلسلہ میں علمی سرگرمیوں کا اہتمام کیا جائے گا اور تحقیق و ریسرچ کا دائرہ وسیع کیا جائے گا۔

اسٹیج کے دائیں جانب پہلی صف میں بیٹھ کر امام حرم کی زیارت تو بخوبی ہو رہی تھی اور ان کی گفتگو سے بھی استفادہ ہو رہا تھا مگر مصافحہ کو بھی جی چاہتا تھا جو اس ہجوم میں مشکل دکھائی دیتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کا کہ انہوں نے بطور خاص اسٹیج پر بلا کر اس کا موقع فراہم کر دیا اور ہم اس تقریب سے شاد کام لوٹے۔ دو روز بعد اللہ تعالیٰ نے الشیخ عبد الرحمان السدیس حفظہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چند لمحات گزارنے کا ایک اور موقع دے دیا، وہ اس طرح کہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ساتھ اسلام آباد کے پنجاب ہاؤس میں امام حرم کی ایک نشست ۳۰ مئی کو مغرب کی نماز کے موقع پر طے ہو گئی اور وفاق المدارس العربیہ کی مجلس عاملہ کے رکن کے طور پر مجھے بھی شرکت کا اعزاز بخشا گیا۔ مغرب کی نماز ہم نے پنجاب ہاؤس اسلام آباد کے ایک ہال میں امام حرم کی اقتدا میں ادا کی اور اس کے بعد وفاق المدارس کی نشست میں ان کے ساتھ کم و بیش اڑھائی گھنٹے گزارنے کا شرف حاصل ہوا۔ وفاق المدارس ملک بھر کے دیوبندی مکتب فکر کے ہزاروں مدارس کی

نمائندگی اور قیادت کرتا ہے اور اس اجتماع میں ملک بھر سے سرکردہ علماء کرام سینکڑوں کی تعداد میں شریک تھے۔ وفاق کی مرکزی قیادت میں سے مولانا سلیم اللہ خان، مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا فضل الرحیم، مولانا انوار الحق حقانی اور مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نمایاں تھے۔ جبکہ وفاقی وزراء میں سے جناب اعجاز الحق، ڈاکٹر عامر لیاقت اور دوسرے بعض وزراء بھی موجود تھے۔ جمعیت علماء اسلام کی نمائندگی مولانا عطاء الرحمان ایم این اے اور سینیٹر مولانا گل نصیب خان نے کی۔ تبلیغی جماعت کے معروف مبلغ مولانا محمد طارق جمیل بھی اسٹیج پر تھے بلکہ انہوں نے اپنی مسجع اور مقفی عربی گفتگو میں جس طرح امام حرم کا خیر مقدم کیا اس نے محفل میں ایک نیا جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ مولانا طارق جمیل کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ صرف ایک داعی اور مبلغ ہی نہیں بلکہ دینی تعلیم کے ممتاز ماہرین میں شمار ہوتے ہیں، کئی تعلیمی ادارے کامیابی سے چلا رہے ہیں اور انہوں نے دینی علوم کی تعلیم و تدریس کی روایت کو ایک نیا رخ دیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ اردو کی طرح عربی زبان کے بھی قادر الکلام خطیب ہیں۔

اس موقع پر امام حرم کو بتایا گیا کہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ساتھ اس وقت گیارہ ہزار کے لگ بھگ دینی مدارس ملحق ہیں، پچاس ہزار سے زائد طلباء حافظ قرآن کریم ہو چکے ہیں، چھیالیس ہزار کے لگ بھگ افراد نے دینی تعلیم مکمل کر کے فائنل کی ڈگری حاصل کی ہے، اور تیس ہزار کے قریب طالبات نے فاضلات کا درجہ حاصل کر لیا ہے جبکہ مجموعی طور پر سترہ لاکھ طلباء ان مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وفاقی وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق نے شرکاء محفل کو بتایا کہ ہم پوری دنیا میں بڑے فخر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں اتنی بڑی تعداد کو تعلیم اور قیام و طعام کی سہولت فراہم کرنے والا اور کوئی ادارہ نہیں ہے اور یہ مدارس دنیا کی سب سے بڑی تعلیمی اور رفاہی این جی او ہیں۔

امام حرم مکہ نے ان اعداد و شمار پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خطاب میں ان کا بطور خاص ذکر کیا اور کہا کہ علماء کی ہمیشہ سے یہ روایت رہی ہے کہ وہ ہر دور میں دین کی تبلیغ اور تعلیم کے ذریعے حجت قائم کرتے ہیں۔ سماحۃ الشیخ عبدالرحمان السدیس نے اپنے پر مغز خطاب میں علماء کرام کی ذمہ داریوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی اور بہت سے اہم امور کی طرف انہیں توجہ دلائی۔ انہوں نے بطور خاص اس بات پر زور دیا کہ فقہی اور فروعی اختلافات میں تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے ایک دوسرے کا احترام کیا

جائے اور پوری طرح متحد ہو کر کفر کا مقابلہ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ کفر کی ہمہ گیر یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے علماء کرام کا اتحاد اولین ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ علماء کرام کو اپنے عمل اور کردار کے حوالہ سے دوسروں کے لیے اسوہ اور قدوہ ہونا چاہیے اور مسلمانوں کی عملی راہنمائی کے لیے خود نمونہ بننا چاہیے۔ امام حرم مکہ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ علماء کرام لوگوں کے سامنے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اصلی اور صحیح حالت میں پیش کریں لیکن اس کے لیے وقت کے اسلوب اور طریق کار کا بھی لحاظ رکھیں اور آج کے ہتھیاروں کو پہچانیں۔

امام حرم ان سطور کی اشاعت تک حرم میں واپس پہنچ چکے ہوں گے مگر ان کی تشریف آوری سے دلوں کو جو ایمانی حرارت ملی ہے اس کی یاد مدتوں دلوں کو گرماتی رہے گی۔

مکالمہ بین المذاہب: اہداف اور دائرے

(مرکزی جامع مسجد، گلاسگو، برطانیہ - ۱۳ مئی ۲۰۰۷ء)

۱۳ مئی ۲۰۰۷ء کو مرکزی جامع مسجد گلاسگو برطانیہ میں ظہر کی نماز کے بعد ایک اجتماع سے "مکالمہ بین المذاہب" کے عنوان پر خطاب کا موقع ملا۔ اس موقع پر کی گئی گزارشات کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ "مکالمہ بین المذاہب" آج کے اہم عالمی موضوعات میں سے ہے جس پر دنیا بھر میں گفتگو کا سلسلہ جاری ہے اور ہر سطح پر اس کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ برطانیہ کے وزیراعظم جناب ٹونی بلیئر کے حوالے سے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ وہ ۲۷ جون ۲۰۰۷ء کو وزارت عظمی سے سبکدوش ہونے کے بعد انٹر فیتھ ڈائیلاگ یعنی بین المذاہب مکالمہ کے لیے ایک باقاعدہ ادارہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ اس سلسلہ میں عالمی سطح پر سنجیدگی کے ساتھ کوئی فورم یا ادارہ کام نہیں کر رہا اس لیے وہ اس کام کے لیے پروگرام بنا رہے ہیں۔ اس سے آپ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں، اسی وجہ سے میں نے آج کی گفتگو کے لیے اس عنوان کا انتخاب کیا ہے۔

مختصر وقت میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مکالمہ بین المذاہب سے مراد کیا ہے؟ اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ اور معروضی صورتحال میں اس کے تقاضے کیا ہیں؟ مکالمہ بین المذاہب کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے حضرات مذہب کے

حوالے سے آپس میں گفتگو کریں، اور آج کے دور میں اس کا سب سے بڑا مقصد بین الاقوامی ماحول میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان مفاہمت اور رواداری کو فروغ دینا بیان کیا جاتا ہے۔ اس مکالمے کے مختلف درجات اور دائرے ہیں، میں ان کا ترتیب وار تعارف کرانا چاہوں گا۔

1. اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا پہلا دائرہ یہ ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں، ان تک جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچائیں اور اسلام کی دعوت کو تمام غیر مسلموں تک عام کرنے کی کوشش کریں۔ کسی مسلمان کا کسی غیر مسلم تک قرآن کریم کا پیغام پہنچانا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کرا کے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اسلامی تعلیمات کی رو سے دنیا بھر کے تمام غیر مسلم انسانوں کا مسلمانوں پر حق ہے اور دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔ اس وقت دنیا کی آبادی چھ سات ارب کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے جن میں ڈیڑھ ارب کے قریب مسلمان ہیں، باقی ساڑھے چار یا پونے پانچ ارب انسانوں تک اسلام کی دعوت پہنچانا اور انہیں قرآن کریم اور جناب نبی کریمؐ کے ساتھ وابستہ ہونے کی دعوت دینا ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے کہ جب ہم اپنے عقیدے کی رو سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ نسل انسانی کی دنیوی اور اخروی کامیابی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہونے میں ہے اور اس کے بغیر اس کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے تو سب لوگوں کو اس سے بچانا اور گمراہی سے نکالنے کی کوشش کرنا ہماری ذمہ داری میں شامل ہو جاتا ہے۔ ورنہ میں اگر ایک شخص کو ہلاک ہوتا دیکھ رہا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ میں اسے اس ہلاکت سے نکال سکتا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ کوشش نہیں کرتا تو اس کی ہلاکت کا میں بھی ذمہ دار قرار پاتا ہوں اور خود کو اس ذمہ داری سے بری الذمہ کرنا میرے لیے مشکل ہو گا۔ یہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ مذہب کے حوالے سے ہماری گفتگو کا پہلا دائرہ ہے۔ اگرچہ اسے یکطرفہ مکالمہ شمار کیا جائے گا لیکن بہرحال یہ اسی نوعیت کی بات ہے اس لیے میں اسے مکالمہ بین المذاہب کا پہلا درجہ تصور کرتا ہوں۔

2. مکالمہ بین المذاہب کا دوسرا دائرہ یا درجہ یہ ہے کہ جہاں مختلف مذاہب کے پیروکار ایک سوسائٹی کے طور پر مشترک زندگی بسر کر رہے ہوں اور انہوں نے اکٹھے ہی رہنا ہے تو وہ اپنے اپنے مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے اکٹھے رہنے کے امکانات اور وسعتوں پر باہم گفتگو کریں کہ وہ کن معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ چل سکتے ہیں اور کہاں کہاں گنجائش پیدا کر سکتے ہیں۔ اور جہاں وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد و احکام کی رو سے تعاون نہیں کر سکتے اور اکٹھے نہیں چل سکتے وہاں وہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور تصادم سے بچنے کے لیے کیا راستہ نکال سکتے ہیں؟ یہ مکالمہ بین المذاہب کا دوسرا دائرہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس وقت دنیا میں اس موضوع پر گفتگو کا جو دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اس کے اہداف میں سے ایک بڑا ہدف یہ بھی ہے۔ بلکہ خود برطانیہ میں جہاں کھڑے ہو کر میں یہ بات کر رہا ہوں اسی قسم کا ماحول پایا جاتا ہے۔

3. مکالمہ بین المذاہب کا تیسرا دائرہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے افراد سوسائٹی میں مذاہب کی مشترکہ باتوں کے فروغ کے لیے مل کر محنت کریں اور مشترکہ امور کے لیے مشترکہ جدوجہد کے راستے تلاش کریں۔ میں ایک ذاتی مثال کے ذریعے واضح کرنا چاہوں گا کہ برطانیہ کے شہر ٹوٹنگھم اور امریکہ کے شہر اٹلانٹا میں مختلف اوقات میں میری دو مسیحی پادریوں سے گفتگو ہوئی، میں نے ان سے عرض کیا کہ اس وقت دنیا میں زنا، فحاشی، ہم جنس پرستی اور عریانی کو فروغ دیا جا رہا ہے اور پوری انسانی سوسائٹی اس کی لپیٹ میں آ رہی ہے۔ جبکہ قرآن کریم اور بائبل دونوں کے نزدیک یہ امور جرائم میں شمار ہوتے ہیں اور اسلامی و مسیحی تعلیمات دونوں کی رو سے یہ گناہ کے اعمال ہیں، تو کیا مسلم اور مسیحی علماء مل کر اس شر اور گناہ سے سوسائٹی کو پاک کرنے کے لیے جدوجہد نہیں کر سکتے؟ اسی طرح اور بھی بہت سے معاملات ہیں جو قرآن کریم اور بائبل دونوں کے نزدیک جرائم ہیں، گناہ کے اعمال ہیں اور سوسائٹی کی تباہی کے اسباب ہیں لیکن ان کا دائرہ مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آسمانی تعلیمات پر یقین رکھنے والے مختلف مذاہب کے علماء ان مشترکہ امور کے

لیے مل جل کر محنت کریں؟ یہ تیسرا دائرہ میرے نزدیک مکالمہ بین المذاہب کے ایجنڈے میں شامل ہو سکتا ہے اور آج کے معروضی حالات میں یہ انسانی سوسائٹی کی ضرورت بھی ہے۔

4. مکالمہ بین المذاہب کا چوتھا دائرہ یا درجہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکار اپنے اپنے مذہب کو حق اور صحیح ثابت کرنے کے لیے باہم گفتگو کریں، اپنے دلائل دیں، دوسروں کے دلائل کا جواب دیں اور دلیل و منطق کے ساتھ اپنے مذہب کی حقانیت اور برتری دوسروں پر ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ یہ مناظرے کا میدان ہے اور اسے قرآن کریم نے مجادلہ قرار دے کر ہدایت کی ہے کہ اگر اس کی نوبت آ جائے تو اسے احسن طریقے سے انجام دو۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ہاں مکالمہ بین المذاہب کا یہی دائرہ زیادہ تر متعارف ہے اور ہم چودہ سو سال سے اسی میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ یہ بھی مکالمہ بین المذاہب تصور کیا جاتا ہے جبکہ مکالمے کے دوسرے شعبوں اور دائروں سے ہم عام طور پر متعارف نہیں ہیں۔

5. مکالمہ بین المذاہب کا ایک اور دائرہ بھی ہے، وہ یہ کہ تمام مذاہب کو اپنی اپنی جگہ صحیح قرار دیتے ہوئے مبینہ طور پر ان کی اچھائیوں اور خوبیوں کو ایک مشترکہ مذہب کے طور پر سمو لیا جائے، اور اس طرح ایسا کرنے والوں کے خیال میں تمام مذاہب کی اچھائیوں کو جمع کر لیا جائے تو اسے ”اتحاد بین المذاہب“ کا عنوان دیا جاتا ہے اور یہ آج عالمی سطح پر منعقد ہونے والی بہت سی بین المذاہب کانفرنسوں کا ایجنڈا اور ہدف ہے۔ اس سے قبل بھی اس طرح کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے ”دین الٰہی“ کے نام سے جو نیا دین ایجاد کیا تھا اس کے پس منظر میں یہی ذہن کارفرما تھا، اور ”بہائی مذہب“ کے پیروکار بھی اپنے نئے مذہب کا یہی بنیادی سبب بیان کرتے ہیں۔ بہائیوں کا کہنا ہے کہ ان کے مذہب کے بانی مرزا بہاء اللہ شیرازی تمام آسمانی مذاہب کی اچھائیوں اور سچائیوں کو اسی طرح جمع کرنے والے ہیں جیسے مختلف پہاڑی علاقوں سے نکلنے والی ندیاں اور نالے دریا میں جا کر ایک ہو جاتی ہیں۔

غالباً سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے کہ حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور میں نے شکاگو میں بہائیوں کا ایک مذہبی مرکز دیکھا جہاں ایک بڑے ہال میں مسلمانوں کی مسجد، ہندوؤں کے مندر، سکھوں کے گوردوارے، مسیحیوں کے چرچ، یہودیوں کے سینیگاگ اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے لیے الگ الگ علامتی عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ اس مرکز کے منتظمین کا کہنا تھا کہ ہم ایک ہی چھت کے نیچے تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنے اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی سہولت فراہم کرتے ہیں اور یہ بات ان کے نزدیک "اتحاد بین المذاہب" علامت تھی۔ اس قسم کی کوشش "مکالمہ بین المذاہب" کے حوالے سے آج کے عالمی ایجنڈے کا بھی ایک اہم حصہ ہے لیکن چونکہ یہ غیر فطری بات ہے اس لیے نہ پہلے کبھی کامیاب ہوئی ہے اور نہ ہی اب کامیاب ہو سکتی ہے۔ غیر فطری اس لیے ہے کہ یہ متضاد باتوں کو جمع کرنے کی کوشش ہے مثلاً توحید اور شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں جو کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے اور ان دونوں کو ایک چھت کے نیچے جمع کرنا قطعی طور پر ایک بے جا تکلف اور غیر ضروری کوشش ہے۔

یہ چند دائرے اور درجے ہیں جو مکالمہ بین المذاہب کی بات کرتے ہوئے اس کی عملی صورتوں کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ لیکن آج کے عالمی تناظر میں اس کے ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو مکالمہ بین المذاہب کی آج کی عالمی کوششوں کا میرے نزدیک سب سے بڑا مقصد اور ہدف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بین المذاہب مکالمہ اور انٹر فیتھ ڈائیلاگ کا ایک بڑا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان رواداری، مفاہمت اور برداشت کو فروغ دے کر انتہا پسندی کو ختم کرنا مقصود ہے۔ یہ بظاہر ایک خوبصورت مقصد ہے لیکن انتہا پسندی ختم کر کے باہمی برداشت کا ماحول پیدا کرنے کی عملی شکل یہ بتائی جا رہی ہے کہ کسی مذہب کو غلط نہ کہا جائے اور کسی کی نفی نہ کی جائے۔ آج کے ماحول میں اگر کسی مذہب کے پیروکار خود کو حق پر قرار دے کر دوسرے مذاہب کو غلط اور باطل کہتے ہیں تو اسے انتہا پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور ان سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ اپنے حق اور صحیح ہونے کی بات کریں دوسرے مذہب کو غلط نہ کہیں اور کسی مذہب کی نفی نہ کریں۔ چونکہ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام ہی

حق مذہب ہے اور دوسرے مذاہب حق اور سچا ہونے کا ٹائٹل استعمال کرنے کے حقدار نہیں ہیں اس لیے ایسا عقیدہ رکھنے والے اور اس کا اظہار کرنے والے مسلمان انتہا پسند ہیں اور انہیں اس کمٹمنٹ میں نرمی کر کے دوسرے مذاہب کے لیے رواداری اور برداشت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔

یہ بات ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے اور ہم قرآن و سنت کی تعلیمات پر ایمان و یقین رکھتے ہوئے دوسرے کسی مذہب کے لیے یہ بات تصور نہیں کر سکتے کہ وہ بھی صحیح مذہب ہے اور باطل نہیں ہے، اس لیے مکالمہ بین المذاہب کے اس ایجنڈے کا سب سے بڑا مخاطب ہم ہیں اور ہم سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ہم دوسرے مذاہب کی نفی نہ کریں، انہیں باطل قرار نہ دیں اور رواداری، برداشت اور مفاہمت کے نام پر اسلام کی طرح انہیں بھی برابر کا درجہ دیں۔ اس سلسلہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کا حوالہ دینا چاہوں گا کہ مذاہب کے درمیان مکالمہ اور مفاہمت کے لیے ان سے بھی بات کی گئی تھی۔ قرآن و حدیث میں مختلف مکالموں کا تذکرہ موجود ہے جن میں سے دو کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ہمارے سامنے یہ بات آجائے کہ اس معاملہ میں جناب نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ کیا ہے اور ہمارے لیے پیغمبر آخر الزماںؐ کا اسوۂ حسنہ کیا ہے۔

حدیث و سیرت کی کم و بیش تمام کتابوں میں مذکور ہے کہ مکہ مکرمہ میں جناب رسول اکرمؐ کے پاس قریش کے سرداروں کا ایک وفد آیا جس نے یہ پیشکش کی کہ وہ مسلمانوں کے معاملے میں نرمی کرنے کے لیے تیار ہیں مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ حضرت محمدؐ ان کے خداؤں یعنی بتوں کی نفی کرنا چھوڑ دیں۔ مثبت بات کریں، منفی نہ کریں، اپنے خدا کی بات کریں، قریش کے خداؤں کی نفی نہ کریں۔ یہ بات کہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن یہ بات نہ کہیں کہ ان کے بت کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ ہی قریش کے سرداروں کے وفد نے یہ پیشکش بھی کی کہ اس صورت میں وہ حضرت محمدؐ کے ساتھ ان کی عبادت میں شریک ہونے کے لیے تیار ہیں اور آپؐ بھی ان کے بت خانوں میں آیا کریں، اس طرح باہمی مفاہمت کا ماحول پیدا ہو گا۔

یہ آج کی معروف اصطلاح میں ”اتحاد بین المذاہب“ کی پیشکش تھی اور اس کا مقصد اسی طرح باہمی برداشت اور مفاہمت کا ماحول پیدا کرنا تھا جیسا کہ آج تقاضا کیا جا رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سورۃ الکافرون کی صورت میں اس کا جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے دوٹوک جواب دلوایا کہ ان کافروں سے کہیں کہ وہ صرف ایک خدا کی عبادت کرنے کو تیار نہیں ہیں اور میں ان کے بتوں کی پوجا نہیں کر سکتا، اس لیے ان کا دین ان کے ساتھ ہے اور میرا دین میرے ساتھ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دلوایا کہ عقیدے اور عبادت میں درمیان کی راہ نہیں ہو سکتی اور اس معاملے میں مفاہمت ممکن نہیں ہے۔ یہ جواب قرآن کریم کی ایک سورہ مبارکہ کے طور پر قیامت تک کے لیے محفوظ ہے، اس لیے ہمارے لیے بھی یہی ہدایت ہے کہ ایمان و عقیدہ اور عبادت کے بارے میں اگر مفاہمت اور ایڈ جسٹمنٹ کی دعوت دی جائے تو اس کے جواب میں ”لکم دینکم ولی دین“ کہہ کر اسے دوٹوک انداز میں مسترد کر دیا جائے۔

اسی طرح قرآن کریم نے ایک اور مکالمے کا ذکر بھی کیا ہے جو جناب نبی اکرمؐ نے نجران سے آنے والے مسیحی علماء اور سرداروں کے ساتھ کیا تھا۔ ان کے ساتھ عقائد پر گفتگو ہوئی جو کسی نتیجے پر نہیں پہنچی، پھر نوبت مباہلے تک پہنچی مگر وہ بھی نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر نبی کریمؐ سے قرآن کریم کی آیات کی صورت میں دوٹوک اعلان کرا دیا کہ ان اہل کتاب سے کہہ دیجئے کہ دو باتیں ہمارے اور ان کے درمیان قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہیں جن پر مفاہمت نہیں ہو سکتی، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور دوسری یہ کہ ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو اللہ تعالیٰ کے نیچے اپنے رب نہ بنالیں۔ گویا توحید کا اقرار، شرک سے دستبرداری اور انسان پر انسان کی خدائی کی نفی کو مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان قدر مشترک قرار دے کر قرآن کریم نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ ان مشترک اقدار پر مفاہمت نہیں ہو سکتی اور ان کو تسلیم کرنے کے بعد ہی دوسرے کسی مسئلہ پر بات چیت کی جا سکتی ہے۔

انسان پر انسان کی خدائی کی نفی کو قرآن کریم نے آسمانی مذاہب کے درمیان قدر مشترک قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب جناب نبی اکرمؐ کے مطابق یوں ہے کہ حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدیؓ نے، جو پہلے مسیحی سردار تھے پھر مسلمان ہو کر صحابہ کرامؓ میں شمار ہوئے، ایک بار آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ قرآن کریم نے ہمارے بارے میں کہا ہے کہ مسیحی حضرات نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے ورے اپنا رب بنا لیا ہے، حالانکہ ہم تو اپنے علماء کرام اور مشائخ کو رب کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے ہاں علماء و مشائخ کو حرام کو حلال کرنے اور حلال کو حرام قرار دینے کا اختیار حاصل

تھا؟ حضرت عدیؓ نے جواب دیا کہ یارسول اللہ یہ اختیار تو ہم علماء و مشائخ کے لیے مانتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا شرک ہے تو اسی طرح حلال و حرام کے اختیار میں کسی اور کو اتھارٹی تسلیم کرنا بھی شرک ہے۔

مسیحی دنیا میں آج بھی صورتحال یہ ہے کہ پاپائے روم کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی حلال کو حرام قرار دے دیں اور کسی حرام کو حلال کی فہرست میں شامل کر دیں۔ جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر حلال کو حرام کرنے یا حرام کو حلال کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے ہوتا تو اس کا استحقاق سب سے پہلے جناب رسول اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوتا، لیکن جب آپؐ نے اپنی ذات کے لیے شہد کو حرام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں واضح طور پر فرما دیا کہ "آپ نے اس چیز کو کیوں حرام کیا جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے؟ تو جب اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کرنے اور اس کی طرف سے حرام کی جانے والی چیز کو حلال قرار دینے کا جناب نبی اکرمؐ کو اختیار نہیں ہے تو پھر کسی اور کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کیا جاسکتا خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

دوسرے مذاہب کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کے مکالموں کا بھی روایات میں تذکرہ موجود ہے لیکن میں نے ان میں سے دو کا حوالہ دیا ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے بھی کیا ہے اور ان کی روشنی میں آج کی دنیا میں "مکالمہ بین المذاہب" کے حوالے سے ہونے والی گفتگو اور معاملات میں ہم واضح راستہ متعیّن کر سکتے ہیں۔

حضرات محترم! یہ ہے انٹر فیتھ ڈائیلاگ کے بارے میں معروضی صورتحال اور اس کے بارے میں قرآن و سنت کی ہدایات کا ایک منظر جو میں نے آپ کے سامنے مختصراً پیش کیا ہے۔ ہمیں اس مکالمے میں شرکت سے انکار نہیں ہے لیکن اگر اس کا مقصد اسلام کو اس کے واحد حق ہونے کے ٹائٹل سے محروم کرنا اور مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ رواداری، برداشت اور مفاہمت کے نام پر دوسرے مذاہب کے لیے بھی حق مذہب ہونے کا ٹائٹل تسلیم کرلیں تو ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۱ مئی ۲۰۰۷ء)

مولانا مفتی محمودؒ کے تفسیری افادات

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۲ جنوری ۲۰۰۷ء)

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو اللہ رب العزت نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، وہ بیک وقت ایک کامیاب سیاستدان ہونے کے ساتھ محدث، فقیہ، خطیب، پارلیمنٹیرین، شب زندہ دار اور عارف باللہ تھے۔ اور انہیں اللہ تعالی نے یہ امتیاز عطا فرمایا تھا کہ وہ جس مسند پر بھی بیٹھے اپنے معاصرین سے ممتاز نظر آئے۔ انہوں نے مدت العمر جامعہ قاسم العلوم ملتان میں حدیث و فقہ اور منقولات و معقولات کے متنوع علوم کی تدریس کی اور مسند افتاء پر ہزاروں فتاوی جاری کیے۔ اور جب لاہور کے مدرسہ قاسم العلوم میں انہوں نے دورۂ تفسیر قرآن کریم کے عنوان سے قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا درس دیا تو اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

ایک دور وہ تھا جب پنجاب میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا نہ عمومی طور پر رواج تھا اور نہ ہی دینی مدارس کے طلبہ کو ترجمہ و تفسیر اہتمام کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ ہمارے نصاب تعلیم میں جلالین اور بیضاوی کے کچھ حصے کے سوا تفسیر نام کی کوئی چیز شامل نہیں تھی۔ اس روایت کو توڑتے ہوئے ہمارے جن بزرگوں نے قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کو عوامی درس اور تدریسی نصاب دونوں سطح پر رواج دیا ان میں حضرت مولانا حسین علیؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ یہ بزرگ عام اجتماعات میں قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر الگ طور پر کرتے تھے اور علماء و طلبہ کے لیے ترجمہ و تفسیر کی کلاسوں کا الگ اہتمام کرتے تھے جن سے لاکھوں افراد نے فائدہ اٹھایا۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے ۱۹۴۳ء میں گکھڑ کی جامع مسجد میں درس قران کریم کا آغاز کیا اور ۱۹۵۲ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے آغاز پر وہاں تدریسی خدمات کا سلسلہ شروع کیا تو طلبہ کے لیے ترجمہ قرآن کریم کی مستقل کلاس شروع کی۔ اس کلاس میں وہ دو سال میں قرآن کریم کا ترجمہ مکمل پڑھاتے تھے۔ مدرسہ میں روزانہ اسباق کا آغاز اس کلاس سے ہوتا تھا، کافیہ کے درجہ سے اوپر کے تمام درجات کے طلبہ کی اس سبق میں شمولیت لازمی ہوتی تھی اور ہمارے طالب

علمی کے دور میں غیر حاضری پر جرمانہ بھی ہوتا تھا۔ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور یہ خدمت بحمد اللہ تعالی میرے سپرد ہے۔

حضرت والد صاحب مدظلہ کے ترجمہ قرآن کریم کے تین الگ الگ حلقے ہوتے تھے۔ روزانہ صبح نماز فجر کے بعد جامع مسجد گکھڑ میں ہفتہ میں تین دن قرآن کریم اور تین دن حدیث نبویؐ کا درس ہوتا تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم میں روزانہ ترجمہ کی مذکورہ کلاس ہوتی تھی اور شام کو روزانہ گکھڑ کے نارمل اسکول میں، جہاں اسکولوں کے اساتذہ کی تربیتی کلاسیں، ایس وی، جے وی، سی ٹی وغیرہ ہوتی تھیں، ان اساتذہ کے لیے درس قرآن کریم کا الگ حلقہ ہوتا تھا۔ تینوں کا رنگ الگ الگ تھا اور ہر کلاس میں اسی کے ماحول اور ذوق کے مطابق ترجمہ ہوا کرتا تھا۔ ان تین حلقوں کے ساتھ ایک چوتھے حلقے کا اضافہ اس وقت ہوا جب ۱۹۷۶ء میں بھٹو حکومت کے صوبائی وزیر اوقاف نے، جو گوجرانوالہ سے ہی تعلق رکھتے تھے، مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور کو سرکاری تحویل میں لینے کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا جس پر شہر کے علماء نے حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی سرپرستی میں اس آرڈر کو مسترد کرتے ہوئے مزاحمتی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اس مزاحمتی تحریک میں سینکڑوں علمائے کرام اور کارکن گرفتار ہوئے جن میں راقم الحروف اور میرے دو چھوٹے بھائی مولانا عبد القدوس خان قارن اور مولانا عبد الحق خان بشیر بھی شامل تھے، ہم اس موقع پر کئی ماہ تک گوجرانوالہ کی ڈسٹرکٹ جیل میں رہے۔ اس موقع پر ضرورت محسوس ہوئی کہ شعبان اور رمضان المبارک کی تعطیلات کے دوران مدرسہ خالی نہ رہنے دیا جائے تاکہ حکومت کو اس پر قبضہ کرنے میں آسانی نہ ہو۔ اس ضرورت کے تحت تعطیلات کے دوران مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورۂ تفسیر قرآن کریم کا اعلان کر دیا گیا اور پھر دو عشروں تک حضرت والد محترم مدظلہ نے شعبان اور رمضان المبارک کی تعطیلات کے دوران ہزاروں علمائے کرام اور طلبہ کو قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر پڑھائی۔

مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور، جو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا قائم کردہ مدرسہ ہے اور جہاں حضرت لاہوریؒ نے ایک مدت تک عوامی اور علمی دونوں حلقوں میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا سلسلہ جاری رکھا، ان کے بعد ان کے جانشین اور ہمارے شیخ و مربی حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے آخر عمر تک یہ تسلسل جاری رکھا۔ جبکہ ان کے وصال کے بعد ایک درویش صفت عالم دین حضرت مولانا حمید الرحمان عباسی مدظلہ

خاموشی کے ساتھ خدمت قرآن کریم کا یہ سلسلہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جس سال مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ نے سالانہ تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر قرآن کریم کا سلسلہ شروع کیا اسی سال مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی فرمائش پر حضرت مفتی محمودؒ نے دورۂ تفسیر پڑھایا۔ دونوں جگہ سینکڑوں علماء و طلبہ شریک درس تھے اور دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے رنگ میں علماء و طلبہ کو قرانی علوم و معارف سے فیض یاب کیا۔ میری چھٹیاں تو اس سال ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں گزریں اس لیے میں دونوں میں سے کسی دورے کا رنگ اس سال نہ دیکھ سکا اور شرکاء سے پوچھ کر اندازہ کیا کہ ان کا ماحول اور رنگ کیا تھا۔

حضرت والد صاحب مدظلہ اس کے بعد ربع صدی تک مسلسل پڑھاتے رہے اور ان کا دورۂ تفسیر پورے کا پورا سی ڈی میں محفوظ ہو گیا ہے جو ناظم مدرسہ نصرۃ العلوم فاروق گنج گوجرانوالہ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ایک ہی سال پڑھایا اور اس کے بعد ان کی مصروفیات نے انہیں موقع نہیں دیا کہ وہ اس تسلسل کو باقی رکھ سکیں۔ اس لیے یہ خواہش رہی کہ وہ بھی کسی طرح محفوظ ہو کر علماء و طلبہ کے پاس پہنچ جائے تو اس سے استفادۂ عام کی کوئی صورت نکل آئے۔ جمعیت پبلکیشنز لاہور کی طرف سے شائع کردہ ان افادات کا مجموعہ "تفسیر محمود" کے نام سے تین جلدوں میں میرے سامنے ہے۔ جامعہ اشرفیہ لاہور کے استاذ حضرت مولانا محمد یوسف خان اور حضرت مولانا صدر الشہیدؒ آف بنوں کے فرزند مولانا حفیظ الرحمان نے اس سال حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ان دروس کو تحریری صورت میں ضبط کیا تھا۔ جبکہ حضرت مولانا مفتی محمد عیسی خان گورمانی، مولانا عبد الرحمان، پروفیسر امجد علی شاکر اور حافظ محمد ریاض درانی نے اسے مرتب کتاب کی شکل دی ہے۔ تین جلدوں میں قرآن کریم کا ترجمہ مکمل ہے البتہ تفسیری حواشی تمام آیات پر نہیں ہیں مگر جن مقامات پر حضرت مفتی صاحب نے قرآنی علوم و احکام کی تشریح کی ہے وہ ان کے خصوصی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ حضرت مفتی صاحب کا امتیازی ذوق عصر حاضر کے مسائل کو سامنے رکھ کر ان پر آیات و احادیث کا انطباق تھا اور آیات قرآنی سے دور حاضر کے مسائل کے بارے میں استدلال و استنباط تھا جو جابجا جھلکتا ہے اور اس ذوق کے حاملین کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے تفسیری ذوق کا اندازہ ان

افادات کے تفصیلی مطالعہ سے ہی پورے طور پر ہو سکتا ہے البتہ بطور نمونہ اس کی چند جھلکیاں قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

شمسی اور قمری سال میں قمری تقویم کی ترجیح کی وجہ بیان کرتے ہوئے مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ:

”قمری ماہ میں واضح علامت چاند کی ہے کہ ایک دیہاتی اور پہاڑی کی چوٹی پر رہنے والا، جنگل اور بیابان میں رہنے والا، صحراؤں کے دامن میں رہنے والا یہ معلوم کر لے کہ آج چاند کی کیا تاریخ ہے۔ اور اس علامت میں ماہ وسال کو عالم فضا میں رکھا گیا کہ کرہ ارض پر کوئی شخص اس قدرتی کیلنڈر سے شاکی نہ رہے اور ہر آدمی اتنا دیکھ کر تاریخ معلوم کر سکے۔ جبکہ بارہ ماہ پر مشتمل شمسی سال کی تقسیم جعلی (مصنوعی) ہے۔ دراصل شمس اپنی ایک دائرہ کی حرکت ایک سال میں مکمل کرتا ہے اور قمر ہر ماہ دائرہ پورا کرتا ہے۔ مثلاً شمس اگر آج حمل میں ہے تو دوبارہ پورے سال کے بعد برج حمل میں آئے گا۔ اس کو لوگوں نے بارہ پر تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن قمر ہر ماہ کو حرکت ذاتی سے براہ راست ثابت کرتا ہے اور ایک ماہ کی قمری حرکت بالکل واضح ہے۔ اب دیکھیے کہ حرکت شمس ایک دائرہ میں ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ہوتی ہے، اب ۳۶۵ دنوں کو تو ۳۱، ۳۰، ۲۸ میں تقسیم کر دیا ہے لیکن چھ گھنٹے ہر سال باقی رہ جاتے ہیں، چار سال بعد چوبیس گھنٹے بچ گئے لہذا انہوں نے کہا کہ چار سال بعد فروری کا مہینہ ۲۸ دن کی بجائے ۲۹ دن کا ہوگا اور اس میں بچت شامل ہوگی۔ یہ تو بالکل جعلی (مصنوعی) ہے۔ اسلام ہمیشہ اس بات کی تائید کرتا ہے جس کا تعلق عوام سے ہو کیونکہ قرآن کریم کا تعلق عوام سے ہے اسی وجہ سے قرآن کریم نے قمری مہینہ کو ترجیح دی ہے۔“

ارتداد کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ:

”بخاری کی حدیث میں ہے ”من بدل دینہ فاقتلوہ“ کہ جو اپنے دین سے مرتد ہو جائے اس کو قتل کر دو۔ آج کل کے مرتدین نے اس میں کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر اس کا دل کا عقیدہ تبدیل ہو گیا تو تم اسے اسلام پر کیسے رکھ سکتے ہو؟ ہمارے موجودہ آئین میں اور اس سے پہلے آئین میں ارتداد کا حق دیا گیا ہے چنانچہ ان کے نزدیک ایک مسلمان کفر کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک ارتداد بنیادی حق ہے لیکن ہم نے حکمت کے ساتھ اسے بدل دیا۔ ہم نے کہا کہ تمہارا مقصد یہ ہے کہ تم ہر مذہب کو آزادی دینا چاہتے ہو، تو یوں نہ کرو کہ ہر شہری کو اختیار ہے کہ جو چاہے مذہب اختیار

کرے بلکہ ہر شہری کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرے، بدلنے والی بات نہ کرو۔"

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس کے منکرین چودہ سو سال سے موجود تھے لیکن آج سائنس کے (چاند پر جانے کے) اس کارنامہ کی وجہ سے ہم جیت گئے۔ ہم نے کہا تھا کہ عیسی علیہ السلام آسمانوں پر زندہ ہیں لیکن آج تک ایک طبقہ انکار کر رہا تھا وہ بھی آج شرمندہ ہے۔ آج ہم جیت گئے، اسلام جیت گیا، ہمیں خوشی ہونی چاہیے نہ کہ الٹا ہم کہیں کہ اسلام پر ضرب لگی ہے۔ یہاں شکست اسلام کی نہیں اس یونانی حکمت کی ہے جس یونانی حکمت کو ایک طبقہ اسلام سمجھ بیٹھا تھا حالانکہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔"

الغرض حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے اس نوعیت کے تفسیری افادات آج کے ماحول اور تناظر کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اللہ تعالی اس کام کو تکمیل تک پہنچانے والے تمام احباب کو جزائے خیر سے نوازیں اور حضرت مفتی صاحب کے ان تفسیری افادات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے استفادہ کا ذریعہ بنائیں، آمین یا رب العالمین۔

قرآن کریم کے چالیس پارے

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۲۰۰۷ء)

سینٹ میں متحدہ حزب اختلاف نے وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف کے اس بیان کے خلاف تحریک التواجمع کرا دی ہے جس میں انہوں نے ایک نجی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ تیسری جماعت سے آٹھویں جماعت تک بچوں کو چالیس پارے پڑھائے جائیں گے تاکہ انہیں مدرسہ جانے کی ضرورت نہ پڑے۔ تحریک التوا میں ارکان سینٹ نے کہا ہے کہ وفاقی وزیر تعلیم کے اس بیان سے پاکستانی قوم کو شدید دکھ ہوا ہے جس کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔

وفاقی وزیر تعلیم ایک ذمہ دار ریٹائرڈ فوجی آفیسر ہیں جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم کے منصب پر فائز ہیں جس کے دستور میں یہ درج ہے کہ اسلامی تعلیمات کا فروغ اور ایک صحیح اسلامی معاشرہ کا قیام حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ہے مگر ان کی اپنی معلومات کا یہ حال ہے کہ انہیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ قرآن کریم کے پارے کتنے ہیں؟ قرآن کریم کے چالیس پاروں کے بارے میں ایک واعظانہ روایت اہل تشیع کے حوالہ سے سنتے آرہے تھے کہ قرآن کریم کے اصل میں چالیس پارے تھے جن میں سے دس پارے بکری کھا گئی اور مکمل قرآن کریم اب صرف امام غائب کے پاس ہے جو اثنا عشریہ اہل تشیع کے عقیدہ کے مطابق ایک غار میں مستور ہیں اور قیامت سے پہلے وہ قرآن کریم لے کر باہر آئیں گے، لیکن اس روایت کو اہل تشیع کی سنجیدہ علمی قیادت بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

۱۹۸۷ء کے دوران حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور مولانا حافظ حسین احمد ایم این اے سمیت ایک وفد کے ہمراہ راقم الحروف کو ایران جانے کا اتفاق ہوا تو ایران کے ایک ذمہ دار اور مقتدر مذہبی راہنما جناب آیت اللہ خزعلی نے ہمارے سامنے قرآن کریم ہاتھ میں لے کر حلف اٹھاتے ہوئے کہا تھا کہ ”ما ایمان داریم کہ این قرآن کریم حق است نہ یک حرف کم نہ زیاد“۔ اس پر مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور آیت اللہ خزعلی کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ ایک الگ دلچسپ قصہ ہے مگر اس حوالہ سے اس موقع پر ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چالیس پاروں والے قصہ کو تو شیعہ کی علمی قیادت بھی قبول نہیں کر رہی، جبکہ ہمارے وفاقی وزیر تعلیم کے ذہن میں کسی دور کی یہ سنی سنائی بات اٹکی ہوئی ہو گی جس کا انہوں نے اپنے ٹی وی انٹرویو میں اظہار کر دیا ہے اور قوم کے بچوں کو دینی مدارس سے دور رکھنے کی مہم میں آٹھویں جماعت تک بچوں کو ”چالیس پارے“ پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہم اس موقع پر اس کے سوا کیا عرض کر سکتے ہیں کہ

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا است
کار طفلاں تمام خواہد شد

البتہ اس میں ”ملا“ کی بجائے ”وزیر“ پڑھ لیا جائے، اس لیے کہ ملا غریب تو بدستور تیس پاروں والے قرآن کریم کو ہی سینے سے لگائے ہوئے ہے اور اس کی حتی الوسع خدمت کر رہا ہے۔

جناب رسول کریمؐ کی دس نصیحتیں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱ جنوری ۲۰۰۷ء)

ایک دینی محفل میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دس نصائح کا قدرے تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہوا جو آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو فرمائی تھیں۔ محفل میں شریک ایک دوست نے خواہش کا اظہار کیا کہ ان نصائح اور ان کے حوالہ سے کی گئی گزارشات کو ضبط تحریر میں بھی آنا چاہیے۔ چنانچہ اسی خیال سے انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے بھی اسے نقل کیا ہے کہ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں کی بطور خاص نصیحت فرمائی، جو یہ ہیں:

۱۔ اے معاذ! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، اگرچہ تجھے جلا دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔

شرک سب گناہوں سے بڑا گناہ اور سب نافرمانیوں سے بڑی نافرمانی ہے جو اللہ تعالیٰ کو کسی حالت میں گوارا نہیں ہے۔ جناب نبی اکرمؐ اور دوسرے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کا اولین نکتہ یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور افعال میں کسی اور کو شریک نہ مانا جائے، حتیٰ کہ اگر کسی موقع پر ایک مسلمان کو شرک اور قتل میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑے تو اس کے لیے عزیمت کا راستہ یہی ہے کہ وہ قتل ہونا قبول کر لے مگر اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہ کرے۔

۲۔ ماں باپ کی نافرمانی ہرگز نہ کرنا اگرچہ وہ تجھے گھربار چھوڑ دینے کا حکم دیں۔

قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے متعدد مقامات پر اپنی توحید اور بندگی کے ساتھ ماں باپ کی فرمانبرداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے جس کی وجہ مفسرین کرامؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ انسان کے پاس سب سے بڑی دولت اور نعمت اس کی زندگی ہے، اور زندگی دینے والا خدا ہے مگر انسان کے وجود اور زندگی کا ظاہری ذریعہ ماں باپ ہیں۔ اس لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کا شکرگزار رہنا ضروری ہے اسی طرح ماں باپ کی شکرگزاری بھی واجب ہے اور ماں باپ کا حق یہ ہے کہ جب تک وہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے کسی واضح حکم کی خلاف ورزی کی بات نہ کریں ان کے حکم کو ماننا شرعاً ضروری ہے۔

۳۔ فرض نماز عمداً ہرگز ترک نہ کرنا کیونکہ جس نے فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑ دی اللہ تعالیٰ کا ذمہ اس سے اٹھ گیا۔

ہر مسلمان مرد اور عورت پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں جن کو بلا عذر ترک کرنا کبیرہ گناہ ہے، اور اگر کوئی فرض نماز رہ گئی ہے تو جب تک اس کی قضا نہیں کرے گا اور توبہ استغفار نہیں کرے گا یہ گناہ معاف نہیں ہو گا۔ اس لیے ہر مسلمان کو نماز کی پابندی کرنی چاہیے۔ جو مسلمان نمازوں کی پابندی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کی نگرانی اور حفاظت میں آجاتا ہے اور جب کوئی شخص جان بوجھ کر فرض نماز ترک کرتا ہے تو یہ حفاظت اس سے اٹھ جاتی ہے۔

۴۔ شراب ہرگز نہ پینا اس لیے کہ یہ ہر برائی کی جڑ ہے۔

شراب کو قرآن کریم نے "گندگی" کہا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے "ام الخبائث" قرار دیا ہے۔ شراب اسلام میں حرام ہے اور شراب کی طرح ہر وہ چیز حرام ہے جو نشہ دیتی ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ نشہ دینے والی ہر چیز حرام ہے اور اس کا استعمال کبیرہ گناہ ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ایسی گندگی سے خود کو دور رکھے اور شراب سمیت نشہ والی کوئی چیز استعمال نہ کرے۔

۵۔ نافرمانی سے بچ کر رہنا اس لیے کہ نافرمانی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنتی ہے۔

یہاں نافرمانی سے مراد کسی انسان کا وہ عمومی رویہ ہے جو وہ احکام الٰہی کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ کسی فریضہ میں اچانک کوتاہی ہوگئی ہے یا کسی شرعی حکم پر عمل نہیں ہوسکا تو یہ گناہ کی بات ہے اور اس کی تلافی اور معافی کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن شرعی احکام کے بارے میں کسی کا عمومی طرز عمل ہی یہ ہوگیا ہے کہ نہ ماننے اور عمل نہ کرنے کا مزاج بن گیا تو ایسا شخص "نافرمان" کہلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ اس لیے ہم سب کو اپنے عمومی طرز عمل کا جائزہ لینا چاہیے کہ قرآن و سنت کے احکام اور ہدایات کے حوالہ سے ہمارا رویہ کیا ہے اور ایسے طرز عمل سے گریز کرنا چاہیے جس پر نافرمانی کا اطلاق ہو سکے۔

۶۔ میدان جنگ سے فرار اختیار نہ کرنا اگرچہ لوگ ہلاک ہو رہے ہوں۔

جہاد اور اس میں ثابت قدمی دینی تقاضوں اور فرائض میں سے ہے اور میدان جہاد میں دشمن سے لڑتے ہوئے موت کے خوف سے بھاگنا کبیرہ گناہ ہے جس کی قرآن کریم نے

مذمت کی ہے۔ اس لیے کہ موت اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے جو اپنے وقت پر ہر حالت میں آکر رہے گی اور جہاد سے بھاگنا دراصل اللہ تعالی کے حکم سے بھاگنا ہے جو شدید ترین نافرمانی ہے۔ البتہ جنگی حکمت کے تحت جگہ بدلنا اور عسکری ضرورت کے تحت پیچھے ہٹنا اس میں شامل نہیں ہے۔

۷۔ جب کسی جگہ موت کی وبا ہو اور تم وہاں ہو تو ثابت قدم رہو۔

شرعی مسئلہ یہ ہے اور جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت ہے کہ اگر کسی جگہ ایسی وبا پھیل جائے کہ عام موتیں ہو رہی ہوں مثلاً ہیضہ اور طاعون وغیرہ تو وہاں رہنے والوں میں سے کوئی باہر نہ جائے، اور نہ ہی باہر سے کوئی وہاں جائے۔ اس پس منظر میں نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر ایسی صورتحال پیش آجائے تو اللہ تعالی کے حکم اور تقدیر پر صابر و شاکر رہتے ہوئے وہاں سے فرار اختیار نہ کیا جائے۔

۸۔ اہل و عیال پر اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرتے رہو۔

گھر کے سربراہ پر اہل و عیال کی کفالت کی ذمہ داری ہے اور بیوی بچوں اور زیر کفالت افراد کے اخراجات اس کا ذمہ ہیں۔ لیکن اس کے لیے ہدایت یہ ہے کہ اس کی مالی حیثیت کے مطابق ہوں، اگر وہ اپنی حیثیت اور وسعت سے کم خرچ کرتا ہے اور ضروریات فراہم نہیں کرتا تو وہ بیوی بچوں کی حق تلفی کر رہا ہے۔ اور اگر بیوی بچے اس کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ کا اس سے مطالبہ کرتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ اسلام نے اس بارے میں حقیقت پسندی اور میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس سلسلہ میں کوتاہی ہوتی ہے جس سے خاندان اور معاشرت کے نظام میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر ہم سب اپنے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے مطابق میانہ روی اور توازن اختیار کریں تو بے شمار مسائل سے خود بخود جان چھوٹ جائے۔

۹۔ گھر والوں سے اپنے ادب کا ڈنڈا نہ اٹھاؤ۔

یہ محاورہ کی زبان میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ گھر کے سربراہ کی حیثیت سے اس کا رعب گھر کے ماحول میں قائم رہنا چاہیے تاکہ گھر کا نظام صحیح طریقہ سے چلتا رہے اور کوئی خرابی نظر آئے تو وہ اس کی اصلاح کر سکے۔ ضروری نہیں کہ ڈنڈا ہاتھ میں لے کر گھر والوں پر برساتا ہی رہے، اصل مقصد گھر کے نظام کا کنٹرول اور اس کے ذریعے خرابیوں کی اصلاح اور نظام کو صحیح طور پر چلانا ہے، جو حکمت و دانش اور محبت و اعتماد کی فضا میں زیادہ مؤثر طریقہ

سے قائم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی بیوی، بچے حتی کہ خادم پر بھی کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا اور محبت و اعتماد کے ساتھ گھر کے نظام کو کنٹرول میں رکھا ہے۔ البتہ کبھی اشد مجبوری ہو اور اصلاح کے دیگر ذرائع ناکام ہو جائیں تو بقدر ضرورت ڈنڈے کے استعمال کی بھی گنجائش موجود ہے۔

۱۰۔ اور ان کو اللہ تعالی کے معاملات میں ڈراتے رہو۔

یعنی بیوی بچوں اور زیر کفالت افراد کے بارے میں گھر کے سربراہ کی صرف یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ان کو کھلائے پلائے اور ان کی ضروریات زندگی کی کفالت کرے۔ بلکہ یہ بھی اس کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ ان کی دینی تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات کی اصلاح اور ایمان و عقیدہ کی درستگی و پختگی کا خیال رکھے۔ کیونکہ اگر گھر کے سربراہ کی غفلت اور بے پرواہی کی وجہ سے گھر کے افراد دین سے دور رہیں گے، ان کے عقائد خراب ہوں گے، اعمال و عبادات میں کوتاہی ہوگی اور اخلاق و عادت میں بگاڑ ہو گا تو ان کے گناہ اور ذمہ داری میں وہ بھی شریک شمار ہو گا۔ اس لیے اس طرف بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

حدود آرڈیننس میں ترامیم ۔ چند حقائق

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۴ دسمبر ۲۰۰۶ء)

۶ دسمبر ۲۰۰۶ء کو بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد میں جمعیت طلباء اسلام کے مقامی یونٹ کے زیر اہتمام ایک نشست میں حدود آرڈیننس اور تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں تفصیلی گفتگو کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ اور بھی مختلف مقامات پر اس سلسلہ میں اظہار خیال کا اتفاق ہوا اور متعدّد جگہوں سے اس موضوع پر خطاب کی دعوت موصول ہوئی ہے مگر میرے لیے مشکل یہ ہے کہ اسباق کے دوران شہر سے باہر کسی پروگرام کے لیے جانے کا سلسلہ ترک کر رکھا ہے کہ اس سے اسباق متاثر ہوتے ہیں۔ صرف جمعرات کو کسی اہم جگہ پر دوستوں کے اصرار پر چلا جاتا ہوں مگر اس میں بھی شرط یہ ہوتی ہے کہ نصف شب کے لگ بھگ گھر واپس پہنچ سکوں اس لیے کہ بلڈ پریشر کی تکلیف بڑھنے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحبان نے کسی بھی ایسے سفر سے منع کر دیا ہے جس میں رات کو آرام نہ کر سکوں۔ بہر حال ان نشستوں میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حدود کیا ہیں؟ ان کے لیے آرڈیننس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ آرڈیننس کی مخالفت کیوں ہو رہی ہے؟ اہم اعتراضات کیا ہیں؟ تحفظ نسواں بل کے ذریعے اس میں کیا تبدیلیاں کی گئی ہیں؟ اس حوالہ سے موجودہ قانونی صورتحال کیا ہے؟ اس سلسلہ میں دینی حلقوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟

حدود کا لفظ قرآن کریم نے مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے لیکن شریعت اور فقہ اسلامی میں یہ لفظ اصطلاح کے طور پر ان سزاؤں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے جو چند جرائم میں قرآن و سنت کی طرف سے متعیّن طور پر طے کر دی گئی ہیں۔ معاشرتی جرائم کا دائرہ بہت وسیع ہے اور انہیں سینکڑوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ تعزیرات پاکستان کی دفعات پانچ سو سے متجاوز ہیں مگر ان سینکڑوں جرائم میں سے قرآن و سنت نے صرف چند کی سزا خود متعیّن کی ہے، باقی تمام جرائم کی سزاؤں کا تعین ایک اسلامی حکومت یا اس کے مجاز اداروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ حالات کے مطابق ان جرائم کی سزاؤں کی مقدار اور نوعیت خود طے کر لیں۔ البتہ چند جرائم مثلاً (۱) زنا (۲) چوری (۳) قذف (۴) ڈکیتی (۵) شراب نوشی (۶) ارتداد وغیرہ کی سزائیں قرآن و سنت میں متعیّن کر دی گئی ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، زنا کی سزا ایک صورت میں سنگسار کرنا اور دوسری صورت میں سو کوڑے مارنا ہے، قذف یعنی کسی پاک دامن شخص پر بدکاری کی تہمت لگانے کی سزا اس کا ثبوت پیش نہ کر سکنے کی صورت میں ۸۰ کوڑے ہے، ڈکیتی کی سزا ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قتل کرنا یا سولی پر لٹکانا یا جلاوطن کر دینا ہے اور شراب نوشی کی سزا ۸۰ کوڑے ہے۔

ان سزاؤں کے حوالہ سے دو باتیں اصولی طور پر عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ یہ بطور آپشن نہیں ہیں بلکہ بطور آرڈر کے ہیں، یعنی ان کو اختیار کرنے اور نافذ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہمیں اس امر کا اختیار نہیں دیا گیا کہ ہم چاہیں تو انہیں اختیار کر لیں اور ہمارا موڈ نہ ہو تو انہیں نظر انداز کر دیں۔ ایسی بات نہیں ہے بلکہ جس طرح قرآن و سنت میں نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ جیسے فرائض کا حکم دیا گیا ہے اسی انداز میں اور انہی صیغوں کے ساتھ قصاص اور حدود کے قوانین کے نفاذ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھ لیں کہ قرآن کریم میں جس مقام پر روزہ کی فرضیت بیان کی گئی ہے کہ اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، اس کے ساتھ ہی انہی الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو! تم پر قصاص کا قانون فرض کیا گیا ہے۔ اسی طرح جیسے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا حکم امر کے صیغے کے ساتھ دیا گیا ہے وہی امر کا صیغہ رجم اور کوڑے مارنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے ان احکام میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نماز فرض ہے تو قصاص کے قانون کا نفاذ بھی فرض ہے اور اگر زکوٰۃ فرض ہے تو زانی کو کوڑے مارنا بھی فرض ہے اور اسی حوالہ سے میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن و سنت میں ان احکام و قوانین کا ذکر بطور آپشن کے نہیں بلکہ

بطور آرڈر کے ہے اور ہم قرآن و سنت پر ایمان رکھتے ہوئے جس طرح نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کے فرائض کے پابند ہیں اسی طرح حدود و قصاص کے ان قوانین کو نافذ کرنے کے بھی پابند ہیں۔

دوسری بات جو اس سلسلہ میں بطور اصول سامنے رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ ہم ان سزاؤں میں اپنی طرف سے ردوبدل کے مجاز نہیں ہیں۔ مثلاً ہم یہ نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم نے قذف کی سزا ۸۰ کوڑے بیان کی ہے تو ہم اس کی نوعیت یا مقدار بدل دیں کہ کوڑوں کی بجائے قید کی سزا مقرر کر لیں یا ۸۰ کوڑوں کی بجائے اس سے کم یا زیادہ مقدار طے کر لیں۔ ہم ان سزاؤں کے نفاذ کے پابند ہیں اور ان کی نوعیت اور مقدار کو برقرار رکھنے کے بھی پابند ہیں۔ ان دونوں معاملات میں قیامت تک کسی کا کوئی اختیار باقی نہیں رہا اور کوئی بھی شخص، طبقہ یا ادارہ ایسا کرتا ہے تو وہ حدود اللہ سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے جسے قرآن کریم نے ظلم اور نافرمانی سے تعبیر کیا ہے۔

حدود شرعیہ کے اس مختصر تعارف کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں اگر اسلام کا نظام نافذ ہوگا تو ظاہر بات ہے کہ ان حدود کا نفاذ بھی ضروری قرار پائے گا۔ یہ بات درست ہے کہ صرف ان حدود کا نام اسلام نہیں ہے اور اسلام کا نفاذ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ حدود اسلام کا ایک اہم شعبہ ہیں اور انہیں نظر انداز کر کے کسی ملک میں نفاذ اسلام کی منزل حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے دینی حلقوں کا مسلسل یہ مطالبہ چلا آرہا تھا کہ قومی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح جرم و سزا کے شعبہ میں بھی اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ پاکستان کا قیام اسلامی نظریہ حیات کی عملداری اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے عمل میں آیا تھا اور بانیٔ پاکستان محمد علی جناح مرحوم سمیت تحریک پاکستان کے تمام ذمہ دار راہنماؤں نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں قرآن و سنت کی عملداری ہوگی اور اسے ایک آئیڈیل اسلامی ریاست بنایا جائے گا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد مسلسل مطالبات اور تحریکات کے باوجود ایسا نہ ہو سکا حتیٰ کہ ۱۹۷۷ء کی زبردست عوامی تحریک نظام مصطفیؐ کے بعد جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم برسراقتدار آئے تو انہوں نے اس عوامی مطالبہ پر حدود آرڈیننس سمیت متعدّد دیگر اسلامی قوانین کے نفاذ کی طرف پیشرفت کی۔

یہاں ایک مغالطہ کا ازالہ ضروری ہے کہ عام طور پر بڑے بھولپن کے ساتھ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ حدود آرڈیننس یا اس نوعیت کے بعض دیگر شرعی قوانین ایک فوجی آمر کے نافذ کردہ قوانین ہیں اور یہ ڈکٹیٹر کے قوانین ہیں جنہیں ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر اس دلیل پر بات کی جائے تو "تحفظ حقوق نسواں بل" بھی ایک فوجی آمر کا نافذ کردہ قانون ہے اس کے باقی رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ لیکن میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ حدود آرڈیننس بلاشبہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے نافذ کیے تھے لیکن ان کے پیچھے ۱۹۷۷ء کی عظیم الشان عوامی تحریک تھی جس میں پورا ملک اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ لے کر سڑکوں پر آ گیا تھا، ہزاروں افراد جیلوں میں گئے تھے اور سینکڑوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ پھر یہ حدود آرڈیننس جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے اپنے ذہن کی اختراع نہیں تھے اس کے لیے اس وقت کی اسلامی نظریاتی کونسل نے مہینوں کام کیا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ جیسے اکابر اہل علم سے استفادہ کیا گیا تھا۔ دوسرے مسلم ممالک کے علماء سے بھی رابطے کیے گئے تھے حتیٰ کہ شام کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی کو پاکستان تشریف آوری کی زحمت دی گئی تھی جن کا شمار عالم اسلام کے ممتاز اصحاب علم میں ہوتا ہے اور اس مسلسل عوامی اور علمی جدوجہد کے بعد حدود آرڈیننس کا وہ مسودہ تشکیل پایا جسے ایک فوجی آمر کا قانون کہہ کر مسترد کیا جا رہا ہے۔

اس پس منظر میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈیننس ملک میں نافذ کیا جسے بعد میں آٹھویں آئینی ترمیمی بل کی صورت میں منظور کر کے منتخب قومی اسمبلی نے عوامی اعتماد کی سند بھی دے دی اور اس طرح ملک میں حدود شرعیہ کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ لیکن نفاذ کے بعد سے ہی اس پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو گیا، ملک کے اندر اور باہر اس کے خلاف اعتراضات اور اس کو ختم کرنے کے مطالبات نے زور پکڑ لیا اور ستائیس برس کے بعد اب یہ مہم اس مقام پر پہنچی ہے کہ مسلسل بین الاقوامی اور داخلی دباؤ کے نتیجے میں تحفظ حقوق نسواں بل کے ذریعے حدود آرڈیننس میں ترامیم کی راہ ہموار کی گئی ہے۔

حدود آرڈیننس پر اعتراضات کیا تھے اور کن حوالوں سے ان کو ختم کرنے یا ان میں ردوبدل کا مطالبہ کیا جا رہا تھا، اس کے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم اس تنازعہ کی اصل نوعیت کو نہیں سمجھ سکیں گے اور اس کشمکش کی ماہیت کا ادراک نہیں کر سکیں گے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی حلقوں کو ہمارے اس قانون پر کیا اعتراض

ہے اور کیوں ہے؟ سادہ سی بات ہے کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے، یہاں کے مسلمان اگر اپنی مرضی سے اپنے معاشرہ کے لیے کوئی قانون اختیار کرتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق کسی قانون کا نفاذ کرتے ہیں تو اس پر امریکہ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور کسی بھی بیرونی ملک یا ادارہ کو پاکستانی عوام کے اس حق میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ اس میں مداخلت کر رہا ہے، اقوام متحدہ کو اس قانون کے خاتمہ میں دلچسپی ہے، یورپی یونین اس قانون کو ختم کرنے پر زور دے رہی ہے، اور ایمنسٹی انٹرنیشنل حدود آرڈیننس کے خلاف متحرک ہے تو ہمیں اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس اختلاف کے اصل سرچشمہ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم اس مداخلت کا راستہ نہیں روک سکیں گے اور اس نوعیت کے اگلے اقدامات کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکیں گے۔ یہاں یہ بات ہمارے علم میں ہونی چاہیے کہ معاملہ صرف حدود آرڈیننس میں چند ترامیم تک محدود نہیں ہے بلکہ اصل ایجنڈا بڑا طویل ہے اور اس کے اہم مراحل آگے آ رہے ہیں۔ بین الاقوامی حلقوں کا مطالبہ حدود قوانین کے حوالہ سے ان ترامیم کا نہیں ہے بلکہ حدود آرڈیننس کو مکمل طور پر ختم کرنے کا ہے اور صرف ان قوانین کو ختم کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے قوانین ان مطالبات کی زد میں ہیں۔

یہ بات بہت سے دوستوں کے ذہن میں تازہ ہوگی کہ امریکی وزارت خارجہ نے پاکستان کے بارے میں اپنی اس سال کی رپورٹ میں صاف طور پر کہا ہے کہ امریکہ پاکستان میں تحفظ ختم نبوت سے متعلقہ قوانین، تحفظ ناموس رسالتؐ کے قانون اور حدود آرڈیننس کے قوانین کو ختم کروانے کے لیے حکومت پاکستان پر دباؤ ڈال رہا ہے اور اسلام آباد کا امریکہ سفارت خانہ اس سلسلہ میں پاکستان کے ارکان پارلیمنٹ سے مسلسل رابطہ میں ہے۔ یہ خبر روزنامہ پاکستان لاہور نے ۷ استمبر ۲۰۰۶ء کو این این آئی کے حوالہ سے شائع کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدود آرڈیننس میں ابھی مزید ترامیم ہوں گی، گستاخ رسولؐ کے لیے موت کی سزا کا قانون ختم کرنے کی بات ہوگی اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے فیصلے پر بھی نظر ثانی ہوگی۔ اس لیے یہ بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگر تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کو آسانی سے ہضم کر لیا گیا اور اس کے خلاف بھرپور قومی احتجاج منظم نہ کیا جا سکا تو ان دوسرے مراحل کو نہیں روکا جا سکے گا اور دینی حلقے اس مہم میں پسپائی کے سوا اور کوئی راستہ

اختیار نہیں کر پائیں گے۔ خدا کرے کہ ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہو لیکن اسباب کی دنیا میں اس سے مختلف نتیجہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

میرے نزدیک اسلامی شرعی قوانین پر مغربی دنیا اور بین الاقوامی حلقوں کے اعتراضات کی اصل وجہ یہ ہے کہ مغرب نے اپنے سیکولر فلسفہ حیات، نظام زندگی اور تمدن و ثقافت کو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی شکل دے کر اور اس پر دنیا کے کم و بیش تمام ممالک سے دستخط لے کر عالمی قوانین کی حیثیت دے رکھی ہے اور اب وہ انسانی حقوق کے نام پر اپنے فلسفہ و تہذیب کو اقوام متحدہ کی چھتری تلے قوت اور دباؤ کے ساتھ دنیا بھر سے منوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور چونکہ اس مغربی فلسفہ و ثقافت کی راہ میں صرف اور صرف اسلامی فلسفہ حیات اور شرعی قوانین مضبوط رکاوٹ ہیں اس لیے نہ صرف یہ کہ ان کی مخالفت کی جا رہی ہے بلکہ مغرب اور ان کے ہمنواؤں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں کسی اسلامی قانون کو عملاً نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا اور نہ ہی کسی خطے میں کوئی نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہونے دی جائے گی۔ آج کی اصل تہذیبی جنگ یہی ہے اور حدود آرڈیننس کے خلاف سیکولر حلقوں کی مہم اسی عالمی جنگ کا ایک چھوٹا سا پارٹ ہے۔

حدود قوانین کے حوالہ سے یہ دیکھ لیجئے کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی دفعہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو ایسی سزا نہیں دی جائے گی جس میں جسمانی تشدد اور ذہنی اذیت ہو اور توہین و تذلیل کا پہلو ہو۔ گویا کسی بھی جرم کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان تینوں باتوں سے خالی ہو اور اگر کسی سزا میں ان میں سے کوئی بات پائی گئی تو وہ انسانی حقوق کے منافی تصور ہوگی۔ اسی بنیاد پر اسلامی سزاؤں کو غیر انسانی اور انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جاتا ہے کہ سنگسار کرنا، کوڑے مارنا، ہاتھ پاؤں کاٹنا، اور بر سر عام سزا دینا بہر حال جسمانی تشدد اور تذلیل پر مشتمل ہے، اور اگر اقوام متحدہ کے چارٹر میں طے کردہ اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو حدود شرعیہ کی کم و بیش سبھی سزائیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار پاتی ہیں۔

اقوام متحدہ کے چارٹر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بین الاقوامی معاہدہ ہے اور چونکہ ہم اس معاہدہ میں شریک ہیں، ہم نے اس پر دستخط کر رکھے ہیں اور ہم اقوام متحدہ کے نظام کا بھی حصہ ہیں، اس لیے ہمیں اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں سپریم کورٹ میں ایک کیس کے حوالہ سے اس پر بحث ہو چکی ہے اور عدالت عظمی نے اسی اصول

پر اس کیس کا فیصلہ کیا تھا کہ انسانی حقوق کا یہ منشور بین الاقوامی معاہدہ ہے اور اس معاہدہ کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی اس موقع پر کہا گیا تھا کہ انسانی حقوق کا یہ چارٹر آج کا عالمی عرف ہے اور قرآن کریم ہمیں معروفات کی پابندی کا حکم دیتا ہے اس لیے بھی اس عالمی عرف کی پابندی ہمارے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ آج اگر امریکہ ہم سے ان قوانین پر نظر ثانی یا ان کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، اقوام متحدہ کے مختلف ادارے ہم سے یہ تقاضا کرتے ہیں، یورپی یونین کی طرف سے یہ بات کہی جاتی ہے، یا ایمنسٹی انٹرنیشنل واویلا کرتی ہے تو وہ بلاوجہ نہیں ہے۔ اس اعتراض، دباؤ یا مطالبہ کی جڑیں اقوام متحدہ کے اس چارٹر کی دفعہ نمبر ۵ میں پیوست ہیں اور اس کے لیے عالمی سطح پر کوئی مضبوط موقف اختیار کیے بغیر ہم اس مخمصے سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ بدقسمتی سے ہمارے مسلم حکمرانوں یا اداروں میں سے کوئی بھی بین الاقوامی سطح پر یہ مسئلہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہے اور ہم صحیح جگہ پر یہ جنگ لڑنے کی بجائے شاخوں پر الجھ رہے ہیں اور جزئیات پر اپنا وقت اور صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔ میری یادداشت کے مطابق ماضی قریب میں یہ مسئلہ مسلمان حکمرانوں میں سے صرف ملائیشیا کے سابق وزیر اعظم مہاتیر محمد نے اٹھایا تھا اور اقوام متحدہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر انہوں نے عالم اسلام کے حکمرانوں پر زور دیا تھا کہ وہ متحد ہو کر دو مسئلوں کے لیے اقوام متحدہ پر دباؤ ڈالیں۔

1. ایک یہ کہ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور کے سسٹم میں عالم اسلام کو بھی شریک کیا جائے۔

2. اور دوسرا یہ کہ انسانی حقوق کے چارٹر پر نظر ثانی کی جائے۔

یہ دونوں باتیں درست اور ضروری ہیں۔ ایک بات سے اقوام متحدہ میں اختیارات کا عدم توازن ختم ہوگا اور عالم اسلام کو اس کا صحیح مقام ملے گا، جبکہ دوسری بات نظریاتی اور تہذیبی توازن کا باعث بنے گی۔ مگر میری معلومات کے مطابق کسی حکمران نے مہاتیر محمد کی اس بات کو قابل توجہ نہیں سمجھا۔ آج بھی اس مسئلہ کا حل یہی ہے۔ عالم اسلام کو نہ تو اقوام متحدہ کے اختیارات اور انتظامی سسٹم میں نمائندگی حاصل ہے اور نہ ہی نظریاتی اور ثقافتی حوالہ سے اسلام اور عالم اسلام کی کسی بات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جبکہ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے کہ اقوام متحدہ کی سطح پر اسے پوری قوت کے ساتھ اٹھایا جائے اور مسلم ممالک متحد ہو کر یہ دونوں حق حاصل کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کریں۔

پاکستان کی داخلی صورتحال کے حوالہ سے معروضی تناظر یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں جہاں اس امر کی ضمانت دی گئی ہے کہ قرآن و سنت کے قوانین کو نافذ کیا جائے گا اور قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکے گا، وہاں یہ گارنٹی بھی دستور میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ انسانی حقوق کی مکمل پاسداری کی جائے گی اور انسانی حقوق کے منافی کوئی قانون ملک میں نافذ نہیں ہو سکے گا۔ میرے نزدیک یہ دو گارنٹیاں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں۔ جب قرآن و سنت والوں کا زور ہوتا ہے وہ اپنا کام نکال لیتے ہیں اور کسی وقت ''انسانی حقوق'' والے پاور میں آجاتے ہیں تو وہ رخ ادھر کو پھیر لیتے ہیں۔ حدود آرڈیننس اور تحفظ حقوق نسواں بل کے حوالہ سے یہی ہوا ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم پاور میں تھے تو انہوں نے قرآن و سنت والی گارنٹی کو استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور جنرل پرویز مشرف پاور میں ہیں تو وہ انسانی حقوق والی گارنٹی کا ایجنڈا آگے بڑھا رہے ہیں۔

قرآن و سنت کے قوانین و نظام اور انسانی حقوق کے چارٹر میں صرف حدود آرڈیننس کی حد تک تنازعہ نہیں ہے بلکہ اس تنازعہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں خاندانی نظام بھی آتا ہے، عقیدہ اور رائے کی آزادی کے مسائل بھی ہیں، عورت کے معاشرتی مقام کی بات بھی ہے اور دیگر امور بھی ہیں۔ اور اگر تفصیل سے دیکھا جائے تو بیسیوں سیاسی، سماجی، معاشرتی، قانونی اور عمرانی مسائل ہیں جن میں قرآن و سنت کی تعلیمات اور انسانی حقوق کے چارٹر کا آپس میں ٹکراؤ ہے اور اس ٹکراؤ کی ماہیت کو پوری طرح سمجھے اور اس کی نوعیت کا صحیح طور پر ادراک کیے بغیر ہم یہ جنگ صحیح طور پر نہیں لڑ سکتے۔

یہ تو ہے حدود شرعیہ کی بین الاقوامی مخالفت کا پس منظر جس سے آپ حضرات کو آگاہ کرنا میں بہرحال ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد داخلی صورتحال کی طرف آجائیے۔ پاکستان میں حدود قوانین کی مخالفت کا سلسلہ ان کے نفاذ کے بعد سے جاری ہے اور ملک کے سیکولر حلقوں کے ساتھ سینکڑوں این جی اوز اور انسانی حقوق کے حوالہ سے کام کرنے والی بیسیوں تنظیمیں اس مقصد کے لیے ربع صدی سے متحرک ہیں۔ ان کی اس مہم کا اصل مقصد تو وہی ہے جو بین الاقوامی حلقوں کا ہے اور ملک کے اندرونی سیکولر حلقوں کی جدوجہد کے اہداف مذکورہ بالا بین الاقوامی اہداف سے مختلف نہیں ہیں لیکن ان کے اعتراضات میں کچھ داخلی امور بھی ہیں جن میں سے ایک دو کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے وقت یہ کہا جارہا تھا کہ اس سے جرائم کنٹرول ہوں گے اور معاشرہ میں امن قائم ہوگا لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا بلکہ حدود کے نفاذ کے بعد جرائم میں اضافہ ہوا ہے اور قانون شکنی کا دائرہ مزید وسیع ہوا ہے۔ اس معروضی حقیقت سے انکار ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی کسی باشعور شخص کو معروضی حقائق سے انکار کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، اس لیے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ہمارے معاشرے میں جرائم کنٹرول نہیں ہوئے بلکہ ان میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس کے اسباب کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے اس لیے کہ آج کے دور میں ہمارے سامنے یہی قوانین سعودی عرب جرائم میں کنٹرول کا ذریعہ بنے ہیں اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے۔ جو حضرات اب سے پون صدی قبل کے سعودی معاشرہ کی صورتحال سے آگاہ ہیں وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ سعودی عرب کے قیام سے قبل حجاز مقدس میں چوری، قتل، ڈاکہ اور دیگر جرائم اس قدر عام تھے کہ حج بیت اللہ کے لیے جانے والے لوگ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے بلکہ اس کا نشانہ زیادہ تر وہی بنتے تھے۔ لیکن شاہ عبدالعزیز بن سعود مرحوم نے سعودی عرب کے قیام کے بعد اس کا اقتدار سنبھالتے ہی شرعی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا اور اس پر مؤثر عملدرآمد کا اہتمام کیا تو وہاں جرائم پر نہ صرف یہ کہ کنٹرول حاصل ہوا بلکہ جرائم کی شرح کے حوالہ سے سعودی عرب کو آج بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی آج کے دور کی ایک مشاہداتی حقیقت ہے کہ ہمارے پڑوسی افغانستان میں جب طالبان نے زمام اقتدار سنبھالی اور شرعی قوانین کے نفاذ کا اہتمام کیا تو ان کے پانچ سالہ دور میں ان کے دائرہ اختیار میں جرائم کنٹرول ہوئے جسے بین الاقوامی حلقوں میں تسلیم کیا گیا حتیٰ کہ وار لارڈز کے خاتمے اور پوست کی کاشت پر پابندی کے حوالہ سے طالبان حکومت کی کامیابی کا عالمی اداروں کی باقاعدہ رپورٹوں میں کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے۔

ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ قوانین اگر سعودی عرب میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور افغانستان میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو پاکستان میں ان کے غیر مؤثر ہونے کی وجہ کہیں اور تلاش کرنی پڑے گی۔ اس لیے کہ بیج اگر ایک زمین میں پھل دیتا ہے، دوسری زمین میں بھی پھل دیتا ہے لیکن تیسری زمین میں پھل نہیں دیتا تو قصور بیج کا نہیں گنا جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یا تو زمین درست نہیں ہے یا اس میں بیج ڈال کر پانی، کھاد اور گوڈی کا

اہتمام کرنے والوں کے عمل میں کوتاہی ہے۔ ہمارے خیال میں فرق کا اصل نکتہ یہ ہے کہ سعودی عرب نے حدود شرعیہ نافذ کر کے ان پر عملدرآمد کے لیے قضا کا شرعی نظام فراہم کیا اس لیے یہ قوانین کامیاب ہوئے۔ طالبان نے بھی افغانستان میں صرف حدود شرعیہ کے نفاذ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان قوانین پر مؤثر عملدرآمد کے لیے قضائے شرعی کا عدالتی نظام بھی قائم کیا جس کی وجہ سے وہ ان قوانین کے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر ہم نے یہ کیا کہ قوانین تو شریعت اسلامیہ کے نافذ کیے مگر عدالتی سسٹم وہی پرانا برطانوی نوآبادیاتی دور کا باقی رکھا اور حدود قوانین کو اس سسٹم کے حوالے کر دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ میں اس کی مثال یوں دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ہنڈا کار کے انجن میں سوزوکی کا گیئر بکس فٹ کر دیا جائے یا چاول چھڑنے والی مشین سے گندم پیسنے کا کام لیا جائے۔ ہمارے ہاں اگر حدود قوانین مؤثر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ قوانین نہیں بلکہ عدالتی سسٹم ہے جسے تبدیل کیے بغیر کسی بھی اسلامی قانون کے مؤثر نفاذ کا مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

حدود قوانین پر دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان قوانین کا غلط استعمال ہوتا ہے اور بہت سی بے گناہ عورتوں کو پھنسا دیا جاتا ہے، لوگ انتقام اور دشمنی میں عورتوں کے نام لکھوا دیتے ہیں اور وہ جیلوں میں بلاوجہ پڑی رہتی ہیں۔ اس حوالہ سے بہت پروپیگنڈا کیا گیا اور کچھ عرصہ قبل ایک آرڈیننس بھی جاری کیا گیا کہ جو عورتیں جیلوں میں ہیں انہیں رہا کر دیا جائے مگر اس آرڈیننس کے نتیجے میں ملک بھر میں جو عورتیں جیلوں سے رہا کی گئیں ان میں تیس فیصد بھی ایسی نہیں تھیں جو حدود قوانین کے تحت جیل میں ہوں لیکن اس کی آڑ میں سب کو رہا کر دیا گیا اور اب صورتحال یہ ہے کہ عورتوں کو کسی بھی جرم میں گرفتار نہ کرنے کی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ بات بجائے خود قابل غور ہے کہ مرد اگر جرم کرتا ہے تو گرفتار ہوگا اور جیل بھی جائے گا مگر عورت جرم کرتی ہے تو اسے جیل میں نہیں بھیجا جائے گا۔ کیا یہ امتیازی قانون نہیں ہے اور کیا عورتوں کو جیل سے مستثنیٰ کر کے جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں برتا جا رہا؟ بہرحال حدود قوانین کے خلاف مسلسل یہ پروپیگنڈا جاری ہے کہ ان کا غلط استعمال ہوتا ہے اور اس بات کو ان قوانین کو ختم کرنے یا ان میں ردوبدل کا جواز بنایا جا رہا ہے۔

صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنی نشری تقریر میں زور دے کر کہا ہے کہ عورتوں پر ستائیس سال سے یہ ظلم ہو رہا تھا کہ ایک عورت زنا بالجبر کا کیس درج کراتی ہے مگر جس پر اس کا الزام ہے وہ اس کے خلاف چار گواہ پیش نہیں کر سکتی تو اسے خود گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے حوالہ سے تو زنا کا اعتراف کر ہی لیا ہے۔ صدر صاحب نے کہا ہے کہ یہ بہت بڑا ظلم ہے جو حدود آرڈیننس کے تحت پاکستان میں عورتوں پر روا رکھا جا رہا ہے اس لیے انہوں نے حدود میں ترامیم کو ضروری سمجھا ہے۔ دوسری طرف مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے علی الاعلان اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ وفاقی شرعی عدالت کے جج اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ کے رکن کے طور پر سترہ سال تک یہ مقدمات سنتے رہے ہیں، اس دوران ایک کیس بھی اس نوعیت کا ان کے سامنے نہیں آیا جس کی صدر صاحب بات کر رہے ہیں۔ پھر بالفرض اگر پروسیجر کی کسی کمزوری کی وجہ سے اس کا امکان موجود بھی ہے تو اس کا حل قانون کو ختم کرنا نہیں بلکہ پروسیجر کو تبدیل کر کے اس کا سدباب کرنا ہے لیکن یہاں سرے سے زنا بالجبر پر شرعی حد کی سزا ہی ختم کر دی گئی ہے۔

ہم اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ حدود قوانین کا غلط استعمال ہوتا رہا ہے تو سوال یہ ہے کہ کونسا قانون ملک کا ایسا ہے جس کا غلط استعمال نہیں ہوتا؟ قتل اور اقدام قتل کی دفعات ۳۰۲ اور ۳۰۷ کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا پچاس فیصد بھی صحیح استعمال ہو رہا ہے اور ان دفعات کے تحت ملک بھر میں جو لوگ جیلوں میں ہیں ان کے بارے میں کون گارنٹی دے سکتا ہے کہ ان میں سے پچاس فیصد بھی اصل ملزم ہیں؟ تو کیا ان دفعات کے غلط استعمال کی وجہ سے ۳۰۲ اور ۳۰۷ کی دفعات کو ختم کر دیا جائے گا؟ اور اگر کوئی شخص اس کا مطالبہ کر دے تو کیا کوئی بھی باشعور شہری اس کی حمایت کے لیے تیار ہو گا؟ کسی قانون کے غلط استعمال کا تعلق قانون کے صحیح یا غلط ہونے سے نہیں بلکہ ہمارے معاشرتی رویہ سے ہے، ہمارے بدعنوان معاشرتی مزاج سے ہے، ہمارے ہاں ہر قانون کا کسی نہ کسی طرح غلط استعمال ضرور ہوتا ہے۔ قانون تو پھر قانون ہے، ہمارے ہاں دستور غریب کا یہ حال ہے کہ جب کسی جنرل کا جی چاہتا ہے اس کے ناک کان مروڑ کر اس کا رخ بدل دیتا ہے اور اسے اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے تو بے چارے قانون کا کیا قصور ہے اور اس کا کون پرسان حال ہے؟ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کا طریقہ قانون کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ معاشرتی رویے کو تبدیل کرنے کی جدوجہد ہے، اس کے بغیر کوئی قانون بھی اس

طرح کے غلط استعمال سے نہیں بچ سکتا جس کا الزام مسلسل حدود آرڈیننس کے حوالہ سے دہرایا جارہا ہے اور اسی الزام پر حدود آرڈیننس کا جھٹکا کر دیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ پس منظر جس کے نتیجے میں تحفظ حقوق نسواں بل سامنے آیا جواب منظوری کے مراحل سے گزر کر ایکٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ بل جب قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تو اس پر خاصا ہنگامہ کھڑا ہوا اور قومی اسمبلی میں موجود علماء کرام نے اسے قرآن و سنت کے منافی قرار دیتے ہوئے شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ اس احتجاج کی شدت کو کم کرنے کے لیے حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمان میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ کچھ ایسے سرکردہ علماء کرام سے اس سلسلہ میں رائے لے لی جائے جو سیاسی کشمکش میں فریق نہ ہوں اور خالصتاً علمی اور دینی حوالہ سے اس بل کی خلاف شریعت باتوں کی نشاندہی کر دیں۔ چودھری صاحب نے اسمبلی کے فلور پر اعلان کیا کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی دفعہ بھی اس بل میں ہوئی تو اسے تبدیل کیا جائے گا اور قرآن و سنت کے منافی کوئی بل کسی صورت میں منظور نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ جن علمائے کرام کو سیاسی طور پر غیر جانبدار تصور کرتے ہوئے اس مقصد کے لیے اسلام آباد بلایا گیا ان میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا مفتی منیب الرحمان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی غلام الرحمان اور مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی کے ساتھ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ ہم چودھری شجاعت حسین کی دعوت پر اسلام آباد میں جمع ہوئے اور طویل مذاکرات اور گفت و شنید کے بعد بعض نکات پر ہم متفق ہو گئے۔ ان مذاکرات میں مذکورہ بالا علمائے کرام کے ساتھ چودھری شجاعت حسین صاحب، چودھری پرویز الٰہی صاحب، اس بل کے بارے میں قومی اسمبلی کے سلیکٹ کمیٹی کے چیئرمین سردار نصر اللہ دریشک صاحب، وفاقی وزیر قانون وصی ظفر صاحب، وفاقی سیکرٹری اور اٹارنی جنرل کے علاوہ دیگر افسران بھی شریک ہوئے۔ ہم نے اس سلسلہ میں کئی ملاقاتیں کیں اور ایک موقع پر تو ہم صبح ۹ بجے سے نماز اور کھانے کے وقفے کے ساتھ رات تین بجے تک بحث و مباحثہ کرتے رہے جس کے نتیجے میں تین باتوں پر اتفاق رائے ہو گیا۔

1. ایک یہ کہ اس نئے قانون میں زنا بالجبر کو شرعی حد کے دائرے سے نکال کر تعزیری قانون بنا دیا گیا ہے جو درست نہیں ہے، اس لیے حسب سابق زنا بالجبر پر شرعی حد کی سزا بحال کی جائے گی۔

2. دوسری بات یہ کہ زنا بالرضا کے مقدمہ میں زنا کا شرعی ثبوت مکمل نہ ہونے پر اس سے نچلے درجے کے جو جرائم اسی کیس میں ثابت ہو گئے ہیں، ان پر حدود آرڈیننس میں تعزیری سزا رکھی گئی تھی مگر اس نئے بل میں ان تعزیری سزاؤں کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ تعزیری سزائیں بحال کی جائیں گی البتہ ان کا عنوان زنا کی بجائے فحاشی میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں طویل بحث و مباحثہ کے بعد ایک نئی دفعہ کا متن طے ہوا جس کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ اسے تحفظ حقوق نسواں بل کا حصہ بنایا جائے گا۔

3. اور تیسری بات یہ کہ حدود آرڈیننس کی اس دفعہ کو نئے مسودہ قانون میں حذف کر دیا گیا تھا کہ کسی دوسرے قانون کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں حدود قوانین کو بالادستی حاصل ہوگی۔ اس پر ایک نئی دفعہ قانون میں شامل کرنے پر اتفاق ہوا کہ ان قوانین کی تعبیر و اطلاق میں قرآن و سنت کی تشریحات کو فوقیت حاصل ہوگی اور اس دفعہ کا متن بھی باہمی اتفاق رائے سے طے ہوا۔

ان کے علاوہ ہم نے اور بھی بہت سی تجاویز دیں جو قومی پریس کے ریکارڈ میں آچکی ہیں مگر مذکورہ تین باتیں صرف ہماری تجاویز نہیں بلکہ متفقہ فیصلوں کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے کہ اگر ہم نے صرف تجاویز اور رائے دینا ہوتی تو وہ ہم دوسری تجاویز کی طرح لکھ کر حوالے کر سکتے تھے لیکن ان تین امور کو طویل مذاکرات کے بعد متفقہ فیصلے کے طور پر تحریر کیا گیا۔ اس پر علماء کرام کے علاوہ چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی اور سردار نصر اللہ دریشک نے بھی دستخط کیے اور پھر ان کو چودھری صاحبان نے ہی پریس کے حوالے کیا۔ لہٰذا ان تین امور کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ علمائے کرام کی تجاویز تھیں جنہیں قبول نہیں کیا گیا بلکہ یہ متفقہ فیصلہ تھا جس سے انحراف کیا گیا ہے اور یہ بہت بڑے ظلم اور ناانصافی کی بات ہے۔ بہرحال ان مراحل سے گزر کر "تحفظ حقوق نسواں بل" کو جس شکل میں قومی اسمبلی اور سینٹ نے منظور کیا ہے اور جس انداز میں صدر جنرل پرویز مشرف نے اس کی منظوری کو ایک تاریخی واقعہ قرار دیتے ہوئے اس پر دستخط کر کے اسے ایکٹ کی شکل دی ہے وہ ایک الگ المیہ ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ قرآن و سنت کے صریح احکام اور علمائے کرام کے ساتھ متفقہ معاہدہ سے انحراف کرنے کے باوجود اس ایکٹ کو قرآن و سنت کے عین مطابق قرار دیا جا رہا ہے اور ملک بھر کے علمائے کرام کی تحقیر

اور کردار کشی کرتے ہوئے قرآن و سنت کی من مانی تشریحات کے ذریعے سے شریعت کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔

اس پس منظر اور معروضی صورتحال کے تذکرہ کے بعد اب میں آتا ہوں اس بات کی طرف کہ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے ذریعے سے حدود آرڈیننس میں کیا تبدیلیاں کی گئی ہیں اور اس نئے قانون کی منظوری کے بعد قانونی صورتحال میں کیا تغیر آیا ہے۔ اس سلسلہ میں میرے تبصرہ کی بنیاد چار رپورٹیں ہیں جن کی روشنی میں اس قانون کے ذریعے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ پہلی رپورٹ جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی کا وہ تجزیاتی مضمون ہے جس میں انہوں نے جامعیت اور اختصار کے ساتھ اس ایکٹ کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ دوسری رپورٹ وہ یادداشت ہے جس میں تمام مکاتب فکر کے سترہ اکابر علماء کرام نے مشترکہ طور پر چودھری شجاعت حسین کو مخاطب کیا ہے اور خود ان کے گھر جا کر وہ یادداشت ان کے حوالے کی ہے۔ تیسری رپورٹ سرکردہ اہل حدیث علمائے کرام کا وہ تجزیاتی جائزہ ہے جو قومی اخبارات کے ذریعے سے منظر عام پر آچکا ہے اور چوتھی رپورٹ محترمہ ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی صاحبہ کا تجزیاتی مضمون ہے جو حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی ہمشیرہ ہیں اور جمعیت علماء پاکستان کے شعبہ خواتین کی سربراہ ہیں۔ ان رپورٹوں کے حوالہ سے ان چند تبدیلیوں کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں جو تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے ذریعے سے سامنے آئی ہیں۔

- مجھے ذاتی طور پر اس سلسلہ میں سب سے بڑی تبدیلی اور خرابی یہ نظر آتی ہے کہ اس قانون میں زنا کے علاوہ اور کوئی مسئلہ شامل نہیں ہے مگر اسے عنوان ”حقوق“ کا دیا گیا ہے اور اس طرح زنا کو حقوق کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ بات صدر جنرل مشرف نے بھی اپنی نشری تقریر میں کہی ہے کہ ہم نے اس ایکٹ میں زنا کے سوا کسی مسئلہ کو نہیں چھیڑا اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ اس میں زنا ہی کے قوانین بیان کیے گئے ہیں لیکن اسے حقوق کا عنوان دے کر یہ تاثر دیا گیا ہے کہ ہمارے ہاں زنا اب جرائم میں نہیں بلکہ حقوق میں شمار ہوگا۔ اس لیے اس قانون کے حوالہ سے میرا سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ زنا حقوق میں کب سے شامل ہو گیا ہے؟ اس پس منظر میں اس سوال کی سنگینی اور سنجیدگی میں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ مغربی دنیا میں زنا حقوق میں شمار

ہوتا ہے، وہاں انسانی حقوق کے نام پر عورتوں کے اسقاط حمل کے مطلق حق اور ہم جنس پرستوں کی شادیوں کو قانونی تحفظ دینے کے جو مطالبات ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں جو قانون سازی ہو رہی ہے وہ زنا کو حقوق میں شامل کرنے کا ہی نتیجہ ہے۔ جبکہ اسلامی شریعت میں یہ عمل جرائم میں بلکہ سنگین ترین جرائم میں شمار کیا جاتا ہے۔

• میرا دوسرا اعتراض اس قانون پر یہ ہے کہ زنا کو حقوق کا عنوان دیا گیا ہے اور حقوق بھی عورتوں کے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دنیا کے سامنے پاکستانی عورت کی یہ تصویر پیش کر رہے ہیں کہ وہ زنا کی سہولت مانگ رہی ہے اور ہمارے معاشرے میں عورت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے زنا کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔ یہ پاکستانی عورت کی بہت غلط تصویر ہے جو ہم اس قانون کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور واقعہ کے بھی خلاف ہے کیونکہ پاکستانی عورتوں کی غالب اکثریت عصمت و عفت پر یقین رکھتی ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر ان کا پختہ ایمان ہے۔

• اس قانون میں ایک بہت بڑی زیادتی یہ کی گئی ہے کہ زنا کی دونوں صورتوں یعنی زنا بالرضا اور زنا بالجبر کو ناقابل دست اندازی پولیس قرار دے دیا گیا ہے جس کی سادہ سی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس طرح پولیس کے عمل دخل کو کم کر دیا گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو پریشان نہ کر سکے۔ لیکن اس ٹیکنیکل تبدیلی کے حقیقی اور عملی نتیجہ کو لوگوں کی نظر سے اوجھل رکھا جا رہا ہے کہ اس طرح زنا کا جرم ریاست کا جرم نہیں رہا بلکہ محض شکایت کا کیس بن گیا ہے۔ یعنی اس جرم کے ارتکاب پر ریاست کو کوئی شکایت نہیں ہے۔ کیونکہ جن جرائم کو ریاست اور سوسائٹی کا جرم تصور کیا جاتا ہے ان میں مدعی خود ریاست ہوتی ہے اور اس کی طرف سے پولیس اس جرم کے کیس کو ڈیل کرتی ہے۔ پولیس کو اس معاملے میں بے دخل کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ اب زنا ریاست کا جرم نہیں رہا۔ کسی شہری بلکہ متاثرہ فریق کو کوئی شکایت ہے تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے اور اگر اس جرم کے ارتکاب پر متاثرہ فریق یا کسی شہری کو اعتراض نہیں ہے تو ریاست کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ بات شرعی اصولوں سے

متصادم ہے اس لیے کہ اسلامی شریعت میں زنا صرف حقوق العباد کا جرم نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ کی بھی خلاف ورزی ہے اور یہ صرف افراد کی حق تلفی نہیں بلکہ ریاست کی بھی حق تلفی ہے۔

• اس قانون کے ذریعے سے ایک تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ زنا بالجبر کو حدود کے دائرہ سے نکال کر تعزیری جرم بنا دیا گیا ہے جو صراحتاً حد شرعی کو تبدیل کرنے کی صورت ہے۔

• تحفظ حقوق نسواں ایکٹ میں ایک ظلم یہ کیا گیا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں عدالت کی طرف سے حتمی فیصلہ سنائے جانے کے بعد اس سزا میں کمی یا معافی کا کسی شخص کو اختیار نہیں ہے، مگر اس قانون میں یہ ناجائز اختیار صوبائی حکومت کو دے دیا گیا ہے۔

• ایک اور خرابی یہ پیدا کی گئی ہے کہ قذف کے قوانین میں یہ گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ اگر عورت عدالت میں رضا کارانہ طور پر زنا کے جرم کے ارتکاب کا اعتراف بھی کرتی ہے تو وہ سزا سے مستثنیٰ ہوگی۔

• ایک اور ٹیکنیکل واردات اس قانون کے ذریعے یہ کی گئی ہے کہ بلوغت کی حد سولہ سال کی عمر مقرر کر کے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ نابالغ لڑکی اگر رضامندی کے ساتھ بھی زنا کی مرتکب ہوتی ہے تو اس کے ساتھ زنا کو "زنا بالجبر" تصور کیا جائے گا اور لڑکی کو کوئی سزا نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سولہ سال کی عمر تک لڑکی پر زنا کا الزام ثابت ہو جانے کے بعد بھی اسے اس جرم میں کوئی سزا نہیں ہوگی۔ اس سے معاشرہ میں بدکاری کے فروغ کی جو صورتحال سامنے آسکتی ہے اسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

• اس کے ساتھ ہی نئے قانون میں یہ بات بھی شامل کر دی گئی ہے کہ اگر خاوند خود اپنی بیوی کے ساتھ جماع میں زبردستی کرتا ہے تو اسے "زنا بالجبر" تصور کیا جائے گا۔ میں اس حوالہ سے جبر کی حمایت نہیں کر رہا لیکن اسے اس درجہ کا جرم قرار دینا بھی ناانصافی اور ظلم ہے کہ اس پر زنا بالجبر کا اطلاق کر دیا جائے۔ اور جن حضرات کو قانون کے غلط استعمال سے بہت زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے میں ان سے دریافت کرنا چاہوں گا کہ کیا اس قانون کا غلط

استعمال نہیں ہوگا اور کیا ہر خاوند کے سر پر یہ تلوار مستقل طور پر نہیں لٹکی رہے گی کہ اس کی بیوی جب کسی بات پر ناراض ہو تو عدالت میں اس کے خلاف ایک درخواست دے کر اسے زنا بالجبر کے کیس میں جیل بھجوا دے؟

ان کے علاوہ اور بھی مسائل ہیں، میں نے بطور نمونہ صرف چند کا ذکر کیا ہے تاکہ آپ یہ اندازہ کر سکیں کہ اس قانون کو قرآن و سنت کے عین مطابق قرار دینے کے جو دعوے کیے جا رہے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟

آخر میں ایک گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہوں اور علمائے کرام اور دینی قیادتوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا کیا دھرا ہے اور یہاں تک جو حالات پہنچے ہیں ان کی سب سے بڑی وجہ خود ہماری غفلت اور کوتاہیاں ہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ میں عورت بہت سے حوالوں سے مظلوم ہے اور اس کے بہت سے شرعی حقوق یہاں دبائے جا رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک دینی حلقوں نے عورتوں کے حقوق بحال کرانے اور ان کی مظلومیت کے حق میں آواز بلند کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہے؟ ملک میں جتنے ادارے اور این جی اوز عورتوں کے حقوق کے حوالہ سے کام کر رہی ہیں کیا ان میں کوئی ایک بھی دینی حلقوں کی نمائندگی کرتی ہے؟ ہم نے خود اتنا بڑا محاذ سیکولر اداروں، حلقوں اور این جی اوز کے حوالے کر رکھا ہے، گزشتہ نصف صدی سے وہ اس شعبہ میں مسلسل کام کر رہی ہیں اور آج جبکہ وہ اپنی نصف صدی کی محنت کو کیش کرا رہی ہیں تو ہمیں تکلیف ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے اس شعبہ میں کیا ہی کیا ہے اور سیکولر این جی اوز کو کارنر کرنے کے لیے ان کے مقابلہ میں ہماری کارکردگی اور جدوجہد کا تناسب کیا ہے؟ ہمیں ان زمینی حقائق کا سامنا کرنا ہوگا اور ان کے منطقی تقاضوں کو سنجیدگی کے ساتھ پورا کرنا ہوگا ورنہ مجھے کم از کم اس سلسلہ میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگلے مراحل میں جو اس سے بھی زیادہ سخت ہوں گے ہم پسپائی اور شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔

دوسری گستاخی جو میں ضروری طور پر کرنا چاہ رہا ہوں یہ ہے کہ خاندانی قوانین اور دیگر شرعی احکام کے حوالہ سے مغرب کے ساتھ ہماری جو فکری، علمی اور ثقافتی کشمکش ہے اس میں ہمارے علمی اور دینی حلقوں کا رول کیا ہے؟ اور ہم اس کشمکش کی نوعیت، اس کے دائرہ کار اور مغربی حلقوں کے طریق کار کو سمجھنے اور حالات کے تناظر اور تقاضوں کا صحیح طور پر

ادراک حاصل کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ مغرب اپنا کام تیزی کے ساتھ آگے بڑھا رہا ہے، اس کے ایجنڈے میں مسلسل پیشرفت کا عمل جاری ہے، اس کا نیٹ ورک مضبوط ہے اور اس کا طریق کار انتہائی سائنٹیفک اور مربوط ہے۔ مگر ہمارے کیمپ میں (چند شخصیات کے استثنا کے ساتھ) جذباتی نعروں، سطحی معلومات اور فرسودہ دفاعی ہتھکنڈوں کے سوا کیا ہے؟ ہمارے ہاں تو اس کے بارے میں سوچنے کو بھی وقت کا ضیاع تصور کیا جاتا ہے اور اس طرف توجہ دلانے والے چند سر پھرے لوگ ہمارے حلقوں میں بے وقوف سمجھے جاتے ہیں۔ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے کسی جگہ لکھا ہے کہ ترکی میں سیکولرازم کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کے علماء اور مشائخ کے پاس ان کاموں کے لیے وقت نہیں تھا اور نہ ہی وہ ان باتوں کی کوئی اہمیت سمجھتے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ شاید ہم نے بھی ترکی کے علماء و مشائخ کی طرح خدانخواستہ ایک نئے اتاترک کو راستہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

قرآن کریم اور رمضان المبارک کی برکات

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۲۹ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

اس سال رمضان المبارک کے آخری عشرے کے دوران مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور دیگر درجنوں دینی مراکز میں تراویح میں ختم قرآن کریم کے حوالے سے منعقد ہونے والی تقریبات میں گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا، ان کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

رمضان المبارک کا تعارف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قرآن ہی کے حوالے سے کرایا ہے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن کریم اتارا گیا، اس لیے قرآن کریم اور رمضان المبارک آپس میں لازم ملزوم ہیں اور ان کا یہ جوڑ اس قدر مضبوط ہے کہ نہ صرف یہ کہ رمضان المبارک میں قرآن کریم اتارا گیا بلکہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کی یہ مقدس کتاب پڑھی بھی سب سے زیادہ جاتی ہے۔ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں قرآن کریم اتنا پڑھا اور سنا نہیں جاتا جتنا اس ماہ مبارک میں پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ آپ تراویح کے حوالے سے دیکھ لیں کہ تراویح میں روزانہ بیک وقت کتنی جگہوں پر قرآن کریم پڑھا اور سنا جاتا ہے اور پھر یہ بھی دیکھیں کہ تراویح کا وقت ساری دنیا میں ایک نہیں ہے۔ ہم جب سحری کھا رہے ہوتے ہیں اس وقت بھی دنیا میں کسی جگہ تراویح کا وقت ہوتا ہے، جب ہم صبح آرام سے فارغ ہو کر دفتر،

دکان اور کام پر جا رہے ہوتے ہیں تب بھی کہیں تراویح ہو رہی ہوتی ہیں، اور جس وقت ہم روزہ افطار کرتے ہیں اس وقت بھی دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں ہزاروں مسلمان تراویح پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ گویا رمضان المبارک کے دوران شب و روز میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں تراویح ادا نہ کی جا رہی ہوں اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان نماز کی حالت میں کھڑے قرآن کریم نہ سن رہے ہوں۔

یہ قرآن کریم کا وہ اعجاز ہے جس کا ہم کھلی آنکھوں سے آج کے دور میں مشاہدہ کر رہے ہیں، بلکہ خود بھی اس میں شریک اور حصہ دار ہیں۔ ہمارا موجودہ دور تنزل کا دور ہے، ادبار کا دور ہے اور انحطاط کا دور ہے، لیکن معروضی صورتحال یہ ہے کہ زندگی کے باقی تمام شعبوں میں ہم سمٹ رہے ہیں، سکڑ رہے ہیں اور سہمے ہوئے ہیں، مگر قرآن کریم کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے اور اس کی وسعتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں قرآن کریم کے مدارس نہ ہوں، ہزاروں بچے جس میں حافظ قرآن نہ بن رہے ہوں اور مختلف عنوانات سے قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا عمل جاری نہ ہو۔

میں اس سلسلہ میں اپنے ایک ذاتی مشاہدے اور تاثر کا تذکرہ کرنا چاہوں گا کہ گزشتہ سال رمضان المبارک کا ابتدائی عشرہ میں نے امریکہ میں گزارا اور پہلی شب کی تراویح بالٹیمور (ریاست میری لینڈ) کی مسجد رحمت میں پڑھیں۔ پاکستان ہی سے تعلق رکھنے والے ایک قاری صاحب نے، جو میرے ہمنام ہیں، ڈیڑھ پارہ پڑھا، سینکڑوں مرد اور ان کے ساتھ سینکڑوں عورتیں ملحقہ ہال میں نماز تراویح ادا کر رہی تھیں۔ میں قاری زاہد صاحب کی اقتدا میں تراویح پڑھ رہا تھا کہ میرا ذہن اچانک اس سوال کی طرف گھوم گیا کہ امریکہ میں اس وقت نماز تراویح میں قرآن کریم سنانے والے حفاظ و قراء کی تعداد کیا ہوگی؟ میں چونکہ امریکہ بہت مرتبہ گیا ہوں اور اس کے متعدّد شہروں میں گھوما پھرا ہوں، اس لیے اپنے اندازے سے سوال کا جواب یہ سوچا کہ امریکہ کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو تراویح میں قرآن کریم سنانے والے حافظوں اور قاریوں کی تعداد یقیناً ہزاروں میں ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سوال ذہن میں آگیا کہ امریکہ کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ایک فیصد اور دو فیصد کے درمیان بتایا جاتا ہے، جبکہ عیسائیوں کی آبادی پچانوے فیصد سے کسی طرح کم نہیں ہوگی اور امریکہ کے عیسائی یورپ کے عیسائیوں کی طرح لامذہب نہیں ہیں بلکہ مذہب اور اس کی عبادات و اقدار کے ساتھ لگاؤ رکھتے ہیں، لیکن کیا پچانوے فیصد

آبادی رکھنے والے مسیحیوں کو ڈیڑھ فیصد آبادی رکھنے والے مسلمانوں کے ہزاروں حفاظ قرآن کریم کے مقابلے میں اپنی مذہبی کتاب کا ایک بھی ایسا حافظ مل جائے گا جو اسی طرح آگے کھڑا ہو کر بائبل کی کوئی کتاب زبانی پڑھ دے، جس طرح روانی اور تسلسل کے ساتھ حفاظ قرآن کریم سناتے ہیں؟ کافی سوچ و بچار کے بعد بھی مجھے اس سوال کا جواب اثبات میں نہ ملا۔

یہ قرآن کریم کے اعجاز کا وہ سدا بہار پہلو ہے جس کا ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں اور یہ پہلو ایسا ہے جس کے ساتھ مسلمان کا تعلق آج بھی قائم ہے، بلکہ یہ عرض کیا جائے تو مناسب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک میں دنیا بھر کے مسلمانوں کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ ایک بار پھر تازہ کر دیتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر رمضان المبارک میں تراویح اور قیام اللیل کا یہ مربوط نظام نہ ہوتا اور ہر طرف قرآن کی قراءت اور سماع کی گہما گہمی نہ ہوتی تو کیا ہمارا قرآن کریم کے ساتھ یہ جوڑ باقی رہتا جو آج سب کو نظر آرہا اور دنیا بھر اسلام دشمن قوتوں کے لیے اضطراب اور بے چینی کا باعث بنا ہوا ہے؟ بلکہ قرآن کریم کے حفاظ اور قراء کرام، جو یقیناً دنیا میں ایک کروڑ کے لگ بھگ ضرور ہوں گے، کیا تراویح، شبینہ اور قیام اللیل کے اس سسٹم کے بغیر قرآن کریم حفظ کر لینے کے بعد اسے زندگی بھر یاد رکھنے میں کامیاب ہو پاتے؟

رمضان المبارک کی برکات میں سے صرف اس ایک برکت کی وسعت اور تنوع پر غور کر لیا جائے تو ایمان تازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ قائم ہے اور ہر سال اس کی تجدید ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس صورتحال کی یہ تعبیر بھی نامناسب نہیں ہوگی کہ ہماری سال بھر کی غفلتوں، بے پروائیوں اور کوتاہیوں کے بعد اللہ تعالیٰ رمضان المبارک میں ہمیں پھر سے قرآن کریم کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اور ہماری بیٹریاں اپنی اپنی گنجائش کے مطابق چارج ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم کے ساتھ ہم جس قدر عقیدت کا اظہار کریں کم ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے لیے ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ تو ہے ہی، ہماری وحدت اور ہم آہنگی کا بھی سب بڑا ذریعہ ہے، لیکن میں اس سے ہٹ کر ایک اور پہلو سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم تو قرآن کریم کے بارے میں بہت کچھ کہتے ہیں اور مختلف حوالوں سے اپنے تعلق اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ خود قرآن کریم ہمارے بارے میں کیا کہتا ہے اور وہ ہمیں کس نظر سے دیکھتا ہے؟

اس سلسلہ میں سورۃ الفاطر کی آیت نمبر ۳۲ آپ کے سامنے تلاوت کی ہے جس میں اللہ تعالی نے دو باتیں فرمائی ہیں:

- ایک یہ کہ جن لوگوں کو ہم نے قرآن کریم کا وارث بنایا ہے ان کا انتخاب ہم نے خود کیا ہے،
- اور دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کے وارث ہیں وہ تینوں درجوں پر ہیں۔ ایک طبقہ ان میں ظالم ہے، دوسرا مقتصد ہے اور تیسرا سابق بالخیرات ہے۔

قرآن کریم کے وارث کون ہیں؟ اس سلسلہ میں مفسرین کرام دو باتیں فرماتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے درجے میں درست ہیں:

1. ایک یہ کہ پوری امت بحیثیت امت قرآن کریم کی وارث ہے، اور اس میں شبہ کی کوئی بات نہیں کہ اقوام عالم کے تناظر میں دیکھا جائے تو امت محمدیہ ہی قرآن کریم کی وارث کہلائے گی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن کریم کے وارث وہ لوگ ہیں جن کا قرآن کریم کے ساتھ کوئی نہ کوئی عملی تعلق ہے، پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں، اس کی تنفیذ کرتے ہیں اور کسی بھی حوالے سے اللہ تعالی کی اس آخری کتاب کی خدمت کرتے ہیں۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ دونوں طبقے اپنی اپنی جگہ وارث ہیں اور اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ان کا انتخاب میں نے خود کیا ہے۔ امتی ہونے کے حوالے سے دیکھ لیجئے کہ ہم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں اور اس وجہ سے قرآن کریم کے وارثوں میں شامل ہیں، لیکن امتی ہونے میں ہماری کسی خواہش اور چوائس کا دخل نہیں ہے، یہ خالصتاً اللہ تعالی کا انتخاب ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان گھرانوں میں پیدا کیا اور ہم جناب نبی اکرمؐ کی امت میں شمار ہو گئے ہیں، ورنہ وہ ہمیں کسی سکھ، ہندو، عیسائی یا مجوسی کے گھرانے میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔

2. دوسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ قرآن کریم کے وارث تین حصوں میں تقسیم ہیں۔ ایک حصے کو ظالم کہا گیا ہے۔ دوسرے کو مقتصد کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے اور تیسرے حصے کو سابق بالخیرات سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ ان تینوں تعبیرات سے کیا مراد ہے؟ اس پر مفسرین کرامؒ نے بہت سے نکات بیان فرمائے ہیں، جن میں سے امام فخرالدین رازیؒ کے بیان کردہ دو تین تفسیری نکات کا ذکر کروں گا جو انہوں نے "تفسیر کبیر" میں ذکر فرمائے ہیں:

- ظالم سے مراد وہ ہیں جو قرآن کریم نہیں پڑھتے، مقتصد سے مراد وہ ہیں جو پڑھتے تو ہیں عمل نہیں کرتے، اور سابق سے مراد وہ لوگ ہیں جو پڑھتے بھی ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔
- ظالم سے مراد وہ ہیں جو قرآن کریم کے پڑھنے اور سمجھنے سے بے پرواہیں، مقتصد سے مراد وہ ہیں جو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اور سابق وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کا علم اور فہم رکھتے ہیں۔
- ظالم سے مراد وہ ہیں جو پڑھتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے، مقتصد سے مراد وہ ہیں جو پڑھتے بھی ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں، جبکہ سابق سے مراد وہ لوگ ہیں جو خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔
- ظالم سے مراد وہ ہیں کہ جن کے روزمرہ معمولات میں گناہ غالب ہوتے ہیں، مقتصد سے مراد وہ ہیں جن کی نیکیاں اور گناہ یکساں اور برابر رہتے ہیں، جبکہ سابق سے مراد وہ حضرات ہیں جن کی زندگی کے اعمال میں نیکیاں گناہوں پر غالب ہوتی ہیں۔

یہ ساری تعبیرات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں، صرف اظہار کے پہلوؤں کا فرق ہے ورنہ سب کا نتیجہ اور ثمر ایک ہی ہے۔ اور میں اس آیت کریمہ کے حوالے سے اپنے آپ کو، آپ سب حضرات کو اس بات پر غور وفکر کی دعوت دینا چاہوں گا کہ یہ وہ درجہ بندی ہے جو خود قرآن کریم نے ہمارے بارے میں کی ہے اور ہمیں مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، جس کو دیکھ کر ہم میں سے ہر شخص کو اپنے بارے میں جائزہ لینا چاہیے کہ اس کا شمار کس درجے میں ہوتا ہے اور وہ کس کیٹیگری میں شامل ہے؟

قرآن کریم کے ساتھ تعلق کے بارے میں اس پہلو پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے ایک اور بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ رمضان المبارک اب ہم سے رخصت ہو چکا ہے، اس دوران قرآن کریم کی تلاوت و سماع اور نیکی کے دیگر مختلف اعمال کے ساتھ ہمارے تعلق میں جو تجدید اور تازگی آئی ہے اسے صرف اس ماہ تک محدود نہیں رہنا چاہیے، بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ رمضان المبارک کے بعد بھی اس کا تسلسل قائم رہے۔

اسلام کا قانون ازدواج اور جدید ذہن کے شبہات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اگست ۲۰۰۶ء)

ماہنامہ الشریعہ کے گزشتہ شمارے میں روزنامہ جناح اسلام آباد کے کالم نگار جناب آصف محمود ایڈووکیٹ کے حوالے سے چند سوالات شائع کیے گئے جن کا تعلق دور حاضر کے معروضی حالات، مغربی فکر و فلسفہ کی یلغار اور بین الاقوامی میڈیا کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کے ماحول میں اسلام کے مختلف احکام و قوانین کی تفہیم کے بارے میں نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والی الجھنوں سے ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ گزارش کی تھی کہ ان سوالات پر ایک تبصرہ الشریعہ کے زیر نظر شمارے میں پیش کیا جائے گا لیکن جب اس کے بعد ان سوالات کا جائزہ لیا گیا تو محسوس ہوا کہ سرسری تبصرہ سے بات نہیں بنے گی بلکہ ان میں سے ہر سوال کا تفصیلی طور پر جائزہ لیا جانا ضروری ہے، اور اس کے ساتھ ان سوالات اور شکوک و شبہات کے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ذہنوں میں جنم لینے کے اسباب کا تجزیہ بھی اس موضوع کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس لیے ہماری کوشش ہوگی کہ اس بحث کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا جائے اور ایسے سوالات اور ان کے اسباب و محرکات کا ترتیب کے ساتھ جائزہ لیا جائے جس کے آغاز کے طور پر ان میں سے صرف ایک سوال کے بارے میں ہم اپنی گزارشات اس شمارے میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم ملک کے دینی حلقوں، علمی مراکز اور قرآن و سنت کی تعلیمات سے تعلق رکھنے والے ارباب وعلم دانش سے گزارش کریں گے کہ وہ ان سوالات کو نظر انداز کرنے اور نئی نسل کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کی بجائے اس بحث میں شریک ہوں اور ان اشکالات و شبہات کے ازالہ کے لیے اپنا علمی و دینی فریضہ ادا کریں۔ آئندہ شمارے میں ہم

ان شکوک و شبہات اور سوالات و اعتراضات کے حوالے سے ایک اصولی بحث کریں گے اور اس کے بعد ان سوالات کا ترتیب وار جائزہ لیا جائے گا، ان شاء اللہ تعالی۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ شادیاں اور قرآن کریم میں مسلمانوں کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت ایک عرصہ سے مغربی حلقوں میں زیر بحث ہے اور اعتراض و طعن کا عنوان بنی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی سامنے آجاتا ہے کہ جب ایک مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے تو عورت کو بیک وقت چار شادیاں کرنے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ حدود آرڈیننس پر گزشتہ دنوں چھیڑی جانے والی بحث کے دوران مختلف حلقوں کی طرف سے یہ سوالات میڈیا کے ذریعے اٹھائے گئے ہیں اور ان پر لوگ اپنے اپنے انداز میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔

صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں جب ایک موقع پر مغربی پاکستان اسمبلی میں عائلی قوانین پر بحث ہو رہی تھی تو اسمبلی کی ایک خاتون ممبر نے یہ سوال کیا تھا کہ مرد کو چار بیویاں کرنے کا حق ہے تو عورت کو چار خاوند کرنے کا حق کیوں نہیں ہے؟ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ بھی اسمبلی کے رکن تھے اور ان کا جواب دینے کا مخصوص انداز ہوتا تھا۔ انہوں نے مذکورہ خاتون کو مخاطب کر کے کہا کہ "بیگم صاحبہ! آپ بیس کریں، آپ کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ممانعت تو قرآن کریم کا حکم ماننے والوں کے لیے ہے، نہ ماننے والوں کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے"۔ چند روز قبل ایک قومی اخبار میں یہی سوال سامنے آنے پر مولانا ہزارویؒ کا یہ جواب ذہن میں تازہ ہو گیا، مگر یہ سوالات جس انداز سے نیشنل میڈیا میں اٹھائے جا رہے ہیں اور انہیں اسلامی احکام و قوانین کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے، اس کے پیش نظر ان سوالات کا قدرے سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ایک سے زائد شادیوں کے بارے میں سوالات کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1. مسلمانوں کو چار سے زائد شادیاں کرنے کا حق قرآن کریم میں کیوں دیا گیا ہے؟

2. جب قرآن کریم نے بیک وقت چار سے زائد نکاح کرنے کی اجازت نہیں دی تو جناب نبی کریمؐ کی کل گیارہ اور بیک وقت نو شادیاں کیوں تھیں؟

3. مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے تو عورت کو ایک سے زیادہ نکاح بیک وقت کرنے کا حق کیوں نہیں دیا گیا؟

مرد کے لیے چار شادیوں کی اجازت

جہاں تک چار شادیاں کرنے کی اجازت کا تعلق ہے، یہ بلاشبہ قرآن مجید میں موجود ہے لیکن اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر اور مقصد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ حکم سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳ میں اس طرح ہے کہ

> "اگر تم خوف کھاؤ کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو، دو دو تین تین اور چار چار۔ اور اگر تم خوف کرو کہ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی کافی ہے۔"

بخاری شریف کی روایت کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ جاہلیت کے دور میں بہت سے لوگ اپنے خاندان کی یتیم اور بے سہارا بچیوں کو ان کے حسن یا مال کی وجہ سے اپنی بیوی بنا لیتے تھے اور ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتے تھے۔ شادیوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی، کوئی بھی شخص جتنی شادیاں چاہتا تھا کر لیتا تھا اور اس طرح عورتیں خاص طور پر یتیم لڑکیاں ظلم اور حق تلفی کا نشانہ بنتی تھیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی رو سے دو پابندیاں عائد کر دیں:

- ایک یہ کہ خاندان کی کسی یتیم لڑکی کو بیوی بنانے کی صورت میں اگر اس کے حقوق پورے نہیں کر سکتے اور انصاف مہیا نہیں کر سکتے تو اس کے ساتھ شادی مت کرو،
- اور دوسری یہ کہ چار سے زیادہ بیویاں بیک وقت رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔

اس طرح بنیادی طور پر یہ حکم چار تک شادیاں کرنے کے حکم کے طور پر نہیں بلکہ چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کے طور پر ہے، اور اسے بھی آیت کریمہ میں مشروط کر دیا گیا ہے کہ اگر انصاف اور حقوق کے تقاضے پورے کر سکو تو اس کی اجازت ہے ورنہ ایک پر ہی قناعت کرو۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت کو اگر معاشرتی مسائل اور ضروریات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو اسے سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور یہ مرد اور عورت دونوں کے حوالے سے ہے۔

مرد کے حوالے سے اس لیے کہ بسا اوقات ایک مرد اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے ایک عورت پر قناعت نہیں کرتا تو اس کے لیے یہ راستہ رکھا گیا ہے کہ وہ ناجائز صورتیں اختیار کرنے کے بجائے باقاعدہ نکاح کرے تاکہ جس عورت کے ساتھ وہ یہ تعلق قائم کرے اس کی ذمہ داری بھی قبول کرے۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ کسی بھی مرد کو کسی بھی عورت کے ساتھ جنسی تعلق کی اس وقت تک اجازت نہیں دیتا جب تک وہ اس عورت کے مالی اخراجات اور جنسی تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کی پرورش اور اخراجات کی ذمہ داری باقاعدہ طور پر قبول نہ کرے۔ اسلام مغرب کے موجودہ فلسفہ اور کلچر کی طرح جنسی تعلقات کو اس طرح آزاد نہیں چھوڑتا کہ مرد تو اپنا جنسی تقاضا پورا کر کے چلتا بنے اور عورت اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تنہا رہ جائے۔

عورت کے حوالے سے اس لیے کہ معاشرے میں بسا اوقات ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ عورت کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ وہ یا تو تنہائی کی زندگی گزارے اور یا کسی شادی شدہ مرد کی دوسری یا تیسری بیوی بن کر اپنی زندگی کو بامقصد بنا لے۔ اس صورت میں اسلام نے جائز نکاح کا راستہ بند کر کے بہت سے ناجائز راستے کھولنے کے بجائے ایسی عورت کو زندگی بسر کرنے کا باوقار راستہ دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ نکاح تو عورت کی اجازت اور مرضی سے ہی ہوتا ہے اور اگر کوئی عورت اس کے لیے سوچ سمجھ کر تیار ہوتی ہے تو اس کی معاشرتی ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جناب نبی اکرمؐ کی چار سے زیادہ بیویاں

جناب نبی کریمؐ کے حوالے سے یہ سوال اس طرح ہے کہ جب قرآن کریم نے چار سے زیادہ شادیوں کی ممانعت کر دی اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ نے بہت سے صحابہ کرامؓ کو چار سے زائد بیویوں سے دستبرداری کا حکم دیا تو جن کی چار سے زائد بیویاں تھیں انہوں نے باقی بیویوں کو الگ کر دیا، مگر خود نبی اکرمؐ نے اپنی چار سے زائد بیویوں کو فارغ نہیں کیا حتیٰ کہ آپؐ کے وصال کے وقت آپ کی نو بیویاں تھیں۔ سوال یہ ہے کہ جس قانون کی دوسرے مسلمانوں سے پابندی کرائی گئی خود نبی اکرمؐ نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا اور چار سے زائد بیویاں مسلسل اپنے نکاح میں کیوں رکھیں؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ رسول اللہؐ نے چار سے زیادہ بیویاں قرآن کریم کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے بعد نہیں کیں بلکہ ان میں سے اکثر اس سے پہلے اس دور

سے آپ کی بیویاں چلی آرہی تھیں جب شادیوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی، البتہ چار کی تعداد کی پابندی عائد ہو جانے کے بعد نبی اکرمؐ نے زائد بیویوں کو الگ نہیں کیا بلکہ دو مزید نکاح بھی کیے اور یہی سب سے بڑا نکتہ اعتراض ہے۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن کریم کے دو دیگر حکموں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ایک حکم سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۵ میں ہے جس میں نبی اکرمؐ کی ازواج مطہرات کو تمام مسلمانوں کی مائیں قرار دیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر ان میں سے ہر خاتون ''ام المومنین'' کہلاتی ہے۔ اور دوسرا حکم اسی سورۃ کی آیت نمبر ۵۳ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ کی کسی بیوی کے ساتھ ان کے بعد کوئی مومن نکاح نہیں کر سکتا۔ گویا ازواج مطہرات کے لیے مومنوں کی ماں ہونے کا لقب محض اعزاز میں نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ عملی پہلو بھی ہیں۔ اس صورت میں یہ الجھن سامنے آرہی تھی کہ باقی جن لوگوں نے چار سے زائد بیویوں کو فارغ کر دیا تھا ایسی خواتین کے لیے نئے نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر ازواج مطہرات نبی اکرمؐ کے گھر سے فارغ ہونے کے بعد کسی دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی تھیں، اس لیے خود ان کے وقار، مستقبل اور تحفظ و مفاد کا تقاضا تھا کہ انہیں فارغ نہ کیا جائے اور وہ بدستور نبی اکرمؐ کے نکاح میں رہیں۔

یہاں ایک بات اور پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی ایک سے زیادہ شادیوں کا تعلق (نعوذ باللہ) جنسی جذبے اور خواہش سے نہیں بلکہ دینی و معاشرتی مصالح سے تھا، اس لیے کہ رسول اللہؐ نے ۲۵ سال سے ۵۰ سال تک کی عمر ایک بیوہ خاتون ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے ساتھ بسر کی جو کسی بھی انسان کی جنسی خواہش اور جذبے کی اصل عمر ہوتی ہے۔ اس دوران حضرت خدیجہ آپ کے نکاح میں رہیں اور حضرت ابراہیمؓ کے علاوہ باقی ساری اولاد بھی انہی کے بطن سے ہوئی، جبکہ عمر میں وہ نبی اکرمؐ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ اس کے بعد حضرت سودہ بنت زمعہؓ آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں اور پھر حضرت عائشہؓ سے نکاح ہوا۔ چنانچہ حضرت سودہؓ کے بعد جتنے نکاح بھی ہوئے ان کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی دینی و معاشرتی مصلحت موجود نظر آتی ہے۔ جبکہ حضرت عائشہؓ سے نکاح کی مصلحت ان کی عظیم دینی و علمی جدوجہد کے حوالہ سے دیکھی جائے تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی گھریلو زندگی اور سنت نبوی کا چار دیواری کے اندر کا علم محفوظ رکھنے اور پورے تفقہ و تیقن کے ساتھ امت تک پہنچانے کے لیے کسی ایسی خاتون کا آنحضرتؐ کی ازواج میں شامل ہونا ضروری تھا جو ذہین و فطین ہونے کے ساتھ

ساتھ عمر کے اس مرحلہ میں ہو جسے تعلیم و تعلم کی عمر کہا جاتا ہے، تاکہ وہ پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ نبی اکرمؐ کی ذاتی اور خاندانی زندگی اور چار دیواری کے اندر کے ارشادات و مصروفیات کا علم حاصل کرے اور امت تک پہنچائے۔ اسی لیے حضرت عائشہؓ کا نکاح جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ بچپن میں ہوا جو تعلیم تعلم کا فطری دور ہوتا ہے اور نو سال سے اٹھارہ سال تک کی عمر رسول اللہؐ کے ساتھ گزار کر حضرت عائشہؓ نے جو کچھ سیکھا، اس کے بعد کم و بیش نصف صدی تک وہ امت کو سکھاتی اور پڑھاتی رہیں۔ اس لیے یہ شادی اور اس کا بچپن میں ہونا امت کی بڑی علمی اور دینی ضرورت کے لیے تھا۔ اسی طرح رسول اللہؐ کی باقی شادیوں کی دینی و معاشرتی مصلحتوں تک بھی رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس پس منظر میں جناب نبی اکرمؐ کا چار سے زیادہ بیویوں کو بدستور اپنے نکاح میں رکھنا دینی و معاشرتی مصالح کے پیش نظر تھا اور خود ان معزز خواتین کے احترام اور مفاد کا تقاضا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی نبی اکرمؐ کو بطور خاص اجازت مرحمت فرمادی تھی۔

عورت کے لیے چار شادیوں کی اجازت کیوں نہیں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ مرد چار بیویاں کر سکتا ہے تو عورت چار خاوند کیوں نہیں کر سکتی؟ اس کا بھی سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو اس کی وجہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

خاندان کو نہ صرف اسلام نے بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اسے سوسائٹی کا بنیادی یونٹ قرار دیا ہے بلکہ دنیا کے ہر مہذب فلسفہ میں خاندان کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ خاندان کے قیام و استحکام کی بنیاد نسب کے تحفظ پر ہے اور نسب کے تحفظ پر ہی خاندان کی تشکیل اور بقا کا دارومدار ہے، کیونکہ جب تک نسب کا تعین اور تحفظ نہ ہو ان رشتوں کا تعین بھی نہیں ہو سکتا جن سے ایک خاندان تشکیل پاتا ہے۔ ایک مرد جتنی زیادہ عورتوں سے جنسی تعلق رکھے، جائز و ناجائز کی بحث سے قطع نظر اگر وہ اپنے اس جنسی تعلق کو تسلیم کرتا ہے تو نسب کے تعین میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور نسب کے ساتھ ساتھ متعلقہ رشتوں کا تعین بھی آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن عورت ایک مرد سے زیادہ لوگوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرے گی تو پیدا ہونے والے بچے کے نسب کا تعین مشکل ہو جائے گا۔

یہ مسئلہ جاہلیت کے دور میں بھی تھا جب زنا کی کھلی اجازت تھی لیکن ان لوگوں نے اس مسئلہ کا حل نکال رکھا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جاہلیت کے دور میں عام طور پر بہت سی عورتیں متعدّد مردوں کے ساتھ جنسی

تعلق قائم کر لیتی تھیں لیکن بچہ پیدا ہونے کی صورت میں وہ عورت ایسے مردوں کا تعین کر کے انہیں طلب کرتی تھی اور سب کی موجودگی میں ان میں سے کسی ایک کو مخاطب کر کے کہتی تھی کہ یہ بچہ تمہارا ہے۔ کسی شخص کو اس فیصلے سے انکار کی جرات نہیں ہوتی تھی اور اسے بچے کی ذمہ داری قبول کرنا پڑتی تھی، جبکہ اس سے زیادہ اشتباہ کی صورت میں قیافہ شناس کو بلایا جاتا تھا جو عورت کی طرف سے جنسی تعلق کے حوالے سے نامزد کیے جانے والے مردوں میں سے قیافہ کی بنیاد پر کسی ایک کا تعین کر دیتا تھا اور اس مرد کو بچے کے باپ کے طور پر ذمہ داری قبول کرنا پڑتی تھی۔

آج مغرب کو بھی اس صورت حال کا سامنا ہے کہ شادی کے بغیر بچوں کی پیدائش بڑھتی جا رہی ہے اور بہت سے بچوں کے باپوں کا تعین ممکن نہیں رہا، مگر مغرب نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ ”سنگل پیرنٹ“ کے قانون کے تحت باپ اور نسب کے تعین کو ہی غیر ضروری قرار دے دیا ہے اور بچے کی پیدائش کی ذمہ داری میں ماں کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ عورت پر صریح ظلم ہے کہ جنسی تعلق میں تو مرد اس عورت کے ساتھ برابر کا شریک ہو مگر اس کے نتائج بھگتنے کے لیے عورت کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ مغرب کو آج فیملی سسٹم کی تباہی اور رشتوں کی پامالی کے حوالے سے جس بحران کا سامنا ہے اس کا سب سے بڑا سبب زنا ہے کہ مغرب نے مرد اور عورت کے جنسی تعلق کے حوالے سے آسمانی تعلیمات سے دستبردار ہو کر فیملی سسٹم کی تباہی کا دروازہ خود کھولا ہے اور اس کے نتائج کو روکنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اس لیے اگر خاندان کو انسانی سوسائٹی کے بنیادی یونٹ کی حیثیت حاصل ہے اور اس کا تحفظ و بقا ضروری ہے تو اس کے لیے نکاح و طلاق کے وہی قوانین فطری اور ناگزیر ہیں جو قرآن پاک پیش کرتا ہے اور سابقہ آسمانی تعلیمات بھی انہی کی تائید کرتی ہیں اس لیے کہ ان کی بنیاد فطرت پر ہے۔

دینی تعلیم کے مختصر کورسز۔ ضرورت و اہمیت

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۰ جولائی ۲۰۰۶ء)

گزشتہ روز تھوڑی دیر کے لیے فیصل آباد جانا ہوا، ملت ٹاؤن میں واقع جامعہ دارالارشاد والاصلاح میں ”فہم دین کورس“ کے آغاز کی تقریب تھی۔ مولانا محمد اشرف ہمدانی کا شمار ایک

دور میں ملک کے معروف خطباء میں رہا ہے۔ جس دور میں وہ گوجرانوالہ کی جامع مسجد پل لکڑ والا میں خطیب تھے، میرا طالب علمی کا آخری دور تھا۔ اس کے بعد وہ جناح کالونی فیصل آباد کی مرکزی جامع مسجد میں خاصا عرصہ خطیب رہے اور اب ملت ٹاؤن فیصل آباد میں مذکورہ بالا عنوان سے ادارہ قائم کر کے سرگرم عمل ہیں۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے سرگرم رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں، اب کچھ عرصہ سے صاحب فراش ہیں اور ان کے فرزند مولانا کفایت اللہ ہمدانی جامعہ میں ان کی نیابت و معاونت کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسکولوں اور کالجوں میں موسم گرما کی تعطیلات کے دوران چالیس روزہ "فہم دین کورس" کا اہتمام کیا ہے جس کی افتتاحی تقریب میں حاضر ہو کر میں نے جمعرات کو مغرب کے بعد کچھ گزارشات پیش کیں۔

کچھ عرصہ سے مختلف شہروں میں اسکولوں اور کالجوں کی سالانہ تعطیلات سے فائدہ اٹھانے کا خوش آئند رجحان بڑھ رہا ہے اور بہت سے ادارے ان چھٹیوں میں اس طرح کے تعلیمی پروگرام کر رہے ہیں۔ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں بھی اکادمی کے ناظم مولانا حافظ محمد یوسف نے اس سال ایک نئے تجربے کا آغاز کیا ہے۔ وہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ میں درس نظامی کی تعلیم کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں اور اس حوالہ سے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے طلبہ نے ان کے اس ذوق سے استفادہ کیا ہے اور ایف اے، بی اے کے امتحانات کے ساتھ درس نظامی میں وفاق المدارس کے امتحانات میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سال انہوں نے اڑھائی ماہ کے دورانیہ کی ایک کلاس شروع کی ہے جس کا افتتاح راقم الحروف نے ۱۰ جون کو کیا ہے اور یہ ۲۵ اگست تک جاری رہے گی۔ مولانا حافظ محمد یوسف کا ارادہ ہے کہ وہ اس کلاس کے طلبہ کو اڑھائی ماہ میں وفاق المدارس العربیہ کا درجہ اولی کا پورا نصاب پڑھا دیں گے اور طلباء اس کا باقاعدہ امتحان دے سکیں گے۔ اس کلاس میں انہیں مڈل، میٹرک اور بی اے سطح کے طلبہ میسر آئے ہیں اور انہیں اطمینان ہے کہ وہ ان شاء اللہ آسانی کے ساتھ مقررہ مدت کے دوران اپنا ہدف پورا کر لیں گے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو میرے خیال میں یہ ایک نیا انقلابی تجربہ ہوگا اور اس سے ملک بھر کے دینی مدارس کو راستہ ملے گا کہ وہ اپنے معمول کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو موسم گرما کی تعطیلات میں درس نظامی کا نصاب پڑھا کر اپنے طلبہ اور فضلاء کی تعداد میں معقول اضافہ کر سکتے ہیں۔

۱۷ جون کو گوجرانوالہ شہر میں مجھے اسی طرح کے ایک کورس کے افتتاح کا موقع ملا جو ہمارے پرانے ساتھی مولانا حافظ گلزار احمد آزاد نے مسجد ختم نبوت (ابوبکر ٹاؤن، سیالکوٹ روڈ، گوجرانوالہ) میں "فہم قرآن کورس" کے نام سے شروع کیا ہے اور اس پچیس روزہ کورس میں وہ شرکاء کو قرآن کریم کی تعلیمات کے حوالے سے ضروریات دین کی تعلیم دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سے ملتا جلتا ایک کورس ضلع نارووال میں ظفروال کے قریب اونچہ کلاں میں مولانا افتخار اللہ شاکر نے شروع کیا ہے جو ۱۵ جون سے شروع ہو کر ۲۹ جون تک جاری رہے گا اور اس کورس کا موضوع قادیانیت، انکار حدیث اور دیگر فتنوں کے خلاف نوجوانوں کو تیار کرنا ہے۔ یہ کورس انہی دنوں میں ہر سال ہوتا ہے اور اس میں مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور حضرت مولانا سید عبد القادر آزادؒ اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں۔ مجھے بھی کم و بیش ہر سال حاضری کا موقع ملتا ہے اور اس سال میں نے ۲۲ جون جمعرات کو ظہر سے عشاء تک کا وقت کورس کے شرکاء کے ساتھ گزارنے کا وعدہ کیا ہے۔

ماشاء اللہ اس طرح کے کورسز ملک کے مختلف شہروں میں اب بڑی تعداد میں ہونے لگے ہیں اور مختلف مکاتب فکر کے ادارے ان کا انتظام کر رہے ہیں۔ گزشتہ روز میں نے ایک بینر عربی زبان کے ایک کورس کا بھی دیکھا جو ہمارے محترم دوست مولانا محمد بشیر سیالکوٹی کے مرکز کی طرف سے تھا۔ مولانا موصوف مسلکا اہل حدیث ہیں اور معتدل مزاج بزرگ ہیں اور مشترکہ دینی کاموں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہونے کے علاوہ مسلک کے اظہار و بیان میں بھی اعتدال کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے مولانا حکیم عبد الرحیم اشرفؒ یاد آجاتے ہیں جو میرے بزرگ دوستوں میں سے تھے اور ہمیشہ شفقت فرماتے تھے، ساری زندگی ملی مسائل کے لیے جدوجہد میں گزاری، ذاکر و شاغل بزرگ تھے اور وحدت امت کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہتے تھے۔ مولانا بشیر سیالکوٹی کو عربی زبان کے فروغ سے بطور خاص دلچسپی ہے اور مختلف سطحوں پر عربی زبان کے مختصر کورسز کراتے رہتے ہیں۔ ان کا مرکز اسلام آباد میں ہے لیکن اس مرکز کے تحت دوسرے شہروں میں بھی کورسز کا اہتمام کرتے ہیں۔

یہ مختصر کورسز عربی زبان کے حوالے سے ہوں، قرآن فہمی کے حوالے سے ہوں، ضروریات دین کی تعلیم کے لیے ہوں یا عقائد کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ہوں، وقت کی اہم ضرورت ہیں اور ان کی طرف دینی اداروں اور مراکز کا بڑھتا ہوا رجحان یقیناً خوش آئند امر

ہے۔ لیکن اس کے لیے چند امور کی طرف بروقت توجہ دینا ضروری ہوگیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان مختصر کورسز میں پڑھایا جانے والا مواد کیا ہے؟ کیونکہ یہ مواد اگر باہمی مشاورت سے طے ہوگا تو اس سلسلہ کی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہوگا اور ہم آہنگی کا دائرہ بھی قائم رہے گا۔ لیکن اگر کیف ما اتفق ہر جگہ الگ الگ نصاب زیر تعلیم ہوگا تو ترجیحات میں تفاوت اور اہداف و مقاصد کا تنوع مزید فکری و ذہنی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سطح پر جو امور سب سے زیادہ ضروری ہیں انہیں درج ذیل ترتیب کے ساتھ ذکر کیا جاسکتا ہے:

- قرآن کریم صحیح تلفظ کے ساتھ اور تجوید کے بنیادی قواعد کے مطابق پڑھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور عوامی سطح پر اس کا اہتمام کم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کوشش کی جائے کہ ان کورسز کے شرکاء کو صحیح تلفظ اور لہجے کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی اس حد تک مشق کروائی جائے کہ وہ خود محنت کرکے قرآن کریم کی صحیح تلاوت کرسکیں۔
- نماز کے ضروری احکام و مسائل اور طریقہ و آداب کے علاوہ نماز میں پڑھے جانے والے وظائف، تسبیحات اور دعاؤں کا تلفظ صحیح کرانے کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی سکھایا جائے۔ تاکہ نماز پڑھتے ہوئے نمازی ذہنی طور پر محسوس کررہا ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیوں پڑھ رہا ہے؟ اسی طرح زکوۃ، روزہ اور حج کے ضروری مسائل سے واقف کرایا جائے۔
- قرآن کریم کی چند سورتیں و آیات اور ان کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث ترجمہ کے ساتھ یاد کرادی جائیں۔ اور روزمرہ معمولات کے حوالے سے مختصر دعائیں بھی ترجمہ کے ساتھ یاد کرائی جائیں۔
- معاشرتی زندگی کے مسائل، خاندانی نظام کی اہمیت، باہمی میل جول کے شرعی آداب، چھوٹے بڑے کے حقوق و آداب، اور انسانی حقوق کے اسلامی تصور واحکام سے متعارف کرایا جائے۔
- حلال و حرام کے مسائل اور ضروری احکام بتائے جائیں۔ اور زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے احکام و مسائل ذہن نشین کرائے جائیں۔

•وجود باری تعالی، توحید، رسالت، قیامت، ختم نبوت، حجیت حدیث، مقام صحابہ کرامؓ اور دیگر ضروریات کے حوالے سے عقائد سے روشناس کرایا جائے۔ اور اہل السنۃ والجماعۃ کے متفقہ عقائد مناسب ترتیب کے ساتھ اہتمام سے پڑھائے جائیں۔

•فکر و تہذیب کی موجودہ عالمی کشمکش سے انہیں آگاہ کیا جائے اور فکری و تہذیبی مسائل کے حوالے سے اہل دین کے موقف اور جدوجہد سے انہیں روشناس کرایا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر موسم گرما کی تعطیلات میں چالیس روزہ یا دو ماہ کے لگ بھگ دورانیہ کے ایسے کورسز کا اہتمام کر کے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات کو ان میں شرکت کی ترغیب دی جائے تو ملک بھر میں دینی تعلیم کے فروغ اور دینی ماحول کے استحکام کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔ جو اسلام اور اہل دین کے خلاف عالمی میڈیا اور لابیوں کی ہمہ گیر یلغار کے ماحول میں دن بدن زیادہ ضروری ہوتی جا رہی ہے۔ میڈیا اور ذرائع ابلاغ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا علاج ہمارے پاس اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دین کی تعلیم کے نظام سے وابستہ کر لیں اور معاشرہ میں قرآن و سنت کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ عام مسلمانوں اور خاص طور پر اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات میں دینی تعلیم کے فروغ اور مسائل و احکام سے واقفیت کا ذوق بیدار کرنے سے بڑی حد تک اس زہر کا تریاق ہو جائے گا جو عالمی میڈیا اور لابیاں مغربی تہذیب و فلسفہ اور ثقافت کے فروغ کے لیے مسلسل پھیلا رہی ہیں۔

ضروریات دین کی حد تک بنیادی تعلیم تو بہر حال ہر سطح پر ضروری ہے اور اس کے لیے ہر دینی ادارہ اور مرکز کو کوئی نہ کوئی پروگرام ان تعطیلات میں ضرور بنانا چاہیے۔ باقی رہی بات درس نظامی کے پورے کورس کی تعلیم کی تو اگر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کا ابتدائی تجربہ کامیاب ہو جائے تو یہ بہت خوشی اور پیشرفت کی بات ہوگی اور اس سے مستقبل کے بہت سے وسیع امکانات کا دروازہ کھلے گا۔ البتہ اس موقع پر دینی مدارس کے وفاقوں بالخصوص وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے یہ گزارش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ ملک بھر میں مختلف موسموں میں اسکولوں اور کالجوں کی سالانہ تعطیلات کے دوران ان کے طلبہ کو کسی نہ کسی درجہ میں دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا کوئی نظم ضرور قائم کریں۔ اور وفاق کی طرف سے

دینی مدارس کو ایسے مختصر کورسز کا ٹاسک دیں جن سے عام لوگوں کے دینی تعلیم کے ساتھ تعلق میں اضافہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قرآن و سنت کی تعلیم کے دائرہ میں شامل کیا جا سکے۔ انفرادی طور پر تو یہ رجحان ملک کے مختلف حصوں میں بڑھ ہی رہا ہے لیکن یہی کام اگر وفاق المدارس العربیہ اور دیگر دینی وفاقوں کی سطح پر ہوگا تو اس کی افادیت اور ثمرات میں کئی گنا اضافہ ہوگا اور وفاقوں کی تعلیمی جدوجہد میں یہ اہم پیشرفت ہوگی۔

فکری ارتداد اور تشکیک کی مہم

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ٦ جولائی ٢٠٠٦ء)

عالمی میڈیا اور بین الاقوامی لابیاں پاکستان میں نہ صرف چند نافذ شدہ اسلامی قوانین و احکام کو ختم کرانے کی تگ و دو کر رہی ہیں بلکہ اسلامی تعلیمات اور احکام و قوانین کے حوالہ سے شکوک و شبہات کی فضا پیدا کرنے میں بھی مسلسل مصروف ہیں۔ نئی نسل ان کی اس مہم کا بطور خاص ہدف ہے اور بہت سے نوجوان طلبہ اور طالبات اسلامی تعلیمات کی حکمتوں اور پس منظر سے پوری طرح واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے شکوک و شبہات کا شکار ہو رہے ہیں۔ معاشرتی مسائل، جدید عالمی ماحول اور تعلیم و میڈیا کی موجودہ بین الاقوامی سرگرمیوں کے باعث جنم لینے والے شکوک و شبہات کو ہمارے شیخ محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے "فکری ارتداد" سے تعبیر فرمایا تھا اور اس پر ایک مستقل مقالہ "ردۃ ولا ابا بکر لہا" (ارتداد پھیل رہا ہے اور اس کے لیے کوئی ابوبکرؓ موجود نہیں ہے) تحریر کیا تھا جس کا مطالعہ ہمارے خیال میں ہر عالم دین اور دینی کارکن کے لیے ضروری ہے۔

یہ فکری ارتداد اب منظم اور مربوط انداز میں آگے بڑھ رہا ہے اور اسے بین الاقوامی لابیوں، عالمی میڈیا اور عالمی تعلیمی نظام کے ساتھ ساتھ بہت سی مسلم حکومتوں، این جی اوز اور مغربی فکر و فلسفہ سے متاثر و مرعوب مسلم دانشوروں کی پشت پناہی حاصل ہے جبکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان اس فکری یلغار کی خصوصی جولانگاہ ہے۔ ہم ایک عرصہ سے علمائے کرام، دانشوروں اور دینی مدارس و مراکز سے گزارش کر رہے ہیں کہ اس فکری ارتداد کی ماہیت، مقاصد اور طریق کار کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے اور نئی نسل کو اس سے بچانے کے لیے مربوط و منظم محنت کی ضرورت ہے۔ مگر کسی حد تک افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اس ضرورت کا احساس بیدار کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے اور ملک میں مجموعی طور

پر وہ ماحول پیدا نہیں ہو رہا کہ نئی نسل کے ایمان و عقیدہ کو بچانے کی فکر کی جائے اور اس کے لیے عملی و فکری سطح پر جن اقدامات کی ضرورت ہے ان کا اہتمام کیا جائے۔ مثلاً اس سلسلہ کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ جو نوجوان اس حوالہ سے کسی شبہ کا شکار ہو جائے اور اسے فی الواقع کسی اسلامی قانون یا حکم کے حوالے سے کوئی شک تنگ کرنے لگے تو اس کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے، ڈانٹ ڈپٹ کر اسے خاموش کرانے کی کوشش نہ کی جائے اور خود اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کی بجائے اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے شک کو دلیل و منطق کے ساتھ افہام و تفہیم کے ماحول میں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

قومی اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اس قسم کے شکوک و شبہات پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ایسے شکوک و شبہات کو، جو دینی تعلیم اور ضروری معلومات سے بے بہرہ نوجوانوں کو جلدی متاثر کر سکتے ہیں، میڈیا کے ذرائع سے بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ لیکن اگر کوئی نوجوان ان میں سے کوئی سوال کسی عالم کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کا جواب چاہتا ہے تو اسے تسلی بخش جواب کی بجائے عام طور پر یہ تنبیہ سننے کو ملتی ہے کہ یہ گمراہی کی باتیں ہیں ان میں مت پڑو۔ اس سے وقتی طور پر وہ خاموش ہو جاتا ہے اور دوبارہ کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں کرتا لیکن اس کے اپنے ذہن کا سارا نظام اتھل پتھل ہو کر رہ جاتا ہے، وہ یا تو شکوک و شبہات کی دلدل میں مزید دھنستا چلا جاتا ہے یا پھر دماغ کی کھڑکیاں بالکل بند کر کے اس قسم کے سوالات پر جلتا کڑھتا رہتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ صورتحال تسلی بخش نہیں ہے اور دینی شخصیات اور اداروں کو اسے بہتر بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔

چند روز سے بعض قومی اخبارات میں اس قسم کے سوالات آرہے ہیں۔ میں نے گزشتہ روز گوجرانوالہ شہر کی ایک مسجد میں مغرب کے بعد مختصر درس میں ان میں سے ایک سوال کو گفتگو کا موضوع بنایا اور اس کا عام فہم انداز میں جواب دیا تو میں نے دیکھا کہ درس میں شریک بہت سے دوستوں کے چہرے کھل اٹھے اور ایسے محسوس ہونے لگا کہ جیسے ان کی کوئی پرانی آرزو پوری ہو رہی ہو۔ بعض احباب نے درس کے اختتام پر مجھ سے مل کر اس پر شکریہ بھی ادا کیا، ایک نوجوان نے دمکتے چہرے کے ساتھ توجہ دلائی کہ اس سے متعلقہ ایک اور سوال بھی آج کے کسی قومی اخبار میں ایک این جی او کی طرف سے سامنے آیا ہے۔ میں نے کہا کہ کسی موقع پر ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا جواب بھی عرض کر دوں گا۔

وہ سوال جس پر میں نے اس درس میں گفتگو کی یہ تھا کہ جب قرآن کریم نے مسلمانوں کو صرف چار شادیوں کی اجازت دی ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ شادیاں کیوں کیں اور وفات کے وقت آنحضرتؐ کی نو بیویاں کیوں تھیں؟ ظاہر بات ہے کہ جس شخص کی معلومات میں صرف یہ بات ہوگی کہ قرآن کریم نے چار سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت نہیں دی اور یہ بھی اس کو معلوم ہوگا کہ جناب نبی اکرمؐ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ کی ۹ بیویاں تھیں تو اس کے ذہن میں مذکورہ بالا سوال کا اٹھ کھڑا ہونا فطری بات ہے۔ اس بات کو میڈیا یا لابی کا کوئی شخص اس کے سامنے بنا سنوار کر پروپیگنڈا کی مخصوص تکنیک کے ساتھ پیش کرے گا تو شک کا کانٹا لازما اس کے ذہن میں پیدا ہوگا اور وہ بے چین ہوگا کہ اس کا جواب معلوم کرکے اپنے ذہن کو مطمئن کرے۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور اس کا یہ حق ہے کہ اس کی بات سنی جائے اور دلیل و منطق کے ساتھ اس کے سوال کا تجزیہ کرکے اسے تسلی بخش جواب دیا جائے۔

میں نے عرض کیا کہ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے چار شادیوں کا حکم نہیں دیا بلکہ جاہلیت کے دور میں غیر محدود شادیوں کا جو رواج تھا اسے محدود کرنے کے لیے چار کی آخری حد مقرر کی ہے۔ اور اس کے ساتھ بھی یہ شرط لگا دی ہے کہ چار تک شادیاں اس صورت میں روا ہیں جب عدل و انصاف کے معروف تقاضے پورے کیے جا سکیں اور اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو قرآن کریم نے صرف ایک شادی پر اکتفا کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے اس حکم کے بعد جن حضرات کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں انہیں چار سے زیادہ بیویاں الگ کرنے کا حکم دے دیا گیا اور وہ الگ ہو گئیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار شادیوں کی حد بندی کے بعد ۹ شادیاں نہیں کیں بلکہ چار سے زائد بیویاں اس دور سے چلی آ رہی تھیں جب چار کی حد بندی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ چار کی حد بندی کے بعد یہ سوال پیدا ہو گیا کہ آنحضرتؐ بھی دوسرے بہت سے حضرات کی طرح چار سے زائد بیویوں سے دستبردار ہو جائیں اور انہیں علیحدہ کر دیں۔ لیکن اس صورت میں رکاوٹ یہ تھی کہ قرآن کریم نے جناب رسول اللہ کی ازواج مطہرات کو تمام مسلمانوں کی مائیں قرار دیا ہے جس کی وجہ سے وہ امہات المؤمنین کہلاتی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ ضابطہ بھی بیان فرما دیا ہے کہ چونکہ حضورؐ کی پاک بیویاں تمام مومنوں کی مائیں ہیں اس لیے آپؐ کے بعد کوئی مسلمان ان

امہات المؤمنین میں سے کسی کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ باقی مسلمان چار سے زائد بیویوں کو الگ کر دیں گے تو ان کا کہیں نہ کہیں نکاح ہو جائے گا مگر آنحضرتؐ جن ازواج کو فارغ کریں گے کدھر جائیں گی؟ کیونکہ ان کا تو کسی سے بھی نکاح نہیں ہو سکے گا جبکہ ان کا مقام یہ ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کی مائیں ہیں لیکن عملی صورتحال یہ ہوگی کہ وہ سوسائٹی میں تنہا ہو کر رہ جائیں گی۔ اس لیے خود ان کے مقام اور احترام کا تقاضا تھا کہ وہ بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہیں اور انہیں الگ نہ کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرمؐ کو اس شرط کے ساتھ اس وقت موجود ساری بیویاں اپنے نکاح میں رکھنے کی اجازت دے دی کہ آپؐ اس کے بعد کوئی نیا نکاح نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی موجودہ ازواج میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ اور نکاح کر سکیں گے۔

حدود آرڈیننس اور اس پر اعتراضات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جولائی ۲۰۰۶ء)

”حدود آرڈیننس“ ایک بار پھر ملک بھر میں موضوع بحث ہے اور وہ لابیاں از سر نو متحرک نظر آ رہی ہیں جو اس کے نفاذ کے ساتھ ہی اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئی تھیں اور قومی اور عالمی سطح پر حدود آرڈیننس کے خلاف فضا گرم کرنے میں مسلسل مصروف چلی آ رہی ہیں۔ اس سے قبل ہم متعدّد بار اس مسئلے کے بارے میں معروضات پیش کر چکے ہیں لیکن موجودہ معروضی صورتحال میں ایک بار پھر اس سوال کا جائزہ لینا ضروری ہو گیا ہے کہ حدود آرڈیننس کیا ہے، اس کے نفاذ کی مخالفت میں کون کون سے طبقے پیش پیش ہیں، اور وہ اس کے خاتمہ کے لیے کیوں سرگرم عمل ہیں؟

”حدود“ اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے اور حدود کا لفظ ان سزاؤں پر بولا جاتا ہے جو مختلف معاشرتی جرائم میں قرآن و سنت میں طے کی گئی ہیں۔ سزاؤں کا وہ حصہ جن کے تعین اور ان میں کمی بیشی میں اسلامی حکومت، مقننہ اور عدلیہ کو اختیار حاصل ہے ”تعزیرات“ کہلاتا ہے۔ لیکن چند سزائیں طے شدہ ہیں جن میں کمی بیشی یا معافی کا حکومت، مقننہ یا عدلیہ میں سے کسی کو شرعاً اختیار حاصل نہیں ہے اور یہ ”حدود“ کہلاتی ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا قرآن کریم نے ہاتھ کاٹنا بیان کی ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآن کریم کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی ہے۔

اس لیے شریعت اسلامیہ میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جب کسی عدالت میں کسی شخص پر چوری کا الزام ثابت ہو جائے تو عدالت اس بات کی پابند ہے کہ اسے وہی سزا دے جو قرآن و سنت نے بیان کی ہے۔ اسے تبدیل کرنے، معاف کرنے یا اس میں لچک پیدا کرنے کا عدالت کو اختیار نہیں ہے۔

معاشرتی جرائم کی یہ سزائیں قرآن کریم سے پہلے توراۃ اور بائبل کے احکام میں بھی شامل رہی ہیں اور اسلام نے ان سزاؤں کو باقی رکھ کر دراصل بائبل کے احکام کے تسلسل کو بحال رکھا ہے، اس لیے اگر آج کے عالمی ماحول میں ہاتھ کے کاٹنے اور سنگسار کرنے کی سزاؤں کو سخت اور معاذ اللہ وحشیانہ قرار دیا جا رہا ہے تو یہ الزام صرف قرآن کریم پر یا شریعت اسلامیہ پر عائد نہیں ہوتا بلکہ بائبل بھی اس "جرم" میں برابر کی شریک ہے اور اسے اس میں قرآن کریم پر سبقت حاصل ہے۔

جہاں تک پاکستان میں ان حدود اللہ کے نفاذ کا تعلق ہے، اس کا مطالبہ تو قیام پاکستان کے وقت سے ہی ہو رہا تھا کہ یہ نفاذ اسلام کا ایک اہم تقاضا تھا، لیکن اس کی عملی نوبت جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور صدارت میں آئی اور انہوں نے ایک آرڈیننس کی صورت میں اسے ملک میں نافذ کر دیا جو "حدود آرڈیننس" کہلاتا ہے اور مسلسل مخالفت اور اعتراضات کا ہدف ہے۔ اس کی متعدّد دفعات کو نہ صرف وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کر دیا گیا ہے بلکہ اس کی منسوخی کے لیے قومی اسمبلی میں باقاعدہ بل لانے کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے نافذ کردہ اس حدود آرڈیننس پر پاکستان میں اور عالمی سطح پر دو طبقوں کو اعتراض ہے اور وہی اس کے خاتمے کے لیے مسلسل تگ و دو کر رہے ہیں۔

• ایک طبقہ وہ ہے جو سرے سے حدود اللہ کے نفاذ کے خلاف ہے۔ وہ چور کا ہاتھ کاٹنے، زانی کو سنگسار کرنے، جھوٹی تہمت پر کوڑے لگانے، یا قصاص میں عضو کے بدلے عضو کاٹنے کو بھی غلط سمجھتا ہے۔ وہ قرآن کریم کی بیان کردہ سزاؤں کو اس دور کے قبائلی معاشرہ کی ضرورت سمجھتے ہوئے آج کے دور میں ان کے نفاذ کو غیر ضروری بلکہ غلط قرار دیتا ہے اور یہ طبقہ اس معاملے میں مغرب کے فکر و فلسفہ سے مکمل طور پر متفق اور ہم آہنگ ہے۔

• دوسرا طبقہ وہ ہے جو ان حدود کے اسلامی ہونے کا قائل ہے لیکن اسے شکایت ہے کہ ان حدود کی تعبیر و تشریح کے لیے حدود آرڈیننس مرتب کرنے

والوں نے ان حضرات کے موقف اور تعبیرات کو معیار تسلیم کرنے کی بجائے امت مسلمہ کے جمہور فقہائے کرام کی تعبیرات کو کیوں بنیاد بنایا ہے؟ اور حدود شرعیہ بلکہ اسلامی احکام و قوانین کی جدید تعبیر و تشریح کرنے والے ان دانشوروں کے نقطۂ نظر کو توجہ کے قابل کیوں نہیں سمجھا؟ اس پر یہ حضرات اس قدر سیخ پا ہیں کہ سرے سے حدود آرڈیننس کو منسوخ اور ختم کرانے کے لیے پہلے طبقہ کے شانہ بشانہ جا کھڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان حضرات کی یہ شکایت بجائے خود محل نظر ہے اور اپنی تعبیرات کو ہر حال میں امت سے قبول کرانے کے لیے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

گزشتہ دنوں ایسے ہی ایک دوست سے میرا اس مسئلہ پر مکالمہ ہوا۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ کیا حدود کی تعبیر و تشریح میں فقہائے امت کی تعبیرات حرف آخر ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ کیا آپ کی تعبیرات حرف آخر ہیں؟ اس پر وہ چپ ہوگئے۔ میں نے گزارش کی کہ کسی بھی سلیم العقل اور صاحب انصاف کو یہ صورتحال پیش آجائے کہ ایک طرف امت کے جمہور فقہاء کی تعبیرات ہوں اور دوسری طرف چند دانشور حضرات اپنی تعبیرات کو اس کے مقابلے پر پیش کر رہے ہوں تو ایک انصاف پسند شخص امت کے چودہ سو سالہ تعامل اور تمام دینی و علمی مکاتب فکر کے جمہور علماء کی اجتماعی تعبیرات کو چند دانشوروں کی آرا پر قربان کرنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں ہوگا۔ ایسے اصحاب دانش کی حالت انتہائی قابل رحم ہے جو مولوی پر یہ الزام لگاتے ہوئے نہیں تھکتے کہ وہ ضدی ہے، ہٹ دھرم ہے اور دوسروں کے نقطہ نظر کا احترام نہیں کرتا، لیکن خود ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا یہ عالم ہے کہ امت کے چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل اور آج کے جمہور علمائے امت کے اتفاقی موقف کے سامنے چند افراد اس بات پر مصر ہیں کہ قرآن و سنت کے احکام و مسائل میں ان کی تعبیرات و تشریحات کو ہر حال میں قبول کیا جائے اور صرف انہی کو ''معیار حق'' قرار دے کر احادیث نبویہؐ اور فقہ اسلامی کے پورے ذخیرے کو ان کے سامنے ''سرنڈر'' کرا دیا جائے، ورنہ وہ مغرب کے ساتھ ہیں اور سرے سے اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کو غیر ضروری قرار دینے والوں کی صف میں کھڑے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ حدود آرڈیننس کا وہ حصہ جس کا تعلق تطبیق و نفاذ کی عملی صورتوں سے ہے، حرف آخر نہیں ہے اور موجودہ عدالتی نظام کے پس منظر میں ان میں سے بعض

باتوں پر نظر ثانی ہو سکتی ہے، لیکن یہ یکطرفہ بات ہے، اس لیے حدود کے نفاذ کو جس عدالتی نظام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ بجائے خود محل نظر ہے اور نیچے سے اوپر تک اس کی ہر سطح اور ماحول چیخ چیخ کر نظر ثانی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ حدود آرڈیننس کے نفاذ سے جو مشکلات اور شکایات عملی طور پر سامنے آئی ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق آرڈیننس کی بعض شقوں سے ہو سکتا ہے، لیکن ان میں سے بیشتر شکایات اور مشکلات کا تعلق موجودہ عدالتی سسٹم اور اس کے پیچ در پیچ نظام سے ہے اور یہ شکایات صرف حدود کے حوالے سے نہیں بلکہ ملک کا ہر قانون اس عدالتی سسٹم کی پیچیدگی اور تہہ در تہہ الجھنوں کا نوحہ کناں ہے۔ مگر ہمارے یہ دانشور اس سارے ملبہ کو حدود آرڈیننس پر ڈال کر اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہیں۔

کچھ عرصہ قبل توہین رسالتؐ کی سزا کے قانون کے حوالہ سے سوال اٹھا تھا کہ اس کا غلط استعمال ہو رہا ہے اس لیے اسے ختم کر دیا جائے۔ ہم نے گزارش کی تھی کہ کون سا قانون ملک میں ایسا ہے جس کا غلط استعمال نہیں ہو رہا؟ اگر کسی قانون کو ختم کر دینے کے لیے صرف یہی جواز کافی ہو کہ اس کے غلط استعمال ہونے کا امکان موجود ہے تو ملک کے پورے قانونی نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا ہو گا اس لیے کہ ملک میں کوئی قانون بھی ایسا نہیں ہے جس کا غلط استعمال نہ ہو رہا ہو اور جس کے غلط استعمال کا امکان موجود نہ ہو مگر اس کا تعلق قانون سے نہیں بلکہ قانونی نظام اور معاشرتی ماحول سے ہوتا ہے۔

اس پس منظر میں ہمیں ان حضرات سے کوئی شکوہ نہیں ہے جو اس حوالہ سے مغرب کی نمائندگی کر رہے ہیں اور سرے سے حدود کے نفاذ ہی کے مخالف ہیں اس لیے کہ ان کا موقف واضح ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام کا نام لے کر مغرب کے موقف اور ایجنڈے کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں، ان سے شکوے کا حق ہم ضرور رکھتے ہیں کیونکہ جسٹس (ر) دراب پٹیل اور عاصمہ جہانگیر کے ساتھ جب ہم محترم جاوید احمد غامدی صاحب اور ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی کو ایک ہی صف میں کھڑا دیکھتے ہیں تو بہر حال ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔

تہذیبی چیلنج۔ سیرت طیبہؐ سے رہنمائی لینے کی ضرورت

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱مئی ۲۰۰۶ء)

ربیع الاول کا مہینہ ہر سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی تذکرہ اور یاد کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی شرعی حکم نہیں ہے لیکن اس ماہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کی مناسبت سے تذکرہ نبویؐ کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے اور دنیا بھر میں مسلمانوں کے مختلف طبقات اپنے اپنے انداز اور طریقہ کے مطابق نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ، حالات مبارکہ، اور ارشادات مقدسہ کے تذکرہ کے لیے تقاریب کا انعقاد کرتے ہیں۔ اس سال یہ تقاریب اس حوالے سے پہلے سے زیادہ اور منفرد اہمیت کی حامل ہیں کہ یورپ کے بعض اخبارات میں جناب نبی اکرمؐ کے خیالی اور توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کے بعد مسلمانان عالم میں اضطراب واحتجاج کی جو لہر اٹھی ہے، اس کے مناظر ابھی ذہنوں میں تازہ ہیں اور ربیع الاول کے یہ اجتماعات بھی اسی تسلسل کا حصہ دکھائی دے رہے ہیں۔

اس وقت عالمی سطح پر فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے مختلف رویوں کے درمیان کشمکش اور تصادم کے بڑھتے ہوئے امکانات کی جو صورتحال پیدا ہوگئی ہے اور جس میں اسلام ایک واضح فریق کے طور پر سامنے آرہا ہے، اس کے پیش نظر نبی اکرمؐ کی سیرت و تعلیمات کے زیادہ سے زیادہ تذکرہ کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے، اس لیے کہ اس تہذیبی اور فکری کشمکش میں قرآن کریم اور سنت نبویؐ ہی سے ہم صحیح سمت کی طرف رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں، اور فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے ان رویوں کا سامنا کرسکتے ہیں جو اسلام کو عالمی منظر سے اس حوالے سے ہٹا دینے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ وہ رویے جن کا تقاضا ہے کہ جس طرح بہت سے دوسرے مذاہب سوسائٹی کی فکری رہنمائی اور ثقافتی و معاشرتی قیادت سے دستبردار ہوگئے ہیں، اسی طرح اسلام کو بھی معاشرتی قیادت کے منظر سے ہٹ جانا چاہیے اور دوسرے مذاہب کی طرح اپنی سرگرمیوں اور ہدایات کو شخصی اور پرائیویٹ دائروں تک محدود کرلینا چاہیے۔

آج کے عالمی منظر میں مسلمانوں کو فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے یہی سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے اور آج نبی اکرمؐ کی سیرت و تعلیمات کا اس پس منظر میں

مطالعہ کرنے اور اسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ سیرت نبویؐ کا جس حوالے سے بھی تذکرہ کیا جائے یہ اجر و ثواب، رہنمائی، اور برکات کا ذریعہ ہے۔ آپؐ تو سراپا رحمت و برکت ہیں اور اجر و ثواب کا سرچشمہ ہیں، لیکن ہمیں اپنی ضروریات کو دیکھنا ہے، اپنی کمزوریوں پر نظر رکھنی ہے اور اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ پھر ان ضروریات، کمزوریوں، اور کوتاہیوں کا پہلا دائرہ ہمارا داخلی دائرہ ہے، اس کے تقاضے مختلف ہیں، جبکہ دوسرا دائرہ عالمی اور بین الاقوامی ہے جو ہمارے داخلی دائرے سے الگ ہونے کے باوجود تیزی سے بڑھتے ہوئے گلوبل ماحول کی وجہ سے اپنے فاصلے کم کرتا جا رہا ہے، اور دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

اس پس منظر میں نبی اکرمؐ کی سیرت و تعلیمات کے ان پہلوؤں کو ترجیحی بنیاد پر سامنے لانے کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے جن کا تعلق ہماری موجودہ ضروریات، کمزوریوں، اور کوتاہیوں سے ہے۔ اسی طرح نبی کریمؐ کی تعلیمات و ارشادات کے ان حصوں کو زیادہ اہمیت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنا ضروری ہو گیا ہے جو آج کے عالمی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور جن میں ان اشکالات و شبہات کا جواب پایا جاتا ہے جو آج کی دنیا کی طرف سے اسلام کے بارے میں نمایاں کیے جا رہے ہیں، اور جن کا جواب دینے کی مختلف اطراف سے کوششیں جاری ہیں۔ بدقسمتی سے ہم اس حوالے سے بھی افراط و تفریط کا شکار ہیں اور ہماری طرف سے ان معاملات میں دو مختلف بلکہ متضاد رویے سامنے آ رہے ہیں جو کنفیوژن کا باعث بن رہے ہیں اور مسائل کے حل کی بجائے ان میں اضافے کا سبب بنتے جا رہے ہیں۔ مثلاً ایک رویہ یہ ہے کہ آج کی دنیا کو درپیش مسائل و مشکلات اور اس کے حل کے لیے منطقی اور فطری ضروریات کی نفی کرتے ہوئے اور ان سے آنکھیں بند کرتے ہوئے رسول اللہؐ کے ارشاد و تعلیمات کو اسی انداز اور ماحول میں پیش کیا جاتا ہے جس کا ہمیں اب سے دو سو سال یا تین سو سال قبل سامنا تھا۔ ہم جب آج کے ماحول اور تناظر میں تین سو سال قبل کے ماحول اور تناظر کے مطابق مسائل اور احکامات کو پیش کرتے ہیں تو اس سے منطقی طور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اسلام میں معاشرتی ارتقا کے ساتھ چلنے کی صلاحیت نہیں ہے، اور وہ تبدیل ہونے والے حالات اور تقاضوں کو اپنے اندر ضم کرنے یا اپنے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کا ذوق نہیں رکھتا۔

اب سے تین سو سال قبل یورپ میں مسیحیت کو اس قسم کی صورت حال درپیش تھی۔ مذہب کے علمبردار اپنے احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح میں زمانے کے تغیرات اور ماحول کی تبدیلی کا لحاظ رکھنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو یورپ کے عوام نے فیصلہ کر لیا کہ معاشرتی ارتقا کا راستہ روکا نہیں جا سکتا اور نہ ہی ان کی تمدن کی ترقی پر قدغن لگائی جا سکتی ہے، اس لیے اگر مذہب ارتقا اور ترقی کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اسے اپنی جگہ کھڑا رہنے دیا جائے اور سوسائٹی کو اپنی رفتار کے ساتھ آگے بڑھنے دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب اور سوسائٹی کا باہمی رشتہ ٹوٹ گیا اور مذہب کی رہنمائی اور اس کی حدود کی پابندی سے آزاد ہو کر سوسائٹی نے ''مادر پدر آزادی'' کا راستہ اختیار کر لیا جس کے خوفناک نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ بدقسمتی سے آج اسلام کے بارے میں بھی یہی سوچ نمایاں کی جا رہی ہے اور اس تاثر کو عام کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں جدید دور کے تقاضوں کو اپنے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اس لیے اسے مسجد کے دائرہ میں رہنے دیا جائے اور شخصی زندگی میں اس کے کردار کی نفی نہ کی جائے۔ البتہ سوسائٹی کو مذہب کی رہنمائی اور اس کے احکام و حدود کی پابندی سے آزاد کر دیا جائے۔ اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے بہت سے ارباب دانش جو اس صورت حال سے پریشان ہیں اور اس سوال کا اپنے اپنے طور پر جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں، ان میں سے کچھ دوست دوسری انتہا کی طرف جاتے دکھائی دے رہے ہیں کہ ان کے معاشرت و تمدن کے جدید مسائل و مشکلات اور ان کے بارے میں موجودہ انسانی سوسائٹی نے جو حل سوچ لیا ہے یا ان سے نکلنے کے لیے جو راستہ طے کر لیا ہے، اسی کو حتمی معیار سمجھ لیا جائے اور اس کے مطابق قرآن کریم اور نبی اکرمؐ کے ارشادات و تعلیمات کی نئی تعبیر و تشریح کر لی جائے، تاکہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ قرآن و سنت کی روشنی میں کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ تعبیر و تشریح ہماری خود ساختہ ہی کیوں نہ ہو۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں رویے غلط ہیں اور انتہا پسندانہ ہیں۔ اصل راستہ ان دونوں کے درمیان ہے جو اگرچہ بہت نازک اور حساس ہے لیکن اس کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح نئی ضروریات اور ان کے بارے میں زمانے کی سوچ کو معیار تسلیم کر کے قرآن و سنت کی اس کے مطابق نئی تعبیر و تشریح کرنا غلط اور گمراہ کن طرز عمل ہے، اسی طرح نئی ضروریات کو نظر انداز کر دینا اور ان کا کوئی نہ کوئی حل نکالنے کی

ضرورت محسوس نہ کرنا بھی غلط ہے اور اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ نبی اکرمؐ کے بعد قرآن کریم کی جمع و ترتیب اور تدوین و کتابت کے بارے میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا، وہ ہماری اس گزارش کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ مختلف جنگوں میں قرآن کریم کے حفاظ کی کثرت کے ساتھ شہادتوں کی خبر سن کر حضرت عمرؓ کو تشویش ہوئی اور انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ قرآن کریم کو مرتب انداز میں لکھ کر محفوظ کر لینا چاہیے۔ یہ ایک نئی ضرورت تھی جو حالات کے تحت پیدا ہو گئی تھی، اسے حضرت عمرؓ نے محسوس کیا اور انہوں نے خلیفۃ المسلمین حضرت صدیق اکبرؓ کے سامنے اس ضرورت کا تذکرہ کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے ابتدا میں یہ کہہ کر اس کام سے انکار کر دیا کہ ایک کام نبی اکرمؐ کے زمانے میں نہیں ہوا تھا، میں کیسے کر سکتا ہوں؟ لیکن جب حضرت عمرؓ نے بار بار اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کریم کی جمع و ترتیب اور تدوین و کتابت کا اجتہادی فیصلہ کر لیا۔ لیکن جب انہوں نے جناب نبی اکرمؐ کے خصوصی کاتب حضرت زید بن ثابتؓ کو بلا کر یہ کام ان کے سپرد کرنا چاہا تو انہوں نے بھی پہلے مرحلہ میں وہی بات کہی جو حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہی تھی کہ جو کام جناب نبی اکرمؐ کے زمانے میں نہیں ہوا تھا وہ کام مجھے کرنے کے لیے آپؓ کیسے کہہ رہے ہیں؟ ان دونوں بزرگوں نے انہیں اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا تب وہ اس کے لیے تیار ہوئے۔

ان بزرگوں کا یہ مکالمہ اور پھر فیصلہ ہمارے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک اصول اور بنیاد ہے کہ کوئی نئی اجتماعی ضرورت پیش آ جائے تو اسے نظر انداز کر دینا دانش مندی نہیں ہے بلکہ اس ضرورت کو تسلیم کرنا، اس کی اہمیت کو سمجھنا، اور اس کا حل نکالنا اہل علم کی دینی ذمہ داری ہے۔ کوئی ضرورت اپنے حل سے زیادہ دیر تک محروم نہیں رہتی کیونکہ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوگا کہ اہل علم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس کا کوئی حل نکالیں گے تو وہ شرعی اصولوں کی روشنی میں ہوگا اور دین کے دائرے میں ہوگا لیکن اگر اہل علم اپنی ذمہ داری پوری نہیں کریں گے تو لوگ خود اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے جو ظاہر ہے کہ دینی اصولوں اور تقاضوں کے دائرہ کا پابند نہیں ہوگا اور اس سے دین سے انحراف کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس حوالے سے ایک اور تاریخی اور اجتہادی فیصلے کا تذکرہ کرنا چاہوں گا کہ نبی اکرمؐ اور پہلے دونوں خلفاء حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر

رضی اللہ عنہما کے دور میں لوگوں سے زکوۃ وصول کرنا بیت المال کی ذمہ داری تھی اور بیت المال کے نمائندے ہر قسم کے اموال کی زکوۃ سرکاری طور پر وصول کیا کرتے تھے، لیکن امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں یہ محسوس کیا کہ لوگوں کے پاس جو ذاتی اور پرائیویٹ رقم ہوتی ہے، سرکاری طور پر اس کی زکوۃ وصول کرنے کی صورت میں ان کی "پرائیویسی" متاثر ہوتی ہے اور لوگوں کے ذاتی معاملات میں سرکاری اہل کاروں کا تجسس بڑھتا ہے۔ اس لیے انہوں نے "اموال ظاہرہ" اور "اموال باطنہ" کا فرق کر کے لوگوں کی ذاتی اور پرائیویٹ رقوم کو زکوۃ کے سرکاری وصولی کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا اور کہا کہ اس قسم کے اموال کی زکوۃ لوگ اپنی ذمہ داری پر خود ادا کیا کریں تاکہ ان کی پرائیویسی متاثر نہ ہو اور سرکاری اہل کار خواہ مخواہ لوگوں کی ذاتی و پرائیویٹ رقوم اور اموال کا کھوج نہ لگاتے پھریں۔

اس نوع کی بیسیوں مثالیں آپ کو اسلامی تاریخ میں ملیں گی۔ خلفائے راشدینؓ کے دور میں، صحابہ کرامؓ کے دور میں، اور ان کے بعد کم و بیش ہر دور میں آپ اس کی مثالیں دیکھیں گے کہ کوئی اجتماعی ضرورت پیدا ہوئی، کسی نئے معاشرتی تقاضے نے سر اٹھایا، تو اہل علم نے اس کا بروقت نوٹس لیا اور اس کا حل نکالا۔ اور شریعت اسلامیہ کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر کہیں اجتہادی دائروں میں تعبیر و تشریح اور تطبیق و تنفیذ کے زاویے تبدیل کرنا پڑے تو ان سے گریز نہیں کیا۔ اسی کا نام اجتہاد ہے، اسی کو زمانے کے بدلتے ہوئے اور بڑھتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ شریعت کو زمانے کے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنا اور چیز ہے، اور زمانے کے تقاضوں کا ادراک و احساس کرتے ہوئے شریعت کے اصولوں کے دائرے میں ان کو پورا کرنے کی کوشش کرنا اس سے بالکل مختلف امر ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آج نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ، حالات مبارکہ، اور ارشادات مقدسہ کو پیش کرتے ہوئے زمانے کی اس ضرورت کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے جدید چیلنج سے نمٹنا کوئی زیادہ مشکل امر نہیں ہے، لیکن اس کے لیے ارباب عزم و ہمت اور اصحاب فہم و ادراک کی ضرورت ہے جو آگے بڑھیں اور جدید تہذیب و فلسفہ کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے وقت کے فکری دھارے کا رخ موڑ دیں۔

سرور کائناتؐ اور اتحاد بین المسلمین

(جامع مسجد، فیز تھری، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، لاہور - ۱۱ اپریل ۲۰۰۶ء)

(ربیع الاول کی بارہویں شب کو ''سرور کائناتؐ اور اتحاد بین المسلمین'' کے عنوان پر خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ۔ مجھے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ہزاروں پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو پر کچھ عرض کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ آقائے نامدار امت مسلمہ کے اتحاد کا مرکزی نقطہ ہیں۔ حضورؐ کی ذات اقدس ہمیشہ مسلمانوں کی وحدت کا مرکز رہی ہے، آج بھی امت آپؐ کی ذات پر مجتمع ہے، اور قیامت تک آپؐ تمام مسلمانوں کی یکساں عقیدت و اطاعت کا مرکز رہیں گے۔ اس عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے میں وقت کے اختصار کے باعث صرف تین حوالوں سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

1. اتحاد کا مطلب کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟

2. مسلمانوں کو آپس میں متحد رکھنے کے لیے جناب نبی اکرمؐ نے جن سینکڑوں ارشادات گرامی میں تلقین فرمائی ہے ان میں سے چند ارشادات نبویؐ کا ذکر کروں گا۔

3. توہین رسالتؐ کے اخباری خاکوں کی اشاعت کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں نے اجتماعی طور پر جناب رسول اللہؐ کے ساتھ جس شدت سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے رسول اکرمؐ کی ذات گرامی ایک بار پھر مسلمانوں کی وحدت و اجتماعیت کے مرکزی نکتے کے طور پر دنیا کے سامنے آئی ہے، اس بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

اتحاد کا مطلب اور اس کے تقاضے

پہلی بات یہ کہ اتحاد کسے کہتے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی قوم کے درمیان اختلافات پیدا نہ ہونے کو اتحاد کہا جاتا ہے۔ یعنی اتحاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ اول تو اختلاف پیدا نہ ہو اور اگر کسی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جائے تو یہ اتحاد ختم ہو جائے۔ میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ کیونکہ اختلاف ایک فطری امر ہے، جہاں بھی انسان باہم اکٹھے ہوں گے ان کے درمیان اختلاف

پیدا ہوگا، یہ عقل و فطرت کا تقاضہ ہے اور اسلام اس کی نفی نہیں کرتا۔ اللہ تعالی نے انسانوں کو عقل و فہم کے مختلف درجات سے نوازا ہے، مزاج الگ الگ ہیں، اور نفسیات میں بے پناہ تفاوت ہے، اس لیے اختلاف پیدا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ اختلاف کو ختم ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ اختلاف اگر پیدا ہوگا تو وہ باقی بھی رہے گا۔ ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اختلاف اور چیز ہے جبکہ تفرقہ اور چیز ہے۔ قرآن کریم نے اختلاف سے کسی جگہ بھی منع نہیں کیا البتہ تفرقہ سے منع کیا ہے۔ چنانچہ اتحاد بین المسلمین پر گفتگو کرتے ہوئے میں اس نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں اور اس سلسلے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیسیوں ارشادات میں سے دو کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسجد نبویؐ میں ایک صاحب نماز پڑھ رہے تھے جس میں وہ بلند آواز سے قرأت کر رہے تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی جو اس طرح نہیں تھی جس طرح حضرت عمرؓ نے جناب رسول اللہؐ سے پڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ چونکہ وہ میرے حساب سے قرآن کریم کی آیت غلط پڑھ رہا تھا اس لیے مجھے سخت غصہ آیا، قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی اسے دبوچ لیتا مگر میں نے صبر کیا اور اس کے نماز مکمل کرنے کا انتظار کیا۔ جونہی اس نے نماز مکمل کی میں نے اس کے گلے میں چادر ڈالی اور کھینچتا ہوا اسے جناب رسول اللہؐ کے پاس لے گیا کہ یا رسول اللہ! یہ شخص نماز میں قرآن کریم غلط پڑھ رہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ پہلے اس کی گردن تو چھوڑو، میں نے اسے چھوڑ دیا تو آپؐ نے اس سے فرمایا کہ وہ آیت جس طرح تم پڑھ رہے تھے اب پڑھ کر سناؤ۔ اس نے سنا دی۔ پھر مجھے فرمایا کہ جس طرح تمہیں یاد ہے تم سناؤ۔ میں نے بھی سنا دی۔ اس پر نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اس نے بھی ٹھیک پڑھا ہے اور تم نے بھی درست پڑھا ہے۔

یہ دراصل قرأتوں کا اختلاف تھا۔ کسی بھی زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا تلفظ اور لہجہ علاقوں اور قوموں کے فرق سے بدل جاتا ہے لیکن معنی ایک ہی رہتا ہے۔ لفظ بھی بنیادی طور پر وہی ہوتا ہے لیکن لہجہ اور تلفظ بدل جاتا ہے اور بعض اوقات سپیلنگ بھی بدل جاتے ہیں۔ میں مثال کے طور پر پنجابی کے ایک لفظ کا حوالہ دوں گا کہ ہمارے ہاں کسی کام کی کیفیت پوچھنے کے لیے ''کیوں'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے مختلف تلفظ

میں کہیں یہ لفظ کیویں ہے، کہیں کداں ہے، کہیں کیکن ہے، کہیں کنجو ہے، اور کسی علاقے میں اسے کیاں کے تلفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ یعنی لفظ اور معنی ایک ہی ہے لیکن تلفظ اور ادائیگی مختلف ہے۔ یہ زبان پر علاقائی اثرات ہوتے ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم جب نازل ہوا تو اسے قریش کے لہجے اور تلفظ میں پڑھنے کی پابندی تھی۔ آپؐ نے بارگاہ ایزدی میں خود درخواست کی کہ ایک ہی لہجے اور تلفظ کا سب عربوں کو پابند بنانے سے بہت سے عرب قبائل کو قرآن کریم پڑھنے میں دقت پیش آسکتی ہے اس لیے اس معاملے میں سہولت پیدا کی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری استدعا پر اللہ تعالی نے قرآن کریم کو سات مختلف لہجوں اور قرأتوں میں پڑھنے کی اجازت دے دی تاکہ تمام لہجوں اور قرأتوں کے ساتھ لوگ آسانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر سکیں۔ اب یہ اختلاف ایسا ہے جو آنحضرتؐ نے خود مانگ کر لیا ہے اس لیے کہ یہ فطری ضرورت تھا۔

دوسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے مستقل الگ وضو فرماتے تھے، لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ایک ہی وضو کے ساتھ پورے دن کی نمازیں پڑھ ڈالیں۔ حضرت عمرؓ نے اس بارے میں دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے آج ایسا کام کیا ہے جو اس سے پہلے آپ نہیں کیا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے الگ وضو کرنا اگرچہ بہت اجر و ثواب کی بات ہے لیکن اس کی پابندی سے بہت سے لوگوں کو دقت ہوگی۔ اس لیے حضورؐ نے ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں ادا کر کے اسے بھی سنت میں شامل فرما لیا تاکہ کسی کو ایسا کرتے ہوئے کوئی الجھن نہ ہو۔ یہ صرف ایک مثال میں نے ذکر کی ہے اس طرح کی بیسیوں بلکہ سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک کام کو جناب رسول اللہؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے انجام دیا تاکہ طریقوں میں تنوع ہو اور لوگوں کو اپنی سہولت کے مطابق ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کرنے میں یہ پریشانی نہ ہو کہ حضورؐ نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔

اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ اسلام نے اختلاف کی نفی نہیں کی بلکہ اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا احترام کیا ہے اور اسے برقرار رکھا ہے۔ البتہ اسلام نے اختلاف

کی حدود کا تعین کیا ہے اور ہر اختلاف کو اس کے دائرے میں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔
اختلاف کی حدود میں پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ جہاں اختلاف کی گنجائش ہو وہاں اختلاف کیا جائے اور جہاں اختلاف کی گنجائش نہ ہو وہاں اختلاف کرنے سے گریز کیا جائے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے بریرہؓ کے ایک واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنی باندی بریرہؓ کو آزاد کر دیا تو وہ ایک صحابی مغیثؓ کے نکاح میں تھیں۔ آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر بریرہؓ کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اگر مغیثؓ کے نکاح میں نہ رہنا چاہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ بریرہؓ نے ایسا ہی کیا اور مغیثؓ سے نکاح ختم کر لیا۔ اس پر مغیثؓ کو پریشانی ہوئی اور اس نے مختلف اطراف سے بریرہؓ کو واپسی پر آمادہ کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں حتیٰ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق مغیثؓ کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھومتے رہتے تھے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو منا لائے؟ حضورؐ نے یہ صورتحال دیکھ کر خود بریرہؓ سے بات کی اور اس بارے میں اس سے پوچھا۔ بریرہؓ نے جواب دیا کہ یہ میرا شرعی حق تھا جو میں نے استعمال کیا ہے کیونکہ میں مغیثؓ کے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم اپنا یہ فیصلہ واپس نہیں لے سکتیں؟ اس نے بڑے ادب سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ بڑی سمجھدار خاتون تھی، اور کیسے نہ ہوتی کہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہ رہی تھی۔ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اس نے یہ سوال کر کے ایک حد فاصل قائم کر دی کہ جناب نبی اکرمؐ کے کسی حکم کو نہ ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ مشورہ کی صورت میں اختیار باقی رہتا ہے۔ جب حضورؐ نے فرمایا کہ میں حکم نہیں دے رہا بلکہ مشورہ دے رہا ہوں تو اس نے بے ساختہ کہا کہ میں اپنے فیصلہ پر قائم ہوں اور مجھے مغیثؓ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر جگہ اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی اور اختلاف وہیں کیا جا سکتا ہے جہاں اس کی گنجائش ہو۔ مثلاً قرآن کریم کے کسی حکم کو سمجھنے اور اس کا مصداق طے کرنے میں تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن نفس حکم سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد اور عمل کا مفہوم و منشا متعیّن کرنے میں تو اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ارشاد و عمل سے اختلاف کی کوئی گنجائش

نہیں ہے۔ لہذا اختلاف کی حدود میں پہلی بات یہ ضروری ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ کہاں اختلاف کی گنجائش ہے اور کہاں نہیں ہے۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ضروری ہے کہ ہر اختلاف کو اپنی سطح پر اور اپنے درجہ میں رکھا جائے۔ ہمارے ہاں اختلاف پر ایک دوسرے کے خلاف فتوی بازی کا جو رجحان زور پکڑ گیا ہے یہ درست نہیں ہے۔ ہر اختلاف کفر و اسلام کا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر اختلاف حلال و حرام کا ہوتا ہے۔ بعض جگہ صرف اولی و غیر اولی اور ترجیحات کا اختلاف ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں فتوی بازی ہر اختلاف کے حوالے سے یکساں ہوتی ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اس رجحان پر قابو پانا وحدت امت کے لیے آج کے دور کا سب سے بڑا تقاضہ ہے۔ اس سلسلہ میں جناب نبی اکرمؐ کے ایک ارشاد گرامی کا حوالہ دوں گا جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کو کافر کہا اگر وہ کافر نہ ہو تو کفر کا فتوی کافر کہنے والے پر واپس لوٹ آئے گا۔ اور جس شخص نے کسی مسلمان پر لعنت بھیجی ہے جبکہ وہ لعنت کا مستحق نہیں تو یہ لعنت بھیجنے والے پر واپس آئے گی۔ یہی فتوے ہمارے ہاں سب سے بڑے فتوے شمار ہوتے ہیں جن کی اہمیت اور نزاکت جناب نبی اکرمؐ نے ان ارشادات گرامی میں بیان فرمائی ہے۔ اگر اختلافات کی حدود کو قائم رکھا جائے اور بلاوجہ فتوی بازی سے گریز کر کے ہر اختلاف کو اس کی سطح پر اور اس کے دائرے میں محدود رکھا جائے تو یہ اختلاف امت کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ یہ اختلافات نہ صرف فطرت کا تقاضہ اور رحمت ہیں بلکہ ہماری معاشرتی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔

وحدت امت کے لیے آنحضرتؐ کے ارشادات

اس کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنے بہت سے ارشادات میں ہمیں باہمی وحدت برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں جناب رسالت مابؐ نے دور جاہلیت کے خاتمے کا اعلان کر کے اسلام اور روشنی کے دور کا آغاز کیا اور یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ ''کل امر الجاہلیۃ تحت موضوع قدمی'' کہ جاہلیت کی تمام اقدار آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ ان میں شرکت و بدعت، نسل پرستی، زبان و رنگ کا امتیاز، بدکاری، شراب، جوا، سود، کہانت و نجوم، ناچ گانا، عریانی، اور باہمی قتل و قتال کی جاہلی اقدار شامل تھیں جنہیں جناب رسول

اللہؐ نے تئیس سالہ محنت کے ساتھ ختم کیا اور ان جاہلی اقدار سے پاک اسلامی معاشرے کا آغاز فرمایا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ آج یہ تمام اقدار ایک ایک کر کے پھر ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان روایات کا ابوجہل، ابولہب، نضر بن حارث، اور دیگر کافر سرداروں کے حوالہ سے ذکر کیا جاتا ہے تو وہ جاہلی اقدار کہلاتی ہیں جبکہ وہی اقدار ہماری سوسائٹی کا حصہ بنتی ہیں تو تمدن، سولائزیشن، ترقی، یا آرٹ کا عنوان اختیار کرلیتی ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ نے اپنے خطبے میں ہمیں اس بات کی تلقین بھی فرمائی تھی کہ میرے بعد کفر و جاہلیت کے دور کی طرف واپس نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانا اور باہمی قتل وقتال کسی بھی عنوان سے ہو، اسے جناب رسول اللہؐ نے کفر و جاہلیت سے تعبیر کیا ہے جبکہ ایک حدیث میں اسے اللہ تعالی کے عذاب کی ایک صورت قرار دیا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میں نے اللہ تعالی سے اپنی امت کے لیے چار باتوں کا سوال کیا، اللہ تعالی نے ان میں سے تین چیزیں عطا فرمائیں لیکن ایک نہیں دی۔ میں نے سوال کیا کہ میری امت پر مجموعی طور پر پہلی امتوں جیسا عذاب نازل نہ ہو، یہ بات اللہ تعالی نے قبول فرمالی۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت یکبارگی گمراہی کا شکار نہ ہو، یہ بات بھی قبول کرلی گئی۔ میں نے گزارش کی کہ میری امت ساری کی ساری یکبارگی تباہ نہ ہو، یہ بات بھی قبول ہوگئی۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت آپس میں نہ لڑے تو یہ بات اللہ تعالی نے قبول نہیں فرمائی۔ جبکہ ایک اور حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت پر جب اللہ تعالی کا عذاب نازل ہوگا تو اس کی عملی صورتیں تین ہوں گی۔ ایک یہ کہ میری امت کے لوگ آپس میں لڑیں گے اور ایک دوسرے کا خون بہائیں گے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالی امت کے شریر لوگوں کو ان پر مسلط کردیں گے۔ اور تیسرا یہ کہ امت کے نیک لوگوں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں، اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ یعنی آنکھ کو تکلیف ہو تو سارا جسم اسے محسوس کرتا ہے اور اگر پاؤں کو کو درد تو جسم کے سارے اعضاء اسے محسوس کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس لیے کوئی مسلمان

نہ اپنے دوسرے بھائی پر خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے ظلم کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کرتا ہے۔

ان ارشادات نبویؐ کی روشنی میں دیکھا جائے تو امت کے موجودہ افتراق کے اسباب کو تلاش کرنا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ آج کے دور کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم امت کے افتراق کے اصل اسباب کو تلاش کریں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ جناب رسول اللہؐ نے ہمیں اسی کی تلقین فرمائی ہے اور اس حوالے سے ہماری یہی دینی و ملی ذمہ داری ہے۔

توہین رسالت کے خاکے اور امت مسلمہ کا اجتماعی ردعمل

اس کے بعد میں گفتگو کے آخری نکتے کی طرف آتا ہوں کہ ہماری تمام تر خرابیوں، کمزوریوں، اور بداعمالیوں کے باوجود توہین رسالتؐ کے خلاف عالم اسلام کے حالیہ اجتماعی احتجاج سے ایک بار پھر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان وحدت و اتحاد کا مرکزی نکتہ آج بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ یہ بات جہاں حضورؐ کی کا اعجاز اور اسلام کی صداقت کا اظہار ہے وہاں اس بات کی بھی علامت ہے کہ مسلمانوں کے ایمان کا کنکشن آج بھی قائم ہے۔ یہ کنکشن درست ہے اور اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ البتہ ہمارے ''سیٹوں'' میں کمزوری ہے، اگر ہم اپنے سیٹ ٹھیک کرلیں اور ان کی خرابیوں کو دور کرلیں تو حضورؐ کی عقیدت کا کنکشن آج بھی ''اسٹیبل'' ہے اور اس کی برکتیں اور بہاریں بدستور تازہ ہیں۔

یورپ کے بعض اخبارات نے تو یقیناً یہ کارروائی شر کے خیال سے کی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں سے خیر کا یہ پہلو نکال دیا ہے کہ حضرت محمدؐ کے ساتھ مسلمانانِ عالم کی بے لچک کمٹمنٹ کا ایک بار پھر اظہار ہوگیا ہے اور مغرب کو اس تکلیف دہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ اس نے گزشتہ تین صدیوں کے درمیان مسلمانوں کی کمٹمنٹ کے مراکز تبدیل کرنے کی جو محنت کی تھی وہ رائیگاں جا رہی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی کمٹمنٹس کی ترجیحات میں آج بھی سرفہرست اسلام اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، باقی تمام کمٹمنٹس کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ یہ حضورؐ کی ذات گرامی، سیرت مبارکہ، اور تعلیمات کا وہ اعجاز ہے جس کا مشاہدہ ہم جیسے گئے گزرے مسلمان بھی کر رہے ہیں اور ساری دنیا اس منظر کو دیکھ رہی ہے۔ اس لیے ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آج کے دور میں ہمارے لیے یہی پیغام ہے کہ اپنی اصل کی طرف واپس پلٹیں اور

آپؐ کی سیرت و اسوۂ حسنہ سے روشنی حاصل کر کے اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگیوں کا جزو بنا لیں۔

تحفظ ناموس رسالتؐ کے سلسلہ میں اہل علم کی ذمہ داری

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ اپریل ۲۰۰۶ء)

صفر کے آغاز میں مدرسہ نصرۃ العلوم کے سہ ماہی امتحان کی تعطیلات کے موقع پر تین روز کے لیے کراچی جانے کا اتفاق ہوا، جامعۃ الرشید، جامعہ انوار القرآن، جامعہ بنوریہ، دفتر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، جامعہ عثمانیہ معین آباد لانڈھی، مجلس علمی جمشید روڈ، مسجد سبیل گورو مندر چوک اور دیگر اداروں میں حاضری، مختلف دینی اجتماعات میں شرکت اور پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام جامعہ انوار القرآن میں منعقدہ ''تحفظ ناموس رسالتؐ کانفرنس'' میں کچھ معروضات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا زرولی خان صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا اسفندیار خان صاحب، حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی، حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم، حضرت مولانا مفتی محمد نعیم، حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری، حضرت مولانا سید فضل الرحمن شاہ، بریگیڈیئر ڈاکٹر قاری فیوض الرحمن اور دیگر سرکردہ علماء کرام سے ملاقات و گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ اس دوران ایک نشریاتی ادارے کی فرمائش پر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں ''حجۃ الوداع'' کے حوالہ سے مختصر گفتگو ریکارڈ کرائی جس کا خلاصہ کچھ دیگر متعلقہ گزارشات کے ساتھ درج ذیل ہے۔

جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ہر پہلو تاریخ کے حوالہ سے اہم اور قیامت تک کے لیے مشعل راہ ہے اسی لیے اس کے تحفظ اور اسے تاریخ کے ریکارڈ میں پوری تفصیل کے ساتھ لانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں سب سے زیادہ اہمیت ''حجۃ الوداع'' کو حاصل ہے اس لیے کہ اس روز جناب نبی اکرمؐ کے اس مشن کی عملی تکمیل ہوئی تھی جس کا اعلان آپؐ نے نبوت ملنے اور پہلی وحی نازل ہونے کے بعد صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر اہل مکہ کے سامنے کیا تھا۔ اور وہ مشن تھا شرک، بت

پرستی اور جاہلیت کی دیگر اقدار کا خاتمہ اور پوری نسل انسانی کو اللہ تعالی کی توحید کے اقرار، اس کی بندگی اور اس کے احکام کی پیروی پر جمع کر کے دنیا میں کلمۃ اللہ کی سربلندی اور اسلام کا غلبہ قائم کرنا۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تئیس سال سے بھی کم عرصہ کی مدت میں کامیابی حاصل کی اور جزیرہ عرب میں بت پرستی اور جاہلی اقدار کا خاتمہ کر کے اسلام کے غلبہ کے دور کا آغاز فرمایا۔ اس موقع پر جناب رسول اکرمؐ نے ایک تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ "کل أمر الجاهلية موضوع تحت قدمی" جاہلیت کی ہر بات آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ میں اس ارشاد نبویؐ کی اس طرح تعبیر کیا کرتا ہوں کہ آنحضرتؐ نے اعلان کیا کہ میں جاہلیت کے تمام نظاموں اور اقدار و روایات کو پاؤں تلے روند کر انسانی سوسائٹی کے قافلہ کو علم، دین اور وحی الہی کی روشنی کی طرف لے کر بڑھ رہا ہوں۔ یہ تاریخ کا ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا جب آسمانی تعلیمات کی تکمیل کا اعلان ہوا، وحی الہی مکمل ہوئی، جاہلیت کے دور کا خاتمہ ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرمؐ نے علاقائیت، قومیت، رنگ، نسل اور زبان کی تفریقوں سے بالاتر ہو کر پوری نسل انسانی کو بلا امتیاز خطاب کرتے ہوئے عالمگیریت اور گلوبلائزیشن کے دور کا آغاز کیا۔

اس موقع پر جناب نبی اکرمؐ نے جو تاریخی اعلانات فرمائے وہ احادیث کے ذخیرے میں حجۃ الوداع کے خطبہ کے عنوان سے متفرق طور پر موجود ہیں، صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے ذوق اور یادداشت کے مطابق اس کے مختلف حصوں کو نقل کیا ہے اور محدثین و مؤرخین نے پورے استناد و اہتمام کے ساتھ ان ارشادات نبویؐ کو حدیث و تاریخ کے ذخیرے میں محفوظ کر لیا ہے۔ اس پر بہت سے محدثین نے کام کیا ہے اور اسے مجتمع صورت میں پیش کرنے کے لیے خاصی محنت کی ہے چنانچہ اس وقت بعض ایسے مجموعے دستیاب ہیں جن میں خطبہ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر روایات کی چھان بین کر کے اس کے مستند متن کو مرتب شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ اس تاریخی اعلان کو بلاشبہ انسانی حقوق کی پہلی جامع دستاویز کا درجہ حاصل ہے اور یہ انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی تعلقات و قوانین کے حوالہ سے سب سے مکمل اور جامع دستاویز ہے کہ اس میں اقوام و طبقات اور افراد و اشخاص کے باہمی حقوق و معاملات کی حدود بیان کی گئی ہیں اور انسان پر اس کے پیدا کرنے اور اس کی پرورش کرنے والی ذات اللہ تعالی کے حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور اسلام کا یہی امتیاز ہے کہ وہ صرف حقوق اللہ یا صرف حقوق العباد کی بات نہیں کرتا بلکہ انسان کو اللہ

تعالی اور اس کے بندوں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ایسا توازن قائم کرتا ہے جو نسل انسانی کی دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے ناگزیر ہے اور جس توازن سے ہٹ کر نسل انسانی نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔

نبی کریمؐ نے اس تاریخی موقع پر جاہلیت کی بہت سی اقدار کا نام لے کر ان کے خاتمہ کا اعلان کیا:

- ان میں ایک بڑی جاہلی لعنت سود کی تھی، آپؐ نے اس کی قطعی حرمت کا اعلان کیا اور اس کی پہل اپنے گھر سے کرتے ہوئے کہا کہ میرے چچا عباسؓ سود کا کاروبار کرتے آئے ہیں، آج کے بعد جس کے ذمہ ان کا قرض ہے وہ صرف اصل رقم واپس کرے گا، اس کے ساتھ سود کی رقم کی واپسی نہیں ہوگی۔
- آنحضرتؐ نے جاہلی دور کے باہمی قتل وقتال اور اس کے بدلہ در بدلہ کی روایت کو ختم کیا اور اپنے خاندان کے ایک مقتول کا قصاص معاف کر کے اس سلسلہ کے خاتمہ کی طرف عملی پہل کی۔
- جناب نبی اکرمؐ نے عورت کی مظلومیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کے حقوق کی ادائیگی کی تلقین فرمائی اور یتیم کے بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے حقوق و مفادات کے تحفظ کی ہدایت کی، اس کے ساتھ میاں بیوی کے باہمی حقوق کی وضاحت کی اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کا حکم فرمایا۔
- جناب رسول اللہ نے اس موقع پر انسان کی جان، مال، آبرو اور جسم کے تحفظ کا ان الفاظ کے ساتھ اعلان فرمایا کہ "ان دماءکم وأموالکم وأعراضکم وأبشارکم حرام علیکم کحرمة یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا" (بخاری شریف) تمہارے خون، تمہارے اموال، تمہاری عزتیں اور تمہارے چمڑے ایک دوسرے پر اسی طرح محترم ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے، اس شہر مقدس کی حرمت ہے اور اس مبارک ماہ کی حرمت ہے۔

اللہ تعالی کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تاریخی خطبہ کی تفصیلات سامنے رکھ کر آج کے عالمی حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاہلیت ایک بار پھر انسانی سوسائٹی میں عود کر آئی ہے جس سے نبی اکرمؐ نے نسل انسانی کو نجات دلائی تھی اور وہ

جاہلی اقدار و روایات ایک ایک کر کے پھر سے انسانی معاشرت کا حصہ بن گئی ہیں جن کو قدموں تلے روندنے کا آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا تھا۔ اس لیے جناب رسول اکرمؐ کی سیرت مبارکہ کے حوالہ سے آج ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم نسل انسانی کو آپؐ کے اس عالمگیر پیغام سے ایک بار پھر آگاہ کر دیں جو آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں پوری نسل انسانی کو دیا تھا۔ لیکن دنیا کو پیغام دینے کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم خود اس پیغام پر عمل پیرا ہوں اور اس کا عملی نمونہ پیش کر کے انسانی سوسائٹی کو اس جاہلیت جدیدہ سے نجات دلانے کی محنت کریں جو جاہلیت قدیمہ کی تمام تر روایات و اقدار کو اپنے اندر سموئے ہوئے نئے میک اپ اور عنوان کے ساتھ دنیا پر مسلط ہو گئی ہے۔ نسل انسانی کے نام جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی پیغام ہے جسے آج کے لوگوں تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اور اسے پورا کر کے ہی ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

مجلس علمی کراچی ایک پرانا علمی مرکز ہے جس کی وسیع لائبریری کچھ عرصہ پہلے تک ٹاور کے علاقہ میں تھی اور حضرت مولانا محمد طاسینؒ کی نگرانی میں علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا مرکز تھی، اس مجلس علمی کے تحت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ جیسے اکابر علماء جدید پیش آمدہ مسائل پر مشترکہ مشاورت کے ساتھ امت کی راہنمائی فرمایا کرتے تھے۔ اب یہ ذوق ناپید ہوتا جا رہا ہے، بہت سے علمی و دینی مراکز اپنے اپنے ذوق کے مطابق علمی و دینی خدمت میں مصروف ہیں اور امت کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں لیکن باہمی مشاورت اور تبادلہ خیالات کے مواقع بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ فقہ حنفی کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ مشاورتی فقہ ہے اور کسی ایک فرد کی فکر و تفقہ کا نتیجہ ہونے کی بجائے اجتماعی علمی کاوش اور مشاورتی اجتہادی مساعی کا ثمرہ ہے، خدا کرے کہ آج کے دور میں جبکہ اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے، اس ذوق کے پھر سے بیدار ہونے کی کوئی صورت نکل آئے، آمین یا رب العالمین۔ یہ مجلس علمی اور اس کی لائبریری اب بنوری ٹاؤن میں جامعہ علوم اسلامیہ کے قریب جمشید روڈ پر منتقل ہو گئی ہے اور حضرت مولانا محمد طاسینؒ کے فرزند جناب عامر طاسین صاحب جو حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے نواسے ہیں، اس کی نگرانی اور انتظام کی ذمہ داری نباہ رہے ہیں۔ ان کی دعوت پر مجلس علمی میں حاضری ہوئی، انہوں نے

مخصوص احباب کی ایک فکری نشست کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں مجھ سے یہ تقاضہ کیا گیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توہین آمیز خاکوں کی یورپی اخبارات میں اشاعت اور اس پر امت مسلمہ کے ردعمل کے حوالہ سے کچھ عرض کروں۔ میں نے گزارش کی کہ:

• جہاں تک امت مسلمہ کے اجتماعی اور عوامی ردعمل کا تعلق ہے وہ تو خوب ہوا ہے، اور یورپ کے اخبارات نے جو شر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کا یہ پہلو سامنے آیا ہے کہ پوری امت نے اجتماعی طور پر ایک بار پھر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ کا اظہار کر کے دنیا کو یہ پیغام دے دیا ہے کہ کسی مسلمان سے کسی دور میں بھی یہ توقع نہ رکھی جائے کہ وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ان کے ساتھ عقیدت و محبت سے کبھی دستبردار ہو سکتا ہے۔ اس طرح اپنے بنیادی عقیدہ اور جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ مسلمانوں کی بے لچک وابستگی ایک بار پھر نکھر کر سامنے آگئی ہے لیکن یہ سب کچھ عوامی سطح پر ہوا ہے، مسلم حکمرانوں نے اس سلسلہ میں وہ کچھ نہیں کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا اور جو وہ موجودہ حالات میں کر سکتے تھے، ان کی ذہنی مرعوبیت اور مغرب سے خوف کی حالت ابھی تک وہی ہے جو انتہائی افسوسناک ہے۔

• اس کے ساتھ ہی ایک اور پہلو پر توجہ کی ضرورت ہے کہ عوامی سطح پر جو احتجاج ہونا چاہیے تھا وہ ہو چکا اور عوام کے مختلف طبقات جو کر سکتے تھے وہ انہوں نے کر دیا، اس کے اثرات بھی ہیں اور فوائد بھی سامنے آرہے ہیں۔ لیکن اس سارے معاملہ سے جو علمی اور فکری سوالات از سر نو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جنہیں بہت زیادہ اجاگر کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے ان کے حوالہ سے علمی اداروں کا کام اب شروع ہوا ہے کہ ان سوالات کا تجزیہ کر کے ان کے پس منظر میں اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کا موقف علمی انداز میں سامنے لایا جائے۔

1. آزادی رائے کی حدود کیا ہیں؟
2. اسلام تنقید برداشت کرتا ہے یا نہیں؟
3. تنقید اور توہین میں کیا فرق ہے؟

4. توہین رسالتؐ پر مسلمان اس قدر جذباتی کیوں ہو جاتے ہیں، وہ دوسروں کو اپنی رائے کے آزادانہ اظہار کا حق کیوں نہیں دیتے؟

5. آج کی عالمگیر برادری اور ماحول میں مسلمان باہمی برداشت اور رواداری سے کام کیوں نہیں لیتے اور وہ دوسرے مذاہب کی نفی اور ان کے خلاف سخت طرز عمل کے خوگر کیوں ہیں؟

ان میں سے کوئی سوال بھی نیا نہیں ہے، ہر سوال تاریخ میں کئی بار دہرایا گیا ہے اور ہر دور میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن آج پھر یہ سوالات نئے تناظر میں دوبارہ سامنے آرہے ہیں تو اہل علم اور علمی مراکز کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان سوالات کا از سر نو سامنا کریں اور آج کے اسلوب اور زبان میں دلیل اور منطق کے ساتھ ان سوالات و اشکالات کا جواب دیں، تحفظ ناموس رسالتؐ کی جدوجہد میں یہ اہل علم کی ذمہ داری ہے جس کی طرف انہیں توجہ دینی چاہیے۔

کراچی: علم اور ابلاغ / بحث و مباحثہ / تفسیری منصوبہ / بچوں کی تعلیم

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۳ مارچ ۲۰۰۶ء)

مدرسہ نصرۃ العلوم میں سہ ماہی امتحان کے بعد دو تین چھٹیوں کی گنجائش تھی، میں نے یہ تین روز کراچی میں گزارنے کا پروگرام بنا لیا کہ اسباق کے دوران لمبے سفر کی گنجائش نہیں ملتی۔ ۶ مارچ پیر کو رات کراچی پہنچا اور ۱۰ مارچ کو صبح واپسی ہوئی، اس دوران مختلف حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں اور متعدّد دینی اجتماعات اور فکری نشستوں میں حاضری کا موقع ملا۔

حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی نے پاکستان شریعت کونسل کی طرف سے جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن میں ”تحفظ ناموس رسالت کانفرس“ کا اہتمام کر رکھا تھا جو ۷ مارچ کو مغرب کے بعد انہی کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوئی اور اس میں راقم الحروف کے علاوہ حضرت مولانا اسفند یار خان، حضرت مولانا زرولی خان، بریگیڈیئر (ر) قاری فیوض الرحمان، مولانا عبدالرشید انصاری، مولانا قاری حضرت ولی اور دوسرے علماء کرام نے

خطاب کیا۔ جامعہ انوار القرآن میں ہی درجہ تخصص کے طلبہ کے لیے دونوں روز صبح نماز فجر کے بعد خصوصی کلاس کا اہتمام تھا جس میں ''مغرب سے مکالمہ کی ضرورت، ترجیحات اور تقاضے'' کے عنوان سے گفتگو ہوئی۔ اسی عنوان پر جامعۃ الرشید کے اساتذہ کی نشست میں اسی روز شام کو گفتگو کی، دونوں محافل میں پیش کی گئی گزارشات کا خلاصہ ایک الگ کالم کی صورت میں پیش کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جامعۃ الرشید میں تخصص کی مختلف کلاسوں کے شرکاء کے ساتھ ایک الگ نشست ہوئی جس میں حصول علم اور ابلاغ کے حوالہ سے بات چیت کی اور فضلاء سے عرض کیا کہ ابلاغ کے لیے علم کی تکمیل ضروری ہے۔ اگر علم مکمل نہیں ہوگا تو ابلاغ ادھورا اور ناقص ہوگا جو فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث بنتا ہے، لیکن اگر علم ہوگا اور ابلاغ نہیں ہوگا تو کتمان علم کی بات ہوگی جس پر قرآن کریم نے سخت عذاب کی وعید بیان کی ہے۔ حصول علم میں دو باتیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ علم میں رسوخ اور فن میں مہارت ہو اور دوسری یہ کہ معلومات میں وسعت، تنوع اور ثقاہت ہو۔ جبکہ ابلاغ میں یہ ضروری ہے کہ زبان اور اسلوب دونوں سادہ اور عام فہم ہوں کیونکہ اگر مخاطب کے فہم تک رسائی نہیں ہوگی تو ابلاغ کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ میں نے تخصص کے کورس کے شرکاء سے گزارش کی کہ وہ ان ضروریات کو سمجھیں اور ان کو سامنے رکھتے ہوئے خود کو مختلف شعبوں میں دین وملت کی خدمت کے لیے تیار کریں۔

جامعۃ الرشید کی اس نشست میں ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کی پالیسی کے حوالہ سے ایک سوال ہوا۔ ماہنامہ الشریعہ اکتوبر ۱۹۸۹ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، اس کا مدیر مسئول میں خود ہوں جبکہ ادارت کی ذمہ داری حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ کے سپرد ہے۔ اس کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اس میں مختلف حلقوں کی بعض تحریریں شائع ہوتی ہیں جو آپس میں متضاد بھی ہوتی ہیں اور بعض مضامین متعدّد قارئین کے نزدیک قابل اعتراض ہوتے ہیں۔ اس کے جواب میں عرض کیا کہ اس سلسلہ میں کنفیوژن صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ الشریعہ کو مسلکی ترجمان کے طور پر دیکھا جاتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ الشریعہ مختلف دینی وعلمی عنوانات پر بحث و مباحثہ کا ایک فورم ہے جس کے ذریعہ کسی بھی مسئلہ پر قارئین کے مثبت اور منفی دونوں قسم کے مضامین پیش کیے جاتے ہیں اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ جس مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے اس پر مختلف مؤقف اور ان کے دلائل براہ راست قارئین کے سامنے پیش کیے جائیں۔ یہ مکالمہ اور مباحثہ کا صحیح اسلوب ہے اور الشریعہ علمی و

فکری مسائل پر مباحثہ کے ایک فورم کے طور پر خدمات سرانجام دے رہا ہے کہ وہ اس انداز پر الجھن کا شکار ہونے کے بجائے مباحثہ میں شریک ہوں اور اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کریں کیونکہ مباحثہ اور مکالمہ کی روایت اسی طرح آگے بڑھتی ہے جو آج کی ضرورت ہے۔

جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی میں بھی حاضری ہوئی، جامعہ کے اساتذہ کی جماعت ان دنوں قرآن کریم کی ایک نئی تفسیر پر کام کر رہی ہے جس میں مشاورت کے درجہ میں مجھ سے بھی ان کا رابطہ ہے۔ جامعہ بنوریہ کے مہتمم مولانا مفتی محمد نعیم صاحب کی خواہش ہے کہ ایک ایسی تفسیر قرآن کریم سامنے آئے جو اسلوب، معلومات اور قرآنی معارف کے اعتبار سے آج کی ضرورت پوری کر سکتی ہو اور علماء کرام کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے استفادہ کا ذریعہ بھی بنے۔ اس حوالہ سے اردو میں متعدّد تفاسیر موجود ہیں لیکن قرآن کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زنی اور نت نئے موتی نکالنے کا عمل ہر دور میں جاری رہے گا۔ اس لیے اس سلسلہ میں کسی بھی کوشش کو حرف آخر قرار نہیں دیا جاسکتا اور کسی بھی نئی کوشش کی ضرورت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جامعہ کے اساتذہ اور مہتمم مولانا مفتی محمد نعیم کے ساتھ تفسیر قرآن کریم کے سلسلہ میں ایک مجلس ہوئی اور اب تک ہونے والے کام کا جائزہ لیا گیا۔ اس روز جامعہ کے امتحانات ہو رہے تھے، مختلف شعبوں میں امتحانات کا نظم دیکھ کر خوشی ہوئی۔

اقرأ روضۃ الاطفال میں حاضری ہوئی جو ہمارے عزیز اور شہید دوست مفتی جمیل خانؒ کی یادگار اور صدقۂ جاریہ ہے۔ مولانا مفتی خالد محمود نے بتایا کہ حسن اتفاق سے اقرأ روضۃ الاطفال کی ملک بھر کی شاخوں کے ناظمین مشاورت کے لیے جمع ہیں، ان سے مختصر گفتگو ہو جائے۔ چنانچہ ان سے گزارش کی کہ آپ حضرات اقرأ روضۃ الاطفال کے ذریعے ایک اہم دینی وملی خدمت کے لیے سرگرم عمل ہیں اور اس وقت انسانی سوسائٹی میں وحی الٰہی کے ساتھ عام لوگوں کا رابطہ قائم کرنے کی مہم میں مصروف ہیں جو بڑے اعزاز اور فخر کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور ملی ضرورت کی تکمیل بھی آپ حضرات کے ہاتھوں ہو رہی ہے، اس پر میں نے ایک واقعہ ذکر کیا کہ اب سے کوئی ربع صدی قبل گوجرانوالہ کے ایک مخیر دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ ہمارے دینی مدارس میں جو طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ زیادہ تر کن علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ صوبہ سرحد، کشمیر اور پنجاب کے مغربی اور جنوبی اضلاع سے ان کا تعلق ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اساتذہ بھی زیادہ

ترائی علاقوں سے ہیں۔ کہنے لگے کہ کیا ہمارا کام صرف چندہ دینا ہی ہے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ جب ہم چندہ دیتے ہیں، خرچ کرتے ہیں تو ہمارے علاقے کے بچوں کے لیے ان مدارس میں دینی تعلیم کا اہتمام کیوں نہیں ہوتا؟ میں نے گزارش کی کہ یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو دینی تعلیم نہیں دلواتے۔ انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب اس کی وجہ پر آپ نے غور کیا؟ میں نے عرض کیا کہ آپ بتا دیں۔ کہنے لگے کہ ہم اپنے بچوں کو دین کے ساتھ دنیا بھی پڑھانا چاہتے ہیں، آپ اپنی تعلیم میں دونوں باتوں کو شامل کر لیں پھر ہم سے شکوہ کریں کہ ہم اپنے بچوں کو دین کیوں نہیں پڑھاتے۔ اس پس منظر میں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقرأ روضۃ الاطفال اور اس قسم کے دوسرے بہت سے ادارے ایک اہم ملی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور آپ حضرات کو اسی جذبہ کے ساتھ اپنے کام کو آگے بڑھانا چاہیے۔

اقرأ روضۃ الاطفال کے بعد حضرت مولانا سید فضل الرحمان کے ہاں حاضری ہوئی جو نقشبندی سلسلہ کے معروف روحانی پیشوا حضرت مولانا سید زاور حسین شاہ صاحبؒ کے فرزند ہیں اور علمی ذوق سے بہرہ ور بزرگ ہیں۔ سیرت نبویؐ ان کا خاص موضوع ہے اور اپنے اس محبوب عنوان پر مسلسل مصروف عمل رہتے ہیں۔ ان کے فرزند ڈاکٹر حافظ سید عزیز الرحمان سے بھی ملاقات ہوئی جن سے ملنے کو ایک عرصہ سے جی چاہتا تھا اس لیے کہ سیرت نبویؐ پر اس فاضل نوجوان کی تحریریں اور محنت کا اسلوب دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اور مستقبل کے حوالے سے امید قائم رہتی ہے کہ علم و تحقیق اور ذوق و اسلوب کا میدان ان شاء اللہ تعالیٰ خالی نہیں رہے گا۔ ''السیرۃ'' کے نام سے ایک معیاری اور تحقیقی ششماہی مجلہ ان کی ادارت میں شائع ہوتا ہے اور ماہنامہ ''مسیحائی'' کراچی کی ادارت بھی ان کے ذمہ ہے جس کا سیرت النبی نمبر اس موقع پر انہوں نے مرحمت کیا جو معیاری مضامین کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ حافظ عزیز الرحمان سے مل کر دلی خوشی ہوئی اور دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ ''مستقبل کی اس امید'' کو نظر بد سے بچائیں، آمین یا رب العالمین۔

مجلس علمی کراچی حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا محمد طاسینؒ کی حسین یادگار ہے۔ ایک عرصہ تک مجلس علمی کا دفتر اور لائبریری ٹاور میں رہی، اس دور میں حضرت مولانا محمد طاسینؒ کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔ اب یہ لائبریری اور دفتر بنوری ٹاؤن میں جمشید روڈ پر ہے۔ حضرت مولانا محمد طاسینؒ کی علمی خدمات بالخصوص اسلامی اقتصادیات پر ان کا تحقیقی کام آج کے دور کا ایک اہم علمی اثاثہ

ہے۔ ان کے فرزند جناب عامر طاسین اس علمی اثاثہ کو نئی نسل تک پہنچانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی دعوت پر مجلس علمی میں حاضری ہوئی اور تحفظ ناموس رسالت کے تقاضوں کے حوالے سے ارباب علم و دانش کی ایک نشست میں شرکت کا موقع ملا۔ میں نے عرض کیا کہ یورپ کے بعض اخبارات کی طرف سے جناب نبی کریمؐ کی شان اقدس میں گستاخی کے خلاف دنیا بھر کے عام مسلمانوں نے اپنے ایمانی جذبات کا اظہار کر دیا ہے لیکن اس حوالہ سے جو علمی اور فکری سوالات اٹھے ہیں اور آزادی رائے، برداشت، تنقید اور ابلاغ کی حدود جیسے عنوانات پر بحث و مباحثہ کا آغاز ہوا ہے، اہل علم و دانش کو ان کی طرف سنجیدہ توجہ دینی چاہیے اور علم، منطق اور استدلال کے ساتھ اسلام کے موقف کی وضاحت کرنی چاہیے۔

معین آباد لانڈھی کے جامعہ عثمانیہ میں مولانا حافظ اقبال اللہ ہزاروی کی دعوت پر حاضری ہوئی اور علماء وطلبہ کی ایک نشست سے خطاب کیا۔

میرا جمعرات کو شام واپسی کا ارادہ تھا لیکن حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی نے جمعرات کو رات جامع مسجد فاروق اعظم حیدرآباد میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام "تحفظ ناموس رسالتؐ کانفرنس" میں میری شرکت کا وعدہ کر لیا تھا اس لیے واپسی کی سیٹ تبدیل کرائی، رات مولانا قاری حسین احمد درخواستی کے ہمراہ حیدر آباد حاضری ہوئی۔ کانفرنس میں شرکت کے علاوہ احباب سے ملاقاتیں ہوئیں، رات ہی رات کراچی واپسی کی اور آٹھ بجے کی فلائیٹ سے واپسی کر کے جمعہ تک بمشکل گوجرانوالہ پہنچ پایا۔ اس سفر میں اے آر وائی کے چینل سے سیرت النبیؐ کے حوالہ سے "حجۃ الوداع" کے موضوع پر گفتگو بھی ہوئی اور اس طرح کراچی کا تین روزہ دورہ اختتام پذیر ہوا۔ ڈیرہ غازی خان کے ہمارے ساتھی مولانا محمد ادریس مجھ سے پہلے کراچی پہنچ چکے تھے اور میرے ساتھ شریک سفر رہے۔

رسول اللہؐ کی محبت اور مسلمانوں کے جذبات

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۶ مارچ ۲۰۰۶ء)

سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی محبت و احترام کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کی اور کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔ اور یہ جناب رسول اللہؐ کا

اعجاز ہے کہ جس کا ان کے ساتھ ایمان و عقیدت کا تعلق قائم ہو گیا اس کے لیے دنیا کی ہر چیز ہیچ ہو گئی اور باقی سب رشتوں اور تعلقات کی کشش ثانوی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس میں نیک اور گنہگار کا کوئی فرق نہیں، جو نیکی اور تقویٰ میں سب سے آگے ہے اس کی محبت اور عقیدت کا بھی وہی عالم ہے اور اس محبت اور عقیدت میں فاسق و فاجر بھی کسی سے کم نہیں رہے۔ عمل کی دنیا اور ہے اور عشق و مستی کی دنیا کا منظر اور ہے بلکہ ہمیشہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب نبی اکرمؐ کے ساتھ محبت و عقیدت کے عملی اظہار کا موقع پیش آیا تو گنہگار اور بے عمل مسلمان اس اظہار میں سبقت لے گئے اور ان کے جذبہ و جنون کی دنیا ہی الگ دکھائی دی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انہیں جناب رسول اکرمؐ کے ساتھ عقیدت اور محبت کے اس جذباتی اظہار میں اپنی بے عملی اور گناہوں کا کفارہ بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت اور عقیدت تو جذبہ و جنون اور اطاعت و وفاداری دونوں سے عبارت تھی۔ اس لیے اس کا رنگ سب سے الگ تھا اور اسی وجہ سے زمانہ ہمیشہ ان کی کوئی مثال لانے سے قاصر رہا ہے۔ مگر اس عقیدت و محبت کے اظہار کا انداز جدا جدا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے اس دنیا میں تین چیزیں پسند ہیں: جناب نبی اکرمؐ کے چہرہ انور کی زیارت کرتا رہوں، میرا مال نبی اکرمؐ پر خرچ ہوتا رہے اور میری بیٹی نبی اکرمؐ کے نکاح میں ہو۔

مگر حضرت عمرو بن العاصؓ کی محبت کا اندازہ اس سے مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے کوئی دریافت کرے کہ حضرت محمد رسول اللہؐ کے چہرۂ انور اور حلیہ مبارک کی کیفیات بیان کروں تو نہیں کر سکوں گا، اس لیے کہ زندگی بھر آنحضرتؐ کے چہرۂ مبارک کو آنکھ بھر کر دیکھ ہی نہیں پایا۔ جب کافر تھا تو اس قدر نفرت تھی کہ نظر ڈالنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور جب مسلمان ہوا تو آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کا رعب اتنا تھا کہ آنکھ بھر کر دیکھنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ یہ اظہار محبت اور احترام و ادب کے اپنے اپنے انداز ہیں، وارفتگی کی ایک ایسی قدر مشترک ہے کہ جس نے سب کو محبت و عقیدت کے بے مثال رشتے میں پرو رکھا ہے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمانؓ کو کفار مکہ سے مذاکرات کے لیے بھیجا گیا اور وہ مکہ مکرمہ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ گھوم رہے تھے کہ ان کے خاندان کے ایک فرد نے

کہا کہ عثمانؓ! آپ نے اپنی چادر اور تہہ بند کو ٹخنوں سے اوپر نصف پنڈلی تک اٹھا رکھا ہے جو یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ اس وقت کی جاہلی ثقافت میں تہہ بند کا زمین کے ساتھ گھسٹنا بڑائی کی علامت سمجھا جاتا تھا اور چادر کا ٹخنوں سے اوپر اٹھائے رکھنا مزدوروں اور نوکروں کی علامت تصور ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ پر ان کے دوستوں نے یہ اعتراض کیا مگر حضرت عثمانؓ نے کمال بے نیازی کے ساتھ اس اعتراض کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ مجھے لوگوں کے طعنوں کی کچھ پروا نہیں اس لیے کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم چادر اسی طرح باندھتے ہیں۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ معروف کمانڈروں میں سے تھے، ایک جنگ کے موقع پر دشمن فوج کے کمانڈروں کے ساتھ کسی معاملے میں مذاکرات کر رہے تھے کہ کھانے کے دوران ان کے ہاتھ سے لقمہ پھسل کر دستر خوان پر گر گیا انہوں نے بلا تکلف اسے اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ یہ وہاں کی ثقافتی روایات کے مطابق عیب کی بات تھی کہ ہاتھ سے گرا ہوا لقمہ اٹھا کر کھا لیا جائے۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہنی مار کر اس طرف توجہ دلائی تو بڑی بے پروائی سے جواب دیا کہ کیا میں ان احمقوں کے طعنے کے خوف سے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چھوڑ دوں؟

حضرت خبیب بن عدیؓ انصاری صحابی تھے، بدر کے غزوہ میں ان کے ہاتھوں قریش کا ایک شخص حارث بن عامر قتل ہوا تھا، یہ ایک موقع پر کافروں کے کسی گروہ کے ہتھے چڑھ گئے اور ان سے حارث بن عامر کے بیٹوں نے انہیں خرید لیا تاکہ ان سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکیں۔ پھر مکہ مکرمہ لے جا کر انہیں کچھ دن قید میں رکھا اور ایک روز اعلان کر کے انہیں قتل کرنے کے لیے کھلے میدان میں لے گئے کہ لوگوں کے سامنے انہیں قتل کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھا سکیں۔ بعض تاریخی روایات میں آتا ہے کہ اس موقع پر کسی قریشی سردار نے ان سے کہا کہ اگر تمہاری جگہ آج محمد ہوتے تو تمہاری جان بچ سکتی تھی۔ یہ سن کر رونے لگے اور کہا کہ تم یہ کیا بات کر رہے ہو؟ خدا کی قسم مجھے سو بار زندگی ملے اور ہر بار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہو جاؤں یہ مجھے منظور ہے لیکن میری سو جانوں کے بدلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھے مجھے یہ برداشت نہیں ہے۔

غزوۂ بدر کے موقع پر جب جہاد کا پہلا حکم قرآن کریم میں نازل ہوا تو جناب رسول اللہؐ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے انہیں حکم سنایا اور جہاد کی تیاری کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ مہاجر صحابہ کرامؓ نے آنحضرتؐ کو وفاداری اور اطاعت کا یقین دلایا مگر آپؐ انصار مدینہ کا ردعمل معلوم کرنا چاہتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت مقداد بن اسودؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم حاضر ہیں، ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح نہیں ہیں جو یہ کہہ دیں کہ آپ اور آپ کا رب جا کر دونوں لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں، ہم آپ کے آگے لڑیں گے، پیچھے لڑیں گے، دائیں لڑیں گے اور بائیں لڑیں گے۔ روایت میں ہے کہ یہ بات سن کر جناب رسول اللہؐ کا چہرۂ مبارک خوشی سے دمکنے لگا۔

یہ سب صحابہ کرامؓ تھے، جناب رسول اللہؐ کے ساتھ ان کی محبت و عقیدت اور اطاعت و وفاداری بے مثال تھی اسی لیے وہ قیامت تک امت مسلمہ کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن عقیدت اور جاں سپاری کا یہ جذبہ تسلسل کے ساتھ امت میں چلا آرہا ہے اور اسی کی ایک جھلک یہ ہے کہ یورپ کے بعض اخبارات کی طرف سے جناب نبی اکرمؐ کی شان اقدس میں گستاخی پر پوری امت مضطرب ہوگئی ہے اور ساری دنیا میں مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں تڑپ اٹھے ہیں۔ دنیا کو شکایت ہے کہ مسلمان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے سے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ بات جو دنیا والوں کے نزدیک شکایت کی ہے، مسلمانوں کے نزدیک اعزاز کی بات ہے کہ یہی جذباتیت ان کے ایمان کی بنیاد ہے اور ان کی روحانیت کا اثاثہ ہے۔ اس پر دو واقعات قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

''شہیدان ناموس رسالتؐ'' نامی ایک کتاب کے حوالے سے میں نے یہ واقعہ پڑھا ہے کہ جون ۱۹۹۹ء کے دوران برطانیہ کے شہر مانچسٹر کے کسی سکول میں ''مشہور مذہبی شخصیت'' کے عنوان پر طلبہ و طالبات میں تقریری مقابلہ ہو رہا تھا۔ کسی مسلمان لڑکی نے اپنی تقریر میں بار بار نبی اکرمؐ کا نام لیا مگر بے خیالی میں ''صلی اللہ علیہ وسلم'' نہ کہہ سکی۔ دو چار بار ایسا ہوا تو ہال میں ایک لڑکی کھڑی ہوگئی اور بلند آواز سے ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ یہ سکول کے قواعد کی سخت خلاف ورزی تھی، اس لڑکی کو ہال سے باہر لے جایا گیا اور سکول کے اساتذہ کے ایک بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس لڑکی نے ہچکیوں اور سسکیوں میں یہ جواب دیا کہ جو کوئی شخص ہمارے پیارے نبیؐ کا نام لیتا ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ

"صلی اللہ علیہ وسلم" کہے، میں اس پر کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتی۔ آپ کا نام سن کر صلی اللہ علیہ وسلم کہنا میرا ایمانی فریضہ ہے، اس فریضے کی ادائیگی سے مجھے ڈسپلن کے نام پر نہیں روکا جا سکتا۔

یہ مانچسٹر کے کسی سکول میں تعلیم حاصل کرنے والی ایک بچی کے جذبات ہیں مگر اس سے زیادہ ایمان افروز واقعہ "مضامین شورش" میں آغا شورش کاشمیری کے حوالے سے اختر شیرانی مرحوم کے بارے میں مذکور ہے۔ اختر شیرانی اردو زبان کے بڑے شاعروں میں سے تھے، رومان اور شباب کے شاعر تھے اور بلانوش تھے۔ آغا صاحب مرحوم لکھتے ہیں کہ ایک بار عرب ہوٹل میں محفل جمی ہوئی تھی، اختر شیرانی مرحوم شراب کی دو بوتلیں چڑھا چکے تھے اور ہوش قائم نہ رہا تھا، تمام بدن پر رعشہ طاری تھا حتیٰ کہ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر زبان سے نکل رہے تھے، ادھر ان کا شروع سے یہ حال تھا کہ اپنے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے۔ اس دوران مختلف شخصیات کے بارے میں ان سے دریافت کیا جاتا رہا اور وہ اپنے ذوق کے مطابق جواب دیتے رہے۔ اس موقع پر ایک نوجوان نے ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوال کر دیا کہ آپ کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس سے آگے آغا شورش کاشمیری کے قلم سے ہی ملاحظہ کیجئے:

> "اللہ اللہ! ایک شیرابی، جیسے کوئی برق تڑپی ہو، بلور کا گلاس اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔ کہنے لگے، بدبخت! ایک عاصی سے سوال کرتا ہے۔ ایک سیہ رو سے پوچھتا ہے۔ ایک فاسق سے کیا کہلوانا چاہتا ہے؟ تمام جسم کانپ رہا تھا، ایکا ایکی رونا شروع کیا گھگھی بندھ گئی۔ پھر فرمایا بدبخت! تم نے اس حال میں یہ نام کیوں لیا، تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟ گستاخ، بے ادب! باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار! اس شریر سوال پر توبہ کرو، میں تمہارا خبث باطن سمجھتا ہوں۔ خود قہر و غضب کی تصویر ہو گئے، اس نوجوان کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس نے بات کو موڑنا چاہا مگر اختر کہاں سنتے تھے، اسے مجلس سے اٹھوا دیا، پھر خود اٹھ کر چلے گئے۔ تمام رات روتے رہے، کہتے تھے کہ یہ لوگ اتنے نڈر ہو گئے ہیں کہ ہمارا آخری سہارا بھی ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں گنہگار ضرور ہوں لیکن یہ مجھے کافر بنانا چاہتا ہے۔"

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ آج کا اخبار آ گیا اور امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش کے دہلی کی ایک تقریب میں خطاب کے حوالے سے ان کا یہ ارشاد نظر سے گزرا کہ وہ پاکستان کے حکمرانوں سے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ اور پاکستان کے کلیدی اشتراک پر

بات چیت کریں گے جس کا مقصد سخت گیر نظریات کی طرف لوگوں کو مائل ہونے سے روکنا ہے۔ سچی بات ہے صدر بش کی یہ بات پڑھ کر ان کے بھولپن پر مجھے ہنسی آرہی ہے کہ اختر شیرانی کی قوم سے وہ کس بات کی توقع کر رہے ہیں!

قرآن کریم اور نبی کریمؐ سے مسلمانوں کی عقیدت

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۰ فروری ۲۰۰۶ء)

توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت

یورپ کے بعض اخبارات کی طرف سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی پر عالم اسلام میں اضطراب مسلسل بڑھتا جا رہا ہے اور پاکستان کی کم و بیش تمام دینی و سیاسی جماعتوں نے ۳مارچ کو ملک گیر ہڑتال کی کال دے دی ہے جس کی تیاریاں ملک بھر میں ہر سطح پر جاری ہیں۔ قوم کا مطالبہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کا اہتمام کرنے والے اخبار کے ملک ڈنمارک کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کیے جائیں اور مغربی میڈیا کی اسلام دشمن مہم اور سرگرمیوں کا اسلامی سربراہ کانفرنس کی سطح پر نوٹس لیا جائے۔ وزیراعظم جناب شوکت عزیز نے گزشتہ روز ایک بیان میں اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ ڈنمارک کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کرنے کے مسئلے کا او آئی سی کے فورم پر جائزہ لیا جائے گا۔

لاہور میں گزشتہ دنوں ہڑتال کے موقع پر جو افسوسناک صورتحال پیدا ہوئی وہ بھی زیر بحث ہے اور اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر ہمارے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حکومت اور ہماری دینی و سیاسی قیادت کو اس سلسلہ میں عوامی جذبات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہے اس لیے احتجاج کے لیے سڑکوں پر آنے والے لوگ قیادت کے بغیر ہی اپنے اپنے انداز میں جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس میں یہ امکان رد نہیں کیا جا سکتا کہ اس صورتحال سے کچھ تشدد پسند عناصر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہوں لیکن اگر سیاسی و دینی قیادت بیدار ہو اور عوامی جذبات کے اظہار کی تحریک کی عملاً قیادت کر رہی ہو تو ایسی صورتحال پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ عوام اس بات پر غصہ میں ہیں کہ بعض یورپی اخبارات نے توہین رسالتؐ کے جس نئے مذموم سلسلہ کا آغاز کیا ہے اس پر مسلم حکومتوں کا (ایک دو کے سوا) ردعمل روایتی اور رسمی سا ہے اور اس کا سنجیدگی کے ساتھ نوٹس نہیں لیا جارہا۔ اور اس کے ساتھ اپنی اپنی حکومتوں کے خلاف مسلم ممالک کے عوام کا وہ غصہ بھی شامل ہوگیا ہے جو ان حکومتوں کی مغرب نواز پالیسیوں کے باعث ایک عرصہ سے مسلم عوام کے دلوں میں پرورش پارہا ہے۔ اور اس حوالہ سے بی بی سی کا یہ تبصرہ بالکل درست اور حقیقت پسندانہ ہے کہ مظاہروں کی شدت میں مسلمان عوام کا اپنی حکومتوں کے خلاف غصہ بھی پوری طرح کارفرما ہے۔

ہم نے گزشتہ کالم میں عرض کیا تھا کہ مغرب اس معاملے میں مسلمانوں کے جذبات کی شدت اور حساسیت کا پوری طرح اندازہ نہیں کررہا اور وہ اس بات کا ادراک نہیں کرپارہا کہ مسلمان قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت اور تقدس کے مسئلے پر اس قدر جذباتی اور حساس ہیں کہ وہ اس کے تحفظ کے جذبے کے تحت کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ جناب رسول اکرمؐ کے ناموس اور حرمت کے سوال پر دنیا بھر کے مسلمان اپنے جذبات کا جس انداز سے اظہار کررہے ہیں وہ سب کے سامنے ہے جبکہ قرآن کریم کے حوالے سے مسلمانوں کی حساسیت کا اندازہ ایک حالیہ واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔

قرآن کریم کی طباعت کا معاملہ

قدرت اللہ اینڈ کمپنی لاہور میں قرآن کریم کی طباعت و اشاعت کا ایک بڑا ادارہ ہے جس نے گزشتہ دنوں قرآن کریم کا ایک نسخہ سعودی عرب کی طرز پر شائع کیا ہے جو مسئلہ بن گیا ہے۔ سعودی عرب کا رسم الخط اور انداز تحریر جنوبی ایشیا سے مختلف ہے۔ قرآن کریم کے متن میں تو کسی جگہ کوئی فرق نہیں اور نہ ہوسکتا ہے لیکن بعض سورتوں کے ناموں اور بعض الفاظ کے طرز تحریر میں فرق ہے جس سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو سعودی عرب کی طرز پر طبع شدہ قرآن کریم کی تلاوت میں دقت پیش آتی ہے۔ چنانچہ حرمین شریفین یعنی مسجد حرام اور مسجد نبویؐ میں بھی اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام لوگوں کو تلاوت کے لیے دونوں طرز کے نسخے الگ الگ فراہم کیے جاتے ہیں۔

مثلاً قرآن کریم کی بعض سورتوں کے ناموں میں فرق ہے۔ ہمارے ہاں جس سورۃ کو بنی اسرائیل کے نام سے پڑھا جاتا ہے، سعودی نسخوں میں اس سورۃ کو ''الاسراء'' کے نام سے

لکھا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ المومن کا نام سورۃ الغافر، سورۃ حم السجدہ کا نام سورۃ فصلت، سورۃ الدھر کا نام سورۃ الانسان اور سورۃ اللھب کا نام سورۃ المسد لکھا گیا ہے۔ ان سورتوں کے یہ سب نام درست ہیں اور احادیث و آثار میں ان کا تذکرہ موجود ہے لیکن چونکہ ہمارے ہاں جنوبی ایشیا میں جو رسم الخط اور مصحف صدیوں سے رائج چلا آ رہا ہے اس کے مطابق یہ نام معروف نہیں ہیں اس لیے قدرت اللہ اینڈ کمپنی کی طرف سے اس نسخے کی اشاعت کے ساتھ ہی یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ اس پر معروف قانون دان جناب ایم ڈی طاہر نے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی اور پنجاب اسمبلی میں پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والی ایم پی اے محترمہ فرزانہ پراچہ نے تحریک التواء کا نوٹس دے دیا۔ محکمہ اوقاف اور وزارت مذہبی امور نے بھی اس کا نوٹس لیا اور قدرت اللہ اینڈ کمپنی نے صورتحال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت پنجاب کے قائم کردہ قرآن بورڈ سے رجوع کر لیا اور ذمہ دار مفتیان کرام سے بھی رابطہ قائم کیا۔ اس پر جامعہ اشرفیہ لاہور کے مولانا مفتی حمید اللہ خان نے لکھا

”سوال میں ذکر کردہ قدرت اللہ کمپنی کا چھپا ہوا تجویدی قران مجید نمبر ۵۷ میں نے بغور بعض جگہوں سے دیکھا ہے، جن سورتوں کے نام مرتب نے تبدیل کیے ہیں، روایات سے ان کا ثبوت تو اپنی جگہ مسلم ہے لیکن یہ ہمارے ملک میں غیر معروف ہیں جس کی وجہ سے عوام میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور مزید فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ یہ تو کر سکتے تھے کہ معروف نام لکھ کر بین القوسین غیر معروف نام ذکر کر دیے جائیں لیکن مرتب نے ایسا نہیں کیا۔ نیز رسم الخط میں خط عثمانی کی اتباع بالاجماع واجب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود دلی خواہش اور جائز ہونے کے خانہ کعبہ کی (ابراہیمی بنیادوں پر) از سر نو تعمیر نہیں فرمائی تھی کہ کہیں امت میں فتنہ برپا نہ ہو جائے۔ لہذا اسد الفتنہ (فتنہ کے امکان کو روکنے کے لیے) مذکورہ قرآن مجید کی اشاعت پاکستان میں فی الفور بند کی جائے یا اس کی اصلاح کی جائے۔“

جبکہ جامعہ خیر المدارس ملتان کے حضرت مولانا مفتی عبد الستار نے یہ تحریر فرمایا کہ

”حفاظت قرآن پاک کا مسئلہ نہایت حساسیت کا حامل ہے خصوصا جبکہ یہود و نصاریٰ کی طرف سے تحریف قرآن پاک کی سازشیں بھی چل رہی ہیں اس لیے امکانی حد تک کسی تغیر و تبدل سے احتراز لازم ہے۔ مذکورہ تبدیل شدہ نام اگرچہ اصول تفسیر کی بعض کتابوں میں ملتے ہیں تاہم امت میں فتنے اور انتشار کا سبب

ہونے کی بناء پر اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی جائے تاکہ آئندہ چل کر اسے اختلاف فی القرآن کی دلیل نہ بنالیا جائے۔ نیز یہ تعامل کے بھی خلاف ہے۔"

پنجاب قرآن بورڈ کے چیئرمین مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے اس پر ۱۲ فروری ۲۰۰۲ء کو مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام کا ایک اجلاس لاہور بورڈ کے دفتر میں طلب کر لیا جس میں مولانا مفتی محمد خان قادری، مولانا عبد المالک خان ایم این اے، پروفیسر عبد الجبار شاکر، محترم میاں نعیم الرحمان اور راقم الحروف نے شرکت کی۔ اجلاس میں ساری صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد جس رائے کا اظہار کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے

"مذکورہ سورتوں کے تبدیل شدہ نام اگرچہ روایات سے ثابت ہیں لیکن ہمارے ہاں متعارف نہیں ہیں۔ اسی طرح سعودی رسم الخط ہمارے ہاں بعض دیگر حوالوں سے بھی معروف نہیں ہے اس لیے اس سے عام مسلمانوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لہذا آئندہ اس قسم کے نسخے کی اشاعت سے گریز کیا جائے اور قدرت اللہ اینڈ کمپنی ایک وضاحتی نوٹ چھپوا کر مطبوعہ قرآن کریم کے ہر نسخے پر چسپاں کرے۔"

مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی زیر صدارت منعقد ہونے والے اس اجلاس میں، جس میں محکمہ اوقاف پنجاب کے سیکشن آفیسر جناب محمد صدیق منہاس اور دیگر بعض افسران نے بھی شرکت کی، قرآن کریم کی حرمت و تقدس کے حوالے سے لاہور میں ہونے والا ایک اور واقعہ بھی زیر بحث آیا جو قارئین کی دلچسپی کی خاطر پیش خدمت ہے۔

لاہور کے ایک کاروباری بزرگ جناب ناظم الدین پنجاب قرآن بورڈ کے ممبر ہیں اور قرآن کریم کے پرانے اوراق کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے ایک عرصہ سے سرگرم عمل ہیں۔ انہیں گزشتہ ہفتے لاہور میں قرآن کریم کی بے حرمتی کے ایک واقعہ کی نشاندہی پر پولیس نے گرفتار کر لیا۔ یہ داستان خود انہی کے قلم سے ملاحظہ کیجئے جو انہوں نے مذکورہ بالا اجلاس میں پنجاب قرآن بورڈ کے چیئرمین مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کو پیش کی۔

"کل بعد نماز جمعہ نہر میں پڑے شہید قرآنی اور مقدس اوراق کے بارے میں ۱۵ پر پولیس کو اور خبریں اخبار کو اطلاع دی تو خود مجھے ہی پولیس نے اس واقعہ کا ملزم سمجھا اور تقریباً ۶ گھنٹے جوہر ٹاؤن اور تھانہ گرین ٹاؤن میں تفتیش کرتی رہی۔ میرے دو ہمسائے جو وہاں سے گزر رہے تھے مجھے دیکھ کر رکے انہیں بھی میرے ساتھ یہ شرمندگی چھ گھنٹے تھانے میں رہ کر برداشت کرنا پڑی جنہیں وہ میرے ساتھ تھانہ لے گئے۔ میں نے انہیں یہ باور کرانے کی بہت کوشش کی کہ میں ایک ذمہ دار آدمی

ہوں اور زندگی کا بہت قیمتی وقت اس عظیم کار خیر میں اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتا ہوں۔ میں تو اسے (قرآن کریم) توہین اور بے ادبی سے بچانے کے لیے اپنی بہترین کوشش کر رہا ہوں اور پنجاب قرآن بورڈ کا ممبر بھی ہوں۔ مگر میرا موبائل اور گاڑی اپنے قبضے میں رکھی، کچھ ریکارڈ میری گاڑی میں شہید قرآن عظیم اور نشر و اشاعت سے متعلق تھا جو میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں وہ اسے چیک کرتے رہے۔ اس واقعے سے جہاں میری ہمسایوں کے سامنے بے عزتی ہوئی وہاں گھر والے بھی سخت پریشان رہے، مسلسل چھ گھنٹے پوچھ گچھ کی گئی پھر رہائی ملی۔"

مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے اجلاس میں بتایا کہ جناب ناظم الدین نے اس حراست کے دوران کسی طرح انہیں موبائل فون پر اطلاع کروادی تھی جس پر انہوں نے آئی جی پنجاب پولیس سے خود بات کی اور بڑی مشکل سے یہ سمجھا پائے کہ ناظم الدین صاحب ایک شریف شہری ہیں، پنجاب قرآن بورڈ کے معزز رکن ہیں اور ایک عرصے سے قرآن کریم کے بوسیدہ نسخوں اور اوراق کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے رضا کارانہ خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ تب جا کر انہیں لاہور پولیس کی تفتیش سے نجات ملی ورنہ خدا جانے انہیں دہشت گردی کے کون سے کیس میں ڈال دیا جاتا کیونکہ تفتیش کے دوران ان سے مسلسل یہی پوچھا جا رہا تھا کہ ان کا تعلق کس دہشت پسند تنظیم سے ہے؟ اجلاس میں اس واقعہ کو انتہائی افسوسناک قرار دیتے ہوئے پنجاب پولیس کے اس طرز عمل پر شدید احتجاج کیا گیا اور حکومت پنجاب اور آئی جی پولیس سے اس کا فوری نوٹس لینے کا مطالبہ کیا گیا۔

چنانچہ اس قسم کے واقعات قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت و محبت اور ان کے جذبات کی شدت و حساسیت کی علامت ہیں جس کا مسلم حکومتوں اور مغرب کو بہرحال احترام کرنا ہوگا۔

ڈنمارک میں توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت اور مسلمانوں کا ردِ عمل

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۶ فروری ۲۰۰۶ء)

ڈنمارک، فرانس اور جرمنی کے اخبارات میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالی کارٹونوں کی اشاعت پر مسلمانوں کا غم وغصہ اور احتجاج عالمی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ حکومت پاکستان نے بھی ڈنمارک کے سفیر کو دفتر خارجہ میں طلب کر کے اس پر باضابطہ احتجاج کیا ہے اور اس سے قبل سعودی عرب اور دیگر مسلم ممالک نے اس کا سخت نوٹس لیا ہے جبکہ عرب ممالک میں ڈنمارک کی مصنوعات کے بائیکاٹ کی مہم نے بھی اس احتجاج میں شدت پیدا کر دی ہے۔ پاکستان میں متحدہ مجلس عمل کی اپیل پر جمعہ کے روز احتجاج کیا گیا اور خطبات جمعہ میں توہین رسالت کے اس قبیح جرم پر ملک گیر احتجاج کے علاوہ بعض مقامات پر احتجاجی مظاہرے بھی ہوئے ہیں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و عقیدت مسلمانوں کے ایمان کی علامت بلکہ اس کی بنیاد ہے جس کے بغیر کوئی مسلمان خود کو مسلمان تصور ہی نہیں کر سکتا۔ خود جناب رسول اللہؐ نے ایک ارشاد گرامی میں فرمایا ہے کہ جس شخص کو اپنی ذات، خاندان اور دنیا بھر سے زیادہ محبت آنحضرتؐ کے ساتھ نہیں ہے اسے مسلمان کہلانے کا سرے سے حق ہی حاصل نہیں ہے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مسلمانوں کی یہ محبت و عقیدت ایسا نازک اور حساس مسئلہ ہے کہ اس کی حساسیت اور نزاکت میں کسی دور میں بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ آج کے دور میں جبکہ مسلمان عملی اعتبار سے انتہائی کمزور اور کردار و اخلاق کے حوالے سے اسلامی احکامات اور نبوی تعلیمات سے خاصا بعد رکھتے ہیں مگر عشق رسولؐ کے معاملے میں ان کی حساسیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آ رہی۔ یہی بات مغرب کے ان دانشوروں کے لیے پریشانی اور الجھن کا باعث بنی ہوئی ہے جو آج کے مسلمانوں کو قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات سے دور رکھنے کے خواہش مند ہیں اور جن کا خیال ہے کہ قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات دنیا کے کسی خطے کے مسلم معاشرے میں عملی طور پر جاری و نافذ ہوگئیں تو وہ مغربی فلسفہ و تہذیب کے لیے حقیقی خطرہ

ثابت ہوں گی اور فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کی دنیا میں مغرب کے فلسفہ و نظام کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

چنانچہ امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش نے گزشتہ دنوں امریکی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جس لہجے میں بنیاد پرست اسلام کو دنیا کے ہر حصے میں پوری قوت کے ساتھ روکنے کا اعلان کیا ہے اس کا پس منظر بھی یہی ہے۔ ہمارے بعض دانشور موجودہ دنیا میں فکر و تہذیب کی کشمکش سے جتنی چاہے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دلوں کو جو بھی کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کر لیں، صدر بش کا یہ اعلان اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ مغرب اس وقت عالمی سطح پر اسلام کے خلاف تہذیبی و فکری جنگ لڑ رہا ہے۔ اس نے بجا طور پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر اس جنگ میں وہ طاقت اور سازش کے ذریعے اسلام کی بنیادی تعلیمات کو انسانی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے بے دخل نہ کر سکا تو یہ مغربی فلسفہ و تہذیب کی واضح شکست ہو گی اور عالمگیر انسانی معاشرے کی فکری و تہذیبی قیادت اسلام کے ہاتھ میں آ جائے گی۔

مغرب کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی تہذیب اور فلسفہ کا حقیقی مقابل صرف اسلام ہے مگر مغرب اسلام کے خلاف فکری جنگ علم و دانش، فکر و فلسفہ اور صحت مندانہ مقابلے کے فطری طریقوں سے لڑنے کی بجائے طاقت، دھاندلی، دھونس اور ہتھیاروں کی زبان استعمال کر رہا ہے۔ صدر بش کا یہ اعلان ہی علمی و فکری میدان میں مغربی فکر و فلسفہ کی شکست خوردہ ذہنیت کی واضح علامت ہے کہ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کی عملداری قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اگر ایک خالص اسلامی معاشرے میں جمہوری اصولوں اور انسانی حقوق کے مسلمہ معیار کے مطابق وہاں کی آبادی کی غالب اکثریت قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات کو اجتماعی زندگی اور قومی معاشرت کی بنیاد بناتی ہے تو صدر بش کے لیے کسی سطح پر کوئی جواز نہیں بنتا کہ وہ اس معاشرے کی اکثریت کو اپنے اس حق کے استعمال سے روک سکیں لیکن اس کے باوجود وہ اس بات پر مصر ہیں اور ان کے پاس اس کے لیے صرف طاقت اور دھونس کی زبان ہے جس کے ذریعے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات کے نفاذ کا ہر قیمت پر اور بزور قوت راستہ روکنے کا اعلان کر رہے ہیں۔

مغرب اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اور کسی بھی مسلم معاشرے میں خلافت راشدہ کے سنہری اصولوں کے مطابق عام مسلمانوں کی رائے کے ساتھ ایک

شعوری اور نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور خلافت راشدہ ہی کی طرز پر رفاہی ریاست کا کوئی عملی نقشہ سامنے آجاتا ہے تو مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اس کا سامنا نہیں کر پائے گا۔ لیکن مغرب کے سامنے اس فکری اور ثقافتی جنگ میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے، جس نے اسے کنفیوژن بلکہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رکھا ہے، کہ اسلام کی جن بنیادی تعلیمات کا وہ عالمگیر انسانی معاشرے میں راستہ روکنا چاہتا ہے وہ قرآن و سنت کی صورت میں اصل حالت میں موجود و محفوظ ہیں، ان کی تعلیم کا نظام قائم ہے اور عام مسلمان کو قرآن کریم کے احکام، جناب نبی اکرمؐ کے حالات زندگی اور تعلیمات تک رسائی حاصل ہے۔ اور اس سے کہیں بڑی بات یہ ہے کہ قرآن کریم اور جناب رسول اللہؐ کی ذات گرامی کے ساتھ ایک عام مسلمان کی محبت اور کمٹمنٹ پوری قوت اور شدت کے ساتھ موجود ہے۔

یہ عام مشاہدے اور تجربے کی بات ہے کہ کوئی مسلمان دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو وہ قرآن کریم کی بے حرمتی برداشت نہیں کرے گا۔ وہ قرآن کریم کی زبان سے واقف نہ ہو، اس کی تعلیمات سے بے خبر ہو، اس کی تلاوت بھی اگرچہ اس کے بس میں نہ ہو لیکن وہ اس کی توہین کسی صورت برداشت نہیں کرے گا اور کوئی بھی شخص اس کے سامنے قرآن کریم کی کسی بات کو جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ یہ ایک ایسی کمٹمنٹ ہے جو دنیا کی کسی اور کتاب کو میسر نہیں جبکہ عام مسلمان اس بات پر آج بھی پوری قوت کے ساتھ قائم ہے۔ یہی محبت و عقیدت ایک عام مسلمان کی جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ بھی ہے۔ وہ اپنی جان دے دے گا لیکن نہ حضورؐ کی کسی بھی درجے میں گستاخی برداشت کرے گا اور نہ ہی آپؐ کے کسی ارشاد گرامی کے جھٹلائے جانے کو گوارا کرے گا۔

مغرب یہ سمجھتا ہے کہ قرآن کریم اور جناب رسول اکرمؐ کی ذات گرامی کے ساتھ ایک عام مسلمان کی اس درجہ محبت و عقیدت اور کمٹمنٹ کی موجودگی میں مسلمان سوسائٹی کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے لاتعلق نہیں کیا جا سکتا اور مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات و احکام کی عملداری سے دستبردار کرانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کو مذہبی رواداری، برداشت اور تحمل کے خوبصورت عنوانوں کے ساتھ آج کل جو سبق پڑھایا جا رہا ہے اس کا ایک پس منظر یہ بھی ہے کہ قرآن کریم اور آنحضرتؐ کے ساتھ عام مسلمان کی اس درجہ کی بے لچک کمٹمنٹ کو کمزور کیا جائے کیونکہ وہ

ان دونوں کے ارشادات اور تعلیمات کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اس بات پر مر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

خود مغرب اپنے ذہن سے وحی اور پیغمبر دونوں کو اتار چکا ہے۔ اس کی وجہ بھی سمجھ آتی ہے کہ مغرب کے پاس نہ وحی اصل حالت میں موجود ہے اور نہ پیغمبروں کے حالات و تعلیمات کا کوئی مستند ذخیرہ اسے میسر ہے۔ اس لیے اس نے سرے سے ان دونوں سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ اور اب وہ مسلمانوں سے یہ توقع بلکہ پرزور مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ بھی وحی اور پیغمبر کو اپنے ذہنوں سے اتار دیں اور اپنے جذبات و احساسات کے دائرے میں انہیں کوئی جگہ نہ دیں۔ لیکن مغرب یہ توقع اور مطالبہ کرتے ہوئے یہ معروضی حقیقت بھول جاتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس یہ دونوں چیزیں اصلی حالت میں موجود و محفوظ ہیں۔ قرآن کریم بھی اصل حالت میں موجود ہے اور جناب رسول اکرمؐ کے حالات زندگی، تعلیمات اور ارشادات بھی پورے استناد اور تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کے پاس موجود ہیں جو صرف لائبریریوں کی زینت نہیں بلکہ پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں، لکھی جاتی ہیں، شائع ہوتی ہیں اور دنیا کے کسی بھی خطے کے مسلمان ان دونوں یا ان میں سے ایک سے محروم نہیں ہیں۔ اس لیے مسلمانوں سے مغرب کی یہ توقع اور مطالبہ کہ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے دست بردار ہو جائیں ایک سراب کے پیچھے بھاگنے کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ہمارے نزدیک وقفے وقفے سے توہین رسالت کے یہ مذموم واقعات اسی فکری اور تہذیبی جنگ کا ایک حصہ ہیں اور ان کے ذریعے مغرب مسلمانوں کی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و عقیدت کو وقتاً فوقتاً جانچتا رہتا ہے، اور یہ اب کی بات نہیں بلکہ صدیوں سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ مگر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی مسلمانوں کو قرآن کریم اور جناب رسول اللہؐ کے ساتھ ان کی محبت و عقیدت اور کمٹمنٹ کے حوالے سے پرکھا گیا، دنیا نے مسلمانوں کو ہر دور میں بیدار پایا ہے۔ آج بھی بحمد اللہ مسلمان بیدار ہے اور مستقبل میں بھی دنیا کبھی مسلمانوں کو اس حوالے سے غافل نہیں پائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نصاب تعلیم سے نماز سکھانے کا طریقہ خارج

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۲۰۰۶ء)

وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی کے اس اعلان پر ملک بھر میں احتجاج کا سلسلہ جاری ہے کہ قومی نصاب تعلیم سے نماز پڑھنے کا طریقہ سکھانے کا مواد خارج کیا جا رہا ہے اس لیے کہ ان کے خیال میں بچوں کو نماز کا طریقہ سکھانا، والدین کی ذمہ داری ہے۔ متعدّد دینی وسیاسی راہنماؤں نے اسے سیکولر ایجنڈے کا حصہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قومی نصاب تعلیم سے دینی تعلیمات کے حصے کو بتدریج خارج کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور ایسا بیرونی اشاروں پر کیا جا رہا ہے، جبکہ بعض طالب علم تنظیموں نے اس فیصلے کے خلاف عوامی مظاہروں کا اہتمام کیا ہے۔ چند سال قبل قرآن کریم کی ناظرہ تعلیم کے بارے میں بھی ہمیں اس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ وفاقی محتسب اعلیٰ نے حکومت کو ہدایت کی کہ سکولوں میں طلبہ اور طالبات کو ناظرہ قرآن کریم پڑھانے کا اہتمام کیا جائے اور مڈل تک قرآن کریم ناظرہ پڑھا دیا جائے مگر وزارت تعلیم نے مختلف حیلوں بہانوں سے اس ہدایت کو سرد خانے میں ڈال دیا چنانچہ اب تک اس کا اہتمام نہیں کیا جا سکا۔ اس کے بعد مختلف سطح کے نصاب سے قرآن کریم کی جہاد سے تعلق رکھنے والی سورتوں اور آیات کو خارج کرنے کی کاروائی سامنے آئی اور اب نماز کا طریقہ سکھانے کا مواد نصاب سے خارج کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران گروہ اور طبقات ذہنی طور پر اس فلسفہ اور فکر کو قبول کر چکے ہیں کہ مذہبی معاملات کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور لوگوں کی دینی ضروریات پوری کرنا حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے اس لیے کہ قرآن کریم نے سورۃ الحج میں مسلم حکمرانوں کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے واضح طور پر فرمایا ہے کہ جب ہم انہیں زمین میں اقتدار دیتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں، نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ اس لیے دینی امور کا معاشرے میں اہتمام ایک مسلمان حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مروجہ دستور میں بھی اسلامی تعلیمات کے فروغ اور مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے آراستہ کرنے کو حکومت کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

وفاقی وزارت تعلیم کے ارباب بست وکشاد سے گزارش ہے کہ اگر انہیں اس سلسلہ میں قرآن وسنت کی ہدایات وتعلیمات پڑھنے کی توفیق نہیں ہے تو کم از کم اپنے ملک کے دستور پر ہی نظر ڈال لیں اور ایسی حرکتوں سے گریز کریں جو اسلام اور دستور دونوں سے انحراف کے مترادف ہیں۔

۲۰۰۵ء

تعلیمی نصاب۔ اسلامی کانفرنس کا معذرت خواہانہ موقف

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۳۰ دسمبر ۲۰۰۵ء)

مکہ مکرمہ میں منعقدہ مسلم سربراہ کانفرنس کے حالیہ غیر معمولی اجلاس کے فیصلوں میں ایک اعلان یہ بھی تھا کہ مسلم ممالک اپنے نصاب تعلیم میں تبدیلی کریں گے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ مسلم دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر اقوام سے بہت پیچھے رہ گئی ہے اور اس کوتاہی کی گزشتہ دو صدیوں سے خوفناک سزا بھگت رہی ہے، اس سلسلہ میں ہمارے حکمرانوں کو کچھ احساس ہو گیا ہو گا اور انہوں نے باہم مل بیٹھ کر یہ طے کیا ہو گا کہ اس کی تلافی کے لیے کوئی راستہ اختیار کیا جائے اور مسلم حکومتیں اپنے نصاب تعلیم میں سائنس و ٹیکنالوجی کے علوم کے حوالے سے معاصر اقوام کے برابر آنے کے لیے ضروری تبدیلیاں کریں۔

او آئی سی کی طرف سے مسلم ممالک کے تعلیمی نصابوں میں تبدیلی کے اس اعلان کے بعد اس سلسلہ میں جو پہلا فیصلہ آیا ہے وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزارت تعلیم کا ہے کہ ہم اپنے نصاب تعلیم سے نماز کا طریقہ خارج کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی کے نزدیک مسلمان بچوں کو نماز کا طریقہ سکھانا حکومت یا ریاستی نظام تعلیم کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو نماز کا طریقہ سکھائیں۔ اس پر ملک بھر کے دینی حلقوں، خاص طور پر طلبہ تنظیموں کی طرف سے احتجاج کا سلسلہ جاری ہے اور مختلف مقامات پر مظاہرے بھی ہوئے ہیں مگر ہمارے روشن خیال

حکمران پوری دل جمعی کے ساتھ اپنے ایجنڈے پر کاربند ہیں اس لیے یہ توقع کم دکھائی دے رہی ہے کہ اس احتجاج کا کوئی اثر ہوگا اور حکومت اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کے لیے آمادہ ہوگی۔

اس سے قبل قرآن کریم کی تعلیم کے حوالے سے بھی اسی قسم کی صورتحال پیش آچکی ہے کہ چند سال پہلے وفاقی محتسب اعلیٰ کی طرف سے حکومت کو ہدایت کی گئی تھی کہ قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کا اسکولوں میں اہتمام کیا جائے اور مڈل تک بچوں کو ناظرہ قرآن کریم پڑھا دیا جائے۔ لیکن حکومت نے اس سلسلہ میں ہاتھ کھڑے کر دیے تھے جس کی وجہ سے اسکولوں میں قرآن کریم کی تعلیم کا ابھی تک اہتمام نہیں ہو سکا۔ حالانکہ قرآن کریم کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ سب سے پہلا اور ابتدائی درجہ ہے کہ مسلمان بچے اور بچیاں قرآن کریم کم از کم ناظرہ تو پڑھ سکیں۔ ممکن ہے اس وقت بھی وزارت تعلیم کے ارباب حل و عقد کے ذہن میں یہی ہو کہ بچوں کو قرآن کریم پڑھانا ہماری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو قرآن کریم پڑھائیں۔

وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی کا یہ کہنا کہ بچوں کو نماز کا طریقہ سکھانا والدین کا کام ہے، ہمارے نزدیک یہ محض دفع الوقتی یا لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بات کہہ دینے کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک مستقل سوچ اور فلسفہ کارفرما ہے کہ دین اور دینی معاملات کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور سوسائٹی میں دینی امور کا اہتمام کرنا ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل نہیں ہے۔ یہ سوچ مجموعی طور پر ہماری قومی پالیسیوں اور حکمران طبقات کے ذہنوں میں پائی جاتی ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً حال ہی میں زلزلے سے متاثرہ علاقوں میں امداد اور بحالی کا جو پروگرام قومی سطح پر ریاستی ذمہ داری کے حوالے سے شروع کیا گیا ہے اور جس کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر وسائل جمع کر کے حکومتی اداروں کی طرف سے امداد و بحالی کی ترجیحات طے کی گئی ہیں، اس پروگرام میں مسجد اور دینی مدرسے کی بحالی کا کوئی شعبہ موجود نہیں ہے۔ حالانکہ زلزلہ سے متاثر ہونے والے مسلمان جہاں آباد ہوں گے انہیں لازماً مسجد کی ضرورت بھی پڑے گی اور اپنے بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے وہ دینی مدرسے کی ضرورت بھی محسوس کریں گے۔ امداد و بحالی کا قومی پروگرام تشکیل دینے والوں کے علم میں یہ بات یقیناً ہوگی کہ زلزلے میں جہاں لوگوں کے مکانات، سرکاری عمارتیں، سکول، کالج، عدالتیں اور

دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والی ہزاروں بلڈنگیں مسمار اور متاثر ہوئی ہیں، وہاں سینکڑوں مساجد اور دینی مدارس بھی زلزلے کی زد میں آئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سلسلہ میں اب تک سامنے آنے والی قومی پالیسی اور پروگرام میں مسجد اور دینی مدرسے کی بحالی کی کوئی بات شامل نہیں ہے بلکہ ایک مقتدر ترین شخصیت کے قومی پریس کے ذریعے سامنے آنے والے اس ارشاد نے صورتحال کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ ہم نے غیر ملکی این جی اوز سے کہا ہے کہ زلزلے سے متاثرہ علاقوں میں سکول اور کالج کی تعمیر کی طرف فوری توجہ دی جائے ورنہ دینی لوگ مدرسے بنانا شروع کر دیں گے۔

مقتدر شخصیات کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ مسجد اور دینی مدرسے بنانے والوں نے اس سے قبل بھی یہ کام کرنے کے لیے کسی سے نہیں پوچھا تھا اور کسی سرکاری شعبے کی طرف سے امداد پر بھروسہ نہیں کیا تھا اور اب بھی وہ اس تکلف میں نہیں پڑیں گے۔ جہاں جہاں کسی نے مسجد و مدرسہ تعمیر کرنا ہوگا وہ کرلے گا اور کوئی بات اس میں رکاوٹ نہیں بن سکے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ البتہ انہوں نے ایک سوچ کا اظہار ضرور کر دیا ہے کہ ہمارے ان مہربانوں کے نزدیک مسجد و مدرسہ، قرآن کریم کی تعلیم، نماز اور دیگر دینی امور کا قومی ضروریات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور ان مقاصد کے لیے ریاستی وسائل کا استعمال ان کے خیال میں درست بات نہیں ہے۔

اس بات کو ایک اور حوالے سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ان مہربانوں کی طرف سے دینی مدارس کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم دینی مدارس کے نصاب میں سائنس و ٹیکنالوجی شامل کر کے انہیں قومی دھارے میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت دینی مدارس جو تعلیم دے رہے ہیں وہ ان کے نزدیک قومی دھارے کی ضروریات میں سے نہیں ہے، ورنہ وہ دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی بات نہ کہتے۔ یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ دینی مدارس صرف دینی تعلیم دیتے ہیں اور تعلیم کے باقی شعبوں میں حصہ نہیں لیتے اس لیے وہ قومی دھارے سے الگ ہیں۔ اس سوچ کو اگر قبول کر لیا جائے تو پھر یہ بھی کہا جاسکے گا کہ لاء کالج چونکہ صرف قانون کی تعلیم دیتے ہیں اور قومی زندگی کے دیگر شعبوں کی تعلیم ان کے نصاب میں شامل نہیں ہے اس لیے وکلاء برادری قومی دھارے میں شامل نہیں ہے، اور انہیں قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے لاء کالجوں کے نصاب میں تبدیلی کر کے اس میں سائنس و ٹیکنالوجی کو شامل

کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ اور پھر یہ بات صرف لاء کالجوں تک محدود نہیں رہے گی بلکہ میڈکل کالج، انجینئرنگ کالج اور اس نوعیت کے دیگر تعلیمی ادارے بھی اسی اصول پر قومی دھارے سے خارج قرار پائیں گے اور انہیں قومی دھارے میں شریک کرنے کے لیے ان کے نصابوں میں دوسرے شعبوں کی تعلیم کو شامل کرنا ضروری ہو جائے گا۔

اس لیے ہمارے نزدیک جناب جاوید اشرف قاضی کا یہ ارشاد کہ بچوں کو نماز کی تعلیم دینا ان کے والدین کی ذمہ داری ہے اور اس بنیاد پر نماز پڑھنے کے طریقے کو قومی نصاب سے خارج کر دینے کا یہ فیصلہ ایک سرسری اور وقتی کارروائی نہیں ہے بلکہ ایک مستقل سوچ اور فلسفے کی نمائندگی کرتی ہے جسے دھیرے دھیرے ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر جاوید اشرف قاضی صاحب اور ان کے رفقاء اس بات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر پا رہے کہ ان کی یہ سوچ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی ہے بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے رائج الوقت دستور سے بھی انحراف ہے۔ اس لیے کہ دستور پاکستان نے قرآن و سنت کے احکام کے نفاذ، اسلامی تعلیمات کے فروغ اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کو حکومت پاکستان کی ذمہ داری قرار دے رکھا ہے۔ جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے، اگر جاوید اشرف قاضی قرآن کریم کا تھوڑا بہت مطالعہ رکھتے ہیں تو یہ بات ان سے مخفی نہیں ہوگی کہ قرآن کریم نے ایمان و عقیدہ کے بعد سب سے زیادہ نماز پر زور دیا ہے اور سینکڑوں آیات کریمہ میں مختلف اور متنوع اسالیب میں نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو نماز کی پابندی کی تلقین کی گئی ہے۔

قرآن کریم نے نماز کو صرف فرد کی ذمہ داری قرار نہیں دیا بلکہ سوسائٹی کی اجتماعی ذمہ داری کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ اسی لیے نماز کے بارے میں صرف یہ حکم نہیں ہے کہ نماز پڑھو بلکہ اقامت صلاۃ یعنی نماز کو معاشرے میں قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں نماز کا ماحول قائم ہو اور نماز کی ادائیگی کا اجتماعی طور پر اہتمام کیا جائے۔ قرآن کریم نے سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۳۲ میں خاندان کے سربراہ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ وہ اپنے گھر کے افراد کو نماز کی ادائیگی کی تلقین کرے اور اس پر کاربند رہے۔ اس طرح نماز کی ذمہ داری فرد سے بڑھ کر خاندان کے دائرے تک وسیع ہوتی ہے بلکہ اجتماعی ذمہ داریوں کا حصہ بن جاتی ہے۔ جبکہ سورۃ الحج کی آیت ۴۱ میں قرآن کریم نے نماز

قائم کرنے یعنی مسلم معاشرے میں نماز کا ماحول بنانے کو مسلم حکمران کی ذمہ داریوں میں بتایا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

"ان لوگوں کو جب ہم زمین میں اقتدار دیتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں، نیکی کے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔"

اس لیے نماز کا اہتمام اور نماز کے ماحول کا قیام فرد اور خاندان سے آگے بڑھ کر ریاست اور ایک مسلم حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ہمارے حکمران اگر اپنے طرز عمل اور پالیسیوں کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ و سنت کو رہنمائی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں تو انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ رسالت مآبؐ اس معاملہ میں کس قدر حساس تھے۔ آپؐ نے ایک موقع پر یہاں تک فرمادیا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ مسجد میں کسی اور کو نماز پڑھانے کے لیے کہوں اور خود نماز کے دوران ان لوگوں کے گھروں کو دیکھوں جو تندرست اور صحیح ہوتے ہوئے بھی نماز باجماعت میں شریک نہیں ہوتے اور پھر ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ مسلم شریف کی روایت کے مطابق جناب رسول اللہؐ نے فرمایا اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے (جن کا نماز کے لیے مسجد میں آنا ضروری نہیں ہے) تو میں اپنے اس ارادے پر ضرور عمل کر گزرتا۔

محترم جاوید اشرف قاضی صاحب! جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تو نماز کے لیے بلاعذر مسجد میں نہ آنے والوں کے گھروں کو آگ لگانے کی بات فرمارہے ہیں اور آنجناب کا کہنا ہے کہ بچوں کو نماز کا طریقہ سکھانا حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل نہیں ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

قدرتی آفات۔ اسباب و عوامل اور ہماری ذمہ داری

(جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام، جہلم - ۲۶ نومبر ۲۰۰۵ء)

(جامعہ کے سالانہ جلسہ دستار بندی سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اکتوبر میں آزاد کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقوں میں آنے والے زلزلہ پر ملک بھر میں گفتگو ہو رہی ہے، اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا جارہا ہے، مختلف قسم کے شکوک و شبہات پھیلائے جارہے ہیں، اور ہر سطح پر میڈیا اور لابیاں اس کے لیے

سرگرم عمل ہیں۔ میں اس کے ایک الگ پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس وقت اس کے بارے میں مختلف حلقوں میں جو باتیں ہو رہی ہیں ان میں دو تین سوالات بطور خاص زیر بحث ہیں۔

1. ایک یہ کہ یہ زلزلہ کون لایا ہے؟
2. دوسرا یہ کہ زلزلے اور دیگر آفتیں کیوں آتی ہیں؟
3. اور تیسرا یہ کہ زلزلے سے ہونے والی خوفناک تباہی کے بعد اس کے نقصانات کو کم کرنے اور اس کے اثرات کو سمیٹنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

آفات کون لاتا ہے؟

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سوال کہ زلزلہ کون لایا ہے بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے اس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بعض دانشوروں کی طرف سے کھلے بندوں یہ کہا جا رہا ہے کہ اس زلزلہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ یا سزا سمجھنے کی بجائے فطری قوانین اور نیچرل سورسز کی کارروائی سمجھا جائے کہ ایسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے اور نیچرل سورسز کے حوالے سے یہ معمول کی کارروائی ہے۔ ایک ممتاز دانشور نے ایک بڑے قومی اخبار میں یہ بات تحریر کی تو میں نے انہیں خط لکھا کہ اگر فطری قوانین خود مختار اور خود کار ہیں تو اسے کسی حد تک قبول کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر فطری قوانین اور نیچرل سورسز کے پیچھے کوئی کنٹرولر اور نگران موجود ہے تو یہ بات درست قرار نہیں پاتی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ان صاحب کے نزدیک یہ سادہ اور فطری قوانین ہی کائنات کی اصل قوت محرکہ ہیں اور ان کے پیچھے کسی ذات کے وجود کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ مگر ہم مسلمان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ کائنات میں کسی درخت کا ایک پتہ بھی اس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ اس لیے ہم سب اس کو نیچرل سورسز کے کھاتے میں ڈال کر مطمئن نہیں بیٹھ سکتے۔

ان محترم دانشور نے اپنے کالم میں میرے اس خط کا ذکر کر کے اس کا یہ جواب دیا کہ نیچرل سورسز "فیڈ" کیے ہوئے پروگرام پر چلتی ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ اس جواب سے بھی بات نہیں بن رہی، اس لیے کہ فیڈ کرنے والا پروگرام کو فیڈ کرنے کے بعد نہ تو بے اختیار ہو گیا ہے اور نہ ہی نیچرل سورسز کی کارروائی سے بے خبر ہے بلکہ سب کچھ اس کے علم اور مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس لیے یہ بات تو عقیدہ کے طور پر بہر حال تسلیم کرنا

ہوگی کہ اس زلزلہ کے دنیاوی اسباب کچھ بھی ہوں لیکن جو کچھ ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے اور اس کے علم اور حکم کے مطابق ہوا ہے۔

قدرتی آفات کیوں آتی ہیں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ زلزلے، سیلاب، طوفان، اور دیگر آفتیں کیوں آتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان کے کچھ ظاہری اسباب بھی ہوں گے۔ ہمارے سائنس دان اور ماہرین ان اسباب کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی نشاندہی بھی کرتے ہیں، ہمیں ان میں سے کسی بات سے انکار نہیں ہے۔ اسباب کے درجے میں ہم ہر معقول بات کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے گزشتہ اقوام پر آنے والی ان آفتوں، زلزلوں، آندھیوں، طوفانوں، وباؤں، اور سیلابوں کا ذکر ان اقوام پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے اظہار کے طور پر کیا ہے اور ان قدرتی آفتوں کو ان قوموں کے لیے خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت سے پہلے اپنی امت میں آنے والی قدرتی آفتوں کا پیش گوئی کے طور پر تذکرہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا یا تنبیہ کے طور پر ان کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند احادیث کا یہاں ذکر کرنا چاہوں گا۔

- ترمذی شریف میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ تم نیکی کا حکم ضرور دیتے رہنا، لوگوں کو برائی سے ضرور منع کرتے رہنا، اور ظلم کرنے والے کا ہاتھ پکڑ کر اسے ظلم سے ضرور روکنا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو ایک دوسرے پر مار دے گا اور تم پر اسی طرح لعنت کرے گا جیسا کہ پہلی امتوں پر کی تھی۔
- ترمذی شریف میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ضرور سرانجام دیتے رہنا، ورنہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب نازل ہوگا، پھر تم دعائیں کرو گے تو تمہاری دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔
- ابوداؤد شریف میں سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جب لوگ معاشرہ میں منکرات یعنی نافرمانی کے اعمال کو دیکھیں اور انہیں تبدیل کرنے کی کوشش نہ کریں اور جب کسی ظالم کو ظلم کرتا

دیکھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ظلم سے نہ روکیں تو قریب ہے کہ سب پر خدا کا عذاب آجائے۔

•ابن ماجہ شریف میں حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت میں بعض لوگ شراب پی رہے ہوں گے اور اس کا نام انہوں نے کچھ اور رکھا ہو گا، مردوں کے سروں پر گانے کے آلات بج رہے ہوں گے، اور گانے والیاں گا رہی ہوں گی کہ اللہ تعالی انہیں زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے کچھ کو بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دے گا۔

•ترمذی شریف میں حضرت علیؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے راویت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جب غنیمت کے مال کو ہاتھوں ہاتھ لوٹا جانے لگے، امانت کو غنیمت کا مال سمجھ لیا جائے، زکوۃ کو تاوان اور بوجھ سمجھا جانے لگے، تعلیم حاصل کرنے میں دین کے مقصد کو پس پشت ڈال دیا جائے، خاوند اپنی بیوی کا فرمانبردار ہو جائے، بیٹا اپنی ماں کا نافرمان ہو جائے، بیٹا اپنے دوست کو قریب کرے اور باپ کو خود سے دور رکھے، مسجدوں میں شور و غل ہونے لگے، قبیلہ کا سردار اس کا فاسق شخص ہو، قوم کا لیڈر اس کا رذیل ترین شخص ہو، کسی شخص کی عزت صرف اس کے شر سے بچنے کے لیے کی جانے لگے، ناچنے والیاں اور گانے بجانے کے آلات عام ہو جائیں، شرابیں پی جانے لگیں، اور امت کے بعد والے لوگ پہلے لوگوں پر لعن طعن کرنے لگیں تو پھر خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو سرخ آندھی، زلزلوں، زمین میں دھنسائے جانے، شکلوں کے مسخ ہونے، پتھر برسنے، اور ایسی دیگر نشانیوں کی صورت میں اس طرح لگاتار ظاہر ہو گا جیسے کسی ہار کی ڈوری ٹوٹ جائے اور موتی لگاتار گرنے لگیں۔

اسی طرح آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ یہ قدرتی آفتیں پہلی امتوں کی طرح اس امت میں بھی آئیں گی اور اللہ تعالی کی ناراضگی کا اظہار ہوں گی۔ اس لیے زلزلہ کے ظاہری اسباب پر ضرور نظر کی جائے اور ان کے حوالے سے بچاؤ اور تحفظ کی ضرور کوشش کی جائے لیکن اس کے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ اس

کے باطنی اسباب اور روحانی عوامل کی طرف بھی توجہ دی جائے اور ان کو دور کرنے کے لیے بھی محنت کی جائے۔ جب ہم یہ بات کہتے ہیں تو اس پر ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ سزا اور تنبیہ تو مجرموں کو ہوتی ہے، جو لوگ جرائم میں شریک نہیں ہیں ان کا کیا قصور ہے اور معصوم بچوں اور عورتوں کا کیا جرم ہے کہ وہ بھی بہت بڑی تعداد میں زلزلہ کی زد میں آ گئے ہیں۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ یہ بات بھی جناب نبی اکرمؐ نے متعدّد ارشادات میں واضح فرمائی ہے۔ جب حضورؐ نے آنے والی ان آفتوں کا ذکر کیا تو یہ سوال خود آپؐ سے بھی کیا گیا تھا کہ کیا نیک لوگوں پر بھی یہ عذاب آئے گا؟ نبی اکرمؐ نے اس کا جواب اثبات میں دیا تھا۔

• بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جب کسی قوم پر خدا کا عمومی عذاب آتا ہے تو نیک و بد سب اس کا شکار ہوتے ہیں۔ البتہ قیامت کے دن سب لوگ اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔

• مسلم شریف میں ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں دکھایا گیا ہے کہ میری امت کا ایک شخص حرم مکہ میں پناہ لیے ہوگا اور میری امت کا ہی ایک لشکر اس کے تعاقب میں مکہ مکرمہ کی طرف یلغار کرے گا۔ لیکن ابھی وہ بیداء کے مقام پر ہوں گے کہ سب لوگ زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ ان میں بہت سے لوگ غیر متعلق بھی ہوں گے؟ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ ان میں مستبصر بھی ہوں گے یعنی وہ لوگ جو اپنی مرضی کے ساتھ شریک ہوں گے، کچھ مجبور بھی ہوں گے جو کسی مجبوری کی وجہ سے ساتھ ہوں گے، اور ابن السبیل یعنی راہ گیر بھی ہوں گے جن کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن جب زمین پھٹے گی تو سب لوگ اس میں سما جائیں گے، البتہ قیامت کے دن سب لوگ اپنی اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے۔

• بخاری شریف میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر جناب نبی اکرمؐ نے امت کے کسی حصے پر آنے والے عمومی عذاب کا ذکر فرمایا تو ام المومنین نے سوال کیا کہ کیا نیک لوگوں کی موجودگی میں

ایسا ہو گا؟ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں جب خباثتوں کی کثرت ہو جائے گی تو ایسا ہی ہو گا۔

- مسلم شریف میں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے بھی اسی نوعیت کی روایت ہے کہ انہوں نے جناب نبی اکرمؐ سے دریافت کیا کہ جو شخص نافرمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہو گا، کیا اس پر بھی عذاب آئے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں دنیا کے عذاب میں سب ایک ساتھ ہوں گے، پھر قیامت کے دن ہر شخص اپنی نیت پر اٹھایا جائے گا۔"

چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون اور ضابطہ ہے جس کی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وضاحت فرما رہے ہیں۔ اس کے مطابق ہمیں جہاں یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، وہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضگی کا اظہار ہے، سزا ہے، تنبیہ ہے، اور عبرت کے لیے ہے جس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔

قدرتی آفات آنے پر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اب آخری سوال کی طرف آئیے کہ اس صورتحال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلہ میں ہمارا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ ہم توبہ و استغفار کریں، اپنے جرائم اور بداعمالیوں کا احساس اجاگر کریں، اپنی زندگیوں کو بدلنے کی کوشش کریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کریں، معاشرے میں برائیوں کو روکنے اور نیکیوں کو پھیلانے کی محنت کریں، اور دین کی طرف عمومی رجوع کا ماحول پیدا کریں۔

اس کے بعد ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کریں، ان کی بحالی کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں کہ یہ ہماری دینی اور قومی ذمہ داری ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ میں خود زلزلہ کے متعدّد علاقوں سے ہو کر آیا ہوں اور تباہی کے خوفناک مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ہزاروں خاندان اور لاکھوں افراد ہماری مدد اور توجہ کے مستحق ہیں۔ اگرچہ امدادی سرگرمیاں وسیع پیمانے پر جاری ہیں لیکن اصل ضرورت سے بہت کم ہیں اور ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ وقتی مسئلہ نہیں ہے اس پر کئی سال لگ سکتے ہیں اور اس کے لیے غیر معمولی محنت اور قربانی کی ضرورت ہو گی۔

اس کے ساتھ ہی اس سلسلہ میں جاں بحق ہونے والے خواتین و حضرات کے لیے دعائے مغفرت کا اہتمام ضروری ہے۔ چونکہ وہ لوگ اچانک اور حادثاتی موت کا شکار ہوئے ہیں اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کے مطابق وہ شہداء میں شامل ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعا بھی ہم پر ان کا حق ہے اور ہمیں اپنی دعاؤں میں انہیں یاد رکھنا چاہیے۔

زلزلہ کی تباہ کاریاں۔ چند توجہ طلب امور

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ نومبر ۲۰۰۵ء)

۸ اکتوبر کے زلزلہ کی شدت اور سنگینی کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے اور ملکی و عالمی سطح پر تمام ممکنہ اور میسر وسائل استعمال کیے جانے کے باوجود نہ تو نقصانات کا پورے طور پر تخمینہ لگایا جا سکا ہے، نہ تمام متاثرہ علاقوں تک رسائی ممکن ہو سکی ہے اور نہ ہی ملبہ میں دب جانے والے انسانوں کو زندہ یا مردہ وہاں سے نکال لینے کی کوئی صورت قابل عمل دکھائی دے رہی ہے۔ امدادی کاروائیاں جاری ہیں اور عالمی برادری، مسلم امہ اور پاکستانی قوم کی بھرپور نمائندگی ان امدادی کاروائیوں میں نظر آ رہی ہے، حکومت پاکستان اور پاک فوج پوری طرح مستعد ہیں اور سیاسی و سماجی تنظیمیں بھی سرگرم کردار ادا کر رہی ہیں۔ میڈیا نے دنیا تک اس خوفناک زلزلے کی تباہ کاریوں کی خبریں پہنچانے اور عالمی برادری کو متاثرہ انسانوں کی امداد کی طرف توجہ دلانے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ قابل تعریف ہے، اس کے ساتھ تنقید اور اعتراضات کا عمل بھی جاری ہے جو امدادی کام کو صحیح رخ پر اور صحیح رفتار سے آگے بڑھانے کے لیے مہمیز کا کام دے رہا ہے۔

زلزلہ کی تباہ کاریوں نے کچھ علمی و فکری سوالات بھی کھڑے کر دیے ہیں جن پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری ہے، ارباب فکر و دانش ان پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں اور اس نازک مرحلہ پر قوم کی فکری راہنمائی کے لیے یہ بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ہمارے بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ اس زلزلہ کو عذاب الٰہی سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ اقوام کے لیے عذاب الٰہی کا سلسلہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا اور اب چونکہ قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر کو جھٹلانے پر اتمام حجت کے بعد جو عذاب جو مختلف قوموں پر آیا کرتا تھا

اس کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا ہے، البتہ ان ارباب دانش کا خیال ہے کہ اس قسم کی قدرتی آفات اب صرف تنبیہ کا درجہ رکھتی ہیں اور انہیں عذاب الٰہی سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے۔ بعض دوستوں نے اسے عذاب قرار نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ جن علاقوں میں یہ زلزلہ آیا ہے اور جن لوگوں کی اکثریت اس سے متاثر ہوئی ہے وہ دین سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں اور ان میں ایسے جرائم اور بغاوت کا ماحول موجود نہیں تھا جسے "عذاب الٰہی" کے نزول کی وجہ قرار دیا جاسکے، اس لیے اس امر پر تردد کا اظہار کیا جارہا ہے کہ اس زلزلہ اور اس کی تباہ کاریوں کو قدرت کی طرف سے سزا یا عذاب کی شکل قرار دیا جائے۔

ان سوالات کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان دونوں سوالوں کا جواب مل جاتا ہے مثلاً:

- ترمذی شریف میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ضرور اہتمام کروگے ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب نازل کرلے پھر ایسا بھی ہوگا کہ تم دعائیں کروگے مگر تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی۔
- ابوداؤد شریف میں سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جب لوگ معاشرہ میں منکرات کو دیکھیں گے اور انہیں تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو قریب ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عمومی عذاب نازل ہوجائے۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب لوگ ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں گے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہیں روکیں گے تو اللہ تعالیٰ کے عمومی عذاب کا شکار ہوسکتے ہیں، اس روایت میں یہ بھی ہے کہ جس قوم میں نافرمانی کے اعمال ہو رہے ہوں اور لوگ انہیں روکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عمومی عذاب نازل فرمادیں۔
- ابوداؤد میں حضرت جریر بن عبد اللہؓ سے بھی یہی روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس قوم میں نافرمانی کے اعمال ہوتے ہوں اور وہ لوگ روکنے

کی طاقت رکھنے کے باوجود روکنے کی کوشش نہ کریں تو اللہ تعالی کی طرف سے عذاب کا شکار ہوسکتے ہیں۔

• شرح السنۃ میں حضرت عدی بن عدی کندیؒ سے روایت ہے کہ ان کے دادا محترم نے جناب نبی اکرمؐ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالی عام لوگوں کو چند افراد کے گناہوں اور بغاوت پر سزا نہیں دیتے لیکن جب یہ کیفیت ہوجائے کہ گناہ اور نافرمانی کے اعمال کھلے بندوں ہورہے ہوں اور دوسرے لوگ روکنے کی طاقت رکھنے کے باوجود نہ روک رہے ہوں تو اللہ تعالی عام و خاص لوگوں کو عذاب میں مبتلا کردیتے ہیں۔

• ابو داؤد میں حضرت ابو موسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میری یہ امت مرحومہ ہے اس کے لیے آخرت میں عذاب نہیں ہے بلکہ اس کا عذاب دنیا میں ہی ہے اور وہ فتنوں، زلزلوں اور باہمی قتل وقتال کی شکل میں ہوگا۔

• ام المومنین ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جناب نبی اکرمؐ سے دریافت کیا کہ اگر نیک لوگ ہمارے درمیان موجود ہوں تب بھی عمومی عذاب آسکتا ہے؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب خباثتوں کی کثرت ہوگی تو ایسا ہی ہوگا۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی آفتوں کی صورت میں عذاب الٰہی کا سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا بلکہ امت محمدیہ پر آنے والی اس قسم کی آفات کو خود جناب نبی اکرمؐ نے ”عذاب“ اور ”عقاب“ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ آنحضرتؐ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالی نے یہ وعدہ فرما رکھا ہے کہ پوری امت مجموعی طور پر ایسے کسی عذاب کا شکار نہیں ہوگی اور حضورؐ کی امت پر آسمانی عذاب نازل نہ ہونے کی صحیح توجیہ یہی ہے کہ پوری امت بیک وقت کسی آسمانی عذاب کا نشانہ نہیں بنے گی کیونکہ پہلی امتوں پر جب کسی پیغمبر کی تکذیب پر عذاب آتا تھا تو وہ جزوی نہیں ہوتا تھا بلکہ پوری کی پوری قوم اس میں ہلاک ہوجایا کرتی تھی، جناب نبی اکرمؐ کی دعا پر اللہ تعالی نے ان کی امت کو ایسے عذاب سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس زلزلے کے حوالہ سے اخبارات میں شائع ہونے والے بعض مضامین اور بیانات میں ایک بات ہمیں یہ کھٹکی ہے کہ بعض بیانات میں قدرتی آفات کا مقابلہ کرنے کا عزم جھلکتا ہے، ممکن ہے مقابلہ کی بات کہنے والوں کا مطلب و مقصد وہ نہ ہو جو اس کے ظاہری مفہوم سے جھلکتا ہے لیکن محسوس ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے زلزلے کا مقابلہ کرنے کا قصد کیا جا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سلسلہ میں احتیاط کی ضرورت ہے اس لیے کہ قدرتی آفات کا مقابلہ نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی کوئی آج تک کسی قدرتی آفت کا مقابلہ کر سکا ہے، اس کی بجائے اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب بات ہوگی کہ ہم اس زلزلے کے نقصانات کا صبر و حوصلہ کے ساتھ سامنا کریں گے اور ان کی تلافی کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آسمان پر بادل اور آندھی کے آثار دیکھ کر جناب نبی اکرمؐ پریشان ہو جایا کرتے تھے اور استغفار کی کثرت کر دیتے تھے۔ ایک روز حضرت عائشہؓ نے اس کے بارے میں دریافت کر لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ بعض امتوں پر خدا کا عذاب بادل اور آندھی کی صورت میں آیا تھا، اس لیے میں یہ چیزیں دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں اور استغفار کثرت سے پڑھنے لگتا ہوں۔ ہمارے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ یہی ہے کہ قدرتی آفات کا مقابلہ کی بات کرنے کی بجائے اجتماعی طور پر توبہ و استغفار کا راستہ اختیار کریں اور قدرت کی ناراضگی پر پریشانی اور اضطراب کا اظہار کریں، البتہ اس کے ساتھ حوصلہ قائم رکھنے اور صبر کا ماحول پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ قومیں صبر و حوصلہ کے ذریعہ ہی ایسے مراحل میں سرخرو ہوا کرتی ہیں۔

ایک اور بات جو ایک دانشور دوست کے مضمون میں اس حوالہ سے کھٹکی ہے یہ ہے کہ انہوں نے حاجی حضرات کو مشورہ دیا ہے کہ حج ترک کر کے اس کی رقم زلزلہ سے متاثر ہونے والوں کو دے دیں یا ان کی بحالی کی مد میں خرچ کر دیں۔ نفلی حج یا عمرہ کی صورت میں تو یہ بات درست ہے اور ہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں اس لیے کہ نفلی عبادت سے حقوق العباد بہر حال مقدم ہیں، لیکن فرائض و واجبات کے بارے میں اس بات کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ کوئی صاحب اگر فرض حج کے لیے جا رہے ہیں تو انہیں حج ترک کرنے کا یہ مشورہ درست نہیں ہے، فرض بہر حال فرض ہے جو اسی شکل میں ادا کرنے سے ادا ہوگا، اس کی کوئی اور متبادل شکل نہیں ہوتی۔ البتہ نفلی حج یا عمرہ کرنے والے حضرات اس نفلی حج اور عمرہ پر اپنے متاثرہ بھائیوں کی مدد اور اجڑے ہوئے خاندانوں کی بحالی کو ترجیح دیں گے تو وہ

دوہرے اجر کے مستحق ہوں گے، نیت کی وجہ سے حج یا عمرہ کا ثواب تو انہیں مل ہی جائے گا جبکہ اپنے متاثرہ بھائیوں کی مدد کا ثواب مستقل ملے گا اور آج کے حالات میں اس سے بہتر اور کوئی اجر نہیں ہے۔

پاکستانی قوم جس ہم آہنگی اور یکجہتی کے ساتھ اپنے متاثرہ بھائیوں کی امداد میں مصروف ہے وہ اس المناک سانحہ کا ایک روشن پہلو ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قوم کو صحیح قیادت میسر آجائے تو اس میں ایک زندہ بیدار اور متحد قوم بننے کی صلاحیت موجود ہے، خدا کرے یہ جذبہ قائم رہے اور جس طرح اپنے متاثرہ اور اجڑے ہوئے بھائیوں کی امداد و تعاون کے لیے ہم ایک نظر آرہے ہیں، دیگر ملی و قومی مقاصد کی طرف پیشرفت میں بھی ہم اسی یکجہتی اور ہم آہنگی کا مظاہرہ کر سکیں، آمین یا رب العالمین۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم پر ایک نظر

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۵ ستمبر ۲۰۰۵ء)

دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے حالیہ فیصلے کے بعد یہ سوال ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ دینی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کا معیار کیا ہے اور وہ قوم اور معاشرے کی کون سی ضروریات پوری کرتے ہیں؟ اس لیے کہ عدالت عظمی کے فیصلے میں یہ کہا گیا ہے کہ دینی مدارس کے فضلاء معیار میں اسکولوں اور کالجوں کے فضلاء کے معیار پر پورا نہیں اترتے، اس لیے ان کی اسناد کو تعلیمی ضروریات کے علاوہ اور کسی مقصد کے لیے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اس سلسلے میں کسی تفصیلی بحث میں جانے کے بجائے دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب کا ایک خاکہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے انہیں یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ دینی مدارس میں اس وقت جو مواد زیر درس ہے، اس کی نوعیت کیا ہے اور قومی و معاشرتی ضروریات کے ساتھ اس تعلیمی مواد کا کیا تعلق ہے؟

اس وقت ملک بھر میں قائم دینی مدارس کی غالب اکثریت پانچ وفاقوں کے ساتھ وابستہ ہے جس کی تقسیم مسلکی حوالے سے ہے:

- وفاق المدارس العربیہ حنفی، دیوبندی (اہل سنت) مسلک سے تعلق رکھتا ہے،

- تنظیم المدارس حنفی، بریلوی (اہل سنت) مسلک کے مدارس پر مشتمل ہے،
- وفاق المدارس السلفیہ کا تعلق اہل حدیث مکتب فکر سے ہے،
- رابطۃ المدارس العربیہ میں جماعت اسلامی سے فکری تعلق رکھنے والے مدارس شامل ہیں،
- جبکہ وفاق المدارس الشیعہ، شیعہ مذہب کے دینی مدارس پر مشتمل ہے۔

ان میں مدارس کی تعداد کے لحاظ سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان سب سے بڑا وفاق ہے اور وفاقوں کے اتحاد میں سرگرم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے سربراہ جامعہ فاروقیہ کراچی کے سربراہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان اور سیکرٹری جنرل جامعہ خیر المدارس ملتان کے سربراہ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری ہیں۔ ان وفاقوں میں جن نصابوں کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کی تفصیلات و جزئیات میں جا بجا فرق موجود ہے لیکن جوہری حوالے سے ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں، بلکہ مضامین کے ساتھ ساتھ ان نصابوں کی اکثر کتابیں بھی مشترکہ ہیں، اور اہداف کے حوالے سے بھی ان سب کا مقصد ایک ہی ہے کہ معاشرے کے عام لوگوں کا تعلق قرآن و سنت اور دینی تعلیمات کے ساتھ قائم رہے اور دینی علوم کی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ ترویج ہو۔ البتہ تعبیر و تشریح میں مسلکی ترجیحات بہر حال غالب ہیں جو بسا اوقات زیادہ شدت اختیار کر جاتی ہیں اور باہر سے دیکھنے والوں کو وہ فرقہ واریت ہی کی عملی شکل دکھائی دیتی ہیں۔

اس وقت وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا نصاب ہمارے سامنے ہے جو وفاق کے ترجمان سہ ماہی وفاق میں ۲۰۰۳ء کے دوران میں شائع ہوا ہے اور اس کی مرحلہ وار تفصیلات ہم قارئین کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔

طلباء اور طالبات کے لیے وفاق المدارس کے نصاب الگ الگ ہیں اور طلباء کا نصاب مجموعی طور پر سترہ سال پر مشتمل ہے جسے درج ذیل درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- پہلا درجہ پرائمری اور مڈل کے آٹھ سالوں پر مشتمل ہے اور اسے ’’ابتدائیہ اور متوسطہ‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔
- دوسرا درجہ ’’ثانویہ عامہ‘‘ کے نام سے میٹرک کے تین سالوں پر مشتمل ہے۔

- تیسرا درجہ "ثانویہ خاصہ" کے عنوان سے ایف اے کے دو سالوں کو محیط ہے۔
- چوتھا درجہ "عالیہ" کے نام سے بی اے کے دو سالوں پر مشتمل ہے۔
- پانچواں درجہ "عالمیہ" کے عنوان سے ایم اے کے دو سالوں کو محیط ہے۔

درجہ ابتدائیہ اور متوسطہ کے آٹھ سالوں کے نصاب میں شامل مضامین کی تفصیل یہ ہے:

1. قرآن کریم نورانی قاعدہ سے لے کر مکمل ناظرہ قرآن کریم مع تجوید اور آخری پارہ حفظ۔ یہ نصاب مرحلہ وار آٹھ سالوں میں مکمل کرایا جاتا ہے۔
2. ضروریات دین میں کلمہ طیبہ و کلمہ شہادت یاد کرانے سے لے کر نماز حنفی، تعلیم الاسلام مکمل، سیرت خاتم الانبیاء اور بہشتی گوہر تک کے نصاب کو آٹھ سالوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔
3. اردو میں جماعت اول سے جماعت ہشتم تک کا نصاب شامل کیا گیا ہے۔
4. حساب اور ریاضی میں گنتی اور پہاڑوں سے لے کر آٹھویں جماعت تک کی ریاضی نصاب میں شامل ہے۔
5. انگریزی اول جماعت سے آٹھویں جماعت تک شامل نصاب ہے۔
6. معاشرتی علوم کو سال سوم سے سال ہشتم تک نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔
7. سال پنجم میں سائنس شامل نصاب ہے، جبکہ اس کے بعد فارسی کے چند رسالے شامل نصاب ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ لازم کیا گیا ہے کہ اردو، انگلش، سائنس، ریاضی اور معاشرتی علوم میں ساتویں سال تک پشاور بورڈ، لاہور بورڈ، کراچی بورڈ اور کوئٹہ بورڈ کا منظور کردہ نصاب پڑھایا جائے گا، جبکہ آٹھویں سال کے لیے ان مضامین کے حوالے سے وفاق نے اپنا نصاب خود مرتب کیا ہے۔

میٹرک کو وفاق نے مڈل کے بعد تین سالوں تک وسیع کر دیا ہے جس میں سال اول کے دوران میں صرف سرکاری بورڈ کے نصاب کے مطابق انگلش، سائنس، ریاضی، اردو، اسلامیات، معاشرتی علوم، اور مطالعہ پاکستان کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور نہم دہم دونوں سالوں کا نصاب ایک سال میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو سالوں میں عربی صرف ونحو، عربی لغت، تجوید وقراءت، تفسیر وحدیث، فقہ اور منطق کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور انشا کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس درجے یعنی میٹرک کے امتحان کے لیے مدارس کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ خود امتحان لیں یا کسی متعلقہ سرکاری بورڈ سے امتحان دلوا دیں۔

ثانویہ خاصہ یعنی ایف اے کے دو سالوں میں تفسیر وحدیث، فقہ اور اصول فقہ، عربی نحو، سیرت وتاریخ، منطق، علم بلاغت اور ادب وانشا کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

عالیہ یعنی بی اے کے درجے میں دو سال کے دوران میں تفسیر وحدیث، فقہ واصول فقہ، بلاغت، فلسفہ وعقائد، لغت عربیہ، تاریخ، فرائض یعنی وراثت کے احکام، فلکیات اور عروض وقوافی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

عالمیہ کا درجہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا آخری درجہ ہے جسے ایم اے کے مساوی سمجھا جاتا ہے اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بھی اسے ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے برابر تسلیم کیا ہوا ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ کہ یہ صرف تعلیمی مقاصد کے لیے ہے۔ دوسرے مقاصد کے لیے اس سند کو تسلیم کرنے کے لیے اسکولوں اور کالجوں کے چند لازمی مضامین (مثلاً اردو، اسلامیات، مطالعہ پاکستان، انگلش وغیرہ) کا امتحان دینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ عالمیہ کے سال اول میں قرآن کریم کی عربی تفسیر بیضاوی شریف کا پہلا پارہ پڑھایا جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم کا ترجمہ اس سے قبل طالب علم مکمل کر چکا ہوتا ہے۔ اس سال کے نصاب میں دو اور مضامین کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ایک معیشت کا جس میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہے اور دوسرا مقارنۃ الادیان یعنی دوسرے معاصر مذاہب کا تعارف۔ جبکہ سال دوم میں حدیث نبوی کی نو بڑی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں: (۱) بخاری شریف (۲) مسلم شریف (۳) ترمذی شریف (۴) ابوداؤد شریف (۵) نسائی شریف (۶) ابن ماجہ شریف (۷) شمائل ترمذی (۸) موطا امام مالک، اور (۹) طحاوی شریف۔

آخری سال درس نظامی کا سب سے اہم سال ہوتا ہے جس میں ہزاروں احادیث نبویہ طالب علم کی نظر سے گزرتی ہیں اور وہ عقائد و عبادات سے لے کر نکاح و طلاق، تجارت و معیشت، زراعت، خلافت، جہاد، معاملات و معاشرت، اخلاق و آداب، امارت و سیاست اور علامات قیامت سمیت سینکڑوں عنوانات و مضامین کے حوالے سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و ارشادات کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اور یہی درس نظامی کا اصلی مقصد ہے، کیونکہ اس سے قبل مسلسل پندرہ سال تک جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ قرآن کریم اور سنت نبوی کے مفہوم تک رسائی کی استعداد پیدا کرنے کے لیے دی جاتی ہیں، اور جب یہ استعداد ایک خاص درجے تک پہنچ جاتی ہے تو پھر طالب علم کو تفسیر قرآن کریم اور احادیث کے ذخیرے سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اگر حدیث نبوی کی ان نو کتابوں کے مضامین اور عنوانات پر ایک نظر ڈال لی جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس قدر متنوع اور ہمہ گیر نصاب ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے اور پہلو کا احاطہ کرتا ہے اور قدیم و جدید کا کوئی مسئلہ ایسا باقی نہیں رہ جاتا جو ان احادیث کے ضمن میں طالب علم کے سامنے نہ آجاتا ہو، البتہ اس جامعیت اور تنوع کا احاطہ استاد اور شاگرد کے ذوق اور استعداد پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک اس کا ادراک رکھتے ہیں اور کس حد تک اس کا فہم حاصل کر پاتے ہیں۔

آخری سال کا نصاب اس قدر بھاری بھر کم ہے کہ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ دورۂ حدیث کے سال طالب علم کو پورا سال سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی، مگر اس کے باوجود راقم الحروف نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں، جہاں دورہ حدیث کے منتہی اسباق میرے ذمے ہوتے ہیں، ایک اور اہم مضمون کا اضافہ کر رکھا ہے جس میں طلبہ کو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے حوالے سے اسلام اور مغرب کی تعلیمات کا فرق سمجھایا جاتا ہے، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا تاریخی اور معاشرتی پس منظر بتایا جاتا ہے، اس کی مختلف دفعات پر قرآن و سنت کی روشنی میں تبصرہ کیا جاتا ہے اور انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور اسلامی احکام و قوانین سے جہاں جہاں متصادم ہے، اس کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

یہ ہے ان مضامین اور تعلیمی مواد کا ایک ہلکا سا خاکہ جو سترہ سال کے دوران میں دینی مدارس کے طلبا کو پڑھایا جاتا ہے اور جسے مرحلہ وار پڑھ کر شہادۃ العالمیہ کے عنوان سے وہ

اس ڈگری کے مستحق قرار پاتے ہیں جو آج کل قومی حلقوں میں متنازعہ حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔

کچھ دیر کیمبرج یونیورسٹی اور واٹن جیل میں

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۵ جولائی ۲۰۰۵ء)

اس سال برطانیہ کے سولہ روزہ سفر کے دوران بعض تقریبات میں جانے کا اتفاق ہوا اور کچھ نئی باتیں سامنے آئیں جن کا تذکرہ قارئین کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔ برطانیہ میں آکسفورڈ اور کیمبرج کو تعلیمی اور ثقافتی مراکز کے طور پر عالمگیر شہرت حاصل ہے اور انہیں مغرب کے فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے علمی سرچشمے سمجھا جاتا ہے۔ مجھے گزشتہ بیس سال کے دوران کم و بیش ہر سال برطانیہ جانے کا موقع ملا ہے اور آکسفورڈ میں کئی بار گیا ہوں مگر کیمبرج جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا حالانکہ وہ بھی آکسفورڈ ہی کی طرح مغرب کا بڑا علمی و تہذیبی مرکز ہے اور لندن سے گھنٹہ سوا گھنٹہ کی ڈرائیو پر واقع ہے۔

۱۸ جون کو لیسٹر کے مولانا محمد فاروق ملا کے ہمراہ چند جگہوں پر جانے کا پروگرام تھا اور واپسی پر رات کو لندن پہنچنا تھا، انہوں نے بتایا کہ ہم اپنے آخری اسٹاپ کینز لین سے لندن کی طرف جائیں گے تو راستہ میں کیمبرج بھی آئے گا۔ میں نے تقاضا کیا کہ پروگرام کی ترتیب ایسے طے کی جائے کہ تھوڑی دیر کے لیے کیمبرج میں گھومنے پھرنے کا موقع میسر آجائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہم کینز لین سے عصر کے بعد جلدی فارغ ہو کر چل پڑے اور مغرب سے تقریباً نصف گھنٹہ قبل کیمبرج جا پہنچے۔ شام کا وقت تھا، کسی دوست کو تلاش کرنے اور یونیورسٹی سے متعلقہ اداروں کے اندر جانے کا موقع نہیں تھا اس لیے پروگرام یہ طے ہوا کہ مغرب کی نماز کیمبرج کی واحد مسجد ”مسجد ابوبکر صدیق“ میں پڑھی جائے اور اس سے قبل تھوڑا سا گھوم پھر کر یونیورسٹی کو باہر سے دیکھ لیا جائے۔ مولانا فاروق ملا کے ہمراہ گاڑی پر ہی دو چار سڑکوں کا چکر لگایا، طلبا اور طالبات کی ٹولیوں کو سڑکوں اور باغات میں چلتے پھرتے دیکھا، بازار کی رونق دیکھی اور مغرب کی نماز کے وقت مسجد میں پہنچ گئے۔ وہی آکسفورڈ کی طرز کا ماحول تھا البتہ مجھے کیمبرج میں رونق آکسفورڈ سے کم محسوس ہوئی۔

مسجد میں پہنچے تو مولانا فاروق ملا نے مسجد کے ذمہ دار حضرات سے میرا تعارف کرا دیا اور ان کا تقاضا ہوا کہ مغرب کے بعد نمازیوں سے میں تھوڑا بہت خطاب کروں۔ امام

صاحب نے بتایا کہ ایک پروگرام پہلے سے بھی طے شدہ ہے اس لیے میں نے مختصراً ایک بات پر اکتفا کیا۔ امام صاحب نے نماز مغرب کی پہلی رکعت میں سورۃ اللیل کی تلاوت کی تھی جس میں بخل کا ذکر ہے اور فرمان الٰہی ہے کہ ”جس نے بخل کیا اور بے پروائی برتی ہم اس کے لیے تنگی کا راستہ ہموار کر دیتے ہیں“۔ میں نے اس کا حوالہ دیا کہ بخل ایک مذموم صفت ہے جو مال میں بھی ہے اور علم میں بھی ہے۔ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال کی نعمت دی ہے لیکن وہ اسے اپنے تک محدود رکھتا ہے اور دوسروں کو اس نعمت میں شریک نہیں کرتا وہ بخیل ہے، اور ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت دی ہے اور وہ اسے خود تک محدود رکھتے ہوئے دوسرے لوگوں کو اس میں شریک کرنے سے گریز کرتا ہے تو وہ بھی بخیل ہے۔ اسی طرح ایمان اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اسے اپنی ذات تک محدود رکھنا بھی بخل ہے، ہر مسلمان کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ ایمان کی دعوت کو عام کرے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس نعمت خداوندی میں شریک کرنے کی کوشش کرے۔ اس حوالے سے میں کیمبرج کے مسلمانوں کو اس بات پر غور و فکر کی دعوت دینا چاہتا ہوں کہ اس شہر میں دنیا کے مختلف ممالک اور علاقوں سے لوگ آتے ہیں اور طلبہ و طالبات کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے، ہم انہیں اسلام کی دعوت دینے اور ایمان کی نعمت میں شریک کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ اگر ہم کچھ نہیں کر رہے اور ایمان کی دولت کو، قرآن و سنت کی دولت کو اور اسلام کی نعمت کو خود اپنی ذات اور ماحول کے دائرے تک محدود رکھے ہوئے ہیں تو ہم بخل سے کام لے رہے ہیں اور قرآن کریم کی اس آیت کا مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں۔

نماز سے فارغ ہوئے تو مسجد کے قریب ہی ایک ریسٹورنٹ کے مالک محمد ارشد صاحب اصرار کر کے ہمیں شام کے کھانے کے لیے لے گئے۔ ان کا تعلق لاہور سے ہے، وہاں لاہور سے تعلق رکھنے والے چند دوست اور بھی تھے انہوں نے پر تکلف کھانا کھلایا۔ میں نے پاکستان شریعت کونسل کا نیوز لیٹر ”نوائے شریعت“ دیا تو دیکھتے ہی کہنے لگے کہ میرے ماموں بھی شریعت کے بارے میں بہت کچھ لکھتے رہتے تھے۔ پوچھا کون بزرگ تھے تو معروف فاضل اور دانشور مولانا ریاض الحسن نوری مرحوم کا نام لیا جو ہمارے محترم دوستوں میں سے تھے اور روزنامہ جنگ اور دیگر اخبارات میں اسلامی شریعت کے مختلف پہلوؤں پر تسلسل سے لکھا کرتے تھے۔ ہمارا ان سے تعلق تھا اور بہت سے کاموں میں ہمارے درمیان مشاورت رہتی تھی۔ وہ اسلامی شریعت کے دفاع اور اس کے مختلف احکام کی

تشریح میں بہت اچھا لکھا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ درجات سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔ صاحب دعوت نے ان کا حوالہ دیا تو زیادہ خوشی ہوئی اور اس طرح مختصر سا وقت کیمبرج میں گزار کر ہم لندن کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس روز ہم نے واٹن کا جیل خانہ بھی دیکھا۔ یہ برطانیہ کے چند بڑے جیل خانوں میں سے ہے اور ٹونگھم سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ مولانا فاروق ملا ہر ہفتے کے روز وہاں جاتے ہیں اور جیل کے مسلمان قیدیوں کے ساتھ ان کی نشست ہوتی ہے۔ وہ انہیں ہفتہ وار کلاس میں قرآن کریم اور دینیات کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ ان کی فرمائش پر میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ ان سے پوچھا کہ مجھے جیل خانے کے اندر جانے کی اجازت مل جائے گی؟ انہوں نے کہا کہ صرف پاسپورٹ چیک ہوگا اس کے سوا کوئی سوال و جواب نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہم جیل کے مین گیٹ پر پہنچے تو مولانا فاروق ملا نے ایک پٹی اپنی کمر کے گرد حمائل کر لی جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ جیل کے منظور شدہ استاذ ہیں، جبکہ میرا پاسپورٹ چیک کیا گیا البتہ موبائل فون اندر لے جانے کی اجازت نہ تھی وہ ہم نے باہر گاڑی میں رکھ دیا۔ جیل کے اندر گئے تو پندرہ سولہ مسلمان قیدی ایک کمرے میں ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے اور ایک میز پر کافی، جوس اور پھل سجائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے جیل کے حالات پوچھے اور انہوں نے جو کچھ بتایا وہ حیران کن تھا۔ اس لیے کہ میں نے بھی کئی بار پاکستان کی جیلوں میں وقت گزرا ہے، ہمارے ہاں ان باتوں اور سہولتوں کا عام قیدی کے لیے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے بتایا کہ شام آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک انہیں کمرے میں بند کر کے لاک کر دیا جاتا ہے اور ہر قیدی کو الگ الگ کمرہ ملا ہوا ہے۔ صبح آٹھ بجے لاک اپ سے نکال کر ناشتہ دیا جاتا ہے جو دودھ اور توس وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے جس کے بعد وہ کام پر چلے جاتے ہیں۔ وہاں کام کی نوعیت یہ ہے کہ جیل کی خدمات سے متعلق بہت سے کام قیدیوں کے سپرد کر دیے جاتے ہیں جو ان کے لیے اختیاری بات ہوتی ہے۔ اگر کوئی قیدی کام نہ کرنا چاہے تو اس پر جبر نہیں کیا جاتا اور کام کرنے والوں کو باقاعدہ معاوضہ ملتا ہے۔ جھاڑو وغیرہ کا کام کرنے والے کا معاوضہ سب سے زیادہ ہوتا ہے، دس سے بارہ پاؤنڈ فی ہفتہ ہو سکتا ہے۔ اس سے کم کام کی نوعیت کے حساب سے پانچ سے آٹھ پاؤنڈ فی ہفتہ معاوضہ ملتا ہے۔ اور جو قیدی کام نہیں کرتا اسے بھی دو پاؤنڈ فی ہفتہ جیل خرچ مل جاتا ہے۔ آٹھ سے ساڑھے گیارہ بجے تک کام

کرتے ہیں، پھر ڈیڑھ گھنٹہ کا وقفہ کھانے اور آرام کے لیے ہوتا ہے، پھر کھیل اور تفریح کا وقت ہوتا ہے جس کے لیے جیل میں مختلف سہولتیں فراہم کی گئی ہیں، اور شام کو آٹھ بجے سے پہلے کھانا کھلا کر پھر لاک اپ میں بند ہو جاتے ہیں۔ میں نے ان سے کھانے اور ناشتے وغیرہ کی تفصیل پوچھی تو اندازہ ہوا کہ برطانیہ کی اس جیل میں ہمارے ہاں کے درمیانے درجے کے ہوٹل یا ریسٹ ہاؤس کے معیار کی سہولت قیدیوں کو ملی ہوئی ہے۔ خود ایک قیدی نے یہی کہا کہ صرف باہر جانے کی پابندی ہے ورنہ یہاں ہم اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ دنوں ایک قیدی کی شادی بھی ہوئی جس کے لیے جیل حکام نے پوری سہولت فراہم کی ہے۔

ان مسلمان قیدیوں نے مجھ سے کچھ کہنے کے لیے کہا تو میں نے گزارش کی کہ آپ حضرات آزمائش اور ابتلا کی زندگی گزار رہے ہیں جس کے لیے میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت آپ کو جلد از جلد رہائی عطا فرمائیں۔ اور اس کے ساتھ ایک بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیل میں آپ کے پاس فرصت کا بہت وقت ہے، اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ فرصت اور فراغت کے وقت کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور اسے ضائع کرنے کی بجائے کسی نہ کسی کام میں لانا چاہیے۔ آپ کو اپنی رہائی تک کا وقت بہر حال اس جیل میں گزارنا ہے اور یہ زیادہ تر وقت فراغت اور فرصت کا ہے، اسے ضائع مت کریں اور کسی نہ کسی کام میں لے آئیں۔ میں اس کے لیے آپ کو تین باتوں کا مشورہ دوں گا:

- ایک یہ کہ اپنی تعلیمی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں اور کوئی نہ کوئی کورس جس کی یہاں سہولت حاصل ہے ضرور کر لیں۔ اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کی تعلیم حاصل کریں اور دینی ضروریات کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں تاکہ جیل سے باہر نکل کر ایک صحیح مسلمان کے طور پر زندگی بسر کر سکیں۔
- دوسری بات یہ ہے کہ یہاں کوئی نہ کوئی ہنر سیکھنے کی سہولت بھی ضرور ہوگی، اس سے فائدہ اٹھائیں اور کوئی نہ کوئی ہنر ضرور سیکھ لیں جو زندگی میں آپ کے کام آئے۔
- تیسری بات یہ ہے کہ خلوت، فرصت اور تنہائی کے ان اوقات میں اپنے مالک اور خالق کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ نماز کی پابندی کریں، قرآن کریم کی تلاوت کا معمول بنائیں، ذکر و اذکار کا اہتمام کریں، درود

شریف پڑھیں اور اس طرح اس فرصت کو اللہ تعالی کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط بنانے کے لیے استعمال کریں۔

کیمبرج یونیورسٹی اور واٹن کے جیل خانے میں حاضری کے علاوہ اس سفر میں ایک نیا لطیفہ سننے اور دیکھنے کو ملا وہ بھی قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ ۱۹ جون کو شام کے وقت ایسٹ لندن میں رامفور روڈ پر گکھڑ سے تعلق رکھنے والے ایک دوست میاں محمد اختر کے ہاں شام کے کھانے پر احباب جمع تھے۔ میاں صاحب محترم نے بتایا کہ ان کے پڑوس میں ایک ہندو رہتا ہے جس نے گھر میں ایک بڑا بت بھگوان کے نام سے رکھا ہوا ہے اور وہ اس کی عبادت کرتا ہے۔ دو روز قبل میں نے دیکھا کہ وہ ایک اور بڑا بت کھینچ کر لا رہا ہے اور مکان کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو کہنے لگا کہ بھگوان ہے۔ میاں اختر نے کہا کہ ایک بھگوان تو تمہارے گھر میں پہلے سے موجود ہے، یہ دوسرا کس لیے لائے ہو؟ تو اس نے کہا کہ یہ بھگوان سیل پر بہت سستا مل گیا ہے اس لیے اسے بھی لے آیا ہوں۔ میاں صاحب نے کہا کہ مجھے بہت ہنسی آئی کہ اسے یہ سیل سے سستا خرید کر لایا ہے اور اسے گھر کے اندر لے جانے میں دشواری پیش آ رہی ہے لیکن کل یہ اسی کے سامنے جھکا ہوگا اور اس سے مرادیں مانگ رہا ہوگا۔ میں نے گزارش کی کہ عقیدہ توحید اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے، جو اس نعمت سے محروم ہو وہ اسی طرح سیل پر سستے بھگوان ڈھونڈتا پھرتا ہے، اللہ تعالی ہم سب کو عقیدۂ توحید پر ثبات و استقامت نصیب فرمائے، آمین۔

قرآن کریم کی بے حرمتی کے شرمناک واقعات

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جون ۲۰۰۵ء)

گوانتاناموبے میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں قرآن کریم کی بے حرمتی کے شرمناک واقعات کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کا دائرہ پوری دنیا میں پھیل رہا ہے اور عوام کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کی حکومتیں بھی اس احتجاج میں شریک ہیں۔ قرآن کریم کی بے حرمتی کا یہ واقعہ منظر عام پر آنے کے بعد بہت سے دیگر واقعات بھی سامنے آ رہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ افغانستان اور گوانتاناموبے میں مسلم قیدیوں کے سامنے اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے اور قرآن مقدس کی بے حرمتی کے واقعات امریکی فوجیوں کا معمول بن گئے

ہیں۔ امریکہ دنیا میں رواداری، مذہبی احترام، ان کے حقوق اور تحمل کا سب سے بڑا علمبردار بنا ہوا ہے اور ساری دنیا کو اس کی تلقین کرتا رہتا ہے لیکن خود امریکہ کے فوجیوں نے افغانستان، عراق، گوانتاناموبے اور دیگر اذیت خانوں میں مسلمان قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہوا ہے اور ان مظلوموں کے خلاف ہونے والی کاروائیوں کی جو تفصیل وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے ان سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ امریکہ تہذیب و تمدن اور آزادی اور انسانی احترام کے نام پر اپنا فلسفہ اور کلچر دنیا بھر پر مسلط کرنے کے درپے ہے اور دنیا پر قبضہ جمانے کے لیے وہ تمام حربے استعمال کر رہا ہے جو کسی زمانے میں چنگیز خان اور ہلاکو خان جیسے درندہ صفت حکمرانوں کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے تھے۔

قرآن کریم کی بے حرمتی دنیا کے کسی بھی مسلمان کے لیے قابل برداشت نہیں ہے اور اس پر مسلمانوں کا غصہ میں آنا اور اپنے جذبات کا اظہار کرنا ایک فطری ردعمل ہے جو ان کے ایمان اور قرآن کریم کے ساتھ ان کی وابستگی کا تقاضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس احتجاج میں کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان پیچھے نہیں ہیں، اس احتجاج اور اضطراب کا دائرہ انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلا ہوا ہے بلکہ مغربی ملکوں میں رہنے والے مسلمان بھی قرآن کریم کی حرمت و تقدس کے بارے میں جذبات کے اظہار میں عالم اسلام کے ساتھ شریک ہیں۔ اس پس منظر میں بعض دینی راہنماؤں کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم کو قرآن کریم کی بے حرمتی کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے امریکہ سے باضابطہ طور پر احتجاج کرنا چاہیے اور اس کا باقاعدہ سربراہی اجلاس بلا کر اس مسئلہ پر دوٹوک موقف اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس پر مسلمانوں کے ایمان کی بنیاد ہے، مغربی طاقتیں ایک عرصہ سے اس کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کی عملی زندگی کا قرآن کریم کے ساتھ تعلق قائم نہ رہے اور مسلمان قرآن کریم کو اسی طرح نظر انداز کر دیں جس طرح دنیا کی مسیحی اکثریت نے بائبل کو اپنی عملی زندگی سے لاتعلق کر رکھا ہے لیکن ماضی کی طرح آج بھی مغربی دنیا کو اس مہم میں ناکامی کا سامنا ہے اور قرآن کریم کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور بے لچک کمٹمنٹ آج بھی نہ صرف قائم ہے بلکہ بحمد اللہ تعالیٰ بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ اور مغرب کی دیگر اقوام کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ مسلمان عملی طور پر کتنے ہی کمزور کیوں نہ

ہوں، فکر و عقیدہ کے حوالہ سے ان کی وابستگی، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور قرآن کریم کے ساتھ آج بھی قائم ہے اور اسے ختم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

”سیرت امہات المومنین“

(مسجد پھولوں والی، باغ سرداراں، راولپنڈی - ۲۲ مئی ۲۰۰۵ء)

مولانا عبد المعبود صاحب راولپنڈی کے بزرگ علماء کرام میں سے ہیں، باغ سرداراں کے علاقہ میں مسجد پھولوں والی کے خطیب ہیں اور مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف نہ صرف عوام بلکہ علماء کرام کے لیے بھی استفادہ کا باعث بن رہی ہیں۔ تاریخ مکہ مکرمہ اور تاریخ مدینہ منورہ پر ان کی تصانیف نے بطور خاص شہرت حاصل کی ہے اور اب انہوں نے امہات المومنین رضوان اللہ علیہن کے حالات زندگی اور سوانح پر قلم اٹھایا ہے۔ ”سیرت امہات المومنین“ کے نام سے آٹھ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں انہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور مسلمانوں کی ماؤں کے حالات اور دینی خدمات کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ جناب رسول اکرمؐ کے خاندانی حالات کے حوالے سے متعدّد سوالات کا جائزہ لیا ہے اور مخالفین کے شکوک واعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے۔ ۲۲ مئی کو ان کی مسجد کے قریب ایک ہال میں اس کتاب کی رونمائی کی تقریب تھی جس میں حضرت مولانا سمیع الحق، مولانا اشرف علی، مولانا سید چراغ الدین شاہ، مولانا عبد القیوم حقانی، مولانا حافظ محمد صدیق اور دیگر علماء کرام کے علاوہ راقم الحروف سے بھی کچھ گزارشات کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس موقع پر میں نے جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ نذر قارئین ہے:

بعد الحمد والصلوۃ۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ مسلمانوں کی مائیں ہونے کے ساتھ ساتھ قیامت تک مسلمان خواتین کے لیے آئیڈیل اور اسوہ ہیں اور نبی کریمؐ کا گھریلو نظام اور خاندانی ماحول پوری نسل انسانی کے لیے ماڈل، آئیڈیل اور اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر اس سے قبل بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ حضرت مولانا عبد المعبود نے بھی اہمیت کے ساتھ اس پر قلم اٹھایا ہے اور معلومات کا بیش بہا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ مگر میں اس کاوش پر انہیں مبارکباد دیتے ہوئے ایک تجویز بھی پیش کرنا چاہوں گا کہ وہ اس

کتاب کے سرورق پر ”جلد اول“ کے جملہ کا اضافہ کر دیں اور دوسری جلد کی تیاری شروع کریں، اس لیے کہ انہوں نے اس کتاب میں دو پہلوؤں پر بات کی ہے:

1. ایک یہ کہ ازواج مطہراتؓ کے حالات زندگی اور دینی خدمات کا تذکرہ کیا ہے جو یقیناً مسلمان خواتین کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ ہیں اور اس سے مسلم خواتین روشنی حاصل کر سکتی ہیں۔

2. اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ازواج مطہراتؓ اور جناب نبی اکرمؐ کی گھریلو زندگی کے بارے میں اہم اعتراضات کا انہوں نے جائزہ لیا ہے اور صحیح نقطۂ نظر کی دلائل کے ساتھ وضاحت کی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ اس موضوع کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے جو آج کے دور میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے مگر اس طرف عام طور پر ہماری توجہ نہیں ہوتی:

3. وہ پہلو خاندانی نظام اور فیملی سسٹم کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھریلو ماحول سے رہنمائی حاصل کرنے کا ہے اور مغرب میں فیملی سسٹم کے سبوتاژ ہو جانے کے بعد اس پہلو نے بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔

خاندانی نظام کے حوالے سے آج کے اہم موضوعات یہ ہیں کہ میاں بیوی کے تعلقات میں توازن کی صورت کیا ہے؟ ان کے باہمی حقوق کی ترجیحات کیا ہیں؟ اور مسلمان خاتون کا معاشرتی کردار کیا ہے؟ اس پر آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ، ازواج مطہراتؓ کے حالات زندگی، اور صحابہ کرامؓ کے معاشرتی ماحول میں ہمیں بہت رہنمائی ملتی ہے مگر ہماری توجہ اس طرف مبذول نہیں ہو رہی۔ اور اگر ہم اس عنوان پر بات بھی کرتے ہیں تو اس کا صرف وہ پہلو سامنے ہوتا ہے جس کا تعلق قدغنوں سے ہے، پابندیوں سے اور رکاوٹوں سے ہے۔ مجھے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کہ اسلام نے عورت کو جن حدود و قیود کا پابند کیا ہے ان کا تذکرہ ضروری ہے اور عورتوں کو ان سے آگاہ کرنا ناگزیر ہے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی ہے کہ اسلام نے عورت کو بہت سے حقوق دیے ہیں، بہت سی ذمہ داریاں دی ہیں، اور خاندان اور معاشرے میں اسے ایک مقام بخشا ہے، مگر وہ ہماری زبان و قلم پر نہیں آتا۔

مجھے یہاں حضرت امیر معاویہؓ کا ایک قول یاد آ رہا ہے کہ جب ان سے کسی نے ان کی کامیاب سیاست کا راز پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ:

”میں ہر شخص کے ساتھ تعلقات کا توازن قائم رکھتا ہوں۔ وہ تعلقات کی رسی ڈھیلی کرتا ہے تو میں کھینچ کر برابر کر لیتا ہوں، اور اگر وہ رسی کو ضرورت سے زیادہ کھینچنے لگتا ہے تو میں رسی کو ڈھیلا کر دیتا ہوں تاکہ توازن برقرار رہے۔“

حضرت معاویہؓ کے اس ارشاد کے حوالے سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے عورت کے معاشرتی کردار اور حقوق کے عنوان سے رسی کو کھینچنے کا کام ضرور شروع کر رکھا ہے مگر توازن قائم رکھنے کے لیے اسے ڈھیلا چھوڑنے کی بات ہم سرے سے بھول گئے ہیں۔ یہ بات محل نظر ہے اور آج کے اصحاب قلم دانشوروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس عدم توازن کو محسوس کریں اور مسلم خواتین کو قدغنوں اور پابندیوں کے ساتھ ساتھ ان حقوق اور آزادیوں سے بھی آگاہ کریں جو اسلام انہیں دیتا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے جن سے انہیں بہرہ ور کیا ہے۔

آج کی دنیا میں ہر مسئلہ کو حقوق کے پیمانے سے ماپا جا رہا ہے اور معاشرتی کردار کے ترازو پر تولا جا رہا ہے۔ اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس پہلو سے جناب رسول اکرمؐ کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کریں، ازواج مطہراتؓ کی زندگیوں پر نظر ڈالیں، اور اسلام کے عطا کردہ حقوق کو دنیا کے سامنے لائیں۔ مثال کے طور پر میں دو واقعات کا حوالہ دینا چاہوں گا:

- ایک بریرۃؓ کا واقعہ ہے جو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خادمہ کی حیثیت سے خاندان نبوت کی فرد تھی۔ اسے جب غلامی سے آزادی ملی تو اس نے اپنا شرعی حق استعمال کرتے ہوئے سابقہ خاوند مغیثؓ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مغیثؓ کی پریشانی دیکھ کر خود جناب نبی اکرمؐ نے اس کی سفارش کی تو بریرۃؓ نے یہ کہہ کر اس سفارش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ”اگر یہ حکم نہیں بلکہ سفارش ہے تو وہ مغیثؓ کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں ہے“۔ یہ ایک عورت کی طرف سے اپنی آزادی اور حق کا بھرپور استعمال تھا جس کا مظاہرہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بلکہ ان کے سامنے کیا اور آپؐ نے کسی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔
- دوسرا واقعہ ایک بچے کا ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق مسجد نبویؐ میں جناب نبی اکرمؐ کی مجلس میں دائیں طرف تیرہ چودہ سال کا بچہ (حضرت عبد اللہ بن عباسؓ) بیٹھا تھا اور بائیں طرف حضرت ابوبکرؓ اور دیگر بزرگ صحابہ کرامؓ تھے۔ آنحضرتؐ کو پانی پیش کیا گیا جو آپؐ نے نوش فرمایا اور بچا ہوا پانی کسی

کو دینا چاہا۔ دائیں طرف عبد اللہ بن عباسؓ تھے جن کا یہ حق بنتا تھا جبکہ بائیں طرف بزرگ صحابہ کرامؓ تھے۔ نبی کریمؐ بچا ہوا پانی بائیں طرف دینا چاہتے تھے مگر اس کے لیے آپؐ نے عبد اللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ اگر تم اجازت دو تو پانی بائیں طرف دے دوں؟ انہوں نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ میں آپؐ کے تبرک کے بارے میں کسی اور کو خود پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے وہ پانی حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو تھما دیا۔

اس قسم کے واقعات جو عورتوں، بچوں اور دیگر طبقات کے حقوق سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے ان حقوق کی پاسداری اور احترام کا سبق ملتا ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات زندگی میں بکھرے پڑے ہیں اور احادیث کے ذخیرے میں اس پر بہت بڑا مواد موجود ہے۔ اس لیے آج کے دور میں سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیرت طیبہ کا اس پہلو سے مطالعہ کیا جائے، آج کے عالمی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے عورتوں، بچوں، مزدوروں اور دیگر طبقات کے حقوق کو سیرت طیبہ اور تعامل صحابہؓ کی روشنی میں اجاگر کیا جائے، اور دنیا کو بتایا جائے کہ عورتوں کے معاشرتی کردار اور حقوق پر اسلام کی تعلیمات زیادہ مکمل اور جامع ہیں اور وہی اس بارے میں فطری تعلیمات ہیں۔

اس پس منظر میں مولانا عبد المعبود صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کی دوسری جلد تحریر کریں اور مسئلہ کے اس اہم ترین پہلو کو بھی مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنائیں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۹ مئی ۲۰۰۵ء)

خدمت حدیث: موجودہ کام اور مستقبل کی ضروریات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ مئی ۲۰۰۵ء)

۱۔ ہمارا مستند علمی ذخیرہ

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و حدیث کا تاریخ کے ریکارڈ پر اس اہتمام اور اعتماد کے ساتھ محفوظ رہنا جہاں نبی اکرمؐ کے تاریخی امتیاز و اختصاص کی حیثیت رکھتا

ہے، وہاں اسلام کے اعجاز اور اس کی حقانیت و ابدیت کی دلیل بھی ہے۔ اس لیے کہ نہ صرف آنحضرتؐ کے احوال واقوال اور ارشادات وفرمودات پورے اہتمام اور استناد کے ساتھ موجود ومحفوظ ہیں بلکہ ان کے نقل وفہم اور ان سے استدلال واستنباط کے عمل میں کسی بھی درجہ میں شریک ہونے والے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کے حالات وکوائف بھی تاریخ نے اپنے ریکارڈ میں محفوظ کر رکھے ہیں۔ اور جناب نبی اکرمؐ کے کسی بھی فعل، قول اور احوال وظروف سے نسبت رکھنے والے کسی بھی شخص کے حالات اور کردار کے بارے میں ضروری معلومات کسی بھی وقت تاریخ کے ریکارڈ سے طلب کی جا سکتی ہیں۔ جبکہ اس حوالہ سے اسماء الرجال کا علم اسلام اور مسلمانوں کی ایسی خصوصیت ہے جس کی مثال دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی۔

دنیا کے تمام ادیان ومذاہب میں اسلام وہ واحد دین ہے جس کے پاس اس کی تعلیمات کسی ترمیم وتحریف اور تبدیلی کے بغیر اصلی حالت میں موجود ہیں۔ اور یہ تعلیمات پرائمری سطح سے لے کر اعلیٰ ترین درجات تک ہر سطح پر تدریس، تحقیق اور تبلیغ واشاعت کے مراحل سے وسیع پیمانے میں ہر وقت گزرتی ہیں جس کی وجہ سے تحریف اور ترمیم کا کوئی بھی حملہ ان کے دائرے میں در اندازی کی گنجائش نہیں پا رہا۔ اور وہ ایک زندہ، متحرک اور توانا نظام تعلیم واصلاح کی صورت میں آج کے زوال پذیر دور میں بھی مسلم معاشرے میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔

دنیا کے ہر مذہب کی تعلیمات انحراف وترمیم کے مراحل سے گزر چکی ہیں اور اسلام کے سوا کوئی مذہب بھی اس وقت دنیا کے مسلمہ اور معیار کے مطابق اس دعوی کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس کے پاس اس کی بنیادی تعلیمات اصلی حالت میں موجود ہیں۔ مگر اسلام پورے اعتماد وحوصلے کے ساتھ آج بھی عالمی فورم پر اس دعوے کے ساتھ کھڑا ہے کہ اس کے پاس نہ صرف قرآن کریم اسی اصلی حالت میں موجود ہے جس طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے اولین شاگردوں صحابہ کرامؓ کے سپرد کیا تھا، بلکہ قرآن کریم کی تعبیر وتشریح میں نبی اکرمؐ کے ارشادات، احوال اور سیر وسوانح بھی اس مکمل اعتماد اور معیار کے ساتھ موجود ہیں جسے آج کی دنیا بھی تسلیم کرتی ہے اور جسے کسی بھی تاریخی ذخیرہ اور دستاویز کے مستند اور صحیح ہونے کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کو اپنے متن اور الفاظ کے لحاظ سے ایک محفوظ اور مستند دستاویز کا درجہ حاصل ہے اور اس کے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کا سسٹم ایسا فول پروف ہے کہ اس میں کسی قسم کی در اندازی کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔ اس لیے فطری طور پر ان عناصر کا رخ اس کی تعبیر و تشریح کے نظام کے مجروح کرنے کی طرف ہی مڑنا تھا جو دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کی تعلیمات کو بھی انسانی خواہشات اور عقل وظن کی سان پر چڑھا دینے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات کو نئے معانی پہنانے اور نت نئی تعبیرات و تشریحات سے روشناس کرانے کے لیے گزشتہ دو تین صدیوں کے دوران کیا کچھ نہیں ہوا اور آج بھی کیا کچھ نہیں ہو رہا۔ لیکن جناب نبی اکرمؐ کی سیرت و سوانح اور سنت و حدیث کا عظیم ذخیرہ اور ان کی چھان پھٹک کا بے مثال نظام اسلامی تعلیمات کے گرد ایسا مضبوط و مستحکم حفاظتی پشتہ ثابت ہوا ہے کہ اس نے تحریف و الحاد کے ہر طوفان کا رخ موڑ دیا ہے۔ اور اسلامی عقائد و احکام کا پرچم ملی زندگی کے دیگر تمام شعبوں کی زبوں حالی کے باوجود آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ یہ کہتے ہوئے لہرا رہا ہے کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

۲- موجودہ فقہی جمود

محدثین و مؤرخین نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و حدیث اور سیرت و سوانح کے سینکڑوں پہلوؤں پر جو عظیم الشان کام کیا ہے اور فقہاء کرام نے اس بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زن ہو کر حکمت و دانش اور استنباط و استدلال کے انمول موتیوں کے جو انبار لگا دیے ہیں، اس پر تاریخ کے اس عملی خراج کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احادیث کے ذخیرے کو محفوظ رکھنے والے محدثین کرام، اسماء رجال سے تعلق رکھنے والے مؤرخین و ناقدین، اور استنباط و استدلال کے شناور فقہاء عظام نے ہر دور میں اس زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے احادیث و سنن کی حفاظت و روایت اور تدوین و ترتیب کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ آپ گزشتہ چودہ صدیوں میں سے کسی بھی صدی میں ان حوالوں سے ہونے والے علمی کام کو سامنے رکھ لیں، آپ کو اس میں سابقہ طریق کار سے مختلف اسلوب نظر آئے گا، جدت دکھائی دے گی، اور تنوع کے نئے افق آپ کی نگاہوں کے سامنے آئیں گے۔ کیونکہ زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے، انسانی

سوسائٹی کی نت نئی ضروریات سامنے آتی رہتی ہیں، سائنسی انکشافات سے علم و معلومات کا دائرہ وسیع تر ہوتا رہتا ہے، اور انسانی ذہن کی پرواز کی سطح بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے ہم نے ایک جگہ رک جانے اور اگلے مراحل سے آنکھیں اور کان بند کر لینے کو بزرگوں کی ''روایت'' سمجھ رکھا ہے حالانکہ اس کا نام روایت نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف میں، خواہ وہ محدثین و مفسرین ہوں، مؤرخین و ناقدین ہوں یا فقہاء و مجتہدین ہوں، کسی دور میں بھی اس طرح کے ''جمود'' کی روایت نہیں رہی۔ ہماری روایت تو تحرک کی ہے، پیش رفت کی ہے، اور مسائل و مشکلات کا سامنا کرنے کی ہے۔ بلکہ میں اس سے بھی آگے بڑھ کر عرض کروں گا کہ ہمارے فقہاء عظام نے صرف حال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مستقبل کے امکانات کو بھانپتے ہوئے ''فقہ فرضی'' اور ''فقہ تقدیری'' کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ قرون ماضیہ میں امت کے سامنے پیش کیا ہے کہ ہم آج تک اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

گلوبلائزیشن کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے عالمی ماحول اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے اختلاط اور ٹکراؤ کے موجودہ تناظر میں بہت سے پہلوؤں سے سنن و احادیث نبویہؐ کے از سر نو وسیع تر مطالعہ اور اس عظیم ترین علمی و دینی ذخیرہ سے راہ نمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے پہلے سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم مستقبل کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں یا نہیں؟ کیا ہم نے زمانے کے سفر میں اسی مقام پر ہمیشہ کے لیے رکنے کا تہیہ کر لیا ہے جہاں ہم اب کھڑے ہیں؟ اور اگر ہم واقعی مستقبل کی طرف سفر جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اس کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لینے کے دعوے میں بھی سنجیدہ ہیں تو اس کے لیے ہمیں آگے بڑھنا ہوگا اور آگے بڑھنے کے وہ تمام منطقی تقاضے پورے کرنا ہوں گے جو ہمارے بزرگ اور اسلاف ہر دور میں پورے کرتے آ رہے ہیں۔

۳- خدمت حدیث کے چند پہلو

اس پس منظر میں اگر حال اور مستقبل کی ضروریات کا جائزہ لیا جائے تو تقاضوں کی ایک لمبی فہرست بن سکتی ہے اور میرے خیال میں اس موضوع پر علمی مذاکروں اور مباحثوں کی صورت میں باہمی مشاورت کے ساتھ وہ فہرست ضرور بننی چاہیے کہ تقاضوں اور ضروریات کی نشان دہی اور ان کے سامنے آنے کے بعد ہی انہیں پورا کرنے کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ مگر یہاں ان میں سے مثال کے طور پر دو تین پہلوؤں کا تذکرہ مناسب

سمجھوں گا، اس امید پر کہ شاید ہماری علمی شخصیات اور ادارے اس طرف متوجہ ہوں اور اس حوالے سے نہ صرف مستقبل بلکہ حال کا بھی بہت سا قرض جو سنت و حدیث کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے ارباب علم و دانش کے ذمہ واجب ہے، اس کی ادائیگی کی کوئی صورت نکل آئے۔

جہاں تک احکام و مسائل کا تعلق ہے، اس حوالے سے مختلف ممالک میں کام ہو رہا ہے اور جدید پیش آمدہ مسائل کا قرآن کریم اور سنت و حدیث کی روشنی میں حل تلاش کرنے کی طرف متعدّد ادارے اور علمی حلقے متوجہ ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی ابھی تنوع اور توسع کے بہت سے پہلو تشنہ ہیں جن کی طرف توجہ کی ضرورت ہے لیکن اس شعبہ میں کچھ نہ کچھ کام بہرحال ہو رہا ہے۔ اس لیے اسے نظر انداز کرتے ہوئے فکری اور تہذیبی راہ نمائی کے اس خلا کی طرف ارباب علم و دانش کو توجہ دلانا چاہوں گا جو عالمی تہذیبی کشمکش کے موجودہ دور میں پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہو رہا ہے اور جس کے منفی اثرات پوری ملت اسلامیہ کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں عرب دنیا میں خاصا کام ہوا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ہوا ہے مگر یہ کام روایتی حلقوں سے ہٹ کر شخصیات کے حوالے سے ہے جس کے اثرات سے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اصل ضرورت روایتی حلقوں کی بیداری کی ہے کہ امت مسلمہ کی اکثریت کا عقیدت و اطاعت کا تعلق انہی سے ہے اور امت کو بحیثیت امت کسی طرف متوجہ کرنے کے لیے روایتی حلقے ہی سب سے زیادہ مؤثر اور بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ میں خود روایتی حلقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے، روایتی حلقوں کی نمائندگی بلکہ دفاع بھی کرتا ہوں لیکن مجھے اس اعتراف میں کوئی باک نہیں ہے کہ اس راہ میں بعض ایسے سخت مقام ضرور آتے ہیں کہ نمائندگی اور دفاع دونوں کے قدم لڑکھڑانے لگ جاتے ہیں اور بڑی مشکل سے قدموں کا توازن برقرار رکھنا پڑتا ہے۔

اس کے بعد میں مثال کے طور پر ان دو تین پہلوؤں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جن کے بارے میں میری طالب علمانہ رائے میں زیادہ اہتمام کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و تعلیمات کو اجاگر کرتے ہوئے امت مسلمہ کی راہ نمائی ان شعبوں میں وقت کا ناگزیر تقاضا ہے۔

۱- امت کی اخلاقی حالت

سب سے پہلے امت مسلمہ کی اخلاقی حالت کا مسئلہ ہے جو آج کسی طرح بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس کا اچھے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ افراد اور کچھ طبقات ہر دور میں اور ہر قوم میں مستثنیٰ رہے ہیں اور رہتے ہیں لیکن ملت بحیثیت ملت اخلاقی لحاظ سے جس سطح پر پہنچ گئی ہے، اس نے ہمیں اقوام عالم کی برادری میں نیک نام نہیں رہنے دیا۔ اخلاقیات کا تعلق سیاست سے ہو یا تجارت سے، معاشرت سے ہو یا مذہب سے، تعلیم سے ہو یا ملازمت سے، صنعت سے ہو یا اجارہ سے، کہیں بھی صورت حال تسلی بخش نہیں ہے۔ ہمارے داخلی معاشرتی دائروں میں جو صورت حال ہے، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں ہے لیکن دوسری اقوام کے معاشرے میں جا کر ہم جو گل کھلا رہے ہیں، اس نے تو لٹیا ہی ڈبو دی ہے۔ میں ایک مثال سے اپنی بات واضح کرنا چاہوں گا کہ برطانیہ میں ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ وہ کوئی کام کاج تو کرتے نہیں ہیں، گزارا کیسے کرتے ہیں؟ انہوں نے بڑی بے تکلفی سے کہا کہ بس ”مال زکوۃ“ سے گزارا ہو جاتا ہے۔ میں نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے کہ برطانوی حکومت کی طرف سے بے روزگاری کا جو وظیفہ ملتا ہے، وہ لیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ کیا آپ کا قانوناً اس وظیفے کا استحقاق بنتا ہے؟ تو فرمایا کہ ”چھڈو جی، کافر نیں۔ اینہاں نوں جناں لٹ سکدے ہو، لٹو“ (چھوڑو جی، یہ کافر ہیں۔ انہیں جتنا لوٹ سکتے ہو، لوٹو)

ظاہر ہے کہ اسی قسم کے طرز عمل کے ساتھ ہم دنیا کے غیر مسلم معاشروں میں اسلام اور مسلمانوں کے تعارف کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ اب اس بات کو ہم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ و سیرت اور سنن و احادیث کے حوالے سے دیکھیں تو معاملہ انتہائی سنگین ہو جاتا ہے۔ جناب رسول اللہؐ تو مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے تشریف لائے ہیں اور شخصی، خاندانی، معاشرتی اور بین الاقوامی چاروں حوالوں سے اخلاقی تعلیمات کا جس قدر وسیع اور متنوع ذخیرہ اور اسوہ و نمونہ جناب نبی اکرمؐ کی سنت و سیرت میں ملتا ہے، دنیا کے کسی اور مذہب یا شخصیت کے پاس اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے مگر ہمارے ہاں ان کا تذکرہ محض برکت و ثواب کے لیے ہوتا ہے۔ اپنے احوال و ظروف پر ارشادات نبویؐ کا اطلاق اور سنت و حدیث کی روشنی میں اپنے طرز عمل کی اصلاح کا کوئی احساس اجتماعی طور پر ہمارے حلقوں میں موجود نہیں ہے۔ آج سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ملی اور بین الاقوامی دونوں حوالوں سے اپنی اخلاقی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی کریں، انہیں

بے نقاب کریں اور ایک ملی تحریک کے طو پر جناب نبی اکرمؐ کی اخلاقی تعلیمات کو آج کے معروضی حالات وضروریات کے تناظر میں جدید اسلوب اور انداز کے ساتھ امت کے ہر فرد تک پہنچانے اور اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ اس سے نہ صرف دوسری قوموں کے سامنے ہمارا تعارف بہتر ہوگا بلکہ ہمارے بہت سے داخلی مسائل و مشکلات بھی خود بخود فضا میں تحلیل ہوکر رہ جائیں گے۔

اس ضمن میں اس بات کا تذکرہ بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ سینکڑوں احادیث نبویہؐ میں معاشرتی خرابیوں کے ساتھ ساتھ ان کے اسباب و نتائج کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے اور بہت سی احادیث میں نتائج و عواقب کا ذکر کرکے معاشرتی خرابیوں سے روکا گیا ہے۔ ایسی احادیث کو زیادہ نمایاں طور پر سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ مثلا صاحب مشکوۃ نے ''باب تغیر الناس'' کی آخری حدیث موطا امام مالک کے حوالے سے بیان کی ہے جو حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کے قول کی صورت میں ہے لیکن اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے محدثین کرام کے اصول کے مطابق مرفوع حدیث کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ:

1. جس قوم میں خیانت عام ہو جائے، ان کے دلوں میں اللہ تعالی دشمن کا رعب ڈال دیتے ہیں۔
2. جس قوم میں زنا عام ہوجائے، اس میں موت کی کثرت ہوجاتی ہے۔
3. جو قوم ماپ تول میں کمی کرنے لگ جائے، اس سے رزق منقطع کرلیا جاتا ہے۔
4. جس قوم میں ناحق فیصلے ہونے لگیں، اس میں خانہ جنگی پھیل جاتی ہے۔
5. اور جو قوم عہد توڑ دے، اس پر دشمن کو مسلط کردیا جاتا ہے۔

اس نوعیت کی بہت سی روایات ہیں جن میں معاشرتی جرائم کے نتائج و عواقب کا ذکر کیا گیا ہے، ان کو اہتمام کے ساتھ اور اجتماعی تحریک کی صورت میں سامنے لانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

۲- گلوبلائزیشن کا دور

دوسرا پہلو جو ارباب علم و دانش کی ترجیحی توجہ کا مستحق ہے، وہ آج کا عالمی ماحول ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گلوبلائزیشن کا دور ہے اور تہذیبوں کے اختلاط کا دور ہے کیونکہ فاصلے اس قدر سمٹ گئے ہیں کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان صدیوں سے قائم

سرحدیں پامال ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان حدود اور فاصلوں کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا، منطقی طور پر یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کہ مختلف تہذیبوں کے اختلاط کے دور میں اسلام کیا راہ نمائی کرتا ہے؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات میں اس بارے میں واضح راہ نمائی موجود ہے اور احادیث کے ذخیرے میں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا جو امام بخاریؒ نے کتاب النکاح، باب عظۃ الرجل بنتہ اور بعض دیگر ابواب میں بیان کی ہے۔ اس تفصیلی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کے بہت سے خاندان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو مہاجرین اور انصار کی خاندانی روایات میں واضح فرق موجود تھا۔ مہاجرین کے ہاں کسی عورت کا اپنے خاوند کو کسی بات پر ٹوکنا یا اس کی کسی بات کو رد کرنا سرے سے متصور نہیں تھا جبکہ انصار کے خاندانوں میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ خاوند کو کسی بات پر ٹوک سکتی تھیں، کسی بات کا جواب دے سکتی تھیں اور کسی بات سے انکار بھی کر سکتی تھیں۔

حضرت عمرؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انہیں ایک روز ان کی بیوی نے کسی بات پر ٹوک دیا تو انہیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے بیوی کو ڈانٹا۔ بیوی نے جواب دیا کہ مجھے ڈانٹنے کی ضرورت نہیں، یہ تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی ہوتا ہے کہ ان کی ازواج مطہراتؓ کسی بات پر ٹوک دیتی ہیں اور کسی بات کا جواب بھی دے دیتی ہیں۔ حضرت عمر نے اسے اس بات سے تعبیر کیا کہ انصار کی عورتوں کی عادات ہماری عورتوں پر اثر انداز ہوتی جا رہی ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اسی غصے کی حالت میں سیدھے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے گھر پہنچے جو ان کی بیٹی تھیں اور انہیں سمجھایا بجھایا کہ ایسا مت کیا کرو۔ وہ تو بیٹی تھیں، خاموش رہیں مگر یہی بات جب حضرت عمرؓ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے کہنا چاہی تو انہوں نے آگے سے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ”آپ نے میاں بیوی کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی ہے؟“ حضرت عمرؓ نے یہ واقعہ جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تو آپؐ نے اس کے جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ فرمایا کہ ”آخر ام سلمہ ہے“۔

یہ دو علاقائی ثقافتوں اور معاشرتی روایات کے اختلاط اور ٹکراؤ کا قصہ ہے اور میری طالب علمانہ رائے ہے کہ تہذیبوں کے اختلاط اور مختلف ثقافتوں کے باہمی میل جول کے

مسائل میں یہ روایت اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس سے ہمیں راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے۔ اور دور نبویؐ کے اس طرز کے واقعات اور روایات و احادیث کی روشنی میں آج کے عالمی حالات کے تناظر میں اصول و ضوابط وضع کرنے چاہئیں کہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تال میل میں کہاں ایڈجسٹمنٹ کی گنجائش ہے، کہاں صاف انکار کی ضرورت ہے، اور کہاں کوئی درمیان کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔

یہاں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم نے دین اور ثقافت کے درمیان حد فاصل قائم نہیں رہنے دی اور بہت سے معاملات میں دونوں کو گڈمڈ کر دیا ہے حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دین کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے اور اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے جبکہ ثقافت کی بنیاد ایک علاقہ میں رہنے والے لوگوں کے درمیان خود بخود تشکیل پا جانے والی معاشرتی اقدار و روایات پر ہوتی ہے اور اس کا سرچشمہ سوسائٹی اور اس کا ماحول ہوتا ہے۔ مگر ہم نے بعض معاملات میں اپنی علاقائی ثقافتوں پر دین و شریعت کا لیبل لگا کر انہیں ساری دنیا سے ہر حال میں منوانے کی قسم کھا رکھی ہے جس سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

سنت و سیرت اور احادیث کے بیش بہا ذخیرے میں ان معاملات میں مکمل راہ نمائی موجود ہے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ خود محنت کر کے بزرگوں کی کمائی میں اضافہ کرنے کے بجائے بزرگوں کی محنت اور کمائی سے ہی گزارا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۳- فتنے اور آثار قیامت

تیسرا پہلو جس کا ذکر احادیث نبویہؐ کے وسیع ذخیرہ سے آج کے حالات کے تناظر میں استفادہ کے لیے کرنا چاہتا ہوں، وہ فتنوں اور آثار قیامت کے بارے میں جناب نبی اکرمؐ کے وہ ارشادات ہیں جو پیش گوئیوں کے طور پر معجزات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں ہمارے لیے ایمان کی تازگی اور پختگی کے ساتھ ساتھ راہ نمائی کا بھی مکمل سامان موجود ہے۔ اس سلسلے کے سینکڑوں ارشادات نبویہؐ میں سے مثال کے طور پر مسلم شریف کی کتاب الفتن کی ان بعض روایات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جن میں جناب نبی اکرمؐ نے فرات کے کنارے سونے کا پہاڑ دریافت ہونے اور اس کے حصول کے لیے مختلف اقوام کے درمیان خونریز جنگوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور انہی میں سے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ کی دو روایات میں مغربی اقوام کی طرف سے عراق کی اقتصادی ناکہ بندی اور اس

کے ساتھ شام اور مصر کی اقتصادی ناکہ بندی کی صراحت بھی موجود ہے۔ یہ اور اس قسم کی بیسیوں دیگر روایات ہمارے آج کے حالات کی عکاسی کرتی ہیں اور بہت سے معاملات میں ہمیں راہ نمائی فراہم کرتی ہیں۔

احکام شرعیہ کی تعبیر کا ایک اہم پہلو

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۴ اپریل ۲۰۰۵ء)

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں سہ ماہی امتحان کی تعطیلات کے دوران چار روز کے لیے صوبہ سندھ جانے کا موقع مل گیا اور کراچی، حیدر آباد، میرپور خاص اور پتھورو میں مختلف اجتماعات میں شرکت کے علاوہ بعض سرکردہ بزرگوں سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ حضرت مولانا فداء الرحمن درخواستی کا ارشاد تھا کہ میں جو مغربی فلسفہ اور انسانی حقوق کے حوالے سے باتیں کرتا رہتا ہوں، اس کے بارے میں جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی میں دورۂ حدیث، درجہ موقوف علیہ اور تخصص کے طلبہ کے سامنے لیکچر دوں۔ چنانچہ دار الحدیث میں ان کلاسوں کے لیے تین خصوصی لیکچروں کا اہتمام ہوا اور میں نے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کا چارٹر سامنے رکھ کر ان طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ:

- مغرب کے نزدیک انسانی حقوق کا تصور کیا ہے؟
- اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کو آج کی دنیا میں بین الاقوامی قانون کے طور پر کیا مقام حاصل ہے؟
- انسانی حقوق کے اس چارٹر کی بنیاد پر قرآن و سنت کے کون کون سے قوانین غلط قرار پاتے ہیں؟
- مسلم حکومتوں پر کون سے شرعی قوانین کے بارے میں ترامیم کے لیے مغرب کا دباؤ موجود ہے؟
- حدود آرڈیننس، امتناع قادیانیت آرڈیننس، نکاح و طلاق اور وراثت کے اسلامی قوانین اور توہین رسالت کی سزا کے قانون کے حوالے سے مغرب کا موقف کیا ہے؟ اور اس موقف اور دباؤ کا اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

ان امور پر تین محاضرات میں جتنی وضاحت کر سکا اس پر اساتذہ اور طلبہ بہت خوش تھے، انہوں نے دلچسپی سے گزارشات سنیں اور موقف کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ یہ باتیں ان کے لیے بالکل نئی ہیں اور انہیں پہلی بار یہ معلوم ہوا ہے کہ انسانی حقوق کے حوالے سے مسلمانوں کے خلاف مغرب کی جو یلغار ہے، اس کا فکری پس منظر اور اس کی علمی بنیاد کیا ہے۔

جامعۃ الرشید میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم اور اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کی یادگار اس عظیم علمی ادارے میں اس سے قبل بھی حاضر ہو چکا ہوں اور اس کے کام کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں مستقبل کی ضروریات کے حوالے سے جس قسم کے علمی اداروں کا قیام ضروری ہے، جامعۃ الرشید ان میں سے ایک ہے، اور اساتذہ کا ذوق اور محنت دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ادارہ مستقبل کی دینی، علمی اور فکری ضروریات کو پورا کرنے کی جدوجہد میں دینی حلقوں کی مؤثر رہنمائی کرے گا۔

یہاں بھی مجھے حکم دیا گیا کہ ''کلیۃ الشریعہ'' کے طلبہ سے کچھ عرض کروں، چنانچہ تعمیل حکم میں چند باتیں عرض کیں، طلبہ کے ساتھ اساتذہ کرام نے بھی اپنی موجودگی کے ساتھ مجھے اعزاز بخشا۔ ''کلیۃ الشریعہ'' کے طلبہ سے میں نے بطور خاص یہ گزارش کی کہ ہمارے ہاں احکام کے تعین اور تغیر دونوں میں عرف کو خاصی اہمیت حاصل ہے اور عرف کی بنیاد پر نہ صرف بہت سے احکام شرعیہ طے پاتے ہیں بلکہ عرف کی تبدیلی کے ساتھ احکام شرعیہ میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے مفتیان کرام اپنے فتاوی میں عرف کا لحاظ رکھتے ہیں لیکن ایک پہلو سے مجھے خلا محسوس ہوتا ہے جس کی طرف توجہ دلانا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ مقامی عرف پر تو ہماری نظر ہوتی ہے مگر عالمی عرف بسا اوقات ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے، جبکہ جس طرح شرعی احکام کے تعین و تغیر میں مقامی عرف اثر انداز ہوتا ہے، بالکل اسی طرح عالمی عرف کی تبدیلی بھی احکام شرعیہ کے تغیر کا باعث بنتی ہے۔ اور خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامی عرف کا لحاظ رکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف اقوام کے درمیان مشترکہ اقدار و روایات اور دوسرے لفظوں میں بین الاقوامی عرف و تعامل کا بھی لحاظ کیا ہے۔ مثال کے طور پر میں دو مواقع کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

1. ایک یہ کہ بنو تمیم کا وفد جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں آیا تو انہوں نے اپنی علاقائی روایت کے مطابق یہ تقاضا کیا کہ آپ شعر و خطابت میں ہمارا مقابلہ کریں۔ آپ کا خطیب ہمارے خطیب سے اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر سے برتر ثابت ہوا تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ جناب رسول اللہ نے ان کی اس بات کو قبول فرمایا، مقابلہ کی مجلس جمی اور بنو تمیم کے شاعر و خطیب کا مقابلہ آنحضرتؐ کے حکم پر حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت ثابت بن قیسؓ نے کیا، اور مقابلہ جیتا، جو بنو تمیم کے قبول اسلام کا باعث بنا۔

2. دوسرا واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آئے اور اس کا خط پیش کیا تو آپؐ نے ان قاصدوں سے دریافت کیا کہ کیا تم مجھے رسول اللہ مانتے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ آنحضرتؐ نے دریافت کیا کہ کیا تم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں قاصد جناب نبی اکرمؐ کو رسول اللہ تسلیم کرنے کے بعد مسیلمہ کو رسول اللہ کہنے پر ارتداد کی وجہ سے قتل کی سزا کے مستحق تو تھے، مگر اس وقت کا یہ مروجہ ضابطہ رکاوٹ بن گیا کہ کسی قوم کے سفیر اور قاصد کو قتل نہیں کیا جاتا۔

ان دو واقعات کے حوالے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف مروجہ روایات اور بین الاقوامی قانون کا احترام کیا ہے بلکہ دوسری اقوام اور قبائل کی روایات کو بھی بوقت ضرورت قبول کیا ہے۔

یہاں اتنی بات ضروری ہے کہ بین الاقوامی عرف و تعامل کی وہ باتیں جو ہمارے قطعی اصولوں اور نصوص صریحہ سے متصادم ہوں گی، ہم ان کو قبول نہیں کریں گے۔ لیکن عالمی عرف اور بین الاقوامی روایات میں سے جو بات ہمارے احکام صریحہ اور مقاصد شریعت کے منافی نہیں ہے، جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ میں ہمیں انہی روایات کو قبول کرنے اور ان کا احترام کرنے کا اشارہ ملتا ہے۔ اس لیے علمائے کرام، اساتذہ اور شریعت کے طلبہ سے میری گزارش ہے کہ وہ مقامی اور علاقائی عرف و تعامل اور روایات و اقدار سے واقفیت

حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قوانین اور عالمی عرف و تعامل سے بھی مکمل واقفیت حاصل کریں، جو گلوبلائزیشن کے اس دور میں زیادہ ضروری ہوگیا ہے اور اس کے بغیر ہم آج کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق احکام شرعیہ کی مکمل اور صحیح تعبیر نہیں کر سکیں گے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں انسانی حقوق کا تصور

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱ جنوری ۲۰۰۵ء)

لندن میں سالانہ حاضری کے دوران ایک دو بار شمالی لندن کی مرکزی جامع مسجد کے نماز جمعہ کے اجتماع میں شرکت ہو جاتی ہے۔ یہ مسجد فنس بری پارک ٹیوب اسٹیشن کے ساتھ ہے اور اس میں چناری ضلع مظفر آباد (آزاد کشمیر) سے تعلق رکھنے والے ہمارے پرانے دوست مولانا قاری محمد عمران خان جہانگیری خطیب و امام ہیں۔ قاری صاحب کافی عرصہ کراچی اور کالا گوجراں جہلم میں رہے ہیں، جمعیت علماء اسلام کے سرگرم حضرات میں سے تھے اور کم و بیش گیارہ سال سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔ لندن میں میرا زیادہ وقت انہی کے ہاں گزرتا ہے اور ان کی مہمان نوازی سے فیضیاب ہوتا ہوں۔ ۲ نومبر کو بھی ان کے پاس تھا اور جمعہ کی ادائیگی کے لیے کسی اور جگہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ انہوں نے فرمایا کہ آج جمعہ پر آپ یہاں بیان کریں، چنانچہ ان کی فرمائش پر کچھ معروضات پیش کیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

سورۃ الذاریات کی چند آیات میں نے تلاوت کی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں اور متقین کے اوصاف بیان فرمائے ہیں اور ان میں ایک بات یہ بھی ذکر کی ہے کہ ”ان کے اموال میں ضرورت مندوں کے حقوق ہوتے ہیں“۔ یعنی وہ اپنے اموال میں سے معاشرہ کے ضرورت مند افراد پر خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ان حقوق میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انسانوں کے باہمی حقوق کے حوالہ سے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

انسانی حقوق کا آج بھی بہت شہرہ ہے اور مختلف حوالوں سے ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ حقوق قرآن کریم نے بھی بیان کیے ہیں، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سینکڑوں احادیث میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے، اور سچی بات یہ ہے کہ باہمی حقوق کی جس قدر تفصیل اور

وضاحت قرآن کریم اور سنت نبویؐ میں ہے دنیا کے کسی اور نظام اور فلسفے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ البتہ دو باتوں کا فرق ہے:

1. ایک یہ کہ قرآن کریم میں حقوق العباد کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کا ذکر بھی ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں کے بھی حقوق ہیں۔ ماں باپ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، خاوند کا حق ہے، بچوں کا حق ہے، رشتہ داروں کا حق ہے، پڑوسیوں کا حق ہے، اور سوسائٹی کے نادار لوگوں کا حق ہے۔ لیکن ان سب کے ساتھ بلکہ ان سے پہلے انسان پر اس کے پیدا کرنے والے خالق و مالک کے حقوق ہیں۔ ان سب حقوق کو اپنی اپنی جگہ صحیح طور پر ادا کر کے ہی انسان اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتا ہے۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے آج کے فلسفہ میں ہر شخص کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے یہ حقوق ہیں جو اسے دوسروں سے ملنے چاہئیں اور جنہیں وہ حاصل کر سکتا ہے۔ جبکہ قرآن و سنت میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر انسان کے ذمہ دوسروں کے یہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی اس کے ذمہ ضروری ہے۔ دونوں میں فرق واضح ہے۔ ایک میں حقوق حاصل کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور دوسرے میں حقوق ادا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اب فیصلہ آپ خود کر لیں کہ ان میں سے کونسا فلسفہ باہمی محبت و اعتماد کی فضا قائم کرتا ہے اور کس فلسفہ کے نتیجہ میں جھگڑے اور فسادات پیدا ہوتے ہیں۔

قرآن و سنت میں ان حقوق کی بہت تفصیل ہے مگر ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کرنا چاہوں گا:

- بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، جو اس پر نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے کسی دوسرے کے ظلم کے لیے تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ جو شخص اپنے کسی بھائی کی حاجت پوری کرتا ہے، اللہ تعالی اس کی حاجت پوری کرتا ہے۔ جو شخص دنیا میں کسی مسلمان بھائی کی کوئی مشکل دور کرتا ہے اللہ تعالی اس کی قیامت کی مشکلات میں سے ایک مشکل دور کر دیں

گے۔ اور جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان بھائی کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب پر پردہ ڈالیں گے۔

اس حدیث میں جناب نبی اکرمؐ نے اللہ تعالیٰ کے قانون اور ضابطے کا ذکر کیا ہے کہ ایک مسلمان دنیا میں دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کرتا ہے، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ وہی رویہ اختیار فرمائیں گے۔ اور یہ بات ہمارے ہاں بھی اس طرح ہے کہ ہماری اولاد اور رشتہ داروں کے ساتھ کوئی شخص اچھا سلوک کرتا ہے تو ہمارے دل میں فطری طور پر اس کے لیے اچھے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ہمارے کسی تعلق دار سے نامناسب سلوک کرتا ہے تو اس کے لیے ہمارے دلوں میں بھی اس طرح کے جذبات ابھرتے ہیں۔ مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا جائے گا فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اسی قسم کے سلوک کی امید رکھنی چاہیے۔

• ایک اور حدیث میں ہے، جو حدیث قدسی ہے، مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنے ایک بندے سے فرمائیں گے کہ اے آدم کے بیٹے! میں فلاں وقت بیمار تھا، تو نے عیادت نہیں کی۔ وہ حیران ہو کر دریافت کرے گا کہ آپ تو رب العالمین ہیں، میں آپ کی عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا جس کا تجھے علم تھا اور تو نے اس کی بیمار پرسی نہیں کی۔ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس موجود پاتا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے آدم کے بیٹے! میں نے فلاں وقت تجھ سے کھانا مانگا تھا، تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ وہ پھر حیرانی سے پوچھے گا کہ یا اللہ! آپ تو رب العالمین ہیں، آپ کیسے بھوکے تھے اور میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا اور اس نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا، تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اس کا ثواب و اجر میری طرف سے تجھے ملتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا، تو نے مجھے پانی نہیں دیا تھا۔ وہ حیرت سے سوال کرے گا کہ یا اللہ! آپ تو رب العالمین ہیں آپ کیسے پیاسے

تھے اور میں آپ کو کیسے پانی پلاتا؟ اللہ تعالی فرمائیں گے کہ میرا فلاں بندہ پیاسا تھا جس کا تجھے علم تھا اور اس نے تجھ سے پانی مانگا تھا، تو نے اسے پانی نہیں پلایا تھا۔ اگر تو اسے پانی پلاتا تو اس کا اجر و ثواب تجھے میری طرف سے ملتا۔

اس حدیث قدسی پر غور فرمائیے کہ اللہ تعالی انسان کی بھوک کو اپنی بھوک، اس کی پیاس کو اپنی پیاس، اور اس کی بیماری کو اپنی بیماری فرما رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ رب العزت ان سب کمزوریوں سے پاک ہیں، وہ بے نیاز ہیں اور کسی قسم کی ضرورت اور کمزوری ان کے ساتھ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ فرما رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنے بندوں کی ضروریات کا لحاظ ہے، اور دوسرے بندوں کو وہ انہیں پورا کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ انہیں اپنے بندوں کی عزت نفس کا بھی پاس ہے کہ دینے والے سے فرما رہے ہیں کہ تو اس کو کچھ نہیں دے رہا مجھے دے رہا ہے اور اس کا اجر و ثواب تجھے مجھ سے ملے گا۔ حتی کہ قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا کہ اگر کسی نے دوسرے پر خرچ کر کے اور اس کی ضرورت پوری کر کے بعد میں اسے جتلا دیا یا کسی اور کے سامنے اس کا تذکرہ کر دیا تو اس کا ثواب باطل ہو جائے گا اور نیکی برباد ہو جائے گی۔

ان احادیث مبارکہ میں جن باتوں کا تذکرہ ہے ان میں سے دو باتوں کا آج کے عالمی حالات کے تناظر میں بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا:

1. ایک یہ کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی پر نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس پر ظلم کرنے دیتا ہے۔ اس حوالہ سے آج کی صورتحال میں دیکھیں کہ افغانستان، فلسطین، کشمیر، چیچنیا اور دوسرے مقامات میں ہمارے مسلمان بھائیوں پر کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہیں؟ اور ہم ان مسلمان بھائیوں کو دوسرے کے مظالم سے بچانے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ یہ بہت سنجیدہ سوال ہے اور اس کا تعلق ایک مسلمان کی حیثیت سے ہماری دینی ذمہ داری سے ہے۔ اس لیے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے اور اپنے مسلمان بھائیوں پر ہونے والے ظلم کو روکنے کے لیے ہم جو کچھ کر سکتے ہوں اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

2. دوسری بات یہ کہ حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالی قیامت کے روز ایک شخص کی بھوک، پیاس اور بیماری کے بارے میں جو سوال کریں گے کہ فلاں شخص بھوکا تھا، پیاسا تھا، بیمار تھا، تم نے اس کی خبر نہیں لی، اس کو کھانا نہیں دیا، اسے پانی نہیں پلایا، اس کی بیمار پرسی نہیں کی، گویا تم نے اس کی حق تلفی کر کے میری حق تلفی کی ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی بھوک، پیاس اور بیماری کے حوالہ سے باز پرس ہوگی تو کیا کسی جگہ پوری کی پوری مسلمان یا انسانی آبادی کی بھوک و پیاس اور فاقہ و بیماری کے بارے میں ہم سے کوئی سوال نہیں ہوگا؟ عراق میں جو کچھ ہوا ہے اور افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب ہمارے سامنے ہے اور ہم ان کی بھوک، فاقہ، بیماری اور کسمپرسی کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن عملاً ہم کیا کر رہے ہیں؟ اس پر ہم سب کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے اور قیامت کے روز اللہ تعالی کی بارگاہ میں پیشی کا تصور سامنے رکھتے ہوئے اس حوالہ سے اپنے کردار کا تعین کرنا چاہیے۔ اللہ تعالی ہم سب کو اپنی ذمہ داری صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

۲۰۰۴ء

اتاترک کی تقلید سے کچھ حاصل نہیں ہوگا

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۳ دسمبر ۲۰۰۴ء)

صدر جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالتے ہی مصطفی کمال اتاترک کو اپنا آئیڈیل قرار دے کر کسی ابہام کے بغیر اپنی پالیسی ترجیحات کا جو دوٹوک اعلان کیا تھا، وہ اس پر بدستور قائم ہیں اور ان کی اب تک کی پالیسیوں اور اعلانات کا تسلسل اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ان کی زبان پر اقتدار کے پہلے روز مصطفی کمال اتاترک کا نام محض اتفاقی طور پر نہیں آ گیا تھا، بلکہ اس کے پیچھے شعور اور عزائم کا ایک بھرپور پس منظر کارفرما تھا۔ اس لیے دینی اقدار و شعائر اور اسلام کے روایتی ڈھانچے کے حوالے سے وہ وقتاً فوقتاً جو کچھ بھی کہتے ہیں، ہمارے لیے غیر متوقع نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمیں اس پر کسی قسم کی حیرت ہوتی ہے۔

مصطفی کمال اتاترک جدید ترکیہ کے بانی ہیں اور برادر ترکی قوم کے محترم لیڈر کے طور پر ہم ان کا احترام کرتے ہیں، بلکہ اس تاریخی حقیقت کا پوری طرح ادراک رکھتے ہیں کہ آج جمہوریہ ترکی ایک ملک کے طور پر اگر موجود ہے اور اس کا شمار آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو اس کا کریڈٹ مصطفی کمال اتاترک کا جائز حق ہے، جنہوں نے ترک نیشنلزم کے نام پر ایک طرف خلافت عثمانیہ کا بوریا بستر سمیٹ کر عثمانی ایمپائر کو تاریخ کی نذر کر دیا تھا جبکہ دوسری طرف اسی ترک نیشنلزم کے ہتھیار سے یورپی مداخلت کاروں کا مقابلہ کر کے ترک قوم اور ملک کو ان کی دستبرد سے بچا لیا تھا۔ ورنہ خلافت عثمانیہ کے خلاف صدیوں جنگ لڑنے والے یورپی ممالک نے جس طرح ترکی کے حصے بخرے کر کے

ڈکار لیے بغیر اسے ہضم کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا، اگر مصطفی کمال اتاترک ان کے کباب میں ہڈی نہ بنتے تو ترکی آج ایک آزاد اور خود مختار ملک اور قوم کے طور پر موجود نہ ہوتا۔

ہمیں مصطفی کمال اتاترک کے اس کردار کا نہ صرف اعتراف ہے، بلکہ ہم اس کا پوری طرح احترام کرتے ہیں، لیکن ہمیں شکایت ہے کہ انھوں نے یورپی برادری میں شامل ہونے کے شوق میں اسلامی اقدار و روایات اور دینی شعائر کی جو قربانی دی اور جس بے دردی کے ساتھ ترکی میں اسلام کی دینی و ثقافتی علامات کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کیا، اس نے ترکی کو کسی طرف کا نہیں رہنے دیا۔ دینی احکام و روایات اور شعائر کو مسلسل مٹاتے چلے جانے کے باوجود ترکی کو ابھی تک یورپی یونین کا رکن بننے کا جائز حق دار تصور نہیں کیا جا رہا اور اس کے یورپی برادری میں شامل ہونے کی راہ میں موجود رکاوٹیں ہنوز ناقابل عبور دکھائی دے رہی ہیں۔

ہمیں بھی وہی مسئلہ درپیش ہے، صرف تناظر میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ ترکی کو یورپی برادری میں شامل ہونے کا شوق تھا جس کے لیے اسے اتنے پاپڑ بیلنے پڑے اور خدا جانے کب تک ان پاپڑوں سے اس کا واسطہ رہے گا، جبکہ ہمیں عالمی برادری کا قابل قبول حصہ بننے کا شوق تنگ کر رہا ہے اور صدر محترم اس شوق کی تکمیل کے لیے مصطفی کمال اتاترک کے نقش قدم پر مسلسل پیشرفت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تمام تر کوششوں اور پروگراموں کا مرکز و محور یہی ہے کہ ہمیں آج کی عالمی برادری اور ورلڈ سسٹم میں ایسا مقام حاصل ہو جائے کہ ہماری کسی بات پر عالمی برادری کو اعتراض نہ ہو اور ہمارا کوئی معاملہ ورلڈ سسٹم کے لیے ناقابل قبول نہ ہو۔ ترکی کی یہ الجھن یورپی برادری کے حوالے سے تھی، جبکہ ہماری الجھن عالمی برادری کے حوالے سے ہے اور ہم یہ دیکھے بغیر کہ گزشتہ پون صدی میں ترکی کو اس طرز عمل سے کیا حاصل ہوا ہے، اسی راہ پر چلنے کے لیے بے چین ہیں۔

گزشتہ دنوں صدر جنرل پرویز مشرف نے ڈاڑھی اور برقعے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے قبل وہ چور کے ہاتھ کاٹنے کی قرآنی سزا کا جس انداز سے ذکر کر چکے ہیں، اور اس سے بھی پہلے ایک موقع پر نماز کے ضروری ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے انھوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ ملک کے عام دینی حلقوں کے لیے ضرور حیرت کا باعث ہوگا، مگر ہمارے لیے غیر متوقع نہیں ہے، اس لیے کہ جمہوریہ ترکیہ کی گزشتہ پون صدی کی تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ ترکی کے قوم پرست لیڈروں کو یورپی برادری کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ

کے لیے کیا کچھ کہنا پڑا تھا، کیا کچھ کرنا پڑا تھا اور کس کس چیز سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح عالم اسلام کا جو لیڈر بھی آج کی عالمی برادری اور ورلڈ سسٹم کو آئیڈیل قرار دے کر اس کے ساتھ ایڈجسٹ ہونا چاہے گا، اسے یہ سب کچھ کہنا پڑے گا اور اس سے کہیں زیادہ کرنا بھی پڑے گا۔ اس کے بغیر کسی مسلمان لیڈر کو آج کا ورلڈ سسٹم پسندیدگی اور قبولیت کی سند دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

صدر جنرل پرویز مشرف کی خدمت میں ان کے مذکورہ بالا ارشادات کے حوالے سے ہم دو گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

1. ایک یہ کہ اسلامی شعائر و اقدار اور اسلام کے چودہ سو سال سے چلے آنے والے روایتی ڈھانچے سے لاتعلقی کے اظہار کے لیے بے چارے مولوی کو رگیدنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی جواز ہے۔ اس لیے کہ مولوی ان میں سے کوئی بات بھی اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا، وہ ہر مسلمان کے لیے پانچ وقت کی نماز کی روزانہ ادائیگی کو ضروری قرار دیتا ہے تو یہ اس کا کوئی خودساختہ مسئلہ نہیں بلکہ قرآن کریم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح حکم ہے کہ ہر عاقل و بالغ مسلمان کے لیے روزانہ پانچ وقت نماز کی ادائیگی اس کے فرائض میں سے ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے مسلمان اور کافر کے درمیان فرق و امتیاز کی علامت ہی نماز کی ادائیگی کو قرار دیا ہے۔ مولوی اگر یہ کہتا ہے کہ قرآن کریم کے حکم کے مطابق چور کا ہاتھ کاٹنے کی شرعی سزا ملک میں نافذ کی جائے تو یہ سزا اس نے مقرر نہیں کی، قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ مولوی جب یہ کہتا ہے کہ مرد اور عورت کا آزادانہ اختلاط شرعاً درست نہیں ہے اور عورت کے لیے حجاب کی پابندی اسلام کی رو سے ضروری ہے تو یہ ضابطہ بھی مولوی نے وضع نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم اور سنت نبویؐ میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اسی طرح مولوی اگر ڈاڑھی کو سنت نبوی قرار دیتا ہے تو یہ اس کا خودساختہ مسئلہ نہیں ہے، بلکہ احادیث کے ذخیرے میں بہت سی روایات موجود ہیں جن میں ڈاڑھی کو مرد کے لیے زینت اور سنت نبویؐ بتایا گیا ہے۔

ان میں سے کوئی مسئلہ بھی مولوی کا اپنا وضع کردہ نہیں ہے، وہ اس حوالے سے صرف دو باتوں کا "مجرم" ہے۔ ایک یہ کہ وہ جو کچھ قرآن کریم میں پڑھتا ہے یا

سنت نبویؐ میں دیکھتا ہے اسے بیان کر دیتا ہے اور ان میں سے کسی بات کو صرف اس لیے چھپاتا نہیں ہے کہ یہ بات ورلڈ سسٹم کے لیے قابل قبول نہیں ہے، یا عالمی برادری اس بات کو پسند نہیں کر رہی۔ جبکہ اس کا دوسرا ”جرم“ یہ ہے کہ وہ قرآن سنت کے احکام و قوانین کی کوئی ایسی تعبیر و تشریح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جو سنت نبویؐ کے ذخیرہ اور امت کے چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسے اس بات کا کوئی شوق نہیں ہے کہ آج کا ورلڈ سسٹم اور عالمی برادری اسے پسندیدگی کا سرٹیفکیٹ جاری کرے، کیونکہ وہ پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ آج کے ورلڈ سسٹم اور عالمی برادری کو اسلام کی جس جس بات پر اعتراض ہے، اس میں اسلام کا موقف صحیح ہے اور عالمی برادری کا موقف غلط ہے۔ یہ بات بھی اس کے ایمان و یقین کا حصہ ہے کہ بالآخر اس حوالے سے عالمی برادری اور ورلڈ سسٹم کو ہی اپنے موقف سے ہٹنا پڑے گا اور اسلام کے فطری اصولوں کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

طاقت کے مراکز پر قبضہ کر لینا اور دولت کے وسائل پر اجارہ داری قائم کر لینا اور بات ہے جبکہ کسی فکر و فلسفہ اور نظام و ثقافت کا صحیح اور حق ہونا اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ حق اور باطل ہونے کا فیصلہ کبھی طاقت اور دولت کی بنیاد پر نہیں ہوا۔ تاریخ میں اس سے قبل بھی بہت سے مراحل آئے ہیں جب طاقت اور دولت نے محض طاقت کے بل پر خود کو حق ثابت کرنے اور دنیا سے منوانے کی کوشش کی ہے لیکن اسے کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اور اب بھی نہیں ہوگی، اس لیے جس کو بھی اسلام کے روایتی ڈھانچے اور دینی شعائر و روایات سے دستبردار ہونا ہے، اسے اخلاقی جرأت سے کام لینا چاہیے اور مولوی کو آڑ بنا کر اسلام پر چاند ماری کی مشق نہیں کرنی چاہیے۔

2. دوسری گزارش یہ ہے کہ اگر ہمارے صدر محترم نے مصطفیٰ کمال اتاترک کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انہیں اسلامی اقدار و روایات سے لاتعلقی کے حوالے سے ترک قوم کی پون صدی کی کوششوں کے نتائج پر بھی ایک نظر ضرور ڈال لینی چاہیے، اور یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کیا وہ اس کام میں اس حد تک آگے جا سکیں گے جہاں تک مصطفیٰ کمال اتاترک چلے گئے تھے؟ اور

اگر خدانخواستہ انھوں نے ایسا کر بھی لیا تو انہیں اس کے نتیجے میں ترکی سے مختلف کوئی نتیجہ حاصل ہو سکے گا؟

سنی شیعہ کشیدگی۔ چند اہم معروضات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ دسمبر ۲۰۰۴ء)

سنی شیعہ تنازع کے حوالے سے 'الشریعہ' میں وقتاً فوقتاً ہم اظہار خیال کرتے رہتے ہیں اور اس بارے میں قارئین ہمارے عقیدہ، جذبات اور طرز عمل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ چند ماہ قبل ہم نے ہمدرد یونیورسٹی دہلی سے آمدہ ایک سوال پر اس سلسلے میں اپنے اسی موقف کو اختصار کے ساتھ دہرا دیا جس کا اظہار اس سے قبل مختلف مضامین میں کیا جا چکا ہے تو اس پر کالعدم سپاہ صحابہ کے ترجمان ماہنامہ "خلافت راشدہ" فیصل آباد نے ستمبر ۲۰۰۴ کے شمارے میں غصے اور ناراضی کا اظہار کیا ہے اور والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے ایک فتویٰ کے حوالے سے اپنے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ حضرت موصوف کے فتویٰ سے انحراف ہے اور 'الشریعہ' نے ان کے موقف سے ہٹ کر کوئی راہ اختیار کر لی ہے۔ اگر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا حوالہ نہ ہوتا تو شاید ہم اس پر تبصرہ کی ضرورت محسوس نہ کرتے، لیکن چونکہ "خلافت راشدہ" کے فاضل مضمون نگار نے اپنے غیظ وغضب کے اظہار کے لیے اس فتویٰ کو آڑ بنایا ہے، اس لیے چند امور کی وضاحت ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

کالعدم سپاہ صحابہ کے ترجمان کا کہنا ہے کہ:

> مولانا زاہد الراشدی جید عالم دین، عظیم اسلامی سکالر، معروف کالم نگار اور ایک مذہبی رسالہ ماہ نامہ 'الشریعہ' کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کے والد محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر بہت بڑی علمی شخصیت اور عظیم عالم دین ہیں۔ انھوں نے ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ کو شیعہ کے بارے میں درج ذیل فتویٰ جاری کیا تھا:
>
> "الجواب ہو المصوب: شیعہ اپنے کفریہ عقائد کی وجہ سے اسلام سے خارج ہیں جن میں تین باتیں اصولی ہیں:
>
> 1. قرآن کریم ان کے نزدیک اصلی شکل میں نہیں۔
> 2. ان کے نزدیک جمہور حضرات صحابہ کرام (العیاذ باللہ) کافر ہیں۔

3.ان کے نزدیک ائمہ معصوم ہیں، حالانکہ معصوم ہونا صرف حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کا خاصہ ہے۔ گویا ان کے نزدیک ہر امام نبی ہے۔ نعوذ باللہ من الخرافات۔

لہذا شیعہ کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں، اور ان کے تقیہ سے قطعا متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

واللہ تعالی اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم۔

ابو الزاہد محمد سرفراز

شیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

یکم رجب ۱۴۰۶ ہجری۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۶"

محترم مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کے والد محترم کا تفصیلی فتوی آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے۔ اب محترم مولانا زاہد الراشدی کا اپنا طرز عمل بھی ملاحظہ فرمائیں کہ ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے شعبہ اسلامیات کے رکن شیعہ مذہب کے پیروکار ڈاکٹر یوگندر سکند نے ایک تحریری انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو محترم مولانا زاہد الراشدی نے اپنے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ الشریعہ جولائی ۲۰۰۴ میں شائع کیا ہے۔ اس انٹرویو میں شیعہ انٹرویو نگار مذکور نے سوال نمبر ۱۱ کیا ہے کہ

"بعض پاکستانی حلقے مثلا سپاہ صحابہ شیعہ کو کافر اور دشمن اسلام قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ ہاں یا نہیں کی صورت میں آپ کی رائے کے وجوہ کیا ہیں؟ اگر آپ اس سے متفق نہیں تو اس نقطہ نظر کی تردید کے لیے آپ نے کیا کردار ادا کیا ہے؟

اب محترم مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کی طرف سے جواب ملاحظہ فرمائیں:

ہم نے سپاہ صحابہؓ کے شدت پسندانہ طریق کار سے ہمیشہ اختلاف کیا ہے اور مختلف مضامین میں اس کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس کے راہ نماؤں مثلا مولانا حق نواز جھنگوی، مولانا ضیاء الرحمن فاروقی اور مولانا محمد اعظم طارق کے ساتھ براہ راست گفتگو میں بھی انھیں اپنے موقف سے آگاہ کیا ہے۔ ہم جمہور علماء اہل سنت کے اس موقف سے متفق ہیں کہ جو شیعہ تحریف قرآن کریم کا قائل ہے، اکابر صحابہ کرام کی تکفیر کرتا ہے اور حضرت عائشہؓ پر قذف کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔ نیز ہم امت کی چودہ سو سالہ تاریخ کے مختلف ادوار میں شیعہ کے سیاسی کردار کے حوالے سے بھی ذہنی تحفظات رکھتے ہیں، لیکن اس کی بنیاد پر ان کے خلاف کافر کافر کی مہم، تشدد

کے ساتھ ان کو دبانے اور کشیدگی کا ماحول پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارا اس حوالہ سے موقف یہ ہے کہ عقائد اور تاریخی کردار کے حوالہ سے باہمی فرق اور فاصلہ کو قائم رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور استدلال و منطق کے ساتھ اپنا موقف پیش کرنے کا راستہ ہی صحیح اور قرین عقل ہے اور اس حوالہ سے ہمیں امت مسلمہ کے اجتماعی رویہ سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔"

آپ نے دیکھا کہ مسؤل کا سوال کتنا واضح اور صاف تھا، لیکن حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ نے جواب کو انتہائی پیچیدہ بنا کر پیش کیا جس سے یہ تاثر صاف نکلتا ہے کہ سپاہ صحابہ والے شیعہ کو غلط کافر کہتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ سوال کرنے والے نے پوچھا کہ سپاہ صحابہ والے شیعہ کو کافر اور دشمن اسلام قرار دیتے ہیں۔ ہاں یا نہیں کی صورت میں جواب دیں اور اس کی وجہ بیان فرما دیں۔ کاش مولانا زاہد الراشدی مدظلہ اس سوال کے جواب میں اپنے والد محترم کا فتویٰ ہی نقل کر دیتے جس میں انہوں نے واضح انداز میں نہ صرف شیعہ کو خارج از اسلام قرار دیا بلکہ ان کے کفر کی تین وجوہات بھی درج کر دی ہیں اور آخر میں پھر لکھا ہے کہ شیعہ کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور ان کے تقیہ سے قطعا متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

ماہنامہ الشریعہ کے اگلے ماہ اگست کے شمارے میں اسی پروفیسر ڈاکٹر یوگندر سکند نے شیعہ سنی تعلقات کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے شیعہ کے خلاف فتویٰ دینے والے علماء حق کو شرک کا مرتکب ہونے، ان کے فتویٰ کو کفر اختیار کرنے سے بھی بڑا جرم قرار دیا ہے۔ محترم جناب مولانا زاہد الراشدی سے دردمندانہ درخواست ہے کہ خدارا خود کو غیر جانب دار اور مذہبی سکالر ثابت کرنے کے لیے شیعہ کی سازشوں کا شکار ہو کر سپاہ صحابہ کے قائدین اور ہزاروں کارکنان کی قربانیوں اور اپنے اسلاف کے فتاویٰ جات کو خاک میں ملانے کی کوشش نہ کریں۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ "خلافت راشدہ" کی اس تحریر کو ایک بار پھر پڑھ لیں اور پھر ہماری درج ذیل معروضات پر توجہ فرمائیں:

- مضمون نگار کو شکایت ہے کہ سوال میں شیعہ کے کافر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے، مگر ہم نے جواب میں بات کو لمبا کر دیا ہے۔

ہمارے خیال میں یہ بات نہیں ہے، اس لیے کہ سوال میں صرف شیعہ کے کافر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں نہیں پوچھا گیا بلکہ یہ سوال سپاہ صحابہ کا نام لے کر اس کے حوالے سے کیا گیا ہے، اس لیے یہ ہماری اخلاقی ذمہ داری تھی کہ جہاں اصل مسئلہ پر اپنا موقف عرض کریں، وہاں اس مسئلہ کے پس منظر میں سپاہ صحابہ کے طرز عمل کے بارے میں بھی اپنا نقطہ نظر بیان کر دیں اور ہم نے وہی کیا ہے۔

• مضمون نگار نے یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ ہم شیعہ کے بارے میں اکابر علماء اہل سنت کے فتوی سے اختلاف کر رہے ہیں جو کہ غلط ہے، کیونکہ جس تحریر میں سپاہ صحابہ کے طرز عمل سے اختلاف کیا گیا ہے، اسی میں فتوی کی تائید بھی موجود ہے۔ البتہ ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تکفیر کرتے ہوئے اس کی وجوہ کا حوالہ بھی دیا جائے اور یہ کہہ کر تکفیر کی جائے کہ جو شیعہ قرآن کریم کی تحریف کا قائل ہے، اکابر صحابہ کرام کی تکفیر کرتا ہے، حضرت عائشہ پر نعوذ باللہ قذف کرتا ہے، ائمہ کو انبیاء کرام کی طرح معصوم مانتا ہے یا دین کی اور کسی ضروری بات کا انکار کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ یہ صراحت اس لیے ضروری ہے کہ شیعہ کہلانے والے بعض فرقے اور افراد ایسے موجود ہیں جن کا یہ عقیدہ نہیں ہے اور اگر کوئی شخص ان عقائد سے لاتعلقی کا اعلان کرتا ہے اور اس کا عمل بھی اس لاتعلقی کی تائید کرتا ہے تو محض شیعہ کہلانے کی وجہ سے اس کی تکفیر کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مثلاً زیدی فرقہ شیعہ کہلاتا ہے مگر اس کے یہ عقائد نہیں ہیں۔ یمن میں ایسے زیدیوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو زیدی شیعہ کہلاتے ہیں مگر ان کے عقائد اہل سنت والے ہیں حتی کہ یمن کے نامور سنی عالم قاضی شوکانی کا شمار بھی زیدیوں میں کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ایران کے دستور میں زیدیوں کو صراحتاً اہل سنت کے فقہی مذاہب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کے ساتھ شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں نور بخشی شیعوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے عقائد اثنا عشریوں سے مختلف ہیں۔ ان کے عقائد کا الگ طور پر جائزہ لیے بغیر انھیں اثنا عشریوں کے ساتھ ایک ہی فتوی میں شمار کر لینا ان کے ساتھ زیادتی کی بات

ہوگی اور افتا کے مسلمہ اصولوں کے بھی منافی ہوگا۔ اس لیے ہمارے نزدیک بات وہی صحیح ہے جو ہمارے اکابر کہتے آرہے ہیں کہ مذکورہ بالا عقائد یا ان میں سے کوئی ایک عقیدہ بھی رکھنے والے شیعہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں اور ان کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے۔

• ہم نے اختلاف اکابر علماء کرام کے فتوی سے نہیں، بلکہ کالعدم سپاہ صحابہ کے طرز عمل اور طریق کار سے کیا ہے اور اب نہیں، شروع سے ہم یہ اختلاف کرتے آرہے ہیں جس پر ہمارے بہت سے سابقہ مضامین گواہ ہیں، بلکہ سپاہ صحابہ کے قائدین کے ساتھ گفتگو میں بھی ہم نے اس کا برملا اظہار کیا ہے اور سپاہ صحابہ کے شدت پسندانہ طرز عمل کو ہم نے ہمیشہ غلط اور نقصان دہ قرار دیا ہے۔ یہ بالکل ایک الگ مسئلہ ہے اور اسے فتوی سے ہٹ کر ایک مستقل مسئلہ کے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ کافر ہونا یا نہ ہونا الگ سوال ہے اور کافروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات کا تعین اس سے بالکل مختلف امر ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کافروں کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کیا تھا۔ مشرکین عرب کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل اور تھا، اہل کتاب کے ساتھ معاملات کی نوعیت اس سے مختلف تھی اور مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے درمیان رہنے والے منافقین کے ساتھ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ان دونوں سے بالکل الگ تھا۔ ان منافقین کے کفر کی گواہی قرآن کریم نے دی ہے اور ان کے کفر میں کسی شک وشبہہ کی گنجایش نہیں ہے حتی کہ ان کا جنازہ پڑھانے اور ان کے لیے دعاے مغفرت کرنے سے بھی قرآن کریم نے روک دیا تھا، لیکن ان کے ساتھ شدت اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مختلف معاملات میں مسلمانوں کے ساتھ شریک رہتے تھے، مسلمانوں کو نہ ان کے معاشرتی بائیکاٹ کا حکم دیا گیا اور نہ ہی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مسلم سوسائٹی سے الگ کیا، حتی کہ بعض غیور مسلمانوں نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی

سے منع کر دیا اور فرمایا، اس سے دنیا میں غلط تاثر پھیلے گا اور لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

• شدت پسندی کے طرز عمل سے اختلاف کر کے ہم کوئی نیا موقف اختیار نہیں کر رہے، بلکہ ہمارے بزرگوں کا موقف بھی یہی ہے جس کی ایک جھلک شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے اس مکتوب گرامی میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو انھوں نے آج سے بارہ سال قبل سپاہ صحابہ کے ارکان کے نام لکھا تھا اور جسے گوجرانوالہ کے معروف عالم دین مولانا محمد ایوب صفدر (مہتمم مدرسہ فیضان سرفراز، پلی نوشہرہ سانسی، جناح روڈ، گوجرانوالہ) نے ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کیا تھا۔ وہ مکتوب گرامی درج ذیل ہے:

باسمہ سبحانہ وتعالی

۱۷ رجب ۱۴۱۲ھ/۲۳ جنوری ۱۹۹۲ء

من ابی الزاہد

الی محترم المقام حضرت مولانا صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج سامی!

گزارش ہے کہ سپاہ صحابہ کے حضرات نے ایران کی طاغوتی طاقت کے بل بوتے اور شہ پر ناچنے والی رافضیت کا پاکستان میں جو دروازہ بند کیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ وقت کی اہم ضرورت ہے بلکہ دینی لحاظ سے بھی فرض کفایہ ہے۔ اللہ تعالی آپ حضرات کی اس مبارک کوشش کو کامیاب کرے اور دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

اگر بار خاطر نہ ہو تو چند ضروری باتیں عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

1. جو ذہن آپ حضرات نے نوجوانوں کا بنایا ہے یا بنائیں گے، وہی وہ اپنائیں گے، کیونکہ اکثریت ان کی علم دین نہیں رکھتی اور اکابر کو بھی نہیں دیکھا۔ جو آپ ان کو بتائیں گے، اسی کو وہ حرف آخر سمجھیں گے اور تن، من، دھن کی بازی لگائیں گے۔ واللہ الموفق۔

2. نوجوان جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات میں بہت کچھ

کر اور کہہ جاتے ہیں۔ شدت اور سختی سے کبھی مسائل حل نہیں ہوئے اور نہ قوت اور طاقت سے کسی فرد یا نظریہ کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ صدر صدام حسین کی ضد اور نادانی کی وجہ سے تیس سے زائد طاقت ور حکومتیں بھی اسے ختم نہ کر سکیں اور وہ ابھی تک جیتا جاگتا ہے۔ اس لیے گزارش ہے کہ نوجوانوں کو قولا اور فعلا شدت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ روکیں۔ رافضیوں کے کفر میں تو شک ہی نہیں، مگر در و دیوار پر کافر کافر لکھنے اور نعرہ بازی سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔ عیاں را چہ بیاں۔

3. ممکن ہے بعض جذباتی اور سطحی اذہان میری اس تحریر سے یہ اخذ کریں کہ میں بک گیا ہوں یا دب گیا ہوں تو یہ نظریہ درست نہ ہوگا۔ بفضلہ تعالی یہ گناہ گار انتہائی غربت اور جوانی کے زمانے میں بھی نہ بکا ہے نہ دبا۔ اب اسی (۸۰) سال کی عمر میں قبر کے پاس پہنچ کر کیسے بک یا دب سکتا ہے؟

4. کافی عرصہ ہوا ہے، حضرت مولانا عطاء المنعم شاہ صاحب دام مجدہم نے حضرت امیر معاویہؓ کے سرکاری طور پر یوم منانے کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے ان کو مفصل خط لکھا تھا کہ آپ کے والد مرحوم امیر شریعت تو بدعات کو مٹانے کے لیے لٹھ لیے پھرتے تھے، آپ اس بدعت کو کیسے جاری کرتے ہیں؟ میرے خیال میں میرا عریضہ ضرور موثر ثابت ہوا اور اس کے بعد ان کا کوئی بیان اس بدعت کی ایجاد کرنے کا میرے علم میں نہیں ہے۔

5. آپ حضرات کی طرف سے زور وشور کے ساتھ حضرات خلفاء راشدین کے ایام سرکاری طور پر منوانے کا مطالبہ آتا ہے۔ آپ جن اکابر کے دامن سے وابستہ ہیں، ان کی تاریخ دیکھ لیجیے۔ کبھی ایسی بدعات کے ایجاد کا تصور

بھی انھیں نہیں آیا۔ عوام تو نہیں جانتے، مگر آپ تو علما ہیں، وسیع مطالعہ کے مالک ہیں۔ اس کارروائی کے بدعت ہونے کے بارے میں آپ حضرات کے سامنے کتابوں کے حوالے پیش کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ولاریب فیہ۔

6. آپ حضرات کا مطالبہ صرف اور صرف خلافت راشدہ کا نظام قائم کرنے کا ہونا چاہیے جو حکمران طبقہ اور سرمایہ داروں کے لیے پیام موت ہے۔ ایام منوانے کی بدعت کے پیچھے ہرگز نہ پڑیں۔ خلافت راشدہ کے نظام کے نافذ کرنے کے مطالبہ میں عنداللہ تعالی بھی آپ سرخرو ہوں گے اور عوام کا تعاون بھی حاصل رہے گا۔

7. اگر بادل نخواستہ آپ کے ایام منانے کی کوئی کوشش منظور کر لی گئی تو حکمران طبقہ بھی اور عوام بھی یہ باور کریں گے کہ ان کو اب خاموش رہنا چاہیے، ان کا مطالبہ پورا ہو گیا ہے۔ اس سے آپ کے اصل مقصد پر زد پڑے گی۔ بھٹو صاحب نے جمعہ کے دن چھٹی کرنے پر کہہ دیا تھا کہ لو، اب اسلام نافذ ہو گیا ہے۔

8. بعض غالی قسم کے اہل بدعت اس کارروائی کے خلاف سخت پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ دیوبندی دن منائیں تو بدعت نہ ہو اور بریلوی منائیں تو بدعت ہو جائے۔ ان کا یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ ماہ جنوری ۱۹۹۲ء کا رضائے مصطفی ضرور بہ ضرور دیکھیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

والسلام

ابو الزاہد محمد سرفراز

از گکھڑ

اس اختلاف کی ایک اور جھلک سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ تعالی کے رفیق خاص مولانا مشتاق احمد کے مضمون کے اس اقتباس میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی

ہے جو انھوں نے مولانا چنیوٹی کے حالات زندگی پر تحریر کیا ہے اور جو ماہنامہ 'الشریعہ' کے ستمبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ مولانا مشتاق احمد اس مضمون میں لکھتے ہیں:

"مولانا چنیوٹی سپاہ صحابہؓ سے ہمدردی تو رکھتے تھے لیکن ان کے مخصوص نعروں کے عام جلسوں میں لگائے جانے سے متفق نہ تھے۔ جامعہ عربیہ چنیوٹ کی مسجد میں سالانہ ردمرزائیت کورس کی اختتامی تقریب منعقد ہوئی۔ شہید ناموس صحابہ مولانا اعظم طارق مرحوم مہمان خصوصی تھے۔ مولانا اعظم طارق کی تقریر سے پہلے کسی نے "کافر کافر شیعہ کافر" کے نعرے لگائے تو مولانا چنیوٹی نے برملا ڈانٹا کہ تم اچھل اچھل کر نعرے لگانے والے تو جلسہ کے بعد اپنے گھروں کو چلے جاؤ گے۔ یہ غریب (مولانا اعظم طارق) جیل چلا جائے گا۔ ان کو جیل سے باہر بھی رہنے دو۔ کیا انہیں جیل بھیجنا چاہتے ہو؟ مولانا اعظم طارق مرحوم عجیب تاثرات کے ساتھ مولانا چنیوٹی کو دیکھتے رہے لیکن اپنی تقریر میں بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔"

'خلافت راشدہ' کے فاضل مضمون نگار اور ان کے ہم نواؤں سے گزارش ہے کہ کالعدم سپاہ صحابہ کے طرز عمل کے ساتھ ہمارا اختلاف بھی وہی ہے جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم، سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر بہت سے سرکردہ اور سنجیدہ علماء کرام کا ہے۔ اس پر سیخ پا ہونے کے بجائے کالعدم سپاہ صحابہ کی قیادت کو اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے اور اپنے طرز عمل اور طریق کار پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ شیعہ جارحیت کے خلاف اہل سنت کے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کا آغاز سپاہ صحابہ نے نہیں کیا، بلکہ اس سے قبل پاکستان میں حضرت مولانا عبد الستار تونسوی مدظلہ، حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا دوست محمد قریشیؒ، حضرت مولانا احمد شاہ چوکیرویؒ، حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ اور دیگر سرکردہ علماء کرام نے نصف صدی تک اس جدوجہد کی قیادت اور راہ نمائی ہے، البتہ کالعدم سپاہ صحابہ نے اس میں شدت پسندی کا اضافہ کیا ہے اور تشدد کا ماحول پیدا کیا ہے، مگر اب وقت آگیا ہے کہ اس شدت پسندی کے نفع ونقصان کا جائزہ لے لیا جائے اور پیچھے مڑ کر دیکھ لیا جائے کہ اس طرز عمل سے ہم نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے؟

ہم اس میں کالعدم سپاہ صحابہ کو تنہا قصور وار نہیں سمجھتے، بلکہ ہمارے نزدیک اس شدت پسندی کا بیج انقلاب ایران کے بعد اس کی سرپرستی میں کالعدم تحریک نفاذ فقہ جعفریہ نے

پاکستان میں فقہ جعفریہ کے جداگانہ نفاذ کا مطالبہ اور اسلام آباد کے وفاقی سیکرٹریٹ کا محاصرہ کر کے بویا تھا۔ سپاہ صحابہ اس کے ردعمل میں وجود میں آئی، لیکن اس ردعمل میں اس قدر آگے نکل گئی کہ نفع ونقصان کا توازن قائم رکھنا یاد نہ رہا اور پیچھے ہٹنے کے راستے بھی بند نظر آنے لگے۔ ہمارا مشورہ اب بھی صرف یہ ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیا جائے، سود وزیاں کا حساب کر لیا جائے اور ان اکابر واسلاف کے طریقے پر واپس آنے کی راہیں تلاش کر لی جائیں جو ہم سے زیادہ متصلب سنی تھے، اہل سنت کے عقائد کے ساتھ ہم سے زیادہ وابستگی اور وفاداری رکھتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ملی اور قومی مقاصد کا شعور بھی رکھتے تھے اور توازن کا دامن ہمیشہ تھامے رکھتے تھے۔ اسی میں سلامتی ہے، یہی صحیح راہ عمل ہے اور اسی میں اہل سنت کے عقائد، حقوق اور مفادات کا تحفظ بھی ہے۔

الحاج سیٹھی محمد یوسف مرحوم

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۱ نومبر ۲۰۰۴ء)

غالباً ۵۶ء یا ۵۷ء کا واقعہ ہے میں گکھڑ کے پرائمری سکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک روز جمعہ کے موقع پر ایک بزرگ تشریف لائے، ان کے ساتھ ایک قاری صاحب تھے۔ حضرت والد محترم مدظلہ نے ان صاحب کو جمعہ کے اجتماع میں کچھ کہنے کا موقع دیا، انہوں نے قرآن کریم صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے اور حفظ قرآن کریم کی اہمیت مختصر لفظوں میں بیان کی۔ ان کے ساتھی قاری صاحب نے قرآن کریم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی اور ان صاحب نے مسجد کے نمازیوں سے کہا کہ اگر آپ حضرات اس مسجد میں قرآن کریم کی تعلیم کا مدرسہ قائم کرنے پر آمادہ ہوں تو قاری صاحب کی آدھی تنخواہ ہم دے دیا کریں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ گکھڑ سے تین میل دور جی ٹی روڈ پر واقع گتہ مل کے مالک سیٹھی محمد یوسف صاحب ہیں اور ان کے ساتھ قاری صاحب گتہ مل کالونی کی مسجد کے خطیب مولانا قاری عبد الحفیظ ہیں جن کا تعلق شیدو شریف اکوڑہ خٹک سے ہے۔

سیٹھی محمد یوسف صاحب کی ترغیب پر گکھڑ میں مدرسہ تجوید القرآن کے نام سے حفظ قرآن کریم کی درسگاہ قائم ہوئی اور قاری اعزاز الحق امروہویؒ بطور استاذ تشریف لائے۔ اس مدرسہ کے ابتدائی طلبہ میں ایک میں بھی تھا جسے سکول سے اٹھا کر حضرت والد صاحب مدظلہ نے قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے اس مدرسہ میں داخل کرا دیا تھا۔ سیٹھی صاحب

مرحوم نے قرآن کریم کے مدارس کے قیام کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا تھا۔ اس مقصد کے لیے تعلیم القرآن ٹرسٹ قائم تھا اور اس کے ذریعہ انہوں نے پاکستان کے مختلف حصوں میں مذکورہ بالا ترغیب کے ساتھ حفظ قرآن کریم کے مدارس کے قیام کی مہم چلائی۔ بعد میں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں آنے سے قبل مجھے گتہ مل کالونی کی مسجد میں کم وبیش ڈیڑھ دو سال خطابت کے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا تو اس کام سے زیادہ واقفیت حاصل ہوئی اور معلوم ہوا کہ تعلیم القرآن ٹرسٹ کے تحت ملک بھر میں کم وبیش گیارہ سو مدارس کی امداد کی جاتی ہے۔ یہ مدارس آہستہ آہستہ خود کفیل ہوتے گئے اور ٹرسٹ کی مدد بھی کم ہوتے ہوئے چند مدارس تک محدود رہ گئی۔ مگر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان میں حفظ قرآن کریم اور تجوید کے ہزاروں مدارس کے قیام کے پیچھے الحاج سیٹھی محمد یوسف مرحوم کی اس محنت کو بنیادی کردار کی حیثیت حاصل ہے۔

سیٹھی صاحب ایک نومسلم باپ کے فرزند تھے۔ ان کے والد سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ پر واقع بستی ترگڑی کے ہندو خاندان سے تعلق رکھتے جو مسلمان ہوئے اور خدمت قرآن کو نہ صرف اپنا مشن بنایا بلکہ اپنے بیٹے کو مستقل طور پر اس کام پر لگا دیا۔ آخر عمر میں سیٹھی صاحب مرحوم کی توجہ سعودی عرب میں حفظ قرآن کریم کے مدارس قائم کرنے پر مبذول ہوگئی تھی اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سعودی عرب میں اس وقت قرآن کریم کے حفظ اور قراءت کا جو ذوق پورے عالم اسلام کے لیے قابل فخر اور لائق تقلید مقام حاصل کر چکا ہے اس کی شروعات بھی سیٹھی محمد یوسف صاحب مرحوم کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کی تفصیل اعظم گڑھ انڈیا کے معروف علمی جریدہ ”معارف“ کے مئی ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک مکتوب میں ملاحظہ کریں جو جناب عبد الملک جامی نے ”مکتوب مدینہ منورہ“ کے طور پر تحریر فرمایا تھا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک موقع پر اہل لاہور سے خطاب کے دوران شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت قرآن کریم اور اس کے عالمگیر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ لاہوریو! اگر تم قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے پر آمادہ نہ ہوگے تو دیکھ لو اللہ تعالی نے ایک سکھ گھرانے میں مولانا احمد علی کو پیدا کر کے انہیں قرآن کریم کے علوم کی اشاعت کے کام پر لگا دیا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم بھی نومسلم تھے اور سکھ سے مسلمان ہوئے تھے۔ حسن اتفاق یہ ہے کہ ان کے گاؤں ”جلال“ اور سیٹھی محمد یوسف مرحوم کے والد کے

گاؤں ''ترگڑی'' میں چند میل کا فاصلہ ہے اور دونوں کے مسلمان ہونے کا زمانہ بھی ایک ہے۔ جناب عبد الملک جامی کا مکتوب ملاحظہ کیجئے اور قرآن کریم کے اعجاز کی آج کے دور میں ایک زندہ شہادت پڑھ کر ایمان تازہ کیجئے۔

۱۶/۱۷ رمضان المبارک چہار شنبہ (یوم الاربعاء)

محب گرامی قدر جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی!

وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں ابھی حرم شریف سے آرہا ہوں، وہاں آج ہمارا حفلہ سنویہ (سالانہ جلسہ) تھا۔ جلسہ یہاں دار القضاء کی اصطلاح ہے، ہمارے ہاں کہتے ہیں آج ''پیشی'' ہے، یہاں کہتے ہیں آج ''جلسہ'' ہے۔

''ہمارا'' کی تشریح یہ ہے کہ یہ عاجز پچیس برس جس کام میں مشغول رہا وہ جماعۃ تحفیظ القرآن کا کام تھا۔ آج جو تقریر (رپورٹ) سنائی گئی اسی میں بتایا گیا کہ اس وقت ہمارے ۱۳۵ مدرسے ہیں للبنین (ذکور)، لڑکیوں کے اس کے علاوہ ہیں۔ لڑکوں کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے اور لڑکیوں کی چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ جن لڑکوں نے اس سال پورا قرآن حفظ کرنے میں کامیابی حاصل کی ان کی تعداد ۴۵ ہے۔ دس پاروں میں پاس ہونے والے تین سو ہیں اور پانچ پاروں میں کامیاب ہونے والے پانچ سو۔ یہ صرف مدینہ منورہ کے مدارس کے اعداد و شمار ہیں۔ پچھلے دنوں جدہ گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ طلبہ کی تعداد ۱۸ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ اور اس وقت یہ مدارس سعودی عرب میں اقصی جنوب سے اقصی شمال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ طلبہ کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہوگی۔ ہمارے ملک فہد صاحب جواب ''خادم الحرمین الشریفین'' کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں، یعنی رسمی و سرکاری طور پر ان کا یہی خطاب ہے، اس شخص کو بھی حفظ قرآن سے بہت دلچسپی ہے۔ کئی سال سے اعلان فرمادیا ہے کہ قید خانوں میں جو قیدی قرآن مجید حفظ کر لے گا اس کی آدھی مدت معاف کر دی جائے گی۔ اس طرح قید خانوں میں لوگ حفظ کرنے پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ یہاں یہ مدارس نائٹ اسکول کے طور پر ہیں، دن میں بچے اپنے اسکولوں میں جاتے ہیں، عصر سے مغرب تک ہمارے ہاں آتے ہیں۔ بعض مدرسے عشاء تک بھی ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو سارا دن جاری رہتے ہیں۔

جو بات اصل کہنے کی ہے وہ ہے کہ ان مدارس کی بنیاد ایک پاکستانی تاجر نے رکھی، وہ بھی ایک لاعلمی کی بنا پر۔ رمضان کے مہینہ میں (پچیس برس پہلے) وہ مکہ مکرمہ آئے ہوئے تھے، وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کچھ لوگ قرآن ہاتھ میں لے کر نماز (نوافل) کی امامت کرا رہے ہیں۔ شوافع کے یہاں چونکہ یہ جائز ہے وہ اس میں مضائقہ نہیں سمجھتے، اور انسان کی طبعی سہولت پسندی کے اسی جواز نے ان کے ہاں حفظ قرآن تقریباً ختم کر دیا۔ یہ سارے علاقے، شافعی علاقے جو میں نے جنوبی ہند (مدراس) سے لے کر ملایا، سنگاپور، انڈونیشیا، تھائی لینڈ تک دیکھے وہاں یہی عالم پایا۔ وجہ شافعی مسلک جو ان ملکوں میں عام ہے۔ انڈونیشیا میں قراءت کا زور ہے، عورتیں بھی خوب قاری ہوئی ہیں مگر حافظوں کا کال ہے۔ ہاں یہ پاکستانی تاجر جن کے دفتر حساب میں لاکھوں کا اجر و ثواب لکھا جا رہا ہے خود ایک نومسلم باپ کے بیٹے تھے۔ ان کا نام محمد یوسف سیٹھی تھا اور ان کے والد جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے ان کا نام عبدالرحیم رکھا گیا تھا۔ درحقیقت یہ ان کے والد ہی کی وصیت تھی جس کی تعمیل میں انہوں نے پاکستان میں قرآن مجید کے مدرسے کھلوانے شروع کیے تاآنکہ وہاں بھی طلبہ کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ سیٹھی صاحب مرحوم کا مقصود صرف حفظ قرآن نہیں تھا بلکہ قرآن فہمی اور اس پر عمل بھی ان کی اسکیم میں داخل تھا۔

خیال فرمائیں کہ جب میں نے آغاز کار میں بعض مدارس طلبہ کی قلت مدرسین کی عدم قابلیت، اہل محلہ کی غفلت و بے اعتنائی کی بنا پر بند کر دیے تو مرحوم سیٹھی صاحب نے فرمایا ”بھائی میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ اگر ایک بچے نے مسجد میں آکر دو رکعت نماز پڑھ لی تو میرا تو پیسہ وصول ہو گیا“۔ قرآن فہمی کے ضمن میں مدارس میں برابر مذاکرات اور محاضرات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ اب سے پچیس برس پہلے حرم شریف کے علاوہ کہیں کسی مسجد میں تراویح نہیں ہوتی تھی، اب یہ ہے کہ ۱۳۵ مسجدوں میں تو مدینہ منورہ میں تراویح ہو رہی ہے اور اسی طرح دوسرے شہروں میں۔ یہ ہمارے ہی بچے ہیں جو ان مساجد میں جا کر تراویح پڑھاتے ہیں۔ اس سال مسجد قبا، مسجد میقات، مسجد الشہداء (امیر حمزہ) جو شہر کی سب سے شاندار وسیع و عریض مساجد ہیں، ہمارے ہی طالب امامت کرا رہے ہیں۔ بلکہ خود حرم شریف میں بھی ہمارا تعلیم و تربیت یافتہ طالب تراویح پڑھا رہا ہے اور وہ ایسے والہانہ انداز میں پڑھتا ہے کہ لوگ اس کے عاشق ہو گئے ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ تراویح (حرم شریف) کے لیے کسی ہندی یا پاکستانی الاصل بلکہ غیر عربی کو

منتخب کیا گیا ہو۔ اس مقری کا نام محمد ایوب ہے اور ان کے باپ جو برما سے ہجرت کر کے آئے تھے ابھی حیات ہیں، برما کی بجائے ان کا پاسپورٹ پاکستانی تھا۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقع پر مرحوم و مغفور الشیخ محمد صالح قزاز صاحب کا ذکر نہ کروں جو بعد میں رابطہ عالم اسلامی کے امین العام ہوگئے تھے، یوسف سیٹھی اگر بانی اول ہیں تو یہ بانی ثانی ہیں۔ سیٹھی صاحب نے جب اپنی اسکیم ان کے سامنے رکھی تو اس کے عاشق ہوگئے اور تن من دھن ہر طرح سے اس پر قربان۔ انہی کا دم تھا، ان ہی کا اثر و رسوخ کہ سیٹھی صاحب کو سارے ملک میں کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ صالح قزاز صاحب جن کا ابھی اسی سال انتقال ہوا مرتے دم تک اسی کام میں منہمک رہے۔ سیٹھی صاحب کے انتقال کو شاید سات سال ہوئے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم فرماتے تھے کہ سیٹھی صاحب کا جس کمرہ (کراچی) میں انتقال ہوا وہ بوقت وفات قدرتی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔

یہ بھی امر واقعہ ہے کہ نومسلمین میں ایمان کی تازگی ہوتی ہے جوش و خروش ہوتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا جوش و خروش اور قوت عملی دنیا کو معلوم ہے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد بھی نومسلم تھے، کتنا انہوں نے کام کیا۔ مولانا علی میاں بھی ان کے شاگرد ہیں اور عند اللہ قبولیت کی یہ نشانی کہ چھ ماہ تک ان کی قبر سے خوشبو آتی رہی۔ تبلیغی جماعت جو اس وقت دنیا میں مشہور ہے، مولانا الیاسؒ کے بعد اس کے دوسرے بانی حاجی عبد الرحمان ایک بنیے کے بیٹے تھے، خود مسلمان ہوئے اور پھر چودہ سو آدمیوں کو مسلمان کیا۔ پھر مسلمان کر کے چھوڑ نہیں دیا، شادی بیاہ، کام کاج، روزگار سے لگانا، تعلیم لانا سب کام کرتے تھے۔ اور ہاں ہمارے علامہ شبلیؒ بھی تو بالآخر ایک نومسلم خاندان سے تھے اور یوں تو علامہ اقبالؒ بھی۔

یہ بات خیال میں رہے کہ اب ہر شہر کی جماعت خود کفیل ہے اور جب سے جامعہ محمد بن سعود (ریاض) نے ان جماعتوں کو اپنی تنظیم میں لے لیا ہے آدھا خرچہ وہ دیتی ہے۔ اس سال ہمارا بجٹ ۴۵ لاکھ (سعودی ریال) کا تھا۔ ایک غیر متعلق بات ہے محض معلومات کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس سال پاکستان سے (رمضان میں) عمرہ کے لیے ۵۵ ہزار آدمی آئے ہیں، ۲۲ لاکھ کی درخواست تھی حکومت انتظام نہیں کر سکی، فال نیک ہے۔ اس تعداد کی رسمی یعنی سرکاری تصدیق ابھی نہیں ہو سکی ورنہ یوں افواہ تو ستر ہزار تک ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

عبدالملک جامی

سنی شیعہ کشیدگی: فریقین ہوش کے ناخن لیں

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ نومبر ۲۰۰۴ء)

(یہ تحریر صادق گنجی قتل کیس کے ملزم شیخ حق نواز کو پھانسی کی سزا ملنے کے بعد مارچ ۲۰۰۱ء میں لکھی گئی تھی۔ حالیہ واقعات کے تناظر میں اسے معمولی ترمیم کے ساتھ یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ مدیر)

لاہور، سیالکوٹ اور ملتان میں فرقہ وارانہ تشدد کے جو نئے المناک واقعات رونما ہوئے ہیں اور بیسیوں بے گناہ شہریوں کی افسوسناک ہلاکت پر منتج ہوئے ہیں، انہوں نے اس سوال کی شدت اور سنگینی میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے کہ آخر اس عمل کو کب اور کہاں بریک لگے گی؟ ہم ایک بار پھر اپنی مساجد میں دروازے بند کر کے سنگینوں کے سائے میں نمازیں ادا کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس سے شاید دونوں طرف کے کچھ جذباتی اور انتہا پسند نوجوانوں کے جذبات کو تھوڑی بہت تسکین ملتی ہو یا اس خونی کھیل کو جاری رکھنے کے خواہش مند حلقوں کے مقاصد کچھ آگے بڑھتے ہوں مگر دین، قوم اور ملک کے لیے یہ سب کچھ انتہائی تباہ کن ہے اور اس کی تباہ کاری کی صلاحیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

سنی شیعہ مسلح کشمکش میں بیرونی عوامل کی کارفرمائی سے انکار نہیں اور ہم اس کی کئی بار اپنی معروضات میں نشان دہی کر چکے ہیں، لیکن بنیادی طور پر یہ مسئلہ اہل سنت اور اہل تشیع کی محاذ آرائی کا ہے اور خارجی عوامل کے لیے بھی آلہ کار اور ایندھن کا کام ہر دو طرف کے جذباتی نوجوان سرانجام دیتے ہیں۔ اس لیے دیگر عوامل و محرکات سے سردست صرف نظر کرتے ہوئے اہل سنت اور اہل تشیع کے رہنماؤں، بالخصوص جذباتی نوجوانوں سے دو گزارشات کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ خدا کرے کہ کسی دل میں یہ بات اتر جائے اور اس خونی عمل کے کسی جگہ رکنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

پہلی بات بخاری شریف کی اس روایت کے حوالہ سے ہے جو "کتاب الادب" میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے منقول ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑے بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے اور برا بھلا کہے۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کوئی شخص اپنے ماں باپ کو

کیسے گالی دے سکتا ہے؟ جناب نبی اکرم نے فرمایا کہ اس نے دوسرے کے ماں اور باپ کو گالی دی اور اس نے جواب میں اس کے باپ یا ماں کو گالی دی تو گویا اس نے اپنے ماں باپ کو خود گالی دی۔ یعنی جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق اپنے ماں باپ کے لیے گالی کا سبب اور واسطہ بننے والا شخص خود ان کو گالی دینے کا مرتکب قرار پائے گا۔ کم و بیش اسی نوعیت کی بات سورۃ الانعام کی آیت ۱۰۸ میں قرآن کریم نے بھی ارشاد فرمائی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم دوسروں کے جھوٹے خداؤں کو برا بھلا نہ کہو، اس لیے کہ وہ جواب میں تمھارے سچے خداؤں کو برا بھلا کہیں گے اور اس کا سبب تم خود بنو گے۔ اس لیے ''مرغی پہلے یا انڈا'' کی طرح اس بحث میں پڑے بغیر کہ اس باہمی قتل وغارت کا آغاز کس نے کیا تھا، ہم اہل سنت اور اہل تشیع، دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے جذباتی اور انتہا پسند نوجوانوں کو اس نکتہ پر غور کی دعوت دینا چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے سنجیدگی اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے لیں کہ دونوں طرف کے جو بڑے بڑے بزرگ اور سرکردہ قائدین اس المناک قتل وغارت کی نذر ہو چکے ہیں، کہیں وہ سبب اور واسطہ کے درجے میں خود ہی اپنے بزرگوں کے قاتل تو قرار نہیں پاتے؟ میں تو جتنا اس مسئلہ کی گہرائی میں جاتا ہوں، دل و دماغ کے لرزہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی احساس کے تحت یہ گزارش بھی کر رہا ہوں۔

دوسری گزارش جناب نبی اکرمؐ کی ایک عملی سنت کے حوالہ سے کرنا چاہتا ہوں۔ عرب قبائل میں انتقام در انتقام کا سلسلہ اسی طرح چلا آ رہا تھا جیسے اب سنی اور شیعہ روزانہ انتقامی جذبہ کے تحت اندھا دھند قتل ہو رہے ہیں۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس سلسلہ کو بریک لگانے کے لیے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا کہ گزشتہ قتلوں کے انتقام کا سلسلہ ختم کر کے نئے سرے سے پر امن زندگی کا آغاز کرو اور گزشتہ قتلوں اور ان کے انتقام کو بھول جاؤ۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس کا صرف زبانی اعلان نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی اس کا اظہار فرمایا کہ اپنے چچا زاد بھائی ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلب کے معصوم بیٹے ایاس کا قتل معاف کرنے کا اسی مجلس میں اعلان فرما دیا اور اپنے اعلان پر عمل درآمد کا آغاز گھر سے کر دیا۔ ایاس، ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کا بیٹا تھا اور بنو سعد میں پرورش پا رہا تھا کہ بنو ہذیل نے اسے قتل کر دیا۔ اس کا انتقام قبائلی روایات کے مطابق بنو عبد المطلب کے ذمہ تھا۔ متعدّد لوگوں کے دلوں میں اس انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور وہ یقیناً کسی موقع کے انتظار میں

ہوں گے کہ جناب نبی اکرمؐ نے بنو عبد المطلب کی طرف سے اپنے اس معصوم بچے کا خون معاف کرنے کا اعلان فرما کر نہ صرف یہ کہ انتقام در انتقام کے اس بظاہر ختم نہ ہونے والے سلسلے کو روک دیا بلکہ باقی لوگوں کے لیے بھی ایک عملی نمونہ پیش کر دیا اور یہ اسی کی برکت تھی کہ پشت در پشت خونریزی کے عادی اور خوگر عرب قبائل کو امن اور باہمی اعتماد کی منزل گم گشتہ مل گئی۔

آج بھی امن کا راستہ یہی ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع کے سرکردہ اکابر سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس مکروہ عمل کو بریک لگانے کے لیے سنت نبوی کی روشنی میں کوئی فارمولا طے کریں اور اس پر اپنے جذباتی نوجوانوں کو پابند کریں یا بصورت دیگر امن کا دشمن بن جانے والوں سے لاتعلقی اور براءت کا اعلان کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ جو فریق بھی اس سمت میں پہل کرے گا، وہ جناب نبی اکرم کی سنت مبارکہ کا دامن تھامنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی قوم کے لیے بھی امن و سلامتی کا پیغام بر ثابت ہوگا لیکن اس کے لیے پاکستان کے امن اور قومی وحدت کو سبوتاژ کرنے کے خواہش مند عناصر کو ''کراس'' کرنے کا حوصلہ درکار ہے۔ خدا کرے کہ سنی شیعہ قائدین اس حوصلہ کا بروقت اظہار کر سکیں، آمین ثم آمین۔

مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

مفتی محمد جمیل خان شہید اور مولانا نذیر احمد تونسوی شہیدؒ کے المناک قتل کی خبر مجھے لندن میں ملی۔ مفتی محمد جمیل خانؒ سے ۸ ستمبر کو جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر کے سالانہ جلسہ ختم بخاری شریف میں ملاقات ہوئی تھی، ۱۳ ستمبر کو بیرونی سفر پر روانہ ہو گیا تھا اس لیے یہ آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ پہلی ملاقات جہاں تک یاد پڑتا ہے ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی جب وہ مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ میں طالب علم تھے اور میں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے خطیب حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی نیابت کے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔

چناب نگر (ربوہ) کے ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مسلمان طلبہ کے ساتھ قادیانی نوجوانوں کے متشددانہ سلوک اور مسلمان طلبہ کے زخمی ہونے کے رد عمل میں قادیانیوں کے خلاف مختلف شہروں میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جنہوں نے

آگے چل کر باقاعدہ تحریک ختم نبوت کی شکل اختیار کر لی اور منتخب پارلیمنٹ نے اسی تحریک کے نتیجے میں قادیانیوں کو دستوری ترمیم کے ذریعے غیر مسلم قرار دے دیا تھا۔ گوجرانوالہ میں تحریک ختم نبوت کا ہیڈ کوارٹر مرکزی جامع مسجد (شیرانوالہ باغ) تھی اور کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے سیکرٹری کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ اس دوران مختلف دینی مدارس کے جن طلبہ نے تحریک ختم نبوت میں سرگرم کردار ادا کیا ان میں مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ کے طالب علم محمد جمیل خان کا نام نمایاں ہے۔

اس کے بعد ملاقاتوں بلکہ رفاقت کا ایک ایسا تسلسل ہے کہ اسے احاطۂ تحریر میں لانا مشکل نظر آرہا ہے۔ وہ جمعیت علماء اسلام کے سرگرم رہنماؤں میں رہے ہیں، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت میں بھرپور کردار ادا کیا ہے، صحافت کے ساتھ تعلق اور قومی اخبارات میں دینی حلقوں کی نمائندگی بھی ہماری قدر مشترک رہی ہے اور بیرونی اسفار میں بہت جگہ رفاقت رہی ہے۔ مجھے ان کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا خدمت گزاری کا جذبہ تھا جو سفر میں عروج پر پہنچ جایا کرتا تھا۔ سفر کے انتظامات، ویزے لگوانا، ٹکٹ خریدنا، کنفرم کرانا، سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا، رہائش کے انتظامات اور دیگر امور کے ساتھ ساتھ ذاتی خدمت کے لیے مستعد رہنا ان کے من پسند مشاغل شمار ہوتے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ حج بھی کیا ہے اور جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں انہیں حاجیوں بالخصوص علماء کرام کی خدمت میں ہمہ تن مصروف دیکھا ہے۔ میں ان کے ساتھ ازبکستان کے سفر میں شریک رہا ہوں، تاشقند، سمرقند اور خرتنگ وغیرہ میں انہیں رفقاء سفر کی خدمت اور سہولت کے کاموں میں اس بے تکلفی کے ساتھ مصروف پایا ہے جیسے وہ کسی دوسرے ملک میں نہیں بلکہ کراچی میں ہیں۔ برطانیہ کے مختلف اسفار میں ان کے ساتھ رفاقت رہی ہے۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام برمنگھم کی مرکزی جامع مسجد میں منعقد ہونے والی عالمی ختم نبوت کانفرنس کے لیے ان کی شب و روز کی مصروفیات دیکھی ہیں۔

انہیں اسٹیج پر آنے کا شوق نہیں تھا بلکہ کانفرنس کی خبریں اور رپورٹ اخبارات میں بروقت شائع کرانا ان کی سرگرمیوں کا مرکزی ہدف ہوتا تھا۔ ختم نبوت کانفرنس برمنگھم کی ہو یا چناب نگر کی، ایسے مواقع پر ان کا صحافتی ذوق انتہا کو چھونے لگتا تھا۔ ایک بڑے اخبار سے ان کا بطور سب ایڈیٹر تعلق تھا، کانفرنس کے موقع پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کرنا،

مضامین فراہم کرنا، خبریں مہیا کرنا اور کانفرنس کی رپورٹنگ کا خود ذاتی طور پر اہتمام کرنا ان کا مشن تھا اور ان کی موجودگی میں ہم ایسے بہت سے کاموں سے بے نیاز ہو جایا کرتے تھے۔

خدمت کے حوالے سے مفتی جمیل احمد خان شہیدؒ کے ذوق کا یہ پہلو بطور خاص قابل ذکر ہے کہ بزرگ علماء کرام تک رسائی حاصل کرنا اور ان کی خدمت کے لیے بہت سے کام اپنے کھاتے میں ڈال لینا ان کا مشغلہ تھا۔ انہیں جن بزرگوں کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا ہے ان میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مفتی ولی حسنؒ، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمانؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ انہی میں میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ بھی ہیں جو ترانوے برس کی عمر میں چند سالوں سے مسلسل صاحب فراش ہیں۔ ہمارے چھوٹے بھائی قاری ساجد خان اور قاری راشد خان ان کی خدمت میں رہتے ہیں، مجھے اپنی نالائقی اور مختلف النوع پیہم مصروفیات کی وجہ سے ان کی خدمت میں رہنے کا موقع نہیں ملتا مگر مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ اور ان کے رفقاء حاجی محمد لقمان میر، ڈاکٹر فضل الرحمان اور مولانا محمد نواز بلوچ نے بیماری اور معذوری کے ایام میں ان کی خدمت کے کاموں کو جس طرح سنبھالا اس پر ان حضرات کے لیے بے ساختہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کی دینی خدمت کا ایک وسیع میدان "اقراء روضۃ الاطفال" کا وہ وسیع نیٹ ورک ہے جس کے تحت کراچی سے گلگت تک مختلف علاقوں میں ایسے مدارس کا جال بچھا دیا گیا ہے جس میں کھاتے پیتے اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے بچے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اسکول کی ضروری تعلیم بھی پاتے ہیں۔ قرآن کریم حفظ کرنے یا دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں کچھ عرصہ تک تو یہی عمومی تاثر رہا ہے کہ غریب گھرانوں کے بچے ہی یہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور عام طور پر معذور بچوں یا ایسے گھرانوں کے بچوں کو ان مدارس میں بھیجا جاتا ہے جو اپنے بچوں کی کفالت نہیں کر پاتے۔ ویسے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ گوجرانوالہ میں ایک دیہاتی خاتون دو بچوں کو لے کر میرے پاس آئی، وہ اتنے چھوٹے تھے کہ انہیں سنبھالنا خود ایک مسئلہ تھا، میں نے بچے واپس کر دیے۔ دو روز کے بعد وہ خاتون ہمارے ایک دوست کو سفارشی بنا کر لے آئی اور کہا کہ خدا کے لیے ان بچوں کو رکھ لیں، میرا خاوند بیمار ہے اور کمانے کے قابل نہیں ہے، میں لوگوں کے گھروں میں کام کر کے گزارا کرتی ہوں، مجھ سے

یہ بچے نہیں سنبھالے جاتے اس لیے انہیں مدرسے میں رکھ لیں۔ ہم نے ترس کھا کر ان بچوں کو رکھ لیا اور خدا کی قدرت کہ ان میں سے ایک بچے نے صرف گیارہ ماہ میں قرآن کریم مکمل حفظ کر لیا اور اگلے سال رمضان المبارک کے دوران نفلوں میں مجھ سے بطور سامع قرآن کریم سنا۔

بحمد اللہ تعالیٰ اب دینی مدارس میں یہ صورتحال نہیں ہے، اب ان مدارس میں کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے گھرانوں کے بچے بھی قرآن کریم حفظ کرتے اور دینی علم کی تعلیم پاتے ہیں۔ بلکہ ایسے مدارس میں جو حفظ قرآن کریم اور دیگر دینی علوم کے ساتھ ساتھ سکول کی تعلیم دیتے ہیں اور تعلیم و انتظام کا معیار دوسرے اسکولوں اور کالجوں کی طرح عمدہ رکھتے ہیں، ان میں داخلے کے لیے امیدواروں کی لمبی لمبی ویٹنگ لسٹیں ہوتی ہیں اور باقاعدہ سفارشیں کرائی جاتی ہیں۔ گوجرانوالہ میں اقراء روضۃ الاطفال کی شاخوں میں داخلے کے لیے مجھ سے کئی معزز شہری مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کے نام سفارشی رقعے لکھواتے رہے۔

صورتحال میں اس خوشگوار تبدیلی کے اسباب میں میرے نزدیک سب سے زیادہ کریڈٹ تبلیغی جماعت کو جاتا ہے جو معاشرے کے مختلف طبقات میں دین کی دعوت اور دینی اقدار کی طرف مسلمانوں کی واپسی کے لیے متحرک ہے اور مسجد کے ساتھ عام مسلمان کو جوڑنے کے کام میں مصروف ہے۔ اس کے بعد اس تبدیلی کے اسباب میں ”اقراء روضۃ الاطفال“ کا بھی بڑا کردار ہے جس نے سوسائٹی کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں اور کھاتے پیتے خاندانوں میں یہ ذوق پیدا کیا کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول اور کالج کی تعلیم دلانے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم حفظ کرائیں، دینی تعلیم سے بھی بہرہ ور کریں۔ اور پھر ان کے معیار کے مطابق انتظامات بھی کیے تاکہ انہیں اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے میں معاشرتی طور پر کوئی عار یا حجاب محسوس نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اب سے ربع صدی قبل جب ہم مالدار یا افسر طبقے کے کسی دوست کو ترغیب دیتے کہ وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلائیں تو عام طور پر ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کے خواہش مند تو ہیں لیکن ایک تو ہم انہیں چندے اور زکوٰۃ کے مال سے پڑھانا نہیں چاہتے اور دوسرے صرف دینی تعلیم نہیں بلکہ عصری تعلیم سے بھی بہرہ ور کرنا چاہتے ہیں۔ اقراء روضۃ الاطفال نے ان دونوں تقاضوں کو کافی حد تک پورا کر دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے طبقاتی معاشرے کی بالائی سطح کو دینی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے میں اقراء روضۃ الاطفال کا بہت اہم کردار ہے اور اس کا کریڈٹ سب سے زیادہ مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کو جاتا ہے۔ خاص طور پر کراچی میں تو اقراء روضۃ الاطفال کے اس کردار کو ایک اور حوالے سے بھی دیکھتا ہوں کہ پاکستان کا یہ سب سے بڑا شہر جو معاشی حوالے سے ملک کا اعصابی مرکز ہے، ایک عرصے سے بین الاقوامی سازشوں کی زد میں ہے اور اسے کئی بار لسانی اور نسلی عصبیتوں کا نشانہ بنا کر سازشوں کے فریم ورک میں فٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس زہر کا اصل تریاق دینی تعلیم اور دینی ماحول ہے جسے فراہم کرنے میں کراچی کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دینی مدارس کے وسیع جال کے ساتھ ساتھ اقراء روضۃ الاطفال کا بھی بڑا حصہ ہے اور قومی وحدت کے تحفظ میں مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کی اس محنت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مفتی محمد جمیل خان کی شہادت کے بعد سے مسلسل اس سوچ میں ہوں کہ ان کی تعزیت کس سے کروں؟ وہ کسی ایک خاندان، ادارے یا حلقے کا فرد نہیں تھا، اس کا معاملہ سب سے یکساں تھا اور سب کی خوشیوں اور دکھ درد میں ایسے شریک ہوتا تھا جیسے خود اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور بیوی بچوں میں خوشیاں بانٹ رہا ہے یا ان کے غم کا بوجھ ہلکا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اور مولانا نذیر احمد تونسوی شہید کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور سب پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

مسلمانوں میں فکر و شعور کی بیداری، وقت کا اہم تقاضا

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

حرمین شریفین کی حاضری کے بعد لندن روانگی سے قبل ایک دو روز جدہ میں قیام رہا اور ایک بزرگ محدث کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ الشیخ عبد اللہ بن احمد الناجی مدظلہ معمر علماء کرام میں سے ہیں اور حدیث نبویؐ کے ممتاز فضلاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایک سو پندرہ برس ان کی عمر ہے اور اب سے پون صدی قبل کے اکابر محدثین سے تلمذ کا شرف رکھتے ہیں۔ سماعت کمزور ہو چکی ہے مگر گفتگو بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ شافعی مذہب

سے تعلق رکھتے ہیں اور زندگی بھر حدیث نبویؐ کی خدمت میں مصروف رہے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی حصے سے حرمین شریفین میں حاضر ہونے والے علم حدیث کے اساتذہ وطلبہ کو ان کا پتہ چلتا ہے تو وہ ان کی خدمت میں حاضری اور ان کی زبان سے حدیث نبویؐ کی سماعت کے ساتھ ان کے شاگردوں کے حلقے میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ یہی شوق مجھے بھی ان کی مجلس میں لے گیا۔ میرے ہم زلف قاری محمد اسلم شہزاد جو جدہ میں قیام پذیر ہیں اور میرے میزبان تھے، جبکہ جدہ میں ہی ایک عرصہ سے قرآن کریم کی تدریسی خدمات سرانجام دینے والے قاری محمد رفیق بھی اپنے فرزند سمیت ہمارے ساتھ تھے۔ شیخ محترم نے چند نصائح سے نوازا، ایک حدیث نبویؐ سنائی اور ہماری درخواست پر ہمیں اپنی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی۔

جدہ میں ایک معروف پاکستانی عالم دین مولانا صاحبزادہ قاری عبد الباسط مدت سے قیام پذیر ہیں، درس قرآن کریم کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں، ان کا درس قرآن کریم کا مستقل حلقہ ہے، پڑھے لکھے لوگ ان کے درس میں آتے ہیں اور استفادہ کرتے ہیں، جدہ سے شائع ہونے والے اردو اخبار روزنامہ ''اردو نیوز'' میں دینی عنوانات کے تحت سوال و جواب پر مشتمل ان کا ہفتہ وار کالم شائع ہوتا ہے جو اردو خواں حلقے میں خاصا مقبول ہے جبکہ ان سوالات وجوابات کا ایک مجموعہ چار جلدوں میں دیوبند سے شائع ہو چکا ہے جس پر اکابر علماء کرام نے تحسین کی ہے۔ جدہ میں کبھی حاضری ہوتی ہے تو ان کی فرمائش پر ان کے حلقۂ درس میں شرکت ہو جاتی ہے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور ان کے ہفتہ وار درس میں فہم قرآن کریم کی ضرورت واہمیت اور اس کے ناگزیر تقاضوں پر کم وبیش ایک گھنٹہ گفتگو کا موقع ملا۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد میں درس میں شریک ہوتی ہے۔ حاضرین کی تعداد اور ذوق و شوق دیکھ کر قاری عبد الباسط کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قاری محمد رفیق کا تعلق کرنال سے ہے، قیام پاکستان کے وقت وہاں سے ملتان آئے اور اب سے ربع صدی قبل جدہ آگئے۔ پرانے مدرس ہیں اور قرآن کریم کی تدریس کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ ان کا خاص ذوق یہ ہے کہ پاکستان، بھارت یا بنگلہ دیش سے آنے والے دیوبندی مسلک کے کوئی عالم دین ان کے قابو آجائیں تو کوشش کر کے انہیں اپنے مدرسے میں لاتے اور جدہ کے علماء کرام اور احباب کے ساتھ ان کی ملاقات و گفتگو کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے تقاضے پر میں بھی حاضر ہوا۔ انہوں نے مختلف

دوستوں کی ایک خصوصی نشست کا اہتمام کر رکھا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس محفل میں عالم اسلام کے معروضی حالات اور مسلم دانشوروں کی ذمہ داریوں کے حوالے سے گفتگو کروں۔

گزشتہ روز جمعۃ المبارک کی نماز میں نے مسجد حرام میں ادا کی تھی اور امام حرم الشیخ عبد الرحمان السدیس کے فکر انگیز خطبے سے شاد کام ہوا تھا۔ انہوں نے اس خطبے میں موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش اور فکر و فلسفہ کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے علماء کرام، اساتذہ، صحافیوں اور دانشوروں کو توجہ دلائی کہ وہ عقیدہ و ثقافت کی اس کشمکش کا ادراک حاصل کریں اور قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں اس ”غزۂ فکری“ میں کردار ادا کریں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ جنگ جذباتی ردعمل، تشدد اور ہتھیاروں کے ساتھ نہیں لڑی جا سکتی بلکہ اس کے لیے عقل، دلیل، حکمت اور علم کے ہتھیاروں سے کام لینا ہوگا۔

میں نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی حوالے سے کیا اور کہا کہ مجھے امام حرم الشیخ السدیس حفظہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے سو فیصد اتفاق ہے کہ عقیدہ و فلسفہ کی جنگ اور فکر و ثقافت کی کشمکش میں دلیل اور منطق کے ہتھیار ہی کام دیتے ہیں اور مسلم اہل دانش کو اس طرف ضروری توجہ دینی چاہیے۔ میں نے گزارش کی کہ مغرب کم و بیش دو سو برس سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فکر و فلسفہ کی جنگ لڑ رہا ہے، اس سے قبل اس کی جنگ ہمارے خلاف مذہب کے نام پر تھی جو صلیبی جنگ کہلاتی تھی، مگر اب دو سو برس سے اس نے پینترا بدل کر سیاست و معیشت، ٹیکنالوجی، عسکریت، وسائل اور فکر و ثقافت میں غلبے کی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ اور اس حقیقت کے اعتراف میں ہمیں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے کہ سیاست، معیشت، ٹیکنالوجی، عسکریت اور وسائل پر قبضے کی جنگ میں ہم مغرب کے ہاتھوں پسپا ہو چکے ہیں۔ اسباب و عوامل کچھ بھی ہوں مگر یہ امر واقع ہے کہ ان سب شعبوں میں ہم مغلوب اور بے بس ہیں۔ البتہ فکر و فلسفہ اور عقیدہ و ثقافت کی جنگ میں مغرب کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی اور مغرب اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں عام مسلمان کا خدا اور رسول اکرمؐ کے ساتھ عقیدہ و محبت کا تعلق توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری آخری دفاعی لائن ہے جس پر ہم لڑ رہے ہیں، اس کے بعد اور کوئی مورچہ نہیں ہے جہاں ہم کھڑے ہو سکیں۔ البتہ یہ اطمینان کی بات ہے کہ اس دفاعی لائن پر ہم پوری استقامت کے ساتھ کھڑے ہیں اور اس

مورچے کو سر کرنے کی کوئی صورت مغرب کو دکھائی نہیں دے رہی جس کی وجہ سے مغرب کی پریشانی اب جھنجھلاہٹ کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔

مغرب کو اس بات کی پریشانی ہے کہ عام مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصے سے تعلق رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ اور سنت رسولؐ کو آج بھی ہر معاملے میں آخری اتھارٹی سمجھتا ہے۔ خود ان پر عمل کرے یا نہ کرے مگر ان کے خلاف کوئی بات سننے یا ان کے کسی حکم سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے نزدیک عقیدہ کہلاتی ہے جبکہ مغرب اسے کمٹمنٹ سے تعبیر کرتا ہے اور انتہا پسندی قرار دیتا ہے۔ ہماری آخری دفاعی لائن یہی ہے جسے مضبوط و مستحکم بنانا ہم سب کی ذمہ داری ہے اور یہ فریضہ سب سے زیادہ علماء کرام، اساتذہ اور دانشوروں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اس محاذ پر سنجیدگی کے ساتھ محنت کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فکر و عقیدہ اور ثقافت کی اس جنگ میں ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو تین درجوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔

1. سب سے پہلی سطح اور درجہ یہ ہے کہ عام مسلمان کا تعلق قرآن و سنتؐ کے ساتھ قائم رہے، دین کے ساتھ اس کا رشتہ برقرار رہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسولؐ کے ساتھ اس کی عقیدت و محبت کا ذوق بڑھتا رہے۔ مساجد و مدارس اور دین کے داعی و مبلغ یہی کام کر رہے ہیں۔ یہ سب سے بنیادی کام ہے اور عام مسلمان کو خدا اور رسولؐ، قرآن و سنت اور دین کے ساتھ جوڑنے کا یہ کام جہاں بھی ہو رہا ہے ہمیں اسے سپورٹ کرنا چاہیے، اسے تقویت دینی چاہیے اور اس کی مدد کرنی چاہیے۔

2. دوسری سطح اور درجہ پڑھے لکھے لوگوں میں فکری بیداری اور دینی شعور کو اجاگر کرنے کا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ خواہ دینی ماحول سے تعلق رکھتے ہوں یا عصری تعلیم سے ان کا تعلق ہو دونوں کی اہمیت یکساں ہے، ان میں دینی اور فکری بیداری کا ماحول قائم کرنا چاہیے۔ پڑھے لکھے لوگ کسی بھی قوم میں اعصاب کی حیثیت رکھتے ہیں، اعصاب میں حس قائم رہے تو پورے جسم میں حرکت موجود رہتی ہے اور تکلیف و اذیت کا احساس باقی رہتا ہے لیکن خدانخواستہ اعصاب بے حس ہو جائیں تو تکلیف، اذیت، درد اور زخم ہر چیز پر احساس ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں

فکری بیداری کو بڑھایا جائے، ان کے دینی ذوق میں اضافہ کیا جائے اور اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہے کہ وہ موجودہ عالمی صورتحال سے باخبر رہیں، اسلام اور کفر کی کشمکش کی تازہ ترین صورتحال پر ان کی نظر ہو اور انہیں اس بات سے آگاہ رکھا جائے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ یہ بیداری اگر موجود رہے گی اور بڑھتی رہے گی تو ہم اپنے عقیدے و ثقافت اور ملی وجود و تشخص کی حفاظت کر سکیں گے لیکن اگر خدانخواستہ یہ احساس اور بیداری ہی ختم ہو گئی تو پھر ہم اپنے تحفظ و دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔

3. تیسری سطح اور درجہ علم و دانش کی اعلیٰ سطح سے تعلق رکھتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلامی عقائد اور فلسفہ و ثقافت پر مغرب کی جانب سے جو اعتراضات ہو رہے ہیں اور شکوک و شبہات پھیلائے جا رہے ہیں ان کی اہمیت کو محسوس کیا جائے اور مسلم دنیا کے اکابر علماء کرام اور اہل دانش عقل و تدبر اور علم و حکمت کی بنیاد پر ان اعتراضات و شکوک کا جواب دیں۔ ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور بین الاقوامی اداروں کی یکطرفہ یلغار نے خود ہمارے پڑھے لکھے نوجوانوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات کی ایک وسیع دنیا آباد کر رکھی ہے جس کا اظہار وہ زبان سے کریں یا نہ کریں لیکن یہ شکوک و شبہات ان کے ذہنوں میں موجود ہیں اور ان کے فکر و عقیدے کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ اہل علم و دانش نے اگر اس کی سنگینی کا احساس نہ کیا تو خدا کی عدالت میں تو وہ مجرم ہوں گے ہی، دنیا میں تاریخ کی عدالت بھی انہیں معاف نہیں کرے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان تین درجوں میں اپنی مہم کو منظم کر سکے اور کام کو آگے بڑھا سکے تو اسلام اور مغرب کی اس فکری اور تہذیبی کشمکش میں ہم اپنا کردار صحیح طور پر ادا کر سکیں گے اور دنیا و آخرت میں سرخروئی سے ہمکنار ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حرمین شریفین کی حاضری اور جدہ میں مختلف اجتماعات میں شرکت کے بعد ۱۹ ستمبر کی شام لندن پہنچا، برطانیہ میں اندازاً ایک ماہ قیام رہے گا، اس کے بعد ہفتہ عشرہ کے لیے

امریکہ جانا ہوگا اور ۲۵ اکتوبر کو وطن واپسی کا پروگرام ہے جبکہ اس دوران قارئین سے حسب معمول رابطہ قائم رہے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آسمانی مذاہب کے درمیان مکالمہ کے لیے قرآنی اصول

(مرکزی جامع مسجد، برمنگھم، برطانیہ - ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

(۱۳ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو مرکزی جامع مسجد برمنگھم برطانیہ میں جمعیت علماء برطانیہ کی سالانہ توحید و سنت کانفرنس سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں محترم ڈاکٹر اختر الزمان غوری، مولانا قاری تصور الحق اور ان کے رفقاء کا شکر گزار ہوں کہ جمعیت علماء برطانیہ کی سالانہ توحید و سنت کانفرنس میں حاضری اور آپ دوستوں سے گفتگو کا موقع فراہم کیا، اللہ تعالیٰ حاضری قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق اور دین حق کی جو باتیں علم میں آئے اس پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین یارب العالمین۔

مجھے توحید کی اہمیت اور اس پر ہمارے ایمان و عقیدہ کی بنیاد کے حوالہ سے کچھ عرض کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور میری اس کمزوری اور مجبوری سے آپ حضرات واقف ہیں کہ کسی بھی موضوع پر بات کرنے سے پہلے معروضی حالات اور عالمی تناظر کو ضرور دیکھتا ہوں اور اسے سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کی کوشش کرتا ہوں۔ آج کی دنیا میں مذاہب و ادیان کے درمیان مکالمہ اور ڈائیلاگ کی بات چل رہی ہے اور مختلف مذاہب کے دینی راہنماؤں کی مشترکہ کانفرنسیں ہو رہی ہیں، ابھی اسلام آباد میں ایک کانفرنس ہوئی ہے، کل کے اخبارات میں یہاں لندن میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس کی خبر تھی، امریکہ میں سالانہ بین المذاہب کانفرنس عالمی سطح پر ہوتی ہے، اور اس بات پر مسلسل زور دیا جا رہا ہے کہ مختلف ادیان و مذاہب کے مذہبی راہنما مل بیٹھیں، مکالمہ کو فروغ دیں، ڈائیلاگ کریں اور باہمی مفاہمت کی راہیں تلاش کریں، میں اس پس منظر میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

توحید میں بات تو ایک ہی ذات کی ہوتی ہے اور اس کی وحدت کی ہوتی ہے، مگر اس ذات واحد اور اس کی وحدیت کے مظاہر قدرت اور صفات کی جہات اس قدر وسیع اور بے شمار

ہیں کہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق روئے زمین کے سارے سمندر سیاہی بن جائیں اور سارے درخت قلموں کی شکل اختیار کرلیں بلکہ اتنے ہی سمندر اور درخت اور آجائیں تو بھی اس ذات واحد کے سارے کلمات کو لکھا نہیں جاسکتا اور ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں ان بے شمار اور ان گنت پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو پر کچھ گزارشات پیش کروں گا کہ آج کے عالمی حالات اور دنیا کی معروضی صورتحال میں مختلف مذاہب کے درمیان مکالمہ و مباحثہ کے پس منظر میں عقیدۂ توحید کی اہمیت کیا ہے اور اس کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کیا ہے؟

میں نے قرآن کریم کی جو آیت مقدسہ آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اس میں بھی ایک بین المذاہب مکالمہ کا ذکر ہے، یہ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۶۴ ہے جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور نجران سے مدینہ منورہ آنے والے مسیحی علماء کے درمیان عقائد پر گفتگو ہوئی، مباحثہ ہوا اور مباہلہ کی بات بھی ہوئی، اور بالآخر ایک معاہدہ پر بات منتج ہوئی کہ دونوں اپنے اپنے عقیدہ و مذہب پر قائم رہیں گے، مگر نجران کے عیسائی جناب نبی اکرمؐ کے اقتدار اور حکومت کو تسلیم کرکے اسلامی ریاست میں بطور ذمی رہیں گے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو اس مکالمہ اور ڈائیلاگ کے سلسلہ میں ہدایات دی ہیں کہ:

> ”اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے بعض اپنے میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ کے نیچے رب نہ بنالیں، پس اگر وہ اس بات کو قبول نہ کریں تو آپ کہہ دیں کہ گواہ رہو کہ ہم تو اس حکم کو قبول کرنے والے ہیں“۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آسمانی مذاہب کے درمیان قدر مشترک کے طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے: ایک یہ کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، اور دوسری یہ کہ انسان آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنالیں۔ قدر مشترک کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ کم سے کم نکات ہیں جن پر باہمی مفاہمت ہوسکتی ہے اور اس سے ہٹ کر کسی مذہب سے گفتگو اور مکالمہ کی گنجائش نہیں ہے۔

عقیدۂ توحید تمام آسمانی مذاہب میں ہمیشہ قدر مشترک رہا ہے۔ اور اگرچہ یہودی اور عیسائی اس عقیدہ سے منحرف ہوگئے ہیں اور انہوں نے تورات اور انجیل میں بہت سی

تحریفات کرلی ہیں، جس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ ہمارے ہاں گوجرانوالہ سے شائع ہونے والے مسیحی ماہنامہ "کلام حق" نے اسی سال فروری یا مارچ کے شمارے میں لاہور سے شائع ہونے والی انگلش بائبل کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ اس میں چالیس سے زیادہ آیات میں ردوبدل کیا گیا ہے۔ ماہنامہ کلام حق نے ان آیات اور ان میں ہونے والے ردوبدل کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس لیے جب صرف ایک مرحلہ میں چالیس سے زیادہ آیات ردوبدل اور تحریف کا شکار ہوئی ہیں تو ہزاروں برس میں ان کتابوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ مگر اس تمام تر ردوبدل اور تحریف کے باوجود آج بھی بائبل کے مروجہ نسخوں میں موجود تورات اور انجیل عقیدہ توحید کی گواہی دے رہی ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ چنانچہ اس موقع پر میں دو حوالے دینا چاہوں گا۔

(۱) لاہور سے شائع ہونے والی اردو بائبل کے عہد نامہ قدیم کی کتاب استثناء کے باب ۵ میں آیت ۶ سے ۲۱ تک ان احکام عشرہ کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے واپسی پر صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کو دیے تھے، وہ دس احکام بائبل کی زبان میں یوں ہیں:

"تب اس نے کہا خداوند تیرا خدا، جو تجھے ملک مصر یعنی غلامی کے گھر سے نکال لایا، میں ہوں۔ میرے آگے تو اور معبودوں کو نہ ماننا، تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے، تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت کرنا، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں، اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں ان کی اولاد کو تیسری اور چوتھی پشت تک باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں، اور ہزاروں پر جو مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور میرے حکموں کو مانتے ہیں رحم کرتا ہوں۔ تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ نہ لینا کیونکہ خداوند اس کو جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔ تو خداوند اپنے خدا کے مطابق سبت کے دن کو یاد کرکے پاک ماننا، چھ دن تک تو محنت کرکے اپنا سارا کام کاج کرنا لیکن ساتویں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے۔ اس میں نہ تو کوئی کام کرے نہ تیرا بیٹا نہ تیری بیٹی نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیرا بیل نہ تیرا گدھا نہ تیرا کوئی اور جانور اور نہ کوئی مسافر جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو، تاکہ تیرا غلام اور تیری لونڈی بھی تیری طرح آرام کریں۔ اور یاد رکھنا کہ تو ملک مصر میں غلام تھا اور وہاں سے خداوند تیرا خدا اپنے زور آور ہاتھ اور بلند بازو سے

تجھ کو نکال لایا، اس لیے خداوند تیرے خدا نے تجھ کو سبت کے دن کو ماننے کا حکم دیا، تو خون نہ کرنا، تو زنا نہ کرنا، تو چوری نہ کرنا، تو اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا، تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا اور نہ اپنے پڑوسی کے گھر یا اس کے کھیت یا غلام یا لونڈی یا اس کی کسی اور چیز کا خواہاں ہونا"۔

یہ تورات کا حکم ہے جس میں عقیدۂ توحید پر کاربند رہنے اور شرک اور بت پرستی سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جبکہ بائبل کے عہد نامہ جدید یعنی انجیل میں بھی عقیدۂ توحید کا ذکر ہے اور انجیل متی کے باب ۴ میں آیات ۱ تا ۱۱ میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے کہ روح القدس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آزمائش کے لیے جنگل میں لے گئے، یہ واقعہ انجیل متی کی زبان میں یوں ہے:

"اس وقت روح القدس یسوع کو جنگل میں لے گیا تاکہ ابلیس سے آزمایا جائے۔ اور چالیس دن اور چالیس رات فاقہ کر کے آخر اسے بھوک لگی، اور آزمانے والے نے پاس آکر اس سے کہا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو فرما کہ یہ پتھر روٹیاں بن جائیں۔ اس نے جواب میں کہا لکھا ہے کہ آدمی صرف روٹی سے ہی جیتا نہیں رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے۔ تب ابلیس اسے مقدس شہر میں لے گیا اور ہیکل کے کنگرے پر کھڑا کر کے اس سے کہا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرا دے کیونکہ لکھا ہے کہ وہ تیری بابت اپنے فرشتوں کو حکم دے گا اور وہ تجھے ہاتھوں پر اٹھا لیں گے، ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر سے ٹھیس لگے۔ یسوع نے اس سے کہا کہ یہ بھی لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کی آزمائش نہ کر۔ پھر ابلیس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی اور اس سے کہا کہ اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ یسوع نے اس سے کہا اے شیطان! دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔ تب ابلیس اس کے پاس سے چلا گیا اور فرشتے آکر اس کی خدمت کرنے لگے۔"

یہ انجیل کی شہادت ہے اس بات پر کہ اصلی اور سچی مسیحیت کی بنیاد بھی توحید پر ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہہ کر شیطان کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا کہ حکم یہ ہے کہ صرف خدا کی عبادت کی جائے اور اسی کو سجدہ کیا جائے۔ یہاں ایک بات چلتے چلتے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابلیس نے حضرت عیسیٰؑ کو دنیا کی ساری بادشاہتوں اور ان کی شان و شوکت

کا منظر دکھا کہ پیشکش کی کہ اگر وہ اسے سجدہ کر دیں تو یہ ساری بادشاہتیں انہیں مل جائیں گی مگر انہوں نے کمال بے نیازی سے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ لیکن آج کے عالمی حالات کو سامنے رکھیں تو لگتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا نام لینے والوں نے یہ سجدہ کر لیا ہے اور اسی کے نتیجے میں دنیا کی بادشاہتیں حاصل کر لی ہیں جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ آج کی دنیا پر حکمرانی کرنے والے مسیحی نام تو حضرت عیسیٰؑ کا لیتے ہیں مگر بائبل کی تعلیمات سے دستبردار ہو کر انہوں نے شیطانی تعلیمات کے مطابق انسانی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ خیر بات توحید کی ہو رہی ہے کہ قرآن کریم نے عقیدۂ توحید کو آسمانی مذاہب کے درمیان قدر مشترک قرار دیا ہے اور آج کی تحریف شدہ تورات اور انجیل بھی اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ توحید ہی تمام آسمانی مذاہب کا اصل عقیدہ ہے اور اسی پر آسمانی تعلیمات کی بنیاد ہے۔

(۲) دوسری بات جسے قرآن کریم نے آسمانی مذاہب کے درمیان قدر مشترک قرار دیا ہے، یہ ہے کہ انسانوں میں سے بعض لوگ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب نہ بنا لیں۔ بظاہر یہ بھی توحید کے سابقہ مفہوم ہی کا جزو معلوم ہوتا ہے لیکن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اس کا ایک مستقل اور الگ مفہوم بیان کیا ہے اس لیے میں اسے الگ قدر مشترک کے طور پر ذکر کر رہا ہوں۔ قرآن کریم نے اہل کتاب کے بارے میں ایک مقام پر فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو یعنی علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ رب بنا لیا ہے، تو حضرت عدی بن حاتمؓ نے جناب نبی اکرمؐ سے سوال کیا کہ ہم تو اپنے احبار و رہبان کو رب کا درجہ نہیں دیا کرتے تھے۔ حضرت عدیؓ دنیائے عرب کے معروف سخی حاتم طائی کے بیٹے تھے اور اسلام کو قبول کرنے سے قبل عیسائی تھے، اسی لیے انہوں نے سوال کیا کہ ہم نے تو اپنے علماء، مشائخ یا سرداروں کو ارباب نہیں بنایا تھا، قرآن کریم نے ہمارے بارے میں یہ کیسے کہہ دیا ہے؟ آنحضرتؐ نے عدیؓ سے کہا کہ کیا تمہارے ہاں احبار و رہبان کو حلال و حرام کے اختیارات حاصل نہیں تھے کہ جس چیز کو وہ حرام قرار دیں وہ حرام ہو جائے اور جس کو حلال کہہ دیں وہ حلال سمجھ لی جائے؟ عدی بن حاتمؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! ایسا تو ہمارے ہاں ہوتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ رب بنانے کا یہی معنیٰ ہے۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے اور اس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے کہ اگر حلال کو حرام کرنے اور حرام کو حلال کرنے کے اختیارات کسی انسان کے حوالے کر دیے جائیں تو یہ اس کو رب بنا لینے کے مترادف ہے، کیونکہ حلال و حرام کے

اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال کرے اور جسے چاہے حرام قرار دے دے، کسی اور کو اس معاملہ میں دخل دینے اور خدا کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس پس منظر میں آج کی دنیا کا نظام دیکھیں تو انسانوں کی ایک بڑی اکثریت نے حلال اور حرام کے اختیارات انسانوں کے لیے مختص کر رکھے ہیں اور جائز اور ناجائز کے فیصلے انسانوں ہی کے سپرد کر دیے ہیں۔ یہ فیصلے کوئی فرد کرے، جماعت کرے یا پارلیمنٹ کرے سب کا نتیجہ ایک ہے۔ اور سب صورتوں میں کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے، کسی کام کو جائز یا ناجائز کرنے، کسی چیز کو ضروری قرار دینے اور کسی کو ممنوع کا درجہ دینے کے اختیارات انسانوں ہی کے پاس ہیں۔ اور مذکورہ بالا روایت کی روشنی میں جناب رسول اکرمؐ کے نزدیک انسانوں کو انسانوں پر رب بنانے کا یہی معنی ہے۔

جبکہ توحید کے ساتھ ساتھ حلال و حرام کے اختیارات میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کو بھی قرآن کریم نے آسمانی مذاہب کے درمیان قدر مشترک قرار دیا ہے اور قرآن کریم نے ان دو اصولوں کو صرف قدر مشترک قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی صاف ہدایت دی ہے کہ "فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون" اگر اہل کتاب اس اصول سے پھر جائیں تو آپ واضح طور پر اعلان کر دیں کہ اے اہل کتاب! تم گواہ رہو کہ ہم انہی اصولوں پر قائم ہیں۔ گویا قرآن کریم نے اس بات کی صراحت کر دی کہ اہل کتاب سے بات صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ ان دو اصولوں کو تسلیم کریں اور آسمانی مذاہب کی ان مشترک اقدار کا اعتراف کریں، اس کے بغیر ان سے بات نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ تاریخی حقیقت ہے کہ نجران کے مسیحیوں کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکالمہ اور ڈائیلاگ اسی نکتہ پر منقطع ہو گیا تھا۔ اس لیے آج بھی ہمارے لیے قرآن کریم کی ہدایت یہی ہے کہ مذاہب کے درمیان مکالمہ اور ڈائیلاگ سے انکار نہیں ہے لیکن یہ مکالمہ جب بھی ہو گا انہی اصولوں پر ہو گا اس کے سوا کسی اور اصول مذہبی پر بات کرنے کی مسلمانوں کو اجازت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اصولوں پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

فہم قرآن کی اہمیت اور اس کے تقاضے

(مدینہ مسجد، اسٹینلے روڈ، آکسفورڈ، برطانیہ - ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

(مدینہ مسجد آکسفورڈ میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ۔ محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے قرآن کریم کی سورۃ القمر کی ایک آیت تلاوت کی ہے، اس کی روشنی میں کچھ ضروری گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ دو باتیں فرمائی ہیں:

- ایک یہ کہ ہم نے قرآن کریم کو ذکر کے لیے آسان کر دیا ہے،
- اور دوسری یہ کہ استفہام کے انداز میں یہ کہہ کر ہمیں دعوت دی ہے کہ کوئی ہے جو اس کا ذکر کرنے والا ہو؟

قرآن کریم کو یاد کرنا اور سمجھنا

یہاں ذکر سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کرامؒ نے عام طور پر دو باتیں کہی ہیں اور اپنے اپنے حوالے سے دونوں باتیں درست ہیں۔ (۱) ذکر سے مراد یاد کرنا بھی ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو یاد کرنے کے لے آسان کر دیا ہے، (۲) اور ذکر کا معنی نصیحت پکڑنا اور معنی و مفہوم کو سمجھنا بھی ہے کہ ہم نے اس مقدس کلام کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔

1. یاد اور حفظ کے لیے قرآن کریم کے آسان ہونے کا ہم کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ دنیا کی یہ واحد کتاب ہے جو یاد ہوتی بھی ہے اور یاد رہتی بھی ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورت سب اسے یاد کر لیتے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ اسے یاد رکھتے بھی ہیں۔ نو سال، دس سال، بلکہ سات اور آٹھ سال کے بچے اور بچیاں بھی قرآن کریم یاد کرتی ہیں۔ ہر زمانے میں قرآن کریم حفظ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہوتی ہے۔ چند سال قبل ایک رسالے میں کسی ادارے کی سروے رپورٹ نظر سے گزری تھی کہ دنیا میں اس وقت قرآن کریم کے حافظوں کی تعداد نوے (۹۰) لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے جس میں دنیا کی کوئی اور کتاب اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔

2. دوسرا معنی اس مقام پر مفسرین کرامؒ نے یہ کیا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے اور اس میں گفتگو کا ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ عام آدمی بھی اس کے مفہوم اور پیغام کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے عام لوگوں کو بات سمجھانے کے لیے بڑی آسان زبان اختیار کی ہے۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ قرآن کریم کی تفسیر کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گفتگو کے فطری اسلوب اور اصول کی طرح اللہ تعالی نے قرآن کریم میں مخاطبین کی زبان اور ذہنی سطح کا لحاظ رکھا ہے اور یہی گفتگو کا فطری تقاضا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں عام لوگوں کے لیے مشاہدات کی زبان استعمال کی ہے جو تعلیم اور تفہیم کے لیے سب سے زیادہ آسان زبان ہوتی ہے۔ آپ حضرات آکسفورڈ جیسے بڑے تعلیمی مرکز میں رہتے ہیں، آپ اس بات کو بہتر طور پر جانتے ہیں کہ تعلیمی ماہرین جب چھوٹے بچوں کے لیے تعلیم کا نصاب تیار کرتے ہیں تو مشاہدات کی زبان سے ہی اس کا آغاز کرتے ہیں۔ بچوں کو سب سے پہلے اردگرد کی اشیا سے متعارف کرایا جاتا ہے اور ان کے مشاہدے میں آنے والی چیزوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ انار ہے، یہ بکری ہے، یہ میز ہے، یہ درخت ہے، یہ انڈا ہے، یہ گیند ہے۔ اسے مشاہدے کی زبان کہتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ آسان زبان ہوتی ہے، اسی لیے بچوں کی تعلیم کا آغاز اسی سے کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں بھی عام لوگوں کے لیے یہی زبان استعمال کی گئی ہے اور انسانوں کو ان کے اردگرد کے ماحول میں روزمرہ استعمال اور مشاہدے میں آنے والی اشیا کی طرف توجہ دلا کر ان کے ذریعے عقائد سمجھانے کا اسلوب اختیار کیا گیا۔ قرآن کریم بار بار دعوت دیتا ہے، آسمان کی طرف دیکھو، بادل دیکھو، ان سے برستا پانی دیکھو، درخت اور سبزہ دیکھو، زمین کے مردہ ہونے اور پھر پانی کے ذریعے اس کے زندہ ہونے کی کیفیت دیکھو، اور جن جانوروں اور اشیا کا تم روزمرہ استعمال کرتے ہو ان کا مشاہدہ کرو۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں اور اللہ تعالی کے وجود، اس کی قدرت، اس کی صفات اور اس کی توحید کا عقیدہ سمجھانے کے لیے سب سے زیادہ زور کائنات

اور اردگرد کے ماحول اور اشیا کے مشاہدے اور ان پر غور و فکر کرنے پر دیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں فلسفہ والوں کے لیے فلسفہ اور معقولات والوں کے لیے عقلی مباحث کا سامان بھی موجود ہے، لیکن عام لوگوں کو بات سمجھانے کے لیے بالکل سادہ اور عام سی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ العنکبوت کی آیت نمبر ۴۱ میں اللہ تعالی نے شرک کے عقیدے کی کمزوری سمجھانے کے لیے مکڑی کی مثال دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جس طرح مکڑی مضبوط چھت اور مستحکم دیوار کی مضبوطی پر اعتماد کرنے کے بجائے کمزور سا الگ جالا تیار کرتی ہے، جو کمزور ترین گھر ہے اور ایک پھونک کی مار نہیں ہے، اسی طرح مشرک بھی اللہ تعالی کی ذات، اس کی قدرت اور اس کی صفات پر اعتماد کرنے کی بجائے اپنی تسلی کے لیے کمزور سے الگ سہارے تلاش کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس کے ذریعے اللہ تعالی نے شرک کی حقیقت عام لوگوں کو سمجھائی ہے۔ قرآن کریم کا عام طور پر اسلوب یہی ہے۔

اس طرح اللہ رب العزت نے سورۃ القمر کی اس آیت کریمہ میں، جو میں نے آغاز میں آپ کے سامنے تلاوت کی ہے، یہ فرمایا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو یاد کرنے کے لیے بھی آسان کیا ہے اور سمجھنے کے لے بھی آسان کر دیا ہے، پھر اس کے بعد ہمیں یہ کہہ کر قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کو سمجھنے کی دعوت دی ہے کہ کیا کوئی اس کا ذکر کرنے والا ہے؟ کیا کوئی اسے یاد کرنے والا ہے؟ اور کیا کوئی اس کو سمجھنے کے لیے تیار ہے؟ یہ بھی کسی بات کی دعوت دینے کا انداز ہوتا ہے اور ہمیں اس دعوت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔

قرآن کریم کے فہم اور تشریح کا فرق

قرآن کریم کو سمجھنے کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر دو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں:

1. ایک یہ کہ قرآن کریم کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے بہت سارے علوم ضروری ہیں اور ان علوم پر عبور حاصل کیے بغیر قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

2. اور دوسری یہ کہ جس شخص کو قرآن کریم کو تھوڑا بہت سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے، وہ اتھارٹی بن کر بیٹھ جاتا ہے کہ اب اس کی تشریح بھی کروں گا۔ اس کی

خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ لوگ اب اسی کی طرف رجوع کریں اور قرآن کریم کی تشریح کے حوالے سے اسی کی بات کو حتمی سمجھیں۔

یہ دو انتہائیں ہیں اور دونوں درست نہیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی بات کو سمجھنا اور چیز ہے اور اس کو سمجھانا اور تشریح کرنا اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ کسی کلام کے مفہوم سے واقف ہونا اور چیز ہے، اور اس کی تشریح کا حق رکھنا اس سے مختلف چیز ہے۔ ہم دونوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور کنفیوژن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر میں یہ عرض کروں گا کہ کسی بھی ملک کے عام شہری کے لیے اپنے ملک کے رائج الوقت قوانین سے واقف ہونا اور اس کے ضروری تقاضوں کو سمجھنا بطور شہری اس کی ذمہ داری میں شامل ہوتا ہے۔ کوئی شہری قانون شکنی کا مرتکب ہو اور عدالت میں طلبی پر یہ کہہ دے کہ میں اس قانون سے واقف نہیں تھا، اس لیے مجھ سے خلاف ورزی کا ارتکاب ہو گیا ہے، تو کسی ملک کی کسی بھی سطح کی عدالت اس عذر کو قبول نہیں کرے گی اور اس بنیاد پر اسے بری نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ ایک شہری کی حیثیت سے اپنے ملک کے قوانین سے آگاہ ہونا تمہاری ذمہ داری ہے اور ملک کے ہر شہری کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ملک کے قوانین سے آگاہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص قانون سے واقف ہے اور اسے سمجھتا ہے، تو اسے صرف اس وجہ سے قانون کی تشریح کا حق حاصل نہیں ہو جائے گا کہ وہ کسی عدالت یا فورم میں یہ کہے کہ میں قانون کو جانتا ہوں، سمجھتا ہوں اور اس کے بارے میں میرا مطالعہ وسیع ہے، اس لیے میں قانون کی تشریح کا حق رکھتا ہوں، اس کی یہ دلیل کسی جگہ بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ قانون کی تشریح، اس سے کسی بات پر استدلال اور اس پر لاگو کرنے کا معیار الگ ہے اور اس کا طریق کار مختلف ہے۔ اس کے لیے قانون کی تعلیم، ڈگری اور تجربہ شرط ہے، اس کے بغیر کسی شخص کو محض مطالعے اور قانون کو سمجھنے اور جاننے کی بنیاد پر قانون کی تشریح کا حق نہیں مل سکتا۔

یہی اصول قرآن کریم کے حوالے سے بھی ہے کہ اس حد تک سمجھنا کہ اس کے احکام اور مفہوم سے آگاہی ہو اور قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھتے یا سنتے ہوئے معلوم ہو جائے کہ اس میں نماز کی بات ہے، روزے کی بات ہے، حلال و حرام کا مسئلہ ہے، جنت و دوزخ کا تذکرہ ہے، کس کام کا حکم دیا گیا ہے یا کس بات سے منع کیا گیا ہے، یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کی

ذمہ داری ہے اور یہ قرآن کریم کے حقوق میں ہے اور اس کلام میں اللہ تعالی کے مخاطب ہم ہیں۔

فہم قرآن کریم کے تقاضے

پیغام کسی کا بھی ہو، اس کا پہلا حق یہ ہوتا ہے کہ اسے پڑھا جائے اور سمجھا جائے۔ دفتر کا خط ہے، عدالت کا سمن ہے، کاروباری فرم کا لیٹر ہے، کسی دوست کی چٹھی ہے، حتی کہ کسی دشمن کا خط ہے تب بھی اس کا پہلا حق یہ ہے کہ اسے پڑھا اور سمجھا جائے۔ ہم اس کے مفہوم کو قبول کریں یا نہ کریں یہ بعد کی بات ہے، لیکن کسی بھی پیغام کو وصول کرنے کے بعد ہم پر اس کا پہلا حق یہ ہوتا ہے کہ ہم اسے سمجھیں۔ اسی طرح قرآن کریم کو پڑھنا اور اس کو سمجھنا بھی قرآن کریم کے ان حقوق میں سے ہے، جو بحیثیت مسلمان ہم پر عائد ہوتے ہیں۔

البتہ فہم قرآن کریم کے چند ضروری تقاضوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے اور یہ قرآن کریم کے حوالے سے کوئی الگ تقاضے نہیں ہیں، بلکہ وہی فطری تقاضے اور ضروریات ہیں جو دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی بھی گفتگو کو سمجھنے اور اس کے صحیح مفہوم سے آگاہی کے لیے ناگزیر سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً:

1. کسی بھی گفتگو اور کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے آگاہی ہو۔ بات انگلش میں ہے تو انگلش زبان کا جاننا ضروری ہے، فارسی میں ہے تو فارسی جاننا ضروری ہے، اور پشتو میں ہے تو پشتو زبان سے آگاہی کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔
2. دوسرے نمبر پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ متکلّم کی منشا تک رسائی ہو، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ سننے والے نے کلام کا مطلب کچھ اور سمجھا ہے، لیکن متکلّم کہتا ہے کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ ایسی صورت میں جب کہ سننے والے کے فہم اور متکلّم کی منشا میں فرق ہو جائے، تو متکلّم کی منشا کو ہی ترجیح حاصل ہوتی ہے اور اسی کے بیان کو اس کے کلام کا صحیح مفہوم اور مصداق سمجھا جاتا ہے۔
3. تیسرے نمبر پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ گفتگو کے محل، موقع اور پس منظر سے آگاہی حاصل کی جائے۔ کیونکہ ایک ہی جملے کا معنی ایک جگہ اور ہوتا ہے اور وہی جملہ کسی اور موقع پر دوسرے پس منظر میں بولا جائے تو اس کا معنی

مختلف ہو جاتا ہے۔ کسی گفتگو کو اس کے پس منظر اور بیک گراؤنڈ سے ہٹ کر دیکھا جائے تو معنی مختلف ہوتا ہے، اور جب اس کے پس منظر اور بیک گراؤنڈ کو سامنے لایا جائے تو اسی جملے اور کلام کا مفہوم اور مطلب یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔

یہ امور قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی کسی بھی زبان میں ہونے والی گفتگو کو سمجھنے اور اس کے صحیح معنی و مفہوم تک رسائی کے لیے یہ تینوں باتیں ضروری تصور کی جاتی ہیں۔ یہی تین باتیں قرآن کریم کے حوالے سے بھی ضروری ہیں اور ان کے بغیر قرآن کریم کو سمجھنے اور اس کا معنی و مفہوم متعیّن کرنے کی کوشش غلطی کا شکار ہو جاتی ہے۔ مثلاً عربی زبان کا جاننا قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر قرآن کریم کو براہ راست سمجھنا ممکن نہیں ہے، پھر عام عربی نہیں بلکہ وہ عربی جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ جس طرح کسی انگریزی اخبار کا مطالعہ کرنے کے لیے عام انگلش کافی ہے، لیکن شکسپیئر کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کے معیاری انگلش سے واقف ہونا ضروری ہے، اسی طرح قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے بھی اس کے معیار کی عربی جاننا لازمی ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کا جاننا ضروری ہے مگر صرف عربی سے واقفیت کافی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ عربی زبان کا جان لینا ہی قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے بلکہ عربی زبان کے ساتھ ساتھ متکلّم کی منشا تک رسائی اور کلام کے پس منظر اور بیک گراؤنڈ سے آگاہ ہونا بھی اسی طرح ضروری ہے، کیونکہ سامع کے فہم اور متکلّم کی منشا کے درمیان اختلاف ہو جانا ایک فطری عمل امر ہے اور ایسی صورت میں متکلّم کی منشا معلوم کرنا اور اس کے مطابق کلام کا معنی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کے حوالے سے اس موقع پر ایک اور نکتہ کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم میں متکلّم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن ہم تک یہ مقدس کلام اللہ تعالیٰ نے اپنے نمائندے کے ذریعے پہنچایا ہے اور وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور قرآن کریم کا متن اور الفاظ آپؐ کے ذریعے ہمیں ملے ہیں، اسی لیے قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے کا مفہوم طے کرتے ہوئے اگر متکلّم کی منشا معلوم کرنا ضروری ہو جائے تو اس کے لیے بھی متکلّم کے نمائندے یعنی حضرت محمدؐ تک رسائی ضروری ہو گی۔ اور جس طرح ہم قرآن

کریم کے الفاظ اور اس کا متن ہم نے آپؐ سے حاصل کیا ہے، ان الفاظ اور متن کا مفہوم سمجھنے کے لیے، متکلّم کی منشا معلوم کرنے کی غرض سے بھی انہی سے رجوع کریں گے۔ اور آپؐ چونکہ اللہ تعالی کے نمائندے اور رسول ہیں اور ہم ان کی اس حیثیت پر ایمان لائے ہوئے ہیں، اس لیے وہ کسی آیت کا جو مفہوم بیان کریں گے، وہ قرآن کریم کے متکلّم، یعنی اللہ تعالی کی طرف سے ہی سمجھا جائے گا۔ یہ بات میں محض رسمی طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ صحابہ کرامؓ کے دور میں متعدّد بار ایسا ہوا کہ قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے کا مفہوم طے کرنے میں الجھن پیش آئی، تو صحابہ کرامؓ نے اس میں اللہ تعالی کی منشا معلوم کرنے کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا اور رسول اللہ نے انہیں بتایا کہ اس آیت میں اللہ تعالی کی منشا اور مراد کیا ہے؟ اس سلسلہ میں بہت سی آیات پیش کی جا سکتی ہیں مگر اس موقع پر وقت کے اختصار کی وجہ سے صرف ایک آیت کریمہ کا حوالہ دوں گا۔

> سورۃ الانعام کی آیت ۸۲ میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ ”وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو خلط ملط نہ ہونے دیا، ان کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں“۔

اب یہاں امن، ہدایت اور ایمان کے لیے شرط یہ قرار پائی کہ ایمان کے ساتھ ظلم کا اختلاط والتباس نہ ہو۔ اور یہ بظاہر بہت سخت شرط ہے اس لیے کہ ظلم کا عام مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی ظلم کہلاتی ہے، جو کسی نہ کسی درجے میں عام طور پر ہوتی ہی رہتی ہے اور جس سے مکمل طور پر بچنا بہت مشکل کام ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے یہاں ظلم کا مطلب یہی سمجھا اور پریشان ہو گئے، ایسے مواقع پر صحابہ کرامؓ پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ وہ چونکہ سمجھتے تھے اس لیے ایسی کسی بات پر پریشان بھی ہوتے تھے، ہم نے سرے سے یہ قصہ ہی نمٹا دیا کہ نہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی پریشان ہوتے ہیں۔ ہم نے قرآن کریم کو سمجھنا ہی چھوڑ دیا تا کہ پریشانی تک نوبت نہ آئے۔ بہرحال صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے، آپس میں مشورہ کیا اور پھر جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی پریشانی ان کے سامنے رکھ دی۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ گزارش کی کہ ”واینا لم یظلم یا رسول اللہ“ یا رسول اللہ! ہم میں سے کون ہے جس سے ظلم و زیادتی کا تھوڑا بہت ارتکاب نہیں ہوتا؟ اور اگر امن اور ہدایت کے لیے ایمان کا ظلم سے بالکل خالی ہونا ضروری ہے تو یہ شرط پورا کرنا کس کے بس کی بات ہے؟ جناب نبی اکرمؐ نے یہ بات سن کر فرمایا کہ تمہاری پریشانی بجا ہے مگر اس آیت میں ”ظلم“ کے

لفظ سے اللہ تعالی کی مراد وہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو، بلکہ یہاں اللہ تعالی کی مراد وہ ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بیٹا اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، اس لیے کہ ”شرک بہت بڑا ظلم ہے“۔ اب آیت کریمہ کا معنی یوں ہوا کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ شرک کو خلط ملط نہ ہونے دیا، ان کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ یہ سن کر صحابہ کرامؓ کی پریشانی دور ہوگئی۔ اس آیت کریمہ میں ظلم کا جو معنی سننے والوں نے سمجھا تھا، وہ متکلّم کی منشا کے خلاف تھا اور متکلّم کی منشا کی وضاحت کے لیے متکلّم کے نمائندے جناب نبی اکرمؐ سے رجوع کیا اور ان کی وضاحت کے ساتھ آیت کریمہ کا مفہوم و معنی طے ہوا۔ اس لیے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے عربی جاننے کے بعد جناب نبی اکرمؐ کی سنت و حدیث سے واقفیت بھی ضروری ہے اور مختلف آیات کریمہ کی انہوں نے جو تشریح و توضیح فرمائی ہے، اس سے آگاہی لازمی ہے، کیونکہ ان کی وضاحت کو متکلّم کی منشا کی تشریح کا درجہ حاصل ہے اور اس کی موجودگی میں صرف سامعین کے فہم کو معیار قرار دے کر قرآن کریم کی کسی آیت کی صحیح تشریح نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح قرآن کریم کی کسی آیت کے صحیح مفہوم تک رسائی کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس موقع پر نازل ہوئی تھی اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ کیونکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کا ظاہری مفہوم مختلف ہوتا ہے، لیکن جب انہیں ان کے پس منظر اور شان نزول کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو مفہوم بدل جاتا ہے۔ اس پر بھی بہت سی آیات قرآنیہ پیش کی جا سکتی ہیں، جن میں سے ایک آیت کریمہ پیش کرنا چاہوں گا۔

> سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۱۵۸ میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ ”صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں، پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کے درمیان بھی چکر لگائے“۔

یہاں ”فلا جناح علیہ ان یطوف بھما“ (پس کوئی حرج نہیں کہ وہ ان ان کے درمیان چکر لگائے) کے جملے سے بظاہر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ حج اور عمرے میں صفا اور مروہ کی سعی ضروری امر نہیں ہے، حالانکہ فقہائے امت اس بات پر متفق ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی حج اور عمرہ دونوں میں ضروری ہے اور اس کے بغیر نہ حج مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی عمرہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بھانجے اور شاگرد حضرت عروہ بن زبیرؓ نے یہ اشکال حضرت عائشہؓ کے سامنے پیش کیا تو حضرت ام المومنینؓ نے اس آیت کریمہ کی شان نزول بیان کی جس سے بات واضح ہو گئی۔ انہوں نے بتایا کہ جاہلیت کے دور میں جو لوگ حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ آتے تھے وہ بیت اللہ کا طواف تو سب ہی کرتے تھے، مگر صفا و مروہ کی سعی سب نہیں کرتے تھے۔ قریش اور ان کے حلیف قبائل صفا و مروہ کی سعی کرتے تھے، جبکہ مدینہ منورہ کے قبائل اوس اور خزرج اور بعض دوسرے قبائل صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔ ان کا موقف غالباً یہ تھا کہ یہ سعی حضرت ہاجرہؓ کی یاد ہے جو قریش کی ماں تھیں، اس لیے یہ ان کے لیے ضروری نہیں ہے۔ وہ اس کی بجائے مناۃ نامی بت کی نیت کرتے تھے جو قدید کے مقام پر تھا اور صفا و مروہ کی سعی کو اپنے لیے درست نہ سمجھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد مناۃ کو نبی اکرمؐ نے ختم کرا دیا تو انصار مدینہ یعنی اوس اور خزرج نے جناب نبی اکرمؐ سے دریافت کیا کہ اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں (یعنی صرف قریش کے ساتھ مخصوص نہیں ہے) اس لیے جو بھی حج یا عمرہ کے لیے آئے وہ صفا و مروہ کی سعی میں کوئی حرج محسوس نہ کرے۔

بخاری شریف کی ایک اور روایت کے مطابق حضرت انس بن مالکؓ نے بھی یہی وضاحت فرمائی جو انصار مدینہ میں سے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم صفا و مروہ کی سعی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اسے جاہلیت کی رسوم میں شمار کیا کرتے تھے، چنانچہ ہماری اس غلط فہمی کو قرآن کریم کی اس آیت کریمہ میں دور کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت کا ظاہری معنی مختلف ہے لیکن حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ نے اس کا پس منظر بیان کیا تو اس کا معنی اس سے بالکل مختلف ہو گیا، اور امت نے اسی معنی کو قبول کیا جو اس پس منظر اور بیک گراؤنڈ میں تعین کیا جاتا ہے۔ آج کی اصطلاح میں اسے پس منظر اور بیک گراؤنڈ کہا جاتا ہے، جب کہ شرعی اصطلاح میں اسے ''شان نزول'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ شان نزول کوئی نہ کوئی صحابیِ رسول ہی بیان کرے گا۔ کسی آیت کا شان نزول حضرت عائشہؓ بیان کریں گی، تو کسی کا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بیان کریں گے، کسی کا حضرت انس بن مالکؓ بیان کریں گے، کسی آیت کا پس منظر حضرت جابر بن عبد اللہؓ بیان کریں گے، اور کسی کا کوئی اور صحابیؓ بیان فرمائیں گے۔

اس حوالے سے اپنی گفتگو کا خلاصہ پھر عرض کر دیتا ہوں کہ قرآن فہمی اور قرآن کریم کی کسی آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے جہاں عربی زبان کا اس کے معیار کے مطابق جاننا ضروری ہے وہاں دو باتیں اور بھی لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و حدیث کا علم حاصل کیا جائے، کیونکہ قرآن کریم کے متکلّم یعنی اللہ تعالیٰ کی منشا اور مراد کا علم ہمیں جناب نبی اکرمؐ سے ہی حاصل ہو گا، اور دوسری یہ کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی تفسیر و تشریح میں جو کچھ فرمایا ہے اس پر ہماری نظر ہو، کیونکہ کسی بھی آیت کریمہ کا پس منظر اور شان نزول معلوم کرنے کے لیے ہمیں صحابہ کرامؓ سے رجوع کرنا ہو گا۔ اور وہی کسی آیت کا بیک گراؤنڈ بیان کریں گے، اس لیے کہ قرآن کریم کے نزول کے عینی گواہ وہی ہیں اور انہی کے سامنے قرآن کریم نازل ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم کا صحیح فہم نصیب کریں اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

مسجد حرام میں شیخ عبد الرحمان السدیس کا فکر انگیز خطبہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۱ ستمبر ۲۰۰۴ء)

۷ ستمبر ۲۰۰۴ء کو جمعۃ المبارک کی نماز مسجد حرام میں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، جدہ میں مقیم میرے ہم زلف قاری محمد اسلم شہزاد بھی ہمراہ تھے۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ مسجد میں داخل ہوئے تو نمازیوں کے ہجوم کے باعث مسجد اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگ دامنی کی شکایت کر رہی تھی۔ ہر طرف سے لوگ اُمڈے چلے آ رہے تھے حالانکہ نہ حج کا موقع تھا اور نہ ہی رمضان المبارک کا۔ یعنی معروف معنوں میں سیزن نہیں تھا مگر اس کے باوجود نمازیوں کا ہجوم دیدنی تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا ذہن قرآن کریم کی ان آیات کی طرف متوجہ ہو گیا جن میں یہ تذکرہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ ان بے آب و گیاہ بے آباد اور خشک پہاڑیوں میں آپ لوگوں کو حج کے لیے پکاریں، آپ کی پکار پر ہر طرف سے انسان بیت اللہ کی زیارت و طواف کے لیے آئیں گے۔ تب سے دنیا کے مختلف

حصوں سے لوگ آرہے ہیں اور آتے چلے جائیں گے حتی کہ جب اس گھر میں لوگوں کی آمد و رفت رک جائے گی تو پھر قیامت قائم ہوگی۔

جمعۃ المبارک کا خطبہ فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر عبد الرحمان السدیس نے ارشاد فرمایا۔ بڑا فکر انگیز خطبہ تھا اور امت مسلمہ کی اجتماعی حالت اور اسے درپیش مسائل کا اس میں نہ صرف تذکرہ تھا بلکہ ان مسائل کے حوالے سے امت کی راہنمائی کا بھی اس میں سامان موجود تھا۔ انہوں نے فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے میدان میں امت کو درپیش چیلنجز کا ذکر کیا اور کہا کہ مغربی فکر و ثقافت نے جس انداز میں مسلم معاشرہ میں دراندازی شروع کر رکھی ہے علماء کرام اور اساتذہ کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور امت کے عقیدہ و ثقافت کے تحفظ کے لیے کردار ادا کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ مسلم معاشرہ میں جو ادارے اور جماعتیں دینی بیداری کے لیے کام کر رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی اور ان کے ساتھ تعاون کی ضرورت ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ مسلم دنیا میں قرآن و سنت کی بنیاد پر باہمی احتساب کا نظام قائم ہو اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے دینی فریضہ کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

شیخ سدیس نے کہا کہ فکر و عقیدہ ہی کسی قوم کی اصل اساس ہوتی ہے اور ہماری اسی اساس پر آج دشمن حملہ آور ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ اسلامی عقیدہ و ثقافت کے خلاف منفی اور معاندانہ مہم میں مصروف ہیں اور مسلم امہ کو اس کے عقیدہ و ثقافت سے محروم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ عقیدہ و ثقافت کی جنگ ہے جس کے لیے مسلم ذرائع ابلاغ، علماء کرام اور اساتذہ کو کردار ادا کرنا چاہیے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں جو مرد اور عورتیں استاد کے منصب پر فائز ہیں نئی نسل کی فکری تربیت اور ذہن سازی ان کی ذمہ داری ہے اور ان کا فرض ہے کہ وہ نئی نسل کو اسلامی فکر و عقیدہ سے آگاہ کریں اور اسلامی اخلاق و اقدار سے روشناس کرائیں کیونکہ اسی صورت میں ہم فکری اور ثقافتی جنگ میں اپنا دفاع اور تحفظ کر سکتے ہیں۔

امام محترم نے مسلم معاشرہ میں پائی جانے والی مبینہ انتہا پسندی کا بھی ذکر کیا اور اسے ہدف تنقید بناتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ موجودہ صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے کہ مسلم نوجوان اپنے حکمرانوں کی تکفیر شروع کر دیں یا اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرنے لگ جائیں بلکہ اس کا صحیح راستہ یہ ہے کہ معاشرہ میں دینی بیداری پیدا کریں، فکری شعور اجاگر کریں اور حکمت عملی کے ساتھ دین کی دعوت دیں۔

امام صاحب یہ فرما رہے تھے اور میرا ذہن یہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر سدیس محترم کا ارشاد بجا ہے اور اس وقت مسلم معاشرہ میں کام کرنے کی صحیح شکل یہی ہے مگر اے کاش! امام حرم ان اسباب کی طرف بھی ہلکا پھلکا سا اشارہ کر دیتے جو مسلم نوجوانوں کو اس رویہ اور طرز عمل کی طرف دھکیل رہے ہیں جسے انتہا پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ ہوا اپنی فطری رفتار سے چل رہی ہو تو اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے سے اس کی رفتار کم نہیں ہوا کرتی بلکہ تیز ہو جایا کرتی ہے۔ ہوا کی راہ میں جتنی رکاوٹیں بڑھتی جائیں گی اس کی تیزی اور تندی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور بہتے پانی کی کیفیت بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس وقت مسلم امہ جس یلغار کی زد میں ہے اور سیاست و معیشت، عسکریت، وسائل و اسباب، صنعت و حرفت اور سائنس و ٹیکنالوجی میں پسپائی اور بے بسی کے بعد اب اس کے فکرو عقیدہ اور ثقافت کے آخری مورچہ اور آخری دفاعی لائن پر جو فیصلہ کن حملہ ہو چکا ہے اس کا مقابلہ کرنے اور اس جنگ میں اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرنے میں دینی تحریکات اور پرجوش مسلم نوجوانوں کو رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور یہ رکاوٹیں دشمن کی طرف سے کم اور مسلم حکمرانوں کی طرف سے زیادہ ہیں۔ مسلم ممالک کی اکثر و بیشتر حکومتوں کی پالیسیوں کا وزن اس وقت اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرنے والوں کے پلڑے میں نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلم حکومتوں کے وسائل اور صلاحیتیں حملہ آوروں کے حق میں استعمال ہو رہی ہیں۔ اس صورتحال میں اگر کچھ باغیرت نوجوان یا حلقے ردعمل میں اعتدال کی بعض حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں تو ان کے طرز عمل سے اختلاف کے باوجود ہمارے نزدیک اس کی ساری ذمہ داری صرف ان پر عائد نہیں ہوتی۔

خیر بات امام محترم کے خطبہ کی ہو رہی تھی کہ انہوں نے موجودہ عالمی فکری و تہذیبی کشمکش کا اپنے خطبہ میں ذکر کیا اور مسلمانوں کو اس سلسلہ میں ان کی ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی۔ سچی بات یہ ہے کہ مسجد حرام میں حرمین شریفین کے ایک محترم و مکرم امام سے خطبہ جمعۃ المبارک میں امت مسلمہ کے اجتماعی مسائل پر گفتگو سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے اس خوشگوار تبدیلی پر اللہ تعالی کا شکر ادا کیا۔ ورنہ حرمین شریفین حاضری کے موقع پر حرمین کے محترم و معزز ائمہ سے امت مسلمہ کے اجتماعی مسائل پر گفتگو سننے کی حسرت ہی دل میں رہ جاتی تھی۔

نماز جمعۃ المبارک کی ادائیگی کے بعد ہم باب العمرہ کے باہر پہنچے کہ حضرت مولانا محمد مکی حجازی مدظلہ کے ساتھ ملاقات تھی اور وہ ہمارے انتظار میں تھے۔ مولانا ہمیں اپنے ہمراہ گھر لے گئے جہاں مولانا سعید احمد عنایت اللہ بھی تشریف لے آئے، کھانا اکٹھے کھایا اور مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، پاکستان کے حالات اور برطانیہ میں تحفظ ختم نبوت کے کام کے سلسلہ میں متعدّد امور پر تبادلۂ خیالات ہوا، وہاں سے فارغ ہو کر جدہ واپسی ہوئی۔

جدہ میں ایک بزرگ محدث حضرت الشیخ عبداللہ بن احمد الناخبی دامت برکاتہم مقیم ہیں جن کی عمر اس وقت ایک سو پندرہ برس بتائی جاتی ہے اور انہیں اب سے پون صدی قبل کے کبار محدثین سے تلمذ اور روایت حدیث کا شرف حاصل ہے۔ میں نے جدہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے قاری محمد رفیق صاحب سے عرض کیا تھا کہ ان سے رابطہ قائم کر کے ملاقات کا وقت لے لیں۔ قاری صاحب محترم نے اس کا اہتمام کر رکھا تھا چنانچہ مغرب کے بعد ان کی خدمت میں حاضری دی۔ انہوں نے بے حد شفقت فرمائی، ایک حدیث سنا کر اور چند نصائح فرما کر شرف تلمذ سے نوازا اور اپنی تمام اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی۔ تحدیث نعمت کے طور پر اس بات کا تذکرہ شاید نامناسب نہ ہو کہ مجھے بحمد اللہ تعالیٰ اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم، عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم، حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی دامت برکاتہم، حضرت مولانا جمال احمد مظاہری دامت برکاتہم اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے علاوہ مسند العصر حضرت الاستاذ الشیخ محمد یاسین الفادانی المکی الشافعیؒ اور الاستاذ المحقق المحدث عبد الفتاح ابو غدہؒ سے باقاعدہ ملاقات و زیارت کے ساتھ تلمذ و اجازت کا شرف حاصل ہے۔ اور اب اس کے ساتھ الاستاذ الشیخ عبداللہ بن احمد الناخبی دامت فیوضہم سے تلمذ و اجازت کی سعادت بھی حاصل ہوگئی ہے فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

عشاء کے بعد صاحبزادہ مولانا قاری عبد الباسط صاحب کے ہفتہ وار درس قرآن کریم کے حلقہ میں حاضری ہوئی، فہم قرآن کریم کا ذوق اور ماحول دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی اور قاری صاحب موصوف کی مسلسل محنت پر ان کے لیے دل سے بے ساختہ دعائیں نکلیں۔ ان کے ارشاد پر فہم قرآن کریم کی اہمیت اور تقاضوں پر کچھ گزارشات بھی پیش کیں۔ آج ہفتہ کو بعد نماز عشاء قاری محمد رفیق صاحب محترم نے علماء کرام کے ساتھ ایک ملاقات کا اہتمام کر رکھا ہے۔ کل اتوار کو لندن روانہ ہو جاؤں گا جہاں سے دس رمضان المبارک تک

گوجرانوالہ واپسی ہوگی اور ہوسکتا ہے اس دوران ہفتہ دس دن کے لیے امریکہ کے صدارتی الیکشن کی انتخابی مہم کا نظارہ کرنے بھی چلا جاؤں، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مدینے کا ایک اور سفر

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۸ ستمبر ۲۰۰۴ء)

چھ سال کے وقفہ کے بعد آج پھر مدینہ منورہ میں ہوں اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضری کی سعادت حاصل کرچکا ہوں۔ پہلی بار ۱۹۸۴ء میں یہاں حاضری ہوئی تھی اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس شرف باریابی سے بہرہ ور ہوتا رہا مگر گزشتہ چند سالوں میں سعودی حکومت کی نئی عمرہ پالیسی کی وجہ سے بریک لگ گئی۔ اور اصل بات تو بلاوے کی ہے، اللہ تعالیٰ اور ان کے آخری رسولؐ کی بارگاہ میں یہ حاضری بلاوے پر ہی ہوتی ہے اور بحمد اللہ یہ بلاوا آگیا۔

گزشتہ ہفتہ اسلام آباد میں پاکستان شریعت کونسل کے اجلاس کے موقع پر ایک دوست کے پوچھنے پر میں نے اپنا پروگرام بتایا اور عرض کیا کہ ۱۳ستمبر کو جدہ جا رہا ہوں وہاں سے پہلے مدینہ منورہ جاؤں گا اور پھر عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ حاضری دوں گا۔ میرا معمول زیادہ تر یہی ہوتا ہے اس پر ایک دوست چونکے اور کہا کہ آپ احرام باندھے بغیر جدہ جائیں گے؟ میں نے عرض کیا کہ ارادہ تو یہی ہے اور معمول بھی یہی ہے۔ انہوں نے احرام کے بغیر میقات عبور کرنے پر اعتراض کیا۔ میں نے گزارش کی کہ اپنے بزرگوں میں سے کسی کے مضمون میں پڑھا تھا کہ اگر پہلے مدینہ منورہ جانے کی نیت ہو تو احرام باندھے بغیر جدہ پہنچنے کی گنجائش ہے۔ انہوں نے حوالہ طلب کیا جو اس وقت میرے ذہن میں نہیں تھا۔ گوجرانوالہ واپس پہنچا تو مدرسہ نصرۃ العلوم کے مہتمم حاجی فیاض خان سواتی سلمہ کا عمرہ کے مسائل پر رسالہ دیکھا جو خاصا معلوماتی ہے، اس میں لکھا ہے کہ احرام کے بغیر میقات عبور کرنے پر دم واجب ہوتا ہے۔ میں نے مصنف سے اس پر بحث کی کہ دم ہے یا صدقہ؟ انہوں نے کہا کہ دم، لیکن اگر احرام کے بغیر میقات عبور کرنے کے بعد عمرہ ادا کیے بغیر میقات کی حدود سے نکل جائے تو یہ دم ساقط ہوجاتا ہے۔ اس پر مجھے اپنے سابقہ معمول پر اطمینان ہوگیا کہ کوئی شخص احرام باندھے بغیر جدہ جاکر وہاں سے مدینہ منورہ چلا جائے تو وہ میقات کی حدود

سے نکل جاتا ہے اور مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے ذوالحلیفہ سے احرام باندھ کر عمرہ ادا کر سکتا ہے۔

بہر حال جدہ پہنچا تو میرے ہم زلف قاری محمد اسلم شہزاد اور میرے چھوٹے بھائی قاری عزیز الرحمن خان شاہد ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ دونوں جدہ میں رہتے ہیں اور مختلف مساجد میں امامت اور تعلیم قرآن کریم کی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ دونوں کی فیملیاں بھی ساتھ ہیں ان کے بچوں کے ساتھ طویل عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی وہ بھی بہت خوش تھے۔ رات کو قاری محمد اسلم شہزاد صاحب نے چند احباب کو کھانے پر بلا رکھا تھا۔ صاحبزادہ قاری عبد الباسط صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک عرصہ سے جدہ میں دینی خدمات میں مصروف ہیں، تحریر اور تقریر کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں، درس قرآن کریم کا مستقل حلقہ ہے اور خاصے لوگ ان سے استفادہ کرتے ہیں، جدہ سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ ”اردو نیوز“ میں حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کی طرز پر مستقل کالم کی صورت میں لوگوں کے دینی سوالات کے جوابات تحریر کرتے رہے ہیں جو اب چار جلدوں میں دیوبند سے شائع ہو چکے ہیں اور اکابر علماء کرام نے ان کی تحسین کی ہے۔ ان کے علاوہ قاری محمد رفیق صاحب بھی تشریف لائے وہ ایک عرصہ سے جدہ میں قرآن کریم کی تعلیم و تدریس میں مگن ہیں اور اب ان کے باذوق بیٹے بھی اس کار خیر میں شریک ہیں۔ کھانے میں اور دوست بھی تھے۔ پاکستان کے حالات بطور خاص زیر بحث رہے اور مختلف حوالوں سے یہ حضرات دیر تک سوال و جواب کرتے رہے۔

۱۴ ستمبر کو جدہ سے ”النقل الجماعی“ کی بس پر مدینہ منورہ پہنچا، جنرل بس اسٹینڈ پر اترتے ہی ایک بنگالی نوجوان نے گھیر لیا اور اس کے ذریعے شارع ستین پر مسجد امیرہ منیرہ کے ساتھ ایک بلڈنگ میں دو دن کے لیے کمرہ لے لیا۔ عشاء کے بعد مسجد نبویؐ میں استاذ محترم قاری محمد انور صاحب مدظلہ سے ملاقات ہوئی، وہ میرے حفظ قرآن کریم کے استاذ ہیں، میں نے ۱۹۶۰ء میں ان سے قرآن کریم حفظ مکمل کیا تھا، وہ کم و بیش بیس سال سے مکہ مکرمہ میں ہیں اور تحفیظ القرآن کے ایک مدرسہ میں پڑھاتے ہیں۔ جب بھی حاضری ہوتی ہے بڑی محبت اور شفقت سے نوازتے ہیں اور میں ان کی دعاؤں سے فیضیاب ہوتا ہوں۔ آج فجر کی نماز کے بعد ایک پرانے پاکستانی عالم دین مولانا محمد الیاس فیصل سے ملاقات ہوئی اور مسجد نبویؐ کے صحن میں کافی دیر تک امت مسلمہ کے مسائل اور موجودہ صورت حال پر ان

سے بات چیت ہوتی رہی۔ مسجد نبویؐ کے پرانے آثار اور مدینہ منورہ کے تاریخی مقامات کے بارے میں ان سے خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ مدینہ کی تاریخی مساجد اور مسجد نبویؐ کے گرد حضرات صحابہ کرامؓ کے مکانات کے بارے میں ان کی دو معلوماتی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جوانہوں نے مجھے مرحمت فرمائیں۔ اس کے بعد گھرلے گئے وہاں ناشتہ کیا اور گفتگو مسلسل جاری رہی۔

مدینہ منورہ کے تاریخی مقامات کی سیر اس سے قبل متعدّد بار کر چکا ہوں اور خاص طور پر ۱۹۸۵ء میں حج کے لیے حاضری کے موقع پر حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ نے جو سیر کرائی تھی اس کے نقوش ابھی تک ذہن میں تازہ ہیں۔ انہوں نے مجھے سقیفہ بنی ساعدہ کا باغیچہ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مکان بھی دکھایا تھا جو اس وقت تک باقی تھا جہاں جناب نبی اکرمؐ نے ہجرت کے بعد کچھ عرصہ اس میں قیام فرمایا تھا۔ میں نے مولانا محمد الیاس فیصل سے دریافت کیا توانہوں نے بتایا کہ سقیفہ بنی ساعدہ کا کچھ حصہ تو باغیچہ کی صورت میں اب بھی موجود ہے مگر حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مکان مسجد نبویؐ کی توسیع کی نذر ہو چکا ہے۔ مولانا محمد الیاس فیصل سے زیادہ تر تعلیمی مسائل پر گفتگو ہوئی، وہ پاکستان کے دور دراز کے دیہاتی علاقوں میں دینی تعلیم اور معلومات کی فراہمی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں، مسیحی مشنریوں اور دوسرے باطل مذاہب اور فرقوں کی روز افزوں سرگرمیوں سے پریشان ہیں اور اس سلسلے میں ایک پروگرام کا خاکہ ذہن میں رکھتے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اپنے اس کار خیر کے پروگرام کو بہتر انداز میں شروع کر سکیں اور کامیابی سے ہمکنار ہوں، آمین یارب العالمین۔

مدینہ منورہ میں جب بھی حاضری ہوتی ہے تبدیلیوں کی کوئی نہ کوئی نئی لہر دکھائی دیتی ہے۔ مسجد نبویؐ کی توسیع کے بعد اس کے اردگرد بڑے بڑے تجارتی مراکز اور ہوٹلوں کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ نیچے مارکیٹیں اور اوپر بڑے بڑے ہوٹل تعمیر ہورہے ہیں جو ظاہر ہے حجاج اور زائرین کے لیے سہولتوں کا باعث ہوں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک بڑی تجارت بھی ہے جس میں شاہی خاندان کے افراد اور بڑے بڑے تجارتی گروپ آگے بڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ آج ابہا سے ہمارے ایک عزیز شاگرد قاری عبیدالرحمان ضیاء اور قاری مہدی حسن کا فون آیا ان کا اصرار ہے کہ ان کے ہاں بھی ضرور حاضری دوں مگر نہ توشیڈول میں گنجائش ہے اور نہ ہی ویزے میں تحمل ہے۔ وہاں پہلے ایک بار جا چکا ہوں،

ہمارے دوستوں اور ساتھیوں کا ایک بڑا حلقہ ہے جو وہاں مختلف مساجد اور مدارس میں قرآن کریم کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں اور اس طرح پاکستان کے دینی مدارس کا فیض سعودی عرب کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے، فالحمد للہ علی ذلک۔

میرا پروگرام کل جمعرات کو مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جانے کا ہے، عمرہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ جمعۃ المبارک کی نماز مسجد حرام میں ادا کروں گا، مختلف دوستوں سے ملاقات ہوگی، اس کے بعد ہفتہ کا دن جدہ میں گزاروں گا جہاں صاحبزادہ قاری محمد عبد الباسط نے درس قرآن کریم اور قاری محمد رفیق صاحب نے علماء کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کر رکھا ہے، اس کے بعد اتوار کو ان شاء اللہ تعالی لندن روانہ ہو جاؤں گا۔

جاہلی اقدار و روایات اور جدید تہذیب

(دارالہدٰی، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۴ جولائی ۲۰۰۴ء)

۲۵ جون کو میں نے جمعہ کی نماز واشنگٹن ڈی سی کے علاقے اسپرنگ فیلڈ کی مسجد دارالہدی میں پڑھائی اور اس سے قبل خطبہ و بیان کا موقع بھی ملا۔ میں اس سے قبل کئی بار یہاں آچکا ہوں اور ہر بار یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ نمازیوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ گزشتہ سال یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ جمعۃ المبارک کے موقع پر زیادہ رش ہونے کی وجہ سے ایک ایک گھنٹے کے وقفے کے ساتھ تین بار جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ ایک نماز مسجد میں پڑھی جاتی ہے اور اس کے بعد مسجد کے ساتھ ملحقہ وسیع ہال میں دو بار نماز ادا کی جاتی ہے۔ آج جب نماز جمعہ کے لیے مسجد میں کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ اجتماع مسجد کے ہال سے زیادہ ہے، صفیں تنگ کی گئیں تو بھی سارے لوگ نہ سما سکے۔ یہاں مسجد کے ہال سے باہر کھلے آسمان تلے نماز کی ادائیگی قانونا جائز نہیں ہے اس لیے مسجد کی انتظامیہ کو نمازیوں سے معذرت کے ساتھ یہ اعلان کرنا پڑا کہ اگلے جمعہ سے مسجد میں جمعہ کی دو نمازیں ہوا کریں گی۔ دارالہدی میں طلبہ اور طالبات کے لیے اسلامی اسکول اور حفظ قرآن کریم کی کلاسیں چل رہی ہیں۔ جبکہ اس سال طالبات کے لیے کے لیے "عالم کورس" کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے جس میں طالبات درس نظامی کا وہی کورس پڑھیں گی جو ہمارے ہاں وفاق المدارس کے تحت طالبات کو پڑھایا جاتا ہے۔ دارالہدی کے منتظم مولانا عبد الحمید اصغر بہاولپور سے تعلق رکھتے ہیں، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں استاذ رہے ہیں، انجینئرنگ میں

ایم ایس سی کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کے لیے ۱۹۸۲ء میں امریکہ گئے مگر یہاں آکر لائن بدل گئی، تب سے مسجد و مدرسہ کے نظام سے منسلک اور دینی تعلیم کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

نماز جمعہ سے قبل بیان میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے حوالہ سے میں نے کچھ گزارشات پیش کیں جن میں مغرب اور مسلمانوں کی تہذیبی کشمکش بھی زیر بحث آگئی۔ اس پہلو پر ہونے والی گفتگو کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں بہت سے اعلانات فرمائے جن میں ایک جملہ تاریخ کے ایک فیصلہ کن موڑ اور نسل انسانی کی تہذیبی زندگی کے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "کل امر الجاھلیۃ تحت قدمی" کہ جاہلیت کی ہر بات میرے پاؤں کے نیچے ہے۔ جناب رسول اکرمؐ نے اپنی بعثت سے قبل کے عرب معاشرے کو جاہلیت کا معاشرہ اور ان کی تہذیب و ثقافت کو جاہلی ثقافت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ میں اس جاہلی معاشرے اور تہذیب کی تمام جاہلی اقدار و روایات کو اپنے پاؤں تلے روند کر آگے بڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک تاریخی اعلان تھا جو صرف اعلان ہی نہیں تھا بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی کہ جناب نبی اکرمؐ نے اپنی بعثت کے پہلے دن سے لے کر حجۃ الوداع تک کی مسلسل جدوجہد کے ساتھ عرب معاشرے کو بہت سی اقدار سے پاک کر دیا تھا اور بہت سی جاہلی روایات سے نجات دلا دی تھی۔

یہ تہذیبی روایات و اقدار جو جناب رسول اللہؐ کی جدوجہد کے ساتھ ختم ہو گئی تھیں اور معاشرہ ان سے پاک ہو گیا تھا، انہی کے بارے میں آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں اعلان فرمایا تھا کہ "جاہلیت کی ہر قدر آج میرے پاؤں کے نیچے ہے"۔ آئیے ذرا ایک نظر ڈال لیں کہ نبی اکرمؐ کے پاؤں کے نیچے جاہلیت کی کون کون سی قدر مسلی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبرؐ نے انسانی معاشرے کو کون کون سی جاہلی اقدار سے نجات دلائی تھی۔ اس مختصر وقت میں ان سب کا احاطہ تو مشکل ہو گا مگر بطور نمونہ ان میں سے چند کا تذکرہ کرنا ضروری ہے:

• نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے عرب معاشرے کو شرک اور بت پرستی سے نجات دلائی اور نہ صرف بیت اللہ اور حرم مکہ کو بتوں سے پاک کیا بلکہ جزیرۂ عرب میں جہاں جہاں بت خانے موجود تھے انہیں فتح مکہ مکرمہ کے بعد مسمار کرا دیا اور جزیرۂ عرب کو شرک اور بت پرستی سے نجات دلا دی۔

• بدکاری عرب معاشرے میں رچ بس گئی تھی، شادی کے بغیر باہمی رضامندی سے جنسی تعلق کو جرم نہیں سمجھا جاتا تھا اور بدکاری کی مختلف صورتیں نہ صرف رائج تھیں بلکہ انہیں معاشرتی تحفظ بھی حاصل تھا۔ مگر جناب رسول اکرمؐ نے باقاعدہ نکاح کے سوا تمام صورتوں کو ختم کرا دیا۔

• شراب اس سوسائٹی کے معمولات کا حصہ تھی اور اس پر فخر کیا جاتا تھا مگر نبی اکرمؐ نے اسے حرام قرار دیا اور ایسا ماحول پیدا کیا کہ زندگی بھر شراب پینے والوں نے شراب گلیوں میں بہا دی اور شراب کے مٹکے سر بازار توڑ دیے۔

• بے پردگی اور عریانی عرب معاشرے میں عام تھی حتیٰ کہ بیت اللہ کا طواف بھی بہت سے مرد اور عورتیں بے لباس ہو کر کرتے تھے۔ بعض قبائل یہ کہتے تھے کہ انسان کی فطرت اور نیچر یہ ہے کہ وہ دنیا میں ننگا آیا تھا اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف اسی فطری اور نیچرل کیفیت میں کرتے ہیں۔ نیچر کا یہ تصور آج کی جدید تہذیب کے پیروکاروں میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ ''نیچرل کلب'' اسی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں جہاں مرد اور عورت بے لباس ہو کر جاتے ہیں اور بیت اللہ کا ننگے طواف کرنے والے عربوں کی طرح یہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں نیچرل حالت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

اس حوالہ سے ایک لطیفہ عرض کرنا چاہوں گا جو ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ نے سنایا کہ ایک صاحب سے ان کی ڈاڑھی کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ڈاڑھی سنت رسولؐ ہے اس لیے رکھنی چاہیے۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ ڈاڑھی فطرت اور نیچر کا حصہ نہیں ہے اس لیے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اس کی ڈاڑھی نہیں ہوتی۔ حضرت درخواستیؒ نے ان صاحب کو جواب دیا کہ اس اصول پر تو دانت بھی نیچر کا حصہ

نہیں ہیں کیونکہ وہ بھی پیدائش کے وقت موجود نہیں ہوتے بلکہ بعد میں نمودار ہوتے ہیں، اس لیے نیچر کا تقاضا پورا کرنے کے لیے انہیں بھی تڑوا دینا چاہیے۔ یہ نیچر کی عجیب سی بات لوگوں کے ہاتھ آگئی ہے۔ ورنہ لباس کے حوالے سے انسان کی فطرت اور نیچر وہ ہے جو قرآن کریم نے حضرت آدم و حوا علیہ السلام کے حوالے سے بیان کی ہے کہ جب جنت میں ممنوعہ درخت کا پھل کھانے سے ان دونوں کے لباس اتر گئے تو وہ دونوں بے ساختہ جنت کے درختوں کے پتے اکھاڑ کر اپنی شرم گاہوں کو ڈھانپنے لگے۔ انسان کی اصل فطرت اور نیچر قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ ہے جسے آج کی دنیا نے خدا جانے کیا سے کیا رنگ دے دیا ہے۔ بہرحال جناب نبی اکرمؐ نے اس عریانی اور بے حیائی کا خاتمہ کیا اور نہ صرف بیت اللہ کے ننگے طواف کو قیامت تک کے لیے ممنوع قرار دے دیا بلکہ عام زندگی میں بھی حجاب کے اصول و قواعد بیان کیے۔

• سود اور جوا اس معاشرے میں عام تھا اور لوگ کھلم کھلا سود اور جوئے کا کاروبار کرتے تھے۔ مگر نبی اکرمؐ نے ان دونوں معاشی لعنتوں کا خاتمہ کیا اور معاشرے کو ان سے نجات دلائی۔

• ناچ گانے کی محفلیں عرب معاشرے میں روزمرہ زندگی کا حصہ اور تفریح کا ایک بڑا ذریعہ تصور ہوتی تھیں مگر جناب رسول اللہؐ نے ان کو برقرار رکھنے اور ان کی حوصلہ افزائی کی بجائے انہیں ختم کیا اور سوسائٹی کو ناچ گانے کی بہت سی مروجہ صورتوں سے نجات دلائی۔

• کہانت اور نجوم کا کاروبار کھلے بندوں ہوتا تھا، ستاروں کی چال سے لوگ قسمت کا حال دریافت کرتے تھے، زائچے بنوا کر مستقبل کی خبریں معلوم کرتے تھے اور کاہنوں کے مشوروں سے اپنے پروگرام ترتیب دیا کرتے تھے۔ مگر نبی اکرمؐ نے اسے گوارا نہ کیا اور معاشرے سے اس کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔

ان جاہلی اقدار کے خاتمے پر ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج جاہلیت کی ہر قدر میرے پاؤں کے نیچے ہے، جن میں سے چند ایک کا میں نے بطور نمونہ تذکرہ کیا ہے۔ اس حوالے سے میں دو سوال آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں:

1. پہلا سوال تو خود اپنے آپ سے، آپ دوستوں اور دنیا بھر کے مسلمانوں سے ہے کہ جن جاہلی اقدار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے پاؤں کے نیچے روندنے کا اعلان فرمایا تھا، ہماری آج کی سوسائٹی میں ان کی صورتحال کیا ہے؟ اور جاہلیت کی وہ کون سی قدر ہے جو حجۃ الوداع میں جناب رسول اللہؐ کے قدموں تلے تھی اور آج پھر دوبارہ بن سنور کر ہماری سوسائٹی میں واپس نہیں آگئی؟ یہ ہم سب مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے اور ہمیں اس سلسلہ میں اپنی صورتحال اور ذمہ داریوں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

2. دوسرا سوال آج کی ترقی یافتہ تہذیب کے علمبرداروں سے ہے جن کا دعوی ہے کہ ان کی تہذیب یعنی ویسٹرن سولائزیشن سب سے زیادہ ترقی یافتہ، جدید ترین اور مکمل تہذیب ہے اور یہ "اینڈ آف ہسٹری" ہے جس کے بعد تہذیب میں کسی مزید ارتقاء کی گنجائش نہیں ہے۔ میرا ان سے سوال یہ ہے کہ آپ نے تہذیب و ثقافت کی دنیا میں کون سی ایسی نئی قدر کا اضافہ کیا ہے جو اس جاہلی تہذیب میں نہ تھی جسے نبی اکرمؐ نے پاؤں کے نیچے روندنے کا اعلان فرمایا تھا؟ آپ نے کوئی نئی بات نہیں کی اور کسی نئی قدر اور روایت کا اضافہ نہیں کیا۔ وہی جاہلی تہذیب ہے جس کی پامال شدہ اقدار و روایات کو آپ نے نئے میک اپ اور اوورہالنگ کے ساتھ ایک بار پھر بنا سنوار کر انسانی سوسائٹی کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اور ہم پر آپ کا الزام یہ ہے کہ ہم انسانی سوسائٹی کو آج سے چودہ سو سال قبل کے ماحول میں واپس لے جانا چاہتے ہیں، ہمیں اس سے انکار نہیں ہے، لیکن آپ نے تو انسانی سوسائٹی کو اس سے بھی ہزاروں سال قبل کے ماحول میں پہنچا دیا ہے۔ آپ تو اپنے کلچر اور ثقافت کے حوالے سے حضرت لوط علیہ السلام کے زمانے میں کھڑے دکھائی دے رہے ہیں۔

آج کی یہ عالمی تہذیبی کشمکش ہمارے شعور و ادارک کے لیے چیلنج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، ارباب فکر و دانش کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس چیلنج کا سنجیدگی کے ساتھ سامنا کریں۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۴ جولائی ۲۰۰۴ء)

نیویارک کی دینی سرگرمیاں

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۷ جون ۲۰۰۴ء)

جمادی الاول کے آغاز میں مدرسے کے شش ماہی امتحان کا آغاز تھا جو ایک ہفتہ جاری رہنا تھا، اس کے بعد ایک ہفتہ کی تعطیلات تھیں۔ میں نے یہ چھٹیاں برطانیہ میں گزارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا مگر ویزے کی درخواست دینے میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ چھٹیوں کے اختتام سے قبل ویزا ملنے کا امکان مشکوک ہوگیا اس لیے ویزے کے لیے پاسپورٹ جمع کرانے کی بجائے میں نے امریکہ کے سفر کا ارادہ کر لیا جہاں سے دارالہدیٰ (اسپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ) کے مولانا عبدالحمید اصغر کی دعوت پہلے سے موجود تھی کہ میں یہ تعطیلات ان کے ہاں گزاروں۔ چنانچہ ۱۹ جون کی صبح ساڑھے تین بجے لاہور سے پی آئی اے کے ذریعے نیویارک روانگی ہوئی۔ امریکہ کا پانچ سالہ ملٹی پل ویزا میرے پاس پہلے سے موجود تھا اس لیے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ فلائٹ آٹھ گھنٹے کی پرواز کے بعد مانچسٹر پہنچی جہاں دو گھنٹے کا وقفہ تھا، ہم جہاز سے اتر کر لاؤنج میں گئے، کچھ گھومے پھرے اور واپس جہاز میں آگئے۔ مگر جہاز کی روانگی میں تاخیر ہوگئی، پہلے بتایا گیا کہ کچھ تکنیکی خرابی ہے جو ٹھیک کی جا رہی ہے، دو گھنٹے اسی میں گزر گئے، پھر معلوم ہوا کہ خرابی کو درست کر لیا گیا ہے مگر پاکستان سے جس مجاز افسر سے اگلے سفر کی کلیئرنس لینی ہے ان سے رابطہ نہیں ہو رہا اور ان کی اجازت کے بغیر جہاز پرواز نہیں کر سکتا۔ پون گھنٹہ اس انتظار نے لے لیا۔ مسافر اس دوران جہاز میں پیک رہے، خدا خدا کر کے اڑھائی پونے تین گھنٹے کی تاخیر کے بعد جہاز نے نیویارک کی طرف اڑان بھری تو مسافروں کی جان میں جان آئی ورنہ طرح طرح کی باتیں اور تبصرے سننے میں آرہے تھے۔

جہاز کو نیویارک کے وقت کے مطابق بارہ بجے دن جے ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اترنا تھا جو دو بجے کے لگ بھگ اترا۔ پاکستانی پاسپورٹ والوں کے لیے امیگریشن اور پھر کسٹم کے مراحل سے گزرنے کا مرحلہ خاصا صبر آزما ہوتا ہے اور پھر ڈھیلے ڈھالے لباس میں لمبی ڈاڑھی کے ساتھ امریکی افسروں کا سامنا کرنا ہو تو وسوسوں اور اندیشوں کی ایک نئی دنیا ذہن میں آباد ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ گیارہ ستمبر کے حادثے کے بعد سے صورتحال خاصی تبدیل ہوگئی ہے۔ مگر میرا اس کے بعد امریکہ کا یہ تیسرا سفر ہے اب تک الحمد للہ کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ گزشتہ سال مئی میں پہلی بار آیا تو کچھ الجھن پیش آئی تھی مگر اس میں خود میرا قصور

تھا کہ امیگریشن کارڈ میں اس مکان کا ایڈریس نہیں رکھ سکا تھا جہاں میں نے قیام کرنا تھا جبکہ قانونی طور پر یہ ضروری تھا۔ مگر میرے پاس وہ ایڈریس موجود نہیں تھا صرف فون نمبر یاد تھا اس لیے کچھ دیر رکاوٹ رہی پھر امیگریشن کے عملے نے خود اس فون پر رابطہ کر کے ایڈریس لیا اور مجھے انٹر ہونے کی اجازت دے دی۔ پاسپورٹ پر میرا پیشہ تدریس لکھا ہے اور مجھے ان اسفار میں اندازہ ہوا ہے کہ تدریس کے شعبے اور سفید ڈاڑھی کا بہرحال احترام پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے ان موہوم اندیشوں اور وسوسوں سے مجھے سابقہ درپیش نہیں ہوا جن کا خدشہ سفر سے پہلے بھی ذہن میں موجود رہتا ہے اور سفر کے بعد بھی۔ احباب زیادہ تر اسی کے بارے میں دریافت کرتے رہتے ہیں کہ امیگریشن کاؤنٹر پر کیا سوال و جواب ہوئے تھے اور آپ کو زیادہ تنگ تو نہیں کیا گیا؟

میں امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں ایک خاتون ڈیوٹی پر تھیں، انہوں نے پاسپورٹ کی ورق گردانی کی، مجھے بغور دیکھا، کوئی سوال و جواب کیے بغیر دونوں ہاتھوں کی انگشت شہادت کے پرنٹ لیے اور مہر لگا کر باہر جانے کی اجازت دے دی۔ کسٹم کاؤنٹر پر مجھے خدشہ تھا کہ کچھ الجھن ہو جائے گی اس لیے کہ گھر والوں نے وہاں کچھ عزیزوں تک پہنچانے کے لیے ہاتھ کی بٹی ہوئی سویوں کے چند پیکٹ میرے سامان میں ڈال دیے تھے، مجھے معلوم تھا کہ امریکہ میں کسٹم حکام سب سے پہلا سوال یہی کرتے ہیں کہ سامان میں فوڈ قسم کی کوئی چیز تو نہیں ہے؟ اب اس سوال پر غلط بیانی تو میرے مشکل تھی اور سچ بولنے پر تفصیلی چیکنگ اور تفتیش کے مرحلے سے گزرنا پڑ سکتا تھا۔ کسٹم کارڈ میں یہ خانہ میں نے خالی چھوڑ دیا اور سوال و جواب کی صورت میں ذہنی طور پر یہ طے کر لیا کہ بتا دوں گا کہ میرے پاس اس قسم کی چیز سامان میں موجود ہے اگر چیک کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔ مگر اس کا مرحلہ نہیں آیا البتہ یہ ہوا کہ جب سامان وصول کر کے ٹرالی پر رکھنا چاہا تو وہ "آزاد" نہیں تھی۔ مجھے یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ امریکی ایئرپورٹس پر ٹرالی مفت میں نہیں ملتی بلکہ اس کے لیے تین ڈالر ڈالنا پڑتے ہیں۔ میرے پاس پاکستانی کرنسی تھی، ڈالر سرے سے کوئی نہیں تھا۔ اب دو ہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ کرنسی تبدیل کراؤں اور پھر ٹرالی حاصل کروں جبکہ دوسری صورت یہ تھی کہ سامان خود اٹھا کر باہر لے جاؤں۔ میں نے دوسری صورت کو ترجیح دی اور دونوں ہاتھوں میں وزنی بیگ اٹھائے ہوئے جب میں کسٹم آفیسر کے پاس سے گزرا اور اسے کسٹم کارڈ دیا تو خدا جانے یہ سفید ڈاڑھی کا احترام تھا یا اسے میری اس مشقت پر ترس آگیا کہ اس نے کارڈ کی طرف

دیکھے یا کوئی سوال کیے بغیر مجھے اشارہ کیا کہ میں باہر جا سکتا ہوں، چنانچہ ایک موہوم خدشے سے جان چھوٹ گئی اور میں ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر آ گیا۔

دارالعلوم نیویارک کے مہتمم مولانا مفتی روح الامین اپنے رفقاء سمیت انتظار میں تھے۔ مولانا مفتی روح الامین کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے، نیویارک کے کوئنز کے علاقے میں دارالعلوم کے نام سے دینی ادارہ چلا رہے ہیں، یہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی طرز کا دینی مدرسہ ہے جہاں حفظ قرآن کریم اور درس نظامی کی تعلیم ہوتی ہے۔ موجودہ عمارت کرائے کی ہے، اب کم و بیش ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر کنیکٹیکٹ میں کئی ایکڑ زمین ایک پرانے اسکول کی عمارت سمیت خریدی ہے اور درس نظامی کا حصہ وہاں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جبکہ حفظ قران کریم کا شعبہ کرائے کی پرانی عمارت میں ہی موجود ہے جو کوئنز کے علاقے میں جمیکا اسٹریٹ کے کونے پر واقع ہے۔ گزشتہ سال جب میں چند دن یہاں رہا تو گیارہ بچوں کے قرآن کریم حفظ مکمل ہونے کی تقریب میں شرکت کی تھی۔ مفتی روح الامین صاحب بڑے باذوق اور علماء سے محبت کرنے والے دوست ہیں۔ پاکستان، بنگلہ دیش یا بھارت سے کوئی بھی عالم دین آئے تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دارالعلوم ضرور آئے اور ان کے ہاں قیام کرے۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ دنوں دارالعلوم دیوبند کے حضرت مولانا سعید احمد پالنپوری تشریف لائے ہوئے تھے اور اگلے ہفتے پاکستان سے حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی ان کے ہاں آ رہے ہیں۔

مفتی صاحب کے ہمراہ ہم ان کے دارالعلوم پہنچے، نماز ادا کی، کھانا کھایا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرما دیا کہ عصر تک آپ آرام کر لیں کیونکہ اس کے بعد کوئنز کے علاقے میں واقع ”فلاشنگ مسلم سنٹر“ میں ایک بچے کے حفظ قرآن کریم مکمل ہونے کی تقریب ہے اور ہم نے اس میں آپ کی شرکت کا وعدہ کر لیا ہے۔ اکیس گھنٹے مسلسل جہاز میں گزارنے کے بعد میرا ارادہ تو یہ تھا کہ ایک آدھ دن صرف آرام ہی کروں گا مگر ایسے مخلص دوستوں کی فرمائش کو ٹالنے کا عادی بھی نہیں ہوں۔ چنانچہ آدھ پون گھنٹے کے آرام کے بعد ہم فلاشنگ مسلم سنٹر جا پہنچے۔ پشاور سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ جلال الدین صاحب جو نیویارک کے تبلیغی مرکز مسجد الفلاح کی انتظامیہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے بچے حافظ عزیز الدین نے دس سال کی عمر میں اسی مسلم سنٹر میں قران کریم حفظ مکمل کیا ہے، اس کی خوشی میں

اس تقریب کا اہتمام تھا۔ علماء کرم اور قرآء و حفاظ کی ایک بڑی تعداد جمع تھی، خواتین و حضرات کا بھرپور اجتماع تھا اور خطابات کے ساتھ ڈنر کا اہتمام بھی تھا۔

مجھے خطاب کے لیے کہا گیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس کے حافظ آج بھی دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جبکہ کسی اور الہامی یا غیر الہامی کتاب کو ایسے حفاظ میسر نہیں ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ نیویارک بہت بڑا اور مسیحی اکثریت کا شہر ہے اس میں مسلمانوں کی آبادی شاید ایک یا دو فیصد ہوگی لیکن اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ اس شہر میں قرآن کریم کے حافظوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہو سکتی ہے تو یہ مبالغے کی بات نہیں ہوگی۔ جبکہ اس کے برعکس یہاں کی غالب اکثریت آبادی کی مذہبی کتاب ”انجیل“ کا ایک حافظ بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے جو اس کی صداقت و حقانیت پر آج بھی ایک زندہ شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

تقریب سے فراغت کے بعد لانگ آئی لینڈ کی مسجد نور کے خطیب مولانا قاری اعجاز احمد مجھے اپنے ساتھ لے گئے، وہ کافی عرصہ گوجرانوالہ میں رہے ہیں اور ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے نماز فجر کے بعد درس قرآن کریم کا اہتمام کر رکھا تھا اس لیے رات انہی کے ہاں قیام کیا۔ صبح درس کے بعد ناشتے پر احباب کی ایک اچھی خاصی نشست ہوگئی، زیادہ تر دوست پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔ عالم اسلام اور پاکستان کی مجموعی صورتحال پر ان دوستوں سے کھل کر بات ہوئی، بہت سی گفتنی اور ناگفتنی باتیں بھی ہوئیں، پھر دوست مجھے مین ہیٹن کے جنرل بس اسٹینڈ تک چھوڑنے آئے، وہاں سے گرے ہاؤنڈ کی نان اسٹاپ بس کے ذریعے چار گھنٹے کا سفر کر کے میں ایک بجے واشنگٹن ڈی سی پہنچ گیا جہاں دار الہدیٰ کے مہتمم مولانا عبد الحمید اصغر استقبال کے لیے لاری اڈے پر موجود تھے۔

امریکہ کا سفر

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۴ جون ۲۰۰۴ء)

میں ایک بار پھر واشنگٹن (ڈی سی) میں ہوں اور یہ گزشتہ ڈیڑھ برس کے دوران میرا امریکہ کا تیسرا سفر ہے۔ اس دفعہ میرا امریکہ آنے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ دو ہفتے کی یہ تعطیلات

برطانیہ میں گزارنے کا پروگرام تھا مگر تقدیر کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے اس لیے پروگرام اچانک تبدیل ہوا اور میں لندن کی بجائے واشنگٹن میں بیٹھا یہ سطور تحریر کر رہا ہوں۔ بہت سے دوستوں کو حیرت ہوتی ہے اور بعض دوست یہ دریافت بھی کر لیتے ہیں کہ یہ بار بار امریکہ کا آنا جانا آخر کیا ہے، تمہیں ویزہ کیسے مل گیا ہے، امریکہ میں داخل کیسے ہو جاتے ہو اور تمہارا خرچہ کون برداشت کرتا ہے؟ میں جواب میں عرض کرتا ہوں کہ ویزہ تو میرے پاس ۱۱ستمبر کے سانحہ سے پہلے کا ہے جو پانچ سال کے لیے ہے اور اگلے سال ستمبر کے آخر تک کارآمد ہے۔ اور امیگریشن کے مراحل میں خود میرا ذہن وسوسوں اور خدشات کا شکار رہتا ہے مگر بحمد اللہ تعالیٰ اب تک کے تین اسفار میں کوئی الجھن اور پریشانی نہیں ہوئی بلکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ مجھے ہمیشہ احترام ملا ہے، سوائے ایک آدھ موقع کے کہ اس میں میرے اپنے ہی کسی قصور کا دخل تھا۔ اس احترام کی وجہ شاید سفید ڈاڑھی ہے، یا پاسپورٹ میں پیشہ کے خانہ میں "تدریس" کا اندراج ہے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ قانون کی پابندی کا بطور خاص اہتمام کرتا ہوں۔ میں اپنے مشن کے حوالہ سے جو کچھ بھی کر سکتا ہوں اس سے گریز نہیں کرتا لیکن میری حتی الوسع کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی کام بھی قانون کے دائرہ سے باہر نہ ہو۔ باقی رہی بات خرچ اخراجات کی تو اللہ تعالیٰ میرے ان دوستوں کو سلامت رکھیں اور دونوں جہانوں کی سعادتوں سے نوازیں جن کی وجہ سے گزشتہ بیس سال کے مسلسل اسفار میں کسی سفر کا پروگرام طے کرتے ہوئے بحمد اللہ تعالیٰ یہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ خرچہ کہاں سے ہوگا؟ یہ سب دین کی برکات ہیں۔

ہفتہ کو دو بجے دن پی آئی اے کے ذریعہ نیویارک پہنچا تو دارالعلوم نیویارک کے مہتمم مولانا مفتی روح الامین اپنے رفقاء کے ہمراہ استقبال کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھے، وہ مجھے دارالعلوم لے گئے جہاں نماز پڑھی، کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کے بعد ہم کوئینز کے علاقہ میں "فلاشنگ مسلم سنٹر" پہنچے جہاں ایک بچے کا حفظ قرآن کریم ختم ہونے پر تقریب کا اہتمام تھا۔ وہاں سے لانگ آئی لینڈ کے علاقہ سلیڈن میں واقع مسجد نور میں حاضری ہوئی جہاں ہمارے پرانے دوست مولانا قاری اعجاز احمد خطیب و امام ہیں، وہ کافی عرصہ گوجرانوالہ رہے ہیں اور اب چند برسوں سے امریکہ میں ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد مختصر درس دیا اور پھر ناشتہ پر احباب سے ملاقات ہوئی۔

اس کے بعد بذریعہ بس واشنگٹن جانے کا پروگرام تھا، انہیں میں سے دو ساتھی مجھے مین ہیٹن کے جنرل بس سٹینڈ تک چھوڑنے کے لیے آئے، راستہ میں خوب گپ شپ رہی، ایک صاحب جو گاڑی چلا رہے تھے خاصے باذوق نکلے، انہوں نے علامات قیامت اور دجال پر بات چھیڑ دی، معلوم ہوا کہ قیامت کی علامات کے حوالہ سے انہوں نے احادیث نبویؐ کا مطالعہ کر رکھا ہے اور ان میں سے ہر حدیث کا کوئی نہ کوئی مفہوم اور مصداق بھی اپنے ذہن کے مطابق طے کیے ہوئے ہیں۔ دجال کے بارے میں ان کا خیال ہے اور ان کے علاوہ بھی بہت سے دوست کہتے ہیں کہ احادیث نبویہؐ میں جس دجال کا ذکر ہے اس سے مراد امریکہ اور اس کی دجالی تہذیب ہے۔ وہ ایک ڈالر کی ایک جانب بنی ہوئی ایک آنکھ پر دجال کی کانی آنکھ کا اطلاق کرتے ہیں اور اسی طرح احادیث میں بیان کردہ مختلف علامتوں کا مختلف امور پر اطلاق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے بھی ڈالر کا نوٹ سامنے رکھ کر انہوں نے یہ فلسفہ سمجھانا چاہا، میں نے عرض کیا کہ یہ فلسفہ میں نے پہلے سے سن اور سمجھ رکھا ہے اور اس سلسلہ میں مختلف دوستوں کی تاویلات و تعبیرات میرے علم میں ہیں۔ وہ یہ بات جان کر بہت خوش ہوئے کہ جو بات وہ مجھے بتانا اور سمجھانا چاہتے ہیں وہ پہلے سے میں جانتا ہوں، اس پر انہوں نے میری رائے پوچھی۔

میں نے عرض کیا کہ اس حوالہ سے ایک اصولی بات عرض کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت سے قبل جن امور کے واقع ہونے کی پیش گوئی فرمائی ہے کیا وہ بعینہ اسی صورت میں واقع ہوں گے جیسے بیان کیے گئے ہیں یا اس سے مختلف بھی ان کے وقوع کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں کیا ان پیش گوئیوں کو ظاہری معنوں پر محمول کرنا ضروری ہے یا ان کی کوئی اور تعبیر اور تاویل بھی ہو سکتی ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی ایک پیش گوئی کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سورۃ الدخان میں ”البطشۃ الکبریٰ“ اور ”دخان“ کی پیشگوئی کا تذکرہ ہے جس کے بارے میں بہت سے مفسرین کرامؒ کا ارشاد ہے کہ دخان سے مراد وہ دھواں ہے جو قیامت سے قبل آسمان دنیا پر نمودار ہوگا اور قیامت کی نشانیوں میں سے ہوگا۔ مگر بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ یہ فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں جناب رسول اللہؐ کی دعا سے قریش پر قحط سالی کا عذاب آیا تھا اور بھوک کی شدت سے یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ انہیں آسمان پر دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا تھا، حقیقت میں فضا میں کوئی دھواں نہیں تھا

بلکہ بھوک کی شدت کی وجہ سے محسوس ایسے ہوتا تھا جیسے ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ قرآن کریم میں جس ’’دخان‘‘ کا تذکرہ ہے وہ یہی مکہ مکرمہ کے لوگوں کو بھوک کی وجہ سے محسوس ہونے والا دھواں ہے اور یہ بات وقوع پذیر ہو چکی ہے۔

اس اختلاف کے دیگر پہلوؤں سے قطع نظر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس ارشاد گرامی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کریم یا حدیث نبویؐ کی کسی پیش گوئی کے ظاہری معنی سے ہٹ کر الگ تعبیر اور تاویل کی گنجائش موجود ہے اس لیے جو علماء کرام یا اہل دانش ان پیش گوئیوں کی وقتی حالات یا واقعات کے پیش نظر مختلف تاویلات کرتے ہیں انہیں قطعی طور پر غلط نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ایک بات اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ تاویل اور تعبیر کو اندازہ اور ظن کے درجہ میں ہی رکھا جائے اسے یقین اور اعتماد کے ساتھ حتمی صورت میں بیان نہ کیا جائے کیونکہ حتمی بات کا علم صرف اللہ تعالی کے پاس ہے۔ نیز کسی پیش گوئی کے ظاہری معنوں کے ساتھ واقع ہونے کے امکان کی نفی نہ کی جائے کیونکہ مستقبل کے امکانات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بہت سی باتیں جو آج سے نصف صدی قبل ناممکن نظر آتی تھیں اب وقوع پذیر ہو چکی ہیں اور بہت سے امور جو آج ناقابل عمل دکھائی دیتے ہیں اب سے بیس تیس برس بعد ان کے قابل عمل اور وقوع پذیر ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ خیر یہ بات تو درمیان میں اس دوست کی گفتگو کے حوالے سے آگئی جو مجھے مین ہیٹن کے جنرل بس سٹینڈ تک پہنچانے گئے تھے۔

نیویارک سے واشنگٹن ڈی سی جانا تھا۔ گزشتہ سال بھی میں نے یہ سفر بس میں کیا تھا مگر اس بار یہ فرق نظر آیا کہ گزشتہ سال ٹکٹ خریدتے وقت کاؤنٹر پر مجھ سے شناخت کا ثبوت پیش کرنے کے لیے کہا گیا اور میرا پاسپورٹ اور ویزہ دیکھ کر ٹکٹ دیا گیا اب کے ایسا نہیں ہوا اور صرف نام لکھوانے پر ٹکٹ جاری کر دیا گیا۔ نان سٹاپ بس کے ذریعے چار گھنٹے کے سفر کے بعد واشنگٹن ڈی سی کے بس سٹیشن پر سوا ایک بجے دن پہنچا تو دارالہدی سپرنگ فیلڈ کے ڈائریکٹر مولانا عبدالحمید اصغر انتظار میں تھے، انہوں نے میرے دارالہدی میں نوروزہ قیام کے دوران روزانہ مغرب کے بعد درس کا اعلان کر رکھا ہے اور ان کا اصرار تو یہ ہے کہ میں ۶ جولائی کو اپنی واپسی تک یہیں قیام کروں مگر نیویارک کے دوستوں کے تقاضے پر یہاں

سے ۲۹ جون کو نیویارک چلا جاؤں گا جہاں دو تین روز قیام کر کے ۶ جولائی کو شام پاکستان واپسی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امریکہ میں ان دنوں نومبر میں ہونے والا صدارتی انتخاب عام طور پر موضوع بحث ہے، صدر جارج ڈبلیو بش کو ڈیموکریٹک حریف جان کیری کا سامنا ہے جو اگرچہ اس قدر مضبوط حریف نہیں سمجھے جا رہے لیکن آج کے امریکی اخبار کی رپورٹ کے مطابق صدر بش کو ہرانے کے عوامی جذبے میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جس کا فائدہ ظاہر ہے جان کیری کو ہی ہو گا۔ گزشتہ روز ایک پاکستانی دوست جو طویل عرصہ سے امریکہ میں رہتے ہیں اور اب امریکی شہری ہیں کہہ رہے تھے کہ عام امریکیوں کا تاثر یہ ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی جب برسر اقتدار آتی ہے تو اس کی زیادہ تر توجہ داخلی مسائل پر ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس ری پبلکن پارٹی کی ترجیحات میں خارجہ پالیسی اور دنیا پر امریکہ کی چودھراہٹ قائم کرنے کو اولیت حاصل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے داخلی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب بھی صدر بش کی پالیسیوں کی وجہ سے امریکہ کے اندر مسائل بڑھ رہے ہیں اور مہنگائی میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے عام امریکی شہری پریشانی میں ہیں، ان کا خیال ہے کہ اگر ڈیموکریٹک پارٹی امریکی عوام کی اس پریشانی کو صحیح طریقہ سے کیش کرانے میں کامیاب رہی تو صدر بش کے لیے دوسری بار صدارت کے منصب پر فائز ہونا شاید ممکن نہ رہے۔

فہم قرآن کریم کی اہمیت اور اس کے تقاضے

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۵ جون ۲۰۰۴ء)

گزشتہ روز نماز مغرب کے بعد مسجد وکیلاں والی (سیٹلائیٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ) میں ترجمہ قرآن کریم کے ایک کورس کی افتتاحی تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ مدرسہ مظاہر العلوم گوجرانوالہ کے استاد حدیث مولانا محمد داؤد نے اسکولوں اور کالجوں کی تعطیلات کے دوران نوجوانوں کے لیے اس خصوصی کورس کا اہتمام کیا ہے جس میں قرآن کریم کے منتخب حصوں کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ضروریات دین اور عربی زبان کے بنیادی قواعد کی تعلیم دی جائے گی۔ شہر کے علمائے کرام، طلبہ، دینی کارکنوں، تاجروں اور وکلاء کی ایک بڑی تعداد نے تقریب میں شرکت کی اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے دعا کے ساتھ کلاس کا افتتاح فرمایا۔ اس تقریب میں راقم الحروف کو فہم قرآن کریم

کی اہمیت اور اس کے ضروری تقاضوں کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا جن کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہے۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ہمارے لیے ہے۔ جب یہ بات بطور عقیدہ ہمارے ذہن میں آجاتی ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے لیے اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ کسی بھی پیغام کا پہلا حق یہی ہوتا ہے کہ اسے پڑھا جائے، سمجھا جائے اور پیغام بھیجنے والے کے مقصد سے آگاہی حاصل کی جائے۔ پیغام کسی دوست کا ہو، دفتری خط ہو، عدالتی سمن ہو، کاروباری لیٹر ہو حتیٰ کہ کسی دشمن کا پیغام بھی ہو تو منطقی طور پر اسے وصول کرنے والے کی پہلی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے پڑھے اور سمجھے کہ پیغام بھیجنے والے نے اسے کیا کہا ہے اور اس سے کس بات کا تقاضا کیا ہے۔ زبان سے آگاہ نہ ہونا ان میں سے کسی پیغام کو سمجھنے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ اور اگر کسی شخص کو کوئی پیغام ایسی زبان میں ملا ہے جس سے وہ واقف نہیں ہے لیکن یہ اسے معلوم ہے کہ پیغام اسی کے نام ہے تو وہ زبان سے ناواقفیت کا بہانہ کر کے اس خط کو ایک طرف نہیں ڈال دے گا بلکہ زبان جاننے والے کو تلاش کرے گا اور جب تک اسے پیغام کی تفصیل معلوم نہیں ہو جائے گی اس خط کو وہ ادھر ادھر نہیں ہونے دے گا۔ مگر بدقسمتی سے وہ عذر جو کسی اور پیغام کے لیے ہم روا نہیں سمجھتے اسے ہم نے قرآن کریم کے لیے عملاً اختیار کر رکھا ہے۔ قرآن کریم کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے، ہمارے خالق و مالک کا پیغام ہے، رازق و حاکم کا پیغام ہے اور ہمارے نام ہے۔ لیکن اسے سمجھنے کی طرف اس لیے توجہ نہیں دیتے کہ وہ عربی زبان میں ہے اور ہم عربی زبان سے ناواقف ہیں۔ یہ قرآن کریم کی حق تلفی ہے کیونکہ قرآن کریم کے ہمارے ذمے جو حقوق ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہم اسے سمجھیں اور اللہ تعالیٰ کے پیغام اور منشا سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

قرآن کریم کو سمجھنا ہماری ضرورت ہے اور یہ ضرورت بہت سے حوالوں سے ہے۔ ان میں سے بطور مثال ایک پہلو کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ بس میں سفر کرتے ہوئے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ایک مسافر نے مجھ سے کہا کہ میں ایک الجھن کا شکار ہوں آپ میری راہنمائی کریں۔ الجھن یہ ہے کہ ہمارے ہاں مختلف علمائے کرام آتے ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف مسائل بیان کرتے ہیں لیکن سب قرآن کریم کی آیات پڑھتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب آتے ہیں ایک مسئلہ بیان کرتے ہیں اور قرآن کریم کی دو چار

آیات پڑھ دیتے ہیں۔ چند روز کے بعد دوسرے مولوی صاحب آتے ہیں وہ اس سے الٹ مسئلہ بیان کرتے ہیں اور وہ بھی قرآن کریم کی چند آیات تلاوت کر دیتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے الجھن ہوتی ہے کہ دونوں قرآن کریم پڑھ رہے ہیں ہم ان میں سے کس کی بات مانیں اور کس کی نہ مانیں؟ آپ اس الجھن کا کوئی حل بتائیں۔

میں نے ان صاحب سے عرض کیا کہ آپ کا کوئی بچہ سکول میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہا ہے، اگر میں اس بچے سے باتیں کرتے ہوئے انگریزی کا کوئی لفظ بولوں اور اس کا غلط ترجمہ کر دوں تو کیا وہ اس کو مان لے گا؟ مثال کے طور پر کیٹ کا ترجمہ میں بلی کی بجائے چوہا کر دوں تو کیا وہ اسے تسلیم کر لے گا؟ کہنے لگے ہرگز نہیں! میں نے عرض کیا کہ مجھے بھی یقین ہے کہ وہ میری بات نہیں مانے گا اور میں اپنا خود ساختہ ترجمہ اسے منوانے کے لیے کتنی ہی چرب زبانی سے کام لوں کتنے ہی اچھے اسلوب میں گفتگو کروں، اشعار پڑھوں، ترنم میں خطاب کروں مگر وہ میری کسی بات سے متاثر نہیں ہوگا اور صاف کہہ دے گا کہ مولوی صاحب! کیٹ کا معنی چوہا نہیں بلی ہے، اس لیے کہ وہ اس لفظ کا ترجمہ جانتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ ایک چھوٹا بچہ انگلش کے کسی لفظ کا غلط ترجمہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا مگر آپ بڑے اور سیانے لوگ مختلف اور متضاد معانی کے لیے قرآن کریم کی آیات جھوم جھوم کر سنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ خود قرآن کریم کو نہیں سمجھتے اور کلام اللہ کے ساتھ آپ کا فہم کا تعلق نہیں ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی چند آیات پڑھ کر جو شخص بھی کوئی مسئلہ آپ کے سامنے بیان کر دے آپ خاموشی کے ساتھ سن لیتے ہیں۔ میں اس حوالہ سے غلط بیان کرنے والے کے قصور کو مانتا ہوں مگر اس سے قبل آپ مجرم ہیں کہ آپ کی بے خبری اور ناواقفیت کی وجہ سے ہی کسی کو آپ کے سامنے ایسا کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اس کی بجائے اگر آپ خود قرآن کریم کو سمجھتے ہوں اور عربی گرائمر سے تھوڑا بہت واقف ہوں تو کسی کو آپ کی بے خبری سے فائدہ اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم کو سمجھنا یہ ہماری ضرورت بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے معاشرے میں قرآن کریم کا فہم عام ہو جائے تو ہمارے اس طرح کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی میں فہم قران کریم کے ایک ضروری تقاضے کی طرف آپ کو توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ اس سلسلہ میں ہمارے ہاں بہت زیادہ افراط و تفریط پائی جاتی ہے:

- ایک طرف یہ ذہن ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے، اس کو سمجھنے کے لیے بہت سے علوم پر مہارت کا ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر قران کریم کے ترجمہ اور مفہوم کی طرف توجہ دینا غلط ہے، اس لیے قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہو اور اس کے سمجھنے کا معاملہ صرف علمائے کرام پر چھوڑ دو۔ یہ ایک طرف کی انتہا ہے۔
- جبکہ دوسری طرف کی انتہا یہ ہے کہ جس شخص کو عربی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ قرآن کریم کو تھوڑا بہت سمجھنے لگتا ہے تو وہ مفتی اور شارح بن جاتا ہے، پھر اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تعبیر و تشریح میں اسے اتھارٹی تسلیم کیا جائے اور ہر دینی مسئلہ میں ٹانگ اڑانا وہ اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔

یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ عام مسلمان کو قرآن کریم کے سمجھنے کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے اور یہ بھی غلط ہے کہ جس کو تھوڑا بہت قرآن کریم سمجھ آنے لگے وہ اتھارٹی بن کر بیٹھ جائے اور دین کے ہر مسئلہ پر رائے دینا شروع کر دے۔ قرآن کریم کے نفس مفہوم کو سمجھنا اور چیز ہے اور یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کی ذمہ داری ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے سمجھ رہا ہو کہ اس آیت میں کس چیز کا حکم ہے اور کیا تقاضا کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی تشریح کا حق اور اس سے مسائل واحکام کے استنباط کا حق اس سے بالکل مختلف چیز ہے اور یہ صرف اس عالم کا حق ہے جو قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کی شرائط کا حامل ہے اور مسلمہ اصولوں کے مطابق وہ اس کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔

چونکہ یہ مسجد وکیلاں والی کہلاتی ہے اور شرکائے محفل میں بہت سے وکلاء موجود ہیں اس لیے میں ان کی زبان میں یہ مسئلہ واضح کرنا چاہوں گا کہ قانون سے آگاہ ہونا اور بات ہے اور قانون کی تشریح کرنا اس سے بالکل مختلف امر ہے۔ قانون سے آگاہ ہونا ملک کے ہر شہری کی ذمہ داری ہے اور ملک کی کسی سطح کی عدالت کسی ملزم کا یہ موقف قبول نہیں کرے گی کہ چونکہ وہ متعلقہ قانون سے واقف نہیں تھا اس لیے اس سے قانون شکنی کا جرم ہو گیا

ہے۔ اس کا یہ عذر کہیں بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ ملک کے شہری کی حیثیت سے یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوانین سے آگاہ ہو، اس لیے بے خبری کسی قانون کی خلاف ورزی کا عذر نہیں بن سکتی۔ مگر قانون کی تشریح کا حق ہر شخص کو حاصل نہیں ہے اور نہ ہی اس پر بحث کرنے اور دلائل دینے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ قانون کی تشریح اعلی عدالتوں کا کام ہے ان کے سوا کوئی قانون کی تشریح نہیں کر سکتا، جبکہ قانون پر بحث کرنا اور دلائل دینا وکلاء کا حق ہے ان کے علاوہ کوئی عدالت کسی شخص کو، خواہ اس کا قانون کا مطالعہ کتنا وسیع کیوں نہ ہو، کسی قانون کی تشریح میں دلائل دینے اور بحث کرنے کا حق نہیں دے گی۔

اس لیے جس طرح قانون سے واقف ہونا ہر شہری کا صرف حق نہیں بلکہ ذمہ داری ہے لیکن قانون پر بحث کرنا وکلاء کا اور اس کی تشریح کرنا اعلی عدالتوں کے جج صاحبان کا حق ہے، اسی طرح قرآن کریم کے نفس مفہوم سے واقف ہونا ہر مسلمان مرد و عورت کی ذمہ داری ہے لیکن اس کی تشریح کرنا اور اس کے بیان کردہ مسائل پر بحث کرنا ان علمائے کرام کا کام ہے جو اس کی صلاحیت و اہلیت رکھتے ہیں اور اس کی مسلمہ شرائط پر پورے اترتے ہیں۔

فہم قرآن کریم کے ان ضروری تقاضوں کو ہم ملحوظ رکھیں گے تو قرآن کریم کے ساتھ ہمارا فہم و ادراک کا تعلق قائم ہوگا اور بہت سی گمراہیوں سے بچے رہیں گے۔ ان گزارشات کے ساتھ ترجمہ قرآن کریم کی اس کلاس کے آغاز پر آپ سب کو مبارکباد دیتا ہوں اور اس کی زیادہ سے زیادہ افادیت کے لیے دعاگو ہوں، آمین یارب العالمین۔

حضرت عیسیٰؑ کی تصلیب اور موجودہ مسیحی مذہبی قیادت کا مخمصہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۱ جون ۲۰۰۴ء)

اسرائیل کی حمایت میں اس وقت یہودی اور مسیحی امتوں میں اتحاد ہے اور اسرائیلی ریاست کو تحفظ فراہم کرنے میں مغرب کی مسیحی حکومتیں یہودیوں سے بھی دو ہاتھ آگے دکھائی دے رہی ہیں۔ حالانکہ گزشتہ دو ہزار برس میں یہودیوں اور مسیحیوں کے مابین کھلی عداوت رہی ہے اور مسیحی حکومتوں کے ہاتھوں یہودیوں کا مسلسل قتل عام ہوتا رہا ہے۔

یہودیوں کے نزدیک حضرت عیسی علیہ السلام نہ صرف یہ کہ نبی نہیں ہیں بلکہ بغیر باپ کے جنم لینے کی وجہ سے حضرت عیسی اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام دونوں نعوذ باللہ شرمناک الزام کا ہدف چلے آرہے ہیں۔ جبکہ مسیحیوں کی طرف سے اب تک یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ان کے بقول حضرت عیسیٰؑ مصلوب ہوئے ہیں تو ان کے سولی پر چڑھنے اور قتل ہونے کی ذمہ داری یہودیوں پر عائد ہوتی ہے اور یہودی حضرت عیسیٰؑ کے قاتل ہیں۔ قرآن کریم نے ان دونوں باتوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اصل پوزیشن واضح کی ہے۔ قرآن کریم نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے لیکن اس کی وجہ اللہ تعالی کی قدرت کا اظہار ہے کہ جس طرح اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو باپ کے بغیر پیدا کر کے اپنی قدرت کا اظہار فرمایا۔ جبکہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں پاک دامن اور راست باز تھے۔

حضرت عیسی علیہ السلام کو مصلوب کرنے کے واقعہ کی قرآن کریم نے تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ دشمن انہیں سولی تک نہیں لے جا سکا تھا اور اشتباہ کا شکار ہو گیا تھا اور اللہ تعالی نے حضرت عیسیٰؑ کو سولی دیے جانے سے قبل زندہ حالت میں آسمان کی طرف اٹھا لیا تھا، ان پر ابھی تک موت وارد نہیں ہوئی۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے، حضرت امام مہدیؒ کے دور میں دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی مینار پر اتریں گے، یہودیوں کا مقابلہ کریں گے، دجال کو قتل کریں گے، اسلامی خلافت کا احیا کریں گے، ان کی شادی ہوگی، بچے ہوں گے، مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوگا اور آنحضرتؐ کے روضۂ اطہر میں دفن ہوں گے جہاں ان کے لیے ایک قبر کی جگہ خالی چلی آرہی ہے۔ البتہ اس بات کی قرآن کریم نے تائید کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کی یہودیوں نے کوشش کی اور ان کی دعوت قبول کرنے کی بجائے دشمنی اور عداوت کا راستہ اختیار کیا تھا اور ان کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔

مگر گزشتہ عیسوی صدی کے آغاز میں یہودیوں نے اسرائیلی ریاست کے قیام کے سلسلہ میں خلافت عثمانیہ سے مایوس ہو کر مسیحی ریاستوں کا رخ کیا اور مسیحی دنیا کو بتدریج لادینیت اور سیکولرازم کی راہ پر ڈال کر آلۂ کار بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ پھر مغرب کی مسیحی ریاستوں کے تعاون سے خلافت عثمانیہ کا تیا پانچہ کرانے کے بعد فلسطین پر قبضہ کرنے اور

اسرائیل کے نام سے یہودیوں کی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مسیحی دنیا کے سیاست کاروں اور سیکولر حلقوں کا یہ عمل تو کسی حد تک قابل فہم تھا لیکن یہ بات اس وقت مضحکہ خیز صورت اختیار کر گئی جب یہودیوں کی ہمنوائی اور ان کی حمایت و پشت پناہی میں مسیحی دنیا کے مذہبی حلقوں نے بھی اپنے دو ہزار سالہ موقف اور تاریخی مذہبی حقائق کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس وقت مغرب کے مسیحی کلیساؤں میں یہ بحث از سر نو شروع ہوگئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر کس نے لٹکایا تھا اور کیا ان کے مبینہ قتل میں یہودیوں کا ہاتھ نہیں ہے؟ اس بحث کا تذکرہ گوجرانوالہ سے شائع ہونے والے مسیحی جریدہ ماہنامہ کلام حق نے مئی ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں کیا ہے اور تفصیلی بحث کے بعد لکھا ہے کہ:

> ”اب دو ہزار سال کے بعد اگر مغربی کلیسائیں یہودیوں کو خداوند یسوع مسیح کی موت سے بری الذمہ قرار دیتی ہیں تو اس کی کوئی مذہبی اور تاریخی اہمیت نہیں۔ یہ تمام پراپیگنڈا یہودیوں کے ایما پر ان کو خوش کرنے کے لیے، سیاسی اور معاشی فائدہ اٹھانے کے لیے اور موجودہ سلطنت اسرائیل کی بقا کے لیے عام مسیحی کی برین واشنگ کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ یہودیوں کو معصوم مطلق مان لیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہودی قوم کی گردن پر اور ان کی اولاد کی گردن پر خداوند یسوع مسیح کا خون ہے جس کا خمیازہ وہ دو ہزار سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک بھگت رہے ہیں اور خداوند یسوع مسیح کی واپسی تک بھگتتے رہیں گے۔“

حضرت عیسیٰؑ کی سولی کے بارے میں مسیحی دنیا کا اب تک یہ روایتی اور کم و بیش متفقہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ یہودیوں نے انہیں سولی پر لٹکانے کا اہتمام کیا تھا جس میں وہ کامیاب ہوگئے تھے، حضرت عیسیٰؑ مصلوب ہوئے تھے، اس کے بعد قبر میں دفن کیے گئے تھے، تین دن کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر قبر سے نکلے تھے اور پھر آسمانوں پر اٹھا لیے گئے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کا دوبارہ نزول مسیحی دنیا کے عقائد میں بھی شامل ہے جس کے مطابق وہ دنیا میں ایک بار پھر خدا کی بادشاہت (مسیحی ریاست) قائم کریں گے اور یہودیوں کو ختم کریں گے۔ چنانچہ بعض مسیحی فرقوں کے نزدیک چونکہ حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ نزول سے قبل یہودیوں کا ایک جگہ مجتمع ہونا اور اسرائیل کے نام سے ریاست قائم کرنا ضروری ہے اس لیے یہودیوں کے ساتھ مسیحی دنیا کا موجودہ تعاون اس شرط کو پورا کرنے کے لیے ہے تاکہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ نزول کی شرائط جلد از جلد پوری ہوں اور وہ دنیا میں تشریف لاکر مسیحی بادشاہت کے قیام کا اعلان کرسکیں۔

لیکن اس سے قطع نظر یہودیوں کو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ دشمنی اور ان کے مبینہ قتل کے الزام سے بری قرار دینے کے لیے مسیحی دنیا کے مذہبی حلقوں کی کوششیں ناقابل فہم ہیں اور شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چونکہ مسیحی دنیا کے نزدیک ان کی مذہبی قیادت کو عقائد کی کسی بھی تعبیر اور احکام میں نسخ اور ردوبدل کا مکمل اختیار حاصل ہے اس لیے مغرب کی مسیحی کلیسائیں یہودیوں کو حضرت عیسیٰؑ کے مبینہ قتل کا ذمہ دار قرار دینے کے بارے میں نئی تعبیر کی راہ ہموار کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر بات صرف عقائد کی نہیں تاریخی حقائق کی بھی ہے اور تاریخی حقائق میں نسخ نہیں ہوا کرتا، ان میں صرف تصدیق ہوتی ہے یا تکذیب ہوتی ہے۔ ماہنامہ کلام حق نے مذکورہ شمارے میں بائبل کے بیسیوں مقامات کا حوالہ دیا ہے جن میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی سازش کی اور مسیحیوں کے بقول وہ اس میں بالآخر کامیاب بھی ہوگئے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں:

- اگر بائبل کا یہ کہنا درست ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل کا اہتمام کیا تو یہودیوں کو اس قتل سے بری الذمہ قرار دینے کی کوششوں کا کوئی جواز نہیں۔
- اور اگر موجودہ مغربی کلیساؤں کے مطابق یہودی حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کی سازش میں شریک نہیں تھے تو یہ کہنا بائبل کی ان بیسیوں آیات کو رد کرنے کے مترادف ہے جن کا حوالہ ماہنامہ کلام حق گوجرانوالہ نے دیا ہے اور یہ بات نسخ اور ردوبدل نہیں بلکہ تکذیب کے زمرہ میں آتی ہے۔

بہرحال مسیحی دنیا کی مذہبی قیادت اس وقت عجیب مخمصے میں ہے اور اسے اسرائیل کی حمایت اور یہودیوں کے ساتھ دوستی واتحاد کا جواز فراہم کرنے کے لیے کیا کیا پینترے بدلنا پڑرہے ہیں اس کا اندازہ ماہنامہ کلام حق کی مذکورہ عبارت سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک بائبل کا تعلق ہے ہم ماہنامہ کلام حق کے پیش کردہ بیسیوں حوالوں میں سے صرف ایک کا تذکرہ قارئین کی دلچسپی کے لیے کرنا چاہتے ہیں جس میں ماہنامہ کلام حق کا کہنا ہے کہ:

”متی باب ۲: ہیرودیس نے خداوند یسوع مسیح کو قتل کروانے کے لیے بیت اللحم میں بچوں کا قتل عام کروایا۔ گو ہیرودیس لادین تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ یہودی بھی تھا۔ جبکہ متی کی انجیل کا باب دوم میں اس اجمال کی تفصیل یوں مذکور ہے

کہ:

”جب یسوع ہیرودیس بادشاہ کے زمانے میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو کئی مجوسی پوپ سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟ کیونکہ پورب میں اس کا ستارہ دیکھ کر ہم اسے سجدہ کرنے آئے ہیں۔ یہ سن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرا گئے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت اللحم میں۔ کیونکہ نبی کی معرفت یوں لکھا گیا ہے کہ اے بیت اللحم یہوداہ کے علاقے! تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔ اس پر ہیرودیس نے مجوسیوں کو چپکے سے بلا کر ان سے تحقیق کی کہ وہ ستارہ کس وقت دکھائی دیا تھا؟ اور یہ کہہ کر انہیں بیت اللحم کو بھیجا کہ جا کر اس بچے کی بابت ٹھیک ٹھیک دریافت کرو اور جب وہ ملے تو مجھے خبر دو تاکہ میں بھی آکر اسے سجدہ کروں۔ وہ بادشاہ کی بات سن کر روانہ ہوئے اور دیکھا جو ستارہ انہوں نے پورب میں دیکھا تھا وہ ان کے آگے آگے چلا یہاں تک کہ اس جگہ کے اوپر جا کر ٹھہر گیا جہاں وہ بچہ تھا۔ وہ ستارہ کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے۔ اور اس گھر میں پہنچ کر اس کی ماں مریم کے پاس دیکھا اور اس کے آگے گر کر سجدہ کیا اور اپنے ڈبے کھول کر سونا، لبان اور مر اس کو نذر کیا۔ اور ہیرودیس کے پاس پھر نہ جانے کی ہدایت خواب میں پا کر دوسری راہ سے اپنے ملک کو روانہ ہوئے۔ جب وہ روانہ ہو گئے تو دیکھو خداوند کے فرشتہ نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر کہا اٹھ! بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو بھاگ جا اور جب تک میں تجھ سے نہ کہوں وہیں رہنا کیونکہ ہیرودیس اس بچے کی تلاش میں ہے تاکہ اسے ہلاک کر دے۔ پس وہ اٹھا اور رات کے وقت بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو روانہ ہو گیا اور ہیرودیس کے مرنے تک وہیں رہا تاکہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کیا تھا وہ پورا ہو کہ مصر سے میں نے اپنے بیٹے کو بلایا۔ جب ہیرودیس نے دیکھا کہ مجوسیوں نے میرے ساتھ ہنسی کی تو نہایت غصے ہوا اور آدمی بھیج کر بیت اللحم اور اس کی سب سرحدوں کے اندر کے ان سب لڑکوں کو قتل کروا دیا جو دو دو برس کے یا اس سے چھوٹے تھے اس وقت کے حساب سے جو اس نے مجوسیوں سے تحقیق کی تھی۔“

انسانی حقوق اور مسلمانوں کا موقف

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۵ اپریل ۲۰۰۴ء)

سال میں ایک آدھ بار سندھ کے بعض اضلاع میں جانے کا موقع ملتا ہے، اس دفعہ بھی مدرسہ نصرۃ العلوم کے سہ ماہی امتحان کے موقع پر دو تین دن کی گنجائش نکل آئی اور پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی کے ہمراہ کراچی، حیدر آباد اور میرپور خاص کے کچھ دینی اداروں میں حاضری ہوگئی۔

حیدر آباد میں جامعہ مفتاح العلوم کے نائب مہتمم مولانا ڈاکٹر عبد السلام قریشی کی کتاب ''احکام فقہیہ قرآن کریم کی روشنی میں'' کی رونمائی تقریب تھی۔ اس مقالہ پر مصنف کو سندھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے اور اس میں انہوں نے احکام و قوانین کے بارے میں قرآن کریم کی آیات کریمہ کو مناسب تشریح کے ساتھ مرتب انداز میں پیش کیا ہے جو ایک اچھی کاوش ہے اور اس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور طالبات کو ضروری دینی معلومات سے بہرہ ور کرنے کے لیے جو خصوصی کورسز پڑھائے جاتے ہیں، ان میں شامل کرنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

اس بار مولانا ڈاکٹر سیف الرحمان آرائیں اور مولانا ڈاکٹر عبد السلام قریشی نے سندھ یونیورسٹی میں حاضری کو بھی میرے پروگرام میں شامل کر لیا تھا اور سندھ یونیورسٹی کی اسلامی علوم کی فیکلٹی کے سربراہ ڈاکٹر عبد الستار انصاری نے اس موقع پر ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا ہوا تھا جس میں مجھے ''اسلام اور انسانی حقوق'' کے موضوع پر خطاب کرنا تھا۔ مگر جب ہم سندھ یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹا طاری تھا اور باہر پولیس گھوم رہی تھی، معلوم ہوا کہ طلبہ کے مختلف گروپوں کے درمیان تنازع کی وجہ سے ہڑتال ہے اور یونیورسٹی خالی ہے۔ البتہ ڈاکٹر عبد الستار انصاری نے اپنے دفتر میں شعبہ علوم اسلامی کے اساتذہ کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ متعدّد علماء کرام بھی شریک تھے۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر انصاری صاحب نے کی اور اسلامی اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر ثناء اللہ بھٹو صاحب نے نشست کی کارروائی چلائی۔ سندھی روایات کے مطابق ڈاکٹر عبد الستار انصاری نے مجھے اجرک اور سندھی ٹوپی اوڑھائی اور عزت افزائی کے کلمات کہے۔

ڈاکٹر عبد الستار انصاری، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے ارادت کا تعلق رکھتے ہیں، شیرانوالہ لاہور میں عرصہ تک ان کی آمد و رفت رہی ہے، مجھے بھی اس دور سے جانتے ہیں اور ان کی محبت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ تاریخ کے استاد اور محقق ہیں، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کی کتاب ”خلافت و ملوکیت“ پر انہوں نے ناقدانہ کام کیا ہے اور اس کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہیں۔ دینی مدارس کے حوالہ سے اس بات کے شاکی ہیں کہ ان میں تاریخ نہیں پڑھائی جاتی، ان کا کہنا ہے کہ تاریخ کو اسی اہمیت اور اہتمام کے ساتھ دینی مدارس میں پڑھانے کی ضرورت ہے جس اہتمام کے ساتھ حدیث پڑھائی جاتی ہے، کیونکہ تاریخ کی اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ ہمارے بہت سے عقائد کے مسائل بھی تاریخ سے متعلق ہیں، اس لیے دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تاریخ کو یکسر نظر انداز کرنے کا رویہ درست نہیں ہے۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ میرا موقف بھی کم و بیش یہی ہے اور میں دینی حلقوں کو مسلسل اس طرف توجہ دلاتا رہتا ہوں۔

اس نشست میں مجھے ”انسانی حقوق اور اسلام“ کے عنوان پر خطاب کی دعوت دی گئی جس پر میں نے برطانیہ میں پاکستان کی ہائی کمشنر محترمہ ملیحہ لودھی کے اس بیان کے حوالہ سے مختصر گفتگو کی جو اسی روز ایک قومی روزنامہ نے شائع کیا تھا۔ اس کے مطابق ملیحہ لودھی نے کہا ہے کہ مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے بارے میں انتہائی غلط تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ اسلام کے تشخص کو درست کرنا مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے، مسلمان اگر خاموش رہے تو یہ جنگ ہار جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان آگے آئیں اور بجائے اس کے کہ اسلام اور مسلمانوں کی دوسرے ”تشریح“ کریں، وہ خود یہ کام سنبھالیں۔ ارکان پارلیمنٹ، میڈیا اور دوسرے با اثر اداروں سے رابطہ میں رہیں اور وہ اس مقصد کے لیے مسلمان خواتین سے بھی مدد لیں۔ ملیحہ لودھی نے لندن میں ساؤتھ آل کے مقام پر گفٹ گروپس کے محمد ارشاد کے ظہرانے میں کمیونٹی لیڈروں سے خطاب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔

راقم الحروف نے گزارش کی کہ مجھے محترمہ ملیحہ لودھی اس ارشاد سے مکمل اتفاق ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغربی ممالک بلکہ پوری دنیا میں جو غلط فہمیاں پائی جا رہی ہیں اور جن کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے ان کو دور کرنے کے لیے مسلمان دانشوروں اور علماء کرام کو آگے آنا چاہیے، اور ابلاغ اور لابنگ کے ان تمام ذرائع اور وسائل

تک رسائی حاصل کرنی چاہیے جو اس حوالہ سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں، اس کے بغیر ہم یہ جنگ نہیں لڑ سکیں گے۔ اس فکری جنگ میں سب سے بڑا ہتھیار ''انسانی حقوق'' کا نعرہ ہے اور مغرب نے بڑی کامیابی کے ساتھ آج کی دنیا کو یہ باور کرا رکھا ہے کہ اسلام میں انسانی حقوق کا تصور نہیں ہے اور انسانی سوسائٹی کو انسانوں کے حقوق سے سب سے پہلے مغرب نے متعارف کرایا ہے۔ حالانکہ اصل صورتحال اس سے قطعی مختلف ہے کیونکہ یورپ اور مغربی دنیا کی حد تک تو یہ دعویٰ کسی حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ عام شہریوں کو ان کے حقوق کا شعور گزشتہ دو تین صدیوں کے دوران حاصل ہوا ہے اور اس میں یورپ کی فکری بیداری کی تحریک اور انقلاب فرانس نے اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن اسلامی دنیا ایک ہزار سال قبل سے ان حقوق سے آشنا ہے جنہیں آج معاشرتی اور شہری حقوق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلکہ اسلام میں حقوق کا جو دائرہ بیان کیا گیا ہے اور ان کی جو فطری درجہ بندی کی گئی ہے مغرب اب بھی اس مقام تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ البتہ اسلام کے انسانی حقوق کے نظام اور مغرب کے انسانی حقوق کے فلسفہ میں دو بنیادی فرق ہیں:

- مغرب صرف بندوں کے حقوق کی بات کرتا ہے، جبکہ اسلام اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے اور دونوں کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔
- مغرب ہر شخص میں اپنے حقوق حاصل کرنے کا ذوق بیدار کرتا ہے، جبکہ اسلام دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کو ترجیح دینے کی تلقین کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے پہلو ہیں جن پر بات ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہمارے اہل دانش جن میں علماء کرام، دینی مدارس کے مدرسین اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بطور خاص قابل ذکر ہیں، اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور اس فکری جنگ میں سنجیدگی کے ساتھ شریک ہوں۔

اس سفر کا تیسرا اہم پروگرام ضلع میرپور خاص میں پتھورو کے مقام پر ''مدرسہ تجوید القرآن'' کی سالانہ تقریب تھی جو ۳۱ مارچ کو بعد نماز مغرب منعقد ہوئی۔ یہ مدرسہ مولانا فداء الرحمان درخواستی نے جامعہ انوار القرآن کراچی کی شاخ کے طور پر قائم کیا ہے۔ میں دو سال قبل جب یہاں آیا تو ایک آدھ عارضی کمرا تھا مگر اب ایک خوبصورت مسجد تعمیر ہو چکی

ہے اور سات کمروں پر مشتمل بلاک بن چکا ہے جس میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ طلبہ قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان میں سے ستر طلبہ وہیں قیام پذیر ہیں۔ دور دراز کے دیہی علاقے میں یہ معیاری اور خوبصورت درسگاہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ مسجد و مدرسہ کا ماحول، صفائی اور زیب و زینت دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ شاید کراچی شہر کے کسی مدرسہ میں بیٹھے ہیں۔ مدرسہ کے چھ طلبہ نے اس سال حفظ قرآن کریم مکمل کیا ہے جن کی دستار بندی کے لیے یہ تقریب منعقد کی گئی تھی۔ اردگرد سے سینکڑوں علماء کرام اور احباب شریک تھے۔ کراچی کے ممتاز عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا زرولی خان مدظلہ تشریف لائے، انہوں نے مختصر خطاب کے ساتھ طلبہ کی دستار بندی کی اور انعامات سے نوازا۔ راقم الحروف نے بھی حفظ قرآن کریم کی اہمیت پر گزارشات پیش کیں۔ علاقہ کی دیگر بہت سی ممتاز شخصیات کے علاوہ سندھ اسمبلی کے اسپیکر سید مظفر حسین شاہ بھی تشریف لائے جو اسی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ راقم الحروف کے خطاب کے دوران وہ تھوڑی دیر کے لیے آئے، کچھ دیر اسٹیج پر بیٹھے اور پھر واپس چلے گئے جبکہ نصف شب تک یہ بارونق محفل قائم رہی۔

حضرت مولانا زرولی خان کی عنایت سے اس سفر میں ایک اور سعادت بھی حاصل ہو گئی، انہوں نے ایک محترم بزرگ کی زیارت سے شاد کام کیا، علاقہ دیر سے ایک بزرگ مولانا سید محمود مدظلہ ان کے ہاں آئے ہوئے تھے جن کی عمر ایک سو چوبیس برس بیان کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے تلمذ کا شرف حاصل کیا ہے۔ ان کے اعزاز میں کھانے کی ایک دعوت میں حضرت مولانا زرولی خان نے بہت سے علماء کرام کو مدعو کیا، حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی اور راقم الحروف بھی مدعو تھے۔ مولانا سید محمود مدظلہ کے ساتھ ملاقات ہوئی، کھانے میں شرکت ہوئی اور مختصر گفتگو کے ساتھ ان کی دعاؤں میں حصہ مل گیا، فالحمد للہ علی ذالک۔

اسلام اور انسانی حقوق۔ سندھ یونیورسٹی میں ایک نشست

(روزنامہ پاکستان، لاہور- ۶ اپریل ۲۰۰۴ء)

سال میں ایک آدھ بار سندھ کے بعض اضلاع میں جانے کا موقع ملتا ہے، اس دفعہ بھی مدرسہ نصرۃ العلوم کے سہ ماہی امتحان کے موقع پر دو تین دن کی گنجائش نکل آئی اور پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی کے ہمراہ کراچی، حیدر آباد اور میرپور خاص کے کچھ دینی اداروں میں حاضری ہوگئی۔

حیدر آباد میں جامعہ مفتاح العلوم کے نائب مہتمم مولانا ڈاکٹر عبدالسلام قریشی کی کتاب ''احکام فقہیہ قرآن کریم کی روشنی میں'' کی تقریب رونمائی تھی۔ اس مقالہ پر مصنف کو سندھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے اور اس میں انہوں نے احکام وقوانین کے بارے میں قرآن کریم کی آیات کریمہ کو مناسب تشریح کے ساتھ مرتب انداز میں پیش کیا ہے جو ایک اچھی کاوش ہے۔ اور اس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور طالبات کو ضروری دینی معلومات سے بہرہ ور کرنے کے لیے جو خصوصی کورسز پڑھائے جاتے ہیں ان میں شامل کرنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

اس بار مولانا ڈاکٹر سیف الرحمان آرائیں اور مولانا ڈاکٹر عبد السلام قریشی نے سندھ یونیورسٹی میں حاضری کو بھی میرے پروگرام میں شامل کر لیا تھا اور سندھ یونیورسٹی کی اسلامی فیکلٹی کے سربراہ ڈاکٹر عبدالستار انصاری نے اس موقع پر ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا ہوا تھا جس میں مجھے ''اسلام اور انسانی حقوق'' کے موضوع پر خطاب کرنا تھا۔ مگر جب ہم سندھ یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹا طاری تھا اور باہر پولیس گھوم رہی تھی، معلوم ہوا کہ طلبہ کے مختلف گروپوں کے درمیان تنازع کی وجہ سے ہڑتال ہے اور یونیورسٹی خالی ہے۔

البتہ ڈاکٹر عبدالستار انصاری نے اپنے دفتر میں شعبہ علوم اسلامی کے اساتذہ کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ متعدّد علماء کرام بھی شریک تھے۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر انصاری صاحب نے کی اور اسلامک اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر ثناء اللہ بھٹو صاحب نے نشست کی کاروائی چلائی۔ سندھی روایات کے

مطابق ڈاکٹر عبدالستار انصاری نے مجھے اجرک اور سندھی ٹوپی اوڑھائی اور عزت افزائی کے کلمات کہے۔ ڈاکٹر عبدالستار انصاری شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے ارادت کا تعلق رکھتے ہیں، شیرانوالہ لاہور میں ایک عرصہ تک ان کی آمد ورفت رہی ہے اور مجھے بھی اس دور سے جانتے ہیں، تاریخ کے استاد اور محقق ہیں اور مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کی کتاب ”خلافت وملوکیت“ پر انہوں نے ناقدانہ کام کیا ہے اور اس کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دینی مدارس کے حوالہ سے اس بات کے شاکی ہیں کہ ان میں تاریخ نہیں پڑھائی جاتی اور ان کا کہنا ہے کہ تاریخ کو بھی اسی اہمیت اور اہتمام کے ساتھ دینی مدارس میں پڑھانے کی ضرورت ہیں جس اہتمام کے ساتھ حدیث پڑھائی جاتی ہے کیونکہ تاریخ کی اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ ہمارے بہت سے عقائد کے مسائل بھی تاریخ سے متعلق ہیں اس لیے دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تاریخ کو یکسر نظر انداز کرنے کا رویہ درست نہیں ہے۔ راقم الحروف نے ان سے عرض کیا کہ میرا موقف بھی کم وبیش یہی ہے اور میں دینی حلقوں کو مسلسل اس طرف توجہ دلاتا رہتا ہوں۔

اس نشست میں مجھے ”انسانی حقوق اور اسلام“ کے عنوان پر خطاب کی دعوت دی گئی جس پر میں نے برطانیہ میں پاکستان کی ہائی کمشنر محترمہ ملیحہ لودھی کے اس بیان کے حوالہ سے مختصر گفتگو کی جو اسی روز ایک قومی روزنامہ نے شائع کیا تھا۔ اس کے مطابق محترمہ ملیحہ لودھی نے کہا ہے کہ مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے بارے انتہائی غلط تاثر پیدا کیا گیا ہے، مسلمانوں کے تشخص کو درست کرنا مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے، مسلمان اگر خاموش رہے تو یہ جنگ ہار جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان سامنے آئیں اور بجائے اس کے کہ اسلام اور مسلمانوں کی دوسرے ”تشریح“ کریں وہ خود یہ کام سنبھالیں۔ ارکان پارلیمنٹ، میڈیا اور دوسرے بااثر اداروں سے رابطہ میں رہیں اور وہ اس مقصد کے لیے مسلمان خواتین سے بھی مدد لیں۔ محترمہ ملیحہ لودھی نے ساؤتھال لندن میں مقامی راہنما محمد ارشاد کے ظہرانے میں کمیونٹی لیڈروں سے خطاب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔

راقم الحروف نے گزارش کی کہ مجھے محترمہ ملیحہ لودھی کے اس ارشاد سے مکمل اتفاق ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغربی ممالک بلکہ پوری دنیا میں جو غلط فہمیاں پائی جارہی ہیں اور جن کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے ان کو دور کرنے کے لیے مسلمان

دانشوروں اور علماء کرام کو آگے آنا چاہیے اور ابلاغ اور لابنگ کے ان تمام ذرائع و وسائل تک رسائی حاصل کرنی چاہیے جو اس حوالہ سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں، اس کے بغیر ہم یہ جنگ نہیں لڑ سکیں گے۔ اس فکری جنگ میں سب سے بڑا ہتھیار ''انسانی حقوق'' کا نعرہ ہے اور مغرب نے بڑی کامیابی کے ساتھ آج کی دنیا کو یہ باور کرا رکھا ہے کہ اسلام میں انسانی حقوق کا تصور نہیں ہے اور انسانی سوسائٹی کو انسانوں کے حقوق سے سب سے پہلے مغرب نے متعارف کرایا ہے۔ حالانکہ اصل صورت حال اس سے قطعی مختلف ہے کیونکہ یورپ اور مغربی دنیا کی حد تک تو یہ دعوی کسی حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ عام شہریوں کو ان کے حقوق کا شعور گزشتہ دو تین صدیوں کے دوران حاصل ہوا ہے اور اس میں یورپ کی فکری بیداری اور انقلاب فرانس نے اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اسلامی دنیا اس سے ایک ہزار سال قبل سے ان حقوق سے آشنا ہے جنہیں آج معاشرتی اور شہری حقوق سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلکہ اسلام میں حقوق کا جو دائرہ بیان کیا گیا ہے اور ان کی جو فطری درجہ بندی کی گئی مغرب اب بھی اس مقام تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ البتہ اسلام کے انسانی حقوق کے نظام اور مغرب کے انسانی حقوق کے فلسفہ میں دو بنیادی فرق ہیں:

- مغرب صرف بندوں کے حقوق کی بات کرتا ہے جبکہ اسلام اللہ تعالی اور بندوں دونوں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے اور دونوں کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔
- مغرب ہر شخص میں اپنے حقوق حاصل کرنے کا ذوق پیدا کرتا ہے جبکہ اسلام دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کو ترجیح دینے کی تلقین کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے پہلو ہیں جن پر بات ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہمارے اہل دانش، جن میں علماء کرام، دینی مدارس کے مدرسین اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بطور خاص قابل ذکر ہیں، اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور اس فکری جنگ میں سنجیدگی کے ساتھ شریک ہوں۔

اس سفر کا تیسرا اہم پروگرام ضلع میرپور خاص میں پتھورو کے مقام پر ''مدرسہ تجوید القرآن'' کی سالانہ تقریب تھی جو ۳۱ مارچ کو بعد نماز مغرب منعقد ہوئی۔ یہ مدرسہ مولانا فداء الرحمان درخواستی نے جامعہ انوار القرآن کراچی کی شاخ کے طور پر قائم کیا ہے، دو سال

قبل جب میں یہاں آیا تو ایک آدھ عارضی کمرا تھا مگر اب ایک خوبصورت مسجد تعمیر ہو چکی ہے اور سات کمروں پر مشتمل بلاک بن چکا ہے جس میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ طلبہ قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان میں سے ستر طلبہ وہیں قیام پذیر ہیں۔ دور دراز کے دیہی علاقے میں یہ معیاری اور خوبصورت درسگاہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، جنگل میں منگل کا سماں تھا، مسجد و مدرسہ کا ماحول، صفائی اور زیب و زینت دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ شاید کراچی شہر کے کسی مدرسہ میں بیٹھے ہیں۔ مدرسہ کے چھ طلبہ نے اس سال حفظ قرآن کریم مکمل کیا ہے جن کی دستار بندی کے لیے یہ تقریب بپا کی گئی تھی۔ ارد گرد سے سینکڑوں علماء کرام اور احباب شریک تھے، کراچی کے ممتاز عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا زرولی خان مدظلہ تشریف لائے، انہوں نے مختصر خطاب کے ساتھ طلبہ کی دستار بندی کی اور انعامات سے نوازا۔ راقم الحروف نے بھی حفظ قرآن کریم کی اہمیت پر چند گزارشات پیش کیں۔ علاقہ کی دیگر بہت سی ممتاز شخصیات کے علاوہ سندھ اسمبلی کے اسپیکر سید مظفر حسین شاہ بھی تشریف لائے جو اسی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ راقم الحروف کے خطاب کے دوران وہ تھوڑی دیر کے لیے آئے کچھ دیر اسٹیج پر بیٹھے اور پھر واپس چلے گئے اور نصف شب تک یہ بارونق محفل قائم رہی۔

حضرت مولانا زرولی خان کی عنایت سے اس سفر میں ایک اور سعادت بھی حاصل ہو گئی، انہوں نے ایک بزرگ کی زیارت سے شاد کام کیا، دیر کے علاقہ سے ایک بزرگ مولانا سید محمود ان کے ہاں آئے ہوئے تھے جن کی عمر ایک سو چوبیس برس بیان کی جاتی ہے اور انہوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے تلمذ کا شرف حاصل کیا ہے۔ ان کے اعزاز میں کھانے کی ایک دعوت میں حضرت مولانا زرولی خان نے بہت سے علماء کرام کو مدعو کیا ہوا تھا۔ حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی اور راقم الحروف بھی مدعو تھے، مولانا سید محمود کے ساتھ ملاقات ہوئی، کھانے میں شرکت ہوئی اور مختصر گفتگو کے ساتھ ان کی دعاؤں میں حصہ مل گیا، فالحمد للہ علی ذلک۔

”نئی امریکی بائبل“ اور مسیحی عقائد

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۶ مارچ ۲۰۰۴ء)

گوجرانوالہ سے شائع ہونے والے مسیحی جریدہ ماہنامہ کلام حق کو چرچ آف پاکستان اور پریسٹیرین چرچ آف پاکستان سے شکایت ہے کہ انہوں نے بائبل کا جو انگریزی متن شائع کیا ہے اس میں بہت سی آیات حذف کر دی گئی ہیں۔ یہ شکایت ماہنامہ کلام حق نے فروری ۲۰۰۴ء کے شمارے میں کی ہے اور بتایا ہے کہ چرچ آف پاکستان کی انگریزی بائبل میں چالیس کے لگ بھگ آیات میں ردوبدل کیا گیا ہے، ان میں بعض آیات بالکل حذف کر دی گئی ہیں اور بعض آیات کے اہم جملے نکال دیے گئے ہیں۔

ماہنامہ کلام حق کے خیال میں ان آیات میں ردوبدل کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے کلام مقدس میں سے وہ تمام آیات حذف کر دی جائیں جن سے خداوند یسوع مسیح کا تجسم، الوہیت، کفارہ، مردوں سے زندہ ہونا اور آسمان پر صعود فرمانا ثابت ہوتا ہے تاکہ خداوند یسوع مسیح کی دوبارہ آمد مشکوک ہو جائے اور خداوند کو وہی حیثیت حاصل ہو جائے جو دوسرے انبیاء کرام کو حاصل ہے اور انہوں نے اس طرح خداوند مسیح کی الوہیت اور پاکیزگی اور فوق البشر ہونے کا انکار کیا ہے اور یہ ایک مذموم جسارت ہے کہ اس کی موجودگی میں مسیحیت کی ساری عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔ ماہنامہ کلام حق نے اسے ”نئی امریکی بائبل“ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس ترجمہ کے ذریعے کلیسا میں بدعتی تعلیم رائج کی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ماہنامہ کلام حق نے مقدس متی، مقدس مرقس، مقدس یوحنا، مقدس لوقا، رسولوں کے اعمال، رومیوں کے نام خط، کرنتھیوں کے نام پہلا خط، عبرانیوں کے نام خط اور مقدس یوحنا کا پہلا خط عام کے علاوہ عہد نامہ قدیم میں سے زبور، یسعیاہ اور زکریاہ نامی رسالوں میں چالیس سے زائد مقامات کی نشاندہی کے ساتھ ان آیات کی تفصیل بھی بیان کی ہے جن میں مذکورہ ردوبدل کیا گیا ہے۔

جہاں تک (۱) حضرت عیسی علیہ السلام کی الوہیت (۲) ان کا نسل انسانی کے گناہوں کا کفارہ بننا (۳) سولی پر موت پانے کے بعد زندہ ہو کر آسمان پر اٹھایا جانا (۴) اور اللہ تعالی کے کلام اور روح کا حضرت عیسی علیہ السلام کی شکل میں ظاہر ہونے کا عقیدہ ہے، اگر ماہنامہ کلام حق کے ریمارکس کے مطابق اس نئی امریکی بائبل میں آیات کے حذف اور ردوبدل کا مقصد یہی ہے جو اس نے بیان کیا ہے تو یہ مقصد اور اقدام مسلمانوں کی طرف سے

خیر مقدم کا مستحق ہے، اس لیے کہ قرآن کریم نے حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں مسیحیوں کے اسی غلو کو مسترد کرتے ہوئے بتایا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ خدا نہیں اور نہ ہی خدائی میں حصہ دار ہیں بلکہ اللہ تعالی کے بندے اور رسول ہیں، وہ اور ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام دونوں پاک دامن ہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ سولی پر نہیں لٹکائے گئے اور نہ ہی ان پر موت وارد ہوئی ہے بلکہ وہ زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے ہیں اور اسی حالت میں دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ چنانچہ جب وہ سولی پر لٹکے ہی نہیں اور نہ ہی ان پر موت وارد ہوئی ہے تو کفارے کا یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے پوری نسل انسانی کے گناہوں کے بدلے موت کی سزا قبول کر کے ان گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

اس پس منظر میں نئی امریکی بائبل کا یہ مبینہ رجحان ہمارے نزدیک اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسیحیوں میں ان خود ساختہ عقائد سے پیچھا چھڑانے کا ذوق بیدار ہو رہا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات کا حصہ نہیں ہیں بلکہ بعد میں کچھ لوگوں نے یہ عقائد گھڑ کر انہیں مسیحی تعلیمات میں شامل کر دیا تھا۔ ورنہ اسلامی تعلیمات کی رو سے آسمانی مذاہب کے عقائد میں کوئی فرق نہیں ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام آپس میں باپ شریک بھائی ہیں جن کی مائیں الگ الگ ہیں۔ اس ارشاد نبویؐ کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ سب انبیاء کرامؑ کا عقیدہ ایک ہی ہے البتہ شریعتیں الگ الگ ہیں۔ اس لیے قرآن و سنت کی تشریحات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کے عقائد وہی تھے جو اسلام کے بنیادی عقائد کے طور پر قرآن کریم نے بیان کیے ہیں اور عقائد کے حوالہ سے مسلمانوں اور اصل مسیحیوں بلکہ اصل یہودیوں کے درمیان بھی کوئی فرق نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہ سالہ مکی دور میں جب قریش مکہ کے مظالم اور ایذارسانی سے تنگ آکر بہت سے صحابہ کرامؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی جہاں مسیحیوں کی حکومت تھی اور اصحمہ نجاشیؓ وہاں کے حکمران تھے تو مکہ مکرمہ کے قریشیوں نے ایک وفد بھیج کر بادشاہ اصحمہ نجاشی سے شکایت کی کہ یہ ہمارے بھگوڑے ہیں انہیں واپس کیا جائے۔ اس پر نجاشی بادشاہ نے ان مہاجرین کو بلایا تو مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے وضاحت کی ہم بھگوڑے نہیں بلکہ ایک سچے دین کی پیروی

کی وجہ سے ان قریشیوں کے مظالم کا شکار ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لیے امان کی خاطر ہم نے حبشہ کا رخ کیا ہے۔ یہ بات سن کر نجاشی بادشاہ نے مہاجر مسلمانوں کو مکہ مکرمہ کے وفد کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا جس پر وفد کے قائد نے دوسرا رخ اختیار کیا کہ یہ مسلمان حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کی گستاخی کرتے ہیں۔ نجاشی بادشاہ نے اس کی وضاحت طلب کی تو حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی ان آیات کریمہ کی تلاوت کی جن میں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی، حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بغیر باپ پیدا ہونے اور ان کے اس اعلان کا تذکرہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور رسول ہوں۔ نجاشی بادشاہ نے حضرت جعفرؓ کی یہ تقریر سن کر کہا کہ اصل حقیقت یہی ہے جو تم نے بیان کی ہے اور میں بھی اسی کا اعتقاد رکھتا ہوں۔ چنانچہ نجاشی بادشاہ نے مہاجر مسلمانوں کو نہ صرف پناہ اور تحفظ دینے کا اعلان کیا بلکہ خود بھی اسلام قبول کر لیا اور اسی ایمان پر وفات پائی جس پر جناب نبی کریمؐ نے اصحمہ نجاشیؓ کو یہ خصوصی اعزاز بخشا کہ مدینہ منورہ میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔

جناب رسول اکرمؐ نے اس وقت کی سب سے بڑی مسیحی ریاست سلطنت روما کے سربراہ قیصر کو دعوت اسلام کا جو خط لکھا اس میں بھی اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ دو باتیں اسلام اور اصل مسیحیت کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں:

- اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔
- اور انسان ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں بلکہ سب مل کر خدا کی حاکمیت کے سامنے جھک جائیں۔

یہی بات قرآن کریم میں تمام اہل کتاب کو عمومی دعوت کے طور پر کہی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب بالخصوص مسیحی اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی الوہیت، تثلیث اور ان کے خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ سے دستبردار ہو کر انہیں خدا کا بندہ اور رسول مانیں اور اللہ تعالیٰ کی خالص توحید کا اقرار کر لیں تو ان کے ساتھ مصالحت و اشتراک کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ مگر قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں اس کے ساتھ یہ بھی صاف طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس بات کو قبول نہ کریں تو آپ کہہ دیں کہ تم سب گواہ رہو کہ ہم اسی عقیدہ کو ماننے والے ہیں۔

اس لیے اگر ماہنامہ کلام حق کے بقول چرچ آف پاکستان کی شائع کردہ نئی امریکی بائبل کی مذکورہ ''تحریفات'' کا مقصد توحید خداوندی کی طرف رجوع اور اس کے خلاف خودساختہ عقائد سے پیچھا چھڑانا ہے تو ہمارے نزدیک خوش آئند بات ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ البتہ اس کے ساتھ ایک اور بات پھر سے واضح ہوگئی ہے کہ تورات اور انجیل کے بارے میں قرآن کریم نے جو یہ کہا تھا کہ ان میں یہودی اور مسیحی علماء اپنی مرضی سے ردوبدل کرتے رہتے ہیں اور مسیحی علماء کی طرف سے قرآن کریم کے اس دعوی کو ہر دور میں جھٹلایا جاتا رہا ہے۔ بائبل کے مذکورہ بالا انگلش ترجمہ نے قرآن کریم کے اس اعلان کی ایک بار پھر تصدیق کر دی ہے کہ ''کتاب مقدس'' میں ردوبدل اور تحریف کا کام صرف ماضی میں نہیں ہوا بلکہ اب بھی جاری ہے اور آج کے جدید دور میں بھی بائبل کی آیات اور ان کے جملوں کو حذف کر دینا اور اپنے کسی مقصد کے لیے ان کو آگے پیچھے کر دینا کوئی غیر معمولی کارروائی نہیں بلکہ ''روٹین ورک'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد ہم قارئین کی دلچسپی کے لیے بطور نمونہ ماہنامہ کلام حق کے دیے گئے چالیس سے زیادہ حوالوں میں سے صرف ایک کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جس کے مطابق ''مقدس لوقا'' کی انجیل کے باب ۱۶ کی بارہ آیات (۹ تا ۲۰) سرے سے انگریزی ترجمہ سے نکال دی گئی ہیں۔ وہ آیات پاکستان بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور کی شائع کردہ اردو ''کتاب مقدس'' میں یوں درج ہیں:

1. ہفتہ کے پہلے روز جب وہ سویرے جی اٹھا تو پہلے مریم مگدلینی کو، جس میں سے اس نے سات بدروحیں نکالی تھیں، دکھائی دیا۔

2. اس نے جاکر اس کے ساتھیوں کو، جو ماتم کرتے اور روتے تھے، خبر دی۔

3. اور انہوں نے یہ سن کر کہ وہ جیتا ہے اور اس نے اسے دیکھا ہے، یقین نہ کیا۔

4. اس کے بعد وہ دوسری صورت میں ان میں سے دو کو، جب وہ دیہات کی طرف پیدل جارہے تھے، دکھائی دیا۔

5. انہوں نے بھی جاکر باقی لوگوں کو خبر دی مگر انہوں نے ان کا بھی یقین نہ کیا۔

6. پھر وہ ان گیارہ کو بھی، جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تھے، دکھائی دیا اور اس نے ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ان کو ملامت کی کیونکہ جنھوں نے اس کے جی اٹھنے کے بعد اسے دیکھا تھا انہوں نے ان کا یقین نہ کیا تھا۔

7. اور اس نے ان سے کہا کہ تم تمام دنیا میں جا کر ساری خلق کے سامنے انجیل کی منادی کرو۔

8. جو ایمان لائے اور بپتسمہ لے وہ نجات پائے گا اور جو ایمان نہ لائے وہ مجرم ٹھہرایا جائے گا۔

9. اور ایمان لانے والوں کے درمیان یہ معجزے ہوں گے، وہ میرے نام سے بدروحوں کو نکالیں گے۔

10. نئی نئی زبانیں بولیں گے، سانپوں کو اٹھائیں گے اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیزیں پیئں گے تو انہیں کچھ ضرر نہ پہنچے گا، وہ بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو اچھے ہو جائیں گے۔

11. غرض خداوند یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کی داہنی طرف بیٹھ گیا۔

12. پھر انہوں نے نکل کر ہر جگہ منادی کی اور خداوند ان کے ساتھ کام کرتا رہا اور کلام کو ان معجزوں کے وسیلے سے، جو ساتھ ساتھ ہوتے تھے، ثابت کرتا رہا، آمین۔

یہ بارہ آیات کیتھولک بائبل کے اردو ترجمہ میں موجود ہیں لیکن ماہنامہ کلام حق کے مطابق انہیں چرچ آف پاکستان کی شائع کردہ سرکاری انگریزی بائبل یا نئی امریکی بائبل سے نکال دیا گیا ہے۔ اور یہ عمل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے بنیادی عقائد کے بارے میں آج کی مسیحی دنیا کی باہمی کشمکش کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ آسمانی کتابوں تورات اور انجیل میں ان کے ماننے والوں کی طرف سے من مانی تحریفات اور ردوبدل کے مسلسل جاری رہنے کی تازہ ترین تصدیق فراہم کرتا ہے۔

اطاعت امیر درست، مگر کن حالات میں!

(روزنامہ پاکستان، لاہور- ۲۴ فروری ۲۰۰۴ء)

صدر جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ دنوں اسلام آباد میں علمائے کرام اور مشائخ عظام کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بہت سی فکر انگیز باتیں کی ہیں جن پر ہر پاکستانی کو غور کرنا چاہیے، کیونکہ صدر محترم کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان کی بہت سے آرا سے ہمیں بھی اختلاف ہے، لیکن اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جن امور کی انہوں نے نشاندہی کی ہے اور جن مسائل کا پاکستان کے حوالے سے انہوں نے اپنے خطاب میں تذکرہ کیا ہے، وہ اس وقت ہمارے لیے چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں ہر باشعور شہری فکر مند اور پریشان ہے۔

جو علمائے کرام اور مشائخ عظام اس اجتماع میں شریک ہوئے، ان کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قوم کے کسی حصے کی نمائندگی نہیں کرتے، کیونکہ وہ سب محترم بزرگ ہیں اور اپنا اپنا حلقہ اثر رکھتے ہیں، لیکن اس اجتماع میں شرکت کے لیے علمائے کرام اور مشائخ عظام کا جس طریقے سے انتخاب کیا گیا ہے، وہ روایتی طور پر وہی تھا جس کی طرف گزشتہ روز ہمیں ایک ذمہ دار صحافی دوست نے توجہ دلائی۔ ایک ضلع میں اسلام آباد کے مذکورہ کنونشن کے لیے علماء کا انتخاب ہو رہا تھا اور ضلعی انتظامیہ کی تیار کردہ فہرست کو "آخری شکل" دی جا رہی تھی تو بعض نام اس خدشے کی بنیاد پر کاٹ دیے گئے کہ یہ شاید وہاں کسی بات پر بول پڑیں، اس لیے ان کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فہرست اچھی طرح چھان بین کر مرتب کی گئی تھی کہ صرف وہی حضرات اس اجتماع میں شریک ہوں جو خاموشی کے ساتھ خطاب سنیں اور پھر کوئی تبصرہ کیے بغیر وہاں سے واپس آجائیں۔ اس سے ہمیں وہ تاریخی واقعہ یاد آگیا کہ حضرت عمر بن العزیزؒ جب خلیفہ بنے تو حضرت حسن بصریؒ کو خط لکھا کہ وہ انہیں ایسے چند علمائے کرام کے نام دیں جن کو وہ اپنے قریب بلا سکیں اور بوقت ضرورت ان سے مشورہ لیتے رہیں۔ حضرت حسن بصریؒ نے جواب میں لکھا کہ "جو علماء ہیں وہ تمہارے پاس آئیں گے نہیں، اور جو تمہارے پاس آجائیں گے ان کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس لیے میں کوئی نام دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

اس کنونشن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ قومی پالیسیوں پر علمائے کرام کو اعتماد میں لینے کے لیے بلایا گیا تھا، لیکن اعتماد میں لینے کا یہ طریقہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ

صرف ایسے لوگوں کو بلایا جائے کہ جو خاموشی کے ساتھ خطاب سنیں اور پھر کوئی بحث و مباحثہ اور سوال و جواب کیے بغیر اسی خاموشی کے ساتھ واپس گھروں کو سدھار جائیں۔ حالانکہ کسی کو اعتماد لینے کا جو عمومی مفہوم ہے، وہ یہ ہے کہ جن کو کسی مسئلے میں اعتماد میں لینا مقصود ہے، انہیں اپنے موقف اور پروگرام سے آگاہ کیا جائے اور پھر ان سے رائے بھی طلب کی جائے اور ان کی تجاویز و آرا کو موقف اور پروگرام کا حصہ بنایا جائے۔ لیکن یہاں تو چھان پھٹک کر بلایا ہی صرف ایسے بزرگوں کو گیا تھا جن سے کسی مسئلے پر بول پڑنے کا کوئی خدشہ نہ ہو، اس لیے ہمیں اس کنونشن کی اس کے علاوہ اور کوئی افادیت نظر نہیں آئی کہ روایتی انداز میں دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صدر محترم کی پالیسیوں کو علماء و مشائخ کی حمایت حاصل ہے اور وہ اسلام کی جو تعبیر و تشریح کر رہے ہیں، اس میں علماء و مشائخ کا ایک حلقہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ اب تو جارج واکر بش کی طرف سے اس سرٹیفکیٹ کے اجرا کے بعد اس تکلف کی ضرورت بھی باقی ہی نہیں رہی جس میں صدر بش نے کہا ہے کہ پاکستان اب اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح کی طرف آرہا ہے۔

صدر پرویز مشرف کے مذکورہ خطاب کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کی ضرورت ہے اور ان پر قومی حلقوں میں بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے، مگر ان میں سے ایک اہم پہلو پر کچھ عرض کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا کہ حاکم وقت اور کمانڈر کی ہر حالت میں اطاعت اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کے اس تاریخی کردار کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے عین حالت جنگ میں کمانڈر کے منصب سے معزولی کے حکم پر سر تسلیم خم کر کے لشکر کی کمان حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کے سپرد کر دی تھی اور پھر انہی کی کمان میں ایک سپاہی کے طور پر جنگ میں حصہ لیا تھا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کا یہ عمل ڈسپلن کی پابندی کے حوالے سے ایک تاریخی اور مثالی کردار کے طور پر یاد کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ان کی عظمت کردار کی علامت ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ روایت کبھی قابل عمل نہیں رہی اور ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے کہ اگر کسی سینئر کو نظر انداز کر کے اس کی جگہ جونیئر فوجی افسر کو کمانڈر بنا دیا جائے تو سینئر افسر اس کی کمان میں کام کرنے کی بجائے اختیاری ریٹائرمنٹ لے کر گھر چلا جاتا ہے، جس کا مظاہرہ ہماری فوجی کمان میں کئی بار ہو چکا ہے، مگر اس سے قطع نظر ہم ایک اور پہلو

سے اس مسئلے کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ کیا حضرت خالد بن ولیدؓ کے اس عمل سے یہ استدلال کرنا درست ہے کہ حاکم اور کمانڈر کی ہر حالت میں اطاعت ضروری ہے اور وہ جو حکم بھی دے، اس سے کسی صورت میں بھی اختلاف یا حکم عدولی کی گنجائش نہیں ہے؟ اس سلسلہ میں ہم عہد نبویؐ کے دو واقعات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جنہیں امام بخاریؒ نے ”صحیح بخاری“ میں روایت کیا ہے۔

• ایک واقعہ یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کی قیادت میں ایک لشکر جہاد کے لیے روانہ کیا اور تلقین کی کہ امیر لشکر کی ہر حالت میں اطاعت کی جائے۔ دوران سفر کسی مقام پر امیر لشکر کسی بات پر غصے میں آ گئے اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ لکڑیاں اکٹھی کر کے لائیں۔ لشکر کے سپاہیوں نے لکڑیوں کا ایک ڈھیر جمع کر لیا۔ امیر صاحب نے حکم دیا کہ اس ڈھیر کو آگ لگائی جائے، جو لگا دی گئی اور جب آگ اچھی طرح بھڑک اٹھی تو کمانڈر نے حکم دیا کہ سارا لشکر اس آگ میں کود جائے۔ سپاہی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اس پر کمانڈر نے یاد دلایا کہ تمہیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین کی تھی کہ امیر کی ہر حالت میں اطاعت کی جائے، اس لیے میرا حکم مانو اور آگ میں چھلانگ لگا دو۔ لشکر نے امیر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے جناب نبی اکرمؐ کا کلمہ پڑھا ہے، اس لیے ہم آگ میں نہیں کودیں گے۔ تھوڑی دیر بعد امیر لشکر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور آگ بھی سرد پڑ گئی۔

مدینہ منورہ واپسی پر یہ مقدمہ جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں پیش ہوا تو بخاری شریف کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ اگر امیر کا حکم مان کر آگ میں چھلانگ لگا دیتے تو قیامت تک آگ میں ہی رہتے۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ امیر کی اطاعت ”معروف“ باتوں میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امیر کسی غلط بات کا حکم دے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔

• دوسرا واقعہ بھی امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے جو حضرت خالد بن ولیدؓ کے بارے میں ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کو ایک لشکر کا کمانڈر بنا کر کفار کے ایک قبیلے کے ساتھ جنگ کے لیے بھیجا۔ حضرت خالد بن

ولیدؓ نے حکم کے مطابق اس قبیلے کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے جواب میں ایسا جملہ کہا جس سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ ہم اپنے دین سے دستبردار ہو گئے ہیں، لیکن کلمہ طیبہ نہ پڑھ سکے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاید وہ کلمہ طیبہ کے الفاظ صحیح طور پر نہیں جانتے تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان کے اس اعلان کو قبول کرنے کی بجائے ان پر حملہ کر دیا اور شکست دے دی۔ جنگ میں ان میں سے کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ قیدی ہوئے جنہیں حضرت خالد بن ولیدؓ نے لشکریوں میں تقسیم فرما دیا۔ راستے میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے لشکریوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے قیدی کو قتل کر دیں۔ لشکر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی موجود تھے۔ انہیں یہ اشکال تھا کہ جب اسلام کی دعوت کے جواب میں اس قبیلے کے افراد نے یہ کہہ دیا تھا کہ ہم اپنے مذہب سے دستبردار ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے، لیکن حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان کی بات قبول کرنے کی بجائے ان کے خلاف جنگ شروع کر دی، اس لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے امیر لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں اپنے قیدی کو قتل نہیں کروں گا اور ہم میں سے کوئی بھی اپنے قیدی کو قتل نہیں کرے گا، بلکہ ہم یہ مقدمہ جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں پیش کریں گے اور ان کے حکم پر عمل کریں گے۔

مدینہ منورہ پہنچ کر یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا، نبی کریمؐ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو بلوا کر جواب طلبی کی اور جب واضح ہو گیا کہ واقعہ اس طرح ہوا ہے جس طرح بیان کیا گیا تو یہ کہہ کر حضرت خالد بن ولیدؓ کے اس عمل سے جناب نبی اکرمؐ نے لاتعلقی اعلان فرمایا کہ "اے اللہ! خالد نے جو کیا، میں اس سے بری ہوں۔"

یہ دونوں واقعات دور نبویؐ کے ہیں اور بخاری شریف میں ہیں، جن میں جناب نبی اکرمؐ نے امیر کے غلط حکم کو انکار کرنے والوں کو سزا دینے یا تنبیہ کرنے کی بجائے غلط حکم دینے والے امیروں کو ڈانٹا، ان کے عمل سے براءت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے، لیکن معروف باتوں میں۔ اگر وہ کوئی غلط حکم دے، جس کا غلط ہونا شرعی نقطہ سے واضح ہو تو اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ''ڈسپلن'' کی نفی کر رہے ہیں۔ جہاں نظم ونسق کا معاملہ ہو اور ڈسپلن کا تقاضا ہو، وہاں امیر اور کمانڈر کی اطاعت واجب ہے، حتیٰ کہ ڈسپلن اور نظم ونسق کے معاملات میں فقہائے کرام نے امیر کے غلط حکم کی اطاعت کو بھی واجب اور ضروری قرار دیا ہے، لیکن جہاں شریعت کے کسی واضح حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو اور اس حکم پر عمل کرنے والا شرعاً گنہگار ٹھہرتا ہو، وہاں اطاعت ضروری نہیں بلکہ حاکم کو اس غلطی پر خبردار کرنا ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد گرامی موجود ہے کہ ''لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق'' خالق کی نافرمانی میں مخلوق میں سے کسی کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔

ایک بدری صحابی کی ''ڈی بریفنگ''

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۷ فروری ۲۰۰۴ء)

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا کہ جب کسی دشمن پر حملہ آور ہوتے تو آخر وقت تک اپنے ہدف کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کو تیاری کا حکم ملتا، تیاری ہوتی، لشکر مدینہ منورہ سے چل پڑتا، مگر آنحضرتؐ اور چند معتمد ترین ساتھیوں کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہوتا تھا کہ ہدف کیا ہے اور ٹارگٹ کون ہے؟ خیبر کی جنگ سے اندازہ کر لیجئے کہ ہزاروں ساتھیوں کے ہمراہ نبی اکرمؐ مدینہ منورہ سے چلے اور خیبر کے دروازے تک پہنچ گئے مگر خیبر والوں کو اس وقت تک معلوم نہ ہو سکا جب تک اسلامی لشکر خیبر کے نواح میں نہیں جا پہنچا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ خیبر کے کسان اور کاشتکار معمول کے مطابق علی الصبح اپنے آلات زراعت لے کر کھیتوں اور باغات کی طرف نکلے تو اچانک اسلامی لشکر کو خیبر کے دروازے پر موجود پایا، الٹے پاؤں واپس دوڑے اور شہر والوں کو خبر دی کہ محمدؐ کا لشکر آ پہنچا ہے، اس پر قلعہ کے دروازے بند کر دیے گئے اور خیبر کا محاصرہ ہو گیا۔ صرف تبوک کے موقع پر ایسا ہوا کہ جناب نبی اکرمؐ نے اپنے ہدف کا پہلے سے اعلان کر دیا کہ رومیوں کے مقابلے پر شام کی طرف جانا ہے۔ ورنہ عام طور پر ہدف کو گول مول رکھا جاتا تھا تاکہ دشمن کو قبل از وقت تیاری کا وقت نہ ملے اور جنگ زیادہ طویل نہ ہونے پائے۔

فتح مکہ پر بھی ایسا ہوا کہ تیاریاں جاری تھیں اور رازداری کا بھی اہتمام کیا جا رہا تھا کہ ان تیاریوں کی دشمن کو قبل از وقت خبر نہ ہو جائے مگر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے صحابہ کرامؓ کو پریشان کر دیا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت مقداد بن الاسودؓ پر مشتمل ایک مہم بھیجی اور انہیں ہدایت کی کہ مکہ مکرمہ جانے والے راستے پر ''روضۂ خاخ'' نامی جگہ پر ایک خاتون سفر کرتی ہوئی ملے گی، وہ کسی کا خط لے کر مکہ مکرمہ جا رہی ہے، اس سے وہ خط قابو کر کے میرے پاس لے آؤ۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ تیز رفتار گھوڑوں پر وہاں پہنچے تو ایک خاتون حالت سفر میں ملی جو کہ مکہ مکرمہ جا رہی تھی، ہم نے اسے بتایا کہ ہمیں حضورؐ نے اس سے وہ خط لینے کے لیے بھیجا ہے جو وہ مکہ مکرمہ لے جا رہی ہے۔ اس خاتون نے انکار کر دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کا خط لے کر مکہ مکرمہ جا رہی ہوں۔ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کے لیے اس انکار کو قبول کرنا ممکن ہی نہیں تھا کہ انہیں یہ بات جناب رسول اکرمؐ نے فرمائی تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ آپؐ کو یہ بات بذریعہ وحی معلوم ہوئی تھی اس لیے اس خاتون کے پاس خط موجود نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ ہم نے اس عورت کو دھمکی دی کہ خط تمہارے پاس موجود ہے جو ہم نے تم سے بہر صورت وصول کرنا ہے، اگر شرافت سے دے دو تو ٹھیک ہے ورنہ ہم تلاشی کے لیے تمہارے کپڑے بھی اتار سکتے ہیں۔ اس دھمکی پر وہ عورت ڈر گئی اور اس نے بالوں کے جوڑے سے وہ خط نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔

خط فوری طور پر جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچایا گیا، اسے کھول کر پڑھا گیا تو وہ حضرت حاطبؓ کی طرف سے قریش کے بعض حضرات کے نام تھا اور اس میں انہیں حضورؐ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دی گئی تھی۔ حضرت حاطبؓ ان صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو بدر کے معرکے میں شریک تھے اور اس وجہ سے ان کا عام حلقوں میں بہت احترام پایا جاتا تھا۔ مگر اس خط نے ساری صورتحال الٹ دی، جس کو بھی پتہ چلا بے چین ہو گیا کہ حاطبؓ ایسی حرکت کیسے کر سکتے ہیں۔ حرکت بلاشبہ بہت سنگین تھی مگر حاطبؓ عام آدمی نہیں تھے بلکہ بدری صحابیؓ تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ کا پارہ تو اس قدر چڑھ گیا کہ تلوار تک ہاتھ جا پہنچا اور جناب نبی اکرمؐ سے اجازت طلب کر لی کہ یا رسول اللہؐ! حاطبؓ منافق ہو گیا ہے اس لیے مجھے اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں۔

جناب رسول اللہؐ نے حضرت حاطبؓ کو طلب کر لیا اور ان کی ”ڈی بریفنگ“ شروع ہوگئی۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے اقرار کیا کہ خط انہی کا ہے اور اس خاتون کو انہوں نے ہی یہ خط قریش کے بعض افراد تک پہنچانے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے درخواست کی کہ یارسول اللہ! میرے بارے میں فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کیجئے، پہلے میری بات سماعت فرما لیجئے۔ آنحضرتؐ نے انہیں اپنا موقف پیش کرنے اور پوزیشن واضح کرنے کا موقع دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ میرے آقا! نہ میں منافق ہوا ہوں، نہ کفر سے میری کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی میرے دل میں اسلام سے برگشتگی کا کوئی پہلو ہے۔ ایک ذاتی مفاد کی خاطر میں نے یہ کام کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے اگرچہ مکہ مکرمہ سے ہی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی لیکن میں مکہ کا پرانا باشندہ نہیں ہوں اور نہ ہی میری وہاں کوئی رشتہ داری ہے۔ البتہ وہاں کچھ عرصہ رہنے کی وجہ سے کچھ مفادات میرے وہاں موجود تھے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ مکہ مکرمہ پر حملہ کی صورت میں باقی مہاجرین، جن کے وہاں رشتہ دار یا مفادات ہیں، ان کا تحفظ کرنے کے لیے تو ان کا کوئی نہ کوئی تعلق دار مکہ مکرمہ میں موجود ہے مگر میرا کوئی تعلق دار نہیں ہے۔ اس لیے اگر میں اس خط کے ذریعے کچھ لوگوں پر احسان کر دوں تو وہ اس احسان مندی میں وہاں میرے خاندان اور مفادات کا اس معرکے کے دوران لحاظ رکھیں گے اور میرے مفادات شاید زیادہ نقصان سے بچ جائیں۔ بس یہ لالچ تھا اور اتنی سی غرض تھی جس کی خاطر میں نے یہ کام کیا ہے۔

حضرت عمرؓ اس وضاحت پر مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے پھر اجازت طلب کی کہ یارسول اللہؐ! مجھے حکم دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ مگر حضورؐ نے حضرت حاطبؓ کی اس وضاحت کو یہ کہہ کر قبول کر لیا کہ یہ سچ بول رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر آپؐ نے فرمایا کہ عمر! کیا تم نہیں جانتے کہ حاطبؓ بدر کے معرکہ میں شریک ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے بدریوں کے گناہ معاف کر دیے ہیں، اس پر حضرت عمرؓ مطمئن ہو کر خاموش ہو گئے۔

گویا جناب رسول اللہؐ نے دو وجوہ سے حضرت حاطبؓ کی اس سنگین ترین غلطی کو معاف فرمایا۔ ایک یہ کہ انہوں نے کوئی بات چھپائی نہیں اور سب کچھ صاف صاف بتا دیا، اور دوسرا ان کا بدری ہونا ان کے لیے معافی کا سبب بن گیا کہ ان کی سابقہ قربانیاں تقاضا کرتی ہیں کہ ان کی غلطی کو معاف کر دیا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ الممتحنہ نازل فرمائی

جس کی ابتدائی آیات میں حضرت حاطبؓ کی اس غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے اور اس کے ضمن میں جہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت سی ہدایات دی ہیں وہاں کافروں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے بھی ہم مسلمانوں کو بعض حقائق سے آگاہ فرمایا ہے۔ ان آیات کریمہ کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے۔

"اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو جبکہ انہوں نے تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے حق کا انکار کر رکھا ہے اور انہوں نے رسول اللہؐ کو اور تمہیں مکہ مکرمہ سے صرف اس "جرم" میں نکال دیا تھا کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آئے ہو۔ اب تم میری راہ میں جہاد کے لیے نکلتے ہو اور میری رضا تلاش کرتے ہو اور اس کے ساتھ ان کافروں کے ساتھ خفیہ دوستیاں بھی رکھتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم کھلے بندوں کرتے ہو اور جو کچھ مخفی طور پر کرتے ہو میں سب باتوں کو جانتا ہوں۔ اور تم میں سے جس نے ایسی حرکت کی وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا۔ کافروں کا حال یہ ہے کہ وہ جب بھی تم پر قابو پائیں گے تمہارے دشمن ہی ثابت ہوں گے، وہ تمہاری طرف برے ارادے سے ہاتھ بھی بڑھائیں گے اور زبانیں بھی دراز کریں گے اور ان کی خواہش یہی ہے کہ تم کفر کی طرف پلٹ جاؤ"۔

یہ ان آیات کا قدرے آزاد ترجمہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت حاطبؓ کے مذکورہ واقعہ کے پس منظر میں سورۃ الممتحنہ کے آغاز میں نازل فرمائیں اور ان میں ہمیں واضح طور پر بتا دیا کہ کافروں کے ساتھ جب بھی دوستی کی کوشش کرو گے وہ یکطرفہ ہو گی۔ ان کی طرف سے دوستی کے جواب میں دوستی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ انہیں جب بھی موقع ملے گا وہ دشمنی کا اظہار ہی کریں گے، اس دشمنی میں ان کے ہاتھ بھی استعمال ہوں گے اور زبانیں بھی حرکت میں آئیں گی۔ اور ان کا ہدف اور ٹارگٹ ایک ہی بات ہے کہ مسلمان اپنے دین پر قائم نہ رہیں بلکہ کفر کی برادری میں شامل ہو جائیں۔

آج ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے عالم کفر کے ساتھ اپنے تعلقات کی ترجیحات طے کرنے میں قرآن کریم کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ خدا کرے کہ ہم اپنی اس غلطی کو کسی درجہ میں محسوس کریں، آمین۔

ائمہ مساجد اور علماء کرام کی معاشرتی ذمہ داریاں

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۶ جنوری ۲۰۰۴ء)

بنگلہ دیش میں ضلع سونام گنج کے ایک قصبہ دیرائی میں ۸ جنوری ۲۰۰۴ء کو ائمہ و علماء کانفرنس کے عنوان سے اجتماع تھا۔ لندن میں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے دینی مرکز ''المرکز الاسلامی'' کے مدیر مولانا محمد شعیب اس کے منتظم تھے۔ مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور مولانا محمد فاروق ملا کے ہمراہ وہاں پہنچا تو علماء کرام نے بڑی محبت کا اظہار کیا۔ استقبال کرنے والوں میں مولانا نور الاسلام خان بھی شامل تھے جو دیکھتے ہی چمٹ گئے اور کان میں کہا کہ میں نصرۃ العلوم کا فاضل ہوں، میں نے ۱۳۹۱ھ میں دورۂ حدیث کیا تھا۔ مجھے بھی بہت خوشی ہوئی، ایک دوسرے سے حال احوال دریافت کیا، پتہ چلا کہ دار العلوم درگاپور میں شیخ الحدیث ہیں اور ایک عرصے سے تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ درگاپور واپسی پر راستہ میں تھا، تھوڑی دیر کے لیے دار العلوم میں رکے اور دار العلوم کے مہتمم حضرت مولانا عبد الحق دامت برکاتہم کی زیارت کی جو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلفاء میں سے ہیں۔ ائمہ و علماء کانفرنس ایک ہال میں تھی جس میں علاقہ بھر کے علماء کرام اور ائمہ کرام کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ کانفرنس کا مقصد علماء اور ائمہ کو ان کی معاشرتی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا تھا۔ راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ علماء کرام کے بارے میں ایک حدیث نبویؐ کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں، جبکہ ائمہ جس مصلے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں اسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مصلیٰ سمجھا جاتا ہے، اور جس منبر پر خطبہ دیتے ہیں اسے منبر رسولؐ کے عنوان سے پکارا جاتا ہے۔ اس حوالے سے علماء اور ائمہ اس معاشرہ میں جناب نبی اکرمؐ کی نیابت اور نمائندگی کے منصب پر فائز ہیں اور ہمیں اس منصب کی ذمہ داریوں اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ جائزہ لینا چاہیے کہ ہم ان ذمہ داریوں کو کہاں تک ادا کر رہے ہیں؟

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیات میں سے اس وقت تین چار امتیازی امور کا تذکرہ کرنا چاہوں گا تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ ہم لوگ، جو علماء کرام کہلاتے ہیں اور امامت کے منصب پر فائز ہیں، اپنے فرائض کی انجام دہی میں کہاں تک کامیاب ہیں؟

• احادیث نبوی کے مطابق غار حرا میں پہلی وحی کے نزول کے بعد جناب نبی اکرمؐ کا جو سب سے پہلا تعارف روایات میں ملتا ہے، ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی زبان سے ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے ان کا وہ معاشرتی رول اور کردار یاد دلایا تھا جسے ایک سوشل ورکر کا کردار کہا جاتا ہے۔ جناب نبی اکرمؐ غار حرا میں پہلی وحی کے اچانک واقعہ کی وجہ سے گھبراہٹ کا شکار تھے جس پر ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں، اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں، بیواؤں کے کام آتے ہیں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں اور مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

غار حرا کی وحی کے بعد ہمیں احادیث نبوی میں جناب نبی اکرمؐ کا پہلا تعارف یہی ملتا ہے اور ہمیں آنحضرتؐ کی نیابت اور نمائندگی کی بات کرتے ہوئے اس بات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کہ اس حیثیت سے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا نمائندگی کر رہے ہیں؟

• اس کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا تعارف ایک داعی اور مصلح کا ہے۔ آپ نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور معاشرہ میں ہر طرف پھیلی ہوئی ان برائیوں کے خلاف آواز بلند کی جن کی وجہ سے وہ معاشرہ جاہلی معاشرہ کہلاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار اور اس کی بندگی کی دعوت تو آنحضرتؐ کی سب سے بڑی دعوت تھی، لیکن اس کے ساتھ آپ نے عرب معاشرے کو جن باتوں کی طرف توجہ دلائی، ان کا تذکرہ قیصر روم کے دربار میں نبی اکرمؐ کے اس وقت کے سب سے بڑے حریف حضرت ابوسفیانؓ نے ان الفاظ سے کیا تھا کہ وہ ہمیں صدق، صلہ اور عفاف کا حکم دیتے ہیں۔ ابوسفیان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قریش کی قیادت کر رہے تھے، لیکن انہیں دنیا کے ایک بڑے بادشاہ کے دربار میں یہ کہنا پڑا کہ جناب نبی اکرمؐ کی دعوت کا ایک بڑا حصہ یہ ہے کہ لوگ سچ بولیں، آپس کے تعلقات اور روابط کو قائم رکھیں اور پاک دامنی اختیار کریں۔

عرب معاشرے میں اس وقت پھیلی ہوئی باہمی رقابتوں، بدکاری اور جھوٹ کے ماحول میں یہ معاشرتی اصلاح کی بہت بڑی دعوت تھی جس سے نبی کریمؐ عرب معاشرہ میں ایک عظیم داعی اور مصلح کے طور پر سامنے آئے۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمائندگی اور نیابت کا دعوی کرتے ہوئے یہ بھی سوچنا ہوگا کہ جس معاشرہ میں ہم رہ رہے ہیں، اس میں داعی اور مصلح کے طور پر ہمارا کردار کیا ہے اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے، نیز معاشرتی برائیوں سے سوسائٹی کو نجات دلانے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟

•اس کے بعد جناب نبی اکرمؐ کے عظیم کردار کا ایک اور رخ سامنے آتا ہے اور وہ ان کی معلم کی حیثیت ہے جسے قرآن کریم نے کئی جگہ بیان کیا ہے اور خود آپؐ نے فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اردگرد رہنے والوں کو اور اپنے پاس آنے والوں کو براہ راست اور ان کے ذریعے سے مختلف اطراف کے لوگوں کو جن باتوں کی تعلیم دی، ان کا دائرہ بہت متنوع اور وسیع ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، آپ علماء کرام ہیں، خوب جانتے ہیں۔ البتہ میں اس طرف ضرور توجہ دلانا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرمؐ کے معلم کے کردار کو سامنے رکھ کر ہم اپنے طرز عمل کا جائزہ لیں کہ جس ماحول میں ہم رہتے ہیں، وہاں کے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ ایک معلم کی حیثیت سے ہمارا کیا رابطہ ہے؟

اگر گستاخی معاف فرمائیں تو میں عرض کرنا چاہوں گا کہ جو لوگ مسجد میں ہمارے پاس آجاتے ہیں اور مدرسہ میں ہم سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں، ان پر تھوڑی بہت محنت کر کے ہم مطمئن ہیں کہ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ ہم نے ان افراد پر قناعت کر لی ہے اور ان کے علاوہ باقی لوگوں سے رابطہ اور تعلق کی ہمیں کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ میری درخواست ہے کہ مسجد اور مدرسہ میں ہمارے پاس آنے والوں کا معاشرہ کے باقی افراد کے ساتھ عددی تناسب ہمیں ضرور معلوم کرنا چاہیے اور پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ماحول اور آبادی کی وہ عظیم اکثریت جس کا ہمارے ساتھ مسجد یا مدرسہ کا کوئی رابطہ نہیں ہے، اس کے ساتھ ایک مصلح اور معلم کے طور پر ہمارا

کیا معاملہ ہے؟ یہ بات سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے روز یہی لوگ ہمارا گریبان پکڑ لیں کہ ہماری اصلاح اور تعلیم کے لیے ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

• جناب نبی اکرمؐ کے معاشرتی کردار کی اور بھی بہت سی حیثیات ہیں۔ آپ حکمران بھی تھے، کمانڈر بھی تھے اور قاضی بھی تھے، لیکن میں سردست سوشل ورکر، داعی، مصلح اور معلم کی حیثیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء کرام اور ائمہ عظام کو غور و فکر کی دعوت دینا چاہتا ہوں کہ ان معاملات میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا نیابت کر رہے ہیں اور آپؐ کے وارث ہونے کا حق کہاں تک ادا کر رہے ہیں؟ معاف کیجیے! ہم نے صرف نماز پڑھا دینے اور اپنے پاس آجانے والوں کو تھوڑی بہت تعلیم دینے پر قناعت کر لی ہے اور اسے رسول اکرمؐ کی وراثت، نیابت اور نمائندگی سمجھ لیا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اور ہمیں اس حوالے سے اپنے کردار، طرز عمل اور ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

دوسری بات جس کی طرف ائمہ اور علماء کی اس کانفرنس کے شرکاء کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے احتساب اور اپنی سرگرمیوں کے ناقدانہ جائزہ کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں اس بات کو نہ صرف غیر ضروری سمجھا جاتا ہے بلکہ معیوب قرار دیا جاتا ہے۔ یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔ مثلاً بعض دوست جب یہ بات کرتے ہیں کہ طالبان ہمارے بھائی ہیں، بہت نیک ہیں، مخلص ہیں اور انہوں نے قربانی اور ایثار کی شاندار روایات زندہ کی ہیں، اس لیے ان کی غلطیاں نہیں نکالنی چاہئیں اور ان کے طرز عمل کا ناقدانہ جائزہ نہیں لینا چاہیے، تو مجھے تعجب ہوتا ہے اور میں عرض کرتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سب سے بہترین اور مقدس طبقہ صحابہ کرامؓ کا گروہ ہے، لیکن جب انہیں غزوۂ احد میں وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور حنین کی لڑائی میں تھوڑی دیر کے لیے ان کے قدم اکھڑے تو قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور ان کی ناکامی کا اعتراف کیا، اس کے اسباب بیان کیے اور ان وجوہ کی نشاندہی کی جن کی وجہ سے انہیں ان دونوں غزووں میں وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سے حضرات صحابہ کرامؓ کے تقدس اور بزرگی میں کوئی فرق نہیں پڑا اور ان کے خلوص اور

قربانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اس لیے قرآن کریم کا اسلوب اور ہدایت ہمارے لیے یہی ہے کہ اگر کسی مرحلہ میں ناکامی ہو تو اس کے اسباب کا جائزہ لو اور وجوہات کی نشاندہی کرو تاکہ ان کے ازالہ کے لیے کوئی صورت نکال سکو۔

اس پس منظر میں آج کی اس ائمہ وعلماء کانفرنس کی وساطت سے میں علماء کرام اور ائمہ عظام کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ کسی بھی جگہ دینی خدمات سرانجام دے رہے ہوں، دو باتوں کا ہر وقت خیال رکھیں:

1. ایک یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث کہلاتے ہوئے اور آپؐ کے مصلے پر کھڑے ہو کر آپؐ کی نمائندگی کا دعوی کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ انسانی معاشرے میں رسول اکرمؐ نے مختلف حیثیات سے جو عظیم کردار ادا کیا تھا، ہم ان میں سے کس حیثیت کی نمائندگی کر رہے ہیں؟

2. اور دوسری بات یہ کہ ہم اس وقت کم و بیش ہر محاذ اور ہر شعبہ میں جس پسپائی کا مسلسل شکار ہو رہے ہیں، اس کے اسباب اور وجوہات کیا ہیں؟ کیونکہ اسی صورت میں ہم انبیاء کرام علیہم السلام کے ورثاء کی حیثیت سے اپنے کردار کو بہتر بنا سکتے ہیں اور جناب نبی اکرمؐ کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

بنگلہ دیش کا قیام اور وطن واپسی

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۴ جنوری ۲۰۰۴ء)

دبئی میں دو روزہ قیام کے حوالہ سے اپنے تاثرات کے کالم میں قارئین سے گزارش کی تھی کہ تاثرات کا بقیہ حصہ اگلے کالم میں پیش کروں گا۔ خیال تھا کہ واپسی دبئی کے راستے سے ہوگی اور کچھ دیگر حضرات سے ملاقات کا ارادہ بھی تھا اس طرح ایک قسط اور پیش کر سکوں گا مگر پروگرام میں تبدیلی ناگزیر ہوگئی۔ ڈھاکہ کے نواح میں ”مدھوپور“ نامی ایک بستی میں ہمارے احباب کا ایک دینی ادارہ ”جامعہ حلیمیہ“ کے نام سے کام کر رہا ہے۔ اس کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد ۹ جنوری کو ہو رہا تھا اور اس مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا عبد الحمید کا اصرار تھا کہ میں اس پروگرام میں شرکت کے لیے ضرور رکوں، جبکہ میرا پروگرام ۷ جنوری

کو دبئی واپسی کا تھا، مگر ان کے اصرار پر ۱۰ جنوری کو پی آئی اے کے ذریعے ڈھاکہ سے براہ راست کراچی واپسی کا پروگرام طے ہو گیا۔

نواکھالی میں حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کے ایک ممتاز خلیفہ حضرت مولانا نور بخشؒ تھے جن کے خلیفہ حضرت مولانا عبد الحلیمؒ نے اس علاقہ میں نمایاں دینی خدمات سرانجام دیں اور ان کے ساتھ مولانا نور بخش کے داماد مولانا نذیر احمدؒ بھی اپنے خسر بزرگوار کے خلیفہ تھے اور اس علاقہ کے مشہور روحانی بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک کے دوران مولانا نذیر احمدؒ پاکستان کی حمایت کے الزام میں مکتی باہنی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر گئے۔ مولانا عبد الحلیم کے خلفاء میں مولانا عبد الحمید صاحب ہیں جو بڑی تعداد میں لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لیے مصروف عمل ہیں اور ان کے ارادت مندوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے فرزند مولانا محمد عبد اللہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فاضل ہیں اور اپنے والد محترم کے ساتھ دینی و سماجی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ جامعہ حلیمیہ مدھوپور کے سالانہ جلسہ میں ہزاروں افراد شریک تھے جبکہ بنگلہ دیش کے بہت سے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ دار العلوم دیوبند کے نائب شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق اعظمی مدظلہ مہمان خصوصی کے طور پر رونق افروز تھے۔ مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور راقم الحروف کو بھی مولانا عبد الحمید اور مولانا عبد اللہ کے اصرار پر رکنا پڑا اور جلسہ میں شرکت ہو گئی۔ جامعہ حلیمیہ کے سالانہ جلسہ میں ایک بار پہلے بھی ۱۹۹۷ء میں والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم العالیہ کے ہمراہ شریک ہو چکا ہوں۔

بنگلہ دیش کے جلسوں کا عجیب انداز ہے۔ یہ جلسہ جمعۃ المبارک کی نماز کے وقت شروع ہوا اور صبح نماز فجر تک صرف نمازوں کے وقفہ کے ساتھ تسلسل سے جاری رہا۔ ۱۹۹۷ء کی بات ہے کہ عشاء کے بعد مولانا عبد اللہ صاحب سے میں نے کہا کہ اگر مجھے گفتگو کے لیے جلد وقت دے دیا جائے تو میں رات آرام کر لوں گا۔ انہوں نے کہا کہ آپ ابھی آرام کریں اور سو جائیں آپ کے خطاب کی باری رات گئے ہوگی اور اس سے قبل آپ کو بیدار کر دیا جائے گا، چنانچہ میں سو گیا۔ رات دو بجے کے لگ بھگ مجھے جگایا گیا اور دس پندرہ منٹ کی تیاری کے بعد میں نے سحری کے وقت خطاب کیا، شرکاء کا جوش و خروش جوں کا توں تھا جو گزشتہ روز ظہر کے بعد سے مسلسل خطابات سن رہے تھے۔

البتہ اس سال مجھے جلدی وقت دے دیا گیا، میں نے حفاظ قرآن کریم کے فضائل پر گفتگو کی اور بتایا کہ اس وقت قرآن کریم کے حوالے سے ہم پر جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچوں کو معنی سمجھے بغیر قرآن کریم کے الفاظ رٹا دیے جاتے ہیں اور وہ طوطے کی طرح اسے دہراتے رہتے ہیں۔ مگر یہ قرآن کریم کا امتیاز اور اعجاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعلیم کے ساتھ اس کی تلاوت اور الفاظ کے رٹنے اور سنانے کو مستقل عبادت قرار دیا ہے اور قرآن کریم کے سننے سنانے پر ہر حرف کے بدلے کم از کم دس نیکیوں کے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ یہ قرآن کریم کی حفاظت کا نظم ہے کہ دنیا میں کاغذ کے کسی ورق پر قرآن کریم موجود ہو یا نہ ہو، لاکھوں حفاظ کے سینوں میں قرآن کریم ہر وقت موجود و محفوظ رہتا ہے اور دنیا کے کسی حصے میں بھی قرآن کریم کے الفاظ میں کسی طرح کے ردوبدل کی کوشش کی جائے اس کی اصلاح اور نشاندہی کے لیے لاکھوں حفاظ ہر دور میں موجود و مستعد رہے ہیں۔

رات کو جلسہ سے خطاب کے بعد ہم ڈھاکہ واپس آ گئے، ہفتہ کی شام کو مولانا منصوری کی ممبئی کے لیے اور میری کراچی کے لیے فلائیٹ تھی اس لیے ڈھاکہ میں مزید دو تین جگہ جانے کا موقع مل گیا۔ بنگلہ دیش میں حکومت کے زیر انتظام چلنے والے دینی مدارس کو ”عالیہ مدرسے“ کہا جاتا ہے جبکہ ہماری طرز کے آزاد پرائیویٹ دینی مدارس ”قومی مدرسے“ کہلاتے ہیں۔ سرکاری مدارس کو مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کنٹرول کرتا ہے جو محکمہ تعلیم کے ماتحت ہے اور اس کے ساتھ کم و بیش آٹھ ہزار مدارس کا الحاق ہے۔ ان میں ایک بڑا مدرسہ ڈھاکہ میں ہے جو مدرسہ عالیہ کے نام سے کام کر رہا ہے، یہ مدرسہ ۱۷۸۰ء میں کلکتہ میں قائم ہوا تھا جب سراج الدولہ شہیدؒ کی شہادت کے صرف ۲۳ برس بعد انگریزی حکومت نے یہ مدرسہ قائم کیا تھا، اس کے پرنسپل ایک عرصہ تک انگریز رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں مدرسہ عالیہ کو ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا۔ اس میں درس نظامی کے بڑے حصے کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ جدید علوم اور مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے، اس کے پرنسپل آج کل پروفیسر منصور الرحمن ہیں جن سے ان کے دفتر میں ہماری ملاقات ہوئی اور انہوں نے مدرسہ عالیہ کے بارے میں خاصی معلومات فراہم کیں۔ ہم نے ان سے عالیہ مدارس کے نصاب کی تفصیلات بھی حاصل کیں جو بنگلہ زبان میں ہیں اور میں انہیں دار الرشاد ڈھاکہ

کے مولانا سلمان ندوی کے سپرد کر آیا ہوں کہ وہ اس کا اردو ترجمہ کر کے ہمیں ارسال کر دیں۔

اس کے بعد ڈھاکہ کے تبلیغی مرکز میں جانا ہوا جو شہر کے بارونق علاقہ میں ہے اور ایک بڑی مسجد کے ساتھ مختلف عمارات ہیں جہاں ملک بھر سے تبلیغی جماعت کے حضرات کی ہر وقت آمد و رفت رہتی ہے اور ایک بڑا مدرسہ بھی قائم ہے۔ تبلیغی مرکز میں قیام پذیر حضرت مولانا مزمل الحق صاحب ہمارے حضرت مولانا عیسی منصوری کے بے تکلف دوستوں میں سے ہیں۔ مولانا منصوری کا شمار تبلیغی جماعت کے پرانے بزرگوں میں ہوتا ہے، انہوں نے حضرت مولانا محمد یوسف دھلویؒ کے دور میں جماعت میں کام کیا ہے اور حضرت مولانا سعید احمد خانؒ کی خدمت میں کئی سال رہے ہیں۔ پرانے اور بے تکلف دوست جب ایک عرصہ کے بعد ملتے ہیں تو ان کی ملاقات کا رنگ ہی اور ہوتا ہے اور ہم نے دونوں حضرات کی بے تکلفانہ نوک جھوک سے پورا حظ اٹھایا۔ ظہر کی نماز تبلیغی مرکز میں ادا کی اور اس کے بعد مولانا مزمل الحق صاحب نے اہتمام اور تکلف کے ساتھ کھانا کھلایا۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو روزنامہ انقلاب کے دفتر گئے، بنگلہ زبان کے اس روزنامہ اخبار کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ بنگلہ دیش کے دینی حلقوں کا ترجمان ہے، وہاں مختلف دوستوں سے ملاقات ہوئی اور پھر ہم ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس روز پلٹن میدان ڈھاکہ میں عوامی لیگ کی سربراہ حسینہ واجد کا جلسہ تھا جس کے لیے مختلف اطراف سے جلوس جلسہ گاہ کی طرف آ رہے تھے۔ ہمیں بھی ایک جلوس کے پیچھے پیچھے خاصی دور تک چلنا پڑا۔ یہ جلوس دیکھ کر پیپلز پارٹی کے جوش و خروش کے دور کے جلوسوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ نوجوانوں کی تعداد زیادہ تھی جو پر جوش نعرے لگاتے ہوئے اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے ہوئے پلٹن میدان کی طرف اپنی قائدہ کا خطاب سننے کے لیے رواں دواں تھے۔ مختلف راستوں سے آنے والے ان پر جوش جلوسوں کی وجہ سے ہم بمشکل مغرب کے قریب ڈھاکہ کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ تک پہنچ پائے جو سابق صدر جنرل ضیاء الرحمن شہید کے نام سے موسوم ہے اور ضیاء انٹرنیشنل ایئرپورٹ کہلاتا ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مولانا عیسی منصوری بنگلہ دیش ایئرلائن کے ذریعہ ممبئی کے لیے پرواز کر گئے اور میں پی آئی اے کے ذریعہ کراچی روانہ ہو گیا۔

بخاری شریف کے چند امتیازات

(بنگلہ دیش - ۵ جنوری ۲۰۰۴ء)

(جامعہ کے شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۳ء سے ۱۰ جنوری ۲۰۰۴ء تک بنگلہ دیش کا دورہ کیا اور ڈھاکہ، چاٹگام، سلہٹ، سونام گنج، درگاپور، مدھوپور، ھاٹ ہزاری، ٹیپا، دیرائی اور مختلف مقامات پر درجنوں دینی اجتماعات سے خطاب کیا، اس دوران انہوں نے جامعہ محمودیہ سلہٹ میں دورہ حدیث کے طلبہ کو بخاری شریف کا پہلا سبق پڑھایا اور مدینۃ العلم دارالسلام سلہٹ اور دارالرشاد میر پور ڈھاکہ کے اساتذہ وطلبہ کی فرمائش پر انہیں بخاری شریف کی ایک حدیث کا درس دیا، بخاری شریف کے سبق کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی مجالس میں ان کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوۃ۔ سب سے پہلے میں بخاری شریف کی تعلیم کا آغاز کرنے والے طلبہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اللہ تعالی نے انہیں اس مقام تک پہنچایا کہ آج وہ حدیث نبویؐ کی سب سے مستند کتاب کی تعلیم کا آغاز کر رہے ہیں، اللہ تعالی انہیں اس کی تکمیل کی توفیق دیں اور علم حدیث کی برکات سے مالامال فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

بخاری شریف علم حدیث کی سب سے مستند کتاب ہے جسے ”اصح الکتب بعد کتاب اللہ“ کہا جاتا ہے، حدیث نبویؐ کا علم بہت مہتم بالشان علم ہے، جسے حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے تمام علوم دینیہ کی اصل اور اساس کہا ہے، اس لیے کہ تمام علوم دینیہ کے چشمے اسی سے پھوٹتے ہیں حتی کہ قرآن کریم بھی ہمیں حدیث نبویؐ کے ذریعے ملا ہے۔ قرآن کریم کا معنی و مفہوم تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں مگر ہمیں تو قرآن کریم کے الفاظ بھی آنحضرتؐ کے ارشادات کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں، اور جناب رسول اللہ کے ارشادات وفرمودات پر ایمان لائے بغیر ہمارا قرآن کریم کے الفاظ تک پہنچنا ہی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے حدیث نبویؐ تمام علوم دینیہ کی اساس اور سرچشمہ ہے اور اسے پورے اہتمام توجہ اور دلجمعی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

اس کے بعد بخاری شریف کے بارے میں چند باتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ بخاری شریف کی وہ خصوصیات اور امتیازات کیا ہیں جنھوں نے اسے حدیث کی تمام کتابوں سے ممتاز کر دیا ہے اور اسے علمی حلقوں میں اس قدر قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے

بارے میں اساتذہ اور طلبہ سے میری گزارش ہوتی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بخاری شریف کے تراجم ابواب پر مستقل رسالہ لکھا ہے جو ہمارے ہاں بخاری شریف کے متداول نسخوں میں موجود ہے۔ اس کی ابتدا میں حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک صفحہ کا مقدمہ ہے جس کے بارے میں ان کا ارشاد ہے کہ بخاری شریف کو جو لوگ سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہیں انہیں یہ مقدمہ حفظ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اساتذہ سے میری گزارش ہے کہ اگر حفظ نہ بھی ہو سکے تو کم از کم یہ مقدمہ بخاری شریف کے طلبہ کو سبقا سبقا ضرور پڑھا دینا چاہیے، اس میں حضرت شاہ صاحبؒ نے بخاری شریف کے بہت سے امتیازات کا ذکر کیا ہے جن میں سے تین چار کا تذکرہ میں اس وقت مناسب سمجھتا ہوں۔

1. ایک یہ کہ بخاری شریف سے قبل محدثین کا طریق کار عام طور پر یہ تھا کہ وہ کسی ایک شعبہ کے بارے میں احادیث جمع کرتے تھے، مثلاً حضرت امام مالکؒ نے احکام کے حوالہ سے احادیث جمع کی ہیں، محمد بن اسحاقؒ نے سیرت و مغازی کی روایات کو مرتب کیا ہے، حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ نے زہد و رقائق کے بارے میں روایات منضبط فرمائی ہیں اور ابن جریجؒ نے تفسیری روایات اکٹھی کی ہیں۔ مگر امام بخاریؒ نے تمام فنون کی روایات کو یکجا کر دیا ہے اور اسی وجہ سے اسے ”الجامع“ کہا جاتا ہے کہ اس میں تفسیر، سیرت، عقائد، مغازی، احکام، تاریخ، اخلاق، معاملات اور دیگر تمام شعبوں کے بارے میں روایات انہوں نے مرتب کر دی ہیں جس سے زندگی کے کم و بیش ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والی روایات بخاری شریف میں مل جاتی ہیں۔

2. بخاری شریف کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس سے قبل پیشتر محدثین روایات بیان کرنے میں صحت کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے تھے اور سند کے بیان کے ساتھ ہر طرح کی روایات بیان کر دیتے تھے، جس سے روایت کی جانچ پڑتال کی ذمہ داری قاری پر آجاتی تھی کہ وہ سند کو دیکھ کر روایات کا درجہ خود طے کر لے۔ یہ بات اہل علم کے حلقہ میں تو ٹھیک ہے مگر عوام کے لیے موزوں نہیں ہے، اس لیے امام بخاریؒ نے روایت کی صحت کا کڑا معیار اور اس کے لیے مضبوط اصول طے کر کے اس بات کی ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ جو روایت

اس کتاب میں نقل کریں گے وہ ان کے بیان کردہ اصول کے مطابق بالکل صحیح ہوگی اور اسے بلا تامل قبول کیا جاسکتا ہے۔

3. تیسرا امتیاز اس کتاب کا یہ ہے کہ اس سے قبل عام محدثین کا اسلوب یہ رہا ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں مرفوع، موقوف، مسند، منقطع ہر قسم کی روایات اور ان کے ساتھ آثار صحابہؓ و تابعینؒ کو یکجا بیان کر دیتے تھے، مگر امام بخاریؒ نے ان میں سے مسند اور مرفوع روایات کو چھانٹ کر الگ پیش کر دیا ہے اور ان کے ساتھ اگر کسی جگہ موقوف روایات یا آثار کا ذکر کیا ہے تو شاہد اور تابع کے طور پر اسے نقل کیا ہے، اصل روایات مسند اور مرفوع ہی پیش کی ہیں۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام الجامع المسند الصحیح رکھا گیا ہے۔

4. بخاری شریف کا چوتھا اور سب سے اہم امتیاز حضرت امام بخاریؒ کا اجتہاد و استنباط ہے جو ان کے تراجم ابواب کی صورت میں ہے اور ان سے امام بخاریؒ کی اجتہادی شان جھلکتی ہے۔ امام بخاریؒ کے فقہی مذہب کے بارے میں زیادہ قرین قیاس قول یہ ہے کہ وہ خود مجتہد مطلق تھے، اگرچہ دیگر بہت سے مجتہدین مطلق کی طرح ان کی فقہ کی ترویج نہیں ہوئی مگر ان کا اجتہادی مرتبہ و مقام یہی ہے، اور انہوں نے ایک ایک حدیث سے کئی کئی مسائل مستنبط کر کے ان پر جو عنوانات قائم کیے ہیں ان سے ان کے اجتہادی مقام کی بلندی معلوم ہوتی ہے۔ بخاری شریف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں پڑھنے اور سمجھنے کی اصل بات حدیث سے ترجمۃ الباب کی مناسبت ہے کیونکہ یہ مناسبت بعض اوقات اتنی دور کی ہوتی ہے کہ اس کے لیے اچھی خاصی ذہنی ورزش کرنا پڑ جاتی ہے۔ ہمارے استاذ محترم اور والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے جو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد ہیں، ایک بار حضرت مدنیؒ کے حوالہ سے ذکر فرمایا کہ بعض اوقات امام بخاریؒ کے بیان کردہ ترجمۃ الباب اور اس کے تحت لائی گئی حدیث میں مناسبت اس طرز کی ہوتی ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے کہ

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ شہد کی مکھی باغ میں جائے گی، پھولوں کا رس چوسے گی، اس سے شہد بنائے گی، پھر چھتہ بنا کر شہد اس میں نکالے گی، چھتے سے موم نکلے گی، اس سے موم بتی بنے گی، یہ موم بتی جلے گی تو پروانے آئیں گے اور اس کی آگ میں جل جائیں گے۔ اس لیے پروانے کو جلنے سے بچانے کے لیے بہتر ہے کہ مکھی کو باغ میں جانے ہی نہ دو تاکہ نہ وہ پھولوں کا رس چوسے، نہ شہد بنائے، نہ چھتہ بنے، نہ موم نکلے، نہ موم بتی بنے، نہ جلے اور نہ پروانے کی موت ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ بسا اوقات امتحان اور آزمائش کے لیے بھی دور دراز کی مناسبت والا عنوان کسی روایت پر قائم فرما دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کی ذہانت اور قابلیت کا اندازہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ امام بخاریؒ کا ذوق ہے کہ وہ ایک ایک حدیث سے کئی کئی مسائل مستنبط کرتے ہیں اور پھر مختلف ابواب میں ان کی مناسبت والے جملے نقل کرتے ہیں، اس لیے بسا اوقات بخاری شریف کی بعض روایات کو یکجا تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور ایک روایت کو جمع کرنے کے لیے کئی ابواب کی ورق گردانی کرنا پڑتی ہے۔ بہرحال یہی بخاری شریف کا کمال اور اس کا حسن ہے اور اس عظیم کتاب کے پڑھنے پڑھانے والوں کو اس کے امتیازات اور خصوصیات کو ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہیے۔

اس کے بعد اب آتے ہیں بخاری شریف کے سبق کے آغاز کی طرف جس کا عام طور پر طریقہ یہ ہے کہ اس کی ابتدائی حدیث پڑھی جاتی ہے اور اس کے بارے میں دو چار ضروری باتوں کے بعد دعا ہوتی ہے۔ میں اس کے مطابق آپ طلبہ میں سے کسی سے یہ روایت سنوں گا لیکن اس سے قبل یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث کی روایت کے دو طریقے محدثین کے ہاں مروج چلے آرہے ہیں، (۱) ایک یہ کہ شاگرد حدیث پڑھتا ہے اور استاذ سنتا ہے، ہمارے ہاں عام طور پر یہی طریقہ رائج ہے، (۲) لیکن دوسرا طریقہ یہ ہے کہ استاذ حدیث پڑھتا ہے اور شاگرد سنتے ہیں، یہ طریقہ بھی محدثین میں رائج رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام مالکؒ کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے سامنے سینکڑوں تلامذہ کی مجلس میں ایک شاگرد روایت پڑھتا تھا اور

امام صاحبؒ کے ساتھ دیگر تلامذہ بھی سنتے تھے مگر قاضی عیاضؒ نے ”ترتیب المدارک“ میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ کے ایک شاگرد ہشام بن عمارؒ کو ایک دن شوق ہوا کہ حضرت استاذ سے احادیث سنیں جس کی انہوں نے استاد محترم سے فرمائش کر دی، امام صاحبؒ نے انکار کیا تو اس نے پھر فرمائش کی جس پر امام مالکؒ نے ہشام بن عمارؒ کو دوسرے شاگرد سے سزا کے طور پر پندرہ چھڑیاں لگوادیں۔ بعد میں امام صاحبؒ کو خیال آیا کہ چھڑیوں کی یہ سزا نہیں دینی چاہیے تھی تو ہشام بن عمارؒ سے معذرت خواہی کی مگر ہشامؒ نے معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ امام مالکؒ نے دوبارہ بات کی تو ہشام بن عمارؒ نے شرط لگادی کہ اگر آپ پندرہ چھڑیوں کے عوض مجھے پندرہ احادیث سنادیں تو میں آپ کو پندرہ چھڑیوں کی یہ سزا معاف کردوں گا۔ چنانچہ امام مالکؒ نے ہشام بن عمارؒ کو پندرہ حدیثیں سنائیں، اس پر ہشام بن عمارؒ نے گزارش کی کہ میں نے یہ طریق کار آپ سے حدیثیں سننے کے لیے اختیار کیا ہے، اس لیے میں اس بات کے لیے تیار ہوں کہ آپ مجھے چھڑیاں مارتے جائیں اور ہر چھڑی کے عوض ایک حدیث سناتے جائیں۔

قاضی عیاضؒ نے ایک اور دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے کہ امام مالکؒ جب اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تھے تو آپ کے پہلو میں پردے کے پیچھے ایک خاتون محدثہ بیٹھتی تھی جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ اگر سبق کے دوران حدیث پڑھنے والے نے کوئی غلطی کر دی ہے اور امام مالکؒ کی اس طرف توجہ نہیں ہوئی تو وہ خاتون محدثہ تپائی پر ہاتھ مار کر خبردار کرتی تھی کہ غلطی ہوگئی ہے۔ اس پر امام مالکؒ شاگرد سے وہ حدیث دوبارہ پڑھواتے اور غلطی چیک ہو جاتی۔ یہ خاتون محدثہ جو استاذ اور شاگرد دونوں کو چیک کرنے کے لیے پردے کے پیچھے بیٹھا کرتی تھی امام مالکؒ کی اپنی بیٹی تھیں، جو اس درجہ کی محدثہ تھیں کہ استاذ اور شاگرد دونوں کو چیک کیا کرتی تھیں۔ قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کا بیٹا پڑھ نہیں سکا تھا اس لیے جب کبھی ان کا بیٹا مجلس کے سامنے سے گزرتا تو امام مالکؒ اس کی طرف اشارہ کر کے حسرت سے کہا کرتے تھے کہ دیکھو وہ میرا بیٹا ہے اور یہ میری بیٹی ہے۔

علم حدیث میں عورتوں نے بھی بہت کمال حاصل کیا ہے اور بے شمار خواتین نے علم حدیث کی خدمت کی ہے، آکسفورڈ میں ہمارے ایک فاضل دوست مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی امت کی محدثات کے حالات جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ گزشتہ سال انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اب تک چھ ہزار کے لگ بھگ محدثات کے حالات جمع کر چکے ہیں جو متعدّد

ضخیم جلدوں کی صورت میں شائع ہوں گے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حدیث کی روایت کے دونوں طریقے ہیں اور میں آج دونوں طریقوں پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ ایک روایت آپ کو سناؤں گا اور ایک روایت آپ سے سنوں گا تاکہ دونوں طریقوں پر ہمارا عمل ہو جائے۔ سنانے کے لیے میں نے جس حدیث کا انتخاب کیا ہے وہ ”مسلسل بالأولیۃ“ کے عنوان سے معروف ہے مگر اس سے قبل اپنی حدیث کی سند کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، بحمد اللہ تعالیٰ مجھے مختلف شیوخ سے روایت حدیث کی اجازت حاصل ہے۔

میرے حدیث کے سب سے بڑے استاذ میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم ہیں جن سے میں نے بخاری شریف پڑھی ہے، وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد ہیں۔ دوسرے بڑے استاذ عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم ہیں جن سے میں نے مسلم شریف پڑھی ہے، وہ حضرت مدنیؒ اور حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ کے شاگرد ہیں۔ تیسرے استاذ حضرت مولانا عبد القیوم ہزاری دامت برکاتہم ہیں جن سے میں نے ابوداؤد شریف پڑھی ہے۔ چوتھے استاذ حضرت مولانا جمال احمد بنوی دامت برکاتہم ہیں جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے شاگرد ہیں۔ صحاح ستہ کی ساری کتابیں میں نے انہی اساتذہ سے پڑھی ہیں اور ان کی وساطت سے مجھے ہندوستان کے تین بڑے مراکز علماء فرنگی محل، دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور سے بالواسطہ تلمذ کا شرف حاصل ہے۔

جبکہ ان کے علاوہ میرے حدیث کے شیوخ میں درج ذیل اکابر بھی شامل ہیں۔ (۱) مکہ مکرمہ میں انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے شافعی المذہب محدث گزرے ہیں جو اپنے دور کے مسند العصر تھے الشیخ المحدث محمد یاسین الفادانیؒ ان کی خدمت میں مولانا منظور احمد چنیوٹی اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے استاذ مولانا سیف الرحمن ملی کے ہمراہ مجھے حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت شیخؒ نے ہمیں متعدّد سلسلات سنائیں جن میں وہ مسلسل بالأولیۃ بھی ہے جو ابھی میں آپ کے سامنے پڑھوں گا، حضرت شیخؒ نے ہمیں زبانی اور تحریری طور پر اپنی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت دی۔ (۲) شام کے معروف محقق اور حنفی محدث الشیخ المحدث عبد الفتاح ابو غدۃؒ کی خدمت میں مجھے لندن میں مولانا عیسیٰ منصوری اور مولانا محمد اکرم ندوی کے ہمراہ حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے امام بخاریؒ کی ”الأدب المفرد“ کی ابتدائی چند روایات مجھ سے سنیں اور اپنی تمام اسناد کے

ساتھ روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (۳) جبکہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مجھے تحریری طور پر اپنی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، اس کے بعد میں آپ کے سامنے مسلسل بالأولیۃ روایت پڑھتا ہوں جس میں مجھ سے لے کر حضرت سفیان بن عیینہؒ تک یہ تسلسل موجود ہے کہ ہر شاگرد نے اپنے استاذ سے پہلی روایت یہی سنی ہے، یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”الراحمون یرحمھم الرحمن تبارک وتعالی ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء“ رحم کرنے والوں پر اللہ تعالی تبارک وتعالی رحم فرماتے ہیں، تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

یہ روایت پڑھے جانے کے بعد ایک طالب علم نے بخاری شریف کی پہلی روایت پڑھی جس پر کہا کہ آپ نے بخاری شریف کی پہلی روایت پڑھی ہے اس پر بہت سی باتیں تو آپ کے استاذ محترم آپ کو بتائیں گے اور یہ انہی کا حق ہے البتہ دو باتیں بطور اشارہ میں بھی آپ سے عرض کر دیتا ہوں۔

1. ایک یہ کہ امام بخاریؒ نے ”بدء الوحی“ سے کتاب کا آغاز کیا ہے، یہ بتانے کے لیے کہ ہمارے تمام معاملات کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے، اس کے بعد کتاب الایمان ہو گی، پھر کتاب العلم ہو گی، پھر عبادات، معاملات، اخلاق اور دیگر امور کے ابواب ہوں گے۔ امام بخاریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایمان و عقیدہ سے لے کر اخلاق و عادات تک ہمارے سارے معاملات وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی روشنی میں طے ہوتے ہیں۔ آج کے عالمی ماحول میں یہ بات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس لیے کہ آج کی دنیا میں سب سے بڑا جھگڑا ہی یہ ہے کہ کیا انسانی سوسائٹی اپنے فیصلے خود کرنے میں آزاد ہے یا اس کے لیے آسمانی تعلیمات کی پابندی ضروری ہے؟ اس تنازعہ میں دنیا کی اکثر قومیں ایک طرف ہیں جنہوں نے آسمانی تعلیمات کو عملی اور اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا ہے، جبکہ ہم مسلمان دوسری طرف ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کے پابند ہیں۔ اس پس منظر میں امام بخاریؒ کا یہ اشارہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے ایمان، علم اور عبادت و معاملات کے ابواب سے پہلے بدء الوحی کا باب قائم کر کے بتا

دیا ہے کہ ہم مسلمان عقیدہ و علم سمیت ہر معاملہ میں وحی الٰہی سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اسی کو پوری نسل انسانی کے لیے راہ نجات سمجھتے ہیں۔

2. دوسرا اشارہ امام بخاریؒ نے ''انما الاعمال بالنیات'' کو پہلی روایت کے طور پر بیان کر کے کیا ہے کہ ایمان و عمل کے ہر معاملہ میں اصل دارومدار نیت پر ہے اور ہر عمل کا نتیجہ انسان کی نیت کے مطابق مرتب ہوگا۔ نیت کی مثال یوں سمجھ لیجئے جیسے بیج ہوتا ہے، جس چیز کا بیج آپ زمین میں ڈالیں گے پھل بھی اسی کا حاصل کریں گے اور جیسا بیج ہوگا پھل بھی ویسا ہی ہوگا۔ اس طرح امام بخاریؒ ہمیں یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ بخاری شریف کے سبق کے آغاز سے قبل اپنی نیتوں کو ٹٹول لو اور ان کی اصلاح کر لو کیونکہ نیت صحیح ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہوگی تو ثمرہ اس کے مطابق حاصل ہوگا اور اگر خدانخواستہ نیت میں کوئی خرابی ہے تو اچھے سے اچھا عمل بھی بیکار ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں خلوص نیت، توجہ اور دلجمعی کے ساتھ حدیث نبویؐ کا علم حاصل کرنے اور اس کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں آمین یارب العالمین۔

حضرت قاری محمد انور کے ساتھ ایک نشست

(۱ جنوری ۲۰۰۴ء)

ان دنوں ہمارے استاذ محترم حضرت قاری محمد انور صاحب مدینہ منورہ سے پاکستان تشریف لائے ہوئے ہیں، وہ گزشتہ اٹھائیس برس سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور تحفیظ القرآن الکریم کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ میں نے قرآن کریم ان سے حفظ کیا تھا جب وہ گکھڑ میں مدرسہ تحفیظ القرآن کے صدر مدرس تھے، یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ گکھڑ کے اس مدرسہ میں، جو محترم الحاج سیٹھی محمد یوسف مرحوم کے تعاون سے اور والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی زیر نگرانی قائم ہوا تھا، اس کے پہلے مدرس حضرت قاری اعزاز الحق امروہیؒ تھے جو ہمارے قرآن کریم کے سب سے پہلے استاذ تھے۔ مدرسہ کا انتظام شہریوں کی ایک کمیٹی کے پاس چلا آرہا ہے اور جب کہ ہمارے حلقوں کی روایت ہے کہ کمیٹیوں اور مدرسین کا مزاج آپس میں نہ ملنے کی وجہ سے بسا اوقات عجیب سی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مختلف مدرسین آتے جاتے رہے مگر

جب محترم قاری محمد انور صاحب تشریف لائے تو نہ صرف یہ کہ ٹھہراؤ پیدا ہو گیا بلکہ ان کے ذوق اور محنت کی وجہ سے مدرسہ نے اس حد تک ترقی کی کہ اب گکھڑ شہر اور اردگرد کے دیہات میں سینکڑوں حفاظ دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں جن میں اکثریت حضرت قاری صاحب کی شاگرد ہے۔

وہ ہمارے خاندانی استاذ بھی ہیں، ہم بارہ بہن بھائیوں کی اکثریت ان کی شاگرد ہے اور ان سے ہم نے قرآن کریم حفظ کیا ہے۔ میں نے اکتوبر ۱۹۶۰ء میں قرآن کریم حفظ مکمل کیا جب میری عمر بارہ سال تھی اور حضرت قاری محمد انور صاحب کا اٹھتی جوانی کا دور تھا۔ ان کے آنے سے پہلے میں مختلف اساتذہ سے کم و بیش بیس پارے حفظ کر چکا تھا لیکن ان کی کیفیت ایسی تھی کہ قاری صاحب نے از سر نو مجھے سارا قرآن کریم یاد کرایا اور اس کے ساتھ ساتھ تلفظ کی تصحیح اور تجوید کے ضروری قواعد کی تعلیم کا بھی نئے سرے سے اہتمام کیا۔ وہ سالہا سال تک گکھڑ میں قرآن کریم پڑھاتے رہے، پھر سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے بیرونی ممالک میں قرآن کریم کے حفظ کے مدارس قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اس پروگرام میں قاری محمد انور صاحب کینیا چلے گئے اور دو سال تک وہاں خدمات سرانجام دیں، اس کے بعد سیٹھی محمد یوسف ہی کے پروگرام کے تحت وہ مدینہ منورہ گئے اور اب تک وہاں قرآن کریم کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں۔

یہ سطور لکھتے ہوئے ان کے گکھڑ کے دور کا ایک اہم واقعہ ذہن میں آ گیا ہے جو ریکارڈ کے لیے تحریر کر رہا ہوں کہ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے دوران، جو پاکستان قومی اتحاد کے زیر اہتمام بھٹو حکومت کے خلاف چلائی گئی تھی اور بھٹو حکومت نے سیاسی مخالفین سے نمٹنے کے لیے فیڈرل سکیورٹی فورس (ایف ایس ایف) کے نام سے ایک مستقل فورس قائم کر رکھی تھی، گکھڑ میں ہر جمعہ کے بعد تحریک کے مطالبات کے حق میں جلوس نکالے جاتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ نماز جمعہ کے بعد والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی قیادت میں جلوس کا آغاز ہوا تو جی ٹی روڈ پر ایف ایس ایف نے جلوس کو روکنے کے لیے پوزیشنیں سنبھال رکھی تھیں۔ جلوس کو آگے بڑھتے دیکھ کر ایف ایس ایف کے کمانڈر نے زمین پر ایک لکیر کھینچ کر اعلان کیا کہ اس لائن کو عبور کرنے والوں کو گولی مار دی جائے گی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ایف ایس ایف کے سپاہیوں نے رائفلیں تان لیں اور فائرنگ کے لیے پوزیشن میں آ گئے۔ اس لکیر کے پاس پہنچ کر والد محترم حضرت مولانا محمد

سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے کہا کہ میں اپنی مسنون عمر (۶۳ سال) پوری کر چکا ہوں اور اب شہادت کی تمنا رکھتا ہوں یہ کہہ کر وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اس ممنوعہ لکیر کو پھلانگ کر آگے بڑھ گئے، ان کے ساتھ جن دو ساتھیوں نے یہ لکیر عبور کی ان میں سے ایک ہمارے استاذ محترم قاری محمد انور صاحب تھے اور دوسرے جمعیت علماء پاکستان کے حاجی سید احمد ڈار مرحوم تھے، ان کا یہ عزم دیکھ کر ایف ایس ایف کی تنی ہوئی رائفلیں جھک گئیں اور جلوس پورے وقار کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔

قاری صاحب محترم کو اللہ تعالیٰ نے تدریس اور تربیت کا خصوصی ذوق عطا فرمایا ہے، گکھڑ کے لوگ اب تک انہیں یاد کرتے ہیں اور ان کی تربیت و شفقت کا فیض حاصل کرنے والے شاگردوں کے دلوں سے ہر وقت ان کے لیے دعائیں نکلتی رہتی ہیں۔ کینیا میں انہوں نے دو سال کام کیا اور جب امتحانات ہوئے تو ان کا مدرسہ تمام مدارس میں نتائج کے لحاظ سے اول تھا جس پر انہیں خصوصی سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ مدینہ منورہ میں ۱۴۲۵ھ میں کم و بیش ساڑھے چار سو کے لگ بھگ مدارس کے طلبہ میں مقابلہ ہوا جو حفظ قرآن کریم کا بہت مشکل مقابلہ ہوتا ہے، انہوں نے اس میں بھی اول پوزیشن حاصل کی جس پر انہیں سند سے نوازا گیا۔ مدینہ منورہ میں وہ تحفیظ القرآن کے مدرسہ میں پڑھاتے ہیں اور ان کے تعلیم یافتہ بعض قاری حضرات حرمین شریفین کی مساجد و مدارس میں امامت اور تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ میں نے کئی بار انہیں مسجد نبویؐ کے برآمدوں میں اپنے شاگردوں کی منزلیں سنتے ہوئے دیکھا ہے جو صرف ان کے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے بھی بڑے اعزاز کی بات ہے۔

قاری صاحب محترم گذشتہ دنوں گکھڑ تشریف لائے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ تھوڑا سا وقت الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے لیے مرحمت فرما دیں تو ہم ان کے چند پرانے شاگرد ان کے ساتھ بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کر لیں گے۔ چنانچہ ۲ مئی کو ان کے ساتھ ایک نشست کا پروگرام بن گیا اور ان کے شاگردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی جن میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے صدر پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر، لاہور کے نامور خطیب مولانا خورشید احمد گنگوہی، میرے چھوٹے بھائی مولانا عبد القدوس قارن، مولانا عبد الحق خان بشیر اور قاری منہاج الحق خان راشد اور دیگر بہت سے علماء کرام اور قراء کرام شریک تھے۔

میں نے شرکاء محفل کو بتایا کہ حضرت قاری محمد انور صاحب میرے صرف حفظ کے استاد نہیں ہیں بلکہ تقریر و خطابت کا فن بھی میں نے ان کی وجہ سے سیکھا ہے۔ وہ قرآن مجید حفظ کرانے کے دوران ہمیں حضرت قاری محمد شریف صاحب رحمہ اللہ تعالی کا علم تجوید پر رسالہ زینت القرآن پڑھایا کرتے تھے اور ہم میں سے بعض کو کلاس میں کھڑا کر کے وہ سبق تقریر کے انداز میں سنتے تھے، میں نے وہاں سے خطابت کا آغاز کیا تھا۔ پھر حضرت قاری صاحب موصوف کے استاذ محترم حضرت مولانا قاری سید محمد حسن شاہ صاحبؒ کبھی کبھار گکھڑ تشریف لاتے تو مسجد میں ان کی تقریر کا اہتمام ہوتا، قاری محمد انور صاحب اس موقع پر مجھے تقریر کے لیے کھڑا کر دیتے اور اس کی باقاعدہ پہلے سے تیاری کراتے۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب انہوں نے مجھے پہلی بار تیاری کرا کے ایک جلسہ میں اسٹیج پر کھڑا کیا تو میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور میں نے تقریر بھی ایسی کی تھی کہ بعد میں حضرت والد محترم مد ظلہ کو اس کی صفائی دینا پڑی تھی کہ بچہ ہے جذبات میں ایسی باتیں کہہ گیا ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مجھے تقریر کا فن حضرت قاری محمد انور صاحب کی توجہ سے حاصل ہوا اور میں اس باب میں بھی ان کو اپنا استاذ سمجھتا ہوں۔

اس نشست میں مولانا خورشید احمد گنگوہی اور پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر نے پرانی یادیں تازہ کیں اور قاری صاحب کے ساتھ اپنے تعلق اور محبت کا اظہار کیا اور حضرت قاری صاحب نے بھی اپنے ماضی کو کریدا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے دادا اپنے علاقے کے بڑے زمیندار تھے جبکہ ان کے والد محترم کا شوق تھا کہ ان کا بیٹا حافظ قرآن ہو۔ انہوں نے اپنے علاقے کے ایک بڑے دینی مدرسہ دارالعلوم ربانیہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں قاری محمد انور صاحب کو حفظ کے لیے داخل کرا دیا جہاں انہوں نے قرآن کریم کی تعلیم کا آغاز کیا جبکہ تجوید انہوں نے مدرسہ تجوید القرآن کوچہ کندی گراں لاہور میں حضرت قاری فضل کریم صاحبؒ اور حضرت مولانا قاری سید محمد حسن شاہ صاحب سے پڑھی اور اس کے بعد تدریس کے لیے گکھڑ آ گئے۔

اس تقریب میں تلاوت قرآن کریم کی سعادت مدرسہ نصرۃ العلوم کے شعبہ تجوید کے صدر مدرس مولانا قاری سعید احمد نے حاصل کی جو ملک کے معروف قراء میں شمار ہوتے ہیں اور بہت اچھے لہجے میں تلاوت کرتے ہیں، نصرۃ العلوم کے فاضل ہیں اور تجوید و قرأت کے تجربہ کار استاذ ہیں۔ میں نے ان کا تعارف محترم قاری محمد انور صاحب سے کرایا تو اس

موقع پر عرض کیا کہ حضرت یہ آپ کی چوتھی پشت ہے اس لیے کہ قاری سعید احمد صاحب ہمارے شاگرد ہیں بلکہ انہوں نے جن قاری صاحب سے قرآن کریم یاد کیا ہے وہ بھی ہمارے شاگرد ہیں، اس طرح وہ قاری محمد انور صاحب کی چوتھی تعلیمی پشت شمار ہوتے ہیں۔ قاری محمد انور صاحب نے بتایا کہ یہ بھی ان کے والد صاحب کی خواہش اور دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ وہ اٹھائیس برس سے مدینہ منورہ میں قرآن کریم کی تدریس و خدمت میں مصروف ہیں اور یہ بات ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں حوالوں سے اعزاز و افتخار کا باعث ہے۔

مولانا خورشید احمد گنگوہی نے اپنے خطاب میں اس نکتہ کی طرف بطور خاص توجہ دلائی کہ یہ قرآن کریم کے فیضان کی وسعت ہے کہ ہم لوگ جو قاری صاحب کے شاگرد ہیں کسی درس یا تقریر میں حوالہ کے لیے بھی قرآن کریم کی کوئی آیت یا جملہ پڑھتے ہیں تو اس کا ثواب سب سے پہلے قاری محمد انور صاحب کے کھاتے میں لکھا جاتا ہے کیونکہ ہم نے قرآن کریم ان سے پڑھا ہے۔

الغرض استاذ محترم کے ساتھ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں یہ نشست بہت پر لطف رہی، پرانی یادیں تازہ ہونے کے ساتھ بہت سے دوستوں کی طویل عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی حتیٰ کہ بعض پرانے دوستوں کو ایک دوسرے کو پہنچاننے میں دقت پیش آئی اور پھر استاذ محترم قاری محمد انور صاحب کی پرسوز دعا پر یہ بابرکت محفل اختتام پذیر ہوئی۔

۲۰۰۳ء

امریکی مسلمانوں کا دین کی طرف رجوع

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۱ نومبر ۲۰۰۳ء)

تقریباً ۴۸ روز کے قیام کے بعد گزشتہ ہفتے امریکہ سے واپسی ہوئی۔ ۱۸ ستمبر کو نیویارک پہنچا تھا اور ۴ نومبر کو شام واشنگٹن کے ڈلس ایئرپورٹ سے روانہ ہو کر ۶ نومبر کو صبح ۹ بجے کے لگ بھگ لاہور واپس پہنچ گیا۔ یہ سفر امریکی دارالحکومت کے نواح میں واقع دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا کی دعوت پر کیا تھا جہاں سیرت النبیؐ کے مختلف پہلوؤں پر دس لیکچرز کے علاوہ متعدّد دینی عنوانات پر سلسلہ وار خطابات کا پروگرام تھا۔ احباب کی فرمائش پر بخاری شریف، مسلم شریف اور مشکوۃ کے بعض ابواب کا درس دیا اور نماز تراویح میں چند پارے سنانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس دوران نیویارک، بفلو، بالٹی مور، برمنگھم، بوسٹن، پراویڈنس اور دیگر شہروں میں جانے اور دینی اجتماعات میں شرکت کا موقع بھی ملا۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحہ کے بعد حالات میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں امریکہ کی داخلی صورتحال کے حوالے سے ایک تبدیلی یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ عام مسلمانوں کا دین کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے اور اسلام کے خلاف میڈیا کی مسلسل مہم نے مسلمانوں کو یہ احساس دلا دیا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں اور جس حالت میں رہیں مسلمان کا لیبل ان پر بہرحال رہے گا اور مغرب انہیں اسی نظر سے دیکھے گا۔ اس کے اثرات یہ ہیں کہ مساجد میں رونق بڑھ رہی ہے اور مساجد کی تعداد کی کم پڑتی جا رہی ہے۔ اب سے تیرہ چودہ برس قبل جب میں یہاں آتا تھا تو اکا دکا مساجد تھیں اور گنتی کے نمازی ہوتے تھے جو بیس میل سے سفر کر کے نماز کے لیے آیا کرتے تھے۔ لیکن اب صورتحال بہت مختلف ہے۔

دارالہدیٰ کا یہی مرکز جس میں میرا قیام رہا اس زمانے میں الیگزینڈریا کے علاقے میں ایک بلڈنگ کے کرائے کے اپارٹمنٹ میں ہوتا تھا مگر اب سپرنگ فیلڈ کے تجارتی علاقے میں اہم راستوں کے سنگم پر خرید شدہ وسیع بلڈنگ میں قائم ہے۔ اس میں اسکول اور قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسجد کی الگ بلڈنگ ہے اور نماز جمعہ کا بھی اہتمام ہے جس میں مسجد بھری ہوتی ہے اور خاصی تعداد میں خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔

دارالہدیٰ کی مسجد میں جمعۃ المبارک کے پانچ یا چھ اجتماعات سے خطاب کرنے کا موقع ملا، میرا خطاب اردو میں ہوتا ہے جو بحمد اللہ تعالیٰ دلچسپی سے سنا جاتا ہے۔ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے جو وہاں جمعہ پڑھنے آتی ہے۔ رش کی کیفیت کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ رمضان المبارک کا پہلا جمعہ تین بار ادا کرنا پڑا۔ مغربی ممالک میں مسجد سے باہر صفیں بچھا کر نماز ادا کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے زیادہ رش کی صورت میں جمعہ اور عید کی نماز مسجد کے ہال میں دو دو تین تین بار ادا کی جاتی ہے۔ مختلف خطباء نماز پڑھاتے ہیں اور الگ الگ اوقات کا اعلان ہوتا ہے جس کی وجہ سے علاقہ کے سب مسلمانوں کو باری باری نماز میں شرکت کا موقع مل جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ساؤتھال لندن کی مرکزی مسجد کے دوستوں نے بتایا کہ گزشتہ عید الفطر کی نماز کا انہیں چار بار اہتمام کرنا پڑا حالانکہ وہ خاصی وسیع مسجد ہے۔ دارالہدیٰ میں تراویح کے وقت بھی مسجد کا ہال تقریباً بھرا ہوتا تھا حالانکہ اس سال اس علاقے میں دو اور مقامات پر بھی تراویح کا اہتمام موجود تھا لیکن اس کے باوجود مسجد دارالہدیٰ کی حاضری میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی۔ دارالہدیٰ کے منتظم مولانا عبد الحمید اصغر نے بتایا کہ گزشتہ سال رمضان المبارک میں اس قدر رش تھا کہ کئی دوستوں کو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے واپس جانا پڑتا تھا مگر اس سال دوسری جگہوں پر تراویح کا سلسلہ شروع ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو سہولت ہوگئی ہے۔

ایک بات جو بطور خاص میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں دینی تعلیم کے حوالے سے تشنگی کا احساس دوسرے ممالک کی بہ نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ عربی زبان، قرآن کریم کا ترجمہ اور حدیث نبویؐ کی کوئی نہ کوئی کتاب باقاعدہ پڑھنے کی خواہش رکھنے والے کئی دوست ملے جن کا تقاضہ تھا کہ ان کے لیے عربی گرائمر اور قرآن و سنت کے کسی مختصر کورس کا اہتمام کیا جائے مگر ڈیڑھ دو ماہ کے عرصہ میں کیا ہو سکتا تھا؟ میں نے

محسوس کیا کہ اگر ان حضرات کے لیے سال یا دو سال کا کوئی کورس مرتب ہو اور شام کی کلاس کے طور پر تعلیمی نظام تشکیل دیا جائے تو بہت سے لوگ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں گے اور ایک مفید تعلیمی سلسلہ کا یہاں اجراء ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض اداروں کو میں نے مشورہ دیا ہے اور متعدّد ادارے اس پر غور کر رہے ہیں۔

خواتین میں بھی دینی تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے، یہاں کی بعض طالبات برطانیہ میں دینی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ امریکہ کے شہر بفلو میں بنات کی دینی تعلیم کا ایک معیاری ادارہ ہے جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کے خلیفہ مجاز حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل میمن مدظلہ کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ طالبات کا ہاسٹل ہے اور درس نظامی کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ اس سال بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے دیا اور اس موقع پر مجھے بھی کچھ گزارش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سپرنگ فیلڈ ورجینیا میں بھی اگلے سال سے ”عالم کلاس“ کا آغاز ہو رہا ہے اور اس کی تیاریاں جاری ہیں، شکاگو جانے کا مجھے اس بار اتفاق نہیں ہوا لیکن معلوم ہوا ہے کہ وہاں بھی خواتین کی دینی تعلیم کا ایک معیاری ادارہ موجود ہے۔

مجھ سے کئی دوستوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن کریم حفظ کرانا چاہتے ہیں انہیں پاکستان میں ایسے مدارس کے بارے میں بتایا جائے جہاں وہ بچوں کو بھیج سکیں۔ میں نے گزارش کی کہ تعلیمی لحاظ سے تو حفظ قرآن کریم کے بہت سے اچھے اور معیاری مدارس موجود ہیں لیکن رہن سہن کے حوالہ سے امریکہ میں پرورش پانے والے بچوں کے لیے ماں باپ کے بغیر پاکستان کے مدارس میں رہنا مشکل ہوگا۔ اس لیے حفظ قرآن کریم کے لیے امریکہ میں ہی کوئی مناسب نظام قائم ہو تو بہتر ہوگا۔ ویسے مختلف جگہوں پر امریکہ میں قرآن کریم کی درسگاہیں کام کر رہی ہیں۔ نیویارک کے کوئینز کے علاقہ میں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا ادارہ ”دارالعلوم نیویارک“ میں نے خود دیکھا ہے جہاں حفظ قرآن کریم کا انتظام موجود ہے اور حفظ کلام پاک کی ایک کلاس سے میں نے ان کے استاذ کی فرمائش پر مختصر خطاب بھی کیا جس میں بچوں کو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے بچپن کے دور کے تعلیمی ذوق و شوق کے چند واقعات سنائے۔

سیاسی طور پر مسلمانوں میں عام طور پر یہ احساس دیکھنے میں آرہا ہے کہ گزشتہ صدارتی الیکشن میں مسلمانوں نے مجموعی طور پر جارج ڈبلیو بش کی حمایت کر کے غلطی کی ہے اور ان کی حمایت سے کامیاب ہونے والے صدر بش نے افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اور جس طرح عالمی سطح پر اسلام اور عالم اسلام کو نشانہ بنایا جارہا ہے اس پر صدر بش کی حمایت کرنے والے مسلمانوں میں خاصی پریشانی پائی جاتی ہے۔ صدر بش نے اگرچہ اپنے خطابات میں یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وہ اسلام کو دہشت گردی کا ذمہ دار نہیں سمجھتے اور ان کے نزدیک اسلام جمہوریت کا مخالف نہیں ہے لیکن امریکی مسلمانوں کے نزدیک اب ایسی باتوں کا کوئی وزن نہیں رہا۔ ڈیڑھ ماہ کے قیام کے دوران میری جس مسلمان سے بھی اس مسئلہ پر بات ہوئی اسے صدر بش سے شاکی پایا اور اس کی باتوں میں درپردہ یہ عزم جھلکتا دکھائی دیا کہ امریکی مسلمان آئندہ صدارتی الیکشن میں گزشتہ غلطیوں کی تلافی کر دیں گے۔ صدر بش کی عمومی حمایت میں بھی مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے اور عام تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ اگر اس دوران کوئی بہت بڑی تبدیلی واقع نہ ہوئی تو جارج ڈبلیو بش کا امریکہ کا آئندہ صدارتی الیکشن میں کامیاب ہونا مشکل ہے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد امریکہ میں مقیم مسلمانوں بالخصوص عربوں اور پاکستانیوں کے خلاف جو وسیع تر ہنگامی اقدامات کیے گئے تھے ان کی وجہ سے بہت سے مسلمان امریکہ چھوڑ گئے ہیں۔ نیویارک کا بروک لین کا علاقہ جو ''منی پاکستان'' کہلاتا تھا اس کا خاص طور پر نشانہ بنا ہے اور ہزاروں پاکستانیوں کو مختلف وجوہ کے باعث وہاں سے جانا پڑا ہے۔ لیکن اب حالات میں کسی حد تک بہتری آئی ہے اور مسلمان اپنے معمولات کی طرف دھیرے دھیرے واپس لوٹ رہے ہیں۔ مگر یہ بات بھی محسوس کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کی حوصلہ شکنی اور غیر قانونی طور پر رہنے والے مسلمانوں کے بارے میں اداروں کی سابقہ پالیسی کی تبدیلی کے ضمن میں جو اقدامات ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد ہنگامی انداز میں کیے گئے تھے انہیں اب باقاعدہ قانونی شکل دی جارہی ہے اور ایسے قوانین و ضوابط سامنے آرہے ہیں جو پالیسی اور طرز عمل کی اس تبدیلی کو مستقل حیثیت دے دیں گے۔

مجھ سے وہاں کئی محافل میں یہ سوال ہوا کہ امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ میرا جواب ہر جگہ یہی تھا کہ وہی جو یہودی کر رہے ہیں۔ یہودیوں کی تعداد اب امریکہ میں مسلمانوں سے زیادہ نہیں رہی۔ اب سے پون صدی قبل تک ان کی صورتحال

بھی یہی تھی جواب مسلمانوں کی ہے لیکن انہوں نے باقاعدہ سوچ بچار کر کے منصوبہ بندی کی اور اس کے لیے مسلسل محنت کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آج امریکہ میں سب سے مضبوط سیاسی اور معاشی قوت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر فیصلہ اور پالیسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مسلمان شاید اتنا کچھ تو نہ کر سکیں لیکن اس قدر محنت ضرور کر سکتے ہیں کہ توازن قائم ہو جائے اور امریکی رائے عامہ یکطرفہ طور پر یہودیوں کی یرغمال نہ بنی رہے۔ مسلمان اگر ہوشمندی اور محنت کے ساتھ کسی حد تک توازن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو موجودہ صورتحال میں نمایاں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

قرآن حکیم کے ہم پر حقوق

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۷ نومبر ۲۰۰۳ء)

رمضان المبارک گزرتا جا رہا ہے اور دنیا بھر میں مسلمان اپنے اپنے ذوق اور توفیق کے مطابق اس کی برکتوں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے، اسی لیے اس میں قرآن کریم سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور نماز کے بغیر بھی اس کی عام طور پر تلاوت ہوتی ہے۔ سمجھ کر پڑھنے والے بھی اس کے پڑھنے اور سننے کا حظ اٹھا رہے ہیں اور بغیر سمجھے پڑھنے سننے والے بھی اس کی برکات سے محروم نہیں ہیں۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ کسی اور کتاب کے حافظ موجود نہیں، مگر اس کے حافظوں کی تعداد دنیا میں اس وقت نوے لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے، جنہوں نے قرآن کریم کو صرف یاد نہیں کیا بلکہ اسے یاد رکھنے کے لیے اس کو پڑھتے سنتے رہنا بھی ان کے معمولات میں شامل ہے۔ یہ بھی قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ جتنا اس کتاب کو باقاعدہ پڑھا اور سنا جاتا ہے، دنیا کی کسی اور کتاب کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہے۔ سورج کی گردش کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی قراءت کے مناظر بھی زمین کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں اور شب و روز کا شاید ہی کوئی ایسا وقت ہو جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں اس کی تلاوت نہ ہو رہی ہو۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام اور خالق کائنات کا پیام ہے، جو ہر دور میں نسل انسانی کے لیے یہی رہا ہے کہ وہ اپنے مالک و خالق کو پہچانے اور اس کے احکامات اور منشا کے مطابق زندگی بسر کرے۔ قرآن کریم کی بنیادی دعوت وہی ہے، جو جنت سے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے دی تھی:

"تمہارے پاس میری طرف سے ہدایات آتی رہیں گی، جو ان ہدایات کی پیروی کرے گا، وہ خوف اور حزن سے نجات پائے گا اور جس نے انکار اور تکذیب کا راستہ اختیار کیا، وہ دوزخ کا ایندھن بنے گا۔"

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالی کے ہر پیغمبر کا یہی پیغام رہا ہے کہ انسان اپنے خالق کو پہچانے، اس کے پیغام کو سمجھے، اس کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرے اور یہ بات ہر وقت ذہن میں رکھے کہ اس عارضی اور وقتی زندگی میں اس نے اس حوالے سے جو طرز عمل اختیار کیا، اس کی ابدی اور ہمیشہ کی زندگی کا فیصلہ اسی کی بنیاد پر ہو گا۔ اسے قیامت کے روز دنیا میں کیے گئے اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا، اس حساب کتاب کے بعد اس کے جنت یا دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہو گا۔

قرآن کریم کے بحر ناپیدا کنار سے غوطہ زنوں نے ہر قسم کے موتی حاصل کیے ہیں۔ چودہ سو برس سے مفسرین اور محققین ایک ایسے سمندر میں غوطہ زن ہیں جس کا کوئی کنارہ ہے نہ اس کی کوئی تہہ دکھائی دے رہی ہے۔ ہر غوطہ زن کو نئے موتی ملتے ہیں اور وہ نت نئے نکات سے دنیا کو روشناس کراتا ہے۔ مؤرخ کو تاریخی حقائق ملتے ہیں، سائنسدان کو کائنات کے نئے نئے حقائق تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ فلسفی کو راہرو فکر دوڑانے کے لیے نئے میدان میسر آتے ہیں، اور انسانی معاشرت کی ہیئت اور نفسیات کا ادراک حاصل کرنے والوں کو نئی حکمتوں اور باریکیوں کا فیض ملتا ہے، مگر قرآن کریم کا اصل موضوع بندے کو اس کے مالک و خالق سے جوڑنا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کے دائرے میں لانا ہے اور یہی تمام حکمتوں سے بڑی حکمت، تمام رازوں سے بڑا راز اور تمام فلسفوں سے بڑا فلسفہ ہے۔

قرآن کریم پوری نسل انسانی کے لیے ہے، مگر ہم مسلمانوں نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا ہے اور نسل انسانی تک اس کی رسائی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں میں سے اگر کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا کسی غیر مسلم کو قرآن کریم دینا جائز ہے؟ مغربی ممالک کی بات اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ سوال اکثر وہیں ہوتا ہے، ورنہ ساری دنیا کی صورتحال یہی ہے، قرآن کریم کے ادب و احترام کے حوالے سے یہ سوال درست بھی ہے کہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کو طہارت والے لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں، اور کافر عام طور پر طہارت کی حالت میں نہیں ہوتا اس لیے اس کے ہاتھ میں قرآن کریم دینا درست ہے یا نہیں؟ مگر میرا ذہن دوسری طرف چلا جاتا ہے اور بسا اوقات

میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ آپ جائز ہونے کی بات کر رہے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ غیر مسلموں تک قرآن کریم کو پہچانا ہمارے فرائض میں شامل ہے، دعوت کے نقطۂ نظر دیکھیں تو ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ ہم غیر مسلموں تک نہ صرف اسلام کی دعوت پہنچائیں، بلکہ اللہ تعالی کا پیام بھی انہیں سنائیں اور اللہ تعالی کا پیغام قرآن کریم کے بغیر کیسے پہنچایا جا سکتا ہے؟ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے:

"قرآن کریم تمہارے بارے میں گواہی دے گا۔ یہ گواہی تمہارے حق میں بھی ہو سکتی ہیں اور تمہارے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔"

گویا ایک مسلمان کے بارے میں قرآن کریم کی گواہی بہرحال ضروری ہے۔ طرز عمل صحیح ہو گا تو یہ گواہی حق میں ہوگی اور رویہ درست نہ ہو گا تو گواہی خلاف ہو جائے گی۔ آج ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں، سنتے ہیں اور اس کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ بجا ہے، درست ہے اور برکات کا باعث ہے، لیکن اس پہلو پر بھی ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ کل قیامت کے روز ہمارے بارے میں اس کی گواہی کیا ہوگی؟ اور اگر اس کی گواہی ہمارے خلاف ریکارڈ پر آگئی تو پھر کون سی دلیل ہمارے کام آئے گی اور کون سا عذر ہم اللہ تعالی کی عدالت میں پیش کر سکیں گے۔

قرآن کریم کے حقوق و آداب کی ایک لمبی فہرست مفسرین وفقہاء نے بیان کی ہے، لیکن ایمان و عقیدے اور عقیدت و محبت کے بعد تین امور کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، اور یہ قرآن کریم کے ایسے حقوق ہیں جن کی ادائیگی کے بغیر اللہ تعالی کی اس مقدس کتاب پر ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا:

1. پہلا حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے، کیونکہ کسی بھی پیغام کا سب سے پہلا حق یہی ہوتا ہے۔ ہر پیغام کو اس کے بھیجنے والے اور پیغام لے کر آنے والے کی اہمیت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پیغام وصول کرنے والا ہر شخص اپنی پہلی ذمہ داری یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس پیغام کو سمجھے اور اس کے مفہوم و مقصد سے آگاہ ہو، جو اس کے لیے آیا ہے۔ مگر ہم مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت کا قرآن کریم کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے، ہم قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، اس کی عقیدت و محبت ہمارے دلوں میں موجود ہے، اس پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اور اس کی تلاوت بھی کرتے ہیں، مگر بد قسمتی سے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں

کرتے۔ یہ قرآن کریم کی حق تلفی ہے اور تھوڑا گہرائی میں جا کر سوچیں تو قرآن کریم کو سمجھنے سے لاپرواہی، توہین اور بے ادبی کی حدود تک بھی جا پہنچتی ہے۔ ہمیں اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

قرآن کریم کو سمجھنے کے حوالے سے ہمارا طرز عمل بہت عجیب ہے۔ یا تو سرے سے اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کریں گے، اور اگر سمجھنے پر آجائیں گے تو پھر دوسری انتہا پر ہوں گے کہ اس کے فہم کا معیار بھی خود ہی بن بیٹھیں گے کہ ہم نے قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب یہی سمجھا ہے۔ حالانکہ سادہ سی بات ہے کہ ملک کے قانون سے ناواقفیت کا مطلب کہیں بھی یہ نہیں ہوتا کہ قانون کی کتاب ہاتھ میں لے کر جس نے جو مطلب سمجھ لیا، وہی اس کے لیے دلیل بن گیا۔ بلکہ قانون سے واقفیت وہی معتبر ہوتی ہے جو قانون جاننے والوں کے ذریعے ہو۔ اسی طرح قرآن کریم کا فہم بھی اس کے ماہرین کی وساطت سے ہوگا تو صحیح ہوگا، ورنہ فکری انتشار کا سبب بنے گا۔ بہرحال یہ قرآن کریم کا پہلا حق ہے کہ اسے سمجھا جائے۔

2. اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کا دوسرا بڑا حق یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے اور اس کا کوئی حکم سامنے آنے پر ایک مسلمان کو بریک لگ جائے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کے اوصاف میں ان کے سوانح نگار اس بات کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہیں کہ ”وہ اللہ کی کتاب پر رک جانے والے تھے“۔ یعنی قرآن کریم کا کوئی حکم سامنے آنے پر ان کے قدم یوں رک جاتے تھے جیسے سڑک پر سرخ بتی کا نشان دیکھ کر ایک اچھے ڈرائیور کا پاؤں خود بخود بریک پر ٹک جاتا ہے۔ قرآن کریم کے حوالے سے ایک مسلمان سے شریعت کا یہی سب سے بڑا تقاضا ہے کہ وہ قرآن کریم کو سمجھ کر اس کے احکام و قوانین پر عمل کرے اور اگر کوئی کام کرتے ہوئے قرآن کریم کا حکم اس کے خلاف اس کے علم میں آجائے تو فوراً اسٹاپ ہو جائے اور اس کے قدم بے ساختہ رک جائیں۔

3. اس کے بعد قرآن کریم کا تیسرا بڑا حق مسلمانوں کے ذمہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے پیغام اور تعلیمات کو نسل انسانی کے ہر شخص تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ یہ ہماری ذمہ داری بھی ہے اور ہمارے دینی فرائض میں بھی شامل ہے۔

اور اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو بات بہت سنگین ہو جاتی ہے کہ ہماری غفلت سے جن لوگوں تک اسلام کی دعوت اور قرآن کریم کا پیغام نہیں پہنچ پاتا، ان کے کفر اور گمراہی کے ذمہ داری میں ہم بھی شریک ہو جاتے ہیں۔

رمضان المبارک کا آخری عشرہ قریب آرہا ہے، اس میں قرآن کریم کی طرف ہماری رغبت بڑھ جاتی ہے۔ یہ بڑھنی بھی چاہیے کہ نزول قرآن کی رات "لیلۃ القدر" اسی عشرہ میں ہے۔ لیکن قرآن کریم کی قراءت، اس کے سماع، قرآن کریم کی محافل، شبینوں، نوافل اور دیگر سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم سب کو اس پہلو پر بھی توجہ دینی چاہیے کہ قرآن کریم کے حقوق کے حوالے سے ہماری صورتحال کیا ہے؟ اور اگر کل قیامت کے روز قرآن کریم نے بارگاہ ایزدی میں ہمارے خلاف "حق تلفی" کا استغاثہ کر دیا تو کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم کے حقوق کو سمجھنے اور انہیں ادا کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین یارب العالمین۔

رمضان اور اجتہاد

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۵ نومبر ۲۰۰۳ء)

رمضان المبارک ایک بار پھر ہماری زندگی میں آیا ہے اور خاموشی کے ساتھ گزرتا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآن کریم کا مہینہ فرمایا ہے کہ اس میں لوح محفوظ سے قرآن کریم اتارا گیا اور جس رات یہ لوح محفوظ سے منتقل ہوا اس رات کو اللہ تعالیٰ نے "شب قدر" قرار دے کر ایک ہزار مہینوں پر بھاری کر دیا۔ قرآن کریم نے اس ماہ میں مسلمانوں پر روزوں کا حکم صادر فرمایا اور کہا کہ روزے رکھنے سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور روزہ رکھنے والوں میں پرہیزگاری کا ذوق بیدار ہوتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صبر و ضبط کا مہینہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں دن کا روزہ اور رات کا قیام اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور اس مبارک مہینہ میں نیکیوں کا اجر بڑھ جاتا ہے۔

یہ چاند کا مہینہ ہے جو موسم بدلتا رہتا ہے، کبھی گرمیوں میں، کبھی بہار میں، کبھی برسات میں اور کبھی سردیوں میں آتا ہے۔ رمضان المبارک تینتیس برسوں میں ہمارے موسموں کا چکر مکمل کر لیتا ہے اور اس طرح ایک مسلمان بالغ ہونے کے بعد طبعی عمر تک سال کے ہر موسم کے روزے رکھ لیتا ہے کہ سال کا سب سے چھوٹا دن بھی اسے مل جاتا ہے اور

سب سے بڑے دن کے روزے کا ثواب بھی وہ حاصل کر لیتا ہے، ہر ذوق کے لیے اس میں تسکین کا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد گرامی ہے کہ مجھے تین چیزیں زیادہ پسند ہیں:

1. گرمیوں میں روزے رکھنا
2. مہمان کی خدمت کرنا
3. تلوار لے کر دشمن کے خلاف جہاد کرنا

گرمیوں کے روزے اللہ تعالی کے خاص بندوں کی پسند ہیں۔ ایک واقعہ پڑھا تھا کہ پرانے زمانوں میں ایک صاحب مکہ مکرمہ سے طائف کی طرف جا رہے تھے، پیدل سفر کا زمانہ تھا۔ مکہ مکرمہ گرم شہر ہے اور موسم گرما میں اس کی ریت کی تپش کا ایک عجیب رنگ ہوتا ہے جبکہ طائف اس سے زیادہ دور نہیں ہے مگر ٹھنڈا ہے اور گرمی کے موسم میں ٹھنڈک کے متلاشیوں کا مرکز بنا رہتا ہے، جیسے ہمارے ہاں راولپنڈی گرم شہر ہے مگر اس سے تھوڑے فاصلے پر مری ٹھنڈا علاقہ ہے۔ وہ صاحب مکہ مکرمہ سے طائف جا رہے تھے، راستہ میں ایک دوست ملا جو طائف سے مکہ مکرمہ کی طرف آ رہا تھا، ملاقات ہوئی، ایک دوسرے کا حال پوچھا اور دریافت کیا کہ کدھر جا رہے ہیں؟ ایک نے جواب دیا کہ رمضان المبارک قریب آ رہا ہے، مکہ مکرمہ گرم علاقہ ہے اس لیے طائف جا رہا ہوں کہ ٹھنڈے علاقے میں روزے آرام سے رکھ لوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں بھی اسی لیے طائف سے مکہ مکرمہ جا رہا ہوں کہ طائف ٹھنڈا علاقہ ہے روزے کا مزہ نہیں آئے گا، مکہ مکرمہ چلتا ہوں جہاں خوب گرمی ہوگی، پیاس لگے گی اور روزے کا مزہ آئے گا۔

یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے، انسان کو اللہ تعالی نے رنگا رنگ کے ذوق اور مزاج عطا کیے ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں جب جولائی اور اگست کے روزے تھے اور گرمی، پسینے اور پیاس نے روزوں کو خوب چمکا رکھا تھا تو بعض حضرات کی طرف سے یہ تجویزیں سامنے آئیں کہ بھٹی پر کام کرنے والے مزدور اور کھیت میں محنت کرنے والے کسان کے لیے یہ روزے بہت مشکل ہیں، اس لیے علمائے کرام کو ان کے لیے کوئی آسانی پیدا کرنی چاہیے اور اجتہاد سے کام لینا چاہیے۔ یہ اجتہاد بھی ہمارے ہاتھ میں خوب ہتھیار ہے کہ جہاں کوئی مشکل محسوس ہوئی اجتہاد کے نام سے آسانیاں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ ایک صاحب نے اس زمانے میں ایک قومی اخبار کے ذریعے تجویز دی کہ اگر علمائے کرام اجتہاد سے کام

لے کر فروری کے مہینہ کو رمضان قرار دے دیں تو دو فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ روزوں کا موسم ہمیشہ کے لیے مناسب ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ یکم مارچ کو عید قرار دینے سے ہر سال دو یا تین عیدوں کا مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ مگر علمائے کرام کے لیے ایسی تجویزوں پر کان دھرنا مشکل تھا کہ اجتہاد کی کچھ حدود ہیں، طریق کار ہے اور شرائط ہیں جو صدیوں سے طے شدہ ہیں، ان کے دائرے میں رہنے والا عمل ہی اجتہاد کہلاتا ہے ورنہ الحاد بن جاتا ہے۔ اور اگر ان حدود اور شرائط کی پابندی کیے بغیر "آزاد اجتہاد" کا دروازہ کھل جائے تو دین کی شکل کچھ سے کچھ ہو جائے بلکہ اب تک کچھ سے کچھ ہو چکی ہوتی۔

چند سال قبل کی بات ہے کہ برطانیہ میں ٹرین کے سفر کے دوران ایک نوجوان میرے پاس آیا اور کہا کہ مولوی صاحب! آپ اجتہاد کر سکتے ہیں؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ کیا میرے پاس اجتہاد کی کوئی اتھارٹی ہے؟ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیا دقت در پیش ہے؟ کہنے لگا کہ ملازم آدمی ہوں اور نماز بھی پابندی سے پڑھتا ہوں لیکن ملازمت کے دوران مجھے ظہر اور عصر کے لیے چھٹی اور موقع نہیں ملتا اس لیے میں اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ ظہر کی نماز فجر کے ساتھ پیشگی پڑھ لیا کروں اور عصر کی نماز مغرب کے ساتھ لیٹ ادا کر لیا کروں۔ میں نے سوچا کہ اب اس وقت اس نوجوان کو اجتہاد کا مطلب اور اس کی حدود سمجھانا آسان بات نہیں ہے اس لیے میں نے کہا کہ بھائی! میں ففٹی ففٹی معاملہ کر سکتا ہوں آپ کا سارا کام نہیں کر سکتا۔ یعنی آپ کو یہ اجازت دے سکتا ہوں کہ اگر دفتر یا کارخانے میں واقعی نماز کی گنجائش نہیں ملتی تو مجبوراً ظہر اور عصر دونوں نمازیں شام کو مغرب کے ساتھ پڑھ لیا کریں کہ قضا تو ہوگی مگر نماز ہو جائے گی۔ لیکن ظہر کی نماز فجر کے ساتھ پیشگی پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس طرح سرے سے نماز ہوگی ہی نہیں۔ اس لیے آپ ہر ممکن کوشش کریں کہ ظہر اور عصر کو اپنے وقت میں ہی کسی طرح پڑھ لیا کریں لیکن اگر کسی صورت میں ممکن نہ ہو تو پیشگی پڑھنے کی بجائے بعد میں اگلی نماز کے ساتھ ادا کر لیں جو قضا کی صورت میں ادا ہو جائے گی۔

تفسیر مظہری میں حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بعض روایات کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں بھی رمضان المبارک ہی کا مہینہ روزوں کے لیے مقرر تھا اور وہ بھی اسی طرح سال کے سارے موسموں میں گھومتا تھا۔ ایک دور میں انہیں بھی گرمیوں کے سخت روزوں نے تنگ کیا تو علماء سے درخواست کی گئی کہ وہ لچک پیدا کریں اور

روزوں کے لیے مناسب موسم متعیّن کر دیں۔ بنی اسرائیل کے علماء نے ایسا کر دیا اور موسم بہار کو روزوں کے لیے طے کر کے یہ اضافہ کیا کہ چونکہ ہم اپنی طرف سے شرعی معاملہ میں ردوبدل کر رہے ہیں اس لیے کفارے کے طور پر دس روزے زیادہ رکھا کریں گے، چنانچہ وہ اس طرح چالیس روزے رکھتے ہیں۔

رمضان المبارک اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے اور قرآن کریم کا مہینہ ہونے کی وجہ سے اس کی مناسبت آج بھی قرآن کریم کے ساتھ زیادہ ہے جس کا مظاہرہ عملی طور پر یوں ہوتا ہے کہ پورے سال کی بہ نسبت اس ماہ مبارک میں قرآن کریم کی تلاوت اور پڑھنے کا معمول ہر جگہ بڑھ جاتا ہے۔ تراویح اور قیام لیل میں قرآن کریم کی قراءت کے ساتھ ساتھ عام معمولات میں قرآن کریم پڑھنے اور سننے کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ گویا سال بھر غفلت میں بسر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس ماہ میں قرآن کریم کے ساتھ مسلمانوں کا جوڑ پھر سے تازہ کر دیتے ہیں اور بیٹریاں چارج ہو جاتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام ہے جو قرآن کریم کے ساتھ عام مسلمان کا تعلق تازہ کرنے کے علاوہ خود قرآن کریم کی مسلسل حفاظت کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے، اس لیے کہ اگر تراویح میں قرآن کریم سنانے کا معمول نہ ہو تو بہت سے حافظ حضرات قرآن کریم یاد نہ رکھ سکیں، تراویح میں قرآن کریم سنانے کی پابندی اس بات کا ذریعہ بن جاتی ہے کہ قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی تعداد قرآن کریم یاد رکھنے کا اہتمام کرتی ہے اور قرآن کریم انہیں مسلسل یاد رہتا ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان المبارک میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات میں روزوں کے علاوہ دو باتوں کا مزید اضافہ ہو جاتا تھا:

- ایک یہ کہ قرآن کریم کی تلاوت و قراءت عام دنوں میں بھی جناب نبی اکرمؐ کا روزمرہ کا معمول ہوتا تھا اور رات کی ایک تہائی وہ نوافل میں قرآن کریم پڑھتے تھے لیکن رمضان المبارک میں اس کی مقدار بڑھ جاتی تھی اور حضرت جبرائیل علیہ السلام روزانہ آکر آنحضرتؐ کے ساتھ اس وقت تک نازل شدہ قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے۔
- اس کے ساتھ رمضان المبارک میں جناب نبی کریمؐ کی سخاوت بھی بڑھ جایا کرتی تھی۔ عام دنوں میں بھی معمول مبارک یہ تھا کہ کوئی سوالی آپؐ کے در

سے خالی نہیں جاتا تھا مگر رمضان المبارک میں تو آپؐ کی سخاوت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ جیسے موسم گرما میں ٹھنڈی ہوا چلا دی جائے۔

• روزے کو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر و ضبط کا ذریعہ بتایا ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ روزے کی حالت میں کھانے، پینے اور دیگر خواہشات پر کنٹرول رکھنے سے انسان میں یہ ذوق بیدار ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں سے بھی اپنے نفس کو باز رکھے جو پورا سال اور دن رات ہر وقت کے لیے حرام ہیں۔ اسی بات کو اللہ تعالی نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روزے تم پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں تا کہ تم متقی بن جاؤ اور تمہارے اندر پرہیز گاری پیدا ہو۔

امام غزالیؒ نے روزے کے تین درجات بیان کیے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

1. ایک روزہ اس شخص کا ہے کہ اس نے روزے کی پابندی قبول کر کے کھانے پینے اور دیگر خواہشات پوری کرنے سے خود کو روکا ہوا ہے لیکن جسم کے باقی اعضا کا روزہ نہیں ہے۔ منہ، کان، آنکھیں، ہاتھ اور پاؤں وغیرہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کیے بغیر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ ممنوعہ کاموں سے نہیں رک رہے اور ان پر روزے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ روزہ اصطلاحی (ٹیکنیکل) روزہ ہے جس سے فریضہ تو اس شخص کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے لیکن روزے کا مقصد پورا نہیں ہوتا کہ روزہ تقوی پیدا کرنے کے لیے فرض کیا گیا ہے۔

2. دوسرا روزہ اس شخص کا ہے کس جس کا صرف منہ، پیٹ اور شرمگاہ کا روزہ نہیں بلکہ اس کے سارے اعضا روزہ کی حالت میں ہیں۔ اس نے اس بات کا اہتمام کر رکھا ہے کہ زبان، کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں وغیرہ سے بھی گناہ کا کوئی کام سرزد نہ ہونے پائے۔ یہی روزہ شریعت کا مقصود ہے اور اسی طرح کے روزے سے قرآن کریم کی منشا کی تکمیل ہوتی ہے۔

3. جبکہ تیسرا روزہ اللہ تعالی کے مقرب بندوں کا ہے کہ وہ دل و دماغ کا بھی روزہ رکھتے ہیں۔ یعنی اپنے دل و دماغ کو اللہ تعالی کی یاد اور آخرت کی فکر میں اس قدر مصروف و مشغول رکھتے ہیں کہ اللہ تعالی کے سوا کسی کا خیال دماغ میں

نہ آنے پائے اور اس کے سوا کوئی خواہش دل تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ یہ روزہ مقربین کا روزہ ہے جو بہت خاص لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

رمضان المبارک گناہوں کی معافی کا مہینہ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے رمضان المبارک کے دوران دن کے وقت ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ روزے رکھے اور راتوں کو ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ تراویح اور تہجد و نوافل کی صورت میں قیام کیا تو اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جبکہ گناہوں کی معافی اور توبہ کی قبولیت کی ایک علامت بعض بزرگوں نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر توبہ سے زندگی میں عملی تبدیلی آئی ہے تو یہ قبولیت کی نشانی ہے۔ خدا کرے کہ یہ رمضان المبارک ہمارے لیے حقیقی رحمتوں اور برکتوں کا باعث ہو، توبہ و استغفار کا ذریعہ بنے، زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ کے مواقع ہمیں اس میں فراہم ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ ہماری زندگیوں میں خوشگوار تبدیلی کا سبب بن جائے، آمین یارب العالمین۔

اسلام دشمنی۔ یہود و نصاریٰ میں قدرِ مشترک

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲ نومبر ۲۰۰۳ء)

امریکی سینٹ نے ملائیشیا کے لیے بارہ لاکھ ڈالر کی فوجی امداد کو مبینہ مذہبی آزادی کے ساتھ مشروط کر دیا ہے اور یہودیوں پر ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد کی تنقید کو ہدف اعتراض بناتے ہوئے امریکی قیادت نے کہا ہے کہ فوجی امداد کے حصول کے لیے مہاتیر محمد کو اس تنقید پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ دوسری طرف ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد نے جو ان سطور کی اشاعت تک اپنے منصب سے ریٹائر ہو چکے ہوں گے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلامی سربراہ کانفرنس میں انہوں نے اپنے خطاب کے دوران یہودیوں کے بارے میں جو یہ بات کہی تھی کہ دنیا پر دراصل چند مٹھی بھر یہودی حکومت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ان کا طرز عمل دشمنی اور عناد کا ہے، مغربی حکمرانوں اور پریس کے ردعمل نے ان کی اس بات کو درست ثابت کر دیا ہے۔

اس سے قبل مغربی پریس اور سیاسی رہنماؤں نے یہودیوں کے خلاف مہاتیر محمد کے ان ریمارکس پر منفی ردعمل کا اظہار کیا تھا اور اب امریکی سینٹ نے بھی اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ مغرب کو یہودیوں پر مہاتیر محمد کی یہ تنقید بہت بری لگی ہے۔ اور

مہاتیر محمد نے، جو اس سے قبل بھی مغرب کے طرز عمل کے مسلسل ناقد رہے ہیں، جاتے جاتے اسے اور زیادہ غضبناک کر دیا ہے جبکہ ان کا یہ اعلان تو مغرب کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز ثابت ہو سکتا ہے کہ ہمیں بارہ لاکھ ڈالر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور ہم یہ رقم امریکہ سے لینے کی بجائے دیگر ذرائع سے حاصل کر لیں گے۔

جہاں تک مہاتیر محمد کے ان ریمارکس کا تعلق ہے کہ یہودی مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں، انہوں نے دنیا پر درپردہ حکومت کا اختیار حاصل کر لیا ہے اور اس وقت دنیا پر دراصل وہی حکمرانی کر رہے ہیں، اس پر مغرب کے پریس اور رہنماؤں کو سیخ پا ہونے کی بجائے حقائق کا جائزہ لینا چاہیے اور اسے مسترد کرنے کی بجائے اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے، اس لیے کہ گزشتہ ایک صدی کی تاریخ اس پر گواہ ہے اور عالمی منظر پر یہودیوں کی صہیونی تحریک جو کردار ادا کر رہی ہے وہ اب کوئی راز نہیں رہا۔ مہاتیر محمد کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے ایک مسلم ملک کے حکمران کی حیثیت سے اس کے کھلم کھلا اظہار کی جرأت کی ہے۔ جبکہ یہودیوں نے دنیا کے اجتماعی نظام پر مغرب کے وسائل اور اثر و رسوخ کے ذریعے جو کنٹرول حاصل کیا ہے اور مسلم حکومتوں کے گرد جو حصار قائم کر رکھا ہے اس کی موجودگی میں انہیں اس بات کی توقع نہیں تھی کہ کوئی مسلمان حکمران موجودہ حالات میں علی الاعلان یہ بات کہہ سکتا ہے جو مہاتیر محمد نے کہہ دی ہے۔ ورنہ دنیا کے نظام بلکہ امریکی سسٹم پر درپردہ یہودی کنٹرول کے بارے میں خود امریکہ میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا اظہار مہاتیر محمد نے کیا ہے۔

یہودیوں نے گزشتہ ایک صدی کے دوران امریکہ میں اس ترقی یافتہ اور بڑے ملک کے وسائل اور ذرائع پر کنٹرول حاصل کرنے اور اقتدار کی اصل باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے جو کچھ کیا ہے اور اس وقت امریکہ کے سیاسی و معاشی نظام اور میڈیا سسٹم میں انہیں جو مقام حاصل ہے وہ کسی باشعور سے مخفی نہیں ہے۔ اور اسے کھلے بندوں دیکھتے ہوئے مہاتیر محمد کی بات کو جھٹلانے کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ صرف اس قدر نہیں ہے جتنا مہاتیر محمد نے بیان کیا ہے بلکہ بات اس سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ امریکی قیادت کسی عالمی لیڈر کے ریمارکس پر اپنی رائے ظاہر کرنے کے لیے بھی اسی دائرے میں محصور ہے جو یہودیوں نے اپنے مفادات کے لیے اس کے گرد قائم کر رکھا ہے۔

مہاتیر محمد کے اس بیان پر جو تبصرے مغرب کے پریس میں ہو رہے ہیں وہ اگر صہیونی تحریک کی طرف سے ہوتے تو کوئی اعتراض اور اشکال کی بات نہیں تھی کہ مہاتیر محمد نے اسے براہ راست ہدف تنقید بنایا ہے اور صہیونی تحریک کو اس کا جواب دینے کا حق حاصل ہے۔ لیکن جب صہیونی تحریک کا موقف امریکی پریس اور امریکی سینٹ کی زبان سے سامنے آتا ہے تو عقل و فہم رکھنے والا ہر شخص سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کے لیے مہاتیر محمد کے ان ریمارکس کو درست تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ دنیا کی قیادت کا دعوی کرنے والی قوتوں کے پیچھے اصل میں یہودی سازشیں کارفرما ہیں اور مٹھی بھر یہودی پوری دنیا پر درپردہ حکومت کر رہے ہیں۔

جہاں تک یہودیوں کی مہارت، قربانیوں، جہد مسلسل اور اپنے مشن و ہدف کے لیے حوصلہ و استقامت کا تعلق ہے ہمیں اس میں کبھی کلام نہیں رہا۔ اور عالمی صہیونی تحریک نے گزشتہ دو صدیوں کے دوران دنیا کے حالات کو تبدیل کرنے اور عالمی صورتحال کو اپنے ایجنڈے کے مطابق نیا رخ دینے میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کی داد نہ دینا سراسر نا انصافی ہوگی۔ بلکہ ہم تو مسلمانوں سے یہ گزارش کرتے رہتے ہیں کہ وہ یہودیوں کی اس جدوجہد کو اسٹڈی کریں، ان کے طریق کار سے واقفیت حاصل کریں اور ان کی ہمہ گیر محنت سے سبق سیکھیں۔ ابھی چند روز قبل امریکہ میں مسلمان دانشوروں کی ایک محفل میں راقم الحروف نے گزارش کی کہ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے زیادہ نہیں تو اب اتنی کم بھی نہیں رہی۔ مسلمانوں کی طرح یہودیوں کا مرکز عقیدت و محبت بھی امریکہ سے باہر ہے۔ مسلمانوں اور یہودیوں کا ایجنڈا مقامی یا علاقائی نہیں بلکہ عالمی ہے اور دونوں کو مغرب کے وسائل اور ذرائع تک رسائی کے مواقع میسر ہیں، تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہودی اپنے عالمی ایجنڈے کے لیے مغربی ممالک کے وسائل اور ذرائع کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں مگر مسلمان ابھی تک سوچ بچار کے مرحل میں ہی ہیں۔ ہمارے نزدیک مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے سوچ بچار کا اصل نکتہ یہی ہے اور جس دن مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں نے اس راز کو پالیا اس دن سے حالات میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جائے گا۔

بحث اس میں نہیں کہ یہودیوں نے یہ مقام حاصل کرنے کے لیے کس قدر محنت کی ہے اور کتنی قربانیاں دی ہیں۔ یہ مسلمہ بات ہے اور اس سے انکار کرنا حقائق سے انکار کے

مترادف ہے۔ البتہ یہ بات ضرور غور طلب ہے کہ اس محنت اور قربانی کا جو صلہ وہ مانگ رہے ہیں کیا ان کا وہ حق بنتا ہے؟ اور اس محنت اور قربانی کے ذریعے جو کارنامے انہوں نے سرانجام دیے ہیں ان کا کوئی جواز ہے؟

- یہودیوں نے سازشوں کے ذریعے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کی سیاسی مرکزیت سے محروم کر دیا ہے،
- مسلمانوں کے ملک فلسطین پر غاصبانہ قبضہ جمایا ہوا ہے،
- خلیج عرب میں اپنی اور اپنے مغربی اتحادیوں کی فوجی قوت اور خوفناک عسکری طاقت کے سائے میں عرب عوام کی سیاسی آزادی اور خود مختاری میں رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں،
- دنیا کے کسی حصے میں کوئی مسلم ملک سیاسی، معاشی یا عسکری طور پر خود کفالت کی منزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو سب سے پہلے یہودیوں کے کان کھڑے ہوتے ہیں اور اس کا راستہ روکنے کے لیے عالمی سطح پر یہودی سازشیں متحرک نظر آنے لگتی ہیں،
- اور بیت المقدس پر قبضے کے بعد "عظیم تر اسرائیل" کے نام پر مدینہ منورہ سمیت بہت سے مسلم اور عرب علاقوں پر قبضے کے یہودی عزائم سامنے آچکے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ یہودیوں کا سب سے زیادہ قتل عام مسیحی اقوام نے کیا ہے اور گزشتہ صدیوں کے دوران یورپ کی مسیحی قوتوں کے ہاتھوں چھ ملین (ساٹھ لاکھ) یہودی بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق قتل ہوئے ہیں۔ مگر یہودیوں کو یہ سب بھول گیا ہے اور اگر یاد ہے تو صرف یہ کہ اب سے چودہ سو برس پہلے مسلمانوں نے انہیں مدینہ منورہ سے نکال دیا تھا اور خیبر پر قبضہ کر کے یہودیوں کو وہاں سے جلاوطن کر دیا تھا۔ مدینہ منورہ اور خیبر کی بستیوں سے جلاوطن ہونا یہودیوں کو اچھی طرح یاد ہے اور اسی وجہ سے "گریٹر اسرائیل" کے نقشے میں یہ دونوں شہر شامل ہیں، مگر یورپ کی مسیحی حکومتوں کے ہاتھوں لاکھوں یہودیوں کا قتل عام انہیں ایسے بھول گیا ہے جیسے سرے سے ایسا کوئی واقعہ ہی رونما نہ ہوا ہو۔

دوسری طرف مسیحی دنیا کا حال یہ ہے کہ یہودیوں کے ساتھ ان کی دو ہزار برس سے چلی آنے والی دشمنی ہوا میں تحلیل ہو گئی ہے۔ خود ان کے بقول یہودیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کو سولی پر لٹکا دیا، ان کی والدہ محترم حضرت مریم علیہا السلام پر شرمناک الزام تراشی کی اور اپنے دور اقتدار میں مسیحیوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ جبکہ یہودیوں کی اس الزام تراشی اور بیہودہ گوئی کا جواب قرآن کریم نے دیا اور حضرت مریمؑ کی پاکدامنی کی گواہی دینے کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰؑ کی شان و مرتبہ کو بیان فرمایا۔ مگر اب یہ سارے حقائق قصۂ پارینہ بن چکے ہیں اور صرف ''اسلام دشمنی'' کی قدر مشترک باقی رہ گئی ہے جس نے دو ہزار سال کی دشمنی اور عداوت کو ختم کرکے مسیحیوں اور یہودیوں کو باہم شیر و شکر کر دیا ہے۔ (۱) مغربی ممالک کے تعاون اور پشت پناہی سے اسرائیل خلیج عرب میں جو کچھ گزشتہ نصف صدی سے کر رہا ہے (۲) فلسطینیوں اور عربوں کو کچلنے کے لیے اسرائیل کو مغربی ممالک کی جو امداد حاصل ہے (۳) اقوام متحدہ کے عالمی فورم پر عربوں اور مسلمانوں کے خلاف اسرائیل کی کھلی ہٹ دھرمی کو جس طرح امریکہ اور اس کے دوسرے ساتھی تحفظ فراہم کر رہے ہیں (۴) اور صرف امریکہ سے اسرائیل کو جو فوجی اور مالی امداد گزشتہ نصف صدی کے دوران ملی ہے اس کے شواہد ریکارڈ پر موجود ہیں اور اس کے اعداد و شمار بھی مخفی نہیں ہیں۔

اگر اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اسرائیل مسلمانوں کا دشمن نہیں ہے، اسرائیل کو مغربی ممالک کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے اور عالمی نظام کو در پردہ یہودی کنٹرول نہیں کر رہے ہے تو پھر سچ، انصاف اور حقائق کی اصطلاحات کے معنی و مفہوم پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ عالمی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے ہاتھوں ان اصطلاحات کا معنی و مفہوم بھی کہیں بدل تو نہیں گیا ہے؟

قرآن کریم نے آج سے چودہ سو برس قبل یہودیوں کے بارے میں دو باتیں کہی تھیں جو اب دنیا کے ہر شخص کو کھلی آنکھوں دکھائی دے رہی ہیں:

1. ایک یہ کہ مسلمانوں کی دشمنی میں یہودی تمام اقوام سے آگے ہیں اور ان کی سرشت میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ عداوت شامل ہے۔

2. اور دوسری بات قرآن کریم نے یہ فرمائی ہے کہ یہودی کبھی دوسروں کے سہارے کے بغیر دنیا میں عزت اور اقتدار حاصل نہیں کر سکیں گے۔

آج قرآن کریم کی دونوں پیش گوئیاں عملی صورت میں دنیا کے سامنے ہیں اور تاریخ کا ہر موڑ اس کی گواہی دے رہا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر مہاتیر محمد نے ایک تاریخی اور معروضی حقیقت کا عالمی فورم پر اظہار کیا ہے تو مغرب کو اس پر ناک بھوں چڑھانے کی بجائے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور حقائق کا از سر نو جائزہ لیتے ہوئے یہودیوں کی بے جا ناز برداری کا رویہ ترک کر کے عالم اسلام کی جائز شکایات کا ازالہ کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو یہ اس بات کی ایک اور عملی دلیل ہوگی کہ ان کے معاملات خود ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں بلکہ مٹھی بھر یہودی انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

مغرب اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش کا فیصلہ کن مورچہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۷ جون ۲۰۰۳ء)

الحاج عبد الرحمان باوا تحفظ ختم نبوت کے محاذ کے سرگرم اور مشنری رہنما ہیں۔ پہلے برما میں قادیانیت کے خلاف مصروف عمل رہے، پھر مشرقی پاکستان کو اپنی سرگرمیوں کا میدان بنایا، سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان آئے اور کراچی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کو منظم کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ لندن میں ختم نبوت مرکز قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تو ان کا اور مولانا منظور احمد الحسینی کا انتخاب ہوا۔ دونوں نے مل کر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کو برطانیہ میں منظم کیا اور اسٹاک ویل کے علاقہ میں ختم نبوت سنٹر کے قیام میں اپنی توانائیاں صرف کر دیں۔ اب کچھ عرصہ سے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نظم سے ہٹ کر لندن کے ایسٹ ہیم کے علاقے میں اسلامک دعوہ کونسل کے نام سے مرکز قائم کیے ہوئے ہیں اور ختم نبوت اکیڈمی چلا رہے ہیں۔ ان کے بیٹے مولانا سہیل باوا ان کے معاون ہیں، شب و روز مصروف و متحرک رہتے ہیں اور کام وہی ہے: عقیدہ ختم نبوت کا پرچار اور قادیانیت کا تعاقب جو ان کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے اور جس کے بغیر الحاج عبد الرحمان باوا کا شخصی تعارف بھی مکمل نہیں ہوتا۔

جب بھی لندن حاضر ہوتا ہوں ان کا اصرار ہوتا ہے کہ ان کے مرکز میں حاضری دوں اور ان کے کام میں تھوڑا بہت حصہ ضرور ڈالوں۔ مجھے بھی خوشی ہوتی ہے کہ ایک نیک کام

میں شرکت ہو جاتی ہے۔ میری شرکت کی صورت انہوں نے یہ رکھی ہوئی ہے کہ انٹرنیٹ پر ایک حلقہ انہوں نے قائم کیا ہوا ہے جس میں وقتاً فوقتاً مجالس ہوتی ہیں، مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے دوست اس میں شریک ہوتے ہیں، ایک آدھ بیان ہوتا ہے، پھر سوال و جواب کی محفل ہوتی ہے اور اس طرح مختلف ممالک میں اپنے گھروں اور دفاتر میں بیٹھے ہوئے لوگ کسی موضوع پر ایک ''انٹرنیشنل سیمینار'' منعقد کر لیتے ہیں۔ مجھ سے ان کی فرمائش ہوتی ہے کہ ان کے اس پروگرام میں کبھی کبھار ضرور شریک ہوا کروں۔ گزشتہ سال لندن آیا تو اس قسم کی ایک محفل انہوں نے قائم کی جو میرا زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ اب پھر انہوں نے میری حاضری پر ایک محفل کا اعلان کر رکھا تھا جو ۲۷ مئی ۲۰۰۳ء کی شب کو منعقد ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ درجن بھر ممالک کے ستر کے قریب افراد اس میں شریک تھے۔ دوبئی، پیرس، کراچی اور دیگر شہروں سے تعلق رکھنے والے حضرات نے سوالات بھی کیے اور کم و بیش ایک گھنٹے تک یہ محفل چلتی رہی۔

باقاعدہ تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا، ایک صاحب نے کمپیئرنگ کی جو دوبئی میں بیٹھے ہوئے تھے، پیرس کے ایک صاحب نے مرزا غلام احمد قادیانی کے ''کارناموں'' پر پنجابی میں دو نظمیں سنائیں جوان کا اپنا کلام تھا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ نصف صدی قبل کے ماحول میں شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں بیٹھا ہوں اور تحریک ختم نبوت کا کوئی جلسہ سن رہا ہوں۔ مجھ سے کہا گیا کہ مسلمانوں کی موجودہ عالمی صورتحال پر گفتگو کروں اور اس کے ساتھ قادیانیت کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں۔ میں نے اپنی مختصر اگفتگو میں گزارش کی کہ میرے نزدیک یہ دو موضوع الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی موضوع کا حصہ ہیں۔ اس لیے کہ آج مسلمان دنیا بھر میں جس مقام پر پہنچے ہیں اور انہیں جس صورتحال کا سامنا ہے اس کے پس منظر میں قادیانیت کا بھی ایک کردار ہے اور مسلمانوں کو اس کیفیت تک پہنچانے میں قادیانیوں کا ایک مستقل رول ہے، اس لیے یہ ایک ہی موضوع کے دو حصے ہیں۔

مسلمان اس وقت عالمی سطح پر جس صورتحال سے دوچار ہیں اسے مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دو صدیوں کی کشمکش میں مغرب نے مسلمانوں کو سیاست، معیشت، عسکریت، تجارت، سائنس، ٹیکنالوجی اور صنعت کے محاذوں پر نہ صرف مسلسل شکست سے دوچار کر رکھا ہے بلکہ یک طرفہ عالمی نظام کے شکنجے میں جکڑ کر بے بسی اور

لاچاری کا عبرتناک نمونہ بنا دیا ہے۔ اس میں ہماری کوتاہیوں اور نااہلیوں کا کتنا دخل ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم ان سب شعبوں میں مغرب کے رحم و کرم پر ہیں اور اس کے بنے ہوئے سازشوں کے جال میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک محاذ ایسا بھی ہے جس میں مغرب کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی اور وہ اس میں اپنی ہر کوشش کو ناکام ہوتے دیکھ کر بری طرح دانت پیس رہا ہے۔ وہ ہے عقیدہ اور ثقافت کا محاذ جہاں مغرب کی تمام محنتیں اب تک اکارت گئی ہیں۔ اور اس کی دو صدیوں کی مسلسل محنت کے باوجود آج بھی صورتحال یہ ہے کہ عام مسلمان کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ قائم ہے۔ یہ ایمان و یقین کا تعلق ہے، محبت و عقیدت کا تعلق ہے اور ان کی سچائی و حقانیت کے بے لچک اظہار کا تعلق ہے۔ مثال کے طور پر آپ دنیا کے کسی علاقے میں کسی بھی مسلمان سے یہ دریافت کر کے دیکھ لیں کہ فلاں مسئلہ پر قرآن و سنت اور سنت نبویؐ کا حکم یہ ہے لیکن آج کی عالمی برادری اور بین الاقوامی ادارے اس کے برعکس یہ کہتے ہیں تو وہ خود اس مسئلہ سے واقف ہے یا نہیں اور اس کو قرآن کریم اور سنت نبویؐ سے آگاہی ہے یا نہیں مگر اس کا دوٹوک جواب کسی تامل کے بغیر یہ ہوگا کہ قرآن کریم اور سنت نبویؐ کا ارشاد درست ہے اور عالمی برادری اور بین الاقوامی اداروں کا کہنا درست نہیں ہے۔

دنیا بھر کے عام مسلمانوں کی اپنے دین کے ساتھ یہ کمٹمنٹ مغرب کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے اور دینی مدارس و مراکز کو اس کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے ان کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ ابھی چند روز قبل میں نیویارک کے کوئینز کے علاقہ کے ایک دینی مدرسہ دارالعلوم نیویارک کی ایک تقریب میں شریک تھا، مجھے بتایا گیا کہ اس مدرسہ میں اس سال گیارہ بچوں نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز اور اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کی جس سطح پر مخالفت ہو رہی ہے اس کے باوجود اس کے حافظوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور دینی مدارس و مکاتب کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ مغربی تہذیب نے اگرچہ مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کو متاثر کیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد دنیا کے ہر خطے میں بلکہ خود مغرب میں بھی اپنی تہذیب و ثقافت پر قائم ہے، اپنے خاندانی نظام کو باقی رکھے ہوئے ہے اور اپنی تہذیبی اقدار کی حفاظت کر رہی ہے۔

اس محاذ پر مسلمانوں کو پسپا کرنے کے لیے مغرب نے جو جتن کیے وہ اصحاب نظر سے مخفی نہیں ہیں۔ انہی میں سے ایک حربہ جھوٹے نبیوں کو کھڑا کرنا تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی، مرزا بہاء اللہ شیرازی اور اس قسم کے دجالوں کو اس لیے کھڑا کیا گیا اور انہیں نبی کے طور پر پیش کیا گیا جنہوں نے مسلمانوں کی صفوں میں عقیدہ اور فکر کا انتشار پیدا کرنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال مرحوم نے جب قادیانیوں کے خلاف کھل کر اظہار کیا تو ان سے اس کی وجہ دریافت کی گئی۔ انہوں نے جواب دیا کہ نئی نبوت کا مطلب مرکز عقیدت اور مرکز اطاعت کو تبدیل کرنا ہے کیونکہ نبی اپنی امت کی عقیدت و اطاعت کا واحد مرکز ہوتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک امت کی عقیدت اور اطاعت کا مرکز ہیں ان کے بعد کسی اور کو نبی ماننے کا مطلب یہ ہے کہ عقیدت اور اطاعت دونوں کا مرکز تبدیل ہو گیا ہے اور اب کوئی نیا مرکز قائم ہو گیا ہے اس لیے مسلمانوں میں جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے بعد قیامت تک کسی نئی نبوت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اپنی گفتگو میں احباب سے گزارش کی کہ قادیانیوں، بہائیوں اور اس کے دیگر فتنہ پردازوں کی مہم کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو عقیدہ و فکر کے خلفشار سے دوچار کیا جائے اور انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ لیکن تحریک ختم نبوت کے محاذ پر کام کرنے والی جماعتوں کی جدوجہد کی برکت سے امت مسلمہ کا بہت بڑا حصہ اس سے محفوظ ہے اور مغرب ان فتنوں کے ذریعے جو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا اس میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی جس پر وہ سیخ پا ہے اور اہل دین کو اپنی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ آج مغرب اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش اسی عقیدہ و فکر اور تہذیب و ثقافت کے محاذ پر جاری ہے جو اگرچہ ہمارا آخری مورچہ ہے لیکن ہمارا عقیدہ ہے اور حالات بھی یہی بتا رہے ہیں کہ یہیں سے مسلمانوں کی واپسی شروع ہوگی اور اسلام ایک بار پھر دنیا کے افق پر پوری شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہو کر رہے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ اس مورچے کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کریں، مسلمانوں کی نئی نسل کو قرآن و سنت کے ساتھ شعور و فہم کی وابستگی سے ہمکنار کرنے کے لیے محنت کریں، انہیں عقیدہ و ثقافت کے فتنوں سے بچانے کی کوشش کریں اور پورے فہم و ادراک اور

بصیرت و شعور کے ساتھ اسلامی عقیدہ و ثقافت کے تحفظ کی جنگ میں اپنا کردار مؤثر طور پر ادا کریں۔

دین اور دینی تعلق کی برکات

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۴ جون ۲۰۰۳ء)

گزشتہ ماہ مجھے تقریباً تیرہ سال کے بعد امریکہ جانے کا موقع ملا۔ مئی کے دوران دو ہفتے امریکہ رہا اور واپسی پر تین چار دن برطانیہ میں گزار کر مئی کے آخر میں وطن واپس آ گیا۔ اس سے قبل ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۰ء تک چار پانچ بار امریکہ جا چکا ہوں۔ اس دوران میں نے کم و بیش درجن بھر امریکی شہروں میں مختلف اجتماعات میں شرکت کی اور متعدّد امریکی اداروں میں جانے کا موقع بھی ملا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر بھی دیکھا بلکہ اس کی ایک سو ساتویں منزل پر واقع سیر گاہ سے نیویارک کا نظارہ کرنے کے علاوہ عصر کی نماز بھی وہیں جماعت کے ساتھ ادا کی جسے دیکھنے کے لیے ایک ہجوم ہمارے گرد جمع ہو گیا تھا۔ نیویارک میں یوم پاکستان کی روایتی ریلی میں شریک ہوا، نیاگرا آبشار دیکھی، کینیڈا کے شہر ٹورنٹو بھی گیا، اور نیویارک سے سان فرانسسکو تک بہت سے امریکی شہروں میں وقت گزارا۔ سان فرانسسکو کا مشہور زلزلہ جس روز آیا اس دن صبح ۶ بجے وہاں سے نیویارک واپسی کے لیے میری پرواز تھی اور زلزلہ اس سے چند گھنٹے بعد آیا تھا۔ امریکہ رہنے والے ایک دوست نے ایک بار مجھ سے کہا کہ ہم نے امریکہ اس قدر گھوم پھر کر نہیں دیکھا جتنا آپ نے دیکھ لیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک دفعہ ایک دست شناس دوست نے اتفاقیہ طور پر میرا ہاتھ دیکھ لیا تھا اور بتایا تھا کہ زاہد صاحب! آپ کے ہاتھ میں سفر کی لکیریں بہت ہیں لیکن آپ کے مقدر میں دولت نظر نہیں آتی۔

یہ دولت کے بغیر سفر کا تجربہ بھی بہت عجیب ہے۔ میں اسے دین کی برکت سمجھتا ہوں کہ بڑے بڑے سرمایہ دار جن سفروں سے گھبراتے ہیں اور لمبی چوڑی پلاننگ کرتے ہیں، ہمارے وہ سفر آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ یہ پندرہ سال قبل کی بات ہے کہ گوجرانوالہ سے ہمارے ایک محترم دوست نے، جو ایک بڑے صنعت کار ہیں اور شاہ ولی اللہ یونیورسٹی پروجیکٹ کے ذمہ دار حضرات میں سے ہیں، میرے ساتھ برطانیہ اور امریکہ کے سفر کا پروگرام بنا لیا۔ ہم نے لندن اور نیویارک کا اکٹھے سفر کیا اور کئی دن ساتھ گزارے۔ اس

زمانے میں ہم ایئرپورٹ پر دکھانے کے لیے ٹریول چیک کی صورت میں چند سو ڈالر لے جایا کرتے تھے۔ میں نے کچھ ٹریول چیک حاصل کیے اور احتیاطا پاسپورٹ کے ساتھ رکھ لیے، لیکن دوران سفر کسی جگہ بھی انہیں کیش کرانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ہر جگہ دوست ہمیں ایئرپورٹ سے وصول کرتے اور واپسی پر چھوڑ جاتے۔ مساجد و مدارس میں ہمارا قیام ہوتا، بہت سے دوست خوشی خوشی گھر لے جا کر ہمیں کھانا کھلاتے اور روزانہ گھومنے پھرنے کے لیے ٹرانسپورٹ بھی مہیا کرتے۔ اس کے علاوہ ہمارا اور کیا خرچہ ہوتا؟ چنانچہ گوجرانوالہ واپس پہنچنے پر میں نے ان صاحب سے کہا کہ میں اپنے ٹریول چیکس واپس کر رہا ہوں تو حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا کہ آپ کا تو صرف ٹکٹ ہی کا خرچہ ہوا ہوگا؟ میں زیر لب مسکرا کر خاموش ہو گیا کہ اس بات کا بھی پردہ ہی رہ جائے تو بہتر ہے۔

یہ بات بہت سے دوست نہیں سمجھ پائیں گے مگر دین اور دینی تعلق کی برکات کا تجربہ ہم شب و روز کرتے رہتے ہیں اس لیے ہمارے لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ متعدّد بار ایسا ہوا کہ معمول کے مطابق دو چار ماہ رہنے کے لیے لندن پہنچا مگر جیب میں چند سو پاکستانی روپوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ صرف یہ خدشہ رہتا تھا کہ اگر امیگریشن کے کاؤنٹر پر متعلقہ آفیسر نے پوچھ لیا کہ وزیٹر کے طور پر اتنے دن رہنے کے لیے آئے ہو تو جیب میں کچھ رقم بھی ہے تو کیا جواب دوں گا۔ عام طور پر وہ نہیں پوچھا کرتے تھے مگر ایک بار انہوں نے پوچھ ہی لیا تو انگریزی زبان نہ جاننا بہانہ بن گیا اور دو تین گول مول الٹے سیدھے اشاروں کے بعد جان چھوٹ گئی۔ اس بار میں ۲۵ مئی کو نیویارک سے ہیتھرو ایئرپورٹ پہنچا تو جس دوست نے مجھے لینے آنا تھا وہ باہر موجود نہیں تھے۔ انہیں فون کر کے صورتحال معلوم کرنے کے لیے سکوں کی ضرورت تھی جو میرے پاس موجود نہیں تھے۔ مجبوراً بیس ڈالر کا ایک نوٹ کیش کرا کے پاؤنڈ حاصل کیے۔ ایئرپورٹ پر کرنسی کے تبادلے کے ریٹ مختلف ہوتے ہیں، مجھے بیس ڈالر کے عوض تقریباً گیارہ برطانوی پاؤنڈ ملے۔ میں نے فون کر کے دوست کا پتہ کیا جو تھوڑی دیر کے بعد لینے کے لیے آ گئے۔ میں چار دن برطانیہ میں رہا، لندن کے علاوہ برمنگھم، مانچسٹر، اور نوٹنگھم بھی گیا۔ چار دن کے بعد جب ۲۸ مئی کی شام کو لاہور واپسی کے لیے ہیتھرو ایئرپورٹ پر پہنچا تو ان میں سے پانچ پاؤنڈ کا نوٹ میری جیب میں موجود تھا جو اب بھی میرے پاس ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ اگلے سفر میں کام آئے گا۔

بات اس رخ پر چل پڑی ہے تو تحدیث نعمت کے لیے ایک اور واقعہ عرض کر دیتا ہوں، صرف اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہ اس دنیا میں دینی تعلق سے زیادہ کوئی تعلق اور فکری رشتے سے زیادہ مستحکم کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جس کا ہم سے کسی طور بھی شکر ادا نہیں ہو پاتا۔ تقریباً ۲۰ سال قبل کی بات ہے، ذی الحجہ کی دوسری یا تیسری تاریخ کو کراچی سے حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن نے فون پر مجھ سے دریافت کیا کہ ”میاں حج پر جانا ہے؟“ میں نے گزارش کی کہ اس سعادت سے انکار کا لفظ منہ پر نہیں لانا چاہتا مگر اب تو وقت بھی گزر گیا ہے اور میرے پاس پاسپورٹ کے سوا اور کچھ ہے بھی نہیں۔ پوچھا کہ ”پاسپورٹ کارآمد ہے نا؟“ میں نے ہاں میں جواب دیا تو کہا کہ ٹی سی ایس سے بھیج دو۔ میں نے پاسپورٹ انہیں بھجوا دیا، دو دن گزرے ہوں گے کہ فون آیا کہ رات نائٹ کوچ سے کراچی پہنچو، کل ایک بجے کراچی سے جدہ کے لیے فلائٹ ہے۔ میں حسب حکم پہنچا اور ذی الحجہ کی پانچویں یا چھٹی تاریخ کو حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن کے قافلے میں شامل ہو کر مغرب سے قبل مکہ مکرمہ پہنچ گیا۔ میں دوستوں سے عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم فقیروں کے کام تو اس طرح ہو جایا کرتے ہیں کہ جیب میں پیسے ہوں یا نہ ہوں، جہاں مقدر میں جانا لکھا ہے اس کے اسباب اللہ تعالیٰ غیب سے پیدا فرما دیتے ہیں۔

لیکن جب مقدر ساتھ نہ دے تو اس طرح بھی ہوتا ہے کہ جس سال عراق نے کویت پر حملہ کیا تھا میں ان دنوں لندن میں تھا۔ واپسی پر عمرہ کے لیے براستہ سعودی عرب وطن واپس آنے کا ارادہ تھا۔ سعودی ایئر لائن کا ٹکٹ تھا، عمرے کا ویزا لیا اور سفر کے لیے جہاز پر سوار ہو گیا۔ لندن سے جدہ کی فلائٹ تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے کی ہوتی ہے، جہاز نے چار گھنٹے کے لگ بھگ سفر طے کر لیا تھا کہ مجھے جہاز کا رخ واپسی کی طرف مڑتا ہوا محسوس ہوا۔ رات کا پچھلا پہر تھا کہ پائلٹ نے اعلان کیا کہ خلیج میں جنگ شروع ہو گئی ہے اور جدہ ایئرپورٹ بند کر دیا گیا ہے اس لیے ہم واپس لندن جا رہے ہیں۔ چنانچہ تقریباً آٹھ گھنٹے مسلسل فضا میں رہنے کے بعد ہم صبح پھر ہیتھرو ایئرپورٹ پر تھے۔ اور جب میں نے رات کو ایئرپورٹ پر چھوڑ کر جانے والے اپنے میزبان کے گھر پہنچ کر ان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ مجھے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

بات بہت دور نکل گئی، تیرہ چودہ سال قبل ہونے والے امریکہ کے بعض اسفار کا ذکر کر رہا تھا، مگر یہ نائن الیون سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اس بار جب امریکہ پہنچا تو صورتحال

بدلی ہوئی تھی، فضا پہلے کی طرح مانوس نہیں تھی، اور دوستوں کے چہروں کے تاثرات بھی مختلف تھے۔ میں نے زیادہ تر دوستوں کو بتایا بھی نہیں تھا اس لیے کہ صرف دو ہفتے کے سفر میں سب کے پاس جانا میرے بس میں نہیں تھا۔ بعض دوستوں کو وہاں پہنچنے کے بعد فون پر بتایا، کچھ کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا، بار بار پوچھتے رہے کہ کیا واقعی امریکہ آئے ہو اور کیسے آئے ہو؟ ان کے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ مجھے امریکہ کا ویزا کیسے مل گیا ہے۔ کیونکہ سب دوست جانتے ہیں کہ میں عالم اسلام اور پاکستان کے حوالے سے امریکی پالیسیوں کے خلاف مسلسل لکھتا رہتا ہوں، اور صرف لکھتا ہی نہیں اجتماعات میں تقریریں بھی کرتا ہوں، بلکہ امریکی موقف اور پالیسیوں کے خلاف مختلف تحریکات میں سرگرم کردار بھی ادا کرتا ہوں۔ اس لیے انہیں میرے امریکہ میں موجود ہونے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس امریکہ کا ویزا ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء سے قبل کا ہے اور ۲۰۰۵ء تک کارآمد ہے۔

میرے امریکہ جانے کے مقاصد میں سے سب سے بڑی بات تو وہاں رہنے والے دوستوں سے تعلقات کی تجدید تھی جو گزشتہ بارہ تیرہ سال سے کم و بیش منقطع تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات اور ان پر نائن الیون کے سانحہ کے بعد پڑنے والے اثرات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ پھر یہ خواہش بھی تھی کہ اگر کچھ دوست وقت نکال سکیں اور اچھی ترجمانی کر سکیں تو دو چار امریکی دانشوروں بالخصوص پادری صاحبان سے موجودہ عالمی صورتحال اور مغرب اور مسلمانوں کی کشمکش کے حوالے سے گفتگو ہو جائے تاکہ ان کا نقطۂ نظر براہ راست معلوم کیا جا سکے۔ آخری بات کے لیے تو فضا سازگار نہیں ملی اور اس خواہش کو کسی اور مناسب موقع کے لیے ملتوی کرنا پڑا، البتہ ایک محدود دائرہ میں پہلی دو باتوں کے سلسلہ میں کچھ پیش رفت ضرور ہوئی۔

واشنگٹن ڈی سی کے علاقے میں ہمارے ایک پرانے دوست مولانا عبد الحمید اصغر صاحب رہتے ہیں، بنیادی طور پر انجینئر ہیں، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں پڑھاتے رہے ہیں، چکوال کے معروف روحانی پیشوا حضرت مولانا حافظ غلام حبیب نقشبندیؒ کے خلفاء میں سے ہیں، اور ایک عرصہ سے واشنگٹن میں مقیم رہ کر دینی خدمات میں مصروف ہیں۔ تب وہ واشنگٹن کے قریب شمالی ورجینیا کے شہر الیگزینڈریا میں ایک کرائے کے مکان میں مسجد اور دینی مکتب قائم کیے ہوئے تھے۔ لیکن اب چند برس سے اس کے قریبی علاقہ

سپرنگ فیلڈ میں ایک عمارت خرید کر اس میں مسجد، دینی درسگاہ اور طالبات کا اسکول قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ مخلص معاونین کی ایک ٹیم ہے اور یہ دوست مل کر اس علاقے میں مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور تعلیمی خدمات کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ الیگزینڈریا سے کچھ آگے جنوب کی طرف ڈمفریز شہر میں میرے ہم زلف محمد یونس صاحب اپنے بچوں سمیت رہتے ہیں، میرا ابتدائی قیام انہی کے ہاں تھا۔ لیکن جب میں اپنے دو عزیزوں کے ہمراہ ملاقات کے لیے مولانا عبد الحمید اصغر کے ہاں پہنچا تو انہوں نے اچانک مجھے دیکھ کر خوشی کے ساتھ ساتھ ناراضگی کا اظہار بھی کیا کہ انہیں آنے کی پہلے اطلاع کیوں نہیں دی۔ انہیں افسوس اس بات پر تھا کہ جس روز میں پہنچا اس سے ایک روز قبل انہوں نے اپنے دینی مرکز ”دارالہدیٰ“ میں بڑے اہتمام کے ساتھ ایک سیرت کانفرنس منعقد کی تھی جس میں علاقے کے سینکڑوں مسلمانوں نے شرکت کی اور حضرت مولانا احترام الحق تھانوی نے اس سے خطاب کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر انہیں میرے پروگرام کا چند روز قبل علم ہو جاتا تو وہ اس کانفرنس کو ایک روز کے لیے آگے کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ مجھے کانفرنس کے انعقاد کا علم نہ تھا اور میں اپنے سفر امریکہ کو جان بوجھ کر اکثر دوستوں سے صرف اس لیے چھپائے ہوئے تھا کہ

کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے

مولانا نے اپنا غصہ میرے لیے اس سزا کی صورت میں نکالا کہ مغرب کی نماز کے بعد دارالہدیٰ کی مسجد میں میرے درس کا اعلان کیا اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ یہ جتنے دن بھی واشنگٹن میں رہیں گے روزانہ مغرب کے بعد دارالہدیٰ میں سیرت نبویؐ پر درس دیا کریں گے اور اس دوران جو دو جمعۃ المبارک آئیں گے وہ بھی یہی پڑھائیں گے۔ چنانچہ یہ ”خوبصورت سزا“ میں نے بھگتی۔

اس کے علاوہ امریکہ کے اس سفر کے دوران دو روز کے لیے نیویارک گیا جبکہ ایک روز کے لیے بفلو جانا ہوا۔ نیویارک کے جمیکا کے علاقہ میں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے نوجوان علمائے کرام نے ”دارالعلوم نیویارک“ کے نام سے دینی درسگاہ قائم کر رکھی ہے۔ وہاں ”قرآن کریم کی تعلیم کی اہمیت اور قرآن کریم کے اعجاز“ کے موضوع پر بیان ہوا۔ انہوں نے خاصے دوست جمع کر رکھے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے بتایا کہ اس سال اس درسگاہ میں گیارہ بچوں نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ہے۔ اس خوشی میں اس موضوع پر چند

گزارشات پیش کیں اور عرض کیا کہ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ جیسے جیسے عالمی سطح پر اس کی تعلیم کی مخالفت ہو رہی ہے، ویسے ویسے دنیا میں قرآن کریم کے حافظوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ نیویارک کے ایک مدرسہ میں اس سال گیارہ بچے حافظ قرآن ہو گئے ہیں۔

نیویارک کے علاقے بروکلین کی مکی مسجد میں دوسرے روز مغرب کے بعد درس ہوا جس کے بعد سوال و جواب کی محفل جمی۔ مکی مسجد کے خطیب حافظ محمد صابر وہاں کی مسلم کمیونٹی کے خاصے متحرک لیڈر ہیں اور سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے والے مسلمان ائمہ میں سے ہیں۔ ان کے گھر کھانے پر سرکردہ حضرات سے ملاقات اور مختلف امور پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے سابق مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا عبد الرزاق عزیز نے، جو نیویارک کے علاقے لانگ آئی لینڈ کے ایک اسلامک سنٹر کے امام ہیں، جزیرے کی خوب سیر کرائی اور پھر خود پانچ چھ گھنٹے کی مسافت پر واشنگٹن ڈی سی چھوڑنے آئے۔

نیویارک ریاست کے سرحدی شہر بیفلو میں دارالعلوم مدینہ کے نام سے ایک معیاری دینی درسگاہ ہے جہاں کے منتظم شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مہاجر مدنیؒ کے خلیفہ مجاز محترم ڈاکٹر محمد اسماعیل میمن ہیں۔ ایک روز کے لیے وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ اسی دارالعلوم مدنیہ کی ''زکریا مسجد'' کو نائن الیون کے سانحہ کے بعد نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ یہ مسجد ایک بڑا چرچ خرید کر بنائی گئی تھی اور اب اس کی دوبارہ تعمیر ہو رہی ہے جو تکمیل کے قریب ہے۔ ظہر اور عصر کی نماز اس مسجد میں باجماعت ادا کی اور دارالعلوم مدینہ میں اساتذہ اور طلبہ کے اجتماع سے مختصر خطاب کا موقع بھی ملا۔

واشنگٹن ڈی سی میں بہت کچھ دیکھنے اور بہت سے حضرات سے بات چیت کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن فضا میں غیر مرئی سی حد درجہ احتیاط اور چوکنا پن محسوس کر کے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ مولانا عبد الحمید اصغر ایک روز نیشنل میوزیم آف امریکن ہسٹری دکھانے لے گئے لیکن رش زیادہ ہونے کے باعث پارکنگ نہ ملی تو میوزیم دیکھے بغیر واپس آنا پڑا۔ البتہ پینٹاگون کے سامنے سے کئی بار گزرنے کا اتفاق ہوا اور جیفرسن کی یادگار کے قریب سے بھی متعدّد بار گزر ہوا۔ شہر میں دریا کے کنارے ایک دھاتی مجسمے کو اس انداز سے زمین میں دبایا گیا ہے کہ اس کا منہ، دونوں ہاتھ، ایک گھٹنا اور دونوں پاؤں باہر ہیں، جبکہ باقی سارا جسم

زمین کے اندر ہے۔ اس کے قریب کوئی کتبہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ اس کی وجہ معلوم ہوسکے مگر ایسا کوئی کتبہ نہ ملا۔ البتہ ایک دوست نے صحیح یا غلط یہ بتایا کہ قیامت کے روز اسی طرح لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے۔ اگر یہ کہانی درست ہے تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ کیا امریکی معاشرے میں ابھی تک قیامت کا اور قبر سے جی اٹھنے کا تصور موجود ہے؟ بظاہر امریکی سوسائٹی کا ماحول اور رجحانات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ لیا ہے اور اسی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن پیش رفت کی جا رہی ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس دنیا کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے اور زیادہ سے زیادہ معاشرتی اسباب اور سہولتیں فراہم کرنے میں امریکی معاشرے کا کوئی جواب نہیں۔ اسی وجہ سے دنیا کے بے شمار لوگ، جن میں مسلمان اور غیر مسلم سبھی شامل ہیں، امریکہ جانے اور وہاں آباد ہونے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔

ایک دوست نے گیارہ ستمبر کے سانحہ کے بعد کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دونوں طرف خوف کی فضا اور احساس موجود ہے۔ ایک طرف مسلمانوں میں اور خاص طور پر عربوں میں کوئی سرگرمی دکھائی دیتی ہے تو پورا سسٹم الرٹ ہو جاتا ہے اور میڈیا بار بار یہ کہہ کر کہ "ابھی مزید بھی کچھ ہونے والا ہے" اس خوف میں مسلسل اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس دوست کا کہنا ہے کہ اس طرف پتہ بھی ہلتا ہے تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف مسلمانوں میں بھی ہر وقت یہ خدشہ اور خطرہ ذہنوں پر سوار رہتا ہے کہ خدا جانے کب کوئی شک کی زد میں آجائے اور دھر لیا جائے۔ کیونکہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد شک و شبہ کی گھاٹی سے گزر چکے ہیں اور خدا جانے کتنوں کو اس چھلنی سے ابھی گزرنا ہے۔ غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کے ساتھ اس سے قبل جو نرمی برتی جاتی تھی اور چشم پوشی سے کام لیا جاتا تھا وہ پالیسی بالکل تبدیل ہوگئی ہے اور سب سے زیادہ متاثر بھی وہی لوگ ہوئے ہیں۔ ان کی ایک بڑی تعداد امریکہ چھوڑ چکی ہے اور اچھی خاصی تعداد جیلوں میں بند ہے۔ وہاں کی جیلوں کی صورتحال کے بارے میں بھی کچھ اچھے تاثرات نہیں پائے جاتے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس حوالے سے گرفتار کیے جانے والے افراد کے ساتھ بہت سی امریکی جیلوں میں معاملہ اور سلوک وہ نہیں ہے جو امریکی جیلوں کے بارے میں عام طور پر سننے میں آتا ہے۔ ایک دوست نے کہا کہ رویہ کے لحاظ سے پاکستان کی جیلوں اور امریکہ کی جیلوں میں کچھ خاص فرق نہیں رہا۔

بعض دوستوں نے تاثرات دریافت کرتے ہوئے یہ سوال بھی کیا کہ میں حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی رائے دوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اب تک کی معلومات پر رائے نہیں دے سکتا، البتہ تسلی کے ساتھ گھومنے پھرنے کے علاوہ کچھ مزید لوگوں سے ملاقات اور گفتگو کی کوئی صورت نکل آئی تو تاثرات کے ساتھ رائے اور تجاویز پر بھی بات ہو جائے گی، ان شاء اللہ تعالی۔

امریکی دستور میں یہودیوں نے مسلسل محنت کے بعد اپنے لیے ایک سہولت حاصل کر رکھی ہے کہ وہ ایک خاص طریقہ کار کے تحت خاندانی قوانین اور مالیاتی معاملات میں اپنی کمیونٹی کے لیے الگ عدالتی نظام قائم کر سکتے ہیں جو ان کے مذہبی قوانین کے مطابق فیصلے کرنے کا مجاز ہے اور اس کے فیصلوں کا سپریم کورٹ تک میں احترام کیا جاتا ہے۔ یہ سسٹم چونکہ مذہبی اقلیتوں کے عنوان سے ہے، اس لیے مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن الجھن یہ ہے کہ ایک تو امریکی مسلمانوں کی اکثریت اس دستوری سہولت اور حق سے بے خبر ہے اور دوسرے یہ کہ مسلم کمیونٹی میں اس قدر ہم آہنگی اور اشتراک کار نہیں ہے کہ وہ کوئی مشترکہ نظام اور طریق کار اس سلسلے میں طے کر سکیں۔ گزشتہ اسفار کے دوران میں نے متعدّد اجتماعات میں یہ مسئلہ اٹھایا تھا اور بہت سے مسلم راہ نماؤں نے میری اس گزارش سے اتفاق کیا تھا کہ امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو اس دستوری حق اور سہولت سے محروم نہیں رہنا چاہیے اور اسے بروے کار لانے کے لیے مشترکہ اور سنجیدہ محنت کا آغاز ہونا چاہیے۔ حالیہ سفر میں اس مسئلہ پر مولانا عبد الحمید اصغر سے تفصیلی بات ہوئی، انہیں اس سلسلے میں باخبر اور فکر مند پایا اور آئندہ کسی سفر کے موقع پر ان کے ساتھ اس حوالے سے پیش رفت کے پروگرام کا ہلکا پھلکا سا نقشہ بھی طے ہوا۔

مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں مساجد کا کردار

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۹ جون ۲۰۰۳ء)

سعودی عرب کے سفیر محترم نے گزشتہ دنوں اسلام آباد میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حالیہ عراقی جنگ کے بعد سعودی عرب میں سینکڑوں ائمہ مساجد کو امامت و خطابت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا ہے اور مزید کئی ائمہ کو فارغ کیا جا رہا ہے۔ سفیر محترم کا کہنا ہے کہ مسجدیں اللہ تعالی کی عبادت اور

قرآن وسنت کی تعلیم کے لیے ہیں سیاسی افکار کے فروغ کے لیے نہیں ہیں، اس لیے سیاسی باتیں کرنے والے خطباء کو فارغ کر دیا گیا ہے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق اس دوران سعودی عرب کے مختلف شہروں میں آٹھ سو کے قریب ائمہ اور خطباء کو فارغ کیا گیا ہے اور مزید کئی سو ائمہ و خطباء کو ان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیے جانے کی توقع ہے۔ اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ یہ ائمہ اپنے نمازیوں کو جمعۃ المبارک کے خطبات اور دروس کے دوران فلسطین، عراق، کشمیر اور افغانستان کے حالات سے آگاہ کرتے تھے اور انہیں ان ممالک کے مسلمان عوام پر ہونے والے مظالم کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ادھر مراکش میں بعض اخباری اطلاعات کے مطابق سرے سے چھ سو کے لگ بھگ مساجد ہی کو بند کر دیا گیا ہے جن کے بارے میں سرکاری موقف یہ ہے کہ وہ حکومت کی منظوری کے بغیر تعمیر ہوئی تھیں۔ جبکہ قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ دینی سرگرمیوں کے باعث ان مساجد کو بند کیا گیا ہے کیونکہ ان سرگرمیوں سے حکومت مخالف جذبات کو فروغ ملنے کا خدشہ تھا۔

مساجد کے بارے میں ہمارے ہاں بھی بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ان میں سیاست کی بات نہیں ہونی چاہیے اور مساجد میں صرف عبادت اور تعلیم کا کام ہونا چاہیے۔ بالخصوص جمعۃ المبارک کے خطبات اور مساجد کے اندر ہونے والے دینی اجتماعات میں سیاست کے حوالہ سے گفتگو سے علماء کرام کو گریز کرنا چاہیے۔ یہ سوچ دراصل مغربی فلسفہ و ثقافت کے اثرات کے باعث ہمارے ہاں در آئی ہے اور یورپی تمدن کے زیر اثر ہمارے ہاں بھی یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ مسجد میں سیاست سے متعلقہ کوئی بات کرنا مسجد کے تقدس کے منافی ہے۔ یورپ اور مغرب میں تو انقلاب فرانس کے بعد مذہب اور چرچ کو قومی اور اجتماعی زندگی سے باقاعدہ طور پر بے دخل کر دیا گیا تھا اور اس بات کو فلسفہ اور عقیدہ کے طور پر اپنا لیا گیا تھا کہ مذہب کا تعلق انسان کے شخصی معاملات سے ہے اور اس میں بھی وہ آزاد ہے کہ مذہب کے ساتھ تعلق رکھے یا نہ رکھے۔ جبکہ قومی زندگی اور اجتماعی معاملات سے مذہب، پادری اور چرچ کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ اس فلسفہ کی رو سے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ چرچ اور عبادت خانہ میں صرف عقیدہ اور عبادت یا زیادہ سے زیادہ مذہبی کتاب کی تعلیم کی بات کی جائے اور اس سے ہٹ کر عبادت خانہ کے مذہبی اجتماعات میں کسی موضوع کو نہ چھیڑا جائے۔ مگر اسلام کے بارے میں یہ

تصور درست نہیں ہے کیونکہ مسجد اور سیاست کو الگ الگ قرار دینے والوں سے بھی اگر پوچھا جائے تو وہ یہی جواب دیں گے کہ اسلام صرف فرد کا دین نہیں بلکہ سوسائٹی اور معاشرہ کا دین بھی ہے اور اس کے احکام کا تعلق صرف انسان کے شخصی معاملات سے نہیں بلکہ ایک مسلم معاشرہ کے اجتماعی معاملات سے بھی ہے۔ لیکن جب وہ اسلام کے اجتماعی کردار کو تسلیم کرتے ہوئے مسجد کو سیاست سے الگ رکھنے کی بات کرتے ہیں تو ان کی ذہنی کنفیوژن پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ یہ دونوں باتیں بیک وقت کیسے کہہ دیتے ہیں؟

اسلام کے معاشرتی کردار کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ کا دور ہمارے لیے آئیڈیل دور ہے کیونکہ اسلام کے کسی بھی حکم، قانون یا کردار کے تعین کے لیے انہی ادوار سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ دور نبویؐ اور دور خلافت راشدہ کی تاریخ گواہ ہے کہ اجتماعی امور سے متعلقہ تمام معاملات ان مثالی ادوار میں مسجد میں ہی طے ہوتے تھے۔ اور جناب نبی اکرمؐ اور خلفاء راشدینؓ کے خطبات جمعہ وعیدین میں اس بات کی کوئی تفریق نہیں ہوتی تھی کہ فلاں بات عبادت اور تعلیم سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اسے مسجد میں ہونا چاہیے اور فلاں بات سیاست اور حکومت سے متعلقہ ہے اس لیے اسے مسجد سے باہر کیا جانا چاہیے۔ مسلمانوں سے متعلقہ معاملات کا تعلق عبادت سے ہو یا تعلیم سے، سیاست سے ہو یا عدالت سے، معاشرے سے ہو یا تمدن سے، صلح سے ہو یا جنگ سے، تجارت سے ہو یا زراعت سے، اور مقامی امور سے ہو یا بین الاقوامی معاملات سے، ان سب کا تذکرہ مسجد میں ہوتا تھا اور ان کے بارے میں ہر اہم فیصلہ مسجد میں کیا جاتا تھا جس کا اعلان مسجد میں ہوتا تھا اور اس کے بارے میں ہدایت بھی مسجد میں جاری کی جاتی تھیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ مسجدیں صرف عبادت اور تعلیم کے لیے ہیں اور سیاسی معاملات کا مسجدوں میں تذکرہ نہیں ہونا چاہیے، جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ اور حضرات خلفاء راشدینؓ کے طرز عمل کے یکسر منافی ہے۔

تعلیم ہی کے حوالے سے دیکھ لیجیے کہ یہ بات سعودی عرب کے سفیر محترم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مسجدیں قرآن وسنت کی تعلیم کے لیے ہیں۔ اور ہمارے دیگر معترضین کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہے کہ قرآن کریم اور سنت رسولؐ کی تعلیم کے لیے مسجد ہی سب سے موزوں جگہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم دیتے ہوئے اس کے وہ حصے تعلیم سے خارج تو نہیں کیے جائیں گے جن میں اجتماعی امور کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔

اسی طرح حدیث نبویؐ کی تعلیم کے دوران حدیث کی کسی کتاب سے وہ ابواب مستثنیٰ نہیں کیے جا سکیں گے جن کا تعلق خلافت، تجارت، جہاد، عدلیہ اور دیگر اجتماعی امور سے ہے۔ اور اگر کسی مسلمان حکومت کا یہ اصرار ہو کہ قرآن کریم اور سنت نبویؐ کی تعلیم صرف ان ابواب کے حوالے سے دی جائے جن کا تعلق عبادت اور اخلاقیات سے ہے، اور مسجد میں قرآن کے ان حصوں اور حدیث کی کتابوں کے ان ابواب کی تعلیم نہ دی جائے جن میں سیاست و حکومت اور عدالت و جہاد کے احکام بیان کیے گئے ہیں تو قرآن و سنت کے تمام احکام کی یکساں فرضیت پر ایمان رکھنے والے علماء کرام کے لیے ایسے کسی حکم کو قبول کرنا کیسے ممکن ہوگا؟ اور ایسی مسلمان حکومت اور یورپ کی ان مسیحی حکومتوں کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا جنہوں نے چرچ، پادری اور بائیبل کو شخصی زندگی اور عبادت و اخلاق کے دائرہ میں محدود کر کے معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے لاتعلق کر رکھا ہے۔

میرا گزشتہ پینتیس سال سے معمول ہے کہ جمعہ کے بیان میں دینی حوالہ سے چند ضروری باتیں کرنے کے بعد آخر میں پانچ دس منٹ حالات حاضرہ پر بات کیا کرتا ہوں اور اسلام اور عالم اسلام سے متعلقہ کوئی بات ملکی یا بین الاقوامی سطح پر سامنے ہو تو اس پر مختصر تبصرہ کر دیتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک انتہائی مخلص بزرگ نے مجھ سے کہا کہ آپ جمعہ کے بیان میں صرف قرآن و سنت کی بات کیا کریں سیاست کی بات نہ کیا کریں۔ مجھے ان کی بات پر تعجب ہوا اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی محسوس ہوئی کہ کیسے کیسے مخلص اور نیک لوگ کس طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ میں نے انہیں اپنے کمرہ میں آنے کے لیے کہا اور اطمینان سے بٹھا کر ان کے سامنے قرآن کریم کھول کر رکھ دیا۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ قرآن کریم کی متعدّد آیات میں نماز اور زکوٰۃ کا حکم یکجا بیان کیا گیا ہے، آپ کا کیا خیال ہے کہ میں نماز کا حکم جمعہ کے بیان میں یا درس میں ذکر کروں تو اس کے ساتھ زکوٰۃ کا تذکرہ کروں یا نہیں؟ فرمانے لگے ضرور کریں میں نے عرض کیا کہ زکوٰۃ کا حکم ہمارے لیے انفرادی سطح پر ہے یا اس میں حکومت کی بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ فرمانے لگے کہ حکومت کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ بیت المال قائم کرنے اور زکوٰۃ کی وصولی اور اسے صحیح مصارف پر خرچ کرنے کا اہتمام کرے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں جمعۃ المبارک کے بیان میں زکوٰۃ کے بارے میں حکومت کی ذمہ داریاں بیان کروں گا اور اس سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کا مطالبہ کروں گا تو آپ کو شکایت ہوگی کہ میں سیاست کی بات کر رہا ہوں۔ پھر میں

نے گزارش کی کہ قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی بلکہ اس سے پہلی آیات میں فرمایا گیا ہے کہ اے مسلمانو! تم پر قصاص کا قانون فرض کیا گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں روزے والی آیت پڑھ کر اس کا ترجمہ وتشریح بیان کروں تو اس کے ساتھ قصاص والی آیت کا ترجمہ تشریح بھی کروں یا اسے بغیر ترجمہ وتشریح کے صرف تلاوت کر کے آگے گزر جاؤں؟ فرمانے لگے کہ اس کا ترجمہ وتشریح بھی ضروری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ قصاص کا قانون میں نے تو نافذ نہیں کرنا بلکہ حکومت نے کرنا ہے، اس لیے ظاہری بات ہے کہ جب اس کا ترجمہ کروں گا اور اس کے احکام بیان کروں گا تو اس کا مخاطب وقت کی حکومت ہوگی اور میں اسی سے مطالبہ کروں گا کہ وہ ملک میں قصاص کے قانون کے نفاذ اور اس پر عمل درآمد کا اہتمام کرے۔ اور اگر میں ایسا کروں گا تو آپ کو پھر شکایت ہوگی کہ میں نے مسجد میں اور جمعہ کے بیان میں سیاست شروع کر دی ہے۔ نیک آدمی تھے، مخلص تھے اور محض سنی سنائی باتوں کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار تھے اس لیے جلدی سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ آپ جو مناسب سمجھیں جمعہ اور درس میں بیان کیا کریں۔ حتیٰ کہ اب اگر کسی جمعہ پر کسی وجہ سے حالات حاضرہ پر تبصرہ نہیں کرتا تو وہ بزرگ بعض اوقات مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ اس جمعہ کو آپ نے سیاست پر بات کیوں نہیں کی۔

پھر جمعہ کا اجتماع صرف اس لیے نہیں کہ خطیب اس میں حالات حاضرہ کے مطابق عامۃ المسلمین کی رہنمائی کرے بلکہ اس لیے بھی ہے کہ اگر کسی عام مسلمان کو حکمرانوں کے کسی طرز عمل پر اعتراض ہو تو جمعہ کے اجتماع پر کھڑے ہو کر اس کے بارے میں دریافت کر کرے۔ حضرت عمرؓ سے ان کا کرتا لمبا ہونے کا سوال جمعۃ المبارک کے خطبہ کے دوران ہی کیا گیا تھا۔ اور خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ تاریخی جملہ مسجد نبویؐ میں خطبہ کے دوران ہی ارشاد فرمایا تھا کہ ”میں اگر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے پکڑ کر سیدھا کر دو۔“

اس لیے مسجد کے بارے میں یہ تصور کہ اس میں عبادت اور مذہبی تعلیم کے علاوہ کوئی بات نہیں ہونی چاہیے اور مسجد میں سیاسی امور کا تذکرہ اور حکمرانوں پر تنقید نہیں کی جانی چاہیے، اسلامی تعلیمات سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا۔ خاص طور پر سعودی عرب کے حکمرانوں کے لیے تو کسی طرح بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ اس تصور کا پرچار کریں کیونکہ سعودی

حکومت قرآن وسنت کو ملک کا دستور قرار دیتی ہے، سعودی مملکت کے فرمانروا خود کو حرمین شریفین کا خادم کہتے ہیں، اور دنیا بھر میں آج کے دور میں ایک مسلمان حکومت کے طرز عمل کے طور پر سعودی عرب کی حکومت کو بطور حوالہ اور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے سعودی عرب کے سفیر محترم کی وساطت سے سعودی عرب کے معزز حکمرانوں سے بڑے ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ وہ مساجد کے ائمہ اور خطباء پر بے جا غصہ نکالنے کی بجائے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں اور اس کے لیے باہر سے کسی کی بات سننے کی بجائے سعودی عرب کے سابق چیف جسٹس الشیخ محمد بن ابراہیمؒ کے ارشادات اور اب سے بارہ سال قبل سعودی عرب کے دو سو سرکردہ علماء کرام اور دانش وروں کی پیش کردہ ''عرضداشت'' کو ہی سامنے رکھ لیں تو انہیں ایک صحیح اسلامی حکومت کی شکل اختیار کرنے کے لیے کسی اور سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

نیکی اور اس کی حفاظت

(دارالہدٰی، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ - ۲۳ مئی ۲۰۰۳ء)

(جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ششماہی امتحان کے بعد دو ہفتے کی تعطیلات کے دوران شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی نے امریکہ اور برطانیہ کا تبلیغی اور مطالعاتی دورہ کیا۔ امریکہ میں دو ہفتے قیام کے دوران انہوں نے دارالہدی (اسپرنگ فیلڈ، ورجینیا)، دارالعلوم نیویارک (کوئینز، نیویارک)، مکی مسجد (بروکلین، نیویارک)، دارالعلوم مدنیہ (بفیلو، نیویارک) اور دیگر مقامات میں دینی اجتماعات سے خطاب کیا۔ ۲۳ مئی ۲۰۰۳ء کو جامع مسجد دارالہدی اسپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے مولانا زاہد الراشدی کا خطاب درج ذیل ہے۔ ادارہ نصرۃ العلوم)

بعد الحمد والصلوۃ۔ محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے سورۃ الکہف کے آخری رکوع کی ایک آیت کریمہ تلاوت کی ہے جس میں اللہ تعالی نے ایک اہم مسئلہ کی طرف ہمیں توجہ دلائی ہے، وہ یہ کہ دنیا میں ہر مسلمان کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائے اور ثواب والے کام کرے تاکہ یہ ثواب اور نیکیاں آخرت میں اسے کام آئیں، لیکن جس طرح نیکیاں کمانا ضروری ہے اسی طرح ان کی حفاظت بھی

ضروری ہے کیونکہ بسا اوقات کمائی ہوئی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں اور کیے ہوئے نیک اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو نیکی کے بارے میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ بعض دوست پوچھتے ہیں کہ مولوی صاحب یہ جو روزانہ ہم سنتے اور پڑھتے ہیں کہ فلاں کام کرنے سے اتنی نیکیاں ملتی ہیں تو یہ نیکیاں کیا چیز ہیں اور کس شکل میں ملتی ہیں؟ میں اس سوال کے جواب میں عرض کیا کرتا ہوں کہ نیکیاں آخرت کی کرنسی ہیں، جس طرح اس دنیا کے معاملات روپے پیسے سے طے ہوتے ہیں اسی طرح آنے والی زندگی میں اور آخرت میں باہمی معاملات نیکیوں اور بدیوں کے ذریعے طے ہوں گے۔ آج جس طرح ہم ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں اور بارڈر کراس کرتے ہیں تو ہمیں وہاں لین دین اور معاملات کے لیے اس ملک کی کرنسی کی ضرورت ہوتی ہے، اور ہم بارڈر کراس کرنے سے قبل اس کا انتظام کر کے اس ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح موت بھی دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے، وہاں جانے سے قبل نیکیوں کا اتنا ذخیرہ جمع کر لینا چاہیے کہ وہاں کی زندگی آسانی کے ساتھ گزاری جا سکے۔

موت کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ موت فنا ہو جانے کا نام ہے یہ غلط بات ہے، یہ مشرکین کا عقیدہ تھا جس کی قرآن کریم نے جابجا صراحت کے ساتھ تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ موت فنا ہو جانے کا نام نہیں بلکہ دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہونے اور اس جہان کا بارڈر کراس کر کے دوسرے جہان میں داخل ہو جانے کا نام ہے۔ اس اگلے جہان کے معاملات نیکی اور بدی کی کرنسی میں طے ہوں گے اور بہت سے مقامات پر باہمی حقوق کا فیصلہ کرتے وقت نیکیوں اور گناہوں کا تبادلہ کر کے حساب برابر کرنا ہوگا۔ اس لیے قرآن کریم نے ترغیب دی ہے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ثواب کماؤ اور جتنی زیادہ ہو سکے نیکیاں حاصل کرو تاکہ آخرت کی زندگی اور قیامت کے دن کے حساب کتاب میں تم سرخرو ہو سکو۔ لیکن جو آیت کریمہ میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اس میں اللہ رب العزت نے اس کے دوسرے پہلو کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ نیکیاں کمانے کے ساتھ ان کی حفاظت کرنا اور آخرت کے حساب کتاب کے وقت تک انہیں بچا کر رکھنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”قل ھل ننبئکم بالاخسرین أعمالا، الذین ضل سعیھم فی الحیاۃ الدنیا وھم یحسبون انھم

یحسنون صنعا" اے پیغمبرؐ! کہہ دیجیے کہ کیا ہم تمہیں ان لوگوں کے بارے میں نہ بتائیں جو اعمال کے لحاظ سے زیادہ خسارے میں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی اس دنیا کی زندگی میں رائیگاں چلی گئی، حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔

ایک خسارہ یہ ہے کہ کوئی شخص سرے سے کماتا ہی نہیں ہے، یہ شخص بھی خسارے میں ہے، لیکن دوسرا خسارہ یہ ہے کہ وہ شخص محنت مزدوری کرتا ہے اور سارا دن مشقت کر کے کمائی کرتا ہے لیکن اپنی کمائی ہوئی رقم کی حفاظت نہیں کر پاتا اور وہ گھر پہنچنے سے قبل راستہ میں ہی کہیں ضائع ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ دوسرا شخص پہلے سے زیادہ خسارے میں ہے اور اس نے زیادہ نقصان اٹھایا ہے کہ محنت و مشقت بھی کی لیکن اپنی محنت کی کمائی سے ضرورت کے وقت فائدہ نہ اٹھا سکا۔ یہی بات قرآن کریم نے نیکیوں کے بارے میں فرمائی ہے کہ جو شخص سرے سے نیکی نہیں کماتا وہ بھی خسارے میں ہے لیکن جو نیکیاں کما کر برباد کر دیتا ہے وہ اس سے زیادہ خسارے میں ہے۔ نیکی وہ کام کی ہے جو آخرت کے حساب کتاب تک انسان کے ساتھ جائے، اور جو راستے میں ہی کہیں برباد ہو جائے وہ کسی کام کی نہیں ہے بلکہ بسا اوقات الٹا وبال کا باعث بن سکتی ہے۔

قرآن کریم نے ایسے متعدّد افعال و اعمال کی نشاندہی کی ہے جو نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں، جس طرح بعض وائرس کمپیوٹر کے پروگراموں کو صاف کر دیتے ہیں اور انسان کا کیا ہوا کام ضائع ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح بعض اعمال ایسے ہیں جن کے ارتکاب سے ایک انسان کی نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں اور حاصل کیا ہوا ثواب برباد ہو جاتا ہے۔ مثلاً شرک کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اللہ رب العزت نے خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "لئن أشركت ليحبطن عملك" اگر خدانخواستہ آپؐ سے شرک سرزد ہو جائے تو آپ کی نیکیاں بھی برباد ہو جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدانخواستہ جناب نبی اکرمؐ سے شرک کا صدور ممکن ہے، ایسا نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معصوم ہوتے ہیں، ان سے شرک کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس آیت کریمہ کے ذریعے ہمیں سمجھانا مقصود ہے کہ شرک اتنا سنگین جرم ہے کہ اگر خدانخواستہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے سرزد ہو جائے تو ان کے اعمال بھی حبط ہو جائیں گے۔ چنانچہ شرک ایسا عمل ہے جو نیکیوں کو برباد کر

دیتا ہے، ثواب کو کھا جاتا ہے اور انسان کے کیے ہوئے اعمال اس کی نحوست سے غارت ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالی نے سورۃ الحجرات میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس و محفل کے آداب بیان کرتے ہوئے ذکر فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو اور اے ایمان والو! تمہاری آواز رسول اللہ کی آواز سے بلند نہ ہونے پائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور بھی نہ ہو۔ یعنی اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے بعد دوسرا سنگین جرم جس سے نیکیاں برباد ہوتی ہیں وہ جناب نبی اکرمؐ کی شان اقدس میں گستاخی ہے اور دربار رسالتؐ کی بے ادبی ہے، جس سے خود اللہ تعالی نے ہمیں خبردار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میرے رسول کی شان میں تمہارا کوئی گستاخانہ طرز عمل تمہاری بے خبری میں زندگی بھر کی نیکیاں برباد کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔

اس کے علاوہ سورۃ محمدؐ میں قرآن کریم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "ذلک بانھم کرھوا ما انزل اللہ فاحبط اعمالھم" انہوں نے اللہ تعالی کے اتارے ہوئے احکام و زیارت کے بارے میں ناپسندیدگی اور کراہت کا اظہار کیا تو اللہ تعالی نے ان کے اعمال برباد کر دیے، یعنی قرآن کریم کی آیات، احکام اور ارشادات کے بارے میں خدانخواستہ کراہت یا ناپسندیدگی کا کسی بھی درجہ میں اظہار ایسا سنگین جرم ہے جس سے حاصل کیا ہوا ثواب ضائع ہو جاتا ہے اور انسان کی کمائی ہوئی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

قرآن کریم نے ایک اور عمل کا بھی ذکر کیا ہے جو نیکیوں کو ضائع کرنے کا ذریعے بنتا ہے، اور وہ ہے کسی پر احسان کر کے اسے جتلانا، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے کہ "یا ایھا الذین آمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی" اے ایمان والو! اپنے صدقات کو من اور اَذی کے ساتھ باطل نہ کرو۔ من کی تشریح مفسرین کرامؒ یہ کرتے ہیں کہ کسی پر خرچ کیا ہے یا کسی کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے اور اس کے بعد اسے منہ پر جتلایا ہے کہ میں نے تم پر یہ خرچ کیا تھا اور تمہارے ساتھ یہ نیکی کی تھی۔ جبکہ اَذی کی تشریح بعض مفسرینؒ کے نزدیک یہ ہے کہ جس پر صدقہ یا احسان کیا ہے اسے براہ راست منہ پر تو نہیں جتلایا لیکن اس کی غیر حاضری میں کسی کے سامنے اس نیکی کا اس انداز سے ذکر کر دیا جس سے اس شخص کو اذیت پہنچتی ہو، تو ایسا کرنا بھی ممنوع ہے اور ایسا کرنے سے بھی صدقے کا ثواب باطل ہو جاتا ہے۔ ظاہر

بات ہے کہ جب صدقہ اللہ تعالی کی رضا کے لیے ہے اور اس کا ثواب بھی اسی سے لینا ہے تو پھر بندے کو جتلانے کا کوئی معنی نہیں اور اگر براہ راست بندے کو جتلا کر یہ کہہ دیا ہے کہ میں نے تجھے دیا تھا تو پھر اللہ تعالی سے اس کے ثواب کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض اعمال کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان سے کسی مسلمان کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں، مثلاً حسد کے بارے میں فرمایا کہ ”ان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب“۔ حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔ حسد ایک منفی جذبہ ہے جس کا شمار اخلاق رذیلہ میں ہوتا ہے، حسد اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے کسی بھائی، دوست یا رشتہ دار کو اچھی حالت میں دیکھ کر دل میں جلن محسوس کرے، کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھے تو اس کی طبیعت تنگ پڑے، اور اس کے دل میں یہ خیال آئے کہ یہ نعمت مجھے نہیں ملی تو اسے کیوں ملی ہے؟ اور اگر میرے پاس یہ نعمت نہیں ہے تو خدا کرے اس کے پاس بھی نہ رہے، یہ منفی جذبہ ہے، بداخلاقی ہے اور اتنا برا عمل ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق انسان کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو لمحوں میں جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

حسد کے برعکس ایک اور جذبہ جو مثبت ہے اور اچھا جذبہ ہے جسے عربی میں غبطہ کہتے ہیں اور اردو میں اسے رشک کہا جاتا ہے۔ یہ جذبہ یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے شخص کو اچھی حالت میں دیکھے یا اس کے پاس کوئی نعمت اسے نظر آئے تو خوش ہو اور دل میں یہ تمنا کرے کہ یا اللہ جس طرح آپ نے میرے اس بھائی پر مہربانی فرمائی ہے مجھ پر بھی اسی طرح مہربانی فرما دیں۔ یہ محمود جذبہ ہے، اخلاق حسنہ میں سے ہے اور اس پر اللہ تعالی راضی ہوتے ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہؐ میں اور بھی بہت سے برے اعمال مذکور ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اعمال انسان کی نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں اور اس کے نیک اعمال کو غارت کر دیتے ہیں۔ اختصار کی وجہ سے ان میں سے چند کا میں نے ذکر کیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ ہم جس طرح نیکیاں کمانے کی محنت کرتے ہیں، ثواب کے حصول کے لیے مشقت کرتے ہیں اسی طرح ان نیکیوں کو بچانے اور بچا کر آخرت تک لے جانے کی فکر بھی کرنی چاہیے، ورنہ اگر قیامت کے روز نیکیوں کا خانہ خالی نکلا اور اس وقت پتہ چلا کہ جو تھوڑی بہت نیکیاں کمائی تھیں وہ بھی دوسرے اعمال کی وجہ سے برباد ہو چکی ہیں، تو یہ بہت بڑے

خسارے کی بات ہوگی، اس سے بڑے خسارے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائیں، ان کی حفاظت کریں اور ایسے اعمال سے بچنے کی کوشش کریں جو نیکیوں کو برباد کرتے ہیں تاکہ جو تھوڑی بہت نیکی اور ثواب ہم کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں وہ آخرت میں ہمارے کام آجائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں آمین یارب العالمین۔

صحابہ کرامؓ اور اُسوۂ نبویؐ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۵ مئی ۲۰۰۳ء)

اگرچہ مولانا شبلی نعمانیؒ اور دیگر مستند مؤرخین کی تحقیق کے مطابق جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت ۹ ربیع الاول ہے لیکن عام طور پر ۱۲ ربیع الاول کو ہی آنحضرتؐ کا یوم ولادت سمجھا جاتا ہے اور اسی روز اہتمام کے ساتھ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں آپؐ کی یاد میں محافل و مجالس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسلام میں شرعی طور پر یوم ولادت کا کوئی تصور نہیں ہے اور اسی وجہ سے خیر القرون یعنی صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ کے ادوار میں اس قسم کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ مگر چونکہ دنیا کی بعض دوسری اقوام اپنے پیشواؤں کا یوم ولادت اور یوم وفات وغیرہ مناتی ہیں اس لیے ان کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی یہ روایت سی بن گئی ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو اور اس کے ساتھ تقریباً ربیع الاول کا سارا مہینہ ولادت نبویؐ اور سیرت نبویؐ کے عنوان سے محافل و منعقد ہوتی ہیں اور حضورؐ کی سیرت طیبہ اور حالات و مناقب کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اگر رسم و رواج کے مروجہ طریقوں کا اہتمام ضروری نہ سمجھا جائے تو جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ کسی بھی محفل میں اجر و ثواب اور رحمت و برکات کا باعث ہوتا ہے۔ اور یہ ہماری دینی ضرورت بھی ہے کہ ہم زندگی کے کسی مرحلہ میں کوئی بھی کام کرتے ہوئے جناب رسول اللہؐ کو یاد کریں، آپؐ کی سنتوں کو ذہن میں تازہ کریں اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ قرآن کریم نے آنحضرتؐ کی حیات مبارکہ کو ہمارے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور اس کا معنی یہی ہے کہ ہم زندگی کے ہر لمحے اور ہر سانس میں حضورؐ کو یاد کرنے اور آپؐ کی سنت و اسوہ کے مطابق ہر کام کرنے کے پابند رہیں۔

چنانچہ جب یادِ نبیؐ کا شرعی طور پر یہ معیار ہے تو پھر نبیؐ کے تذکرہ اور یاد کے لیے کسی دن یا مہینہ کو مخصوص کرنے کا کوئی معنی باقی نہیں رہ جاتا۔ تاہم اس کے باوجود یہ ایک معاشرتی روایت سی بن گئی ہے اور کم و بیش ہر مکتبہ فکر کے افراد کسی نہ کسی عنوان سے اس روایت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ کسی حوالہ سے بھی ہو اور ان کی حیات مبارکہ کے کسی بھی پہلو کا تذکرہ کیا جائے، یہ اجر و ثواب، خیر و برکت اور بے پایاں رحمتوں کے نزول کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن سیرت نبویؐ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کا تعلق کس انداز کا تھا اور حضرات صحابہ کرامؓ کس طرح حضورؐ کی باتوں کو یاد کیا کرتے تھے؟ اس کی چند جھلکیاں آج کی محفل میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور سیرت و سنت کے ساتھ مسلمان کا اصل تعلق یہی ہے۔ اور سنت نبویؐ کے ساتھ ہمارا یہی تعلق بحال ہوگا تو ہماری زندگیاں انقلاب سے روشناس ہوں گی، وہی انقلاب جو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں آیا تھا تو انہوں نے عرب کی جاہلی تہذیب اور قیصر و کسریٰ کی پرشکوہ سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور وہ انقلاب جو ہماری زندگیوں میں نہیں آیا تو ہم دنیا کے ہر خطے میں ظلم و کفر کی قوتوں کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے بے بسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے کوئی یہ دریافت کرے کہ جناب رسول اللہؐ کا چہرہ مبارک کیسا تھا تو میں اس سوال کا جواب نہیں دے پاؤں گا اور آپؐ کے چہرہ مبارک کی تفصیلات بیان کرنا میرے بس میں نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جب میں کافر تھا تو میرے دل میں حضرت محمدؐ کے لیے اس قدر شدید نفرت تھی کہ میں ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا، لیکن جب میں مسلمان ہوا تو میرے دل میں آقائے نامدارؐ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کے رعب کی وجہ سے میں ان کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ اور اسی کیفیت میں زندگی بسر ہوگئی کہ میں ایک بار بھی رسول اکرمؐ کے چہرہ مبارک کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکا اور اسی وجہ سے آنحضرتؐ کے چہرۂ انور کی تفصیلات اور سراپا بیان کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ جناب نبی اکرمؐ کے ذاتی خادموں میں سے تھے جنہیں دس سال کی عمر میں ان کی والدہ محترمہ حضرت ام سلیمؓ نے اس مقصد کے لیے رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا کہ میرا یہ بچہ آپؐ کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں

کہ ایک دفعہ کسی انصاری صحابیؓ نے حضورؐ کی دعوت کی۔ بطور خادم میں بھی ساتھ تھا، صاحب خانہ نے خشک کیے ہوئے گوشت (قدید) کی بوٹیوں کے ساتھ شوربے والا کدو پکا رکھا تھا جو آنحضرتؐ کی مرغوب غذا تھی۔ دستر خوان بچھا کر ایک بڑا پیالہ رکھ دیا گیا جس میں کدو اور شوربے والا گوشت تھا۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ پیالے میں سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھانے لگے، یہ دیکھ کر میں نے شوربے میں سے کدو کے ٹکڑے نکال کر آپؐ کے سامنے رکھنے شروع کر دیے۔ اور پھر اس کے بعد مجھے کدو سے محبت سے ہوگئی اس لیے کہ جناب رسول اللہؐ اسے پسند فرماتے تھے، پھر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ گھر والوں نے مجھ سے کوئی چیز پکانے کے لیے پوچھا ہو اور میں کدو کے علاوہ کسی اور چیز کی فرمائش کی ہو۔

حتیٰ کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت میں جب بصرہ نئے شہر کے طور پر آباد ہوا اور وہاں امیر المومنینؓ نے بہت سے دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ حضرت انس بن مالکؓ کو بھی بصرہ میں بھیج دیا اور وہاں انہیں کچھ زمین عنایت فرمائی تو حضرت انسؓ نے اس زمین میں کدو ہی کاشت کرنا شروع کر دیے۔ حضرت انسؓ کی زمین میں فاصلے کے ساتھ کھجور کے درخت اور درمیان میں کدو کی بیلیں ہر طرف دکھائی دیتی تھیں۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ کی پسند کے ساتھ محبت اور رسالت مآبؐ کی دعا کا اثر تھا کہ باقی لوگوں کی کھیتیاں سال میں ایک بار فصل دیتی تھیں جبکہ میری فصل سال میں دو بار فصل دیتی تھی اور بسا اوقات اتنے بڑے بڑے کدو ہوتے تھے کہ ایک کدو کو کاٹ کر گدھے پر لاد کر گھر لے جانا پڑتا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے شاگرد اور خادم خاص حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ آخر عمر میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نابینا ہوگئے تھے لیکن حج کے سفر پر متواتر جاتے تھے۔ اور حج بھی اس ترتیب کے ساتھ کرتے تھے کہ جہاں رسول اللہؐ نے احرام باندھا وہیں احرام باندھنا ہے، جہاں غسل کیا تھا وہیں غسل کرنا ہے، جہاں ظہر پڑھی تھی وہیں ظہر پڑھنی ہے، جہاں پہلی رات قیام کیا تھا وہیں پہلی رات قیام کرنا ہے، اور جہاں دوسرے دن ظہر پڑھی تھی دوسرے دن ظہر پڑھنی ہے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ذوق تھا جس پر وہ آخر عمر تک عمل کرتے رہے۔ حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ ایک بار سفر حج میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک جگہ مجھ سے پوچھا کہ یہاں سے فلاں جانب اتنے فاصلے پر ایک بڑا پتھر ہوگا کیا وہ تمہیں نظر آ رہا

ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا کہ مجھے وہاں لے چلو، میں انہیں اس پتھر تک لے گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس کے قریب ایک طرف رخ کر کے اس طرح تھوڑی دیر بیٹھے جیسے پیشاب کرنا چاہ رہے ہوں، مگر پیشاب کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پوچھا تو بتایا کہ جناب نبی اکرمؐ نے اس مقام پر بیٹھ کر پیشاب کیا تھا، مجھے پیشاب کی حاجت نہیں تھی مگر جی چاہتا تھا کہ یہاں کچھ دیر ضرور بیٹھوں اس لیے میں یہاں بیٹھا ہوں۔

حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب نابینا ہو گئے تھے، ایک روز مجھ سے کہا کہ ذرا بازار تک لے چلو۔ میں نے ہاتھ پکڑا اور بازار لے آیا تھوڑی دور تک چلے اور پھر فرمایا واپس چلو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کام تو آپ نے کوئی بھی نہیں کیا۔ فرمایا کہ آتے ہوئے چند دوستوں کے ساتھ سلام جواب ہوا ہے اور واپسی پر بھی کچھ لوگوں کے ساتھ گزرتے ہوئے سلام کلام ہوگا۔ بس اسی کام کے لیے آیا تھا کہ کچھ مسلمان بھائیوں سے سلام کہنے اور سلام کا جواب دینے کی اس سنت پر عمل ہو جائے گا جس پر کافی دنوں سے اندر بیٹھے بیٹھے عمل نہیں ہو رہا تھا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ مصر کے فاتح تھے۔ وہ جب مصر میں یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور شہر و قلعے فتح کرتے ہوئے بڑھتے جا رہے تھے کہ بوبیس نامی ایک قلعہ پر ان کے قدم رک گئے۔ آٹھ ہزار کا لشکر پاس تھا قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے کافی دن گزر گئے تھے مگر قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی قلعہ فتح ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں خط دے کر قاصد روانہ کیا اور صورتحال عرض کر کے ان سے رہنمائی چاہی تو حضرت عمرؓ نے جواب میں چار افراد پر مشتمل کمک بھیجی جن میں زبیر بن العوامؓ، حضرت مقداد بن اسودؓ، حضرت خارجہ بن حذافہؓ اور حضرت بسر بن اوطاةؓ شامل تھے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے جوابی خط میں لکھا کہ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آٹھ ہزار کا صحابہؓ کا لشکر ہو اور قلعہ فتح نہ ہو، ضرور تم سے رسول اللہؐ کی کوئی سنت ترک ہو گئی ہے جس کی وجہ سے برکت نہیں رہی اس لیے اس بات کی فکر کرو۔ امیر المومنین کا خط ملنے کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے لشکر کو خط سنایا اور کہا کہ امیر المومنین کی بات غلط نہیں ہو سکتی، ضرور ہم سے کوئی سنت نبویؐ ترک ہو گئی ہے جس کی وجہ ہم فتح کی برکت سے ابھی تک محروم ہیں۔ اس پر سارے لشکر نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ جنگی مصروفیات کی وجہ سے لشکر کے بہت سے لوگوں سے مسواک رہ جاتی ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے سارے لشکر کو حکم دیا کہ مسواکیں پکڑو اور قریب ندی کے کنارے بیٹھ کر مسواک کرو۔ اب جو قلعہ کے اندر محصور لوگوں نے آٹھ ہزار کے لشکر کو اجتماعی طور پر مسواک کرتے یا دانت تیز کرتے دیکھا تو اسے کوئی نئی جنگی چال سمجھا اور خوف زدہ ہو کر لڑائی کے بغیر قلعہ مسلمانوں کے سپرد کرنے کے لیے صلح کا پرچم بلند کر دیا۔

یہ صحابہ کرامؓ کا جناب نبی اکرمؐ کی سنت مبارکہ کے ساتھ عملی تعلق تھے۔ وہ اس صاف اور شفاف آئینے میں اپنے چہرے دیکھتے تھے اور اس کی روشنی میں اپنے اعمال و کردار کی اصلاح کرتے تھے۔ آج بھی حضورؐ کی سیرت و سنت میں ہمارے لیے یہی سبق ہے۔ ہم اگر اپنی عملی زندگی اور کردار و اخلاق میں اس سے راہنمائی حاصل کریں اور اس کے تقاضوں کے مطابق خود کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں تو رحمتوں اور برکتوں کا نزول آج بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے اندر جو کمی ہے وہ پاور ہاؤس کی طرف سے نہیں ہے کہ وہ تو سدا بہار پاور ہاؤس ہے۔ ضرورت راستے کے کنکشن کو چیک کرنے کی ہے کہ کنکشن کی تاریں ٹوٹی ہوئی ہوں تو پاور حاصل نہیں ہوتی۔

”فک کل نظام“

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲ مئی ۲۰۰۳ء)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اب سے تین صدیاں قبل ایک بات کہہ دی تھی کہ اب آئندہ عالم اسلام میں اسلامی نظام کے احیا اور خلافت کے قیام کی بنیاد ”فک کل نظام“ پر ہوگی اور اس کے لیے ان کے افکار و فلسفہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔ ”فک کل نظام“ کا مطلب یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے موجودہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی ڈھانچے میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش نہیں ہے اور اس ڈھانچے سے مکمل نجات حاصل کر کے نئے نقشے پر ہی ملت اسلامیہ کی نئی اسلامی زندگی کا آغاز ہو سکے گا۔ موجودہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی ڈھانچے نے ایک ہزار سال سے زیادہ وقت گزار لیا ہے، اس نے آزادی اور عروج کا دور بھی دیکھا ہے اور غلامی اور زوال کے دور سے بھی ملت اسلامیہ اسی ڈھانچے کے ساتھ گزری ہے۔ اب اس بلڈنگ کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ اس میں مرمت اور جزوی اصلاح و تعمیر کے ساتھ صورتحال میں اصلاح کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور جیسا کہ دنیا کا عمومی رواج اور روایت ہے کہ نئی بلڈنگ تعمیر کرنے کے لیے پرانی بلڈنگ کو گرانا پڑتا ہے۔ اب اس بات

کا وقت آگیا ہے کہ اس بوسیدہ عمارت سے بھی جان چھڑالی جائے اور از سر نو نقشہ ترتیب دے کر اس پر ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی عمارت کھڑی کی جائے۔

اس نئے نقشے کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فکری بنیاد بھی فراہم کی ہے کہ ہمیں سب سے پہلے انسانی سوسائٹی اور عالمگیر معاشرت کے لیے اسلامی نظام و قوانین کی افادیت و ضرورت کو ثابت کرنا ہوگا اور دنیا کو عقل و منطق اور فہم و استدلال کے ساتھ بتانا ہوگا کہ انسانی سوسائٹی کو مقامی، علاقائی اور عالمی سطح پر جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل قرآن و سنت میں موجود ہے اور وہ حل سب سے بہتر ہے اس لیے دنیا کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ارشاد ہے کہ قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی جو مختلف عملی صورتیں (وجوہ اعجاز) ہیں اور جن کے حوالہ سے قرآن کریم نے دنیا بھر کو چیلنج کیا ہے کہ کوئی فرد یا قوم قرآن کریم کے مقابلہ کی کوئی کتاب لا سکتی ہو تو لا کر دکھائے۔ اس چیلنج کا ہر دور میں الگ الگ مفہوم رہا ہے۔ کسی زمانے میں جبکہ دنیا میں فصاحت و بلاغت کا عروج تھا اور قوموں کے لیے سب سے زیادہ باعث فخر ان کی زبان دانی اور فصاحت ہوا کرتی تھی، ان کے لیے قرآن کریم کا چیلنج اس پہلو سے تھا کہ کوئی فرد یا قوم فصاحت یا بلاغت میں قرآن کریم کا مقابلہ کر کے دکھائے اور اگر وہ پوری کتاب نہیں لا سکتے تو کم از کم ایک سورۃ کا مقابلہ ہر کر دکھائیں۔ مگر اب آنے والا دور چونکہ سماجیات، سسٹم، قانون اور عالمگیر معاشرت کا ہے اس لیے قرآن کریم کے اس چیلنج کا ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے کہ انسانی سوسائٹی کی تشکیل، معاشرہ کی فلاح و بہبود اور نسل انسانی کے مسائل کے حل کے لیے قرآن کریم نے جو قوانین و ضوابط پیش کیے ہیں، افادیت و ضرورت اور نتائج و ثمرات کے حوالہ سے ان کے مقابل کا کوئی ایک قانون دنیا والے پیش کر دیں۔ لیکن جیسے دوسرے میدانوں میں قرآن کریم کا مقابلہ کسی قوم سے آج تک نہیں ہو سکا اس میدان میں بھی نہیں ہو سکے گا۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہمارے سامنے آچکی ہے اور ہم نے اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا ہے، وہ یہ کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر ابھی تک اس کو یاد کیا جا رہا ہے اور نہ صرف یہ افغانستان کے باشندے اس دور کے امن کا تذکرہ کر رہے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی دانشگاہوں میں یہ مسئلہ بحث اور مکالمہ کا موضوع بنا ہوا ہے کہ طالبان نے اپنے پانچ سالہ دور میں اپنے کنٹرول کی حدود میں وہ امن کیسے قائم کر لیا تھا جو اب فوجوں اور وسائل کی فراوانی کے باوجود قائم نہیں ہو رہا؟ اور یہ کیا

بات تھی کہ طالبان کے امیر کے ایک رسمی حکم پر کسی لالچ اور تخویف کے بغیر ان کے زیر کنٹرول پورے علاقے میں پوست کی کاشت ختم ہوگئی تھی مگر اب لالچ اور ڈر کے تمام حربوں کے باوجود اس کی کاشت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ بعض اخباری رپورٹوں کے مطابق طالبان رہنماؤں سے اس سلسلہ میں رابطے بھی کیے گئے ہیں کہ وہ یہ بتائیں کہ انہوں نے امن کیسے قائم رکھا ہوا تھا لیکن اس میں کوئی راز کی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی لمبے چوڑے فلسفے کا مسئلہ ہے بلکہ سادہ سی بات ہے کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں اپنے زیر کنٹرول علاقے میں قرآن و سنت کے احکام کی عملداری کا اعلان کر رکھا تھا اور وہ اس پر اپنی استطاعت کی حد تک عملدرآمد میں بھی سنجیدہ تھے۔ یہ قانون افغان عوام کے عقیدہ اور معاشرت دونوں کے ساتھ ہم آہنگ تھا اس لیے انہیں اس پر عملدرآمد میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی، انہوں نے سمجھا کہ وہ کسی مسلط ہونے والے گروہ کے احکام پر عمل نہیں کر رہے بلکہ اپنے پیدا کرنے والے خدا کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں جس کے ہر فیصلے میں حکمت ہے اور کسی حکم میں اس کا اپنا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، وہ ہمارے مسائل و مشکلات سے کماحقہ آگاہ ہے اور ان کو دور کرنے کی پوری قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمارا خیر خواہ اور مہربان بھی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جس قانون کو کسی بھی معاشرہ میں عقیدہ و یقین کی یہ پشت پناہی میسر ہوگی اسے نفاذ کے لیے کسی لمبے چوڑے سسٹم اور ڈھانچے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور ہر شہری کا ذہن اور ضمیر خود بخود اسے قانون کی پابندی کے لیے تیار کر لے گا۔ جبکہ اس کے برعکس جس قانون اور ضابطے کے بارے میں عام لوگوں کا یہ تاثر ہو کہ یہ مسلط لوگوں نے اپنے مفادات کے لیے نافذ کیا ہے اور اس میں عوام سے زیادہ نافذ کرنے والوں کا مفاد وابستہ ہے، نیز نافذ کرنے والوں کو نہ ان کی حقیقی مشکلات کا علم ہے اور نہ ہی وہ لوگوں کے اس درجہ کے خیر خواہ ہیں کہ ان کے فائدہ کے لیے خود اپنے مفادات کی قربانی دے سکیں تو ایسے قوانین اور ضوابط کو کسی بھی معاشرہ میں نفاذ اور اثر انداز ہونے کے لیے مصنوعی سہاروں اور دباؤ کی ضرورت ہر وقت رہے گی۔ وہ قانون اور ضابطہ اسی وقت تک نافذ اور مؤثر رہے گا جب تک اسے دباؤ اور سہارے کی طاقت میسر ہوگی اور جونہی یہ دباؤ اور سہارا کمزور پڑے گا، قانون بھی فضا میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا۔

اسلام کے قانون کا امتیاز یہی ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان اور یقین کا ماحول پیدا کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر معاشرتی نظام کا ڈھانچہ استوار کرتا ہے۔ یہ خصوصیت دنیا کے کسی اور نظام کو حاصل نہیں ہے بلکہ دنیا نے علاقائی قومیتوں کے جو بت انسانی عقیدت و محبت اور وفاداری و اطاعت کے جذبات کی تسکین کے لیے تراش رکھے ہیں اور جن مصنوعی سہاروں پر مختلف نظام اب تک چل رہے ہیں وہ بت بھی انٹر نیشنلزم اور بین الاقوامیت کے بڑھتے ہوئے طوفان کے سامنے خود کو کھڑا رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ارشاد کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کو عقیدہ اور یقین کی قوت سے ایک بار پھر روشناس کرایا جائے اور نسل انسانی کو یہ پیغام دیا جائے کہ انسانی نسل میں کسی نظام اور فلسفہ وفکر کے فروغ اور نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد عقیدہ پر ہو۔ اور کائنات کو پیدا کرنے والی ذات پر یقین ہی وہ واحد عقیدہ ہے جو انسانوں کو کسی ایک سسٹم میں مربوط کر سکتا ہے۔ قرآن کریم اسی عقیدہ کا اعلان کرتا ہے، اسی کی طرف پوری نسل انسانی کو بلاتا ہے، اسی کو انسانی معاشرہ کی واحد فکری بنیاد قرار دیتا ہے اور اسی کو اپنا کر انسانی سوسائٹی ایک بہتر عالمی ماحول اور کامیاب گلوبل سسٹم کی طرف پیش رفت کر سکتی ہے۔

قرآن کریم کے نادر اور تاریخی نسخے

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۹ اپریل ۲۰۰۳ء)

۲۲ اپریل کو جب عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ کے ہمراہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے سیمینار میں شرکت کے لیے عصر سے قبل فیصل مسجد اسلام آباد پہنچا سیمینار کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کی آخری نشست مغرب کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں ہو رہی ہے اس لیے اب وہاں جانا ہوگا۔ البتہ فیصل مسجد کی ایک دیوار پر بینر دیکھنے میں آیا جس کے مطابق اس سے اگلے روز یعنی ۲۳ اپریل کو انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی کی طرف سے اسی مقام پر قرآن کریم کے نادر نسخوں کی نمائش کا آغاز ہو رہا تھا اور اس کا افتتاح صدر جنرل پرویز مشرف نے کرنا تھا۔

ادارہ تحقیقات اسلامی کا سیمینار ”برصغیر میں مطالعہ حدیث“ کے عنوان پر تھا جو دو روز سے جاری تھا اور اس کی آخری نشست میں ”احادیث پر موجودہ کام اور مستقبل کی ضرورتوں

کا جائزہ" کے عنوان پر میرا مقالہ تھا اس لیے ہم وہاں چلے گئے جہاں مغرب کے بعد یہ نشست ہوئی۔ اس نشست میں بین الاقوامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر حسن محمود الشافعی، پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر چشتی، پروفیسر ڈاکٹر احمد الغزالی، پروفیسر ڈاکٹر سفیر اختر، پروفیسر ڈاکٹر سہیل حسن اور پروفیسر ڈاکٹر باقر خاکوانی نے حدیث نبویؐ کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے حال اور مستقبل کی ضروریات پر اظہار کیا اور راقم الحروف نے بھی اپنا مضمون پڑھا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر سید الطاف حسین اس نشست کے صدر تھے جبکہ مہمان خصوصی کی مسند عزت افزائی کے لیے مجھے سونپ دی گئی تھی۔

ہم نے دوسرے روز بعض ضروری کاموں کے حوالہ سے اسلام آباد میں رکنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور خیال تھا کہ اسی دوران فیصل مسجد بھی جائیں گے اور قرآن کریم کے نادر نسخوں کی نمائش پر ایک نظر ڈالتے چلیں گے بلکہ دعوۃ اکیڈمی کے بعض دوستوں نے باقاعدہ وہاں آنے اور علماء کی ایک تربیتی نشست میں گفتگو کی دعوت بھی دے دی۔ مگر بعد میں مشاورت میں یہ بات سامنے آئی کہ ۲۳ اپریل کو صدر جنرل پرویز مشرف نے وہاں آنا ہے اور نمائش کا افتتاح کرنا ہے اس موقع پر سکیورٹی کے کئی مسائل ہوں گے اور آمد و رفت میں کئی تحفظات سامنے آئیں گے اس لیے اس روز وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ نمائش پر ایک نظر ڈالنے کی حسرت دل میں لیے ہم گوجرانوالہ واپس آ گئے۔ لیکن واپس پہنچتے ہی سب سے پہلے یہ پتہ چلا کہ قرآن کریم کے نادر نسخوں کی اس نمائش کی افتتاحی نشست میں شرکت کا باضابطہ دعوت نامہ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی کی طرف سے ٹی سی ایس کے ذریعے گھر پہنچا ہوا ہے۔ مگر اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کہ اس نشست کے لیے یا ویسے بھی نمائش کے لیے دوبارہ سفر کی طے شدہ مصروفیات میں گنجائش نہیں تھی اس لیے اس نمائش کے حوالہ سے اخباری رپورٹوں پر ہی گزارہ کرنا پڑا جن میں بطور خاص دلچسپی کی چیز صدر جنرل پرویز مشرف کا وہ خطاب ہے جو انہوں نے افتتاحی تقریب میں کیا اور جس میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کو جدید علوم سے ہم آہنگ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

اخباری رپورٹوں سے پتہ چلا کہ اس نمائش میں قرآن کریم کے نادر نسخوں کے علاوہ اس موقع پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض تبرکات کی زیارت کا بھی اہتمام تھا جس سے دل کی حسرت کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے ایک نادر اور تاریخی نسخے کی زیارت کے لیے ۱۹۸۵ء میں کراچی سے

لندن جاتے ہوئے حضرت مولانا ضیاء القاسمیؒ، مولانا منظور احمد چنیوٹی اور راقم الحروف ایک روز کے لیے استنبول رکے تھے۔ یہ نسخہ استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں ہے اور یہ وہ نسخہ ہے جس کی تلاوت کرتے ہوئے امیرالمومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے باغیوں اور فسادیوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا تھا اور اس پر حضرت عثمانؓ کے خون کے دھبے بھی موجود ہیں۔ مگر ہم اس کی زیارت نہ کر سکے کہ ان دنوں میوزیم مرمت کے لیے بند تھا، البتہ استنبول میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر مبارک پر حاضری اور دعا کی سعادت حاصل ہوگئی۔

قرآن کریم کا ایک اور نادر نسخہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں ہے جو متعدّد عثمانی، صفوی اور مغل حکمرانوں کے پاس رہا ہے اور اس پر ان بادشاہوں کی مہریں بھی ثبت ہیں جن کے پاس یہ قرآن کریم مختلف اوقات میں تھا۔ اس کے آخر میں لکھا ہے کہ ''کتبہ عثمان بن عفان'' کہ قرآن کرم کا یہ نسخہ حضرت عثمانؓ کا تحریر کردہ ہے۔ مجھے اس نسخے کی زیارت کا موقع ملا ہے اور میں اس کے دیدار سے بحمداللہ تعالی شاد کام ہوا ہوں۔

قرآن کریم کے ایک نادر نسخہ کا قصہ مولانا منظور احمد چنیوٹی سناتے ہیں۔ وہ جب پہلی بار ایم پی اے بنے تو اخبارات میں خبر آئی کہ یمن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ کا تحریر کردہ قرآن کریم دریافت ہوا ہے جس پر مغربی ماہرین کی ٹیمیں تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ مولانا چنیوٹی خود صنعا گئے اور اس نسخے کی زیارت کی۔ اس کے بارے میں جرمن ماہرین کی ٹیم نے ایک سال کی ریسرچ کے بعد رپورٹ دی ہے کہ فی الواقع یہ حضرت علیؓ کے دور کا نسخہ ہے اور ان کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔ راقم الحروف ان دنوں ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کا مدیر تھا، مولانا چنیوٹی اس قرآن کریم کے بعض اوراق کا عکس بھی لائے جن کی فوٹو ہم نے ترجمان اسلام میں شائع کی۔ حضرت علیؓ کے تحریر کردہ اس قرآن کریم کے بارے میں مولانا چنیوٹی نے بطور خاص جس بات کو چیک کیا وہ یہ تھی کہ اس کے مندرجات اور حضرت عثمانؓ کے مصاحف کے مندرجات میں کوئی فرق تو نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مجھے جہاں جہاں شبہ ہو سکتا تھا ان مقامات کو چیک کیا ہے اور کوئی فرق نہیں پایا۔

فیصل مسجد میں قرآن کریم کے نادر نسخوں کی نمائش کی افتتاحی تقریب سے صدر جنرل پرویز مشرف نے جو خطاب کیا اس میں انہوں نے بہت سی فکر انگیز باتیں کی ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً انہوں نے دینی مدارس کی تعلیمی اور رفاہی خدمات کا ایک بار پھر

یہ کہہ کر ذکر کیا ہے کہ یہ ملک کی سب سے بڑی این جی اوز ہیں جن کے تحت لاکھوں طلبہ اور طالبات کی دیکھ بھال کی جاتی ہے اور انہیں تعلیم دی جاتی ہے، البتہ ان میں جدید علوم کی تعلیم کو شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے ان کالموں میں ہمیشہ اس بات کی حمایت کی ہے کہ ہم دینی مدارس کے نصاب میں ضروری عصری علوم کو شامل کرنے کے حق میں ہیں مگر اس حد تک کہ اس سے خود دینی تعلیم کا نصاب متاثر نہ ہو، اور جدید علوم کا اونٹ دینی مدارس کے خیمے میں داخل کرتے کرتے خود دینی علوم کے نصاب کو ہی خیمہ بدر نہ کر دیا جائے، جیسا کہ اس سے قبل جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں عملی طور پر ہو چکا ہے۔

صدر جنرل پرویز مشرف نے اس موقع پر اسلامی تعلیمات کو جدید علوم سے ہم آہنگ کرنے کی جو بات کی ہے وہ تھوڑی سی تجزیہ طلب ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ دینی مدارس اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے جدید اسلوب، مختلف زبانوں، عصری علوم اور سائنٹیفک طریق کار سے استفادہ کریں تو اس کی افادیت و اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے، اور خود ہم بھی دینی مدارس کے ارباب حل و عقد سے بار بار یہ عرض کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی علوم کو ہی جدید تقاضوں اور جدید علوم کے مطابق ڈھالا جائے تو یہ بات بہرحال محل نظر ہے۔ اس حوالہ سے بھی کہ جدید علوم جو کچھ بھی ہوں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں جبکہ اسلامی علوم کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے اور یہ بات ہمارے ایمان سے تعلق رکھتی ہے کہ انسانی ذہن کی تخلیقات کو وحی الٰہی پر بالادستی دینے کا تصور تک نہیں کر سکتے، یہ ایمانیات کا مسئلہ ہے اور اسے ایمانیات ہی کے حوالہ سے دیکھنا ہو گا۔ علاوہ ازیں یہ بات اس حوالہ سے بھی محل نظر ہے کہ جدید علوم اور سائنسی تحقیقات کسی ایک مقام پر رکنے والی چیز نہیں ہے، اس کے نتائج آج سے ایک صدی قبل اور تھے، نصف صدی قبل اس سے مختلف ہو گئے تھے، آج ان سے بھی مختلف ہیں، اور آج سے نصف صدی بعد ان میں اور زیادہ فرق نمودار ہو چکا ہو گا۔ جبکہ وحی اپنے ایمانی حقائق اور بنیادی اخلاقیات کے حوالہ سے جس موقف پر دو ہزار سال قبل قائم تھی آج بھی اسی پر قائم ہے اور اب سے دو ہزار سال بعد بھی اس کا موقف وہی ہو گا۔ اس لیے اسے دن بدن نئے رخ اور مختلف نتائج سے روشناس ہونے والے جدید علوم کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کشمکش میں تو جدید علوم کو ہی بالآخر وحی الٰہی کی بالادستی کے سامنے جھکنا ہو گا کہ دونوں کا فطری مقام یہی ہے۔

دور جدید میں اجتہاد کی ضرورت اور دائرۂ کار

(پنجاب یونیورسٹی، لاہور - ۱۸ مارچ ۲۰۰۳ء)

(۱۸ مارچ ۲۰۰۳ء کو شیخ زید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں ''اجتہاد'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھا گیا۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ شیخ زید اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب کی ڈائریکٹر محترمہ ڈاکٹر شوکت جمیلہ صاحبہ کا شکر گزار ہوں کہ آج کی اس محفل میں حاضری اور اظہار خیال کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالی انہیں جزائے خیر دیں اور ہمیں مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

۱۔ اجتہاد کا مفہوم اور اس کی ضرورت

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے آخری پیغمبر ہیں اور ان کے ساتھ ہی آسمان سے نازل ہونے والی وحی کا سلسلہ مکمل ہو گیا ہے، اب قیامت تک کوئی نبی نہیں پیدا ہوگا اور نہ ہی کوئی وحی نازل ہوگی اور اس کے ساتھ اس عقیدہ کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ قیامت تک نسل انسانی کی ہدایت، راہ نمائی، فلاح اور نجات قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی تعلیمات میں منحصر ہے تو منطقی طور پر یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ زمانہ اور وقت تو ایک جگہ اور ایک کیفیت پر ٹھہرنے والی چیز نہیں ہے، اس میں مسلسل تغیر رونما ہوتا رہتا ہے، انسانی سوسائٹی تغیر اور ارتقا کے مراحل سے پیہم گزر رہی ہے اور دنیا کے احوال وظروف میں تبدیلیاں انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں، پھر اس مسلسل اور پیہم تغیر پذیر دنیا اور سوسائٹی میں نئے احوال وظروف سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسانی معاشرہ کی راہ نمائی کا نظام کیا ہے؟ اور سلسلہ وحی مکمل ہو جانے کے بعد قیامت تک آنے والے انسانوں کا آسمانی تعلیمات کے ساتھ رشتہ کیسے قائم رہے گا؟ مغرب نے تو یہ کہہ کر اس سارے قضیے سے پیچھا چھڑا لیا ہے کہ انسانی سوسائٹی اب بالغ ہو گئی ہے اور اپنا برا بھلا خود سمجھنے لگی ہے اس لیے اسے آسمانی تعلیمات اور وحی الہی کی ڈکٹیشن کی سرے سے ضرورت ہی نہیں رہی، اب اس کے فیصلے خود اس کے ہاتھ میں ہیں۔ انسانی سوسائٹی کی اکثریت جو چاہے اور انسان کی اجتماعی عقل وخرد جو سمجھے، وہی حرف آخر ہے اور اسے مزید کسی نگرانی اور چیک کی حاجت نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے لیے یہ بات کہنا اور

اسے قبول کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ یہ ایمان رکھتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی کسی مرحلہ میں بھی آسمانی تعلیمات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اور انسانی معاشرہ کو شخصی، طبقاتی یا اجتماعی طور پر کبھی بھی یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ وحی الٰہی سے لاتعلق ہو کر اپنے فیصلوں میں غیر مشروط طور پر آزاد ہو اس لیے قیامت تک انسانی سوسائٹی کی راہ نمائی کے لیے آسمانی تعلیمات کا تسلسل ضروری ہے۔

قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی سنت و تعلیمات دونوں تاریخ کے ریکارڈ پر محفوظ حالت میں موجود ہیں اور دنیا بھر میں شب و روز ان کی تعلیم و تدریس اور تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں انسانی زندگی کو قیامت تک پیش آنے والے حالات و مسائل کی تفصیلات موجود نہیں ہیں اور نہ ہی موجود ہو سکتی ہیں اس لیے اسلام نے بعد میں رونما ہونے والے حالات و واقعات اور مشکلات و مسائل کے حوالہ سے انسانی معاشرہ کو قرآن و سنت کے دائرہ کا پابند رکھتے ہوئے جزئیات و فروعات میں حالات و مواقع کی مناسبت سے قرآن و سنت کی اصولی راہ نمائی کی روشنی میں عقل و قیاس کے ساتھ فیصلے کرنے کا اختیار دے دیا ہے اور اسی اختیار کو شریعت کی اصطلاح میں ”اجتہاد“ کہتے ہیں۔

جن مسائل میں قرآن و سنت کی واضح راہ نمائی موجود نہیں ہے، ان میں قرآن و سنت کی روشنی میں رائے اور اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کرنے کا یہ عمل صحابہ کرامؓ میں خود جناب نبی اکرمؐ کے دور میں بھی جاری تھا۔ احادیث کے ذخیرے میں بیسیوں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو کوئی معاملہ درپیش ہوا، قرآن کریم کا کوئی واضح حکم سامنے نہیں تھا، جناب نبی اکرمؐ تک فوری رسائی بھی ممکن نہیں تھی تو متعلقہ حضرات نے اپنی رائے سے ایک فیصلہ کر لیا اور اس پر عمل کر گزرے۔ بعد میں جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں بات پیش کی گئی تو آنحضرتؐ نے یہ تو کیا کہ کسی کے عمل کی توثیق کر کے اسے سند جواز عطا فرما دی اور کسی کے عمل کو خطا قرار دے دیا لیکن کبھی بھی نبی اکرمؐ نے اس ”اختیار“ کی نفی نہیں فرمائی کہ قرآن و سنت کی واضح راہ نمائی موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنی رائے اور اجتہاد سے فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔

اس حوالے سے حضرت معاذ بن جبلؓ کی مشہور روایت کی ترتیب بھی یہی ہے کہ انہیں یمن کا عامل و قاضی بناتے ہوئے نبی اکرمؐ نے پوچھا کہ کسی مسئلہ میں قرآن کریم اور سنت

نبوی سے راہ نمائی نہ ملی تو وہ کیا کریں گے؟ انہوں نے فرمایا کہ اجتہد برایي، میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا تو جناب نبی اکرمؐ نے ان کے اس جواب پر خوشی کا اظہار کر کے اس بات کی توثیق و تصدیق فرمادی۔

۲۔ عمل اجتہاد کا تاریخی ارتقا

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ کے پورے دور میں اسی اصول کے مطابق نئے پیش آمدہ مسائل کے فیصلے ہوتے رہے اور اس کے لیے باقاعدہ اصول و ضوابط طے کرنے کا کام بھی انہی کے دور میں شروع ہو گیا جیسا کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دیگر اکابر صحابہ کرامؓ کے متعدّد ارشادات سے اس کی نشان دہی ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ چونکہ براہ راست چشمہ نبوت سے فیض یاب تھے اور جناب نبی اکرمؐ کے مزاج اور سنت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے اجتہاد کے حوالہ سے کسی واضح درجہ بندی، اصول و ضوابط اور دائرہ کار کے تعین کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی گئی البتہ بعد کے ادوار میں ”اجتہاد“ کے اس عمل کو ہر کس و ناکس کی جولان گاہ بننے سے بچانے کے لیے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے اصول و قوانین طے کیے جائیں، دائرہ کار کی وضاحت کی جائے، درجہ بندی اور ترجیحات کا تعین کیا جائے اور اہلیت و صلاحیت کا معیار بھی طے کر لیا جائے تاکہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور نئے پیش آمدہ مسائل کے شرعی حل کا یہ مقدس عمل بازیچہ اطفال بننے کے بجائے صحیح رخ پر منظم ہو اور امت کی فکری و عملی راہ نمائی کا موثر ذریعہ ثابت ہو، چنانچہ بیسیوں مجتہدین اور ائمہ کرامؒ نے اس کے لیے انفرادی و اجتماعی محنت کی اور کم و بیش تین سو برس تک عالم اسلام کے مختلف حصوں اور امت کے مختلف گروہوں میں جاری رہنے والے متنوع علمی مباحث کے نتیجے میں وہ منظم فقہی مکاتب فکر وجود میں آئے جنہیں آج حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور دوسرے عنوانات کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اور جو بعد کی صدیوں میں کم و بیش ساری امت کو اپنے دائروں میں سمیٹتے چلے آرہے ہیں۔

البتہ یہ فرق ضرور سامنے آیا کہ ابتدائی صدیوں میں اجتہاد کا عمل ان فقہی مکاتب فکر کی طرز کے متعیّن اصول و ضوابط کے دائروں کا پابند نہیں تھا اور آزادانہ اجتہاد کے ذریعہ مجتہدین اپنے اپنے علاقوں میں امت کی راہ نمائی کا فریضہ سرانجام دیتے تھے مگر ان فقہی مکاتب فکر کے منظم ہونے کے بعد اجتہاد کے اصول و ضوابط طے کرنے کا کام جاری نہ رہا

اور انہی کے واضح کردہ اصول و قوانین کی پابندی کرتے ہوئے عملی دائروں میں اجتہاد کا سلسلہ بدستور چلتا رہا۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ کسی بھی علم کے بنیادی اصول وضوابط کے تعین کا ایک خاص وقت ہوتا ہے، یہ وہی وقت ہوتا ہے جب وہ تشکیل و تدوین کے مراحل سے گزر رہا ہو۔ اور جب وہ تشکیل و تدوین کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچتا ہے تو بنیادی اصول وضوابط کے وضع کرنے کا عمل ضرورت پوری ہو جانے کی وجہ سے خود بخود رک جاتا ہے اور اس کے بعد اس علم نے ہمیشہ انہی بنیادی اصولوں کے دائرے میں آگے بڑھنا ہوتا ہے جو اس کے لیے ابتدا میں طے کر دیے جاتے ہیں۔ ان اصول کے دائرہ میں اس علم کا ارتقا جاری رہتا ہے لیکن اس کے بنیادی اصولوں کو نہ کبھی چیلنج کیا جاتا ہے اور نہ ہی انہیں جامد قرار دے کر تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر علم صرف کو سامنے رکھا جا سکتا ہے کہ اس کے اصول اور بنیادی قوانین انسانوں نے ہی وضع کیے ہیں اور ماضی، مضارع، فاعل، امر، نہی اور ظرف وغیرہ کے صیغوں کی تشکیل اور دیگر ضوابط ایک دور میں صرف کے اماموں نے طے کیے ہیں، ان میں جزوی ترمیمات و توضیحات ہر دور میں ہوتی رہی ہیں لیکن بنیادی قواعد کا ڈھانچہ وہی چلا آ رہا ہے جو اس کے ابتدائی ائمہ نے طے کر دیا تھا۔ اسے نہ تو کسی بھی دور میں چیلنج کرنے کا کوئی جواز ہے اور نہ ہی یہ سوال اٹھانا عقل مندی کی بات ہوگی کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل کے لوگوں کو قواعد وضوابط بنانے کا حق تھا تو آج کے ترقی یافتہ دور میں یہ حق ہمیں کیوں حاصل نہیں ہے؟ ہم ان قواعد وضوابط میں اضافہ کر سکتے ہیں، ان کی ضرورت کے مطابق نئی تشریحات کر سکتے ہیں لیکن اس کے بنیادی ڈھانچہ کی نفی نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی نسبت تبدیل کر سکتے ہیں کہ یہ اعزاز تقدیر و تاریخ میں جن کے لیے طے تھا، ان کو مل چکا ہے اور اب قیامت تک ان سے یہ کریڈٹ چھینا نہیں جا سکتا۔

۳- علما، دور جدید اور اجتہاد

آج کل عام طور پر ایک بات تسلسل کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ علماء کرام نے ”اجتہاد“ کا دروازہ بند کر دیا ہے اور جمود کو امت پر مسلسل مسلط کر رکھا ہے جس کی وجہ سے امت پر ترقی کے دروازے مسدود ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مرحلہ پر اس سوال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے تو مناسب بات ہوگی۔

جہاں تک اجتہاد کے بنیادی اصول وضوابط کے تعین کی بات ہے، اس کا دروازہ تو ابتدائی تین صدیوں کے بعد سے اس لحاظ سے بند ہے کہ اس کے بعد اجتہاد کا عمل انہی دائروں میں ہوتا آرہا ہے جو مسلمہ فقہی مکاتب فکر نے طے کر دیے تھے اور یہ دروازہ کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہوا بلکہ ضرورت پوری ہو جانے کے بعد فطری طور پر خود بخود بند ہو گیا ہے جیسا کہ کسی بھی علم کا فطری پراسیس ہوتا ہے، البتہ مسلمہ فقہی مکاتب فکر کے متعیّن کردہ اصولوں کے دائرہ میں اجتہاد کا معاملہ قدرے تفصیل طلب ہے۔ ہمارے خیال میں جو فقہ جس دور میں بھی کسی اسلامی مملکت کا قانون رہی ہے، اس میں وقت کی رفتار اور ضرورت کے مطابق اجتہاد کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ اس اجتہاد میں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ پرانے فقہی فتاوی پر نظر ثانی کا عمل بھی شامل ہے۔ خلافت عثمانیہ اور جنوبی ایشیا کی مغل حکومت دونوں کا قانون فقہ حنفی پر مبنی تھا۔ خلافت عثمانیہ میں ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' کی تدوین اور مغل حکومت میں ''فتاوی عالم گیری'' کی ترتیب کے کام پر نظر ڈال لیجیے، آپ کو سابقہ فقہی فتاوی پر نظر ثانی اور نئے مسائل کے حل کی اجتہادی کاوشیں دونوں جگہ یکساں دکھائی دیں گی۔ موجودہ دور میں سعودی عرب میں حنبلی فقہ کی عمل داری ہے، آپ اس کا جائزہ لیں گے تو سعودی قضاۃ کے فیصلوں میں آپ کو حنبلی فقہ اب سے دو سو برس قبل کی جزئیات کی شکل میں نہیں بلکہ آج کی ضروریات اور تقاضوں کے حوالے سے جدید اجتہادات کی روشنی میں آگے بڑھتی نظر آئے گی۔ اسی طرح اہل تشیع نے ایران میں فقہ جعفری کو ملکی قانون کا درجہ دیا ہے تو یقیناً انہوں نے صدیوں پہلی کتابیں اٹھا کر انہیں عدالتی قانون کی حیثیت نہیں دے دی بلکہ آج کے حالات اور تقاضوں کے مطابق انہیں جدید اجتہادات کے ساتھ جدید قانونی زبان اور اصطلاحات کے ذریعہ نافذ العمل بنایا ہے۔

یہ فقہی مذاہب کے اس کردار کی بات ہے جو انہوں نے مختلف ممالک میں سرکاری مذاہب کے طور پر ادا کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ اس سے ہٹ کر پرائیویٹ سیکٹر میں دیکھ لیجیے۔ ہمارے ہاں جنوبی ایشیا میں مغل اقتدار کے خاتمہ کے بعد اجتہاد اور افتا کا یہ عمل عدالت اور سرکار کے دائرہ سے نکل کر عوامی حلقوں میں آگیا تھا۔ اس خطے میں گزشتہ دو صدیوں کے دوران سینکڑوں دار الافتا قائم ہوئے ہیں جو اب بھی کام کر رہے ہیں اور ان میں سے بیسیوں کو علمی و عوامی حلقوں میں اس درجہ کا اعتماد حاصل ہے کہ دینی معاملات میں

ان کی بات کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے بلا مبالغہ لاکھوں فتاوی جاری کیے ہیں جو کئی ضخیم کتابوں کی صورت میں مارکیٹ میں موجود ہیں۔ اگر اہل علم کی کوئی ٹیم اس کام کے لیے مقرر کی جائے کہ وہ ان فتاوی کا جائزہ لے کر یہ تجزیہ کرے کہ ان میں کتنے فتوے ایسے ہیں جن میں ان مفتیان کرام نے اجتہادی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے قرآن و سنت کی روشنی میں جدید مسائل کے نئے حل پیش کیے ہیں تو ہمارے محتاط اندازے کے مطابق ان کا تناسب مجموعی فتاوی کے بیس فی صد سے کسی طرح کم نہیں ہوگا۔ آپ ان کے فتاوی سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس بات سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ انہوں نے نئے مسائل کا سامنا کیا، ان کے حل کے لیے اجتہاد کا عمل اختیار کیا اور جدید مسائل میں مسلمانوں کی راہ نمائی کی ہے۔

ہم تھوڑا سا اور آگے بڑھ کر ایک دو حوالے اور دینا چاہیں گے۔ ایک یہ کہ پاکستان بننے کے بعد جب یہ سوال اٹھا کہ اسلامی نظام کا نفاذ کس مذہبی فرقہ کی تشریحات کے مطابق ہوگا تو تمام مذہبی مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام جمع ہوئے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سربراہی میں انہوں نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات طے کر کے واضح کر دیا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالہ سے مذہبی مکاتب فکر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان دستوری نکات کو مذہبی مکاتب فکر کے اتحاد اور اتفاق کے مظہر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بات درست ہے، لیکن ہمارے نزدیک تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات اتحاد امت کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم اور حساس ملی معاملات میں اجتہادی عمل کے آئینہ دار بھی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک نکتہ اجتہادی عمل کی عکاسی کرتا ہے اور ان سرکردہ علماء کرام کی اجتہادی صلاحیتوں کی علامت ہے۔ مثال کے طور پر ان علماء کرام نے متفقہ طور پر طے کیا کہ ایک اسلامی ریاست میں حکومت کی تشکیل عوام کے ووٹوں سے ہوگی اور منتخب قیادت ہی ملک پر حکمرانی کی اہل ہوگی۔ ہمارے خیال میں یہ اتنا بڑا اجتہادی فیصلہ ہے جسے خلافت عثمانیہ اور مغل حکومت کے صدیوں سے چلے آنے والے خاندانی سیاسی ڈھانچوں کے تناظر میں گزشتہ صدی کے دوران علماء کرام کا سب سے بڑا اجتہادی فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور بات پر غور کر لیا جائے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد علماء کرام نے ۲۲ دستوری نکات میں وحدانی طرز حکومت کو ملک کے لیے موزوں قرار دیا تھا لیکن جب

۱۹۷۳ء کے دستور کی تشکیل کے دوران انہوں نے حالات کا تقاضا دیکھا تو وحدانی طرز حکومت کے بجائے وفاقی پارلیمانی نظام کی طرف منتقل ہوتے ہوئے کوئی سوال اور اشکال کھڑا نہیں کیا بلکہ اسلام کو ملک کا ریاستی مذہب قرار دلواتے ہوئے وفاقی پارلیمانی نظام کو اس کے سسٹم کے طور پر قبول کر لیا۔ اسے اگر اجتہادی عمل تسلیم نہ کیا جائے تو یہ نہ صرف ان علماء کرام کے ساتھ ناانصافی ہوگی بلکہ خود اجتہاد کے مفہوم و معنی سے بھی ناواقفیت کا اظہار ہوگا۔

تھوڑا سا اور آگے بڑھیں تو ایک اور منظر آپ کے سامنے آپ کی توجہ کا طلب گار ہے اور وہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت قائم ہونے والی اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ ہے جو اس نے ملکی قوانین کا جائزہ لے کر قرآن و سنت کی روشنی میں ان میں ضروری ترامیم کے لیے مرتب کی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے ملکی قوانین کا جائزہ لیا ہے، ان پر نظر ثانی کی ہے، قرآن و سنت کے اصولوں کو دیکھا ہے، حالات کے تقاضوں اور ضروریات کو جانچا ہے اور ملکی اور عالمی سطح پر سرکردہ ارباب دانش کی مشاورت سے تمام مروجہ قوانین کے حوالے سے اپنی سفارشات ترتیب دی ہیں۔ میرا ملک بھر کے اہل دانش سے سوال ہے کہ کیا یہ اجتہادی عمل نہیں ہے؟ اس اجتہادی عمل کو تو علماء کرام نے صرف اپنے دائرہ تک محدود رکھنے پر بھی اصرار نہیں کیا۔ اس میں نہ صرف جدید قانون اور دیگر مختلف شعبوں کے ماہرین شامل چلے آ رہے ہیں بلکہ اس کی سربراہی بھی کبھی روایتی حلقہ کے کسی عالم دین کے پاس نہیں رہی۔ اس میں ہر مکتب فکر کے سرکردہ اور معتمد علماء کرام مختلف اوقات میں شریک رہے ہیں۔ علماء کرام نے پوری دل جمعی اور شرح صدر کے ساتھ اس اجتہادی عمل کو آگے بڑھایا ہے اور آج اس کونسل کی سفارشات کو ملک میں بطور قانون نافذ کرانے کے لیے بھی سب سے زیادہ علماء کرام کی جماعتیں سرگرم عمل ہیں اس لیے یہ کہنا کہ عملی اجتہاد کا دروازہ صدیوں سے مکمل طور پر بند چلا آ رہا ہے اور علماء کرام نے کسی دور میں بھی کسی درجہ کے اجتہاد سے کام نہیں لیا، تاریخی حقائق اور تسلسل کے منافی ہے۔

ہماری ان معروضات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا اور بدلتے ہوئے حالات جن امور کا تقاضا کرتے ہیں، وہ سب کچھ ہو رہا ہے اور علماء کرام اور دینی حلقے ہر قسم کے اعتراض اور سوال سے بری الذمہ ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے اور خود ہمیں اس سلسلے میں بہت سے اشکالات ہیں جن کا تذکرہ ہم اس کے بعد کرنا چاہتے ہیں لیکن اس سے قبل اتنی

بات ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کسی بھی طبقہ کے کردار کی کلی نفی کرتے ہوئے اگر آپ اس سے اپنی شکایات پر بات کرنا چاہیں گے تو آپ کی جائز شکایات بھی قابل توجہ نہیں سمجھی جائیں گی۔ اس لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ جتنا کام ہو رہا ہے، اس کا اعتراف کیا جائے اور کام کرنے والوں کو اس کا کریڈٹ دیا جائے۔ اس کے بعد جو کام نہیں ہو رہا، اس کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کی طرف توجہ دلائی جائے اور اسے روبہ عمل لانے کے لیے قابل قبول تجاویز دی جائیں۔

۴- دینی حلقوں کے لیے چند توجہ طلب پہلو

اس کے بعد ہم ان ضروریات اور تقاضوں کی طرف آتے ہیں جو آج کے روز افزوں تغیر پذیر حالات میں اجتہاد کے حوالے سے علماء کرام اور دینی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہمارے علمی مراکز اور دینی ادارے اپنی ترجیحات اور دائرہ کار سے ہٹ کر کوئی بات سننے کو تیار دکھائی نہیں دیتے۔

• پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے دینی مراکز اور علمی اداروں نے اپنی علمی سرگرمیوں کو روز مرہ ضروریات کے دائرے میں محدود کر رکھا ہے اور وہ بھی اپنے الگ الگ ماحول میں جس سے ان کے کام کی افادیت اور تاثیر یقیناً مجروح ہو رہی ہے۔ انہیں جس بات کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور جس کے لیے ان پر دباؤ ہوتا ہے، اس کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کر گزرتے ہیں لیکن خود اپنی ذمہ داری پر ملی ضروریات کا جائزہ لینے اور امکانات کی بنیاد پر مسائل کے تعین اور ان کے حل کا کوئی نظام کسی مکتب فکر کے کسی علمی ادارے کے پاس موجود نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ”فقہ تقدیری“ کا وہ عظیم الشان علمی کام جو کسی دور میں ہمارے فقہا اور ائمہ کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا، وہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

• ملی ضروریات کے حوالے سے اجتماعی علمی کاوش پرائیویٹ سیکٹر میں ۳۱ علماء کرام کے ۲۲ دستوری نکات کے بعد اب تک تعطل کا شکار ہے اور یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ پارلیمنٹ، وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے سرکاری فورم پر دینی و ملی مقاصد کے لیے مشترکہ علمی خدمات سرانجام دینے والے علماء کرام کو غیر سرکاری سطح پر انہی مقاصد کے لیے مل بیٹھنے اور دینی و علمی مسائل مشترکہ طور پر طے کرنے میں حجاب کیوں ہے؟

•قرآن و سنت کی نئی تعبیر و تشریح اور جدید فقہ اسلامی کی تدوین کے نعرہ سے تو ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ اس سے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل سے کٹ جانے کا تصور اجاگر ہوتا ہے مگر فقہ اسلامی پر اجتماعی نظر ثانی کو ہم وقت کی ناگزیر ضرورت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح کی ضرورت جس طرح سلطان اورنگ زیب عالم گیرؒ کے دور میں محسوس کی گئی تھی اور جس کے نتیجے میں فتاویٰ عالم گیری وجود میں آیا تھا۔ اگر گیارہویں صدی ہجری میں فقہ کے سابقہ ذخیرہ پر نظر ثانی اور اس وقت کے جدید مسائل کے حل کے لیے مشترکہ علمی کاوش فقہی تسلسل کے منافی نہیں تھی تو آج بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ آج کوئی اورنگ زیب عالم گیرؒ طرز کا مسلم حکمران موجود نہیں جو نظام شریعت کے نفاذ کو اپنی ذمہ داری محسوس کرے، اس لیے یہ دینی اداروں اور علمی مراکز کے ذمہ امت کا قرض ہے کہ وہ کوئی ایسا اجتماعی نظام وضع کریں کہ قدیم فقہی ذخیرہ پر موجودہ حالات کی روشنی میں نظر ثانی کر کے عرف و عادات، تعامل اور دیگر احوال و ظروف کے تغیر کی وجہ سے جن مسائل کی از سر نو وضاحت ضروری ہے، اسے سرانجام دینے کی کوئی معقول اور قابل قبول صورت نکل آئے۔

•اجتہاد کے لیے علمی ماخذ یعنی قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ علوم کی مہارت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن حالات اور محل پر اس کا اطلاق کیا جانا ہے، اس سے بھی کماحقہ واقفیت حاصل کی جائے یعنی اجتہاد کے ماخذ اور محل دونوں سے یکساں آگاہی اجتہاد کے عمل کے صحیح ہونے کا ناگزیر تقاضا ہے مگر ہمارے دینی اداروں میں دوسرے پہلو کو یکسر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال عرض کروں گا کہ ایک دینی مدرسہ کے دار الافتا میں مفتی صاحب ایک استفتا پر غور کر رہے تھے جو بینک کے کسی معاملہ کے حوالے سے تھا۔ میں بھی اتفاق سے وہاں موجود تھا۔ انہوں نے اس پر مجھ سے رائے چاہی۔ میں نے استفتا دیکھ کر کہا کہ میں بینکنگ کے سسٹم سے واقف نہیں ہوں اور اس کے جس شعبہ کے بارے میں یہ مسئلہ پوچھا گیا ہے، مجھے اس کے مبادیات کا علم بھی نہیں ہے اس لیے میں اس کے بارے میں کوئی

رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ باتیں تو میں بھی نہیں جانتا۔ میں نے عرض کیا کہ پھر آپ فتویٰ کیسے دیں گے؟ وہ میرے اس سوال پر پریشان تو ہوئے لیکن میرا خیال ہے کہ فتویٰ انہوں نے کوئی نہ کوئی ضرور صادر کر دیا ہوگا۔

• بدقسمتی سے ہم نے ایک بات کم وبیش حتمی سمجھ رکھی ہے کہ ہمارے روایتی حلقوں سے ہٹ کر کوئی بھی شخص یا ادارہ کوئی علمی یا دینی بات کرتا ہے تو وہ یقیناً گمراہی پھیلاتا ہے اور ہم نے اسے بہرحال مخالف کیمپ میں ہی دھکیلنا ہے۔ اگر تو ہم نئے پیش آمدہ مسائل پر غور وخوض اور ان کے حل کے لیے کوئی مربوط نظام رکھتے ہیں اور کوئی بھی مسئلہ پیش آنے پر خودکار نظام کی طرح ہمارا کوئی نہ کوئی حلقہ یا مرکز اس پر غور وفکر اور بحث وتمحیص کے لیے سرگرم عمل ہو جاتا ہے تو پھر کسی حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سسٹم سے ہٹ کر بات کرنے والے کی حوصلہ شکنی کی جائے لیکن کسی بھی مسئلہ پر ہمارے ہاں اس وقت تحریک ہوتی ہے جب دو چار حلقوں سے بات آچکتی ہے اور ہم کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو دفاعی ضروریات کے تحت متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارا سارا عمل دفاع اور تحفظات کے گرد گھومنے لگتا ہے اور اصل کرنے کا کام اسی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ انتہائی پریشان کن صورت حال ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے، غیر روایتی علمی حلقوں کے حوالے سے ترجیحات قائم کرنی چاہییں اور جہاں افہام وتفہیم سے کام لینا ممکن ہو، اسے موہوم گمراہی کی نذر کر دینے کے بجائے قابل قبول غیر روایتی حلقوں سے استفادہ کی صورتیں نکالنی چاہییں۔

• میں ایک متصلب اور شعوری حنفی ہوں اور اپنے دائرۂ کار میں اپنے فقہی اصولوں کی پابندی ضروری سمجھتا ہوں لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کرنا بھی میرے لیے مشکل ہے کہ جس طرح گلوبلائزیشن کے بڑھتے ہوئے عمل نے مختلف ادیان کے حوالے سے مشترکہ عالمی سوسائٹی کی تشکیل کی راہ ہموار کر دی ہے، اسی طرح مسلم ممالک کے درمیان آبادی کے روز افزوں تبادلہ نے فقہی مذاہب کے حوالے سے بھی مشترکہ سوسائٹیاں قائم کر دی ہیں اور دنیا کے

مختلف حصوں میں سینکڑوں جگہ ایسا ماحول موجود ہے جہاں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور ظاہری مکاتب فکر کے حضرات مشترکہ طور پر رہتے ہیں، اکٹھے نمازیں پڑھتے ہیں اور مل جل کر دینی تقاضے پورے کرتے ہیں۔ انہیں فقہی اختلافات کے حوالہ سے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیسے چلنا ہے؟ اس کی وضاحت آج کی ایک مستقل ضرورت ہے۔ ہمارے فقہا نے اس کی حدود بیان کی ہیں لیکن ہماری اس طرف توجہ نہیں ہے جس سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ دینی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مذکورہ بالا دونوں حوالوں یعنی مختلف ادیان و مذاہب اور داخلی فقہی مکاتب فکر کے پس منظر میں اس ضرورت کا احساس کریں اور اس کو پورا کرنے کے لیے کردار ادا کریں۔

• اجتہاد کے حوالے سے جو کام اس وقت ہمارے خیال میں سب سے زیادہ ضروری ہے، بدقسمتی سے وہی سب سے زیادہ نظر انداز ہو رہا ہے اور وہ ہے اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر اور اقوام متحدہ کے مختلف اداروں کے وہ فیصلے اور ضوابط جنہیں بین الاقوامی قوانین کا درجہ حاصل ہے اور جن کی بنیاد پر متعدّد اسلامی احکام وقوانین کی عالمی سطح پر نہ صرف مخالفت ہو رہی ہے بلکہ عالمی ادارے مسلم حکومتوں پر ان اسلامی احکام قوانین کی مخالفت میں مسلسل دباؤ ڈالتے رہتے ہیں مگر ان بین الاقوامی قوانین کے بارے میں ہمارے علمی حلقوں اور دینی اداروں کا کوئی مشترکہ موقف ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جس طرح ہمارے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے ۲۲ دستوری نکات طے کیے تھے، اسی طرز پر اقوام متحدہ کے چارٹر اور دیگر بین الاقوامی قوانین کا جائزہ لے کر قابل اعتراض حصوں کی نشان دہی کی جائے اور دلائل کے ساتھ قانونی زبان میں اس سلسلہ میں اسلامی موقف کی وضاحت کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کا متبادل چارٹر بھی پیش کیا جائے۔

• ہمارے ہاں دینی مراکز اور علمی اداروں میں مقامی ضروریات کے حوالے سے محدود مقاصد کے لیے رجال کار کی تیاری تو ہو رہی ہے مثلاً امام، خطیب، مدرس، مفتی، قاری وغیرہ۔ اگرچہ اس میں بھی بہت سے امور قابل توجہ ہیں لیکن پھر بھی بنیادی کام بحمد اللہ تعالیٰ ہو رہا ہے مگر اجتماعی نظام کو سمجھنے اور اس کے

مسائل پر رائے دینے نیز عالمی ماحول کے ادراک اور فلسفہ وتہذیب کی بین الاقوامی کشمکش سے واقفیت اور اس پر منطق واستدلال کے جدید اسلوب میں اظہار خیال کے لیے رجال کار کی تیاری کا کام سرے سے مفقود ہے اور بین الاقوامی مسائل پر علمی ودینی نقطہ نظر سے موقف کے اظہار کے لیے بھی کوئی فورم موجود نہیں ہے۔

• ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ ہمارے علمی ودینی حلقوں کا موجودہ اور مروجہ طرز گفتگواور استدلال کا اسلوب خود ہمارے داخلی ماحول کے لیے تو کسی حد تک قابل اطمینان ہوسکتا ہے لیکن جدید علمی حلقوں خاص طور پر مغربی فکر وفلسفہ کے حاملین اور ان کے متاثرین سے مکالمہ کے لیے وہ قطعی طور پر اجنبی ہے جس کی وجہ سے ہم علمی ودینی مسائل پر ایک معقول اور جائز موقف کا بھی صحیح طور پر اظہار نہیں کرپاتے۔ اس کے ساتھ ابلاغ کے جدید ذرائع تک رسائی اور ان کے استعمال کی صورت حال کو بھی شامل کرلیا جائے تو معاملہ اور زیادہ پریشان کن ہوجاتا ہے۔

ان گزارشات کے بعد ہم آخر میں خلاصہ کلام کے طور پر یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ہمارے نزدیک اصل ضرورت اس حوالے سے اس امر کی ہے کہ ۲۲ دستوری نکات والے ۳۱ علماء کرام کی طرز اور سطح پر غیر سرکاری طور پر ایک فورم وجود میں آئے جو متعلقہ ضروری امور کا جائزہ لے اور آج کی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل کے لیے کوئی قابل عمل نظام کار طے کرے۔ ہمارے خیال میں دینی مدارس کے پانچوں وفاق جو تمام دینی مکاتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں اور جن کا ایک مشترکہ رابطہ بورڈ بھی موجود ہے، اس کام کے آغاز کے لیے بہترین فورم ثابت ہوسکتا ہے بشرطیکہ ان وفاقوں کے ذمہ دار بزرگ ان ضروریات کو محسوس کریں اور ان کی تکمیل کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔

مجھے احساس ہے کہ میں نے موضوع کی مناسبت سے کوئی مربوط علمی گفتگو کرنے کے بجائے اس کے حوالے سے اپنے جذبات واحساسات کو ہی آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا ہے جن میں بہت سی باتیں شاید غیر متعلق محسوس ہوں مگر امید ہے کہ آپ سب بزرگ میری اس فروگزاشت سے درگزر کرتے ہوئے ایک کارکن کے جذبات واحساسات پر مناسب توجہ دیں گے اور دعا بھی فرمائیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سلسلہ میں صحیح

سمت میں پیش رفت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اپریل ۲۰۰۳ء)

انسانی کلوننگ اسلامی نقطہ نظر سے

(روزنامہ اوصاف، ملتان - ۱۷ فروری ۲۰۰۳ء)

کلوننگ کا مسئلہ اس وقت علمی حلقوں میں زیر بحث ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر دنیا بھر میں بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ کلوننگ کے تکنیکی پہلوؤں کے بارے میں کچھ عرض کرنا تو ہمارے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ یہ اہل فن کا کام ہے اور ہم اس فن سے نابلد ہیں، البتہ انسانی زندگی اور سوسائٹی پر اس عمل کے اثرات اور اس کے ممکنہ نتائج و ثمرات کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ کلوننگ کا عمل کیا ہے یا کم از کم ہم اسے کیا سمجھتے ہیں؟ کیونکہ اس کے بعد ہی اس کے ثمرات اور اثرات کے بارے میں کوئی گزارش کی جاسکتی ہے۔ کلوننگ کے بارے میں مختلف مضامین کے مطالعہ کے بعد ہم اس کے بارے میں اب تک یہ سمجھ پائے ہیں کہ تخلیق کے فطری اور روایتی طریق کار سے ہٹ کر سائنس دانوں نے ایک نیا پراسس اور طریق کار ایجاد کرلیا ہے جس سے تخلیق کے عمل کو زیادہ تیزی کے ساتھ بروئے کار لانا ممکن ہوگیا ہے اور ایک تخلیق شدہ چیز سے مواد حاصل کر کے اس جیسی دیگر بے شمار چیزوں کا پیدا کرنا آسان ہوگیا ہے۔ مثلاً اب تک ایک نئے انسان کے دنیا میں آنے کا ظاہری پراسس یہ چلا آرہا ہے کہ مرد اور عورت کا آپس میں جنسی ملاپ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ان کے تخلیقی جرثومے آپس میں جڑ کر ایک نئے انسانی وجود کا ڈھانچہ مہیا کرتے ہیں، جو بتدریج نشوونما پاتے ہوئے عورت کے رحم میں مکمل انسانی بچے کی شکل اختیار کر کے اپنے وقت پر تولیدی عمل کے ذریعے باہر آجاتا ہے۔ لیکن اس نئے سسٹم میں مرد اور عورت کا ملاپ ضروری نہیں ہے بلکہ ان کے جسم کے وہ خلیے یا ان میں سے کسی ایک کے جسم کے وہ خلیے، جو ماں کے رحم میں انسانی وجود کی منزل تک پہنچتے ہیں، ایک مشینی طریق کار کے ذریعے یہ مراحل طے کریں گے، اور اس کے ٹیکنیکل تقاضے پورے کرتے ہوئے ان خلیوں کو انسانی وجود کی منزل تک پہنچایا جائے گا۔ اس صورت میں وہ نیا وجود

میں آنے والا انسان اس انسان کی ہوبہو کاپی ہو گا جس کے جسم سے خلیے حاصل کر کے انہیں اس پراسس سے گزارا گیا ہے اور اس طریقہ سے ایک انسان سے دوچار نہیں، بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اس کی فوٹو کاپیاں تیار کی جا سکیں گی جو ہر اعتبار سے اس جیسی ہوں گی۔ اس عمل کا تجربہ نباتات اور حیوانات میں کامیابی کے ساتھ کیا جا چکا ہے بلکہ بعض سائنس دانوں نے انسانوں میں بھی اس تجربہ کی کامیابی کا دعوی کیا ہے اور سابقہ تجربات کی روشنی میں ان کے اس دعوی کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔

اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا یہ تخلیق کا عمل ہے؟ کیونکہ اگر اسے تخلیق کا عمل قرار دے دیا جائے تو قرآن کریم کے اس دعوے کی نفی ہو جاتی ہے کہ ”خالق“ صرف اللہ تعالی کی ذات ہے اور اس کے سوا سب لوگ جمع ہو کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ لیکن کلوننگ کا یہ عمل بتاتا ہے کہ اسے مجازی طور پر ایک نئی تخلیق کہہ لیا جائے تو بھی حقیقتاً یہ تخلیق کا عمل نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تخلیق جس کی نسبت ہم اللہ تعالی کی طرف کرتے ہیں، وہ کسی سابقہ نمونہ اور میٹریل کے بغیر ایک نئی چیز ایجاد کرنے یعنی عدم سے وجود میں لانے کا عمل ہے اور وہ اللہ تعالی ہی کے اختیار میں ہے۔ اس کے سوا یہ بات کسی اور کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کسی میٹریل اور نمونہ کے بغیر کوئی نئی چیز بنا لے اور نہ ہی آج تک ایسا ہو سکا ہے۔ سائنس دانوں اور ہنر مندوں نے اب تک جتنی چیزیں ایجاد کی ہیں، وہ پہلے سے موجود میٹریل کو نئی ترکیب کے ساتھ جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔ کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں ہے جس کا میٹریل کسی سائنس دان یا ہنر مند نے ایجاد کیا ہو۔ جبکہ کائنات میں موجود میٹریل کی مختلف شکلوں تک رسائی حاصل کرنا اور اسے مختلف صورتوں میں جوڑ کر نئی سے نئی ایجاد کی صورت میں لانا ان انسانی کمالات کا ایک حصہ ہے جو خود اللہ تعالی نے انسان کو ودیعت کیے ہیں اور انسان کے اس خداداد کمال کا قرآن کریم میں جابجا اعتراف کیا گیا ہے۔

کلوننگ کا عمل کسی نئے پودے، جانور یا انسان کو جنم دینے کا نام نہیں بلکہ انہی اشیا کے اسی میٹریل کو ایک الگ ترتیب اور پراسس دینے کا نام ہے جو اس سے قبل ایک دوسری ترکیب اور پراسس کے ساتھ تخلیقی مراحل طے کرتا آرہا ہے، اس لیے اسے مجازی طور پر تخلیق کہنے میں تو شاید کوئی حرج نہ ہو لیکن تخلیق کے حقیقی مفہوم و معنی کا اس پر سرے سے اطلاق ہی نہیں ہوتا، اس لیے اس سے تخلیق کے بارے میں قرآن کریم کے بیان کردہ عقیدے پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ بلکہ ایک اور انداز سے دیکھا جائے تو سائنسی تخلیقات و تحقیقات جوں

جوں آگے بڑھ رہی ہے، اللہ تعالی کی بے پایاں قدرت کے نت نئے مظاہر سامنے آرہے ہیں اور انسانی کمالات کے ساتھ ساتھ اس کی حیرت اور بے بسی میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے کہ کوئی نئی چیز بنانا تو کجا، انسان اپنی تمام تر ذہنی اور سائنسی ترقی کے باوجود ابھی تک اللہ تعالی کی پیدا کردہ اشیا کے ایک محدود حصے تک ہی رسائی حاصل کر سکا ہے۔ اور اللہ تعالی کی پیدا کردہ چیزوں کی ترکیب و ترتیب میں جو تنوع اور نت نئے امکانات مستور ہیں، ان تک پہنچنا بھی اس کی ہمت و استطاعت کے لیے بدستور چیلنج بنا ہوا ہے۔ البتہ کلوننگ کے اس عمل نے اسلام کے اس عقیدے کی تائید کر دی ہے کہ انسان مرنے کے بعد فنا کے گھاٹ نہیں اتر جاتا بلکہ اس کے وجود میں، خواہ وہ کوئی شکل بھی اختیار کر لے، یہ صلاحیت موجود رہتی ہے کہ وہ دوبارہ اپنی پہلی صورت کی طرف لوٹ آئے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قیامت، اخروی زندگی اور انسان کے قبر سے دوبارہ اٹھنے کا عقیدہ بیان کیا تو مشرکین عرب نے یہی اشکال پیش کیا تھا کہ جب ہم مر کر مٹی میں مل جائیں گے، ہڈیاں بوسیدہ ہو کر خاک ہو جائیں گی اور ہمارا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا تو دوبارہ ہم کیسے قبروں سے کھڑے کیے جائیں گے؟ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اس کا جواب دیا کہ جیسے ہم نے پہلے تمہیں پانی کے ایک قطرے سے پیدا کیا، دوبارہ تمہاری بوسیدہ ہڈیوں کو انسانی وجود کی شکل میں واپس لانے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ جبکہ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان مرنے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے یا اس کا وجود کسی بھی شکل میں ختم ہو جاتا ہے تو سارے جسم کے فنا ہو جانے کی صورت میں بھی اس کے جسم کا ایک جزو (عجب الذنب) ''دمچی کا مہرہ'' فنا سے محفوظ رہتا ہے جو اس کی دوبارہ تخلیق کا باعث بن جاتا ہے۔

گویا انسانی جسم کے اس آخری جز میں، جو فنا ہونے سے محفوظ رہتا ہے، یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ اسی انسان کے دوبارہ وجود میں آنے کا ذریعہ بن جائے جس کے جسم کا وہ حصہ ہے۔ اس لیے کلوننگ کا یہ عمل اخروی زندگی اور انسان کے دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں اسلام کے عقیدہ کی سائنسی تصدیق و توثیق کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے جناب نبی اکرمؐ کا ایک اور معجزہ بھی ہمارے مشاہدے میں آرہا ہے کہ جس نتیجے پر سائنس چودہ سو سال کے بعد پہنچی ہے، جناب نبی اکرمؐ نے چودہ صدیاں پہلے اس کی پیش گوئی فرما دی تھی کہ انسانی جسم کا ایک ایسا جز ہے جو کبھی فنا سے دوچار نہیں ہوتا۔ ہمیں یقین ہے کہ

جس طرح سائنس نے جناب رسول اکرمؐ کے ارشاد گرامی کے ایک حصے کی کلوننگ کے ذریعے تائید کر دی ہے، اس ارشاد گرامی کے دوسرے حصے کی تائید بھی سائنس جلد یا بدیر ضرور کر دے گی، کیونکہ یہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جس کا کوئی لفظ بلکہ حرف بھی کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

کلوننگ کے حوالے سے چند اعتقادی پہلوؤں پر گفتگو کے بعد ہم ان سوالات کی طرف آتے ہیں کہ اس سے انسانی سوسائٹی اور انسان کی عملی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اور کیا ان اثرات و نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے کلوننگ کے اس عمل کی شرعا اجازت دی جا سکتی ہے؟

جہاں تک نباتات اور انسان کے علاوہ باقی حیوانات کا تعلق ہے، ان میں کلوننگ کے اس عمل کو ناجائز قرار دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگرچہ ظاہری طور پر یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ یہ ہزاروں سال سے چلے آنے والے روایتی طریقہ اور پراسس کے خلاف ہے۔ ہم اسے روایتی طریقہ کہہ رہے ہیں، فطری نہیں، اس لیے کہ میٹریل کی ترکیب و ترتیب میں جو تبدیلی حیطۂ عمل اور دائرہ امکان میں آجائے، وہ ہمارے خیال میں فطری ہی کے زمرے میں شامل ہو جائے گی۔ کیونکہ فطرت کسی جامد چیز کا نام نہیں بلکہ کائنات میں جو حرکت، ارتقا اور تنوع نظر آرہا ہے، وہ دراصل فطرت کے تنوع، حرکت اور ارتقا ہی کا مظہر ہے۔ اس لیے کائنات کی موجود اور مستور اشیا میں سے کسی نئی چیز کی نشاندہی یا ان اشیا کی ترکیب و ترتیب اور پراسس کی کسی نئی شکل کا انکشاف فطرت کے خلاف نہیں بلکہ فطرت ہی کا حصہ متصور ہوگا، جو اس سے قبل ہماری نگاہوں سے مستور تھا اور اب ارتقا اور حرکت کے فطری عمل کے ذریعے اپنے اصل وقت پر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔

اس سے قبل جب جانوروں میں مصنوعی نسل کشی اور مرغی کے انڈوں سے روایتی طریقے سے ہٹ کر مشینی عمل کے ذریعے چوزے نکالنے کا عمل کچھ عرصہ پہلے شروع ہوا تھا تو ایک نئی بات ہونے کی وجہ سے ذہنوں کو اس میں انجانا پن محسوس ہوا تھا اور اس قسم کے سوالات سامنے آئے تھے کہ یہ انڈے جائز ہیں یا نہیں؟ اور نر اور مادہ جانور میں باقاعدہ جفتی کے بغیر حمل کا بیج رکھنے کا عمل درست ہے یا نہیں؟ بلکہ خود ہمارے ذہن میں یہ سوال ابھی تک موجود ہے کہ کیا ایسا کرنا جانوروں کو ان کے فطری جذبات اور خواہشات کی تکمیل

سے روکنے کا عمل نہیں ہے؟ اور کیا یہ ان کی حق تلفی تو نہیں؟ لیکن ان سب سوالات اور اشکالات کے باوجود اس عمل نے جواز ہی کا درجہ حاصل کیا کیونکہ انسانوں اور جنوں کے سوا کوئی مخلوق ہمارے عقیدہ کے مطابق ایسی نہیں ہے جو کسی شریعت کی پابند ہو اور جس پر شرعی قواعد و ضوابط کا اطلاق ضروری ہو۔ اس لیے ان کے بارے میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے وہ ضابطے تو موجود ہیں جو ہم انسانوں کے لیے شریعت اسلامیہ نے بیان کیے ہیں، لیکن خود ان جانوروں پر حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے کسی قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس لیے نباتات اور مشینی چوزوں کی طرح کلوننگ کے عمل میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور اگر اس سے انسانی سوسائٹی کو کوئی فائدہ ہو تو شریعت اس میں رکاوٹ نہیں بنتی بلکہ نسل انسانی کے فائدے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

مگر انسانی زندگی میں کلوننگ کے عمل دخل کی صورت اس سے قطعی مختلف ہے، اس لیے کہ ہمارے عقیدہ کے مطابق انسان ایک مکلف مخلوق ہے جو آسمانی تعلیمات کی پابند ہے اور انسانی سوسائٹی کی ان معروف اقدار و روایات کا تحفظ اس کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر عمل ہے، جن پر خود انسانی سوسائٹی کا مدار ہے اور جن معروف اقدار و روایات سے انحراف کر کے انسان ایک مدنی اور شہری زندگی سے محروم ہو کر جنگل کی غیر متمدن زندگی کا رخ کر سکتا ہے۔ جن اقوام و طبقات نے انسانی سوسائٹی اور انسان کی معاشرتی زندگی کو آسمانی تعلیمات کی بالادستی سے آزاد سمجھ رکھا ہے اور جن کے فیصلے صرف اور صرف سوسائٹی کی خواہشات اور اجتماعی عقل کے حوالے سے طے پاتے ہیں، وہ یقیناً کلوننگ کے نتائج و ثمرات پر ایک الگ زاویے سے غور کریں گے، لیکن ہم بحیثیت مسلمان خود کو آسمانی تعلیمات کا پابند سمجھتے ہیں اور انسانی معاشرت کے انہی قواعد و ضوابط کو قبول کر سکتے ہیں جو آسمانی تعلیمات یا دوسرے لفظوں میں قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس لیے کلوننگ یا اس جیسے کسی بھی عمل کو قبول کرنے یا اس کے درجات متعیّن کرنے میں ہمارا انداز دوسری قوموں سے قطعی مختلف ہو گا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے بعض دانشور دھوکہ کھا جاتے ہیں، اور جب وہ مسلم علماء کو مغربی مفکرین سے ہٹ کر الگ انداز سے نئی سائنسی ایجادات کا جائزہ لیتے اور رائے قائم کرتے دیکھتے ہیں تو مسلمانوں اور مغربی اقوام کے اس بنیادی فکری فرق سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے کنفیوژن کا شکار ہو جاتے ہیں، جس کا نتیجہ عام طور پر مسلم علماء

کے خلاف طعن وتشنیع کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ مسلمان ارباب علم و دانش کو ایسے معاملات میں دو پہلوؤں سے غور کرنا ہوتا ہے۔ مغربی مفکرین اور دانشور صرف ایک حوالے سے سوچتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی اس مسئلے کے بارے میں کیا سوچتی اور کیا چاہتی ہے، اور ان کے خیال میں اس میں انسانی سوسائٹی کے لیے فائدہ کا تناسب کیا ہے؟ لیکن مسلم علماء کو اس کے ساتھ ایک اور پہلو کا جائزہ بھی لینا ہوتا ہے کہ اس بارے میں انسانی سوسائٹی کے خالق و مالک کی تعلیمات کیا ہیں اور آسمانی تعلیمات اس مسئلے کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟

اس پس منظر میں انسانی کلوننگ کا جائزہ لیں تو ہمیں اس کی درجہ بندی کرنا پڑے گی اور اس کی مختلف صورتوں کا الگ الگ جائزہ لینا ہوگا۔ مثلاً اگر یہ کلوننگ صرف انسانی جسم کے اعضا تک محدود ہے اور اس کے ذریعے معذور افراد کے لیے مطلوبہ جسمانی اعضا تیار کیے جاتے ہیں تو یہ بہت اچھا عمل ہے، جس سے سرجری کے شعبہ میں انسانی سوسائٹی کو بہت فائدہ ہوگا اور بے شمار معذور افراد ان اعضا سے فائدہ اٹھا کر ایک مکمل انسان کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ ہمارے خیال میں شریعت اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی اور علاج کے نقطۂ نظر سے انسانی جسم کے اعضا کی تیاری کے لیے کلوننگ کے عمل کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ایک بانجھ جوڑے کے لیے اولاد پیدا کرنے کا مسئلہ ہے تو بھی اس شرط کے ساتھ یہ عمل قابل قبول ہوگا کہ معاملہ باقاعدہ میاں اور بیوی کے درمیان محدود رہے اور میاں بیوی کے تولیدی جرثوموں کے ملاپ میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو اسے سائنسی اور تکنیکی طور پر کلوننگ کے عمل کے ذریعے دور کر دیا جائے۔ لیکن درمیان میں کسی اور عورت کا رحم یا کسی اور مرد کا مادہ استعمال نہ ہو کیونکہ اگر کسی غیر مرد کا مادہ منویہ کسی عورت کے رحم میں جائے گا تو زنا کی صورتوں میں شمار ہوگا۔

اس سے قبل ٹیسٹ ٹیوب بچے کی ولادت کا مسئلہ سامنے آیا تھا تو علماء اسلام نے یہی بات کہی تھی کہ اگر میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے اور درمیان میں کسی اور عورت کا رحم استعمال نہیں ہوتا تو یہ طریقۂ علاج کے طور پر جائز ہے، لیکن اگر کوئی اور عورت بھی درمیان میں آتی ہے تو اس کے شرعی جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ اب جن اقوام کے نزدیک زنا کوئی بڑا جرم نہیں ہے اور مرد عورت کا ملاپ، خواہ کسی بھی طور پر ہو، ایک نارمل سا معاملہ ہے، ان کے ہاں تو کلوننگ یا ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے عمل میں کسی تیسری عورت

کی شرکت اور اس کے رحم کا استعمال کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاں یہ بہت بڑا مسئلہ ہے جس کا تعلق صرف زنا کے احکام سے نہیں بلکہ نسب کے احکام سے بھی ہے کہ کلوننگ کے ذریعے جنم لینے والا بچہ کس باپ کا اور کس ماں کا شمار ہوگا؟ اگر اس کا خلیہ صرف مرد سے لیا گیا ہے تو ماں کون ہوگی؟ اور صرف عورت کا خلیہ استعمال ہوا ہے تو باپ کس کو تصور کیا جائے گا؟ اور اگر کوئی تیسری عورت درمیان میں آگئی ہے تو ماں کا درجہ کسے حاصل ہوگا؟ اس مسئلے کی اہمیت مغرب میں یقیناً نہیں ہے کہ وہاں اب کسی کے تعارف یا حقوق کے تعین کے لیے باپ کا تذکرہ قانوناً ضروری نہیں رہا اور صرف ماں سے منسوب بچوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تو ماں اور باپ دونوں کا تعین ضروری ہے جس پر نسب کا، وراثت کا، رشتہ داریوں کے تعین کا اور آگے چل کر نکاح کے جائز یا ناجائز ہونے کا دار و مدار ہے۔ اس کے بغیر ہمارا پورا خاندانی نظام چوپٹ ہو کر رہ جاتا ہے، وہی خاندانی نظام جس کی بربادی کا نوحہ انہی وجوہ کی بنا پر آج ہر مغربی دانشور کی زبان پر ہے۔ انسانی کلوننگ کا یہ عمل ہمیں اس سے کہیں زیادہ خاندانی انارکی سے دوچار کر سکتا ہے۔

اولاد کے لیے مرد اور عورت کا ملاپ ایک فطری یا روایتی طریقہ چلا آ رہا ہے لیکن اسلام اس کی تمام ممکنہ صورتوں کو قبول نہیں کرتا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جاہلیت کے دور میں میاں بیوی باہمی رضامندی سے یہ صورت بھی اختیار کرتے تھے کہ بیوی کو کسی خاندان میں صرف اس لیے بھیج دیا جاتا تھا کہ وہ وہاں کے کسی مرد سے حاملہ ہو اور ان کے خیال میں ایک اعلیٰ نسل کا بچہ ان کے ہاں پیدا ہو جائے، یا ہندوؤں میں ”نیوگ“ کا طریقہ ہے کہ بے اولاد میاں بیوی باہمی رضامندی سے کسی تیسرے مرد کو درمیان میں لاتے ہیں جس سے مجامعت کر کے وہ عورت حاملہ ہوتی ہے اور دونوں میاں بیوی خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے اس طریقے سے اولاد حاصل کر لی ہے۔ لیکن اسلام نے ان دونوں طریقوں کی نفی کی ہے اور انہیں زنا قرار دیا ہے۔ اسلامی شریعت میں سب سے زیادہ سخت اور سنگین سزا زنا کے جرم میں ہی مقرر کی گئی ہے اور تورات کی بیان کردہ اس سزا کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی شریعت میں برقرار رکھا ہے کہ شادی شدہ مرد یا عورت اگر زنا کا ارتکاب کریں تو انہیں سنگسار کر دیا جائے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی میں خاندان کے بنیادی یونٹ کے تحفظ، رشتوں کے تقدس اور باہمی حقوق کے تحفظ و ادائیگی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ نسب کا تعلق واضح ہو اور اس میں کوئی ابہام نہ ہو۔ زنا

چونکہ نسب میں ابہام پیدا کرتا ہے اور اس سے رشتوں کے تعین، وراثت، باہمی حقوق اور نکاح کے جواز وغیرہ کے سارے معاملات مخدوش ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں خاندانی نظام اپنی فطری اور قانونی بنیاد سے محروم ہو کر انارکی اور تباہی کا شکار ہو جاتا ہے، اس لیے اسے اسلام نے کسی صورت میں اور کسی حالت میں گوارا نہیں کیا۔

اس پس منظر میں کلوننگ یا ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی کوئی ایسی شکل جس سے نکاح اور نسب کے شرعی ضابطے مجروح ہوتے ہوں اور خاندانی رشتوں کے دائرے ٹوٹتے ہوں، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور اگر اس حوالے سے علمائے اسلام اس کی مخالفت کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سائنس کی کسی نئی ایجاد کی مخالفت کر رہے ہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ اس کی اجازت دینے سے انسانی رشتوں کا تقدس اور خاندانی نظام کا بنیادی یونٹ پامال ہوتا ہے۔ اور یہ مخالفت بالکل اس طرح کی ہے جیسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دور جاہلیت کی اس رسم کو ختم کر دیا تھا کہ کسی عورت کو خاوند کی مرضی سے حمل حاصل کرنے کے لیے دوسرے خاندان میں بھیج دیا جائے یا جیسے ہندوؤں میں رائج "نیوگ" کے طریقے کو اسلام نے جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

یہاں دو سوال اور بھی توجہ طلب ہیں۔

- ایک یہ کہ اگر کلوننگ کا معاملہ میاں بیوی کے درمیان ہی رہے تو ہم اس کے جواز کے امکان کو تسلیم کر رہے ہیں کہ بے اولاد جوڑے میں اولاد کے حصول کے لیے علاج کے طور پر اس عمل کو قبول کیا جا سکتا ہے، لیکن سوال یہ ہے، جیسا کہ کہا جا رہا ہے کہ کلوننگ کے ذریعے پیدا ہونے والا بچہ اس انسان کی بالکل فوٹو کاپی ہوگا جس کے جسم سے اس کا جرثومہ یا خلیہ حاصل کیا گیا ہے، تو اس کے علیحدہ وجود اور تشخص کا تعین کیسے ہوگا؟ یہ ایک مستقل کنفیوژن ہے جس کے حل کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آ رہی۔
- اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کلوننگ کے طریقے سے جنم لینے والا بچہ خالصتاً مشینی عمل کے ذریعے وجود میں آیا ہے اور کسی زندہ یا مردہ انسان کے جسم سے اس کا صرف خلیہ حاصل کیا گیا ہے تو اس مشینی بے بی کے ماں باپ کون ہوں گے؟ اس کے وارث کون ہوں گے اور وہ کس کا وارث ہوگا؟ اس کا نکاح کس سے جائز ہوگا اور وہ کون سے خاندان کا رکن متصور ہوگا؟ یہ سب

سوالات اسلامی شریعت کی رو سے انتہائی ضروری ہیں اور ان کا کوئی حل سامنے لائے بغیر اس قسم کے کسی بھی عمل کو جواز کی سند فراہم نہیں کی جا سکتی۔

پھر اسلامی شریعت کے ضوابط اور حدود سے ہٹ کر عام معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو ان سوالات سے کوئی مفر دکھائی نہیں دیتا، اس لیے کہ اگر "کلوننگ نسل" جنگل کے لیے پیدا کرنی ہے اور انسانوں کی فوٹو کاپیاں بنا کر انہیں جنگلات کی طرف دھکیل دینا ہے کہ باقی جانوروں کی طرح جیسے حالات اور مواقع ہوں، وہ بھی زندگی بسر کرتے رہیں تو کوئی اشکال کی بات نہیں، لیکن اگر "کلوننگ نسل" کے افراد کو انسانی سوسائٹی میں رہنا ہے اور انسانی معاشرت کی اسی مشینری میں فٹ ہونا ہے تو انہیں تیار کرنے سے پہلے ان کی جگہ کا تعین کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ پرزے اس مشینری میں کسی جگہ فٹ بھی ہو سکیں گے یا اس سے محض "سپیئر پارٹس" کے بلا ضرورت ڈھیر لگاتے چلے جانے کا شوق ہی پورا ہوگا؟

اس کے دیگر بہت سے پہلوؤں پر بھی گفتگو کی گنجائش موجود ہے اور یہ گفتگو اہل علم میں جاری رہے گی مگر اصولی طور پر یہ بنیادی بات ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی سائنسی ایجاد اگر نسل انسانی کے فائدے میں ہے اور اس سے انسانی سوسائٹی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور باہمی رشتے مضبوط ہوتے ہیں تو وہ ایک مفید ایجاد ہے اور اسے قبول کرنے میں کسی باشعور کو حجاب نہیں ہو سکتا، لیکن اگر کوئی ایجاد انسانی سوسائٹی کے رشتوں کو کمزور کرنے، انسانی معاشرت میں خلفشار پیدا کرنے اور مسلمہ اخلاقی اقدار و روایات کو تباہ کرنے کا زیادہ احتمال رکھتی ہو تو اسے محض اس شوق اور خوشی میں سند جواز فراہم نہیں کی جا سکتی کہ انسان نے تباہی کے ایک نئے گڑھے تک رسائی حاصل کر لی ہے۔

قربانی کے بارے میں چند شبہات کا ازالہ

(جامعہ قاسمیہ، قاسم ٹاؤن، گوجرانوالہ - ۱۰ فروری ۲۰۰۳ء)

(۸ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ کو بعد نماز مغرب جامعہ قاسمیہ، قاسم ٹاؤن، گوجرانوالہ میں درس حدیث۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ بخاری شریف میں حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحی کے روز نماز عید کے لیے عید گاہ میں تشریف لائے، نماز پڑھائی، اس کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا، اور اس میں یہ فرمایا کہ جس نے نماز کے بعد

قربانی کی اس نے ہماری سنت کو پا لیا اور جس نے نماز عید سے قبل قربانی کر لی اس نے عام دنوں کی طرح گوشت کھایا۔ اس پر حضرت براء بن عازبؓ کے ماموں حضرت ابوبردہ بن نیارؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو عید سے قبل قربانی کا جانور ذبح کر کے اس کے گوشت سے ناشتہ کر آیا ہوں، میں یہ سمجھا تھا کہ آج کا سارا دن کھانے پینے کا دن ہے اس لیے میں نے جانور ذبح کر دیا، اب میں کیا کروں؟ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اس کے بدلے دوسرا جانور ذبح کرو۔ ابوبردہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک بکری ہے جو پلی ہوئی تو خوب ہے مگر عمر اس کی پوری نہیں ہے، کیا وہ ذبح کر دوں؟ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تم وہی ذبح کر دو مگر تمہارے بعد کسی اور کو اس کی اجازت نہیں ہے۔

یہ اس روایت کا خلاصہ ہے جو حضرت براء بن عازبؓ کے حوالہ سے امام بخاریؒ نے بیان فرمائی ہے، اس سے فقہاء کرام متعدّد مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور خود امام بخاریؒ نے بھی اسے مختلف عنوانات کے تحت ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند مسائل کا تذکرہ آپ حضرات کے سامنے کیا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے مسائل بیان فرمائے اور اس کی تلقین کی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قربانی صرف منیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، جیسا کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ قربانی اصل میں تو صرف منیٰ میں ہے تاکہ حج کے موقع پر دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے حاجی حضرات کی مہمانی ہو سکے، اور اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر صاحب حیثیت حضرات سے کہا ہے کہ وہ جانور ذبح کریں تاکہ حاجی حضرات کی تواضع ہو جائے، جبکہ منیٰ کے علاوہ کسی اور جگہ قربانی کا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ مگر بخاری شریف کی یہ روایت ان حضرات کے اس دعویٰ کی نفی کرتی ہے، اس لیے کہ جناب نبی اکرمؐ نے قربانی کا یہ حکم مدینہ منورہ میں دیا ہے اور اس دور میں حاجی حضرات کا مدینہ منورہ جانے کا کوئی معمول نہیں ہوتا تھا۔

بخاری شریف ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ خود بھی مدینہ منورہ میں ہر سال قربانی کیا کرتے تھے، بلکہ ایک روایت میں ہے کہ دو بکرے ذبح کرتے تھے، ایک اپنی طرف سے اور دوسرے جانور کے بارے میں فرماتے تھے کہ "عن من لم یضح من اُمتی" یہ میری امت کے ان افراد کی طرف سے ہے جو قربانی کی طاقت نہیں رکھتے ہوں گے۔ اللہ اللہ! حضورؐ کی اپنی امت کے ساتھ شفقت و رحمت کا اندازہ کیجئے کہ امت کے

قربانی کی طاقت نہ رکھنے والے افراد کو قربانی کے ثواب سے محروم نہیں رکھنا چاہتے اور ان کی طرف سے خود قربانی کر گئے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف قربانی کی استطاعت رکھتے ہوئے قربانی نہ کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''من وجد سعۃ ولم یضح فلا یقربن مصلانا'' جو قربانی کی استطاعت رکھتا ہے اور اس نے قربانی نہیں کی وہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔ یہ ناراضگی کا اظہار ہے اور لاتعلقی اور براءت کا جملہ ہے کہ اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے؟

الغرض حضرت براء بن عازبؓ کی اس روایت سے پہلا مسئلہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قربانی صرف منیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان بستے ہیں قربانی کا یہ حکم ان سب کے لیے ہے۔

دوسرا مسئلہ اس حدیث سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قربانی صرف جانور ذبح کرنے کا نام ہے، اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض حضرات نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ قربانی کا اصل مقصد تو صدقہ خیرات ہے اس کے لیے جانور ذبح کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ رفاہ عامہ کا کوئی کام اور غریب لوگوں کے فائدہ کے لیے کوئی خرچہ کسی بھی طریقہ سے کر لیا جائے تو اس سے قربانی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ قربانی کو اللہ تعالیٰ نے، قرآن کریم میں ''نسک'' عبادت قرار دیا ہے۔ اور عبادت وہی ہوتی ہے جس کا طریقہ شریعت نے متعیّن کیا ہے، شریعت نے جس عبادت کا جو طریقہ اور شکل طے کی ہے اسی کے مطابق وہ عبادت ادا کی جائے گی تو عبادت کہلائے گی ورنہ وہ عبادت نہیں رہے گی۔ مثلاً نماز عبادت ہے، اس کی خاص شکل متعیّن ہے اور شریعت نے اس کے ارکان، طریقہ اور اوقات خود طے کیے ہیں۔ اب کوئی شخص یہ کہے کہ اصل مقصد تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اطاعت اور بندگی کا اظہار ہے اور نماز کی دو چار رکعتوں میں پانچ دس منٹ صرف ہوتے ہیں، میں اس کی بجائے مسجد میں باوضو قبلہ رو کھڑے ہو کر دو گھنٹے تلاوت کلام کریم اور ذکر اذکار کروں گا، اگر اس کی نیت میں مذکورہ فتور نہیں ہے تو اسے دو گھنٹے کی اس تلاوت اور ذکر اذکار کا ثواب ملے گا، لیکن اس کی یہ ورزش اور محنت اس دو رکعت فرض نماز کا متبادل نہیں ہوگی جو وہ صرف تین چار منٹ میں ادا کر لیتا ہے۔ اور وہ دو رکعت فرض نماز اسی وقت عبادت قرار پائے گی جب وہ شریعت کی مقررہ ہیئت اور طریق کار کے مطابق ادا کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت ابو بردہؓ کو نماز عید سے قبل

جانور ذبح کرنے کی غلطی کی تلافی کے لیے اس کی جگہ دوبارہ جانور ذبح کرنے کا حکم دیا ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ قربانی کی عبادت جانور ذبح کرنے کی صورت میں ہی ادا ہوگی، اس کا کوئی اور متبادل نہیں ہے۔

تیسرا مسئلہ اس حدیث کی رو سے فقہاء کرامؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ قربانی واجب ہے کیونکہ جناب رسول اکرمؐ کا حضرت ابوبردہؓ کو دوبارہ جانور ذبح کرنے اور قربانی ادا کرنے کا حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی ضروری ہے اور صاحب استطاعت سے یہ ذمہ داری قربانی دیے بغیر ساقط نہیں ہوگی۔ اسے ہمارے فقہاء احناف واجب سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسرے فقہاء کرامؒ اسے سنت مؤکدہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاحی فرق ہے ورنہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قربانی کی طاقت رکھنے والا شخص اگر قربانی نہیں دے گا تو گنہگار ہوگا۔

چوتھا مسئلہ اس حدیث سے فقہاء کرامؒ نے یہ مستنبط کیا ہے کہ جس شہر یا قصبہ میں عید کی نماز ادا کی جاتی ہے وہاں قربانی نماز عید کی ادائیگی کے بعد کرنی چاہیے، نماز عید سے قبل کی گئی قربانی ادا نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے آنحضرتؐ نے حضرت ابوبردہؓ کو دوبارہ قربانی کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے نماز سے قبل ذبح کیے ہوئے جانور کے بدلے میں دوسرا جانور ذبح کیا۔

پانچواں مسئلہ اس حدیث سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قربانی کے لیے جانور کی جو عمر شریعت نے مقرر کی ہے اس سے کم عمر کا جانور قربانی میں ذبح کرنا درست نہیں ہے اور اس سے قربانی ادا نہیں ہوتی، اس لیے کہ جناب نبی اکرمؐ نے حضرت ابوبردہؓ کو کم عمر کا جانور ذبح کرنے کی اجازت یہ فرما کر دی تھی کہ تمہارے بعد کسی کو اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

یہ چند مسائل فقہائے کرامؒ نے حضرت براء بن عازبؓ کی اس روایت کی روشنی میں بیان فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

۲۰۰۲ء

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۴ دسمبر ۲۰۰۲ء)

ممتاز محقق، دانش ور اور مصنف ڈاکٹر محمد حمید اللہ گزشتہ دنوں فلوریڈا (امریکا) میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا علمی تعلق جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے تھا، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے تلامذہ میں سے تھے اور جامعہ عثمانیہ کے علمی و تحقیقی کاموں میں ایک عرصہ تک شریک رہے۔ حیدر آباد پر بھارت کے قبضہ کے بعد پاکستان آ گئے اور پھر یہاں سے فرانس کے دار الحکومت پیرس چلے گئے جہاں انہوں نے طویل عرصہ تک اسلام کی دعوت واشاعت کے حوالہ سے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ فرانسیسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور بے شمار لوگوں کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ بہت سے فرانسیسی باشندوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ وہ بنیادی طور پر تعلیم و تحقیق کی دنیا کے آدمی تھے اور انہوں نے ساری زندگی لکھنے پڑھنے کے ماحول میں گزار دی۔ فقیر منش اور قناعت پسند بزرگ تھے، کتاب زندگی بھر ان کی ساتھی رہی اور کتاب ہی کی خدمت میں وہ آخر دم تک مصروف رہے۔

وفات کے وقت ان کی عمر ۸۸ برس کے لگ بھگ تھی۔ راقم الحروف کے نام ایک مکتوب میں، جو ماہنامہ الشریعہ (فروری ۹۱ء) میں شائع ہو چکا ہے، انہوں نے لکھا تھا کہ ان کی ولادت محرم الحرام ۱۳۲۶ھ میں ہوئی تھی۔ ان کی متعدّد علمی و تحقیقی تصانیف ہیں جن سے اہل علم ایک عرصہ سے استفادہ کر رہے ہیں اور ان کی بعض تصانیف متعدّد یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے سیرت نبوی کے سیاسی پہلوؤں

اور اسلام کے اجتماعی نظام کے حوالے سے نمایاں علمی خدمات سرانجام دیں۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی اور دور نبوت کے سیاسی وثائق کے حوالے سے ان کا علمی کام اہل علم کے لیے گراں قدر تحفہ ہے اور انھوں نے ''صحیفہ ہمام بن منبہ'' کی تلاش وتحقیق اور طباعت کا اہتمام کر کے منکرین حدیث کے اس اعتراض کا عملی جواب دیا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں احادیث کی جمع وترتیب کا کام نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے پاکستان میں اسلامی قوانین کی ترتیب وتدوین کے حوالہ سے بھی مختلف اوقات میں خدمات سرانجام دیں۔ سیرت نبوی کے مختلف عنوانات پر بہاول پور اسلامی یونیورسٹی میں ان کے خطبات نے بہت مقبولیت حاصل کی جو ''خطبات بہاول پور'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں اور ''رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی'' کے عنوان سے ان کی محققانہ تصنیف کو بھی اہل علم کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہر وسیع المطالعہ محقق کی طرح وہ بھی مختلف مسائل پر جداگانہ رائے رکھتے تھے اور ان کے تفردات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے لیکن اپنی رائے پر اڑنے اور ہر حال میں اس کا دفاع کرنے کے بجائے وہ غلطی ظاہر ہونے پر اسے تسلیم کرتے تھے اور اپنی رائے سے رجوع میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مغربی دانش وروں کی طرف سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے جانے والے اعتراضات میں ایک یہ بھی ہے کہ جب قرآن کریم میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صریحا ممانعت آگئی اور اس کے مطابق آنحضرتؐ نے متعدّد صحابہ کرام کو، جن کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، حکم دیا کہ وہ زائد بیویوں کو الگ کر دیں تو خود آپؐ نے بیک وقت نو بیویاں کیوں رکھیں اور قرآنی ضابطہ کے مطابق ان میں سے چار سے زائد بیویوں کو الگ کیوں نہیں کر دیا؟ اس کے جواب میں جمہور علما یہ کہتے ہیں کہ یہ حضورؐ کی خصوصیات میں سے ہے اور آپؐ کو اس کی خاص اجازت دی گئی تھی۔ اس کی بہت سی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ باقی صحابہ کرام نے چار سے زائد جن بیویوں کو اپنی زوجیت سے الگ کیا، ان کے تو دوسری جگہ نکاح ہو گئے اور وہ نئے گھروں میں آباد ہو گئیں لیکن جناب رسول اللہؐ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کے ساتھ آنحضرتؐ کے بعد کسی امتی کا نکاح قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں اس لیے اگر آپؐ بھی چار سے زیادہ بیویوں کو الگ کر دیتے تو وہ بے سہارا ہو

جاتیں اور ان کا کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہتا جو امت کی ماؤں کے حوالہ سے بہت سنگین بات ہوتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرمؐ کو تمام بیویاں اپنے نکاح میں باقی رکھنے کی بطور خاص اجازت دے دی۔

مگر ڈاکٹر حمید اللہ نے ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے سہ ماہی عربی مجلہ ”الدراسات الاسلامیۃ“ کے محرم تا ربیع الاول ۱۴۱۰ھ کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں یہ موقف اختیار کیا کہ جناب رسول اللہؐ نے قرآن کریم کے مذکورہ حکم کے بعد حقوق زوجیت کے ساتھ تو صرف چار بیویوں کو باقی رکھا اور پانچ بیویوں کو ”اعزازی بیویوں“ کی حیثیت دے دی جو آپؐ کی بیویاں تو سمجھی جاتی تھیں مگر انہیں ”حقوق زوجیت“ حاصل نہیں تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مغربی دانش وروں کے اعتراض کا اپنے طور پر جواب دینے کی کوشش کی۔

ہم نے ماہنامہ ’الشریعہ‘ گوجرانوالہ میں اس پر گرفت کی اور اکتوبر ۹۰ء کے شمارے میں پروفیسر عبد الرحیم ریحانی کا مضمون شائع کیا جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اس موقف کی دلائل کے ساتھ تردید کی۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں ہمیں مضمون بھجوایا جس میں انہوں نے اپنے موقف کو دہراتے ہوئے اس کے حق میں دلائل دیے۔ ہم نے وہ مضمون دسمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع کر دیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کے موقف اور دلائل پر اطمینان نہیں ہے اور ہم اس کا علمی و تحقیقی جواب دیں گے۔ اس دوران ماہنامہ ”صدائے اسلام“ پشاور نے بھی ڈاکٹر صاحب کے موقف پر گرفت کی جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے ”صدائے اسلام“ کے مدیر محترم کے نام مکتوب میں اپنے موقف سے رجوع کر لیا اور فرمایا کہ میں نے صرف اہل مغرب کے ایک اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی تھی، اگر جمہور علما کو اس سے اتفاق نہیں ہے تو مجھے بھی اپنے موقف پر اصرار نہیں اور میں اس پر معذرت خواہ ہوں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ مکتوب ”صدائے اسلام“ کے حوالے سے ماہنامہ ”الشریعہ“ گوجرانوالہ کے مارچ ۱۹۹۱ء کے شمارے میں شائع کیا اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی حق پرستی اور فراخ دلی کا اعتراف کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ تفردات ہر صاحب علم اور محقق کا حق ہے۔ جو بھی مطالعہ کرے گا، تحقیق کرے گا اور کسی مسئلہ پر متنوع علمی مواد کو سامنے رکھ کر اپنی رائے قائم کرے گا، اس کی

رائے کسی نہ کسی مسئلہ پر باقی علما سے مختلف ہو جائے گی۔ یہ فطری بات ہے البتہ اہل علم کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور کسی مرحلہ پر اپنی رائے کی غلطی ان پر واضح ہو جائے تو وہ اسے رجوع میں بھی کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے۔ یہ بات محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب میں بھی ہم نے دیکھی ہے جو ان کے خلوص، للّٰہیت اور قبول حق کے جذبہ کی علامت ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے عمر بھر علمی و تحقیقی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا اور ایک دنیا نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ ہم خود ان کے خوشہ چینوں اور ان کی تحقیقات سے استفادہ کرنے والوں میں شامل ہیں اس لیے مجھے ان کی وفات پر ذاتی طور پر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے کسی شفیق استاذ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ایک عالم، محقق، دانش ور اور صاحب فضل و کمال شخصیت کی موت پر اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی وفات بلاشبہ پورے عالم اسلام کے لیے صدمہ کا باعث ہے اور علمی دنیا کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی علمی و دینی خدمات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین

قرآن کریم کا ایک بڑا اعجاز

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۱ دسمبر ۲۰۰۲ء)

سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۸ میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کے نزول سے قبل آپ نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی لکھ سکتے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک پیدا کر سکتے تھے۔ یعنی اگر جناب رسول اللہ ''امی'' نہ ہوتے اور لکھنا پڑھنا جانتے ہوتے تو مخالفین کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور کہیں سے یہ حکمت و دانش کا ذخیرہ مل گیا ہے جسے قرآن کی شکل میں پیش کر کے یہ دعویٰ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سرے سے یہ امکان ختم کر دیا اور ایک امی شخصیت پر قرآن کریم نازل کر کے اشتباہ کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

اس کے بعد آیت ۴۹ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں یہ فرمایا کہ یہ کھلی کھلی آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں ہیں اور ان آیات کا انکار ظالم لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم کے اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سینوں میں محفوظ

ہو جاتا ہے جو قرآن کریم کی خصوصیات میں سے ہے اور اس کے اعجاز کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ دنیا کی کسی اور کتاب کے حافظ موجود نہیں ہیں۔ اول تو کوئی کتاب یاد ہوتی نہیں اور اگر کوئی کسی کتاب کو یاد کر لے تو اسے زندگی بھر یاد رکھنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ جبکہ قرآن کریم نہ صرف آسانی کے ساتھ یاد ہو جاتا ہے بلکہ اسے زندگی بھر یاد رکھنا بھی کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اور بہت سے توجہ رکھنے والے حافظ قرآن نہ صرف اسے یاد رکھتے ہیں بلکہ زندگی بھر تراویح اور نوافل میں سنانے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت دنیا میں قرآن کریم کے حفاظ کی تعداد نوے لاکھ کے لگ بھگ ہے اور یہ قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی کھلی اور ناقابل تردید شہادت ہے۔

حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ نے سورۃ العنکبوت کی انہی آیات کے ضمن میں لکھا ہے کہ قرآن کریم کی اصل جگہ سینہ ہے اور کتابت امر زائد ہے۔ یعنی قرآن کریم کا اصل حق یہ ہے کہ اسے یاد کیا جائے اور اس کی حفاظت کا اصل نظام بھی یہی ہے کہ وہ یاد کیا جاتا ہے اور اتنی بار پڑھا اور سنا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور چیز کے خلط ملط ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ کتابت قرآن کریم کی ضروریات میں سے نہیں ہے، اسے لکھا جائے یا نہ لکھا جائے اس کی حفاظت کے نظام میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کے دور میں قرآن کریم تحریری طور پر کتابی شکل میں موجود نہیں تھا اور اسے تحریری طور پر کتاب کی شکل حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں احتیاطی تدبیر کے طور پر دی گئی۔ اس سے قبل وہ صرف یاد کرنے کی چیز تھی اور ہزاروں صحابہ کرامؓ کے سینوں میں محفوظ تھا۔

1. قرآن کریم کو تحریری صورت میں کتاب کی شکل دینے کا داعیہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے ذہن میں پیدا ہوا جب آنحضرتؐ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے دور میں مختلف اطراف میں بغاوت کے شعلے بھڑکے اور مرتدین کی سرکوبی کے لیے صحابہ کرامؓ کے مختلف لشکر چاروں طرف پھیل گئے۔ ان جنگوں میں شہید ہونے والے صحابہ کرامؓ میں ایک بڑی تعداد قرآن کریم کے حفاظ کی تھی، خصوصاً مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں شہید ہونے والے حافظ قرآن کریم صحابہ کرامؓ کی تعداد سات سو کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ کو تشویش ہوئی اور انہوں نے خلیفہ وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ سے عرض کیا کہ قرآن کریم کو کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لینا

چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ پہلے تو اس کام کے لیے تیار نہ ہوئے پھر کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے اس تجویز کو قبول کیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو یہ ذمہ داری سونپی کہ قرآن کریم کو کتابی شکل میں محفوظ کیا جائے، جس پر قرآن کریم کا پہلا باضابطہ نسخہ لکھا گیا اور اسے سرکاری نسخہ کے طور پر مسجد نبویؐ میں رکھ دیا گیا۔ یہ قرآن کریم کو کتابی شکل دینے کا پہلا مرحلہ تھا۔

2. اس کے بعد دوسرا مرحلہ امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے دور میں پیش آیا جب اسلام کا دائرہ عرب سے باہر علاقوں میں دور دور تک پھیل چکا تھا۔ قرآن کریم عربی زبان میں قریش کی لغت میں نازل ہوا تھا لیکن ہر زبان میں لغتوں اور لہجوں کا تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے اور کچھ الفاظ اور حروف مختلف علاقوں میں لہجے اور لغتوں کے فرق کے ساتھ بولے اور پڑھے جاتے ہیں، جس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا مگر دیکھنے میں وہ الگ الگ لفظ دکھائی دیتے ہیں۔ اہل زبان ان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے مگر دوسری قوموں میں ان میں فرق سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کریم کو عربی کے مختلف لہجوں اور لغتوں میں پڑھنے کی اجازت تھی جو عربوں کے ہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن یہ فرق جب عجمیوں کے سامنے آیا تو اختلاف پیدا ہونے لگے اور تنازعات کھڑے ہونے شروع ہوگئے۔ حضرت حذیفہ بن ایمانؓ نے ایک موقع پر دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا جو قرآن کریم کے ایک لفظ پر جھگڑا کر رہے تھے۔ دونوں عجمی تھے، ایک لفظ کو الگ الگ لغت میں پڑھ رہے تھے اور عربی زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے الگ الگ ہی سمجھ رہے تھے۔ یہ جھگڑا دیکھ کر حضرت حذیفہؓ کو تشویش ہوئی انہوں نے اپنی تشویش سے حضرت عثمانؓ کو آگاہ کیا تو انہوں نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ کے ساتھ امیر المومنین کی حیثیت سے یہ فیصلہ صادر فرمادیا کہ قرآن کریم آئندہ قریش ہی کی لغت میں پڑھا جائے گا اور اس کی کتابت بھی اسی میں ہوگی۔ حضرت عثمانؓ نے مختلف لہجوں میں لکھی ہوئی قرآن کریم کی سورتیں لوگوں سے حاصل کیں اور سب کو جمع کر کے نذر آتش کر دیا، اور قرآن کریم کا جو محفوظ کتابی نسخہ بیت المال میں موجود تھا اس کی مختلف نقول قریش کی لغت پر

تیار کر کے مختلف صوبوں میں بھجوادیں جن میں سے تین نسخے اب بھی موجود ہیں۔ ایک استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں ہے، دوسرا تاشقند میں ہے، اور تیسرا نسخہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں ہے جس کی میں نے بھی زیارت کی ہے۔ یہ قرآن کریم کی کتابی شکل میں محفوظ کرنے کا دوسرا مرحلہ تھا۔

3. جبکہ تیسرا مرحلہ اموی دور خلافت میں آیا اور اس کا باعث حجاج بن یوسف بنا۔ حجاج بن یوسف کے مظالم کی داستان بڑی لمبی ہے مگر اس کے ملی کاموں کی فہرست بھی اسی طرح طویل ہے جن میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے کسی موقع پر ایک عجمی کو قرآن کریم پڑھتے سنا جو قرآن کریم پر زیر زبر اور دیگر علامات نہ ہونے کی وجہ سے غلط پڑھ رہا تھا اور ایک آیت کو اس قدر غلط پڑھ رہا تھا کہ اس سے کفر کا مفہوم نکلتا تھا۔ یہ سن کر حجاج کو تشویش ہوئی اور اس نے سرکردہ علماء کرام کی کمیٹی بنا کر اسے یہ کام سونپا کہ وہ قرآن کریم پر زیر زبر اور دوسری ایسی علامتیں لگائیں جس سے غیر عرب لوگوں کے لیے اس کی صحیح تلاوت آسان ہو جائے۔

اس طرح قرآن کریم کی یہ کتابی شکل وجود میں آئی جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ کتابی صورت ہماری ضرورت ہے، جبکہ قرآن کریم ہر وقت لاکھوں مسلمانوں کے سینوں میں اس شان کے ساتھ محفوظ رہتا ہے کہ ہر سال رمضان المبارک میں اسے اہتمام کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے، چنانچہ کتاب کے ظاہری اسباب کی کوئی اہمیت اس کے لیے باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی حقیقت کو حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا کہ قرآن کریم کی اصل جگہ سینہ ہے اور کتابت امر زائد ہے۔ یعنی اگر قرآن کریم کی سرے سے کہیں کتابت نہ کی جائے تو بھی قرآن کریم کی موجودگی اور حفاظت کا نظام متاثر نہیں ہوتا، لاکھوں حفاظ اس کی ہر وقت حفاظت کر رہے ہوتے ہیں، اور یہ قرآن کریم کا بہت بڑا اعجاز ہے۔

حفاظتِ قرآن کا تکوینی نظام

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۰ نومبر ۲۰۰۲ء)

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے کہ اس مہینہ میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور اس میں قرآن کریم کی تلاوت عام دنوں سے بڑھ جاتی ہے۔ ہر دیندار مسلمان کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس مبارک ماہ کے دوران وہ قرآن کریم کی اہتمام کے ساتھ تلاوت کرے اور تراویح اور نوافل میں قرآن کریم سننے کی سعادت حاصل کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام ہے کہ عام طور پر سال بھر کی غفلت اور بے توجہی کی کسی نہ کسی حد تک اس مہینہ میں تلافی ہو جاتی ہے اور ایمان اور عمل کی بیٹری ایک سال کے لیے پھر چارج ہو جاتی ہے۔

اس بات کا اندازہ کرنا انتہائی مشکل امر ہے کہ انفرادی طور پر قرآن کریم کی تلاوت اور سننے اور سنانے سے ہٹ کر اجتماعی طور پر تراویح اور نوافل میں اس ماہ کے دوران دنیا بھر میں کتنی بار قرآن کریم پڑھا جاتا ہے؟ اعداد و شمار جمع کرنے کا کوئی جدید ترین سسٹم بھی شاید دنیا میں رمضان المبارک کے دوران قرآن کریم سننے اور سنانے کے حوالے سے اعداد و شمار کو مرتب کرنے کی مہم سر نہ کر سکے۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز بھی ہے اور اس کی حفاظت کا ایک "فول پروف سسٹم" بھی کہ قرآن کریم کے الفاظ کو اتنی بار دہرایا جائے اور اتنی بار سنا اور سنایا جائے کہ اس میں کسی حرف کے داخلہ یا کسی حرف کی کمی کا کسی سطح پر کوئی امکان باقی نہ رہ جائے۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی بے نیاز ہے اور اس کی صفات بھی بے نیاز ہیں، اس لیے قرآن کریم کو بھی حفاظت کے ظاہری اسباب سے بے نیاز کر دیا گیا ہے۔ کسی کتاب کی بقا اور حفاظت کے ظاہری اسباب چمڑا، تختی، کاغذ، قلم، ڈسک، سی ڈی اور کیسٹ وغیرہ ہیں۔ یہ اسباب موجود ہوں تو کتاب کا وجود بھی ہے، اور اگر خدانخواستہ ان اسباب کا وجود باقی نہ رہے تو کسی کتاب کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ لیکن قرآن کریم ان تمام اسباب سے بے نیاز ہے کہ ان میں سے ایک سبب بھی باقی نہ رہے تب بھی قرآن کریم پر اس کا رتی بھر اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ وہ لاکھوں سینوں کی کیسٹوں میں محفوظ ہے اور اتنی بار پڑھا اور سنا جاتا ہے کہ کتاب کے وجود اور بقا کے ظاہری اسباب کی موجودگی یا غیر موجودگی اس کے لیے ایک جیسی ہو گئی ہے۔

چند سال قبل کی بات ہے میں کراچی میں تھا، جامعہ انوار القرآن گرین ٹاؤن کراچی میں چند نوجوان ملاقات کے لیے آئے اور اس بات پر پریشانی کا اظہار کیا کہ مختلف غیر مسلم گروپوں نے قرآن کریم کے حوالے سے انٹرنیٹ پر ویب سائٹس بنا رکھی ہیں جن پر وہ قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کے ساتھ ساتھ اس سے ملتی جلتی سورتیں اور آیات اپنی طرف سے گھڑ کر قرآنی آیات اور سورتوں کے ساتھ خلط ملط کر رہے ہیں جن سے ایک نا واقف شخص الجھن اور دھوکہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے چند سورتوں کے پرنٹس بھی دیے جو قرآن کریم کی طرز پر گھڑی گئی ہیں اور انہیں قرآنی سورتوں کے انداز میں ان ویب سائٹس پر دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے بعض سورتوں اور آیات میں قرآنی تعلیمات کا مذاق اڑایا گیا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گستاخانہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

میں نے ان نوجوانوں سے عرض کیا کہ ان کی پریشانی بجا ہے۔ ہر مسلمان کو قرآن کریم کے بارے میں اس قسم کی صورتحال پر پریشان ہونا چاہئے اور یہ پریشانی قرآن کریم کے ساتھ ایک مسلمان کی محبت کی علامت ہے۔ کیونکہ غیرت اور غصہ وہیں آتا ہے جہاں محبت ہوتی ہے اور جہاں عقیدت و محبت نہ ہو وہاں نہ کسی کو غصہ آتا ہے اور نہ ہی اس کی غیرت جوش مارتی ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اس پریشانی اور غیرت پر آپ حضرات بڑے اجر و ثواب کے مستحق ہیں لیکن اس پریشانی کو خود پر مسلط کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس قسم کی حرکتوں سے قرآن کریم کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس طرح کے سینکڑوں گروپ بھی انٹرنیٹ پر قائم اور متحرک ہو جائیں تو وہ قرآن کریم کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میرے اس جواب پر ان میں سے ایک نوجوان نے حیرت بلکہ قدرے خفگی کا اظہار کیا تو میں نے وضاحت کی کہ انٹرنیٹ کے جن دو چار گروپوں کی آپ بات کر رہے ہیں ان جیسے بیسیوں گروپ اور وجود میں آجائیں اور قرآن کریم کی ایک سو چودہ سورتوں کے ساتھ ان سے ڈبل تعداد میں سورتیں گھڑ کر بیسیوں ویب سائٹس کے ذریعے سامنے لے آئیں تو ہمیں ان سب کے کام کو واچ کرنے اور اس کی چھانٹی کرنے کے لیے کسی لمبے چوڑے بندوبست کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بس پندرہ سال کا ایک ایسا بچہ کافی ہو گا جس نے قرآن کریم یاد کرنے کے بعد چار پانچ دفعہ سنا لیا ہے۔ اور ایسے بچے پندرہ سال کی عمر میں

ہزاروں مل جائیں گے۔ اس بچے کو کمپیوٹر کی سکرین کے سامنے بٹھادیں اور اس کے سامنے سے ان انٹرنیٹ گروپوں کا قرآن کریم کے بارے میں مذکورہ عمل گزارنا شروع کردیں۔ وہ بچہ چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ ایک دن اور رات میں اس سارے کام کی چھانٹی کر کے رکھ دے گا کہ یہ سورۃ صحیح ہے اور یہ جعلی ہے، اس سورۃ میں یہ آیت صحیح ہے اور یہ جعلی ہے، اس آیت میں یہ لفظ صحیح ہے اور یہ جعلی۔ وہ بچہ قرآن کریم کے ایک لفظ کا ترجمہ نہیں جانتا اور کسی ایک سورۃ کا مفہوم اور شان نزول بھی اس کے علم میں نہیں ہے اور قرآن کریم کا عالم نہیں ہے بلکہ صرف حافظ ہے اور اس نے طوطے کی طرح قرآن کریم کے الفاظ رٹنے اور سننے سنانے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن انٹرنیٹ کے اس جدید ترین اور سائنٹفک ورک کو جانچنے اور اس کی چھانٹی کرنے کی لیے وہ بچہ کافی ہے۔ چنانچہ جس کام کو جانچنے اور چھانٹنے کے لیے پندرہ سال کا ایک بچہ کافی ہو اس سے قرآن کریم کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

یہ قرآن کریم کی حفاظت کا تکوینی نظام ہے اور اس کے ہوتے ہوئے قرآن کریم میں کسی ردوبدل اور اس کے کسی لفظ کے آگے پیچھے ہونے کا کوئی امکان کسی درجہ باقی نہیں رہا۔ رمضان المبارک قرآن کریم کو سننے و سنانے اور پڑھنے و دہرانے کا خاص مہینہ ہے۔ اس مہینے میں اہتمام کے ساتھ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے، سنا جاتا ہے، سنایا جاتا ہے، دہرایا جاتا ہے اور پورا سال غفلت میں گزارنے کے بعد مسلمان ایک بار پھر قرآن کریم کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ کر لیتے ہیں۔ رمضان المبارک آخری مراحل میں ہے اور قرآن کریم کے نزول اور تکرار و تلاوت کا یہ مبارک مہینہ چند دنوں میں ہم سے رخصت ہونے والا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ مہینہ ہمارے لیے قرآن کریم کے ساتھ اپنے تعلقات و معاملات کو درست کرنے کا ذریعہ ثابت ہو اور یہ مبارک مہینہ ہمیں صحت و عافیت اور توفیق و قبولیت کے ساتھ زندگی میں بار بار نصیب ہو، آمین یارب العالمین۔

جدید مغربی معاشرے کے لیے دینی مدارس کا پیغام

(جامعہ الہدٰی، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ نومبر ۲۰۰۲ء)

(شیفیلڈ، برطانیہ میں مدنی ٹرسٹ ٹونگھم کے زیر اہتمام جامعہ الہدی کی افتتاحی تقریب سے خطاب)

برادر محترم مولانا رضاء الحق سیاکھوی اور ان کے رفقا کا شکر گزار ہوں کہ جامعہ الہدی شیفیلڈ کے افتتاح کے موقع پر اس تقریب میں آپ حضرات کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا موقع فراہم کیا اور اس نئے تعلیمی ادارے کے آغاز پر مدنی ٹرسٹ کے تمام دوستوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت اس ادارہ کو پورے خطے میں دین کی سربلندی اور علم کے فروغ کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یارب العالمین۔

ہم ایک دینی درس گاہ کے افتتاح کی تقریب میں جمع ہیں اور دینی مدارس کے حوالے سے اس وقت یہ صورت حال ہمارے سامنے ہے کہ ایک طرف دینی مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور نئی دینی درس گاہیں قائم ہو رہی ہیں اور دوسری طرف دینی مدارس کی مخالفت عالمی سطح پر بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مدرسہ کو انسان کی تہذیبی پیش رفت میں رکاوٹ قرار دیا جا رہا ہے، سولائزیشن کا دشمن بتایا جا رہا ہے اور بلند آہنگی کے ساتھ یہ پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ یہ مدرسہ تہذیب و تمدن کے لیے خطرہ ہے، سولائزیشن اور نسل انسانی کی ثقافتی پیش رفت کے لیے خطرہ ہے اور موجودہ عالمی سسٹم کے لیے خطرہ ہے، اس لیے اسے ختم کیا جائے یا کم از کم اس کے جداگانہ تشخص، کردار، آزادی اور خود مختاری کو محدود کر دیا جائے۔ میں اس پس منظر میں آج کی اس محفل میں صرف ایک پہلو پر مختصراً کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ وہ لوگ جو اس مدرسہ کی مخالفت میں پیش پیش ہیں اور اسے بند کرنے کے درپے ہیں، ان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تم انصاف کی نظر سے دیکھو تو یہ مدرسہ خود تمہاری ضرورت بھی ہے اور پوری نسل انسانی کو اس کی ضرورت ہے۔ میری اس گزارش کے مخاطب وہ تمام لوگ ہیں جو اس دینی مدرسہ کے مخالف ہیں اور خاص طور پر ویسٹرن سولائزیشن کے علم برداروں اور مغربی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرنے والے دانش وروں سے عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ یہ دینی درس گاہ تمہاری ضرورت بھی ہے، جو کچھ یہ مدرسہ پڑھا رہا ہے اور جن علوم کو یہ تاریخ کی دست برد سے محفوظ رکھے ہوئے ہے، اس کی مستقبل میں تمہیں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے بلکہ ضرورت پڑے گی اس لیے تم اس کی ضرورت سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

تم نے اب سے دو تین سو برس قبل یورپ میں اہل مذہب کے ظالمانہ کردار سے تنگ آکر اس کے رد عمل میں مذہب کا طوق گردن سے اتار دیا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب سے تین صدیاں قبل یورپ میں اہل مذہب کا کردار کیا تھا اور کس طرح انہوں نے پورے

معاشرے کو اپنے ظالمانہ کردار کے شکنجے میں کسا ہوا تھا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اسی کے ردعمل میں تم نے مذہب سے پیچھا چھڑانے کا راستہ اختیار کیا تھا۔ تم اہل مذہب کی مخالفت میں خود مذہب کے خلاف انتہا پر چلے گئے اور تم نے کہا کہ اب انسانی سوسائٹی بالغ ہوگئی ہے اور اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے، اس لیے انسان کو باہر سے ڈکٹیشن لینے کی ضرورت نہیں ہے اور آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی پابندی کا دور گزر گیا ہے اس لیے اب ہم اپنے معاملات خود طے کریں گے، انسانی سوسائٹی اپنے فیصلے خود کرے گی اور کسی بیرونی ہدایت کے بغیر اپنا نظام خود چلائے گی۔ تم نے اس فلسفے پر ایک نیا نظام تشکیل دیا، ایک نیا کلچر پیش کیا اور پھر اسے پوری دنیا پر مسلط کرنے کے لیے ہر طرف چڑھ دوڑے۔

لیکن تین صدیوں کے بعد آج تمہاری اس تگ ودو کے نتائج سامنے آرہے ہیں تو تم خود پریشانی کا شکار ہوگئے ہو، آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی راہ نمائی سے بے نیاز ہو کر آج انسانی سوسائٹی فکری انتشار، تہذیبی انارکی اور افراتفری کی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور تمہاری دانش گاہیں خود اس مقام سے واپسی کی راہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ برطانیہ کے سابق وزیراعظم جان میجر نے اس نعرہ پر باقاعدہ مہم چلائی کہ "Back to Basics" (بنیادوں کی طرف واپسی) کی ضرورت ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے بنیاد پرستی کو طعنہ بنا دیا گیا ہے اور اہل مغرب خود بنیادوں کی طرف واپسی کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے بی بی سی پر کئی لیکچر دیے اور کہا کہ ہم نے صرف عقل کو معیار قرار دے کر ٹھوکر کھائی ہے اور ہم نسل انسانی کو نقصان کی طرف لے جا رہے ہیں اس لیے "وجدان" کی طرف واپسی کی ضرورت ہے۔ برطانوی شہزادے نے "وجدان" کی اصطلاح استعمال کی ہے جو ابتدائی مرحلہ ہے۔ اس کے بعد وحی اور الہام ہی کی بات آئے گی۔ جبکہ ممتاز روسی لیڈر اور دانش ور گورباچوف نے کھلے بندوں اعتراف کیا کہ ہم نے عالمی جنگ کے بعد دفتروں اور کارخانوں میں افرادی قوت کے خلا کو پر کرنے کے لیے عورت کو بہکا کر گھر سے نکالا جس سے ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا ہے اور اب ہمیں عورت کو دوبارہ گھر میں لے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔

ان باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کے دانش وروں کی سوچ کا رخ کیا ہے اور وہ موجودہ صورت حال سے کس قدر پریشان ہیں۔ اب یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی رہنمائی سے پیچھا چھڑا کر نسل انسانی نے کوئی فائدہ حاصل نہیں

کیا بلکہ نقصان سے دوچار ہوئی ہے اور انسانی سوسائٹی کو اس نئے فلسفے اور کلچر نے اخلاقی انارکی اور ذہنی خلفشار کے سوا کچھ نہیں دیا چنانچہ مغرب کی دانش گاہوں میں اس بات پر غور شروع ہو چکا ہے کہ یہاں سے واپسی کا راستہ کیا ہے اور انسانی سوسائٹی کو اس دلدل سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔

مغرب کے اہل دانش سے میرا سوال ہے کہ جس ”وجدان“ اور ”بنیادوں“ کی طرف واپسی کی تم بات کر رہے ہو، اگر تم نے اس کا فیصلہ کر لیا اور تمہارے پاس اب اس فیصلے کے سوا کوئی اور ”چوائس“ باقی بھی نہیں رہا تو یہ بنیادیں تمہیں ملیں گی کہاں سے؟ اور عقل انسانی کے لیے بیرونی راہ نمائی یا دوسرے لفظوں میں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کا یہ سودا تم آخر کس دکان سے حاصل کر سکو گے؟ یہ ”جنس“ آج مسلمانوں کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ کسی اور مذہب کے ماننے والوں کے پاس آسمانی تعلیمات کا کوئی قابل اعتماد ذخیرہ موجود ہے۔ یہ سعادت صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کے پاس نہ صرف قرآن کریم اصلی حالت میں محفوظ و موجود ہے بلکہ قرآن کریم کی تشریحات و تعبیرات میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات بھی تمام تر جزئیات و تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں اور نسل انسانی نے جب کبھی آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا، اسے یہ چیز صرف اور صرف مسلمانوں کے ہاں سے ہی ملے گی اور دنیا کا کوئی مذہب انسانی سوسائٹی کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے آخری کتاب قرآن کریم اور آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات و تعلیمات کی حفاظت کا ایسا فول پروف انتظام کر رکھا ہے کہ ان میں کسی اور چیز کی در اندازی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت ہے کہ لاکھوں سینوں میں قرآن کریم کے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کے سب سے پہلے لکھوائے جانے والے نسخے بھی ابھی تک موجود و محفوظ ہیں جو امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان کے دور میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اس لیے آج صرف اور صرف مسلمان اس دعویٰ کی پوزیشن میں ہیں کہ ان کے پاس آسمانی تعلیمات محفوظ حالت میں موجود ہیں اور نسل انسانی کو جب بھی آسمانی تعلیمات کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ اصلی حالت میں اسے مسلمانوں کے پاس مل جائیں گی۔

میں مغرب کے اہل دانش سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سمجھ دار لوگ ہیں اور سمجھ دار لوگوں کی ایک علامت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی متبادل ضرور ذہن میں رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی مغرب کے دانش وروں کو سوچنا چاہیے کہ جس راستے پر انہوں نے نسل انسانی کو تین سو برس قبل چلانا شروع کیا تھا، اس کی ناکامی کی صورت میں ان کے پاس اس کا متبادل کیا ہے؟ اور انہوں نے اس کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟

آج سچی بات یہ ہے کہ مغرب کا فلسفہ ناکام ہو چکا ہے، مغرب کے کلچر نے انسانی سوسائٹی کو اخلاقی انارکی اور ذہنی خلفشار سے دوچار کر دیا ہے، انسانی قدریں برباد ہو گئی ہیں، خاندانی نظام جو انسانی سوسائٹی کا بنیادی یونٹ ہے، بکھر کر رہ گیا ہے اور خود مغرب کے دانش وروں نے وجدان، بنیادوں اور ماضی کی طرف واپس جانے کے لیے سوچنا شروع کر دیا ہے اس لیے میں ان سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دینی مدرسہ جس کو وہ ختم کرنے کے درپے ہیں، انہی وجدانیات، بنیادوں اور ماضی کے اخلاقی اقدار کی تعلیم دے رہا ہے جن کی ضرورت کا احساس خود ان کے ذہنوں میں اجاگر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہ مدرسہ ان اقدار و تعلیمات کو نہ صرف محفوظ رکھے ہوئے ہے بلکہ اسے نئی نسل کے سپرد کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کے محاذ پر سرگرم عمل بھی ہے اور اس حوالے سے یہ مدرسہ ان لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور کل جب انہیں کہیں اور پناہ نہیں ملے گی، یہی مدرسہ ان کی راہ نمائی اور نجات کے لیے کردار ادا کرے گا۔

باقی رہی بات اس مدرسہ کو ختم کرنے کی تو میں اس موقع پر اہل مغرب سے اختصار کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تم بار بار اس بات کا تجربہ کر چکے ہو کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں اس لیے اس کام میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ تم نے ۱۸۵۷ء کے بعد جنوبی ایشیا میں اس درس گاہ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا لیکن جبر و تشدد کے تمام تر مراحل کے باوجود جنوبی ایشیا میں یہ درس گاہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ پہلے سے زیادہ متحرک اور موثر کردار ادا کر رہی ہے۔ تم نے ترکی میں اس مدرسہ کو اپنی طرف سے مکمل طور پر ختم کر دیا تھا اور اس کو دوبارہ ابھرنے سے روکنے کے لیے پون صدی سے جبر کا ہر حربہ آزما رہے ہو لیکن یہ مدرسہ ترکی میں بھی زندہ ہے اور اگر تم اس کی زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہو تو ترکی میں فوج کے جبر سے ہٹ کر ایک الیکشن کرا کے دیکھ لو، تمہیں اس مدرسے کی کارکردگی کا گراف معلوم ہو جائے گا۔ تم نے وسطی ایشیا میں اس مدرسہ کو بند کرنے کے لیے جبر اور تشدد کو انتہا تک پہنچا

دیا اور اس درس گاہ کا کردار ختم کرنے کے لیے ریاستی جبر کی ہر شکل آزما کر دیکھ لی ہے لیکن پون صدی کے بعد دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ وسطی ایشیا میں بھی یہ مدرسہ زندہ ہے اور اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

اس لیے میں مغرب کے دانش وروں کو آج کی اس محفل کی وساطت سے یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ حقائق سے آنکھیں بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ مدرسہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ پوری نسل انسانی کی اور خود تمہاری بھی ضرورت ہے۔ اس چٹان سے سر ٹکرانے کے بجائے اس کے وجود کو تسلیم کرو اور اس کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کا پیغام نسل انسانی کے بہتر مستقبل کا پیغام ہے، انسانی سوسائٹی کو انارکی اور خلفشار کی دلدل سے نکالنے کا پیغام ہے اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کا پیغام ہے۔ اب نسل انسانی کو اسی پیغام کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے سو نسل انسانی کی فلاح کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دینی مدارس کے بارے میں پانچ سوالات کے جوابات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

پچھلے دنوں پاکستان کے مختلف شہروں میں دینی مدارس کے سالانہ اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا اور عام طور پر دینی مدارس کے جداگانہ تشخص اور کردار کے حوالے سے عام ذہنوں میں پائے جانے والے شکوک و شبہات اور سوالات کا جائزہ لیا گیا۔ ان میں جامعہ عبد اللہ بن مسعودؓ خانپور، جامعہ مفتاح العلوم سرگودھا، دارالعلوم ربانیہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، مدرسہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا، جامعہ رشیدیہ ساہیوال، جامعہ عثمانیہ شورکوٹ، جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن کراچی، جامعہ مدینۃ العلم فیصل آباد، جامعہ فاروقیہ شیخوپورہ اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان اجتماعات میں ہونے والی گفتگو کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ دینی مدارس کے بارے میں عام طور پر چار پانچ سوالات ذہنوں میں پائے جاتے ہیں اور ورلڈ میڈیا کے منفی پروپیگنڈا کے ساتھ ساتھ قومی سطح پر بھی ان کے

بارے میں شکوک و شبہات اور تحفظات کا اظہار کیا جارہا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات اور شبہات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے۔ وہ سوالات یہ ہیں:

1. دینی مدارس اپنے نصاب میں جدید علوم اور آج کی ضروریات مثلا سائنس، ریاضی، انگلش زبان، اور کمپیوٹر وغیرہ کو شامل کیوں نہیں کر رہے اور انہیں اس سلسلہ میں کیا رکاوٹ اور حجاب ہے؟

2. جب ملک کے ہزاروں تعلیمی ادارے حکومتی انتظام کے تحت چل رہے ہیں اور حکومت کے مختلف شعبے ان کا کامیابی کے ساتھ انتظام چلا رہے ہیں تو دینی مدارس کو سرکاری کنٹرول میں آنے سے انکار کیوں ہے اور وہ اپنا جداگانہ نظام اور تشخص قائم رکھنے پر کیوں مصر ہیں؟

3. اگر ورلڈ اسٹیبلشمنٹ یا ریاستی ادارے دینی مدارس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو دینی تعلیم کے جس جداگانہ تشخص کی بات کی جاتی ہے اس کا مستقبل کیا ہوگا اور دینی حلقے اپنا روایتی کردار کس طرح برقرار رکھ سکیں گے؟

4. دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس تعلیم کے حصول کے بعد ملازمت کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اور روزگار کے تحفظ کی کوئی صورت نہیں ہے، اس کا حل کیا ہے؟

5. دینی مدارس اپنے خلاف ملکی اور عالمی سطح پر پائی جانے والی مہم کو موجودہ عالمی صورتحال میں کس نظر سے دیکھتے ہیں اور موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش میں ان کا موقف کیا ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ دینی مدارس اپنے نصاب میں انگلش زبان، سائنس، ریاضی اور دیگر جدید ضروری علوم و فنون کو شامل کرنے سے کیوں انکاری ہیں؟ اس کے جواب میں تین گزارشات پیش خدمت ہیں۔

پہلی گزارش یہ ہے کہ دینی مدارس کو جائز حد تک ان علوم و فنون کو اپنے نصاب میں شامل کرنے سے کوئی انکار نہیں ہے۔ اب تک مسئلہ زیادہ تر وسائل کا رہا ہے کہ دینی مدارس کے وسائل محدود ہوتے ہیں اور انہیں تھوڑے وسائل کے ساتھ اپنا کام چلانا پڑتا

ہے۔ لیکن اس کے باوجود دینی مدارس نے انگریزی، ریاضی، سائنس اور کمپیوٹر ٹریننگ وغیرہ کے مضامین کو اپنے نصاب میں بتدریج شامل کرنے کا سلسلہ کچھ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے اور دینی مدارس کے تمام وفاق میٹرک کی سطح تک کے نصاب میں یہ مضامین شامل کر چکے ہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ ان مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کی جائز حد دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کے نزدیک میٹرک ہے، اس کے بعد کے نصاب میں ان مضامین کی شمولیت ضروری نہیں بلکہ بعض حوالوں سے نقصان دہ ہے، اس لیے میٹرک کے بعد کے درجات میں ان مضامین کو شامل نصاب کرنے کے لیے دینی مدارس تیار نہیں ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد عمومی تعلیم کے دائرے بھی تقسیم ہو جاتے ہیں اور ہر دائرہ میں اسی شعبہ کی تعلیم ہوتی ہے اس میں دوسرے شعبوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً لاء کالج میں صرف قانون کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور اس میں سائنس پڑھانے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، انجینئرنگ میں صرف اس سے متعلقہ مضامین کی تعلیم ہوتی ہے اور اس میں قانون پڑھانے کا کوئی تقاضا نہیں ہوتا، اور میڈیکل کالج میں صرف طب سے متعلقہ مضامین شامل نصاب ہوتے ہیں اور اس میں انجینئرنگ کے مضامین کی تعلیم کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح دینی تعلیم بھی ایک مستقل شعبہ ہے اور بنیادی تعلیم کی حد میٹرک ہو یا ایف اے، اس کے بعد دینی علوم کے نصاب میں دیگر شعبوں کے مضامین شامل کرنے کا مطالبہ ہمارے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے لاء کالج میں سائنس پڑھانے کا مطالبہ کیا جائے یا میڈیکل کالج میں قانون پڑھانے کا تقاضا کیا جائے۔

اس سوال کے جواب میں تیسری گزارش ذرا تلخ سی ہے لیکن اس موقع پر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے محترم گورنر پنجاب جنرل (ر) خالد مقبول گزشتہ دنوں جامعہ اشرفیہ لاہور میں تشریف لے گئے اور اساتذہ و طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے ہم معاصر اقوام کے سامنے ذلیل ہو رہے ہیں اس لیے دینی مدارس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس کے جواب میں راقم الحروف نے ایک مضمون میں تفصیل کے ساتھ گزارش کی کہ ان کے اس ارشاد سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اسی کی مسلسل مار کھا رہے ہیں

لیکن اس کا ذمہ دار دینی مدارس کو قرار دینے اور ان سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دینے کے تقاضے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر قوتوں سے بہت زیادہ پیچھے رہ گئے ہیں اور اس کا احساس ان لوگوں کو زیادہ ہے جو مسلمانوں کے عقیدہ و ثقافت کے تحفظ کی جنگ میں مغرب کے مقابلہ میں عملی طور پر صف آرا ہیں۔ اور صرف ایک مثال سے اس صورتحال کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ آج سے ایک صدی قبل اللہ تعالیٰ نے ہمارے زوال و ادبار کے دور میں ہمیں خلیج عرب میں تیل کے چشموں کی عظیم دولت سے نوازا تھا مگر ہماری نااہلی کی صورتحال یہ تھی کہ:

- ہم زمین کھود کر تیل نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے،
- تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی اہلیت ہم میں نہیں تھی،
- اور ریفائن کرنے کے بعد اسے دنیا میں بیچنے یعنی مارکیٹنگ کی صلاحیت سے بھی ہم بے بہرہ تھے۔

چنانچہ ہم نے اپنی نااہلی کو دور کرنے اور ان چیزوں کی صلاحیت حاصل کرنے کے بجائے اس کام کے لیے مغربی ماہرین کو بلایا، ماہرین آئے، ان کے بعد مغرب کی کمپنیاں آئیں، پھر دولت سمیٹنے کے لیے مغرب کے بینک آگئے، ان کے پیچھے کنٹرول حاصل کرنے کے لیے سفارت کاروں اور سیاست کاروں نے چکر لگانا شروع کیے، اور آخر میں مغربی ممالک کی فوجیں آگئیں جو تیل کے چشموں کا گھیرا ڈالے بیٹھی ہیں۔ زمین ہماری ہے، چشمے ہمارے ہیں اور تیل ہمارا ہے لیکن کنٹرول مغربی کمپنیوں کا ہے اور تیل سے حاصل ہونے والی دولت مغربی بینکوں میں ہے جو ہماری نااہلی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ نہ دینے کا نتیجہ ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہم آج بھی پون صدی گزر جانے کے باوجود ان تینوں صلاحیتوں سے کورے ہیں جبکہ ابھی چند روز قبل امریکی وزارت دفاع کی پینٹاگون میں دی جانے والی ایک بریفنگ میں واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ اگر سعودی عرب نے امریکی ہدایات و احکام پر پوری طرح عمل نہ کیا تو تیل کے چشموں پر براہ راست قبضہ کیا جا سکتا ہے اور مغربی ملکوں میں سعودی عرب کے اثاثے ضبط اور مغربی ملکوں میں اس کے اکاؤنٹس منجمد کیے جا سکتے ہیں۔

اس صورتحال کا دکھ اور تکلیف ہم دینی حلقوں سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے لیکن اس بات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کے

دوسری قوموں سے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری کس پر ہے اور اس میں دینی مدارس کا قصور کیا ہے؟ ۱۸۵۷ء میں دہلی پر تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد جب متحدہ ہندوستان میں ہمارے صدیوں سے چلے آنے والے نظام تعلیم کو کلیتاً ختم کر دیا گیا اور تمام تر تعلیمی اور تہذیبی نظام کو تلپٹ کر کے رکھ دیا گیا تو اس وقت تعلیمی محاذ پر دو طبقے سامنے آئے:

- ایک علماء کرام کا گروہ تھا جس نے مسجد و مدرسہ کو آباد رکھنے، قرآن و سنت کی تعلیم کا سلسلہ باقی رکھنے، مسلمانوں کے عقیدہ و اعمال کے تحفظ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا تسلسل جاری رکھنے کی ذمہ داری قبول کی اور اس کے لیے کسی قسم کے ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون سے بے نیازی اختیار کرتے ہوئے عام مسلمانوں کے رضاکارانہ تعاون سے دینی مدارس کے آزادانہ نظام کی بنیاد رکھی۔
- جبکہ دوسری طرف انگریزی زبان اور سائنس و ٹیکنالوجی جیسے جدید علوم کی ترویج و تعلیم کے لیے ایک دوسرا طبقہ سامنے آیا جس نے سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر علوم میں مسلمانوں کو دوسری اقوام کے برابر لانے کی ذمہ داری قبول کی اور ایک مستقل نظام تعلیم کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اس نظام کا آغاز بھی رضاکارانہ چندہ سے ہوا تھا لیکن اسے بتدریج ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون حاصل ہوتا چلا گیا اور بہت جلد ریاست و حکومت نے اس نظام کی تمام تر ذمہ داری اور اخراجات اپنے کھاتے میں ڈال لیے۔

دینی مدارس نے اپنا نظام عام مسلمانوں کے چندہ سے چلایا اور کسی حکومت سے نہ مالی امداد طلب کی اور نہ ہی کسی حکومت کی مالی مدد اس درجہ میں قبول کی کہ اس پر مدارس کے نظام کا انحصار ہو جائے۔ علماء کرام نے اپنی عزت نفس کی پروا نہ کرتے ہوئے زکوۃ مانگی، صدقات مانگے، خیرات مانگی، عطیات مانگے، حتیٰ کہ ایک ایک دروازے پر دستک دے کر روٹیاں مانگیں۔ میں نے خود اپنے طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے مختلف محلوں میں گھروں سے روٹیاں مانگی ہیں، ہم چند طالب علم گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کر روٹیاں مانگ کر لاتے تھے اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے سب طلبہ وہ روٹیاں کھا کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ برصغیر کے طول و عرض کے اکثر مدارس میں ایک عرصہ تک جاری رہا اور

اس طریقہ سے دینی مدارس نے نہ صرف عام مسلمانوں تک قرآن وحدیث کی تعلیم کو پہنچایا بلکہ ان کی مسجدیں اور مدرسوں کو آباد رکھا، ملک بھر کی لاکھوں مساجد میں نماز پڑھانے والے امام مہیا کیے، قرآن کریم کی تعلیم دینے والے اور رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن کریم سنانے والے لاکھوں حافظ اور قاری فراہم کیے، دینی علوم کی تعلیم دینے والے لاکھوں مدرسین تیار کیے، مسائل بتانے والے ہزاروں مفتی پیدا کیے، خطبات دینے والے خطیب، مقرر اور واعظ تیار کیے، کتابیں لکھنے والے مصنفین دیے، دنیا بھر میں دین اسلام کی دعوت دینے والے لاکھوں مبلغین بھیجے اور اس سب سے بڑھ کر میدان جنگ میں کفر وظلم کے خلاف ہتھیار اٹھا کر جنگ کرنے والے ہزاروں مجاہدین بھی ان مدارس نے فراہم کیے۔

اس لیے اپنی ذمہ داری اور مشن کے حوالے سے دینی مدارس پر کوتاہی کا کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ملک کے کسی حصے میں نماز پڑھانے کے لیے امام میسر نہیں ہے، جمعہ پڑھانے کے لیے خطیب نہیں مل رہا، قرآن کریم پڑھانے والا قاری اور رمضان المبارک میں قرآن کریم سنانے کے لیے حافظ موجود نہیں ہے، دینی علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے مدرسین کی کمی ہے، مسئلہ بتانے والے مفتی حضرات کا فقدان ہے، یا دین کی دعوت دینے والے مبلغ کی آواز نہیں پہنچ رہی تو اس کے لیے دینی مدارس کو مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے اور ان کی کوتاہی شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری دینی مدارس پر ڈالنا انصاف کی بات نہیں ہے، اس کے بارے میں ان لوگوں سے دریافت کیجیے جنھوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی اور سائنس وٹیکنالوجی میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے برابر لانے کا عہد کیا تھا۔ جبکہ اس کے لیے کم از کم ایک صدی سے انہیں ریاستی وسائل میسر چلے آرہے ہیں اور قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ ان کے لیے وقف ہوتا ہے، ان سے پوچھیے کہ وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں کے برابر لانے میں کیوں کامیاب نہیں ہوئے؟ بلکہ میری گزارش ہے کہ اس مقصد کے لیے قومی تعلیمی کمیشن قائم کیا جائے جو اس بات کا جائزہ لے کہ ریاستی نظام تعلیم ملی اور قومی مقاصد کے حصول میں کیوں ناکام رہا ہے، اس کی ذمہ داری کا تعین کیا جائے اور اس عظیم ناکامی کی تلافی کے لیے اقدامات و تجاویز طے کی جائیں۔

چنانچہ میں نے گورنر پنجاب سے اپنے مضمون میں گزارش کی کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں قوم کے پیچھے رہ جانے کا رونا ضرور روئیں اور ان علوم کی طرف توجہ کی تلقین بھی ضرور کریں لیکن اس شکوہ اور تلقین کی جگہ جامعہ اشرفیہ نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی ہے، وہاں کھڑے ہو کر یہ گلے شکوے دہرائیں اور اپنی ناکامی کی سیاہی غریب مولوی کے چہرے پر ملنے کی کوشش نہ کریں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب ملک کے دیگر ہزاروں تعلیمی ادارے حکومتی کنٹرول میں چل رہے ہیں تو دینی مدارس کو سرکاری نظام وکنٹرول کے دائرہ میں آنے سے کیوں انکار ہے؟ اس کے جواب میں دو باتیں عرض کی جا رہی ہیں، ایک تو اصولی بات ہے اور دوسری واقعاتی۔

اصولی بات یہ ہے کہ تعلیم صرف ایک پیشہ وارانہ کام نہیں بلکہ مشن ہے جس کے کچھ اہداف ہوتے ہیں اور جس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان مشرق اور مغرب جیسی دوری ہے اور دونوں کا ہدف اور ٹارگٹ ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہے۔ اس لیے دینی مدارس کے نظام کو عملاً سیکولر ریاستی تعلیمی نظام کے تابع کرنے کا مطلب اس ہدف ومشن اور مقصد سے دستبرداری ہوگا جس کے لیے دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اگر ریاستی نظام تعلیم اپنا قبلہ درست کرے جو ایک نظریاتی اسلامی ریاست اور حکومت قائم ہونے کے بعد ہی ممکن ہے تو ایک خالص اسلامی نظریاتی ریاست وحکومت کے نظام کی بالادستی قبول کرنے سے دینی مدارس کو قطعی طور پر کوئی انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن سیکولر اہداف اور پالیسیاں رکھنے والے ریاستی نظام کے کنٹرول کو قبول کرنا دینی مدارس کے لیے اپنے بنیادی مشن اور ہدف سے محروم ہو جانا ہوگا اس لیے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات واقعاتی ہے جو اس اصولی گزارش کی تصدیق کرتی ہے کہ بعض دینی مدارس کو سرکاری نظام کے تحت چلانے کا تجربہ ہم اس سے قبل کر چکے ہیں جو ناکام ثابت ہوا ہے۔ صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں محکمہ اوقاف قائم ہوا تھا جس نے ملک بھر میں ہزاروں مساجد، مزارات اور ان کے ساتھ بیسیوں مدارس کو تحویل میں لے لیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ان کا نظام صحیح نہیں ہے اور ان کی مالیات میں گڑبڑ ہوتی ہے اس لیے انہیں سرکاری تحویل میں لے لیا گیا ہے تاکہ ان کے نظام کو زیادہ بہتر طریقہ سے چلایا جائے۔ لیکن عملاً یہ ہوا کہ نظام

پہلے سے بھی خراب ہوگیا جس کا مشاہدہ محکمہ اوقاف کے زیر انتظام مساجد اور عام مسلمانوں کی آزادانہ کمیٹیوں کے تحت قائم مساجد کے نظاموں کا کسی بھی شعبہ میں تقابل کر کے کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ محکمہ اوقاف نے کتنے ہی دینی مدارس بھی اس وقت تحویل میں لیے جن کا اب وجود تک باقی نہیں رہا اور اس کی ایک واضح مثال اوکاڑہ کے گول چوک کی جامع مسجد میں قائم جامعہ عثمانیہ کی شکل میں موجود ہے جس کا مشاہدہ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت جاکر کرسکتا ہے۔ محکمہ اوقاف کی تحویل میں جانے سے قبل یہ مدرسہ ملک کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا اور اس میں سینکڑوں طلبہ ہاسٹل میں رہتے تھے مگر اب وہاں کوئی درسگاہ نہیں ہے جبکہ مدرسہ کے کمرے محکمہ اوقاف نے مختلف اداروں اور لوگوں کو کرائے پر دے رکھے ہیں۔

صدر محمد ایوب خان مرحوم ہی کے دور میں ریاست بہاولپور باقاعدہ طور پر پاکستان میں ضم ہوئی تو وہاں کا سب سے بڑا دینی مدرسہ جامعہ عباسیہ تھا جسے محکمہ تعلیم نے اپنی تحویل میں لیا اور اسے اسلامی یونیورسٹی کا درجہ دیا۔ دینی نصاب تعلیم اور سرکاری نصاب کو ملا کر ایک مشترکہ نصاب تعلیم مرتب کیا گیا، علامہ شمس الحق افغانی، مولانا سید احمد سعید کاظمی، مولانا عبد الرشید نعمانی جیسے بہت سے علمائے کرام کو مختلف شہروں سے اٹھا کر بہاولپور میں بٹھایا گیا اور ایک ماڈل دار العلوم یا ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا اعلان کیا گیا۔ لیکن آج اس کی حالت یہ ہے کہ دینی نصاب تعلیم کے مضامین اس کے نصاب سے بتدریج خارج ہوچکے ہیں اور اس کا نصاب وہی ہے جو ملک کی دیگر سرکاری یونیورسٹیوں کا ہے جبکہ اس کے معیار کا یہ حال ہے کہ جس طالب علم کو ملک کی کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا اس کے لیے اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔

محکمہ تعلیم اور محکمہ اوقاف دونوں کے ہاتھوں مختلف دینی مدارس کا یہ حشر دیکھنے کے بعد بھی اگر دینی مدارس سے یہ توقع رکھی جارہی ہے کہ وہ سرکاری کنٹرول کو قبول کرلیں گے اور محکمہ تعلیم یا محکمہ اوقاف کے نظام میں شامل ہونے کے بعد ان کی حالت پہلے سے بہتر ہوگی تو اسے سادگی اور بھول پن کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ اس لیے بڑے ادب سے گزارش ہے کہ ہم ماضی قریب میں ماڈل دار العلوم اور سرکاری نظام کا تلخ تجربہ کرچکے ہیں اور اس تجربہ کو دہرانے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ مومن کا وصف یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ جیسا کہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اس بات پر تلی بیٹھی ہے اور ریاستی ادارے بھی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ دینی مدارس کو اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے سنہرے عنوان اور انہیں جدید وسائل اور سہولتیں فراہم کرنے کی خوشنما ترغیب کے ساتھ سرکاری کنٹرول میں لایا جائے، تو اگر خدانخواستہ یہ عناصر اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر آزادانہ دینی تعلیم کا مستقبل کیا ہوگا؟

اس کے جواب میں گزارش ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ طاقت کا استعمال اور چیز ہے اور فکر و عقیدہ کو تبدیل کرنا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ آج کی عالمی اسٹیبلشمنٹ اور اس کا لیڈر امریکہ طاقت اور جبر و تشدد کے ذریعے جسموں کو ختم کر سکتا ہے، وہ ڈیزی کٹر کی بارش کر سکتا ہے، بلڈنگوں اور آبادیوں کو تہس نہس کر سکتا ہے لیکن کسی کے ذہن و عقیدہ کو تبدیل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ گزشتہ دنوں امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول پاکستان تشریف لائے، آنے سے قبل ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ وہ پاکستانی معاشرے کو سیکولر بنانے کے ایجنڈے پر بھی بات کریں گے۔ ایک مضمون میں راقم الحروف نے ان سے گزارش کی کہ وہ اس پر اپنا وقت ضائع نہ کریں، ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان سے قبل اب سے دو صدیاں پہلے برطانیہ بھی اسی ایجنڈے پر جنوبی ایشیا میں آیا تھا، اس نے ہزاروں دینی مدارس بند کر دیے تھے، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی تھیں، بلڈنگیں قبضہ میں لے لی تھیں اور بہت سی عمارات بلڈوز کر دی تھیں، ہزاروں علماء کرام کو شہید کر دیا تھا اور ہزاروں کو جیل میں ڈال دیا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شہادت کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک ایک سو نوے برس برطانیہ یہاں اسی ایجنڈے پر کام کرتا رہا لیکن آج نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ مدارس کی تعداد پہلے سے زیادہ ہے۔ مولوی، حافظ، قاری، خطیب، مدرس، مبلغ اور مجاہد اپنی تعداد اور کارکردگی دونوں حوالوں سے پہلے سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔ اسی لیے کسی بھی طاقتور کو یہ غلط فہمی ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ وہ طاقت اور جبر کے ذریعے دینی تعلیم کو ختم کر سکتا ہے اور بلڈنگوں پر قبضہ کر کے، علماء کرام کو گرفتار کر کے یا ان کے ایک حصے کو ملازمتوں اور سہولتوں کے نام پر جال میں پھانس کر دینی تعلیم اور اس کے آزادانہ کردار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ بات بطور خاص قابل توجہ ہے کہ دینی مدرسہ بلڈنگ یا زمین کا نام نہیں ہے بلکہ مولوی اور سوسائٹی کے تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق اگر قائم ہے تو دینی مدرسہ بھی قائم ہے،

اسے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ اس پر میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں مولوی اور سوسائٹی کا تعلق قائم ہے، یہ تعلق لین کا بھی ہے اور دین کا بھی ہے۔ دین کا تعلق یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں کسی شخص کو اگر نماز پڑھتے ہوئے کسی بات پر شک ہو گیا ہے کہ نماز خراب تو نہیں ہوگئی، تو اس کا یہ شک مولوی نے ہی دور کرنا ہے۔ یہ شک عام مسلمان کو ہوا ہے یا پارلیمنٹ کے ممبر کو ہوا ہے، ہائی کورٹ کے جسٹس کو ہوا ہے یا پولیس کے آئی جی کو ہوا ہے، اسٹیٹ بینک کے گورنر کو ہوا ہے یا معاشرے میں کسی طبقہ کے کسی بھی شخص کو نماز، روزہ، زکوۃ، حج یا کسی دینی معاملہ میں اگر شک ہو گیا ہے تو اس کا شک بہر حال کسی مولوی صاحب سے پوچھ کر ہی دور ہوگا، اس کے سوا اس کی تسلی کی اور کوئی صورت نہیں۔ حتی کہ اگر کوئی صاحب سارا دن دفتر یا دکان میں کرسی پر بیٹھ کر مولوی کو برا بھلا کہتے رہے ہیں، مولوی کے عیوب اور اس کمزوریاں بیان کرتے رہے ہیں، اور غریب مولوی کو بات بات پر کوستے رہے ہیں مگر شام کو گھر گئے تو کسی بات پر اہلیہ محترمہ سے تو تکار ہوگئی، غصہ میں منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل گئی اور شک میں پڑ گئے کہ اب ہم میاں بیوی رہے یا نہیں، تو ان صاحب کا یہ شک بھی کسی مولوی نے ہی دور کرنا ہے، وہ اس شک سے نجات پانے کے لیے کسی تھانے میں نہیں جائیں گے اور نہ ہی پارلیمنٹ یا ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے بلکہ اسی مولوی کے حجرے میں جائیں گے جسے سارا دن بیٹھے کوستے رہے ہیں۔

یہ تو مولوی کا سوسائٹی کے ساتھ دین کا تعلق ہے اور یہ وہ چیز ہے جو مولوی معاشرے کو دیتا ہے۔ دوسرا تعلق لین کا ہے کہ سوسائٹی مولوی کو کیا دیتی ہے؟ کسی گھر میں کوئی مصیبت یا پریشانی آگئی اور صاحب خانہ نے یہ حدیث مبارکہ سن رکھی ہے کہ صدقہ دینے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور پریشانیاں دور ہوتی ہیں، ان صاحب نے صدقہ دینے کا ارادہ کیا اور شہر کی بکرا منڈی میں گئے، وہاں سے انہوں نے صدقہ دینے کے لیے بکرا خریدا اور اس کی رسی پکڑے آرہے ہیں؟ کیا خیال ہے وہ یہ بکرا کسی تھانے میں پہنچائیں گے؟ پارلیمنٹ میں لے جائیں گے؟ ہائی کورٹ کے دروازے پر باندھیں گے؟ یا سیکرٹریٹ کے کسی افسر کی نذر کریں گے؟ نہیں بلکہ وہ کسی مسجد یا مدرسہ کا رخ کریں گے جہاں کوئی مولوی دس بارہ طلبہ کو پڑھا رہے ہوں اور بکرا ان کے سپرد کر کے ہی ان صاحب کو اطمینان ہوگا کہ ان کا صدقہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔ یہ بکرا مولوی کا حق ہے اور مولوی نے ہی کھانا ہے۔ اس لیے میں

عرض کیا کرتا ہوں کہ اس معاشرے میں دین کا مسئلہ صرف مولوی نے بتانا ہے اور صدقہ کا بکرا مولوی نے ہی کھانا ہے، اس لیے جب تک مولوی اور سوسائٹی کا یہ دوطرفہ تعلق قائم ہے ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور اس کا لیڈر امریکہ جو بس میں ہو کر لیں دینی مدرسہ ہمارے معاشرہ میں بند نہیں ہو سکتا۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم پر روزگار کا تحفظ اور ملازمت کی گارنٹی موجود نہیں ہے اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو نوجوان خود کو وقف کرتا ہے اس کے بارے میں عام طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ کرے گا کیا؟ مولوی تو بن جائے گا لیکن کھائے گا کہاں سے؟ اس کے جواب میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

ایک یہ کہ ایسا کہنے والوں سے میرا سوال ہے کہ کیا آج تک کسی مولوی یا حافظ کو انہوں نے بھوکا مرتے دیکھا ہے؟ کسی مولوی، حافظ یا قاری کو بھوک اور فاقہ کی وجہ سے خودکشی کرتے دیکھا ہے؟ یا پاکستان کی پوری تاریخ میں مولوی، قاریوں یا حافظوں کا کوئی جلوس سڑک پر آیا ہے کہ ان کا گزارہ نہیں ہوتا ان کی تنخواہیں بڑھائی جائیں اور انہیں سہولتیں فراہم کی جائیں۔ کبھی مولویوں یا قاریوں نے ہڑتال کی ہو کہ وہ تنخواہیں نہ بڑھانے کی وجہ سے نماز پڑھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ اکا دکا شخصی واقعات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مجموعی طور پر طبقاتی حیثیت سے دینی حلقوں میں کبھی اس حوالہ سے ہڑتال، جلوس، قرارداد یا مطالبات کی فضا دیکھنے میں نہیں آئی۔ میرے ان سوالات کا مطلب یہ ہے کہ جب مولوی خود اپنے افلاس، فقر اور محتاجی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ رہا تو کسی دوسرے کو اس کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

دوسری گزارش ہے کہ اس صورتحال کی وجہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دین کی برکت سے مولوی، بلکہ دین اور مسجد سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو ضروریات کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے اور یہ عملی تجربہ و مشاہدہ کی بات ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بحمد اللہ تعالیٰ بھوکا نہیں مرتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مولوی اور حافظ کو صرف تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ اس بات کی ذہنی تربیت بھی دی جاتی ہے کہ نماز پڑھانا اور قرآن کریم کی تعلیم دینا اس کا پیشہ نہیں بلکہ مشن اور دینی خدمت ہے۔ اس لیے وہ قناعت کرتا ہے، ضروریات کو ضروریات تک محدود رکھتا ہے اور اتنے تھوڑے وظیفہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے بلکہ عملاً کر کے دکھا دیتا ہے جتنے وظیفہ میں کسی

دوسرے شعبہ کا کوئی فرد اتنا کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر آپ نے مشاہدہ کرنا ہو تو اپنے قریب ہی کسی مسجد کے امام یا کسی مدرسہ کے مدرس سے اس کی تنخواہ اور سہولتوں کے بارے میں پوچھ لیں اور اس کی ڈیوٹی کی نوعیت اور اوقات کار کے بارے میں بھی دریافت کر لیں آپ کو صحیح طور پر اندازہ ہو گا کہ غریب مولوی طعنہ، تحقیر اور تذلیل کے ہر وار کو برداشت کرتے ہوئے کتنے معمولی وسائل کے ساتھ معاشرہ کی کتنی بڑی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔

پانچواں سوال موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش کے حوالہ سے دینی مدارس کے موقف اور کردار کے بارے میں ہے اور میں اس پس منظر میں آج کی عالمی اسٹیبلشمنٹ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ بات درست ہے کہ آپ لوگوں کو دینی مدرسہ کے کردار اور اس کے وجود سے سخت تکلیف ہے اور تم بجا طور پر یہ سمجھتے ہو کہ دنیا بھر میں انسانی معاشرہ پر مذہب کے اثرات کو ختم یا محدود کر دینے میں گزشتہ دو صدیوں کے درمیان تم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں حتیٰ کہ اسلام کے سوا ہر مذہب کے پیروکاروں کو تم نے مذہب کے اجتماعی کردار سے دستبرداری پر آمادہ کر لیا ہے، ان کامیابیوں کے عمل کو اسلامی معاشرہ میں آکر بریک لگ گئی ہے اور تم دنیا کے کسی بھی حصے میں عام مسلمانوں کو دین اسلام کی بنیادوں سے ذہنی طور پر دستبردار کرانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ جیسا کہ آج کی صورتحال یہ ہے کہ مسلمان دین سے عملاً کتنا دور کیوں نہ ہو اور دین کی کسی ایک بات پر بھی اس کا عمل نہ ہو لیکن اس کی ذہنی کمٹمنٹ قرآن کریم کے ساتھ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ آج بھی بے لچک ہے۔ آپ عملی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے، دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی عام مسلمان سے ہاں یا ناں کے طور پر سوال کیجئے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے اور آج کی عالمی برادری اس کے خلاف یہ تقاضا کر رہی ہے، یا جناب نبی اکرمؐ کی یہ تعلیم ہے اور اقوام متحدہ کی فلاں قرارداد میں اس کے برعکس یہ تقاضا ہے، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس مسلمان کا اسلام کی کسی بات پر عمل ہو یا نہ ہو لیکن اس سوال کے جواب میں وہ کوئی توقف کیے بغیر دوٹوک جواب دے گا کہ عالمی برادری اور اقوام متحدہ کا تقاضا غلط ہے اور قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد بالکل صحیح اور بجا ہے۔

قرآن و سنت کے ساتھ عام مسلمان کی یہ بے لچک کمٹمنٹ آج کی ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور عالمی استعمار کے لیے چیلنج بنی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ کے سابق صدر کلنٹن کو ابھی چند ماہ

قبل مکہ مکرمہ کے پڑوس جدہ میں ورلڈ اکنامک فورم سے خطاب کرتے ہوئے سعودی حکمرانوں سے یہ کہنا پڑا ہے کہ اگر تم دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں ہمارے ساتھ مخلص اور سنجیدہ ہو تو تمہیں اپنے نظام تعلیم میں تبدیلی کرنا ہوگی اور دینی امور کم کرنے کے ساتھ ساتھ عقیدہ کی تلقین بھی ختم کرنا ہوگی۔ ہم عالمی استعمار کی اس تکلیف کو سمجھتے ہیں کہ مذہب اور دین کے خلاف اس کی صدیوں کی مہم اسلامی معاشرہ میں آکر ناکامی سے دوچار ہو رہی ہے جس کی وجہ دینی تعلیم اور دینی درسگاہ ہے۔ اور اسی وجہ سے ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور اس کی ہدایات پر چلنے والی مسلم ریاستیں دینی مدارس کے آزادانہ کردار کو ختم کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ لیکن ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے میرا سوال یہ ہے کہ تم دینی تعلیم کو ختم کرنے کا تجربہ کتنی بار دہراؤ گے؟ گزشتہ دو صدیوں میں تم نے عالمی سطح پر اس کام کے لیے تین تجربے کیے ہیں اور تینوں میں تمہیں ناکامی ہوئی ہے۔

تم نے سب سے پہلا تجربہ جنوبی ایشیا میں کیا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ برطانوی حکومت نے اس خطہ میں ہزاروں دینی مدارس کو بند کیا، جائیدادیں ضبط کیں، عمارات مسمار کیں اور پڑھنے والوں کو ہزاروں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن تمام تر جبر کے باوجود دینی تعلیم موجود ہے بلکہ پہلے سے زیادہ ہے۔

تم نے دوسرا تجربہ ترکی میں کیا، وہاں خلافت کا خاتمہ کرایا، عربی زبان ختم کرائی، رسم الخط تبدیل کرایا، عدالتوں سے شرعی قوانین ختم کرائے، مدارس بند کرائے، قرآن کریم اور اذان تک کو عربی میں پڑھنا ممنوع قرار دلوایا، شرعی پردہ کو قانوناً ختم کرایا، حتیٰ کہ ایک خاتون منتخب رکن پارلیمنٹ کو صرف سکارف سر پر لینے کی وجہ سے پارلیمنٹ کی رکنیت سے محروم ہونا پڑا۔ لیکن ان تمام اقدامات اور جبر و تشدد کے باوجود پون صدی گزر جانے کے بعد بھی ترکی کے عام مسلمانوں میں نہ صرف دینی تعلیم موجود ہے بلکہ دینی روایات و شعائر کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں دینی اقدار کے دوبارہ غلبہ کی خواہش بھی پائی جاتی ہے جس پر قابو پانے کے لیے تمہارے پاس فوجی جبر کے سوا کوئی راستہ موجود نہیں۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ترکی کے عوام کو فوجی جبر سے آزاد کر کے آج بھی کھلی فضا میں اپنی حکومت منتخب کرنے کا موقع دیا جائے تو وہی لوگ منتخب ہوں گے جو اسلامی اقدار پر یقین رکھتے ہیں اور سوسائٹی میں اسلام کے اجتماعی کردار کی بحالی کے خواہش مند ہیں اس لیے ترکی میں بھی تمہارا تجربہ ناکام ثابت ہوا۔

تم نے مسلم معاشرہ کو دینی تعلیم سے محروم کرنے کا تیسرا تجربہ وسطی ایشیا میں کیا جہاں بخارا، تاشقند اور سمرقند جیسے اسلامی تہذیب کے مراکز میں ہزاروں مساجد و مدارس کو جبرا بند کر دیا گیا، مسجدوں اور دینی درسگاہوں کو تالے لگ گئے، میں نے تاشقند میں وہ مسجد دیکھی ہے جو چالیس سال تک سیمنٹ کا گودام رہی ہے اور سمرقند کی اس جامع مسجد میں ایک رات گزاری ہے جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس کا مین ہال نعوذ باللہ نصف صدی تک سینما ہال بنا رہا ہے۔ ہم نے خرتنگ میں امام بخاریؒ کے مزار سے باہر ایک بڑھیا خاتون کو قرآن کریم کا نسخہ دیا تو وہ اسے سینے سے لگا کر زاروقطار رونے لگی کہ ستر سال کے بعد قرآن کریم کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ جہاں جبر و تشدد کا یہ ماحول تھا کہ تاشقند کی قوقل تاش کی مسجد کے امام نے بتایا کہ ہم اگر دو بھائی اپنے گھر کے صحن میں نماز پڑھتے تھے تو ایک بھائی دروازے پر پہرا دیتا کہ کوئی شخص ہمیں نماز پڑھتے دیکھ نہ لے۔ لیکن پون صدی کے اس خوفناک ریاستی جبر کے باوجود وسطی ایشیا میں دینی تعلیم آج بھی موجود ہے اور میں نے ان ہزاروں خفیہ درسگاہوں میں سے ایک کی زیارت کی ہے جو زیر زمین تہہ خانوں میں قائم تھیں اور جہاں رات کے پچھلے پہر طلبہ خفیہ طور پر آکر وہی کتابیں اور علوم پڑھتے تھے جو ہمارے دینی مدارس میں رائج ہیں اور جن کی تعلیم حاصل کر کے حافظ، قاری اور عالم دین بنتے ہیں۔ چنانچہ آج صورتحال یہ ہے کہ وسطی ایشیا میں سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد مسلم ریاستیں آزاد ہوئی ہیں اور ہزاروں مساجد و مدارس کے تالے کھلے ہیں تو انہیں نماز پڑھانے اور قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لیے باہر سے افراد درآمد نہیں کرنا پڑے بلکہ خفیہ درسگاہوں میں پڑھنے والے ہزاروں طلبہ نے ہی مساجد و مدارس کا نظام سنبھال لیا اور عملاً صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ زیر زمین خفیہ تہہ خانوں میں چلنے والے مدارس زمین کے اوپر ان مساجد و مدارس میں واپس آ گئے ہیں جنہیں ساٹھ یا ستر سال کے بعد آزادی نصیب ہوئی۔

اس لیے میں عالمی استعمار اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے دوٹوک عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جبر و تشدد کے ایک نئے دور سے بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا، اس سے ہماری مشکلات میں یقیناً اضافہ ہوگا اور آزمائش کے نئے مراحل ہمارے لیے بلاشبہ صبر آزما ہوں گے لیکن اس سے دینی تعلیم کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آئے گا، وہ باقی رہے گی اور قیامت تک باقی رہے گی اس لیے کہ یہ خدا کا دین ہے اور اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کا دین ہے جس نے قیامت تک باقی رہنا ہے اور محفوظ رہنا ہے۔ یہ ہمارے عقیدہ کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو قیامت تک دنیا میں محفوظ رکھنے کا اعلان فرمایا اور وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ جب وہ قرآن کریم اور اس کی تعلیم کی حفاظت کرے گا تو اس کے اسباب کی بھی حفاظت کرے گا۔ ظاہر بات ہے کہ مجھے اگر دودھ کی حفاظت کے لیے کہا جائے گا تو میں صرف دودھ کی حفاظت نہیں کروں گا بلکہ اس پیالے کی حفاظت بھی کروں گا جس میں وہ دودھ ہے، کیونکہ عالم اسباب میں اس پیالے کی حفاظت سے ہی دودھ کی حفاظت بھی ہوگی۔ اس لیے یہ دینی مدارس قرآن کریم کی تعلیم کے اسباب ہیں جن کی حفاظت قرآن کریم کے ساتھ خود بخود ہوتی رہے گی بلکہ یہ تو کشتیٔ نوح کی حیثیت رکھتے ہیں اور فتنوں اور آزمائشوں کے اس ہمہ گیر سیلاب اور طوفان میں وہی شخص نجات حاصل کر سکے گا جو اس کشتی میں سوار ہو جائے گا۔ اس لیے جہاں میں عام مسلمانوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے اس کشتی میں آجائیں اس کے بغیر وہ ایمان نہیں بچا سکیں گے، اسی طرح ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے بھی میری گزارش ہے کہ وہ حقائق کو تسلیم کرے اور چٹان کے ساتھ ٹکراتے رہنے کی بجائے اس چٹان کا وجود تسلیم کر لے۔

باقی رہی بات انسانی سوسائٹی کے لیے بہتر سسٹم اور نظام کی تو اس سے زیادہ یقین کے ساتھ ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ آج کی ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے بجائے نسل انسانی کے بہتر مستقبل کی ضمانت دینے والا نظام ہمارے پاس ہے۔ عالمی استعمار کے لیڈر چاہیں تو ہم اس پر ان کے ساتھ گفتگو کے لیے تیار ہیں مگر اس کے لیے انہیں محاذ آرائی ترک کر کے مذاکرات کی میز پر آنا ہوگا اور یہ تو بہرحال طے ہے، آج نہیں تو کل کیونکہ اس کے بغیر آج کی دنیا کے پاس کوئی متبادل راستہ اور چوائس موجود نہیں ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے منسوب آبدوز

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲ ستمبر ۲۰۰۲ء)

پاک بحریہ نے ملکی وسائل سے تیار ہونے والی پہلی آبدوز سمندر میں اتار دی ہے اور دفاعی ماہرین کا کہنا ہے کہ اس میں پاکستان کے سمندری دفاع کو تقویت حاصل ہوگی اور

بھارت کے لیے بحری کارروائیاں کرنا اب پہلے کی طرح آسان نہیں رہے گا۔ اس آبدوز کو صحابیٔ رسول حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے منسوب کرکے اس کا نام ”سعد“ رکھا گیا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ معروف صحابیٔ رسول ہیں، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، بڑے جرنیلوں میں سے ہیں، فاتح ایران ہیں اور اپنے دور کے بڑے تیر اندازوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ یہ ان دو خوش قسمت ترین صحابہ کرامؓ میں سے ایک ہیں جن کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ جملہ ادا ہوا کہ ”میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں“۔ ان میں سے ایک یہ سعدؓ ہیں جو غزوۂ احد میں جناب نبی کریمؐ کے ساتھ اس وقت بطور جان نثار کھڑے تھے جب کافروں نے آپ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ حضرت سعدؓ حضورؐ کی پشت پر کھڑے تیر اندازی کے ذریعے مزید دشمنوں کو قریب آنے سے روک رہے تھے۔ اس وقت جناب رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے یہ جملہ صادر ہوا کہ ”اے سعدؓ میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں، تیر اندازی جاری رکھو“۔ دوسرے حضرت زبیر بن العوامؓ ہیں، وہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، انہیں غزوۂ خندق کے موقع پر جناب نبی اکرمؐ نے دشمن کے کیمپ میں صورتحال معلوم کرنے کے لیے بھیجا، بڑے خطرناک حالات تھے، یہودی اپنے قلعہ میں مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف تھے، ایسے موقع پر ان کے علاقے میں جانا اور چل پھر کر صورتحال معلوم کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ چنانچہ حضرت زبیرؓ جب یہ ڈیوٹی ادا کرکے واپس آئے تو آنحضرتؐ نے انہیں بھی ان الفاظ کے ساتھ شاباش دی کہ ”میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں“۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا ایک دلچسپ واقعہ بخاری شریف میں اس حوالہ سے مذکور ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر یہ مکہ مکرمہ میں بیمار ہوئے اور بیماری اس قدر بڑھی کہ بظاہر بچنے کی امید باقی نہ رہی۔ انہیں دو باتوں کی فکر لاحق ہوئی۔ ایک یہ کہ ان کی اولاد میں اس وقت ایک لڑکی کے سوا کوئی وارث نہ تھا اور جائیداد خاصی تھی، انہیں فکر تھی کہ جائیداد کا کیا بنے گا؟ اور دوسری فکر یہ تھی کہ انہوں نے جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مکہ مکرمہ میں اپنا گھربار چھوڑ مدینہ منورہ ہجرت کی تھی اور اب مکہ مکرمہ میں موت آنے کی صورت میں انہیں یہ پریشانی تھی کہ اگر میں یہاں فوت ہوا اور یہیں دفن ہوگیا تو میری ہجرت کا کیا بنے گا، کیا میری ہجرت منسوخ اور باطل تو نہیں ہو جائے گی؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خیمے میں عیادت کے لیے تشریف لائے تو حضرت سعدؓ نے اپنی

دونوں پریشانیوں کا اظہار فرمایا اور عرض کیا کہ اگر میں اپنی جائیداد اللہ تعالی کی رضا کے لیے صدقہ کر دوں تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا؟ آنحضرتؐ نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا کہ کل جائیداد کے تیسرے حصے سے زیادہ تم صدقہ اور وصیت نہیں کر سکتے کیونکہ تمہارے دیگر ورثاء اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ تمہاری جو کمائی رشتہ داروں اور اولاد حتی کہ بیوی پر خرچ ہوگی تو اللہ تعالی کے ہاں وہ بھی صدقہ ہی شمار ہو گا۔ اس کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ ضروری نہیں کہ اسی مرض میں تمہاری وفات ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم خاصا عرصہ زندہ رہو، بعض قوموں کو تجھ سے نقصان پہنچے اور کچھ قوموں کو تم سے فائدہ حاصل ہو۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی جسے معجزات نبویؐ میں شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اس مرض سے صحتیاب ہوئے اور اس کے بعد خاصی دیر تک حیات رہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں کوفہ کے گورنر رہے، انہی کے بارے میں حضرت عمرؓ کو شکایت ملی کہ انہوں نے امیر المؤمنین کی ہدایات کے برعکس اپنے دروازے پر ڈیوڑھی بنوالی ہے اور حضرت عمرؓ کے حکم پر ان کے انسپکٹر پولیس حضرت محمد بن سلمہؓ نے اس ڈیوڑھی کو آگ لگا دی تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران ہیں۔ فارس کی سلطنت کو اللہ تعالی نے ان کے ہاتھ پر فتح کرا کر اسلامی قلمرو میں شامل فرمایا اور ایران کا نامور کمانڈر رستم انہی کے مقابلہ میں شکست کھا کر مارا گیا تھا۔ میں ایک عرصہ سے اپنے بیانات اور مضامین میں یہ عرض کرتا آرہا ہوں کہ ہمارا عجیب حال ہے کہ جس رستم نے مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائی اور میدان جنگ سے بھاگتا ہوا ایک مجاہد کے ہاتھوں قتل ہوا وہ آج ہمارے ہاں طاقت اور بہادری کا نشان ہے کہ جس کو ہم بڑا پہلوان کہنا چاہتے ہیں اسے ”رستم“ قرار دیتے ہیں کہ یہ رستم گوجرانوالہ ہے، یہ رستم پنجاب ہے اور یہ رستم پاکستان ہے۔ لیکن جس عظیم المرتبت جرنیل کے مقابلہ میں رستم نے شکست کھائی اس کا ہماری فوجی اصلاحات یا بہادری کے تمغوں میں کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے مجھے اس بات پر بہت خوشی ہوئی ہے کہ اسلامی تاریخ کے ایک بڑے جرنیل اور عظیم صحابیٔ رسول کے نام سے پاک بحریہ کی آبدوز کو منسوب کیا گیا ہے۔ یہ ایک عظیم مسلم جرنیل کو خراج عقیدت ہے جس سے پاک بحریہ کے نوجوانوں کی ذہن سازی

ہوگی، ماضی کے ساتھ ان کا رشتہ جڑے گا اور یقیناً ایک صحابیٔ رسول کے نام سے خیر و برکت بھی حاصل ہوگی۔

مگر اس حوالہ سے پاک بحریہ کے اعلیٰ حکام سے ایک گزارش کرنے کو جی چاہتا ہو کہ اسلامی تاریخ میں بحریہ کے بانی حضرت امیر معاویہؓ ہیں کہ ان کے دور میں سب سے پہلے بحری فوج تیار ہوئی، بحری بیڑا بنا، اس وقت کی سب سے بڑی بحری قوت سلطنت روما کے ساتھ بحری لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور جزیرہ قبرص فتح ہوا۔ اس لیے پاک بحریہ کا سب سے پہلا نشان اسلامی تاریخ کے حوالہ سے حضرت معاویہؓ کے نام پر ہونا چاہیے اور اسلامی سلطنت میں سب سے پہلا بحری بیڑا تیار کرنے والے عظیم جرنیل امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کو اس حوالہ سے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ بات تو بخاری شریف میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے امت میں پہلی بحری لڑائی کی پیش گوئی فرمائی تھی اور اس کا ہدف قسطنطنیہ کو بتاتے ہوئے اس کے تمام شرکاء کو جنتی قرار دیا۔ اور تاریخی طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ آنحضرتؐ کی یہ پیش گوئی حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں پوری ہوئی۔ اس لیے پاک بحریہ کے اعلیٰ حکام سے گزارش ہے کہ وہ اس پر غور فرمائیں اور ہماری تجویز یہ ہے کہ بحریہ کے حوالہ سے بہادری کا سب سے بڑا نشان حضرت معاویہؓ کے نام سے ''نشان معاویہؓ'' کے طور پر منسوب کیا جائے۔

حضرت سرفراز خان صفدرؒ کے دروس قرآن کی اشاعت کا آغاز

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اگست ۲۰۰۲ء)

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کو فرنگی استعمار سے آزادی دلانے کی جدوجہد میں گرفتار ہو کر مالٹا جزیرے میں تقریباً ساڑھے تین سال نظر بند رہے اور رہائی کے بعد جب دیوبند واپس پہنچے تو انہوں نے اپنے زندگی بھر کے تجربات اور جدوجہد کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے نزدیک مسلمانوں کے ادبار و زوال کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک قرآن پاک سے دوری اور دوسرا باہمی اختلافات و تنازعات، اس لیے امت مسلمہ کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے

یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کو عام کیا جائے اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد و مفاہمت کو فروغ دینے کے لیے محنت کی جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ بڑھاپے اور ضعف کا زمانہ تھا اور اس کے بعد جلد ہی وہ دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ان کے تلامذہ اور خوشہ چینوں نے اس نصیحت کو پلے باندھا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے نئے جذبہ و لگن کے ساتھ مصروف عمل ہو گئے۔ اس سے قبل حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالی اور ان کے عظیم المرتبت فرزندوں حضرت شاہ عبد العزیزؒ، حضرت شاہ عبد القادرؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن کریم کے فارسی اور اردو میں تراجم اور تفسیریں لکھ کر اس خطہ کے مسلمانوں کو توجہ دلائی تھی کہ ان کا قرآن کریم کے ساتھ فہم و شعور کا تعلق قائم ہونا ضروری ہے اور اس کے بغیر وہ کفر و ضلالت کے حملوں اور گمراہ کن افکار و نظریات کی یلغار سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے جبکہ حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ اور خوشہ چینوں کی یہ جدوجہد بھی اسی کا تسلسل تھی۔ بالخصوص پنجاب میں بدعات و اوہام کے سراب کے پیچھے بھاگتے چلے جانے والے ضعیف العقیدہ مسلمانوں کو خرافات و رسوم کی دلدل سے نکال کر قرآن و سنت کی تعلیمات سے براہ راست روشناس کرانا بڑا کٹھن مرحلہ تھا لیکن اس کے لیے جن ارباب عزیمت نے عزم و ہمت سے کام لیا اور کسی مخالفت اور طعن و تشنیع کی پروا کیے بغیر قرآن کریم کو عام لوگوں کی زبان میں ترجمہ و تفسیر کے ساتھ پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا، ان میں امام الموحدین حضرت مولانا حسین علی قدس اللہ سرہ العزیز آف واں بھچراں ضلع میانوالی، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز اور حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی نور اللہ مرقدہ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں جنہوں نے اس دور میں علاقائی زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر سے عام مسلمانوں کو روشناس کرانے کی مہم شروع کی جب عام سطح پر اس کا تصور بھی موجود نہیں تھا مگر ان ارباب ہمت کے عزم و استقلال کا ثمرہ ہے کہ آج پنجاب کے طول و عرض میں قرآن کریم کے دروس کی محافل کو شمار کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی ذات گرامی بھی ہے جنہوں نے ۱۹۴۳ء میں گکھڑ کی جامع مسجد بوہڑ والی میں صبح نماز کے بعد روزانہ درس قرآن کریم کا آغاز کیا اور جب تک صحت نے اجازت دی، کم و بیش

پچپن برس تک اس سلسلہ کو پوری پابندی کے ساتھ جاری رکھا۔ انہیں حدیث میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے اور ترجمہ و تفسیر میں امام الموحدین حضرت مولانا حسین علی سے شرف تلمذ و اجازت حاصل ہے اور انہی کے اسلوب و طرز پر انہوں نے زندگی بھر اپنے تلامذہ اور خوشہ چینوں کو قرآن و حدیث کے علوم و تعلیمات سے بہرہ ور کرنے کی مسلسل محنت کی ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے درس قرآن کریم کے چار الگ الگ حلقے رہے ہیں۔ ایک درس بالکل عوامی سطح کا تھا جو صبح نماز فجر کے بعد مسجد میں ٹھیٹھ پنجابی زبان میں ہوتا تھا۔ دوسرا حلقہ گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے تھا جو سالہا سال جاری رہا۔ تیسرا حلقہ مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ میں متوسط اور منتہی درجہ کے طلبہ کے لیے ہوتا تھا اور دو سال میں مکمل ہوتا تھا۔ اور چوتھا مدرسہ نصرۃ العلوم میں ۷۶ء کے بعد شعبان اور رمضان کی تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر کی طرز پر تھا جو پچیس برس تک پابندی سے ہوتا رہا اور اس کا دورانیہ تقریباً ڈیڑھ ماہ ہوتا تھا۔ ان چاروں حلقہ ہائے دروس کا اپنا اپنا رنگ تھا اور ہر درس میں مخاطبین کی ذہنی سطح اور فہم کے لحاظ سے قرآنی علوم و معارف کے موتی ان کے دامن قلب و ذہن میں منتقل ہوتے چلے جاتے تھے۔ ان چاروں حلقہ ہائے درس میں جن علماء کرام، طلبہ، جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں اور عام مسلمانوں نے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے براہ راست استفادہ کیا ہے، ان کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق چالیس ہزار سے زائد بنتی ہے۔ وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

ان میں عام لوگوں کے استفادہ کے لیے جامع مسجد گکھڑ والا درس قرآن کریم زیادہ تفصیلی اور عام فہم ہوتا تھا جس کے بارے میں متعدّد حضرات نے خواہش کا اظہار کیا اور بعض مرتبہ عملی کوشش کا آغاز بھی ہوا کہ اسے قلم بند کر کے شائع کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ درس خالص پنجابی میں ہوتا تھا جو اگرچہ پورے کا پورا ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ ہو چکا ہے مگر اسے پنجابی سے اردو میں منتقل کرنا سب سے کٹھن مرحلہ ہے اس لیے بہت سی خواہشیں بلکہ کوششیں اس مرحلہ پر آکر دم توڑ گئیں۔

البتہ ہر کام کا قدرت کی طرف سے ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور اس کی سعادت بھی قدرت خداوندی کی طرف سے طے شدہ ہوتی ہے اس لیے تاخیر در تاخیر کے بعد یہ

صورت سامنے آئی کہ اب مولانا محمد نواز بلوچ فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم اور برادرم محمد لقمان میر صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور تمام تر مشکلات کے باوجود اس کا آغاز بھی کر دیا ہے جس پر دونوں حضرات اور ان کے دیگر سب رفقاء نہ صرف حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے تلامذہ اور خوشہ چینوں بلکہ ہمارے پورے خاندان کی طرف سے بھی ہدیہ تشکر و تبریک کے مستحق ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اس فرض کفایہ کی سعادت کو تکمیل تک پہنچا سکیں اور ان کی یہ مبارک سعی، قرآنی تعلیمات کے فروغ، حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے افادات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور ان گنت لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے اور بارگاہ ایزدی میں قبولیت سے سرفراز ہو۔

یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ یہ دروس کی کاپیاں ہیں اور درس و خطاب کا انداز تحریر سے مختلف ہوتا ہے اس لیے بعض جگہ تکرار نظر آئے گا جو درس و بیان کے لوازم میں سے ہے لہذا قارئین سے گزارش ہے کہ اس کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ان دروس کو ریکارڈنگ کے ذریعے سے محفوظ کرنے میں محمد اقبال آف دوبئی اور محمد سرور منہاس آف گکھڑ کی مسلسل محنت کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنھوں نے اس عظیم علمی ذخیرہ کو ریکارڈ کرنے کے لیے سالہا سال تک پابندی کے ساتھ خدمت سرانجام دی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین یارب العالمین۔

دینی مدارس۔ پس منظر اور موجودہ کردار

(روزنامہ انصاف، لاہور - ۲۴ جولائی ۲۰۰۲ء)

دینی مدارس کی ضرورت

اہل اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے انفرادی و اجتماعی اور شخصی و معاشرتی تمام معاملات میں وحی الٰہی کے پابند ہیں۔ اور اخروی نجات کے ساتھ ساتھ ان کی دنیوی کامیابی اور فلاح بھی آسمانی تعلیمات کی پیروی پر موقوف ہے۔ اہل اسلام حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں کی تعلیمات کو حق مانتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہؐ کی تعلیمات تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کا نچوڑ و خلاصہ ہیں اور قرآن کریم وحی الٰہی کا فائنل اور

مکمل ایڈیشن ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں جو معروضی حقائق سے مکمل مطابقت رکھتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور وحی الٰہی کا صرف وہی حصہ تاریخ کے ریکارڈ میں مکمل طور پر محفوظ ہے جو قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات و تعلیمات پر مشتمل ہے۔ جبکہ اس کے سوا اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر پر نازل ہونے والی وحی اور اس کی اپنی تعلیمات اس وقت دنیا میں کہیں بھی محفوظ حالت میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے آج جو شخص یا قوم بھی آسمانی تعلیمات کو اپنی زندگی کے معاملات میں راہنما بنانا چاہتا ہے اس کے لیے قرآن کریم اور اسوۂ محمدؐ کی طرف رجوع کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

اہل اسلام یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ چونکہ آسمانی تعلیمات ہی نسل انسانی کی صحیح راہنمائی کی ضامن ہیں، اور انسان محض اپنی انفرادی یا اجتماعی عقل و خواہش کی بنیاد پر مسائل حل کرنے اور مثالی انسانی سوسائٹی تشکیل دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور چونکہ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی آسمانی تعلیمات کو مکمل اور محفوظ حالت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اس لیے اہل اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف خود اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی میں قرآن و سنت پر مکمل طور پر عمل کریں بلکہ دنیا کی دوسری اقوام کے سامنے بھی اسلامی تعلیمات کو پیش کریں۔ اور انہیں دعوت دیں کہ وہ محض انسانی عقل و خواہش پر بھروسہ کرنے کی بجائے وحی الٰہی کی بالاتر راہنمائی کو قبول کریں اور آسمانی تعلیمات کے محفوظ ترین اور فائنل ایڈیشن قرآن و سنت کی طرف رجوع کر کے انسانی سوسائٹی کو عقل و خواہش کی بے لگام پیروی سے نجات دلائیں، تاکہ دنیا کی انسانی آبادی مجموعی طور پر فطری قوانین اور نظام کے تحت امن و خوشحالی کی حقیقی منزل سے ہمکنار ہو سکے۔

اس پس منظر میں ہر مسلمان اور عورت کا قرآن و سنت کی تعلیمات سے آراستہ ہونا اس کے دینی فرائض میں شامل ہے۔ اور مسلمانوں کی مذہبی قیادت اسے اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے کہ وہ ہر مسلمان خاندان اور فرد کو ضروری دینی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہو کر گزرے اور اس معاملہ میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھے۔

دینی مدارس کا تعلیمی و انتظامی پس منظر

بیشتر مسلم ممالک پر برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور دیگر استعماری قوتوں کے تسلط سے قبل ان ممالک میں دینی تعلیمات کے فروغ کو ریاستی ذمہ داری شمار کیا جاتا تھا۔ اور ہر مسلمان حکومت اپنے ملک کے باشندوں کو قرآن و سنت کی تعلیمات اور دینی احکام و فرائض

سے آگاہ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی جس کے لیے ہر ریاستی نظام میں خاطر خواہ بندوبست موجود ہوتا تھا۔ مگر جب استعماری قوتوں نے مختلف حیلوں اور ریشہ دوانیوں سے مسلم ممالک کے اقتدار پر قبضہ کر کر کے ان ملکوں کے نظام تبدیل کیے تو دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی شعبہ میں بھی تبدیلی کر کے مسلم عوام کو دینی تعلیم کے صدیوں سے چلے آنے والے تسلسل سے محروم کردیا۔ اس صورتحال میں آسمانی تعلیمات کے تحفظ، دینی تعلیمات کے فروغ، اور مسلم عوام کو قرآن وسنت کی تعلیمات واحکام سے آراستہ کرنے کی ذمہ داری کو اپنا بنیادی اور ناگزیر فریضہ سمجھتے ہوئے مسلمانوں کی مذہبی قیادت نے اس کے لیے امداد باہمی کی بنیاد پر رضا کارانہ اور پرائیویٹ تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی جو آج مختلف مسلم ممالک بالخصوص جنوبی ایشیاء کے ممالک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں دینی مدارس کی شکل میں موجود ہے۔ برصغیر پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں مغل حکومت کے دور میں ''درس نظامی'' کا یہی نصاب ملک کا سرکاری نصاب تعلیم تھا جو آج ضروری ترامیم اور تبدیلیوں کے ساتھ اسی نام سے دینی مدارس میں رائج ہے۔

درس نظامی ۔ دینی مدارس کا تعلیمی نصاب

اس نصاب کو ''درس نظامی'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ ملا نظام الدین سہالویؒ نے، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے معاصرین میں سے تھے، کئی نسلوں سے پڑھائے جانے والے تعلیمی نصاب کو باقاعدہ اور مربوط نصاب کی شکل دی تھی۔ اس کے بعد یہ نصاب انہی کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اس نصاب میں بنیادی طور پر مندرجہ ذیل علوم شامل ہیں۔

1. قرآن کریم اور حدیث رسولؐ۔ ترجمہ وتشریح کے ساتھ۔
2. صرف ونحو اور عربی ادب وگرامر کے دیگر فنون۔ تاکہ قرآن وسنت تک براہ راست رسائی آسان ہو۔
3. فقہ اسلامی۔ تاکہ قرآن وسنت سے مستنبط احکام وقوانین سے آگاہی ہو۔
4. یونانی منطق وفلسفہ۔ تاکہ اس منطق وفلسفہ کے عروج اور عملداری کے دور میں لکھے گئے اسلامی لٹریچر کے وسیع ذخیرہ تک رسائی ممکن ہو۔
5. علم کلام۔ تاکہ دیگر مذاہب کے ساتھ اسلامی عقائد کا فرق اور عقائد کے حوالہ سے مسلمان فرقوں کی تعبیرات کا باہمی فرق ذہنوں میں واضح ہو۔

6. ریاضی اور حساب۔ تاکہ باہمی لین دین اور حساب کتاب کو نمٹانا آسان ہو۔

7. فارسی زبان جو کہ مغل دور کی سرکاری زبان تھی اور درس نظامی کے نصاب کا لازمی حصہ تھی۔ تاکہ دفتری اور سرکاری امور میں بلا جھجھک شرکت ہو سکے۔

8. کتابت و تحریر۔ تاکہ لکھنا پڑھنا آسان ہو۔

اس طرح ایک مہذب اور منظم سوسائٹی میں تعلیم کے تمام ضروری تقاضے مثلا خواندگی، دفتری زبان، مروجہ قوانین، مذہبی زبان، عقائد و نظریات، کلچر و ثقافت، اسلامی لٹریچر تک رسائی، حساب و کتاب، اور قرآن و سنت کی تعلیمات سے آگاہی تک کے سب اہم اور ناگزیر امور اس نصاب کے اندر سمو دیے گئے تھے۔ ملک کی عام آبادی کے لوگ مسلم اور غیر مسلم سب یہی نصاب پڑھتے تھے اور اسی نصاب کی بنیاد پر انتظامی، عدالتی، اور مالیاتی شعبوں میں تمام مناصب تک پہنچتے تھے۔ مگر جب برطانوی استعمار نے مغل حکومت سے اقتدار چھین کر اس خطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی اور انتظامی، مالیاتی، اور عدالتی نظام کو یکسر بدل دینے کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان بھی فارسی کی بجائے انگریزی مقرر کر دی تو اجتماعی اور ریاستی معاملات سے لاتعلق ہونے کی وجہ سے درس نظامی کی بنیاد پر چلنے والا یہ پورا نصاب و نظام بے مصرف ہو کر رہ گیا اور اس کی جگہ نئے حکمرانوں کے نافذ کردہ جدید تعلیمی نظام نے لے لی۔

دینی مدارس کا قیام

اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے کچھ مردان خیر نے مسجد و مدرسہ کے معاشرتی کردار کو بحال رکھنے کی حد تک درس نظامی کے اس سسٹم کو بہر حال قائم رکھنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے رضاکارانہ عوامی چندہ اور امداد باہمی کے اصول کو بنیاد بنا کر پرائیویٹ دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابتداء میں دیوبند، سہارنپور، مراد آباد، اور دیگر چند شہروں میں دینی مدارس قائم ہوئے۔ لیکن یہ ضرورت چونکہ پورے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی مشترکہ ضرورت تھی اس لیے ایک قابل عمل مثال سامنے آتے ہی ملک کے طول و عرض میں اس قسم کے دینی مدارس کا ایک جال بچھ گیا۔ ان مدارس کا نصاب بنیادی طور پر وہی چلا آرہا ہے جس کا تذکرہ سطور بالا میں درس نظامی کے حوالہ سے کیا گیا ہے۔ مگر اسے بے

لچک اور جامد نصاب کے طور پر نہیں اختیار کیا گیا بلکہ ہر دور میں اجتماعی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں مناسب تبدیلیاں بھی کی گئیں اور ان تبدیلیوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ تاہم تعلیمی نصاب اور نظام کے حوالہ سے ان مدارس کے ارباب حل وعقد نے بعض ناگزیر تحفظات کے پیش نظر دو باتوں کو بنیادی پالیسی کے طور پر اختیار کیا۔ اور یہی دو باتیں عالم اسباب میں ان مدارس کے نظام میں استحکام اور ان کے جداگانہ تشخص وامتیاز کی بقا کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

1. مالیاتی امور میں مدارس کے اس نظام نے ریاستی اداروں سے مکمل بے نیازی کا رویہ اختیار کیا۔ سرکاری امداد کسی صورت میں قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور نہ ہی کسی سطح پر سرکاری مداخلت کو در آنے کا موقع فراہم کیا۔ ان مدارس نے اپنے اخراجات اور مالیاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عوام کے صدقات، زکوۃ، عطیات، اور چندے کی دیگر صورتوں پر بھروسہ کیا اور قناعت وبے نیازی کے ساتھ بہت تھوڑے خرچ سے کام چلایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی حکومت ان مدارس کے معاملات میں مداخلت کے لیے راہ نہ پاسکی اور یہ مدارس پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔

2. ان مدارس نے شعوری طور پر یہ پالیسی اختیار کی کہ ان کے فارغ التحصیل علماء کی غالب اکثریت مسجد و مدرسہ کے سوا کسی اور شعبۂ زندگی میں نہ کھپ سکے۔ اسی وجہ سے یہ مدارس جدید تعلیم کو اپنے نصاب میں پوری طرح شامل کرنے سے اب تک گریزاں ہیں۔ کیونکہ انہیں بجا طور پر یہ خطرہ ہے کہ اگر ان کے تربیت یافتہ افراد بھی مسجد و مدرسہ کے نظام کا حصہ بننے کی بجائے دوسرے شعبوں میں چلے جائیں گے تو مسجد و مدرسہ کے لیے امام اور استاد فراہم کرنے کا کام پھر سے ادھورا رہ جائے گا۔ اور وہ خلاء بدستور موجود رہے گا جس کو پر کرنے کے لیے دینی مدارس کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا، اور اس طرح پرائیویٹ دینی مدارس کے اس نظام کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

ان مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان اور دیگر جدید علوم وفنون کو داخل نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان مدارس کے ارباب حل وعقد انگریزی زبان کو ناجائز سمجھتے تھے، جیسا کہ

بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ انگریزی کو بطور زبان سیکھنے کے جواز کا فتوی حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے اس دور میں دے دیا تھا جبکہ ابھی دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ فتوی آج بھی فتاوی عزیزی میں موجود ہے۔ اسی طرح یہ علماء جدید سائنسی علوم کے بھی مخالف نہیں تھے بلکہ وہ عام مسلمانوں کو ان کے حصول کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ البتہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ دینی مدارس سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے علماء مسجد و مدرسہ کے ماحول تک محدود رہیں اور یہاں سے نکل کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہ کھپ جائیں تاکہ وہ خلاء دوبارہ عود نہ کر آئے جو برطانوی حکومت کی طرف سے درس نظامی کے مدارس کو ختم کرنے سے پیدا ہو گیا تھا۔ اور جس خلاء کو پر کرنے کے لیے یہ دینی مدارس پرائیویٹ سطح پر کامیاب کوشش کر رہے تھے۔

مگر ان بنیادی تحفظات کے باوجود دینی مدارس نے اپنے نصاب میں ضروری تبدیلیوں اور ترامیم سے کبھی گریز نہیں کیا اور ہر دور میں نصاب میں ردوبدل کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مثلا

- مغل دور میں درس نظامی کے نصاب میں حدیث نبویؐ کی صرف ایک کتاب ''مشکوۃ شریف'' شامل تھی۔ جبکہ اس کے بعد صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ کے ساتھ موطا امام مالک اور دیگر کتب احادیث بھی شامل نصاب کی گئیں۔
- مختلف فنون میں پرانی کتابوں کی جگہ نئی کتابیں شامل کی گئی ہیں بلکہ بعض کتابیں بطور خاص اس مقصد کے لیے لکھوائی گئیں۔
- سینکڑوں دینی مدارس کے ساتھ مڈل اور ہائی سکول کی سطح پر عصری تعلیم کے سکول قائم ہیں۔ جبکہ انگریزی اور ریاضی جیسے ضروری مضامین بنیادی ضرورت کی حد تک خود درس نظامی کے نصاب میں بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔
- امتحانات کے نظام کو باہمی طور پر مربوط بنانے کے لیے مختلف بورڈ ملکی سطح پر قائم ہیں جو جدید اسلوب اور معیار کے مطابق امتحانات کا نظام مرتب کرتے ہیں، ان کی نگرانی کرتے ہیں، امتحانات کے لیے پرچے تیار کیے جاتے ہیں، ان کی مارکنگ ہوتی ہے، رزلٹ جاری کیے جاتے ہیں اور ملک گیر سطح پر امتحانات کے نظام میں یکسانیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

• بہت سے بڑے مدارس نے مختلف مضامین میں تخصص (پی ایچ ڈی) کے شعبے قائم کر رکھے ہیں جن میں افتاء، دعوت و ارشاد، اور تقابل ادیان کے مضامین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

• ان مدارس کی اسناد کو مختلف سطحوں پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن آف پاکستان نے تسلیم کیا ہے۔ ان مدارس کے فضلاء بیرون ملک معروف تعلیمی اداروں بالخصوص جامعہ ازہر قاہرہ، مدینہ یونیورسٹی، اور دیگر بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں اعلی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور امتیازی پوزیشن سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

دینی مدارس کا معاشرتی کردار

اس تناظر میں ان دینی مدارس کی معاشرتی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس کا سرسری خاکہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ

1. ملک کے لاکھوں نادار افراد کو نہ صرف تعلیم سے بہرہ ور کرتے ہیں بلکہ ان کی ضروریات مثلاً خوراک، رہائش، علاج، اور کتابوں وغیرہ کی کفالت بھی کرتے ہیں۔

2. معاشرہ میں بنیادی تعلیم اور خواندگی کے تناسب میں معقول اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔

3. قرآن وسنت کی تعلیم اور دینی علوم کی اشاعت وفروغ کا باعث بنتے ہیں۔

4. عام مسلمانوں کو عبادات، دینی رہنمائی، اور مذہبی تعلیم کے لیے رجال کار فراہم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔

5. عام مسلمانوں کے عقائد، عبادات، اخلاق، اور مذہبی کردار کا تحفظ کرتے ہیں اور دین کے ساتھ ان کا عملی رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

6. اسلام کے خاندانی نظام اور کلچر وثقافت کی حفاظت کر رہے ہیں، اور غیر اسلامی ثقافت وکلچر کی یلغار کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے مضبوط حصار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

7. اسلامی عقائد واحکام کی اشاعت کرتے ہیں اور ان کے خلاف غیر مسلم حلقوں کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات و شبہات کا جواب دیتے ہیں۔

8. اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عقائد و احکام سے انحراف اور بغاوت کا مقابلہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کی "راسخ العقیدگی" کا تحفظ کرتے ہیں۔

9. مادہ پرستی، مفادات، خود غرضی، اور نفسا نفسی کے اس دور میں قناعت، ایثار، اور سادگی کی روحانی اقدار کو مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حصے میں باقی رکھے ہوئے ہیں۔

10. وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے مکمل اور محفوظ ذخیرہ کی نہ صرف حفاظت کر رہے ہیں بلکہ سوسائٹی میں اس کی عملی تطبیق کا نمونہ بھی باقی رکھے ہوئے ہیں۔ تاکہ نسل انسانی کے وہ سلیم الفطرت لوگ جو "عقل و خواہش" کی مطلق العنانی کے تلخ اور تباہ کن معاشرتی نتائج کو محسوس کرتے ہیں اور جن کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، انہیں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے حقیقی سرچشمہ تک رسائی میں کوئی دقت نہ ہو۔ اس طرح یہ مدارس صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کی خدمت کر رہے ہیں اور اس کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔

دینی مدارس پر چند نمایاں اعتراضات

اس موقع پر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ سسٹم کے بارے میں عام طور پر کیے جانے والے چند سوالات کا بھی جائزہ لے لیا جائے تاکہ ان مدارس کے ناقدین کا موقف اور ان کی حقیقت بھی سامنے آجائے۔ مثلا

1. یہ مدارس بنیاد پرستی کو فروغ دے رہے ہیں جو گلوبلائزیشن کے اس دور میں ملٹی نیشنل کلچر اور مشترکہ عالمی معاشرے کی تشکیل میں رکاوٹ ہے۔

2. ان مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات مختلف جہادی تحریکات میں عسکری خدمات سرانجام دے رہے ہیں، اس طرح یہ مدارس دہشت گردی کے فروغ کا باعث ہیں۔ نیز ان مدارس میں تعلیم کے ساتھ عسکری ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔

3. قومی سطح پر مدارس اجتماعی دھارے میں شامل ہونے کی بجائے الگ تشخص قائم رکھنے پر مصر ہیں اور مروجہ ریاستی نظام تعلیم کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ

قبول نہیں کر رہے جس کی وجہ سے قوم میں ”دو ذہنی“ کی فضا موجود ہے اور یہ دوہرا نظام قومی یکجہتی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

دینی مدارس اور بنیاد پرستی

جہاں تک بنیاد پرستی کا تعلق ہے، اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مدارس عام مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے وابستہ رکھے ہوئے ہیں جس کی بدولت مسلم معاشرہ میں اس سولائزیشن کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے جو مذہب کے اجتماعی کردار کی نفی کرتے ہوئے سوسائٹی کی اجتماعی عقل و خواہش کی بنیاد پر سیکولر ثقافت کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہے، تو دینی مدارس کو اس الزام کے قبول کرنے سے کوئی انکار نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے اپنے لیے الزام کی بجائے اعزاز اور کریڈٹ سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے اس کردار کی اثر خیزی کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

دینی مدارس کا بنیادی موقف ہی یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہنمائی اور قیادت کے لیے انفرادی یا اجتماعی عقل و خواہش کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی نگرانی اور بالادستی ضروری ہے۔ اور اس سے ہٹ کر اباحیت مطلقہ اور ہمہ نوع آزادی کی بنیاد پر جو کلچر ”گلوبل سولائزیشن“ کے نام پر فروغ دیا جا رہا ہے وہ سراسر غلط ہے، گمراہی ہے، اور نسل انسانی کو مزید تباہی و انارکی کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے۔ اگر دینی مدارس اس موقف میں لچک پیدا کر لیں تو خود ان کا مقصد وجود ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور ان کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ اس لیے اس معاملہ میں دینی مدارس کسی قسم کی کوئی لچک قبول کرنے کے روادار نہیں ہیں۔

دینی مدارس اور جہادی تحریکات

دوسرا سوال جہادی اور عسکری تحریکات میں دینی مدارس کے طلباء کی کثرت کے ساتھ شمولیت کے بارے میں ہے۔ اس سلسلہ میں دو مسئلے قطعی طور پر الگ الگ ہیں۔

ایک مسئلہ جہاد کے بارے میں شرعی احکام اور قرآن و سنت کے فرمودات کی تعلیم کا ہے۔ یہ تعلیم یقیناً ان مدارس میں ہوتی ہے اور اسی طرح ہوتی ہے جس طرح قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے باقی شعبوں کی ہوتی ہے۔ یہ دینی تعلیمات کا حصہ ہے اور کسی دینی ادارے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ قرآن و سنت کی دیگر تعلیمات کا تو اپنے ہاں اہتمام

کرے مگر جہاد سے متعلقہ آیات قرآنی، احادیث نبویؐ، اور فقہی ابواب کو صرف اس لیے نصاب سے خارج کر دے کہ دنیا کے کچھ حلقے اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ جہاد کی عملی تربیت اور عسکری ٹریننگ کا ہے۔ یہ ان مدارس میں کسی سطح پر نہیں ہوتی اور نہ ہی ان مدارس میں ایسا کوئی نظام موجود ہے جو طلبہ کو اس طرح کی ٹریننگ دیتا ہو۔ حتی کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں این سی سی طرز کی جو نیم فوجی تربیت عام طلبہ کو دی جاتی ہے، دینی مدارس کے نظام میں وہ بھی باضابطہ طور پر موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ دینی مدارس اپنے طلبہ کو عسکری ٹریننگ دیتے ہیں۔ البتہ دینی مدارس کے طلبہ یہاں سے فارغ ہو کر یا چھٹیوں کے دوران اپنی آزادانہ مرضی سے کسی دباؤ کے بغیر جہادی تحریکات کے مراکز میں جاتے ہیں، ٹریننگ حاصل کرتے ہیں، اور کسی نہ کسی محاذ پر جہاد میں شریک بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا مدارس کے نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ٹریننگ کے یہ مراکز مدارس کے سسٹم میں شامل ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہزاروں نوجوان مختلف عسکری تنظیموں میں شامل ہو جاتے ہیں جن میں جہادی تحریکات بھی ہیں، لسانی گروپ بھی ہیں، علاقائی تنظیمیں بھی ہیں، اور طبقاتی گروہ بھی ہیں، حتی کہ ڈکیتی اور رہزنی کے گینگ بھی ان میں شامل ہیں۔ یہ نوجوان بھی مختلف ٹریننگ سنٹروں میں عسکری تربیت حاصل کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر کارروائیاں کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی گروہ کی کارروائیوں کا ذمہ دار ان کے تعلیمی اداروں کو قرار نہیں دیا جاتا بلکہ انہیں ان کے ذاتی فعل اور پسند پر محمول کیا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی دینی مدارس کے طلبہ بھی اگر تعلیمی نظام اور ڈسپلن سے ہٹ کر جہادی تحریکات میں شامل ہوتے ہیں اور عسکری تربیت حاصل کر کے کسی کارروائی میں حصہ لیتے ہیں تو ان کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

دینی مدارس اور اجتماعی قومی دھارا

تیسرا سوال قومی اجتماعی دھارے سے الگ رہنے اور جداگانہ تشخص قائم رکھنے کا ہے۔ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ اس کا تعلق بھی ان مدارس کے مقصد وجود سے ہے۔ کیونکہ جب تک ریاستی نظام ہمارے معاشرہ میں دینی تعلیمات کے فروغ، مساجد کے لیے ائمہ کی فراہمی، دینی رہنمائی کے لیے علماء کی تیاری، اور قرآن و سنت کی تعلیم کے لیے اساتذہ مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اس کے لیے قابل قبول عملی نظام پیش نہیں کرتا اس

وقت تک ان مدارس کے قیام و وجود کی ضرورت بہرحال باقی رہے گی۔ ورنہ وہی خلاء پیدا ہو جائے گا جس کو پر کرنے کے لیے مدارس قائم کیے گئے تھے اور اس خلاء کو باقی رکھنے کا کوئی باشعور مسلمان رسک نہیں لے سکتا۔ اس خلاء کو پر کرنے کے لیے نہ صرف ان مدارس کا وجود ضروری ہے بلکہ ان کی اس مالیاتی خود مختاری، انتظامی آزادی، اور نصابی تحفظات کا برقرار رکھنا بھی ناگزیر ہے جس کے بغیر یہ اپنا کردار اعتماد کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے۔

اس لیے دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی نظام اور معاشرہ میں ''دو ذہنی'' اور ''تعلیمی دوئی'' کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری ریاستی نظام پر عائد ہوتی ہے جو اس کردار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو ان مدارس کے جداگانہ وجود کا باعث ہے۔ مگر ان مدارس کو اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کی خواہش کا مسلسل اظہار کرنے کا منطقی نتیجہ معاشرہ میں دینی تعلیم کے اس نظام کو یکسر ختم اور بے اثر کر دینے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ مدارس دینیہ کے خلاف اس مسموم فضا میں وہ حق پسند و حقیقت پسند حضرات قابل تحسین ہیں جو ان کی ضرورت و افادیت اور خدمات کے نہ صرف معترف ہیں بلکہ ان مدارس کے ساتھ مالی و اخلاقی تعاون کرتے ہوئے اسلام کی آواز کو سربلند کرنے میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

رفاہ عامہ۔ نظریات کی ترویج کا سب سے مؤثر ذریعہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲ جولائی ۲۰۰۲ء)

گزشتہ دنوں پاک بھارت سرحد کے قریب ضلع نارووال کے قصبہ ظفروال کے نواح میں اونچا کلاں نامی بستی میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں مدرسہ انوار القرآن کے مہتمم قاری افتخار اللہ شاکر صاحب نے گزشتہ ڈیڑھ ہفتہ سے علماء کرام اور اسکولوں کے ٹیچر صاحبان کے لیے پندرہ روزہ تربیتی پروگرام کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں اس کا اہتمام کرتے ہیں جس سے علاقہ کے مختلف دیہات اور قصبات سے علماء کرام اور اسکولوں کے اساتذہ شریک ہوتے ہیں اور حالات حاضرہ کی مناسبت سے متعدّد سرکردہ علماء کرام انہیں ضروری مسائل پر بریف کرتے ہیں۔ مجھے موجودہ عالمی صورتحال کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنے کے لیے کہا گیا تو میں نے مغرب اور مسلمانوں کے درمیان دن بدن تیز تر ہونے والی کشمکش کے علمی و فکری پہلوؤں پر کچھ معروضات پیش کر دیں۔ اس

گفتگو کا خلاصہ عرض کرنے سے قبل دو تین باتوں کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں جو میرے لیے اس موقع پر خوشی کا باعث ہیں۔

ایک تو اس علاقہ کے ایک ہندو خاندان کے نومسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی جس کا سابق نام تیرس پرکاش تھا۔ دو سال قبل اس نے اسلام قبول کر کے عبداللہ نام اختیار کر لیا اور اب دارالعلوم مدنیہ رسول پارک لاہور میں دینی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس کے جذبات دیکھ کر خوشی ہوئی اور یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ وہ نہ صرف قبول اسلام کے بعد خوش اور مطمئن ہے بلکہ خاندان کے دیگر افراد کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی پھوپھی اپنے بچوں سمیت مسلمان ہو چکی ہے۔ خدا کرے کہ باقی اہل خاندان بھی اس کار خیر میں اس کے ساتھی بن جائیں، آمین۔

دوسرے نمبر پر ایک نوجوان محمد شہباز کے حفظ قرآن کی تکمیل کی تقریب میں شرکت کر کے خوشی ہوئی، یہ بھی اسی علاقے کا رہنے والا نوجوان ہے جس کا والد سعودی عرب میں محنت مزدوری کرتا ہے۔ اس نوجوان نے گزشتہ سال میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد اسے قرآن کریم یاد کرنے کا شوق ہوا جو اس نے قاری افتخار اللہ شاکر کے بقول صرف ساڑھے چار ماہ میں مکمل کر لیا۔ اور ۲۸ جون کو صبح نماز فجر کے بعد مدنی مسجد اونچا کلاں میں راقم الحروف کو آخری سبق سنا کر حافظ قرآن کے لقب سے مشرف ہو گیا۔

راقم نے علماء کرام اور اساتذہ و طلبہ کی مشترکہ نشست میں ان سے گزارش کی کہ وہ موجودہ حالات سے واقفیت حاصل کریں، مسلمانوں کے خلاف مغرب کی مہم کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور مغربیت تہذیب و ثقافت اور اسلام کے درمیان تیزی سے فیصلہ کن مرحلہ کی طرف بڑھنے والی تہذیبی کشمکش کا ادراک کریں۔ یہ عقیدہ کی جنگ ہے، تہذیب و ثقافت کی جنگ ہے اور فکر و فلسفہ کی جنگ ہے۔ مغرب دنیا بھر کے وسائل اور دولت پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب، فلسفہ اور نظام حیات کو بھی طاقت کے زور سے دنیا پر مسلط کرنا چاہتا ہے اور وہ اسلام کو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہوئے اسے ہر قیمت پر راستے سے ہٹانے پر تلا ہوا ہے۔

مغرب کو اس جنگ میں سب سے زیادہ مشکل عقیدہ کے محاذ پر پیش آ رہی ہے کیونکہ دنیا کا کوئی بھی مسلمان خواہ وہ کتنا ہی بے علم، بے عمل بلکہ بدعمل کیوں نہ ہو، دو چیزوں کے ساتھ بے لچک وابستگی اور دوٹوک کمٹمنٹ رکھتا ہے۔ ایک قرآن کریم ہے اور دوسرا جناب نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ دنیا کے کسی خطے کا کوئی مسلمان ان دونوں کے بارے میں کوئی لفظ سننے کا روادار نہیں ہے اور ان کی محبت و احترام میں کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ قرآن کریم کے ایک لفظ کا ترجمہ نہ جانتا ہو اور اس کے کسی ایک حکم پر بھی عمل نہ کرتا ہو لیکن قرآن کریم کی بے حرمتی برداشت نہیں کرے گا اور قرآن کریم کے کسی حکم کے خلاف کسی قسم کے ریمارکس گوارا کرنے کے لیے خود کو تیار نہیں پائے گا۔ اسی طرح ایک مسلمان جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت سے واقفیت نہ رکھتا ہو اور سنت نبویؐ پر اس کی زندگی میں عمل نہ پایا جاتا ہو مگر آنحضرتؐ کی شان میں ادنی سی گستاخی اور آپؐ کے کسی حکم کی توہین کو وہ برداشت نہیں کر پائے گا۔ قرآن کریم اور جناب رسول اللہؐ کی ذات گرامی کے ساتھ عام مسلمان کی یہ جذباتی وابستگی مغرب کے لیے پریشان کن مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس وقت مغرب کا سب سے بڑا ہدف یہ ہے کہ مسلمان کو اس کے عقیدہ سے ہٹا دیا جائے اور ایمانیات کے حوالے سے اسے متذبذب کر دیا جائے۔

امریکا کے سابق صدر بل کلنٹن صدارت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان دنوں امریکی مہم کی نظریاتی محاذ پر قیادت کر رہے ہیں اور دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچ کر ارباب دانش کے سامنے لیکچروں کی صورت میں امریکی مہم کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے دو ماہ قبل جدہ سعودی عرب میں اکنامک فورم سے خطاب کرتے ہوئے واضح طور پر عقیدہ کو ہدف بنایا اور سعودی دانشوروں سے کہا کہ وہ جب تک نئی نسل کو عقیدہ کی تلقین ترک نہیں کریں گے اور اپنے نصاب تعلیم سے عقیدہ کی تلقین کا عنصر خارج نہیں کریں گے، دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم میں ان کی شرکت پر اعتماد قائم نہیں ہوگا۔ اگرچہ سعودی حکام نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ہے اور سعودی وزیر تعلیم بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ ہم اپنے نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لیکن اس سے مغرب کی ذہنیت اور اس کے اہداف کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ یہ جنگ کس حوالے سے لڑ رہا ہے اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

دنیا بھر کے مسلم ممالک کے عوامی ماحول پر نظر ڈالی جائے تو ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مسلم معاشروں میں ایمان و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت کی گرفت کو کمزور کرنے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر طور پر جو ہتھیار استعمال ہو رہا ہے وہ این جی اوز کا ہے

جو رفاہی اداروں کے عنوان سے قائم ہوتی ہیں۔ یہ این جی اوز تعلیم، صحت اور رفاہ عامہ کے دیگر شعبوں میں سرگرم ہوتی ہیں اور اس کی آڑ میں اپنے فکری و تہذیبی ایجنڈے کو آگے بڑھاتی ہیں۔ یہ اس وقت مسلم معاشروں میں شکوک و شبہات پھیلانے، ایمان و یقین کو کمزور کرنے، اور اسلامی احکام و قوانین کے حوالہ سے تذبذب کی فضا قائم کرنے کے لیے مغرب کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

اگر میری اس گزارش کو گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس میں ہماری کوتاہی اور غفلت کا زیادہ دخل ہے کیونکہ ہم رفاہ عامہ کے محاذ پر، عوام کی تعلیم و صحت کی بہتری کے محاذ پر، اور ان کے حقوق و مفادات کے محاذ پر سرگرم نہیں ہیں۔ ہم نے ان کاموں کو اپنی ذمہ داریوں کے دائرے سے باہر نکال رکھا ہے اور اسی خلا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسیحی مشنریاں اور این جی اوز ہمارے ہاں اربوں روپے صرف کر کے کسی حد تک رفاہی کام بھی کر رہی ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ فکری انتشار اور تہذیبی خلفشار پھیلانے میں مصروف ہیں۔

ہمارے ہاں رفاہی کاموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے حالانکہ یہ سنت رسولؐ ہے۔ علماء کرام کو اس سلسلہ میں دو واقعات یاد دلانا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ جناب نبی اکرمؐ جب پہلی وحی کے نزول کے بعد غار حراء سے گھر تشریف لائے اور آپؐ پر گھبراہٹ کی کیفیت تھی تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے آنحضرتؐ کو کن الفاظ کے ساتھ تسلی دی تھی؟ اس پر ہم سب کو غور کرنا چاہیے۔ ام المومنینؓ نے کہا کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، غریبوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں، ضرورت مندوں کا سہارا بنتے ہیں، اور بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اس لیے آپ کو اللہ تعالی ہرگز ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے آنحضرتؐ سے کہا کہ آپ سوشل ورکر ہیں اس لیے آپ بالکل اطمینان رکھیں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالی کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت کرنے والوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔

اسی طرح بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب ایک موقع پر جناب نبی اکرمؐ سے اجازت لے کر مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا اور اپنا سامان اٹھا کر مکہ مکرمہ سے نکل کھڑے ہوئے تو راستہ میں بنو قارہ قبیلہ کا کافر سردار ابن الدغنہ ملا۔ وہ یہ

معلوم کر کے پریشان ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مکہ مکرمہ چھوڑ کر ہجرت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابن الدغنہ نے اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ سے وہی الفاظ کہے جو ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے غار حرا سے واپسی پر جناب نبی اکرمؐ سے کہے تھے۔ اس کافر سردار نے کہا کہ آپ سوشل ورکر ہیں اور کسی سوشل ورکر سے سوسائٹی کا محروم ہو جانا بہت بڑی محرومی ہوتا ہے۔ اس لیے میں آپ کو مکہ نہیں چھوڑنے دوں گا۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ مکہ مکرمہ واپس لایا اور اعلان کیا کہ آج سے ابوبکرؓ ان کی امان میں ہیں اس لیے کوئی شخص ان سے تعرض نہ کرے۔

ان دو واقعات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں سوشل ورک کی اہمیت کیا ہے۔ اس لیے میں علماء کرام اور اساتذہ سے عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ عقیدہ کے محاذ پر خصوصی توجہ دیں جس کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نئی نسل کو قرآن کریم کے فہم و شعور سے آراستہ کیا جائے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت سے انہیں واقف کرایا جائے۔ اور اس کے بعد سماجی خدمت کے محاذ پر کام کو منظم کیا جائے کیونکہ اس میدان کو کلیتاً دشمن کے حوالے کر دینا دانشمندی نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ان دو محاذوں پر سنجیدگی اور دل جمعی کے ساتھ کام شروع کر دیں اور اسے اپنا مشن سمجھ کر جدوجہد منظم کریں تو فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے میدان میں مغرب کی یلغار کا راستہ روکا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

سود کے بارے میں چند گزارشات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جولائی ۲۰۰۲ء)

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سودی نظام و قوانین کے ۳۰ جون ۲۰۰۲ء تک خاتمہ کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان کے تاریخی فیصلے پر نظر ثانی کے سلسلے شریعت ایپلٹ بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان میں یو بی ایل کی اپیل کی سماعت کے موقع پر دینی و ملی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے ”پاکستان شریعت کونسل“ کی طرف سے حسب ذیل گزارشات شریعت ایپلٹ بنچ کے معزز ارکان، فریقین کے وکلاء اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے دیگر سرکردہ ارباب علم و دانش کی خدمت میں پیش کی گئیں:

• سود تمام آسمانی شریعتوں میں حرام رہا ہے اور بائبل میں بھی اس سلسلے میں واضح ہدایات موجود ہیں چنانچہ بائبل کی کتاب خروج باب ۲۲ آیت ۲۵ میں ارشاد ہے کہ:

"اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہے، کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔"

استثناء باب ۲۳ آیت ۱۹ میں ہے کہ:

"تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا خواہ وہ روپے کا ہو یا اناج کا یا کسی اور ایسی چیز کا جو بیاج پر دی جایا کرتی ہے۔"

جبکہ زبور باب ۱۵ آیت ۵ میں نیک آدمی کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

"وہ اپنا روپیہ سود پر نہیں دیتا۔"

قرآن کریم میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۵ تا ۲۷۹ میں سود کی ممانعت کرتے ہوئے سود اور تجارت کو باہم مثل قرار دینے والوں کے موقف کی نفی کی گئی ہے، تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا گیا ہے، سود سے باز نہ آنے والوں کے طرز عمل کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف قرار دیا گیا ہے، اور سود اور تجارت میں فرق نہ کرنے والوں کو مخبوط الحواس بتایا گیا ہے۔

سورۃ النساء کی آیت ۶۱ میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور عذاب کے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بتایا گیا ہے کہ انہیں سود سے منع کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ سود لیتے تھے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ کے تاریخی خطبے میں سود کی کلی ممانعت اور تمام سابقہ سودی معاملات کے خاتمہ کا اعلان فرمایا اور آپؐ کی بیسیوں احادیث میں سود کی مذمت اور سود کا کاروبار کرنے والوں کے لیے سخت عذاب اور شدید ناراضی کا ذکر موجود ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے "سیرت النبی" میں لکھا ہے کہ جب اہل طائف نے جناب رسول اللہ کی خدمت میں پیش ہو کر اسلام قبول کرنے کے لیے چند

شرائط پیش کیں تو ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہم سود کا لین دین نہیں چھوڑ سکتے اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ہمارا بیشتر کاروبار سود پر چلتا ہے لیکن آنحضرتؐ نے یہ شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"سیرت النبی" میں ہی مذکور ہے کہ نجران کے مسیحیوں نے جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ اسلامی سلطنت میں بطور ذمی رہنے کا معاہدہ کیا تو معاہدہ کی باقاعدہ شرائط میں یہ بات درج تھی کہ ان میں سے کوئی سود کا لین دین نہیں کرے گا۔

• کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ نے اس سود کی ممانعت کی ہے جو شخصی قرضوں پر ضرورت مندوں سے لیا جاتا تھا اور تجارتی قرضوں یا لین دین میں سود کی ممانعت نہیں فرمائی۔ یہ بات درست نہیں ہے اور مندرجہ ذیل شواہد اس کی تردید کرتے ہیں:

1. سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ۔

"اگر مقروض تنگ دست ہو تو کشادہ دست ہونے تک اس کو مہلت دے دو۔"

آیت میں اس صورت کے بیان کے لیے حرف ان استعمال ہوا ہے جو عربی زبان کے قواعد کی رو سے اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ صورت نادر الوقوع ہے کیونکہ عام الوقوع صورت کے ذکر کے لیے عربی زبان میں حرف اذا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں اللہ تعالیٰ نے روزمرہ لین دین کے احکام بیان کرنے کے لیے اذا تداینتم بدین کے الفاظ، جبکہ اگلی آیت میں اسی ضمن کی ایک نادر صورت یعنی سفر میں لین دین کی صورت میں رہن کا حکم بیان کرنے کے لیے وان کنتم علی سفر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح سورۃ المائدہ کی آیت ۶ میں عام حالات میں نماز سے پہلے وضو کا حکم بیان کرنے کے لیے اذا قمتم الی الصلوۃ کے الفاظ آئے ہیں، جبکہ غیر معمولی صورت احوال میں تیمم کا حکم بیان کرنے کے لیے وان کنتم مرضی او علی سفر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ تصور کہ نزول قرآن کے زمانے میں

صرف تنگ دست اور مفلوک الحال لوگ ہی اپنی روز مرہ ضروریات کے لیے سود پر قرض لیا کرتے تھے، غلط ہے کیونکہ یہ صورت تو، قرآن کے الفاظ کی رو سے، نادر اور قلیل الوقوع تھی۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ لوگ عام طور پر ذاتی اور صرفی ضروریات کے بجائے تجارتی مقاصد کے لیے سود پر قرض لیا کرتے تھے اور قرآن نے اسی کو حرام قرار دیا ہے۔

2. سورۃ الروم کی آیت ۳۹ میں اللہ تعالی نے سود پر قرض دینے کا محرک بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وما اتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ۔

اور تم سود پر جو قرض اس غرض سے دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال میں بڑھے تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتی۔

یہ محرک، ظاہر ہے کہ ضرورت مندوں کو دیے جانے والے صرفی قرضوں کے بجائے حقیقتا تجارتی سود میں پایا جاتا ہے کیونکہ صرفی قرضوں میں تو قرض کے مع سود واپس آنے کے بجائے خود اصل رقم ہی کے ڈوب جانے کا امکان غالب ہوتا ہے۔

3. سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب التغلیظ فی الربا میں حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود کا معاملہ لکھنے والے اور اس کا گواہ بننے والے سب افراد کو اللہ کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس سود سے مراد تجارتی کے بجائے صرف صرفی قرضوں کا سود ہے تو اس میں سود دینے والا کس وجہ سے لعنت کا مستحق ہے؟ کیونکہ وہ بے چارہ تو جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے نہایت اضطرار کی حالت میں سود پر قرض لے رہا ہے۔

4. احادیث میں "ربا الفضل" یعنی ہم جنس اشیا کے مبادلہ میں کمی بیشی کی ممانعت کے احکام "ربا النسیئہ" ہی کی فرع ہیں اور سود

سے بچنے کے لیے سد ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں دو روایتیں درج ذیل ہیں:

صاحب مشکوۃ نے باب الربوا میں بخاری شریف اور مسلم شریف کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے خیبر کے محاصل وصول کرنے کے لیے ایک نمائندہ بھیجا جو واپس آیا تو اس کے پاس عمدہ قسم کی کھجوریں تھیں۔ نبی اکرمؐ نے پوچھا کہ کیا خیبر میں ساری کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ میں نے عام اور ردی کھجوریں زیادہ مقدار میں دے کر ان کے عوض عمدہ کھجوریں تھوڑی مقدار میں لے لی ہیں۔ نبی اکرمؐ نے اس سے منع فرمایا اور ہدایت کی کہ اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو ردی کھجوریں نقد رقم کے عوض بیچ کر اس کے بدلے میں عمدہ کھجوریں خرید لیا کرو۔

مشکوۃ شریف باب الربوا میں ہی بخاری اور مسلم کے حوالے سے یہ واقعہ بھی منقول ہے کہ حضرت بلالؓ نبی کریمؐ کی خدمت میں عمدہ کھجوریں لائے۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ کہاں سے آئی ہیں؟ حضرت بلالؓ نے جواب دیا کہ عام کھجوریں زیادہ مقدار میں دے کر ان کے عوض میں عمدہ کھجوریں تھوڑی مقدار میں لے لی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو "عین ربا" ہے، اس لیے ایسا مت کرو اور اگر اس طرح کرنا ضروری ہو تو عام کھجوریں کسی اور چیز کے عوض فروخت کر کے اس کے بدلے میں عمدہ کھجوریں لے لیا کرو۔

احادیث سے ظاہر ہے کہ ربا الفضل کے احکام کا اطلاق روزمرہ کے تجارتی لین دین پر ہوتا ہے نہ کہ صرفی قرضوں پر۔ اب یہ ایک بالکل نامعقول بات ہوگی کہ تجارتی لین دین میں سد ذریعہ کے طور پر ربا الفضل تو حرام ہو اور ربا النسیہ، جس سے بچنے کے لیے ربا الفضل کو احتیاطاً ممنوع قرار دیا گیا ہے، حلال اور جائز ہو۔

5. یہ بات تاریخی شواہد سے بھی ثابت ہے کہ عہد رسالت اور دور صحابہ میں تجارتی قرضوں کا رواج موجود تھا۔ اس سلسلے میں دو واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

بخاری شریف کتاب الجہاد، باب برکۃ الغازی فی مالہ میں مذکور ہے کہ حضرت زبیر بن العوامؓ لوگوں سے قرض لے کر تجارت کیا کرتے تھے اور وفات کے بعد ان کے ذمے مختلف لوگوں کے اس قسم کے قرضوں کی مالیت بائیس لاکھ درہم تھی جو موجودہ پاکستانی کرنسی کے حساب سے پانچ کروڑ روپے سے زیادہ رقم بنتی ہے۔

طبری مطبوعہ قاہرہ ج ۳، ص ۸۷ میں مذکور ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں ہند بن عتبہؓ نے بیت المال سے قرض لے کر بلاد کلب میں جا کر اس سے تجارت کی۔

ان شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ دور نبوی اور دور صحابہ میں شخصی قرضوں کے علاوہ تجارت میں سود کی شکلیں موجود تھیں، لوگوں سے قرض لے کر سرمایہ کاری ہوتی تھی اور تجارت کے لیے بیت المال سے قرض لینے کی صورت بھی موجود تھی لیکن ان تمام صورتوں کی موجودگی کے باوجود کسی بھی صورت میں سود کا کوئی معمول نہیں تھا اور شخصی ضرورت، تجارت اور سرمایہ کاری سمیت کسی بھی غرض کے لیے قرض لینے پر سود کی کلی ممانعت تھی۔

• جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدّد احادیث میں امت میں سود کے عام ہونے کو قیامت کی نشانیوں اور امت میں پیدا ہونے والی خرابیوں میں ذکر فرمایا ہے، مثلاً:

1. مشکوۃ باب الربوا میں ابو داؤد، نسائی اور مسند احمد کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ہر شخص سود کھانے لگے گا

اور جو نہیں کھانا چاہے گا، اس کے سانس کے ساتھ سود شامل ہو گا۔

2. مسند احمد اور بیہقی میں حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک دور ایسا آئے گا کہ کچھ لوگوں کی شکلیں اس لیے بندروں اور خنزیروں کی صورت میں مسخ ہو جائیں گی کہ وہ شراب پیتے ہوں گے، ریشم پہنتے ہوں گے، ناچ گانے کی محفلیں آباد کرتے ہوں گے اور سود کھاتے ہوں گے۔

3. حافظ ابن القیمؒ نے ”اغاثۃ اللہفانؒ“ میں جناب نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ”لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ وہ تجارت کے نام پر سود کو حلال قرار دینے لگیں گے۔“

• اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قیام اس غرض سے عمل میں لایا گیا تھا کہ اس ملک میں قرآن و سنت کا نظام نافذ کیا جائے گا اور برطانوی دور کے نوآبادیاتی نظام سے نجات حاصل کر کے اس کی جگہ قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کی طرز پر نیا نظام رائج کیا جائے گا جس کی صراحت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے متعدّد ارشادات میں موجود ہے۔ انہوں نے ملکی معیشت کے بارے میں بھی وضاحت کے ساتھ فرمایا تھا کہ پاکستان کے معاشی نظام کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہو گی اور مغرب کے معاشی نظام سے نجات حاصل کی جائے گی چنانچہ سنگ میل پبلیکیشنز اردو بازار لاہور کی شائع کردہ کتاب ”قائد اعظم کے مہ و سال“ (مصنفہ جناب محمد علی چراغ) کے ص ۳۳۰ میں مذکور ہے کہ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ:

”مغرب کے نظام معاشیات نے متعدّد مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ میں اسلامی نظریات کے مطابق آپ کے یہاں نظام معیشت دیکھنے کا متمنّی ہوں۔ مغرب کا معاشی نظام ہی دو عظیم جنگوں کا موجب بنا ہے۔ ہمیں اپنے مقاصد اور ضروریات کے لیے کام کرنا ہے، ہمیں انسانوں کے لیے معاشرتی اور معاشی انصاف کے تقاضے پورے کرنے ہیں۔“

جبکہ مکتبہ محمود مکان نمبر ۸، رسول پورہ اسٹریٹ اچھرہ لاہور کے شائع کردہ کتابچہ "نظریہ پاکستان اور اسلامی نظام" میں قائداعظم کے مذکورہ خطاب کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

"میں اشتیاق اور دلچسپی سے معلوم کرتا رہوں گا کہ آپ کی "مجلس تحقیق" بنکاری کے ایسے طریقے کیونکر وضع کرتی ہے جو معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے اسلامی تصورات کے مطابق ہوں۔ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں اور اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ مغرب کو اس تباہی سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ مغربی نظام، افراد انسانی کے مابین انصاف کرنے اور بین الاقوامی میدان میں آویزش اور چپقلش دور کرنے میں ناکام رہا ہے بلکہ گزشتہ نصف صدی میں ہونے والی دو عظیم جنگوں کی ذمہ داری سراسر مغرب پر عائد ہوتی ہے۔ مغربی دنیا صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظام اور نظریہ اختیار کیا تو عوام کی پرسکون خوش حالی حاصل کرنے کے اپنے نصب العین میں ہمیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اپنی تقدیر ہمیں منفرد انداز میں بنانی پڑے گی۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی تصورات پر قائم ہو۔ ایسا نظام پیش کر کے گویا ہم مسلمانوں کی حیثیت سے اپنا قومی فرض سرانجام دیں گے۔ انسانیت کو سچے اور صحیح امن کا پیغام دیں گے کہ صرف ایسا امن ہی انسانیت کو جنگ کی ہولناکی سے بچا سکتا ہے اور صرف ایسا امن ہی بنی نوع انسان کی خوشی اور خوش حالی کا امین ہو سکتا ہے۔"

اس لیے شریعت اپیلٹ بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان کے قابل صد احترام سربراہ اور معزز ارکان سے گزارش ہے کہ سودی نظام کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کے تاریخی فیصلے پر نظر ثانی کا فیصلہ کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات، جناب نبی اکرمؐ اور خلفاء راشدین کے تعامل، امت کے ہر دور کے جمہور علماء وفقہاء کے فیصلوں، قیام پاکستان کے نظریاتی مقاصد

اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ارشادات و تصریحات کو سامنے رکھیں اور نوآبادیاتی استحصالی نظام کے منحوس شکنجے سے مظلوم پاکستانی قوم کو نجات دلانے والے تاریخی فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرمودات کی تعمیل کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مغرب کے استحصالی معاشی نظام کے جبر کو توڑنے میں پہل اور پیش قدمی کا اعزاز بھی برقرار رکھیں۔

پاکستان میں سودی نظام۔ تین پہلوؤں سے

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۶ جون ۲۰۰۲ء)

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سودی نظام و قوانین کے ۳۰ جون ۲۰۰۲ء تک خاتمہ کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان کے تاریخی فیصلے پر نظر ثانی کے سلسلے میں یو بی ایل کی اپیل ان دنوں شریعت ایپلٹ بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان میں زیر سماعت ہے۔ اس موقع پر دینی و ملی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے ''پاکستان شریعت کونسل'' کی طرف سے چند گزارشات فریقین کے وکلاء اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے دیگر سرکردہ ارباب علم و دانش کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) آسمانی مذاہب میں سود کی حرمت

سود تمام آسمانی شریعتوں میں حرام چلا آ رہا ہے اور بائبل میں بھی اس سلسلے میں واضح ہدایات موجود ہیں۔

- چنانچہ بائبل کی کتاب خروج باب ۲۲ آیت ۲۵ میں ارشاد ہوتا ہے

  ''اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو، جو تیرے پاس رہتا ہے، کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور اس سے سود نہ لینا''۔

- استثناء باب ۲۳ آیت ۱۹ میں ہے

  ''تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا خواہ وہ روپے کا ہو یا اناج کا یا کسی اور ایسی چیز کا جو بیاج پر دی جایا کرتی ہے''۔

• جبکہ زبور باب ۱۵ آیت ۵ میں نیک آدمی کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے
"وہ اپنا روپیہ سود پر نہیں دیتا"۔

• قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیات ۲۷۵ تا ۲۷۹ میں سود کی ممانعت کرتے ہوئے سود اور تجارت کو باہم مثل قرار دینے والوں کے موقف کی نفی کی گئی ہے۔ تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا گیا ہے، سود سے باز نہ آنے والوں کے طرز عمل کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف قرار دیا گیا ہے، اور سود اور تجارت میں فرق نہ کرنے والوں کو مخبوط الحواس بتایا گیا ہے۔

• سورۃ النساء کی آیت ۶۱ میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور عذاب کے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بتایا گیا ہے کہ انہیں سود سے منع کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ سود لیتے تھے۔

• جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ کے تاریخی خطبے میں سود کی کلی ممانعت اور تمام سابقہ سودی معاملات کے خاتمہ کا اعلان فرمایا۔ اور جناب رسول اللہؐ کی بیسیوں احادیث میں سود کی مذمت اور سود کا کاروبار کرنے والوں کے لیے سخت عذاب اور شدید ناراضی کی وعید موجود ہے۔

• علامہ سید سلیمان ندویؒ نے "سیرۃ النبیؐ" میں لکھا ہے کہ جب اہل طائف نے جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں پیش ہو کر اسلام قبول کرنے کے لیے چند شرائط پیش کیں تو ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہم سود کا لین دین نہیں چھوڑ سکتے اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہمارا بیشتر کاروبار سود پر چلتا ہے۔ لیکن آنحضرتؐ نے یہ شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ "سیرۃ النبیؐ" میں ہی مذکور ہے کہ نجران کے مسیحیوں نے جناب رسول اکرمؐ کے ساتھ اسلامی سلطنت میں بطور ذمی رہنے کا معاہدہ کیا تو معاہدہ کی باقاعدہ شرائط میں یہ بات درج تھی کہ ان میں سے کوئی بھی سود کا لین دین نہیں کرے گا۔

• جناب نبی اکرمؐ نے متعدّد احادیث میں امت میں سود کے عام ہونے کو قیامت کی نشانیوں اور امت میں پیدا ہونے والی خرابیوں میں ذکر فرمایا ہے۔

• مثلاً مشکوۃ باب الربا میں ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد کے حوالے سے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ہر شخص سود کھانے لگے گا اور جو نہیں کھانا چاہے گا اس کے سانس کے ساتھ سود شامل ہو گا۔

• مسند احمد اور بیہقی میں حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک دور ایسا آئے گا کہ کچھ لوگوں کی شکلیں اس لیے بندروں اور خنزیروں کی صورت میں مسخ ہو جائیں گی کہ وہ شراب پیتے ہوں گے، ریشم پہنتے ہوں گے، ناچ گانے کی محفلیں آباد کرتے ہوں گے اور سود کھاتے ہوں گے۔

• حافظ ابن القیمؒ نے ''اغاثۃ اللھفان'' میں جناب رسول اللہؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ وہ تجارت کے نام پر سود کو حلال قرار دینے لگیں گے''۔

(۲) شخصی و تجارتی سود کا معاملہ

کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ نے اس سود کی ممانعت کی ہے جو شخصی قرض پر ضرورت مندوں سے لیا جاتا تھا لیکن تجارتی قرض یا لین دین میں سود کی ممانعت نہیں فرمائی۔ یہ بات درست نہیں ہے، مندرجہ ذیل شواہد اس کی تردید کرتے ہیں۔

1. سورۃ البقرۃ میں حرمت ربا کے احکام کے ضمن میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ہے ''اگر مقروض تنگ دست ہو تو کشادہ دست ہونے تک اس کو مہلت دے دو''۔ اس آیت میں اس صورت کے بیان کے لیے لفظ ''ان'' استعمال ہوا ہے جو عربی زبان کے قواعد کی رو سے اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ صورت نادر الوقوع ہے۔ کیونکہ عام الوقوع صورت کے ذکر کے لیے عربی زبان میں لفظ ''اذ'' استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں اللہ تعالی نے روز مرہ لین دین کے احکام بیان کرنے کے لیے ''اذا تداینتم بدین''

کے، جبکہ اگلی آیت میں اسی ضمن کی ایک نادر صورت یعنی سفر میں لین دین کی صورت میں رہنے کا حکم بیان کرنے کے لیے "وان کنتم علی سفر" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح سورۃ المائدۃ کی آیت ۶ میں عام حالات میں نماز سے پہلے وضو کا حکم بیان کرنے کے لیے "اذا قمتم الی الصلاۃ" کے الفاظ آئے ہیں، جبکہ غیر معمولی صورت احوال میں تیمم کا حکم بیان کرنے کے لیے "وان کنتم مرضی اوعلی سفر" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

چنانچہ یہ تصور غلط ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں صرف تنگ دست اور مفلوک الحال لوگ ہی اپنی روزمرہ ضروریات کے لیے سود پر قرض لیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ صورت تو قرآن کے الفاظ کی رو سے نادر اور قلیل الوقوع تھی جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ لوگ عام طور پر ذاتی اور صرفی ضروریات کے بجائے تجارتی مقاصد کے لیے سود پر قرض لیا کرتے تھے اور قرآن نے کسی تفریق کے بغیر دونوں کو حرام قرار دیا ہے۔

2. سورۃ الروم کی آیت ۳۹ میں اللہ تعالی نے سود پر قرض دینے کا محرک بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اور تم سود پر جو قرض اس غرض سے دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال میں بڑھے تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا"۔ یہ محرک ظاہر ہے کہ ضرورت مندوں کو دیے جانے والے صرفی قرضوں کی بجائے حقیقتاً تجارتی سود میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ صرفی قرضوں میں تو قرض کے مع سود واپس آنے کے بجائے خود اصل رقم ہی کے ڈوب جانے کا امکان غالب ہوتا ہے۔

3. سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب التغلیظ فی الربا میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، سود دینے والے، سود کا معاملہ لکھنے والے اور اس کا گواہ بننے والے سب افراد کو اللہ کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس سود سے مراد تجارتی کے بجائے صرف صرفی قرضوں کا سود ہے تو اس میں سود لینے والا کس وجہ سے لعنت کا مستحق ہے؟ کیونکہ وہ بے چارہ تو جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے نہایت اضطرار کی حالت میں سود پر قرض لے رہا ہے۔

4. احادیث میں ''ربا الفضل'' یعنی ہم جنس اشیاء کے مبادلہ میں کمی بیشی کی ممانعت کے احکام ''ربا النسیأۃ'' ہی کی فرع ہیں اور سود سے بچنے کے لیے سد ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں دو روایتیں درج ذیل ہیں۔

• صاحب مشکوۃ نے باب الربا میں بخاری شریف اور مسلم شریف کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے خیبر کے محاصل وصول کرنے کے لیے ایک نمائندہ بھیجا جو واپس آیا تو اس کے پاس سب عمدہ قسم کی کھجوریں تھیں۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ کیا خیبر میں ساری کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ میں نے عام اور ردی کھجوریں زیادہ مقدار میں دے کر ان کے عوض عمدہ کھجوریں تھوڑی مقدار میں لے لی ہیں۔ جناب رسول اللہؐ نے اس سے منع فرمایا اور ہدایت کی کہ اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو ردی کھجوریں نقد رقم کے عوض بیچ کر اس کے بدلے میں عمدہ کھجوریں خرید لیا کرو۔

• مشکوۃ شریف باب الربا میں ہی بخاری اور مسلم کے حوالے سے یہ واقعہ بھی منقول ہے کہ حضرت بلالؓ جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں عمدہ کھجوریں لائے۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ کہاں سے آئی ہیں؟ حضرت بلالؓ نے جواب دیا کہ عام کھجوریں زیادہ مقدار میں دے کر ان کے عوض یہ عمدہ کھجوریں تھوڑی مقدار میں لے لی ہیں۔ جناب رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ تو ''عین ربا'' ہے اس لیے ایسا مت کرو۔ اگر اس طرح کرنا ضروری ہو تو عام کھجوریں کسی اور چیز کے عوض فروخت کر کے اس کے بدلے میں عمدہ کھجوریں لے لیا کرو۔

احادیث سے ظاہر ہے کہ ربا الفضل کے احکام کا اطلاق روزمرہ کے تجارتی لین دین پر ہوتا ہے نہ کہ صرفی قرضوں پر۔ اب یہ ایک بالکل نامعقول بات ہوگی کہ تجارتی لین دین میں سد ذریعہ کے طور پر ربا الفضل تو حرام ہو اور ربا النسیئہ،

جس سے بچنے کے لیے ربا الفضل کو احتیاطاً ممنوع قرار دیا گیا ہو، حلال اور جائز ہو۔

5. یہ بات تاریخی شواہد سے بھی ثابت ہے کہ عہد رسالتؐ اور دور صحابہؓ میں تجارتی قرضوں کا رواج موجود تھا۔ اس سلسلے میں دو واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

• بخاری شریف کتاب الجہاد باب برکۃ الغازی فی مالہ میں مذکورہ ہے کہ حضرت زبیر بن العوامؓ لوگوں سے قرض لے کر تجارت کیا کرتے تھے اور وفات کے بعد ان کے ذمے مختلف لوگوں کے اس قسم کے قرضوں کی مالیت بائیس لاکھ درہم تھی جو موجودہ پاکستانی کرنسی کے حساب سے پانچ کروڑ روپے سے زیادہ رقم بنتی ہے۔

• طبری مطبوعہ قاہرہ ج ۳ ص ۸۷ میں مذکورہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں ہند بن عتبہؓ نے بیت المال سے قرض لے کر بلاد کلب میں جا کر اس سے تجارت کی۔

ان شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ دور نبویؐ اور دور صحابہؓ میں شخصی قرضوں کے علاوہ تجارت میں سود کی شکلیں موجود تھیں، لوگوں سے قرض لے کر سرمایہ کاری ہوتی تھی اور تجارت کے لیے بیت المال سے قرض لینے کی صورت بھی موجود تھی لیکن ان تمام صورتوں کی موجودگی کے باوجود کسی بھی صورت میں سود کا کوئی معمول نہیں تھا۔ اور شخصی ضرورت، تجارت اور سرمایہ کاری سمیت کسی بھی غرض کے لیے قرض لینے پر سود کی کلی ممانعت تھی۔

(۳) قیام پاکستان کا مقصد اور بانیٔ پاکستان کے ارشادات

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قیام اس غرض سے عمل میں لایا گیا تھا کہ اس ملک میں قرآن و سنت کا نظام نافذ کیا جائے گا اور برطانوی دور کے نوآبادیاتی نظام سے نجات حاصل کر کے اس کی جگہ قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کی طرز پر نیا نظام رائج کیا جائے گا جس کی صراحت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے متعدّد ارشادات میں موجود ہے۔ انہوں نے ملکی معیشت کے بارے میں وضاحت کے ساتھ فرمایا تھا کہ پاکستان کے معاشی نظام کی بنیاد

اسلامی تعلیمات پر ہوگی اور مغرب کے معاشی نظام سے نجات حاصل کی جائے گی۔ چنانچہ سنگ میل پبلی کیشنز اردو بازار لاہور کی شائع کردہ کتاب ''قائداعظم کے مہ و سال'' (مصنف جناب محمد علی چراغ) کے ص ۳۳۰ پر مذکور ہے کہ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اپنے خطاب میں فرمایا

''مغرب کے نظام معاشیات نے متعدّد مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ میں اسلامی نظریات کے مطابق آپ کے یہاں نظام معیشت دیکھنے کا متمنّی ہوں۔ مغرب کا معاشی نظام ہی دو عظیم جنگوں کا موجب بنا ہے۔ ہمیں اپنے مقاصد اور ضروریات کے لیے کام کرنا ہے، ہمیں انسانوں کے لیے معاشرتی اور معاشی انصاف کے تقاضے پورے کرنے ہیں''۔

مکتبہ محمود مکان نمبر ۸، رسول پورہ اسٹریٹ، اچھرہ، لاہور سے شائع کردہ کتابچہ ''نظریۂ پاکستان اور اسلامی نظام'' میں قائداعظم کے مذکورہ خطاب کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

''میں اشتیاق اور دلچسپی سے معلوم کرتا رہوں گا کہ آپ کی ''مجلس تحقیق'' بینکاری کے ایسے طریقے کیونکر وضع کرتی ہے جو معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے اسلامی تصورات کے مطابق ہوں۔ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں اور اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ مغرب کو اس تباہی سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ مغربی نظام افرادِ انسانی کے مابین انصاف کرنے اور بین الاقوامی میدان میں آویزش اور چپقلش دور کرنے میں ناکام رہا ہے۔ بلکہ گزشتہ نصف صدی میں ہونے والی دو عظیم جنگوں کی ذمہ داری سراسر مغرب پر عائد ہوتی ہے۔ مغربی دنیا صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظام اور نظریہ اختیار کیا تو عوام کی پرسکون خوشحالی حاصل کرنے کے لیے اپنے نصب العین میں ہمیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اپنی تقدیر ہمیں منفرد انداز میں بنانی پڑے گی۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی تصورات پر قائم ہو۔ ایسا نظام پیش کر کے گویا ہم مسلمانوں کی حیثیت سے اپنا قومی فرض سرانجام دیں گے، انسانیت کو سچے اور صحیح امن کا پیغام دیں گے کہ صرف ایسا امن ہی انسانیت کو جنگ کی ہولناکی سے بچا سکتا ہے اور صرف

ایسا امن ہی بنی نوع انسان کی خوشی اور خوشحالی کا امین ہو سکتا ہے“۔

اسلام میں شخصی اور تجارتی سود دونوں حرام ہیں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۲ جون ۲۰۰۲ء)

سپریم کورٹ آف پاکستان میں سود کے بارے میں عدالت عظمی کے فیصلہ پر نظر ثانی کی اپیل دائر ہوگئی ہے اور ان سطور کی اشاعت تک اپیل کی سماعت شروع ہو چکی ہوگی۔ عدالت عظمی نے اپنے فیصلے میں پاکستان میں رائج تمام سودی قوانین کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیتے ہوئے حکومت کو ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مقررہ مدت کے اندر سودی قوانین کو ختم کر کے ان کی جگہ اسلامی مالیاتی قوانین کا نفاذ عمل میں لائے۔ یہ مدت ۳۰ جون ۲۰۰۲ء کو ختم ہو رہی ہے اور اسی وجہ سے حکومت نے سپریم کورٹ سے دوبارہ رجوع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مدت ختم ہونے سے قبل موجودہ مالیاتی نظام کے تسلسل کو باقی رکھنے کا کوئی راستہ نکالا جا سکے۔

سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بنچ کے رکن جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی کو اس منصب سے فارغ کر دیا گیا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سودی قوانین کے خلاف عدالت عظمی کا مذکورہ فیصلہ انہوں نے تحریر کیا تھا اور اب وہ اس فیصلہ کو مزید معطل رکھنے اور اس پر عملدرآمد کی مدت میں توسیع کرنے کے لیے تیار دکھائی نہیں دے رہے تھے، اس لیے مبینہ طور پر وہ آرڈر ہی واپس لے لیا گیا ہے جس کے تحت انہیں ۱۹۹۶ء میں سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بنچ کا رکن بنایا گیا تھا۔ ان کی جگہ نئے رکن کا تقرر ہو گیا ہے اور سودی قوانین کے بارے میں عدالت عظمی کے فیصلہ پر نظر ثانی کی اپیل کی سماعت کے لیے پانچ رکنی بنچ مقرر کیا جا چکا ہے۔

حکومتی حلقے موجودہ مالیاتی نظام کے تسلسل کو ہر حال میں باقی رکھنا چاہتے ہیں اور سودی قوانین کو اسلامی قوانین میں تبدیل کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہیں۔ اس کی غمازی اٹارنی جنرل آف پاکستان کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ہم ایسے علماء تلاش کر رہے ہیں جو سود کا شرعی طور پر جواز پیش کر سکیں۔ اس لیے اس سلسلہ میں اب تک ہونے والے اقدامات کی روشنی میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حکومت عدالت عظمی سے اس فیصلہ پر عملدرآمد کو غیر معینہ مدت تک ملتوی کرانے یا کم از کم مزید مہلت حاصل

کرنے میں کامیاب ہوگی اور موجودہ سود پر مبنی مالیاتی نظام کو ۳۰ جون کے بعد بھی جاری رکھا جاسکے گا۔

سود کو تمام آسمانی شریعتوں میں مشترکہ طور پر حرام اور ناجائز کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جس طرح قرآن کریم نے سود کے لین دین سے منع کیا ہے بائبل میں بھی اس کی ممانعت موجود ہے۔ چنانچہ بائبل کی کتاب خروج باب ۲۲ آیت ۲۵ میں یہ ہدایت درج ہے کہ

"اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہے کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔"

اسی طرح بائبل کی کتاب استثناء باب ۲۳ آیت ۱۹ میں کہا گیا ہے کہ

"تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا خواہ وہ روپے کا سود ہو یا اناج کا یا کسی اور ایسی چیز کا جو بیاج پر دی جاتی ہے۔"

جبکہ زبور باب ۱۵ کی آیت ۵ میں اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

"وہ اپنا روپیہ سود پر نہیں دیتا۔"

چنانچہ قرآن کریم سورہ النساء کی آیات ۱۵۳ تا ۱۶۱ میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور لعنت و غضب کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ انہیں سود کے لین دین سے منع کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ سود لیتے تھے۔ قرآن کریم میں سورہ البقرہ کی آیات ۲۷۵ تا ۲۷۹ میں اللہ تعالیٰ نے سود کے لین دین سے منع کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ سود سے رقم میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ بے برکتی ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ انتباہ بھی کیا گیا ہے کہ

"اے ایمان والو! اگر تم سود کھانے سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔"

اسی طرح سورہ آل عمران آیت ۱۳۰ میں سود خوری سے منع کرتے ہوئے سورہ الروم آیت ۳۹ میں سمجھا گیا ہے کہ تم رقم میں اضافے کے لیے جو سود کا کاروبار کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک رقم میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ صدقہ خیرات کرنے سے رقم میں برکت ہوتی ہے اور وہی اصل اضافہ ہے۔

سود کے بارے میں عام طور پر ایک غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ قرآن کریم میں جس سود سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد شخصی قرضہ ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند اپنی کسی ضرورت کے لیے قرض لے تو اس پر سود نہ لیا جائے، اس سے مراد تجارتی سود نہیں ہے کیونکہ تجارتی سود کوئی ضرورت مند ذاتی ضرورت کے لیے نہیں لیتا بلکہ مالدار لوگ تجارتی مقاصد کے

لیے سود کا لین دین کرتے ہیں جس میں باہمی رضامندی شامل ہوتی ہے اس لیے تجارتی سود اس حرمت میں شامل نہیں ہے۔ لیکن یہ سراسر مغالطہ آفرینی ہے کیونکہ قرآن کریم میں جہاں سود کی حرمت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں مشرکین کی یہ دلیل بھی بیان کی گئی ہے کہ سود تو کاروبار ہی کی طرح ہے اور اللہ تعالی نے مشرکین کی یہ دلیل ذکر کرنے کے بعد سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیات میں اس کی نفی فرمائی ہے کہ سود اور تجارت میں فرق ہے اس لیے اللہ تعالی نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور تجارت کو جائز کہا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تجارتی سود بھی اسی طرح رائج تھا جیسے شخصی قرضوں پر سود کا لین دین ہوتا تھا۔ چنانچہ مولانا شبلیؒ نعمانی نے ''سیرت النبیؐ'' میں طائف والوں کے مسلمان ہونے کا واقعہ میں لکھا ہے کہ جب طائف کا وفد آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا تو اسلام قبول کرنے کے لیے جو شرائط پیش کیں ان میں ایک شرط یہ تھی کہ ہم سود کا لین دین نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے لیے ان کی ایک دلیل یہ تھی کہ ہمارے تمام تر کاروبار کا مدار سود پر ہے اس کے بغیر ہم کاروبار جاری نہیں رکھ سکتے۔ لیکن جناب نبی اکرمؐ نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا اور طائف والوں کو قبول اسلام کے لیے دیگر شرائط کے ساتھ یہ شرط بھی واپس لینا پڑی۔ اسی طرح ''سیرت النبیؐ'' میں ہی درج ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کا جو معاہدہ کیا اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اگر نجران والوں نے سود کا لین دین کیا تو معاہدہ ختم ہو جائے گا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے خیبر پر ایک عامل مقرر کیا تاکہ وہاں کی پیداوار سے بیت المال کا حصہ وصول کرے، وہ عامل واپس آیا تو اس کے پاس تمام کی تمام عمدہ کھجوریں تھیں۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہوتی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ میں نے ردی کھجوریں زیادہ مقدار میں دے کر عمدہ کھجوریں ان کے عوض تھوڑی مقدار میں لے لی ہیں۔ حضورؐ نے اس سے منع فرمایا کہ یہ سود ہے اس کی بجائے ایسا کیا کرو کہ ردی کھجوریں نقد رقم کے عوض بیچ کر اس نقد رقم سے عمدہ کھجوریں خرید لیا کرو۔

بخاری اور مسلم میں یہ روایت بھی ہے کہ حضرت بلالؓ ایک بار عمدہ کھجوریں حضورؐ کی خدمت میں لائے۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ اتنی عمدہ کھجوریں کہاں سے آئی ہیں؟ حضرت بلالؓ

نے کہا کہ میرے پاس ردی کھجوریں تھیں میں نے انہیں زیادہ مقدار میں دے کران کے عوض تھوڑی مقدار میں عمدہ کھجوریں لے لی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ یہ تو عین سود ہے۔ ایسامت کرو بلکہ اگر یہ کرنا ہو تو ردی کھجوریں کسی اور چیز کے عوض بیچ کر اس کے بدلے عمدہ کھجوریں لیا کرو۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں شخصی سود اور تجارتی سود میں کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں کو یکساں طور پر حرام قرار دیا گیا ہے اور تجارتی سود کی آڑ میں سود کو جائز قرار دینے کی کوشش دراصل عذر لنگ ہے جس کے بارے میں حافظ ابن القیمؒ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی پہلے ہی بیان فرمادی ہے کہ

”ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ تجارت کے نام پر سود کو حلال قرار دینے لگیں گے۔“

سود کی حیثیت رسول اللہؐ کی نظر میں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۱ جون ۲۰۰۲ء)

سود کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان میں بحث جاری ہے اس مناسبت سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات پیش کیے جارہے ہیں۔

1. بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے کبیرہ گناہوں میں سات بڑے گناہوں کا ذکر فرمایا اور ان میں سود کا بھی ذکر کیا کہ سات بڑے گناہوں میں سود کا لین دین بھی شامل ہے۔

2. بخاری شریف میں حضرت عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سود کھانے والوں، دینے والوں، سودی کاروبار کے گواہوں، اور سود کا معاملہ لکھنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔

3. مستدرک حاکم کی روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ چار آدمیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ انہیں جنت میں نہیں داخل کیا جائے گا۔ (۱) شراب کا عادی (۲) سود خور (۳) یتیم کا مال کھانے والا (۴) ماں باپ کا نافرمان۔

4. ابن ماجہؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ سود کی برائی کے ستر درجے ہیں جس میں سب سے کم درجہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص (معاذ اللہ) اپنی ماں سے بدکاری کا ارتکاب کرے۔

5. مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی بستی میں زنا اور سود عام ہو جائے تو گویا اس بستی کے لوگوں نے اپنی جانوں کو اللہ تعالی کے عذاب کا مستحق بنا لیا ہے۔

6. مسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنے سفر معراج کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سفر میں اللہ تعالی نے مختلف لوگوں کو ان کے جرائم پر ملنے والی سزاؤں کی کیفیات آپؐ کو دکھائیں۔ ان میں سے ایک گروہ کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان لوگوں کے پیٹ اتنے بڑے بڑے تھے جیسے کمرے ہوں، ان میں سانپ دوڑتے پھرتے تھے جو باہر سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ حضورؐ نے ساتھ والے فرشتے سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ سود کھانے والے لوگ ہیں جو اس عذاب کا شکار ہیں۔

7. بخاری شریف میں حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے اپنا ایک خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں خواب میں یہ منظر دکھایا گیا کہ خون کی نہر ہے جس کے درمیان میں ایک شخص ہے جو تیرتے ہوئے کنارے کی طرف آتا ہے اور باہر نکلنا چاہتا ہے مگر کنارے پر کھڑا ایک شخص پتھر مار کر اسے واپس نہر کے وسط میں دھکیل دیتا ہے۔ وہ پھر نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو کنارے والا شخص دوبارہ بھاری پتھر مار کر اسے واپس دھکیل دیتا ہے اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ آپؐ نے فرشتوں سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سود خور ہے جسے اس صورت میں عذاب دیا جا رہا ہے۔

8. طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ قیامت سے قبل لوگوں میں سود، زنا، اور شراب نوشی کی کثرت ہو جائے گی۔

9. مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جب لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرنے لگیں گے اور لوگ عینہ (سود کی ایک قسم) کا کاروبار کرنے لگیں گے اور جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کریں گے۔ پھر وہ عذاب اس وقت تک ان سے نہیں ہٹے گا جب تک وہ دین کی طرف واپس نہیں لوٹ جائیں گے۔

10. مسلم شریف میں روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں سود کی ممانعت کا اعلان کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ جاہلیت کے دور کا سود ختم کر دیا گیا ہے، اس سے قبل جن لوگوں نے سود پر رقوم کا لین دین کر رکھا ہے وہ اصل رقم واپس کریں گے اور سود کی رقم ادا نہیں کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب سے پہلے سود کی جس رقم کے ختم کرنے کا میں اعلان کرتا ہوں وہ میرے چچا حضرت عباسؓ کی رقوم ہیں جو سودی کاروبار کے سلسلہ میں لوگوں کے ذمہ تھیں، وہ سب ساقط کر دی گئی ہیں۔

11. مسند احمد میں حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کچھ لوگ بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دیے جائیں گے جس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ شراب پیتے ہوں گے، ریشم پہنتے ہوں گے، ناچنے گانے والیاں ان کی محفلوں میں ہوں گی، اور وہ سود کھاتے ہوں گے۔

12. مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے جناب رسول اللہؐ کے ساتھ جب اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیت کے طور پر رہنے کا معاہدہ کیا تو اس معاہدہ میں حضورؐ نے ایک شق یہ بھی لکھوائی کہ تم میں سے جس نے سود کا کاروبار کیا وہ اس ذمہ داری (معاہدہ) میں شامل نہیں ہوگا۔

13. مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ اے مسلمانو! تم یہودیوں، عیسائیوں، اور

مجوسیوں کے ساتھ کاروبار میں شرکت نہ کرو۔ وجہ پوچھی گئی تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ سودی کاروبار کرتے ہیں جو حلال نہیں ہے۔

14. دارقطنی میں حضرت عبد اللہ بن حنظلہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سود کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت اور برا ہے۔

15. اغاثہ اللھفان میں حافظ ابن القیمؒ نے جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ میری امت پر ایک دور ایسا آئے گا جب لوگ تجارت کے نام پر سود کو حلال قرار دینے لگیں گے۔

سیرت نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم۔ چند مزید گزارشات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۹ مئی ۲۰۰۲ء)

شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کی سالانہ سیرت کانفرنس میں ”سیرت نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم“ کے عنوان سے راقم الحروف کی گزارشات قارئین کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ اس کانفرنس میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف، ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی اور دیگر علماء کرام نے بھی خطاب کیا جبکہ مہمان خصوصی اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان تھے جنہوں نے اپنے اختتامی خطاب میں راقم الحروف کی معروضات کو سیرۃ النبیؐ کے صحیح رخ پر مطالعہ کی کوشش قرار دیا اور کہا کہ آج کے عالمی حالات اور مشکلات و مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے سیرت نبویؐ کے اسی طرز کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے میری گزارشات کے حوالہ سے دو پہلوؤں پر اپنے تحفظات کا بھی اظہار فرمایا جن کے بارے میں خود میرا بھی خیال ہے کہ ان کی وضاحت ضروری تھی اور یہ وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے خطاب کے بعد اس سیرت کانفرنس میں مزید کچھ گزارش کرنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے ان امور کی طرف توجہ دلانے پر ڈاکٹر ایس ایم زمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ”نوائے قلم“ کے ذریعے ان کے بارے میں ضروری معروضات پیش کر رہا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ مذہب کے لیے ہتھیار اٹھانے سے کیا مراد ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ:

- اگر تو اس سے مراد مذہب کے دفاع کے لیے ہتھیار اٹھانا ہے تو اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے،
- اور اگر اس کا مطلب مذہب کی تبلیغ کے لیے ہتھیار اٹھانا ہے تو یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور قرآن کریم نے سورہ بقرہ آیت ۲۵۵ میں صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ ”دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔“

مجھے ڈاکٹر صاحب موصوف کی دونوں باتوں سے اتفاق ہے لیکن یہ معاملہ ان دو صورتوں میں محدود نہیں ہے بلکہ ایک اور صورت بھی درمیان میں موجود ہے جس کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے عام طور پر یہ الجھن پیش آجایا کرتی ہے۔ وہ ہے کچھ قوموں اور گروہوں کا اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نسل انسانی تک اسلام کا پیغام پہنچانے میں رکاوٹ بننا۔ اور اسلام نے کافر قوتوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا حکم اسی صورت میں دیا ہے جبکہ وہ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچنے میں رکاوٹ بن جائیں، کیونکہ اسلام یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو پیغام ہے صرف وہی نسل انسانی کی نجات کا ضامن ہے اور انسانی معاشرہ اس کے بغیر نجات و فلاح اور امن و خوشحالی کی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو لوگ شخصی یا مقامی دائروں میں اسلام قبول نہیں کرتے لیکن اسلام کی دعوت میں بھی رکاوٹ نہیں بنتے، اسلام ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا اور انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ لیکن جو کافر اسلام قبول نہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف اس قدر معاندانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں کہ اس کی دعوت میں رکاوٹ بن جائیں تو اسلام ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی بات کرتا ہے۔ یہ ہتھیار اٹھانا کسی کو قبول اسلام پر مجبور کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسلام کی دعوت میں رکاوٹ بننے سے روکنے کے لیے ہے۔ چنانچہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے حوالہ سے اپنے کمانڈروں کو یہی ہدایات دی ہیں کہ:

1. سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کرو، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے اور کوئی تنازع باقی نہیں رہتا۔

2. لیکن اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو دوسرے نمبر پر کافروں کے سامنے یہ پیشکش رکھنے کی ہدایت جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے دی گئی ہے کہ اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے اسلام کی بالادستی (عالمی کردار) کو قبول کر لو، اگر وہ یہ درجہ قبول کر لیں تو بھی ان کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا بلکہ اسلامی ریاست ان کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اسے نبھاتی ہے۔

3. اس کے بعد تیسرے درجہ میں یہ بات ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں اور اسلام کی بالادستی کو قبول نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں مزاحم ہیں اور رکاوٹ بن رہے ہیں، چنانچہ اس صورت میں جناب نبی اکرمؐ نے ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا ہے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ قرار دیتے ہوئے اس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ بتایا ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے امریکہ اور اس کے اتحادی یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت جو عالمی نظام اور بین الاقوامی سسٹم موجود ہے اور جس تہذیب و ثقافت نے اس وقت پوری دنیا کو گھیرے میں لے رکھا ہے وہی سسٹم اور ثقافت نسل انسانی کے لیے سب سے بہتر ہے اور اس سے بہتر کسی سسٹم اور کلچر کا کوئی امکان نہیں ہے، اس لیے دنیا کا جو ملک اور قوم ان کے نزدیک اس نظام و ثقافت کے عالمی کردار کے لیے خطرہ قرار پاتا ہے وہ اس کے خلاف چڑھ دوڑتے ہیں، اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں اور پھر ہزاروں انسانوں کی ہلاکتوں کے باوجود بڑے فخر کے ساتھ اس اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے عالمی تہذیب کو بچا لیا ہے اور ورلڈ سسٹم کو درپیش خطرات کو ختم کر دیا ہے۔

میں اس مرحلہ میں اپنے اس موقف کا پھر اعادہ کرنا چاہوں گا کہ اگر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک تہذیب اور نظام کو نسل انسانی کے لیے سب سے بہتر سمجھتے ہوئے اس کے عالمی غلبہ کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھائیں تو وہ کسی دوسری تہذیب اور نظام کے علمبرداروں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتے کہ وہ اگر اپنے نظام و تہذیب کو نسل انسانی کے لیے دیانتداری کے ساتھ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں تو اس کے لیے عالمی کردار کے قیام اور تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھائیں۔ اور اگر امریکی اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھتے ہوئے دوسرے فریق کو اس حق سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو اس کا نام انصاف نہیں بلکہ یہ جنگل

کا قانون اور طاقت کی حکمرانی ہے جو طاقت اور اسلحہ کے زور پر تو قائم کی جا سکتی ہے لیکن اخلاقی جواز اور انصاف کی بنیاد سے محروم ہونے کی وجہ سے اسے قائم رکھنا کبھی ممکن نہیں رہا اور نہ ہی آئندہ ایسا کوئی امکان ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم زمان نے دوسرا سوال یہ اٹھایا کہ میں نے جن چھاپہ مار کارروائیوں کا حوالہ دیا ہے ان کے حوالے سے دہشت گردی کی ایسی کارروائیوں کی حمایت نہیں کی جا سکتی جن میں بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں اور نہ ہی ایسی کسی کارروائی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے جس میں کسی بستی، چوک یا ریڑھی میں بم رکھ کر بے گناہ شہریوں کے جسموں کے پرخچے اڑا دیے جاتے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر محترم کے اس ارشاد سے بھی مکمل اتفاق ہے لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ ہر چھاپہ مار کارروائی دہشت گردی نہیں ہوتی اور ہمیں چھاپہ مار کارروائیوں اور دہشت گردی میں فرق کرتے ہوئے ان کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا ہوگی۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف، ابو رافع اور اسود عنسی کے قتل کے لیے جن کارروائیوں کا حکم دیا وہ چھاپہ مار کارروائیاں ہیں اور حضرت ابو بصیرؓ نے سمندر کے کنارے عسکری کیمپ قائم کر کے قریش مکہ کے خلاف جو کارروائیاں کیں وہ بھی چھاپہ مار کارروائیاں ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کارروائیاں متعیّن اہداف کے لیے تھیں اور ان کا دائرہ بھی اہداف تک محدود رہا۔ جبکہ بدر کی جنگ سے قبل ابو سفیان کے تجارتی قافلہ کو روکنے کے لیے جناب نبی اکرمؐ کی تیاری اور قریش کے تجارتی راستے میں چھاپہ مار کر کیمپ قائم کر کے حضرت ابو بصیرؓ کا قریش کی شام کے تجارت میں رکاوٹ ڈالنا، یہ دشمن کی معیشت پر ضرب لگانے کی کارروائیاں تھیں اور یہ بھی جنگی حکمت عملی کا حصہ ہونے کی وجہ سے دہشت گردی نہیں ہیں۔

البتہ اس سے ہٹ کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سول آبادی اور بے گناہ اور غیر متعلق شہریوں کو نشانہ بنانے کی اجازت نہیں دی، اس کے بارے میں آپؐ کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ اور اسی وجہ سے غیر متعلقہ، بے گناہ اور نہتے شہریوں کو کسی قسم کی عسکری کارروائی کا نشانہ بنانا، اسی طرح کسی بس یا چوک میں بم رکھ کر یا کسی مسجد یا امام بارگاہ میں بم پھینک کر بے گناہ لوگوں کی جانوں سے کھیلنا یقیناً دہشت گردی ہے جس کی کوئی بھی ذی شعور شخص حمایت نہیں کر سکتا۔

مگر ایک سوال باقی ہے کہ کسی ضروری ہدف کو نشانہ بناتے ہوئے اگر ناگزیر درجہ میں کچھ بے گناہ زد میں آرہے ہوں تو پھر کیا کیا جائے؟ تو اس کے بارے میں ابو داؤد شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ کا واضح ارشاد موجود ہے کہ ایک غزوہ میں آپؐ سے سوال کیا گیا کہ دشمن کی قوت توڑنے کے لیے فلاں جگہ شب خون مارنا ضروری ہوگیا ہے مگر وہاں کچھ غیر متعلقہ لوگ بھی موجود ہیں جو حملہ کی صورت میں زد میں آسکتے ہیں۔ تو نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ بھی انہی میں سے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگی ضروریات کے لیے اگر کہیں کارروائی ناگزیر ہو جائے اور اس کارروائی کی زد میں غیر متعلقہ لوگ آرہے ہوں تو مجبوری کے درجہ میں اسے گوارا کیا جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے امریکی اتحاد نے اہداف کو نشانہ بناتے ہوئے ہزاروں بے گناہ افغانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور اس کا جواز صرف یہی پیش کیا جاتا ہے کہ جنگی کارروائی کے لیے ایسا ناگزیر تھا اور اس سے کوئی مفر نہیں تھا۔

امید ہے کہ ڈاکٹر ایس ایم زمان کے اٹھائے ہوئے دو سوالوں کی مناسب وضاحت قارئین کے سامنے آگئی ہوگی، اس سلسلہ میں اگر مزید کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اس کے لیے بھی حاضر ہوں، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پارلیمنٹ کے لیے اجتہاد کا اختیار

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۳ مئی ۲۰۰۲ء)

گزشتہ دنوں ملک کے معروف قانون دان جناب عابد حسن منٹو نے ایک قومی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ اجتہاد کے لیے مولوی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آج کے دور میں اجتہاد کرنا پارلیمنٹ کا کام ہے۔ جبکہ اس سے کچھ دن بعد تنظیم اسلامی پاکستان کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد کے ایک خطبہ جمعہ کے حوالے سے ان کا یہ ارشاد سامنے آیا ہے کہ اجتہاد کا کام کلیتاً پارلیمنٹ کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ یوں یہ بحث ایک بار پھر قومی اخبارات میں شروع ہوتی نظر آرہی ہے کہ آج کے دور میں اجتہاد کا حق کس کو حاصل ہے؟ اس سے قبل بھی یہ بحث کئی بار قومی حلقوں میں مختلف مراحل میں ہو چکی ہے اور متعدّد ارباب علم و دانش نے اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ اسلامائزیشن کے

حوالے سے یہ ایک بنیادی مسئلہ اور فیصلہ طلب معاملہ ہے اس لیے جب تک بحث وتمحیص کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ جاتی اظہار خیال کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اجتہاد علمی

شرعی اصطلاح میں ''اجتہاد'' اہل علم کی اس علمی تگ ودو کو کہا جاتا ہے جو وہ قرآن وسنت کے کسی حکم کی تعبیر وتشریح اور کسی نئے پیش آمدہ مسئلہ کے شرعی حل کے لیے کرتے ہیں، اسے ''اجتہاد علمی'' بھی کہا جاتا ہے اور اسے شرعی دلائل میں ایک مستقل دلیل کی حیثیت حاصل ہے۔ اجتہاد کے حوالے سے تمام امور تو اس مختصر مضمون میں زیر بحث نہیں آسکتے البتہ چند اہم پہلوؤں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کی جارہی ہیں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے اسلامی قلمرو (ریاست) میں شامل ہونے کے بعد حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کے ایک حصے کا قاضی بنا کر بھیجا تو روانہ کرنے سے قبل ان سے ایک انٹرویو لیا۔ اس میں جناب رسول اکرمؐ نے سوال کیا کہ تمہارے سامنے کوئی معاملہ پیش ہوا تو فیصلہ کس بنیاد پر کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ قرآن کریم کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ دوسرا سوال ہوا کہ اگر قرآن کریم میں تمہیں اس مسئلے کا کوئی حل نہ ملا تو پھر کیا کرو گے؟ جواب دیا کہ آپؐ یعنی جناب نبی اکرمؐ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضورؐ نے پھر سوال کیا کہ اگر میری سنت میں بھی اس معاملہ میں کوئی رہنمائی نہ ملی تو کیا کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور صحیح نتیجے تک پہنچنے میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی روا نہیں رکھوں گا۔ اس پر آنحضرتؐ نے ان کی تصویب فرمائی اور انہیں یمن کے لیے روانہ کر دیا۔

اس روایت کی روشنی میں یہ اصول قائم ہوا کہ کسی بھی مسئلے کا حل سب سے پہلے قرآن کریم میں تلاش کیا جائے گا اور اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ قرآن کریم میں نہ ملے تو سنت نبویؐ میں اس مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے گا اور اس کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے گا۔ اور اگر قرآن وسنت دونوں میں مسئلے کا حل نہ ملے تو پھر اہل علم کو حق حاصل ہوگا کہ وہ قرآن وسنت کی اصولی رہنمائی کی روشنی میں اس مسئلہ کا کوئی حل نکالیں۔ اس عمل کو شرعی اصطلاح میں ''اجتہاد'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرن اول میں اجتہاد کا یہی مفہوم تھا لیکن جب صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے دور میں بہت سے مسائل پر اجتماعی اجتہاد ہوا اور بعض امور پر صحابہ کرامؓ نے بالاتفاق فیصلے فرمائے تو اس ترتیب میں ایک اور درجے کا اضافہ ہوگیا کہ اگر کسی

اجتہادی مسئلہ پر صحابہ کرامؓ کے دور میں یا خیر القرون میں اہل علم نے اجتہاد کر کے ایک متفقہ موقف اختیار کر لیا ہے تو اس مسئلہ میں کوئی نیا اجتہاد کرنے کی بجائے اس متفقہ موقف کو ترجیح دی جائے گی۔ اسے ”اجماع“ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شرعی دلائل کی ترتیب علمائے امت کے ہاں اس طرح قائم ہوئی کہ

1. قرآن کریم: مسئلے کا حل سب سے پہلے قرآن کریم کی روشنی میں ہو گا،

2. سنت نبویؐ: قرآن کریم میں وضاحت و صراحت نہ ملنے پر سنت نبویؐ سے رجوع کیا جائے گا،

3. اجماع: سنت نبویؐ میں بھی مسئلے کا واضح حل موجود نہ ہونے کی صورت میں اس مسئلہ پر اگر علمائے کرام اور فقہائے عظام نے پہلے سے کوئی متفقہ یا اکثریتی موقف اختیار کر رکھا ہے تو اسے اختیار کیا جائے گا،

4. اجتہاد: اور اگر اجماع کی صورت میں بھی مسئلے کا کوئی حل اس سے قبل سامنے نہیں آیا تو اہل علم و اجتہاد شرعی اصولوں کی روشنی میں اس مسئلے کا حل نکالیں گے اور انہیں اجتہاد کا حق حاصل ہو گا۔

چنانچہ یہ چار دلائل امت کے اہل علم میں متعارف چلے آ رہے ہیں۔

اجتہاد مطلق

ابتداء میں قرآن و سنت میں جس مسئلہ کی وضاحت نہ ملتی اس میں علماء کے رائے قائم کرنے کو اجتہاد کہا جاتا تھا۔ مگر بعد میں قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر و تشریح میں الگ الگ نقطۂ نظر کے اظہار اور ان میں سے کسی ایک کو علمی بنیاد پر اختیار کرنے کے عمل کو بھی اجتہاد کے زمرے میں شمار کیا جانے لگا جس سے اجتہاد کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ صحابہ کرامؓ کا دور گزر جانے کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اجتہاد کا طریق کار اور اس کے کچھ اصول و ضوابط متعیّن کیے جائیں۔ چنانچہ حضرت حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، ابراہیم نخعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام جعفر صادقؒ، امام زیدؒ، امام لیث، اور امام داؤد ظاہریؒ سمیت بیسیوں اہل علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اجتہاد کے اصول وضع کیے اور ان کے مطابق عملی اجتہادات کیے مگر ان میں سے چند بزرگوں کی علمی کاوشوں کو امت میں پذیرائی

حاصل ہوئی جس سے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری، زیدی وغیرہ فقہی مکاتب فکر وجود میں آئے جبکہ باقی علمی حلقے آہستہ آہستہ تاریخ کی نذر ہو گئے۔

اجتہاد کے اصول وضوابط اور قوانین مدون کرنے کو ''اجتہاد مطلق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے ''مجتہد مطلق'' کہلاتے ہیں۔ یہ اجتہاد کا ابتدائی دور تھا جب اصول و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت تھی اور اس پر بیسیوں فقہاء نے کام کیا۔ ان میں سے چند فقہاء کو امت میں قبول عام حاصل ہونے کے بعد یہ ضرورت پوری ہوگئی اور ''اجتہاد مطلق'' کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اس معاملہ میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ علماء نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ حالانکہ ''اجتہاد مطلق'' کا دروازہ کسی نے بند کرنے کا اعلان نہیں کیا بلکہ ایک ضرورت پوری ہو جانے کے بعد خود بخود بند ہو گیا کیونکہ اس کے بعد از سر نو اجتہاد کے اصول وضوابط مرتب و مدون کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

ہر علم کا یہی معاملہ ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین کے ابتدائی دور میں اس کے چند بنیادی قواعد وضوابط مرتب ہوتے ہیں اور پھر انہی پر آئندہ چل کر اس علم کی مسلسل پیش رفت ہوتی ہے اور ان قواعد وضوابط کو دوامی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ علم کی مسلسل پیش رفت اور ترقی کے باوجود ان بنیادی قواعد وضوابط کو ہمیشہ حتمی سمجھا جاتا ہے اور انہیں ری اوپن کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی زبان کی گرامر کے بنیادی قواعد ہی کو لے لیجیے، وہ اب سے بہت پہلے اس دور میں طے ہو گئے تھے جب انہیں طے کرنے کی ضرورت تھی۔ اور جب وہ طے ہو کر گرامر کی بنیاد بن گئے تو انہیں دوامی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس لیے اگر کوئی شخص یہ کہہ کر اس زبان کی گرامر کے نئے قواعد مرتب کرنا چاہے گا کہ ہمیں اس کا حق کیوں حاصل نہیں ہے، تو اس کی اس بات کو ارباب علم و دانش میں کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔ اسی طرح اصول وضوابط کے تعین کی حد تک ''اجتہاد مطلق'' کا کام خیر القرون میں مکمل ہو گیا تھا اور ضرورت مکمل ہوتے ہی اس کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا۔ مگر ان اصولوں کی روشنی میں ''عملی اجتہاد'' کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا اور اب بھی ہر فقہی مکتب فکر میں عملی اجتہاد مختلف سطحوں پر ہو رہا ہے۔

''اجتہاد عملی'' کے لیے اہلیت کا معیار

اجتہاد چونکہ دو قسم کی علمی کاوشوں کا کام ہے:

1. قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر و تشریح اور استنباط و استدلال،
2. اور نئے پیش آمدہ مسائل کا قرآن و سنت کی روشنی میں حل تلاش کرنا،
اس لیے فقہائے امت نے اس کی اہلیت کی شرائط بھی طے کر دی ہیں اور ہر کس و ناکس کو اس کا حق نہیں دیا کہ وہ اجتہاد کے نام پر دینی مسائل میں رائے دیتا پھرے اور پھر اس کو قبول کرنے پر اصرار بھی کرے۔ ان شرائط پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔
1. سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ چونکہ قرآن و سنت اور ان کی تعبیرات و تشریحات کا بیشتر ذخیرہ عربی زبان میں ہے، اس لیے اجتہاد کرنے والے کو عربی زبان پر اس قدر عبور ضرور حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اس ذخیرے سے براہ راست استفادہ کر سکے،
2. قرآن کریم کی متعلقہ آیات کے شان نزول اور پس منظر کے ساتھ اسے یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ کون سی آیت پہلے نازل ہوئی اور کون سی بعد میں، تاکہ وہ اس آیت کریمہ کا صحیح مصداق اور مفہوم سمجھ سکے،
3. احادیث نبویہؐ کے ذخیرے تک اس کی علمی رسائی کے ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کسی حدیث کے صحیح، ضعیف، اور موضوع ہونے کا معیار کیا ہے۔ اور احادیث و واقعات میں تقدیم و تاخیر بھی اس کے علم میں ہو تاکہ وہ کسی بھی حدیث نبویؐ کی صحت و ضعف کے معیار اور اس کے مفہوم و مطلب کو سمجھ سکے،
4. مختلف مسائل پر اب تک جو اجتہادات ہو چکے ہیں، وہ بھی اس کی نظر میں ہونے چاہئیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کر سکے اور کسی مسئلے میں اجماع امت کے دائرے کو توڑنے کا مرتکب نہ ہو۔
یہ وہ چند شرائط ہیں جو منطقی طور پر ہر آدمی کی سمجھ میں آنے والی ہیں اور ان شرائط پر پورا اترے بغیر کسی شخص کو اجتہاد کا حق دینے کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ اسی وجہ سے چند سال قبل جب یہ تجویز سامنے آئی کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق حاصل ہونا چاہیے اور پارلیمنٹ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح میں جو فیصلہ کر دے اسے حتمی قرار دینا چاہیے، اس وقت بھی راقم الحروف نے عرض کیا تھا کہ ہمیں اس تجویز سے اختلاف نہیں ہے۔ آج کے دور میں جو مسائل اجتہاد طلب ہیں ان میں ہم پارلیمنٹ کو فائنل اتھارٹی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں

مگر اس کے لیے ایک شرط ناگزیر ہے کہ الیکشن رولز میں ترمیم کر کے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کو شرط قرار دے دیا جائے۔ اور اگر اجتہاد کی اہلیت کی شرائط کے بارے میں علمائے کرام کے موقف کو قبول کرنا مشکل ہو تو دو آئینی اداروں (۱) وفاقی شرعی عدالت اور (۲) اسلامی نظریاتی کونسل سے رجوع کر کے ان سے ان شرائط کا تعین کرا لیا جائے جو آج کے دور میں کسی بھی مسئلے میں شرعی اجتہاد کی اہلیت کے لیے ضروری ہیں۔ اور پھر الیکشن رولز میں ترمیم کر کے ان شرائط کو پارلیمنٹ کا رکن بننے کے لیے لازم قرار دے دیا جائے۔

اجتہاد کی اہلیت کا معیار طے کیے بغیر اور اسے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے ضروری قرار دیے بغیر قرآن و سنت کو ترجمہ و تعبیر اور تشریح و اجتہاد کے لیے پارلیمنٹ کے حوالے کر دینا قرآن و سنت کو بازیچۂ اطفال بنانے کے مترادف ہوگا۔ یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کسی گاڑی کا بونٹ اٹھا کر اسے کسی دینی مدرسے کے طلبہ کے سپرد کر دیا جائے کہ انجن چیک کریں اور اس کی خرابیوں کی نشاندہی کر کے انہیں صحیح کریں۔ اس لیے جناب عابد حسن منٹو سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر وہ اپنی چند لاکھ کی گاڑی کو اس کی مشینری سے ناواقف لوگوں کے سپرد کرنے کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو قرآن اور سنت نبویؐ نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ انہیں ایسے لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کا نعرہ لگا رہے ہیں جو ان کی ابجد تک سے واقف نہیں ہیں۔

سیرت نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم

(پنجاب یونیورسٹی، لاہور - ۱۶ مئی ۲۰۰۲ء)

(۱۶ مئی ۲۰۰۲ء کو شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام ”سیرۃ النبیؐ کانفرنس“ میں خطاب۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا شکر گزار ہوں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوع پر منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں شرکت اور گفتگو کے اعزاز سے نوازا اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہمارے مل بیٹھنے کو قبول فرماتے ہوئے کچھ مقصد کی باتیں کہنے، سننے اور پھر ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔ مجھے گفتگو کے لیے ”سیرت نبویؐ کی روشنی میں

جہاد کا مفہوم" کا عنوان دیا گیا ہے جس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ حتی کہ تذکرہ بھی اس مختصر وقت میں ممکن نہیں ہے اس لیے بہت سے امور کو نظر انداز کرتے ہوئے چند ایک ایسے سوالات کا جائزہ لینا چاہوں گا جو جہاد کے حوالے سے آج کے دور میں عالمی سطح پر موضوع بحث ہیں اور ان کے بارے میں مثبت اور منفی طور پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا رہا ہے۔

"جہاد" کا لفظ لغوی مفہوم کے حوالے سے کوشش، محنت و مشقت اور تگ ودو کی مختلف شکلوں کا احاطہ کرتا ہے اور اسے دینی پس منظر میں لیا جائے تو اسلام کی سربلندی، دعوت و تبلیغ، ترویج و تنفیذ، اور تحفظ و دفاع کے لیے کی جانے والی مختلف النوع عملی کوششوں کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنی خواہشات پر کنٹرول اور نفس کی اصلاح کی مساعی پر بھی جہاد کا لفظ بولا گیا ہے جس کی قرآن و سنت میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن جہاد کا ایک خصوصی مفہوم جنگ اور محاربہ بھی ہے جسے قرآن کریم میں "جہاد فی سبیل اللہ" اور "قتال" کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے اور سینکڑوں آیات قرآنی اور ہزاروں احادیث نبویہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور اس جہاد کے فضائل، احکام، مسائل اور مقصدیت پر قرآن و سنت میں پورے اہتمام کے ساتھ جابجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ہے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کافروں کے خلاف میدان جنگ میں صف آرا ہو کر ہتھیاروں کے ساتھ ان سے معرکہ آرائی کرنا اور قتل و قتال کے ذریعے سے کفر پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا جس کی اہمیت و فضیلت پر قرآن کریم اور سنت نبویؐ کی سینکڑوں تصریحات گواہ ہیں۔ اور اس کو آج کے دور میں اس وجہ سے سب سے زیادہ تنقید و اعتراض کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ جدید عقل و دانش کے نزدیک عقیدہ و مذہب کے فروغ اور غلبہ کے لیے ہتھیار اٹھانا تہذیب و تمدن کے تقاضوں کے خلاف ہے اور ایسا کرنا بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے دائرے میں آتا ہے۔

اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ عقیدہ و مذہب کے لیے ہتھیار اٹھانے اور باطل مذاہب پر حق مذہب کی بالادستی کے لیے عسکری جنگ لڑنے کا آغاز حضرت محمد رسول اللہؐ نے نہیں کیا بلکہ جہاد کا یہ عمل آسمانی ادیان میں پہلے سے تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے اس حوالے سے تاریخ میں کسی نئے عمل اور اسلوب کا اضافہ کرنے کے بجائے آسمانی مذاہب کی ایک مسلسل روایت کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ جس طرح قرآن کریم میں جہاد اور مجاہدین کا تذکرہ پایا جاتا ہے، اسی

طرح بائبل میں بھی ان مجاہدین اور مذہبی جنگوں کا ذکر موجود ہے جو بنی اسرائیل نے اپنے مذہب کے دفاع اور اپنی آزادی اور تشخص کے تحفظ کے لیے لڑیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم نے فلسطین کی سرزمین پر لڑی جانے والی ایک مقدس جنگ کا سورۃ البقرۃ میں تذکرہ کیا ہے جو جالوت جیسے ظالم حکمران کے خلاف حضرت طالوت کی قیادت میں لڑی گئی اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت بادشاہ کا معجزانہ طور پر خاتمہ ہوا۔ اس جنگ کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے اور اس میں حضرت طالوت کو ''ساؤل بادشاہ'' کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر آج کی جدید دانش کو مذہب کے نام پر ہتھیار اٹھانے پر اعتراض ہے تو اس کا ہدف صرف قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی نہیں بلکہ اصولی طور پر بائبل اور بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ اس کی زد میں ہے، صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ بائبل کے ماننے والوں نے بائبل پر ایمان کے دعوے کے باوجود اس کے عملی احکام اور ماضی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے جبکہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے تمام تر عملی کمزوریوں کے باوجود اپنے ماضی اور قرآنی احکام و تعلیمات سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس وضاحت کے بعد جہاد کی مقصدیت کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جہاد کا مقصد آنحضرتؐ نے ''اعلاء کلمۃ اللہ'' قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جس کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی میں حکم اور قانون کا درجہ انسانی خواہشات اور ظن و گمان کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور آسمانی تعلیمات کو حاصل ہونا چاہیے۔ اور کلمۃ اللہ کی اسی سربلندی کے لیے قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ نے آسمانی مذاہب کی ان دینی معرکہ آرائیوں کے تسلسل کو باقی رکھا ہے تاکہ کسی دور میں بھی انسانی خواہشات اور عقل و گمان کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر غلبہ حاصل نہ ہونے پائے اور انسانی سوسائٹی پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی عملداری کے جس مشن کے لیے حضرت انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے ہیں، اس میں تعطل واقع نہ ہو۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے ایک ارشاد مبارک میں یہ کہہ کر اس جدوجہد کے قیامت تک جاری رہنے کا اعلان فرما دیا ہے کہ ''الجہاد ماض الی یوم القیامۃ''۔

یہ فکر و فلسفہ کی جنگ ہے، اسلوب زندگی کی معرکہ آرائی ہے، اور تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے جس میں شروع سے آسمانی مذاہب کا یہ موقف رہا ہے اور اب آسمانی مذاہب و ادیان کے حقیقی وارث کی حیثیت سے اسلام کا موقف بھی یہی ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہ نمائی

اور اس کے مسائل کے حل کے لیے انسانی خواہشات اور عقل و دانش تنہا کفایت نہیں کرتیں بلکہ ان پر آسمانی تعلیمات کی نگرانی ضروری ہے کیونکہ اس ”چیک اینڈ بیلنس“ (Check & balance) کے بغیر انسانی خواہشات اور انسانی عقل کے لیے پوری نسل انسانی کی ضروریات و مفادات میں توازن قائم رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تہذیب جدید نے آسمانی تعلیمات سے دستبرداری کا اعلان کر کے خواہشات اور عقل ہی کو تمام امور کی فائنل اتھارٹی قرار دے رکھا ہے جس سے توازن بگڑ گیا ہے، اجتماعی اخلاقیات دم توڑ گئی ہیں، طاقت کا بے لگام گھوڑا وحی الٰہی کی لگام سے آزاد ہو گیا ہے، اور پوری دنیا میں ہر طرف جنگل کے قانون (Might is right) کا دور دورہ ہے۔

آج کی جدید دانش نے چونکہ مذاہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے شخصی زندگی کے دائروں میں محدود کر دیا ہے اس لیے عقل جدید کے نزدیک مذہب کو وہ مقام حاصل نہیں رہا کہ اس کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں اور اس کے فروغ و تنفیذ کے لیے عسکری قوت کو استعمال میں لایا جائے ورنہ ہتھیار تو آج بھی موجود ہیں اور جتنے ہتھیار آج پائے جاتے ہیں اور تیار ہو رہے ہیں، انسانی تاریخ میں اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہ ہتھیار استعمال بھی ہوتے ہیں اور وہ تباہی لاتے ہیں کہ اس سے قبل کی انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے مگر ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والوں کے مقاصد اور عنوانات مختلف ہیں:

- جرمنی نے جرمن نسل کی برتری کے عنوان سے ہتھیار بنائے اور دو عظیم جنگوں میں پوری دنیا کے لیے تباہی کا سامان فراہم کیا۔
- روس نے محنت کشوں کی طبقاتی بالادستی کے نام پر عسکری قوت کا بے تحاشا استعمال کیا اور نسل انسانی کے ایک بڑے حصے کو تہہ تیغ کر دیا۔
- اسرائیل ایک نسلی مذہب کی برتری کے لیے اپنے سائز سے سینکڑوں گنا زیادہ ہتھیار جمع کیے ہوئے ہے اور فلسطینیوں کی مسلسل نسل کشی (Genocide) میں مصروف ہے۔
- اور امریکہ نے مغربی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے نام پر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر نسلی برتری، طبقاتی بالادستی، اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانا اور صرف اٹھانا نہیں بلکہ اسے وحشیانہ انداز میں اندھا دھند استعمال کر کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا دہشت گردی نہیں ہے تو آسمانی تعلیمات کے فروغ اور وحی الٰہی کی بالادستی کے لیے ہتھیار اٹھانے کو کون سے قانون اور اخلاقیات کے تحت دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے؟

باقی تمام پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے آج کی معروضی صورت حال (Scenario) میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے طرز عمل کا جائزہ لے لیں کہ افغانستان اور دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کا نام لینے والوں کے خلاف ''عالمی اتحاد'' کے پرچم تلے جو وحشیانہ فوج کشی جاری ہے، اس کے جواز میں اس کے علاوہ اب تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکی کہ اسلام کا نام لینے والے ان مبینہ انتہا پسندوں سے آج کی عالمی تہذیب کو خطرہ ہے، بالادست ثقافت کو خطرہ ہے، اور بین الاقوامی نظام کو خطرہ ہے، اس لیے ان انتہا پسندوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عقیدہ و مذہب کے لیے ہتھیار اٹھانے کو دہشت گردی کہنے والے خود ایک مذہب اور عقیدہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے میدان جنگ میں مسلسل صف آرا ہیں۔

میری اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانے اور اسے بے دریغ استعمال کرنے کا ایک فریق کو حق حاصل ہے تو اس کے خلاف دوسرے عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے علمبرداروں کو ہتھیار اٹھانے کے حق سے کسی طرح محروم نہیں کیا جا سکتا اور ہتھیار بنانے اور استعمال کرنے کے لیے یہ کوئی وجہ جواز (Excuse) نہیں ہے کہ چونکہ ایک فریق کے پاس ہتھیار بنانے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اسے ان ہتھیاروں کے استعمال کے مواقع زیادہ میسر ہیں، اس لیے اسے تو ہتھیار بنانے اور چلانے کا حق حاصل ہے، اور دوسرا فریق اس صلاحیت میں کمزور اور ان مواقع کی فراوانی سے محروم ہے اس لیے اسے اس کا سرے سے کوئی حق نہیں ہے۔

آج امریکہ اور اس کے اتحادی اس بات پر مطمئن ہیں کہ جو جنگ وہ لڑ رہے ہیں، وہ اعلیٰ مقاصد کی خاطر لڑی جا رہی ہے، انسانیت کی بھلائی کی جنگ ہے، اور ان کے بقول اعلیٰ ترین تہذیبی اقدار کے تحفظ کی جنگ ہے۔ جنگ کی اسی مقصدیت کی وجہ سے انہیں اس عظیم جانی و مالی نقصان کی کوئی پروا نہیں ہے جو دنیا بھر میں ان کے ہاتھوں مسلسل جاری ہے۔

انسان مر رہے ہیں، عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں، بچے یتیم ہو رہے ہیں، عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو رہی ہیں، ملکوں اور قوموں کی معیشتیں تباہ ہو رہی ہیں، اور امن و امان کا توازن مسلسل بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے چونکہ اپنے زعم کے مطابق یہ سب کچھ اعلیٰ مقاصد کے لیے کر رہے ہیں اور ان اقدامات کے ذریعے سے اعلیٰ تہذیب و ثقافت کا تحفظ کر رہے ہیں اس لیے ان کے خیال میں یہ سب کچھ جائز ہے اور جنگ کا حصہ ہے جسے کسی چون و چرا کے بغیر پوری نسل انسانی کو برداشت کرنا چاہیے۔ یہی بات اسلام کہتا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ نسل انسانی کے لیے نجات کا راستہ انسانی خواہشات اور صرف انسانی عقل نہیں ہے بلکہ وحی الٰہی کی نگرانی اور آسمانی تعلیمات کی برتری انسانی سوسائٹی کے لیے ضروری ہے۔ اور اسلام کے نزدیک انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور تہذیبی روایات کا سرچشمہ انسانی خواہشات اور عقل محض نہیں بلکہ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات ہیں اس لیے ایک مسلمان اگر ان مقاصد کے لیے ہتھیار اٹھاتا ہے تو دنیا کی مسلمہ روایات اور تاریخی عمل کی روشنی میں اسے یہ کہہ کر اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا کہ مخالف فریق کے نزدیک اس کا یہ عمل دہشت گردی قرار پا گیا ہے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد قرآن و سنت کی رو سے جہاد کی چند عملی صورتوں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں:

- قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے حوالے سے جہاد کے ایک حکم کا تذکرہ سورۃ المائدہ میں کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے چنگل سے بنی اسرائیل کو نکال کر صحرائے سینا میں خیمہ زن ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو حکم ملا کہ وہ "بیت المقدس" کو عمالقہ سے آزاد کرنے کے لیے جہاد کریں اور آگے بڑھ کر حملہ آور ہوں۔ مگر غلامی کے دائرے سے تازہ تازہ نکلنے والی مرعوب قوم کو اس کا حوصلہ نہ ہوا اور پھر اس کے چالیس سال بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جنگ لڑ کر بیت المقدس کو آزاد کرایا۔

- قرآن کریم نے بنی اسرائیل ہی کے حوالے سے ایک اور جہاد کا تذکرہ کیا ہے جس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں کہ جالوت نامی ظالم بادشاہ نے فلسطین کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے بنی اسرائیل کو مظالم کا شکار بنانا

شروع کیا تو اللہ تعالی کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام کے حکم پر طالوت بادشاہ کی قیادت میں بنی اسرائیل کی مٹھی بھر جماعت نے جالوت کا مقابلہ کیا اور اسے میدان جنگ میں شکست دے کر فلسطین کے علاقے آزاد کرائے۔

• جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کفار مکہ کے خلاف پہلے بڑے معرکے کی قیادت بدر کے میدان میں کی اور قریش کو شکست دے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ جنگ قریش مکہ کے ان عزائم پر ضرب لگانے کے لیے بپا ہوئی تھی جو وہ اسلام کو ختم کرنے اور جناب نبی اکرمؐ اور ان کی جماعت کو ناکام بنانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس کے بعد احد اور احزاب کی جنگیں بھی اسی پس منظر میں تھیں اور اس کشمکش کا خاتمہ اس وقت ہوا جب آپؐ نے ۸ھ میں خود پیش قدمی کر کے مکہ مکرمہ پر قبضہ کر لیا۔

• یہود مدینہ کے ساتھ آنحضرتؐ نے امن و امان کے ماحول میں وقت بسر کرنے کی کوشش کی لیکن یہودیوں کی سازشوں اور عہد شکنیوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ رہا تو آپؐ نے یہودیوں کے سب سے بڑے مرکز (Stronghold) خیبر پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کر لیا اور یہود کا زور توڑ دیا۔

• قیصر روم کے باج گزاروں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور یہ خبر ملی کہ خود قیصر روم مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے تو جناب نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں اس کا انتظار کرنے کے بجائے شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کی اور تبوک میں ایک ماہ قیام کر کے رومی فوجوں کا انتظار کرنے کے بعد وہاں سے واپس تشریف لائے۔

یہ تو چند کھلی جنگیں ہیں جو علانیہ لڑی گئیں لیکن ان سے ہٹ کر ایسی متعدّد کارروائیاں بھی سیرۃ النبی کے ریکارڈ میں ملتی ہیں جنہیں چھاپہ مار کارروائیوں (Ambush) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

• مدینہ منورہ کے ایک سازشی یہودی سردار کعب بن اشرف کو جناب نبی اکرمؐ کے ایما پر حضرت محمد بن مسلمہؓ اور ان کے رفقاء نے شب خون مار کر قتل کیا۔

• خیبر کے نواح کے ایک اور سازشی یہودی سردار ابورافع کو جناب نبی اکرمؐ کے حکم پر حضرت عبد اللہ بن عتیکؓ نے اسی قسم کی چھاپہ مار کارروائی کے ذریعے سے قتل کیا۔

• جناب نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں یمن کے اسلامی صوبہ پر ایک مدعی نبوت اسود عنسی نے قبضہ کر کے آنحضرتؐ کے مقرر کردہ گورنر کو شہید کر دیا اور اسلامی ریاست کے عمال کو یمن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو آپؐ کے ایما پر حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے چھاپہ مار کارروائی کر کے اسود عنسی کو رات کی تاریکی میں قتل کیا اور یمن پر اسلامی اقتدار کا پرچم دوبارہ لہرا دیا۔

• صلح حدیبیہ میں قریش مکہ کی بعض ناجائز اور یک طرفہ شرائط کے خلاف دباؤ ڈالنے کے لیے حضرت ابوبصیرؓ اور حضرت ابوجندلؓ نے سمندر کے کنارے ایک باقاعدہ چھاپہ مار کیمپ قائم کیا اور قریش کا شام کی طرف تجارت کا راستہ غیر محفوظ بنا دیا جس سے مجبور ہو کر قریش کو صلح حدیبیہ کے معاہدے میں شامل اپنی یک طرفہ شرائط واپس لینا پڑیں اور ابوبصیرؓ کی چھاپہ مار کارروائیوں سے تنگ آکر قریش کو حضورؐ سے دوبارہ گفتگو کرنا پڑی۔

جناب نبی اکرمؐ نے میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے کے ساتھ ساتھ میڈیا کے محاذ پر بھی کفار کے خلاف صف آرائی کی چنانچہ غزوۂ احزاب کے بعد حضورؐ نے مدینہ منورہ کے ایک اجتماع میں باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کیا کہ اب قریش مکہ کو مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کی جرات نہیں ہوگی لیکن اب وہ زبان کی جنگ لڑیں گے اور مسلمانوں کے خلاف پورے عرب میں پراپیگنڈے اور منافرت انگیزی کا بازار گرم کریں گے۔ آپؐ نے اس موقع پر شعر و خطابت سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرامؓ کو میدان میں آنے کی ترغیب دی چنانچہ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ نے کھلے بندوں اعلان کر کے یہ محاذ سنبھالا اور شعر و شاعری کے محاذ پر کفار کے حملوں کا پوری جرات کے ساتھ مقابلہ کیا۔

زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں ہے لیکن ان گزارشات سے اتنی بات ضرور سامنے آگئی ہوگی کہ جناب رسول اللہؐ نے اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کے تحفظ و استحکام کے لیے

موقع و محل کی مناسبت سے جنگ کی ہر ممکنہ صورت اختیار کی اور محاذ آرائی کے جس اسلوب نے بھی آنحضرتؐ کے سامنے اپنا چیلنج رکھا، اسے جواب میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

آج کے حالات میں جہاد کے حوالے سے دو سوال عام طور پر کیے جاتے ہیں:

1. ایک یہ کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا کسی علاقے میں جہاد کے لیے ایک اسلامی حکومت کا وجود اور اس کی اجازت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں حضرت ابوبصیرؓ کا کیمپ اور حضرت فیروز دیلمیؓ کی چھاپہ مار کارروائی میں ہمارے سامنے واضح مثال کے طور پر موجود ہے۔ حضرت ابوبصیرؓ نے اپنا کیمپ حضورؐ کی اجازت سے قائم نہیں کیا تھا لیکن جب یہ کیمپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا تو آپؐ نے نہ صرف اس کے نتائج کو قبول کیا بلکہ قریش کی طرف سے یک طرفہ شرائط سے دستبرداری کے بعد اس کیمپ کے مجاہدین کو باعزت طور پر واپس بلا لیا۔ اسی طرح یمن پر اسود عنسی کا غیر اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ سے فوج بھیج کر لشکر کشی نہیں کی بلکہ یمن کے اندر مسلمانوں کو بغاوت کرنے کا حکم دیا اور اسی بغاوت کی عملی شکل وہ چھاپہ مار کارروائی تھی جس کے نتیجے میں اسود عنسی قتل ہوا۔

2. دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر جہاد شرعی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے تو جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں اقلیت (Minority) کے طور پر رہتے ہیں، ان کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا ان کے لیے جہاد میں شمولیت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں دو واقعات کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور ان کے والد محترم جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کی خدمت میں جہاد میں شمولیت کے لیے حاضر ہو رہے تھے کہ راستے میں کفار کے ایک گروہ نے گرفتار کر لیا اور اس شرط پر انہوں نے ہمیں رہا کیا ہے کہ ہم ان کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر حصہ نہیں لیں گے۔ اس پر آنحضرتؐ نے یہ فرما کر انہیں بدر کے معرکے میں شریک ہونے سے روک دیا کہ اگر تم نے

اس بات کا وعدہ کر لیا ہے تو اس وعدہ کی پاسداری تم پر لازم ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد محترم موجود ہوتے ہوئے بھی بدر کے معرکے میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکے تھے۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول اکرمؐ قبا میں قیام فرما تھے اور ابھی مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے لیکن حضرت سلمان فارسیؓ کا ذکر نہ بدر کے مجاہدین میں ملتا ہے اور نہ وہ احد ہی میں شریک ہو سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت آزاد نہیں تھے بلکہ ایک یہودی کے غلام تھے چنانچہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کی شمولیت جس پہلے غزوے میں ہوئی، وہ احزاب کا معرکہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے جہاد کے حوالے سے مسلمانوں کے معروضی حالات اور ان کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا ہے اس لیے جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں رہتے ہیں اور ان کے ان ریاستوں کے ساتھ وفاداری کے معاہدات موجود ہیں، ان کے لیے ان معاہدات کی پاسداری لازمی ہے۔ البتہ اپنے ملکوں کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور ہمدردی و خیر خواہی کے لیے وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، وہ ان کی دینی ذمہ داری ہے اور اس میں انہیں کسی درجے میں بھی کوتاہی روا نہیں رکھنی چاہیے۔ گزشتہ سال افغانستان پر امریکی حملے کے موقع پر میں برطانیہ میں تھا۔ مجھ سے وہاں کے بہت سے مسلمانوں نے دریافت کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو یہودیوں کی پیروی کرنا چاہیے اور ان سے کام کا طریقہ سیکھنا چاہیے کیونکہ یہودی ان ممالک میں رہتے ہوئے جو کچھ یہودیت کے عالمی غلبہ اور اسرائیل کے تحفظ و دفاع کے لیے کر رہے ہیں، اسلام کے غلبہ اور مظلوم مسلمانوں کے دفاع کے لیے وہ سب کچھ کرنا مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ مگر یہ کام طریقہ اور ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیے اور جن ملکوں میں مسلمان رہ رہے ہیں، ان کے ساتھ اپنے معاہدات اور کمٹمنٹ کے دائرے میں رہتے ہوئے کرنا چاہیے۔

1. آج دنیا کی عمومی صورت حال پھر اس سطح پر آ گئی ہے کہ خواہشات اور محدود عقل پرستی نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور آسمانی تعلیمات کا نام لینے کو جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ آج کی اجتماعی عقل نے اللہ تعالی کی حاکمیت سے

انکار کرکے حاکمیت مطلقہ کا منصب خود سنبھال لیا ہے اور وحی الٰہی سے راہ نمائی حاصل کرنے کے بجائے اس کے نشانات و اثرات کو ختم کرنے کی ہر سطح پر کوشش ہو رہی ہے۔ اس فضا میں "اعلاء کلمۃ اللہ" کا پرچم پھر سے بلند کرنا اگرچہ مشکل بلکہ مشکل تر دکھائی دیتا ہے لیکن جناب نبی اکرمؐ کی سنت و سیرت کا تقاضا یہی ہے کہ نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محض کی پیروی کے فریب سے نکالا جائے اور اسے آسمانی تعلیمات کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے وحی الٰہی کے ہدایات کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے۔

2. اس کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان جس مظلومیت اور کسمپرسی کے عالم میں ظالم اور متسلط قوتوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہیں اور انہیں جس بے رحمی اور سنگ دلی کے ساتھ ان کے مذہبی تشخص کے ساتھ ساتھ قومی آزادی اور علاقائی خود مختاری (Territorial independence) سے محروم کیا جا رہا ہے، اس کے خلاف کلمہ حق بلند کرنا اور ان مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جبر کے ماحول سے نجات دلانے کے لیے جو کچھ ممکن ہو، کر گزرنا یہ بھی حضورؐ کی تعلیمات و ارشادات کا ایک اہم حصہ ہے جس سے صرف نظر کرکے ہم آپؐ کی اتباع اور پیروی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

ان دو عظیم تر ملی مقاصد کے لیے جدوجہد کے مختلف شعبے ہیں۔ فکر و فلسفہ کا میدان ہے، میڈیا اور انفرمیشن ٹیکنالوجی کی جولان گاہ ہے، تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے، تعلیم و تربیت کا دائرہ ہے، لابنگ اور سفارت کاری کا شعبہ ہے، اور عسکری صلاحیت کے ساتھ ہتھیاروں کی معرکہ آرائی ہے۔ یہ سب جہاد فی سبیل اللہ کے شعبے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں "سنت نبوی کی روشنی میں جہاد کا مفہوم" یہ ہے کہ:

- نسل انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقل محض کی پیروی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور آسمانی تعلیمات کی عمل داری کی طرف لانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔

• اسلام کی دعوت اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو نسل انسانی کے ہر فرد تک پہنچانے اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق اسے دعوت اسلام کا مقصد و افادیت سمجھانے کا اہتمام کیا جائے۔

• ملت اسلامیہ کو فکری وحدت، سیاسی مرکزیت، معاشی خود کفالت، ٹیکنالوجی کی مہارت، اور عسکری قوت و صلاحیت کی فراہمی کے لیے بھرپور وسائل اور توانائیاں بروئے کار لائی جائیں۔

• مسلمان کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے اور قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کے لیے تگ و دو کی جائے نیز دینی تعلیم و تربیت کے نظام کو ہر سطح پر مربوط و منظم کیا جائے۔

• مظلوم مسلمانوں کو ظلم و جبر سے نجات دلانے اور ان کے دینی تشخص اور علاقائی خود مختاری کی بحالی کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کی جائے۔

• مسلم ممالک میں قرآن و سنت کی عملداری اور شرعی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کر کے تمام مسلم ملکوں کو عالمی سطح پر کنفیڈریشن کی صورت میں خلافت اسلامیہ قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

• دینی جذبہ و غیرت کے تحت ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کے حق میں ہتھیار اٹھانے والے مجاہدین کو عالمی استعمار کے ہاتھوں ذبح کرانے اور ان کے قتل عام پر خوش ہونے کے بجائے ان کو بچانے کی کوشش کی جائے اور اس عظیم قوت کو ضائع ہونے سے بچانے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرتے ہوئے انہیں ملت اسلامیہ کے لیے حقیقی معنوں میں ایک کارآمد قوت بنانے کی راہ نکالی جائے۔

• اسلامی تعلیمات، قرآن و سنت کے قوانین اور جہاد کے بارے میں عالمی استعمار اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے یک طرفہ اور معاندانہ پروپیگنڈے سے متاثر و مرعوب ہونے کے بجائے اس کو مسترد کیا جائے اور دلیل و منطق کے ساتھ اسلامی احکام اور جہاد کی ضرورت و افادیت سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔

یہ کام دراصل مسلم حکومتوں کے کرنے کے ہیں اور انہیں او آئی سی کے عملی ایجنڈے کا حصہ ہونا چاہیے لیکن اگر دینی مراکز اور اسلامی تحریکات بھی باہمی ربط و مشاورت کے ساتھ ان مقاصد کے لیے مشترکہ پیش رفت کا اہتمام کر سکیں تو حالات کو خاصا بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

سیرت نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم۔ چند مزید گزارشات

بیت اللہ کی عظمت و حفاظت

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۱ اپریل ۲۰۰۲ء)

ایک معاصر روزنامہ نے ۱۴ اپریل ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں خبر دی ہے کہ مکہ مکرمہ پر ایٹم بم گرانے کا مطالبہ کرنے والے امریکی صحافی رچ لوری پر فالج کا شدید حملہ ہوا ہے اور اس کی حالت خطرے میں بتائی جاتی ہے۔ اوہایو میڈیکل ہسپتال کے ڈاکٹروں نے رچ لوری کی اچانک بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ خبر کے مطابق مذکورہ امریکی صحافی نے چند روز پیشتر ''انٹرنیشنل ریویو'' نامی رسالے میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں تمام مسلمانوں کو نیویارک اور واشنگٹن پر ہونے والے حملوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کعبہ پر ایٹم بم چلانے کا مطالبہ کیا تھا۔

رچ لوری کے بارے میں یہ خبر کہاں تک صداقت پر مبنی ہے اس کے بارے میں چند روز تک صورتحال سامنے آجائے گی لیکن بیت اللہ کی عظمت اور اس کی حفاظت کے لیے خصوصی خدائی نظام کے حوالہ سے ایسا ہونا بعید از قیاس بات نہیں ہے کیونکہ کعبہ شعائر اللہ میں سے ہے اور شعائر اللہ کی بے حرمتی پر غیبی قوتوں کا متحرک ہونا نظام فطرت کا ایک ناگزیر حصہ ہے جس کا مظاہرہ تاریخ اس سے قبل بھی متعدّد بار دیکھ چکی ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے سال بھی اس نوعیت کا ایک تاریخی واقعہ رونما ہو چکا ہے کہ بیت اللہ پر حملہ کرنے کی کوشش ہوئی لیکن حملہ آوروں کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حملہ کی قیادت کرنے والا ایک مسیحی حکمران تھا جس کو ابرہہ کہا جاتا ہے اور حبشہ کی طرف سے یمن کا حکمران تھا۔ تفسیر و تاریخ کی روایات کے مطابق ایک مذہبی مسیحی حکمران کے طور پر شمالی عرب میں مکہ مکرمہ کے بیت اللہ کی ہمہ گیر عوامی مقبولیت ابرہہ کو کھٹکتی تھی اور اسے یہ کعبہ اپنے مذہب کے فروغ کی راہ

میں ایک بڑی رکاوٹ نظر آتا تھا۔ چنانچہ اس نے عربوں کی توجہ کو تقسیم کرنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے صنعاء میں اسی طرح کا ایک کعبہ تعمیر کرایا اور عربوں کو دعوت دی کہ وہ مکہ مکرمہ کے بیت اللہ کا رخ کرنے کی بجائے صنعاء کے کعبہ کی طرف آئیں اور اس کا طواف کریں۔ اس پر مکہ مکرمہ کے کسی قریشی کو غصہ آیا اور اس نے صنعاء جا کر ابرہہ کے بنائے ہوئے اس کعبہ میں گندگی ڈال دی۔ ابرہہ اس پر سخت غضبناک ہوا اور اس نے شاہ حبشہ سے مدد لے کر ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ مکہ مکرمہ پر چڑھائی کا پروگرام بنالیا تاکہ وہ انتقام کے طور پر (نعوذ باللہ) بیت اللہ کو گرا سکے۔

راستہ میں بنو خثعم کے ساتھ اس کی محاذ آرائی ہوئی اور کچھ قبائل نے مزاحمت کی مگر ابرہہ کی قوت و لشکر کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکا۔ طائف کے قریب پہنچنے پر وہاں کے ایک سردار ابو رغال نے ابرہہ سے اس بات کی ضمانت چاہی کہ وہ طائف کے بت خانہ کو نقصان نہ پہنچائے تو وہ مزاحمت نہیں کریں گے۔ یہ پیشکش ابرہہ نے اس شرط پر منظور کی کہ اگر طائف والے مکہ مکرمہ تک پہنچنے میں اس کی رہبری کریں تو وہ ان کے بت خانہ سے تعرض نہیں کرے گا، جس پر ابو رغال نے مکہ مکرمہ تک ابرہہ کے لشکر کی رہبری کی ذمہ داری قبول کر لی۔

طائف سے یہ لشکر آگے بڑھا تو مکہ مکرمہ والوں کو خبر ہوئی، اس وقت مکہ مکرمہ کے سردار جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا محترم جناب عبد المطلب تھے جن کی رہنمائی میں مکہ والوں نے مشاورت کر کے مکہ مکرمہ خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اردگرد پہاڑوں میں بکھر گئے۔ ابرہہ اپنے لشکر سمیت وادی محسر تک پہنچا اور بیت اللہ پر حملہ آور ہونے کے لیے آخری تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

اس دوران ابرہہ کے بعض لشکریوں نے مکہ مکرمہ والوں کچھ لوگوں کی بکریاں اور جانور پکڑ لیے۔ جناب عبد المطلب نے ابرہہ تک رسائی حاصل کی اور اس سے ملاقات کر کے استدعا کی کہ ہمارے جو جانور تمہارے لشکریوں نے پکڑ لیے ہیں وہ واپس کر دیے جائیں۔ ابرہہ نے حیرت سے پوچھا کہ میں تمہارے کعبہ کو گرانے اور مکہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے ارادے سے آیا ہوں، اس بات کی تمہیں کوئی فکر نہیں ہے اور چند بکریوں کی تمہیں فکر ہے جو میرے لشکریوں نے پکڑ لی ہیں؟ جناب عبد المطلب نے اس کے جواب میں وہ

تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو بیت اللہ کی غیبی حفاظت کا عنوان بن گیا۔ انہوں نے کہا کہ بکریاں ہماری ہیں اس لیے واپس لینے آیا ہوں، بیت اللہ کا مالک اس کی خود حفاظت کر لے گا۔

ابرہہ نے وہ بکریاں واپس دلوا دیں اور انتہائی تعجب و حیرت کے ساتھ جناب عبد المطلب کو رخصت کیا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ کعبہ کے اردگرد رہنے والے اسے چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے ہیں تو اس کی حفاظت آخر کس طرح ہوگی۔ مگر اسے یہ بات سمجھنے میں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور تفسیر و تاریخ کی روایات کے مطابق سمندر کی طرف سے سبز اور زرد رنگ کے پرندوں کے جھنڈ نمودار ہوئے جو اپنی ننھی منی چونچوں میں سنگریزے اور کنکریاں اٹھائے ہوئے تھے اور انہوں نے ابرہہ کے لشکر کے اوپر پہنچتے ہی ان کنکریوں سے ایسی ''بمباری'' کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں سمیت زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ روایات میں آتا ہے کہ پرندے کی چونچ سے گرتے ہی وہ کنکر ہاتھی پر سوار لشکری کے سر پر پڑتا اور اس کی کھوپڑی اور جسم سے گزرتے ہوئے ہاتھی کے پیٹ سے نکل کر زمین میں دھنس جاتا اور اس کے ساتھ ہی وہ سوار اور ہاتھی دونوں زمین پر ڈھیر ہو جاتے۔

قرآن کریم میں اس واقعہ کے حوالہ سے ایک مستقل سورت ''الفیل'' کے نام سے موجود ہے جس میں ابرہہ کے لشکر پر کنکریوں کی بارش کرنے والے پرندوں کا ''ابابیل'' کے نام سے تذکرہ کیا گیا ہے اور اس ''بمباری'' کے بعد ابرہہ کے لشکر کی حالت کو یوں تعبیر کیا گیا ہے جیسے چبایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی اس طرح حفاظت فرمائی جبکہ ابرہہ کا بنایا ہوا یہ کعبہ فتح مکہ کے بعد جناب نبی اکرمؐ کے حکم پر حضرت جریر بن عبد اللہؓ کی قیادت میں ایک دستہ نے وہاں جا کر گرا دیا اور اسے آگ لگا دی، جس کی رپورٹ حضرت جریرؓ نے واپسی پر جناب نبی اکرمؐ کو ان الفاظ میں دی کہ یا رسول اللہؐ! میں اس یمنی کعبہ کو اس حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں جیسے کسی خارش زدہ اونٹ پر تارکول کا لیپ کر دیا گیا ہو۔ اس کعبہ کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ مولانا منظور احمد چنیوٹی چند سال قبل یمن گئے تھے، ان کے سفر کا مقصد قرآن کریم کے اس نسخہ کی زیارت کرنا تھا جو حضرت علیؓ سے منسوب ہے اور جرمن ماہرین کی ٹیم نے تفصیلی معائنہ و تجزیہ کے بعد اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ نسخہ حضرت علیؓ ہی کا تحریر فرمودہ ہے۔ مولانا چنیوٹی پنجاب اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے صنعاء گئے اور اس نسخہ کی

زیارت کی جس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اس کے مندرجات بعینہ وہی ہیں جو دنیا میں اس وقت کروڑوں کی تعداد میں چھپنے والے "مصحف عثمانی" کے ہیں اور اپنے مندرجات و مشمولات کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ کے لکھوائے ہوئے قرآن کریم اور حضرت علیؓ کے تحریر فرمودہ قرآن کریم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مولانا چنیوٹی بتاتے ہیں کہ اس موقع پر انہوں نے ابرہہ کے اس مصنوعی کعبہ کا کھنڈر بھی دیکھا جس کی کیفیت آج بھی اسی طرح ہے جیسے حضرت جریر بن عبد اللہؓ نے فرمایا تھا کہ اس کی دیواریں جل کر اس طرح سیاہ ہوگئی ہیں جیسے خارش زدہ اونٹ کے جسم پر تارکول مل دیا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے دین کی اشاعت کے اسباب خود پیدا کرتا ہے

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۷ مارچ ۲۰۰۲ء)

گزشتہ سال مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کی تعمیر نو اور توسیع کے منصوبہ کا آغاز ہوا تو خیال ہوا کہ مسجد اور اس سے متعلقہ تاریخی شخصیات کا مختصر تعارف بھی لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ اس دوران جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق یہ مسجد ۱۳۰۱ھ میں یعنی اب سے کوئی سوا سو برس قبل تعمیر ہوئی، اسے تعمیر کرنے والے بزرگ شیخ صاحب دین اور شیخ نبی بخش مرحوم دو بھائی تھے جنہوں نے راولپنڈی کی مرکزی جامع مسجد بھی تعمیر کی۔ چنانچہ گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد اور راولپنڈی کی مرکزی جامع مسجد کا نقشہ کم و بیش ایک جیسا ہے اور بنانے والے بزرگ بھی ایک ہیں۔ اس زمانے میں گوجرانوالہ میں ایک بہت بڑے عالم مولانا سراج الدین احمدؒ شہر کے خطیب ہوتے تھے جنہیں فقیہ پنجاب کہا جاتا تھا اور انہوں نے فقہ حنفی کی معروف کتاب "ہدایہ" کی شرح "سراج الہدایہ" کے نام سے لکھی، وہ اس مسجد کے بانی و خطیب تھے۔

مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کی تاریخ کا سب سے زیادہ قابل ذکر باب یہ ہے کہ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ مرحوم نے، جو گکھڑ کے قریب بستی جلال کے رہنے والے تھے، اسی مسجد میں مولانا سراج الدین احمدؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ اسی زمانہ میں گکھڑ کے قریب دو بستیوں ترگڑی اور تلونڈی کھجور والی کے

دو اور غیر مسلم بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ایک کا نام شیخ عبد الرحیمؒ ہے جو ضلع گوجرانوالہ کے معروف صنعتکار الحاج سیٹھی محمد یوسف مرحوم (راہوالی گتہ مل والے) کے والد محترم تھے، وہ ترگڑی کے رہنے والے تھے اور ہندو تھے۔ جبکہ دوسرے باواجی شیخ عبد الحق تھے جو ہندو پنڈت تھے اور تلونڈی کھجور والی میں ایک دھرم شالہ چلاتے تھے۔ یہ گرو اور چیلہ دونوں اکٹھے مسلمان ہوئے اور ان دونوں نے بھی گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں مولانا سراج احمدؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

باواجی عبد الحقؒ تو مسجد ہی کے لیے وقف ہو گئے، قرآن کریم پڑھا، دینی تعلیم حاصل کی اور پھر مرکزی جامع مسجد کے امام مقرر ہو گئے جہاں وہ تقریباً نصف صدی تک نماز پڑھاتے رہے۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے قرآن کریم کی ابتدائی تعلیم اسی جامع مسجد میں باواجی عبد الحقؒ سے حاصل کی۔ باواجی مرحوم مستجاب الدعوات بزرگ تھے اور لوگ دور دور سے ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آیا کرتے تھے۔ باواجی عبد الحقؒ خود تو جامع مسجد میں قرآن کریم کی تعلیم دیتے تھے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے لیکن اپنے دو شاگردوں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور شیخ عبد الرحیم مرحوم کو انہوں نے قرآن کریم اس انداز سے پڑھایا اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ ان کا ایسا رشتہ جوڑا کہ دونوں بزرگ اس خطہ میں بلکہ بہت وسیع دائرہ میں قرآن کریم کی تعلیم و اشاعت کی عظیم جدوجہد کی علامت بن گئے۔

اس زمانے میں پنجاب میں عمومی سطح پر قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر عام لوگوں کو سنانے اور پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ اس کام کا آغاز حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے اس دور میں کیا جب انہیں آزادئ ہند کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ساتھ کام کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور لاہور میں لا کر اس شرط کا پابند کیا گیا کہ وہ لاہور کی حدود سے باہر نہیں نکلیں گے اور اپنی نقل و حرکت سے حکومت کو باخبر رکھیں گے۔ انہوں نے اپنے عظیم استاد حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت باواجی عبد الحقؒ کے حکم کی تعمیل میں قرآن کریم کے عمومی درس اور ترجمہ و تفسیر کا آغاز کیا۔ آج پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، افغانستان، ایران، وسطی ایشیا اور بہت سے ممالک میں ان کے ہزاروں شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد قرآن کریم کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں۔

جبکہ شیخ عبدالرحیمؒ نے ایک نئی مہم کا آغاز کیا، انہیں قدرت کی طرف سے یہ ذوق ودیعت عطا ہوا تھا کہ عام مسلمانوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کے لیے انہیں تیار کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کریم کی تلاوت، قراءت اور حفظ کی حوصلہ افزائی شروع کی اور اپنے محدود وسائل کے ساتھ وہ قرآن کریم پڑھنے والوں کو وظیفہ اور انعامات دیتے رہے۔ اس مشن کو ان کے بیٹے سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے آگے بڑھایا، وہ کاروباری لحاظ سے بھی بہت آگے نکل چکے تھے اور راہوالی گتہ فیکٹری کے مالک تھے جو ایک زمانہ میں ضلع گوجرانوالہ کی بہت بڑی ملوں میں شمار ہوتی تھی۔

سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس مہم پر صرف کرنا شروع کیا کہ مسجدوں میں قرآن کریم پڑھانے کے لیے مستند قاری رکھے جائیں اور صحیح تلفظ و تجوید کے ساتھ بچوں کو قرآن کریم پڑھایا جائے۔ اس کے لیے وہ قاری صاحب کی تنخواہ کا نصف، تہائی یا چوتھائی حصہ، جو بھی مسجد کی انتظامیہ کے ساتھ طے پا جاتا، اپنی طرف سے ادا کرتے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے باقاعدہ ''تعلیم القرآن ٹرسٹ'' قائم کیا جس کے تحت ۱۹۷۰ء تک پاکستان کے مختلف شہروں میں چار سو سے زائد مدارس ایسے تھے جن میں قرآن کریم کی تعلیم دینے والے قراء اور حفاظ کی تنخواہوں کا کم و بیش ایک تہائی حصہ اس ٹرسٹ کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے ریکارڈ کے مطابق تعلیم القرآن ٹرسٹ کے تعاون سے چلنے والے تعلیم القرآن کے چار سو سے زائد مدارس میں اس وقت ساڑھے سات سو سے زیادہ قاری بطور استاذ کام کر رہے تھے اور تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد اے ہزار سے زائد تھی۔ جبکہ حفظ قرآن کریم کے بعد تجوید و قراءت اور قراء کی تیاری کے لیے تعلیم القرآن ٹرسٹ کے تحت ''معہد القرآن الکریم'' کے نام سے مستقل ادارہ قائم کیا گیا جو ۱۹۶۲ء سے مسلسل کام کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم القرآن ٹرسٹ نے سکولوں میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے قاری مہیا کرنے کی اسکیم شروع کی جس کے تحت جو اسکول اس تعاون کو قبول کرتے انہیں ٹرسٹ کی طرف سے قاری مہیا کر دیا جاتا۔ اس پروگرام میں ۱۹۷۰ء تک ایک سو سے زائد اسکولوں میں ایک سو بائیس قاری مہیا کیے جا چکے تھے۔

اس سے کہیں زیادہ تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ سعودی عرب بلکہ حرمین شریفین میں بھی حفظ قرآن کریم کے مکاتب کا آغاز سیٹھی محمد یوسف صاحب مرحوم کی تحریک سے ہوا۔ ورنہ اب سے چالیس برس قبل تک سعودی عرب میں قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے

باقاعدہ مدارس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ سیٹھی صاحب مرحوم نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے کراچی کے ایک دینی مدرسہ میں مکہ مکرمہ کے دو طلبہ کو قرآن کریم حفظ کرتے دیکھا تو بے حد تعجب ہوا۔ معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ سرزمین حجاز میں قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے باقاعدہ طور پر کوئی نظام نہیں ہے۔ سیٹھی صاحب عمرہ کے ارادہ سے سعودیہ چلے گئے اور دہران میں ان بچوں کے والدین سے مل کر صورتحال معلوم کی اور پھر حرمین شریفین میں تعلیم القرآن کے مکاتب قائم کرنے کا پروگرام بنالیا۔ ابتداء میں بہت دشواری پیش آئی اور سعودی حکام کو اعتماد میں لینے کے لیے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ برف پگھلنے لگی اور انہیں سعودی حکومت کا اس حد تک اعتماد میسر آگیا کہ مکہ مکرمہ اور دیگر شہروں میں ”تحفیظ القرآن الکریم“ کے نام سے مکاتب قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ سیٹھی محمد یوسف مرحوم اپنی وفات (۱۹۷۷ء) تک سعودی عرب کے مختلف شہروں میں ایک سو سولہ مدارس قائم کر چکے تھے جن میں ڈیڑھ سو اساتذہ پانچ ہزار سے زائد طلبہ کو قرآن کریم کی تعلیم دے رہے تھے۔

اس کار خیر میں سعودی حکومت اور وہاں کے شیوخ نے بھی سیٹھی صاحب سے تعاون کیا جن میں سے عرب مجاہد اسامہ بن لادن کے والد محترم محمد بن لادن کا بطور خاص سیٹھی صاحب نے تذکرہ کیا ہے۔ وہ اپنے انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ

> ”تعمیر حرمین کے ٹھیکیدار محمد بن لادن مکہ مکرمہ کے بہت متمول اور معروف ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے، میں نے پانچ منٹ مانگے، آپ حیران ہوں گے کہ انہوں نے میری مختصر باتیں خاموشی سے سنیں، بات ختم ہوئی تو ریسور اٹھایا اور اپنے منیجر کو فون پر کہا کہ شیخ محمد یوسف سیٹھی جو کہتے ہیں سنو اور جو مانگتے ہیں دے دو۔ میں نے تین ہزار ریال ماہانہ کا مطالبہ کیا جو منظور ہو گیا اور یہ رقم انہوں نے تاحیات دینے کا فیصلہ کیا۔ بعد میں یہ رقم پانچ ہزار ماہانہ ریال ہو گئی اور ان کی وفات کے بعد ان کے سعادت مند بیٹے نے یہ سلسلہ اسی طرح جاری رکھا ہے۔“

۱۹۷۷ء میں سیٹھی محمد یوسف مرحوم کی وفات کے بعد تحفیظ القرآن الکریم کے ان مدارس کا نظام سعودی حکومت نے سنبھال لیا اور اب یہ مدارس سعودی حکومت کے نظام کے تحت چل رہے ہیں۔

قارئین کی خدمت میں یہ داستان پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی اشاعت و تعلیم کے لیے خود اسباب پیدا کرتا ہے اور اگر مسلمانوں میں ذوق نہ رہے تو کافر

گھرانوں سے افراد چن کر انہیں اس کام پر لگا دیا کرتا ہے۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بارے میں سنا ہے کہ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کبھی موج میں آتے تو حضرت لاہوریؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے تھے کہ

"لاہوریو! دیکھ لو اگر تم قرآن سے منہ پھیر لو گے تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہوگی۔ وہ ایک سکھ کے پوتے کو لاہور میں بٹھا کر اس سے قرآن کریم کی خدمت لینے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔"

جہاد کی فرضیت اور افرادی قوت کا تناسب

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۹ فروری ۲۰۰۲ء)

جہاد کے بارے میں سورۃ الانفال کی آیت ۶۵ و ۶۶ میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اہل ایمان کو لڑائی پر ابھاریں اور اس کے ساتھ یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اگر دس کافروں کے مقابلہ میں ایک مسلمان ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ساتھ شامل ہوگا تو دس کے مقابلہ میں ایک مسلمان کو غلبہ نصیب ہوگا۔ یہ ابتدائی حکم تھا جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تخفیف فرما دی کہ دو کے مقابلہ میں ایک مسلمان کو غلبہ ملے گا اگر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا حکم اور حکمت شامل ہوگی۔

یہ دونوں حکم ایک ہی جگہ یکے بعد دیگرے مذکور ہیں جس سے فقہاء یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی جگہ مسلمانوں کا لشکر اپنے سے دوگنا زیادہ کافروں کے مقابلہ میں ہے تو اسے میدان جنگ سے تعداد کی کمی کی بنیاد پر پیچھے ہٹنے کی اجازت نہیں ہے، ہاں اس سے زیادہ تعداد اور تناسب ہو تو پھر اس کی اجازت ہے کہ میدان سے ہٹ جائیں۔ اس سے ہمارے بعض اہل علم اور دانشور دوستوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ ایک اور دو کا تناسب جہاد کی فرضیت کے لیے شرط کا درجہ رکھتا ہے اس لیے اگر کسی جگہ کافروں کی طاقت اور تعداد مسلمانوں کی طاقت و تعداد کی دوگنا سے زیادہ ہے تو وہاں مسلمانوں پر جہاد سرے سے فرض ہی نہیں ہوتا بلکہ اگر وہ اس صورت میں کافروں کے مقابلہ میں صف آراء ہوں گے تو قرآن کریم کے حکم کی خلاف ورزی کریں گے اور ان کا یہ اقدام شرعی تقاضوں کے منافی ہوگا۔ اسی پس منظر میں مختلف ممالک میں مسلمانوں کی ان جہادی گروپوں کی عسکری کاروائیوں کو بھی ہمارے ان دانشوروں کی طرف سے ناروا یا کم از کم خلاف حکمت و مصلحت قرار دیا جا رہا ہے

جو اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتوں کے خلاف عسکری جدوجہد میں مصروف ہیں اور بعض جگہ توازن کا تناسب سو گنا سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جارہا ہے کہ یہ جہادی تحریکیں محض جذبات کے تحت کام کررہی ہیں اور حکمت و دانش بلکہ شرعی اصولوں اور احکام کی رو سے ان کی اس جذباتی جدوجہد کی حمایت کرنا ضروری نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ بات محض مغالطہ کی حیثیت رکھتی ہے اور عام مسلمانوں کو جہادی تحریکات کے بارے میں بلاوجہ تشویش اور تذبذب میں ڈالنے کے مترادف ہے اس لیے کہ قرآن کریم نے کافروں کے مقابلہ میں قتال یعنی لڑائی کے لیے کم از کم ایک اور دو کا جو تناسب ان آیات میں بیان کیا ہے وہ جہاد کی فرضیت یا آغاز کے لیے شرط کے طور پر نہیں بلکہ میدان جنگ سے پیچھے ہٹنے کے لیے جواز کے درجہ میں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر کسی جگہ مسلمانوں کی قوت کا تناسب اس سے کم ہو تو وہ جہاد شروع نہیں کرسکتے بلکہ یہ ہے کہ جہاں قوت کا تناسب ایک اور دو سے کم ہو اور مسلمان تعداد کی کمی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا چاہیں تو انہیں اس کی اجازت ہے اور اگر اس صورت میں وہ میدان سے ہٹ آئیں گے تو وہ "فرار من الزحف" یعنی میدان جنگ سے بھاگنے کے مجرم قرار نہیں پائیں گے۔ یہاں بھی بات صرف اجازت تک ہے کہ ہٹنا چاہیں تو ہٹ سکتے ہیں، یہ حکم نہیں ہے کہ اس صورت میں ان پر میدان جنگ چھوڑ دینا شرعاً ضروری ہو جائے گا۔ چنانچہ انہی آیات کے تحت حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ "موضح القرآن" میں لکھتے ہیں کہ

> "دور اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے ان پر حکم ہوا کہ آپ سے دس برابر کافروں پر جہاد کریں، پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے تب یہی حکم ہوا کہ دو برابر جہاد کریں، یہی حکم اب بھی باقی ہے لیکن اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرت محمدؐ کے وقت ایک ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔"

حضرت شاہ صاحبؒ فرما رہے ہیں کہ اپنے سے دو گنا سے زیادہ کافروں پر جہاد میں حملہ کرنا منع نہیں بلکہ زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے اور اس کی دلیل کے طور پر وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے جس واقعہ کا ذکر فرما رہے ہیں اس میں تناسب ایک اور اسی کا بنتا ہے کہ صرف ایک ہزار مسلمانوں نے اسی ہزار کافروں کا مقابلہ کیا ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کریم کا بیان کردہ ایک اور دو کا تناسب جہاد کی فرضیت اور آغاز کے لیے نہیں بلکہ میدان جنگ سے پیچھے ہٹنے کے لیے جواز کی شرط کے طور پر ہے اور اس حکم کے حوالہ سے جہادی تحریکات پر حرف گیری کرنا قرآن کریم کے منشا کے خلاف ہے۔

اس بات پر بھی غور کرلیا جائے کہ ان آیات کے بارے میں مفسرین کرام عام طور پر یہ لکھتے ہیں کہ ان کا نزول غزوۂ بدر کے موقع پر ہوا۔ ایک اور دس کے تناسب میں جنگ جاری رکھنے کا حکم غزوۂ بدر سے پہلے کا ہے اور اس میں ایک اور دو کے درجہ تک تخفیف غزوۂ بدر کے بعد ہوئی ہے۔ جبکہ اس کے بعد خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو غزوات ہوئے ان میں اکثر جنگوں میں مسلمانوں اور کافروں کا تناسب ایک اور دو کا نہیں تھا لیکن اس کے باوجود نہ صرف جنگ ہوئی بلکہ جناب رسول اللہؐ نے اس کی قیادت بھی فرمائی۔ غزوۂ احد میں جناب نبی اکرمؐ کے لشکر کی تعداد سات سو تھی اور مقابلہ میں تین ہزار کفار تھے، یہاں کفار کا تناسب چار گنا سے بھی زیادہ بنتا ہے لیکن اس کے باوجود جناب رسالت مآب نے میدان جنگ میں مقابلہ کیا حتیٰ کہ کفار کے میدان چھوڑ کر چلے جانے کے بعد بھی حمراء الاسد تک ان کا تعاقب کیا۔ غزوۂ خندق میں چوبیس ہزار کے لگ بھگ کفار کا جم غفیر مدینہ منورہ پر چڑھ دوڑا جس کا مقابلہ آنحضرتؐ نے صرف تین ہزار کی نفری کے ساتھ کیا، یہاں مسلمانوں اور کافروں کا تناسب ایک اور آٹھ کا بنتا ہے۔

اگر سورۃ الانفال کی مذکورہ آیات کا مطلب یہی تھا کہ اپنے سے دوگنا سے زائد کافروں کے مقابلہ میں جہاد کرنا جائز نہیں ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے آٹھ گنا زیادہ قوت کے مقابلہ میں صف آراء ہونے کی بجائے ہمارے ان دانشور دوستوں کی رائے کے مطابق مذاکرات، صبر کے ساتھ حالات کو برداشت کرنے اور قوت کا توازن درست ہونے تک تیاری اور انتظار کرنے کی پالیسی اختیار فرماتے لیکن ایسا نہیں ہوا اور جناب رسالت مآبؐ نے آٹھ گنا زیادہ قوت کے مقابلہ میں نہ صرف ہتھیار اٹھائے بلکہ انہیں میدان سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ خیبر کے غزوہ میں حضورؐ کا لشکر سولہ سو افراد پر مشتمل تھا جس کی قیادت کرتے ہوئے آپؐ نے خیبر پر چڑھائی کی اور ان کا مقابلہ بیس ہزار یہودیوں سے ہوا۔ اور یہ خندق کی طرح دفاعی جنگ نہیں تھی بلکہ اقدامی جہاد تھا کہ جناب نبی اکرمؐ نے خیبر پر حملہ کیا اور اپنے سے کم از کم بارہ گنا زیادہ قوت کو شکست دے کر خیبر پر قبضہ کر لیا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں بھی یہ صورت حال قائم رہی۔ قادسیہ کی جنگ میں مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تھی اور مقابلہ ایک لاکھ بیس ہزار ایرانیوں سے ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ یرموک کی جنگ میں علامہ ابن خلدونؒ کے مطابق بتیس ہزار

مسلمان چار لاکھ رومیوں کے مقابلہ میں صف آراء ہوئے اور رومیوں کو کم و بیش ایک لاکھ لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اسپین کے معروف معرکہ میں طارق بن زیادؒ کی فوج کی تعداد صرف بارہ ہزار تھی اور مقابلہ میں ایک لاکھ عیسائیوں کا لشکر تھا اور یہاں بھی دفاع مقصود نہیں تھا بلکہ طارق بن زیادؒ نے سمندر پار کر کے خود اسپین پر چڑھائی کی تھی اور آٹھ گنا زیادہ قوت کو شکست دے کر اسپین پر قبضہ کر لیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں قیصر ارمانوس دیوجانس نے تین لاکھ کا لشکر لے کر سلطان ارسلان سلجوقی پر چڑھائی کر دی۔ سلطان کے پاس صرف پندرہ ہزار کی نفری تھی، سلطان کو پہلے پریشانی ہوئی مگر اس وقت کے ایک بڑے عالم امام ابونصر محمد بن عبدالمالکؒ نے سلطان کو حوصلہ دیا اور کہا کہ تعداد کی قلت کی وجہ سے میدان سے ہٹنا درست نہیں ہے ہمیں مقابلہ کرنا چاہیے، چنانچہ سلطان نے میدان میں مقابلہ کیا اور فتح پائی۔

یہ چند واقعات بطور نمونہ ذکر کیے گئے ہیں ورنہ تاریخ اسلام اور اسلامی غزوات کا تسلسل کے ساتھ مطالعہ کر کے ایسے واقعات معلوم کیے جائیں تو ان کی تعداد سینکڑوں سے بڑھ جائے گی جہاں مسلمانوں کا مقابلہ دوگنا سے زیادہ نہیں بلکہ پانچ گنا اور دس گنا سے بھی زیادہ فوجوں سے ہوا لیکن پوری تاریخ اسلام میں کہیں بھی کسی عالم یا دانشور نے قرآن کریم کی ان آیات کا حوالہ دے کر مسلمانوں سے یہ نہیں کہا کہ تمہارے مقابلہ میں کافروں کی تعداد قرآن کریم کے بیان کردہ تناسب سے زیادہ ہے اس لیے تم پر جہاد فرض نہیں ہے، پانچ گنا بلکہ دس گنا تعداد اور قوت کے مقابلہ میں صف آراء ہو کر تم جذباتیت کا مظاہرہ کر رہے ہو اور تمہارا یہ عمل حکمت و دانش کے خلاف ہے۔ اللہ جانے ہمارے دور کے ان اہل دانش کو قرآن کریم کی اس منشا کا براہ راست کہاں سے علم ہو گیا ہے؟ ملت اسلامیہ کی چودہ سو سالہ تاریخ اور امت کا اب تک چلا آنے والا اجتماعی تعامل تو اس کی تائید نہیں کرتا۔

مسلم ممالک کا نصاب تعلیم اور بل کلنٹن کی ہدایات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۸ جنوری ۲۰۰۲ء)

جدہ میں اکنامک فورم سے خطاب کرتے ہوئے سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا ایک جملہ ایک قومی اخبار نے یوں نقل کیا ہے

"انہوں نے مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی نظام میں عقیدے کی تلقین

ختم کریں۔“

اس بارے میں کچھ گزارشات گزشتہ کالم میں پیش کی جا چکی ہیں۔ ۲۲ جنوری ۲۰۰۲ء کو ایک اور قومی اخبار نے جناب کلنٹن کے اس خطاب کی مزید تفصیلات شائع کی ہیں جن کے پیش نظر کچھ مزید معروضات ضروری محسوس ہوتی ہیں۔ اس اخبار کے مطابق

• سابق صدر بل کلنٹن نے ایسے ”عالمی سیاسی معاشرہ“ کی تشکیل کے لیے جذباتی اپیل کی ہے جو رواداری پر مبنی ہو اور دہشت گردی کے خلاف لڑ سکے۔ جدہ میں تین روزہ اکنامک فورم سے اپنے خطاب میں انہوں نے امریکی حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ باقی دنیا سے رابطہ کرے اور مسلمانوں پر زور دے کہ وہ تعلیمی نظام میں جبری مسلط کیے گئے نظریات کو ختم کرنے کے لیے سکولوں کا نصاب تبدیل کریں۔

• انہوں نے کہا کہ عالمی سطح پر ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہیے جہاں ہر ایک کو اپنی پسند کے مطابق خدا کی پرستش کی آزادی ہو اور کوئی اس پر اعتراض نہ کرے۔

• دہشت گردوں نے ایسی دیواروں کو پھر سے کھڑا کرنے کی کوشش کی جنہیں ہم نے بڑی محنت سے گرایا تھا۔

• انہوں نے امام کعبہ اور جامعہ ازہر کے امام سے اپنی ملاقات کا بطور خاص حوالہ دیا اور کہا کہ یہ لوگ دہشت گردی کے خلاف آواز تو بلند کر رہے ہیں مگر یہ سلسلہ سکولوں کی تعلیم تک جانا چاہیے۔

بل کلنٹن کی ان کھلی کھلی باتوں سے ہمیں اس لحاظ سے خوشی ہوئی ہے کہ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف بات کی ہے۔ اس طرح وہ نکتہ اور پوائنٹ مزید واضح ہوتا جا رہا ہے جو مغرب اور اسلام کے درمیان دن بدن بڑھتی چلی جانے والی کشمکش میں بنیادی تنازعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے یہ بات بھی نکھر کر سامنے آگئی ہے کہ مغرب کے لیڈر بار بار اس یقین دہانی کا جو تکرار کر رہے ہیں کہ ان کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں ہے وہ محض ڈپلومیسی ہے۔ جبکہ وہ دہشت گردی کی کوئی تعریف متعیّن کیے بغیر جن اقدار و روایات اور احکام و ضوابط کو دہشت گردی قرار دے کر ہدف بنائے ہوئے ہیں وہ اصل میں اسلامی تعلیمات ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور مغربی لیڈروں کے نزدیک اس ”دہشت گردی“ کے

خاتمہ کے لیے مسلمان ملکوں کے تعلیمی نظام اور اسلامی تعلیمی نصاب کے بنیادی ڈھانچہ میں تبدیلی ناگزیر ہے۔

مغرب اور اسلام کے درمیان تنازعہ، کشمکش اور جنگ کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مغرب اسلام کو ایک مذہب کے طور پر برداشت کرنے کے لیے تو تیار ہے جو مسیحیت، یہودیت، ہندوازم اور بدھ مت کی طرح انسانی سوسائٹی کی اجتماعی قیادت کے کردار سے دستبردار ہو کر شخصی زندگی اور عبادت خانوں تک محدود ہو جائے اور اپنی ان حدود سے باہر اجتماعی معاملات میں کسی حوالہ سے بھی دخل اندازی نہ کرے۔ اس اسلام کے ساتھ مغرب کی کوئی جنگ نہیں ہے اور نہ ہی اس اسلام کو ختم کرنے میں انہیں کوئی دلچسپی ہے کیونکہ جب مذہب معاشرہ کی اجتماعی قیادت اور راہنمائی سے کنارہ کش ہو کر سیاست، تجارت، معیشت، قانون، معاشرت اور کلچر غرضیکہ ہر شعبہ میں مغرب کے فلسفہ و نظام کی بالادستی کے لیے میدان خود ہی خالی کر رہا ہے تو مغرب کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ اس شکست خوردہ اور ہتھیار ڈال دینے والے مذہب کے خلاف کشمکش میں اپنا وقت، سرمایہ اور صلاحیتیں ضائع کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیت، یہودیت، ہندومت اور بدھ ازم کے خلاف مغرب کی کوئی لڑائی نہیں ہے کیونکہ ان مذاہب کے پیروکار دنیا بھر میں اپنی مذہبی سرگرمیوں کو شخصی زندگی اور عبادت خانوں تک محدود کر کے سیاست، قانون، معیشت، معاشرت اور دیگر اجتماعی شعبوں میں مغربی فلسفہ و ثقافت کی بالادستی کو قبول کر چکے ہیں۔

مگر اسلام کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام اپنے معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی کردار سے کسی طور پر دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے جس کی دو بنیادی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کے پاس قرآن کریم اور سنت نبویؐ کی تعلیمات مکمل اور محفوظ حالت میں بدستور موجود ہیں اور انہیں تبدیل کرنے یا پردۂ اخفاء میں لے جانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عام مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی خطے سے تعلق رکھتا ہو اور کتنا ہی بے علم، بے عمل بلکہ بدعمل کیوں نہ ہو لیکن جب قرآن کریم کے کسی حکم اور جناب نبی اکرمؐ کے کسی ارشاد کی بات آئے گی وہ خواہ اس پر عمل کرتا ہو یا نہ ہو مگر اس سے دستبردار ہونے یا اس کے بارے میں کوئی کمزور بات کہنے اور سننے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ دنیا کے کسی بھی خطے کا عام مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جامع نظام زندگی ہے اور بہتر و برتر تہذیبی اقدار کا حامل ہے جسے عالمی قوتوں نے طاقت، سیاست اور معاشی بالادستی کے

زور سے دبا رکھا ہے۔ اور جب بھی حالات سازگار ہوئے اسلام اپنا اجتماعی کردار ادا کرنے کے لیے پھر سے عالمی افق پر ابھرے گا۔

اسلام کا یہی پہلو مغرب کے لیے ناقابل قبول ہے کیونکہ اس طرح اسلام ایک محکوم مذہب کی بجائے ایک مقابل تہذیبی قوت کے طور پر سامنے آتا ہے اور مغرب کی تہذیبی بالادستی کو چیلنج کرتا دکھائی دیتا ہے جو مغرب کے لیے قطعی طور پر ناقابل برداشت ہے چنانچہ مغرب اسلام سے پیچھا چھڑانے کے جتن کر رہا ہے۔ اس کی ایک جزوی صورت جناب کلنٹن کے یہ لیکچر بھی ہیں جن میں وہ مسلمانوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ وہ اپنا تعلیمی نصاب و نظام تبدیل کریں اور عقیدہ کی تلقین ختم کریں۔ اس معاملہ میں مذہب کی حساسیت کا اندازہ اس بات سے کر لیں کہ جناب کلنٹن اپنے اس دورہ میں امام کعبہ سے اور جامعہ ازہر کے امام محترم سے ملے ہیں اور ان کی طرف سے دہشت گردی کے خلاف آواز بلند کرنے کو انہوں نے سراہا بھی ہے لیکن ان کے نزدیک اس کے ساتھ مسلمانوں کے تعلیمی نصاب و نظام سے ان باتوں کو نکالنا بھی ضروری ہے جنہیں امریکہ دہشت گردی قرار دیتا ہے۔

امام کعبہ اور جامعہ ازہر کے شیخ اکبر عالم اسلام کے ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے افغانستان کے خلاف امریکہ کی فوج کشی میں کھل کر امریکہ کی حمایت کی ہے اور مظلوم طالبان کو برسرعام غلط ٹھہرایا ہے۔ لیکن امریکہ اس پر بھی خوش نہیں ہے اور ان سے تقاضا کر رہا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف آواز بلند کرنے کو اسکولوں اور مدارس تک لے جائیں اور اپنے تعلیمی نظام و نصاب کو امریکی ایجنڈے کے مطابق تبدیل کریں۔

ہم ان کالموں میں کئی بار واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی تعلیمات اور ہمارے تعلیمی نصاب میں جو باتیں امریکہ کے موقف کے مطابق دہشت گردی کا حصہ قرار پاتی ہیں ان میں جہاد کے احکام، نکاح و طلاق اور وراثت کے شرعی قوانین، معاشرتی جرائم کی شرعی سزائیں، اور ریاست کے سرکاری مذہب کے طور پر اسلام کا ریاستی کردار بھی شامل ہے۔ جن کے بارے میں امریکہ، اقوام متحدہ کے متعلقہ ادارے اور مغرب کی بین الاقوامی لابیاں درجنوں رپورٹوں اور بیسیوں قراردادوں میں یہ بات کہہ چکی ہیں کہ یہ سب امور انسانی حقوق کے مروجہ عالمی فلسفہ کے خلاف ہیں اور اقوام متحدہ کے چارٹر اور فیصلوں کے منافی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی مسلمان ملک اپنے تعلیمی نظام کے حوالہ سے جناب کلنٹن کے

ارشاد کو قبول کرتا ہے تو آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ اسے قرآن کریم کی کتنی آیات اور جناب رسول اللہؐ کے کتنے ارشادات سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

جناب کلنٹن سے گزارش ہے کہ وہ معروضی حقائق کو تسلیم کریں اور امریکی راہنماؤں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ اسلامی تعلیمات کو ختم کرنے یا تقسیم کرنے اور مسلمانوں کو قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے احکام سے دستبردار کرانے کی بے نتیجہ کوششوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ یہ کوشش اس سے قبل برطانیہ کر چکا ہے جس نے ڈیڑھ سو سال قبل دہلی پر اقتدار قائم ہونے کے بعد جنوبی ایشیا کے صدیوں پرانے تعلیمی نصاب و نظام کو یکسر تبدیل کر دیا تھا بلکہ بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ مسلمانوں کو ''ماڈرنائز'' کر کے انہیں ان کی پرانی، روایتی اور دقیانوسی تعلیم کے دائرے سے باہر نکالا جائے اور مغرب سے آنے والے جدید فلسفہ و ثقافت سے انہیں ہم آہنگ کیا جائے۔ لیکن برطانیہ کو اس ساری تگ و دو میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کا نقشہ آج سب کے سامنے ہے اور اب بھی اس قسم کی کسی کوشش کا نتیجہ اس سے کسی صورت مختلف نہیں ہوگا۔ اس لیے امریکی رہنماؤں کے لیے دانشمندی کا راستہ یہی ہے کہ وہ اسلام کو مسیحیت، یہودیت، ہندوازم اور بدھ مت کی طرح ایک روایتی اور فرسودہ مذہب سمجھ کر اسے دبانے اور کارنر کرنے کی فضول محنت میں وقت ضائع نہ کریں بلکہ اسے مغربی فلسفہ و ثقافت کے مقابل ایک زندہ و توانا فلسفہ و ثقافت کی حیثیت سے تسلیم کر کے حوصلے کے ساتھ اس کا سامنا کریں۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نسل انسانی گلوبلائزیشن کے دور میں داخل ہو چکی ہے اور ایک نیا عالمی سیاسی معاشرہ تشکیل پانے والا ہے جس کی قیادت کے لیے مغربی فلسفہ و نظام اور اسلامی فلسفہ و ثقافت کے درمیان جنگ جاری ہے۔ جناب کلنٹن اور ان کے ہمنوا اگر یہ جنگ دھونس، دھاندلی، بمباری، لشکرکشی اور معاشی استحصال کے ہتھیاروں سے ہی لڑنا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی ہے لیکن اتنی بات وہ ضرور یاد رکھیں کہ عقیدہ و ثقافت کی جنگ ان ہتھیاروں سے وقتی طور پر لڑی تو جا سکتی ہے مگر ان ہتھیاروں نے آج تک کسی کو ایسی جنگوں میں کامیابی سے ہمکنار نہیں کیا۔

۲۰۰۱ء

میدان جنگ سے فرار ۔ بزدلی اور حکمت عملی کا فرق

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۰ دسمبر ۲۰۰۱ء)

حضرت خالد بن ولیدؓ غزوۂ موتہ سے مسلمانوں کا لشکر لے کر مدینہ منورہ واپس پہنچے تو مدینہ منورہ میں غم و حزن کی فضا تھی۔ علامہ شبلیؒ نعمانی نے اپنی تصنیف سیرت النبیؐ میں لکھا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غم اور پریشانی کے عالم میں مسجد نبویؐ کے ایک کونے میں جا بیٹھے جبکہ مدینہ کے عام لوگوں نے آنے والے لشکر کا استقبال اس طرح کیا کہ ان کے چہروں پر خاک پھینک رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ”میدان جنگ سے بھاگنے والو واپس آ گئے ہو؟“

یہ سن آٹھ ہجری کی بات ہے جب جناب رسول اللہؐ نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف ممالک کے حکمرانوں کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے تو اس وقت کی سب سے بڑی عیسائی سلطنت روم کے باجگزار صوبہ شام کے ایک حکمران کے نام بھی خط روانہ کیا۔ خط لے کر جانے والے صحابی حضرت حارث بن عمیرؓ تھے جنہیں قیصر روم کے ایک ماتحت عرب سردار شرجیل بن عمرو نے شہید کر دیا۔ آنحضرتؐ نے اپنے سفیر کے قتل کا قصاص لینے کے لیے تین ہزار صحابہ کرامؓ پر مشتمل لشکر روانہ کیا جس کا کمانڈر حضرت زید بن حارثہؓ کو مقرر فرمایا جو کہ ایک آزاد کردہ غلام تھے۔ جبکہ لشکر میں حضرت خالد بن ولیدؓ اور بعض دیگر معروف جرنیل بھی شامل تھے اس لیے عام عرب روایات کے مطابق زید بن حارثہؓ کی تقرری کو محسوس کیا گیا مگر آپؐ نے لشکر کو انہی کی قیادت میں روانہ کر دیا اور ساتھ ہی یہ

ہدایت فرمائی کہ زید بن حارثہؓ شہید ہوں تو ان کی جگہ عبد اللہ بن رواحہؓ لشکر کے امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالبؓ لشکر کی کمان سنبھالیں گے۔

تین ہزار صحابہؓ کا یہ لشکر جب شام کے علاقہ بلقاء میں پہنچا تو نہ صرف شرجیل بن عمرو ایک لاکھ فوج جمع کر کے اس کی کمان کرتے ہوئے مقابلہ کے لیے موجود تھا بلکہ خود قیصر روم بھی ایک لاکھ فوج کے ساتھ اسی علاقہ میں خیمہ زن تھا۔ یہ اس وقت کی سب سے بڑی عیسائی سلطنت اور دنیا کی سپر پاور روم کے ساتھ مسلمانوں کی پہلی معرکہ آرائی تھی۔ امیر لشکر زید بن حارثہؓ نے اپنی عددی قوت کو دشمن کے مقابلہ میں بہت کم سمجھتے ہوئے جنگ شروع کرنے سے قبل جناب نبی اکرمؐ سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا مگر حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور بعض دیگر حضرات نے اس سے اتفاق نہ کیا اور رائے دی کہ اب جب کہ ہم یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بجائے مقابلہ میں ڈٹ جانا چاہیے۔ چنانچہ موتہ کے مقام پر تین ہزار کا یہ لشکر شرجیل بن عمرو کے ایک لاکھ کے لشکر کے مقابلہ میں جا کھڑا ہوا۔ جنگ شروع ہوئی اور امیر لشکر حضرت زید بن حارثہؓ بے جگری سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ آگے بڑھے اور انہوں نے بھی کچھ دیر مقابلہ کے بعد شہادت کا مقام حاصل کر لیا۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے لشکر کی کمان سنبھالی اور مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ پرچم ان کے دائیں ہاتھ میں تھا جس پر دشمن نے وار کیا اور وہ ہاتھ کٹ گیا، انہوں نے پرچم دوسرے ہاتھ میں لے لیا، اس پر ایک وار ہوا اور وہ بھی کٹ گیا، اب پرچم کو انہوں نے گردن میں دبا کر گرنے سے بچایا اور پوری دلیری کے ساتھ کھڑے رہے۔ اس دور میں میدان جنگ میں پرچم کا گر جانا شکست کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ ایک سپاہی کی حیثیت سے لشکر میں موجود تھے اور جنگ میں شریک تھے۔ انہوں نے یہ منظر دیکھا تو جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھ کر پرچم تھام لیا اور لشکر سے مخاطب ہو کر اعلان کیا کہ جناب رسول اللہؐ کے مقرر کردہ تینوں امیر باری باری شہید ہو گئے ہیں اب مشورہ کا وقت نہیں ہے اس لیے میں نے از خود آگے بڑھ کر کمان سنبھال لی ہے اور اب اس لشکر کی کمان میں خالد بن ولیدؓ کر رہا ہوں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے سامنے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اس لشکر کو دشمن کے نرغے سے بحفاظت کس طرح نکالا جائے۔ اور اس وقت کی معروضی صورتحال میں

کامیابی یہی تھی کہ لشکر کو کسی مزید نقصان کے بغیر جنگ سے باہر لے جایا جائے تاکہ صورتحال کا از سرنو جائزہ لے کر نئی حکمت عملی طے کی جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے کمال حکمت عملی، حوصلہ مندی اور تدبر کے ساتھ اس لشکر کو دشمن کے نرغہ سے نکالا لیکن دوبارہ جنگ میں شریک ہونے کی بجائے مدینہ منورہ واپسی کی کو زیادہ بہتر سمجھا تاکہ آنحضرتؐ کی خدمت میں تفصیل عرض کرکے نئی ہدایات لی جائیں۔

یہ لشکر جب مدینہ منورہ پہنچا تو اسے عام طور پر شکست سمجھا گیا اور اسی وجہ سے مدینہ منورہ کے کچھ لوگوں نے آنے والوں کو میدان جنگ سے فرار کا طعنہ دے کر ان کے چہروں پر خاک بھی پھینکی۔ مگر جناب رسول اللہؐ نے اس پسپائی کو شکست قرار دینے کی بجائے دوبارہ حملہ کی تیاری کے لیے میدان جنگ سے واپسی قرار دیا۔ اور یہی وہ موقع تھا جب حضرت خالد بن ولیدؓ کی جرأت و تدبر اور جنگی حکمت عملی کو سراہتے ہوئے جناب نبی اکرمؐ نے انہیں ”سیف اللہ“ کا خطاب بھی دیا۔

اس غزوہ میں مسلمانوں کی پسپائی کا بدلہ لینے کے لیے جناب رسول اللہؐ نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں ایک لشکر شام پر چڑھائی کے لیے پھر تیار کیا اور اس کا امیر حضرت زید بن حارثہؓ کے فرزند حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مقرر فرمایا۔ وہ اس وقت انیس بیس برس کے لگ بھگ عمر کے نوجوان تھے، ان کی امارت پر بھی بعض حضرات کی طرف سے اعتراض کیا گیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا لیکن بخدا وہ بھی امارت کا اہل تھا اور یہ اس کا بیٹا اسامہ بھی امارت کی اہلیت رکھتا ہے۔ آنحضرتؐ نے بیماری کے باوجود خود مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جا کر لشکر کو روانہ کیا مگر یہ لشکر ابھی تھوڑے فاصلہ پر جرف کے مقام تک پہنچا تھا کہ حضورؐ کا وصال ہوگیا اور حضرت اسامہ بن زیدؓ لشکر کو لے کر واپس آگئے اور آپؐ کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے۔ رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو ہر طرف بغاوت اور ارتداد کے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے اور بہت مشکل صورتحال پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے حضرت عمر بن الخطابؓ اور بعض دیگر صحابہ کرامؓ نے خلیفہ رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ اس موقع پر اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کو شام کی طرف رومیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ نہ کیا جائے بلکہ مدینہ منورہ کی حفاظت اور دفاع کے لیے اس لشکر کو روک لیا جائے۔ مگر حضرت

صدیق اکبرؓ نے یہ کہہ کر لشکر کی روانگی روکنے سے انکار کر دیا کہ جس لشکر کو خود جناب رسول اللہؐ روانہ کر چکے ہیں اسے میں نہیں روک سکتا۔

چنانچہ لشکر کی دوبارہ روانگی طے پائی اور حضرت صدیق اکبرؓ نے خود مدینہ منورہ سے باہر جا کر لشکر کو رخصت کیا اور یہ فرمایا کہ اگر خلافت کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو وہ خود بھی اس لشکر میں اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں رومیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوتے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ لشکر کو لے کر شام کی طرف بڑھے تو اس بار کوئی بڑی مزاحمت نہ ہوئی اور وہ بڑھتے بڑھتے دمشق کے قریب الزیت اور المزہ کے مقامات تک جا پہنچے، وہاں کچھ دن قیام کیا اور مدینہ منورہ واپس لوٹ آئے۔ یہ لشکر غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کی وقتی پسپائی کا جواب بھی تھا اور سلطنت روما کے زیر تسلط عرب علاقوں کی فتوحات کا نقطۂ آغاز بھی ثابت ہوا۔ اور پھر اس کے بعد اس وقت کی سب سے بڑی عیسائی سلطنت اور سپر پاور "سلطنت روما" کو مسلمانوں کے پے در پے حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے سمٹنے اور سمٹتے چلے جانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

امارت اسلامی افغانستان کا خاتمہ اور نئی افغان حکومت کے رجحانات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۱ دسمبر ۲۰۰۱ء)

کابل پر امارت اسلامی افغانستان کا کنٹرول ختم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ سنبھالنے والے شمالی اتحاد کے وزیر انصاف نے ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ طالبان کے سخت قوانین ختم کر دیے جائیں گے اور کسی کو ہاتھ کاٹنے، سنگسار کرنے، اور کوڑے مارنے کی سزا آئندہ نہیں دی جائے گی بلکہ صدر داؤد خان کے دور کے قوانین واپس لائے جائیں گے جن کے بارے میں ایک قومی اخبار نے یکم دسمبر کو یہ خبر شائع کی ہے کہ کابل کے ایک پچیس سالہ شخص نے بتایا ہے کہ اسے طالبان حکومت نے اس جرم میں ایک سال قید کی سزا دی تھی کہ اس نے گرل فرینڈ رکھی ہوئی تھی جبکہ صدر داؤد خان کے دور میں اسے جرم تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کابل کی نئی حکومت کے رجحانات کیا ہیں اور طالبان حکومت نے شرعی نظام کے نفاذ کو جہاد افغانستان کا منطقی تقاضا قرار دیتے ہوئے اس

کی طرف جو پیش رفت کی تھی اسے کابل کی نئی حکومت کس حد تک جاری رکھنے کے لیے تیار ہوگی؟

جہاں تک شرعی قوانین کے نفاذ کو جہاد افغانستان کا منطقی تقاضا قرار دینے کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ روسی استعمار کے خلاف جہاد کا اعلان ہی اس بنیاد پر ہوا تھا کہ کمیونزم کا کافرانہ نظام نافذ ہو گیا ہے اور اسے ختم کر کے شرعی نظام کا نفاذ مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے۔ اس لیے اگر اب بھی افغانستان میں صدر داؤد کے دور کے قوانین نے ہی واپس آنا ہے تو سرے سے اس جنگ کی شرعی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جو جنگ کمیونسٹ نظام کے خاتمہ کے لیے "جہاد افغانستان" کے نام سے لڑی گئی تھی اور جس میں موجودہ شمالی اتحاد میں شامل اہم راہنما بھی پیش پیش تھے۔ باقی رہی یہ بات کہ طالبان نے جو قوانین نافذ کیے تھے وہ سخت ہیں تو ان کی سختی اپنی جگہ مگر انہیں "طالبان کے قوانین" قرار دے کر مسترد کرنا کسی ایسے شخص یا گروہ کو زیب نہیں دیتا جو مسلمان کہلاتا ہے اور قرآن کریم پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس لیے کہ سنگسار کرنے، کوڑے مارنے، اور ہاتھ کاٹنے کی سزائیں طالبان کی تجویز کردہ نہیں بلکہ قرآن کریم نے ان کی صراحت کی ہے اور یہ سزائیں قرآن کریم میں بدستور موجود ہیں۔

گزشتہ دنوں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی "انسانی حقوق کمیٹی" نے ایک قرارداد میں ایران کو بھی وارننگ دی ہے کہ وہ سنگسار کرنے، کوڑے مارنے، ہاتھ کاٹنے اور سرعام سزا دینے کے قوانین تبدیل کرے۔ شاید اسی لیے افغانستان میں شمالی اتحاد کے وزیر انصاف کو اقوام متحدہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پیشگی یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ افغانستان کی نئی حکومت ملک میں طالبان کے نافذ کردہ شرعی قوانین کا تسلسل جاری نہیں رکھے گی۔

ہم ایک عرصہ سے عرض کر رہے ہیں کہ افغانستان کے حوالہ سے امریکی ایجنڈے کی سب سے اہم شق طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کرنا تھا کیونکہ یہ دنیا کی واحد مسلم حکومت تھی جو اسلام کا صرف نام نہیں لیتی تھی بلکہ اس نے سوسائٹی میں قرآن و سنت کے بیان کردہ قوانین کو من وعن نافذ کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا اور وہ اس میں کس قسم کی لچک اختیار کرنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں تھی۔ طالبان حکومت کی بعض تعبیرات یا ترجیحات سے اختلاف ہو سکتا ہے اور خود ہم نے بھی متعدّد بار طالبان حکومت کے بعض ذمہ دار حضرات سے ان تعبیرات و ترجیحات کے حوالہ سے بات کی ہے اور اپنے تحفظات

کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تعبیرات و ترجیحات کا فرق اور چیز ہے اور سرے سے ان قوانین کو ہی "طالبان کے سخت قوانین" قرار دے کر مسترد کر دینا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ اور مغرب دراصل یہی چاہتا ہے کہ "وحشیانہ سزائیں" اور "دہشت گردی" کے نام سے شرعی قوانین کے خلاف وسیع تر معاندانہ پراپیگنڈا کر کے، نیز عسکری قوت اور معاشی دباؤ کے ذریعے انہیں اس بات کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ شریعت کے ان احکام و قوانین سے دستبردار ہو جائیں جو مغرب کے عالمی نظام سے مطابقت نہیں رکھتے اور جن کی موجودگی میں مسلمان معاشرہ کو مغربی ثقافت کے دائرہ میں لانا ممکن نہیں ہے۔

مغرب اور اس کے ہمنواؤں کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ سب قوانین قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں جو چودہ سو برس سے بالکل محفوظ حالت میں مسلمانوں کے پاس نہ صرف موجود ہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اس حفاظ و قراء مسلسل اس کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں اور وہ اتنے اہتمام کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے کہ اس کے کسی لفظ یا جملے کو آگے پیچھے کرنا یا اس کے بیان کردہ کسی قانون اور ضابطے کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً مذہب کے نام پر اور مذہب کے تحفظ کے لیے جنگ کو مغرب کے ہاں "دہشت گردی" سمجھا جاتا ہے اور امریکہ کی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف موجودہ عالمی جنگ کا مقصد صرف یہی ہے کہ دنیا بھر کے ان لوگوں کو ختم کیا جائے جو مذہبی جذبہ کے ساتھ مذہب کے فروغ یا تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھاتے ہیں۔ جبکہ اسلام میں یہ جنگ "جہاد" کہلاتی ہے اور اس پر قرآن کریم کی سینکڑوں آیات موجود ہیں جو پوری صراحت کے ساتھ جہاد کے احکام و قوانین بیان کرتی ہیں اور مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتی ہیں۔ مگر قرآن کریم نے جہاد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ سب کچھ مغربی فلسفہ کی رو سے انتہا پسندی اور دہشت گردی شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم اور سنت نبویؐ نے چور کا ہاتھ کاٹنے، زانی کو سنگسار کرنے، جھوٹی تہمت لگانے والے کو کوڑے مارنے، قاتل کو قصاص میں قتل کرنے، ڈاکو کے ہاتھ پاؤں کاٹنے، اور مجرم کو سرعام سزا دینے کے احکام دیے ہیں جو مغربی فلسفہ کی رو سے وحشیانہ سزائیں کہلاتی ہیں۔

چنانچہ اب یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہوتی جا رہی ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور، جنرل اسمبلی کی قراردادوں، مغربی لابیوں کے مطالبات، اور امریکہ کی دھونس کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن و سنت کے احکام سے دستبرداری پر مجبور کیا جائے اور

"انسانی حقوق کے چارٹر" کی پابندی کے نام پر انہیں مغربی تہذیب و ثقافت کے دائرہ میں لایا جائے۔ یہ مہم آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے جاری ہے جب بہت سے مسلم ممالک پر برطانوی، فرانسیسی اور پرتگیزی استعمار نے قبضہ کر کے وہاں صدیوں سے چلے آنے والے شرعی قوانین کو ختم کر دیا تھا اور مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو یہ سمجھانا شروع کیا تھا کہ اب ان قوانین کا دور نہیں رہا، زمانہ بہت ترقی کر چکا، سائنس نے بہت سے نئے حقائق دریافت کیے ہیں اور ٹیکنالوجی بہت آگے بڑھ گئی ہے، اس لیے خاندان اور معاشرہ کے حوالہ سے ان قوانین کے لیے دنیا میں اب کوئی جگہ نہیں رہی جو قرآن و سنت میں بیان کیے گئے ہیں۔

اس مقصد کے لیے خود مسلمانوں میں بہت سے ایسے فکری حلقے کھڑے کیے گئے جنہوں نے قرآنی احکام و قوانین کی من مانی تشریح کر کے مسلمانوں کو مغربی فکر و فلسفہ کے سامنے سر جھکانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ مگر مسلم ممالک کے حکمران گروہوں اور ان کے ساتھ ایک محدود مغرب زدہ طبقہ کے علاوہ کسی نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ آج بھی دنیا کے ہر خطے میں عام مسلمانوں کی اکثریت اپنے اس ایمان و یقین پر قائم ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو قیامت تک نافذ العمل رہے گی اور اس کی تعبیر و تشریح صرف وہی قبول ہوگی جو خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جو کہ سیرت و سنت اور حدیث کے ذخیرہ میں پوری طرح موجود و محفوظ ہے۔

چنانچہ ان قوانین کو طالبان کے قوانین یا ایرانی حکومت کے قوانین کا نام دینے یا دہشت گردی اور وحشیانہ سزائیں قرار دینے کی اس نئی عالمی مہم کا نتیجہ بھی پہلے سے مختلف نہیں ہوگا۔ دنیا بھر کا عام مسلمان قرآن و سنت پر دوٹوک ایمان اور ان کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ رکھتا ہے، اسے امریکی بمباری اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے ذریعہ قرآن و سنت کے صریح احکام سے دستبردار کرانے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

موجودہ عالمی صورتحال میں علماء کرام کی ذمہ داریاں

(جامعہ ریاض العلوم، لیسٹر، برطانیہ - ۱۰ نومبر ۲۰۰۱ء)

برطانیہ کے جن دینی و تعلیمی اداروں کا کام دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اور کچھ امید قائم ہوتی ہے ان میں لیسٹر کی اسلامک دعوہ اکیڈمی سرفہرست ہے جو مولانا محمد سلیم دھورات کی

سربراہی میں کام کر رہی ہے اور جس کا تذکرہ پہلے بھی ان کالموں میں ہو چکا ہے۔ اس سال اسلامک دعوہ اکیڈمی اور اس کے ساتھ منسلک جامعہ ریاض العلوم اور مدرسہ ریاض القرآن کا سالانہ جلسہ ۱۰ نومبر کو تھا جس میں شرکت کا موقع ملا اور کچھ گزارشات بھی پیش کیں۔ جلسہ میں مدرسہ ریاض القرآن میں حفظ قرآن کریم مکمل کرنے والے نو حفاظ نے آخری سبق سنایا اور جامعہ ریاض العلوم کے سالانہ امتحانات میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات دیے گئے۔ جبکہ دارالعلوم بری کے استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی محمد شیر نے بھی خطاب کیا۔

حفاظ کا آخری سبق سننے سے قبل جلسہ میں اس اعلان سے میں چونک گیا کہ حفظ قرآن کریم مکمل کرنے والے ان طلبہ کا آج صرف آخری سبق سنا جائے گا لیکن ان کی دستار بندی نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں معمول یہ ہے کہ عام طور پر آخری سبق سننے کے ساتھ ہی حافظ صاحب کو کسی بزرگ کے ہاتھوں دستار بندھوا کر حافظ کا خطاب دے دیا جاتا ہے اور اس کے بعد قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لیے اسے دہرانا اور بار بار سنا کر اسے پختہ کرنا اس حافظ کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے حفاظ بے پروائی کی وجہ سے قرآن کریم بھول جاتے ہیں اور ثواب و اجر کی بجائے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لیے جلسہ میں مدرسہ ریاض القرآن کے مہتمم مولانا محمد سلیم دھورات کی طرف سے کیا گیا یہ اعلان مجھے بہت اچھا لگا کہ آج ان حفاظ کا صرف آخری سبق سنا جائے گا اور ان کی دستار بندی اس وقت ہوگی جب یہ بیس مرتبہ قرآن کریم دہرا لیں گے، کم از کم پانچ پارے ایک نشست میں سنانے کے قابل ہو جائیں گے اور پورے قرآن کریم کا تفصیلی امتحان دے کر اسے پاس کر لیں گے۔ ان مراحل سے گزر کر جب یہ دستار فضیلت کے مستحق ہو جائیں گے تو دستار بندی اور سند کے ساتھ ساتھ انہیں عمرہ کا ٹکٹ بھی دیا جائے گا۔

جلسہ سے قبل مولانا محمد سلیم دھورات نے علماء کرام کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا بھی اہتمام کر رکھا تھا جس میں مختلف شعبوں سے علماء کرام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور مجھے کہا گیا کہ میں ان علماء کرام سے موجودہ عالمی صورتحال اور علماء کرام کی ذمہ داریوں کے حوالہ سے گفتگو کروں۔ چنانچہ جو گزارشات اس وقت اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے پیش کی جا سکیں ان کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ علماء کرام میری برادری ہے اس لیے ان سے گفتگو کرنے اور بہت سی گزارشات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ڈر بھی لگتا ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو ان کے شایان شان نہ ہو، اور یہ خوف بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ کوئی بات کسی نازک مزاج پر گراں گزر گئی تو پھر وہی کچھ نہ ہو جائے جو ایسے مواقع پر ہو جایا کرتا ہے۔ اس لیے پیشگی معذرت خواہی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں جو موجودہ عالمی صورتحال میں علماء کرام کی ذمہ داریوں کے حوالہ سے ہوں گی اور جن میں تین امور کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

1. موجودہ حالات میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے حوالہ سے ضروریات کیا ہیں اور ہم اس سلسلہ میں کیا کر رہے ہیں؟
2. عالمی استعمار کی فکری اور ثقافتی یلغار کے علمی و فکری پہلوؤں اور مغالطوں کی نشاندہی اور انہیں بے نقاب کرنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟
3. مغرب کے ذرائع ابلاغ جس طرح اسلام کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کر رہے ہیں اس کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟

دعوت اسلام

جہاں تک دعوت اسلام کا تعلق ہے، اسلام عالمگیر مذہب ہے اور دعوت کا مذہب ہے۔ اس لیے دنیا کے ہر شخص تک اسلام کی دعوت پہنچانا اور پوری نسل انسانی کو اسلام کی تعلیمات سے متعارف کرا کے اسے اسلام کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرنا ملت اسلامیہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے جس میں سب سے اہم کردار علماء کرام کا بنتا ہے۔ جبکہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحات کے بعد دنیا کے حالات میں عالمگیر تبدیلی کے ماحول میں دعوت اسلام کی اس ذمہ داری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس کے دو پہلوؤں پر بطور خاص نظر رکھنی چاہیے۔

ایک یہ کہ گیارہ ستمبر کے بعد مغربی ممالک کے کتب خانوں میں اسلام اور قرآن کریم کے بارے میں موجود کتابیں بعض اخباری اطلاعات کے مطابق ہاتھوں ہاتھ بک گئی ہیں اور ان کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں جاننے

اور باخبر ہونے کی خواہش بڑھ رہی ہے اور اسلام کو سمجھنے کے خواہاں لوگوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ ہمیں اس مانگ اور طلب کو محسوس کرنا چاہیے اور اسے پورا کرنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے ورنہ مارکیٹ کی مانگ تو پوری ہو جایا کرتی ہے لیکن جو لوگ اس خلا کو پر کریں گے ان کے بارے میں آپ ہی کو شکایت ہوگی کہ یہ اسلام کے نام پر کیا پیش کیا جا رہا ہے؟

دوسرا پہلو یہ کہ اس وقت مغربی ممالک میں صورتحال یہ ہے کہ اسلام کی بات اگر سلیقے اور دانش مندی سے کی جائے تو نفع اٹھانے والے اور اس پر غور کرنے والے موجود ہیں۔ اور ابھی اس بات کی گنجائش دکھائی دے رہی ہے کہ آپ حکمت و دانش کے ساتھ اسلام کی بات کریں تو آپ کی بات کو سنا جائے اور اس پر غور بھی کیا جائے۔ لیکن صورتحال میں تبدیلی آ رہی ہے اور مغرب اور اسلام کے درمیان کشمکش اور فاصلے میں جس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر میں نہیں سمجھتا کہ یہ فضا زیادہ دیر تک قائم رہے گی۔ اور شاید دو چار سال کے بعد آپ کو اسلام کی دعوت کے حوالہ سے اپنی بات کہنے اور لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے آج کی طرح کا سازگار ماحول نہ ملے۔ اس لیے میری رائے میں مغرب میں اسلام کی دعوت و تعارف کا یہ چانس خدانخواستہ آخری ہو سکتا ہے اور ہمیں اس کو کسی حال میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کے دینی اور تعلیمی ادارے اس سلسلہ میں زیادہ کردار ادا کر سکتے ہیں اور ان کی ذمہ داری بھی زیادہ بنتی ہے۔ اس کے لیے میری تجویز یہ ہے کہ یہاں کی ضروریات، نفسیات اور ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کی بنیادی تعلیمات کا سادہ سا تعارف اور اس کے ساتھ اسلام کی دعوت کو اس ملک کے ہر فرد تک پہنچانے کے لیے منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ہم اس کام کا سنجیدگی کے ساتھ ارادہ کر لیں اور اس کی صحیح طریقہ سے منصوبہ بندی کر لیں تو اس کے لیے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ درکار ہوگا۔ ہم ایک سال یا زیادہ سے زیادہ دو سال میں یہ کام کر سکتے ہیں اور میں یہاں کے علماء کرام، تعلیمی اداروں اور دینی مراکز سے اس پر سنجیدہ توجہ کی درخواست کر رہا ہوں۔

فکری اور ثقافتی یلغار

دوسرا مسئلہ عالمی استعمار کی فکری اور ثقافتی یلغار میں اس کی پیدہ کردہ نظریاتی و فکری گمراہیوں اور مغالطوں کا ہے جن کی نشاندہی علماء کرام کی ذمہ داری ہے لیکن ہمیں سرے

سے اس کا ادراک ہی نہیں ہے۔ ہم صرف یہ واویلا کرنے اور شور کرنے پر قناعت کیے ہوئے ہیں کہ مغرب ہماری ثقافت کو برباد کر رہا ہے اور ہمارے دین و عقیدہ کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے، لیکن عملی طور پر کیا ہو رہا ہے اور وہ کون سے مسائل ہیں جو گمراہی کا عنوان ہیں، ان کی طرف سرے سے توجہ نہیں ہے۔ ہم صرف مغرب کی ثقافتی یلغار کا شور مچا کر خوش ہیں کہ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں جو میرے نزدیک انتہائی سادہ لوحی کی بات ہے۔

دو عملی مسائل کے حوالہ سے اپنی بات واضح کرنا چاہوں گا۔ ایک تو گلوبلائزیشن کا مسئلہ ہے جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا موضوع ہے اور دنیا کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ نسل انسانی اور انسانی معاشرہ قومیت اور علاقائیت کے دائروں سے نکل کر اور زبان و نسل کے فرق سے بالاتر ہو کر عالمگیریت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک مشترک عالمی معاشرہ تشکیل پا رہا ہے۔ جی ایٹ کے نام سے آٹھ سرمایہ دار ملکوں نے اس کی قیادت سنبھال رکھی ہے، وہ عالمگیریت اور بین الاقوامیت کے اس رجحان کو اپنی خواہشات اور پروگرام کے مطابق ڈھال کر پوری دنیا پر اپنی تہذیبی، تجارتی اور سیاسی بالادستی مسلط کرنے کے درپے ہیں، اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو قوت و طاقت کے ساتھ بلڈوز کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بظاہر یہ عالمی معاشرہ قائم کرنے اور انسانوں کو قومیتوں اور علاقائیت کے دائروں سے نکال کر بین الاقوامیت کے وسیع دائرہ میں لانے کا پروگرام ہے لیکن دراصل یہ آٹھ سرمایہ دار اور طاقتور ملکوں کے مشترکہ پروگرام اور قیادت کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کی منصوبہ بندی ہے جسے گلوبلائزیشن کے نام سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

میں اس حوالہ سے دو پہلوؤں کا بطور خاص تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ یہ بات سراسر گمراہی اور مغالطہ آفرینی ہے کہ گلوبلائزیشن کا آغاز اب ہو رہا ہے اور جی ایٹ میں شامل ممالک دنیا کو اس سے متعارف کرا رہے ہیں۔ اس لیے کہ عالمگیریت اور گلوبلائزیشن کا آغاز اس زمین پر اسی وقت ہو گیا تھا جب جناب نبی اکرم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری نسل انسانی کے لیے بطور نبی مبعوث ہونے کا اعلان فرمایا تھا اور رنگ، نسل، زبان اور قومیت کے تمام دائروں کو توڑتے ہوئے پوری نسل انسانی کو ایک دین، نظام حیات اور فلسفہ زندگی کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ اور یہ صرف نظری بات نہیں تھی بلکہ عملی طور پر خلفاء راشدینؓ کے دور سے ایک ایسی ریاست وجود میں آگئی تھی جس میں عرب، افریقہ اور ایشیا کے علاقے اور اقوام رنگ و نسل کے کسی امتیاز کے بغیر ایک نظام حیات اور ایک ہی

نظام حکومت میں بھائیوں کی طرح شریک تھے۔ اور خلافت کا یہ تسلسل تیرہ صدیوں تک دنیا کے نقشے پر عملاً موجود رہا ہے۔

۱۹۲۴ء میں ختم ہونے والی ترکی کی خلافت عثمانیہ کو دیکھ لیجیے، اس کی تمام تر کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود اس میں آخر دم تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اور اقوام شامل رہی ہیں جو ایک ہی نظام حیات کے علمبردار تھے اور ایک ہی ریاستی سسٹم کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے۔ مغرب نے سازشوں کے ذریعے اس کا خاتمہ کیا اور اب ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک دنیا کے نقشے پر موجود رہنے والی عالمگیریت کی نفی کر کے دنیا کو عالمگیریت کے آغاز کی نوید دی جا رہی ہے جو سراسر دھوکہ اور فراڈ ہے۔ کیونکہ عالمگیریت اور گلوبلائزیشن تو پہلے سے موجود ہے اور چودہ سو سال سے عملاً چلتی آ رہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اسلام کی عالمگیریت کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر تھی اور آج مغرب کی طرف سے مسلط کی جانے والی عالمگیریت کی بنیاد انسانی خواہشات پر ہے کہ سوسائٹی کی اکثریت جو چاہے وہی قانون ہے اور وہی حلال و حرام کی بنیاد ہے۔ انسانی سوسائٹی کی اکثریت جسے چاہے جائز قرار دے اور جسے چاہے ناجائز قرار دے ڈالے، اس میں انسانی خواہشات کے سوا اور کسی بات کا دخل نہیں ہے اور نہ ہی وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کا اس سے کوئی تعلق ہے۔

بلکہ یہاں تو بات اس سے بھی مختلف ہے اور جی ایٹ کی قیادت میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے فورم سے جو عالمگیریت دنیا پر زبردستی مسلط کی جا رہی ہے اس کی بنیاد نسل انسانی کی اجتماعی خواہشات پر بھی نہیں بلکہ صرف آٹھ ممالک کی بالادستی پر ہے اور غریب ممالک و اقوام پر سرمایہ دار اور طاقتور ملکوں کی اجارہ داری قائم کرنے پر ہے، مگر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسے گلوبلائزیشن اور عالمگیریت قرار دے کر مسلسل فروغ دیا جا رہا ہے۔

نوٹ: یہ مضمون کا پہلا حصہ ہے، دوسرا حصہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ۔ ۷ نومبر ۲۰۰۱ء)

نائن الیون کا سانحہ اور مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل

(مانچسٹر، برطانیہ - ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

(نائن الیون کے سانحہ کے بعد مانچسٹر برطانیہ میں ایک اجتماع سے خطاب۔

(مطبوعہ روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ مسلم ممالک میں سب سے پہلے ترکی نے سیکولر فلسفہ کو دستوری طور پر قبول کیا تھا اور وہی سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اس پر ابھی تک قائم بھی ہے، حتی کہ ترکی کا دستور صراحت کے ساتھ قرآن و سنت کی راہنمائی کو مسترد کرتا ہے، لیکن ترکی کے عام مسلمان نے آج تک اس لامذہبی فلسفہ کو قبول نہیں کیا اور عام ترکی مسلمانوں کو جب بھی موقع ملتا ہے، وہ قرآن و سنت کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ کا کھلم کھلا اظہار کر دیتے ہیں۔ یہ بات مغرب کے حکمرانوں کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے اور وہ مسلم ممالک کے دینی حلقوں کو مذہب کے ساتھ عام مسلمانوں کی اس بے لچک وابستگی کا بڑا سبب سمجھتے ہوئے انہیں بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دے کر ان سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

مذہب اور لامذہبیت کے درمیان کشمکش

اس لیے یہ کشمکش ایک مذہب کی دوسرے مذہب کے خلاف نہیں بلکہ لامذہبیت کی جنگ مذہب کے خلاف ہے۔ ہمیں اس فرق کو سمجھنا چاہیے اور اس کے مطابق اپنی حکمت عملی اور ترجیحات کا تعین کرنا چاہیے۔ یہ بات اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسانی معاشرہ کے لیے مذہب کے اجتماعی احکام و قوانین کے حوالے سے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے اور تورات، انجیل اور قرآن کریم کی تعلیمات میں اس حد تک یکسانیت آج بھی موجود ہے کہ انہیں یکجا کیا جائے تو احکام و قوانین کا مشترکہ ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خود مسیحی دنیا کے بعض مذہبی رہنما یہی بات کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے سانحات کے بعد امریکہ کے معروف مذہبی راہنما فادر جیری فال ویل نے کرسچین ٹی وی پر اپنی نشری تقریر میں جو کچھ کہا ہے، وہ میری ان گزارشات کی تائید کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے امریکی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات عذاب الٰہی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا آغاز ہے جس کے ذریعے ہم خوف کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے ہیں اور ہم اس عذاب کے مستحق تھے۔ جیری فال ویل کا کہنا ہے کہ اس عذاب کا باعث وہ عناصر ہیں جنہوں نے سیکولرازم کی راہ ہموار کی ہے، حقوق نسواں کے نام پر معاشرہ میں بدکاری پھیلائی ہے، ہم جنسی کی حمایت کر

کے اللہ تعالی کے غضب کو دعوت دی ہے، اور اسقاط حمل کو فروغ دے کر خدا کے غصے کو بھڑکایا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بھی جیری فال ویل کے اس تبصرہ کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کیونکہ یہ عذاب صرف امریکیوں پر نازل نہیں ہوا بلکہ اس کے ساتھ پورا عالم اسلام بھی عذاب کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں عذاب الہی کے اسباب اسی نوعیت کے ہیں اور ہم پر نازل ہونے والے یہ مصائب خود ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ ہماری بداعمالیاں اور قرآن وسنت کی اجتماعی تعلیمات سے انحراف باطنی اور روحانی طور پر ہماری موجودہ تکالیف اور مصائب کا سبب ہیں۔ جبکہ ظاہری اسباب کے حوالے سے دیکھا جائے تو بھی اس وقت ملت اسلامیہ کو جو مسائل و مشکلات درپیش ہیں، ان کے پیچھے خود ہماری کوتاہیاں اور بداعمالیاں تجزیہ و تحلیل کی اسکرین پر صاف طور پر جھلکتی دکھائی دے رہی ہیں۔

اس لیے برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان علماء اور دانشوروں سے میری گزارش ہے کہ وہ موجودہ کشمکش کی اصل نوعیت کا ادراک کرتے ہوئے یہودی اور مسیحی امتوں کے ان عناصر کو تلاش کریں اور ان سے روابط استوار کریں جو فادر جیری فال ویل جیسے خیالات رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے فطری حلیف ہیں اور یقیناً ہر جگہ موجود ہیں، لیکن ہمارا ان سے رابطہ نہیں ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی محنت کریں، عقل و دانش سے کام لیں اور حوصلہ و تدبر کا ثبوت دیں تو علمی و فکری طور پر ایک مضبوط محاذ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

مصائب و تکالیف اور اسوۂ حسنہ

دوسری گزارش یہ ہے کہ ہمیں مصائب و تکالیف اور آزمائش کے دور میں بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ اور اسوہ حسنہ سے رہنمائی حاصل کرنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ایسے حالات میں رسالت مآبؐ کی سنت میں ہمارے لیے کیا سبق ہے؟ اس سلسلے میں سیرت نبوی کے دو واقعات پیش کرنا چاہوں گا جو اس قسم کے حالات میں ہمارے لیے سبق اور اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں:

- ایک واقعہ ہجرت کا ہے جب نبی اکرمؐ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ ساتھ تھے، ظاہری کیفیت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ سے رات کو چھپ کر نکلے ہیں، تلاش میں گھومنے والے گروہوں سے

بچنے کے لیے تین دن تک غار ثور میں چھپے رہے ہیں، عام راستہ چھوڑ کر سمندر کے کنارے انجان اور غیر معروف راستے سے سفر کر رہے ہیں، راستے میں کوئی ملتا ہے تو حضرت ابوبکرؓ پورا تعارف کرانے کی بجائے گول مول بات کہہ رہے ہیں، اور اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اور ہدف یہی رہ گیا ہے کہ کسی طرح تلاش میں پھرنے والے کافر گروہوں اور ٹولیوں سے بچ بچا کر یثرب پہنچ جائیں۔ لیکن اسی کیفیت میں جب سراقہ بن مالک ملے، انہوں نے جناب نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پکڑنا چاہا تو آپؐ ان سے فرما رہے ہیں کہ اے سراقہ، میں تمھارے ہاتھوں میں کسریٰ بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔

ظاہری کیفیت دیکھیے کہ اپنی جان کی حفاظت مسئلہ بنا ہوا ہے، لیکن نظر کہاں پر ہے؟ اس وقت کی ایک سپر پاور فارس کے بادشاہ کے سونے کے کنگنوں پر، کہ اس بادشاہ کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوگی اور اس کے خزانوں کے ساتھ اس کے ہاتھ کے کنگن بھی مسلمانوں کے قبضے میں آئیں گے۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے جو پورا ہوا اور امیر المومنین حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں فارس فتح ہونے پر وہ کنگن مال غنیمت میں آئے جو اس پیشین گوئی کو پورا کرنے کے لیے سراقہ بن مالک کو تھوڑی دیر کے لیے پہنائے گئے۔ لیکن معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ہمارے لیے سبق بھی ہے اور جناب نبی اکرمؐ کا اسوہ و سنت ہے کہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنا حوصلہ قائم رکھیں، مورال برقرار رہے اور اصل ٹارگٹ نظر سے اوجھل نہ ہو۔

- دوسرا واقعہ غزوہ احزاب کا ہے جب تمام عرب قبائل نے قریش کی قیادت میں متحدہ محاذ بنا کر مدینہ منورہ پر چاروں طرف سے یلغار کر دی تھی اور مسلمانوں کو روایتی طریق جنگ ترک کر کے اپنے دفاع کے لیے مدینہ منورہ کے گرد خندق کھودنا پڑی تھی۔ قرآن کریم نے اس وقت مسلمانوں کی ظاہری کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ ”جب تم پر لشکر چڑھ دوڑے تھے، جب تمھاری آنکھیں خوف کے مارے پتھرا گئی تھیں، جب تمہارے دل خوف کی شدت سے سینوں سے اچھل کر حلق میں پھنس گئے تھے، جب تم اللہ تعالیٰ کی مدد کے بارے میں گمانوں کا شکار ہونے لگے تھے، جب مسلمان آزمائش میں

ڈال دیے گئے تھے اور جب وہ شدید زلزلے کی کیفیت سے دوچار ہو گئے تھے۔“

یہ وہ منظر کشی ہے جو غزوۂ احزاب کے موقع پر مدینہ منورہ میں مسلمانوں پر طاری خوف کی کیفیت کے حوالے سے خود قرآن کریم نے سورۃ الاحزاب میں کی ہے۔ جبکہ احادیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ کفار کے لشکر کے پہنچنے سے پہلے پہلے خندق مکمل کر لینے کا ہدف ذہنوں پر اس حد تک غالب آگیا تھا کہ خندق کھودنے میں مصروفیت کے باعث صحابہ کرامؓ اور خود جناب نبی اکرمؐ کی عصر کی نماز قضا ہوتے ہوتے بچی۔ اس کیفیت میں جب آنحضرتؐ نے ایک چٹان پر کدال کی ضرب لگائی تو چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے ساتھ ایک روشنی چمکی اور آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اس چمک میں قیصر و کسریٰ کے محلات دکھائی دیے ہیں۔ قیصر اور کسریٰ اس وقت کی دونوں بڑی اور عالمی قوتوں کے حکمرانوں کے لقب ہیں اور جناب نبی اکرمؐ سے اس خوف و ہراس کی شدت کی کیفیت میں بھی صحابہ کرامؓ کو قیصر و کسریٰ کے محلات کی خوشخبری دلوائی جا رہی ہے۔ یہ معجزہ بھی پورا ہوا اور اس کے ساتھ سبق بھی ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی حوصلہ قائم رکھنا، مورال کو بلند رکھنا اور اپنے اصل ٹارگٹ کو نظر میں رکھنا سنت نبوی اور اسوۂ رسول ہے۔

اس لیے میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مصائب و آلام اور مشکلات و تکالیف کی انتہائی شدت اور سنگینی کے اس دور میں ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ حوصلے قائم رکھیں، حالات کی ناہمواری کے سامنے سپر انداز نہ ہوں، مشکلات سے گھبرانے اور ان کے سامنے بے بسی کا اظہار کرنے کی بجائے ان کا سامنا کریں، اپنی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کا ادراک کریں، توبہ و استغفار کا اہتمام کریں، قرآن و سنت کے ساتھ تعلق کو مضبوط کریں اور پورے حوصلہ و استقامت کے ساتھ حالات کی بہتری کی سمت سفر جاری رکھیں، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ دعاؤں کا اہتمام کریں کہ فیصلے وہیں ہوتے ہیں اور ساری طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ وہی ہے۔

اسلامی تحریکات کی ذمہ داری

تیسری گزارش ان حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں ہے جن کا اصل تعلق تو مسلمان حکمرانوں سے ہے مگر موجودہ صورتحال میں ان سے کسی کردار کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہے۔ اس لیے اسلامی تحریکات سے یہ گزارش کرنا ضروری ہے کہ وہ اس وقت جنگ کا سب سے بڑا ہدف ہیں اور مغرب کی یلغار کا سب سے بڑا ٹارگٹ ہیں، انہیں آپس میں رابطہ و مشاورت اور مفاہمت و مشارکت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ وہ مل کر ہی اس بحران سے نکل سکتے ہیں اور عالمی متحدہ طاقتوں کے حربوں کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی علماء کرام اور اصحاب فہم و دانش کی بھی ذمہ داری ہے کہ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے علمی و فکری تقاضوں کا ادراک کریں اور مسلمان عوام کی رہنمائی کریں۔ غیر ضروری مسائل میں اس وقت عوام کو الجھانا انتہائی غیر ذمہ داری کی بات ہوگی، اس لیے علماء اور دانشور اپنی ترجیحات کا از سرنو جائزہ لیں اور علم و دانش کے محاذ پر پوری سنجیدگی، تدبر، جرات اور حوصلہ کے ساتھ امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھیں۔

مغرب میں مقیم مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل

چوتھی گزارش ان مسلمانوں سے ہے جو برطانیہ میں اور مغرب کے دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان اکثر یہ دریافت کرتے ہیں کہ ایسے حالات میں جبکہ پورا عالم اسلام حالت جنگ میں ہے، ان کی شرعی ذمہ داری کیا ہے اور وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے فریضے سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ یہ بہت حساس اور نازک مسئلہ ہے اور اس کے ہر پہلو پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہوں گا کہ اسلامی تاریخ میں جنگ بدر سے زیادہ نازک معرکہ کبھی نہیں ہوا جس میں ایک طرف خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کی کمان کر رہے ہیں اور دوسری طرف آپؐ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل قریش کے لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ اسلامی لشکر کی حالت یہ تھی کہ چھوٹے بڑے سب ملا کر ۳۱۳ بنتے تھے، اور حالات کی نزاکت کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ جناب نبی اکرمؐ رات کو سجدے میں سر رکھ کر آنسو بہاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان الفاظ میں التجا فرما رہے ہیں کہ یا اللہ! یہ چند افراد میری زندگی بھر کی کمائی ہے، اگر یہ لٹ گئے تو قیامت تک اس زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اس وقت نبی کریمؐ کو ایک ایک شخص کی ضرورت تھی، لیکن صحابہ کرامؓ میں سے چار بزرگ ایسے ہیں جو موجود اور تندرست ہوتے ہوئے بھی بدر کی لڑائی میں شریک نہیں ہوئے، اور سب کے شریک نہ ہونے کی وجوہ مختلف تھیں:

• ان میں سے حضرت عثمانؓ کو تو خود جناب نبی اکرمؐ نے جنگ میں شرکت سے روک دیا۔ ان کی اہلیہ اور جناب نبی اکرمؐ کی بیٹی حضرت رقیہ بیمار تھیں اور گھر میں اکیلی تھیں۔ ان کی تیمارداری کرنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ خود اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں، اس لیے حضرت عثمانؓ کی خواہش کے باوجود آنحضرتؐ نے انہیں غزوۂ بدر میں شرکت سے حکماً روک دیا اور وہ مدینہ منورہ میں موجود ہوتے ہوئے بھی بدر کے معرکے میں شریک نہ ہو سکے۔

• حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور ان کے والد محترم دونوں جناب نبی اکرمؐ کے پاس آرہے تھے کہ راستے میں کافروں نے پکڑ لیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ آپ دونوں ہمارے خلاف جنگ میں حضرت محمدؐ کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ کفار کی قید سے رہا ہو کر دونوں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر آپؐ نے انہیں یہ کہہ کر جنگ میں شرکت سے روک دیا کہ چونکہ آپ دونوں نے کفار کی یہ شرط منظور کر لی تھی، اس لیے آپ ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹا موجود ہوتے ہوئے بھی غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے۔

• حضرت سلمان فارسیؓ جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں اس وقت آئے تھے جب آنحضرتؐ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے ابھی قبا میں مقیم تھے اور مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے۔ اسی دور میں حضرت سلمان فارسیؓ مسلمان ہوئے، لیکن مدینہ منورہ میں موجود ہوتے ہوئے بھی بدر واحد کے معرکوں میں شریک نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک یہودی خاندان کے غلام تھے اور اپنے فیصلوں میں آزادی اور خود مختاری نہیں رکھتے تھے۔ اس کے بعد غزوۂ احزاب سے قبل وہ آزاد ہوئے تو اس غزوہ میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ خندق بھی انہی کے مشورے سے کھودی گئی تھی۔

ان واقعات کے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جہاد فرض ہے، لیکن اسلام نے لوگوں کی مجبوریوں، احوال وظروف اور ضروریات کے مختلف دائرؤں کا لحاظ رکھا ہے اور انہیں اپنے اپنے درجے میں تسلیم کیا ہے۔ اس لیے میں یہ گزارش کروں گا کہ غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی جو مجبوریاں ہیں، ان کے جو معاملات ہیں اور جن شرائط وقیود کے ساتھ وہ ان ممالک میں رہ رہے ہیں، ان کو ملحوظ رکھنا بھی شریعت کا تقاضا ہے۔ اس بنیاد پر میری استدعا ہے کہ مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان اپنے اپنے ملک کے قانون اور دستور سے بغاوت کا راستہ اختیار نہ کریں اور قانون شکنی سے ہر صورت میں گریز کریں، البتہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کی حمایت اور امداد کے لیے جو کچھ کرسکتے ہیں، اس سے گریز نہ کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کا اصل محاذ میڈیا کا محاذ ہے اور مظلوم اور بے گھر لوگوں کی مالی معاونت کا محاذ ہے۔ اس محاذ پر یہاں کام کو منظم کرنے کی ضرورت ہے اور آپ لوگوں کے کرنے کا اصل کام یہ ہے۔ اسلام کے بارے میں، مسلمانوں کے بارے میں اور دینی تحریکات کے بارے میں یہاں کا میڈیا جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کا جواب دینا اور اسلام اور مسلمانوں کی پوزیشن کو واضح کرنا بہت بڑی دینی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی ادارے اور لابیاں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو کارروائیاں کر رہی ہیں، ان کی نشاندہی کرنا اور ان کا تعاقب کرنا دین کا بہت بڑا تقاضا ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں مظلوم مسلمان اپنی آزادی اور دینی تشخص کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں، ان کو سیاسی اور اخلاقی سپورٹ مہیا کرنا ہماری شرعی ذمہ داری ہے اور جنگوں میں بے گھر ہونے والے لاکھوں مسلمان خاندانوں کی مالی مدد کرنا اور انہیں ضروریات زندگی فراہم کرنا اسلام کا اہم حکم ہے۔ اس لیے میری آپ حضرات سے گزارش ہے کہ آپ لوگ ان شعبوں کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کرتے ہوئے انہیں صحیح طور پر اور بروقت ادا کرنے کے لیے محنت کریں۔

اس سلسلے میں مزید کسی تفصیل میں جائے بغیر یہ بات عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے ذہن میں یہ بات ہر وقت رکھیں کہ امریکہ اور برطانیہ میں رہنے والے یہودی ان ملکوں کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے یہودیت اور اسرائیل کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اور جو کچھ کرسکتے ہیں، وہ سب کچھ آپ بھی یہاں رہتے ہوئے اور یہاں کے قوانین کی پابندی کرتے ہوئے اسلام اور مسلم ممالک کے لیے کرسکتے ہیں۔ اگر انہیں اس کا حق

حاصل ہے تو آپ کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔ بس اس معیار اور کسوٹی کو سامنے رکھیے اور اسلام، ملت اسلامیہ اور مسلم ممالک کے لیے ملکی قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے جو کچھ آپ کے بس میں ہو، ضرور کیجیے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فرائض کو پہچاننے اور انہیں صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دستور کو چھیڑنا خطرناک ہوگا

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۴ جولائی ۲۰۰۱ء)

جناب محمد رفیق تارڑ ایوان صدر سے رخصت ہو کر لاہور میں اپنی رہائش گاہ پر آرام کر رہے ہیں اور بعض اخبارات کی رپورٹ کے مطابق ان کا ارادہ اب مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا ہے۔ وہ ملک میں دستور کی آخری علامت کے طور پر باقی رہ گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے فوجی حکام کے تقاضے پر استعفیٰ دینے سے انکار کیا مگر ان کے انکار کے باوجود انہیں پی سی او کے تحت سبکدوش کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کو تحلیل کر دیا گیا اور ان منتخب اداروں کے سربراہوں کو بھی ان کے مناصب سے فارغ کر دیا گیا ہے جس کے بعد اب اس ملک میں دستور کی کوئی رسمی علامت بھی موجود نہیں رہی جو جنرل پرویز مشرف کے چیف ایگزیکٹو بننے سے قبل تک نافذ العمل تھا۔ اور اب ملک کا سارا نظام پی سی او کے تحت چلایا جا رہا ہے جس کی تمام تر بنیاد چیف ایگزیکٹو کی شخصی وفاداری پر ہے۔

جب جنرل ضیاء الحق مرحوم نے چوہدری فضل الٰہی مرحوم کو صدارت سے سبکدوش کر کے صدر مملکت کا منصب سنبھالا تو پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ ان دنوں شیرانوالہ گیٹ لاہور میں قیام پذیر تھے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ جب صدر ضیاء الحق مرحوم کے بطور صدر حلف اٹھانے کی خبر ملی، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ تشریف فرما تھے، اس موقع پر کچھ اخبار نویس آ گئے، انہوں نے مفتی صاحبؒ سے ردعمل معلوم کرنا چاہا تو مفتی صاحب نے کہا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے اور مزید کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ اخبار نویس چلے گئے تو حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے مفتی صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟ مفتی صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت آپ کا کیا خیال

ہے؟ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے فرمایا کہ یہ معمولی بات تو نہیں ہے بہت بڑی بات ہے اور ’’ایہہ ہتھاں دیاں دتیاں نے، دنداں نال کھولنیاں وی اوکھیاں ہوجان گیاں‘‘۔ یعنی یہ ہاتھوں سے دی ہوئی گانٹھیں دانتوں کے ساتھ کھولنی بھی مشکل ہوجائیں گی۔ اس پر حضرت مولانا مفتی محمودؒ کچھ متفکر ہوئے مگر فرمایا کہ اب تو میں نے جو کچھ کہا ہے کہہ چکا ہوں۔

بالکل اسی طرح کی کیفیت اب میری ہو رہی ہے کہ دستور کے حوالے سے پریشانی اور اضطراب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۳ء کا دستور ملک کے چاروں صوبوں کے ساتھ ساتھ تمام سیاسی و دینی حلقوں کا متفقہ دستور ہے جو قومی وحدت کی واحد علامت ہے۔ اس وقت ملک میں علاقائی، فرقہ وارانہ اور لسانی حوالوں سے جو تفریقیں دن بدن وسیع ہوتی جا رہی ہیں اور جو نئے نئے دستور مسائل اور تقاضے سامنے آرہے ہیں انہیں اگر ۱۹۷۳ء کے دستور کے دائرے سے ہٹ کر چھیڑنے کی کوشش کی گئی اور اس دستوری ڈھانچے کو کراس کر کے ان مسائل کا حل نکالنے کا اختیار کیا گیا تو ملک شدید دستوری بحران سے دوچار ہوسکتا ہے اور عالمی سطح پر جو لابیاں اور ادارے اس سلسلہ میں متحرک دکھائی دیتے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خطرہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا کوئی دستوری بحران پیدا کرنے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کی قومی وحدت کو نقصان پہنچانے کے لیے بین الاقوامی عوامل و محرکات بھی پس پردہ سرگرم عمل ہوگئے ہیں اس لیے ملک کے سیاسی حلقوں کو یہ مسئلہ سرسری انداز میں نہیں لینا چاہیے اور اس صورتحال کے تمام تر مضمرات اور خدشات کو سامنے رکھتے ہوئے ’’دستور پاکستان‘‘ کے ہر حال میں تحفظ اور اس کی جلد از جلد بحالی کے لیے ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

دستور کے تحفظ کی بات کرتے ہوئے خدا جانے میرے ذہن میں یہ بات کیوں بار بار آرہی ہے کہ خانہ کعبہ کی موجودہ تعمیر خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کے خلاف ہے مگر اس کے باوجود اسے صرف اس لیے برقرار رکھا گیا تھا کہ اس کے نقشہ میں بار بار ردوبدل سے امت میں خلفشار پیدا ہوگا اور ’’خانہ کعبہ‘‘ حکمرانوں کے درمیان بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کا ابراہیمی نقشہ یہ تھا کہ اس کی کرسی (دروازہ) زمین کے برابر تھی دو دروازے آمنے سامنے تھے اور حطیم کا حصہ چھت کے تحت بیت اللہ میں شامل تھا جناب نبی اکرمؐ کی بعثت سے قبل مشرکین مکہ نے

اسے دوبارہ تعمیر کیا تو ایک دروازہ بند کر دیا، کرسی اونچی کر دی اور حطیم کا حصہ چھت سے باہر نکال دیا، جناب نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر اس خواہش کا اظہار کیا کہ خانہ کعبہ کو دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشہ کے مطابق تعمیر کیا جائے مگر یہ فرمایا کہ قریش جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں وہ اس بات کو محسوس کریں گے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جب یزید کی بیعت سے انکار کر کے حجاز مقدس میں حکومت قائم کر لی تو انہوں نے اپنی خالہ محترمہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جناب نبی اکرمؐ کی یہ بات سن رکھی تھی اس لیے انہوں نے خانہ کعبہ کو گرا کر اسے ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کر دیا مگر جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو شکست دے کر اور انہیں شہید کر کے حجاج بن یوسف نے مکہ مکرمہ کا کنٹرول سنبھالا تو خانہ کعبہ کو پھر سے گرا کر اسے قریش کی طرز پر تعمیر کر دیا اس کے بعد بنو امیہ سے جب خلافت بنو عباس میں منتقل ہوئی تو عباسی خلفاء نے خانہ کعبہ کو گرانے اور جناب نبی اکرمؐ کی خواہش کے مطابق اسے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا جس پر اس وقت کے امام اہل سنت حضرت امام مالکؒ نے فتویٰ دیا کہ اب خانہ کعبہ اسی حالت میں رہے گا اور اسے گرا کر پھر سے تعمیر کرنا اب جائز نہیں ہے اس لیے کہ اگر ہر آنے والا حکمران اسی طرح کرتا رہے گا تو خانہ کعبہ بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ چنانچہ حضرت امام مالکؒ کے فتویٰ کے بعد عباسی حکمران اس ارادے پر عمل سے رک گئے اور تب سے خانہ کعبہ اسی طرح چلا آرہا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اصل بات ملی وحدت، ملکی سالمیت اور قومی خودمختاری کی ہے اور یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اگر ۱۹۷۳ء کے دستور کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تو یہ تینوں باتیں خطرات کا شکار ہو جائیں گی، اس لیے ہمارے حکمران اور سیاسی قائدین کو اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور دستوری ڈھانچے کے تحفظ اور بحالی کے لیے کسی مصلحت، دباؤ یا مفاد کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔

دینی نصاب تعلیم اور بین الاقوامی دباؤ

(ہفت روزہ الہلال، اسلام آباد - ۱۱ مئی ۲۰۰۱ء)

مسلمانوں کے دینی نصاب تعلیم کا مسئلہ آج سے نہیں صدیوں سے مغربی اقوام کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ ایک تاریخی روایت ہے کہ برطانیہ کے وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے آج سے

کوئی سو برس قبل برطانوی پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر قرآن کریم کا نسخہ لہراتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب مسلمانوں میں پڑھی جاتی رہے گی اس وقت تک مسلمانوں میں مذہبی جنون (جہاد) باقی رہے گا، اور جب تک مسلمانوں میں مذہبی جنون موجود رہے گا تب تک انہیں غلام رکھنا ممکن نہیں ہے۔

یہ روایت کہاں تک درست ہے، مگر حقائق کے اعتبار سے اس کی واقعیت میں کلام کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ جو مسلمان ایک دفعہ قرآن کریم کے مضامین سے اجمالی طور پر بھی واقف ہو جاتا ہے اسے اسلام سے ہٹانا اور کفر کی کسی بات سے سمجھوتے اور مفاہمت کے لیے تیار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ گزشتہ دنوں ایک محفل میں چند دوست حکومت پاکستان کی طرف سے قائم کیے جانے والے ماڈل دینی مدارس کے بارے میں بات کر رہے تھے اور کچھ خدشات کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ گھبرانے والی بات نہیں کیونکہ سرکاری خرچ سے پڑھایا جائے یا غیر سرکاری خرچ سے اگر یہی قرآن کریم پڑھایا جائے گا تو عقیدہ و فکر کے اعتبار سے نتیجہ کچھ مختلف نہیں ہوگا اور قرآن کریم اپنے پڑھنے والوں کے دماغوں پر یکساں اثرات قائم کرے گا۔

تحریک آزادی کے ممتاز رہنما مولانا محمد علی قصوریؒ کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سربراہ تھے انہی دنوں یوپی (اترپردیش) کے انگریز گورنر سر جان ہیرٹ نے انہیں بلا کر پیشکش کی کہ اگر ندوہ کے نصاب میں حدیث رسولؐ کو لازمی کی بجائے اختیاری مضمون قرار دے دیا جائے اور قرآن کریم کی تعلیم کے نصاب سے سورہ انفال، سورہ توبہ، سورہ ممتحنہ اور سورہ صف کو نکال دیا جائے تو انگریزی حکومت ندوۃ العلماء لکھنؤ کو ایک لاکھ روپے سالانہ گرانٹ دینے کے لیے تیار ہے۔ مگر مولانا شبلی نعمانیؒ نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا شبلی نعمانیؒ کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا اور یہ اس سے پہلے کا قصہ ہے۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ اس وقت کے ایک لاکھ روپے آج کے حساب سے کتنی رقم بنتی ہوگی اور انگریز حکمران ان معاملات میں کس قدر حساس اور سنجیدہ تھے۔ انگریز حکمرانوں کے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ ”درس نظامی“ کے جس نصاب و نظام کو انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد یکسر ختم کر دیا تھا اور اس نظام کو چلانے والے ہزاروں مدارس بند کر کے ان کی جائیدادیں اور بلڈنگیں ضبط کر لی تھیں، وہ چند درویش صفت علماء کی مخلصانہ جدوجہد کی بدولت ایک متوازی نظام کی

صورت میں نہ صرف قائم رہا بلکہ دن بدن ترقی کرتے ہوئے دنیا کی تمام استعماری قوتوں کے لیے ایک علمی اور فکری چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا۔

دوسری طرف سر سید احمد خان مرحوم نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی بنیاد پر جس جدید نظام تعلیم کی بنیاد رکھی تھی اور فکری آزادی کے نام پر قرآن و سنت کی نت نئی تعبیرات و تشریحات کا جو بیڑا اٹھایا تھا وہ عام مسلمانوں کو ہضم نہ ہوا اور جدید تعلیم کا نظام راسخ العقیدہ اور دیندار مسلمانوں کے تعاون کے بغیر آگے بڑھتا نظر نہ آیا۔ اس لیے وہاں بھی مذہبی معاملات کی باگ ڈور ہر دور میں علماء ہی کے ہاتھ میں دینا پڑی جس کی وجہ سے علی گڑھ کا نظام تعلیم جدید تعلیم کا مرکز تو بن گیا مگر اسلام کی جدید تعبیر و تشریح کا فلسفہ اس نظام میں ایڈجسٹ نہ ہو سکا۔ اس طرح اس جدید نظام تعلیم میں بھی دین اسلام کی جو تھوڑی بہت تعلیم شامل کی گئی وہ سر سید احمد خانؒ کے فلسفے کے بجائے علماء کرام اور امت کے اجماعی عقیدہ و تعامل کے مطابق تھی اور اس کو پڑھانے اور چلانے کے لیے بھی علماء کے روایتی طبقہ سے افراد کار فراہم کیے گئے۔ چنانچہ علی گڑھ محمڈن کالج میں، جو بعد میں یونیورسٹی کہلایا، شعبہ دینیات کے پہلے سربراہ حضرت مولانا عبد اللہ انصاریؒ تھے جو دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داماد اور اپنے وقت کے بڑے عالم دین تھے۔ انہی مولانا عبد اللہ انصاریؒ کے بیٹے مولانا منصور انصاریؒ تحریک آزادی میں امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے دست راست تھے۔ مولانا منصور انصاریؒ کے فرزند مولانا حامد انصاری معروف کتاب "اسلام کا نظام حکومت" کے مصنف ہیں اور ان کے بیٹے ڈاکٹر عابد اللہ غازی آج کل شکاگو امریکہ میں اسلامی تعلیمات کے ایک بڑے پراجیکٹ کے نگران ہیں۔ علی گڑھ اور اس کی طرز پر چلنے والے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اگرچہ دینی تعلیم کا مواد بہت کم چلا آرہا ہے مگر جتنا بھی ہے اس کی بنیاد جدید فکر و فلسفہ کی بجائے قدیم روایت پر ہے جو پاکستان کے قیام کے بعد بھی بدستور قائم ہے اور اس میں دینی حلقوں کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے کچھ اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہو سکی۔

یہ بات آج کے عالمی تعلیمی حلقوں کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے کیونکہ قرآن کریم، حدیث رسولؐ اور فقہ اسلامی کا خواہ کتنا تھوڑا حصہ ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کا مواد قدیمی ہے اور طرز روایتی ہے تو اس کے اثر انداز ہونے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اور اس کی تعلیم و تدریس کے مرحلہ سے گزرنے والا مسلمان عملی لحاظ سے خواہ کتنا ہی بیکار

ہو مگر قرآن و سنت اور دین کی بنیادوں کے ساتھ کمٹمنٹ کے اعتبار سے وہ یقیناً بے لچک ثابت ہوگا۔ اسی وجہ سے اقوام متحدہ کے تعلیمی اداروں اور دیگر بین الاقوامی تعلیمی حلقوں کی طرف سے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے تعاون سے پاکستان پر دباؤ بڑھایا جارہا ہے کہ وہ سرکاری نصاب تعلیم کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنائے۔ جس سے ان مطلب یہ ہے کہ دینیات کا وہ حصہ جسے بین الاقوامی حلقے بنیاد پرستی میں اضافے کا باعث سمجھتے ہیں اور جس میں جہاد کے احکام کے علاوہ خاندانی نظام اور نکاح و طلاق و وراثت کے احکام بھی شامل ہیں، اسے نصاب سے نکال دیا جائے۔

گزشتہ دنوں قرآنی تعلیم کے مواد سے سورہ توبہ اور سورہ انفال کو طلبہ اور طالبات کے لیے مشکل قرار دیتے ہوئے نصاب سے خارج کرنے کی جو آواز اٹھی تھی وہ اسی پس منظر میں تھی اور اسی تقاضے کی صدائے بازگشت تھی جو ایک صدی قبل یوپی کے انگریز گورنر نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سربراہ مولانا شبلی نعمانیؒ سے کیا تھا۔ لیکن یہ تقاضہ جب خالص غلامی کے دور میں قابل قبول نہیں تھا تو آج بظاہر آزادی کے دور میں کس طرح قبولیت حاصل کر سکتا ہے؟ مگر سیکولر حلقوں کی چابکدستی کی داد دیجیے کہ جو بات وہ سیدھے راستے سے منوانے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے اس کے لیے انہوں نے بالواسطہ طریقہ اختیار کیا ہے اور وہ جنرل پرویز مشرف کی کابینہ سے یہ فیصلہ کرانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ نصابی کتابوں کی تیاری اور طباعت کی ذمہ داری سرانجام دینے والے ٹیکسٹ بک بورڈز غیر مؤثر کر دیے گئے ہیں اور اب یہ کام بین الاقوامی اداروں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ یعنی ان تقاضوں اور مطالبات کو حکومت پاکستان سے براہ راست منوانے میں کامیابی کے امکانات واضح نہ دیکھتے ہوئے بین الاقوامی اداروں نے یہ سارا کام ہی اپنے ہاتھ میں لینے کا راستہ صاف کر لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملک کے دینی حلقے اور محب وطن تعلیمی ادارے اس صورتحال کا کس طرح سامنا کرتے ہیں اور بین الاقوامی سیکولر حلقوں کے اس ''کامیاب وار'' کے توڑ کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں؟

معزامجد اور ڈاکٹر محمد فاروق کے جواب میں

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ مئی ۲۰۰۱ء)

محترم جاوید احمد غامدی کے بعض ارشادات کے حوالے سے جو گفتگو کچھ عرصے سے چل رہی ہے اس کے ضمن میں ان کے دو شاگردوں جناب معزامجد اور ڈاکٹر محمد فاروق خان نے ماہنامہ اشراق لاہور کے مئی ۲۰۰۱ء کے شمارے میں کچھ مزید خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

معزامجد صاحب نے حسب سابق (۱) کسی مسلم ریاست پر کافروں کے تسلط کے خلاف علماء کے اعلان جہاد کے استحقاق (۲) زکوۃ کے علاوہ کسی اور ٹیکس کی ممانعت (۳) اور علماء کے فتوی کے آزادانہ حق کے بارے میں اپنے موقف کی مزید وضاحت کی ہے۔ جبکہ ڈاکٹر محمد فاروق خان نے (۱) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتوائے جہاد (۲) الجزائر کی جنگ آزادی (۳) اور جہاد افغانستان کے تاریخی تناظر کو اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اسی ترتیب سے ہم ان کے خیالات وارشادات پر تبصرہ کریں گے۔

جناب غامدی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ جہاد کے اعلان کا حق اسلامی ریاست کے سوا کسی کو نہیں ہے جس کے جواب میں ہم نے عرض کیا کہ اگر کسی مسلم علاقہ پر کافروں کا تسلط قائم ہو جائے اور اسلامی ریاست کا وجود ہی ختم ہو جائے تو علماء کرام اور دینی قیادت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کافرانہ تسلط کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مزاحمت کریں اور اسلامی اقتدار بحال کرنے کی کوشش کریں۔ جیسا کہ یمن پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی اسود عنسی نے قبضہ کر لیا تھا اور حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے گوریلا طرز پر شب خون مار کر اسود عنسی کو قتل کر دیا تھا جس سے اس کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گیا۔ اس لیے اب بھی ایسی صورت میں کافروں کے تسلط کا شکار ہونے والے مسلمانوں کے لیے شرعی مسئلہ یہی ہے کہ وہ اس تسلط کو قبول نہ کریں، اس کے خاتمہ کے لیے جو ان کے بس میں ہو کر گزریں اور اس سلسلے میں ان کی جدوجہد کو شرعی جہاد کا درجہ حاصل ہو گا۔

معزامجد صاحب نے ہمارے استدلال کو درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ”یہ واقعہ اس طرح رونما ہوا ہی نہیں جیسا کہ مولانا نے بیان فرمایا ہے“۔ لیکن خود انہوں نے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں اس بات کو من وعن تسلیم کیا گیا ہے

کہ اسود عنسی کو حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے قتل کیا تھا جس سے اس کی حکومت ختم ہو کر مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گئی تھا البتہ اتنے واقعہ کو بعینہ تسلیم کرتے ہوئے معزامجد صاحب نے اس میں دو اضافے فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کو اس کارروائی کا حکم خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد اس مسئلہ پر یمن کے مسلمانوں کا اجتماع ہوا جس میں اسود عنسی کے خلاف کاروائی کے لیے اجتماعی مشاورت ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تفصیل سے ہمارے بیان کردہ واقعہ کی تردید کس طرح ہو گئی جسے موصوف اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ واقعہ اس طرح رونما ہوا ہی نہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ واقعہ تو وہ بھی وہی بیان کر رہے ہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ کارروائی حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے از خود نہیں کی تھی بلکہ جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت اور دوسرے مسلمانوں کے مشورہ سے کی تھی تو اس سے ہمارے موقف کی مزید تائید ہوتی ہے۔ مگر اس کی وضاحت سے قبل اس امر کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فیروز دیلمیؓ کے لیے جناب نبی اکرمؐ کی اس ہدایت کا ہمیں بھی علم تھا لیکن چونکہ وہ روایت جناب غامدی صاحب کے اصولوں کے مطابق ''خبریت'' کے قابل قبول معیار پر پوری نہیں اترتی تھی اس لیے ہم نے اس کا حوالہ نہیں دیا اور نفس واقعہ کا ذکر کر دیا۔ البتہ مسلمانوں کی مشاورت کا واقعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا تھا جس کا معزامجد صاحب نے ذکر کیا ہے، معلومات میں اس اضافے پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ویسے استنباط واستدلال، تعبیر وتشریح اور اصول سازی کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کا یہ فائدہ تو ہوتا ہی ہے کہ جس بات پر جی چاہا اسے قبول کر لیا اور جسے ذہن نے قبول نہ کیا اس سے انکار کر دیا۔ جی نہ چاہا تو رجم کے بارے میں بخاری اور مسلم کی روایات قابل قبول قرار نہ پائیں اور کہیں ''گیئر'' پھنس گیا تو ''اصابہ'' کی روایت کا سہارا لینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوا۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

واقعات کی ان تفصیلات کو تسلیم کرتے ہوئے جو جناب معزامجد صاحب نے بیان کی ہیں ہماری گزارش ہے کہ اس سے ہمارا یہ موقف مزید پختہ ہو گیا ہے کہ کسی مسلم علاقہ پر کافروں کے تسلط کی صورت میں وہاں کے مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اس

تسلط کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کریں اور اس سلسلہ میں جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت یہی ہے جو حافظ ابن حجرؒ کی اصابہ کے حوالہ سے معزامجد صاحب نے نقل کی ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کو اسود عنسی کے خلاف کاروائی کا حکم دیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معزامجد صاحب کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بحیثیت حاکم دیا تھا اور ہمارے نزدیک اس میں ان کی پیغمبرانہ حیثیت بھی شامل ہے۔ اس لیے اب بھی اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مسلم علاقہ پر کافروں کا تسلط ہو جائے تو وہاں کے مسلمانوں کے لیے جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت اور حکم وہی ہے جو یمن کو اسود عنسی کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کو دیا گیا تھا۔

پھر یہ نکتہ بھی یہاں قابل غور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر صوبہ میں بغاوت کو کچلنے کے لیے صرف ریاستی کاروائی کرنا ہوتی تو اس کے لیے فوج کشی مدینہ منورہ سے ہوتی مگر نبی اکرمؐ ریاست کی طرف سے یہ فوج کشی کرنے کی بجائے یمن کی مقامی آبادی کو حکم دے رہے ہیں کہ وہ اسود عنسی کے تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ ''اصابہ'' کی جس روایت کا معزامجد صاحب نے حوالہ دیا ہے اس کے مطابق نبی اکرمؐ نے حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کو اسود عنسیؒ کے خلاف ''محاربہ'' کا حکم دیا ہے۔ اب محاربہ کے معنی و مفہوم کے بارے میں اور کسی کو تردد ہو تو ہو مگر غامدی صاحب کے شاگردوں سے یہ توقع نہیں کی ہو سکتی کہ وہ اس کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہوں گے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ معز امجد صاحب اس واقعہ کو تسلیم کر رہے ہیں اور اس کے پیچھے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وہدایت کا تذکرہ بھی کرتے ہیں لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس واقعہ کو جہاد کی حیثیت دینے میں تامل انہیں ہے جیسا کہ ان کا ارشاد گرامی ہے کہ:

> ''یہ جابر و غاصب قوم کے خلاف گروہ بندی اور جتھابندی کر کے جہاد کرنے کا واقعہ نہیں بلکہ ایک غاصب حکمران کے قتل کا واقعہ ہے۔ گروہ بندی اور جتھابندی کر کے جہاد کرنا اور کسی (اچھے یا برے) حکمران کے قتل کی سازش کرنا دو بالکل الگ معاملات ہیں۔''

واقعہ کی ان تفصیلات کو ایک بار پھر ترتیب وار دیکھ لیں جو خود معزامجد صاحب نے بیان کی ہیں کہ یمن میں اسود عنسی کے تسلط کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے یمن کے لوگوں کو اس کے خلاف محاربہ کا حکم دیا۔ اس حکم کے بعد یمن کے مسلمانوں کا مشاورتی اجتماع ہوا جس میں اسود عنسی کے خلاف کارروائی کے فریقوں کا جائزہ لیا گیا، اس کے بعد حضرت فیروز دیلمیؓ،

حضرت قیس بن مکشوحؓ اور حضرت دادویہؓ نے گروپ بنایا اور اسود عنسی کے حرم میں زبردست شامل کی جانے والی خاتون آزادؓ کے ساتھ ساز باز کر کے اسود عنسی کو قتل کر دیا۔ اور پھر معز امجد صاحب کے حوصلہ کی داد دیجئے کہ اس سب کچھ کے باوجود ان کے نزدیک اس کاروائی کو شرعی جہاد کی حیثیت حاصل نہیں ہے اور وہ اسے ''محض ایک غاصب حکمران کے قتل کی سازش'' ہی تصور کر رہے ہیں۔ اور مزید لطف کی بات یہ ہے کہ واقعہ کی یہ ساری تفصیلات خود بیان کرنے کے بعد معز امجد صاحب اس سے نتیجہ یہ اخذ کر رہے ہیں کہ:

''اس ساری کارروائی کا عملی ظہور اسود عنسی کے اپنے گروہ میں پھوٹ پڑنے اور اس کے اپنے ہی عمال کی طرف سے اس کے قتل کو کامیاب بنانے کی صورت میں ہوا۔''

اس ''ذہنی گورکھ دھندے'' پر اس کے سوا کیا تبصرہ کیا جاسکتا ہے کہ:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

زکوۃ کے علاوہ ٹیکس کا جواز

جاوید احمد غامدی صاحب نے فرمایا تھا کہ اسلام میں زکوۃ کے سوا اور کوئی ٹیکس لگانے کا جواز نہیں ہے۔ ہم نے اس پر عرض کیا کہ زکوۃ کے علاوہ کسی اور ٹیکس کی شرعی ممانعت پر کوئی صریح دلیل موجود نہیں ہے۔ اس پر معز امجد صاحب اور خورشید ندیم صاحب نے قرآن کریم اور سنت نبویؐ سے اپنے موقف کے حق میں کچھ دلائل پیش کیے ہیں اور اپنے استدلال و استنباط کو مستحکم کرنے کے لیے خاصی تگ و دو کی ہے جس پر وہ داد کے مستحق ہیں۔ ان دلائل سے ان کا موقف ثابت ہوا یا نہیں مگر اتنی بات ضرور واضح ہوگئی ہے کہ قرآن و سنت کی راہنمائی کے حوالے سے یہ مسئلہ صراحت اور قطعیت کے دائرہ کا نہیں بلکہ استدلال اور استنباط کی سطح کا ہے۔ ورنہ انہیں اتنی لمبی چوڑی محنت کی ضرورت نہ پڑتی۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں بات استدلال و استنباط کی ہوگی وہاں سب اہل علم کے لیے گنجائش ہوگی کہ وہ استدلال و استنباط کا حق استعمال کریں۔ اور کسی شخص یا گروہ کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنے استدلال و استنباط کے نتیجے کو حتمی اور قطعی قرار دے کر دوسرے کی سرے سے نفی کر دے۔

اس سلسلہ میں بات کو آگے بڑھانے سے پہلے معز امجد صاحب کی ایک ذہنی الجھن کو دور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے گزشتہ مضمون میں عرض کیا تھا کہ فقہاء اسلام

نے ''نوائب'' اور ''ضرائب'' کے عنوان سے ان ٹیکسوں کے احکام بیان فرمائے ہیں جو ایک اسلامی حکومت کی طرف سے زکوۃ کے علاوہ بھی مسلمان رعیت پر عائد کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے معزز امجد صاحب نے لکھا ہے:

''ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی آیات اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے بعد کسی شخص کی بات یہ حیثیت نہیں رکھتی کہ اسے ان آیات و ارشادات سے نکلنے والے حکم پر ترجیح دی جائے۔''

اسی طرح وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

''لوگوں کی آرا کا حوالہ دینے کی بجائے ہمارے استدلال کی غلطی واضح کریں۔''

اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ فقہاء اسلام کی آرا کو قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر ترجیح دینے کا تاثر سراسر مغالطہ نوازی ہے کیونکہ یہ ترجیح آیات و ارشادات پر نہیں بلکہ ان سے بعض لوگوں کے استدلال پر ہے۔ اب ایک طرف انہی آیات و احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ ابن الہمامؒ اور دوسرے فقہاء کرام ''نوائب و ضرائب'' کے عنوان سے اسلامی حکومت کو زکوۃ کے علاوہ بھی ضرورت کے وقت ٹیکس لگانے کی اجازت دے رہے ہیں اور دوسری طرف ان آیات و احادیث سے جناب جاوید احمد غامدی ان ٹیکسوں کے عدم جواز کا استدلال کر رہے ہیں۔ اس بحث میں اگر میرے جیسا کوئی طالب علم یہ کہہ دے کہ علامہ ابن الہمامؒ اور دوسرے فقہاء کا استدلال غامدی صاحب کے استدلال پر فائق ہے تو اسے کسی شخص کی بات کو قرآن و سنت کے ارشاد پر ترجیح دینے سے تعبیر کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اور جناب غامدی کے استدلال و استنباط کو قرآن و سنت کے ارشادات اور ان سے نکلے ہوئے احکام کا درجہ کب سے حاصل ہو گیا ہے؟ پھر ''لوگوں کی آرا'' کی پھبتی بھی خوب رہی۔ حالانکہ ہم نے ''لوگوں کی آرا'' کا حوالہ نہیں دیا بلکہ فقہاء اسلام کے فیصلوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ فقہاء اسلام جن کے فقہ و اجتہاد پر امت کے بڑے حصے کو اعتماد ہے اور جن کے فتاوی کی بنیاد پر صدیوں تک اسلامی عدالتوں میں فیصلے صادر ہوتے رہے ہیں۔

ہمارے ایک بزرگ تھے جن کا انتقال ہو گیا ہے، انہیں اپنے بعض تفردات کے حوالے سے حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کا یہ ارشاد دہرانے کا بڑا شوق تھا اور وہ عام جلسوں میں بڑے ترنم کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ ''ھم رجال و نحن رجال'' (وہ بھی مرد ہیں اور ہم بھی مرد ہیں)۔ اس سے ان کا مطلب و مقصد یہ ہوتا تھا کہ کسی مسئلہ میں امت کے اکابر اہل علم

سے انہیں اختلاف ہے تو وہ اس کا حق رکھتے ہیں کیونکہ وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔ ایک مجلس میں اس کا تذکرہ ہوا تو میں نے عرض کیا کہ یہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے قول کا بہت غلط استعمال ہے اور امام صاحبؒ پر ظلم ہے کیونکہ امام صاحبؒ کا اس قول سے ہرگز یہ مطلب نہیں تھا جو یہ بزرگ بیان کر رہے ہیں۔ امام صاحبؒ کا پورا ارشاد اس طرح ہے کہ:

> ''اگر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد سامنے آجائے تو سر آنکھوں پر۔ اگر وہ نہ ہو اور صحابہ کرامؓ کا کوئی اجماعی فیصلہ مل جائے تو ہم اس سے انحراف نہیں کرتے۔ اور اگر صحابہ کرامؓ کے اقوال کسی مسئلہ میں مختلف ہوں تو ہم انہی میں سے کوئی قول لے لیتے ہیں اور صحابہ کرامؓ کے اقوال کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ البتہ ان کے بعد کے کسی بزرگ کی رائے ہو تو ''ھم رجال ونحن رجال'' وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں''۔

امام ابو حنیفہؒ چونکہ تابعی تھے اور باقی تابعین ان کے معاصرین کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے یہ بات انہوں نے اپنے معاصرین کے بارے میں فرمائی ہے کہ جس طرح انہیں استدلال و استنباط کا حق ہے اسی طرح ہمیں بھی اس کا حق حاصل ہے اور ہمارے درمیان دلائل کے علاوہ اور کسی بات کو ترجیح نہیں ہوگی۔ جبکہ اپنے متقدمین کے بارے میں وہ یہ حق تسلیم کر رہے ہیں کہ ان کی بات صرف اس حوالے سے بھی قابل ترجیح ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ یا کسی صحابیؓ کی رائے ہے خواہ اس کے ساتھ کوئی دلیل ہو یا نہ ہو۔ اس لیے کوئی شخص ''ھم رجال ونحن رجال'' کا نعرہ اپنے معاصرین کے حوالے سے لگاتا ہے تو ہم اس کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں مگر اس نعرہ کی آڑ میں کسی کو ائمہ کرامؒ، فقہاء عظامؒ اور محدثین کرامؒ کی صف میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اس کے بعد استدلال کے حوالے سے بھی ایک بار پر غور کر لیا جائے تو مناسب ہوگا۔ معز امجد صاحب نے مسلم شریف کی روایت پیش کی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

> ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ وہ یہ شرائط پوری کر دیں تو ان کی جانیں اور اموال مجھ سے محفوظ ہو جائیں گے الا یہ کہ وہ ان سے متعلق کسی حق کے تحت اس سے محروم کر دیے جائیں۔ رہا ان کا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے۔''

ہم نے اس سلسلہ میں عرض کیا تھا کہ ”الا بحقھا“ کی جو استثنا ہے وہ زکوۃ کی ادائیگی کے بعد ہے۔ اس لیے زکوۃ کی ادائیگی کے بعد بھی مال میں ایسا حق باقی ہے جو ”عصموا“ کی ضمانت میں شامل نہیں ہے۔ اس پر معز امجد صاحب کو دو اشکال ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اس استثنا کو مان لیا جائے تو جناب نبی اکرمؐ نے جس امان کی ضمانت دی ہے وہ بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اور دوسرا یہ کہ یہ استثنا صرف زکوۃ سے نہیں بلکہ جان کے حوالے سے بھی ہے۔ ہیں اس سے کوئی انکار نہیں کہ ”الا بحقھا“ کی استثنا جان اور مال دونوں کے حوالے سے ہے اور دونوں صورتوں میں یہ استثنا موجود ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھنے، نماز ادا کرنے اور زکوۃ دینے کے باوجود اگر کسی مسلمان کی جان و مال سے کسی حق کے عوض تعرض ضروری ہوا تو ”عصموا منی“ کی ضمانت کے تحت اسے تحفظ حاصل نہیں ہوگا اور اس کی جان و مال سے تعرض روا ہوگا۔ مثلاً جان کے حوالے سے یہ کہ کسی مسلمان نے دوسرے مسلمان کو قتل کر دیا تو قصاص میں اس کا قتل جائز ہوگا۔ کوئی شادی شدہ مسلمان زنا کا مرتکب ہے تو کتاب اللہ کے حکم کے مطابق اسے سنگسار کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی مسلمان (نعوذ باللہ) مرتد ہوگیا ہے تو اسے بھی شرعی قانون کے مطابق توبہ نہ کرنے کی صورت میں قتل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر اس کے مال میں ریاست یا سوسائٹی کا کوئی حق متعلق ہوگیا ہے تو اس سے ضرورت کے مطابق مال لیا جاسکے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر جان کی ضمانت سے استثنا کی صورتیں موجود ہیں تو مال کی حفاظت کی ضمانت سے استثنا کا امکان کیوں تسلیم نہیں کیا جا رہا؟ اور اگر کسی بھی درجہ کی شرعی دلیل سے اس کی ضرورت اور جواز مل جاتا ہے تو اسے ”عصموا منی“ کی ضمانت کے منافی قرار دینے کا آخر کیا جواز ہے؟ اس لیے ان دونوں صورتوں میں تمام تر موجود اور ممکنہ استثناؤں کے باوجود ”عصموا منی“ کی ضمانت بدستور موجود و قائم ہے اور اسے (نعوذ باللہ) بے معنی سمجھنا محض خام خالی ہے۔

اگر معز امجد صاحب کو یاد ہو تو ہمارا پہلا اور اصولی سوال یہ تھا کہ اگر زکوۃ کے علاوہ کسی اور ٹیکس کی ممانعت کی کوئی صریح دلیل موجود ہے تو ہماری راہنمائی کی جائے مگر ان کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس کوئی واضح اور صریح دلیل موجود نہیں ہے اور وہ بھی اپنا موقف استدلال و استنباط کے ذریعے ہی واضح کرنا چاہ رہے ہیں۔ تو ہمیں اس تکلف میں پڑنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے کہ امت کے اجماعی تعامل اور فقہاء امت کے استدلالات

کو محض اس شوق پر دریا برد کر دیں کہ ہمارے ایک محترم دوست جاوید احمد غامدی صاحب نے نئے سرے سے قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد و استنباط کا پرچم بلند کر دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی معزامجد صاحب سے گزارش ہے کہ ہمارے نزدیک ان کے استدلال کی دیگر کئی باتوں کے علاوہ ایک اصولی اور بنیادی غلطی یہ بھی ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد و استنباط میں امت کے اجماعی تعامل اور جمہور اہل علم کے موقف کو بہت سے معاملات میں نظر انداز کر رہے ہیں جس کی ہمارے ہاں کسی درجہ میں بھی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اگر جمہور اہل علم اور امت کے اجماعی تعامل کو کراس کر کے قرآن و سنت سے براہ راست استنباط و استدلال کا دروازہ کھول دیا جائے تو موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں امت مسلمہ میں ہزاروں مکاتب فکر وجود میں آئیں گے جو فکر و استدلال کے محاذ پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوں گے اور وہ دھما چوکڑی مچے گی کہ الامان والحفیظ۔

کچھ عرصہ قبل محترم ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال صاحب نے یہ مہم شروع کر دی تھی کہ قرآن و سنت کی از سر نو تعبیر و تشریح کی جائے اور اجتہاد و استنباط کا حق علماء کی بجائے پارلیمنٹ کو دیا جائے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان فرمائی تھی کہ امت میں اس وقت جو فرقہ بندی ہے اس سے نجات کی صورت اس کے سوا ممکن نہیں ہے۔ ہم نے ایک مضمون میں ان سے گزارش کی تھی کہ ان کا یہ فارمولا تو "بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا" کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ اس وقت امت کا بڑا حصہ اعتقادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہے: اہل سنت اور اہل تشیع۔ جبکہ اہل سنت فقہی طور پر پانچ حصوں میں بٹے ہوئے ہیں: حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور ظاہری۔ یہ سب مل کر زیادہ سے زیادہ آٹھ دس گروہ بنتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں عالمگیریت کا عنصر موجود ہے۔ جبکہ انہیں ختم کر کے مسلم ممالک کی اسمبلیوں کے ذریعے اجتہاد و استنباط کا دروازہ کھولا جائے گا تو دیگر کئی قباحتوں کے علاوہ ایک بڑی قباحت یہ ہو گی کہ مسلم ممالک اور ان کی قومی و صوبائی اسمبلیوں کی تعداد کے حساب سے سینکڑوں نئے فقہی مذاہب وجود میں آجائیں گے جو سب کے سب علاقائی ہوں گے اور ملت اسلامیہ کی رہی سہی وحدت بھی پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔

فتویٰ اور قضا

جناب جاوید غامدی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ فتویٰ کے نظام کو ریاستی نظام کے تابع ہونا چاہیے اور علماء کو آزادانہ فتویٰ کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ فتویٰ کا معنی

ہی کسی عالم دین کی آزادانہ رائے ہے، اسے اگر آزادی سے محروم کر دیا جائے تو وہ سرے سے فتوی ہی نہیں رہتا بلکہ قضا یا حکم کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے جواب میں معزامجد صاحب نے اپنے حالیہ مضمون میں ارشاد فرمایا ہے کہ انہیں صرف اس فتوی پر اعتراض ہے جس میں فتوی کو قضا کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس لیے میرے خیال میں اس سلسلہ میں بحث کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اتنی وضاحت ضروری ہے کہ جہاں اسلامی حکومت قائم ہو اور شرعی قوانین کی عملداری کا نظام موجود ہو وہاں قضا کا متوازی نظام قطعی طور پر غلط اور خروج کے حکم میں ہوگا، لیکن جہاں مسلمانوں پر کافروں کا اقتدار ہو وہاں مسلمانوں کو قابل عمل حدود میں قضا کا داخلی نظام قائم کرنے کا حق حاصل ہے جیسا کہ اندلس کے شہر قرطبہ پر کفار کے تسلط کے بعد علامہ ابن الہمامؒ نے فتوی دیا تھا کہ:

> ”قرطبہ جیسے شہر جہاں کافر والی بن جائیں تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے کسی پر متفق ہو کر اسے والی بنائیں جو ان کے لیے قاضی متعیّن کرے یا خود فیصلے کرے۔“ (فتح القدیر)

اس طرح کا فتوی ”فتاوی عالمگیریہ“ میں بھی موجود ہے اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے جب ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوی دیا تھا تو اس کے ساتھ مسلمانوں کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ جمعہ و عیدین اور دیگر شرعی احکام کی بجاآوری کے لیے اپنے میں سے کسی کو امیر مقرر کریں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا فتوی

ہم نے عرض کیا تھا کہ دمشق پر تاتاریوں کی یلغار کے موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے جہاد کا فتوی دیا تھا جو کسی ریاستی نظام کے تحت نہیں بلکہ آزادانہ حیثیت سے تھا۔ اس لیے ہمارے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ اگر حالات ایسی صورت اختیار کر لیں تو علماء کو حق حاصل ہے بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہاد کا اعلان کریں اور امت کی عملی قیادت کریں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب نے اس واقعہ کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ ابن تیمیہؒ نے یہ فتوی دے کر ریاستی نظام کو سہارا دیا تھا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اور نہ ہی اس سے ہمارے موقف میں کوئی فرق ہی پڑتا ہے۔ اصل بات اپنی جگہ قائم ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے یہ فتوی کسی ریاستی نظم کے تحت دیا تھا یا آزادانہ

حیثیت سے اپنی دینی و علمی ذمہ داری سمجھتے ہوئے جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا؟ اس بات کی کوئی وضاحت ڈاکٹر صاحب نہیں کر سکے۔

الجزائر کی جنگ آزادی

ڈاکٹر محمد فاروق خان نے الجزائر کی جنگ آزادی کی تاریخ یوں بیان کی ہے کہ ۱۹۵۴ء میں محاذ حریت وطنی قائم ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں قاہرہ میں فرحت عباس کی سربراہ میں الجزائر کی جلاوطن حکومت قائم ہوئی اور ۱۹۶۲ء میں الجزائر آزاد ہو گیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آ گیا اور اس کی پشت پر علماء کے مسلسل جہاد آزادی، بالاکوٹ اور شاملی کے معرکوں، قبائلی عوام کی جنگ، حاجی شریعت اللہؒ، سردار احمد خان کھرلؒ، حاجی صاحب ترنگ زئیؒ اور تیتومیرؒ کے معرکہ ہائے حریت اور لاکھوں علماء کرام اور عوام کی جانوں کی قربانیوں کو یوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے جیسے ان واقعات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ الجزائر کی جنگ آزادی ۱۹۵۴ء میں شروع ہو کر صرف آٹھ سال میں منزل تک نہیں پہنچ گئی تھی بلکہ اس کے پیچھے لاکھوں مجاہدین آزای کا خون ہے اور ان میں وہ غریب مولوی بھی شامل ہیں جن کا نام لیتے ہوئے محترم غامدی صاحب کے شاگردوں کو نہ جانے کیوں حجاب محسوس ہوتا ہے۔ الشیخ عبد الحمید بن بادیسؒ اور الشیخ ابراہیمیؒ تو جہاد آزادی کے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے باقاعدہ جہاد کا فتویٰ دے کر اور جمعیۃ العلماء الجزائر قائم کر کے جہاد میں حصہ لیا تھا۔ انہی علماء کی وجہ سے لاہور میں الجزائر کے جہاد آزادی کی حمایت میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی قیادت میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کی مہم چلائی گئی تھی۔ الجزائر کی آزادی کے بعد الشیخ ابراہیمیؒ لاہور تشریف لائے تھے جن کا شاندار استقبال کیا گیا تھا اور الشیخ بن بادیسؒ کی انہی خدمات کے اعتراف میں لاہور میونسپل کارپوریشن نے ایک سڑک کو بن بادیس روڈ کے نام سے موسوم کیا تھا۔

جہاد افغانستان

ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب نے جہاد افغانستان کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا ہے مگر کیا مجال کہ کسی غریب مولوی کا نام ان کی نوک قلم پر آنے پائے سوائے مولوی محمد یونس خالص کے کہ ان کا تذکرہ انجینئر گلبدین حکمت یار کی جماعت میں تفریق بیان کرنے کے

لیے ضروری ہو گیا تھا۔ حالانکہ مولوی محمد نبی محمدی، مولوی جلال الدین حقانی، مولوی نصر اللہ منصور اور مولوی ارسلان رحمانی جہاد آزادی کے عملی قائدین میں سے ہیں ۔ جبکہ مولوی جلال الدین حقانی نے خوست چھاؤنی کی فتح میں اور مولوی ارسلان رحمانی نے ارگون چھاؤنی کی فتح میں مجاہدین کی خود کمان کی تھی۔ لیکن چونکہ مولویوں کے تذکرے سے جہاد کی شرعی حیثیت کا تاثر ابھرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب اسے صرف جنگ آزادی کی حد تک دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے مولویوں کا تذکرہ ہی سرے سے غائب کر دیا ہے۔

خاتمہ کلام

ہمارا خیال ہے کہ اس بحث کو یہیں سمیٹ لیا جائے، اسی لیے اب تک دونوں طرف سے شائع ہونے والے کم و بیش سبھی مضامین یکجا شائع کیے جا رہے ہیں تا کہ اہل علم کو مطالعہ اور تجزیہ میں آسانی رہے۔ دونوں طرف کے دلائل سامنے آچکے ہیں، مزید تکرار کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے ہم بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں محترم جاوید احمد غامدی اور ان کے شاگردان گرامی کی خدمت میں برادرانہ طور پر چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں:

1. ہمیں ان کے مطالعہ و تحقیق اور استنباط و استدلال کے حق سے کوئی انکار اور اختلاف نہیں ہے مگر اس بات سے ضرور اختلاف ہے کہ وہ اپنے استدلال و استنباط کو صرف اس لیے حرف آخر قرار دے رہے ہیں کہ ان کی سوئی اس نکتہ سے آگے نہیں بڑھ رہی۔ ان کی جو بات جمہور اہل علم کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل کر لے گی ہمیں بھی اسے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو گا، اور اگر کوئی بات جمہور اہل علم کے ہاں قابل قبول نہیں ہو گی تو بھی اسے قبول نہ کرنے کے باوجود دیگر اصحاب علم کے تفردات کی طرح ہم ان کا احترام کریں گے۔

2. اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک سنت رسولؐ کے ساتھ ساتھ جماعت صحابہؓ قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کا معیار ہے، اسی طرح امت کا اجماعی تعامل بھی قرآن و سنت کی منشا و مصداق تک پہنچنے کا محفوظ راستہ ہے اور ان دائروں کو کراس کرنے کا مطلب اہل سنت کی مسلمہ حدود کو کراس کرنا ہے۔ اس لیے الدین النصیحہ کے ارشاد نبویؐ کی رو سے میری برادرانہ درخواست ہے کہ استدلال و استنباط میں ان دائروں کا بہر حال لحاظ رکھا جائے کیونکہ خیر بہر حال اسی میں ہے۔

3. مولوی غریب پر رحم کھایا جائے، گھر کے کامے فرد کی طرح سب سے زیادہ کام بھی اسی کے ذمہ ہیں، سب سے زیادہ بے اعتنائی کا شکار بھی وہی ہے اور سب سے زیادہ گالیاں بھی وہی کھاتا ہے۔ امت کو جب بھی قربانی کی ضرورت پڑی ہے مولوی نے آگے بڑھ کر مار کھائی ہے اور خون دیا ہے اور آج امت میں دینداری کی جو بھی رونق قائم ہے عالم اسباب میں اسی کے دم قدم سے ہے۔ آپ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو دین پڑھائیے یہ بھی دین کی بہت بڑی خدمت ہے لیکن اس کے لیے غریب مولوی کو طنز و تعریض کے تیروں کا نشانہ بناتے رہنا ضروری تو نہیں۔

خوارج اور ان کا طرز استدلال

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۷ اپریل ۲۰۰۱ء)

خوارج کے قیام کا پس منظر

امت مسلمہ میں جس گروہ نے سب سے پہلے سنت نبویؐ اور تعامل صحابہؓ کو نظر انداز کر کے قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے اور اپنے فہم و استدلال کی بنیاد پر قرآن کریم کے احکام و قوانین کے تعین کا راستہ اختیار کیا وہ ''خوارج'' کا گروہ ہے۔ خوارج کے بارے میں خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی موجود ہے کہ میری امت میں ایک گروہ ایسا آئے گا جو قرآن کریم کی بہت زیادہ تلاوت کرے گا، اس کی نمازیں اور روزے بھی عام مسلمانوں کو تعجب میں ڈالنے والی ہوں گی، لیکن قرآن کریم ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا اور وہ قرآن کریم کے نام پر لوگوں کو گمراہ کریں گے۔

مسلم شریف میں حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایات منقول ہیں جن کے مطابق جناب نبی اکرمؐ غزوہ حنین سے فارغ ہو کر واپس تشریف لاتے ہوئے مکہ مکرمہ سے بیس میل دور جعرانہ کے مقام پر قیام پذیر تھے اور اپنے ساتھیوں میں مال غنیمت کے حصے تقسیم فرما رہے تھے۔ آپؐ فتح مکہ اور غزوہ حنین کے موقع پر نئے مسلمان ہونے والوں کو ان کی تالیف قلب کے لیے ترجیح دیتے ہوئے مال غنیمت کا زیادہ حصہ دے رہے تھے جس پر بنو تمیم کے ایک صاحب ذوالخویصرہ نے اعتراض کر دیا کہ

جناب آپ عدل سے کام لیں۔ حضورؐ نے سخت غصے کی کیفیت میں جواب دیا کہ اگر میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون ہے جو عدل کرے گا؟ حضرت عمرؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے جناب رسول اللہؐ سے اس شخص کا سر قلم کرنے کی اجازت چاہی تو رسالت مآبؐ نے یہ کہہ کر روک دیا کہ اس طرح لوگ کہنے لگیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے لگے ہیں۔

اس کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اس شخص کی قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کریم کی تلاوت اور نماز و روزہ کا بہت زیادہ اہتمام کریں گے لیکن دین ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا اور وہ دین سے ایسے نکل چکے ہوں گے جیسے کمان سے تیر نکل جاتا ہے۔ یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی جب ۳۷ھ میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی فوجوں میں صفین کے مقام پر جنگ ہو رہی تھی تو حضرت معاویہؓ نے جنگ میں اپنی پوزیشن کمزور دیکھتے ہوئے پیشکش کر دی کہ آپس میں لڑنے اور خون بہاتے چلے جانے کی بجائے قرآن کریم کے مطابق کسی کو حکم اور ثالث مقرر کر کے ان کے ذریعہ ہم اپنے تنازعات طے کر لیں۔ حضرت علیؓ کے لیے اس پیشکش کو مسترد کرنا مشکل تھا اس لیے انہوں نے اسے قبول کر کے جنگ بندی کا اعلان کر دیا، مگر ان کی فوج میں شامل بنو تمیم کے لوگوں نے حضرت علیؓ کے اس فیصلے سے اختلاف کیا اور قرآن کریم کی آیت مبارکہ ان الحکم الا اللہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ حکم دینا صرف اللہ تعالی کا حق ہے اور انسانوں میں سے کسی کو حکم اور ثالث مقرر کرنا کفر ہے، اس لیے حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ کر کے ان کے نزدیک کفر کا ارتکاب کیا ہے لہذا وہ اس کفر سے توبہ کریں ورنہ ہم ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔ حضرت علیؓ نے یہ موقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس پر ان کے لشکر سے چھ ہزار افراد الگ ہو گئے جن میں سے زیادہ افراد کا تعلق بنو تمیم سے تھا۔ انہوں نے ''حروراء'' کے مقام پر پہنچ کر پڑاؤ کیا اور عبداللہ بن وہب راسی کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔ چونکہ اس گروہ نے امیر المومنین حضرت علیؓ کی اطاعت سے نکلنے کا اعلان کیا اس لیے انہیں ''خارجی'' کہا جاتا ہے۔ اور انہوں نے حروراء کے مقام پر اپنا امیر منتخب کر کے باقاعدہ گروہ کی شکل اختیار کی اس لیے انہیں ''حروریۃ'' بھی کہا جاتا ہے۔

خارجیوں نے حضرت علیؓ کے لشکر سے الگ ہو کر صرف سیاسی بنیادوں پر علیحدہ تشخص اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے افکار و خیالات کو باقاعدہ عقائد کی شکل دے کر ایک نئے مذہبی گروہ

اور مکتب فکر کے طور پر سامنے آئے اور صدیوں تک امت مسلمہ کے لیے پریشان کن مسئلہ بنے رہے۔ ان کے عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے سے مسلمان کافر اور واجب القتل ہو جاتا ہے۔ اس بنیاد پر جہاں بھی ان کا اقتدار قائم ہوا انہوں نے بے شمار مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ ان کا کہنا تھا کہ خلیفہ برحق صرف دو بزرگ تھے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ۔ ان کے بعد حضرت عثمانؓ صرف چھ سال برحق خلیفہ رہے لیکن جب ان پر لوگوں کی طرف سے اعتراضات شروع ہوگئے تو وہ خلیفہ برحق کے منصب سے معزول ہوگئے۔ خارجیوں کے نزدیک حضرت علیؓ بھی جنگ صفین تک خلیفہ برحق تھے اس کے بعد جب انہوں نے تحکیم قبول کر لی تو وہ بھی خلیفہ نہ رہے بلکہ (نعوذ باللہ) انہوں نے ایسا کفر کیا کہ توبہ کے بغیر وہ اپنی پہلی پوزیشن پر واپس نہیں آسکتے تھے۔

خارجیوں کے ایک فرقہ ''ازارقہ'' کے نزدیک کسی مسلمان کے لیے کبیرہ گناہ کا ارتکاب اتنا سخت جرم ہے کہ وہ اس سے مرتد قرار پاتا ہے اور اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ اور ان کے ہاں شرعی حکم یہ ہے کہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والا مسلمان کافر ہو گیا ہے، اس نے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں ہی رہنا ہے اور اس کے لیے شفاعت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ خارجی قرآن کریم کی بعض آیات مبارکہ کے ظاہری مفہوم سے استدلال کرتے ہوئے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت کسی بھی نبی، ولی یا بزرگ کی شفاعت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

حضرت علیؓ نے صفر ۳۸ھ میں خوارج کے خلاف نہروان کے مقام پر لشکر کشی کرتے ہوئے انہیں شکست دی جس میں ان کا پہلا امیر عبد اللہ بن وہب بھی مارا گیا۔ لیکن اس گروہ کا خاتمہ نہ ہو سکا اور اس نے مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں تسلط حاصل کیا اور حکومت قائم کی۔ حضرت علیؓ خارجیوں کی سازش کا شکار ہو کر اسی گروہ کے فرد عبد الرحمان بن ملجم کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ خارجیوں نے ۱۴۴ھ میں مراکش اور الجزائر کے علاقہ میں ''تاہرت'' نامی شہر آباد کر کے ''سلطنت رستمیہ'' کی بنیاد رکھی اور ایک ایرانی النسل عبد الرحمان بن رستم کو پہلا امام چنا۔ یہ سلطنت کم و بیش ڈیڑھ سو سال تک قائم رہی اور ۲۹۶ھ میں فاطمیوں کے ایک پرجوش داعی ابو عبد اللہ کے ہاتھوں اس سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

خوارج سخت جنگ جو تھے اور چھاپہ مار جنگ کے ماہر تھے۔ وہ قرآن کریم کی تلاوت، نماز، روزہ کی پابندی اور شب زندہ داری میں اس قدر معروف تھے کہ عبادت و ریاضت

میں انہیں بطور مثال پیش کیا جاتا تھا۔ ان کا ایک فرقہ ''اباضیہ'' کہلاتا ہے جو یمامہ کی ایک بستی اباضہ کے رہنے والے خارجی شیخ عبداللہ بن اباض کی طرف منسوب ہے۔ یہ فرقہ وہی عقائد رکھتا ہے جو دوسرے خارجیوں کے ہیں لیکن طرز عمل میں دوسرے گروہوں سے نسبتا نرم اور معتدل سمجھا جاتا ہے۔ یہ فرقہ آج تک موجود ہے، خلیج عرب کی ریاست ''سلطنت آف عمان'' میں اسی گروہ کی حکمرانی ہے اور مسقط اس ریاست کا دارالحکومت ہے۔

خوارج نے چونکہ حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں الگ تشخص قائم کر لیا تھا اس لیے متنازعہ مسائل پر بعض صحابہ کرامؓ سے ان کی گفتگو ہوئی اور بحث و مباحثہ کا یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور ان کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ساتھ ہونے والے ان کے مباحثوں کی کچھ تفصیل یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے ساتھ خارجیوں کا مکالمہ

امام مسلمؒ نے کتاب الایمان میں ایک تابعی بزرگ حضرت یزید الفقیرؒ کا واقعہ نقل کیا ہے جسے وہ خود بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں بھی خارجیوں کی رائے سے متاثر ہو گیا تھا اور یہ رائے رکھتا تھا کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور ہمیشہ جہنم میں رہنے کا مستحق قرار پاتا ہے اس لیے شفاعت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی کوئی شخص جہنم میں جانے کے بعد وہاں سے نکل سکے گا۔

یزید الفقیرؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک جماعت کے ساتھ میں حج کے لیے گیا، حج سے فارغ ہو کر ہمارا ارادہ ہوا کہ واپسی پر مدینہ منورہ میں کچھ حضرات سے ملاقاتیں کرتے چلیں۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ مسجد کے ستون سے ٹیک لگائے لوگوں کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنا رہے تھے۔ ہم بھی سننے کے لیے بیٹھ گئے۔ دوران گفتگو انہوں نے دوزخیوں کا ذکر کیا اور نیک لوگوں کی شفاعت پر ان کے جہنم سے نکلنے کی بات کی تو میں نے حضرت جابرؓ سے سوال کر دیا کہ اے رسول اللہؐ کے ساتھی! آپ لوگ یہ دوزخیوں کے دوزخ سے نکلنے کی کیا باتیں کرتے رہتے ہیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ دوزخی جب دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو انہیں دوبارہ آگ میں دھکیل دیا جائے گا (سورۃ الحج آیت ۲۲)۔ اسی طرح قرآن کریم میں مومنوں

کو دعا سکھائی گئی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے جس کو آگ میں داخل کیا تو اسے رسوا کر دیا اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا (سورۃ آل عمران آیت ۱۹۳)۔ یعنی جب جہنم سے نکلنے کا ارادہ کرنے والوں کو واپس دھکیل دیا جائے گا اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا تو پھر شفاعت کا کیا مقصد باقی رہ جاتا ہے؟

اس کے جواب میں حضرت جابرؓ نے سوال کیا کہ کیا تم قرآن کریم پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن کریم میں حضرت محمدؐ کے لیے مقام محمود کا تذکرہ بھی سنا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں اس سے مراد سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۹ ہے جس میں آپؐ سے کہا گیا ہے کہ ”آپ رات کے وقت تہجد کی نماز پابندی سے پڑھا کریں قریب ہے کہ اللہ تعالی آپؐ کو مقام محمود عطا فرمائیں“۔ پھر حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے مقام محمود کی وضاحت کرتے ہوئے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بیان فرمایا کہ اس ”مقام محمود“ پر کھڑے ہو کر وہ شفاعت کریں گے جس کی برکت سے اللہ تعالی بہت سے لوگوں کو جہنم کے عذاب سے نجات دیں گے۔ اس کے بعد کہ وہ آگ میں جل کر سیاہ ہو چکے ہوں گے مگر انہیں جہنم سے نکال کر جنت کے دروازے پر ”نہر حیات“ میں غسل کرایا جائے گا تو غسل کے بعد ان کے جسم پھر تر و تازہ ہو جائیں گے اور انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

یزید فقیرؒ کہتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت جابرؓ نے حدیث شفاعت کی دیگر تفصیلات بھی بیان کیں جو وہ پوری طرح یاد نہیں رکھ سکے۔ مگر امام مسلمؒ نے دوسری سند سے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث بھی بیان کر دی ہے کہ ان سے بعض لوگوں نے سوال کیا کہ قرآن کریم کی اس آیت سے کیا مراد ہے جس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جہنم میں وارد نہ ہو (سورۃ مریم آیت ۷۱)۔ حضرت جابرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس سے مراد پل صراط سے گزرنا ہے جو جہنم کے اوپر ہوگا اور جنت میں جانے والے ہر شخص کو اس پر سے گزرنا پڑے گا۔ حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب لوگ حشر کے میدان میں جمع ہوں گے اور لوگوں کو ان کے معبودوں کے نام پر بلایا جائے گا جس پر سب لوگ اپنے اپنے معبودوں کو پہچان کر ان کے پیچھے چل پڑیں گے۔ جبکہ اللہ تعالی کی عبادت کرنے والے مسلمان پیچھے رہ جائیں گے۔ ان میں مسلمان، منافق، اور نیک و بد سب ہوں گے۔ اللہ تعالی ان سے دریافت کریں گے کہ تم کس کے انتظار میں

کھڑے ہو؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم اپنے رب کے انتظار میں ہیں۔ اللہ تعالی اپنی تجلی ظاہر فرمائیں گے جس پر سب مسلمان اس تجلی کے پیچھے چل پڑیں گے۔ آگے جہنم کے اوپر پل صراط ہوگا جس سے وہ گزریں گے۔ اس پل صراط کے دونوں طرف کنڈیاں اور کانٹے ہوں گے جو اللہ تعالی کے حکم کے مطابق ان گزرنے والوں میں سے جن کو جہنم میں گرانا مقصود ہوگا انہیں نیچے کھینچ لیں گے۔ جبکہ اہل ایمان سیدھے گزر جائیں گے۔ ان سیدھے گزر جانے والوں میں سب سے پہلا ستر ہزار افراد کا بڑا گروہ ہوگا جن کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے اور وہ بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اہل ایمان کو درجہ بدرجہ شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور سب جنتی باری باری شفاعت کریں گے جس کی برکت سے اللہ تعالی ان تمام مسلمانوں کو جہنم سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے جنہوں نے اللہ تعالی کی وحدانیت کا اقرار کیا ہوگا مگر اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے جہنم کی سزا بھگت رہے ہوں گے۔ حتی کہ جس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ بھی شفاعت کی برکت سے جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ ایسے لوگ جہنم کی آگ کی وجہ سے جل کر سیاہ ہو چکے ہوں گے لیکن نہر حیات میں غسل کے بعد تر وتازہ جسموں کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے۔ وہاں انہیں سوال اور تمنا کے اظہار کی اجازت دی جائے گی اور اس دنیا اور اس کے برابر دس دنیاؤں جتنی دولت اور نعمتیں ہر جنتی کو عطا کی جائیں گی۔

یزید فقیرؒ کہتے ہیں کہ جب حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے یہ تفصیلات بیان کیں اور بتایا کہ قرآن کریم میں جناب نبی اکرمؐ کے لیے جس ”مقام محمود“ کا ذکر ہے اس سے مراد وہی ”مقام شفاعت“ ہے اور یہ ساری تفصیل خود حضورؐ نے ارشاد فرمائی ہے۔ تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ بزرگ جناب نبی اکرمؐ کی طرف جھوٹ کی بات منسوب نہیں کر سکتے اس لیے میں تو ان کی بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ چنانچہ ہماری ساری جماعت میں سے صرف ایک شخص اپنے سابقہ عقیدے پر ڈٹا رہا جبکہ باقی ہم سب نے اس سے توبہ کر کے اپنا عقیدہ درست کر لیا۔

اس واقعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم سے استدلال کے حوالہ سے قرون اولی کے اصحاب خیر سنت رسولؐ کی طرف، اور سنت رسولؐ کو سمجھنے کے لیے صحابہ کرامؓ کی تعلیمات کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور سلیم الفطرت حضرات سنت نبویؐ اور فہم

صحابہؓ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے فہم و استدلال سے دستبردار ہو جایا کرتے تھے۔ البتہ جن کے مقدر میں گمراہی ہو اور جنہوں نے اپنی عقل و فہم اور دانش و استدلال کو ہی ہر بات کا آخری معیار قرار دے رکھا ہو انہیں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے ارشادات بھی مطمئن نہیں کر سکتے اور وہ اس کے بعد بھی ہٹ دھرمی ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ خارجیوں کا مکالمہ

امام نسائیؒ کی ''سنن کبری'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خصوصیات کے تذکرہ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ جب جنگ صفین میں حضرت علیؓ نے جنگ بندی کر کے حضرت معاویہؓ کے ساتھ تنازعات طے کرنے کے لیے حضرت ابو موسی اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو حکم اور ثالث تسلیم کر لیا، اور اس پر ان کے لشکر کے چھ ہزار افراد نے باغی ہو کر حروراء کے مقام پر اپنا الگ کیمپ لگا لیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت علیؓ سے ان کے پاس جا کر گفتگو کرنے کی اجازت مانگی، اور ان سے اجازت لے کر وہ باغیوں کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا خیر مقدم کیا اور پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ میں تمہارے پاس جناب رسول اللہؐ کے صحابہ کرام مہاجرین و انصار کی طرف سے آیا ہوں اور نبی اکرمؐ کے چچازاد بھائی اور داماد کی طرف سے آیا ہوں۔ قرآن کریم ان کی موجودگی میں نازل ہوا ہے اور وہ قرآن کریم کے معانی و مقاصد کو تم سے بہتر جانتے ہیں۔ جبکہ تمہارے درمیان ان صحابہ کرامؓ میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تمہیں حضرت علیؓ اور صحابہ کرامؓ پر کیا اعتراض ہے جو تم انہیں چھوڑ کر چلے آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں پر ہمارے تین اعتراض ہیں۔

1. پہلا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے دین کے بارے میں انسانوں کو حکم اور ثالث تسلیم کیا ہے جبکہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ حکم صرف اللہ تعالی کا ہے۔

2. دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے جمل اور صفین کی جنگیں لڑی ہیں مگر نہ مخالفین میں سے کسی کو قیدی بنایا ہے اور نہ ہی ان کے اموال کو غنیمت کے مال کے طور پر تقسیم کیا ہے۔ اگر وہ مسلمان ہیں تو ان کے خلاف جنگ لڑنا جائز

نہیں تھا، اور اگر وہ کافر ہیں تو ان کے اموال کو غنیمت اور قیدیوں کو غلام کیوں نہیں بنایا گیا؟

3. تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حکم اور ثالث تسلیم کر کے حضرت علیؓ نے خود کو امیر المومنین کے منصب سے الگ کر لیا ہے اور اس کا اختیار ثالثوں کو دے دیا ہے کہ وہ جسے چاہیں امیر المومنین بنالیں۔ اس لیے اگر وہ امیر المومنین نہیں رہے تو لامحالہ امیر الکافرین ہو گئے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے پوچھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں بس یہی تین اعتراض ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر میں قرآن کریم اور سنت رسولؐ کی روشنی میں ان تینوں کا جواب دے دوں تو کیا تم واپس جانے کو تیار ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں ایسی صورت میں ہم واپس جانے کو تیار ہیں۔

1. حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ تمہارا پہلا سوال انسانوں کو حکم بنانے کے بارے میں ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں میاں اور بیوی کے تنازعہ کے بارے میں حکم دیا ہے کہ اگر جھگڑا بڑھ جائے تو خاوند اور بیوی دونوں کی طرف سے ایک ایک ثالث مقرر کیا جائے جو دونوں کا جھگڑا طے کرائے۔ اسی طرح احرام کی حالت میں جانور کا شکار کرنا منع ہے، اگر کسی حاجی یا عمرہ کرنے والے نے احرام کی حالت میں کوئی جانور شکار کر لیا تو اس کے برابر کا جانور بطور کفارہ ذبح کرے، اور اگر اس کے برابر یا مثل کا کوئی جانور نہ ہو تو شکار ہونے والے جانور کی قیمت صدقہ کرے، جبکہ اس قیمت کا تعین دو عادل آدمی کریں گے۔ چنانچہ اگر میاں بیوی کا جھگڑا طے کرنے اور ایک خرگوش جیسے جانور کی قیمت طے کرنے کے لیے حکم مقرر کرنا جائز ہے تو مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں خونریزی رکوانے کے لیے حکم اور ثالث بنانا کیوں جائز نہیں؟

2. تم نے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے جمل اور صفین کی جنگ میں مخالفین کو قیدی کیوں نہیں بنایا اور ان کے اموال کو غنیمت میں تقسیم کیوں نہیں کیا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ ان میں ام المومنین حضرت عائشہؓ بھی ہیں جنہیں قرآن کریم کی نص قطعی میں مومنوں کی ماں قرار دیا گیا ہے تو کیا تم انہیں

قید کر کے (نعوذ باللہ) لونڈی بنانے کے لیے تیار ہو گے؟ اگر تم ایسا کرو گے تو خود کفر کا ارتکاب کرو گے۔

3. تمہارا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حکم اور ثالث تسلیم کر کے امیر المومنین کے منصب سے دستبرداری اختیار کر لی ہے۔ یہ تمہاری غلطی فہمی ہے کیونکہ یہ معاملہ ایسے ہے جیسے صلح حدیبیہ میں جناب نبی اکرمؐ قریش مکہ سے مذاکرات کر رہے تھے تو آپ نے معاہدہ اس طرح لکھوایا کہ یہ محمد رسول اللہ اور قریش مکہ کے درمیان طے پانے والا معاہدہ ہے۔ اس پر قریش کے نمائندہ نے اعتراض کر دیا کہ اگر ہم معاہدہ میں آپ کو رسول اللہ تسلیم کر لیں تو سرے سے کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر معاہدہ کا عنوان اس طرح لکھا جائے کہ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ اور قریش مکہ کے درمیان طے پایا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے حدیبیہ کے معاہدہ میں اپنے نام کے ساتھ رسول اللہ کا جملہ کٹوا کر محمد بن عبد اللہ کا جملہ تحریر کرایا تب جا کر قریش کے نمائندہ نے اس معاہدہ کی عبارت کو قبول کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اگر رسول اللہ کا لفظ آپؐ کے نام کے ساتھ لکھے جانے کے بعد کٹوانے سے کوئی فرق نہیں پڑا اور نبی اکرمؐ رسالت کے منصب سے (نعوذ باللہ) معزول نہیں ہو گئے تو معاہدہ اور صلح کی خاطر حضرت علیؓ کی طرف سے امیر المومنین کی اصطلاح کو وقتی طور پر اپنے نام سے الگ کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ امیر المومنین کے منصب سے معزول نہیں ہو گئے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اس وضاحت کے بعد ان لوگوں سے پوچھا کہ کیا میں نے تمہارے اعتراضات کا جواب دے دیا ہے؟ جواب میں اجتماعی آواز آئی کہ ہاں آپ نے جواب دے دیا ہے۔ چنانچہ اس گفتگو کے بعد چھ ہزار باغیوں میں سے دو ہزار نے اپنے موقف سے رجوع کیا اور حضرت علیؓ کے لشکر میں واپس آ گئے۔ جبکہ باقی چار ہزار اپنی ضد پر اڑے رہے اور ایک سال بعد حضرت علیؓ نے خود لشکر کی کمان کرتے ہوئے نہروان کی جنگ میں انہیں شکست دی۔

صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اس موقع پر نہ صرف خوارج کی سطحی ذہنیت اور کھوکھلے اعتراضات کو بے نقاب کیا بلکہ بطور اصول یہ بات بھی سمجھا دی کہ قرآن کریم کی

صرف ایک دو آیات کو سامنے رکھ کر ان کے ظاہری مفہوم سے حتمی نتیجہ قائم کر لینا درست طرز عمل نہیں ہے۔ بلکہ تمام متعلقہ آیات کریمہ اور احادیث نبویہؐ کی روشنی میں قرآن کریم کے معنی و مقصد کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مرحلہ حضرات صحابہ کرامؓ کے ارشادات و تعلیمات کی روشنی میں طے کیا جائے۔ کیونکہ قرآن کریم ان کی موجودگی میں نازل ہوا ہے اور وہ قرآن کریم کے مفہوم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاو مراد کو باقی ساری امت کی بہ نسبت بہتر سمجھتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ساتھ خارجیوں کا مکالمہ

دارالعلوم دیوبند کے استاد الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے ''نفحۃ العرب'' میں ہیثم بن عدیؒ کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جب منصب خلافت سنبھالا تو خوارج نے جزیرہ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے اور شوذب خارجی ان کا سربراہ تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے محمد بن زبیرؒ اور عون بن عبد اللہ بن مسعودؒ کو اپنا نمائندہ بنا کر اور خط دے کر ان کے پاس بھیجا۔ اس کے جواب میں خارجیوں نے دو نمائندے روانہ کیے، ایک بنو شیبان قبیلے سے تھا اور دوسرا حبشہ کا معلوم ہوتا تھا جس کا نام شوذب تھا۔ یہ نمائندے جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے پاس پہنچے تو امیر المومنینؒ ایک بالاخانے میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے انہیں اندر بلانے سے قبل ان کی تلاشی لینے کا حکم دیا تاکہ ان کے پاس کوئی ایسا ہتھیار نہ ہو جس سے وہ امیر المومنین کو نقصان پہنچا سکیں۔ پھر انہیں بالاخانے میں پہنچا دیا گیا جہاں امیر المومنین کا بیٹا عبد الملک اور دربان مزاخم بھی موجود تھے، اور وہ دو نمائندے بھی ساتھ تھے جنہیں خارجیوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔

سلام و جواب کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ان سے سوال کیا کہ تم لوگوں نے میری حکومت کو کیوں تسلیم نہیں کیا؟ تمہارا مجھ پر کیا اعتراض ہے؟ ان میں سے جو حبشی تھا اس نے جواب میں کہا کہ ہمیں آپ کی سیرت، انصاف پسندی، عدل اور دیانتداری پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ایک اشکال ہے اگر آپ اس کا حل پیش کریں تو ہم آپ کی اطاعت قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اشکال یہ ہے کہ آپ نے اپنے خاندان کے طرز عمل کو تبدیل کر دیا ہے، ان کے طریقہ کے مخالف چل رہے ہیں، اور ان کے بہت سے معاملات کو آپ نے ظلم قرار دیا ہے۔ اگر آپ کا یہ طرز عمل درست ہے اور وہ لوگ واقعی ظالم تھے تو

آپ ان پر لعنت کیوں نہیں کرتے؟ بس آپ کی یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور یہی آپ کے ساتھ ہمارے اختلاف کی بنیادی وجہ ہے۔

امیرالمومنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ سن کر اللہ تعالی کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگوں نے یہ طرز عمل کسی دنیاوی غرض سے اختیار نہیں کیا بلکہ آخرت کی بہتری تمہارا مقصد ہے لیکن تم بات سمجھنے میں غلطی کر گئے ہو۔ اس لیے میں اس کی وضاحت کر رہا ہوں تاکہ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے۔ میرا تم سے سوال یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا تم انہیں اپنے اچھے بزرگ اور نجات پانے والے سمجھتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں ہم انہیں ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ یہ تمہیں معلوم ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بہت سے قبائل مرتد ہو گئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کے خلاف جنگ لڑی اور انہیں شکست دے کر ان کے اموال غنیمت اپنے قبضہ میں کر لیے اور قیدیوں کو غلام بنا لیا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے وہ تمام قیدی ان کے خاندانوں کو واپس کر دیے۔ تو کیا حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ سے برات کا اعلان بھی کیا تھا؟ یا تم لوگ ان میں سے کسی سے برات کا اعلان کرتے ہو؟ خوارج کے ان نمائندوں نے جواب دیا کہ ہم ایسا نہیں کرتے۔

پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دریافت کیا کہ نہروان میں تمہارے بڑے جمع تھے اور وہ تمہارے بزرگ اسلاف ہیں، ان کے خلاف جب اہل کوفہ نے بغاوت کی تو انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا، نہ کسی کا خون بہایا، نہ کسی کو خوف زدہ کیا، اور نہ ہی کسی کا مال لوٹا۔ لیکن جب اہل بصرہ نے خروج کیا تو تمہارے انہی بزرگوں نے ان کا قتل عام کر ڈالا۔ حضرت عبد اللہ بن خباب بن حارثؓ جیسے بزرگ کو ان کی لونڈی سمیت قتل کر دیا، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا۔ حتی کہ عورتوں اور بچوں کو ابلتے اور جوش مارتے ہوئے دودھ کی کڑاہیوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔ کیا ایسا ہوا؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ ہاں ہوا ہے۔ امیرالمومنین نے فرمایا تو کیا کوفہ والوں نے بصرہ والوں سے برات کا اعلان کیا؟ یا تم ان دونوں سے کسی سے برات کا اعلان کرتے ہو اور ان پر لعنت بھیجتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ کیا دین ایک ہے یا دو ہیں؟ کیا تمہارے لیے ان لوگوں پر لعنت نہ کرنے کی گنجائش موجود ہے اور میرے لیے نہیں کہ میں اپنے خاندان کے

بزرگوں کے بارے میں خاموشی اختیار کر سکوں؟ پھر میں تم سے پوچھتا ہوں کہ فرعون سب سے ظالم حکمران تھا جس نے یہ دعویٰ کر رکھا تھا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ تو کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تم نے زندگی میں کتنی بار فرعون پر لعنت کی ہے؟ خارجی نے جواب دیا کہ مجھے تو یاد نہیں ہے کہ میں نے فرعون پر کبھی لعنت کی ہو۔ امیر المومنین نے فرمایا کہ افسوس ہے تم پر کہ اپنے لیے تو یہ گنجائش رکھتے ہو کہ فرعون پر بھی لعنت نہ کرو اور مجھ پر یہ ضروری قرار دیتے ہو کہ میں اپنے خاندان کے بزرگوں پر لعنت بھیجوں اور ان سے برات کا اعلان کروں۔

امیر المومنین نے کہا کہ پھر میرے اس سوال پر بھی غور کرو کہ جناب رسول اللہؐ کی سنت مبارکہ تو یہ ہے کہ انہیں بت پرستوں کی طرف بھیجا گیا تھا، آپؐ نے انہیں دعوت دی کہ وہ بت پرستی کو ترک کر کے ایک اللہ کی بندگی اختیار کریں۔ اور جس شخص نے بھی بت پرستی اور شرک چھوڑ کر لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا، نبی اکرمؐ نے اسے امن دے دیا اور اس کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تمہارے پاس ایسے لوگ آتے ہیں جنہوں نے بت پرستی ترک کر کے جناب محمد رسول اللہؐ کا کلمہ پڑھا ہے اور وہ تمہارے سامنے کلمہ پڑھتے ہیں مگر تم ان کے خون کو بھی حلال سمجھتے ہو اور ان کے مالوں پر قبضہ کر لیتے ہو۔ لیکن اگر تمہارے پاس یہودی یا عیسائی آجائیں اور دوسرے دینوں کے لوگ آجائیں تو ان کی جان و مال کو محترم قرار دے کر ان کی حفاظت کرتے ہو۔ کیا تمہارے لیے ساری گنجائشیں موجود ہیں اور میرے لیے تم کوئی گنجائش دینے کے لیے تیار نہیں ہو۔

روایت کے مطابق امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی یہ باتیں سن کر خوارج کے دو نمائندوں میں سے ایک (حبشی) نے کہا کہ میں نے آج جیسی مدلل اور ٹھوس بات کبھی نہیں سنی۔ اس لیے میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ حق پر ہیں اور میں آپ کی مخالفت ترک کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ جبکہ دوسرے نمائندے نے جو بنو شیبان میں سے تھا کہا کہ آپ کی بات تو واضح ہے مگر میں تنہا کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوں، اس لیے واپس جا کر ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ روایت میں اس بات کی بھی صراحت ہے کہ وہ حبشی توبہ کر کے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے پاس ہی ٹھہر گیا اور وفات تک وہیں رہا۔ مگر دوسرا شخص واپس چلا گیا اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی وفات کے بعد ایک جنگ میں خارجیوں کے ساتھ مارا گیا۔

گویا امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے یہ اصول سمجھا دیا کہ کسی شرعی حکم یا ضابطہ کے تعین کے لیے قرآن کریم یا سنت نبویؐ کے ظاہری مفہوم کو سامنے رکھنا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے طرز عمل کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے ان آیات اور سنتوں کا کیا مطلب سمجھا ہے اور ان پر کیسے عمل کیا ہے؟ کیونکہ صحابہ کرامؓ قرآن کریم کے نزول اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت واسوہ کے عینی گواہ ہونے کے ساتھ ساتھ دین کے ان دونوں سرچشموں پر عمل کا معیار اور کسوٹی بھی ہیں۔ اور اس کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہی کسی اصول یا قانون کے کھرا یا کھوٹا ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ خارجیوں کا مکالمہ

خوارج نے ایک دور میں کوفہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی وفات کے بعد ان کے فرزند عبد اللہ عمرؒ کو کوفہ کا والی مقرر کیا گیا تھا، انہی کے دور میں خارجیوں نے ضحاک کی قیادت میں بغاوت کی اور عبد اللہ بن عمرؒ کو شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت امام اعظم ابوحنیفہؒ کوفہ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مذہبی راہ نما کی حیثیت سے موجود تھے۔ ضحاک خارجی کے حکم پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور ضحاک کے سامنے پیش کیا گیا۔ خارجی چونکہ عام مسلمانوں کو گمراہ سمجھتے تھے اس لیے ہر مسلمان سے توبہ کراتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ سے بھی ایک موقع پر انہوں نے یہ کہہ کر توبہ کا مطالبہ کیا تھا کہ جس طرح ہم کہتے ہیں اس طرح تم بھی توبہ کرو۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ''حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی'' میں اس واقعہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ امام صاحبؒ کو جب ضحاک خارجی کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ تب یا شیخ من الکفر کہ بڑے میاں کفر سے توبہ کرو۔ امام ابوحنیفہؒ دانا و حکیم بزرگ تھے، جواب میں فرمایا انا تائب من کل کفر کہ میں ہر قسم کے کفر سے تائب ہوں۔ خارجیوں کے سربراہ نے یہ سن کر امام صاحبؒ کو رہا کر دیا مگر ان کے جانے کے بعد کسی نے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ نے تو اس جملہ میں تمہارے کفر سے توبہ کا اظہار کیا ہے۔ یہ سن کر امام صاحبؒ کو پھر واپس بلایا لیا گیا اور سوال ہوا کہ ہم نے سنا ہے کہ جس کفر سے تم نے توبہ کی ہے اس سے مراد ہمارے عقائد ہیں۔ امام صاحبؒ خارجیوں کی نفسیات اور طرز استدلال سے واقف تھے اس لیے انہی کی زبان میں دریافت کیا کہ تم نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کا تمہیں یقین ہے یا محض گمان ہے؟ ضحاک نے جواب دیا کہ یقین نہیں بلکہ ظن

ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ ان بعض الظن اثم بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اس لیے تم نے گمان کر کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور خود اپنے عقیدہ کے مطابق تم کبیرہ گناہ کر کے کافر ہو گئے ہو۔ اس لیے پہلے تم کفر سے توبہ کرو۔ اس نے جواب میں تسلیم کیا کہ ہاں مجھ سے گناہ ہوا ہے اس لیے میں کفر سے توبہ کرتا ہوں، اب تم بھی کفر سے توبہ کرو۔ یہ سن کر امام صاحبؒ نے پھر وہی جملہ دہرا دیا کہ میں ہر کفر سے اللہ تعالی کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔ خارجیوں کے سردار نے اس کے بعد امام صاحبؒ کو رہا کر دیا۔

لیکن اس کے بعد ایک اور طوفان کھڑا ہو گیا۔ خارجیوں کے سردار ضحاک نے کوفہ کی جامع مسجد میں آکر اعلان کر دیا کہ کوفہ کے جو عام مسلمان خارجیوں کے عقائد نہیں رکھتے وہ کافر ہیں اس لیے انہیں قتل کر دیا جائے اور ان کے بیوی بچوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا جائے۔ اس سے پورے کوفہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ خارجی سخت جنگ جو اور نڈر لوگ تھے اور ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ یہ سب کچھ کر گزریں۔ ادھر شہر میں کسی کو یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ خارجیوں کے سردار ضحاک یا کسی اور ذمہ دار سے اس بارے میں گفتگو کر سکے۔ امام ابو حنیفہؒ چونکہ پہلے اس کے سامنے پیش ہو چکے تھے اور آپس میں گفتگو بھی ہو چکی تھی اس لیے امام صاحبؒ نے ہمت سے کام لیا اور ضحاک کے پاس چلے گئے جو ننگی تلوار ہاتھ میں لیے جامع مسجد میں جا بیٹھا تھا۔ امام صاحبؒ نے ضحاک کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ میں ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے پوچھنے کی اجازت دی تو فرمایا کہ کوفہ والوں کے قتل عام کا حکم کس وجہ سے دیا گیا ہے؟ اس نے کہا کہ چونکہ یہ لوگ مرتد ہیں اس لیے ان کا قتل ہم پر واجب ہے۔ امام صاحبؒ نے پوچھا کہ مرتد ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا انہوں نے سابقہ مذہب ترک کر کے کوئی نیا مذہب اختیار کر لیا ہے یا بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہی قائم ہیں؟ امام صاحبؒ کا مطلب یہ تھا کہ ارتداد تو دین سے پھر جانے کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص ایک دین کو ترک کر کے دوسرا دین اختیار کر لے۔ جبکہ کوفہ والوں نے تو دین تبدیل نہیں کیا اور بدستور پہلے مذہب پر قائم ہیں اس لیے ان پر مرتد ہونے کا اطلاق کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

امام صاحبؒ کا یہ سوال سن کر ضحاک خارجی چونکا اور کہا کہ اپنی بات ایک بار پھر دہرائیے۔ امام صاحبؒ نے سوال دوبارہ بیان کر دیا۔ اب یہ امام صاحبؒ کا طرز استدلال تھا یا ان کی شب زندہ داری اور درد دل کا کرشمہ کہ ضحاک نے ان کی بات سنتے ہی زور سے کہا

اخطئنا کہ ہم سے غلطی ہوگئی۔ یہ کہہ کر اس نے تلوار میان میں ڈال لی، اسے دیکھ کر جامع مسجد کے صحن میں پھیلے ہوئے اس کے ہزاروں ساتھیوں نے بھی اپنی اپنی تلواریں میان میں کرلیں۔ اور یوں امام ابو حنیفہؒ کی جرات اور تدبر کی بدولت اہل کوفہ کی جان بخشی ہوگئی۔ مولانا گیلانیؒ نے اس موقع پر حضرت ابو معاذ بلخیؒ کا یہ مقولہ بھی نقل کیا ہے کہ "کوفہ کے سب لوگ امام ابو حنیفہؒ کے آزاد کردہ غلام ہیں اس لیے کہ ان کی جانیں امام صاحبؒ کی وجہ سے ضحاک خارجی کی تلوار سے بچی ہیں"۔

الغرض خوارج نے سنت نبویؐ اور اسوۂ صحابہؓ کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن کریم سے براہ راست استدلال کر کے شرعی قواعد و اصول خود وضع کرنے کی جو روش اختیار کی تھی، اور اس کے ساتھ بے جا تشدد اور سطحیت کے اظہار کے ساتھ دین کو جس من پسند طریقہ سے پیش کرنا چاہا تھا اس سے امت کو فتنہ و فساد اور خونریزی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کے برعکس اہل السنۃ والجماعت کی بنیاد ہی سنت نبویؐ اور اسوۂ صحابہؓ کے دو بنیادی اصولوں پر ہے۔ اور اہل السنۃ والجماعت سے مراد اہل حق کا وہ طبقہ ہے جو قرن اول سے اب تک اس اصول پر قائم ہے کہ دینی راہ نمائی، شرعی قوانین و احکام، اور قرآن فہمی کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد و عمل اس بارے میں کیا ہے، دوسری یہ کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے اسے کیسے سمجھا ہے اور اس پر کس طرح عمل کیا ہے۔ قرآن کریم کے مقصد و منشاء تک رسائی کے یہی دو فطری اور صحیح راستے ہیں، ان سے ہٹ کر جو راستہ اختیار کیا جائے گا اور جو اسلوب وضع کیا جائے گا اس سے گمراہی اور فکری انارکی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

علماء کے سیاسی کردار پر جناب غامدی کا موقف

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۵ مارچ ۲۰۰۱ء)

۱- اس بحث کا پس منظر

غالباً عید الفطر کے ایام کی بات ہے کہ محترم جاوید احمد غامدی نے پشاور پریس کلب میں جہاد، فتوی، زکوۃ، ٹیکس اور علماء کے سیاسی کردار کے حوالہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جو ملک کے جمہور علماء کے موقف اور طرز عمل سے مختلف تھے۔ اس لیے میں نے روزنامہ

اوصاف اسلام آباد میں مسلسل شائع ہونے والے اپنے کالم ”نوائے قلم“ میں ان کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ اس پر غامدی صاحب محترم کے شاگرد رشید جناب خورشید احمد ندیم نے روزنامہ جنگ میں غامدی صاحب کے موقف کی مزید وضاحت کی جن پر میں نے ان کی چند باتوں پر روزنامہ اوصاف میں دوبارہ تبصرہ کر دیا۔

اس کے بعد غامدی صاحب کے ایک اور شاگرد معز امجد نے روزنامہ پاکستان میں انہی امور پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا اور اسے جاوید احمد غامدی کی زیرادارت شائع ہونے والے ماہنامہ اشراق لاہور میں بھی میرے مذکورہ بالا مضمون کے ساتھ شائع کر دیا گیا۔ زیر نظر مضمون میں معز امجد کے اس مضمون کی بعض باتوں پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں لیکن چونکہ سابقہ مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہونے کی وجہ سے بیشتر قارئین کے سامنے پوری بحث نہیں ہوگی اس لیے اس کا مختصر خلاصہ ساتھ پیش کر رہا ہوں تاکہ بحث کا کوئی پہلو قارئین کے سامنے تشنہ نہ رہے۔

غامدی صاحب نے فرمایا تھا کہ علماء کو سیاست میں فریق بننے کی بجائے اپنا کردار علمی و فکری راہنمائی تک محدود رکھنا چاہیے اور بہتر ہے کہ مولوی کو سیاستدان بنانے کی بجائے سیاستدان کو مولوی بنانے کی کوشش کی جائے۔ راقم الحروف نے اس پر عرض کیا کہ یہ موقع محل کی مناسبت کی بات ہے کہ علماء کرام علمی و فکری راہنمائی اور قیادت کریں یا ضرورت ہو تو حالات کی اصلاح کے لیے خود سیاست میں فریق بننے کا راستہ اختیار کریں۔ دونوں طرف امت کے اہل علم کا اسوہ موجود ہے اور ضرورت کے مطابق کوئی سا راستہ اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔ خورشید احمد ندیم نے جواب میں اس سے اتفاق کیا کہ یہ حلال و حرام کا مسئلہ نہیں بلکہ حکمت و تدبیر کی بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ پاکستان میں علماء کرام کے قومی سیاست میں خود فریق بننے سے دین اور علماء کو فائدہ کی بجائے نقصان ہوا ہے۔ راقم الحروف نے ان کی اس بات سے اختلاف کیا اور عرض کیا کہ ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کی منظوری صرف اس لیے ہوسکی کہ اسمبلی میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بطور رکن موجود تھے۔ اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے، قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کی دستوری ضمانت اور دیگر اسلامی دفعات کی شمولیت کی واحد وجہ یہ تھی کہ دستور ساز اسمبلی میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، اور مولانا عبد

المصطفی ازہریؒ جیسے سرکردہ علماء نے اس کے لیے مشترکہ طور پر جنگ لڑی۔ اس لیے اگر آج کے شدید بین الاقوامی دباؤ اور عالمی سطح کی مسلسل مخالفت کے باوجود پاکستان دستوری طور پر ایک اسلامی ریاست کے طور پر قائم ہے اور کفر و استعمار کی آنکھوں میں مسلسل کھٹک رہا ہے تو یہ قومی سیاست میں علماء کرام کے فریق بننے کی وجہ سے ہے۔ لہذا اس ایک بنیادی اور اصولی فائدہ کے لیے ان نقصانات کو برداشت کیا جا سکتا ہے جو اس سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے سامنے آرہے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں یہ فائدہ نقصانات پر بھاری ہے۔

غامدی صاحب نے فرمایا تھا کہ جہاد کا حق صرف اسلامی حکومت کو ہے، اس کی طرف سے اعلان کے بغیر کوئی جنگ جہاد نہیں کہلا سکتی، اس لیے مختلف جہادی گروپوں کی طرف سے کی جانے والی جنگ شرعاً جہاد نہیں ہے۔ راقم الحروف نے اس پر عرض کیا کہ بلاشبہ کسی ملک یا قوم کے خلاف اعلان جنگ مسلمان حکومت ہی کا حق ہے لیکن جب کسی مسلمان آبادی پر کافروں کا جابرانہ تسلط قائم ہو جائے اور مسلمانوں کی حکومت اس تسلط کے خلاف مزاحمت کے لیے تیار نہ ہو یا اس میں مزاحمت کی سکت نہ رہے تو پھر آزادی کے حصول کے لیے جہاد کا آغاز کسی حکومت کے اعلان یا اجازت پر موقوف نہیں رہے گا۔ اور ایسے موقع پر اگر علماء مسلمان معاشرہ کی قیادت کرتے ہوئے کافر قوت کے تسلط کے خلاف مزاحمت کا اعلان کریں گے تو وہ شرعاً جہاد کہلائے گا۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے برصغیر پاک و ہند کے جہاد آزادی، الجزائر کے جہاد آزادی، اور افغانستان کے جہاد کے ساتھ ساتھ تاتاریوں کی یورش کے خلاف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے اعلان جہاد کا بھی حوالہ دیا کہ ماضی میں علماء کرام نے ایسے مراحل میں جہاد کا اعلان کیا ہے اور ان کی جدوجہد کو شرعی جہاد ہی کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

۲۔ قطعی اور ظنی اصولوں میں فرق

اس کے جواب میں معز امجد نے طویل بحث کی ہے اور میں اس کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ انہوں نے اصولی طور پر میرے طرز استدلال سے اختلاف کیا ہے کہ میں نے امت کے اہل علم کے تعامل سے استدلال کر کے غلطی کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> ”عام انسانوں کی بات بے شک مختلف ہوگی مگر مولانا محترم جیسے اہل علم سے ہماری توقع یہی ہے کہ وہ اہل علم کے عمل سے شریعت اخذ کرنے کی بجائے شریعت کی

روشنی میں اس عمل کا جائزہ لیں۔ اگر شریعت اسلامی کے بنیادی ماخذوں یعنی قرآن و سنت میں اس عمل کی بنیاد موجود ہے تو اسے شریعت کے مطابق اور اگر ایسی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے تو بغیر کسی تردد کے اسے شریعت سے ہٹا ہوا قرار دیں۔“

میرے نزدیک ہمارے درمیان نقطۂ نظر کے اختلاف کا بنیادی نکتہ اور اصل موڑ یہی ہے۔ اگر یہ واضح ہو جائے تو باقی معاملات کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں رہے گا۔ اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ شریعت کے اصول دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو قرآن کریم اور سنت نبویؐ سے دلالت صریحہ اور قطعی ثبوت کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہیں۔ یعنی ان کے مفہوم کے تعین کے لیے کسی استدلال اور استنباط کی ضرورت نہیں اور ثبوت میں بھی کوئی ابہام نہیں ہے۔ اور جو فقہاء کی اصطلاح میں صریح الدلالہ اور قطعی الثبوت کہلاتے ہیں ان کے بارے میں تو کسی درجہ میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انہیں ہر بات پر فوقیت حاصل ہے اور کسی بھی شخصیت کے موقف یا طرز عمل کو اس پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم کی سورۃ التحریم کے مطابق خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حلال و حرام کی واضح اشیاء میں اپنی رائے اور مرضی اختیار کرنے کا حق حاصل نہیں دیا گیا۔ لیکن شریعت کے جن اصول واحکام کے ثبوت اور استدلال و استنباط کا مدار شخصیات پر ہے اور وہ شخصیات کے استدلال و استنباط ہی کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں ان کے بارے میں بنیادی حیثیت اور ترجیح شخصیات کو حاصل ہے۔ اور شخصیات کے علم و فضل اور درجات میں تفاوت کا اثر ان کے استنباط کردہ اصول و احکام پر لازماً پڑے گا۔ یہ ایک بدیہی بات ہے جس سے محترم غامدی اور ان کے لائق احترام شاگردان گرامی کو بھی شاید اختلاف نہیں ہوگا۔

سادہ سی بات ہے کہ اگر اصول نے شخصیات کو جنم دیا ہے تو اصول کو ان پر بالادستی ہوگی، اور اگر شخصیات نے اصول قائم کیے ہیں اور اصول کا اپنا وجود ان شخصیات کے استدلال و استنباط کا رہین منت ہے تو ان اصول کو شخصیات پر بالاتر قرار دینے اور ان کے مقابلہ میں شخصیات کی قطعی طور پر نفی کر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بلکہ خود قرآن کریم کی منشا کو سامنے رکھا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے اصول بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اتباع کے بارے میں شخصیات کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔ سورۃ الفاتحہ قرآن کریم کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ تلاوت کی جانے والی سورت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں صراط مستقیم پر چلتے رہنے کی توفیق مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے اور ”صراط مستقیم“ کی

وضاحت میں صراط الذین انعمت علیھم فرما کر شخصیات ہی کو آئیڈیل بنانے کا راستہ دکھایا ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرہ کی ایک آیت میں صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ اگر باقی لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسا ایمان تم لائے ہو تو وہ ہدایت پائیں گے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ ایمان کے معاملہ میں صحابہ کرامؓ کی شخصیات کو معیار اور آئیڈیل قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اہل علم اور شخصیات سے شریعت اخذ کرنے کی بات نہ تو قرآن کریم کی منشا کے خلاف ہے اور نہ ہی عقل و منطق اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ شریعت کے جو احکام و اصول اہل علم اور شخصیات کے استدلال و استنباط کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں، ان احکام و اصول کی ترجیحات بھی اہل علم اور شخصیات کے درمیان موجود ترجیحات کے ساتھ ساتھ اپنی ترتیب قائم کریں گی۔ اور اسی ترتیب و ترجیح کے فہم و ادراک اور تشکیل و اطلاق کا نام فقہی تدبر ہے جس نے فقہائے امت کو اہل علم کے دیگر تمام طبقات پر فوقیت اور امتیاز عطا کیا ہے۔ شریعت کے ہر حکم کو اس کی صحیح جگہ پر رکھنے اور اس سے صحیح طور پر استفادہ کے لیے ان ترجیحات کا لحاظ ناگزیر ہے ورنہ شریعت پر عمل کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی سامنے رہنی چاہیے کہ ہر دور میں اس دور کی ضروریات کے مطابق اصول وضع کیے گئے ہیں اور انہی ضروریات کے تحت ان کا اطلاق بھی ہوا ہے۔ اس لیے قطعی اور صریح اصولوں کو بالاتر رکھتے ہوئے ظنی اور استدلالی اصولوں کو ان کی ضروریات کے دائرہ تک محدود رکھنا اور انہیں وضع کرنے والے اہل علم اور شخصیات کی ترجیحات کے معیار پر ان کی ترتیب قائم کرنا بھی شریعت کا تقاضا ہے۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں بعض اصولی حضرات ٹھوکر کھاتے ہیں کیونکہ جب وہ خود اپنے وضع کردہ اصولوں کا اطلاق پوری امت پر کرنے لگتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ امت کا بیشتر حصہ انہیں اپنے اصولوں پر عمل کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ اور ان کی اصول پرستی انہیں اس بات پر ابھارنے لگتی ہے کہ وہ اپنے قائم کردہ اصولوں کی لاٹھی اٹھا کر اس کے ساتھ پوری امت کے اہل علم کو ہانکنے لگ جائیں۔

اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ایک عملی مثال دینا چاہوں گا۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک دوست میرے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ نے حضرت امام بخاریؒ کی طرح احادیث نبویؐ کے جمع کرنے اور ان کی صحت

کے اصول قائم کرنے پر کوئی کام کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرا یہ جواب ان کے لیے حیرت کا باعث بنا اور انہوں نے قدرے غصے سے فرمایا کہ کیا امام ابوحنیفہؒ کو احادیث کی ضرورت نہیں تھی؟ میں نے جواب دیا کہ احادیث کی ضرورت تھی لیکن ان پر امام بخاریؒ کی طرز کے کام کی انہیں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پھر میں نے اس کی وضاحت کی کہ امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ یہ صحابہ کرامؓ کا آخری دور تھا اور کوفہ صحابہ کرامؓ کا مرکز تھا۔ اس لیے امام صاحبؒ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے صغار صحابہؓ اور کبار تابعینؒ کو دیکھا اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی وفات ۱۵۶ھ میں ہوئی اور ان کے دور میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث و سنن کی روایت میں اتنے واسطے نہیں ہوتے تھے کہ ان کی چھان بین کی زیادہ ضرورت پڑتی۔ اس لیے انہوں نے ایک دو قابل اعتماد واسطوں سے جو روایات ملیں انہی کی بنیاد پر اپنی فقہ کی عمارت کھڑی کر دی۔ جبکہ امام بخاریؒ کی ولادت ۱۹۴ھ اور وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی۔ اس وقت احادیث کی روایت میں چار پانچ واسطے آ چکے تھے اور ان کی صحت و ضعف کے لیے سخت اصول قائم کرنے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ اس لیے امام بخاریؒ نے اس ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اصول قائم کیے اور ان کی بنیاد پر صحیح احادیث کا ایک منتخب ذخیرہ امت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس لیے امام بخاریؒ کے وضع کردہ اصول کی اہمیت اپنی جگہ پوری طرح مسلم ہے لیکن ان اصولوں کا پون صدی پہلے پر موثر بہ ماضی اطلاق کر کے امام ابوحنیفہؒ کو ان کا پابند بنانا نہ شریعت کا تقاضا ہے اور نہ عقل و دانش اس کی متحمل ہے۔

اس پس منظر میں محترم جاوید غامدی صاحب اور ان کے رفقاء سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ حضرت مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے استدلال و استنباط اور ان کے قائم کردہ اصولوں کی اہمیت سے انکار نہیں اور اہل علم کے درمیان مسلمہ حدود کے دائرہ میں ان سے استفادہ کی ضرورت سے بھی ہم صرف نظر نہیں کر رہے۔ مگر ان اصولوں کا اطلاق ماضی کے ہر دور کے اہل علم پر کر کے پوری امت کے اہل علم کے تعامل اور مسلسل طرز عمل کی نفی کر دینا بھی دانش مندی کا تقاضا نہیں۔

اس سلسلہ میں تیسری گزارش ہے کہ جس کی طرف ہم اپنے سابقہ مضامین میں اصولی فقہاء اور عملی فقہاء کی اصطلاح کے ساتھ اشارہ کر چکے ہیں کہ اصول وضع کرنا ایک مختلف

عمل ہے اور سوسائٹی کے عملی مسائل پر ان کا اطلاق کر کے قواعد و احکام مستنبط کرنا اس سے مختلف عمل کا نام ہے۔ آج کی اصطلاح میں اسے دستور سازی اور قانون سازی کے اصولی کام اور سوسائٹی میں عملی طور پر اس کے نفاذ کے عدالتی عمل کے درمیان فرق سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے بسا اوقات مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور عملی مشکلات کا لحاظ نہ کر کے صرف اصول کی بنیاد پر فیصلے کرتے چلے جانے سے ایسی الجھنیں جنم لیتی ہیں جن کا حل بظاہر مشکل نظر آنے لگتا ہے۔ اس اصولیت محضہ کا اظہار سب سے پہلے خوارج نے کیا تھا جنہوں نے اپنے ذوق کے مطابق کچھ اصول وضع کیے اور ان اصولوں پر اس قدر سختی دکھائی کہ بعض حضرات نے صحابہ کرامؓ تک کی تکفیر کر ڈالی۔ مثلاً انہوں نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان بپا ہونے والی صفین کی جنگ مین حضرت علیؓ کی طرف سے تحکیم پر راضی ہونے سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے لشکر سے علیحدگی اختیار کی۔ ان کی بغاوت اور علیحدگی کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ان کے پاس حضرت علیؓ کے نمائندہ کے طور پر گفتگو کے لیے گئے تو امام نسائی کی "سنن کبری" کی روایت کے مطابق ان خوارج نے حضرت علیؓ پر جو اعتراضات کیے ان میں ایک یہ تھا کہ اگر حضرت معاویہؓ اور ان کے رفقاء مسلمان ہیں تو ان کے خلاف جنگ لڑنا جائز نہیں ہے۔ اور اگر وہ مسلمان نہیں ہیں تو جنگ میں ان کے قیدیوں کو غلام کیوں نہیں بنایا گیا؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جنگ تو ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ بھی ہوئی تھی، کیا تم (نعوذ باللہ) انہیں لونڈی بنانا پسند کرو گے؟ اس کا جواب خوارج کے پاس کوئی نہیں تھا چنانچہ چھ ہزار خوارج میں سے دو ہزار افراد اس بات پر ان کا ساتھ چھوڑ کر حضرت علیؓ کے کیمپ میں واپس آ گئے تھے۔

اس لیے اصول، اہل علم اور شخصیات میں توازن کے حوالہ سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ

1. قرآن و سنت کے بیان کردہ قطعی اور صریح اصولوں کو ہر چیز پر فوقیت اور بالاتری حاصل ہے۔

2. جو اصول اہل علم نے قرآن و سنت کی روشنی میں خود مستنبط کیے ہیں ان میں اصل مدار شخصیات پر ہے اور شخصیات کی باہمی ترجیحات ان کے وضع کردہ اصولوں میں بھی کارفرما ہوں گی۔

3. ظنی اور استنباطی اصولوں اور سوسائٹی میں ان کے اطلاق و تطبیق کی عملی مشکلات دونوں کو سامنے رکھ کر احکام و ضوابط طے کیے جائیں گے۔

4. بعد میں پیش آنے والی ضروریات کے لیے وضع کیے جانے والے اصولوں کا موثر بہ ماضی اطلاق ضروری نہیں ہوگا اور نہ ہی ماضی کے معاملات کا ان کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے گا۔

5. صحابہ کرامؓ کا دور چونکہ ان سب استنباطات، استدلالات اور اجتہادات سے مقدم ہے اور وہ چشمہ نبوت سے براہ راست فیض یاب ہوئے ہیں، اس لیے قرآن و سنت کے مفہوم و مصداق کے تعین اور بعد میں آنے والے اصولوں کے تعارض و تضاد کے حل کے لیے ان کا تعامل حتمی حجت ہے۔

۳- اعلان جہاد کے لیے حکومت کی شرط

اس اصولی بحث کے بعد میں جہاد کے مسئلہ کی طرف آتا ہوں جس میں ہمارے درمیان اختلاف کا نکتہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے ملک یا آبادی پر کفار کا تسلط قائم ہو جائے تو کیا مسلمان آبادی یا ان کے علماء کسی باضابطہ حکومت کے قیام کے بغیر اس تسلط کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ ایسی صورت میں علماء کرام کو جہاد کے اعلان کا حق حاصل ہے اور ان کے اعلان کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگ شرعاً جہاد کہلائے گی۔ جیسے جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف، الجزائر میں فرانسیسی استعمار کے تسلط کے خلاف، اور افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط کے خلاف آزادی کی جنگ علماء کے فتویٰ پر جہاد کے عنوان سے لڑی گئی ہے۔ مگر معز امجد ان میں سے کسی جنگ کو جہاد قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور انہوں نے جواب میں فرمایا ہے کہ قرآن کریم نے ان کے بقول مسلمانوں کی آبادی پر کافروں کے تسلط کی صورت میں دو ہی راستے بتائے ہیں۔ پہلا راستہ یہ کہ اگر ہجرت کا راستہ اور مقام موجود ہو تو وہ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ اور دوسرا یہ کہ اگر ہجرت قابل عمل نہ ہو تو صبر و شکر کر کے بیٹھے رہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حالات کی تبدیلی کا انتظار کریں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں سورۃ النساء، سورۃ الانفال اور سورۃ الاعراف کی بعض آیات کریمہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ وہ مسئلہ کی نوعیت ہی کو سرے سے نہیں سمجھ سکے۔ کیونکہ ان آیات کریمہ میں ان مسلمانوں کے لیے احکام بیان کیے گئے ہیں جو کافروں کی سوسائٹی میں

مسلمان ہوگئے ہیں اور ان کے زیر اثر رہے ہیں۔ ان کے لیے حکم یہ ہے کہ اگر وہ وہاں سے ہجرت کر سکتے ہیں تو نکل جائیں ورنہ صبر و حوصلہ کے کے ساتھ حالات کی تبدیلی کا انتظار کریں۔ جبکہ ہم جس صورت پر بحث کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی پر باہر سے آکر کافروں نے تسلط جما لیا ہے اور مسلمان اکثریت پر کافر اقلیت کا جبر و اقتدار قائم ہوگیا ہے اس صورت میں محترم غامدی اور ان کے تلامذہ ہی مسلم اکثریت کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ اپنا علاقہ کافر غالبین کے حوالہ کر کے وہاں سے چلے جائیں یا ان کے جبر و ظلم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے جائیں۔ ورنہ ہمیں تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس سے برعکس رہنمائی ملتی ہے۔

یمن کا علاقہ جناب نبی اکرمؐ کے دور میں مسلم مملکت میں شامل ہوگیا تھا اور شہر بن باذانؓ کو رسول اللہؐ نے اپنی طرف سے وہاں کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ یمن کے مختلف علاقوں میں حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو موسی اشعریؓ، اور دوسرے عمال کا تقرر کیا تھا۔ مگر اسود عنسی نے نبوت کا دعوی کر کے صنعا پر چڑھائی کی اور شہر بن باذانؓ کو قتل کر کے یمن کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ مقتول گورنر کی بیوی کو زبردست اپنے حرم میں داخل کیا، یمن کے مختلف علاقوں سے جناب نبی اکرمؐ کے مقرر کردہ عاملوں کو نکال دیا، اور اس طرح یمن کا صوبہ اسلامی حکومت سے نکل کر کافروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس پر تین حضرات حضرت فیروز دیلمیؓ، حضرت قیس بن مکشوحؓ، اور حضرت دادویہؓ نے باہمی مشورہ کر کے گوریلا طرز جنگ پر شبخون مارنے کا پروگرام بنایا۔ مقتول مسلمان گورنر شہر بن باذانؓ کی بیوی سے جو اسود عنسی نے زبردستی اپنے حرم میں داخل کر رکھی تھی، ان تینوں حضرات نے رابطہ کر کے ساز باز کی جس کے تحت اس نے رات کو اسود عنسی کو بہت زیادہ شراب پلا دی، ان حضرات نے محل کی دیوار میں نقب لگا کر اندر داخل ہونے کا راستہ نکالا اور رات کی تاریکی میں اسود عنسی اور اس کے پہرہ داروں کو قتل کر کے اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ یہ گوریلا کاروائی تھی اور مسلح کاروائی تھی۔ اس میں معز امجد صاحب کو یقیناً کچھ اخلاقی خرابیاں نظر آرہی ہوں گی اور بلا ضرورت قتل و غارت بھی دکھائی دیتی ہوگی۔ لیکن عملاً یہ سب کچھ ہوا جس کے نتیجہ میں یمن پر مسلمانوں کا اقتدار دوبارہ بحال ہوا۔ اور جناب نبی اکرمؐ کو جب ان کے وصال سے صرف دو روز قبل وحی کے ذریعہ اس کارروائی کی خبر ملی تو آپؐ نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ کو یہ خوشخبری سنائی فاز فیروز کہ

فیروز اپنے مشن میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس کے بعد حضرت فیروز ویلمیؓ جب اس کامیابی کی خبر لے کر یمن سے مدینہ منورہ پہنچے تو جناب نبی اکرمؐ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رپورٹ خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ کو پیش کی اور انہوں نے اس پر اطمینان اور مسرت کا اظہار فرمایا۔

اس لیے محترم معز امجد صاحب سے عرض ہے کہ جن آیات کریمہ سے انہوں نے استدلال کیا ہے ان کا مصداق یہ نہیں ہے بلکہ اس کی عملی شکل وہی یمن والی ہے کہ جب کسی مسلمان ملک پر کافروں کا تسلط قائم ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو صورت بھی اس وقت کے حالات کی روشنی میں اختیار کر سکیں اس سے گریز نہ کریں۔ اور وہ کافر و ظالم قوت کے جابرانہ تسلط کے خلاف مزاحمت کی جو صورت بھی اختیار کریں گے وہ حضرت فیروز ویلمیؓ کی اس گوریلا کاروائی اور شبخون کی طرح جہاد ہی کہلائے گی۔

۴- زکوۃ کے علاوہ ٹیکسیشن

زکوۃ کے بارے میں جناب جاوید غامدی نے فرمایا تھا کہ اسلامی مملکت میں اجتماعی معیشت کے نظام کو چلانے کے لیے زکوۃ ہی کا نظام کافی ہے اس کے علاوہ اسلام نے حکومت کو اور کوئی ٹیکس لگانے کی اجازت نہیں دی۔ اس پر میں نے عرض کیا تھا کہ یہ درست ہے کہ اگر زکوۃ اور دیگر شرعی واجبات کا نظام صحیح طور پر قائم ہو جائے تو معاشرہ کی اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اور کوئی ٹیکس لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ٹیکسوں کا مروجہ نظام سراسر ظالمانہ ہے جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی وقت قومی ضروریات زکوۃ اور بیت المال کی دیگر شرعی مدات سے پوری نہ ہوں تو کیا حکومت وقتی ضرورت کے لیے کوئی اور ٹیکس جائز حد تک لگانے کی مجاز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ممانعت کی کوئی دلیل ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اگر کوئی دلیل غامدی صاحب کے پاس موجود ہو تو وہ رہنمائی فرمائیں۔

اس کے جواب میں معز امجد صاحب نے قرآن کریم کی بعض آیات اور جناب نبی اکرمؐ کے بعض ارشادات سے استدلال کیا ہے مگر یہ استدلال ان کے موقف کی تائید نہیں کرتا۔ مثلاً انہوں نے سورۃ التوبہ کی آیت ۵ کا حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں، نماز کا اہتمام کریں، اور زکوۃ ادا کریں تو فخلوا سبیلھم ان کی راہ چھوڑ دو۔ یہاں ان کی راہ چھوڑ دو

سے انہوں نے استدلال کیا ہے کہ ان سے اور کوئی مالی تقاضہ کرنا درست نہیں ہو گا۔ مگر اس کی وضاحت میں مسلم شریف کی جو روایت انہوں نے پیش کی ہے اس میں جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں سے اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور میری رسالت کی شہادت دے دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور جب وہ ایسا کریں تو ان کی جانیں اور ان کے اموال مجھ سے محفوظ ہو جائیں گے۔ یہاں اموال کے محفوظ ہو جانے کا مفہوم معز امجد صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ ان سے مزید کوئی مالی تقاضہ نہیں ہو سکے گا۔ اگر ان کے بیان کردہ مفہوم کو صحیح سمجھ لیا جائے تو بھی اس روایت میں الا بحقھا کی استثناء موجود ہے جو خود انہوں نے بھی نقل کی ہے۔ جس سے یہ بات متعیّن ہو جاتی ہے کہ اسلام کے حقوق کے حوالہ سے زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال کا تقاضہ مسلمانوں سے کیا جا سکتا ہے۔ پھر انہوں نے ابن ماجہ کی یہ روایت پیش کی ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ترمذی کے حوالہ سے جناب نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد بھی نقل کر دیا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق موجود ہے۔

اس لیے میرے خیال میں یہ آیات اور روایات غامدی صاحب کے موقف کی بجائے ہمارے موقف کی تائید کرتی ہیں کہ ضرورت پڑنے پر زکوٰۃ کے علاوہ مزید ٹیکس بھی اسلامی حکومت کی طرف سے عائد کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی ”اسلامی معاشیات“ اور مولانا حفظ الرحمان کی ”اسلام کا اقتصادی نظام“ کا حوالہ دوں گا جس میں انہوں نے ”ضرائب“ اور ”نوائب“ کے عنوان سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ۔۔۔۔۔ امام ابن حزم اندلسیؒ اور فقہائے احناف میں سے صاحب ہدایہؒ اور علامہ ابن حاتمؒ صاحب فتح القدیر کے ارشادات و تصریحات کے ساتھ یہ بات واضح کی ہے کہ اجتماعی ضروریات مثلاً نہر کھودنے، دفاعی تیاریوں، فوج کی تنخواہ، اور قیدیوں کی رہائی وغیرہ کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ مزید ٹیکس لگائے جا سکتے ہیں۔ البتہ ہنر مندوں اور کاروباری لوگوں پر ان کے ہنر یا کاروبار کے حوالہ سے جو ٹیکس لگائے جاتے ہیں وہ ظالمانہ ہیں اور شریعت میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی علامہ ابن ہمام حنفیؒ لکھتے ہیں کہ

”ہمارے زمانے میں یہ عموماً جو محصول وصول کیے جاتے ہیں چونکہ یہ ظلماً وصول کیے جاتے ہیں اس لیے ظلم کے ازالہ کا جتنا کسی کو موقع مل سکے اس کے لیے

بہتر ہے۔‘‘

چنانچہ ٹیکسوں کے باب میں یہ بحث تو موجود ہے کہ کون سا ٹیکس جائز ہے اور کونسا ناجائز۔ اور یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہے کہ وصولی کا کون سا طریقہ صحیح ہے اور کون سا غلط ہے۔ لیکن اصولی طور پر قومی ضروریات کے لیے زکوۃ کے علاوہ اسلامی حکومت جائز حد تک دیگر ٹیکس بھی لگا سکتی ہے اور اس کی کوئی واضح شرعی ممانعت موجود نہیں ہے۔

۵- فتوی کا آزادانہ حق

فتوی کے بارے میں غامدی صاحب نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ علماء کرام کے آزادانہ فتوے خرابیاں پیدا کر رہے ہیں اس لیے فتوی دینے کے حق کو ریاستی قوانین کے تابع ہونا چاہیے۔ اسی پس منظر میں انہوں نے بنگلہ دیش ہائی کورٹ کے اس حالیہ فیصلے کو صدی کا بہترین فیصلہ قرار دیا ہے جس میں علماء کرام کے آزادانہ طور پر فتوی دینے کے حق کو سلب کر لینے کی بات کی گئی ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا تھا کہ غامدی صاحب کا یہ ارشاد فتوی کے مفہوم اور اس حوالہ سے امت کے اجتماعی تعامل کے منافی ہے جس پر ہر دور میں جمہور علماء کا عمل رہا ہے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ بعض غیر ذمہ دار حضرات کے فتوے خرابیوں کا باعث ضرور بن رہے ہین جس طرح عدالتوں میں ہر سطح پر رشوت اور بدعنوانی عام ہو جانے پر سب ججوں سے فیصلہ کرنے کا حق واپس لینے کی بات قرین انصاف نہیں ہے اسی طرح فتوؤں میں غیر ذمہ دارانہ رجحان بڑھنے پر تمام علماء کرام سے فتوی کا حق سلب کر لینا بھی قرین قیاس نہیں ہے۔

اس کے جواب میں معز امجد صاحب نے طویل بحث کی ہے جس کا خلاصہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ علماء کرام کے جو فتاوی پارلیمان اور عدالت کے معاملات میں رخنہ ڈالتے ہیں وہ اجتماعی نظم میں خرابی پیدا کرتے ہیں ان پر ضرور پابندی عائد ہونی چاہیے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات فتوی کے مفہوم اور اس کے دائرہ کار دونوں کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ فتوی کہتے ہی کسی مسئلہ پر آزادانہ شرعی رائے کو ہیں۔ اگر کسی مسئلہ پر کوئی حاکم انتظامی فیصلہ دے گا تو وہ شرعی اصطلاح میں ’’امر‘‘ کہلائے گا۔ اور کوئی عدالت فیصلہ صادر کرے گی تو اسے ’’قضا‘‘ کہا جائے گا۔ جبکہ اگر کسی سوال پر کوئی عالم دین اپنے علم و تجربہ کی روشنی میں شرعی رائے دے گا تو وہ ’’فتوی‘‘ قرار پائے گا، اس میں سے اگر آزادانہ رائے کا عنصر نکال دیا جائے تو وہ سرے سے فتوی ہی نہیں رہتا۔ وہ یا تو حکم بن جائے گا یا قضا

کے زمرہ میں شامل ہو جائے گا۔ اس لیے فتویٰ کے طور پر باقی رکھنے کا ناگزیر تقاضہ ہے کہ اس کی آزادی بھی قائم رہے۔

اسی طرح فتویٰ کا دائرہ کار صرف شرعی رائے کا اظہار ہے، کسی انتظامی حکم کو منسوخ کرنے یا کسی عدالت کے فیصلے کو نامعلوم قرار دینے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے وہ کسی صورت میں بھی انتظامیہ اور عدلیہ کے لیے چیلنج نہیں بن سکتا اور نہ ہی اس سے اجتماعی نظام میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اجتماعی نظم میں خرابی وہاں پیدا ہوگی جہاں انتظامیہ اور عدلیہ لوگوں کی شرعی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہیں گی اور لوگ ان سے مایوس ہو کر علماء کرام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں گے جیسا کہ آج کل اکثر مسلم ممالک میں ہو رہا ہے۔ مگر اس کی ذمہ داری فتویٰ کے نظام پر نہیں بلکہ عدالتی اور انتظامی سسٹم پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کسی مسلم معاشرہ کا اجتماعی نظم اگر اپنے افراد کو شریعت کے مطابق عدالتی اور انتظامی احکامات فراہم نہیں کر رہا اور مسلمان اپنے دین پر عملدرآمد کے خواہش مند ہیں تو عام مسلمانوں کو شرعی مسئلہ پوچھنے اور علماء کو اس کا جواب دینے کے حق سے محروم کرنا اس سسٹم کو مستحکم کرنے کے مترادف ہوگا جو ایک مسلمان معاشرہ کو غیر اسلامی نظام کے تابع رکھنا چاہتا ہے۔ جس کی کم از کم جاوید احمد غامدی صاحب جیسے صاحب علم سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً بنگلہ دیش کا معاملہ لے لیجیے جہاں دستوری طور پر سیکولر نظام نافذ ہے اور عدالتی سسٹم بھی اسی نظام کے تابع ہے۔ اس لیے اس سسٹم میں علماء کو پابند کرنا کہ وہ کسی معاملہ میں شرعی رائے کا اظہار بھی ریاستی قوانین کے دائرہ سے ہٹ کر نہ کریں، ایک سیکولر نظام کو تقویت دینے اور دینی اقدار کو مزید کمزور کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اکثر مسلم ممالک میں اس وقت عملاً سیکولر نظام نافذ ہے۔ خود ہمارے ہاں پاکستان میں بھی دستوری طور پر اسلامی ریاست ہونے کے باوجود عملی نظام کی بنیادی سیکولر ہیں۔ حتیٰ کہ ہماری عدالتوں میں بھی برطانوی دور کا نوآبادیاتی نظام بدستور چلا آ رہا ہے۔ بلکہ ترکی کی مثال اس سے زیادہ واضح ہے کہ وہاں شرعی احکام پر عمل کرنے کی ہی سرے سے ممانعت ہے۔ ان ممالک میں اگر کوئی مسلمان شہری قرآن و سنت کے احکام اور شرعی ضوابط کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ علماء کرام سے دریافت کر کے اس کے مطابق عمل کرے۔ اور اکثر مسلم ممالک میں شرعی احکام و قوانین کی وضاحت اور کسی حد

تک ان پر عملدرآمد کا یہی ایک آخری ادارہ باقی رہ گیا ہے۔ کیا محترم جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے شاگردان گرامی مولوی کی مخالفت اور اسے نیچا دکھانے کے شوق میں سیکولر سسٹم کے مقابل اس آخری مورچے کو بھی گرا دینا چاہتے ہیں؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کا اسوۂ حسنہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۶ مارچ ۲۰۰۱ء)

یوں تو تمام انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والتسلیمات کی مبارک زندگیاں پوری نسل انسانی کے لیے مشعل راہ اور اسوۂ حسنہ ہیں لیکن سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بعد قرآن کریم میں جس شخصیت کی زندگی اور کردار کو بطور خاص اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے وہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔ جن کے بارے میں سورۃ الممتحنہ میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تمہارے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کی زندگیوں میں اسوۂ حسنہ (عمدہ نمونہ) ہے۔ اور اس تلقین کے ساتھ ان کے کردار کے جس پہلو کو اہمیت کے ساتھ اسی سورۃ میں اجاگر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے قوم کے اجتماعی کفر اور اس کفر پر ڈٹ جانے والوں سے واضح طور پر برأت کا اعلان کیا، اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی بھی بندگی و اطاعت کی جاتی تھی ان سب معبودوں اور خود ساختہ خداؤں سے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے قوم پر واضح کر دیا کہ جب تک تم ان جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک اللہ کی بندگی اور اطاعت پر نہیں آجاتے تمہارے ساتھ ہمارا دوستی کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ہم تمہارے اس نظام کو کسی حالت میں قبول کر سکتے ہیں۔ یہ سورۃ الممتحنہ کی اس آیت کریمہ کا مختصر مفہوم ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دے کر مسلمانوں کو ان کی پیروی کی تلقین کی گئی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے وہ جلیل القدر پیغمبر ہیں جن کی یاد مختلف حوالوں سے ہر سال پوری دنیا میں منائی جاتی ہے اور چونکہ ملت اسلامیہ حضرت ابراہیمؑ کے مشن اور دین کی اصل وارث ہے اس لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خاندان کی روایات کو زندہ رکھنے اور ان کی پیروی کرنے کا اہتمام بھی سب سے زیادہ وہی کرتی ہے۔

- بیت اللہ شریف کا طواف کیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے تعمیر کر کے وادی مکہ کو ایک بار پھر آباد کیا،

• صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی جاتی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ محترمہ حضرت سیدہ ہاجرہؒ نے اپنے شیر خوار پیاسے بچے حضرت اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں چکر کاٹے تھے،

• مقام ابراہیمؑ میں دو رکعت نفل ادا کر کے حضرت ابراہیمؑ کی یاد تازہ کی جاتی ہے،

• اور سب سے بڑھ کر منیٰ میں لاکھوں جانور ذبح کر کے حضرت ابراہیمؑ کی عظیم قربانی کو یاد کیا جاتا ہے جہاں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر جواں سال بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی گردن پر چھری رکھ کر اپنی طرف سے انہیں قربان کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس عظیم جذبۂ قربانی کو قبولیت سے نوازتے ہوئے چھری سے کاٹنے کی صلاحیت سلب کر لی، حضرت اسماعیلؑ زندہ رہے اور قربانی بھی ہو گئی۔ بلکہ ایسی قربانی ہوئی کہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کی یاد کو آنے والی نسلوں میں باقی رکھنے کا وعدہ فرما لیا اور اسی وعدۂ خداوندی کے مطابق نہ صرف ہر سال لاکھوں جانور منیٰ میں ذبح ہوتے ہیں بلکہ دنیا میں کروڑوں جانور حضرت اسماعیلؑ اور ان کے عظیم المرتبت باپ کی اس عظیم قربانی کی یاد میں قربان ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ ہم نے انہیں مختلف آزمائشوں میں ڈالا اور جب وہ ہر امتحان و آزمائش میں کامیاب ہوئے تو ہم نے انہیں نسل انسانی کا امام بنا دیا۔ اور یہ ان کی امامت ہی کا اظہار ہے کہ ہر آسمانی مذہب کے پیروکار خود کو حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کرنے میں فخر محسوس کرے ہیں۔ یہودی خود کو ابراہیمی کہتے ہیں اور عیسائیوں کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین عرب بھی ابراہیمی کہلاتے تھے اور انہوں نے خانہ کعبہ میں پرستش کے لیے جو بت نصب کر رکھے تھے ان میں حضرت ابراہیمؑ کا مجسمہ بھی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن کرم میں ان سب دعوؤں کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ مشرک اور بت پرست نہیں تھے بلکہ مؤحد اور بت شکن تھے، اس لیے ان کے دین کے وارث مسلمان ہیں جو بت پرستی سے نفرت کرتے ہیں اور توحید خداوندی کے علمبردار ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم قربانیوں اور آزمائشوں میں ایک بڑی آزمائش یہ تھی جس کا ذکر قرآن کریم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ وہ ظلم، کفر اور شرک پر قائم سوسائٹی اور

قوم کے خلاف تن تنہا کھڑے ہو گئے اور توحید خداوندی کا پرچم بلند کیا۔ ان کی دعوت صرف سمجھانے تک محدود نہیں رہی بلکہ قوم کے اجتماعی کفر کو کھلے بندوں چیلنج کیا، انہیں لاجواب کیا اور خود اپنی قوم کے بت خانے میں گھس کر بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ قرآن کریم حضرت ابراہیمؑ کی اس بت شکنی کے بعد قوم کی پنچائیت کے سامنے ان کی پیشی کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ جب قوم کے سرداروں نے سوال کیا کہ اے ابراہیمؑ! ہمارے خداؤں کا یہ حشر تم نے کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کے درمیان یہ بڑا بت جو سلامت کھڑا ہے اس نے کیا ہوگا، اور تم خود ان سے ہی کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ ان کا یہ حشر کس نے کیا ہے؟ پنچائیت والوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور سب کے سب سر جھکائے یہ کہہ رہے تھے کہ اے ابراہیمؑ! تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے یہ خدا کلام نہیں کیا کرتے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اسی لمحے کا انتظار تھا، فوراً گویا ہوئے کہ افسوس ہے تم اور تمہارے ان معبودوں پر، کیا اب بھی تم سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو؟

اور وہ مکالمہ اس سے بھی بڑھ کر تھا جو شاہی دربار میں نمرود کے ساتھ ہوا جو وقت کا بادشاہ تھا۔ اس کا دعوی تھا کہ خدائی اختیارات اس کے پاس ہیں اور وہ موت و حیات کا مالک ہے۔ مگر جب حضرت ابراہیمؑ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ میرا رب سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے، تیرے پاس اگر خدائی اختیارات ہیں تو سورج کو مغرب سے طلوع کر کے دکھاؤ۔ قرآن کریم کا کہنا ہے کہ نمرود اس سوال پر مبہوت و ششدر ہو کر رہ گیا اور اس کے تمام تر جاہ و جلال، لاؤ لشکر اور کروفر کے باوجود فتح و کامرانی حضرت ابراہیمؑ کے حصے میں آئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور مشاہدات و محسوسات کی زبان کا دور تھا اور ہر بات کو اسی معیار پر سمجھا اور پرکھا جاتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی قوم کے عام لوگوں کے سامنے، پنچائیت کے سامنے اور پھر بادشاہ وقت کے سامنے اسی زبان میں گفتگو کی۔ انہوں نے بتوں کے ٹوٹ جانے اور کلام نہ کرنے کو، ستاروں اور چاند کے ڈوب جانے کو، اور سورج کے مشرق سے طلوع ہونے کے کھلے مشاہدات کو اللہ تعالی کی وحدانیت پر اپنے استدلال کی بنیاد بنایا اور قوم کے ہر طبقے کو خود اس کی زبان میں لاجواب کر دیا۔ اس دور میں مشاہدات کی زبان کے غلبے کا یہ عالم تھا کہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق خود حضرت ابراہیمؑ نے

بھی اللہ تعالیٰ سے درخواست کر دی کہ وہ انہیں اس بات کا مشاہدہ کرائیں کہ مردوں کو زندہ کیسے کیا جاتا ہے۔

اس لیے جہاں حج، طواف، سعی، قربانی اور مقام ابراہیم کے نوافل حضرت ابراہیمؑ کی یاد کو تازہ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نسبت کا اظہار ہیں وہاں کفر و ظلم کے اجتماعی نظام کے خلاف صف آراء ہونا اور منطق و استدلال کے مروجہ اسلوب کو اختیار کر کے کفر و باطل کو لاجواب کرنا بھی سنت ابراہیمیؑ ہے۔ اور قرآن کریم نے اسی سنت ابراہیمیؑ کو سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اور زیادہ نمایاں کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

رجم کی شرعی حیثیت اور غامدی صاحب

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۵ فروری ۲۰۰۱ء)

ہم محترم جاوید احمد غامدی صاحب کا یہ ارشاد گزشتہ کالم میں پیش کر چکے ہیں کہ سنت ان کے نزدیک دین ابراہیمیؑ کی کسی ایسی روایت کے تسلسل کا نام ہے جسے جناب نبی اکرمؐ نے بھی مناسب ترمیم و اضافہ کے ساتھ باقی رکھا ہو۔ ان کے اس ارشاد کی کسوٹی پر ہم رجم کی شرعی حیثیت کے مسئلہ کو پرکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ بات واضح کر سکیں کہ غامدی صاحب محترم اور ان کے رفقاء رجم کے معاملہ میں خود اپنے قائم کردہ اصول پر قائم نہیں رہ سکے۔

رجم کے لفظی معنی سنگسار کرنا ہے یعنی کسی شخص کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دینا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں متعدّد جرائم کی شرعی سزا کے طور پر بطور قانون رائج تھا۔ مثلاً:

شرک اور بت پرستی کے لیے سنگسار کرنے کی سزا تھی۔ (بحوالہ استثناء ۱۷/۷)

ہفتہ کے دن کی بے حرمتی پر سنگسار کی سزا تھی۔ (گنتی ۳۶-۱۵/۳۲)

جادوگر کے لیے سنگسار کی سزا تھی۔ (احبار ۲۰/۲۷)

اللہ تعالیٰ کی توہین پر سنگسار کی سزا تھی۔ (احبار ۱۴-۲۴/۱۳)

غیر اللہ کی نذر ماننے والے کے لیے سنگسار کی سزا تھی۔ (احبار ۲-۲۰/۱)

اسی طرح شادی شدہ مرد یا عورت کے زنا کا مرتکب ہونے پر بھی اس کے لیے شرعی سزا یہ تھی کہ اسے برسرِعام سنگسار کر دیا جائے۔ چنانچہ توریت کی کتاب استثناء باب ۲۲ آیت ۲۲ میں ہے کہ

”اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے ہوئے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں، یعنی وہ مرد بھی جس نے اس عورت سے صحبت کی اور وہ عورت بھی۔“

اس کی تائید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں بھی ہے جیسا کہ انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۳ میں ہے کہ

”اور فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی، اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا اے استاذ! یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے، توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں پس تو اس عورت کے بارے میں کیا کہتا ہے؟“

اس کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دین ابراہیمیؑ کی اس مسلسل روایت کی توثیق فرمائی۔ چنانچہ امام بخاریؒ صحیح بخاری کی کتاب الحدود میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ روایت بخاری شریف کے پانچ چھ دیگر مقامات میں بھی موجود ہے اور ان سب روایات کو سامنے رکھتے ہوئے واقعہ کی ترتیب یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں ایک یہودی جوڑا یعنی مرد اور عورت زنا کے مجرم کے طور پر پیش کیے گئے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میں تمہاری کتاب کے مطابق اس مقدمہ کا فیصلہ کروں گا اور خود یہود کے علماء سے دریافت کیا کہ تمہارے ہاں اس جرم کی سزا کیا ہے؟ کہنے لگے کہ ہمارے ہاں زنا کی سزا یہ ہے کہ دونوں کا منہ کالا کر کے پھرایا جائے اور کوڑے مارے جائیں۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ کیا تمہارے دین میں اس کی سزا رجم (سنگسار کرنا) نہیں ہے؟ یہودی علماء نے جواب دیا کہ نہیں۔

اس پر مجلس میں موجود حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ جھوٹ بولتے ہیں، تورات میں زنا کی سزا سنگسار کرنا ہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ یہود کے بڑے علماء میں سے تھے جو مسلمان ہوگئے تھے اور صحابیِ رسول تھے۔ ان کے کہنے پر آپؐ نے یہودی علماء کو تورات لانے کے لیے کہا، تورات لائی گئی اور ایک یہودی عالم نے اس کا متعلقہ حصہ پڑھنا شروع کیا مگر اس طرح کہ رجم والی آیت پر اس نے ہاتھ رکھ دیا اور آگے پیچھے پڑھتا رہا۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ جھٹکا اور وہ آیت پڑھی جس میں زنا کی سزا رجم بیان کی گئی ہے۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے اس یہودی جوڑے کو سنگسار کر دیا۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلمانوں کے ایک سے زیادہ کیس آئے جن میں آپؐ نے زنا کے شادی شدہ مرتکب حضرات کو سنگسار کرنے کی سزا دی۔ پھر خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اس سزا کا تسلسل باقی رہا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق امیر المومنین حضرت عمرؓ نے خطبہ جمعہ میں اس بات کا اعلان کیا کہ کتاب اللہ کی رو سے شادی شدہ مرد یا عورت کے لیے زنا کی سزا رجم کرنا ہی ہے اور کوئی شخص اس کے بارے میں کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہو۔ پھر بخاری شریف ہی کی روایت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے دور خلافت میں زنا کے ایک کیس میں رجم کی سزا دی اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میں یہ سزا جناب نبی اکرمؐ کی سنت کے مطابق دے رہا ہوں۔ اس کے بعد امت کے جمہور اہل علم کا یہی موقف رہا ہے اور چودہ سو سال کے دوران جہاں بھی حدود شرعیہ نافذ ہوئی ہیں وہاں شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے زنا کی سزا یہی نافذ رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دین ابراہیمیؑ کی یہ روایت جس کا ذکر تورات میں موجود ہے، انجیل اس کی تصدیق کرتی ہے، جناب نبی اکرمؐ نے نہ صرف اس کی تصدیق کی بلکہ اسے بطور قانون نافذ کر کے اس کے تسلسل کو برقرار رکھا، اور امت میں بھی چودہ سو سال سے یہی سزا "شرعی حد" کے طور پر متعارف چلی آرہی ہے۔ پھر دین ابراہیمیؑ کا یہ تاریخی اور اجماعی تعامل آخر غامدی صاحب کے ہاں کیوں قابل قبول نہیں ہے؟

مشکلات و مصائب میں سنت نبویؐ

(مسجد بلال بن رباحؓ، متحدہ عرب امارات - ۱ جنوری ۲۰۰۱ء)

مدیر "الشریعہ" مولانا زاہد الراشدی نے ۱۲ جنوری سے ۲۱ جنوری ۲۰۰۱ء تک متحدہ عرب امارات کا تبلیغی دورہ کیا اور مختلف اجتماعات سے خطاب کرنے کے علاوہ سرکردہ شخصیات سے ملاقاتیں کیں اور متعدّد علمی و دینی مراکز میں گئے۔ انہوں نے یہ دورہ جمعیت طلباء اسلام پاکستان کے سابق راہنما جناب محمد فاروق شیخ اور جمعیۃ اہل السنۃ والجماعۃ متحدہ عرب امارات کے سیکرٹری اطلاعات حافظ بشیر احمد چیمہ کی دعوت پر کیا اور دوبئی، شارجہ، عجمان، ام القوین، راس الخیمۃ اور الفجیرۃ کی ریاستوں میں احباب سے ملاقاتیں کیں۔ اتفاق سے جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمن صاحب بھی ان دنوں متحدہ عرب امارات کے دورے پر تھے چنانچہ دونوں

راہ نماؤں نے دوبئی کی مسجد الغریر، مسجد الرفاعۃ اور مسجد بلال بن رباحؓ میں عام اجتماعات سے خطاب کیا اور حافظ بشیر احمد چیمہ کی طرف سے دیے گئے عصرانہ میں شرکت کی۔ مسجد بلال بن رباحؓ میں عام اجتماع سے مولانا زاہد الراشدی کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ (ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج کے اس اجتماع سے جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمن تفصیلی خطاب کریں گے۔ ان سے قبل مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کو کہا گیا ہے، اس لیے بطور تمہید چند باتیں آپ سے عرض کروں گا۔ مجھ سے پہلے ہمارے فاضل دوست مولانا مفتی عبد الرحمن نے اپنے خطاب میں افغانستان کی طالبان حکومت کا ذکر کیا ہے اور اسے درپیش مشکلات کا حوالہ دیا ہے۔ بلا شبہ طالبان آج کے دور کا مظلوم ترین طبقہ ہے جس کے خلاف کفر و نفاق کی پوری دنیا متحد ہو گئی ہے اور انہیں عالمی استعمار کے سامنے جھکانے یا مٹا دینے کے لیے منصوبے بن چکے ہیں۔

طالبان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کا صرف نام نہیں لیتے بلکہ اپنے ملک میں اسلامی احکام و قوانین کو عملی طور پر نافذ بھی کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ کسی قسم کے بین الاقوامی دباؤ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا اصل جرم یہی ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف پابندیوں اور ان کی اقتصادی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے، اس سے قبل بھی اہل حق اس قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے آرہے ہیں حتیٰ کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ مکرمہ کے کفار کی طرف سے اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا جب قریش کے باقی خاندانوں نے بنو ہاشم سے مطالبہ کیا تھا کہ محمدؐ کو قتل کے لیے ان کے حوالے کر دیا جائے لیکن بنو ہاشم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں قریش کے تمام قبائل نے مل کر بنو ہاشم کا سوشل بائیکاٹ کر دیا اور جناب رسول اللہؐ اپنے خاندان سمیت شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے۔

کفار کی طرف سے ان کے خلاف یہ پابندیاں عائد کی گئی تھیں کہ ان کے ساتھ لین دین نہیں ہوگا، ان سے رشتہ داری قائم نہیں کی جائے گی، ان کے پاس خوراک وغیرہ کی کوئی چیز نہیں جانے دی جائے گی اور ان کی معاشی ناکہ بندی ہوگی۔ اس دوران آنحضرتؐ اور ان کے ساتھیوں کو کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے اس ارشاد سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم درختوں کے پتے کھا کر گزارے کیا کرتے تھے اور

راستے میں پڑا ہوا خشک چمڑا اٹھا لیتے تھے اور اسے گرم پانی میں نرم کر کے چبا کر نگل لیا کرتے تھے۔

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وادی میں بھوکے بچے جب روتے چلاتے تو ارد گرد گھومنے والے مشرکین یہ آوازیں سن کو خوش ہوا کرتے تھے۔ اس کیفیت کے ساتھ نبی اکرمؐ اور ان کے خاندان کو محصور رہنا پڑا لیکن مشرکین کی عائد کردہ یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہ روک سکیں اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عمل نہ صرف جاری رہا بلکہ اس دوران حضرت ابوذر غفاریؓ اور بہت سے دیگر حضرات نے اسلام قبول کیا اور مشرکین کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی پابندیاں اور ناکہ بندی تین سال گزرنے کے باوجود کارگر نہیں ہو رہی تو کچھ سمجھ دار مشرکین نے آگے بڑھ کر وہ معاہدہ ختم کرا دیا۔ اس لیے آج بھی یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہیں روک سکیں گی اور اگر طالبان حکومت اپنے مشن اور پروگرام پر استقامت کے ساتھ گامزن رہی تو پابندیاں لگانے والوں کو بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا فیصلہ کس قدر غلط تھا۔

میں اس موقع پر اس صورت حال کے حوالہ سے آپ حضرات کی خدمت میں ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مشکلات و مصائب کے بارے میں اسلام کا مزاج کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ اس پر سیرت نبوی سے دو واقعات پیش کروں گا تاکہ یہ بات ہمارے سامنے رہے کہ مشکلات و مصائب کے دور میں سنت نبوی کیا ہے۔

ایک واقعہ تو اس وقت کا ہے جب آنحضرتؐ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت ظاہری کیفیت یہ تھی کہ خود اپنی جان کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا، رات کی تاریکی میں چھپ کر مکہ مکرمہ سے نکلے تھے، سفر کے لیے عام راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ خفیہ راستے سے سفر کر رہے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے ہمراہ تین دن تک غار ثور میں روپوش رہے اور راستہ میں چلتے ہوئے کسی کو اپنے نام بتانے میں بھی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہ تو ظاہری کیفیت تھی کہ بظاہر جان کا بچانا مشکل ہو رہا تھا لیکن اسی دوران سراقہ بن مالکؓ جناب نبی اکرمؐ کو راستہ میں ملے اور پکڑنے میں ناکام ہو کر امان چاہی تو حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ ”سراقہ، میں تمہارے ہاتھوں میں کسری بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں“

یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے قدرت کے ساتھ ساتھ حکمت کا بھی اظہار تھا جس میں ہمارے لیے دو سبق ہیں۔ ایک یہ کہ خدائی فیصلے ظاہری حالات پر نہیں ہوتے۔ ظاہری حالات جس قدر بھی ناموافق ہوں، اگر مسلمان کا تعلق اللہ تعالی کے ساتھ

مضبوط ہے اور اس کا ایمان و یقین پختہ ہے تو ظاہری حالات کی ناسازگاری اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ اور دوسرا سبق یہ ہے کہ مسلمان کو ظاہری حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، مشکلات کتنی ہی کیوں نہ ہوں، اسے اپنا ہدف سامنے رکھنا چاہیے اور ٹارگٹ میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے۔ اب دیکھیے کہ جناب رسول اللہؐ ظاہری طور پر کس حال میں ہیں کہ چھپ کر اور جان بچا کر مدینہ منورہ پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن نظر کہاں ہے؟ کسریٰ کے کنگنوں پر جو اس وقت کی ایک بڑی سلطنت کا حکمران تھا اور سراقہ بن مالکؓ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اسے کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے اور پھر یہ صرف ایک وقتی بات نہیں تھی بلکہ پیش گوئی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں فارس فتح ہوا، کسریٰ کے شاہی خزانے غنیمت کے مال میں مدینہ منورہ آئے، ان میں وہ کنگن بھی تھے جو کسریٰ بادشاہ دربار میں پہنا کرتا تھا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے سراقہ بن مالک کو بلایا اور یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے کسریٰ کے کنگن انہیں پہنائے کہ اگرچہ سونے کے کنگن پہننا مرد کے لیے جائز نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کو پورا کرنے کے لیے میں یہ کنگن کچھ دیر کے لیے تمہیں پہنا رہا ہوں۔ اس طرح رسول اکرمؐ نے ہمیں سبق دیا کہ مشکلات و مصائب اور حالات کی ناسازگاری سے گھبرا کر مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور اپنے ہدف اور ٹارگٹ میں کوئی کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔

دوسرا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بدر و احد کی جنگ میں ناکام و نامراد ہو کر قریش مکہ نے یہ بات سمجھ لی کہ وہ اکیلے جناب نبی اکرمؐ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے عرب قبائل سے گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں کے خلاف ان کا متحدہ محاذ بنوایا اور ایک بہت بڑا لشکر لے کر مدینہ منورہ کی طرف یلغار کر دی۔ یہ غزوۂ احزاب کی بات ہے جسے غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف عرب قبائل کا بہت بڑا متحدہ محاذ تھا اور دوسری طرف حضورؐ اور ان کے ساتھی تھے جن کی تعداد چھوٹے بڑے سب ملا کر ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ آپؐ نے مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے خندق کھودنے کا پروگرام بنایا اور خود صحابہ کرام کے ساتھ مل کر دن رات خندق کھودنے میں مصروف رہے۔ قرآن کریم نے سورۃ الاحزاب میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اہل ایمان کو یاد دلایا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب تم پر چاروں

طرف سے لشکر چڑھ دوڑے تھے، جب تمہاری آنکھیں خوف کے مارے پتھرا گئی تھیں، جب خوف کی شدت سے تمہارے دل سینوں سے اچھل کر حلق میں پھنس گئے تھے، جب تم اللہ تعالیٰ کی مدد کے بارے میں گمانوں کا شکار ہونے لگے تھے، جب مومنوں کو آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا اور جب ان پر شدید زلزلے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

یہ اس وقت کی ظاہری کیفیت تھی جس کا نقشہ قرآن کریم ان الفاظ میں کھینچ رہا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ بہت سے خندق کھودنے والوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا اور بعض لوگوں نے بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے حتی کہ ایک صاحب نے آنحضرتؐ کو اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ اس نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے تو آپؐ نے اپنے پیٹ مبارک سے کپڑا اٹھا کر دکھا دیا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اس صورت حال میں جب ظاہری طور پر سخت مایوسی اور شدید خوف کی کیفیت مدینہ منورہ کی آبادی کا احاطہ کیے ہوئے تھی، حضورؐ سے خندق میں ایک چٹان کے سخت ضربوں کے باوجود نہ ٹوٹنے کی شکایت کی گئی، چنانچہ آپؐ خود تشریف لے گئے اور کدال کی ایک ہی ضرب سے چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ جب آپ نے کدال سے چٹان پر ضرب لگائی تو وہاں سے چمک اٹھی اور اللہ کے نبیؐ نے فرمایا کہ "مجھے اس چمک میں قیصر و کسریٰ کے محلات دکھائی دیے ہیں"

ظاہری کیفیت دیکھیے کہ خوف اور مایوسی کا کیا عالم ہے؟ اور اس حالت میں نظر کی بلندی ملاحظہ کیجیے کہ اس وقت کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے شاہی محلات دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری تھی اور یہ سبق تھا کہ ظاہری حالات سے مایوس نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھو، اس پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مشن پر گامزن رہو اور اپنے ٹارگٹ اور ہدف میں کوئی کمزوری نہ آنے دو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تر ساز و سامان اور لشکر کی کثرت کے باوجود قبائل عرب کی یہ یلغار ناکام ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرمؐ کو نہ صرف فتح عطا فرمائی بلکہ اس پیش گوئی کے مطابق قیصر و کسریٰ کے شاہی محلات بھی اپنے اپنے وقت میں مسلمانوں کو عطا فرمائے۔

قرآن کریم میں ہے کہ آزمائش اور ابتلا کے اس سخت ترین دور کے بعد غزوۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد اس طرح کی کہ ہوا کو تیز کر دیا اور غیبی لشکر آسمان سے اتارے

جنہوں نے محاصرہ کرنے والے کافروں کے لشکر کو تتر بتر کر دیا اور وہ کوئی مقصد حاصل کیے بغیر ناکام واپس لوٹ گئے۔ اس لیے ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ طالبان کی اسلامی حکومت اگر اسلام کے مکمل اور عملی نفاذ کے مشن پر قائم رہتی ہے اور ظاہری حالات کی ناسازگاری سے خوفزدہ نہیں ہوتی تو اس کے لیے بھی غیب کی قدرتیں حرکت میں آئیں گی اور امریکہ کی قیادت میں عالمی استعمار کا ان کے خلاف متحدہ محاذ اسی طرح ناکام ہوگا جس طرح جناب رسول اللہؐ کے خلاف قبائل عرب کا اتحاد ناکام ہو گیا تھا۔ البتہ ہمیں اس حوالہ سے اپنی ذمہ داریوں پر ضرور نگاہ رکھنی چاہئے کہ اپنے مظلوم طالبان بھائیوں کی اس مشکل وقت میں ہم کیا مدد کر سکتے ہیں اور ان کا ہاتھ کس طرح بٹا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقہ سے نباہنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

عیدالفطر اور قرآنِ حکیم کا پیغام

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۶ دسمبر ۲۰۰۰ء)

”عید“ کا لفظ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے آیا ہے۔ سورۃ المائدہ آیت ۱۱۱ تا ۱۱۵ میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے ان کے حواریوں نے تقاضا کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہم پر تیار کھانے کا دسترخوان آسمان سے اتار سکتے ہیں؟ حضرت عیسیٰؑ نے ان سے کہا کہ خدا سے ڈرو کیونکہ اس قسم کے تقاضے کرنا مناسب نہیں ہے۔ حواریوں نے کہا کہ اگر ہمارے لیے تیار کھانے کا دسترخوان اتارا گیا تو ہم اس سے کھائیں گے اور اس سے آپ کی صداقت پر ہمارا ایمان بھی مزید پختہ ہو جائے گا۔

اس پر حضرت عیسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ہم پر آسمان سے تیار کھانے کا دسترخوان اتار دیں جو آپ کی قدرت کی نشانی ہوگی اور ہم اس کے نزول کے دن کو اپنے لیے عید کا دن بنالیں گے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دعا قبول کرتے ہوئے دسترخوان اتارا جس میں عمدہ قسم کے تیار کھانے تھے۔ لیکن ساتھ ہی خبردار کر دیا کہ اس نشانی کو دیکھنے کے بعد بھی تم میں سے جو ناشکری کرے گا میں اسے ایسا عذاب دوں گا جو جہان میں کسی اور کو نہیں دیا ہو گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بھی قرآن کریم نے یوم الزینۃ (زینت والا دن) کا تذکرہ کیا ہے۔ سورۃ طٰہٰ آیت ۵۹ میں ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے معجزات کا مقابلہ کرنے کے لیے جادوگروں کو جمع کرنا چاہا تو اس مقابلہ کے لیے زینت والا دن تجویز کیا گیا جو کہ عید کے طور پر منایا جاتا تھا۔

عید خوشی کے اجتماعی اظہار کا نام ہے جس میں سب لوگ شریک ہوتے ہیں اور اللہ تعالی کی نعمتوں اور احسانات پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے سب سے بڑی مسرت اسی بات میں ہوتی ہے کہ اسے اللہ تعالی کی رضا اور خوشی نصیب ہوجائے۔ احادیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد منقول ہے کہ

"جس دن ہم سے اللہ تعالی اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا کوئی کام سرزد نہ ہو ہمارے لیے وہ عید کا دن ہے۔"

قرآن کریم میں سورۃ ابراہیمؑ کی آیت ۷ میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ اگر تم میری نعمتوں پر شکر ادا کرو گے تو میں ان نعمتوں کو تمہارے لیے بڑھا دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ اور جو نعمت خود مانگ کر لی جائے اس کی ناشکری پر خدا کا عذاب تو اور بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسی علیہ السلام کے مائدہ والے واقعہ میں مشہور مفسر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے "تفسیر مظہری" میں حضرت سلمان فارسیؓ کی ایک طویل روایت بیان کی ہے جس کا کچھ حصہ نقل کیا جارہا ہے۔

حضرت عیسیؑ کے حواریوں کے تقاضے پر جب آسمان سے تیار کھانوں کا دستر خوان اترنا شروع ہوا تو چالیس دن تک یہ معمول رہا کہ صبح چاشت کے وقت دستر خوان اترتا جس میں طرح طرح کے کھانے ہوتے۔ امیر، غریب، چھوٹے، بڑے، مرد، عورتیں سب مل کر تناول کرتے۔ چالیس روز کے بعد اللہ تعالی نے حضرت عیسیؑ سے وحی کے ذریعے فرمایا کہ آج کے بعد یہ دستر خوان صرف غریب اور نادار لوگوں کے لیے مخصوص ہوگا، جبکہ امیر اور صاحب استطاعت لوگ اس کے قریب نہ جائیں۔ حضرت عیسیؑ نے اس حکم خداوندی کا اعلان کیا تو امیر اور صاحب حیثیت لوگوں کو یہ گراں گزرا اور انہوں نے طرح طرح کی باتیں اور حیلے تراشنا شروع کر دیے جس پر اللہ تعالی نے وحی بھیجی کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم لوگوں کی فرمائش پر جو نعمت میں اتار رہا ہوں اس کی ناشکری کرنے والوں کو ایسی سزا دوں گا جو اس جہان میں اور کسی کو نہیں دوں گا۔ چنانچہ ان میں سے تین سو تینتیس افراد کو یہ سزا ملی کہ رات کو اپنی بیویوں کے پاس آرام کر رہے تھے کہ ان کی شکلیں خنزیروں کی صورت میں تبدیل ہوگئیں۔ صبح ہوئی تو ان کی شکلیں مسخ ہوچکی تھیں اور وہ خنزیروں کی شکل میں بازاروں میں پھر رہے تھے۔ اس پر پوری قوم میں کہرام مچ گیا اور لوگ حضرت عیسیؑ کے گرد جمع ہوکر آہ و بکا کرنے لگے۔ وہ تین سو تینتیس خنزیر بھی حضرت عیسیؑ کے گرد چکر لگاتے اور روتے تھے مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اسی روایت میں ہے کہ حضرت عیسیؑ ان

میں سے کسی کو نام لے کر پکارتے تو وہ سر کے اشارے سے ہاں کرتا مگر گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ اس حالت میں تین دن رہنے کے بعد وہ سب کے سب موت کا شکار ہو گئے۔

یہ روایت پڑھنے کے بعد میرا ذہن اس طرف گھوم گیا کہ ہم نے بھی تو پاکستان جیسی عظیم نعمت خدا تعالیٰ سے مانگ کر لی تھی۔ اور اس وعدہ کے ساتھ لی تھی کہ یا اللہ! ہم جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو ایک الگ سلطنت عطا فرما دے، ہم اس میں تیرے احکام کی پیروی کا اہتمام کریں گے اور آخری پیغمبرؐ پر تیرے نازل کردہ نظام کی عملداری قائم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ہمیں عطا فرمائی مگر نصف صدی میں اس کی جو ناقدری ہم نے کی ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین اور اس کے نظام کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ملک کے وسائل میں غریب شہریوں کے لیے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھے ہیں وہ گنتی کے چند افراد نے سلب کر لیے ہیں۔ عام آدمی زندگی کے بنیادی اور ضروری اسباب کو ترس رہا ہے اور اس کے لیے جسم کے ساتھ روح کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر مراعات یافتہ طبقے اور افراد اربوں، کھربوں روپے کی مالیت کے وسائل پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور ملک کی دولت کا بہت بڑا حصہ باہر بھجوا دیا گیا ہے۔

اس صورت حال میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے غیض و غضب کے اظہار میں کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے؟ یہ درست ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی ایک دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو پہلی امتوں جیسے عذاب سے محفوظ رکھنے کا وعدہ کر رکھا ہے اور وہ اپنے وعدوں کو بہر حال پورا کرنے والا ہے۔ اس لیے شکلیں بدلنے کے تمام اسباب موجود ہونے کے باوجود ہمارا معاشرہ اس عذاب سے بچا ہوا ہے۔ لیکن عذاب کی دیگر صورتیں بھی تو ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے اظہار اور عذاب الٰہی کی تین عملی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

1. آپس کے جھگڑے اور لڑائیاں ہوں گی۔
2. امت کے شر والے لوگوں کو اللہ تعالیٰ امت پر مسلط کر دے گا۔
3. نیک لوگوں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔

عذاب الٰہی کی ان صورتوں میں سے کون سی شکل باقی رہ گئی ہے جس کا ہمیں انتظار ہے اور نافرمانی اور سرکشی کی اور کون سی حد ہے جس کی طرف ہم مسلسل بڑھتے چلے جا رہے

ہیں؟ عید خوشی کا دن ہے، مسرت کے اجتماعی اظہار کا نام ہے مگر ہمیں اس مرحلہ پر اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم خوشی کس بات پر منا رہے ہیں؟

اخلاقی اور دینی اقدار کی بربادی پر؟
قومی دولت کی لوٹ کھسوٹ پر؟
عالمی طاقتوں کی غلامی پر؟
بین الاقوامی اداروں کے ہاتھوں یرغمال بننے پر؟
ملی حمیت و غیرت کی موت پر؟
فرقہ وارانہ قتل و غارت پر؟
اور ہر سمت بے حسی کے راج پر؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے ”مرگ انبوہ جشنے وارد“ کو عید کا نام دے رکھا ہے۔ اور اجتماعی خودکشی کے لیے نئے کپڑے پہن کر، خوب بن سنور کر اور خود اپنے ہاتھوں میں طرح طرح کے آلات قتل لے کر ہم اپنی زندگی کے آخری رقص میں مصروف ہو گئے ہیں۔

میری گزارش کا مقصد یہ نہیں کہ ہم عید نہ منائیں، عید تو سنت رسولؐ ہے اور ہمارے دینی شعائر میں سے ہے۔ مگر عید مناتے ہوئے ہمیں قرآن کریم کی سورۃ الحدید آیت ۱۶ میں اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو بھی ایک بار پڑھ لینا چاہیے کہ

> ”کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ اور اس کے نازل کردہ نظام حق کے لیے نرم ہو جائیں۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہیں ان سے پہلے کتاب دی گئی تھی مگر ان کی مدت دراز ہو گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔“

مکہ کا سردار قیصرِ روم کے دربار میں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۶ دسمبر ۲۰۰۰ء)

غزوۂ بدر میں ابوجہل کے قتل ہو جانے کے بعد قریش کی سرداری ابوسفیان نے سنبھال لی اور فتح مکہ تک تمام معرکوں میں وہ قریش کی کمان کرتے رہے لیکن فتح مکہ کے بعد وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اپنے دور جاہلیت کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک واقعہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ

نے ان سے روایت کیا ہے اور امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کے پہلے باب میں اسے نقل کیا ہے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے درمیان حدیبیہ میں دس سال تک آپس میں جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ اور عارضی مصالحت کے اس دور میں جہاں جناب نبی اکرمؐ مختلف علاقوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو اسلام کی دعوت کے خطوط بھجوا رہے تھے وہاں مکہ کے قریشی بھی تجارت کے لیے آزادانہ گھوم پھر رہے تھے۔

رسول اکرمؐ نے اس وقت کی ایک بڑی بلکہ سب سے بڑی سلطنت رومن ایمپائر کے حکمران ہرقل کو بھی، جو قیصر روم کہلاتا تھا، دعوت اسلام کا خط بھجوایا۔ یہ خط حضرت دحیہ کلبیؓ لے کر گئے۔ شام اس دور میں رومی سلطنت کا حصہ تھا اور قیصر روم شام کے دورے پر ایلیا میں آیا ہوا تھا۔ جبکہ جناب ابوسفیان بھی ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ وہیں قیام پذیر تھے۔ آنحضرتؐ کا ہرقل کے نام خط لے کر حضرت دحیہ کلبیؓ وہاں پہنچے۔ ہرقل کو اطلاع دی گئی کہ حجاز سے ایک قاصد آیا ہوا ہے جو نئے نبی حضرت محمدؐ کا خط اسے پیش کرنا چاہتا ہے۔ ہرقل نے خط وصول کرنے سے قبل حضورؐ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھا اور اپنے اہلکاروں سے کہا کہ ان کے علاقے سے اگر کچھ لوگ یہاں آئے ہوں تو انہیں میرے پاس لایا جائے تاکہ میں ان سے اس نئے نبی کے بارے میں دریافت کر سکوں۔ سرکاری کارندوں نے جناب ابوسفیان کو ڈھونڈ نکالا اور انہیں قیصر روم کے دربار میں پیش کر دیا۔ حضرت ابوسفیانؓ فرماتے ہیں کہ قیصر روم نے ہمیں دیکھ کر کہا کہ تم میں سے جو شخص اس نئے نبی سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا ہو وہ آگے آجائے جس پر میں آگے بڑھ گیا اور باقی ساتھی میرے پیچھے تھے۔

قیصر نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے کچھ سوالات کروں گا، ان کے صحیح جواب دینا۔ اور میرے ساتھیوں سے کہا کہ اگر یہ کسی سوال کے جواب میں غلطی کرے تو تم اسے ٹوک دینا۔ اس کے بعد قیصر روم نے سوالات کیے جنہیں ترتیب وار پیش کیا جا رہا ہے۔

قیصر: اس شخص کا خاندان اور نسب کیا ہے؟

ابوسفیان: یہ معزز ترین خاندان سے ہے۔

قیصر: اس خاندان میں پہلے کوئی بادشاہ گزرا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس کے خاندان میں پہلے کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا؟
ابوسفیان: نہیں۔
قیصر: اس کے پیروکار کمزور لوگ ہیں یا خوشحال؟
ابوسفیان: کمزور لوگ زیادہ ہیں۔
قیصر: ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟
ابوسفیان: دن بدن بڑھ رہی ہے۔
قیصر: کوئی شخص اس پر ایمان لانے کے بعد مرتد بھی ہوا؟
ابوسفیان: نہیں۔
قیصر: تمہیں اس شخص پر کبھی جھوٹ کا شک گزرا؟
ابوسفیان: نہیں۔
قیصر: کبھی کسی معاہدے سے اس نے غداری کی؟
ابوسفیان: ہم اس وقت معاہدہ کے دور سے گزر رہے ہیں، دیکھیں کیا کرتا ہے۔
قیصر: تمہاری کبھی جنگ بھی ہوئی اور کیا نتیجہ نکلا؟
ابوسفیان: متعدّد جنگیں ہوئیں، کبھی وہ جیتا اور کبھی ہم۔
قیصر: اس کی تعلیمات کیا ہیں؟
ابوسفیان: وہ کہتا ہے کہ ایک اللہ کی بندگی کرو، تمہارے باپ دادا نے جو بت بنا رکھے ہیں انہیں چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ نماز پڑھو، سچائی اختیار کرو، پاک دامن رہو، صلہ رحمی کرو، امانت ادا کرو، اور وعدہ پورا کرو۔

اس پر قیصر روم نے اپنے سوالات پر عمومی تبصرہ کیا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے کوئی نبی یا بادشاہ قریب زمانہ میں گزرا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ صاحب اس کی نقل کر رہے ہیں اور اس طریقہ سے بادشاہت دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ باقی باتیں جتنی بتائی گئی ہیں وہ انبیاء ہی کے شایان شان ہیں کہ ان کا تعلق شریف اور معزز خاندانوں سے ہوتا ہے اور ان پر ایمان لانے والا کوئی شخص انہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ انبیاء سچے لوگ ہوتے ہیں، معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں، ان کے ساتھ جنگوں میں اتار چڑھاؤ کے معاملات رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبروں کی تعلیمات وہی ہوتی ہیں جو تم نے ان صاحب کے حوالہ سے بتائی ہیں۔

اس تبصرہ کے بعد قیصر روم نے کہا کہ میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ تم نے کہا ہے اگر یہ سب اسی طرح ہے تو یہ شخص میرے ان قدموں کی جگہ کا مالک ہو کر رہے گا۔ اور اگر میرے بس میں ہو تو میں ان صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے پاؤں خود اپنے ہاتھوں سے دھوؤں۔ اس موقع پر قیصر روم نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس بات کا اندازہ تو تھا کہ ایسے ایک پیغمبر کا ظہور ہونے والا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ پیغمبر تم عربوں میں سے ہوگا۔

حضرت ابو سفیانؓ کہتے ہیں کہ قیصر روم نے ان سے سوالات کرنے کے بعد تبصرہ کیا اور اس کے بعد حضرت دحیہ کلبیؓ نے بادشاہ کو جناب نبی اکرمؐ کا گرامی نامہ پیش کیا جس کا مضمون یہ ہے۔

اللہ کے بندے اور رسول محمدؐ کی طرف سے روم کے بادشاہ ہرقل کے نام۔

سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کر لو سلامتی پا جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اجر عطا فرمائیں گے۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو رومیوں کا گناہ تجھ پر ہوگا۔ اے اہل کتاب آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندی نہ کریں۔ اور ہم میں سے کچھ لوگ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا رب نہ بنائیں۔ پس اگر وہ اہل کتاب اعراض کریں تو تم (اہل اسلام) کہہ دو کہ ہم تو اس بات کو قبول کرنے والے ہیں۔

حضرت ابو سفیانؓ کہتے ہیں کہ قیصر روم کی یہ باتیں سن کر دربار میں ہر طرف شور مچ گیا اور مختلف اطراف سے آوازیں بلند ہونے لگیں جس پر ہمیں دربار سے نکال کر دروازے بند کر دیے گئے۔ میں نے باہر آتے ہی اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہؓ کی بات تو پوری ہونے لگی ہے۔ رومیوں کا بادشاہ بھی اس سے خوف کھاتا ہے۔ اس کے بعد میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اب اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ حتیٰ کہ اسلام میرے دل میں داخل ہو گیا اور میں نے بالآخر اسلام قبول کر لیا۔ ابو کبشہؓ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے خاوند کو کہا جاتا تھا جو آنحضرتؐ کی رضاعی ماں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حلیمہؓ کا بچپن میں دودھ پیا تھا جس کی نسبت سے حضرت ابو کبشہؓ جناب نبی اکرمؐ کے رضاعی باپ

بن گئے تھے۔ مشرکین مکہ اسی وجہ سے حقارت آمیز لہجہ میں آنحضرتؐ کو ابو کبشتہ کا بیٹا کہا کرتے تھے۔

آپؐ کا خط پڑھے جانے کے بعد دربار میں شور و غوغا ہوا تو ابو سفیان اور ان کے ساتھیوں کو دربار سے نکال کر دروازے بند کر دیے گئے۔ لیکن بادشاہ کے دربار میں کیا ہوا؟ وہ شام کے اس وقت کے چیف پادری ابن ناطورا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے جو بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت میں مذکور ہے۔

ابن ناطورا اس واقعہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیصر روم ہرقل بادشاہ ایک روز صبح کے وقت انتہائی سست اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ قریبی ساتھیوں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ میں رات ستاروں کو دیکھ رہا تھا تو ستاروں کی چال سے مجھے معلوم ہوا کہ ملک الختان کا ظہور ہو گیا ہے یعنی ختنے والوں کا بادشاہ ظاہر ہو گیا ہے اور اس کے غلبہ کا دور شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ ختنہ کرنے والے لوگ کون اور کہاں ہیں؟ سرکاری پادریوں اور مصاحبوں نے جواب دیا کہ یہودی ختنہ کرتے ہیں لیکن وہ تو اس پوزیشن میں نہیں کہ ہمیں پریشان کر سکیں۔ وہ بہت تھوڑی تعداد میں ہیں، آپ مدائن کے حاکم کو حکم دیں وہ ان کا خاتمہ کر دے گا۔ اس دوران غسان کے بادشاہ نے قیصر روم کو خبر دی کہ حجاز میں ایک نئے نبی کا ظہور ہوا ہے۔ قیصر نے دریافت کیا کہ کیا یہ لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ جواب ملا کہ ہاں ان کے ہاں ختنہ ہوتا ہے۔ تو اس وقت سے قیصر روم کے دل میں جناب نبی کریمؐ کے بارے میں بات بیٹھ گئی۔

ابن ناطورا کے مطابق ہرقل بادشاہ نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ اس امت نسل انسانی کا بادشاہ ہے جو ظاہر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ہرقل نے اپنے ایک صاحب علم اور ساتھی کو ساری تفصیل لکھ کر روانہ کی اور اس سے رائے چاہی جبکہ بادشاہ خود حمص کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ جب حمص پہنچا تو اس کے پاس اس صاحب علم ساتھی کا جواب آچکا تھا، اس نے ہرقل کی رائے کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ مکہ میں جس کا ظہور ہوا ہے وہ واقعی نبیؐ ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے حمص کے ایک ہال میں روم کے سرداروں کو جمع کیا اور ان کو ساری بات بتاتے ہوئے کہا کہ اگر تم فلاح اور رشد چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بادشاہت قائم رہے تو اس نبیؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ یہ سن کر ہال میں شور مچ گیا، طرح طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور بہت سے لوگ وحشی گدھوں کی طرح ہال سے باہر کی طرف بھاگنے

لگے۔ اس پر ہرقل بادشاہ نے انہیں باہر جانے سے روکا اور کہا کہ ٹھہرو میں تو یہ باتیں تمہارے امتحان کے لیے کر رہا تھا تاکہ تمہارے ایمان کی مضبوطی دیکھوں اور وہ میں نے دیکھ لی ہے۔ قیصر روم کے اس اعلان پر درباریوں کے قدم رک گئے اور وہ واپس آکر بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

یوں سچ اور اقتدار کے درمیان وہ کشمکش اپنے انجام کو پہنچی جس نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے مطلق العنان حکمران کے ذہن میں کچھ عرصہ سے ہلچل مچا رکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقتدار والوں کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں اور وہ ایک حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اس کے اعتراف سے کیوں رک جاتے ہیں۔

آج پھر تاریخ خود کو دہرا رہی کہ نسل انسانی اخلاقی، معاشرتی اور معاشی طور پر ہولناک تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ استحصال اور ظلم و غصب نے عالمی نظام کے خوشنما لیبل کے ساتھ پورے انسانی معاشرہ پر اپنے خونی پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ہر طرف افراتفری اور جبر و تشدد کا دور دورہ ہے، پسے ہوئے طبقات دنیا کے ہر خطے میں کسی نجات دہندہ کی راہ تک رہے ہیں، اور اعلیٰ دانش گاہوں میں موجودہ ورلڈ سسٹم کی ناکامی اور تباہ کاریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے متبادل سسٹم کی تلاش جاری ہے۔ یہ بات اب ہر ایک کی سمجھ میں آرہی ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی کی طرف واپسی کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ اور یہ بھی ہر ایک کو معلوم ہے کہ انبیاء کرام کی تعلیمات اور وحی الٰہی کا محفوظ ذخیرہ صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔ اس کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ تاریخ کے ایک عظیم الشان ریکارڈ کے طور پر آج کے قیصروں، بادشاہوں اور حکمرانوں کو بھی مسلسل دعوت دے رہا ہے کہ ”اسلام قبول کر لو سلامتی پا جاؤ گے۔“

لیکن بات یہ ہے کہ جب مسلم ممالک کے دارالحکومتوں میں بیٹھے ہوئے حکمران اس پیغام کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو دوسروں سے اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ آج کے مسلمان حکمران انسانی سوسائٹی پر اسلامی احکام و قوانین کی عملداری میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ وہ جناب نبی اکرمؐ کا کلمہ پڑھتے ہوئے، آپؐ کی محبت کا دم بھرتے ہوئے، اور آپؐ کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بھی اس آخر الزمان پیغمبرؐ کے سلامتی کے پیغام کے حوالہ سے ”قیصر روم“ بنے بیٹھے ہیں۔ مگر تاریخ کسی ایک جگہ رک نہیں جایا کرتی،

وہ اپنی طبعی رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور ''قیصر'' اپنی تمام تر شوکت و سطوت کے باوجود اس کے دھندلکوں میں گم ہو جایا کرتے ہیں۔

حافظ قرآن کریم کا ایک اور بڑا اعزاز

(اسلامک دعوہ اکیڈمی، لیسٹر، برطانیہ - ۲۵ نومبر ۲۰۰۰ء)

اس سال برطانیہ سے واپسی سے ایک روز قبل لیسٹر کی اسلامک دعوہ اکیڈمی کی سالانہ تقریب میں شرکت کا موقع ملا اور اکیڈمی کی تعلیمی پیش رفت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ اکیڈمی لیسٹر کے نوجوان عالم دین مولانا محمد سلیم دھورات نے قائم کی ہے اور نو سال قبل ایک گھر میں قائم ہونے والا یہ ادارہ اب ایک خوبصورت بلڈنگ میں منتقل ہو چکا ہے جو پہلے بوڑھوں کی دیکھ بھال کے کام آتی تھی مگر مولانا سلیم دھورات نے اسے خرید کر مسلم نوجوانوں کی دینی تعلیم و تربیت کے مرکز میں تبدیل کر دیا ہے۔

لیسٹر برطانیہ کے ان شہروں میں سے ہے جہاں مسلمانوں کی دینی چہل پہل عام ہے، مسجدیں آباد ہیں، شام کے مکاتب میں مجموعی طور پر ہزاروں بچے اور بچیاں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بازاروں میں عام طور پر مسلمانوں کی دکانیں ہیں۔ لیسٹر کو وہاں کی میونسپلٹی نے کچھ عرصہ قبل گوجرانوالہ کے ساتھ جڑواں شہر قرار دیا تھا اور میری اس کے ساتھ مناسبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ مولانا محمد سلیم دھورات کے والد مرحوم انڈیا کے صوبہ گجرات سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ انہوں نے یہیں پرورش پائی ہے اور دارالعلوم بری میں دینی تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں لندن کے ویمبلے کانفرنس ہال میں پہلی سالانہ ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں اسٹیج سیکرٹری کے طور پر مولانا محمد سلیم دھورات کا اس لیے انتخاب کیا گیا تھا کہ وہ بہت اچھی انگلش بولتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ دارالعلوم بری میں زیر تعلیم تھے مگر اب نہ صرف ایک معیاری تعلیمی ادارہ کے سربراہ ہیں بلکہ تصوف و سلوک میں بھی وہ ایک روحانی پیشوا کے طور پر آگے بڑھ رہے ہیں۔

اسلامک دعوہ اکیڈمی میں قرآن کریم حفظ و ناظرہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ درس نظامی کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے اور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کا سلسلہ بھی قائم ہے جس کے لیے شخصی رابطوں کے علاوہ اسلام کی دعوت اور دیگر

ضروری معلومات پر مشتمل درجنوں کتابچے انگلش میں چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ سالانہ تقریب میں مولانا محمد سلیم دھورات کے بھائی مولانا محمد اسماعیل دھورات نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اس دعوت کے نتیجے میں اب تک ۶۳ افراد دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور قبول اسلام کے بعد ان کی دینی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ سالانہ تقریب میں پاکستان کے ممتاز عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مہمان خصوصی تھے، انہوں نے تفصیلی خطاب فرمایا اور اکیڈمی کے شعبہ حفظ میں قرآن کریم حفظ مکمل کرنے والے ایک حافظ اور ایک فاضل عالم دین کی دستار بندی کی جس نے ابتدائی دینی تعلیم اس اکیڈمی میں حاصل کی تھی مگر اس کی تکمیل جنوبی افریقہ کے ایک دارالعلوم میں کر کے اس سال سند فراغت حاصل کی ہے۔

مولانا محمد سلیم دھورات کی دعوت پر راقم الحروف کو بھی اس اجتماع میں شرکت اور خطاب کا موقع مل گیا جس کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ اسلامک دعوۃ اکیڈمی لیسٹر کا یہ سالانہ اجتماع بہت سے حوالے اور مناسبتیں رکھتا ہے جن میں ایک یہ ہے کہ اکیڈمی میں قرآن کریم مکمل کرنے والے ایک حافظ کی دستار بندی ہونے والی ہے اور ویسے بھی رمضان المبارک کا برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ چند دنوں میں شروع ہو رہا ہے اس لیے میں اسی مناسبت سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ رمضان المبارک میں قرآن کریم کا نزول ہوا تھا اس لیے یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے، اسی وجہ سے اس ماہ میں باقی سارے سال کی بہ نسبت قرآن کریم کی تلاوت زیادہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا پاک کلام کثرت کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ قرآن کریم کا پڑھنا اور سننا دونوں عبادت کا درجہ رکھتے ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ آپؐ قرآن کریم کی تلاوت تو اہتمام سے کرتے ہی تھے مگر اس کے ساتھ اس کے سننے کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔ صحابہ کرامؓ میں حضرت ابی بن کعبؓ بہت بڑے قاری ہیں بلکہ ایک ارشاد گرامی میں جناب نبی اکرمؐ نے انہیں امت کا سب سے بڑا قاری ہونے کا خطاب دیا ہے اور یہ ان کے بڑے اعزازات اور امتیازات میں سے ہے۔ ان کا دوسرا بڑا اعزاز یہ ہے کہ رمضان المبارک میں تراویح کے دوران قرآن کریم مکمل پڑھنے اور سننے کی جو سنت چودہ سو برس سے جاری ہے اس کا آغاز ان سے ہوا تھا اور مسجد نبویؐ میں تراویح کے دوران سب سے پہلے انہوں نے قرآن کریم سنایا تھا۔ ان کا تیسرا بڑا اعزاز یہ ہے کہ

ایک بار جناب رسول اللہؐ نے بلا کر ان سے فرمائش کی کہ وہ آپؐ کو قرآن کریم سنائیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے تعجب سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! کیا میں آپ کو قرآن کریم سناؤں، آپ پر تو خود قرآن کریم نازل ہوتا ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہاں تم مجھے قران کریم سناؤ اس لیے کہ ابھی حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے اللہ تعالی کا پیغام دیا ہے کہ ابی بن کعبؓ کو بلا کر اس سے قرآن کریم کی سورۃ البینہ سنو۔ اس پر حضرت ابی بن کعبؓ کو اور زیادہ تعجب ہوا اور دریافت کیا کہ کیا اللہ تعالی نے میرا نام لے کر فرمایا ہے؟ آنحضرتؐ نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت ابی بن کعبؓ نے خوشی سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ حضورؐ کو قرآن کریم کی یہ سورت سنائی۔

اس لیے قرآن کریم سننے کا اہتمام کرنا بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور رمضان المبارک میں تراویح میں یہ سنت جاری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں قرآن کریم کم از کم ایک بار ضرور نماز کی حالت میں سن لیا جائے۔

قرآن کریم حفظ کرنا اور حافظ ہونا بہت بڑی سعادت کی بات ہے لیکن یہ بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے کیونکہ قرآن کریم پورا یاد کرنا ضروری نہیں ہے لیکن اگر یاد کر لیا جائے تو اس کو ساری زندگی یاد رکھنا فرض ہو جاتا ہے۔ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے قرآن کریم یاد کیا مگر اپنی غفلت اور بے پرواہی کی وجہ سے بھول گیا تو قیامت کے روز وہ کوڑھا کر کے اٹھایا جائے گا۔ لیکن اگر قرآن کریم یاد کرنے والا ساری زندگی اسے یاد رکھے اور اس کے احکام پر عمل بھی کرے تو اس کے اعزازات بہت ہیں اور اسے اللہ تعالی کی بارگاہ سے قیامت کے روز بڑے بڑے انعامات سے نوازا جائے گا جن میں سے صرف ایک کا آج تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے قرآن کریم یاد کیا، یاد کرنے کے بعد اسے یاد رکھا اور اس کے احکام پر عمل بھی کیا، اس حافظ سے قیامت کے روز کہا جائے گا کہ اپنے خاندان کے ایسے دس افراد کو اپنے ساتھ جنت میں لے جاؤ جن کے بارے میں دوزخ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ حافظ قرآن کریم کا کوٹہ ہے کہ وہ دس جہنمیوں کو جہنم کے دروازے سے واپس لا کر جنت میں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اسی لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جب قرآن کریم پر عمل کرنے والا حافظ قیامت کے دن دس افراد کی نجات کا کوٹہ لے کر کھڑا ہوگا، ساری برادری اس کے گرد جمع ہو کر امید بھری نظروں سے اس کی

طرف دیکھ رہی ہوگی اور وہ ان میں سے دس افراد کا انتخاب کر کے انہیں اپنے ساتھ جنت میں لے جانے کے لیے بلا رہا ہوگا تو تب پتہ چلے گا کہ حافظ قرآن کریم کتنا بڑا وی آئی پی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ اور وی آئی پی کا لفظ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ جناب نبی اکرمؐ کے اس ارشاد کا ترجمہ کر رہا ہوں ”اشراف امتی حملۃ القرآن“ کہ میری امت کے اشراف قرآن کریم کو اٹھانے والے ہیں۔

اس مناسبت سے میں ایک اور بات آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں اور آپ سب اس بات پر غور کر لیں کہ کل قیامت کے دن اگر ہمارے معاملات کا فیصلہ میرٹ اور فائل پر کرنے کا اعلان ہو گیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ جس طرح کی زندگی ہم گزار رہے ہیں اور ہمارے شب و روز کے جو معمولات ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہم میں سے کون اپنی فائل اور میرٹ پر کسی بھی درجہ میں اعتماد کر سکتا ہے؟ ہمارے پاس کون سا میرٹ ہے اور ہماری فائل میں آخر ہے ہی کیا؟ اس لیے ہماری نجات تو اسی طرح کے کسی کوٹے میں شامل ہو کر ہو گئی تو کچھ امید ہے ورنہ اور تو کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ لہٰذا میری گزارش ہے کہ ہر خاندان کو اپنے لیے چار پانچ ضمانتیوں کا انتظام بہرحال کر ہی لینا چاہیے۔ کسی خاندان میں پانچ حافظ ہوں گے تو پچاس کا، دس ہوں گے تو سو افراد کی نجات کا بندوبست ہو جائے گا۔

ان گزارشات کے ساتھ قرآن کریم حفظ مکمل کرنے والے نوجوان، اس کے والدین، اساتذہ اور اسلامک دعوہ اکیڈمی کے منتظمین و معاونین کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس نوجوان کو قرآن کریم کو یاد رکھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تعلیم کو فروغ دینے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ یکم دسمبر ۲۰۰۰ء)

حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ۔ مردِ درویش کی چند قلندرانہ باتیں

(ہفت روزہ الہلال، اسلام آباد - ۱۰ نومبر ۲۰۰۰ء)

اس سال لندن آتے ہوئے کراچی میں چند روزہ قیام کے دوران حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی قدس اللہ سرہ العزیز کے منجھلے فرزند مولانا حاجی مطیع الرحمان درخواستی کے ساتھ بھی کچھ روز کی سفری رفاقت رہی اور اسی موقع پر ان سے حضرت درخواستیؒ کی وہ تاریخی تقریر آڈیو کیسٹ کے ذریعے سننے کا موقع ملا جو انہوں نے امام العلماء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی وفات پر ۱۹۶۲ء میں رمضان المبارک کے آخری جمعۃ المبارک کے اجتماع میں خانپور کی عید گاہ میں کی تھی۔ حضرت لاہوریؒ کا انتقال اسی رمضان المبارک میں ہوا تھا اور حضرت درخواستیؒ ان کے جنازہ میں شرکت کے بعد لاہور سے واپس آئے تھے، رمضان المبارک کا آخری جمعہ تھا اور مدرسہ مخزن العلوم عید گاہ خانپور میں حضرت درخواستیؒ سے اس سال قرآن کریم کا دورہ تفسیر پڑھنے والے اڑھائی سو کے لگ بھگ طلبہ کا اختتامی سبق بھی اسی موقع پر ہوا۔ اس آڈیو کیسٹ میں حضرت درخواستیؒ کی جمعہ کی تقریر سے قبل کی تقریر کے علاوہ جمعہ کے بعد دورۂ تفسیر کا آخری سبق اور درس شامل ہے۔ اس کے ساتھ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کے اس خطاب کا ایک حصہ بھی ہے جو انہوں نے دین پور شریف میں تشریف آوری کے موقع پر فرمایا تھا۔ اور اس میں جہاد آزادی ہند میں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دیگر اکابر علماء دیوبند کی خدمات کا تذکرہ ہے۔

حضرت درخواستیؒ کا یہ خطاب جو اڑتیس سال قبل کا ہے، میں نے پہلی بار سنا لیکن یوں لگتا ہے جیسے آج کے ماحول میں اور آج کے حالات کے تناظر میں وہ علماء کرام اور اہل دین کے کسی بہت بڑے اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں اور کفر و استعمار کی قوتوں کی سازشوں اور کوششوں کے مقابلہ میں اہل حق کے موقف کا اعلان کر رہے ہیں۔ جب سے یہ تقریر سنی ہے بہت سے دوستوں کو مشورہ دے چکا ہوں کہ وہ یہ کیسٹ "مولانا حاجی مطیع الرحمن درخواستی نائب مہتمم جامعہ مخزن العلوم عید گاہ خانپور ضلع رحیم یار خان" سے ضرور حاصل

کریں اور ایمان کی تازگی نیز اہل حق کے موقف اور عزم سے آگاہی کے لیے کبھی کبھی اسے اہتمام کے ساتھ ضرور سن لیا کریں۔

حضرت درخواستیؒ معروف معنوں میں سیاستدان نہیں تھے بلکہ صاحب جذب اور صاحب حال بزرگ تھے جن پر ہر وقت جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی احادیث کا عشق غالب رہتا تھا۔ مگر حق گوئی اور فتنوں کے تعاقب میں وہ اپنے دور کے علماء کرام میں صف اول کے لوگوں میں سے تھے اور بہت سے ایسے مواقع میرے سامنے ہیں جب ملک کے اہم سیاسی مسائل میں ان کی ”مجذوبانہ بصیرت“ نے اہل حق کے لیے مشعل راہ کا کام دیا اور بعض ایسے واقعات کا عینی شاہد ہوں جب ان کی بات سیاسی مصلحتوں کی خاطر نظر انداز کر دی گئی مگر بعد کے حالات کا منظر یہ تھا کہ سیاسی مصلحتوں کا سراب زیادہ دیر تک آنکھوں کو متوجہ نہ رکھ سکا اور ”مجذوبانہ بصیرت“ کی بات وقت کے میزان پر درست نکلی۔ اس پس منظر میں حضرت درخواستیؒ کے اس خطاب کے بعض اہم حصے اپنی زبان اور ترتیب کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ اسے محض اخباری رپوٹنگ کے طور پر پڑھا جائے کیونکہ اصل لطف تو حضرت درخواستیؒ کے خصوصی انداز میں ہے جو کیسٹ سے براہ راست سن کر ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔

امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اللہ والے تھے جنہوں نے قرآن کریم کی اشاعت کو زندگی کا مشن بنا رکھا تھا حتیٰ کہ بیماری کی حالت میں بھی اس مشن کو جاری رکھا اور آخر دم تک قرآن کریم کا درس اور تعلیم دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس سے قبل حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ اور دیگر اکابر ہم سے جدا ہوئے ہیں اور اب حضرت لاہوریؒ بھی ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کا خلاء پر نہیں ہو سکتا البتہ ہمیں ان کا مشن جاری رکھنا چاہیے اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ مشن جاری رہے گا۔ اہل باطل خوش نہ ہوں کہ حق کہنے والے چلے گئے، نہیں بلکہ ایک جائے گا تو دوسرا اس کی جگہ حق کہنے والا کھڑا ہو گا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ہمارے لیے سعادت کی بات ہو گی کہ ہم جانے والوں کے مشن کو سینے سے لگائے رکھیں اور انہی کی طرح محنت اور جدوجہد کرتے ہوئے ان سے جا ملیں۔

ملکی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت درخواستیؒ نے اس خطاب میں کہا کہ دینی اقدار کا مذاق اڑایا جارہا ہے، رمضان المبارک کی بے حرمتی ہورہی ہے، ناچ گانا عام ہے، فلمیں بن رہی ہیں، سینما آباد ہیں اور لوگوں کو بے حیا بنایا جارہا ہے۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وحدیث کا انکار ہورہا ہے، نبی کے یاروں صحابہ کرامؓ کی توہین ہوتی ہے اور حضورؐ کے گھرانے کی بے احترامی کی جاتی ہے لیکن کوئی اس کا نوٹس نہیں لیتا، اس زندگی سے موت بہتر ہے اور اس حالت میں جینے کا کوئی مزہ نہیں۔ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں اور ملک کے صدر اور تمام افسروں سمیت ہر شخص پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے فرنگی کی سیاست نہیں آتی مگر قرآن و حدیث کی سیاست کو میں چھوڑ نہیں سکتا، میری سیاست قرآن و سنت ہے اور قرآن و سنت کے نظام کی بالادستی ہمارا سب سے بڑا مشن ہے اس سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہوسکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں قرآن کا نظام آئے، حدیث رسولؐ کا نظام آئے۔ کلب خانے بند ہوں، سینماؤں پر تالے لگ جائیں، رمضان المبارک کا احترام ہو اور اسلامی احکام کی حکمرانی قائم ہو، اس سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ ہم دار و رسن قبول کرسکتے ہیں لیکن اسلامی نظام سے دست بردار نہیں ہوں گے۔

ہمیں ملک کا غدار کہا جارہا ہے، ہم غدار نہیں ہیں ملک کے وفادار ہیں اور میں تو خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر پاکستان کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں کہ یا اللہ پاکستان کی حفاظت فرما اور اسے ہندوؤں اور سکھوں کے غصہ سے محفوظ رکھ۔ جو شخص خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر، رو کر ملک کے لیے دعائیں مانگے وہ غدار کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم ملک کے وفادار ہیں مگر اس ملک کو فرنگی نظام سے نجات دلا کر محمدیؐ نظام کے ذریعے مستحکم کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ملک کی بقا اور استحکام اسی میں ہے۔ مگر لڈو کھا کر ملک کو برباد کرنے والے ملک میں فرنگی نظام کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اسلامی نظام میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ ہم صدر کی رعایا ہیں اور اپنے افسروں کی بھی رعیت ہیں لیکن اگر صدر بھی اسلامی نظام سے بے وفائی کریں گے تو ہم ان کی بات نہیں مانیں گے اور میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم سر دے دیں گے مگر اسلامی نظام کے خلاف کوئی بات قبول نہیں کریں گے۔ ہمارے ملک کو پہلے فرنگی نظام کے ذریعے برباد کیا جاتا رہا اور اب امریکی نظام کے ذریعے ملک کو تباہ کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں مگر ہم نے نہ فرنگی نظام کو قبول کیا تھا اور نہ ہی امریکی نظام کو قبول کریں گے۔ ہمارے بزرگوں نے فرنگی نظام کے خلاف جنگ لڑی تھی اور ہم امریکی نظام کے تسلط کے خلاف جنگ لڑیں گے

اور ہمارا اعلان ہے کہ ہم سولی چڑھ جائیں گے، دار ورسن کو منظور کرلیں گے مگر امریکی نظام کا تسلط برداشت نہیں کریں گے۔

میں صدر پاکستان سے، ملک کے افسروں سے، ججوں سے اور حکمرانوں سے کہتا ہوں کہ یہ ملک ہم سب کا ہے۔ ہمارا بھی ہے اور آپ کا بھی ہے اس لیے ہم سب کو اس ملک کی فکر کرنی چاہیے اور سب کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔ نہ تم ہمارے لیے غیر ہو نہ ہم تمہارے لیے غیر ہیں، سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ہم سب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی اور غلام ہیں۔ اس لیے ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ نبی اکرمؐ کا نظام اور قانون نافذ کرکے اس ملک کو بچالیں۔ یہ ملک اسی نظام سے بچے گا، فرنگیوں اور امریکیوں کے نظام سے یہ ملک باقی نہیں رہے گا۔ لڈو کھا کر ملک کو بدنام کرنے والوں سے میں کہتا ہوں کہ تمہاری آنکھیں بند ہیں۔ تم نے دوست اور دشمن میں تمیز کرنا چھوڑ دی ہے، دوستوں کو دشمن سمجھ لیا ہے اور دشمنوں کو دوست بنا رکھا ہے۔ اس لیے خدا تم سے ناراض ہے اور شیطان تم پر مسلط ہوگیا ہے، اس حالت سے باہر نکلو، قرآن وسنت کو سینے سے لگاؤ اور اللہ کے بندوں کی بات مانو تاکہ یہ ملک دشمن کی سازشوں سے محفوظ ہو جائے۔ میرے اندر کوئی کمال نہیں ہے البتہ قرآن کریم کا جوہر اللہ تعالیٰ نے سینے میں رکھ دیا ہے میری کوشش ہے کہ یہ جوہر مرنے تک ساتھ رہے اور اسے ساتھ لے کر قبر میں جاؤں، میں خانپوریوں سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں قرآن سناتا رہوں گا، حدیث رسول سناتا رہوں گا، تم مجھے بے شک جوتے مارو مجھے پتھر مارو میں تمہارے جوتے کھالوں گا تمہارے پتھر برداشت کرلوں گا مگر قرآن سنانے سے باز نہیں آؤں گا اور قرآن کے نظام کی دعوت دینے سے کبھی باز نہیں آؤں گا۔

قرآنی اصول اور جناب معین قریشی

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

پاکستان کے سابق وزیراعظم معین قریشی نے گزشتہ دنوں واشنگٹن میں ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ چودہ سو سال قبل کے حالات اور قوانین کو آج کے دور میں لاگو کرنا مناسب نہیں ہے اور شریعت کے نفاذ کا مطالبہ بھی ضروری نہیں ہے، البتہ قرآن کریم کی روح کے مطابق قوانین بننے چاہئیں اور اصول قرآن کریم سے اخذ کرنا چاہئیں۔

معین قریشی کا تعلق علماء کے ایسے معروف خاندان سے ہے جس نے اس خطہ میں اسلامی علوم وروایات کے تحفظ اور آزادئ وطن کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں اور ان کی ملی و دینی خدمات کا ہر حلقہ میں احترام واعتراف کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا عبد القادر قصوریؒ اور حضرت مولانا محی الدین قصوریؒ کا شمار برصغیر کے ممتاز اہل حدیث علماء میں ہوتا ہے۔ معین قریشی اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں لیکن موقف کے حوالے سے وہ اپنے بزرگوں کی روایات اور مسلک سے بالکل الٹ چل رہے ہیں۔ ان کے بزرگ اہل حدیث کہلاتے تھے جو سنت کے دائرہ تک محدود رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ اسے مزید وسعت دے کر ظاہر حدیث پر عمل کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ جبکہ معین قریشی سنت و حدیث کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے قرآن کریم کے ظاہری احکام کو بھی غیر ضروری بلکہ آج کے حالات کے لیے نامناسب قرار دے رہے ہیں، اور ان کا ارشاد ہے کہ قرآن کریم کی روح کشید کرکے اس میں سے اصول اخذ کیے جائیں۔

قرآن کریم کو اصول اخذ کرنے تک محدود رکھنا اور اس کے ظاہری اور واضح احکام پر عمل کرنے کی بجائے اس کی روح کے مطابق قوانین وضوابط ترتیب دینا کوئی نیا موقف نہیں ہے، اور نہ ہی علمی حلقوں کے لیے اس میں کوئی اجنبیت باقی رہ گئی ہے۔ کیونکہ ایک عرصہ سے یہ موقف ان حلقوں کی طرف سے سامنے لایا جارہا ہے جو مغرب کے جدید فلسفہ، ذہنی و فکری ارتقا، اور معاشرتی روایات و اقدار کو اصل معیار سمجھتے ہیں لیکن قرآن کریم کے واضح احکام وارشادات کو اس سے مختلف بلکہ متضاد پاکر کنفیوژن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ پھر انہیں قرآن کریم سے انکار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تو وہ دونوں طرف کی وابستگی کو بیک وقت برقرار رکھنے کے لیے درمیان کا یہ راستہ نکالتے ہیں کہ قرآن کریم کو تو اصول اور روح کی حد تک رکھا جائے جبکہ اس کے شیلٹر کے نیچے مغربی فلسفہ کے مطابق سوسائٹی کو ہر معاملہ میں فیصلہ کن اتھارٹی تسلیم کرتے ہوئے حالات اور ضروریات کے مطابق حسب منشا قوانین وضع کرلیے جائیں۔

- حسب منشا نئے احکام و قوانین وضع کرنے کی یہی خواہش فقہائے اربعہ حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ، اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے فقہی اجتہادات کے حوالے سے تعامل امت سے انحراف کی راہ ہموار کرتی ہے۔

• اسی خواہش کی کوکھ سے اجماع صحابہؓ کی اہمیت سے انکار جنم لیتا ہے۔
• یہی خواہش سنت نبویؐ کو غیر ضروری قرار دینے پر اکساتی ہے۔
• اور یہی تقاضا قرآن کریم کے ظاہری احکام کو چودہ سو سالہ پرانے دور کی ضرورت قرار دینے اور اس کی روح کے مطابق نئے احکام و قوانین تشکیل دینے پر آمادہ کرتا ہے۔

لیکن اس وقت اس پہلو کو زیر بحث لانے کی بجائے ہم جناب معین قریشی اور ان کے ہم خیال حضرات کی خدمت میں قرآن کریم ہی کے چند راہنما اصولوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن کریم سے اپنا مطلب نکالنے اور اس سے اپنی بات کہلوانے کا راستہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ خود اس سے راہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو قرآن کریم کی اصولی راہنمائی آج بھی وہی ہے جس کی تفصیلات و تشریحات سنت نبویؐ، اجماع صحابہؓ، فقہاء اربعہؒ کے اجتہادات، اور امت کے چودہ سو سالہ تعامل کی صورت میں صدیوں سے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اور جس کی نمائندگی اور ترجمانی کا فریضہ آج بھی امت کے کم و بیش تمام مکاتب فکر کے سنجیدہ علماء کرام اور مجتہدین سرانجام دے رہے ہیں۔ اصولی رہنمائی کے حوالے سے قرآن کریم کی تعلیمات میں سے سردست دس اصولوں کا تذکرہ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

1. قرآن کریم کی سب سے پہلی سورۃ الفاتحہ میں اللہ رب العزت نے ہمیں ہر وقت ہدایت پر قائم رہنے کی دعا مانگتے رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اور ہدایت کا معیار یہ بتایا ہے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہوئی ہے وہ ہدایت یافتہ ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کے مستحق ٹھہرے ہیں وہ ہدایت سے محروم ہیں۔ پھر قرآن کریم میں ماضی کی بیسیوں اقوام کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی پر عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے انعام اور رحمت کا حقدار ٹھہرایا ہے جبکہ ان سے انحراف کرنے والوں کو ملعون و مغضوب قرار دیا ہے۔ اس لیے قرآن کریم سب سے پہلے ہمیں یہ اصول سمجھاتا ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی ہی ہدایت کا واحد معیار ہیں اور اس کے سوا سب گمراہی ہے۔

2. سورۃ البقرہ آیت ۸۵ میں قرآن کریم ہمیں یہ اصول دیتا ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی میں تقسیم درست نہیں ہے کہ جس بات کو جی چاہے مان لیا جائے اور جس کو جی نہ چاہے اس سے انکار کر دیا جائے۔ بلکہ وحی الٰہی کے ایک حصے پر ایمان لانا اور اسی کے دوسرے حصے کو نہ ماننا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذاب اور رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے سب احکام و قوانین کو بیک وقت ماننا اور ان پر ایک مربوط اور مکمل نظام کے طور پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اور ان میں سے اپنی مرضی کے احکام و قوانین کا انتخاب کرنا گمراہی ہے۔

3. سورۃ المائدہ آیت ۴۹ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آسمانی تعلیمات پر عملدرآمد اور قرآنی احکام کے نفاذ کے بارے میں لوگوں کی خواہشات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور اگر اس میں لوگوں کی خواہشات کا لحاظ کیا جائے گا تو یہ فتنہ کا باعث ہوگا اور ایسا کرنے والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کے مستحق ہوں گے۔

4. سورۃ المائدہ آیت ۴۴ تا ۴۷ ارشاد ربانی ہے کہ خدائی قوانین کا نفاذ اختیاری بات نہیں ہے بلکہ سوسائٹی میں ان کا نفاذ ضروری ہے۔ اور اگر کوئی شخص یا گروہ اختیار رکھتے ہوئے بھی معاشرہ میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کا نفاذ نہیں کرتا ہے تو وہ کافروں، ظالموں، اور فاسقوں کے زمرہ میں شمار ہوگا۔

5. سورۃ النساء آیت ۸۰ اور سورۃ الحشر آیت ۷ میں قرآن کریم نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا ہے، اس سے انحراف کو گمراہی کہا ہے، اور یہ تلقین کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ جس بات کا حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس بات سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا اور قرآن کریم کے احکام کی تشریح معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ جناب نبی کریمؐ کی سنت ہے۔ اس لیے قرآن کریم کے ساتھ سنت نبویؐ بھی قانون سازی کا بنیادی سرچشمہ ہے۔

6. سورۃ البقرہ آیت ۱۳ اور آیت ۱۳۷ میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو ایمان اور راہنمائی کا معیار قرار دیا ہے اور باقی تمام لوگوں کو صحابہ کرامؓ کی طرح ایمان

لانے کی تلقین کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح میں سنت نبویؐ کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کا اسوہ اور تعامل بھی رہنمائی کا اہم ذریعہ ہے۔

7. سورۃ الشوریٰ آیت ۳۸ میں اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں۔ سورۃ آل عمران ۱۵۹ میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو مشورہ میں شریک کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا نظام باہمی مشاورت پر مبنی ہے اور اجتماعی معاملات طے کرنے میں درجہ بدرجہ لوگوں کو مشاورت کے نظام میں شریک کرنا ضروری ہے۔

8. سورۃ النساء آیت ۸۳ میں قرآن کریم نے یہ ہدایت دی ہے کہ امن یا خوف کے حوالے سے کوئی نیا معاملہ پیش آجائے تو اس کی عوام میں تشہیر کرنے کی بجائے پہلے اسے ایسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے جو اس کی گہرائی تک پہنچ کر اس سے نتائج اخذ کر سکتے ہوں، پھر ان کی رہنمائی میں بات کو آگے چلایا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی نیا مسئلہ یا واقعہ ہو تو پہلے اس کے بارے میں متعلقہ ماہرین کی رائے لی جائے اور پھر اسے عوام کے سامنے لایا جائے ورنہ مسئلہ براہ راست عوام کے سامنے لانے سے خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔

9. سورۃ النساء آیت ۵۹ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہؐ کے بعد اپنے اولی الامر یعنی حکام کی بھی اطاعت کریں۔ لیکن اگر ان کے درمیان کسی بات پر تنازعہ ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے حاصل کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت وقت اور مسلمان حکام کی اطاعت ضروری ہے لیکن حکومت اور رعایا کے درمیان کوئی معاملہ متنازعہ ہو جانے کی صورت میں اس کا فیصلہ قرآن و سنت کی روشنی میں کرنا ضروری ہوگا۔

10. سورۃ النساء آیت ۱۱۵ میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ سنت رسول اللہؐ واضح ہو جانے کے بعد اس کی مخالفت کرنا اور اس کے بعد مسلمانوں کے اجتماعی

طرز عمل سے ہٹنا بھی گمراہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجماع امت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے اور قرآن و سنت کے بعد امت مسلمہ کے اجماعی تعامل کا ساتھ دینا بھی لازم ہے۔ اس لیے قرآن و سنت کے احکام کی تشریح و تعبیر اور اسلامی نظام کے بنیادی خدوخال کے حوالے سے امت کی اکثریت چودہ سو سال سے جو سمجھتی رہی ہے اور جس پر عمل کرتی رہی ہے وہی اسلام کی حقیقی تعبیر و تشریح ہے، اور اس سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرنا سراسر گمراہی ہے۔

قرآنِ کریم اور ماضی کا سبق

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۶ ستمبر ۲۰۰۰ء)

سقوط ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عظیم سانحہ کے بارے میں جسٹس حمود الرحمان مرحوم کی سربراہی میں قائم کیے گئے کمیشن کی مبینہ رپورٹ بھارت کے کسی اخبار میں شائع ہوئی اور اس کے بعد پاکستان میں اس کی باضابطہ اشاعت کے مطالبہ نے زور پکڑا تو چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے یہ کہہ کر اس سے دامن چھڑا لیا کہ یہ پرانی بات ہو چکی ہے اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ماضی کو بھول جائیں اور پچھلے واقعات کی کرید میں پڑنے کی بجائے مستقبل کی فکر کریں۔

ہمارے خیال میں جنرل صاحب کا یہ مشورہ قرین انصاف نہیں ہے اور اس کی نرم سے نرم الفاظ میں بھی تعبیر کی جائے تو اس کے لیے ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے سوا کوئی متبادل عنوان ذہن میں نہیں آرہا۔ اس لیے کہ مستقبل کی عمارت ہمیشہ ماضی کی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے اور ماضی کی بنیادیں کھودے بغیر صرف حال کی زمین پر کھڑی کی جانے والی کسی عمارت کے بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ماضی سے آنکھیں بند کرنا زندہ قوموں کا شعار نہیں ہوتا اور اپنی غلطیوں اور حماقتوں کو یاد رکھ کر ان سے سبق حاصل نہ کرنے والے افراد، گروہ اور قومیں اس کارگاہ حیات میں مستقبل کی طرف کامیاب پیش رفت نہیں کر پاتیں۔ اس لیے اگر جنرل صاحب موصوف حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ شائع نہ کرنے کی کوئی اور وجہ بیان کر دیتے یا کم از کم ''وسیع تر قومی مفاد و مصلحت'' کے سکہ بند عذر کا حوالہ دے دیتے تو شاید خاموشی کا کوئی جواز نکل آتا مگر ماضی کو بھول جانے کا مشورہ دے کر رپورٹ شائع نہ کرنے کے اعلان نے نہ صرف یہ کہ قوم کی مایوسی میں اضافہ کیا ہے بلکہ ان حساس دلوں

کے زخموں کو بھی ایک بار پھر کرید ڈالا ہے جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دولخت ہو جانے کے عظیم سانحہ پر ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود دل گرفتہ ہیں اور اس کے اسباب و عوامل اور ذمہ دار طبقات وافراد سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔
اور پھر ماضی کو بھول جانے کا سبق اسلامی تعلیمات کے بھی منافی ہے کیونکہ قرآن کریم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو پیغام دیا ہے اس کا بہت بڑا حصہ ماضی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اور ماضی بھی تیس چالیس سال پہلے کا نہیں بلکہ ہزاروں سال پہلے والا ماضی قرآن کریم نے بار بار ہمارے سامنے رکھا ہے اور ساتھ یہ ہدایت کی ہے کہ اس سے عبرت پکڑو، اس سے سبق حاصل کرو، اس کی روشنی میں اپنے حال کو سنوارو اور اسی کو سامنے رکھ کر مستقبل کے منصوبے بناؤ:

- قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام سے بھول ہوئی کہ شجر ممنوعہ کا ذائقہ چکھ لیا تو انہیں جنت چھوڑنا پڑی، یہ ہمارے سبق کے لیے ہے کہ جنت میں دوبارہ جانا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنا ہوگی اور جن کاموں اور چیزوں سے تمہیں منع کیا گیا ہے ان سے باز رہنا ہوگا۔
- قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ خدائی کا دعوی کرنے والے نمرود اور فرعون نے جب اہل ایمان اور اہل حق کی بات ماننے کی بجائے ان سے ٹکر لینے کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ کی غیبی قوتوں نے انہیں پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ اس میں بھی سبق ہے کہ اقتدار اور قوت پر گرفت رکھنے والے حضرات ظاہری طاقت اور اسباب کو ہی سب کچھ نہ سمجھ لیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ان غیبی قوتوں اور تدبیروں کو ذہن میں رکھیں جو اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے لیے حرکت میں آجائیں تو تمام تر ظاہری شکوہ و جلال پانی میں ڈبکیاں کھانے لگتا ہے۔
- قرآن کریم نے ہمیں قوم لوط کے حشر سے آگاہ کیا ہے کہ جب وہ شہوت پرستی کی انتہا کو چھونے لگے اور فطرت کے تمام دائروں کو توڑتے ہوئے آسمانی تعلیمات اور اللہ تعالیٰ کے فرستادہ نیک بندوں سے الجھنے پر آگئے تو آسمان نے

ان پر پتھروں کی بارش کر دی اور سدوم اور عمورا کی بستیوں کی بربادی پر اللہ تعالیٰ نے بحیرۂ مردار کو قیامت تک کے لیے نشان عبرت بنا دیا۔

• قرآن کریم نے ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ اور ماضی سے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ روشناس کرایا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو نبوت ملی، بادشاہت ملی، آسمانی شریعت ملی، دنیاوی جاہ و جلال ملا، جنوں انسانوں اور بحر و بر پر حکومت ملی اور اقوام عالم پر برتری و بالادستی حاصل ہوئی۔ مگر یہ عظیم خاندان جب آسمانی تعلیمات کی پابندی کرنے کی بجائے اپنی خواہشات کی پیروی پر اتر آیا اور اس نے ”خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں“ کے مصداق تورات کے احکام کی من مانی تشریحات شروع کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت اور غیظ و غضب کا مستحق قرار پا گیا۔

• قرآن کریم نے ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان سے نسبت پر فخر کرنے والے عربوں کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے بیت اللہ کو بت پرستی اور شرک کی آماجگاہ بنا دیا اور زنا، شراب، جوا، بدکاری، نسل پرستی، سود اور ناچ گانے جیسی جاہلانہ اقدار کو اپنی زندگیوں کا معمول بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے کس طرح انہیں ان کی جاہلانہ تہذیب سمیت صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

یہ سب کچھ ہمارے سبق کے لیے ہے اور ہمیں اپنے حال کی اصلاح اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے اس میں فکری بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔ ورنہ قرآن کریم نعوذ باللہ کوئی قصہ گوئی کی کتاب نہیں ہے کہ اس کا اتنا بڑا حصہ ماضی کے واقعات اور قصوں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منافقانہ تعلق رکھنے والے جس گروہ کی سازشوں اور حرکتوں کے بارے میں بتایا ہے وہ آج کے دور میں ہمارے لیے ماضی کی حیثیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اسلام اور ایمان کے دعوی اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں رہتے ہوئے قرآنی احکام اور نبوی تعلیمات سے روگردانی کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ جناب رسول اللہؐ کو دق کرنے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کس طرح اس وقت کی عالمی قوت سلطنت روما سے سازباز کر کے پرائیویٹ سوسائٹی (این جی او) تشکیل دی اور مسجد کے نام سے خود مدینہ

منورہ کے اندر مسلمانوں کے خلاف اڈہ قائم کرنا چاہا تو قرآن کریم نے اسے ''مسجد ضرار'' قرار دے کر نذر آتش کروا دیا۔

یہ سب واقعات ہمارے لیے سبق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اتنا مقدس سبق کہ ہم انہیں اللہ تعالیٰ کا کلام مان کر تلاوت کرتے ہیں اور ایک ایک حرف پر کم از کم دس دس نیکیوں کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اس لیے جنرل پرویز مشرف صاحب سے بڑے ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ اگر جنت سے نسل انسانی کے نکلنے کے واقعہ پر حضرت آدم علیہ السلام کی بھول اور خطا کی رپورٹ قیامت تک کے لیے مسلسل شائع ہو سکتی ہے تو ''سقوط ڈھاکہ'' جیسے عظیم سانحہ پر پاک فوج کے جرنیلوں، سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کی غلطیوں، حماقتوں اور بدعنوانیوں کی رپورٹ شائع ہونے سے کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔

جمعہ کی چھٹی اور راجہ صاحب کا فلسفہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۵ جولائی ۲۰۰۰ء)

راجہ انور صاحب نے اپنے مضمون میں جمعہ کی چھٹی کا ذکر کیا ہے، میثاق مدینہ کا حوالہ دیا ہے، کسی مسلم مملکت کو ''اسلامی'' قرار دینے پر اعتراض کیا ہے، اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ریاست کو ''دولۃ العربیۃ'' کے طور پر پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس لیے ان امور کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جمعۃ المبارک کی چھٹی

جمعہ کی چھٹی کے بارے میں راجہ صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ اس پر بلاوجہ زور دیا جا رہا ہے حالانکہ اسلامی تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ دو مسئلے الگ الگ ہیں۔ ایک یہ کہ چھٹی ہونی چاہیے یا نہیں اور دوسرا یہ کہ اگر ہو تو کس دن ہو؟

جہاں تک پہلے نکتے کا تعلق ہے، یہ بات درست ہے کہ اسلام چھٹی کی بجائے کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بلکہ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ عام دنوں میں پانچ نمازوں کی پابندی ہے مگر عید کے دن ان میں کوئی کمی کرنے کی بجائے ایک نماز کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اس لیے اگر سرے سے چھٹی نہ کی جائے اور ہفتہ کے ساتوں دن کام کیا جائے تو یہ اسلام کے مزاج کے زیادہ قریب ہے۔ لیکن جب ہم عزیمت کا یہ راستہ ترک کر

کے رخصت پر آگئے ہیں اور چھٹی کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس چھٹی کا تعین اسلامی روایات کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب یہودی اس معاملہ میں اپنی مذہبی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے ہفتہ کے روز چھٹی کرتے ہیں اور عیسائی اپنی مذہبی روایات کی وجہ سے اتوار کا دن چھٹی کے طور پر مناتے ہیں تو ہمیں بھی اس بات میں کوئی حجاب نہیں محسوس کرنا چاہیے کہ چھٹی کے لیے جمعہ کا دن مقرر کریں جسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "سید الایام" قرار دیا ہے اور اپنی زبان مبارک سے اس دن کے بہت سے فضائل اور خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔

پھر اسلامی تاریخ بھی جمعہ کی چھٹی کے تصور سے خالی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں بھارت کے ممتاز محقق حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی تصنیف "خیر القرون کی درسگاہیں" کا حوالہ دینا چاہوں گا جو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند انڈیا نے شائع کی ہے۔ اس میں صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے دور کی علمی درسگاہوں کا تعارف کراتے ہوئے "جمعہ کی چھٹی" کا مستقل عنوان قائم کر کے بتایا گیا ہے کہ تعلیمی اداروں میں جمعہ کی چھٹی کا رواج امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور میں ہی ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں تاریخی کتابوں کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جب حضرت عمرؓ شام کے طویل سفر سے واپس آئے تو جمعرات کا دن تھا اور مدینہ منورہ کے لوگوں نے شہر سے باہر آکر حضرت عمرؓ کا استقبال کیا جن میں بچوں کی بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کے ساتھ جمعہ کی شب مدینہ منورہ سے باہر بسر کی اور جب جمعہ کی صبح کو مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو اس روز قرآن کریم کے مدارس میں بچوں کو چھٹی کرنے کی اجازت دے دی جس کے بعد سے جمعہ کے روز چھٹی کا رواج ہو گیا۔

کتاب میں معروف استاد ایوب بن حسن رافعیؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ہم جمعہ کے روز مدرسہ کے بچوں کے ساتھ مدینہ منورہ سے باہر نکلا کرتے تھے اور بچے کھیل کود اور گھڑ سواری کے ساتھ جی بہلایا کرتے تھے۔ اس روایت میں حضرت مصعب بن زبیرؓ کے بچوں کی گھڑ سواری کا بھی ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معمول صحابہ کرامؓ کے آخری دور کا ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے تابعینؒ کے دور کے ایک محاورہ کا ذکر کیا ہے جو قرآن کریم کے ایک استاد ابن مجاہدؒ نے کسی بھاری بھرکم شخص کو دیکھ کر کہا کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ بوجھل ہے جتنا ہفتہ کا دن بچوں کے لیے بوجھل ہوتا ہے۔ یعنی جمعہ کی چھٹی گزار کر ہفتہ

کے روز صبح تعلیم کے لیے مدرسہ میں جانا بچوں کے لیے بہت بوجھل اور گراں ہوتا ہے اور محاورہ میں اسی پس منظر میں ایک بوجھل آدمی کے موٹاپے کا ذکر کیا گیا ہے۔

الغرض جمعہ کا دن نہ صرف فضیلت اور امتیاز والا ہے بلکہ قرون اولی میں اس دن کی چھٹی کا تصور بھی موجود ہے۔ اس لیے اگر ہم نے چھٹی کرنی ہے تو اس کے لیے جمعہ کا دن ہی زیادہ موزوں ہے اور آج کے بین الاقوامی تناظر میں ملی حمیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم جمعہ کے دن کو ہفتہ وار چھٹی کا دن قرار دیں۔

راجہ صاحب محترم نے جمعہ کی چھٹی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ مغربی ممالک ہفتہ اور اتوار دو دن چھٹی کرتے ہیں جبکہ ہم جمعہ کی چھٹی کریں گے تو ان کے ساتھ تجارتی اور دفتری روابط میں تین دن کا انقطاع آجائے گا اس لیے ہمیں اس انقطاع کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں کرنا چاہیے ورنہ ہمارے تجارتی نقصانات میں اضافہ ہو جائے گا۔ میرے خیال میں راجہ صاحب محترم نے تجارتی اور دفتری روابط کے مجموعی تناظر پر نظر نہیں دوڑائی ورنہ یہ بات ان کی نگاہ سے اوجھل نہ رہتی کہ یہ مشکل تو ہمیں روزمرہ معاملات میں بھی درپیش ہے۔ مثلاً جاپان کے ساتھ ہمارے وقت کا چار گھنٹے کا فرق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جاپان کے صنعتی ادارے اور دفاتر ہم سے چار گھنٹے پہلے کھل جاتے ہیں اور چار گھنٹے پہلے بند ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان کے ساتھ (براہ راست یعنی ای میل وغیرہ کے علاوہ) روابط کے لیے روزانہ صرف چار گھنٹے ملتے ہیں۔ اسی طرح برطانیہ کے ساتھ ہمارا چار گھنٹے کا فرق ہے کہ ہمارے دفاتر اور فیکٹریاں برطانیہ سے چار گھنٹے پہلے کھلتے اور چار گھنٹے پہلے بند ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ بھی ہمیں صرف چار گھنٹے فوری رابطہ کے لیے ملتے ہیں۔ جبکہ ہمارے اقتصادی قبلہ وکعبہ امریکہ بہادر کے ساتھ ہمارے وقت کا فرق نو سے بارہ گھنٹے کا ہے کہ نیویارک ہم سے نو گھنٹے اور لاس اینجلس بارہ گھنٹے پیچھے ہے اس لیے امریکہ کے دفاتر اور فیکٹریوں کے ساتھ تو ہمیں اپنے دفتری اوقات میں سرے سے رابطہ کا کوئی وقت ہی نہیں ملتا۔

اس تناظر میں اگر راجہ انور محترم کے فلسفہ کو قبول کیا جائے تو اپنا وقت بچانے کے لیے ہمیں اپنے اوقات کار کی درجہ بندی کرنا ہوگی۔ جاپان کے لیے سحری کے وقت دفتر کھولنا ہوں گے، برطانیہ کے لیے عشاء تک دفتر کھلے رکھنا ہوں گے، اور امریکہ کے لیے رات کو دفتر اور فیکٹریاں کھولنے کا شیڈول طے کرنا ہوگا۔ ورنہ جمعہ کی چھٹی کی صورت میں تو

ہمارے صرف چار گھنٹے فی ہفتہ حرج ہو سکتے ہیں مگر اس وقت عملاً روزانہ چار گھنٹے اور امریکہ کے حوالہ سے آٹھ گھنٹے ضائع ہو رہے ہیں، کیا راجہ انور صاحب اس الجھن کا کوئی حل پیش فرمائیں گے؟

اسلامی ریاست کی اصطلاح اور اس کا پس منظر

راجہ انور محترم نے اپنے مضمون میں اسلامی ریاست کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے اور میثاق مدینہ، دولت العربیہ اور کسی ریاست کو اسلامی قرار دینے کے عنوانات کے ساتھ یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ اسلام ایک فرد کا شخصی معاملہ ہے اور اس کا سوسائٹی اور ریاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کسی ایک شخص کو تو مسلمان قرار دیا جا سکتا ہے مگر کسی ریاست کو اسلامی قرار دینا ان کے بقول خود اسلامی روایات کے منافی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے "میثاق مدینہ" کا ذکر کرنا چاہوں گا جسے ہمارے جدید تعلیم یافتہ دانشور ایک مسلم ریاست کا دستور قرار دے کر آج بھی ایک آئیڈیل دستوری دستاویز کے طور پر پیش کرتے ہیں مگر یہ بات سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ میثاق مدینہ کسی منظم ریاست کا دستور نہیں بلکہ مدینہ منورہ کے مختلف قبائل کے ساتھ اکٹھے رہنے کا ایک عبوری معاہدہ تھا جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے قبائل کے ساتھ کیا تھا اور بالآخر "ریاست مدینہ" کی تشکیل پر منتج ہوا تھا۔ چونکہ اس وقت تک قرآن کریم کی احکام و قوانین والی آیات نازل نہیں ہوئی تھیں اس لیے آنحضرتؐ نے کام چلانے کے لیے میثاق مدینہ اور مواخات جیسے اقدامات کیے جن کی حیثیت عبوری تھی اور جوں جوں قرآن کریم میں احکام و قوانین نازل ہوتے گئے ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں کیے جانے والے اقدامات خود بخود ختم ہوتے چلے گئے۔ اس لیے میثاق مدینہ کی حیثیت دستوری زبان میں فائنل اور مکمل دستور کی نہیں بلکہ ابتدائی اور عبوری دستوری معاہدہ کی ہے اور اسے آج کے دور میں کسی مسلم مملکت کے لیے دستور سازی کی حتمی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر میثاق مدینہ کو ہی دستور سازی کی واحد بنیاد تسلیم کیا جائے تو اس کے بعد دس سال تک مسلسل نازل ہونے والی قرآنی آیات اور اسلامی قوانین و احکام کے ایک بڑے حصے کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ جبکہ بعد میں نازل ہونے والی آیات و احکام کو میثاق مدینہ کے ساتھ ایڈجسٹ کیا جائے تو اسے اسلامی دستور سازی کی واحد بنیاد

قرار دینا ممکن نہیں رہتا۔ چنانچہ اسلامی دستور سازی کی حتمی بنیاد قرآن و سنت کی وہ آخری شکل ہے جو جناب رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے وصال تک مکمل ہوتی رہی اور جس کی عملی صورت خلافت راشدہ کی صورت میں تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔

راجہ صاحب نے جسٹس عبدالوحید صدیقی کے حوالہ سے ”دولت العربیہ“ کی بات بھی کی ہے لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ خود قرآن کریم نے جناب نبی اکرمؐ کی نبوت کو صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کے لیے عام قرار دیا ہے اور واشگاف الفاظ میں آنحضرتؐ کی تعلیمات اور اسوہ کو قیامت تک کے لیے تمام نسل انسانی کی راہ نمائی کا واحد سرچشمہ بتایا ہے۔ جبکہ جناب رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں عرب وعجم اور کالے وگورے کے فرق کی نفی کرتے ہوئے ساری نوع انسانی کے لیے رہنما اصول پیش فرمائے ہیں۔ راجہ صاحب شاید اس بات کا ادراک نہیں کر سکے کہ اسلام میں حکومت کا تصور ہی نبوت کی نیابت اور نمائندگی کا ہے۔ اور اسلام کے سیاسی نظام کے لیے ”خلافت“ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جو بعد کے کسی دور میں وضع نہیں کی گئی بلکہ خود قرآن کریم اور آنحضرتؐ نے اسلامی حکومت کے لیے خلافت کی اصطلاح ارشاد فرمائی ہے۔

خلافت کا معنی نیابت ہے اور اس کی وضاحت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس طرح کی ہے کہ خلیفہ اس مسلم حکمران کو کہتے ہیں جو جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے ریاستی امور و فرائض کو سرانجام دے جیسا کہ خلفاء اسلام ہر دور میں کرتے چلے آئے ہیں۔ اس لیے جب نبوت کی نیابت کا نام خلافت ہے تو اس کا دائرہ بھی نبوت ہی کی طرح وسیع ہوگا اور اسے کسی علاقہ کے ساتھ مخصوص کرنا قرآن وسنت کی ان تمام تعلیمات اور ارشادات کی نفی کے مترادف ہوگا جو جناب رسول اللہؐ کی نبوت اور تعلیمات کو پوری نسل انسانی کے لیے عام قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح اسلام کے عالمگیر دین ہونے کے عقیدہ کی ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آپڑے گی۔

راجہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے غور فرمائیں کہ اگر ان کے یا جسٹس صدیقی صاحب کے بقول اسلامی خلافت کو ”دولت عربیہ“ قرار دے دیا جائے تو یہ خلافت جس نبوت کی نیابت کر رہی ہے اسے بھی عربیت کے دائرہ میں محدود ماننا پڑے گا۔ یعنی نعوذ باللہ یہ کہنا پڑے گا کہ نبی اکرمؐ صرف عربوں کے نبی تھے اور ان کا لایا ہوا انقلاب ”عرب انقلاب“ تھا۔ جبکہ

یہی وہ بات ہے جو مغرب کے یہودی اور مسیحی مستشرقین صدیوں سے ہمارے ذہنوں میں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حضرت محمدؐ کا انقلاب بہت اچھا تھا اور اس نے انسانیت کی بڑی خدمت کی لیکن وہ عرب انقلاب تھا اور اس کی بنیاد پر جو کلچر دنیا میں متعارف ہوا وہ عرب کلچر تھا جو اپنی طبعی مدت پوری کر چکا ہے، اس لیے مسلمانوں کو اس پر اصرار کرنے کی بجائے اس نئے کلچر کو قبول کر لینا چاہیے جو ان کے سامنے مغرب پیش کر رہا ہے کیونکہ وہی مغربی کلچر اب گلوبل کلچر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر اسلام اپنی تعلیمات اور تاریخ دونوں حوالوں سے ان مستشرقین کے اس دعوے کی نفی کرتا ہے اور اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

جہاں تک کسی ریاست کو اسلامی قرار دینے کا تعلق ہے راجہ صاحب محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ یہ ایک دستوری اصطلاح ہے جس کی تاریخ بہت مختصر ہے۔ جس دور کی راجہ صاحب بات کر رہے ہیں وہ دستوری اصطلاحات اور دستوری زبان سے بہت پہلے کا دور ہے اور اس دور کے معاملات کو آج کی دستوری زبان اور اصطلاحات پر پرکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ چونکہ جناب رسول اللہؐ اور خلفاء راشدینؓ نے اپنی مجلس شوریٰ کے لیے پارلیمنٹ کی اصطلاح استعمال نہیں کی تھی اس لیے آج کسی اسلامی ملک کی مجلس شوریٰ کو پارلیمنٹ کہنا اسلامی روایات سے مطابق نہیں رکھتا۔ اسلامی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے جو ریاست قائم کی اس کی بنیاد قرآن کریم پر تھی اور آپؐ کی نیابت میں جو خلافت قائم ہوئی وہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ جناب رسول اللہؐ کی سنت و احکام کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔

معاشرتی حقوق اور اسلامی تعلیمات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۷ جولائی ۲۰۰۰ء)

سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ کے سلامت ہسپتال میں ڈاکٹر صداقت علی صاحب کی دعوت پر ہر بدھ کو تین بجے گھنٹے پون گھنٹے کی ایک محفل جمتی ہے جس میں شہر کے چند سرکردہ ڈاکٹر صاحبان اور سلامت ہسپتال کے عملہ کے حضرات شریک ہوتے ہیں۔ اس محفل میں قرآن کریم کی چند آیات کا ترجمہ اور تشریح بیان ہوتی ہے، کچھ دینی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا ہے اور پھر ماحضر اکٹھے تناول کر کے محفل اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر ترتیب تسلسل کے ساتھ چل رہی ہے۔ فاتحہ سے سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۵ تک یہ خدمت ہمارے فاضل دوست پروفیسر غلام رسول عدیم صاحب سرانجام دیتے رہے، اس کے بعد قرعہ فال میرے نام نکل آیا اور ڈاکٹر صاحبان کے ذوق قرآن فہمی نے مجھے گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس ہفتہ وار محفل میں پابندی کے ساتھ حاضری پر مجبور کر دیا۔

گزشتہ بدھ کو سورۃ النساء کی آیت ۳۶ تا ۴۲ زیر درس تھی جن میں سے پہلی آیت کریمہ میں حقوق کا تذکرہ ہے۔ حقوق اللہ کا بھی اور حقوق العباد کا بھی۔ چونکہ ان دنوں حقوق انسانی کا تذکرہ ہر محفل میں ہونے لگا ہے اور اسلام کے بارے میں بطور خاص یہ کہا جانے لگا ہے کہ حقوق کے حوالے سے اس کا دامن آج کی دنیا کے بہت سے حلقوں کو تنگ نظر آتا ہے۔ اس آیت کریمہ کی تشریح میں جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ حقوق کے بارے میں اسلام نے کتنا متوازن، جامع اور وسیع پیکیج دیا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ اس آیت کریمہ میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کی تلقین کی ہے اور شرک سے ہر حال میں بچنے کا حکم دیا ہے جو انسان کے ذمہ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا اور بنیادی حق ہے اور حقوق اللہ کی ادائیگی کی اساس ہے۔ انسان کے پاس سب سے بڑی نعمت اس کی زندگی ہے جس کی وجہ سے وہ باقی نعمتوں سے استفادہ کر پاتا ہے۔ یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے اس لیے سب سے پہلے انسان کے ذمہ حق بھی اللہ کا ہی لازم آتا ہے کہ وہ اس کا شکر ادا کرے، اس کے احکام کی پیروی کرے اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اس کے بعد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے۔ قرآن کریم میں اور بھی بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ اپنی بندگی اور توحید کے ساتھ ماں باپ سے حسن سلوک کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی وجہ مفسرین یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا اصل خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن عالم اسباب میں اس کی زندگی اور وجود کا باعث اس کے ماں باپ ہیں۔ اس لیے حقوق خداوندی کے بعد ماں باپ کا حق بنتا ہے کہ ان کی فرمانبرداری کی جائے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے اقرار اور اس کی بندگی میں اللہ تعالیٰ اور رسول خداؐ کے حقوق سمیت

تمام احکام شریعہ شامل ہیں۔ کیونکہ عبادت اور بندگی کا مطلب صرف یہ نہیں کہ چند رسوم شرعیہ کو بجالایا جائے، بلکہ ان کے ساتھ زندگی کے تمام معاملات میں قرآن و سنت کی پیروی بھی بندگی کے مفہوم میں شامل ہے۔

ماں باپ کے بعد اللہ تعالی نے جن لوگوں کو انسان کے حسن سلوک کا حقدار قرار دیا ہے وہ اس آیت کریمہ کی رو سے درج ذیل ہیں:

1. قریبی رشتہ دار
2. یتیم بچے
3. نادار اور مسکین لوگ
4. وہ پڑوسی جو رشتہ دار بھی ہیں
5. وہ پڑوسی جو رشتہ دار نہیں ہیں
6. رفیق سفر اور ہم مجلس دوست
7. مسافر اور مہمان
8. غلام اور ماتحت افراد

ان افراد کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دے کر اللہ تعالی نے آیت کریمہ کا اختتام اس جملہ پر کیا ہے کہ:

"بے شک اللہ تعالی کسی متکبر اور شیخی بگھارنے والے کو پسند نہیں کرتے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوتاہی اللہ تعالی کے نزدیک تکبر اور شیخی بگھارنے کے زمرہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور جس طرح اللہ تعالی کی بندگی سے گریز کبرو نخوت کی علامت ہے اسی طرح اس کے بندوں کے حقوق کو اہمیت نہ دینا اور ان کی ادائیگی کی ضرورت محسوس نہ کرنا بھی خود کو بڑا سمجھنے اور لوگوں کو حقیر تصور کرنے کے مترادف ہے۔

بندوں کے یہ حقوق "معاشرتی حقوق" ہیں اور ان کی پاسداری کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا حیثیت دیتے تھے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے جو بخاری شریف میں مذکور ہے۔ آنحضرتؐ ایک محفل میں تشریف فرماتھے۔ آپ کے دائیں جانب ایک نوعمر بچہ (حضرت عبد اللہ بن عباسؓ) اور بائیں جانب بڑی عمر کے جوان (حضرت خالد بن ولیدؓ) بیٹھے تھے۔ حضورؐ کی خدمت میں ایک مشروب پیش کیا گیا جو آپ نے نوش فرمایا۔

جبکہ برتن میں کچھ مشروب بچ گیا جو آپ نے بائیں جانب والے ساتھی کو دینا چاہا۔ مگر چونکہ حق دائیں جانب والے کا تھا اس لیے اس سے پوچھا کہ اگر تم اجازت دو تو میں یہ بچا ہوا مشروب دوسری طرف والے ساتھی کو دے دوں؟ اس پر نوعمر لڑکے نے کہا کہ:

"میں آپؐ کے تبرک میں اپنے حق پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا۔"

اس واقعہ کے راوی حضرت سہل بن ساعدؓ کہتے ہیں کہ یہ جواب سن کر آنحضرتؐ نے وہ پیالہ اس بچے کے ہاتھ میں اس طرح تھمایا کہ اس میں ناگواری کے اثرات محسوس ہو رہے تھے۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ جناب نبی اکرمؐ کی نظر میں باہمی حقوق کی کیا اہمیت تھی کہ خود حضورؐ وہ پیالہ دوسری طرف دینا چاہتے تھے لیکن حق والا اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوا جس پر آپؐ کو ناگواری ہوئی مگر اس کے باوجود پیالہ اسی کے ہاتھ میں دیا جس کا حق تھا۔ ایسا کر کے جناب رسول اللہؐ نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ باہمی حقوق کی ادائیگی کا کس درجہ اہتمام ضروری ہے۔

آج ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات سے ہم خود بھی آگاہ نہیں ہیں اور دنیا کو بھی ان سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہمیں صحیح طور پر محسوس نہیں ہو رہی۔ ورنہ حقوق کا جو جامع اور متوازن تصور قرآن کریم نے دیا ہے دنیا کے کسی نظام میں اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

انسانی حقوق اور اسوۂ نبویؐ

(ڈسٹرکٹ کونسل ہال، گوجرانوالہ - ۳ جولائی ۲۰۰۰ء)

(۳ جولائی ۲۰۰۰ء کو ۱۱ بجے دن ڈسٹرکٹ کونسل ہال گوجرانوالہ میں محکمہ اوقاف پنجاب کے زیر اہتمام سالانہ ڈویژنل سیرت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت محکمہ اوقاف کے زونل ایڈمنسٹریٹر نے کی جبکہ کمشنر گوجرانوالہ ڈویژن جناب خوشنود اختر لاشاری مہمان خصوصی تھے۔ کانفرنس سے مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ مدیر الشریعہ مولانا زاہد الراشدی نے بھی خطاب کیا، ان کے خطاب کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سب سے پہلے محکمہ اوقاف پنجاب کا شکر گزار ہوں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حیات مبارکہ کے حوالہ سے منعقد ہونے والی اس

تقریب میں شرکت اور آپ حضرات سے گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ سیرت نبویؐ پر گفتگو کرنے والا اپنی بات شروع کرنے سے پہلے اس الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس وسیع و عریض چمنستان کے سدا بہار پھولوں میں سے کس کا انتخاب کرے اور کسے چھوڑے کیونکہ اس باغ کے ہر پھول کی خوشبو نرالی ہے اور کسی ایک کو چھوڑ کر آگے نکل جانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسی کشمکش میں، میں نے آج کے دور میں زیر بحث آنے والے سب سے بڑے موضوع کے حوالہ سے سیرت طیبہ کے صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کرنے کا ارادہ کیا ہے اور وہ ہے ”انسانی حقوق“ کا موضوع جو آج کا سب سے اہم عنوان ہے اور دنیا بھر میں اس پر گفتگو اور بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف اور شفاف سیرت مبارکہ کو ہم نہ آج کی دنیا کے سامنے تحریر و تقریر کی صورت میں صحیح طور پر پیش کر رہے ہیں اور نہ ہی ہماری عملی زندگی میں اس کی کوئی جھلک پائی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ہم مسلمانوں کا وجود اسلامی تعلیمات اور جناب رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ تک نسل انسانی کی رسائی میں رکاوٹ اور حجاب بن کر رہ گیا ہے۔ بہرحال آج کی دنیا کا سب سے اہم موضوع ”انسانی حقوق“ ہے اور مغرب آج کی نسل کیانسانی کو یہ باور کرانے میں مصروف ہے کہ اس نے انسانوں کو حقوق کا شعور بخشا اور ان کے حقوق کا تعین کیا ہے۔ لیکن تاریخ کے میزان پر یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے عنوان سے حقوق کا جو تعارف اور تفصیلات قرآن کریم میں چودہ سو برس پہلے سامنے آچکی ہیں آج کا کوئی نظام خدا اور اس کے بندوں کے درمیان اور پھر خود انسانوں کے باہمی حقوق کے بارے میں اس طرح کا جامع تصور اور نظام پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جناب سرور کائناتؐ کی سیرت طیبہ میں بے شمار واقعات ہیں جن میں آنحضرتؐ نے انسانوں بلکہ جانوروں تک کے حقوق کی وضاحت کی ہے، ان کی ادائیگی کی تلقین کی ہے اور اپنے حقوق کی پاسداری کے جذبہ کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ آج کی مجلس میں انہی میں سے چند واقعات کا تذکرہ کرنا چاہ رہا ہوں۔

ابوداؤد شریف کی روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ ایک دفعہ مدینہ منورہ کے کسی باغ میں تشریف لے گئے، وہاں ایک کمزور اور لاغر سا اونٹ کھڑا تھا، رسول اکرمؐ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ اپنی زبان میں کچھ شکایت کرنے لگا۔ نبی کریمؐ نے دریافت کیا کہ

اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا کہ یارسول اللہ! یہ اونٹ میرا ہے۔ اس پر آپؐ نے اسے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اس جاندار کے حقوق میں کوتاہی نہ کرو۔ پھر فرمایا کہ اس اونٹ نے تمہارے بارے میں دو شکایتیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اس سے کام اس کی ہمت سے زیادہ لیتے ہو اور دوسری یہ کہ اسے اس کی ضرورت کے مطابق خوراک نہیں دیتے۔ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے، اس پر ہمت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور ضرورت کے مطابق خوراک مہیا کرو۔ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ جناب نبی اکرمؐ نے نہ صرف انسانوں کے بلکہ جانوروں کے حقوق بھی بیان فرمائے ہیں اور ان میں کوتاہی کو ظلم قرار دیا ہے۔

ابوداؤد شریف ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز پیدل کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے، ایک صحابیؓ نے جو گدھے پر سوار تھے، دیکھا تو حضورؐ کے پاس آکر آپ سے درخواست کی کہ اس کے ساتھ گدھے پر سوار ہو جائیں۔ یہ کہہ کر وہ صحابی گدھے پر اپنی جگہ سے پیچھے ہٹے تاکہ نبی اکرم ان سے آگے بیٹھ جائیں۔ مگر جناب رسول اکرمؐ نے یہ کہہ کر آگے بیٹھنے سے احتراز فرمایا کہ "صاحب الدابۃ احق بصدرھا" جانور کا مالک آگے بیٹھنے کا زیادہ حقدار ہے۔ صحابیؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں بخوشی اپنے اس حق سے دستبردار ہوتا ہوں تو اس کے بعد آپؐ گدھے پر اس کے آگے بیٹھ گئے۔ یہ بات بظاہر ایک عام اور معمولی سی لگتی ہے لیکن اس میں نبی کریمؐ کی یہ سنت اور تعلیم موجود ہے کہ باہمی حقوق کا احترام کس قدر ضروری ہے اور حقوق کے بارے میں بڑے چھوٹے کی کوئی ترجیح نہیں ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ تشریف فرما تھے، آپ کے دائیں جانب حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے تھے اور بائیں جانب حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔ یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ ان کی حقیقی خالہ تھیں اس لیے دونوں آنحضرتؐ کے بھانجے بھی لگتے تھے۔ اس مجلس میں جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں کوئی مشروب پیش کیا گیا جو آپؐ نے نوش فرمایا جس کا کچھ حصہ بچ گیا تو وہ بائیں جانب بیٹھے ہوئے حضرت خالد بن ولیدؓ کو دینا چاہا جبکہ یہ حق دائیں جانب والے کا بنتا تھا جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ تھے، جو اگرچہ چھوٹے بچے تھے اس لیے کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے ان

سے اجازت مانگی اور پوچھا کہ تم اجازت دو تو یہ بچا ہوا مشروب بائیں جانب والے کو دے دوں؟ مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ میں آپ کے تبرک کے بارے میں خود پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا۔ یہ جواب سن کر حضورؐ نے پیالہ انہی کو دیا لیکن روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''تلہ فی یدہ'' پیالہ زور سے ان کے ہاتھ میں تھما دیا جس کے بارے میں شارحین کہتے ہیں کہ اس انداز میں ناگواری کا پہلو جھلکتا تھا۔ اس واقعہ پر غور کر کے نتیجہ اخذ کیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جی بائیں جانب پیالہ دینے کو چاہتا تھا لیکن جس کا حق تھا اس سے اجازت مانگنا ضروری سمجھا، اور اجازت نہ دینے پر اگرچہ ناگواری بھی ہوئی مگر پیالہ دیا اسی کو جس کا حق تھا خواہ وہ چھوٹا بچہ ہی تھا۔ اس سے زیادہ دوسرے کے حق کے احترام اور اپنے حق کے لیے اڑ جانے کے جذبہ کی حوصلہ افزائی کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

یہ واقعہ بھی بخاری شریف میں مذکور ہے اور اس کی تفصیلات حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی خرید کر آزاد کر دی جس کا نام بریرہؓ تھا۔ وہ لونڈی ہونے کی حالت میں مغیثؓ نامی ایک نوجوان کے نکاح میں تھی۔ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر لونڈی کا اس کے مالک نے کسی سے نکاح کر دیا ہو اور اس کے بعد کسی مرحلہ پر وہ لونڈی آزاد ہو جائے تو اسے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے خاوند کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ بریرہؓ کو یہ مسئلہ معلوم تھا اس لیے اس نے اپنا یہ حق استعمال کرتے ہوئے مغیثؓ سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مغیثؓ کو پتہ چلا تو بہت پریشان ہوا کہ اچھا خاصا گھر اجڑ رہا ہے۔ اس نے مختلف طریقوں سے بریرہؓ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ فیصلے پر نظر ثانی کر لے مگر بریرہؓ نے کوئی بات سننے سے انکار کر دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ مغیثؓ کی پریشانی اس حالت تک پہنچ گئی کہ وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں دیوانہ وار آنسو بہاتا پھرتا تھا اور لوگوں سے کہتا تھا کہ خدا کے لیے کوئی بریرہؓ کو اس فیصلہ پر نظر ثانی کے لیے آمادہ کرے۔ حتیٰ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کے سامنے اس تعجب کا اظہار کیا کہ اس کی محبت دیکھو کہ وہ گلیوں میں آنسو بہاتا پھر رہا ہے اور بریرہؓ کی نفرت دیکھو کہ وہ اس کا نام سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ صورتحال دیکھ کر خود جناب نبی اکرمؐ نے بریرہؓ سے مغیثؓ کی سفارش کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے بلا کر اس خواہش کا اظہار فرمایا۔ آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی

کی بات سن کر بریرہؓ نے ایک سوال کیا کہ یارسول اللہ! کیا یہ حکم ہے یا محض سفارش؟ سوال پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مومنہ تھی اور صحابیہؓ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر حکم ہوا تو اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرما دیا ہے کہ جب اللہ تعالی اور اس کے رسول کسی بات کا حکم دے دیں تو پھر کسی مومن مرد یا عورت کا یہ حق باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس کے بعد اپنا اختیار استعمال کریں۔ اس لیے بریرہؓ نے اس کی وضاحت چاہی اور جب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ یہ حکم نہیں بلکہ صرف سفارش ہے تو اس نے فورا کہہ دیا کہ مجھے اس (مغیثؓ) کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آپ غور فرمائیے کہ سفارش کرنے والے کون ہیں؟ کائنات میں اس سے بڑی اور کوئی سفارش نہیں ہو سکتی۔ لیکن اپنے حق پر اڑتے ہوئے اس سفارش کو قبول نہ کرنے والی کون ہے؟ ایک عام خاتون جو چند روز پہلے تک کسی کی لونڈی تھی اور اب خود جناب نبی کریمؐ کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خادمہ ہے۔ لیکن کیا مجال کہ اس کے اس فیصلے پر آنحضرتؐ کی پیشانی پر کوئی بل آیا ہو یا آپؐ نے اس کے بعد اسے کبھی جتلایا بھی ہو حالانکہ وہ بطور خادمہ اکثر حضرت عائشہؓ کے پاس ہی رہتی تھی۔ آج ہمارا کوئی ماتحت ہماری سفارش رد کر کے دیکھے کہ پھر اس کے ساتھ ہمارا کیا معاملہ ہوتا ہے۔ لیکن جناب رسول اکرمؐ نے اس کے بعد کبھی اس کا ذکر تک نہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے نہ صرف حقوق کا تعین کیا ہے، ان کی وضاحت کی ہے اور ان کی ادائیگی کی تلقین کی ہے بلکہ اپنے حق کے لیے اڑ جانے والے کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے اور کسی کو اس کی راہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دی۔

حضرات محترم! یہ چند واقعات میں نے انسانی حقوق کے حوالہ سے جناب رسول اکرمؐ کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کی طرف توجہ دلانے کے لیے عرض کیے ہیں اور آخر میں پھر یہی عرض کرتا ہوں کہ یہ آج کی دنیا کی ضرورت ہے اور ہماری ذمہ داری ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کو دنیائے انسانیت کے سامنے صحیح طور پر پیش کرنے کے لیے ہم سنجیدگی کے ساتھ محنت کریں کیونکہ آج نسل انسانی کو جو مشکلات اور مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسی میں ہے۔

غیرت کا جذبہ اور اس کی شرعی حدود

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۷ اپریل ۲۰۰۰ء)

ان دنوں غیرت کے نام پر قتل کی وارداتیں بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں کا خاص موضوع ہیں اور قتل کی ان وارداتوں کے حوالہ سے غیرت کا لفظ اور اس کا مفہوم بھی مسلسل زیر بحث ہے۔

''غیرت'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے مفہوم میں اہل زبان دو باتوں کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی ناگوار بات دیکھ کر دل کی کیفیت کا متغیّر ہو جانا، اور دوسرا یہ کہ اپنے کسی خاص حق میں غیر کی شرکت کو برداشت نہ کرنا۔ ان دو باتوں کے اجتماع سے پیدا ہونے والے جذبہ کا نام غیرت ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیرت کو صفات حمیدہ میں شمار کیا ہے۔ بخاری اور مسلم کی روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

> ''اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ غیرت والے ہیں، اس کے بعد میں سب سے زیادہ غیرت والا ہوں، اور مومن بھی غیرت مند ہوتا ہے۔''

علماء کرام نے اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کا باعث بھی غیرت ہی کو قرار دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ جس گناہ کو چاہیں گے بخش دیں گے لیکن شرک کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ علماء کا کہنا ہے کہ بندگی اور عبادت اللہ تعالیٰ کا خاص حق ہے، اس لیے اس خاص حق میں کسی دوسرے کی شرکت کو گوارا کرنا غیرت کے خلاف ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں سب سے زیادہ مذمت شرک کی بیان کی گئی ہے۔

غیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس شخصیت کے ساتھ محبت ہو اس کی کسی درجہ میں بھی توہین برداشت نہیں ہوتی۔ حافظ ابن القیم کے بقول جس شخص کو جس شخصیت کے ساتھ جس قدر محبت ہو اسی قدر اسے اس پر غیرت آتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی، قرآن کریم، اور جناب نبی اکرمؐ کی بے حرمتی پر ایک مسلمان سب سے زیادہ طیش میں آتا ہے کہ بحیثیت مسلمان اس کی محبت سب سے زیادہ انہی کے ساتھ ہوتی ہے۔ چنانچہ غیرت محبت کی علامت بھی ہے کہ جس کے ساتھ جتنی محبت ہوگی انسان اس پر اتنی ہی غیرت کھائے گا۔

اللہ تعالیٰ، قرآن کریم، اور رسول اکرمؐ کے بعد غیرت کا مظاہرہ جس چیز پر سب سے زیادہ ہوتا ہے وہ میاں بیوی کا تعلق ہے اور عصمت و عفت کے باہمی تعلقات کا تحفظ

ہے۔ اس کے بارے میں غیرت کے اظہار کے بیسیوں واقعات احادیث کے ذخیرے میں موجود ہیں۔ حتی کہ اس حوالہ سے خود جناب نبی اکرمؐ اور ازواج مطہرات کے متعدّد واقعات ہیں جو اسلامی تعلیمات میں اس جذبۂ صادقہ کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ ان میں سے چند واقعات کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ ایک بار ام المومنین حضرت عائشہؓ کے پاس ان کے حجرہ میں تشریف لائے تو ایک نوجوان کو ان کے حجرے میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ یہ دیکھتے ہی آپؐ کے چہرے کا رنگ متغیّر ہوگیا جسے حضرت عائشہؓ نے بھانپ لیا اور فوراً وضاحت کی کہ یا رسول اللہ! یہ میرا رضاعی بھائی ہے۔

اور یہ بھی غیرت ہی کا اظہار تھا کہ قرآن کریم میں پردے کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا مگر حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! آپ کی مجلس میں مسلمان، منافق، کافر ہر قسم کے لوگ آتے ہیں اور مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ آپ کی بیویوں اور بیٹیوں پر ان لوگوں کی نگاہ پڑے، اس لیے آپ انہیں پردہ کا حکم دیجیے۔ مفسرین کرام کا کہنا ہے کہ اسی کے بعد سورۃ الاحزاب کی یہ آیت نازل ہوئی:

> ”اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیجیے کہ وہ اپنے اوپر چادریں لٹکا کر رکھا کریں۔“

غیرت کا تعلق مرد و عورت دونوں سے ہے۔ اسلام نے دونوں کا یہ حق مساوی تسلیم کیا ہے کہ اگر دوسرا فریق ان کے خاص حق میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے تو وہ اس پر غصہ کا اظہار کرے اور اس پر احتجاج کرے۔ حتی کہ کسی مرد کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان بیویوں کا یہ حق بھی اسلام میں تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ باہمی معاملات کے توازن میں کوئی فرق محسوس کریں تو اس کا اظہار کریں۔ چنانچہ نسائی کی روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے ایک بار اپنی باری والے دن تھوڑی دیر کے لیے رسول اللہؐ کو اپنے پاس نہ پایا۔ انہیں خدشہ ہوا کہ آپؐ کسی اور بیوی کے ہاں تو نہیں چلے گئے تھے۔ حضورؐ جب واپس آئے تو حضرت عائشہؓ نے آپؐ کے سر کے بالوں میں انگلیاں داخل کر کے یہ دیکھا کیا کہ کہیں آپ غسل کر کے تو نہیں آئے۔

جناب نبی اکرمؐ نے غیرت کو نہ صرف اچھا جذبہ قرار دیا ہے بلکہ اس کا احترام بھی کیا ہے۔ چنانچہ صحیح روایت میں ہے کہ آپؐ نے خواب میں جنت کی سیر کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کا محل دیکھا اور اس میں داخل ہونا چاہا مگر کونے میں ایک خوبصورت خاتون کو وضو کرتے

دیکھ کر رک گئے اور محل کے اندر نہیں گئے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ مجھے عمرؓ کی غیرت کا خیال آ گیا تھا۔

اپنے گھر کے ماحول میں عصمت و عفت کے ماحول کو قائم رکھنا اور پردہ داری کے تقاضوں کا لحاظ کرنا گھر کے سربراہ کی ذمہ داریوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ نسائی کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "دیوث" شخص پر جنت حرام کر دی گئی ہے۔ اور پھر لفظ دیوث کی وضاحت بھی آپؐ نے خود فرمائی کہ وہ شخص جو اپنے گھر والوں میں بے حیائی کی باتیں برداشت کر لے۔

تاریخی روایات میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ سے خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کرنے والے باغی جب انہیں شہید کرنے کے لیے گھر میں داخل ہو گئے تو امیرالمومنینؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہؓ نے عربوں کے رواج کے مطابق سر کے بال بکھیر کر حملہ آوروں کو رحم کی دہائی دینا چاہی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے دور سے چلا کر آواز دی کہ:

"اپنی چادر اوڑھ لو۔ کیونکہ تمہارا ننگے سر ہونا میرے لیے ان لوگوں کے حملے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔"

احادیث کے ذخیرہ میں اس کے علاوہ بھی بیسیوں واقعات ہیں جن میں غیرت کے اسی دینی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر جس طرح انسان کے دوسرے اوصاف اور خصلتوں کی حدود بیان کی گئی ہیں اسی طرح جناب نبی اکرمؐ نے غیرت کے جائز اور ناجائز پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے اور اس کی حدود بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً ابوداؤد میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایک غیرت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ پھر فرمایا کہ جو غیرت کسی سبب کی وجہ سے ہو وہ پسندیدہ ہے جبکہ غیرت کا جو اظہار کسی سبب کے بغیر خواہ مخواہ ہو اسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ کسی سبب اور وجہ کے ظاہر ہونے پر اگر غصہ اور غیرت کا اظہار کیا جائے تو بجا ہے مگر بلا وجہ اور بلا سبب خواہ مخواہ غیرت کا اظہار شرعاً درست نہیں ہے۔

اسی طرح غیرت اور غصہ کا جائز حد تک اظہار تو بجا ہے مگر قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے کہ جب زنا کے ثبوت اور اس کی سزا کے لیے چار گواہوں کی شرط قرآن کریم میں نازل ہوئی تو حضرت سعد بن عبادہؓ نے تعجب سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا میں اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو دیکھ کر چار گواہ تلاش کرتا پھروں گا؟ نہیں بلکہ بخدا میں تو تلوار کے ساتھ اس کا کام تمام کر دوں گا۔ جناب نبی اکرمؐ

نے اس پر فرمایا کہ دیکھو سعدؓ کتنا غیرت والا ہے، میں بھی غیرت والا ہوں اور اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ غیرت والا ہے۔ یعنی آپؐ نے حضرت سعدؓ کی غیرت کا تذکرہ تو فرمایا مگر قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی۔

اسی طرح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کی اہلیہ ان کے دور خلافت میں فجر اور عشاء کی نماز کے لیے باقاعدگی کے ساتھ مسجد میں جایا کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات اپنی طبعی غیرت کی وجہ سے پسند نہیں تھی مگر منع بھی نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ یہ بیان کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"اللہ کی بندیوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکا کرو۔"

اس لیے حضرت عمرؓ پسند نہ ہونے کے باوجود اپنی اہلیہ کو مسجد میں جانے سے نہیں روکتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ غیرت کا اظہار بہت اچھی چیز ہے لیکن جو حقوق عورت کو شریعت نے دے رکھے ہیں انہیں غیرت کے نام پر ان سے روکنا درست نہیں ہے۔

الغرض غیرت ایک اچھا جذبہ ہے جو نہ صرف ہمارے ایمان و عقیدہ کی حفاظت کرتا ہے بلکہ عورت اور مرد کے عفت و عصمت کے نظام اور خاندانی ماحول کے تقدس کا محافظ بھی ہے۔ البتہ اس کے اظہار اور استعمال کی حدود بھی متعیّن ہیں کہ غیرت کے نام پر نہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت ہے اور نہ ہی عورتوں کو ان کے شرعی حقوق سے محروم کر دینے کا کوئی جواز ہے۔

شادی اور اس کے سماجی اثرات

(جامعہ علوم اسلامیہ، میرپور - ۳ اپریل ۲۰۰۰ء)

(میرپور آزاد کشمیر کی بزرگ دینی و سماجی شخصیت اور مدنی ٹرسٹ جامعہ الہدیٰ (ٹونگھم، برطانیہ) کے چیئرمین مولانا ڈاکٹر اختر الزمان غوری کی دختر کے نکاح کی باوقار تقریب ۱۳ اپریل ۲۰۰۰ء کو جامعہ علوم اسلامیہ میرپور کی جامع مسجد خدیجۃ الکبریٰؓ میں عصر کی نماز کے بعد منعقد ہوئی جس میں آزاد کشمیر سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب عبد المجید ملک، سابق وزیر چودھری محمد یوسف، ضلع مفتی مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی، بزرگ عالم دین مولانا عبد الغفور اور ممتاز کشمیری لیڈر چودھری

فضل الٰہی تاج پوری سمیت سرکردہ معززین علاقہ، سرکاری حکام، علماء کرام اور وکلاء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی جبکہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ علوم عربی و اسلامیات کے سربراہ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے اور خطاب کیا۔ پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی نے خطبہ مسنونہ پڑھ کر ایجاب و قبول کرایا اور اس موقع پر نکاح کی اہمیت اور دیگر متعلقہ امور پر خطاب کیا جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ یہ ہمارے محترم دوست اور بزرگ ساتھی مولانا ڈاکٹر اختر الزمان غوری صاحب کی بیٹی کے نکاح کی تقریب ہے جس میں شرکت اور آپ حضرات کے ساتھ ملاقات و گفتگو کا موقع فراہم کرنے پر میں محترم ڈاکٹر صاحب کا شکرگزار ہوں اور دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت اس نکاح کو میاں بیوی اور ان کے خاندانوں میں محبت اور اعتماد میں اضافے کا ذریعہ بنائیں اور باہمی محبت و اعتماد کے ساتھ نیکی کی زندگی کی توفیق دیں، آمین۔

شادی کو عام طور پر ایک سماجی ضرورت سمجھا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک طبعی ضرورت ہے اور سماجی ضرورت بھی ہے۔ لیکن اسلام نے اسے صرف ضرورت کے دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ زندگی کے مقاصد میں شمار کیا ہے اور نیکی اور عبادت قرار دیا ہے جس سے شادی کے بارے میں اسلام کے فلسفہ اور باقی دنیا کی سوچ میں ایک بنیادی فرق سامنے آتا ہے۔ کیونکہ اگر شادی کو محض ایک ضرورت اور مجبوری سمجھا جائے تو پھر یہ ضرورت جہاں پوری ہو اور جس حد تک پوری ہو بس اسی کی کوشش کی جائے گی، لیکن اگر اس کے دائرہ کو وسعت دے کر اسے مقصد اور نیکی بھی شمار کیا جائے تو پھر اس کی حدود اور دائرہ کار کا تعین مقصد اور عبادت کے حوالہ سے ہوگا۔ اور یہی چیز اسلام کے فلسفۂ نکاح اور اس کے خاندانی نظام کے تصور کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت کہا ہے اور یہ سارے پیغمبروں کی مشترکہ سنت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں نے شادی کی اور ان کی اولاد بھی ہوئی جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے کہ "بے شک ہم نے آپؐ سے پہلے کئی رسول بھیجے اور انہیں بیویاں اور اولاد بھی عطا کی" (سورہ الرعد)۔ البتہ دو پیغمبروں کے بارے میں صراحت ہے کہ ان کی شادی نہیں ہوئی۔ ایک حضرت یحیٰی علیہ السلام جن کے بارے میں قرآن کریم میں ہے کہ وہ "حصور"

تھے یعنی عورت کے قریب نہ جانے والے تھے اور دوسرے حضرت عیسی علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں احادیث میں ہے کہ ان کی شادی ابھی ہونی ہے، وہ جب دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کی شادی ہوگی اور اولاد بھی ہوگی۔ اس لیے شادی حضرات انبیاء کرامؑ کی سنت ہے اور عبادت بھی ہے کہ اگر اللہ تعالی کی رضا کی نیت کی جائے تو شادی کے ہر عمل پر جناب نبی اکرمؐ نے ثواب کی بشارت دی ہے۔ حتی کہ نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص محبت سے اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالتا ہے تو یہ بھی صدقہ شمار ہوگا اور اس پر اسے ثواب ملے گا۔ "در مختار" فقہ حنفی کی معروف کتاب ہے، اس میں لکھا ہے کہ دو عبادتیں ایسی ہیں جو تمام انبیاء کرام میں مشترک رہی ہیں اور یہ دو عبادتیں جنت میں بھی ہوں گی۔ ایک ایمان باللہ اور دوسری نکاح اور شادی۔ یعنی باقی عبادات میں تو انبیاء کرام کی شریعتوں میں فرق رہا ہے کہ نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ کی کیفیات مختلف رہی ہیں لیکن اللہ تعالی پر ایمان اور اس کا ذکر اور نکاح یہ دو عمل ایسے ہیں جو تمام انبیاء کرام میں یکساں رہے ہیں اور جنت میں بھی ہوں گے۔

اسلام کی نظر میں شادی انسانی ضرورت بھی ہے، اس کی زندگی کا مقصد بھی ہے، عبادت بھی ہے اور ایک مسلمان کے ایمان اور اخلاق و عادات کی حفاظت کے لیے مضبوط حصار بھی ہے جسے قرآن کریم نے احصان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ "حصن" عربی زبان میں قلعہ کو کہتے ہیں اور "احصان" کا معنی قلعہ بنانا اور قلعہ بندی کرنا ہے۔ گویا ایک مسلمان جب شادی کر کے گھر آباد کرتا ہے تو وہ ایک نیا قلعہ تعمیر کرتا ہے جو اس کے ایمان، اخلاق اور عادات کی حفاظت کرتا ہے اور اس باطنی تحفظ کے ساتھ ساتھ اسے لوگوں کی نگاہوں، باتوں اور شکوک و شبہات سے بھی تحفظ مل جاتا ہے اور شادی اس کے لیے بہت سی ظاہری اور باطنی تحفظات کا قلعہ بن جاتی ہے۔ پھر قرآن کریم نے ایک اور بہت خوبصورت اشارہ کیا ہے کہ اس حوالہ سے جہاں مردوں کا ذکر کیا وہاں فرمایا "محصنین" جو فاعل کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے قلعہ بنانے والے، اور جہاں عورتوں کا تذکرہ فرمایا وہاں کہا "محصنات" جو مفعول کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے وہ چیزیں جنہیں قلعے کے اندر رکھ کر ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ گویا قلعہ بنانے والا اور اس پر پہرہ دینے والا مرد ہے۔ اور وہ متاع عزیز جس کی حفاظت کے لیے قلعہ بنایا گیا ہے اور جس کو اس چار دیواری کے اندر رکھ کر اس کی حفاظت مقصود ہے وہ عورت ہے۔

اسی ایک لفظ سے خاندانی نظام کے اسلامی فلسفہ کی وضاحت ہو جاتی ہے اور خاندانی نظام کے حوالہ سے آج کی دنیا کو درپیش صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو اسلام کے اس ''فلسفہ احصان'' کی اہمیت اور زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔ کیونکہ آج مغربی دنیا کو جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ خاندانی نظام کے بکھر جانے اور فیملی سسٹم کے ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہو جانے کا ہے جس نے پوری مغربی دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس سوچ کا کہ شادی محض ایک سماجی ضرورت ہے، اس لیے جس کی یہ ضرورت جہاں اور جس حد تک پوری ہو جاتی ہے اسے اس سے زیادہ اس حوالہ سے کسی اور بات سے دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں شادی مقصد ہے، عبادت ہے اور مذہبی فرائض میں سے ہے جس کے لیے مذہب کے واضح احکام ہیں، رشتوں کا تقدس ہے اور باہمی حقوق و مفادات کا ایک متوازن نظام ہے جس نے مرد و عورت کے تعلقات کے گرد تحفظات کا ایک مضبوط حصار قائم کر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا خاندانی نظام ابھی تک بحمد اللہ تعالیٰ محفوظ ہے اور اس قلعہ میں شگاف ڈالنے کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ حتیٰ کہ امریکہ کی خاتون اول مسز ہیلری کلنٹن چند برس قبل جب اسلام آباد کے دورے پر آئیں تو ان کی طرف سے اخبارات میں ایک تبصرہ شائع ہوا کہ انہیں مشرق کا خاندانی نظام دیکھ کر رشک آتا ہے۔ یہی وہ قلعہ بندی ہے جسے قرآن کریم نے ''احصان'' سے تعبیر کیا ہے اور اسی بات کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس نے شادی کی اس نے اپنے نصف دین کو مکمل کر لیا اور اب اسے باقی نصف دین کی فکر کرنی چاہیے۔''

اس موقع پر ایک دلچسپ تاریخی واقعہ ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شادی کا سماج پر کیا اثر ہوتا ہے اور معاشرتی زندگی کے ساتھ شادی اور نکاح کا کیا تعلق ہے۔ بعض شادیاں ایسی ہوتی ہیں جو سوسائٹی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں حتیٰ کہ بسا اوقات ایک شادی پوری سوسائٹی میں انقلاب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی قسم کی ایک شادی کا تذکرہ گزشتہ دنوں تاریخ کی ایک کتاب میں نظر سے گزرا کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جب خلافت سنبھالنے کے بعد مقتدر طبقہ کے افراد اور شاہی خاندان کے لوگوں سے بیت المال اور قومی خزانے کے اثاثے اور رقوم واپس لینے کا فیصلہ کیا تو ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اس وقت بیت المال یعنی قومی خزانے کے اسی فیصد اثاثے اور اموال شاہی خاندان اور وی آئی پی لوگوں کے قبضے میں تھے جنہیں واپس لینے

کے لیے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے سب سے پہلے اپنے گھر سے آغاز کیا۔ باغ فدک ان کے قبضہ میں تھا اسے واپس کیا، گھر آکر بیوی کے زیور اتروائے اور بیت المال کو بھجوا دیے، اپنی سواری کے لیے شاہی گھوڑوں کا دستہ واپس کر دیا اور اس کے بعد حکمران خاندان کا اجلاس طلب کر کے انہیں الٹی میٹم دیا کہ دو ہفتے کے اندر اندر بیت المال کے تمام اثاثے اور اموال قومی خزانے میں واپس کر دیے جائیں۔ چنانچہ انہیں سب کچھ واپس کرنا پڑا اور مؤرخین کے مطابق دو ہفتے کے اندر قومی خزانے کے تمام اموال پھر سے بیت المال میں جمع ہو گئے۔ اس پر خاندان خلافت میں خاصی ناراضگی کا اظہار کیا گیا حتیٰ کہ مسلمہ بن عبد الملکؒ کو جو سالار افواج تھے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے برادر نسبتی بھی تھے ان سے گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا۔ انہوں نے امیر المؤمنین سے سوال کیا کہ جو فیصلے ان سے پہلے خلفاء نے کیے ہیں انہیں وہ کیوں منسوخ کر رہے ہیں؟ مطلب یہ تھا کہ جو عطیات سابقہ حکمرانوں نے دیے ہیں انہیں واپس لینے کا انہیں اختیار نہیں ہے۔ اس پر امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے مسلمہ بن عبد الملکؒ سے دو سوال کیے:

- ایک یہ کہ اگر کسی ایک مسئلہ پر تمہارے پاس دو الگ الگ حکم ہوں، ایک حکم تمہارے والد محترم خلیفہ عبد الملک بن مروان کا ہو اور دوسرا حکم خلافت بنو امیہ کے بانی حضرت امیر معاویہؓ کا ہو جو اس سے مختلف ہو تو تم کس کے حکم کو ترجیح دو گے؟ مسلمہؒ نے جواب دیا کہ حضرت معاویہؓ کے حکم کو ترجیح دوں گا کیونکہ وہ پہلے کا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے کہا کہ میرے پاس ان سے بھی پہلے کا آرڈر موجود ہے جو قرآن کریم کا ہے اور میں اسے ترجیح دے رہا ہوں۔
- انہوں نے مسلمہ سے دوسرا سوال یہ کیا کہ اگر تمہارے علم میں ہو کہ ایک شخص فوت ہو گیا ہے اور اس کی جائیداد پر اس کے چند طاقتور بیٹوں نے قبضہ کر لیا ہے جس سے دوسرے مستحقین افراد وراثت کے حق سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور پھر کسی وقت تمہیں یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ تم ان محروم مستحقین کو ان کا حق واپس دلا سکو تو تم کیا کرو گے؟ مسلمہ نے جواب دیا کہ میں اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے مستحق افراد کو ان کا حق ضرور دلاؤں گا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا کہ میں نے بھی اس سے مختلف کام نہیں کیا۔

اس پر مسلمہ کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ خاندان والوں نے جب دیکھا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ پر ان کی کوئی بات اثر نہیں کر رہی تو باہمی مشورہ کر کے خاندان کی اس وقت کی سب سے بزرگ شخصیت فاطمہ بنت مروانؒ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا جو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی پھوپھی تھیں اور اس وقت خاندان کی سب سے معمر خاتون تھیں۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ پھوپھی محترمہ کے کہنے پر عمر بن عبد العزیزؒ اس معاملہ میں شاید نرمی اختیار کر لیں۔ لیکن جب پھوپھی محترمہ نے عمر بن عبد العزیزؒ کو بلا کر خاندان والوں کی شکایت سے آگاہ کیا اور کچھ نرمی کرنے کی تلقین کی تو انہوں نے اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں بھی خاموش کرا دیا۔ اس پر فاطمہ بنت مروانؒ نے خاندان والوں سے کہا کہ میں نے تو اس وقت ہی کہہ دیا تھا جب اس کے باپ یعنی عبد العزیز بن مروانؒ کا رشتہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی پوتی سے کیا جا رہا تھا کہ یہ رشتہ سوچ سمجھ کر کرنا شاید تم سے نہ نبھ سکے لیکن کسی نے میری بات پر کان نہ دھرے اور آج اسی کے اثرات سب کے سامنے آ رہے ہیں اس لیے میں عمر بن عبد العزیزؒ سے اس سے زیادہ اب کچھ نہیں کہہ سکتی۔

یہ رشتہ بھی عجیب تھا، معروف تاریخی واقعہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک رات مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر کے اندر سے ماں اور بیٹی کی گفتگو سنائی دی۔ ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو تاکہ بازار میں فروخت ہو تو چار پیسے زیادہ مل جائیں۔ بیٹی نے جواب دیا کہ امیر المؤمنینؓ نے سختی کے ساتھ اس سے منع کر رکھا ہے۔ ماں نے کہا کہ امیر المؤمنین کون سا اس وقت ہماری بات سن رہے ہیں۔ بیٹی نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین نہیں سن رہے مگر اللہ تعالیٰ تو ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہماری باتیں سن بھی رہا ہے اس لیے میں دودھ میں پانی نہیں ملاؤں گی۔ حضرت عمرؓ گھر واپس تشریف لے گئے، صبح ماں بیٹی دونوں کو بلا لیا اور رات کے قصے کے بارے میں دریافت کیا، دونوں نے تصدیق کی تو حضرت عمرؓ نے اس نیک دل اور دیانت دار بیٹی کا رشتہ اپنے بیٹے حضرت عاصم بن عمرؓ کے لیے مانگ لیا جو طے ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی والدہ محترمہ انہی حضرت عاصمؒ اور ان کی اس نیک دل اہلیہ کی بیٹی تھیں اور فاطمہ بن مروانؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا کہ اس نے رشتہ کرتے وقت کہہ دیا تھا کہ عمر بن الخطابؓ کی پوتی کو گھر میں لا کر اس کے اثرات بھی قبول کرنا ہوں گے اس لیے اب ان کے اقدامات پر شکایات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ سوسائٹی پر شادیوں کے اثرات کیا ہوتے ہیں اور بعض شادیاں کس طرح بڑی بڑی معاشرتی تبدیلیوں کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اگر اپنی شادیوں میں مقصدیت اور نیکی کے پہلوؤں کو غالب کریں گے اور عبادت و ثواب سمجھ کر ان کے تقاضوں کی تکمیل کریں گے تو ہمیں ان کی برکات بھی نصیب ہوں گی اور شادی کے جو فوائد اسلام نے بیان کیے ہیں وہ بھی ہمیں ضرور حاصل ہوں گے۔

مگر ہم نے تو شادی کو خرافات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے اور شادی کی تقریبات میں اس قدر تکلفات و خرافات کو جمع کر لیا ہے کہ بسا اوقات ایسی تقریبات میں خطبہ اور ایجاب و قبول کی سنت کا بجالانا بھی ماحول کے پس منظر میں اجنبی سا کام محسوس ہونے لگتا ہے۔ مجھے تو شادی کی ایسی تقریبات سے وحشت ہونے لگی ہے اور اکثر و بیشتر شادیوں میں شرکت سے صرف اس وجہ سے انکار کر دیتا ہوں کہ وہاں جا کر عجیب سی اجنبیت ذہن پر سوار ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر اختر الزمان غوری صاحب نے اپنی سعادت مند بیٹی کے نکاح پر مسجد میں یہ باوقار اور سادہ سی جو تقریب منعقد کی ہے اسے دیکھ کر واقعتا بہت خوشی ہوئی ہے اور میں اس پر ڈاکٹر صاحب بلکہ دونوں خاندانوں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس شادی کو میاں بیوی اور دونوں خاندانوں میں باہمی محبت اور اعتماد میں دن بدن اضافے کا ذریعہ بنائیں اور ہم سب کو خوشی کی ایسی تقریبات اسی طرح وقار اور سادگی کے ساتھ نیکی اور برکت کے ماحول میں منعقد کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

میٹرک کا نصاب اور سورہ توبہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۴ فروری ۲۰۰۰ء)

میرپور آزاد کشمیر کے ضلعی مفتی مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی نے ''اوصاف'' میں شائع ہونے والے ایک مراسلہ میں بتایا ہے کہ پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم کے بعض ذمہ دار حکام میٹرک کے نصاب تعلیم سے قرآن کریم کی سورۃ توبہ کو خارج کرنے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس سے قبل بھی راقم الحروف کے علم میں بعض ذرائع سے یہ بات آچکی ہے کہ وفاقی وزارت تعلیم میں اس قسم کی کھسر پھسر جاری ہے اور اس سلسلہ میں اسلام آباد میں

ایک اجلاس بھی ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ سورۃ بہت مشکل ہے اور ملک کے مختلف حصوں سے طلبہ کے خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ اس سورۃ کا ترجمہ پڑھنا ان کے لیے دشوار ہے اور انہیں امتحان میں دقت پیش آتی ہے۔

ملک کے کسی بھی حصہ سے وزارت تعلیم کے حکام کے نام اس قسم کے خطوط کا اہتمام کرنا ان این جی اوز کے لیے کوئی انوکھا کام نہیں ہے جو رفاہی اور تعلیمی سرگرمیوں کے نام پر بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے ملک میں ذہنی انتشار اور فکری انارکی کی فضا پیدا کرنے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ورنہ جہاں تک مشکل مضامین کا تعلق ہے میٹرک کے طلبہ کے لیے اس سے کہیں زیادہ مشکل انگریزی اور ریاضی کے مضامین ہیں۔ اور میٹرک میں فیل ہونے والے طلبہ کی ایک بڑی تعداد بلکہ اکثریت ان دو مضامین کی وجہ سے فیل ہوتی ہے۔ مگر وزارت تعلیم کے حکام یا این جی اوز نے کبھی طلبہ اور طالبات کی اس مشکل کو دور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی ایسی کسی شکایت کو توجہ کے قابل سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ تعلیم میں نصاب کی بنیاد اس پر نہیں ہوتی کہ طلبہ اپنے لیے کون سی بات کو آسان سمجھتے ہیں اور کون سی بات انہیں مشکل دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ نصاب تعلیم کی بنیاد معاشرتی ضروریات اور ملی تقاضوں پر ہوتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس سطح پر ہم ان طلبہ اور طالبات کو کیا پڑھانا چاہتے ہیں، پھر اس دائرہ کے تعین کے بعد اس کے اندر رہتے ہوئے طلبہ کے لیے متوقع مشکلات کو آسان کرنے کی کوشش میں بھی کوئی حرج نہیں ہوتا۔

جہاں تک سورۃ توبہ کا تعلق ہے، مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی کے اس خیال سے ہمیں اتفاق ہے کہ یہ طلبہ اور طالبات کے لیے مشکل ہو یا نہ ہو البتہ سورۃ کے مضامین کو ہضم کرنا ان عالمی طاقتوں اور بین الاقوامی اداروں کے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے جو ملت اسلامیہ میں تیزی سے ابھرتے ہوئے جذبۂ جہاد کو موجودہ عالمی نظام کے لیے خطرہ سمجھ رہے ہیں۔ اور ان کے نزدیک مسلمان بچوں کا قرآنی تعلیمات سے واقف ہونا ان کے بنیاد پرست ہونے اور جہاد کے احکام وفضائل سے آگاہی ان کے دہشت گرد ہونے کی علامت ہے۔ اسی وجہ سے تعلیمی نصاب کے حوالے سے کام کرنے والے عالمی ادارے اور تعلیم کے نام پر مالی امداد دینے والی بین الاقوامی تنظیمیں مسلمان ملکوں پر اپنے نصاب تعلیم پر نظر ثانی اور اس میں دینی معلومات کا عنصر کم سے کم کرنے پر زور دیتی رہتی ہیں۔

کچھ عرصہ قبل صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ”مسجد مکتب اسکیم“ کے عنوان سے ملک بھر میں ایک تعلیمی پروگرام شروع کیا گیا تھا جس کا مقصد تعلیمی دائرہ کو وسیع کرنا، مساجد کو عوامی تعلیمی دائرہ میں شامل کرنا اور خواندگی اور تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ اس پروگرام کے تحت مساجد میں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ پرائمری اسکولوں کی سطح تک تعلیم کا اہتمام کیا جانا تھا جس سے پرائمری سطح پر تعلیم کے اخراجات بہت کم ہو جاتے اور زیادہ سے زیادہ بچوں کو اس سے فائدہ ہوتا۔ یہ سلسلہ شروع ہوا اور ملک کے بہت سے حصوں میں مساجد میں اس پروگرام کا آغاز بھی ہوا مگر بعد میں یہ اسکیم ختم کر دی گئی۔ واقفان حال نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ عالمی اداروں کے خیال میں اس طرح ملک میں بچوں کی بہت زیادہ تعداد کو مساجد کے ماحول میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا، اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی اکثریت بچپن میں ہی بنیاد پرستی کی خوگر ہو جاتی اور اس کے نتیجے میں بنیاد پرستوں کے تناسب میں بہت اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ مبینہ طور پر عالمی اداروں کی مداخلت کی وجہ سے یہ مفید اسکیم ختم کر دی گئی۔

اس سابقہ تلخ تجربہ کے پیش نظر محسوس ہوتا ہے کہ میٹرک کے نصاب سے سورۃ توبہ کو خارج کرنے کی یہ تجویز بھی اسی پس منظر میں پیش کی گئی ہے اور اگر قارئین سورۃ توبہ کے مضامین پر ایک نظر ڈال لیں تو انہیں اس تجویز کا پس منظر اور مقصد سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ان سطور میں سورۃ توبہ کے سب مضامین کا احاطہ تو مشکل ہے البتہ ان میں سے چند اہم امور کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

- یہ سورۃ قرآن کریم کے دسویں اور گیارہویں پارے میں ہے اور اس کے دو نام ہیں۔ اسے سورۃ برائت بھی کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین کے بہت سے قبائل نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امن کے معاہدات کر رکھے تھے لیکن بعض قبائل بالخصوص قریش نے ان معاہدات کی شرائط کی پاسداری نہیں کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اکرمؐ کو ان معاملات سے برائت کے اعلان کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی ایسے تمام معاہدے ٹوٹ گئے جن میں عرب قبائل نے شرائط کو ملحوظ رکھنے کی بجائے من مانی کرنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ جن قبائل نے شرائط کی پابندی کی ان کے ساتھ معاہدات کو برقرار رکھا گیا۔

• اور اسے سورۃ توبہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں جناب رسول اللہؐ کے تین مخلص صحابہ کرام حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت ہلال بن امیہؓ اور حضرت مرارہ بن ربیعؓ کی توبہ قبول کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جو غزوۂ تبوک میں کسی عذر کے بغیر پیچھے رہ گئے تھے۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا کہ اس وقت کی ایک عالمی قوت رومن ایمپائر نے شام کے راستے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ اس پر رسول اکرمؐ نے انہیں مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا موقع دینے کی بجائے خود شام کی سرحد پر جانے اور وہاں ان کے خلاف محاذ آرا ہونے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے مدینہ منورہ میں عام لام بندی کا حکم دے دیا۔ سخت گرمی کا موسم تھا، فصلیں پکی ہوئی تھیں، مالی سال کے اختتام کی وجہ سے وسائل اور پیسے کم تھے جبکہ سفر لمبا تھا اس لیے لوگوں کا جہاد کے لیے جانا بظاہر بہت مشکل تھا۔ لیکن حضرات صحابہ کرامؓ نے ان تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود حضورؐ کی پکار پر لبیک کہا اور ہزاروں کی تعداد میں تیار ہو گئے۔ البتہ منافقوں نے حیلے بہانے شروع کر دیے اور مختلف عذر پیش کر کے ان کی ایک بڑی تعداد پیچھے رہ گئی جبکہ صحابہ کرامؓ میں سے مذکورہ بالا تین حضرات ساتھ نہ جا سکے۔ آنحضرتؐ لشکر لے کر تبوک تک گئے، وہاں ایک ماہ قیام کیا مگر رومی لشکر کو مقابلے پر آنے کی ہمت نہ ہوئی اور آپؐ لشکر لے کر واپس آ گئے۔ مدینہ منورہ واپسی پر منافقین نے تو جھوٹے عذر اور حیلے بہانے پیش کر کے اپنی جان چھڑا لی لیکن مذکورہ تین بزرگوں نے صاف گوئی کے ساتھ اپنے قصور کا اعتراف کیا جس پر انہیں یہ سزا دی گئی کہ آنحضرتؐ نے خود اور آپؐ کے حکم سے صحابہ کرامؓ نے ان تینوں حضرات کا کئی روز تک سوشل بائیکاٹ کیے رکھا جس میں ان کے ساتھ بول چال اور لین دین کے سارے معاملات ترک کر دیے گئے۔ لیکن ان حضرات کی مسلسل ثابت قدمی کے باعث اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی توبہ قبول کرنے کا اعلان فرمایا جس کا ذکر اس سورۃ میں ہے اور اسی وجہ سے اسے سورۃ توبہ کہا جاتا ہے۔

- اس کے علاوہ اس سورۃ میں غزوۂ حنین کا ذکر ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے قدم اکھڑ جانے کے بعد ان کی مدد کی اور انہیں فتح عطا فرمائی۔
- اس کے ساتھ ہی یہ حکم اس سورۃ میں بطور خاص مذکور ہے کہ مشرکین کو آج کے بعد مکہ مکرمہ میں مسجد حرام اور بیت اللہ شریف کے قریب آنے کی اجازت نہ دی جائے۔
- پھر اس سورۃ میں یہود و نصاریٰ کی سرکشی اور نافرمانی کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے علماء اور پیروں کی ایک بڑی تعداد نے خود کو خدائی مقام عطا کر رکھا ہے اور وہ لوگوں کا مال اس کے ذریعہ ہڑپ کرتے ہیں۔
- اس سورۃ میں مسلمانوں کو جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دی گئی ہے، جہاد کے فضائل بیان کیے گئے ہیں اور جہاد سے پیچھے رہنے والے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔
- اس کے علاوہ اس سورۃ میں جناب رسول اللہؐ کو منافقین کا جنازہ پڑھانے سے روکا گیا ہے۔
- جبکہ سورۃ کے اختتام پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ان میں دین کا علم اور تفقہ حاصل کرنے والی ایک جماعت ضرور موجود رہنی چاہیے جو دینی معاملات میں امت کی رہنمائی کرتی رہے۔

یہ سورۃ توبہ کے بعض مضامین کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سورۃ کو میٹرک کے نصاب سے نکالنے کی تجویز کا اصل مقصد کیا ہے۔

کیا نکاح کے لیے مرد و عورت کا باہمی ایجاب و قبول کافی ہے؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۳ فروری ۲۰۰۰ء)

وفاقی شرعی عدالت کے ایک حالیہ فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے گزشتہ روز اپنے کالم میں ہم نے گزارش کی تھی کہ نکاح میں صرف میاں بیوی کے اقرار کو کافی سمجھتے ہوئے گواہوں کی موجودگی کو ضروری قرار نہ دینا قرآن و سنت کے احکام کے صریح منافی ہے۔ اس سلسلہ میں

وفاقی شرعی عدالت کی وضاحت ہمارے کالم کی اشاعت سے پہلے ہی سامنے آچکی ہے جو لاہور کے ایک قومی روزنامہ نے ۲۲ جنوری ۲۰۰۰ء کو یوں شائع کی ہے کہ

> ”وفاقی شرعی عدالت نے گزشتہ روز شائع ہونے والے عالم زیب بنام سرکار کے فیصلے کی وضاحت کی ہے۔ عدالت کے مطابق جب میاں بیوی ایک دوسرے سے نکاح کی تصدیق کریں تو پھر گواہوں کو عدالت میں طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قبل ازیں عدالت کے دیے گئے اسی نوعیت کے فیصلے میں ایسا ہی موقف اختیار کیا گیا تھا۔“

اس میں اگرچہ مسئلہ کی نوعیت بدل گئی ہے کہ فاضل عدالت نے نکاح کے انعقاد میں گواہوں کی موجودگی کی شرط کو غیر ضروری قرار نہیں دیا بلکہ عدالت میں ضرورت پیش آنے پر گواہوں کو عدالت میں طلب کرنے کو غیر ضروری قرار دیا ہے اور میاں بیوی کے باہمی اقرار و اعتراف کو کافی تصور کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود فاضل عدالت کے اس فیصلہ میں ابہام باقی ہے اور معاملہ پوری طرح واضح نہیں ہوا۔ اس لیے کہ بات ”خفیہ نکاح“ کی ہو رہی ہے کیونکہ تصفیہ طلب معاملہ میں عدالت کے سامنے ایسی صورت رکھی گئی ہے کہ ایک جوڑے کے باہمی تعلق کی بنا پر بچی پیدا ہوگئی ہے اور اس جوڑے کے نکاح کا معاشرے میں کسی کو علم نہیں ہے جس کی وجہ سے اس بچی کو ناجائز اولاد سمجھا جا رہا ہے۔ اسی بنیاد پر ان کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ درج کیا گیا ہے اور اسی حوالہ سے ماتحت عدالت نے اس بچی کو ناجائز اولاد قرار دیتے ہوئے اس کے ماں باپ کو سزا سنائی ہے۔

چنانچہ یہاں توجہ طلب امور دو ہیں جن کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

1. ایک یہ کہ کوئی ایسا نکاح جسے معاشرے سے خفیہ رکھا گیا ہو اور میاں بیوی کہلانے والے جوڑے کے علاوہ کسی اور کو اس کا علم نہ ہو، اس نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

2. دوسرا یہ کہ جس نکاح کو عدالت میں چیلنج کر دیا گیا ہو اور جس کے بارے میں خود جوڑے کا اعتراف ہو کہ وہ خفیہ نکاح ہے، کیا اس نکاح کے قانونی ثبوت کے لیے صرف ان دونوں کا باہمی اعتراف کافی ہے؟

جہاں تک خفیہ نکاح کا تعلق ہے ہم اپنی سابقہ گزارشات میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اور نہ صرف یہ کہ قرآن کریم نے اسے ولا متخذات اخدان کہہ کر حرام کاری قرار دیا ہے بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے

اعلان کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ نکاح کھلے بندوں کرو۔ حتیٰ کہ مسجد میں نکاح کرنے کو مسنون قرار دیا گیا ہے جو کہ پبلک پلیس ہے اور اس موقع پر جناب رسول اللہؐ نے ”دف“ تک بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ اردگرد کے لوگوں کو پتہ چل جائے کہ ہمارے پڑوس میں شادی اور نکاح کی تقریب ہو رہی ہے اور ایک جوڑے میں قائم ہونے والا یہ رشتہ کسی طرح خفیہ نہ رہے۔

تفسیر قرطبیؒ میں سورۃ النساء آیت ۶۲ کے ضمن میں یہ روایت درج ہے کہ جناب رسول اکرمؐ ایک شادی میں تشریف لائے تو وہاں دف بجایا جا رہا تھا۔ آنحضرتؐ نے اس موقع پر فرمایا کہ ھذا النکاح لا السفاح ولا نکاح السر کہ نکاح یہ ہے جو زنا نہیں ہے اور نہ ہی خفیہ نکاح ہے۔

جبکہ تفسیر خازن میں اسی آیت کریمہ کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ جاہلیت کے دور میں زنا کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ عورت بدکار ہوتی تھی اور جو شخص بھی اس کے ساتھ بدکاری کرنا چاہتا وہ اس کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔ اس کو قرآن کریم میں سفاح کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ ایک عورت ایک مخصوص مرد کے ساتھ خفیہ جنسی تعلقات قائم کر لیتی تھی اور اس کے علاوہ کسی اور مرد کی طرف التفات نہیں کرتی تھی۔ اسے قرآن کریم نے متخذات اخدان سے تعبیر کیا ہے اور دونوں صورتوں کو زنا قرار دے کر ان کی نفی کی ہے۔ اس لیے کسی بھی مرد اور عورت کے درمیان ایسا جنسی تعلق جو معاشرے کے علم میں نہ ہو، اسے شریعت میں نکاح السر یعنی خفیہ نکاح قرار دیا گیا ہے اور اس کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ دو گواہوں کی بات تو کم سے کم حد ہے کہ کم از کم دو افراد کے علم میں یہ نکاح ہو۔ حتیٰ کہ امام مالکؒ تو اسے بھی کافی نہیں سمجھتے اور اعلان اور تشہیر کو نکاح کے جواز کے لیے شرط قرار دیتے ہیں۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فاضل عدالت کے فیصلہ کے مطابق، جس کا ذکر ہم سابقہ کالم میں کر چکے ہیں، اس نکاح پر مرد اور عورت کے باہمی اقرار کے علاوہ اور کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جسے فاضل عدالت نے ”تصادق زوجین“ قرار دیا ہے۔ اس نکاح کو عدالت میں چیلنج کیا گیا ہے اور ماتحت عدالت نے نکاح کو تسلیم نہ کرتے ہوئے دونوں کو سزا سنا دی ہے۔ کیا اس صورت میں صرف مرد اور عورت کا باہمی اقرار ان کے نکاح کے قانونی ثبوت کے لیے کافی ہے؟ ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے کیونکہ اگر متنازعہ ہونے کی

صورت میں بھی نکاح کے ثبوت کے لیے صرف مرد اور عورت کے باہمی اقرار کو کافی سمجھ لیا جائے تو نکاح میں گواہوں کی موجودگی کی کوئی افادیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور نکاح کے لیے مجلس کا انعقاد، خطبہ، گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول اور رجسٹریشن وغیرہ سب کام بلاضرورت سمجھے جائیں گے۔

اور اس صورت میں یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ اگر نکاح کے ثبوت کے لیے صرف مرد اور عورت کا باہمی اقرار کافی ہے تو قرآن کریم نے ولا متخذات اخدان اور ولا متخذی اخدان کے الفاظ کے ساتھ دور جاہلیت کے جس خفیہ نکاح کی نفی کی ہے اس کی عملی شکل کیا قرار پائے گی؟ اس لیے ہم اس گزارش کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وفاقی شرعی عدالت کی مذکورہ وضاحت کافی نہیں ہے اور اسے اس مسئلہ کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

جہادی تحریکات، سی ٹی بی ٹی اور قرآن کا حکم

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۳ جنوری ۲۰۰۰ء)

ایک قومی اخبار کے لاہور ایڈیشن کی رپورٹ کے مطابق چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کے ساتھ ملاقات کے دوران ان پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جا سکتا ہے جیسے روس کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جا سکا تھا۔ مذکورہ رپورٹ میں اعلیٰ عسکری ذرائع کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کو بتا دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ اور اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نبھاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں نہیں دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا چیچنیا جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جا سکتا۔

اس سے قبل یہ خبریں قومی پریس کے ذریعے سامنے آچکی ہیں کہ امریکی سینٹروں نے جنرل پرویز مشرف کے ساتھ ملاقاتوں میں جن امور پر زور دیا ہے ان میں سی ٹی بی ٹی (Comprehensive Test Ban Treaty) پر دستخط کرنے، حرکۃ المجاہدین اور دیگر جہادی تنظیموں پر پابندی لگانے، مولانا مسعود اظہر کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے، ان کے خلاف دہشت گردی کے الزام میں مقدمہ درج کرنے، اور عرب مجاہد اسامہ بن لادن

کی گرفتاری میں تعاون کرنے کے تقاضے بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ لیکن جنرل پرویز مشرف نے یہ کہہ کر پاکستانی عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے کہ وہ جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ جنرل پرویز مشرف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جہاد اور جہادی تنظیمیں صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کا دائرہ پورے عالم اسلام تک پھیلا ہوا ہے اور جہاد کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے اسے لیے اسے روکنا ممکن نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی قوتوں کے لیے پریشانی کی اصل بات بھی یہی ہے کہ جہاد کا دائرہ پوری دنیا میں وسیع ہوتا جا رہا ہے، ورنہ جب تک جہاد کا یہ عمل صرف افغانستان تک محدود تھا اور اس کی زد صرف روس پر پڑ رہی تھی اس وقت تک مغربی ملکوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ اس سے خوش تھے اور جہادی تنظیموں کی حمایت وامداد میں بھی فراخدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس وقت ان کا خیال یہ تھا کہ سوویت یونین کی شکست وریخت کے بعد افغانستان کی مجاہد تنظیمیں شاید امریکہ کے سامنے اظہار تشکر میں سجدہ ریز ہو جائیں گی اور امریکہ بہادر آسانی کے ساتھ انہیں کچھ اور تھپکی دے کر سنکیانگ میں چین کے خلاف صف آرا کر دے گا۔ مگر ان مجاہدین تنظیموں نے چین کی طرف رخ کرنے کی بجائے پہلے خود امریکہ سے نمٹ لینا زیادہ ضروری سمجھا اور نہ صرف یہ کہ فلسطین، کشمیر، صومالیہ، بوسنیا، کسوو، چیچنیا، مورو، اراکان اور اب انڈونیشیا میں جہاد کا چرچا ہونے لگا۔ بلکہ خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواریوں کی مسلح افواج کی موجودگی ان مجاہدین کو زیادہ کھٹکنے لگی اور مختلف مسلم ممالک سے جہاد افغانستان میں شرکت کے لیے آنے والے نوجوانوں نے اپنے اپنے ملکوں کی مغرب نواز اور امریکہ پرست حکومتوں کے لیے مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں تو امریکہ بہادر کو یہ بات سمجھ آئی کہ یہ مجاہدین توفی الواقع جذبۂ جہاد سے سرشار ہیں۔ اسی جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کے لیے برطانوی استعمار کو مرزا غلام احمد قادیانی اور زار شاہی روس کو محمد علی باب اور بہاء اللہ شیرازی جیسے جھوٹے نبی کھڑے کرنا پڑے تھے اور جس جہاد سے جان چھڑانے کے لیے ترکی کی خلافت عثمانیہ کا تیاپانچہ کیا گیا تھا۔

امریکہ بہادر کو یہ بات بھی تکلیف دے رہی ہے کہ جن مجاہدین کو روس کے خلاف اسلحہ خود اس نے فراہم کیا تھا اور ان میں سے بہت سے نوجوانوں کو ٹریننگ بھی دی تھی وہی مجاہدین اب خود امریکہ کے سامنے کھڑے ہیں اور پوری دنیا میں اس کے لیے چیلنج کی

حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ اس لیے اب امریکہ جہاد کی آواز کو دنیا سے ختم کرنا چاہتا ہے، مجاہدین کے عالمی نیٹ ورک کو توڑنے کے درپے ہے اور جہادی تحریکوں کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں بدنام کرنے اور مسلم ممالک کی ریاستی قوت کے ذریعے انہیں کچلنے کی منصوبہ بندی کیے بیٹھا ہے۔ مگر اب وقت گزر چکا ہے کیونکہ جہادی تحریکات نے پوری دنیا میں وسیع نیٹ ورک قائم کر لیا ہے اور ان کی جڑیں مسلمان عام میں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ انہیں ختم کرنے کی امریکی خواہش حسرت میں تبدیل ہوتی جارہی ہے، چنانچہ مغرب استعمار کے لیے اب دانت پیسنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔

اس لیے ہم چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کو جہادی تحریکات کے بارے میں ملت اسلامیہ کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنے اور امریکی سینٹروں کو معروضی حقائق سے آگاہ کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جنرل صاحب! یہ سی ٹی بی ٹی کا چکر بھی اسی ایجنڈے کا حصہ ہے اور امریکی خواہشات اور مطالبات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو جہادی تحریکات پر پابندی لگانے اور ایٹمی پروگرام پر بین الاقوامی کنٹرول قبول کرنے کے ان دونوں مطالبات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں تقاضوں کی علت اور پس منظر ایک ہی ہے اور دونوں کا مقصد بھی ایک ہے کہ عالم اسلام اس قابل نہ رہے کہ وہ بھارت اور اسرائیل جیسی مسلمان دشمن طاقتوں کے لیے خطرہ بن سکے، تاکہ خلیج عرب میں اسرائیل کی بالادستی اور جنوبی ایشیا میں بھارت کی تھانیداری قائم کرنے کا منصوبہ کسی رکاوٹ کے بغیر پایہ تکمیل تک پہنچ جائے اور مسلم دنیا کو ایک بار پھر صدیوں کی غلامی کے نئے شکنجے میں جکڑا جا سکے۔ امریکہ بھارت کو ایٹمی طاقت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے اور اسرائیل کے پاس ایٹم بموں کی موجودگی پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر پاکستان کا ایٹمی قوت ہونا اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے، اور وہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک کو اسلام، جہاد اور ایٹمی قوت تینوں سے محروم کر دینے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے اور اسی لیے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے لیے پاکستان پر مسلسل دباؤ بڑھایا جارہا ہے۔

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حامی عناصر کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ اس معاہدے پر دستخط کر دینے سے پاکستان کی ایٹمی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر اس کے عوض ملک کو بہت سی مراعات حاصل ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ جب ایٹمی قوت میں کوئی فرق

نہیں پڑے گا تو بہت سی مراعات آخر کس چیز کے عوض حاصل ہوں گی؟ اور مغرب کا یہودی ساہوکار ہم پر کس لیے اتنا مہربان ہو رہا ہے کہ کوئی معاوضہ وصول کیے بغیر وہ ہمیں مراعات سے مالامال کر دینا چاہتا ہے؟ ہمیں جن اقتصادی سہولتوں کی خوشخبری دی جا رہی ہے اور جس معاشی خوشحالی کے سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں آخر وہ کس چیز کے بدلے میں ہیں؟ سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں سے پاکستان کی ایٹمی پوزیشن میں کوئی فرق نہ پڑنے کا ڈھنڈورا پیٹنے والے دانشور اگر اس گتھی کو سلجھا سکیں اور مغرب کے یہودی سرمایہ کاروں کی ہم پر متوقع بے تحاشا نوازشات کی وجہ بتا سکیں تو ان کی بے حد نوازش ہوگی۔

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دینے کی حمایت میں یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ دستخط کر دینے کا مطلب ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنا نہیں بلکہ مزید آگے بڑھنے سے روکنا ہے، جبکہ ہم اس وقت اتنی ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں کہ ہمیں اس میں مزید پیشرفت کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اگر اپنے ایٹمی پروگرام پر سی ٹی بی ٹی کے ذریعے بین الاقوامی کنٹرول قبول کر لیتے ہیں اور خود کو ایک معاہدہ کا پابند کر لیتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس بین الاقوامی کنٹرول کی کنٹرولنگ اتھارٹی آئندہ ہمیں اس ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنے کے لیے کبھی نہیں کہے گی؟ آخر اس معاملہ میں کنٹرولنگ اتھارٹی خود ہم تو نہیں ہیں بلکہ یہ پوزیشن انہی بین الاقوامی اداروں اور قوتوں کو حاصل ہے جو نصف صدی سے ہمارے خلاف بھارت اور اسرائیل کو ہر طرح سپورٹ کرتے چلے آ رہے ہیں اور ہماری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان قوتوں اور اداروں کو ہم گزشتہ پچاس برس سے دیکھ رہے ہیں بلکہ بھگت رہے ہیں اس لیے ان کی کسی بات اور کسی وعدے پر بھروسہ آخر کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

چنانچہ ہم چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سے یہ گزارش کریں گے کہ جس طرح انہوں نے جہاد اور جہادی تحریکات کے بارے میں امریکی سینٹروں کے سامنے اپنے ایمانی جذبات اور پاکستانی عوام کے دلی احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے اسی طرح ایٹمی پروگرام اور سی ٹی بی ٹی کے بارے میں بھی اپنے ملک کے غیور عوام کے جذبات سے امریکہ اور دیگر عالمی قوتوں کو پورے حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ آگاہ کر دیں۔ اور پھر یہ مسئلہ صرف جذبات و احساسات کا ہی نہیں بلکہ ہمارے عقیدہ و ایمان کا بھی ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف "جنگی قوت" حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کی حد بھی

بیان کی ہے ’’ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم‘‘ (الانفال) کہ دشمن پر مسلمانوں کا رعب قائم ہو یعنی مقابلہ میں طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے جب تک ایٹمی توانائی اور جدید ترین جنگی قوت کے حوالہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان طاقت کے تناسب میں توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آجاتا اور مسلم ممالک ’’ترھبون بہ عدو اللہ‘‘ کی پوزیشن میں نہیں آجاتے، ایٹمی قوت میں کسی پیشرفت پر پابندی قبول کرنا قرآن کریم کی منشا اور حکم کے خلاف ہے، وہی قرآن کریم جسے ہاتھ میں لے کر بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے لاکھوں مسلمانوں کے سامنے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا دستور یہ قرآن ہوگا اور اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور دستور کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے جنرل صاحب سے یہ استدعا ہے کہ جہاد اور جہادی تحریکات کی طرح ’’جہادی قوت‘‘ کے بارے میں بھی قرآن کریم کے حکم اور مسلمانوں کے دینی و ملی جذبات سے مغربی قوتوں کو دوٹوک طور پر آگاہ کر دیں کہ ملک اور قوم دونوں کا مفاد اسی میں ہے۔

زکوٰۃ کا نظام اور شہزادہ چارلس

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱ جنوری ۲۰۰۰ء)

لاہور سے شائع ہونے والے ایک قومی روزنامے کی رپورٹ کے مطابق برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس نے گزشتہ دنوں دورہ عمان کے دوران ایک خصوصی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ زکوٰۃ کا نظام نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ساری دنیا کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق تقریب سے خطاب کے دوران شہزادہ چارلس نے سامعین کو اس وقت چونکا دیا جب انہوں نے اسلام کے اہم رکن زکوٰۃ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ انسانی مساوات کی ایک شاندار مثال ہے جس کی پیروی ہر انسان کو کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ کے نظام کی پیروی کر کے دولت اور طاقت میں توازن برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ شہزادہ چارلس ان دنوں اسلام کا انتہائی دلچسپی سے مطالعہ کر رہے ہیں اور وہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے زکوٰۃ سے بے حد متاثر ہیں۔

اسلام نے زکوٰۃ، صدقات، وراثت اور دیگر ذرائع سے دولت کی تقسیم در تقسیم کا جو ہمہ گیر نظام دیا ہے اس کا فلسفہ خود قرآن کریم نے سورۃ الحشر آیت ۷ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ ’’تاکہ دولت تم میں سے مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے‘‘۔

معاشرہ میں دولت کی تقسیم کا توازن قائم کرنا امن و انصاف اور خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ دولت کی حیثیت سوسائٹی میں وہی ہے جو انسانی جسم میں خون کی ہے۔ خون اگر گردش کرتا رہے گا تو جسمانی صحت قائم رہے گی۔ کسی جگہ خون ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے گا تو خرابی پیدا ہوگی، پھوڑے پھنسیاں اور اس قسم کی بیماریاں جنم لیں گی۔ اور اگر کسی عضومیں خون اس کی ضرورت سے کم فراہم ہوگا تو وہ عضو مفلوج ہو جائے گا۔ پھر تمام اعضا کی ضروریات یکساں نہیں ہیں، ہر ایک کی ضرورت کی مقدار الگ ہے۔ اور مساوات کا معنی یہ نہیں ہے کہ تمام اعضا کو خون کی برابر برابر مقدار ملے، بلکہ مساوات اس کا نام ہے کہ ہر عضو کو اس کی ضرورت کے مطابق خون ملتا رہے۔ اسی کا نام توازن ہے اور جب بھی یہ توازن بگڑے گا انسانی جسم بیماریوں کی آماجگاہ بن جائے گا۔

اسلام نے سوسائٹی میں دولت کی گردش کو اسی لیے ضروری قرار دیا ہے اور دولت کی تقسیم کا ایک فطری نظام دیا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے انسانی معاشرہ خود بخود امن اور خوشحالی کی منزل سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ بلکہ قرآن کریم کا دعوی ہے کہ آسمانی تعلیمات پر عمل کی ان برکات سے ہر دور میں انسانی معاشرہ مستفید ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ آیت ٦٦ میں بنی اسرائیل کے حوالہ سے یہ ارشاد ربانی ہے کہ اگر وہ تورات، انجیل اور انبیاء کرامؑ کی دیگر تعلیمات کو اپنے معاشرہ میں بطور سسٹم نافذ و قائم کرتے تو آسمان بھی ان کے لیے رزق برساتا اور زمین بھی ان کے لیے رزق اگلتی۔ یہ وعدہ صرف بنی اسرائیل کے ساتھ نہیں تھا بلکہ ہمارے ساتھ بھی ہے کہ قرآن کریم کو بطور نظام اپنا لیں تو آسمان اور زمین دونوں طرف سے رزق اور برکتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔

اس سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جسے روایت کرنے والے صحابی حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدی بن حاتمؓ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبویؐ میں صحابہ کرام کے ہمراہ تشریف فرما تھے کہ ایک صاحب نے اپنے علاقہ کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ! ہمارے علاقہ میں قتل و غارت، ڈکیتی اور بدامنی بہت زیادہ ہے، جان و مال اور آبرو محفوظ نہیں ہے۔ ان کی بات ابھی مکمل ہوئی تھی کہ ایک اور صاحب بولے یا رسول اللہ! ہمارے علاقہ میں غربت اور بھوک و افلاس بہت ہے، لوگ بہت تنگ ہیں، کھانے کو نہیں ملتا۔ عدیؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ان دونوں کو کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

1. عدیؓ! تم نے حیرہ دیکھا ہے؟ حیرہ ایک شہر کا نام ہے جو بنو غسان کی سلطنت کا پایہ تخت تھا اور اب غالباً کوفہ کا حصہ ہے۔ حضرت عدیؓ نے جواب دیا کہ دیکھا تو نہیں البتہ سن رکھا ہے۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ عدیؓ! اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کچھ لمبی عمر عطا کی تو دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک عورت سونے چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی اونٹ کے کجاوے میں بیٹھ کر مکہ مکرمہ تک تنہا سفر کرے گی اور پورے راستے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر اس کے دل میں نہیں ہوگا۔ عدیؓ کہتے ہیں کہ میں تعجب اور حیرت سے سوچنے لگا کہ حیرہ سے مکہ مکرمہ آتے ہوئے تو راستہ میں ہمارا قبیلہ بھی آباد ہے اور اپنے قبیلہ کے نوجوانوں کو میں جانتا ہوں کہ ان سے کون سی چیز بچتی ہے، اس لیے سوچ میں پڑ گیا کہ جب وہ عورت سفر کر رہی ہوگی تو میری قوم کے غنڈے اس وقت کہاں ہوں گے؟

2. لیکن میں ابھی اسی حیرت اور تعجب میں تھا کہ جناب نبی اکرمؐ نے دوسری بات فرمادی کہ عدیؓ! اگر تم مزید کچھ عرصہ زندہ رہے تو دیکھو گے کہ کسریٰ کے خزانے فتح ہوں گے اور مدینہ میں لا کر تقسیم کیے جائیں گے۔ عدیؓ کہتے ہیں میں نے تعجب سے پوچھا یا رسول اللہ! کون کسریٰ؟ وہی جو فارس کا بادشاہ ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہاں وہی۔

3. عدیؓ کہتے ہیں کہ میں تعجب اور حیرت کے ساتھ اس ارشاد پر غور کر رہا تھا کہ نبی اکرمؐ نے تیسری بات فرمادی کہ عدیؓ! اگر تمہیں کچھ لمبی عمر نصیب ہوئی تو دیکھو گے کہ تم لوگ اپنی زکوٰۃ کا سونا اور چاندی ہتھیلی پر رکھ کر بازاروں میں آوازیں دو گے کہ کوئی زکوٰۃ کا مستحق ہو تو آکر وصول کر لے مگر تمہیں اس سوسائٹی میں کوئی زکوٰۃ کا مستحق نہیں ملے گا۔

محدثینؒ کہتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتمؓ کو خطاب کر کے ان دو آدمیوں کے سوال کا جواب دیا تھا جنہوں نے اپنے علاقوں کے حالات بیان کرتے ہوئے بدامنی، قتل و غارت، غنڈی گردی، بھوک، افلاس، فاقہ کشی اور غربت کی شکایت کی تھی۔ ان کے جواب میں جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جو تعلیمات میں پیش کر رہا ہوں ان پر حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ عمل کر

کے دیکھو، اس درجہ کا امن نصیب ہو گا کہ حیرہ (کوفہ) سے مکہ مکرمہ آتے ہوئے راستہ میں جان، مال اور آبرو کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا اور اس درجہ کی خوشحالی ہو گی کہ لوگ زکوۃ کی رقم ہاتھوں میں اٹھائے بازاروں میں آوازیں دے کر زکوۃ کا مستحق تلاش کریں گے مگر سوسائٹی میں انہیں کوئی زکوۃ کا مستحق نہیں ملے گا۔

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور اسلامی نظام کی برکت سے دنیا نے امن و خوشحالی کے اس دور کا نظارہ کیا کہ آج پوری نسل انسانی دوبارہ اس کے لیے ترس رہی ہے۔ اس لیے اگر شہزادہ چارلس کو زکوۃ کے نظام سے دنیا کی تقدیر بدلتی دکھائی دیتی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں، دنیا اس سے پہلے اس بابرکت نظام کی بدولت نسل انسانی کی تقدیر بدلنے کا منظر دیکھ چکی ہے اور آئندہ بھی انسانی معاشرہ کی تقدیر جب کبھی بدلی اسی نظام کے ذریعے بدلے گی۔

۱۹۹۹ء

قرآن کریم اور نومسلم خواتین

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء)

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے، اس میں قرآن کریم لوح محفوظ سے نازل ہوا اور اسی میں قرآن کریم کی سب سے زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔ خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ رمضان المبارک میں باقی سال کی بہ نسبت قرآن کریم کی تلاوت زیادہ کیا کرتے تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام رمضان المبارک میں اہتمام کے ساتھ تشریف لاتے اور آنحضرتؐ کے ساتھ اس سال تک نازل ہونے والے قرآن کریم کا دور کرتے تھے۔ آخری سال حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دو دفعہ دور کیا جس کے بارے میں محدثین کا کہنا ہے کہ یہ جناب رسول اللہؐ کے لیے اشارہ تھا کہ اگلے سال موقع نہیں ملے گا۔

یہ قرآن کریم کے اعجاز کا ایک پہلو ہے کہ دنیا میں لاکھوں سینوں میں ہر دور میں محفوظ رہتا ہے اور روزمرہ تلاوت کے علاوہ رمضان المبارک کے دوران لاکھوں مساجد میں اہتمام کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس قسم کی باتیں عام طور پر سننے میں آتی تھیں کہ اس طرح الفاظ کو رٹنے اور بلا سمجھے دہرائے چلے جانے کا کیا فائدہ تھا؟ لیکن جوں جوں اس قسم کے اعتراضات و شبہات زیادہ ہوئے اس سے کہیں زیادہ قرآن کریم کے حفاظ کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایسی بستیوں میں جہاں آج سے ربع صدی قبل تراویح میں قرآن کریم سنانے کے لیے ایک حافظ بھی میسر نہیں آتا تھا، وہاں اب ایک ایک مسجد

میں کئی کئی حافظ قرآن موجود ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں یہ بھی قرآن کریم کے اعجاز کا اظہار ہے۔

مگر اس مناسبت سے قرآن کریم کے اعجاز کے ایک اور پہلو کا مختصر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو گزشتہ روز ”نومسلم خواتین کی آپ بیتیاں“ نامی ایک کتاب کے مطالعہ کے دوران نظر سے گزرا۔ یہ کتاب محترمہ نگہت عائشہ نے ترتیب دی ہے اور اس میں مختلف ممالک کی ستر نومسلم خواتین کی آپ بیتیاں شامل کی گئی ہیں۔ پونے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ خوبصورت کتاب ندوۃ المعارف ۱۳ کبیر اسٹریٹ اردو بازار لاہور نے شائع کی ہے اور اس میں جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کے ایک سفرنامے کو بطور دیباچہ شامل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے لندن کے معروف روزنامہ لندن ٹائمز کی ۹ نومبر ۱۹۹۳ء کی ایک رپورٹ کی بنیاد پر ماضی قریب میں مسلمان ہونے والی بعض نومسلم خواتین کے تاثرات بیان کیے ہیں۔ ان میں اسکاٹ لینڈ کی ایک خاتون کا تذکرہ بھی ہے جو ۱۹۷۴ء میں مسلمان ہوئیں اور انہوں نے اپنا اسلامی نام ”نوریہ“ رکھا۔ اس خاتون کے قبول اسلام کی وجہ ”ٹائمز“ کی رپورٹ کے مطابق یہ تھی کہ انہیں (نعوذ باللہ) ردی میں قرآن کریم کے کچھ اوراق ملے جن کے مطالعہ سے انہیں قرآن کریم کے باقاعدہ مطالعہ کا شوق ہوا۔ اور جب انہوں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا تو اسلام قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ کار نہ رہا۔

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس کا مطالعہ آج بھی بھٹکے ہوئے انسانوں کی ہدایت کا سبب بنتا ہے بشرطیکہ وہ مطالعہ ہماری طرح رسمی اور روایتی نہ ہو۔ یہ واقعہ پڑھ کر مجھے نو سال پرانا ایک اور واقعہ یاد آگیا جب امریکہ سے ایک نومسلم خاتون گوجرانوالہ آئیں اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے مہتمم مولانا صوفی عبد الحمید سواتی سے ملاقات کے علاوہ ہمارے گھر بھی تشریف لائیں۔ اس خاتون کے قبول اسلام کی وجہ قرآن کریم کا مطالعہ بنا اور یہ واقعہ انہوں نے خود ہمیں سنایا۔ خاتون کا پہلا نام ”مارسیہ کے ہرمینسن“ تھا اور ایم کے ہرمینسن کہلاتی تھیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اپنے نام کا مخفف قائم رکھنے کے لیے اسلامی نام مجاہدہ رکھ لیا اور اس طرح ان کے نام کا مخفف ایم کے ہرمینسن قائم رہا۔

اس نومسلم خاتون کا کہنا تھا کہ فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہیں ذہنی طور پر ایک خلاء محسوس ہوتا تھا اور کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔ اسی سکون کی تلاش میں وہ مختلف ملکوں میں گھومتی رہیں اور یونیورسٹیوں میں کورسز کرتی رہیں۔ اسی دوران

اسپین کی کسی یونیورسٹی میں وہ اپنے ہاسٹل میں تھیں کہ ایک روز ریڈیو کی سوئی گھماتے ہوئے ایک جگہ سے عجیب سی پرکشش آواز سنائی دی۔ آواز میں کشش تھی مگر زبان سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ایک دو دفعہ سننے کے بعد مختلف حضرات سے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ مراکش ریڈیو ہے اور اس وقت مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کا سننا معمول بن گیا۔ قرآن کریم کا انگلش ترجمہ منگوا کر پڑھا مگر لطف نہ آیا تو عربی زبان کا کورس کیا۔ زبان سے مانوس ہو کر براہ راست قرآن کریم کا مطالعہ کیا اور مسلمان ہو گئیں۔

ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے اس کے بعد مختلف اسلامی تحریکات اور شخصیات کا مطالعہ کیا اور سب سے زیادہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے متاثر ہوئیں۔ حتیٰ کہ ''مغرب اور شاہ ولی اللہ کا تعارف'' کے موضوع پر برکلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ اس وقت وہ کیلی فورنیا کی سین ڈیگو یونیورسٹی میں فلسفہ کی استاذ ہیں اور انہوں نے اسی یونیورسٹی میں امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ و تعلیمات پر ریسرچ کے لیے ''شاہ ولی اللہ چیئر'' قائم کر رکھی ہے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی معرکۃ الاراء تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا انگلش ترجمہ بھی کیا ہے اور مختلف جرائد میں شاہ صاحبؒ کے بارے میں مضامین لکھتی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے ایک پاکستانی پروفیسر محمد علوی سے شادی کی۔ وہ ۱۹۹۰ء میں اپنے شوہر کے ہمراہ پاکستان آئیں تو گوجرانوالہ بھی تشریف لائیں۔ انہیں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تیاری کے دوران ہمارے چچا محترم مولانا صوفی عبدالحمید سواتی کی بعض تصنیفات سے استفادہ کا موقع ملا تھا، وہ اسی نسبت سے ان سے ملاقات و گفتگو کے لیے آئی تھیں۔ میں بھی اس ملاقات میں شریک تھا۔ ان سے حضرت صوفی صاحب نے یہ سوال کیا تھا کہ آج کے دور میں ہم مسلمانوں میں تو کوئی ایسی کشش کی بات نہیں ہے جسے دیکھ کر کوئی غیر مسلم مسلمان ہو، اور آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں آپ کیسے مسلمان ہو گئی ہیں؟ اس کے جواب میں محترمہ نے کہا کہ وہ کسی مسلمان سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے مسلمان ہوئی ہیں۔ اور پھر انہوں نے یہ سارا واقعہ سنایا جس کا تذکرہ سطور بالا میں ہو چکا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کا یہ اعجاز آج بھی قائم ہے کہ وہ ہر ایک کو ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے بشرطیکہ کوئی اسے اس نیت سے پڑھے۔ اگر اسکاٹ لینڈ کی نوریہ کے لیے ردی کی ٹوکری

میں پڑے قرآن کریم کے چند اوراق ہدایت کا باعث بن سکتے ہیں اور امریکہ کی مارسیہ کو مراکش ریڈیو سے نشر ہونے والی قرآن کریم کی آواز ہدایت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے تو ہماری مسجدوں، گھروں اور محفلوں میں شب و روز اہتمام کے ساتھ پڑھا اور سنا جانے والا قرآن کریم ہمیں گمراہی، اخلاق باختگی، کرپشن اور بے راہ روی کی دلدل سے کیوں نہیں نکال سکتا؟ بات صرف لائن سیدھی کرنے کی ہے، اس لیے کہ کنکشن درست ہو اور بلب فیوز نہ ہو چکا ہو تو "پاور ہاؤس" کو روشنی منتقل کرنے میں بخل سے کام لینے کی آخر کیا ضرورت ہی کیا ہے؟

دینی مدارس کا معاشرتی کردار۔ دو الزامات کا جائزہ

(جامعہ اسلامیہ، کامونکی - ۳۰ نومبر ۱۹۹۹ء)

(۳۰ نومبر ۱۹۹۹ء کو جامعہ اسلامیہ کامونکی کی نو تعمیر شدہ مسجد شہداء میں نماز باجماعت کے آغاز اور جامعہ کے ہسپتال کے افتتاح کے موقع پر ایک باوقار تقریب ہوئی جو ظہر سے مغرب تک جاری رہی۔ تقریب کی صدارت استاد العلماء حضرت مولانا قاری محمد ظریف صاحب فاضل دیوبند نے کی جبکہ پیر طریقت حضرت مولانا پیر عبد الرحیم نقشبندی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی، پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارف اسلامیہ کے مدیر ڈاکٹر محمود الحسن عارف، مولانا خورشید احمد گنگوہی، مولانا سعید الرحمان احمد، قاری محمد عالمگیر رحیمی، حافظ فیاض احمد بٹ اور دیگر علماء کرام نے خطاب کیا اور جامعہ اسلامیہ کے بانی و مہتمم مولانا عبد الرؤف فاروقی نے جامعہ کی کارکردگی اور عزائم سے شرکائے محفل کو آگاہ کیا۔ اس موقع پر مولانا زاہد الراشدی نے "معاشرہ میں دینی مدارس کی اہمیت اور کردار" کے عنوان پر جو گفتگو کی اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ سب سے پہلے جامعہ اسلامیہ کامونکی کے مہتمم مولانا عبد الرؤف فاروقی اور ان کے رفقاء کو جامعہ کی جدوجہد میں مسلسل پیش رفت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مولانا فاروقی نے اپنی رپورٹ میں ہسپتال اور دیگر حوالوں سے جن عزائم کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں وقت کے تقاضوں اور آنے والے

دور کی ضروریات کا احساس بیدار ہو رہا ہے، اگرچہ اس کی رفتار بہت سست ہے جو ہمارے عمومی مزاج کا حصہ ہے تاہم یہ خوشی کی بات ہے کہ وقت کی ضرورتوں کا احساس پیدا ہو رہا ہے اور انہیں پورا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ پیش رفت بھی ہو رہی ہے۔ اس وقت کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے اس لیے اختصار کے ساتھ اس درسگاہ اور اس جیسی ہزاروں دینی درسگاہوں کے حوالہ سے ایک دو ضروری باتیں عرض کرنا چاہوں گا، اس لیے کہ آج دینی مدارس اور درسگاہیں دنیا بھر کی اعلیٰ دانش گاہوں، اداروں، لابیوں اور میڈیا سنٹروں کا موضوع بحث ہیں اور معاشرہ میں ان کے کردار اور ضرورت کے بارے میں مختلف باتیں کہی جا رہی ہیں۔ یہ درسگاہیں جنہیں دینی مدارس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس سطح پر موضوع گفتگو ہیں کہ بی بی سی اور وائس آف امریکہ جیسے نشریاتی ادارے ان کے بارے میں پروگرام پیش کرتے ہیں، ایمنسٹی اور اقوام متحدہ کے ادارے ان کے بارے میں رپورٹیں جاری کرتے ہیں، بین الاقوامی پریس ان مدارس کے کردار کو موضوع بحث بنا رہا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ امریکہ کی کانگریس میں گزشتہ دنوں یہی دینی مدارس زیر بحث آئے ہیں اور ان کی بندش کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان مدارس کے حقیقی کردار سے آپ حضرات بھی واقف ہوں اور اسی خیال سے چند معروضات پیش کر رہا ہوں۔

- ان مدارس پر الزام ہے کہ یہ نئی پود کو مستقبل کی بجائے ماضی سے جوڑ رہے ہیں اور ترقی اور پیش رفت کی بجائے پسپائی کا سبق دے رہے ہیں۔
- ہمارے ہاں ایک اور بات بھی کہی جاتی ہے کہ ان مدارس سے تیار ہونے والی کھیپ کی معاشرہ میں کھپت نہیں ہے اور یہ بیکاروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کر رہے ہیں جو سوسائٹی کے کسی شعبے میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کوئی مالک اپنی فیکٹری میں ایسا مال تیار نہیں کرتا جس کی مارکیٹ میں مانگ نہ ہو اور کوئی کاشتکار اپنے کھیت میں ایسی فصل نہیں بوتا جس کی منڈی میں طلب اور کھپت نہ ہو مگر یہ مدارس دھڑا دھڑ ایسے افراد تیار کرتے جا رہے ہیں جن کی معاشرہ کے کسی شعبہ میں نہ طلب ہے اور نہ ہی کھپت ہے، اس لیے ان مدارس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

الزامات کی فہرست بڑی لمبی ہے اور شکایات کا سلسلہ بہت طویل ہے لیکن وقت مختصر ہے اس لیے ان میں سے صرف دو الزامات کا آج کی محفل میں جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ یہ مدارس آج کی تہذیب اور ورلڈ کلچر کے خلاف نئی نسل کی ذہن سازی کر رہے ہیں اور دوسرا یہ کہ ان مدارس کے تیار کردہ افراد کی معاشرہ کے کسی شعبہ میں کھپت نہیں ہے۔

جہاں تک ورلڈ کلچر اور جدید تہذیب کے خلاف نئی پود کی ذہن سازی کا تعلق ہے میں اس الزام کو قبول کرتا ہوں اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم آج کے ورلڈ کلچر کو جو ویسٹرن سولائزیشن کی جدید شکل ہے تسلیم نہیں کرتے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے دینی مدارس کا بنیادی مشن ہی یہ ہے کہ نئی پود کو ویسٹرن سولائزیشن کا شکار ہونے سے بچایا جائے اور صرف اپنے نوجوانوں کو نہیں بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کو ہم اس ورلڈ کلچر سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کلچر نے انسانیت کو تباہی کے کنارے تک پہنچا دیا ہے اور انسانی اخلاق و اقدار اور رشتوں کے تقدس کا جنازہ نکال دیا ہے۔ میں ان مغرب والوں سے پوچھتا ہوں کہ یہ ہمیں کس کلچر اور تمدن کی دعوت دیتے ہیں اور کس سولائزیشن کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں؟ ان کے ورلڈ کلچر نے آج انسانی سوسائٹی کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ امریکہ اور یورپ کے کم و بیش سب ملکوں میں ہم جنس پرستی اور مرد کا مرد کے ساتھ جنسی تعلق قانونی طور پر جائز قرار پا چکا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ برطانیہ کی ایک عدالت میں مقدمہ چلتا رہا جس میں ایک مرد نے دعویٰ کیا کہ اس کا ایک اور مرد کے ساتھ جنسی تعلق تھا اور وہ دونوں ایک جوڑے کے طور پر اکٹھے رہتے تھے، اب اس کے پارٹنر کا انتقال ہو گیا ہے اس لیے اسے اپنے مرنے والے پارٹنر کی بیوی تسلیم کر کے اس کا قانونی طور پر وارث قرار دیا جائے۔ ابھی دو تین ہفتے قبل یہ خبر میں نے اخبارات میں پڑھی ہے کہ عدالت نے اس کا موقف تسلیم کر لیا ہے اور اسے مرنے والے ساتھی کا وارث قرار دے دیا گیا ہے۔

ہم اس کلچر کو تسلیم نہیں کرتے جس کلچر کی وجہ سے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر خدائی عذاب نازل ہوا تھا اور سدوم اور عمورہ جیسی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ یہ کلچر انسانیت کی تباہی کا کلچر ہے، انسانی اخلاق و اقدار کی بربادی کا کلچر ہے اور خدا کی لعنت اور عذاب کو دعوت دینے والا کلچر ہے جس کے خلاف جدوجہد کو ہم اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ آج انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ نسل انسانی کو اس بربادی سے

بچایا جائے اور اسے ان انسانی اخلاق و اقدار کی طرف واپس لایا جائے جن کی بنیاد آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی پر ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ دینی مدارس یہی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

دوسرا الزام یہ ہے کہ مدارس جو طبقہ پیدا کر رہے ہیں اس کی معاشرہ میں کھپت نہیں ہے اور یہ معاشرہ کی کوئی ضرورت پوری نہیں کر رہے اس لیے ان مدارس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ الزام قطعی طور پر غلط ہے اور میں آپ حضرات کی خدمت میں یہ جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مدارس معاشرہ کی کون سی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں اور ان مدارس کے پیدا کردہ افراد سوسائٹی کے کون سے خلا کو پر کر رہے ہیں۔ اس کے لیے میں حکومت پاکستان کے ایک اعلان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو کم و بیش تین سال قبل وفاقی محتسب اعلیٰ کے ایک حکم کے بعد کیا گیا تھا کہ حکومت ملک بھر کے پرائمری اسکولوں میں قرآن کریم کی لازمی ناظرہ تعلیم کا انتظام کرے گی۔ یہ دینی تعلیم کی سب سے نچلی سطح اور سب سے کم تر درجہ ہے کہ ایک مسلمان کم از کم قرآن کریم ناظرہ پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس لیے جب حکومت نے سرکاری سطح پر پرائمری سکولوں میں قرآن کریم کی لازمی ناظرہ تعلیم کی ذمہ داری قبول کی تو ہم بہت خوش ہوئے کہ سب سے نچلی اور عمومی سطح پر ہی سہی مگر حکومت نے اس سلسلہ میں کسی ذمہ داری کا احساس تو کیا ہے۔ اس کو معمولی سطح پر میں اس حوالہ سے کہہ رہا ہوں کہ یہ کام ہمارے ہاں بالکل معمولی درجہ کا سمجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ یہ کام وہ ہے جو دیہات میں بعض عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی کرتی رہتی ہیں کہ محلہ کے بچوں اور بچیوں کو ناظرہ قرآن کریم پڑھا دیں اور بہت سی عورتیں ایسی ہیں کہ جیسا بھی قرآن کریم ان کو پڑھنا آتا ہے وہ محلے کے بچوں کو پڑھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

چنانچہ ہماری حکومت نے ملک میں قرآن کریم کی تعلیم کا انتظام کرنے کی ذمہ داری اس سطح پر قبول کی لیکن تین چار سال گزر جانے کے باوجود ملک کے پرائمری اسکولوں میں آج تک اس کا انتظام نہیں ہو سکا اور اس وقت بھی سرکاری پرائمری اسکولوں میں یہ سلسلہ موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ محکمہ تعلیم کے ذمہ دار حضرات سے دریافت کی گئی تو جواب ملا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ لیا گیا ہے کیونکہ ملک بھر میں پرائمری اسکولوں کی جو تعداد ہے اگر فی اسکول دو استاذ بھی مہیا کیے جائیں تو اتنی تعداد میں قرآن کریم کے اساتذہ مہیا

کرنا مشکل ہے اور اگر استاذ کہیں سے مل بھی جائیں تو انہیں تنخواہ دینے کے لیے بجٹ میں رقم نہیں ہے اس لیے یہ منصوبہ ناقابل عمل ہے۔

دوسری طرف اس بات کا جائزہ بھی لے لیجئے کہ ملک میں مسجدوں کی تعداد پرائمری اسکولوں سے کم ہے یا زیادہ؟ میرا اندازہ ہے کہ ملک بھر میں مساجد اگر بہت زیادہ نہیں تو مجموعی طور پر پرائمری اسکولوں سے پانچ گنا زیادہ تعداد میں تو یقیناً ہوں گی۔ ان مساجد میں خطیب فراہم ہو رہے ہیں، امام مل رہے ہیں، قرآن کریم پڑھانے والے استاذ مل رہے ہیں اور اب رمضان المبارک قریب ہے اور ہر مسجد میں قرآن کریم تراویح میں سنانے کے لیے نہ صرف حافظ میسر ہوگا بلکہ سامع بھی ملے گا۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں میں حافظوں کی تعداد مساجد کی تعداد سے بڑھ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کھیپ کہاں سے آ رہی ہے؟ یہ کھیپ نہ آسمان سے نازل ہوتی ہے اور نہ زمین سے اگتی ہے بلکہ یہی دینی مدارس ہیں جو معاشرے کی اتنی بڑی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔ اور جس کام کی ذمہ داری قبول کرنے سے پورے ملک کا ریونیو وصول کرنے والی اور قومی بجٹ کنٹرول کرنے والی حکومت نے ہاتھ کھڑے کر دیے ہیں اس قومی ضرورت کو یہ دینی مدارس پورا کر رہے ہیں۔

اور پھر یہ بھی دیکھیے کہ ان دینی مدارس کے بجٹ کو سرکاری تعلیمی اداروں کو دیے جانے والے بجٹ کے ساتھ کوئی نسبت ہے؟ آپ حضرات تصور بھی نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم پڑھانے والے استاذ کتنے تھوڑے وظیفے پر کتنی لمبی ڈیوٹی دیتا ہے؟ قرآن کریم پڑھانے والا ایک صحیح استاذ صبح سحری کے وقت بچوں کو لیے بیٹھا ہوتا ہے، نماز فجر کے بعد پڑھاتا ہے، ظہر کے بعد پڑھاتا ہے، مغرب کے بعد پڑھاتا ہے اور رات سردیوں میں لمبی ہو تو عشاء کے بعد بھی گھنٹہ ڈیڑھ کے لیے بچوں کو لے کر پھر بیٹھ جاتا ہے۔ اتنی لمبی ڈیوٹی پر اس کو تنخواہ کتنی ملتی ہے، آپ کسی ایسے استاذ سے پوچھ کر دیکھ لیں۔ پھر آپ نے کبھی یہ نہیں سنا ہوگا کہ قاریوں نے تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے ہڑتال کر دی ہے، حافظوں نے قرآن کریم سنانے سے انکار کر دیا ہے یا اماموں نے نماز پڑھانے سے معذرت کر دی ہے۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ جو طبقہ اتنے تھوڑے بجٹ کے ساتھ، اس قدر معمولی وظیفوں پر اور انتہائی صبر و ایثار کی فضا میں قوم کی اتنی بڑی ضرورت کو پورا کر رہا ہے اور اتنے بڑے خلا کو پر کیے ہوئے ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ معاشرے میں اس کی ضرورت نہیں ہے اور دینی مدارس کے پیدا کردہ افراد کی سوسائٹی میں کوئی کھپت نہیں ہے۔

اس مختصر جائزے کے بعد ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب دینی مدارس کے خلاف اتنی اعلیٰ سطح پر باتیں ہوتی ہیں کہ امریکہ اور اقوام متحدہ سے مطالبے آنے لگتے ہیں اور حکومتیں دھمکیاں دینے اور خوف زدہ کرنے پر اتر آتی ہیں تو بعض دوست پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان مدارس کا کیا بنے گا؟ میں ان سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مدارس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا اور یہ اسی طرح اپنا کام کرتے رہیں گے ان شاءاللہ تعالیٰ۔ اس لیے کہ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ قرآن کریم کی قیامت تک حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ قرآن کریم کی حفاظت کرے گا تو اس سینے کی بھی حفاظت کرے گا جس میں قرآن کریم موجود ہے اور اس سسٹم اور نظام کی حفاظت بھی کرے گا جو قرآن کریم کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال سے بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ دو دوست ایک جگہ بیٹھے دودھ پی رہے ہیں، ایک دوست اپنا دودھ کا گلاس رکھ کر دوسرے سے کہتا ہے کہ میں دو چار منٹ کے لیے ضروری کام سے جا رہا ہوں، میری واپسی تک دودھ کی حفاظت کرنا تاکہ کوئی جانور اسے پی نہ جائے۔ اب وہ دوسرا شخص اپنے دوست کے آنے تک دودھ کی حفاظت کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ صرف دودھ کی نہیں بلکہ اس گلاس یا پیالے کی حفاظت بھی کر رہا ہے جس میں دودھ موجود ہے، اس طرح دودھ کے ساتھ ساتھ اس برتن کی حفاظت خود بخود ہو رہی ہے۔ اس لیے کسی تردد کے بغیر عرض کرتا ہوں کہ یہ دینی مدارس قرآن کریم اور اس کے علوم کی حفاظت کا تکوینی ذریعہ ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ ان دینی مدارس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرما رکھا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر وعدہ سچا اور پکا ہے۔ لہٰذا آپ حضرات کسی قسم کی پریشانی کا شکار نہ ہوں، ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ نیت صحیح رکھیں، جذبہ خالص رکھیں اور اپنی ہمت و استطاعت کے مطابق جو کچھ ہم سے ہو چکے کام کرتے رہیں۔ نتائج اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہیں اور اس نے خود پر صحیح بھروسہ رکھنے والوں کو پہلے بھی کبھی مایوس نہیں کیا اور آئندہ بھی کبھی نہیں کرے گا۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ دسمبر ۱۹۹۹ء)

قرآن کریم سے ترک تعلق کی مختلف صورتیں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۵ ستمبر ۱۹۹۹ء)

اس دفعہ برطانیہ سے واپسی سے دو روز قبل یکم ستمبر کو آکسفورڈ کی سٹینلی روڈ کی مسجد میں ظہر کے بعد ''قرآن کریم کے حقوق'' کے حوالہ سے مختصر گفتگو کا موقع ملا جس کا خلاصہ نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۳۰ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے روز حشر کے میدان میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دائر کی جانے والی ایک درخواست کا ذکر فرمایا ہے کہ اس روز جبکہ ظالم و فاسق لوگ اپنی بداعمالیوں پر حسرت اور بے بسی کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو دانتوں میں چبائیں گے اور اپنی اس کوتاہی کا حسرت کے ساتھ تذکرہ کریں گے کہ اے کاش! ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ اختیار کی ہوتی اور فلاں فلاں کے نقش قدم پر نہ چلے ہوتے۔ اس روز آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ ''اے میرے رب! میری اس قوم نے قرآن کریم کو مہجور بنا دیا تھا''۔ مہجور ہجر سے ہے جس کا عام فہم معنی یہ ہے کہ چھوڑ دینا۔ اس لیے میں اس کا محاورے کا ترجمہ یوں کیا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میری اس قوم نے قرآن کریم کو پس پشت ڈال دیا تھا اور نظر انداز کر دیا تھا۔

اس حوالہ سے ہم نے دو باتوں پر غور کرنا ہے۔ ایک یہ کہ جب عدالت اللہ تعالیٰ کی ہوگی، میدان حشر کا ہوگا اور مدعی جناب رسول اللہؐ خود ہوں گے تو مدعا علیہ کون ہوں گے؟ کیا ان مدعا علیہم کی فہرست میں ہمارا نام تو نہیں ہوگا؟ اور جس کیس میں مدعی خود رسول اکرمؐ ہوں گے، اس میں مدعا علیہم کا حشر کیا ہوگا؟ یہ بڑا نازک اور ضروری سوال ہے جس پر مجھے اور آپ کو غور کرنا چاہیے اور اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ کہیں حضور علیہ السلام کے دائر کردہ کیس میں مدعا علیہم کی فہرست میں ہمارا نام نہ آجائے۔ دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ قرآن کریم کو چھوڑ دینے کا معنی کیا ہے اور وہ کون سا عمل ہے جس کے ارتکاب کو قرآن کریم کو ترک کر دینے سے تعبیر کیا جائے گا؟ اس پر آٹھویں صدی ہجری کے معروف محدث اور فقیہ حافظ ابن القیمؒ کا ایک ارشاد بیان کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے اپنی کتاب ''الفوائد'' میں لکھا ہے کہ ''ہجر قرآن'' یعنی قرآن کریم کو چھوڑ دینے، پس پشت ڈال دینے اور نظر انداز کر دینے کی مختلف عملی صورتیں ہیں۔

1. پہلی صورت یہ ہے کہ قرآن کریم کو پڑھنے اور سننے کا اہتمام نہ کیا جائے کیونکہ قرآن کریم کی تلاوت کرنا اور اس کو اہتمام کے ساتھ سننا دونوں عبادت ہیں اور جناب نبی اکرمؐ کی سنت ہیں۔ حضورؐ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے اور اہتمام کر کے مختلف حضرات سے اسے سنتے بھی تھے اور قرآن کریم پڑھنے اور سننے کے دونوں عملوں پر آپؐ نے اجر و ثواب بیان فرمایا ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام کرے اور اسے سننے کا معمول بھی بنائے تاکہ وہ قرآن کریم سے بے توجہی کا مرتکب قرار نہ پائے۔

2. حافظ ابن القیمؒ نے ہجر قرآن کی دوسری عملی صورت یہ بیان فرمائی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ کی جائے۔ یہ عجیب سی صورتحال ہے کہ ہم ایمان تو رکھتے ہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ہمارے لیے ہے مگر ہم اس کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اور اس سے زیادہ تعجب انگیز بلکہ مضحکہ خیز صورت یہ ہے کہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام مانتے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہم سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اور نماز میں ہم اللہ تعالیٰ کی باتیں سنتے بھی ہیں اور اس سے باتیں کرتے بھی ہیں لیکن نہ وہ باتیں سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ہم سے کرتا ہے اور نہ وہ باتیں سمجھتے ہیں جو ہم اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ یہ دنیا کی عجیب ترین گفتگو ہے جو ہم شب و روز پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہم آج کے مسلمان اس پر دنیا کا ایک مستقل ”اعجوبہ“ کہلانے کے مستحق ہیں۔

3. حافظ ابن القیمؒ کے بقول قرآن کریم کو ترک کر دینے کی تیسری عملی شکل یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل نہ کیا جائے اور اس کے بیان کردہ حلال و حرام کی پروا نہ کی جائے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کا اصل مقصد تو رہنمائی اور ہدایت ہے اور ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے احکام پر عمل کرے اور اس کے بیان کردہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے دائروں کو زندگی میں ملحوظ رکھے۔ یہ قرآن کریم کا حق ہے اور ہم میں سے ہر شخص کو اس حوالہ سے اپنے کردار کا جائزہ لینا چاہیے۔ اور بالخصوص اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جن

امور پر کچھ بحث ہے وہ تو ایک طرف رہیں، کچھ معاملات ایسے ہیں جن کے حلال و حرام ہونے کو قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ دو ٹوک انداز میں بیان کیا ہے، کیا ہم ان پر عمل کر رہے ہیں؟

4. چوتھی عملی صورت قرآن کریم کو ترک کر دینے کی یہ ہے کہ اسے اپنی زندگی کے معاملات میں جج اور فیصل تسلیم نہ کیا جائے۔ کیونکہ قرآن کریم ہمارے لیے حکم اور قانون کی کتاب ہے جس کے بارے میں خود اللہ تعالی نے سورۃ النساء آیت نمبر ۱۰۵ میں جناب رسول اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے یہ کتاب آپ پر اس لیے اتاری ہے کہ آپ اس کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کریں۔ چنانچہ قرآن کریم کو اپنے تنازعات اور زندگی کے ہر معاملہ میں حکم تسلیم کرنا بھی ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔ مگر اس کا طریقہ یہ نہیں جو ہم نے اختیار کر رکھا ہے کہ دو آدمیوں میں لین دین کا جھگڑا ہے تو ایک فریق نے پیسے قرآن کریم پر رکھ دیے کہ تمہارے ہیں تو اٹھا لو۔ اور پھر دونوں فریق خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے قرآن کریم کے ذریعے فیصلہ کیا ہے۔ اسی طرح کسی مقدمہ میں فریقین قرآن کریم پر حلف اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے اور حلف اٹھا کر خوشی خوشی گھر واپس ہوئے کہ ہم نے قرآن کریم سے فیصلہ لیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بعض اوقات تو صورتحال اتنی مضحکہ خیز ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی بے حرمتی اور توہین تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ قرآن کریم سے فیصلہ لینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس معاملہ میں تنازعہ ہے یا معاملہ فیصلہ طلب ہے اس کے بارے میں قرآن کریم کو کھول کر دیکھا جائے کہ اس کی ہدایات کیا ہیں اور پھر اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

5. ہجر قرآن کریم کی پانچویں صورت حافظ ابن القیمؒ نے یہ بیان کی ہے کہ قرآن کریم کو بیماریوں میں شفا کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اس لیے کہ قرآن کریم روحانی اور جسمانی دونوں طرح کی بیماریوں کی شفا ہے اور اس کی برکت سے نہ صرف روحانی بیماریوں مثلاً، تکبر، بغض، حسد، حرص اور خود غرضی وغیرہ سے شفا حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کی تلاوت سے گھروں میں برکات نازل ہوتی ہیں،

روحانی سکون ملتا ہے اور جسمانی بیماریوں سے بھی اللہ تعالیٰ شفاء عطا فرماتے ہیں۔ اور اس کے متعلق جناب رسول اللہؐ کی متعدّد روایات میں ہدایات موجود ہیں۔

یہ قرآن کریم کے حقوق کا ایک خاکہ ہم نے حافظ ابن القیمؒ کے حوالہ سے عرض کیا ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کریم کے ساتھ اپنا تعلق درست کرنے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں تاکہ قیامت کے روز جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ دعوی کی صورت میں ان کے مدعا علیہم میں شامل ہونے سے بچ سکیں، آمین یا رب العالمین۔

مسلم پرسنل لاء اور موجودہ عالمی صورتحال

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۳۱ اگست ۱۹۹۹ء)

۲۰ اگست ۱۹۹۹ء کو مرکزی جامع مسجد گلاسگو برطانیہ میں جمعیت اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام ایک نشست میں "مسلم پرسنل لاء" کے حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوۃ۔ کچھ عرصہ سے یورپ میں مختلف حلقوں کی طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو پرسنل لاء میں اپنا جداگانہ تشخص تسلیم کرانے کے لیے آواز بلند کرنی چاہیے۔ سرکردہ علماء کرام کی یورپی کونسل نے دو ماہ قبل جرمنی میں معروف سکالر ڈاکٹر محمد یوسف قرضاوی کی زیر صدارت اجلاس منعقد کر کے اس تجویز کی طرف دینی اداروں کو توجہ دلائی ہے اور برطانوی دارالامراء کے مسلمان رکن لارڈ نذیر احمد نے بھی ایک حالیہ تقریر میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے اس بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہ رہا ہوں لیکن قبل اس کے کہ غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں مسلم اقلیتوں کے لیے مسلم پرسنل لاء کی اہمیت پر کچھ عرض کروں خود مسلم ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں مسلم پرسنل لاء کی صورتحال کے بارے میں گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ہمارے شخصی قوانین اور فیملی لاز خود مسلم ممالک میں خطرے میں ہیں اور مسلم حکومتوں پر بین الاقوامی طور پر دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے ممالک میں عمومی قوانین اور خاص طور پر پرسنل لاء یعنی نکاح و طلاق اور وراثت

سے متعلقہ قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کے لیے قرآن و سنت کے بیان کردہ ضابطوں میں تبدیلی کریں اور انہیں عالمی معیار کے مطابق بنائیں۔

اس سلسلہ میں بین الاقوامی معیار سے مراد اقوام متحدہ کا بنیادی حقوق کا چارٹر اور اس کی تشریح میں اقوام متحدہ کے مختلف اداروں اور کانفرنسوں کی قراردادیں ہیں جن کی بہت سی باتیں نکاح و طلاق اور وراثت کے بارے میں قرآن و سنت کے صریح احکام سے متصادم ہیں۔ اسی لیے بین الاقوامی اداروں اور لابیوں کی طرف سے مسلم ممالک سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جب وہ اقوام متحدہ کے رکن ہیں اور اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر چکے ہیں تو انہیں اس کے مطابق اپنے قوانین میں ترمیم کرنی چاہیے اور اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس کے اداروں کے فیصلوں کا احترام کرنا چاہیے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی بنیاد پر مروجہ بین الاقوامی قوانین اور قرآن و سنت کے شرعی احکام میں کیا فرق اور تضاد ہے؟ اس کو واضح کرنے کے لیے دو تین باتوں کو بطور مثال ذکر کرنا چاہوں گا۔

1. بین الاقوامی قوانین کے مطابق کوئی بھی مرد اور عورت رنگ و نسل اور مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر آپس میں آزادانہ مرضی سے شادی کر سکتے ہیں، مگر اسلام میں مسلمان عورت کا نکاح کسی غیر مسلم مرد سے نہیں ہو سکتا، اسی طرح مسلمان مرد بھی اہل کتاب کے علاوہ کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والی خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جس کا اظہار آپ کے سامنے اس وقت ہوتا ہے جب یہاں کسی مغربی ملک میں کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلمان نوجوان کے ساتھ عدالت کے ذریعہ شادی کر لیتی ہے، لیکن جب آپ عدالت سے رجوع کرتے ہیں کہ اسلام اس شادی کی اجازت نہیں دیتا تو یہاں کی عدالت آپ کا اعتراض سننے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور مروجہ بین الاقوامی معیار کے مطابق نہ صرف اس شادی کو جائز قرار دے دیتی ہے بلکہ یہاں کا سسٹم اس شادی کو مکمل تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔

2. اسی طرح نکاح کا رشتہ ختم کرنے میں مروجہ بین الاقوامی قانون خاوند اور بیوی کا یکساں حق تسلیم کرتا ہے کہ دونوں میں سے جو بھی چاہے اس رشتہ کو ختم کر سکتا ہے۔ جبکہ اسلام نے نکاح کا رشتہ غیر مشروط طور پر ختم کرنے کا حق خاوند کو دیا ہے جسے قرآن کریم نے "بیدہ عقدۃ النکاح" کے ساتھ بیان کیا

ہے۔ جبکہ عورت کو یہ حق براہ راست اور غیر مشروط طور پر نہیں دیا گیا بلکہ خلع کے عنوان سے عورت کا یہ حق عدالتی پراسیس کے ذریعہ تعلیم کیا گیا ہے۔ اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلام عورت کو نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا حق غیر مشروط طور پر نہیں دیتا اور یہ بات مروجہ بین الاقوامی قانون سے متصادم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں برطانیہ میں کوئی مسلمان خاتون اپنے خاوند کو طلاق دے دے تو کوئی عدالت خاوند کا یہ اعتراض سننے کے لیے تیار نہیں ہوگی کہ چونکہ شرعی قوانین کی رو سے طلاق دینے کا حق صرف اسے ہے اس لیے یہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ قانونی طور پر وہ طلاق واقع ہو جائے گی اور یہاں کا سسٹم اس طلاق کا تحفظ بھی کرے گا۔

3. اس کے علاوہ وراثت کے معاملہ میں بھی قرآن کریم نے حصوں کی جو تقسیم کی ہے وہ واضح طور پر غیر مساویانہ ہے۔ خاوند کے فوت ہو جانے کی صورت میں بیوی کو ایک صورت میں آٹھواں اور دوسری صورت میں چوتھا حصہ ملتا ہے، اور بیٹی کا حصہ ہر صورت میں بیٹے سے نصف ہوتا ہے۔ جبکہ بین الاقوامی قانون اس سلسلہ میں برابری کا متقاضی ہے اور قرآن کریم کے بیان کردہ غیر مساویانہ حصوں کو غیر منصفانہ قرار دیتا ہے۔ لہذا جب وراثت کے قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ حصوں پر نظر ثانی کر کے ان میں ترمیم کی جائے۔

یہ تین مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ نکاح، طلاق اور وراثت کے باب میں قرآن و سنت کے بیان کردہ قوانین آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین سے متصادم ہیں اس لیے اقوام متحدہ کے مختلف اداروں سمیت بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے مسلم ممالک پر یہ دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے قوانین میں ردوبدل کر کے انہیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنائیں۔

اس پر مسلم ممالک اور حکومتوں کا ردعمل تین طرح کا ہے۔

1. ایک ردعمل ترکی کا ہے کہ اس نے پون صدی قبل ہی قرآن و سنت کے احکام سے اعلانیہ دستبرداری اختیار کر کے مغربی قوانین کو قبول کر لیا تھا اور وہ

اپنے اس فیصلہ پر سختی کے ساتھ قائم ہے۔ بلکہ اگر ترکی میں اس حوالہ سے قرآن و سنت کے احکام کی طرف واپسی کا معمولی سا رجحان بھی نظر آنے لگتا ہے تو ریاستی قوانین اور ادارے اسے روکنے کے لیے پوری طرح سرگرم ہو جاتے ہیں۔

2. دوسرا ردعمل امارت اسلامی افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام کے ساتھ بے لچک وابستگی قائم رکھتے ہوئے اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس کی بنیاد پر تشکیل پانے والے مروجہ بین الاقوامی قوانین کو قبول کرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں۔ اور ان کا یہ انکار بھی اس بات کی ایک بڑی وجہ ہے کہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر کنٹرول اور دارالحکومت کا قبضہ حاصل کرنے اور اپنے زیر تسلط علاقے میں مکمل امن قائم کر لینے کے باوجود ان کی حکومت کو اقوام متحدہ میں تسلیم نہیں کیا جا رہا اور انہیں اقوام متحدہ میں افغانستان کی نشست سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

3. ترکی اور افغانستان کے فیصلے تو دوٹوک اور غیر مبہم ہیں جو سب کے سامنے ہیں۔ لیکن ایک تیسرا ردعمل بھی ہے جو پاکستان سمیت بیشتر مسلم ممالک کا ہے کہ قرآن و سنت پر عملدرآمد کا ٹائٹل بھی ہاتھ میں رہے اور مغرب کو بھی مطمئن رکھا جائے۔ اس کے لیے ایک الگ راستہ اختیار کیا گیا کہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی ایسی تعبیر و تشریح کی جائے جس سے قوانین کو مغرب کے معیار کے قریب تر لایا جائے۔ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں مسلم فیملی لاز آرڈیننس یعنی عائلی قوانین کے نفاذ کی صورت میں ہوئی تھی جس کی متعدّد دفعات کو ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے متفقہ طور پر قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا لیکن اس کے باوجود وہ نافذ ہوئے اور ابھی تک ریاستی قوت کے بل بوتے پر مسلسل نافذ العمل ہیں۔ ان قوانین میں سے صرف ایک کی مثال دوں گا کہ نکاح کے فارم میں خاوند کی طرف سے عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دینے کا خانہ رکھ کر ہم نے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے پاکستان میں

عورت کو بھی طلاق کا حق دے دیا ہے۔ اسی سے باقی قوانین کے رخ کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اب اقوام متحدہ کی قاہرہ اور بیجینگ میں ہونے والی خواتین کانفرنسوں کے بعد ان کی قراردادوں اور فیصلوں کی روشنی میں اگلے مرحلوں کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک حاضر سروس جسٹس کی سربراہی میں قائم ہونے والی ''خواتین حقوق کمیشن'' نے کچھ عرصہ قبل جو سفارشات پیش کی ہیں وہ قانون سازی کے لیے وزارت قانون کی میز پر ہیں۔ ان میں واضح طور پر سفارش کی گئی ہے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح طلاق کا مکمل حق دیا جائے اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم ختم کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی عدالتوں میں بھی اس نوعیت کے فیصلے ہونے لگے ہیں مثلاً لاہور ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا ہے اور سندھ ہائیکورٹ نے ایک فیصلہ میں وراثت میں بیٹی کے نصف حصے کو انصاف کے منافی قرار دے دیا ہے۔ اس طرح ہم نے قرآن وسنت کا ٹائٹل برقرار رکھتے ہوئے بین الاقوامی معیار کے قریب آنے کے لیے شرعی احکام کی نئی اور من مانی تعبیر و تشریح کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی قوانین کے معیار کو پورا کرنے اور مغربی اداروں کو مطمئن کرنے کے لیے قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی نئی تعبیر وتشریح کا یہ عمل مسلم ممالک کی حکومتوں اور حکومتی اداروں کا ہے جبکہ عام مسلمانوں اور ملت اسلامیہ کی رائے عامہ نے اس عمل کو قبول نہیں کیا۔ کیونکہ ہر مسلمان ملک میں دینی حلقے اور عام مسلمان قرآن وسنت کے احکام وقوانین کی اسی تعبیر وتشریح پر سختی سے عمل پیرا ہیں جو چودہ سو سال سے اجماعی طور پر چلی آرہی ہے اور وہ اس میں کسی قسم کا ردوبدل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دینی ادارے ہر جگہ اس کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ چنانچہ ابھی بنگلہ دیش سے لندن آئے ہوئے ہمارے پرانے بزرگ مولانا محی الدین خان نے بتایا ہے کہ بنگلہ دیش کی ہائیکورٹ نے کومیلا کے ایک مقدمہ میں طلاق یافتہ خاتون کو سابقہ خاوند کی طرف سے زندگی بھر نان ونفقہ دیے جانے کا حکم صادر کر دیا تو سرکردہ علماء کرام نے شریعت کونسل قائم کر کے اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا اور عدالت عظمی نے علماء کرام کا موقف سننے کے بعد ہائیکورٹ کے فیصلے کو قرآن وسنت کے منافی قرار دے دیا۔

الغرض یہ ایک الگ کشمکش ہے جو مسلمان حکومتوں اور دینی حلقوں کے درمیان جاری ہے اور عام مسلمان ہر ملک میں قرآن وسنت کے حوالہ سے علماء کرام اور دینی حلقوں کے ساتھ ہیں۔

یہ قدرے تفصیل میں نے اس لیے عرض کی ہے تاکہ آپ حضرات کے سامنے وہ صورتحال واضح ہو جو اس وقت مسلم ممالک میں نکاح وطلاق اور وراثت کے اسلامی قوانین کے حوالہ سے مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اسی بنیاد پر میں نے عرض کیا ہے کہ مسلم پرسنل لاء خود مسلم ممالک میں خطرہ میں ہیں اور انہیں مغربی ممالک کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک مسلسل عمل جاری ہے۔ اور صرف پرسنل لاء اور خاندانی قوانین کی بات نہیں بلکہ قرآن وسنت کے بہت سے دیگر احکام وقوانین بھی مغربی دباؤ کی زد میں ہیں۔ مثلاً اقوام متحدہ کے چارٹر کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ کسی مجرم کو دی جانے والی سزا اہانت، ذہنی اذیت اور جسمانی تشدد سے خالی ہونی چاہیے۔ یعنی سزا ایسی ہو کہ اس میں مجرم کی توہین نہ ہوتی ہو، وہ ذہنی اذیت کا شکار نہ ہو اور اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بھی نہ بننا پڑے۔ چنانچہ اس بنیاد پر ہاتھ کاٹنے، سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور کھلے بندوں عام لوگوں کے سامنے سزا دینے کے سب قواعد وضوابط اس بین الاقوامی معیار کے منافی قرار پاتے ہیں۔ جرائم کی شرعی سزاؤں کی بین الاقوامی اداروں کی طرف سے جو مخالفت ہوتی ہے اس کی وجہ یہی ہے اور جرائم کی شرعی سزاؤں کو بعض سیاسی لیڈروں کی طرف سے وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دیے جانے کا پس منظر بھی یہی ہے۔

اس حوالہ سے مغرب والوں کا موقف تو سمجھ میں آتا ہے کہ بہت سے اسلامی احکام و قوانین ان کے بقول آج کے بین الاقوامی معیار کے منافی ہیں اس لیے اگر مسلم ممالک نے بین الاقوامی برادری کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں اس کے احکام وضوابط بھی قبول کرنا ہوں گے۔ اسی طرح بین الاقوامی اداروں کی یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جن مسلم ممالک نے اقوام متحدہ کی رکنیت قبول کر کے اس کے چارٹر پر دستخط کیے ہوئے ہیں انہیں اس بین الاقوامی معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ البتہ ان مسلم حکومتوں کا طرز عمل سمجھ سے بالاتر ہے جو بین الاقوامی معیار اور قرآن وسنت کے قوانین کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کوشش میں شرعی احکام کا حلیہ بگاڑ دینا چاہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد کی وہ بات پسند آئی ہے جو انہوں نے اقوام متحدہ کی پچاس سالہ

تقریبات کے موقع پر مسلم حکومتوں کے سامنے رکھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے بارے میں اقوام متحدہ کے دوہرے طرز عمل پر احتجاج کے طور پر مسلم ممالک کو اقوام متحدہ کی پچاس سالہ تقریبات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے اور اقوام متحدہ کے چارٹر پر نظر ثانی کر کے اسے از سر نو مرتب کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے، کیونکہ یہ چارٹر پچاس سال قبل ترتیب دیا گیا تھا جب اکثر مسلم ممالک غلامی کی حالت میں تھے جبکہ آج صورتحال بدل گئی ہے اس لیے عالم اسلام کے موقف اور پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اس چارٹر پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت مہاتیر محمد کی یہ بات مسلم حکومتوں نے قبول نہیں کی لیکن یہی موقف حقیقت پسندانہ ہے اور مسلم ممالک کو بالآخر اسی موقف پر آنا ہوگا۔

یہ تو ہے صورتحال مسلم پرسنل لاء کے حوالہ سے خود مسلم ممالک کی۔ اب آئیے ان ممالک کی طرف جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں بھارت کے مسلمان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ تمام تر مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے خاندانی قوانین کا تحفظ کیے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی میں تمام مکاتب فکر کا مشترکہ ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کے پرسنل لاء کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بھارت میں ''کامن سول کوڈ'' کے نفاذ کے نام سے مسلمانوں کے جداگانہ شخصی قوانین کو ختم کرنے کی مہم ایک عرصہ سے چل رہی ہے اور مسلمانوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ قومی یکجہتی کی خاطر نکاح و طلاق اور وراثت میں اپنے جداگانہ مذہبی قوانین سے دستبردار ہو کر کامن سول کوڈ قبول کر لیں۔ چنانچہ یہاں بھی کامن سول کوڈ سے مراد وہی بین الاقوامی قوانین اور معیار ہے جس کا تذکرہ میں نے پہلے اقوام متحدہ کے چارٹر کے حوالہ سے کر دیا ہے۔ مگر انڈین مسلمان اس معاملہ میں بالکل بے لچک ہیں اور پرسنل لاء میں اپنے مذہبی احکام و قوانین کے تحفظ کا پوری طرح عزم کیے ہوئے ہیں جس پر وہ بلاشبہ تبریک و تحسین اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

جہاں تک مغربی ممالک کا تعلق ہے، میں نے چند ایسے مسائل کا ابتداء میں ذکر کر دیا ہے جن کا سامنا آپ حضرات کو یہاں درپیش ہے۔ مثلاً مسلمان لڑکی کی غیر مسلم لڑکے سے شادی، مسلمان بیوی کا عدالتی سسٹم کے ذریعہ خاوند کو طلاق دینا، اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم۔ اس قسم کے مسائل آپ حضرات کو مسلسل پیش آتے ہیں اور آپ جب مذہب اور اپنی روایات کے حوالہ سے بات کرتے ہیں تو آپ کی بات قطعی طور پر نہیں سنی

جاتی۔ لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں، لڑکے باغی ہو جاتے ہیں، انہیں اس سلسلہ میں ریاستی سسٹم کی طرف سے مکمل تحفظ و پشت پناہی مہیا ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے مسلم خاندان تتر بتر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

جبکہ عالمی صورتحال یہ ہے کہ پرسنل لاء اور کلچر میں ہر قوم کے جداگانہ تشخص کے حق کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ امریکہ میں یہودیوں کو پرسنل لاء بلکہ بزنس لاء میں بھی اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے اور ان کے لیے الگ عدالتیں قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہاں برطانیہ میں بھی یہودیوں کو جداگانہ پرسنل لاء کا تحفظ حاصل ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو بھی پرسنل لاء میں اپنے جداگانہ تشخص کو تسلیم کرانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کی حکومت کو اس سے کوئی انکار ہوگا کیونکہ اسی برطانیہ نے جب برصغیر پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور برما پر مشتمل متحدہ ہندوستان میں مغلوں سے اقتدار حاصل کیا تھا تو مغلوں کے دور سے چلا آنے والا عدالتی نظام ختم کر دیا تھا۔ اس وقت متحدہ ہندوستان کی عدالتوں میں فتاوی عالمگیری نافذ تھا جس کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے۔ انگریزوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس عدالتی نظام کو ختم کر کے انگریزی قوانین نافذ کر دیے تھے جو اب تک چلے آ رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے پرسنل لاء یعنی نکاح و طلاق اور وراثت کے باب میں مسلمانوں کا یہ حق اس وقت بھی بحال رکھا تھا کہ وہ ان معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں اور ''محمڈن لاء'' کے نام سے پرسنل لاء اور خاندانی قوانین میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس دور میں جبکہ ہم برطانوی استعمار کے غلام تھے اور برطانیہ کی نوآبادی تھے ہمارے اس حق سے انکار نہیں کیا گیا تھا تو آج برطانیہ میں رہنے والے مسلمان غلام نہیں بلکہ برابر کے شہری ہیں تو ان کے اس حق کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو پرسنل لاء میں جداگانہ تشخص فراہم کیا گیا ہے۔ خود پاکستان کے دستور میں ان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے اور سب سے پہلے علماء کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں اس اصول کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا کہ پرسنل لاء میں تمام اقلیتوں کو اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔ اس لیے جب پاکستان میں عیسائی اقلیت اور دیگر اقلیتوں کو یہ حق دینے سے انکار

نہیں کیا گیا تو برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرنے میں بھی کوئی حجاب نہیں ہونا چاہیے۔

ان گزارشات کے ساتھ میں مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں سے عرض کروں گا کہ وہ اپنے خاندانی نظام کے تحفظ کی طرف توجہ دیں اور پرسنل لاء میں اپنا جداگانہ تشخص تسلیم کرانے کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کریں کیونکہ اس کے بغیر وہ خاندانی نظام کے حوالہ سے درپیش ان مسائل اور مشکلات سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے جنہوں نے مغرب میں رہنے والے ہر حساس اور دیندار مسلمان خاندان کو پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن جدوجہد سے میرا مقصد لڑائی جھگڑا اور بے تکا شور و غوغا نہیں ہے بلکہ جدوجہد سے مراد یہ ہے کہ معقولیت اور منطق کے ساتھ اپنا موقف متعلقہ اداروں اور شخصیات کے سامنے پیش کیا جائے، اس کے لیے لابنگ کی جائے، بریفنگ کی جائے اور رائے عامہ کو موثر طریقہ سے ہموار کر کے مغرب کی حکومتوں کو اس کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے اس مسلمہ حق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے اپنے ملکوں میں اسے دستوری تحفظ فراہم کریں۔

”غیرت“ کے خلاف مہم

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۳ اگست ۱۹۹۹ء)

لندن سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ نے ۱۴ اگست کی اشاعت میں اسلام آباد میں ہونے والے ایک مظاہرہ کی تصویر شائع کی ہے جس میں تین چار عورتیں سینہ کوبی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور تصویر کے نیچے لکھا ہے کہ

”پاکستان کے بعض علاقوں میں غیرت کے نام پر ان عورتوں کو قتل کر دیا جاتا ہے جو خاندان کے شرمسار ہونے کا باعث بنتی ہیں۔ گزشتہ دنوں اس رسم کے خلاف سینٹ میں تحریک بھی ناکام ہوگئی ہے۔ جمعہ کے روز اسلام آباد میں خواتین اس رسم کے خلاف مظاہرے کے دوران سینہ کوبی کر رہی ہیں۔“

ظاہر ہے کہ اس مظاہرہ کا اہتمام کسی این جی او نے کیا ہوگا کیونکہ این جی اوز ایک عرصہ سے اس مہم میں مصروف ہیں کہ ”غیرت“ نام کا جو جذبہ ایشیائی اقوام بالخصوص مسلمانوں میں ابھی تک موجود ہے اسے کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے تاکہ وہ بھی غیرت و حمیت کے حوالہ سے اس مقام پر آجائیں جو مغربی معاشرہ نے حاصل کر لیا ہے۔ اور جس کے بارے

میں لاہور ایم اے او کالج کے ایک سابق پروفیسر نے، جو ان دنوں برطانیہ میں مقیم ہیں، راقم الحروف کو بتایا کہ ان سے پاکستان میں ان کے ایک شاگرد نے ''غیرت'' کا انگریزی ترجمہ دریافت کیا تو تلاش بسیار کے باوجود وہ انگریزی میں غیرت کا مفہوم ادا کرنے والا کوئی لفظ معلوم نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے شاگرد کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ مغرب کی سوسائٹی میں غیرت کا جذبہ سرے سے پایا ہی نہیں جاتا اس لیے ان کے ہاں کوئی لفظ بھی استعمال میں نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک کے لوگ جب کسی مسلمان کو غیرت کے حوالہ سے کوئی کام کرتا دیکھتے ہیں تو انہیں تعجب ہوتا ہے اور وہ بالکل نہیں سمجھ پاتے کہ آخر یہ کون سا جذبہ ہے جس نے اس شخص کو اتنے بڑے اقدام پر مجبور کر دیا ہے؟ ایک مسلمان کے لیے غیرت کا سب سے بڑا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالی، حضرت محمدؐ، قرآن کریم، اور اسلام کے کسی شعار کی توہین برداشت نہیں کر پاتا اور وہ اس کے ردعمل میں جان لینے یا جان دینے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بات مغرب میں رہنے والوں کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی اور وہ اسے جنون اور جذباتیت قرار دے کر مسلمانوں کی اصلاح اور انہیں اپنی طرح ''سولائزڈ'' کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح ماں، بہن، بیٹی، بیوی پر غیرت کھانا اور ان کے ساتھ کسی غیر مرد کے نامناسب روابط کو برداشت نہ کرنا بھی مسلمانوں کے اخلاق و روایات و اقدار کا حصہ ہے۔ اور یہ بھی مغرب والوں کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی عورت کسی مرد سے تعلقات استوار کرتی ہے تو اس میں کسی اور کو مداخلت کرنے کا آخر کیا حق حاصل ہے؟ اور عورت اپنی آزادی اور خود مختاری کے ساتھ اپنے جذبات اور جسم کو کسی بھی مرد کے لیے مخصوص کرنا چاہتی ہے تو اس کے باپ، بھائی، خاوند، بیٹے، یا خاندان کو اس کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے کا حق کس نے دیا ہے اور انہیں آخر اس سے کیوں تکلیف ہوتی ہے؟

یہ دراصل دو الگ الگ فلسفے اور دو متضاد کلچر ہیں جو آپس میں ٹکرا رہے ہیں اور دنیا چونکہ دن بدن آپس میں قریب تر ہوتی جا رہی ہے اور فاصلے سمٹ رہے ہیں اس لیے یہ ٹکراؤ بھی روز بروز واضح تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس پس منظر میں جب مغربی ملکوں کی سرپرستی اور بین الاقوامی اداروں کے مالی تعاون کے ساتھ پاکستان کی این جی اوز ''غیرت کے نام پر قتل'' کے خلاف سڑکوں پر مظاہروں کا اہتمام کرتی نظر آتی ہیں تو اس مہم کے مقاصد و اہداف کو

سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا۔ عورت کے حوالہ سے ”غیرت“ کا اسلامی مفہوم کیا ہے، اس کے بارے میں بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہے مگر یہ کالم زیادہ تفصیلات کا متحمل نہیں ہے اس لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات کی روشنی میں کچھ اصولی باتوں کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

• پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے مردوں اور عورتوں دونوں کو کھلے لفظوں میں ”خفیہ مراسم“ سے منع کیا ہے اور ولا متخذات اخدان اور ولا متخذی اخدان کے تحت ان خفیہ مراسم کو حرام کاری قرار دیا ہے۔

• دوسری بات یہ ہے کہ میاں بیوی کے باہمی حقوق بیان کرتے ہوئے جناب رسول اللہؐ نے عورت کے ذمہ خاوند کے اس حق کی صراحت کی ہے کہ وہ اس کی غیر حاضری میں اپنے نفس اور اس کے مال میں اس سے خیانت نہ کرے، اور خاوند جس شخص کا گھر میں آنا پسند نہیں کرتا اسے گھر میں نہ آنے دے۔ اس سلسلہ میں خود حضورؐ کا ایک واقعہ احادیث میں آتا ہے کہ آپؐ اپنی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے پاس آئے تو ان کے حجرے میں ایک صاحب کو دیکھا۔ حضرت عائشہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کا یہ دیکھتے ہی چہرے کا رنگ متغیّر ہو گیا۔ ام المومنینؓ پوری طرح مزاج شناس تھیں اس لیے فوراً وضاحت کی کہ یارسول اللہ! یہ افلحؓ ہیں جو میرے چچا لگتے ہیں۔ حضورؐ نے انہیں پہچانا تو معمول کی کیفیت بحال ہوئی۔ اس لیے یہ بات بطور اصول معلوم ہوتی ہے کہ گھر میں کسی غیر مرد کو دیکھ کر غیرت کھانا خود جناب نبی اکرمؐ کی سنت ہے۔

• غیرت کے جذبہ کا احترام کرنا بھی آنحضرتؐ کی سنت ہے۔ حضورؐ نے اپنا ایک خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں جنت میں ایک محل دکھایا گیا جو بہت خوبصورت تھا اور جس میں حوروں اور خادموں کی ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ آپؐ نے فرشتوں سے پوچھا کہ یہ کس کا محل ہے تو انہوں نے بتایا کہ حضرت عمرؓ کا محل ہے۔ رسول اکرمؐ فرماتے ہیں کہ میرا جی چاہا کہ محل کو اندر جا کر بھی دیکھوں مگر مجھے عمرؓ کی غیرت یاد آگئی اور میں اندر جانے سے رک گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود غیرت کھانا اور دوسروں کی غیرت کا احترام کرنا یہ دونوں جذبے اسوۂ نبویؐ کا حصہ ہیں۔

• حتیٰ کہ نبی اکرمؐ نے اس غیرت کو ایمان کے تقاضوں میں شمار کیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ ’’دیوث‘‘ جنت میں نہیں جائے گا۔ اور دیوث کا معنی محدثین نے بے غیرت کیا ہے اور ہر اس شخص کو اس لقب کا مصداق ٹھہرایا ہے جو اپنے گھر میں غیر مردوں کا آزادی کے ساتھ آنا جانا دیکھے اور خاموشی سے برداشت کر لے۔

البتہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت اسلام کسی کو نہیں دیتا۔ اور ایسی کسی شکایت کی صورت میں ہر فریق کو عدالت سے رجوع کا حق دیتا ہے۔ حتیٰ کہ کسی مرد یا عورت پر چار شرعی گواہوں کی فراہمی کے بغیر بدکاری کے الزام کو مستقل جرم قرار دیا گیا ہے جسے ’’قذف‘‘ کہتے ہیں اور اس کی سزا قرآن کریم نے ۸۰ کوڑے بیان کی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص کسی مرد یا عورت پر بدکاری کا الزام لگاتا ہے اور شرعی گواہ مہیا نہیں کر پاتا تو اسے ’’قذف‘‘ کے جرم میں ۸۰ کوڑے سزا بھگتنا پڑے گی۔ جبکہ صرف خاوند کو اس سے ایک حد تک استثناء دی گئی ہے کہ اگر اس نے اپنی بیوی کو بدکاری کا مرتکب پایا ہے اور گواہ موجود نہیں ہیں تو وہ عدالت میں چار گواہوں کی جگہ چار قسمیں کھائے گا اور پانچویں قسم اس بات کی کھائے گا کہ اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کے جواب میں اگر بیوی خاموش رہی تو سزا کی مستحق قرار پائے گی اور اگر وہ انکار کرتی ہے تو اسے بھی اسی طرح کی پانچ قسمیں عدالت کے روبرو کھانا پڑیں گی جس کے بعد ان میں تفریق ہو جائے گی اور وہ آپس میں میاں بیوی نہیں رہیں گے۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں ’’لعان‘‘ کہتے ہیں اور اس کا یہ حکم خود قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ جب زنا کے ثبوت کے لیے چار عینی گواہوں کو شرعاً شرط قرار دیا گیا تو انصار مدینہؓ کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ نے جناب رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی شخص کو بدکاری میں مصروف دیکھوں تو کیا میں اسے دیکھنے کے لیے چار آدمی تلاش کرتا پھروں گا؟ خدا کی قسم میں تو اسی وقت انہیں قتل کر دوں گا۔ یہ سن کر حضورؐ مسکرائے اور فرمایا کہ سعدؓ! میں تجھ سے زیادہ غیرت والا ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت والا ہے۔ اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ غیرت کا جذبہ اپنے مقام پر درست ہے مگر قانون وہی ہے جو شریعت نے بیان کیا ہے اور اسے ہاتھ میں لینے کی کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔

پھر یہ غیرت صرف مرد کا حق نہیں بلکہ عورت کا بھی اسی طرح حق ہے۔ عورت کو بھی غیرت آتی ہے اور اس کے جائز طریقہ سے اظہار کا اسے بھی حق حاصل ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات حضورؐ میرے گھر تھے، اچانک رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو آپؐ کو موجود نہ پایا۔ خیال ہوا کہ کسی دوسری بیوی کے پاس نہ چلے گئے ہوں۔ اس کیفیت میں آپؐ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی، ادھر ادھر دیکھا تو حضورؐ کو جنت البقیع کے قبرستان میں پایا جہاں وہ دعا کر رہے تھے۔ فرماتی ہیں کہ مجھے خود ہی احساس ہوا کہ میں کس خیال میں ہوں اور حضورؐ کیا کر رہے ہیں۔ اسی طرح ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرتؐ کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر دیکھا کہ آپؐ غسل کر کے تو نہیں آئے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے حق میں دوسرے کی مداخلت یا شرکت کو محسوس کرنا اور اس پر ردعمل کا اظہار بھی غیرت کہلاتا ہے۔ اور شریعت میں اس جذبہ کو نہ صرف تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کے احترام کی تلقین کی گئی ہے اور اسے قابل تعریف جذبات میں شمار کیا گیا ہے۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ حضورؐ حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں تھے کہ کسی دوسری زوجہ محترمہؓ کی طرف سے ایک برتن میں کھانے کی کوئی چیز آئی۔ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو ہاتھ مار کر اسے زمین پر گرا دیا، اس پر آپؐ نے حجرہ میں موجود دیگر افراد سے کہا کہ اٹھا کر کھا لو تمہاری ماں کو غیرت آ گئی ہے۔

اس سلسلہ میں دور نبویؐ اور دور صحابہؓ کے بیسیوں واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جو غیرت کے اسلامی جذبہ کی وضاحت کرتے ہیں اور اس کی حدود کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس لیے جہاں تک قانون کو ہاتھ میں لینے کا تعلق ہے اگر صرف اس حد تک بات کی جاتی ہے تو ہم اس کی تائید کرتے ہیں کہ قانون کو ہاتھ میں لینا کسی شہری کے لیے جائز نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی یک طرفہ بات ہوگی کیونکہ قانون کے حوالہ سے جہاں شہریوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں وہاں اسٹیٹ اور سسٹم کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قانون پر بے لاگ عملدرآمد کی ضمانت مہیا کرے ورنہ اگر ایک فریق اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہا تو قانون کا عمل دونوں ہاتھوں سے بجنے والی تالی کی بجائے ایک ہاتھ سے بجنے والا تھپڑ ہو کر رہ جائے گا۔

چنانچہ اگر عورتوں کے حقوق اور قانون کی عملداری کے نام سے چلائی جانے والی این جی اوز کی اس مہم کا مقصد ''غیرت'' کے جذبہ کی نفی کرنا اور اس کے خلاف نفرت پھیلا کر مسلم معاشرہ کو مغربی سوسائٹی کی سطح پر لانا ہے تو اسے کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اسے قبول کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی ناک کٹا شخص ناک والوں کو یہ مشورہ دینے لگے کہ دیکھو میں کتنا خوبصورت لگ رہا ہوں اس لیے میری طرح نظر آنے کے لیے تم بھی اپنی ناک کٹوا دو۔ اب مغرب والوں کو خوش کرنے کے لیے ہم اپنی ناک کٹوانے سے تو رہے!

خیر القرون میں خواتین کے علم و فضل کا اعتراف

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۶ اگست ۱۹۹۹ء)

۲۴ جولائی ۱۹۹۹ء کو جامعہ الہدیٰ ٹوتھم برطانیہ میں تقسیم اسناد و انعامات کی سالانہ تقریب تھی۔ اس تقریب میں جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کے والدین اور جامعہ کے منتظمین و معاونین شریک ہوتے ہیں۔ اس سال سولہ سال سے زائد عمر کی طالبات کی ایک کلاس ''عالمہ'' کا دو سالہ کورس مکمل کر کے فارغ ہو رہی تھی جو جامعہ سے فارغ ہونے والی پہلی کلاس ہے، اس لیے جامعہ الہدیٰ کے منتظمین اور کارکنوں کی خوشی قابل دید تھی۔ مجھے جب ابتدا میں بتایا گیا کہ ''مہمان خصوصی'' کی حیثیت سے مجھے گفتگو کرنا ہوگی تو میں نے اپنے ذہن میں گفتگو کا تانا بانا بننا شروع کر دیا اور گزشتہ سال اسی تقریب میں کی جانے والی گفتگو کے تسلسل میں چند باتوں کی ترتیب قائم کر لی۔ مگر جب خود میری ہی تجویز پر پاکستان کے بزرگ عالم دین اور ماہنامہ الرشید لاہور کے مدیر مولانا حافظ عبد الرشید ارشد کو یہ ذمہ داری منتقل ہوگئی تو گفتگو کا جو خاکہ ذہن میں ترتیب دے رکھا تھا وہ زبان پر نہ آسکا۔ لیکن اسے اگلے سال تک ملتوی رکھنے کی بجائے ان معروضات کی صورت میں پیش کر دینے کو زیادہ مناسب خیال کر رہا ہوں۔

گزشتہ سال اس تقریب میں مسلم خواتین کو دی جانے والی تعلیم کی حدود اور دائرے کے سوال پر عرض کیا تھا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سلسلہ میں کامل ترین اسوہ اور معیار ہیں۔ کیونکہ وہ نو سال کی عمر میں حرم نبویؐ میں آئیں، اٹھارہ برس کی عمر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رہیں، اور پھر کم و بیش نصف صدی تک انہوں نے تعلیم و تدریس اور امت کی رہنمائی میں ہی باقی زندگی گزار دی۔ ان کے معاصرین جن علوم

میں ان کی خصوصی مہارت کا اعتراف کرتے ہیں ان کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ ہے۔ ان میں قرآن کریم کی تفسیر، حدیث و سنت، شعرو ادب، اور طب و علاج بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علوم انہوں نے جناب نبی اکرمؐ کے گھر میں ہی حاصل کیے، اس لیے مسلمان طالبات کے لیے تعلیم کا دائرہ و نصاب بھی اسی کی روشنی میں طے ہونا چاہیے۔

اس کے بعد اسی تسلسل میں خیر القرون یعنی صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ کے دور کے چند واقعات عرض کرنا چاہتا ہوں جن سے علم و فضل میں مسلم خواتین کی پیش رفت بلکہ برتری کا اظہار ہوتا ہے، اور اس زمانے میں اس کا پوری طرح اعتراف کیا گیا ہے۔

تفسیر ابن کثیرؒ میں مذکور ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ایک بار مسجد نبویؐ میں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اعلان کیا کہ بعض لوگوں نے نکاح میں مہر کے لیے بڑی بڑی رقمیں مقرر کرنا شروع کر دی ہیں جس سے مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ اس لیے وہ یہ پابندی عائد کر رہے ہیں کہ کوئی شخص نکاح میں چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کرے۔ حضرت عمرؓ خطبہ ارشاد فرما کر باہر تشریف لائے تو ایک قریشی خاتون نے انہیں روک لیا اور کہا کہ عورتوں کو خاوندوں کی طرف سے دی جانے والی رقوم کو قرآن کریم (سورۃ النساء آیت ۲۰) میں ''قنطار'' سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا معنی ڈھیر ہے۔ اور جب قرآن کریم ہمیں ڈھیروں دلواتا ہے تو آپ کو اس پر پابندی لگانے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ واپس منبر پر تشریف لے گئے اور دوبارہ اعلان کیا کہ میرے فیصلے پر ایک عورت نے اعتراض کیا ہے جو درست ہے اور وہ قرآن کریم کے مفہوم کو مجھ سے زیادہ بہتر سمجھی ہے اس لیے میں اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔

تابعین میں حضرت سعید بن المسیبؒ معروف بزرگ ہیں جنہیں ''افقہ التابعین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق حضرت حسن بصریؒ جیسے بزرگ بھی مشکل مسائل میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے شاگردوں میں سے ایک ذہین شخص سے کر دیا۔ شادی کے بعد شب عروسی گزار کر صبح جب وہ صاحب گھر سے نکلنے لگے تو نئی نویلی دلہن نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ جواب دیا کہ استاد محترم حضرت سعید بن المسیبؒ کی مجلس میں حصول علم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے جا رہا ہوں۔ اس خاتون نے جواب دیا کہ اس کے لیے وہاں

جانے کی ضرورت نہیں ہے، ابا جان کا سارا علم میرے پاس ہے اور وہ میں ہی آپ کو سنا دوں گی۔

امام مالک بن انسؒ اہل سنت کے چار بڑے اماموں میں سے ہیں۔ امام اہل سنت اور امام مدینہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں اور اتباع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ قاضی عیاضؒ نے ''ترتیب المدارک'' میں لکھا ہے کہ حضرت امام مالکؒ جب حدیث پڑھانے بیٹھتے تو ان کی بیٹی بھی دروازے کے پیچھے بیٹھتی تھی۔ امام مالکؒ کے سامنے شاگردوں کا ایک بڑا ہجوم ہوتا تھا، ان میں سے کوئی صاحب احادیث سناتے تو حضرت امام مالکؒ سن کر تصدیق فرما دیتے یا ضرورت ہوتی تو اصلاح کر دیتے اور معنی و مفہوم بیان فرما دیتے۔ ان کی دختر نیک اختر دروازے کے پیچھے بیٹھ کر یہ سب سنتی تھیں اور اگر حدیث پڑھنے والا کہیں غلطی کرتا تو وہ دروازہ کھٹکھٹا دیتیں جس پر امام مالکؒ پڑھنے والے کو ٹوک دیتے کہ تم نے کہیں غلطی کی ہے۔ چنانچہ اسے دوبارہ چیک کیا جاتا تو کہیں نہ کہیں غلطی ضرور نکل آتی۔ قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں کہ بیٹی کا حال یہ تھا جبکہ امام مالکؒ کا بیٹا جس کا نام محمد تھا ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہتا اور لاپروائی کے ساتھ سامنے سے گزر جاتا۔ اس پر امام مالکؒ نے کئی بار شاگردوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ خدا کی شان دیکھو، وہ میری بیٹی ہے اور یہ میرا بیٹا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ اس بیٹے کو دیکھ کر بات سمجھ میں آتی ہے کہ علم وراثت میں منتقل نہیں ہوتا۔

امام شافعیؒ بھی اہل سنت کے بڑے اماموں میں سے ہیں اور ان کے پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہے۔ امام تاج الدین السبکیؒ نے ''طبقات الشافعیۃ الکبری'' میں حضرت امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انہیں کسی مقدمہ میں گواہ کے طور پر قاضی کی عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ اصول کے مطابق ان کے ساتھ ایک اور خاتون بھی گواہ تھیں کیونکہ قرآن کریم نے بعض معاملات میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر قرار دیا ہے۔ قاضی نے دونوں کی گواہی سنی اور جرح کے لیے دونوں کو الگ الگ کرنا چاہا تاکہ وہ گواہی میں ایک دوسرے کی معاونت نہ کر سکیں۔ امام شافعیؒ کی والدہ محترم نے اس موقع پر قاضی کو ٹوک دیا کہ وہ دو خاتون گواہوں کو ایک ہی معاملہ میں گواہی دیتے ہوئے الگ الگ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ قرآن کریم (سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲) میں دو عورتوں کی گواہی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر ایک بھول جائے تو

دوسری اسے یاد دلا سکے۔ اس لیے دونوں کو الگ الگ کر کے گواہی لینا قرآن کریم کی منشا کے خلاف ہے۔ چنانچہ قاضی کو ان کا موقف تسلیم کرنا پڑا۔

یہ چند واقعات خیر القرون کے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت مسلمہ کے خیر القرون یعنی مثالی اور آئیڈیل دور میں عورت کو علم و فضل میں کیا مقام حاصل تھا۔ اور وہ نہ صرف علم میں مردوں سے آگے بڑھ کر اپنی برتری کا اظہار کر سکتی تھی بلکہ اس کے علم و فضل اور برتری کا کھلے بندوں اعتراف بھی کیا جاتا تھا۔

متعہ اور پاکستان لاء کمیشن

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۷ جون ۱۹۹۹ء)

پاکستان لاء کمیشن کی تجاویز و سفارشات میں سے ایک سفارش یعنی چائلڈ لیبر کی کم از کم عمر ا ۵ سال مقرر کرنے کے بارے میں گزشتہ مضمون میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں۔ آج کی صحبت میں کمیشن کی ایک اور تجویز کے حوالہ سے کچھ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے جو ''متعہ'' کے بارے میں ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ طلاق یافتہ عورت کو متعہ کا حق دینے کے سلسلہ میں مختلف فقہی مکاتب فکر کی آرا کا جائزہ لیا جائے اور اس کو عملی شکل دینے کے بارے میں غور کیا جائے۔

''متعہ'' کا لفظی معنی فائدہ اٹھانے کے ہیں اور قرآن کریم میں احکام کے باب میں یہ لفظ جن الگ الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے انہیں فقہاء کرام نے متعۃ الحج، متعۃ النکاح اور متعۃ الطلاق کی تین اصطلاحات کی صورت میں پیش کیا ہے۔

متعۃ الحج

متعۃ الحج کا معنی ہے کہ ایک شخص حج کے مہینے شروع ہونے یعنی یکم شوال کے بعد مکہ مکرمہ پہنچا اور عمرہ ادا کر کے احرام کھول دیا۔ پھر اسی سفر میں اس نے نئے احرام کے ساتھ حج کیا تو وہ شخص متمتّع کہلائے گا۔ کیونکہ اس نے ایک سفر میں حج کے ساتھ ساتھ عمرہ کا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ لیکن اگر عمرہ کا احرام کھولے بغیر اسی احرام میں حج بھی کر لیا تو وہ شخص قارن کہلائے گا۔ ''تمتع'' اور ''قران'' دونوں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمتع میں عمرہ الگ احرام سے ہوتا ہے اور ایام حج میں الگ احرام باندھا

جاتا ہے، جبکہ قران میں عمرہ اور حج ایک ہی احرام کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں شکرانے کا ایک دم واجب ہوتا ہے جسے دم تمتع اور دم قران کہتے ہیں۔ یعنی قربانی کے دن منی میں ایک جانور ذبح کرنا ہوتا ہے جو تمتع یا قران کے شکرانے کی نیت سے ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ جانور ذبح کیے بغیر حاجی احرام کی پابندیوں سے فارغ نہیں ہوتا۔

ہمارے حاجی صاحبان کی غالب اکثریت ایسی ہے جو مسئلہ سے بے خبر ہونے کی وجہ سے منی میں قربانی کی نیت سے جانور ذبح کرتے ہیں لیکن تمتع یا قران کرنے کے باوجود اس کے شکرانے کے طور پر جانور قربان نہیں کرتے۔ اس لیے وہ احرام کی شرعی پابندیوں سے فارغ نہیں ہوتے اور گناہگار ہوتے ہیں۔ جبکہ قربانی الگ چیز ہے اور تمتع یا قران کا دم اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔

متعۃ النکاح

متعۃ النکاح متعیّن وقت کے لیے کیا جاتا ہے اور یہ جاہلیت کے زمانے میں رائج نکاح کی مختلف صورتوں میں سے ایک ہے۔ معروف محقق السید سابق نے ''فقہ السنۃ'' میں دور جاہلیت میں مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کی جائز سمجھی جانے والی جو صورتیں بیان کی ہیں وہ مندرجہ ذیل آٹھ شکلیں بنتی ہیں:

1. کسی مرد کے کسی عورت کے ساتھ خفیہ تعلقات جاہلی سوسائٹی میں جائز تصور ہوتے تھے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ مرد اور عورت کے تعلقات کا اظہار بری بات ہے، اگر یہ تعلقات خفیہ ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس صورت کو قرآن کریم نے ''متخذات اخدان'' سے تعبیر کیا ہے۔
2. کوئی بھی دو مرد آپس میں بیویوں کا تبادلہ کر سکتے تھے اور یہ اس معاشرہ میں جائز سمجھا جاتا تھا۔
3. دس سے کم افراد ایک عورت کے ساتھ باری باری جنسی تعلق قائم کرتے تھے۔ اور اگر بچہ پیدا ہوتا تو وہ عورت ان سب کو جمع کر کے بچہ ان میں سے کسی ایک سے منسوب کر دیتی تھی اور اس شخص کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔
4. بعض عورتیں اپنے دروازے پر خاص قسم کا پرچم گاڑ دیتی تھیں جو اس بات کی علامت ہوتا تھا کہ کوئی بھی شخص جنسی بھوک مٹانے کے لیے وہاں آ سکتا

ہے، چنانچہ لوگ آتے رہتے تھے۔ اور اگر بچہ پیدا ہو جاتا تو اس دوران آنے والے افراد کو جمع کیا جاتا تھا اور قیافہ و علامات کے ذریعہ باپ کا تعین کر کے بچے کی ذمہ داری اسے سونپ دی جاتی تھی۔

5. کسی خاص قبیلہ، سردار، یا بہادر شخص کا تخم حاصل کرنے کے لیے خاوند خود اپنی بیوی کو متعیّنہ وقت کے لیے اس کے پاس بھیج دیتا تھا جو حمل ٹھہرنے کے بعد واپس آجاتی تھی اور ایسے بچے پر فخر کیا جاتا تھا۔

6. متعیّنہ وقت یعنی چند گھنٹوں، دنوں، مہینوں یا سالوں کے لیے باقاعدہ نکاح کیا جاتا تھا جو مقررہ وقت ختم ہونے پر خود بخود ختم ہو جاتا تھا۔ اسے نکاح متعہ کہتے ہیں۔

7. مرد اور عورت کا عمر بھر کے لیے کسی وقت کی تحدید کے بغیر نکاح ہوتا تھا جو آج بھی شرعی نکاح کے طور پر رائج ہے۔

8. بیوی کے علاوہ مملوکہ لونڈی کے ساتھ جنسی تعلق کی بھی اجازت تھی۔

یہ سب صورتیں دور جاہلیت کے عرف اور سوسائٹی میں مرد و عورت کے جنسی تعلق کی جائز صورتیں شمار ہوتی تھیں۔ ان میں سے دو صورتوں کو قرآن کریم نے باقی رکھا اور باقی تمام شکلوں کو ممنوع قرار دے دیا۔ چنانچہ سورۃ المومنون کی آیات نمبر ۶،۵ اور ۷ میں اہل ایمان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ:

”وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے بارے میں ان پر کچھ ملامت نہیں ہے۔ البتہ ان کے علاوہ جس نے کسی اور عورت کا قصد کیا تو ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔“

گویا اپنی بیوی اور لونڈی کے علاوہ کسی عورت سے جنسی تعلق کی باقی تمام صورتوں کو قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا اور شریعت کی نظر میں وہ حرام کاری کی صورتیں شمار ہوتی ہیں۔ لونڈی کے بارے میں شرعی حکم اور آج کے دور میں اس کے امکانات کے حوالہ سے کسی مستقل مضمون میں گزارشات پیش کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالی۔

البتہ باقاعدہ بیوی اور نکاح کے بارے میں اہل سنت اور اہل تشیع کے ایک بنیادی اختلاف کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ نکاح کی جس شکل کو قرآن کریم نے جائز قرار دے کر باقی رکھا ہے اس میں ”نکاح متعہ“ یعنی متعیّنہ وقت کے لیے کیا جانے والا نکاح شامل ہے یا نہیں؟

اہل سنت کے نزدیک "متعہ" نکاح کی جائز صورت نہیں ہے اور مستند روایات کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے غزوۂ خیبر کے موقع پر اسے ممنوع قرار دے دیا تھا اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ چنانچہ وقت مقرر کر کے کیا جانے والا نکاح اہل سنت کے ہاں زنا شمار ہوتا ہے۔

جبکہ اہل تشیع کا موقف یہ ہے کہ "متعہ" کا جواز اب بھی موجود ہے اور اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ وہ قرآن کریم میں جائز قرار دی جانے والی بیوی میں متعہ والی عورت کو بھی شمار سمجھتے ہیں۔

متعۃ الطلاق

متعۃ الطلاق کا مطلب یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق ہو جائے اسے اس کا خاوند اپنی حیثیت کے مطابق لباس کا ایک جوڑا دے۔ یہ بھی فقہی اصطلاح میں متعہ کہلاتا ہے۔ طلاق یافتہ عورت کو لباس کا جوڑا دینا احناف کے ہاں ایک صورت میں واجب ہے جب کہ نکاح میں مہر کا تعین نہیں ہوا اور میاں بیوی کے ملاپ سے پہلے طلاق ہوگئی۔ ایسی صورت میں چونکہ مہر واجب نہیں ہے تو اس کے بدل کے طور پر ایک جوڑا خاوند کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اپنی طلاق یافتہ بیوی کو ایک جوڑا دے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۶ میں ہے کہ:

> "تم پر کوئی حرج نہیں کہ اگر تم عورت کو چھونے سے پہلے یا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دو اور ان کو متعہ (یعنی لباس کا جوڑا) دو۔ خوشحال شخص پر اس کے حساب سے اور تنگ دست پر اس کے حساب سے ہے۔"

مگر اس ایک صورت کے سوا باقی تمام صورتوں میں جن میں مہر مکمل یا نصف واجب ہوتا ہے، احناف کے نزدیک یہ متعہ واجب نہیں ہے۔ البتہ مستحب ہے کہ خاوند اگر مہر کے ساتھ جوڑا بھی دے دے تو زیادہ بہتر ہے۔ مگر باقی فقہاء کے نزدیک طلاق کی تمام صورتوں میں متعہ دینا واجب ہے۔

پاکستان لاء کمیشن کی تجویز

یہ متعہ کی تین الگ الگ صورتیں ہیں جو ہم نے فقہی اصطلاحات کی روشنی میں بیان کی ہیں۔ اب پاکستان لاء کمیشن کی تجویز پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے۔ متعۃ الحج تو اس کے

موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے باقی دو صورتوں یعنی متعۃ النکاح اور متعۃ الطلاق میں سے ہی کسی ایک پر اس تجویز کو محمول کیا جاسکتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ پاکستان لاء کمیشن کی مراد اس سے متعۃ النکاح ہو کیونکہ یہ ایک نئے فتنے کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہو گا۔

اولا اس لیے کہ پاکستان اہل سنت کی غالب اکثریت کا ملک ہے اور اہل سنت کے تمام فقہی مذاہب کے نزدیک نکاح متعہ قطعی طور پر حرام ہے۔

ثانیا اس لیے کہ اگرچہ اہل تشیع اس کے جواز کے قائل ہیں مگر اس کے تلخ نتائج ان کی قیادت کی نظر سے بھی مخفی نہیں ہیں۔ چنانچہ آیت اللہ خمینی نے ایران میں بر سر اقتدار آنے کے بعد متعہ کی بعض صورتوں کو ممنوع قرار دے دیا تھا، ان کے بعد جناب رفسنجانی نے دوبارہ ان میں لچک پیدا کی ہے۔ حتی کہ ۱۹۸۷ء میں ایران کے دورے کے موقع پر ایک وفد کے ہمراہ راقم الحروف نے مشہد میں جناب آیت اللہ شیرازی کا جمعہ کا خطبہ خود سنا جس میں انہوں نے متعہ پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اصولا یہ جائز ہے مگر جس طرح لونڈی کی شرعی شرائط آج کے دور میں نہیں پائی جاتیں اسی طرح متعہ کی سب شرائط بھی آج کے دور میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے آج عملا متعہ کی اجازت نہیں ہے۔

اور ثالثا اگر آج کے ماحول میں تھوڑے سے معاوضہ پر مقرر وقت کے لیے کسی عورت کے ساتھ جنسی تعلق کا جواز قانونا فراہم کر دیا جائے تو حرام کاری اور زنا کے بہت سے دروازے خود بخود کھل جائیں گے۔ اور اس کے رسیا لوگوں کو اور کسی ''شیلٹر'' کی تلاش کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

ہاں اگر پاکستان لاء کمیشن کی متعہ سے مراد طلاق یافتہ عورت کو خاوند کی طرف سے دیا جانے والا لباس کا جوڑا ہے تو پھر بات الگ ہے، جبکہ تجویز کے سیاق و سباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مسلمہ فقہی اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے غور و فکر کی گنجائش موجود ہے۔ فقہائے احناف ہر طلاق یافتہ عورت کو یہ جوڑا دینے کے استحباب کے تو پہلے ہی قائل ہیں۔ اگر کسی اجتماعی اور عمومی مصلحت کی خاطر اس استحباب کو وجوب کا درجہ دے دیا جائے تو شاید انہیں بھی اس پر کوئی خاص اعتراض نہ ہو۔

قرآن کریم کا معجزہ

(مرکزی جامع مسجد، فنس بری پارک، لندن - ۴ جون ۱۹۹۹ء)

(شمالی لندن کی مرکزی جامع مسجد (فنس بری پارک) میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ میں نے سورۃ العنکبوت کی دو آیات تلاوت کی ہیں جو اکیسویں پارے کے پہلے رکوع کی آخری آیتیں ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے ایک سوال کا جواب دیا ہے۔ مشرکین مکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اکثر و بیشتر نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرمؐ کو سینکڑوں معجزات عطا فرمائے ہیں جن میں سے بعض معجزات ایسے ہیں جو مشرکین کی فرمائش پر دیے گئے اور ایسے معجزات بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی فرمائش کے بغیر اپنی حکمت سے عطا فرمائے:

• سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک کافر نے بند مٹھی آنحضرتؐ کے سامنے کر کے کہا کہ اگر آپ یہ بتا دیں کہ اس بند مٹھی میں کیا ہے تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ خود بتا دیں تو؟ اس نے کہا کہ یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ چنانچہ اس کی مٹھی میں جو کنکریاں تھیں وہ نبی کریمؐ کے ارشاد پر خود بول اٹھیں اور بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھا۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا جو ایک کافر کی فرمائش پر ظاہر ہوا۔

• اسی طرح شق قمر کا معجزہ ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک رات مطلع صاف تھا، چاند مکمل تھا اور جناب رسول اکرمؐ چاند کی روشنی میں کھلے آسمان تلے تشریف فرما تھے۔ مکہ کے چند سرکردہ حضرات آئے اور کہا کہ ہم آپ پر ایمان لانے کے لیے تیار ہیں مگر شرط یہ ہے کہ یہ چاند آپ کی سچائی کی گواہی دینے کے لیے دو ٹکڑے ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالی کہ آپ اشارہ کریں، آپؐ نے انگشت شہادت سے اشارہ کیا تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ اب وہ کافر سردار ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، آنکھیں مل رہے تھے اور بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ رہے تھے، مگر ایمان مقدر میں نہیں تھا اس لیے جب یہ یقین ہو گیا کہ چاند واقعی دو ٹکڑے ہے جو صاف نظر آ رہا ہے تو کہنے لگے کہ بڑے بڑے جادوگر دیکھے ہیں مگر کسی کا جادو

آسمان پر نہیں چلتا اور یہ تو اتنا بڑا جادوگر ہے کہ اس کا جادو آسمان پر بھی چلتا ہے۔

تو اللہ رب العزت نے جناب رسول اکرمؐ کو کفار مکہ کی فرمائش پر بھی متعدّد معجزات عطا فرمائے مگر اس کے باوجود ان کے مطالبات کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور طرح طرح کے معجزات کی فرمائش کرتے رہتے تھے جن میں سے بعض فرمائشوں کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی ہے:

- مثلاً ایک بار انہوں نے تقاضا کیا کہ اللہ تعالی خود ہمارے سامنے آکر آپؐ کی نبوت کی شہادت دے یا کم از کم اللہ تعالی کے فرشتے آکر ہمیں بتائیں کہ یہ اللہ تعالی کے نبی ہیں۔
- ایک موقع پر یہ تقاضا کیا کہ اگر آپ رسول خدا ہیں تو آپ کے آگے آگے فرشتوں کو ہونا چاہیے جو پروٹوکول کی ڈیوٹی دیں اور لوگوں کو خبردار کریں کہ اللہ کے نبی آرہے ہیں۔
- ایک تقاضا یہ تھا کہ اگر آپ واقعی اللہ تعالی کے رسول ہیں تو مکہ مکرمہ میں آپ کا سونے کا محل ہونا چاہیے، انگور اور کھجور کا باغ ہونا چاہیے اور نہریں اور چشمے ہونے چاہئیں تاکہ لوگوں کو دور سے پتہ چلے کہ یہ پیغمبر کا ڈیرہ ہے۔
- اسی طرح کفار مکہ کی ایک یہ فرمائش بھی قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ آپ یہ کتاب جو تھوڑی تھوڑی کرکے ہمیں سناتے ہیں اسے ہم نہیں مانتے۔ ہم تو اس کتاب کو مانیں گے کہ آپ ہمارے سامنے خالی ہاتھ آسمان کی طرف چڑھ جائیں اور پھر وہاں سے واپس آئیں تو آپ کے ہاتھ میں کتاب ہو، اس کتاب پر ہم ایمان لائیں گے۔

الغرض اس طرح کے بے تکے سوالات اور تقاضے مشرکین مکہ آنحضرتؐ سے کرتے رہتے تھے۔ سورۃ العنکبوت کی جو آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں ان میں اللہ تعالی نے مشرکین کے انہی سوالات کا جواب دیتے ہوئے دو باتیں فرمائی ہیں۔ پہلے مشرکین کا سوال نقل کیا ہے کہ "وہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت محمد پر ان کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اترتیں؟" اگرچہ نشانیاں تو بہت سی نازل ہوئیں جو مشرکین نے بھی دیکھیں مگر ان کا مطلب تھا کہ جو نشانیاں ہم کہتے ہیں وہ کیوں پوری نہیں ہوتیں؟ اس کے

جواب میں اللہ تعالی نے پہلی بات یہ فرمائی کہ ”قل انما الآیات عند اللہ“ اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ تعالی کے پاس ہیں۔ یعنی نشانیاں اور معجزات دینا اس کے اختیار میں ہے اور اس کی حکمت بھی وہی جانتا ہے کہ کون سی نشانیاں دینی ہیں اور کونسی نہیں، میرا کام نشانیاں پیش کرنا نہیں اور نہ ہی یہ میری ڈیوٹی میں شامل ہے۔ ”انما انا نذیر مبین“ میری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤں اور اس کے احکام کو کھول کر بیان کردوں۔ نشانیاں اور معجزات دینا اللہ تعالی کا کام ہے، چاہے دے اور چاہے نہ دے اور اس کی حکمت بھی وہی جانتا ہے۔

اب آپ خود غور کر لیجئے کہ چاند کا دو ٹکڑے کرنا بھی کفار مکہ کا مطالبہ تھا اور مکہ مکرمہ میں سونے کا ایک محل بھی انہی کا تقاضا تھا۔ اللہ تعالی نے آسمان کا چاند دو ٹکڑے کر دیا مگر مکہ مکرمہ میں سونے کا محل نہیں دیا حالانکہ ہمارے حساب سے وہ اس سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے، اگرچہ اللہ تعالی کے لیے نہ وہ مشکل ہے اور نہ یہ مشکل ہے۔ اگر اللہ تعالی مکہ مکرمہ میں سونے کا ایک محل بنا دیتے تو کون سی مشکل بات تھی مگر ایسا نہیں کیا اور اسی میں حکمت تھی۔ اللہ تعالی کے ہر کام میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں، کوئی حکمت ہماری سمجھ میں بھی آجاتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ اللہ تعالی کے ہر فیصلہ کی ہر حکمت ہم سمجھ جائیں، البتہ یہ ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالی کا کوئی حکم یا کام حکمتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ حوالہ اس وقت ذہن میں نہیں ہے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حوالہ سے کسی جگہ پڑھا تھا کہ مکہ مکرمہ میں جناب نبی اکرمؐ کو سونے کا محل نہ دینے کی ایک حکمت ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے کہ اگر یہ سونے کا محل بن جاتا تو قیامت تک کے لیے مخالفین کو ایک ہتھیار مل جاتا کہ جتنے لوگ بھی آنحضرتؐ پر ایمان لائے وہ ان کی سچائی اور اسلام کی حقانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ سونے کا محل دیکھ کر ایمان لائے تھے۔ اس لیے اللہ تعالی نے آسمان کا چاند تو مشرکین مکہ کی فرمائش پر دو ٹکڑے کر دیا مگر مکہ مکرمہ میں سونے کا ایک محل بنا کر نہیں دیا۔

مکہ مکرمہ کے کفار کے اس سوال کے جواب میں دوسری بات اللہ تعالی نے یہ فرمائی کہ ”کیا ان کو یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری ہے جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اس کتاب میں رحمت اور نصیحت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔“ گویا اللہ رب العزت نے یہ فرمایا کہ قرآن کریم جیسے عظیم معجزے اور نشانی کے بعد یہ اور کس معجزہ کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ایک بہت بڑی بات سامنے آجانے کے بعد چھوٹی چھوٹی

باتوں کے پیچھے پڑنا عجیب سا لگتا ہے اور بے وقوفی معلوم ہوتی ہے اور قرآن کریم میں سوال کے انداز میں مشرکین کی اسی بے وقوفی کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم جناب رسول اکرمؐ کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ ہے اور قیامت تک زندہ رہنے والا معجزہ ہے۔ باقی بہت سے معجزے وقتی تھے جن پر ہمارا ایمان ہے۔ مثلاً ہم نے چاند کو دو ٹکڑے نہیں دیکھا مگر ہمارا اس پر ایمان ہے، یا ہم میں سے کسی نے آپؐ کی مبارک انگلیوں سے پانی کا چشمہ پھوٹتے نہیں دیکھا مگر ہمارا ایمان ہے، ہم نے آپؐ کی برکت سے چند افراد کا کھانا سینکڑوں حضرات کو سیر ہو کر کھاتے نہیں دیکھا مگر ہمارا ایمان ہے۔ اسی طرح اور معجزات ہیں جو ہم نے دیکھے نہیں مگر ان میں سے جو بھی صحیح روایات کے ساتھ ثابت ہیں ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ قرآن کریم ایک ایسا معجزہ ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، قرآن کریم کو دیکھ بھی رہے ہیں اور اس کے اعجاز کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں اور قیامت تک لوگ اس زندہ معجزہ کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہیں گے۔

قرآن کریم کا ایک اعجاز ہے کہ یہ سینوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور پھر محفوظ رہتا بھی ہے۔ دنیا میں صرف یہی ایک کتاب ہے جس کے حافظ لاکھوں کی تعداد میں دنیا میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے جس کا ذکر خود قرآن کریم نے سورۃ العنکبوت کی مذکورہ آیات سے کچھ پہلے کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کی آیات اہل علم کے سینوں میں محفوظ رہتی ہیں ”فی صدور الذین اوتوا العلم“۔ اس پر حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی اصل جگہ سینہ ہے جبکہ کتابت امر زائد ہے۔ یعنی قرآن کریم کا اصل مقام یہ ہے کہ اسے سینے میں محفوظ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے اسے دوسرے اسباب سے بے نیاز کر دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو بے نیاز ذات ہے اس لیے اس کا کلام بھی بے نیاز ہے اور ظاہری اسباب کا محتاج نہیں۔ آج دنیا میں کاغذ، قلم، سیاہی، ڈسک، کیسٹ، سی ڈی اور اس طرح کے اسباب ختم ہو جائیں اور ان کا وجود باقی نہ رہے تو دنیا کی ہر کتاب ختم ہو جائے گی، ہر تحریر اور کلام فنا ہو جائے گا مگر قرآن کریم پھر بھی موجود رہے گا جو ان اسباب سے بے نیاز ہے اور لاکھوں اہل ایمان کے سینوں میں محفوظ ہے۔

اسی طرح قرآن کریم کے اعجاز کا ایک اور پہلو بھی دیکھ لیں۔ دنیا میں لاکھوں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں مگر کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا ہے تو وہ پہلے سے مختلف ہوتا ہے،

تیسرے ایڈیشن میں اور زیادہ فرق ہو جاتا ہے۔ مگر قرآن کریم کے جو چند نسخے سب سے پہلے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں تحریر کیے گئے ان میں سے دو نسخے اصلی حالت میں آج بھی موجود ہیں۔ ایک ترکی میں ہے جو استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں ہے اور دوسرا یہاں لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ اس لندن والے نسخہ کی میں نے بھی زیارت کی ہے جس کے آخر میں لکھا ہے ”کتبہ عثمان بن عفان“ کہ اس قرآن کریم کو حضرت عثمانؓ نے لکھا ہے۔ اس پر بعض عثمانی، صفوی اور مغل حکمرانوں کی مہریں بھی ہیں جن کے پاس باری باری یہ قرآن کریم رہا ہے اور پھر مغل دور کے اختتام پر انگریزوں نے وہاں سے لندن منتقل کر دیا تھا۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ چودہ سو سال قبل لکھے جانے والے اصل نسخے موجود ہیں اور آج مراکش سے انڈونیشیا تک کسی مسلم مطبع کا چھپا ہوا قرآن کریم لے کر تقابل کر لیں آپ کو (عبارت کے اعتبار سے) کوئی فرق نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے اسی اعجاز کا ذکر کر رہے ہیں اور مشرکین مکہ سے پوچھ رہے ہیں کہ اتنے بڑے معجزہ کے بعد اور کون سی نشانی مانگتے ہو؟

ان آیات کریمہ کے بارے میں ایک روایت بھی آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں جو امام سیوطیؒ نے مسند دارمی کے حوالے سے ”لباب النقول فی اسباب النزول“ میں نقل کی ہے کہ مدینہ منورہ میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ یہودی اور بت پرست بھی رہتے تھے اور مخلوط معاشرہ اور شہرداری تھی اس لیے سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے، خوشی غمی کی محفلوں میں اکٹھے ہوتے اور ایک دوسرے کی باتیں بھی سنتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ صحابہ کرامؓ یہودیوں سے پرانے دور کی اور انبیاء سابقینؑ کی کوئی بات سنتے تو آپس میں بھی اس پر بحث و گفتگو کرتے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بعض صحابہ کرامؓ کو اونٹ کے کولہے کی ایک ہڈی ملی جس پر تورات کے کچھ احکام درج تھے۔ اس زمانہ میں کاغذ عام نہیں ہوتا تھا اور زیادہ تر ہڈیاں، چوڑے پتھر، بڑے پتے اور درخت کی چھال وغیرہ لکھنے پڑھنے کے کام آتے تھے۔ اونٹ کے کولہے کی ہڈی کو اس دور کا تختہ سیاہ سمجھ لیں۔ وہ حضرات اسے اٹھا کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، خیال ہو گا کہ حضورؐ خوش ہوں گے مگر آپؐ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور مسند دارمی کی روایت کے مطابق ارشاد فرمایا کہ ”کفی بقوم ضلالۃ ان یرغبوا عما جاء بہ نبیھم الی ما جاء بہ غیرہ الی غیرھم او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم“۔ یہ روایت امام ابن جریرؒ نے تفسیر طبری میں بھی نقل کی ہے اور اس ارشاد نبویؐ

کا معنی یہ ہے کہ کسی قوم کے گمراہ ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی ہدایات وتعلیمات کی بجائے دوسروں کی تعلیمات کی طرف توجہ دینا شروع کر دے۔ اس کا محاورہ کا ترجمہ میں یوں کرتا ہوں کہ جب کوئی امت اپنے پیغمبر کی تعلیمات کے ہوتے ہوئے دوسروں کی طرف دیکھنا شروع کر دے تو اس کی گمراہی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ فرما کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی ''کیا ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپؐ پر ہم نے کتاب اتاری ہے جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، بے شک اس میں ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے''۔

گویا اس آیت کریمہ میں جہاں کافروں کے لیے یہ پیغام ہے کہ قرآن کریم کے آجانے کے بعد اور کسی نشانی اور معجزہ کا مطالبہ معقولیت کی بات نہیں ہے وہاں ہم مسلمانوں کے لیے بھی اس میں پیغام ہے کہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی سنت کے ہوتے ہوئے راہنمائی کے لیے کسی اور طرف دیکھنا گمراہی ہے۔ اور آج ہم دنیا بھر کے مسلمان اپنی حالت پر غور کریں تو یہی گمراہی ہم پر مسلط ہے کہ قرآن کریم ہمارے گھروں میں ہے، زبانوں پر ہے اور سینوں میں ہے۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وسیرت سے ہماری الماریاں بھری ہوئی ہیں مگر ہم اپنے اجتماعی معاملات میں راہنمائی کے لیے ادھر ادھر جھک مارتے پھر رہے ہیں۔ کبھی ماسکو کی طرف دیکھتے ہیں، کبھی واشنگٹن کی طرف دیکھتے ہیں، کبھی لندن کا رخ کر لیتے ہیں، کبھی بیجینگ کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی پیرس سے راہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ گمراہی ہے اور جب تک اس گمراہی سے نجات حاصل کر کے ہم قرآن وسنت کی تعلیمات پر قناعت نہیں کریں گے اور انہیں سینے سے نہیں لگائیں گے ہدایت اور کامیابی کی منزل کی طرف گامزن نہیں ہو سکیں گے۔ اللہ تعالی ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

سنی شیعہ کشیدگی۔ ظفر حسین نقوی صاحب کے خیالات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۶ مئی ۱۹۹۹ء)

جناب ظفر حسین نقوی نے عنوان بالا پر میری گزارشات کے حوالہ سے ایک بار پھر قلم اٹھایا ہے اور میری درخواست کے برعکس پھر انہی مسائل کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے جن سے میں صرف اس لیے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان مسائل پر از سر نو بحث و مباحثہ کا دروازہ کھلنے سے کشیدگی بڑھے گی اور اس کا نقصان ہو گا۔ قارئین گواہ ہیں کہ میں نے اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان مذہبی اختلافات اور پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی کا باعث بننے والے عوامل کو الگ الگ موضوعات قرار دیتے ہوئے ابتدا میں گزارش کی تھی کہ:

1. جہاں تک مذہبی اختلافات کا تعلق ہے وہ اصولی اور بنیادی ہیں ان پر مفاہمت ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ان پر بحث و مباحثہ کا کوئی فائدہ ہے۔

2. البتہ پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ کا باعث بننے والے اسباب و عوامل کا تجزیہ کرنا ضروری ہے کیونکہ ان اسباب و عوامل کو دور کیے بغیر اہل سنت اور اہل تشیع کے انتہا پسند گروہوں کے درمیان پائی جانے والی موجودہ تصادم کی کیفیت کو کنٹرول کرنا مشکل ہو گا۔

مگر نقوی صاحب محترم اس طرف آنے کو تیار نہیں اور انہوں نے سنی شیعہ کشمکش کے پاکستان کی حد تک واقعاتی پس منظر کو موضوع بحث بنانے سے صاف انکار کر دیا ہے اور ایمان بالقرآن اور امامت کے اصولی مسائل پر گفتگو کا راستہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً میں نے گزشتہ مضمون میں تہران کے ایک مذہبی اجتماع کے بینر کا حوالہ دیا تھا کہ اس کے حوالہ سے اختلافات کی اصولی حیثیت بدستور موجود ہے، مگر نقوی صاحب آیت تکمیل دین کے شان نزول کی بحث میں پڑ گئے ہیں کہ دین کی تکمیل کا اعلان کرنے والی آیت قرآنی فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی اور اہل سنت کے فلاں فلاں بزرگوں نے بھی اس شان نزول کو تسلیم کا ہے۔ حالانکہ اس ساری تگ و دو کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ شان نزول کوئی بھی ہو نتیجہ تو ایک ہی ہے جس کا اعتراف خود نقوی صاحب نے اس مضمون میں کیا ہے کہ اہل تشیع حضرت علیؓ کی امامت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر نقوی صاحب نے اس عقیدہ امامت کی وضاحت کی

کوشش بھی فرمائی ہے۔ اس بات کا ذکر میں نے سابقہ مضمون میں اشارتاً کر دیا تھا کہ اہل تشیع جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ کی امامت کے قائل ہیں جو ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصوص ہے، ان کے نزدیک امام معصوم ہوتا ہے اور اس کی مذہبی ہدایات کو اس معنی میں وحی کا درجہ حاصل ہوتا ہے کہ اسے کسی اور دلیل سے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ اہل سنت کے نزدیک وحی، معصومیت اور آسمانی ہدایات جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو چکی ہیں، آپؐ کے بعد کسی کو معصومیت کا درجہ حاصل نہیں ہے اور آپؐ کے بعد امامت نہیں بلکہ خلافت کا نظام ہے جو منصوص نہیں ہے بلکہ خلیفہ کا انتخاب امت کی صوابدید پر ہے۔ اب یہ ایک اصولی اور بنیادی اختلاف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دین کے اجتماعی نظام اور امت کے جماعتی نظم کی اصولی بنیاد کے حوالہ سے ہے۔ میں اس پر بحث نہیں کر رہا کہ ان میں سے کون سا درست ہے اور کون سا درست نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایک کے حق میں دلائل دے رہا ہوں، بلکہ صرف یہ ذکر کر رہا ہوں کہ یہ اختلاف موجود ہے اور اصولی ہے۔ خدا جانے میری یہ گزارش نقوی صاحب کے ذہن تک کیوں رسائی حاصل نہیں کر سکی اور وہ کنفیوژن کا شکار ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امامت کے حوالہ سے اصولی اختلاف کو تسلیم بھی کر رہے ہیں اور میری گزارش کی تردید بھی ضروری سمجھ رہے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم پر ایمان کا معاملہ ہے، میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اس پر اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان اصولی اختلاف ہے، اس سے زیادہ میں نے کچھ عرض نہیں کیا۔ مگر نقوی صاحب محترم اس مسئلہ میں بھی تفصیلات میں جانے پر مصر ہیں اور مناظرہ و مباحثہ کا اسلوب اختیار کر رہے ہیں۔ میں صرف اختلاف کے وجود کی بات کر رہا ہوں جبکہ وہ اس کے دلائل کی طرف دامن کھینچ رہے ہیں۔ مگر میں اب بھی اس موقف پر قائم ہوں کہ اختلافات پر مباحثہ کا فائدہ نہیں ہے اور اس سے کشیدگی کم کرنے کی بجائے اس میں اضافہ ہوگا۔

البتہ اس حوالہ سے ایک واقعہ عرض کر دیتا ہوں کہ ۱۹۸۷ء میں پاکستان کے علمائے کرام اور دانشوروں کا ایک وفد ایران کی وزارت مذہبی امور کی دعوت پر ایران گیا جس میں راقم الحروف اور مولانا منظور احمد چنیوٹی بھی تھے۔ اس گیارہ روزہ دورے کے موقع پر تہران میں ایک تقریب بطور خاص قرآن کریم کے حوالہ سے منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی

مقتدر ایرانی رہنما جناب آیت اللہ خزعلی تھے۔ تقریب میں دو بچوں نے قرآن کریم کی تلاوت کی اور مہمان خصوصی نے ہمیں ان کوششوں سے آگاہ کیا جو ایرانی حکومت ملک میں قرآن کریم کی تعلیم کے فروغ کے بارے میں کر رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ ہمارے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موجودہ قرآن کریم پر ہمارا ایمان نہیں ہے مگر یہ بات غلط ہے، ہم قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، یہ کہہ کر جناب آیت اللہ خزعلی نے جیب سے قرآن کریم کا نسخہ نکالا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر کہا ”ما ایمان داریم کہ این قرآن حق است نہ یک حرف کم نہ یک حرف زیاد“۔ یعنی ہم ایمان رکھتے ہیں کہ یہ قرآن کریم حق ہے نہ اس میں کوئی حرف کم ہے اور نہ زیادہ ہے۔ اس پر مولانا منظور احمد چنیوٹی نے سوال کیا کہ ہمیں آپ کی زبان سے یہ بات سن کر خوشی ہو رہی ہے مگر سوال یہ ہے کہ آپ کی بنیادی کتابوں میں قرآن کریم کے تحریف شدہ ہونے کے بارے میں جو روایات ہیں ان کا کیا بنے گا؟ خزعلی صاحب نے جواب دیا کہ ان روایات کے ساتھ ہم وہی سلوک کرتے ہیں جو حضرات اہل سنت امام سیوطیؒ کی بیان کردہ ان روایات کے ساتھ روا رکھتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی اتنے ہزار آیات تھیں مگر اب موجودہ قرآن کریم میں آیات کی وہ تعداد نہیں ہے۔ چنیوٹی صاحب نے اس پر کہا کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے کیونکہ امام سیوطیؒ کی روایات کا اہل سنت کے اہل علم کے ہاں وہ درجہ نہیں ہے اور وہ بھی ایک دو روایات ہیں، مگر اہل تشیع کے ہاں تو حدیث کی مرکزی کتابوں ”صحاح اربعہ“ میں دو ہزار روایات ہیں جن میں قرآن کریم کو تحریف شدہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے ان دونوں باتوں کو برابر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خزعلی صاحب نے جواب میں کہا کہ کچھ بھی ہو امام جعفر صادقؒ کا قول ہے کہ جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہو اسے دیوار پر مار دو، اس لیے ہم ان سب روایات کو دیوار پر مارتے ہیں۔ مولانا چنیوٹی نے اس کے بعد کہا کہ ہم آپ کے اس ارشاد پر بہت خوش ہیں مگر ایک نکتہ کی اور وضاحت کر دیں کہ اہل سنت کے نزدیک جو شخص قرآن کریم کو تحریف شدہ مانتا ہے وہ مسلمان نہیں ہے، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ جناب آیت اللہ خزعلی نے اس کے جواب میں مسکراہٹ آمیز خاموشی اختیار کر لی اور بات اسی پر ختم ہو گئی۔

یہ واقعہ صرف اس لیے عرض کیا ہے کہ مسائل و اختلافات کا وجود بہر حال قائم ہے اور ان پر بحث میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ضرورت ان اسباب و عوامل کی نشاندہی اور سدباب کی ہے جو پاکستان میں گزشتہ نصف صدی کے دوران کشیدگی میں اضافہ کا باعث

بنے ہیں، ان کے بارے میں لیپا پوتی سے کام لینے سے بات نہیں بنے گی، حقائق و واقعات کو تسلیم کرنا ہوگا اور کشیدگی کے عوامل کو حقیقت پسندی کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کرنا ہوگی، اس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں ہے۔

دینی مدارس اور جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۸ مئی ۱۹۹۹ء)

حاجی محمد بوستان صاحب تبلیغی جماعت کے سرکردہ حضرات میں سے ہیں اور میرپور آزاد کشمیر سے ان کا تعلق ہے۔ ایک عرصہ سے برطانیہ کے شہر شیفیلڈ میں رہائش پذیر ہیں، عالمی سطح پر تبلیغی اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں، خود عالم دین نہیں مگر علماء کی مجالس میں بیٹھتے ہیں اور دعوت و تبلیغ اور دینی تعلیم کے مسائل پر اپنی رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے میرپور آزاد کشمیر میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کر رکھی ہے جس میں دورۂ حدیث تک کے اسباق ہوتے ہیں اور وہ شیفیلڈ میں بیٹھ کر اس دینی مدرسہ کو کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ سال میں ایک دو دفعہ پاکستان آتے ہیں اور جامعہ سے متعلقہ ضروری امور کو نمٹا کر واپس چلے جاتے ہیں۔

گزشتہ دنوں حاجی صاحب نے فون پر راقم الحروف سے رابطہ کیا اور بتایا کہ وہ اس جامعہ میں طلبہ کے لیے کمپیوٹر کلاس کا اجرا کر رہے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ میں اس موقع پر میرپور آکر جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے کمپیوٹر سنٹر کے افتتاح کی رسم ادا کروں۔ اور اس کے ساتھ ہی اساتذہ، طلبہ اور دیگر شرکاء کی تقریب میں کمپیوٹر اور دیگر جدید ذرائع کی اہمیت کے عنوان پر اظہار خیال بھی کروں۔ چنانچہ ان کی دعوت پر ۹ مئی کو میرپور جانے کا اتفاق ہوا۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے ایک کشادہ کلاس روم میں کمپیوٹرز کی فراہمی کے ساتھ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اور ان کے اساتذہ کے لیے کمپیوٹر ٹریننگ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ راقم الحروف نے بٹن دبا کر اس پروگرام کا افتتاح کیا، جبکہ کمپیوٹر نے شرکاء محفل کو سورۃ الفاتحہ سنا کر اور اسکرین پر اس کی کتابت دکھا کر تقریب کا آغاز کیا۔ تقریب میں جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ شہر کے متعدّد سرکردہ حضرات بھی شریک تھے۔

حاجی بوستان صاحب نے تمہیدی گفتگو میں کہا کہ ان کی یہ خواہش ہے کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور دینی تعلیم و تربیت کے شعبہ میں ابلاغ کے جدید ترین ذرائع سے استفادہ کیا

جائے اور شرعی احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے ابلاغ کے ہر میسر ذریعہ کو استعمال میں لایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اسی مقصد کے لیے انہوں نے کمپیوٹر کلاس کا اہتمام کیا ہے تاکہ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ یہ ٹریننگ حاصل کریں اور اسے استعمال میں لانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس سنٹر میں ”انٹرنیٹ“ کی سہولت بھی فراہم کرنا چاہتے ہیں لیکن میرپور میں ٹیلی فون کا ڈیجیٹل ایکسچینج نہ ہونے کی وجہ سے سردست یہ ممکن نہیں ہے۔

راقم الحروف نے اپنی گفتگو میں جس نکتہ پر سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھا کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے ہر دور میں ابلاغ کے ہر میسر ذریعہ کو اختیار کرنا، مخاطب کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر گفتگو کرنا، اور گفتگو کے مروجہ اسلوب سے استفادہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی پیغام اور دعوت مخاطب لوگوں کے ذہنوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی۔ اور اس سلسلہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ میں ہمیں واضح راہنمائی ملتی ہے۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں آنحضرتؐ نے بت پرستی اور شرک کے خلاف آواز اٹھائی اور کلمہ توحید بلند کیا تو مخالفت کا بازار گرم ہو گیا۔ اس دوران قریش کے سرکردہ حضرات کا ایک وفد نبی اکرمؐ کے پاس آیا اور کہا کہ آپؐ جو دعوت دے رہے ہیں ہم اس کی غرض سمجھنا چاہتے ہیں کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کے جواب میں نبی اکرمؐ نے جو ارشاد فرمایا اس پر غور کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا:

> ”میں ایک کلمہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اگر تم اسے قبول کر لو تو عرب پر تمہاری حکمرانی ہوگی اور عجم بھی تمہارے تابع ہوگا۔“

یہ سردار لوگ تھے کہ قیامت، جنت اور قبر کی بات ان کی سمجھ میں آنے والی نہ تھی۔ اس لیے رسول اللہؐ نے ان کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے انہی کی زبان میں بات کی کہ ”چودھراہٹ“ قائم رکھنے بلکہ اس کا دائرہ وسیع کرنے کا راستہ بھی یہی ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔

اسی طرح غزوۂ احزاب میں جب قریش اور ان کے حلیف قبائل کو مدینہ منورہ کے محاصرہ میں ناکامی ہوئی اور انہیں بے نیل مرام واپس جانا پڑا تو رسول اکرمؐ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں فرمائیں۔ ایک تو یہ کہا کہ اب قریش کو ہم پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہیں ہوگی اور اب ہم ہی ان کی طرف جائیں گے۔ اور دوسری بات یہ فرمائی کہ قریش ہمارے خلاف ہتھیار کی جنگ میں شکست کھا چکے ہیں اس لیے اب وہ عرب قبائل میں

ہمارے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائیں گے اور ادب و شعر کی جنگ لڑیں گے۔ شعر گوئی اور خطابت اس دور کا امتیازی اسلوب تھا جس کی طرف رسول اللہؐ نے اشارہ کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ کو ترغیب دی کہ وہ اس جنگ یعنی "میڈیا وار" کے لیے بھی تیار رہیں۔

چنانچہ تین حضرات نے اس معرکہ آرائی کے لیے خود کو پیش کیا۔ (۱) حضرت حسان بن ثابتؓ (۲) حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ (۳) حضرت کعب بن مالکؓ۔ اور ان تینوں حضرات نے اس معرکہ میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ان حضرات کی باہمی تقسیم کار یہ تھی کہ ایک صاحب جناب نبی اکرمؐ کی مدح و نعت کہتے اور کافروں کے اعتراضات کا جواب دیتے، دوسرے صاحب کافروں کی ہجو و مذمت میں اشعار کہتے، جبکہ تیسرے صاحب رزمیہ شاعری کرتے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق ایسا بھی ہوتا تھا کہ مسجد نبویؐ میں منبر پر کھڑے ہو کر حضرت حسان بن ثابتؓ اشعار سناتے تو خود جناب نبی اکرمؐ سامنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ بیٹھے انہیں داد دیتے اور ان کے لیے دعا فرماتے تھے۔

یہ اس دور کا اسلوب تھا جس میں قبائل اور اقوام ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر اپنی برتری کا اظہار کرتی تھیں۔ اس لیے آنحضرتؐ نے اس اسلوب کو اختیار کرنے سے گریز نہیں کیا بلکہ اس کا بھرپور استعمال کر کے اس محاذ پر بھی قریش کو شکست دی۔

اس کے ساتھ ابلاغ کے ذرائع کو بھی دیکھ لیں کہ وہ دور مشینری کا دور نہیں تھا، ایسے آلات اس دور میں وجود میں نہیں آئے تھے، مگر اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا فطری جذبہ موجود تھا۔ چنانچہ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا خواہشمند ہر شخص اور ہر گروہ یہ جذبہ پوری طرح استعمال کرتا تھا اور جناب نبی اکرمؐ نے بھی ایسے کسی موقع سے استفادہ کرنے سے گریز نہیں کیا۔ مثلاً عکاظ کا میلہ کوئی مذہبی اجتماع نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک کلچرل فیسٹیول کی ہوتی تھی جس میں ناچ گانا بھی ہوتا تھا، شراب نوشی بھی ہوتی تھی، دنگل بھی ہوتے تھے، شعر و خطابت کے مقابلے بھی ہوتے تھے، خرید و فروخت بھی ہوتی تھی، اور عرب کی جاہلی معاشرت کا ہر اچھا اور برا پہلو اس میں نمایاں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک رسائی کا ایک ذریعہ بھی ہوتا تھا۔ اس لیے حضورؐ وہاں تشریف لے گئے اور ان سب سرگرمیوں کے باوجود وہاں آئے ہوئے مختلف قبائل کے لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس طرح کے دیگر میلوں میں بھی جناب رسالت مآبؐ تشریف لے گئے۔

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے جو ذریعہ بھی موجود ہو اس کی قباحتوں کو دیکھ کر اسے ترک نہیں کر دینا چاہیے بلکہ جس حد تک ممکن ہو اپنے مقصد اور مشن کے لیے اسے استعمال کرنا چاہیے۔

راقم الحروف نے اپنی گفتگو میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی اہمیت بھی بیان کی اور دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ سے گزارش کی کہ انہیں ان دونوں پر دسترس حاصل کرنی چاہیے۔ کیونکہ مستقبل میں ان کے بغیر تعلیم اور دعوت دونوں میدانوں میں ہم معاصر اقوام اور طبقات سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

راقم الحروف کی گفتگو کے بعد جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی کی دعا پر یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔

قرآن فہمی میں سنتِ نبویؐ کی اہمیت

(جامع مسجد دارالعلوم نعمانیہ، ڈیرہ اسماعیل خان - ۴ مئی ۱۹۹۹ء)

(۴ مئی ۱۹۹۹ء کو دارالعلوم نعمانیہ ڈیرہ اسماعیل خان کی جامع مسجد میں مولانا زاہد الراشدی نے درس قرآن دیا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ حضرت مولانا علاؤ الدین مدظلہ ہمارے محترم بزرگ ہیں، مخدوم ہیں اور مشفق ہیں۔ ان کے حکم کی تعمیل میں درس قرآن کریم کے عنوان سے گفتگو کے لیے آپ کے سامنے بیٹھ گیا ہوں، دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں، آمین۔

قرآن کریم کے درس کے حوالہ سے قرآن فہمی کے بنیادی اصولوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ غلط فہمی آج کل عام ہو رہی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی ہے اور جو شخص عربی زبان پر، گرامر پر اور لٹریچر پر عبور رکھتا ہے وہ براہ راست قرآن کریم کی جس آیت کا جو مفہوم سمجھ لے وہی درست ہے۔ یہ گمراہی ہے اور قرآن فہمی کے بنیادی تقاضوں کے منافی ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں بنیادی گزارش یہ ہے کہ قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس کی آیات کا صحیح مصداق و مفہوم معلوم کرنے کے لیے سنت نبویؐ سب سے بڑی بنیاد ہے کیونکہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہمیں قرآن کریم ملا ہے اور آپؐ نے قرآن کریم کے صرف الفاظ ہم تک نہیں پہنچائے بلکہ اس کی تعلیم بھی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جناب نبی اکرمؐ کے منصبی فرائض میں دو باتوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ ایک ''یتلوا علیہم آیاتہ'' کہ آپؐ لوگوں کو قرآن کریم کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور دوسرا ''یعلمہم الکتاب'' کہ لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ یتلوا کا تعلق الفاظ سے ہے اور یعلم کا تعلق ان الفاظ کے معنی و مفہوم سے ہے اور یہ دونوں باتیں جناب نبی اکرمؐ کے فرائض منصبی میں سے ہیں۔ اس لیے ایسا نہیں ہوا کہ نبی کریمؐ نے (نعوذ باللہ) ایک چٹھی رساں کے طور پر قرآن کریم امت کے حوالہ کر دیا ہو اور خود فارغ ہو گئے ہوں بلکہ آپؐ نے قرآن کریم کے الفاظ و آیات پڑھ کر سنانے اور انہیں امت کے حوالہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل ۲۳ برس تک ان کی تعلیم بھی دی ہے۔ اور وہی تعلیم سنت نبویؐ ہے جو قرآن کریم کی صرف تشریح و بیان ہی نہیں بلکہ اس پر ایمان کی بنیاد بھی ہے کیونکہ سنت و حدیث پر ایمان لائے بغیر قرآن کریم پر ایمان لانا ہی ممکن نہیں ہے۔

حضرت امام شافعیؒ سے ایک جملہ منسوب ہے کہ ''القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی القرآن'' یعنی سنت قرآن کریم کی اتنی محتاج نہیں ہے جتنا قرآن کریم سنت کا محتاج ہے۔ اس جملہ کا مطلب عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم متن ہے اور سنت رسولؐ اس کی شرح ہے اس لیے شرح کے بغیر متن کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے، جبکہ شرح میں متن خود بخود موجود ہوتا ہے۔ مگر میں اس جملہ کو اور مفہوم میں لیتا ہوں اور اس کی تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک جگہ گفتگو ہو رہی تھی کہ قرآن کریم کے بعد اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور حدیث و سنت چونکہ اختلافات کا ذریعہ بنتی ہے اس لیے انہیں قرآن کریم کے ساتھ لازم قرار دینا درست نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حدیث کے بغیر تو خود قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سورہ الکوثر قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورت ہے جو تین چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی شخص انکار کر دیتا ہے کہ میں سارے قرآن کو مانتا ہوں مگر اس سورت کو قرآن کریم کا حصہ نہیں مانتا تو ہمیں اس کے سامنے اس سورت کو قرآن کریم کا حصہ ثابت کرنے کے لیے کوئی اتھارٹی پیش کرنا ہوگی کہ ہم کس کے کہنے پر سورہ الکوثر کو قرآن کریم کا حصہ مان رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو براہ راست ہمیں کچھ نہیں فرمایا اور نہ ہی جبریل علیہ السلام سے ہمارا کوئی رابطہ

ہے۔ ہمارے سامنے تو اس بارے میں ایک ہی اتھارٹی ہے اور وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جنہوں نے جس جملہ اور آیت کو قرآن کریم کا حصہ قرار دیا اسے ہم نے قرآن کریم کا جزو تسلیم کر لیا۔ آپؐ کے علاوہ ہمارے پاس قرآن کریم کی آیات، سورتوں اور الفاظ کے تعین کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لیے سورہ الکوثر کے حوالہ سے بھی اتھارٹی جناب نبی کریمؐ ہی کی ذات اقدس ہے کہ چونکہ آپؐ نے سورہ الکوثر کو قرآن کریم میں شامل کیا ہے اس لیے یہ سورت کتاب اللہ کا حصہ ہے ورنہ اس سلسلہ میں اور کوئی ذریعہ اور اتھارٹی ہمیں میسر نہیں ہے۔

چنانچہ جب یہ طے ہو گیا کہ ہم نے سورہ الکوثر کو قرآن کریم کا حصہ اس لیے تسلیم کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے تو ”جناب رسول اللہؐ نے فرمایا ہے“ کے جملہ کو آپ کیا کہیں گے؟ یہ حدیث ہے اور اور آپ خود غور کر لیں کہ ہم پہلے حدیث پر ایمان لائے ہیں یا قرآن کریم پر؟ اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ رتبہ اور مقام میں قرآن کریم حدیث سے مقدم ہے مگر ایمان کی ترتیب میں حدیث قرآن کریم سے پہلے ہے۔ کیونکہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ ہو قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن ہی نہیں ہے اور امام شافعیؒ کے مذکورہ جملہ کو میں اسی مفہوم میں لیتا ہوں۔

لہذا سنت و حدیث نہ صرف قرآن کریم کی تشریح اور اس کا بیان ہے بلکہ اس پر ایمان کی بنیاد بھی ہے۔ اور قرآن کریم کے ساتھ سنت کا تعلق قول اور عمل کا تعلق ہے اور یہ بات ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ ”کان خلقہ القرآن“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات قرآن کریم تھے۔ یعنی وہ قرآن کریم جو الفاظ میں تلاوت کیا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے اسے اگر عمل و کردار اور اخلاق وعادات کی شکل میں دیکھنا چاہو تو وہ جناب نبی کریمؐ کی حیات طیبہ اور سیرت و سنت ہے۔ اسے یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے سکول اور کالج میں ایک استاد کلاس روم میں سائنس کا ایک فارمولا پڑھاتا ہے اور پھر لیبارٹری میں اسے عملی مرحلہ سے گزار کر دکھاتا ہے۔ جو کچھ اس نے کلاس روم میں پڑھایا ہے اسے تھیوری کہتے ہیں اور جس عملی تجربہ کا مظاہرہ لیبارٹری میں کیا ہے وہ پریکٹیکل کہلاتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم تھیوری ہے اور سنت نبویؐ پریکٹیکل ہے جو اسی تھیوری کی عملی شکل ہے۔

اس سے ہٹ کر ایک اور انداز میں بھی بات کو دیکھ لیں، وہ یہ کہ کسی عام شخص سے یہ سوال کریں کہ اس قرآن کریم پر نسل انسانی میں کس شخصیت نے سب سے زیادہ اور مکمل عمل کیا ہے؟ اس کے جواب میں کوئی شخص بھی جناب نبی اکرمؐ کے علاوہ کوئی اور نام نہیں لے گا اور نہ ہی لے سکتا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جس کا عمل کتاب اللہ پر سب سے زیادہ مکمل ہو گا وہی اس پر عمل میں دوسروں کے لیے نمونہ اور معیار بنے گا۔ اس لیے خود قرآن کریم نے جناب نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ کو پوری امت کے لیے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔

اس کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سنت نبویؐ کے بغیر قرآن کریم کو براہ راست سمجھنا ممکن نہیں ہے اور یہ دعوی کرنا گمراہی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے صرف عربی گرامر اور لٹریچر پر عبور کافی ہے۔ اس پر چند واقعات عرض کروں گا کہ حضرات صحابہ کرامؓ عرب تھے اور عربی ان کی مادری زبان تھی مگر بعض مواقع ایسے آئے کہ انہیں قرآن کریم کے الفاظ و احکام کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگی اور جب نبی کریمؐ نے وضاحت فرمائی تو وہ قرآن کریم کی مراد سمجھ سکے۔

حاتم طائی عرب کے مشہور سخی ہیں جن کی سخاوت کے قصے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا البتہ چونکہ وہ تاریخی روایات کے مطابق بت پرستی ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے اور آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے دنیا میں رائج الوقت حق مذہب عیسائیت ہی تھا اس لیے حاتم طائی کو اہل حق میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا بیٹا عدیؓ اور بیٹی سفانہؓ دونوں صحابی ہیں۔ عدی بن حاتمؓ کا قصہ ہے کہ جب رمضان المبارک میں سحری کا حکم نازل ہوا کہ اس وقت تک سحری میں کھا پی سکتے ہو جب تک سفید اور سیاہ دھاریاں الگ الگ ظاہر نہ ہو جائیں۔ یہاں قرآن کریم کی مراد طلوع فجر کے وقت مشرق کی جانب آسمان پر نظر آنے والی سفید روشنی اور سیاہ اندھیرے کی دھاریاں ہیں جن کا الگ الگ نظر آنا طلوع فجر کی علامت ہے اور اسی کے ساتھ سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ مگر عدی بن حاتمؓ نے یہ کیا کہ دھاگے کی سفید اور سیاہ ڈوریاں اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیں اور سحری کے وقت انہیں دیکھ کر کھاتے پیتے رہتے اور جب وہ الگ الگ دکھائی دینے لگتیں تو کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک روز جناب رسول اکرمؐ کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضورؐ مسکرائے اور فرمایا کہ ”اذا لوسادتک عریض یا عدی“ پھر تو اے عدیؓ! تیرا تکیہ بہت چوڑا ہے۔ یعنی سفید اور سیاہ دھاریوں سے

قرآن کریم نے جو مراد لیا ہے وہ اگر تیرے تکیے کے نیچے آجاتا ہے تو پھر تو تکیہ بہت چوڑا ہوگا۔ اس کے بعد آپؐ نے قرآن کریم کی مراد واضح کی تو عدی بن حاتمؓ بات سمجھے اور تکیہ کے نیچے سے دھاگے کی ڈوریاں نکال دیں۔

غور فرمائیے کہ عدی بن حاتمؓ عرب ہیں، عرب کے بیٹے ہیں، سردار ہیں اور سردار کے بیٹے ہیں مگر قرآن کریم کا بیان کردہ محاورہ سمجھنے میں غلطی لگ گئی اور اس وقت تک قرآن کریم کا مطلب نہیں سمجھ پائے جب تک خود حضورؐ نے اس کی وضاحت نہیں فرمادی۔ اس لیے اگر آج کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ محض عربی دانی کے زور پر قرآن کریم کے مفہوم و مراد کو پا سکتا ہے تو یہ بات کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک شخصی واقعہ ہے اور کسی بھی شخص کو ذاتی طور پر اس قسم کا مغالطہ ہوسکتا ہے، اس لیے اجتماعی واقعہ بھی عرض کردیتا ہوں۔ یہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ جب سورۃ الانعام کی آیت ۸۲ نازل ہوئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس نہ ہونے دیا، وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور انہی کے لیے امن ہوگا۔ یہ سن کر صحابہ کرامؓ میں بے چینی پھیل گئی، انہوں نے ظلم کا عام مفہوم سمجھا کہ لوگوں میں باہمی معاملات و حقوق اور لین دین میں جو کمی بیشی اور حق تلفی ہوجاتی ہے وہ ظلم ہے۔ بلاشبہ ظلم کا عمومی مفہوم یہی ہے مگر پریشانی اس بات پر ہوئی کہ یہ کمی بیشی تو انسانی معاشرت کا حصہ ہے اور روزمرہ معاملات میں کہیں نہ کہیں ہو ہی جاتی ہے، اس سے مکمل گریز کو اگر ایمان و نجات کے لیے شرط قرار دیا جائے تو بہت کم لوگوں کا ایمان قبولیت کے معیار پر پورا اترے گا۔ صحابہ کرامؓ کی پریشانی اس حد تک بڑھی کہ جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں کچھ حضرات پیش ہوئے اور اپنے اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ ”اینا لم یظلم یا رسول اللہ“ ہم میں سے کون ہے جس سے تھوڑی بہت زیادتی نہیں ہوجاتی؟ معصوم تو صرف پیغمبر ہیں باقی لوگ تو نہیں ہیں اور معاملات میں تھوڑی بہت کمی بیشی ہوتی ہی رہتی ہے، اس لیے ایمان وہدایت کا یہ معیار بہت سخت ہے کہ ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس بھی نہ ہو۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن کر صحابہ کرامؓ کو تسلی دی کہ یہ پریشانی بجا ہے مگر یہاں ظلم سے مراد وہ نہیں جو سمجھا جارہا ہے بلکہ اس آیت کریمہ میں ظلم سے مراد وہ ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو

وصیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یا بنی لاتشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم" بیٹا! شرک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اس پر صحابہ کرامؓ کی پریشانی دور ہوئی کہ ایمان کی قبولیت کے لیے جس ظلم سے مکمل گریز کو شرط کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہ عام ظلم نہیں بلکہ شرک ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں عام طور پر بولا جانے والا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے اور مخاطب صحابہ کرامؓ سب کے سب عرب ہیں مگر انہیں لفظ کی مراد سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اور وہ اس وقت قرآن کریم کا مقصد پا سکے ہیں جب آنحضرتؐ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے جو حافظ ابن کثیرؒ نے سورہ النساء کی آیت ۱۲۳ کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اس آیت میں ایک جملہ ہے "من یعمل سوءا یجزبہ" جس نے برائی کا کوئی کام کیا اسے ضرور بدلہ دیا جائے گا۔ یہاں "سوءا" نکرہ ہے جس میں برائی کا معمولی سا کام بھی شامل ہے۔ جب نبی کریمؐ نے یہ آیت صحابہ کرامؓ کو سنائی تو مجلس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی موجود تھے، یہ جملہ سنتے ہی ان کی حالت متغیّر ہوگئی اور چہرے کا رنگ بدل گیا حتیٰ کہ خود حضورؐ نے ان کی کیفیت کو محسوس کر کے پوچھا کہ "مالک یا ابا بکر" آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! یہ آیت سن کر میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے کیونکہ جب ہر چھوٹے بڑے کام پر قیامت کے روز گرفت ہوگی تو کون شخص وہاں کے عذاب سے بچ سکے گا؟ آنحضرتؐ نے یہ سن کر فرمایا کہ نہیں آپ نے "یجزبہ" کا معنی یہ سمجھا ہے کہ ہر عمل کا بدلہ قیامت کے روز ہی ملے گا، یہ ضروری نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی اہل ایمان کو جو تکالیف اور پریشانیاں پیش آتی ہیں وہ ان کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ بن جاتی ہیں حتیٰ کہ کسی مومن کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہے تو وہ بھی کسی گناہ کا کفارہ بن گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کی جان میں جان آئی کہ جو بات وہ سمجھے تھے وہ صحیح نہیں تھی۔

اب حضرت ابوبکرؓ نسلی عرب ہیں اور ان کی مادری زبان عربی ہے بلکہ انہیں "اعلم الصحابہؓ" کہا جاتا ہے مگر قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ کا مفہوم نہیں سمجھ پائے اور نبی کریمؐ نے وضاحت کی تو بات ان کی سمجھ میں آئی۔

بلکہ میں تو اس سے اگلی بات کرتا ہوں کہ جناب رسول اللہ کی سنت تو قرآن فہمی کی بنیاد ہے، حضرات صحابہ کرامؓ کے ارشادات و تشریحات سے بھی ہم بے نیاز نہیں رہ سکتے اور بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے ارشادات سامنے نہ ہوں تو قرآن کریم کے

ارشادات کا مصداق متعیّن کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی دو واقعات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سورۃ المائدہ کی آیت ۱۰۵ کے ضمن میں حافظ ابن کثیرؒ نے روایت نقل کی ہے، اس آیت میں اہل ایمان سے خطاب کر کے فرمایا ہے کہ ''اے ایمان والو! تم پر اپنا فکر لازم ہے، کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو تمہیں کوئی ضرر نہیں دے سکتا اگر تم خود ہدایت پر ہو''۔ ابن کثیرؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے دور خلافت میں اسی آیت کریمہ کا مفہوم و مصداق بیان کرنا پڑا جس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ کسی نے اس دور کے حالات پر یہ آیت پڑھ دی ہوگی۔ اور آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو منکرین ختم نبوت، منکرین زکوٰۃ اور دیگر مرتدین کے خلاف جس طرح محاذ آرا ہونا پڑا تھا، اس پس منظر میں کسی نے یہ آیت پڑھ دی ہو تو عام حلقوں میں اس کا کیا مطلب سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے برسرعام اس کا اعلان فرمایا کہ اس آیت کریمہ میں خطاب ہم لوگوں سے نہیں ہے بلکہ اس دور کے مسلمانوں سے ہے جب فتنے عام ہو جائیں گے اور عقائد و ایمان کے فتنوں کی اس قدر کثرت ہو جائے گی کہ ایمان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اسی زمانے کے لوگوں کے لیے یہ حکم ہے کہ جب اپنا ایمان بچانا مشکل ہو جائے تو دوسروں کی فکر کرنے کی بجائے اپنا فکر کرو اور اپنے ایمان کو بچانے کی کوشش کرو۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے دور خلافت کے حالات، ان کی جنگوں اور اس آیت کریمہ کے حوالہ سے ان کی وضاحت کو سامنے رکھتے ہوئے ذرا غور کر لیں کہ اگر حضرت ابوبکرؓ آیت کریمہ کا یہ مصداق واضح نہ کرتے تو منکرین ختم نبوت، منکرین زکوٰۃ اور دیگر مرتدین کے خلاف ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کی حیثیت محل نظر ہو جاتی ہے، بلکہ جس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے حضرت صدیق اکبرؓ نے وضاحت فرمائی وہ باقی رہ جاتی تو ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا پورا دینی شعبہ ہی کالعدم ہو کر رہ جاتا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم طے کرتے ہوئے اس دور کا پس منظر اور حضرات صحابہ کرامؓ کی تشریحات کو بھی سامنے رکھا جائے ورنہ قرآن کریم کی مراد تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح امام ترمذیؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ رومیوں کے خلاف معرکوں کے دوران ایک جنگ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی شریک تھے، مسلمانوں اور رومیوں کے لشکر آمنے سامنے تھے اور لڑائی کی تیاری ہو رہی تھی کہ مسلمانوں کے لشکر میں سے ایک

پرجوش نوجوان نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا اور اکیلا ہی دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ اس پر لوگوں نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اپنے انداز میں باتیں کیں کہ اس نے جلد بازی کی، جذباتی کام کیا ہے اور غلطی کی ہے۔ اسی دوران کسی صاحب نے سورہ البقرہ کی آیت ۱۹۵ کا ایک جملہ پڑھ دیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت پڑو''۔ یہ سن کر حضرت ابوایوب انصاریؓ چونکے اور موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے جس مفہوم میں ان صاحب نے اسے پڑھا ہے۔ یہ آیت ہم انصار مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے اس کا مفہوم اور مصداق ہم بہتر جانتے ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انصار مدینہ نے دل کھول کر ساتھ دیا اور مہاجرین کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ قریش کے ساتھ معرکہ آرائی میں بھی پوری قوت کے ساتھ شریک رہے۔ بدر، احد، احزاب اور دیگر جنگوں میں بھرپور حصہ لیا، اس دوران اپنی کھیتی باڑی کی طرف ان کی توجہ کم ہوگئی، باغات کی حالت بگڑنے لگی اور معاشی حالت خاصی متاثر ہوئی۔

ترمذیؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوایوب انصاریؓ نے کہا کہ جب غزوۂ خیبر کے بعد مسلمانوں کی حالت کچھ سنبھلی اور صورتحال بہتر ہونے لگی تو انصار مدینہ میں سے کچھ حضرات نے باہم مشورہ کیا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری اس طرح کی امداد کی ضرورت نہیں رہی جیسی ہم اب تک کرتے آرہے ہیں اور حالات خاصے بہتر ہوگئے ہیں اس لیے ہم اب اپنے باغات اور کھیتی باڑی کی طرف توجہ دیں اور خرچ کرنے کے معاملہ میں کچھ کمی کرلیں تاکہ اس دوران معاشی طور پر جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس پر قرآن کریم کی مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ اس آیت کا شان نزول ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد اور دفاع پر بدستور پہلے کی طرح خرچ کرتے رہو کیونکہ اگر اس میں کمی کرو گے تو کمزور ہو جاؤ گے اور جہادی قوت کمزور کرنے کا مطلب خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنا ہوگا اس لیے اس آیت کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔

اب ان دونوں واقعات کو سامنے رکھ لیجئے کہ قرآن کریم کی آیات کریمہ کا مطلب اور پس منظر حضرات صحابہ کرامؓ نے بیان کیا تو واضح ہوا ورنہ ان کا ظاہری مفہوم کچھ اور ہے۔

ان گزارشات کے بعد میں آپ حضرات کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر ارشادات و تعلیمات بھی اصولی طور پر قرآن کریم ہی کا حصہ ہیں، اس پر ایک دو واقعات عرض کروں گا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ایک بار کوفہ کی جامع مسجد میں درس دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ ”جسم پر نام گدوانے والی، بال اکھاڑنے والی اور ریتی سے رگڑ کر دانت چھوٹے کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے“۔ یہ اس زمانے کا فیشن تھا جیسا کہ ہر دور میں عورتوں میں رواج ہوتا ہے کہ وہ خود کو سنوارتی ہیں، آرائش و زیبائش اختیار کرتی ہیں اور پھر ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ انہیں دیکھا جائے۔ یہ سن کر کوفہ کی ایک خاتون ام یعقوبؒ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے درس میں آئی اور پوچھا کہ آپ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے، کیا یہ قرآن کریم میں ہے؟ خاتون کا مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے تو اس کا ذکر قرآن کریم میں ہونا چاہیے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے جواب دیا کہ ہاں یہ قرآن کریم میں ہے۔ ام یعقوبؒ نے کہا کہ قرآن کریم تو میں نے بھی سارا پڑھا ہے اس میں کہیں یہ مسئلہ مذکور نہیں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ سورہ الحشر کی آیت ۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے رسول تمہیں جو دیں وہ لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایسا فیشن کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اس لیے آپؐ کا یہ ارشاد بھی قرآنی تعلیمات ہی کا حصہ ہے۔

اس سے قطع نظر بھی یہ بات سوچ لیں کہ نمائندہ کسے کہتے ہیں؟ نمائندگی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جو بات بھی کہتا ہے اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ اس کی طرف سے ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہوتا ہے۔ ہم خود بھی اگر کسی کو نمائندہ بنا کر بھیجتے ہیں اور اس کی بات توجہ سے نہیں سنی جاتی تو شکایت ہمیں ہوتی ہے کہ فلاں صاحب نے ہمارے نمائندے کی بات پر توجہ نہیں دی اور اس کو ہم نمائندہ کی بجائے اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ جبکہ ”رسول“ کا معنی ہی قاصد اور نمائندہ کے ہیں اس لیے جب اللہ تعالیٰ اصولی طور پر یہ بات فرما رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے نمائندہ ہیں، یہ جس کام کا کہیں وہ کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ، تو اس اصول کے تحت آنحضرت کے تمام تر ارشادات و فرمودات اللہ تعالیٰ ہی کے ارشادات قرار پاتے ہیں۔ میں آپ حضرات کے سامنے ایک اور مثال پیش کرنا

چاہوں گا۔ آپ کے ضلع کا حاکم ڈپٹی کمشنر ہے جو صوبائی حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ جو حکم بھی دیتا ہے وہ صوبائی حکومت کی طرف سے تصور ہوتا ہے۔ آج تک کسی شخص نے کسی ڈپٹی کمشنر کے پاس جا کر یہ سوال نہیں کیا کہ آپ نے جو حکم جاری کیا ہے اس پر صوبائی حکومت کی تصدیق دکھائیں۔ اور اگر کسی کو شوق ہو تو وہ ڈپٹی کمشنر کے کسی حکم پر اس سے یہ سوال کر کے دیکھ لیں جواب خود معلوم ہو جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کا ایک اور ارشاد اسی آیت کے ضمن میں تفسیر قرطبی میں بھی مذکور ہے کہ ایک دفعہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرد کو دیکھا کہ وہ احرام کی دو چادروں کے ساتھ کوئی سلا ہوا کپڑا بھی پہنے ہوئے تھا۔ انہوں نے اسے روک کر بتایا کہ مرد کے لیے احرام کی حالت میں سلا ہوا کپڑا پہننا منع ہے۔ اس نے جھٹ سے سوال کر دیا کہ کیا یہ قرآن کریم میں ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہاں قرآن کریم میں ہے اور پھر مذکورہ آیت پڑھ کر یہی استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا نبیؐ جس کام کا حکم دے وہ کرو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ، اور جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مرد کے لیے حالت احرام میں سلا ہوا کپڑا پہننا درست نہیں ہے۔

حتیٰ کہ حضرت امام شافعیؒ تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں، تفسیر قرطبی میں اسی آیت کے ضمن میں مذکور ہے کہ حضرت امام محمد بن ادریس شافعیؒ نے، جو اہل سنت کے چار بڑے اماموں میں سے ایک ہیں، کسی روز اپنی محفل میں یہ فرمایا کہ آج جو مسئلہ پوچھو گے قرآن کریم کی روشنی میں بیان کروں گا۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا حالت احرام میں بھڑ مارنا درست ہے؟ جواب دیا کہ ہاں درست ہے۔ کسی نے سوال کیا کہ قرآن کریم میں کہاں ہے؟ حضرت امام شافعیؒ نے سورہ الحشر کی مذکورہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میرا رسول جس کام کے کرنے کا حکم دے وہ کرو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ، جبکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد میرے خلفائے راشدینؓ کی اتباع بھی تم پر لازم ہے۔ اور حالت احرام میں بھڑ کو مارنے کا یہ سوال خلیفۂ راشد حضرت عمر بن الخطابؓ سے کیا گیا تھا اور انہوں نے فرمایا تھا کہ جائز ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کا یہ حکم سنت نبویؐ کا حصہ ہے اور ارشاد نبویؐ قرآنی تعلیمات کا حصہ ہے اس لیے یہ مسئلہ بھی قرآن کریم کے احکام میں موجود ہے۔

اس استدلال پر ایک بار پھر غور فرما لیجیے، یہ میرا استدلال نہیں ہے بلکہ امام اہل سنت حضرت امام شافعیؒ استدلال کر رہے ہیں۔ اس لیے جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن فہمی کے لیے سنت نبویؐ اور صحابہ کرامؓ کے تعامل کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر قرآن کریم کی کئی آیات کے صحیح مصداق تک پہنچنا مشکل ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرمودات اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلے بھی قرآنی تعلیمات کا حصہ ہیں اور انہیں قرآن کریم سے الگ کرنا درست نہیں ہے۔

حضرات محترم! میں نے آپ کے سامنے قرآن و سنت کے باہمی تعلق اور قرآن فہمی کے چند بنیادی اصولوں پر کچھ گزارشات پیش کی ہیں، دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن و سنت کا صحیح فہم نصیب فرمائیں اور ان پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دین کی تکمیل اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ مئی ۱۹۹۹ء)

ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد وہاں کی مذہبی قیادت مسلسل اس بات کا تاثر دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ اہل تشیع کو جن انتہا پسندانہ عقائد کا حامل ٹھہرایا جاتا ہے، ایران کے انقلابی مذہبی راہنما اس سے بری ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ اعتدال پسندانہ مذہبی عقائد و رجحانات رکھتے ہیں بلکہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان اتحاد اور مفاہمت کے بھی علمبردار ہیں۔

چنانچہ ۱۹۸۷ء میں راقم الحروف کو پاکستانی علماء اور دانشوروں کے ایک وفد کے ہمراہ ایران کی وزارت مذہبی امور کی دعوت پر تہران جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ہمارے لیے ایک محفل بطور خاص اس امر کے اظہار کے لیے سجائی گئی کہ قرآن کریم پر ایمان کا اظہار کیا جائے، اور اس الزام کے ازالہ کی کوشش کی جائے کہ اہل تشیع قرآن کریم کو تحریف شدہ قرار دیتے ہیں۔ اس محفل میں مقتدر ایرانی راہنما جناب آیت اللہ خزعلی نے قرآن کریم پر ایمان اور اس کے غیر محرف ہونے پر مفصل خطاب کیا۔ جس پر ہمارے وفد میں شامل مولانا منظور احمد چنیوٹی کے ساتھ ان کا ہلکا پھلکا مناظرہ بھی ہو گیا۔

مگر ان تمام کوششوں کے باوجود اپنے مذہبی عقائد و رجحانات کو چھپانے میں اسے (ایرانی قیادت کو) کبھی کامیابی نہیں ہوئی، کیونکہ دل کی بات کسی نہ کسی طرح سامنے آ ہی جاتی ہے

اور اسے زیادہ دیر تک مخفی رکھنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال چند روز قبل تہران میں ہونے والے ایک مذہبی اجتماع کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور نے ۶ اپریل ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں ”عید غدیر“ کے عنوان سے تہران میں منعقد ہونے والے ایک مذہبی اجتماع کی تصویر شائع کی ہے جس کا منظر یہ ہے کہ ایران کے مذہبی پیشوا جناب آیت اللہ خامنہ ای اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں، جبکہ اسٹیج پر ایران کے موجودہ صدر جناب محمد خاتمی اور سابق صدر جناب ہاشمی رفسنجانی کے ہمراہ قومی اسمبلی کے اسپیکر اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی بیٹھے ہیں، اور ایران کی اس اعلیٰ ترین قیادت کے سروں پر ایک بینر لٹک رہا ہے جس کی عبارت یہ ہے:

”الحمد للہ الذی جعل کمال دینہ و تمام نعمتہ بولایۃ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام۔“

یہ دراصل قرآن کریم کی اس معروف آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ میں نے آج تمہارے لیے دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے اور وحیٔ الٰہی مکمل ہونے کی خوشخبری ہے۔ اور اس امر کا اعلان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جس وحی کا آغاز ہوا تھا، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ مکمل ہو گئی ہے اور آسمانی ہدایات کی نعمت پوری ہو گئی ہے۔ مگر مذکورہ بینر کی عبارت یہ کہہ رہی ہے کہ وحی کی تکمیل اور دین کی نعمت کا اتمام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں بلکہ اس کی تکمیل اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولایت کے ساتھ ہوئی ہے۔

ہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولایت کے قائل ہیں، انہیں امام الاولیاء مانتے ہیں اور ان کے ساتھ محبت و عقیدت کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ لیکن وحیٔ الٰہی اور دین کی تکمیل کے ساتھ ان کی ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ وحی اور دین کی تکمیل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ ہو گئی ہے۔ اور اس کے بعد کسی بھی اور بزرگ یا شخصیت کی طرف اس کو منسوب کرنا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و ختم نبوت کو نعوذ باللہ نامکمل قرار دینے کے مترادف ہے۔ اور اسی سے ایران کی مذہبی قیادت کی ان کوششوں کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے جو وہ خود کو اعتدال پسند ظاہر کرنے اور عالم اسلام کی قیادت کے لیے آگے لانے کے لیے کر رہی ہے۔

”طلوع اسلام“ اور چوہدری غلام احمد پرویز

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۶ اپریل ۱۹۹۹ء)

۱- مباحثے کا پس منظر

گزشتہ دنوں کویت سے انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کے سیکرٹری اطلاعات عبد الخالق بھٹی صاحب کا ایک مراسلہ ”اوصاف“ میں شائع ہوا جس میں انہوں نے منکرین حدیث بالخصوص چودھری غلام احمد پرویز صاحب کے افکار و نظریات پر تنقید کی ہے کہ وہ حدیث و سنت کی حجیت کے منکر ہیں۔ جبکہ امت مسلمہ کا اجماعی موقف ہے کہ جو شخص یا گروہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو شرعی حجت تسلیم نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس کے جواب میں پرویز صاحب کے حلقہ سے کسی صاحب نے ایک مضمون میں لکھا کہ انہیں حدیث و سنت کا منکر قرار دینا درست نہیں ہے۔

چنانچہ اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی ایک پرانی تصنیف (انکار حدیث کے نتائج) کا وہ حصہ جو پرویز صاحب کے بارے میں ہے ”اوصاف“ کو اشاعت کے لیے بھیج دیا گیا جو دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے پرویز صاحب کے آرگن ”طلوع اسلام“ کے حوالوں سے یہ بات واضح کی ہے کہ پرویز صاحب نے دین کی تعبیر اور قرآن کی تشریح کا جو راستہ اختیار کیا ہے اس کی بنیاد سنت رسولؐ اور امت کے اجماعی تعامل پر نہیں ہے۔ بلکہ وہ امت کے جمہور اہل علم کی تشریحات، صحابہ کرامؓ کے اجماعی تعامل، اور جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات سب کو پھلانگ کر قرآن کریم کی براہ راست نئی تشریح کرنے کے درپے ہیں جو کہ بلاشبہ گمراہی کا راستہ ہے۔

اس کے جواب میں جناب محمد لطیف چودھری صاحب کا ایک تفصیلی مضمون ”اوصاف“ میں شائع ہوا ہے جس سے بحث کچھ اور آگے بڑھی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں قارئین کی خدمت میں کچھ اصولی گزارشات پیش کی جائیں۔ مگر اس سے قبل کویت کے عبد الخالق بھٹی صاحب کے مراسلہ کا کچھ پس منظر بیان کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

کویت میں ہمارے عزیز دوست مولانا ڈاکٹر احمد علی سراج کافی عرصہ سے قیام پذیر ہیں اور ایک مسجد میں خطابت کے علاوہ انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کے امیر کی حیثیت سے

خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ ایک فعال اور بیدار مغز دینی کارکن ہیں، ڈیرہ اسماعیل خان کی معروف دینی درسگاہ دارالعلوم نعمانیہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سراج الدین صاحب کے فرزند ہیں، اور ہمارے عزیز دوست و ساتھی ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ پہلے کویت میں ''طلوع اسلام'' کے حلقہ کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں دیکھ کر وہاں کی وزارت اوقاف کو اس بات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ یہ وہ حلقہ ہے جسے پاکستان کے علماء کرام نے حدیث و سنت کی حجیت سے انکار کی بنیاد پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دے رکھا ہے۔ انہوں نے وزارت اوقاف کویت کو باقاعدہ درخواست دی جس کے ساتھ علماء پاکستان کے فتاوی منسلک کیے۔ وزارت اوقاف نے ان کا موقف تسلیم کرتے ہوئے ''طلوع اسلام'' کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ اس کے جواب میں ''طلوع اسلام'' کے حلقہ نے وزارت اوقاف اور کویت کی شرعی عدالت سے رجوع کیا اور درخواست دائر کی جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ ''طلوع اسلام'' کے خلاف مولانا احمد علی سراج کا موقف تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کا متفقہ موقف نہیں ہے بلکہ ان کا ذاتی خیال ہے جو عناد اور تعصب کی وجہ سے درخواست کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے ''طلوع اسلام'' پر پابندی کا حکم واپس لیا جائے۔

مولانا احمد علی سراج نے اس سلسلہ میں راقم الحروف سے رابطہ کیا جس پر راقم الحروف نے لاہور کے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام سے گزارش کی کہ اس سلسلے میں ایک فتوی از سرنو مرتب کیا جائے۔ چنانچہ جمعیت اتحاد العلماء پاکستان کے صدر مولانا عبد المالک خان کی خصوصی محنت کے ساتھ چودھری غلام احمد پرویز اور ''طلوع اسلام'' کی عبارات کا از سرنو جائزہ لے کر ایک متفقہ فتوی مرتب کیا گیا جس میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ پرویز صاحب اور ''طلوع اسلام'' کا حلقہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وسنت کو شرعی حجت تسلیم نہیں کرتے، اس لیے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ اس فتوی پر جامعہ اشرفیہ، جامعہ مدنیہ، جامعہ نعیمیہ، جامعہ رضویہ ماڈل ٹاؤن، جامعہ اہل حدیث اور دیگر علمی اداروں کی طرف سے مولانا مفتی عبد الواحد، مولانا شیر محمد علوی، مولانا عبد المالک خان، مولانا حافظ عبد القادر روپڑی، مولانا مفتی غلام سرور قادری، ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، مولانا حافظ صلاح الدین یوسف، مولانا حافظ عبد الرحمن مدنی، اور دیگر سرکردہ علماء کرام نے دستخط کیے اور یہ متفقہ فتوی کویت کی وزارت اوقاف اور عدالت کو بھجوا دیا گیا۔

جبکہ اس کے ساتھ دارالعلوم کراچی سے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور بھارت کی امارت شرعیہ بہار سے مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کے فتاوی کے علاوہ سعودی عرب کے مفتی اعظم الشیخ عبدالعزیز بن باز کے فتاوی بھی عدالت میں پیش کیے گئے۔ چنانچہ ان تمام فتاوی کی بنیاد پر کویت کی شرعی عدالت نے ''طلوع اسلام'' کے حلقہ کی اپیل خارج کرتے ہوئے اس کی سرگرمیوں پر پابندی کے بارے میں وزارت اوقاف کے حکم کی توثیق کر دی ہے۔

اس پس منظر میں مولانا احمد علی سراج کے رفیق کار اور انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کویت کے سیکرٹری جنرل عبدالخالق بھٹی کا وہ مراسلہ ''اوصاف'' میں شائع ہوا جس سے اس بحث کا آغاز ہوا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں جناب لطیف چودھری کا تفصیلی مضمون اس وقت ہمارے سامنے ہے جو حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی تحریر کے جواب میں ہے۔

۲-قربانی کے مسئلے سے استدلال

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے اپنی تحریر میں یہ اصولی موقف اختیار کیا ہے کہ پرویز صاحب نے دین کی تعبیر و تشریح میں سنت رسولؐ، اسوہ صحابہ کرامؓ، اور امت مسلمہ کے چودہ سو سال سے چلے آنے والے اجماعی تعامل سے ہٹ کر ان سب سے الگ راستہ اختیار کیا ہے جو امت کے جمہور اہل علم کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مثال کے طور پر قطع ید، قربانی، تقدیر اور دیگر بعض امور کے بارے میں ''طلوع اسلام'' کی بعض عبارات یہ بات واضح کرنے کے لیے پیش کی ہیں کہ پرویز صاحب کا نکتہ نظر جمہور امت سے الگ ہے۔

اس کے جواب میں محمد لطیف چودھری نے اس اصولی موقف کو رد کیے بغیر ان مسائل میں پرویز صاحب کے موقف کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیے ہیں۔ حالانکہ زیر بحث مسئلہ یہ نہیں ہے کہ موقف کس کا درست ہے اور کس کے پاس دلائل ہیں۔ بلکہ غور طلب بات صرف اتنی ہے کہ ان مسائل میں پرویز صاحب کا موقف جمہور امت کے موقف سے الگ ہے یا نہیں؟ اس لیے محمد لطیف چودھری نے اصولی بحث کی طرف آئے بغیر پرویز صاحب کی عبارات کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پرویز صاحب اور ''طلوع اسلام'' کے موقف کو امت کے جمہور اہل علم کے موقف

سے الگ قرار دینے سے اتفاق کر رہے ہیں، اسی لیے انہیں اس کے حق میں دلائل دینے کی ضرورت پیش آرہی ہے۔

مثلاً انہوں نے سب سے زیادہ زور "قربانی" کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت میں صرف کیا ہے اور بلاوجہ حوالوں اور عبارات کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ حالانکہ مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ "طلوع اسلام" کے نزدیک قربانی کا تعلق صرف حج کے دنوں میں منی میں ذبح ہونے والے جانوروں سے ہے۔ اور اس کے علاوہ دنیا بھر میں عید الاضحی کے موقع پر جو جانور ذبح کیے جاتے ہیں وہ ان کے نزدیک "قربانی" کے شرعی حکم میں شامل نہیں ہیں۔ جبکہ جمہور اہل علم چودہ سو سال سے دنیا بھر میں عید الاضحی کے موقع پر ذبح کیے جانے والے جانوروں کو "شرعی قربانی" تصور کرتے ہیں اور اسی نیت کے ساتھ دنیا بھر کے مسلمان ہر سال قربانی دیتے ہیں۔ اس پر محمد لطیف چودھری نے دو باتوں پر خواہ مخواہ اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کیا۔ ایک اس بات پر کہ قربانی کو احناف واجب کہتے ہیں مگر دوسرے فقہی مکاتب فکر اسے واجب نہیں کہتے۔ جبکہ دوسرا اس پر کہ لغت میں قربانی کے فلاں فلاں معنی بھی آئے ہیں۔

حالانکہ اصل بات صرف اتنی ہے کہ قربانی احناف کے نزدیک واجب اور دوسرے فقہاء کے نزدیک سنت ہے۔ مگر قربانی کے شرعی حکم سے مراد تو سب کی ایک ہی ہے کہ قربانی صرف حج اور منی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں عید الاضحی کے موقع پر ذبح کیے جانے والے جانور شرعی قربانی کے زمرہ میں شامل ہیں۔ اس میں اگر فقہاء کے ہاں واجب اور سنت کی درجہ بندی کا فرق ہے تو اس سے یہ بات کہاں سے ثابت ہوئی کہ قربانی کے بارے میں پرویز صاحب کا موقف درست ہے۔ دنیا بھر میں آج بھی مشاہدہ کر لیجیے کہ کیا صرف حنفی مسلمان قربانی کرتے ہیں؟ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اہل اسلام کے مسلمہ فقہی مذاہب میں سے کس مذہب کے پیروکار یہ قربانی نہیں کرتے؟ بلکہ ہمارے ہاں پاکستان میں تو حنفی صرف تین دن قربانی کرتے ہیں مگر غیر حنفی حضرات کو چوتھے دن بھی یہ قربانی کرنے پر اصرار ہوتا ہے۔ اس لیے واجب اور سنت کی درجہ بندی کو بہانہ بنا کر "طلوع اسلام" کے گمراہ کن موقف کی تائید آخر کس طرح ممکن ہے؟

۳- لغت کے معانی سے استدلال

لغت کے مسئلہ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ کسی لفظ کے لغت میں دس معنی ہیں مگر جس شخصیت نے اپنی گفتگو میں وہ لفظ بولا ہے اس نے خود اس کا معنی متعیّن کر دیا ہے کہ اس لفظ سے میری مراد یہ ہے۔ اب اس کے بعد لغت کے بیان کردہ باقی نو معنوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی کوئی صاحب لغت کی کتابیں سامنے رکھ کر بیٹھ جائیں کہ چونکہ اس لفظ کے بہت سے معنی ہیں، میں اس گفتگو کا مخاطب ہوں، مجھے عقل سلیم حاصل ہے، میں لغت پر عبور رکھتا ہوں، اس لیے اس گفتگو میں اس لفظ کے معنی اور مراد بھی میں خود متعیّن کروں گا۔ تو ایسے صاحب کی ”عقل سلیم“ کے لیے دعائے صحت کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں صرف ”طلوع اسلام“ ہی نہیں بلکہ بعض دیگر حلقے بھی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ قرآن کریم کے کسی بھی لفظ یا اصطلاح کا معنی متعیّن کرنے کے لیے عربی لغت اور محاوروں کے دفتروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ متکلّم نے اگر اپنی مراد خود واضح کر دی ہے تو اس کے بعد اس کے خلاف کسی اور معنی اور مراد کو خواہ مخواہ اس کے ذمہ لگانے کے لیے لغت اور محاوروں کی صحرا نوردی کرنا متکلّم کی مراد کو رد کرنے اور اس پر عدم اعتماد کے اظہار کے مترادف ہے۔

نماز ہی کو لے لیجیے کہ قرآن کریم نے اس کے لیے ”صلوۃ“ کا لفظ بولا ہے جس کے معنی لغت میں متعدّد ہیں۔ مگر ان مختلف معنوں میں سے ایک معنی اور کیفیت خود صاحب قرآن کی وضاحت اور عمل سے متعیّن ہوگئی ہے۔ چنانچہ اب لغت میں بیان کیے گئے دیگر معنوں کی آڑ لے کر صاحب قرآن کی وضاحت و تشریح کے بارے میں شکوک و شبہات کی فضا پیدا کرنا صاحب قرآن پر بے اعتمادی کا اظہار ہے۔ اور ہمیں ”طلوع اسلام“ اور اس کے دیگر ہمنواؤں سے یہی شکایت ہے۔

۴- قرآنی الفاظ و عبارات کی تشریح کی اصل اتھارٹی کون؟

اب اس نکتہ کی طرف آجائیے کہ قرآن کریم کے حوالہ سے ”متکلّم“ کون ہے اور قرآنی الفاظ و عبارات کی تشریح و توضیح میں اصل ”اتھارٹی“ کون ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مگر ہمارے سامنے قرآن کریم کے متکلّم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ہیں۔ ہمیں اللہ رب العزت نے قرآن کریم براہ راست عطا نہیں فرمایا بلکہ آنحضرتؐ کی وساطت سے دیا ہے۔ اور نبی اکرمؐ بھی ایک پوسٹ مین کی طرح قرآن کریم امت کے حوالہ کر کے فارغ نہیں ہو گئے (نعوذ باللہ) کہ بس میرا کام اتنا ہی تھا، اب تم جانو اور یہ قرآن جانے۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل ۲۳ سال تک اس قرآن کریم کی تعلیم دیتے رہے اور اس کے معانی بیان کرتے رہے، اس کی تشریح کرتے رہے اور اس کی روشنی میں احکام نافذ کرتے رہے۔ خود قرآن کریم نے جناب رسول اللہؐ کا منصب بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ وہ صرف قرآن کریم کے الفاظ پہنچانے والے نہیں بلکہ اس کی تعلیم دینے والے اور اس کا بیان کرنے والے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ”تعلیم“ اور ”بیان“ کا یہ سلسلہ جو ۲۳ سال کے عرصہ پر محیط ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ اور قرآن کریم کے الفاظ و احکام کی شرح و تعبیر میں رسول اللہؐ کے ارشادات و اعمال اور وضاحت و تشریح کو کیا مقام حاصل ہے؟ مولانا سرفراز خان صفدر نے تو صرف اتنی بات واضح کی ہے کہ قرآن کریم کے متن و الفاظ کے علاوہ اس کی تعبیر و تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات و توضیحات ہیں وہ پرویز صاحب اور ”طلوع اسلام“ کے نزدیک شرعی دلیل نہیں ہیں۔ مگر محمد لطیف چودھری صاحب اسے الزام قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اعتراف بھی کر رہے ہیں کہ علم کے صرف دو ذرائع ہیں: قرآن کریم اور عقل و بصیرت۔ اور وحی صرف وہ ہے جو قرآن کریم میں ہے، اس کے باہر کہیں نہیں ہے۔ حالانکہ یہی بات مولانا محمد سرفراز خان صفدر سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ حدیث و سنت اور جناب رسول اللہؐ کے اپنے ارشادات و تعلیمات کو، جو قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں، انہیں ”طلوع اسلام“ کے نزدیک وحی اور علم کے ماخذ کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ جب چودھری صاحب موصوف کو یہ بات تسلیم ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ مولانا سرفراز خان صفدر کی کون سی بات کا رد کر رہے ہیں؟

ہم نے سطور بالا میں عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کلام تو اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن ہمارے سامنے اس کے متکلّم جناب نبی اکرمؐ ہیں۔ اس لیے انہی کے بیان کردہ معنی اور مراد کو متکلّم کی اپنی وضاحت کا درجہ حاصل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کسی اور ذریعہ سے بھیجا ہوتا اور حضورؐ الگ کھڑے اس کی تشریح و توضیح کر رہے ہوتے تو کسی درجہ میں سوچنے کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ اس تشریح و تعبیر کی حیثیت کیا ہے؟ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ

قرآن کریم کے الفاظ بھی حضورؐ بیان کررہے ہیں اور ان کی تشریح و توضیح بھی آپؐ ہی فرمارہے ہیں۔ یعنی آپؐ یہ فرمارہے ہیں کہ "یہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے اور یہ اس کا مطلب ہے۔"

اب ہمارے پاس تو کوئی کسوٹی نہیں ہے کہ ان دو باتوں میں سے ایک کو قبول کرنا ضروری سمجھیں اور دوسری بات کے بارے میں یہ اختیار حاصل کرنے کی کوشش کریں کہ جی آپ کی دوسری بات پہلی بات کے مطابق سمجھ آئی تو مانیں گے۔ لیکن اگر ہم یہ سمجھے کہ آپ کی دوسری بات پہلی بات سے مطابقت نہیں رکھتی یا لغت، محاورہ اور دنیا کے عرف میں ہمیں آپ کی پہلی بات کا کوئی معنی اور مفہوم نظر آگیا تو پھر ہم آپ کی دوسری بات کو قبول کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔

"طلوع اسلام" کے دوستوں کی خدمت میں عرض ہے کہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس بات پر غور کریں کہ قرآن کریم اور اس سے باہر حدیث و سنت دونوں کا "متکلّم" ایک ہے، مخاطب طبقہ بھی ایک ہے، اور ان دونوں کو امت تک پہنچانے والے ذرائع بھی ایک ہی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ متکلّم کی ایک بات کو ہم مانیں گے لیکن دوسری بات کو ماننے کے پابند نہیں ہوگے، یہ خود متکلّم کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار ہے۔ اور اسے الفاظ کی میناکاری کے جتنے پردوں میں بھی چھپانے کی کوشش کی جائے وہ اہل بصیرت کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتی۔

۵- اللہ تعالی کی طرف سے حدیث و سنت کی توثیق

"طلوع اسلام" کے دوستوں کو حدیث و سنت کے وحی ہونے سے انکار ہے اور وہ قرآن کریم سے باہر کسی وحی کا وجود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے قرآن کریم ہی کی زبان میں بات کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اجتہادی فیصلوں پر اللہ تعالی نے نکیر فرمائی۔ بات یوں ہوئی کہ آنحضرتؐ نے کئی مواقع پر وحی الٰہی نازل نہ ہونے کی صورت میں اپنے اجتہاد سے فیصلے فرمائے جن میں سے بعض کے بارے میں قرآن کریم میں کہا گیا کہ آپ کو یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مثلاً

1. بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا۔
2. مسجد ضرار میں نماز کا وعدہ کرنا۔
3. عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھانا۔

4. شہد استعمال نہ کرنے کی قسم کھانا وغیر ذلک۔

اب ذرا سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیے کہ وحی تو رسول اللہؐ کی حیات مبارکہ کے آخری لمحات تک جاری تھی اور قرآن کی آخری آیات آنحضرتؐ کی وفات سے چند روز پہلے نازل ہوئیں۔ اور پورے قرآن کریم میں جناب نبی اکرمؐ کے زندگی بھر کے تمام تر اعمال و افعال، ارشادات و اقوال اور فیصلوں میں سے صرف چار پانچ باتوں پر گرفت کی گئی۔ یہ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت کا تقاضا تھا تاکہ ان چند باتوں پر گرفت کے ساتھ حضورؐ کے باقی تمام ارشادات، اعمال اور فیصلوں کی توثیق ہو جائے۔ چنانچہ قرآن کریم کے آخر وقت تک نازل ہوتے رہنے اور چند باتوں کے علاوہ باقی تمام امور پر خاموش رہنے سے ان سب کی توثیق ہو گئی ہے۔

اس لیے محمد لطیف چودھری صاحب سے گزارش ہے کہ حدیث و سنت کو جو ''وحی حکمی'' کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے ساتھ رسول اللہؐ کے وہ تمام ارشادات و افعال بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے خاموشی اختیار کی ہے۔ اس لیے علم کا ماخذ قرآن کریم اور سنت رسولؐ دونوں ہیں۔ جبکہ عقل کو علم کا ماخذ قرار دینا ''عقل'' کی ماہیت و حقیقت سے ناواقفیت کا اظہار ہے۔ کیونکہ عقل صرف ایک استعداد کا نام ہے جس کے ذریعہ کوئی شخص علم کے سرچشموں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ عقل علم کا ذریعہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی شخص علم حاصل نہیں کر پاتا لیکن عقل خود علم نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست بات نہیں ہے کہ عقل علم کا ماخذ ہے، کیونکہ ماخذ اور ذریعہ میں فرق ہوتا ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ ''طلوع اسلام'' کے دوستوں سے عرض ہے کہ جب وہ اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ قرآن کریم کی تعبیر و تشریح میں ان کا اسلوب پوری امت سے جداگانہ ہے جس کی بنیاد سیرت و احادیث اور چودہ سو سال سے چلی آنے والی دین کی اجتماعی تعبیر و تشریح پر نہیں ہے۔ تو پھر انہیں اپنے بارے میں دینی حلقوں کے کسی متفقہ موقف پر شکوہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ دین کی تعبیر و تشریح کے حوالہ سے ایک طرف خود رسول اللہؐ کھڑے ہوں، ان کے ساتھ صحابہ کرامؓ ہوں، امت کے تمام فقہاء و محدثین ہوں، اور امت کا چودہ سو سالہ اجماعی تعامل ہو۔ جبکہ دوسری طرف چودھری غلام احمد پرویز صاحب ''طلوع اسلام'' کے چند دوستوں کے ہمراہ لغت اور

محاوروں کی کتابیں ہاتھوں میں تھامے امت کو اپنی طرف بلا رہے ہوں، اور اس کے ساتھ ان کا یہ تقاضا بھی ہو کہ دوسری طرف کھڑی پوری امت کے علمی نمائندے ان کے بارے میں کسی رائے کا اظہار بھی نہ کریں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

قرآن فہمی میں حدیث و سنت کی اہمیت

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۵ اپریل ۱۹۹۹ء)

بھیرہ کی جامع مسجد اور بگوی خاندان ہماری علمی و دینی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ دہلی کی ولی اللّٰہی درسگاہ سے لے کر بادشاہی مسجد لاہور کی خطابت اور بھیرہ میں حزب الانصار کی تعلیمی و اصلاحی سرگرمیوں تک ایک پوری تاریخ ہے جس کا احاطہ ایک یا دو مضمون نہیں کر سکتے۔ اس دینی مرکز اور علمی خاندان کی سب سے اہم خصوصیت وہ توازن اور اعتدال ہے جو اہل سنت اور حنفی مکتب کے دو بڑے گروہوں دیوبندی اور بریلوی کے درمیان اختلافات کی شدت کے دور میں بھی دونوں کے سرکردہ حضرات کو یکجا کرنے کے اہتمام سے ظاہر ہوتا ہے اور جو اس دور میں بلاشبہ بہت بڑے حوصلے کی بات ہے۔

اس سال بھی اپریل کے آغاز میں حزب الانصار بھیرہ نے مرکزی جامع مسجد میں منعقدہ اپنے سالانہ اجتماع میں اس روایت کو برقرار رکھا اور حزب الانصار کے امیر صاحبزادہ ابرار احمد بگوی صاحب کی دعوت پر دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام نے شرکت کی۔ راقم الحروف بھی مدعو تھا اور سالانہ اجتماع کی آخری نشست میں حضرت مولانا عبد الستار تونسوی کے مفصل خطاب سے پہلے کچھ گزارشات پیش کرنے کا مجھے موقع ملا۔ میری گفتگو کا عنوان تھا ''قرآن فہمی میں سنت رسولؐ کی اہمیت'' اور اس ضمن میں جو بنیادی نکتہ عرض کیا وہ یہ تھا کہ حضرات صحابہ کرامؓ خود عرب تھے اور عربی زبان ان کی مادری اور نسلی زبان تھی لیکن اس کے باوجود بہت سے مواقع پر انہیں قرآن کریم کی بعض آیات کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگی اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت کے بعد وہ قرآن کریم کا صحیح مقصد و مفہوم سمجھ پائے۔ اس لیے رسول اللہ کے ارشادات اور اعمال و افعال قرآن فہمی کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے ہٹ کر اگر محض عربی دانی کے زعم میں کوئی شخص قرآن کریم سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش کرے گا تو وہ گمراہی پھیلانے کے سوا کچھ

نہیں کر پائے گا۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے چند واقعات پیش کیے جن میں سے دو تین کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پہلا واقعہ حضرت عدی بن حاتمؓ کا ہے جو صحابیِ رسول تھے اور عرب کے مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے تھے۔ انہوں نے رمضان المبارک میں سحری کے بارے میں قرآن کریم کا یہ حکم سنا کہ ''اس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے الگ نہ ہو جائے''۔ یہاں سفید اور سیاہ دھاگوں سے مراد روشنی اور اندھیرے کی وہ دھاریاں ہیں جو صبح صادق کے وقت آسمان پر مشرق کی جانب چوڑائی میں نمودار ہوتی ہیں اور اس بات کی علامت ہوتی ہیں کہ رات ختم ہو کر صبح شروع ہو گئی ہے۔ حضرت عدی بن حاتمؓ قرآن کریم کا مفہوم نہ سمجھ پائے اور سفید اور سیاہ دھاگے کو حقیقی سمجھ کر اپنے تکیے کے نیچے دھاگے کی سیاہ اور سفید ڈوریاں رکھ لیں، اور معمول یہ بنا لیا کہ صبح جب تک وہ دھاگے الگ الگ دکھائی نہ دینے لگ جاتے اس وقت تک سحری کھاتے پیتے رہتے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک روز عدی بن حاتمؓ نے جناب نبی اکرمؐ کے سامنے اس کا تذکرہ کر دیا۔ آپؐ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ ''عدی! تمھارا تکیہ تو پھر بہت چوڑا ہے''۔ یعنی سیاہ اور سفید دھاریوں سے قرآن کریم کی جو مراد ہے کہ افق کی سیاہ اور سفید دھاریاں جس تکیے کے نیچے آجائیں تو وہ تکیہ کتنا چوڑا ہوگا۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ نے حضرت عدی بن حاتمؓ کو قرآن کریم کے ارشاد کا مطلب سمجھایا تو ان کی غلط فہمی دور ہوئی اور انہوں نے تکیے کے نیچے سے دھاگے نکال دیے۔

دوسرا واقعہ اجتماعی ہے کہ جب سورۃ الانعام کی آیت کریمہ ۸۲ نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے۔ آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس نہ ہونے دیا ان کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں''۔ گویا ایمان کی قبولیت کا معیار یہ قرار پایا کہ اس کے ساتھ ظلم کا التباس نہ ہونے پائے۔ ظلم کا لفظ عام بولا جانے والا ہے اور اس سے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ روزمرہ معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ جو کمی بیشی اور ناانصافی ہو جاتی ہے وہ ظلم ہے۔ بلاشبہ وہ بھی ظلم ہے لیکن یہ انسانی زندگی کا حصہ ہے اور اس قدر عام ہے کہ اگر اسے ایمان کی قبولیت کے لیے شرط قرار دیا جائے تو بہت کم لوگ ایمان کو قبولیت کے معیار پر پورا دکھا سکیں گے۔ صحابہ کرامؓ نے اس آیت میں ''ظلم'' کا یہی مطلب سمجھا اور پریشان ہو گئے کہ یہ تو بڑی سخت شرط

ہے جسے اکثر لوگ پورا نہیں کر سکیں گے۔ پریشانی اس قدر بڑھی کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باقاعدہ وفد پیش ہوا اور عام صحابہ کرامؓ کی طرف سے اس پریشانی کا اظہار کیا۔ جناب رسول اکرمؐ نے وفد کی بات سنی اور انہیں تسلی دی کہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن کریم کی اس آیت میں "ظلم" کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو عام طور پر سمجھا جا رہا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ ظلم ہے جس کا ذکر حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کیا تھا کہ "بیٹا! شرک کا ارتکاب نہ کرنا کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔ جناب نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے یہ وضاحت سن کر صحابہ کرامؓ کو اطمینان ہوا اور ان کی پریشانی دور ہوئی۔

اس سے اندازہ کر لیجئے کہ قرآن کریم کے کسی حکم یا لفظ کا صحیح مصداق متعیّن کرنے میں جناب نبی اکرمؐ کی حدیث و سنت کا مقام کیا ہے؟ اور جب صحابہ کرامؓ، جو نسلی عرب تھے، محض قرآن کریم کے الفاظ سن کر نبی کریمؐ کی وضاحت کے بغیر اس کا مفہوم نہیں سمجھ پا رہے تھے تو آج محض عربی دانی کے دعوے کے ساتھ قرآن کریم کا معنی اور مفہوم بیان کرنے والے قرآن کریم کے اصل مقاصد تک کیسے رسائی حاصل کر سکتے ہیں؟

تیسرا واقعہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا ہے اور یہ بھی بخاری شریف میں ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا معمول یہ تھا کہ کوفہ کی جامع مسجد میں ہفتہ میں ایک دن درس دیا کرتے تھے اور عام لوگوں کو دینی مسائل و احکام سے آگاہ کرتے تھے، ایک موقع پر درس میں انہوں نے عورتوں کی فیشن پرستی کا ذکر کیا اور اس دور کے "میک اپ" کی دو تین باتوں کا تذکرہ کر کے فرمایا کہ ایسا کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت بھیجی ہے۔ یہ سن کر کوفہ کی ایک خاتون جس کا نام بخاری شریف کی روایت میں "ام یعقوب" بتایا گیا ہے، ان کے پاس آئی اور پوچھا کہ آپ نے یہ بات بیان کی ہے کہ ایسا فیشن کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ ہاں میں نے یہ بات کہی ہے۔ اس خاتون نے پوچھا کہ یہ بات قرآن کریم میں ہے؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کی بات کہی جا رہی ہے تو اس ذکر قرآن کریم میں ہونا چاہیے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ ہاں قرآن میں یہ بات موجود ہے۔ اس خاتون نے کہا کہ قرآن کریم تو میں نے بھی پڑھا ہے اس میں کہیں اس بات کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس

کے جواب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جو ارشاد فرمایا وہ قرآن و سنت کے حقیقی تعلق اور قرآن فہمی میں حدیث و سنت کے مقام کو واضح کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم کے سورۃ الحشر میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ ”اللہ تعالی کا رسول تمہیں جو چیز دے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس رک جاؤ“۔ اور رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ اس قسم کا فیشن کرنے والی (یعنی جسم پر سوئی سے نام کھدوانے والی، جلد سے بال نوچنے والی، اور ریتی سے رگڑ کر دانت چھوٹے کرنے والی) عورتوں پر اللہ تعالی کی لعنت ہے، اس لیے رسول اللہ کا یہ ارشاد قرآن کریم کی تعلیمات کا حصہ ہے اور اسے قرآن کریم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

گویا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ارشاد کے مطابق چونکہ حضرت محمدؐ اللہ تعالی کے رسول ہیں اور اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ان کے بارے میں اصولی طور پر واضح حکم دے دیا ہے کہ وہ جس کام کا حکم دیں وہ کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ، اس لیے نبی اکرمؐ کے ارشادات اور حدیث و سنت قرآنی اصولوں کی وضاحت کے طور پر قرآنی تعلیمات ہی کا حصہ ہیں، اور یہ قرآن کریم کی حقیقی تشریح ہے جس سے الگ کر کے قرآن کریم کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

اجتہاد اور اس کے راہنما اصول

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱ اپریل ۱۹۹۹ء)

اجتہاد کا لغوی معنی کوشش کرنا ہے۔ اور شرعا ”اجتہاد“ اس کوشش کو کہتے ہیں جو کوئی مجتہد سطح کا عالم دین کسی ایسے دینی مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے کرتا ہے جس میں قرآن و سنت کا کوئی واضح حکم موجود نہ ہو۔ یہ شریعت کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضہ ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی ترغیب دی ہے۔ آپؐ نے معروف صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو اس موقع پر ان سے انٹرویو لیا جسے حدیث کی بہت سی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

رسول اللہؐ نے معاذ بن جبلؓ سے پوچھا کہ تمہارے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو تو فیصلہ کیسے کرو گے؟ جواب دیا کہ قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ رسول اکرمؐ نے سوال کیا کہ اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملا تو پھر کیا کرو گے؟ جواب دیا کہ آپؐ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ نبی کریمؐ نے پھر دریافت کیا کہ اگر میری سنت میں بھی کوئی حکم نہ ملا تو پھر کیا

کرو گے؟ جواب دیا کہ پھر میں اپنی طرف سے کوشش (اجتہاد) کروں گا اور صحیح فیصلہ تک پہنچنے میں کوئی کوتاہی روا نہیں رکھوں گا۔ اس پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر حضرت معاذ بن جبلؓ کے جواب کی توثیق و تصویب فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے نمائندہ کو اسی بات کی توفیق عطا فرمائی ہے جس کو اللہ تعالیٰ خود پسند فرماتے ہیں۔ تو گویا آنحضرتؐ نے اہل علم کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن کریم اور سنت رسولؐ کا حکم واضح نہ ہو اس میں وہ اپنے علم کی بنیاد پر رائے قائم کریں اور اس کے مطابق فیصلہ دے دیں۔

اجتہاد خود جناب نبی اکرمؐ بھی کیا کرتے تھے کہ اگر کسی مسئلہ میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی اور فیصلہ کرنا ضروری ہو جاتا تو اپنی صوابدید پر فیصلہ فرما دیا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ وحی جاری تھی اور بعض فیصلوں پر اللہ رب العزت کی طرف سے گرفت بھی ہو جاتی تھی جن میں سے کچھ کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، اس لیے رسول اللہؐ کے کسی اجتہادی فیصلہ کے بعد اس کے خلاف وحی نازل نہ ہونے کی صورت میں بارگاہ ایزدی سے اس کی توثیق و تصدیق ہو جاتی تھی۔ اور اس خاموش توثیق کے ساتھ حضورؐ کے فیصلوں کو وحی کی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی اور اسی وجہ سے حدیث و سنت کو ''وحی حکمی'' شمار کیا جاتا ہے۔

حضرات صحابہ کرامؓ کا معمول یہ تھا کہ قرآن کریم اور سنت نبویؐ میں کوئی فیصلہ واضح نہ ہوتا تو وہ اجتہاد کرتے تھے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ میں ایسے بزرگوں کی بڑی تعداد موجود تھی جو اجتہاد کر کے فتویٰ دیتے تھے اور ان کا فتویٰ تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ کتاب اللہ میں اس کا حکم تلاش کرتے تھے اور اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے تھے۔ اگر کتاب اللہ میں حکم نہ ملتا تو رسول اللہؐ کی سنت میں حکم معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر انہیں خود کوئی ایسی سنت یاد نہ ہوتی تو صحابہ کرامؓ سے دریافت کرتے تھے کہ انہیں اس کے بارے میں رسول اللہؐ کا کوئی ارشاد معلوم ہو تو بتائیں۔ اور اس طرح کوشش کے بعد بھی اگر رسول اکرمؐ کا کوئی فیصلہ نہ ملتا تو پھر سرکردہ اور صالح افراد کو جمع کر کے مشورہ کرتے تھے اور اس کی روشنی میں فیصلہ فرما دیتے تھے۔

صحابہ کرامؓ چونکہ براہ راست درسگاہ نبویؐ سے فیض یافتہ تھے اس لیے ان کے دور میں اس سلسلہ میں کوئی اصول وضع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ البتہ صحابہ کرامؓ نے اس بارے میں اپنے طرز عمل کے ساتھ ایسے اصول قائم کر دیے تھے جو بعد میں مجتہدین کے لیے راہنما بن گئے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ نے ''السنن الکبری'' میں بیان کیا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ کسی معاملہ میں فیصلہ کرتے وقت اگر قرآن و سنت سے کوئی حکم نہ ملتا تو حضرت ابوبکر کا کوئی فیصلہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اگر ان کا بھی متعلقہ مسئلہ میں کوئی فیصلہ نہ ملتا تو پھر خود فیصلہ صادر کرتے تھے۔ اور امام بیہقیؒ نے ہی حضرت ابو موسی اشعریؓ کے نام حضرت عمر بن الخطابؓ کا یہ خط بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے امیر المومنین کی حیثیت سے تحریر فرمایا تھا کہ:

> ''جس معاملہ میں قرآن و سنت کا کوئی فیصلہ نہ ملے اور دل میں خلجان ہو تو اچھی طرح سوچ سمجھ سے کام لو اور اس جیسے فیصلے تلاش کر کے ان پر قیاس کرو، اور اللہ تعالی کی رضا اور صحیح بات تک پہنچنے کا عزم رکھو۔''

اسی طرح امام بیہقیؒ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ایک خطبہ کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ تمہارے پاس جو معاملہ درپیش ہو اور اس میں قرآن اور سنت نبویؐ کا کوئی فیصلہ نہ ملے تو یہ دیکھو کہ اس سے پہلے نیک بندوں نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ اور فیصلہ نہ ملے تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کرو۔

چنانچہ ان اکابر صحابہؓ کے ارشادات اور فیصلوں کی روشنی میں اجتہاد کے راہنما اصول یہ ہیں:

- قرآن کریم یا سنت رسولؐ کا حکم جس مسئلہ میں واضح ہے اس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔
- قرآن و سنت میں واضح حکم نہ ملے تو سابقہ مجتہدین اور صالحین کے فیصلوں کی پیروی کی جائے۔
- سابقہ مجتہدین اور صالحین کا بھی کوئی فیصلہ نہ ملے تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا جائے۔
- اپنی رائے سے اجتہاد کا معنی یہ نہیں کہ جیسے چاہے رائے قائم کر لی جائے۔ بلکہ قرآن کریم، سنت نبویؐ، اور ماضی کے مجتہدین کے فیصلوں میں زیر

بحث مسئلہ سے ملتے جلتے مسائل و معاملات تلاش کیے جائیں اور ان پر قیاس کر کے نئے مسائل میں فیصلے کیے جائیں۔

صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین کا دور آیا تو "اجتہاد" کے لیے باقاعدہ اصول و ضوابط وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی اور مذکورہ "راہنما اصولوں" کی روشنی میں بیسیوں مجتہدین نے قواعد و ضوابط مرتب کر کے ان کے مطابق اجتہادی کاوشوں کا آغاز کیا۔ تابعین میں سے حضرت امام ابوحنیفہؒ، تبع تابعین میں سے حضرت امام مالکؒ اور ان کے بعد حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے وضع کردہ اصولوں کو امت میں قبولیت عامہ حاصل ہوئی اور ان کی بنیاد پر فقہی مکاتب فکر تشکیل پائے۔ ان مجتہدین نے صحابہ کرامؓ کے حوالہ سے مذکورہ بالا راہنما اصولوں کے ساتھ ایک اور اہم اصول کا اضافہ کیا جو اس عمل کا فطری اور منطقی تقاضا تھا کہ اجتہاد کا حق ہر شخص کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ وہی شخص یہ حق استعمال کر سکے گا جس کو قرآن کریم پر، سنت رسولؐ پر، عربی زبان پر، اور ماضی کے اجتہادات پر مکمل عبور حاصل ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر اجتہاد کے دائرے کو ملحوظ رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں ہو گا۔

چنانچہ یہ اجتہاد اور اس کے دائرہ و استحقاق کا ایک ابتدائی تعارف ہے جس سے قارئین اجتہاد کی ضرورت اور اس کی نوعیت کے بارے میں کسی حد تک واقف ہو جائیں گے۔ البتہ ایک اہم سوال باقی ہے کہ کیا آج کے دور میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے؟ اس پر پھر کسی وقت گزارشات پیش کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وحی کی ضرورت اور اس کی حقیقت و ماہیت

(جامعہ اسلامیہ، صدر، راولپنڈی - ۱۰ مارچ ۱۹۹۹ء)

(۱۰ مارچ ۱۹۹۹ء کو جامعہ اسلامیہ (کشمیر روڈ، راولپنڈی صدر) میں بخاری شریف کے سبق کے آغاز پر ایک باوقار تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں راولپنڈی اور اسلام آباد کے علمائے کرام اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ بہت سے دیگر شہریوں نے بھی شرکت کی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا حسن جان مدظلہ نے بخاری شریف کی پہلی حدیث کا درس دے کر سبق کا آغاز فرمایا جبکہ ان کے علاوہ شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد السلام، حضرت مولانا قاری

سعید الرحمان، اور مدیر الشریعہ مولانا زاہد الراشدی نے بھی شرکاء سے خطاب کیا۔
مولانا راشدی کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ حضرات علمائے کرام، محترم بزرگو، دوستو اور عزیز طلبہ! حضرت مولانا قاری سعید الرحمان صاحب نے مجھے اور آپ دونوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا حسن جان مدظلہ کے خطاب کے بعد اور شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ مدظلہ کے خطاب سے پہلے مجھے حکم دیا ہے کہ بخاری شریف کے سبق کے افتتاح کی اس تقریب میں آپ حضرات کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کروں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان دو بزرگوں کے درمیان مجھ جیسا طالب علم کیا بات کرے گا۔ البتہ ایک بات ذہن میں آئی ہے جس سے کچھ حوصلہ ہوا ہے، وہ یہ کہ فقہائے کرامؒ نے زکوۃ کے نصاب کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر وہ سال کے آغاز اور اختتام پر مکمل ہے تو درمیان میں کسی وقت اس میں کمی بھی ہو جائے تو اس کمی کا اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے یہ سوچ کر آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا ہوں کہ گفتگو کا آغاز حضرت مولانا حسن جان صاحب نے کیا ہے اور اختتام اور دعا حضرت مولانا شیر علی شاہ صاحب فرمائیں گے، اگر درمیان میں مجھ جیسے طالب علم کی کمزور باتیں بھی ہو جائیں تو تقریب کا نصاب بہر حال متاثر نہیں ہوگا۔

حضرات محترم! امام بخاریؒ نے اپنی عظیم المرتبت کتاب کا آغاز ”بدء الوحی“ سے کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز کیسے ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے حضرت مولانا حسن جان نے وحی کے حوالہ سے گفتگو فرمائی ہے اور میں بھی وحی کے بارے میں ہی کچھ طالب علمانہ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔ اول یہ کہ وحی کی ضرورت کیا ہے؟ دوسری یہ کہ وحی کی ماہیت کیا ہے؟ اور تیسری یہ کہ بخاری شریف جس علم کی کتاب ہے یعنی حدیث نبویؐ، اس علم کا وحی کے ساتھ تعلق کیا ہے۔

وحی کی ضرورت کیا ہے؟

جہاں تک وحی کی ضرورت کا تعلق ہے اس کے بارے میں اتنی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا رضی اللہ عنہا یعنی نسل انسانی کے ماں باپ کو زمین پر اتارا تھا تو اترنے کے حکم کے ساتھ ہی ایک ہدایت کی تھی کہ:

> ”زمین پر اتر جاؤ! وہاں میری طرف سے ہدایات آتی رہیں گی، جس نے ان ہدایات کی پیروی کی وہ غم اور خوف سے نجات پائے گا اور جس نے انہیں جھٹلا دیا وہ

جہنم میں جائے گا۔“ (سورہ البقرہ)

زمین ہمارا آبائی وطن نہیں ہے، ہمارا آبائی وطن جنت ہے جہاں ماں اور باپ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو پیدا کیا گیا۔ زمین میں ہم عارضی طور پر امتحان کے لیے آئے ہیں اور امتحانی عرصہ گزارنے کے بعد ہم نے اس زمین سے واپس چلے جانا ہے۔ البتہ واپس اصلی گھر یعنی جنت میں ان لوگوں کو جانا نصیب ہو گا جو زمین میں اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے امتحان میں کامیاب ہوں گے، اور جو لوگ ان ہدایات سے انکار کر دیں گے اور امتحان میں ناکام ثابت ہوں گے وہ واپس اصلی گھر میں نہیں جائیں گے بلکہ دوسرے گھر یعنی دوزخ میں جانا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے پہلے دو افراد کو زمین پر اتارتے ہی کہہ دیا تھا کہ انسانی آبادی زمین پر اپنی مرضی میں آزاد نہیں ہو گی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایات کی پابند ہو گی۔ یہ ہدایات حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوئیں۔ ان ہدایات کا نام وحی ہے اور یہ زمین پر نسل انسانی کے لیے خدائی دستور ہے۔

حضرت امام بخاریؒ نے وحی سے کتاب کا آغاز کیا ہے اور اس کے بعد ایمان، علم اور اعمال کے ابواب لائے ہیں۔ اس طرح انہوں نے یہ بتا دیا ہے کہ ہمارے ہاں ایمان ویقین اور علم و عمل سمیت ہر چیز کی بنیاد وحیٔ الٰہی ہے اور ہم ہر معاملہ میں وحیٔ الٰہی کی راہنمائی حاصل کرنے کے پابند ہیں۔ اور اگر آپ غور فرمائیں تو یہ آج کی انسانی سوسائٹی کا سب سے بڑا مسئلہ بھی ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحیٔ الٰہی سے بغاوت کے بعد انسانی سوسائٹی نے جو کئی صدیاں گزاری ہیں اور اپنے مسائل خود حل کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ناکامی کے بعد نسل انسانی کو آج پھر وحیٔ الٰہی کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انسانی سوسائٹی اپنی حکمران خود ہے اور اسے اپنے معاملات طے کرنے کے لیے باہر سے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ آج دنیا بھر میں یہی گمراہی مسلط ہے مگر امام بخاریؒ نے ”بدء الوحی“ سے کتاب کا آغاز کر کے اس تصور کو رد کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر معاملہ میں وحیٔ الٰہی کی راہنمائی کی ضرورت ہے اور آسمانی تعلیمات کی پیروی کے بغیر انسانی معاشرہ دنیا یا آخرت کسی جگہ میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

وحی کی ماہیت کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ وحی کی ماہیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وحی انسان کی اپنی کسی تخلیقی صلاحیت کا ثمرہ ہے یا واقعتا باہر سے اسے ہدایات ملتی ہیں؟ آج کل عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وحی کا کوئی خارجی وجود نہیں بلکہ بعض انسانوں میں مخصوص قسم کی تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے اور اس صلاحیت کی بنیاد پر وہ جو سوچتے اور کہتے ہیں اس کا نام وحی ہے۔ یہ بات سرسید احمد خان نے لکھی ہے اور آج کی فکری گمراہیوں کا سب سے بڑا سرچشمہ یہی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وحی کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے بلکہ شعر و شاعری طرز کی تخلیقی صلاحیت حضرات انبیائے کرامؑ کو ودیعت ہوئی تھی، اس حوالہ سے ان پر خاص کیفیت وارد ہوتی تھی، اس کیفیت کا نام جبرئیلؑ ہے اور اس کیفیت میں ان کی زبان سے صادر ہونے والے کلام کا نام وحی ہے۔ اس طرح نہ حضرت جبریل علیہ السلام کا کوئی خارجی وجود ہے اور نہ ہی وحی کوئی باہر سے آنے والی ہدایت ہے۔

آج جب کوئی دانشور جناب رسول اکرمؐ کو خراج عقیدت پیش کرنے اور محبت کے اظہار کے ساتھ آپؐ کی ہدایات کی تعریف کرتا ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بہت اچھی تھیں مگر آج کے زمانہ کے لیے نہیں تھیں، اب زمانہ بدل گیا ہے اس لیے بہت سی اصلاحات کی ضرورت ہے، تو اس کے پس منظر میں یہی فکری کجی کارفرما ہوتی ہے کہ وحی خود جناب نبی اکرمؐ کی سوچ اور تخلیقی صلاحیت کا ثمرہ ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اصل واقعہ یہ ہے کہ وحی باہر سے آنے والی ہدایات کا نام ہے جسے بھیجنے والا اللہ تعالیٰ ہے، لانے والے حضرت جبرئیلؑ ہیں، اور وہ حضرات انبیائے کرامؑ پر نازل ہوئی ہے۔ اس لیے وحی داخلی کیفیات کا نام نہیں ہے بلکہ خارجی ہدایات کا ذریعہ ہے۔

کم و بیش یہی بات قادیانی کہتے ہیں مگر اور انداز سے۔ ان کا کہنا ہے کہ نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی چیز ہے، یعنی کوئی شخص خود بھی ترقی اور محنت کر کے نبوت کے منصب تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کیونکہ نبوت خالصتاً وہبی منصب ہے جسے خود اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے عطا فرماتے ہیں اور وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی ہدایات کا نام ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو چکی ہیں اور آپؐ کے بعد نبوت اور وحی کا دروازہ قیامت تک کے لیے بند ہو چکا ہے۔

وحی کا حدیث و سنت کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

تیسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث و سنت کا وحی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس پر بہت کچھ عرض کیا جا سکتا ہے مگر اس موقع پر مختصراً صرف اتنی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث و سنت بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ اور یہ قرآن کریم کا بیان اور اس کی شرح ہے جو جناب نبی اکرمؐ نے اللہ تعالیٰ کے رسول اور نمائندہ کی حیثیت سے فرمائی ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی مستند اور ''سرکاری'' تشریح یہی ہے۔ اس پر تفصیلات میں جانے کی بجائے ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں جو خود امام بخاریؒ نے اس کتاب میں نقل کیا ہے کہ جناب نبی کریمؐ کے جلیل القدر صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کوفہ کی جامع مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ ایک درس میں انہوں نے عورتوں کے بارے میں مسائل بیان کرتے ہوئے آنحضرتؐ کا یہ ارشاد نقل کر دیا کہ:

> ''جسم پر نام گڈوانے والی، بال اکھاڑنے والی اور ریتی سے دانت رگڑ کر ان کو چھوٹا کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے''۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق کوفہ کی ایک خاتون ام یعقوبؒ نے یہ بات سنی تو وہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس آئی اور پوچھا کہ کیا آپ نے یہ بات فرمائی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں میں نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے۔ اس پر خاتون نے سوال کیا کہ کیا یہ قرآن میں ہے؟ اس کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ جب لعنت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو اس کا ذکر قرآن کریم میں ہونا چاہیے، اس لیے اس نے یہ سوال کر دیا۔ حضرت عبد الہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ ہاں قرآن کریم میں یہ بات موجود ہے۔ اس پر خاتون نے تعجب اور حیرت کے ساتھ پوچھا کہ قرآن کریم تو میں نے بھی پڑھا ہے اس میں کہیں یہ مسئلہ موجود نہیں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحشر میں فرمایا ہے کہ ''اللہ کے رسول تمہیں جس کام کے کرنے کا حکم دیں وہ کرو اور جس کام سے روکیں اس سے رک جاؤ''۔ اور جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جسم پر نام گدوانے والی، بال اکھاڑنے والی اور دانت رگڑ کر چھوٹے کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔'' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دراصل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جناب نبی اکرمؐ جب اللہ تعالیٰ کے رسول اور نمائندہ ہیں تو اصول یہ ہے کہ نمائندہ کی کوئی بات اپنی نہیں ہوتی بلکہ وہ نمائندہ کی حیثیت سے جو کچھ بھی کہتا ہے وہ اسی

کی طرف سے ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمادیا کہ میرا رسول جس کام کے کرنے کا حکم دے وہ کرو اور جس کام سے روکے اس سے رک جاؤ تو اس اصول کے تحت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی فرمایا ہے اور جو کچھ بھی کہا ہے وہ قرآنی تعلیمات کا ہی حصہ ہے اور اسے قرآن کریم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کم ہے اس لیے انہی گزارشات پر اکتفا کرتا ہوں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اسلام میں سوشل ورک کی اہمیت

(سوشل ویلفیئر سوسائٹی، کنڈن سیان، سیالکوٹ - ۱۷ جنوری ۱۹۹۹ء)

(اس سال ۲۹ رمضان المبارک کو ضلع سیالکوٹ کے قصبہ کنڈن سیان میں نوجوانوں کی ایک رفاہی تنظیم "سوشل ویلفیئر سوسائٹی" نے افطار پارٹی کے عنوان سے تقریب منعقد کی جس میں علاقہ بھر سے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کے مہمان خصوصی پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی تھے اور انہوں نے اس موقع پر "اسلام میں سوشل ورک کی اہمیت" کے موضوع پر خطاب کیا، ان کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سب سے پہلے سوشل ویلفیئر سوسائٹی کنڈن سیان کے نوجوانوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس تقریب کا اہتمام کیا اور آپ حضرات سے ملاقات اور گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں اور کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

سوشل ورک یا انسانی خدمت اور معاشرہ کے غریب و نادار لوگوں کے کام آنا بہت بڑی نیکی ہے اور اسلام نے اس کی تعلیم دی ہے۔ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے اور آپؐ نے دکھی انسانیت کی خدمت اور نادار لوگوں کا ہاتھ بٹانے کا بڑا اجر و ثواب بیان فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ آقائے نامدارؐ پر وحی نازل ہونے کے بعد آپؐ کا پہلا تعارف ہمارے سامنے اسی حوالہ سے آیا ہے کہ آپؐ نادار اور مستحق لوگوں کی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ

آنحضرتؐ کا معمول یہ تھا کہ چند دن کی خوراک اور پانی لے کر غار حرا میں چلے جاتے تھے اور سب لوگوں سے الگ تھلگ اللہ تعالی کی بندگی میں مصروف رہتے تھے۔ ایک دن وہیں غار میں وحی کے آغاز کا واقعہ پیش آگیا، حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور اللہ تعالی کی طرف سے آپؐ کو قرآن کریم کی پہلی آیات سنائیں۔ اس واقعہ کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ آپ نے کئی بار سن رکھا ہوگا اور آپ کے ذہن میں ہوگا۔ اچانک یہ واقعہ ہوا، اس سے قبل اس قسم کی بات کبھی نہیں ہوئی تھی اس لیے جناب نبی کریمؐ پر گھبراہٹ کا طاری ہونا فطری بات تھی۔

آپؐ گھر تشریف لائے، چادر اوڑھی اور لیٹ گئے۔ اہلیہ محترمہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا دانا و بینا خاتون تھیں، پریشانی بھانپ گئیں، پوچھا تو آنحضرتؐ نے سارا واقعہ بیان کر دیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ''خشیت علی نفسی'' مجھے اپنے بارے میں ڈر لگ رہا ہے۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی اور کہا کہ خدا کی قسم اللہ تعالی آپ کو غمزدہ نہیں کرے گا۔ اور انہوں نے اپنے دعوی پر جو دلیل دی وہ یہ تھی کہ ''آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں، لوگوں کی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور بے سہارا لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔'' گویا ام المؤمنین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ جو لوگ انسانی سوسائٹی میں دوسروں کے کام آنے والے ہوں اللہ تعالی انہیں غمزدہ اور پریشان نہیں کیا کرتا۔

اس طرح پہلی وحی نازل ہونے کے بعد احادیث کے ذخیرہ میں نبی کریمؐ کا جو سب سے پہلا تعارف ہمارے سامنے آتا ہے وہ ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ بہت بڑے سوشل ورکر تھے اور دکھی انسانیت کی خدمت آپؐ کی سب سے پہلی سنت مبارکہ ہے۔

یہ اللہ تعالی کی حکمت ہے کہ جناب رسول اکرمؐ کے سب سے بڑے ساتھی اور خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تعارف بھی احادیث میں انہی الفاظ کے ساتھ ملتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں آنحضرتؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے خلاف قریش کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے اور انہیں مزید برداشت کرنے کی تاب نہ رہی تو بہت سے صحابہ کرامؓ حضورؐ سے اجازت لے کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے جن میں حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت

جعفر طیارؓ بھی تھے۔ انہی دنوں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بھی اس قسم کی صورتحال پیش آئی کہ آپ اپنے گھر کے صحن میں قرآن کریم پڑھا کرتے تھے اور ارد گرد کے بچے اور عورتیں اسے سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ اس پر محلہ کے بڑے لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو منع کر دیا کہ اگر قرآن کریم پڑھنا ہو تو کمرے میں بند ہو کر پڑھیں کھلے صحن میں نہ پڑھا کریں کیونکہ اس سے ہماری عورتیں اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ اس سے دلبرداشتہ ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہجرت کی اجازت چاہی کہ جہاں اپنے گھر کے صحن میں بھی قرآن کریم پڑھنے کی اجازت نہ ہو وہاں رہنے کا کیا فائدہ ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر سے ضروری سامان اٹھا کر ہجرت کے ارادے سے مکہ مکرمہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں قبیلہ بنو قارہ کا سردار ابن الدغنہ ملا، اس نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا کہ اب ظلم و صبر کی انتہا ہو گئی ہے اور میں ہجرت کے ارادے سے شہر چھوڑ کر کہیں اور جا رہا ہوں۔ اس کافر سردار نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا اور میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ اس موقع پر اس نے کہا کہ آپ جیسے شخص کا شہر سے چلے جانا شہر کے لوگوں کے لیے اچھی علامت نہیں ہے اور پھر حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں وہی بات کہی جو ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ نے غار حرا سے واپسی پر جناب نبی اکرمؐ سے کہی تھی کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، معذوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور لوگوں کی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ چنانچہ کافروں کے قبیلہ بنو قارہ کا سردار ابن الدغنہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ واپس مکہ لے آیا اور خانہ کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ ابوبکرؓ آج کے بعد میری امان میں ہیں کوئی ان کو تنگ نہ کرے۔

گویا جناب رسول اکرمؐ اور ان کے ساتھ خلیفہ حضرت ابوبکرؓ دونوں کا مزاج و طبیعت ایک تھے اور دونوں کی عادات و اخلاق یکساں تھے۔ اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اسلام میں نبوت اور خلافت دونوں کا مزاج ”سوشل ورک“ کا مزاج ہے اور دونوں کی معاشرتی بنیاد سماجی خدمت پر ہے۔ اس حوالہ سے میں نوجوانوں سے بطور خاص عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسابقت، معاصرت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ فطری جذبہ ہے اور اسلام نے انسان کے کسی فطری جذبے کی نفی نہیں کی اور کسی طبعی ضرورت سے انکار

نہیں کیا۔ البتہ ہر جذبہ اور ضرورت کا رخ متعیّن کر دیا ہے اور اسے منفی کی بجائے مثبت میدان میں آگے بڑھنے کی ترغیب دی ہے۔ آج کل ہمارے ہاں بھی مسابقت کا جذبہ کار فرما ہے لیکن اس کا میدان اور ہے۔ اس کا اظہار دولت کے جمع کرنے میں ہوتا ہے، بلڈنگوں کی تعمیر میں ہوتا ہے، اقتدار کے حصول میں ہوتا ہے اور جماعتوں، گروہوں اور جتھوں کے قیام میں ہوتا ہے۔ جبکہ یہی مسابقت کا جذبہ صحابہ کرامؓ میں تھا تو اس کا میدان اور تھا۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے جس سے کوئی انسان خالی نہیں ہے مگر اس کا صحیح میدان وہ ہے جو صحابہ کرامؓ نے پیش کیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات آسمان صاف تھا، چاند نہیں تھا، ستارے ہر طرف جگمگا رہے تھے، ان گنت ستاروں کا ہجوم دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھوں کہ کیا کوئی خوش نصیب انسان ایسا بھی ہے جس کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کی طرح ان گنت ہوں۔ فرماتی ہیں کہ جی میں یہ تھا کہ اس سوال کے جواب میں میرے والد محترم (حضرت ابو بکرؓ) کا نام ہی آسکتا ہے لیکن حضورؐ سے یہ سوال کیا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں ایسا خوش نصیب شخص ہے اور وہ عمر بن الخطابؓ ہے۔ حضرت عائشہؓ توقع کے خلاف جواب سن کر چونک اٹھیں اور بے ساختہ دوسرا سوال کر دیا کہ ”و ابی یا رسول اللہ؟“ اللہ کے رسول میرے والد محترم کہاں گئے؟ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ! تم ابو بکرؓ کی نیکیوں کی بات کرتی ہو، بخدا عمرؓ کی ساری زندگی کی نیکیاں ایک طرف مگر ابو بکرؓ کی غار کی رات والی نیکی ان سب پر بھاری ہے جو انہوں نے ہجرت میں میرے ساتھ وقت گزارا۔

چنانچہ حضرات صحابہ کرامؓ میں مقابلہ اور مسابقت کا میدان نیکیوں کا تھا اور وہ اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ساری زندگی یہ حسرت رہی کہ نیکیوں میں حضرت ابو بکرؓ سے آگے بڑھوں مگر دو واقعات نے مجھے اس حسرت کے پورا ہونے سے مایوس کر دیا اور میرے دل نے گواہی دی کہ اس شیخ سے آگے بڑھنا میرے بس میں نہیں ہے۔ ایک واقعہ تبوک کے غزوہ کا بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریمؐ نے غزوہ کے لیے صحابہ کرامؓ سے زیادہ سے زیادہ چندہ لانے کے لیے کہا تو حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ان دنوں میری حالت حضرت ابو بکرؓ سے اچھی تھی اور میں خوش تھا کہ آج میں سبقت حاصل کر لوں گا۔

چنانچہ خوشی خوشی گھر گیا اور جو کچھ بھی گھر میں موجود تھا، نقدی، سامان، غلہ، کھجوریں وغیرہ سب آدھا آدھا کیا۔ نصف سامان گھر میں چھوڑا اور نصف سامان باندھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ادھر سے حضرت ابوبکرؓ بھی ایک گٹھڑی اٹھائے آ گئے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ آپ کیا لائے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے بتایا کہ جو کچھ گھر میں تھا نصف نصف کر کے آدھا گھر میں چھوڑ آیا ہوں اور آدھا آپؐ کی خدمت میں لے آیا ہوں۔ اور پھر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! جو کچھ گھر میں تھا اٹھا کر لے آیا ہوں اور گھر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے نام کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میرے دل میں چوٹ سی لگی اور دل نے گواہی دی کہ عمرؓ! اس شیخ سے نیکی میں آگے بڑھنا مشکل ہے۔

دوسرا واقعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے دور کا بیان کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا کہنا ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک ضعیف اور بے سہارا خاتون تھی، ایک کٹیا میں رہتی تھی اور انتہائی ضعیف اور نابینا تھی۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ اس خاتون کی تھوڑی بہت خدمت کرنی چاہیے۔ ایک روز صبح نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر اس خیال سے کٹیا کی طرف گیا کہ اس بڑھیا کی کٹیا کی صفائی کر دوں گا، پانی کا برتن بھر کر رکھ دوں گا اور کچھ کھانے پینے کی چیز دے آؤں گا۔ وہاں پہنچا، بڑھیا سے سلام عرض کیا اور کہا کہ میں مدینہ منورہ کا باشندہ ہوں اور اس خیال سے آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ بیٹا تم سے پہلے ایک شخص آیا تھا، وہ روزانہ آتا ہے اور یہ سارے کام کر جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگلے روز میں ذرا جلدی گیا تاکہ یہ دیکھوں کہ وہ شخص کون ہے؟ دیکھا کہ ایک شخص منہ لپیٹے ہوئے پانی کا گھڑا بڑھیا کی کٹیا میں رکھ کر باہر آ رہا ہے۔ قریب ہو کر معلوم کیا تو وہ خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو صبح سویرے مدینہ منورہ کی ایک بے سہارا، معذور اور ضعیف بڑھیا کی خدمت گزاری کے فرض سے عہدہ برآ ہو رہے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس روز تو میرے دل نے یہ فیصلہ دے دیا کہ یہ مقابلہ میرے بس کی بات نہیں اور اس شیخ سے نیکیوں میں آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

میں سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے نوجوانوں سے عرض کروں گا کہ باہم مقابلہ اور مسابقت کا اصل میدان یہ ہے۔ اس لیے نیکیوں میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور معاشرہ کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی بڑھ چڑھ کر خدمت کریں۔ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی سنت ہے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کا حصہ ہے۔ ابھی مجھ سے پہلے ایک نوجوان نے خطاب کرتے ہوئے یہ ذکر کیا ہے کہ سوشل ورک کا سب سے بڑا کام لوگوں کو گمراہی سے نکالنا ہے اور ہدایت کے راستے پر لانا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ جناب نبی اکرمؐ کا سب سے بڑا مشن یہی تھا کہ نسل انسانی کو راہ راست پر لایا جائے اور جہنم سے انسانوں کو بچانے کی کوشش کی جائے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم میں حضورؐ کی اس خواہش کو ”حرص“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو کسی خواہش کا آخری اور انتہائی درجہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”حریص علیکم“ نبی اکرمؐ تمہارے ایمان لانے اور ہدایت پانے پر حریص ہیں۔ اور خود آنحضرتؐ نے اپنی مثال یوں دی ہے کہ جیسے اندھوں کا ایک بڑا گروہ ایک طرف کو جا رہا ہو اور ادھر بہت بڑا گڑھا ہو جس میں آگ جل رہی ہو جبکہ ایک بینا شخص اس منظر کو دیکھ رہا ہو، اب اس سے برداشت نہیں ہو گا اور وہ آوازیں دے گا، شور مچائے گا اور قریب آکر ان اندھوں کو گڑھے کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہی ہے، تم لوگوں کو جہنم کا گڑھا نظر نہیں آرہا اور تم سب اس کی طرف بھاگے جا رہے ہو، مجھے وہ گڑھا دکھائی دے رہا ہے اور تمہارا اس کی طرف دوڑے چلے جانا بھی نظر آرہا ہے اس لیے میں تمہیں آوازیں دے رہا ہوں اور میری ہر ممکن کوشش ہے کہ کوئی شخص اس گڑھے میں نہ گرنے پائے۔

البتہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اس کا تکوینی فیصلہ ہے کہ ہدایت دینے کا اختیار اس نے اپنے پاس رکھا ہے کہ جس کو چاہے ہدایت دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اگر ہدایت کا یہ اختیار اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیتا تو حضور علیہ السلام کے زمانے کا تو کوئی ایک انسان بھی جہنم میں نہ جاتا اور آپؐ کم از کم اپنے دور کے ہر انسان کو ہدایت کے دائرے میں ضرور لے آتے۔ اس لیے میں نوجوانوں سے عرض کرتا ہوں کہ لوگوں کی راہنمائی کرنا، انہیں ایمان کے راستے پر لانا، کفر اور گمراہی سے بچانا اور نیک اعمال کی ترغیب دے کر اچھے مسلمان بنانا بھی جناب رسول اکرمؐ کا مشن ہے، اور دکھی انسانیت کی خدمت کرنا، نادار لوگوں کے کام آنا، لوگوں کی مشکلات اور مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا اور بے سہارا لوگوں کا سہارا بننا بھی سنت نبویؐ ہے۔ یہ سب سوشل ویلفیئر کے کام ہیں اور ان میں سے جس شعبہ میں بھی موقع مل جائے اس میں کام کرنا ہم سب کے

لیے سعادت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

اعمال کی سزا و جزا کا اسلامی تصور

(جامعہ قاسمیہ، قاسم ٹاؤن، گوجرانوالہ - ۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء)

(مولانا زاہد الراشدی کا سالہا سال سے معمول ہے کہ رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو نماز فجر کے بعد جامعہ قاسمیہ (قاسم ٹاؤن، گوجرانوالہ) میں قرآن کریم کا درس دیتے ہیں، اس سال کے درس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۲۳ تلاوت کی ہے جس کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا ارشاد گرامی ہے کہ اس میں اعمال کی سزا اور جزا کے حوالہ سے مشرکین مکہ اور اہل کتاب کے خیالات کا رد کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ اعمال کے بدلے کے بارے میں نہ تو مشرکین کی آرزوئیں پوری ہوں گی اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کا لحاظ رکھا جائے گا بلکہ جو شخص بھی کوئی برا عمل کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا اور ہر شخص کو اپنے اعمال کی سزا خود بھگتنا ہوگی۔

اہل کتاب میں سے یہود کا کہنا یہ تھا کہ وہ خدا کے پیارے ہیں۔ پہلے انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں، پھر آہستہ آہستہ اس بات پر آگئے کہ ”نحن ابناء اللہ واحباءہ“ کہ ہم خود خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہم انبیاء کرامؑ کی اولاد ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ہمیں جہنم نہیں بھیجیں گے اور اگر کوئی ضابطہ پورا کرنے کے لیے بھیجا بھی گیا تو گنتی کے چند دن ہم جہنم میں رہیں گے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں چلے جائیں گے۔ انہیں اس بات پر گھمنڈ تھا کہ وہ انبیاء کرامؑ کی اولاد ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہا جاتا ہے جن کی نسل میں بڑی تعداد میں پیغمبر آئے اور چار بڑی آسمانی کتابوں میں سے تین یعنی تورات، زبور اور انجیل بھی انہی کی اولاد میں نازل ہوئیں۔ اس لیے بنی اسرائیل اس خوش فہمی کا شکار ہوگئے کہ اس بڑی نسبت کی وجہ سے وہ جہنم سے بچ جائیں گے اور انہیں بداعمالیوں کی کوئی بڑی سزا نہیں بھگتنا پڑے گی۔

دوسری طرف عیسائیوں نے کفارے کا عقیدہ اختیار کر لیا کہ ہر انسانی پیدائشی گنہگار ہے اس لیے وہ نہ تو گناہ سے بچ سکتا ہے اور نہ ہی اس سے پاک ہو سکتا ہے، البتہ حضرت عیسی علیہ السلام عیسائیوں کے بقول سولی پر چڑھ گئے اور نے اس طرح نسل انسانی کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اب جو شخص صلیب کے سائے میں آجائے گا یعنی عیسائی ہو جائے گا وہ اس کفارہ میں شمولیت کا مستحق ہو گا اور اس کی برکت سے گناہوں سے پاک ہو جائے گا، اور جو شخص اس دائرہ میں نہیں آئے گا جیسا گنہگار پیدا ہوا ہے ویسا ہی گنہگار مر جائے گا اور اسے گناہوں سے کسی صورت میں نجات حاصل نہیں ہو گی۔ اب انہیں دیکھیے کہ انہوں نے اپنے گناہوں کے عوض اللہ تعالی کے معصوم پیغمبر حضرت عیسیؑ کو بزعم خود سولی پر چڑھا دیا کہ گناہ یہ کریں اور سزا حضرت عیسی بھگتیں۔ ویسے حضرت عیسی علیہ السلام کے سولی پر چڑھنے کا عقیدہ عیسائیوں کا ہے ہمارا نہیں ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نہ سولی چڑھے ہیں اور نہ اب تک ان پر موت وارد ہوئی ہے، وہ زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے تھے، اب بھی زندہ ہیں اور قیامت سے پہلے دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔ مگر عیسائیوں کے عقیدے کی داد دیں کہ اپنے گناہوں کی سزا پیغمبر کو دے رہے ہیں اور انہیں سولی پر چڑھا کر خوش ہیں کہ وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ بن گئے ہیں۔

تیسری طرف مشرکین مکہ کو اس بات کا یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ وہ بار بار پوچھتے تھے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے، خاک میں مل جائیں گے، راکھ بن جائیں گے تو پھر دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے؟ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے متعدّد مقامات پر مشرکین کے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ جس ذات نے تمہیں پہلے پیدا کیا ہے اور پانی کے ایک قطرے سے تمہارا وجود بنایا ہے بلکہ عدم سے وجود میں لایا ہے اس کے لیے دوبارہ اٹھانا مشکل نہیں ہے، جو پہلے پیدا کر سکتا ہے وہ دوبارہ بھی تمہارے بکھرے ہوئے اجزا کو مجتمع کر کے زندگی دے سکتا ہے، حتی کہ ایک مقام پر اللہ تعالی نے یہ فرمایا کہ ”افعیینا بالخلق الاول“ کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں؟ تو مشرکین کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کی کوئی حقیقت نہیں ہے اس لیے زندگی یہی دنیا کی زندگی ہے اس میں جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔

اللہ تعالی نے اس آیت کریمہ میں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے ان تینوں فلسفوں کو رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ نہ کسی نسبت کی وجہ سے گناہوں سے چھٹکارا ملے گا، نہ کی

دوسرے کا کوئی کفارہ کام آئے گا اور نہ ہی موت کی وجہ سے کوئی انسان اپنی بداعمالیوں کی سزا سے بچ سکے گا۔ بلکہ ہر شخص کو اپنے اعمال کی جزا اور سزا کے مرحلہ سے گزرنا ہو گا اور جس شخص نے بھی کوئی برا کام کیا اسے اس کا بدلہ مل کر رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ، اپنے چچا حضرت عباسؓ اور اپنی سب سے لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس خیال میں نہ رہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق داری ہے لہذا کچھ نہیں کہا جائے گا، بلکہ صرف اللہ تعالی کی رحمت ہی کام آئے گی اس لیے ایسے اعمال کرتے رہنا جو اللہ تعالی کی رحمت کا باعث بنتے ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب جناب رسول اللہ کی تعلق داری کام نہیں آئے گی تو اس دنیا میں اس سے بڑی اور کونسی نسبت ہے جس کے بارے میں انسان خوش فہمی کا شکار ہو کہ اس نسبت کی وجہ سے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

یہاں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اعمال کی سزا و جزا کے بارے میں یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین مکہ کے ان عقائد اور فلسفوں پر اس لحاظ سے بھی نظر ڈال لیجئے کہ یہ تینوں فلسفے انسانی معاشرہ میں جرائم کی حوصلہ افزائی کرنے والے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک فلسفہ بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی سوسائٹی کو جرم اور گناہ سے پاک کرنے کی ترغیب دیتا ہو اور انسان کو گناہ اور جرم سے روکتا ہو۔ جب ایک شخص کا عقیدہ یہ بن جائے کہ وہ نبیوں کی اولاد ہے اور یہ نسبت اسے جنت میں لے جائے گی اور اسے اپنے گناہوں کی کوئی بڑی سزا نہیں بھگتنا پڑے گی تو وہ گناہ سے کیونکر باز آئے گا؟ اس کے لیے تو گناہ سرے سے گناہ ہی نہیں رہے گا اور وہ پوری بے فکری کے ساتھ اپنی بے لگام خواہشات کی تکمیل کرتا رہے گا۔ اسی طرح جب کسی شخص کا عقیدہ یہ ہو جائے کہ وہ جو گناہ بھی کرے گا حضرت عیسی علیہ السلام اس کی طرف سے کفارہ دے گئے ہیں اور وہ اس کفارے کی وجہ سے ہر گناہ سے پاک ہو جائے گا۔ تو اس شخص کو گناہ اور جرم سے کون سی قوت روکے گی؟ بلکہ وہ تو بے دھڑک ہو کر بڑے سے بڑا گناہ اور بڑے سے بڑا جرم کر گزرے گا اور پھر صلیب گلے میں لٹکا کر مطمئن ہو جائے گا کہ میں اس کی وجہ سے اپنے جرم اور کفارہ کی سزا سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ اسی طرح جو شخص سرے سے سزا و جزا کے عقیدہ کو ہی نہیں مانتا اور اس کا ذہن یہ بن گیا ہے کہ یہی دنیا سب کچھ ہے اس کے بعد کچھ نہیں ہے تو وہ اس دنیا میں زندگی کی بہتر

سے بہتر سہولتیں حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرے گا اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے کون سے فرق کا وہ لحاظ کرے گا؟

اس لیے اسلام کا عقیدہ ہی صرف ایسا عقیدہ ہے جو انسان کے دل میں نہ صرف خدا کا خوف پیدا کرتا ہے بلکہ اپنے اعمال کی جوابدہی اور حساب کتاب کے لیے انسان کو ذہنی طور پر تیار کرتا ہے جس کی وجہ سے حلال و حرام کا فرق ذہن میں ابھرتا ہے اور انسان جائز و ناجائز کے کسی دائرے کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور یہی ایک قوت ہے جو اس دنیا میں انسانی معاشرے کو جرائم اور گناہوں سے پاک کر سکتی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کر لیجئے کہ یہ آیت جب نازل ہوئی اور اس میں بتایا گیا کہ ''من یعمل سوءا یجزبہ'' جس نے بھی کوئی برا عمل کیا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ تو حضرات صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے حتی کہ حضرت صدیق اکبر فرماتے ہیں کہ مجھ پر یہ آیت سن کر ایسی کیفیت طاری ہوئی جیسے میری کمر ٹوٹ گئی ہو۔ مسند احمدؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے سے میری اس پریشانی اور اضطراب کو بھانپ لیا اور دریافت فرمایا کہ ''مالک یا ابا بکر'' ابوبکر! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے جو آیت کریمہ سنائی ہے اس کی وجہ سے میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب ہر عمل کا بدلہ ضرور دیا جائے گا تو تھوڑی بہت غلطیاں تو ہر انسان سے ہوتی رہتی ہیں، پھر ہم میں سے کون بچ سکے گا؟ اس پر آنحضرتؐ نے یہ کہہ کر حضرت ابوبکرؓ کو تسلی دی کہ ہر عمل کا بدلہ آخرت میں ضروری نہیں ہے بلکہ کچھ اعمال کا بدلہ اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی دے دیتے ہیں اور مومن کو اس دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے خواہ وہ ذہنی اذیت ہو، مالی پریشانی ہو یا بدنی تکلیف ہو حتی کہ اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو یہ اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے۔

تو حضرات محترم! یہ ہے اس آیت کریمہ کا مختصر مفہوم جو میں نے عرض کیا ہے، دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اعمال کی اصلاح کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ فروری ۱۹۹۹ء)

عبادات اور معاملات میں توازن

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۴ جنوری ۱۹۹۹ء)

آج کی محفل میں دور نبویؐ کے ایک ایسے واقعہ کا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے جس سے اسلام کے معاشرتی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلامی احکام و ہدایات کے اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ یہ واقعہ صحابیٔ رسول حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کا ہے جو حدیث نبویؐ کے بڑے راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ صوفی منش بزرگ تھے، انہیں نماز، روزہ اور تعلیم و تعلم کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور ان کا یہ معمول بن گیا تھا کہ روزانہ پابندی کے ساتھ روزہ رکھتے تھے اور رات کا بیشتر حصہ اہتمام کے ساتھ نماز و قیام میں گزارتے تھے۔ حتیٰ کہ حافظ ابن عبد البر نے ”الاستیعاب“ میں ذکر کیا ہے کہ ان کے والد محترم حضرت عمرو بن العاصؓ کو اس بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باقاعدہ شکایت کرنا پڑی۔ اس شکایت کا پس منظر بھی بعض روایات میں بڑا دلچسپ بیان ہوا ہے۔

حضرت عبد اللہؓ کی شادی ہوئی اور وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ الگ گھر میں آباد ہو گئے تو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے بیٹے اور بہو کا حال احوال دریافت کرنے کے لیے ان کے گھر گئے۔ بہو گھر میں موجود تھیں ان سے حال پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہر طرح خیریت ہے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے عبد اللہؓ کے طرز عمل اور سلوک کے بارے میں استفسار کیا تو اس نیک دل خاتون نے معنی خیز انداز میں کہا:

> ”آپ کا بیٹا بہت نیک ہے۔ ساری رات مصلے پر ہوتا ہے اور سارا دن روزے سے رہتا ہے۔“

عمرو بن العاصؓ جہاندیدہ شخص تھے فوراً سمجھ گئے کہ بہو دراصل شکایت کر رہی ہے۔ چنانچہ خود کچھ کہنے کی بجائے حضورؐ کی خدمت میں شکایت پیش کر دی۔ اس سے آگے کا واقعہ بخاری شریف میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت عبد اللہؓ کو بلایا اور اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے تصدیق کر دی کہ وہ بلا ناغہ روزہ رکھتے ہیں اور رات کا اکثر حصہ نماز و قیام میں گزارتے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا:

> ”تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، اور تیرے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔“

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ اگرچہ عبادت اللہ تعالی کا حق ہے جسے جتنا زیادہ ادا کیا جائے کم ہے۔ لیکن اس سے انسان کے اپنے جسم، گھر والوں، اور ملنے ملانے والوں کے حقوق متاثر نہیں ہونے چاہئیں۔ اور انسان کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان توازن قائم رکھنا چاہیے جو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ وہ ہر چاند ماہ کے درمیانے تین روزے رکھ لیا کریں تو انہیں ہمیشہ کے روزوں (صوم الدھر) کا ثواب مل جائے گا۔ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ بہت کم ہیں اور میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا یہ معمول بنالو کہ ایک دن روزہ رکھو اور دو دن نہ رکھو، اس طرح مہینے میں دس روزے ہو جایا کریں گے۔ حضرت عبداللہؓ اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہؐ میں اس سے زیادہ ہمت رکھتا ہوں۔ اس پر نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی سنت اپنالو کہ وہ زندگی بھر ایک دن چھوڑ کر ایک روزہ رکھا کرتے تھے اور مہینے میں پندرہ روزے بن جاتے تھے۔

بخاری شریف کی روایت کے مطابق عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا اس پر بھی قناعت کرنے کو جی نہ چاہا اور یہ کہہ کر مزید تقاضہ کیا کہ میں اس سے افضل روزوں کی طاقت رکھتا ہوں۔ اس پر حضورؐ نے حد بندی کر دی اور فرمایا کہ اس سے افضل کوئی روزہ نہیں ہے۔ بعض روایات کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کے بارے میں بھی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے جناب نبی اکرمؐ کی اسی نوعیت کی گفتگو ہوئی اور ان کے اصرار کے باوجود آپؐ نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ سات دن سے کم مدت میں قرآن کریم مکمل کیا کریں۔

اس طرح رسول اکرمؐ نے حکما عبداللہ بن عمروؓ کے اوقات کے ایک حصے کو نماز اور قرآن سے فارغ کر کے انہیں اپنے جسم، بیوی، مہمانوں اور دیگر لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ زندگی بھر اس معمول پر قائم رہے جو جوانی اور ہمت کے دور میں تو انہیں اپنی طاقت سے کم نظر آتا تھا لیکن جب بڑھاپے اور ضعف نے غلبہ پایا تو مشکل محسوس ہوئی۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق وہ خود بڑھاپے میں کہا کرتے تھے کہ:

”اے کاش! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا۔“

مگراب ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ جس معمول کا وعدہ وہ خود اپنے اصرار پر جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ کر چکے تھے اسے چھوڑنے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتے تھے۔ جبکہ بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے اس معمول کو نباہنا ان کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔

اس واقعہ سے جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن قائم رکھنے حکم دیتا ہے اور حقوق اللہ کی ادائیگی کی کوئی ایسی صورت قبول نہیں کرتا جس سے حقوق العباد متاثر ہوتے ہوں۔ وہاں ایک اور بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ انسان جب بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے سامنے وقتی حالات ہوتے ہیں اور وہ انہی کی روشنی میں معاملات انجام دیتا ہے۔ جبکہ اسلام ایسا کوئی فیصلہ کرنے میں تمام احوال و ظروف کا لحاظ رکھتا ہے جو کہ بسا اوقات انسان کو عجیب محسوس ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ اس کے اول و آخر تمام احوال سے واقف ہے اس لیے قاعدہ اور ضابطہ وہی دیرپا اور مؤثر ثابت ہوتا ہے جو انسان کا خود اپنا طے کردہ نہ ہو بلکہ اس کے ماضی اور مستقبل سے مکمل آگاہی رکھنے والے مالک و خالق کی طرف سے بیان کیا گیا ہو۔

یہی صورت انسانی اجتماعیت کے قوانین و احکام کی ہے کہ انسان جب اپنی سوسائٹی کے لیے خود قوانین وضع کرتے ہیں تو قوانین وضع کرنے والا فرد ہو یا جماعت، نمائندہ ہو یا ڈکٹیٹر، اس کے سامنے احوال و ظروف اور اسباب و محرکات سب وقتی ہوتے ہیں۔ اور وہ انہی کے دائرے میں قاعدے اور ضابطے ترتیب دیتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ بے کار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے انسانی معاشرے کے لیے وہی قوانین و احکام فطری اور دیرپا ہیں جو کائنات کے خالق و مالک نے وحی کے ذریعے بھیجے ہیں۔ کیونکہ وہ ساری نوع انسانی کی ضروریات کو خود ان سے بہتر طور پر جانتا ہے اور ان سب کے ماضی، حال اور مستقبل سے کماحقہ آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے آج تک کبھی اپنے کسی قانون کے بارے میں نہ معذرت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ کسی دور میں اس کے غیر مؤثر ہونے کی کوئی شکایت سنی گئی ہے۔

۱۹۹۸ء

مسیحی دنیا کو قرآن کریم کی دعوت

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۳۱ دسمبر ۱۹۹۸ء)

رمضان المبارک قرآن کریم کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں قرآن کریم نازل ہوا اور اسی مہینے میں دنیا بھر میں قرآن کریم کی سب سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے۔ اتفاق سے کرسمس ڈے بھی اس سال رمضان المبارک میں آیا ہے اور آئندہ مزید دو سال تک اسی ماہ مبارک میں کرسمس ڈے آئے گا۔ یہ کرسمس ڈے مسیحی برادری کی سالانہ عید ہے جو مسیحی روایات کے مطابق حضرت عیسی علیہ السلام کے یوم ولادت کے عنوان سے منائی جاتی ہے اور دنیا بھر میں اس موقع پر رنگا رنگ تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔

انبیاء سابقینؑ کے حوالہ سے ہماری دینی روایت یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں آباد یہودیوں کو دیکھا کہ وہ عاشور یعنی دس محرم کو روزہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے بتایا کہ اس روز بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات ملی تھی اور فرعون اپنے لشکر سمیت بحیرۂ قلزم میں غرق ہو گیا تھا، اس کی خوشی میں ہم یہ روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا ''نحن احق بموسی منکم'' کہ حضرت موسیٰؑ پر ہمارا حق تم سے زیادہ ہے اس لیے ہم بھی اس دن روزہ رکھیں گے۔

چنانچہ آخر عمر تک جناب نبی اکرمؐ کا معمول رہا کہ آپؐ دس محرم کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ البتہ آخری سال یہ فرمایا کہ ہمارے روزے اور یہود کے روزے میں کچھ فرق ہونا چاہیے، اس لیے آئندہ سال اگر موقع ملا تو ہم دس محرم کے ساتھ ایک اور دن کا روزہ بھی ملائیں

گے۔ مگر اگلے سال کے محرم سے قبل جناب نبی اکرمؐ کا وصال ہو گیا، اس بنا پر فقہاء کرام مسئلہ یہ بیان کرتے ہیں کہ دس محرم کو نفلی روزہ رکھنا سنت نبویؐ ہے لیکن تنہا اس دن کا روزہ نہ رکھا جائے بلکہ بہتر ہے کہ اس کے ساتھ نو محرم یا گیارہ محرم کا روزہ بھی ملا لیا جائے تاکہ اس حوالہ سے جناب نبی اکرمؐ کی آخری خواہش کی تعمیل بھی ہو جائے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امم سابقہ کے مذہبی تہواروں میں ان کے ساتھ کسی درجہ کی ہم آہنگی کا اظہار کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس سے اسلام کی کوئی روایت متاثر نہ ہوتی ہو اور ملت اسلامیہ کا امتیاز قائم رہے۔

قرآن کریم انبیاء سابقین علیہم السلام کی تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے اور تورات، زبور اور انجیل سمیت سب سابقہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کو وحی الٰہی تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کریم خود کو ان تمام کتابوں اور صحیفوں کی مشترک تعلیمات کا محافظ اور تصدیق کنندہ قرار دیتا ہے اور ان سب امتوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ انسانی خواہشات و تصورات کے پیچھے بھاگنے کی بجائے آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی پیروی کریں۔ کیونکہ انسان جب بھی اپنی سوچ اور خواہش کے پیچھے چلے گا تو گمراہی کا شکار ہوگا۔ اور جب وہ اپنی خواہشات اور فکر و خیال کو آسمانی تعلیمات کے تابع کر دے گا تو اسے اعتماد اور سکون میسر آئے گا۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہی ہے بلکہ اس کا کہنا ہے کہ پہلی آسمانی کتابوں کی دعوت بھی یہی تھی جسے ان کتابوں کی پیروی کا دعویٰ کرنے والوں نے بھلا دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے پہلی کتابوں کے علمبرداروں بالخصوص یہودیوں اور عیسائیوں کو اس بات پر بار بار جھنجھوڑا ہے کہ وہ اپنی کتابوں پر عمل کیوں نہیں کرتے اور انہوں نے آسمانی تعلیمات کو کیوں پس پشت ڈال رکھا ہے؟

یہود و نصاریٰ باہم متحارب قومیں تھیں اور ان کی آپس کی محاذ آرائی اور کشت و خون سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ مگر یہ بھی قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے اس دور میں ان کی آپس کی دوستی کی پیش گوئی کی جب ان دونوں قوموں کے درمیان دوستی کے رشتے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ دوستی سے منع کرتے ہوئے کہا کہ ”بعضھم اولیاء بعض“ کہ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تاریخ نے قرآن کریم کی اس پیش گوئی کو اس طرح سچا کر دکھایا کہ آج یہودی اور عیسائی اپنی تمام تر دشمنی اور لڑائیاں بھلا کر باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ

عیسائی دنیا کے وسائل اور یہودی دماغ مل کر اسلام اور عالم اسلام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیے ہوئے ہیں۔

مگران سب باتوں سے قطع نظر جی چاہتا ہے کہ مسیحی برادری کو ان کی اس عید پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے قرآن کریم کی وہ دعوت دہرا دی جائے جس میں مسیحی دنیا بلکہ سب اہل کتاب کو آسمانی تعلیمات کی ’’مشترک اقدار‘‘ کی طرف واپس لوٹ آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دعوت سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۶۴ میں ان الفاظ کے ساتھ دی گئی ہے کہ:

’’اے پیغمبرؐ! اہل کتاب سے کہہ دیجیے کہ آجاؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں۔ پس اگر یہ اہل کتاب اس بات کو قبول نہ کریں تو اے مسلمانو! تم کہہ دو کہ تم سب گواہ رہو کہ ہم تو بے شک اس حکم کو ماننے والے ہیں۔‘‘

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کو مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان ’’قدر مشترک‘‘ قرار دیا ہے۔ ایک توحید الٰہی کا اقرار اور شرک سے بے زاری، اور دوسری انسان پر انسان کی حکمرانی کی نفی۔ یہ دو اصول ہیں جو قرآن کریم کے بقول تمام آسمانی مذاہب میں قدر مشترک ہیں اور ان پر کسی حالت میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اہل کتاب کے نہ ماننے کی صورت میں بھی مسلمانوں کو اس پر قائم رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یعنی قرآن کریم عبادت اور حاکمیت دونوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بنیاد قرار دیتا ہے اور انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی کو رد کرتا ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ حاکمیت کے اختیارات انسان شخصی حکمرانی کی صورت میں اپنے پاس رکھنا چاہے، کسی طبقہ کی حکمرانی کا نعرہ لگایا جائے، پارٹی کی آمریت ہو، یا ووٹ کی پرچی کے ذریعے اکثریت کو (وحی الٰہی کے برخلاف) حکمران قرار دے دیا جائے۔ یہ سب انسان پر انسان کی حکمرانی کی مختلف شکلیں ہیں جن کو اسلام قبول نہیں کرتا اور وہ انسانی سوسائٹی پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو آسمانی تعلیمات کے ذریعے نافذ دیکھنا چاہتا ہے۔

قرآن کریم کی یہ دعوت آج بھی قائم ہے اور رمضان المبارک میں آنے والے کرسمس ڈے کے موقع پر ہم مسیحی برادری کو مبارکباد دیتے ہوئے یہی دعوت پیش کرتے ہیں کہ آؤ جس یسوع مسیح علیہ السلام کی ولادت کی دنیا بھر میں خوشیاں منا رہے ہو اسی کی تعلیمات کی طرف واپس آجاؤ۔ اور آسمانی وحی کو ایک بار پھر انسانی سوسائٹی کی بنیاد بنانے کے لیے آگے

بڑھو کیونکہ شخصی، گروہی اور اجتماعی سوچ و خواہشات کے ہاتھوں انسانی معاشرہ بہت چر کے کھا چکا ہے اور اس ''مسیحا'' کا منتظر ہے جو ہاتھ پکڑ کر اسے ایک بار پھر آسمانی تعلیمات کے دامن میں واپس لے جائے۔

ربوہ کا نام اور اس کے باشندوں کے مالکانہ حقوق

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۴ نومبر ۱۹۹۸ء)

پنجاب اسمبلی نے گزشتہ دنوں ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کی ہے جس میں ربوہ کا نام تبدیل کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ قادیانی جماعت کے ترجمان نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے انسانی حقوق کے منافی اور ناروا قرار دیا ہے اور ربوہ کی بعض تاجر تنظیموں نے بھی اس قرارداد پر نکتہ چینی کی ہے، نیز عالمی ذرائع ابلاغ نے کہا ہے کہ اس قرارداد پر عملدرآمد سے پاکستان میں بنیاد پرست مسلمانوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

ربوہ دریائے چناب کے کنارے ایک نیا آباد ہونے والا شہر ہے جو قیام پاکستان کے بعد قادیانی جماعت نے بسایا ہے۔ تقسیم ہند میں قادیانیوں کا ہیڈ کوارٹر ''قادیان'' بھارت کے ضلع گورداسپور میں رہ گیا تو قادیانی جماعت کی رائل فیملی اور ہزاروں ارکان مشرقی پنجاب سے منتقل ہو کر پاکستان میں شامل ہونے والے مغربی پنجاب میں آگئے اور چنیوٹ کے قریب دریائے چناب کے دوسرے کنارے پر ہزاروں ایکڑ سرکاری اراضی پنجاب کے گورنر سر موڈی کی منظوری سے معمولی رقم کے عوض لیز پر حاصل کر کے اپنا نیا ہیڈ کوارٹر بنا لیا اور اسے ربوہ کے نام سے منسوب کیا۔ اس علاقے کا نام ربوہ رکھنے پر ملک کے دینی حلقوں کو مسلسل اعتراض ہے اور انہی کے اعتراض اور مطالبے کے باعث پنجاب اسمبلی نے یہ قرارداد منظور کی ہے۔

اس مطالبے کا پس منظر یہ ہے کہ قادیانی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے دعوی کی بنیاد اس پر رکھی کہ حضرت عیسی علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدّد ارشادات میں جس مسیح کی آمد کی پیش گوئی فرمائی ہے اس سے مراد (نعوذ باللہ) مرزا غلام احمد قادیانی ہیں۔ جبکہ اہل اسلام کا اجتماعی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام پر ابھی تک موت وارد نہیں ہوئی، وہ زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے تھے، وہ جناب نبی اکرمؐ کے ارشادات کے مطابق قیامت سے قبل دوبارہ نازل ہوں گے

اور اسلام کے غلبہ اور خلافت کے قیام میں امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی راہ نمائی فرمائیں گے۔ اسی سلسلہ میں نبی اکرمؐ نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ اور حضرت امام مہدیؒ کی دو الگ الگ شخصیتوں کے حوالہ سے اس قدر تفصیل اور صراحت کے ساتھ علامات بیان فرما دی ہیں کہ کوئی طالع آزما اس حوالہ سے باخبر مسلمانوں کو کسی طرح دھوکہ نہیں دے سکتا۔

مگر مرزا غلام احمد قادیانی نے دعویٰ کر دیا کہ عیسیٰ بن مریمؑ فوت ہو چکے ہیں اور احادیث نبویہ میں جس عیسیٰ بن مریم کے دوبارہ نزول ہونے کا ذکر ہے اس سے مراد وہ خود یعنی مرزا قادیانی ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے بہت سے اعتراضات کیے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ احادیث میں ذکر ہے کہ عیسیٰ بن مریمؑ جامع مسجد دمشق کے مینار پر نازل ہوں گے۔ اس پر مرزا غلام احمد قادیانی نے قادیان میں ''منارۃ المسیح'' کے نام سے ایک مینار کی تعمیر شروع کر دی اور اس کے لیے ملک کے طول و عرض سے چندہ کیا مگر وہ مینار مرزا قادیانی کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں نے اس کی تکمیل کی۔ اس مینار کی تعمیر کا اصل مقصد یہ تھا کہ بعد میں آنے والے لوگ جو اس کی تعمیر کے وقت اور پس منظر سے آگاہ نہیں ہوں گے کم از کم وہ تو ''منارۃ المسیح'' کو دیکھ کر دھوکہ کھائیں گے۔ یہ قادیانی جماعت کا مخصوص طریقۂ واردات ہے کہ اشتباہ اور فریب کو جان بوجھ کر قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس کی آڑ میں سادہ لوح اور بے خبر لوگوں کو شکار کیا جا سکے۔

چنانچہ ربوہ بھی قادیانی جماعت کی اس تکنیک کا شاہکار ہے کیونکہ ''ربوہ'' کا لفظ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام کے حوالہ سے سورۃ المومنین کی آیت ۵۰ میں اس طرح آیا ہے:

> ''اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کو اپنی قدرت کی نشانی دی اور انہیں ایک ٹیلے (ربوہ) پر رہنے کی جگہ دی جو قرار کی جگہ تھی اور پانی بھی موجود تھا۔''

اب قرآن کریم میں ربوہ کا لفظ حضرت عیسیٰؑ کے حوالہ سے مذکور ہے اور اسے ان کی قرار گاہ قرار دیا گیا ہے جبکہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ ہے کہ وہ خود عیسیٰ بن مریم ہیں۔ اس لیے ربوہ کے آباد ہونے کے وقت اور اس کے پس منظر سے بے خبر جو شخص بھی قرآن کریم میں ربوہ کا لفظ پڑھے گا اور مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ اس کی نظر سے گزرے گا تو وہ دھوکے کا شکار ہو گا اور یہی بے خبری اسے قادیانیوں کے دام ہمرنگ زمین میں پھنسا دے گی۔ جیسا کہ اس قرارداد کے محرک مولانا منظور احمد چنیوٹی ایم پی اے نے ایک واقعہ بتایا کہ

کچھ عرصہ قبل افریقہ کے کسی ملک کے تبلیغی دورے کے موقع پر ایک جلسہ کے بعد کچھ نوجوان ان سے جھگڑ پڑے کہ وہ ربوہ والوں کے خلاف اس شدت کے ساتھ کیوں بیان کرتے ہیں جبکہ ربوہ کا ذکر تو قرآن کریم میں موجود ہے۔

اس وجہ سے تحریک ختم نبوت کے مطالبات میں یہ بات ہمیشہ شامل رہی ہے کہ ربوہ کا نام تبدیل کر دیا جائے تاکہ قرآن کریم کے حوالہ سے لوگوں کو فریب کا شکار کرنے کا یہ مکروہ عمل ختم ہو سکے۔ اور پنجاب اسمبلی کے رکن مولانا منظور احمد چنیوٹی ایک عرصہ سے اس کے لیے کوشاں رہے ہیں اور انہی کی تحریک پر پنجاب اسمبلی نے یہ قرارداد منظور کی ہے جس پر ملک کے دینی حلقے اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں اور سیکولر لابیوں کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اس موقع پر دو گزارشات اس قرارداد کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم پیش کرنا چاہتے ہیں۔
ایک یہ کہ جہاں ربوہ کا نام تبدیل کرنے کا اصولی فیصلہ ہو گیا ہے وہاں ربوہ کے باشندوں کو ان کے مکانات کے ملکیتی حقوق دینے کا فیصلہ بھی ہو جانا چاہیے کیونکہ ربوہ کی زمین انجمن احمدیہ کی ملکیت ہے جو لوگوں کو مکان بنانے کے لیے لیز پر دی گئی ہے اور اس دائرے میں رہنے والے کسی بھی رہائشی کو اپنے مکان یا دکان کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ صورتحال نظر ثانی کی محتاج ہے اور اس کا متعلقہ اداروں کو سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔ اور کم و بیش نصف صدی سے رہنے والے رہائشیوں کو ان کے مکانات اور دکانوں کے مالکانہ حقوق دلوانے کے لیے قانون سازی کرنی چاہیے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ قادیانی جماعت کے ترجمان نے اس قرارداد کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا ہے جو اصل معاملہ کے برعکس بات ہے۔ کیونکہ ایک فریق قرآن کریم کے ایک لفظ کو غلط استعمال کر کے دنیا بھر کے لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے جبکہ دوسرے فریق نے دھوکہ کی اس فضا کو ختم کرنے کے لیے پیش رفت کرنا چاہی ہے۔ اب انصاف پسند لوگ خود فیصلہ کریں کہ ان میں سے کون سا فریق انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور کون سا فریق انسانی حقوق کی پاسداری میں مصروف ہے۔ بلکہ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ربوہ کے نام کی تبدیلی انسانی حقوق کا مسئلہ نہیں بلکہ اس شہر کے باشندوں کو مکانات اور دکانوں کے مالکانہ حقوق دینے کا مسئلہ انسانی حقوق کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اگر انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں اپنے کاز کے ساتھ مخلص اور سنجیدہ ہیں تو ان کی ذمہ

داری ہے کہ نام کی تبدیلی پر واویلا کرنے کی بجائے ربوہ کے شہریوں کو مالکانہ حقوق دلوانے کے لیے آگے بڑھیں۔

سیرت نبویؐ اور ڈکٹیٹر شپ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۷ نومبر ۱۹۹۸ء)

وزیراعظم میاں محمد نواز شریف نے یہ انکشاف کر کے ملک میں ایک نئی بحث کا آغاز کر دیا ہے کہ وہ جب قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کے ترمیمی بل کی حمایت کے لیے پارلیمنٹ کے ارکان سے رابطے کر رہے تھے تو ایک سینیٹر نے ان سے یہاں تک کہہ دیا کہ ”حضورؐ تو خود ڈکٹیٹر تھے“ (نعوذ باللہ)۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پنجاب اسمبلی کے اپوزیشن لیڈر جناب سعید احمد منہاس نے وزیراعظم سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس سینیٹر کا نام بتائیں عوام خود اسے سنگسار کر دیں گے۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل چودھری احمد مختار نے وزیراعظم کے اس انکشاف کو ایک نئے انتشار کا پیش خیمہ قرار دیا ہے، اور پاکستان عوامی اتحاد کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے چیف الیکشن کمشنر سے کہا ہے کہ وزیراعظم کے خلاف ایک گستاخ رسولؐ کا جرم چھپانے اور اس کا نام ظاہر نہ کرنے کے جرم میں کاروائی کریں۔

یہ مسئلہ فی الواقع سنگین ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سب سے اعلیٰ قانون ساز ادارے کے ایک رکن کی زبان پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بارے میں یہ گمراہ کن اور گستاخانہ الفاظ آخر کس طرح آ گئے؟ اس معاملہ کے ضروری پہلوؤں کا جائزہ لینا اور انصاف و دینی حمیت کے تقاضے کو پورا کرنا متعلقہ شخصیات اور اداروں کی ذمہ داری ہے۔ مگر ہم اس مسئلے کے بارے میں ایک اور پہلو سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کے بارے میں مذکورہ سینیٹر کا یہ جملہ اس کا اپنا نہیں بلکہ ایک درآمدی فقرہ ہے جو مغرب کے نظریہ ساز کارخانوں میں ڈھلا ہے۔ اور یہ نوآبادیاتی نظام تعلیم و تربیت میں نشوونما پانے والے ہر ایسے شخص کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں چپکا ہوا ہے جسے اسلامی تعلیمات، خلافت راشدہ اور اسلامی تاریخ کے بارے میں ضروری معلومات میسر نہیں ہیں۔ اس سینیٹر نے یہ جسارت کی ہے کہ وہ اس جملے کو ذہن کے فریزر سے نکال کر نوک زبان پر لے آیا ہے ورنہ بہت سے ذہنوں کے ”اسٹور روم“ اسلام اور

جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں اس قسم کے متعدّد ریمارکس اپنے دامن کی تاریکیوں میں سمیٹے ہوئے ہیں اور معاشرتی دباؤ کے باعث ان کے اظہار کی ہمت نہیں پا رہے۔ ہمارے نزدیک اس کا بنیادی سبب دو امر ہیں۔

ایک ہمارے قومی نظام تعلیم کی بے مقصدیت ہے کہ اس نے قیام پاکستان کے بعد نصف صدی کے طویل عرصہ میں ابھی تک یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ مغرب کے سیاسی فلسفے اور نظام کے مقابلہ میں اسلام کو ایک سیاسی نظام اور فلسفے کے طور پر نئی نسل کے سامنے پیش کرے۔ اور ان شکوک و شبہات کا علمی طور پر ازالہ کرے جو مغرب کے تعلیمی نظام اور میڈیا سسٹم نے اسلام اور جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں ہر طرف پھیلا رکھے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کا یکطرفہ پراپیگنڈا اور نظریاتی یلغار بہت سے ذہنوں میں اپنی کمین گاہیں قائم کرتی جا رہی ہے، جبکہ ہم ان ذہنوں سے یہ کانٹے نکال باہر پھینکنے کی بجائے انہیں وہیں دبا دینے اور دبائے رکھنے میں عافیت محسوس کر رہے ہیں۔

دوسرا یہ کہ ہمارے علماء کرام، خطباء اور واعظین میں ایسے افراد کا تناسب بہت کم اور بہت ہی کم ہے جو اپنے مواعظ و خطبات میں اسلام کے اجتماعی پہلوؤں اور جناب رسول اللہؐ کی سنت مبارکہ کے اجتماعی دائروں کو گفتگو کا موضوع بناتے ہیں، جس کی وجہ سے قوم کے مختلف طبقات کا ایک بہت بڑا حصہ اسلام کے اجتماعی نظام اور سنت نبویؐ کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، اور قانونی پہلوؤں سے ناواقف ہے۔ لیکن یہی ناواقفیت اور جہالت کبھی کبھی اپنی آخری حدود بھی تجاوز کر کے گستاخی اور جسارت کی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہے تو ہم جذبات اور اشتعال کی ایک اور لہر کا وزن ڈال کر اسے دبائے رکھنے کا عمل دہرا دیتے ہیں۔

اب مغرب کے اسی الزام کو دیکھ لیجئے جو آنحضرتؐ کے بارے میں صدیوں سے دہرایا جا رہا ہے کہ (معاذ اللہ) آپؐ مطلق العنان اور ڈکٹیٹر تھے۔ حالانکہ یہ سراسر جہالت اور رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ سے بے خبری ہے اور باخبر ہونے کی صورت میں محض عناد اور ہٹ دھرمی ہے۔ کیونکہ سیرت نبویؐ شاہد ہے اور تاریخ کے ریکارڈ پر یہ گواہی موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو دونوں طرف کا لحاظ رکھنے کے پابند تھے۔ انہیں ایک طرف یہ حکم تھا کہ وہ مسلمانوں کو اجتماعی معاملات میں شریک مشورہ کریں وشاورھم فی الامر (سورۃ الشوریٰ)۔ اور دوسری طرف وہ اس امر کے پابند تھے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام میں اپنی مرضی

سے کوئی رد و بدل نہیں کر سکتے اور وحی الٰہی کو ہر صورت میں پورا کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے ان دونوں ذمہ داریوں کو اس شان سے نبھایا کہ تاریخ انسانی میں اس کی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ سیرت طیبہ اس قسم کے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے، صرف دو تین واقعات اس موقع پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

- غزوۂ احد کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ اس مسئلہ پر مشورہ کر رہے تھے کہ جنگ مدینہ منورہ میں رہ کر اور محصور ہو کر لڑنی چاہیے یا باہر نکل کر کھلے میدان میں کفار کا سامنا کیا جائے۔ خود آپؐ کی رائے محصور ہو کر لڑنے کی تھی مگر مشورہ کی مجلس میں عمومی رجحان باہر جا کر لڑنے کا تھا اس لیے نبی اکرمؐ نے خود اپنی رائے کے خلاف باہر جا کر لڑنے کا فیصلہ کیا اور یہ لڑائی احد پہاڑ کے دامن میں کھلے میدان میں ہوئی۔
- ایک مرتبہ جناب نبی اکرمؐ نے اپنے ایک گھریلو معاملہ کے باعث قسم کھالی کہ وہ شہد استعمال نہیں کریں گے۔ یہ ایک ذاتی نوعیت کا معاملہ تھا لیکن وحی الٰہی نے حضورؐ کو اپنا حلف توڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ آپؐ نے قسم توڑی اور اس کا کفارہ ادا کیا اور پھر حسب سابق شہد استعمال کرتے رہے۔
- اسی طرح جناب نبی اکرمؐ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے اور آپؐ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی جو آپؐ نے مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک صحابیؓ کی ننگی کمر پر ماردی، کمر ننگی تھی اور کھجور کی ٹہنی گھڑی ہوئی نہیں تھی اس لیے ذرا سخت لگی اور کمر پر خراش بھی آگئی۔ اس صحابیؓ نے بھری مجلس میں بدلے کا مطالبہ کر دیا۔ آنحضرتؐ نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر ٹہنی اس صحابیؓ کے ہاتھ میں دے دی اور اپنی کمر آگے کر کے فرمایا کہ ”اپنا بدلہ لے لو“۔

اس قسم کے واقعات سیرت نبویؐ میں قدم قدم پر ملتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے نہ صرف قانون کی پابندی اور قانون کے سامنے برابری کی اعلیٰ ترین عملی مثال پیش کی بلکہ لوگوں کے معاملات میں ان سے مشورہ کرنے اور ان کے مشورہ کو اہمیت اور ترجیح دینے کی روایت قائم کی اور یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب خود مغرب قانون، رائے، مشورہ اور حق نامی کسی چیز سے متعارف نہیں تھا۔ اس لیے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر مغرب کے اس ”بھونڈے الزام“ کو جہالت یا ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ مگر

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم محض مغرب کو کوسنے اور کوستے رہنے کی بجائے اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس کریں اور نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ اور دینی راہ نمائی کے شعبوں کے ارباب حل و عقد ہماری نئی نسل کو اسلام کے اجتماعی نظام اور سیرت طیبہؐ سے متعارف کرانے کا اہتمام کریں۔ ورنہ مغربی فلسفہ اور کلچر کے لیے ”بوسٹر“ کا کام کرنے والے حضرات اس قسم کے بے ہودہ ریمارکس نشر کرتے رہیں گے اور ہم ”ذہنی ارتداد“ کی اس رو کے سامنے جذبات اور اشتعال کے عارضی بند ہر دفعہ نہیں باندھ سکیں گے۔

اسلام کا نظامِ حکومت اور رائے عامہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۱ نومبر ۱۹۹۸ء)

روزنامہ اوصاف کے مدیر محترم نے مالاکنڈ ڈویژن کی تحریک نفاذ شریعت کے سربراہ مولانا صوفی محمد کے اس بیان کو اپنے ایک اداراتی شذرہ میں موضوع بحث بنایا ہے جس میں انہوں نے جمہوریت کو مغرب کی مسلط کردہ لعنت قرار دیتے ہوئے اس سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت کا مروجہ نظام جس میں علامہ اقبالؒ کے نزدیک ”بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے“ مغرب ہی کا عطیہ ہے اور یہ نظام اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت اب اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ تاریخ کو پیچھے مڑ کر جمہوری نظام کے نفع و نقصان کے تناسب کا اندازہ کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے اور اس کے مداح بھی کبھی کبھی اس کی فریب کاریوں کا تذکرہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر ہم آج کی محفل میں جمہوریت اور اسلام کے حوالے سے ایک ”کنفیوژن“ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو بسا اوقات ادھوری بات کی وجہ سے عام ذہنوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور روزنامہ اوصاف کے مدیر محترم نے بھی غالباً اسی کنفیوژن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام جمہوری طرز حکومت کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کے اپنے نظام میں حکومت کی تشکیل کا اصول کیا ہے؟ اور اگر اسلام حکومت کی تشکیل اور اسے چلانے میں رائے عامہ کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور عام لوگوں کے ساتھ مشاورت کو ضروری قرار دیتا ہے تو اسے جمہوریت قرار دینے میں کیا مضائقہ ہے؟

جہاں تک اسلام کے نظام مشاورت کو جمہوریت قرار دینے سے گریز کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ بہت سے مسلم دانشوروں کا موقف یہ ہے کہ ’’جمہوریت‘‘ اپنے لغوی معنوں کے لحاظ سے اسلام کے لیے کوئی ناپسندیدہ یا اجنبی چیز نہیں ہے اور مروجہ جمہوریت کی پیدائش سے صدیوں پہلے مسلم علماء اور محققین کی تصانیف میں ’’جمہور‘‘ کی اصطلاح مسلسل استعمال ہوتی چلی آرہی ہے۔ لیکن جب سے یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم سے آگے بڑھ کر ایک مخصوص نظام کے لیے متعیّن ہوگیا ہے اور اس کے زبان پر یا تحریر میں آتے ہی ایک مخصوص سسٹم کا تصور ذہنوں میں آنے لگا ہے تو اس کے بعد اس لفظ کے لغوی معنوں کا کوئی اعتبار نہیں رہا۔ اور یہ معاملہ صرف اس لفظ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو لفظ بھی اپنے لغوی معنوں میں عام رہنے کی بجائے کسی مخصوص مفہوم اور اصطلاح کے لیے متعیّن ہوجاتا ہے تو پھر اس کے بعد اس کے لغوی مفہوم کا اعتبار باقی نہیں رہتا۔ خود لفظ ’’اسلام‘‘ کو دیکھ لیجیے، یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے دنیا کے کسی بھی مذہب کے پیروکاروں کے لیے ناقابل قبول نہیں ہے۔ لیکن جب سے ’’اسلام‘‘ کا لفظ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے لیے بولا جانے لگا ہے اور دین محمدؐ کے لیے مخصوص ہوگیا ہے تب سے دنیا کے کسی اور مذہب کا کوئی پیروکار اسے اپنے لیے استعمال کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، اور یہ ایک اصولی بات ہے۔ اس لیے اگر مسلم علماء اور دانشور اسلام کے سیاسی نظام کے لیے ’’جمہوریت‘‘ کی اصطلاح کو پسند نہیں کرتے تو ان کا یہ طرز عمل بلاوجہ نہیں ہے کیونکہ اب یہ لفظ ایک متعیّن نظام کے لیے خاص ہوگیا ہے۔ اور آپ جب بھی ’’جمہوریت‘‘ کا لفظ بولیں گے تو عام ذہن کسی توقف کے بغیر مغربی نظام سیاست کی طرف مڑ جائے گا اور اس نظام سے ہٹ کر آپ اس لفظ کی جو تشریح بھی کرنا چاہیں گے خود جمہوریت کا لفظ اسے قبول نہیں کرے گا۔

لیکن اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے ’’جمہوریت‘‘ کی نفی کرنے والے حضرات بھی عام طور پر ادھوری بات کہتے ہیں جس سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ بات تو کہہ دیتے ہیں کہ مغربی جمہوریت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ یہ وضاحت نہیں کرتے کہ خود اسلام میں حکومت کی تشکیل کا اصول کیا ہے اور حکومت کے قیام اور اسے چلانے میں رائے عامہ کو کیا مقام

حاصل ہے؟ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک دو اصولی باتیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

پہلی بات یہ کہ اسلام میں سیاسی نظام کے لیے ''خلافت'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا حاکم حکومت کا نظام چلانے میں جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے اور آنحضرتؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کا پابند ہے اسی لیے اسے خلیفہ کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خلیفہ کا تقرر کون کرے گا؟ اس سلسلہ میں امت میں دو واضح مکتب فکر پائے جاتے ہیں، اہل تشیع اور اہل سنت۔

اہل تشیع کے بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، اسی وجہ سے اہل تشیع کی اذان میں حضرت علیؓ کے لیے ''وصی رسول اللہ'' یعنی رسول اللہؐ کے نامزد کردہ اور ''خلیفۃ بلا فصل'' کے الفاظ شامل ہوتے ہیں جو دراصل ان کے سیاسی نظام اور فلسفے کا اعلان ہوتا ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک حضرت علیؓ کے بعد یہ سلسلہ جسے وہ ''امامت'' سے تعبیر کرتے ہیں ان کی اولاد میں مسلسل چلتا رہا تو ان کے بارہویں امام غائب ہو گئے تھے اور قیامت سے پہلے ان کا ظہور ہوگا جبکہ درمیان کا عرصہ امام کے غائب ہونے کا زمانہ کہلاتا ہے اور اس دوران ''ولایت فقیہ'' کا درجہ ہے جس کے تحت کوئی مذہبی شخصیت امام غائب کی نمائندگی کرتے ہوئے امت کی حکمران ہوتی ہے۔ چنانچہ ایران کے دستور کے مطابق یہ حیثیت پہلے جناب خمینی کو حاصل تھی اور اب اس مقام پر جناب خامنہ ای فائز ہیں جو امام غائب کے نمائندہ ہیں اور انہی کے اختیارات سے بہرہ ور ہیں۔ اہل تشیع کے نزدیک چونکہ امام کا تقرب من جانب اللہ ہوتا ہے اس لیے وہ امام معصوم ہوتا ہے اور شریعت کی تعبیر و تشریح میں اسے فائنل اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

دوسرا مکتب فکر اہل سنت کا ہے جن کا موقف ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں واضح اشارات دے دیے تھے لیکن نامزد کسی کو نہیں کیا تھا، آپؐ نے خلیفہ کا انتخاب امت کی عمومی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ عملاً بھی ایسا ہی ہوا کہ رسول اللہؐ کے وصال کے بعد عامۃ الناس کی رائے سے حضرت ابوبکرؓ کو حکمران چنا گیا۔ اس لیے علم عقائد و کلام کے ائمہ جب اسلام کے سیاسی نظام کے

حوالے سے اہل سنت اور اہل تشیع کے مذاہب کا فرق بیان کرتے ہیں تو تین باتوں کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہیں۔

1. ایک یہ کہ اہل سنت کے ہاں یہ نظام ”خلافت“ کہلاتا ہے جبکہ اہل تشیع اسے ”امامت“ سے تعبیر کرتے ہیں۔

2. دوسرا فرق یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک خلافت کا قیام عامۃ الناس کی رائے سے عمل میں آتا ہے جبکہ اہل تشیع کے ہاں امامت موروثی ہے اور نامزدگی کے ذریعہ اس کا تعین ہوتا ہے۔

3. اور تیسرا فرق یہ ہے کہ اہل سنت کے ہاں خلیفہ کو معصومیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا، وہ قرآن و سنت کی تصریحات کا پابند ہوتا ہے اور نئے پیش آمدہ معاملات میں متعلقہ حضرات کے ساتھ مشاورت اس کے فرائض میں شامل ہوتی ہے۔ جبکہ اہل تشیع کے نزدیک امام ”معصوم“ ہوتا ہے اور شریعت کی تعبیر میں اس کی رائے حتمی ہوتی ہے۔

اس کے بعد مملکت کا نظام چلانے کا معاملہ ہے، اس میں بھی یہی بات واضح ہے کہ قرآن و سنت کے صریح اور منصوص مسائل میں کسی کی رائے کا کوئی دخل نہیں اور اسے ہر حکومت ہر حالت میں بجالانے کی پابند ہے۔ البتہ اس کے بعد دو قسم کے مسائل رہ جاتے ہیں۔ ایک وہ مسائل ہیں جن کا تعلق قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح سے ہے، ان کے بارے میں اہل علم کے ساتھ مشاورت اور ان کی راہنمائی ضروری ہے۔ اور دوسرے وہ مسائل جو عام لوگوں کے حقوق و معاملات اور روزمرہ پیش آمدہ امور سے متعلق ہیں، ان کے بارے میں عام لوگوں کو صلاح مشورہ میں شریک کرنا اور ان کی رائے پر فیصلہ دینا سنت نبویؐ بھی ہے اور خلفاء راشدینؓ کی سنت بھی ہے۔ حتیٰ کہ جناب نبی اکرمؐ نے تو غزوۂ احد پر خود اپنی رائے کے خلاف شرکاء مجلس کی رائے پر فیصلہ کر دیا تھا جس سے رائے عامہ کی اہمیت اور حیثیت کا سنت نبویؐ کی روشنی میں بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جناب رسول اللہ نے روزمرہ مسائل اور عام لوگوں کے حقوق و معاملات پر ان کے ساتھ براہ راست بھی مشورہ کیا ہے اور بالواسطہ بھی ہزاروں لوگوں کو مشاورت کے نظام میں شریک کیا ہے، جبکہ غزوہ حنین کے بعد قیدیوں کی واپسی کے مسئلہ پر مسلمانوں کے بارہ ہزار افراد پر مشتمل لشکر سے ان کی رائے

ان کے نمائندہ ”عرفاء“ کے ذریعہ معلوم کر کے نبی اکرمؐ نے عوامی نمائندگی کے اصول کی توثیق فرما دی تھی۔

چنانچہ اگر علماء کرام جمہوریت سے بیزاری کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کریں کہ اسلامی نظام میں اہل سنت کے نقطۂ نظر کے مطابق:

1. حکومت کی تشکیل عوام کی رائے سے ہوتی ہے۔
2. حکومت اور عوام قرآن و سنت کے منصوص اور صریح احکام کے یکساں پابند ہوتے ہیں۔
3. قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح سے متعلقہ امور اہل علم کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔
4. عوام کے حقوق و معاملات اور روز مرہ پیش آمدہ امور کا فیصلہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں براہ راست یا بالواسطہ نمائندگی کی صورت میں عام لوگوں کی رائے سے ہوتا ہے۔

تو اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی کنفیوژن لوگوں کے ذہنوں میں پیدا نہیں ہوگا بلکہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک واضح نقشہ لوگوں کے سامنے آجائے گا اور وہ زیادہ اعتماد اور شرح صدر کے ساتھ اسلامی نظام کے حق میں آواز بلند کریں گے۔

معاشی خود کفالت کی اسلامی بنیادیں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۸ جون ۱۹۹۸ء)

غزوۂ خیبر کے بعد مال غنیمت کی کثرت ہوئی اور سر سبز و شاداب علاقے بھی مسلمانوں کی تحویل میں آئے تو مدینہ منورہ کے عام لوگوں کی زندگی میں بہتری کے آثار نمودار ہوئے اور تنگی و عسرت کے دن پھرنے لگے۔ یہ دیکھ کر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے باہم مشورہ کیا کہ رسول اللہؐ سے تقاضہ کیا جائے کہ ہمارے حالات میں بھی کچھ بہتری آنی چاہیے اور خرچ اخراجات کا معاملہ پہلے سے کچھ سہولت والا ہونا چاہیے۔ سب ازواج نے مل کر جناب نبی اکرمؐ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ام المومنین حضرت عائشہؓ کو اپنا نمائندہ اور متکلّم بنایا۔ انہوں نے بڑی حکمت اور دانشمندی کے ساتھ ازواج مطہراتؓ کی یہ درخواست حضورؐ کے گوش گزار کی لیکن پھر بھی درخواست

الٹی پڑگئی۔ رسول اللہؐ ناراض ہوگئے، اپنی بیویوں سے بول چال بند کردی اور مسجد کے حجرہ میں گوشہ نشین ہوگئے۔ اتنے دن گزر گئے کہ شہر میں چہ مگوئیاں شروع ہوگئیں اور یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہؐ نے اپنی ازواجؓ کو طلاق دے دی ہے۔ آپؐ کی ازواج میں حضرت عمرؓ کی دختر حضرت حفصہؓ بھی تھیں، حضرت عمرؓ یہ سن کر تڑپ اٹھے اور بے چینی واضطراب کے عالم میں اس حجرے کا رخ کیا جس میں آنحضرتؐ گوشہ نشین تھے۔ بڑی مشکل سے اندر جانے کی اجازت ملی، سامنے ہوتے ہی بے ساختہ پوچھا کہ کیا آپؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ حضورؐ نے نفی میں سر ہلایا تو حضرت عمرؓ الٹے پاؤں واپس پلٹے، حجرہ سے نکل کر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور لوگوں کو خوشخبری دی کہ طلاق والی افواہ غلط تھی۔ اس اطلاع پر لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان کے چہروں پر رونق واپس آئی۔

پھر سورۃ الاحزاب کی آیات نازل ہوئیں جن میں ازواج مطہراتؓ سے خطاب کرکے کہا گیا ہے کہ اگر وہ دنیا کی سہولت چاہتی ہیں تو وہ بھی مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے انہیں پیغمبر خدا کا گھر چھوڑنا ہوگا۔ اور اگر وہ اسی مقدس گھر میں رہنا چاہتی ہیں تو جیسی تنگی ترشی کی زندگی پہلے سے گزارتی آرہی ہیں اسی پر قناعت کرنا ہوگی۔ چنانچہ انہیں اختیار دے دیا گیا کہ انہیں دنیا کی سہولتوں اور رسول اللہؐ کی رفاقت میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا کیونکہ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس کے جواب میں سب سے پہلے ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اور پھر باقی سب امہات المومنین نے رسول اللہؐ کی رفاقت میں رہنے کا اعلان کیا۔ اور یوں ان کا مدینہ منورہ کے عام لوگوں کی طرح کی سہولتوں کا تقاضہ بھی مسترد ہوگیا جو اسی بستی کی ان جیسی دوسری عورتوں اور انہی جیسے دوسرے گھروں کو میسر تھیں۔

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی فقروفاقہ کی زندگی تھی۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تین دن مسلسل عام قسم کی کھجوریں بھی پیٹ بھر کر کھانے کو ملی ہوں۔ ارباب دانش کا کہنا ہے کہ یہ فقروفاقہ اختیاری تھا۔ رسول اللہؐ اگر چاہتے تو دنیاوی سہولتیں بے دام غلام کی طرح ہاتھ باندھے ان کے دروازے پر کھڑی نظر آتیں، لیکن نبی اکرمؐ نے فقروفاقہ اور تنگی و عسرت کا راستہ اختیار کیا جو ان کی حکمت ودانش کا خوبصورت اظہار تھا۔ اور اسی میں پوری امت کے لیے اور خاص طور پر حکمران طبقہ کے لیے سبق ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالی کے آخری پیغمبرؐ نے یہ تعلیم دی ہے کہ حکمران اور رہنما جس قدر سادہ زندگی گزاریں گے اور

عام لوگوں کے قریب رہیں گے اسی قدر انہیں عام لوگوں کے مسائل اور مشکلات سے آگاہی حاصل ہوگی اور اس سوسائٹی کی اجتماعی نفسیات پر ان کی گرفت قائم رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اس معاملہ میں جناب نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنانے کا بطور خاص اہتمام کیا اور انسانی تاریخ میں زندہ و جاوید ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں انگریزی عملداری کے تحت داخلی وخود مختاری فارمولا کے مطابق جب پہلی بار انتخابات ہوئے اور چند صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہوگئیں تو جناب گاندھی نے اپنے وزراء کو اس بات کی تلقین کی کہ اگر وہ حکمرانی میں کسی شخصیت کو بطور آئیڈیل سامنے رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سب سے پہلی شخصیات ہیں۔ یہ تاریخ کا خراج عقیدت ہے جو خلفائے راشدینؓ کے حصے میں آیا اور اس کی وجہ ان کا کوئی کروفر یا بلند و بالا محلات اور پر شکوہ ایوان نہیں تھے بلکہ سادگی، قناعت اور فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔ اس طرز زندگی نے انہیں اپنی ہی رعیت کے عام لوگوں سے ممتاز نہیں ہونے دیا تھا اور یہی ان کی کامیابی اور فخر و امتیاز کا سب سے بڑا راز ہے۔

خلفائے راشدینؓ نے قومی خزانے کو امانت کا درجہ دیا اور اس حد تک آگے چلے گئے کہ ایک بار امیر المومنین حضرت عمرؓ بیمار ہو گئے۔ بیماری کیا تھی کہ خشک روٹی کھاتے کھاتے انتڑیوں میں خشکی اور سوزش پیدا ہوگئی تھی۔ طبیب نے زیتون کا تیل بطور علاج تجویز کیا تو فرمایا کہ میرے پاس زیتون کا تیل استعمال کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ زیتون کا تیل بیت المال میں موجود ہے اس میں سے لے لیں۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے انچارج کو بلایا اور پوچھا کہ بیت المال میں زیتون کا جو تیل ہے اسے اگر مدینہ منورہ میں عام دستور کے مطابق تقسیم کیا جائے تو میرے حصے میں کتنا آئے گا؟ اس نے جواب میں جتنی مقدار بتائی وہ بہت تھوڑی تھی، طبیب نے کہا کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔ اس پر امیر المومنین حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ اس سے زیادہ اس تیل پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا کہ ”جتنا چاہے گڑگڑا تارہ، تجھے وہی ملے گا جو مدینہ کے عام شہریوں کو ملتا ہے“۔

یہ محض قصے کہانیاں نہیں کہ انہیں پڑھ سن کر ہم سر دھنتے رہیں اور ان بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کر کے راہنمائی کے لیے دوسری قوموں کی لائبریریاں کھنگالنے میں لگ

جائیں۔ یہ ہماری تاریخی روایات ہیں، شاندار ماضی ہے، راہنمائی کی اصل بنیادیں ہیں اور حکمت ودانش کے سرچشمے ہیں جو آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ اور سنگ میل ہیں۔

آج ہمارے قائدین معاشی خود کفالت اور اقتصادی استحکام کا نعرہ لگا کر ملک کے نظام معیشت میں اصلاحات کی باتیں کر رہے ہیں، قناعت اور سادگی کی نوید سنائی جا رہی ہے، ایوان صدر، وزیر اعظم اور گورنر ہاؤس چھوڑنے کے اعلانات ہو رہے ہیں اور قوم کے منتخب نمائندے بجٹ اور اقتصادی اصلاحات پر بحث و تمحیص میں مصروف ہیں۔ اس لیے ان سب سے گزارش ہے کہ جی چاہتا ہے تو آؤ ہم سب مل کر چودہ سو سال پہلے کے ”زیرو پوائنٹ“ پر واپس چلے جائیں اور وہاں سے ازسرنو انہی خطوط پر اجتماعی زندگی کا آغاز کریں کیونکہ اس کے سوا سب فریب ہے۔

امت مسلمہ کے مسائل اور امام مسجد نبویؐ کا خطبہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ء)

مولانا منظور احمد چنیوٹی راوی ہیں کہ ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران وہ سعودی عرب میں تھے اور رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے قادیانیت کے بارے میں قائم کیے گئے گروپ کے ساتھ مصروف کار تھے۔ اس دوران حرمین شریفین کے ایک بزرگ امام محترم سے ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے امام صاحب سے استدعا کی کہ وہ جمعۃ المبارک کے خطبہ میں پاکستان کی تحریک ختم نبوت کا تذکرہ کر کے قادیانیت کے بارے میں کچھ کلمات ارشاد فرما دیں۔ امام محترم نے جواب دیا کہ انہیں اس سلسلہ میں متعلقہ حکام سے اجازت لینا پڑے گی۔ مولانا چنیوٹی نے کہا کہ چلو خطبہ جمعہ نہ سہی دعا میں ہی ذکر کر دیں اور عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے اسلامیان پاکستان کی کامیابی کے لیے دعا فرما دیں، جواب ملا کہ اس کے لیے بھی متعلقہ حکام کو اعتماد میں لینا ہو گا۔

یہ شخصی یا خاندانی حکومت کا سب سے بڑا المیہ ہوتا ہے کہ شخصیت یا خاندان کے مفادات اور وقار کو پورے نظام میں محور کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور کسی بے ضرر بلکہ مفید بات کے لیے بھی بعض چہروں کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنا ضروری سمجھا جانے لگتا ہے۔

۱۹۹۲ء میں سعودی عرب کے سینکڑوں سرکردہ علماء کرام اور دانشوروں نے ”مذکرۃ النصیحہ“ (خیر خواہی کی یادداشت) کے نام سے ایک عرضداشت بادشاہ معظم کے حضور

پیش کی جس میں حکومت کی مختلف پالیسیوں بالخصوص خلیج میں امریکی افواج کی موجودگی، ملک میں سودی نظام و معیشت کے تسلسل، اور شرعی عدالتوں کے دائرہ کار اور اختیارات کو بتدریج محدود کرنے کے طرز عمل پر تنقید کرتے ہوئے ان پر نظر ثانی کرنے کا مطالبہ کیا گیا، اور شریعت اسلامیہ کے مطابق عوام کے شرعی اور شہری حقوق کی بحالی پر زور دیا گیا۔ اس عرضداشت پر دستخط کرنے والے سینکڑوں علماء اور دانشوروں کو گرفتار کر لیا گیا اور بہت سے جلاوطن کر دیے گئے۔ ان میں سے دو بڑے علمائے کرام الشیخ سفر الحوالی اور الشیخ سلمان العودۃ ابھی تک زیر حراست ہیں۔ اور دو ممتاز دانشور ڈاکٹر محمد المسعری اور ڈاکٹر سعد الفقیہ اپنے دیگر رفقاء سمیت لندن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جبکہ عالم اسلام کے عظیم مجاہد الشیخ مجاہد اسامہ بن لادن اسی قسم کی جرأت رندانہ کی پاداش میں افغانستان کی سنگلاخ وادیوں میں ''خانہ بدوشی'' کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

اس ''خیر خواہی کی عرضداشت'' کے جواب میں علماء کے سرکاری کیمپ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ بادشاہ معظم کی پالیسیوں پر اس طرح کھلم کھلا تنقید کرنا اور اس حوالہ سے لوگوں کا ذہن تیار کرنا درست طرز عمل نہیں ہے، اور ان سرکاری علماء کے بقول شریعت اسلامیہ میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک درست طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی کو شرعی نقطۂ نظر سے حکومت کی کسی پالیسی پر اعتراض ہو تو وہ اسے مخفی طور پر تنہائی میں باوقار طریقہ سے متعلقہ حکام کے گوش گزار کر دے۔ بس اس کی ذمہ دار صرف اتنی ہے اور ایسا کر کے وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔

اس پس منظر میں مدینہ منورہ کے محترم عالم دین اور مسجد نبوی علی صاحبہا التحیۃ والسلام کے امام الشیخ علی عبد الرحمن الحذیفی کے ایک خطبہ جمعہ کی آڈیو کیسٹ سننے کا اتفاق ہوا تو خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے بعض اہم اور نازک مسائل پر عالم اسلام کے دینی حلقوں کی بے باک ترجمانی کا راستہ اختیار کیا ہے اور روایتی طریق کار سے ہٹ کر عالم اسلام کے زندہ مسائل کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ یہ کیسٹ مدینہ منورہ سے آنے والے ایک دوست نے ہمیں مرحمت فرمائی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ الشیخ علی الحذیفی نے یہ خطبہ ذیقعد ۱۴۱۸ھ کے پہلے جمعۃ المبارک کو مسجد نبوی میں ارشاد فرمایا۔ جبکہ ایران کے سابق صدر جناب رفسنجانی بھی مدینہ منورہ کے دورے پر آئے ہوئے تھے اور جمعۃ المبارک کے اجتماع میں

شریک تھے۔ مگر مذکورہ روایت کے مطابق وہ خطبہ کے دوران ہی اٹھ کر اپنے محافظین کے ہمراہ واپس چلے گئے۔

الشیخ علی عبد الرحمن الحذیفی اپنے علم و فضل اور نیکی و تقوی کے حوالہ سے عالم اسلام کی معروف شخصیت ہیں اور قرآن کریم کی قراءت میں ان کا سوز و گداز بطور خاص لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں ان کی عقیدت و محبت ابھارنے کا باعث ہے۔ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں کسی نماز کی ادائیگی ایک مسلمان کے لیے بذات خود بہت بڑی سعادت اور خوش بختی کی بات ہے، لیکن راقم الحروف نے اس بات کا کئی بار مشاہدہ کیا ہے کہ کسی جہری نماز کی تکبیر تحریمہ میں الشیخ علی الحذیفی کی آواز سن کر نمازیوں کے چہرے کھل اٹھتے ہیں کہ آج ان کی زبان سے قرآن کریم سن کر نماز کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ خود راقم الحروف بھی ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہے، کئی نمازیں ان کی اقتدا میں ادا کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہے اور آئندہ بھی اس سعادت کے بار بار حصول کا امیدوار ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مصر کے الشیخ محمود خلیل الحصریؒ کے بعد اگر کسی قاری کی تلاوت قرآن کریم نے متاثر کیا ہے اور دل کی بے حس تاروں کو حرکت دی ہے تو وہ یہی الشیخ علی عبد الرحمن الحذیفی ہیں۔ اللہ تعالی انہیں حفظ و امان میں رکھے اور ہر قسم کی ابتلا و آزمائش میں استقامت اور سرخروئی نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

شیخ حذیفی نے مذکورہ خطبہ جمعہ میں اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں امریکہ اور دیگر مغربی طاقتوں کے طرز عمل کو موضوع بحث بنایا ہے اور کہا ہے کہ خلیج عرب میں امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی افواج کی موجودگی کے بنیادی اہداف چھ ہیں:

1. اسرائیل کا تحفظ
2. ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی راہ ہموار کرنا
3. مشرق وسطی پر فوجی تسلط
4. عربوں کی دولت کا استحصال
5. اسلام کی دعوت کا راستہ روکنا
6. اسلامی اقدار اور تہذیب کا خاتمہ

انہوں نے کہا کہ سعودی عرب کو خلیجی ممالک میں کلیدی حیثیت حاصل ہے اس لیے امریکہ اس پر بطور خاص نظریں جمائے ہوئے ہے اور مغربی طاقتیں سعودی عرب کی

سالمیت و وحدت کو نقصان پہنچانے اور اس کی اسلامی حیثیت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ انہوں نے عربوں کے موجودہ المیہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد بڑی طاقتوں نے عربوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل کر دیا اور قومیتوں کے نام پر آپس میں الجھا دیا۔ پھر ان میں سے بہت سے ممالک میں فوجی انقلابوں کے ذریعے شخصی حکومتیں مسلط ہوئیں اور اسلام کی بجائے قوم پرستی، سوشلزم اور علاقائیت کو فروغ دیا گیا۔ بلکہ بعض ممالک میں اسلامی اقدار و روایات کو جبراً ختم کرنے کی بھی کوشش کی گئی اور اسلامی اجتماعیت کے مختلف مظاہر حتیٰ کہ نماز باجماعت کی ادائیگی کا اہتمام بھی مشکل بنا دیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ بڑی طاقتوں نے مسلم ممالک پر تسلط کے دوران سب سے بڑا کام یہ کیا کہ محاکم شرعیہ کو ختم کر کے غیر اسلامی قوانین نافذ کر دیے۔ ان میں سے صرف سعودی عرب ابھی تک محفوظ ہے کہ وہاں شرعی عدالتوں کا نظام موجود ہے اور لوگوں کے مقدمات کے فیصلے شریعت اسلامی کے مطابق ہوتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ یہود و نصاریٰ اسلام اور مسلمانوں کے بڑے دشمن ہیں۔ پوری تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو ختم کرنے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ دوستانہ تعلقات سے قرآن کریم میں واضح طور پر منع کیا ہے، اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دینے کا حکم دیا ہے۔ لیکن آج امریکہ اور برطانیہ کی افواج نہ صرف جزیرۂ عرب میں موجود ہیں بلکہ عرب ممالک کے داخلی معاملات میں مداخلت کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خلیج عرب کو یہود و نصاریٰ کے وجود سے پاک کرانا ہمارے دینی واجبات میں سے ہے اور اس کے لیے دنیا بھر کے مسلمان، عوام اور حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے سعودی بھائیوں کا ساتھ دیں۔

انہوں نے ''وحدت ادیان'' اور مختلف مذاہب کے درمیان قرب پیدا کرنے کے تصور کا بطور خاص نوٹس لیا اور کہا کہ یہودیت، عیسائیت، ہندو ازم، اور دیگر مذاہب کے ساتھ اسلام کا بنیادی اختلاف عقائد اور ایمانیات کا اختلاف ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ مفاہمت اور قرب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کے پاس اصل سرمایہ ان کا ایمان اور عقائد ہیں۔ اگر ان میں بھی لچک قبول کر لی جائے تو اور کون سی بات باقی رہ جاتی ہے؟

انہوں نے سنی شیعہ اختلافات کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ اختلافات بنیادی ہیں، کیونکہ قرآن کریم کا محفوظ ہونا، صحابہ کرامؓ کا مومن ہونا، اور بالخصوص خلفاء ثلاثہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا اہل ایمان کا سرخیل ہونا ہمارے عقائد و ایمان کا حصہ ہے۔ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی پر قرآن کریم نے شہادت دی ہے۔ اس لیے ان بزرگوں پر طعن کرنے والوں کے ساتھ ہم جمع نہیں ہو سکتے اور ایسا کرنا دینی حمیت کے منافی ہو گا۔

انہوں نے کہا کہ عالمی طاقتوں کا بنیادی مقصد ہمارے عقائد و ایمان کو کمزور کرنا اور ہمیں ان سے محروم کرنا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے عقائد کی حفاظت کریں اور ایمان کو مضبوط بنائیں۔ کیونکہ ایمان ہی کی قوت ہے جو ہمارے کام آئے گی اور اسی قوت کی وجہ سے ہم کفر کی یلغار کا مقابلہ کر سکیں گے۔

انہوں نے ترکی کے حالات کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ترکی میں اسلامی شعائر کو جبراً مٹایا جا رہا ہے اور اہل دین کے خلاف زمین تنگ کی جا رہی ہے، صرف اس لیے کہ ترک مسلمان اسلام سے محبت کرتے ہیں اور ماضی میں ترکی نے خلافت عثمانیہ کے نام سے ایک عرصہ تک اسلام کا پرچم سربلند کیے رکھا ہے۔ انہوں نے مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ توبہ کا راستہ اختیار کریں اور کفر و ظلم کی زندگی ترک کر کے اطاعت اور فرمانبرداری کی زندگی اختیار کریں۔ جس نے لوگوں پر ظلم کیا ہے وہ ظلم سے توبہ کرے، جس نے بدکاری کی ہے وہ بدکاری سے توبہ کرے، جو نشہ کرتا ہے وہ نشے سے توبہ کرے، اور جو سودی کاروبار کرتا ہے وہ سود سے توبہ کرے، بے نماز لوگ نماز کی پابندی کریں، مسلمان حکومتیں اسلامی احکام و قوانین کی عملداری کا اہتمام کریں، کتاب و سنت کے فیصلوں پر عمل کریں، اور ہم سب اپنے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری پیغمبرؐ کی ہدایات کی پیروی کریں۔ اسی صورت میں اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہوں گے، اور جب خدا راضی ہو گا تو دنیا کی یہ طاقتیں ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گی۔

الشیخ علی عبد الرحمن الحذیفی کے اس تاریخی خطاب کے چند پہلو ہم نے پیش کیے ہیں۔ جبکہ ہمارے نزدیک ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل علم اس خطاب کو خود سنیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہم ان اطلاعات پر تشویش کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس خطبہ کے بعد سے شیخ موصوف منظر سے مسلسل غائب

ہیں اور کم و بیش ڈیڑھ ماہ سے انہوں نے نہ کسی جمعہ پر خطبہ دیا ہے اور نہ ہی کوئی نماز پڑھائی ہے۔ ہمارے ایک ذمہ دار دوست جو اس دوران دو ہفتے مدینہ منورہ رہ کر آئے ہیں، بتاتے ہیں کہ ان دو ہفتوں میں شیخ حذیفی نے ایک نماز بھی نہیں پڑھائی۔ معلوم نہیں کہ آیا انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے یا وہ گھر میں نظر بند کر دیے گئے ہیں؟ ہم سعودی عرب کی معزز حکومت سے گزارش کریں گے کہ وہ الشیخ علی عبد الرحمن الحذیفی جیسے ہر دلعزیز امام و خطیب کی صحت و سلامتی اور آزادی کے بارے میں تازہ ترین صورتحال سے عالم اسلام کو باخبر کرے۔

روزنامہ اوصاف میں ”نوائے قلم“ کا آغاز

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۳ مارچ ۱۹۹۸ء)

حامد میر سے کچھ زیادہ تعارف نہیں رہا، البتہ ان کے والد مرحوم پروفیسر وارث میر کا پرانا قاری اور کسی حد تک ناقد بھی رہا ہوں۔ وارث میر مرحوم واضح سوچ رکھنے، جرأت سے بات کرنے اور منطق و استدلال کے سہارے آگے بڑھنے والے دانشور تھے۔ اس لیے بہت سی باتوں میں اختلاف کے باوجود ان کے مضامین اہتمام سے پڑھتا تھا۔ حامد میر اس کوچے میں آئے تو تعارف اتنا ہی تھا کہ نوجوان صحافی ہیں اور پروفیسر وارث میر کے بیٹے ہیں۔ لیکن ”قلم کمان“ اور ”پاکستان“ میں ان کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی گئیں اور ایک نیا، باہمت اور باصلاحیت دانشور ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔

حامد میر کی ہر بات سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور نہ ہی ایسا ممکن ہے، مگر اس نوجوان کی یہ عادت مجھے پسند ہے کہ کسی بھی موضوع پر غور و فکر اور مطالعہ و تحقیق کے بعد قلم اٹھاتا ہے اور جو بات ایک بار طے کر لیتا ہے اس پر ڈٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حامد میر نے مجھے روزنامہ پاکستان میں لکھنے کے لیے کہا تو انکار نہ کر سکا۔ اور متنوع مصروفیات کے باوجود کم و بیش سال بھر مختلف عنوانات پر مضامین کا سلسلہ چلتا رہا۔ اور پھر جب حامد میر ”پاکستان“ سے ”اوصاف“ میں منتقل ہو گئے تو میرا بھی جی چاہا کہ اس نوجوان کے ساتھ ہی رہوں، مگر تالی کے لیے دوسرے ہاتھ کی حرکت کے انتظار میں کچھ وقت گزر گیا۔ اور اب یہ شرط پوری ہونے پر ”نوائے قلم“ کے مستقل عنوان کے ساتھ قلم ہاتھ میں لے رہا ہوں۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ ہفتہ میں دو یا کم از کم ایک بار قارئین سے ضرور ملاقات ہوتی رہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابتدا میں بطور تمہید ایک دو وضاحتیں ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ میں ''صحافت برائے صحافت'' کا قائل نہیں ہوں اور نہ ہی اس معنی میں خود کو صحافی سمجھتا ہوں۔ صحافت میرے نزدیک محض ایک ذریعہ ہے لوگوں کے ذہنوں تک رسائی کا، اور اس ذریعے کو صحیح مقاصد کے لیے استعمال کرنا ہی اس کے ساتھ انصاف کا اصل تقاضہ ہے۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتا کہ اسلام، ملت اسلامیہ اور پاکستان کے ساتھ میری کمٹمنٹ دو ٹوک اور بے لچک ہے۔ اور ان تین میں سے کسی ایک حوالہ سے بھی ''غیر جانبداری'' کا قائل بلکہ متحمل نہیں ہوں۔

دوسری بات یہ کہ میں خود اپنے بارے میں کہا کرتا ہوں کہ میرا ذوق ''حذیفی ذوق'' ہے۔ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف صحابی حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا ذوق، جو رسول اللہؐ کے ''رازدار'' صحابی کہلواتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہؐ کی زندگی کا ایک راز ایسا ہے جو ان کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ کہ ایک بار چند منافقین نے نقاب پہن کر نبی اکرمؐ پر قاتلانہ حملہ کیا جو ناکام رہا۔ رسول اللہؐ نے ان منافقین کو پہچان لیا اور ان کے نام اس شرط پر حذیفہ بن الیمانؓ کو بتا دیے کہ یہ راز صرف ان کے سینے میں دفن رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور کوئی بھی شخص حضرت حذیفہؓ سے کبھی یہ راز حاصل نہ کر سکا۔

حضرت حذیفہؓ اپنے بارے میں یہ کہا کرتے تھے کہ دوسرے صحابہؓ رسول اللہؐ سے خیر کی باتیں پوچھا کرتے تھے مگر میں شر کی باتیں پوچھتا تھا۔ شر کی بات پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرمؐ سے فتنوں اور امت میں پیدا ہونے والی خرابیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے تھے، اور فتنوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا ان کا خصوصی شغف بن گیا تھا۔ کم و بیش اسی طرح کا ذوق میرا بھی بن گیا ہے اور شر کے ساتھ اس ''دوستی'' کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض دوست حیران ہو کر مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ اخبار ہم بھی پورے اہتمام سے پڑھتے ہیں لیکن ہمیں کوئی بات محسوس نہیں ہوتی لیکن تم اخبار پر ایک نظر ڈال کر اس میں سے تبصرے کے لیے دو تین خبریں نکال لیتے ہو کہ فلاں ملک نے ہمارے خلاف یہ کر دیا، فلاں لابی نے یہ کر دیا اور فلاں ادارے نے یہ کر دیا۔ میں اسے خدا کی دین اور عطیہ سمجھتے ہوئے اس پر اس ذات اقدس کا بے حد و حساب شکر گزار ہوں۔ اور شکر گزاری کا سب سے بہتر طریقہ یہی سمجھتا ہوں کہ اس ذوق کو خود تک محدود رکھنے کی بجائے اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کروں تاکہ وہ شر سے واقف ہوں،

اس کے سرچشموں سے آگاہی حاصل کریں، اور اس کے اہداف کو پہچانیں۔ کیونکہ شر اور اذیت سے بچنے کے لیے سب سے پہلا اور سب سے ضروری مرحلہ یہی ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد آج کی دنیا میں شر کے سب سے بڑے نمائندہ اور شر کی قوتوں کے سب سے بڑے لیڈر کے نام سے "نوائے قلم" کے سلسلہ کا آغاز کر رہا ہوں، اور میرے اگلے اور پہلے باضابطہ کالم کا عنوان ہوگا "امریکی جرائم اور شہر سدوم"۔

۱۹۹۷ء

مغرب کی بالادستی اور حضرت عمرو بن العاصؓ

(روزنامہ پاکستان، اسلام آباد - ۱۷ جولائی ۱۹۹۷ء)

فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا شمار ''دھاۃ العرب'' میں ہوتا ہے، یعنی عرب کے چوٹی کے ذہین اور ہوشیار لوگوں میں، جن کی فطانت وفراست کا تذکرہ تاریخ میں ہمیشہ امتیازی حیثیت سے ہوتا رہا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار جرنیل، کامیاب منتظم، مدبر سیاست کار، اور انسانی اجتماعیت کے مزاج ونفسیات سے اچھی طرح واقف تھے جس پر ان کی زندگی کے متعدّد واقعات گواہ ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ یہاں پیش کیا جارہا ہے جس سے ان کی دور اندیشی اور پیش بینی کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی مجلس میں ایک روز مستورد قرشیؓ بیٹھے ہوئے تھے جن کا شمار صغار صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ مستورد قرشیؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''تقوم الساعۃ والروم اکثر الناس'' کہ قیامت سے پہلے رومی لوگوں میں کثرت سے پھیل جائیں گے۔ روم اس دور میں عیسائی سلطنت کا پایۂ تخت تھا اور رومیوں سے عام طور پر مغرب کے عیسائی حکمران مراد ہوتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو چونکے اور پوچھا کہ دیکھو! کیا کہہ رہے ہو؟ مستورد قرشیؓ نے کہا کہ میں وہی کہہ رہا ہوں جو میں نے جناب رسول اللہؐ سے سنا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر ان رومیوں میں چار خصلتیں موجود ہوں گی (جن کی وجہ سے وہ انسانی سوسائٹی پر غالب آئیں گے)۔

1. "اِنھم لأحلم الناس عند فتنۃ" — پہلی یہ کہ وہ فتنے اور آزمائش کے وقت دوسرے لوگوں سے زیادہ تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کریں گے،
2. "وأسرعھم اِفاقۃ بعد مصیبۃ" — دوسری یہ کہ وہ مصیبت گزر جانے کے بعد سنبھلنے میں دوسرے لوگوں سے تیز ہوں گے،
3. "وأوشکھم کرۃ بعد فرۃ" — تیسری یہ کہ وہ شکست کے بعد دوبارہ جلدی حملہ آور ہونے والے ہوں گے،
4. "وخیرھم لمسکین ویتیم وضعیف" — چوتھی یہ کہ وہ اپنے یتیموں، مسکینوں اور کمزوروں کے لیے اچھے لوگ ثابت ہوں گے، اتنا کہہ کر حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ "وخامسۃ حسنۃ جمیلۃ" ان میں ایک اور پانچویں خصلت بھی ہوگی جو اچھی اور خوب ہوگی
5. "وأمنعھم من ظلم الملوک" — وہ لوگوں کو حکمرانوں کے مظالم سے روکنے میں پیش پیش ہوں گے۔

اس ارشاد کو ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیے اور اندازہ کیجیے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے کس طرح ہمارے آج کے دور کا نقشہ چودہ سو برس قبل جناب رسول اللہ ﷺ کی ایک پیش گوئی کی وضاحت کرتے ہوئے کھینچ دیا تھا۔ انھوں نے دراصل قوموں کے مزاج و نفسیات کو سمجھتے ہوئے اقوام عالم کی برادری میں برتری اور بالادستی کی منزل تک پہنچانے والے اخلاق اور خصلتوں کی وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو قوم بردباری، غریب پروری، اور عدل و انصاف کے اوصاف اپنا لیتی ہے اسے انسانی برادری میں برتری حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اقوام کی برادری میں قیادت کا تخت سنبھال لیتی ہے۔ یہ پانچ اوصاف جن کا ذکر حضرت عمرو بن العاصؓ نے کیا ہے انسانیت کے اعلیٰ اخلاق ہیں جو آسمانی تعلیمات کی بنیاد ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے وحی الٰہی کے ذریعہ نسل انسانی کے لیے موصول ہونے والی ان خدائی ہدایات کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔

آسمانی مذاہب کے مطالعہ میں آپ کو انسانی اخلاق اور اعلیٰ انسانی اوصاف کی تعلیم نمایاں نظر آئے گی۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے ان تعلیمات کو اپنایا ہے اس کے نتائج سے اسے ضرور ثمر ملا ہے۔ اس بارے میں خود جناب رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات دیکھ لیں کہ آپؐ نے اپنی امت کو کن اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرایا؟ اس کا مشاہدہ جناب نبی

اکرمؐ کی ذات گرامی، آپؐ کے قائم کردہ معاشرے، اور خلفائے راشدینؓ کے طرز زندگی اور طرز حکومت میں بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص حضرت عمرو بن العاصؓ کے ذکر کردہ آخری دو اوصاف تو خلفائے راشدہ کا طرہ امتیاز ہیں، یعنی غریب پروری اور لوگوں کو حکمرانوں کے مظالم سے روکنا خلفاء راشدینؓ کے نظام حکومت کی بنیاد تھا۔ معاشرہ کے نادار افراد، کمزوروں، بے سہارا لوگوں، یتیموں، بیواؤں، اور مجبوروں کی سرکاری خزانے (بیت المال) سے کفالت کا اہتمام خلافت راشدہ کے دور میں ہی منظم طریقہ سے شروع ہوا تھا۔ اور حکمرانوں کو عام آدمی کے سامنے احتساب کے لیے پیش کر کے عدل اور انصاف کی ضمانت بھی سب سے پہلے خلافت راشدہ نے ہی فراہم کی تھی۔

آج دنیا کی دوسری قوموں نے ہماری اس "متاع" پر قبضہ کر لیا ہے تو یہ ہماری کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ آج مغرب سے ہمیں شکوہ ہے کہ مغرب ہمارے خلاف صف آرا ہے اور ہمیں اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ کر زیر کرنے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتا ہے، کر رہا ہے۔ مغرب سے ہمیں یہ بھی شکایت ہے کہ وہ ہم پر اپنی ثقافت مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور انسانی حقوق کے خود ساختہ فلسفے کے ہتھیار سے ہماری اخلاقی، دینی، اور معاشرتی اقدار و روایات کو ملیا میٹ کرنے کے درپے ہے۔ یہ شکایتیں بجا ہیں لیکن ہمیں حضرت عمرو بن العاصؓ کے مذکورہ ارشاد کے حوالہ سے مغرب کے ساتھ اپنا تقابل اس حوالہ سے بھی کر لینا چاہیے کہ

1. مصیبت و مشکل کے وقت مغربی اقوام اور ہمارے طرز عمل میں کیا فرق ہوتا ہے؟
2. مصیبت کے گزر جانے کے بعد سنبھلنے میں ہم کتنا وقت لیتے ہیں؟
3. شکست کے بعد اس کی تلافی کرنے یا ماتم کرتے رہنے میں سے ہم کونسا راستہ اختیار کرتے ہیں؟
4. معاشرہ کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی کفالت کے لیے ہمارے پاس کونسا نظام موجود ہے؟
5. اور عام لوگوں کو حکام کے مظالم اور ریاستی جبر سے بچانے کے لیے ہمارا "معاشرتی شعور" کس مرحلہ میں ہے؟

انسانی حقوق کے حوالے سے مغرب کا گزشتہ صدی کا ریکارڈ سامنے رکھا جائے تو یہ شکایت ضرور سامنے آتی ہے کہ مسلم ممالک کے بارے میں مغرب دوہرا معیار رکھتا ہے اور جن ممالک کی حکومتیں مغرب کے مفادات کی نگہبانی کر رہی ہیں وہاں کے عوام کے انسانی اور سیاسی حقوق کے معاملہ میں مغرب نے مجرمانہ غفلت اور خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر عمومی تناظر میں دیکھا جائے تو آج مغربی ممالک دنیا بھر کے مختلف خطوں کی حکومتوں کے ستائے ہوئے مظلوموں کی سب سے بڑی پناہ گاہ بھی ہیں اور معاشرے کے نادار و معذور افراد کے لیے اگر زندگی کی سب سے زیادہ سہولتیں میسر ہیں تو وہ بھی انہی مغربی ممالک میں ہیں۔

اس پس منظر میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے اس ارشاد گرامی میں جہاں قوموں کی قائدانہ صلاحیتوں اور اوصاف کی نشاندہی ملتی ہے وہاں ہمارے لیے یہ سبق بھی ہے کہ ہمارا بھولا ہوا سبق دوسری قوموں نے سیکھ کر اقوام کی برادری میں چودھراہٹ حاصل کر لی ہے اور ہم ابھی تک "پدرم سلطان بود" کے نعرے کی مستی میں گم ہیں۔ اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی ثقافت کے کی جدوجہد کرنے والے مراکز، شخصیات اور اداروں کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہیے کہ ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کی بحالی کی شاہراہ یہی ہے۔

۱۹۹۶ء

برطانیہ کی مساجد کمیٹیاں اور آئمہ و خطباء

(روزنامہ پاکستان، اسلام آباد - ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

ان دنوں لندن سے شائع ہونے والے ایک اردو روزنامہ میں مساجد کی انتظامیہ کمیٹیوں اور آئمہ مساجد کے درمیان بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری ہے۔ مساجد کی انتظامیہ کمیٹیوں کی ایک مشترکہ کونسل کی طرف سے بیان شائع ہوا کہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے سپانسر پر جن آئمہ اور خطباء کو بلایا جاتا ہے وہ صرف اتنا وقت مساجد میں گزارتے ہیں جتنا مستقل ویزے کے حصول کے لیے ضروری ہوتا ہے اور جونہی ان کے پاسپورٹ پر مستقل ویزے کی مہر لگ جاتی ہے وہ مساجد و مکاتب کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور اپنے لیے دیگر مصروفیات تلاش کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے مساجد و مکاتب میں خطباء، آئمہ اور مدرسین کی ضرورت کا مسئلہ مستقل طور پر درپیش رہتا ہے۔ اس کے جواب میں آئمہ مساجد کی بعض تنظیموں کی طرف سے بیان آیا ہے کہ سپانسر پر آئمہ اور خطباء کو بلانے والی مساجد کمیٹیاں ان آئمہ کے ساتھ چار پانچ سال تک جو سلوک روا رکھتی ہیں وہ غلاموں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ معاوضہ انتہائی قلیل ہوتا ہے بلکہ پابندیاں اور طرز عمل بھی اس قدر اہانت آمیز ہوتا ہے کہ مجبوری کی مدت گزر جانے کے بعد کوئی شریف آدمی ان کمیٹیوں کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کرتا۔

برطانیہ میں مساجد و مکاتب کی صورتحال یہ ہے کہ مختلف ممالک سے یہاں آکر بسنے والے مسلمانوں نے یہاں اپنی اپنی ضروریات کے مطابق مساجد قائم کر رکھی ہیں جن کی مجموعی تعداد پورے برطانیہ میں ایک ہزار کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ ان میں سے

بہت سی مساجد ایسی ہیں جو باقاعدہ طور پر منظوری لے کر مساجد کی شکل میں تعمیر کی گئی ہیں، بعض مساجد کرایہ یا ملکیت کے فلیٹس میں قائم ہیں اور سینکڑوں مساجد ایسی بھی ہیں جو غیر آباد گرجے خرید کر ان میں بنائی گئی ہیں۔ ان مساجد میں پانچ وقت کی نماز باجماعت، جمعہ اور عیدین کے اہتمام کے ساتھ ساتھ شام کو پانچ سے سات تک یا ہفتہ و اتوار کو چھٹی کے روز قرآن کریم کی تعلیم کے مکاتب قائم ہیں جہاں ہزاروں بچے قرآن کریم اور دینی معلومات کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے دینی تعلیم کے بڑے دار العلوم اور جامعات مختلف علاقوں میں الگ طور پر بھی قائم ہو رہے ہیں جس میں درس نظامی کے ساتھ ساتھ مقامی سکولوں کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ان کے ہاسٹلوں میں سینکڑوں طلبہ مقیم ہوتے ہیں۔ اسی طرز پر بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے بھی ادارے قائم ہونا شروع ہو گئے ہیں اور اس طرح دینی تعلیم کا دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے۔

پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے آنے والے مسلمانوں کی مساجد اور مکاتب اپنے ملکوں کی طرح یہاں بھی مسالک کی تفریق کا دائرہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور شیعہ کی تفریق کے علاوہ یہاں علاقائی تفریق کا رنگ بھی نمایاں ہے اور گجراتی، بنگالی، میرپوری اور پنجابی طرز کی گروہ بندیاں ان مساجد و مکاتب کے نظام میں کارفرما دکھائی دیتی ہیں۔

ان مساجد کے لیے آئمہ و خطباء اور قرآن کریم کی تعلیم کے اساتذہ ظاہر بات ہے کہ اپنے ممالک سے ہی درآمد کیے جاتے ہیں۔ اور چونکہ مسلکی اور علاقائی گروہ بندی کی رعایتوں کے علاوہ مساجد قائم کرنے والی کمیٹیوں کے ذمہ دار افراد کی ذاتی پسند و ناپسند اور اپنے رشتہ داروں اور تعلق داروں کو ترجیح دینے کا مسئلہ بھی درپیش رہتا ہے، اس لیے یہاں کے ماحول کی ضروریات کے مطابق آئمہ و اساتذہ کی اہلیت کا تعین اور اس کی روشنی میں افراد کا انتخاب ابھی تک ترجیحات میں شامل نہیں ہو سکا۔ دوسری طرف پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے دینی اداروں نے اس امر کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی کہ مغربی ممالک کی مساجد و مدارس کے لیے وہاں کی ضروریات کا جائزہ لے کر ان کے مطابق آئمہ اور اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور تیاری کا اہتمام کریں تاکہ وہ وہاں جا کر اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی صحیح دینی راہنمائی کی ذمہ داری بہتر طور پر ادا کر سکیں۔ اس لیے برطانیہ میں آنے والے آئمہ، خطباء اور دینی اساتذہ کی غالب اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جو اپنی جگہ ضروری دینی تعلیم اور

صلاحیت سے یقینا بہرہ ور ہوں گے لیکن زبان، نفسیات، ذہنی سطح اور معاشرتی فرق کے لحاظ سے یہاں کی ضروریات سے قطعی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اور ان میں سے اکثر حضرات کی یہاں آمد کا مقصد صرف دین کی خدمت نہیں بلکہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا بھی ہے۔ چنانچہ انہیں اس کے لیے جو مواقع میسر آتے ہیں ان سے استفادہ میں انہیں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا اور اس کے منطقی اثرات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔

آج سے دو سال قبل ورلڈ اسلامک فورم نے اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے شعبہ ”دعوت اکیڈمی“ کے تعاون سے یورپ کے مسلمان طلبہ اور طالبات کے لیے اردو اور انگلش میں دینی تعلیم کا ایک کورس ”اسلامک ہوم اسٹڈی کورس“ کے نام سے شروع کیا تھا جس میں اب بحمد اللہ تعالیٰ ایک ہزار سے زائد طلبا اور طالبات شریک ہیں۔ گزشتہ سال لندن کی ایک مجلس میں راقم الحروف نے علماء کو اس کورس کی اہمیت و ضرورت کی طرف توجہ دلائی تو ایک بڑے عالم دین نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”حضرت! یہاں دین کی کیا بات کرتے ہیں، یہاں تو بس پونڈ اکٹھے کریں اور اپنے ملک میں جا کر دین کی خدمت کریں۔“ اس سے یہاں کی اس نفسیاتی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو دین کے نام پر اس ملک میں آنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے ذہنوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یقیناً سب لوگ ایسے نہیں ہیں اور ایسے افراد کی بڑی تعداد مساجد و مدارس میں کام کر رہی ہے جو دین کی خدمت کے مشنری جذبہ سے بہرہ ور ہیں۔ لیکن مجموعی ماحول اور خاص طور پر پاکستان سے تعلق رکھنے والے مکاتب اور مساجد میں وہ صورتحال نمایاں نظر آتی ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

مساجد کمیٹیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ ان کمیٹیوں میں ایسے افراد کی تعداد کم نہیں ہے جو مسجد یا دین کی خدمت کے لیے ان کمیٹیوں میں شامل نہیں ہیں بلکہ چودھراہٹ کا کوئی اور میدان اس سوسائٹی میں اپنے لیے موجود نہ پا کر وہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے مساجد کمیٹیوں کا رخ کرتے ہیں۔ اور پھر ان کی چودھراہٹ اور حکمرانی کا سارا زور امام اور خطیب کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے پر صرف ہو جاتا ہے۔ ان کمیٹیوں میں دو دو تین تین دھڑے بن جاتے ہیں اور ہر دھڑے کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ امام اور خطیب صرف اس کی مرضی کے مطابق چلے۔ چنانچہ ہوشیار قسم کے خطیب و امام تو

کسی طاقتور دھڑے کے ساتھ فریق بن کر دوسرے دھڑے کا دھڑن تختہ کرا دیتے ہیں اور خود بھی اقتدار میں شریک ہو جاتے ہیں جبکہ سادہ قسم کے امام مساجد کمیٹیوں کے ان دھڑوں میں ”غریب کی جورو“ بنے رہتے ہیں اور اس وقت کے انتظار میں سر جھکائے رکھتے ہیں کہ کب ان کے پاسپورٹ پر مستقل ویزے کی مہر لگے اور وہ ان کمیٹیوں کے چنگل سے نجات حاصل کریں۔

آئمہ اور خطباء کی تنخواہوں کی صورتحال یہ ہے کہ شام کو پانچ سے سات بجے تک قرآن کریم کی تعلیم دینے والے اساتذہ عام طور پر تیس سے چالیس پونڈ ہفتہ تنخواہ پاتے ہیں، جبکہ پانچ وقت کی نماز اور جمعہ کے ساتھ ساتھ شام کی کلاس کی پابندی اور مسجد کی نگرانی و حفاظت کی ذمہ داری نبھانے والے آئمہ و خطباء ستر سے سو پونڈ تک فی ہفتہ تنخواہ کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ بعض حضرات اس سے زیادہ معاوضہ پاتے ہیں لیکن عام طور پر لندن اور دیگر بڑے شہروں کا معیار یہی ہے اور یہ یہاں کے عام معیار سے کم و بیش نصف کے لگ بھگ ہے۔ بالخصوص وہ آئمہ جو مساجد کے حجروں میں قیام پذیر اور اپنی خوراک کے خود ذمہ دار ہیں ان کے لیے صورتحال زیادہ پریشان کن ہوتی ہے۔ اور انہیں ٹیوشن اور دیگر ذرائع اختیار کر کے اپنا حساب کتاب برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اس قلیل معاوضہ کے ساتھ آئمہ و خطباء کو مساجد کمیٹیوں اور ان کے چودھری قسم کے ارکان کے سامنے جس طرح ہر وقت جوابدہ رہنا پڑتا ہے وہ علماء کرام کے لیے زیادہ تکلیف دہ امر ہے۔ اسی وجہ سے مستقل ویزے تک کی عبوری مدت کو یہاں آئمہ مساجد کی اصطلاح میں ”عدت“ کہا جاتا ہے اور یہ آئمہ جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے اس کی ”عدت“ کی بقایا مدت اور اس کے بعد کے پروگرام کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔

گزشتہ سال کی بات ہے لندن کے ایک علاقہ کی بڑی مسجد میں اس کی انتظامیہ کمیٹی کی ہفتہ وار میٹنگ میں راقم الحروف بھی بیٹھا تھا۔ اس مسجد میں فنڈز کی فراوانی کی وجہ سے تین خطیب بیک وقت کام کر رہے تھے اور کمیٹی والے اگلے ہفتہ کے دوران ان آئمہ کے درمیان نمازوں کی تقسیم کا شیڈول طے کر رہے تھے کہ مثلاً منگل کے روز فجر کی نماز کون پڑھائے گا، ظہر کون پڑھائے گا اور عصر کس کے ذمہ ہوگی۔ تقسیم کا انداز یہ تھا کہ تینوں میں سے کسی امام کو کسی دن بھی ایسی گنجائش نہ مل سکے کہ وہ کسی کام کے لیے کہیں جانا چاہے تو جا سکے۔ مجھے یہ صورتحال دیکھ کر تکلیف ہوئی، میں نے کمیٹی والوں کے طرز عمل سے اختلاف

کیا اور ان سے کہا کہ وہ آئمہ کے ساتھ یہ معاملہ نہ کریں بلکہ انہیں صرف اس بات کا پابند کریں کہ ہر نماز میں ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہونا چاہیے اور اس کے بعد باقی تقسیم ان پر چھوڑ دیں کہ وہ آپس میں ضرورت اور سہولت کے مطابق تقسیم کار کر لیں، لیکن کمیٹی والوں کو میں اس بات پر قائل نہ کر سکا۔ اس سے مساجد کمیٹیوں اور آئمہ مساجد کے درمیان تعلقات کار کی نوعیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ان کمیٹیوں میں بیشتر افراد دیندار اور اچھے خیالات و جذبات کے حامل ہوتے ہیں لیکن ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو محض چودھراہٹ کے خیال سے کمیٹیوں پر حاوی ہو جاتے ہیں اور اس مقصد کے لیے خاصی رقوم بھی مساجد کی تعمیر میں صرف کر دیتے ہیں۔ ابھی گزشتہ ہفتے کی بات ہے کہ مفتیان کرام کی ایک سوسائٹی میں جو ''اسلامک فقہ اکیڈمی برطانیہ'' کے نام سے کام کر رہی ہے، یہ بات زیر بحث تھی کہ مساجد کمیٹیوں میں ایسے افراد کی رکنیت کی شرعی حیثیت کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے جو صوم و صلاۃ کے پابند نہیں ہیں اور شراب وغیرہ کی فروخت جیسے حرام کاروبار میں مصروف ہیں، مساجد کمیٹیوں میں اس قسم کے افراد کی موجودگی زیادہ خرابی کا باعث بنتی ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو مساجد کمیٹیوں اور آئمہ مساجد دونوں کی مذکورہ شکایات اپنی اپنی جگہ درست ہیں اور ان کے اسباب کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لے کر ان کے ازالہ کے لیے ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک اس کام کی اصل ذمہ داری تو اسلامی کانفرنس کے جدہ سیکرٹریٹ کی ہے کہ وہ غیر مسلم ممالک میں مساجد و مکاتب کے نظام کا جائزہ لینے اور ان کی مشکلات و مسائل کے حل کے لیے ایک مستقل شعبہ قائم کرے اور اس مقصد کے لیے ایک مؤثر نظام کار وضع کیا جائے۔ تاہم پاکستان کی حد تک ہماری تجویز یہ ہے کہ

- دینی مدارس کے وفاق اور بڑے دینی مدارس مغربی ممالک کی ضروریات کا جائزہ لے کر ان کے مطابق آئمہ اور اساتذہ کی تیاری اور تربیت کے الگ شعبے قائم کریں۔
- اسلامی نظریاتی کونسل اپنا وفد بھیج کر ان ممالک میں مقیم پاکستانیوں کی مساجد اور دینی مکاتب کے نظام کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کے لیے سفارشات مرتب کرنے کے علاوہ مساجد کمیٹیوں اور آئمہ و خطباء کے لیے

ضابطۂ اخلاق طے کرے جس پر عملدرآمد کی پاکستانی سفارت خانوں کے ذریعے نگرانی کی جائے۔

• پاکستانی سفارت خانوں میں موجود تعلیمی شعبوں کا دائرہ کار دینی تعلیم تک بڑھایا جائے اور سفارت خانوں میں مذہبی امور کے شعبے بھی قائم کیے جائیں۔ اور وزارت تعلیم اور وزارت مذہبی امور کے یہ شعبے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں مساجد و مکاتب اور دینی تعلیم کے نظام میں پاکستانی کمیونٹی کی راہنمائی کریں۔

• پاکستان میں مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کے وفاقوں کا مشترکہ بورڈ اپنا وفد بھیج کر مغربی ممالک میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مسائل کا جائزہ لے اور غیر سرکاری سطح پر سفارشات مرتب کر کے ان ممالک میں مقیم پاکستانیوں کی رہنمائی کی جائے۔

بلبلاتا ہوا انسانی معاشرہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۱۹۹۶ء)

اسلام دین فطرت ہے اور نسل انسانی کے لیے ان تعلیمات و ہدایات کی نمائندگی کرتا ہے جو خالق کائنات نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے ذریعے نازل فرمائی ہیں۔ قرآن کریم میں متعدّد مقامات پر اس امر کی صراحت موجود ہے کہ قرآنی تعلیمات نئی نہیں بلکہ حضرات انبیاء کرامؑ پر نازل ہونے والی سابقہ وحی کی مصدق و موید اور اس کی مکمل ترین شکل ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ انبیاء کرامؑ پر نازل ہونے والی کتابوں اور ان کی تعلیمات کا کوئی ذخیرہ اگر آج تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ترین صورت میں موجود ہے تو وہ صرف قرآن کریم اور جناب رسول اکرمؐ کی سنت و سیرت ہے، اس لیے اس وقت دنیا میں آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی نمائندگی کا حق صرف اور صرف قرآن و سنت کو ہے۔ اور انسانی معاشرہ کی قیادت اور راہنمائی کے لیے وحی اور عقل کے درمیان جو معرکہ آخری اور فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکا ہے اس میں عقل انسانی کی بنیاد پر تشکیل پانے والی سولائزیشن اور نظام ہائے حیات کا اصل مقابلہ قرآن و سنت سے ہی ہے۔

انسانی معاشرہ کی راہنمائی کے لیے عقل اور خواہشات کا ہمیشہ سے گٹھ جوڑ رہا ہے۔ خواہشات انسانی سوسائٹی میں باہمی ٹکراؤ کا باعث بنتی ہیں، فساد اور بدامنی کو جنم دیتی ہیں اور خرابیاں پیدا کرتی ہیں۔ جبکہ عقل ان خواہشات کی نگرانی اور کنٹرول کی دعویدار ہے، لیکن یہ ایسا کمزور نگران ہے جو خود کو خواہشات کے منہ زور گھوڑے کی پشت پر بے بس پا کر اکثر اوقات اپنے آپ کو بھی اسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور یوں معاشرہ خواہشات کے خوفناک عفریت کے ہاتھوں فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن کر رہ جاتا ہے۔ نسل انسانی کی تاریخ گواہ ہے کہ عقل کی کمزور لگام خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو کسی دور میں بھی کنٹرول نہیں کر سکی اور انسانی خواہشات نے صرف اس وقت فطرت کے دائرے میں رہنا قبول کیا جب ان پر وحی الٰہی کی حکمرانی قائم ہوئی۔

وحی، عقل اور خواہشات کی طویل کشمکش کی پوری تاریخ پر نظر ڈال لیجیے، عقل کو انسانی خواہشات پر کنٹرول میں اسی وقت کامیابی ہوئی ہے جب اس نے وحی کی راہنمائی کو قبول کر کے اس کے معاون کے طور پر خواہشات کا مقابلہ کیا ہے۔ اور جب بھی عقل نے وحی الٰہی سے بے نیاز ہو کر انسانی خواہشات کا سامنا کرنے کی کوشش کی ہے اسے شکست اور رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آج کا انسانی معاشرہ اس کی مکمل تصویر پیش کر رہا ہے۔ عقل نے آزادی، مساوات اور سولائزیشن کے نام پر انسانی خواہشات کو قواعد و ضوابط کے ایک دائرے کا پابند کرنا چاہا اور آسمانی تعلیمات اور وحی کو ذاتی عقیدہ، عبادت اور اخلاق کے حصار میں بند کر کے زندگی کے اجتماعی شعبوں میں اس کی عملداری کو مسترد کر دیا، لیکن عقل کی اس تین صدیوں پر محیط جدوجہد کا نتیجہ کیا سامنے آیا؟ آج پوری دنیا میں انسانی معاشرے پر خواہشات کی حکمرانی ہے اور جس قوم، طبقہ، گروہ یا فرد کی رسائی طاقت اور عقل کے ہتھیاروں تک ہو جاتی ہے قاعدے، ضابطے، اصول، نظریات اور اخلاق اس کے نزدیک بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عقل کا اس کے سوا کوئی کردار باقی نہیں رہ گیا کہ وہ خواہشات کی حکمرانی کے لیے جواز کے دلائل پیش کرتی رہے اور وحشیانہ خواہشات کا شکار ہونے والے مظلوم انسانوں کو یہ کہہ کر تسلی دیتی رہے کہ چونکہ انسان کی ہر خواہش کا پورا ہونا اس کا حق ہے اور جس خواہش پر سوسائٹی کی اکثریت کا اتفاق ہو جائے اسے قانون کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے ۴۹ فیصد کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ۵۱ فیصد کی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنیں اور خاموشی کے

ساتھ انہیں پورا کرتے رہیں۔ قتل وغارت، لوٹ مار، بھوک، جہالت، نسل، زبان اور علاقہ کی بنیاد پر منافرت، کنواری ماؤں اور ناجائز بچوں میں مسلسل اضافہ، خاندانی زندگی کی تباہی، رشتوں کے تقدس کی پامالی اور عزت و عفت کی بے حرمتی کے جو مظاہر آج انسانی معاشرہ میں ہر طرف دکھائی دے رہے ہیں وہ کس کے پیدا کردہ ہیں؟ انہیں خواہشات نے جنم دیا ہے اور عقل انہیں جواز کے دلائل فراہم کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔

عقل اور خواہشات کے گٹھ جوڑنے وحی کو انسانی زندگی سے بے دخل کرنے کا جو ڈرامہ تین صدیاں قبل شروع کیا تھا وہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور اس کا ڈراپ سین انسانی سوسائٹی کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے۔ قرآن کریم نے اس کشمکش کا ذکر چودہ سو برس قبل ان الفاظ سے کر دیا تھا ان یتبعون الا الظن وماتھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدی (النجم) ”یہ لوگ صرف ظن (انتہائے عقل) اور خواہشات کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے“۔

اسلام عقل کے کردار اور ضرورت سے انکار نہیں کرتا بلکہ قرآن کریم نے بار بار غور و فکر اور تدبر کی دعوت دی ہے اور عقل کے استعمال کی تلقین کی ہے۔ اسلام حکمت و دانش کا دین ہے اور فقہ و اجتہاد اس کے بنیادی اصولوں میں شامل ہیں لیکن عقل کو حکمران کی نہیں بلکہ معاون کی حیثیت دی ہے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ عقل کو کبھی حکمران کا درجہ حاصل نہیں رہا، وہ اگر وحی کی معاون نہیں بنی تو اسے طاقت یا خواہشات کی چاکری کرنا پڑی ہے۔ قدرت نے اسے معاونت کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ ہمیشہ وحی، طاقت یا خواہشات میں سے کسی کی معاون رہی ہے۔ اس لیے عقل کا صحیح کردار یہی ہے کہ وحی کے دائرے میں پابند ہو اور اس کے احکام کی تعمیل کے لیے معاونت کرے۔

اسلام خواہشات سے بھی انکار نہیں کرتا بلکہ وہ ترک خواہشات اور رہبانیت کو عبادت کا درجہ دینے کا روادار نہیں ہوا۔ اسلام نے انسان کی ہر فطری خواہش کو تسلیم کیا ہے اور اس کی تکمیل کا حق دیا ہے لیکن خواہشات کی بے لگامی کو اسلام قبول نہیں کرتا اور خواہشات کو آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی ہدایات کا پابند دیکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس پابندی کے بغیر خواہشات کو کنٹرول کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے اور خواہشات کو کنٹرول کے دائرے میں رکھے بغیر معاشرہ میں امن و سلامتی کا قیام نہیں ہو سکتا۔ اسلام انسان پر خواہشات کی حکمرانی کا نہیں بلکہ خواہشات پر انسان کی حکمرانی کا قائل ہے۔ اور اسلام کی

تعلیم یہ ہے کہ جو انسان اپنی خواہشات پر کنٹرول نہیں کر سکتا وہ انسانی فطرت پر قائم نہیں رہا۔ اور خواہشات پر حکمرانی عقل محض کے ذریعے نہیں بلکہ وحی و عقل کے امتزاج اور توفیق الٰہی سے ہی قائم ہو سکتی ہے۔

آج انسانی معاشرہ کا سب سے بڑا مسئلہ بے لگام اور روز افزوں خواہشات پر کنٹرول حاصل کرنا ہے کیونکہ اس کے بغیر امن، خوشحالی، سلامتی اور سکون کا حصول ممکن نہیں ہے۔ گزشتہ تین صدیوں کے تلخ تجربہ نے یہ بات ایک بار پھر ثابت کر دی ہے کہ انسانی خواہشات کو کنٹرول کرنا عقل محض کے بس کی بات نہیں ہے۔ عقل کو زود یا بدیر وحی کے سائے میں آنا پڑے گا اور آسمانی تعلیمات کی بالادستی قبول کرنا ہو گی۔ اور انسانی تاریخ کے ریکارڈ پر یہ آسمانی تعلیمات صرف اور صرف قرآن و سنت کی تعلیمات کی صورت میں موجود ہیں جو وحی، عقل اور خواہشات کے خوبصورت امتزاج اور توازن کی علمبردار ہیں۔ عقل انسانی اس حقیقت کا جس دن ادراک کرلے گی وہ انسانی معاشرہ میں ایک صحت مند، خوشگوار اور فطری انقلاب کا یوم آغاز ہو گا۔

قرآن کریم سے شادی: ایک مذموم جاگیردانہ رسم

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱ جنوری ۱۹۹۶ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۴ دسمبر ۱۹۹۵ء کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت پاکستان سے تعزیرات پاکستان میں ایک دفعہ کے اضافہ کی سفارش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تحت کسی دوشیزہ کی قرآن کریم، درگاہ، یا کسی اور مقدس چیز کے ساتھ شادی کو قانوناً قابل سزا جرم قرار دے دیا جائے گا۔

کسی خاتون کو مذہبی تقدس کی آڑ میں شادی کے حق سے محروم کر دینے اور ساری عمر شادی کے بغیر گزار دینے پر مجبور کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ عیسائی معاشرہ میں وہ خواتین ”نن“ کہلاتی ہیں جو ”کنواری مریم“ کے نام پر ساری زندگی کنواری رہنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ اور ہندوؤں کے ہاں انہیں ”دیوداسیاں“ کہا جاتا ہے جن کی شادی کسی دیوتا، بت، یا مندر کے ساتھ کر دی جاتی ہے اور پھر وہ ساری زندگی مندر میں بغیر شادی کے گزار دیتی ہیں۔ ان ننوں اور دیوداسیوں کا جو حشر مذہبی عبادت گاہوں میں مذہبی تقدس کی آڑ میں ہوتا ہے وہ ایک انتہائی دلخراش داستان ہے۔

اسلام نے اسی لیے تجرد کی زندگی کو عبادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور شادی کو مسنون بلکہ بعض حالات میں واجب قرار دیا ہے۔ لیکن یار لوگوں نے اپنے مفادات کی خاطر اس مکروہ رسم کو مسلمان معاشرہ میں بھی گھسیٹ لیا ہے اور بعض بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں میں یہ مذموم سلسلہ چلا آتا ہے کہ جوان بیٹی کو دلہن بنا کر قرآن کریم اس کی جھولی میں رکھ دیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ تمہاری شادی اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کے ساتھ کر دی گئی ہے، پھر ساری زندگی وہ بدقسمت عورت تنہا رہنے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس مکروہ دھندے کا اصل مقصد جاگیر اور زمین کا تحفظ ہوتا ہے کہ بیٹی کا دوسری جگہ بیاہ کر دیا تو اسے جاگیر یا زمین کا حصہ بھی دینا پڑے گا، اس لیے قرآن کریم کے نام پر اسے شادی کے حق سے ہی محروم کر دیا جاتا ہے، تاکہ زمین اور جاگیر کو تقسیم سے بچایا جا سکے۔ اسی طرح بعض خواتین کو درگاہوں اور دیگر مقدس اشیا کے نام منسوب کر کے بھی یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس پس منظر میں اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ اقدام مستحسن ہے اور حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ اس سفارش کو قانون کی شکل دے کر خواتین کے ساتھ قرآن کریم کے نام پر ہونے والے اس شرمناک ظلم کا عملاً خاتمہ کرنے کی راہ ہموار کرے۔

۱۹۹۵ء

مکارم اخلاق اور سیرت نبویؐ

(جامعہ الہدیٰ، نوٹنگھم، برطانیہ - ۲ ستمبر ۱۹۹۵ء)

بعد الحمد والصلاۃ۔ حضرات محترم! سب سے پہلے تو میں مدنی مسجد کی منتظمہ اور بالخصوص مولانا رضاء الحق سیاکھوی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے لیے اس سعادت میں شمولیت کا اہتمام فرمایا کہ جناب سرور کائنات، شفیع المذنبین، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وازواجہ واصحابہ واتباعہ وبارک وسلم کی سیرت طیبہ پر چند دن مسلسل کچھ گزارش کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس کے بعد میں آپ حضرات سے درخواست کروں گا کہ گفتگو کے باقاعدہ آغاز سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں خصوصی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں کی اصلاح فرمائیں اور یہ عمل جو ہم شروع کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ خلوص نیت کے ساتھ اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائیں۔ اس دوران سیرت طیبہ کے حوالے سے جو گفتگو ہو اللہ تعالیٰ کہنے اور سننے والوں کو جناب نبی کریمؐ کے اسوۂ حسنہ سے زیادہ سے زیادہ واقفیت اور اس پر عمل کی توفیق سے نوازے، اس لیے کہ صحیح علم کا فائدہ تبھی ہے جب اس پر عمل ہو۔

سیرت طیبہ، بحر ناپیدا کنار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ایک بہت بڑا سمندر ہے، ایسا سمندر نہ جس کا کوئی کنارہ ہے اور نہ جس کی کوئی تہہ ہے۔ آج دنیا کے سمندر کی تہہ تو لوگوں نے ڈھونڈلی ہے اور کنارے بھی معلوم کر لیے گئے ہیں لیکن رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی تہہ تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور قیامت تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔ گزشتہ ڈیڑھ

ہزار سال سے جناب نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں اور مذاکرات ہو رہے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی نئی بات اللہ تعالی دلوں میں ڈال دیتے ہیں، یوں آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے نئے نئے نکات، نئی نئی چیزیں اور نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں جو کہ قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج تک جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اور جتنا کچھ کہا جا چکا ہے یہ سب مل کر بھی جناب رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ کا حق ادا نہیں کرتے تو یہ بات خلاف واقعہ نہیں ہے۔ رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ کا احاطہ تو کسی کے بس کی بات نہیں ہے، یہ دعوی کہ ہم ساری سیرت بیان کر لیں گے یا ساری سیرت سمجھ لیں گے یہ بات ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرا یہ ارادہ ہے کہ آج کے ہمارے عملی مسائل کے حوالے سے آنحضرتؐ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو ترتیب کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ ہم نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر گفتگو کے جو عنوانات منتخب کیے ہیں ان کی ترتیب یہ ہے، ان عنوانات پر ان شاء اللہ العزیز روزانہ گفتگو ہوگی اللہ تعالی تکمیل کی توفیق دے، آمین۔

۱۔ سیرت نبویؐ اور مکارم اخلاق

۲۔ سیرت نبویؐ اور سماجی خدمت

۳۔ سیرت نبویؐ اور خواتین کی معاشرتی حیثیت

۴۔ سیرت نبویؐ اور انسانی حقوق

۵۔ سیرت نبویؐ اور سیاسی قیادت

۶۔ سیرت نبویؐ اور قانون کی بالادستی

۷۔ سیرت نبویؐ اور معاشی انصاف

۸۔ سیرت نبویؐ اور دعوت اسلام

۹۔ سیرت نبویؐ اور خاندان نبوت

۱۰۔ سیرت نبویؐ اور تسخیر کائنات

انسانی اخلاق

ہماری آج کی پہلے دن کی گفتگو کا عنوان ہے: سیرت نبویؐ اور مکارم اخلاق۔ ”خلق“ انسانی عادت کو کہتے ہیں ”اخلاق“ عادات کو کہتے ہیں۔ انسان جب اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو والدین کی تربیت، ارد گرد کے ماحول اور حالات و واقعات کے ذریعے اس کا مختلف

عادات پر مشتمل ایک مزاج بن جاتا ہے۔ اخلاق اچھے بھی ہوتے ہیں اور اخلاق برے بھی ہوتے ہیں، اخلاق فاضلہ اور اخلاق رذیلہ دونوں کا ذکر آتا ہے۔ اچھی عادت ہے سچ بولنا بری عادت ہے جھوٹ بولنا، اچھی عادت ہے انصاف کرنا بری عادت ہے ظلم کرنا، اچھی عادت ہے وعدہ پورا کرنا بری عادت ہے وعدہ توڑنا۔ یہ میں نے مثال کے طور پر عرض کیا ہے کہ عادات اچھی بھی ہوتی ہیں اور عادات بری بھی ہوتی ہیں، اچھی عادات کو بھی اخلاق کہتے ہیں اور بری عادات کو۔

ایک انسان کی عادات صرف اسی پر اثرانداز نہیں ہوتیں بلکہ پوری سوسائٹی پر اثرانداز ہوتی ہیں اس لیے کہ کوئی بھی انسان دنیا میں اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ایک انسان اگر دنیا میں باقی انسانوں سے کٹ کر تنہا رہنا چاہے تو یہ بات ممکن نہیں ہے، اللہ تعالی نے انسانی زندگیوں کے لیے اجتماعی معاشرہ بنایا ہے اور مل جل کر رہنے والی اور ایک دوسرے کے کام آنے والی سوسائٹی بنائی ہے۔ سب انسان مل کر اجتماعی اعمال سے گزرتے ہیں تو ایک معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ مثال کے طور پر میرے ہاتھ میں یہ ایک کاغذ ہے جس پر کچھ لکھا ہے یہ مجھ اکیلے کا کام نہیں ہے۔ اس کاغذ کے بننے میں خدا جانے کتنے لوگوں کا عمل دخل ہے، جس قلم سے لکھا گیا ہے اس کے بننے میں خدا جانے کتنے لوگوں کا عمل شامل ہے، قلم میں جو سیاہی ہے خدا جانے اس کے بننے میں کن کن لوگوں کی مہارت کار فرما ہے، اور پھر میری اس کاغذ پر لکھنے کی جو صلاحیت ہے خدا جانے اس کے پیچھے کن کن لوگوں کی محنت شامل ہے۔ تو اس کاغذ پر جو تحریر ہے یہ اتنے سارے لوگوں کی محنت اور عمل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ کوئی بھی عمل دنیا میں ایسا نہیں ہے جو ایک انسان تنہا کر سکے، چنانچہ انسانوں کے اجتماعی اعمال سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے، اگر انسانوں کے مجموعی اعمال اچھے ہوں تو ایک اچھی سوسائٹی بنتی ہے لیکن اگر انسانوں کے مجموعی اعمال برے ہوں تو ایک بری سوسائٹی بنتی ہے۔

یوں سمجھ لیں کہ انسانی معاشرہ ایک مشین ہے جس کے پرزے انسان ہیں۔ مشین کے اچھے یا برے ہونے کا دارومدار پرزوں کے معیار پر ہے، پرزے اچھے معیار کے ہوں گے اور جس انجینئر نے وہ مشین ڈیزائن کی ہے اس کی ہدایات کے مطابق ہوں گے تو ان پرزوں سے مشین بھی اچھی بنے گی، لیکن اگر مشین کے اکثر یا بنیادی پرزے خراب ہوں گے تو وہ مشین بیکار ہوگی۔ اسی طرح معاشرے کے اکثر لوگوں کی اور راہنما لوگوں کی اخلاق

وعادات اچھی ہوں گی تو اس سے ایک اچھا معاشرہ بنے گا لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوگا تو ظاہر بات ہے کہ معاشرہ بھی براہی سامنے آئے گا۔ حضرات انبیاءؑ کی تعلیمات کی بنیاد اسی بات پر ہے کہ انسان اس مشینری کا ایک صحیح اور کار آمد پرزہ بنے اور انسان کا ایمان، یقین اور اس کی عادات اچھی ہوں۔ اگر انسان کا خدا کی ذات پر یقین پختہ ہوگا تو اس کے اخلاق واعمال اچھے ہوں گے اور یوں وہ معاشرے کا ایک مفید فرد بنے گا۔

بہترین اخلاق کے لوگ

اس دنیا میں اخلاق اور کردار کے اعتبار سے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سب سے بہتر لوگ تھے، یہ صرف ہماری عقیدت اور محبت کی بات نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ اور حقیقت ہے۔ اسی طرح انبیاء کرامؑ میں سے سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ شخصیت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، یہ بات اپنے اور پرائے سب تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی ذات گرامی انسانی تاریخ کی سب سے بہتر شخصیت تھی۔ اور طبقات انسانی میں سب سے بہتر طبقہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طبقہ تھا، یہ تاریخی شہادت ہے کہ ایک معاشرے اور سوسائٹی کے طور صحابہ کرامؓ کا طبقہ سب سے مثالی اور آئیڈیل طبقہ تھا، ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنے والا ایک دوسرے کے لیے ایثار کرنے والا ایک دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا۔ ایسا طبقہ جس کی بنیاد اچھے اخلاق وعادات پر تھی اس لیے کہ یہ طبقہ جناب نبی کریمؐ کا تربیت یافتہ تھا اور حضورؐ نے ایک ایک پرزے کی تربیت اس انداز سے کر دی تھی کہ وہ انسانی معاشرے کی مشین میں پرزے کے طور پر اپنی اپنی جگہ فٹ ہوتے چلے گئے اور یوں دنیا کا ایک بہترین معاشرہ تشکیل پایا۔

چنانچہ اخلاق فاضلہ انسانی معاشرے کی سب سے بنیادی ضرورت ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین اور ایمانیات کے بعد انسانی معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت اچھے اخلاق وعادات کا حامل ہونا ہے۔ اچھی عادات میں اللہ پر ایمان بھی ہے، عبادات بھی ہیں اور آپس کے معاملات بھی ہیں۔ لیکن شخصی مزاج اور شخصی عادات کا اچھا ہونا یہ دین اسلام کا سب سے بڑا مطالبہ اور سب سے بڑا تقاضا ہے۔ خود جناب نبی کریمؐ سے جب پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب بندہ کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، رسول اللہؐ نے خود فرمایا کہ میرا قرب سب سے زیادہ اسے نصیب

ہوگا جوسب سے زیادہ خوش اخلاق ہوگا۔ایک حدیث میں رسول اللہؐ نے یوں ارشاد فرمایا کہ اگرتم سوسائٹی میں اچھے لوگ دیکھنا چاہو توان لوگوں کو دیکھو جو ”احسنھم اخلاقا“ جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

نسل انسانی کی بہترین شخصیت

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق حسنہ کے اعتبار سے پوری نسل انسانی میں ممتاز ترین شخصیت ہیں۔ایک بات یہ ہے کہ کوئی شخص ذاتی حد تک عادات واخلاق کے اعتبار سے اچھے مزاج کا حامل ہو،اس اعتبار سے توآپؐ اچھے مزاج کے حامل تھے ہی،لیکن آپؐ نے اپنے اچھے اخلاق و عادات کو اپنے ساتھیوں، دوستوں، بچوں اور شاگردوں میں تقسیم فرمایا اور اخلاق فاضلہ کی ایک بہترین سوسائٹی دنیا کو دی۔یہ جناب نبی کریمؐ کا کمال ہے کہ آپ نے اچھے اخلاق کی تربیت دے کر ایک باکمال جماعت تشکیل دی جو آج بھی ایک بہترین معاشرے کے طور پر دنیا کے سامنے مثال ہے۔جناب رسول اللہؐ نے اچھے اخلاق کی تربیت کو اپنی زندگی کا مشن قرار دیتے ہوئے فرمایا ”بعثت لا تمم مکارم الاخلاق“ کہ مجھے سب سے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔فرمایا کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق میں جو سب سے بلندی والے شرافت والے اور عزت والے اخلاق ہیں انہیں اپنے کمال تک پہنچا دوں اور واقعی جناب نبی کریمؐ نے مکارم اخلاق کو انتہا تک پہنچایا۔رسول اللہؐ کی حیات مبارکہ میں قدم قدم پر اخلاق حسنہ کا مظاہرہ دکھائی دیتا ہے۔اخلاق حسنہ میں آپ کوئی بھی دو چار چیزیں منتخب کرلیں آنحضرتؐ کی شخصیت آپ کو ان کی انتہا پر نظر آئے گی۔میں اس موقع پر جناب رسول اکرمؐ شخصیت کے حوالے سے کچھ چیدہ چیدہ باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہوں گا۔

سچائی

”سچائی“ اخلاق حسنہ میں سب سے پہلی عادت ہے۔سچ بولنا اس دنیا کی سب سے بڑی خوبی ہے اور انسانی اخلاق و عادات میں سب سے اچھی عادت سچ بولنا ہے۔اسی طرح جھوٹ بولنا سب سے بری عادت ہے۔ایک کافر شخص جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں ایمان قبول کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھ میں بہت سی بری عادت ہیں۔میں شراب بھی پیتا ہوں زنا بھی کرتا ہوں اور نہ جانے کیا کچھ کرتا ہوں۔میں ایمان قبول کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن سب بری عادات یک دم نہیں چھوڑ

سکتا البتہ ایک ایک کر کے چھوڑ سکتا ہوں۔ جناب رسول اکرمؐ نے اس شخص کی اس شرط پر راضی ہوتے ہوئے اسے کلمہ پڑھوایا اور اس شخص نے ایمان قبول کر لیا۔ اس کے بعد آپؐ نے اس شخص سے کہا کہ میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم آج کے بعد جھوٹ نہیں بولو گے، اس نے کہا کہ ٹھیک ہے میرا آپ کے ساتھ وعدہ ہے کہ میں آج کے بعد جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اللہ کی قدرت دیکھیں کہ اس جھوٹ کے چھوڑنے سے اس شخص کی سب برائیاں یکے بعد دیگرے چھوٹتی چلی گئیں۔

جناب رسول اللہؐ نے برائیوں کی ترتیب میں سب سے پہلے ''جھوٹ'' کا ذکر فرمایا۔ آپؐ نے اپنی تعلیم سے بتایا کہ اچھائیوں میں سب سے اچھی عادت سچائی ہے جبکہ برائیوں میں سب سے بری عادت جھوٹ ہے۔ رسول اللہؐ کو پوری نسل انسانی میں ''اصدق الناس'' کہا جاتا ہے اور یہ کوئی مبالغے کی بات نہیں ہے کہ ہم اپنی عقیدت اور محبت کی وجہ سے ایسی بات کہہ رہے ہیں بلکہ یہ امر واقعہ ہے جس کی بڑے سے بڑے دشمن نے بھی تصدیق کی ہے۔ حضورؐ کے سب سے بڑے دشمن دو تھے پہلے ابو جہل اور اس کے بعد ابو سفیان۔ رسول اللہؐ کے خلاف مکہ کے معاشرے کو لڑانے والے یہی دو بڑے تھے لیکن آنحضرت کے ایک سچا انسان ہونے کے بارے میں دونوں کی گواہی تاریخ کے ریکارڈ پر ہے۔

ابو جہل سے کسی نے پوچھا کہ محمدؐ کے بارے میں تمہارا کیا رائے ہے؟ ابو جہل نے اقرار کیا کہ محمدؐ سچے آدمی ہیں۔ اس سے پوچھا گیا کہ اگر وہ سچے ہیں تو تم مانتے کیوں نہیں ہو؟ ابو جہل نے کہا کہ یہ الگ بات ہے کہ میں نہیں مانتا یہ ہماری چودھراہٹ کا مسئلہ ہے لیکن محمدؐ ایک سچا آدمی ہے۔ دشمن کی شہادت ہی اصل میں سب سے بڑی گواہی ہوتی ہے۔

اس وقت کی سب سے بڑی سپر پاور روم کے بادشاہ قیصر کے دربار میں جب جناب محمد رسول اللہؐ کا خط پہنچا تو قیصر روم نے کہا کہ عرب معاشرے کا کوئی ایسا معتبر آدمی لاؤ جس کے ساتھ میں محمدؐ کے بارے میں بات کر سکوں۔ ابو سفیان بھی اتفاق سے ان دنوں تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے چنانچہ قیصر روم کے دربار میں حضورؐ کا خط پڑھا گیا اور ابو سفیان جو رسول اللہؐ کے اس وقت کے سب سے بڑے مخالف تھے انہیں قیصر روم کے دربار میں بلا کر پوچھا گیا کہ تمہارے علاقے کے ایک آدمی محمدؐ کا خط آیا ہوا ہے، میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ قیصر روم نے ابو سفیان سے جناب نبی کریمؐ کی ذات گرامی کے بارے میں جو سوالات کیے ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس شخص

(محمدؐ) کی ذاتی زندگی میں سچ اور جھوٹ کے حوالے سے تمہاری کیا رائے ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا کہ محمدؐ ایک سچ بولنے والا بندہ ہے۔ چنانچہ یہ بھی ایک بہت بڑی تاریخی شہادت ہے کہ آپؐ کے سب سے دشمن نے بھی آپؐ کے سچا اور کھرا آدمی ہونے کا اعتراف کیا۔

حضورؐ کی ذاتی زندگی تو سچائی ہی سے عبارت تھی، صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر پورے معاشرے سے شہادت مانگی کہ میں نے تمہارے اندر چالیس سال گزارے ہیں میرے شب و روز تم نے دیکھے ہیں میرا بچپن، جوانی، اٹھنا بیٹھنا اور میرے معاملات سب کچھ تم لوگوں نے دیکھا ہے، تم لوگوں کی میرے بارے میں کیا رائے ہے؟ ''ھل وجد تمونی صادقا او کاذبا'' کہ مجھے تم لوگوں نے سچا پایا یا جھوٹا؟ سب نے بیک وقت آواز کہا ''ما وجدنا فیک الا صدقا'' کہ اے محمدؐ تمہاری زندگی میں ہم نے کبھی سچائی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تو سچائی کا مظہر تھے ہی لیکن آپؐ نے جو سوسائٹی تشکیل دی وہ کیسی تھی؟ آپؐ کی حیات مبارکہ میں غزوۂ تبوک کا لشکر سب سے بڑا اور مشکل لشکر تھا جسے جیش عسرت کہا جاتا ہے۔ شام کی طرف ایک لمبا سفر تھا، ایک طرف کا سفر ایک مہینے میں طے ہوتا تھا اور پھر یہ اندیشے بھی تھے قیصر روم سے مقابلہ ہے خدا جانے وہاں کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی۔ چنانچہ منافقین تو بہانے اور عذر کر کے مدینہ منورہ رہ گئے لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ مخلص صحابیؓ بھی اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے رہ گئے جن میں سے ایک حضرت کعب بن مالکؓ بھی تھے۔ چونکہ غزوہ میں شرکت کے لیے اعلان عام تھا اس لیے رسول اللہؐ غزوہ سے جب واپس تشریف لائے تو پیچھے رہ جانے والے لوگوں سے پوچھا کہ بھئی کیا بات تھی تم لوگ ساتھ کیوں نہیں گئے؟ جو لوگ منافقین تھے انہوں نے تو بہانے گھڑے کسی نے کہا کہ بیوی بیمار تھی کسی نے کہا کہ بچہ بیمار تھا کسی نے کہا کہ فلاں ضروری کام تھا وغیرہ۔ جبکہ کعب ابن مالکؓ خود کہتے ہیں کہ میں بھی غزوہ میں نہیں جا سکا تھا میں نے سوچا کہ جیسے یہ سارے لوگ عذر بہانے کر کے جان چھڑا رہے ہیں ایسے ہی میں بھی کوئی ہلکا پھلکا عذر پیش کر کے اپنا کام بنا سکتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ یہ بات ذہن میں آئی لیکن پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ کعب! ایسا نہ کرنا بلکہ سچ بولنا اور رسول اللہ کے سامنے جھوٹ مت بولنا۔ چنانچہ جھوٹ بولنے والوں نے تو وقتی طور پر اپنی جان بخشی کروالی لیکن حضرت کعب بن مالکؓ نے سچ بولا اور مسلسل پچاس روز تک سوشل بائیکاٹ کی سزا بھگتی۔ شاعر کہتا ہے کہ:

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

یہ جناب نبی کریمؐ کی تربیت تھی کہ جھوٹ بول کر جان نہیں چھڑوانی بلکہ سچ بول کر سزا بھگتنی ہے، یہ جناب نبی کریمؐ کے اخلاق کا پرتو تھا کہ آپ کے تربیت یافتہ صحابیؓ نے مشکل وقت میں سچ بول کر دنیا کو بتایا کہ سچائی کسے کہتے ہیں۔

تحمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کے سب سے نمایاں اوصاف میں ایک صفت کا ذکر ہوتا ہے جسے تحمل، بردباری اور درگذر کہتے ہیں۔ یعنی تکلیف، مخالفت اور اذیت کو برداشت کرتے ہوئے دشمن کو معاف کر دینا۔ دنیا کی کوئی اور شخصیت جناب نبی کریمؐ کے تحمل اور بردباری کے کسی ایک واقعہ کی مثال بھی نہیں پیش کر سکتی۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کے بارے میں تو کوئی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ آپؐ وہاں طاقت میں نہیں تھے کہ لوگ جب تکلیف دیتے تھے تو برداشت کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مکہ کی زندگی میں اختیار نہیں تھا، قوت نہیں تھی، اقتدار نہیں تھا اور آپ کی جماعت کمزور تھی، صبر کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ لیکن مدنی زندگی میں جب آپؐ کے پاس اقتدار تھا جب آپ کے پاس حکومت تھی اور پھر جب آپ مکہ مکرمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو مکی زندگی کی وہ ساری تکالیف وہ ساری اذیتیں وہ ساری مشکلات آپ کے سامنے تھیں۔ جب آپ دس ہزار صحابہؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے، اللہ اکبر کی صدا بلند کی، خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا، مکہ مکرمہ میں اقتدار قائم کیا اور پھر سب کو اکٹھا کر کے یہ سوال کیا کہ آج کے دن تم لوگ مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟ اس پر مکہ والوں نے کہا کہ ہم آپ سے ایک شریف آدمی کی اور ایک شریف آدمی کے بیٹے کے سلوک کی توقع رکھتے ہیں، اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا ”لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء“ کہ آج کے دن تم سے کوئی انتقام نہیں ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

حضورؐ کے پاس اختیار اور طاقت تھی آپؐ کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ حضورؐ کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ جن کے بارے میں کسی کو تصور بھی نہیں تھا کہ انہیں معافی مل جائے گی، عکرمہؓ نے مکہ چھوڑا اور جدہ پہنچ کر سمندر میں کشتی پر بیٹھ گئے کہ اب میرے لیے یہاں رہنا ممکن نہیں اس لیے مجھے جزیرۃ العرب سے نکل کر کہیں دور چلے جانا چاہیے۔ عکرمہؓ کی اہلیہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور پوچھا کہ یا رسول اللہؐ کیا عکرمہؓ

کے لیے بھی معافی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں۔ عکرمہؓ کی بیوی نے پوچھا وہ عکرمہؓ جو ابو جہل کا بیٹا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، ہاں جانتا ہوں اس کے لیے بھی معافی ہے۔ پوچھا کیا میں عکرمہؓ کو ڈھونڈ کر لے آوٴں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں لے آوٴ۔ چنانچہ وہ جدہ تک پیچھا کر کے اپنے خاوند کو واپس لائی اور وہ ایک معزز شہری کے طور پر اسلامی معاشرہ کا حصہ بنے۔

اسی طرح وحشی بن حربؓ آئے جنہوں نے حضورؐ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ کو احد کے میدان میں اس بے دردی سے شہید کیا تھا کہ ان کی زبان کاٹی تھی کان کاٹے تھے ناک کاٹی تھی اور سینے سے جگر نکالا تھا۔ لیکن جب رسول اللہؐ مکہ کے فاتح کی حیثیت سے لوگوں کی قسمت کے فیصلے کر رہے تھے تو وحشی بن حربؓ آئے اور بتایا کہ یا رسول اللہ! میں وحشی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، ہاں جانتا ہوں۔ پوچھا اگر میں اسلام قبول کروں تو کیا میرا اسلام قبول ہو گا؟ فرمایا، ہاں قبول ہو گا۔ بتایا، جناب میں حمزہؓ کا قاتل ہوں کیا یہ قتل مجھے معاف ہو جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا، ہاں معاف ہو جائے گا۔ ”الاسلام یھدم ما کان قبلہ“ کہ اسلام قبول کرنے سے کفر کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وحشی کا اسلام قبول کر کے جناب نبی اکرمؐ نے انہیں اپنے مسلمانوں اور عقیدت مندوں میں شامل کیا۔ لیکن انسانی فطرت کے پیش نظر آپؐ نے ایک بات فرمائی کہ وحشی! تمہارا اسلام قبول ہے، تم صحابیؓ ہو اور تمہارے سارے گناہ معاف ہیں لیکن میں جب تمہیں دیکھتا ہوں تو اپنے چچا کی شہادت کا وہ منظر میرے سامنے آجاتا ہے۔ اس پر وحشیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! آج کے بعد آپ مجھے نہیں دیکھیں گے۔ حضورؐ کو تکلیف کے اوقات نہ یاد دلانے کے لیے وحشی نے یہ وعدہ کیا ورنہ کس صحابی کا جی چاہتا ہے کہ وہ حضورؐ کے سامنے نہ آنے کے لیے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے پابند کر لے، چنانچہ وحشی شام چلے گئے اور انہوں نے حضورؐ کے ساتھ کیا ہوا یہ وعدہ نبھایا۔

وحشیؓ خود روایت کرتے ہیں کہ میرے دل میں ایک کھٹک تھی کہ قیامت کے دن جب حمزہؓ اپنے چاک سینے کے ساتھ پیش ہوں گے تو قاتل کا نام بھی سامنے آئے گا، وحشیؓ کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ حسرت اور تمنا تھی کہ یا اللہ! جتنا بڑا مسلمان میرے ہاتھوں شہید ہوا ہے اتنا ہی بڑا کافر میرے ہاتھوں مارا جائے تاکہ کل قیامت کے دن جب یہ کہا جائے کہ یہ حمزہ کا قاتل ہے تو دوسری طرف بھی کوئی بڑا نام ہو جس سے حساب برابر ہو جائے۔ چنانچہ وحشیؓ کے ہاتھوں نبوت کا دعوے دار مسیلمہ کذاب قتل ہوا۔ وحشی کہتے ہیں کہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے تک میں نے وہی نیزہ سنبھال کر رکھا ہوا تھا جس سے میں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا کہ اس سے کسی بڑے کافر کو قتل کروں گا، وحشی وہ نیزہ لے کر یمامہ کی لڑائی میں شریک ہوئے اور مسیلمہ کو قتل کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ مسیلمہ کو قتل کرنے کے بعد وحشیؓ میدان جنگ میں دیوانہ وار طرح گھومتے تھے اور اعلان کرتے جاتے تھے کہ لوگو! میں حمزہؓ کا قاتل تھا اور میں مسیلمہ کا قاتل ہوں۔ وہ کھٹک جو وحشیؓ کے دل میں تھی نکل گئی اور ذہنی تسکین ہوگئی کہ میں نے آج اپنا حساب چکا دیا ہے۔

دنیا نے بڑے بڑے فاتح دیکھے ہیں لیکن فتح کے بعد قبضے کے بعد اور اقتدار و حکومت ملنے کے بعد اس طرح کوئی اپنے دشمنوں کو معاف کر دے اس کی مثال جناب نبی کریمؐ کے علاوہ کوئی اور فاتح پیش نہیں کر سکتا۔

امانت

اخلاق حسنہ اور اچھی عادات میں امانت و دیانت کا ذکر بھی آتا ہے۔ امانت ایک اچھی عادت ہے جبکہ بے ایمانی ایک بری عادت ہے، دیانت ایک اچھی خصلت ہے جبکہ بددیانتی ایک بری خصلت ہے۔ کسی کی امانت میں خیانت کرنا اور کسی کے ساتھ بددیانتی کا معاملہ کرنا یہ انسان کے برے اخلاق میں شمار ہوتا ہے۔ جبکہ امانت کا خیال کرنا، لوگوں کے ساتھ دیانت کا معاملہ کرنا اور لوگوں کے حقوق کو محفوظ رکھنا یہ اچھے اخلاق کا مظاہرہ ہے۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس بات میں بھی انتہاء پر ہے کہ اپنوں کے ساتھ دیانت کا معاملہ کرنا آسان ہے، کمال تو یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ امانت و دیانت کا معاملہ کیا جائے۔

جب کفار مکہ کے ستم سے تنگ آکر آنحضرتؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہونے لگے تو یہ وہ وقت تھا جب مکہ کے تمام قبائل نے متحد ہو کر آپؐ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماحول یہ تھا کہ قبائل نے افراد منتخب کر کے قاتلوں کا گروہ بنا دیا تھا اور اس گروہ کے سب افراد آپؐ کی جان کے درپے تھے، قاتلوں نے مختلف راستوں کی ناکہ بندی کر کے آپؐ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس ماحول سے اور قتل کے اس فیصلے کے نتائج سے بچنے کے لیے حضورؐ نے ہجرت کا راستہ اختیار کیا تھا، اس صورت حال میں جب آنحضرتؐ مکہ سے نکلنے لگے تو آپ کا آخری عمل کیا تھا؟ آپؐ نے اپنے بستر پر اپنے چچا زاد حضرت علیؓ کو سلایا اس وقت حضرت علیؓ آپؐ کے داماد نہیں تھے۔ حضورؐ نے رخصت ہوتے وقت چند امانتیں

حضرت علیؓ کے سپرد کیں اور انہیں نصیحت کی کہ یہ امانتیں فلاں فلاں تک پہنچا کر ہمارے ساتھ شامل ہو جانا، یہ امانتیں حضورؐ کے دشمنوں کی تھیں۔ حضورؐ کی دیانت کا یہ حال کہ جن دشمنوں کی تلواروں کے سائے تلے سے نکل رہے ہیں انہی کی امانتوں کو واپس کرنے کی فکر اور اہتمام کر رہے ہیں۔

جناب نبی کریمؐ جب جہاد کے لیے نکلتے تھے تو عام طور پر لشکر کے خاص لوگوں کے علاوہ آخری منزل سے لوگوں کو آگاہ نہیں فرماتے تھے۔ خیبر کے لیے حضورؐ لشکر لے کر نکلے جو کہ یہود کا علاقہ تھا، صبح کے وقت جب ان کے کاشت کار کھیتی باڑی کے لیے گھروں سے نکل رہے تھے تب انہیں پتہ چلا کہ محمدؐ کے لشکر نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ جب وہاں پہنچ کر آپؐ کے لشکر نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تو ایک شخص اسود راعیؓ جو بعد میں صحابی ہوئے، اس علاقے میں بکریاں چرا رہے تھے، انہیں اپنے کالے رنگ کی وجہ سے اسود اور چرواہا ہونے کی وجہ سے راعی کہا جاتا تھا۔ اسود راعی کسی کے غلام تھے اور اس کی بکریاں چرایا کرتے تھے انہوں نے دیکھا کہ نبی کریمؐ کا لشکر خیبر تک پہنچ گیا تھا، وہ جناب نبی کریمؐ کے پاس آئے اور پوچھا کہ میں اگر آپؐ کا دین قبول کر لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا جنت ملے گی۔ اسود راعی نے پوچھا کیا مجھ کالے کو جنت ملے گی؟ آپؐ نے فرمایا ہاں تجھے جنت ملے گی۔ پوچھا کیا میری نجات ہو جائے گی؟ فرمایا ہاں ہو جائے گی۔ اسود راعیؓ نے کہا ٹھیک ہے آپ مجھے کلمہ پڑھائیں۔ چنانچہ آپؐ نے اسود راعیؓ کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کر دیا۔ مسلمان ہونے کے بعد اسود راعیؓ نے حضورؐ سے کہا کہ میں اب آپ کا خادم ہوں۔ آپؐ نے فرمایا وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بکریاں جو تم چرا رہے ہو یہ کس کی ہیں؟ خیال فرمائیے کہ حالت جنگ میں دشمن کے قلعے کا محاصرہ کر رکھا ہے اور بکریاں بھی کسی دشمن کی ہیں۔ فرمایا کہ تمہارا اسلام قبول کرنا اپنی جگہ لیکن یہ بکریاں جس کی ملکیت ہیں جس کی امانت ہیں اسے واپس کر کے آؤ۔ اسود راعیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! اگر میں بکریاں واپس کرنے گیا تو میں خود کیسے واپس آؤں گا؟ فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ گھر جا کر انہیں دروازے سے اندر کر آؤ۔

ایفائے عہد

مکارم اخلاق اور اچھی عادات میں وعدہ نبھانا ایک اچھی خصلت ہے۔ وعدہ پورا کرنا ایک اچھی عادت ہے جبکہ وعدہ کی خلاف ورزی کرنا ایک بری عادت ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے وعدہ پورا کرنے کی تلقین بھی فرمائی اور خود وعدہ پورا کرنے کی مثالیں بھی لوگوں کے سامنے پیش کیں۔

مکہ مکرمہ میں رسول اللہؐ کے ایک ساتھی عبد اللہ تھے جو حضورؐ کے نبوت سے پہلے کے دوستوں میں سے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے کی بات ہے میرا حضورؐ کے ساتھ ایک کاروباری سودا ہوا۔ سودے کی کچھ رقم میرے پاس تھی جو میں نے حضورؐ کو دے دی جبکہ باقی رقم کے لیے کہا کہ آپ یہاں رکیں میں گھر سے لے کر آتا ہوں۔ لیکن جب میں گھر پہنچا تو میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی حتی کہ اس بات کو تین دن گزر گئے، تیسرے دن مجھے یاد آیا کہ میں نے تو حضورؐ کو فلاں جگہ رک کر انتظار کرنے کا کہا تھا۔ کہتے ہیں کہ میں بھاگم بھاگ اس جگہ پہنچا تو حضورؐ وہاں کھڑے تھے۔ آپؐ نے شکایت کا صرف ایک ہی جملہ ارشاد فرمایا کہ عبد اللہ تم نے مجھے بہت پریشان کیا۔ فرمایا کہ تم مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ اس جگہ پر کھڑے ہو کر تمہارا انتظار کروں اور میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ تمہارے واپس آنے تک یہاں رکوں گا۔ ایفائے عہد کی اور وعدہ پورا کرنے کی یہ مثال دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔

اسی طرح حضورؐ کے ایک صحابی ہیں حذیفہ بن یمانؓ۔ دونوں باپ بیٹا صحابی تھے، باپ کا نام حسیل تھا لیکن یمنی ہونے کی وجہ سے لوگوں نے یمان نام رکھ دیا تھا، بنو غطفان کے قبیلے سے ان کا تعلق تھا۔ جنگ بدر سے پہلے یہ دونوں مسلمان ہو چکے تھے اور انہوں نے یہ باتیں سن رکھی تھیں کہ مکہ والوں کا مدینہ والوں سے مقابلہ ہونے والا ہے، چنانچہ دونوں باپ بیٹا اس نیت سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے کہ وہاں جا کر مدینہ والوں کے ساتھ مل کر مکہ والوں کے خلاف لشکر میں شریک ہوں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ راستے میں ابوجہل کا لشکر مل گیا جنہوں نے بھانپ لیا کہ یہ دونوں باپ بیٹا مدینہ والوں کے لشکر میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ انہوں نے روک لیا کہ ہم تم دونوں کو محمدؐ کے لشکر میں شامل نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی کہ ہم تو صرف مدینہ جا رہے ہیں، اس پر ابوجہل کے لشکر والوں نے ان سے کہا کہ اگر تم محمدؐ کے لشکر میں شامل نہ ہونے کا وعدہ کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ انہیں بھی اس بات پر اعتماد تھا کہ رسول اللہؐ کے ساتھی جو وعدہ کرتے ہیں پورا کرتے ہیں، چنانچہ اس وعدہ پر حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد حضرت یمانؓ کو چھوڑا۔

جب یہ وعدہ کر کے دونوں باپ بیٹا مدینہ منورہ پہنچے تو حضورؐ کا لشکر بدر کے لیے پیش قدمی کر رہا تھا۔ ملاقات پر انہوں نے حضورؐ سے ابوجہل کے لشکر ہاتھوں پکڑے جانے اور وعدہ پر رہائی کا سارا قصہ ذکر کر دیا۔ کیفیت دیکھئے کہ جناب نبی کریمؐ کو محاذ جنگ کے لیے ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی، بوڑھے اور بچے ملا کر ۳۱۳ لوگ ہوئے تھے، نہ تلواریں پوری نہ گھوڑے پورے اور نہ کمانیں پوری۔ جبکہ دوسری طرف جنگ کے لیے ہر طرح کے سازو سامان سے لبریز کفار کا لشکر ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ لیکن جب حذیفہ بن یمانؓ نے حضورؐ کو بتایا کہ ہم ابوجہل کے لشکر سے وعدہ کر کے آئے ہیں کہ آپ کے لشکر میں شامل ہو کر ان کے خلاف نہیں لڑیں گے تب انہوں نے ہمیں چھوڑا ہے، اگر آپؐ حکم دیں تو ہم اب بھی حاضر ہیں۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا نہیں! تم لوگوں کو لشکر میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہے بلکہ تم اپنا وعدہ نبھاؤ گے۔ یہ ہے ایفائے عہد اور وعدے کا پورا کرنا۔ حالت جنگ میں دشمن کے ساتھ وعدہ پورا کرنے کے لیے اپنی ضرورت کی اتنی بڑی قربانی دے کر جناب رسول اکرمؐ نے ایفائے عہد کی جو مثال پیش کی دنیا کی تاریخ ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ جب دشمن کے ساتھ تلواریں چل رہی ہوں تب اخلاق کی تکمیل کرنا تب وعدے اور سچائی کا لحاظ رکھنا، اس کا نام ہے اخلاق فاضلہ۔

خوش طبعی

حضرت عمرو بن العاصؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ ''دھاۃ العرب'' یعنی کے چوٹی کے سیاست دانوں میں سے تھے اور فاتح مصر تھے، ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرتؓ آپ رسول اللہؐ کے چہرۂ مبارک کی تفصیلات بیان کیجیے۔ فرمانے لگے سچی بات یہ ہے کہ میں خیال نہیں کر سکا، اس کی وجہ یہ بتائی کہ حضورؐ کی شخصیت کا رعب ہی اتنا تھا کہ کبھی اس بات کی ہمت نہیں ہوئی کہ نظر بھر کر حضورؐ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھ سکوں۔ لیکن اس خداداد ہیبت و رعب کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضورؐ سے زیادہ نرم کلام کرنے والا نہیں دیکھا، آپؐ خوش کلامی فرماتے تھے اور آپ کے چہرے پر تبسم رہتا تھا۔ آپؐ جب بات کرتے تھے تو مسکراتے تھے، اس رعب و دبدبہ کے باوجود اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوش طبعی کا معاملہ بھی فرماتے تھے۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی طبیعت میں تکلف والا رعب نہیں تھا، آپؐ خواہ مخواہ رعب نہیں

جماتے تھے بلکہ آپ کی ہیبت اور دبدبہ خداداد تھا لیکن اس کے باوجود آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ حسب موقع خوش طبعی فرماتے تھے۔

زاہرؓ ایک دیہاتی صحابی تھے وہ آپؐ کے لیے کبھی گاؤں سے کوئی تحفہ وغیرہ بھی بھیجا کرتے تھے، اسی طرح حضورؐ بھی انہیں کبھی کوئی تحفہ دیا کرتے تھے۔ زاہرؓ ایک دفعہ بازار میں تھے کہ حضورؐ نے جاکر پیچھے سے اس طرح جھینپ (دونوں بازوؤں میں جکڑ) لیا کہ وہ حضورؐ کو دیکھ نہ سکیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کون ہے؟ حضورؐ نے جواب نہیں دیا اس خیال سے کہ وہ خود ہی بوجھیں، چنانچہ دوسری یا تیسری دفعہ پوچھنے پر حضورؐ نے انہیں چھوڑا۔

اسی طرح آپؐ کی خدمت میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ یارسول اللہ! میرے لیے دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت دے، آپؐ نے فرمایا کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی جس پر وہ پریشان ہوگئی کہ میں تو دعا کے لیے آئی تھی لیکن حضورؐ یہ کیا خبر دے رہے ہیں؟ لیکن اس کی پریشانی دیکھ کر حضورؐ نے بتایا کہ سب لوگ جوان ہوکر جنت میں جائیں گے۔

ایسے ہی ایک شخص آیا اور حضورؐ سے درخواست کی کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے آپ مجھے بیت المال سے ایک اونٹ عنایت کردیں۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا میں تمہیں اونٹ کا بچہ دے دیتا ہوں۔ وہ فکرمند ہوکر کہنے لگا یارسول اللہ! اونٹ کا بچہ لے کر میں کیا کروں گا مجھے تو سفر کے لیے سواری چاہیے؟ آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھئی ہر اونٹ کسی اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔

تواضع

اخلاق حسنہ میں تواضع ایک اچھی عادت ہے جبکہ تکبر ایک بری عادت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع کی تعریف اور تکبر کی مذمت فرمائی ہے۔ خیال فرمائیے کہ آنحضرتؐ سے بڑھ کر قابل احترام شخصیت کونسی ہوگی اور صحابہ کرامؓ سے زیادہ آپؐ کا احترام کس نے کیا ہوگا؟ خود جناب نبی کریمؐ کی تواضع کا حال یہ تھا کہ انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ جب مجلس میں تشریف لاتے تھے تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم احتراماً کھڑے ہوجائیں لیکن ہم کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ حضورؐ کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ایک جگہ صحابہ کرامؓ گفتگو فرما رہے تھے جس میں حضرت یونس علیہ السلام کا حضورؐ کے ساتھ تقابل کے انداز میں تذکرہ ہو رہا تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ”لا تفضلونی علی یونس بن متی“ کہ مجھے اس طرح حضرت یونسؑ پر فضیلت مت دو۔

ایک بات تو عقیدے کی ہے کہ جناب نبی کریمؐ افضل الانبیاء ہیں، سارے نبیوں کے سردار ہیں اور سارے انبیاء میں برتر شخصیت ہیں۔ قرآن کریم بھی یہ کہتا ہے "تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض" لیکن آپؐ نے دو انبیاء کا آپس میں اس طرح تقابل کرنے سے منع فرمایا کہ یہ دیکھنا شروع کر دیا جائے کہ فلاں پیغمبر میں یہ بات تھی اور فلاں میں نہیں تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس طرح تقابل نہ کرو کہ جس سے کسی پیغمبر کی توہین کا پہلو نکلتا ہو یا جس سے کسی بزرگ کی تخفیف کا پہلو سامنے آتا ہو۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا "لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسی بن مریم" کہ مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ چڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے عیسی ابن مریم کو بڑھا چڑھا دیا تھا۔

حضرات محترم! جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے آیا ہوں اور دنیا کو اخلاق کا بہترین نمونہ دکھانے آیا ہوں۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنی جماعت کو اخلاق فاضلہ کی تربیت دے کر دنیا کے سامنے بہترین اخلاق و عادات کا حامل ایک معاشرہ پیش کیا، یہ جناب نبی کریمؐ کا ایک بڑا معجزہ اور اعجاز ہے۔ اللہ تعالی ہمیں آپؐ کی سنت پر اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

سماجی خدمت اور سیرت نبویؐ

(جامعہ الہدٰی، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۵ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اسلام دین فطرت ہے اور اللہ تعالی نے جناب نبی کریمؐ کو انسانی زندگی کے لیے جو نظام حیات دیا ہے وہ ایک فطری نظام حیات ہے، اس نظام کے کسی شعبے میں کوئی خلاء نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، جہاں یہ محسوس ہوتا ہو کہ اسلام میں اس کے متعلق ہدایات موجود نہیں ہیں، اسلام نے اگر کسی معاملے کے متعلق براہ راست ہدایات نہیں دیں تو ایسے اصول و ضوابط دیے ہیں جن سے ان معاملات کا حل اخذ کیا جا سکتا ہے اور ان کے متعلق راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے، یوں انسانی زندگی کا کوئی شعبہ خدا اور رسول کی رہنمائی اور ہدایت سے خالی نہیں رہنے دیا گیا۔

باہمی حقوق کی نوعیت

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی معاشرے میں رہنے والوں کے آپس کے حقوق بیان فرمائے ہیں، یہ حقوق دو نوعیت کے ہیں، پہلی نوعیت شخصی حقوق کی ہے جبکہ دوسری اجتماعی حقوق کی ہے۔ شخصی حقوق کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص کا دوسرے شخص پر کیا حق ہے، یعنی ماں کا حق بچے پر اور بچے کا حق ماں پر، میاں کا حق بیوی پر اور بیوی کا حق میاں پر، بھائی کا حق بہن پر اور بہن کا حق بھائی پر، استاد کا حق شاگرد پر اور شاگرد کا حق استاد پر، یہ شخصی حقوق ہیں جن کی تفصیلات رسول اللہؐ نے بیان فرمائی ہیں۔ اجتماعی حقوق کا معنی یہ ہے کہ معاشرے کا انسان پر کیا حق ہے، سوسائٹی کا جو مشترکہ حق انسان پر ہے اسے سماجی خدمت یا سوشل ورک کہتے ہیں۔ معاشرہ اجتماعی طور پر جو انسان سے تقاضا کرتا ہے اس تقاضے کو پورا کرنا سماجی خدمت کرنا کہلاتا ہے۔ اس پیمانے پر دیکھا جائے تو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلواۃ والتسلیمات سے بڑھ کر اور کوئی سماجی خدمت گزار نہیں رہا اور پھر انبیاء میں سب سے بڑے سوشل ورکر جناب رسالت مآبؐ ہیں۔

حضورؐ بطور سماجی خدمت گزار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بالکل آغاز میں ہی آپؐ کا تعارف ایک سوشل ورکر کے طور پر سامنے آتا ہے، جب حضرت جبریل علیہ السلام غار حرا میں پہلی وحی لے کر آئے تو یہ حضورؐ کے لیے ایک اچانک بات تھی، آپؐ نے وحی تو قبول کر لی لیکن اس غیر معمولی واقعہ کی وجہ سے آپؐ کی طبیعت پر بے پناہ بوجھ تھا۔ پہلی وحی کے مراحل سے گزر کر آنحضرتؐ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے اس تمام واقعہ کا ذکر کیا، ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جو جناب نبی کریمؐ کی زوجہ محترمہ تھیں اور قیامت تک دنیا کے مسلمانوں کی محترم ماں ہیں، رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ مجھ پر شخصی احسانات کرنے والی عورتوں میں سب سے بڑھ کر خدیجہؓ تھیں۔

حضرت خدیجہؓ بڑی سمجھ دار خاتون تھیں، حضورؐ نے گھر آکر زوجہ محترمہ کو غار حرا کا یہ واقعہ سنایا اور ساتھ ہی پریشانی کا اظہار فرمایا جو کہ ایک طبعی اور فطری بات تھی، اس پر ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ نے پہلا ردعمل یہ ظاہر کیا، ”واللہ لا یخزیک اللہ أبدا“ خدا کی قسم! آپ تسلی رکھیے اللہ تعالیٰ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا اس واقعے میں آپ کے لیے پریشانی کی کوئی بات

نہیں ہے۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے اس کی وجہ بیان فرمائی ''انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق'' کہ اللہ تعالی آپ کو اس لیے ضائع نہیں ہونے دے گا کہ معاشرے میں آپ کی خدمات اور کارکردگی قابل تعریف و ستائش ہیں، آپ صلہ رحمی کرنے والے ہیں، رشتوں کو جوڑنے والے ہیں، ٹوٹے ہوئے رشتوں کو ملانے والے ہیں، بیواؤں اور لاوارث لوگوں کا بوجھ اٹھانے والے ہیں، محتاجوں کو کما کر دینے والے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری کرنے والے ہیں اور لوگوں پر آنے والی مشکلات میں ان کی مدد کرنے والے ہیں۔ یعنی جو آدمی سوسائٹی کے حقوق ادا کرتا ہو اور معاشرے کے نادار لوگوں کا سہارا بنتا ہو اللہ تعالی ایسے شخص کو ضائع نہیں کرتے بلکہ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایک نبی کے طور پر جناب نبی کریمؐ کا پہلا تعارف ہی اس بات سے ہوا کہ آپؐ بیواؤں، یتیموں، مسکینوں اور غریبوں کے کام آتے ہیں۔ چنانچہ سماجی خدمت سوسائٹی کا حق ہے، معاشرے کا یہ حق جناب نبی کریمؐ نے خود بھی ادا کیا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔

حضرت خدیجہؓ کے یہی الفاظ عرب قبیلے کے ایک سردار ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں کہے تھے، جب مکہ مکرمہ کے مسلمانوں پر مکہ کی زمین تنگ کر دی گئی، مشرکین مکہ نے تکلیفوں اور اذیتوں کی انتہا کر دی اور اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ جو جناب نبی کریمؐ کے سب سے قریبی ساتھی تھے، وہ بھی معاشرے کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئے۔ انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مکہ میں زندگی گزارنا برداشت سے باہر ہو رہا ہے، اجازت ہو تو میں بھی ہجرت کر جاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے سامان باندھا اور ہجرت کے ارادے سے مکہ سے نکل گئے اور کچھ سفر بھی طے کر لیا۔ بنو قارہ کا سردار ابن الدغنہ جو عرب قبائل کے سرداروں میں ایک بڑا سردار تھا، وہ کسی سفر سے مکہ واپس آ رہا تھا، راستے میں اس کی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملاقات ہو گئی، ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ بتایا کہ مکہ کے لوگوں نے جینا دوبھر کر دیا ہے، اس لیے مکہ سے ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔ خود نبی کریمؐ نے بھی ہجرت کی رات مکہ کی طرف منہ کر کے کہا تھا کہ اے میرے شہر! اے اللہ

کے گھر والے شہر، تجھے چھوڑ کر جانے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن کیا کروں، اس شہر کے مکین یہاں رہنے نہیں دیتے۔ ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا، تیرے جیسے لوگ شہر نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر ابن الدغنہ نے وہی الفاظ حضرت صدیق اکبرؓ سے کہے جو حضرت خدیجہؓ نے پہلی وحی کے بعد حضورؐ سے فرمائے تھے ”انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتقری الضیف وتکسب المعدوم وتعین علی نوائب الحق“۔ ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ تم میرے ساتھ واپس چلو، میں تمہاری ضمانت دوں گا، چنانچہ وہ انہیں ساتھ لے کر مکہ واپس آیا اور بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا کہ لوگو! میں بنو قارہ کا سردار ابن الدغنہ ہوں، ابوبکرؓ تمہاری اذیتوں کی وجہ سے شہر چھوڑ کر جا رہا تھا، مجھ سے برداشت نہیں ہوا، اس لیے میں اسے لے کر واپس آیا ہوں، اگر کسی کو ابوبکرؓ سے کوئی شکایت ہے تو وہ مجھ سے بات کرے، میں ابوبکرؓ کی ضمانت دیتا ہوں اور وہ میری پناہ میں ہے۔ پھر کہا کہ لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ابوبکر جیسا سماجی خدمت گزار تمہارے طرز عمل سے شہر چھوڑ کر جا رہا ہے۔ یعنی ابن الدغنہ نے کہا کہ سوشل ورکر تو کسی معاشرے کی آبرو ہوتا ہے، ایسے آدمی کو شہر چھوڑنے پر مجبور کرنا اس معاشرے کی بدبختی کی علامت ہے۔ چنانچہ چند روز تک حضرت صدیق اکبرؓ ابن الدغنہ کی پناہ میں رہے لیکن بعد میں حسب حالات حضرت ابوبکرؓ نے ابن الدغنہ کی یہ پناہ واپس کر دی۔

راستے کے حقوق

حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راستوں میں اور کھلی گزرگاہ میں مت بیٹھا کرو۔ بعض صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ ہمارے پاس تو گھروں میں جگہ نہیں ہوتی، کوئی دوست وغیرہ ملنے آجائے تو ہم باہر کھلی جگہ میں اس کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں یا راستے میں کسی جگہ پر اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اگر گھر سے باہر کھلی گزرگاہ میں بیٹھنا ضروری ہو تو پھر راستے کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے پوچھا ”یا رسول اللہ وما حق الطریق“ کہ انسانوں کے حق تو سنے تھے، یہ راستے کا حق کیا ہے؟ چنانچہ جناب نبی کریمؐ نے راستے کے حقوق بیان کیے ”غض البصر وکف الاذی عن الطریق ورد السلام والامر بالمعروف والنھی عن المنکر وغیر ذلک“۔

1. پہلا حق یہ فرمایا کہ نگاہیں نیچے رکھو اور آنے جانے والوں پر تانک جھانک مت کرو۔

2. دوسرا حق یہ فرمایا کہ راستے میں اس طرح کھڑے ہو کر لوگوں کو اذیت مت دو کہ آنے جانے والوں کے لیے راستہ بند ہو جائے، اور اگر کوئی اذیت والی چیز راستہ میں دیکھو تو اسے ہٹا دو۔

3. تیسرا حق یہ فرمایا کہ گزرنے والا مسلمان بھائی اگر سلام کرے تو اس کے سلام کا جواب دو۔

4. چوتھا حق یہ فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو یعنی راستے میں کوئی برائی ہوتے دیکھو تو اس کی ممانعت کا اہتمام کرو۔

5. پانچواں حق یہ فرمایا کہ کوئی شخص راستہ گم کر بیٹھے تو اس کی راہنمائی کرو۔

دین اسلام کی دعوت

جناب نبی کریمؐ نے راہنمائی کا دائرہ وسیع رکھا ہے کہ ایک غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دینا یہ بھی ایک مسلمان پر معاشرے کا حق ہے۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر صورتحال یہ تھی کہ قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے کافی دن گزر گئے تھے اور قلعہ فتح کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، ایک دن نبی کریمؐ نے شام کے وقت اعلان فرمایا کہ میں کل لڑائی کا جھنڈا ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جس کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ خیبر کا قلعہ فتح کروائیں گے، اس کے ساتھ یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا کہ ’’یحبہ اللہ ورسولہ‘‘ کہ اس سے اللہ اور اس کے رسول کو محبت بھی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ وہ رات ہم سب نے ایسی گزاری کہ ہر صحابی کے دل میں یہ بات تھی کہ اللہ کرے کہ کل لڑائی کا جھنڈا مجھے ملے، فرماتے ہیں کہ مجھے زندگی بھر کبھی امارت کی خواہش نہیں ہوئی لیکن اس رات یہ خواہش میرے دل میں بھی تھی اس لیے کہ اس میں ایک تو رسول اللہؐ نے فتح کی خوشخبری دی، دوسرا ’’یحبہ اللہ ورسولہ‘‘ فرمایا۔

صبح ہوئی، جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ علیؓ کو بلاؤ، حضورؐ کو بتایا گیا کہ وہ تو بیمار ہیں اور ٹھیک طرح سے دیکھ بھی نہیں سکتے، حضرت علیؓ آئے تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ علیؓ آج لشکر کی کمان تم کرو گے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! اس سے بڑی سعادت کی بات کیا ہو سکتی ہے لیکن میں تو ٹھیک طریقے سے دیکھ بھی نہیں سکتا، میری آنکھوں کا برا حال ہے، رسول اللہؐ نے اپنا لعاب مبارک حضرت علیؓ کی آنکھوں پر لگایا جس سے ان کی آنکھیں اسی وقت ٹھیک ہو گئیں۔ حضورؐ کا معجزہ دیکھیں کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہر سال گرمیوں میں

میری آنکھیں خراب ہو جاتی تھیں لیکن اس کے بعد زندگی میں کبھی خراب نہیں ہوئیں۔
حضورؐ نے جب جھنڈا حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیا تو اس کے ساتھ ایک ہدایت فرمائی کہ جا کر پہلا کام یہ کرنا کہ انہیں اسلام کی دعوت دینا۔ پھر فرمایا کہ علیؓ اگر ایک آدمی بھی تمہاری وجہ سے اسلام میں داخل ہو جائے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں کی دولت سے بھی بہتر ہے، اس زمانے میں سرخ اونٹ سب سے بڑی دولت سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ حضورؐ نے غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دینے کو معاشرے کا حق بتایا۔

اصلاح دین کی دعوت

ایک آدمی نیکی کے راستے پر نہیں چل رہا، جبکہ دوسرا آدمی برائی کے راستے پر چل رہا ہے، یہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ایک آدمی نیکی بھی نہیں کر رہا اور برائی بھی نہیں کر رہا لیکن اس میں نیکی کی صلاحیت موجود ہے، ایسے آدمی کو نیکی کے راستے پر چلانا دوسرے مسلمان کا حق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک مسلمان جو غلط راستے پر چل رہا ہے اسے صحیح راستے پر لانا بھی دوسرے مسلمان کا حق ہے، اگر اس کی غفلت کی وجہ سے دوسرا مسلمان غلط راستے پر چلتا رہا تو یہ بھی قصوروار ٹھہرے گا۔
راستہ دکھانے میں نبی کریمؐ نے دو باتیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی بات یہ کہ کوئی شخص اپنے گھر کا یا اپنی منزل کا راستہ بھول جائے تو اسے صحیح راستے پر چلا دینا، دوسری بات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق بیان فرمائی کہ کوئی شخص نیکی اور بدی کے معاملے میں صحیح راستے پر نہ چل رہا ہو تو اسے صحیح راستے پر چلانا۔ رسول اللہؐ نے راہنمائی کو سوسائٹی کا سب سے بڑا حق قرار دیا، یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق جہاں تک ممکن ہو یہ حق ادا کرے۔

ظلم سے روکنا

عبداللہ بن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "المسلم اخوا لمسلم لا یظلمہ ولا یظلمہ" کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ وہ اسے دوسروں کے ظلم کے حوالے کرتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ کسی پر دوسروں کو ظلم کرنے دیتا ہے، معاشرے کے افراد کا ہم پر صرف یہ حق نہیں ہے کہ ہم ان پر ظلم نہ کریں بلکہ یہ بھی حق ہے کہ کہیں ظلم ہوتا ہو تو حسب استطاعت

اسے روکیں۔ جناب نبی کریمؐ نے حکم فرمایا ''أنصر أخاک ظالما أو مظلوما'' کہ تمہارا بھائی ظالم ہو یا مظلوم، اس کی مدد کرو۔ پوچھا گیا کہ یا رسول اللہؐ مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے کہ اسے ظالم کے ظلم سے بچائیں لیکن ظالم کی مدد کا کیا معنی ہے؟ فرمایا، ظالم بھائی کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم کرنے سے روکو۔

حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاد رکھو! جو شخص کسی دوسرے مسلمان بھائی کی ضرورت کو پورا کرے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، پھر فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان بھائی کی مشکل میں اس کے کام آئے، اللہ تعالیٰ اس کی اپنی مشکل آسان فرما دیتا ہے۔ پھر فرمایا، جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب پر پردہ ڈالیں گے۔ اس موقع پر حضورؐ نے غیبت کی مذمت فرمائی کہ غیبت بری چیز ہے جبکہ قرآن کریم نے غیبت کو اپنے مردار بھائی کا گوشت کھانا قرار دیا ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر اس شخص میں وہ عیب ہو کیا تب بھی اس کا تذکرہ منع ہے؟ آپؐ نے فرمایا، اسی کا نام تو غیبت ہے۔ ایک آدمی میں کوئی عیب ہو اور آپ بلا ضرورت اس کا تذکرہ کریں، یہی تو غیبت ہے۔ لیکن اگر آپ کسی آدمی کے ایسے عیب کا تذکرہ کریں گے جو اس میں نہیں ہے، یہ تو در بہتان ہو جاتا ہے۔

جناب نبی کریمؐ نے لوگوں کے باہمی حقوق کے متعلق ایک حدیث قدسی کا ذکر فرمایا۔ حدیث قدسی اسے کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ اپنے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی بات کا مفہوم روایت کریں۔ حدیث قدسی اور قرآنی آیات میں یہی فرق ہے کہ قرآن کریم میں بات بھی اللہ تعالیٰ کی ہے اور الفاظ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، جبکہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو حضورؐ اپنے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں یعنی ان الفاظ کا اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ بھوکوں کو کھلانا حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے ایک بندے سے ارشاد فرمائیں گے کہ اے میرے بندے! میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کیوں نہیں کھلایا؟ بندہ کہے گا کہ یا اللہ! آپ اور بھوک؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہاں تمہارے پڑوس میں ایک آدمی بھوکا تھا اس کے لیے میں نے تم سے کھانا مانگا تھا تم نے اسے کھانا نہیں کھلایا، اسے کھلانا دراصل مجھے ہی کھلانا تھا۔ تم نے اپنے اڑوس پڑوس میں یہ خیال ہی نہیں کیا کہ کون بھوکا ہے اور کس کو کھانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک شخص سے

فرمائیں گے کہ میں بیمار تھا تم نے میری بیمار پرسی نہیں کی۔ بندہ کہے گا یا اللہ! آپ بیمار تھے؟ اللہ تعالی فرمائیں گے کہ ہاں تمہارے پڑوس میں تمہارا فلاں بھائی بیمار تھا تم نے اس کی عیادت نہیں کی۔ میں نے تمہیں بیمار پرسی کا حکم دیا تھا تم اس کی عیادت کرتے تو دراصل میری عیادت کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالی ایک شخص سے فرمائیں گے کہ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ کہے گا یا اللہ! آپ اور پیاس؟ اللہ تعالی فرمائیں گے تمہارے محلے میں فلاں شخص پیاسا تھا اسے پینے کا پانی میسر نہیں تھا تم نے اس کی اس ضرورت کا خیال نہیں رکھا، تم اسے پانی پلاتے تو دراصل مجھے پانی پلاتے۔

خیال فرمائیے کہ اللہ تعالی نے معاشرتی حقوق کو کس انداز سے بیان فرمایا ہے اور لوگوں کے آپس کے حقوق کی اللہ تعالی کے ہاں کس قدر اہمیت ہے کہ اللہ تعالی بھوکوں، بیماروں اور پیاسوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ جناب نبی کریمؐ نے تو یوں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی پیاسے کو پانی پلایا قیامت کے دن اللہ تعالی اسے حوض کوثر سے میرے ہاتھوں پانی پلائے گا، جس نے کسی بھوکے کو کھانا کھلایا اللہ تعالی قیامت کے دن اسے جنت کے میوے کھلائیں گے۔ مشکل میں کسی کے کام آنا، کسی مقروض کا قرضہ ادا کرنا، کسی بیمار کی دوا کا خرچہ برداشت کرنا، کسی الجھن کے شکار فرد کے ساتھ بات چیت کر کے اس کی کوئی الجھن دور کرنا، یا کسی بھی نوعیت کی مشکل آسان کرنا، ان سب کا اللہ تعالی کے ہاں بے حد اجر و ثواب ہے۔

انسان کے ساتھ اللہ تعالی کا طرز عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول بیان فرمایا کہ قیامت کے دن کے بارے میں ہر آدمی کو اللہ تعالی سے اپنے ساتھ کسی خاص سلوک کی توقع ہوتی ہے کہ اللہ تعالی مجھ سے اس طرح کا معاملہ فرمائیں گے۔ حضورؐ نے ایک بڑا جامع جملہ ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو خدا کی مخلوق کے ساتھ جو طرز عمل تمہارا ہوگا، خدا کا وہی طرز عمل تمہارے ساتھ ہوگا۔ یعنی تم لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈالو گے خدا تمہارے عیبوں پر پردہ ڈالے گا، تم لوگوں کی غلطیاں معاف کرو گے خدا تمہاری غلطیاں معاف کرے گا، تم لوگوں کی گردنیں بوجھ سے چھڑواؤ گے اللہ تعالی تمہاری گردن سے بوجھ ہٹا دے گا، تم بھوکوں کو کھلاؤ گے اللہ تعالی تمہاری بھوک دور کر دیں گے۔ گویا رسول اللہؐ نے یہ اصول بیان فرمادیا کہ تمہارا جو طرز عمل اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہوگا، اللہ تعالی سے بھی اسی طرز عمل کی توقع رکھنا، اور پھر مخلوق سے مراد

صرف مسلمان نہیں ہیں۔ آپس کے حقوق بیان فرماتے ہوئے حضورؐ نے ایک عجیب ترتیب بتائی۔

پڑوسی کے حقوق

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پڑوسی تین قسم کے ہیں:

- ایک وہ جو تمہارا پڑوسی بھی ہے، مسلمان بھی ہے اور رشتہ دار بھی ہے، ایسے شخص کے تم پر تین حق ہیں: پڑوسی کا حق، مسلمان بھائی ہونے کا حق اور صلہ رحمی کا حق۔
- دوسرا وہ جو تمہارا رشتہ دار تو نہیں لیکن مسلمان ہے اور پڑوسی ہے، اس کے تم پر دو حق ہیں: مسلمان بھائی ہونے کا حق اور پڑوسی ہونے کا حق۔
- پھر اس شخص کا حق جو مسلمان بھی نہیں اور رشتہ دار بھی نہیں، لیکن اس کا بھی پڑوسی ہونے کا تم پر حق ہے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ کسی خوشی کے موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے گھر والوں نے ایک بکری ذبح کی، گوشت پکایا اور محلے میں تقسیم کیا۔ حضرت عبداللہؓ جب گھر تشریف لائے تو پوچھا کہ ہمارے فلاں یہودی پڑوسی کو آپ لوگوں نے گوشت بھیجا ہے یا نہیں؟ گھر والوں نے جواب دیا کہ اس پڑوسی کو بھیجنا تو یاد نہیں رہا، حضرت عبداللہؓ نے اس پر ناراضگی ظاہر کی اور فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں کیا فرمایا ہے؟ پھر ایک حدیث نقل کی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ''مازال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم'' کہ جبریل علیہ السلام بار بار مجھے پڑوسیوں کے بارے میں تلقین کرتے رہے حتی کہ میں نے خیال کیا کہ وہ انہیں وارث قرار دینے کا حکم لے آئیں گے۔

ایک حدیث کے مطابق جناب رسول اللہؐ نے پڑوسیوں کے حقوق میں یہاں تک ارشاد فرمایا کہ اگر گوشت پکایا ہے تو شوربہ زیادہ کر لو اور پڑوسی کا خیال کرو، اکیلے مت کھاؤ۔ ایک اور حدیث میں فرمایا ''لیس المؤمن الذی یبیت شبعان وجارہ جائع فی جنبہ وھو یعلمہ'' کہ وہ شخص مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں ہے جو خود تورات کو پیٹ بھر کر سوئے، لیکن اس کا پڑوسی بھوکا سوئے۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ گھر میں اگر کھانے کے لیے پھل لے کر آؤ تو

اس میں سے اپنے پڑوسی کو بھی بھجواؤ، اگر نہیں بھجوا سکتے تو اپنے بچوں کو پھل لے کر باہر مت آنے دو، پڑوسی کے بچے دیکھیں گے تو وہ اپنے باپ سے ویسا پھل کھانے کی ضد کریں گے، اور اگر اس غریب کی استطاعت سے باہر ہو گا تو بچوں کو مایوسی ہو گی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ چھلکے باہر مت پھینکو، پڑوسی کے بچے دیکھیں گے تو اپنے ماں باپ کو تنگ کریں گے۔

پڑوس کی حد کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے ایک دن پوچھ لیا کہ یا رسول اللہ! آپ پڑوس کے حقوق بیان فرماتے ہیں، پڑوس کی کیا حد ہے؟ فرمایا چالیس گھروں تک۔ بعض محدثین نے آسانی فرمادی کہ کل چالیس گھر یعنی ہر طرف سے دس دس گھر لیکن بعض محدثین کہتے ہیں کہ دونوں اطراف میں چالیس چالیس گھر۔

جائز سفارش

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشکل وقت میں لوگوں کے کام آنا بظاہر معاشرے کا حق ہے، لیکن اللہ تعالی نے اسے اپنا حق بتایا ہے۔ کوئی آدمی کسی مشکل اور پریشانی میں ہو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اس کی یہ مصیبت دور کی جائے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ اگر خود نہیں کر سکتا تو کسی ایسے شخص سے سفارش کر دے جو یہ کام کر سکے۔ قرآن کریم نے اس بارے میں فرمایا ہے ”من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منھا و من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا“ (سورۃ النساء ۸۵) کہ جس نے کسی کی اچھے کام میں سفارش کی اس کا ثواب میں حصہ ہو گا اور جس نے کسی کی برے کام میں سفارش کی اس کے گناہ کا اس پر بھی بوجھ ہو گا۔

اچھی سفارش سے مراد یہ ہے کہ آدمی ضرورت مند ہو اور اس کی حاجت جائز ہو، غلط سفارش سے مراد یہ ہے کہ آدمی ضرورت مند نہیں ہے یا یہ کہ اس کی حاجت غیر قانونی اور ناجائز ہے۔ جناب نبی کریمؐ خود سفارش کی تلقین فرمایا کرتے تھے، حضرت ابو موسی اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریمؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اگر کام لے کر آئے تو اس کی سفارش کیا کرو، فرمایا فیصلہ تو میں نے وہی کرنا ہوتا ہے جو اللہ تعالی کی طرف سے القاء ہوتا ہے لیکن تم کیوں ثواب سے محروم ہوتے ہو؟

رسول اللہؐ خود بھی سفارش کیا کرتے تھے، جب حضرت جابرؓ کے والد فوت ہوئے تو یہ آٹھ بہنوں کے اکیلے کفیل تھے اور یہودیوں کے مقروض تھے۔ ایک باغ اور کچھ زمین تھی

جس پر پھل اور فصل اگائی ہوئی تھی جب فصل کٹنے کا وقت آیا تو یہودیوں نے کہہ دیا کہ ہم تمہیں فصل نہیں اٹھانے دیں گے پہلا ہمارا قرضہ واپس کرو۔ جبکہ قرضہ اتنا تھا کہ ساری فصل اٹھا کر بھی قرضہ نہ چکایا جا سکتا۔ اب اگر ساری فصل وہ لے جاتے تو حضرت جابرؓ کے گھر کے لیے کیا بچتا؟ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ یا رسول اللہ! ایک تو باپ کی وفات کا صدمہ ہے دوسرا آٹھ بہنیں ہیں جن کی کفالت کا بوجھ ہے اور اب تیسرا اس قرضہ کی پریشانی نے آن گھیرا ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے ان یہودی افراد کے پاس حضرت جابرؓ کی سفارش کی کہ اللہ کے بندو! یہ مجبور آدمی ہے اگر تم اسے سہولت دو تو یہ قسط وار تمہارا قرضہ ادا کر دے گا لیکن تم اسے ساری فصل سے محروم نہ کرو، اس نے سال کا خرچہ بھی گھر میں رکھنا ہے اور بہنوں کی کفالت بھی کرنی ہے۔ لیکن یہودیوں نے آنحضرتؐ کی سفارش ماننے سے انکار کر دیا کہ اس کے باپ نے ہم سے قرضہ لیا تھا ہم تو جابرؓ سے وہ قرضہ لے کر ہی رہیں گے۔ اس پر شان رسالت جوش میں آگئی، آپؐ نے جابرؓ سے فرمایا کہ اپنے باغ کا سارا پھل کاٹ کر ڈھیر لگا دو اور اس پر کپڑا بچھا دو پھر سب قرض داروں کو بلاؤ کہ آکر اپنا قرضہ لے جائیں، چنانچہ حضرت جابرؓ نے ایسا ہی کیا۔ جناب نبی کریمؐ اس موقع پر تشریف لے گئے اور پوچھا کیا سب قرض دار آگئے ہیں؟ جابرؓ نے بتایا، ہاں آگئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب چادر کے نیچے سے کھجوریں نکالتے جاؤ اور قرض داروں کو دیتے جاؤ۔ حضرت جابرؓ نے کھجوریں نکال کر دینا شروع کر دیے یہاں تک کہ سب قرض داروں کا قرضہ ادا ہو گیا، اس کے بعد چادر اٹھا کر دیکھا تو پھلوں کا ڈھیر ویسا کا ویسا تھا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔

جناب نبی کریمؐ نے سفارش کی تلقین بھی فرمائی اور اس کا اجر بھی بتایا، کسی آدمی کی کوئی ضرورت ہے جسے پورا کرنے کا طریقہ اسے معلوم نہیں ہے یا متعلقہ محکمہ یا دفتر تک اس کی رسائی نہیں ہے جبکہ آپ اس کے معاون بن کر، اسے مطلوبہ معلومات مہیا کر کے، متعلقہ محکمہ سے اس کی واقفیت کروا کر، اسے متعلقہ آدمی سے ملوا کر اس کا کام کروا دیتے ہیں تو یہ سفارش یا معاونت کہلاتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب ہے۔

رسول اللہؐ نے اپنے ایک اور صحابیؓ کے لیے بھی سفارش کی تھی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے اپنی لونڈی بریرہؓ کو آزاد کر دیا، وہ ایک صحابی مغیثؓ کے نکاح میں تھی۔ شریعت میں آزاد ہونے والی لونڈی کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ پہلے خاوند کے نکاح میں رہے یا

اسے ختم کردے، خیر آج کے دور میں نہ تو غلامی کا تصور پایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی شرائط موجود ہیں۔ آزادی کے بعد بریرہؓ نے اعلان کر دیا میں مغیثؓ سے اپنا نکاح فسخ کرتی ہوں، مغیثؓ کو اس پر بے حد پریشانی ہوئی۔ روایات میں آتا ہے کہ مغیثؓ گلیوں میں روتے پھرتے تھے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ خدا کے لیے کوئی میری بریرہؓ سے سفارش کرے۔ حتی کہ جناب نبی کریمؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ بریرہؓ سے میری سفارش کر دیں۔ حضورؐ نے بریرہؓ کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے مغیثؓ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے؟ بریرہؓ نے جواب دیا، ہاں کر لی ہے، اس لیے کہ شریعت مجھے اس کا حق دیتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اگر تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر کے مغیث کے پاس واپس چلی جاؤ تو کیا حرج ہے؟ بریرہؓ نے اس پر حضورؐ سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ حضورؐ نے فرمایا، مشورہ ہے۔ بریرہؓ نے جواب دیا، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر یہ مشورہ ہے تو مجھے منظور نہیں ہے۔

سفارش بھی معاشرے میں ضرورت مندوں کے کام آنے والا ایک ذریعہ ہے اور جناب نبی کریمؐ نے اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے، آپ نے اس کی تلقین بھی فرمائی لیکن جائز کاموں میں ''شفاعۃ حسنۃ''۔ کوئی اگر کسی کے جائز کام میں سفارش کرے گا تو ثواب میں شریک ہوگا لیکن اگر کسی ناجائز کام میں سفارش کرے گا تو گناہ میں حصہ دار ہوگا۔

جھگڑنے والوں میں صلح کروانا

معاشرے کی ایک اور بڑی خدمت یہ ہے کہ روٹھے ہوئے لوگوں کو آپس میں ملا دینا۔ جھگڑنے والوں کی آپس میں صلح کرانا بھی ایک سماجی خدمت ہے، قرآن کریم میں ہے ''انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم'' (سورۃ الحجرات ۱۰) کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں، اگر آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کراؤ۔ دو آدمی، دو خاندان، یا دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کروانا بھی معاشرے کا حق ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں بہت سے مواقع پر جھگڑنے والوں کی آپس میں صلح کروائی، اس کی ایک یادگار مثال تو آپ کی نبوت سے پہلے کی ہے جب آپ نے عرب قبائل کے درمیان صلح کروائی۔

عرب قبائل کے درمیان صلح کا یادگار واقعہ روایات میں آتا ہے کہ خانہ کعبہ کا غلاف اور اس کے دروازے کسی عورت کی بے احتیاطی سے جل گئے، چنانچہ عرب قبائل نے خانہ

کعبہ کی پرانی عمارت گرا کر نئی عمارت بنانے کا فیصلہ کیا۔ ابو جہل جو کہ ایک بڑا سردار تھا، اس نے اعلان کیا کہ اللہ کے گھر کی تعمیر کے لیے چندے کی رقم میں چوری، شراب، سود، جوے، بد کاری، اور کسی بھی قسم کی حرام کمائی کے پیسے قبول نہیں کیے جائیں گے، جس نے چندہ دینا ہے صرف حلال کی کمائی میں سے دے۔ یہ جو کعبہ کے باہر حطیم کا نامکمل حصہ ہے، مورخین اس کی وجہ یہی بتاتے ہیں کہ حلال کمائی کے اتنے پیسے جمع ہی نہیں ہو سکے کہ پورے خانہ کعبہ کی تعمیر ہو سکتی۔

چنانچہ بیت اللہ کی تعمیر کا آغاز ہوا اور جب حجر اسود کے نصب کرنے کی باری آئی تو وہ قبائل جھگڑ پڑے ہر قبیلے کا مطالبہ تھا کہ ہمارے قبیلے کا سردار حجر اسود کو نصب کرے گا، شام تک یہ لوگ اس بات پر آپس میں جھگڑتے رہے۔ شام کو ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ جھگڑا یہیں رہنے دو صبح کے وقت جو آدمی سب سے پہلے بیت اللہ میں آئے گا وہ ہمارا حکم ہو گا اسی سے ہم اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروائیں گے۔ صبح انہوں نے دیکھا کہ نبی کریمؐ سب سے پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے سارے خوش ہو گئے کہ ''الصادق الامین'' آ گیا۔ آپؐ پر سب کا اعتماد تو پہلے سے تھا، انہوں نے حضورؐ سے کہا کہ آپؐ ہمارے اس جھگڑے کا فیصلہ کریں، آپؐ نے فرمایا کہ ایک چادر لے کر آؤ، چادر لائی گئی، آپؐ نے حجر اسود کو اٹھا کر اس چادر میں رکھا، پھر فرمایا کہ تمام قبیلے کے سردار آ کر یہ چادر پکڑیں اور اسے اٹھا کر اس جگہ کے قریب لے جائیں جہاں حجر اسود نے نصب ہونا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد حضورؐ نے چادر سے حجر اسود اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔ آپؐ نے صلح کے عمل کے بارے میں فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالی اس عمل کی برکت سے گناہ معاف فرما دیں گے۔

ایک دفعہ حضورؐ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور حضرت حسنؓ جو اس وقت چند سال کے چھوٹے بچے تھے سامنے کھیل رہے تھے، کھیلتے کھیلتے کسی وجہ سے گر گئے۔ حضورؐ نے دیکھا تو آپؐ سے رہا نہ گیا آپؐ منبر سے اترے، جا کر حسنؓ کے کپڑے جھاڑے گود میں اٹھایا اور انہیں ساتھ لے کر منبر پر کھڑے ہو گئے اور اسی طرح خطبہ ارشاد فرمانا شروع کر دیا۔ فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے، پھر فرمایا ''و سیصلح اللہ بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین'' کہ اللہ تعالی میرے اس بیٹے کی وجہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروائے گا۔ یہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کی مصالحت کی طرف اشارہ تھا اور پیشگوئی تھی جو پوری

ہوئی اور حضرت حسنؓ کی دست برداری کی وجہ سے پوری امت حضرت معاویہؓ کی خلافت پر متفق ہو کر ایک بار پھر متحد ہو گئی۔ جھگڑے کو نمٹانا اور صلح کرانا یہ بھی سماج کی خدمت ہے اور معاشرے کا حق ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جب ایک مسلمان ملے تو سلام کرو، کوئی دوسرا اسلام کرے تو اس کا جواب دو، کوئی دعوت کرے تو قبول کرو، ہر مسلمان کی خیر خواہی کرو، خیر کی بات اور خیر کا عمل کرو، کوئی بیمار ہو تو عیادت کرو، کوئی چھینک مار کر ''الحمدللہ'' کہے تو ''یرحمک اللہ'' کہو، کوئی مسلمان بھائی فوت ہو جائے تو جنازے میں شریک ہو، یہ سب آپس کے حقوق ہیں۔

آج کی گفتگو کا عنوان تھا کہ سماجی خدمت بھی معاشرے کا حق ہے یعنی ضرورت مندوں کے کام آنا، لوگوں کی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹانا، بیواؤں یتیموں مسکینوں کی کفالت کرنا اور نادار لوگوں کی مدد کرنا، یہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے اجر و ثواب کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

خواتین کی معاشرتی حیثیت اور سیرت نبویؐ

(جامعہ الہدیٰ، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۵ء)

آج دنیا میں خواتین کی معاشرتی حیثیت کے حوالے سے بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔ خواتین کا معاشرتی مقام کیا ہے، ان کے حقوق و فرائض کیا ہیں، انفرادی و اجتماعی معاملات میں ان کی رائے کی کیا حیثیت ہے اور مردوں کے ساتھ ان کی مساوات کا درجہ کیا ہے۔ آج پوری دنیا میں یہ موضوع زیر بحث ہے، اس پر مقالات لکھے جا رہے ہیں، کتابیں چھپ رہی ہیں اور خواتین کی کانفرنسز منعقد ہو رہی ہیں جن کا موضوع گفتگو یہ ہے کہ مختلف معاشروں میں خواتین کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی ہیں اور انہیں اپنے معاشروں میں وہ حیثیت نہیں دی جا رہی جس کی وہ مستحق ہیں۔ اس موضوع پر ہونے والی گفتگو میں بالخصوص اسلام کے احکام و قوانین پر سب سے زیادہ تنقید کی جا رہی ہے کہ اسلام نے عورت کو وہ مقام نہیں دیا جو اسے ملنا چاہیے۔

انسانی زندگی ایک مشین کی مانند ہے جبکہ مرد و عورت اس کے دو کلیدی پرزے ہیں۔ دنیا میں اصول یہ ہے کہ جو کمپنی ایک مشینری بناتی ہے وہ اس کے استعمال کے لیے ہدایات

بھی دیتی ہے اس لیے کہ جس کمپنی نے مشینری بنائی ہے وہی اس کی قوت اور کارکردگی کو زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ پھر جن لوگوں تک وہ مشینری پہنچتی ہے وہ ان ہدایات کی پیروی کرتے ہوئے اسے استعمال میں لاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالی انسانی زندگی کی اس مشینری کا خالق ہے اور وہی اس کی کارکردگی اور نظم و ضبط کو سمجھتا ہے، اس مشینری کی خوبیاں، اس کی کمزوریاں اور اس کی دیکھ بھال کے تقاضے وہی جانتا ہے۔ چنانچہ ہمارا اس بات پر بھی ایمان ہے کہ انسانی زندگی کو چلانے کے جو قواعد و ضوابط اللہ تعالی نے آسمانی وحی کے ذریعے طے فرما دیے ہیں وہی فطری اور صحیح ہیں۔

دور جاہلیت میں خواتین کی معاشرتی حیثیت

جناب نبی کریمؐ نے معاشرے میں خواتین کو کیا مقام دیا اور حضورؐ کی سیرت طیبہ سے معاشرے میں خواتین کی حیثیت میں کیا فرق آیا؟ اس کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ آنحضرتؐ جب اللہ تعالی کے نبی کے طور پر مبعوث ہوئے تو اس وقت معاشرے میں خواتین کی کیا حالت تھی۔ دور جاہلیت کے معاشرے میں عورت کی حالت یہ تھی کہ اس کی پیدائش پر شرمندگی محسوس کی جاتی تھی اور صدمے کا اظہار کیا جاتا تھا۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں ”واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسودا وھو کظیم۔ یتواری من القوم من سوء ما بشر بہ ایمسکہ علی ھون ام یدسہ فی التراب الا ساء ما یحکمون“ (سورۃ النحل: ۵۸۔۵۹) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری دی جائے، اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غمگین ہو جاتا ہے (۵۸) اس خوشخبری کی برائی کے باعث لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، کہ آیا اسے ذلت کے ساتھ قبول کر کے رہنے دے یا اس کو مٹی میں دفن کر دے، دیکھو کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں (۵۹)۔

عرب معاشرے کی عام صورتحال یہ تھی کہ جب کسی کو یہ خبر دی جاتی تھی کہ تمہارے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کا چہرہ شرم کے مارے سیاہ ہو جاتا تھا، وہ اس کیفیت میں آجاتا تھا کہ کس طرح اپنے غصے اور بے عزتی کو چھپاؤں، اس خبر کی شرمندگی سے بچنے کے لیے وہ اپنا منہ چھپاتا پھرتا تھا اور پھر اس سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ اس لڑکی کو ذلت کے ساتھ ساری زندگی برداشت کروں یا اسے ابھی سے دفن کر دوں۔ اس وقت کی عورت کی معاشرتی حیثیت یہ تھی کہ اکثر و بیشتر لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں کہ ان کا گھر میں رہنا گھر کے سربراہ کے لیے باعث عار اور ذلت کی بات سمجھا جاتا تھا۔

احادیث میں ایسے بہت سے واقعات آتے ہیں کہ لوگوں نے دور جاہلیت میں اپنی بچیوں کو زندہ دفن کرنے کا جناب نبی کریمؐ کے سامنے اعتراف کیا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ ہم دور جاہلیت میں فی الواقع عورت کو حقیر جانتے تھے کہ یہ ایک استعمال اور غلامی کی چیز ہے اور یہ کہ اس کا معاشرے میں کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ ہمیں تو رسول اللہؐ نے بتایا کہ مرد کی طرح عورت بھی معاشرے کا ایک قابل احترام فرد ہے، رسول اللہؐ کی تعلیمات سے ہمیں پتہ چلا کہ ایک عورت بھی انسان کی حیثیت سے اسی طرح حقوق رکھتی ہے جس طرح ایک مرد حقوق رکھتا ہے۔

مرد و عورت کے رشتے اور اسوۂ نبویؐ

عورت اور مرد کے چار بنیادی رشتے ہیں۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا رشتہ۔

حضورؐ کا ماں کے ساتھ رشتہ

رسول اللہؐ کی حقیقی والدہ تو آپ کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں لیکن حضورؐ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ مسلمان اور صحابیہ ہوئی ہیں، ان کے خاوند حضرت ابو کبشہؓ حضورؐ کے رضاعی باپ تھے، وہ بھی مسلمان اور صحابیؓ ہوئے ہیں۔ جب نبی کریمؐ کی والدہ آپ سے ملنے کے لیے آئیں تو آپؐ نے ان کے لیے اپنی چادر زمین پر بچھائی، اس پر اماں جان کو بٹھایا اور خود ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ حضور اکرمؐ نے اپنے طرز عمل سے بتایا کہ عورت کا جو بھی رشتہ ہو، اس کے ساتھ اس کے مطابق رویہ رکھا جائے۔ بیٹی لاڈ اور شفقت کی مستحق ہے، بہن محبت و عزت کی مستحق ہے، بیوی پیار و حسن سلوک کی مستحق ہے اور ماں خدمت و احترام کی مستحق ہے۔

حضورؐ کا بہن کے ساتھ رشتہ

جناب نبی کریمؐ کا نہ تو کوئی بھائی تھا اور نہ کوئی بہن۔ محدثین بیان فرماتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں گرفتار ہونے والوں کو پہلے تو قیدی بنایا لیکن جب بنو ہوازن کے وفد کے آنے پر حضورؐ نے سب کو رہا کر دیا۔ ان رہا ہونے والے قیدیوں میں سے ایک خاتون نبی کریمؐ کے پاس آئیں اور کہا کہ میں آپ کی بہن ہوں، رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم میری بہن کیسے ہو، میری تو کوئی بہن نہیں ہے۔ خاتون کہنے لگی کہ جناب میں نے اور آپ نے حلیمہ سعدیہؓ کا دودھ پیا ہے، آپ کو شاید یاد نہیں ہے کہ آپؐ اور میں بچپن میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ پھر

خاتون نے حضورؐ کو یاد دلانے کے لیے بتایا کہ ایک دفعہ آپؐ نے میری کمر پر دانت گاڑ دیے تھے جس کا نشان ابھی بھی موجود ہے، کیا میں آپ کو زخم کا وہ نشان دکھا دوں؟ رسول اللہؐ نے فرمایا، ہاں تم میری بہن ہو۔ حضورؐ نے فرمایا ہے ”یحرم من الرضاع مایحرم من النسب“ کہ دودھ کا رشتہ بھی ایسے ہی ہے جیسے نسب کا رشتہ ہے۔

جو چیزیں نسب سے حلال یا حرام ہوتی ہیں، وہی چیزیں رضاعت سے بھی حلال یا حرام ہو جاتی ہیں۔ جب یہ بات طے ہوگئی کہ وہ خاتون رسول اللہؐ کی رضاعی بہن ہے تو حضورؐ نے خاتون سے فرمایا کہ اگر تم اپنے بھائی کے ساتھ جانا چاہو تو میرے ساتھ مدینہ منورہ چلو، تمہارا بھائی تمہاری کفالت کرے گا، لیکن اگر تم واپس جانا چاہو تو میں تمہیں خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجوں گا۔ خاتون نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اس خاتون کو اپنی بہن ہونے کا اعزاز دیا اور ایک دستہ کے ساتھ تحائف دے کر رخصت کیا کہ میری بہن کو اس کے گھر پہنچا کر آؤ۔

حضورؐ کا بیوی کے ساتھ رشتہ

جناب نبی کریمؐ کی کل ۱۱ جبکہ بیک وقت ۹ بیویاں تھیں۔ علمائے امت اس میں ایک حکمت تو یہ بتاتے ہیں کہ اس وقت عرب قبائل کو سیاسی و معاشرتی طور پر اپنے ساتھ جوڑنے کے لیے ان قبائل کے ساتھ یہ ازدواجی رشتے قائم کرنا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ دوسری حکمت یہ بتاتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے حضورؐ کے گھر میں مختلف عمروں اور مزاجوں کی عورتیں جمع کر کے خواتین کے متعلق احکام و قوانین کی تعلیم کے بارے میں آپؐ کے لیے سہولت پیدا فرما دی۔ ورنہ جناب نبی کریمؐ نے پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کے ساتھ پہلا نکاح کیا تو اس وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس تھی۔ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ پچیس سال تک تنہا آپؐ کی زوجہ محترمہ رہیں اور آپؐ پچاس برس کے تھے جب حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ باقی ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، ام حبیبہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت زینب ام المساکینؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ شامل ہیں۔

آپؐ کا اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ معاملہ کیسا تھا؟ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے سوائے میدان جنگ کے، اپنی ساری زندگی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، نہ کسی بیوی پر، نہ کسی خادم پر اور نہ کسی غلام پر۔ ازواج مطہرات کے ساتھ اپنے طرز عمل کی

شہادت دیتے ہوئے حضورؐ خود فرماتے ہیں ’’خیرکم خیرکم لأھلہ وأنا خیرکم لأھلی‘‘ کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب سے اچھا ہوں۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تقریباً دس سال حضورؐ کی خدمت کی۔ حضرت انسؓ ۱۰ سال کی عمر میں حضورؐ کی خدمت میں آئے اور حضورؐ کے وصال کے وقت ان کی عمر ۲۱ برس تھی۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ذاتی خادم کی حیثیت سے حضورؐ کی خدمت میں تقریباً دس سال گزارے لیکن کبھی رسول اللہؐ کو کسی پر ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔

حضورؐ کا بیٹی کے ساتھ رشتہ

رسول اللہؐ نے اپنی تعلیمات سے بتایا کہ بیٹی شفقت کی مستحق ہے، رسول اللہؐ کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ جب حضورؐ سے ملنے آتی تھیں تو آپؐ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے، یہ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے لیے آپؐ کی شفقت کا اظہار تھا۔ نبی کریمؐ نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے والے عربوں کے اس معاشرے میں اپنی چاروں بیٹیوں کی پرورش کی، ان کے سر پر دست شفقت رکھا اور دنیا کو یہ دکھایا کہ بیٹیوں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا جاتا ہے۔

محدثین فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا کوئی بیٹا جوان نہیں ہوا جبکہ چاروں بیٹیاں جوان ہوئیں اور ان چاروں کی شادیاں ہوئیں۔ حضورؐ کے کسی بیٹے کے جوان نہ ہونے کے بارے میں محدثین یہ حکمت بیان فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بادشاہت اور ولی عہد کے تصور کی نفی کرنا مقصود تھی۔ حضورؐ کا کوئی بیٹا جوان ہوتا تو حضورؐ کے وصال کے بعد لا محالہ ولی عہد کے طور پر چن لیا جاتا اور یوں نسل در نسل بادشاہت کا یہ سلسلہ چل نکلتا۔ آپؐ کی چاروں بیٹیوں کے جوان ہونے اور پھر ان کی شادیاں ہونے کے بارے میں محدثین یہ حکمت بیان فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو یہ تعلیم دینا مقصود تھی کہ بیٹیاں باعث شرمندگی نہیں بلکہ قابل شفقت ہوتی ہیں۔

عورت کا اپنے حق میں آواز اٹھانا

قرآن کریم کی سورۃ المجادلہ اسی بارے میں نازل کی گئی کہ ایک عورت نے نبی کریمؐ کے سامنے آکر اپنے حق میں آواز اٹھائی۔ ’مجادلہ‘ کا لفظی معنی ہے ’جھگڑا‘۔ ایک عورت نے نبی کریمؐ سے آکر اپنے خاوند کے طلاق کے الفاظ کے متعلق بات کی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

'جھگڑے' کے نام سے ہی سورۃ نازل فرمادی، یہ عورت حضرت اوس بن ثابت انصاریؓ کی بیوی خولہ بنت ثعلبہؓ تھیں۔ میاں بیوی میں کوئی جھگڑا ہوا، خاوند نے جاہلیت کے رواج کے مطابق کچھ الفاظ بول دیے کہ تم میرے لیے ماں کی طرح ہو۔ جاہلیت کے دور میں یہ طلاق کے الفاظ ہوا کرتے تھے، اس وقت تک ظہار کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور طریقہ یہ تھا کہ جب تک کسی معاملے میں کوئی نئی وحی نہ آتی تو پرانا رواج چلتا تھا، چنانچہ پرانے رواج کے مطابق اسے طلاق ہوگئی تھی۔ خولہؓ رسول اللہؐ کے پاس آئی کہ یارسول اللہ! میرے خاوند نے مجھ سے یہ بات کہہ دی ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ طلاق ہوگئی ہے۔ خولہؓ نے کہا کہ یارسول اللہؐ! میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا، طلاق تو واقع ہوگئی ہے، اب میں اس بارے میں کیا کرسکتا ہوں؟ خولہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ میں بوڑھی کہاں جاؤں گی؟ حضورؐ نے فرمایا کہ جب تک اس معاملے میں وحی نہیں آتی، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خولہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ! میری اس خاوند سے بہت محبت ہے، میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔ چنانچہ وہ اسی طرح حضورؐ سے جھگڑتی رہی کہ کبھی اپنے بچوں کی بات کرتی ہے اور کبھی اپنے بڑھاپے کی بات کرتی ہے جبکہ حضورؐ یہی بات فرماتے جارہے ہیں کہ اس معاملے میں میرے پاس کوئی حکم ابھی تک نہیں آیا۔ اس پر خولہؓ نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاکر کہا کہ یااللہ! یہاں تو میرا مسئلہ حل نہیں ہورہا، تو ہی میرا مسئلہ حل کر۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اس کی آواز سن لی اور اس جھگڑے کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا "قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا و تشتکی الی اللہ واللہ یسمع تحاورکما ان اللہ سمیع بصیر" (سورۃ المجادلۃ ۱) کہ بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی تھی اور اللہ کی جناب میں شکایت کرتی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا زمانہ تھا، حضرت عمرؓ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بازار میں جارہے تھے، ایک بوڑھی خاتون لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے سامنے آگئی اور آواز دی، عمر! بات سنو۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے۔ بڑھیا کہنے لگی، تم وہی عمر ہو جو بکریاں چرایا کرتے تھے، پھر کہا، اے عمر! اب تم امیر المؤمنین ہوگئے ہو لیکن اپنا وہ وقت یاد رکھنا اور لوگوں کے ساتھ زیادتی نہ کرنا۔ حضرت عمرؓ کے ساتھیوں نے بڑھیا کے اس لہجے اور بات کو محسوس کیا اور کہا کہ اے اللہ کی بندی تم کس سے مخاطب ہو اور کیا کہہ رہی ہو۔ ان کے

سامنے تو وہ حضرت عمرؓ تھے جو چھتیس ہزار شہروں کے فاتح تھے اور جن کا نام سن کر قیصر اپنے تخت پر لرزتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں کو منع کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ خاتون تو وہ ہے جس کی بات اللہ تعالی نے آسمانوں پر سنی اس لیے میں زمین پر اس کی بات کیوں نہ سنوں گا، بخدا یہ اگر شام تک مجھے یہاں کھڑا رکھے، میں یہیں کھڑا رہوں گا۔ یہ خاتون وہی خولہؓ بنت ثعلبہ تھیں جن کے بارے میں سورۃ المجادلہ نازل ہوئی تھی۔

خاوند اور بیوی کے جھگڑے میں حکم مقرر کرنا

رسول اللہؐ کے ازواج مطہرات کے ساتھ گھریلو معاملات میں مختلف کیفیات ہوتی تھیں جبکہ صحابہ کرامؓ کے گھروں میں جھگڑے ہوتے تھے اور پھر ان جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے حکم بھی مقرر ہوتے تھے۔ رسول اللہؐ نے عورتوں کو معاشرے میں اپنے خاوندوں کے ساتھ جائز معاملات میں اختلاف کا حق بھی دیا اور انہیں ان جھگڑوں میں انصاف حاصل کرنے کے لیے حکم مقرر کرنے کا حق بھی دیا۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں رسول اللہؐ نے مرد کو گھر کا سربراہ بتاتے ہوئے مرد اور عورت، دونوں کو گھر کا ذمہ دار بتایا ”الرجل راع فی بیتہ والمرءۃ راعیۃ فی بیت زوجھا“ کہ مرد اپنے گھر کا ذمہ دار ہے اور عورت بھی اپنے خاوند کے گھر کے معاملات کی ذمہ دار ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے جہاں مرد کو گھر کا سربراہ قرار دیا وہاں یہ تلقین بھی فرمائی ”خیرکم خیرکم من اہلہ وانا خیر من اہلی“ کہ تم میں سے بہتر آدمی وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے بہتر ہوں۔

گھریلو زندگی میں کسی تنازع یا جھگڑا کا ہو جانا فطری بات ہے، ایک دفعہ حضورؐ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا کسی معاملے میں کوئی تنازع ہو گیا، دونوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بلایا جائے تاکہ وہ دونوں کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ کریں۔ حضرت عائشہؓ اپنے موقف پر اڑی ہوئی تھیں جبکہ رسول اللہؐ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور درمیان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ حکم مقرر ہوئے جو کہ حضرت عائشہؓ کے والد اور نبی کریمؐ کے دوست تھے۔ حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے، بیٹھے اور پوچھا کہ بتائیں آپ لوگوں کا جھگڑا کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ سے پوچھیں کیا معاملہ ہے، حضرت عائشہؓ نے حضورؐ سے کہا کہ آپ بتائیں کہ جھگڑا کیا ہے، لیکن بات ٹھیک ٹھیک بتائیں۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ غصے میں آ گئے اور حضرت عائشہؓ کو تھپڑ مار دیا، اتنا زوردار کے ان کے منہ سے خون نکل آیا۔ حضرت

ابوبکرؓ نے اپنی بیٹی سے فرمایا کہ یہ جرأت کہ رسول اللہؐ سے سیدھی بات کہنے کا کہہ رہی ہو۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ تو اس خیال میں تھے کہ حضرت عائشہؓ اللہ کے رسول کی طرف سے کسی غلط بات کا گمان کر رہی ہیں جبکہ حضرت عائشہؓ کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے اور اسی تصور کے ساتھ وہ روایتی انداز میں اپنے خاوند کے متعلق بات کر رہی تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے جب یہ دیکھا کہ ان کے والد اس قدر ناراض ہو گئے ہیں تو وہ اٹھیں اور پناہ کے لیے حضورؐ کے پیچھے جا کر چھپ گئیں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ابوبکر! میں نے تو آپ کو جھگڑا نمٹانے کے لیے بلایا تھا، اس بات کے لیے تو آپ کو نہیں بلایا تھا۔

عورت کا رائے کا حق

نبی کریمؐ کے زمانے میں مکہ اور مدینہ کے معاشروں میں کچھ فرق تھا، بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ مکہ میں کیفیت یہ تھی کہ ہم معاملات میں عورتوں سے مشورے نہیں کیا کرتے تھے اور عورتوں پر سختی کا ماحول رکھتے تھے، لیکن ہم جب مدینہ منورہ گئے تو وہاں کا معاشرہ کچھ مختلف تھا۔ انصار کی عورتیں گھر کے معاملات میں آزاد تھیں، وہ معاملات میں مشورہ بھی دیتی تھیں اور خاوند کی کوئی بات غلط ہوتی تو اسے ٹوک بھی دیتیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ کچھ دن گزرے تو انصار کی عورتوں کے دیکھا دیکھی ہماری عورتوں نے بھی جواب دینا شروع کر دیا، ہمیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہو گیا۔ ہم نے جناب نبی کریمؐ سے اس کا تذکرہ کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارا تو کلچر خراب ہو گیا ہے، ہماری عورتیں تو بڑی پابند اور چپ رہنے والی تھیں، اب یہ بھی انصار کی عورتوں کی طرح بولنے لگ گئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "نعم النساء نساء الانصار" کہ انصار کی عورتیں اچھی عورتیں ہیں۔ یعنی نبی کریمؐ نے گھر کی عورتوں کے ساتھ مشورہ کرنے اور ان سے معاملات میں رائے لینے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ جناب نبی کریمؐ نے عورت کو یہ مقام دیا کہ وہ معاملات میں اپنی رائے دے سکتی ہے اور اس کی رائے کی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے۔

نبی کریمؐ نے ایک عورت کی رائے کا کہاں تک احترام کیا؟ اس بات کا اندازہ بریرہؓ کے واقعہ سے کر لیجیے۔ بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھی اور مغیثؓ کے نکاح میں تھی، ہوا یوں کہ حضرت عائشہؓ نے بریرہؓ کو آزاد کر دیا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایک لونڈی کو آزاد ہونے کے بعد یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے نکاح میں رہے یا نہ رہے، اسے خیار عتق کہتے ہیں۔ بریرہؓ نے آزادی کے بعد اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مغیثؓ سے اپنا نکاح توڑ دیا۔

مغیثؓ کو بریرہؓ سے بے حد محبت تھی، اس نکاح کے ختم ہونے سے مغیثؓ کو بہت صدمہ ہوا، روایات میں آتا ہے کہ مغیثؓ مدینہ کی گلیوں میں روتا پھرتا تھا کہ کوئی ہے جو بریرہؓ سے میری سفارش کرے۔ بالآخر جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ ہی بریرہؓ سے میری سفارش کر دیں، میرا تو گھر اجڑ گیا ہے۔

رسول اللہؐ نے بریرہؓ کو بلوایا اور پوچھا، بریرہ! تم نے مغیث کو چھوڑ دیا ہے۔ بریرہؓ نے جواب دیا، جی یارسول اللہ، چھوڑ دیا ہے۔ آپؐ نے پوچھا، کیوں چھوڑ دیا ہے؟ بریرہ نے جواب دیا، یارسول اللہ، یہ میرا شرعی حق ہے، آپؐ ہی نے تو یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ مجھے آزادی کے بعد یہ حق حاصل ہے کہ میں اپنے خاوند کی بیوی رہوں یا نہ رہوں۔ پھر حضورؐ نے مغیثؓ کی سفارش کرتے ہوئے بریرہؓ سے کہا کہ اگر تم اپنے فیصلہ سے رجوع کر لو اور مغیثؓ کے نکاح میں واپس چلی جاؤ تو اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس پر بریرہؓ نے ایک سوال کیا کہ یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم یا ہے مشورہ؟ سوال کا مقصد یہ تھا کہ اگر حضورؐ کا حکم ہے، پھر تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اگر مشورہ ہے تو پھر میرے پاس سوچنے کا موقع ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ میرا حکم نہیں ہے بلکہ مشورہ ہے۔ بریرہؓ نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی رسول اللہؐ کے ہاں اپنے حقوق کے معاملے میں عورت کی رائے کو یہ درجہ حاصل تھا کہ حضورؐ کی اپنی سفارش ایک آزاد کردہ لونڈی نے قبول نہیں کی۔ حضورؐ نے بریرہؓ کا یہ حق تسلیم کیا اور کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ بریرہ تم نے میری سفارش رد کر دی تھی۔

خلفائے راشدینؓ تو عورتوں کے معاملات میں مشورہ ہی عورتوں سے کیا کرتے تھے، عورتیں اجتماعی معاملات میں ایک دائرے کے اندر رہ کر اپنی رائے دیتی تھیں۔ تاریخ میں حضرت عمر فاروقؓ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کو شہر کی گلیوں میں گشت کرتے ہوئے ایک گھر کے سامنے سے گزرے تو اندر سے ایک عورت کے اشعار پڑھنے کی آواز آئی، وہ عورت اپنے خاوند کی فرقت میں اشعار پڑھ رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پتہ کروایا کہ آخر قصہ کیا ہے، حضرت عمرؓ کو بتایا گیا کہ یہ ایک جوان خاتون ہے جس کا خاوند بڑے عرصے سے جہاد کے لیے میدان جنگ میں ہے۔ حضرت عمرؓ کو تشویش لاحق ہوگئی کہ یہ کیا معاملہ ہوا، آخر اس عورت کی جوانی کے بھی کچھ تقاضے ہیں، اگلی صبح اپنی دختر حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور بتایا کہ رات کو یہ واقعہ ہوا ہے اور میں بہت فکر مند ہو گیا ہوں کہ بحیثیت امیر

میں کتنے لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہوں۔ پھر کہا کہ عورتوں سے مشورہ کر کے بتاؤ کہ ایک عورت اپنے خاوند سے زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ جدا رہ سکتی ہے، چنانچہ حضرت حفصہؓ نے مشورہ کر کے رائے دی کہ چار مہینے کے بعد مجاہد کو واپس گھر بھیجا جائے۔

ایک عورت کا جنگی مجرم کو پناہ دینا

فتح مکہ سے پہلے قریش کے ساتھ جنگوں کا زمانہ تھا، ان جنگوں کے نتیجے میں قیدیوں کا پکڑا جانا معمول کی بات تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے جنگ کا ایک اصول یہ تھا کہ حالت جنگ میں جس طرح لشکر کا امیر کسی کافر کو پناہ دے سکتا ہے، اسی طرح ایک عام سپاہی یا ایک عام شہری بھی کسی کافر کو پناہ دے سکتا ہے۔ اگر کسی کافر کو اس طرح پناہ مل جاتی تو پھر اسلامی لشکر کے لیے اسے قتل کرنا ممنوع ہو جاتا تھا۔ ام ہانیؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بہن تھیں، ایسے ہی کسی جنگ کے دوران ان کا ایک مشرک رشتہ دار تھا جسے مباح الدم قرار دے دیا گیا تھا، ام ہانیؓ نے اسے پناہ دے دی۔ پھر وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنے ایک رشتہ دار کو پناہ دی ہے لیکن میرے بھائی حضرت علیؓ اسے مارنا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نے ام ہانیؓ کی پناہ کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا ''قد اَجرنا من اَجرت'' کہ جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے پناہ دی۔

اسی طرح کا ایک اور دلچسپ واقعہ محدثین نقل فرماتے ہیں، حضورؐ کے دامادوں میں ترتیب سے، سب سے بڑے داماد ابوالعاصؓ بن ربیع تھے، دوسرے نمبر پر حضرت عثمانؓ بن عفان تھے اور تیسرے نمبر پر حضرت علیؓ بن ابی طالب تھے۔ حضورؐ کی بڑی بیٹی حضرت زینبؓ حضرت ابوالعاصؓ کے نکاح میں تھیں، جنگ بدر میں ابوالعاص کافروں کے لشکر میں تھے اور ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے جبکہ ان دونوں کا نکاح قائم تھا کہ نکاح کے احکامات ابھی نازل نہیں ہوئے تھے، یہ حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا کہ کافر مرد اور مسلمان عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ ابوالعاصؓ بدر کی جنگ میں مسلمان لشکر کے ہاتھوں قید ہو گئے، حضرت زینبؓ کو پتہ چلا کہ ابوالعاصؓ بدر کی جنگ میں گرفتار ہو کر حضورؐ کی قید میں ہیں اور یہ کہ فدیہ کے عوض قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ ہوا ہے۔ ابوالعاصؓ کے پاس فدیہ کے لیے دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار اتار کر ابوالعاصؓ کو بھیجا کہ یہ ہار فدیہ میں دے کر رہائی حاصل کرو۔ بدر کے میدان میں وہ ہار حضرت ابوالعاصؓ کے پاس پہنچا اور انہوں نے وہ ہار حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا کہ میری رہائی کے لیے

اسے فدیہ میں قبول فرمائیں۔ یہ وہ ہار تھا جو حضرت خدیجہؓ نے اپنی بیٹی زینبؓ کے نکاح کے موقع پر انہیں تحفہ میں دیا تھا۔ جب یہ ہار دیکھا تو نبی کریمؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، حضورؐ کو حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اپنی پچیس سالہ رفاقت کا وہ وقت یاد آ گیا۔ حضورؐ نے ساتھیوں سے کہا کہ اگر تم کہو تو یہ ہار میں اسے واپس کر دوں، کہ یہ میری بیٹی کے پاس میری زوجہ حضرت خدیجہؓ کی نشانی ہے۔ چنانچہ صحابہؓ نے متفقہ طور پر وہ ہار واپس کر دیا اور ابوالعاصؓ کو بھی چھوڑ دیا۔

ابوالعاصؓ اس کے بعد کافی دیر مکہ میں کفر کی حالت میں رہے، ایک موقع پر مسلمانوں کے ساتھ کسی جھڑپ میں وہ ایک بار پھر پکڑے گئے، صحابہؓ انہیں ساتھ لے کر مدینہ منورہ آ گئے۔ طریقہ یہ تھا کہ جو بھی قیدی پکڑا جاتا اسے لا کر مسجد نبوی میں ستون سے باندھ دیا جاتا تھا، رسول اللہؐ صبح نماز کے بعد مسجد میں کوئی قیدی دیکھتے تو لوگوں سے مشورہ کر کے اس کی قسمت کا فیصلہ سناتے۔ رات کو ابوالعاصؓ کو مسجد نبویؐ میں ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا، حضرت زینبؓ کو بھی پتہ چل گیا کہ ابوالعاصؓ پکڑے گئے ہیں اور انہیں مسجد نبوی میں ستون کے ساتھ باندھا گیا ہے اور یہ کہ صبح نماز کے بعد ان کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ حضرت زینبؓ نے چپکے سے چادر اوڑھی اور مسجد نبویؐ کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ حضورؐ فجر کی نماز پڑھا کر جیسے ہی نمازیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے تو حضرت زینبؓ نے آواز لگا دی کہ یا رسول اللہ! اس قیدی کو میں نے پناہ دے دی۔ حضورؐ نے یہاں بھی یہ ارشاد فرمایا ”قد أجرنا من أجرت“ کہ جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے پناہ دی۔ چنانچہ ابوالعاصؓ کو چھوڑ دیا گیا، پھر بعد میں ابوالعاصؓ بعد میں مسلمان ہو گئے، رسول اللہؐ کے صحابی بنے اور مجاہد بن کر انہوں نے بہت سی جنگوں میں حصہ لیا۔

عورت اور تعلیم و تعلم

اسلام کی پہلی صدی میں تعلیم و تعلم کے حوالے سے عورتوں کی کیا خدمات تھیں؟ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک چھوٹی سی بچی سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ آنحضرتؐ سے نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کم عمر تھیں، لیکن حضرت عائشہؓ کی زندگی اور جدوجہد کو دیکھیں تو اس نکاح کا مقصد آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتا ہے اور پھر عرب معاشرے کے رواج کے مطابق ایسے نکاح میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔ تھوڑا غور فرمائیے کہ دین کا وہ حصہ جو گھر کی زندگی سے متعلق

ہے، اس کی تعلیم کے لیے بھی ایک شاگرد کی ضرورت تھی، ایسا شاگرد جو ذہین ہو اور حضورؐ کے گھر کی زندگی کو سمجھ کر آگے روایت کر سکتا ہو۔ شاگرد کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ لائق ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ شاگردی کی عمر کا بھی ہو۔ حضرت عائشہؓ کی عمر شاگردی کے لیے بہترین تھی، پھر گھر کی زندگی کے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کی تعلیم کے لیے میاں بیوی کے درجے کی بے تکلفی کا ماحول چاہیے۔ تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ حضورؐ کا یہ نکاح بعد میں آنے والے دور میں دین اسلام کی اشاعت و تعلیم میں کس قدر مفید ثابت ہوا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ ذمہ داری کامیابی کے ساتھ نبھائی، انہوں نے اسلامی علوم میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ وہ اپنے وقت کے مجتہد صحابہؓ میں شمار ہوتی تھیں اور اپنے والد محترم حضرت صدیق اکبرؓ اور بعد کے خلفائے راشدین کے زمانے میں فتویٰ دیا کرتی تھیں۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں حضرت عائشہؓ کے براہ راست شاگردوں کی تعداد تقریباً ۲۰۰ سے زائد ہے۔

حضرت عائشہؓ کے بارے میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو خود بڑے جلیل القدر فقیہ صحابی ہیں، فرماتے ہیں ”ما اشکل علینا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم قط الا وجدنا فیہ عندھا علما“ کہ کبھی کوئی ایسا مسئلہ ہم اصحاب محمدؐ پر نہیں آیا کہ جس کا حل حضرت عائشہؓ کے پاس نہ ملا ہو۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ جو تابعین میں بڑے محدث اور فقیہ ہوئے ہیں، حضرت عائشہؓ کے سب سے بڑے شاگرد تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں حدیث، فقہ، قرآن کریم کی تفسیر، اسرار دین، طب و وراثت کے احکام، ادب اور شعر، ان شعبوں میں حضرت عائشہؓ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ رسول اللہؐ کے وصال کے بعد تقریباً نصف صدی تک آپؓ حیات رہیں۔ حضرت عائشہؓ کا ۵۸ھ میں انتقال ہوا اور ان کی وفات تک ان کی مسند افتاء مدینہ منورہ میں قائم رہی۔

حضرت عائشہؓ کا طریقہ تعلیم یہ تھا کہ اپنے حجرے کے اندر دروازے سے کچھ فاصلے پر پردہ لٹکا کر بیٹھ جاتی تھیں، پردے اور دروازے کے درمیان اتنی جگہ ہوتی تھی کہ آنے والے بیٹھ کر بات وغیرہ کر سکیں۔ صحابہ کرامؓ کو معلوم ہوتا تھا کہ ام المؤمنین اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر، حجرے کا دروازہ کھول کر اپنی مسند پر بیٹھ جاتی ہیں۔ لوگ آکر سلام عرض کرتے تھے کہ اور تعارف کراتے تھے کہ ام المؤمنین میں فلاں آدمی ہوں اور یہ مسئلہ عرض کرنا چاہتا ہوں، حضرت عائشہؓ اندر آنے کی اجازت دیتیں اور بات سن کر مسئلہ بیان فرما دیتی

تھیں۔ لوگ اپنے جھگڑے لے کر بھی آتے تھے اور ام المؤمنین سے فیصلہ کرواتے تھے۔ ایک طرف یہ بات ہے کہ صحابہ کرامؓ فتوی لینے میں، مسئلہ پوچھنے میں اور راہنمائی لینے میں حضرت عائشہؓ سے رجوع کر رہے ہیں اور اس کے لیے مستقل ایک دربار لگا ہوا ہے جبکہ دوسری طرف یہ بات کہ حضرت عائشہ کی طرف سے پردے کا اہتمام کسی طور بھی تعلیم و تعلم میں رکاوٹ نہیں بن رہا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب تک میرے حجرے میں رسول اللہؐ کی قبر مبارک تھی، میں گھر میں ننگے سر گھومتی پھرتی تھی کہ یہ میرے خاوند کی قبر تھی۔ رسول اللہؐ کے وصال کے اڑھائی سال بعد حضرت صدیق اکبرؓ کی قبر اسی حجرے میں بنی، فرماتی ہیں کہ میں پھر بھی تسلی سے ننگے سر گھومتی پھرتی تھی کہ ایک قبر خاوند کی ہے جبکہ دوسری والد کی ہے۔ والد کے سامنے سر کا ننگا ہونا، بالوں کا ننگا ہونا جائز ہے۔ لیکن فرماتی ہیں کہ جب حضرت عمر فاروقؓ میرے حجرے میں دفن ہوئے تو اس کے بعد میں زندگی بھر اپنے کمرے میں ننگے سر نہیں رہی، اس جھجھک سے کہ یہ ایک غیر محرم کی قبر ہے۔ اس سب کے باوجود حضرت عائشہؓ نے اپنے حجرے میں مسند تدریس قائم رکھی۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ پردہ رکاوٹ ہے، میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ نے اس زمانے کی روز مرہ زندگی کی سختیوں کے باوجود پردے کا اہتمام کرتے ہوئے نصف صدی تک درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھا۔ آپؓ اتنی بڑی مقتیہ تھیں کہ اکابر صحابہؓ اپنے مسئلوں کے لیے آپؓ سے رجوع کرتے تھے اور بڑے بڑے علماء راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ پردہ بھی قائم رہا اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

جناب نبی کریمؐ کی ازواج مطہرات اور صحابیات میں دوسرے نمبر پر حضرت ام سلمہؓ کا ذکر آتا ہے کہ وہ بھی اپنے وقت کی مقتیہ تھیں، فتاوی کی کتابوں میں ان کے فتوؤں کا مجموعہ بھی ملتا ہے۔ حضرت حفصہؓ بھی مسئلہ بیان کیا کرتی تھیں اور فتوی دیا کرتی تھیں۔ آپؓ کی صحابیات میں شفاء بنت عبد اللہؓ کا ذکر آتا ہے، حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں بہت سے معاملات ان کے سپرد کر رکھے تھے۔

یہ وہ نقشہ ہے جو حضورؐ اور حضرات صحابہؓ کرام کے دور میں تھا کہ عورت مجتہد بھی ہے، عورت مقتیہ بھی ہے، عورت محدثہ بھی ہے، عورت معلمہ بھی ہے اور اجتماعی معاملات میں عورت کی رائے تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلے بھی ہو رہے ہیں۔

مرد و عورت کے درمیان حقوق و فرائض کا توازن

آج عورت کو فطرت کے حوالے سے معاشرے میں جو مقام حاصل ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہے۔ عورت کے ساتھ جو ناانصافیاں ہو رہی ہیں، اس کی جو حق تلفی ہو رہی ہے، معاشرے میں اس کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں، اس کے سدباب کے لیے قابل ذکر اقدامات نہیں ہو رہے۔ لیکن عورت کی معاشرتی حیثیت کے حوالے سے یہ بات پیش نظر رکھنا اور اس کی طرف عورتوں کی توجہ مبذول کرانا بہت ضروری ہے کہ ایک عورت کے معاشرتی حقوق دراصل ہیں کونسے؟

آج لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ اسلام عورت کو وہ کچھ نہیں دے رہا جو مغرب دے رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورتوں کے حقوق کے حوالے سے مغرب ہمارا معیار ہے؟ وہ مغرب جس نے فرائض کو حقوق کا نام دے کر عورتوں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں اور ترقی پذیر ممالک کو عورت کی آزادی کے نام پر اس بات پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ ہم ویسٹرن سولائزیشن کو قبول کریں۔ دوسروں کو آزادیٔ رائے کا درس دینے والوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگ مغربی طرز زندگی کے علاوہ کسی اور طرز زندگی پر عمل پیرا رہیں۔

گوربا چوف کا تجزیہ

مغربی دانشور خود بھی مغربی ثقافت کے نتائج سے پریشان ہیں، روس کے سابق وزیراعظم گوربا چوف نے اپنی کتاب ’پرسٹرائیکا‘ میں لکھا ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں لاکھوں افراد قتل ہوئے جس کی وجہ سے ہمارے پاس کارخانوں اور دفتروں میں افرادی قوت کی کمی ہوگئی۔ اس افرادی قوت کی کمی کو دور کرنے کا طریقہ ہم نے یہ سوچا کہ کسی طرح بہلا پھسلا کر عورت کو دفتروں اور کارخانوں میں لایا جائے۔ ہم عورت کو مردوں کے برابر حقوق کا، مساوات کا اور معاش کا لالچ دے کر کارخانوں اور دفتروں میں لے آئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہمارے کارخانوں اور دفتروں کا نظام تو چل گیا لیکن ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہوگیا۔ گوربا چوف نے کہا کہ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو اس کے اصل مقام، یعنی گھریلو زندگی میں کیسے واپس لے جائیں۔

ہیلری کلنٹن کا تجزیہ

امریکہ کی سابق خاتون اول ہیلری کلنٹن نے ایک مرتبہ دورۂ پاکستان کے دوران مختلف سکولز اور کالجز کا دورہ کیا۔ اسلام آباد کے ایک سکول میں ہیلری کلنٹن نے طالبات سے پوچھا کہ تمہارا یہاں کا مسئلہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہاں جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل اور حصول تعلیم کے جدید ذرائع کا فقدان ہے۔ وہیں ایک طالبہ نے ہیلری کلنٹن سے پوچھ لیا کہ آپ کے وہاں امریکہ کا مسئلہ کیا ہے؟ ہیلری کلنٹن نے کہا کہ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان لڑکیاں بن بیاہی مائیں بن جاتی ہیں، جس کے بعد وہ زندگی کی بہت سی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہ بات تو ہیلری کلنٹن نے کہی، لیکن اگر کسی لڑکی کا بچہ نہ بھی ہو تو وہ جوانی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان گنت لوگوں کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہوتی ہے جس میں بے احتیاطی کے نتیجے میں کئی لڑکیوں کو ابارشن کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک موقع پر ہیلری کلنٹن نے کہا کہ مجھے مشرق کا خاندانی نظام دیکھ کر رشک آتا ہے کہ یہاں کی نوجوان لڑکی اپنے ماموں، چاچا، پھوپھی اور خالہ کے حصار میں ہوتی ہے۔

جان میجر کی مہم

سابق برطانوی وزیراعظم جان میجر نے 'بیک ٹو دی بیسکس' کے نام سے ایک مہم چلائی کہ ہمیں "بنیادوں کی طرف واپس" جانا چاہیے اور اپنے خاندانی نظام کو اس پرانی ڈگر پر لے جانا چاہیے جو عورت کو معاشرے میں اس کے اصل مقام پر لے جائے۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل برطانوی اخبارات میں یہ خبر تھی کہ حکومت برطانیہ نے ایسی عورتوں کو اضافی سہولیات دینے کا وعدہ کیا ہے جو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھروں میں رہیں۔

اسلام کا خاندانی نظام

اسلام نے مرد و عورت کا فطری توازن قائم کرتے ہوئے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک بات یہ کہی ہے کہ عورت کو رائے دینے کا حق ضرور حاصل ہے لیکن گھر کے نظام کا سربراہ مرد ہے اس لیے کہ کنٹرول ایک ہاتھ میں ہو تو نظام صحیح چلتا ہے اور اگر اختیارات دو ہاتھوں میں برابر تقسیم کر دیے جائیں تو سسٹم تباہ ہو جاتا ہے جیسا کہ کائنات کے نظام کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے "لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا" (سورۃ الانبیاء ۲۲) کہ زمین و آسمان میں اللہ

تعالی کے سوا بھی کوئی معبود ہوتا تو دونوں درہم برہم ہو جاتے، سو اللہ تعالی ان امور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کر رہے ہیں۔

یعنی نظم کا تقاضا یہ ہے کہ سربراہی کسی ایک کی ہو۔ دوسری بات یہ کہی کہ عورت کے جتنے فرائض ہیں، ان سے ہٹ کر ان پر کوئی ذمہ داری نہ ڈالی جائے۔ مجموعی انسانی معاشرے کے حوالے سے اسلامی تعلیمات یہ کہتی ہیں کہ مرد اپنے گھر کے اخراجات کا کفیل ہے جبکہ عورت گھر کے اندرونی نظام کی ذمہ دار ہے۔ ہاں بوقت ضرورت بیوی اپنے خاوند کا ہاتھ بٹا سکتی ہے اور خاوند بھی گھر کے اندرونی معاملات میں بیوی کی مدد کر سکتا ہے۔ اللہ تعالی نے مرد و عورت کے درمیان حقوق و فرائض کی یہ تقسیم ان کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی ہے۔ لیکن مغرب والوں نے عورتوں کو آزادی کے نام پر اس بات پر اکسایا ہے کہ گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹانے کے لیے کمانا ان کے حقوق میں شامل ہے، اس بات کو انہوں نے مرد و عورت کے درمیان مساوات کا نام دیا ہے۔ دفتر میں جا کر کام کرنا، فیکٹری میں مزدوری کرنا، یہ عورت پر اضافی ذمہ داری ہے جنہیں حقوق کا پر فریب نام دے دیا گیا ہے۔ جبکہ عورت کی جو فطری ذمہ داریاں ہیں، یعنی بچہ جننا اور اس کی پرورش کرنا، ان میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اسی طرح اسلام مطلقا شادی برائے جنسی تسکین کا قائل نہیں ہے بلکہ قرآن کہتا ہے "ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین" (سورۃ النساء ۲۴) بشرطیکہ انہیں اپنے مال کے بدلے میں طلب کرو ایسے حال میں کہ نکاح کرنے والے ہو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ یعنی اسلام کہتا ہے کہ اگر کسی عورت کو ہاتھ لگانا ہے تو پہلے مہر اور نان نفقہ کی صورت میں اس کی مالی ذمہ داری قبول کرو، پھر گھر بسانے کی نیت سے نکاح کرو جس کا مقصد صرف شہوت نہ ہو بلکہ خاندان آباد کرنا مقصود ہے۔ یعنی عورت کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کرو، اس کی اور ہونے والے بچوں کی مالی ذمہ داری قبول کرو، اس کے بعد جنسی خواہش کی طرف آؤ۔

پھر قرآن نے کہا کہ ایسی لڑکیوں سے نکاح کرو جو 'محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان" (سورۃ النساء ۲۵) نکاح میں آنے والیاں ہوں، آزاد شہوت رانیاں کرنے والیاں نہ ہوں اور نہ چھپی یاریاں کرنی والیاں ہوں۔

میں اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ عورت اور مرد کے معاشرتی تعلقات کے توازن میں، معاشرے میں عورت کی حیثیت کے بارے میں، گھریلو زندگی میں عورت کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے اور مرد و عورت کے اختیارات و حقوق کی تقسیم میں جو دائرہ کار جناب نبی کریمؐ نے قائم کیا ہے وہی نیچرل ہے وہی فطری ہے اور بالآخر اسی پر واپس آئیں گے تو معاشرے میں ایک توازن قائم ہوگا، اس کے بغیر معاشرے کو اصل اور فطری سکون حاصل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

انسانی حقوق اور سیرت نبویؐ

(جامعہ الہدیٰ، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۵ء)

آج دنیا میں انسانی حقوق کے حوالے سے سب سے زیادہ گفتگو ہو رہی ہے۔ دنیا کی تمام اقوام کے ذرائع ابلاغ میں اصحاب علم و دانش اس موضوع پر سب سے زیادہ گفتگو کر رہے ہیں کہ دنیا میں انسانوں کو کیا حقوق حاصل ہونے چاہئیں، کونسے حقوق انہیں حاصل ہیں اور کن حقوق سے وہ محروم ہیں۔ میں آج کی گفتگو میں تاریخی حقائق کی بنیاد پر یہ بات واضح کرنا چاہوں گا کہ انسانی حقوق کا تصور سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا تھا جس کی عملی شکل جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں ملتی ہے۔ معاشرے میں انسانی حقوق کے احترام اور تحفظ کا جو عملی نمونہ جناب رسول اللہؐ اور حضرات خلفائے راشدینؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، دنیا کا کوئی اور نظام اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اسلام میں حقوق کا تصور

اسلام میں حقوق کا تصور کیا ہے؟ حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک موقع پر اپنے میزبان سے فرمایا ”ان لربک علیک حقا ولنفسک علیک حقا ولأھلک علیک حقا (وفی روایۃ: ولزورک علیک حقا)، فاعط کل ذی حق حقہ“ (بخاری، رقم ۱۹۶۸) کہ تیرے رب کے تجھ پر حق ہیں، تمہارے نفس کا تجھ پر حق ہے، تمہاری بیوی کا تجھ پر حق ہے، آنے جانے والے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

جب حضرت سلمان فارسیؓ کی اس بات کا تذکرہ کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا ”صدق سلمان“ کہ سلمان نے جو کہا، سچ کہا۔ چنانچہ اسلام میں حقوق کا بنیادی تصور حضرت سلمان فارسیؓ کا یہ جملہ ہے ”أعط کل ذی حق حقہ“ کہ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو سرزمین عرب میں اس حوالے سے دو انتہائیں تھیں۔ ایک طرف رہبانیت تھی کہ اللہ کی رضا کے لیے دنیا کے تمام معاملات چھوڑ دیے جائیں، رہبانیت سے مراد یہ ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں اکیلے زندگی بسر کی جائے، یہ حقوق اللہ کا غلبہ تھا کہ صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور دنیاوی معاملات مثلاً بیوی بچوں اور معاشرت وغیرہ کو ضروری نہ سمجھا جائے، نبی کریمؐ نے اپنے متعدّد ارشادات میں واضح طور پر رہبانیت کے تصور کی نفی فرمائی ہے۔ دوسری طرف خدافراموشی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے وجود سے ہی انکار تھا، یا پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اور آسمانی تعلیمات کی نافرمانی اس قدر عروج پر تھی کہ وہ زمانہ اسلامی تعلیمات کی رو سے دور جاہلیت قرار پایا۔

اسلام نے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن قائم کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے ”واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم“ (سورۃ النساء ۳۶) اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غرباء کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضے میں ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا اصول یہ ہے کہ فرائض میں حقوق اللہ مقدم ہیں جبکہ فرائض کے علاوہ نوافل، مستحبات اور مباحات میں حقوق العباد مقدم ہیں۔ اور اگر حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ٹکراؤ کی نوبت آجائے تو بھی بعض صورتوں میں حقوق العباد مقدم ہیں۔

رنگ ونسل، زبان، برادری اور علاقہ کی بنیاد پر امتیاز

آج یہ کہا جاتا ہے کہ رنگ، نسل، برادری، زبان اور علاقہ کی بنیاد پر انسانوں کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف معاشرت رکھنے والے اور مختلف رنگ ونسل کے لوگ یکساں سلوک کے مستحق ہیں اور بحیثیت انسان برابر ہیں۔ اسلام نے یہی بات تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل کہی تھی۔ عرب قبائل کے اس معاشرے میں رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ قریش اور غیر قریش کے لوگ برابر نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اگر قریش کے کسی فرد کے ہاتھوں کسی دوسرے قبیلے کا آدمی قتل ہو جاتا تھا تو قصاص میں قریش کا آدمی قتل نہیں ہوتا تھا، قریش اور غیر قریش کا خون برابر نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن اگر کسی دوسرے قبیلے کے ہاتھوں قریش کا کوئی آدمی قتل ہوجاتا تو قصاص میں دو آدمی قتل کیے جاتے۔ یہ ایسا معاشرہ تھا جہاں عرب والے عجمیوں کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے۔ "عرب" اور "عجم" کے الفاظ ہی اس معاشرے کی کیفیت پر دلالت کرتے ہیں، "عرب" کا معنی ہے بولنے والا جبکہ "عجم" کا معنی ہے گونگا۔ عرب کے لوگ کہتے تھے کہ زبان تو ہم لوگ بولتے ہیں باقی سب گونگے ہیں۔

جناب رسول اللہؐ نے اس فرق کے خاتمے کا اعلان کیا، حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا "ان اللہ عزو جل یقول یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر وانثی و جعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم، فلیس لعربی علی عجمی فضل ولا لعجمی علی عربی فضل ولا لاسود علی ابیض ولا لابیض علی اسود فضل الا بالتقوی" (المعجم الکبیر، ۱۸/۱۲، رقم ۱۶) کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ اے لوگو! میں نے تمہیں ایک ہی مرد اور عورت (آدم و حوا) سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ یہ باہم تمہاری پہچان کا ذریعہ ہو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت کا مستحق وہ ہے جو زیادہ حدود کا پابند ہے۔ اس لیے کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر اور کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ فضیلت کا معیار صرف تقوی ہے۔

رسول اللہؐ نے اس میں ایک تقسیم فرمائی ہے، حضورؐ نے لوگوں کو حقوق میں یکساں قرار دیا ہے لیکن تکریم میں برابر قرار نہیں دیا۔ "الا بالتقوی" میں حضورؐ نے یہی بات فرمائی ہے کہ رنگ ونسل اور ذات پات کے اعتبار سے سب انسانوں کے حقوق برابر ہیں لیکن عزت و

تکریم میں سارے یکساں نہیں ہیں اس لیے کہ عزت و تکریم کا مدار کردار، اعمال اور تقوی پر ہے۔

رسول اللہؐ نے رنگ و نسل کے امتیاز کو صرف زبان سے ہی نہیں ختم کیا بلکہ عمل سے بھی ختم کیا اور مساوات کا ایک جامع اور مکمل نمونہ پیش کیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو دس ہزار صحابہؓ کا لشکر آپ کے ساتھ تھا، ان میں بڑے بڑے اکابر صحابہ موجود تھے، السابقون الاولون بھی تھے، مہاجرین بھی تھے اور انصار بھی۔ لیکن خانہ کعبہ سے بتوں کی صفائی کے بعد آپؐ نے سب سے پہلی اذان کے لیے کس کا انتخاب کیا؟ حضورؐ نے حضرت بلال حبشیؓ سے فرمایا کہ بلال آؤ اور خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اللہ کا نام بلند کرو، آج مسلمانوں کے اس اقتدار کا افتتاح تمہاری اذان سے ہوگا۔ حضرت بلالؓ کعبہ کی چھت پر چڑھے، اللہ اکبر کہا، اذان کے ساتھ کلمہ حق بلند کیا اور مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کے اقتدار اعلی کا اعلان کیا۔ حضورؐ کے حکم سے حضرت بلالؓ کے اس عمل نے مسلمانوں کی تاریخ میں کالے اور گورے کے اس فرق کو ہمیشہ کے لیے پاؤں کے نیچے روند ڈالا، رسول اللہؐ نے اپنے قول و عمل کے ساتھ دنیا کو کالے اور گورے کا امتیاز مٹا کر دکھایا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ کے وصال کے بعد جب حضرت بلالؓ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آیا کرتے تھے تو حضرت عمرؓ ان کا استقبال ان الفاظ سے کیا کرتے تھے "انت اخونا و مولانا" کہ بلالؓ تم ہمارے بھائی بھی ہو اور ہمارے سردار بھی ہو۔ "مولا" کا معنی ہے سردار، آقا، بڑا، بزرگ۔

جان، مال اور آبرو کی حفاظت

انسانی حقوق کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ معاشرے میں جان، مال اور آبرو کا تحفظ انسان کا بنیادی حق ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ان دماء کم وأموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمت یومکم ھذا فی شھرکم ھذا وفی بلدکم ھذا او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم" (بخاری، رقم ۴۰۵۴، ۶۵۵۱) کہ تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں، تم پر (آپس میں) اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن اور اس مہینے میں تمہارے اس شہر کی حرمت ہے۔ بخاری کی ایک اور روایت میں "وابشارکم" کا لفظ بھی ہے کہ تمہارے چمڑے بھی ایک دوسرے پر حرام ہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر ہاتھ نہ اٹھائے۔

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا "ألا، انماھن أربع: أن لاتشرکوا باللہ شیئا، ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق، ولا تزنوا، ولا تسرقوا" (مسند احمد، ۱۸۲۲۰) کہ آگاہ رہو! ان چار باتوں سے بچنا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، خدا کی حرام کردہ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرنا، زنا نہ کرنا اور چوری نہ کرنا۔

نبی کریمؐ نے فرمایا "الالا تظلموا، الالا تظلموا، الالا تظلموا، انہ لایحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ" (مسند احمد، ۱۹۷۷۴) کہ سنو، ظلم نہ کرنا۔ سنو، ظلم نہ کرنا۔ سنو، ظلم نہ کرنا۔ کسی شخص کا مال اس کے دل کی خوشی کے بغیر لینا حلال نہیں ہے۔ ایک شخص نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر مجھے اپنے چچازاد بھائی کی بکریوں کا ریوڑ دکھائی دے اور میں ان میں سے ایک بکری لے کر اس کو ذبح کرلوں تو کیا مجھے اس کا گناہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا، اگر تمہیں کوئی بکری وادی میں اس حال میں ملے کہ اس نے چھری اور (آگ جلانے کے لیے) پتھر بھی اٹھا رکھے ہوں، تب بھی تم اس کو ہاتھ مت لگانا۔ (بیہقی، السنن الکبری، ۱۱۳۰۵)

نبی کریمؐ نے فرمایا "العاریۃ موداۃ" عاریتا لی ہوئی چیز واپس کی جائے "والمنحۃ مردودۃ" دودھ پینے کے لیے جو جانور کسی نے دیا ہوا سے لوٹایا جائے "والدین مقضی" لیا ہوا قرض ادا کیا جائے "والزعیم غارم" اور قرض کا ضامن (قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں) ذمہ دار ہوگا۔ (ترمذی، ۲۰۴۶)

رسول اللہؐ نے ایسی گفتگو کو گناہ عظیم بتایا ہے جس سے کسی کی بے عزتی کا پہلو سامنے آتا ہو۔ جو شخص کسی پر بدکاری کی تہمت لگائے وہ سزا کا مستحق ہے کہ اس نے کسی دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اسی طرح قرآن نے غیبت سے منع فرمایا "ولا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ" (سورۃ الحجرات ۱۲) اور کوئی کسی کی غیبت نہ کیا کرے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، سو تم اس کو ناپسند کرتے ہو۔

ایک صحابیؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! جس شخص کے عیب کا ذکر کیا جائے اگر اس شخص میں وہ عیب ہو کیا تب بھی ذکر کرنا منع ہے؟ صحابیؓ کے ذہن میں شاید یہ تھا کہ کسی کا ایسا عیب ذکر کیا جائے جو اس میں نہ ہو، تب غیبت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اسی کا نام تو غیبت ہے۔ ایک آدمی میں کوئی عیب موجود ہے اور اس عیب کو کسی جگہ خواہ مخواہ مجلس آرائی کے لیے بلا ضرورت ذکر کرنا، اسی کا نام غیبت ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر اس شخص میں وہ عیب

نہیں ہے تب تو یہ بہتان ہو گا۔ جان و مال اور آبرو کا تحفظ اسلام سے زیادہ کس نے کیا ہے؟ اسلام کے احکام سے زیادہ جامع احکام کس کے ہیں کہ کسی کو ناحق قتل کرنا، کسی کی عزت کو مجروح کرنا، کسی کی غیبت کرنا اور کسی پر بہتان لگانا، یہ سب قابل سزا جرم قرار پائے ہیں۔

اپنا حق طلب کرنے کا شعور

ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کی مجلس میں تشریف فرما تھے ایک صحابیؓ نے جسم پر صرف ایک چادر باندھ رکھی تھی اور کرتا نہیں پہن رکھا تھا، رسول اللہؐ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک چھڑی تھی جو گھڑی ہوئی نہیں تھی، باتوں باتوں میں محبت سے حضورؐ نے اس کی کمر پر چھڑی مار دی، ٹہنی اس طرح لگی کہ صحابیؓ کے جسم پر خراش آگئی۔ وہ صحابیؓ کہنے لگے یارسول اللہ! آپ نے مجھے چھڑی ماری ہے میں آپؐ سے اس کا بدلہ لوں گا۔ اس پر جناب نبی کریمؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں حاکم ہوں اور بڑا ہوں تم کس خیال میں ہو؟ رسول اللہؐ نے چھڑی اس کے ہاتھ میں دی اور کمر آگے کر دی۔ اس نے چھڑی پکڑ لی اور کہا کہ یارسول اللہ! بدلہ برابر نہیں ہے میری کمر ننگی تھی جبکہ آپ نے کرتا پہن رکھا ہے پہلے کرتا اتاریئے۔ جناب نبی کریمؐ نے کرتا اتار کر ننگی کمر اس کے سامنے کر دی کہ تمہارا یہ حق ہے کہ تم پورا بدلہ لو۔ صحابیؓ نے حضورؐ کو بانہوں میں جکڑ لیا اور کہا کہ یارسول اللہ! میں تو بدن سے بدن ملانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا میرا ارادہ آپ سے بدلہ لینے کا تو نہیں تھا۔ لیکن جناب نبی کریمؐ نے دنیا کو بتایا کہ اپنے حق کا مطالبہ کرنا بھی انسان کا حق ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، حضرت عمرؓ جن کے رعب و دبدبے کے بارے میں رسول اللہؐ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ عمرؓ جس راستے سے جاتا ہو شیطان کو اس راستے پر آنے کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ اپنا راستہ تبدیل کر لیتا ہے۔ حضرت عمرؓ جن کے رعب و دبدبے کی کیفیت یہ تھی کہ زلزلہ آیا تو کوڑا زمین پر مارا اور کہا کیوں کانپتی ہو کیا عمرؓ نے تم پر انصاف نہیں کیا؟ ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ منبر رسول پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے ہزاروں صحابہؓ بیٹھے سن رہے تھے۔ فرمایا ''اسمعوا واطیعوا'' میری بات سنو اور میری اطاعت کرو۔ ایک صحابیؓ نے کھڑا ہو کر کہا ''لا سمع ولا طاع'' کہ جناب نہ سنتے ہیں اور نہ مانتے ہیں۔ پوچھا کیا معاملہ ہے؟ صحابیؓ نے کہا کہ پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیں پھر آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے، وہ یہ کہ بیت المال سے آپ نے چند دن قبل لوگوں میں کپڑے تقسیم کیے تھے ہم سب کو ایک ایک

چادر ملی تھی۔ مجھے بھی اور آپ کو بھی وہی کپڑا ملا تھا، وہ چادر اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس سے میرا کرتا بن سکتا لیکن آپ اسی کپڑے کا کرتا پہنے کھڑے ہیں، آپ کا کرتا اس کپڑے سے کیسے بن گیا جبکہ آپ کا قد بھی نسبتا لمبا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تمہارا سوال ٹھیک ہے اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہؓ دے گا۔ پھر بیٹے سے کہا کہ عبداللہ! اٹھو اور جواب دو۔ حضرت عبد اللہؓ نے اٹھ کر وضاحت کی کہ بھئی میں نے اپنے حصے کی چادر والد محترم کو دے دی تھی کہ دو چادریں ملا کر ان کا کرتا بن جائے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اب میں اپنا خطبہ کہوں؟ اس صحابیؓ نے کہا کہ "قل! نسمع و نطیع" ارشاد فرمائیے ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔

رشتہ داروں کے حقوق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلہ رحمی کی تلقین بھی کی اور اپنی حیات مبارکہ میں بے شمار مقامات پر عملی مثالوں کے ذریعے اس کی تعلیم بھی دی۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حضورؐ کے طرز عمل کو دیکھا جائے تو خاندانی نظام کا ایک ایسا مربوط نمونہ سامنے آتا ہے کہ جس کی مثال دنیا کی کوئی دوسری شخصیت یا کوئی اور نظام پیش کرنے سے عاجز ہے۔ حضورؐ نے ایک شخص کی زندگی میں والدین کے مقام اور ان کی حیثیت کی اہمیت اس انداز سے بیان فرمائی کہ والدین کی نافرمانی کو کبیرہ گناہ قرار دیا اور والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو جنت کا راستہ بتلایا۔ ایک موقع پر نبی کریمؐ نے فرمایا "ان اللہ عزوجل یوصیکم بامھاتکم" (المعجم الکبیر، ۷۶۴۷) کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ماؤں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے ہیں۔

نبی کریمؐ نے اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا "ید المعطی العلیا، أمک و أباک وأختک وأخاک، ثم أدناک فأدناک" (مسند احمد، ۱۶۰۱۸) کہ دینے والے کا ہاتھ اوپر (برتر) ہوتا ہے، پہلے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر خرچ کرو پھر درجہ بدرجہ اپنے قریبی رشتہ داروں پر۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ حضرت زینبؓ نے نبی کریمؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میرا شوہر ضرورت مند ہے کیا میرے لیے اس کو صدقہ دینا جائز ہے؟ آپؐ نے فرمایا "نعم ولک أجران" ہاں تمہیں اس صدقے کا دوہرا اجر ملے گا۔

عورتوں کے حقوق

دنیا میں انسانی حقوق کے حوالے سے عورتوں کے حقوق کی بات بھی ہو رہی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں عورت کی جبری شادی کی جاتی ہے، اس کا مہر مختلف حیلوں سے ہضم کر لیا جاتا ہے اور اسے جائیداد اور وراثت میں سے حصہ نہیں ملتا۔ جناب نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا کہ یاد رکھو "ألا، واستوصوا بالنساء خیرا،۔۔۔ ان لکم علی نساء حقا ولھن علیکم حقا" (ترمذی، ۳۰۱۲) کہ سنو، عورتوں کے ساتھ بھلائی کے بارے میں میری وصیت قبول کرو۔۔۔ تمہارے حقوق عورتوں پر ہیں اور عورتوں کے حقوق تم پر ہیں۔ یعنی مرد و عورت، دونوں کی طرف سے حقوق ادا ہوں گے تو بات آگے چلے گی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں عورتوں کے بارے میں سب سے زیادہ نصیحت کرتا ہوں کہ یہ عورتیں فطرتا (اپنی ساخت کے اعتبار سے مرد سے) کمزور ہیں، طاقتور کی ذمہ داری ہے کہ وہ کمزور کے حقوق ادا کرے۔ اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا "فاتقوا اللہ فی النساء فانکم أخذ تموھن بأمان اللہ واستحللتم فروجھن بکلمۃ اللہ" (مسلم، ۲۱۳۷) کہ عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امان کے تحت اپنے نکاح میں لیا ہے اور خدا کی اجازت کے تحت ان کی شرم گاہوں سے فائدہ اٹھانا تمہارے لیے حلال ہوا ہے۔

پڑوسیوں کے حقوق

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں جو خود تو رات کو پیٹ بھر کر سوئے لیکن اس کا پڑوسی بھوکا سوئے۔ حضرت ابو امامۃ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر پڑوسیوں کا خیال رکھنے کی اس قدر تاکید فرمائی کہ مجھے خیال ہوا کہ آپ پڑوسی کو وراثت میں بھی حق دار قرار دے دیں گے۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں:

رشتہ دار مسلمان پڑوسی: اس کے تم پر تین حق ہیں: پڑوسی کا، مسلمان کا اور صلہ رحمی کا۔

مسلمان پڑوسی: اس کے تم پر دو حق ہیں: پڑوسی کا اور مسلمان کا۔

غیر مسلم پڑوسی: اس کا تم پر ایک یعنی پڑوسی ہونے کا حق ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے اپنی اہلیہ کے ساتھ اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ انہوں نے گوشت پکا کر محلے میں تقسیم کیا لیکن ایک یہودی پڑوسی کے ہاں بھیجنا بھول گئیں اور اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جناب نبی کریمؐ نے پڑوسیوں کے بارے میں کیا حقوق بیان فرمائے ہیں۔

نادار لوگوں کی مدد

حضرت عمر فاروقؓ رات کی تاریکی میں گشت کیا کرتے تھے، ایک دفعہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آئی، حضرت عمرؓ گزر گئے اور دوبارہ اس گلی میں آئے تو بچے ابھی تک رو رہے تھے، اسی طرح تیسرا چکر لگایا تو بچوں کے رونے کی آواز ابھی بھی آ رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے دروازے پر دستک دی، دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا نکلی، پوچھا اماں کیا بات ہے بچے مسلسل رو رہے ہیں۔ بڑھیا نے بتایا کہ بچے بھوکے بیٹھے ہیں کھانے کو کچھ نہیں ہے روئیں گے نہیں تو کیا کریں گے؟ ان کا باپ ان کے سر پر نہیں ہے اور میں ان کی کفیل ہوں۔ گھر میں ایک ہنڈیا پک رہی تھی، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس ہنڈیا میں کیا ہے؟ بڑھیا نے بتایا کہ بچوں کو دلاسہ دینے کے لیے خالی پانی کی ہنڈیا چڑھا رکھی ہے کہ روتے روتے بہل جائیں گے اور سو جائیں گے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ایک خادم تھا اسے ساتھ لے کر بیت المال گئے اور آٹے کی بوری اٹھوا کر خود اپنے کندھے پر رکھوائی، اب خادم ساتھ چل رہا ہے اور امیر المؤمنین نے کندھے پر بوری اٹھائی ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جا کر بڑھیا کو آٹا دیا اور آگ جلا کر دی اور اس نے آٹا لے کر کھانے پکانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

حضرت عمرؓ اس دوران وہاں موجود رہے اور بڑھیا سے بات چیت کرتے رہے۔ فرمایا کہ اماں عمر اسی شہر میں رہتا ہے اگر کھانے کو کچھ نہیں تھا تو عمر کو جا کر بتایا ہوتا۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں جا کر عمرؓ کو بتاتی پھروں کہ میرے بچے بھوکے ہیں، یہ عمر کا کام ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھے کہ شہر میں کون کون سے گھر بھوکے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے دوسرا سوال کیا، اماں! عمر ایک آدمی ہے کس کس کا پتہ چلائے گا۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ بیٹا! اگر عمر اپنی رعیت کے بھوکوں کا پتہ نہیں چلا سکتا تو اسے یہ مسند خالی کر دینی چاہیے۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل جناب نبی کریمؐ نے اور ان کے بعد خلفائے راشدین نے لوگوں کو یہ شعور دیا کہ اپنا حق کس طرح اور کس حوصلے کے ساتھ طلب کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ”لومات الکلب جوعا علی شط الفرات لکان عمر مسؤلا عنہ یوم القیامۃ“ کہ اگر دریائے فرات کے کنارے میں ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے گا تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ عمرؓ تیری سلطنت میں ایک جاندار دریائے فرات کے کنارے پر بھوکا کیوں مرا۔

نجی زندگی کا تحفظ

نجی زندگی کا تحفظ بھی انسانی حقوق میں سے ہے۔ ایک شخص کو اپنی نجی زندگی، شخصی زندگی اور گھر کی چار دیواری کے اندر کی زندگی کا تحفظ حاصل ہے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا ”ولا تجسسوا“ کہ ایک دوسرے کے ذاتی حالات و معاملات میں مت پڑو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کے گھر میں جاؤ تو اجازت لیے بغیر گھر میں مت داخل ہو۔ رسول اللہؐ ایک صحابیؓ کے گھر تشریف لے گئے، آپؐ کا معمول مبارک یہ تھا کہ آپؐ باہر سے بلند آواز میں السلام علیکم کہتے تھے، یہ اجازت مانگنے کا ایک طریقہ ہوتا تھا۔ اگر اندر سے جواب آتا تو ٹھیک ورنہ آپ وہیں سے لوٹ جاتے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تین دفعہ اجازت مانگو، اجازت مانگنے کا طریقہ عرف کے مطابق ہے، آج کل دروازے کے باہر بیل لگی ہوتی ہے، موقع محل کے مطابق اگر تین دفعہ السلام علیکم کہنے یا تین دفعہ بیل بجانے کے بعد بھی اندر سے جواب نہ آئے تو آدمی خواہ مخواہ وہاں کھڑا نہ رہے۔ آپؐ نے تین دفعہ السلام علیکم کہا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو حضورؐ واپسی کے لیے پلٹے ہی تھے کہ اندر سے وہی صحابیؓ دوڑتے دوڑتے آئے۔ رسول اللہؐ نے پوچھا کہ بھئی آپ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، صحابیؓ نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! میں نے تینوں دفعہ جواب دیا لیکن آہستہ دیا اس لیے کہ آپ کی زبان مبارک سے بار بار سلام سننے کو جی چاہتا تھا۔ یہ اجازت مانگنا دوسروں کے گھر کی نجی زندگی کا تحفظ ہے۔

ایک شخص نبی کریمؐ کی خدمت میں آیا اور پوچھا، یارسول اللہ! میں اپنی ماں کے گھر جاؤں تو اس سے بھی اجازت مانگوں؟ فرمایا، ہاں اس سے بھی اجازت مانگو۔ پوچھا، یارسول اللہ! میری ماں الگ گھر میں رہتی ہے کیا میں اس سے بھی اجازت مانگو؟ آپ نے پھر فرمایا، ہاں اس سے بھی اجازت مانگ کر اندر جاؤ۔ اس نے پھر تیسری بار پوچھا، یارسول اللہ! مجھے بار بار جانا پڑتا ہے۔ حضورؐ نے اس پر کہا کہ اگر تمہاری ماں کسی نامناسب حالت میں بیٹھی ہو تو

کیا تم دیکھنا پسند کرو گے؟ اس نے کہا، نہیں۔ فرمایا، پھر اجازت لے کر جاؤ۔ یہ ایک گھر کی نجی زندگی کا تحفظ ہے۔

رسول اللہؐ نے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر کسی کے گھر جا کر اجازت مانگ رہے ہو تو دروازے کے سامنے مت کھڑے ہو اور فرمایا ''جعل الاِستیذان لاَجل البصر'' کہ اجازت مانگنے کے حکم کی وجہ یہی ہے کہ اچانک نظر نہ پڑ جائے۔ ایسی جگہ مت کھڑے ہو کہ دروازہ کھلتے ہی گھر کے اندر تک نظر پڑ جائے بلکہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو، ممکن ہے کوئی بچہ اچانک دروازہ کھول دے اور آپ کی نظر گھر کے اندر پڑ جائے، گھر والے نہ جانے کس ماحول میں بیٹھے ہوں اور ان کی پردہ دری ہو جائے۔ آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کسی کے گھر کے دروازے کے ایک سوراخ میں سے اندر جھانک رہا تھا۔ آپؐ نے منع فرماتے ہوئے کہا کہ اگر وہ شخص تمہیں ایسا کرتے دیکھ کر تمہاری آنکھ میں سلاخ گھسیڑ دیتا تو اسے اس کا حق حاصل تھا۔

قانون کی نظر میں سب کا برابر ہونا

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک زرہ گم ہو گئی تھی جو کسی طرح ایک یہودی کے ہاتھ میں چلی گئی، حضرت علیؓ نے کسی جگہ وہ زرہ دیکھی تو پہچان لی کہ یہ تو میری زرہ ہے جبکہ یہودی کا کہنا تھا کہ اس نے وہ زرہ کہیں سے خریدی ہے۔ یعنی ایک یہودی سے اسلامی حکومت کے سربراہ کا جھگڑا ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے قاضی شریحؒ کی عدالت میں دعوی کر دیا کہ یہ میری زرہ ہے اور اس یہودی کے پاس ہے۔ قاضی شریحؒ حضرت علیؓ کی حکومت میں چیف جسٹس تھے۔ دعوی چونکہ حضرت علیؓ نے دائر کیا تھا اس لیے مدعی یہ تھے، عدالت نے حضرت علیؓ سے مطالبہ کیا کہ گواہ لائیں۔ اب عدالت میں قاضی کے سامنے یہودی بھی کھڑا ہے اور حضرت علیؓ بھی۔ حضرت علیؓ کو کوئی عدالتی تحفظ حاصل نہیں تھا کہ سربراہ مملکت کو عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا، پھر کوئی پروٹوکول بھی نہیں تھا کہ حضرت علیؓ کو بیٹھنے کے لیے کرسی وغیرہ مہیا کی گئی ہو، دونوں ساتھ ساتھ قاضی کے سامنے کھڑے تھے۔ حضرت علیؓ نے گواہ پیش کیے جن میں ایک ان کا بیٹا حضرت حسنؓ تھے اور دوسرا کوئی اور شخص تھا۔ قاضیؒ نے کہا کہ جناب بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں ہے، اگر حسنؓ کے علاوہ کوئی اور گواہ ہے تو لائیے ورنہ میں آپ کے خلاف فیصلہ کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے پاس اور کوئی گواہ نہیں ہے۔ قاضی شریحؒ نے امیر المؤمنین کے سامنے

کھڑے کھڑے یہ فیصلہ سنا دیا کہ جناب یہ زرہ اس یہودی کی ہے میں آپ کا دعوی خارج کرتا ہوں۔ قانون کی نظر میں برابری کا جو تصور اسلام نے دیا ہے تمام تر تہذیب و تمدن کے دعووں کے باوجود دنیا آج بھی اس مقام تک نہیں پہنچی۔

اسلام میں غلامی کا تصور

آج غلامی کے مسئلہ کے حوالے سے اسلام کو تنقید کا نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غلامی ایسا رواج تھا جسے اسلام نے بڑی حکمت کے ساتھ بتدریج ختم کیا۔ جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس زمانے میں کسی شخص کو غلام بنانے کے تین طریقے رائج تھے۔

ایک طریقہ تو وہ تھا جسے آج کل کی اصطلاح میں بردہ فروشی کہتے ہیں یعنی کوئی طاقتور آدمی کسی کمزور آدمی کو پکڑتا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیتا تھا۔ حضرت زید بن حارثہؓ بھی ایسے ہی غلام بنے تھے، وہ کسی غلام خاندان کے نہیں تھے، راہ چلتے کچھ طاقتور لوگوں نے پکڑا اور بیچ دیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ بھی ایسے ہی غلام بنے تھے، علم کی تلاش میں سفر کر رہے تھے کہ کچھ طاقتور لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے غلام بنا کر بیچ دیا۔ آج بھی کچھ لوگ ایسے کرتے ہیں کہ کسی بچے یا بچی کو اغوا کر کے آگے بیچ دیا۔ چنانچہ ایک طریقہ غلام بنانے کا یہ رائج تھا۔

دوسرا طریقہ غلام بننے کا یہ تھا جس کا کہ بائبل میں بھی ذکر ہے اور پرانی قوموں میں بھی یہ طریقہ رائج رہا ہے کہ کسی مجرم کے ذمے کوئی تاوان ہوتا تو عدالت، پنچایت، تحکیم یا قضا اس شخص کو سزا کے طور پر غلام بنا دیتی بلکہ بعض اوقات کوئی مجبور آدمی خود کو کسی کی غلامی میں دے دیتا تھا، مثلاً کسی پر کوئی قرض ہوتا جسے وہ چکا نہیں سکتا تو وہ لاچار ہو کر کہہ دیتا تھا کہ ٹھیک ہے میں تمہارا غلام ہوں مجھے بیچ کر اپنا قرضہ پورا کر لو یا خود مجھ سے کام لے لو۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا، جنگ کے دوران جو لوگ قید میں آجاتے تھے ان کے بارے میں مختلف صورتیں ہوتی تھیں، مثلاً یہ کہ انہیں

- ویسے ہی چھوڑ دیا جائے،
- قیدیوں کے تبادلے میں چھوڑ دیا جائے،
- فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے،
- قتل کر دیا جائے،
- یا قیدی بنا لیا جائے۔

اگر جنگی مجرموں کو قید کرنے کا فیصلہ ہو جاتا تو اس کی پھر دو صورتیں ہوتی تھیں کہ انہیں قید خانے میں ڈال دیا جائے، یا پھر غلام بنا کر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی جیل میں قید کر لیا جائے یا پھر نیم آزادی دے دی جائے، حضورؐ کے زمانے میں عرب میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے، ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو قید میں رکھنا مشکل ہوتا تھا اس لیے یہ قیدی خادم کے طور پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔

چنانچہ یہ تین طریقے اس وقت غلام بنانے کے رائج تھے۔ جناب نبی کریمؐ نے غلامی کی تمام صورتوں کو ناجائز قرار دیتے ہوئے انتظامی ضروریات کے پیش نظر صرف آخری صورت کی گنجائش برقرار رکھی کہ جنگی قیدیوں کو مختلف خاندانوں میں بطور خادم تقسیم کر دیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا "بیع الحر حرام" کہ بردہ فروشی حرام ہے "ثمن الحر حرام" جرمانے یا تاوان میں بھی غلام بنانا حرام ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنی جنگوں کے زیادہ تر قیدی یا تو ایسے ہی چھوڑ دیے یا تبادلے میں چھوڑے یا پھر فدیہ لے کر چھوڑے۔ غزوۂ حنین میں سب قیدی بلا معاوضہ رہا کر دیے گئے۔ ایک دو جنگوں میں جب یہ دیکھا کہ قیدی بنانا ضروری ہے وہاں قیدی بنائے گئے لیکن ساتھ ان کے حقوق بھی بیان کیے گئے۔

رسول اللہؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا "خولکم إخوانکم" یہ تمہارے بھائی ہیں "اطعموھم مما اطعمتم" جو خود کھاتے ہو انہیں بھی وہی کھلاؤ "البسوھم مما تلبسون" جو خود پہنتے ہو انہیں بھی اسی معیار کا پہناؤ "ولا تکلفوھم مالا یطیقون" اور جس کام کی ان میں طاقت نہیں وہ بوجھ ان پر مت ڈالو، "إن کلفتموھم فاعینوھم" اگر کوئی کام ان کی طاقت سے زیادہ ہے تو ان کی مدد کرو۔

ایک صحابی حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک غلام کو تھپڑ مارا تو پیچھے سے آواز آئی ابو مسعود! جتنی قدرت تم اس پر رکھتے ہو اس سے کہیں زیادہ قدرت والا تمہارے اوپر ہے، تم نے اپنے آپ کو مالک سمجھ کر تھپڑ مارا ہے تمہارا بھی کوئی مالک ہے۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جناب رسول اللہؐ تھے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! میں نے اللہ کی خاطر اسے آزاد کر دیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں لپیٹ میں لے لیتی۔

جناب نبی کریمؐ نے جو آخری وصیت فرمائی اس میں دو باتیں فرمائیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنی زندگی کا یہ آخری جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا:

”الصلوۃ وماملکت ایمانکم“ اپنی نماز کا خیال کرنا اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے اپنی ترغیبات کے ذریعے غلاموں کا مسئلہ اتنا حساس بنا دیا کہ صحابہ کرامؓ نے معمولی سے معمولی بات پر غلاموں کو آزاد کرنا شروع کر دیا اور یوں عملی طور پر مسلمانوں کے معاشرے میں ایک وقت غلامی عملاً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے آج کی گفتگو میں اصولاً یہ بات عرض کی ہے کہ انسانی حقوق کا تصور سب سے پہلے اسلام نے دیا ہے جبکہ آج کی ویسٹرن سولائزیشن اس کے بارہ سو سال بعد انسانی حقوق سے آشنا ہوئی ہے۔ رائے کی آزادی ہو، جان کا تحفظ ہو، مال کا تحفظ ہو، آبرو کا تحفظ ہو، گھریلو زندگی کا تحفظ ہو، عورتوں کے حقوق ہوں، غلاموں کے حقوق ہوں، رشتہ داروں کے حقوق ہوں، اپنا حق مانگنے کا شعور ہو، یہ معاملات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے ہیں اور آج کی نسل انسانی اپنے تمام تر دعوؤں اور ترقی کے باوجود اس مقام تک نہیں پہنچ سکی جس کا عملی نقشہ حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں صحابہ کرامؓ نے پیش کیا تھا۔ اسلام کو اگر سمجھنا ہے تو وہ خلفائے راشدین کے دور کو سامنے رکھ کر سمجھنا ہوگا کہ وہی آئیڈیل دور ہے اور وہی مثالی اجتماعی سوسائٹی ہے جس کی بنیاد حقوق اللہ اور حقوق العباد پر قائم کی گئی، اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

سیاسی قیادت اور سیرت نبویؐ

(جامعہ الہدیٰ، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۵ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اسلام دین فطرت ہے۔ دین و مذہب کے اعتبار سے، عقیدہ و ایمانیات کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کے اعتبار سے تمام انبیاء کا مشترکہ دین ہے، یہ دین حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوا۔ انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے ادوار میں حالات کی ضروریات کے تحت انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کرتے رہے۔ دین اسلام میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں اور زمانوں کا احاطہ کیا ہے، جناب نبی کریمؐ نے جب تکمیل دین کا اعلان کیا تو انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ باقی نہیں رہا تھا جس میں انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی کا سامان باہم نہ پہنچا دیا گیا ہو۔

سیاست بھی انسانی سوسائٹی کا ایک بہت اہم شعبہ ہے۔ سیاست کسے کہتے ہیں؟ قوم کی اجتماعی قیادت کرنا، ان کے لیے نظام حکومت قائم کرنا، اس نظام حکومت کا نظم اچھے طریقے سے چلانا اور اجتماعی معاملات میں قوم کی راہنمائی کرنا، اسے سیاست کہتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرامؑ نے اس شعبے میں بھی وحی الٰہی کی بنیاد پر انسانیت کی راہنمائی کی، اللہ تبارک وتعالی نے قرآن کریم میں بہت سے انبیاء کرامؑ کا تذکرہ فرمایا ہے جو اپنے اپنے دور میں وقت کے حکمران بھی تھے اور دینی و مذہبی معاملات میں قائد بھی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے جنھوں نے اپنی قوم کو فرعون سے آزادی دلانے کے لیے جدوجہد کی اور بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے چھٹکارا دلوا کر ان کی حکومت قائم کی، اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا تذکرہ حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ کے طور پر آتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر ہے کہ وہ اپنے دور میں پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے، اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر آتا ہے کہ وہ اپنے دور میں پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے ایسی بادشاہت جو انہوں نے اللہ تعالی سے مانگ کر لی۔ حضرت سلیمانؑ اپنی بادشاہت کے لیے دعا مانگا کرتے تھے ”قال رب اغفرلی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی انک انت الوھاب“ (سورۃ ص ۳۵) کہا کہ اے میرے رب مجھے معاف کردے اور مجھے ایسی سلطنت عطا کر کہ میرے بعد کسی اور کو میسر نہ ہو آپ بڑے عطا کرنے والے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کی بادشاہت ایسی تھی جو انسانوں پر تو تھی ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنوں پر بھی تھی، ہوا پر بھی تھی اور پرندوں پر بھی تھی۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سینکڑوں کی تعداد میں ایسے گزرے ہیں جو اپنے وقت میں پیغمبر بھی تھے اور حکمران بھی، چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے سیاسی راہنمائی کو بھی حضرات انبیاء کرامؑ کے فرائض منصبی میں ذکر فرمایا ہے۔

سیرت طیبہ کے حوالے سے دو باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ پوری نسل انسانی میں رسول اللہؐ کے سوا زندگی کے کسی شعبے کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جس کے حالات زندگی اس قدر تفصیل کے ساتھ اور اس قدر اعتماد کے ساتھ ریکارڈ پر محفوظ ہوں۔ نہ سیاست کے شعبے میں، نہ قانون کے شعبے میں، نہ تجارت کے شعبے میں، نہ مذہب کے شعبے میں، نہ علم و فلسفے کے شعبے میں اور نہ ہی زندگی کے کسی اور شعبے میں۔ تاریخ انسانی میں کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں ہے جس کی زندگی کے ایک ایک مرحلے کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ رسول اللہؐ کے سوا پوری نسل انسانی میں

کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ جس کی شخصیت اس قدر جامع ہو کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس سے راہنمائی ملتی ہو، یہ جناب رسول اللہؐ کا اعجاز ہے اور یہ بھی حضورؐ کے معجزات میں سے ایک ہے۔

ایک جامع شخصیت

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس قدر جامع ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے ہر کردار کا نمونہ ملتا ہے۔ آپؐ ایک امین بھی تھے کہ مکہ کے لوگ اپنی امانتوں کو آپؐ کے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ آپ ایک حکم و منصف بھی تھے کہ عرب قبائل کے درمیان حجر اسود کی تنصیب کا معاملہ کس خوش اسلوبی سے طے فرمایا۔ آپؐ تاجر بھی تھے کہ حضرت خدیجہؓ کے تجارتی قافلے دوسرے ملکوں میں لے کر جاتے اور تجارت کرتے تھے۔ آپؐ ایک مبلغ بھی تھے کہ لوگوں کو نیکی اور اچھائی کی طرف بلاتے اور بدی و برائی سے روکتے تھے۔ حق و باطل کی لڑائی میں آپؐ ایسے فوجی کمانڈر بن کر ابھرے کہ اس پر تاریخ میں مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ رسول اللہؐ منصب انصاف پر فائز تھے کہ آپ قاضی اور جج بھی تھے، خود آپؐ کے پاس بھی مقدمات آتے تھے جن کے آپؐ فیصلے سنایا کرتے تھے، اور پھر باقی قاضیوں کے پاس جو مقدمات آتے ان کے فیصلوں پر اپیلیں حضورؐ کی خدمت میں آتی تھیں جن پر حضورؐ فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ آپ ایک سیاسی لیڈر بھی تھے کہ مختلف قبائل کے وفود آپ کے پاس آتے تھے جن سے آپ مذاکرات اور گفتگو فرماتے تھے۔ آپ اپنی ریاست کے سب سے بڑے ڈپلومیٹ سب سے بڑے سفارت کار بھی تھے کہ آپؐ دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات اور معاملات کو بھی نبھاتے تھے۔ نبی کریمؐ اپنی ریاست کے منتظم اعلیٰ بھی تھے کہ ریاست کے داخلی معاملات کے متعلق فیصلے بھی آپؐ خود فرمایا کرتے تھے۔ رسول اللہؐ مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کے امام بھی تھے کہ آپؐ نماز خود پڑھاتے تھے۔ جناب نبی کریمؐ ایک خطیب بھی تھے کہ خطبۂ جمعہ اور دیگر خطبات ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

یہ میں نے انسانی زندگی کے ان اہم کرداروں میں سے چند کا ذکر کیا ہے جو جناب نبی کریمؐ نے نبھائے۔ پھر ایسا بھی نہیں تھا کہ حضورؐ ایک شعبے میں اچھے تھے اور دوسرے شعبے میں خدانخواستہ کمزور تھے، رسول اللہؐ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر تھے اور افضل الانبیاء تھے اللہ تعالیٰ نے جو شعبہ بھی حضورؐ کے سپرد کیا اس میں حضورؐ کی کارکردگی کا معیار انتہا پر تھا، یہ جناب نبی کریمؐ کی جامعیت ہے۔

خلفاء اسلامؓ، نبوی ذمہ داریوں کے وارث

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لانبی بعدی وسیکون بعدی خلفاء“ کہ بنی اسرائیل کے انبیاء اپنی قوموں کے پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی قائد بھی تھے، جب ایک نبی دنیا سے تشریف لے جاتے تو دوسرے نبی ان کی جگہ آجاتے جیسے حضرت موسیٰؑ کی جگہ حضرت یوشع بن نونؑ نے لی، بنی اسرائیل میں یہ تسلسل چلتا رہا۔ جناب نبی کریمؐ بھی اسی طرح اپنی قوم کے سیاسی قائد تھے، رسول اللہؐ نہ صرف امت مسلمہ کے قائد تھے بلکہ آپ نسل انسانی کے بھی سب سے بڑے سیاسی قائد تھے۔ رسول اللہؐ نے اس حدیث میں یہ بات فرمائی ”لانبی بعدی“ کہ پہلے انبیاء میں تو تسلسل تھا اور نبوت جاری تھی لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ سوال یہ ہوا کہ جب آپ کے بعد نبی کوئی نہیں آئے گا تو یہ خلا کون پر کرے گا، آپؐ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اس لیے آپؐ کے بعد سیاسی قیادت کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ پھر آپ نے فرمایا ”فسیکون بعدی خلفاء“ کہ میرے بعد یہ منصب اور ذمہ داری خلفاء نبھائیں گے، یعنی میرے بعد خلافت کا نظام ہوگا اور خلفاء کا سلسلہ ہوگا جو نبوی ذمہ داریوں کو سنبھالیں گے۔

رسول اللہؐ نے جہاں زندگی کے باقی شعبوں میں راہنمائی کی ہے وہاں آپ نے اپنی امت کی سیاسی قیادت بھی کی، آنحضرتؐ نے اپنی سیرت و سنت کے حوالے سے اجتماعی نظام دیا ہے جسے نظام خلافت کہتے ہیں۔ جناب رسول اللہؐ کی ساری زندگی اس نظام کی تعلیم وتکمیل کے مراحل پر مشتمل ہے جبکہ خلافت کا یہ نظام اپنی آب و تاب کے ساتھ خلافت راشدہ کے دور میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے دنیا کو ایک حکومتی نظام دیا، حکومتی نظام کو چلانے کے لیے راہنما اصول دیے اور اس کے لیے قیادت تیار کی۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر تاریخ اسلام میں مستقل تصانیف تحریر کی گئی ہیں لیکن میں سربراہ مملکت اور نظام حکومت کے حوالے سے دو بنیادی اصولوں پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔

(۱) پہلا اصول یہ کہ حاکم وقت کا معیار زندگی معاشرے کے ایک عام آدمی کے معیار زندگی کے مطابق ہونا چاہیے۔

(۲) دوسرا اصول یہ کہ معاشرے کے ہر فرد، بالخصوص اصحاب علم و دانش کو حاکم وقت کے احتساب کا حق ہونا چاہیے۔

سربراہ مملکت کا معیار زندگی

حاکم وقت کو اپنی رعیت کی نظر میں کیسا ہونا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرز زندگی سے خود بھی اس کی مثال پیش کی اور آپؐ کے بعد اصحاب خلافت راشدہ نے بھی اسی طرز کا معیار زندگی برقرار رکھا۔ جناب رسالت مآب نے اپنے دور کے سب سے کمزور طبقے کے برابر اپنا معیار زندگی رکھا، اس پر علماء نے اور صوفیاء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں کہ حضورؐ کا فقر اختیاری تھا۔ رسول اللہؐ کے گھر میں کئی کئی دن تک آگ نہیں جلتی تھی، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خاندان نبوت میں ہم نے معمولی قسم کی کھجوریں تین دن مسلسل پیٹ بھر کر کھائی ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپؐ چاہتے تو کیا زندگی کی سہولتیں حاصل نہ کر سکتے تھے؟ لیکن نبی کریمؐ نے ایک پیغمبر ہوتے ہوئے، کمانڈر انچیف ہوتے ہوئے، چیف جسٹس ہوتے ہوئے، منتظم اعلیٰ ہوتے ہوئے اور حاکم وقت ہوتے ہوئے اپنا معیار زندگی معاشرے کے عام طبقے کے برابر رکھا۔ آپؐ خیال فرمائیے کہ اس معاملے میں رسول اللہؐ کس قدر حساس تھے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کا ہم سب کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا تھا کہ کسی اور خاوند کا اپنی بیوی کے ساتھ نہ ہوتا ہو گا، حضورؐ نے خود فرمایا کہ میں اپنے گھر والوں کے معاملے میں تم سب سے بہتر ہوں۔

حضورؐ کا معیار زندگی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج کے ساتھ زندگی میں ایک مرتبہ ناراضگی کا مرحلہ آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ غزوۂ خیبر میں جب مال غنیمت ہاتھ آیا تو صحابہ کرامؓ کے گھروں میں خوشحالی آئی اور معاشی صورت حال میں آسانی پیدا ہوئی جس کی بدولت سے معیار زندگی کچھ بہتر ہوا۔ ازواج مطہرات نے آپس میں مشورہ کیا کہ لوگوں کے گھروں میں تو سہولتیں آئی ہیں ہمارے گھروں میں بھی آنی چاہئیں۔ آپس میں صلاح مشورہ کر کے طے کیا کہ جب حضورؐ گھر تشریف لائیں گے تو آپس میں سب اکٹھی ہو کر حضورؐ سے بات چیت کریں گی۔ چنانچہ نبی کریمؐ ایک زوجہ محترمہ کے گھر میں آئے تو پروگرام کے مطابق سب ازواج وہاں اکٹھی ہو گئیں، انہوں نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو اپنا ترجمان بنایا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنی گفتگو اس انداز سے کی کہ یا رسول اللہ! ہمارا زیادہ وقت پھٹے ہوئے کپڑے سینے سلانے میں گزر جاتا ہے اگر تھوڑی سہولت ہمیں بھی حاصل ہو جائے تو اچھی زندگی گزار سکیں گی اور اطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکیں گی، باقی

لوگوں کے گھروں میں اگر سہولت آئی ہے تو ہمارے گھروں میں بھی آنی چاہیے۔ رسول اللہؐ اس پر ناراض ہوگئے کہ تم لوگوں نے یہ سوال کیوں کیا، اور قرآن کریم نے اس پر وعید اتاری ”یا ایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا جمیلا“ (سورۃ الاحزاب ۲۸) کہ اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور اس کی آسائش منظور ہے تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔ یعنی اللہ تعالی نے فرمایا کہ اے پیغمبر ان سے کہہ دیجیے کہ اگر دنیا چاہیے تو اس گھر میں نہیں ملے گی یہاں تو اسی طرح گزارا کرنا ہوگا۔ ایک ریاست کے سربراہ کے طور پر یہ جناب نبی کریمؐ کا ایک اہم پہلو تھا۔ اور پھر خیال فرمائیے کہ اس کی پیروی آپؐ کے خلفاء میں کیسے ہوئی، آنحضرتؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے جانشینوں نے اس طرز عمل کی پیروی کیسے کی؟

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا معیار زندگی

حضرت صدیق اکبرؓ اپنے ذریعہ معاش کے لیے مدینہ کی نواحی بستیوں میں کپڑے بیچا کرتے تھے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام کے خلیفۂ اول منتخب ہوئے، منصب خلافت سنبھالنے کے بعد دوسرے دن کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے بازار میں جا رہے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یا خلیفۃ رسول اللہ کہاں جا رہے ہیں؟ اس زمانے میں امیر المؤمنین کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی تھی یہ اصطلاح حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں آئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ کپڑے بیچنے جا رہا ہوں، حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ تو خلیفۃ المسلمین ہیں اگر آپ کپڑے بیچنے نکل پڑیں گے تو مسلمانوں کے معاملات کون نمٹائے گا۔ آپ کی عدم موجودگی میں کسی ملک کا وفد آگیا کوئی مقدمہ آگیا یا کوئی ریاستی مسئلہ درپیش ہوا تو اسے کون نمٹائے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اگر میں مسجد میں بیٹھ گیا تو بچے کہاں سے کھائیں گے، میرا تو یہ ذریعہ معاش ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جناب آپ گھر تشریف لے جائیے میں اصحاب شوری کو اکٹھا کر کے اس مسئلے کا حل تلاش کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اصحاب شوری کے گھروں میں گئے اور سب کو مسجد نبوی میں اکٹھا کیا۔ خلافت راشدہ کے قیام کے بعد سب سے پہلا اجلاس اسی مسئلے پر ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے مسئلہ پیش کیا کہ میں نے راستے میں خلیفۃ المسلمین کو دیکھا کہ گٹھڑی اٹھائے کپڑا بیچنے جا رہے تھے، یہ بال بچے دار ہیں

اگر یہ کام نہیں کریں گے تو بچے کہاں سے کھائیں گے۔ اس لیے ہمیں بیت المال سے خلیفة المسلمین کے لیے تنخواہ مقرر کرنی چاہیے۔ چنانچہ سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ خلیفة المسلمین کے لیے بیت المال سے تنخواہ مقرر ہونی چاہیے، پھر اس بات پر بحث ہوئی کہ خلیفة المسلین کی تنخواہ کتنی ہونی چاہیے؟ اس وقت کے امیر المؤمنین بیک وقت حاکم وقت بھی تھے، چیف جسٹس بھی تھے اور افواج کے کمانڈر بھی تھے، تمام بڑے بڑے عہدے ان کے پاس تھے۔ تنخواہ کے متعلق مختلف آراء سامنے آئیں لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رائے پر فیصلہ ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ کے ایک عام آدمی کا تخمینہ لگایا جائے کہ اس کا خرچہ کتنا ہے اس کے مطابق خلیفة المسلمین کی تنخواہ مقرر کر دی جائے۔ یہ وہی اصول تھا جو رسول اللہ ؐ نے قائم کیا تھا کہ حاکم وقت کا معیار زندگی عام آدمی کے برابر ہونا چاہیے۔

حضرت ابو بکرؓ کی تنخواہ کتنی مقرر ہوئی؟ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگا لیجیے کہ تاریخ میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے آخری عرصے میں عید کا وقت قریب آرہا تھا۔ زوجہ محترمہ نے عرض کیا کہ یا خلیفة المسلمین! عید کا دن قریب آرہا ہے عید کے دن بچوں کے لیے کچھ میٹھا پکانے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میرے پاس تو اس کی گنجائش نہیں ہے مجھے تو بیت المال سے جو راشن ملتا ہے میں اس سے زیادہ نہیں لے سکتا اور میرا اپنا کوئی کاروبار نہیں ہے اس لیے یہ خیال رہنے ہی دو۔ اہلیہ نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنے طور پر انتظام کروں؟ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، ٹھیک ہے اگر کر سکتی ہو تو کر لو۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد عید کا دن آیا اور حضرت ابو بکرؓ تیاری کر کے عید گاہ کی طرف جانے لگے تو دیکھا کہ اہلیہ نے میٹھا پکایا ہوا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پوچھا یہ بندوبست کہاں سے کیا ہے ہمارے پاس تو اس کی گنجائش نہیں تھی۔ اہلیہ نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں بیت المال سے راشن کا جو آٹا روزانہ آتا ہے، میں نے اس میں سے ایک مٹھی آٹا الگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند دنوں میں اتنا آٹا ہو گیا کہ اس میں سے آدھا آٹا بازار میں بیچ کر میں نے گڑ اور تیل منگوایا، باقی آدھا آٹا اس میں گوندھ کر حلوہ بنا لیا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا ابھی تک کسی نے کھایا تو نہیں؟ جواب ملا نہیں ابھی کسی نے نہیں کھایا۔ فرمایا دیگچی لاؤ، آپؓ نے دیگچی منگوا کر اٹھائی اور چل دیے۔ حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراحؓ جو بیت المال کے انچارج تھے ان سے جا کر فرمایا کہ ابو عبیدہؓ! یہ حلوہ ابو بکر کے گھر والوں کا حق نہیں ہے

بلکہ یہ مدینہ منورہ کے یتیموں اور بیواؤں کا حق ہے۔ اور سنو! آج کے بعد میرے گھر میں ایک مٹھی آٹا کم بھیجا کرنا کیونکہ ہمارا گزارا ایک مٹھی کم آٹے سے بھی ہو جاتا ہے۔ دنیا کے کس خطے کا کس مذہب کا کس نظام کا کونسا حکمران ہے جو اس کی مثال پیش کر سکے؟ رسول اللہؐ اور ان کے خلفاء نے حکمرانی کا یہ معیار بتایا کہ حکمرانی برتری اور فخر کا نہیں بلکہ فریضے اور ذمہ داری کا نام ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا معیار زندگی

ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ بیمار ہو گئے۔ طبیب آئے حال احوال دیکھا نبض دیکھی اور بتایا کہ انتڑیاں خشک ہو گئی ہیں کچھ دن زیتون کا تیل استعمال کریں یہی آپ کا علاج ہے۔ فرمایا میرے گھر میں تو زیتون کا تیل نہیں ہے۔ کسی نے بتایا کہ بیت المال میں زیتون کا تیل موجود ہے۔ فرمایا اچھا! بیت المال میں زیتون کا تیل ہے، ابو عبیدہؓ کو بلائیں۔ پوچھا عبیدہ بیت المال میں زیتون کا تیل ہے؟ بتایا، جی حضرت! موجود ہے۔ پوچھا کتنا ہے؟ بتایا کہ حضرت! بہت ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ تیل مدینہ منورہ کے سب لوگوں میں تقسیم کیا جائے تو میرے حصے میں کتنا آتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ حضرت پھر وہ اتنی مقدار کا نہیں ہو گا کہ کھانے کے قابل ہو۔ آپؓ نے فرمایا بس اس سے زیادہ حق میرا بیت المال پر نہیں ہے۔ بیت المال کی چیز مدینہ منورہ کے لوگوں میں برابر تقسیم ہو کر جو حصہ میرے حصے میں آتا ہے بس وہی میرا حق ہے اس سے زیادہ میں نہیں لے سکتا۔ طبیب نے کہا کہ حضرت! بطور قرض لے لیں۔ پوچھا کیا تم ضمانت دیتے ہو کہ اگر میں قرض نہ ادا کر سکا تو تم ادا کرو گے؟

میں نے عرض کیا کہ خلفائے راشدین نے جناب نبی کریمؐ کی تعلیمات کے مطابق نظام حکومت کی ایسی مثال پیش کی کہ دنیا کا کوئی نظام اسے دہرا نہ سکا۔ یہ اللہ کے رسولؐ کی حکمت تھی کہ حاکم وقت عام آدمی کے معیار کے مطابق زندگی گزارے گا تو عام لوگوں کی مشکلات و مسائل سے آگاہ ہو گا اور انہیں حل کرنے کی فکر کرے گا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے انصاف کا معیار

امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا ایک واقعہ تاریخ والے لکھتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد دوسرے ملکوں کی طرف سے وفود کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، رواج کے مطابق ملکوں کے وفد دوسرے ملکوں میں جاتے تھے تو تحفے تحائف لے کر جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ قیصر روم نے تحفے میں عورتوں کے استعمال کی خوشبو بھیجی جو پاؤڈر

کی شکل میں تھی۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اسے عورتوں میں کیسے تقسیم کیا جائے، ساتھیوں نے کہا کہ حضرت! اپنی زوجہ محترمہ کو دے دیجیے کہ وہ اسے عورتوں میں تقسیم کر دیں گی۔ حضرت عمرؓ گھر تشریف لے گئے اور اہلیہ محترمہ کو بتایا کہ یہ خوشبو تحفے میں آئی ہے اسے عورتوں میں تقسیم کرنا ہے اس کے لیے ساتھیوں نے تمہارا نام تجویز کیا ہے اس لیے تم اسے تقسیم کر دو لیکن پہلے مجھے بتاؤ کہ تمہاری تقسیم کا طریقہ کیا ہوگا؟ اہلیہ نے کہا کہ عورتوں کو اکٹھا کروں گی اور سب میں برابر برابر تقسیم کر دوں گی۔ پوچھا اپنا حصہ کتنا رکھو گی؟ بتایا کہ جتنا دوسروں کو دوں گی اتنا ہی اپنا بھی رکھوں گی۔ فرمایا کہ خوشبو کا وہ حصہ جو تقسیم کرتے وقت ہاتھ پر لگ جائے گا وہ کس کھاتے میں جائے گا؟ اس لیے یہ خوشبو سب میں تقسیم کرو لیکن اپنا حصہ کم رکھنا۔ دنیا کا کونسا حکمران ہے جو انصاف کو اس درجے پر قائم رکھ سکے۔

حاکم وقت کے احتساب کا حق

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا نظام قائم کیا اور معاشرے کے ہر فرد کو احتساب کا حق دیا، ایک مرتبہ ایک صحابیؓ کو باتوں باتوں میں حضورؐ نے چھڑی ماردی جس سے اس کے جسم پر خراش آگئی تو اس نے کہا کہ یارسول اللہؐ میں آپ سے بدلہ لوں گا۔ آپ نے اس کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے فوراً چھڑی اس کے ہاتھ میں دے دی اور اپنی کمر آگے کر دی۔ جب حضرت ابوبکرؓ حضورؐ کے جانشین کے طور پر خلیفہ بنے اور مسجد نبوی میں آئے تو پہلا خطبہ یہ ارشاد فرمایا کہ لوگو! میں تم پر امیر بنا دیا گیا ہوں لیکن میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں۔ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی انکساری اور کسر نفسی تھی ورنہ "افضل البشر بعد الانبیاء ابوبکر الصدیقؓ" حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ التسلیمات کے بعد نسل انسانی کی بزرگ ترین شخصیت جناب ابوبکر صدیقؓ کی تھی۔ فرمایا کہ میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں لیکن میں تم پر حکمران بنا دیا گیا ہوں اگر میں سیدھا سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو لیکن اگر میں ٹیڑھا چلوں اور میرے طرز عمل میں کہیں کجی نظر آئے تو مجھے سیدھا کر دو۔ خلیفۃ المسلمین اپنے پہلے خطبے میں اپنی رعیت کو یہ حق دے رہا ہے کہ اگر میں کسی معاملے میں ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کر دینا۔

جب خلیفہ بنے تو یہی بات حضرت عمر فاروقؓ نے بھی دہرائی۔ آپؓ نے خطبہ ارشاد فرمایا کہ لوگو! ابوبکر صدیقؓ نے مجھے تم پر اپنا جانشین مقرر کیا ہے اور تم پر اپنا امیر بنا دیا ہے۔

پھر پوچھا کہ میں اگر سیدھا سیدھا چلوں گا تو میرا ساتھ دو گے لیکن اگر میں ٹیڑھا چلوں گا تو تمہارا طرز عمل کیا ہو گا؟ ایک بدو صحابیؓ نے کھڑے ہو کر اپنی تلوار لہرائی کہ پھر ہم تلوار سے آپ کو سیدھا کر دیں گے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ عمر کی رعیت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عمر کو تلوار کے ساتھ سیدھا رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔
رسول اللہؐ نے لوگوں کو احتساب کا تصور اور آزادئ رائے کا یہ حق دیا کہ ایک بار جب حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المال سے ایک خاندان کے لیے راشن پہنچایا تو گھر کی بڑھیا نے رات کی تاریکی میں حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر عمر اپنی رعیت کے بھوکوں کا خیال نہیں کر سکتا تو اسے اپنے عہدے پر فائز رہنے کا حق نہیں ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد احتساب کے اس تصور کو خلفائے اسلام نے کس طرح قائم رکھا؟ امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ بیس سال تک مسلمانوں کے متفقہ امیر المومنین رہے ان کے بارے میں تاریخ ایک دلچسپ واقعہ نقل کرتی ہے۔ طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت معاویہؓ نے ایک دن جمعے کے خطبے کے دوران ایک جملہ فرمایا ”انما المال مالنا والفیئ فیئنا من شئنا أعطیناہ و من شئنا منعناہ“ کہ بیت المال کا مال ہمارا مال ہے اور غنیمت کا مال ہمارا مال ہے ہم جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔ یعنی بیت المال کی دولت اور غنیمت کے مال پر ہماری مرضی ہے کہ جسے چاہیں دیں جسے چاہیں نہ دیں۔ اس پر ایک جمعہ گزر گیا۔ اگلا جمعہ آیا تو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے یہ بات پھر دہرا دی، لوگوں میں کچھ کھسر پھسر ہوئی کہ یہ کیا بات ہو رہی ہے۔ تیسرا جمعہ آیا تو حضرت معاویہؓ نے ایک بار پھر یہی بات دہرا دی۔ دمشق کی جامع مسجد میں جمعے کا یہ خطبہ ہو رہا تھا اجتماع میں سے ایک آدمی کھڑا ہو گیا اس نے کہا کہ امیر المؤمنین بات سنیے، یہ تیسرا جمعہ ہے کہ آپ یہی بات کہہ رہے ہیں۔ سنیے، یہ بیت المال کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے یہ مسلمانوں کا مال ہے ہم کسی کو مسلمانوں اور بیت المال کے درمیان حائل نہیں ہونے دیں گے۔ جمعہ کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس شخص کو اپنے گھر بلا لیا، کچھ لوگ پیچھے گئے کہ اگر کوئی بات سختی کی ہوئی تو ہم اس کی حمایت کریں گے۔ اندر گئے تو دیکھا کہ حضرت معاویہؓ نے اسے اپنی مسند پر بٹھا رکھا ہے اور خود اس کے سامنے مؤدب بیٹھے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ”ان ھذا أحیانی أحیاہ اللہ“ کہ اللہ تعالی اسے زندگی دے اس نے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ میں جو یہ بات دہرا رہا تھا تو میں ایسا قصداً کر رہا تھا کہ اس سے میرا ایک

مقصد تھا۔ فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ سے یہ ارشاد سنا کہ میرے بعد میری امت میں کچھ حکمران ایسے بھی آئیں گے جو میرے منبر پر کھڑے ہو کر جو جی میں آئے گا کہیں گے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا کوئی باز پرس نہیں کرنے والا ہوگا، ایسے حکمران جہنم میں بندروں کی طرح چھلانگیں لگاتے پھریں گے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ جب پہلے جمعے میں مجھے کسی نے اس بات پر نہیں ٹوکا تو مجھے یہ بات کھٹکی کہ معاویہؓ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ دوسرے جمعے میں نے پھر یہ بات دہرائی کہ شاید اب کوئی کھڑا ہو، جب پھر کوئی نہیں کھڑا ہوا تو مجھے پریشانی لاحق ہوگئی کہ یہ مسئلہ تو خراب لگتا ہے، کہیں میں رسول اللہؐ کی پیشین گوئی کی زد میں تو نہیں آرہا۔ آج کے خطبۂ جمعہ میں اس شخص نے کھڑے ہو کر مجھے ٹوک دیا اور مجھے حضورؐ کی اس پیشین گوئی کی زد سے نکالا۔ حضرت معاویہؓ صحابہ کرامؓ میں آخری خلیفہ ہیں ان کا معیار یہ ہے کہ وہ خود احتسابی کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو نبی کریمؐ کی پیشین گوئی پر پرکھ رہے ہیں۔

حاکم وقت کا احتساب، رعیت کا حق یا ذمہ داری؟

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا جو تصور پیش کیا اس میں عام لوگوں کو احتساب کا حق دیا کہ اگر حاکم وقت میں کوئی غلط بات دیکھیں تو ٹوک دیں۔ آج کے نظام سیاست میں اور اسلام کے نظام سیاست میں ایک بنیادی فرق ہے۔ حاکم وقت اگر کوئی بات یا عمل حق کے خلاف کر رہا ہو یا ناانصافی اور ظلم کا معاملہ کر رہا ہو تو اسے اس طرز عمل سے روکنے کو آج کی دنیا ہر شہری کا حق قرار دیتی ہے۔ لیکن حاکم وقت کے خلاف تنقید کرنا اسے اس کی غلطی پر ٹوکنا اور اس کی غلط بات کی نشاندہی کرنا، اسلام نے اسے حق نہیں بلکہ ذمہ داری قرار دیا ہے۔ اسلام کے اور آج کے مروجہ نظام سیاست میں یہ فرق ہے۔ حق تو اختیاری ہوتا ہے کہ کوئی اپنا حق استعمال کرے یا نہ کرے لیکن رسول اللہؐ نے یہ اختیار نہیں دیا بلکہ بالخصوص علماء کے حوالے سے یہ فرمایا کہ غلط بات کو غلط کہنا پڑے گا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جو عالم ایک ظالم حکمران کے ظلم کو دیکھ کر خاموش رہے وہ اپنی ذمہ داری سے گریز کر رہا ہے، جناب نبی کریمؐ نے اسے جہاد قرار دیا "افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" کہ سب سے بہتر جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔

ایک حدیث میں جناب نبی کریمؐ نے ان لوگوں کو جو ظالم حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنے کا حوصلہ نہ کریں، شیطان کا ساتھی قرار دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جو میرے منبر بیٹھتا ہے اور ظالم کے ظلم کو ظلم نہیں کہتا "شیطان اخرس" وہ گونگا شیطان ہے۔ لیکن اس میں نکتہ یہ

ہے کہ بھلائی کی بات ایسے انداز سے کہی جائے کہ جس میں خیر خواہی ہو۔ ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ! دین کیا ہے؟ فرمایا خیر خواہی کا نام دین ہے۔ پوچھا کس کی خیر خواہی؟ فرمایا ”للہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم“ کہ اللہ کے لیے خیر خواہی (اللہ کی بندگی)، اللہ کے رسول کے لیے خیر خواہی (رسول اللہؐ کی نصیحت پر عمل)، مسلم حکمرانوں کی خیر خواہی (غلط باتوں پر تنقید) اور عوام الناس کی خیر خواہی۔ یعنی غلط بات پر موقع محل کی مناسبت سے تنقید کرنا ایک ذمہ دار شہری کا فریضہ ہے لیکن یہ تنقید ایسے انداز سے ہو کہ اس میں دشمنی کا پہلو نہ ہو بلکہ خیر خواہی کا پہلو ہو۔ جناب نبی کریمؐ نے حکمرانوں کی غلطیوں کو درست کرنے کو دین قرار دیا اور اسے جہاد کا درجہ دیا۔

میں نے اپنی گفتگو میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام حکومت کی دو بنیادی خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ کہ آپؐ نے ایک حاکم وقت کے طور پر اپنا معیار زندگی عام لوگوں کے مطابق رکھا، اس میں حکمت یہ تھی کہ ایک حاکم وقت عام لوگوں کے مسائل و مشکلات سے صحیح طور پر آگاہی اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے جبکہ وہ خود روز مرہ زندگی کے ان مسائل و مشکلات سے گزرے۔ اگر حکمرانوں اور عوام الناس کے معیار زندگی میں فرق ہوگا تو حکمرانوں کو لوگوں کے مسائل کا صحیح ادراک نہیں ہو سکے گا اور وہ صحیح حکمرانی نہیں کر سکیں گے۔ رسول اللہؐ نے جو طرز حکومت متعارف کروایا اس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ معاشرے کے ہر فرد کو حاکم وقت کے احتساب کا حق دیا۔ اور بالخصوص معاشرے کے اصحاب علم و دانش کی یہ ذمہ داری قرار دی کہ وہ حکمرانوں کے غلط اقدامات کی نشاندہی کرتے رہیں کہ احتساب کا یہ عمل حکومتی نظام کو صحیح رخ پر چلنے میں مدد دیتا رہے۔ اہل علم اگر امراء کے احتساب سے صرف نظر کریں گے اور جانتے بوجھتے ہوئے ان کے غلط اقدامات کی نشاندہی نہیں کریں گے تو وہ مجرم ٹھہریں گے اور اپنے فرض کی ادائیگی میں قصوروار ہوں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے سیاسی راہنمائی کا جو تصور پیش کیا اس کی ایک جھلک میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔

قانون کی بالادستی اور سیرت نبویؐ

(جامعہ الہدٰی، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۵ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج جب مسلمان دنیا کے کسی خطے میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو حکومت و قانون کی بنیاد بنانے کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک کا سارے کا سارا نظام قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے مطابق ہونا چاہیے، وہاں اسلام کی بالادستی ہونی چاہیے، حدود شرعیہ نافذ ہونی چاہئیں، خلافت کا نظام نافذ ہونا چاہیے، تو اس کے جواب میں عام طور پر ایک بات کہی جاتی ہے کہ آج کے دور میں تھیاکریسی نہیں چل سکتی، یا آج کے دور میں پاپائیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تھیاکریسی اور پاپائیت

تھیاکریسی اور پاپائیت کسے کہتے ہیں؟ تھیاکریسی اور پاپائیت اسے کہا جاتا ہے کہ وقت کا حکمران خود کو خدا کا نائب اور نمائندہ قرار دے کر جو چاہے فیصلے کرے، لوگ اسے سننے اور ماننے پر مجبور ہوں اور ان فیصلوں پر عمل کے پابند ہوں۔ تھیاکریسی کا مختصر معنی یہ ہے کہ حاکم وقت خود کو قانون سے بالاتر سمجھے، وہ خود کسی قانون کا پابند نہ ہو، جبکہ جو کچھ کہہ دے وہ قانون کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم وقت یہ سمجھے کہ میں خدا کا نمائندہ ہوں اس لیے میں جو بھی بات کہتا ہوں وہ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں خدا کے نام پر، خدا کے اشارے کے نام پر، یا الہام کے نام پر پیغمبر کے سوا کوئی حاکم اپنی بات کو خدا کی بات قرار دے کر لوگوں کو اپنی اطاعت کا پابند بنا لے، اس کا نام تھیا کریسی ہے اس کا نام پاپائیت ہے۔

دنیا پاپائیت اور تھیاکریسی کی ڈسی ہوئی ہے، لوگوں کے ذہنوں میں حکومت کے حوالے سے جب مذہب کا نام آتا ہے تو یورپ کا وہ چار سو سالہ دور ان کے سامنے آجاتا ہے جس میں یورپ کے اندر تھیاکریسی اور پاپائیت کا راج رہا ہے اور یورپ میں پوپ اور اس کی کونسل اپنے فیصلوں کو خدا کا فیصلہ قرار دیتے رہے ہیں، آج بھی وہ اپنے دائرے میں یہی کرتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں پر مذہب اور خدا کے نام پر بڑا ظلم ہوا ہے، بادشاہ نے اور کلیسا نے خدا کے نمائندے بن کر جس بات کو اپنے مفاد کے خلاف پایا ہے اس کو مذہب کی مخالفت قرار دے کر لوگوں کے خلاف فیصلے کیے اور لوگوں کو سزائیں دی ہیں۔ اس لیے آج

جب مذہب کی بنیاد پر حکومت کا نام آتا ہے تو ان لوگوں کے ذہنوں میں وہ تاریک دور آجاتا ہے جسے یہ ڈارک ایجز (Dark ages) کہتے ہیں۔ اس پس منظر کی بنیاد پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر جب بھی حکومت ہوگی تو حکمران خدا کے نام پر اپنی من مانی کرے گا اس لیے کہ مذہب اور خدا کے سامنے لوگ پابند اور مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آج جب دنیا کے کسی بھی ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ ہوتا ہے تو جواب میں یہ ردعمل سامنے آتا ہے کہ آج کے دور میں تھیاکریسی کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ وہ کشمکش ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے مسلمانوں کو درپیش ہے۔

اسلام میں تھیاکریسی کا تصور

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں تھیاکریسی کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے، اسلام تو خلافت یعنی نیابت کا تصور دیتا ہے۔ ہمارے ہاں جناب رسول اللہؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد قیامت تک کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ جس کی بات کو خدا کی بات کہا جا سکے، اور پھر خود نبی کریمؐ کی شخصیت بھی اللہ تعالیٰ کے قانون اور ضابطے سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ پاپائیت اس کا نام ہے کہ ایک آدمی کو اس درجہ میں معصوم تصور کر لیا جائے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی اور یہ کہ جو بات وہ کہہ دے وہ دراصل خدا ہی کی بات ہے، اس کے آگے کوئی قانون نہیں ہے کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں دنیا بھر کے اہل سنت والجماعت کے تمام مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہؐ کی ذات گرامی کے بعد قیامت تک امت میں سے کوئی آدمی ایسا نہیں ہوا اور نہ ہوگا کہ جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ معصوم ہے، خدا کا نمائندہ ہے اور غلطی سے بالاتر ہے۔

جناب نبی کریمؐ اپنی ۲۳ سالہ نبوی زندگی میں خود بھی کبھی خدائی قانون سے بالاتر نہیں رہے، آپؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ میں یہ کہتا ہوں اس لیے میری بات مانو بلکہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے یہ حکم آیا ہے جس کا میں بھی پابند ہوں اور تم لوگ بھی پابند ہو۔ رسول اللہؐ نے کسی بات کی نسبت اپنی طرف نہیں کی، حالانکہ جہاں تک ہمارے ایمان کا تعلق ہے رسول اللہؐ دین کے معاملے میں آخری اتھارٹی ہیں، ہمارے سامنے نہ اللہ تعالیٰ ہیں اور نہ جبریل علیہ السلام بلکہ ہمارے سامنے تو حضورؐ کی شخصیت ہے۔ لیکن دین کے معاملے میں، قانون کے معاملے میں اور معاملات کے بارے میں آخری اتھارٹی ہونے کے باوجود خود رسول اللہؐ کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ آپ قانون اور ضابطے کے پابند

رہے ہیں۔ اللہ تعالی نے جناب نبی کریمؐ کو مختلف معاملات میں قانون کا پابند بنا کر یہ بتایا کہ اسلام تھیا کریسی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قانون اور ضابطے کی پابندی کا نام ہے۔ اس حوالے سے میں جناب نبی کریمؐ، خلافت راشدہ اور خیر القرون کے حوالے سے چند واقعات کا تذکرہ کروں گا جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جناب رسول اللہؐ اور ان کے بعد آنے والے خلفاء اسلام اللہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ ضابطے اور دائرے کے پابند رہے ہیں۔

منہ بولے بیٹے کی حیثیت

جناب نبی کریمؐ نے اپنے انتہائی پیارے ساتھی حضرت زید بن حارثہؓ کو جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام بھی تھے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا، وہ زید بن حارثہؓ جنہوں نے اپنی تلاش میں آنے والے اپنے خاندان کو یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ رسول اللہؐ کے دامن سے وابستہ ہونے کے بعد اب میں حضورؐ کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مکہ مکرمہ میں کافی عرصہ تک حضورؐ کی کنیت ابو زید رہی اور زید بن حارثہؓ کو زید بن محمدؐ کہا جاتا رہا۔ جاہلیت کے دور میں جب لوگ کسی کو منہ بولا بیٹا بناتے تھے تو وہ پھر حقیقی بیٹا ہی شمار ہوتا تھا، وہ وراثت میں بھی شریک ہو جاتا تھا اور اس کے ساتھ حلال و حرام کے مسائل بھی وابستہ ہو جاتے تھے۔ عرب قبائل کے رواج کے مطابق منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تھا اور اس کی بیوی بہو سمجھی جاتی تھی اس لیے بیٹا فوت ہو جانے کی صورت میں بہو سے خسر کا نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ جناب نبی کریمؐ نے زید بن حارثہؓ کو متبنیٰ بنایا تو لوگوں نے انہیں زید بن محمدؐ کہنا شروع کر دیا۔ لیکن جب اللہ تعالی نے ضابطہ نازل کیا کہ یہ رواج ٹھیک نہیں ہے اس لیے جو اصل باپ ہے اسی کی طرف نسبت ہوگی اور اپنی طرف سے کسی کو باپ یا بیٹا بنا لینے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس پر نبی کریمؐ نے اعلان فرما دیا کہ آج کے بعد نہ کوئی زید کو زید بن محمدؐ کہے اور نہ کوئی مجھے ابو زید کہے، وہ حارثہؓ کا بیٹا ہے اور میں اپنی اولاد کا باپ ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالی نے سب سے پہلے جناب نبی کریمؐ پر ضابطہ اور قانون نازل کیا اور اس طریقے سے نازل کیا کہ آپؐ کے ذریعے عرب کا یہ رواج توڑتے ہوئے اللہ تعالی نے اپنے حکم سے جناب نبی کریمؐ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینبؓ کا نکاح کروایا۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر ہے ''فلما قضی زید منھا وطرا زوجنکھا لکیلا یکون علی المؤمنین حرج فی ازواج ادعیاءھم'' (سورۃ الاحزاب ۳۷) اور جب زید اس سے حاجت پوری کر چکا تو ہم نے آپؐ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی گناہ نہ سمجھا

جائے۔ جناب نبی کریمؐ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بتایا کہ محمد اللہ کے رسول اور نمائندے ہیں لیکن وہ بھی ہمارے قانون اور ضابطے کے پابند ہیں۔

امراء کے لیے الگ مجلس

ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما تھے، آپؐ کی مجلس میں حضرت بلال، عمار بن یاسر، زید بن حارثہ اور عبد اللہ بن مسعود رضوان اللہ علیہم اجمعین بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ مکہ مکرمہ میں قریش کے ساتھ مخالفت کے عروج کا زمانہ تھا، ابو طالب ابھی زندہ تھے۔ کچھ قریشی سردار اکٹھے ہو کر نبی کریمؐ کے پاس آئے، ان میں عتبہ اور شیبہ وغیرہ کا نام بھی آتا ہے، کہنے لگے کہ جناب ہم آپ کی بات سننا چاہتے ہیں لیکن آپ کی مجلس میں یہ جو غریب لوگ بیٹھے ہوئے ہیں ان کی موجودگی میں ہم آپ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ حضورؐ کے ابتدائی ساتھی معاشرے کے یہی کمزور لوگ تھے۔ قریش کے سرداروں نے کہا کہ جناب ہم آپ کے ساتھ بات چیت کے لیے تیار ہیں لیکن آپ کے ان ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنا ہمارے معاشرتی مقام کے خلاف ہے، آپ انہیں اپنی مجلس سے اٹھا دیں اور ہمارے ساتھ الگ مجلس کریں پھر ہم آپ کی بات سن لیں گے۔ جناب نبی کریمؐ نے جواب دیا کہ ہم اس بارے میں مشورہ کر کے آپ کو بتائیں گے، نبی کریمؐ نے اثبات یا نفی میں جواب نہیں دیا۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس بارے میں مشورہ بھی کیا، حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں ان کی اس شرط کو قبول کر کے بات چیت کر لینی چاہیے، ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی سردار مسلمان ہو جائے تو اس سے ہم مسلمانوں کو فائدہ ہو گا۔ ابھی یہ مشاورت ہو رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرما دیا ”ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی یریدون وجھہ ما علیک من حسابھم من شیء وما من حسابک علیھم من شیء فتطردھم فتکون من الظالمین“ (سورۃ الانعام ۵۲) اور جو لوگ اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں انہیں آپ اپنے سے دور نہ کریں جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں، نہ آپ کے ذمے ان کا کوئی حساب ہے اور نہ ان کے ذمے آپ کا کوئی حساب ہے، اگر آپ نے انہیں اپنے سے دور ہٹایا تو آپ بے انصافوں میں سے ہوں گے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ اگر آپؐ نے ان بڑوں کی خاطر اپنے کمزور ساتھیوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیا ”فتکون من الظالمین“ تو ہمارے ہاں آپ کا شمار بھی

ظالموں میں ہوگا۔ جناب نبی کریمؐ جو ابھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر رہے تھے اور ابھی آپؐ نے اپنا ذہن واضح نہیں کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرما دیا کہ جناب ان امراء کی معاشرتی امتیاز برقرار رکھنے کی یہ منشا پوری نہیں ہوگی۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں، اور اس فیصلے میں بھی بہت سی حکمتیں ہوں گی۔ اس بارے میں ایک حکمت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ اگر اس وقت رسول اللہؐ چند لمحوں کے لیے یہ مجلس الگ کر لیتے تو قیامت تک امیروں کی مجلسیں غریبوں کی مجلسوں سے الگ ہو جاتیں، اگرچہ یہ ایک وقتی بات ہوتی لیکن بعد میں آنے والے سرداروں اور امراء کو یہ جواز مل جاتا اور پھر کوئی بڑا کسی غریب کو اپنے پاس نہ بیٹھنے دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ نازل فرمایا اور نبی کریمؐ کو اس ضابطے کا پابند کیا، قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ہم نے اپنے پیغمبر کو قانون اور ضابطے کے دائرے میں رکھا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کی تعلیم کے پیش نظر حضورؐ کے ذہن میں کبھی کوئی ایسی بات آئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرما دیا کہ جناب معاملہ ویسے نہیں ہوگا جیسے آپ سوچ رہے ہیں بلکہ ہمارے حکم کے مطابق ہوگا، یا پھر اگر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے کسی ایسے فیصلے کو قبولیت بخشی بھی تو تنبیہ کر دی کہ معاملہ اگر دوسرے طریقے سے ہوتا تو بہتر تھا۔ جیسے جناب نبی کریمؐ نے غزوۂ بدر کے موقع پر فدیہ لے کر قیدیوں کی رہائی کا جو فیصلہ کیا، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے تو اس پر عملدرآمد کر لیں لیکن اصل فیصلہ وہ ہوتا جس کے لیے حضرت عمرؓ نے رائے دی تھی۔

حضورؐ کی شہد کے استعمال نہ کرنے کی قسم

اسی طرح شہد کے معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں آج کے بعد شہد استعمال نہیں کروں گا۔ حضورؐ نے امت کے لیے شہد کو حرام قرار نہیں دیا تھا صرف اپنی ذات کے لیے اس کا استعمال منع فرمایا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کے بارے میں کس انداز سے ذکر فرمایا "یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک واللہ غفور الرحیم۔ قد فرض اللہ لکم تحلت ایمانکم واللہ مولاکم وھو العلیم الحکیم" (سورۃ التحریم ۱۔۲) کہ اے نبی! آپ کیوں حرام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے، آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں، اور اللہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔ اللہ نے آپ کے لیے اپنی قسموں کا توڑ دینا فرض کر دیا ہے اور اللہ ہی آپ کا مالک ہے اور وہی

سب کا جاننے والا، حکمت والا ہے۔ یعنی اللہ رب العزت نے فرمایا کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا ہمارا کام ہے، آپ ایسی چیز کو اپنے لیے کیوں حرام کر رہے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، اس لیے اللہ آپ کے لیے اس بات کو فرض کر رہا ہے کہ آپ قسم توڑیں، شہد کھائیں اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کریں۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے قسم توڑی، شہد کھایا، اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کیا۔ اس واقعے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے یہ تعلیم ہے کہ اللہ کا رسول کہتے ہی اسے ہیں جو اللہ کے احکامات کا پابند ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جناب نبی کریمؐ ہمارے رسول ہیں اور دین کے معاملے میں تمہارے لیے آخری اتھارٹی اسی لیے ہیں کہ وہ ہمارے قانون اور ضابطے کے پابند ہیں۔

اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے، ان واقعات میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تکوینی نظام کے تحت اس بات کی تعلیم کا اہتمام فرمایا کہ خود رسول اللہؐ کی ذات گرامی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے اپنے طرز عمل سے قانون کی پابندی کا یہ تصور دیا کہ عام آدمی تو ایک طرف، افضل الانبیاء حضرت محمد رسول اللہؐ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعیّن کیے گئے قانون اور ضابطے کے پابند ہیں۔

حدود شرعیہ کا نفاذ

حدود کہتے ہیں ان سزاؤں کو جو قرآن کریم نے متعیّن بیان فرما دی ہیں مثلاً چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، شادی شدہ زانی کی سزا سنگسار ہے جبکہ غیر شادی شدہ کی سزا کوڑے مارنا ہے، کسی پر بدکاری کی تہمت لگانے کی سزا قذف ہے، اور شراب کی سزا اجماع امت سے متعیّن ہے۔ جو جرائم حدود شرعیہ کے دائرے میں آتے ہیں ان کے متعلق عدالت میں قاضی جرم کے ثابت ہونے یا نہ ہونے پر تو بحث کر سکتا ہے لیکن جب جرم ثابت ہو جائے تو پھر قاضی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ سزا معاف کر سکے یا سزا میں کمی بیشی کر سکے۔ حد کا معنیٰ ہی یہ ہے کہ یہ معاملہ طے شدہ ہے۔ جج کے سامنے مقدمہ آئے گا تو جج اس بات کی تفتیش تو کرے گا کہ یہ جرم واقع ہوا ہے یا نہیں، لیکن جب جرم ثابت ہو جاتا ہے تو پھر سزا کے دینے میں جج کا کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا، وہ سزا بہر حال وہی دے گا جو قرآن کریم میں متعیّن کی گئی ہے۔

نسائی شریف میں ہے کہ حضرت صفوان بن امیہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے چوری کی، ہم نے اسے پکڑ کر پہلے تو خود لعن طعن کی اور پھر جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں

پیش کیا کہ یارسول اللہؐ اس نے چوری کی ہے، اس سے پوچھا گیا تو وہ مان گیا کہ ہاں میں نے چوری کی ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو، جب ہاتھ کٹنے کا وقت آیا تو جس شخص کی چوری ہوئی تھی اس نے کہا کہ یارسول اللہؐ میں اسے معاف کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ چور کو میرے پاس لانے سے پہلے پہلے معاف ہو سکتا تھا لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ کی تعلیم یہی ہے کہ جب کوئی مجرم پکڑا جائے تو قاضی کی عدالت میں پہنچنے سے پہلے پہلے آپس میں معاملہ رفع دفع کر لیا جائے تا کہ اسے اتنی بڑی سزا نہ ملے۔ لیکن اگر مجرم قاضی کی عدالت میں پہنچ جاتا ہے اور اس پر ایسا جرم ثابت ہو جاتا ہے جو حدود اللہ سے متعلق ہے تو پھر اس کے بعد سزا میں کمی بیشی یا سزا کے معاف کر دینے میں کسی کا اختیار نہیں رہتا۔

ایک اور مشہور واقعہ جو تاریخ میں مذکور ہے کہ بنو مخزوم کی فاطمہ نامی ایک خاتون نے چوری کی، اس کا جرم ثابت ہو گیا، رسول اللہؐ کی عدالت میں مقدمہ گیا۔ بنو مخزوم عرب کے معروف اور باعزت قبائل میں سے تھا، ان کے لیے یہ عزت کا مسئلہ بن گیا کہ ہمارے قبیلے کی خاتون کا ہاتھ کٹے گا تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ یہ خاتون سزا سے بچ جائے، کسی نے مشورہ دیا کہ رسول اللہؐ سے اس کے متعلق سفارش کی جائے، اور سفارش کے لیے نبی کریمؐ کے کسی قریبی ساتھی سے بات کی جائے۔ نبی کریمؐ کے اس وقت سب سے زیادہ چہیتے حضرت اسامہ بن زیدؓ تھے، یہ زید بن حارثہؓ کے بیٹے تھے جنہیں کسی وقت حضورؐ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا، اس لحاظ سے یہ آپؐ کے پوتے لگتے تھے۔ ان کا لقب ہی حب رسول اللہ تھا یعنی رسول اللہؐ کے محبوب نوجوان۔ مشورہ ہوا کہ اسامہ بن زیدؓ سے بات کی جائے کہ وہ حضورؐ سے سزا کی معافی کے بارے میں سفارش کریں، اس وقت اسامہ پندرہ سترہ برس کے نوعمر نوجوان تھے، اسامہؓ سے بات ہوئی تو اسامہ اس کام کے لیے تیار ہو گئے۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضورؐ آرام فرما رہے تھے، بیٹھ کر ٹانگیں دبانا شروع کیں اور پھر گفتگو کا آغاز کیا۔ یارسول اللہؐ ایک گزارش کرنے آیا ہوں بنو مخزوم کی فاطمہ کا مقدمہ آپ کے پاس ہے، آپؐ نے فرمایا، ہاں۔ اسامہؓ نے پوچھا آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا ہے؟ فرمایا، ہاں۔ یارسول اللہؐ وہ عزت والا خاندان ہے اس سے اس خاندان کی بہت بدنامی ہو گی۔ رسول اللہؐ جو لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا اسامہ! ''أتشفع فی حد من حدود اللہ'' کہ اللہ کے قانون

کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ لوگوں کو بلاؤ، لوگ اکٹھے ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ سفارشیں تلاش کرتے ہو؟ تمہیں اس کا علم نہیں ہے کہ اللہ تعالی کے ضابطے اور قانون کیسے ہیں؟ تم لوگ خدا کے قانون اور حدود کو نہیں سمجھتے؟ فرمایا "والذی نفس محمد بیدہ" اس پروردگار کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے "لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم" کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی اس کا ہاتھ بھی کٹے گا۔

آپ نے اس معاملے کی شدت بیان کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹوں گا اس لیے کہ خدا کے ضابطوں میں سفارش نہیں چلتی اور اللہ کے قانون میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جناب نبی کریمؐ نے قانون اور ضابطے کی پابندی کا یہ تصور دیا کہ جو بات اللہ تعالی نے طے کر دی ہے اسے تبدیل کرنے کا اختیار اللہ کے پیغمبر کے پاس بھی نہیں ہے، جب اللہ کے ضابطوں میں اللہ کے پیغمبر کا اختیار نہیں ہے تو اور کس کو مجال ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت

حضرات خلفائے راشدینؓ نے جس انداز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے قانون کی بالادستی کو اپنے عمل کے ساتھ مستحکم کیا، تاریخ ایسے بے مثال واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا معمول یہ تھا کہ صبح مسجد میں آکر تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے اور پھر فجر کے لیے مسجد میں ہی انتظار کیا کرتے تھے۔ ایک دن حسب معمول صبح مسجد کی طرف نکلے، قاتل گھات میں بیٹھا تھا، اس نے موقع تاک کر حضرت علیؓ پر وار کر دیا۔ حضرت علیؓ کو شدید زخمی حالت میں ان کے گھر لے جایا گیا، بڑے بیٹے حضرت حسنؓ جو حضرت علیؓ کے جانشین بھی ہوئے اور پھر جناب نبی کریمؐ کی پیشین گوئی کے مطابق انہوں نے امت کے دو بڑے طبقوں میں صلح کروا کر امت کو متحد بھی کیا۔ ان کے سامنے ان کا باپ زخمی حالت میں پڑا تھا اور موت کے آثار نمایاں تھے۔ ایسی صورت حال میں اولاد سے زیادہ غصہ کس کو ہو گا؟ حضرت حسنؓ نے طیش اور غصے میں یہ بات کہی کہ امیر المؤمنین اس قاتل کو تو میں اپنے ہاتھ سے قتل کرنے جاتا ہوں۔ حضرت علیؓ جو زخمی حالت میں تھے، موت سامنے نظر آ رہی تھی لیکن فرمایا، حسن! جب تک میں زندہ ہوں وہ قاتل نہیں ہے، اس لیے اگر اسے مارو گے تو تم خود قاتل بنو گے، لیکن اگر میں

مر گیا تو میرے مرنے کے بعد جو نئے امیر المؤمنین ہوں گے، یہ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس قاتل کو سزا دیں۔

اس معاملے کی حساسیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ حضرت علیؓ زندگی و موت کی کشمکش میں بھی اس قدر حاضر دماغی کے ساتھ ضابطے اور قانون کی بات فرما رہے ہیں کہ جب تک میں زندہ ہوں وہ شخص قاتل نہیں ہے اور میرے شہید ہونے کی صورت میں جو نیا امیر المؤمنین بنے گا، یہ اس کا کام ہے کہ وہ قاتل کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا دے۔ چنانچہ اپنے بیٹے سے فرمایا کہ تمہیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ تم قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس شخص کو قتل کر دو۔ یہ ان مثالوں میں سے ایک مثال ہے جو جناب نبی کریمؐ کے خلفاء نے قائم کیں اور دنیا کو بتایا کہ قانون کی بالادستی کسے کہتے ہیں۔

حضرت عثمان غنیؓ کا محاصرہ

امیر المؤمنین عثمان بن عفانؓ کا باغیوں نے محاصرہ کر رکھا تھا جبکہ اکثر صحابہ کرامؓ حج پر گئے ہوئے تھے، حضرت ابوہریرہؓ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا کہ امیر المؤمنین یہ چند سو باغی ہیں، آپ اپنے لشکر کو حکم دیں، دو تین گھنٹے میں ان کا صفایا ہو جائے گا۔ حضرت عثمانؓ جن کے تابع پورا عرب تھا، ان کے زمانے میں تو بلوچستان اور کابل تک اسلامی سلطنت آگئی تھی۔ فرمایا، دیکھو، رسول اللہؐ نے کسی مسلمان کے قتل کی اجازت تین صورتوں میں دی ہے۔ پہلی صورت یہ کہ وہ کسی کو قتل کرے تو قصاص میں اسے قتل کیا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ مرتد ہو جائے تو اسے قتل کیا جائے گا، اور تیسری صورت یہ ہے کہ بغاوت کرے تو اس جرم میں اسے قتل کیا جائے گا۔ ابھی تک ان تین صورتوں میں سے کوئی ایک جرم بھی انہوں نے نہیں کیا اس لیے میں اس وقت تک کوئی اقدام نہیں اٹھاؤں گا اور کسی کو تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دوں گا جب تک میں شوریٰ والوں سے مشورہ کر کے ان کا جرم متعیّن نہیں کر لیتا۔ صورتحال یہ تھی کہ کھانا اور پانی تک بند تھا، باغی باہر سے کسی کو اندر نہیں آنے دے رہے تھے، چھپ چھپا کر کوئی اکا دکا آدمی اندر آجاتا تھا۔ سوال ہوا کہ حضرت اگر ان باغیوں کے خلاف آپ نے تلوار نہیں اٹھانی تو پھر ان کا مطالبہ تسلیم کریں۔ فرمایا، یہ بھی نہیں کر سکتا۔ رسول اللہؐ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ عثمان! اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائیں گے، لوگ زبردستی اسے اتارنا چاہیں گے، لیکن تم نہ

اتارنا۔ فرمایا، میں نہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کروں گا اور نہ اپنی زندگی میں کسی مسلمان کے خلاف تلوار اٹھاؤں گا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اسلام کا سیاسی نظام خلافت ہے نہ کہ پاپائیت یا تھیاکریسی۔ جناب نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے خلفاء نے قانون اور ضابطے کو اپنی ذات پر مقدم رکھنے کی ایسی مثالیں پیش کیں کہ جن کی روشنی میں اسلامی نظام کو تھیاکریسی قرار دینے والوں کو بے انصاف کہے بغیر چارہ نہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا احتساب

امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تابعین میں سے تھے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کا پرتو تھے، انہوں نے واقعی حضرت عمرؓ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے حکومتی نظام میں بہت سی اصلاحات کیں، مورخین کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ جب مدینہ کے گورنر تھے تب مدینہ سے دمشق جاتے ہوئے ان کا ذاتی سامان ایک سو اونٹوں پر لدا ہوتا تھا، جو لباس صبح کے وقت پہنتے تھے، شام کے وقت نہیں پہنتے تھے، جو خوشبو وہ استعمال کرتے تھے بڑے بڑے امراء کو نصیب نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایسی شہزادگی کا دور بھی گزارا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی کایا کیسے پلٹی اور امیر المؤمنین بننے کے بعد انہوں نے کیا فیصلے کیے؟ ان کی اہلیہ فاطمہ بنت عبدالملکؒ تھیں جو کہ خود بھی ایک بڑے اموی خلیفہ کی بیٹی تھیں، اس کا گھر سامان اور زیورات سے بھرا پڑا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بننے کے بعد گھر آئے اور آکر اپنی اہلیہ سے کہا کہ فاطمہ! بات سنو، مجھ سے پہلے خلیفہ نے مجھے نامزد کیا تھا اور اب لوگوں نے میری بیعت کر لی ہے، میں لوگوں پر امیر بنا دیا گیا ہوں، امیر المؤمنین کی حیثیت سے جو اقدامات مجھے کرنے ہیں، ان کی ابتداء میں اپنے گھر سے کر رہا ہوں۔ یہ جو تمہارے گھر میں سامان پڑا ہے، یہ کپڑے، یہ زیورات، یہ فرنیچر، یہ سب تمہارے ذاتی پیسوں سے نہیں آئے، یہ تمہارے باپ اور بھائیوں نے تحفے میں دیا تھا، لیکن یہ سب بیت المال کا سامان ہے، مجھے سب سے پہلے بیت المال کی چیزیں بیت المال کو واپس بھجوانی ہیں۔ اپنی اہلیہ سے کہا کہ فاطمہؒ دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو، اگر یہ سامان رکھنا ہے تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گا، اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو ان میں سے ایک ایک چیز واپس کرنا ہوگی۔

فاطمہ بنت عبد الملکؒ ایک سمجھدار خاتون تھی، اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! میرا زیور بھی آپ ہیں اور میرا لباس بھی آپ ہیں۔ تاریخ نے پہلی بار دیکھا ہو گا کہ کسی شخص نے حکمران بننے کے بعد گھر میں سامان لانے کے بجائے گھر کا سامان باہر نکال دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ فاطمہ بنت عبد الملکؒ کے پاس بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ بچا، اس اللہ کی بندی نے بھی باقی کی زندگی اسی طرح گزاری جس طرح عمر بن عبد العزیزؒ نے گزاری، ورنہ جس عورت نے ایک شہزادی کی زندگی گزاری ہو کیا وہ ایک لمحہ بھی ایسی زندگی سے محروم رہ سکتی ہے؟ اس کے بعد امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے سارے خاندان کو اکٹھا کیا کہ میں امیر المؤمنین بنا دیا گیا ہوں، جس کسی کے پاس بیت المال کا کوئی بھی سامان ہے اسے وہ بیت المال کو واپس کرنا ہو گا، لیکن اس کی ابتداء انہوں نے اپنے گھر سے کی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تقریباً اڑھائی سال حکومت کی تھی کہ انہیں زہر پلا دیا گیا، لیکن انہوں نے ایک بار پھر حضرت عمر فاروقؓ کے دور کی یاد تازہ کر دی تھی کہ انصاف کی حکومت کسے کہتے ہیں اور خلافت کا نظام کیسا ہوتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کا قیصر روم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ

ہم تاریخ میں جب خلفاء کا ذکر کرتے ہیں تو نرمی کے دور کا آغاز حضرت معاویہؓ سے کرتے ہیں۔ خلفاء راشدین کا زمانہ تو بہت اعلیٰ معیار کا زمانہ تھا اس لیے حضرت معاویہؓ کی حکومت کو خلفائے راشدین کے مقابلے میں نرم حکومت کہا جاتا ہے، ایسی حکومت جس کی بنیاد رخصتوں پر تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں دو سپر طاقتیں تھیں، ایک دمشق اور دوسری روم۔ ایک طرف قسطنطنیہ کے علاقوں میں قیصر روم کی بڑی طاقت تھی، دوسری طرف اسلامی سلطنت تھی جس کا دارالحکومت دمشق تھا۔ حضرت معاویہؓ مسلمانوں کے متفقہ امیر تھے اور بڑے ذہین سیاست دان تھے، انہیں عرب کے چوٹی کے مدبرین میں شمار کیا جاتا ہے، بڑے ٹھنڈے، دھیمے اور سمجھدار آدمی تھے، انہوں نے ہی رومیوں کے خلاف پہلی جنگ لڑی۔

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ ایک موقع پر قیصر روم کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا ایک معینہ مدت کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ تھا، جب معاہدے کی مدت ختم ہونے کا وقت قریب آیا تو حضرت معاویہؓ نے دمشق سے لشکر تیار کیا اور سرحد کی طرف چل دیے، منصوبہ یہ تھا کہ معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے پہلے لشکر لے کر سرحد پر پہنچ جائیں اور جیسے

ہی مدت ختم ہو رومیوں پر چڑھائی کر دیں۔ اپنے ملک میں تو نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی، چنانچہ حضرت معاویہؓ اپنی کمان میں ہزاروں کا لشکر ساتھ لیے سرحد کی طرف رواں دواں تھے، ابھی چند دن کا سفر طے ہوا تھا کہ دیکھا کہ ایک آدمی دمشق کی طرف سے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آ رہا تھا۔ اس زمانے میں غیر معمولی طور پر اہم خبریں تیز رفتار گھڑ سواروں کے ذریعے پہنچائی جاتی تھیں۔ جب قریب آئے تو وہ عمرو بن عبسہؓ تھے۔ حضرت عمرو بن عبسہؓ بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ وہ آواز دیتے آ رہے تھے "معاویہ وفاء لا غدر، معاویہ وفاء لا غدر" کہ معاویہ! وفا کرنی چاہیے، غدر نہیں کرنا چاہیے، معاویہ! معاہدہ پورا کرنا چاہیے، توڑنا نہیں چاہیے۔ جب قریب پہنچے تو حضرت معاویہؓ نے پہلے تو حال احوال پوچھا، پھر پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ حضرت عمروؓ نے پوچھا کہ کیا آپ کا قیصر روم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ نہیں ہے؟ جواب ملا، معاہدہ تو ہے۔ پوچھا، کیا مدت ختم ہو گئی ہے؟ بتایا، نہیں ابھی تو مدت ختم نہیں ہوئی۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میں یقین دلاتا ہوں کہ مدت ختم ہونے سے قبل لڑائی نہیں کروں گا، میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے تک لشکر لے کر سرحد پر پہنچ جاؤں۔ حضرت عمروؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ ہو تو معاہدے کی مدت ختم ہونے تک اپنی فوجوں کو مرکز سے حرکت مت دو۔ حضرت معاویہؓ چونک پڑے اور پوچھا کیا آپ نے خود سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے ان کانوں نے سنا ہے، میرے دل نے اس بات کو محفوظ رکھا ہے۔۔ حضرت معاویہؓ نے لشکر کو حکم دیا کہ واپس دمشق چلو کہ اب کسی چال، کسی تدبیر، اور کسی حکمت عملی کی کوئی حیثیت نہیں اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم سامنے آگیا ہے، چنانچہ سب انہی قدموں پر دمشق واپس آ گئے۔

"خلافت" پاپائیت یا تھیا کریسی نہیں ہے

اسلام کے سیاسی نظام کا نام خلافت ہے اور خلافت حکمرانی کا نہیں بلکہ ذمہ داری کا نام ہے، اسلام میں پاپائیت کا تصور نہیں ہے کہ خلیفہ جو بات کہہ دے وہی حرف آخر ہے۔ خلافت کے نظام میں خلیفہ آخری اتھارٹی ہے لیکن وہ بھی ضابطے کا پابند ہے اور اس کے گرد بھی قانون کا حصار ہے۔ خلیفہ کا معنی کیا ہے؟ خلیفہ کا لفظی معنی "نائب" کا ہے اور نائب کے اپنے کوئی اختیارات نہیں ہوتے بلکہ وہ جس کا نائب ہوتا ہے اس کی بات لے کر آگے بڑھتا ہے۔ آج یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام تھیا کریسی ہے اور مسلمان خلافت اور خدا کی

نمائندگی کے نام پر دنیا بھر میں مذہب کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ خلیفہ کسے کہتے ہیں؟ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو آپ کا لقب ''خلیفۃ رسول اللہ'' تھا یعنی اللہ کے رسول کے خلیفہ۔ حضرت عمر فاروقؓ جب خلیفہ بنے تو ان کا لقب ہوا ''خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ'' یعنی رسول اللہؐ کے خلیفہ کے خلیفہ۔ ابتدائی چند دن تو یہی کہا جاتا رہا یا خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ لیکن پھر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہوئی اس طرح تو اگلے خلیفہ کے ساتھ تین دفعہ ''خلیفہ'' آئے گا۔ ایک دن حضرت عمرؓ کو حضرت عمرو بن العاصؓ نے ''یا امیر المومنین'' کہہ کر پکارا تو حضرت عمرؓ نے اس خطاب کو پسند کیا چنانچہ اس کے بعد سے اسلامی حکومت کے سربراہ کے لیے امیر المؤمنین کی اصطلاح رائج ہو گئی۔

حضرت صدیق اکبرؓ جنہیں خلیفۃ رسول اللہ کہا جاتا تھا، ایک دن ایک صحابی نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہہ دیا ''یا خلیفۃ اللہ'' اے اللہ کے خلیفہ۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا ''لست بخلیفۃ اللہ انا خلیفۃ رسول اللہ'' میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ میں رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے تو اس ایک جملے سے تھیاکریسی کا قصہ صاف کر دیا تھا۔ اللہ کے خلیفہ ہونے کا تصور کیا ہے؟ یہی کہ میں خدا کا خلیفہ ہوں میرے ساتھ خدا کا براہ راست تعلق ہے اور میری جو بات بھی ہے دراصل خدا ہی کی بات ہے۔ فرمایا کہ انبیاء خدا کے خلیفہ تھے، حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات خدا کی خلافت کرتے تھے، میں خدا کا نہیں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ رسول اللہؐ جو متعیّن حدود و قوانین اور ضوابط دے کر گئے ہیں وہ سب کے سامنے ہیں اور ایسا کوئی معاملہ نہیں بچا کہ جس کے متعلق خلیفہ خدا سے پوچھ کر بتائے، اس لیے ہم یہ گنجائش نہیں رکھنا چاہتے کہ کوئی خلیفہ یہ بات کہہ سکے میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہوں۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک جملے کے ساتھ ساری بات صاف کر دی کہ اسلام تھیاکریسی کا نام نہیں ہے اور اسلام کے حکومتی نظام خلافت میں پاپائیت کا اور خدا کی نیابت میں حکومت کرنے کا تصور نہیں ہے، اسلام میں خلافت قانون کی بالادستی کا نام ہے، جس طرح ایک عام آدمی قانون کا پابند ہے اسی طرح ایک خلیفہ بھی قانون کا پابند ہے۔ عام آدمی خلاف ورزی کرے گا تو خلیفہ پکڑے گا جبکہ خلیفہ خلاف ورزی کرے گا تو ایک عام آدمی پکڑے گا، دونوں ایک دوسرے کے محتسب ہیں۔ جناب رسول اللہؐ نے خود بھی قانون کی بالادستی کی حکومت قائم کی اور قانون کی بالادستی کا ایک نظام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس

لیے اسلام کے بارے میں یہ بات کہنا ناانصافی ہے کہ اسلام پاپائیت ہے۔ اسلام میں جس طرح ایک عام آدمی ضابطے اور قانون کا پابند ہے اسی طرح ایک حکمران حتی کہ اللہ کے رسول بھی ضابطے کے پابند ہیں۔

معاشی انصاف اور سیرت نبویؐ

(جامعہ الہدٰی، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۵ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام سے انسانی نسل کی تخلیق کی اور نسل انسانی کے بتدریج ارتقاء کے ساتھ انسانی معاشرہ قائم ہوا۔ کھانا پینا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، میل ملاقات، بیماری و صحت، حقوق و معاملات وغیرہ، انسانی معاشرے کے یہ عوامل شروع ہی سے انسان کے ساتھ چلے آرہے ہیں اور انسانی زندگی کی ضروریات انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہیں۔ بنیادی ضروریات تو تمام انسانوں کی ایک جیسی ہوتی ہیں تاہم انفرادی ضروریات انسان کے ذوق، قابلیت اور ترجیحات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ انسان کی ضروریات کیسی بھی ہوں وسائل کے ذریعے سے پوری ہوتی ہیں کیونکہ یہ دنیا وسائل اور اسباب کی دنیا ہے، اسباب اور وسائل کے بغیر اس دنیا میں زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ضابطے کے خلاف ہے۔ ایک وقت آئے گا جب انسانی زندگی جنت میں وسائل و اسباب کی محتاج نہیں ہوگی اور وہاں انسان کو اپنی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے محنت و مشقت کا راستہ اختیار نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن اس دنیا میں بہر حال اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی زندگی کو محنت و مشقت اور وسائل و اسباب کے ساتھ وابستہ کیا ہے، یوں نسل انسانی کے تمام لوگ کسی نہ کسی درجے میں اسباب اختیار کر کے ہی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

نسل انسانی میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سے زیادہ متوکل اور ان سے زیادہ دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا کوئی دوسرا طبقہ نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء کرامؑ نے بھی زندگی کے وسائل و اسباب اختیار کیے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں حسب ضرورت محنت مزدوری بھی کی، بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی۔ آپؐ نے ایک مرتبہ خود فرمایا کہ میں نے فلاں قبیلے کی بکریاں اتنی اجرت پر چرائی تھیں، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عام طور پر انبیاء کرام سے بکریاں چرانے کا کام لیا ہے۔ مفسرین کرام

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سے بکریاں چرانے کا کام اس لیے لیا کہ بکریوں کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے، بھیڑوں کو قابو کرنا آسان ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ دوسری بھیڑ کے پیچھے چلتی ہے لیکن ایک بکری دوسری بکری کے پیچھے نہیں چلتی۔ حضرت موسیٰؑ کے بکریاں چرانے کا قرآن کریم میں ذکر ہے کہ ان کا باقاعدہ آٹھ یا دس سال کا معاہدہ تھا جس کے تحت انہوں نے حضرت شعیبؑ بکریاں چرائیں۔ چنانچہ اسباب و وسائل کا اختیار کرنا اس دنیا میں لازمی ہے۔

اسباب اختیار کرنے میں توازن

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اسباب اختیار کیے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی لیکن آپؐ نے اس سلسلے میں ایک توازن قائم کیا، آپؐ نے اسباب کو ترک کرنے سے بھی منع فرمایا ہے اور اسباب پر مکمل بھروسہ کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ رسول اللہؐ کے پاس کوئی شخص سوال لے کر آتا تھا تو حضورؐ اس کی حالت کو پرکھتے تھے اگر وہ معذور یا مستحق ہوتا تو آپؐ اس کی مدد فرماتے تھے لیکن اگر صحت منداور کمانے کے قابل ہوتا تو اس کی رہنمائی فرماتے تھے، آپؐ اسے محنت و مزدوری کی تلقین کرتے اور کمانے کی ترغیب دیتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی کریمؐ کے پاس آیا اور آپؐ سے عرض کی کہ یارسول اللہ! محتاج ہوں میری مدد فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا اے اللہ کے بندے تم تندرست اور صحت مند آدمی ہو، محنت مزدوری کر کے کما سکتے ہو اس لیے جاؤ اور اپنے لیے کماؤ۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپؐ نے پوچھا کیا تمہارے پاس گھر میں کچھ بھی نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ گھر میں صرف لکڑی کا ایک پیالہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ اور گھر سے وہ پیالہ لے آؤ، وہ شخص گیا اور جا کر پیالہ لے آیا۔ آپؐ نے پیالہ لے کر مجلس میں اس کی بولی دی اور پوچھا کہ کوئی اس پیالے کی کتنی قیمت دے گا؟ ایک شخص نے کہا کہ میں ایک درہم دیتا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا کیا کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے؟ ایک شخص نے کہا کہ ڈیڑھ درہم دیتا ہوں۔ آپؐ نے پھر پوچھا کیا کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے؟ ایک نے کہا کہ دو درہم دیتا ہوں۔ فرمایا لاؤ، اس طرح آپؐ نے وہ پیالہ نیلام کر کے بیچ دیا۔ اس رقم سے نبی کریمؐ نے کلہاڑی کا پھل خریدا اور اپنے ہاتھ سے لکڑی کا دستہ اس میں ڈالا۔ پھر اس سوال کرنے والے شخص سے فرمایا کہ یہ کلہاڑی لے کر جنگل میں جاؤ، لکڑیاں کاٹو اور لا کر بازار میں بیچو، چند دن بعد آکر مجھے بتانا کہ کیا صورت حال ہے۔ وہ شخص کلہاڑی

لے گیا، چند دن گزرے تو وہ شخص دوبارہ آیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میں حسب حکم حاضر ہوں۔ آپؐ نے پوچھا کیا صورتحال ہے؟ اس نے بتایا کہ یارسول اللہ گھر میں آٹا بھی ہے، کھجوریں بھی ہیں اور کھانے پینے کے برتن بھی ہیں۔ فرمایا یہ حالت بہتر ہے یا پہلے والی حالت بہتر تھی؟

اسباب ترک کرنے سے ممانعت

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباب ترک کرنے سے منع فرمایا ہے، فرمایا کہ توکل اسباب ترک کردینے کا نام نہیں ہے کہ انسان اسباب کو بالکل چھوڑ دے۔ ایک دفعہ جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں کہیں سے ایک مہمان آیا، آپؐ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ کوئی باہر سے مہمان آتا تو آپؐ پہلے اس سے کھانے پینے کے متعلق پوچھتے، سواری کے جانور کے متعلق پوچھتے کہ اسے کہاں باندھا ہے اس کی خوراک وغیرہ کا انتظام کیا ہے اور رہنے کا بندوبست کہاں ہے؟ کوئی دور سے آدمی آتا تو آپؐ اس سے ان ضروریات کے متعلق دریافت فرماتے۔ آپؐ نے اس شخص سے پوچھا کیسے آئے ہو؟ اس نے بتایا کہ اونٹ پر آیا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا کہ اونٹ کہاں ہے؟ کہنے لگا کہ باہر چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے پوچھا باہر کہاں چھوڑ دیا ہے؟ اس نے کہا کہ بس اللہ کے توکل پر باہر چھوڑ آیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، بندۂ خدا توکل اس کا نام نہیں ہے پہلے جا کر اس کی رسی کسی جگہ پر باندھو اور پھر اللہ پر توکل کرو۔ یعنی اس کی حفاظت کا جتنا بندوبست تمہارے ذمے ہے وہ تم کرو اور اس کے بعد اسے اللہ کے بھروسے پر چھوڑو۔ رسول اللہؐ نے تعلیم یہ دی کہ جو تمہارے بس میں ہیں وہ اسباب اختیار کرو اور پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ د۔ اس لیے کہ اسباب کا اختیار کرنا انسان کے بس میں ہے لیکن نتیجہ انسان کے بس میں نہیں ہے، اسباب پر بھروسہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسباب کے پیدا کرنے والے پر بھروسہ ہونا چاہیے کہ اے اللہ جو میرے بس میں تھا میں نے کر دیا ہے اب تو مہربانی فرما۔

اسلامی نظام معیشت کا بنیادی اصول

آج کی دنیا کے مروجہ معاشی علوم نے فلسفے اور سائنس کے طور پر گزشتہ چند صدیوں میں منظم شکل اختیار کی ہے، لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کی تعلیمات کی روشنی میں خلفائے راشدینؓ نے آج سے کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال قبل اسلامی نظام حکومت

کے تحت معاشی حقوق اور معاشی عدل کا ایک عظیم الشان تصور قائم کر دیا تھا اور پھر اپنی زندگیوں میں اس تصور کے عملی نمونے بھی پیش کر دیے تھے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے تو ایک ہی جملے میں اسلام کے نظام معیشت کا خلاصہ بیان فرما دیا "کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" (سورۃ الحشر ۷) تاکہ دولت تمہارے دولتمندوں میں ہی نہ گھومتی رہے۔

اس آیت میں پہلے اللہ تعالی نے ضرورت مندوں کے حقوق بیان کیے، پھر یہ جملہ فرمایا کہ یہ دولت تقسیم کرنے کا نظام ہم نے اس لیے دیا ہے تاکہ دولت صرف دولتمندوں میں ہی نہ گھومتی رہے بلکہ سارے معاشرے میں گردش کرے۔ اسلام کے معاشی نظام کا مقصد ہی یہ ہے کہ دولت معاشرے میں صرف مالداروں کے پاس ہی نہ رکی رہے بلکہ ایک خودکار طریقے پر معاشرے کے تمام طبقات میں تقسیم ہوتی رہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ معاشرے میں دولت کی مثال ایسے ہے جیسے انسانی جسم میں خون، کیونکہ جسم کے ہر حصے کو اپنی ضرورت کے مطابق خون ملتا رہے تو جسم کا نظام ٹھیک چلتا رہتا ہے۔ انگلی کی ضرورت الگ ہے، کان کی ضرورت الگ ہے اور بالوں کی ضرورت الگ ہے، یوں کسی عضو کو کم ضرورت ہے اور کسی کو زیادہ۔ اگر جسم کے کسی حصے میں خون ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو وہاں پھوڑے پھنسیاں بن جاتے ہیں، جلد خراب ہو جاتی ہے اور پیپ پیدا ہو جاتی ہے، ضرورت سے زیادہ خون جلد کو فاسد کر دیتا ہے، جبکہ ضرورت سے کم خون فالج کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے خون کا پورے جسم میں ایک تناسب اور توازن کے ساتھ گردش کرنا اچھی صحت کے لیے ضروری ہے۔ یہی اصول قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ دولت کا معاشرے میں ایک تناسب کے ساتھ گردش کرنا لازمی ہے، ہر ایک کو اس کا حصہ ملنا ضروری ہے اور دولت کا کسی ایک جگہ بلا ضرورت جمع ہو جانا نظام معیشت کی خرابی کا باعث ہے۔

دولت کی گردش

چنانچہ دو چیزیں اسلامی نظام میں ایسی ہیں جو دولت کی تقسیم اور گردش کا ذریعہ ہیں: (۱) وراثت (۲) زکوۃ۔

ایک آدمی ساری زندگی محنت کر کے جو جائیداد بناتا ہے، وہ اس کے فوت ہونے کے بعد اس کی اولاد میں تقسیم کر دی جاتی ہے، اگر اس کی اپنی اولاد نہ ہو تو پھر یہ جائیداد رشتہ داروں

میں درجہ بدرجہ تقسیم ہوتی ہے۔ اسی طرح جب اس آدمی کی اولاد کی وفات کا وقت آتا ہے تو ان کی جائیداد آگے ان کی اولاد میں تقسیم ہو جاتی ہے، یوں تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ معاشرے میں دولت کی گردش کو جاری رکھتا ہے، اور یہی وراثت کا اصل مقصد ہے کہ وراثت کی تقسیم دولت کو ایک جگہ پر منجمد نہیں رہنے دیتی۔

زکوۃ بھی دولت کو تقسیم کرتی ہے کہ دولتمند لوگ اپنی دولت کا چالیسواں حصہ ہر سال فقراء، غرباء و مساکین کو دیتے ہیں، زکوۃ کے ذریعے مجموعی طور پر ایک خطیر رقم معاشرے کے نادار لوگوں تک ہر سال پہنچتی رہتی ہے۔ زکوۃ کے احکام دولت کی جنس کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اسلام نے دولت کی تقسیم ایسے نظم کے تحت کی ہے جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے، اور جس میں حقوق کا تعین مساوات کی بنیاد پر ہے۔

ریاست کی طرف سے وظائف کی تقسیم

تاریخ میں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کے درمیان ایک دلچسپ اختلاف مذکور ہے، خلافت راشدہ کے قیام کے بعد جو پہلا باضابطہ اختلاف ہوا جس میں حضرت ابوبکرؓ اپنے موقف پر قائم رہے اور حضرت عمرؓ اپنے موقف پر قائم رہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ جب خلیفہ بنے تو سب سے پہلا مال بحرین سے آیا، حضرت بلالؓ جو مہم پر تھے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات سے چند روز بعد واپس آئے، بحرین سے جتنا مال آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اتنا مال کہیں سے نہیں آیا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے شوری والوں کو بلایا کہ بھئی مال آیا ہے اور تقسیم کرنا ہے لیکن پہلے ہمیں تقسیم کے اصول طے کرنے ہوں گے کہ کس کو کتنا حصہ ملے، اس پر شوری کے اراکین میں بحث ہوئی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا موقف

حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ وظائف کی تقسیم میں فضیلت کے درجات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً ازواج مطہرات کو سب سے زیادہ دیا جائے، پھر مہاجرین کو، پھر انصار کو اور اس کے بعد دوسرے مسلمانوں کو اور اس کے لیے باقاعدہ درجہ بندی کی جائے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے یہ تھی کہ فضیلت کا تعلق آخرت سے ہے، اس کا لحاظ بروز قیامت ہو گا کہ جو زیادہ فضیلت والا ہے وہ جنت میں زیادہ اونچے درجات پر پہنچے گا، جنت کے درجات ثواب کے حساب سے ہوں گے، یعنی فضیلت کا تعلق آخرت میں ثواب اور اجر سے ہے۔ جبکہ یہ دنیا اسباب اور حقوق کی دنیا ہے، اس دنیا کے معاملات حقوق پر ہیں

اور حقوق میں سب برابر ہیں، رعیت میں سب یکساں حقوق کے حصے دار ہیں، اس لیے جتنا حصہ مہاجر کو ملنا چاہیے اتنا ہی انصاری کو ملنا چاہیے، وظیفہ سب کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اڑھائی سے تین سالہ دور خلافت میں یکساں حصے تقسیم کیے گئے، جو حصہ حضرت عائشہؓ کو ملا وہی حضرت بلالؓ کو ملا، جو بدری کو ملا وہی احد والے کو ملا۔

یہاں ایک فرق ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے موقف کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جس کے پاس زیادہ ہے اس سے چھین کر سب کو برابر دیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو حقوق ریاست دیتی ہے ان حقوق میں برابری ہو، جو وظیفے بیت المال دیتا ہے اس میں سب کے ساتھ برابری کا معاملہ ہو، اب جس کو پیسے ملے ہیں اس کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ اس رقم کو کیسے استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک باپ نے اپنے دو بیٹوں کو اپنی کمائی میں سے دس دس ہزار روپے دیے، اس نے اولاد کے ساتھ برابری کا حق ادا کر دیا۔ اب یہ عین ممکن ہے کہ اولاد میں سے ہر ایک کی صلاحیتیں اور ذوق دوسرے سے مختلف ہوں، ایک نے رقم جمع کر کے کوئی کاروبار کیا اور اگلے سال تک زیادہ پیسے بنا لیے۔ دوسرے نے اپنی روز مرہ ضروریات اتنی بڑھا لیں کہ اسی پر سب پیسے خرچ ہو گئے اور سال کے آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ بچا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے یہ تھی کہ ریاست سب کے ساتھ برابری کرے، اس میں ترجیحات نہ ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ کا موقف

حضرت عمر فاروقؓ خود مجتہد اور صاحب علم آدمی تھے، حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ میں جو فضیلت کے درجات ہیں، اس کے حساب سے تقسیم کے حصے طے ہونے چاہئیں۔ اس لحاظ سے سب سے زیادہ حصہ ازواج مطہرات کو ملنا چاہیے، اس سے کم حضورؐ کے باقی خاندان کو یعنی بیٹیاں وغیرہ، پھر مہاجرین و انصار کو۔ اسی طرح مختلف غزوات میں شریک ہونے والوں میں بھی ترجیح ہونی چاہیے کہ بدر والوں کو زیادہ ملے اور باقی غزوات والوں کو درجہ بدرجہ ان سے کم ملنا چاہیے، یعنی مال کی تقسیم فضیلت کے اعتبار سے ترجیحات کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق مسلمانوں کے دلوں میں جو عقیدت کی ترجیحات ہیں اور جو فضیلت کے درجات ہیں ان کے مطابق دولت تقسیم ہو۔ مثلاً جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ترتیب بیان فرمائی ہے "والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ" اور سب سے پہلے

ایمان لانے والوں میں مہاجرین اور انصار اور جو نیکی میں ان کے پیروی کرنے والے ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے اپنی دیانت دارانہ رائے کے مطابق فہرستیں مرتب کرائیں اور فضیلت کے اعتبار سے تقسیم کا نظام قائم کیا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے دس سال یہی طریقہ کار چلتا رہا۔ کتاب الخراج میں امام ابو یوسفؒ روایت نقل کرتے ہیں کہ آخری سال ایک مجلس میں حضرت عمرؓ نے یہ بات کہی کہ بھئی بات سنو، میں نے شیخ (حضرت ابوبکرؓ) کی رائے سے اختلاف کیا تھا، اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی بات ٹھیک تھی۔ اس لیے کہ ترجیحات میں جب تفاوت ہوا تو معاشرے میں مختلف طبقات بن گئے، اور یہ فطری بات ہے کہ جب لوگوں کے ساتھ لین دین مختلف ہوگا تو اس سے مختلف طبقات بھی بنیں گے۔ جیسے مثال کے طور پر عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں سرکاری ملازمین میں جو گریڈ سسٹم ہے، وہ ہمارے ہاں تعارف کی بنیاد ہی بن گیا ہے، کسی سرکاری ملازم کا ذکر ہوتا ہے تو ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ فلاں گریڈ کا ٹیچر ہے یا فلاں گریڈ کا افسر ہے۔ بلکہ یہ گریڈ سسٹم معاشرے میں تفاوت کا سبب بھی بن گیا ہے کہ اونچے گریڈ والے کو نچلے گریڈ والے سے کوئی کام پڑ جائے تو وہ اس سے درخواست کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے تفاوت کے اصول پر وظائف تقسیم کیے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی منظور تھا۔ لیکن آخری سال یہ اعتراف فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے میری رائے کے مقابلے میں زیادہ ٹھیک تھی، آئندہ سال اگر مجھے موقع ملا تو میں خلیفہ اول کا سسٹم بحال کر دوں گا، لیکن حضرت عمرؓ کو آئندہ سال موقع نہ ملا کہ انہیں شہید کر دیا گیا۔ جبکہ حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے پہلے موقف کے حامی تھے، چنانچہ وہی نظم چلتا رہا۔

دولت کی تقسیم میں ریاست کا صوابدیدی اختیار

یہاں علماء نے بڑی دلچسپ بحث کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی آراء ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں، دونوں نے بحیثیت امیر المؤمنین اپنی اپنی رائے پر عمل کیا، جبکہ صحابہؓ نے دونوں کا ساتھ دیا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کی گنجائش رکھی ہے۔ یہ حالات پر منحصر ہے کہ اگر حالات کا تقاضا برابری کا ہو تو اس کے لیے خلیفہ اول کی مثال سامنے ہے، اور اگر

حالات کا تقاضا ترجیحات کا ہو تو اس کی گنجائش بھی ہے کہ خلیفہ دوم نے اسی پر عمل کیا ہے۔ اگر اسلامی حکومت اپنے ملک میں حالات محسوس کرے کہ برابری کی ضرورت ہے تو اس کی گنجائش بھی موجود ہے، لیکن اگر ترجیحات کی ضرورت ہو تو اس کی مثال بھی موجود ہے۔

غزوۂ حنین کے دو اہم واقعات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں غزوۂ حنین ایک مشہور معرکہ ہے، بنو ھوازن کے ساتھ لڑائی تھی اور وہ لوگ ان گنت جانور اور بے تحاشا مال و دولت ساتھ لے کر میدان جنگ میں آئے تھے، جس میں سونا وغیرہ بھی تھا، فتح کے نتیجے میں یہ سب مال غنیمت کی صورت میں مسلمانوں کے ہاتھ آگیا، اس غزوہ میں مسلمانوں کو مال بھی بہت ملا اور قیدی بھی بہت ہاتھ آئے۔ دستور کے مطابق رسول اللہؐ نے مال غنیمت بھی تقسیم فرمادیا اور قیدی بھی بطور غلام تقسیم فرمادیے۔ اس غزوہ میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔

انصار مدینہ کی فضیلت

ایک تو یہ کہ رسول اللہؐ نے مال کی تقسیم میں نومسلموں کو ترجیح دی، خاص طور پر جو لوگ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے ان کو زیادہ نوازا۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ لوگ شکست کے بعد ایسی صورت حال میں مسلمان ہوئے تھے کہ بظاہر ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا اس لیے حضورؐ نے حوصلہ افزائی کے لیے ان لوگوں کو زیادہ حصہ دیا کہ ان کے دل میں مجبوری یا جبر کے ساتھ مسلمان ہونے کا خیال نہ آئے، اب اتفاق کی بات یہ تھی کہ ان میں حضورؐ کے خاندان کے افراد زیادہ تھے۔ چنانچہ انصار مدینہ میں سے کسی نوجوان کی زبان پر یہ بات آگئی کہ ماریں ہم کھاتے رہے اور سونا چاندی یہ لوگ لے گئے۔ انسان کمزور ہے کبھی ایسی بات زبان پر آجاتی ہے، کہنے والے کے دل میں یہ خیال آگیا کہ بدر میں، احد میں، خندق میں ہم نے لڑائیاں لڑیں اور آج دولت کی تقسیم کی باری آئی ہے تو قریشی غالب آگئے۔ رسول اللہؐ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے حکم فرمایا کہ انصار مدینہ ایک جگہ اکٹھے ہوں۔ یہ ایک بہت عظیم طبقہ تھا جتنی قربانیاں انصار مدینہ نے دیں اور جتنا ایثار انہوں نے دکھایا دنیا کا اور کوئی طبقہ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جب انصار اکٹھے ہوئے تو حضورؐ نے ان سے فرمایا، مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ماریں کھانے اور لڑائیاں لڑنے میں ہم آگے رہے جبکہ مال غنیمت کا سونا چاندی اور مال مویشی قریش والے لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو تو میں نے اس لیے زیادہ دیا

ہے کہ یہ نومسلم ہیں اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم انصار لوگوں کی خدمات اور قربانیوں میری نظروں سے اوجھل نہیں ہیں "والذی نفس محمد بیدہ لو سلک الناس وادیا وسلکت الانصار وادیا لسلکت وادی الانصار" اس پروردگار کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے اگر ساری دنیا کے لوگ ایک طرف چل پڑیں اور انصار دوسری طرف چلیں میں انصار کے ساتھ چلوں گا۔ کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ لوگوں کے لیے بکریاں اور مال ہوں لیکن تمہارے لیے محمدؐ ہوں؟ اس پر انصار بیک وقت پکار اٹھے "رضینا باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیا"۔

حقوق کے معاملے میں انفرادی رائے معلوم کرنا

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ بنو ھوازن کے لوگ رسول اللہؐ کے پاس وفد لے کر آ گئے، کہنے لگے جناب جو ہوا سو ہوا کہ آپ کو فتح حاصل ہوئی اور ہمیں شکست ہو گئی لیکن ہماری بہت بے عزتی ہوئی ہے، لڑائی میں شکست کی وجہ سے نہیں بلکہ قیدی اور بہت سا مال آپ کے قبضے میں آنے سے۔ اگر آپ مہربانی فرما کر ہمارے قیدی اور مال واپس کر دیں تو ہماری کچھ عزت بحال ہو جائے گی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں چیزیں نہیں ملیں گی ایک چیز کا انتخاب کر لو، یا قیدی واپس لے لو یا مال لے لو۔ یہ سب چیزیں ہم نے میدان جنگ میں قبضہ کی ہیں اصولی طور پر تو تمہارا دونوں پر حق نہیں بنتا لیکن ہماری پیشکش یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک چیز واپس لے سکتے ہو۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ ہم مشورہ کر کے آپ کو بتائیں گے، وہ لوگ جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں ایک بار پھر آئے اور کہا کہ ہم نے مشورہ کر لیا ہے ہمیں مال نہیں چاہیے بلکہ ہمارے قیدی واپس کر دیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا، ٹھیک ہے لیکن معاملہ یہ ہے کہ قیدی تو تقسیم کیے جا چکے ہیں، جن لوگوں کو یہ قیدی دیے گئے ہیں ان سے بات کر کے میں آپ لوگوں کو بتاؤں گا کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

چنانچہ آپؐ نے اپنے لشکر کے ساتھ بات کی کہ اس طرح بنو ھوازن کا وفد آیا تھا وہ اپنا مال اور قیدی واپس مانگ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ مال یا قیدیوں میں سے ایک واپس لے لو، وہ دوبارہ آئے ہیں اور اپنے قیدی واپس لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں، میں دونوں میں سے ایک چیز واپس کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اگر تم لوگ بخوشی قیدی واپس کر دو تو تمہاری مرضی ہے اگر نہیں کرنا چاہتے تو مجھے بطور قرض دے دو، میں اگلے موقع پر پہلے تم لوگوں کا قرض ادا کروں گا اور پھر باقیوں کو دوں گا۔ تمام صحابہ کرامؓ نے بیک وقت کہا کہ یا

رسول اللہ! ہم بخوشی واپس کرتے ہیں۔ آپ نے جو وعدہ کیا ہے وہ ہم پورا کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں بھئی اس طرح نہیں کیونکہ مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ تم میں سے کون خوشی کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہے اور کون اپنے آپ کو اس کے لیے مجبور سمجھ رہا ہے۔ فرمایا جاؤ اپنے اپنے خیموں میں، تمہارے قبیلوں اور گروپوں کے جو عرفاء یعنی نمائندے ہیں وہ تم سے رات کو بات کریں اور پھر صبح کو آکر مجھے تمہاری رضا کے متعلق بتائیں تب میں فیصلہ کروں گا۔ چنانچہ رات درمیان میں گزری، دوسرے دن رسول اللہؐ کے پاس تمام گروپوں کے عریف آئے کہ یارسول اللہؐ ہم نے اپنے ساتھیوں سے بات کرلی ہے سب قیدیوں کو بخوشی واپس کرنے پر راضی ہیں، اس طرح رسول اللہؐ نے قیدی واپس کردیے۔ رسول اللہؐ نے حقوق کے معاملے میں رائے معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتلایا کہ جب تک سب کے بارے میں انفرادی طور پر تسلی نہ ہو جائے، قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ نبی کریمؐ نے یہاں یہ بتایا کہ جہاں حقوق کی بات ہو وہاں گول مول بات نہیں چلتی۔

حکمرانی، ایک ذمہ داری نہ کہ ذریعۂ عیش وعشرت

خلافت راشدہ میں دفتری نظام، فہرستیں، اعداد و شمار، مردم شماری، یہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں شروع ہوئی، پھر حضرت عمر فاروقؓ نے اس نظام کے تحت وظائف کی تقسیم کا اہتمام کیا۔ حضرت عمرؓ اپنے عمال یعنی گورنروں کو جو ہدایات فرمایا کرتے تھے ان میں دو تین باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں دو قسم کے عامل ہوتے تھے۔ ایک عامل ہوتا تھا منتظم، اور ایک ہوتا تھا قاضی۔ اس کے علاوہ ایک اور ذمہ داری لوگوں سے زکوۃ وعشر اور بیت المال کے واجبات وصول کرنے کی ہوتی تھی۔ حسب ضرورت ایک آدمی کو بھی مختلف ذمہ داریاں دے دی جاتی تھیں اور کبھی ایک ڈیوٹی پر ایک سے زیادہ آدمی متعیّن کر دیے جاتے تھے۔ خلافت راشدہ کا اصول یہ تھا کہ حکمرانوں اور رعیت کے درمیان معیار زندگی میں زیادہ فرق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی ہدایات تھیں کہ کوئی گورنر

- اپنے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنا سکتا۔
- ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا۔
- باریک لباس نہیں پہن سکتا۔
- چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھا سکتا۔

ترکی گھوڑے پر سفر کرنا، گھر کے آگے ڈیوڑھی بنوانا، باریک لباس پہننا اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانا اس زمانے میں عیش و عشرت کی علامات تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو خبر ملی کہ ان کے ایک گورنر عیاض بن غنمؓ نے باریک لباس پہننا شروع کر دیا ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے نمائندے حضرت محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا کہ جا کر اس معاملہ کی تحقیق کرو۔ اگر یہ خبر درست ہے تو گورنر صاحب جس حالت میں ہوں اسی حالت میں انہیں اپنے ساتھ لے کر آؤ۔ محمد بن مسلمہؓ گئے اور جا کر عیاض بن غنمؓ سے کہا کہ گورنر محترم! امیر المؤمنین کا حکم یہ ہے کہ اگر میں آپ کو باریک لباس پہنے دیکھوں تو آپ کو اسی حالت میں پکڑ کر امیر المؤمنین کے پاس لے جاؤں، اس لیے آپ کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کریں اور میرے ساتھ چلیں، چنانچہ وہ گورنر صاحب کو لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے عیاض بن غنم سے فرمایا کہ اچھا! اب تجھے لوگوں پر حکمرانی کا شوق آ گیا ہے، تم نے حکمرانی کو لذت کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ فرمایا کہ جناب گورنر! یہ کرتا اتاریں اور بکری کے بالوں کا بنا ہوا جبہ پہنیں آپ کے ذمے ایک نئی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے کہ آج کے بعد آپ بیت المال کی بکریاں چرایا کریں گے۔ چنانچہ چھ مہینے تک عیاض بن غنمؓ نے ننگے بدن پر بکری کے بالوں کا جبہ پہن کر بیت المال کی بکریاں چرائیں۔ چھ مہینے گزرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے بلا کر پوچھا کہ جناب کچھ مزاج ٹھکانے آئے ہیں؟ عیاض بن غنمؓ نے کہا کہ جی امیر المؤمنین آ گئے ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے انہیں ایک بار پھر گورنر مقرر کر دیا۔ یہ حضرت عمرؓ کا اپنے عمال کے ساتھ معاملہ تھا، یعنی یہ بتایا کہ جو عام لوگوں کا حق ہے وہی تمہارا حق بھی ہے اور یہ کہ حکمرانی نے تمہارے ساتھ سرخاب کے پر نہیں لگا دیے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور صحابہؓ میں بہت بڑی شخصیت تھے آپؓ السابقون الاولون میں سے تھے اور ایران کے فاتح تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کوفہ کا گورنر مقرر کیا ہوا تھا، حضرت عمرؓ کو یہ شکایت ملی کہ حضرت سعدؓ نے اپنے گھر کے دروازے کے آگے ایک ڈیوڑھی بنوا رکھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا اور فرمایا کہ اگر ڈیوڑھی دیکھو تو ڈیوڑھی گرا کر پھر انہیں بتانا کہ میں نے ایسا کرنے کے لیے کہا ہے۔ حضرت سعدؓ اپنے گھر بیٹھے تھے کہ باہر شور مچ گیا کہ امیر کوفہ کی ڈیوڑھی گر گئی ہے۔ باہر نکل کر دیکھا تو محمد بن مسلمہؓ تھے سب کو پتہ چل گیا کہ کون آیا ہے اور ڈیوڑھی کس وجہ سے

گری ہے، محمد بن مسلمہؓ نے بتایا کہ امیر المؤمنین کا حکم تھا کہ ڈیوڑھی گرا کر پھر آپ کو بتایا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ لوگوں اور حکمرانوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ ہو اور ان کے حقوق و معاملات اور معاشرت میں فرق نہ آنے پائے۔ اگرچہ وظائف کی تقسیم میں ترجیحات کا طریقہ کار تھا لیکن عمومی پالیسی یہ تھی کہ ہر آدمی کو عمال تک، سرکاری حکام تک رسائی حاصل ہونی چاہیے اور انہیں ان کا حق بلا تاخیر ملنا چاہیے۔

ہر پیدا ہونے والے بچے کے لیے وظیفہ

ہر وہ بچہ جو دودھ پینے کی عمر سے گزر جائے، حضرت عمر فاروقؓ نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا۔ ایک دن رات کو گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے ایک بچے کے مسلسل رونے کی آواز آرہی تھی، پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک بچہ ماں کی گود میں مسلسل روئے جارہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بچہ ماں کی گود میں زیادہ دیر نہیں رو نہیں سکتا، ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ماں بچے سے دودھ چھڑانا چاہتی ہے تاکہ بچے کا وظیفہ مقرر ہو جائے لیکن بچہ ابھی ایک سال کا ہے اور دودھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ آپؓ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ عمر کی مملکت میں اتنا ظلم ہو رہا ہے، حضرت عمرؓ نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ مائیں اس پالیسی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وظیفہ حاصل کرنے کی لالچ میں اپنے بچوں سے دودھ چھڑوا رہی ہیں۔ آپؓ نے حکم دیا کہ آج کے بعد بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

ذمی کے لیے وظیفہ

ذمیوں یعنی اسلامی ریاست میں بسنے والے غیر مسلموں کے لیے بھی وظیفے مقرر تھے، ایک دن حضرت عمرؓ بازار میں جا رہے تھے دیکھا کہ ایک بوڑھا یہودی بازار میں مانگ رہا تھا۔ پوچھا کہ یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ ایک یہودی ہے۔ پوچھا مانگ کیوں رہا ہے کیا اسے وظیفہ نہیں ملتا؟ بوڑھے کو نہیں پتہ تھا کہ یہ حضرت عمرؓ ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ عمر کو جزیہ دینا ہوتا ہے اب میرے پاس اتنے پیسے نہیں بچتے کہ جزیہ دے سکوں۔ حضرت عمرؓ پریشان ہو گئے اور واپس آکر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ذمی لوگ جوانی میں تو محنت مزدوری کر کے

ہمیں جزیہ دے سکتے ہیں، بڑھاپے میں کیا کریں۔ پھر یہ حکم جاری کیا کہ تحقیق کرو کہ جو غیر مسلم کمانے کے قابل نہیں رہا اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا اور جو اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکتا اسے بیت المال سے وظیفہ دیا جائے گا۔ فرمایا ایسے اور لوگوں کو تلاش کرو جو جزیہ ادا کرنے کے لیے اس طرح پریشان ہو رہے ہوں گے، یعنی ریاست کے ذمے ہر شہری کے حقوق ہیں۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ لباس، کھانا پینا اور شادی بھی ریاست کے ذمے ہے، اگر کوئی آدمی اپنی شادی کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتا تو ریاست اس کی شادی کا خرچ اٹھانے کی ذمہ دار ہے، کوئی آدمی اپنا مہر ادا نہیں کر سکتا تو ریاست اس کا مہر ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے اسلامی فلاحی ریاست کا جو تصور دیا وہ یہی ہے کہ مملکت کے شہری سکون سے رہیں اور ہر فرد کو اس کا صحیح حق ملے۔ یہی جناب نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں معاشی انصاف کا دائرہ ہے۔

دعوت اسلام اور سیرت نبویؐ

(جامعہ الہدیٰ، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۵ء)

بعد الحمد والصلوۃ۔ دعوت اسلام کے حوالے سے میں تین پہلوؤں پر بات کروں گا۔ پہلی بات یہ کہ اسلام کی دعوت کی بنیادی حیثیت و نوعیت کیا ہے۔ دوسری بات اس الزام کی حقیقت کو واضح کرنا کہ رسول اللہؐ نے اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا تھا اور یہ کہ اسلام دنیا میں طاقت کے بل پر پھیلا ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ اسلام کی دعوت اور دوسروں کو اسلام کی طرف بلانے کے حوالے سے رسول اللہؐ کا طریقہ کار کیا تھا۔

دعوت اسلام کی بنیادی حیثیت و نوعیت

جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات بھی دنیا میں آئے ان کی نبوت علاقہ، قوم اور وقت کے لحاظ سے محدود تھی۔ بنی اسرائیل میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تقریباً تین ہزار پیغمبر آئے، ان سب پیغمبروں کی نبوت بنی اسرائیل کے خاندان اور قوم کے لیے مخصوص تھی۔ حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ اور جن دیگر انبیاء کا ذکر آتا

ہے یہ اپنے اپنے علاقے اور قوم کے لیے نبی ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت یونسؑ ایک شہر نینوا کے پیغمبر ہوئے۔ اسی طرح علاقہ کے لحاظ سے بھی پیغمبر آئے ہیں کہ ایک ہی وقت میں کئی کئی پیغمبر مختلف علاقوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف مبعوث ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت شعیبؑ دونوں بیک وقت اپنی قوم کے پیغمبر تھے، دونوں خسر داماد بھی تھے کہ حضرت موسیٰؑ کی شادی حضرت شعیبؑ کی بیٹی سے ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ بھی بیک وقت پیغمبر تھے، حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، دونوں کی نبوت کے دائرے الگ الگ تھے۔ چنانچہ حضورؐ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء کرامؑ کی نبوتیں علاقے کے لحاظ سے بھی محدود تھیں، نسلی اعتبار سے بھی محدود تھیں اور وقت کے اعتبار سے بھی محدود تھیں۔ جناب رسول اللہؐ کی نبوت علاقے، نسل اور وقت کسی لحاظ سے بھی محدود نہیں ہے۔ آنحضرتؐ کی نبوت دنیا کے تمام علاقوں کے لیے ہے، تمام اقوام کے لیے ہے اور قیامت تک کے وقت کے لیے ہے۔

یہ عمومی رسالت اللہ تعالیٰ نے صرف جناب نبی کریمؐ کو عطا فرمائی اور اسے آپؐ نے اپنی خصوصیات میں ذکر فرمایا ”أعطیت بست لم یعط أحد قبلی ۔۔۔ أرسلت الی الخلق کافۃ“ یعنی مجھے چھ باتیں ایسی ملی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں۔ ان میں سے ایک بات یہ فرمائی کہ مجھے تمام نسل انسانی کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں مختلف مذاہب رائج چلے آرہے ہیں جن میں بڑے مذاہب آسمانی کتابوں کے حوالے سے ہیں۔ دنیا کے بیشتر بڑے مذاہب دعوت کے مذاہب نہیں ہیں، جیسے یہودی مذہب ایک نسلی مذہب ہے کہ وہ اپنے مخصوص خاندان اور اولاد سے باہر کسی کو اپنے مذہب کی دعوت نہیں دیتے، یہودیوں کا دنیا میں کہیں بھی عمومی دعوتی مرکز نہیں ہے۔ اسی طرح ہندو وطنی مذہب ہے، وہ دوسرے علاقوں کے لوگوں کو ہندو بننے کی دعوت نہیں دیتے بلکہ ان کے ہاں تو صدیوں سے بہت سے طبقات چلے آرہے ہیں جن کی بنیاد معاشرتی امتیازات پر ہے۔ عام ہندو کے لیے ان کی مذہبی کتاب وید کو چھونا تک منع ہے۔ ہندوؤں کا مذہب بھی دعوتی مذہب نہیں ہے یہ وطن کی بنیاد پر چلے آرہے ہیں۔ اسی طرح مجوسی جو کہ دنیا میں بہت کم تعداد میں موجود ہیں وہ بھی کسی غیر مجوسی کو مجوسی بننے کی دعوت نہیں دیتے۔

البتہ عیسائی دنیا بھر میں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے حوالے سے دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آج کے دور کی تحریف شدہ اور تبدیل شدہ بائبل میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

واضح ہدایات موجود ہیں کہ میں صرف بنی اسرائیل کے پاس بھیجا گیا ہوں، بنی اسرائیل کے سوا میری دعوت کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ حتیٰ کہ متی میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ تشریف فرما تھے کہ ایک خاتون آئی اور اس نے کوئی مسئلہ پوچھا، حضرت عیسیٰؑ نے جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا کہ آپ نیک آدمی ہیں میں آپ سے مسئلہ پوچھنا چاہتی ہوں، حضرت عیسیٰؑ نے پھر جواب نہیں دیا۔ اس نے جب تیسری بار پوچھا تو فرمایا کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس بھیجا گیا ہوں اس کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ وہ خاتون بنی اسرائیل کی نہیں تھی بلکہ کسی اور خاندان کی تھی۔ انجیل کی بہت سی آیات ہیں جن میں حضرت عیسیٰؑ کی واضح ہدایات ہیں کہ ہمارا مذہب بنی اسرائیل تک محدود ہے۔ چنانچہ عیسائی جو آج دنیا میں عیسائیت کی دعوت دیتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

اسلام ایک عالمگیر دعوتی مذہب

اسلام آسمانی مذاہب میں سے واحد مذہب ہے جس کی دعوت پوری نسل انسانی کے لیے، دنیا کے تمام علاقوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ جناب نبی کریمؐ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا“ (سورۃ الاعراف ۱۵۸) (اے پیغمبر) کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تمام انسانوں کے لیے اللہ کا رسول ہوں۔ نسل انسانی کی طرف جناب نبی کریمؐ کی نبوت عام ہے اس لیے اسلام کی دعوت کسی خاص علاقے، نسل اور وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، یہ اسلام کی دعوت کی بنیادی حیثیت ہے۔

دعوت اسلام کا ایک پہلو یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ جنوں کے لیے بھی نبی تھے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ”تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا“ (سورۃ الفرقان ۱) کہ برکت والی ہے وہ ذات جس نے قرآن کریم اپنے بندے پر اتارا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے خبر دینے والا ہو۔ عالمین سے مراد انسان اور جن ہیں۔ جن ایک علیحدہ اور مستقل مخلوق ہے، جن اور انسان دونوں مکلف مخلوق ہیں۔ جس طرح نبی کریمؐ انسانوں کے لیے نبی ہیں اسی طرح آپؐ جنوں کے لیے بھی نبی ہیں۔ جن بھی جناب نبی کریمؐ کے امتی ہیں جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے ”قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرانا عجبا۔ یھدی الی الرشد فامنا بہ ولن نشرک بربنا احدا“ (سورۃ الجن ۱۔۲) آپ (ان لوگوں سے) کہیے کہ میرے پاس اس

بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا، پھر (اپنی قوم میں واپس جاکر) انہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتلاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور ہم (اب) اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔ یہ آیات اس واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں کہ ایک دفعہ نبی کریمؐ چند صحابہؓ کے ہمراہ مکہ کے باہر ایک کھلی جگہ پر فجر کی نماز ادا فرمارہے تھے صبح کا پر سکون اور پر نور وقت تھا، جناب نبی کریمؐ کی زبان مبارک پر اللہ کا کلام تھا، آپؐ قرآن کریم کی تلاوت فرمارہے تھے۔ اسی اثناء میں جنوں کا ایک گروہ وہاں سے گزرا تو آپؐ کو تلاوت کرتا دیکھ کر رک گیا۔

اللہ تعالی نے فرمایا کہ جنوں کا وہ گروہ ہم نے وہاں بھیجا تھا "واذ صرفنآ الیک نفرا من الجن یستمعون القران فلما حضروہ قالوا انصتوا فلما قضی ولوا الی قومھم منذرین" (سورۃ الاحقاف ۲۹) اور جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے، غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آپہنچے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو، پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے۔ اس سے اگلی آیات میں اس بات کا ذکر ہے کہ انہوں نے جاکر اپنی قوم سے کہا کہ ہم وہ کتاب سن کر آئے ہیں جو موسی علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے، پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ کے اس پیغمبر کا کہنا مانو اور اللہ تعالی پر ایمان لے آؤ۔ چنانچہ جناب نبی کریمؐ کی نبوت عالمین کے لیے یعنی جنوں اور انسانوں کے لیے ہے، یہی دونوں مخلوقیں مکلف ہیں باقی مخلوقات مکلف نہیں ہیں۔

رسول اللہؐ کی نبوت اور دعوت پوری نسل انسانی کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے، چنانچہ جس طرح حضورؐ کے باقی فرائض امت کو منتقل ہوئے ہیں اسی طرح دعوت کا فرض بھی امت کو منتقل ہوا ہے۔ آپؐ کے پیروکار بحیثیت امت اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ قرآن کریم اور سنت رسول کی شکل میں اللہ تعالی کا پیغام نسل انسانی تک پہنچائیں۔ اگر امت میں دعوت کا یہ عمل جاری رہے گا تو امت بری الذمہ ہوگی لیکن اگر کسی دور میں امت میں دعوت کا یہ عمل رک جائے گا یعنی نسل انسانی تک اسلام کا پیغام پہنچنے کا عمل معدوم ہو جائے گا تو نتیجے میں بحیثیت امت پوری امت مسلمہ گناہگار ٹھہرے گی۔ یہ دعوت اسلام کی اصولی حیثیت ہے۔

رسول اللہ ؐ، تاریخ انسانی کی کامیاب ترین شخصیت

مؤرخین یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ نسل انسانی میں کوئی شخصیت ایسی نہیں گزری کہ جس نے اتنے مختصر عرصے میں اپنی جدوجہد کے نتائج حاصل کیے ہوں، ایسی شخصیت جس نے صرف ۲۳ سال کے عرصے میں اپنے مشن کو اعلان کے مرحلے سے لے کر کامیابی کے مرحلے تک پہنچایا ہو۔ رسول اللہ ؐ نے نبوت ملنے سے کچھ عرصہ بعد صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر سر عام دعوت دی تھی، گویا یہ آپ ؐ کے مشن کا اعلان تھا "یا ایھا الناس، قولوا الا الہ الا اللہ تفلحوا" کہ اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور پھر اس کے تقریبا ۲۲ سال بعد صفا کے قریب منیٰ میں کھڑے ہو کر حضور ؐ نے اعلان فرمایا "فزت ورب کعبہ" رب کعبہ کی قسم میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ رسول اللہ ؐ نے یہ اعلان کیا کہ میں نے جس مشن کا آغاز کیا تھا آج اس کے نتائج حاصل کر لیے ہیں۔ پھر آپ ؐ نے اپنی کامیابی پر لوگوں کو بھی گواہ بنایا "وانتم تسألون عنی فما انتم قائلون؟ قالوا نشہد انک قد بلغت وادیت ونصحت فقال باصبعہ السبابہ یرفعہا الی السماء وینکتہا الی الناس اللھم اشھد اللھم اشھد اللھم اشھد ثلاث مرات" (مسلم ۲۱۳۷) کہ تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا، پس تم کیا کہو گے؟ لوگوں نے کہا ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے پیغام پہنچا دیا اور پوری خیر خواہی کے ساتھ ذمہ داری ادا کر دی۔ رسول اللہ ؐ نے اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور اس کے ساتھ لوگوں لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا۔

جناب رسول اللہ ؐ تقریبا ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے اجتماع سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں کہ کل قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا کہ ہم نے اپنا پیغمبر بھیجا تھا اس نے تم تک میری بات پہنچائی یا نہیں۔ صحابہ ؓ نے اس پر گواہی دی کہ آپ ؐ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سونپی گئی یہ ذمہ داری نبھا دی ہے۔ چنانچہ اکیس بائیس سال کے مختصر عرصے میں رسول اللہ ؐ نے ایک مشن شروع کیا اور اپنی زندگی میں ہی اس مشن کی کامیابی کا اعلان فرمایا۔ اور یہ کامیابی ایسی نہیں تھی کہ ایک آدمی نے یہ دعویٰ کر دیا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں بلکہ تاریخ نے اس بات کو تسلیم کیا کہ یہ ایک عظیم کامیابی تھی۔ ایک مغربی مصنف نے کتاب لکھی ہے "دنیا کے سو بڑے آدمی"۔ اس کتاب میں اس نے پہلے نمبر پر جناب نبی کریم ؐ کا تذکرہ کیا ہے، پھر مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ لوگ مجھ سے یہ بات پوچھیں گے کہ تم نے

عیسائی ہو کر محمدؐ کو پہلے نمبر کی شخصیت کیوں قرار دیا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے اس لیے کہ خود میرے طے کردہ میرٹ پر تاریخ میں اور کوئی شخصیت پہلے نمبر پر نہیں ہے۔

اسلام پر دنیا میں بزور طاقت پھیلنے کا الزام

دنیا اس بات کا اقرار تو کرتی ہے کہ اتنے مختصر عرصے میں اتنی وسیع تر کامیابی حضورؐ کے علاوہ اور کسی شخصیت کو نہیں ملی لیکن اس سے اگلی بات کہ یہ کامیابی رسول اللہؐ نے کیسے حاصل کی، اس میں بیشتر غیر مسلم مصنفین دیانت داری کا مظاہرہ نہیں کرتے اور یہ دعوی کرتے ہیں کہ ایک وقت آگیا تھا جب محمدؐ کے ساتھ تلوار والے اور طاقتور لوگ اکٹھے ہو گئے تھے، چنانچہ یہ لوگ جدھر جاتے تھے مار دھاڑ کرتے تھے جس کے نتیجے میں لوگ ان کے ڈر سے اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ یورپ کے مؤرخین نے حضورؐ کی کامیابی کی یہ توجیہ کی ہے کہ محمدؐ اور صحابہؓ کے دور میں اسلام کی کامیابی تلوار اور طاقت کا کرشمہ ہے لیکن یہ دعوی خلاف واقعہ ہے اور حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ جو لوگ حضورؐ کی دعوت کے دور سے واقف ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں کہ اس دور میں تلوار حضورؐ کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ ان کے دشمنوں کے ہاتھ میں تھی۔ حضورؐ کی دعوت کا دور مکہ کا تیرہ سالہ دور ہے۔ کوئی ان مؤرخین سے پوچھے کہ کیا جناب نبی کریمؐ کے اولین اور سب سے پختہ ساتھیوں نے تلوار کے زور پر اسلام قبول کیا؟ اسلام اگر تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو وہ لوگ جنہوں نے حضورؐ کے اس تیرہ سالہ مکی زندگی میں اسلام قبول کیا، ان کے قبول اسلام کے بارے میں ان مؤرخین کے پاس کیا توجیہ ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ جناب نبی کریمؐ اور ان کے ساتھیوں نے پہلے تو کئی سال تک اپنے دفاع کے لیے بھی تلوار نہیں اٹھائی، وہ مکہ کے ظالموں کو اپنے صبر و حوصلہ کے ساتھ شکست دینے میں کامیاب ہوئے، اس کے بعد مدینہ منورہ میں انہوں نے ظلم اور ناانصافی کی سرکوبی کا سلسلہ عرب و عجم تک پھیلایا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا قبول اسلام

یہ وقت تو وہ تھا کہ رسول اللہؐ کا تین سال تک شعب ابی طالب میں محاصرہ رہا۔ تمام قبائل کی طرف سے حضورؐ کا سوشل بائیکاٹ تھا، انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ بنو ہاشم سے یعنی حضورؐ اور ان کے خاندان سے لین دین نہیں کریں گے، نہ رشتہ دیں گے، نہ رشتہ لیں گے، نہ خوشی غمی میں شریک ہوں گے اور نہ ساتھ اٹھیں بیٹھیں گے۔ جناب نبی کریمؐ نے

تین سال اس کیفیت میں گزارے، اس دور میں بھی لوگ مسلمان ہوئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے اسلام قبول کرنے کا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں، وہ اپنے دور میں عرب کے بڑے دلیر خاندان کے فرد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے قریب سے گزرنے والا کوئی قافلہ صحیح سلامت بچ کے نہیں نکلتا تھا۔ حضورؐ کے اعلان نبوت سے پہلے حضرت ابوذر غفاریؓ موحد تھے اور بت پرستی سے نفرت تھی، فرماتے ہیں کہ میں اپنے ذوق کے مطابق اللہ کی عبادت بھی کرتا تھا، کبھی رکوع کرلیتا، کبھی سجدہ کرلیتا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ مکے میں ایک آدمی ہے جو بت پرستی سے نفرت کرتا ہے اور اس نے نبوت کا اعلان کررکھا ہے، میں نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ جاکر حالات معلوم کرکے آؤ۔ مکہ مکرمہ سے شام جاتے ہوئے راستے میں بنوغفار کا قبیلہ پڑتا ہے، بھائی مکہ گیا اور حالات معلوم کرکے آیا۔ اس نے بتایا کہ ان صاحب کا نام یہ ہے، ان کے والد کا نام یہ ہے اور اس طرح نبوت کا دعوی کرتے ہیں اور یہ کہ مکہ کے مقامی لوگوں نے ان کا بائیکاٹ کررکھا ہے۔

ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میری تشفی نہ ہوئی، میں نے مکہ مکرمہ خود جانے کا فیصلہ کیا۔ میں مکہ پہنچ کر حرم میں بطور مسافر جاکر بیٹھ گیا جیسا کہ عام رواج تھا۔ فرماتے ہیں کہ ایک صاحب (حضرت علیؓ) آئے اور پوچھا کہ اے مسافر کہاں سے آیا ہے؟ حضرت علیؓ کا ذوق یہ تھا کہ وہ شام کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے لیے مسافر ڈھونڈا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ انہیں ساتھ لے گئے اور لے جاکر کھانا کھلایا۔ ابوذر غفاریؓ واپس آکر حرم میں سوگئے۔ دوسرے دن حضرت علیؓ پھر دیکھنے گئے کہ کوئی مسافر ہو کھانا کھانے والا، دیکھا کہ وہی مسافر پھر بیٹھا ہے۔ پوچھا کہ کیا مسافر کو اپنی منزل کا ابھی پتہ نہیں چلا؟ ابوذرؓ کہنے لگے کہ ابھی پتہ نہیں چلا۔ حضرت علیؓ نے کہا آؤ میرے ساتھ۔ کھانا کھایا اور واپس آکر پھر سوگئے۔ بعض روایات میں دوسری رات اور بعض روایات کے مطابق تیسری رات پھر یہی ہوا کہ حضرت علیؓ کسی مسافر کی تلاش میں آئے تو دیکھا کہ وہی شخص بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا کہ اللہ کے بندے تم نے کہیں جانا نہیں؟ کہا کہ نہیں۔ حضرت علیؓ پھر ساتھ لے گئے اور پوچھا کہ اصل بات کیا ہے، کیوں مسلسل یہاں بیٹھے ہو۔ ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہاں مکہ میں حضورؐ کا مخالف کون ہے اور حمایتی کون ہے، میں حضرت علیؓ کو بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے میزبان سے کہا کہ اگر تم اعتماد کرو اور رازداری کا وعدہ کرو تو میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں ایمانداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ میرے اور تمہارے

درمیان راز رہے گا۔ اس پر حضرت ابوذر غفاریؓ نے بتایا کہ میں اس شخص کی تلاش میں آیا ہوں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ بھئی تم صحیح آدمی کے پاس پہنچے ہو۔

رسول اللہؐ اپنے ٹھکانے پر شعب ابی طالب میں محصور تھے، حضرت علیؓ نے کہا کہ تمہیں حضورؐ سے ملانے کے لیے تھوڑی منصوبہ بندی کرنی پڑے گی۔ میں صبح آکر تمہیں لے جاؤں گا، تم میرے پیچھے پیچھے چلنا، اگر راستے میں مجھے کوئی خطرہ محسوس ہوا کہ کسی کو ہم پر شک ہو گیا ہے تو میں جوتا صحیح کرنے کے بہانے بیٹھ جاؤں گا، تم سیدھا نکل جانا تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ خیر دونوں رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ابو ذر غفاریؓ نے بتایا کہ میں آپ ہی کی طرح موحد ہوں، ایک اللہ کو مانتا ہوں اور بت پرستی سے نفرت کرتا ہوں، مجھے آپ کے متعلق معلوم ہوا ہے تو میں آپ کی دعوت کے متعلق دریافت کرنے آیا ہوں۔ حضورؐ نے اپنی دعوت بتائی، اس پر حضرت ابوذر غفاریؓ نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔ پھر حضورؐ سے پوچھا کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ تم اپنی قوم میں چلے جاؤ اور جا کر لوگوں کو دین کی بات بتاؤ، جب کوئی نئی بات ہوگی تو میں تمہیں اطلاع کروں گا۔ کہنے لگے کہ یا رسول اللہؐ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے اسلام کا اعلان نہ کر کے جاؤں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ تمہاری مرضی پر ہے لیکن میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اپنی قوم میں جاؤ۔

حرم مکہ میں لوگ اکٹھے ہوتے تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ نے وہاں جا کر اعلان کیا کہ اے لوگو! میرا یہ نام ہے اور فلاں قبیلے سے آیا ہوں تاکہ تم مجھے پہچان لو۔ میں نے محمد رسول اللہؐ کا کلمہ پڑھ لیا ہے اور اس پر میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں۔ لوگوں نے یہ سنا تو انہیں پکڑ کر مارنا شروع کر دیا، کوئی گھونسہ مار رہا ہے، کوئی لات مار رہا ہے اور کوئی ڈنڈا مار رہا ہے۔ حضرت ابوذر غفارؓ مار کھاتے جا رہے ہیں اور کہتے جا رہے ہیں کہ میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے لا الہ الا اللہ۔ حضرت عباسؓ نے یہ معاملہ دیکھ لیا، وہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے لیکن صاحب بصیرت آدمی تھے اور معاملات کو سمجھتے تھے۔ لوگوں سے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو، یہ بنو غفار کا آدمی ہے، اگر اسے کچھ ہو گیا تو تمہارا تجارت کا راستہ بند ہو جائے گا۔ حضرت عباسؓ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو ان لوگوں سے چھڑوایا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے آکر حضورؐ کی خدمت میں بتایا کہ یہ معاملہ ہوا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ اس دور میں مسلمان ہوئے جب رسول اللہؐ کا سوشل بائیکاٹ تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو حضرت ابوذر غفاریؓ کو کس تلوار نے مسلمان کیا؟ یہ نہ مکہ کے رہنے والے تھے، نہ حضورؐ کے رشتہ دار تھے اور حضورؐ کے ساتھ کوئی تعلق داری بھی نہیں تھی۔ کسی کے بتانے پر کہ فلاں شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، باہر سے آئے اور آکر اپنی تسلی اور اعتماد کے بعد اسلام قبول کیا۔

یمنی قبیلے کے سردار طفیلؓ بن عمرو دوسی کا قبول اسلام

حضورؐ کی مکی زندگی میں دعوت اسلام کے اس دور میں ان لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا جنہیں حضورؐ سے ملنے سے بھی روکا جاتا تھا۔ یمن کا ایک قبیلہ تھا بنو دوس، اس کے سردار تھے طفیل بن عمرو دوسیؓ، اپنے وقت کے بڑے شاعر تھے۔ مکہ مکرمہ میں حج یا عمرہ کے لیے آئے، مکہ کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ یمن کا ایک سردار آیا ہے تو ازراہ ہمدردی ابوجہل نے کہا کہ طفیل! تم آئے ہو تو تمہیں خبردار کردوں کہ ہمارے ہاں ایک جادوگر ہے، وہ بڑی عجیب عجیب باتیں کرتا ہے اور لوگوں کو اپنے دین سے برگشتہ کردیتا ہے۔ تمہیں ہماری نصیحت یہ ہے کہ ایسی صورت اختیار کرو کہ اس کی بات تمہارے کان میں نہ پڑے۔ طفیلؓ کہتے ہیں کہ مجھے لوگوں نے اتنا ڈرایا کہ میں نے اپنی کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ جب میں مکہ کی گلیوں میں گھومتا تھا تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتا تھا کہ کہیں اس جادوگر کی کوئی آواز میرے کان میں نہ پڑ جائے۔ لیکن جو آواز مقدر میں تھی، اسے کون روک سکتا تھا۔ ایک دن حرم میں جا رہے تھے، جناب نبی کریمؐ نماز میں یا ویسے ہی قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ طفیلؓ کے کان میں آواز پڑی تو سوچا کیا فرق پڑتا ہے تھوڑی دیر سن ہی لیتے ہیں، دیکھیں تو سہی کہ یہ کلام کیا کہتا ہے۔ کانوں سے روئی نکالی اور کھڑے ہوگئے، چند آیات سنیں تو کہنے لگے کہ نہ تو یہ شعر ہیں، اس لیے کہ میں خود شاعر ہوں اور جانتا ہوں کہ شعر کسے کہتے ہیں، اور نہ یہ جادو ہے ایسا کلام تو میں نے زندگی میں کبھی سنا ہی نہیں۔ حضورؐ فارغ ہوئے تو یہ حضورؐ کے پاس پہنچ گئے اور پوچھا کہ کیا آپ ہی محمدؐ ہیں، مجھے تو لوگوں نے بہت ڈرایا تھا۔ آپؐ مجھے اپنے کلام میں سے مزید کچھ سنائیں، حضورؐ نے چند آیات مزید تلاوت کردیں، طفیلؓ نے فوراً کہا کہ مجھے کلمہ پڑھائیے۔ یہ بے انصاف مؤرخین بتلائیں کہ طفیل بن عمرو دوسیؓ کو کس تلوار نے مسلمان کیا؟

اور حضرت عمر بن الخطابؓ تو اسلام کو مٹانے کے لیے گھر سے نکلے تھے اور تلوار ان کے ہاتھ میں تھی۔ جناب نبی کریمؐ نے مکہ کے تیرہ سالہ دور میں اسلام کی دعوت دی، یہ مظلومیت کا دور تھا۔ حضرت خبابؓ جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مظالم حد سے بڑھ گئے ہیں۔ فرمایا صبر کرو۔ کہا یا رسول اللہ! کہاں تک صبر کریں۔ حضرت خبابؓ کا مالک انہیں جلے ہوئے کوئلوں پر لٹا کر اوپر چڑھ کر بیٹھ جاتا تھا، ان کی چربی پگھل کر کوئلوں میں گھل جاتی تھی۔ حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمایا صبر کرو۔ یہ صبر اور مظلومیت کا دور تھا۔ حضرت زبیر بن العوامؓ کا چچا انہیں چٹائی میں باندھ کر چھت کے ساتھ الٹا لٹکا دیتا تھا اور پورے محلے کی گندگی نیچے اکٹھی کر کے اس کو آگ لگا دیتا تھا۔ حضرت بلالؓ کو مکہ کے بچے گلیوں میں پتھروں اور ریت میں گھسیٹتے پھرتے تھے اور وہ ''احد احد احد'' پکارتے جاتے تھے۔ رسول اللہؐ کی دعوت کو اگر قبول عام حاصل ہوا تو وہ اسلام کی سچائی کی بنا پر ہوا۔ نبی کریمؐ کا کردار، آپؐ کا اخلاق اور قرآن کریم کی عظمت، یہ اسلام کی دعوت کا باعث ہوئے۔ ورنہ پہلے تیرہ سالہ دور میں تلوار تو دوسری طرف کے لوگوں کے پاس تھی۔ چنانچہ یہ الزام کے جناب نبی کریمؐ کی دعوت تلوار کے زور سے پھیلی ہے، غلط بات ہے۔

امریکہ کی ایک پروفیسر کا قبول اسلام

قرآن کریم آج بھی معجزہ ہے۔ امریکہ میں ایک محترم نومسلم خاتون ہیں ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن، انہوں نے اسلام قبول کیا۔ سین ڈیگو یونیورسٹی میں فلسفے کی استاد تھیں، انہوں نے عربی، اردو، فارسی اور گورومکھی، چار زبانیں سیکھیں۔ شاہ ولی اللہؒ پر پی ایچ ڈی کی۔ پاکستان کے ایک پروفیسر صاحب کے ساتھ ان کی شادی ہوئی۔ میرے چچا محترم صوفی عبد الحمید سواتیؒ کا بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ پر خاصا کام ہے، ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن کو صوفی صاحب کی کتابوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ وہ ایک دفعہ اپنے خاوند کے ساتھ پاکستان آئیں تو گوجرانوالہ میں صوفی صاحب سے ملاقات کے لیے بھی آئیں۔ میں بھی ملاقات میں تھا۔ خاتون نے اپنی گفتگو میں صوفی صاحب سے بہت سے سوالات پوچھے اور مسائل کے متعلق دریافت کیا۔ صوفی صاحب نے بھی ان خاتون سے ایک سوال کیا کہ اللہ کی بندی تم خود کفیل ہو، عقل مند خاتون ہو کہ فلسفے کی پروفیسر ہو اور ہم مسلمانوں میں بھی آج کے دور میں کشش کی ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ جسے دیکھ کر تم مسلمان ہوئی ہو، تم کیسے مسلمان ہو گئی؟ خاتون

نے جواب دیا کہ مجھے کسی مسلمان نے مسلمان نہیں کیا اور میں کسی مسلمان کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوئی۔

خاتون نے کہا کہ مجھے تو قرآن کریم نے مسلمان کیا ہے، پھر انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا واقعہ سنایا۔ بتایا کہ میں نے فلسفے میں ایم اے کیا تھا اور مجھے ذہنی طور پر سکون نہیں تھا۔ میں کبھی کسی یونیورسٹی میں کسی کورس کے لیے چلی جاتی اور کبھی کسی دوسری یونیورسٹی میں کسی دوسرے کورس کے لیے چلی جاتی، کہیں سکون نہیں ملتا تھا۔ میں نے اسی کیفیت میں اسپین کی یونیورسٹی میں ایک کورس کر رہی تھی، ایک دن ہاسٹل میں ریڈیو سن رہی تھی کہ ایک اسٹیشن پر عجیب سی آواز آئی، زبان اجنبی تھی لیکن مجھے آواز میں کشش محسوس ہوئی۔ میں نے اگلے دن پھر اسی اسٹیشن پر یہی آواز سنی، اسی طرح دو چار دن سنتی رہی، آواز سننے کو جی چاہتا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے اور زبان کونسی ہے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ یہ مراکش کا ریڈیو ہے اور مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کریم جو کہ عربی میں ہے، اس کی تلاوت ہو رہی ہے۔ کہتی ہیں کہ میں نے قرآن مجید کا انگلش ترجمہ منگوا کر پڑھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ پہلے عربی زبان سیکھوں گی، پھر قرآن کریم کو اس کی اصل زبان میں پڑھوں گی اور پھر فیصلہ کروں گی۔ چنانچہ میں نے قاہرہ یونیورسٹی میں دو سال تک عربی زبان سیکھی، پھر قرآن کریم کا مطالعہ کیا، اس طرح قرآن کریم نے مجھے مسلمان کیا ہے۔

دعوت اسلام اور حضورؐ کا اسوہ

اسلام کی مقبولیت کی وجہ قرآن کریم کا اعجاز اور جناب نبی کریمؐ کے سیرت و کردار کی اپنی قوت تھی۔ اسلام قرآن کی صداقت پر اور رسول اللہؐ کے کردار کی سچائی پر پھیلا ہے۔ جناب نبی کریمؐ کی اسلام کے لیے جو دعوت تھی، اس کے بارے میں رسول اللہؐ کا اصول کیا تھا اور آپؐ نے اس بارے میں کیا ہدایات دیں؟ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تھا ”قال رب انی دعوت قومی لیلا و نھارا۔ فلم یزدھم دعآءی الا فرارا“ (سورۃ نوح ۵۔۶) (آخر نوحؑ نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی (دین حق کی طرف) بلایا۔ سو میرے بلانے پر (دین سے) اور زیادہ بھاگتے رہے۔

جناب نبی کریمؐ کی دعوت کی کیفیت بھی یہ تھی کہ جس پر اللہ تعالی نے یہ کہا ”لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین“ (سورۃ الشعراء ۲) شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے

کرتے) اپنی جان دے دیں گے۔ یعنی آپ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالیے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہوتے، یہ تو مقدر کی بات ہے، یعنی آپ لوگوں کو زبردستی مسلمان نہیں کر سکتے۔ آپ کا کام تو یہ ہے کہ اپنی طرف سے حق بات بیان فرمادیجئے، اب جس کا جی چاہے مسلمان ہو اور جس کا جی چاہے مسلمان نہ ہو۔ ”وقل الحق من ربکم فمن شآء فلیؤمن ومن شآء فلیکفر“ (سورۃ الکھف ۲۹) اور آپ کہہ دیں سچی بات جو آپ کے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے مان لے اور جو چاہے انکار کردے۔ داعی کے دل میں انسانوں کے ایمان کے لیے تڑپ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں حضورؐ کو لوگوں کے ایمان کے بارے میں حریص قرار دیا۔ رسول اللہؐ کے دل میں یہ خواہش حرص کے درجے کی بات تھی کہ دنیا اسلام پر اور ہدایت پر آجائے، فرمایا ”حریص علیکم“ (سورۃ التوبہ ۱۲۸) کہ تمہاری بھلائی میں وہ حریص ہیں۔ حرص خواہش کا آخری درجہ ہوتا ہے جسے دنیاوی معاملات میں اچھا نہیں سمجھا جاتا، دنیا کے معاملات میں حرص ہو تو یہ قابل تعریف چیز نہیں ہے۔ لیکن رسول اللہؐ دین کے معاملے میں، دعوت کے معاملے میں اور لوگوں کے ایمان قبول کرنے کے معاملے میں حریص تھے۔

حضورؐ خود فرماتے ہیں کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے نابینا لوگوں کا ایک گروہ بھاگے جا رہا ہو اور ان کے آگے ایک بہت بڑا گڑھا ہو جس میں آگ جل رہی ہو۔ ایک بینا یعنی دیکھنے والا آدمی یہ منظر دیکھتا ہے تو دوڑا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ کے بندو یہ کس طرف بھاگے جا رہے ہو، رک جاؤ، ورنہ آگ میں جل کر مر جاؤ گے۔ وہ بینا آدمی اس کوشش میں ہے کہ ان میں سے کوئی آگ کے گڑھے میں نہ گر جائے۔ فرمایا تم سب دوزخ کی آگ کی طرف بھاگے جا رہے ہو اور مجھے یہ منظر نظر آ رہا ہے، تم جہنم کی یہ آگ دیکھ نہیں رہے ہو لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ تم اس کی طرف بھاگے جا رہے ہو اور میں تمہیں آوازیں دیتا جا رہا ہوں کہ خدا کے لیے اس طرف مت بھاگو، آگے آگ ہے۔ اسی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”حریص علیکم“ کہ محمدؐ تمہارے ایمان کے معاملے میں حریص ہیں۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے لوگوں کے ایمان کی خواہش اس درجے میں کی۔ ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ اے علی! اگر ایک آدمی بھی تمہاری وجہ سے مسلمان ہو جائے تو تمہارے لیے سرخ اونٹوں کی دولت سے بھی بہتر ہے ”لأن یھدی اللہ بک رجلا۔۔۔ خیر لک من حمر النعم او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم“۔

رسول اللہؐ کی دعوت کا اسلوب یہ تھا کہ دعوت دینے والے کے اپنے دل میں تڑپ ہو کہ میں نے نسل انسانی کو آگ سے بچانا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو اپنے بھائی سمجھے اور ہر ممکن کوشش کرے کہ وہ جہنم کی طرف جانے والے راستے سے ہٹ جائیں۔ یہ جناب نبی کریمؐ کا اسوہ ہے کہ پوری نسل انسانی کے لیے انسان کے دل میں تڑپ موجود ہو کہ نسل انسانی کو ہدایت کے راستے پر لانا اور آگ اور جہنم سے بچانا میری ذمہ داری ہے۔ داعی کا انداز گفتگو جناب نبی کریمؐ نے جس لب و لہجے میں اسلام کی دعوت دی، آپؐ کی زبان کی مٹھاس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا جو کہ خیر خواہی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس لیے کہ خیر خواہی میٹھی زبان سے ہی ہوگی اور نرمی سے ہوگی۔ آپ کسی کو غلط راستے سے بچانا چاہتے ہیں اور اپنے راستے پر لانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس شخص کو یہ اعتماد حاصل ہونا چاہیے کہ دعوت دینے والا میرا خیر خواہ ہے۔ لیکن اگر دعوت دینے والے کی گفتگو ایسی ہو کہ سننے والا اس سے شرمندگی یا ہتک محسوس کرے تو وہ دعوت قبول کرنے پر کیسے آمادہ ہو گا؟ دعوت کا پہلا اصول یہ ہے کہ دعوت خیر خواہی کے جذبے سے اور خیر خواہی کے انداز سے دی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے پاس بھیجا ”اذھب الی فرعون انہ طغیٰ“ (سورۃ طہٰ ۴۲) جاؤ فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ وہ فرعون جس نے خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا اور وہ فرعون جو کہتا تھا ”وقال فرعون یاھامان ابن لی صرحا لعلی ابلغ الاسباب۔ اسباب السماوات فاطلع الی الہ موسیٰ وانی لاظنہ کاذبا“ (سورۃ المؤمن ۳۶) اور فرعون نے کہا، اے ہامان میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ، شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں۔ پھر (وہاں جاکر) موسیٰؑ کے خدا کو دیکھوں اور میں تو موسیٰؑ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔ فرعون اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ ایک لمبی سی عمارت بناؤ جس پر چڑھ کر میں اس خدا کو دیکھوں جس کا موسیٰؑ دعویٰ کرتا ہے، مجھے تو یہ بات جھوٹی لگتی ہے۔ وہ فرعون جس کا دماغ یہاں تک پہنچ چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کو یہ کہہ کر بھیجا ”فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر او یخشیٰ“ (سورۃ طہٰ ۴۲) پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔ یعنی فرعون جیسا سرکش آدمی جس نے خدا ہونے کا دعویٰ کر رکھا تھا، اس کے پاس اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا اور ہدایت کی کہ نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

چنانچہ یہی دعوت کا اسلوب ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے یہ تعلیم دی کہ دعوت کی زبان خیر خواہی کی زبان ہونی چاہیے کہ سننے والا خیر خواہی کا جذبہ محسوس کرے۔

ایک مرتبہ حضرت حسنؓ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا کہ وہ وضو تو کر رہا ہے لیکن ٹھیک طریقے سے نہیں کر رہا۔ ہمارا آج کل کا طریقہ یہ ہے کہ ہم سیدھا منہ پر کہہ دیتے ہیں کہ بھئی بوڑھے ہو گئے ہو ابھی تک وضو کرنا نہیں آیا۔ اگر ہم نرمی کا طریقہ بھی اختیار کرتے ہیں تو اتنا تو کہہ ہی دیتے ہیں کہ بابا جی کسی سے وضو کرنا ہی سیکھ لیا ہوتا۔ حضرت حسنؓ نے بزرگ کو ان کی غلطی بتانے کا کیا خوبصورت طریقہ اختیار کیا، بزرگ سے کہا کہ بابا جی میں بچہ ہوں، آپ ذرا میرا وضو دیکھیں کہ کہیں میرے وضو میں کوئی غلطی تو نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے سامنے بیٹھ کر وضو کیا، بزرگ کہنے لگے کہ بیٹا تمہارا وضو تو ٹھیک ہے میرے وضو میں گڑبڑ ہے۔

مخاطب کی ذہنی سطح اور نفسیات کا لحاظ جناب نبی کریمؐ نے تو ہر انداز سے دعوت دی ہے، مخاطب نے جس انداز میں بات سمجھنا چاہی حضورؐ نے اسی انداز میں بات سمجھائی۔ حضرت رکانہؓ جو ایک پہلوان تھے وہ کیسے مسلمان ہوئے؟ ہر آدمی اپنے فن کی زبان سمجھتا ہے، وہ حضورؐ کے پاس آئے اور کہا کہ میں تب آپ کو نبی مانوں گا جب آپ مجھے کشتی میں پچھاڑیں گے۔ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ نبوت کا کشتی سے کیا تعلق؟ حضورؐ کھڑے ہوئے، کشتی لڑی اور پچھاڑ دیا۔ رکانہؓ کہنے لگے کہ ایک مرتبہ میں تو اتفاقاً ایسا ہو جاتا ہے، آپ میرے ساتھ دوبارہ کشتی لڑیں۔ حضورؐ نے دوسری بار بھی پچھاڑ دیا۔ رکانہؓ کہنے لگے کہ ایک بار اور لڑیں۔ چنانچہ تین بار کشتی لڑی اور حضورؐ نے تینوں بار کامیابی حاصل کی، اس پر رکانہؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ رکانہؓ کو دلیل اور منطق کی زبان نہیں آتی تھی، وہ کشتی کی زبان ہی سمجھتے تھے۔ جناب نبی کریمؐ نے لوگوں کو ان کی زبان میں مخاطب کیا ہے اور ان کی نفسیات کے مطابق ان کے ساتھ ڈیل کیا۔ اسی حوالے سے ایک اور واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ایک دفعہ رسول اللہؐ مکہ مکرمہ میں اپنے چچا ابو طالب کے پاس بیٹھے تھے، عرب سرداروں کا ایک وفد آیا، بڑے بڑے سردار تھے جن میں ابو جہل بھی تھا۔ سب نے حضورؐ پر تنقید شروع کر دی اور شکایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابو جہل نے بالآخر حضورؐ سے پوچھا کہ بھتیجے! تم کہنا کیا چاہتے ہو، تمہارا مقصد کیا ہے؟ بات تو دعوت پر ہو رہی تھی کہ حضورؐ لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور بت پرستی وغیرہ سے منع فرماتے ہیں۔ ابو جہل نے کہا کہ بھتیجے دو ٹوک بات کرو کہ تم جو باتیں کہہ رہے ہو، یہ باتیں اگر ہم مان لیں تو ان کا نتیجہ کیا

ہوگا۔ رسول اللہؐ نے کیا جواب دیا؟ فرمایا کہ میں ایک کلمہ آپ لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں، اگر یہ کلمہ آپ لوگ قبول کر لو تو عرب پر بھی تمہاری حکومت قائم ہوگی اور عجم بھی تمہارے قبضے میں ہوگا۔ یہ رسول اللہؐ نے قریش کے سرداروں کو جواب دیا۔ اب کلمے کے نتائج میں صرف یہی نتیجہ تو نہیں ہے کہ حکومت قائم ہو جائے، کلمے کا اصل نتیجہ تو جنت ہے۔ لیکن یہی بات جب مدینہ منورہ میں ثابت بن قیس انصاریؓ نے پوچھی تو انہیں حضورؐ نے کیا جواب دیا؟ ثابت بن قیسؓ نے حضورؐ سے فرمایا کہ ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح ہم اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا، جنت ملے گی۔ ثابتؓ نے کہا، ہم راضی ہیں۔ یعنی ابوجہل نے نتیجہ پوچھا تو جواب دیا کہ اس کے بدلے میں حکومت ملے گی، لیکن ثابت بن قیسؓ نے نتیجہ دریافت کیا تو فرمایا کہ جنت ملے گی۔ حضورؐ نے ہر مخاطب کی نفسیات کے مطابق اسے جواب دیا۔ ثابت بن قیسؓ کو ان کی نفسیات کے مطابق جواب دیا اور ابوجہل کو اس کی نفسیات کے مطابق جواب دیا۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ اسلام کی دعوت دیتے وقت مخاطب کی نفسیات اور ذہنی سطح دیکھتے تھے کہ یہ کونسی زبان اور کونسا اسلوب سمجھتا ہے۔

جس طرح رسول اللہؐ دوسرے علاقوں میں وفد بھیجتے تھے اسی طرح حضورؐ کے پاس بھی دوسرے علاقوں سے وفد آتے تھے۔ عرب کا مشہور قبیلہ ہے بنوتمیم، یہ بڑا چوہدری قسم کا قبیلہ تھا، ان کا وفد مدینہ منورہ میں رسول اللہؐ کے پاس آیا۔ اس زمانے کا اسلوب یہ تھا کہ جب کوئی وفد دوسرے قبیلے کے پاس جاتا تھا تو وہ اپنا شاعر اور اپنا خطیب ساتھ لے کر جاتا تھا۔ باقاعدہ مذاکرات سے پہلے خطیب اور شاعر کا مقابلہ ہوتا تھا، وفد کا خطیب اپنی قوم کے خصائل بیان کرتا تھا کہ ہم یہ ہیں، ہم وہ ہیں۔ اسی طرح شاعر اپنی شاعری میں اپنے آباؤ اجداد، اپنے بڑوں اور اپنے نامور افراد کے کارناموں کا ذکر کرتا تھا۔ جواب میں میزبان قبیلے کا خطیب اور شاعر اپنے قبیلے کی تعریف بیان کرتا تھا، اس کے بعد پھر باقاعدہ گفتگو شروع ہوتی تھی۔ بنوتمیم کا وفد بھی ایسا اکھڑ تھا کہ آکر حجرہ مبارکہ کے باہر سے ہی آواز دی یا محمد اُخرج الینا کہ اے محمدؐ باہر آکر ہماری بات سنیں۔ حضورؐ باہر تشریف لائے اور پھر ملاقات کے لیے بٹھایا۔ اقرع بن حابسؓ جو بنوتمیم کے وفد کی قیادت کر رہے تھے، ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے وفد کے خطیب سے کہا کہ اٹھو اور بات شروع کرو، اس نے اٹھ کر اپنی قوم کے فضائل و مناقب بیان کیے۔ نبی کریمؐ کے خطیب تھے ثابت بن

قیسؓ، حضورؐ نے خود ان کا لقب رکھا تھا خطیب الاسلام۔ حضورؐ نے ثابتؓ سے کہا کہ اٹھو اور جواب دو، ثابت بن قیسؓ اٹھے اور اسلام اور حضورؐ کے مناقب بیان کیے۔ اس کے بعد اقرع بن حابسؓ نے اپنے وفد کے شاعر سے کہا کہ اٹھ کر اپنا کلام کہو، اس نے اٹھ کر اپنے قبیلے کی بہادری اور کارناموں کو شاعری میں بیان کیا۔ حضورؐ نے جواب میں اپنے شاعر حسان بن ثابتؓ سے کہا کہ اٹھو اور اپنا کلام کہو۔ حسان بن ثابت اپنے دور کے چوٹی کے شاعر تھے اور حضورؐ کے ذاتی شاعر تھے، انہیں شاعر رسول اللہ کا لقب حاصل تھا۔ چنانچہ وہ اٹھے اور اشعار میں اسلام کے مناقب اور حضورؐ کی مدح بیان کی۔ جب مذاکرات پورے ہوئے تو وفد کے سربراہ اقرع یہ کہہ کر اٹھے کہ بخدا محمدؐ کا خطیب بھی ہمارے خطیب سے بڑا ہے اور محمدؐ کا شاعر بھی ہمارے شاعر سے بڑا ہے۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ رسول اللہؐ کی دعوت کا اسلوب یہ تھا کہ جو زبان مخاطب سمجھتا تھا، اسی زبان میں آپؐ اس سے بات کرتے تھے، یہ دعوت کا بنیادی اسلوب ہے۔

آج کی گفتگو میں پہلی بات میں نے یہ عرض کی کہ جناب نبی کریمؐ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء کرامؑ کسی خاص علاقہ، قوم یا مخصوص عرصہ کے نبی تھے اور یوں ان کی نبوت کا دائرہ کار بھی علاقہ، قوم یا کسی خاص وقت محدود تھا۔ لیکن جناب رسول اللہؐ کو اللہ تعالی نے دنیا کے تمام علاقوں، تمام قوموں اور قیامت تک کے لیے نبوت عطا کی۔ یوں آپؐ کی شریعت قیامت تک آنے والے نسل انسانی کے تمام طبقات کے لیے ہے۔

دوسری بات میں نے یہ عرض کی کہ وہ غیر مسلم مؤرخین جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر اور طاقت کے بل پر دنیا میں پھیلا ہے، ان کا یہ دعوی انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ اس لیے کہ مکہ میں نبی کریمؐ کی دعوت کا پہلا تیرہ سالہ دور انتہائی مظلومیت کا اور دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹوں کا دور تھا، اس دور میں بھی بہت سے مقامی اور غیر مقامی لوگ قرآن کریم کی عظمت اور حضورؐ کے کردار سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے اور ان لوگوں نے بھی اپنی زندگیوں کو پیش مشکلات و خطرات کا سامنا اسی طرح کیا جس طرح خود جناب نبی کریمؐ نے اپنی ذات کے حوالے سے کیا۔ جبکہ تلوار کا استعمال حضورؐ اور ان کے اصحابؓ نے پہلے تو اپنے دفاع میں اور بعد میں انصاف پر مبنی حکومت قائم کرنے کے لیے استعمال کیا، ایسی حکومت جس کی بنیاد وحی الہی اور جناب نبی کریمؐ کے اعلی اخلاق و کردار پر تھی۔ پھر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مشرق بعید انڈونیشیا، ملائیشیا وغیرہ کی طرف مسلمانوں کا کبھی کوئی لشکر

جنگ کے لیے نہیں گیا لیکن وہاں کروڑوں مسلمان بستے ہیں جو عرب کے مسلمان تاجروں کے کردار اور اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔

تیسری بات میں نے یہ عرض کی کہ دعوت اسلام کے حوالے سے رسول اللہؐ کا طرز عمل کیا تھا۔ پہلا یہ کہ داعی کے دل میں نسل انسانی کے لیے ہمدردی ہو اور ان کو مسلمان بنانے کے لیے تڑپ ہو۔ دوسرا یہ کہ داعی کا لب و لہجہ نرم اور انداز گفتگو شفیقانہ ہو تاکہ جسے دعوت دی جا رہی ہو، وہ داعی کو اپنا خیر خواہ سمجھے۔ تیسرا یہ کہ جسے دعوت دی جا رہی ہے اس کی ذہنی سطح اور نفسیات کا لحاظ کیا جائے اور یہ تسلی کی جائے کہ مخاطب تک اصل بات پہنچ گئی ہے۔

خاندانِ نبوتؐ

(جامعہ الہدٰی، نوٹنگھم، برطانیہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۵ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، ایک حضرت اسحاق علیہ السلام اور دوسرے حضرت اسماعیل علیہ السلام۔ یوں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں دو سلسلے چلے۔ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے جن کا لقب ''اسرائیل'' تھا جو کہ عبرانی زبان میں ''عبد اللہ'' کو کہتے ہیں یعنی اللہ کا بندہ۔ حضرت اسحاقؑ سے بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں تقریباً تین ہزار پیغمبر مبعوث فرمائے۔ جبکہ حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے صرف ایک ہی پیغمبر ہوئے جو کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے قریش کا خاندان تھا جس کی ایک شاخ بنو ہاشم خاندان کی تھی، اس بنو ہاشم خاندان میں حضورؐ مبعوث ہوئے۔

نبی کریمؐ کے والدین

حضرت عبد اللہؓ اور حضرت آمنہؓ جناب نبی کریمؐ کے والدین تھے، حضورؐ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ آپؐ کے والد محترم، جناب عبد المطلب کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ننھال سے آپؐ کا تعلق بنو نجار سے تھا جو کہ یثرب شہر کا ایک قبیلہ تھا۔ یثرب اب مدینہ منورہ کہلاتا ہے۔ والد محترم عبد اللہ حضورؐ کی ولادت سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے،

آپؐ غالباً پانچ یا چھ سال کے تھے جب آپؐ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا۔ آپؐ نے بنو سعد کی ایک خاتون حلیمہ سعدیہ کا دودھ پیا جن کے خاوند ابو کبشہؓ کے نام سے معروف ہیں۔ انہی کی وجہ سے قریش کے بعض سردار طنز کے طور پر جناب نبی کریمؐ کو ابن ابی کبشہ کہا کرتے تھے۔ جب قیصر روم کے دربار میں ابوسفیانؓ پیش ہوئے اور قیصر روم کے ساتھ رسول اللہؐ کے بارے میں بات ہوئی تو ابوسفیانؓ نے دیکھا کہ قیصر روم نے رسول اللہؐ اور ان کے خط کو بہت اہمیت دی، گفتگو سے فارغ ہو کر باہر آئے تو ابوسفیانؓ نے کہا "اَمرَ اَمرابن کبشۃ" کہ ابو کبشہ کے بیٹے کی بات تو بہت بڑی ہوگئی ہے۔

ابو کبشہ اور سعدیہ حلیمہ رضی اللہ عنہما حضورؐ کے رضاعی ماں باپ تھے، دونوں مسلمان ہوئے۔ رسول اللہؐ نے آخر وقت تک ان کا خیال رکھا اور یہ دونوں صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ جناب نبی کریمؐ کی کوئی حقیقی بہن یا بھائی نہیں تھا۔ غزوۂ حنین کی لڑائی کے بعد ایک خاتون حضرت شیماءؓ نے آپؐ کی رضاعی بہن ہونے کا دعویٰ کیا اور آپ کو بچپن کے واقعات یاد دلائے تو حضورؐ نے اس خاتون کے رضاعی بہن ہونے کی تصدیق کی اور اسے اکرام کے ساتھ تحفے تحائف دے کر رخصت کیا۔

نبی کریمؐ کی ازواج

جناب رسول اللہؐ کی ازواج میں نکاح کی ترتیب کے لحاظ سے حضرت خدیجہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینب ام المساکینؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت صفیہؓ کے نام آتے ہیں۔ رسول اللہؐ کی کل ۱۱ بیویاں تھیں جبکہ بیک وقت ۹ تھیں۔ آنحضرتؐ کی حیات مبارکہ میں آپؐ کی دو بیویاں فوت ہوئیں، ایک حضرت خدیجہؓ اور دوسری حضرت زینب ام المساکینؓ۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

آپؐ کی پہلی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ قریش کی بڑی باعزت خاتون تھیں۔ وہ ایک تجارت پیشہ اور مالدار خاتون تھیں۔ جب حضورؐ کا حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح ہوا تو آپؐ پچیس برس کے جبکہ حضرت خدیجہؓ چالیس برس کی تھیں۔ یہ رسول اللہؐ کا پہلا نکاح تھا جبکہ حضرت خدیجہؓ اس سے پہلے بیوہ ہو چکی تھیں۔ حضورؐ کا حضرت خدیجہؓ کے ساتھ یہ نکاح پچیس برس تک قائم رہا۔ ان پچیس سال کے دوران حضرت خدیجہؓ تنہا حضورؐ کے نکاح

میں رہیں۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے وقت جناب نبی کریمؐ کی عمر پچاس برس تھی۔ اپنی عمر کے پچیس سے پچاس سال کے عرصے تک حضورؐ نے اور کوئی شادی نہیں کی، حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی سب سے لمبی مدت کی بیوی تھیں۔ نبی کریمؐ آخرت وقت تک حضرت خدیجہؓ کو یاد کرتے تھے اور ان کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے کبھی کسی پر رشک نہیں آیا سوائے خدیجہؓ کے، جب بھی کوئی بات ہوتی تو آپؐ فرماتے کہ خدیجہؓ یوں کیا کرتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے کسی بات پر حضرت خدیجہؓ کا نام لیا تو میں بول پڑی کہ یا رسول اللہؐ آپ کیا اس بڑھیا کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان سے اچھی عورتیں دی ہیں۔ رسول اللہؐ نے اس پر حضرت خدیجہؓ کا دفاع کرتے ہوئے فرمایا کہ خدیجہؓ نے اس وقت میری تصدیق کی جب لوگ مجھے جھٹلاتے تھے، اس نے مجھ پر اپنا مال بھی خرچ کیا اور مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔

حضرت خدیجہؓ اور حضورؐ کے چچا ابو طالب کی وفات قریب قریب ہوئی۔ گھر میں سب سے زیادہ حضورؐ کا ساتھ دینے والی حضرت خدیجہؓ تھیں جبکہ گھر سے باہر خاندان میں سب سے زیادہ محافظ اور مددگار جناب ابو طالب تھے۔ ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انہوں نے چچا ہونے کے ناطے سے چچا ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ابو طالب رسول اللہؐ کے ساتھ شعب ابو طالب میں بھی محصور رہے۔ جناب ابو طالب کی زندگی میں کسی کو حضورؐ کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی، جسے بھی کوئی شکایت ہوتی تو وہ ابو طالب سے کرتا تھا کہ اپنے بھتیجے سے یہ بات کرو، اپنے بھتیجے کو یہ سمجھاؤ۔ ابو طالب کی شخصیت کا ایک رعب اور مقام تھا۔ جس سال یکے بعد دیگرے جناب ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو وہ سال حضورؐ کے لیے بہت پریشانی کا تھا کہ عالم اسباب میں جو دو بڑے سہارے تھے، دونوں ختم ہو گئے۔ اس لیے رسول اللہؐ نے اسے عام الحزن قرار دیا کہ یہ میرا غم کا سال ہے۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد قریش ہی کی ایک خاتون حضرت سودہ بنت زمعہؓ سے حضورؐ کا نکاح ہوا۔ یہ بھی ایک بیوہ خاتون تھیں اور حضورؐ کے مکی دور میں ہی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ حضرت سودہؓ جسمانی ساخت کے لحاظ سے اونچی لمبی اور بھاری تھیں۔ ان کی

تاریخ وفات کے متعلق اختلاف ہے، عام خیال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت کے آخری عرصے میں وفات پائی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

حضرت عائشہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی تھیں اور ازواج مطہرات میں نبی کریمؐ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ ۹ سال کی عمر میں رسول اللہؐ کے عقد میں آئیں اور آپؐ کے وصال کے وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی۔ حضرت عائشہؓ سے نبی کریمؐ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت عائشہؓ ایک ذہین، فصیح اللسان اور سخی خاتون تھیں، ان کا علمی مقام یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں نہ صرف فتوے دیا کرتی تھیں بلکہ دوسرے اکابر صحابہؓ کے فتوؤں پر نقد کیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ حضورؐ کے وصال کے بعد ایک دفعہ کسی نے انہیں ایک لاکھ درہم ہدیہ بھیجا جو انہوں نے شام ہونے سے پہلے پہلے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت عائشہ کی شاگرد عمرہؓ اس کے متعلق بتاتی ہیں کہ ہم سب روزے سے تھے، حضرت عائشہؓ نے یہ رقم تقسیم کرنا شروع کر دی کہ یہ برتن بھر کر فلاں کو دے آؤ اور یہ رقم فلاں کے گھر دے آؤ، سارا دن ہم یہی کام کرتے رہے۔ روزہ کھولنے سے کچھ وقت پہلے حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے؟ میں نے حضرت عائشہ کو بتایا کہ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ناراضگی سے فرمایا کہ پہلے یاد کراتے تو میں افطاری کے لیے کچھ درہم رکھ لیتی، اب کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے پانی سے روزہ کھولو۔ حضرت عائشہؓ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد تقریباً ۴۵ سال تک زندہ رہیں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

حضرت حفصہؓ حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی تھیں۔ ان کے خاوند حضرت خنیسؓ غزوہ بدر میں زخمی ہوئے اور بعد میں انہی زخموں کی وجہ سے شہید ہوئے۔ حضرت حفصہؓ جب بیوہ ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ان کے نکاح کے متعلق بات کی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ یہ بات حضرت عمرؓ کو بہت ناگوار گزری لیکن بعد میں جب حضرت عمرؓ کو یہ بات پتہ چلی تو اطمینان ہو گیا کہ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے حضرت حفصہؓ کے متعلق پہلے سے تذکرہ فرمایا ہوا تھا۔ چنانچہ ۲ھ میں حضورؐ کا حضرت حفصہؓ سے نکاح ہوا۔ انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

حضرت زینب ام المساکین رضی اللہ عنہا

حضرت زینبؓ کے خاوند عبد اللہ بن جحشؓ جنگ احد میں شہید ہوئے تو حضورؐ نے ان کے ساتھ نکاح کر لیا لیکن حضورؐ کے ساتھ نکاح کے چند مہینے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت زینبؓ غرباء کو کھانا کھلانے اور مساکین کی مدد میں مشہور تھیں اس لیے انہیں ام المساکین کہا جاتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد حضورؐ کی صرف یہی زوجہ تھیں جو حضورؐ کی حیات مبارکہ میں فوت ہوئیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام سلمہؓ کا اصل نام ہند تھا، ذہین اور دانشمند خاتون تھیں۔ ان کے خاوند ابو سلمہؓ بھی غزوۂ احد میں شہید ہوئے، نبی کریمؐ نے ابو سلمہؓ کی نماز جنازہ پڑھانے کے بعد ان کی بہادری کی بہت تعریف کی۔ حضورؐ نے خود ام سلمہؓ کو نکاح کا پیغام بھجوایا، چنانچہ غزوۂ احد کے بعد نبی کریمؐ سے ان کا نکاح ہوا۔ عام خیال یہ ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وفات ازواج مطہرات میں سب سے آخر میں ہوئی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

حضرت زینبؓ حضورؐ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ کی بیوی تھیں۔ انہوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تو اللہ رب العزت نے ان کا نکاح جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ کرنے کا قرآن کریم میں اعلان کر دیا۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ حضورؐ کے اس نکاح کا قرآن کریم میں ذکر ہے جس پر حضرت زینبؓ بہت فخر کیا کرتی تھیں۔ حضرت زینبؓ حضورؐ کے خاندان بنو ہاشم سے تھیں۔ محدثین ایک دلچسپ بات نقل کرتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا، میری ازواج میں سے میرے بعد سب سے پہلے میرے پاس وہ آئے گی جس کا ہاتھ سب سے زیادہ لمبا ہو گا۔ اس پر بعض ازواج مطہرات نے یہ دیکھنے کے لیے اپنے ہاتھوں کی پیمائش کی کہ کس کا ہاتھ لمبا ہے۔ حالانکہ اس سے حضورؐ کی مراد زیادہ سخاوت کرنے والی یا زیادہ خرچ کرنے والی کی تھی اور یہ بات ام المؤمنین حضرت زینبؓ پر صادق آتی تھی۔ حضرت زینبؓ بہت سخی اور بڑے دل والی خاتون تھیں جو ہاتھ میں آتا لوگوں پر خرچ کر دیتیں۔ چنانچہ حضورؐ کی پیشین گوئی کے مطابق آپؐ کی وفات کے بعد سب سے پہلے حضرت زینبؓ کی وفات ہوئی۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا

غزوۂ بنو مصطلق میں بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے جو لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ حضرت جویریہؓ لڑائی میں شکست کھانے والے قبیلے کے سردار کی بیٹی تھیں، وہ بھی قید ہو کر آئیں اور حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئیں۔ حضورؐ نے حضرت ثابت بن قیس کو رقم ادا کر کے حضرت جویریہؓ کو آزاد کرایا اور ان سے نکاح کر لیا۔ جب لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی حضرت جویریہؓ کے قبیلے کے قیدیوں کو آزاد کرنا شروع کر دیا، یوں رسول اللہؐ کے اس نکاح کی وجہ سے سینکڑوں قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا۔ حضرت جویریہؓ کا انتقال حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کے زمانے میں ہوا۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام حبیبہؓ کے خاوند نے عیسائیت قبول کر لی تھی چنانچہ اسی وجہ سے ان کی اپنے خاوند سے علیحدگی ہو گئی۔ روایات میں آتا ہے کہ نجاشی حبشہ نے آپؐ کا اور ام حبیبہؓ کا نکاح پڑھایا۔ حضرت ام حبیبہؓ کی وفات بھی حضرت امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں ہوئی۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا

حضرت میمونہؓ اپنے خاوند ابورہم کی وفات کے بعد رسول اللہؐ کے عقد میں آئیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی خواہش پر یہ نکاح ہوا۔ حضرت عباسؓ نے ان کا نکاح پڑھایا جبکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا

حضرت صفیہؓ غزوۂ خیبر میں قید ہو کر آئیں، جناب رسول اللہؐ نے انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ حضرت صفیہؓ کے والد اور بھائی غزوۂ خیبر میں مارے گئے تھے۔ حضورؐ کو حضرت صفیہؓ کے ساتھ بڑی الفت تھی اور حسب موقع ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

نبی کریمؐ کا گھریلو ماحول

ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں جناب نبی کریمؐ کا روزانہ کا معمول یہ تھا کہ آپؐ عصر کی نماز کے بعد تمام ازواج مطہرات کے حجروں میں باری باری جایا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں آپؐ کا قیام مسجد نبوی کے پیچھے حجروں میں تھا۔ ایک حجرہ

حضرت عائشہؓ کا تھا جس میں اب حضور نبی کریمؐ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی قبور ہیں جبکہ ایک قبر کی جگہ ابھی باقی ہے جو حضرت عیسی علیہ السلام کے لیے مخصوص ہے۔ باقی ازواج مطہرات کے حجرے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت عیسیؑ کو اللہ تعالی نے زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا تھا اس لیے ان کو دوسرے انسانوں کی طرح موت نہیں آئی اور اللہ تعالی حضرت عیسی کو نبی کریمؐ کے امتی کی حیثیت سے دوبارہ دنیا میں بھیجیں گے۔ انسانوں میں سب سے لمبی عمر کے انسان حضرت عیسیؑ ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر حضرت نوح علیہ السلام کو لمبی عمر کا انسان مانا جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ لمبی عمر حضرت عیسی علیہ السلام کی ہے کہ ان کی اس وقت تقریبا دوہزار سال عمر ہوگئی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ حضرت عیسیؑ دوبارہ نازل ہوں گے اور حضرت امام مہدیؒ کے ساتھ مل کر دنیا میں اسلام کا غلبہ قائم کریں گے، ان کی شادی ہوگی، بچے ہوں گے، مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوگا اور وہ میرے ساتھ قبر میں دفن ہوں گے۔ چنانچہ اس قبر کی جگہ اب بھی خالی ہے اور وہاں لکھا ہوا ہے کہ یہ قبر کی جگہ حضرت عیسی علیہ السلام کے لیے مخصوص ہے۔

جناب رسول اللہؐ روزانہ عصر کے بعد باری باری ہر زوجہ کے حجرے میں جاتے تھے، سب سے حال احوال پوچھتے تھے اور ضروریات کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے۔ رات کس زوجہؓ کے پاس گزاری جائے، اس کے لیے آپؐ نے باریاں مقرر کر رکھی تھی۔ حضورؐ نے اللہ تعالی سے اپنی دعا میں کہا تھا کہ یا اللہ! جو میرے اختیار میں ہے اس میں تو میں برابری کرتا ہوں، یعنی ازواج کے لیے خرچہ اور عطیات وغیرہ، لیکن جو میرے اختیار میں نہیں ہے یعنی دل کا رجحان اور میلان، اے اللہ اس میں میرا مواخذہ نہ کرنا۔ دلی معاملہ آپؐ کا حضرت عائشہؓ کے ساتھ زیادہ تھا جو کہ ایک فطری بات تھی، دل کے معاملات کسی کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ حضرت عائشہؓ نوجوان، ذہین اور سمجھدار خاتون تھیں اور ازواج مطہرات میں حضورؐ کی سب سے زیادہ پسندیدہ تھیں۔ اور یہ بات بھی غیر فطری نہیں ہے کہ جہاں ایک سے زیادہ بیویاں بیک وقت ہوں وہاں آپس میں اختلاف کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ازواج مطہرات کی بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نوک جھونک رہتی تھی، محدثین اس بارے میں بہت سے واقعات ذکر فرماتے ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالی کی حکمت تھی اور یہ امت کی تعلیم کا ایک اہتمام تھا کہ مختلف مزاج کی عورتیں

حضورؐ کے ساتھ مل جل کر رہیں، ان کی آپس میں معاصرت بھی ہو، نوک جھونک بھی ہو، لیکن اس سب کے باوجود ایک دائرے کی پابندی بھی ہو۔

ازواج مطہراتؓ میں سب سے زیادہ معاصرت حضرت عائشہؓ اور حضرت زینبؓ کے درمیان تھی۔ کبھی کبھی بات سخت بھی ہو جاتی تھی، دونوں حسب موقع ایک دوسرے پر فخر بھی جتلایا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر حضرت زینبؓ فرمایا کرتی تھیں کہ میرا قرآن کریم میں ذکر ہے "فلما قضی زید منھا وطرا زوجنکھا لکی لا یکون علی المؤمنین حرج فی ازواج ادعیاءھم (سورۃ الاحزاب ۳۷) کہ پھر جب زید اس (زینب) سے حاجت پوری کر چکا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی گناہ نہ ہو۔ حضرت زینبؓ دوسری ازواج مطہرات سے فرمایا کرتی تھیں کہ تم سب کا نکاح زمین پر ہوا جبکہ میرا نکاح آسمانوں پر ہوا۔ تم میں سے کسی کے نکاح کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے لیکن میرے نکاح کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ سب ازواج اکٹھی ہوئیں کہ حضورؐ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے اس کے لیے انہوں نے آپس میں فیصلہ کر کے حضرت زینبؓ متکلّم بنایا۔ حضرت زینبؓ نے لمبی گفتگو کی کہ یارسول اللہؐ ازواج مطہرات کو حضرت عائشہؓ کے بارے میں کچھ تحفظات ہیں وغیرہ۔ جب حضرت زینبؓ بات مکمل کر چکیں تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ یارسول اللہؐ مجھے بھی اجازت ہے کہ میں کچھ بات کروں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں تمہارا بھی حق ہے۔ حضرت عائشہؓ بہت فصیح اللسان تھیں ان کی فصاحت اپنے زمانے میں ضرب المثل تھی۔ جب حضرت عائشہؓ نے گفتگو شروع کی تو سب ازواج خاموش ہو گئیں۔ حضورؐ نے آخر میں ایک ہی جملہ فرمایا کہ آخر ابوبکرؓ کی بیٹی ہے، یعنی باقی ازواج سے کہا کہ اب بولو عائشہؓ کے سامنے۔ چنانچہ اس قسم کی باتیں ازواج مطہرات میں آپس میں معاصرت کی ہو جایا کرتی تھیں۔

یہ فطری بات ہے کہ ایک خاوند کی زیادہ بیویاں ہوں تو ان کا آپس میں کسی نہ کسی بات پر اختلاف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب منافقوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو ازواج مطہرات سے حضرت عائشہؓ کے کردار کے بارے میں پوچھا گیا۔ اس واقعہ کے گزر جانے کے بعد حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ مجھے سب سے زیادہ خطرہ زینبؓ سے تھا لیکن حضرت عائشہؓ کے بارے میں سب سے زیادہ صفائی حضرت زینبؓ نے ہی دی۔ حضرت زینبؓ نے فرمایا "ماعلمت فیھا الا خیرا" یارسول اللہؐ میں نے تو عائشہ میں خیر کے سوا کوئی

بات نہیں دیکھی۔ یہ بھی اللہ تعالی نے ازواج کے درمیان باہمی زندگی کا ایک نمونہ بتایا کہ یہ موقع ہوتا ہے فائدہ اٹھانے کا، لیکن حضرت زینبؓ نے باوجود معاصرت کے وہ بات کہی جسے وہ دیانت داری کے ساتھ سچ سمجھتی تھیں۔

خرچ کا معاملہ یہ تھا کہ جو کچھ حضورؐ کے پاس ہوتا آپؐ برابر تقسیم فرمادیتے تھے۔ آپؐ کا کوئی مستقل کاروبار تو تھا نہیں، غنیمت میں سے حصہ مل جاتا، بیت المال سے کوئی چیز مل جاتی، یا کوئی ہدیہ پیش کردیتا تو حضورؐ ازواج میں تقسیم فرمادیتے۔ گھر کی صورتحال کے بارے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی ہم یعنی حضورؐ کے خاندان پر ایسا وقت نہیں گزرا کہ ہم نے عام قسم کی کھجوریں تین دن مسلسل پیٹ بھر کر کھائی ہوں، کئی کئی دن چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ کبھی کچھ کھجوریں مل جاتیں، کبھی ستو وغیرہ مل جاتا اور کبھی کچھ بھی نہ ملتا۔ فرماتی ہیں کہ جب حضورؐ حیات تھے تو ہم میں سے ہر ایک کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑوں کا ہوتا تھا۔ یہ رسول اللہؐ کی ہدایت تھی کہ زندگی میں غیر ضروری سہولتیں اختیار نہ کی جائیں۔ رسول اللہؐ نے اختیاری طور پر اور حکمت کے طور پر یہ زندگی اختیار کی تھی اور حضورؐ کی زندگی کے بعد بھی ازواج مطہرات نے آخر وقت تک یہی طرز زندگی اپنائے رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ کے وصال کے بعد ازواج کے پاس مال زیادہ آتا تھا لیکن وہ سب ضرورت مندوں پر خرچ بھی ہوجاتا تھا۔

یہ جناب نبی کریمؐ کے گھر کا ماحول تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے زندگی بھر ہم ازواج کو گھر کے معاملات میں نہیں ٹوکا، حضورؐ سختی نہیں فرماتے تھے۔ حضورؐ نے خود فرمایا کہ ”انا خیرکم لأھلی“ کہ میں تم میں سے اپنے خاندان کے ساتھ سب سے بہتر ہوں۔ البتہ دینی معاملے میں کمی بیشی ہوتی تو آپؐ اس کا نوٹس لیتے تھے لیکن گھر کے اندر یا دنیوی معاملات میں کسی قسم کا کوئی نقصان ہوتا تو رسول اللہؐ ہمارے ساتھ اس کے متعلق نرمی سے پیش آتے۔ رسول اللہ گھر کے کاموں میں ہمارا ہاتھ بٹاتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے حسب ضرورت گھر میں جھاڑو بھی دیا، جوتے بھی گانٹھے اور چارپائیاں بھی کسیں۔ اس طرح گھر کے دیگر کاموں میں حضورؐ ازواج مطہرات کی مدد فرمایا تھے۔

نبی کریمؐ کی اولاد

حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ حضورؐ کی ساری اولاد حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھی۔ صرف حضرت ماریہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی جو مصر کے بادشاہ مقوقس نے آپؐ کو ہدیہ میں بھیجی تھیں۔

حضرت قاسم رضی اللہ عنہ

حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کی اولاد میں، بیٹوں میں یقینی طور پر حضرت قاسمؓ کا نام آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت قاسمؓ اتنی عمر کو پہنچ گئے تھے کہ گھوڑے کی سواری کر لیتے تھے لیکن نبوت سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ باقی بیٹوں کے نام بعض روایات میں آتے ہیں، عبداللہ، طاہر اور طیب۔ اس میں مؤرخین اختلاف کرتے ہیں کہ یہ الگ الگ بیٹے ہیں یا ایک ہی بیٹے کا نام عبداللہ ہے اور لقب طاہر ہے۔ یہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے، قاسم چونکہ بڑے ہوئے تھے اس لیے ان کا ذکر روایات میں آتا ہے۔ رسول اللہؐ کی کنیت ابوالقاسم انہی کی وجہ سے تھی۔ چھوٹے بچوں کے نام تو روایات میں آتے ہیں لیکن ان کے بارے میں تفصیلات نہیں آتیں، بعض محدثین کہتے ہیں کہ دو بیٹے تھے، بعض کہتے ہیں کہ تین بیٹے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ عبداللہ، طاہر، طیب ایک ہی بیٹے کے نام تھے۔

البتہ حضورؐ کی چار بیٹیاں تھیں، چاروں جوان ہوئیں اور چاروں کی شادیاں ہوئیں۔ تین بیٹیوں کی اولاد ہوئی جبکہ ایک کی اولاد نہیں ہوئی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

آپؐ کی بڑی بیٹی حضرت زینبؓ کا نکاح اپنے خالہ زاد ابوالعاص بن ربیعؓ سے ہوا تھا جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے۔ یہ غزوۂ بدر میں کفار کی طرف سے تھے۔ غزوۂ بدر کے بعد ابوالعاص حضورؐ کی قید میں آ گئے تھے جبکہ دونوں کا نکاح باقی تھا کہ ابھی نکاح کے نئے قوانین نازل نہیں ہوئے تھے۔ حضرت زینبؓ نے اپنا ہار فدیہ میں دے کر انہیں رہا کروایا۔ ابوالعاصؓ بعد میں ایک موقع پر مسلمان ہو گئے تھے اور پھر مسلمانوں کی طرف سے معرکوں میں شریک ہوتے رہے، بہت بہادر آدمی تھے۔ ان کا ذکر نبی کریمؐ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ ابوالعاصؓ نے مجھے میری بیٹی کے بارے میں کبھی تنگ نہیں کیا۔ کسی باپ کا اپنی بیٹی کے حوالے سے داماد کا خیر سے ذکر کرنا بڑی بات ہوتی ہے۔ حضرت زینبؓ کی اولاد میں ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی۔ بڑی بیٹی امامہؓ تھیں جبکہ بیٹے علی تھے۔ امامہؓ حضورؐ کی

بہت لاڈلی نواسی تھیں، روایات میں آتا ہے کہ امامہؓ نماز کے دوران حضورؐ کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں، حضورؐ قعدے میں بیٹھتے تھے تو امامہؓ کبھی کندھے پر چڑھ جاتیں اور کبھی آکر گود میں بیٹھ جاتی تھیں۔ حضورؐ نماز کے دوران سجدے میں جاتے تھے تو یہ گردن پر چڑھ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ایک روایت میں تو یوں آتا ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ امامہؓ کو اپنی گود میں اٹھا کر نماز مکمل کی۔

جناب رسول اللہؐ بچوں سے بہت شفقت فرمایا کرتے تھے، بچوں کو گود میں اٹھانا، ان کو پیار کرنا، انہیں بوسہ دینا، ان کے سر پر ہاتھ پھیرنا، ان کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرنا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں بچوں کے ساتھ حضورؐ سے زیادہ شفقت کرنے والا نہیں دیکھا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ بچوں کو بہلانے کے لیے زبان ہلا کر دکھایا کرتے تھے، آپؐ بچوں کے ساتھ بچہ بن جایا کرتے تھے۔ امامہؓ جوان ہوئیں تو حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کی وصیت کے مطابق حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے امامہؓ سے نکاح کیا۔ حضرت زینبؓ کے ایک بیٹے تھے جن کا نام علیؓ تھا۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا

حضورؐ کی دوسری بیٹی حضرت رقیہؓ تھیں۔ حضرت رقیہؓ کا نکاح حضورؐ نے پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے کیا تھا، نکاح ہوگیا تھا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ حضورؐ کی تیسری بیٹی ام کلثوم ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ کے نکاح میں تھیں۔ اس دوران دعوت اسلام کا سلسلہ شروع ہوگیا، ابولہب نے اس عداوت میں اعلان کر دیا کہ میں اپنے بیٹوں کی شادیاں حضورؐ کی بیٹیوں سے نہیں کروں گا۔ پھر حضرت رقیہ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے ہوا، حضرت عثمانؓ جب ہجرت کر کے حبشہ گئے تو حضرت رقیہؓ ان کے ساتھ تھیں، حبشہ میں ان کا بیٹا عبد اللہؓ پیدا ہوا۔ حضرت عثمانؓ انہی کے حوالے سے ابو عبد اللہؓ کہلاتے تھے۔ یہ حضورؐ کا دوسرا نواسہ جبکہ حضرت رقیہؓ کے بطن سے پہلا بیٹا تھا، چھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ ایسے کہ مدینہ منورہ واپس آئے، ایک مرتبہ کھیل رہے تھے کہ کسی دوسرے بچے نے چھڑی ماری جو آنکھ میں لگ گئی، اسی زخم سے پھر وفات ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ مدینہ میں ہوتے ہوئے بھی بدر کی لڑائی میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت رقیہؓ گھر میں بیمار تھیں، حضرت عثمانؓ کے علاوہ اور کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

حضورؐ نے خود حضرت عثمانؓ سے گھر پر رکنے کا کہا تھا کہ رقیہؓ اٹھ نہیں سکتی، پانی نہیں پی سکتی، معذور ہے، اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ حضرت رقیہ کی تیمار داری میں مدینہ منورہ میں رکے رہے اور پھر اسی حالت میں غزوۂ بدر کے بعد حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا

حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضورؐ نے اپنی دوسری بیٹی ام کلثوم حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دی، اسی لیے حضرت عثمانؓ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے یعنی دو نوروں والا۔ ایک بیٹی کے بعد دوسری بیٹی کو نکاح میں دینا، یہ داماد پر بے پناہ اعتماد کی علامت ہے۔ جب حضرت ام کلثومؓ بھی فوت ہو گئیں تو اس وقت حضورؐ کی بیٹیوں میں صرف حضرت فاطمہؓ زندہ تھیں اور حضرت علیؓ کے نکاح میں تھیں۔ حضورؐ نے حضرت عثمانؓ سے ایک جملہ فرمایا کہ اے عثمان! اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں تیرے نکاح میں دیتا جاتا۔ حضرت ام کلثومؓ کی اولاد نہ تھی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

حضورؐ کے تیسرے داماد حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ دامادوں میں حضرت علیؓ حضورؐ کے سب سے زیادہ چہیتے داماد تھے جبکہ بیٹیوں میں حضرت فاطمہؓ حضورؐ کی سب سے زیادہ چہیتی بیٹی تھیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ سب سے چھوٹا بچہ زیادہ لاڈلا ہوتا ہے، رسول اللہؐ کو حضرت فاطمہؓ سے بہت محبت تھی۔ آپؐ کسی سفر پر جانے سے پہلے سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملنے جاتے، آپؐ سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے۔ جب حضرت فاطمہؓ جوان ہوئیں تو مختلف جگہوں سے شادی کے پیغامات آتے جن پر حضورؐ خاموش ہو جاتے تھے۔ لیکن جب حضرت علیؓ نے حضورؐ سے پوچھا کہ اگر فاطمہؓ کا نکاح میرے ساتھ ہو جائے تو اس پر حضورؐ مسکرائے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ شاید حضورؐ اسی انتظار میں تھے۔ حضرت علیؓ درویش آدمی تھے، حضورؐ نے پوچھا کچھ پاس ہے بھی یا نہیں؟ حضرت علیؓ نے بتایا، یارسول اللہؐ کچھ بھی نہیں ہے۔ پوچھا مہر دینے کے لیے کچھ ہے؟ بتایا، یارسول اللہؐ وہ بھی نہیں ہے۔ حضورؐ نے پوچھا وہ زرہ کہاں ہے جو تمہیں غنیمت میں ملی تھی؟ بتایا، وہ میرے پاس ہے۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ لے کر آؤ۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے وہ زرہ لے کر بیچ دی جسے حضرت عثمانؓ نے خریدا۔ حضورؐ نے حضرت

علیؓ سے فرمایا کہ اس میں سے مہر بھی ادا کرنا اور کچھ سامان وغیرہ بھی خریدنا۔ اور جب نکاح ہوگیا تو رہائش کا مسئلہ پیدا ہوگیا کہ حضرت علیؓ تو حضورؐ کے پاس ہی رہتے تھے۔ ایک انصاری صحابیؓ تھے حضرت حارثؓ، وہ کہنے لگے کہ حضورؐ میرے پاس ایک مکان فارغ ہے، میری اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی کہ آپؐ کی بیٹی اور داماد وہاں رہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ وہاں منتقل ہوگئے۔ حضورؐ کی زندگی میں حضرت فاطمہؓ کے علاوہ آپؐ کی ساری اولاد فوت ہوگئی تھی۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ بیماری کی حالت میں تھے تو حضرت فاطمہؓ آیا کرتی تھیں اور حضورؐ کا حال احوال پوچھا کرتی تھیں۔ آپؐ کی وفات سے کچھ دن پہلے حضرت فاطمہؓ آئیں اور آکر حال احوال پوچھا، حضورؐ نے بھی ان کی خیریت دریافت کی۔ حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کے کان میں کچھ بات کہی جس سے حضرت فاطمہؓ زاروقطار رونے لگ گئیں۔ اس پر آپؐ نے دوبارہ حضرت فاطمہؓ کے کان میں کچھ کہا تو وہ ہنسنے لگ گئیں۔ حضرت فاطمہؓ حضورؐ کے پاس سے اٹھ کر حضرت عائشہؓ کے پاس گئیں تو انہوں نے پوچھ لیا کہ کیا بات تھی کہ پہلے حضورؐ نے کچھ کہا تو آپ رونے لگ گئیں اور دوبارہ کچھ کہا تو آپ ہنسنے لگ گئیں۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ کان میں بات کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ راز کی بات تھی۔ حضرت فاطمہؓ نے وہ بات رسول اللہؐ کی حیات میں کسی کو نہیں بتائی۔ حضورؐ کے انتقال کے بعد جب حالات معمول پر آئے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ سے پھر وہی بات پوچھی۔ اس پر وہ کہنے لگیں کہ بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے میرے کان میں کہا تھا کہ فاطمہ! میں دنیا سے جارہا ہوں۔ باپ کی وفات کی خبر کا ایک بیٹی کو کتنا صدمہ ہوسکتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کہتی ہیں کہ جب میں نے رونا شروع کیا تو حضورؐ نے میرے کان میں پھر کہا کہ میرے بعد سب سے پہلے تم میرے پاس آؤ گی۔

صوفیاء فرماتے ہیں کہ دیکھو، یہ محبت کا رشتہ کیسا رشتہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے جب حضرت فاطمہؓ کو اپنی وفات کی خبر دی تو آپ رو پڑیں لیکن جب ان کی وفات کی خبر دی تو اس پر خوش ہوگئیں۔ اب کسی کو وفات کی خبر دی جائے تو اس کا کیا ردعمل ہونا چاہیے۔ یہ محبت کے رشتے ہوتے ہیں کہ جن میں زندگی و موت کا معاملہ بے معنی ہوجاتا ہے۔ نبی کریمؐ نے حضرت فاطمہؓ کو ان کی موت کی خبر دی تو وہ خوش ہوگئیں اور ہنسنے لگیں کہ والد سے جدائی کے دن زیادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ تقریباً چھ مہینے حیات

رہیں۔ رسول اللہؐ کی سب سے چھوٹی، سب سے چہیتی اور سب سے لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا "فاطمہ بضعۃ منی" "فاطمہ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔

یہ فطری بات ہے کہ انسان کو کچھ باتیں طبعی طور پر ناگوار گزرتی ہیں۔ ابوجہل کی بیٹی مسلمان ہوگئی تھی اور صحابیہ بن کر مدینہ منورہ آگئی تھی۔ حضرت علیؓ کے دل میں اس کے ساتھ نکاح کا خیال آیا اور یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی کہ عرب میں تعدد ازدواج کا عام رواج تھا۔ رسول اللہؐ کو خبر ہوئی تو حضورؐ نے اس کو پسند نہ فرمایا جس پر حضرت علیؓ نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ حالانکہ وہ صحابیہ تھی لیکن یہ حضورؐ کا حضرت فاطمہؓ کے ساتھ طبعی رشتہ تھا کہ حضورؐ نے اس کو گوارا نہ کیا۔ حضرت فاطمہؓ بہت باحیا تھیں۔ ایک مرتبہ اسماء بنت عمیسؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ جب ہم ہجرت کر کے حبشہ گئے تو وہاں میں نے جنازے کا ایک طریقہ دیکھا تھا کیا میں وہ بتاؤں آپ کو؟ فرمایا، ہاں بتاؤ۔ اسماء نے طریقہ بتایا کہ وہاں کے لوگ میت کی چارپائی کے دونوں طرف درخت کی ٹہنیاں پھنسا کر اس کا محراب بناتے تھے اور پھر اس کے اوپر پردہ ڈال دیتے تھے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ میرے جنازے پر ایسا ہی کرنا۔

حضرت فاطمہؓ کے تین بیٹے تھے۔ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت محسنؓ۔ رسول اللہؐ کی گود میں جن بچوں نے پرورش پائی ان میں حضرت امامہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ دوپہر کو آرام فرما رہے تھے کہ حضرت حسنؓ آپ کے پیٹ پر چڑھ کر بیٹھے اور کپڑے گیلے کر دیے، حضورؐ نے اٹھ کر کپڑے پاک کرنے کا انتظام کیا۔ رسول اللہؐ ان سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بنو تمیم کے سردار اقرع بن حابسؓ پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے غالباً حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ کو بوسہ دیا۔ اقرع نے حیرانگی سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ آپ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں؟ میرے دس بچے ہیں، میں نے تو کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ایک روایت کے مطابق فرمایا کہ خدا نے اگر تیرے سینے میں پتھر کا دل رکھ دیا ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایک دفعہ رسول اللہؐ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ حضرت حسنؓ جو سامنے سے گزر رہے تھے، ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ حضورؐ نے دیکھا تو آپؐ سے رہا نہ گیا، آپؐ منبر سے اتر کر گئے، حضرت حسنؓ کو اٹھا کر اپنے ساتھ منبر پر لائے اور پھر اسی طرح خطبہ ارشاد فرمانا شروع کر دیا۔ پھر یہ پیشین گوئی

فرمائی ''ان ابنی ھذا سیداو سیصلح اللہ بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین'' کہ یہ میرا بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالی اس کی وجہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروائے گا۔

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ

آپؐ کے آخری بیٹے حضرت ابراہیمؓ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے۔ بعض روایات میں ایک سال اور بعض روایات میں دو سال کا ذکر آتا ہے کہ اس عمر میں ان کا انتقال ہو گیا تھا، حضورؐ ان کی وفات پر بہت غمگین ہوئے، آپؐ نے فرمایا ''انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون'' اے ابراہیمؓ! ہم تمہاری جدائی پر بہت غمزدہ ہیں۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک صحابیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہؐ آپ ہمیں رونے سے منع فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ زبان کے رونے سے منع کرتا ہوں آنکھ کا رونا تو فطری ہے۔ زبان کا رونا منع ہے یعنی شکوہ کرنا اور بین کرنا وغیرہ لیکن جب آدمی غمگین ہو تو آنکھوں سے آنسو بہتے ہی ہیں۔

نبی کریمؐ کے متعلقین

حضورؐ کے اہل خاندان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جو گھر کے افراد سمجھے جاتے تھے۔ دو تین شخصیات ایسی تھیں کہ جنہیں باہر سے آنے والا گھر کے افراد ہی سمجھتا تھا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ

حضرت بلالؓ فرماتے ہیں کہ ہجرت سے لے کر حضورؐ کے وصال تک، رسول اللہؐ کے گھر کے کام کاج میری ذمہ داری ہوا کرتے تھے۔ کوئی رقم آتی تو گھر کے خرچ اور گھر کی ضروریات کے لیے میرے حوالے ہو جاتی تھی، گھر کے متعلق کوئی بھی کام ہوتا حضورؐ مجھ سے کہتے تھے کہ بلال! فلاں فلاں کام کرنا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

دوسرے عبد اللہ بن مسعودؓ تھے جن کے پاس حضورؐ کی مسواک اور بچھونا وغیرہ ہوتا تھا۔ حضورؐ کے لیے قضائے حاجت یا وضو کے پانی وغیرہ کا بندوبست کرنا، یہ ان کا کام تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا تو لقب ہی پڑ گیا تھا ''صاحب الوسادۃ'' کہ یہ حضورؐ کے بچھونے والے ہیں۔ مدینہ منورہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ حضورؐ کے ذاتی خادم کی ذمہ داری نبھاتے تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

تیسرے آدمی حضرت انس بن مالکؓ تھے جو حضورؐ کے ذاتی خادم تھے، ان کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔ ان کی والدہ محترمہ ہجرت سے پہلے مسلمان ہوگئی تھیں، ان کے خاوند کا نام مالک آتا ہے جو ان کے قبول اسلام سے ناراض ہو کر گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ حضرت انسؓ کی والدہ نے پھر ابو طلحہؓ سے نکاح کیا۔ حضورؐ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی عمر دس سال تھی۔ والدہ نے کہا کہ یا رسول اللہؐ ہمارے پاس اور تو کچھ نہیں ہے لیکن یہ بچہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہے، پھر انس بن مالکؓ آپؐ کی خدمت میں رہے۔ گھر میں کئی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے، کسی کو بلانا، کسی کو پیغام پہنچانا، گھر کی دیگر ضروریات وغیرہ۔ حضرت انسؓ نے دس سال تک حضورؐ کی خدمت کی، اس پر حضورؐ نے حضرت انسؓ کو ایک دعا دی جو کہ ایک مشہور دعا ہے۔ حضورؐ نے دعا فرمائی ''اللھم بارک لہ فی عمرہ ومالہ واکثر ولدہ'' کہ اے اللہ! اسے مال بھی بہت زیادہ دے اور اولاد بھی بہت زیادہ دے۔ چنانچہ سب سے آخر میں جن چند صحابہؓ نے وفات پائی، حضرت انسؓ ان میں سے ایک تھے۔ مختلف روایات کے مطابق ۱۰۲ھ یا ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں انہوں نے وفات فرمائی۔ تقریباً ۱۱۲ سال کی عمر پائی، حضرت انسؓ کی براہ راست اولاد ۲۰۰ سے زیادہ تھی جبکہ بے حساب دولت کے مالک تھے۔

میں نے رسول اللہؐ کے کنبے اور خاندان کا مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نبی کریمؐ پر کروڑوں درود نازل فرمائیں، آپؐ کی ازواج پر، آپؐ کی اولاد پر، آپؐ کے تمام متعلقین پر اور قیامت تک آنے والے آپؐ کے تمام اتباع پر اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جناب نبی کریمؐ کی سیرت پر چلنے کی، آپؐ کے اسوہ کو اپنانے کی اور حضورؐ کی سنت کا ذوق بیدار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

دفاعی بجٹ میں کمی، قومی خودکشی کے مترادف

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ مئی ۱۹۹۵ء)

ان دنوں عالمی طاقتوں اور اداروں کی طرف سے پاکستان کو مسلسل یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دفاعی اخراجات میں کمی کرے اور جدید ہتھیاروں کی تیاری سے گریز کرنے کے علاوہ فوج کی تعداد بھی گھٹائے۔ خود ہمارے بعض دانشور بھی اسی خیال کا اظہار کر رہے ہیں

اور دلیل یہ دی جارہی ہے کہ پاکستان کی اقتصادی ترقی اور خوشحالی کے لیے دفاعی اخراجات کو کم سے کم کرنا ضروری ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے حضرات دو باتوں کو بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

1. ایک یہ کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اور اس ناتے سے اسے دنیا بھر کی اسلام دشمن قوتوں سے خطرہ ہے،

2. دوسری یہ کہ پاکستان کا سابقہ بھارت سے ہے جس کی تنگ نظر ہندو اکثریت کے ساتھ مسلمانوں کی گزشتہ ایک ہزار برس سے مسلسل محاذ آرائی ہے۔ اور کشمیر کا مسئلہ حل ہوجائے تب بھی اس تاریخی پس منظر کے ہوتے ہوئے اس کشیدگی اور محاذ آرائی کا ختم ہونا ممکن نہیں ہے۔

ان تاریخی حقائق کے ہوتے ہوئے پاکستان کو دفاعی اخراجات میں کمی اور فوج کو گھٹانے کا مشورہ یقینا پاکستان کی خیر خواہی نہیں ہے۔ پھر اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ مشورہ اسلامی تعلیمات کے بھی یکسر منافی ہے کیونکہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ

"دشمن کے مقابلہ میں جتنی قوت تمہارے بس میں ہو مہیا کرو تاکہ دشمن پر تمہارا رعب قائم رہے۔" (سورۃ الانفال)

گویا حکم خداوندی کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کی دفاعی قوت اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ دشمن کے مقابلہ میں طاقت کا توازن ان کے حق میں ہو کیونکہ اس کے بغیر دشمن پر رعب قائم ہونا اور دشمن کا مسلمانوں کی قوت سے مرعوب ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت اس امر پر متفق ہیں کہ جدید ترین ہتھیاروں کی تیاری اور مکمل دفاعی ٹیکنالوجی کا حصول مسلمانوں کے دینی فرائض میں سے ہے اور اس معاملہ میں کوتاہی کر کے مسلمان حکومتیں اپنی شرعی ذمہ داری سے کوتاہی کی مرتکب ہو رہی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر بھی اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو اس معاملہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ

"اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔" (سورۃ البقرۃ)

اس آیت کریمہ کی تشریح میں امام ترمذیؒ نے صحیح سند کے ساتھ ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ملک کی عمومی اقتصادی صورتحال اور دفاعی اخراجات کے درمیان توازن و تناسب

کے سلسلہ میں اسلام کے مزاج اور ہدایات کا پتہ چلتا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ معروف صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے موقع پر مسجد نبویؐ اور اس کے ملحقہ حجروں کی تعمیر تک رسول اکرمؐ کے میزبان رہے، اور حضرت امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں اس وقت کی ایک بڑی قوت سلطنت روما کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کے شوق میں بڑھاپے اور ضعف کے باوجود اصرار کر کے لشکر میں شامل ہوئے، ان کی قبر رومی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطنیہ (استنبول) میں ہے۔ وہ رومیوں کے خلاف جنگ کے دوران ایک محاذ پر تھے جہاں مسلمانوں اور رومیوں کا آمنا سامنا ہوا اور ایک پرجوش مسلمان مجاہد مسلمانوں کی صف سے نکل کر اکیلا ہی دشمن کی صفوں میں گھس گیا جس پر کسی صاحب نے قرآن کریم کی یہ آیت بلند آواز سے پڑھی ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس نوجوان نے اکیلے دشمن کی صفوں میں گھس کر غلطی کی ہے جو اس آیت کریمہ کی منشا کے خلاف ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے لوگوں کی زبان سے اس آیت کریمہ کا حوالہ سن کر ان کو ٹوکا اور فرمایا کہ تم نے آیت کا مطلب صحیح نہیں سمجھا کیونکہ اس آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیت ہم انصار مدینہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس میں ہمیں ایک غلط سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے۔ پھر حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اس کا پس منظر یوں بیان فرمایا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہم انصار مدینہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپؐ کی نصرت و رفاقت میں مصروف ہو گئے۔ ہجرت کے دوسرے سال ہی غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مسلسل چند برس ایسے گزرے کہ ہم اپنے کاروبار، کھیتی باڑی اور معاشی حالات کی طرف توجہ نہ دے سکے جس سے ہماری معاشی صورتحال ناگفتہ بہ ہو گئی۔ لیکن چند برسوں کے بعد جب مسلمان مضبوط ہو گئے اور کفار کی پے در پے شکستوں کے باعث کچھ استحکام کی صورتحال نظر آنے لگی تو بعض انصارؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب حالات خاصے بدل گئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری اس طرح کی مدد کی ضرورت نہیں رہی اس لیے ہمیں جہاد کے معاملات سے تھوڑا سا صرف نظر کر کے اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور کھیتی باڑی اور کاروبار کے معاملات کی طرف دوبارہ متوجہ ہونا چاہیے۔

اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی کہ

"اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

اس لیے اس آیت میں ہم انصار مدینہ کو اس سوچ پر تنبیہ کی گئی ہے اور اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ آیت کریمہ کے مطابق ہلاکت کا راستہ یہ ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیا جائے جس کا نتیجہ لازماً یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہوگی اور طاقت کا توازن دشمن کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اس وضاحت کے ساتھ یہ بات پوری طرح روشن ہوجاتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں معاشی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے ساتھ فوجی اور دفاعی قوت کا توازن و تناسب اس طور پر قائم رکھنا ضروری ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں فوجی قوت کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی فوجی قوت میں کمی کرنا قرآن کریم کی زبان میں "قومی خودکشی" کہلائے گا۔

اس پس منظر میں جب ہم آج پاکستان کو درپیش صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف عالمی سازشوں اور بھارت کی فوجی طاقت میں مسلسل اضافہ پر نظر ڈالتے ہیں تو یقیناً پاکستان کی فوجی قوت میں کمی کے مشورے وطن عزیز کے مفاد کے منافی دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے مذکورہ بالا دونوں احکام یعنی وقت کی جدید ترین فوجی قوت کے حصول کا حکم اور فوجی اخراجات میں کمی کو ہلاکت کا راستہ قرار دینا ہماری فوجی اور دفاعی پالیسی کو واضح طور پر یہ رخ دیتے ہیں کہ ہم دفاع کے لیے ایٹمی قوت کے حصول کی کوشش کریں اور انصار مدینہؓ کی طرح ہر قسم کی تنگی ترشی اور معاشی نقصانات برداشت کرتے ہوئے پاکستان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک مستحکم اور ناقابل شکست فوجی قوت بنانے کی طرف توجہ دیں۔

مجاہدین کی عالمی تنظیم "حرکۃ الانصار"

افغانستان میں مسلح روسی جارحیت کے بعد اس خطہ کے غیور علماء اور مسلمانوں نے جہاد کا آغاز کیا تو اس میں دنیا بھر کے غیرت مند مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کے علماء اور دینی کارکنوں نے بھی پورے جوش و جذبہ کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔ پاکستان کے دینی مدارس میں جہاد افغانستان کے لیے علماء اور طلبہ کو منظم کرنے کے کام کا آغاز فیصل آباد کے مجاہد عالم دین مولانا ارشاد احمد شہیدؒ نے کیا اور "حرکۃ الجہاد الاسلامی" کے نام سے مجاہدین کی جماعت تیار کی جس نے مختلف محاذوں پر افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جہاد میں عملی حصہ

لیا۔ مولانا ارشاد احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد یہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ مولانا سیف اللہ اختر کی قیادت میں ”حرکۃ الجہاد الاسلامی“ کے پلیٹ فارم پر کام ہوتا رہا اور مولانا فضل الرحمان خلیل کی سربراہی میں ”حرکۃ المجاہدین“ منظم ہوگئی۔ دونوں جماعتوں نے افغانستان کے مختلف محاذوں کے علاوہ تاجکستان، کشمیر اور دیگر علاقوں میں جہاد میں پرجوش حصہ لیا۔ ان کے ذریعے ہزاروں علماء اور طلبہ نے جہاد کی تربیت حاصل کی، سینکڑوں نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا اور ملک کے دینی مدارس میں جہاد کی فضا قائم ہوگئی۔

دو سال قبل اکابر علماء کرام کی محنت سے دونوں جماعتوں میں اتحاد کی راہ ہموار ہوئی اور دونوں تنظیموں کے راہنماؤں نے حرکۃ الجہاد الاسلامی اور حرکۃ المجاہدین کی بجائے ”حرکۃ الانصار“ کے نام سے ایک نئے مشترکہ پلیٹ فارم پر کام شروع کر دیا جو اس وقت مقبوضہ کشمیر اور دیگر خطوں میں اپنی جرأت مندانہ جہادی سرگرمیوں کے باعث عالمی سطح پر متعارف ہے اور دینی بیداری کی مسلح تحریکات میں ایک باوقار اور منظم جماعت کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل چند غیر مطمئن دوست حرکۃ الجہاد الاسلامی کے دوبارہ احیاء کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا سیف اللہ اختر کی سربراہی میں اس سمت عملی پیش رفت کا آغاز ہوگیا تو اکابر علماء نے صورتحال کا بروقت نوٹس لیا اور مجاہدین کے اس وسیع حلقہ کو ایک نئے خلفشار سے بچا لیا۔ اس سلسلہ میں دو عظیم افغان کمانڈروں حضرت مولانا محمد ارسلان رحمانی اور حضرت مولانا جلال الدین حقانی کے ساتھ انٹرنیشنل اسلامک مشن کے سربراہ مولانا عبد الحفیظ مکی کی توجہات اور مساعی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے شبانہ روز کی محنت کے ساتھ حرکۃ الانصار اور نوتشکیل شدہ حرکۃ الجہاد الاسلامی کے راہنماؤں میں پیدا ہو جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ان سب کو حرکۃ الانصار کے پلیٹ فارم پر دوبارہ مجتمع کر دیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف حرکۃ الانصار کی متفقہ قیادت کا چناؤ عمل میں آگیا ہے بلکہ نیا دستور اور مجلس شوریٰ بھی طے پا گئی ہے۔

ہم اس مثبت اور مبارک پیشرفت پر مولانا ارسلان رحمانی، مولانا جلال الدین حقانی، مولانا عبد الحفیظ مکی اور حرکۃ الانصار کے تمام راہنماؤں اور کارکنوں بالخصوص مولانا قاری سیف اللہ اختر اور مولانا فضل الرحمان خلیل کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی بھرپور کامیابی کے لیے دعاگو ہیں، اللھم ربنا آمین۔

اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر اور اسلامی تعلیمات

(جامع مسجد صدیقیہ، سیٹلائیٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ - ۱۷ اپریل ۱۹۹۵ء)

(ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا زاہد الراشدی نے ۷ اپریل ۱۹۹۵ء کو مسجد صدیقیہ سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں فورم کی ماہانہ فکری نشست اور ۱۷ اپریل ۱۹۹۵ء کو مرکزی جامع مسجد شادمان لاہور میں مسلم ہیومن رائٹس سوسائٹی کی فکری نشست سے مندرجہ بالا موضوع پر تفصیلی خطاب کیا۔ دونوں خطابات کو یکجا ترتیب کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج ہماری گفتگو کا عنوان ہے ”اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر اور اسلامی تعلیمات“ جس کے تحت ہم اس فکری اور نظریاتی کشمکش کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو اس وقت عالمی سطح پر انسانی حقوق اور ان کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے جاری ہے۔

”انسانی حقوق“ آج کی دنیا میں سب سے زیادہ زیر بحث آنے والا موضوع ہے اور یہ مغرب کے ہاتھ میں ایک ایسا فکری ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ مسلم ممالک اور تیسری دنیا پر مسلسل حملہ آور ہے۔ مغرب نے انسانی حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے چارٹر کو مسلمہ معیار کا درجہ دے کر کسی بھی معاملہ میں اس سے الگ رویہ رکھنے والے تیسری دنیا اور عالم اسلام کے ممالک کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دینے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اور اس سلسلہ میں اسے عالمی ذرائع ابلاغ کے ساتھ ساتھ عالم اسلام اور تیسری دنیا میں اپنی ہم نوا لابیوں کا بھرپور تعاون حاصل ہے جبکہ اس نظریاتی و فکری یلغار میں ملت اسلامیہ کے عقائد و احکام اور روایات و اقدار سب سے زیادہ مغربی دانشوروں، لابیوں اور ذرائع ابلاغ کے حملوں کی زد میں ہیں۔

اس کشمکش میں جب ہم اسلام کے عقائد و احکام پر مغربی دانشوروں کے حملوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ یلغار عقائد و احکام اور معاشرت کے تمام شعبوں پر محیط نظر آتی ہے۔ اگر آپ گزشتہ ایک دہائی کے دوران پیش آنے والے واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے حالات کا تجزیہ کریں گے تو آپ کو صورتحال کا نقشہ کچھ یوں نظر آئے گا۔

• سلمان رشدی کو مغربی ممالک اور ذرائع ابلاغ نے صرف اس ''کارنامے'' پر آزادیٔ رائے کا ہیرو بنا کر پیش کیا ہے کہ اس نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مسلمانوں کے بے پایاں عشق و محبت پر ضرب لگانے کی کوشش کی اور ملت اسلامیہ کے اس اجماعی عقیدہ کا دائرہ توڑنا چاہا کہ جناب رسول اللہؐ ہر قسم کے اختلاف، اعتراض اور تنقید سے بالاتر اور غیر مشروط اطاعت کا مرکز ہیں۔

• تسلیمہ نسرین صرف اس ''جرأت رندانہ'' پر مغرب کی آنکھوں کا تارا بن گئی ہے کہ اس نے قرآن کریم کے ناقابل تغیر و تبدل ہونے کے عقیدہ پر یہ کہہ کر ضرب لگانے کی کوشش کی کہ آج کے حالات کی روشنی میں قرآن کریم میں ترامیم کی ضرورت ہے۔

• معاشرتی جرائم کی اسلامی سزاؤں ہاتھ کاٹنے، سنگسار کرنے اور کوڑے مارنے کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا گیا ہے، پاکستان کی عدالت عظمی میں مجرم کو کھلے بندوں سزا دینے کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی گردانا گیا ہے اور پاکستان میں برائے نام نافذ چند اسلامی تعزیری قوانین کو ختم کرنے کے لیے امریکہ کی طرف سے مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔

• توہین رسالتؐ پر سزا کے قانون کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا گیا ہے اور اس قانون کے خاتمہ کے لیے دباؤ ڈالنے کے ساتھ ساتھ مغربی حکومتوں کی طرف سے توہین رسالتؐ کے مرتکب افراد کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کا سلسلہ جاری ہے۔

• قادیانیت کو اسلام سے الگ مذہب قرار دینے اور قادیانیوں کو اسلام کا نام اور مسلمانوں کے مذہبی شعائر کے استعمال سے روکنے کے قانونی و آئینی اقدامات کو بھی انسانی حقوق کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ اور قادیانیوں کو مظلوم قرار دے کر امریکہ کی طرف سے ان کے خلاف مذکورہ اقدامات واپس لینے پر زور دیا جا رہا ہے۔

• اسلام کے معاشرتی اور خاندانی نظام کو معاشرت کے موجودہ عالمی نظام کے منافی قرار دیا جا رہا ہے اور خاندانی زندگی کے بارے میں بیشتر مسلم ممالک

میں مروجہ قوانین کو عالمی معیار کے مطابق بدل دینے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ جس میں شادی کے لیے مذہب کی شرط کو ختم کرنے، آزادانہ جنسی تعلقات کے بھرپور مواقع کی فراہمی، ہم جنس پرستی کو قانونی طور پر تسلیم کرنے اور بن بیاہی ماؤں اور ناجائز بچوں کو سماجی تحفظ فراہم کرنے کے تقاضے شامل ہیں۔

- اسلام کے عقائد و احکام کے ساتھ مسلمانوں کی غیر مشروط اور وفادارانہ وابستگی کو ''بنیاد پرستی'' قرار دیا جا رہا ہے اور ایسی دینی تحریکات پر بھی ''دہشت گردی'' کا لیبل چسپاں کر کے انہیں عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ مسلسل کردار کشی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جو متعدّد مسلم ممالک میں اسلامی عقائد و احکام کے ساتھ وابستگی کی بنا پر ریاستی تشدد کا نشانہ بننے کی وجہ سے اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئی ہیں، یا غیر مسلم ممالک میں موجود مسلم اقلیتوں کی آزادی اور ان کے اسلامی تشخص کے تحفظ کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔

یہ ہے ایک سرسری خاکہ مغرب کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں سامنے آنے والے اعتراضات اور تقاضوں کا جو گزشتہ ایک عشرہ کے دوران منظم مہم اور مربوط نظریاتی جنگ کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور جن کے سامنے مسلم ممالک کی بیشتر حکومتیں ''سپر انداز'' ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ چنانچہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزیر اعظم نے اپنے حالیہ دورۂ امریکہ کے دوران یہ کہہ کر مسلم حکمرانوں کے اسی رجحان کی نشاندہی کی ہے کہ وہ ''انٹر نیشنلزم پر یقین رکھتی ہیں''۔ اس انٹر نیشنلزم کا تصور مغرب کے نزدیک یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور کو پوری دنیا کا مشترکہ دستور تسلیم کر کے تمام ممالک اقوام متحدہ کی بالادستی کے سامنے جھک جائیں، اور اقوام متحدہ کو کنفیڈریشن طرز کی مشترکہ حکومت قرار دے کر ساری دنیا ایک عالمی برادری کی شکل اختیار کر لے۔ گویا وہ مغرب جس نے گزشتہ ایک سو سال کے دوران نیشنلزم اور قومیت کے نام پر عالم اسلام کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، اب انہی ٹکڑوں کو ''انٹر نیشنلزم'' کے نام پر وہ اپنی بالادستی میں ویسٹرن سولائزیشن میں ضم کرنے کے لیے کوشاں ہے اور اس اسکیم کے تانے بانے پوری طرح بنے جا چکے ہیں۔

معزز شرکاء محفل! اس نظریاتی معرکہ اور فکری جنگ میں بنیادی حیثیت اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور جنیوا انسانی حقوق کمیشن کے فیصلوں اور قراردادوں کو حاصل

ہے۔ ’’انسانی حقوق کا چارٹر‘‘ متن ہے جبکہ جنیوا کنونشن کے فیصلے اور قراردادیں اس کی شرح ہیں جو اس نظریاتی جنگ میں مغرب کے ہاتھ میں ایک مضبوط ہتھیار کا کام دے رہی ہیں۔ مغرب کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ کی رکنیت اختیار کرنے والے تمام ممالک نے انسانی حقوق کے اس چارٹر پر دستخط کر کے اسے تسلیم کر لیا ہے اس لیے وہ اس کے پابند ہیں۔ اور جن ممالک میں اس چارٹر کے منافی قوانین نافذ ہیں وہ اس بین الاقوامی معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ تمام ممالک خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم اس عالمی معاہدہ کی پابندی کریں اور اپنے اپنے ملک میں رائج قوانین میں ترامیم کر کے انہیں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

ہمیں مغرب کے اس موقف اور اس کی پشت پر کارفرما عزائم کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا ہوگا۔ محض جذباتی طور پر اسے مسترد کر دینے سے بات نہیں بنے گی اور ’’ہم نہیں مانتے‘‘ کا خالی نعرہ دنیا بھر کے ان اربوں انسانوں اور عالم اسلام کے ان کروڑوں مسلمانوں کو ہمارے موقف کے بارے میں مطمئن نہیں کر سکے گا جو ورلڈ میڈیا کی براہ راست زد میں ہیں اور جن کی آنکھوں اور کانوں کو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغرب کے پراپیگنڈے کا روزمرہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مسلم علماء، دانشور اور دینی ادارے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور جنیوا انسانی حقوق کنونشن کی قراردادوں اور فیصلوں کا علمی بنیاد پر جائزہ لیں اور مغرب کے اعتراضات و خدشات کا منطق و استدلال کے ساتھ سامنا کر کے انسانی حقوق کے حوالہ سے ملت اسلامیہ کا موقف سامنے لائیں۔ ہمیں انسانی حقوق کے بارے میں معروضی حالات اور انسانی معاشرہ کو درپیش مسائل کی روشنی میں اپنے موقف کا واضح طور پر تعین کرنا ہوگا اور اسے علم اور منطق و استدلال کی بنیاد پر افہام و تفہیم کے جذبہ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم اس خوفناک نظریاتی جنگ میں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکیں گے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور اس کی تشریح میں جنیوا انسانی حقوق کنونشن کی قراردادوں اور فیصلوں کا جائزہ ہمیں دو مرحلوں میں لینا ہوگا۔

- پہلے مرحلہ میں ان دونوں کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے اور بحث و مذاکرہ کے عمل سے گزر کر ان دونوں کے ان حصوں کی نشاندہی کرنا ہوگی جو ہمارے خیال میں اسلام کے عقائد و احکام سے متصادم ہیں اور جن کو قبول کرنے کی

صورت میں ہمیں اپنے دینی عقائد، احکام اور معاشرتی اقدار سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ انسانی حقوق کے چارٹر اور جنیوا کنونشن کی قراردادوں کے اسلام سے متصادم حصوں کی متعیّن طور پر نشاندہی کے بعد دنیا بھر کو وسیع پیمانے پر ان سے آگاہ کرنا ہوگا اور عالمی سطح پر ان کی تشہیر کرنا ہوگی تاکہ پوری دنیا کے اہل دانش ہمارے موقف کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

• جبکہ دوسرے مرحلے پر ہمیں علمی اور منطقی طور پر اسلام کے ان احکام و قوانین اور روایات و اقدار کی بہتری اور افادیت کو ثابت کرنا ہوگا جنہیں انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جارہا ہے اور جو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر سے متصادم نظر آرہے ہیں۔

سامعین محترم! ان گزارشات کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ چنانچہ بحث کے آغاز کے طور پر ہم اس چارٹر کے بعض حصوں کا ابتدائی اور سرسری طور پر جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ چارٹر اقوام متحدہ نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو جاری کیا تھا اور اس وقت ہمارے سامنے اس کا اردو متن ہے جو اسلام آباد کے ماہنامہ ”نوائے قانون“ نے دسمبر ۱۹۹۴ء کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ انسانی حقوق کے اس چارٹر کی ۳۰ دفعات ہیں اور اس میں اجتماعی زندگی کے کم و بیش تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

چارٹر کے ابتدائی مطالعہ میں ہم نے اس کی چند دفعات گفتگو کے لیے منتخب کی ہیں جو ہمارے خیال میں بعض اسلامی قوانین و احکام کو انسانی حقوق کے منافی قرار دینے کا باعث بن رہی ہیں لیکن ان دفعات کو زیر بحث لانے سے پہلے چارٹر کی اعتقادی اور فکری بنیاد کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ چارٹر دراصل مغربی فلسفہ حیات اور ویسٹرن سولائزیشن کا نقطۂ عروج ہے جس کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہے کہ مذہب کا تعلق صرف عقیدہ، عبادت اور اخلاقیات سے ہے جس میں ہر انسان آزاد ہے کہ وہ عقیدہ، عبادت اور اخلاقیات میں جو رجحان چاہے اختیار کرے اور یہ اس کا ذاتی معاملہ سمجھا جائے جس سے ریاست یا کوئی اور اتھارٹی کسی قسم کا تعرض نہ کرے۔ البتہ انسانی زندگی کے اجتماعی معاملات مثلاً سیاست، قانون، ایڈمنسٹریشن، تجارت، زراعت، اور معیشت کے ساتھ مذہب کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور

ان امور میں ہر قوم اپنے اجتماعی یا اکثریتی رجحانات کے مطابق کوئی بھی نظام اختیار کر سکتی ہے اور وہ نظام مذہب کی کسی بھی قید یا چھاپ سے آزاد ہو گا۔

اسے اصطلاحی طور پر سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی سیکولرازم کو قبول کرنے کا ہم سے تقاضہ کیا جا رہا ہے۔ سیکولرازم کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ یورپ میں بادشاہ، کلیسا اور جاگیردار کے اتحاد ثلاثہ نے جب غریب عوام پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا اور بادشاہت اور جاگیرداری کے خلاف بے بس عوام کی بغاوت میں کلیسا اور پادری نے عوام کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا تو عوامی انقلاب نے بادشاہت اور جاگیرداری کے ساتھ کلیسا اور پادری کی بساط اقتدار بھی الٹ کر رکھ دی اور مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے اس کا دائرہ کار کلیسا کی چار دیواری کے اندر محدود کر دیا۔ لیکن اس تاریخی پس منظر کے پہلو بہ پہلو ایک اعتقادی اور فکری بنیاد بھی ہے جو سیکولرازم اور مغربی جمہوریت کو نظریاتی قوت فراہم کر رہی ہے۔

حضرات مکرم! مغرب کے مادہ پرستانہ فلسفے کی بنیاد نظریہ ارتقاء پر ہے جس کا خاکہ کچھ اس طرح ہے کہ اس دنیا میں جو کسی پیدا کرنے والے اور چلانے والے خدا کے بغیر خود بخود وجود میں آگئی ہے، انسانی نسل حیوانی ارتقاء کا نتیجہ ہے جو کیچڑ سے جنم لینے والے کیڑے سے شروع ہو کر مختلف زمانوں میں شکلیں بدلتا ہوا انسان کی صورت اختیار کر گیا ہے اور یہ اس کی آخری اور حتمی شکل ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرہ بھی ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے جو جنگلوں اور غاروں سے شروع ہوا اور مختلف شکلیں بدلتا ہوا اور معاشرت کے مختلف طریقے، قوانین اور نظام آزماتا ہوا جمہوریت، سیکولرازم اور ویسٹرن سولائزیشن کی موجودہ شکل اختیار کر گیا ہے اور یہ انسانی معاشرت کی آخری اور مکمل شکل ہے جس میں اب مزید بہتری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ گویا جس طرح نسلی اعتبار سے انسان آخری منزل میں ہے اور اب اس کے نئی کئی شکل اختیار کرنے کا امکان نہیں ہے، اسی طرح معاشرتی لحاظ سے بھی ویسٹرن سولائزیشن آخری منزل ہے اور اب اس سے بہتر کوئی معاشرتی ڈھانچہ سامنے آنے کا امکان نہیں ہے۔ اسے ''اینڈ آف ہسٹری'' سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور مغربی دانشور اب ارتقاء کے عمل کے مزید آگے بڑھنے کے امکانات کو مسترد کرتے ہوئے مکمل تباہی کو انسانی زندگی کی اگلی منزل قرار دے رہے ہیں۔

اس طرح جب موجودہ انسانی معاشرہ نہ صرف انسانیت بلکہ پوری کائنات ارضی کی آخری، مکمل اور ترقی یافتہ شکل قرار پاتا ہے اور یہی کائنات وجود کا حاصل ہے تو خیر و شر کا آخری معیار بھی یہی ہے۔ اس لیے جسے یہ انسانی معاشرہ خیر قرار دے دے وہی خیر ہے اور جو اس معاشرہ کے نزدیک شر قرار پائے وہی شر ہے۔ اس کے علاوہ خیر اور شر کو ماپنے اور جانچنے کا کوئی اور پیمانہ موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی چیز یا کام کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے۔

مگر اسلام اس تصور کو سرے سے قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس قرآن و سنت پر یقین رکھنے والے ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ یہ کائنات کسی حادثہ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اسے کائنات کے مالک و خالق اللہ تعالی نے پیدا کیا ہے اور وہی اسے ایک نظم کے ساتھ چلا رہا ہے۔ اسی طرح انسانی نسل کسی ارتقائی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالی نے اسے ایک مستقل مخلوق کے طور پر پیدا کیا ہے اور اشرف المخلوقات ٹھہرایا ہے۔ پھر انسانی زندگی کا ایک معاشرہ کی شکل اختیار کر جانا بھی خودرو ارتقائی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کے مطابق نسل انسانی کا پہلا فرد ”حضرت آدم علیہ السلام“ علم، قانون، شرم و حیا، لباس اور مکان کی سہولتوں سے بہرہ ور تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہر باشعور مسلمان یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ نسل انسانی اس دنیاوی زندگی میں آسمانی ہدایات کی پابند ہے جو اس کے پاس اس کے خالق و مالک کی طرف سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ آئی ہیں اور ان ہدایات کی آخری اور مکمل شکل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں جن پر عملدرآمد زندگی کے اگلے اور آخری مرحلہ میں کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ اسلامی تعلیمات میں انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے لیکن اس تفصیل کے ساتھ کہ اس کے لیے ”احسن تقویم“ کا خطاب بھی استعمال کیا گیا ہے اور اسے ”اسفل سافلین“ کے مقام کا مستحق بھی قرار دیا گیا ہے۔

گویا انسان اور انسانی معاشرہ کی موجودہ شکل آخری اور حتمی نہیں ہے، یہ امتحانی گزرگاہ ہے جس سے گزر کر اگلی زندگی میں اسے ”احسن تقویم“ یا ”اسفل سافلین“ کی منزل سے ہمکنار ہونا ہے اور وہی اس کا ”اینڈ آف ہسٹری“ ہوگا۔ اس لیے موجودہ انسانی معاشرہ جب آخری اور حتمی منزل نہیں ہے تو اس کی سوچ اور عقل بھی خیر اور شر کا آخری معیار نہیں ہے

بلکہ خیر اور شر کا حتمی معیار آسمانی وحی ہے جس کی مکمل شکل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی صورت میں موجود ہے۔

معزز شرکائے محفل! یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی پہلی دفعہ میں تمام انسانوں کو آزادی اور حقوق کے ساتھ ساتھ تکریم میں بھی برابر قرار دیا گیا ہے جبکہ اسلام تمام انسانوں کو تکریم کا یکساں مستحق تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا اصول ”ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم“ ہے کہ جو اچھے کردار کا حامل ہے وہ تکریم کا مستحق ہے اور جس کا کردار انسانی اخلاق کے مطابق نہیں ہے وہ تکریم کا حقدار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں چارٹر کی دفعہ ۵ کا جائزہ لیا جائے تو جرائم کی اسلامی سزاؤں کو غیر انسانی قرار دینے کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ دفعہ نمبر ۵ کا عنوان ہے ”تشدد کا خاتمہ“ اور اس میں کہا گیا ہے کہ:

> ”کسی شخص کو تشدد اور ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور کسی شخص کے ساتھ غیر انسانی اور ذلت آمیز سلوک نہیں کیا جائے گا یا ایسی سزا نہیں دی جائے گی۔“

گویا اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق کسی مجرم کو دی جانے والی سزا کا تشدد اور تذلیل کی آمیزش سے خالی ہونا ضروری ہے اور جس سزا میں ان میں سے کسی کوئی عنصر موجود ہو گا وہ انسانی حقوق کے منافی قرار پائے گی۔ اسی بنا پر ہاتھ کاٹنے، کوڑے مارنے اور سنگسار کرنے کی سزاؤں کو انسانی حقوق کے خلاف قرار دیا جا رہا ہے اور اسی بنا پر پاکستان کی عدالت عظمی میں کسی مجرم کو کھلے بندوں سزا دینے کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔ جبکہ اسلام میں جرائم پر سخت سزاؤں کا مقصد ہی یہ ہے کہ مجرم کو نصیحت ہو اور دیکھنے والے اس سے عبرت پکڑیں۔

اس کے بعد چارٹر کی دفعہ ۱۶ پر ایک نظر ڈال لیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ:

> ”پوری عمر کے مردوں اور عورتوں کو نسل، قومیت یا مذہب کی کسی تحدید کے بغیر باہم شادی کرنے اور خاندان کی بنیاد رکھنے کا حق حاصل ہے۔ شادی، دوران شادی اور اس کی تنسیخ کے سلسلہ میں وہ مساوی حقوق رکھتے ہیں“۔

اس دفعہ میں اسلامی تعلیمات کی رو سے چند باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ”پوری عمر“ سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اسلامی احکام میں شادی کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ ”مذہب کی کسی تحدید کے بغیر“ کا مطلب واضح ہے کہ کوئی مسلمان مرد کسی بھی غیر مسلم عورت سے اور کوئی مسلمان عورت کسی بھی غیر مسلم مرد سے شادی کر

سکتی ہے جبکہ یہ اسلامی تعلیمات کے یکسر منافی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ شادی کی تنسیخ کے سلسلہ میں دونوں کے مساوی حقوق کا تصور بھی اسلامی احکام کے خلاف ہے۔ کیونکہ اسلام نے طلاق کے بارے میں واضح ترجیحات قائم کی ہیں اور دونوں کو یکساں حقوق بہرحال نہیں دیے ہیں۔

اس کے سات چارٹر کی دفعہ ۲۵ کی شق ۲ کو بھی شامل کرلیں جس میں کہا گیا ہے کہ:

"ماں اور بچے کو خصوصی توجہ اور مدد کا حق حاصل ہے۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہوں یا بغیر شادی کے پیدا ہوں یکساں سماجی تحفظ سے بہرہ ور ہونے کا حق رکھتے ہیں"۔

اور ان دونوں دفعات کے ساتھ گزشتہ برس قاہرہ میں منعقد ہونے والی اقوام متحدہ کی بہبود آبادی کانفرنس کی سفارشات کو بھی سامنے رکھیں جن میں تمام ممالک سے تقاضہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے عوام کو آزادانہ جنسی اختلاط کے مواقع فراہم کریں، اسقاط حمل کی سہولتیں مہیا کریں، بن بیاہی ماؤں کو سماجی تحفظ سے بہرہ ور کریں اور ہم جنسی کو قانونی جواز کی سند عطا کریں۔

حضرات محترم! اب آپ ان تمام امور کے اشتراک کے ساتھ خاندانی زندگی سے متعلقہ قوانین کے بارے میں اس "عالمی معیار" کو سمجھنے کی کوشش کریں جسے اپنانے کی تمام ممالک کو تلقین کی جارہی ہے اور یہ تقاضا کیا جارہا ہے کہ اگر کسی ملک میں اس معیار کے خلاف عائلی قوانین نافذ ہیں تو وہ ان میں ترامیم کرکے انہیں اس عالمی معیار کے مطابق ڈھال لے۔

کم و بیش یہی صورتحال آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ عقیدہ، آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کے حوالہ سے انسانی حقوق کے مذکرہ چارٹر کی تصریحات کی بھی ہے جو چارٹر کی دفعہ ۱۸ اور ۱۹ میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہیں:

"ہر شخص کو آزادیٔ خیال، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ مذہب کا حق حاصل ہے، اس حق میں اپنا مذہب اور عقیدہ تبدیل کرنے اور انفرادی و اجتماعی طور پر علیحدگی میں یا سب کے سامنے اپنے مذہب یا عقیدے کی تعلیم، اس پر عمل کرنے، اس کے مطابق عبادت کرنے اور اس کی پابندی کرنے کی آزادی کا حق شامل ہے"۔

"ہر شخص کو آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کا حق حاصل ہے، اس حق میں بلا مداخلت رائے رکھنے کی آزادی اور بلا لحاظ علاقائی حدود کسی بھی ذریعے سے اطلاعات اور نظریات تلاش کرنے، حاصل کرنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کی آزادی

شامل ہے"۔

ان دونوں دفعات پر ایک بار پھر غور کر لیجئے اور سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین، پاکستان کے چند مسیحی گستاخان رسولؐ اور قادیانیوں سمیت ان تمام طبقوں اور گروہوں کے مبینہ حقوق کا جائزہ لیجئے جن کی پامالی کا ڈھنڈورا پیٹ کر مغرب کی حکومتیں اور ذرائع ابلاغ انسانی حقوق کے حوالہ سے مسلمانوں کے طرز عمل کو مسلسل ہدف تنقید بنا رہے ہیں۔

حضرات مکرم! بات زیادہ لمبی ہوتی جا رہی ہے اس لیے گفتگو سمیٹتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی بعض دفعات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی سرسری طور پر کسی لمبی بحث میں الجھے بغیر صرف اس غرض سے کہ ان اعتراضات و شبہات کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہو جائے جو انسانی حقوق کے حوالہ سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی طرف سے کیے جا رہے ہیں۔ تاکہ مغرب کے ان عزائم کو سمجھنا مشکل نہ رہے جو اس کشمکش میں اس کے اہداف کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ یہ ایک سرسری اور ابتدائی مطالعہ ہے جو علماء کرام اور دانشوروں کو مسئلہ کی سنگینی اور اہمیت کا احساس دلانے کے لیے ہے۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ:

- علماء کرام اور اہل دانش اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور اس کی تشریح و تعبیر میں جنیوا انسانی حقوق کمیشن کی قراردادوں اور فیصلوں کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی ایک ایک شق کا تجزیہ کریں،
- اس پر بڑے دینی اداروں اور مدارس میں مذاکروں اور علمی بحث و مباحثہ کا اہتمام کیا جائے،
- قرآن کریم، حدیث نبویؐ اور فقہ کی تدریس و تعلیم میں اساتذہ ان موضوعات کو اپنی گفتگو کا حصہ بنائیں،
- اور اہل قلم قومی اخبارات اور دینی جرائد میں ان مسائل پر اظہار خیال کریں۔

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اس تمام تر گفتگو اور مباحثہ میں سیاسی نعرہ بازی اور مناظرانہ اسلوب سے گریز کرتے ہوئے خالصتاً علمی زبان اور منطقی و استدلالی انداز اختیار کیا جائے تاکہ ہم دنیا پر اسلام کی حقانیت، افادیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ

ملت اسلامیہ کی نئی نسل اور تعلیم یافتہ طبقہ کی غالب اکثریت کو غیر شعوری ارتداد سے بچا سکیں جو اسلام کے احکام و قوانین پر مغربی فلسفہ کے اعتراضات کے مسلسل یکطرفہ پراپیگنڈہ کا کوئی معقول جواب نہ پاکر دھیرے دھیرے اس کے دائرۂ اثر میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ خدا کرے کہ علمی شخصیات اور دینی ادارے وقت کے اس سب سے بڑے چیلنج کا صحیح طور پر ادراک کر سکیں، آمین یا رب العالمین۔

۱۹۹۴ء

سنی شیعہ کشمکش کے اسباب و عوامل

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ دسمبر ۱۹۹۴ء)

تحریک جعفریہؒ پاکستان اور سپاہ صحابہؓ پاکستان کے درمیان کشمکش نے مسلح تصادم کی جو صورت اختیار کر لی ہے، اس سے ملک کا ہر ذی شعور شہری پریشان ہے۔ دونوں جانب سے سینکڑوں افراد اب تک اس مسلح تصادم کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اور ارباب اختیار فرقہ واریت کے خاتمہ کے عنوان سے اس کشمکش پر قابو پانے کا بار بار عزم ظاہر کرتے ہیں، مگر اس کی جڑیں معاشرہ میں اس قدر گہرائی تک اتر چکی ہیں کہ بیخ کنی کے لیے ان تک رسائی مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کشیدگی کے اسباب و عوامل کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ تجزیہ کیا جائے اور سنجیدہ عمومی بحث و مباحثہ کے ذریعہ اس کے محرکات کا کھوج لگا کر اس مقام تک پہنچا جائے جہاں سے اس کشمکش کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ تاکہ ان کو بند کرنے کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔

یہ کشمکش اور تصادم جو عملاً سپاہ صحابہؓ پاکستان اور تحریک جعفریہؒ پاکستان کے درمیان ہے، دراصل شیعہ سنی کشمکش کا شدت پسندانہ اظہار ہے۔ اور شیعہ سنی کشمکش کی تاریخ بہت پرانی ہے جس کا آغاز پہلی صدی ہجری کے اختتام سے قبل ابتدائی شکل میں ہو گیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے ملت اسلامیہ میں عقائد و نظریات کے لحاظ سے دو واضح متحارب گروہوں کی صورت اختیار کر لی۔ قارئین کی معلومات کے لیے دونوں گروہوں کے اعتقادات میں چند بنیادی فرق واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

• اہل سنت کے نزدیک موجودہ قرآن کریم ہی اصلی اور مکمل قرآن کریم ہے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء راشدینؓ نے مرتب شکل میں امت کو دیا تھا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی رد و بدل نہیں ہوا۔ اہل تشیع کے نزدیک یہ قرآن کریم مکمل نہیں ہے بلکہ ان کے بقول اس میں رد و بدل ہوا ہے۔ جبکہ اصل قرآن کریم امام غائب کے پاس ہے جو اپنے وقت پر اسے لے کر ظاہر ہوں گے، اس وقت تک مصلحتاً موجودہ قرآن کریم کو ہی بطور قرآن پڑھنا اور پیش کرنا بامر مجبوری درست ہے۔

• اہل سنت کے نزدیک جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپؐ کا ساتھ دینے والے سب لوگ صحابہ کرامؓ ہیں۔ ان میں مہاجرین، انصار اور اہل بیت سمیت تمام طبقات شامل ہیں۔ یہ سب لوگ اہل ایمان ہیں، سب کے ساتھ عقیدت و محبت رکھنا ضروری ہے اور سب کے سب ہدایت کا ذریعہ اور معیار ہیں۔ جبکہ اہل تشیع کے نزدیک اہل بیتؓ کے سوا باقی لوگ لائق اعتبار نہیں ہیں، بلکہ انہیں اہل ایمان میں شامل کرنا بھی درست نہیں ہے۔ اور اہل بیتؓ سے مراد بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور کنبہ کے سب افراد نہیں بلکہ صرف حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر ازواج مطہرات اور اولاد اہل تشیع کے نزدیک اہل بیت میں شامل نہیں ہے۔

• اہل سنت کے نزدیک قرآن کریم کے بعد سنت رسولؐ دین کا دوسرا بڑا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔ اور سنت سے مراد وہ تمام روایات و احادیث ہیں جو صحابہ کرامؓ کے کسی بھی فرد سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہیں۔ جبکہ اہل تشیع بھی سنت رسولؐ کو دین کا ماخذ مانتے ہیں، مگر ان کے نزدیک حدیث و سنت صرف وہی ہے جو اہل بیتؓ سے منقول ہے۔ اور ان کے علاوہ مہاجرینؓ، انصارؓ، ازواج مطہراتؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے منقول روایات اہل تشیع کے نزدیک سنت میں شامل نہیں ہیں۔

• اہل سنت کے نزدیک جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے، اس لیے کوئی شخصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

بعد ایسی نہیں ہے جس کی رائے میں خطا کا احتمال نہ ہو۔ اور کسی دلیل اور بنیاد کے بغیر اس کی بات بہر صورت واجب العمل ہو۔ جبکہ اہل تشیع کے نزدیک اہل بیتؓ کے ۱۲ امام معصوم عن الخطاہیں اور ان کی رائے اور قول کو وہی حیثیت حاصل ہے جو پیغمبر کی وحی کو حاصل ہوتی ہے۔

• اہل سنت کے نزدیک خلفاء راشدین کی واقعاتی ترتیب ہی اصلی اور جائز ترتیب ہے۔ یعنی پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ، دوسرے حضرت عمرؓ، تیسرے حضرت عثمانؓ، اور چوتھے حضرت علیؓ ہیں۔ اور ان کے درمیان فضیلت و رتبہ کی ترتیب بھی یہی ہے۔ جبکہ اہل تشیع کے نزدیک جناب نبی اکرم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق تھا جو انہیں نہیں دیا گیا۔ اس لیے پہلے تین خلفاء کی خلافت جائز نہیں ہے بلکہ ان کی حیثیت غاصبین اور ظالمین کی ہے۔

چنانچہ ان واضح اور بنیادی اختلافات کے ہوتے ہوئے دونوں میں سے کسی کے لیے بھی دوسرے فریق کو بطور مسلمان قبول کرنا ممکن نہیں تھا۔ اور اس کا واضح اظہار دونوں فریقوں کی بنیادی کتابوں اور اساسی تعلیمات میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی حد تک تعلقات اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان صدیوں سے قائم چلے آرہے ہیں جو حالات کی ضرورت کی تحت بسا اوقات مشترکہ معاملات میں باہمی تعاون کی صورت بھی اختیار کر جاتے ہیں۔

اس پس منظر میں وطن عزیز پاکستان میں شیعہ سنی تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو ماضی کے حوالہ سے ان میں حوصلہ افزائی کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے اور بہت سی دینی تحریکات میں سنی اور شیعہ قائدین ایک پلیٹ فارم پر جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں:

• تحریک آزادی میں مجلس احرار اسلام کی جدوجہد ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، اور صاحبزادہ سید فیض الحسنؒ کے ساتھ مولانا مظہر علی اظہر بھی صف اول کے لیڈروں میں شامل ہیں جو شیعہ تھے اور ایک عرصہ تک احرار کے سیکرٹری جنرل رہے ہیں۔

•تحریک پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کا شیعہ ہونا کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بد ایونیؒ، اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ جیسے اکابر علماء نے ان کی قیادت میں قیام پاکستان کی جنگ لڑی ہے۔

•تحریک ختم نبوت میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا سید ابوالحسناتؒ، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، اور مولانا خواجہ خان محمد کے ساتھ سید مظفر علی شمسی اور علامہ غضنفر کراروی جیسے شیعہ راہنماؤں کی محنت بھی شامل ہے۔

•قیام پاکستان کے بعد اسلامی دستور کے لیے ۲۲ دستوری نکات مرتب کرنے والے ۳۱ سرکردہ علماء کرام میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالحامد بد ایونیؒ، مولانا محمد داؤد غزنویؒ، اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ ممتاز شیعہ راہنما حافظ کفایت حسن اور مولانا مفتی جعفر حسین بھی شریک تھے۔

اس لیے یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اعتقادی اختلافات کی شدت اور سنگینی کے باوجود پاکستان میں اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور مشترکہ معاملات میں باہمی تعاون کچھ عرصہ پہلے تک قائم رہی ہے۔ اور اہل سنت نے اپنی واضح اکثریت کے ہوتے ہوئے بھی اہل تشیع کو قومی معاملات میں شریک کرنے حتیٰ کہ دینی تحریکات کی قیادت کی صف میں شامل کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ لیکن اب یہ فضا قائم نہیں رہی اور جہاں قومی سطح پر فرقہ وارانہ کشیدگی کے مسلح تصادم کی صورت اختیار کر جانے کی شکل میں اس کے نقصانات سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں، وہاں تحریک نفاذ اسلام کے ایک نظریاتی کارکن کی حیثیت سے میں اپنے اس دکھ کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے نفاذ اسلام کی جدوجہد کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان میں، جہاں سیکولر حلقوں کو کبھی نفاذ شریعت کے مطالبہ کو فرقہ وارانہ قرار دینے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی، ”شریعت بل“ کے بارے میں تحریک جعفریہ کے جداگانہ موقف کے باعث نفاذ شریعت کو فرقہ واریت کا باعث قرار دینے کا ہتھیار سیکولر حلقوں کے ہاتھ میں ایسا مضبوطی کے ساتھ آیا ہے کہ بے چارے شریعت بل کے سرعام پرخچے اڑ گئے۔

سوال یہ ہے کہ باہمی برداشت اور مشترکہ معاملات میں تعاون کی یہ فضا آخر تبدیل کیسے ہوئی؟ اور وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے اہل سنت اور اہل تشیع کے راہنماؤں کو تحریک پاکستان، تحریک ختم نبوت، مجلس احرار اسلام اور ۲۲ نکات کی ترتیب و تدوین کی فضا سے نکال کر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے؟ اس سوال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینا ضروری ہے۔ اور اب وقت آگیا ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے سنجیدہ راہنما ان عوامل کا سنجیدگی سے تجزیہ کریں۔ اور تحریک جعفریہؒ اور سپاہ صحابہؓ کے مسلح تصادم کو ملک گیر سطح پر شیعہ سنی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرنے سے روکنے کے لیے اپنے علم و دانش کو استعمال میں لائیں۔ اسی جذبہ اور درد دل کے ساتھ شیعہ سنی کشمکش کے موجودہ شدت پسندانہ اظہار کے اسباب و عوامل کے بارے میں ہم اپنا نقطہ نظر پیش کر رہے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک حالات کو شدت اور سنگینی کے اس مقام تک لے جانے میں تین باتوں کا دخل سب سے زیادہ ہے۔ اور بدقسمتی سے تینوں باتوں کی ذمہ داری بنیادی طور پر اہل تشیع پر عائد ہوتی ہے۔

ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اہل تشیع نے قومی معاملات میں جداگانہ موقف، مطالبات اور حقوق کی جدوجہد شروع کی اور تعلیمی اداروں میں اپنے لیے جداگانہ نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ قانونی نظام میں اپنی فقہ کے الگ نفاذ کا مطالبہ کر دیا۔ یہ دونوں مطالبات نہ صرف یہ کہ غیر منطقی اور غیر حقیقت پسندانہ تھے بلکہ ان مطالبات نے شیعہ اور سنی آبادی کے درمیان دوئی اور منافرت کی ایک واضح لکیر کھینچ دی۔ جس کے نتائج و ثمرات آج ہمارے سامنے ہیں۔ جہاں تک نصاب تعلیم کا تعلق ہے، اہل تشیع کی یہ شکایت بجا تھی کہ چونکہ سکولوں میں اسلامیات کا نصاب ملک کی اکثریت اہل سنت کے معتقدات کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے، اس لیے ان کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن اس کا آسان حل یہ تھا کہ اسلامیات کا یہ نصاب شیعہ طلبہ کے لیے اختیاری قرار دے دیا جاتا اور اہل تشیع اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا اہتمام اپنی مذہبی درسگاہوں میں کرتے۔ لیکن اس پر اکتفا نہ کیا گیا اور سکولوں میں دو الگ الگ نصابوں کی بیک وقت تعلیم ضروری سمجھی گئی جس سے تعلیمی اداروں سے ہی اعتقادی محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا۔ اسی طرح فقہ جعفریہ کے متوازی نفاذ کے مطالبہ نے بھی صورت حال خراب کی۔ جہاں تک پرسنل لاء اور شخصی قوانین کا تعلق ہے، اہل سنت نے کبھی اہل تشیع کے اس حق سے انکار نہیں کیا کہ ان کے شخصی معاملات

ان کی فقہ کے مطابق ہوں۔ یہ ایک مسلمہ حق ہے جس کا اعتراف علماء کے ۲۲ نکات میں بھی کیا گیا ہے اور موجودہ دستور میں بھی انہیں یہ حق حاصل ہے۔ لیکن پوری کی پوری فقہ جعفریہ کے نفاذ کا مطالبہ عملاً ملک کے پبلک لاء میں دو متوازی نظاموں کے نظام کا مطالبہ ہے جو مسلمہ اصولوں کے منافی ہے۔ اور خود ایران میں بھی، جہاں شیعہ اکثریت ہے اور ولایت فقیہ کی مذہبی حکومت ہے، یہ طریق کار اختیار نہیں کیا گیا۔ ایرانی دستور کے مطابق ملک کا سرکاری مذہب اور پبلک لاء اکثریتی فقہ اثنا عشری جعفریہ کے مطابق ہے، اور اہل سنت کو صرف پرسنل لاء میں اپنی فقہ پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر پاکستان میں اہل تشیع نے ایران سے الگ معیار اختیار کیا اور فقہ جعفریہ کے متوازی نظام کا مطالبہ کر کے جہاں سیکولر حلقوں کو موقع دیا کہ وہ نفاذ شریعت کو فرقہ وارانہ مسئلہ قرار دے کر اس کے خلاف مہم چلائیں، وہاں شیعہ اور سنی کے الگ الگ ہونے کے تصور کو اور زیادہ پختہ کر دیا۔

شیعہ سنی کشیدگی میں اضافہ کا دوسرا بڑا سبب شیعہ لٹریچر اور شیعہ مقررین کے خطابات میں حضرات صحابہ کرامؓ کے بارے میں توہین آمیز اور گستاخانہ جذبات کا برملا اظہار ہے۔ ازواج مطہراتؓ، خلفاء راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے بارے میں اہل تشیع کے عقائد جو بھی ہوں، یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ لیکن ایک ایسے معاشرہ میں جس کی اکثریت ان بزرگوں سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتی ہو، ان کے بارے میں مخالفانہ جذبات کا اظہار ایک الگ مسئلہ ہے۔ پاکستان میں ایک محتاط اندازے کے مطابق اہل سنت کی تعداد ۹۵ فیصد ہے، اور وہ ازواج مطہراتؓ، خلفاء راشدینؓ، اور اہل بیت عظامؓ سمیت تمام صحابہ کرامؓ کے ساتھ محبت و عقیدت اور ان کے احترام کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک کے باوجود یہ بھی حقائق ہیں کہ اہل تشیع کے ذمہ دار حضرات کی کھلی بندوں تقسیم ہونے والی کتابوں اور رسالوں میں ان قابل احترام ہستیوں کے بارے میں گستاخانہ مواد موجود ہوتا ہے۔ بہت سے شیعہ مقررین کھلے خطابات میں ان بزرگوں کے بارے میں توہین آمیز باتیں کہہ جاتے ہیں اور درجنوں ایسے واقعات ہو چکے ہیں جن میں صحابہ کرامؓ اور خلفاء راشدین کے پتلے کھلے عام جلا کر ان کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ صورت حال آخر کس حد تک برداشت ہو سکتی ہے؟ اہل سنت کی یہ مجبوری ہے کہ وہ ان باتوں کا جواب برابر کی سطح پر نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اہل تشیع کے اس سطح کے بزرگ یعنی حضرات ائمہ اہل بیتؒ خود اہل سنت کے بھی قابل احترام بزرگ ہیں اور ان کے خلاف کوئی بات کہنا اہل

سنت کے نزدیک اسی طرح ناقابل برداشت جرم ہے جیسے حضرات صحابہ کرامؓ کی توہین ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے اہل سنت کی طرف سے ان باتوں کا ردعمل کئی گنا زیادہ شدت اختیار کر کے اپنے سامنے کے اہل تشیع کے مقابل آجاتا ہے۔ جو بہر حال کشیدگی اور اشتعال میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

شیعہ سنی کشیدگی میں اضافہ کا تیسرا بڑا سبب اہل تشیع کے ماتمی جلوس ہیں جو اہل تشیع کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتے ہیں، مگر اہل سنت انہیں جائز نہیں سمجھتے۔ جہاں تک امام حسینؓ اور خانوادہ نبوت کی کربلا میں شہادت اور ان کی مظلومیت کا تعلق ہے، اہل سنت کے جذبات بھی اس معاملہ میں اہل تشیع سے کم نہیں ہیں اور وہ اپنے جذبات غم، صدمہ اور محبت کا اپنے انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ لیکن غم کے اظہار کا جو طریقہ ماتمی جلوسوں کی صورت میں اہل تشیع کی طرف سے رواج پا گیا ہے وہ اہل سنت کے نزدیک نہ صرف یہ کہ درست نہیں بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے منافی ہے۔ اہل سنت کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اہل تشیع اپنے جذبات غم کا اظہار اپنے طریقے سے کریں، بشرطیکہ وہ ان کے گھروں کی چار دیواری اور عبادت گاہوں میں محدود ہو۔ اور اس کا دائرہ اہل سنت کے گھروں اور آبادی تک وسیع نہ کیا جائے۔ سوال یہ نہیں کہ اہل تشیع کو اپنے مذہب کے مطابق ماتم کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ وہ تو طے شدہ حق ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کا دائرہ کار اہل تشیع تک محدود رہنا چاہیے اور ان لوگوں تک وسیع نہیں ہونا چاہیے جو اسے جائز نہیں سمجھتے۔ کیونکہ کوئی بھی ایسا اجتماع یا جلوس ان لوگوں کے درمیان لے آیا جائے جو مذہبی طور پر اسے جائز نہ سمجھتے ہوں، بہر حال کشیدگی پیدا کرتا ہے اور اس کشیدگی کے المناک مظاہرے کئی بار ہم اپنے ملک کے بازاروں اور سڑکوں پر دیکھ چکے ہیں۔

یہ ہیں وہ چند بنیادی اسباب جنہوں نے پاکستان میں شیعہ سنی تعلقات کو باہمی برداشت اور تعاون کی فضا سے نکال کر محاذ آرائی اور مسلح تصادم کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ ہم سپاہ صحابہؓ پاکستان کی پالیسی اور طریق کار سے متفق نہیں ہیں اور اس کا اظہار سپاہ صحابہؓ کے قائدین کے ساتھ روبرو گفتگو کے علاوہ پبلک بیانات میں بھی کئی بار کر چکے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک سپاہ صحابہؓ اس ردعمل کا نام ہے جو اہل تشیع کے مذکورہ بالا طرز عمل کے نتیجہ

میں فطری طور پر نمودار ہوا ہے۔ اور ری ایکشن کی شدت اور تلخی کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہوں، اس کی ذمہ داری بہرحال اس "عمل" پر عائد ہوتی ہے جو اس ردعمل کو جنم دیتا ہے۔

اسباب و عوامل کے تجزیہ کے بعد ضروری ہے کہ شیعہ سنی تعلقات کے مستقبل کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کر دی جائیں۔ ہمارے نزدیک شیعہ سنی تعلقات کو مستقبل میں منفی شاہراہ پر گامزن رکھنے یا مثبت رخ دینے کا اختیار بھی اہل تشیع کے سنجیدہ راہنماؤں کے پاس ہے۔ اگر شیعہ قیادت یہ سمجھتی ہے کہ بڑھتی ہوئی کشیدگی کو بریک لگانا ضروری ہے اور باہمی برداشت اور تعاون کی سابقہ فضا کی بحالی ملک و قوم اور خود شیعہ آبادی کے لیے مفید ہے تو ابھی اس کے دروازے بند نہیں ہوئے۔ اور اس منزل گم گشتہ کے حصول کے لیے سنجیدگی کے ساتھ پیش رفت کی جا سکتی ہے۔ بلکہ ذاتی طور پر خود ہمارا جی چاہتا ہے کہ تحریک نفاذ شریعت اور تحریک ختم نبوت میں اہل تشیع کا سابقہ رول بحال ہو۔ لیکن اس کے لیے شیعہ قیادت کو جداگانہ فقہ کے نفاذ اور ہر چھوٹی بڑی بات میں جداگانہ تشخص کے اظہار کا راستہ ترک کر کے علماء کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات کی پوزیشن پر قومی دھارے میں واپس آنا ہوگا۔ ناموس صحابہؓ کے تحفظ اور ماتمی جلسوں کے بارے میں اہل سنت کے قیادت کے ساتھ اعتماد کی فضا بحال کرنا ہوگی۔ اور اہل سنت کے مذہبی جذبات کے احترام کا عملاً یقین دلانا ہوگا۔ اور اگر شیعہ قیادت اس پوزیشن پر واپسی کو مشکل خیال کرتی ہے اور قومی دھارے سے الگ جداگانہ تشخص، موقف اور مطالبات کی راہ پر چلتے رہنا اس کے نزدیک ناگزیر امر ہے تو اس کے منطقی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے ایسا کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ مگر اہل سنت اس پوزیشن میں بھی اہل تشیع کے ساتھ تعلقات کار کا از سر نو تعین کرنے کے لیے تیار ہوں گے جس کے لیے ہمارے نزدیک سب سے بہتر معیار ایرانی دستور ہے۔ اور ہم اہل سنت اور اہل تشیع کے راہنماؤں کے سامنے یہ تجویز پیش کریں گے کہ:

- آئندہ مردم شماری شیعہ سنی بنیادوں پر کرا کے دونوں کی آبادی کا صحیح تناسب معلوم کر لیا جائے تاکہ باہمی حقوق کا تعین عملاً ممکن ہو جائے۔
- ایران کے دستور میں اکثریت اور اقلیت کے لیے جو دائرہ مقرر کیا گیا ہے، اسے معیار تسلیم کر کے پاکستان میں دستوری ترامیم کے ذریعہ اسے مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے۔

• آبادی کے صحیح تناسب کے مردم شماری کے ذریعہ تعین کے بعد فوج اور سول کی ملازمتوں اور اسمبلیوں کی نمائندگی کے لیے اسی بنیاد پر تناسب طے کر دیا جائے تاکہ کوئی فریق دوسرے کے حقوق پر اثرانداز نہ ہو سکے۔

ہمیں امید ہے کہ ملک کے سنجیدہ اہل دانش ان تجاویز کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لے کر بڑھتی ہوئی شیعہ سنی کشمکش کی روک تھام کے لیے موثر کردار ادا کریں گے۔

انسانی حقوق کا مغربی تصور سیرت طیبہؐ کی روشنی میں

(مظفر آباد، آزاد کشمیر - ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء)

(۲۷ و ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء کو مظفر آباد میں حکومت آزاد کشمیر کے زیراہتمام منعقدہ سیرت کانفرنس میں پڑھا گیا)

بعد الحمد والصلوة۔ صدر ذی وقار، معزز مہمان خصوصی اور قابل صد احترام شرکاء سیرت کانفرنس! جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کہ اسلام کی دعوت اور پیغام کو مخاطب کی زبان میں اس کی ذہنی سطح اور نفسیات کے مطابق پیش کیا جائے۔ مکہ مکرمہ کے قریشی سردار جب جناب رسول اللہؐ کی دعوت توحید کے اثرات سے پریشان ہو کر جرگے کی صورت میں آنحضرتؐ کے پاس آئے اور پوچھا کہ آخر آپؐ کی دعوت کا مقصد کیا ہے اور آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ تو رسول اکرمؐ نے ان کے مزاج و نفسیات اور ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ

> ”میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ اگر تم اسے قبول کر لو تو عرب و عجم تمہارے تابع ہوں گے۔“

جناب نبی اکرمؐ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ غلبہ، قوت اور اقتدار کے سوا کسی اور زبان کو نہیں سمجھتے اس لیے آپؐ نے انہی کی زبان میں دعوت اسلام کے نتائج و فوائد سے انہیں آگاہ کیا۔ اور یہ بات خلاف واقعہ بھی نہ تھی اس لیے کہ اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کے بے شمار نتائج و منافع میں سے ایک منفعت یہ بھی تھی۔ چونکہ سوال کرنے والوں کے ہاں اس منفعت کی اہمیت زیادہ تھی اس لیے آنحضرتؐ نے اسی کا حوالہ دے کر ان کے سوال کا جواب مرحمت فرمایا۔

اس پس منظر میں آج کے دور میں دعوت اسلام کی ضروریات اور تقاضوں کا جائزہ لیا جائے اور جناب رسالت مآبؐ کی سیرت طیبہ کو نسل انسانی کے سامنے پیش کرنے کے لیے ترجیحات پر غور کیا جائے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے بارے میں قرآن کریم کی تعلیمات اور رسول اکرمؐ کے ارشادات واحکام کو زیادہ اہمیت کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے۔ اور انسانی معاشرہ کو بتایا جائے کہ انسانی حقوق کے تعین اور تحفظ کا جو معیار اور دائرہ کار اللہ تعالی کے آخری پیغمبر نے کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال قبل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، انسانی عقل تدریج و ترقی کے تمام مراحل طے کرنے اور مختلف نظام ہائے زندگی کا تجربہ کرنے کے باوجود اس کا کوئی متبادل سامنے نہیں لاسکی، اور انسانی معاشرہ ایک بار پھر پریشانی اور اضطراب کے عالم میں اپنے مسائل و مشکلات کے حل کے لیے کسی مسیحا کے انتظار میں ہے۔

آج کی دنیا میں ''انسانی حقوق'' کی زبان سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ سنی جانے والی زبان ہے، جبکہ ورلڈ میڈیا اور لابیوں نے اسے صرف زبان کی حد تک نہیں رہنے دیا بلکہ وقت کا موثر ترین ہتھیار بنا دیا ہے جو عالم اسلام اور تیسری دنیا کی اقوام کے خلاف مغرب کے ہاتھوں میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔ اور مغرب جسے چاہتا ہے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور جنیوا کنونشن کی قراردادوں کے شکنجے میں جکڑ کر انسانی حقوق کی چھری کے ساتھ ذبح کر دیتا ہے۔

حضرات محترم! مغرب انسانی حقوق کے حوالہ سے جتنے بلند بانگ دعوے کرلے، مگر انسانی حقوق اور فری سوسائٹی کے مغربی تصور پر مبنی سولائزیشن نے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے آج جو روپ دھار لیا ہے اس نے خود مغربی دانش وروں کو حیران و ششدر کر دیا ہے اور مغربی معاشرہ میں جنسی انارکی اور فیملی سسٹم کی تباہی نے گورباچوف جیسے مدبر کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم نے عورت کو گھر سے نکال کر غلطی کی ہے اور اب اسے گھر واپس لے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔

دراصل مغرب حقوق و فرائض میں توازن قائم رکھنے اور ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ جبکہ جناب رسول اللہؐ نے حقوق اور فرائض کو نہ صرف یکجا ذکر کیا بلکہ ان کے درمیان ایسا حسین توازن قائم کر دیا جو گاڑی کے دو پہیوں کی طرح انسانی زندگی کا یکساں بوجھ اٹھا سکتا ہے اور اسے لے کر کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے۔ مگر مغرب

نے حقوق و فرائض کو آپس میں گڈمڈ کر دیا اور ان کے درمیان کوئی خط امتیاز قائم نہ رہنے دیا جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ ذہنی انتشار اور فکری انارکی کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے۔ مثلاً

- اقتدار اور حکومت کو نبی اکرمؐ نے فرائض اور ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے اور قدم قدم پر اس ذمہ داری کی نزاکت اور سنگینی سے خبردار کیا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ حکمرانوں میں احساس ذمہ داری اور خداخوفی کی صورت میں ظاہر ہوا اور لوگ اقتدار کی دوڑ میں شریک ہونے کی بجائے اس سے بچنے میں عافیت محسوس کرنے لگے۔ مگر مغرب نے اسے حقوق کی فہرست میں رکھ دیا اور اس حق کو حاصل کرنے کے لیے جو دوڑ لگتی ہے اس کے فوائد و نقصانات کا تناسب ہر ذی شعور پر واضح ہے۔
- محنت، مزدوری اور ملازمت کے ذریعے روزی کمانا اور اہل خانہ کی کفالت کرنا رسول اکرمؐ کی تعلیمات کی رو سے فرائض کا حصہ ہے اور ڈیوٹی ہے جو گھر کے سربراہ پر عائد ہوتی ہے۔ مگر مغرب نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بے شمار افراد کے قتل ہو جانے کے باعث پیدا ہونے والے افرادی قوت کے خلاء کو پر کرنے کے لیے عورت کو گھر سے باہر لانے کی ضرورت محسوس کی تو ملازمت اور محنت و مزدوری کی ڈیوٹی پر ”حقوق“ کا خوشنما لیبل چسپاں کر کے اس غریب کو ورغلا لیا۔ اور وہ ”عقل کی پوری“ بچہ جننے اور اس کی پرورش کرنے کی ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ اسے کما کر کھلانے کی ڈیوٹی میں بھی شامل ہو کر خوش ہونے لگی کہ اب میں مردوں کے شانہ بشانہ ”مساوی حقوق“ سے بہرہ ور ہو گئی ہوں۔
- جناب رسول اللہؐ نے امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور حکومت کے غلط طرز عمل پر نقد و جرح کو فرائض میں شمار کیا ہے جو حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی کسی تقسیم کے بغیر معاشرہ کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ رسول اکرمؐ نے جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے کو جہاد قرار دیا ہے اور یہ تعلیم دی ہے کہ جو شخص دیکھتے جانتے ہوئے بھی غلط کو غلط نہیں کہتا وہ شریعت کی نظر میں مجرم ہے۔ مگر مغرب نے آزادئ رائے اور حکومت کی غلط پالیسی پر اسے ٹوکنے کو فرائض کے زمرہ سے نکال کر حقوق کے دائرہ میں شامل کر لیا۔ اس کا

ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ یہ ایک اختیاری امر بن گیا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ’’حقوق‘‘ کے تصور نے اقتدار اور اپوزیشن کی صف بندی کر دی جس نے پوری قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔

یہ چند مثالیں یہ بات واضح کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ مغرب نے ’’حقوق و فرائض‘‘ کو خلط ملط کر کے انسانی معاشرہ کی گاڑی کے دونوں پہیوں کا توازن بگاڑ دیا ہے جس کی وجہ سے گاڑی مسلسل لڑکھڑاتی چلی جا رہی ہے۔ جبکہ جناب رسالت مآبؐ نے حقوق و فرائض میں توازن قائم کیا اور اس کا عملی نمونہ خلافت راشدہ کی صورت میں پیش کر کے دنیا کو دکھا دیا۔

سامعین گرامی قدر! مغرب سے انسانی حقوق کے حوالہ سے دوسری بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ حقوق کے تعین کا معیار قائم کرنے میں اس کی نگاہ انسانی معاشرے کی وسیع تر ضروریات کا احاطہ نہ کر سکی۔ مغرب نے حق کے تعین میں معیار یہ پیش کیا کہ ہر شخص کو اپنی مرضی پر عمل کرنے کا حق ہے، جب تک کہ دوسرے شخص کی آزادی متاثر نہ ہو۔ اس طرح مغرب نے حق و ناحق اور جائز و ناجائز کے تعین میں شخصی مفادات و ضروریات میں ہم آہنگی یا ٹکراؤ کو بنیاد بنایا اور اس سے آگے نسل انسانی اور انسانی معاشرہ کی اجتماعی ضروریات و مفادات تک اس کی نگاہ نہ جا سکی جس کا خمیازہ مغرب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ مثلاً

- مرد و عورت کے اختلاط میں مغرب نے یہ تصور پیش کیا کہ جس درجہ کے اختلاط پر دونوں باہم رضامند ہوں، کسی تیسرے کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی قانون کو گرفت کرنی چاہیے۔ یہاں مغرب نے مرد اور عورت کی باہمی رضامندی تو دیکھ لی مگر پورے معاشرہ پر اس اختلاط کے اثرات کو نہ دیکھ سکا جس کے نتیجے میں کنواری ماؤں اور ناجائز بچوں کے تناسب میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور فیملی سسٹم تباہی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ جبکہ جناب نبی اکرمؐ نے مرد و عورت کی اس باہمی رضامندی کو بھی جرم قرار دیا ہے جو معاشرے کے لیے منفی نتائج کا باعث بن سکتی ہو۔ اور مرد و عورت کے اختلاط اور میل جول کا ایک دائرہ قائم کر کے باقی ہر قسم کے میل جول سے منع فرما دیا ہے، کیونکہ کسی بھی عمل کے جائز ہونے کے لیے صرف اس عمل کے دو فریقوں کا رضامند ہونا کافی نہیں بلکہ انسانی معاشرہ کا اس کے منفی اثرات سے

محفوظ رہنا بھی ضروری ہے۔ اور یہی بنیاد ہے اس توازن کی جو رسول اکرمؐ نے مرد و عورت کے تعلقات کے حوالہ سے قائم فرمایا ہے۔

• سود کے بارے میں مغرب نے کہا کہ جب سود لینے اور دینے والے آپس میں متفق ہیں تو کسی اور کو کیا اعتراض ہے؟ یہاں بھی مغرب نے دو افراد کی رضامندی کے محدود دائرہ کو بنیاد بنایا۔ جبکہ جناب رسالت مآبؐ نے معاشرہ پر مجموعی طور پر اس کے منفی اثرات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی حرمت کا اعلان فرمایا۔ اور آج سودی معیشت نے جس طرح پوری دنیا کو چند مخصوص گروہوں کی معاشی اجارہ دارہ کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے وہ اسلامی تعلیمات کی صداقت اور جناب رسول اللہؐ کی خداداد فراست و بصیرت کی روشن اور کھلی شہادت ہے۔

ان گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ جناب رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے حوالہ سے ہمیں آج کھلے دل و دماغ کے ساتھ انسانی حقوق کے مغربی تصور کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کے وسیع تر پراپیگنڈہ سے مرعوب ہونے کی بجائے اس کے کھوکھلے پن کو تقابلی مطالعہ کے ساتھ سامنے لاکر اسلامی تعلیمات و احکام کو واضح کرنا چاہیے۔ تاکہ مشکلات و مصائب کے صحرا میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کی اسوۂ حسنہ کے شفاف اور خوش ذائقہ سرچشمۂ حیات کی طرف راہنمائی کی جا سکے۔

حضرات گرامی قدر! مغرب اور انسانی حقوق کے حوالہ سے گفتگو چلی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے فلسفہ کی فکری بنیادوں سے ہٹ کر اس کے واقعاتی پہلوؤں پر بھی کچھ معروضات پیش کر دی جائیں۔ بالخصوص اس تضاد اور دوعملی کے پس منظر میں جو مغرب نے عالم اسلام کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ اور جس نے یہ بات پوری طرح واضح کر دی ہے کہ مغرب کے نزدیک "انسانی حقوق" کسی فلسفہ یا اصول کا نام نہیں بلکہ یہ محض ایک ہتھیار ہے جو اس نے مخالف اقوام پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اختیار کر رکھا ہے، ورنہ

• مغرب جو ووٹ، الیکشن اور بیلٹ باکس کے تقدس کا علمبردار ہے اور غیر جمہوری حکومتوں کا اپنے ساتھ برابر کی سطح پر بیٹھنا گوارا نہیں کرتا، الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ کی انتخابی کامیابی پر آتش زیرپا کیوں ہے؟ اور اسلامک

فرنٹ کی جمہوری قوت کو کچلنے کے لیے الجزائر کی غیر جمہوری حکومت کی پشت پناہی کیوں کر رہا ہے؟

• آج اس مغرب کو بوسنیا کے خلاف سربوں کی جارحیت اور بوسنیا کے مسلمانوں کا گاجر مولی کی طرح کٹتے چلے جانا نظر نہیں آرہا؟ صرف اس لیے کہ جن کی عصمتیں لٹ رہی ہیں اور جن کی گردنیں کٹ رہی ہیں وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ جبکہ مغرب سلامتی کونسل کی اٹھک بیٹھک اور زبانی جمع خرچ کے ساتھ سربوں کی مکمل فتح کا انتظار بلکہ عملاً اس کے مقاصد کے حصول کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے۔

• اس مغرب کو وادئ کشمیر میں گھر گھر بہنے والا خون نظر نہیں آرہا اور نہ حوا کی بیٹیوں کی دل فگار چیخیں مغرب کے کانوں تک پہنچ پا رہی ہیں۔ کشمیر میں انسانی حقوق کے ساتھ ہولی کھیلی جا رہی ہے مگر چونکہ مرنے والے مسلمان ہیں اور ان کے ساتھ مغرب کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے اس لیے کشمیر کے حوالے سے مغرب کے کان اور آنکھیں بند ہیں، اور اس کے انسانی حقوق کے سارے کے سارے فلسفے مصلحتوں کے فریزر میں منجمد پڑے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ کشمیر، بوسنیا، فلسطین اور اب چیچنیا کے خلاف روسی جارحیت کے حوالہ سے منافقانہ طرز عمل نے مغرب کے چہرے سے "انسانی حقوق" کا ریاکارانہ نقاب نوچ پھینکا ہے اور اس کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے کر دیا ہے جس کے بعد اس کے پیش کردہ "انسانی حقوق" کا ظاہری بھرم بھی قائم رہتا نظر نہیں آرہا۔

چنانچہ مسلم علماء اور دانشوروں کو چاہیے کہ وہ حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھیں اور دنیا کو منطق و استدلال کے ساتھ بتائیں کہ انسانی حقوق کا حقیقی فلسفہ اور متوازن نظام وہی ہے جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا اور آج بھی انسانی معاشرہ کی فلاح و کامیابی اسی نظام کو اپنانے پر منحصر ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ فروری ۱۹۹۵ء)

اخلاق حسنہ، سیرت نبویؐ کا سب سے نمایاں پہلو

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی انسانی تاریخ کی وہ منفرد اور ممتاز ترین شخصیت ہے جس کے حالات زندگی، عادات و اطوار، ارشادات و فرمودات، اور اخلاق حسنہ اس قدر تفصیل کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں کہ آنحضرتؐ کی زندگی ایک کھلی کتاب کے طور پر نسل انسانی کے سامنے ہے اور آپؐ کی معاشرتی و خاندانی حتیٰ کہ شخصی اور پرائیویٹ زندگی کا بھی کوئی پہلو تاریخ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔ اسے محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ انسانی تاریخ اپنے دامن میں جناب رسول اللہؐ کے سوا کسی اور شخصیت کے احوال واقوال کو اس اہتمام کے ساتھ محفوظ نہیں رکھ سکی۔ بلکہ یہ قدرت خداوندی کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کے تکوینی فیصلے کا آئینہ دار ہے کہ جب اللہ رب العزت نے اپنے پاکیزہ کلام قرآن کریم میں جناب محمد رسول اللہؐ کی زندگی کو پوری نسل انسانی کے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دیا تو اس اسوۂ حسنہ اور نمونۂ کامل کا اپنی تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہنا اس حکم خداوندی کا منطقی تقاضہ ہے۔ اور یہ منطقی تقاضہ ایک معجزہ کے طور پر تاریخ انسانی کا ناقابل فراموش باب بن چکا ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ ایک انسان زندگی کے کسی بھی شعبہ میں قدم رکھنے اور آگے بڑھنے سے پہلے اپنے سے بہتر شخص کے عمل و کردار کو بطور نمونہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جو شخص کسی بھی حوالے سے اس کی نظروں میں بہتر اور خوب قرار پاتا ہے اس کی پیروی کو وہ اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ”آئیڈیل کی تلاش“ کا تصور اسی انسانی فطرت کا اظہار ہے اور اللہ رب العزت نے نسل انسانی کی ہدایت و راہنمائی کے نظام میں اس کی فطرت کے اس پہلو کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورہ الفاتحہ میں انسان کو ہدایت کے لیے جو دعا سکھائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ

> ”اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے پر جو تیرے غضب کا شکار ہوئے۔“

یہ انعام یافتہ لوگ جن کے نقش قدم پر چلنے کی سورہ فاتحہ میں تلقین کی گئی ہے بلاشبہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے سچے پیروکاروں کا مقدس گروہ ہے جو اپنے کردار

واخلاق کے اعتبار سے نسل انسانی کا سب سے ممتاز طبقہ ہے۔اور نسل انسانی نے اپنے اپنے دور میں اس طبقہ کے ہر فرد سے راہنمائی اور ہدایت حاصل کی ہے۔ لیکن ان نیک اور پارسا شخصیات کی زندگیاں اپنی اپنی جگہ ہدایت کا منبع ہونے کے باوجود آج کے انسان کے لیے تاریخ کے صفحات پر اس انداز سے محفوظ نہیں ہیں کہ وہ ان سے اپنی زندگی کے مسائل و مشکلات میں راہنمائی حاصل کر سکے۔ سوائے جناب محمد رسول اللہؐ کی حیات مبارکہ کے کہ آج کا انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں راہنمائی حاصل کرنا چاہے تو اسے آنحضرتؐ کے حالات زندگی یا اقوال وارشادات میں راہنمائی کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور مل جائے گی۔ یہ محض عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے آزمائش کی کسی بھی کسوٹی پر آج بھی پرکھا جاسکتا ہے۔

آج نسل انسانی جس ذہنی انتشار، دلی بے اطمینانی اور معاشرتی انارکی کا شکار ہے اس نے ان تمام نظریات، افکار، فلسفوں اور نظاموں کے بھرم توڑ کر رکھ دیے ہیں جن کے تانے بانے خود انسان ہزاروں برس سے اپنے اردگرد بنتا آرہا ہے، اور جن کے سہارے انسانی معاشرہ کو امن وسکون کی منزل سے ہمکنار کرنے کا کوئی بھی خواب تعمیر کا دامن نہیں تھام سکا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ بے راہ روی کے تپتے ہوئے ریگستان میں بھٹکنے والی انسانی کی راہنمائی اس سرچشمۂ ہدایت کی طرف کی جائے جو سب سے زیادہ محفوظ، شفاف، شفابخش اور خوش ذائقہ ہے۔ اور بلاشبہ وہ جناب رسول اللہؐ کا اسوہ حسنہ ہے جس کی پیروی کے بغیر نسل انسانی امن وسکون کی حقیقی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سراپا مجموعۂ صفات حمیدہ ہے۔ آپؐ کی حیات مبارکہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ارباب بصیرت اور اہل فکر و دانش سے خراج عقیدت وصول نہ کر چکا ہو۔ لیکن آنحضرتؐ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو جس نے دوست و دشمن سب کو اس بارگاہ خیر وحسن میں سرنیاز خم کرنے پر مجبور کر دیا، آپؐ کے اخلاق کریمانہ ہیں جسے

- قران کریم نے ''خلق عظیم'' سے تعبیر کیا ہے۔
- ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کان خلقہ القرآن کہہ کر اسے قرآن پاک کی عملی تعبیر وتفسیر قرار دیا ہے۔

•جناب رسالت مآب ایک حدیث میں خود اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں انمابعثت لاتمم مکارم الاخلاق کہ مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ "مجھے اچھے کام مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے"۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اچھے کاموں یعنی مکارم اخلاق کو جن بلندیوں سے ہمکنار کیا ان کی مثال پیش کرنے سے تاریخ آج تک قاصر ہے۔ آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو بھی اچھی عادات اور بہتر معاملات کی تلقین فرمائی ہے۔ اور اخلاق کریمانہ انہی دو امور سے عبارت ہے۔

•ایک حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے مجھے تم سب میں سب سے زیادہ اچھا وہ شخص لگتا ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں اور سب سے برا میرے نزدیک وہ ہے جو برے اخلاق کا حامل ہے۔

•ایک اور حدیث کے مطابق آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ صاحب ایمان شخص اچھے اخلاق کی بدولت ان لوگوں جیسا مقام حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفل پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے کے عادی ہیں۔

•ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا کہ زیادہ کامل ایمان ان لوگوں کا ہے جو اچھے اخلاق والے ہیں۔

•ایک صحابیؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! انسان کو سب سے بہتر چیز کون سی عطا ہوئی ہے؟ فرمایا، اچھے اخلاق۔

•حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی اکرمؐ نے آخری ملاقات میں جو وصیت کی اس میں فرمایا کہ تم لوگوں کے ساتھ اپنے اخلاق بہتر بناؤ۔

•ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ اپنے بارے میں یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! تو نے جس طرح میری جسمانی بناوٹ کو بہتر بنایا ہے اس طرح میری عادات و اخلاق کو بھی بہتر کر دے۔

•حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس نے جھوٹ ترک کر دیا اس کا ٹھکانہ جنت کے آغاز میں ہو گا، جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا ترک کیا اس کا ٹھکانہ جنت کے درمیان ہو گا، اور

جس نے اپنی ساری عادات و اخلاق کو بہتر بنا لیا اسے جنت کے سب سے اوپر والے حصہ میں جگہ ملے گی۔

اخلاق و عادات کے حوالہ سے جناب رسول اللہؐ نے صرف اپنی زندگی اور عمل کا نمونہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اپنی تعلیمات و ہدایات میں اچھے اور برے اخلاق کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی ہے۔ آپؐ نے اخلاق حسنہ کا ایک ایسا معیار مقرر کر دیا ہے جو ڈیڑھ ہزار سال کے لگ بھگ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس باب میں حرف آخر ہے۔ آپؐ نے اچھے اخلاق کی تفصیل بیان فرمائی ہے، اچھی عادات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ہر ایک کے فوائد سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے، اور پھر خود ان پر عمل کر کے اس کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح جناب نبی کریمؐ نے برے اخلاق اور بد عادات کا تذکرہ فرمایا ہے، ان کے نتائج سے لوگوں کو خبردار کیا ہے، اور خود اس سے بچ کر بری عادات سے گریز کی عملی تربیت دی ہے۔

یہ انسانی معاشرہ پر درسگاہ نبویؐ کا سب سے بڑا احسان ہے کہ اسے اخلاق کریمانہ کی تعلیم اور اس پر عملدرآمد کا پورا پیکیج ایک ہی جگہ حسین توازن کے ساتھ مل رہا ہے۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ ان کی تربیت یافتہ جماعت (صحابہ کرامؓ) کی اجتماعی زندگی بھی کھلی کتاب کی صورت میں لوگوں کے سامنے ہے جو اجتماعی اخلاق و آداب اور عادات و اطوار میں قیامت تک انسانی معاشرہ کی راہنمائی کرتی رہے گی۔

کیا مولانا عبید اللہ سندھیؒ اشتراکیت سے متاثر ہو گئے تھے؟

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۴ء)

(مولانا عبید اللہ سندھیؒ قومی سیمینار منعقدہ کراچی (۱۰ و ۱۱ ستمبر ۱۹۹۴ء) کے لیے لکھا گیا۔)

یہ المیہ کم و بیش ہر بڑی شخصیت کے ساتھ پیش آتا ہے کہ اس کی تصویر کے لیے اس کے معتقدین اور ناقدین اپنے اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ فریم اور خاکے طے کر لیتے ہیں اور پھر تصویر کو ان میں فٹ کرنے کی متضاد کوششیں بسا اوقات اصل چہرے کو دھندلا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ بھی نادان دوستوں اور بے رحم ناقدوں کے اس طرز عمل

سے محفوظ نہیں رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس منفرد انقلابی مفکر کی وفات کو نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ہم اس کی فکر کو لے کر آگے بڑھنے کی بجائے تاریخ کے صفحات میں اسے تلاش اور دریافت کرنے کے مرحلہ میں ہی رکے ہوئے ہیں۔

- مولانا عبید اللہ سندھیؒ کون تھے؟
- برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کی تاریخ میں ان کی جدوجہد اور کردار کی حیثیت کیا ہے؟
- اور کیا وہ اپنے فکر و فلسفہ میں مغربی سرمایہ داری اور اشتراکیت کی عالمی کشمکش سے متاثر ہو کر فریق بن گئے تھے؟

ان سوالات کا جائزہ لینے سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی جدوجہد اور تگ و تاز کن مقاصد کے لیے تھی اور انہیں اپنی محنت کے لیے جو ماحول اور میدان ملا اس میں وہ کن مشکلات اور رکاوٹوں سے دوچار ہوئے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا ذاتی تعارف صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، اسکول کی تعلیم کے دور میں دوستوں کی سوسائٹی اور بعض کتابوں کے مطالعہ سے اسلام سے متاثر ہوا، اسلام قبول کیا، گھربار چھوڑا، اور ان کی قسمت یاوری کرتے ہوئے انہیں اپنے وقت کے عارف باللہ سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیقؒ (بھرچونڈی شریف سندھ) کی خدمت میں لے گئی جہاں ان کے دل و دماغ اور شخصیت و کردار کو ایک ایسا سانچہ میسر آگیا جس میں ڈھل کر وہ اسلام کے غلبہ و نفاذ اور ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کی بحالی کی اس تحریک میں ایک کارآمد پرزے کی طرح فٹ ہو گئے، جسے تحریک ولی اللّٰہی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا سندھیؒ کا تعارف تحریک ولی اللّٰہی کے ایک بے لوث کارکن اور باشعور راہنما کا تعارف ہے۔ اور یہی وہ پس منظر ہے جو مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی اصل شخصیت سے ہمیں متعارف کراتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد اور دست راست تھے جو اپنے دور میں تحریک ولی اللّٰہی کے قائد اور جنگ آزادی کے سرخیل رہے ہیں۔ انہی کی وساطت سے مولانا سندھیؒ امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ، جدوجہد اور تحریک سے متعارف ہوئے اور پھر اسی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے تحریک ولی اللّٰہی کے لیے فکری اور نظریاتی کام بھی کیا اور معروضی حالات میں اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے جاں

گسل محنت بھی کی۔ بلکہ اگر قربانیوں، محنت و مشقت اور ایثار کے حوالہ سے دیکھا جائے تو شاید ہی اس دور کا کوئی اور راہنما ان کا ہم پلہ ثابت ہو سکے۔

حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا سندھیؒ کی جدوجہد کے مقاصد اور اہداف کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس فکری اور نظریاتی جنگ کے تاریخی تسلسل پر ایک نظر ڈال لی جائے جو مسلم معاشرہ کو بیرونی فلسفوں اور معاشرتوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے طویل عرصہ سے لڑی جا رہی ہے۔

1. اس جنگ کا پہلا دور وہ تھا جب یونانی فلسفہ نے اسلامی عقائد پر یلغار کی اور مسلمانوں کے اعتقادی حصار کو توڑنا چاہا۔ مگر غزالیؒ، ابن رشدؒ اور ابن تیمیہؒ جیسی عبقری شخصیتیں سامنے آئیں اور یونانی فلسفہ ہی کی زبان اختیار کر کے اسی کے ہتھیاروں سے اس کا راستہ روک دیا۔

2. دوسرے دور میں ہندو تہذیب و فلسفہ نے مسلم معاشرہ کو اپنے اندر ضم کر لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے مگر حضرت مجدد الفؒ ثانی اور ان کے رفقاء کی صبر آزما جدوجہد نے ہندو فلسفہ و معاشرت کی قوت ہاضمہ کو ناکارہ بنا دیا۔

3. جبکہ اس جنگ کا تیسرا مرحلہ یورپی فلسفہ و معاشرت کی یلغار کا ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قبل از وقت محسوس کر لیا اور اس کا سامنا کرنے کے لیے ایک فکری اور علمی جدوجہد کی بنیاد رکھی دی جو آج تک اس معرکہ میں مسلمانوں کے لیے ڈھال بنی ہوئی ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ جب حضرت شیخ الہندؒ کے معاون و مددگار کے طور پر اس تحریک میں شامل ہوئے تو یہ تحریک اس مرحلہ میں تھی کہ برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش پوری طرح انگریزی عملداری میں آچکا تھا اور اس کے خلاف جہاد بالاکوٹ، بنگال کی فرائضی تحریک، اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سمیت تمام مزاحمتی تحریکیں وقتی طور پر ناکامی سے دوچار ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کی سیاست، تعلیم، معاشرت اور معیشت کے صدیوں سے چلے آنے والے ڈھانچے دہلی کے انگریز حکمرانوں کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ چکے تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کارکنوں کی نئی کھیپ تیار کر کے بدیشی غاصبوں کے خلاف ایک نیا معرکہ بپا کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

گزشتہ تین صدیوں کے دوران میں جب یورپی اقوام نے دنیا بھر کو غلام بنانے کے لیے چاروں طرف یلغار کی تو یہ تنہا انگریزوں کی یلغار نہ تھی بلکہ اس میں فرانسیسی، ولندیزی، پرتگیزی اور جرمن بھی شامل تھے۔ لیکن انگریز کی شاطرانہ چالوں کے سامنے ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہوسکا اور بالآخر یہ سب یکے بعد دیگرے سپر انداز ہوتے چلے گئے۔ حتی کہ اس سلسلہ کا آخری سیمی فائنل بھی انگریزوں نے جیت لیا جو کیمونزم کے خلاف "کولڈ وار" کے نام پر چند سال قبل تک بپا رہا ہے۔ اور اب تمام مغربی اقوام امریکہ کی قیادت میں متحد ہوکر مسلمانوں کے ساتھ فائنل میچ کے لیے پوری طرح فارم میں ہیں۔

مگر جب شیخ الہندؒ نے اس صدی کے آغاز میں دہلی کے انگریز حکمرانوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا پروگرام بنایا تو دنیا کا سیاسی منظر آج سے بہت مختلف تھا۔ ترکی کی خلافت عثمانیہ جو پانچ صدیوں تک مسلمانان عالم کی سیاسی وحدت و مرکزیت کی علامت سمجھی جاتی رہی ہے ابھی زندہ تھی، اور جرمن ایک توانا و طاقتور حریف کے طور پر انگریز قوم کا سامنا کر رہے تھے، بلکہ انگریز دشمنی نے ترکوں اور جرمنوں کو ایک دوسرے کے قدرتی حلیف کی حیثیت دے رکھی تھی۔ ایسے حالات میں حضرت شیخ الہندؒ نے بھی ایک ہوشیار جرنیل کی طرح انگریزوں اور جرمنوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس کے لیے منصوبہ بندی کی۔ اس کی تفصیلات مولانا سید محمد میاںؒ نے اپنی کتاب "تحریک شیخ الہند" میں انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ سرکاری دستاویزات کے حوالہ سے مرتب کر دی ہیں اور اب جرمن وزارت خارجہ کے ایک سابق ڈپٹی سیکرٹری اور برلن یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے استاذ پروفیسر اولف شمل کے حوالہ سے بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ روزنامہ جنگ لندن ۱۶ اگست ۱۹۹۴ء کے مطابق پروفیسر اولف شمل کے بقول شیخ الہندؒ کی تحریک پر جرمن، ترک اور افغان حکومتیں ان کے ساتھ ایک ایسے معاہدہ پر متفق ہوگئی تھیں جس کا مقصد برصغیر میں انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے لیے مشترکہ کارروائی کرنا تھا۔

اس جدوجہد کو "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ "تحریک شیخ الہندؒ" کے نام سے بھی متعارف تھی جبکہ پروفیسر اولف شمل نے اسے "برلن پلان" کا نام دیا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس کے روح رواں تھے اور جرمنوں، ترکوں اور افغانوں کے ساتھ مذاکرات و معاہدات میں ان کے کردار کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ لیکن یہ تحریک بوجوہ ناکام ہوگئی اور اسی دور میں عالمی سیاسی منظر بھی تبدیل ہوگیا۔ ترکی کی خلافت

عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا، جنگ عظیم اول میں جرمن شکست کھا گئے، اور کمیونسٹ انقلاب کے بعد روس ایک نئے حریف کے طور پر انگریزوں کے سامنے آ گیا۔ ان حالات میں جبکہ شیخ الہندؒ کے پلان کی ناکامی کے بعد اس تحریک کے کم و بیش سب ارکان دہلی کی انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار ہو کر جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے جا چکے تھے اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ تنہا جیل سے باہر رہ گئے تھے تو ایک موقع شناس اور مدبر سیاستدان کی حیثیت سے مولانا سندھیؒ کے لیے فطری راستہ یہی تھا کہ وہ انگریزوں کے نئے عالمی حریف "کمیونسٹ روس" کے ساتھ سلسلہ جنبانی کرتے۔ اور جس طرح ان کے استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے انگریزوں اور جرمنوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی بالکل اسی طرح وہ انگریزوں اور روسیوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے کی راہ نکالتے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ماسکو کا سفر کیا، وہاں کچھ عرصہ قیام کیا، کمیونسٹ لیڈروں سے ملاقاتیں کیں، کمیونسٹ انقلاب کا مطالعہ کیا اور مغربی سرمایہ داری اور کمیونزم کی کشمکش کے پس منظر میں روسی انقلاب کے بعض پہلوؤں پر کلمہ خیر بھی کہا۔

بس یہ ہے وہ پس منظر جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یار دوستوں نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے اشتراکیت سے متاثر ہونے کا مفروضہ قائم کر لیا اور اب تک آنکھیں بند کر کے اس لکیر کو پیٹے جا رہے ہیں۔ بدقسمتی سے مولانا سندھیؒ کے بعض خوشہ چین جنہوں نے اپنے استاذ کی پیروی میں کمیونسٹ انقلاب اور نظام کے مطالعہ کی زحمت تو اٹھالی لیکن ان کی طرح فکری و نظریاتی توازن قائم نہ رکھ سکے، خود پر "لغزش پا" کا الزام زیادہ بوجھل سمجھتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے استاذ کی طرف منتقل کر دینے میں عافیت محسوس کی اور یہ بات ناقدین کے بے رحم ہاتھوں میں پہنچ کر ایک نئے فکری معرکے کا عنوان بن گئی۔ ستم بالائے ستم کہ نادان دوستوں اور بے رحم ناقدوں میں سے کسی نے بھی خود مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے ان کا موقف اور پوزیشن سمجھنے کی زحمت گوارا نہ کی جو اپنی جلاوطنی کے اختتام پر ہندوستان واپسی سے چند ماہ قبل اپنی خود نوشت میں یہ تحریر فرما رہے ہیں کہ

> "۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا، سات مہینے ماسکو میں رہا، سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا، کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا)۔ میرے اس

مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہؒ کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے، اس زمانہ کے لادینی حملہ سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔"
(بحوالہ "میری زندگی" مولانا سندھیؒ ص ۱۲۔ مطبوعہ مجلس قاسم المعارف دیوبند)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی "اس نص صریح" کے بعد بھی اگر کوئی صاحب ماسکو میں مولاناؒ کے قیام، سوشلزم کے مطالعہ اور برصغیر کی آزادی کے لیے روسی راہنماؤں کا تعاون حاصل کرنے کی کوششوں کو "اشتراکیت سے متاثر ہونے" کا عنوان دینے پر مصر ہیں تو انہیں رائے قائم کرنے کے حق سے نہیں روکا جا سکتا لیکن مولانا سندھیؒ کا دامن اس الزام سے بہرحال پاک ہے۔

مولانا سندھیؒ پر اشتراکیت سے متاثر ہونے کے الزام کا ایک اور انداز سے بھی جائزہ لے لیا جائے تو بہتر ہو گا۔ وہ یہ کہ کمیونزم اور کمیونسٹ انقلاب کے تین الگ الگ پہلو ہیں جنہیں سامنے رکھنا ضروری ہے

1. کمیونزم کا اعتقادی پہلو جس کا تعلق خدا تعالیٰ کے انکار، مذہب سے نفرت اور اخلاقیات سے انحراف سے ہے،
2. مغربی سرمایہ داری اور کمیونزم کے معاشی اصولوں کے تقابلی مطالعہ میں ترجیحات کا تعین،
3. اور روسی انقلاب کے ابتدائی دور میں دنیا بھر کی تحریکات آزادی کے ساتھ اس کا ہمدردانہ طرزِ عمل۔

جہاں تک اعتقاد و نظریات کا تعلق ہے مولانا سندھیؒ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ایمان و کردار اور عبادات و اخلاق میں آخر وقت تک کوئی ایسا جھول سامنے آیا ہو جسے کمزوری تو کجا رخصت کے دائرہ میں شامل کیا جا سکے۔ ان کا ایمان و عمل تو حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح عزیمت و استقامت کا ایمان و عمل ہے جس کے ساتھ سوائے رشک کے اور کوئی نسبت قائم نہیں کی جا سکتی۔ اور مولانا سندھیؒ خود اپنے ایمانی عزم کا اظہار ان الفاظ میں کر رہے ہیں کہ

"ہم پر قطعی طور پر لازم ہے کہ ہم تمام اقوام عالم کے سامنے ثابت کر دیں کہ انسانیت کے ہاتھ میں قرآن کریم سے زیادہ درست اور صحیح کوئی پروگرام نہیں ہے۔
پھر ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ جو لوگ قرآن کریم پر ایمان لا چکے ہیں ان کی جماعت کو منظم کیا جائے خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہم ان کی کسی اور حیثیت

کی طرف نہ دیکھیں بجز قرآن کریم پر ایمان لانے کے۔ پس ایسی جماعت ہی مخالفین پر غالب آئے گی لیکن ان کا غلبہ انتقامی شکل میں نہیں ہو گا بلکہ ہدایت اور ارشاد کے طریق پر ہو گا جیسا کہ والد اپنی اولاد پر غالب ہوتا ہے۔ اب اس نظام کے خلاف جو بھی اٹھ کھڑا ہو گا وہ فنا کر دینے کے قابل ہو گا۔" (الہام الرحمن بحوالہ "مولانا سندھیؒ کے علوم وافکار" از مولانا عبدالحمید سواتی ص ١٧)

"میرا یہ غیر متزلزل یقین اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بے شک اسلام پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ایک بار پھر ابھرے گا لیکن خارج میں اس کا ڈھانچہ وہ نہیں رہے گا جو اس وقت ہے۔" (ذاتی ڈائری ص ٣٣)

"میں مطمئن ہوں کہ اسلام کا احیاء نشاۃ ثانیہ میں دو اصولوں پر ہو گا

1. اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ اور جو آدمی ہماری اس بات پر متفق ہے وہ ہماری جماعت کا فرد ہو گا۔ یہی ایک کلمہ تمام امور کے لیے کفایت کرنے والا ہے۔

2. سود کی قطعی حرمت اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کو روکنا اور سود کھانے والوں کے خلاف اعلان جنگ کرنا۔ مسلمان ان دونوں اصولوں پر عمل پیرا ہوئے بغیر کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتے۔"

(بحوالہ مولانا سندھیؒ کے علوم وافکار ص ٢٤)

البتہ مولانا سندھیؒ نے مغربی سرمایہ داری اور کمیونزم کے تقابلی مطالعہ میں اپنی ترجیحات ضرور قائم کی ہیں جو ان امور پر اجتہادی نظر رکھنے والے ہر صاحب علم کا حق ہے۔ اس حوالہ سے مولانا سندھیؒ کے افکار اور ترجیحات سے اختلاف یا اتفاق دونوں کی گنجائش موجود ہے لیکن ایسے معاملات میں جن کا تعلق قرآن و سنت کی صریح نصوص سے نہیں، انہیں رائے قائم کرنے اور ترجیحات متعیّن کرنے کے علمی حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح مولانا سندھیؒ نے روسی انقلاب کے ابتدائی دور میں دنیا بھر کی تحریکات آزادی کے ساتھ اس کے ہمدردانہ رویہ کی تعریف کی ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ ایک فطری، نارمل اور معقول طرز عمل ہے جو ان جیسے حالات سے دوچار کسی بھی مجاہد آزادی کے لیے ناگزیر تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ روسی انقلاب کے بارے میں مولانا سندھیؒ کے اس دور کے تاثرات کا اطلاق بعد کے ادوار پر بھی ہو جبکہ روس خود ایک استعمار کا روپ دھار چکا تھا اور مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی

اقوام کی آزادی غصب کر کے ان کے مذہب، ثقافت اور معاشرت کو ملیامیٹ کرنے کے درپے تھا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں رومیوں اور ایرانیوں کی باہمی جنگ کے حوالہ سے قرآن کریم نے بھی ایک موقع پر رومیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور رومیوں کی کامیابی کو مسلمانوں کے لیے باعث فرحت قرار دیا ہے۔ لیکن یہ ایک وقتی بات تھی اور اس وقت کے معروضی حالات کے پس منظر میں تھی۔ اس کے چند سال بعد خود جناب رسول اللہؐ صحابہ کرامؓ کا لشکر جرار لے کر تبوک کے مقام پر جہاد کے لیے رومی لشکر کا انتظار کر رہے تھے۔

مولانا سندھیؒ نے اس دور میں روسی انقلاب کے بارے میں اگرچہ کچھ تعریفی باتیں کی ہیں تو انہیں اس دور کے معروضی حالات کے پس منظر میں ہی دیکھنا ہوگا۔ ورنہ جہاں تک کمیونزم کے اعتقادی اور نظریاتی پہلوؤں کا تعلق ہے ان کے بارے میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا نظریہ اور عقیدہ بھی وہی ہے جو اس دور کے دوسرے اہل علم کا ہے کہ وہ اس سے متاثر یا مرعوب ہونے کی بجائے پوری قوت سے اس کا ابطال کر رہے ہیں اور اس کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ہم اپنی معروضات کا اختتام مولانا سندھیؒ کے اس ارشاد پر کر رہے ہیں جس کے بعد اس سلسلہ میں کسی وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

> ”جو امت قرآن کریم کا پروگرام نہیں اپنائے گی وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔ مسلمان قرآن کی عالمی تنظیمی دعوت کا پروگرام لے کر اٹھے اور پھر وہ اپنی اس تنظیمی دعوت میں کامیاب ہوگئے اور یہ صرف پچاس سال کی مدت یعنی واقعہ صفین کی تحکیم تک ہوا۔ اب جب کوئی امت اپنی تنظیمی دعوت لے کر اٹھے گی تو وہ کبھی بھی کامیاب نہ ہوگی جب تک وہ قرآن کے پروگرام کو نہ اپنائے۔ ہم نے یہ بات تحقیق سے دریافت کی ہے اور موجودہ دور میں عالمی تحریکات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارا ایمان اس بات پر پختہ ہوگیا ہے۔ لوگ بالعموم یہ جانتے ہیں کہ روسی انقلاب فقط ایک اقتصادی انقلاب ہے، ادیان اور حیات اخروی سے بحث نہیں کرتا۔ اور ہم ان روسیوں کے پاس بیٹھے ہیں اور ان کے افکار و خیالات ہم نے معلوم کیے ہیں اور ہم نے بتدریج اور آہستہ آہستہ نرمی اور لطافت سے امام ولی اللہؒ کا پروگرام جو انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں پیش کیا ان روسیوں کے سامنے رکھا تو انہوں نے اسے نہایت ہی

مستحسن خیال کیا اور ہم سے پوچھنے لگے کہ کیا کوئی جماعت اس وقت ایسی ہے جو اس پروگرام پر عمل کرتی ہو؟ جب ہم نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے بہت افسوس کیا اور کہنے لگے اگر کوئی جماعت اس پروگرام پر عمل کرنے والی ہوتی تو ہم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور ہم بھی ان میں داخل ہو کر ان کا مذہب اختیار کر لیتے اور یہ بات ہمارے لیے آسان بنا دیتی ہماری ان مشکلات کو جنہوں نے ہمارے پروگرام کو کسانوں میں نافذ ہونے سے روک رکھا ہے۔ یہ ان روسیوں کی بات کا بلاکم و کاست اور بلاتحریف کے خلاصہ ہے۔ اس کے بعد مجھے یقین ہوا کہ یہ لوگ ہمارے قرآنی پروگرام کو قبول کرنے کی طرف مجبور ہوں گے اگرچہ ایک زمانہ کے بعد ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم آج کے دور میں عالمی تحریکوں میں سے کسی تحریک کو ایسا نہیں پاتے کہ وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف اور مناقض ہو، جس طرح انقلابی روس کی تحریک قرآنی پروگرام کے مناقض اور مخالف ہے اور باوجود اس کے کہ وہ بھی مجبور اور مضطر ہیں کہ قرآن اور اس کے پروگرام کی طرف رجوع کریں، باقی تحریکات کا کیا پوچھنا۔ اور اس چیز نے میرے ایمان میں زیادتی اور قوت پیدا کر دی ہے کہ ہدایت اور فلاح قرآن کے نزول کے بعد صرف قرآن کریم کے اتباع پر ہی موقوف ہے۔" (الہام الرحمن ص ۷۰ بحوالہ مولانا سندھیؒ کے علوم وافکار ص ۱۹)

پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے وفاقی وزارت مذہبی امور کی سفارشات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جولائی ۱۹۹۴ء)

ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے حکومت کی ہدایت پر وزارت مذہبی امور نے سفارشات پر مبنی تفصیلی رپورٹ مرتب کی ہے جس میں نفاذ شریعت کے لیے دستوری تقاضوں، عدل وانصاف، تعلیم، معیشت، ذرائع ابلاغ، اصلاح جیل خانہ جات، معاشرتی اور دفتری اصلاحات کے حوالے سے تفصیلی سفارشات پیش کی گئی ہیں۔ وزارت نے یہ رپورٹ ملک کی مذہبی تنظیموں اور اسلامی نظریاتی کونسل کی مدد سے تیار کی ہے۔ اس رپورٹ کو کابینہ اپنے آئندہ اجلاس میں غور کرنے کے بعد پارلیمنٹ میں پیش کرے گی اور

ملکی آئین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے دستور میں ترمیم کرنے کی تجویز پارلیمنٹ میں پیش کرے گی۔ جو سفارشات کی گئی ہیں ان کی تفصیلات یہ ہیں۔

دستوری سفارشات میں آئین کے آرٹیکل ۲ میں ترمیم کرنے کا کہا گیا ہے۔ اس میں ترمیم کر کے آرٹیکل ۲ کو ۲ (ا) لکھا جائے گا۔ آرٹیکل ۲ (۲) اسلام کے احکام جو قرآن کریم اور سنت رسول میں منضبط ہیں، پاکستان کا سپریم لاء قرار پائیں گے۔ آرٹیکل ۲ (۳) آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۲ (۳۰) اور ۲۲۷ (۲) میں شامل کسی امر کے باوجود کوئی قانون بشمول دستور کے یا کوئی رسم و رواج جو قانون کا حکم رکھتا ہو، تناقص کی اس حد تک کالعدم ہو گا جس حد تک وہ قرآن و سنت میں منضبط احکام اسلام کا مناقض ہو۔ آرٹیکل (۴) مملکت کوئی ایسا قانون وضع نہیں کرے گی جو کہ قرآن کریم اور سنت رسول میں منضبط احکام اسلام سے متصادم، متناقض یا ان کے منافی ہو۔ یا کوئی قانون جو اس شق کی خلاف ورزی میں وضع کیا گیا ہو، وہ خلاف ورزی کی حد تک کالعدم ہو گا۔ دستوری سفارشات کے مطابق آئین کی دفعہ ۲۰۳ (بی) کی شق (سی) کو حذف کر کے اس شق کا اضافہ کیا جائے کہ قانون میں دستور یا ہر وہ رسم و رواج شامل ہے جو قانون کا اثر رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ دفعہ ۲۰۳ (سی) کی شق (۹) کو حذف کر کے اس میں اس شق کا اضافہ کیا جائے کہ چیف جسٹس یا کوئی جج اس وقت تک اپنے عہدے پر فائز رہے گا جب تک اس کی عمر ۷۰ سال کو نہ پہنچ جائے، سوائے اس کے کہ وہ یا تو خود اپنے عہدے سے استعفیٰ دے یا دستور کے مطابق اس کو اپنے عہدے سے ہٹا دیا جائے۔

عدل و انصاف کے متعلق رپورٹ نے اپنی سفارشات میں کہا ہے کہ عدالتی نظام میں تبدیلی وقت کی اہم اور فوری ضرورت ہے۔ معاشرے میں تبدیلی کے لیے مؤثر عدالتی نظام کو رائج کرنا ہو گا۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کا عمل عدل و انصاف کے نظام میں تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ضمن میں ۵ تجاویز دی گئی ہیں:

1. صوبائی، ضلعی اور تھانے کی سطح پر قاضی اور مفتی مقرر کیے جائیں۔
2. سستا اور فوری انصاف مہیا کیا جائے، کورٹ فیس ختم کی جائے، اپیل کے زیادہ چینل ہوں۔
3. قاضی جلد فیصلہ کرے اور تمام عدالتی مراحل میں سے گزر کر مقدمات کے حتمی و قطعی فیصلے کے لیے زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال مقرر کی جائے۔

4. اسلام کا نظام احتساب بغیر کسی استثنا کے نافذ کیا جائے جو مرکز اور صوبائی سطح سے لے کر تھانے اور دیہات کی سطح پر نافذ العمل ہو۔

5. جرائم کی روک تھام کے لیے موقع پر انصاف مہیا کیا جائے۔ ضابطہ فوجداری میں طریقہ تفتیش کے بارے میں اور عدالتی نظام میں اہم ترمیمات کی اشد ضرورت ہے، اس ضمن میں قاضی کورٹس کے مسودہ بل سے استفادہ کیا جائے۔

تعلیم کے سلسلہ میں سفارشات پیش کی گئی ہیں کہ:

1. تعلیمی اداروں میں بالخصوص اسکولوں میں کم از کم ایک نماز میں بچے باجماعت شریک ہوں۔

2. طالبات کے لیے این سی سی ٹریننگ میں خاتون اساتذہ کا تقرر کیا جائے، بصورت مجبوری ریٹائرڈ معمر فوجیوں کو بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔

3. علوم جدید اور علوم قدیم دونوں عمومی تعلیم اور دینی تعلیم کے حامل اداروں میں پڑھائے جائیں۔

4. اسلامیات کی تعلیم کا معیار بلند کیا جائے اور اس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد کی ٹھوس تعلیمات اتنی مقدار میں پڑھائی جائیں کہ دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ہر طالب علم کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر آجائے۔

5. پانچویں جماعت تک ناظرہ تعلیم قرآن کریم کے لیے اسلامیات کے مضمون سے الگ مستقل وقت رکھا جائے اور اس مرحلے تک پورے قرآن کریم کی ناظرہ تدریس مکمل کرائی جائے۔

6. عربی زبان کو اسلامیات کی تعلیم کا مستقل جزو بنایا جائے۔

7. مخلوط تعلیم کو ختم کرنے کے لیے بلا تاخیر کم از کم مدت کا تعین کیا جائے جس میں ضروری انتظامی امور کی تکمیل کی جا سکے۔ اور طالبات کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو ان کی فطری ضروریات کے مطابق ہوں۔ دو خواتین یونیورسٹیوں کے قیام کے متعلق مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق کے اعلان کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔

8. طلباء کو ایسی غیر نصابی سرگرمیوں کی اجازت نہ دی جائے جو اسلام کے خلاف ہوں مثلاً رقص و سرود اور مخلوط ڈرامے وغیرہ۔

معیشت کے بارے میں تجویز ہے کہ ملک کے نظام معیشت کو قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔ نیز وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کی روشنی میں معیشت کے تمام شعبوں کو سود سے پاک کیا جائے اور متبادل اسلامی نظام معیشت قائم کیا جائے اور اس کے لیے ضروری قانونی ڈھانچہ فراہم کیا جائے۔ اس ضمن میں سفارشات میں کہا گیا ہے کہ:

1. پاکستان میں بینکنگ اور مالیاتی ادارے مضاربہ اور مشارکہ کی بنیاد پر چلنے چاہئیں اور اس مقصد کے لیے ضروری قانونی ڈھانچہ فراہم کرنا ناگزیر ہے۔ لہذا مالی کاروبار کے ان طریقوں میں بنیادی اہمیت بلاسود شراکتی تعامل کو دی جائے۔

2. موجودہ مارک اپ سسٹم دراصل سود کا دوسرا نام ہے، لہذا اسے ختم کیا جائے۔

3. جدید معاشی نظام میں وینچر کیپیٹل (زر مخطرہ) معیشت کی ترقی و فروغ کے لیے بنیادی محرک تسلیم کیا جاتا ہے۔ سرمایہ پیدا کرنے اور سرمایہ کاری کا اسلامی فلسفہ صرف وینچر کیپیٹل کی اجازت دیتا ہے نہ کہ قرض پر دیے ہوئے پہلے سے طے کردہ سود کی سرمایہ کی۔ اسلام صرف قرض حسنہ دینے کی اجازت دیتا ہے۔

4. مالی اداروں اور بینکوں میں مضاربت اور مشارکت کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت اپنے لین دین میں سود ختم کرنے کو یقینی بنائے۔

5. بینکوں کا با اثر افراد کا قرضہ معاف کرنا شرعی لحاظ سے نہایت قابل اعتراض ہے کیونکہ یہ ان لوگوں کی دولت ہے جو بینک میں پیسہ جمع کراتے ہیں۔ یہ اختیار بینکوں اور مالیاتی اداروں کی انتظامیہ سے لے کر صرف عدالتوں کو ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔

6. فکسڈ ٹیکسیشن کا نظام رائج کیا جائے۔

7. بیرونی سودی قرضوں کی ادائیگی کی خاطر پاکستانی پروجیکٹس کے حصص زر مبادلہ کے عوض بیچے جائیں اور اس طرح حاصل ہونے والے زر بیع سے غیر ملکی قرضے ادا کیے جائیں۔

8. زکوۃ اور عشر کے موجودہ نظام میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔
9. قرض حسنہ کو مجموعی طور پر اسلامی طریقہ کار کے مطابق رائج کیا جائے۔
10. اسلام میں قرض معاف کرنے کی گنجائش سوائے قرضہ دینے والے کے کسی اور کو نہیں، اس لیے قیام پاکستان سے لے کر اب تک حکمرانوں کے کہنے پر جو قرضے معاف ہوئے ہیں وہ واجب الادا ہیں۔

ذرائع ابلاغ کے اغراض و مقاصد قوم کو تفریحی، تعلیمی، اخلاقی، قانونی، معاشرتی اور سیاسی شعور سے آگہی اور معلومات فراہم کرنا ہیں۔ قومی مقاصد اور اسلامی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے موعظہ حسنہ اور حکمت بالغہ سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔

1. ذرائع ابلاغ کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ قوم کو نیکی، صداقت اور اچھائی کی طرف رہنمائی کریں۔
2. ٹیلیویژن اور ریڈیو پر مخرب اخلاق ڈراموں، فلموں، گانوں اور خلاف اسلام پروگراموں کی نشر و اشاعت فی الفور بند کی جائے۔
3. حکومت ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات و رسائل کے متعلق ایسا اہتمام کرے جس کی رو سے جھوٹی خبر یا اطلاع دینا یا شائع کرنا قابل تعزیر ہو۔
4. اخبارات و رسائل اور دیگر ذرائع ابلاغ عامہ کو ناشائستہ اور غیر اخلاقی اشتہارات اور مواد کی اشاعت سے روکا جائے۔
5. مخرب اخلاق ویڈیو سنٹر بند کیے جائیں، ڈش انٹینا کے بنانے، لگانے، درآمد کرنے اور استعمال کرنے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔

اصلاح جیل خانہ جات کے ضمن میں سفارشات کی گئی ہیں کہ:

1. قیدیوں کے اخلاق اور دینی اصلاح کے لیے جیل میں مستند علمائے دین کا تقرر کیا جائے جو تبلیغ کا کام انجام دے سکیں۔
2. جو مسلم قیدی صوم و صلوۃ اور اسلامی شعائر کے پابند ہوں اور قرآن مجید حفظ کریں تو ان کی قید کی مدت میں کمی کی جائے۔
3. اسلام کے نظام حدود و تعزیرات کے مطابق سزائیں دی جائیں تاکہ جرائم کا خاتمہ ہو۔

معاشرتی اصلاحات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

1. ملک میں اسلام کے نظام حسبہ یعنی احتساب کو رائج کیا جائے۔
2. لسانی اور علاقائی تنظیموں پر پابندی عائد کی جائے۔
3. مساجد کو مسلمانوں کی اجتماعی تقریبات کا مرکز و محور بنایا جائے۔
4. عورتوں کو شرعی ستر و حجاب کا پابند بنایا جائے۔
5. حکومت یہ اہتمام کرے کہ میراث میں عورتوں کو شرعی حصہ ملے۔
6. فرمان امتناع شراب میں جو منشیات رکھی گئی ہیں ان کو فی الفور ختم کیا جائے۔

دفتری اصلاحات کے لیے تجویز پیش کی گئی ہے کہ:

1. دفاتر میں نظام صلوۃ کو مؤثر بنایا جائے۔
2. تمام سرکاری و غیر سرکاری تقریبات میں رقص و سرود اور خلاف شرع امور کو ممنوع قرار دیا جائے۔
3. بیوروکریسی اور بالخصوص پولیس کی اصلاح کی جائے۔
4. دفاتر میں خواتین کی سروسز کی مخلوط شکل میں حوصلہ شکنی کی جائے۔

خلافتِ اسلامیہ کے احیا کی اہمیت اور اس کے تقاضے

(جامع مسجد صدیقیہ، سیٹلائیٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ - ۱۵ جنوری ۱۹۹۴ء)

(۱۵ جنوری ۱۹۹۴ء کو ورلڈ اسلامک فورم کی ماہانہ فکری نشست جامع مسجد صدیقیہ سیٹلائیٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں جمعیت اہل سنت کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں مولانا زاہد الراشدی نے مندرجہ ذیل خطاب کیا۔ مولانا حافظ گلزار احمد آزاد نے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔ ادارہ الشریعہ)

بعد الحمد والصلوۃ۔ آج کی نشست کے لیے گفتگو کا عنوان طے ہوا ہے "خلافت اسلامیہ کا احیا اور اس کا طریق کار"۔ اس لیے خلافت کے مفہوم اور تعریف کے ذکر کے بعد تین امور پر گفتگو ہوگی:

1. خلافت کا اعتقادی اور شرعی پہلو کہ ہمارے عقیدہ میں خلافت کی اہمیت اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

2. خلافت کا تاریخی پہلو کہ اس کا آغاز کب ہوا تھا اور خاتمہ کب اور کیسے ہوا؟

3. اور یہ سوال کہ آج کے دور میں خلافت اسلامیہ کے احیا کے لیے کون سا طریق کار قابل عمل ہے۔

خلافت کا مفہوم

سب سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے اور جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد کیا ہوتی ہے؟ خلافت کا لفظی معنی ہے نیابت، یعنی کسی کا نائب ہونا۔

قرآن کریم نے خلافت کا لفظ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے حوالہ سے نسل انسانی کے لیے استعمال کیا ہے جب اللہ تعالی نے فرشتوں سے فرمایا کہ ''میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں'' (البقرہ)۔ یہاں خلیفہ سے مراد حضرت آدمؑ اور ان کی نسل ہے۔ یعنی اس کائنات ارضی کا نظام اللہ رب العزت نے نسل انسانی کے سپرد فرمایا ہے اور وہ اس نظام کو چلانے میں اللہ تعالی کی نائب ہے۔ خلیفہ کا لفظ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں بھی بولا گیا ہے جو بنی اسرائیل کے پیغمبر اور بادشاہ تھے۔ چنانچہ اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں ''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، پس لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کیا کر اور خواہش کی پیروی نہ کرنا'' (ص)۔ بہرحال خلافت کا معنی نیابت ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ نسل انسانی اس کائنات ارضی میں خود مختار اور آزاد نہیں بلکہ نائب ہے جو اپنے دائرہ کار اور اختیارات میں مقرر کردہ حدود کا پابند ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایک اور انداز سے بھی بیان کیا ہے۔ جب حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو جنت سے زمین پر اتارا گیا تو اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ ''تم دونوں زمین پر اتر جاؤ، پس ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آئیں گی، جس نے ان کی پیروی کی وہ غم اور خوف سے نجات پائے گا اور جس نے انکار کر دیا وہ آگ کا ایندھن بنیں گے'' (البقرہ)۔ یہ بھی خلافت ہی کی ایک تعبیر ہے کہ نسل انسانی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے مطلقاً آزاد و خود مختار نہیں بلکہ آسمانی ہدایات کی پابند ہے جو حضرات انبیاء کرامؑ کے ذریعے سے نازل ہوتی رہی ہیں اور جو وحی کی صورت میں حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر حضرت محمدؐ پر مکمل ہو گئی ہیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدّد ارشادات میں خلافت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس کا پورا سسٹم یوں بیان فرمایا ہے کہ ’’بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھ میں تھی، جب ایک نبی دنیا سے چلا جاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا۔ اور میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے البتہ میرے بعد خلفاء ہوں گے‘‘۔ اس ارشاد گرامی میں جناب رسول اکرمؐ نے خلافت کو سیاسی قیادت اور حکمرانی کے معنی میں بیان فرمایا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ میرے بعد یہ سیاسی قیادت اور حکمرانی خلفاء کے ہاتھ میں ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی معروف کتاب ازالۃ الخفاء میں خلافت کی جو تعریف کی ہے اس میں خلافت کو جناب نبی اکرمؐ کی نیابت سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ’’خلافت اس اقتدار عمومی کا نام ہے جو معاشرہ میں اقامت دین کا اہتمام کرے، امن و امان کا بندوبست کرے، لوگوں کو انصاف فراہم کرے، احکام اسلام کے نفاذ کی ذمہ داری قبول کرے اور فریضۂ جہاد کی ادائیگی کا اہتمام کرے‘‘۔ اسی کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ نیابتاً علی النبی کہ یہ اقتدار عمومی جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کے طور پر ہوگا۔ گویا ہمارے ہاں خلافت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاست، قیادت اور حکمرانی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کے طور پر کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ’’خلیفۃ رسول اللہ‘‘ کہا جاتا تھا جبکہ امیر المؤمنین کی اصطلاح ان کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں اختیار کی گئی۔

تاریخی کشمکش

اس موقع پر مناسب ہوگا کہ اس تاریخی کشمکش پر ایک نظر ڈال لی جائے جو نسل انسانی کے آغاز سے ہی خلافت اور انسانی ذہن کی کاوشوں کے درمیان شروع ہو گئی تھی اور اب تک پورے شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ نسل انسانی کے آغاز سے اب تک انسانی معاشرہ پر جن قوانین اور ضابطوں کی حکمرانی رہی ہے وہ بنیادی طور پر دو طرح کے ہیں:

1. ایک طرف وہ نظام ہائے حیات ہیں جنہیں خود انسانی ذہن نے تشکیل دیا اور مختلف صورتوں میں انسانی معاشرہ پر ان کی حکمرانی رہی۔ ان میں خاندانی بادشاہت بھی ہے اور شخصی ڈکٹیٹرشپ بھی، جماعتی آمریت بھی ہے اور طبقاتی بالادستی بھی۔ اسی طرح بعض قوموں کا خود کو حکمرانی کے لیے مختص کر لینا

بھی اس میں شامل ہے۔ یہ سب نظام انسانی ذہن کی پیداوار ہیں، کہیں شخصی ذہن کارفرما ہے، کہیں اجتماعی ذہن دخل انداز ہے اور کہیں گروہی اور طبقاتی ذہن نے بالادستی قائم کر رکھی ہے۔ اور ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے اب انسانی ذہن مغربی جمہوریت اور سولائزیشن کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج سے ہمکنار ہو چکا ہے جو ان تمام مرحلہ وار نظاموں کی ترقی یافتہ اور آخری شکل ہے۔ اور خود مغربی مفکرین کے بقول اب اس کے بعد انسانی ذہن سے اس سے بہتر کسی اور نظام کی توقع نہیں کی جا سکتی، جسے وہ ''اینڈ آف ہسٹری'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

2. دوسری طرف وحی الٰہی پر مبنی نظام ہے جس کا آغاز حضرت آدمؑ سے ہوا اور حضرت محمدؐ پر نازل ہونے والی وحی کی صورت میں وہ نظام مکمل ہو گیا اور اس کی عملی تعبیر خلافت راشدہ ہے۔

یہ دونوں نظام مکمل ہو چکے ہیں، اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور اب ان دونوں کے درمیان آخری راؤنڈ ہونے والا ہے، فائنل مقابلہ ہونے والا ہے، ان میں سے جو جیتے گا وہی انسانی معاشرہ پر حکمرانی کرے گا۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے، تاریخ کا عمل ہے جسے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس مقابلہ میں جیت اسلام کی ہوگی، خلافت کے نظام کی ہوگی، وحی الٰہی کی ہوگی اور جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق اس مقابلہ کے بعد اسلام کا غلبہ ہوگا اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب روئے زمین پر لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں کے سوا کوئی موجود نہیں ہوگا۔ یہ بہرحال ہوگا اور جناب نبی کریمؐ کا ارشاد پورا ہو کر رہے گا لیکن اس سے قبل طویل کشمکش اور تاریخی ٹکراؤ کا آخری اور فیصلہ کن مرحلہ آنے والا ہے جس سے گزر کر ہم خلافت کے دور میں داخل ہوں گے۔

خلافت کا شرعی حکم

خلافت کے مفہوم اور تاریخی کشمکش کے تذکرہ کے بعد اب ہم اس کے شرعی حکم کی طرف آتے ہیں جسے فقہاء کرام نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، بالخصوص امام ولی اللہ دہلویؒ نے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ فقہاء کرام نے خلافت کے قیام کو واجب قرار دیا ہے اور امام ابن حجر مکیؒ نے اپنی کتاب ''الصواعق المحرقہ'' میں اسے ''اہم الواجبات'' فرمایا ہے یعنی تمام واجبات سے زیادہ واجب۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے نزدیک یہ

واجب اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اسے جناب رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین سے بھی مقدم سمجھا اور حضورؐ کے وصال کے بعد پہلے خلیفہ کا انتخاب کیا پھر آنحضرتؐ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء میں اسے قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ قرار دیا ہے، یعنی اگر دنیا کے کسی بھی حصہ میں خلافت کا نظام موجود نہ ہو تو دنیا بھر کے مسلمان گنہ گار قرار پائیں گے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ شرعاً خلافت کے قیام کے واجب ہونے پر تین دلائل پیش کرتے ہیں:

1. پہلی دلیل یہ کہ جناب نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ کا سب سے پہلا اجماع خلافت کے قیام پر ہوا تھا اور انہوں نے جناب رسالت مآب کی تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اس فریضہ کی ادائیگی کا اہتمام کیا۔

2. دوسری دلیل کے طور پر وہ جناب نبی اکرمؐ کے اس ارشاد گرامی کو پیش کرتے ہیں کہ "جو شخص اس حالت میں مر گیا کہ اس کی گردن میں بیعت نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا ہے"۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ یہاں بیعت سے مراد خلافت کی بیعت لیتے ہیں اور اسے ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔

3. اور ان کی پیش کردہ تیسری دلیل یہ ہے کہ جو کام کسی فرض کی ادائیگی کے لیے ضروری ہو وہ خود بھی فرض ہو جاتا ہے۔ مثلاً وضو بذات خود فرض نہیں ہے لیکن چونکہ نماز اس کے بغیر نہیں ہوتی اس لیے نماز کے لیے وضو کرنا بھی فرض ہے۔ اسی طرح مسلم معاشرہ میں ارکان اسلام کا قیام، جہاد کا اہتمام، قضا کے نظام کا قیام، امن قائم کرنا اور علوم اسلامیہ کا احیا سب فرائض ہیں اور ان فرائض کی ادائیگی خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے خلافت کا قیام بھی ان مقاصد کے لیے اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز کے لیے وضو فرض ہے۔

خلافت کی سیاسی اہمیت

خلافت کے شرعی حکم کے ساتھ ساتھ اس کی سیاسی اہمیت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں جو میں نے اپنے بعض اساتذہ

سے سنا ہے۔ وہ یہ کہ جن دنوں تحریک آزادی کے عظیم راہنما شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ مالٹا جزیرے میں نظر بند تھے، ان کے ساتھ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی بھی گرفتار تھے، جبکہ ایک انگریز فوجی افسر بھی کسی جرم میں وہاں سزا کاٹ رہا تھا۔ یہ دور وہ تھا جب ترکی کی خلافت عثمانیہ جس نے کم و بیش پانچ سو سال تک عالم اسلام کی خدمت کی ہے آخری دموں پر تھی اور برطانیہ، فرانس اور اٹلی سمیت پورا یورپ اس خلافت کے خاتمہ کے لیے سازشوں میں مصروف تھا۔ ایک روز ملاقات میں مولانا مدنی نے اس انگریز فوجی افسر سے پوچھا کہ آپ لوگ ایک کمزور اور برائے نام سی حکومت کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں اور خلافت عثمانیہ سے آخر آپ کو خطرہ کیا ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی آپ کہہ رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ خلافت عثمانیہ اس وقت ایک کمزور سی حکومت ہے جس کا رعب و دبدبہ اور قوت و شوکت قصہ پارینہ ہو چکی ہے لیکن ایک قوت اس کے پاس اب بھی باقی ہے اور وہ خلافت کا لفظ ہے اور امیر المؤمنین کی اصطلاح ہے۔ کیونکہ خلیفہ کے لفظ میں آج بھی اتنی طاقت ہے کہ اگر خلیفہ کی طرف سے دنیا کے کسی خطہ میں کسی کافر قوم کے خلاف جہاد کا اعلان ہو جائے تو دنیا بھر کے مسلمان نوجوانوں میں ہلچل مچ جاتی ہے اور ایک جذباتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم اس قوت سے خائف ہیں اور اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ انگریز خلافت عثمانیہ کے خلاف سازش کر کے اسی قوت کو توڑنا چاہتے تھے اور اسے انہوں نے توڑ دیا جس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کا کوئی عنوان باقی نہیں رہا اور ہم انتشار و افتراق کا شکار ہو گئے۔

خلافت کا تاریخی پہلو

خلافت اسلامیہ کا ایک تاریخی پہلو بھی ہے جسے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیس سال خلافت راشدہ کا دور رہا جو خلافت کا مثالی دور ہے، اس کے بعد خلافت عامہ کا دور شروع ہو گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا کہنا ہے کہ خلافت راشدہ کا دور تیس سال تک ہی چل سکتا تھا کیونکہ اس کے بعد ان کڑی شرائط کے حامل لوگ موجود نہیں رہے تھے۔ اس کے بعد خلافت عامہ کا دور ہے جس پر خلافت راشدہ کا اطلاق نہیں کیا گیا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ خلافتیں غیر اسلامی تھیں بلکہ یہ خلافتیں بھی اسلامی تھیں جنہیں علماء امت نے ہر دور میں تسلیم کیا ہے، ان میں:

1. بنو امیہ کی خلافت ہے جو حضرت معاویہؓ سے شروع ہوئی اور ۹۰ سال تک قائم رہی۔

2. اس کے بعد اموی خلیفہ مروان ثانی سے عباسیوں نے خلافت چھین لی۔ اور اموی خاندان ہسپانیہ منتقل ہو گیا جہاں اس نے کم و بیش آٹھ سو سال تک خلافت کا پرچم لہرائے رکھا۔ جبکہ عباسیوں کی خلافت کا آغاز سفاح سے ہوا اور تقریباً پانچ سو برس تک اس کا تسلسل قائم رہا۔ حتیٰ کہ معتصم باللہ کے دور میں ہلاکو خان نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور بنو عباس کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

3. اس کے بعد بنو عثمان نے خلافت کا پرچم اٹھایا، یہ ترک تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے چن لیا تھا۔ سلطان عثمان اولؒ نے خلافت کے قیام کا اعلان کیا اور انہی کے نام سے یہ خلافت عثمانیہ کہلائی۔ خلافت کا یہ دور بھی کم و بیش پانچ سو سال کو محیط ہے اور اس سلسلہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید مرحوم ہیں جنہیں ۱۹۲۴ء میں جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک نے جلاوطن کر کے خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

جس زمانے میں یورپ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے لیے بے چین تھا اور اس کی سازشیں منظر عام پر آرہی تھیں، ہمارے ہاں برصغیر پاک و ہند میں خلافت کی حمایت کے لیے ایک پرجوش تحریک اٹھی جو تحریک خلافت کے نام سے تاریخ کا یادگار حصہ ہے، لیکن مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں خلافت کے خاتمہ کے بعد یہ تحریک خلافت بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔

خلافت عثمانیہ کے خلاف یورپ کی سازشیں اب ایک ایک کر کے بے نقاب ہو رہی ہیں اور اس پر لٹریچر آرہا ہے کہ یورپ نے کس طرح خلافت عثمانیہ کے سقوط کی راہ ہموار کی، ترکی جیسے عالم اسلام کے بازوئے شمشیرزن کو سیکولرازم کی طرف مائل کیا اور مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کا خاتمہ کر دیا۔

الغرض خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور کے بعد حضرت معاویہؓ سے شروع ہونے والی خلافت عامہ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء تک قائم رہی۔ اس دوران اچھے حکمران بھی آئے اور برے حکمران دیکھنا بھی عالم اسلام کو نصیب ہوئے لیکن مجموعی طور پر خلافت کا تسلسل بہرحال قائم رہا۔ بالخصوص بعض ادوار کی تمام تر خرابیوں کے باوجود خلافت عامہ کے اس تیرہ سو

سالہ طویل دور میں عدالتی نظام کا ریکارڈ شاندار رہا ہے اور عدالتوں میں قرآن و سنت کے احکام پر عملدرآمد کا سلسلہ بلاخوف لومۃ لائم چلتا رہا ہے۔ اسی طرح جہاد کا تسلسل بھی ہر دور میں قائم رہا ہے جو دنیا میں مسلمانوں کے رعب و دبدبہ کا ذریعہ بنا رہا۔ اس دوران خلافت راشدہ کا دارالحکومت مدینہ منورہ اور کچھ عرصہ کے لیے کوفہ تھا۔ بنوامیہ کا دارالخلافہ دمشق رہا، بنوعباس نے بغداد کو دارالخلافہ بنایا، اور بنوعثمان کا دارالخلافہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اسی تاریخی شہر میں ۱۹۲۴ء تک قائم رہا۔

خلافت کے احیا کی ضرورت

حضرات محترم! اب ہم اس نکتہ کی طرف آتے ہیں کہ آج کے دور میں خلافت اسلامیہ کے احیا کی اہمیت کیا ہے اور اس کے لیے عملی طریق کار کیا ہو سکتا ہے؟ خلافت کے احیا کی پہلی صورت تو یہ ہے کہ یہ ہمارا اجتماعی شرعی فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے بغیر ہم دنیا بھر کے تمام مسلمان گناہ گار ہیں اور شرعی فرض کے تارک ہیں۔ پھر صرف اس ایک فرض کے تارک نہیں بلکہ خلافت کے ذریعے احکام اسلامی کے نفاذ، اقامت دین، جہاد اور شرعی قضا کے جو فرائض بجا لائے جا سکتے ہیں ہم ان کے بھی تارک ہیں اور ان سب فرائض کو نظر انداز کرنے کا بوجھ ہم پر ہے۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں سیاسی وحدت اور مرکزیت کے قیام کا واحد ذریعہ صرف اور صرف خلافت ہے اور گزشتہ صدی کے تجربات نے واضح کر دیا ہے کہ سیاسی وحدت اور مرکزیت کے بغیر عالم اسلام تمام تر وسائل اور صلاحیتوں کے باوجود اپنا ایک مسئلہ بھی حل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے، اس لیے آج عالم اسلام کا سب سے بڑا اور سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ خلافت کے احیا و قیام کی کوئی عملی صورت پیدا کی جائے۔

عملی طریق کار

خلافت کے انعقاد و قیام کی جو صورتیں فقہاء اسلام نے بیان کی ہیں وہ بنیادی طور پر پانچ ہیں:

1. عام مسلمانوں کی رائے سے خلیفہ کا انتخاب کیا جائے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب ہوا تھا۔

2. خلیفۂ وقت کسی اہل شخص کو اپنا جانشین نامزد کر دے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو نامزد کیا تھا۔

3. خلیفۂ وقت کی نامزد کردہ خصوصی کمیٹی خلیفہ کا انتخاب کرے، جس طرح حضرت عثمان غنیؓ کا انتخاب عمل میں لایا گیا تھا۔

4. مجلس شوریٰ خلیفہ کو چنے، جیسے حضرت علیؓ چنے گئے تھے۔

5. کوئی اہل شخص اقتدار پر بزور قوت قبضہ کر لے اور امت اسے قبول کر لے، جیسے حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد حضرت معاویہؓ کی خلافت پر امت کا اجماع ہو گیا تھا۔

آج کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے دوسرا، تیسرا اور چوتھا طریقہ تو سردست قابل عمل نہیں ہے کیونکہ اس وقت کوئی شرعی خلیفہ موجود نہیں ہے جو کسی کو نامزد کر سکے، خصوصی کمیٹی بنا سکے یا مجلس شوریٰ قائم کر سکے۔ اس کے بعد پہلا اور پانچواں طریق کار ہی قابل عمل رہ جاتا ہے اور اس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ کسی مسلمان ملک کی منتخب پارلیمنٹ اپنے ملک کے دستور پر نظر ثانی کر کے شرعی بنیادوں پر خلافت کے احیا کا اعلان کرے اور عام آدمیوں کی رائے سے خلیفہ وقت کا انتخاب کیا جائے۔ یا کوئی طاقتور گروہ طاقت کے زور سے اقتدار پر قبضہ کر لے اور ان میں سے خلافت کے اہل شخص کو خلیفہ کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ فقہاء اسلام کی بیان کردہ صورتوں میں سے خلافت اسلامیہ کے احیا اور قیام کی کوئی اور صورت موجودہ حالات میں قابل عمل نہیں ہے۔

ایک اہم قابل توجہ نکتہ

اس مرحلہ میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۹۲۴ء تک خلافت کے جیسے کیسے تسلسل کو قبول کرنے کے باوجود ہمیں خلافت کے نظام کی تشکیل و تدوین میں خلافت راشدہ ہی کو معیار بنانا ہوگا۔ بعد کے خلافتی نظام اس بارے میں ہماری راہنمائی نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی خلافت راشدہ کے اصولوں کی طرف براہ راست رجوع کیے بغیر ہم مغربی جمہوریت اور ویسٹرن سولائزیشن کا مقابلہ کر سکیں گے۔ حکومت کی تشکیل میں عام آدمی کا حصہ، حاکم وقت پر تنقید کا حق، آزادئ رائے اور خلیفہ وقت سے اپنا حق کھلے بندوں طلب کرنے کا جو معیار خلافت راشدہ کے دور میں قائم ہوا وہ آپ کو بعد کے ادوار میں نہیں

ملے گا اور یہی معیار ہے جسے عملاً سامنے لا کر مغربی جمہوریت کے کھوکھلے پن کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص دو معاملات میں خلافت راشدہ کے طرز عمل کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا:

1. ایک حکومت کی تشکیل اور خلیفہ کے انتخاب میں عام آدمی کی رائے کی اہمیت، جسے حضرت عمرؓ نے بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق یوں بیان فرمایا کہ ”خبردار! لوگوں کے مشورہ کے بغیر خلیفہ کی بیعت کا نام نہ لینا اور جس نے ایسا کیا اس کی بات کو قبول نہ کرنا“۔

2. اور دوسرا نظم مملکت چلانے میں لوگوں کے ساتھ مشاورت کا نظام، جس کا اہتمام خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ کی سنت مبارکہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں لوگوں کو مشاورت میں شریک کیا کرتے تھے، جیسا کہ بدر، احد اور احزاب کے غزوات کے حوالہ سے احادیث موجود ہیں۔ حتیٰ کہ غزوہ حنین کے قیدیوں کی واپسی کے سلسلہ میں مشاورت کے موقع پر لوگوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باعث عرفاء یعنی لوگوں کے نمائندوں کے ذریعے سے ان کی رائے معلوم کر کے آنحضرتؐ نے فیصلہ فرمایا۔

اس لیے خلافت کا سیاسی نظام طے کرتے وقت ہمیں خلافت راشدہ کو مشعل راہ بنانا ہوگا، اسی صورت میں ہم آج کی دنیا کو مغربی جمہوریت سے بہتر نظام دے سکتے ہیں اور وقت کے چیلنج کا سامنا کر سکتے ہیں۔

حضرات محترم! میں آخر میں اس فکری نشست کے انعقاد پر جمعیت اہل سنت کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ سب دوستوں سے اس دعا کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں کہ اللہ رب العزت عالم اسلام کو خلافت کے حقیقی نظام سے ایک بار پھر بہرہ ور فرمائیں اور ہمیں اس کے لیے مؤثر اور نتیجہ خیز محنت کی توفیق دیں، آمین یا الہ العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جون ۱۹۹۶ء)

۱۹۹۳ء

مغربی ممالک میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱دسمبر ۱۹۹۳ء)

مغربی ممالک میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم و تربیت اور دینی مکاتب کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام دینی مکاتب کے چند سینئر اساتذہ اور دیگر متعلقہ حضرات کے درمیان ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا۔ یہ مذاکرہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو مرکز الدعوۃ والارشاد (پلیسٹ گروو ایسٹھم، لندن) میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا محمد اسماعیل بوٹا نے کی اور اس میں مولانا مسعود عالم قاضی، مولانا عبد الرشید رحمانی، مولانا فیاض عادل فاروقی، حاجی افتخار احمد، حاجی ولی آدم پٹیل، حافظ حفظ الرحمن تاراپوری اور حاجی غلام قادر کے علاوہ راقم الحروف اور ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد عیسی منصوری نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر یہ طے کیا گیا کہ مذاکرہ میں زیر بحث آنے والی اہم اور مفید تجاویز پر مشتمل رپورٹ مرتب کر کے اخبارات و جرائد اور دینی مکاتب کے منتظمین و اساتذہ تک پہنچائی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات اس سے استفادہ کر سکیں۔

ضروریات دین کا دائرہ

مذاکرہ میں اس امر کا جائزہ لیا گیا کہ مغربی معاشرہ میں ان ضروریات کا دائرہ کیا ہے جن کی تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض عین ہے اور جن کے بغیر کوئی شخص اس معاشرہ میں ایک صحیح مسلمان کے طور پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بحث و تمحیص کے بعد والدین، اساتذہ اور خطباء وائمہ سے یہ گزارش کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار

میں مندرجہ ذیل امور کے حوالہ سے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دیں:

• یورپی معاشرت کی بنیاد مادہ پرستی اور دہریت پر ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کو ابتدا ہی سے اللہ تعالی کے وجود، اس کی قدرت، توحید باری تعالی، کائنات کے نظام کے بارے میں قرآنی عقائد: رسالت، ختم نبوت، قیامت اور قرآن و سنت کی اہمیت کے سلسلہ میں ضروری باتیں ذہن نشین کرائی جائیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی ذمہ داری ماں باپ کی ہے اور پھر دینی مکاتب کے اساتذہ کی کہ وہ بچوں کی ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ ان کی اعتقادی تعلیم کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی شعوری اور مربوط کوشش کریں۔

• اعتقادات و ایمانیات کے بعد عبادات یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کے ضروری مسائل کی تعلیم ضروری ہے، لیکن ان مسائل کی تعلیم کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان عبادات کی اہمیت و افادیت کو ذہین نشین کرانا اور ان بچوں کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں ان عبادات کا شعوری طور پر قائل کرنا ضروری ہے تاکہ وہ بوجھ سمجھ کر نہیں بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے عبادت کی طرف مائل ہوں۔ اخلاقیات و معاملات میں بچوں کو اسلامی احکام کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ یورپی معاشرت کی مادہ پرستانہ اخلاقیات کے نقصانات سے آگاہ کرنا اور ان کے ذہنوں میں اسلامی اخلاق اور یورپی اخلاق کے فرق کو واضح کر کے اسلامی اخلاق کی افادیت اور برتری کو شعوری طور پر ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ روزمرہ کے معمولات اور استعمال میں آنے والی اشیا کے حوالہ سے حلال و حرام کا فرق ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔

• حجاب و حیا کے شرعی مسائل سے واقفیت کرانے کے ساتھ مرد و عورت کے اختلاط کے نقصانات اور اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی خرابیوں سے بھی بچوں کو آگاہ کیا جائے۔

• اس معاشرہ میں رہنے والے نوجوانوں کو عیسائیت، یہودیت، ہندو ازم اور سکھ مذہب کے بنیادی عقائد اور مسلمانوں کے ساتھ اعتقادی اور معاشرتی فرق و اختلاف سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔

• اسلام کے حوالہ سے ابھرنے والے اعتقادی فتنوں مثلاً تجدد پسندی، قادیانیت اور انکار حدیث کے دینی نقصانات سے بچوں کا واقف ہونا ضروری ہے۔

شرکاء مذاکرہ کی رائے یہ ہے کہ اگر والدین اور اساتذہ میں ان امور کی اہمیت کا احساس بیدار ہو جائے اور وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالہ سے اپنے معمولات میں اس کے مطابق ترتیب پیدا کر لیں تو یہ مقاصد با آسانی موجودہ وسائل اور نظام سے بھی کسی حد تک پورے ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے مناسب ہوگا کہ وقتاً فوقتاً اساتذہ اور والدین کے اجتماعات کر کے ان سے ان امور پر تبادلہ خیال کیا جائے۔

دینی مکاتب کی کارکردگی

مذاکرہ میں مغربی ممالک میں مساجد میں قائم دینی مکاتب کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا جو ہفتہ کے دوران شام کو دو گھنٹے یا ویک اینڈ پر ہفتہ اور اتوار کی کلاسوں کی صورت میں جاری ہیں۔ یہ محسوس کیا گیا کہ ان مکاتب کا وجود بسا غنیمت ہے جو مسلمان بچوں کو قرآن کریم اور دین سے وابستہ رکھنے کا عالم اسباب میں اس وقت واحد ذریعہ ہیں اور اس سلسلہ میں منتظمین اور اساتذہ کی محنت بلاشبہ لائق ستائش ہے، لیکن اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا بھی انتہائی ضروری ہے:

• مسلم کمیونٹی کی مجموعی آبادی میں مساجد و مکاتب میں آنے والے بچوں کا تناسب دیکھا جائے اور مسجد و مکتب میں نہ آنے والے بچوں کو مکتب میں لانے یا ان تک متبادل ذرائع سے تعلیم پہنچانے کا مناسب اور قابل عمل ذریعہ اختیار کیا جائے۔

• مکاتب میں صرف قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بعض میں حفظ قرآن کا اہتمام بھی ہے اور اس کے ساتھ عبادات کے حوالہ سے مسائل و احکام کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہونے کے باوجود ناکافی ہے اور اس کے ساتھ ضروریات دین کے مذکورہ پیکیج کو ایڈجسٹ کرنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ایک مسلمان نوجوان کی دینی تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی۔

• ان مکاتب میں قرآن کریم ناظرہ مکمل کر لینے کے بعد عام طور پر ایک مسلمان بچہ دینی تعلیم سے فارغ سمجھا جاتا ہے اور ایسا عام طور پر بارہ تیرہ سال کی

عمر میں ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس بچے کا مسجد و مکتب یا دینی تعلیم کے کسی سسٹم کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا جو شرکاء مذاکرہ کی رائے میں سب سے زیادہ خطرناک بات ہے۔ کیونکہ ایک نوجوان کی شخصیت و کردار کی تشکیل اور عادات و اخلاق کے رسوخ کی یہی عمر ہوتی ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ تعلیمی نصاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے: (۱) پہلے حصہ میں پانچ سال سے بارہ سال تک کی عمر کے بچوں کو قرآن کریم اور ضروریات دین کا مذکورہ بالا نصاب پڑھایا جائے۔ (۲) اور دوسرے حصہ میں بارہ سے سولہ سال کی عمر کے بچوں کو اردو پڑھنا سکھایا جائے اور عربی گریمر کی ضروری تعلیم کے ساتھ قرآن کریم کا ترجمہ، احادیث کا منتخب کورس اور فقہ کی کوئی ایک کتاب پڑھا دی جائے۔

- شرکاء مذاکرہ کی رائے یہ ہے کہ بچوں کو تعلیم اسی زبان میں دی جائے جسے وہ زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ اس معاشرہ میں وہ زبان انگلش ہے اور انگلش نہ جاننے والے اساتذہ اس سلسلہ میں تھوڑی سی مشقت گوارا کر کے انگلش زبان کے نائٹ کورسز کے ذریعے اپنی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ تعلیمی ذمہ داری کو زیادہ بہتر طور پر ادا کر سکیں۔
- چونکہ دینی لٹریچر زیادہ تر عربی اور اردو میں ہے، اس لیے غیر عرب بچوں کو اردو بطور زبان سکھانا ضروری ہے تاکہ وہ دینی لٹریچر کے ساتھ وابستہ رہیں اور اس سے استفادہ کر سکیں۔

تجرباتی مکتب

مذاکرہ کے دوران بتایا گیا کہ ورلڈ اسلامک فورم نے اس مذاکرہ کی روشنی میں مرتب ہونے والی رپورٹ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مسلم کمیونٹی کو وسیع طور پر ان ضروریات کی طرف توجہ دلائی جا سکے۔ نیز یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ اس رپورٹ کی بنیاد پر ایک تجرباتی مکتب فورم کے زیر اہتمام لندن میں قائم کیا جائے گا جو امید ہے کہ اگست ۱۹۹۴ء کے دوران کام شروع کر دے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس کے تفصیلی پروگرام کا

اعلان ۷ اگست ۱۹۹۴ء کو اسلامک سنٹر (ریجنٹ پارک، لندن) میں منعقد ہونے والے ورلڈ اسلامک فورم کے دوسرے سالانہ بین الاقوامی سیمینار میں کر دیا جائے گا۔

دینی مکاتب کی انتظامی کمیٹیاں

مذاکرہ میں دینی مکاتب کا نظام چلانے والی کمیٹیوں کی کارکردگی کا بھی جائزہ لیا گیا اور اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ مسلم کمیونٹی کے اصحاب خیر اپنا وقت اور مال صرف کر کے دینی تعلیم کے نظام کو چلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں جو لائق تحسین ہے، تاہم تین امور کی طرف ان کمیٹیوں کو بھی بطور خاص توجہ دلانے کا فیصلہ کیا گیا:

- انتظامی کمیٹیوں کے ارکان کی غالب اکثریت تمام تر خلوص، ایثار اور محنت کے باوجود چونکہ تعلیم کی فنی مہارت اور تجربہ سے بہرہ ور نہیں ہوتی، اس لیے ضروری ہے کہ دینی مکاتب کی انتظامی کمیٹیاں تعلیمی نصاب و نظام کو بہتر طور پر چلانے کے لیے جید علماء اور ماہرین تعلیم (قدیم و جدید) پر مشتمل نگران کمیٹیاں تشکیل دیں اور تمام تر تعلیمی امور ان نگران کمیٹیوں کے ذریعہ کنٹرول کیے جائیں۔
- بہت سے مکاتب میں تعلیم دینے والے اساتذہ کی تنخواہوں کی مروجہ سطح تسلی بخش نہیں ہے، اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اساتذہ معاشی تفکرات سے آزاد ہو کر دلجمعی کے ساتھ کام کر سکیں۔
- بہت سے مکاتب میں طلبہ کی تعداد اساتذہ کی استعداد کار سے بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے کام صحیح طور پر نہیں چل سکتا، اس لیے ضروری ہے کہ طلبہ کی تعداد استاد کی استعداد کار اور کلاس کے وقت، تینوں امور کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔

نصاب اور طرز تعلیم

مذاکرہ میں دینی مکاتب میں مروج نصاب ہائے تعلیم اور طرز تعلیم کا جائزہ بھی لیا گیا اور ان دونوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بحث و مباحثہ کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ نصاب کے طور پر پڑھائے جانے والے بیشتر رسالے بچوں کی مانوس زبان میں نہیں ہیں۔ جو رسالے انگلش میں ہیں، ان کی زبان کا معیار بچوں کی عمر اور ذہنی سطح سے مطابقت

نہیں رکھتا اور اردو میں پڑھائے جانے والے کتابچے بھی اپنے مضامین و مواد کی قدر و اہمیت کے باوجود زبان کے لحاظ سے بچوں کی ذہنی سطح سے بلند ہیں، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی تعلیم کے نصاب اور طرز تعلیم دونوں کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور ایسی زبان اور طریق کار اختیار کیا جائے جس سے بچے زیادہ مانوس ہوں اور ان کے لیے اس میں شوق اور کشش کے اسباب بھی موجود ہوں۔ شرکاء مذاکرہ کی رائے میں اگرچہ اس سلسلے میں کوئی مؤثر پیشرفت فوری طور پر ممکن نہیں ہے اور یہ مقاصد ایک تدریجی عمل کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتے ہیں، تاہم اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز اور بریفنگ کا اہتمام کر کے موجودہ صورتحال کو کافی حد تک بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

تاشقند اور سمرقند کے پانچ روزہ سفر کی سرگزشت

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اگست ۱۹۹۳ء)

تاشقند وسطی ایشیا کی ایک اہم ریاست ازبکستان کا دارالحکومت ہے اور ہماری کئی تاریخی اور قومی یادیں اس سے وابستہ ہیں۔ وسطی ایشیا کا یہ خطہ، جسے علمی حلقوں میں ماوراء النہر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، صدیوں تک علوم اسلامیہ بالخصوص فقہ حنفی کا مرکز رہا ہے اور اسے امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، صاحب ہدایہ امام برہان الدین مرغینانیؒ اور فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ جیسے اساطین علم و فضل کی علمی جولانگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پھر پاکستان کی قومی تاریخ میں بھی تاشقند کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۶۵ء کی خوفناک پاک بھارت جنگ کے نتائج کو سمیٹنے کے لیے پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم اور بھارت کے وزیر اعظم آنجہانی لال بہادر شاستری کے درمیان مذاکرات اسی تاشقند میں ہوئے تھے اور انہی مذاکرات کے حوالہ سے "تاشقند کا راز" ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کا ایک مؤثر سیاسی ہتھیار اور قومی سیاست میں ہلچل اور گہما گہمی کا ذریعہ بنا رہا۔

اس پس منظر میں سوویت یونین کے تسلط سے وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی کے بعد سے یہ خواہش تھی کہ وسطی ایشیا کے اہم علاقوں بالخصوص تاشقند کو دیکھا جائے اور اس خطہ کے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور معاشرتی حالت کا جائزہ لیا جائے۔ سال رواں کے آغاز میں لندن سے واپسی پر یہ پروگرام طے ہوا کہ مجھے "ورلڈ اسلامک فورم" کے ضروری امور کے

لیے جون میں دوبارہ لندن آنا ہے تو واپسی کے لیے سستے ٹکٹ کی تلاش شروع ہوئی جو میرے جیسے سفید پوش مسافروں کی مجبوری ہوتی ہے۔ مختلف ایئرلائنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ صورت حال سامنے آئی کہ ان میں سب سے سستا ٹکٹ ازبک ایئرلائن کا ہے جو کراچی سے براستہ تاشقند لندن پہنچنے تک تاشقند میں چند روز قیام کی سہولت کے ساتھ دو سو پینتالیس برطانوی پونڈ کا بنتا ہے۔ اس رقم کو پاکستانی کرنسی میں شمار کیا جائے تو دس ہزار روپے کے لگ بھگ بن جاتی ہے۔ چنانچہ ''ایک ٹکٹ میں دو مزے'' یعنی سستے ٹکٹ کی سہولت اور تاشقند کی سیر کا لطف حاصل کرنے کا پروگرام بنالیا اور لندن سے ہی واپسی کا ٹکٹ بھی خرید لیا۔

پروگرام کے مطابق مجھے عید الاضحی کے فورا بعد سفر پر روانہ ہونا تھا اور کراچی سے سفر کے آغاز کے علاوہ تاشقند کا ویزا بھی وہیں سے حاصل کرنا تھا۔ اس لیے پانچ جون کو صبح کراچی پہنچ گیا، وہاں پہنچ کر جب یہ معلوم ہوا کہ کراچی کے علماء کرام کا ایک وفد انہی دنوں تاشقند جانے والا ہے جس میں اقراء ڈائجسٹ کے ایڈیٹر مفتی محمد جمیل خان بھی شامل ہیں تو سفر کے حوالہ سے بہت سی الجھنوں اور پریشانیوں سے ذہن خود بخود آزاد ہوگیا۔ علماء کے وفود مرتب کرنا، ان کے بیرونی سفر کے دفتری اور قانونی مراحل کو ہنستے کھیلتے طے کرنا اور پھر سفر کے آغاز سے اختتام تک خود کو وفود کی خدمت کے لیے وقف کر دینا مولانا مفتی محمد جمیل خان کا خصوصی ذوق اور دل پسند مشغلہ ہے۔ مجھے مکہ مکرمہ اور لندن کے دو اسفار میں ان کی اس ''خدمت گزاری'' سے لطف اندوز ہونے کا اس سے قبل موقع مل چکا ہے اس لیے میں نے اپنے سفر کے معاملات ان کے سپرد کر دیے اور خود مطمئن ہوکر دوسری مصروفیات میں مشغول ہوگیا۔ یہ وفد عالمی مجلس ختم نبوت کی طرف سے وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی دینی ضروریات کا جائزہ لینے اور ان میں قرآن کریم کے نسخے اور ضروری دینی لٹریچر تقسیم کرنے کے لیے جا رہا تھا اور اس میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر، مولانا مفتی نظام الدین شامزی، مولانا محمد عاصم، قاری عتیق الرحمن اور انور زیب خان شامل تھے، اور بعد میں جمعیت علماء اسلام کے مرکزی نائب امیر مولانا فداء الرحمن درخواستی اور راقم الحروف بھی اس میں شامل ہوگئے۔ ویزے کے لیے درخواستیں جمع کرانے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ ایک ہفتہ کے ویزا کی فیس تیس ڈالر اور پندرہ روز کے ویزا کی فیس چالیس ڈالر ہے اور اگر ویزا ایک دو روز میں ارجنٹ حاصل کرنا ہو تو

فیس ڈبل ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ تاشقند کے کسی ہوٹل کی کم سے کم تین روز کی پیشگی بکنگ بھی ویزے کے حصول کے لیے ضروری ہے اور یہ بکنگ ساڑھے چار ہزار روپے فی کس کے حساب سے ہوتی ہے۔ مجھے صرف ایک ہفتہ کا ویزا درکار تھا اس لیے ہوٹل کے ساڑھے چار ہزار روپے کے علاوہ امریکی ڈالر بھی ادا کرنا پڑے اور اس طرح لندن سے سستا خریدنے کا جو مزہ ذہنی اور اقتصادی طور پر میسر تھا تقریباً چھ ہزار روپے کے اس اضافی بوجھ کے ساتھ کرکرا سا ہو کر رہ گیا اور میرے سفری بجٹ کا گراف "عاشق نامراد" کی آرزوؤں کی طرح گرتا چلا گیا۔

خدا خدا کر کے ۷ جون کو وفد کے ویزوں کے لیے درخواست دی گئی تو شام کو "ففٹی ففٹی" نتیجہ برآمد ہوا یعنی نصف ارکان کو ویزا مل گیا اور نصف کے ویزوں سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر دل کھٹکا کہ خدا خیر کرے، فیصلوں کا یہ انداز تو آنجہانی مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملتا جلتا ہے۔ رنجیت سنگھ کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ایک روز دربار میں ان کے سامنے لوگوں کی درخواستوں کا ایک "دتھا" پیش کیا گیا۔ مہاراجہ موصوف اس وقت شاید شکایات سننے کے موڈ میں نہیں تھے اس لیے درخواستوں کو درمیان سے نصف کر کے انہیں الگ الگ میز پر رکھا اور فیصلہ صادر کر دیا کہ "آھا منجور تے آھا نامنجور" یعنی یہ ایک طرف والی درخواستیں منظور ہیں اور دوسری طرف والی درخواستیں نامنظور ہیں۔ خیال ہوا کہ ہماری درخواستیں پیش ہوتے وقت ازبک قونصل خانے کے حکام شاید اسی طرح کے موڈ میں ہوں اس لیے نصف درخواستیں منظور ہوئیں اور نصف مسترد ہو گئی ہیں۔ لیکن جب وجہ معلوم کرنے کا تردد کیا تو معاملہ بالکل الٹ نکلا یعنی نصف درخواستیں مسترد کرنے کی وجہ "کام نہ کرنے کا موڈ" نہیں تھا بلکہ کارکردگی دکھانے اور خود کو مستعد ظاہر کرنے کا شوق ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر، مولانا فداء الرحمن درخواستی اور مفتی نظام الدین شامزئی جیسے سنجیدہ بزرگوں کی درخواستیں نامنظور ہونے کا باعث بن گیا ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ ان کی ڈاڑھیاں لمبی ہیں جو ان کے متشدد مذہبی ہونے کی علامت ہیں اس لیے انہیں ویزا نہیں دیا جا سکتا۔

یہ ڈاڑھی بھی عجیب چیز ہے جو امریکہ بہادر کے "نیو ورلڈ آرڈر" کی بدولت کچھ عرصہ سے عالمی امن کے لیے خطرے کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے اور اب امریکہ اور اس کی بہی خواہوں کو کسی کے ہاتھ میں کلاشنکوف دیکھ کر اتنی تشویش نہیں ہوتی جتنا کہ کسی مسلمان کے

چہرے پر ڈاڑھی دیکھ کر ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ مجھے اس سے پہلے بھی ڈاڑھی کی اس خطرناکی کا کچھ اندازہ تھا اس لیے کہ تقریباً ایک ماہ قبل اسلام آباد میں مسئلہ کشمیر کے بعض پہلوؤں کے حوالہ سے ایک اجلاس میں ایک ذمہ دار کشمیری راہنما نے یہ انکشاف کیا تھا کہ چند دن پہلے مظفر آباد کے گرد و نواح میں کشمیری مہاجرین کے کیمپوں میں ایک حساس ادارے کی طرف سے یہ ہدایت جاری کی گئیں کہ چونکہ مختلف امریکی گروپ اس علاقہ کا دورہ کرتے رہتے ہیں اس لیے بڑی ڈاڑھیوں والے حضرات سے کہا جائے کہ وہ ایسے موقع پر ادھر ادھر ہو جایا کریں تاکہ ان پر امریکیوں کی نظر نہ پڑے۔

فرعون کے بارے میں تاریخی روایات میں آتا ہے کہ اسے علم نجوم کے ماہرین نے ایک خواب کی تعبیر میں بتا دیا تھا کہ اس کے اقتدار کا خاتمہ بنی اسرائیل کے ایک نوجوان کے ہاتھوں ہوگا۔ اس پر فرعون نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا آج کے بعد پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے۔ مگر جس موسیٰ کی آمد کو روکنے کے لیے فرعون نے ہزاروں بچوں کے بے گناہ خون سے اپنے ہاتھ رنگے خدا کی بے نیازی نے خود فرعون کے گھر میں اس موسیٰ کی پرورش کا اہتمام کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ستم ظریف نجومی نے آج کے فرعون کو بھی بتا دیا ہے کہ عالمی اسٹیج پر اس کی "خرمستیاں" اپنے عروج کو پہنچ کر اب زوال کی طرف ٹرن لینے والی ہیں اور اس کی چودھراہٹ اور رعونت کا خاتمہ کسی ڈاڑھی والے مسلمان کے ہاتھوں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ بہادر کے حواریوں اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے خواہشمند حلقوں میں ڈاڑھی والے مسلمان بطور خاص نشانے پر ہیں۔ خدا تعالیٰ کی بے نیازی اور اس کا اٹل قانون فطرت ہمارے اس ایمان کی بنیاد ہے کہ آج کا فرعون بھی اپنے "موسیٰ" کی آمد اور نشو نما کو کسی صورت میں نہیں روک سکے گا لیکن یہ "موسیٰ کا خوف" دنیا بھر کے کتنے بے گناہ ڈاڑھی والے مسلمانوں کے خون سے امریکہ اور اس کے حواریوں کے ہاتھ رنگتا ہے اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

خیر کراچی کے ازبک قونصل خانے نے ہمارے وفد کے نصف ارکان کو ویزے دینے سے ان کی ڈاڑھیاں لمبی ہونے کے باعث انکار کر دیا تھا مگر مفتی محمد جمیل خان ہار ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے، انہوں نے پینترا بدلا اور دوسرے دن کسی اور ٹریول ایجنٹ کی معرفت انہی حضرات کی درخواستیں دوبارہ بھجوا دیں، اب خدا جانے کہ ویزا افسر کی یادداشت نے کام

نہیں کیا یا مولانا فدا الرحمن درخواستی کے وظیفوں نے اثر دکھایا کہ شام تک ان بزرگوں کے ویزے لگ گئے اور اس طرح ہمارے وفد کے تاشقند کے سفر کی راہ ہموار ہوئی۔

چنانچہ مولانا فدا الرحمن درخواستی، مولانا عبد الرزاق سکندر، مولانا مفتی نظام الدین شامزئی، مفتی محمد جمیل خان، مولانا محمد عاصم، مولانا عتیق الرحمن، انور زیب خان اور راقم الحروف پر مشتمل آٹھ رکنی وفد ۹ جون بدھ کو کراچی کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے ازبک ایئرلائن کے ذریعے شام ساڑھے سات بجے روانہ ہو کر تقریبا سوا دس بجے تاشقند ایئرپورٹ پہنچا۔ آنجہانی سوویت یونین کے ہوائی اڈوں کے انتظامات کے بارے میں اس سے قبل بھی کچھ سن رکھا تھا، تاشقند ایئرپورٹ بھی انہی میں سے ہے جسے اب انٹرنیشنل معیار پر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن مسافروں کے ساتھ عملہ کا طرز عمل اب بھی پہلے جیسا ہے اور وہاں مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مسافر کمیونسٹ پارٹی کے عام ارکان ہیں اور ایئرپورٹ کا عملہ پارٹی کی لیڈرشب ہے۔ امیگریشن اور کسٹم کے معاملات نمٹانے کے لیے عملہ ناکافی ہے اور طریقہ کار فرسودہ۔ اس پر مستزاد یہ کہ طرز عمل بھی بین الاقوامی ہوائی اڈوں کے مسلمہ معیار سے میل نہیں کھاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں ان مراحل سے گزرنے میں سوا دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ مجھے پیشاب کی تکلیف رہتی ہے مگر ایئرپورٹ کے اس حصہ میں صرف ایک ٹوائلٹ نظر آیا جہاں نہ پانی تھا، نہ ٹشو پیپر اور نہ صفائی۔ میں تو دیکھ کر ہی واپس آ گیا کہ ابھی ہم نے ٹھکانے پر پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نماز ادا کرنا تھی اور مجھ میں اس وقت کپڑے دھونے اور نہانے کا حوصلہ نہ تھا۔ ہمارے ایک اور ساتھی اندر آ گئے اور واپس آ کر کہنے لگے کہ یہ تو "لی مارکیٹ کراچی" کے ٹوائلٹ سے بھی گیا گزرا ہے۔ خیر پیشاب روکے امیگریشن ہال سے باہر نکلنے کا انتظار کرتے ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ باہر کھلی فضا میں آئے تو کراچی سے سپر انٹرنیشنل ٹریول کے ذریعے جس ہوٹل کی بکنگ کرائی تھی اس کا نمائندہ موجود تھا۔ اسے دیکھ کر کچھ پریشانی کم ہوئی کہ چلو اب ہوٹل پہنچ کر اس مشکل سے نجات مل جائے گی مگر ابھی کہاں؟

گاڑیاں امیگریشن ہال کے گیٹ سے کافی فاصلہ پر کھڑی ہوتی ہیں اور وہاں تک سامان لے جانے کے لیے ٹرالیاں ندارد۔ ہمارے پاس آٹھ آدمیوں کے سامان کے علاوہ قرآن کریم اور ازبکی زبان میں مترجم نماز کے کچھ پیکٹ بھی تھے جنہیں ازبکستان میں تقسیم کرنا مقصود تھا۔ یہ اہتمام عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے کیا گیا تھا اور وفد بھی عالمی مجلس

کی طرف سے ہی ازبکستان کے دورہ پر گیا تھا۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اس سے قبل بھی وسطی ایشیا کی ریاستوں میں قرآن کریم کے نسخے بڑی مقدار میں تقسیم کر چکی ہے اور اب وہیں قرآن کریم چھپوا کر تقسیم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے کیونکہ اتنی مقدار میں قرآن کریم باہر سے وہاں لے جانا مشکل ہے۔ خود ہمیں کراچی ایئرپورٹ سے قرآن کریم کے بہت سے پیکٹ واپس کرنا پڑے تھے کیونکہ ازبک ایئرلائن کے عملہ نے مقررہ وزن سے زیادہ پیکٹ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ خیر تاشقند ایئرپورٹ پر ہمیں ایسی آزاد ٹرالی نظر نہ آئی جسے مسافر اپنی مرضی سے کرائے کے بغیر استعمال کر سکتے۔ البتہ کچھ قلی نما افراد کے پاس چھوٹی بڑی ٹرالیاں تھیں، ایک ریڑھی نما ٹرالی پر سامان لادا اور ہمارا سامان دو ہزار روبل کے عوض گاڑیوں کے اسٹینڈ تک پہنچا۔ روبل آنجہانی سوویت یونین کا سکہ تھا جو اب بھی روس اور وسطی ایشیا کی نو آزاد ریاستوں میں چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کبھی یہ امریکی ڈالر کے برابر ہوتا تھا مگر اب امریکی ڈالر کے عوض ساڑھے گیارہ سو کے لگ بھگ روبل سرکاری طور پر ملتے ہیں اور غیر سرکاری طور پر ساڑے بارہ سو روبل بھی مل جاتے ہیں۔ خدا خدا کر کے اسٹینڈ پر پہنچے تو گاڑی ندارد۔ کم وبیش پون گھنٹہ وہاں کھڑے رہنا پڑا پھر کہیں گاڑی کی شکل دکھائی دی۔ ہوٹل پہنچے تو پتہ چلا کہ یہ وہ ہوٹل ہی نہیں جو کراچی سے بک کرایا گیا تھا۔ بتایا گیا کہ اس ہوٹل میں جگہ نہیں ہے اس لیے متبادل ہوٹل میں لایا گیا ہے۔ اس ہوٹل کا نام یوشلیک ہے اور خاصا بڑا ہے، ہمیں اس کی نویں منزل پر کمرے ملے جو غالباً آخری منزل ہے، مجھے اور مولانا فداالرحمن درخواستی کو ایک کمرہ ملا۔ کمرہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو سیدھا باتھ روم میں گھس گیا کہ پیشاب کا زور اب میری دماغی کیفیت پر بھی اثر انداز ہونے لگا تھا۔ پیشاب سے فارغ ہو کر ارد گرد نظر دوڑائی تو استنجا کے لیے نہ وہاں کوئی برتن تھا کہ پانی استعمال کر سکوں اور نہ ٹیشو پیپر نام کی کوئی چیز تھی۔ جیسے کیسے اس مرحلہ سے نجات حاصل کی اور نماز ادا کی۔

نیند کے لیے بستر پر دراز ہونے لگے تو ایک نئی مشکل سے دوچار ہو گئے، کمرے میں پنکھا نہیں تھا اور گرمی کی کیفیت یہ تھی کہ اگر کھڑکیاں اور دروازے کھلے رکھے جائیں تو گزارہ ہو سکتا تھا اور اگر دروازہ بند کر دیں تو حبس کی سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ حبس اور گرمی سے میں بھی بہت تنگ پڑتا ہوں لیکن جہاں مجبوری ہو خاموشی کے ساتھ گزارہ کر لینے کا مزاج بنا ہوا ہے۔ البتہ مولانا فداالرحمن درخواستی کے لیے یہ صورتحال خاصی پریشان کن ثابت ہوئی، وہ اس معاملہ میں بادشاہ ہیں، ٹھنڈک اور سبزہ ان کی کمزوری ہیں، ایسی کمزوری کہ یہ دو

چیزیں دکھا کر انہیں دنیا و مافیہا سے بے خبر کیا جا سکتا ہے۔ سونے کے لیے ٹھنڈا ماحول نہ ملے تو ان کی رات غسل کرتے ہوئے بسر ہوتی ہے چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ میں بیڈ پر لیٹا تو مولانا درخواستی غسل خانے میں تھے اور صبح جب میری آنکھ کھلی تب بھی وہ غسل خانہ میں تھے۔ یہ ہوٹل جو تھری سٹار ہوٹلوں کے معیار کا لگتا تھا ہمیں صرف تین دن کے لیے ملا۔ ہم جمعرات کو صبح ۲ بجے کے لگ بھگ کمروں میں داخل ہوئے تھے جبکہ ہمیں کہا گیا کہ ہفتہ کے روز بارہ بجے سے پہلے کمرے خالی کر دینے ہیں۔ مجھ سے کراچی میں سپر ٹریول انٹرنیشنل نے ہوٹل کے کرایہ کی مد میں ساڑھے چار ہزار روپے وصول کیے تھے اور دو دو افراد کو ایک کمرہ ملا تھا۔ اس طرح تھری سٹار کا یہ ہوٹل ہمیں یومیہ تین ہزار پاکستانی روپے میں پڑا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس میں ہوٹل اور ٹریول ایجنسی کی ''بندر بانٹ'' کا تناسب کیا تھا، ہمارے کپڑے بہرحال اتر چکے تھے اور ہماری بے بسی کا حال یہ تھا کہ زبان سے ناواقفیت کے باعث ''اظہار بھی مشکل ہے'' کی عملی تصویر بنے ہوئے تھے۔

ایئرپورٹ اور ہوٹل سے قطع نظر باقی شہر بہت خوبصورت ہے، باغات اور درختوں میں گھرا ہوا تاشقند دیکھ کر سفر کی ساری کلفتیں ذہن سے اتر گئیں۔ کشادہ سڑکیں، درختوں کی لمبی قطاریں، ہر طرف سبزہ اور ہر گھر کے ساتھ باغیچہ نے ایک عجیب سماں باندھ رکھا ہے۔ ٹریفک کی سہولت عام ہے، ٹرام، بجلی والی بس اور آٹو بس کے ساتھ ساتھ زیر زمین ٹرین کا نظام بھی موجود ہے۔ ٹرام اور انڈر گراؤنڈ ٹرین میں جسے میٹرو کہا جاتا ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے فی کس کرایہ چھ روبل ہے جو پاکستانی سکہ کے حساب سے بیس پیسے کے قریب بنتے ہیں۔ ٹیکسی بھی اس حساب سے کچھ مہنگی نہیں، واپسی پر ہم نے تاشقند ہوٹل سے ایئرپورٹ تک ٹیکسی کا کرایہ چار سو روبل دیا اور فاصلہ اندازاً دو میل تھا۔

۱۰ جون جمعرات کو ہم نے شہر میں گھومنے کا پروگرام بنایا، مفتی محمد جمیل خان چونکہ پہلے بھی آ چکے تھے اس لیے کوئی دقت نہ ہوئی۔ ہم پہلے مدرسہ قوقل تاش گئے جو تاشقند کے علاقہ چہار سو میں ہے۔ مدرسہ کی عمارت مغل طرز تعمیر کا نمونہ ہے اور باہر سے ایک بلند و بالا قلعہ دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ دینی مدرسہ چار صدیوں سے آباد چلا آ رہا تھا، کمیونسٹ انقلاب کے بعد اسے بند کر دیا گیا اور کچھ عرصہ پہلے تک سیمنٹ کے سٹور کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ آزادی کے آثار نمودار ہونے پر علاقہ کے نوجوانوں نے ایک باہمت بزرگ جناب محمد نعیم کی سرکردگی میں اس پر قبضہ کر لیا اور اسے دوبارہ دینی مدرسہ کی

شکل دینے کی کوشش شروع کر دی۔ نعیم صاحب اب مدرسہ کے منتظم ہیں اور ان کی زیر نگرانی مرمت اور تعمیر نو کا کام جاری ہے۔ مدرسہ میں عربی اور دینیات کی تعلیم ہوتی ہے مگر اوقات متعیّن نہیں ہیں، طلبہ اور دیگر حضرات اپنی اپنی سہولت کے مطابق مختلف اوقات میں آتے ہیں اور سبق پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ بچیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تعلیم حاصل کرتی ہے۔ آج کل تعطیلات ہیں مگر جزوی طور پر تعلیم کا سلسلہ اس کے باوجود جاری ہے۔ معلوم ہوا کہ مجموعی طور پر دو ہزار کے لگ بھگ طلبہ اور طالبات دینی تعلیم کے لیے مدرسہ قوقل تاش میں آتے ہیں۔ یہاں ایک اور بزرگ سے بھی ملاقات ہوئی جن کا نام قابل محمد ہے۔ نماز اور جمعہ کے خطابت کے فرائض وہی سرانجام دیتے ہیں، عربی میں گفتگو کر سکتے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جن پر کمیونسٹ انقلاب اپنی تمام تر قہر سامانیوں کے باوجود اثرانداز نہیں ہو سکا اور وہ عقیدہ وعمل کے لحاظ سے اپنی پرانی طرز پر قائم ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے پچاس برس تک بازار سے گوشت خرید کر نہیں کھایا اس لیے کہ ذبح کا نظام شریعت کے مطابق نہیں تھا۔ مدرسہ قوقل تاش کے قریب ایک بڑا گنبد دکھائی دیا۔ میں نے سمجھا کہ کوئی مزار ہے مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک مسجد ہے جو مدرسہ کی طرح سیمنٹ کے گودام کا کام دیتی رہی ہے، اب مقفل ہے اور ابھی تک واگزاری اور آبادی سے محروم ہے۔

تاشقند کے مسلمان بے حد مہمان نواز ہیں، مہمان جب تک بیٹھا رہے اس کے سامنے دسترخوان بچھا رہتا ہے جس پر پھل اور خشک میوے موجود رہتے ہیں اور گرم چائے وقفے وقفے سے آتی رہتی ہے۔ ہمارے جانے پر بھی محمد نعیم صاحب نے دسترخوان بچھا دیا اور ظہر کے بعد پلاؤ کے ساتھ ہماری تواضع کی۔ یہاں کی چائے بڑی آسان ہے کہ دودھ اور چینی دونوں کے تکلف سے پاک ہوتی ہے، مہمان زیادہ اہمیت کا حامل ہو تو چینی کے اعزاز سے مشرف ہو پاتا ہے اور بحمد اللہ تعالی ہمیں اسی زمرہ میں شمار کیا گیا۔

اسی مدرسہ میں چینی ترکستان کے مولوی محمد امین صاحب بھی مدرس ہیں جنہوں نے جامعۃ العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی اور دیگر پاکستانی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے، اردو بول لیتے ہیں اور ان کی یہ صلاحیت اس دورہ میں ہمارے بہت کام آئی۔ انہوں نے گوجرانوالہ کے مدرسہ نصرۃ العلوم میں والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ العالی سے قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر پڑھی ہے اور اچھے با اخلاق اور خدمت گزار ساتھی

ہیں۔ دینی مدارس کے مدرسین کا حال یہاں بھی ناگفتہ بہ ہے ایک عام مدرس پانچ ہزار روبل تنخواہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے جبکہ اشیائے صرف کی قیمتوں کا حال یہ ہے کہ چھوٹا گوشت تقریباً ایک ہزار روبل میں ایک کلو ملتا ہے۔ ایک مدرس نے بتایا کہ ان کا تنخواہ سے روزمرہ خوراک کا گزارہ بھی نہیں چلتا لیکن وہ یہ کام چھوڑ کر کوئی اور کام اس لیے نہیں کرتے کہ پھر دین کی تعلیم کا کام کیسے چلے گا؟

مدرسہ قوقل تاش کے بعد ہم ادارہ امور دینی دیکھنے گئے، یہ سرکاری ادارہ ہے جو کمیونسٹ دور میں قائم رہا۔ اس کے سامنے ایک بڑی مسجد ہے جو ان خوش قسمت مساجد میں سے ہے جو کمیونسٹ دور میں بھی بطور نمونہ باقی رکھی گئی تھیں اور باہر سے آنے والے مسلمانوں کو یہ مساجد دکھا کر مسلمانوں کی مذہبی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔ اس مسجد کے ساتھ ایک حجرہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف میں سے ایک مصحف موجود ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں عرب قبائل کے لہجوں اور لغات میں فرق کو قرآن کریم کی تلاوت پر اثر انداز ہوتے دیکھا تو قریش کی لغت پر قرآن کریم کے چند نسخے اہتمام کے ساتھ لکھوا کر مختلف علاقوں کو بھجوا دیے اور یہ حکم دے دیا کہ قرآن کریم کی تلاوت آئندہ اس مصحف کے مطابق کی جائے۔ ان مصاحف میں سے ایک استنبول کے توپکاپی میوزیم میں ہے اور دوسرا تاشقند میں ہے، مگر اس روز حجرہ کا چابی بردار موجود نہیں تھا اس لیے ہم اس مصحف شریف کی زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے۔

شام کو ہم نے میدان استقلال دیکھا، اس میدان میں لینن کا مجسمہ ہوا کرتا تھا جو آزادی ملتے ہی ازبکستان کے مسلمانوں نے گرا دیا اور اس کے ساتھ ہی اس میدان کا نام "مستقل میدان" رکھ دیا گیا۔ چاروں طرف فوارے، درمیان میں خوبصورت سبزہ زار اور اردگرد بلند و بالا عمارتوں نے اس تفریح گاہ کو خاصا دلفریب بنا دیا ہے۔

۱۱ جنوری کو جمعہ کی نماز ہم نے مدرسہ قوقل تاش میں ادا کی۔ مدرسہ کے مین گیٹ سے باہر کھلے میدان میں نماز ادا کی گئی۔ الشیخ قابل محمد نے پہلے ازبک زبان میں خطاب کیا بلکہ ایک کتاب کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا پھر مختصر عربی خطبہ کے بعد نماز پڑھا دی۔ اجتماع بھرپور تھا۔ نماز جمعہ کے بعد تاشقند کے نواح میں نذر بیغ نامی ایک بستی میں عبد الرشید صاحب کے ہاں دعوت کا اہتمام تھا۔ پر تکلف دعوت تھی اور میزبان کا خلوص تھا کہ مہمانوں نے دسترخوان کا خوب حق ادا کیا۔

۱۲ جنوری ہفتہ کو سمرقند جانے کا پروگرام تھا، چونکہ مفتی محمد جمیل خان اور ڈاکٹر عبد الرزق سکندر صاحب قرآن کریم کے طباعت کے سلسلہ میں ماسکو بھی جانا چاہتے تھے۔ ٹریول ایجنٹ کے ذریعے متعلقہ حکام سے استفسار کیا گیا تو جواب ملا کہ الگ ویزے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تین دن سے کم مدت کے لیے ماسکو جانا چاہتے ہیں تو اسی ویزے پر جاسکتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ جب ماسکو جانے کے لیے الگ ویزے کی ضرورت نہیں تو سمرقند تو ازبکستان ہی کا ایک شہر ہے اس کے لیے بھی الگ ویزے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ چنانچہ ویگن کرایہ پر لی اور مدرسہ قوقل تاش کے ایک اور استاذ جناب عبد الغنی صاحب کی راہ نمائی میں سمرقند کی طرف روانہ ہوگئے۔ مگر غالبا ایک چوتھائی سفر طے کر چکے ہوں گے کہ دریائے جیحوں پار کرتے ہی پولیس چوکی پر ہمیں روک لیا گیا اور کہا گیا کہ آپ کے پاس صرف تاشقند کا ویزا ہے اس لیے آپ لوگ سمرقند نہیں جاسکتے۔ خاصی پریشانی ہوئی مگر کم وبیش دو گھنٹے کی ”بک بک جھک جھک“ کے بعد انہوں نے ہمیں دس ہزار روبل فی کس جرمانہ کیا اور سمرقند جانے کی اجازت دے دی۔ تاشقند سے سمرقند تین سو کلو میٹر کے لگ بھگ ہے اور سڑک اگرچہ یورپ کے معیار کی تو نہیں لیکن ہماری پاکستانی سڑکوں سے اچھی ہے۔

اس سفر سے اندازہ ہوا کہ وسطی ایشیا کی یہ ریاستیں کس قدر سرسبز و شاداب ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے زرعی فارم ہیں جہاں مرد اور عورتیں کھیت مزدور کے طور پر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں زمین ابھی تک سرکاری ملکیت میں ہے اور کاشتکار بطور مزدور کام کرتے ہیں، بہت تھوڑی زمین لوگوں کی انفرادی ملکیت میں ہے۔ سرکاری زمین اگر کوئی خریدنا چاہے تو اس کی سہولت موجود ہے لیکن آبادی کی غالب اکثریت میں یہ سکت ہی نہیں کہ وہ مالک زمین بن سکے۔ بمشکل دو وقت کا کھانا چلتا ہے اور سہولتوں کا تو یہاں کی عام آبادی تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ضروریات کا دائرہ بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے، پھیکے قہوے کے ساتھ سوکھی روٹی اور موسمی پھل عام آدمی کی خوراک ہیں۔ کھانے پینے میں زیادہ تکلف پلاؤ کا ہوتا ہے جو موٹے چاول سے بنتا ہے۔ ہمارے دوستوں نے جہاں جہاں پلاؤ کھایا اس کی بڑی تعریف کی مگر ہم گوجرانوالہ کے لوگوں کے لیے موٹے چاول کا پلاؤ جتنا مزیدار ہوسکتا ہے اتنا ہی تھا۔ بعض مقامات پر سالن بھی دیکھا۔ بند گوبھی، آلو اور گاجر کے ساتھ گوشت کی چند بوٹیاں پانی میں ابال کر نمک چھڑک لیں تو سالن تیار ہے، سوپ بھی

پئیں اور اس کے ساتھ روٹی بھی کھائیں۔ ازبکستان کی پیداوار میں زیادہ حصہ کپاس کا ہے جو یہاں کی خاص پیداوار کہلاتی ہے اور برآمد بھی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد آلو، گاجر اور گندم کی کاشت ہوتی ہے، البتہ پھل بے پناہ ہوتا ہے بالخصوص چیری، شہتوت، خوبانی اور انگور تو بے اندازہ ہوتے ہیں۔ سمرقند میں ہمارا قیام مدرسہ زود مراد میں تھا جس کے منتظم الشیخ مصطفی قل ہیں۔ یہ مدرسہ ایک قدیمی مسجد کے ساتھ ہے جو کچھ عرصہ قبل شیخ موصوف کی مساعی سے آزاد اور آباد ہوئی ہے، اس سے قبل یہ مقفل رہی ہے۔ البتہ صفائی اور مرمت کے دوران اس کی دیواروں پر ایسے اعلانات چسپاں دکھائی دیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس مسجد کے ہال میں انگلش فلمیں دکھائی جاتی رہی ہیں۔ بہرحال یہ مسجد آباد ہے اور دینی درسگاہ بھی شیخ مصطفی قل کی نگرانی میں روبہ ترقی ہے۔ سمرقند میں دینی رجحانات تاشقند کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور کہا جاتا ہے کہ جوں جوں آگے بڑھتے جائیں دینی رجحانات کا تناسب بڑھتا چلا جاتا ہے کیونکہ روسی تسلط زیادہ تر دارالحکومت اور بڑے شہروں تک رہا ہے اور دیہی علاقے نسبتاً کم متاثر ہوئے ہیں۔

ثمرقند تاریخی روایات کے مطابق ۴۵ھ میں حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں فتح ہو کر اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا تھا اور اسے جناب نبی اکرمؐ کے چچازاد بھائی حضرت قثم بن عباسؓ اور حضرت عثمانؓ کے فرزند حضرت سعید بن عثمانؓ کی آخری آرام گاہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ سمرقند میں حضرت امام ابو منصور ماتریدیؒ، امام ابواللیث سمرقندیؒ اور نقشبندی سلسلہ کے عظیم پیشوا خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے مزارات ہیں، جبکہ حضرت امام بخاریؒ کا مزار سمرقند سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جہاں ان کے نام پر ایک دینی درسگاہ بھی ہے۔ ان سب مزارات پر حاضری دی اور حسب توفیق قرآن خوانی کی سعادت حاصل ہوئی۔ صاحب ہدایہ امام برہان الدین مرغینانیؒ کے مزار پر حاضری کی خواہش بھی تھی مگر یہ معلوم کر کے بے حد دکھ ہوا کہ یہ مزار جس مکان میں تھا وہ کسی یہودی نے خریدا ہے اور مزار کا نشان غالباً ختم ہو گیا ہے۔ امام بخاریؒ کے مزار پر محدثین کی پرانی روایت کے مطابق مولانا مفتی نظام الدین شامزئی نے بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث پڑھی اور باقی حضرات نے سماع کا شرف حاصل کیا۔

سمرقند میں مدرسہ ریگستان بھی دیکھا۔ ریگستان علاقہ کا نام ہے جہاں تین قلعہ نما، پرشکوہ اور بلند و بالا عمارتیں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ یہ تینوں دینی مدارس تھے جو الغ بیگ، شیخ طلا

محمد اور شیر داد کے نام سے منسوب ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم دہلی کے شاہی قلعہ اور شاہی مسجد کے درمیان کھڑے ہیں۔ تینوں مدارس کمیونسٹ انقلاب کے دوران میوزیم بنے رہے اور ان کے درمیانی میدان میں اسٹیڈیم طرز کی نشستیں بنادی گئی تھیں جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہاں تھیٹر دکھایا جاتا رہا ہے۔

سمرقند سے ہم نے ۱۳ جون پیر کو تاشقند واپسی کی۔ مفتی محمد جمیل خان اپنے ساتھ قرآن کریم اور ازبکی زبان میں مترجم نماز کے علاوہ ٹوپیاں اور تسبیح بھی خاصی تعداد میں لائے تھے اور کلمہ طیبہ کا سکہ بھی تھا جس پر ازبکی زبان میں ترجمہ کے ساتھ کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے۔ جہاں بھی گئے ان کی تقسیم کا سلسلہ جاری رہا، بوڑھے افراد بالخصوص ازحد احترام اور عقیدت کے ساتھ انہیں سینے سے لگاتے اور بوسہ دیتے۔ قرآن کریم اور تسبیح کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ پون صدی کے بعد یہاں کے عام مسلمانوں کو قرآن کریم کی زیارت نصیب ہوئی ہے، اس کے اشتیاق اور عقیدت کا اندازہ آخر کیسے لگایا جاسکتا ہے۔ تاشقند واپس پہنچے تو نئے سرے سے ہوٹل کی بکنگ کا مرحلہ درپیش تھا۔ یوشلیک ہوٹل میں واپس جانا دوستوں کو پسند نہ تھا اس لیے تاشقند ہوٹل میں کمرے بک کرائے گئے، ہوٹل کا معیار تو یوشلیک سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا البتہ کمرے ذرا کھلے کھلے سے تھے اس لیے ایک حد تک تغیر کا احساس رہا۔

۱۵ جون پیر کو تاشقند میں استاذ ذاکر جان سے ملاقات ہوئی بلکہ انہوں نے شام کو پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ استاذ ذاکر جان مسجد مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کے امام وخطیب اور اس کے ساتھ مدرسہ کے منتظم ہیں، ان کے ساتھ ایک اچھی معلوماتی نشست رہی اور کم از کم میرے لیے تاشقند کے سفر میں مقصدیت کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔ میرے لیے یہ تعجب کی بات تھی کہ استاذ قابل محمد، استاذ مصطفی قل اور استاذ ذاکر جان عربی میں اچھی گفتگو کر رہے تھے جبکہ ان میں سے کسی نے ازبکستان سے باہر کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کمیونسٹ انقلاب کے دور میں خفیہ طور پر دینی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا ہے اور دینی شخصیات نے تعلیم وتربیت کا تسلسل کسی دور میں بھی ٹوٹنے نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جبکہ آزادی کے بعد پورے ازبکستان میں ایک ہزار کے قریب مساجد ومدارس دوبارہ آباد ہوچکے ہیں، ان کی آبادی کے لیے رجال کار اسی معاشرہ سے سامنے آئے ہیں۔ یہ رجال کار ان خفیہ مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں جو حجرہ مدرسہ کے

نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور ازبکستان کے طول و عرض میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود رہے ہیں۔ ان میں سے ایک مدرسہ کی زیارت ہم نے بھی کی جو دارالحکومت میں تھا، ایک صاحب دل بزرگ نے اپنے مکان کے عقبی نصف حصہ کو باغ کی شکل دے کر گھنے درختوں کے جھنڈ میں چار حجرے بنا رکھے تھے جن میں طلبہ قرآن کریم، فقہ اور عربی کی تعلیم اسی صاحب مکان سے حاصل کرتے تھے۔ اس طرح کے مدارس میں حفظ قرآن اور دینیات کا سلسلہ چلتا رہا۔ جبکہ جبر کا یہ عالم تھا کہ ایک دیندار شخص کے لیے اپنے گھر میں نماز پڑھنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک بزرگ نے ہمیں بتایا کہ ان کے والد دوپہر کے وقت کام سے وقفہ کر کے گھر آتے تو ظہر کی نماز اس کیفیت میں ادا کرتے تھے کہ چائے کی چینک ان کے سامنے پڑی رہتی اور میں دروازے پر پہرے کے لیے کھڑا ہوتا۔ نماز کے دوران ذرا سی آہٹ پر والد صاحب نماز توڑ کر چائے کا پیالہ اٹھا لیتے اور مجھ سے دروازے پر کوئی پوچھتا کہ تمہارے والد اندر کیا کر رہے ہیں تو میں قسم کھا کر بتاتا کہ وہ چائے پی رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو پیسے اور پھل دے کر یہ پوچھا جاتا کہ تمہارے والد گھر میں نماز تو نہیں پڑھتے؟ جن کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ وہ گھر میں نماز پڑھتے ہیں وہ ایسے غائب کر دیے جاتے کہ پھر ان کا کوئی سراغ نہ ملتا۔ سکولوں میں چھوٹے بچوں سے بڑی شفقت کے ساتھ پوچھا جاتا کہ سنا ہے کہ تم قرآن شریف بہت اچھا پڑھتے ہو، کوئی سورت تو سناؤ، وہ بچہ سورت سنا دیتا تو دوسرا سوال ہوتا کہ قرآن تم نے کس سے پڑھا ہے؟ بچہ استاذ کا نام بتا دیتا تو دوسرے دن استاذ غائب ہو جاتا۔ لیکن بچے بھی ہوشیار ہو گئے تھے، قرآن کریم کا کوئی حصہ فرمائش پر سنا دیتے اور استاذ کے بارے میں بتا دیتے کہ دادا سے یا تایا سے پڑھا ہے اور وہ فوت ہو گئے ہیں۔

وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کو سوویت یونین کے خاتمہ کے ساتھ جو آزادی ملی ہے اس کا عملی اثر سر دست یہی سامنے آیا ہے اور مساجد و مدارس کی آبادی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔ ورنہ عام معاشرتی اور قومی زندگی میں پہلے سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا اس لیے کہ ان ریاستوں میں حکومتیں ابھی تک وہی ہیں جو آزادی سے پہلے تھیں، انتظام بھی وہی ہے اور عام معاشرتی زندگی بھی اسی ڈگر پر ہے۔ شراب عام ہے، حلال و حرام کا کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا، عورتوں کا لباس یورپین ہے، بعض عورتیں شلوار اور سر پر رومال سے مزین نظر آتی ہیں جو ان کی مذہبیت کی علامت سمجھی جاتی ہے مگر اکثریت اس سے محروم ہے، پارکوں

میں اسی طرح جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومتے نظر آتے ہیں، زمین بدستور سرکاری ملکیت ہے، تجارت کے بڑے حصہ پر سرکاری کنٹرول ہے، عام آدمی کی معاشی حالت پہلے کی طرح ہے بلکہ روبل کی قیمت خوفناک حد تک کم ہوجانے کے باعث مہنگائی بڑھ گئی ہے، ایک صاحب نے بتایا کہ پہلے ایک روبل میں چھ روٹیاں ملتی تھیں اب وہی روٹی بیس روبل میں ایک ملتی ہے اور ایک ذمہ دار آدمی کے بقول عام آبادی کا بڑا حصہ دو وقت کی روٹی سے لاچار ہے۔

سیاسی صورت حال یہ ہے کہ تاجکستان میں رونما ہونے والے واقعات کے باعث ان ریاستوں کی حکومتیں چوکنا ہوگئی ہیں اور اپنے تحفظ کے لیے دوبارہ روس کی طرف دیکھنے لگی ہیں۔ روس کے ساتھ تعلقات کو مستحکم کیا جارہا ہے اور آزادی کا جو رسہ چند سال قبل ڈھیلا کر دیا گیا تھا اسے دھیرے دھیرے دوبارہ کسا جارہا ہے۔ مذہبی لوگوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے اور باہر سے آنے والے مذہبی افراد کو یہ حکومتیں اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگی ہی۔ تبلیغی جماعت کی نقل وحرکت پر پابندی لگا دی گئی ہے اور ان ریاستوں کی حکومتیں پاکستان کے بجائے بھارت کی نام نہاد سیکولر حکومت کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے میں عافیت محسوس کرنے لگی ہیں۔ ان حالات میں وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کی آزادی کا وہ خواب پریشان ہوتا دکھائی دیتا ہے جو وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات دوبارہ استوار ہونے کے حوالہ سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے دیکھا تھا۔

یہ بات تو بدیہی ہے کہ وسطی ایشیا کی یہ آزادی جہاد افغانستان کی رہین محنت ہے لیکن یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ روس نے اس خطہ میں آزادی کے نام پر وہی کھیل کھیلا ہے جو اس سے قبل برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ اپنے زیر تسلط مسلم ممالک کو آزادی دیتے وقت کھیل چکے ہیں کہ ان ممالک پر آزادی کا لیبل لگ جائے لیکن ان کا نظام اور حکمران طبقے وہی رہیں جو استعماری قبضہ کے دوران تھے۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران آزاد ہونے والے مسلم ممالک پر نظر ڈال لیں آپ کو یہی صورت حال نظر آئے گی۔ ان ممالک میں نہ نظام بدلا ہے، نہ معاشرتی زندگی میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ حکمران طبقے تبدیل ہوئے ہیں۔ اور یہ مسلم ممالک انقلاب کے ایک ایسے عجیب وغریب تصور سے روشناس ہوئے ہیں کہ قومی اور معاشرتی زندگی میں کوئی عملی تبدیلی آئے بغیر ان پر آزادی اور انقلاب کا خوشنما لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے۔ خدا جانے کہ ایسے موقع پر میرے ذہن میں ”شراب کی بوتل پر زمزم کا لیبل“

کا محاورہ بار بار کیوں گردش کر رہا ہے؟ شاید اس لیے کہ ابھی تک اس کے علاوہ کسی اور عملی تبدیلی کا ادراک نہیں کر پایا۔ بہر حال وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کی آزادی بھی اس عمل کا تسلسل ہے جس سے اکثر مسلم ممالک گزشتہ نصف صدی کے دوران دوچار ہو چکے ہیں اور یہ بات دن بدن اور زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے کہ افغانستان کے مسئلہ پر جنیوا مذاکرات کے دوران روس اور امریکہ کے درمیان اس بات پر خفیہ مفاہمت ہو گئی تھی کہ اگر وسطی ایشیا کے معاملات کو کابل میں اسلامی نظریاتی حکومت کے قیام واستحکام کے بعد تک مؤخر کر دیا گیا تو وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں میں آزادی کا عمل مذہبی اور نظریاتی حوالوں سے منظم ہو گا جو امریکہ اور روس دونوں کے لیے خطرناک ہو گا۔ اس لیے کابل پر مجاہدین کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہی وسطی ایشیا کے مسلم ممالک کے عوام کو آزادی کا ”لولی پاپ“ دے دیا جائے تاکہ سیکولر نظام اور سیکولر حکومتوں کا تسلسل قائم رہ سکے۔

الغرض ان مشاہدات و محسوسات اور جذبات و تاثرات کے ساتھ ۱۵ جون کو لندن روانگی کے لیے تاشقند ایئر پورٹ پر پہنچا تو ایئر پورٹ کے سابقہ تجربات کا تسلسل دوبارہ قائم ہو گیا۔ میں نے پندرہ جون کی سیٹ کراچی سے کنفرم کرائی تھی اور تاشقند پہنچ کر ری کنفرم کی مہر بھی لگوائی تھی مگر ایک لمبی قطار میں کم وبیش ڈیڑھ گھنٹہ تک رینگتے ہوئے کاؤنٹر پر پہنچا تو یہ کہہ کر مجھے قطار سے الگ کر دیا گیا کہ آپ کی سیٹ کنفرم نہیں ہے۔ میں نے بہت شور مچایا کہ کنفرمیشن اور ری کنفرمیشن کی دونوں مہریں لگی ہوئی ہیں لیکن جواب ملا کہ ہمارے پاس کنفرم سیٹوں کی جو فہرست ہے اس میں آپ کا نام نہیں ہے اس لیے آپ چانس پر ہیں۔ غصہ کے تلخ گھونٹ پی جانے کے سوا کیا چارہ تھا؟ تھوڑے سے انتظار کے بعد چانس پر سیٹ تو مل گئی مگر ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ سامان تولتے وقت کاؤنٹر کے عملہ نے میرا دستی بیگ بھی ترازو پر رکھ لیا۔ میرے پاس سفر میں عام طور پر ایک بیگ یا زیادہ سے زیادہ دو ہوتے ہیں۔ اس دفعہ میرے پاس کچھ لٹریچر تھا جو میں نے تول کر بائیس کلو گرام تک کا بیگ بنا رکھا تھا اور میرا ذاتی سامان ہاتھ کے بیگ میں تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ بیگ میرے ہاتھ میں رہے گا، جواب ملا کہ بے شک ہاتھ میں رکھیں مگر وزن ان کا بھی ہو گا۔ چنانچہ دونوں کو ملا کر وزن ۳۳ کلو گرام بن گیا اور مجھے چار و ناچار گیارہ کلوگرام وزن کا کرایہ بلاوجہ ادا کرنا پڑا اور دس ڈالر ایئر پورٹ ٹیکس اس پر مستزاد تھا۔ بہر حال ان مراحل سے گزر کر جہاز پر سوار ہوا تو چانس پر ہونے کی وجہ سے آخر میں جانے کے باعث سیٹ کی تلاش مشکل ہو گئی۔

ازبک ایئرلائن کے بورڈنگ کارڈ پر سیٹ کا نمبر نہیں ہوتا۔ رش میں سیٹ تلاش کرتے ہوئے جہاز کے آخری حصے میں پہنچا تو دو باریش حضرات کے درمیان ایک سیٹ خالی تھی، انہوں نے تیسرا باریش دیکھ کر بیک وقت آواز دی کہ یہاں آجائیں اور میں ان کے درمیان بیٹھ گیا۔ ان میں تو ایک سردار صاحب تھے جو جالندھر سے آرہے تھے اور دوسرے باریش نوجوان کا تعارف ہوا تو حسن اتفاق پر بارگاہ ایزدی میں تشکر بجالایا کہ یہ صاحب مولانا محمد اکرم ندوی تھے جو ندوۃ العلماء لکھنو سے تعلق رکھتے ہیں اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی زیرنگرانی اسلامک سنٹر میں خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ ان سے مختلف دینی، علمی اور معاشرتی مسائل پر مفید گفتگو ہوتی رہی اور حضرت مولانا علی میاں کی صحت وعافیت اور بھارتی مسلمانوں کے تازہ ترین حالات سے آگاہی ہوئی۔ تقریباً سات گھنٹے کی پرواز کے بعد لندن کے وقت کے مطابق شام سوا سات بجے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترے تو پھر وہی ڈاڑھی کا مسئلہ سامنے آگیا اور امیگریشن کے کاؤنٹر پر میرا پاسپورٹ چیک کر کے یہ کہہ کر روک لیا گیا کہ گزشتہ سال آپ نے انٹری کی پوری مدت چھ ماہ برطانیہ میں کیوں گزاری ہے؟ میرا موقف یہ تھا کہ جب آپ نے چھ ماہ کی انٹری دی تھی تو چھ ماہ سے دو دن کم یہاں رہنے پر اعتراض کیوں ہے؟ میں اس اعتراض کا جواز سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک طرف تین سردار صاحبان بھی دوسرے کاؤنٹر پر میری طرح بیٹھے نظر آئے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے جیسے بات دونوں کی سمجھ میں آگئی ہو کہ اصل مسئلہ ڈاڑھی کا ہی ہے۔ بہرحال دو گھنٹے کے اتار چڑھاؤ کے بعد مجھے لندن میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

اسلامی نظام، انسانی حقوق اور قادیانیت

(مرکزی جامع مسجد، گلاسکو، برطانیہ - ۲۴ جولائی ۱۹۹۳ء)

(۲۴ جولائی ۱۹۹۳ء کو مرکزی جامع مسجد گلاسکو اور ۱۶ اگست ۱۹۹۳ء کو مرکزی جامع مسجد برمنگھم (برطانیہ) میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیراہتمام منعقدہ اجتماعات سے خطاب۔)

بعد الحمد والصلوۃ۔ حضرت الامیر! قابل احترام علماء کرام، بزرگو، دوستو اور ساتھیو! ایک دور تھا جب مرزا غلام احمد قادیانی کی امت کا ہیڈ کوارٹر قادیان میں تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب

قادیانیت کے خلاف کوئی بات کہنا برطانوی حکومت کے غیظ و غضب کو دعوت دینا تھا۔ تب مجلس احرار اسلام کے شعبہ تبلیغ نے قادیان میں کانفرنس کا اہتمام کیا جہاں قادیانی امت اپنا سالانہ اجتماع منعقد کیا کرتی تھی اور اسے مبینہ طور پر معاذ اللہ حج کی طرح مقدس اجتماع کی حیثیت دی جاتی تھی۔ اس دور میں قادیان میں مسلمانوں کا اجتماع منعقد کرنے میں احرار کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال اس دور میں یہ روایت قائم ہوگئی کہ قادیانی گروہ کے سالانہ اجتماع کے ساتھ مسلمان بھی اپنا اجتماع قادیان میں منعقد کرنے لگے۔ پھر قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں کا سالانہ اجتماع ربوہ میں منتقل ہوا تو مجلس تحفظ ختم نبوت نے ربوہ سے چند میل کے فاصلہ پر چنیوٹ میں سالانہ ختم نبوت کانفرنس کے انعقاد کا سلسلہ شروع کر دیا، پھر جب ۱۹۸۴ء میں قادیانی امت کے سربراہ مرزا طاہر احمد نے امتناع قادیانیت کے صدارتی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ربوہ کو چھوڑ کر اپنا ہیڈکوارٹر لندن میں منتقل کر لیا اور سالانہ اجتماع بھی لندن میں منعقد ہونے لگا تو ۱۹۸۵ء سے سالانہ ختم نبوت کانفرنس بھی برطانیہ میں منتقل ہوگئی۔ پہلے چند سال لندن کے ویمبلے کانفرنس سنٹر میں ختم نبوت کانفرنس کا انعقاد ہوتا رہا، پھر برطانیہ کے مسلمانوں کے اصرار پر مختلف شہروں میں اس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

حضرات محترم! مجھ سے پہلے فاضل مقررین نے عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت اور اس کے تقاضوں پر مفید اور معلوماتی گفتگو کی ہے، لیکن میں اس روایتی انداز سے کچھ ہٹ کر اس سلسلہ میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور ان سوالات و اشکالات کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا خواہش مند ہوں جو مغربی میڈیا اور قادیانیت کی سرپرست لابیاں قادیانیت کے حوالہ سے اسلام، پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل ابھار رہی ہیں، آپ حضرات چونکہ ویسٹرن میڈیا کی براہ راست زد میں ہیں، اس لیے آپ دوستوں کے سامنے ان امور کا تجزیہ انتہائی ضروری ہے۔ لہذا میری گزارشات چار امور کے بارے میں ہوں گی:

1. سب سے پہلے اس سوال کا جائزہ لوں گا کہ جب مسلمان اسے کہتے ہیں جو قرآن کریم اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو، اور قادیانی ان دونوں پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں تو آپ لوگوں کے پاس انہیں غیر مسلم کہنے کا آخر کیا جواز ہے؟

2. دوسرے نمبر پر میں یہ واضح کروں گا کہ قادیانیوں کے ساتھ ہمارا اصل جھگڑا کیا ہے؟

3. تیسرے نمبر پر اس سوال پر اظہار خیال کروں گا کہ جب آپ لوگ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے چکے اور ایک آرڈیننس کے ذریعے ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگا چکے تو اب ان کے پیچھے لٹھ لیے کیوں پھر رہے ہیں، اور انہیں ان انسانی اور شہری حقوق سے کیوں محروم رکھے ہوئے ہیں جو ملک کے شہری کی حیثیت سے انہیں حاصل ہونے چاہئیں؟

4. اور آخر میں تحریک ختم نبوت کی تازہ ترین صورتحال سے آپ حضرات کو آگاہ کرنا چاہوں گا کہ قادیانیت کے خلاف جس تحریک کا آغاز حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ، حضرت سید انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے کیا تھا، وہ آج کس مرحلہ میں ہے اور حضرت مولانا خان محمد صاحب کی زیر قیادت کون سے مورچوں پر صف آرا ہے۔

محترم بزرگو اور دوستو! قادیانیوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے اور آج کی نئ مسلمان نسل کے لیے یہ سوال بظاہر خاصا پیچیدہ ہے کہ قادیانی گروہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اظہار کرتا ہے اور قرآن کریم کو بھی ماننے کا دعویدار ہے تو پھر وہ غیر مسلم کیوں ہے؟ جواب میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف قرآن کریم اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مان لینا کافی نہیں ہے۔ اور دلیل میں دو واقعات پیش کرنا چاہوں گا جو خود جناب نبی اکرمؐ کے دور میں پیش آئے اور جن میں صرف رسول اللہ کی رسالت کا اقرار کافی نہیں سمجھا گیا۔

ایک واقعہ حافظ ابن البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں نقل کیا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کے ایک نوجوان صحابی حضرت حبیب بن زید انصاریؓ کو مسیلمہ کذاب کے کچھ ساتھی پکڑ کر لے گئے۔ مسیلمہ یمامہ کے علاقہ میں بنو حنیفہ کا سردار تھا اور اس نے نبوت کا دعوی کر رکھا تھا۔ اس کا نام مسیلمہ تھا، کذاب کا خطاب اسے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ حبیب بن زیدؓ کو مسیلمہ کے دربار میں پیش کیا گیا، مسیلمہ نے ان سے سوال کیا کہ تم حضرت محمدؐ کو اللہ تعالی کا رسول مانتے ہو؟ جواب دیا: ہاں مانتا ہوں۔ دوسرا سوال کیا کہ کیا تم مجھے اللہ تعالی کا رسول مانتے ہو؟ جواب میں اس نوجوان صحابی نے جو جملہ کہا، وہ ایمان و

استقامت اور عشق و محبت کا کمال اظہار ہے۔ ارشاد فرمایا: ’’ان فی اذنی صمما عن سماع ما تقول‘‘۔ اس جملہ میں جو زور اور وزن ہے، ترجمہ میں شاید اس کا دسواں حصہ بھی ادا نہ کر سکوں مگر اس محاورہ کا ترجمہ یہ ہے کہ ’’میرے کان تمہاری یہ بات سننے سے انکار کرتے ہیں‘‘۔ روایات میں ہے کہ مسیلمہ نے اس عاشق رسول نوجوان صحابی کا ایک بازو کاٹنے کا حکم دیا جو کاٹ دیا گیا۔ پھر مسیلمہ نے اپنا سوال دہرایا، مگر جواب وہی ملا۔ پھر دوسرا بازو کاٹا گیا، مگر سوال دہرانے پر جواب حسب سابق تھا۔ حتی کہ حضرت حبیب بن زیدؓ کے جسم مبارک کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں شہید کر دیا گیا، مگر ختم نبوت کے اس سب سے پہلے شہید نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بعد کسی اور کے لیے رسالت و نبوت کا جملہ سننے کے لیے اپنے کانوں کو آمادہ نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ امام حاکمؒ نے ’’المستدرک‘‘ میں بیان کیا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کی طرف سے دو قاصد آئے۔ انہوں نے مسیلمہ کا خط پیش کیا جس کا عنوان تھا: ’’محمد رسول اللہ کے نام مسیلمہ رسول اللہ (معاذ اللہ) کی طرف سے‘‘، اور خط میں یہ کہا گیا تھا کہ ’’آپ اپنے بعد مجھے اپنا جانشین نامزد کر دیں یا شہروں کی نبوت اپنے پاس رکھیں اور دیہات کی نبوت میرے حوالہ کر دیں، پھر میرا اور آپ کا کوئی جھگڑا نہیں ہے‘‘۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خط کا جواب تو یہ دیا کہ میں مسیلمہ کو ایک تنکا دینے کا روادار نہیں ہوں۔ زمین خدا کی ہے، وہ جسے چاہے اس کا وارث بنا دے۔ البتہ مسیلمہ کے قاصدوں سے پوچھا کہ کیا تم مجھے اللہ تعالی کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ پھر پوچھا کہ مسیلمہ کو بھی رسول مانتے ہو؟ انہوں نے جواب ہاں میں دیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر قاصدوں کا قتل سفارتی آداب کے منافی نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔ یہاں ضمناً ایک بات اور بھی عرض کرتا جاؤں کہ آنحضرتؐ نے تو سفارتی آداب کا لحاظ رکھا اور صاف طور پر فرما دیا کہ سفارتی آداب کی وجہ سے تمہاری جان بخشی ہو گئی ہے، ورنہ میرے پاس تمہارے لیے قتل کے سوا کوئی سزا نہ تھی، جبکہ مسیلمہ کذاب نے سفارتی آداب کو پامال کر دیا اور جب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جنگ سے پہلے قاصد مسیلمہ کے پاس بھیجا تو مسیلمہ نے اسے شہید کرا دیا۔

میں نے دو واقعات آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ دونوں دور رسالت کے ہیں اور دونوں میں مسیلمہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار کے بعد

ثانوی حیثیت سے اپنی رسالت کی بات کر رہا ہے، لیکن اس کی بات قبول نہیں کی گئی، حتیٰ کہ ایک نوجوان صحابیؓ نے اس تصور کو رد کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف حضرت محمدؐ کی رسالت کا اقرار کافی نہیں بلکہ آپ کو آخری نبی ماننا اور آپ کے بعد کسی بھی شخص کے لیے رسالت و نبوت کے تصور کو رد کرنا بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ قادیانیوں کے ساتھ ہمارا اصل جھگڑا کیا ہے؟ اصل واقعہ یہ ہے کہ قادیانیوں نے نئی نبوت اور نئی وحی کے ساتھ اپنے لیے ایک نئے مذہب کا انتخاب کیا ہے اور مسلمانوں سے اپنا مذہب الگ کر لیا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ہمارا نام اور ہماری اصطلاحات اور شعائر استعمال کر کے دنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اسلام کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ان کے ساتھ جھگڑا یہ ہے کہ قادیانی مذہب، اسلام سے الگ ایک مذہب ہے لیکن نام ہمارا استعمال کرتا ہے، ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔

حضرات محترم! ایک مسلمہ اصول کے حوالے سے مسئلہ کا جائزہ لیجیے۔ مذاہب کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ نبی کے بدلنے سے مذہب بدل جاتا ہے۔ جب کوئی قوم نئے نبی اور اس کے ساتھ نئی شریعت پر ایمان لائے گی، اس کا مذہب پہلے سے چلے آنے والے مذہب سے الگ ہو جائے گا۔ آپ کے ہاں برطانیہ میں یہودی بھی رہتے ہیں، عیسائی بھی رہتے ہیں۔ یہودی حضرت موسیٰ کو مانتے ہیں اور تورات پر ایمان رکھتے ہیں۔ عیسائی بھی حضرت موسیٰ کو مانتے ہیں اور تورات پر ایمان رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور تورات پر دونوں کا ایمان ہے لیکن چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ اور انجیل پر بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں یہودی تسلیم نہیں کرتے، اس لیے عیسائیوں کا مذہب یہودیوں سے الگ ہو گیا، اور دونوں قومیں الگ الگ مذاہب کے پیروکار کی حیثیت سے دنیا میں آباد ہیں۔ اب اگر کوئی عیسائی حضرت عیسیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے یہودی کہلائے گا، یا اپنا تعارف یہودیت کے حوالے سے کرائے گا، یا یہودیوں کے مخصوص مذہبی شعائر اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے استعمال کرے گا، تو جھگڑا پیدا ہو گا اور دنیا کا کوئی یہودی کسی عیسائی کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ وہ خود کو یہودی کہلائے اور عیسائی مذہب کے پرچار کے لیے یہودیوں کے مذہبی شعائر و علامات کا استعمال کرے۔

اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ جب مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعوی کیا، اپنے لیے رسول اللہ کا لقب اختیار کیا، اسلام کے احکام کو منسوخ کرنے کا دعوی کیا، نئی وحی اور نئے احکام کی بات کی، تو اس کے ماننے والے، مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار بن گئے اور اس گروہ کا مذہب مسلمانوں کے مذہب سے الگ ہو گیا۔ اور یہ بات تو قادیانی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کے مذہب سے مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کا مذہب الگ ہے۔ اس لیے ایک سادہ سی بات ہے کہ جب دونوں الگ الگ مذہب کے پیروکار ہیں تو دونوں کا نام بھی الگ الگ ہونا چاہیے اور قادیانیوں کو اپنے لیے اسلام اور مسلمانوں سے الگ کوئی اور نام اختیار کرنا چاہیے۔

حضرات محترم! اس حقیقت کو قادیانی گروہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کا مذہب الگ الگ ہے اور تاریخ کے ریکارڈ میں اس کی متعدّد دستاویزی شہادتیں موجود ہیں جن میں سے بعض کا میں اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

جب پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم ہو رہی تھی تو پنجاب کی تقسیم کے لیے ریڈکلف کمیشن بیٹھا تھا۔ پنجاب کو اس بنیاد پر تقسیم کیا جا رہا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان میں شامل ہوں گے، اور جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں وہ بھارت کا حصہ ہوں گے۔ گورداسپور کا علاقہ جہاں قادیان واقع ہے، اس علاقے کی صورتحال یہ تھی کہ اگر قادیانی آبادی خود کو مسلمانوں میں شامل کراتی ہے تو یہ خطہ زمین پاکستان کے حصہ میں آتا ہے، اور اگر قادیانی گروہ مسلمانوں سے الگ شمار ہوتا ہے تو گورداسپور کا یہ علاقہ بھارت کے پاس چلا جاتا ہے۔ اس وقت قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے، جو مرزا غلام احمد قادیانی کا فرزند اور مرزا طاہر احمد کا باپ تھا، اپنا کیس مسلمانوں سے الگ پیش کر کے یہ فیصلہ تاریخ میں ریکارڈ کرا دیا کہ قادیانی خود کو مسلمانوں سے الگ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ چودھری ظفر اللہ خان نے مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت پر قادیانیوں کی فائل مسلمانوں سے الگ ریڈکلف کمیشن کے سامنے پیش کی جس کی بنیاد پر گورداسپور غیر مسلم اکثریت کا علاقہ قرار پایا اور بھارت کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی کے نتیجے میں بھارت کو کشمیر کے لیے راستہ ملا اور اس نے کشمیر پر قبضہ کر لیا اور آج بھی لاکھوں کشمیری عوام بھارتی تسلط اور وحشت و درندگی کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کا جنازہ تھا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جنازہ پڑھا رہے تھے۔ ملک بھر کے سرکردہ حضرات اور غیر ملکی سفراء جنازہ میں شریک تھے۔ حکومت پاکستان کا قادیانی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان بھی موجود تھا لیکن جنازہ میں شریک نہیں ہوا اور غیر مسلم سفیروں کے ساتھ الگ بیٹھا رہا۔ یہ بات قومی پریس کے ریکارڈ میں ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان سے پوچھا گیا کہ آپ وزیر خارجہ ہیں، آپ کا گورنر جنرل فوت ہوا ہے، آپ کے ملک کا بانی اور سرپرست فوت ہوا ہے، آپ جنازہ کے وقت موجود ہیں لیکن جنازہ میں شریک نہیں ہوئے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس پر ظفر اللہ خان نے کہا کہ: ”مجھے کافر حکومت کا مسلمان وزیر خارجہ سمجھ لیا جائے یا مسلمان حکومت کا کافر وزیر خارجہ“۔ اس طرح چودھری ظفر اللہ خان نے بھی تاریخ میں اپنی شہادت ریکارڈ کروائی کہ مسلمانوں کا مذہب الگ ہے اور قادیانی ان سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار ہیں۔

۱۹۷۴ء میں جب پاکستان کی قومی اسمبلی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی آئینی ترمیم پر بحث کر رہی تھی تو اسمبلی نے یکطرفہ فیصلہ کرنے کے بجائے قادیانیوں کے دونوں گروہوں کو اسمبلی کے سامنے اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دیا۔ قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد نے گیارہ روز تک اور لاہوری گروپ کے سربراہ مولوی صدر الدین نے دو روز تک اسمبلی کے سامنے اپنے موقف کی وضاحت کی اور ان کا موقف پوری طرح سننے کے بعد اسمبلی نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔ اس موقع پر مرزا ناصر احمد سے پوچھا گیا کہ وہ دنیا بھر کے ایک ارب کے لگ بھگ ان مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے؟ مرزا ناصر احمد نے پہلے اس سوال کو گول کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر پارلیمنٹ کے فلور پر انہیں اپنے اس عقیدہ کا دوٹوک اظہار کرنا پڑا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہ لانے والے دنیا بھر کے ایک ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح مرزا طاہر احمد کے بڑے بھائی مرزا ناصر احمد نے بھی تاریخ کی عدالت میں اپنی یہ شہادت ریکارڈ کرا دی کہ وہ قادیانیت کو مسلمانوں سے الگ مذہب قرار دیتے ہیں۔

حضرات محترم! جب یہ بات طے شدہ ہے کہ قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں سے الگ ہے اور دونوں ایک مذہب کے پیروکار نہیں ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ”اسلام“ کا نام ان میں سے ایک ہی فریق استعمال کرے گا، دونوں استعمال نہیں کر سکتے۔ اسلام کا نام اور اس کے

شعائر و اصطلاحات مثلاً کلمہ طیبہ، مسجد، امیر المومنین، ام المومنین، خلیفہ اور صحابی جو اسلام کے ساتھ مخصوص ہیں اور مسلمانوں کی پہچان بن چکے ہیں، انہیں استعمال کرنے کا حق ایک امت کو ہو گا۔ آپ حضرات خانہ خدا میں بیٹھے ہیں، آپ ہی انصاف سے کہیں کہ کیا دونوں گروہوں کو اسلام کا نام، اسلام کا لیبل اور اس کا ٹریڈ مارک استعمال کرنے کا حق ہے؟ اگر نہیں اور انصاف کا تقاضا ہے کہ نہیں، تو پھر انصاف کے ساتھ فیصلہ یہ بھی کیجیے کہ یہ حق دونوں میں سے کس فریق کا ہے؟ اس کا جو چودہ سو سال سے اس نام اور اصطلاحات کو استعمال کر رہا ہے یا اس کا جو ایک سو سال سے اس کا دعویدار ہے؟

اصل بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک عام کاروباری بات ہے، عام سی مثال ہے، اس حوالہ سے بات عرض کرتا ہوں۔ ایک کمپنی ہے جو سو سال سے کام کر رہی ہے۔ اس کا نام ہے، ایک لیبل ہے، ایک ٹریڈ مارک ہے۔ وہ اسی نام، لیبل اور ٹریڈ مارک کے ساتھ مارکیٹ میں متعارف ہے۔ اس کی ساکھ ہے، اسی حوالہ سے اس کا اعتبار قائم ہے۔ اب کچھ لوگ اس سے الگ ہو کر ایک نئی کمپنی بناتے ہیں۔ ایمان کے ساتھ بتائیے کہ کیا اس نئی کمپنی کو پہلی کمپنی کا نام، ٹریڈ مارک اور لیبل استعمال کرنے کا حق حاصل ہے؟ اگر نہیں اور اس کے باوجود نئی کمپنی اپنا مال مارکیٹ میں لانے کے لیے پہلی کمپنی کا نام استعمال کرتی ہے، اس کا ٹریڈ مارک اور لیبل استعمال کرتی ہے، تو انصاف کی زبان اسے کیا کہتی ہے؟ قانون اسے کیا کہتا ہے؟ میں ان مغربی لابسٹوں سے جو ہمارے خلاف زور و شور سے پراپیگنڈا کرتے ہیں، پوچھتا ہوں کہ انصاف کا تقاضا کیا ہے؟ قانون کا تقاضا کیا ہے؟ دانش کا تقاضا کیا ہے؟ خدا کے لیے ہمارے موقف بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔

نبوت کا دعوی بہاء اللہ نے بھی کیا تھا، اس کے ماننے والے بہائی بھی ہم سے الگ مذہب رکھتے ہیں۔ ہم انہیں کافر کہتے ہیں، لیکن ہمارا ان سے قادیانیوں کی طرز کا کوئی تنازعہ نہیں ہے، کشمکش کی کوئی فضا نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اسلام کا نام استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنا نام اور اصطلاحات الگ کر لی ہیں۔ وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر لوگوں کو دھوکہ نہیں دیتے، اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہتے۔ ہم انہیں کافر کہتے ہیں لیکن ہمارا ان سے جھگڑا کوئی نہیں ہے۔ قادیانیوں کے ساتھ تنازعہ یہ ہے کہ مذہب نیا ہے، کمپنی نئی ہے، لیکن نام ہمارا استعمال کرتے ہیں، لیبل اور ٹریڈ مارک ہمارا استعمال کرتے ہیں۔ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ دھوکہ ہے، فراڈ ہے، اور کھلا فریب ہے۔ ہم دنیا بھر کے قانون دانوں کو دہائی

دیتے ہیں کہ خدا کے لیے ہمارے خلاف پراپیگنڈا کرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لو کہ اصل قصہ کیا ہے اور تنازعہ کس بات پر ہے؟

محترم بزرگو اور دوستو! اب آئیے تیسرے سوال کی طرف کہ جب پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا ہے، ان کی سرگرمیوں کے سدباب کے لیے آرڈیننس بھی نافذ العمل ہو چکا ہے تو اب ان کے ساتھ جھگڑا کیا ہے اور انہیں انسانی اور شہری حقوق سے کیوں محروم رکھا گیا ہے؟ اس کے جواب میں پہلے آپ حضرات کو قادیانیوں کی اس تگ ودو سے آگاہ کرنا چاہوں گا جو انہوں نے اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اسے مغربی ممالک کے سامنے انسانی حقوق کی پامالی کے مسئلہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے کی ہے، تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ قادیانی گروہ کے کام کا انداز کیا ہے اور اس کا طریقہ واردات کیا ہے۔

۱۹۸۴ء میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں کی سرگرمیوں پر بعض پابندیاں عائد کر دیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ قادیانی غیر مسلم اقلیت قرار دیے جا چکے ہیں، اس لیے وہ اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتے، خود کو مسلمان نہیں کہلوا سکتے، اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہہ سکتے اور مسلمانوں کے مخصوص مذہبی شعائر اور علامات کو استعمال نہیں کر سکتے۔ آرڈیننس میں ایسا کرنے کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ صدارتی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد مرزا طاہر احمد لندن میں آ کر بیٹھ گیا اور مغربی لابیوں کو اپروچ کر کے یہ دہائی دی کہ پاکستان میں امتناع قادیانیت کے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں کے انسانی حقوق چھین لیے گئے ہیں، ان کے ہیومن رائٹس پامال کر دیے گئے ہیں، انہیں عبادت کے حق سے روک دیا گیا ہے، اور ان کے اپنے مذہب پر عمل کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ویسٹرن میڈیا بھی اس مہم میں شریک ہو گیا۔ اسے تو انتظار رہتا ہے کہ اسلام اور پاکستان کے خلاف کوئی بات کہنے کو ملے وہ تو بہانہ تلاش کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف کسی بات پر شور اٹھا سکیں۔

پھر بات یہیں تک نہیں رہی بلکہ جنیوا میں انسانی حقوق کے کمیشن کو اپروچ کیا گیا۔ یہ کمیشن اقوام متحدہ کے تحت قائم ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک پر نظر رکھتا ہے اور جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، اس کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر مغربی حکومتیں اپنی پالیسیاں مرتب کرتی ہیں۔ قادیانیوں کی طرف سے اس کمیشن کے پاس درخواست دائر کی گئی کہ پاکستان میں ان کے شہری حقوق پامال کیے جا رہے ہے

ہیں لیکن اس درخواست سے پہلے ایک اور بات کا اہتمام ہو چکا تھا کہ جنیوا میں پاکستان کی سفارت اور نمائندگی مسٹر منصور احمد سنبھال چکا تھا جو معروف قادیانی ڈپلومیٹ ہے، پاکستان کا سینئر سفارت کار ہے اور اس وقت جاپان میں پاکستان کا سفیر ہے۔ اب راستہ صاف تھا۔ درخواست قادیانیوں کی طرف سے تھی اور کمیشن کے سامنے پاکستان کی نمائندگی اور حکومت پاکستان کے موقف کی وضاحت کی ذمہ داری ایک قادیانی سفارت کار پر تھی۔ نتیجہ وہی ہونا تھا جو ہوا اور جنیوا کے انسانی حقوق کمیشن نے اس مضمون کی قرارداد منظور کر لی کہ پاکستان میں واقعتا قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال کر دیے گئے ہیں اور حکومت پاکستان اس کی ذمہ دار ہے۔

بات اور آگے بڑھی اور قادیانی گروہ اس قرارداد کو لے کر واشنگٹن پہنچا جہاں پریسلر رہتا ہے، جہاں سولارز رہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں ان کو؟ اور پاکستان کا کون سا باشعور شہری ہے جو پریسلر اور سولارز کو نہیں جانتا۔ وہاں لابنگ ہوئی، اس وقت امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی پاکستان کی اقتصادی اور فوجی امداد کی بحالی کے لیے شرائط طے کر رہی تھی۔ جنیوا کے انسانی حقوق کے کمیشن کی یہ قرارداد اس کے سامنے پیش ہوئی اور امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کے لیے امداد کی شرائط والی قرارداد میں قادیانیت کا مسئلہ بھی شامل کر لیا۔ یہ ہے مرزا طاہر احمد کی مہم اور یہ ہے اس کا طریق واردات جسے آپ کے علم میں لانا میں ضروری سمجھا۔

امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کی امداد کے لیے جن شرائط کو اپنی قرارداد میں شامل کیا، ان کا خلاصہ روزنامہ جنگ لاہور نے ۵ مئی ۱۹۸۷ء کو اور روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۲۵ اپریل ۱۹۸۷ء کو شائع کیا ہے۔ یہ میرے پاس موجود ہے اور آپ حضرات میں سے اکثر نہیں جانتے کہ ان شرائط میں کون کون سی باتیں شامل ہیں۔ عام طور پر صرف ایٹمی تنصیبات کے معائنہ کی شرط کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ بنیادی شرط ہے اور ہم اس مسئلہ پر پاکستانی حکومت اور قوم کے موقف کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں بلکہ ہم تو اس سے بھی آگے کی بات کہتے ہیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ایٹم بم پاکستان اور دیگر مسلم ملکوں کا حق ہے اور اس سلسلہ میں معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ خیر، امریکی شرائط میں صرف ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ نہیں، اور امور بھی ہیں جن میں سے دو کا بطور خاص آپ کے سامنے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کی اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی امداد کے لیے ضروری ہوگا کہ امریکی صدر ہر سال ایک سرٹیفکیٹ جاری کرے جس میں یہ درج ہوگا کہ ”حکومت پاکستان نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالہ میں نمایاں ترقی کی ہے“۔ یہ کتنا خوبصورت جملہ ہے لیکن ”کلمۃ حق ارید بھا الباطل“۔ اس کے اندر جو زہر چھپا ہوا ہے، آپ حضرات نہیں جانتے۔ آپ کہیں تو عرض کردوں کہ اس شوگر کے پردے میں کون سا زہر ہے؟ اس شرط میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو روکنے کی بات کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان مغربی ملکوں کے ہاں انسانی حقوق کا تصور کیا ہے اور یہ کس چیز کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے دیکھنا پڑے گا کہ پاکستان میں مغربی میڈیا کے ”بوسٹر“ کیا کہتے ہیں؟ مغربی میڈیا کے بوسٹر ہر جگہ موجود ہیں، پاکستان میں بھی ہیں۔ امریکی سینٹ کی اس قرارداد کے بعد پاکستان میں انسانی حقوق کمیشن قائم ہوا ہے جس کے سربراہ ریٹائرڈ جسٹس دراب پٹیل ہیں جو پارسی ہیں اور سیکرٹری جنرل بیگم عاصمہ جہانگیر ہیں جو ایک قادیانی ایڈووکیٹ مسٹر جہانگیر کی بیوی ہے۔ یہ لوگ پاکستان میں ہیومن رائٹس کے عنوان سے فورم منعقد کرتے ہیں، جلسوں کا اہتمام کرتے ہیں، مظاہرے کرتے ہیں اور امریکی سفارت کار ان کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ذرا سنیے، اس کمیشن کے سربراہ مسٹر پٹیل کیا کہتے ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۵ اپریل ۱۹۸۷ء کے مطابق مسٹر دراب پٹیل نے کہا کہ:

> ”کمیشن کو بہت سے ایسے قوانین منسوخ کرانے کی کوشش بھی کرنا ہوگی جو یکطرفہ ہیں اور جن سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا راستہ کھلتا ہے۔ اس سلسلہ میں حدود آرڈیننس، قانون شہادت، غیر مسلموں کو مسلمانوں کی شہادت پر سزا دینے کا مسئلہ، قادیانیوں اور احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے والا قانون، جداگانہ انتخاب کا قانون، سیاسی جماعتوں کا قانون، یہ سارے قوانین ختم کرنا ہوں گے۔ یہ قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں۔“

روزنامہ نوائے وقت نے ۲۷ اپریل ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں بیگم عاصمہ جہانگیر کے حوالہ سے کمیشن کے جنرل اجلاس میں کیے جانے والے مطالبات بھی شائع کیے ہیں جن کے مطابق:

> ”تعزیرات پاکستان اور حدود آرڈیننس کی بعض سزاؤں کو ظالمانہ اور غیر انسانی قرار دیا گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ سنگسار کرنے، پھانسی پر لٹکانے اور موت کی سزا

کوفی الفور ختم کیا جائے، نیز کوڑے لگانے، ہاتھ کاٹنے اور قید تنہائی کی سزائیں بھی ختم کر دی جائیں۔ جنرل اجلاس میں منظور کردہ ڈیکلریشن میں تمام مذہبی اقلیتوں کی تائید کی گئی ہے اور اس ضرورت پر زور دیا گیا ہے کہ حکومت کسی بھی شخص کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ مذہب یا فرقے کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہ کرے۔“

حضرات محترم! اب تو آپ اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے کہ انسانی حقوق سے ان کی مراد کیا ہے اور ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی کو روکنے کے عنوان سے مغربی ممالک اور لابیاں ہم سے کیا تقاضا کر رہی ہیں؟ امریکہ ہم سے یہ ضمانت چاہتا ہے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اسلامی قوانین نافذ نہیں کریں گے، قرآن کریم کے احکام نافذ نہیں کریں گے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کی پارلیمنٹ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر موت کی سزا کا قانون منظور کیا ہے؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ توہین رسالت کو بھی انسانی حقوق میں شامل کیا جا رہا ہے اور یہ حق مانگا جا رہا ہے کہ کوئی بدبخت توہین رسالت کا ارتکاب کرنا چاہے تو اسے اس کا حق حاصل ہو اور قانون کو حرکت میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ہے ان لوگوں کا انسانی حقوق کا تصور اور یہ اسی قسم کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ اس وقت کانفرنس کی اسٹیج پر پنجاب کے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل جناب نذیر غازی ایڈووکیٹ بھی تشریف فرما ہیں، ان سے معذرت کے ساتھ ایک ”ریڈلائن“ کراس کرنے لگا ہوں کہ ہم پر انسانی حقوق کا کیسا تصور تھوپا جا رہا ہے۔ گزشتہ سال چکوال میں اغوا اور قتل کی ایک واردات ہوئی، خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا، عدالت نے قاتل کو موت کی سزا سنائی اور یہ فیصلہ دیا کہ پھانسی بر سر عام لوگوں کے سامنے دی جائے۔ اسلام کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ سزا بر سر عام دی جائے تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: ”ولیشہد عذابھما طائفۃ من المومنین“ (سورۃ النور) مجرموں کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے۔ یہ اسلامی قانون کا تقاضا ہے، لیکن ہماری عدالت عظمیٰ نے اس سزا پر عملدرآمد روک دیا اور سپریم کورٹ میں گزشتہ چار پانچ ماہ سے اس نکتہ پر بحث جاری ہے کہ مجرم کو لوگوں کے سامنے سزا دینا اس کی عزت نفس کے منافی ہے اور یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اس لیے قاتل کو سرعام پھانسی نہیں دینی چاہیے۔

محترم بزرگو اور دوستو! یہ مثالیں میں نے وضاحت کے ساتھ اس لیے آپ کے سامنے رکھی ہیں تاکہ آپ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ انسانی حقوق سے مغربی ممالک کی مراد کیا ہے اور یہ طاقتیں جب ہم سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہ کرنے کی ضمانت طلب کرتی ہیں تو اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

اب ایک اور شرط بھی سماعت فرما لیجیے جو امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کے لیے امریکی امداد کی شرائط کے ضمن میں اپنی قرارداد میں ذکر کی ہے۔ اس کے مطابق امریکی صدر ہر سال اپنے سرٹیفکیٹ میں یہ بھی لکھیں گے کہ:

"حکومت پاکستان اقلیتی گروہوں مثلاً احمدیوں کو مکمل شہری اور مذہبی آزادیاں نہ دینے کی روش سے باز آرہی ہے اور ایسی تمام سرگرمیاں ختم کر رہی ہے جو مذہبی آزادیوں پر قدغن عائد کرتی ہیں"۔

آپ حضرات کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے اور معاملات کہاں تک آگے پہنچ چکے ہیں۔ آپ میں سے بیشتر حضرات یہ کہہ دیں گے کہ ہمیں تو ان باتوں کا علم نہیں ہے، لیکن کیا آپ کا نہ جاننا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے؟ کیا یہ بھی ہمارا قصور ہے کہ آپ حضرات مغرب میں رہتے ہوئے بھی ان امور سے واقف نہیں ہیں؟ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور اپنی ذمہ داری کا احساس کیجیے۔

حضرات محترم! اب میں اس صدارتی آرڈیننس کی طرف آتا ہوں جسے مرزا طاہر احمد اور اس کی سرپرست لابیوں کی طرف سے پوری دنیا میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا عنوان دے کر بدنام کیا جا رہا ہے یعنی ۱۹۸۴ء کا وہ صدارتی آرڈیننس جس کے تحت صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے قادیانیوں کو اسلام کا نام اور اصطلاحات استعمال کرنے سے روک دیا ہے اور جس کے بارے میں مغربی لابیاں یہ کہہ رہی ہیں کہ اس کے ذریعے قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال ہو گئے ہیں۔ لیکن پہلے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ آرڈیننس صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کا تیار کردہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے فوجی ہیڈکوارٹر نے ترتیب دیا ہے، بلکہ یہ آرڈیننس تحریک ختم نبوت کے ان مطالبات پر مشتمل ہے جن کے لیے ہم نے ملک بھر میں تحریک چلائی، اسٹریٹ پاور کو منظم کیا، لوگوں کو سڑکوں پر لائے اور راولپنڈی کی طرف لانگ مارچ کیا۔ اس پر مجبور ہو کر ہمارے مطالبات کو آرڈیننس کی شکل دی گئی، اس لیے یہ مارشل لاء ریگولیشن یا کسی ڈکٹیٹر کا نافذ کردہ قانون نہیں بلکہ عوامی مطالبات پر مشتمل ایک قانونی ضابطہ ہے۔ اس آرڈیننس کا مقصد اور منشا صرف یہ ہے کہ

چونکہ قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں سے الگ ہے، اس لیے قادیانی اسلام کا نام اور مسلمانوں کے مخصوص مذہبی شعائر استعمال نہ کریں۔ اس کے علاوہ اس آرڈیننس میں کچھ نہیں ہے۔ اس آرڈیننس کی رو سے قادیانیوں کو اس امر کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ:

1. اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ نہ کریں اور خود کو مسلمان کے طور پر ظاہر نہ کریں۔

2. اپنی عبادت گاہ کو ”مسجد“ نہ کہیں اور اپنی عبادت کے لیے لوگوں کو بلانے کا طریقہ اذان سے الگ اختیار کریں اور اسے ”اذان“ نہ کہیں۔

3. جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے علاوہ کسی اور خاتون کو ”ام المومنین“ نہ کہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور خلفاء کے علاوہ کسی اور کے لیے ”صحابی“ یا ”خلیفہ“ کی اصطلاح استعمال نہ کریں۔

آرڈیننس میں ان امور کو جرم قرار دیتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کے ارتکاب پر تین سال تک قید یا جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ میں مغربی لابسٹوں سے پوچھتا ہوں کہ اس آرڈیننس میں قادیانیوں کو عبادت گاہ بنانے یا عبادت کرنے سے کہاں روکا گیا ہے؟ انہیں صرف اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہنے سے روکا گیا ہے، اذان دینے سے روکا گیا ہے اور اسلام کے دیگر شعائر کے استعمال سے روکا گیا ہے۔ اور جب قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں کے مذہب سے الگ ایک جداگانہ مذہب ہے تو یہ پابندیاں اس کا منطقی تقاضا ہیں، اور ان اصولی اور منطقی پابندیوں کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔ ہماری یہ آواز ویسٹرن میڈیا تک پہنچنی چاہیے اور مغربی لابیوں کے علم میں آنی چاہیے۔

برطانیہ میں رہنے والے مسلمان بھائیو! ہم تو مجبور ہیں، سال میں ایک آدھ بار آتے ہیں اور آواز لگا کر چلے جاتے ہیں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ اگر مرزا طاہر احمد یہاں کے ذرائع استعمال کر سکتا ہے تو مغرب کے ذرائع ابلاغ آپ کی دسترس سے باہر نہیں۔ اگر مرزا طاہر احمد مغربی لابیوں کو اپروچ کر سکتا ہے تو آپ حضرات بھی کر سکتے ہیں۔ خدا کے لیے آپ بھی اپنے فرائض پہچانیں اور اسلام اور پاکستان کے دفاع کے لیے سائنٹفک بنیادوں پر کام کا طریقہ اختیار کریں۔

حضرات محترم! اگر بات انسانی حقوق کی ہے تو میں یہ بات ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہم نہیں کررہے، بلکہ قادیانی کررہے ہیں اور عملی صورتحال یہ ہے کہ خود ہمارے انسانی حقوق قادیانیوں کے ہاتھوں پامال ہورہے ہیں اس لیے کہ اسلام کا نام، مسجد، اذان، کلمہ طیبہ اور دیگر اسلامی شعائر دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کی پہچان ہیں اور ان کی شناخت ہیں۔ اپنی شناخت کا تحفظ مسلمانوں کا حق ہے اور شناخت کی حفاظت انسانی حقوق میں شامل ہے جسے قادیانی مسلسل پامال کررہے ہیں، لیکن جب قادیانیوں کے خلاف اس جرم میں قانونی کارروائی ہوتی ہے تو مغربی لابسٹ چیخ اٹھتے ہیں کہ قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال ہورہے ہیں۔ مغرب میں بیٹھ کر اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے والے لابسٹوں سے خدا کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ کچھ انصاف کریں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کریں کہ وہ اپنی شناخت اور پہچان کی حفاظت کر سکیں اور اسلام کا نام اور اس کا لیبل اور ٹریڈ مارک غلط استعمال کرنے والوں کو ایسا کرنے سے باز رکھ سکیں۔ یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اپنے مذہبی نام کا تحفظ کریں، اپنی شناخت کا تحفظ کریں، اپنی علامات اور نشانیوں کا تحفظ کریں اور اپنی پہچان کو بچائیں۔ قادیانی گروہ مٹھی بھر ہونے کے باوجود مغربی طاقتوں اور لابیوں کی شہ پر ہماری پہچان خراب کررہا ہے اور ہماری شناخت کو مجروح کررہا ہے۔ صدارتی آرڈیننس میں قادیانیوں کو اسی جرم سے روکا گیا ہے، اس لیے انصاف کی بات یہ ہے کہ امتناع قادیانیت کا صدارتی آرڈیننس انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا نہیں بلکہ ان کی حفاظت اور ہیومن رائٹس کے تقاضوں کی تکمیل کا آرڈیننس ہے۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ حضرات کا خاصا وقت لے لیا ہے، لیکن ابھی ایک اہم مسئلہ باقی ہے اور وہ ہے تحریک ختم نبوت کی موجودہ صورتحال اور وہ مسائل جن کا اس وقت ہمیں سامنا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ اصولی بات آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم نے اپنی تحریکی مطالبات کی بنیاد محض جذبات پر نہیں رکھی۔ آپ ہماری تقاریر میں بہت سی جذباتی باتیں سنتے ہیں۔ ہمارے مقررین واجب القتل ہونے کی بات بھی کرتے ہیں اور مسیلمہ کذاب کے خلاف حضرت صدیق اکبرؓ کے مسلح جہاد وقتال کے حوالے بھی دیتے ہیں۔ ہمارے جذبات یہی ہیں اور ہر مسلمان کے جذبات یہی ہونے چاہئیں لیکن ہم نے اپنے مطالبات کی بنیاد ان جذبات سے بہت پیچھے ہٹ کر ایک سادہ اور منطقی سے تقاضے

پر رکھی ہے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے بعد اس کے منطقی اور قانونی تقاضے پورے کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ ہمارا نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے یہ مطالبہ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے کیا تھا اور انہوں نے اپنے بیانات اور خطوط میں اسے ناگزیر قرار دیا تھا۔ ہم نے اسے قبول کر لیا اور اسے ہی اپنی تحریک کی بنیاد بنا لیا۔ اس مطالبہ پر ۱۹۷۴ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے پاکستان کی پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا اور اسی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد اور تحریک کے نتیجہ میں ۱۹۸۴ء میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں کو اسلام کا نام اور مسلمانوں کی مخصوص مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے سے روک دیا تھا اور اس وقت ہم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے سلسلہ میں مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال کے اسی مطالبہ کے منطقی اور بدیہی تقاضوں کو پورا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

حضرات محترم! ہمارے ہاں اس وقت ایک اور مسئلہ چل رہا ہے اور ہم اس کے لیے حضرت الامیر مولانا خواجہ خان محمد کی قیادت میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ مسئلہ پاکستان کے قومی شناختی کارڈ میں مذہب کے خانہ کا ہے اور ہمارا موقف یہ ہے کہ جب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر اسلام کا نام اور اسلامی اصطلاحات کے استعمال سے روک دیا گیا ہے۔ اور جب انتخابات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نشستیں الگ الگ کر کے جداگانہ بنیادوں پر الیکشن کا طریق کار اختیار کر لیا گیا ہے، اور جب الیکشن میں ووٹ کا استعمال شناختی کارڈ کی بنیاد پر ہوتا ہے، تو ان تمام فیصلوں کا منطقی اور ناگزیر تقاضا ہے کہ قومی شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ بڑھا کر ہر شہری کی مذہبی حیثیت کو واضح کر دیا جائے تاکہ ووٹ کے استعمال، بیرون ملک سفر یا کسی بھی معاملہ میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔

جونیجو حکومت کے دور میں یہ سوال اٹھایا گیا تو کہا گیا کہ اصولاً یہ مطالبہ درست ہے لیکن عملاً سارے ملک میں جاری شدہ شناختی کارڈوں کو منسوخ کرنا اور سب کارڈ نئے سرے سے جاری کرنا مشکل ہے۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت میں بھی یہ بات اٹھائی گئی اور مطالبہ سے اتفاق کرتے ہوئے عملی مجبوری ظاہر کی گئی۔ اب میاں نواز شریف صاحب کی حکومت میں یہ اعلان ہوا ہے کہ پورے ملک میں تمام شناختی کارڈوں کو کمپیوٹرائزڈ کیا جا رہا ہے تو ہم نے از سر نو مہم شروع کی کہ اب تو کوئی عملی رکاوٹ نہیں رہی۔ اب نئے شناختی کارڈوں میں

مذہب کا خانہ بڑھا دیا جائے، تو صدر پاکستان، وزیر اعظم اور وزیر داخلہ سے متعدّد وفود ملے۔ صدر محترم نے تو دو دفعہ قومی پریس میں وعدہ کیا کہ یہ مطالبہ درست ہے اور پورا کیا جائے۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے بھی وفود سے وعدے کیے۔ لیکن صدر پاکستان نے جس شناختی کارڈ کے ذریعے ملک میں کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈوں کے اجرا کا افتتاح کیا اس میں مذہب کا خانہ نہیں تھا۔ ہم نے پھر احتجاج کیا، اسلام آباد میں تمام مکاتب فکر کی احتجاجی کانفرنس منعقد کی جس پر ہمیں بتایا گیا کہ شناختی کارڈوں کا اجرا روک دیا گیا ہے اور مذہب کے خانہ کے ساتھ نیا کارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن صورتحال ابھی جوں کی توں ہے اور تحریک ختم نبوت کے حوالہ سے آپ ہماری مشکلات کا اندازہ کریں کہ ایک سیدھی سی منطقی اور ناگزیر ضرورت کے لیے بھی ہمیں کن مراحل سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ مجھے یہاں برطانیہ آنے کے بعد یہ افسوسناک بات معلوم ہوئی ہے کہ جناب وزیر اعظم نے تحریک ختم نبوت کے ایک وفد سے چند روز پہلے لاہور میں یہ کہا ہے کہ میں تو یہ کام کرنا چاہتا ہوں لیکن ایک بہت بڑی لابی رکاوٹ ہے۔

میرے محترم بزرگو اور دوستو! کہنے کی باتیں بہت سی ہیں لیکن وقت کا دامن تنگ ہوتا جا رہا ہے اور میرے بعد دوسرے فاضل مقررین نے بھی آنا ہے، اس لیے آخر میں آپ حضرات سے پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مغرب کے ممالک اور لابیاں ایک بات طے کر چکی ہیں کہ کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام کو کسی قیمت پر نافذ نہ ہونے دیا جائے۔ یہ صرف ہمارا مسئلہ نہیں، الجزائر اور تیونس میں بھی یہی مسئلہ ہے اور مصر اور مراکش کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ دنیا کے ہر مسلمان ملک میں مغربی میڈیا کے بوسٹر موجود ہیں جو انسانی حقوق اور بنیاد پرستی کے عنوان سے اسلامی قوانین کی مخالفت کر رہے ہیں اور قادیانیت جیسے گمراہ گروہوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ ان مسائل کا ادراک حاصل کرنا، مغربی لابیوں کے طریق واردات کو سمجھنا اور اس کا توڑ پیدا کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے، لیکن اس جسارت پر مجھے معاف فرمائیں کہ اس سلسلہ میں پہلی ذمہ داری آپ لوگوں کی ہے جو مغربی ممالک میں مقیم ہیں اور یہاں کے ذرائع تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری ذمہ داری ہے۔ آئیے ہم سب عہد کریں کہ اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کے دفاع میں اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس کریں گے اور اسے پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دیں۔ آمین۔

۱۹۹۲ء

مغربی معاشرہ میں دینی تعلیم

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱دسمبر ۱۹۹۲ء)

مولانا محمد کمال خان ہمارے محترم بزرگ ہیں، سوات کے رہنے والے ہیں، ایک عرصہ تک ڈیوزبری (برطانیہ) کے تبلیغی مرکز کے دینی مدرسہ میں خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں اور اب ٹونگھم کے قریب نیوارک سے متّصل بلڈنگ خرید کر الجامعۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک بڑا دینی ادارہ قائم کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ بلڈنگ رائل ایئر فورس کے آفیسرز کے ہاسٹل کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے، اس میں ڈیڑھ سو کے قریب کمرے ہیں اور مجموعی رقبہ دس ایکڑ سے زائد ہے۔ اس کی قیمت کی قرضہ حسنہ سے ادائیگی کے لیے اصحاب خیر سے رابطے کر رہے ہیں، خیال ہے کہ آنے والے رمضان المبارک کے بعد تعلیمی و تدریسی سلسلہ کا وہاں باقاعدہ آغاز ہو جائے گا، ان شاء اللہ العزیز۔ مولانا موصوف نے گزشتہ دنوں دو تین ملاقاتوں میں راقم الحروف سے ارشاد فرمایا کہ جامعہ کے تعلیمی نظام و نصاب کے بارے میں انہیں مشورہ دوں، یہ ان کا حسن ظن ہے، ورنہ بیس سالہ تدریسی زندگی گزارنے کے باوجود خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ تعلیمی نظام و نصاب جیسے اہم اور نازک مسائل پر رائے زنی کر سکوں، تاہم ان کے حکم کی تعمیل میں اس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں۔

برصغیر کے دینی مدارس کا پس منظر اور نظام و نصاب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام و نصاب کے کسی نئے خاکہ پر گفتگو سے پہلے دینی مدارس کے موجودہ نظام و ماحول پر مختصر سا تبصرہ ہو جائے تاکہ اس کا تاریخی پس منظر

سامنے رہے۔ برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش اور برما میں دینی مدارس کا موجودہ نظام اس تسلسل کا ایک حصہ ہے جس کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برصغیر کے مسلمانوں کی شکست کے بعد ہوا تھا۔ انگریز حکمرانوں نے جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد پورے برصغیر پر تعلیمی و تہذیبی یلغار کردی تھی، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے تباہ برباد کردیے تھے اور زبان، قانون اور نظام تعلیم کو یکسر تبدیل کر کے پرانے تعلیمی نظام کی عملی افادیت کو یکسر ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس وقت چند مردان باخدا نے امداد باہمی اور عوامی تعاون کی بنیاد پر دینی مدارس کے قیام کی طرف قدم بڑھایا۔ ابتدا میں دیوبند، سہارنپور اور مراد آباد میں چند دینی مدرسے قائم ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے برصغیر میں ان مدارس کا جال بچھ گیا۔ ان مدارس میں فارسی اور عربی زبان کے ساتھ قرآن وحدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب، منطق، فلسفہ اور دیگر متعلقہ علوم کو نصاب میں سمو دیا گیا اور ملا نظام الدین سہالویؒ کے مرتب کردہ "درس نظامی" کے دائرہ میں رہتے ہوئے دینی ضروریات اور ترجیحات کا ایک ہدف متعیّن کردیا گیا۔ اب تک ہمارے دینی مدارس اسی دائرے میں کام کر رہے ہیں اور معاشرہ ان کی جدوجہد کے ثمرات سے بہرہ ور ہو رہا ہے۔

تاریخ کے طالب علم اور نفاذ شریعت کی جدوجہد کے نظریاتی کارکن کی حیثیت سے یہ بات عرصہ سے ذہن میں گردش کر رہی تھی کہ آزادئ وطن کے بعد دینی تعلیم کے اس پرانے نصاب و نظام کو جوں کا توں قائم رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ یہ نظام دور غلامی کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا تھا اور آزادی کے بعد وہ تقاضے بدل گئے ہیں، اس لیے پورے تعلیمی نظام و نصاب میں اجتہادی تبدیلیوں بلکہ انقلاب کی ضرورت ہے۔ حتیٰ کہ گزشتہ سال حکومت پاکستان کے قائم کردہ تعلیمی کمیشن کے ایک سوالنامہ کے جواب میں راقم الحروف نے یہ لکھ بھی دیا کہ علی گڑھ کا نظام تعلیم اور دیوبند کا نظام تعلیم دونوں دور غلامی کی یادگار ہیں اور دونوں کی بنیاد خوف اور تحفظات پر تھی:

1. ایک طبقہ کے سامنے یہ خوف تھا کہ اگر مسلمان نوجوانوں نے جدید تعلیم اور انگریزی زبان سے بے اعتنائی برتی تو قومی زندگی کی دوڑ میں ہندو آگے بڑھ جائے گا اور قومی نظام زندگی کی باگ پر مسلمان کی گرفت قائم نہیں رہے گی، اس لیے اس طبقہ نے علی گڑھ کے نظام کی بنیاد رکھی۔

2. دوسری طرف ایک طبقے کو یہ خوف تھا کہ اگر دینی علوم کی تعلیم و تدریس کا مناسب انتظام نہ ہو سکا تو قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ علوم رفتہ رفتہ مسلمانوں کی زندگی سے نکل جائیں گے، نیز مسلمانوں کو مساجد میں نماز اور قرآن کریم پڑھانے والے ائمہ اور حفاظ میسر نہیں آئیں گے تو دین کے ساتھ ان کا تعلق قائم نہیں رہے گا اور رفتہ رفتہ یہ خطہ بھی اسپین بن جائے گا، اس لیے اس طبقہ نے دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔

دونوں خوف اپنی اپنی جگہ بجا تھے اور ان کی بنیاد پر قائم ہونے والے دونوں تعلیمی نظاموں نے معاشرہ کی خدمت کی اور اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تاریخی کردار ادا کیا، لیکن آزادی اور قیام پاکستان کے بعد ان دونوں کو ختم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اب ضرورت بالکل نئے نظام تعلیم کی ہے۔ جس کا خاکہ میرے نزدیک یہ ہے کہ میٹرک تک تعلیم ہر شہری کے لیے لازمی قرار دی جائے جس میں مندرجہ ذیل امور شامل ہوں: (۱) علاقائی زبان (۲) اردو بحیثیت قومی زبان (۳) عربی بطور دینی زبان (۴) انگلش بطور بین الاقوامی زبان (۵) لکھنا پڑھنا (۶) روز مرہ ضروریات کا حساب (۷) جغرافیہ (۸) تاریخ (۹) جنرل سائنس (۱۰) ضروریات دین۔ یہاں تک تعلیم ہر شہری کے لیے ضروری ہو، اس کے لیے ایک ہی طرز کے تعلیمی ادارے ہوں جن میں کسی قسم کی طبقاتی ترجیحات نہ ہوں۔ میٹرک کے بعد تعلیم کو انجینئرنگ، میڈیکل، علم دین، تاریخ، سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر ضروری شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر شعبہ کی ضروریات کے مطابق قومی تعلیمی پالیسی کی منصوبہ بندی کی جائے۔

یہ خلاصہ ہے ان گزارشات کا جو سوالنامہ کے جواب میں قومی تعلیمی کمیشن کو میں نے بھجوائیں۔ اس کے ساتھ یہ احساس بھی رہا کہ ''چھوٹا منہ بڑی بات والی'' بات ہو گئی ہے، مگر گزشتہ دنوں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی سے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ ان کے والد محترم مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے قیام پاکستان کے بعد کم و بیش اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار تعلیمات اسلامیہ بورڈ میں فرمایا تھا اور ان کا نقطۂ نظر بھی لگ بھگ یہی تھا۔ تفصیلات میں جائے بغیر صرف ایک مثال سے بات واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ دینی مدارس نے دور غلامی میں بنیادی طور پر تین چار اہم خدمات سرانجام دی ہیں:

• ایک یہ قرآن و حدیث اور ان سے متعلقہ علوم و فنون کی حفاظت کی ہے۔
• دوسری یہ کہ مسلمانوں کو مساجد اور مدارس آباد رکھنے کے لیے ائمہ، حفاظ اور مدرسین مہیا کرتے رہے ہیں۔
• تیسری یہ کہ مسلمہ دینی عقائد و احکام کے خلاف اٹھنے والے ہر نظریاتی فتنہ کا تعاقب کیا ہے۔
• اور چوتھی یہ کہ تحریک آزادی کو تربیت یافتہ قائدین اور کارکنوں کی کھیپ فراہم کی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد دینی مدارس کی ذمہ داری

اب اس حوالہ سے قیام پاکستان کے بعد ملک میں شریعت اسلامیہ کی بالادستی اور نفاذ کی تحریک کی فکری و علمی قیادت بھی دینی مدارس کی ذمہ داری تھی اور دو کام انہوں نے بہر حال کرنا تھے:

1. ایک یہ کہ اپنے طلبہ کو نفاذ اسلام کے حوالے سے پیش آمدہ فکری و عملی مسائل سے مانوس کراتے اور حدیث و فقہ کی تدریس میں جدید تہذیبی، نظریاتی اور معاشرتی مسائل کو زیر بحث لایا جاتا تاکہ علماء میں ان مسائل پر قرآن و سنت کی روشنی میں بحث و تمحیص اور استنباط و استخراج کا ذوق بیدار ہوتا،
2. اور دوسرا یہ کہ طلبہ و علماء کو ذہنی طور پر تیار کیا جاتا تاکہ وہ معاشرہ میں شریعت کی بالادستی کی جدوجہد کی قیادت کریں۔

لیکن یہ دونوں کام ہمارے مدارس میں نہیں ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قومی سیاست تو اپنی جگہ، خود نفاذ شریعت کی جدوجہد بھی فکری انارکی کا شکار ہے اور اس پر سنجیدہ دینی حلقوں کی گرفت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں حدیث کی کتابوں میں رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے فروعی مباحث پر ہفتوں صرف ہو جاتے ہیں، مجھے ان ضروریات سے انکار نہیں اور اپنی ضرورت کے دائرہ میں ہر علمی بحث کی اہمیت مسلم ہے، لیکن میں اس وقت اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا جب دیکھتا ہوں کہ قانون سازی کی حدود، آبادی کے کنٹرول، سود، نظریہ ارتقا، جدلی معاشیات، اباحیت مطلقہ، اسلامی حکومت کی سیاسی بنیاد، اور انسانی حقوق کے حوالے سے جو مسائل قدم قدم پر دامن پکڑے ہمارا منہ چڑا رہے ہیں، ان پر کوئی بحث و مباحثہ نہیں ہوتا، حالانکہ حدیث و فقہ کی کتابوں میں ان کے بارے میں بھی وافر

مقدار میں مواد موجود ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزار میں سے نو سو ننانوے علماء کو جب عملی طور پر ان میں سے کسی مسئلہ کا سامنا درپیش ہوتا ہے تو وہ رائج الوقت منطق و استدلال سے تہی دامن ہوتے ہیں، مجبور ہو کر فتوی اور طعن و تشنیع کی زبان کا سہارا لیتے ہیں، اور کرکٹ کی اصطلاح میں ''ایل بی ڈبلیو'' ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مغربی معاشرہ میں دینی تعلیم کا موجودہ نظم

اب ایک طائرانہ نظر برطانیہ میں دینی تعلیم کے مروجہ سسٹم پر ڈال لی جائے تو مناسب ہو گا۔ یہاں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے آنے والے مسلمانوں میں بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے جو نظام چل رہا ہے، اس کے تحت ایک تو مساجد یا اسلامک سنٹروں میں قائم وہ مکتب ہیں جہاں روزانہ شام پانچ سے سات بجے تک یا ویک اینڈ پر ہفتہ اور اتوار کے روز دینی تعلیم دی جاتی ہے، قرآن پاک ناظرہ پڑھایا جاتا ہے، نماز اور دیگر دینی مسائل بچوں کو ذہن نشین کرائے جاتے ہیں اور ایک طرح سے بنیادی دینی تعلیم سے بچوں اور بچیوں کو ایک حد تک آراستہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ایک اچھی کوشش ہے اور یہاں پروان چڑھنے والی مسلمان پود میں اگر دین کے ساتھ کوئی تعلق ہے تو اسی کی برکت سے ہے۔

اس کے علاوہ وہ مدارس، جامعات اور دارالعلوم بھی اب تیزی کے ساتھ برطانیہ کے مختلف شہروں میں قائم ہو رہے ہیں جن کا مقصد علم دین کی مکمل تعلیم دے کر علماء تیار کرنا ہے تاکہ وہ معاشرہ میں دینی قیادت کے فرائض سنبھال سکیں۔ اور ان کے بارے میں میری ایک واضح رائے ہے لیکن اسے عرض کرنے سے قبل اس تجویز کو سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح پاکستان میں وفاق المدارس کے ناموں سے دینی مدارس کے مختلف بورڈ ہیں جن کے تحت مدارس کا سلسلہ رفتہ رفتہ نظم آشنا ہوتا جا رہا ہے اور ان وفاقوں کی اسناد کو حکومتی سطح پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے، اسی طرز پر برطانیہ میں بھی دینی مدارس کا ایک وفاق قائم ہونا ضروری ہے اور بہتر ہو گا کہ مختلف مکاتب فکر کے الگ الگ وفاق نہ ہوں، بلکہ اہل سنت کے مسلمہ مکاتب فکر کا ایک مشترکہ بورڈ ہو۔

یہاں یہ بات بھی المیہ کی حد تک موجود ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے درمیان بعد، مناقشت اور مسابقت کی فضا نے باہم مل بیٹھنے کے راستے مسدود کر رکھے ہیں، حالانکہ پاکستان میں فرقہ وارانہ تعصبات کے باوجود ہم نفاذ شریعت اور ختم نبوت جیسے مشترکہ

مقاصد کے لیے بوقت ضرورت مل بیٹھتے ہیں اور اس کے ثمرات بھی حاصل کرتے ہیں، لیکن جہاں اس مل بیٹھنے کی ضرورت زیادہ ہے وہاں اس کے امکانات کم نظر آرہے ہیں، جو انتہائی افسوسناک امر ہے اور دیوبندی، بریلوی و اہل حدیث مکاتب فکر کے برطانوی قائدین کو اس پہلو کا ضرور جائزہ لینا چاہیے۔ بہرحال بہتر تو یہی ہے کہ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر کے مدارس کا مشترکہ بورڈ قائم ہو، ورنہ اگر سردست ایسا کرنا قابل عمل نہ ہو تو ہمارے مکتب فکر کے مدارس کو بہرحال جلد از جلد اس قسم کا کوئی نظام ضرور قائم کر لینا چاہیے۔ یہ وفاق یا بورڈ دو امور کی نگرانی اور اہتمام کرے:

1. ایک یہ کہ برطانوی معاشرہ بلکہ مغربی معاشرہ کی دینی ضروریات کا وسیع تناظر میں جائزہ لے کر اس کی بنیاد پر تعلیمی نصاب و نظام ترتیب دیا جائے۔
2. اور دوسرا یہ کہ مدارس کی درجہ بندی کر کے ان کے تعلیمی معیار، امتحانات اور تربیتی ماحول کی نگرانی کی جائے۔

مغربی معاشرہ کی دینی ضروریات

اب میں اس طرف آرہا ہوں کہ برطانوی معاشرہ کی دینی ضروریات میرے نزدیک کیا ہیں اور ان کی بنیاد پر دینی تعلیم کے نظام کا نیا ڈھانچہ کیا ہونا چاہیے؟ مجھے ۱۹۸۵ء سے کم و بیش ہر سال برطانیہ میں آنے کا موقع مل رہا ہے اور حالات کا جائزہ لیتے رہنے کی عادت بھی ہے۔ میں نے مسلسل کوشش کی ہے کہ کھلی آنکھوں سے یہاں کی دینی ضروریات کا جائزہ لوں اور اس کے نتائج اب آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں، لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ ایک شخص کی رائے اور تجزیہ بہرحال ایک ہی شخص کا ہوتا ہے جو اجتماعی مشاورت کا بدل کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ اس سلسلہ میں کسی اجتماعی مشاورت کا اہتمام ہو اور اس میں مجھے بھی شرکت کی سعادت بخشی جائے تاکہ زیادہ بہتر طور پر حالات و ضروریات کا تجزیہ کر کے نتائج کو سامنے لایا جا سکے۔ تاہم گفتگو کی بنیاد کے طور پر چند ابتدائی گزارشات اس ضمن میں پیش کر رہا ہوں۔

اس معاشرہ کی دینی ضرورت کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) ہر مسلمان کی شخصی دینی ضروریات

شخصی ضروریات سے مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان کو بحیثیت مسلمان اس معاشرہ میں رہنے کے لیے جس قسم کی دینی تعلیم اور معلومات کی ضرورت ہے، وہ اسے مہیا ہونی

چاہیے۔ اور ظاہر بات ہے کہ دینی مدارس و مکاتب کے سوا اس ضرورت کے پورا کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ شخصی دینی ضروریات کو ہم ضروریات دین کے اجمالی تعارف کی صورت میں یوں سمیٹ سکتے ہیں کہ ہر مسلمان کو قرآن کریم صحیح تلفظ کے ساتھ کم از کم ناظرہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ اسے اتنی سورتیں یاد ہونی چاہئیں کہ وہ پانچ وقت کی نماز مسنون طریقہ سے ادا کر سکے۔ بہتر تو یہ ہے کہ تھوڑی بہت عربی گریمر کے ساتھ مسلم نوجوانوں کے لیے قرآن کریم کے ترجمہ کی کلاسوں کا اہتمام کیا جائے، ورنہ کم از کم ایک دو پارے ترجمہ کے ساتھ ضرور ہوں۔ اسے اسلام کے بنیادی عقائد کا علم ہو اور یہاں رہنے والی دوسری قوموں کے ساتھ عقائد کا فرق معلوم ہو۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور دیگر اسلامی عبادات کے بارے میں اتنی معلومات اسے ضرور حاصل ہوں کہ وہ انہیں صحیح طریقہ سے ادا کر سکے۔ حلال حرام اور جائز ناجائز کے مسائل اس کے علم میں ہوں اور اسلامی تاریخ و شخصیات بالخصوص حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اسے ضروری معلومات حاصل ہوں۔

شخصی دینی ضروریات کے اس وسیع تناظر میں ہم ان مکاتب کی کارکردگی کا جائزہ لیں جو مساجد اور اسلامک سنٹروں میں اس وقت چل رہی ہے تو نتائج کا گراف تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف جاتا دکھائی دے گا۔ اول تو یہ دیکھیں کہ ان مکاتب و مدارس میں آنے والے بچوں کو ملنے والی تعلیم اور حاصل ہونے والی معلومات کا ان کی مجموعی دینی ضروریات کے لحاظ سے کیا تناسب ہے؟ رزلٹ کارڈ آپ کے سامنے حقائق کی ایک نئی دنیا کو بے نقاب کر دے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان مدارس و مکاتب کی افادیت سے انکار کر رہا ہوں، کیونکہ اب تک نئی نسل کا دین کے ساتھ جو تعلق قائم ہے، اس کی بنیاد انہی مدارس پر ہے، لیکن جتنا کام ہونا چاہیے یا جتنا ہو سکتا ہے، اتنا نہیں ہو رہا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ باہمی مشاورت نہیں ہے، منصوبہ بندی نہیں ہے اور کام کی ترجیحات متعیّن نہیں ہیں۔ اگر اس کا اہتمام ہو جائے تو انہی مکاتب و مدارس کی کارکردگی میں کم از کم سو فیصد اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۲) مسلم کمیونٹی کی اجتماعی ضروریات

شخصی دینی ضروریات سے آگے بڑھ کر دوسرا دائرہ مسلم کمیونٹی کی اجتماعی دینی ضروریات کا ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں کو ایسی دینی قیادت کی ضرورت ہے جو اسلامی احکام و تعلیمات سے پوری واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ مغربی معاشرہ کی

خرابیوں اور نفسیات سے بھی آگاہ ہو تاکہ وہ دینی قیادت مسلمانوں اور ان کی نئی نسل کو اس معاشرہ کی خرابیوں سے حکمت عملی کے ساتھ بچاتے ہوئے صحیح اسلامی زندگی بسر کرنے میں راہنمائی کر سکے۔ اس دینی قیادت کو ہم تین حصوں میں تقسیم کریں گے:

1. ایک مساجد کے ائمہ کا طبقہ، یعنی یہاں مساجد میں ایسے ائمہ کی ضرورت ہے جو نماز پڑھا سکیں، قرآن کریم ناظرہ اور ترجمہ کی تعلیم دے سکیں، ضرورت کے مطابق بچوں کو ایک دو پارے یاد کرا سکیں، اور دینی معلومات اور احکام و مسائل کی چھوٹی کتابیں پڑھا سکیں۔ یہ کھیپ یہیں تیار ہونی چاہیے، کیونکہ باہر سے آنے والے ائمہ اور حفاظ یہاں کے ماحول کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی واقف نہیں ہوتے جس سے استاد اور شاگرد کے درمیان حجاب قائم رہتا ہے اور مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دینی مدارس کو سب سے زیادہ توجہ ایسے ائمہ کی تیاری کی طرف دینی چاہیے اور اس سطح کے لیے کسی لمبے چوڑے نصاب کی ضرورت نہیں۔ یہ امور کفایت کر جائیں گے کہ امام صاحب قرآن کریم معروف لہجہ میں صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکتے ہوں، حافظ ہوں تو بہت بہتر، ورنہ ایک دو پارے انہیں ضرور یاد ہوں، قرآن کریم کو سمجھنے کی حد تک عربی گریمر پر انہیں عبور ہو، فقہ کی ایک آدھ کتاب مثلاً قدوری انہوں نے اہتمام سے پڑھ رکھی ہو، اور اپنی علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ اردو اور انگلش پر بھی انہیں عبور ہو۔ اس سے زیادہ علم کی اس سطح پر ضرورت نہیں ہے، ہاں کوئی اپنے شوق کی تکمیل کے لیے پڑھنا چاہے تو اس کی کوئی حد متعیّن نہیں کی جا سکتی۔

2. دوسرا درجہ خطباء کرام کا ہے جو دراصل مسلمانوں کی عمومی راہنمائی کرتے ہیں اور جن کی تیاری پر سرے سے ہمارے ہاں کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ میرے نزدیک یورپ کی کسی مسجد میں خطبہ دینے والے یا کسی اسٹیج پر تقریر کرنے والے خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ درس نظامی کا مستند فاضل ہو، اسلامی تاریخ کا مکمل مطالعہ رکھتا ہو، یہودیت، عیسائیت، ہندوازم، سکھ مت اور بدھ مت جیسے مذاہب کے بارے میں ضروری معلومات اسے حاصل ہوں، اور اسلام کے ساتھ ان مذاہب کے اعتقادی اور معاشرتی فرق پر اس کی

نظر ہو۔ مسلم ممالک میں دور غلامی کے دوران علماء کی جدوجہد اور دینی تحریکات سے واقف ہو، یورپ میں اجتماعی زندگی کے حوالہ سے مادی فلسفہ سے عیسائیت کی شکست کے تاریخی پس منظر سے آگاہ ہو، مطالعہ کا ذوق رکھتا ہو اور اپنی علاقائی زبان کے علاوہ اردو اور انگلش میں گفتگو پر بھی اسے قدرت حاصل ہو۔ ان اوصاف کے بغیر اگر کوئی شخص یورپ کی کسی مسجد میں منبر رسولؐ پر بیٹھتا ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ یہاں بسنے والے مسلمانوں کی دینی راہنمائی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ وقت گزارنا اور بات ہے اور دینی راہنمائی کے فریضہ کی ادائیگی اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت جو ائمہ اور خطباء برطانیہ اور یورپ کی مساجد میں موجود ہیں اور اس معیار پر پورے نہیں اترتے، ان کا کیا کیا جائے؟ ان کے لیے میرے خیال میں ایسے ریفریشر کورسوں کا اہتمام کیا جا سکتا ہے جو کمزوریوں کو دور کر سکیں۔ یہ کورس سال میں ایک ماہ یا وقفہ وقفہ سے پندرہ روز کے لیے ہو سکتے ہیں یا خط و کتابت کورسز کے ذریعے بھی اس خلا کو پر کیا جا سکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ بڑے ادارے اس طرف متوجہ ہوں اور خود ائمہ اور خطباء بھی اس کی ضرورت کا احساس اپنے اندر پیدا کریں۔

3. تیسرا درجہ مدرسین اور اسکالرز کا ہے جن کے ساتھ مفتیان کرام کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ دینی راہنمائی کی اعلیٰ سطح ہے اور اس کے لیے اسی درجہ کے ذہین علماء کی ضرورت ہے جو تدریس اور افتاء کے ساتھ ساتھ تحقیق و مطالعہ کے میدان میں بھی علماء اور طلبہ کی راہنمائی کر سکیں۔ اس طبقہ کے افراد کے لیے ازحد ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی زبان میں اچھا لکھنے پر قادر ہوں، مسائل کے تجزیہ و تحقیق اور استنباط و استخراج کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں، اور اسلام کے بارے میں مغربی میڈیا کی زبان اور لہجہ کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے اسی زبان میں اس کا جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ طبقہ خودبخود نہیں پیدا ہوگا، اس کے لیے بڑے دینی مدارس کو تربیتی شعبے قائم کرنا ہوں گے، تخصص کے کورس ترتیب دینا ہوں گے اور مستقل اکیڈیمیاں قائم کرنا ہوں گی۔

(۳) مغربی معاشرہ کی مجموعی دینی ضروریات

ایک مسلمان کی شخصی دینی ضروریات اور مغرب میں بسنے والی مسلم کمیونٹی کی اجتماعی دینی ضروریات کے ساتھ ہم نے یورپی معاشرہ کی مجموعی دینی ضروریات کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں، اس کا بھی ہم پر حق ہے کہ اس کے افراد تک اسلام کی دعوت کو صحیح طریقہ سے پہنچائیں اور یہ ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے جس کی ادائیگی کے بارے میں روز محشر ہم سے پرسش ہوگی۔ اس لیے اس پہلو پر بھی سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ درست ہے کہ تبلیغی جماعت اس سلسلہ میں پوری مسلمان آبادی کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہی ہے اور ہمیں اس کا شکرگزار ہونے کے ساتھ اس کی کامیابی کے لیے دعاگو اور عملاً اس کا معاون بھی بننا چاہیے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام اصلا علماء کرام کا ہے اور وہی اس کام کو صحیح طریقہ سے سرانجام دے سکتے ہیں، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے دینی مدارس اپنے تعلیمی نصاب و نظام میں دعوت اسلام کے لیے طلبہ کی ذہن سازی اور اس کی عملی تربیت کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے شامل کریں جس میں یہاں کی معاشرتی نفسیات اور دعوت اسلام کے دیگر تقاضوں کو سمو دیا جائے تاکہ فارغ ہونے والے علماء کرام اس فریضہ سے غافل اور بے توجہ نہ ہوں۔

تعلیمی نصاب کا خاکہ

ان گزارشات کے بعد مولانا محمد کمال خان کے استفسار کے حوالہ سے ایک بڑے دینی جامعہ کے لیے تعلیمی نصاب کا ایک خاکہ اپنی ذاتی سوچ اور مطالعہ کی بنیاد پر پیش کر رہا ہوں:

1. یورپ میں قائم ہونے والے کسی بھی بڑے دینی جامعہ کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہاں سرکاری طور پر جتنی تعلیم لازمی ہے، اس کی کلاسوں کا اہتمام جامعہ میں کیا جائے، اور ثانوی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معیاری اسکول ہو جس کا معیار تعلیم سرکاری اسکولوں سے کسی طرح کم نہ ہو۔ البتہ ماحول اپنا ہو تاکہ مسلم نوجوان عصری تعلیم میں دیگر آبادی سے پیچھے نہ رہیں اور یہاں کے تعلیمی ماحول کے برے اثرات سے بچ سکیں۔ یہ تعلیم علماء اور حفاظ کے لیے بھی از حد ضروری ہے، بالخصوص انگلش زبان کو اس حد تک اہمیت دی جائے کہ دینی جامعات کے فضلاء تحریری اور تقریری طور پر مافی

الضمیر کا اظہار عمدگی سے کر سکیں۔ قرآن کریم ناظرہ، ابتدائی عربی گریمر، کم از کم ایک پارہ حفظ اور عقائد و احکام کی بنیادی تعلیم کو اسکول کے نصاب میں سمو دیا جائے اور احادیث نبویہ کا ایک منتخب حصہ بھی اس میں شامل کیا جائے۔

2. دوسرے مرحلہ پر خالص دینی تعلیم کے لیے درس نظامی کی طرز پر ایک متوسط نصاب ترتیب دیا جائے جس کا دورانیہ پانچ سال سے زائد نہ ہو۔ اس میں عربی صرف و نحو شامل کیے جائیں لیکن اس سطح پر چار امور کا اہتمام از حد ضروری ہے:

- زیر درس کتابوں میں مضامین کا بہت زیادہ تکرار نہ ہو۔
- مضامین طلبہ کو رٹانے کی بجائے قواعد ذہن نشین کرا کے اجراء و تمرین کے ذریعہ ان کی ذاتی استعداد کو اجاگر کیا جائے۔
- سیرت النبیؐ، دور صحابہؓ اور اسلام کی مجموعی تاریخ کو اس نصاب میں لازماً شامل کیا جائے۔
- ہر مضمون میں قدیم کتابوں کے ساتھ ساتھ دور حاضر میں لکھی گئی ایک ایک دو دو نئی کتابیں بھی شامل نصاب کی جائیں تاکہ طلبہ ان علوم میں نئے رجحانات سے نابلد نہ رہیں۔

3. تیسرے مرحلہ میں میرے نزدیک دورۂ حدیث ہونا چاہیے، لیکن موجودہ طرز پر ہرگز نہیں۔ میں دورۂ حدیث کے لیے صحاح ستہ کی تعلیم کے موجودہ نصاب سے متفق ہوں، اس کی برکات و اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہ مرحلہ دو سال میں ہونا چاہیے کیونکہ دورۂ حدیث کے طلبہ کی غالب اکثریت موجودہ طرز میں احادیث کے مضامین کا ادراک نہیں کر پاتی اور احادیث کے اتنے بڑے ذخیرہ سے یوں گزر جاتی ہے جیسے کوئی شخص نیم خوابی کی حالت میں اونگھتے ہوئے کسی بڑے باغ سے گزر جائے، اور پھر یہ بیان کرتا پھرے کہ میں نے باغ میں یہ دیکھا، وہ دیکھا۔ اس لیے میرے خیال میں دورۂ حدیث کے دورانیہ میں ایک سال کا اضافہ ضروری ہے۔

اس کی ترتیب یہ ہو کہ پہلے سال صحاح ستہ کی دو کتابوں کے ساتھ ساتھ طلبہ کو اصول حدیث کا اعادہ کرایا جائے اور اس میں سنت کی اہمیت، حجیت حدیث پر

دور حاضر کے اعتراضات و شبہات کا جواب ذہن نشین کرایا جائے۔ قانون سازی کے موجودہ تصورات کا اصول فقہ سے تقابل کرا کے طلبہ کو آئین و قانون کے بارے میں اسلامی اصولوں سے واقف کرایا جائے۔ تجارت، بینکاری، قانون، اجتہاد، سیاست، معاشرت، انسانی حقوق، جدلی معاشیات، نظریہ ارتقا اور دیگر ضروری اجتماعی مباحث سے انہیں متعارف کرایا جائے۔ نیز اسی سال کے دوران حجۃ اللہ البالغہ کے چند منتخب مباحث بھی شامل نصاب کیے جائیں۔ اور اس ایک سالہ تیاری کے بعد دوسرے سال میں انہیں صحاح ستہ کی باقی چار کتابیں پڑھائی جائیں تاکہ وہ حدیث و سنت کے اتنے بڑے ذخیرہ سے اچھی طرح روشناس ہوں اور عملی زندگی میں انہیں کسی مسئلہ میں راہنمائی کی ضرورت ہو تو اس ذخیرہ سے استفادہ کر سکیں۔ اس مرحلہ کے بعد طالب علم کو فاضل کی سندی دی جائے۔

4. اس کے بعد چوتھا درجہ تخصصات کا ہے اور ایک بڑے جامعہ میں کسی بھی اسلامی موضوع پر تخصص کی سہولت موجود ہونی چاہیے، لیکن چند مضامین دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق بہت زیادہ اہم ہیں اور ان میں تخصص کے شعبوں کا قیام ازبس ضروری ہے۔

مذاہب باطلہ

عیسائیت، یہودیت، ہندوازم، بدھ مت اور دیگر مذاہب سے اس کا ذوق رکھنے والے علماء کو مکمل واقفیت کرائی جائے، لیکن صرف اعتقادی مباحث کو مناظرانہ انداز میں رٹانے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے تاریخی تناظر، تہذیبی تصادم اور موجودہ دور میں ان کے مابین درپیش عملی مسائل سے بھی ان کو روشناس کرایا جائے۔

فقہی مذاہب

احناف، شوافع، حنابلہ، مالکیہ اور دیگر فقہی مذاہب سے اپنے علماء اور طلبہ کو اپنی فقہ کی ترجیحی بنیادوں اور دلائل سے واقف کرانا چاہیں تو یہ بہت بہتر ہے بلکہ اس کا بہت بڑا حصہ احادیث کی کتابوں کی تدریس میں خود بخود آجاتا ہے، لیکن اس کا

دائرہ فقہی اور فروعی ہی رکھا جائے اور ان فقہی مذاہب کے مابین محاذ آرائی کی فضا پیدا کرنے سے گریز کیا جائے۔

تاریخ اسلام

تاریخ اسلام کو دوسرے درجہ کے نصاب میں شامل کرنے کی تجویز پہلے گزر چکی ہے، لیکن وہاں صرف تاریخ سے واقفیت مراد ہے، جبکہ علماء اسلام کے ایک طبقہ کی تاریخ کے تقابلی مطالعہ پر گہری نظر ہونی چاہیے اور اس میں تخصص کا شعبہ ضروری ہے۔ بالخصوص آج کے دور میں ایک عالم دین کے لیے دور نبوی، خلافت راشدہ، صلیبی جنگوں، یورپ میں جدید فلسفہ اور کلیسا کی تاریخی کشمکش اور مسلم ممالک پر استعماری قوتوں کے قبضہ کے دوران وہاں کی دینی تحریکات سے آگاہی انتہائی ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ سمجھ نہیں سکتا کہ آج کے دور میں دعوت اسلام کا تقاضا کیا ہے اور اسلام کی بات کو اس نے کس انداز میں پیش کرنا ہے۔

خطابت و دعوت

خطیب اسلام کا داعی ہے، وہ اسلام کی دعوت، پیغام اور احکام کو معاشرہ کے سامنے پیش کرتا ہے، اس لیے اسے خطابت اور دعوت دونوں کے تقاضوں سے بہرہ ور ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے تخصص کے ایک مستقل شعبہ کا قیام ضروری ہے۔

افتاء

فقہ وافتاء میں تخصص کے شعبے پاکستان کے بڑے جامعات میں موجود ہیں، اس طرز پر یہاں بھی یہ شعبہ قائم ہونا چاہیے جو یہاں کی معاشرتی ضروریات کو سامنے رکھ کر تشکیل دیا جائے۔

میڈیا

الیکٹرانک میڈیا اور اخبارات و جرائد آج کے دور میں ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں بلکہ رائے عامہ پر دراصل انہی کا کنٹرول ہوتا ہے، اس لیے ان سے صرف نظر ممکن نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ سب ذرائع بیک وقت اختیار کیے جائیں، لیکن جن ذرائع کو استعمال میں لایا جاسکتا ہے انہیں ضرور اختیار کیا جائے

اور اسے ”کیف ما اتفق“ لوگوں کی صوابدید پر نہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ علماء کو اس کی باقاعدہ تربیت دی جائے۔ بالخصوص صحافت کے جدید طرز سے علماء کا واقف ہونا اسی طرح ضروری ہے جیسے خطابت اور دعوت کے اصولوں سے آگاہی لازمی ہے، اور اس مقصد کے لیے بڑے جامعات کو مستقل تربیتی شعبہ قائم کرنا چاہیے۔

اسلام اور دور حاضر

یہ ایک مستقل مضمون ہے، اس لیے کہ کمیونزم کی شکست وریخت کے بعد مغربی دنیا کا سب سے بڑا ہدف اب اسلام ہے اور اسلام کے حقیقی نظریات وافکار کو دبائے رکھنے اور مسلمانوں کی نئی نسل بالخصوص دانشور طبقہ کو مرعوبیت کے حصار میں بند رکھنے کے لیے وہ اپنے تمام وسائل اور صلاحیتیں صرف کر رہی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے مغرب کی سرگرمیوں کا مطالعہ، تجزیہ اور اس کے پھیلائے ہوئے اعتراضات وشبہات کے جوابات کے لیے بڑے دینی جامعات میں الگ شعبے قائم ہونے چاہئیں جن میں اس انتہائی اہم فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ذہین اور ذی استعداد علماء کی تربیت کا بھی اہتمام ہو۔

روحانی تربیت

آخر میں اس پورے تعلیمی نظام کی اصل روح کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جس کے بغیر تعلیم وتدریس کا بڑے سے بڑا نظام بھی بے جان لاشہ ہے، اور وہ ہے تزکیہ نفس اور روحانی تربیت کا اہتمام، جس سے بے اعتنائی نے ہمارے مروجہ تعلیمی نظام کو بڑی حد تک بے ثمر کر رکھا ہے۔ میں نے بہت سخت بات لکھ دی ہے لیکن حالات کا تجزیہ کیا جائے تو اس سے نرم الفاظ اس کی تعبیر کے لیے نہیں ملیں گے۔ یہ درست ہے کہ روحانی سلسلوں میں اہلیت کا معیار کم ہوتا جا رہا ہے اور دکانداریاں بڑھ رہی ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے دستبرداری اختیار کر لی جائے۔ ضرورت کی کوئی چیز اگر بازار میں خالص نہ مل رہی ہو تو اس کی تلاش ترک کر دینا عقلمندی کا راستہ نہیں ہے۔ اس کساد بازاری میں بھی اللہ والے یقیناً موجود ہیں، ان سے علماء اور طلبہ کا تعلق ہونا چاہیے اور مدارس کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک دینی مدارس سے فارغ

التحصیل ہونے والے طالب علم کے لیے دو باتوں میں سے ایک بہرحال ضروری ہے: یا تو اس کا کسی صاحب نسبت بزرگ سے تربیت کا عملی تعلق ہو، یا اس نے تبلیغی جماعت کے ساتھ کچھ وقت لگا رکھا ہو، اس کے بغیر عملی تربیت کا وہ رنگ نہیں چڑھتا جو آج کے معاشرہ میں ایک باکردار عالم دین پر غالب ہونا ناگزیر ہے۔

مولانا محمد کمال خان کا شکر گزار ہوں کہ ان کے توجہ دلانے پر تعلیمی نظام کے بارے میں چند گزارشات قلم بند کرنے کی توفیق مل گئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور ان گزارشات میں جو باتیں صحیح اور مسلمانوں کے لیے مفید ہو، اسے اپنانے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا الہ العالمین۔

شریعت کی تعبیر و تشریح اور علامہ محمد اقبالؒ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ جون ۱۹۹۲ء)

ان دنوں قومی اخبارات میں ”عورت کی حکمرانی“ کے بارے میں بحث کا سلسلہ چل رہا ہے اور عورت کی حکمرانی کے جواز اور عدم جواز پر دونوں طرف سے اپنے اپنے ذوق کے مطابق دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔ جو حضرات عورت کی حکمرانی کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے وہ اپنے موقف کے حق میں قرآن کریم کی آیت کریمہ ”الرجال قوامون علی النساء“ کے علاوہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدّد ارشادات اور امت کا چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل پیش کر رہے ہیں، جبکہ جواز کے قائل حضرات قرآن و سنت کے ارشادات کی تاویلات کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے چند جزوی واقعات اور بعض اہل علم کے انفرادی اقوال کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس بحث کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور کیا امت مسلمہ کے اہل علم اس بحث کی روشنی میں اپنے چودہ سو سالہ اجتماعی موقف اور تعامل سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی سردست ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن اس ضمن میں موقر قومی روزنامہ جنگ کے محترم کالم نگار جناب عبد اللطیف سیٹھی نے جنگ لاہور، ۱۲ جون ۱۹۹۲ء میں مطبوعہ کالم کے ذریعے اس بحث کو ختم کرنے کی جو تجویز پیش فرمائی ہے، اس کا جائزہ لینا بہرحال ضروری ہے۔

جناب سیٹھی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ عورت ایک اسلامی ملک کی سربراہ ہو سکتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال نے کسی جگہ تحریر کر دیا ہے کہ عورت خلیفہ ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ سیٹھی صاحب کا یہ ارشاد بھی ہے کہ چونکہ علماء کی اکثریت نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں حصہ نہیں لیا تھا اور پاکستان ان کی مرضی کے خلاف علامہ اقبال کی سوچ کے مطابق بنا ہے، اس لیے پاکستان میں دین کی وہی تشریح قابل قبول ہوگی جو علامہ اقبال نے کی ہے۔ چنانچہ اس پس منظر میں عبداللطیف سیٹھی صاحب نے فرمایا ہے کہ:

> ”حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی ایک انگلش تحریر میں فرمایا تھا کہ عورت بطور خلیفہ الیکشن میں منتخب ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ صاف الفاظ میں یہ بات اب نہیں ہو سکتی اور اس مسئلہ پر اب بحث ختم ہونی چاہیے۔ آخر کسی ایک کو اتھارٹی تو ماننا ہی پڑے گا اور اقبالؒ سے بڑی اسلامی امور پر اندریں زمانہ کوئی اتھارٹی نہیں ہو سکتی۔“

جہاں تک قیام پاکستان کی جدوجہد کا تعلق ہے، جناب عبداللطیف سیٹھی اور ان کے ہمنوا ایک عرصہ سے رائے عامہ کو یہ مغالطہ دینے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ علماء کی اکثریت نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی جبکہ یہ بات تاریخی حقائق اور واقعات کے یکسر منافی ہے اور اس کو بار بار دہرائے چلے جانے کا مقصد تاریخ کے ریکارڈ کو خراب کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت جمعیت علمائے ہند اور اس کے ساتھ مجلس احرار اسلام نے بھی تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور انہیں اس مخالفت پر آج بھی کوئی ندامت نہیں ہے، کیونکہ جن خدشات و شبہات کی بنیاد پر وہ قیام پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، قیام پاکستان کے بعد کی پینتالیس سالہ تاریخ نے ان میں سے کسی ایک کی بھی نفی نہیں کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام کی بڑی بڑی جماعتیں اور اکابر علماء قیام پاکستان کی جدوجہد میں عملاً شریک رہے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا اطہر علیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ میں سے کس بزرگ کی خدمات کی تحریک پاکستان سے نفی کی جا سکتی ہے؟ ان میں سے بعض بزرگ تو وہ ہیں کہ جن کی شبانہ روز محنت کے بغیر مسلم لیگ صوبہ سرحد اور سلہٹ کا ریفرنڈم جیتنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ان اکابر علماء کے ساتھ علماء اور کارکنوں کی ایک کھیپ تھی جس نے ہر جگہ قیام پاکستان کے لیے ان تھک محنت کی اور یہ کہنا

بے جا نہ ہو گا کہ تحریک پاکستان کا اسلامی اور نظریاتی تشخص ان علماء اور کارکنوں کی وجہ سے ہی عام مسلمانوں کے ذہنوں میں قائم ہوا، ورنہ تحریک پاکستان کی اصل قیادت کے ذہنی رجحانات اور نظریاتی اعتبار کے بارے میں تو مسلم لیگی راہنماؤں جناب میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، جناب سردار شوکت حیات اور جناب راجہ صاحب محمود آباد کے ان اعترافات کے بعد کسی تبصرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ قیام پاکستان کا مقصد صرف ہندوؤں کے معاشی تسلط سے نجات حاصل کرنا تھا، جبکہ اسلامی نظام اور لا الہ الا اللہ کا نعرہ صرف عام مسلمانوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔

اس لیے محترم جناب عبد اللطیف سیٹھی اور ان کے ہمنواؤں سے بصد احترام گزارش ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر ارد گرد کے تاریخی حقائق کا ادراک کریں اور علماء کی اکثریت پر تحریک پاکستان کی مخالفت کا بے بنیاد الزام دہراتے چلے جانے کی بجائے معروضی حقائق کو تسلیم کرنے کی روش اختیار کریں۔ آخر جب بانی پاکستان نے مبینہ طور پر قیام پاکستان کے موقع پر پاکستان کا قومی پرچم کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے ہاتھوں لہرا کر تحریک پاکستان میں علماء کے کردار کا عملاً اعتراف کر لیا تھا تو قائد اعظم مرحومؒ کے نام کی مالا جپنے والے ان قلمکاروں کو اس قدر واضح حقیقت کے تسلیم کرنے میں کون سا حجاب مانع ہے؟

رہی یہ بات کہ چونکہ علامہ اقبالؒ نے فرما دیا ہے کہ عورت خلیفہ ہو سکتی ہے اس لیے اس بات کو آخری سمجھا جائے اور عورت کی حکمرانی کی بحث کو ختم کر دیا جائے، تو میں یہ بات دوٹوک اور واضح الفاظ میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس بات سے نہ صرف یہ کہ کلیتاً انکار ہے بلکہ ہم اسے دوبارہ سننے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ دین میں آخری بات صرف اور صرف جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور اس ذات گرامی کے بعد پوری امت میں کوئی شخصیت بھی ایسی نہیں ہے جس کی بات کو صرف اس لیے آخری اور حتمی قرار دیا جائے کہ چونکہ انہوں نے یہ بات کہہ دی ہے اس لیے بات ختم، اب کسی اور بحث کی گنجائش نہیں رہی۔ جناب عبد اللطیف سیٹھی کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت حنفی فقہ کی پیروکار ہے۔ خود علامہ اقبال فقہی امور میں حنفی فقہ کے پیروکار تھے اور انہوں نے وصیت نامہ میں اپنے فرزند کو حنفی فقہ کی پیروی کی تلقین بھی فرمائی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہونے اور کہلانے کے باوجود

امام اعظمؒ کی ہر بات کو صرف اس لیے تسلیم نہیں کر لیتے کہ چونکہ یہ بات امام صاحبؒ نے فرما دی ہے، اس لیے حرف آخر ہے۔ اہل علم احنافؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اقوال پر بحث کرتے ہیں، شرعی دلائل کی روشنی میں ان کا جائزہ لیتے ہیں اور بہت سے مسائل ہیں جن میں احناف دلائل کی بنیاد پر امام صاحبؒ کے قول کی بجائے ان کے تلامذہ میں سے کسی کے قول کو قبول کرتے ہیں۔ اس لیے جب ”حرف آخر“ کی حیثیت امام صاحبؒ کو حاصل نہیں ہے جو خود علامہ اقبالؒ کے بھی امام ہیں، تو علامہ اقبال کی اس حیثیت کو آخر کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟ حرف آخر کی حیثیت صرف پیغمبر کی ہوتی ہے جس کے علم کا سرچشمہ وحی الٰہی ہوتی ہے، اس لیے جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے بعد نہ کسی شخصیت کے لیے نبوت اور وحی کا امکان تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کی بات کو حرف آخر کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی قومی خدمات، امت کے مسائل پر ان کی گہری نظر اور ملت کی بہتری کے لیے ان کے جذبات و احساسات سے انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن ان کی شخصیت اور خدمات کے تمام تر اعترافات کے باوجود شرعی معاملات میں ان کے اقوال و ارشادات کو اسی طرح شرعی دلائل کی روشنی میں پرکھا جائے گا جس طرح امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام حسنؒ، امام زفرؒ اور دوسرے ائمہ کے اقوال و ارشادات کو پرکھا جاتا ہے، اور جو بات بھی مسلمہ شرعی معیار پر پوری نہیں اترے گی، اسے قطعی طور پر رد کر دیا جائے گا۔ اس میں نہ علامہ اقبالؒ کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہے اور نہ ہی پاکستان کے قیام میں ان کے قائدانہ کردار پر کوئی حرف آتا ہے۔ یہ علمی مسائل ہیں جہاں علمی اصول و ضوابط کی فرماں روائی ہے۔ انہیں سیاسی طعن و تشنیع اور الزام کی زبان میں حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ الجھنیں ضرور پیدا ہوں گی جن سے پریشان ہو کر عبداللطیف سیٹھی صاحب عورت کی حکمرانی کی بحث کو ختم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔

یہاں اجتہاد کی ماہیت، اس کے دائرہ کار اور اس کے لیے اہلیت کے معیار کے بارے میں چند امور کی وضاحت از حد ضروری ہے کیونکہ اجتہاد کا جو مطلب و مفہوم آج عام طور پر سمجھا جا رہا ہے، شرعاً اس پر اجتہاد کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ شریعت نے اجتہاد کے کچھ اصول و ضوابط متعیّن کیے ہیں جن کا لحاظ قیاس اور اجتہاد کے نام پر کیے جانے والے ہر عمل میں لازماً کیا جائے گا۔

آج کل عام طور پر یہ سمجھا اور کہا جا رہا ہے کہ قرآن و سنت کے جس حکم پر عملدرآمد میں کوئی وقتی یا عارضی معاشرتی مشکل پیش آجائے، علمائے کرام باہم مشورہ کے ساتھ اس حکم کو ضرورت کے مطابق تبدیل کر دیں، اس کا نام اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا یہ مفہوم کوئی نیا نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کے ہاں یہی اجتہاد رائج تھا اور علمائے بنی اسرائیل لوگوں کے مطالبات پر زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر شرعی احکام میں اسی قسم کی تبدیلیاں کیا کرتے تھے، لیکن قرآن کریم نے اس عمل کو اجتہاد کی بجائے تحریف کا نام دیا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل کے جدت پسند لوگوں کے مطالبات اور مصلحت پسند علماء کی انہی کارروائیوں کے نتیجے میں تورات، زبور اور انجیل اصلی شکل میں موجود نہیں رہیں اور انبیائے بنی اسرائیل کی پیش کردہ شریعتوں کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کے برعکس جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اجتہاد کا تصور دیا ہے، وہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت کے مطابق یوں ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن و سنت کا حکم واضح نہ ہو، اس میں اہل علم قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں کوئی فیصلہ کر لیں۔ یہ اجتہاد حق ہے اور کسی بھی دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا گیا۔ لیکن جب نئے پیش آمدہ مسئلے کا فیصلہ قرآن و سنت کی روشنی میں کرنا ہے تو منطقی طور پر ضروری ہے کہ فیصلہ کرنے والا شخص یا افراد قرآن و سنت کی روشنی سے بہرہ ور ہوں، اور قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ علوم کی اس درجہ کی مہارت رکھتے ہوں کہ وہ ان کی روشنی میں مسائل و احکام کا استنباط کر سکیں۔

گزشتہ دنوں محترم جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دیا جائے اور قوم کے منتخب نمائندے مل بیٹھ کر اجتہادی امور پر فیصلہ دیں۔ ہم نے اس تجویز سے اتفاق کیا تھا اور عرض کیا تھا کہ صرف ایک شرط کے ساتھ ہم اس تجویز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی مطلوبہ اہلیت کو شرط قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ جس پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن کریم کا ناظرہ پڑھنا بھی شرط نہیں ہے، اسے قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کی ذمہ داری سونپ دینا قرآن و سنت کے ساتھ تو مذاق ہو گا ہی، خود اس پارلیمنٹ کے ارکان پر صریح ظلم ہو گا۔ ہاں اگر الیکشن رولز میں ترمیم کر کے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کو شرط قرار دے دیا جائے تو ہمیں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے اور اسے بخوشی تسلیم کرنے میں کوئی حجاب نہیں ہو گا۔ جبکہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کا معیار بھی ہم تجویز نہیں کرتے،

سپریم کورٹ، وفاقی شرعی عدالت، اور اسلامی نظریاتی کونسل، تینوں باوقار آئینی ادارے ہیں، ان میں سے کسی ایک ادارے سے استصواب کرلیا جائے وہ اجتہاد کی اہلیت کے لیے جو معیار مقرر کرے اسے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے شرط بنا دیا جائے۔ اس اصولی اور ناگزیر منطقی تقاضے کو نظر انداز کرکے اجتہاد کے نام پر جو عمل کیا جائے گا وہ بنی اسرائیل کے عمل تحریف سے مختلف نہیں ہوگا۔

اجتہاد کے بارے میں ضروری گزارش کے بعد اب ہم اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ اجتہاد اور قیاس کے حوالے سے عورت کی حکمرانی کے مسئلہ کی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ عورت کی حکمرانی کے جائز نہ ہونے پر قرآن کریم کی جو آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات پیش کیے جارہے ہیں، وہ واضح ہیں یا نہیں؟ اگر وہ واضح اور صریح ہیں تو پھر یہ مسئلہ اجتہاد کے دائرے میں نہیں آتا اور اجتہاد کے نام پر اس میں کسی ردوبدل کی حمایت علمی طور پر نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات پرکھنے کا ہمارے پاس پیمانہ بھی موجود ہے کہ امت مسلمہ اور اس کے اہل علم نے مجموعی طور پر ان آیات و احادیث سے کیا مفہوم مراد لیا ہے؟ اس معیار پر جب ہم ان آیات و احادیث کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت واشگاف صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے کہ امت مسلمہ کے تمام معروف مفسرین و محدثین اور تمام مکاتب فکر کے نامور مجتہدین و فقہاء ان آیات و احادیث سے عورت کی حکمرانی کے عدم جواز پر استدلال کرتے ہیں اور احناف، شوافع، مالکیہ، حنابلہ، ظاہریہ اور اہل تشیع کے کسی معروف محدث، مفسر، فقیہ یا مجتہد نے ان آیات و احادیث کے اس اجتماعی مفہوم سے اختلاف نہیں کیا، جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہ آیات و احادیث عورت کی حکمرانی کے عدم جواز پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں اور قرآن وسنت کی صراحت کے بعد اس مسئلہ میں اجتہاد کا کوئی دخل باقی نہیں رہ جاتا۔

پھر اگر اس اصول سے کسی حد تک صرف نظر کرتے ہوئے آیات و احادیث کی تشریح و تعبیر اور ان سے احکام و مسائل کے استنباط و استخراج کی حد تک اجتہاد کی گنجائش تسلیم بھی کرلی جائے تو یہ اجتہاد ہو چکا ہے، کیونکہ تمام مکاتب فکر کے مجتہدین ان آیات و احادیث سے یہ مسئلہ مستنبط کرچکے ہیں کہ شریعت اسلامیہ کی رو سے عورت کسی مسلم ریاست میں حکمرانی کے منصب پر فائز نہیں ہوسکتی۔ اور یہ کسی ایک دور کا اجتہاد نہیں، چودہ سو سال کے تمام ادوار کا اجتماعی اجتہاد ہے۔ اب اس مسئلہ پر اجتہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل

اس چودہ سو سالہ اجتماعی تعبیر و تشریح اور متفقہ اجتہاد پر نظر ثانی اور اسے ''ری اوپن'' کرنے کا عمل کہلائے گا۔ اجتہاد پر نظر ثانی اور اسے ری اوپن کرنے کی بھی کچھ شرائط ہیں اور اس کے کچھ عملی تقاضے ہیں۔ اگر ہمارے دوستوں کے پاس امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل کو ری اوپن کرنے کی کوئی بنیاد موجود ہے تو اسے سامنے لائیں اور اس سے علمی بحث کا آغاز کریں تاکہ اس بحث کا کوئی علمی فائدہ مرتب ہو اور بحث منطقی طور پر آگے بڑھ سکے۔ ورنہ جزوی واقعات، دور از کار تاویلات اور مرجوح اقوال کے سہارے ایک بات پر ضد کیے چلے جانا عام آدمی کے ذہن میں تو شاید تشویش پیدا کر سکے، علمی دنیا میں اس کا قطعاً کوئی وزن نہیں ہو گا۔

۱۹۹۰ء

شریعت بل، پارلیمنٹ کی خود مختاری اور اجتہاد

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۰ء)

صدر مملکت کی طرف سے قومی اسمبلی توڑے جانے کے بعد عوامی سطح پر شریعت بل کے بارے میں بحث و تمحیص کا سلسلہ اگرچہ وقتی طور پر رک گیا ہے اور شریعت بل کی منظوری اور نفاذ کے بارے میں لوگ ۲۴ اکتوبر کو معرض وجود میں آنے والی قومی اسمبلی کا انتظار کر رہے ہیں، لیکن اہل دانش کے ہاں شریعت بل پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ ملک کے دو معروف قانون دانوں ریٹائرڈ جسٹس جناب جاوید اقبال اور جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کے مضامین گزشتہ دنوں روزنامہ جنگ کے ادارتی صفحات کی زینت بنے ہیں جن میں شریعت بل کے حوالہ سے چند نکات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کے اہم نکات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ تصویر کے دونوں رخ قارئین کے سامنے رہیں اور انہیں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے مضمون میں جن نکات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، وہ یہ ہیں:

- تحریک پاکستان میں عوام نے علماء کی سوچ کو مسترد کر کے علامہ محمد اقبال اور قائداعظم کی سوچ کو اپنایا تھا، اس لیے پاکستان میں اسلام کا نفاذ علماء کی بجائے علامہ اقبال اور قائداعظم کی سوچ اور فکر کے مطابق ہونا چاہیے۔
- عصر حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اسلامی احکام میں وسیع تر اجتہاد کی ضرورت ہے اور علماء مختلف وجوہ کی بنا پر اجتہاد کی صلاحیت سے بہرہ

ور نہیں رہے، اس لیے دین کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کے تمام تر اختیارات منتخب پارلیمنٹ کے حوالہ کر دینے چاہئیں۔

- پارلیمنٹ کی بالادستی سے شریعت کی توہین ہوتی ہے اور شریعت کی بالادستی سے پارلیمنٹ کی خود مختاری مجروح ہوتی ہے، اس لیے قانون نفاذ شریعت میں "قطع و برید" کر کے کوئی درمیانی راہ نکالنی چاہیے۔

جب کہ جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کے اٹھائے ہوئے زیادہ نکات درج ذیل ہیں:

- قرارداد مقاصد میں کسی جگہ بھی شریعت کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، اس لیے شریعت بل کا قرارداد مقاصد کے ساتھ تعلق جوڑ کر علمائے کرام قرارداد مقاصد کی غلط تشریح کر رہے ہیں۔
- جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے قرارداد مقاصد کو آئین کا واجب العمل حصہ بنا کر غلطی کی ہے کیونکہ سیاسی حالات کے مدوجزر میں آئین کے ٹوٹنے اور معطل ہونے کا خطرہ رہتا ہے، اس لیے قرارداد مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا کر اسے بھی معرض خطر میں ڈال دیا گیا ہے۔

جہاں تک تحریک پاکستان میں علماء کی سوچ کو عوام کی طرف سے مسترد کیے جانے کا تعلق ہے، ہمیں افسوس ہے کہ تاریخی حقائق اس دعوے میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال کا ساتھ نہیں دے رہے، کیونکہ علماء کے ایک طبقہ نے تحریک پاکستان کی ضرور مخالفت کی تھی اور وہ اپنی اس مخالفت پر کسی قسم کا نقاب ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، لیکن علماء ہی کا ایک بہت بڑا طبقہ تحریک پاکستان کے ہراول دستہ کے طور پر قیام پاکستان کی جدوجہد میں شریک تھا۔ آخر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تحریک پاکستان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ اور ان کے ہزاروں رفقاء کے وجود کو کس طرح نظر انداز کر جاتے ہیں جو نہ صرف تحریک پاکستان کی صف اول میں شامل تھے بلکہ صوبہ سرحد اور سلہٹ میں پاکستان کے حق میں ریفرنڈم جیتنے میں انہی علماء کا رول بنیادی اور فیصلہ کن رہا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو حقائق کی بالکل صحیح ترجمانی ہوگی کہ تحریک پاکستان کے نظریاتی اور اسلامی تشخص پر عوام کا اعتماد انہی علماء و مشائخ کی بدولت قائم ہوا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ علامہ محمد اقبالؒ اور قائد اعظمؒ اسلام

کی تعبیر و تشریح کے بارے میں جمہور مسلمانوں سے ہٹ کر کسی نئے فکر کے داعی تھے، ان دونوں شخصیات کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ نے دین کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کی عمومی ضرورت کے حوالہ سے اپنے خیالات و افکار پیش کیے ہیں جو عام علماء کے موقف سے مختلف ہیں، لیکن انہوں نے ان افکار و خیالات کو فقہی مذہب اور نئے فکر کے طور پر کبھی پیش نہیں کیا اور نہ ہی اس پر اصرار کیا ہے کہ ان کے خیالات کو من و عن قبول کر لیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس ضمن میں علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی حیثیت تجاویز کی ہے جو انہوں نے علمی حلقوں کے سامنے پیش کیں اور علمی حلقوں کا اجتماعی طرز عمل شاہد ہے کہ انہوں نے علامہ محمد اقبالؒ کے تمام تر احترام کے باوجود ان تجاویز کو قبول نہیں کیا، لیکن اس توازن کے ساتھ کہ نہ تو ان شاذ افکار کی بنیاد پر علامہ محمد اقبالؒ کو اپنے روایتی طرز تنقید کا ہدف بنایا ہے اور نہ ہی ان کے افکار کو من و عن قبول کیا ہے۔

جمہور اہل علم کے اس حق سے ڈاکٹر جاوید اقبال بھی انکار نہیں کریں گے کہ وہ کسی بھی سوچ اور فکر کو، خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کی طرف سے آئی ہو، دین و علم کے مسلمہ اصول و ضوابط سے ہٹا ہوا دیکھیں تو اسے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔ کیونکہ جب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب علامہ محمد اقبالؒ کے حوالہ سے اپنے لیے یہ حق مانگتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متفقہ اور اجماعی فیصلوں کو مصلحت وقت کے موافق نہ پائیں تو قبول نہ کریں، تو علامہ محمد اقبالؒ کی کسی سوچ اور رائے کی حیثیت صحابہ کرامؓ کے اجماع سے زیادہ تو نہیں ہے کہ اسے ہر صورت قبول کرنے پر اصرار کیا جائے اور کسی کو اس سے اختلاف کا حق نہ دیا جائے۔ پھر جب بات جمہوریت کی ہے تو یہ اصول اہل علم کے لیے کیوں نہیں ہے اور ملک کے جمہور اہل علم اور اہل دین کے مقابلہ میں ایک شخصی رائے پر اصرار کیوں کیا جا رہا ہے؟

بہرحال ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبالؒ دین میں تعبیر و تشریح کے حوالہ سے کسی نئے فقہی مذہب اور مکتب فکر کے بانی اور داعی نہیں تھے، نہ انہوں نے اس کا دعویٰ کیا، نہ اس کے لیے حلقہ بنایا اور نہ ہی عامۃ الناس کو دعوت دی کہ وہ علماء کی بیان کردہ تشریح دین کو مسترد کر کے ان کے اس مبینہ مکتب فکر کو قبول کریں۔ بات صرف اتنی تھی کہ علامہ محمد اقبالؒ نے ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ اپنے افکار و خیالات کو تجاویز کی صورت میں اہل علم کے سامنے پیش کیا لیکن جمہور اہل علم نے مرحوم کے خلوص،

جذبہ خیر خواہی اور احترام کے باعث انہیں خاموشی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جس سے بات ختم ہو گئی۔ لیکن اب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تاریخ کے حوالے ہو جانے والے اس مسئلہ کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنے قابل صد احترام مرحوم والد کے کندھے پر رکھ کر ایک نئے مکتب فکر کے قیام کی بندوق داغنے کے درپے ہیں یہ تو خود علامہ محمد اقبالؒ کے ساتھ زیادتی ہو گی۔

باقی رہی بات تحریک پاکستان کی تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کا اسلامی اور نظریاتی تشخص مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ اور ان کے اہل علم رفقاء سے وابستہ ہے، اس لیے پاکستان میں اسلام کی تعبیر و تشریح انہی اصول و ضوابط کے مطابق ہو گی جن کے یہ مذکورہ بالا اہل علم داعی ہیں اور وہ اصول و ضوابط ان حضرات کے طے کردہ نہیں ہیں، بلکہ چودہ سو سال سے امت کا اجماعی تعامل انہی اصولوں پر ہے اور آج بھی پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے جمہور اہل علم ان اصول و ضوابط کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب آئیے اجتہاد کی عمومی ضرورت اور پارلیمنٹ کو اس کا حق دینے کے سوال کی طرف۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ آج کے دور میں بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر وسیع تر اجتہاد کی ضرورت ہے، علماء بھی اس ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اجتہاد کر بھی رہے ہیں۔ ملک کے ہر بڑے جامعہ اور دار العلوم میں دار الافتاء موجود ہے اور مفتیان کرام روزمرہ پیش آمدہ مسائل و امور پر فتوے جاری کر رہے ہیں۔ ان فتاوی میں جمود نہیں ہے بلکہ اجتہاد و تحرک پوری طرح کارفرما ہے۔ مفتیان کرام عمومی ضروریات اور مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے پیش رو فقہائے کرام کے فیصلوں سے اختلاف بھی کر رہے ہیں اور بوقت ضرورت دوسرے فقہی مذاہب کے فیصلوں کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نئی آرا بھی قائم کر رہے ہیں۔ دینی اداروں کے شعبہ ہائے فتاوی سے ہٹ کر قومی سطح پر اسلامی نظریاتی کونسل کے پلیٹ فارم پر نفاذ اسلام کے لیے جو علمی کام گزشتہ دس سال کے دوران ہوا ہے، اس میں تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے مل بیٹھ کر پیش آمدہ مسائل کا حل نکالا ہے، مسودات قانون ترتیب دیے ہیں اور متعدّد نئے فقہی نکات اٹھائے ہیں۔

اجتہاد اسی کا نام ہے اور اجتہاد کا یہ عمل انفرادی اور اجتماعی سطح پر جاری وساری ہے، جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت میں علمائے کرام نے اجتہاد اور تعبیر دین کے اس عمل میں جدید قانون دان حضرات کے ساتھ اشتراک کو فراخ دلی کے ساتھ قبول کیا ہے اور مل جل کر اجتہاد کے اس عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ''شریعت بل'' کے ذریعے قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کے تمام تر اختیارات وفاقی شرعی عدالت کے حوالے کر دیے ہیں جس میں عصری قانونی ماہرین کو علماء پر عددی برتری حاصل ہے۔ یہ متواتر پیشرفت اس امر کی شاہد ہے کہ علماء نہ تو فقہی جمود کے قائل ہیں، نہ اجتہاد کی راہ میں رکاوٹ ہیں، اور نہ ہی اجتہاد اور تعبیر دین پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے درپے ہیں۔ البتہ وہ یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ اجتہاد کے عمل کو صحیح طور پر آگے بڑھانے کے لیے دو امور کی پابندی بہر حال ضروری ہے: ایک اجتہاد کا دائرہ کار اور دوسرا اجتہاد کی اہلیت۔ کیونکہ ان دو باتوں کا لحاظ رکھے بغیر اجتہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل اجتہاد نہیں ہوگا، بلکہ الحاد اور زندقہ کی حدود میں داخل ہو جائے گا۔

اجتہاد کا دائرہ کار خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ والی حدیث میں متعیّن فرما دیا ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح حکم نہ ہو اس میں مجتہد کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے صریح احکام دائرہ اجتہاد سے خارج ہیں اور ان میں اجتہاد کے نام پر کسی قسم کے ردوبدل کی گنجائش نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص یا ادارہ قرآن وسنت کے کسی صریح حکم کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اور اسے ''اجتہاد'' کا نام دیتا ہے تو علماء اسے تسلیم نہیں کرتے اور اسے الحاد قرار دیتے ہیں، لیکن ہمارے مہربانوں کو شکوہ ہے کہ علماء جمود کے قائل ہیں اور اجتہاد سے انکار کر رہے ہیں۔

اجتہاد کے ضمن میں دوسرا بنیادی پہلو ''اہلیت'' کا ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن و سنت کی تشریح وتعبیر کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت ضروری ہے۔ ایک شخص جو قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیث رسول کا کوئی جملہ پڑھ کر براہ راست اس کا مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر ہے، اسے قرآن وسنت کا شارح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے جس پر کسی دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ امام ولی اللہ دہلویؒ نے تو اجتہاد کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت کا بہت بلند معیار بیان کیا ہے اور ''ازالۃ الخفاء'' میں اجتہاد کی اہلیت

کے لیے ایک درجن سے زائد علوم کی مہارت کو شرط قرار دیا ہے۔ ان کی یہ بات بالکل منطقی اور معقول ہے جس کی تفصیل میں جائے بغیر صرف ایک مثال سے ہم اپنے موقف کو واضح کریں گے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیگر ضروری علوم کی مکمل مہارت کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حالات زندگی پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ کیونکہ بسا اوقات اس کے سامنے کسی مسئلہ میں جناب نبی اکرمؐ کے دو یا تین متفاوت ارشادات یا عمل آئیں گے، اس نے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان میں سے آخری عمل کو ناسخ قرار دے کر قبول کرے گا اور باقی کو منسوخ سمجھے گا۔ اب وہ آخری عمل کا فیصلہ کیسے کرے گا؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے جناب رسالت مآبؐ کے ارشادات اور احوال سے اس قدر واقفیت حاصل ہو کہ وہ آپ کے اعمال میں واقعاتی ترتیب قائم کر سکے اور یہ فیصلہ کر سکے کہ پہلا عمل کون سا ہے اور آخری عمل کون سا ہے، اس کے بغیر یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے جو بات سمجھانے کے لیے عرض کی گئی، ورنہ جن چودہ علوم کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اجتہاد کی اہلیت کے لیے شرط قرار دیا ہے، ان میں سے ہر علم مجتہد کے لیے منطقی اور بدیہی طور پر اسی طرح ضروری ہے۔ اس پس منظر میں جب پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کی بات کی جاتی ہے تو علماء کو اس میں تامل ہوتا ہے اور وہ تامل بلاوجہ نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے ضروری علوم کی مہارت تو کجا، قرآن کریم کو سادہ ترجمہ کے ساتھ سمجھنا بھی شرط نہیں ہے۔ آخر ایک ایسے ادارہ کے لیے، جس کے ارکان کی غالب اکثریت قرآن وسنت سے ناواقف ہے اور جس کی رکنیت کے لیے قرآن کریم کا سادہ ترجمہ جاننا بھی شرط نہیں، قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کا حق علماء آخر کیسے تسلیم کر لیں؟

پھر اہلیت کا یہ صرف ایک پہلو ہے کہ اجتہاد کا حق صرف اسے ہے جسے ضروری علوم پر مہارت حاصل ہو۔ اس کا دوسرا پہلو خدا خوفی اور تقویٰ کا بھی ہے جو علمی اہلیت کے ساتھ اسی سطح پر ضروری ہے۔ ہمارے فقہاء کے ہاں تو خدا خوفی اور تقویٰ کا یہ معیار رہا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ اپنے قرض خواہ کے مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے کہ اس طرح قرض کے ساتھ سایہ دیوار میں کھڑا ہونے کا نفع شامل ہو

جائے گا جو سود بن سکتا ہے۔ ان مجتہدین کے اجتہاد کا حق ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس پارلیمنٹ کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں جس کی ''ہارس ٹریڈنگ'' کے قصے دنیا بھر میں ہماری قومی رسوائی کا باعث بن رہے ہیں۔ لیکن علماء کو اس سے بھی انکار نہیں ہے، اگر وہ وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے لیے اجتہاد کا حق تسلیم کر سکتے ہیں تو پارلیمنٹ کے سامنے سپر انداز ہونے میں بھی انہیں کوئی حجاب نہیں ہے۔ البتہ اجتہاد کے دائرہ کار اور اہلیت کے اصولوں سے دستبردار ہونے کے لیے وہ کسی صورت میں تیار نہیں ہیں اور اس کے لیے دو امور کو آئینی طور پر قطعیت کے ساتھ طے کرنا ہوگا۔ ایک یہ کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے صریح احکام میں ردوبدل کی مجاز نہیں ہوگی اور دوسرا یہ کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن و سنت کی ضروری واقفیت شرط ہوگی۔

محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ان دو امور کو تسلیم کر لیں تو پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے بارے میں ان کے موقف کو قبول کرنے کے لیے ہم تیار ہیں، بلکہ اجتہاد کی اہلیت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بیان کردہ سخت شرائط پر بھی ہمیں زیادہ اصرار نہیں ہوگا۔ اور اس ضمن میں بھی ہم اسلامی نظریاتی کونسل یا وفاقی شرعی عدالت کا یہ استحقاق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کا حق دینے کا مقصد سامنے رکھ کر پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن و سنت سے واقفیت کا معیار طے کر دیں۔ لیکن ان بنیادی امور کو ملحوظ رکھے بغیر اگر پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کا حق دیا جاتا ہے اور پارلیمنٹ اسے استعمال کرتی ہے تو ہمارے نزدیک پاپائے روم کی بائیبل میں ردوبدل کا حق رکھنے والی کونسلوں کے فیصلوں، اکبر بادشاہ کے درباری اجتہاد کے ذریعے وجود میں آنے والے دین الٰہی، اور اجتہاد کے غیر مشروط حق سے بہرہ ور منتخب پارلیمنٹ کے فیصلوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

اب ہم تیسرے نکتے کی طرف آتے ہیں جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے پارلیمنٹ اور شریعت میں سے کسی ایک کی بالادستی کی صورت میں دوسرے کی حیثیت مجروح ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ اور اس طرح علماء کے اس موقف کو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پارلیمنٹ کی مکمل بالادستی کی صورت میں شریعت کی بالادستی نہیں رہتی اور یہ نہ صرف شریعت کی توہین ہے بلکہ ایک عام مسلمان کے بنیادی عقیدہ کے بھی منافی ہے۔ لیکن اس کا حل ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے قانون نفاذ شریعت پر پارلیمنٹ کی بالادستی

بہرحال قائم رکھنے کی صورت میں تجویز کیا ہے اور اس میں کسی قسم کی لچک کے روادار نہیں ہیں۔ ہمیں ان کے اس موقف سے اختلاف ہے کیونکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا بنیادی عقیدہ ہے کہ قرآن وسنت کو دنیا کے ہر ادارے پر بالادستی حاصل ہے اور کوئی منتخب یا غیر منتخب ادارہ ایسا نہیں ہے جسے قرآن وسنت کے احکام پر بالادستی دی جاسکے۔

اب ہم ملک امجد حسین صاحب ایڈووکیٹ کے اٹھائے ہوئے دو نکات کی طرف آتے ہیں۔ ان کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ قرارداد مقاصد میں ''شریعت'' کا لفظ تک نہیں ہے تو شریعت بل کے لیے اس کا حوالہ کیوں دیا جارہا ہے؟ مگر یہ بات انتہائی سطحی ہے جس کی اتنے بڑے قانون دان سے کم از کم ہمیں توقع نہیں تھی۔ ''شریعت'' کی اصطلاح خود قرآن کریم کی ارشاد فرمودہ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لایعلمون۔ (الجاثیہ ۱۸)

''پھر ہم نے آپ کو دین کے بارے میں شریعت پر قائم کیا ہے، پس آپ اس کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔''

اور قرارداد مقاصد کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

1. مملکت جملہ حقوق و اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے جس میں اصول جمہوریت و حریت و مساوات و رواداری اور عدل عمرانی کو، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

2. مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ انفرادی و اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جو قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں متعیّن ہیں، ترتیب دے سکیں۔

اب آپ خیال فرمائیے کہ قرارداد مقاصد نے دستوری طور پر اسلام کی تشریحات اور قرآن وسنت کی تعلیمات کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے اور قرآن کریم نے ''شریعت'' کی پیروی کا حکم دیا ہے تو شریعت کے قرآنی حکم کو اختیار کرنا قرارداد مقاصد ہی کی تکمیل نہیں تو اور کیا ہے؟

قرارداد مقاصد ایک اصولی دستاویز ہے۔ ملک میں اسلامائزیشن کے لیے جتنے اقدامات بھی ہوں گے، اس قرارداد مقاصد پر عملدرآمد میں پیشرفت شمار ہوں گے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ قرارداد مقاصد میں ان سب کا تفصیلا ذکر بھی ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے

سپریم کورٹ نے قصاص و دیت آرڈیننس جاری کرنے کا حکومت کو پابند کیا ہے اور حکومت چند روز تک آرڈیننس لا رہی ہے۔ اب کوئی شخص یہ کہے کہ قرارداد مقاصد میں تو "حدود و قصاص" کا لفظ نہیں ہے اس لیے اس آرڈیننس کے سلسلے میں قرارداد مقاصد کا حوالہ نہ دیا جائے، تو یہ بالکل غلط بات ہوگی۔ کیونکہ حدود و قصاص کے قانون کا نفاذ بلاشبہ قرارداد مقاصد کی اس شق پر عملدرآمد ہوگا جس میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی پابندی کی ضمانت دی گئی ہے۔

رہا دوسرا نکتہ کہ قرارداد مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا کر معرض خطر میں ڈال دیا گیا ہے تو یہ خدشہ سابقہ تجربات کی بنیاد پر بے بنیاد ہے، کیونکہ پاکستان میں آئین ٹوٹنے اور نئے دستور ترتیب پانے کا افسوسناک عمل اگرچہ متعدّد بار دہرایا گیا ہے، لیکن قرارداد مقاصد کو کوئی دستور بھی نظر انداز نہیں کر سکا اور ہر آئین میں اسے شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ۱۹۴۹ء میں پہلی دستور ساز اسمبلی میں منظور ہونے والی قرارداد مقاصد کو ملک کی ایک بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جسے کسی بھی دور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

قرارداد مقاصد میں پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کو ہمیشہ کے لیے طے کر دینے کے علاوہ خدا کی حاکمیت، قرآن و سنت کی بالادستی، اور اسلامی احکام کی عملداری کی ضمانت دی گئی ہے، اور اسلامائزیشن کی ایک مستحکم اور مضبوط آئینی بنیاد فراہم کر دی گئی ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی طرف سے قرارداد مقاصد کو دستور کا باضابطہ حصہ قرار دیے جانے سے قبل قرارداد مقاصد کو ۱۹۷۳ء سمیت تمام دساتیر میں محض دیباچہ کی حیثیت سے بطور تبرک شامل کیا جاتا رہا ہے، جس پر عملدرآمد آئینی لحاظ سے ضروری نہیں تھا، مگر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت حاصل شدہ اختیارات کی رو سے قرارداد مقاصد کو آئین کا باضابطہ اور قابل عمل حصہ بنا دیا جو قرارداد مقاصد کا اصل دستوری مقام ہے اور بلاشبہ یہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

کیا حضرت عمرؓ نے احادیث بیان کرنے سے منع فرمایا تھا؟

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ ستمبر ۱۹۹۰ء)

سوال: منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں احادیث کی روایت سے منع فرمایا تھا، اس کی کیا حقیقت ہے؟ (عبدالکریم، کوئٹہ)

جواب: یہ بات درست نہیں ہے اور جو روایات ایسی منقول ہیں ان کا مطلب ہرگز وہ نہیں ہے جو منکرین حدیث بیان کرتے ہیں، بلکہ اصل روایات کو ملاحظہ کیا جائے تو مطلقاً منع کرنے کا حکم ہمیں نہیں ملتا بلکہ اس میں روایات کو بکثرت بیان کرنے سے روکا گیا ہے۔ چنانچہ عراق کی طرف روانہ کردہ وفد کو حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ

"فلا تصدوھم بالاحادیث فتشغلوھم جودوا القران واقلوا الروایۃ عن رسول اللہ"

(تذکرۃ الحفاظ للامام ذہبیؒ ج ا ص ۴)

ترجمہ: "انہیں (اہل عراق کو) احادیث کے ذریعے (قرآن سے) نہ روک دینا کہ تم انہیں (احادیث کے ساتھ ہی) مشغول کر دو۔ قرآن کو اچھا کر کے (پڑھو) اور (احادیث) بیان کرنا کم کر دو۔"

اس کی وجہ حافظ ذہبیؒ یہ بیان کرتے ہیں کہ

"وقد کان عمر من وجلہ ان یخطئ الصاحب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یامرھم ان یقلوا الروایۃ عن نبیھم ولئلا یتشاغل الناس بالاحادیث عن حفظ القران۔"

ترجمہ: "عمرؓ نے اس خوف سے کہ رسول اللہ کی طرف بہتان منسوب ہو جائے گا، اصحابؓ کو حکم دیا کہ احادیث کی روایت کو کم کر دیں اور تاکہ لوگ قرآن کو چھوڑ کر احادیث کے ساتھ مشغول نہ ہو جائیں۔"

علاوہ ازیں اگر حضرت عمرؓ کی مراد روایت حدیث سے مطلقاً منع کرنا ہوتی تو لازماً آپ خود بھی احادیث کی روایت نہ کرتے حالانکہ ایک قول کے مطابق حضرت عمرؓ سے ۵۳۷ احادیث مروی ہیں (تاریخ عمرؓ بن الخطاب للامام ابو الفرج جمال الدین ابن الجوزیؒ ص ۱۷۳)۔ پھر حضرت عمرؓ ایک عام راوی نہیں بلکہ پختہ کار محدث تھے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:

"وھو الذی من للمحدثین التثبت فی النقل۔" (تذکرہ ص ۶ ج ۱)

ترجمہ: ”حضرت عمرؓ نے ہی محدثین کو نقل حدیث میں ثابت قدمی کی راہ بتلائی۔“

حافظ ذہبیؒ نے چند واقعات نقل کیے ہیں جو منکرین حدیث کے دعوے کے ابطال پر حجت قاطعہ ہیں۔ یہاں پر ان میں سے ایک نقل کیا جاتا ہے: ابو موسی الاشعریؓ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے گھر آئے اور باہر کھڑے ہو کر تین دفعہ سلام کیا لیکن جواب نہ ملنے پر واپس ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے آدمی بھیج کر آپ کو بلوایا اور پوچھا کہ آپ واپس کیوں لوٹ گئے تھے؟ ابو موسیٰؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا اگر تین دفعہ سلام کرنے پر بھی جواب نہ ملے تو واپس لوٹ آیا کرو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک اور گواہ لاؤ ورنہ میں سزا دوں گا۔ تو ابو موسیٰؓ نے صحابہ میں سے ایک آدمی کو بطور گواہ کے پیش کر دیا یعنی حضرت عمرؓ نے ایک راوی کے ہوتے ہوئے (جو ثقہ بھی تھے) گواہ طلب کیا اور اس کے بعد انہیں اطمینان ہوا۔ الغرض منکرین حدیث کا مذکورہ دعوی بدلائل قاطعہ و براہین ساطعہ باطل ہے۔

عورت کی حکمرانی کی شرعی حیثیت

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور- ۵ جنوری ۱۹۹۰ء)

مرد اور عورت دونوں نسل انسانی کے ایسے ستون ہیں کہ جن میں سے ایک کو بھی اس کی جگہ سے سرکا دیا جائے تو انسانی معاشرہ کا ڈھانچہ قائم نہیں رہتا۔ اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کو اپنی قدرت خاص سے پیدا فرمایا اور ان دونوں کے ذریعے نسل انسانی کو دنیا میں بڑھا پھیلا کر مرد اور عورت کے درمیان ذمہ داریوں اور فرائض کی فطری تقسیم کر دی، دونوں کا دائرہ کار متعیّن کر دیا اور دونوں کے باہمی حقوق کو ایک توازن اور تناسب کے ساتھ طے فرما دیا۔

مرد اور عورت کے درمیان حقوق و فرائض کی اس تقسیم کا تعلق تکوینی امور سے بھی ہے جو نسل انسانی کی تخلیق کے ساتھ ہی طے کر دیے گئے ہیں اور ان میں انسان کوشش بھی کرے تو کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ مثلاً مرد کو اللہ تعالی نے قوت و جاہ، جرأت و بہادری اور سختی و مضبوطی کا پیکر بنایا ہے جبکہ عورت اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے اس کے برعکس ہے، اس میں ملائمت ہے، انفعال ہے، کمزوری ہے اور کسی مضبوط پناہ کے حصار

میں رہنے کا فطری جذبہ ہے۔ یہ ایک ایسا واضح فرق ہے جو زندگی کے تمام افعال و احوال میں جاری و ساری نظر آتا ہے اور جسے کوئی منطق، کوئی سائنس اور کوئی خود ساختہ معاشرتی فلسفہ تبدیل نہیں کر سکتا۔

نسل انسانی کی نشوونما کے لیے خالق کائنات نے مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کو ذریعہ بنایا اور اس ملاپ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے دونوں میں محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ مرد اور عورت کے درمیان محبت کے اظہار میں اللہ تعالی نے مرد کی بالادستی اور عورت کے انفعال کے فطری فرق کو قائم رکھا اور ملاپ میں بھی مرد کو بالادستی بخشی۔ یہ بھی ایسا واضح اور محسوس فرق ہے جس کا نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی منطقی یا سائنسی فارمولا کے ذریعے اسے بدلا جا سکتا ہے۔

نسل انسانی کو بڑھانے کے مشترکہ عمل میں بھی اللہ رب العزت نے دونوں کے فرائض الگ الگ متعیّن کر دیے۔ عورت کے ذمے بچہ کے بوجھ کو پیٹ میں اٹھانا، پیدائش کے بعد اس کو گود میں لینا اور ہوش سنبھالنے تک اس کی تمام چھوٹی موٹی ضروریات و حوائج خود سرانجام دینا ہے۔ جبکہ مرد کو ان تینوں کاموں سے رب العزت نے آزاد رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ باقی امور اس کے ذمہ ہیں کہ وہ بچہ اور اس کی ماں کے اخراجات کا بوجھ اٹھائے گا، ان کی حفاظت و نگرانی کرے گا اور معاشرہ کے ساتھ ان کے رابطہ و تعلق کا ذریعہ بنے گا۔ یہ فرق اور تقسیم بھی ایسی ٹھوس ہے کہ تبدیلی اور تغیر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

یورپی معاشرت نے عورت کی آزادی اور اس کے احترام کی بحالی کے نام سے اس فرق کو مٹانے کی سرتوڑ کوشش کی ہے لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ عورت کی ذمہ داریوں اور فرائض میں اضافہ ہو گیا ہے۔ عورت خود کو بچے کی پیدائش اور پرورش کے بوجھ سے تو آزاد نہیں کرا سکی البتہ اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری میں مرد کے ساتھ شریک ہو گئی ہے۔ اس طرح دنیا بھر میں یورپی معاشرت کے پیروکار مردوں نے مزید کسی ذمہ داری کا بوجھ اپنے اوپر لیے بغیر اپنی ذمہ داریوں کا نصف بوجھ بھی عورت پر ڈال دیا ہے اور ناقص العقل سادہ عورت آزادئ مساوات اور زندگی کی دوڑ میں کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کے خوشنما اور دلفریب نعروں سے دھوکا کھا کر دوہری ذمہ داریوں کے چکر میں پھنس کر رہ گئی ہے۔

اسلام ایک فطری نظام حیات ہے جو اسی خالق و مالک نے عطا فرمایا ہے جس نے مرد اور عورت کے درمیان فرائض و حقوق کی تکوینی تقسیم کی ہے، اسی لیے اسلام کے شرعی اور قانونی احکام کی بنیاد بھی اس تکوینی تقسیم کے فطری تقاضوں پر ہے۔ اور اس وقت دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جو عورت اور مرد کے درمیان حقوق و فرائض کی شرعی اور قانونی تقسیم دونوں کے تخلیقی فرق اور تکوینی ذمہ داریوں کے عین مطابق کرتا ہے اور اس کے ذریعے ایک خوشحال، پرسکون اور پرامن معاشرہ کی ضمانت دیتا ہے۔ ورنہ بیشتر مروجہ معاشرتی اقدار کی بنیاد اس فطری اور تکوینی فرق سے فرار اور انحراف پر ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فرق تو کسی سے مٹ نہیں پا رہا مگر اس سے انحراف اور فرار پر مبنی معاشرتی بے چینی، نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی الجھنوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

یورپی تہذیب و معاشرت نے آزادی اور مساوات کے نام پر جہاں عورت کو اس غلط فہمی میں ڈالا کہ ملازمت کرنا اس کا حق ہے، حالانکہ ملازمت حق نہیں ذمہ داری ہے، اسی طرح حکمرانی اور قیادت کو حقوق کی فہرست میں شامل کر کے عورت کو اس دوڑ میں بھی شریک کر دیا۔ جبکہ اسلام اس فلسفہ کو تسلیم نہیں کرتا، اسلام یہ کہتا ہے کہ گھر کے اخراجات فراہم کرنے کے لیے ملازمت کرنا حقوق سے نہیں بلکہ ذمہ داریوں سے تعلق رکھتا ہے، اور مرد اور عورت کے درمیان ذمہ داریوں کی فطری تقسیم میں یہ ذمہ داری مرد کے کھاتے میں ہے۔ اسی طرح حکمرانی اور قیادت کا شمار بھی حقوق میں نہیں بلکہ ذمہ داریوں اور فرائض میں ہوتا ہے اور اسلام عورت کے طبعی اور فطری فرائض اور ذمہ داریوں سے زائد کسی ذمہ داری اور فرض کا بوجھ اس کے نازک کندھوں پر نہیں ڈالنا چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانی کی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے اور عورت کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ انسانی معاشرت کے اسلامی فلسفہ اور آج کے مروجہ نظریات میں یہی بنیادی فرق ہے کہ اسلام حکمرانی کو ذمہ داری قرار دیتا ہے جبکہ موجودہ سیاسی نظاموں نے اسے حقوق میں شامل کر کے اس خودساختہ حق کے لیے مختلف انسانی طبقات کو مسابقت کی دوڑ میں اس قدر الجھا دیا گیا ہے کہ حقوق و فرائض کے درمیان کوئی خط امتیاز باقی نہیں رہا۔

اس پس منظر میں جب ہم عورت کی حکمرانی کے بارے میں اسلام کے احکام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان لوگوں کی منطق میں کوئی وزن دکھائی نہیں دیتا جو مغرب کی معاشرتی اقدار کو اپنے معاشرے پر منطبق کرنے کے شوق میں نہ صرف مرد اور عورت کے درمیان

مساوات اور عورت کی نام نہاد آزادی کا پرچار کر رہے ہیں بلکہ اس کے لیے اسلام کے واضح احکام کو توڑ موڑ کر پیش کرنے اور انہیں خود ساختہ معانی پہنانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ چنانچہ ان دنوں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک خاتون کی حکمرانی کے حوالہ سے یہ بحث چل رہی ہے کہ شرعاً کسی عورت کو حکمران بنانا درست ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن و سنت اور اجماع امت کی واضح تصریحات کے باوجود کچھ حضرات اس کوشش میں مصروف دکھائی دیتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں سے عورت کی حکمرانی کے جواز میں دلائل کشید کیے جائیں تاکہ مغربی تہذیب و معاشرت کی پیروی کے شوق اور عمل کو شرعی جواز کی چھتری بھی فراہم کی جا سکے۔ اسی لیے یہ ضروری محسوس ہوا کہ عورت کی حکمرانی کے بارے میں شرعی احکام کو وضاحت کے ساتھ قارئین کے سامنے لایا جائے اور ان خود ساختہ دلائل کی حقیقت بے نقاب کر دی جائے جو اس مسلمہ اجماعی مسئلہ کو مشکوک بنانے کے لیے مختلف حلقوں کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

اسلام میں کسی بھی مسئلہ کے شرعی ثبوت کے لیے مسلمہ اصول چار ہیں جنہیں دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

1. قرآن کریم
2. سنت نبویؐ
3. اجماع امت
4. اجتہاد و قیاس

ہم ترتیب کے ساتھ اپنے اس دعوی کے ثبوت میں ان چاروں دلائل کو پیش کریں گے کہ کسی عورت کو حکمران بنانا شرعاً جائز نہیں ہے۔

(۱) قرآن کریم

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر مرد اور عورت کے درمیان حقوق و فرائض کی اس فطری تقسیم کو واضح کیا ہے۔ ان سب آیات کریمہ کو اس موقف کے حق میں منطقی استدلال کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم ان میں سے دو آیات کریمہ کا حوالہ دیں گے۔

1. حکمرانی کا تصور اسلام میں ''خلافت'' کا ہے کہ انسانی معاشرہ میں کوئی بھی حکمران خود مختار نہیں بلکہ حکمرانی میں خدا تعالی کا نائب ہے۔ اصل حکمرانی

اللہ تعالی کی ہے اور انسان اس کا نائب ہے جو اپنی مرضی سے نہیں بلکہ خدا تعالی کے احکام و قوانین کے مطابق انسانی معاشرہ پر حکومت کرتا ہے، اسی کا نام ''خلافت'' ہے۔ جب تک انبیاء کرام علیہم السلام کی تشریف آوری کا سلسلہ جاری رہا، خلافت کا یہ منصب زیادہ تر حضرات انبیاء کرامؑ ہی کے پاس رہا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب الامارۃ میں حضرت ابوہریرۃؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کا اظہار یوں فرمایا ہے کہ

> ''بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت کا فریضہ انبیاء کرام علیہم السلام سرانجام دیتے تھے، جب ایک نبیؑ دنیا سے چلے جاتے تو دوسرے نبیؑ ان کی جگہ لے لیتے۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا البتہ میرے بعد خلفاء ہوں گے۔''

یعنی خلافت و حکومت دراصل انبیاء کرامؑ کی نیابت کا نام ہے اور اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں صراحت کر دی ہے کہ دنیا میں جتنے بھی پیغمبر بھیجے گئے وہ سب مرد تھے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

> وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم۔
>
> اور ہم نے آپؐ سے قبل رسول بنا کر نہیں بھیجا مگر صرف مردوں کو جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

اس لیے جب نبی صرف اور صرف مرد آئے ہیں تو ان کی نیابت بھی صرف مردوں میں ہی محدود رہے گی۔

2. اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

> الرجال قوامون علی النسآء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض۔
>
> مرد حکمران ہیں عورتوں پر، اس لیے کہ اللہ تعالی نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

یہ آیت کریمہ اس بارے میں صریح ہے کہ جہاں مردوں اور عورتوں کا مشترکہ معاملہ ہو گا وہاں حکمرانی مردوں ہی کے حصہ میں آئے گی اور یہی وہ فضیلت ہے جو اللہ تعالی نے مرد کو عورت پر عطا فرمائی ہے۔

اس آیت کریمہ کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ آیت کریمہ خاندانی احکام و قوانین کے سیاق و سباق میں ہے اس لیے اس سے مراد مطلق حکمرانی نہیں بلکہ خاندان کی سربراہی ہے جو ظاہر ہے کہ مرد ہی کے پاس ہے۔ لیکن ان کا یہ استدلال دو وجہ سے غلط ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ عورت کی حکمرانی کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات کی روشنی میں جب ہم اس آیت کریمہ کا مفہوم متعیّن کریں گے تو اسے خاندان کی سربراہی تک محدود رکھنا ممکن نہیں رہے گا بلکہ خاندان کی سربراہی کے ساتھ مطلق حکمرانی بھی اس کے مفہوم میں شامل ہوگی۔ یہ ارشادات نبویؐ ہم آگے چل کر نقل کر رہے ہیں۔ دوسرا اس وجہ سے کہ امت کے معروف مفسرین کرامؒ نے اس آیت کریمہ کی جو تفسیر کی ہے اس میں علی الاطلاق ہر قسم کی حکمرانی عورت کے لیے نفی کی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

> ولھذا کانت النبوۃ مختصۃ بالرجال وکذلک الملک الاعظم وکذا منصب القضاء وغیر ذلک۔ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۴۹۱)
>
> اور اسی وجہ سے نبوت مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی طرح حکومت اور قضا کا منصب بھی انہی کے لیے خاص ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ کے علاوہ امام رازیؒ (تفسیر کبیر ج ۱۰ ص ۸۸)، امام قرطبیؒ (ص ۱۶۸ ج ۵)، علامہ سید محمود آلوسیؒ (روح المعانی ص ۵ ص ۲۳) اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (مظہری ج ۲ ص ۹۸) نے اس آیت کی یہی تفسیر لکھی ہے۔ اور ان کے علاوہ بھی کم و بیش تمام مفسرین نے اس آیت کریمہ سے عورت کی حکمرانی کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے۔

(۲) حدیث رسولؐ

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بہت سے ارشادات میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ عورت کی حکمرانی نہ صرف عدم فلاح اور ہلاکت کا موجب ہے بلکہ مردوں کے لیے موت سے بدتر ہے۔ ان میں سے چند احادیث ذیل میں درج کی جا رہی ہیں:

1. امام بخاریؒ کتاب المغازی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس بات کی خبر دی گئی کہ فارس کے لوگوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنا لیا ہے تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ۔

وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنا حکمران عورت کو بنالیا۔

2. حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب تمہارے حکمران تم میں سے اچھے لوگ ہوں، تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورہ سے طے پائیں تو تمہارے لیے زمین کی پشت اس کے پیٹ سے بہتر ہے۔ اور جب تمہارے حکمران تم میں سے برے لوگ ہوں، تمہارے مال دار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو تمہارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے۔“ (ترمذی ج ۲ ص ۵۲)

3. امام حاکمؒ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور اس کی سند کو امام ذہبی نے صحیح تسلیم کیا ہے کہ جناب رسول اکرمؐ کی خدمت میں مسلمانوں کا ایک لشکر فتح و نصرت حاصل کر کے آیا اور اپنی فتح کی رپورٹ پیش کی۔ آنحضرتؐ نے مجاہدین سے جنگ کے احوال اور ان کی فتح کے ظاہری اسباب دریافت کیے تو آپؐ کو بتایا گیا کہ کفار کے لشکر کی قیادت ایک خاتون کر رہی تھی۔ اس پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ھلکت الرجال حین اطاعت النساء۔ (مستدرک حاکم ج ۴ ص ۲۹۱)

مرد جب عورتوں کی اطاعت قبول کریں گے تو ہلاکت میں پڑیں گے۔

4. علامہ ابن حجر الہیتمیؒ حضرت ابوبکرؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ کی مجلس میں ملکہ سبا بلقیسؓ کا ایک دفعہ ذکر ہوا تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

لایقدس اللہ امۃ قادتھم امراۃ۔ (مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۱۰)

اللہ تعالیٰ اس قوم کو پاکیزگی عطا نہیں فرماتے جس کی قیادت عورت کر رہی ہو۔

5. امام طبرانیؒ حضرت جابر بن سمرۃؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا:

لن یفلح قوم یملک رایھم امراۃ۔ (مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۰۹)

وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جن کی رائے کی مالک عورت ہو۔

6. امام ابوداؤد طیاسیؒ حضرت ابوبکرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا:

لن یفلح قوم اسندوا امرھم الی امراۃ۔ (طیاسی ص ۱۱۸)

وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنی حکمرانی عورت کے حوالہ کر دی۔

7. امام ابن الاثیرؒ اس روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں:

ماافلح قوم قیمھم امراۃ۔ (النہایۃ ج ۴ ص ۱۳۵)

وہ قوم کامیاب نہیں ہوگی جس کی منتظم عورت ہو۔

8. مسند احمد میں ہے:

لن یفلح قوم تملکھم امراۃ۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۴۳)

وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس کی حکمران عورت ہو۔

9. اہل تشیع کی معروف کتاب ”مستدرک الرسائل“ میں، جو الحاج مرزا حسین نوری طبرسی کی لکھی ہوئی ہے اور قم سے طبع ہوئی ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کو جنت سے نکلنے کا حکم دیا تو حضرت حواؑ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں نے تمہیں ناقص العقل والدین بنایا ہے اور

لم اجعل منکن حاکما ولم ابعث منکن نبیا۔ (مستدرک الرسائل باب ان المراۃ لا تولی القضاء)

میں نے تم عورتوں میں سے کوئی حاکم نہیں بنایا اور نہ تم میں سے کسی کو نبی بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہاں حاکم نہیں بنایا کا معنی یہ ہوگا کہ حاکم بننے کی اجازت نہیں دی، اس لیے جو عورتیں کسی دور میں حاکم بن گئی ہیں ان کی حیثیت وہی ہوگی جو نبوت کا دعویٰ کرنے والی عورتوں کی ہے۔

10. اسی مستدرک الرسائل میں یہ روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے جناب رسول اللہؐ سے کچھ سوالات کیے، ان میں سے ایک سوال حضرت آدمؑ کی پسلی سے حضرت حواؑ کو پیدا کرنے کے بارے میں بھی تھا۔ سوال یہ تھا کہ حضرت حواؑ کو حضرت آدمؑ کے پورے وجود سے پیدا کیا گیا یا وجود کے کچھ حصہ سے بنایا گیا تو جناب سرور کائناتؐ نے فرمایا کہ

بل من بعضہ ولو خلقت من کلہ لجاز القضاء فی النسآء کما یجوز فی الرجال۔

بلکہ حضرت حواءؑ کو حضرت آدمؑ کے وجود کے بعض حصہ سے پیدا کیا گیا اور اگر انہیں پورے وجود سے پیدا کیا جاتا تو قضا کا منصب عورتوں کے لیے بھی اسی طرح جائز ہو جاتا جس طرح مردوں کے لیے جائز ہے۔

11. اہل تشیع کے ہی ایک اور محقق الاستاذ الشیخ جعفر السبحانی اپنی کتاب ''معالم الحکومۃ الاسلامیہ'' میں، جو مکتبہ الامام امیر المومنین العامۃ اصفہان سے چھپی ہے، امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے عورتوں کے بارے میں احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

ولا تولی القضآء۔ (المیزان ج ۱۸ ص ۹۳۔ معالم الحکومۃ الاسلامیہ ص ۲۷۷)

عورت قضا کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتی۔

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ان واضح ارشادات کے بعد اس امر میں اب شک و شبہ کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ شرعاً کسی عورت کے حکمران بننے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(۳) اجماع امت

قرآن و سنت کے بعد دلائل شرعیہ میں اجماع کا درجہ ہے اور چودہ سو سال سے امت مسلمہ کا اس پر اجماع و اتفاق چلا آتا ہے کہ عورت شرعاً حکمران نہیں بن سکتی۔

1. خلفاء راشدین کے مبارک دور سے آج تک امت مسلمہ کا اجماعی تعامل اس امر پر ہے کہ کوئی عورت کسی خطہ میں مسلمانوں کی حکمران نہیں بنی۔ اس لیے ہمارے نزدیک امت کا یہ عمل صرف اجماع نہیں بلکہ ''تواتر عملی'' کی

حیثیت رکھتا ہے کیونکہ عورت کو حکمران نہ بنانے کا یہ عمل اس قدر مسلسل اور متواتر ہے کہ چودہ سوسالہ تاریخ میں کہیں بھی اس کی قابل توجہ خلاف ورزی نظر نہیں آتی۔ بلکہ کسی موقع پر اگر جزوی طور پر اس کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو مسلمانوں نے اس پر گرفت کی ہے جیسا کہ نویں صدی ہجری کا ایک واقعہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ مصر میں بنی ایوب خاندان کی ایک خاتون "شجرۃ الدر" حکمران بن گئی۔ اس وقت بغداد میں خلیفہ ابو جعفر مستنصر باللہؒ کی حکومت تھی، انہوں نے یہ واقعہ معلوم ہونے پر امراء کے نام تحریری پیغام بھیجا کہ

اعلمونا ان کان ما بقی عندکم فی مصر من الرجال من یصلح للسلطنۃ فنحن نرسل لکم من یصلح لھا اما سمعتم فی الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لا افلح قوم ولوا امرھم امراۃ۔ (اعلام النساء ج ۲ ص ۲۸۶)

ہمیں بتاؤ اگر تمہارے پاس مصر میں حکمرانی کے اہل مرد باقی نہیں رہے تو ہم یہاں سے بھیج دیتے ہیں۔ کیا تم نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ وہ قوم کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنا حکمران عورت کو بنالیا۔

خلیفہ وقت کے اس پیغام پر "شجرۃ الدر" منصب سے معزول ہوگئی اور اس کی جگہ سپہ سالار کو مصر کا حکمران بنالیا گیا۔

2. امام بغویؒ (شرح السنۃ ج ۷۷) میں فرماتے ہیں کہ سب علماء کا اتفاق ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی۔

3. امام ابوبکر بن العربیؒ (احکام القرآن ج ۳ ص ۴۴۵) حضرت ابوبکرؓ والی حدیث نقل کرکے فرماتے ہیں:

وھذا نص فی الامراۃ لا تکون خلیفۃ ولا خلاف فیہ۔

یہ حدیث اس بارے میں نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں بن سکتی اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

4. امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

اجمع المسلمون علیہ۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۱۴۹)

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے۔

5. امام الحرمین الجوینیؒ فرماتے ہیں:

واجمعوا ان المراۃ لایجوز ان تکونا اماما۔ (الارشاد فی اصول الاعتقاد ص ۲۵۹)

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ عورت کا حکمران بننا جائز نہیں۔

6. حافظ ابن حزمؒ امت کے اجماعی مسائل کے بارے میں اپنی معروف کتاب ''مراتب الاجماع'' میں فرماتے ہیں:

واتفقوا ان الامامۃ لاتجوز لامراۃ۔ (مراتب الاجماع ص ۱۲۶)

اور علماء کا اتفاق ہے کہ حکمرانی عورت کے لیے جائز نہیں ہے۔

7. دور حاضر کے معروف محقق ڈاکٹر منیر عجلانی لکھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں میں سے کسی عالم کو نہیں جانتے جس نے عورت کی حکمرانی کو جائز کہا ہو۔

فالاجماع فی ھذہ القضیۃ تام لم یشذ عنہ۔ (عبقریۃ الاسلام فی اصول الحکم ص ۷۰)

اس مسئلہ میں اجماع اتنا مکمل ہے کہ اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔

8. پاکستان میں تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے ۱۹۵۱ء میں ۲۲ دستوری نکات پر اتفاق کیا اور ان میں حکومت کے سربراہ کے لیے مرد کی شرط کو لازمی قرار دیا۔

(۴) اجتہاد و قیاس

دلائل شرعیہ میں چوتھا درجہ اجتہاد اور قیاس کا ہے۔ اجتہاد اور قیاس کا اصل محل اگرچہ غیر منصوص مسائل ہیں کیونکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی مسائل میں اجتہاد کی اجازت دی ہے جن میں قرآن و سنت کی واضح ہدایات موجود نہ ہوں۔ لیکن چونکہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور ان سے احکام و مسائل کا استنباط بھی اجتہاد اور قیاس سے تعلق رکھنے والے امور ہیں اس لیے شاید کسی ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ ممکن ہے فقہائے اسلام اور مجتہدین نے احکام و مسائل کے استنباط میں عورت کی حکمرانی کے لیے کوئی گنجائش کسی درجہ میں دیکھ لی ہو۔ لیکن یہ شبہ بھی وہم و تخیل سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ امت کے تمام مسلمہ فقہی مکاتب فکر کے مجتہدین نے اس امر کی صراحت کی ہے

کہ حکمرانی کے منصب کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ مرد ہونا بھی ضروری ہے اور عورت کے حکمران بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

فقه حنفی

فقہ حنفی کی معروف و مستند کتاب ''الدر المختار'' اور اس کی شرح ''ردالمختار'' میں اس امر کی تصریح ہے کہ حکمران کے لیے دوسری شرائط کے ساتھ مرد ہونا بھی ضروری ہے اور

لا یصح تقریر المراۃ فی وظیفۃ الامامۃ۔ (شامی ج ۴ ص ۳۹۵، ج ا ص ۵۱۲)

عورت کو حکمرانی کے کام پر مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔

فقه شافعی

فقہ شافعیؒ کی مستند کتاب ''المجموع شرح المہذب'' میں لکھا ہے:

القضاء لا یجوز لامراۃ۔

قضا کا منصب عورت کے لیے جائز نہیں ہے۔

فقه حنبلی

فقہ حنبلیؒ کی مستند کتاب المغنی (ج ۱۱ ص ۳۸۰) میں ہے:

المراۃ لا تصلح للامامۃ ولا لتولیۃ البلدان ولھذا لم یول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا احد من خلفاء ولا من بعدھم قضاء ولا ولایۃ ولو جاز ذلک لم تخل منہ جمیع الزمان غالبا۔

عورت نہ ملک کی حاکم بن سکتی ہے اور نہ شہروں کی حاکم بن سکتی ہے۔ اسی لیے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت کو مقرر نہیں کیا، نہ ان کے خلفاء نے کسی کو مقرر کیا اور نہ ہی ان کے بعد والوں نے قضا یا حکمرانی کے کسی منصب پر کسی عورت کو فائز کیا اور اگر اس کا کوئی جواز ہوتا تو یہ سارا زمانہ اس سے خالی نہ ہوتا۔

فقه مالکی

فقہ مالکیؒ کی مستند کتاب ''منحۃ الجلیل'' میں نماز کی امامت، لوگوں کے درمیان فیصلوں، اسلام کی حفاظت، حدود شرعیہ کے نفاذ اور جہاد جیسے احکام کی بجاآوری کے لیے شرائط بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

فیشترط فیہ العدالہ والذکورۃ والفطنۃ والعلم۔

پس اس کے لیے شرط ہے کہ عادل ہو، مرد ہو، سمجھدار ہو اور عالم ہو۔

فقہ ظاہری

اہل ظاہر کے معروف امام حافظ ابن حزمؒ فرماتے ہیں:

ولا خلاف بین واحد فی انھا لاتجوز لامراۃ۔ (المحلی ج ۹ ص ۳۶۰۔ الملل ج ۴ ص ۱۶۷)

اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ حکمرانی عورت کے لیے جائز نہیں ہے۔

اہل تشیع

معروف شیعہ محقق الاستاذ الشیخ جعفر السبحانی لکھتے ہیں:

فقد اجمع علماء الامامیۃ کلھم علی عدم انعقاد القضاء للمراۃ وان استکملت جمیع الشرائط الاخری۔ (معالم الحکومۃ الاسلامیۃ ص ۲۷۸)

امامیہ مکتب فکر کے تمام علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ قضاء کا منصب عورت کے سپرد کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ اس میں دوسری تمام شرائط پائی جاتی ہوں۔

اہل حدیث

معروف اہلحدیث عالم قاضی شوکانیؒ حضرت ابوبکرؓ والی روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فیہ دلیل علی ان المراۃ لیست من اھل الولایات ولایحل لقوم تولیتھا۔ (نیل الاوطار ج ۸ ص ۲۷۴)

اس میں دلیل ہے کہ عورت حکمرانی کے امور کی اہل نہیں ہے اور کسی قوم کے لیے اس کو حکمران بنانا جائز نہیں ہے۔

الغرض قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کی واضح نصوص، اجماع امت اور تمام مسلم مکاتب فکر کے فقہاء کے صریح ارشادات سے یہ بات بالکل بے غبار ہو جاتی ہے کہ کسی عورت کا مسلمان ملک میں حکمرانی کے منصب پر فائز ہونا شرعی طور پر بالکل ناجائز ہے۔

۱۹۸۹ء

حجیّتِ حدیث اور ختمِ نبوت کے موضوع پر شکاگو میں عالمی کانفرنس

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ۱ نومبر ۱۹۸۹ء)

شکاگو کا شمار ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بڑے شہروں میں ہوتا ہے جو دنیا کی پانچ بڑی جھیلوں کے سلسلہ میں مشی گن نامی بڑی جھیل کے کنارے آباد ہے۔ دنیا میں میٹھے پانی کی یہ سب سے بڑی جھیل کہنے کو جھیل ہے لیکن ایک سمندر کا نقشہ پیش کرتی ہے جو سینکڑوں میل کے علاقہ کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے، میٹھے پانی کے اس سمندر کی وجہ سے شکاگو کا پورا علاقہ انتہائی سرسبز و شاداب ہے۔

شکاگو کی مجموعی آبادی ۸۰ لاکھ کے قریب ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد اڑھائی تین لاکھ کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ ان میں مقامی سیاہ فام نومسلموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جو بلالی مسلم کہلاتے ہیں اور وارث دین محمد ان کی رہبری اور قیادت کر رہے ہیں۔ وارث دین محمد عالیجاہ محمد کے فرزند ہیں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور گورے امریکیوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکا کر سیاہ فاموں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ لیکن عالیجاہ محمد کی زندگی میں ہی اس کے دست راست مالکم ایکس نے اس کی جھوٹی نبوت سے بغاوت کر کے اسلام کے صحیح عقائد کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا تھا جس کی پاداش میں مالکم ایکس کو شہید کر دیا گیا۔ مالکم ایکس کی شہادت رنگ لائی اور عالیجاہ محمد کی وفات کے بعد خود اس کے فرزند وارث دین محمد نے باپ کے عقائد کو مسترد کر دیا اور اب وہ صحیح العقیدہ بلالی مسلمانوں کی رہبری کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ وارث دین محمد کے خلاف

ان کے دوسرے بھائیوں نے عدالت میں دعوی دائر کر دیا کہ چونکہ وارث اپنے باپ کے عقائد اور مذہب سے منحرف ہو گئے ہیں اس لیے عالیجاہ محمد کی کروڑوں ڈالر کی جائیداد میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ وارث یہ مقدمہ ہار گئے ہیں لیکن انہیں اس کی پرواہ نہیں ہے اور وہ پوری لگن اور محنت کے ساتھ بلالی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کی مہم میں مصروف ہیں۔

دوسرے نمبر پر یہاں عرب اور فلسطینی مسلمان ہیں اور پھر انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آکر یہاں آباد ہونے والے مسلمانوں کا نمبر آتا ہے۔ انڈیا سے آنے والے مسلمانوں میں حیدرآباد دکن کے حضرات کی تعداد زیادہ ہے جو اسلام کے ساتھ وابستگی اور دینی فرائض واحکام کی بجاآوری میں سب سے زیادہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ پاکستانی مسلمانوں کی شکاگو میں تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق دس ہزار کے قریب بیان کی جاتی ہے۔

امریکہ اور یورپ کے دیگر علاقوں کی طرح شکاگو کے مسلمانوں کا بھی سب سے بڑا مسئلہ مذہبی احکام و اقدار کے ساتھ وابستگی کو برقرار رکھنا اور امریکہ میں پیدا ہونے والی نئی مسلمان نسل کو دینی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرتے ہوئے اپنی اولاد کو مغربی معاشرہ کے مذہب کش جراثیم سے بچانا ہے۔ یہ کام اگرچہ بہت کٹھن اور مشکل ہے لیکن درد دل رکھنے والے مسلمان اس مقصد کے لیے مختلف شعبوں میں سرگرم عمل ہیں اور متعدّد ادارے اس سلسلہ میں اب تک قائم ہو چکے ہیں۔ بلالی مسلمانوں کا ایک مستقل نظام ہے جو وارث دین محمد کی قیادت میں تعلیمی اور تبلیغی محاذوں پر مصروف عمل ہے۔ یورپین مسلمانوں نے اسلامک کلچرل سنٹر کے نام سے ایک مرکز قائم کیا ہوا ہے، مرکز میں ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔ ایک تنظیم اسلامک فاؤنڈیشن کے نام سے کام کر رہی ہے۔ جبکہ یہاں کے مسلمانوں کا سب سے قدیمی ادارہ مسلم کمیونٹی سنٹر ہے جس کے ساتھ عرب، پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے مسلمانوں کے علاوہ مقامی مسلمان بھی وابستہ ہیں۔

مسلم کمیونٹی سنٹر (ایم سی سی) کے صدر ان دنوں حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد قیصر الدین ہیں، نائب صدر مقامی نومسلم نکولس عبداللہ ہیں اور سیکرٹری جنرل کے فرائض جناب عثمان باقی سرانجام دے رہے ہیں جن کا تعلق مدارس سے ہے۔ مسلم کمیونٹی سنٹر میں جمعہ اور نماز پنجگانہ کے لیے مسجد کے علاوہ بچوں کی تعلیم و تدریس کا ایک وسیع رضاکارانہ نظام ہے جس کے تحت ہفتہ اور اتوار کو سنٹر میں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ ہفتہ

اور اتوار دو دن یہاں سرکاری چھٹی ہوتی ہے اور ان دو دنوں میں کم و بیش ساڑھے آٹھ سو بچوں کی کلاسیں مختلف اوقات میں لگتی ہیں جبکہ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ اساتذہ اور استانیاں ان کلاسوں میں رضاکارانہ طور پر قرآن کریم، سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام کی تعلیم دیتی ہیں۔ مختلف گھروں میں الگ کلاسوں کا انتظام بھی سنٹر کی طرف سے کیا جاتا ہے اور ہفتہ کے باقی چار ایام یعنی پیر، منگل، بدھ اور جمعرات کو دارالعلوم کے عنوان سے مولانا محمد عبد اللہ سلیم شام کو پانچ سے آٹھ بجے تک بچوں کو قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی تعلیم دیتے ہیں۔ مولانا محمد عبد اللہ سلیم دارالعلوم دیوبند (وقف) کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد نعیم مدظلہ کے فرزند ہیں اور ایک عرصہ سے شکاگو میں مسلمانوں کی علمی و دینی راہنمائی کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

ان جزوقتی تعلیمی اداروں کے علاوہ دو مستقل تعلیمی ادارے بھی قائم ہیں جن میں سے ایک ادارہ اسلامک فاؤنڈیشن کے تحت فل ٹائم اسکول کے طور پر کام کر رہا ہے جبکہ دوسرا ادارہ امریکن اسلامک کالج کے نام سے قائم کیا گیا ہے جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں پہلا اسلامک کالج ہے، اسے قائم کرنے میں ایک لبنانی عالم ڈاکٹر احمد صقر پیش پیش تھے جو کیلی فورنیا چلے گئے ہیں اور اب پاکستان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر غلام حیدر آسی اس ادارہ کو چلا رہے ہیں۔ کالج میں تعلیمی نصاب اور معیار وہی رکھا گیا ہے جو عام امریکی کالجوں کا ہے لیکن اس میں قرآن کریم، سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام کے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے اور مسلمان بچوں کو ایسا ماحول فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ تہذیبی اور ذہنی لحاظ سے امریکی معاشرہ میں جذب ہونے سے بچ سکیں۔ البتہ کالج کے منتظمین عام مسلمانوں کا رجحان اس کی طرف منتقل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جس کی وجہ سے ابھی کالج میں طلبہ کی تعداد خاطر خواہ نہیں ہے۔ دینی، تعلیمی اور تنظیمی امور کی طرف عام مسلمانوں کی عدم توجہ کی شکایت اکثر پائی جاتی ہے بالخصوص پاکستانی حضرات کے بارے میں تو یہ شکایت افسوسناک حد تک موجود ہے کہ انہیں نہ تو دینی احکام کی بجاآوری اور اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم سے دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ہی پاکستان کے مفاد اور نقصان کے لحاظ سے کچھ سوچنے اور کام کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اکثر پاکستانیوں کا مطمح نظر صرف ڈالر کمانا اور خود کو زیادہ سے زیادہ امریکی ثابت کرنا ہے۔

اس پس منظر میں دو پاکستانیوں کا کردار شکاگو میں قابل رشک نظر آتا ہے۔ ایک صاحب ریاض حسین وڑائچ ہیں جو ۲۶ سال سے امریکہ میں اور ۱۸ سال سے شکاگو میں قیام پذیر ہیں، چنیوٹ کے رہنے والے ہیں، یہاں کاروبار کرتے ہیں، پابند صوم و صلوٰۃ اور دینی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے بزرگ ہیں، مسلم کمیونٹی سنٹر کے ڈائریکٹروں میں سے ہیں جنہیں عام مسلمانوں کے ووٹوں سے جمہوری اصولوں کے مطابق منتخب کیا جاتا ہے۔ وڑائچ صاحب ایک اور ادارے سے بھی منسلک ہیں جو غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے "اسلامک انسٹیٹیوٹ فار انفرمیشن اینڈ ایجوکیشن" کے نام سے کام کر رہا ہے۔ انسٹیٹیوٹ کے سربراہ ڈاکٹر سید امیر علی ہیں اور وڑائچ صاحب اس ادارے کے ٹرسٹی ہیں، اس ادارہ کا پروگرام یہ ہے کہ ۲۰۱۲ء تک اسلام کی دعوت امریکہ اور کینیڈا کے ہر غیر مسلم تک پہنچا دی جائے۔ اس مقصد کے لیے ادارہ لٹریچر شائع کرتا ہے، نومسلموں کے لیے تربیتی کلاسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ایک پبلک دارالمطالعہ قائم کیا گیا ہے جہاں ہر شخص متعیّن اوقات میں جا کر اسلام کے بارے میں لٹریچر کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ دوسرے صاحب حافظ محمد صدیق انور ہیں جو فیصل آباد کے رہنے والے ہیں اور ماہنامہ پاکستانی کے نام سے ایک اخبار تسلسل اور پابندی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ یہ جریدہ نفاذ اسلام، تحفظ ختم نبوت اور سالمیت پاکستان کے لیے مخلصانہ کام کر رہا ہے، سیکولر اور لادین لابیوں کے ساتھ ان کی مسلسل جنگ رہتی ہے، اسی کشمکش میں گزشتہ دنوں ان کے گھر کے سامنے ان کی گاڑی بھی نذر آتش کر دی گئی تھی۔ پرجوش مسلمان اور محب وطن پاکستانی ہیں، امریکہ میں مقیم دوسرے پاکستانیوں کو بھی اپنا جیسا پرجوش دیکھنا چاہتے ہیں لیکن مثبت نتیجہ نہ پا کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

شکاگو میں بہائی مذہب کا بہت بڑا مرکز ہے، یہ مرکز شمالی امریکہ کی بہائی جماعت کو کنٹرول کرتا ہے۔ قادیانیوں کی سرگرمیاں بھی خاصی تیز ہیں اور وہ اپنے لیے میدان کھلا پا کر متحرک رہتے ہیں۔ امریکہ میں مقیم مسلمانوں میں انکار حدیث کے جراثیم بھی سرایت کرتے جا رہے ہیں۔ راشد خلیفہ نامی ایک صاحب نے کچھ عرصہ قبل ۱۹ کے عدد کو عنوان بنا کر قرآن کریم کے اعجاز کا ایک نیا پہلو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی اور خاصی شہرت پائی۔ ۱۹ کے عدد کو بنیاد بنا کر ان صاحب نے پہلے احادیث نبویؐ کا انکار کیا کہ احادیث ان کے ۱۹ کے فارمولا پر پورا نہیں اترتیں، پھر قرآن کریم کی بعض آیات کو اس عددی فارمولا سے ہٹا

ہوا پاکر ان سے انکار کر دیا اور اب یہ صاحب خود نبوت کے دعویدار ہیں۔ جبکہ ان سے پہلے مدعی نبوت عالیجاہ محمد کے پیروکار لوئیس فرخان کی قیادت میں عالیجاہ محمد کے مذہب پر عمل پیرا اور اس کے پرچارک ہیں۔

اس پس منظر میں شکاگو اور دیگر علاقوں کے دردِ دل سے بہرہ ور مسلمانوں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ باطل مذاہب بالخصوص انکار ختم نبوت اور انکار حدیث کے سدباب کے لیے منظم جدوجہد کی جائے۔ اس مقصد کے لیے مجلس تحفظ ختم نبوت کا باقاعدہ قیام عمل میں لایا گیا جس کے امیر مولانا محمد عبداللہ سلیم اور سیکرٹری جنرل جناب عبدالحئی ہیں۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے ۷ و ۸ اکتوبر کو ہالیڈے ان شکاگو میں ختم نبوت اور حجیت رسول پر دو روزہ عالمی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں مختلف ممالک کے سرکردہ مسلم علماء اور دانشوروں نے شریک ہو کر متعدّد دینی عنوانات پر اپنے خیالات سے شرکائے کانفرنس کو مستفید کیا۔

کانفرنس میں ایک ہزار سے زائد مندوبین شریک ہوئے جن میں حضرات و خواتین دونوں شامل تھے، جبکہ زعماء میں بھارت سے دارالعلوم (وقف) دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا محمد نعیم، ندوۃ العلماء لکھنو کے استاذ الحدیث مولانا برہان الدین سنبھلی، حیدر آباد دکن سے مولانا حمید الدین عاقل حسامی، رامپور سے مولانا محمد یوسف اصلاحی، پاکستان سے جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی، سینیٹر مولانا سمیع الحق، مولانا منظور احمد چنیوٹی، مولانا میاں محمد اجمل قادری، مولانا عبدالرحمان باوا، مولانا منظور احمد الحسینی، پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی اور راقم الحروف، سعودی شہزادہ محمد الفیصل، رابطہ عالم اسلامی کے جناب داؤد اسد، نیشن آف اسلام کے وارث دین محمد، ڈاکٹر جمال بدوی (کینیڈا)، ڈاکٹر مزمل صدیقی، شیخ احمد ذکی حماد، امام سراج وہاج، ڈاکٹر احمد صقر، الشیخ جمال سعید، الشیخ محمد نور، مولانا عبید الرحمان، ڈاکٹر فتحی عثمان، جناب عبدالحمید ڈوگر، جناب قادر حسین خان، ڈاکٹر عبدالوحید فخری اور دیگر سرکردہ حضرات شامل ہیں۔ کانفرنس کی پانچ نشستیں ہوئیں جن میں:

- عقیدۂ ختم نبوت، حجیت حدیث،
- امریکہ میں مسلم نوجوانوں کی ذمہ داریاں،
- گھریلو زندگی میں نفاذ اسلام،
- غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت،

• اور نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کی ضرورت جیسے اہم عنوانات پر علماء اور دانشوروں نے اظہار خیال کیا۔

پرنس محمد فیصل نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ حدیث نبوی پر ایمان اور ان پر عملدرآمد ہی ہمارے لیے نجات کا واحد راستہ ہے۔

امام وارث دین محمد نے ختم نبوت کے عقیدہ کی وضاحت کی اور کہا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ ان کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور پوری امت چودہ سو سال سے اس عقیدہ پر متفق ہے تو اب کوئی بھی شخص نبوت کا دعوی کرے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی ایسے کسی دعوی کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

مولانا محمد نعیم شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (وقف) نے کہا کہ ختم نبوت اور حجیت حدیث آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم کے بعد کوئی کتاب نہیں اس لیے وہ قیامت تک محفوظ ہے، اسی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں اس لیے آنحضرتؐ کے ارشادات بھی قیامت تک کے لیے محفوظ اور حجت ہیں۔

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی نے بھی حجیت حدیث پر اپنے مخصوص علمی انداز میں اظہار خیال کیا اور کہا کہ قرآن کریم کے احکام و معانی کے تعین کا مدار حدیث رسولؐ پر ہے، اس لیے اگر حدیث رسولؐ پر خدانخواستہ ایمان باقی نہ رہے تو قرآن کریم کے مقاصد و معانی کا تعین بھی ممکن نہیں رہتا۔

سینیٹر مولانا سمیع الحق نے قادیانیت کے سیاسی پس منظر کو بے نقاب کیا اور کہا کہ یہ بنیادی طور پر ایک سیاسی گروہ ہے جس کا مقصد استعماری قوتوں کے آلۂ کار کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔ انہوں نے جہاد افغانستان اور پاکستان میں خاتون کی حکمرانی کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ مغربی طاقتیں جہاد افغانستان کو سبوتاژ کرنا چاہتی ہیں اور پاکستان میں خاتون کی حکمرانی کو اپنی تہذیبی فتح قرار دے کر اسے مستحکم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

مولانا منظور احمد چنیوٹی نے حیات حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں اہل اسلام کے عقیدہ کی وضاحت کی اور اس سلسلہ میں قادیانیوں کی طرف سے پیش کیے گئے اعتراضات و شبہات کے جواب دیے۔ انہوں نے مرزا طاہر احمد کی دعوت مباہلہ کا پس

منظر بیان کیا اور کانفرنس کے شرکاء کو بتایا کہ اس مباہلہ کے نتیجہ میں مرزا طاہر احمد کا سیکرٹری حسن عودہ قادیانیت سے تائب ہوکر اسلام قبول کر چکا ہے۔

مولانا محمد یوسف اصلاحی نے قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں عقیدۂ ختم نبوت کی وضاحت کی اور بتایا کہ قرآن کریم کی متعدّد آیات میں اس بنیادی عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے۔

مولانا میاں محمد اجمل قادری نے امریکہ میں مقیم مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ وہ اپنی اولاد اور نئی نسل کے دین و اخلاق کی حفاظت کی فکر کریں اور گھروں میں دینی ماحول کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔

مولانا عاقل حسامی نے کہا کہ عقیدہ ختم نبوت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جس کے بغیر دین کی عمارت قائم نہیں رہتی، اس لیے تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس عقیدہ کی حفاظت کا بطور خاص اہتمام کریں۔

راقم الحروف نے اس موقع پر عرض کیا کہ امریکہ میں یہودی لابی قادیانیوں کی حمایت اور ملت اسلامیہ کی مخالفت میں متحرک ہے، اس لابی کا سامنا کرنا اور اس کے پھیلائے ہوئے زہر کا ازالہ کرنا یہاں کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔

مولانا حافظ شفیق الرحمانؒ

(ہفت روزہ خدام الدین، لاہور۔ ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ء)

شہر کی بزرگ دینی شخصیت مولانا حافظ شفیق الرحمان ۱۹ جون کو اچانک انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حافظ صاحب مرحوم کا شمار گوجرانوالہ کی ممتاز شخصیات میں ہوتا تھا اور وہ معروف دینی درسگاہ مدرسہ نصرۃ العلوم کی مجلس انتظامیہ کے صدر تھے۔ ان کی نماز جنازہ شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے پڑھائی جس میں علماء، طلباء اور شہریوں نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی اور اس کے بعد انہیں مقامی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مولانا حافظ شفیق الرحمان ۱۹۲۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے، ان کے والد محترم مولوی مولا بخش مرحوم ایک مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ حافظ شفیق الرحمان مرحوم نے دینی تعلیم مدرسہ خیر المدارس جالندھر میں حاصل کی اور قیام پاکستان

کے بعد جب یہی مدرسہ ملتان منتقل ہو گیا تو انہوں نے مدرسہ خیر المدارس ملتان میں دورۂ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی۔ ان کے ہم سبق ساتھیوں میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند حضرت مولانا ابوذر بخاری اور پنجاب کے موجودہ وزیر زکوۃ وعشر مولانا قاری سعید الرحمان بھی شامل ہیں۔ حافظ صاحب مرحوم کی دستار بندی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فرمائی۔ قرآن کریم کی تعلیم انہوں نے معروف استاذ القرآن مولانا قاری کریم بخش سے حاصل کی اور تمام زندگی قرآن کریم کی بے لوث خدمت میں گزار دی۔

قیام پاکستان کے بعد حافظ صاحب کا خاندان امرتسر سے گوجرانوالہ منتقل ہو گیا، ان کے بڑے بھائی ملک عبد الرحمان مرحوم ریلوے میں ملازم تھے۔ دینی تعلیم سے فراغت کے بعد حافظ شفیق الرحمان مرحوم نے بازار سید نگری میں کریانہ اور دیسی گھی کا کاروبار شروع کیا جو آخری عمر میں الیکٹرک سٹور میں تبدیل ہو گیا، اور اب کچھ عرصہ سے وہ اپنے فرزندوں کے ہمراہ حافظ الیکٹرک سٹور کے نام سے کاروبار کر رہے تھے۔ حافظ صاحب کا دکان میں یہ معمول رہا ہے کہ درجنوں کی تعداد میں بچے ہر وقت ان کے ہاں زیر تعلیم رہتے۔ وہ دکانداری بھی کرتے اور بچوں کو قرآن کریم بھی پڑھاتے۔ سینکڑوں حفاظ نے ان سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی جن میں سے بعض علماء ہیں، کچھ ڈاکٹرز ہیں اور کچھ تلامذہ دیگر شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

مولانا حافظ شفیق الرحمان مرحوم کا معمول یہ تھا کہ ہر وقت قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول رہتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور کاروبار کرتے ہوئے ان کی زبان پر قرآن کریم ہوتا۔ ان کے ایک دوست کی روایت ہے کہ جوانی کے زمانے میں روزانہ ایک قرآن کریم مکمل کرنے کا معمول تھا اور ان دنوں بھی دس پندرہ پارے روزانہ پڑھ لیتے تھے۔ ایک دوست سے کہنے لگے کہ جب میں غسل خانہ اور بیت الخلاء میں جاتا ہوں تو بڑی مشکل سے زبان پر کنٹرول کرتا ہوں کہ کہیں اس حالت میں بھی قرآن کریم زبان پر جاری نہ ہو جائے۔

مولانا حافظ شفیق الرحمان عظیم دینی درسگاہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے بانی ارکان میں سے ہیں۔ اس مدرسہ کی بنیاد حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی نے ۱۹۵۲ء میں رکھی تھی اور پھر اپنے بھائی شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے ساتھ مل کر انہوں نے مسلسل محنت اور پر خلوص جدوجہد کے ساتھ اسے ملک کی بڑی دینی درسگاہوں کی صف

میں لا کھڑا کیا۔ مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور مولانا صوفی عبد الحمید سواتی کو مدرسہ نصرۃ العلوم کے قیام، تعمیر اور ترقی میں ابتدا سے جن حضرات کا قریبی تعاون حاصل رہا ہے ان میں حافظ شفیق الرحمان سرفہرست تھے۔ بلکہ اپنی وفات سے پہلے کچھ عرصہ سے مدرسہ کی مجلس انتظامیہ کے صدر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم کا بیعت کا تعلق حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ سے تھا۔ ان کے انتقال کے بعد حافظ صاحب نے بیعت کا تعلق امام الہدی حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے قائم کر لیا اور تمام اسباق بہت جلد مکمل کیے۔ سیاسی طور پر جمعیت علمائے اسلام پاکستان سے وابستہ تھے۔ جمعیت کے امیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے ساتھ خصوصی عقیدت تھی اور آخر دم تک پوری استقامت کے ساتھ حضرت درخواستیؒ کے ساتھ وابستہ رہے۔

ان کی رہائش سیٹلائیٹ ٹاؤن میں مسجد صدیقیہ کے قریب تھی اور وہ مسجد صدیقیہ کی انتظامیہ کے رکن تھے بلکہ مسجد کے انتظامات میں انہیں نگران اور سرپرست کی حیثیت حاصل تھی۔ گوجرانوالہ میں قیام کے بعد کم و بیش تیس سال تک انہوں نے شہر کی مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں رمضان المبارک کے دوران تراویح میں قرآن کریم سنایا۔ جبکہ کچھ عرصہ سے ان کی جگہ اب راقم الحروف کو تراویح میں قرآن کریم سنانے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

حافظ صاحب مرحوم اکثر اپنے لیے حسن خاتمہ اور چلتے پھرتے موت کی دعا مانگا کرتے تھے اور ایسا ہی ہوا۔ وفات کے روز بھی معمول کے مطابق دکان پر آئے، ان کے دو شاگرد جو حج کے لیے جا رہے تھے انہوں نے حافظ صاحب سے ملاقات کی۔ پہلے حافظ محمد اکرم آئے، ان سے کہا کہ حرمین شریفین میں میرے لیے ایمان پر خاتمہ کی دعا کرنا۔ وفات سے تقریباً نصف گھنٹہ قبل حافظ محمد نثار ملاقات کے لیے آئے، وہ بھی حج کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے، ان سے بھی یہی کہا کہ میرے لیے ایمان پر خاتمہ کی دعا کرنا۔ تھوڑی دیر گزری کہ اچانک دل کا دورہ ہوا اور چند لمحوں میں اپنی زندگی کی تمنا اور دعا کے مطابق چلتے پھرتے اچانک خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا حافظ شفیق الرحمان کے تین فرزند عتیق الرحمان، انیس الرحمان اور نفیس الرحمان دوکان کا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالی انہیں اپنے نیک دل اور شفیق باپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ وفات کے بعد مولانا قاضی حمید اللہ خان نے انہیں

خواب میں دیکھا کہ صاف ستھرا لباس میں ایک خوبصورت جگہ میں کھڑے ہیں، حال پوچھا تو کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ یہ ایک غیبی اشارہ ہے جوان کے حسن خاتمہ کی علامت ہے۔ اللہ تعالی مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

عورت کی حکمرانی: علماء کے موقف پر اعتراضات کا تجزیہ

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء)

عورت کی حکمرانی کے بارے میں علماء کا موقف قرآن و سنت اور اجماع امت کی روشنی میں اس قدر واضح اور مبرہن ہوکر سامنے آچکا ہے کہ اب اس میں مزید کلام کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اور نہ ہی اہل علم و دانش اور اصحاب فہم و فراست کے لیے اس مسئلہ میں کسی قسم کا کوئی ابہام باقی رہ گیا ہے کہ قرآن و سنت کے صریح احکام اور امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ تواتر عملی کی رو سے کسی مسلم ریاست میں خاتون کے حکمران بننے کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے۔ البتہ اس موقف اور اس کے مطابق علماء کرام کی اجتماعی جدوجہد کے بارے میں مختلف شکوک و شبہات اور اعتراضات سامنے آرہے ہیں جن کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینا ضروری ہے، اور زیر نظر مضمون میں انہی شبہات و اعتراضات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

ملکہ سبا

یہ بات کہی جاتی ہے کہ قرآن کریم میں ملکہ صبا حضرت بلقیسؓ کا ذکر موجود ہے جو سبا کی حکمران تھیں اور جنہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، اگر عورت کی حکمرانی ناجائز ہوتی تو ان کا ملکہ کی حیثیت سے قرآن کریم میں ذکر نہ ہوتا۔

لیکن جب ہم اس واقعہ کے حوالہ سے قرآن کریم کے ارشادات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ اعتراض بے وزن نظر آتا ہے، اس لیے کہ

• قرآن کریم نے ملکہ سبا کی حکومت کا جس دور کے حوالہ سے ذکر کیا ہے وہ ان کا کفر کا دور ہے اور قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وہ اس دور میں سورج کی پجاری تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمان ہونے کے بعد ملکہ سبا کی حکومت کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

• حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کے ہاتھ جو خط ملکہ سبا کو ارسال کیا تھا اس میں اسے مسلمان ہونے کی دعوت ان الفاظ میں دی تھی کہ الا تعلوا علی واتونی مسلمین (سورہ النمل) مجھ سے سرکشی نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس آؤ۔ یہ دعوت ملکہ سبا اور اس کی قوم کو تھی اور اسی دعوت کو قبول کرتے ہوئے ملکہ سبا ایمان لائی تھیں۔ اس لیے سرکشی نہ کرنے اور مطیع ہو کر چلے آنے کا مفہوم یہی تھا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی الگ اور مستقل حکومت باقی نہیں رہی تھی۔

• اگر بالفرض اسلام قبول کرنے کے بعد ملکہ سبا کی حکومت باقی رہی ہو تو بھی ان کا یہ عمل ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے جو احکام اور واقعات قرآن کریم میں مذکور ہوئے ہیں اور قرآن کریم نے مسلمانوں کو ان کے خلاف حکم دیا ہے تو وہ احکام باقی نہیں رہے بلکہ منسوخ ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ملا جیونؒ نے اصول فقہ کی معروف کتاب "نور الانوار" میں صراحت کی ہے اور اسی بنیاد پر معروف مفسر قرآن علامہ آلوسیؒ نے ملکہ سبا کی حکومت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس سے عورت کی حکمرانی کے جواز میں استدلال کرنا درست نہیں"۔ (روح المعانی ص ۱۸۹ ج ۱۹)

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ

یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ اگر عورت کی حکمرانی جائز نہ ہوتی تو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنگ جمل میں صحابہ کرامؓ کے ایک گروہ کی قیادت کیوں کرتیں؟ مگر یہ اعتراض بھی غلط اور بے بنیاد ہے، اس لیے کہ

• ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے امارت اور حکمرانی کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا اور نہ اس لیے جنگ لڑی تھی۔ بلکہ وہ صرف حضرت عثمانؓ کے خون کے بدلہ کا مطالبہ لے کر میدان میں آئی تھیں، اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

- حضرت عائشہؓ کا یہ عمل ان کی اجتہادی خطا تھی جس پر خود ام المؤمنینؓ نے کئی بار پشیمانی کا اظہار فرمایا۔ مثلاً طبقات ابن سعد (ص۸۱ ج ۸) میں ہے کہ ام المؤمنینؓ جب قرآن کریم کی آیت کریمہ وقرن فی بیوتکن کی تلاوت کرتیں تو روتے روتے ان کا آنچل آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔ اس آیت کریمہ میں ازواج مطہراتؓ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھی رہیں۔ اسی طرح امام حاکمؒ (مستدرک ص۸ ج ۴) میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے وصیت فرمائی کہ انہیں وفات کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روضۂ اطہر میں دفن نہ کیا جائے کیونکہ ان سے حضور علیہ السلام کے بعد ایک غلطی سرزد ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں مصنف ابن ابی شیبہ (ص ۲۷۷ ج ۱۵) میں حضرت عائشہؓ کا یہ قول منقول ہے کہ اے کاش میرے دس بیٹے مرجاتے لیکن میں یہ سفر نہ کرتی۔ اس لیے حضرت ام المؤمنین کے اس عمل کو دلیل بنانا درست نہیں ہے۔

فقہائے احناف

یہ اشکال پیش کیا جاتا ہے کہ فقہائے احناف عورت کو قاضی بنانے کے حق میں ہیں اس لیے عورت قاضی بن سکتی ہے تو حاکم کیوں نہیں بن سکتی؟ لیکن یہ کہنا بھی درست نہیں ہے اور اس سلسلہ میں فقہائے احناف کے موقف کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ فتویٰ علی الاطلاق فقہائے احناف نے نہیں دیا کہ عورت کو قاضی بنایا جا سکتا ہے بلکہ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر کسی حاکم نے عورت کو قاضی بنا دیا ہے اور اس عورت نے قاضی کی حیثیت سے فیصلے کیے ہیں تو اس کے فیصلے ان مقدمات میں نافذ ہوں گے جن کا تعلق حدود و قصاص سے نہیں ہے، اور حدود و قصاص کے مقدمات میں اس کے فیصلے نافذ نہیں ہوں گے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ (رد المحتار ص ۳۹۵ ج ۴) میں صراحت کرتے ہیں کہ غیر حدود و قصاص میں عورت کی قضا نافذ ہوگی لیکن اس کو قاضی بنانے والا گنہگار ہوگا۔ اس لیے فقہائے احناف کے موقف کی عملی صورت یوں بنتی ہے کہ

- حدود و قصاص کے مقدمات میں عورت قاضی نہیں بن سکتی اور نہ ہی اس کے فیصلے نافذ ہوتے ہیں۔

• باقی ماندہ مقدمات میں بھی عورت کو قاضی بنانے والا گنہگار ہوگا لیکن اس کے فیصلے نافذ ہوجائیں گے۔

اس لیے فقہائے احناف کے اس موقف کو عورت کی حکمرانی کے جواز کے لیے دلیل بنانے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امام ابن جریر طبریؒ

مشہور مفسر قرآن امام ابن جریر طبریؒ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عورت کو قاضی بنانے کے جواز کا فتوی دیا تھا۔ لیکن علامہ آلوسیؒ اس کی تردید کرتے ہیں اور روح المعانی (ص ۱۸۹ ج ۱۹) میں فرماتے ہیں کہ امام ابن جریرؒ کی طرف سے اس فتوی کی نسبت درست نہیں ہے۔

حضرت تھانویؒ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک فتوی بڑے شدومد کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے جو امداد الفتاوی میں موجود ہے اور جس میں بھوپال کی بیگمات کی نسبت کے حوالہ سے یہ فتوی دیا گیا ہے کہ عورت کو حکمران بنانا جائز ہے۔ لیکن اس فتوی کا سہارا لینا بھی بے سود ہے اس لیے کہ حضرت تھانویؒ نے اس فتوی سے رجوع کرلیا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ

• اس فتوی میں ملکہ سبا کی حکومت کو استدلال کی بنیاد بنا دیا گیا تھا مگر حضرت تھانویؒ نے خود اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں اس استدلال کو رد کر دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ "۔۔۔ ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے"۔ (بیان القرآن ص ۸۵ ج ۸)

• حضرت تھانویؒ نے آخری عمر میں "احکام القرآن" خود اپنی نگرانی میں تحریر کرائی جس کا سورۃ النمل والا حصہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے لکھا جو حضرت تھانویؒ کو پڑھ کر سنایا گیا اور ان کی منظوری سے شائع ہوا۔ اس میں دلائل کے ساتھ اس مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ عورت شرعاً حکمران نہیں بن سکتی۔

عورت اور پارلیمنٹ

یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ خواتین کو پارلیمنٹ کی رکنیت دینے کے مسئلہ پر علماء نے مخالفت نہیں کی بلکہ خود علماء کی طرف سے بعض خواتین کو اسمبلیوں کا رکن بنوایا گیا، اس لیے جب عورت اسمبلی کی ممبر بن سکتی ہے تو اسی اسمبلی میں قائد ایوان کیوں نہیں بن سکتی؟

مگر یہ سوال بھی لاعلمی پر مبنی ہے کیونکہ اسمبلی کی رکنیت اور چیز ہے اور حکمرانی کے اختیارات اس سے بالکل مختلف ہیں۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدینؓ نے خواتین کو مشاورت میں شریک کرنے سے منع نہیں کیا بلکہ خود بھی متعلقہ امور میں عورتوں سے مشاورت کرتے رہے ہیں۔ اس لیے علمی اور عوامی دونوں امور میں عورت کو اسمبلی کی رکن کی حیثیت سے مشاورت میں شریک کیا جا سکتا ہے، البتہ اس کے لیے پردہ کے شرعی احکام کی پابندی ضروری ہوگی۔ مگر حکمرانی کے اختیارات عورت کے حوالے کرنے سے قرآن و سنت میں صراحت کے ساتھ منع کیا گیا ہے اس لیے اس کی گنجائش نہیں ہے۔

سربراہ مملکت یا سربراہ حکومت؟

یہ الجھن بھی پیش کی جا رہی ہے کہ قرآن و سنت میں عورت کو سربراہ مملکت بنانے کی ممانعت کی گئی ہے اور سربراہ مملکت تو صدر ہوتا ہے جبکہ وزیراعظم سربراہ حکومت ہوتا ہے، اس لیے اس ممانعت کا اطلاق صرف صدر پر ہوتا ہے وزیراعظم پر نہیں ہوتا۔ لیکن تھوڑے سے غور و فکر کے ساتھ یہ الجھن بھی ختم ہو جاتی ہے اس لیے کہ

- ابتدائے اسلام میں مملکت اور حکومت کی تقسیم کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت کے عہدے ایک ہی شخصیت کے پاس ہوتے تھے۔ اس لیے قرآن و سنت نے عورت کے حاکم ہونے کی جو ممانعت کی ہے وہ ان دونوں حیثیتوں کو شامل ہے، اور اگر ان دونوں حیثیتوں کو الگ کر لیا جائے گا تو اس ممانعت کا اطلاق ہر ایک پر ہوگا۔ اس لیے اس اصول کے مطابق عورت نہ سربراہ مملکت بن سکتی ہے اور نہ ہی سربراہ حکومت کا منصب سنبھال سکتی ہے۔

• سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت کی منصبی حیثیتوں کو الگ الگ کر کے بھی تجزیہ کیا جائے تو ممانعت کا پہلا مصداق سربراہ حکومت کا منصب قرار پاتا ہے۔ کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جو اس ضمن میں محدثین نے روایت کیے ہیں ان میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ وہ قوم کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنے امر کا والی عورت کو بنا دیا۔ یہ فرمایا کہ جب تمہارے "امور" عورتوں کے سپرد ہوں گے تو تمہارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہوگا۔ اب یہ دیکھ لیجئے کہ "امر" اور "امور" کا تعلق مملکت اور حکومت میں سے کس کے ساتھ ہے؟ ظاہر بات ہے کہ امور کا طے کرنا حکومت کا کام ہوتا ہے اس لیے ان احادیث کی روشنی میں عورت کے لیے حکمرانی کی ممانعت کا مصداق سب سے پہلے سربراہ حکومت ہے اور کسی عورت کے وزیراعظم بننے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے۔

جمہوری عمل اور علماء

یہ اعتراض بھی سامنے لایا گیا ہے کہ پاکستان میں خاتون کا وزیراعظم کے منصب پر فائز ہونا جمہوری عمل کا نتیجہ ہے اور یہ وہی جمہوری عمل ہے جس میں خود علماء کی جماعتیں حصہ لیتی رہی ہیں اور اب بھی اس میں شریک ہیں۔ اس لیے جب علماء اس جمہوری عمل کو تسلیم کرتے ہیں اور خود اس میں حصہ لیتے ہیں تو اس کے نتائج کو تسلیم کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ علماء نے کسی دور میں بھی آزاد جمہوری عمل کو تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی اب وہ اسے قبول کرتے ہیں بلکہ علماء کرام نے جدوجہد کر کے

• قرارداد مقاصد کی صورت میں جمہوری عمل کو قرآن و سنت کا پابند قرار دلوایا۔

• ۲۲ دستوری نکات کی صورت میں اسلامی اصولوں کے پابند جمہوری عمل کا تصور پیش کیا۔

• ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے اور قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنائے جانے کی ضمانت کی دفعات شامل کرائی۔

اس لیے جب علماء قیام پاکستان سے اب تک آزاد جمہوری عمل کو رد کرتے ہوئے قرآن و سنت کے دائرہ میں محدود جمہوری عمل کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں تو انہیں جمہوری عمل کے ہر اس فیصلے کو مسترد کرنے کا حق حاصل ہے جو قرآن و سنت کے احکام کے منافی ہو۔

دستور کی خلاف ورزی

بعض ذمہ دار حضرات کی طرف سے کہا گیا ہے کہ عورت کی حکمرانی کی مخالفت ملک کے آئین کی خلاف ورزی ہے اور اس پر سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان حضرات کا یہ کہنا مغالطہ پر مبنی ہے بلکہ اگر دستوری دفعات کا تجزیہ کیا جائے تو خود عورت کو حکمران بنانا آئین کی خلاف ورزی قرار پاتا ہے۔ کیونکہ دستور میں کسی عورت کو صدر یا وزیراعظم بنائے جانے کا جواز صریحا مذکور نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ دستور اس بارے میں خاموش ہے۔ لیکن جب سے قرارداد مقاصد کو دستور کا باقاعدہ حصہ بنایا گیا ہے آئینی طور پر اس بات کی پابندی ضروری ہوگئی ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی فیصلہ یا حکم نافذ نہ کیا جائے۔ اس لیے جب عورت کو حکمران بنانا قرآن و سنت کی رو سے جائز نہیں ہے تو قرارداد مقاصد کی روشنی میں خود بخود یہ پابندی ضروری ہو جاتی ہے کہ کسی عورت کو وزیراعظم نہ بنایا جائے۔ اس بنا پر عورت کی حکمرانی کی مخالفت آئین کی خلاف ورزی نہیں بلکہ عورت کو وزیراعظم بنانا ملک کے دستور کی خلاف ورزی قرار پائے گا۔

اس ضمن میں ایک اور نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ جب مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمدؒ نورانی اور دیگر علماء نے اس دستور پر دستخط کر دیے تھے تو انہوں نے اسے اسلامی تسلیم کر لیا تھا، اس لیے اس دستور کے مطابق جو کام ہو گا وہ اسلام کے مطابق ہی ہو گا۔

لیکن یہ سراسر مغالطہ ہے کیونکہ ۱۹۷۳ء کا دستور تیار کرنے والی دستور ساز اسمبلی میں جو ارکان تھے انہوں نے اس دستور پر غیر مشروط دستخط نہیں کیے تھے بلکہ طویل مذاکرات کے نتیجہ میں یہ آئینی ضمانت حاصل کی تھی کہ ملک میں تمام غیر اسلامی قوانین کو سات سال کے اندر قرآن و سنت کے مطابق تبدیل کر دیا جائے گا۔ یہ ضمانت خود اسی آئین میں درج ہے کہ اس ضمانت کے حصول کے بعد علماء نے آئین پر دستخط کیے تھے۔ اب بھی صورتحال یہ ہے کہ علماء ملک کے آئین و قانون کو اس طرح غیر مشروط ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس سے انہیں قرآن و سنت پر بالادستی حاصل ہو جائے۔ بلکہ بالادستی قرآن و سنت کی ہے اور

علماء کی تمام تر جدوجہد کا مرکزی ہدف یہی ہے کہ آئین و قانون کو قرآن و سنت کی بالادستی کا عملاً پابند بنایا جائے۔

محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت

یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ جو علماء آج عورت کے حکمران بننے پر مخالفت کر رہے ہیں ان کی اکثریت نے ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔
لیکن یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے کیونکہ اس وقت علماء کی تین بڑی جماعتیں تھیں۔ جمعیت علماء اسلام پاکستان جس کی قیادت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ کر رہے تھے۔ جمعیت اہل حدیث پاکستان جس کی قیادت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کے ہاتھ میں تھی اور جمعیۃ العلماء پاکستان جس کے سربراہ صاجزادہ سید فیض الحسنؒ تھے۔ ان تینوں جماعتوں نے باقاعدہ جماعتی فیصلوں کی صورت میں اعلان کیا تھا کہ چونکہ عورت کو ملک کا حکمران بنانا شرعاً جائز نہیں ہے اس لیے وہ محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت سے قاصر ہیں۔
اس سلسلہ میں قومی اسمبلی کے ایک عالم دین رکن نے گزشتہ دنوں قومی پریس میں یہاں تک کہہ دیا کہ عورت کی حکمرانی کے خلاف راولپنڈی میں علماء کا جو کنونشن منعقد ہوا تھا اس کے شرکاء کی اکثریت نے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔ ہماری طرف سے یہ عرض کیا گیا ہے کہ راولپنڈی کنونشن میں شریک ہونے والے علماء کی تعداد دو ہزار سے متجاوز ہے، ان میں سے صرف بیس افراد کی ہی نشاندہی کر دی جائے جنہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا تھا لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ اور یہ ایک ایسی خلاف واقعہ بات ہے جس کی تحقیق کیے بغیر بعض ثقہ اور ذمہ دار نظر آنے والے حضرات بھی اسے بار بار دہرائے جا رہے ہیں۔

علماء پہلے کہاں تھے؟

یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ علماء کو اچانک یہ بات سوجھی ہے کہ عورت کو وزیراعظم بنانا درست نہیں ہے، اس سے قبل علماء خاموش رہے ہیں، ان کے سامنے دستور بنے ہیں اور ساری باتیں ہوتی رہی ہیں مگر علماء نے کبھی اس قسم کی مہم نہیں چلائی۔ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ یہ بھی محض مفروضہ ہے جو حالات اور واقعات کے تسلسل سے بے خبری کے باعث قائم کر لیا گیا ہے، ورنہ

• جب قرارداد مقاصد میں یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ کوئی کام قرآن و سنت کے منافی نہیں ہو گا تو اس مسئلہ میں بھی علماء کے اطمینان کے لیے یہ بات کافی تھی۔

• اس کے باوجود تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء نے ۱۹۵۲ء کے طے کردہ ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں یہ طے کر دیا تھا کہ سربراہ حکومت کے لیے مرد ہونا ضروری ہے۔

• ۱۹۷۳ء کا دستور جب دستور ساز اسمبلی میں زیر بحث تھا تو شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ اکوڑہ خٹک نے اس مسئلہ پر مستقل دستوری ترمیم پیش کی تھی جو دستور ساز اسمبلی کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس پر مولانا مرحوم نے اسمبلی میں اپنے خطاب کے دوران دلائل کے ساتھ اس مسئلہ کو واضح کیا تھا کہ عورت کو حکمران بنانا شرعاً جائز نہیں ہے۔

• جنرل ضیاء الحق مرحومؒ کے دور میں وفاقی مجلس شوریٰ نے آئینی ترامیم کے لیے محترم فدا محمد خان کی سربراہی میں کمیٹی قائم کی تھی، اس کمیٹی کے رکن مولانا قاضی عبد اللطیف نے عورت کی حکمرانی کے مسئلہ کی وضاحت کی اور باقی ارکان کے نہ ماننے کی وجہ سے اپنا اختلافی نوٹ تحریر کرایا جو کمیٹی کے ریکارڈ میں موجود ہے۔

• حالیہ انتخابات کے بعد جب ایک خاتون کے وزیر اعظم بننے کے امکانات واضح ہونے لگے تو جمعیت علماء اسلام پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا سمیع الحق نے صدر جناب غلام اسحاق خان سے ملاقات کر کے ان پر مسئلہ کی شرعی پوزیشن واضح کی اور پورے ملک کے علماء کی طرف سے اتمام حجت کا فریضہ ادا کیا۔

اس لیے یہ بات کہنا غلط ہے کہ علماء اس سے قبل خاموش رہے ہیں اور اب ایک خاص پارٹی کی ضد میں اس کی وزیر اعظم کی مخالفت کر رہے ہیں۔

جناب غلام اسحاق خان کی حمایت

بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ عورت کی حکمرانی کی مخالفت کرنے والے بعض علماء نے صدارتی انتخابات میں جناب غلام اسحاق خان کی حمایت کی حالانکہ وہ اس

سے قبل ایک خاتون کو وزیراعظم نامزد کر چکے تھے، اس لیے ان علماء کے قول و فعل میں تضاد ہے۔

لیکن یہ بات بھی مغالطہ انگیزی کے سوا کچھ وزن نہیں رکھتی کیونکہ اس صدارتی انتخاب میں دو امیدوار سامنے آئے تھے۔ ایک جناب غلام اسحاق خان جنھوں نے ایک خاتون کو ملک کا وزیراعظم نامزد کیا ہے اور دوسرے جناب نوابزادہ نصر اللہ خان جو ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخاب میں ایک خاتون کو ملک کا سربراہ بنانے کی مہم کی قیادت کر چکے ہیں اور اب تک اپنے اس کارنامہ کا فخر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ اس لیے اس حیثیت سے تو دونوں امیدوار برابر تھے۔ اس صورتحال میں جن علماء نے جناب غلام اسحاق خان کی حمایت کی ان کے پیش نظر ملک میں سیاسی توازن کو برقرار رکھنا تھا کیونکہ اگر صدر اور وزیراعظم دونوں ایک ہی کیمپ (ایم آر ڈی) کے بن جاتے تو ''ضیاء دشمنی'' کی قدر مشترک انہیں آٹھویں آئینی ترمیمی بل سمیت بہت سے ایسے اقدامات کے خاتمہ پر جمع کر دیتی جس سے ملک و قوم کو بہر حال کوئی فائدہ نہ ہوتا بلکہ سیاسی عدم توازن ملک میں نئے بحران کا باعث بن جاتا۔ علماء نے اس بحران اور سیاسی عدم توازن سے ملک کو بچانے کے لیے جناب غلام اسحاق خان کی حمایت کی ہے۔

قوت فیصلہ پارلیمنٹ کے پاس ہے

یہ بات بھی بعض حلقے پیش کر رہے ہیں کہ جمہوری نظام میں قوت فیصلہ پارلیمنٹ کے پاس ہوتی ہے اور وزیراعظم صرف ان فیصلوں کے نفاذ کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس لیے وزیراعظم پر اس مطلق حکمرانی کا اطلاق نہیں ہوتا جس کی نفی قرآن و سنت میں عورت کے لیے کی گئی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اصول کے خلاف ہے اس لیے کہ

- اکثر جمہوری ممالک بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں جمہوریت کی ہیئت کذائیہ یہ ہوتی ہے کہ اکثریتی پارٹی پارلیمنٹ میں فیصلوں کا محور ہوتی ہے اور اکثریتی پارٹی کے فیصلوں کا محور اس کا لیڈر ہوتا ہے، اس لیے عملاً فیصلوں کی باگ ڈور وزیراعظم کے ہاتھ میں ہی ہوتی ہے۔
- معروف مسلمان مفکر علامہ الماوردیؒ نے الاحکام السلطانیہ (ص ۲۵) میں صراحت کی ہے کہ صرف (طے شدہ فیصلوں کو) نافذ کرنے والی وزارت اگرچہ

کمزور وزارت ہے اور اس کی شرائط کم ہیں لیکن عورت کے لیے یہ وزارت بھی جائز نہیں ہے۔

• حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد کی وزارت اعلی کے دور میں اپنے ساتھ شریک اقتدار جماعت کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ نیپ کی رکن صوبائی اسمبلی بیگم محمودہ سلیم کو صوبائی کابینہ میں شامل کیا جائے۔ مولانا مفتی محمودؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلامی احکام کی رو سے کسی عورت کو ماتحت وزیر کی حیثیت سے بھی شریک اقتدار نہیں کیا جا سکتا۔

صرف ایک ہی مسئلہ کیوں؟

بعض ارباب علم و فضل ایک اور غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں جس کا اظہار وہ اپنی مجالس میں دبے لفظوں کے ساتھ کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ یہ بجا ہے کہ عورت شرعاً حکمران نہیں بن سکتی اور ایک خاتون کا وزیر اعظم بن جانا شرعی طور پر غلط ہے، لیکن ملک میں صرف یہی تو ایک مسئلہ نہیں ہے اور بھی بہت سے مسائل ہیں علماء کی جدوجہد کے اور بھی بہت سے میدان ہیں، اس لیے علماء کو صرف ایک مسئلہ کے پیچھے نہیں پڑ جانا چاہیے۔

ہم ان حضرات کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ان علماء حق کی جدوجہد اور قربانیوں کا حوالہ دیں گے جنہوں نے گزشتہ چودہ سو سال کے دوران مختلف ادوار میں جدوجہد کی اور قربانیوں کی نئی روایات قائم کیں۔ ان میں سے جس بزرگ کے حالات کا مطالعہ کریں گے آپ کو اس کی جدوجہد کا ہدف ایک ہی مسئلہ ملے گا۔

امام احمد بن حنبلؒ کو دیکھ لیجئے انہوں نے خلق قرآن کے گمراہ کن عقیدہ کو اپنی جدوجہد کا ہدف بنا لیا حالانکہ اس وقت گمراہیاں اور بھی تھیں مسائل اور بھی تھے لیکن امام احمدؒ نے اپنی پشت پر کوڑے صرف خلق قرآن کے مسئلہ پر کھائے۔ کیا ہمارے آج کے بزرگ ان کے بارے میں بھی یہی بات فرمائیں گے کہ امام احمدؒ کو کیا پڑی تھی کہ ایک ہی مسئلہ کے پیچھے پڑ گئے، اس دور میں اور مسائل بھی تھے ان پر اس شدومد کے ساتھ امام احمدؒ نے آواز نہ اٹھائی۔ امام مالکؒ کی مظلومیت کا باعث بھی صرف ایک مسئلہ تھا۔ امام سرخسیؒ کو بھی صرف ایک مسئلہ کی خاطر اندھے کنوئیں کی جیل کاٹنی پڑی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی مسئلہ اس زمانہ کی مجموعی گمراہیوں کا عنوان بن جاتا ہے اور پھر علماء حق کی تمام تر توجہ اس ایک مسئلہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اور وہ بجا طور پر

یہ سمجھتے ہیں کہ اس ایک بڑی گمراہی کے خاتمہ سے اس کے ضمن میں آنے والی باقی خرابیاں خود بخود مٹ جائیں گی۔ آج یہی صورتحال پاکستان کے علماء کو درپیش ہے، اس ملک میں چوالیس سال سے ایک کشمکش چلی آرہی ہے کہ ملک کے آئین و قانون پر قرآن و سنت کو بالادستی حاصل ہوگی یا اسلام کا لیبل لگانے کے باوجود ملک کے اجتماعی نظام کو سیکولرازم کی بنیاد پر چلایا جاتا رہے گا؟ اسلامی حدود، دیت، شہادت، رجم، قصاص، پردہ اور دیگر امور کے بارے میں سیاسی لیڈروں کے قرآن و سنت کے خلاف بیانات اور ملحد طبقوں کی مہم کا پس منظر یہی نظریاتی کشمکش ہے۔ اور یہی نظریاتی کشمکش آج عورت کی حکمرانی کی صورت میں مشخص ہوکر عملی حیثیت سے سامنے آگئی ہے۔ اب اگر اسے قبول کرلیا جاتا ہے تو مذکورہ بالا تمام گمراہیوں اور ان کے اصل سرچشمہ سیکولرازم کو بھی ہضم کرنا پڑے گا۔ اور اگر علماء نے متحد ہوکر اسے بریک لگادی تو گمراہیوں کے اس سیلاب کے سامنے بند باندھنے اور آئین و قانون پر قرآن و سنت کی بالادستی قائم کرنے کی راہ بھی ہموار ہوجائے گی۔

اس لیے ہمارے نزدیک اس وقت پاکستان کے علماء کرام کو اسوۂ صدیق اکبرؓ کو مشعل راہ بنانا چاہیے جنھوں نے نگاہ بصیرت سے یہ بھانپ لیا تھا کہ بیت المال کو زکوۃ ادا کرنے سے انکار صرف ایک مسئلہ نہیں بلکہ بہت سے فتنوں کا دروازہ ہے۔ اس لیے انہوں نے کمال عزیمت کے ساتھ ہر قیمت پر اس دروازے کو بند کرنے کا فیصلہ کرلیا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی فیصلہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے حق میں درست اور بروقت ثابت ہوا۔

۱۹۸۷ء

چند روز حرمین شریفین کی فضاؤں میں

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

لندن کی عالمی ختم نبوت کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی پر عمرہ کا ارادہ تھا، سعودی عرب کے سفارت خانہ سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ ابھی عمرہ کے ویزا پر پابندی ہے۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے ایک وفد نے مولانا سید عبد القادر آزاد کی سربراہی میں سفارتخانہ کے حکام سے ملاقات کی تو ختم نبوت کانفرنس کے شرکاء میں سے واپسی پر عمرہ ادا کرنے کے خواہشمند حضرات کو وزٹ ویزا دے دیا گیا۔ چنانچہ ۲۳ ستمبر کو KLM کی فلائٹ سے پہلے لندن سے ایمسٹرڈیم اور پھر وہاں سے جدہ کا سفر کیا۔ جدہ ایئرپورٹ سے ضروری امور کی تکمیل کے بعد باہر نکلا تو مقامی وقت کے مطابق رات کے تقریباً دس بج چکے تھے۔

جدہ میں متعدّد دوست رہائش پذیر ہیں لیکن کسی کو اطلاع نہ دے سکا۔ خواہش یہ تھی کہ رات ہی رات مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ ادا کر لیا جائے، ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلتے ہی ٹیکسی ڈرائیوروں کی یلغار کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ دیر اسی جگہ کھڑا رہنے میں عافیت سمجھی۔ پھر ایک نوجوان ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ اس ہجوم سے الگ ہو گیا۔ اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ دو سو ریال میں مکہ لے جائے گا۔ دو سو ریال کا مطلب ہمارے پاکستانی سکے میں تقریباً ایک ہزار روپے تھا جو میرے وارے میں نہیں تھا۔ اس سے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا تو پتہ چلا کہ وہ ہزارہ میں بٹل کے مقام کا رہنے والا ہے۔ میرا آبائی تعلق بھی ہزارہ کے اسی علاقے سے ہے اور بہت سے رشتہ دار اب بھی اس علاقہ میں قیام پذیر ہیں۔ میں نے "ہزارویت" کے اس تعلق کو مزید آگے بڑھایا تو اس نوجوان ڈرائیور کا دل کچھ پسیجا اور اس

نے مشورہ دیا کہ آپ کے لیے بہتر ہے کہ میں آپ کو پچاس ریال میں جدہ کے جنرل بس اسٹینڈ تک لے جاتا ہوں وہاں سے آپ کو ٹیکسی مل جائے گی جو پندرہ ریال فی کس کے حساب سے مسافروں کو مکہ مکرمہ لے جاتی ہے۔ چنانچہ اس مشورہ کی بنیاد پر میں نے جنرل بس اسٹینڈ تک جانا بہتر سمجھا۔ وہاں ایک بڑی ٹیکسی تیار کھڑی تھی جس میں آٹھ سیٹیں تھیں اور وہ ہمیں پندرہ کی بجائے دس ریال فی کس کے حساب سے مکہ مکرمہ لے گئی۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر مسجد حرام کے مینار جب نظر آئے تو رات کا پون بج چکا تھا، عجیب و غریب کیفیت تھی، کم و بیش دو سال کے بعد حرم پاک میں حاضری کا موقع ملا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی تاخیر کے بغیر بیت اللہ کے گرد طواف کرنے والوں کے ہجوم میں شامل ہوا جائے مگر ہاتھوں میں سامان کے دو بیگ رکاوٹ تھے انہیں مسجد حرام میں نہیں لے جا سکتا تھا اور باہر بھی انہیں کسی جگہ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ مکہ مکرمہ میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے راہنما مولانا عبد الحفیظ مکی کے علاوہ میرے خالو مولانا قاضی محمد رویس خان بھی رہائش پذیر ہیں جو مکہ یونیورسٹی میں ایل ایل ایم کے آخری سال میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور محلہ اجیاد میں ان کی رہائش ہے لیکن میں نے یہاں بھی کسی کو اطلاع نہیں دی تھی اس لیے لاچار ہوٹل کا سہارا لینا پڑا۔ حرم پاک کے سامنے ٹیکسی سے اترتے ہی لاہور کے ریلوے اسٹیشن سے باہر والا منظر سامنے آگیا۔ تین چار اطراف سے کمرہ کمرہ کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر سامان اٹھا لیا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ملتان کے علاقے کا رہنے والا ہے، ایک ہوٹل میں لے گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے صرف صبح تک سامان رکھنے کی جگہ چاہیے۔ اس نے کہا کہ چھوٹے کمرہ کا کرایہ تیس ریال ہے آپ سے پچیس ریال لے لوں گا۔ سامان کمرہ میں رکھ کر چابی لی اور وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر مسجد حرام میں داخل ہوا۔ ان دنوں وہاں رش نہیں تھا، حاجی حضرات کم و بیش سب واپس جا چکے تھے اور عمرہ کے ویزا پر پابندی تھی اس لیے رش بہت کم تھا۔

مسجد حرام کے صحن میں پہنچا تو فیصل آباد کے حاجی خلیل احمد لدھیانوی بیٹھے ہوئے تھے، ملاقات ہوئی، کچھ حال احوال کا ذکر ہوا، انہوں نے لندن ختم نبوت کانفرنس کی تفصیلات دریافت کیں۔ اس کے بعد عمرہ ادا کیا، رش کی کمی اور رات کے پچھلے پہر کے وقت نے عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ خدا کے سیاہ پوش گھر کے اتنے قریب سے طواف اور حجر اسود کے بوسے کی بار بار سعادت نے دل کو ہلچل کی ایک نئی کیفیت سے دوچار کیا۔ جب عمرہ کی

ادائیگی سے فارغ ہوا تو فجر کی اذان میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ حاجی خلیل احمد لدھیانوی اپنی رہائش گاہ پر لے گئے اور صبح گاہی چائے کے ساتھ انہوں نے سفر کی ساری تھکان دور کر دی۔ واپس مسجد حرام پہنچے تو ارادہ کیا کہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر ہوٹل میں جا کر آرام کروں گا اور ظہر کے بعد قاضی محمد رویس خان کی رہائش گاہ تلاش کی جائے گی لیکن خدا کا کرم ہوا کہ نماز فجر میں قاضی محمد رویس خان میرے ساتھ ہی آکر صف میں کھڑے ہو گئے۔ اس اتفاقیہ ملاقات سے بے حد خوشی ہوئی۔ نماز کے بعد انہوں نے ہوٹل سے میرا سامان اٹھایا اور ہم ان کی رہائش گاہ پر منتقل ہو گئے۔ ان کا موڈ تو ہوٹل والے سے پچیس ریال واپس لینے کا بھی تھا مگر سفر کی نوعیت کے پیش نظر میں نے اسے مناسب نہ سمجھا۔

مکہ مکرمہ میں چار روزہ قیام کے دوران مدرسہ صولتیہ میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر پاک و ہند سے ہجرت کرنے والے معروف عالم دین اور جنگ آزادی کے ممتاز راہنما مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کوششوں سے قائم ہوا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی کے محاذ پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ انہیں عیسائیت کی تردید میں بھی امتیازی مقام حاصل تھا، معروف پادری ڈاکٹر فنڈر انہی سے مناظرہ میں شکست کھا کر برصغیر سے فرار ہو کر ترکی پہنچے تھے اور ترکی میں جب وہاں کے علماء ڈاکٹر فنڈر کی یلغار سے عاجز آگئے تو عثمانی خلیفہ نے حرم پاک میں حج کے موقع پر اعلان کرایا کہ ایک منطقی اور فلسطی پادری نے ترکی کے علماء کو پریشان کر رکھا ہے کوئی اس کا مقابلہ کرنے والا ہو تو ہمارے پاس آئے۔ مولانا رحمت علی کیرانویؒ ان دنوں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ جا چکے تھے، وہ عثمانی خلافت کے ذمہ دار حضرات کے سامنے پیش ہوئے تو انہیں مولانا موصوف کے سادہ لباس اور عام وضع قطع کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ یہ سادہ سا مولوی اس پادری کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن جب مولانا کیرانویؒ کو ترکی لے جایا گیا اور ڈاکٹر فنڈر کو معلوم ہوا کہ وہی ہندوستان والا مولوی یہاں ترکی میں آگیا ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر مناظرہ سے انکار کر دیا کہ میں نے تو علماء ترکی کو مناظرہ کا چیلنج دیا تھا اس کے ساتھ ہی ترکی سے فرار عافیت سمجھی اور ترکی کے علماء کی اس مصیبت سے جان چھوٹ گئی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اس موقع پر ”اظہار الحق“ کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں موجودہ بائبل کو تحریف شدہ ثابت کیا گیا ہے اور اس پر ایسے دلائل قائم کیے

گئے ہیں جن کا جواب ابھی تک عیسائی علماء سے نہیں بن پڑا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ پاکستان کی سپریم کورٹ کے جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے ایک وقیع مقدمہ کے ساتھ ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے اور اردو زبان میں تحریف بائبل کے موضوع پر آخری اور فیصلہ کن کتاب ہے۔

بات مدرسہ صولتیہ کی ہو رہی تھی، یہ مکہ مکرمہ میں حنفی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والا واحد مدرسہ ہے جس کا اہتمام مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے پڑپوتے مولانا محمد شمیم کے ہاتھ میں ہے۔ مدرسہ صولتیہ حج کے دنوں میں پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے عازمین حج کے لیے راہنمائی اور خدمت کے ایک بہت بڑے مرکز کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ حاجیوں کو دینی مسائل سے آگاہ کرنا، ان کی امانتوں کی حفاظت کرنا، ضروری امور میں ان کی راہنمائی کرنا، ان کی قربانیوں کا مناسب اور قابل اعتماد انتظام کرنا، ان کی ڈاک اپنے پتہ پر منگوانا اور دیگر ضروری امور حج کے دنوں میں اس دینی ادارہ کے فرائض میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مولانا محمد شمیم سے ملاقات ہوئی، مختلف امور پر تبادلۂ خیالات ہوا، پاکستان میں بموں کے دھماکوں، کراچی کے حالات اور نفاذ شریعت میں مسلسل تاخیر پر بے حد مضطرب او رپریشان تھے۔ انہوں نے اس خواہش کا بار بار اظہار کیا کہ پاکستان کے دینی حلقے مل جل کر ملک کو بچانے اور اسلام کے نفاذ کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں۔

مدینہ منورہ میں استاذ محترم قاری محمد انور صاحب کے پاس ایک روز قیام رہا۔ قرآن کریم حفظ کرنے میں میرے سب سے بڑے اور آخری استاذ قاری صاحب موصوف ہیں۔ کافی عرصہ سے مدینہ منورہ میں حفظ قرآن کریم کے ایک مدرسہ میں استاذ ہیں۔ یہ مدرسہ آزاد کشمیر کے معروف قاری جناب قاری خلیل احمد نے قائم کیا تھا، پہلے پرائیویٹ تھا اب جامعہ محمد بن سعود ریاض کے تحت حفظ قرآن کریم کے سارے مدارس سرکاری نگرانی میں آچکے ہیں۔ سعودی عرب میں حفظ قرآن کریم کے مدارس قائم کرنے کا اعزاز بھی ایک پاکستانی بزرگ حاجی سیٹھی محمد یوسف مرحوم کو حاصل ہوا ہے۔ آج سے پچیس تیس سال پہلے اس علاقہ میں قرآن کریم حفظ کرنے کا کوئی باقاعدہ سلسلہ نہیں تھا۔ گتہ فیکٹری راہوالی ضلع گوجرانوالہ کے مالک حاجی سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے پاکستان میں بے شمار مقامات پر حفظ قرآن کے مکاتب و مدارس قائم کرائے تو انہیں حجاز مقدس میں بھی اس سلسلۂ خیر کو جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ مظفر آباد سے قاری محمد خلیل صاحب، لاہور سے قاری محمد

ذاکر صاحب اور دیگر قراء کو ساتھ لائے اور یہاں ذمہ دار حضرات سے اس مسئلہ پر بات چیت کی۔ کافی تگ و دو اور مشکلات کے بعد انہیں مکہ مکرمہ کی ایک دو مساجد میں حفظ قرآن کے مدارس چھوٹی سطح پر قائم کرنے کی اجازت ملی جو بڑھتے بڑھتے پورے سعودی عرب میں پھیل گئے اور اب سعودی عرب کے مختلف شہروں میں کام کرنے والے ان مدارس کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے جنہیں جامعہ محمد بن سعود ریاض کے ایک خصوصی شعبہ کی نگرانی میں دے دیا گیا ہے۔

قاری محمد خلیل صاحب اب بھی مدینہ منورہ میں پڑھاتے ہیں، ان کے ساتھ استاذ محترم قاری محمد انور صاحب، جناب قاری عبد الرحمان تونسوی اور دیگر اساتذہ اس مدرسہ میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ سیٹھی محمد یوسف مرحوم کا تعلق ایک نومسلم خاندان سے ہے، ان کے والد محترم مسلمان ہوئے تھے اور یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے گاؤں بھی قریب قریب ہیں۔ سیٹھی صاحب مرحوم کے والد محترم ترگڑی کے رہنے والے تھے جبکہ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم جلال کے تھے۔ اور ان کے ساتھ اس زمانے میں ایک اور بزرگ باوا جی عبد الحقؒ بھی مسلمان ہوئے جو تلونڈی کھجور والی کے رہنے والے تھے۔ یہ تینوں گاؤں گکھڑ کے قریب بالکل ساتھ ساتھ ہیں اور اللہ رب العزت نے ان تینوں سے دین کی خدمت کا نمایاں کام لیا ہے۔

1. باوا جی عبد الحقؒ کم و بیش نصف صدی تک گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد (شیرانوالہ باغ) کے امام رہے ہیں، اس مسجد میں آج کل خطابت کی ذمہ داری راقم الحروف کے سپرد ہے۔ باوا جی مرحوم مستجاب الدعوات بزرگ کی حیثیت سے مرجع خلائق تھے۔ ساری زندگی قرآن کریم کی تعلیم دیتے رہے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے بھی قرآن کریم باوا جی مرحوم سے پڑھا۔ باوا جیؒ کی قبر گوجرانوالہ کے بڑے قبرستان میں ہے اور پرانے لوگ اب بھی ان کی قبر تلاش کر کے فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

2. حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے اللہ تعالی نے قرآن کریم کی جو خدمت لی وہ سب کے سامنے ہے۔ انہوں نے اس دور میں لاہور میں قرآن کریم کے ترجمہ اور درس کا آغاز کیا جب یہ سلسلہ خود دینی حلقوں میں مانوس نہ تھا۔

3. اور سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے نہ صرف پاکستان بلکہ سعودی عرب میں قرآن کریم کے حفظ کے ہزاروں مدارس قائم کرانے کی جو جدوجہد کی وہ عالم اسلام کی دینی جدوجہد کا ایک روشن باب ہے۔

تو مسلم خاندانوں کی یہ دینی خدمات دیکھ کر اللہ تعالی کی بے نیازی کا مظاہرہ سامنے آتا ہے جس کا ذکر اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اس طرح کیا ہے کہ

"اگر تم پھر جاؤ گے تو اللہ تعالی تمہارے سوا دوسرے لوگوں کو لے آئیں گے اور وہ تمہارے جیسے نہیں ہوں گے۔"

وزٹ ویزا کا یہ فائدہ ہوا کہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ کے علاوہ اس مرتبہ ریاض جانے کا موقع بھی مل گیا۔ وہاں پاکستان کے بے شمار لوگ رہتے ہیں، میرے بڑے بہنوئی حاجی سلطان محمود خان ریاض کے قریب صلبوح پاور ہاؤس میں ڈیزل مکینک ہیں۔ سینکڑوں پاکستانی قاری حضرات ریاض اور اردگرد کے شہروں میں حفظ قرآن کریم کے مدارس میں کام کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ گکھڑ کے مدرسہ تجوید القرآن میں محمد رفیق نام کے تین ساتھی تھے، ہم سب نے قاری محمد انور صاحب سے قرآن کریم یاد کیا۔ ایک قاری محمد رفیق درزی کے نام سے متعارف ہیں، دوسرے قاری محمد رفیق گیلانی کہلاتے ہیں، تیسرے قاری محمد رفیق وڑائچ ہیں اور اتفاق سے تینوں ریاض میں ہیں۔ اکثر دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ قاری جمیل الرحمان کشمیری نے رات کو عشائیہ میں متعدّد حضرات کو مدعا کر رکھا تھا مگر مجھے سب سے زیادہ حیرت ہزارہ کے ایک نوجوان جناب ضیاء الرحیم ضیاء کی پھرتی پر ہوئی۔ انہیں میری حاضری کا علم مغرب سے پہلے ہوا اور یہ بھی بتایا گیا کہ واپسی کے لیے رات گیارہ بجے ایئرپورٹ پہنچنا ہے مگر انہوں نے مختصر ترین وقت میں ایک اچھی خاصی نشست کا اہتمام کر لیا۔ رات دس بجے ان کے ہاں متعدّد پاکستانی احباب کے علاوہ پاکستانی اور عرب اخبارات کے نمائندے جمع تھے۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی اور سوال و جواب کی نشست بڑی پر لطف رہی۔ جناب ضیاء الرحیم ضیاء حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے عزیزوں میں سے ہیں اور رشتہ میں ان کے نواسے لگتے ہیں، ریاض میں دکان کرتے ہیں اور سماجی تقریبات کا وقتاً فوقتاً اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ مزید وقت گزارنے کو جی چاہتا تھا مگر طیارے کی روانگی کے لیے وقت کا دامن لحظہ بہ لحظہ سمٹ رہا تھا اس لیے ساڑھے گیارہ بجے بادل نخواستہ ان سے معذرت کر کے پاکستان واپسی کے لیے ریاض کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

مہدی سوڈانی کا تعارف اور امام سراج وہاج سے ایک ملاقات

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

میرے نیویارک کے سفر کے مقاصد میں بلیک مسلم تحریک کے مختلف گروپوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور کسی صحیح العقیدہ گروپ کے ساتھ رابطہ کی کوشش کرنا بھی تھا۔ چنانچہ اس میں اس حد تک کامیابی حاصل ہو سکی کہ حلقہ اسلامی شمالی امریکہ کے امیر جناب عبد الشکور کی وساطت سے بلیک مسلم تحریک کے ایک اہم راہنما امام سراج وہاج کے ساتھ ایک تفصیلی نشست ہوئی۔ اور ''انصار اللہ'' کے نام سے کام کرنے والے ایک اور بلیک مسلم گروپ کے بارے میں عربی زبان میں ایک کتابچہ میسر آگیا۔ انصار اللہ کے نام سے کام کرنے والے گروہ مہدی سوڈانی کا پیروکار ہے۔ مہدی سوڈانی نے انیسویں صدی میں سوڈان کی تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا اور مسلح جنگ کے ذریعے برٹش استعمار کو سوڈان سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ خود مختاری اور آزادی کی اس جدوجہد کے حوالے سے مہدی سوڈانی سوڈان کی تحریک آزادی کا ایک روشن کردار ہے لیکن اس کتابچہ کے ذریعے مہدی اور اس کے پیروکاروں کے جو عقائد و نظریات سامنے آئے ہیں وہ ملت اسلامیہ کے معروف اور مسلمہ مکاتب فکر میں سے کسی کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتے۔

اس کتابچہ کا نام ہے ''دعوۃ المہدی فی امریکا''۔ اس کے صفحہ اول پر مہدی سوڈانی کی تصویر ہے جبکہ صفحہ دوم پر امریکہ میں اس تحریک کے موجودہ سربراہ الامام عیسی الہادی المہدی کی تصویر اور صفحہ آخر پر مہدی سوڈانی کی قبر اور امریکہ میں انصار اللہ کی بڑی مسجد کی تصاویر کے ساتھ تحریک کا پرچم بھی دیا گیا ہے۔ پرچم سبز، سرخ اور سیاہ رنگ کی تین لمبی پٹیوں پر مشتمل ہے۔ سب سے اوپر سیاہ پٹی ہے جس پر کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' لکھا ہوا ہے، درمیان میں سفید چاند اور ایک گرز ہے جبکہ سب سے نیچے سبز پٹی پر یہ جملہ درج ہے ''والہدی محمد احمد خلیفۃ رسول اللہ''۔ کتابچہ میں امام مہدی کے بارے میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف ارشادات کا حوالہ دے کر مہدی سوڈانی پر انہیں فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بنیادی تصور یہ دیا گیا ہے کہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جناب سرور کائناتؐ سیاہ فام تھے اور اصل عرب بھی سیاہ فام ہیں جو بنوامیہ

کے دور حکومت میں سوڈان جاکر آباد ہو گئے تھے۔ اس لیے اصل عرب سوڈانی ہیں اور باقی تمام عرب مخلوط نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسب نامہ کے ذریعے مہدی سوڈانی کو سیدنا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتابچہ میں بہائی فرقہ کی طرح علم الاعداد کے حوالہ سے ۱۹ کے عدد کا سہارا بھی لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد مہدی سوڈانی ۱۹ویں خلیفہ اور خاتم الخلفاء ہیں۔ ۱۹ خلفاء اور اماموں کے نام اس طرح درج ہیں: (۱) امام حسنؓ (۲) امام حسینؓ (۳) امام زین العابدینؒ (۴) امام محمد الباقرؒ (۵) امام جعفر الصادقؒ (۶) امام موسیٰ الحدیمؒ (۷) امام علی الرضاؒ (۸) امام محمد التقیؒ (۹) امام علی الناجیؒ (۱۰) امام حسن عسکریؒ (۱۱) محمد المنتصر (۱۲) عبد الکبیر (۱۳) عثمان (۱۴) یونس (۱۵) محمد (۱۶) عبد اللہ (۱۷) فحل (۱۸) سید (۱۹) مہدی سوڈانی۔

مہدی سوڈانی سے منسوب بعض روایات بھی کتابچہ میں درج ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور صلحاء کی موجودگی میں جناب نبی اکرمؐ نے مجھے اپنی مسند پر (معاذ اللہ) بار بار بٹھایا۔ ایک روایت کے مطابق مہدی کا کہنا ہے کہ جب میں جنگ کے لیے نکلتا ہوں تو تمام انبیاء کرامؑ میرے ساتھ ہوتے ہیں اور حضرت عزرائیلؑ میرا پرچم اٹھائے ہوئے سب سے آگے ہوتے ہیں۔ اس قسم کی اور روایات بھی کتابچہ میں درج کی گئی ہیں۔

انصار اللہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ امریکہ کے مختلف شہروں میں یہ خاصا مؤثر گروپ ہے، بڑے بڑے مراکز ہیں اور دعوت و تبلیغ کا کام وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ان کی گفتگو اور تقاریر میں بعض ازواج مطہراتؓ بالخصوص ام المومنین حضرت عائشہؓ کا ذکر نامناسب انداز میں کیا جاتا ہے اور حضرت عائشہؓ پر منافقین کے جس بہتان کی قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ تردید کی گئی ہے اس تہمت کو درست سمجھ کر اس کا بھی یہ لوگ ذکر کرتے ہیں۔

امام سراج وہاج بلیک مسلم تحریک کے صحیح العقیدہ گروپ کے ایک راہنما ہیں جو نیویارک کے علاقہ بروکلین کی مسجد تقویٰ کے خطیب و امام ہیں۔ اسلام کی دعوت و تبلیغ میں متحرک اور پرجوش ہیں اور نامور مسلم اسکالر جناب احمد دیدات کے ساتھ مل کر عیسائیوں کے

ساتھ مباحثوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ میری ان سے ملاقات جناب عبدالشکور کی قیام گاہ پر دوپہر کے کھانے پر ہوئی اور بہت سے مسائل پر ان سے کھل کر بات چیت ہوئی۔ ترجمانی کے فرائض جناب عبدالشکور نے سرانجام دیے۔ ہمارے ساتھ دور اور دوست آغا امان اللہ اور جناب عبدالرحمان بھی شریک محفل تھے۔ جناب سراج وہاج نے اپنی عمر ۷۳ برس بتائی اور کہا کہ وہ نیویارک یونیورسٹی کے طالب علم تھے جب وہ عالیجاہ محمد کی تحریک سے متاثر ہوئے اور مسیحی مذہب ترک کر کے عالیجاہ محمد کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ عالیجاہ محمد کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ سیاہ فام امریکیوں کو ان کے حقوق کا شعور بخشنے اور بیدار و منظم کرنے میں ان کا کردار سب سے نمایاں ہے اور انہوں نے اس محاذ پر طویل اور صبر آزما جنگ لڑی ہے۔ لیکن ان کا دعوی یہ تھا کہ:

1. وہ خدا کے آخری نبی ہیں۔
2. خدا انسانی شکل میں دنیا میں موجود ہے۔
3. قرآن کریم اللہ تعالی کی کتاب ہے لیکن اڑھائی ہزار سال کے بعد اس کا بدل جانا ضروری ہے۔
4. سفید فام لوگ شیطان کی نسل سے ہیں۔
5. نماز صرف کھڑے ہو کر دعا کرنے کا نام ہے۔
6. روزے رمضان المبارک کی بجائے ماہ دسمبر کے فرض ہیں۔
7. مچھلی، سفید چاول اور سفید آلو حرام ہیں۔

عالیجاہ محمد کے قریبی ساتھیوں میں اس کے ایک منسٹر "مالکم ایکس" تھے۔ سابق امریکی صدر مسٹر کینیڈی کے قتل کے موقع پر ایک اخباری بیان دینے پر ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے بتدریج بڑھتے چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد مالکم ایکس کو حج بیت اللہ کے لیے جانے کا موقع ملا تو انہوں نے بے شمار سفید فام مسلمانوں کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا جس سے ان کے ذہن میں یہ شک پیدا ہوا کہ حرم پاک میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے والے یہ بے شمار سفید فام آخر شیطان کی نسل سے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس شک نے بڑھتے بڑھتے تجسس کی شکل اختیار کر لی۔ مالکم ایکس نے مختلف لوگوں سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اصل اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور پایا۔ واپس جا کر انہوں نے عالیجاہ محمد سے بغاوت کا اعلان کیا اور صحیح اسلام کا پرچار شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ جن

کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پہلے سے موجود تھے مالکم ایکس کے گرد اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ مالکم ایکس نے اپنے نام کے ساتھ ایکس کا لاحقہ ہٹا کر شہباز کو اس کا متبادل بنایا اور "مالکم شہباز" کہلانا شروع کر دیا لیکن یہ مرد مجاہد ابھی پوری طرح اپنا حلقہ منظم نہ کر پایا تھا کہ ا ۹۶۵ء میں اسے شہید کر دیا گیا۔ مالکم شہباز شہیدؒ کے قتل کے الزام میں تین افراد پکڑے گئے جن میں سے دو بری ہو چکے ہیں جبکہ تیسرا ابھی جیل میں ہے۔ وہ قتل میں ملوث ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور اس کا تعلق عالیجاہ محمد کی جماعت "نیشن آف اسلام" سے ہے۔ اس لیے عام تاثر یہی ہے کہ مالکم شہباز کو عالیجاہ محمد کی جماعت نے شہید کرایا ہے۔

عالیجاہ محمد کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا ویلس دین محمد اس کا جانشین بنا لیکن اس کے عقائد میں بہت زیادہ تبدیلی آچکی ہے۔ اگرچہ وہ مکمل طور پر نہیں بدلا لیکن اب تک عالیجاہ محمد کے بہت سے نظریات سے وہ منحرف ہو چکا ہے اور تبدیلی کا یہ عمل ابھی جاری ہے۔ مگر دوسری طرف مالکم شہیدؒ کا ایک قریبی ساتھی لوئیس فرخان ان کی شہادت کے بعد عالیجاہ محمد کے عقائد کی طرف لوٹ گیا اور اس وقت عالیجاہ محمد کی جماعت "نیشن آف اسلام" کی قیادت اس کے ہاتھ میں ہے۔ مالکم شہباز شہیدؒ کوئی باقاعدہ جماعت منظم نہیں کر سکے تھے لیکن ان کی روشن کی ہوئی شمع نے بے شمار لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھایا اور اسلام کے صحیح عقائد کی دعوت و ترویج کا عمل نہ صرف سیاہ فام باشندوں بلکہ سفید فاموں میں بھی جاری ہے۔ امام سراج وہاج نے بتایا کہ صحیح العقیدہ مسلمانوں کے مختلف گروپ دعوت و تبلیغ کے عمل میں مصروف ہیں اور بہت سے سفید فام لوگ مسلمان ہو کر ہماری اس جدوجہد میں شریک ہو چکے ہیں۔ اب ہماری کوشش یہ ہے کہ ان گروپوں کے درمیان ایک مستقل رابطہ کا نظام تشکیل دیں اور وسیع پیمانے پر مل جل کر کام کو آگے بڑھائیں۔

اپنے بارے میں جناب سراج وہاج نے بتایا کہ انہوں نے عیسائیت ترک کرنے کے بعد طالب علمی کے زمانے میں عالیجاہ محمد کی تعلیمات کو اسلام سمجھ کر قبول کیا تھا لیکن مالکم شہیدؒ کی طرح انہوں نے بھی سوچنا شروع کیا پھر انہیں مکہ مکرمہ جانے کا موقع ملا۔ وہاں کچھ عرصہ "ملک عبدالعزیزؒ یونیورسٹی" میں بھی رہے۔ اس دوران انہیں اسلام کے صحیح عقائد اور دیگر ضروری امور سے آگاہی ہوئی اور اب وہ اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد پر پختگی سے کاربند ہیں اور انہیں صحیح اسلام سمجھتے ہوئے ان کے پرچار میں مصروف ہیں۔ جناب سراج وہاج نے بتایا کہ امریکہ میں عالیجاہ محمد کے گروپ کے علاوہ مہدی سوڈانی گروپ "انصار اللہ" کے نام

سے متحرک ہے اور ایک اور گروپ بھی نمودار ہوا ہے جس کی راہنمائی ٹوسان نامی شہر کے ڈاکٹر راشد خلیفہ کر رہے ہیں۔ ان صاحب نے پہلے ایک مقالہ میں علم الاعداد کے حوالہ سے ۱۹ کے عدد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس کے ذریعے قرآن کریم کی صداقت کو ثابت کیا۔ ایک نئی فنی تحقیق ہونے کی وجہ سے اسے پسند کیا گیا لیکن ان کی دوسری تحقیق یہ تھی کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ۱۹ کے عدد کے فارمولا پر پوری نہیں اترتیں اس لیے احادیث سب جعلی ہیں۔ اور اب قرآن کریم کی بعض سورتیں اور آیات بھی ان کی تنقید کا نشانہ بن رہی ہیں اور تنقید کی بنیاد وہی ۱۹ کا عدد ہے۔

امریکہ میں رائے ونڈ کی تبلیغی جماعت کی محنت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ عام مسلمانوں کی اصلاح اور انہیں اسلامی احکام پر عمل کا پابند بنانے کی حد تک اس جماعت کا عمل بہت مفید اور مؤثر ہے اور اس کے اچھے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں لیکن ہمارے ہاں زیادہ ضرورت غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کے عمل کو وسیع کرنے کی ہے اور ہم اس سلسلہ کو منظم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امام سراج وہاج دعوت و تبلیغ کے ساتھ اصلاح معاشرہ کے لیے جذبۂ جہاد سے بھی سرشار ہیں اور اس سلسلہ میں جیل بھگت چکے ہیں جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ نیویارک میں ایک فلسطینی کی بلڈنگ میں کچھ کرایہ داروں نے منشیات کے کاروبار کا اڈہ بنایا ہوا تھا۔ بلڈنگ کے مالک نے پولیس کو شکایت کی مگر پولیس نے کوئی کارروائی نہ کی۔ اس نے اپنی پریشانی کا ذکر امام سراج وہاج سے کیا، انہوں نے چند ساتھی ساتھ لیے اور بلڈنگ میں جا کر منشیات کا کاروبار کرنے والوں سے کہا کہ وہ فوری طور پر مکان خالی کر دیں۔ انہوں نے لیت ولعل سے کام لیا تو جناب سراج وہاج اور ان کے رفقاء نے زبردستی عمارت خالی کرالی اور کرایہ داروں کا سامان وغیرہ نکال کر باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد پولیس آئی اور انہیں گرفتار کر کے لے گئی، وہ پانچ دن جیل میں رہے، ان کے باقی ساتھی بھی جیل میں کچھ عرصہ رہے پھر ضمانت پر رہائی ہوگئی۔ مگر ٹی وی اور اخبارات نے اس واقعہ کو بہت زیادہ اہمیت دی اور پولیس کے رویہ کو ہدف تنقید بنایا کہ اس نے منشیات کا کاروبار کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنے کی بجائے اس کاروبار کے خلاف جہاد کرنے والوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس واقعہ سے امریکہ کے عوامی حلقوں میں امام سراج وہاج کی شہرت و وقار میں اضافہ ہوا ہے۔

جناب سراج وہاج نے ان دنوں ایک اور معرکہ کا آغاز کر دیا ہے اور وہ ان کی دوسری شادی ہے جس کا امریکی معاشرہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی پہلی اہلیہ موجود ہیں جن سے پانچ بچیاں اور دو بچے ہیں اور اب انہوں نے دوسری شادی کی ہے جو امریکی قانون کے مطابق جرم ہے اور اس کی سزا پانچ سال قید ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ یہ ”جرم“ انہوں نے کیوں کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے اور میں اس کے ذریعے عدالت کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس جرم میں مجھے پکڑا جائے اور عدالت میں پیش کیا جائے اور خدا کرے کہ بات سپریم کورٹ تک پہنچے۔ میں جج صاحبان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف ایک شخص کو عدالت میں پیش کیا جاتا ہے جس کے ساتھ ایک عورت اور چند بچے ہیں، وہ شخص عدالت کو بتاتا ہے کہ یہ عورت میری بیوی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ میرے ویسے ہی تعلقات ہیں اور اس سے یہ بچے میرے ہی ہیں۔ عدالت کے استفسار پر وہ کہتا ہے کہ میری بیوی کو ان تعلقات کا علم نہیں ہے اور میں خفیہ طور پر ان تعلقات کو نباہ رہا ہوں۔ عدالت کے دوسرے استفسار پر وہ بتاتا ہے کہ وہ نہ تو اس عورت کو کوئی خرچہ دے رہا ہے اور نہ ہی اس کے بچوں کے اخراجات اور تعلیم کا بندوبست کر رہا ہے۔ اس شخص کو عدالت کہتی ہے کہ جاؤ تم آزاد ہو تم نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ دوسری طرف ایک اور شخص عدالت میں پیش ہوتا ہے جس کے ساتھ ایک عورت اور چند بچے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس عورت کے ساتھ میں نے نکاح کیا ہے جس کا میری پہلی بیوی کو علم ہے اور وہ اس پر راضی ہے بلکہ میں نے اس شادی کا مسجد میں اعلان کیا ہے۔ اس سے ہونے والے یہ بچے میرے ہیں، میں اس عورت کو خرچہ دیتا ہوں اور ان بچوں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام بھی کرتا ہوں۔ اس شخص کو عدالت کہتی ہے کہ تم نے ”جرم“ کا ارتکاب کیا ہے اس لیے تمہیں پانچ سال قید کی سزا سنائی جاتی ہے۔

امام سراج وہاج نے کہا کہ میں امریکی نظام قانون کے ذمہ دار حضرات کے سامنے کھڑے ہو کر ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا انصاف کا تقاضا یہی ہے اور کیا قانون و انصاف کا یہ نظام انسانیت کے وقار و معیار پر پورا اترتا ہے؟ جناب سراج وہاج پورے جوش و جذبہ کے ساتھ اپنے اس عزم کا اظہار کر رہے تھے اور میرے ذہن کے پردۂ اسکرین پر ایک اور سیاہ فام امریکی نومسلم محمد علی کلے کی تصویر ابھر رہی تھی جس نے ویت نام کی جنگ کے لیے جبری بھرتی کو اپنے مذہبی عقائد کے منافی قرار دے کر بھرتی ہونے کی بجائے امریکی نظام

انصاف کا سامنا کرنے اور جیل بھگتنے کو ترجیح دی تھی۔ اللہ تعالیٰ امام سراج وہاج کو اپنے اس عزم میں ثابت قدم رکھیں اور امریکی معاشرت کے نازک اور حساس پہلو کو چیلنج کے اس معرکہ میں کامرانی سے ہمکنار کریں، آمین یارب العالمین۔

جہادِ افغانستان اور عالمِ اسلام

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۱ اگست ۱۹۸۷ء)

(یہ مضمون قومی اسمبلی کے سابق رکن مولانا نور محمد شہیدؒ آف وانا کی کتاب ''جہاد افغانستان'' کے پیش لفظ کے طور پر تحریر کیا گیا تھا۔)

جہاد اسلام کے بنیادی احکام میں سے ایک حکم ہے جس پر ملت اسلامیہ کی سطوت و شوکت اور غلبہ و اقتدار کا دارومدار ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے جہاد کے احکام و مسائل اسی تفصیل واہتمام کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں جس تفصیل واہتمام کے ساتھ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر احکام شرعیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرون اولیٰ میں اسلام کے احکام کا ذکر جب بھی ہوتا تھا جہاد کا ذکر ان کے ساتھ ہوتا تھا اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد میں فکری یا عملی طور پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ محدثین اور فقہاء نے احادیث اور فقہ کی جتنی کتابیں مرتب کر کے امت کے حوالے کی ہیں ان میں جہاد کے مستقل ابواب قائم کیے ہیں، اس کے مسائل بیان کیے ہیں اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جہاد کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی کوہان کی بلندی یعنی اس کی برتری اور رفعت کی علامت قرار دیا ہے اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

> ''جب تم کاروبار اور کھیتی باڑی کے پیچھے پڑ جاؤ گے اور جہاد ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کر دیں گے جو دین کی طرف واپس آئے بغیر تم سے نہیں ہٹے گی۔'' (ابوداؤد)

گویا جہاد مسلمانوں کی عزت و وقار کی علامت ہے اور اس کا ترک کرنا ذلت و رسوائی کا باعث ہے اور یہ ذلت و رسوائی ہم عالم اسلام میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کم و بیش ایک ارب کے قریب تعداد اور چالیس سے زائد باقاعدہ مسلم حکومتوں کے ہوتے ہوئے بھی اسباب و وسائل کی فراوانی کے باوجود آج ملت اسلامیہ غیروں بلکہ دشمنوں کی دست نگر ہے۔ نظریات اور نظام سے لے کر دفاع اور ٹیکنالوجی تک ہر معاملہ میں ہم

دوسروں کے محتاج ہیں، اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے؟ حافظ ابن حجر الہیثمیؒ نے ''الزواجر عن اقتراف الکبائر'' میں امام طبرانیؒ کے حوالے سے روایت نقل کی ہے اور اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے جس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

ماترک قوم الجہاد الا عمھم اللہ تعالی بالعذاب۔ (الزواجر ص ۱۶۴ ج ۲)

کوئی قوم بھی جہاد ترک نہیں کرتی مگر اللہ تعالی اسے عمومی عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اس ارشاد نبویؐ کی روشنی میں آج ہم عالم اسلام کی مجموعی صورت حال کو دیکھیں تو جہاد جیسے اہم فریضہ کے ترک کر دینے کے نتیجہ میں خدا تعالی کا یہ عمومی عذاب باہمی تشتت و افتراق، غیر مسلم اقوام کے فکری اور نظریاتی غلبہ، سائنسی و حربی بالادستی اور دشمنوں کی احتیاج کی صورت میں بالکل واضح اور روشن دکھائی دیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملت اسلامیہ کے ہاتھ میں جب تک جہاد کا پرچم سربلند رہا ہے مسلمانوں کی بداعمالیوں کے باوجود کفر کی قوتیں ان کے سامنے سرنگوں رہی ہیں اور مسلمانوں کی قوت و شوکت پوری دنیا میں مسلم رہی ہے۔ اور جب سے مسلمانوں نے اپنے شب و روز کے اعمال میں سے جہاد اور اس کی تیاری کو نکال دیا ہے ملت اسلامیہ کی حیثیت ایک بے بس اور مقہور قوم کی ہو کر رہ گئی ہے۔ برطانیہ کے ایک سابق وزیراعظم مسٹر گلڈسٹون کے مطابق جہاد (بقول ان کے ''مذہبی جنون'') کا یہ جذبہ ہی ایک ایسی قوت ہے جو مسلمانوں کو کسی دوسری قوم کا محکوم ہونے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کے مختلف حصوں پر استعماری قوتوں کے غلبہ و تسلط کے بعد ان متسلط قوتوں کا سب سے بڑا ہدف یہی رہا ہے کہ مسلمانوں میں جہاد کے جذبہ کو سرد کیا جائے اور ان کی عملی زندگی سے جہاد کے شرعی حکم کو بے دخل کر دیا جائے۔ خود ہمارے ہاں برصغیر پاکستان، بھارت و بنگلہ دیش میں برطانوی استعمار نے اپنے دور تسلط میں مختلف مذہبی طبقوں کو صرف اس لیے جنم دیا کہ وہ جہاد کی مخالفت کریں اور مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کو دور کریں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کا تو مقصد وحید یہی تھا۔

خلافت عثمانیہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا آخری نشان اور علامت تھی جسے ختم کرنے کے لیے استعماری قوتوں نے مسلسل سازشیں کیں اور اب تو واقعات کے تسلسل اور قرائن و شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے مؤرخین کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا کہ ترکوں کی خلافت عثمانیہ کے خلاف عربوں کو ابھارنے اور خلافت کے زیر نگین

مختلف علاقوں میں بغاوت پیدا کرنے میں مغربی استعمار کی مسلسل سازشوں کا حصہ ہے۔ اور انہی ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں خلافت عثمانیہ کا وجود ختم ہوا جس سے استعماری قوتوں کے تین بڑے مقاصد تھے:

1. مسلمانوں میں خلافت کا برائے نام وجود بلکہ اس کا تصور بھی باقی نہ رہے اور مسلمان نظام حکومت کے سلسلہ میں جدید افکار و نظریات کو ذہنا قبول کر لیں۔
2. مسلمانوں میں جہاد کا تصور ختم ہو جائے اور کوئی ایسا ادارہ باقی نہ رہے جو مسلمانوں کو جہاد کے لیے دعوت دے سکے یا انہیں جمع کر سکے۔
3. مسلمانوں کی اجتماعی قوت (خلافت عثمانیہ) کو ختم کر کے فلسطین میں یہودیوں کو بسانے اور ان کی ریاست قائم کرنے کی راہ ہموار کی جائے۔

اب اس کے نتائج کو دیکھ لیں کہ ان تینوں مقاصد میں استعماری قوتوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ خلافت کا تصور مسلمانوں کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور کم و بیش تمام مسلم حکومتوں کی بنیاد جدید افکار مثلاً جمہوریت یا سوشلزم پر ہے۔ سعودی عرب یا ایک دو اور حکومتوں کی اصولی بنیاد اگرچہ مذہب پر بیان کی جاتی ہے مگر وہاں بھی نظام حکومت اسلامی خلافت نہیں بلکہ بادشاہت ہے اور ملک کا مکمل نظام بھی پورا اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ جہاد کا ذکر اب صرف حدیث اور فقہ کی کتابوں میں رہ گیا ہے، مسلمانوں کی عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ حتیٰ کہ افغانستان میں خالص شرعی بنیادوں پر ہونے والا جہاد بھی اب مسلمانوں کو کوئی عجیب و غریب سا مسئلہ لگ رہا ہے اور عام مسلمان کا ذہن اس جہاد کو اپنے اندر جگہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہے۔ فلسطین میں یہودی سلطنت اسرائیل کے نام سے نہ صرف قائم ہو چکی ہے بلکہ عالم عرب اور پورے عالم اسلام کے لیے ایک مصیبت اور چیلنج بنی ہوئی ہے۔

یہی صورت حال ہے جسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات گرامی میں (۱) اللہ تعالیٰ کے عمومی عذاب (۲) مسلمانوں کی ذلت (۳) دشمن کے تسلط (۴) اور ملت اسلامیہ کی بے بسی سے تعبیر کیا ہے۔ بلکہ قران کریم کی آیت کریمہ "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ" کی جو تفسیر صحابئ رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے کی ہے اسے سامنے رکھا جائے تو یہ خود اختیاری ہلاکت کی وہ شاہراہ ہے جس پر چلنے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم

میں منع فرمایا ہے۔ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی ص ۱۲۱ ج ۲ میں حضرت ابو عمرانؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے حدیث حسن غریب صحیح قرار دیا ہے۔

"حضرت ابو عمرانؓ کہتے ہیں کہ ہم غزوۂ روم کے موقع پر روم کے ایک شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ اچانک رومیوں کا ایک بڑا لشکر قلعہ سے نکل کر ہم پر حملہ آور ہوا۔ ہمارے لشکر میں سے بھی کم و بیش اتنے ہی لوگ یا ان سے زیادہ ان کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک مسلمان نے تنہا آگے بڑھ کر رومیوں پر حملہ کر دیا اور ان کے لشکر میں گھس گیا۔ مسلمان یہ دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ یہ شخص تو اپنے ہاتھوں سے خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ) اس پر حضرت ابو ایوب انصاریؓ اٹھے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کریمہ کا یہ مطلب سمجھتے ہو حالانکہ قرآن کریم کی یہ آیت ہم انصار مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دیا اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو ہم میں سے بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائے بغیر آپس میں خفیہ مشورہ کیا کہ ہمارے اموال اکثر جنگوں میں صرف ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اب اسلام کو غلبہ دے دیا ہے اور اس کے مددگار بہت ہو گئے ہیں اس لیے اب اگر ہم گھروں میں رہ کر اپنے اموال وغیرہ کی اصلاح کر لیں اور نقصانات کی تلافی کی کوئی صورت نکالیں تو بہتر ہو گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر یہ آیت کریمہ نازل کر کے ہماری بات کو رد کر دیا کہ "وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ" کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو اور خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ تو اس ہلاکت سے مراد اپنے اموال اور کاروبار کی اصلاح کے لیے گھروں میں بیٹھ رہنا اور جہاد کو ترک کر دینا ہے۔"

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے ارشاد کے مطابق جہاد کو ترک کر دینا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے اور قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم و مقصد بھی یہی ہے۔ اس تفسیر کی روشنی میں بھی ہم اپنے موجودہ حالات کا تجزیہ کریں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ مسلمانوں نے جہاد کا راستہ ترک کر کے خود کو ہلاکت کی موجودہ دلدل میں دھکیل دیا ہے اور ذلت و رسوائی ان کا مقدر بن کر رہ گئی ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت کے حوالے سے بات گزر چکی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک جہاد کے باعث مسلط ہونے والی اس رسوائی کی پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ذلت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی

صورت دین (یعنی جہاد) کی طرف واپسی کے بغیر نہیں ہوگی۔ اس لیے آج عالم اسلام کی اجتماعی مشکلات و مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد کو بیدار کیا جائے اور جہاد کی تحریک کو اس انداز میں منظم کیا جائے کہ وہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ اور عظمت رفتہ کی بحالی کا نقطۂ آغاز بن سکے۔

اس پس منظر میں جہاد افغانستان کو دیکھا جائے تو یہ مایوسیوں کے اس تاریک دور میں امید کی ایک ایسی کرن نظر آتی ہے جس سے ملت اسلامیہ کے اس عظیم شاہراہ پر گامزن ہونے کے امکانات محسوس ہو رہے ہیں جو عالم اسلام کی سطوت و شوکت اور غلبہ و اقتدار کی منزل کی طرف جاتی ہے۔ افغانستان میں روسی استعمار کی جارحانہ فوج کشی اور غلبہ کے خلاف افغانستان کے غیور و جسور حریت پسند مسلمان آزادی کی جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ شرعی نقطۂ نظر سے بلاشبہ جہاد ہے اور دنیائے اسلام کے دینی و علمی حلقے اس کے جہاد شرعی ہونے پر متفق ہیں۔ راقم الحروف کو خود جہاد افغانستان کے بعض مورچوں پر جانے کا موقع ملا ہے اور ارگون کے محاذ پر کچھ لمحات گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس موقع پر ایک افغان عالم دین کی یہ بات میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے کہ

> ”ہمیں افغانستان کی موجودہ صورت حال کی شکل میں اس جرم کی سزا ملی ہے کہ جب روس نے وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں پر قبضہ کیا اور وہاں کے بعض حریت پسند مسلمانوں نے مزاحمت اور جہاد کا راستہ اختیار کیا تو ہم یعنی افغانستان کے مسلمانوں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ان کی مدد نہ کی جس کی وجہ سے وہ پسپا اور مجبور ہو گئے۔ اور وہاں کامیابی کے بعد روس کو افغانستان کی طرف پیش قدمی کا حوصلہ ہوا، اس لیے میں پاکستان کے علماء کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ہماری حالت سے عبرت پکڑیں اور اس جرم کا ارتکاب نہ کریں جس کے نتیجہ میں ہم یہ بڑی سزا بھگت رہے ہیں۔“

جہاد کے شرعی احکام کے مطابق جس ملک پر کافروں کا تسلط ہو جائے وہاں کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے جبکہ ان کے قریب رہنے والے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اس مسئلہ کی رو سے ہم اہل پاکستان پر جہاد افغانستان میں حصہ لینا اگر فرض عین نہیں تو فرض کفایہ تو بہر حال ضرور ہے اور ہم شرعاً اس کے مکلف ہیں کہ جہاد میں جتنا حصہ ڈال سکیں اس سے گریز نہ کریں۔ جہاد افغانستان میں حصہ لینے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے اور اس کے خلاف مختلف

حلقوں کی طرف سے جو شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں ان کا ازالہ کر کے جہاد کی شرعی حیثیت کو واضح کیا جائے۔

افغان مجاہدین کی مسلسل پیش قدمی اور ڈاکٹر نجیب اللہ کے بقول افغانستان کے ۸۰ فیصد علاقہ پر مجاہدین کے کنٹرول نے روس کے ساتھ امریکہ کو بھی پریشانی سے دوچار کر دیا ہے۔ کیونکہ افغانستان میں ایک خالص دینی حکومت کے قیام سے جہاں روس کو بخارا، تاشقند اور روس میں واقع دیگر مسلم ریاستوں میں دینی بیداری اور آزادی کی تحریکات ابھرنے کا خطرہ ہے وہاں یہ صورت حال امریکہ کے لیے بھی قابل برداشت نہیں ہے کہ افغانستان میں قائم ہونے والی دینی حکومت جنوبی ایشیا اور مشرق وسطی کی مسلم ریاستوں میں غلبۂ اسلام کی تحریکات کے لیے تقویت و تائید کا باعث بنے۔ اور یہ تحریکات افغان حریت پسندوں کے پرجوش جذبات کی تائید سے اپنے ملکوں میں لادینی حکومتوں اور نظاموں کا تختہ الٹ کر دینی حکومتیں قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس اور امریکہ دونوں کی لابیاں جہاد افغانستان کے خلاف نفرت انگیز پراپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ روسی لابی اسے امریکہ اور روس کے مفادات کی جنگ قرار دے کر مسلمانوں کی توجہ اس سے ہٹانے میں مصروف ہے، اور امریکی لابی صرف روسی جارحیت کے مقابلہ کی حد تک اس کی حمایت کر کے اس سے آگے اس کی شرعی حیثیت اور دینی حکومت کے قیام کے خلاف مسلسل سازشیں کر رہی ہے۔ جبکہ مجاہدین افغانستان ان دونوں لابیوں کے اثرات سے بے نیاز ہو کر صرف اس مقصد کے لیے مصروف جہاد ہیں کہ افغانستان سے روسی افواج کی مکمل اور غیر مشروط واپسی اور اس کے بعد مکمل شرعی نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو۔

جہاد افغانستان کے خلاف مختلف جہتوں سے پراپگینڈا میں شدت آرہی ہے۔ بالخصوص پاکستان کے عوام کو افغان مجاہدین اور مہاجرین سے متنفر اور بے زار کرنے کے لیے بیرونی لابیاں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو پوری طرح استعمال میں لا رہی ہیں۔ ان حالات میں ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی صاحب قلم دانشور جہاد افغانستان کے اہم موضوع پر قلم اٹھائیں اور شکوک و شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے اس کی شرعی و سیاسی حیثیت کو عوام کے سامنے واضح کریں۔ ۱۹۸۷ء کے آغاز میں افغانستان کے ارگون محاذ سے واپسی پر راقم الحروف کو جنوبی وزیرستان کے صدر مقام وانا میں ایک رات قیام کا موقع ملا اور جنوبی وزیرستان کے مجاہد عالم دین مولانا نور محمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ

مولانا موصوف نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ایک کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ کتاب کے مختلف مقامات دیکھے تو دل کو بے حد خوشی ہوئی کہ اس سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرنے والے سوالات و اعتراضات کے جوابات مولانا موصوف نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ دیے ہیں اور گرد و غبار کو خوبصورتی کے ساتھ جھاڑ کر جہاد افغانستان کی شرعی حیثیت کو بالکل بے غبار انداز میں پیش کر دیا ہے۔ مولانا موصوف محقق عالم اور بے باک خطیب ہیں مگر ان کے پشتون ہونے کے اثرات کتاب کی زبان پر غالب تھے اس لیے میں نے درخواست کی کہ یہ کتاب نظر ثانی اور صحت کے لیے راقم الحروف کے سپرد فرمائیں جو انہوں نے کمال شفقت سے قبول فرمائی۔ چنانچہ کتاب کے مسودہ کو از سر نو صاف کرنے اور اپنی نگرانی میں کتابت کرانے کی سعادت مجھے حاصل ہوگئی، فالحمد للہ علی ذلک۔

''جہاد افغانستان'' کے نام سے یہ کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، اس امید پر کہ یہ کتاب ان شکوک و شبہات کے خاتمہ کا مؤثر ذریعہ بنے گی جو افغانستان کے جہاد آزادی کے بارے میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجاہدین افغانستان کو ان کے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائیں اور غیور افغان قوم کی اس عظیم جدوجہد کو عالم اسلام میں جہاد کے احیاء اور اسلام کے غلبہ کا نکتۂ آغاز بنائیں، آمین یا الہ العالمین۔

ایران میں گیارہ روز: ایرانی انقلاب کے اثرات، معاشرتی تبدیلیاں، اور اہل سنت کے مسائل

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۶ فروری ۱۹۸۷ء)

کوئٹہ کی جامع مسجد سفید کے خطیب مولانا قاری عبد الرحمن ایرانی انقلاب کے ان پرجوش حامیوں میں شمار ہوتے ہیں جو نہ صرف خود انقلاب ایران کے محاسن و فضائل کے پرچار میں مصروف رہتے ہیں بلکہ ان کی مسلسل کوشش رہتی ہے کہ پاکستان کے دینی حلقوں کے روابط ایرانی انقلاب کے رہنماؤں کے ساتھ مثبت بنیادوں پر استوار ہوں اور پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کے سلسلہ میں ایران کے انقلابی رہنماؤں کے تجربات سے استفادہ کیا جائے۔ گزشتہ سال حج بیت اللہ کے موقع پر مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں ان سے

ملاقات ہوئی تو انقلاب ایران کی بہت سی خوبیوں کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے پیشکش کی کہ اگر آپ ایران میں اس انقلاب کے اثرات کو براہ راست دیکھنا چاہیں تو حکومت ایران کی طرف سے اس کا اہتمام ہو سکتا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ میں ایرانی انقلاب کے نتائج و ثمرات کو براہ راست دیکھنے کے لیے ایران جانے کی خواہش رکھتا ہوں بشرطیکہ میرے ساتھ اور دوست بھی ہوں اور ایران میں جن حضرات سے ہم ملنا چاہیں ان سے ہمیں ملنے کی اجازت ہو۔ میری مراد اس سے ایران کے اہل سنت تھے جن کے بارے میں مختلف حلقوں سے دبے لفظوں میں یہ باتیں سامنے آرہی تھیں کہ ایران کے اہل سنت اپنے حقوق اور مستقبل کے بارے میں مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ وہ مناسب موقع پر اس سلسلہ میں مجھ سے رابطہ قائم کریں گے۔

اس پس منظر میں مجھے پاکستانی علماء، وکلاء اور دانشوروں کے اس وفد میں شامل کر لیا گیا جس نے یکم جنوری سے ۱۲ جنوری تک ایران کے مختلف حصوں کا مطالعاتی دورہ کیا اور میری گزارش پر پنجاب اسمبلی کے رکن اور جمعیت علماء اسلام کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا منظور احمد چنیوٹی کو بھی وفد میں شامل کیا گیا۔ یہ وفد پندرہ ارکان پر مشتمل تھا جس میں ہم دونوں کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے:

(۱) چودھری صفدر علی، سیکرٹری اطلاعات جماعت اسلامی پاکستان۔ (۲) حافظ حسین احمد، سیکرٹری اطلاعات جمعیت علماء اسلام (مولانا فضل الرحمن گروپ) پاکستان۔ (۳) ممتاز صحافی جناب مختار حسن۔ (۴) ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی، سربراہ شعبہ بین الاقوامی تعلقات قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد۔ (۵) نواب محمد احسن خاکوانی ایڈووکیٹ، ملتان۔ (۶) مولانا مفتی دائم الدین، سکھر۔ (۷) جناب اسد اللہ بھٹو ایڈووکیٹ، سکھر۔ (۸) جناب راجہ رب نواز ایڈووکیٹ، کوئٹہ۔ (۹) جناب مولانا قاری عبد الرحمن، کوئٹہ۔ (۱۰) جناب ڈاکٹر عطاء الرحمن، کوئٹہ۔ (۱۱) جناب رشید بیگ، کوئٹہ۔ (۱۲) جناب ڈاکٹر عبد الواسع، لورالائی۔

ہم یکم جنوری کو نماز عصر سے قبل تفتان سے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے ایران کی حدود میں داخل ہوئے اور ۱۲ جنوری کو صبح آٹھ بجے کے قریب یہیں سے دوبارہ پاکستان واپس آ گئے۔ ایران کی انقلابی حکومت کا ادارہ ”سازمان تبلیغات اسلامی“ اس دورہ میں ہمارا میزبان تھا اور ادارہ کے بیرونی امور کے ڈائریکٹر حجۃ الاسلام جناب محمد علی تسخیری نے میزبانی کے امور کی براہ راست نگرانی کی۔ ایرانی سرحد پر زاھدان کی انتظامیہ کے نمائندے

اور سازمان تبلیغات اسلامی کے مقامی عہدہ دار ہمارے خیر مقدم کے لیے موجود تھے اور انہوں نے ۱۲ جنوری کو واپسی پر ہمیں خدا حافظ کہا۔

دورہ کا مقصد

ایران میں گیارہ روزہ قیام کے دوران ہم نے چھ دن تہران میں قیام کیا اور انہی میں سے ایک دن کا حصہ قم میں گزارا۔ دو دن مشہد میں رہے، دو دن زاھدان میں قیام رہا اور باقی وقت سفر میں گزرا۔ وفد میں مختلف طبقات اور متنوع افکار کے حامل حضرات شریک تھے، ظاہر ہے کہ ایران میں ہر ایک نے اپنے ذہن کے مطابق صور تحال کا جائزہ لیا اور پھر اسی بنیاد پر اپنی سوچ کا رخ متعیّن کیا۔ چنانچہ مولانا منظور احمد چنیوٹی اور راقم الحروف نے بھی اس دورہ کے آغاز پر اپنے طور پر ایک ذہنی ترتیب قائم کرلی کہ کن باتوں کا جائزہ لینا ہے اور ایرانی انقلاب کے راہنماؤں سے ملاقات کے دوران کون سے امور پر گفتگو کرنی ہے۔ ہم اپنی ترتیب کے مطابق مندرجہ ذیل امور کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔

1. ایران میں مذہبی بنیاد پر آنے والا یہ انقلاب کیا صرف شاہ ایران کے خلاف عوامی نفرت کا وقتی ردعمل تھا یا اس انقلاب کی کوئی فکری بنیاد بھی موجود ہے؟
2. کیا ایرانی انقلاب کے قائدین اور مذہبی حلقے اس انقلاب کے تحفظ اور دوام کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار ہیں؟
3. کیا اس انقلاب کے نتیجہ میں اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں کوئی عملی تبدیلی بھی آئی ہے، یا یہ صرف ایک لیبل ہے جو اسی پرانے نظام پر چسپاں کر دیا گیا ہے؟
4. انقلاب ایران کے رہنماؤں نے فرقہ وارانہ مسائل پر کس طرح قابو پایا ہے؟
5. ایران میں اہل سنت کس حال میں ہیں اور کیا وہ موجودہ انقلاب اور اپنے حقوق و مفادات کے بارے میں مطمئن ہیں؟
6. پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کی راہ میں حائل رکاوٹوں بالخصوص فرقہ وارانہ الجھنوں اور فقہی تشخص کے تعین کے بارے میں ایرانی راہنماؤں کا نقطہ نظر کیا ہے؟

یہ تھے وہ سوالات جو ایران کی سرحد عبور کرتے ہوئے ہمارے ذہنوں میں گھوم رہے تھے اور جب ہم نے واپسی پر میر جاوہ اور تفتان کے درمیان آہنی پھاٹک سے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو ہم دونوں کم از کم مطمئن تھے کہ ایک حد تک ہم ان سوالات کے جوابات حاصل کر چکے تھے۔ ایران میں قیام کے دوران ہماری سرگرمیوں کی تفصیلات کچھ اس طرح رہی ہیں:

ایران میں ہماری سرگرمیاں

تہران میں یونیورسٹی کے وسیع گراؤنڈ میں ادا کی جانے والی نماز جمعہ کے اجتماع میں شرکت کی۔ یہ اجتماع تہران میں جمعۃ المبارک کا واحد اجتماع ہوتا ہے جس میں کم و بیش پانچ چھ لاکھ افراد شریک ہوتے ہیں اور صدر ایران جناب علی خامنہ ای، یا اسپیکر قومی اسمبلی جناب ہاشمی رفسنجانی، یا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس خطبۂ جمعہ اور امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ جس روز ہم نے اس عظیم اجتماع میں شرکت کی اس روز چیف جسٹس جناب آیت اللہ عبد الکریم اردبیلی نے خطبہ دیا، ان کے پہلے خطبہ کا موضوع اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں ماں باپ کی ذمہ داری تھا جبکہ دوسرے خطبہ میں انہوں نے ایران کے قومی مسائل مثلاً عراق ایران جنگ، کویت کی اسلامی کانفرنس اور دیگر مسائل پر روشنی ڈالی۔ گویا یہ اجتماع ایک طرح سے قومی مسائل پر عوام کو اعتماد میں لینے کا اجتماع تھا جو ہر جمعہ کو منعقد ہوتا ہے اور اسے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پورے ایران میں نشر کیا جاتا ہے۔

ایران کی اعلیٰ ترین کونسل ”شوریٰ نگہبان“ کے فقیہ جناب آیت اللہ جنتی سے ہماری اجتماعی ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے انقلاب ایران کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ باقی مسلم ممالک میں بھی دینی انقلاب کی جدوجہد ہونی چاہیے۔ اس مجلس میں ہماری طرف سے ان مشکلات کا ذکر کیا گیا جو پاکستان میں نفاذ اسلام کی راہ میں حائل ہیں، بالخصوص انہیں توجہ دلائی گئی کہ پاکستان میں شیعہ فقہ کے مستقل نفاذ کا مطالبہ نفاذ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے۔

جناب آیت اللہ جنتی نے بتایا کہ ایران میں شیعہ اکثریت کی بنا پر پبلک لاء میں صرف انہی کی فقہ نافذ ہے جبکہ اہل سنت اور دوسرے مذاہب کو پرسنل لاء میں ان کے مذہب کے مطابق فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہماری طرف سے یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان میں فقہ جعفریہ کے بطور پبلک لاء نفاذ کے مطالبہ کے ساتھ ایران انقلاب کی نمائندگی کا تاثر بھی دیا

جارہا ہے جس کی وجہ سے انقلاب ایران کے بارے میں عوامی تاثر مجروح ہورہا ہے اور ان لوگوں کی توقعات مایوسی میں بدل رہی ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ ایران میں مذہبی انقلاب کی کامیابی کے بعد پاکستان کی دینی قوتوں کو اس سے تقویت حاصل ہوگی اور ان کے لیے منزل تک پہنچنا آسان ہوجائے گا۔

جناب آیت اللہ جنتی سے اس امر کا ذکر کیا گیا کہ شیعہ سنی فسادات کے سلسلہ میں بھی بعض مواقع پر ایران کا حوالہ سامنے آتا ہے جس سے عمومی تاثر انقلاب ایران کے خلاف بن جاتا ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ یہاں سے ایک وفد پاکستان جائے اور صورتحال کا خود جائزہ لے کر ان شکایات کے ازالہ کی کوشش کرے۔ جناب آیت اللہ جنتی نے اس سلسلہ میں ضروری غور و خوض اور اقدامات کا وعدہ کیا۔ جناب آیت اللہ جنتی کو ''شریعت بل'' کے مختلف پہلوؤں اور تازہ صورتحال سے بھی آگاہ کیا گیا۔

شوریٰ نگہبان کے ایک اور ممبر جناب آیت اللہ خزعلی کے ساتھ ایک مستقل نشست قرآن کریم کے سلسلہ میں منعقد ہوئی۔ اس نشست میں ایک نوجوان ایرانی قاری نے قرآن کریم کی تلاوت کی اور عمدہ تلاوت کی۔ پھر جناب آیت اللہ خزعلی نے قرآن کریم کے بارے میں ایران کی انقلابی حکومت کے اقدامات کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ان کی نگرانی میں ایک مستقل سرکاری ادارہ قرآن کریم کی اشاعت میں مصروف ہے۔ انہوں نے اس خبر کو افسوسناک قرار دیا کہ پاکستان میں ایران کے مطبوعہ قرآن کریم پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ہماری طرف سے وضاحت کی گئی کہ ایران کے کسی ایک مطبع کے چھاپے ہوئے قرآن کریم کو اس میں واضح غلطیوں کے باعث ضبط کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جناب آیت اللہ خزعلی نے اس بات کا ذکر کیا کہ ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم قرآن کریم میں تحریف کے قائل ہیں، یہ بات غلط ہے، ماضی میں کچھ حضرات نے ایسا لکھا ہے مگر ہم اسے نہیں مانتے اور اسی قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے جو آج موجود ہے اور اس میں کسی حرف کی کمی یا زیادتی کو ہم نہیں مانتے۔

مولانا منظور احمد چنیوٹی نے اس موقع پر کہا کہ شیعہ اکابر کی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں جن میں موجودہ قرآن کریم کو اصلی ماننے سے انکار کیا گیا ہے، اس کے جواب میں جناب آیت اللہ خزعلی نے کہا کہ یہ ضعیف روایات ہیں ہم انہیں معتبر تسلیم نہیں کرتے، جس طرح اہل سنت کے بعض حضرات کی کتابوں میں بھی ایسی روایات موجود ہیں جنہیں

اہل سنت تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا چنیوٹی نے کہا کہ اہل سنت کے ہاں تو ایسی چند ایک روایتیں ہیں لیکن آپ کے ہاں ہزاروں روایات ہیں۔ خزعلی صاحب نے جواب دیا کہ ضعیف روایت ایک ہو یا ایک ہزار ہو بہرحال ضعیف ہیں ہم انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا چنیوٹی نے کہا کہ اس کی وضاحت تو ہوگئی لیکن ایک بات کی وضاحت باقی ہے، وہ یہ کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو شخص قرآن کریم میں تحریف کا قائل ہے وہ مسلمان نہیں ہے، کیا آپ بھی اس فتویٰ کی تائید کرتے ہیں؟ جناب آیت اللہ خزعلی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اور بات کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔

بہرحال اس گفتگو سے قطع نظر ہم نے یہ محسوس کیا کہ ایرانی انقلاب کے راہنماؤں کا رخ قرآن کریم کی اشاعت کی طرف خاصا واضح ہے، ان کی تقاریر و بیانات میں جابجا قرآن کریم کی آیات سے استدلال ہوتا ہے، ریڈیو پر وقتاً فوقتاً قرآن کریم کی تلاوت اور درس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور دیواروں پر مختلف مسائل کے حوالہ سے قرآن کریم کی آیات کے جملے جگہ جگہ نمایاں طور پر تحریر دکھائی دیتے ہیں۔

ہمیں ایران کے معروف آرٹسٹ حسین صادق کے فن پاروں کی ایک نمائش دکھائی گئی جس میں زندگی کے مختلف حقائق کو انقلابی افکار کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے اور اس نامور فنکار نے انسانی زندگی کے تضادات کو بڑے خوبصورت انداز میں اجاگر کیا ہے۔ بالخصوص ”ناصر خان“ کے عنوان سے ایک فن پارہ کو بہت پسند کیا گیا جس میں ایک روایتی جاگیردار کے مظالم اور کمزور طبقوں کی مظلومیت اور بے بسی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

تہران میں چھ روزہ قیام کے دوران ہمیں ایک دن قم لے جانے کا اہتمام کیا گیا۔ قم ایران کا دینی و علمی مرکز ہے اور جناب آیت اللہ خمینی کا مدرسہ فیضیہ بھی قم میں ہے جو انقلاب ایران کا فکری مرکز ہے۔ ہمارے ساتھ سازمان تبلیغات اسلامی کی طرف سے سرینگر سے تعلق رکھنے والے جناب مقصود علی رضوی اور لکھنو کے جناب خادم حسین بطور رہبر اور ترجمان ہمسفر تھے، ان کی زبانی جو کچھ معلومات حاصل ہوئیں ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ:

- قم کے مختلف مدارس میں اس وقت اٹھارہ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں، ان میں ایک ہزار طلبہ پاکستانی ہیں، بعض پاکستانی طلبہ سے ہماری ملاقات بھی ہوئی۔

•ان مدارس میں اثنا عشری جعفری فقہ کے مطابق مکمل مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہر طالب علم کے لیے عربی اس معیار کی لازمی ہے کہ وہ لکھ سکے اور گفتگو اور تقریر کر سکے، اس کے علاوہ انگریزی یا فرانسیسی زبانوں میں سے بھی ایک زبان اسی معیار پر لازمی ہے۔

•ان مدارس میں اسلامی نظام حیات کے مختلف شعبے بطور نصاب پڑھائے جاتے ہیں، مدرسہ فیضیہ کے ایک کلاس روم میں داخل ہوئے تو کم و بیش تین سو طلبہ کلاس میں تھے اور آیت اللہ قفقازی اسلامی حکومت کے معاشرتی فرائض پر لیکچر دے رہے تھے اور طلبہ کو املاء کرا رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ ہم بھی لیکچر میں شریک ہوئے، بے حد معلوماتی لیکچر تھا۔

•ہمیں بتایا گیا کہ یہ مدارس مکمل طور پر آزاد ہیں، نہ حکومت سے کچھ وصول کرتے ہیں اور نہ نظام میں حکومت کا کوئی دخل ہے۔ ان مدارس کے اخراجات خمس کی اس رقم سے پورے ہوتے ہیں جو اہل تشیع اپنے اماموں کو ادا کرتے ہیں۔

•ہمیں بتایا گیا کہ وہ مجتہد جن کی اس وقت تمام دنیا کے اثنا عشری شیعہ تقلید کرتے ہیں وہ چار ہیں: (۱) جناب آیت اللہ خوئی، نجف اشرف (۲) جناب آیت اللہ خمینی، تہران (۳) جناب آیت اللہ گلپایگانی، قم۔ چوتھے بزرگ کا نام مجھے یاد نہیں رہا، شیعہ حضرات ان اماموں کو اپنا خمس ادا کرتے ہیں اور خمس کی اس رقم سے یہ مدارس چلتے ہیں۔

قم کے سفر میں ہی جناب آیت اللہ منتظری سے وفد کی ملاقات ہوئی۔ جناب منتظری کو آیت اللہ العظمیٰ کہا جاتا ہے اور وہ جناب آیت اللہ خمینی کے قائم مقام ہیں۔ ملاقات اور گفتگو سے اندازہ ہوا کہ بے حد متین اور مرنجاں مرنج قسم کی علمی شخصیت کے مالک ہیں بلکہ بعض سنی راہنماؤں نے کھلم کھلا اظہار کیا کہ ایرانی انقلاب کے راہنماؤں سے جناب آیت اللہ منتظری اہل تشیع اور اہل سنت کے درمیان رواداری اور تعلقات کے حوالہ سے سب سے زیادہ موزوں اور بردبار شخصیت ہیں۔ بہر حال ان سے ملاقات ہوئی اور مختصر گفتگو بھی ہوئی، انہوں نے معاشرہ میں علماء کے فرائض، استعماری سازشوں سے واقفیت حاصل کرنے، مظلوم طبقوں کی حمایت کرنے، اور اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان زیادہ سے

زیادہ رواداری پر زور دیا۔ انہی دنوں یہ خبر اخبارات میں آ رہی تھی کہ ترکی میں لڑکیوں کے کالجوں میں باپردہ داخل ہونے پر قانونا پابندی لگا دی گئی ہے، جناب آیت اللہ منتظری نے اس پر برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں غیر اسلامی اقتدار کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کریں۔

ہماری طرف سے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا اور وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے راقم الحروف نے انقلاب ایران کے بارے میں وفد کے جذبات و احساسات کا اظہار کیا۔ ہمارے وفد کے ایک محترم رکن جناب ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی نے انقلاب ایران اور پاکستان کے دینی حلقوں کے درمیان روابط کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر گفتگو کرنی چاہی مگر وقت کی کمی کے باعث بات آگے نہ بڑھ سکی۔

قم میں ہی سیدہ فاطمہؓ کے مزار پر بھی حاضری اور دعا کی سعادت حاصل ہوئی، یہ امام علی رضاؒ کی بہن ہیں جن کے بارے میں روایت ہے کہ اپنے بھائی امام علی رضاؒ سے ملاقات کے لیے مشہد جا رہی تھیں، راستہ میں قم سے گزر ہوا تو خبر ملی کہ امام علی رضاؒ کا انتقال ہو گیا ہے، غم سے بیمار ہو گئیں اور یہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا مزار اہل ایران کی عقیدتوں کا مرکز ہے اور مزار سے ملحق مسجد میں قم کے مدارس کے طلبہ اپنے اسباق کے تکرار میں مصروف رہتے ہیں۔

تہران میں امام جعفر صادقؒ کے نام سے ایک دینی یونیورسٹی قائم کی گئی ہے۔ یونیورسٹی کی عمارت جدید معیار کی اعلیٰ عمارت ہے اور اس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ ہمارے وفد نے یونیورسٹی کے طلبہ کے ساتھ ان کے میس میں دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر طلبہ کی طرف سے وفد کے اعزاز میں ایک مختصر استقبالیہ دیا گیا جس میں ایک طالب علم نے شستہ عربی میں اور دوسرے طالب علم نے انگریزی میں خیر مقدمی تقریر کی۔ جواب میں مولانا منظور احمد چنیوٹی نے عربی میں اور جناب محمد احسن خاکوانی ایڈووکیٹ نے انگریزی میں تقریر کی۔

تہران میں ایران کی ’’شوریٰ ملی‘‘ یعنی قومی اسمبلی کی کارروائی دیکھنے کا موقع ملا۔ قومی اسمبلی کے ارکان عوام کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں، اسپیکر جناب ہاشمی رفسنجانی خود اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، ایرانی قومی اسمبلی کی کارروائی ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہوتی ہے، سوائے کارروائی کے اس حصہ کے جسے خود ایوان خفیہ قرار دے دے۔ وفد نے کم و

بیش ایک گھنٹہ تک اجلاس کی کاروائی کا مشاہدہ کیا، مولانا منظور احمد چنیوٹی اپنے پارلیمانی تجربات کے حوالہ سے گہری دلچسپی لے رہے تھے اور انہوں نے بہت سی ایسی باتیں نوٹ کیں جو ہمارے ہاں کے پارلیمانی طریق کار سے مختلف ہیں۔ قومی اسمبلی کی گیلری میں ہر رکن کی تصویر اور ضروری کوائف آویزاں تھے جن میں اس کی تعلیم، حلقہ انتخاب، حاصل کردہ ووٹوں کی تعداد اور دوسری باتیں درج ہیں۔

اس موقع پر ایک کمیٹی روم میں قومی اسمبلی کے سنی ارکان کے ساتھ ہماری خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ایران کی قومی اسمبلی میں سنی ارکان کی تعداد چودہ ہے جو بلوچستان، کردستان اور ترکمان صحرا کے علاقوں سے منتخب ہوئے ہیں۔ اس وقت آٹھ سنی ارکان موجود تھے جو ہمارے ساتھ اس نشست میں شریک ہوئے، ان کی ترجمانی بلوچستان سے دو منتخب ارکان اسمبلی مولانا محمد اسحاق مدنی اور مولانا محمد حامد کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ:

- سنی ارکان کے لیے ایوان میں الگ نشستیں مخصوص نہیں ہیں بلکہ وہ بھی دوسرے ارکان کی طرح عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آتے ہیں اور اس وقت دو سو ستر کے ایوان میں چودہ سنی ارکان ہیں۔
- ایوان میں عورتوں کے لیے بھی الگ نشستیں مخصوص نہیں ہیں بلکہ انہیں بھی عام انتخابات میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے اور اس وقت چند خواتین عوام کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہو کر ایوان میں موجود ہیں۔
- البتہ غیر مسلم اقلیتوں کے لیے پانچ نشستیں مخصوص ہیں جن میں سے تین نشستیں عیسائیوں کی، ایک یہودیوں کی اور ایک پارسیوں کی نشست ہے۔
- ایران میں وحدانی طرز حکومت ہے، صوبوں میں گورنر ہیں لیکن الگ اسمبلیاں اور صوبائی وزراء نہیں ہیں۔
- ملک میں ایک ہی پبلک لاء نافذ ہے جو اثنا عشری جعفری فقہ کے مطابق ہے، البتہ اہل سنت کو پرسنل لاء میں اپنی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ فیصلے ان کے اپنے قاضی کرتے ہیں۔

اس موقع پر کردستان سے ایرانی پارلیمنٹ کے بزرگ سنی رکن جناب حسینی نے ہم سے سوال کیا کہ کیا پاکستان میں بھی قرآن و سنت کے قوانین نافذ ہیں؟ ہمارا جواب یہ تھا کہ مکمل

طور پر نہیں ہیں اور ہم اس کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اس پر حسینی صاحب نے کہا کہ ہماری طرف سے پاکستانی علماء اور عوام کو یہ پیغام دے دیں کہ وہ اپنے ملک میں قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ کے لیے جدوجہد تیز کر دیں اور اس کے لیے سب مل کر محنت کریں۔

تہران، قم، مشہد اور زاھدان میں گیارہ روزہ قیام کے دوران ہمیں ان شہروں میں عراق ایران جنگ کے براہ راست اثرات نظر نہیں آئے، البتہ ایرانی راہنماؤں کی تقاریر اور اخبارات کی خبروں میں اس کا تذکرہ کثرت سے موجود تھا۔ جنگ کے معاشرتی اثرات روز مرہ اشیا کے نرخوں میں کسی حد تک محسوس ہو رہے تھے۔ ہمارے وفد کو دماونڈ ہوٹل میں، جہاں ہمارا قیام تھا، جنگ کے بارے میں دو فلمیں دکھائی گئیں۔ ایک فلم میں یہ دکھایا گیا کہ عراقی فوجوں نے ایرانی علاقے خالی کرتے ہوئے راستہ میں بارودی سرنگیں بچھا دیں جنہیں ایرانی فوج کے گزرنے سے پہلے صاف کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایرانی رضا کاروں نے اپنی جانوں پر کھیل کر مقررہ وقت کے اندر ان بارودی سرنگوں کو صاف کر دیا۔ دوسری فلم ایک بچے کے بارے میں تھی جسے کمانڈر محاذ جنگ پر لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا، اس نے فوجیوں کو پانی پلانے کے بہانے محاذ جنگ پر جانے کی اجازت حاصل کی اور دوران جنگ پانی پلاتے ہوئے زخمی ہو گیا، پھر ہسپتال میں اس نے پیاس کی شدت کے باعث دم توڑ دیا۔

اس کے علاوہ جنوبی تہران میں حضرت ابوذر غفاریؓ کے نام سے موسوم ایک مسجد میں عام جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اس میں عراق ایران جنگ میں جاں بحق ہونے والوں کے ورثاء زیادہ تعداد میں شریک ہیں۔ جلسہ کے شرکاء بالخصوص نوجوانوں کا جوش و خروش دیدنی تھا اور اس سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ اگر سارے ملک کے نوجوانوں کے جذبات ایسے ہی ہیں تو ان کو شکست دینا بہت ہی مشکل ہے۔ اسی جلسہ میں وفد کی طرف سے مجھے خطاب کرنے کا موقع ملا اور میں نے ایرانی انقلاب کے مذہبی پہلوؤں پر اپنے احساسات سے حاضرین کو آگاہ کیا۔

تہران میں ہمیں سابق شاہی خاندان کے وہ محلات دکھائے گئے جہاں پہلوی خاندان کے شاہ اور شاہزادے رہائش پذیر تھے۔ شاہ ایران اور اس کی والدہ کا جس محل میں قیام تھا وہ دونوں محل دیکھے، اور ولی عہد شہزادہ علی رضا کے لیے جو محل تیار ہو رہا تھا وہ بھی دیکھا۔ یہ محلات جو کبھی شاہی جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ کا نشان تھے، اب عبرت کا عنوان بن چکے

تھے۔ انقلابی لیڈروں نے ان محلات کو میوزیم کی شکل دے دی ہے اور عبرت دلانے کے لیے قرآنی آیات کے کتبے ان میں جابجا آویزاں کر دیے ہیں۔

تہران میں شوریٰ نگہبان کے چار قانون دان ارکان (۱) جناب علی زادہ (۲) جناب پیژنی (۳) جناب مہرپور (۴) اور جناب افتخار صاحب کے ساتھ ہمارے وفد کے ارکان (۱) مولانا چنیوٹی (۲) راجہ رب نواز ایڈووکیٹ (۳) مفتی دائم الدین (۴) محمد احسن خاکوانی ایڈووکیٹ (۵) اسد اللہ بھٹوایڈووکیٹ (۶) اور راقم الحروف کی ایک ملاقات ہوئی جس میں ایران میں عوام کو حاصل بنیادی حقوق کے تحفظ وضمانت میں عدالتوں کے کردار، اور قانونی نظام میں انقلاب کے بعد کی اصلاحات پر تفصیلی تبادلہ خیالات ہوا۔

تہران میں چھ روزہ قیام کے بعد ہم بذریعہ ریل گاڑی مشہد روانہ ہوئے۔ ریل شام چار بجے تہران سے روانہ ہوئی اور صبح آٹھ بجے کے قریب مشہد پہنچی جبکہ فجر کی نماز ہم نے راستہ میں امام مسلمؒ کے شہر نیشاپور کے ریلوے اسٹیشن پر ادا کی۔ مشہد میں ہمارا قیام دوسرے دن دو بجے تک رہا۔ اسی دوران امام رضا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر دعا کے لیے حاضری دی۔ امام رضاؒ کے نام پر نئی تعمیر شدہ یونیورسٹی دیکھی جو واقعتاً قابل دید ہے۔ یونیورسٹی کے میس میں طلبہ کے ساتھ کھانا کھایا اور شہر میں وفد کے ارکان نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق شاپنگ کی۔

مشہد میں جمعہ کا اجتماع بھی دیکھا جو خاصا بڑا اجتماع تھا، آیت اللہ شیرازی نے خطبہ جمعہ دیا۔ پہلے خطبہ کا موضوع ازدواجی مسائل تھے اور دوسرے خطبہ میں انہوں نے قومی مسائل کا ذکر کیا۔ جناب آیت اللہ خمینی کے نمائندہ جناب آیت اللہ طبسی کے ساتھ ہماری ملاقات ہوئی اور باہمی دلچسپی کے مختلف امور پر باہمی گفتگو ہوئی۔

تہران میں قیام کے دوران معلوم ہوا کہ ایرانی بلوچستان کے بزرگ سنی عالم دین مولانا عبد العزیز بیمار ہیں اور تہران میں مولانا محمد اسحاق مدنی (ممبر پارلیمنٹ) کے گھر میں رہائش پذیر ہیں۔ مولانا عبد العزیز ایران میں اہل سنت کے سب سے بزرگ عالم دین ہیں۔ انقلاب ایران کے راہنماؤں میں شامل رہے ہیں، انقلاب کے بعد ایران کی دستور ساز اسمبلی کے رکن رہے ہیں، پھر قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے ہیں، آج کل مولانا محمد اسحاق مدنی انہی کی سیٹ پر قومی اسمبلی کے رکن ہیں۔ مولانا موصوف سے ہماری ملاقات ہوئی تو انہیں ایران کے انقلابی راہنماؤں کے رویہ کے بارے میں بے حد شاکی پایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ابتدا

میں رویہ درست رہا اور اہل سنت کے ساتھ معاملات میں رواداری رہی لیکن انقلاب کے استحکام کے ساتھ ساتھ رویہ میں بھی تبدیلی آتی گئی حتی کہ اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ابتدا میں صلاح مشورہ کے لیے انہیں زاھدان سے خصوصی طیارہ کے ذریعے تہران لایا جاتا تھا لیکن اب وہ خود تہران میں آکر دس دس دن بیٹھے رہتے ہیں کسی ذمہ داری سے ملاقات نہیں ہوتی، اور اگر ملاقات ہو جاتی ہے تو جو گفتگو ہوتی ہے اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلتا، شکایات بڑھتی جا رہی ہیں اور اعتماد کی فضا بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ مولانا عبدالعزیز کے لہجہ کی تلخی سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ معاملات سنگینی کی حدود کو چھو رہے ہیں اور اگر ان کو سنبھالا دینے کی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو یہ سنگینی کسی نئی الجھن اور بحران کا باعث بن سکتی ہے۔

زاھدان میں ہمارا وفد مرکزی جامع مسجد میں گیا جو مکی مسجد کے نام سے معروف ہے۔ عشاء کی نماز ہم نے وہاں ادا کی اور نمازیوں سے ملاقات کی۔ اس مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز ہیں جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے اور اب مولانا موصوف کی علالت کی وجہ سے ان کے داماد مولانا عبدالحمید ان کی جگہ فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

جامع مسجد کے قریب دارالعلوم زاھدان میں اساتذہ اور طلبہ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس مدرسہ کے منتظم مولانا نذیر احمد ہیں جو دارالعلوم کراچی کے فارغ التحصیل ہیں، ان کے معاون مولانا محمد قاسم بھی دارالعلوم کراچی کے فاضل ہیں۔ زاھدان سے کم و بیش ڈیڑھ سو کلومیٹر دور سراوان میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے شاگرد مولانا محمد یوسف نے ایک بڑا دینی مدرسہ قائم کر رکھا ہے جہاں دورۂ حدیث بھی ہوتا ہے۔ مولانا محمد یوسف زاھدان آئے ہوئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی اور مختلف مسائل پر گفتگو بھی ہوئی۔

پاکستانی وفد کی واپسی سے ایک روز قبل زاھدان کے گورنر سے وفد کی ملاقات ہوئی اور مختلف امور پر وفد کے ارکان نے ایرانی بلوچستان کے گورنر سے تبادلہ خیالات کیا۔

وفد کی سرگرمیوں کی مختصر رپورٹ کے بعد اب میں ان امور کی طرف آتا ہوں جن کا ابتدا میں ذکر کیا تھا کہ ایران جانے سے ہماری غرض کیا تھی اور وہ کون سے امور تھے جن کا جائزہ لینا ہمارا مقصد تھا۔

انقلاب کی فکری بنیاد

پہلی بات یہ تھی کہ کیا یہ انقلاب صرف شاہی خاندان کے خلاف عوامی نفرت کا وقتی نتیجہ تھا یا انقلاب کی کوئی فکری بنیاد بھی موجود تھی؟ ہم نے اس نقطہ نظر سے جو مشاہدہ کیا ہے اس سے واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس انقلاب کے لیے ایک عرصہ سے فکری کام ہو رہا تھا اور انقلاب کے راہنماؤں نے صرف فکری بنیادوں پر انقلاب کی جدوجہد کو استوار کیا ہے بلکہ اس کے لیے رجال کار کی مطلوبہ کھیپ مہیا کرنے کی طرف بھی ضروری توجہ دی ہے۔ ایران کے مذہبی راہنماؤں نے لادینی نظریات بالخصوص سیکولرازم کے خلاف مسلسل فکری جنگ لڑی ہے اور مغربی تہذیب و ثقافت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر کے اپنے عوام کو منطق اور استدلال کے ساتھ یہ باور کرایا ہے کہ مادر پدر آزاد جمہوریت، سیکولرازم، سوشلزم اور مغربی تہذیب ان کے عقائد و نظریات اور دینی مزاج سے متصادم ہے اور انہیں اپنے مذہب کی بالادستی کے لیے ان تمام چیزوں سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی۔

قوم میں یہ شعور بیدار کرنے کے بعد انقلاب ایران کے فکری راہنماؤں نے اہل فکر و دانش کو اپنی فکری جدوجہد کا ہدف بنایا ہے، بالخصوص دو راہنماؤں جناب آیت اللہ باقر صدر اور آیت اللہ مرتضی مطہری نے انسانی زندگی کے اجتماعی مسائل پر جس طرح قلم اٹھایا ہے اور دلیل و منطق کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جدید نظریات و افکار کے تار و پود کو بکھیرا ہے اس سے ایران کا دانشور طبقہ بھی انقلاب کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ اور بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی انقلاب کی پشت پر ایک مسلسل اور شعوری فکری جدوجہد کی قوت موجود ہے۔ اگر شیعہ سنی اختلافات کے حوالہ سے نہ دیکھا جائے تو میرے نزدیک آیت اللہ باقر صدر اور آیت اللہ مرتضی مطہری کی فکری کاوشوں اور جدید نظریات و تہذیب کے خلاف ان کی نظریاتی جدوجہد سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ کیا ایران کے مذہبی حلقے اس انقلاب کے تحفظ و استحکام کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں ہے اور مشاہدات بتاتے ہیں کہ اس وقت بھی ایران میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے مذہب کے ساتھ شعوری اور جذباتی وابستگی کے ساتھ ساتھ نظام مملکت کے اصولوں اور طریقوں سے واقف ہیں اور قم کے مدارس کے علاوہ امام جعفر صادقؒ یونیورسٹی، امام

رضا یونیورسٹی اور دیگر یونیورسٹیاں انقلاب کی نظریاتی ضرورت کے مطابق نئی نسل کو تیار کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔

تیسرا سوال ہمارے ذہنوں میں یہ تھا کہ کیا انقلاب نے معاشرہ میں کوئی عملی تبدیلی پیدا کی ہے یا یہ محض لیبل ہے؟ اس سوال کی اہمیت ہمارے نزدیک خود ہمارے ہاں گزشتہ نو سال سے دکھائے جانے والے اسلامائزیشن کے شو کے پیش نظر زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اس لیے ہماری کوشش یہ رہی کہ اس سوال کے جواب کے لیے ہم ایرانی معاشرہ کے زیادہ قریب ہونے کی صورت اختیار کریں۔ چنانچہ اس کوشش کے نتیجہ میں جن تبدیلیوں کو ہم دیکھ سکے ہیں ان کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے:

- آزاد خیالی اور سیکولرازم کے فتنے ایران کے مذہبی حلقوں کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں، اور اگر پاکستان کے دینی حلقے مجھے اس گستاخی پر معاف کریں تو اس امر کی نشاندہی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایران کے مذہبی حلقوں نے سیکولر حلقوں کے خلاف یہ کامیابی فتوؤں اور طعن و تشنیع کا بازار گرم کر کے نہیں بلکہ منطق و استدلال سے ان کی فکر کو شکست دے کر حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انہیں اس کامیابی کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے جبر کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ وہ عوام کی براہ راست نمائندگی پر اعتماد کرتے ہوئے منتخب اداروں کے ذریعے حکومت کر رہے ہیں۔
- نئی نسل کے رجحانات کو کافی حد تک مذہب کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ ہمیں وہاں مذہب، انقلاب اور مذہبی اقدار کی باتیں کرنے والوں میں بوڑھوں کی بہ نسبت نوجوانوں کا تناسب زیادہ نظر آیا جو اس امر کا ثبوت ہے کہ ایران کی مذہبی قیادت نئی نسل کو اپنی ڈھب پر لانے میں کافی حد تک کامیاب رہی ہے اور یہ بات انقلاب ایران کے استحکام اور محفوظ مستقبل کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔
- یہ بھی انقلاب ایران کا کرشمہ ہے کہ ایشیا کا پیرس کہلانے والے تہران میں آج کسی خاتون کے بے حجاب چلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایرانی عورت روایتی آرائش و زیبائش سے بیگانہ ایک سادہ سی سیاہ چادر میں ملبوس ایران کے بازاروں میں دکھائی دیتی ہے، حتیٰ کہ ابتدائی سکول میں جانے والی

پانچ چھ سال کی عمر کی بچیاں بھی اسی حجاب میں مستور بستے اٹھائے سکولوں کی طرف جاتی نظر آتی ہیں۔ تہران کے بعض عام شہریوں کے مطابق اس شہر میں انقلاب سے پہلے عریانی، بدکاری اور شراب خوری کے اڈے عام تھے مگر اب یہ اڈے ختم ہو چکے ہیں۔ بازاروں، ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں میں پردے کی اہمیت کے بینر اور کتبے آویزاں ہیں۔ تہران ایئرپورٹ پر شہداء کے پیام کے حوالہ سے یہ کتبہ لکھا تھا کہ ”خواہرم! سیاہی حجاب تو کو بندہ تراز سرخئ خون من است“ کہ میری بہن! تیرے پردہ کی سیاہی میرے خون کی سرخی سے زیادہ مقدس ہے۔ مشہد میں امام رضاؒ کے مزار کے باہر ایک بڑا کتبہ لکھا ہوا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ”مزار کی زیارت مستحب ہے مگر پردہ کی رعایت واجب ہے۔“

• الغرض اس ثقافتی انقلاب کے ذریعے انقلاب ایران کے لیڈروں نے ایرانی معاشرہ کو مغربی تہذیب کے غلبہ اور یورپی ثقافت کی بالادستی سے نجات دلانے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے اور نہ صرف ایرانی عورت کو ایک باوقار حجاب سے بہرہ ور کر دیا ہے بلکہ عورت کو تجارتی نمائش کا عنوان بننے سے بھی نجات دلا دی ہے۔ چنانچہ ہم نے وہاں اخبارات کے ایڈیشنوں کو عورت کے جسم اور حسن کی نمائش سے عاری پایا ہے اور جنرل اسٹوروں میں پاؤڈر اور کریم کے ڈبے بیچنے کے لیے عورت کی مسکراہٹ کو سفارشی کا روپ دھارے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف نہ کرنا بخل اور ناانصافی ہو گا۔

• ہمیں ایران کے بینکوں میں جا کر ان کے نئے بینکاری کے نظام کو دیکھنے اور عدالتوں میں جا کر عدالتی نظام میں انقلاب کے بعد کی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا مگر مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق ایرانی بینکوں سے سود کا نظام ختم کیا جا چکا ہے اور ”مضاربت“ اور ”قرض حسنہ“ کی بنیادوں پر بینکاری کا نیا نظام کام کر رہا ہے۔ اسی طرح عدالتوں میں اہل ایران کے مذہبی معتقدات کے مطابق شرعی حدود کا نہ صرف نفاذ ہو چکا ہے بلکہ ان پر کامیابی سے عملدرآمد بھی ہو رہا ہے۔

چوتھی بات جو ہم معلوم کرنا چاہتے تھے، یہ تھی کہ ایرانی انقلاب کے لیڈروں نے فرقہ وارانہ مسائل پر قابو پانے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی، بالخصوص عدالتوں میں مذہبی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں فقہی بنیادوں کے تعین کے مسئلہ پر انہوں نے کیا اصول طے کیا ہے؟ کیونکہ پاکستان میں ہمارے لیے یہ مسئلہ خاصی الجھن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری گفتگو قومی اسمبلی کے سنی ارکان کے علاوہ شوریٰ نگہبان کے چھ ارکان بالخصوص جناب آیت اللہ جنتی سے ہوئی اور ایران کے دستور کا مطالعہ کیا۔ ان راہنماؤں نے بھی ہمیں ایران کے دستور کی طرف توجہ دلائی کہ اس میں یہ مسئلہ طے کر دیا گیا ہے جس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ:

> دستور کی دفعہ ۱۲ میں کہا گیا ہے کہ ”ایران کا سرکاری دین اسلام اور مذہب اثنا عشری جعفری ہے اور دستور کی یہ دفعہ ہمیشہ کے لیے ناقابل تبدیل ہے۔ دیگر اسلامی مذاہب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور زیدی کا مکمل احترام ہوگا، ان کے پیروکار اپنی مذہبی رسومات اپنی فقہ کے مطابق انجام دینے میں آزاد ہوں گے۔ دینی تعلیم اور شخصی قوانین (نکاح، طلاق، وراثت، وصیت) میں ان کے فیصلے ان کی فقہ کے مطابق ہوں گے۔ جس علاقہ میں ان میں سے کسی مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت ہوگی وہاں کے مقامی قوانین، شوریٰ کے اختیارات کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اپنے مذہب کے مطابق بنا سکیں گے بشرطیکہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے حقوق محفوظ رہیں۔“

گویا ایران میں وہاں کی آبادی کی اکثریت کی فقہ کو نہ صرف دستوری تحفظ دیا گیا ہے بلکہ دوسری فقہوں کے پیروکاروں کو پرسنل لاء، مذہبی رسومات اور مقامی قوانین میں ان کی فقہوں کے مطابق عملدرآمد کی آزادی دے کر پبلک لاء میں صرف اکثریتی فقہ کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ایران کے دستور کی دفعہ ۱۱۵ کے مطابق ایران کے صدر کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ:

> ”ایران کی مذہبی اور سیاسی شخصیات میں سے ہو، ایرانی الاصل ہو، ایرانی قومیت رکھتا ہو، منتظم اور مدبر ہو، امانت و تقویٰ سے بہرہ ور ہو، اسلامی جمہوریہ ایران کی بنیادوں پر یقین رکھتا ہو، اور رسمی مذہب (جعفری اثنا عشری) کا پیروکار ہو۔“

اسی طرح ہمیں بتایا گیا کہ اگرچہ قومی اسمبلی میں ہر فقہی مذہب کے پیروکار منتخب ہو کر ممبر بن سکتے ہیں لیکن قومی اسمبلی کے اوپر بارہ افراد کی جو شوریٰ نگہبان (نگران کونسل) ہے اور جو

قومی اسمبلی کے فیصلوں پر نظر ثانی کر کے ان کی توثیق یا رد کرنے کی مجاز ہے، اس کی رکنیت کے لیے اثناعشری جعفری ہونا شرط ہے۔ کسی دوسری فقہ کا پیروکار اس کونسل کا رکن نہیں بن سکتا اور نہ ہی موجودہ بارہ ارکان میں اس وقت کوئی ہے۔

چنانچہ ان معلومات کے حصول کے بعد جب ہم نے ایرانی راہنماؤں کو اس طرف توجہ دلائی کہ پاکستان میں غالب سنی اکثریت ہوتے ہوئے بھی فقہ جعفری کو بطور پبلک لاء نافذ کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے حتی کہ یہ مطالبہ نفاذ اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، تو انہوں نے اس مطالبہ کو غلط قرار دیا اور کہا کہ پاکستان کی سنی اکثریت کا یہ حق ہے کہ ملک کا پبلک لاء ان کی فقہ کے مطابق ہو اور دوسری فقہوں کے پیروکاروں کو پرسنل لاء میں آزادی دی جائے۔

پانچواں سوال جس کا جائزہ لینا ہمارے دورۂ ایران کے اہم مقاصد میں شامل تھا، یہ تھا ایران کے اہل سنت کے بارے میں صورتحال معلوم کرنا کہ وہ کس حال میں ہیں اور انقلاب ایران کے بعد اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں؟ ہم نے اس سلسلہ میں متعدّد سنی راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے حتی الامکان کرید کرید کر سوالات کیے۔ ان میں ایسے راہنما بھی ہیں جنہوں نے حکومت ایران کے تمام اقدامات کی حمایت کی ہے، اور وہ راہنما بھی ہیں جن کی مخالفت میں شدت اور تلخی واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ لیکن ایک بات پر سبھی متفق تھے کہ شاہ ایران کے دور سے مذہبی طور پر انقلاب کے بعد کا دور بہرحال بہتر ہے اور انقلاب سے ایرانی معاشرہ میں نظریاتی، دینی اور معاشرتی تبدیلیاں آئی ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اہل سنت کو درپیش مسائل و مشکلات اور ان کے حل کے سلسلہ میں ایرانی حکومت کی بے توجہی کی شکایت عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے۔ اور یہ بے توجہی اب ان حدود کو چھو رہی ہے کہ ہمیں اہل سنت کے مسائل سے آگاہ کرنے میں بھی اس لیے ہچکچاہٹ محسوس کی جا رہی تھی کہ شاید ہمارے وہاں سے آجانے کے بعد یہ بات ان کے لیے نقصان کا باعث نہ بن جائے۔

ایران میں اہل سنت کے مسائل

- ایران کی مجموعی آبادی میں اہل سنت کے تناسب کا صحیح تعین ممکن نہیں ہے اس لیے کہ اب تک اس فرق کے ساتھ مردم شماری نہیں ہوئی لیکن ایک ذمہ دار سنی راہنما کے اندازے کے مطابق مجموعی آبادی میں اہل سنت کا تناسب

پچیس فیصد ہو سکتا ہے۔ کردستان اور بلوچستان دو صوبے ایسے ہیں جہاں اہل سنت کی اکثریت ہے لیکن صوبائی حکومتیں نہ ہونے کی وجہ سے یہ اکثریت بے وزن ہو کر رہ گئی ہے۔ حتیٰ کہ بلوچستان کے بعض راہنماؤں کو شکایت ہے کہ اس صوبہ میں اہل سنت ساٹھ فیصد سے زیادہ ہیں لیکن اعلیٰ ملازمتوں میں کوئی سنی نظر نہیں آتا، سب کے سب اعلیٰ افسران غیر سنی ہیں اور وہ بھی باہر سے بھیجے گئے ہیں۔ گویا وہاں کا مسئلہ نان سنی کے ساتھ نان لوکل کا بھی ہے جو ان کے اندر محرومی اور مایوسی کے احساس کو اجاگر کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ ایک راہنما نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا کہ ہمارے ہاں تو اینٹیں بنانے والے بھی باہر سے آتے ہیں۔ کم و بیش یہی صورتحال کردستان کی بھی بیان کی جاتی ہے۔

• اہل سنت کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ انہیں اپنے حقوق کے لیے منظم ہونے کا حق نہیں ہے۔ حالانکہ ایران کے دستور کی دفعہ ۲۶ کے مطابق انہیں تنظیم بنانے کا حق حاصل ہے لیکن کردستان کے ایک اہم سنی راہنما احمد مفتی زادہ مسلسل چار سال سے صرف اس لیے جیل میں ہیں کہ انہوں نے حقوق اہل سنت کے تحفظ کے لیے ایک تنظیم کا ڈھانچہ قائم کیا تھا۔ اسی طرح سراوان کے صوفی دوست محمد ایک سال سے جیل میں ہیں بلکہ اس وقت بیمار ہیں اور ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ علاوہ ازیں سرخس کے مولانا محی الدین ایک سال جیل میں رہے ہیں اور اب انہیں سات سال کے لیے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔

• اہل سنت کو یہ بھی شکایت ہے کہ ان کے مذہبی معتقدات کا احترام نہیں کیا جاتا۔ بعض ایرانی راہنما مشترک اجتماعات میں اہل سنت کے مذہب کے خلاف تقریریں کرتے ہیں اور ان کے اکابر کے بارے میں وہ کچھ کہتے ہیں جو ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ ایک بزرگ سنی راہنما حسرت بھرے لہجے میں کہنے لگے کہ بھئی ہم غلامی کی زندگی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اپنے اکابر کی توہین کیسے سنیں، اس سے تو موت اچھی ہے۔ ایسے ہی ایک واقعہ کی نشاندہی کی گئی کہ شوریٰ نگہبان کے ممبروں میں سے کسی صاحب نے ریڈیو تقریر کرتے ہوئے جنگ جمل کے حوالہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف لڑنے

والوں کو ''ائمۃ الکفر'' قرار دیا حالانکہ ان میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ اس پر بلوچستان سے ایرانی پارلیمنٹ کے سابق منتخب ممبر مولانا نظر محمد نے احتجاج کیا اور ایک پبلک تقریر میں اس کی مذمت کی تو انہیں گرفتار کر لیا گیا اور ابھی تک وہ نہ صرف زیر حراست ہیں بلکہ حراست کے دوران انہیں ٹی وی پر معذرت کے لیے مجبور کرنے کے باوجود انہیں رہا نہیں کیا گیا۔

• اہل سنت کو یہ شکوہ ہے کہ ان کی اکثریت کے صوبوں میں نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ملازمتوں اور عہدوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ دوسرے صوبوں سے غیر سنی آبادی ان کے صوبوں میں بتدریج منتقل کر کے ان کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ایک سنی راہنما کا اس سلسلہ میں یہ کہنا تھا کہ اگر دس سال تک یہ صورتحال اسی طرح جاری رہی تو ہماری نئی نسل بالکل جاہل رہ جائے گی اور بلوچستان اور کردستان میں ہماری اکثریت باقی نہیں رہے گی۔

• اہل سنت کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان کے طلبہ کو یونیورسٹیوں میں داخلہ نہیں ملتا۔ دینی تعلیم کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق اعلیٰ مدارس موجود نہیں ہیں اور پاکستان کے دینی مدارس میں تعلیم کے لیے انہیں جانے کی سہولت میسر نہیں ہے۔ انہیں پاسپورٹ نہیں دیا جاتا اور جو طلبہ چوری چھپے پاکستان کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں واپسی پر انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے، حالانکہ اس کے برعکس صرف قم کے دینی مدارس میں پاکستان کے ایک ہزار کے قریب طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایران کے سنی طلباء دینی تعلیم کے لیے پاکستان کے مدارس میں آنا چاہتے ہیں لیکن بے بس ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ انہیں پاکستان کے دینی مدارس میں داخلہ ملنا چاہیے اور اسی طرح پاسپورٹ پر تعلیم کے لیے پاکستان جانے کا حق ہونا چاہیے جس طرح پاکستانی طلباء کو قم جانے کا حق حاصل ہے۔

الغرض اہل سنت اپنے حقوق و مفادات کے سلسلہ میں بے یقینی کا شکار ہیں اور ان کی یہ بے یقینی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم نے اپنے میزبانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے بلکہ ہمارے دورے کے اختتام سے قبل ہمارے تاثرات معلوم کرنے کے لیے ایک سوالنامہ

ہمیں دیا گیا تھا جس کے جوابات سب نے اپنے اپنے تاثرات کے مطابق تحریر کیے۔ راقم الحروف نے اپنے جوابات میں ایران کی انقلابی قیادت کو اس مسئلہ کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ:

> ”ایران شیعہ اکثریت کا ملک ہے اور اہل سنت یہاں بعض صوبوں میں اکثریت میں ہونے کے باوجود مجموعی طور پر اقلیت میں ہیں۔ فطری طور پر عالم اسلام میں سنی اکثریت کے ممالک ایرانی انقلاب کو یہاں کی سنی اقلیت کے رجحانات اور جذبات کے آئینہ میں دیکھیں گے۔ اس لیے سب سے پہلے ایران کی انقلابی حکومت کو یہاں کی سنی اقلیت کو مطمئن کرنا چاہیے اور ناراض عناصر کو عملی طور پر اعتماد میں لینا چاہیے، تاکہ وہ عالم اسلام میں انقلاب ایران سے سنی مسلمانوں کی دوری کا باعث بننے کی بجائے اس انقلاب کے مؤثر مبلغ بن سکیں۔“

۱۹۸۳ء

اسلامی ثقافت، جمہوریت، نجی ملکیت اور اجتہاد

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۱۸ نومبر ۱۹۸۳ء)

(ایک صاحب نے گزشتہ دنوں کچھ سوالات بھجوائے اور فوری جواب کا تقاضا کیا، عجلت کے باعث کسی مناسب تیاری کے بغیر جوابات قلمبند کرنا پڑے۔ سوالات کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ غالبا کسی امتحانی پرچے کے ہیں لیکن اہم موضوعات سے متعلق ہیں اس لیے ان کے جوابات نذر قارئین ہیں۔ راشدی)

سوال: کیا یہ درست ہے کہ اسلامک کلچر نام کی کوئی چیز سرے سے موجود نہیں ہے کیونکہ مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے وہیں کا کلچر اپنا لیا؟

جواب: اس سلسلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ کلچر کہتے کس کو ہیں؟ عام طور پر کلچر کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کلچر کسی قوم کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رچ بس جانے والی ان روایات اور اعمال سے عبارت ہوتا ہے جن سے اس قوم کا تشخص اور امتیاز دوسری اقوام سے ظاہر ہو۔ اگر واقعی کلچر اسی چیز کا نام ہے تو تاریخ عالم کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلامک کلچر سے زیادہ مضبوط اور مستحکم کلچر کوئی اور قوم پیش نہیں کر سکی اور اسلام جس علاقہ میں گیا ہے اس نے وہاں کے کلچر کو قبول کرنے کی بجائے اس کی بنیادی ہیئت کو تبدیل کر دیا ہے۔

اسلام سب سے پہلے اس کلچر پر اثر انداز ہوا جو ڈیڑھ ہزار سال قبل کے جزیرۂ نمائے عرب کا علاقائی کلچر کہلاتا ہے۔ اور اس نے عربوں کے نہ صرف عقائد کو بدل دیا بلکہ ان کی معاشرتی زندگی میں بھی انقلاب پیدا کیا، حلال و حرام کے تصورات بدل

گئے، باہمی تعلقات و روابط کی بنیادیں تبدیل ہوگئیں، خوشی وغمی کی تقریبات اور طریق کار نے نیا رخ اختیار کر لیا، طبقات، رنگ ونسل اور زبان کا امتیاز مٹ گیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب پیدا کر کے اسلام نے عربوں کی اجتماعی زندگی کو ایک نئی ہیئت دے دی۔ عرب اقوام کی قبل از اسلام زندگی اور بعد از اسلام زندگی پر ایک نظر ڈال لیجئے آپ کو جو محسوس فرق اور تبدیلی نظر آئے گی وہی اسلام کا امتیاز اور تشخص ہے اور اسی کا نام ''اسلامک کلچر'' ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اسلام نے مختلف اقوام میں پہنچنے کے بعد وہاں کی ثقافت پر اثرانداز ہونے کے لیے اکھاڑ پچھاڑ کی بجائے ایڈ جسٹمنٹ کی حکمت عملی اختیار کی ہے اور وہاں کے کلچر کے صرف اس حصہ کی نفی کی ہے جو اس کے عقائد اور بنیادی احکام سے متصادم ہوا ہے۔ اور ایسی روایات و اقدار کو اپنے اندر سمونے میں بخل سے کام نہیں لیا جو اس کے احکام و عقائد کے منافی نہیں تھیں، حتی کہ عرب جاہلیت کی تمام کلچرل روایات و اقدار کو بھی اسلام نے کلیۃ رد نہیں کیا بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں آج بھی اسلام ایسی روایات و اقدار کا حامل ہے جو جاہلی کلچر کا اہم حصہ رہی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں مختلف اوقات میں ثقافتوں نے اقوام عالم پر اپنا سکہ جمانے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا ہے اسلام کا طریق کار اس سے مختلف رہا ہے۔ ان ثقافتوں اور تہذیبوں کا طریق کار یہ رہا ہے کہ وہ جہاں گئی ہیں وہاں کی مقامی تہذیبوں کو کلیۃ تاخت و تاراج کر کے ان کی مکمل نفی کر کے ڈنڈے اور طاقت کے زور پر ان کی جگہ لینے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ اسلام نے پہلے سے موجود تہذیبوں کی نہ تو مکمل طور پر نفی کی ہے اور نہ تصادم کے ذریعے ان سے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام نے ان تہذیبوں کی ایسی باتوں کو فراخدلی کے ساتھ قبول کر لیا ہے جو اس کے عقائد و روایات کے منافی نہیں تھیں اور صرف ان روایات و اقدار کو رد کیا ہے جن سے اس کے عقائد و احکام پر زد پڑتی ہو اور پھر اس رد کرنے میں بھی طاقت اور ڈنڈے کی بجائے افہام و تفہیم اور اخلاق و محبت کے ہتھیار سے کام لیا ہے۔

تاریخ اسلام کے ابتدائی ادوار کو دیکھیے، مجاہدین اسلام جس خطۂ زمین میں گئے ہیں وہاں تسلط قائم ہونے کے بعد ڈنڈے اور تلوار کو ایک طرف رکھ دیا ہے اور اخلاق و محبت کے ہتھیاروں سے قوموں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔ برصغیر پاکستان،

ہندوستان اور بنگلہ دیش کو ہی لے لیجیے، یہاں اسلام کے آنے سے پہلے اجتماعی زندگی میں جو اقدار و روایات اور مجموعی ہیئت تھی کیا اسلام کے آنے کے بعد بھی زندگی اسی نہج پر قائم رہی ہے جس رخ پر پہلے تھی؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے کیونکہ مسلمانان ہند کی قبل از اسلام زندگی اور بعد از اسلام زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ فرق عقائد و احکام سے لے کر شادی و غمی، تجارت، اخلاق اور روز مرہ معمولات تک ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے۔ تو پھر اسلامک کلچر کے وجود سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے؟

قصہ صرف یہ ہے کہ اسلام نے تہذیبی تبدیلیوں اور ثقافتی انقلاب کے لیے وہ ہتھکنڈے اختیار نہیں کیے جن سے دوسری تہذیبیں استفادہ کرتی رہی ہیں اور اپنے عقائد و احکام اور تہذیب و ثقافت کو اخلاق و محبت اور افہام و تفہیم کے ذریعے دوسری اقوام پر حاوی کیا ہے۔ اس لیے ظاہر بین حضرات بھولپن کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام کا تو اپنا کوئی کلچر ہی نہیں۔ ہمارے ہاں بھی اسلام نے ہندو تہذیب و کلچر کی ایسی تمام روایات و اقدار کو رد کیا ہے جو اسلام سے متصادم تھیں اور ایسی روایات و اقدار سے تعرض نہیں کیا جن سے ان کے بنیادی احکام متاثر نہیں ہوتے تھے۔ زندگی کے کسی شعبے کو مثال بنا کر دیکھ لیجیے ہندو طرز زندگی اور مسلم طرز زندگی میں آپ کو فرق محسوس ہوگا اور تبدیلی نظر آئے گی، اسی کا نام کلچر ہے اور کسی قوم کا یہی امتیاز و تشخص اس کی تہذیب کہلاتا ہے۔ البتہ اس تہذیب و ثقافت کو یہاں کی تہذیب و ثقافت پر حاوی کرنے کے لیے اسلام نے خواجہ معین الدین اجمیریؒ، سید علی ہجویریؒ اور دوسرے اولیاء کرامؒ کے کردار اور اخلاق کو ہتھیار بنایا ہے جنھوں نے اپنی سچائی، بلندئ کردار، اخلاق اور محبت کے ذریعے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کے رخ موڑ دیے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا۔

سوال: اسلام کے عقیدۂ توحید کے تہذیبی اثرات بیان کیجیے۔

جواب: عقیدۂ توحید کی بنیاد دو باتوں پر ہے:

1. کائنات کا خالق خداوند تعالی ہے اور اس نے نسل انسانی کو اپنا نائب بنا کر اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کائنات پر احکام الٰہی کے مطابق حکمرانی کرے۔ اور یہ اس لحاظ سے دکھائی بھی دے رہی ہے کہ کرۂ ارض میں زمین، فضا اور سمندر پر تصرف کا نظام انسان کے ہاتھ میں

ہے۔

2. اطاعت حکم برداری اور بندگی کے لائق صرف خدا کی ذات ہے۔ خوف اور لالچ کے تمام امور اسی سے متعلق ہیں، نفع و نقصان کا مالک صرف وہ ہے اور موت وحیات، عزت و ذلت، رزق و اقتدار، آزادی و غلامی صرف اس کے قبضے میں ہے۔

عقیدۂ توحید کا وہ پہلو جس کا ہم نے نمبر ا کے طور پر ذکر کیا ہے ایک مسلمان میں مقصد زندگی کا احساس پیدا کر کے اسے بے مقصد زندگی گزارنے سے روکتا ہے، اور زندگی برائے زندگی کی بجائے اسے زندگی برائے مقصد کی شاہراہ پر گامزن کرتا ہے۔ اور عقیدۂ توحید کا پہلو نمبر ۲ ایک مسلمان کو خدا کے سوا باقی سب کے خوف سے بے نیاز کر کے اس کے اندر وہ جرأت اور حوصلہ پیدا کرتا ہے جو اسے ہر حالت میں حق گوئی اور حق پرستی پر آمادہ کرتا ہے۔

ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد زندگی کو بامقصد سمجھیں اور ہر حالت میں حق کو قبول کرنے اور اسے لاگو کرنے میں خدا کے سوا ہر طاقت کے ڈر سے بے نیاز ہو جائیں، صرف وہی معاشرہ دنیا میں امن و انصاف کا ضامن ہو سکتا ہے اور لوگوں کو ظلم و جبر اور استحصال و غلامی سے نجات دلا سکتا ہے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید مسلم معاشرہ میں یہ اوصاف پیدا کرتا ہے اور انہی اوصاف پر اسلامی معاشرہ کی بنیاد رکھ کر اسے خیر امت کے طور پر دنیا میں صحت مندانہ معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی انقلاب کا داعی بناتا ہے۔

سوال: اسلام کا عقیدۂ تقدیر "توکل" کے نام پر بے عملی کو فروغ دیتا ہے؟

جواب: یہ اسلام پر الزام ہے، اسلام نے کہیں تقدیر اور توکل کی ایسی تعبیر نہیں کی جسے بے عملی کا نام دیا جا سکے۔ بلکہ اسلام جہد مسلسل اور عمل پیہم کا نام ہے اور ہر بات میں عمل اور حتی الوسع عمل کو ضروری قرار دیتا ہے۔ تقدیر اور توکل انسان کو اس کے عمل اور جدوجہد کے بے نتیجہ ہونے کی صورت میں اس کے منفی ردعمل سے بچاتے ہیں اور اس کے حوصلہ کو قائم رکھتے ہوئے عمل اور جدوجہد پر دوبارہ آمادہ کرتے ہیں۔ تقدیر اور توکل کے نام سے اسلام صرف یہ کہتا ہے کہ اپنے مقاصد کے لیے عمل کرو اور جو کچھ تمہارے بس میں ہے کر گزرو لیکن نتائج تمہارے اختیار میں نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہیں اور ان کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ لیکن تمہارے ثواب و

عقاب اور ذمہ داری کا تعلق اس فیصلے سے نہیں بلکہ تمہارے عمل سے ہے، جو عمل کرو گے اس کے نتائج تمہیں بھگتنا ہوں گے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ عمل صالح کا بھی ذکر کیا ہے اور سورۃ العصر میں نجات اور کامیابی کا مدار بیان کرتے ہوئے ایمان اور عمل صالح کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

اور یہ الزام اسلام کے عملی کردار کے لحاظ سے بھی خلاف واقعہ ہے۔ اگر اسلام تقدیر اور توکل کے نام پر بے عملی کا داعی ہوتا تو اس کے اولین پیروکار صحابہ کرامؓ جہد مسلسل کے پیکر نہ ہوتے، اس بے عملی کا اثر سب سے زیادہ ان پر ہوتا جبکہ وہ اس کے برعکس رات کو جائے نماز پر خدا کی عبادت کرنے والے اور دن کو جہاد اور مشقت کرنے والے تھے۔ اسلام اگر تقدیر اور توکل کے نام پر بے عملی کو فروغ دیتا تو خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر و احد کے محاذوں پر بے سروسامانی کے باوجود کفار کے مقابلہ میں صف آراء نہ ہوتے بلکہ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر تقدیر، توکل اور دعاؤں کے ساتھ ان جنگوں کو جیتنے کی راہ اختیار کرتے۔

اس لیے یہ کہنا خلاف واقعہ ہے کہ اسلام نے تقدیر اور توکل کے نام پر بے عملی کو فروغ دیا ہے۔ بلکہ اسلام نے تقدیر اور توکل کے ذریعے مسلمانوں کے جوش عمل میں اضافہ کیا ہے اور جہد و عمل کے نتائج سامنے نہ آنے پر اسے خدا کے حوالے کرنے کا جذبہ اجاگر کر کے منفی ردعمل سے بچایا ہے اور جہد عمل کی اس سپرٹ کو قائم رکھا ہے جو نتائج سامنے نہ آنے پر عموماً کمزور پڑ جایا کرتی ہے۔

حتیٰ کہ توکل کے نام پر بے عملی کی خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل کے ساتھ نفی فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ دیکھ لیجئے۔ ایک صحابی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دور سے آئے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ جواب دیا کہ خدا کے توکل پر کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ توکل اس کا نام نہیں ہے، پہلے اونٹ کے پاؤں کو رسی کے ساتھ باندھو پھر خدا پر توکل کرو۔ گویا آپؐ نے توکل کا معنی واضح فرما دیا کہ توکل خدا کے بھروسے پر بیکار بیٹھ جانے کا نام نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے مقصد کے لیے وسائل اور محنت کو مکمل طور پر اختیار کرو اور پھر اس کے نتائج خدا پر چھوڑ دو۔

اسلام کی اس قدر واضح تعلیمات، عمل اور معاشرہ پر اس کے اثرات کو دیکھتے ہوئے بھی یہ الزام عائد کر دینا کس قدر ناانصافی ہے کہ اسلام کا عقیدۂ تقدیر توکل کے

نام پر بے عملی کو فروغ دیتا ہے۔

سوال: نماز کے تہذیبی اثرات پر روشنی ڈالیے۔

جواب: نماز انسان میں طہارت و پاکیزگی کی عادات پیدا کرتی ہے، اس کے ذہن و فکر کو یکسوئی عطا کرتی ہے، وقت کی پابندی اور ذمہ داری کے احساس کا خوگر بناتی ہے، جوابدہی کا تصور اس کے ذہن میں زندہ رکھتی ہے اور اس طرح معاشرہ کو ایسے تربیت یافتہ افراد فراہم کرتی ہے جو اس کی صحت مندانہ تشکیل میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ پھر باجماعت نماز، جمعہ کی نماز اور عید کی نماز کے ذریعے ہر سطح پر مسلمانوں کی اجتماعیت ابھرتی ہے، باہمی میل جول اور افہام و تفہیم کے مواقع مسلسل فراہم ہوتے ہیں اور وحدت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

سوال: روزہ ایک انفرادی عبادت ہے لہٰذا اس سے معاشرتی اصلاح کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

جواب: بنیادی طور پر یہ تصور ہی غلط ہے کہ جو چیز صرف انفرادی اصلاح کا ذریعہ ہو اس کے اثرات معاشرہ پر نہیں ہوتے۔ کیونکہ معاشرہ افراد ہی کا مجموعہ ہے اور ایک فرد اصلاح کے عمل سے جس قدر بہرہ ور ہوگا معاشرہ اتنے ہی اس کے اثرات قبول کرے گا بلکہ فرد کی اصلاح کے بغیر تو معاشرہ کی اصلاح کا تصور بھی ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد کو نظر انداز کر کے اصلاح کے عمل کو معاشرہ پر اوپر سے مسلط کرنے کی ہر کوشش دنیا میں ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔

روزہ اگرچہ بظاہر انفرادی عمل ہے اور ایک مسلمان کی ذات کا معاملہ ہے لیکن یہ عمل مسلمان کو صبر و استقامت، تقویٰ، پرہیزگاری اور دیگر اوصاف حمیدہ سے موصوف کر کے ایک اچھے معاشرہ کی تشکیل کے لیے تیار کرتا ہے۔

سوال: جمہوریت میں عوام کی حاکمیت کا تصور پایا جاتا ہے جو سراسر الحاد کے مترادف ہے، لہٰذا اسلامی نظام سیاست میں جمہوریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟

جواب: یہ مسئلہ قدرے تفصیل طلب ہے۔ جمہوریت کو اگر اس معنی میں لیا جائے کہ اس کی بنیاد عوام کی حاکمیت پر ہے اور عوام یا ان کے نمائندے جو فیصلہ بھی کر لیں وہ حتمی اور آخری ہے، یہ جمہوریت اسلام کے قطعی منافی اور اس کے بنیادی عقائد و احکام سے متصادم ہے اور اس کے الحاد و کفر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اگر جمہوریت سے یہ مراد لی جائے کہ خدا کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کر کے احکام و قوانین

کو اس کے فرامین کے تابع رکھتے ہوئے نظم مملکت میں عوام کو شریک کیا جائے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے ان کی رائے سے حکمران کا انتخاب کیا جائے تو اسلام اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ خود اس کا علمبردار ہے۔

یہ بات طے ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے اور ایک مسلمان حکومت اپنے ہر فیصلہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی پابند ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پابندی کے اس دائرے میں رہنے والی اس حکومت کی تشکیل کیسے ہوگی؟ اسلام نے قیامت تک کے حکمرانوں کی کوئی فہرست جاری نہیں کی جبکہ وحی کا دروازہ بند ہے، اس لیے کسی حکمران کی خدا کی طرف سے تقرری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے حکمران کے لیے شرائط و حدود اور اوصاف و اہلیت کا معیار بتایا ہے اور ان تمام امور کے ساتھ حکمران کے تعین اور حکومت کی عملی تشکیل کا راستہ کھلا رکھا ہے۔ اس کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ کے اولین تعامل کو مثال و معیار بنانا زیادہ بہتر ہوگا جنہوں نے عمومی رائے کے ساتھ اپنے میں سے بہترین شخصیت حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفہ چن لیا۔ اور جناب رسول اللہؐ نے بھی اچھے اور برے حکمران کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے یہی ارشاد فرمایا ہے:

”تمہارے اچھے حکمران وہ ہیں جو تم سے محبت کریں تم ان سے محبت کرو، وہ تمہارے لیے رحمت کی دعا کریں تم ان کے لیے رحمت کی دعا کرو، اور تمہارے برے حکمران وہ ہیں جو تم سے بغض رکھیں تم ان سے بغض رکھو، وہ تم پر لعنت بھیجیں تم ان پر لعنت بھیجو۔“ (مسلم شریف)

گویا اچھے اور صحیح حکمران کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی رعایا اور اس کے درمیان محبت و اعتماد کا تعلق ہو بغض و نفرت کا نہ ہو۔ اور اس محبت و اعتماد کے اظہار کے لیے کسی زمانہ میں جو بھی طریق کار اس دور کے تقاضوں کے مطابق ضروری ہوگا اسے بہرحال اپنانا پڑے گا۔ اس لیے حکومت اور اقتدار کو احکام الٰہی کے دائرہ میں پابند رکھتے ہوئے حکومت کی تشکیل میں عوام کی محبت و اعتماد حاصل کرنے اور انہیں تشکیل حکومت میں شریک کرنے کے لیے جو بھی قابل عمل طریقہ اختیار کیا جا سکے اسلام اس کی نفی نہیں کرتا۔ اور آج کے دور میں انتخاب اور ووٹ کے طریق کار کو قبول کرنا اس لیے ضروری ہے کہ موجودہ حالات میں اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے عوام اور حکومت کے درمیان اعتماد کا اظہار ہو سکے۔

اس کے علاوہ جمہوریت کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھنا پڑے گا اور وہ ہے ایک اسلامی مملکت کے شہریوں کے بنیادی حقوق کی عملداری اور بحالی کا مسئلہ۔ اسلام اپنے ملک کے باشندوں کو جو بنیادی حقوق غیر مشروط طور پر دیتا ہے ان میں (۱) اظہار رائے کا حق (۲) حکومت پر تنقید اور معاملات حکومت میں مشاورت کا حق (۳) خوراک (۴) رہائش (۵) لباس (۶) تعلیم (۷) اور علاج وغیرہ کو اولین اہمیت حاصل ہے اور یہ حقوق تمام شہریوں کو کسی امتیاز کے بغیر حاصل ہیں۔ اب کوئی فرد یا طبقہ ملک کے باشندوں کو ان حقوق یا ان میں سے کسی حق سے طاقت کے بل پر محروم کرتا ہے تو ان حقوق کی بازیابی اور عملداری کی جدوجہد اور جمہور کو ان کے حقوق دلوانے کی ہر کوشش بلاشبہ اسلامی تعلیمات کے مطابق بلکہ اسلامی احکام کا تقاضہ ہے۔

الغرض عوام کی مطلق حاکمیت کی نفی کر کے خدا کی حاکمیت کے تابع رہتے ہوئے تشکیل حکومت میں عوام کی شرکت، حکمرانوں پر عوام کے اعتماد کے اظہار اور شہریوں کے بنیادی حقوق کی عملداری کے لیے اگر کوئی نظام وضع کیا جاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اسے اسلام کے علاوہ اور کوئی عنوان دینے کی ضرورت نہیں، لیکن اسے مغربی جمہوریت پر قیاس کر کے نہ تو اس کی مکمل نفی کی جا سکتی ہے اور نہ اسے اسلامی احکام و تعلیمات کے منافی قرار دیا جا سکتا ہے۔

سوال: نجی ملکیت معاشی مساوات میں خلل ڈالنے کا باعث ہے اور مساوات اسلامی نظام معاشرت میں بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا اسلام میں نجی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

جواب: بنیادی طور پر یہ تصور ہی اب غلط ثابت ہو گیا ہے کہ نجی ملکیت معاشی مساوات میں خلل ڈالنے کا باعث ہے۔ کیونکہ روس اور چین جیسے ممالک جو کمیونزم کے عالمی پرچارک ہیں اپنے اپنے ملک میں نجی ملکیت بحال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور اپنے اس تجربے کے مثبت اثرات کو محسوس کرتے ہوئے ان کا برملا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ اور اس طرح نجی ملکیت کی نفی کرنے والے اس عالمی فلسفہ اور نظام کو ہی ”ریورس گیئر“ لگ گیا ہے جو نجی ملکیت کو معاشی مساوات کے منافی قرار دے کر اس کی نفی پر اپنے اقتصادی نظام کی بنیاد رکھتا تھا۔

اسلام نظام فطرت ہے، وہ فرد اور اجتماعیت کی اہمیت کو یکساں طور پر تسلیم کر کے

ان کے مابین فطری اور قابل عمل توازن قائم کرتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی نفی کر کے معاشرہ کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اجتماعیت افراد سے عبارت ہے، اگر فرد کا وجود نہ ہو اور اس کی انفرادیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو اجتماعیت کیسے ہوگی؟ جبکہ اجتماعیت افراد کے مجموعے کا نام ہے، اگر اجتماعیت کی نفی کر دی جائے تو افراد ایک معاشرہ کی شکل کیسے اختیار کریں گے؟ اسلام ان دونوں حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے دونوں کے درمیان فطری توازن قائم کرتا ہے اور معاشرہ کے ہر فرد کے ہر اس حق کو تسلیم کرتا ہے جس کی زد اجتماعیت کے تقاضوں پر نہ پڑتی ہو۔

نجی ملکیت کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ اسلام نجی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، اس کا احترام کرتا ہے اور اس کی ترغیب دیتا ہے لیکن اسے اجتماعیت کے تقاضوں کا پابند بناتا ہے۔ اسلام فرد کی نجی ملکیت میں معاشرہ کے حقوق متعیّن کرتا ہے، ان حقوق کی ادائیگی کا نظام پیش کرتا ہے اور اجتماعیت کی نمائندہ ریاست اور حکومت کو ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ مملکت کے تمام شہریوں کے معاشی حقوق کی ضمانت دے۔ اسلام حقوق کی مساوات کا علمبردار ہے، ریاست کے وسائل پر اس کے تمام شہریوں کے یکساں حقوق کا اصول پیش کرتا ہے، خوراک، رہائش، لباس، علاج اور تعلیم کو ہر شہری کا بنیادی حق قرار دے کر ایک اسلامی حکومت کو ان حقوق کی فراہمی کا ضامن قرار دیتا ہے اور ہر مالدار کو پابند کرتا ہے کہ وہ اپنی ملکیت کا ایک متعیّن حصہ ان اجتماعی معاشی حقوق کی عملداری کے لیے ریاست کو فراہم کرے۔ اسلام ہر شہری کو حق دیتا ہے کہ وہ سر عام کھڑا ہو کر حاکم وقت سے اپنے حق کا تقاضہ کرے اور سربراہ مملکت کو اس احساس کا خوگر بناتا ہے کہ اگر کسی دریا کے کنارے پر ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے تو سربراہ مملکت خود کو اس کا ذمہ دار سمجھے۔

اس دائرہ میں اسلام نجی ملکیت کا قائل ہے اور اجتماعیت کے حقوق ادا کرتے ہوئے نجی ملکیت کو ہر فرد کا فطری حق قرار دیتا ہے جس کی نفی نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس فطری حق کی نفی کرنے والے اپنے اس موقف اور عمل پر عملاً قائم رہ سکے ہیں۔

سوال: زکوۃ مال کا تزکیہ بھی کرتی ہے اور صاحب مال کا بھی، قرآن و سنت کے حوالے سے واضح کریں۔

جواب: صاحب مال کے مال پر اجتماعیت اور معاشرہ کے مسلمہ حقوق ہیں، ان

حقوق کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور ان کا تعین بھی کرتا ہے، جبکہ حقوق وصول کرنے والوں کی عزت نفس کی پاسداری کے لیے اسلام اسے خدا کا حق قرار دیتا ہے۔ اب ایک شخص اگر اپنے مال میں سے خدا تعالی اور معاشرہ کا حق ادا نہیں کرتا تو اس کا مال اس کے اپنے حق اور دوسروں کے حقوق کے ساتھ مخلوط ہے، اور جب وہ تمام حقوق ادا کر دے گا تو اس کا مال اس کا اپنا ہو گا اور دوسروں کے حقوق سے پاک ہو جائے گا۔ مال کے تزکیہ کا یہی معنی ہے کہ اس کا مال اللہ تعالی اور بندوں کے حق سے پاک ہو گیا ہے۔

صاحب مال کے ذہن میں یہ تصور ہر وقت اجاگر رہے گا کہ یہ مال اللہ تعالی کا عطا کردہ ہے اور اس میں سے اللہ رب العزت کے حقوق کے حوالے سے معاشرہ کے حقوق اس کے ذمہ ہیں۔ اور یہ احساس اس میں خدا ترسی، جواب دہی اور حق کی ادائیگی کے اوصاف پیدا کر دے گا۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ ان کے مال سے صدقہ وصول کریں تاکہ آپ ان کو پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں۔" (التوبہ)

دوسرے مقام پر متقی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وہ اپنے مال کو خرچ کر کے پاکیزگی حاصل کرتا ہے۔"

ام المؤمنین سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ جس "کنز" کی قرآن کریم میں مذمت کی گئی ہے وہ کونسا ہے؟ تو جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

"جب تم اپنے مال کی زکوۃ ادا کر دو تو وہ کنز نہیں رہتا۔" (ابوداؤد)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں:

"زکوۃ لوگوں کے مال کو پاک کرنے کے لیے فرض کی گئی ہے۔" (بخاری)

سوال: حدیث نبویؐ بھی وحی کی ایک قسم ہے، بحث کیجئے۔

جواب: جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی بنیادی طور پر تین قسم کی ہے:

1. پہلی قسم کلام الہی ہے جو قرآن کریم کی صورت میں نازل ہوئی۔ یہ خالصتاً باری تعالی کا کلام ہے اور اسی شکل میں نازل ہو کر اب تک محفوظ

ہے۔

2. دوسری قسم ان احکام پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کے علاوہ اللہ تعالی نے مختلف معاملات میں جناب رسول اللہؐ پر نازل فرمائے اور آنحضرتؐ نے انہیں اپنے الفاظ میں بیان فرما دیا۔

3. اور تیسری قسم ان احکام اور فیصلوں کی صورت میں ہے جو متعدّد معاملات و امور میں جناب نبی اکرمؐ نے از خود ارشاد فرمائے اور وحی جاری ہونے کے باوجود ان پر کوئی روک ٹوک نہ کر کے اللہ تعالی کی طرف سے عملاً ان کی تصدیق فرما دی گئی۔ اسے وحی حکمی کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں متعدّد ایسے امور کا ذکر ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فیصلہ فرما دیا لیکن اللہ تبارک و تعالی نے اس پر ٹوک دیا کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ قرآن کریم کا یہ طرز اس بات پر دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کے وہ تمام فیصلے اور احکام جن پر قرآن کریم میں یا وحی کے دیگر طریقوں میں کوئی ٹوک نہیں ہوئی، عملاً اللہ تعالی کی طرف سے تصدیق شدہ ہیں۔ اگر یہ فیصلے مصدقہ نہ ہوتے یا درست نہ ہوتے تو اللہ تعالی کی طرف سے ان پر ٹوک دیا جاتا جیسا کہ بعض امور میں ایسا ہوا بھی ہے۔ اسی کا نام ''وحی حکمی'' ہے اور وحی کی یہ تینوں صورتیں حجت ہیں۔

سوال: اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا تھا، تو اب اسے کھولنا ضروری ہے، بحث کیجئے۔

جواب: اجتہاد کا دروازہ کسی دور میں بند نہیں ہوا۔ صرف اتنی بات ہے کہ جن اجتہادی امور پر خیر القرون میں اجتہاد ہو چکا ہے اور ان کے اسباب و محرکات اور وجوہ و علل بھی جوں کے توں ہیں، ان میں خیر القرون کے اجتہاد کو ہی بنیاد بنانا ضروری ہے۔ ورنہ اگر اجتہاد علی الاجتہاد کا دروازہ اسی طرح کھلا چھوڑ دیا گیا تو اس سے فقہی انارکی پیدا ہو گی اور اجتہادات کو کسی دائرہ اور ضابطہ کا پابند نہیں رکھا جا سکے گا۔

باقی رہے وہ معاملات جن پر اجتہاد کی ضرورت ہے، یا خیر القرون کے وہ اجتہادات جن کے اسباب و علل حالات کے تغیر کی وجہ سے تبدیل ہو چکے ہیں، ان میں اجتہاد کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ البتہ اجتہاد حق ہے اہل اجتہاد کا، ہر کس و ناکس کا نہیں۔ جو حضرات قرآن و حدیث اور دیگر متعلقہ علوم پر اس قدر عبور رکھتے ہیں جو اجتہاد کے لیے ضروری ہیں، ان کے اجتہاد کا حق مسلم ہے اور اس اجتہاد کے

موجود و نافذ ہونے میں بھی کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

محنت کش اور اسلامی نظام

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۱ اپریل ۱۹۸۳ء)

محنت انسانی عظمت کا ایک ایسا عنوان اور اجتماعیت کا ایک ایسا محور ہے جس کے گرد انسانی معاشرہ کی چکی گھومتی ہے اور جس کے بغیر نوع انسانی کی معاشرت اور اجتماعیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کے خالق و مالک نے انسانی معاشرہ کے لیے جو فطری نظام زندگی نازل فرمایا اس میں محنت کی عظمت کا نہ صرف اعتراف کیا گیا ہے بلکہ دین خداوندی کو پیش کرنے والے عظیم المرتبت انبیاء علیہم السلام کو "محنت کشوں" کی صف میں کھڑا کر کے خداوند عالم نے محنت کو پیغمبری وصف کا درجہ عطا فرمایا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق:

- آدم علیہ السلام نے کاشت کاری کی، سوت کاتا۔
- نوح علیہ السلام نے لکڑی کا کام کیا اور اپنی محنت سے کھاتے تھے۔
- ادریس علیہ السلام درزی تھے۔
- شیث علیہ السلام سوت کاتتے تھے۔
- داؤد علیہ السلام بادشاہ ہونے کے باوجود لوہے کی زرہیں بناتے اور ان کی کمائی کھاتے تھے۔

خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کو اپنا شعار بنایا، بیت اللہ کی تعمیر نو، مسجد کی نبویؐ کی تعمیر اور مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے خندق کھودتے وقت آپؐ نے "محنت کش" کا جو عظیم کردار دنیا کے سامنے پیش کیا وہ محنت کشوں کے لیے مشعل راہ ہے:

- حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ ہم غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھود رہے تھے کہ ایک سخت چٹان آڑے آگئی۔ آنحضرتؐ کو صورتحال سے آگاہ کیا گیا تو آپؐ اس حالت میں کہ تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا اور بھوک کی شدت کے باعث پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا، تشریف لائے، کدال اٹھائی اور چٹان کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ (بخاری ص ۸۸ ج ۲)

• حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ خندق کی کھدائی کے موقع پر اپنے ہاتھوں سے مٹی اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتے تھے۔ (بخاری ص ۵۸۹ ج ۲)

• صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اکثر محنت کش تھے۔ بخاری ص ۲۷۸ ج ۱ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ابوداؤد ص ۵۱ ج ۱ میں حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ "عمال انفسہم" (اپنے کام کاج خود کرنے والے) محنت کش تھے اور موٹا جھوٹا پہنتے تھے جس کی وجہ سے جمعہ کے اجتماع کے موقع پر ان کے پسینہ کی بو پھیلتی تھی۔ اسی بنا پر آنحضرتؐ نے جمعہ کے دن غسل کا حکم دیا۔

• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "محنت کش" کی کمائی کو سب سے اچھی کمائی قرار دیا۔ بخاری ص ۲۷۸ ج ۲ میں حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اس سے اچھی کمائی کوئی نہیں کہ انسان اپنے ہاتھ کی محنت سے کھائے۔

اس کے ساتھ ہی جناب رسول اللہؐ نے محنت کشوں کو معاشرہ میں ان کا صحیح مقام دلانے کے لیے جو ہدایات فرمائیں اور قرآن وحدیث میں محنت کشوں کے معاشرتی مقام کا جو نقشہ کھینچا دنیا کا کوئی نظام بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل محنت کشوں، غلاموں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو معاشرہ میں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، نام نہاد بڑے لوگ ان کے ساتھ بیٹھنا توہین سمجھتے تھے اور انہیں وہ حقوق حاصل نہ تھے جو انسانی معاشرہ میں حاصل ہونے چاہئیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کو ان کے صحیح مقام و مرتبہ سے سرفراز فرمایا۔ محنت کشوں سے "وڈیروں" کی نفرت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں جناب نبی اکرمؐ کی مجلس میں حضرت بلالؓ، حضرت خبابؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت زیدؓ جیسے حضرات بھی تھے۔ اتنے میں چند کافر سردار آئے کہ ہم آپ کی بات سننا چاہتے ہیں اور شاید سمجھ کر مان بھی لیں لیکن "ضعفاء" کے ساتھ بیٹھنا ہماری توہین ہے، آپ ہمیں الگ مجلس میں اپنی بات سمجھائیں۔ سرداروں اور وڈیروں کی یہ فرمائش اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان الفاظ کے ساتھ رد فرمائی ہے کہ:

"اے حبیبؐ! (ان کافروں وڈیروں کی وجہ سے) ان لوگوں کو دور نہ ہٹائیں جو صبح شام اپنے رب کو اس کی رضا کے لیے یاد کرتے ہیں، نہ ان کے حساب کی آپ پر

ذمہ داری ہے اور نہ آپ کے حساب کی ان پر ذمہ داری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ان کو (اپنی مجلس سے) ہٹا دیں تو آپ کا شمار نا انصافوں میں ہو جائے"۔ (سورہ الانعام)

نبی اکرم صلی الہ علیہ وسلم نے غلاموں کے بارے میں، جو محنت کشوں کا سب سے نچلا درجہ اور کمزور طبقہ شمار ہوتا تھا، حسن سلوک کی بار بار نصیحت فرمائی، حتیٰ کہ آپ کی آخری وصیت (الصلاۃ وماملکت ایمانکم) بھی نماز کی پابندی اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی دو ہدایات پر مشتمل تھی۔ آپؐ نے غلاموں کو معاشرہ میں معیار زندگی کے لحاظ سے دوسرے لوگوں کے مساوی درجہ عطا فرمایا اور واضح طور پر ہدایت فرمائی کہ:

"یہ غلام تمہارے ہی بھائی اور ساتھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس تم میں سے کسی شخص کے تحت اس کا بھائی ہو تو اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور ایسا کوئی کام اس کے ذمہ نہ لگائے جو اس کے بس سے باہر ہو۔" (بخاری ص ۹ ج ۱)

جناب رسول اللہؐ کے اس واضح ارشاد سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے کہ جب مالک اور اس کے خرید کردہ غلام کے درمیان معیار زندگی کی برابری اسلامی نظام کا بنیادی تقاضا ہے تو آج کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان بھی معیار زندگی کی برابری قائم کر کے ہی اسلامی نظام کو صحیح طور پر روبہ عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ کے اس ارشاد پر صحابہ کرامؓ نے انفرادی اور اجتماعی طور پر جس طرح عمل کیا اور خلافت راشدہ کی صورت میں اسلامی نظام کا جو مثالی معاشرہ دنیا کے سامنے پیش کیا، دنیا کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

انفرادی طور پر:

- حضرت عثمانؓ اپنے غلاموں کو خود اپنے معیار کا کھانا اور لباس مہیا فرماتے۔
- حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اپنی لڑکیوں اور لونڈیوں کو ایک جیسا زیور پہناتے۔
- حضرت ابوذر غفاریؓ اپنا اور اپنے غلام کا لباس ایک ہی کپڑے سے سلواتے۔

اور اجتماعی طور پر:

• اس معاشرہ میں جہاں بڑے اور چھوٹے طبقوں کی واضح تقسیم موجود تھی، اسلام نے خلافت راشدہ کی صورت میں ایسے معاشرہ کی بنیاد ڈالی جس میں بڑے چھوٹے اور متوسط طبقوں کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔ معاشرہ میں امیر المؤمنین، صوبوں کے گورنر اور عمال کا طبقہ بھی موجود تھا اور اس حکمران طبقہ کا معیار زندگی وہی تھا جو ایک عام آدمی کا تھا۔

• حضرت ابوبکرؓ کے لیے بیت المال سے وظیفہ کے تعین کے لیے مشورہ ہو رہا تھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آپ کی اور آپ کے اہل و عیال کی ضروریات کو معروف طریقہ سے (عام آدمی کی طرح) پورا کرنے کے لیے جتنا وظیفہ ضروری ہو وہی آپ کا ہے۔ اصحاب شوریٰ نے حضرت علیؓ کے قول کو پسند کیا اور اسی پر فیصلہ ہو گیا (طبری ص ۱۶۴ ج ۴)۔ جبکہ حضرت عمرؓ نے بھی اپنا اور اپنے گورنروں اور عمال کا وظیفہ عام آدمی کے گزارے کے مطابق مقرر فرمایا۔

• معاشرہ میں حضرت عبد الرحمان بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عثمان جیسے مالدار تاجر بھی تھے مگر ان کا رہن سہن اور کھانا پینا معاشرہ کے عام آدمی کی طرح تھا۔ اور ان کی دولت ذاتی تعیش اور نمود پر صرف ہونے کی بجائے غرباء اور معاشرہ کی فلاح و بہبود میں صرف ہوتی تھی۔

الغرض آج جس طرح معاشرہ بڑے طبقے، متوسط طبقے اور چھوٹے طبقے میں تقسیم ہو چکا ہے اور اصحاب ثروت نے دولت کے اظہار و تعیش کے لیے ہر شہر میں اپنے الگ الگ محلے بسا لیے ہیں، خلافت راشدہ کے دور میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ اسلام نے پہلے سے موجود طبقاتی تقسیم کو ختم کر کے خلافت راشدہ کی صورت میں ایک خالصتاً غیر طبقاتی معاشرہ پیش کیا۔ اور یہاں اس حقیقت کا اظہار شاید بے محل نہ ہو کہ آج کمیونزم کے جس خطرات کا اظہار کیا جا رہا ہے اس کی بنیادی وجہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم ہی ہے جس کے نتیجہ میں ایک طرف دولت سے کھیلنے والوں اور بات بات پر دولت کی نمائش کرنے والوں کا طبقہ بلند و بالا محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے اور دوسری طرف اسی معاشرہ میں آبادی کی اکثریت روزمرہ ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ کمیونزم ہمیشہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم سے جنم لیتا ہے اس لیے کمیونزم کا راستہ بھی صرف اسی صورت میں روکا جا سکتا ہے کہ معاشرہ میں معیار زندگی کی برابری کا اصول اپنا کر خلافت راشدہ کی طرز پر غیر

طبقاتی معاشرہ کی تشکیل کے لیے اجتماعی اور ہمہ گیر جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ ورنہ کمیونزم کا راستہ صرف نعروں اور جذباتی تقریروں سے نہیں روکا جاسکے گا۔

ہمارا آج کا موجودہ اقتصادی و معاشی نظام نوآبادیاتی دور کی یادگار ہے، اسلام کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس نظام کو تبدیل کر کے محنت کشوں کو معاشرہ میں دوسرے طبقوں کے برابر معیار زندگی کی سہولتیں فراہم کی جائیں اور حق ملکیت میں مساوات کا وہ واضح اور اٹل اصول اپنایا جائے جو اسلامی نظام کی اصل روح ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں حق ملکیت میں مساوات کے اصول کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اسلام معاشرہ کے مختلف طبقات اور افراد کے درمیان مساوات کا کیا اصول قائم کرتا ہے۔

اسلام نے فرد کی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور اسے یہ بھی اجازت دی ہے کہ وہ جائز اور حلال ذرائع سے اپنی ملکیت اور دولت میں جس قدر چاہے اضافہ کر لے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام یہ پابندی بھی لگاتا ہے کہ:

- دولت کی اجتماعی گردش صرف سرمایہ داروں میں محدود نہ رہے بلکہ معاشرہ کے تمام طبقے اس سے فیض یاب ہوں۔ ”لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم“ (سورۃ الحشر)
- دولت کی ایسی نمائش اور عیش و عشرت کے ایسے مواقع جن سے محروم طبقے مایوسی کا شکار ہوں یا ان میں مسابقت اور معیار زندگی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ناجائز ذرائع کو اختیار کرنے کی سوچ پیدا کر دے، قانوناً ممنوع قرار دیے جائیں۔
- معیار زندگی مثلاً خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ معاملات میں معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان یکسانیت کا اصول کارفرما رہے اور اگر اس مقصد کے لیے کسی قانونی قدغن کی ضرورت ہو تو اس سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ شہر کی تعمیر کے وقت پابندی لگا دی تھی کہ کوئی شخص تین کمروں سے زائد مکان نہ بنائے اور یہ بھی ہدایت فرما دی تھی کہ مکانوں کو بلند کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ نہ کرو۔“ (بحوالہ اسوۂ صحابہؓ ص ۲۶۵ ج ۱)

• دولت اور اس کے جو ذرائع حکومت کی طرف سے تقسیم کیے جائیں ان میں بالکل برابری اور مساوات کا اصول اپنایا جائے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے بیان فرمایا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے خلیفہ بننے کے بعد جب بحرین وغیرہ سے مال آیا تو آپؓ نے اسے مدینہ کے شہریوں میں برابر تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ حضرت لوگوں میں کچھ فضیلت اور مرتبہ والے بھی ہیں لیکن آپؓ نے سب کو برابر حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ جہاں تک فضیلت اور درجہ کا تعلق ہے اس کا ثواب اللہ تعالیٰ دیں گے۔ ''وھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرہ'' (کتاب الخراج ص ۵۰) اور یہ معیشت ہے اس میں برابری اور مساوات کا اصول ترجیح سے بہتر ہے۔

• اور جیسا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دولت کی مساوی تقسیم کو ہی اسلامی معیشت کا صحیح اصول قرار دیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے امام مہدیؑ کے ظہور کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب امام مہدیؑ آئیں گے تو زمین ظلم و جور سے پر ہوگی اور امام مہدیؑ ظلم و جبر کا خاتمہ کر کے دنیا بھر میں عدل و انصاف کو غالب کر دیں گے۔ پھر فرمایا ''و یقسم المال صحاحا قال لہ رجل ما صحاحا قال بالسویۃ بین الناس، رواہ احمد و ابو یعلی و رجالہما ثقات'' (مجمع الزوائد ص ۳۱۴ ج ۷) کہ امام مہدیؑ لوگوں میں صحیح طریقہ سے تقسیم کریں گے، ایک شخص نے پوچھا کہ صحیح طریقہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں میں برابری اور مساوات کی بنیاد پر۔

الغرض اسلام نے جائز ذرائع سے دولت کمانے کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ معیار زندگی کی برابری اور قومی سطح پر دولت اور اس کے ذرائع کی تقسیم میں مساوات کو اصول قرار دیا ہے۔ اور مساوات کے اس اصول کو قائم کرنے کے لیے بوقت ضرورت اصحاب ثروت سے ان کا زائد مال حاصل کر کے دوسرے لوگوں میں تقسیم کرنے کا تصور بھی موجود ہے، جیسا کہ:

• حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراحؓ نے ایک سفر کے دوران جب آپؓ کے ہمراہ تین سو صحابہؓ تھے، زادِ راہ ختم ہونے پر سب لوگوں کے زادِ راہ ان سے حاصل کر

لیے اور برابری کی بنیاد پر اس میں سے ان کو خوراک دیتے رہے۔ (محلی ص ۱۵۸ ج ۶)

• اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ جو بات میں نے اب محسوس کی ہے اگر اسے پہلے محسوس کر لیتا تو مالداروں کے زائد اموال ان سے چھین کر مہاجر فقراء میں تقسیم کر دیتا۔ (محلی ص ۱۵۸ ج ۶)

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر معاشرہ کسی وقت اس نوعیت کی صورت حال سے دوچار ہو جائے تو معیار زندگی میں برابری اور دولت و ذرائع دولت کی تقسیم میں مساوات کے اصول کو دائرہ عمل میں لانے کے لیے اصحاب ثروت کے زائد اموال کو ضبط کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت اور محنت کش کی عظمت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ معاشرہ میں محنت کشوں کو تمام طبقوں کے برابر معیار زندگی کی ضمانت دی، اور دولت کے قومی ذرائع سے ہر شہری کے برابر مستفیذ ہونے کے حق کو اصول قرار دیا۔ یہ انسانی معاشرت کے ایسے فطری اور محکم اصول ہیں جن سے بہتر اصول اور کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا۔

آخر میں ہم اپنی گزارشات کا اختتام امیر المومنین حضرت علیؓ کے اس ارشاد گرامی پر کرنا چاہتے ہیں کہ:

> ”اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے مالوں میں فقراء کا اتنا حق رکھا ہے جس سے ان کی ضروریات کی کفایت ہو سکے۔ پس اگر فقراء بھوکے رہیں یا ننگے ہوں یا اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مشقت کا شکار ہوں تو یہ اغنیاء کی بے پرواہی اور ان کی طرف سے فقراء کے حقوق میں کوتاہی کے باعث ہوگا۔ اور ایسے اغنیاء اللہ تعالیٰ سے محاسبہ اور عذاب کے مستحق ہیں۔“ (المحلی لابن حزم ص ۱۵۶ ج ۱)

۱۹۸۲ء

قرآن کریم کی بے حرمتی کا افسوسناک واقعہ — قادیانی اور آئین

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۵ مارچ ۱۹۸۲ء)

گزشتہ دنوں سرکاری ذرائع سے یہ خبر قومی اخبارات میں شائع ہوئی ہے کہ تخریب کاروں کے خلاف پولیس کی مہم کے دوران قرآن کریم کی بے حرمتی کا یہ افسوسناک سانحہ سامنے آیا ہے کہ کچھ بدبخت عناصر نے قرآن کریم کے نسخوں کو اندر سے کاٹ کر ان میں بارود بھرا اور پھر ان نسخوں کو بعض اہم شخصیات کو پیش کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس ضمن میں اخبارات اور ٹیلی ویژن کے ذریعے قرآن کریم کے کٹے ہوئے نسخے کی نمائش بھی کی گئی ہے اور ملک کے طول و عرض میں اس المناک واقعہ پر احتجاج اور غم و غصہ کے اظہار کا سلسلہ جاری ہے۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جسے اللہ رب العزت نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انسانیت کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے نازل فرمایا اور قیامت تک کے لیے یہی نسخۂ کیمیا انسانیت کے تمام دکھوں اور مشکلات و مصائب کا واحد علاج ہے۔ اس عظیم اور آخری آسمانی کتاب کے ساتھ ملت اسلامیہ کی عقیدت اور جذباتی وابستگی کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں اور اسی عقیدت کا اظہار ملک کے مختلف حصوں میں ہڑتالوں، جلوسوں اور احتجاجی اجتماعات کی شکل میں ہو رہا ہے۔ ہم اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ کوئی مسلمان اپنے گروہی مقاصد کے لیے قرآن مقدس کی توہین جیسے سنگین جرم کا بھی ارتکاب کر سکتا ہے لیکن قران کریم کا کٹا پھٹا نسخہ بتاتا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب ہوا ہے اور

نام نہاد مسلمانوں کی بدبختی اور شقاوت قلبی اس سرحد کو بھی عبور کر چکی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ قرآن مقدس کی بے حرمتی اور توہین کی یہ مذموم حرکت فی الوقع تخریب کاروں کی کاروائی ہے یا بعض حلقوں کے مطابق یہ واردات تخریب کاروں کے گرد حصار تنگ کرنے کے لیے ہوئی ہے، اور قرآن کریم کے زخمی نسخے کی تصویریں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اللہ تعالی کی اس آخری کتاب پر چاقو چلا ہے اور اس کا سینہ چاک ہوا ہے۔ کرنے والا کوئی بھی ہو اس کی بدبختی اور شقاوت قلبی میں کوئی شک نہیں، ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس المناک سانحہ کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے، اس سنگین اور مذموم حرکت کے مرتکب افراد اور اس کے پس پردہ عوامل و محرکات کو بے نقاب کیا جائے اور مجرموں کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ آئندہ کسی کو اس قسم کی حرکت کے بارے میں سوچنے کی بھی جرأت نہ ہو۔

قادیانی اور آئین

ملک کے ممتاز قانون دان مسٹر یحیی بختیار نے یہ کہہ کر پورے ملک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین سے قادیانیوں کے بارے میں شقوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۷۳ء کا آئین بحال ہوگا تو اس میں یہ شقیں موجود نہیں ہوں گی۔ اس کے جواب میں حکومت کی طرف سے جو وضاحتیں جاری ہوئی ہیں وہ سب عبوری آئین کے حوالہ سے ہیں مگر ۱۹۷۳ء کے آئین میں قادیانیوں کے بارے میں شقوں کی موجودگی یا حذف ہوجانے کے بارے میں سرکاری حلقے مکمل طور پر خاموش ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ یہ دینی مسئلہ ہے، اس سے کروڑوں مسلمانوں کی دینی حمیت و غیرت وابستہ ہے اور یہ مسئلہ سیاست کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے دین و ایمان کا ہے۔

اس لیے ہم حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ وہ اس سلسلہ میں قومی و دینی حلقوں کو مطمئن کرے۔ اور ہم دینی و قومی حلقوں سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ اس نازک مسئلہ پر مشترکہ لائحہ عمل اختیار کر کے قادیانیوں کے بارے میں پوری قوم کے متفقہ فیصلہ کے تحفظ کا اہتمام کریں۔

۱۹۷۹ء

انسانی اجتماعیت کے جدید تقاضے اور اسلام کا عادلانہ نظام

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۲۱ دسمبر ۱۹۷۹ء)

لاہور ہائی کورٹ کے شریعت بینچ میں ریٹائرڈ جسٹس جناب بدیع الزمان کیکاؤس کی طرف سے انتخاب و سیاست کے مروجہ قوانین کو چیلنج کیے جانے کے بعد سے علمی و فکری حلقوں میں اس بحث نے سنجیدگی اور شدت اختیار کرلی ہے کہ آج کے دور میں اسلام کے نظام عدل و انصاف کو نافذ کرنے کے لیے عملی اقدامات اور ترجیحات کی کیا صورت ہوگی؟ اور موجودہ دور نے انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے جن تقاضوں اور ضروریات کو جنم دیا ہے اسلام کا دائرۂ توسعات انہیں کس حد تک اپنے اندر سمونے کے لیے تیار ہے؟

دراصل ملت اسلامیہ کے بیشتر ممالک پر استعماری ممالک کے قبضہ اور ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک اس کے تسلسل کے باعث ملت اسلامیہ میں سیاسی قیادت کا جو خلا پیدا ہوا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ استعماری قوتوں نے ملت اسلامیہ کی نظریاتی، سیاسی اور تہذیبی یکجہتی کے خلاف جو تکنیکی اور نفسیاتی جنگ لڑی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ موجودہ دور کے عملی تقاضوں اور اسلامی نظام کے آئیڈیل اور مثالی خاکے کے درمیان مطابقت کی زنجیروں پر بے یقینی اور شکوک کی دھند چھائی ہوئی ہے۔ ورنہ اگر ملت اسلامیہ کی سیاسی قیادت کو کسی خلا اور وقفہ کے بغیر مسلسل آگے بڑھنے کا موقع ملتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ انسانی اجتماعیت کے جدید تقاضوں اور اسلامی نظام پر ملت اسلامیہ کے اجتماعی تعامل کے درمیان مطابقت کی راہیں خود بخود ہموار نہ ہوتی چلی جاتیں۔ مگر آج کی صورتحال یہ ہے کہ مسلم

ممالک میں اسلامی نظام کے احیاء و نفاذ کی مؤثر اور نتیجہ خیز تحریکات کے باوجود بہت سے ایسے مسائل درپیش ہیں جن کے بارے میں کسی واضح موقف کا تعین اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اولین شرط کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ صورتحال بلاشبہ ارباب علم و اجتہاد کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے مطالعہ کی روشنی میں ان امور پر کچھ معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اصحاب علم و دانش ان پر سنجیدہ توجہ دیں گے اور یہ گزارشات اس موضوع پر بحث کو آگے بڑھانے میں مدد دیں گی۔

غور و فکر کے بنیادی امور

اسلامی نظام اور موجودہ دور کے تقاضوں اور ضروریات کے مختلف پہلوؤں پر ایک نظر ڈالی جائے تو غور و فکر کے لیے مندرجہ ذیل بنیادی امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ اسلامی نظام کی نوعیت

۲۔ قانون سازی کا طریق کار

۳۔ حکومت کی تشکیل میں عوام کی نمائندگی

۴۔ سربراہ مملکت کے لیے اہلیت کا معیار

۵۔ سیاسی جماعتوں کا وجود اور ان کی حیثیت

۶۔ امیدواری کا مسئلہ

۷۔ عورت کی رائے

ان امور پر غور و خوض سے قبل بنیادی طور پر اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلام کے عدل و انصاف کا اصل خاکہ وہ ہے جو آئیڈیل اور مثالی ہے اور جس کی عملی تصویر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء راشدین کا دور حکومت ہے۔ نبوت کے دس سالہ مدنی دور اور خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور پر مشتمل اسلامی حکومت کا یہ چالیس سالہ عرصہ ہی دراصل مکمل ترین اسلامی نظام اور اسلام کے عدل و انصاف کی اصل منزل ہے اور اسلامی نظام کے احیاء کی تحریکات کا رخ بھی اسی منزل کی طرف ہے۔ لیکن اس حقیقی منزل کی طرف سفر کے آغاز کے لیے ہمیں بین الاقوامی حالات، اقوام عالم کی باہمی کشمکش اور ملت اسلامیہ کی قوت ہاضمہ کا اندازہ کرتے ہوئے اسلامی نظام کے ”کم سے کم

خاکہ'' کا تعین کرنا ہوگا۔ اور اس مقصد کے لیے قرآن و سنت کے طے کردہ اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ہم انہی توسعات کا دامن تھامنے پر مجبور ہوں گے جن توسعات کے سہارے بنوامیہ، بنوعباس اور بنوعثمان کے ادوار خلافت میں فقہاء امت نے ضرورت اور اجتماعی مصلحت کے نظریہ کے تحت خلافت راشدہ سے کہیں کم معیار پر اسلامی نظام کے ساتھ گزارہ کرنے کی اجتماعی روش اختیار کرلی تھی۔

تاہم اس امر کی ضرور کوشش کی جائے گی کہ توسعات کا یہ سلسلہ قرآن کریم، سنت نبوی علی صاحبہا التحیۃ والسلام، خلافت راشدہ اور تعامل صحابہؓ کے دائرہ سے نہ نکلنے پائے اور ہم اسلام کے ان چار بنیادی مآخذ کے دائرہ میں اپنے لیے راہ عمل متعیّن کر کے اسلامی نظام کے نفاذ کا عملی آغاز کر سکیں۔

ا۔ اسلامی نظام کی نوعیت

اسلام نے حکمرانی کا جو تصور دیا ہے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ کائنات کا اصل حکمران اللہ تعالی ہے اور اللہ رب العزت نے بنی نوع انسان کی ہدایت، راہنمائی اور قیادت کے لیے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کو مبعوث فرمایا۔ چنانچہ ان پاک نفوس نے نہ صرف انسانیت کو اللہ تعالی کے راستہ کی طرف بلایا بلکہ انسان کے اجتماعی و سیاسی معاملات میں بھی اس کی قیادت و راہنمائی فرمائی۔ جیسا کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے ''الجامع الصحیح'' میں حضرت ابوہریرہؓ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ

> ''بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت ان کے پیغمبرؑ کرتے تھے، ایک پیغمبر دنیا سے تشریف لے جاتے تو ان کی جگہ دوسرے پیغمبر آجاتے، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، البتہ خلفاء ہوں گے۔''

گویا اللہ تعالی نے انسانیت کی مذہبی اور سیاسی قیادت کو انبیاء کرام علیہم السلام کی شخصیات میں جمع کر دیا اور چونکہ جناب نبی اکرمؐ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا تھا اس لیے آپؐ کے بعد یہ ذمہ داری خلفاء کے سپرد کر دی گئی تاکہ وہ مذہبی، سیاسی اور عسکری امور میں جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کی قیادت کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ اسی لیے اسلام کے سیاسی نظام کو ''خلافت'' کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ابن

خلدونؒ نے تاریخ ص ۳۳۹ ج ۱ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء ص ۲۸ میں خلافت کی تعریف اس طور پر کی ہے کہ

> ”خلافت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کرتے ہوئے ملت اسلامیہ میں اسلامی احکام و قوانین کی عملداری، انتظامی، عسکری اور سیاسی امور کی انجام دہی کا نام ہے۔“

خلافت کے اس تصور کے ساتھ جو شخص بھی برسراقتدار آئے اسے خلیفہ، امام یا امیر کسی بھی نام سے پکارا جاسکتا ہے اور وہ قرآن و سنت کے دائرہ میں چلنے کا پابند ہے۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلام نے سربراہ مملکت کو اسلامی احکام و قوانین کا پابند بنانے کے بعد خلافت کی اصطلاح پر زیادہ اصرار نہیں کیا اور نہ ہی باقی تفصیلات کو چھیڑا ہے۔ بلکہ ایک اصول طے کر لینے کے بعد تفصیلات اور جزئیات میں ملت اسلامیہ کو پیش آمدہ حالات کے مطابق کوئی سی راہ اختیار کر لینے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ اسلام کو اصطلاحات سے نہیں بلکہ اسلامی اصول و احکام کی پابندی سے غرض ہے اور جب حکمران کے لیے یہ طے ہو گیا کہ وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے اور حکمرانی میں انہی کی ہدایات و احکام کا پابند ہے تو اسے کسی بھی نام سے پکارا جائے اور اس کے لیے باقی تفصیلات کچھ بھی طے کر لی جائیں، اسلام کو اس سے بحث نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ”ملوکیت“ اور ”بادشاہت“ بھی جو آج کی دنیا میں مبغوض ترین سیاسی اصطلاحات سمجھی جاتی ہیں، اسلام کے ہاں مطلقاً ناپسندیدہ نہیں ہیں اور اسلام نے ظالم و جابر بادشاہوں کے ظلم و جبر کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرنے کے باوجود ملوکیت کی اصطلاح کو اپنے لیے چڑ نہیں بنایا بلکہ خود قرآن کریم میں کم از کم چار بزرگ ہستیوں کا ملوکیت کے حوالے سے ذکر موجود ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام تو خود پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ تھے، حضرت یوسف علیہ السلام ایک بادشاہ کے وزیر بنے اور بنی اسرائیل کے لیے حضرت طالوتؑ کی بادشاہت کا خود اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا۔

اسی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد مقامات پر ملوکیت کی اصطلاح استعمال کی ہے جیسا کہ مجمع الزوائد ص ۱۹۰ ج ۵ میں حافظ ابن حجر المکیؒ نے طبرانیؒ کے حوالے سے سند صحیح کے ساتھ جو روایت نقل کی ہے اس میں جناب رسول اکرمؐ نے ”خلافت و رحمت“ اور ”امارۃ و رحمت“ کے ساتھ ”ملوکیت و رحمت“ کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسلام صرف حکمران کو جناب نبی اکرمؐ کا نائب اور ان کی ہدایات کا

پابند دیکھنا چاہتا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ خلیفہ کہلائے، امیر کہلائے یا بادشاہ۔ ابن خلدونؒ ص ۱۴۱ ج ۱ اور ابن تیمیہؒ کے مجموعہ فتاویٰ ص ۲۷ ج ۳۵ میں اس بحث کو تفصیل کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔

ائمہ اہل السنۃ والجماعۃ کا کم و بیش اجماعی قول ہے کہ خلافت کا قیام اور خلیفہ یا امیر کا انتخاب ملت اسلامیہ پر فرض اور واجب ہے جس سے کسی حالت میں مفر نہیں۔ چنانچہ ابن خلدونؒ ص ۳۳۹ ج ۱، الدر المختار ص ۵۳ ج ۱، شرح عقائد ص ۱۱۰، شرح نوویؒ علی مسلم ص ۱۲۴ ج ۲، مسامرہ ص ۲۹۶، اصول الدین التمیمیؒ ص ۲۷۱ اور الصواعق المحرقۃ ابن حجر المکیؒ ص ۷ میں خلافت کے وجوب اور فرضیت پر صحابہ کرامؓ اور ائمہ اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماع نقل کیا گیا ہے۔ اور الدر المختار اور شرح عقائد میں اس فرضیت اور وجوب کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خلافت کے قیام کو تمام واجبات سے اہم سمجھا حتیٰ کہ جناب نبی اکرمؐ کے دنیا سے پردہ پوش ہوجانے کے بعد صحابہ کرامؓ نے آپؐ کو روضۂ اطہر میں دفن کرنے سے بھی خلیفہ کے انتخاب کے کام کو مقدم کیا۔ اس سے خلافت کی فرضیت اور وجوب کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ اسلام میں:

1. مسلم حکومت دینی احکام و قوانین کے نفاذ اور سیاسی، انتظامی و عسکری امور کی انجام دہی میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نائب اور آپؐ کی ہدایات کی پابند ہے۔
2. ایسی حکومت کا قیام مسلمانوں پر شرعاً فرض ہے۔
3. اس نوعیت کی حکومت اور اس کے سربراہ کے لیے کوئی سی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔

۲۔ قانون سازی کا طریق کار

اسلام میں قانون سازی کی گنجائش اور اس کے طریق کار پر گفتگو عموماً خلط مبحث کا شکار ہوجاتی ہے اس لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ غور کی ضرورت ہے۔

اسلامی قوانین و احکام کا ایک حصہ وہ ہے جو قرآن و سنت، خلافت راشدہ اور اجماع امت کی صورت میں طے شدہ ہے، اس دائرہ میں کسی قسم کی قانون سازی یا ترمیم و تبدل کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن و سنت کی بات تو بالکل واضح ہے۔ اور خلافت راشدہ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین کی سنت کو اپنی سنت کے ساتھ ذکر کرکے اپنی اور

ان کی سنت کو مسلمانوں کے لیے یکساں واجب الاتباع قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد نبویؐ ہے کہ

"تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت اپنے داڑھوں کے ساتھ مضبوطی سے تھامے رکھو جہاں تک تمہارے بس میں ہو۔"

اسی طرح اجماع بھی قرآن و سنت کے بعد شریعت کی دلیلوں میں سے ایک محکم دلیل ہے اور اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ اجماع سے مراد یہ ہے کہ کسی ایسے مسئلہ پر جس میں قرآن کریم یا سنت نبویؐ کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو، کسی دور کے مجتہدین اگر اس میں ایک فیصلہ پر متفق ہو جائیں تو وہ بھی شرعی طور پر واجب الاتباع ہو جاتا ہے۔ امام شافعیؒ نے اجماع کے حجت ہونے پر قرآن کریم کی آیت کریمہ کے جملہ "ویتبع غیر سبیل المؤمنین" سے استدلال کیا ہے (بحوالہ مواہب الرحمان ص ۱۹۴ ج ۵)۔ یہاں امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے اس خط کا حوالہ بے محل نہ ہوگا جو انہوں نے قاضی شریحؒ کے نام لکھا اور اس میں قانون سازی سے متعلق بنیادی امور کی طرف ان الفاظ میں راہنمائی فرمائی کہ

"اگر آپ کے پاس کوئی معاملہ آئے تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس کا حل تلاش کر کے اس کے مطابق فیصلہ کریں، اگر وہاں نہ ملے تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں فیصلہ کریں، اگر سنت نبویؐ میں بھی کوئی بات نہ ملے تو صالحین اور ائمۂ عدل کے فیصلوں کو اپنے فیصلہ کی بنیاد بنائیں، اور اگر ان کا بھی کوئی فیصلہ نہ مل سکے تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کریں۔" (مفتاح الجنۃ للسیوطیؒ ص ۳۳)

اسی طرح امام نسائیؒ نے سنن نسائی ص ۳۰۵ ج ۲ اور امام حاکمؒ نے مستدرک ص ۹۴ ج ۴ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے جس میں انہوں نے قضا کی ذمہ داریوں اور نزاکتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے "راہنما اصول" کے طور پر یہ ہدایت فرمائی ہے کہ

"آج کے بعد اگر کسی شخص کو قاضی بنایا جائے تو وہ کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت سب سے پہلے کتاب اللہ کو دیکھے، اگر وہاں کوئی چیز نہ ملے تو سنت نبویؐ کے مطابق فیصلہ کرے، اگر سنت نبویؐ میں بھی واضح راہنمائی نہ ملے تو صالحین میں سے کسی کی پیروی کرے، اور اگر ان کا بھی کوئی فیصلہ نہ ملے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔" (مفتاح الجنۃ سیوطیؒ ص ۳۲)

گویا جناب نبی اکرمؐ، حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت امام شافعیؒ کے ان ارشادات کی روشنی میں کسی معاملے کو طے کرتے وقت ترجیحات کی ترتیب یوں ہوگی:

(۱) کتاب اللہ

(۲) سنت نبویؐ

(۳) خلفاء راشدین کے فیصلے

(۴) اجماع امت

(۵) صلحاء امت کے فیصلے

تو اب بات یوں واضح ہوئی کہ جن امور میں کتاب اللہ، سنت نبویؐ، خلافت راشدہ، اجماع امت اور صلحاء امت کا کوئی واضح فیصلہ سامنے آچکا ہے وہ طے شدہ امور ہیں، ان میں ترمیم و تبدل یا جدید اصطلاح میں قانون سازی کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن وہ امور جن کے بارے میں شرعی فیصلے کے یہ چاروں ذرائع خاموش ہیں "اجتہاد" یا "قانون سازی" کی اجازت ہے اور موجودہ حالات میں ان امور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

جن امور کا تعلق شرعی مسائل یا اصطلاحی معنوں میں اجتہادی امور سے ہے، ایسے امور کا فیصلہ بلاشبہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو قرآن و سنت اور دیگر اسلامی علوم کے ماہر اور اجتہادی صفات سے متّصف ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ایک "مجتہد" کے لیے پانچ علوم پر دسترس کو ضروری قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

> "آج کے دور میں مندرجہ ذیل پانچ علوم حاصل کیے بغیر کوئی شخص مجتہد نہیں ہو سکتا۔ (۱) قرآن کریم کا علم قرأت و تفسیر کے ساتھ۔ (۲) حدیث رسولؐ کا علم اسناد اور صحیح و ضعیف کی معرفت کے ساتھ۔ (۳) مختلف مسائل میں سلف صالحین کے اقوال کا علم تاکہ اجماع سے تجاوز نہ کرے اور دو قولوں میں اختلاف کی صورت میں تیسرا قول اختیار نہ کرے۔ (۴) عربی زبان اور اس کے متعلقہ امور کا علم۔ (۵) مسائل کے استنباط اور مختلف اقوال میں تطبیق کا علم۔" (ازالۃ الخفاء ص ۲۱)

اس لیے اجتہادی مسائل کا حل اجتہادی صفات سے متّصف افراد ہی کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ اور اجتہادی صفات سے متّصف افراد کے چناؤ میں مختلف مکاتب فکر یا مسالک کی نمائندگی کا اصول تو تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن عوام کی نمائندگی کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وہ روایت نقل کر دی جائے جو طبرانیؒ نے "المعجم الاوسط" میں سند صحیح کے ساتھ نقل کی ہے:

"حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے جس میں امر یا نہی کی صورت میں کوئی حکم موجود نہیں تو اس صورت میں آپ کا حکم کیا ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس معاملے میں فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو اور کسی ایک خاص رائے پر نہ چلو۔" (مجمع الزوائد ص ۱۷۸ ج ۱)

فقہاء اور عابدین سے مشورہ کا حکم اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ایسے معاملات طے کرنے والے افراد کا چناؤ "تفقہ" اور "نیکی" کی بنیاد پر کیا جائے گا نہ کہ نمائندگی کے اصول پر۔

۳۔ حکومت کی تشکیل میں عوام کی نمائندگی

البتہ ایسے امور اور معاملات جن کا تعلق اجتہادی مسائل سے نہیں بلکہ انتظامی امور اور عام لوگوں کے حقوق و مسائل سے ہے ان میں عام لوگوں اور ان کے نمائندوں کو مشوروں میں شریک کرنا اور ان مشوروں کو فیصلوں کی بنیاد بنانا جناب رسول اللہؐ کی سنت ہے۔ آنحضرتؐ نے ایسے معاملات میں عام افراد کو کسی تخصیص و تحدید کے بغیر نہ صرف مشورہ میں شریک کیا بلکہ بعض مواقع پر خود اپنی رائے کے خلاف ان کے فیصلوں کو تسلیم کیا۔ جیسا کہ غزوۂ احد کے موقع پر آنحضرتؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ہمیں مدینہ منورہ میں محصور ہو کر مقابلہ کرنا چاہیے یا باہر کھلے میدان میں کفار سے جنگ کرنی چاہیے؟ حضورؐ نے اپنی رائے، جس کا اظہار بھی آپؐ نے کر دیا، محصور ہو کر لڑنے کی تھی لیکن صحابہ کرامؓ کی اکثریت کھلے میدان میں مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے اپنی رائے کے خلاف ان کے فیصلہ کو قبول فرما لیا۔ حتیٰ کہ جناب رسول اکرمؐ کے ہتھیار بند ہو جانے کے بعد یہ حضرات نادم ہو کر آپؐ کی خدمت میں معذرت کے لیے آئے تو بھی آپؐ نے فیصلہ کو تبدیل نہ کیا۔ چنانچہ اسی فیصلہ کے مطابق یہ جنگ مدینہ منورہ کی گلیوں کی بجائے احد کے میدان میں لڑی گئی۔ (بحوالہ البدایہ والنہایہ ص ۱۳ ج ۴)

اسی طرح غزوۂ حنین کے بعد جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کثیر مقدار میں حاصل ہونے والے مال غنیمت اور قیدیوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا تو دشمنوں کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں آیا اور درخواست کی کہ ہم پر مہربانی کرتے ہوئے ہمارا مال اور قیدی واپس کر دیے جائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ دونوں چیزیں واپس نہیں مل سکتیں ایک کا مطالبہ کرو، تو انہوں نے قیدیوں کی واپسی کی درخواست کر دی۔ جناب نبی اکرمؐ نے مجاہدین کو جن کی تعداد

دس ہزار سے متجاوز تھی جمع فرمایا اور بنو ہوازن کے وفد کی درخواست ان کے سامنے رکھی۔ ساتھ ہی یہ فرمادیا کہ تم میں سے جو شخص اپنے حصہ کا قیدی بخوشی واپس کرنا چاہے تو بہتر ورنہ میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب قیدی واپس کرنے والوں کو آئندہ جہاد میں حاصل ہونے والے مال غنیمت اور قیدیوں کی تقسیم میں ترجیح دی جائے گی۔ اس پر مجمع سے اجتماعی آواز بلند ہوئی کہ ہم آپؐ کے فیصلہ پر بخوشی سارے قیدی واپس کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن آنحضرتؐ نے اس اجتماعی آواز کو فیصلہ کے لیے کافی نہ سمجھا اور فرمایا کہ یوں نہیں بلکہ ارجعوا حتی یرفع الینا عرفاؤکم امرکم (بخاری ص ۶۱۸ ج ۲) تم لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاؤ اور تمہارے نمائندے ہمارے پاس آکر تمہاری رائے پیش کریں تب ہم فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ لوگ واپس چلے گئے اور ان کے نمائندے ان سے بات چیت کرکے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تب آپؐ نے قیدیوں کی واپسی کا حتمی فیصلہ فرمادیا۔

حدیث میں ”عرفاء“ کا لفظ ہے جو ”عریف“ کی جمع ہے اور ہم نے اس کا معنی نمائندہ کیا ہے۔ اس لیے کہ عربی لغت کے معروف امام اسماعیل بن حماد الجوہریؒ نے الصحاح ص ۱۴۰۲ ج ۲ میں عریف اور نقیب کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ صاحب فقہ اللغۃ سے بھی علامہ بدر الدین العینیؒ سے عمدۃ القاری ص ۲۲۷ ج ۱ میں یہی قول نقل کیا ہے۔ اور المنجد ص ۵۲۱ میں بھی عریف کا معنی نقیب کیا گیا ہے۔ اور نقیب کی اصطلاح کو جب ہم بیعت عقبہ کے حوالہ سے جاننے کی کوشش کریں گے تو ہمیں اس میں نمائندگی کا پہلو واضح اور نمایاں نظر آئے گا کیونکہ بیعت عقبہ کے دونوں مواقع پر جب مدینہ منورہ (یثرب) کے دو اہم قبیلوں اوس اور خزرج کے نمائندوں نے اپنے قبائل کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تو نہ صرف آپؐ نے ان کی بیعت کو قبول کیا بلکہ خود اپنے وجود مبارک کو ان نمائندوں کی نمائندگی پر اعتماد کرتے ہوئے اہل یثرب کے سپرد کردینے کے فیصلے کا اعلان فرمایا۔ چنانچہ یہی بیعت بعد میں ہجرت کی بنیاد بنی۔ بیعت عقبہ میں اوس اور خزرج کی نمائندگی کرنے والوں کو حدیث میں ”نقباء“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے (مجمع الزوائد ص ۴۸ ج ۶)

”عریف“ کے ضمن میں یہ بات خصوصاً قابل توجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے غزوۂ حنین کی یہ روایت دیگر مقامات پر ذکر کرنے کے علاوہ کتاب الامارۃ میں ”العرفاء للناس“ کے عنوان سے مستقل باب قائم کرکے اس کے تحت یہ حدیث بطور خاص ذکر کی ہے جس سے امام

بخاریؒ کے ذہنی رجحان کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عریف اور نقیب کو ہم معنی قرار دینے کے بعد ان کے ضمن میں محدثین اور ائمہ لغت نے جو معانی نقل کیے ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے:

علامہ بدر الدین العینیؒ عمدۃ القاری ص ۲۵۴ ج ۲۴ میں عریف کا معنی کرتے ہیں "القائم بامر طائفۃ من الناس" لوگوں کے ایک گروہ کے معاملات نمٹانے والا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ عریف کا معنی کرتے ہیں "القیم بامر القبیلۃ او الجماعۃ من الانس یلي امورھم ویعرف احوالھم ویتعرف الامیر احوالھم" (بحوالہ حاشیہ مشکوۃ ص ۳۲۱) یعنی کسی قبیلہ یا لوگوں کے ایک گروہ کے معاملات نمٹانے والا جو ان کے امور طے کرے، ان کے حالات معلوم کرے اور امیر کو ان کے حالات و مسائل سے آگاہ کرے۔

صاحب فقہ اللغۃ نے عریف اور نقیب کو ہم معنی قرار دے کر نقیب کا معنی کیا ہے "شاھد القوم و ضمینھم" قوم کا گواہ اور ضامن۔

جوہریؒ نے عریف کا معنی نقیب کرنے کے بعد اس کی وضاحت میں لکھا ہے "وھو دون الرئیس" وہ سربراہ سے کم رتبہ کا ہے۔

صاحب المنجد نے ص ۹۰۵ پر نقیب کے معنی میں مندرجہ بالا اقوال کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے "الذی ینقد عن احوالھم" جو لوگوں کے احوال کرید تا ہے۔

خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض دیگر ارشادات میں بھی عریف کا ذکر کم و بیش انہی معنوں میں ملتا ہے۔ مثلاً امام ابوداؤد نے حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے روایت نقل ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

> "عرافت حق ہے اور لوگوں کے لیے عریف ضروری ہیں (حق ادا نہ کرنے والے) عرفاء دوزخ میں جائیں گے۔" (بحوالہ مشکوۃ ص ۳۳۱)

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے مسند میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

> "امراء کے لیے ہلاکت ہے، عرفاء کے لیے ہلاکت ہے، اور امناء کے لیے ہلاکت ہے۔" (مشکوۃ ص ۳۲۱)

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین افراد امیر، عرف اور امین کو ہلاکت کے حوالہ سے ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے اور ان تینوں کا تعلق مسلمانوں کے نظم مملکت سے ہے۔

علامہ بدر الدین العینیؒ نے ”عرفاء“ کے چناؤ کو غزوۂ حنین کے حوالے سے سنت قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ امیر اور امام کے لیے براہ راست تمام لوگوں کے حالات سے واقف ہونا ممکن نہیں اس لیے امیر اور رعیت کے درمیان عرفاء کا وجود ضروری ہے تاکہ لوگوں کے مسائل کے حل میں امام کی معاونت کر سکیں۔ (عمدۃ القاری ص ۲۵۴ ج ۲۴)

مختصر اً یہ کہ

1. منصوص مسائل میں قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔
2. غیر منصوص مسائل میں سے اجتہادی امور پر صرف اجتہادی صفات سے متّصف افراد ہی فیصلہ دے سکتے ہیں۔
3. انتظامی امور اور لوگوں کے حقوق اور مسائل کے بارے میں عوام کو براہ راست یا نمائندوں کے ذریعے مشاورت میں شریک کیا جا سکتا ہے۔
4. قبیلوں، عوام کے مختلف گروہوں یا جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک پلیٹ فارم ضروری ہے جو عرفاء کے طور پر عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ کا کام دے۔ ان عرفاء یا نقباء کا چناؤ بھی وہی قبیلے، عوام کے گروہ یا جماعتیں کریں گی۔

۴۔ سربراہ مملکت کے لیے اہلیت کا معیار

اس سوال پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے ہمیں خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور میں اختیار کیے گئے طریق کار پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اس کے بعد امت کے تیرہ سو سالہ تعامل اور ائمہ وفقہاء کی آراء واقوال کو سامنے رکھ کر اپنے لیے راہ عمل متعیّن کرنا ہوگی۔

خلافت راشدہ میں سب سے پہلے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتخاب کو لیجیے، اس سلسلہ میں حدیث و تاریخ کی کتب میں جو روایات نقل کی گئی ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر مجموعی نتیجہ اخذ کیا جائے تو مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

1. جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ اشارۃ حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت، اہلیت اور استحقاق نیابت کے بارے میں بہت کچھ فرما دیا تھا لیکن باقاعدہ ان کی نامزدگی نہیں فرمائی تھی۔

2. جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کی جس مجلس میں حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ چنا گیا اس میں انصار مدینہ کی طرف سے خلافت کے ایک سنجیدہ امیدوار حضرت سعد بن عبادہؓ موجود تھے۔

3. اس مجلس میں خلافت کے استحقاق کے لیے باقاعدہ بحث ہوئی اور بالآخر جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد "الائمۃ من قریش" کے حوالہ سے فیصلہ حضرت ابوبکرؓ کے حق میں ہوا۔

4. حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اس خصوصی مجلس کی بیعت کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ مسجد نبویؐ میں بیعت عامہ کا اہتمام کیا گیا۔

اسی بنا پر علامہ ابن تیمیہؒ نے مجموعہ فتاوی ص ۷۴ ج ۲۵ میں جمہور علماء، فقہاء، محدثین اور متکلمین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت مسلمانوں کے عمومی اختیار سے معرض قیام میں آئی اور علامہ عبدالوہاب الشعرانیؒ نے الیواقیت والجواہر ص ۷۶ ج ۲ میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی بنیاد "اجماع امت" کو قرار دیا ہے۔

خلافت راشدہ کے دوسرے مرحلے میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا لیکن اس نامزدگی کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی اہلیت و استحقاق پر جمہور مسلمانوں کے محسوس کیے جانے والے اعتماد کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے نامزدگی کے فیصلہ سے قبل مختلف طبقات کے افراد سے مشورہ کیا اور اس طویل مشاورت کے بعد نامزدگی کا فیصلہ کیا۔

تیسرے مرحلہ میں حضرت عمرؓ نے چھ افراد پر مشتمل کونسل قائم کر کے انہیں اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرنے کی ہدایت کر دی۔ چنانچہ کونسل میں جب فیصلہ حضرت عبدا لرحمان بن عوفؓ کے سپرد کر دیا تو روایات شاہد ہیں کہ انہوں نے اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے سے پہلے مختلف طبقات کے نمائندوں سے مسلسل مشورہ کیا اور عمومی مشاورت کے ذریعے اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کیا۔

چوتھے مرحلہ میں حضرت علیؓ کا انتخاب مدینہ منورہ میں موجود اصحاب شوری نے کیا اور پانچویں مرحلہ میں حضرت علیؓ نے اپنے فرزند حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد فرما دیا۔

خلافت راشدہ کے بعد حضرت معاویہؓ کی خلافت کی نوعیت یہ تھی کہ انہوں نے طاقت کے زور سے اقتدار حاصل کیا اور حضرت علیؓ کے متوازی حکومت قائم کر لی۔ لیکن حضرت

علیؓ کے فرزند اور ان کے نامزدہ کردہ جانشین حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری اختیار کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ جس کے بعد ائمہ اہل السنۃ والجماعۃ کی تصریحات کے مطابق حضرت معاویہؓ متفقہ طور پر خلیفہ برحق اور امیر المؤمنین بن گئے۔ (بحوالہ شرح عقیدۃ الطحاوی ص ۴۶۸)

حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد اپنے فرزند یزید کو جانشین نامزد کر دیا اور اس کے بعد نامزدگی کا یہ سلسلہ چلتا گیا اور بنوامیہ، بنوعباس اور بنوعثمان کے ادوار خلافت میں اس نے مستقل روایت کی حیثیت اختیار کرلی۔ البتہ صحابہ کرامؓ کے دور میں قیام خلافت کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے انہیں سامنے رکھ کر فقہاء امت نے خلافت کے انعقاد کے لیے مندرجہ ذیل صورتوں کو جائز قرار دیا:

1. جمہور مسلمانوں یا ان کے نمائندوں کے اختیار و اجماع سے خلیفہ چنا جائے۔
2. خلیفہ کسی اہل شخص کو اپنا جانشین نامزد کرے یا نامزدگی کے دائرے کو چند اہل اشخاص کے درمیان محدود کردے۔
3. کوئی اہل شخص بزور اقتدار پر قبضہ کر کے اپنا اقتدار مستحکم کرے اور اس میں خلافت کی اہلیت موجود ہو۔

(بحوالہ: تمہید ابی الشکور السالمیؒ ص ۱۵۹۔ ازالۃ الخفاء از شاہ ولی اللہ دہلویؒ ص ۲۳۔ شرح نووی علی مسلم ص ۱۲۰ ج ۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۰ ج ۲۔ اصول الدین التیمی ص ۲۷۹)

یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ان تمام طریقوں میں سب سے افضل اور محفوظ طریقہ وہی ہے جو سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب میں اختیار کیا گیا۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے عامۃ المسلمین کی بیعت یا اختیار کو ابن تیمیہؒ نے مجموعہ فتاویٰ ص ۷۴ ج ۳۵ میں جمہور علماء و فقہاء، محدثین اور متکلّمین کے حوالہ سے عوام "براہ راست" حق تسلیم کیا ہے، جس کی تائید عبدالوہاب شعرانیؒ نے الیواقیت والجواہر ص ۷۶ ج ۲ میں "اجماع" کے عنوان سے کی ہے اور یہی اجماع ابوالشکور سالمیؒ نے تمہید ص ۱۵۹ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے طور پر نقل کیا ہے۔ لیکن نوویؒ نے شرح مسلم ص ۱۲۵ ج ۳ میں، بزرویؒ نے اصول الدین ص ۱۸۶ میں اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ازالۃ

الخفاء ص ۲۳ اور حجۃ اللہ البالغۃ ص ۱۵۰ میں اس اختیار اور اجماع کو "بالواسطہ" حق قرار دیا ہے۔ چنانچہ نوویؒ کے نزدیک یہ حق "اہل حل و عقد" کو حاصل ہے۔ بزدویؒ کے نزدیک "اہل الرائی والتدبیر" کی ایک جماعت خلیفہ کا انتخاب کرے گی اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اہل حل و عقد کو انتخاب خلیفہ کا حق دے کر مندرجہ ذیل طبقات کو اہل حل و عقد کے زمرہ میں شمار کیا ہے:

(۱) علماء (۲) قضاہ (۳) امراء (۴) وجوہ ناس (سرکردہ شخصیات) (۵) لشکروں کے سربراہ (۶) جو لوگ مسلمانوں کے خیر خواہ ہوں اور اصحاب رائے ہوں۔

اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ قیام پاکستان کے بعد تمام مکاتب فکر کے سرکردہ ۳۱ علماء نے اسلامی دستور کے لیے جو متفقہ فارمولا طے کیا تھا اس میں نکتہ ۱۲ یہ ہے:

"رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہوریا ان کے نمائندوں کو اعتماد ہو۔"

اور اسی موضوع پر گفتگو کے اختتام سے قبل ہم سیدنا عمرؓ کے اس خطبہ کا حوالہ دینا ضروری سمجھتے ہیں جس میں انہوں نے کسی شخص کے اس قول پر کہ وہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد اپنی مرضی کے ایک بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرے گا، آپؓ نے سخت تنبیہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ

"جس شخص نے بھی مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کی اس کی پیروی نہ کی جائے اور نہ اس کی بیعت کردہ شخص کو امام مانا جائے۔" (بخاری ص ۱۰۰۹ ج ۲)

مختصراً یہ کہ

1. اسلامی حکومت کی تشکیل میں عامۃ المسلمین کی رائے کو دخل حاصل ہے۔
2. سربراہ مملکت کے انتخاب کے لیے عامۃ المسلمین سے براہ راست یا بالواسطہ رائے حاصل کرنے کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کے خلیفہ، امام یا امیر کے لیے مسلمان ہونے کی شرط تو واضح اور بدیہی ہے جس کے لیے کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ ابن خلدونؒ نے مندرجہ ذیل چار صفات کو خلیفہ یا امام کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ (ابن خلدون ص ۳۴۲ ج ۱)

(۱)علم (۲) عدالت (۳) متعلقہ امور کی صلاحیت (۴) جسمانی و ذہنی سلامتی۔ پانچویں شرط یعنی خلیفہ کے قریشی ہونے کو ابن خلدونؒ نے اختلافی شرط لکھا ہے۔

صاحب در مختار نے ص ۵۴۳ج ۱ میں یہ شرائط لکھی ہیں:

(۱) مسلمان ہو (۲) آزاد ہو (۳) عاقل ہو (۴) بالغ ہو (۵) امور مملکت پر قادر ہو (۶) قریشی ہو۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے:

> ”چونکہ خلافت سے متعلقہ امور میں (۱) دینی علوم کا احیاء (۲) ارکان اسلام کا قیام (۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۴) قیام جہاد (۵) قضاء (۶) حدود اسلامی کا قیام شامل ہیں اس لیے ان تمام امور کا علم اور ان پر دسترس خلافت کی شرائط میں ہے۔“ (ازالۃ الخفاء ص ۱۸)

دوسرے مقام پر شرائط کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) مسلمان ہو (۲) عاقل و بالغ ہو (۳) آزاد ہو (۴) بہادر ہو (۵) مرد ہو (۶) گفتگو اور سمع و نظر کی اعلی صلاحیت کا حامل ہو (۷) عادل ہو یعنی کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرنے والا ہو (۸) مجتہد درجہ کا عالم ہو (۹) قریشی ہو۔ (ازالۃ الخفاء ص ۱۸ تا ۲۳)

ابو اسحاق شاطبیؒ نے الاعتصام ص ۱۰۸ ج ۲ میں اس بات پر علماء کا اتفاق نقل کیا ہے کہ خلافت کی اہمیت کے لیے سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ شرعی علوم میں مجتہد اور مفتی درجہ کا عالم ہو۔

ان ساری شرائط کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیفہ کو دینی علوم سے واقف، امور سیاست و سلطنت سے آگاہ، مدبر اور جری ہونا چاہیے تاکہ وہ اسلامی احکام کی روشنی میں ملک کا نظام بخوبی چلا سکے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ۲۲ دستوری نکات مرتب کرنے والے ۳۱ علماء نے بھی سربراہ مملکت کے لیے مسلمان مرد ہونے کے بعد تدین، صلاحیت اور اصابت رائے کو شرط قرار دیا ہے۔ اور مندرجہ بالا تمام شرائط کم و بیش ان تین شرطوں میں سما جاتی ہیں۔ ان میں صرف قریشی ہونے کی شرط اختلافی ہے جس پر علماء کے اختلاف کا ذکر ابن خلدونؒ نے بھی کیا ہے۔ اس سلسلہ میں کسی طویل بحث میں پڑے بغیر یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ ان علماء امت کے موقف کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے جنہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی ”الائمۃ من قریش“ کو خبر پر محمول کرکے دیگر احادیث

صیحہ کی روشنی میں یہ رائے دی ہے کہ خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط ضروری نہیں ہے۔اس لیے کہ آج کے دور میں اس شرط پر اصرار بے شمار عملی پیچیدگیاں پیدا کر دے گا اور اس لیے بھی کہ خلافت عثمانیہ کے صدیوں پر محیط دور میں کم و بیش تمام فقہاء اور علماء کا عثمانی خلفاء کے قریشی نہ ہونے کے باوجود ان کی خلافت کی صحت اور انعقاد پر اتفاق رہا ہے، جسے خلافت کے لیے قریشیت کی شرط کو ترک کر دینے پر اجماع قرار دیا جا سکتا ہے جیسا کہ قیام پاکستان کے بعد ۳۱ علماء امت نے بھی اس شرط کا لحاظ نہیں رکھا۔

۵۔ سیاسی جماعتوں کا وجود اور ان کی حیثیت

سیاسی جماعتیں آج کی سیاسی و جمہوری زندگی کا ایک ایسا لازمہ ہیں جس کے بغیر سیاسی پیش رفت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسلامی معاشرہ کے اولین دور میں اس قسم کی جماعتوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا جس سے ذہنوں میں بجا طور پر یہ شبہ ابھرتا ہے کہ کیا اسلامی نظام میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل اور جماعت بندی کے ذریعے اقتدار و سیاست کے مسائل طے کرنے کا کوئی جواز بھی ہے؟

جہاں تک موجودہ طرز کی سیاسی جماعتوں کی تشکیل اور ان کی بنیاد پر سیاسی ڈھانچہ کو استوار کرنے کا تعلق ہے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ قرون اولی میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں دنیا کے کسی بھی معاشرہ میں سیاسی جماعت بندی کا تصور موجود نہ تھا بلکہ سیاسی تقسیم قبائل کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی۔ خود مکہ مکرمہ میں بنوہاشم اور بنوامیہ کی سیاسی چپقلش اور یثرب میں بنواوس اور بنوخزرج کے درمیان محاذ آرائی تاریخ کی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ان قبائل کے مشرف بہ اسلام ہونے تک جاری رہی۔

سوال یہ ہے کہ کیا قبائل یا گروہوں کے عنوان سے معاشرہ کی سیاسی تقسیم کو اسلام نے بھی قبول کیا ہے یا نہیں؟ ہمارے خیال میں تاریخ کے مسلمہ حقائق اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد سب سے پہلا اہم ترین واقعہ غزوۂ بدر ہے جس میں قبائل کی بنیاد پر اسلامی فوج کی تقسیم کے علاوہ تقسیم کی ایک اور ترقی یافتہ شکل بھی ابھری ہے جسے مہاجرین اور انصار کی تقسیم کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ تقسیم کی یہ ترقی یافتہ شکل پورے اسلامی معاشرہ پر حاوی ہوتی چلی گئی، مثلاً:

1. بدر کے معرکہ کے لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو جب تک حضرت سعد بن معاذؓ نے انصار مدینہ کی طرف سے بطور خاص نمائندگی کرتے ہوئے شریک جنگ ہونے کا یقین نہیں دلایا جناب رسول اللہؐ کو اطمینان نہیں ہوا۔ (قصص القرآن از مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ص ۴۰۳ ج ۴ بحوالہ بخاری و مسلم)

2. بدر اور دیگر غزوات میں جناب نبی اکرمؐ نے انصار اور مہاجرین کو اپنے دست مبارک سے الگ الگ پرچم عطا فرمائے۔

3. غزوۂ حنین میں مال غنیمت کو قریش کے نومسلموں میں تقسیم کیے جانے کو انصار نے بطور انصار محسوس کیا حتی کہ آنحضرتؐ نے انصار مدینہ کا الگ اجتماع کر کے ان کی تشفی و اطمینان کا اہتمام کیا۔

4. جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد جانشین کے انتخاب کے موقع پر بھی انصار اور مہاجرین کی یہ تقسیم کھل کر سامنے آئی جسے بڑی مشکل سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے سنبھالا۔

ان حقائق پر غور و خوض سے یہ حقیقت نکھرتی چلی جاتی ہے کہ اسلام نے معاشرہ کی سیاسی تقسیم کو قبائل سے آگے بڑھ کر ایک ترقی یافتہ شکل دی اور دور نبوت و خلافت راشدہ میں مہاجرین اور انصار کی یہ تقسیم نہ صرف یہ کہ محسوس کی جاتی رہی بلکہ جناب نبی اکرمؐ اور خلفاء راشدین نے اس تقسیم کو قبول بھی کیا۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسلام معاشرہ میں سیاسی گروہ بندی کو، بشرطیکہ وہ ملت اسلامیہ کی وحدت کے لیے خطرہ نہ بنے، روا رکھتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رکھ لینی چاہیے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو ”بر“ اور ”تقویٰ“ کے معاملہ میں باہمی تعاون کا حکم دیا ہے اور کسی مقصد اور پروگرام کے لیے ایک نظم کے تحت جماعت کی تشکیل باہمی تعاون ہی کی ایک منظم اور ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل اگر ملی وحدت کے استحکام کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ہو اور ان کے منشور اور پروگرام کی بنیاد ”بر“ اور ”تقویٰ“ پر ہو تو اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

٦۔ امیدواری کا مسئلہ

کسی منصب کے لیے خود امیدوار ہونے کے شرعی جواز کا مسئلہ بھی ان دنوں زیر بحث ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدّد ارشادات کے حوالے سے یہ کہا جارہا ہے کہ اسلام کسی منصب کے لیے خود امیدوار ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر ہمارے نزدیک مسئلہ کی اصل صورت یہ نہیں ہے۔

1. اس لیے کہ امیدوار ہونا اور منصب طلب کرنا فی نفسہ معیوب یا مذموم امر نہیں ہے، ورنہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہت اور حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر سے وزارت خانہ کا تقاضہ نہ کرتے۔

2. نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جن ارشادات میں امارت یا قضا کا سوال اور تقاضہ کرنے کی ممانعت مذکور ہے ان میں بھی آپؐ نے مختلف حضرات کو مختلف انداز میں بات فرمائی ہے۔ مثلاً:

- حضرت ابوذرؓ نے تقاضہ کیا کہ مجھے عامل بنا دیا جائے تو نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ابوذرؓ تم کمزور ہو اور یہ امانت ہے۔ (مسلم ص ۱۲۱ ج ۲)
- ایک انصاری صحابیؓ نے عامل بنانے کا تقاضہ کیا تو نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میرے بعد تم نامساعد حالات دیکھو گے اس لیے صبر کرو۔ (بخاری ص ۱۰۷۲ ج ۱)
- حضرت عبد الرحمان بن سمرہؓ کو نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ امارت کا سوال نہ کرنا اس لیے کہ امارت بغیر سوال کے ملے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کی جاتی ہے اور اگر سوال سے ملے تو اس کی اپنی ذمہ داری پر چھوڑ دی جاتی ہے۔ (مسلم ص ۱۲۵ ج ۳)

3. حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے چچازاد بھائی انہیں بتائے بغیر سفارشی بنا کر نبی اکرمؐ کی خدمت کے پاس لے گئے اور عامل بنانے کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا بخدا ہم اس کو عامل نہیں بناتے جو سوال کرے اور حریص ہو۔ (ص ۱۲۵ ج ۲)

ان ارشادات پر ایک بار پھر غور فرمائیے یقیناً آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ آنحضرتؐ نے طلب قضا یا طلب امارۃ کی مطلقاً ممانعت نہیں فرمائی بلکہ ہر شخص کو

اس کے مخصوص حالات اور کیفیت کے مطابق جواب دیا۔ کسی کو کمزوری کے حوالے سے، کسی کو قضا اور امارت کی سخت ترین ذمہ داری سے، اور ان میں سے صرف ایک مقام پر حضورؐ نے انکار میں شدت اختیار فرمائی ہے جہاں سوال کرنے والے اپنے ساتھ سفارشی بھی لائے ہیں اور آپؐ کو ان میں حرص کا عنصر نظر آتا ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہؐ نے اس ارشاد میں سوال کے ساتھ حرص کا بھی ذکر کیا ہے۔

4. اس کے ساتھ اگر حضرت ابوہریرہؓ کی مندرجہ ذیل روایت کو بھی سامنے رکھا جائے تو معاملہ مزید صاف ہو جاتا ہے۔ اس روایت کے مطابق:

> ”جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے مسلمانوں کی قضا کا منصب طلب کیا اور اس کو پا لیا تو اگر اس کا انصاف ظلم پر غالب رہا تو اس کے لیے جنت ہے، اور اگر اس کا ظلم انصاف پر غالب رہا تو اس کے لیے جہنم ہے۔“ (ابوداؤد ص ۵۰۳ ج ۲)

اسی لیے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور دیگر محدثین نے ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنے اوپر اعتماد ہو کہ وہ منصب کے تقاضے پورے کر سکے گا اور اس کا مقصد حصول جاہ و اقتدار نہیں بلکہ خدمت خلق ہو تو ایسے شخص کے لیے منصب کا طلب کرنا ممانعت کے ضمن میں نہیں آتا۔ (حاشیہ ابوداؤد ص ۵۰۳ ج ۲۔ اعلاء السنن ص ۷ ج ۳)

5. اور اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ اگر عہدہ کی طلب اور تقاضے کی کلی ممانعت کو بنیاد بنا لیا جائے تو آج کے دور میں ہماری اجتماعی زندگی کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکے گی کیونکہ جناب رسول اکرمؐ سے طلب عہدہ کی ممانعت میں جو ارشادات منقول ہیں ان میں سیاسی عہدہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ ان تین قسم کے عہدوں کا ذکر ہے: قضاء (بحوالہ ابوداؤد ص ۵۰۴ ج ۲)، امارۃ (بحوالہ مسلم ص ۱۲۵ ج ۲)، استعمال یعنی عامل بنانا (بحوالہ مسلم ص ۱۲۱ ج ۲)

ان میں سے قضاء کا تعلق عدلیہ سے، امارۃ کا تعلق سیاست سے اور استعمال کا تعلق انتظامیہ سے ہے۔ اور اگر ان تینوں شعبوں میں یہ اصول بنا لیا جائے کہ کوئی عہدہ درخواست، مطالبہ یا تقاضے کی بنیاد پر نہیں دیا جائے گا تو تخیلاتی طور

پر یہ بات کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو مگر عمل کی دنیا میں اس سے پوری اجتماعی زندگی کا
پہیہ جام ہو کر رہ جائے گا۔

ان امور کی بنا پر ہماری رائے یہ ہے کہ جس طرح عدلیہ اور انتظامیہ کے مناصب کے لیے اہلیت کی ضروری شرائط عائد کر کے امیدواروں میں سے موزوں افراد کو چنا جاتا ہے اسی طرح سیاسی عہدوں کے لیے بھی اہلیت کی شرائط کا تعین ہونا چاہیے اور ان شرائط پر پورا اترنے والے افراد کے لیے سیاسی عہدوں کی طلب اور امیدواری کے لیے دروازے کھلے رہنے چاہئیں۔

۷۔ عورتوں کی رائے

عورتوں کو رائے کا حق دینے کا مسئلہ بھی خاصا نازک ہے اور سنجیدہ غور و خوض کا محتاج ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات تو شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ عورتوں سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور خلافت راشدہ کے دور میں بھی عورتوں ہی سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ اس لیے عورتوں کے حقوق و مسائل میں عورتوں ہی کو ان کی نمائندگی کا حق دینے کا تصور غیر اسلامی نہیں ہے جبکہ عوامی مسائل میں بھی عورتوں کے رائے دینے کی روایات موجود ہیں۔ جیسا کہ حضرت عطاء بن ابی رباحؒ نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں کہا ہے کہ

> ”وہ لوگوں میں سب سے زیادہ فقیہہ اور عالم تھیں اور عام لوگوں کے مسائل میں سب سے اچھی رائے دینے والی تھیں۔“ (تہذیب التہذیب ص ۴۳۵ ج ۱۲)

اور اس کے ساتھ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا یہ ارشاد بھی ملا لیا جائے کہ

> ”ہم اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی کوئی اشکال پیش آیا اور ہم نے اسے حضرت عائشہؓ کے سامنے رکھا تو ان کے پاس اس کے بارے میں علم پایا۔“
> (ترمذی ص ۲۳۰ ص ۲)

گویا حضرت ام المؤمنین عائشہؓ نے علمی اور عوامی مسائل میں صحابہ کرامؓ کی راہنمائی کر کے یہ اصول قائم کر دیا کہ عورتیں اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق علمی اور عوامی دونوں امور میں رائے دے سکتی ہیں۔ اب یہاں صرف یہ اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں اور مردوں کے درمیان حجاب کی جو حدود قائم کی ہیں ان کی موجودگی میں عورتوں کے لیے عوامی مسائل میں مروجہ انداز میں رائے دینا کہاں تک ممکن ہے۔ تو اس

کے حل کے لیے یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ عورتوں کے حقوق و مسائل میں عورتوں کی نمائندگی کا اصول تسلیم کرتے ہوئے حجاب کی شرعی حدود کے اندر ان کے لیے اس کا اہتمام کیا جائے۔ اور جن مجالس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا مشترک طور پر شریک ہونا ضروری خیال کیا جائے ان میں شرکت کرنے والی خواتین کے لیے عمر کا اس حد تک تعین کر دیا جائے جہاں شریعت بھی حجاب کی پابندیوں کو نرم کر دیتی ہے۔

خلاصہ کلام

آخر میں ہم اس تمام گفتگو کے خلاصہ کے طور پر یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام کا سیاسی نظام ''اہلیت اور نمائندگی'' کے حسین امتزاج کا نام ہے جہاں حاکم اور رعایا کے درمیان اعتماد کا رشتہ رکھنے کے لیے ''نمائندگی'' کا اصول اپنایا گیا ہے اور نظم ریاست کو صحیح طور پر نمٹانے کے لیے ''اہلیت'' کو معیار بنایا گیا ہے۔ اس لیے معاشرہ کو اسلامی نظام کے سانچہ میں ڈھالنے کے لیے ضروری ہے کہ اجتماعی زندگی کی گاڑی کو نمائندگی اور اہلیت کے دو فطری پہیوں (قدموں) پر کھڑا کیا جائے تاکہ ملت اسلامیہ کا قافلہ امن و خوشحالی اور دنیوی و اخروی فلاح کی منزل حقیقی کی طرف گامزن ہو سکے۔

(نوٹ: اسلامی نظام کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں مندرجہ بالا معروضات راقم الحروف کے ذاتی مطالعہ کا ماحصل ہیں اور ان میں کسی سیاسی یا مذہبی مکتب فکر کی نمائندگی کا داعیہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے انہیں صرف قرآن و سنت کے ایک طالب علم کی انفرادی کاوش اور اس کے ذاتی مطالعہ کے نتیجہ کے طور پر ہی پڑھا جائے۔ ابو عمار زاہد الراشدی)

۱۹۷۶ء

حضرت امیر معاویہؓ اور ان کی روایت کردہ چند احادیث

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۶ء)

امیرالمؤمنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما ان خوش قسمت ترین افراد میں سے ہیں جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے شرف صحابیت کے ساتھ ساتھ عقل و دانش اور فہم و فراست کی وافر دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔ ان کا شمار عرب کے ذہین ترین سیاست دانوں میں ہوتا ہے اور ان کی سیاسی بصیرت بطور مثال پیش کی جاتی ہے۔ حضرت معاویہؓ نہ صرف خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے بلکہ ان کے والد گرامی حضرت ابو سفیانؓ، والدہ محترمہ حضرت ہندہؓ، برادر گرامی حضرت امیر یزیدؓ اور ہمشیرہ محترمہ حضرت ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا شمار بھی صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ام حبیبہؓ تو جناب رسول اکرمؐ کی زوجہ مکرمہ اور تمام مسلمانوں کی قابل احترام ماں ہیں۔

حضرت معاویہؓ کی عظمت اور بزرگی پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بات پیش نہیں کی جا سکتی کہ ان کا شمار ان کاتبین وحی میں ہوتا ہے جنہیں خداوند بزرگ و برتر نے قرآن کریم میں "کرام بررۃ" کے معزز خطاب سے یاد فرمایا ہے، اور یہ بات ان پر جناب نبی اکرمؐ کے بے پناہ اعتماد کا واضح ثبوت ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی بزرگی کی طرف صرف قرآن کریم نے ہی اشارہ نہیں فرمایا بلکہ آنحضرتؐ نے بھی متعدّد ارشادات میں ان کے فضائل حمیدہ کا ذکر فرما کر ان کی تعریف فرمائی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ارشاد ہے:

"معاویہؓ میری امت میں سب سے زیادہ سخی اور بردبار ہے"۔ (طبرانی)

ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"معاویہؓ میرا رازدار ہے"۔(محب طبری)

ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو دعا دی:

"اے اللہ! معاویہؓ کو ہادی و مہدی بنا"۔(ترمذی)

ایک بار نگاہ نبوت نے حضرت معاویہؓ کی پیشانی پر امارت و خلافت کے آثار دیکھ کر ان الفاظ کے ساتھ انہیں نوید سنائی کہ

"اے معاویہؓ! اگر تجھے حکومت ملی تو اللہ سے ڈرنا اور نرمی کرنا"۔

الغرض یہ اور ان جیسے دیگر ارشادات نبوت اس امر پر شاہد ہیں کہ حضرت معاویہؓ اپنی عادات و فضائل اور شرف و سعادت کی بنا پر متعدّد بار بارگاہ نبوت سے داد تحسین پا چکے ہیں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اعتماد بھی حضرت معاویہؓ کو حاصل رہا۔ امیرالموٴمنین حضرت عمرؓ نے ان کے بڑے بھائی حضرت امیر یزید بن ابی سفیانؓ کی وفات کے بعد ان کی جگہ انہیں شام کا حاکم مقرر کیا، اور اس کے بعد وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پورے دور میں گورنر شام رہے۔ اس دوران ایک بات بطور خاص دلچسپ اور قابل ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ جو اپنے گورنروں پر گرفت کے معاملے میں بڑے سخت تھے اور انہوں نے گورنروں پر باریک لباس نہ پہننے، چھنا ہوا آٹا نہ کھانے اور دروازے پر چھتہ تک نہ بنانے کی پابندی لگا رکھی تھی، ایک دفعہ شام کے دورے پر گئے تو دیکھا کہ حضرت معاویہؓ نے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ دربار لگا رکھا ہے۔ دریافت کیا تو عرض کیا کہ حضرت یہ سرحدی صوبہ ہے، پڑوسی ملکوں کے جاسوس آتے رہتے ہیں اس لیے ان کے سامنے شان و شوکت کے اظہار کے لیے میں نے ایسا کرنا ضروری سمجھا ہے۔ باقی رہی میری حالت، تو آپ دیکھیے میں نے وہی سادہ پیوند لگے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، اور ان کے اوپر صرف دربار میں دکھاوے کے لیے خوشنما چوغہ پہن کر آتا ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کے ایک ساتھی نے کہا حضرت دیکھیے معاویہؓ نے اپنے عمل کی تعبیر کتنی اچھی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے مسکرا کر فرمایا کہ اسی لیے تو ہم نے ان کو اتنے اہم صوبے کا گورنر بنا رکھا ہے۔ گویا امیرالمومنین حضرت عمرؓ نے ان کی وضاحت کو نہ صرف قبول فرما لیا بلکہ دبے الفاظ میں اس کی تحسین بھی فرمائی، اور یہ ان پر حضرت عمرؓ کے مکمل اعتماد کا شاندار اظہار ہے۔

صحابہ کرامؓ کے ساتھ ساتھ خاندان نبوتؐ نے بھی متعدّد مواقع پر حضرت معاویہؓ پر اعتماد کا اظہار کیا۔ بلکہ آپ تو خود خاندان نبوت سے متعلق تھے کہ آپ کی حقیقی بہن حضرت ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حرم نبویؐ میں تھیں۔ چند سازشیوں اور شرپسندوں کی سازش سے جب صحابہ کرامؓ کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور بڑھتے بڑھتے باہمی جنگ و قتال پر منتج ہوئیں تو دنیا نے سوچا کہ یہ شیرازہ شاید اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بکھرا رہے گا۔ لیکن امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد ان کے فرزند اور جناب رسول اکرمؐ کے نواسے حضرت حسن بن علیؓ جب سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے دشمنوں کی ان توقعات پر پانی پھیر دیا اور حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو کر اور ان کے ہاتھ پر اطاعت و وفاداری کی بیعت کر کے پوری ملت اسلامیہ کو ایک بار پھر ایک پرچم تلے متحد کر دیا۔

حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے حضرت حسنؓ کی دستبرداری جہاں اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ باہمی جنگ و قتال کے باوجود حضرت معاویہؓ کو خاندان نبوت کا اعتماد حاصل تھا، وہاں حضرت معاویہؓ کے اس شرف کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ان کے عہد خلافت میں ایک بار پھر پوری امت مسلمہ جمع ہو گئی اور ان کے ساڑھے انیس سالہ دور خلافت میں پھر کسی باہمی انتشار و افتراق کا سراغ نہیں ملتا۔

حضرت معاویہؓ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں دیگر فضائل و مناقب سے نوازا تھا وہاں ان کا شمار صحابہ کرامؓ کے اس پاکیزہ گروہ میں ہوتا ہے جس نے نبی اکرمؐ کے ارشادات کو امت تک پہنچانے کا شرف حاصل کیا۔ بلکہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے بقول تو حضرت معاویہؓ نہ صرف احادیث رسولؐ کے راوی ہیں بلکہ مجتہد صحابیؓ ہیں۔

راقم الحروف گزشتہ سال (اکتوبر ۱۹۷۵ء کے دوران) جب ”نظام شریعت کنونشن گوجرانوالہ“ میں قرار دادیں پڑھنے کے جرم میں تحفظ امن عامہ آرڈیننس کی دفعہ ۱۶ کے تحت حوالۂ زندان ہوا تو ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں فراغت کے اوقات کو حضرت معاویہؓ کی روایت کردہ احادیث جمع کرنے میں صرف کیا اور ان میں سند و متن کے اعتبار سے چالیس صحیح احادیث کا انتخاب کر کے ”الاربعین عن معاویۃؓ امیر المومنین“ کے نام سے ایک مسودہ ترتیب دیا جس پر والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ العالی کی نظر ثانی کے بعد وہ مسودہ شائع کرنے کا خیال ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اب اتفاق سے تحریک مسجد نور

کے سلسلہ میں دوبارہ ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں فرصت کے لمحات میسر آئے ہیں تو پرانی یاد پھر تازہ ہوگئی ہے لیکن اس وقت میرے پاس صرف علامہ جلال الدین السیوطیؒ کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث ”الجامع الصغیر“ ہے، اس کے علاوہ حدیث کی کوئی اور کتاب موجود نہیں۔ اس لیے الجامع الصغیر پر ایک سرسری نظر ڈال کر حضرت معاویہؓ کی روایت کردہ چند احادیث نبوی علی صاحبہا التحیۃ والسلام قارئین ترجمان اسلام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

سفارش کا اجر

ابن عساکرؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”سفارش کرو، اجر دیے جاؤ گے“۔ یعنی اچھے کاموں میں اگر تمہاری سفارش سے کسی کا مقصد حل ہوتا ہے تو اس کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔

لیلۃ القدر

- طبرانیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لیلۃ القدر کو ستائیسویں رات میں تلاش کرو“۔
- ابن نصرؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا ”لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری راتوں میں تلاش کرو“۔
- ابوداؤد حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا ”لیلۃ القدر ستائیسویں رات ہے“۔

لیلۃ القدر کے بارے میں روایات مختلف ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی پانچ طاق راتوں میں سے ایک ہے اور ان میں سے کسی ایک رات کا تعین نہیں ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ

طبرانیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق جاری کر دیا ہے“۔

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے بہت سے احکام و مسائل ان کی زبان سے کہلوانے کے بعد ان کے مطابق وحی

نازل فرمائی۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے بارے میں حضرت عمرؓ پہلے رائے کا اظہار کر چکے تھے۔ ایسے امور کو ''موافقات عمرؓ'' کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ غالب ہے

طبرانیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مغلوب نہیں ہوتے، انہیں دھوکہ نہیں دیا جا سکتا اور انہیں کسی ایسے معاملے کی خبر نہیں دی جاتی جس کے بارے میں انہیں پہلے علم نہ ہو۔''

اعمال کی مثال

ابن ماجہؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا: ''اعمال کی مثال برتن جیسی ہے، اگر اس کا نیچے والا حصہ پاک ہو تو اوپر والا حصہ بھی پاک ہو گا، اور اگر نیچے والا حصہ خراب ہو تو اوپر والا بھی خراب ہو گا۔''

جھوٹ سے ممانعت

طبرانیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''میں تمہیں جھوٹ سے منع کرتا ہوں۔''

باہمی مدح

ابن ماجہؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: ''باہمی مدح و ستائش سے بچو کیونکہ یہ ایک دوسرے کو ذبح کرنا ہے۔''

مصنوعی بال

نسائی حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ''جس عورت نے اپنے بالوں کے ساتھ مصنوعی بالوں کا اضافہ کیا، اس نے جھوٹ کا اضافہ کیا۔''

اہل خانہ سے حسن سلوک

طبرانیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔ اور تم میں سے اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا میں ہوں۔''

ظالم حکمران

ابویعلیؒ اور طبرانیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: "میرے بعد کچھ حکمران ایسے بھی آئیں گے جو بات کریں گے تو کوئی انہیں ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکے گا، ایسے حکمران جہنم میں بندروں کی طرح چھلانگیں لگاتے پھریں گے۔"

حضرت طلحہؓ

سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۲۳ میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: "مومنوں میں کچھ مرد ایسے ہیں جنہوں نے اللہ تعالی کے ساتھ اپنا عہد سچ کر دکھایا۔ پس ان میں سے کچھ نے اپنا ذمہ پورا کر دیا اور کچھ منتظر ہیں"۔

ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "طلحہؓ اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنا ذمہ پورا کر دیا ہے"۔

غصہ شیطانی فعل ہے

ابن عساکرؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: "غصہ شیطانی کام ہے، شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے۔ اس لیے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو غسل کر لیا کرے۔"

ناقابل مغفرت گناہ

احمدؒ، نسائیؒ اور حاکمؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا: "ہر گناہ کے بارے میں اللہ تعالی سے معافی کی امید کی جا سکتی ہے مگر شرک کرنے والے اور مومن بھائی کو عمداً قتل کرنے والے کی بخشش نہیں ہوگی"۔

لہو و لعب

بخاریؒ الادب المفردؒ میں اور بیہقیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: "لہو و لعب کا مجھ سے اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

گناہوں کا کفارہ

احمدؒ اور حاکمؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: "مومن کو جب بھی کوئی ایسی تکلیف پہنچتی ہے جو اسے بدنی اذیت میں مبتلا کر دے تو اللہ تعالی اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتے ہیں۔"

استقبال کی خواہش

احمدؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص نے اس بات کو پسند کیا کہ لوگ اس کا استقبال کھڑے ہو کر کریں، اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے“۔

انصارؓ سے محبت

احمدؒ اور بخاریؒ تاریخ میں حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے انصارؓ سے محبت کی، اللہ تعالی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور جس نے انصارؓ سے بغض کیا، اللہ تعالی اس سے بغض کرتے ہیں۔“

اذان کے جواب کا اجر

طبرانیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے اذان سن کر اس کے الفاظ دہرائے اس کو مؤذن جتنا ثواب ملے گا۔“

مسئلہ یہ ہے کہ اذان کے الفاظ کا جواب دینا چاہیے۔ حی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الاباللہ جبکہ باقی کلمات کے جواب میں وہی جملے کہنے چاہئیں۔ اور اذان کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھ کر ”اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ۔۔۔“ دعا پڑھنی چاہیے۔

بچوں سے پیار

ابن عساکرؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ”جس کے بچے ہوں، اسے ان سے پیار کرنا چاہیے۔“

نبیؐ پر جھوٹ

احمدؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا (یعنی کوئی غلط بات منسوب کی) تو اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے۔“

دین کی سمجھ

احمدؒ اور بیہقیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص کے ساتھ اللہ تعالی بہتری کا ارادہ کرتے ہیں، اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔“

مؤذن کی گردن

احمدؒ، مسلمؒ اور ابن ماجہؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا:
"قیامت کے دن مؤذنوں کی گردنیں اونچی ہوں گی۔"

مغالطہ پیدا کرنے کی ممانعت

احمدؒ اور ابوداؤد حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغالطے پیدا کرنے سے منع فرمایا ہے۔"

متعہ کی ممانعت

طبرانیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے مندرجہ ذیل چیزوں سے منع فرمایا ہے:

- سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے سے،
- سونا اور ریشم پہننے سے،
- چیتے کی کھال پر بیٹھنے سے،
- متعہ (محدود وقت کے لیے نکاح کرنے) سے،
- پختہ عمارتیں بنانے سے،
- میت پر نوحہ کرنے سے،
- بیہودہ شعر گوئی کرنے سے،
- تصویر بنانے سے،
- درندوں کے چمڑے استعمال کرنے سے،
- زینت کے بے جا اظہار سے،
- گانے بجانے سے،
- مرد کو سونا اور ریشم استعمال کرنے سے۔

سخاوت اور بخل

ویلمیؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:
"سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک ہے جس کی ٹہنیاں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں۔ جس نے اس کی ٹہنی کو پکڑ لیا وہ اسے جنت میں لے جائے گی۔ اور بخل جہنم کے درختوں میں سے

ایک ہے جس کی ٹہنیاں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں۔ جس نے اس کی ٹہنی کو پکڑ لیا وہ اسے جہنم میں لے جائے گی۔“

دو نمازوں میں وقفہ

احمدؒ اور ابوداؤدؒ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ”ایک نماز ختم ہوجانے کے بعد دوسری نماز اس وقت تک نہ شروع کی جائے جب تک پہلی نماز مکمل نہ ہوجائے، یا جب تک درمیان میں بات نہ کرے۔“

۱۹۷۳ء

مسئلہ ارتداد اور الحاج ممتاز احمد فاروقی کا موقف

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور-۱ مارچ ۱۹۷۳ء)

قائد جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے ۲ فروری ۱۹۷۳ء کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اپنی نشری تقریر اور انٹرویو میں مستقل آئین کے مسودہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ مسودہ آئین میں مسلمان کو مرتد ہونے کی اجازت دی گئی ہے، حالانکہ اسلام میں کسی بھی مسلمان کو اسلام چھوڑنے کا حق نہیں ہے اور مرتد کی شرعی سزا قتل ہے۔ اس پر محترم الحاج ممتاز احمد فاروقی نے نوائے وقت (۱۳ فروری) میں مطبوعہ ایک مضمون میں مفتی صاحب کے اس موقف پر اعتراض کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرتد کو قتل کرنے کا سوال نہ تو عقلاً درست ہے اور نہ ہی شرعی طور پر اس کا کوئی واضح ثبوت ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قارئین کی خدمت میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

قرآن کریم اور مرتد کی سزا

قرآن کریم میں مرتد کی سزا صراحت کے ساتھ قتل بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ پہلے پارہ میں ہی اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جب بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی تو اللہ رب العزت نے ان کی توبہ کی قبولیت کے لیے یہ حکم صادر فرمایا تھا کہ اپنے آپ کو قتل کر دو۔ چنانچہ روایات میں تصریح ہے کہ کم و بیش ستر ہزار افراد نے ارتداد کے جرم میں موت کی سزا پائی۔

احادیث نبویؐ اور مرتد کی سزا

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سلسلہ میں وضاحت کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ چند روایات پیش خدمت ہیں۔

1. حضرت ابو موسی اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے انہیں یمن میں دین کی تعلیم کے لیے بھیجا۔ ایک روز حضرت معاذؓ حضرت ابو موسیؓ کے پاس آئے تو ان کے پاس ایک شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ حضرت معاذؓ نے اسے دیکھ کر ابو موسیؓ سے کہا کہ حضرت ہم تو لوگوں کو دین سکھانے کے لیے آئے ہیں، عذاب دینے کے لیے نہیں۔ حضرت ابو موسیؓ نے جواب دیا کہ یہ اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو گیا ہے۔ اس پر حضرت معاذؓ نے فرمایا اس خدا کی قسم جس نے نبیؐ برحق کو مبعوث فرمایا، میں اس کو آگ میں جلائے بغیر نہیں ٹلوں گا۔ حضرت ابو موسیؓ نے فرمایا، ابھی ٹھہرو ہمارا اس کے ذمہ کچھ حساب ہے۔ مگر حضرت معاذؓ نے اصرار کیا کہ میں اسے جلا کر دم لوں گا، چنانچہ لکڑیاں منگوائی گئیں اور اس مرتد کو قتل کر کے سپرد آگ کر دیا۔ امام طبرانیؒ نے اس حدیث کو روایت کیا، اس کے سارے راوی ثقہ ہیں۔ یہ روایت بخاری ص ۱۰۲۳ ج ۲ اور المحلی ص ۲۳۹ ج ۸ میں بھی ہے۔ (المجمع الزوائد ص ۲۶۱ ج ۶)

2. حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا جس شخص نے دین بدل دیا اسے قتل کر دو۔ اور اس کو طبرانی نے روایت کیا اور اس کی سند حسن ہے۔ (مجمع الزوائد ص ۲۶۱ ج ۱)

3. حضرت معاویہ بن حیدۃؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا جس شخص نے دین تبدیل کیا، اسے قتل کر دو۔ اسے طبرانی نے روایت کیا، اس کے سارے راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ص ۲۶۱ ج ۴)

4. جناب نبی اکرمؐ کے پاس مسیلمہ کذاب کے قاصد پہنچے، ایک عبد اللہ بن نواحہ اور دوسرا ثمامہ بن اثال تھا۔ ان دونوں نے آنحضرتؐ کو مسیلمہ کا خط دیا جس میں یہ لکھا تھا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور آپؐ کے ساتھ مجھے شریک ٹھہرایا گیا ہے۔ آپؐ نے خط پڑھ کر قاصدوں سے پوچھا کہ تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

انہوں نے کہا جو عقیدہ مسیلمہ کا ہے وہی ہمارا ہے۔ اس پر نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اگر قاصدوں کو قتل کرنا سفارتی آداب کے خلاف نہ ہوتا تو میں تمہاری گردنیں اڑا دیتا۔ (روح المعانی ص ۱۴۱ ج ۴، مستدرک ص ۵۳ ج ۳، سنن الکبری ص ۲۰۶ ج ۷)

5. حضرت عقلمہ بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا، جو شخص مرتد ہوگیا اسے قتل کر دو۔ اس کو طبرانیؒ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ (الجامع الصغیر ص ۳۴۷ ج ۲)

6. حضرت عبدالرحمان بن ثوبانؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا جو شخص اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہوجائے اس کی گردن مار دو۔ (مجمع الزوائد ص ۲۶۱ ج ۶)

7. حضرت ام المؤمنین عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس شخص نے دین بدل دیا اسے قتل کر دو۔ (مجمع الزوائد ص ۲۶۱ ج ۶)

خلفاء راشدینؓ اور مرتد کی سزا

حضرات خلفاء راشدینؓ نے بھی اپنے ادوار میں مرتد کی سزا قتل کے حکم پر سختی سے عمل کیا۔

1. سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب سریر آرائے خلافت ہوئے تو عرب کے بہت سے قبائل مرتد ہو چکے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو ختم نبوت کے عقیدہ سے منحرف ہوکر جھوٹے نبیوں کے پیروکار بن چکے تھے اور وہ بھی تھے جو صرف زکوۃ کا انکار کرتے تھے۔ مگر صدیق اکبرؓ نے سب کے خلاف از خود اعلان جنگ فرمایا۔ حالانکہ صحابہ کرامؓ، خصوصا حضرت عمرؓ نے اس بات پر اصرار کیا کہ کم از کم مانعین زکوۃ کے خلاف سردست جہاد نہ کریں۔ مگر صدیق اکبرؓ نے انکار فرمایا اور کہا کہ جس نے نماز اور زکوۃ کے درمیان فرق کیا وہ مرتد ہے اور میں مرتدین کے خلاف ضرور لڑوں گا یہاں تک کہ ان کا خاتمہ نہ ہوجائے یا وہ اسلام کو مکمل طور پر قبول نہ کرلیں۔

چنانچہ احادیث اور تاریخ کی کم و بیش تمام کتابوں میں موجود ہے کہ صدیق اکبرؓ نے مانعین زکوۃ اور ختم نبوت کے منکروں کے خلاف پوری قوت کے ساتھ جہاد کیا اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ بعد میں ہمیں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ صدیق اکبرؓ کا فیصلہ درست تھا۔ (تاریخ الخلفاء ص ۵۴)

2. سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت ابو موسی اشعریؓ کا ایک قاصد آیا، اس نے بیان کیا کہ ایک شخص اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ عرض کیا کہ قتل کے سوا چارہ کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم نے اسے تین دن تک قید کر کے مہلت کیوں نہ دی، شاید وہ اس دوران توبہ کر لیتا۔ پھر فرمایا کہ اے اللہ! میں وہاں موجود نہ تھا اور نہ خبر ملنے پر راضی ہوں (یعنی اگر میں وہاں موجود ہوتا تو اسے قتل کرنے سے پہلے تین دن کی مہلت دیتا اور اس دوران اسے قید کر دیتا کہ شاید توبہ کر لے)۔ (فتح الباری ص ۲۹۵ ج ۱۵، نیل الاوطار ص ۲۰۳ ج ۷)

3. سیدنا عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے پاس گورنر کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا پیغام پہنچا کہ ہم نے کوفہ میں کچھ لوگوں کو پکڑا ہے جو خفیہ طور پر مسیلمہ کذاب کے دین پر عمل کرتے ہیں، ان کا کیا کیا جائے؟ امیر المومنین نے جواب دیا کہ توبہ کی مہلت دو، اگر توبہ کر لیں تو چھوڑ دو ورنہ قتل کر دو۔ پھر حضرت ابن مسعودؓ نے ان مرتدوں کو توبہ کے لیے کہا تو گروہ کے سردار عبد اللہ بن نواحہ کے سوا سب نے توبہ کر لی۔ پھر حضرت ابن مسعودؓ نے ابن نواحہ کو قتل کر کے اس کی لاش کو عبرت کے لیے کھلے بازار میں رکھ دیا اور توبہ کرنے والوں کو جلاوطن کر دیا۔ (مستدرک ص ۵۳ ج ۳، ابوداؤد ص ۲۴۷ ج ۱، سنن الکبری ص ۲۰۶ ج ۸، المحلی ص ۲۳۰ ج ۸)

حضرت سلیمان بن موسیؒ کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین عثمان بن عفانؓ کے پاس ایک شخص لایا گیا جو اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو گیا۔ آپؓ نے اسے تین دن تک توبہ کی مہلت دی، اس کے بعد توبہ نہ کرنے پر قتل کر دیا۔ (المحلی ص ۲۳۰ ج ۸)

4. امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ زندیقوں کو لایا گیا، آپؓ نے ان کو آگ میں جلوادیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ تک بات پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ میں انہیں نہ جلاتا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے عذاب کے ساتھ لوگوں کو عذاب نہ دو۔ بلکہ میں انہیں قتل کر دیتا کیونکہ آپؐ نے فرمایا جو شخص دین بدل دے اسے قتل کر دو۔ (بخاری ص ۱۰۲۰ ج ۲)

ابو عمر شیبانیؒ روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ بنو عجل کا ایک شخص مسلمان ہونے کے بعد عیسائی ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے اس کو طلب کر کے پوچھا تو کیا کہتا ہے؟ کہنے لگا میں کہتا ہوں کہ حضرت عیسی علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ حضرت علیؓ نے اسے قتل کر کے آگ میں جلا دیا۔ (المحلی لابن حزم ص ۲۲۹ ج ۸)

حضرت علیؓ کے پاس ایک بوڑھا لایا گیا جو اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو گیا تھا۔ آپؓ نے اسے کہا کہ توبہ کرے مگر اس نے انکار کر دیا، پھر آپؓ نے اس کی گردن اڑادی۔ (المحلی ص ۲۳۰ ج ۸)

5. امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ارشاد فرمایا کہ مرتد کو تین دن تک توبہ کی مہلت دی جائے، اگر اس نے توبہ نہ کی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (نصب الرایہ ص ۴۶۱ ج ۳)

ائمہ اربعہ اور مرتد کی سزا

قرآن کریم، احادیث نبویؐ اور خلفاء راشدینؓ کے ارشادات اور فیصلوں کے بعد ائمہ اربعہ کا فیصلہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

امام مناویؒ فرماتے ہیں کہ چاروں ائمہ یعنی حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ اس بات پر متفق ہیں کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ صرف عورت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک توبہ نہ کر لے یا اس کی موت نہ آجائے۔ (السراج المنیر ص ۴۴۳ ج ۳، نصب الرایہ ص ۴۶۲ ج ۳)

فاروقی صاحب کے اشکالات

یہ حوالہ جات نقل کرنے کے بعد ہم فاروقی صاحب کے ان اشکالات کا دفعیہ بھی ضروری سمجھتے ہیں جوانہوں نے اپنے مضمون میں اٹھائے ہیں۔

1. محترم فاروقی صاحب نے اس سلسلہ میں قرآن کریم کی آیات کا حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دین میں جبر نہیں۔ مگر فاروقی صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کافر کو مسلمان ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسلام قبول کرنے کے لیے کسی پر کوئی جبر نہیں مگر اسلام قبول کر لینے کے بعد اس سے انحراف اس آیت کے ضمن میں نہیں آتا۔ چنانچہ علامہ ابن حزمؒ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس آیت سے اس امر پر استدلال کرنا درست نہیں کہ مرتد پر جبر نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت اس معنی پر محمول نہیں بلکہ مرتد کو توبہ کے لیے اکراہ ضروری ہے۔ (المحلی ص ۳۳۵ ج ۸)

2. دوسرا اشکال فاروقی صاحب کا یہ ہے کہ احادیث میں صرف ایک حدیث ابن عباس سے مروی ہے جو سن شعور کو اس وقت پہنچے جبکہ مسلمانوں کی کفار سے لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو اسلام کو چھوڑ کر ساتھ ہی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ اس قید کی تہدید اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ عورتیں جنگ میں حصہ نہ لیتی تھیں۔

اس اشکال کے تین پہلو ہیں: (۱) اس باب میں صرف ایک حدیث ہے۔ (۲) یہ حکم ان مرتدوں کے بارے میں ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں کافروں سے جا ملے۔ (۳) حضرت امام ابو حنیفہؒ نے بھی اسی وجہ سے قتل کے حکم سے عورت کو مستثنیٰ کیا ہے۔

• پہلی بات تو قارئین کے سامنے آچکی ہے کہ صرف ایک حدیث نہیں متعدّد احادیث ہیں جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ مرتد کو قتل کر دو۔ وقت کی قلت کے باوجود ہم نے ایسی سات احادیث ذکر کی ہیں جبکہ خلفاء راشدین کے فیصلے الگ ہیں۔

• دوسرا پہلو بھی بے بنیاد ہے کیونکہ خلفاء راشدین کے پاس جو مرتد لائے گئے وہ مسلمانوں کے خلاف محاذ آرا نہیں تھے۔ حتی کہ حضرت عثمانؓ کے حکم سے کوفہ میں مسیلمہ کذاب کے جس گروہ کے سرغنہ کو قتل کیا گیا وہ تو ارتداد ظاہر بھی نہیں کرتے تھے بلکہ چھپ کر اپنے مذہب پر عمل پیرا تھے مگر پھر بھی مرتد کی سزا قتل کے فیصلہ سے نہ بچ سکے۔

• تیسری بات بھی بے بنیاد ہے کیونکہ امام اعظمؒ نے عورتوں کو قتل کے حکم سے اس لیے مستثنیٰ نہیں کیا کہ وہ جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہیں، بلکہ اس لیے کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور حدیث میں عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

(ملاحظہ ہو ہدایہ ص ۵۸۱ ج ۳، نصب الرایہ ص ۴۶۱ ج ۳)

3. ایک اشکال یہ بھی فاروقی صاحب نے اٹھایا ہے کہ ایک مہذب ملک میں اس قسم کی سزا کا کوئی عقلی جواز نظر نہیں آتا۔ اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ دین اسلام کے فیصلوں کا معیار محدود انسانی عقل نہیں بلکہ وحی الٰہی ہے۔ اور حدیث رسولؐ کے مقابلہ میں کسی انسان کی عقل کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ ہی کسی مسلمان کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے ارشادات کو اپنی ناقص عقل پر پرکھتا پھرے۔ پھر بھی فاروقی صاحب کی تشفی کے لیے عرض ہے کہ محترم! اسلام صرف چند عبادات پر مشتمل ایک رسمی مذہب نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ایک مکمل نظام اور دستور ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں جس میں آئین اور دستور سے بغاوت کی سزا مقرر نہ کی گئی ہو جو عموماً موت ہوتی ہے۔ حتی کہ امریکہ میں کمیونزم کا نام لینا بھی جرم ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا آئین اسلام ہے، ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے، قانون کا مأخذ قرآن اور سنت ہیں، تو اس ملکی دستور سے بغاوت و ارتداد کو

روکنے کے لیے قانون کیوں نہیں بننا چاہیے اور یہ دنیا کے کون سے معیار عقل کے خلاف ہے؟

اس لیے میں محترم فاروقی صاحب اور ان کے ہمنواؤں سے آخر میں گزارش کروں گا کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں اور ملک میں مکمل اسلامی دستور کے نفاذ اور ارتداد والحاد کے انسداد کے لیے اگر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کی جدوجہد میں شرکت ان کے بس کی بات نہیں تو کم از کم ان کی راہ میں روڑے اٹکا کر اپنی عاقبت کو خراب نہ کریں۔